تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# تفسیرِ قرآن

# تفسیرِ ماجدی

## جلد اوّل

سُورۃ فاتحہ — تا — سُورۃ مائدہ

از

مولانا عبدالماجد دریابادی

رحمۃ اللہ علیہ


مجلسِ نشریاتِ قرآن

۱۔ کے ۳۰، ناظم آباد مینشن، ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

جن کی ایک عمر عقلی علوم کے مطالعہ میں گذری تھی، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کے ذریعہ سے کتنے لوگوں کے ایمان بچ گئے، اور کتنے لوگوں کے ایمان میں نئی طاقت و توانائی پیدا ہوگئی۔

اب یہ نیا دور تھا عقلی علوم اور فلسفۂ یونان کے بجائے تجربی علوم، سائنس، بالخصوص طبیعیات کا دور دورہ تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے اکتشافات و تحقیقات ہو رہی تھیں، تاریخ و جغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کرلی تھی، جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت اور مقبولیت حاصل کرلی تھی، بہت سے قدیم تاریخی مسلّمات اور جغرافیائی روایات محلِ نظر، بلکہ خلافِ واقعہ سمجھی جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثارِ قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سبب سے عالمِ اسلام بالخصوص اس کے علمی طبقہ پر ایک نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات و تحقیقات کی روشنی میں اعجازِ قرآن اور صداقتِ قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکارا کرنا تھا، جیسا کہ قدیم علماء و متکلمین، اور مفسرینِ قرآن کو اپنے زمانہ میں یونانی فلسفہ اور حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا، اور انھوں نے علمی و عقلی دلائل سے قرآن مجید کی حقانیت کو ثابت کیا تھا۔

اس کارِ عظیم کو انجام دینے کے لئے مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے کمرِ ہمت باندھی، اور انگریزی اور اُردو میں اپنے تفسیری نوٹس کے ذریعہ اس خدمت کو انجام دیا، اس کام کی تکمیل کے لئے ہمارے علم میں وہ موزوں ترین آدمی تھے، اس لئے کہ وہ جدید علوم میں بصیرت رکھتے تھے، اُن کو مطالعہ کا شوق نہیں بلکہ عشق تھا، ان کی نظر میں غیر معمولی وسعت اور ثقافت میں تنوّع تھا، وہ جدید طبقہ کی نفسیات اور ذہنی ساخت سے واقف تھے، علم کے تیز رفتار رواں دواں قافلہ سے وہ کبھی پچھڑنے نہیں پائے، اور اس تفسیری خدمت کے دوران میں تو انھوں نے خاص طور پر اس کا اہتمام رکھا کہ کوئی ایسی کتاب ان کی نظر و مطالعہ سے بچنے نہ پائے جس سے قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق میں کچھ بھی مدد ملتی ہو، سالہا سال کی اس کوشش و مطالعہ، اور عرق ریزی کا نتیجہ اُن کی انگریزی اور اردو کی تفسیر ہے۔

راقم اس کے اظہار میں حرج نہیں سمجھتا کہ تفسیر قرآن (اپنی علمی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ) میرا ابتدا سے موضوع رہا ہے، تقریباً دس برس دار العلوم ندوۃ العلماء میں یہ مضمون میری حقیر ذات سے متعلق رہا، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی خدمت کی توفیق عطا فرمائی، اس سلسلہ میں قدیم تفاسیر میں سے کوئی قابلِ ذکر تفسیر (جو کوئی خصوصیت رکھتی ہو) ایسی یاد نہیں آتی جو نظر سے نہ گذری ہو، جدید مطبوعات بھی علم میں آتے رہے، اور ان سے بھی وقتاً فوقتاً استفادہ کی نوبت آئی، عربی ممالک کے سفر کے سلسلہ میں جدید ترین مطبوعات سے بھی واقفیت کا موقعہ ملا، اس کے بعد شاید میرا یہ عرض کرنا کچھ وقعت رکھتا ہو، اور ناظرین کے لئے ہمت افزائی اور اطمینانِ قلبی کا باعث ہو کہ "تفسیر ماجدی" اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے، اور تمام تفسیری ذخیرہ کی موجودگی میں اس کی بہرحال ضرورت تھی، قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ اُن میں قرآن کا اعجاز اور وحیِ محمدیؐ کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہوسکتی، جب تک کہ ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو، اور جن اقوال و عقائد کی تردید یا نفی کی گئی ہو، اُن کی حقیقت و اصلیت اور اُن کی اس دور میں اہمیت و مقبولیت و عمومیت معلوم نہ ہو، اس سلسلہ میں مولانا عبد الماجد صاحب نے ایک نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے، جس کا شکریہ ان سب لوگوں پر واجب ہے جو مغربی زبانوں سے براہِ راست واقفیت نہ رکھنے کی وجہ سے ان ماخذوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یا اُن کے پاس اتنا وقت اور

ایسا وسیع کتب خانہ نہیں ہے، قرآنی واقعات وقصص اور مقامات و امکنہ، نیز اشخاص واقوام اور مذاہب و فرق سے متعلق انھوں نے اتنا مواد جمع کر دیا ہے جو یکجا نہیں مل سکتا، پھر جہاں تک میری نظر پڑی ہے، وہ مسلکِ سلف سے ہٹے نہیں ہیں۔

قرآن مجید کا یہ بھی ایک اعجاز ہے اور اس کے کامل طور پر منزل من اللہ اور محفوظ رہنے کی دلیل ہے کہ صحفِ سابقہ تورات وانجیل میں باہر سے جو چیزیں داخل کر دی گئی تھیں اور بے اصل مشہورات وروایات اس میں شامل ہوگئی تھیں، کچھ تو بعد کی علمی تحقیقات کی روشنی میں اور کچھ اُن سے جو غلط فہمیاں، ذاتِ الٰہی اور انبیاء علیہم السّلام کی شخصیتوں کے بارے میں اُن سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی تھیں، بلکہ اُن سے اُن کی ذات، اُن کی عصمت وتقدس، اور اُن کی دعوت پر حرف آتا تھا، قرآن مجید کے ترجمہ ہی کے ذریعہ یا براہِ راست مطالعہ کے اثر سے ان صحیفوں کے مطالعہ کرنے والے اور اُن پر ایمان رکھنے والے ان اقوال کی نسبتوں اور صحفِ سابقہ میں ان مضامین کی شمولیت سے شرمندہ اور خائف ہوئے، اور انھوں نے کہیں اُن کو خارج کرتے اور کہیں الفاظ کے تغیّر وتبدّل سے اس کی تلافی کی کوشش کی، اور ان صحیفوں کے دوسری زبانوں میں ترجمے اور تشریح میں اور کہیں اپنے جدید علمی تحقیقات اور مذاہب و اخلاق کے موسوعات (ENCYCLOPAEDIAS) میں اُن کی نفی اور تردید کی یا ایسی جدید تحقیقات پیش کیں جن سے تردید وتنقید اور ارتیاب وتشکیک کے وہ خطرات دور ہوں اور جدید تحقیقات واکتشافات پر نظر رکھنے والے عقیدہ کے تزلزل اور شک وارتیاب سے محفوظ ہو جائیں، اور کبھی کبھی اُن کو ان بعض بیانات پر جوان "مقدّس کتابوں" میں باہر سے شامل ہو گئے ہیں، اور وہ ان کو ماننے والوں کے عقیدہ میں مسلّمات وعقائد میں داخل ہیں، مستقل کتابیں لکھنے کی بھی توفیق ہوئی، اور یہ سلسلہ عرصہ سے شروع ہو کر ابھی تک جاری ہے لیکن اس کے لئے تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY) اور کسی ترقی یافتہ مغربی زبان کے جاننے (بالخصوص انگریزی دانی کی ضرورت تھی) اور اس سے بڑھ کر قرآن کے اعجاز اور اس کے محفوظ رہنے پر عقیدۂ راسخ پھر عزم وبلند ہمّتی، محنت کوشی اور جذبۂ دینی کی ضرورت تھی (معذرت کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ) ہمارے جدید دانش گاہوں کے فضلاء اور کسی مغربی زبان کے ماہر ابھی تک اس گہرے، وسیع اور ذمہ دارانہ تقابلی مطالعہ سے غافل اور کنارہ کش رہے ہیں، جس سے قرآن مجید کا یہ اعجاز اظہر من الشمس اور ایک بدیہی حقیقت کی طرح واضح اور روشن ہو۔

ہمارے محدود علم میں (اور یہ بات وسیع سفروں اور سیاحتوں، یورپ اور امریکہ کے سفروں اور وہاں کی بہت سی علمی کوششوں سے واقفیت کے بعد لکھا جا رہا ہے) اللہ تعالیٰ نے ہندوستان کے ایک محقق اور فاضل یگانہ اور خادمِ دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کو توفیق دی کہ وہ تقابلِ مذاہب اور تقابلِ صحفِ سماوی کا منظّم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ فرمائیں اور کم سے کم انگریزی میں شائع ہونے والی تنقیدی، احتسابی وتقابلی کتابوں، موسوعات، انسائیکلوپیڈیاز، اور وقتاً فوقتاً شائع ہونے والے مضامین ومباحث کا مطالعہ جاری رکھیں، اور ان کے حوالہ ونشان دہی سے بدیہی حقائق کی طرح قرآن مجید کے اعجاز اور اس کی محفوظیت اور تورات وانجیل کے تحریفات، خارجی اضافات اور ذات وصفات خداوندی کے خلاف بیانات اور نسبتوں سے پردہ اٹھائیں، یہ ایک خادمِ دین مترجم ومفسر قرآن کا وہ کارنامہ اور اس کے اخلاص وبلند ہمتی کا شاہکار ہے، جس میں راقم حروف کی نظر میں اُن کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نظر نہیں آتا۔

اس کی تصدیق و تشریح کے لئے راقم اپنی کتاب "مطالعہ قرآن کے اصول و مبادی" کا ایک مضمون پیش کرتا ہے، "صُحفِ سابقہ کی تحریفات پر تنبیہ اور مذاہبِ سابقہ کے عقائد و فِرَق کے باریک فرق" کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔

قرآن کے اعجاز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مختلف مذہبی فرقوں کے اختلافی عقائد اور خیالات کو (جن سے عام آدمی واقف نہیں ہے) بڑی صحت اور پختگی کے ساتھ بیان کیا ہے، اور ان کے مختلف مذہبی خیالات و اختلافات کے سلسلہ میں بڑی نازک باریک باتوں کا خیال رکھا ہے، قرآن نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ان کے جو عقائد و اختلافات بیان کئے ہیں، ان کے مذہبی ذخیرہ کے وسیع اور گہرے مطالعہ سے اس کے لفظ لفظ کی تصدیق ہوتی ہے، جس قدر ان مذاہب سے گہری واقفیت پیدا ہوتی جارہی ہے، اور ان کی کتابوں کے (جو اب کثرت سے شائع ہوتی جارہی ہیں) گہرے مطالعہ کے مواقع و ذرائع بڑھتے جارہے ہیں، قرآن کے بیانات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے اور عجیب عجیب حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اُن کے بارے میں کوئی لفظ ضائع و بے کار نہیں اور اس کے الفاظ و تعبیر کا کوئی فرق بے محل نہیں ہے۔

اس طرح اشخاص و واقعات کے سلسلہ میں قرآن نے جن چیزوں پر زور دیا، یا جن چیزوں کی نفی کی ہے، وہ اس وجہ سے ہے کہ یہودی و عیسائی ان چیزوں کو نہیں مانتے تھے، اور اُن کے بعض الزامات و روایات کی تردید مقصود ہے، یہاں پر اس کی صرف تین مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے "کفر" کی نفی کی ہے، اور کہا ہے:-

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا۔ (سورۃ البقرۃ ۔ ۱۰۲) — اور سلیمان علیہ السلام نے مطلق کفر کی بات نہیں کی، بلکہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔

ایک خالی الذہن اور سلیم الفطرت انسان کو اس پر تعجب ہوسکتا تھا کہ ایک جلیل القدر نبی سے "کفر" کی نفی کی کیا ضرورت تھی؟ نبوّت کا منصب نہ صرف ایمان کا مستلزم ہے، بلکہ نبی برحق اہلِ ایمان کا امام و قائد، پیشوا و مقتدیٰ، اور اپنی امت کے لئے ہدایت و ایمان کا ذریعہ اور سرچشمہ ہوتا ہے۔

لیکن بائیبل میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق جو تصریحات آئی ہیں، اور جن کے بعض نمونے پچھلے صفحات میں گذرے ہیں، اور اُن کے بارے میں یہودیوں میں (معاذ اللہ) شرک و ثنیت، اور تعلیم سحر وغیرہ کی جو روایات مشہور و مقبول عام تھیں، نیز یہودی لٹریچر (دائرۂ معارف یہودیہ (JEWISH ENCYCLOPAEDIA) اور دائرۂ معارف مذاہب و اخلاق (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION & ETHICS) وغیرہ ماخذ کے شائع ہونے بعد ان کے بارہ میں یہودی نقطۂ نظر، اور تاریخی پس منظر کا جو علم ہوتا ہے، اس کو سامنے رکھ کر، اس نفی و تردید، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عصمت و براءت کے قرآنی بیان کی قدر و قیمت، اور اہمیت و ضرورت واضح ہوجاتی ہے، یہودی اور عیسائی دنیا (جس کے نزدیک عقائد و تعلیمات کا ماخذ قرآن نہیں بائیبل تھی) اپنے اسی قدیم خیال پر قائم رہی، لیکن بالآخر اس کو اسی صداقت کی طرف آنا پڑا جس کا دنیا کے تمام علمی متمدن مرکزوں سے دور بیٹھ کر صحرائے عرب میں ایک نبیٔ اُمّی نے ساڑھے تیرہ سو[13] برس پہلے اعلان کیا تھا، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے (جو برطانوی تحقیق و کاوش کا لبِّ لُباب ہوتا ہے) اس مقالہ میں جو حضرت سلیمانؑ پر ہے، صاف طور پر کہا گیا ہے۔

"سلیمان خدائے واحد کا مخلص پرستار تھا۔"[1]

انسائیکلوپیڈیا ببلیکا (ENCYLOPAEDIA BIBLCA) جو خاص مسیحی فضلاء اور ماہرین علوم، عہد عتیق کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ ہے، میں صاف طور پر اس کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ بائبل کی وہ آیتیں جن سے حضرت سلیمانؑ کا (معاذ اللہ) کفر اور شرک ثابت ہوتا ہے، بڑھائی گئی ہیں، اور الحاقی ہیں، اور اپنی بیویوں کے اثر سے ان کے دیوتا کی پرستش کے الزام کی صاف تردید کی گئی ہے۔[2]

**۲**۔ قرآن شریف میں "خلق السمٰوات والارض" کے بعد آتا ہے کہ اس عمل خلق وتکوین کے بعد اس کو کسی طرح کا تکان اور آرام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ | اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور (جو مخلوقات) |
| وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا | ان میں ہے سب کو چھ دن میں بنا دیا، اور ہم کو |
| مِنْ لُّغُوْبٍ ○ (سورۃ ق۔ ۳۸) | ذرا بھی تھکان نہیں ہوا۔ |

ایک سلیم الفطرت انسان اس کو پڑھ کر تعجب کر سکتا ہے کہ اس قوی اور عزیز، قادر وقاہر خدا کو جس کی صفت ہے "وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا"[3] (اور زمین وآسمان کی نگہبانی اس کے لئے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں) اور "لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ"[4] (اور اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند) اس کی صفائی دینے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ اس خلق وتکوین کے بعد تھکا نہیں؟ لیکن جب بائبل کی اس عبارت پر نظر پڑتی ہے کہ خدا نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو بنایا، اور ساتویں دن آرام کیا تھا۔ (پیدائش ۲:۲)[5]

بائبل کے عربی ترجمہ میں "فاستراح فی الیوم السابع" کے الفاظ ہیں (ساتویں دن استراحت کی) کنگ جیمس کی مستند انگریزی بائبل میں حسب ذیل الفاظ ہیں:۔

" AND HE RESTED ON SEVENTH DAY FROM ALL HIS WORK WHICH HE HAD MADE " GEN. 2:2

ان تصریحات کے پڑھنے کے بعد ہی قرآن خداوندی "وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ" کی ضرورت، معنویت، اور افادیت صحیح طور پر سمجھ میں آتی ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس جہالت اور جرءت کی تردید، اور کس غلط فہمی یا غلط بیانی کا ازالہ ہے جس میں علم وہدایت کے سب سے بڑے مدعی ہزاروں برس مبتلا رہے، اور شاید اسی کی یادگار میں آج تک وہ (سبت) مناتے ہیں، اور اس میں کچھ کام نہیں کرتے۔

**۳**۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدہ کو قرآن مجید نے تین[6] طرح سے ذکر کیا ہے:۔

---

[1] جلد ۲ ص ۹۵۲ طبع چہاردہم

[2] مستفاد از تفسیر ماجدی ملاحظہ ہو تفسیر آیت "وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا" (البقرۃ۔ ۱۰۲)

[3] و [4] سورۃ البقرۃ ۔ ۲۵۵

[5] معلوم ہوتا ہے کہ مسیحی علماء اور مترجمین کو بعد میں اس غلطی کا احساس ہوا کہ وہ خدا کی طرف کس کمزوری کو منسوب کر رہے ہیں، اور انھوں نے اپنے اصول ومعمول کے مطابق تراجم پر نظر ثانی کرتے کے وقت اس تعبیر میں ترمیم کر دی، ہمارے سامنے برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی کا ۱۹۵۸ء کا جو ایڈیشن ہے اس میں اس کے بجائے حسب ذیل عبارت ہے "اور اپنے سارے کام سے جسے وہ کر رہا تھا، ساتویں دن فارغ ہوا" (۲: ۱، ۲)

| | |
|---|---|
| ۱ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ط (المائدہ - آیت ۱۷ - و آیت ۷۲) | جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم خدا ہیں بیشک کافر ہیں۔ |
| ۲ - وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ط (سورۃ التوبہ ـ ۳۰) | اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ |
| ۳ - وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا لا سُبْحٰنَهٗ ط سورۃ البقرۃ آیت ۱۱۶ سورۃ یونس ۶۸) | اور یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے (نہیں) وہ پاک ہے۔ |
| وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ۝ (سورۃ مریم ۸۸ ـ ۸۹) | اور کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے (ایسا کہنے والو یہ تو تم بری بات (زبان پر) لائے ہو۔ |
| وَمَا يَنْۢبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ۝ (سورۃ مریم ـ ۹۲) | اور خدا کو شایان شان نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔ |
| وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ۝ (الاسراء ـ ۱۱۱) | اور کہو کہ سب تعریف خدا ہی کو ہے، جس نے نہ توکسی کو بیٹا بنایا ہے نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔ |
| وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ (الکہف ـ ۴) | اور ان لوگوں کو بھی ڈرایئے جو کہتے ہیں کہ خدا نے (کسی کو) بیٹا بنالیا ہے۔ |

کیا یہ صرف اسالیب بیان کا فرق ہے اور یہ سب معنیً متحد اور مرادف ہیں؟ لیکن مسیحی فرقوں کی تاریخ اور ان کے عقائد کی تفصیل معلوم ہونے کے بعد جواب روشنی میں آچکی ہے، الفاظ کے اس دقیق فرق کی افادیت و اہمیت سمجھ میں آتی ہے اور خاص طور پر جب یہ معلوم ہو گیا کہ مسیحیوں میں ایک مستقل فرقہ ADOPTIONIST کا ہے، جو حضرت مسیحؑ کی صلبی اولاد ہونے اور ان کی ابنیت و ولدیت کا قائل نہیں، بلکہ صرف اس کا قائل ہے، کہ خدا نے معاذ اللہ ان کو متبنّیٰ (ADOPT) کر لیا تھا، تو قرآن کے اعجاز کا قائل ہو جانا پڑتا ہے، نبی عربی اُمّی نے حجاز میں بیٹھ کر چودہ سو برس پہلے وحی کی بنیاد پر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا تھا، اور اس دقیق فرق کو جس سے اچھے پڑھے لکھے عیسائی بھی واقف نہ تھے ملحوظ رکھا تھا، مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی لکھتے ہیں :-

"مسیحیوں کا ایک زبردست ADOPTIONIST اتحادیوں کے نام سے گذرا ہے، ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصلاحی لفظ تبنّیت یا اتحادیت ADOPTIONSIM کا ہے، ان کے عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ "اقنوم اوّل یعنی خدائے برتر و اعظم نے انھیں اپنا بیٹا قرار دے کر اپنا متبنّیٰ بنا کر شریک الوہیت کر لیا، اور اب وہ الوہیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفات الٰہی میں شریک و سہیم ہے" اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۵۸۰ء میں ملتی ہے، آٹھویں صدی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا، آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اسی شاخ کی جانب ہے"[1]

یہ تمام دقیق باتیں، اور یہ معجزانہ پہلو کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی، جس کو یہودیوں، عیسائیوں کے

[1] تفسیر ماجدی جلد اول صفحہ ۲۰۴

اندرونی اور گہرے واقعات وخیالات کا پورا علم نہیں تھا، یہ عالم الغیب کا صحیفہ ہے جس میں کوئی شک و اشتباہ، اور اس کے علم میں کوئی نقص وعیب نہیں۔

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ (حٰمٓ السجدۃ ۴۱-۴۲)

اور یہ تو ایک عالی مرتبہ کتاب ہے اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے (اور) دانا (اور) خوبیوں والا (خدا) کی (اتاری ہوئی ہے۔[1]

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے لئے بڑے فخر ومسرت اور اس سے بڑھ کر سعادت وتوفیق الٰہی کی بات ہے کہ اس کو اس قابل صدہزار قدر دینی وقرآنی خدمت کی حامل تفسیر کو پہلی مرتبہ ہندوستان سے نظر ثانی اور تعارف ومقدمہ کے ساتھ شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اس کے لائق احترام اور مستحق قدر واعتراف مصنف کے لئے ذخیرۂ آخرت اور مجلس کے لئے باعثِ برکت وقبولیت بنائے۔

**سیّد ابوالحسن علی ندوی**

---

[1] مطالعہ قرآن کے اصول ومبادی ص ۸۶-۷۵

اس مقالہ کے لکھنے کے بعد حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی تردید میں مستقل کتاب (TRIAL OF JESUS CHRIST) شائع ہوئی، جو مولانا کی عنایت ومحبت سے مطالعہ میں آئی، اس میں مصنف نے قدیم رومی تاریخ اور عدالتی کاغذات کی مدد سے اس وقت کے وہ ضابطہ، قوانین اور روایات جمع کر دی ہیں، جن کے مطالعہ سے فرمان خداوندی وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم کی ایسی تصدیق ہوتی ہے، اور حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی نفی وقرآن مجید کا اعجاز وصداقت روزِ روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# افتتاحیہ [۱]

## (طبع ثانی)

نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

کتاب کسی زبان کی بھی ہو، اگر ادبی اعتبار سے بلند، اور معنوی اعتبار سے عظیم ہے تو اُسے کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں، ہر صاحبِ قلم کے لئے کٹھن، بلکہ کہنا چاہئے کہ صبر آزما ہے، ہر زبان کی ساخت الگ ہوتی ہے، ترکیبیں جدا گانہ، نشستِ الفاظ کی ایک ہیئت مخصوص، صرف ونحو کے قاعدوں ضابطوں کی ایک وضع خصوصی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر لفظ اپنی زبان میں جو ضمنی مدلولات اور مخفی اشارات وکنایات رکھتا ہے، انھیں زبانِ ترجمہ کے کسی لفظ میں بعینہٖ کیونکر لے آیا جائے؟ ــــــ ترجمہ میں اگر پابندی زبانِ ترجمہ کے طور طریقوں، ترکیبوں اور بندشوں محاورہ و روزمرہ کی رکھئے، تو یہ تو اپنا نا ہوا، ترجمہ کرنا نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ اسے "ترجمانی" کہہ لیجئے، اور اگر کہیں التزام اصل لفظ کی جگہ لفظ رکھ دینے کا کر لیا، اور تکیہ تمام تر لغت وفرہنگ کی کتابوں پر رکھا تو عبارت ایسی سپاٹ اور بے رنگ وبے کیف بن جائے گی کہ خود اپنی ہی طبیعت بدحظ ہو کر رہے گی اور جی اُس کے پڑھنے پڑھانے کو نہ اٹھے گا۔

غالب اور اقبال کے کلام کے انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں، اور سعدی کی گلستان اور مولانا رومی کی مثنوی کے ترجمے انگریزی اور اردو میں موجود ہیں، بڑی قابلیت اور بڑے اہتمام وکاوش سے کئے ہوئے لیکن ان سب مثالوں میں اصل اور اس کے ترجمہ میں ادبی وذوقی حیثیت سے کوئی مناسبت ہی نہ رہی تو جب یہ حال انسانوں ہی کی لکھی ہوئی ہر اونچی معیاری کتاب کا ہوا تو اب اُس کتاب کے باب میں کیا کہیے جو دنیا کی ہر عظیم کتاب سے عظیم تر، اور ہر بلند نوشتے سے بلند تر ہے، اور جس کی عظمتوں، رفعتوں، نزاکتوں، لطافتوں، ملاحتوں تک پورا بار پانا، کیا لفظی اور کیا معنوی ہر اعتبار سے حدودِ بشری ہی سے باہر ہے! ــــــ دنیا کے بڑے سے بڑے عالموں، فاضلوں، دانشوروں، ادیبوں، حکیموں، عالموں، عارفوں کے بھی بس کی بات نہیں کہ دنیا کی اس ایک ہی کتاب **الکتاب** کو کما حقہٗ اپنی زبان میں منتقل کر کے دکھا سکیں، کبھی نہ کسی منزل پر پہنچ کر سب ہی اپنے کو اعترافِ عجز پر مجبور پاتے ہیں، کہاں کلامِ خدائے قدوس ونامحدود، اور کہاں فہم واستعداد بندۂ محدود، دونوں میں اتنی نسبت بھی تو نہیں، جتنی آفتاب کو ذرہ سے، سمندر کو قطرہ سے ہوتی ہے، شارحین، مترجمین، مفسرین، اگر کہیں نہ کہیں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ نہ جائیں تو کیا کریں ؎

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے  
تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

لیکن قربان جایئے اُس رحمتِ بے حساب اور مرحمتِ بے پایاں کے کہ وعدۂ مزد وصلۂ رسائی ویافت پر نہیں مجرد سعی وتلاش پر رکھ دیا ہے، داد وانعام کے لئے شرط کامیابی وفائز المرامی کی نہیں، صرف ہمت واخلاصِ نیت پر رکھی ہے[۱] اجر وصلہ کے دروازے اپنی طرف سے کھول دیئے ہیں، اور انتظار صرف اِس کا رہتا ہے کہ بندے کا کوئی قدم طلب وسعی کا اٹھے تو سہی!

---

[۱] اس حقیقت کے بارے میں ایک عارف شاعر (اکبر الہ آبادی) کیا خوب اور کس مزے سے کہہ گیا ہے ؎

حشر تک کھل نہ سکے راز اسے کہتے ہیں  
جستجو پھر بھی کرو، ناز اسے کہتے ہیں

داد حق را قابلیت شرط نیست!

اِدھر بندے نے ہچکچاتے ہوئے قدم اٹھایا کہ اُدھر سے نوازش و دستگیری شروع ہوگئی!

ایک سر تا پائے بضاعت اور سراپائے بے علمی و نااہلی کی ہمت اسی شانِ ربُّ العالمینی نے بڑھائی، اور جو پیکرِ ضعف و جہل تھا، اس میں عزم و حوصلہ کی روح اسی کرشمۂ بندہ نوازی نے دوڑائی!

اس حوصلہ کو دیکھئے اور ہم کو دیکھئے ہے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھئے

---

شرح و تفسیر کی بحثوں کو ذرا دیر کے لئے چھوڑیئے محض سادے ترجمہ کو لیجئے، اردو و عربی کے درمیان فرق، صرفی، نحوی، اسلوبی انشائی حیثیت سے گویا مشرق و مغرب کا ہے، عربی میں جو اسلوبِ بیان، فصاحت کے اعلا معیار پر ہے وہ اردو میں آکر کہیں کہیں غیر فصیح ہی نہیں، مہمل بن جاتا ہے، عربی میں زور و تاکید کے موقع پر ضمیر کو بے تکلف مکرر بلکہ تین تین بار لے آتے ہیں جیسے انه هو يبدئ ويعيد۔ انك انت العزيز الحكيم۔ اننا سمعنا۔ انني انا الله۔ انا نحن نحي الموتىٰ۔ نحن نزلنا عليك۔ اب اگر لفظی ترجمہ کی دھن میں اس قسم کی ترکیبوں میں اردو میں بھی ضمیر غائب "وہ" یا ضمیر حاضر "تو" یا ضمیر متکلم "میں" یا "ہم" دہرا کر یا تہرا کر لائی جائے تو اردو عبارت تو غارت ہی ہوجائے، لازماً اردو میں اِس مفہوم کو لانے کے لئے اردو ہی کے اسلوب سے کام لینا پڑے گا، اور ضمیر کی تکرار سے نہیں، بلکہ ضمیر کے ساتھ کہیں "ہی" سے کام لیا جائے گا، کہیں "تو" (بہ واؤ مجہول) لگا دیا جائے گا، اور کہیں "ہی" اور "تو" دونوں کو ملا کر کام لیا جائے گا۔

اسی طرح اردو میں حال اور مستقبل کے دو صیغے مستقل اور الگ الگ ہیں، عربی میں دونوں کے لئے ایک ہی صیغہ مضارع کا ہے جسے بجنسہٖ اردو میں لے آنے کی کوئی شکل ہی نہیں، اور ترجمہ کے لئے ناگزیر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک صیغہ حسب مقتضائے مقام اردو کے لئے متعیّن کرے ——— اسی طرح تثنیہ کو جمع سے ممتاز کرنے کے لئے اردو میں لفظ "دو" یا "دونوں" کی تصریح لازمی ہے۔

عربی کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ فقرے میں فعل کو مکرر لے آتے ہیں کہیں فعل ہی کی کسی حالت میں، اور کہیں اُسے اسمی یا مصدری صورت دے کر، اور کہیں موصوف کی صفت خود اُسی لفظ سے لے آتے ہیں۔ اعذّبه عذابًا۔ فيميلوا ميلا۔ فرضتم لهن فريضة مكروا مكرًا۔ قتّلوا تقتيلا۔ يفجّروا تفجيرا۔ يخرجكم اخراجًا۔ قدّروها تقديرا۔ اخرجني مخرج صدق۔ ادخلني مدخل صدق۔ وغیرہ پچاسوں ترکیبیں اس قسم کی قرآن مجید میں آئی ہیں اور عربی میں عین فصاحت کے اعلیٰ معیار پر ہیں، لیکن اردو میں وہی لفظ دہرا دینے سے بات بالکل ہی نہ بن سکے گی، اور اردو میں اس موقع کے لئے کوئی دوسرا ہی لفظ لانا پڑے گا، کہیں "بہت" کہیں "بڑا" کہیں "خوب" کہیں "خوب ہی" کہیں "مار کے" وقس علیٰ ہٰذا۔

اسی طرح ایک خالص عربی ترکیب فزادهم الله مرضًا کی ہے، اب اگر اس کا تحت اللفظ ترجمہ "بس بڑھا دیا ان کو اللہ نے ازروئے مرض" کر دیا، تو اِس بیسویں صدی عیسوی والے عام اردو خواں کے پلّے کیا پڑے گا؟ لازم ہے کہ عربی ترکیب سے ہٹ کر سلیس اردو میں "بس اللہ نے ان کا مرض بڑھا دیا" لایا جائے، اور ایسی ترکیبیں قرآن مجید میں ایک دو جگہ نہیں خاصی متعدد موجود ہیں ——— اور ایسی ہی ایک اور الجھن صیغۂ مجہول کو ترجمہ میں مجہول رکھنے میں بھی کبھی کبھی پیش آجاتی ہے، اس کی ایک مثال قرآن مجید کے شروع ہی میں غير المغضوب عليهم میں ملتی ہے، چنانچہ اکثر مترجمین کو اس کا ترجمہ صیغۂ معروف میں کرنا پڑا ہے "تو" یا "ترا" کے اضافہ کے ساتھ، مثلاً "نہ وہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا ہے" یا "نہ وہ جن پر تو غصہ ہوا ہے"!

ایک بڑا مرحلہ مترجم کے لئے لغات اضداد کا ہے، عربی میں متعدد لفظ ایسے ہیں جو متضاد مفہوموں کے لئے آتے ہیں، مثلاً

شراء کہ خریدنے کے لئے بھی آتا ہے اور فروخت کرنے کے لئے بھی، یا حیا، کہ امید و بیم دونوں موقعوں پر آتا ہے یا قرء کہ اس کے مفہوم میں پاکی بھی داخل ہے اور ناپاکی بھی، چنانچہ عربی میں مستقل کتابیں لغاتِ اضداد پر موجود ہیں، قرآن مجید میں ایسے لفظوں کی بہتات تو نہیں کہی جاسکتی، پھر بھی جہاں کہیں ہیں، وہاں مترجم کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا ہوتا ہے، اور سہارا سیاق کلام کا لینا ہوتا ہے ——— اور اسی سے ملتا ہوا مسئلہ اختلافِ قرأت کا ہے، جہاں دو دو قرأتیں وارد ہوئی ہیں، اور دونوں متواتر، وہاں اعراب بدل گئے ہیں، اور قدرۃً اس کا اثر معنی و مفہوم پر پڑا ہے، اس اختلافِ قرأت کی ایک نمایاں مثال، سورۃ المائدہ کی چھٹی آیت ہے، جہاں فامسحوا برؤسکم وارجلکم میں ارجلکم کی قرأت نصب کے علاوہ جر کے ساتھ (ارجلکم) بھی متواتر ہے اور اختلافِ قرأت کا دائرہ اعراب تک محدود نہیں علاماتِ وقف میں بھی وارد ہوا ہے۔

انتشارِ ضمائر کا مرحلہ بھی کچھ کم نازک و دشوار نہیں، ایک ہی آیت بلکہ جزو آیت کے اندر ایک ہی ضمیر کا مرجع ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ اور ہو گیا! ایسے موقع پر اگر خود سیاق کلام کے بعد رہنمائی حدیث و آثار سے نہ مل جائے تو مترجم غریب کا تو کام ہی تمام ہو جائے!

پھر ایک بڑی دقت ان الفاظِ قرآنی سے پیدا ہو گئی ہے جو اردو میں چل گئے ہیں، بلکہ ہماری زبان میں گھل مل گئے ہیں، یہ چیز تو بہ ظاہر بڑی آسانی پیدا کرنے والی ہے، اور نو آموز مترجم اس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ ان کے ترجمہ کی ضرورت ہی کیا، یہ تو خود اُردو بن گئے ہیں لیکن حقیقتِ حال اس کے برعکس ہے، یہ لفظ اردو میں آتو بے شک گئے ہیں لیکن اپنے مفہوم قرآنی سے الگ ہو کر، مترجم نے اگر انھیں کہیں اسی طرح اردو میں منتقل کر دیا تو نادانستہ اور غیر شعوری طور پر، مفہوم قرآنی سے بہت دور جا پڑے گا، اشتراکِ صُوری کے باوجود اختلافِ معنوی کی ممکن صورتیں تین ہیں، اور تینوں ہی ترجمۂ قرآن کے سلسلے میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں:-

۱- زیادہ تر تو ایسا ہے کہ قرآن مجید نے ایک لفظ وسیع و عمومی معنی میں استعمال کیا ہے لیکن بعد کو عربی میں اس کا ایک محدود متعین اصطلاحی مفہوم قائم ہو گیا، اور اردو میں منتقل ہو کر اس کا وہی آخری مفہوم آیا، اس کی ایک روشن مثال لفظ "قتل" ہے، قرآن نے اسے لغوی، وسیع، عمومی مفہوم میں لیا ہے یعنی جان لینے یا مطلق ہلاک کرنے کے معنی میں، بعد کو یہی لفظ ایک اصطلاحِ فقہی بن گیا اور اب اس کے معنی کسی دھاردار آلہ سے "ہلاک کرنے" تک محدود ہو گئے، اور اردو میں رائج بھی محدود اصطلاحی مفہوم ہو گیا ——— ایسے الفاظ کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔ رب، جہاد، ظلم، وثوق، شراب، آیت، خیر، زکوٰۃ، فضل، دین، عرش، سماء، جاہل، نسل، مکر، کید، اجل، مجاہدین، شیطان، جنت وغیرہ پانچ سوں قرآنی لفظ اسی قبیل کے ہیں کہ انھیں ہر جگہ اردو ترجمہ میں منتقل کر دینا فہم قرآنی پر شدید ظلم کرنا ہو گا۔

۲- کہیں صورتِ حال اس سے مختلف ہے یعنی قرآن میں متجانس کیفیات یا متماثل اشیاء کے لئے الفاظ کئی کئی آئے ہیں، مگر اردو میں ان کے ادا کرنے کو لفظ بس ایک ہی یا دو موجود ہیں، جیسے اردو میں ایک لفظ "سانپ" ہے، قرآن مجید اس کے لئے تین تین لفظ تھوڑے تھوڑے سے فرق کے اظہار کے لئے لایا ہے، کہیں حیۃ، کہیں جان، کہیں ثعبان، یا اردو میں لفظ "اونٹ" ہے، قرآن مجید تین تین لفظ لایا ہے، کہیں بعیر، کہیں جمل، کہیں ابل ——— عربی زبان خصوصاً قرآنی زبان کی وسعتوں کا کہنا ہی کیا، دن رات کے مختلف اوقات کے لئے اردو میں مستعمل لفظ صرف چار ہیں، صبح، شام، دوپہر، سہ پہر، قرآن مجید نے اوقاتِ شب و روز کے لئے کم سے کم دس لفظ اختیار کئے ہیں، بکرۃ، اصیل، ضحیٰ، غسق، فجر، صبح، غدو، عشیۃ، ظہیرۃ، عصر، اب اتنے لفظوں کے ٹھیک مقابل اردو لفظ کہاں سے لائے جائیں! اسی طرح اردو میں ایک لفظ "ڈرنا" یا اس کا متعدی ڈرانا، آتا ہے، قرآن مجید نے اس کے لئے سات سات مادوں سے کام لیا ہے، خوف، خشیت، وجل، تقویٰ، حذر، اشفاق، رھبۃ، ایک اور مفہوم ہے، جس کے لئے اردو میں "جماعت" یا "گروہ" ہی سے کام چلانا پڑتا ہے، قرآن مجید نے اسے سات سات طریقوں سے تعبیر کیا ہے، فئۃ، طائفۃ، حزب، نفر، عصبۃ، فریق، فرقۃ، الی

طرح اردو کے ایک لفظ "چھپانے" کے لئے قرآن مجید میں کئی کئی لفظ مل جاتے ہیں کہیں تخفون کہیں تسرّون کہیں تستون کہیں تکتمون ایسے ہی اس کے مقابل مفہوم کے لئے اردو میں کام صرف کھولنے یا ظاہر کرنے سے چلایا جاتا ہے لیکن قرآن مجید میں اس کے لئے کہیں تبدون ہے کہیں تخرجون کہیں تعلنون، کہیں تجہرون علیٰ ہذا قرآن کے الخالق اور الباری اور الفاطر اور بدیع گو متقارب المعنی ہیں پھر بھی چار مستقل مفہوموں کو بیان کرنے والے ہیں، اردو میں ان کے الگ الگ مترادفات مشکل ہی سے مل سکیں گے۔

۳۔ ان دونوں صورتوں یعنی کہیں تحدید و تخصیص، اور کہیں تعمیم و توسیع کے علاوہ ایک تیسری صورت یہ بھی ہے کہ:۔

(الف) یا تو قرآنی لفظ نے اردو میں آکر ایک دوسرے معنی اختیار کرلئے ہیں۔

(ب) اور یا اُس نے ۲ دو مشہور قرآنی مفہوموں کے بجائے صرف ایک ہی مفہوم اردو میں قبول کیا ہے۔

اور ایسے الفاظ دوچار نہیں، کثرت سے ملیں گے، مثلاً یہ یا ان کے مشتقات:۔

وسیلہ، محراب، فوج، ذرّہ، غلام، مشفق، ناصح، غصّہ، غرور، عارض، اعتبار، تاویل، کشف، فتح، ارث، بلا، قاصد، فتنہ، فلک، عام، سیّارہ، ذکر، حظ، بری، اسباب، نہر، اعلام، مجنون، شہید، رقیب، قہر، عورة، ممنون، صاحب، تکلیف۔

اور ظاہر ہے کہ یہ تینوں فہرستیں محض نمونہ کے طور پر درج ہوئیں، احاطہ و استقصاء مقصود نہیں۔

اور یہ چند مشکلات تو اپنی کم سوادی اور بے استعدادی کے معیار سے عرض ہوئیں اور یہ تلاش، کاوش و تعمق کے بعد کسی نہ کسی درجہ میں حل ہو ہی جاتی ہیں، باقی جو دشواری، بڑے سے بڑے فاضل کے لئے بھی اس راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہے وہ خود قرآن کا اعلیٰ اور حدِ بشری سے مافوق، مرتبۂ بلاغت ہے، جس شدّت کا زور اور جوش قرآن میں اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، اور جس غضب کی تاثیر سے اس کی ایک ایک آیت ایک ایک ترکیب لبریز ہے اس کا، بلکہ اس کے عُشرِ عشیر کا بھی ترجمہ میں منتقل کرنا دنیا کے بڑے سے بھی بڑے انسان کے بس میں نہیں یہ رسول کریمؐ ہی کا ظرف تھا، جو اس پُر عظمت و جلال وحی کے بار کو برداشت کرسکے، اور پھر اسی کے ذریعہ سے انھوں نے عرب کے پتھر دل والوں کو موم کردیا، ایک سیلاب رواں کردیا، دلوں میں ایک آگ لگادی، دماغوں میں انقلاب برپا کردیا ـــــ قرآن مجید کی تحدّی تو اتنی سی تھی کہ کوئی دوسرا چھوٹے سے چھوٹا بھی قرآن بنا کر لے آئے لیکن یہ ظلوم و جہول عرض کرتا ہے کہ کوئی قرآن کو کسی دوسری زبان میں جیسا کہ اس کا حق ہے، منتقل ہی کرکے دکھائے، بڑے سے بڑے فاضلِ روزگار کے شرف و افتخار کے لئے یہی بہت ہے کہ وہ اپنی بساط کے لائق کچھ تھوڑے ہی بہت نکتے بلاغتِ قرآنی کے سمجھ لے!

اردو میں قرآن مجید کے ترجمے ایک دو نہیں، ماشاء اللہ خاصی بڑی تعداد میں ہوچکے ہیں، اور برابر ہوتے جارہے ہیں ان میں سے بیشتر اپنی جگہ اچھے ہی ہیں، ان میں مرتبۂ امتیاز نہ صرف اپنی اوّلیت کے لحاظ سے بلکہ لفظی و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے بھی، اب تک شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے ترجمہ کو حاصل ہے، اس کا سال طبع ۱۲۰۵ھ ۱۷۹۰ء ہے لیکن اس عاجز نے اپنے لئے دلیلِ راہ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ کے ترجمہ کو بنایا، جو اُن کی تفسیر بیان القرآن کے ساتھ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء میں اول بار شائع ہوا ہے، اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بس اپنا نظیر آپ ہی ہے۔

عقائد و شرح و تفسیر سے الگ ہوکر، جہاں تک محض ترجمہ کا تعلق ہے، کم سے کم ۲ دو اور ترجمے بھی اچھے نکل چکے ہیں۔ بعض نے ترجمہ کے بجائے ترجمانی اپنا مطمحِ نظر رکھا ہے، اور ظاہر ہے کہ ترجمان کو آزادی کا حق مترجم سے کہیں زیادہ حاصل ہوجاتا ہے

---

ترجمہ کی چند مشکلات بیان ہوچکیں، شرح و تفسیر کی ذمہ داریاں اور دشواریاں اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

قرآن مجید جہاں یکتا و منفرد اور حیثیتوں سے ہے، وہاں اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ بہ یک وقت زندہ جاوید اور ہمہ وقت تازہ، اور عالمی یا آفاقی صحیفۂ ہدایت بھی ہے، اور بہ قید زمان و مکان، ایک متعین ملک و متعین ماحول کے لئے مخصوص بھی یعنی ایک طرف تو وہ دنیا کے ہر ملک و اقلیم کے لئے ہے، اس کی مخاطب چین و جاپان، ایران و ہندوستان، یورپ اور امریکا اور افریقہ، شرق، مغرب، شمال و جنوب کی ساری ہی قومیں ہیں، اور وہ بھی کسی مخصوص۔ محدود زمانہ کی نہیں، بلکہ پہلی صدی ہجری کی طرح چودھویں صدی ہجری کی بھی، خواہ ان کی تہذیب و تمدن اور ماحول کچھ بھی ہو، اور دوسری طرف اس کی مخاطب اول و براہ راست ایک مخصوص ملک عرب کی وہ قوم تھی جو تاریخ کے ایک متعین زمانہ، ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں موجود و آباد تھی، اور اپنی ایک مخصوص ذہنیت ثقافت و معاشرت اور مخصوص فکری و وجدانی ہیئت کے ساتھ ــــــ قرآن مجید کی یہ دوگانہ حیثیت یعنی ایک طرف عالمی و آفاقی، اور دوسری طرف قومی و وطنی، موجود ہی نہیں، بلکہ برابر ساتھ ساتھ چل رہی ہے، گو ظاہر ہے کہ ترتیب زمانی کے لحاظ سے یہ دوسری حیثیت پہلی پر مقدم ہے۔

یہ ایک کلیدی و بنیادی حقیقت ہے اور اس کے مستحضر رکھنے سے دو نتیجے خود بخود لازم آجاتے ہیں:-

**۱**۔ قرآن مجید کی معنویت گو آفاق گیر ہے لیکن اپنی صورت و قالب کے لحاظ سے وہ بہر حال عربی کلام ہے، نہ انگریزی یا اردو یا کچھ اور، اور جہاں تک اسلوب بیان اور طرز ادا کا تعلق ہے، وہ عربی ہی کے لغوی، نحوی، لسانی، ادبی، انشائی، اسلوبی مقتضیات کا پورا کرنے والا ہے، نہ کسی اور زبان کے تقاضوں کا، سجع، وزن اور قافیہ اگر بلاغت عرب کے اجزاء ہیں تو وہ ضرور اس میں موجود ہوں گے، بعض موقعوں پر اگر فقروں کی تکرار عربی حسن ادب کی جان ہے، تو وہ یقیناً اس میں پائی جائے گی، شہادت پیش کرنے کے موقع پر اگر قسم کھانا عربی زور بیان کا ایک جزو ہے تو وہ لازمی طور پر اس میں شامل ہوگا، وقس علیٰ ہذا، غرض یہ کہ اس میں زبان کی سلاست و لطافت اور بیان کی فصاحت و بلاغت جو کچھ بھی ملے گی سب عربی ہی کے معیار کے مطابق، نہ کہ ہندی یا فارسی یا سنسکرت یا انگریزی یا جرمنی زبان کے معیار کے ماتحت، اس صریح و واضح معیار کو چھوڑ کر اسے کسی بھی غیر عرب پیمانے سے ناپنے کا مطالبہ کرنا خود اپنے جہل اور نامعقولیت کا مظاہرہ کرنا ہے۔

**۲**۔ مخاطب اول و براہ راست قوم عرب تھی، ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول کی، اس لئے مخاطبین کے فہم و استعداد کی، اور ان کے مسلمات عقل و نقل کی رعایت (جب تک کہ اس سے کوئی دینی، روحانی، اخلاقی گمراہی نہ پیدا ہو رہی ہو) حد درجہ ضروری تھی، حکایات و امثال میں اگر ذکر ارجن، بھیم کا یا رستم و اسفندیار کا یا یونان و روم کے مشاہیر کا چھیڑ دیا جاتا، یا گردش ارض و آفتاب کے ضمن میں اگر نیوٹن اور آئنسٹائن کے زمانہ کے نظریات و تحقیقات کا حوالہ دیا جانے لگتا یا تاریخ، جغرافیہ، عام علوم و فنون کے سلسلے میں کوئی بھی ایسی بات وضاحت و صراحت کے ساتھ فرما دی جاتی، جو مخاطبین اول کی فہم و استعداد سے بالاتر ہوتی تو یہ سر تا سر خلاف حکمت و مصلحت ہوتا، کلیدی اور بنیادی اصلاحی حقیقتوں کا منوانا، بجائے خود ہی کیا کم دشوار تھا کہ ایک اور محاذ جنگ خواہ مخواہ ایسے غریب و نامانوس مذاکرات کا قائم ہو جاتا، اور توحید، رسالت و آخرت کے منکرین کو ایک اور وسیع میدان انکار و تکذیب کا خواہ مخواہ ہاتھ آجاتا۔

اس لئے قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان ساری فرعی، ضمنی، ثانوی بحثوں سے متعلق اس نے صراحت تو ایک بار بھی مذاق عرب کے خلاف نہیں کی اور اہل عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال ہی پر چھوڑے رکھا، لیکن انداز ایسے برابر رکھ دیئے اور کلام میں لچک اتنی پیدا کر دی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تعبیر و تشریح میں آزاد رہیں۔ یہ انتہائی نازک و دشوار مقام تھا، کوئی بشری عقل و حکمت اس سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتی تھی، یہ قرآن ہی کا اعجاز ہے اور اس کے کتاب الٰہی ہونے پر ایک مستقل دلیل۔

سائنس اور ایک سائنس ہی پر کیا موقوف ہے، ریاضی کے ممکن استثناء کے بعد سارے ہی دنیوی علوم و فنون کا یہ حال ہے کہ ان کی

یافت اور تحقیق برابر بدلتی رہتی ہے اور ثبات و قرار ان علوم میں سے کسی کے بھی نصیب میں نہیں اسی مسلسل و مستمر بے ثباتی کا نام ان علوم کی "ترقی" یا "ارتقاء" رکھ دیا گیا ہے، نظریات و ظنیات ہی نہیں ان علوم کے بڑے بڑے مقبول و معروف مسلّمات و قطعیات تک ہر تھوڑی مدت گزر جانے پر کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں، اور "قدیم" کے پرستار "جدید" کے معتقدین کا لس منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں! ــــ قرآن مجید بشری علوم کی ان نیرنگیوں اور تلون مزاجیوں کا ساتھ کیونکر دے سکتا تھا، اس نے آن ہونی ہونی کر دکھائی کہ اپنی عبارت کے اندر لچک اس غضب کی اور اتنی حیرت انگیز رکھ دی کہ جس طرح اب تک کسی دور کے بھی محقق "اسے عصری تحقیقات کے منافی و معارض نہ پا سکے آئندہ بھی کسی دور میں ان شاء اللہ نہ پا سکیں گے۔

ایک گزارش اور ــــ قرآن مجید نے متعدد غیر قوموں کا ذکر کثرت سے کیا ہے کبھی ان کے حال سے سبق لینے کو اور کبھی اپنے مخاطبین پر حجت قائم کرنے کو ان کے عقائد اور ان کے اعمال کو جابجا صراحت سے بیان کیا ہے اور ان کی تلمیحات کو کثرت سے لایا ہے، یہود اور نصرانیوں کے علاوہ قوم اسرائیل، قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم یونس، قوم شعیب، قوم فرعون وغیرہ کے صریح تذکرے تو ظاہر ہی ہیں، باقی ذکر مجوس اور صائبین، اور قوم تبع اور قریش اور اصحاب فیل کا بھی نام لے کر کیا ہے اور کفر و شرک میں مبتلا، معاصر اور گزشتہ کتنی ہی آخرت فراموش قوموں کی جانب اشارے کہیں مجمل اور کہیں خوب مفصل کئے ہیں، اور ملکوں میں نام مصر اور بابل اور مدین کے، اور اشخاص میں نام علاوہ حضرات انبیاء کے، مریم، قارون، فرعون، ہامان، عمران، سامری، ابو لہب، ام موسیٰ، امرأۃ لوط، امرأۃ فرعون وغیرہ کے، اور بتوں میں نام لات، عزیٰ، منات، بعل کے لئے ہیں، اس لئے لازمی ہے کہ جدید مفسر و شارح قرآن تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی، اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، اور عرب اور نواحِ عرب کے مشرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں (خصوصاً فلکیات) سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو، ورنہ باوجود تدین و تقویٰ، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہو جائے گا، اور اس کا قلم کہیں فرعون اور لشکر فرعون کی غرقابی کو بجائے بحر قلزم کے دریائے نیل میں دکھائے گا کہیں حضرت مسیح کا تلوار سے قریب القتل ہو جانا بیان کرے گا، اور کہیں فرعون کو کسی تاجدار کا شخصی نام سمجھ کر دعوئ الوہیت اس کی شخصیت کی جانب منسوب کرنے لگے گا ــــ مفسر کا محض صالح و متقی ہونا ہرگز اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی، جغرافی اور عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہیں قرآن مجید یقیناً ایک دینی صحیفہ ہے لیکن اس کا علمی پایہ بھی ہرگز ایسا نہیں کہ کسی کو اس پر کسی اعتبار سے بھی حرف گیری کا موقع مل سکے۔

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن مجید معنوی اعتبار سے بھی ایک انتہائی مرتب و منظم کتاب ہے اور انشائی اعتبار سے انتہائی بلیغ اور اسی نسبت سے قدرۃً ایک دشوار ترین کتاب بھی، اس کے دقائق و اسرار تو الگ رہے، اس کی ظاہری لفظی ترکیبیں تک بھی ہر جگہ آسان نہیں، اس کی تفسیر کو کوئی ایک بندہ تو کیا، سارے ہی بندے مل کر بھی چاہیں کہ درجۂ تکمیل کو پہنچا دیں تو یہ حد بشری سے خارج ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے جس کو جتنی بافت قرآن کے اندر میسر آ جائے بس وہی اس بندے کے مرتبہ و شرف کے لئے بہت ہے ــــ قرآن مجید نے اپنے کو آسان جو فرمایا ہے وہ موعظت اور عبرت پذیری کے پہلو سے قابل عمل ہونے کے لحاظ سے ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر نہ کہ دوسرے پہلوؤں سے۔

ایک طرف یہ سب ہے لیکن دوسری طرف یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ قرآن وقت کے چلتے ہوئے اور اصطلاحی مفہوم میں کوئی "علمی" یا "ادبی" یا "تحقیقی" مقالہ نہیں، اصلاً وہ محض کتاب ہدایت ہے، یا انسانی زندگی کا انفرادی و اجتماعی دستور العمل اس کی دنیا سراسر حکمت و اخلاق، روحانیت، عبدیت و انابت کی دنیا ہے، اس کی فضا سکینت قلب کی فضا، اور اس کا ماحول تقویٰ و طہارت کا ماحول ہے، اس کے مغز تک پہنچنے کے لئے تقویٰ و طہارت کسی درجہ میں بہرحال ناگزیر ہے، طہارت جسم کی طرح طہارت قلب کا ذرا سا بھی اہتمام کئے بغیر محض زبان و لغت کے بل پر قرآن فہمی کی سعی یکسر سعی لاحاصل ہے، آخر ابو جہل (عمر بن ہشام مخزومی) اور ابو لہب (عبد العزیٰ بن عبد المطلب ہاشمی) تو خالص قریشی تھے، اور ٹکسالی اہل زبان کوئی لسانی اشکال انہیں کیوں پیش آنے لگا تھا۔

لیکن بدنصیبوں نے اپنی روح کو روحانیت قرآنی سے تمام تر بیگانہ و نا آشنا رکھا، قرآن اُن پر ذرّہ بھر بھی نہ کُھل سکا، بند کا بند ہی رہا، اور اُن کو اور ان کے ساتھیوں کو قرآن فہمی کی سعادت درجۂ ادنیٰ میں بھی نصیب نہ ہوئی۔

کلام اس غیرت والے غنی عن العالمین کا ہے جس سے بڑھ کر نہ کوئی غیور ہے نہ بے نیاز، اور متکلم کی شانِ غیرت و غنا کا عکس پوری طرح کلام میں جلوہ گر، جو بڑا بننا چاہتا ہے لازم ہے کہ وہ چھوٹا بن کر اس دروازے میں داخل ہو، عارف رومی نے سو فی صد صحیح ہی کہا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ — جز کہ اشکستہ نہ گیرد دستِ شاہ

استاد کی ضرورت جب چھوٹے سے چھوٹے علم اور سہل سے سہل فن میں پڑتی ہے تو قرآن کا علم تو سارے علوم کا بادشاہ اور سب سے بڑھ کر مہتم بالشان ہے، کیسے ممکن ہے کہ قرآنیات کا کوئی طالب علم استاد سے اور اگلے ماہرین فن کے نتائج تحقیق سے بے نیاز رہ کر اس کی منزلیں طے کرلے، اور اگر کسی کو بد قسمتی سے (ان سطور کے راقم کی طرح) کوئی زندہ استاد کامل الفن نہ میسّر آئے، (گو ان سطور کے راقم کو مولانا حمید الدین فراہیؒ، صاحبِ "نظام القرآن" اور حضرت مولانا تھانویؒ صاحبِ "بیان القرآن" کی سرسری صحبتیں کچھ عرصہ تک ضرور نصیب رہی ہیں) تو اس خلا کو اکابر مفسرین اور محقق شارحین کی کتابیں ایک بڑی حد تک پُر کر سکتی ہیں۔

ان حضرات کی تلاش، تفحّص، تحقیق کی داد دل سے دیجیے، ان کی سپاس گزاری کے لئے قلب کی گہرائیوں کو وقف کر دیجیے، ان کے کارنامے اگر رہنمائی کو نہ موجود ہوتے تو آج کس کی ہمت ہوتی کہ اس امرِ مہم و عظیم کو چھیڑ بھی سکتا، سڑک انھیں متقدمین کی سعی و مشقت سے بنی بنائی ہوئی مل گئی، جس پر قدم رکھنا ہر متاخر کے لئے آسان ہو گیا ہے، لیکن اس انتہائی قدر و منزلت اور آخری احترام و اعتراف کے بعد بھی یہ عقیدہ ذہن میں تازہ رکھئے کہ نبی معصومؑ کے بعد کوئی بھی معصوم امت میں نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، اس لئے فکر و فہم و اجتہاد کے لحاظ سے ہر بڑے سے بڑا محقّق بھی غیر معصوم ہی ہے اس لئے پیروی کسی کے بھی قول کی ہر حال میں کئے جانا، اور صریح دلیل مخالف کے باوجود بھی کرتے رہنا طریق حق و صواب نہیں — اللہ کے کلام کی شرح و تفسیر، اگلوں اور پچھلوں کے کسی دور میں بھی آخری اور انفطائی نہیں ہو سکتی، کون اس علیم کل کے کلام کے سارے گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن کی گرفت میں لا سکتا ہے؟ کس کا علم علیم مطلق کی کتاب کے سارے اطراف کا احاطہ کر سکتا ہے؟ نئے نئے گوشے فکر و نظر کے ہمیشہ اُبھرتے آئیں گے، اور نئے نئے میدان علم و تحقیق کو دعوت ہر دور میں دیتے رہیں گے، نئے نئے سوال برابر پیدا ہوں گے، اور نئے نئے جواب کتاب الہدیٰ کے صفحوں میں تلاش سے برابر ملتے رہیں گے۔

لیکن دوسروں کی معصومیت سے انکار کے معنی خود اپنی معصومیت کے اثبات کے واللہ باللہ نہیں، ورنہ اس سے یہ خوش اعتقادی اپنی تلاش دیانت کے لئے لازم آتی ہے کہ جیسے یہ علم و تحقیق کا حرف آخر ہے، اور جزم و وثوق کے ساتھ قابلِ اعتماد، حاشا، اس کا وہم بھی نہ آئے، یا فوق کل ذی علم علیم۔

---

لغت و متعلقاتِ لغت، لغتِ قرآنی اور تفسیر و متعلقاتِ تفسیر کا ذخیرہ عربی میں ماشاء اللہ اچھا خاصہ موجود ہے، اس پر اپنی بضاعت کی رسائی جہاں تک ہو سکی، اور جہاں جہاں سے استفادہ و خوشہ چینی ممکن ہوئی، اس کی مختصر سی فہرست درج ذیل ہے۔

## ۱۔ لغت

۱۔ الجمھرۃ فی اللغۃ (چار ضخیم جلدوں میں) از ابوبکر محمد بن حسین ابن درید الازدی (ف ۳۲۱ھ)

۲۔ الصحاح (چھ جلدوں میں) از ابو نصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری (ف ۳۹۳ھ یا ۳۹۸ھ)

۳۔ القاموس (دو ضخیم جلدوں میں) از مجد الدین محمد بن یعقوب الفیروزآبادی (ف ۸۱۷ھ)

۴۔ لسان العرب (بیس حصوں یا پانچ ضخیم جلدوں میں) از جمال الدین محمد بن کرم بن منظور الافریقی الخزرجی (ف ۷۱۱ھ)

۵۔ تاج العروس شرح القاموس (دس ضخیم جلدوں میں) از سید مرتضی زبیدی بلگرامی (ف ۱۲۰۵ھ)
۶۔ اقرب الموارد (تین جلدوں میں) از سعید الخوری الشرطونی (ف ۱۳۳۱ھ)
۷۔ کلیات ابی البقاء۔ از الشریف ابوالبقاء الحسن الکندی (ف ۱۰۹۵ھ)
۸۔ کتاب الأضداد۔ از محمد بن القاسم الانباری البغدادی (ف ۳۲۷ھ)
۹۔ کتاب الأجناس۔ از ابوعبید القاسم بن سلام البغدادی (ف ۲۲۴ھ)

ان کے علاوہ شاذونادر کام صراح (فارسی ترجمۂ صحاح) اور منتہی الارب ور المنجد سے بھی لیا گیا ہے بہ لحاظ استفادہ سرفہرست تاج اور لسان ہیں۔

## (الف) لغات القرآن

عام لغت کے علاوہ جو مخصوص لغات قرآنی ہیں، حسب ذیل پیش نظر رہی ہیں:۔

۱۔ المفردات فی غریب القرآن۔ از ابوالقاسم الراغب الاصفہانی (ف ۵۰۲ھ)
۲۔ غریب القرآن۔ از ابوبکر محمد بن عزیز السجستانی (ف ۳۳۰ھ)
۳۔ مشکلات القرآن وغریبہ۔ از ابن قتیبہ الدینوری (ف ۲۷۶ھ)
۴۔ مفردات القرآن۔ از حمید الدین الفراہی (ف ۱۳۴۹ھ)
۵۔ النہایۃ فی غریب الحدیث والتنزیل (چار جلدوں میں) از مجد الدین مبارک ابن الأثیر الجزری (ف ۶۰۶ھ)

اور ان کے علاوہ کہیں کہیں "مشکلات القرآن" (از انور شاہ کاشمیری) بھی۔[1]

خصوصی استفادہ "مفرداتِ" راغب سے رہا تھا، اور اس کے بعد "نہایہ ابن اثیر" سے۔

## (ب) اعراب القرآن

۱۔ اعراب القرآن۔ از ابوالبقاء العکبری۔ (ف ۶۱۶ھ)
۲۔ مغنی اللبیب۔ (دو جلدوں میں) از جمال الدین ابو محمد عبداللہ یوسف بن ہشام الانصاری (ف ۷۶۱ھ)
۳۔ مجاز القرآن۔ (جزو اول۔ سورۃ الکہف تک) از ابوعبیدہ معمر۔ (ف ۲۱۰ھ)
۴۔ معانی القرآن۔ (جزو اول۔ سورۂ یونس تک) از ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء (ف ۲۰۷ھ)
۵۔ اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم۔ از ابوعبداللہ حسن معروف بہ ابن خالویہ (ف ۳۷۰ھ)

## (ج) قرآنیات کی جامع کتابیں

۱۔ الإتقان فی علوم القرآن۔ از ابوالفضل عبدالرحمن جلال الدین السیوطی (ف ۹۱۱ھ)
۲۔ البرہان فی علوم القرآن۔ (چار جلدوں میں) از بدر الدین زرکشی (ف ۷۹۳ھ)

## ۲۔ عربی تفسیریں

۱۔ تنویر المقیاس۔ روایات منقول از حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابئ رسولؐ (ف ۶۸ھ)
۲۔ تفسیر القرآن الکریم۔ (۴۸ سورتوں کی تفسیر) از سفیان ثوری الکوفی (ف ۱۶۱ھ)

---

[1] عزالدین بن عبدالسلام (ف ۶۶۰ھ) کی کتاب "الفوائد فی مشکل القرآن" (مطبوعہ کویت) پہلی جلد تفسیر کے پریس میں چلے جانے کے بعد ملی آئندہ جلدوں میں اس کا حوالہ لفظ "مشکل" سے ملا کرے گا۔ انشاء اللہ۔

۳۔ تفسیر جامع البیان (۳۰ جلدوں میں) از ابو جعفر ابن جریر الطبری۔ (ف سنہ ۳۱۰ھ)

۴۔ الکشاف (۲ جلدوں میں) از جار اللہ محمود بن عمر زمخشری (ف سنہ ۵۳۸ھ)

۵۔ مفاتیح الغیب معروف بہ التفسیر الکبیر (۷ جلدوں میں) بیشتر حصہ از محمد فخر الدین رازی (ف سنہ ۶۰۶ھ)

۶۔ الجامع لاحکام القرآن معروف بہ تفسیر قرطبی (۲۰ جلدوں میں) از ابو محمد عبداللہ بن احمد القرطبی (ف سنہ ۶۷۱ھ)

۷۔ معالم التنزیل (۸ جلدوں میں) از محی السنۃ حسین بن مسعود البغوی (ف سنہ ۵۱۰ھ)

۸۔ تفسیر ابن کثیر (۸ جلدوں میں) از عماد الدین ابو الفداء اسمٰعیل بن کثیر الدمشقی (ف سنہ ۷۷۴ھ)

۹۔ انوار التنزیل معروف بہ تفسیر بیضاوی (۵ جلدوں میں) از قاضی عمر ناصر الدین البیضاوی (ف سنہ ۶۸۵ھ)

۱۰۔ مدارک التنزیل (۵ جلدوں میں) از حافظ الدین ابو البرکات عبداللہ بن احمد محمود النسفی (ف سنہ ۷۱۰ھ)

۱۱۔ البحر المحیط (۸ جلدوں میں) از اثیر الدین ابو حیان الغرناطی (ف سنہ ۷۴۰ھ)

۱۲۔ روح المعانی (۹ جلدوں میں) از شہاب الدین آلوسی بغدادی (ف سنہ ۱۲۷۰ھ)

۱۳۔ التفسیر القیم: تفسیری اقوال ابن قیم۔ (مرتبۂ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی) (ف سنہ ۷۵۱ھ)

۱۴۔ جلالین {از جلال الدین محلی (ف سنہ ۸۹۱ھ) و جلال الدین سیوطی (ف سنہ ۹۱۱ھ)}

یہ سب تفسیریں اہل سنت کی مستند و معتمد ہیں، زمخشری صاحبِ کشاف اگرچہ معتزلی ہیں لیکن سند قبول انھیں بھی اہل سنت میں حاصل رہی ہے خصوصاً ان کے نکاتِ ادبی، نحوی و لغوی کو، اور بیضاوی و مدارک کی تو کہنا چاہئے اصل و اساس ہی کشاف ہے مفسرین کی بڑی تعداد فقہیات میں شافعی، اہل حدیث یا مالکی ہے، البتہ صاحبِ مدارک پختہ حنفی ہیں۔

ترتیب و استفادہ کے لحاظ سے سرفہرست ابن جریر، قرطبی، کبیر اور روح المعانی رہی ہیں۔

سرسری ورق گردانی کی حد تک ذیل کی تفسیروں پر بھی رہی ہے اور کہیں کہیں کام کی باتیں ان میں بھی نکل آتی ہیں:۔

۱۔ الباب التاویل معروف بہ تفسیر خازن۔ از علاء الدین ابو الحسن علی بن محمد الخازن (ف سنہ ۷۴۱ھ)

۲۔ غرائب القرآن معروف بہ تفسیر نیشاپوری۔ از نظام الدین الحسن الخراسانی النیشاپوری (ف سنہ ۷۱۸ھ)

۳۔ ارشاد العقل السلیم معروف بہ تفسیر ابی سعود۔ از ابو السعود محمد بن محمد الحسن الرومی (ف سنہ ۹۴۰ھ)

۴۔ نظام القرآن (مختلف سورتوں کی تفسیر) از حمید الدین الفراہی (ف سنہ ۱۳۴۹ھ)

۵۔ النہر اللقیط بر حاشیہ البحر المحیط۔ از اثیر الدین ابو حیان الغرناطی (ف سنہ ۷۴۵ھ)

۶۔ تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن۔ از ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری (ف سنہ ۱۳۶۹ھ)

## (الف) فقہی تفسیریں

۱۔ احکام القرآن (۳ جلدوں میں) از ابو بکر جصاص رازی حنفی (ف سنہ ۳۷۰ھ)

۲۔ احکام القرآن (۲ جلدوں میں) از قاضی ابو بکر محمد بن العربی مالکی (ف سنہ ۵۷۳ھ)

۳۔ تفسیر احمدی۔ از شیخ احمد عرف ملا جیون امیٹھوی حنفی (ف سنہ ۱۱۴۰ھ)

عربی تفسیروں میں یکسانیت و تکرار بڑی کثرت سے پائی جاتی ہے یعنی ایک مفسر جو پہلے لکھ گیا ہے اکثر بعد کے آنے والے اسے گویا آنکھ بند کر کے یعنی بلا جرح و نقد نقل کرتے چلے گئے ہیں، اور بہت جگہ لفظ تک نہیں بدلے ہیں لیکن اسی کے ساتھ دوسری طرف تنوع و رنگارنگی

بھی اچھی خاصی ہے ہر بڑے مفسر کا جیسے ایک مستقل مذہب و مسلک ہے اور اس کے ساتھ اُسی کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں ــــ مفسرین کی اکثریت مشرقی ہے یعنی عراق، شام، عرب و ایران وغیرہ کی لیکن دو بڑے مفسر مغربی بھی ہیں، ایک امام قرطبی، دوسرے محدث ابوحیان غرناطی کہ یہ دونوں اسپین کے تھے، اگر مطالعہ ذرا غور سے کیا جائے تو مشرق و مغرب دونوں کی ذہنیت اور طرزِ فکر کا فرق ان تفسیروں میں جھلکتا ہوا نظر آئے گا، اسپین جغرافی حیثیت سے تو بہر حال یورپ ہی کا ایک حصہ ہے۔

مذاقِ طبع کے لحاظ سے بھی مفسروں کی تقسیم یا درجہ بندی کی جاسکتی ہے، کسی کے ہاں سارا زور روایاتِ حدیث و آثارِ صحابہؓ پر ہے، اور کوئی نحوی ترکیبوں کے حل اور صرفی اشتقاق کے سلجھانے میں لگا ہوا ہے، اور کوئی کوئی ایسے بھی ہوئے جن میں شانِ جامعیت موجود ہے، مثلاً متقدمین میں امام رازی اور متاخرین میں آلوسی بغدادی کہ ان دونوں کے ہاں کہنا چاہئے کہ سب ہی کچھ موجود ہے۔

فارسی تفسیروں میں کوئی قابلِ ذکر کتاب نظر نہ آئی، ہاں ترجمہ کی حد تک شاہ ولی اللہ دہلوی کی "فتح الرحمٰن" کا نام لیا جاسکتا ہے۔

## ۳۔ اردو تفسیریں

۱۔ بیان القرآن (۱۲ جلدوں میں) از اشرف علی تھانوی (ف ۱۳۶۳ھ)

اسے اگر اردو کی ساری تفسیروں کا سرتاج سمجھا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔

۲۔ خلاصۃ التفاسیر (۵ جلدوں میں) از فتح محمد تائب لکھنوی (ف ۱۳۴۲ھ)

ہر چہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کی مصداق۔

۳۔ مواہب الرحمٰن (۳۰ طویل، عریض، ضخیم جلدوں میں) از امیر علی ملیح آبادی (ف ۱۳۳۶ھ)

کہنا چاہئے کہ عربی کی ساری ہی متداول تفسیروں کا جوہر کھنچ کر اس کے اندر آگیا ہے۔

ذیل کی بھی تفسیریں جستہ جستہ پیشِ نظر رہیں:۔

۱۔ فتح المنان معروف بہ تفسیر حقّانی (۷ جلدوں میں) از ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی (ف ۱۲۴۷ھ)

۲۔ تفسیر ثنائی (۷ جلدوں میں) از ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۳۶۱ھ)

۳۔ ترجمہ تفسیر مظہری۔ از قاضی ثناء اللہ پانی پتی (صرف چند پارے نظر سے گزر سکے) (ف ۱۲۲۵ھ)

۴۔ ترجمہ تفسیر فتح العزیز۔ از شاہ عبدالعزیز دہلوی (صرف پارہ ۲۹ نظر سے گزرا) (ف ۱۲۳۹ھ)

۵۔ غایۃ البیان فی تفسیر القرآن (۲ جلدوں میں) از احمد حسن امروہوی (صرف دوسری جلد دستیاب ہوئی) (ف غالباً ۱۳۲۴ھ)

۶۔ بیان القرآن (۳ جلدوں میں) از محمد علی لاہوری ایم اے (محض ترجمہ کی حد تک قابلِ قدر ہے) (ف ۱۳۶۸ھ)

۷۔ تفہیم القرآن (۵ جلدوں میں) از ابوالاعلیٰ مودودی (صرف پہلی چار دستیاب ہوئیں)

۸۔ حواشی شبیری (بر حاشیۂ ترجمۂ شیخ الہند) از شبیر احمد عثمانی دیوبندی (ف ۱۳۷۰ھ)

۹۔ ترجمان القرآن۔ از مولانا ابوالکلام آزاد (صرف پہلی دو جلدیں نظر سے گزریں)

یہ ساری تفسیریں بجز دو یا تین کے عقائد اہلِ سنت کی ترجمان ہیں۔

ان کے علاوہ سلوک قرآنی پر ایک بڑے کام کی کتاب:۔

مسائل السلوک من کلام الملوک۔ از اشرف علی تھانوی ہے۔

"مرشد تھانوی" کے حوالہ سے جو عبارتیں اپنی تفسیر میں درج کی ہیں، وہ سب اس سے لی گئی ہیں۔

لغت و تفسیر کی جن کتابوں کے حوالے بار بار اور کثرت سے دینے پڑے ہیں، بہ غرض سہولت بجائے ہر مرتبہ اُن کا پورا نام نقل کرنے کے صرف اُن کے مختصر مخففات درج کر دیئے گئے، ان علامات کو یہاں سمجھ لیجئے۔

| نمبر شمار | حوالہ | اصل کتاب | نمبر شمار | حوالہ | اصل کتاب |
|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ابن جریر | تفسیر جامع البیان طبری | ۱۶ | رازی | مفاتیح الغیب |
| ۲ | ابن خالویہ | اعراب ثلاثین سورۃ من القرآن الکریم | ۱۷ | راغب | مفردات غریب القرآن |
| ۳ | ابن عباس | تنویر المقباس | ۱۸ | روح | روح المعانی |
| ۴ | ابن العربی | احکام القرآن | ۱۹ | سجستانی | غریب القرآن |
| ۵ | ابن قتیبہ | مشکلات القرآن و غریبہ | ۲۰ | عکبری | اعراب القرآن |
| ۶ | ابوالبقاء | کلیات ابوالبقاء | ۲۱ | قرطبی | تفسیر احکام القرآن |
| ۷ | اقرب | اقرب الموارد | ۲۲ | کشاف | تفسیر الکشاف |
| ۸ | ابوسعود | حواشی ابوسعود العمادی | ۲۳ | مجاز | تفسیر مجاز القرآن |
| ۹ | بحر | البحر المحیط | ۲۴ | مدارک | تفسیر مدارک التنزیل |
| ۱۰ | برہان | البرہان فی علوم القرآن | ۲۵ | معالم | معالم التنزیل |
| ۱۱ | بیضاوی | انوار التنزیل | ۲۶ | معانی | معانی القرآن |
| ۱۲ | تاج | تاج العروس | ۲۷ | مغنی | مغنی اللبیب |
| ۱۳ | تھانوی | تفسیر بیان القرآن | ۲۸ | نہر | النہر اللقیط |
| ۱۴ | جصاص | احکام القرآن | ۲۹ | نیشاپوری | تفسیر غرائب القرآن |
| ۱۵ | جوہری | الصحاح | | | |

اِن مخففات کے علاوہ جو کچھ بھی حوالے ہیں، وہ کتابوں کے پورے نام کے ساتھ ہیں۔

---

مالک و مولا جس بے بضاعت کو بھی چاہے رحمتوں اور برکتوں سے نواز دے جس مشتِ خاک کو چاہے نعمتوں سے مالا مال اور عزتوں سے سرفراز کر دے، جب اپنی علمی کم مائیگی بلکہ بے مائیگی پر نظر جاتی ہے تو بہ خدا اپنی اِس جسارت پر عقل دنگ و حیران رہ جاتی ہے ـــ جو عقلاً اَن ہونی تھی، وہ عملاً بہر حال ہو کر رہی کام الٹا سیدھا، جیسا اور جس طرح بھی بن پڑا، ہو ہی گیا، اب وہ خلق و خالق دونوں کے روبرو ہے جس نے لکھ ڈالنے کی توفیق دی، کیا عجب کہ وہی رب العزت اپنی اس توفیق کی لاج بھی رکھ لے!

تفسیر طبع اول کا مسودہ کوئی ۴، ۵ سال کی مدت میں ۱۹۴۳ء میں ختم ہو گیا تھا، چار سال سے اوپر کی مدت مسودہ کی کانٹ چھانٹ اور صفائی یعنی مسودہ سے مبیضہ بننے میں لگ گئے، ۴۷ء تک مبیضہ ناشر صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا، پھر جو کچھ گزری، اور کتاب جب اور جس ہیئت و صورت کے ساتھ ۱۳، ۱۴ سال کے صبر آزما انتظار کے بعد یعنی ۱۹۶۲ء میں پریس سے باہر نکلی اس کے تذکرے سے اب کچھ حاصل نہیں۔

سفینہ جب کنارے پہ آ لگا غالبؔ　　خدا سے کیا گلہ، جورِ ناخدا کہیے

کتاب پر نظرِ ثانی کا کام، مسودۂ اول کی تکمیل کے ڈیڑھ ہی ایک سال بعد شروع ہو گیا تھا نظرِ ثانی اپنی فہم و بساط کے لائق تفسیر کی سطر سطر پر کی گئی، اور خاصی حد تک ترجمہ کی بھی، حذف و ترمیم کی ضرورت تفسیر میں جا بجا محسوس ہوئی، اور اضافہ کی گنجائش بہت زائد نکلی خصوصاً اس کے تاریخی اور سائنسی حصوں میں طبع اول کو پڑھ کر جن ناظرین کرام نے اپنے مشوروں سے نوازا یا یوں کہیے کہ راقم آثم کو اس کی کوتاہیوں، غلطیوں اور لغزش سے مطلع فرمایا، اُن کی فہرست خاصی طویل ہے، ورنہ عجب نہیں کہ شکریہ نام بہ نام ایک ایک کا ادا کیا جاتا لیکن تین ایسے ہیں جن کی صراحت ناگزیر ہے، نمبر اول پر میرے قدیم مخلص و رفیق مولانا محمد اویس ندوی نگرامی سلمہ اللہ شیخ التفسیر دار العلوم ندوہ ہیں، ان کی گراں بہا امداد مختلف طریقوں سے حاصل ہوتی رہی، باقی دوسرے صاحبوں میں سے ایک فرنگی محل کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع انصاری لکھنوی ثم پاکستانی ہیں، اور دوسرے صاحب سنبھل (ضلع مراد آباد) کے مولوی محمد حسن صاحب بدر ہیں، ان دونوں نے بڑی شفقت و تعب اٹھا کر دیدہ ریزی کے ساتھ بڑی ہی مفصل یادداشتوں سے شکر گزار کیا۔

اور اپنے اُن محسن کے لئے کیا کہوں، اور ان کا نام زبان پر کیوں کر لاؤں، جنھوں نے دس ہزار کی یکمشت رقم سے اس کام کا لگا لگا دیا اور اس شدید ترین گرانی اور کاغذ کتابت و سامانِ طبع کی شدید کمیابی کے وقت کم سے کم جلد اول کی طباعت کو ممکن بنا دیا، باقی جلدوں کی طبع و اشاعت کا بھی اللہ ہی مالک و ضامن ہے، خود اسی جلد کے تیار ہو جانے کی کیا امید تھی زندگی نے اگر وفا کی بھی جس کی امید ضعیف کیا معنی موہوم سی ہے، تو ان شاء اللہ اخیر کے ساتھ اشاریہ (انڈکس) بھی شامل ہو گا۔

رب العزت اس ناچیز و بے مایہ کی کوشش کو خلعتِ قبول سے سرفراز فرمائے، اور حشر میں قرآن مجید کے شارحوں، مفسروں کے خادموں کی صف میں اٹھائے، اور مجھے اور میرے والدین کو، میرے عزیزوں اور مخلصوں کو، میرے بزرگوں اور خوردوں کو، اور ان سب کو جو کسی حیثیت سے اور کسی درجہ میں بھی اس تفسیر کی تکمیل میں شریک و معاون رہے ہیں، سب کو اپنے آغوشِ رحمت میں جگہ دے، اور اپنے لطف و کرم کی بارش ساری اُمّتِ اسلامی پر نازل فرما دے۔

قطرۂ ز آبِ رحمت تو بس ست  شستن نامۂ سیاہ ہمہ را

ناظرین سے صرف اتنی التجا ہے کہ اِن دعاؤں پر آمین کہہ دیں، اور خود بھی اس کا اجر حاصل کریں۔

مئی ۱۹۶۷ء
محرم ۱۳۸۷ھ

عبد الماجد
دریاباد - بارہ بنکی

## مکرر

بیسویں صدی کے ثلث آخر میں کوئی کتاب وہ بھی ضخیم چھپے اور وہ انڈکس (اشاریہ) سے خالی ہو، مصنف کی کم نصیبی کے سوا اور کس چیز پر اسے محمول کیا جائے لیکن اپنی کم نصیبی تو اس سے بھی بڑھ کر نکلی، انڈکس کیا معنی معمولی فہرستِ مضامین کا انتظام بھی اس کے لئے نہ ہو سکا۔

پڑھنے والوں کو اس خامی سے جس زحمت کا شکار ہونا پڑے، اس کے لئے بجز درخواست عفو کے اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

عبد الماجد
فروری ۱۹۶۸ء
ذی قعدہ ۱۳۸۷ھ

# افتتاحیہ (۲)

نحمدہٗ ونستعینہ ونصلی علیٰ رسولہ. قرآن مجید صرف مسلمانوں ہی کے لئے نازل ہوا ہے، یا اُس میں کچھ حصہ دوسروں کا بھی ہے؟ قرآن کی خدمت جتنی گراں اور قابلِ قدر جیسی گہری اور قابلِ رشک مسلمانوں نے کی کیا کسی دوسری قوم نے اپنے صحیفۂ مقدس کی کی ہوگی لیکن اس سارے اعتراف کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ اس چودہ ۱۴۰۰ سو برس کی مدت میں قرآن کے مخاطب صرف مسلمان ہی سمجھے گئے، اور اسی مفروضہ پر اس کی شرح و تفسیر میں دفتر کے دفتر تیار ہوتے چلے گئے، اس پر حق کہنا چاہئے کہ مسلمانوں ہی کا قائم ہوا، اور اس کے خلاف یا اس سے ہٹ کر کبھی سوچا ہی نہ گیا۔

اور اب تک یہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا، قرآن اصلاً صرف کتابِ ہدایت ہے، اس کی دعوت، توحید، رسالتؐ معاد کی مع ان کی تفصیلات و جزئیات کے ہے، اس کی پکار عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق کے مسائل تک محدود ہے، اور اب تک جو کچھ لکھا لکھایا گیا ہے سب ان ہی مسائل کو زیادہ مدلل، زیادہ روشن و واضح کرنے ہی کے لئے لیکن قرآن مجید میں صرف یہی کچھ نہیں ہے، ضمناً اور بالواسطہ تاریخ، جغرافیہ اور سائنس کے سیکڑوں نکتوں پر گفتگو آگئی ہے اور ان مادی، دنیوی حقیقتوں پر بھی روشنی پڑتی چلی گئی ہے، افتتاحیہ نمبر (۱) میں یہ حقیقت گوش گزار کی جا چکی ہے کہ قرآن کی حیثیت اپنے اصل و مغز کے لحاظ سے ابدی، آفاقی، عالمگیر ہے، یعنی زمان و مکان کی قیود سے ماوراء لیکن دوسری یا ضمنی حیثیت سے جب یہ کلام چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کی قوم عرب کے لئے نازل ہوا تو اس میں پوری رعایت زمانہ و ماحول کی بھی رکھ لی گئی، پھلوں میں نام انار، انگور اور کھجور کے لائے گئے، آم اور آڑو اور نارنگی کے نہیں لائے گئے، جانوروں میں ذکر اونٹ، گھوڑے، ہاتھی، کتے کا لایا گیا جس سے عرب مانوس تھے، تیندوے، گینڈے، فاختہ، قمری کا نہیں لایا گیا، چاند، سورج اور ستاروں کے بیان کئے گئے تو قصداً ایسی عبارت میں جو اس زمانہ کے مسلمات عقلی و فکری سے ٹکراتی نہ تھی، لیکن اتنی لچک رکھتی تھی کہ جب صدیوں کے بعد نظریات فلکی بدل جائیں، تو الفاظِ قرآنی کی تفسیر و تشریح جب بھی ذہنوں پر گراں نہ ہو، زمین کی کرویت اور زمین کی گردش، اور سورج اور چاند کی خلائی گردشیں سب کی سب کھل کر اس نے اُس زمانہ میں بیان نہیں کیں جبکہ یونان کے حکیم، ہندوستان کے پنڈت، عراق و مصر کے منجم سب اس کے قائل و معتقد تھے کہ آسمان نام ہے ایک بڑی اور ٹھوس چھت کا جس میں ستارے، چاند جڑے اور جُڑے ہوئے ہیں، اگر بیان کر دیتا تو کون اس کلام کو قابلِ اعتنا سمجھتا اور کتنی بحثیں عقلی اور دماغی، اصل مقصد ہدایت سے بالکل الگ نہ چھڑ جاتیں، بالامحالہ حکمتِ خداوندی نے ایسا اعجازی طریقۂ کلام اختیار کیا کہ جس سے ظاہری مطلب تو

اس زمانہ کے مزعومات، مسلّمات اور معتقدات کے مطابق نکل آئے لیکن اتنی گنجائش اس میں ہو کہ جب عقل انسانی بلوغ کو پہنچ جائے، اور علوم وفنون برگ و بار لے آئیں تو وہی کلام معنی ومفہوم علومِ عصری کے عین مطابق دینے لگے، اور کلام کا یہ اعجاز بجائے خود اس کی حقانیت کی ایک مستقل دلیل بن جائے ـــــ اور مومنین صادقین کے علاوہ باہر والے بھی بہ قدر اپنے ظرف ونصیب کے اس سے مستفید ہونے لگیں۔

فرعون کو جب تک لوگ فلاں بادشاہ کا شخصی نام سمجھتے رہے، اس نام کے عربی ترجمے بھی ملتے رہے، اور یہ عقیدہ جما رہا کہ وہ اپنی ذات سے مدّعیِ اُلوہیت وربوبیت کا ہو گیا تھا، لیکن جب تاریخ نے پردہ کشائی کی کہ وہ شخصی نام نہیں بلکہ لقب شاہی فرماں رواؤں کے اس خاندان کا تھا جو اپنے کو مظہر یا اوتار معبودِ اعظم یا سورج دیوتا کا سمجھ رہا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کے معاصر ایک نہیں دو فرعون ہوئے ہیں، تو اب فرعون دو نہیں بیس ہوئے ہوں، قرآنی بیان کو اُس سے کیا ضرر ؟ ـــــ اگلوں نے مفسرِ قرآن کے لئے جو شرائط تقویٰ وطہارتِ قلب وغیرہ کے لکھے ہیں، وہ یقیناً بجائے خود لازمی وناگزیر ہیں لیکن جب ایک بار سوال یہ چھڑ گیا اور طے پا گیا کہ قرآن کریم، غیروں اور منکروں کے لئے بھی ہے تو تفسیر نگار کے لئے علومِ عصری سے بہرہ مند ہونا بھی کچھ کم ضروری نہیں رہ جاتا۔

---

بے خیالی اور بے غوری کی تو بات ہی دوسری ہے ورنہ اگر استقراء سے کام لیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآن اگرچہ صراحۃً کہیں بھی دعوت دُنیا کے چلتے ہوئے علوم وفنون کی طرف توجہ کی نہیں دیتا، لیکن ساتھ ہی مطالبات ایسے کرتا ہے کہ کہیں بہ قاعدۂ اشارۃ النص اور کہیں بہ قاعدۂ اقتضاء النص کہ دوسرے علوم وفنون کی تحصیل کچھ ناگزیر سی ہو جاتی ہے، مثلاً جہاں تقسیم ترکہ کا حکم ہے، فرمائیے کہ اس کی تعمیل بغیر علم الحساب (ارتھمیٹک) کے ممکن کیونکر ہے ؟ یا اس قسم کے جو ٹکڑے جابجا آتے گئے ہیں، قل سیروا فی الارض۔ اولم یسیروا فی الارض۔ اُن پر عمل درآمد بغیر جغرافیہ کے میدان میں قدم رکھے کیونکر ممکن ہے، اسی طرح اس مضمون کی جتنی آیتیں آئی ہیں کہ انّ فی خلق السمٰوٰت والارض واختلاف اللیل والنھار لاٰیات لِاُولی الالباب۔ ان کے ذیل میں مفسر کی نظر علومِ طبعی وفلکیات میں جتنی گہری ہو گی اس کو حکمت وصنعتِ تکوینی کے کیسے کیسے دلائل وشواہد ملتے جائیں گے، دریا اور پہاڑ، شجر وحجر، جمادات ونباتات اور حیوانات کی پیدائش کے جہاں جہاں تذکرے آئے ہیں، ان کے تعین وتحقیق نے کتنے ہی سائنسی علوم کے دروازے کھول دیئے ہیں، یتفکرون۔ یفقھون اور یعلمون وغیرہ کی تاکید وتفصیل سے اگر منطق اور استدلالاتِ فکری کی طرف رہنمائی مقصود نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور نوحؑ وابراہیمؑ۔ اسحاقؑ واسماعیلؑ، ایوبؑ ویونسؑ۔ داؤدؑ وسلیمانؑ۔ موسیٰؑ وہارونؑ۔ یعقوبؑ ویوسفؑ۔ عزیرؑ وزکریاؑ، یحییٰؑ وعیسیٰؑ، لقمان وذوالقرنین اور قومِ عاد وثمود، تبّع اور فرعون وقارون وہامان کے نام لے آنے سے ملکوں ملکوں کی تاریخ کی طرف توجہ دلانا تو بالکل ہی ظاہر ہے، جتنی صحیح وتاریخی دریافتیں ان شخصیتوں اور ان کی قوموں سے متعلق فراہم ہوتی رہیں گی۔ ان شاء اللہ قرآن کا زرِ خالص اور زیادہ ہی نکھرتا آئے گا۔

---

قرآن مجید میں حشو مطلق نہیں ہے، جو عبارتیں سرسری اور پہلی نگاہ میں غیر ضروری بلکہ بے تعلق سی نظر آتی ہیں

اُن کی بھی جب اہمیت کھل کر رہتی ہے تو ان کی معنویت کا بالآخر اعتراف کرنا پڑتا ہے حضرت سلیمانؑ کے ذکر میں آتا ہے کہ وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا۔ اور مسلمان جو شروع ہی سے حضرت سلیمانؑ کو پیمبر برحق مانتا ہے جھٹ سے سوال کر بیٹھتا ہے کہ آخر پیمبر سے کفر کا امکان ہی کیا تھا پیمبر کی یہ منقبت بے ضرورت ہی تو ٹھہرتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اہل کتاب کی مسلم کتاب بائبل (عہد عتیق) کے صحیفہ سلاطین کے باب ۱۱ کی ابتدائی آیتوں میں یہ صاف درج ہے کہ سلیمانؑ اپنی آخر عمر میں غیر معبودوں کی طرف مائل ہو گئے تھے' اور "اجنبی معبودوں" کی پیروی کرنے لگے تھے' گویا توحید سے نکل کر شرک میں پڑ گئے تھے' اور یہود اور مسیحیوں کی کروڑوں آبادی کے نزدیک مشرک ہو گئے تھے' اتنی شدید گمراہی کی تردید قرآن اگر کھل کر نہ کرتا تو اور کیا کرتا! —— الفاظِ قرآنی کی معنویت اور اہمیت اب ظاہر ہو گئی ہوگی۔

اسی سورۂ بقرہ میں وارد ہوتا ہے (رکوع ۲۲ آیت ۱۷۷) کہ لیس البرّان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب الخ (نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا مُنہ مشرق یا مغرب کی طرف پھیرا کرو) آیت نے مترجمین وشارحین کو حیرت میں ڈال دیا ہے' کسی نے ترجمہ لیس البر کا "نیکی یہی نہیں ہے" کیا ہے' اور کسی نے "نیکی کامل یہ نہیں ہے" گویا مشرق رُخی یا مغرب رُخی کا نیکی یا عملِ خیر ہونا سب ترجموں میں مشترک ہے' حالانکہ قرآن مجید سرے سے اسی کی نفی کر رہا ہے' مفسرین رحمہم اللہ بیچارے اِس حقیقت سے بےخبر تھے کہ دنیائے شرک میں شرکِ جلی کی ایک قسم سمت پرستی بھی ہے' کلامِ مبین ضرب اسی عقیدہ پر لگا رہا ہے' اور کہہ رہا ہے کہ سمت پرستی میں کیا رکھا ہے' جو تم کسی متعین سمت کو مقدس فرض کئے ہوئے ہو' بلکہ طاعت کے اصناف واقسام تو یہ ہیں کہ :۔

وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ (البقرہ۔ ۱۷۷)

کوئی شخص ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیمبروں پر اور مال خرچ کرتا ہے اس کی محبت کے باوجود اپنے قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور مسکینوں پر اور مسافروں پر اور سائلوں پر اور (قیدیوں اور غلاموں کی) گردنیں چھڑانے پر اور نماز کی پابندی کرنے پر اور زکوٰۃ کی ادائی کرنے پر اور وعدوں کے پورا کرنے پر جبکہ معاہدہ کر چکے ہوں' اور تنگی اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنیوالے

یعنی طاعت کی صورتیں نکلیں یا تو اعتقادی وایمانی' یا پھر عملی (جسمانی ومالی) نہ کہ محض مشرق رُخی یا مغرب رُخی' تقدس کسی سمت میں کچھ بھی نہیں' طاعت تو ایک مخصوص مکان یا مرکز یا قبلہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا ہے' خواہ وہ نمازی کے جس سمت میں بھی پڑ رہا ہو —— اس ایک علم یعنی شرکِ سمت پرستی نے حکمِ قرآنی کی معنویت کیسی واضح اور جلی کر دی!

اسی طرح سورۃ القصص میں فرعون، ہامان کو حضرت موسیٰؑ کے مقابلہ کے سلسلہ میں حکم دیتا ہے۔

فَاَوْقِدْ لِىْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّىْ صَرْحًا لَّعَلِّىْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّىْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ (رکوع ۴ آیت ۳۸)

اے ہامان! تو میرے لئے مٹی کی اینٹوں کو آگ دے تاکہ پکا محل کھڑا کریں جس پر سے ہم موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھ سکیں اور میں تو موسیٰ کو اس باب میں جھوٹا ہی سمجھتا ہوں۔

اب اس آیت میں من طین حشو ہی معلوم ہوتا ہے لیکن اس حقیقت کو مستحضر کرلیجئے کہ دنیا کی بڑی اور مہذب سلطنتوں میں شاہی محل پتھر ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور قدرۃً قصر فرعون بھی سنگی سمجھا جاتا، سنگ مرمر کا، سنگ رخام کا، یا کسی اور ایسے ہی قیمتی پتھر کا، لیکن مصر کی شاہی عمارتوں کی تعمیر پتھر سے نہیں، مٹی سے ہوئی ہے' اور فن تعمیرات کی تاریخیں جو لکھی گئی ہیں' ان میں یہ صراحت سے درج ہے کہ مصر کا تعمیری تمدن سنگی نہیں، گلی رہا ہے' قرآن مجید نے اس فنی باریکی کو پیش نظر رکھ کر، اور رفعِ اشتباہ کے خیال سے من طین کی صراحت کردی، اور اس پر حشو کا اطلاق ذرا بھی نہ ہونے دیا ——

مفسرین بڑے بڑے اہل علم و فضل سہی' اللہ کے علم سے سارے عالم کے عالموں' فاضلوں' اور مفسروں کے علم کو ملا کر بھی کیا نسبت؟

قرآن کریم کے کلامِ الٰہی ہونے پر جو قوی ترین دلائل قائم ہیں' ان میں سے ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ فلکیات سے متعلق جو قرآنی بیانات تھے' وہ جس طرح اس وقت صادق رہے تھے' جب یونان و مصر، ہند و عرب، چین و فرنگستان کے علم کی دنیا میں آسمان نیلگوں مثل بادل کے ایک ٹھوس چھت تھا، ستارے اس میں جڑے ہوئے تھے' اور آسمان چاند اور سورج کو لئے ہوئے مسلسل زمین کے گرد گردش میں رہتا تھا، اور زمین ایک چپٹی ساکن بستی تھی' وہ قرآنی بیانات آج بھی اسی طرح چسپاں اور صادق ہیں جب پرانے نظریات کی دھجیاں بکھر گئی ہیں اور ان کی جگہ تمام تر نئے، نرالے اور انوکھے حقائق نے لے لی ہے.

---

جدید مفسر کی نظر صاحبِ قرآن کے ماحول اور ملک کی تاریخ پر ہونا لازمی ہے' اور یہ نظر جتنی گہری اور وسیع ہو، اسی قدر بہتر ہے' بعض قدیم مفسرین نے شانِ نزول کو بہت اہمیت دی ہے اور اس عنوان کے ماتحت رطب و یابس ساری ہی روایتوں کو یکجا کر دیا ہے' یہ تلاش بے شک قابل قدر ہے' لیکن کافی نہیں' اس میں وسعت اور گہرائی دونوں بہت زیادہ چاہیئے' محض چند صحابہ اور مخلصوں کے حالات و اقوال جمع کر دینا کافی نہیں' نہ صرف قبیلۂ قریش بلکہ سارے حجاز کے طور طریقوں کو پیش نظر ہونا چاہیئے' ان کے رسم و رواج، عقائد و اوہام' ان کے معتقدات و مزعومات' ان کے شعر و خطبات سب سے واقفیت ہونا چاہیئے' قریبی ملکوں سے ان کے تعلقات کی کیا نوعیت تھی' عورتوں کا ان کے ہاں سیاسی، مذہبی، معاشی، معاشرتی مرتبہ کیا تھا، دولت کے کیا کیا مصرف رائج تھے' آقا و غلام، زردار و نادار کے درمیان تعلقات کی نوعیت کیا تھی' مفلس، یتیم اور مسافر کس برتاؤ کے مستحق سمجھے جاتے تھے' قانونی، اخلاقی و معاشی آداب کس سطح اور کس معیار کے تھے، سیاسی اور عمرانی رشتے ایک طرف عراق و ایران' دوسری طرف شام و مصر کے ساتھ کس قسم کے تھے' شرک کے مختلف مذاہب اور مسیحیت، یہودیت، مجوسیت کس کس روپ میں جلوہ گر تھے' تاریخی نوشتوں کے علاوہ اثری کتبات نے ان سارے مسائل سے متعلق جو معلومات کے انبار لگا دیئے ہیں' یہ سب تفسیر لکھنے والے کے دائرہ نظر کے اندر آجاتے ہیں.

اسلامی اصطلاحیں بہت بعد کی چلی ہیں، قدیم لفظی و لغوی اشتراک سے دھوکا نہ کھانا چاہیئے، دور قبل اسلام میں وہی لفظ اگر کسی کی زبان سے ادا ہو تو اس کا ترجمہ اسلامی اصطلاح میں کر دینا کہیں تو غیر ضروری ہوگا، اور کہیں صریح غلط، مثلاً ایک لفظ صلوٰۃ ہے جس کا اردو ترجمہ اسلامی اصطلاح میں نماز ہے' لیکن حضرت شعیبؑ کی قوم جب اس لفظ کا استعمال کرتی ہے تو ضرور نہیں کہ اس موقع پر بھی اس کا ترجمہ "نماز" ہی سے کیا جائے، اور اس کے تصور میں قیام، قعود، رکوع، سجود وغیرہ نمازِ اسلامی کے ارکان کو شامل رکھا جائے بلکہ "پوجا" یا "پوجا پاٹ" بھی کافی ہوسکتا ہے' اسی طرح جب پیکرِ عصمت و متانت حضرت یوسفؑ کو ایک خادم کی حیثیت سے دیکھ' ایک جاہلی ملک کی امیر زادیاں پکار اٹھی تھیں

اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ تو مَلَک کا ترجمہ فرشتہ سے کرنا صحیح نہ ہوگا، فرشتہ کا تخیل مشرک قوموں میں سرے سے تھا ہی نہیں، یہ تو سرتاسر اسلامی تصور ہے، یہاں ترجمہ دیوتا، یا دھرماتما سے کرنا مناسب ہوگا ــــ قرآن مجید تو باریک سے باریک فرق کا لحاظ رکھتا ہے، چنانچہ ملک مصر کے فرماں رواؤں کے لئے وہ دو مختلف موقعوں پر دو مختلف لفظ لایا ہے، حضرت یوسفؑ کے ہم عصر فرمانروا کے لئے مَلِک اور اس کے کئی سو برس کے بعد حضرت موسیٰؑ کے معاصر کے لئے فرعون، اس لئے کہ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں مصر کا شاہی خاندان بالکل دوسرا ہو چکا تھا، اور اب یہاں بادشاہ کا سرکاری لقب فرعون مقرر ہو چکا تھا۔

---

قرآن کا بہت بڑا اعجاز (کہنا چاہیئے کہ شاید سب سے بڑا اعجاز) یہ ہے کہ اس نے عقلی علوم اور ترقی پذیر علوم کے مسائل کے باب میں بڑی ہی لچک روا رکھی ہے کہ جو مسئلہ جس طرح اس کے نزول کے وقت علومِ عصری کے عین مطابق نظر آتا تھا، اسی طرح آج چودہ سو سال کے بعد بھی معاصر تحقیق کے مطابق ہے، اللہ پانی کا برسانے والا ہے، یہ حقیقتِ قرآنی آج بھی پوری طرح صحیح اور یقینی ہے، جب یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سورج کی حرارت سے سمندر کے پانی سے بھاپ اٹھتی ہے اور اوپر چڑھتی ہے، منجمد ہو کر خاص کثیف شکل بادلوں کی اختیار کر لیتی ہے، یہ بادل پہاڑوں سے ٹکرا کر پلٹتے ہیں، ہوا اُن کا رخ اور ان کی بلندی مقرر کرتی ہے، پھر جب حرارت اور رطوبت ایک خاص درجہ کی ہوتی ہے، تو یہ بادل بوند بوند ہو کر زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور اس وقت بھی پوری طرح صحیح اور یقینی تھی، جب یہ کچھ معلوم نہ تھا، اور انسان صرف اتنا جانتا تھا کہ بادل ایک قسم کے جانور ہیں جو سمندر سے پانی پی کر آسمان پر چلے جاتے ہیں، اور آسمان پر پانی کے ذخیرے جمع رہتے ہیں، جیسے دنیا میں لوگ ٹنکیوں اور پیپوں میں پانی کا ذخیرہ جمع رکھتے ہیں ــــ اس صورتِ حال کا راز صرف یہ ہے کہ قرآن نے مغیبات کا تو پورا اور کافی علم اپنے اندر دے دیا اور اللہ، روح، وحی، فرشتے، پیمبروں، جنّت، دوزخ، جزائے اعمال سے متعلق تو ساری ضروری تفصیل بیان کر دی، اس لئے کہ ان ماوراءِ عقلیات کے علم کا کوئی قابلِ اعتماد ذریعہ بجز وحی الٰہی اور کتابِ آسمانی کے ممکن نہیں، باقی جتنے علوم و فنون کا تعلق انسانی عقل، ذہن و دماغ سے ہے، اور ان کے مجموعہ کا نام خواہ فلسفہ رکھئے خواہ سائنس، ان کی جزئی تفصیلات کی طرف تو قرآن گیا ہی نہیں ہے بلکہ صرف مجمل اشارات ان کے متعلق کر دیئے ہیں، اس اعتماد کے ساتھ کہ جوں جوں عقلِ بشری ترقی کرتی جائے گی، یہ عقلی گتھیاں خود بخود کھلتی جائیں گی اور طبیعاتی تحقیقیں اپنے کو مادی آلات کی مدد سے پہنچواتی جائیں گی۔

اعجازِ قرآنی یہی ہے کہ سائنسی تحقیقات جو کچھ بھی ہوں، قرآن ان علومِ عصری سے کہیں سے ٹکرائے گا نہیں بلکہ ان کے ہم آہنگ ہی ہر دور میں نکلے گا ــــ یہ بنیادی حقیقتیں اگر پیش نظر رہیں تو ان شاء اللہ تفہیم قرآن میں بڑی سہولتیں پیدا ہو جائیں گی اور تفسیر قرآن بجائے ایک "خشک" سے موضوع کے ہم دنیا والوں کے لئے بھی بڑا دلچسپ بن جائے گا۔

---

تفسیر کے بعد اب دو لفظ زبانِ ترجمہ کے متعلق اور سن لیجئے، ترجمہ جو بھی کرے گا، انھیں محاورات سے کرے گا، جو وہ اپنے گردوپیش بول چال میں پائے گا، اور محاورات کا حال یہ ہے کہ سو برس کی مدت تو خیر بہت بڑی ہوئی،

بچاس ہی برس میں یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے، اور کتنے ہی کہنہ و فرسودہ ہو جاتے ہیں، ہم اپنی عمر کا گھٹنا اور سرکنا تو محسوس کرتے ہیں، لیکن یہ بہت کم محسوس ہونے پاتا ہے کہ لفظوں کی عمر بھی تو اسی طرح ہر روز گھٹتی اور سرکتی رہتی ہے، ابھی یہ لفظ جو تگڑا اور توانا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے بوڑھا اور کمزور ہو چلا بلکہ جگہ چھوڑنے لگا اور قریب ہے کہ بالکل ٹکسال باہر ہو جائے، شاہ عبد القادر دہلویؒ کی زبان اپنے زمانہ میں ترجمہ کی بہترین زبان تھی لیکن آخر کب تک ثبات و قیام اُسے بھی رہتا، جدید نسل کے لئے اب وہ پچاس فی صدی ناقابلِ فہم ہو گئی ہے، قدرت کے اس تصرف کو روک دینا یا اس کی باگ پھیر دینا کس کے بس کی بات ہے، نمونے کے طور پر صرف دس پانچ لفظ سن لیجئے:۔

"صاحب" پہلے مالک و حاکم کو کہتے تھے، اب صرف رفیق کو کہتے اور ہلکی تعظیم کے موقع پر بولتے ہیں۔

"تماشبین" پہلے عیاش کو کہتے تھے، اب عام تماشائی کے معنی میں بولتے ہیں۔

"رنج" کا لفظ پہلے بیماری کے لئے بھی عام تھا، اب صرف غم کے مترادف ہے۔

"چالاک" پہلے اردو میں متحرک کو بھی کہتے تھے، اب صرف زیرک و دانا کو کہتے ہیں پہلوئے ذم لئے ہوئے،

"بہرہ" پہلے مطلق حصہ کے معنی میں آتا تھا اب بجز منفی ترکیب "بے بہرہ" کے یا فارسی ترکیب (مثلاً بہرہ ور) اردو کے استعمال میں نہیں۔

"دریا" کے مفہوم میں پہلے "سمندر" بھی شامل تھا، اب سمندر کے لئے نہیں آتا۔

"بندی خانہ" پہلے اردو میں عام تھا، اب اس کی جگہ جیل یا جیل خانہ یا قید خانہ بولتے ہیں۔

"آشنا" اور "آشنائی" پہلے مطلق "دوست" اور "دوستی" کے مترادف تھے، اب دونوں میں پہلوئے ذم شامل ہو چکا ہے، تقریباً یہی حال "یار" اور "یاری" کا ہو گیا ہے۔

"پاداش" پہلے مطلق جزا یا معاوضہ کے معنی میں تھا، اب سزا یا جرمانہ ہی کے معنی میں رہ گیا ہے۔

# افتتاحیہ (۳)

نحمدہٗ ونستعینہ ونستغفرہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ ایمان اگرچہ اصطلاح میں کفر وانکار کے مقابل کی چیز ہے لیکن قرآن مجید نے اسے شروع ہی میں جس کیفیت نفسی کے مقابلہ ومعاوضہ میں رکھا ہے، وہ ریب یا شک واشتباہ ہے، اور نفی کلی اسی کی کی ہے ایمان جس کیفیت تیقن کا نام ہے اس کے لوازم میں اطمینان یکسوئی اور ٹھہراؤ۔ ریب اس کے مقابل مترادف ہے بے اطمینانی، بے یقینی، شک اضطراب وتردد کے۔ ایمان ایک روشن ستارہ اور مستحکم قلعہ ہے ثبات وقیام کا، سکونِ قلب کا، انشراحِ خاطر کا، ریب اس کے ٹھیک برعکس ایک تاریک گڑھا ہے، بے قراری کا، تذبذب کا، دودلے پن کا، قرآن جس عالم اور جس مقام کی چیز ہے وہ ایمان ہے، اور وہ دعوت بھی دیتا ہے اسی ایمان کی، اور بیدار بھی کرتا ہے اسی احساسِ ایمانی کو، اور اسی کو قرآن نے مزید زور وتاکید کے لئے کہیں کہیں ایقان سے بھی تعبیر کیا ہے اس مقام سے اعراض اور اس سے انکار اپنے کو حیص بیص میں، ڈانواڈولی میں مبتلا رکھنا ہے۔

اس مقامِ عرفان سے گر کر اس جہلِ محض کو جہلِ مرکب بنانے کے لئے اس خشک وویران بیہڑ کو سبز باغ بنا ڈالنے کے لئے اور اس پر روغن اور پالش پھیرنے کے لئے شیطان لعین مُغوی اول نے طرح طرح کے خوشنما نام اور بلند بانگ مصطلحات اس کے لئے گڑھ لئے ہیں مثلاً تشکیک وعقلیت، فلسفہ ولاادریت، ماحصل ان شاندار "علوم" کا اور نقلی فنون کا، سکونِ قلب کی دولت سے محروم رہنا اور ظن وتخمین کی تاریکیوں میں ہچکولے کھاتے رہنا ہے۔

یہ کتاب حکیم اپنے نقطۂ آغاز ہی سے نفی "ریب" کی کرتی ہے "ذٰلک الکتاب لاریب فیہ" (البقرۃ آیت ۱) اور بدانجاموں کے حق میں خبر یہ "فی ریبھم یترددون" (سورۂ توبہ ع ۶) "فی شک یلعبون" (دخان ع ۱) "لاھیۃ قلوبھم" (انبیاء ع ۱) "فی غفلۃ معرضون" (انبیاء ع ۱) "لفی شک منہ مریب" (حٰم السجدۃ ع ۵) کی سناتی ہے خوش انجامی کی خوش خبری صرف ان کے حق میں یہ ہے، جن کے دل ایمان وایقان سے لبریز ہیں "الذین یومنون بالغیب" (بقرہ ع ۱) "یومنون بما انزل من قبلک" (بقرہ ع ۱) "وبالاٰخرۃ ھم یوقنون" (بقرہ ع ۱)۔

اس تمہیدی معروضہ کے بعد گزارش ہے کہ قرآن کی اس خصوصیت کا استحضار کرلیا جائے جو افتتاحیہ نمبر ایک میں بیان ہوچکی ہے کہ قرآن دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو ایک ہی وقت میں مطلق بھی ہے اور مقید بھی،

یعنی ایک طرف ازلی وابدی ہدایت نامہ' ہر ملک ہر قوم' ہر زمانہ کے لئے اور دوسری طرف زمان ومکان کی قید سے محدود ومقیّد بھی' ملک عرب کے صوبہ حجاز میں ساتویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں نازل ہونے والی اور اس وقت وزمانہ کی ساری خصوصیات لئے ہوئے' عربی لغت ولسان کی پابند' عربی اسلوب بیان کے مطابق' عربوں کے خیالات وعقائد' معاشرت واخلاق' تاریخ وجغرافیہ' سب کی رعایت رکھنے والی' اور قرآن علاوہ اور دوسری حیثیتوں کے ایک کلام معجز اس اعتبار سے بھی ہے کہ وہ اپنی اسی دوگانہ حیثیت اطلاقی ومقیّد کو شروع سے آخر تک قائم رکھے ہوئے ہے۔

اس بنیادی حقیقت سے ایک دوسری حقیقت بہ طور فرع پیدا ہوتی ہے' فہم قرآنی کی کلید محض دینداری اور اخلاص مندی سے ہاتھ نہیں آجاتی' اور اسی طرح نہ محض عام معلومات کی وسعت وفراوانی سے اور نہ محض علوم وفنون پر دسترس اور عبور سے اور نہ اس طرح محض عربی زبان کی سطحی واقفیت اور نہ رسمی مہارت سے ہی کام چل سکتا ہے' یہ امر محض اتفاقی نہیں' اور نہ ثانوی درجہ کا ہے کہ قرآن عربی زبان میں ایک عرب پر نازل ہوا اور اس کی براہ راست اور اولین مخاطب قوم عرب قرار پائی' ان میں سے ہر شے درجۂ اول کی اور ایک مقصدی اہمیت رکھتی ہے اور جب تک یہ مقصدی اہمیت پوری طرح پیش نظر نہ ہوگی قرآن پوری طرح کھل نہ سکے گا' اس کے متعدد گوشے اور پہلو ذہن بشری میں غیر واضح' ناصاف' اور دھندلے رہ جائیں گے اور پڑھنے والے کی آنکھ پر ایک غباری عینک چڑھی رہے گی' قرآن کی تخلیق نعوذ باللہ یہ نہیں کہ کسی طرح لشتم پشتم ہوگئی ہو اور ٹوٹی پھوٹی عربی جاننے والا اسے اٹک اٹک کر پڑھے اور اس کی فصاحت وبلاغت کو' اس کے ادب وانشاء کو اپنے دماغ کے گوشوں میں سمیٹ لے' وہ فصیح ترین' بلیغ ترین' جمیل ترین عربی' عربی مبین میں ہے' وہ شروع سے آخر تک خالص ترین' شیریں ترین عربی میں ہے' یہ نہیں کہ کہیں اس کا اسلوب عجمی یا ہندی ہوگیا ہے' یا کوئی ترکیب اس میں چینی' جاپانی یا انگریزی زبان کی آگئی ہے یا کوئی تخئیل فارسی یا ترکی یا عبرانی کی در آئی ہو' اس میں ذرا شک نہیں کہ راغب اصفہانی اور زمخشری ترکستانی اور ابو البقاء عجمی اور علیٰ ہمارے زمانہ میں حمید الدین فراہی ہندی بہت کچھ اپنی والی تفہیم قرآن کر گئے' اُدھر فراء وابو عبید بھی اپنے امکان بھر تنقیح کو پانی بنا گئے' اور صحاح وقاموس' لسان العرب' تاج العروس' اپنی کاوشوں سے بہت کچھ آبیاری اس چمن کی کر گئے' پھر بھی قرآنیات کے طالب علم کو چاہیئے کہ اُسے کلام جاہلیت پر پورا عبور حاصل ہو' ایک ایک تلمیح' ایک ایک ضرب المثل جاہلیت عرب کی اس کے نوک زبان ہو' اور معنی وبیان کے جو نکتے اور دقیقے اسلوب عربی میں رائج ہوں' وہ پانچویں صدی عیسوی کے ایک عرب اہل زبان کی طرح اس کے دماغ میں مستحضر ہوں' محاضرات عرب کی ایک ایک روایت' ایک ایک حکایت سے اس کا دماغ گونج رہا ہو۔

ان سطور کے راقم اور ان اوراق کے جامع کو اور علوم وفنون بھی آتے ہی کیا ہیں' لیکن جہاں تک ادبیات عرب کا تعلق ہے اس کا شمار تو مبتدیوں کی صف میں بھی نہیں! اور اس کامل نااہلی کے باوجود وہ جو جرأت وجسارت کر چکا ہے اس پر اگر آخرت میں مواخذہ ہی سے بچ جائے تو یہی اس کے حق میں عین رحمت ہوگی۔

---

قرآن ایک اور لحاظ سے بھی معجز ہے' اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ قرآن اس طرح کی تصنیف نہیں

جیسی دنیا کی بہترین تصنیفیں ہیں، ایک مصنف ایک مستقل موضوع اپنے سامنے رکھتا ہے، سوچ بچار کر قلم اٹھاتا ہے، ہر باب کا ربط دوسرے باب سے اور ہر فصل کا وصل دوسری فصل سے کرتا جاتا ہے، اول کو آخر سے وابستہ رکھتا ہے، کاٹ چھانٹ، رد و بدل کرتا رہتا ہے، نظرثانی پر نظرثانی کرتا ہے، یہ نہیں ہوتا کہ کتاب کی تیاری و تکمیل کی مدت ۲۲۔۲۳ سال کی ہو (اور اس مدت میں بشری مصنف جوان سے بوڑھا ہو جاتا ہے) اور کتاب کے مختلف ٹکڑے، موقع اور ضرورت پیش آجانے پر برجستہ اور فی الفور تیار ہوئے ہیں، یہ کتاب مغلوبیت کے حال میں تیار ہوئی ہے اور اقتدار و قوت کے عہد میں بھی، حالتِ امن و آشتی میں بھی اور شدت جنگ و حرب کے حال میں بھی ہدایات اس میں اخلاق و موعظت کے بھی ہیں اور معاشیات و مالیات کے بھی، احکام اس میں عبادات کے بھی ہیں اور معاملات کے بھی، اور اس تنوع و اختلاف موضوع کے باوجود اس میں نہ کوئی تضاد و تناقص ہے اور نہ کوئی نشیب و فراز، ہر جزئی واقعہ کے لئے کوئی نہ کوئی ہدایت، جیسے زمان و مکان کا کوئی بھی اثر اس کلام پر نہیں!

یہ حقیقتیں ہیں تو بالکل صاف اور سامنے کی، نہ ان میں کوئی خفا و پوشیدگی نہ ان میں کوئی اشتباہ و پیچیدگی، یہاں ان کے عرض کرنے سے مقصود صرف یہ کہ ناظرین ان کا استحضار کر لیں، اور اپنے ایمان کو قوی سے قوی تر بنا لیں، عرض ہے کہ جب متن کی تلاوت ترجمہ سمیت کریں، تو کلام الٰہی کی اس دوگانہ حیثیت کو جسے ہر حال میں قائم رکھنا ہے، کہیں بھی نظر سے نہ اوجھل ہونے دیں، انشاء اللہ اس سے نفع یقینی انھیں محسوس ہوگا، اور حسِ باطنی و روحانی کو ایک نیا ذوق و لطف اس سے حاصل ہوگا —— جو واقعات بہ ظاہر بالکل جزئی و شخصی ہوں مختص بالوقت بھی مختص بالمکان بھی، انھیں اسی طرح لانا، مگر اس حکیمانہ سلیقہ مندی اور حسن ترتیب سے کہ یہ جزئیات کام کلیات و اصول کا دے سکیں، اور پھر اس نظم کو قصے اور حکایات ہوں تو، اور قانون و ضابطے ہوں تو، دونوں صورتوں میں پختگی اور قطعیت کے ساتھ قائم رکھنا اگر اعجاز کا کمال نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

---

اسلام اپنے شارع کے زمانے ہی میں مدینہ، مکہ اور پورے صوبۂ حجاز سے باہر نکل چکا تھا اور چند ہی روز بعد اوّل جانشینوں یعنی خلافتِ راشدہ کے دور میں آس پاس کے سارے ملکوں نجد، یمن، عراق، شام، فلسطین، مصر، ایران تک پہنچ چکا تھا اور کچھ ہی دنوں بعد اسپین اور یونان، اور ٹرکی، ایران، افغانستان، بلوچستان، ہندوستان اور چین سب اس کے زیر اثر تھے، کچھ فوجی طاقت سے اور زیادہ تر تبلیغی قوت سے لیکن سب کا رنگ الگ الگ، ہر ملک اپنی انفرادیت و شخصیت لئے ہوئے، کوئی ملک دوسرے ملک کا مثنیٰ نہیں اور ایک قوم دوسری قوم کا چربہ نہیں، عجمی اسلام الگ، ہندی اسلام الگ، مصری اسلام الگ، اسپینی اسلام الگ ہر قوم کے اسلام میں دخل اس کے رسم و رواج کا، ہر ملک کے اسلام میں خو بو اس سرزمین کی شامل، ہر ملک کے باشندوں کی نسلی و نفسیاتی خصوصیات سے متاثر ہر ملک کا اسلام وہاں کی آب و ہوا سے اور مقامی رسم و رواج سے رنگین —— تشریع تکوینیات کو منسوخ نہیں کر دیتی معدوم نہیں کر دیتی اپنی روح کو قائم و ثابت رکھ کر ان میں صرف ترمیم و اصلاح کر دیتی ہے۔

قرآن کے متعلم کو چاہئے کہ تفسیر کے عظیم الشان ذخیرہ کو بھی اسی نظر سے دیکھے حجاز میں بیٹھ کر جو تفسیریں

لکھی گئیں وہ قدرۃً ان تفسیروں سے مختلف ہیں جو عراق و ایران میں لکھی گئیں، اور اسپین والے مفسرین کا رنگ صریحاً شامی اور عجمی اور ہندی تفسیروں سے مختلف ہے، طالب علم کی نظر ان سب باریکیوں پر رہے۔

یہ اختلافات تو جغرافی و مکانی نقطۂ نظر سے ہوئے، دوسرا اختلاف اسی درجہ و مرتبہ کا تاریخی ہے، یا وقت اور دور کے اثر سے دوسری صدی ہجری کے طلبۂ قرآنی کا رنگ بالکل سادہ اور منقولی اور گویا تحت اللفظی تھا، پانچویں صدی میں جب یونان کی منطق اور فلکیات و مابعد الطبیعات کی دخل در معقولات فضا میں گونج اور چمک پیدا کر چکی تھی، اور عجم کی دولت و امارت عقلیات کی دنیا کو مسموم اور فضا کو زہر آلود کر چکی تھی بحثوں کا رخ بھی پلٹ گیا، نئے نئے مسئلے کھل کر سامنے آنے لگے اور اپنے حل کا انتظار کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ چودھویں صدی ہجری — جب سائنس اور علوم طبعی کا عمل دخل پوری طرح شروع ہوگیا، اور سیاسی معاشیاتی سوالات دل و دماغ دونوں پر چھاپہ مارنے لگے — اٹیم بم، ہائیڈروجن بم اور خلائی جہازوں کے دور میں جو سوالات آئیں گے، ناگزیر ہے کہ وہ ان سے بہت مختلف ہوں جو اس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے، جب انسان کا سفر صرف اپنی ٹانگوں کے بل پر ہوتا تھا، یا زیادہ سے زیادہ اونٹ اور خچر اور گھوڑے اور بیل تک محدود تھا، اور اس کی بزم آرائیاں بجائے گیس کے ہنڈوں، بجلی کے قمقموں کے صرف شمع و فانوس اور موم بتیوں کو جانتی پہچانتی تھیں۔

بات تو صرف وہی ہے جیسے وقت کا ایک شاعر اکبر الٰہ آبادی اپنی زبان میں کہہ گیا ہے۔

دینِ خدا ہے حق کی تجلی کے واسطے — دنیا اٹھی ہے اپنی تعلی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ — اللہ ہی ہے ان کی تسلی کے واسطے

**عبد الماجد**
دریاباد ضلع بارہ بنکی

جولائی ۱۹۷۶ء

(۱)

# سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ

رکوعہا ۱ — ایک رکوع

ایاتہا ۷ — سات آیتیں — ۲۵ لفظ — ۱۲۳ حرف

سورۂ فاتحہ ۔ مکی

ل سورۃ کے لفظی معنی بلندی یا بلند منزل کے ہیں۔

السورۃ الرفعۃ (لسان) السورۃ المنزلۃ الرفیعۃ (راغب۔ ابو البقاء) ای منزلۃ ثم منزلۃ (مجاز)

جس طرح دنیا کی دوسری کتابیں مختلف بابوں میں تقسیم ہوتی ہیں، قرآن کے ہر باب کو سورت کہتے ہیں، گویا ہر سورۃ ایک بلند منزل کا نام ہے اور ہر سورۃ دوسری سورۃ سے ایک بلند منزل کی طرف سے دوسری بلند منزل کی طرف لے جاتی ہے۔

وبہا سمّیت السورۃ من القرآن ای رفعتہ (لسان) بہ سمیت سورۃ القرآن لاجلالہ ورفعتہ (تاج) قیل بارتفاعہا لانّہا کلام اللہ (ابو البقاء) فکل سورۃ من القرآن بمنزلۃ درجۃ رفیعۃ ومنزلٍ عالٍ ویرتفع القاری منہا الی درجۃ اُخرٰی (ابو البقاء) معنی السورۃ فی کلام العرب الإبانۃ لہا من سورۃ اُخرٰی وانفصالہا عنہا وسُمّیت بذلک لأنّہ یرتفع فیہا من منزلۃ الی منزلۃ (قرطبی)

سورۃ کے دوسرے معنی شہر پناہ کی دیوار کے بھی ہیں۔

سور المدینۃ حائطہا (راغب)

سورۂ قرآنی کو سورہ اس لئے بھی کہا جاتا ہے کہ گویا وہ فصیلِ شہر کی طرح اپنے مضامین کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

قیل من سورۃ المدینۃ لاحاطتہا بآیاتہا (ابو البقاء)

قرآن مجید کو مختلف سورتوں میں تقسیم و ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما گئے تھے۔

قال قوم من اھل العلم ان تالیف سورۃ القرآن علی ماھو علیہ فی مصحفنا کان من توقیف من النبی صلعم۔ (قرطبی)

آنحضور ہی کے ارشاد کے مطابق ایک سورۃ شروع کی جاتی تھی اور دوسری ختم، اور جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو آپ فرما دیتے تھے کہ اس کو فلاں سورۃ میں لکھ لو، حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ:

فاذا انزلت علیہ الآیۃ فیقول ضعوا ھذہ الآیۃ فی السورۃ التی یذکر فیہا۔

جب حضور پر کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فرماتے کہ اس کو فلاں سورۃ میں رکھو (جامع ترمذی تفسیر سورۃ البراۃ)

کُل قرآنی سورتوں کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) ہے۔

ے فاتحۃ کے لفظی معنی ہیں ابتداء کرنے والی کے، قرآن مجید کی اس ابتدائی سورت کو بھی الفاتحۃ اسی لئے کہتے ہیں، یہ گویا دیباچۂ قرآن ہے، سورتوں کے نام بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے رکھے ہوئے ہیں، اکثر ایک ایک سورۃ کے کئی کئی نام روایت ہوئے ہیں۔

وقد ثبتت جمیع اسماء السور بالتوقیف من الاحادیث والآثار (اتقان۔ نوع ۱۷)

اس فاتحۃ الکتاب کے بھی متعدد نام احادیث میں آئے ہیں، سورۃ الشفاء، سورۃ وافیہ، اُمّ القرآن وغیرہ۔ قرطبی نے بارہ [۱۲] نام گنائے ہیں، مشہور ترین نام یہی الفاتحۃ ہے۔ سورۃ کے فضائل سے احادیث لبریز ہیں۔ اہمیت خاص اسی سے ظاہر ہے کہ نماز کی ہر رکعت میں اس کا پڑھنا واجب ہے، بلکہ شافعیہ کی تحقیق میں فرض ہے، کوئی نماز بغیر قرآن کے اس جزو کے مکمل نہیں ہوتی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ شیطان چار مرتبہ خاص طور پر رویا چلایا ہے، اور ان چار میں سے ایک موقع نزول سورۂ فاتحہ کا ہے۔ سورۂ فاتحہ گو سورۃ مختصر ہے لیکن بہ لحاظ معنویت وجامعیت گویا دریا کوزہ میں بند ہے۔ منکرین و مخالفین تک اس کے ایجاز کے اعجاز کے قائل ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:—

"حمد باری کی یہ زبردست مناجات سلیس اتنی کہ مزید تشریح سے بے نیاز۔ اس پر معنویت سے لبریز۔"

(جلد ۱۵ ص ۹۰۳ - طبع یازدہم)

۳ سورتوں کی اہم ترین تقسیم وہ ہے جو ہجرت کو حد فاصل قرار دے کر اس کے قبل اور اس کے بعد کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ جو سورتیں قبل ہجرت نبوی یعنی رسول اللہ صلعم کے زمانۂ قیام مکہ میں نازل ہوئیں، خواہ اُن کا نزول حدود شہر مکہ سے باہر ہی کا ہوا ہو، مکی کہلاتی ہیں، اور جو سورتیں بعد ہجرت نبوی یعنی زمانۂ قیام مدینہ میں نازل ہوئیں وہ مدنی کہلاتی ہیں، خواہ اُن کا نزول حدود شہر مدینہ سے باہر ہی ہوا ہو۔

اعلم ان للناس فی المکی والمدنی اصطلاحات ثلثۃ اشھرھا ان المکی ما نزل قبل الھجرۃ والمدنی ما نزل بعدھا سواء نزل بالمدینۃ ام بمکۃ (اتقان، سیوطی، النوع الاول) والاصطلاح علی ان کل ما نزل قبل الھجرۃ فھو مکی وما نزل بعد الھجرۃ فھو مدنی سواء نزل فی البلد حال الاقامۃ او فی غیرھا حال السفر۔ (ابو البقاء)

لیکن یہ تقسیم صرف عمومی حیثیت سے ہے، ورنہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مدنی سورت کے اندر مکی آیتیں رکھا دی ہیں، یا اس کے برعکس، ربطِ مضمون و مناسبتِ مقام کا صحیح ترو لطیف تر احساس رسول اللہ صلعم سے بڑھ کر اور کس کو ہو سکتا تھا؟ اس لئے کسی متعین آیت کے باب میں اس کے مکی یا مدنی ہونے کا فیصلہ جزم کے ساتھ کرنا دشوار ہے۔ روایتیں جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں، کوئی درجۂ تواتر کو پہنچی ہوئی نہیں ہیں، محض مُفیدِ ظن ہیں، مُفیدِ یقین نہیں، اور اس قسم کے عقلی و قیاسی معیار کہ مثلاً یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے شروع ہونے والی آیتیں لازمی طور پر مدنی ہوں گی اور یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ سے شروع ہونے والی لازمی طور پر مکی محض اکثری و تخمینی ہیں، کلی و قطعی نہیں، اور محض ان روایات و نظریات کے ماتحت کسی آیت پر جزم و وثوق کے ساتھ کوئی حکم لگا دینا، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ قرآن مجید کی کسی جدید ترتیب اُسے ترتیب نزولی کا نام دے کر آمادہ ہو جانا بڑی جسارت کا کام ہے۔ اصل میں یہ بلا مسیحیوں کے ہاں سے آئی ہے کہ انھیں نے اپنے ہاں کے قدیم و جدید دونوں صحیفوں کو جو نہ سند متصل کے ساتھ پہنچے ہیں، نہ جن کے راویوں کا کسی کو علم ہے اور جو نہ اپنی اصلی زبانوں میں موجود ہیں، بلکہ محض ترجمے ہیں، اس قسم کی سرتا سر ظنی بلکہ وہمی "تحقیقات" کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے اور مغرب زدہ مسلمانوں نے نادانی سے یہ خیال کر لیا کہ جیسے یہ بھی کوئی بڑی دلیل علم و فضل و تحقیق کی ہے!

۴ سورۃ کے اندر کی ایک بڑی تقسیم کا نام رکوع ہے۔ بڑی سورتوں میں اکثر رکوع دس دس آیتوں پر رکھے گئے ہیں، ورنہ اتنی مقدار ہے جو ایک رکعت میں بہ آسانی پڑھی جا سکتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ پارہ ۳۰ کی بہ ہم چھوٹی سورتوں

## بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

شروع اللہ[۸] نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے[۹]

بھی کُل ایک ہی ایک رکوع ہے' (پورے قرآن میں ۵۴۰ رکوع ہیں)

**۵** آیۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں، اصطلاح میں سورت کے اندر کی سب سے چھوٹی تقسیم کا نام ہے ہر فقرہ جس میں کوئی حکم ہو، یا وہ ایک مستقل عبارت ہو ایک آیت ہے۔

وقیل لکل جملۃ من القراٰن دالّۃ علی حکمٍ اٰیۃ (راغب) وقد یقال لکل کلام منہ منفصل بفصل لفظیٍ اٰیۃ (راغب) وأمّا الآیۃ فھی العلامۃ بمعنی أنھا علامۃ لإنقطاع الکلام الذی قبلھا من الذی بعدھا وانفصالہ (قرطبی) والآیۃ من القراٰن انّما سمّیت اٰیۃ لأنھا کلام متصل الی انقطاعہ وانقطاع معناہ قصۃ ثم قصّۃ (مجاز القراٰن)

قرآن مجید کی کُل آیتیں شمار کرلی گئی ہیں' اور ان کی میزان بقول اصح ۶۶۱۶ ہے۔ (اتقان)

**۶** قرآن مجید کے کل الفاظ بھی شمار کرلئے گئے ہیں' اور ان کی میزان بقول اصح ۷۷۹۳۴ ہے۔ (اتقان)

**۷** کل حروف قرآنی بھی شمار کرلئے گئے ہیں' اور ان کی میزان بقول اصح ۳،۲۳،۷۶۰ ہے۔ (اتقان) اللہ اللہ! کلامِ الٰہی کے عاشق و شیدائی کیسی کیسی دیدہ ریزیاں اس کے واسطے کرگئے ہیں۔

**۸** قرآن مجید کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سورت کے ہر سوت کی ابتدا میں دُہرایا گیا ہے' یعنی ۱۱۳ بار اور سورۃ النمل کے اندر عبارت میں بہ طور آیتِ قرآنی بھی آیا ہے' اور اس لئے اس کے جُزوِ قرآن ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سورت کی ابتدا میں بھی اس کی حیثیت بہ طور ایک مستقل آیت کے ہے؟ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے کہ نہیں ہے' بلکہ یہ سورتوں کے درمیان محض بہ طور علامت فرق و تمیز کے' اور ہر سورت کے شروع میں بہ طور افتتاحی فقرہ کے ہے' امام مالکؒ بھی اسی مسلک سے متفق ہیں۔

قال مالک وابوحنیفۃ لیست فی اوائل السور بآیۃ وانما ھی استفتاح لیعلم بھا مبدءھا (ابن العربی) مفصل بحث جصاص رازی حنفیؒ کی احکام القرآن میں موجود ہے۔

ہر جائز کام کی ابتداء بسم اللہ سے کرنے کی بڑی فضیلتیں حدیث میں وارد ہوئی ہیں اور خود رسول اللہ صلعم کی عادت مبارک یہی تھی کہ کھانا کھاتے، پانی پیتے، وضو کرتے، جانور ذبح کرتے، غرض اس قسم کے سارے کاموں کی ابتدا بسم اللہ ہی سے کرتے تھے' اور بے بھی یہی کہ جو شخص کسی کام کو خدائے رحمٰن و رحیم کا نام لے کر شروع کرتا ہے' وہ عملاً اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ میرا ضمیر پاک ہے میری نیت مخلصانہ ہے، میرا مقصد اعلیٰ ہے اور میں توحید کا پرستار ہوں، ایک طرف شرک سے' دوسری طرف الحاد سے بیزار' غرض بسم اللہ سے بڑھ کر قوت بخش اور اس سے زیادہ روح و اخلاق کو بلند کرنے والا ذکر اور کوئی نہیں۔

بسم اللہ کی ب نحویوں کی اصطلاح میں باءِ استعانت کہلاتی ہے' اور باءِ ابتدائیہ بھی۔

الباء حرف جرّ للاستعانۃ ومنہ باء البسملۃ علی المختار عند قومٍ (قاموس۔ تاج) وردّہ آخرون قال آخرون الباء فیھا بمعنی الابتداء وکأنہ قال أبتدی باسم اللہ (تاج)

یہ اصطلاحی بحثیں جو کچھ بھی ہوں، بہرحال پڑھنے والا گویا یہ کہتا ہے کہ میں شروع کرتا ہوں اس کلام کو اللہ کے نام سے مدد چاہتے ہوئے اور یہ کہہ کر بسم اللہ خواں گویا اپنی اور سب کی طرف سے قطع نظر کر کے تکیہ کرلیتا ہے اللہ کی ذات اور اس کی صفاتِ رحمانیہ و رحیمیت پر۔

بسم اللہ اس کی ترکیب مقدر یوں مانی گئی ہے، بسم اللہ قبل کل شئ واوّل کل شئ۔

مجازہ کأنک قلت بسم اللہ قبل کل شئ واوّل کل شئ (مجاز)

الرّحمٰن مرادف ہے ذُوالرّحمۃ کے (مجاز)

الرّحیم مرادف ہے الراحم کے (مجاز)

**اَللہ** خدا کے لئے اسم ذات ہے، کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا ہے، فارسی کے "خدا" یا انگریزی کے "گاڈ" کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی بولا جا سکے، اس کی نہ جمع آئی ہے، نہ تثنیہ، نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے، اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

عَلَمٌ للذّات واجب الوجود المستجمع بجمیع صفات الکمال غیر مشتق (تاج) لم یُسَمّ بہ غیرہ تبارک وتعالیٰ ولھذا لایعرف فی کلام العرب لہ اشتقاق من فعل یفعل (ابن کثیر) ولذلک لم یثنّ ولم یجمع (قرطبی)

**ف** الرّحمٰن و الرّحیم۔ دونوں ایک ہی مصدر رحمۃ سے مشتق ہیں جیسے ندیم و ندمان۔ اور مفہوم دونوں کا اصلاً ایک ہی ہے۔

اسمان مشتقّان من الرحمۃ ونظیرھما فی اللغۃ ندیم وندمان وھما بمعنیً (صحاح)

رحمٰن کا صحیح ترجمہ دشوار ہے۔ مصدر رحمۃ سے صیغۂ مبالغہ ہے فعلان کے وزن پر زیادتیِ صفت کے لیے جس کے بعد زیادتی کا کوئی درجہ نہ ہو۔

معناہ عند أھل اللغۃ ذوالرحمۃ التی لاغایۃ بعدھا فی الرحمۃ (تاج) مبالغۃ فعلان مثل غضبان وسکران من حیث الاستیلاء والغلبۃ (بحر)

اسم ذات "اللہ" کی طرح اسم صفت "رحمٰن" کا اطلاق بھی صرف ذات باری ہی پر ہوتا ہے۔

ولایطلق الرحمٰن الّاعلی اللہ تعالیٰ (راغب) اسم مختص باللہ لایجوزان یسمّی بہ غیرہ (تاج) قل ادعوا اللہ اوادعوا الرحمٰن فعادل بہ الاسم الذی لایشرکہ فیہ غیرہ (صحاح)

یہ بات اتفاقی نہیں بہت پُرمعنی ہے کہ قرآن مجید میں اسم ذات کے بعد جو سب سے پہلا اسم صفاتی ارشاد ہوا ہے وہ صفتِ رحمانیت کا مظہر ہے۔ لین پول (LANE POUL) انگریزاسی لیے اپنے ہم قوموں کو سنا کر کہتا ہے کہ:۔

"لوگ یہ بات برابر بھول جاتے ہیں کہ قرآن کے اندر وصف رحمت پر کتنا زور دیا گیا ہے۔"

رحیم بھی اسم صفت صیغۂ مبالغہ ہے، فعیل کے وزن پر۔ تکرار و تواتر کے اظہار کے لیے۔

مبالغۃ الفعیل من حیث التکرار۔ (بحر)

گویا صفتِ رحمت و شفقت کی انتہائی قوت و شدت کا اظہار رحمٰن سے ہو رہا ہے اور انتہائی تعدد وکثرت

# اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١﴾

(ساری) تعریف[1] اللہ کے لئے ہے (وہ) جہانوں کا مُربّی[2] ہے

رحیم سے کیفیت و کمیت کے اس فرق کے اظہار کے لیے رحمٰن کا ترجمہ "نہایت رحم کرنے والے" اور رحیم کا ترجمہ "بار بار رحم کرنے والے" سے کیا گیا ہے۔

رَحْمٰن میں شانِ کرم کا عموم ہے مومن و کافر سب کے لیے۔ اور اسی لیے اس کا ظہور اسی دنیا میں بھی ہو رہا ہے۔ رَحِیْم میں تجلیِ رحمت و مغفرت کا خصوص ہے اہل ایمان کے ساتھ، اس لیے اس کا پورا ظہور آخرت ہی میں ہوگا، اور اسی معنی میں یہ حدیث صحیح مسلم میں صحابی ابن مسعود کے واسطہ سے آئی ہے کہ الرحمٰن رحمٰن الدنیا والرحیم رحیم الآخرۃ۔ اور اسی معنی میں جعفر صادق رض کا بھی یہ قول نقل ہوا ہے۔ الرحمٰن اسم خاص لصفۃ عامۃ والرحیم اسم عام لصفۃ خاصۃ (تاج)

صوفیانہ مذاق پر ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ رحمانیت وہ تربیت ہے جو ذرائع و وسائط کے ساتھ ہو، اور رحیمیت وہ تربیت ہے جو براہ راست و بلا واسطہ ہو، رحمانیت وہ شفقت ہے جو طبیب مریض کے ساتھ رکھتا ہے اور رحیمیت شفقتِ محض ہے (روح)

اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلہ میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو:۔

"شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے"!

کوئی نسبت اس شرک جلی کو اسلام کی توحیدِ خالص سے ہے؟ راقم آثم کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ عجب نہیں، جو خالق اکبر کی یہی صفاتِ رحمانیت و رحیمیت ہی مسخ ہو کر مسیحیت میں بیٹا اور روح القدس بن گئی ہوں۔

**[1]** اَلْحَمْدُ میں ال کلمۂ استغراق ہے یعنی جمیع حمد کوئی سی بھی ہو، کسی قسم کی بھی ہو، بظاہر کسی کے لیے بھی ہو۔

حَمْد کا درجہ لغوی اعتبار سے، مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے، شکر تو کسی متعین ہی نعمت کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور مدح میں ممدوح کی خوبیوں کا ارادی و اختیاری ہونا ضروری نہیں، صرف حمد ہی ایسی چیز ہے جو محمود کی عام اختیاری خوبیوں اور فضیلتوں کی بنا پر کی جاتی ہے (راغب)

فی کلام العرب معناہ الثناء الکامل (قرطبی)

گویا قرآن مجید کی سب سے پہلی تعلیم توحید کے جملہ اصناف کی جامع ہے، مدح اور تعریف کسی کی بھی ہو کسی نام سے بھی ہو، درحقیقت صرف اللہ ہی کی ہوتی ہے اور اسی کو پہنچتی ہے۔

الالف واللام فی الحمد لاستغراق جمیع أجناس الحمد للہ تعالیٰ (ابن کثیر)

اور یہی معنی ہیں اس حدیث نبوی کے بھی کہ اللّٰھم لک الحمد کلہ ولک الملک کلہ وبیدک الخیر کلہ والیک یرجع الأمر کلہ۔ حاکم اگر عادل ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے صفت عدل اس کے اندر رکھ دی ہے، طبیب اگر حاذق ہے تو اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اللہ نے اسے یہ کمال عطا کر دیا ہے، کسی کی شکل حسین ہے

اور کسی کی سیرت پاکیزہ ہے تو، ہر موقع پر مدح وثنا وتعریف وستائش کی اصل مستحق صرف ذات باری تعالیٰ جمال آفریں وکمال آفریں ہے۔ ع

ہر جا کنیم سجدہ بہ آں آستاں رسد!

الله رَبِّ، جو یہاں بہ طور اسم استعمال ہوا ہے، مصدر ہے تربیت کے معنی میں، اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف نشوونما دیتے رہنا، تا آنکہ وہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔

ھو انشاء الشئ حالا فحالا الی حد التمام (راغب) وھو تبلیغ الشئ إلی کمالہ شیئًا فشیئًا (بیضاوی)

الرب المصلح والمدبر والجابر والقائم یقال لمن قام باصلاح شئ واتمامہ (قرطبی)

اُردو میں اس کا ترجمہ پروردگار سے بھی صحیح ہے لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لیے "مُرَبّی" کا ہے، اور یہی مترجم تھانوی نے اختیار کیا ہے، اصول ارتقاء جس پر یورپ کو ناز ہے، ذرا خیال کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی پوری رعایت لفظ "رب" میں آگئی ہے، ربوبیت کے معنی ہی کسی شے کو درجہ بدرجہ حدِ کمال تک پہنچانا یا ارتقاء ہے، یہاں مُراد اُسی کا اصل اصول ہے نہ کہ ڈارون وغیرہ کے بیان کئے ہوئے قاعدے اور ضابطے، عربی میں اس کا اطلاق مطلق اور بلا اضافت صورت میں صرف حق تعالیٰ پر ہوتا ہے۔

ولا یقال الربّ مطلقا الا للہ تعالیٰ (راغب) ولا یستعمل الرب لغیر اللہ بل بالاضافۃ (ابن کثیر) لا یقال الربّ بالألف واللام الا للہ تعالیٰ (ابن خالویہ)

بسم اللہ سے اگر قطع نظر کرلی جائے تو متنِ قرآن میں سب سے پہلے اللہ کی صفت ربوبیت ہی کا اظہار ہے گویا یہ صفت اُمّ الصفات ہے، اور آگے جتنے بھی اسماء الٰہی آئیں گے، سب کی تفسیر مقاصدِ ربوبیت ہی کے تحت میں ہوگی، اور مسیحیوں کے "آسمانی باپ" سے کہیں زیادہ شفقت، کہیں زیادہ قدرت، کہیں زیادہ حکمت لفظ ربّ سے عیاں ہے۔

عٰلَمین۔ عالم کا لفظ خود اسم جمع ہے کوئی اس کا واحد نہیں آتا، اور مُراد ہے خلقت یا موجودات کے۔

العالم الخلق کلّہ (لسان)

عالمون۔ بہ صیغۂ جمع کے معنی ہوئے ہر ہر صنف موجودات اور سارے سلسلۂ کائنات کے۔

والعالمون اصناف الخلق (لسان)

اور اب اس کرۂ ارض کے علاوہ جس سے ہم مانوس ہیں، جتنے بھی عالم "ماہتاب" "مریخ" وغیرہ کے دریافت ہوتے جائیں، سب اسی قرآنی صیغۂ جمع کے تحت میں آتے جائیں گے۔

ربّ العٰلمین کا لفظ لا کر قرآن مجید نے گویا بتادیا کہ ہر صنفِ موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادرِ مطلق واحد ویکتا کے ہاتھوں میں ہے، کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ ربوبیت وتربیت سے آزاد ومستثنیٰ نہیں۔

یہ تعلیم بھی اسی ایک لفظ سے مل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خدا نہیں، یہ حقیقت تاریخ مذاہب میں نہایت درجہ اہمیّت رکھتی ہے، اسلام سے قبل مذاہب جس صورت میں موجود تھے وہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے، ہر قوم خدا کو صرف اپنا خدا تسلیم کرتی تھی، گویا خدا کی حیثیت محض

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝۲ مٰلِكِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ۝۳

(وہ) رحمٰن ۱۲ (وہ) رحیم ۱۳ (وہ) مالک روزِ جزا کا ۱۴

قومی خدا کی رہ گئی تھی، بابل، مصر، ہند، یونان، روم، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خدا کے خدائے کائنات ہونے کی پوری طرح قائل نہیں رہی تھی، قرآن نے ایک لفظ ربّ العٰلمین لاکر ان سارے مشرکانہ و گمراہانہ عقائد کی تردید کردی، مشرک قوموں کو سب سے زیادہ ٹھوکر صفتِ ربوبیت ہی کے سمجھنے میں لگی ہے، اسی لیے قرآن نے تصحیح میں بھی اُسی کو مقدم رکھا، علماء کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ کلمۂ الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین تمام کلموں سے افضل و اشرف ہے، یہاں تک کہ لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ سے بھی، اس لیے کہ اس میں صرف توحید ہے اور اس میں توحید کے ساتھ حمد بھی۔ (قرطبی)

۱۲ (جو دنیا میں سب کو رزق دے رہا ہے، سب کو راحت پہنچا رہا ہے، نفع رسانی کا دروازہ سب کے لیے کھولے ہوئے ہے۔)

الرحمٰن العاطف علی البرّ والفاجر بالرزق لھم ودفع الآفات عنھم (ابن عباسؓ)

الرحمٰن فی نفسہ (المنار) ذی الرحمۃ العامۃ التی وسعت کل شیٔ (المنار)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ۹

۱۳ (جو آخرت میں مومنین کو اجر ان کے استحقاق سے بہت زائد دے گا۔)

الرحیم خاصّۃ علی المؤمنین بالمغفرۃ وادخالھم بالجنۃ (ابن عباسؓ) الرحیم بخلقہ (المنار) ذی الرحمۃ الخاصّۃ بمن شاء من عبادہ الصالحین (المنار)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۹

صفات کے بیان میں صفتِ ربوبیت کو سب سے پہلے لانا اور اس کے معًا بعد صفاتِ رحمانیت و رحیمیت پر زور دینا خود اس امر کی ایک واضح شہادت ہے کہ عقائد اسلام میں ان صفات کا مرتبہ کتنا بلند اور ان کا درجہ کیسا اہم ہے، ان تصریحات کی موجودگی میں اور ان کی تکرار کے باوجود بھی پادریوں کا یہ کہے جانا کہ اسلام کا خدا صرف قوت اور قہرمانی کا خدا ہے، حقیقت پر کیسا ظلم کرنا ہے۔

۱۴ مٰلِكِ۔ حاکم یا قاضی خواہ کیسے ہی وسیع اختیارات رکھتا ہو بہرحال اس کے اختیارات محدود ہی ہوتے ہیں اور وہ مجرم کو حسب ضابطہ سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے گویا خود حاکم پر حکومت ضابطہ یا قانون کی ہوتی ہے، بخلاف اس کے مالک وہ ہوتا ہے جسے پورے اختیارات حاصل ہوں مجرم کو چاہے بخش دے چاہے سزا دے، کوئی اس سے بازپرس کرنے والا اور کوئی اس پر حاکم نہیں، حدیث مسلم میں آچکا ہے کہ لا مالك الّا اللّٰہ عزّوجلّ (اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی مالک نہیں) اور محققین کا قول بھی ایسا ہی ہے کہ بجز اللہ کے اور کسی کو مالک کہنا یا پکارنا جائز نہیں۔

لا یجوز ان یُسمّٰی احد بھذا الاسم ولا یدعی بہ الّا اللّٰہ تعالیٰ (قرطبی)

لفظ کا فارسی ترجمہ بھی اسی لیے سفیان تابعیؒ سے شہنشاہ مروی ہے۔

قال سفیان مثل شاھان شاہ (قرطبی)

اور مفسرین نے بھی معنی مطلق الاختیار کے لیے ہیں۔

المالک ھو المتصرف فی الاعیان المملوکۃ کیف یشاء من الملک (بیضاوی)

ہندوستان کی بعض مشہور مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ قانون مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") کے خلاف خدا بھی نہیں جا سکتا اور کسی خطاوار کو معاف نہیں کر سکتا، مسیحیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ خدا انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیے صفتِ عفو و رحم کے اظہار کے لیے، اسے اپنے اکلوتے "بیٹے" کو بطور کفارہ کے سب گناہگار مخلوق کی طرف سے پیش کرنا پڑا، قرآن مجید کے ایک لفظ "مالک" میں ان سب باطل عقائد کی تردید آ گئی، اسے اختیار کامل ہے کہ جس مستحقِ سزا کو چاہے سزا دے اور جس مجرم کو چاہے بعد سفارش یا بلا سفارش بالکل ہی معاف کر دے۔

یوم الدین۔ دین کے معنی لغت میں متعدد آتے ہیں۔

الدّین الجزاء والحساب (مجاز) الدین الحساب ..... الدین الجزاء (کتاب الاجناس)

اور قیامت کو بھی روز جزاء اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پورے حساب اور ہر عمل کے بدلے کا دن ہوگا، یہاں بھی یوم الدین سے مراد روزِ حشر ہے۔

ای یوم حساب الخلائق وھو یوم القیٰمۃ یدینھم بأعمالھم (ابن جریر عن ابن عباسؓ) أی یوم البعث والجزاء (کبیر) فانہ الیوم الذی یدین اللہ العباد فیہ بأعمالھم (ابن القیم) ولھذا قیل لیوم القیٰمۃِ یوم الدین انھا ھو یوم الحساب (کتاب الاجناس)

اللہ تعالیٰ مالک تو آج بھی ہے روز جزا کے ساتھ تخصیص کا مطلب یہ ہے کہ اس روز اس کی صفتِ مالکیت کا مشاہدہ و تحقق بڑے سے بڑے منکر کو بھی ہو کر رہے گا۔

ابن قیمؒ نے کہا کہ سورہ میں پانچ اسمائے الٰہی آئے ہیں، اور پانچوں کی تشریح الگ الگ کی ہے خلاصہ یہ کہ اسم اللہ صفاتِ جلال و جمال کا جامع ہے اور اس کے اندر وہ سب کچھ بالاجمال آ گیا جس کی تفصیل اسمائے حسنیٰ ہیں۔

تستلزم ان یجمع معانی الاسماء الحسنیٰ دالّ علیھا بالاجمال ..... فصفات الجلال والجمال اخصّ باسم اللہ (ابن القیم)

اور اسم الرّب کے تحت میں سارے صفاتِ فعل و قدرت، ضرر و نفع، عطاء و منع وغیرہ کے آ گئے۔

وصفات الفعل والقدرۃ والتفرد والنفع والعطاء والمنع ونفوذ المشیۃ وکمال القوۃ وتدبیر امر الخلقۃ اخصّ باسم الرب (ابن القیم)

اور اسم الرحمٰن کے تحت میں، صفاتِ جود و احسان، بخشش و کرم، لطف و رافت آ گئے۔

وصفات الاحسان والجود والبرّ والحنان والمنّ، والرافۃ واللطف اخصّ باسم الرحمٰن (ابن القیم)

اور اسم الرحیم کے معنی ہیں اپنے بندوں پر رحم کرنے والا۔

والرحیم الراحم لعبادہ اور اسم مالک کے تحت میں صفاتِ عدل، جزا و سزا، اور اعزاز و اذلال وغیرہ آ گئے

وصفات العدل والقبض والبسط والخفض والرفع والعطاء والمنع والاعزاز والاذلال والقھر والحکم وغیرھا اخصّ باسم الملک (ابن القیم)

# اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝۴ؕ

ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں[۵] اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں[۶]

۵ (نہ کہ کسی اور کی، اے اللہ!)

اِيَّاكَ لفظ اِيَّا خود ہی حصر اور تخصیص کے لیے آتا ہے اور پھر بہ حیثیت مفعول اس کی تقدیم فعل نَعْبُدُ پر اس حصر و تخصیص کو اور زیادہ مؤکد کر رہی ہے، یعنی ہم تیری عبادت میں شائبہ بھی کسی کی شرکت کا نہیں رکھتے۔

معناہ نعبدك ولا نعبد غيرك (ابن عباس) وقدم المفعول للتعظيم والاهتمام به والدلالة على الحصر. (بیضاوی)

یہ مفعول کو مقدم کرکے لانے کی ترکیب درست ہے، اس کے برعکس فعل کو مقدم کرکے لانے کی ترکیب مثلاً نعبد ایاك جائز نہیں، اب یہاں سے دعا کی تعلیم ہے گویا بندے اپنی زبان سے دعا کر رہے ہیں، اس سے پہلے صرف تمہید دعا تھی، صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب، یا مخاطب سے غائب کی طرف دفعۃً انتقال کا نام صنعتِ التفات ہے اور عربی ادب و انشاء میں یہ عیب نہیں، اس کا شمار بہترین صنعتوں میں سے ہے، صاحبِ کشاف نے اس موقع پر امرءالقیس جاہلی کے تین شعر شہادۃً نقل کیے ہیں تینوں میں یہ صنعت موجود ہے۔

دیباچہ میں گزر چکا ہے کہ کسی عبارتِ ادبی کی خوبیوں کی جانچ اور پرکھ کے لیے خود اس زبان کے ادب کا معیار پیشِ نظر لازمی ہے نہ کہ کسی دوسرے کے ادبی معیار کا، عربی عبارت عربی ہی کے فنِ بلاغت سے جانچی جائے گی نہ کہ اُردو، فارسی، انگریزی، ہندی، چینی، جاپانی کسی اور زبان کے معیار سے۔

بزرگوں سے منقول ہے کہ قرآن مجید کا لُبِّ لُباب سورۂ فاتحہ ہے، اور سورۂ فاتحہ کا لُبِّ لُباب یہ آیت ہے۔

قال بعض السلف الفاتحة سر القرآن وسرها هذه الكلمة۔ (ابن کثیر)

نَعْبُدُ عبادت نام ہے تذلّل، انکسار و افتقار کے آخری مرتبہ کا۔

انها غاية التذلل (راغب) العبادة اقصى غاية الخضوع والتذلل (کشاف)

اور اسی لیے اس کا مستحق بجز ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی نہیں۔

لم تستعمل الا فى الخضوع لله تعالى (کشاف) ولا يستحقها الا من له غاية الافضال وهو الله تعالى. (راغب)

مشرک قومیں خدا معلوم چھوٹے بڑے کتنے دیوی دیوتاؤں کو عبادت میں شریک کرتی رہتی ہیں بلکہ ان کی عبادتوں میں تو خدا کی شرکت رسمے بھی نہیں پاتی معبود تمام تر اگنی دیوتا اور سورج دیوتا اور کالی مائی اور کبھی جی وغیرہ بن جاتی ہیں، مسیحیوں کے ہاں بھی نماز جیسی اور جب کبھی بھی ہوتی ہے اس میں برابر خدا کے ساتھ فرزندِ خدا کی شرکت رہتی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی) آیت کے ایک لفظ اِيَّاكَ سے تردید ہوگئی، سارے مذہبوں کے مشرکانہ طرزِ عبادت کی۔

نَعْبُدُ کا صیغۂ جمع بھی قابلِ لحاظ ہے، دعا تنہا ایک ایک فرد نہیں کر رہا ہے ساری ملتِ اسلامیہ مل کر اجتماعی رنگ میں کر رہی ہے اور یہ اجتماعیت کی اہمیت قرآن و حدیث دونوں کی دعاؤں میں کثرت سے جلوہ گر ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ نسبتِ عبودیت سالک کے مقام کی انتہا ہے، کوئی مقام اس سے مافوق نہیں۔

۶ (نہ کہ کسی اور سے، اُسے حاجت روا سمجھ کر، اے اللہ!)

# اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝۵

چلا ہم کو سیدھا راستہ ؀

آیت کے جزوِ اول میں بیزاری اور تبرّی ہے شرک سے اور اس آخری جزو میں بندہ کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بساطی، بے قدرتی کا، اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نصرت کے لیے ہر طرح اللہ کے ہاتھ میں سپرد کر دینے کا۔

فالاوّل تبرء من الشرك والثانی تبرء من الحول والقوة وتفویض الی اللہ عزّ وجلّ (ابن کثیر)

نَعۡبُدُ کے مقابلہ نَسۡتَعِيۡنُ لانا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق، تیری ہی اعانت، تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ اِيَّاكَ کی تکرار توحید اور ردِّ شرک کی اہمیت کو اور دوبالا کر رہی ہے۔

کرّر للاهتمام والحصر (ابن کثیر) کرّر الضمیر للتنصیص علی انه المستعان به لا غیر (بیضاوی)

نعبد کا تعلق اللہ کی صفتِ اُلوہیت سے ہے اور نستعین کا صفتِ ربوبیت سے (ابن القیم)

آیت نے جڑ کاٹ دی ہے، ہر قسم کی مظہر پرستی اور مخلوق پرستی کی، شرک کی خفی سے خفی بھی راہیں بند کر دی ہیں، اور کوئی خفیف سی بھی گنجائش پیر پرستی، پیمبر پرستی، فرشتہ پرستی وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سالک کا مقام اِيَّاكَ نَعۡبُدُ پر تمام ہو جاتا ہے۔ اِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ سے وہ طالبِ تمکین ورسوخ ہوتا ہے۔

؀ یعنی وہ راہ جس میں کوئی کجی نہیں، کوئی اونچ نیچ نہیں، کہیں ٹھوکر لگنے کا احتمال نہیں، مراد اس سے جادۂ شریعت ہے کہ یہی زندگی کا مکمّل نظام ہے، زندگی کے ہر گوشہ اور ہر شعبہ کے باب میں ایک مکمل دستورِ حیات ہے اور اسی پر چلتے رہنا، فرد و جماعت دونوں کے حق میں دنیوی اور اُخروی اعتبار سے فلاح ہی فلاح ہے صحابہؓ تابعین سب سے یہی معنی مروی ہیں۔

هو دین اللہ الذی لا عوج له (ابن جریر عن ابن عباس) قال ابن عباس وجابر هو الاسلام و هو قول مقاتل (معالم) عن ابی مالك و ....... عن ابن عباس و ....... عن ابن مسعود و عن ناس من اصحاب النبی صلّی اللہ علیه وسلّم قالوا هو الاسلام (ابن کثیر)

اِهۡدِنَا یہ گویا بندوں کی زبان سے درخواست ہے کہ اے ہمارے ہادیِ برحق و رہنمائے حقیقی! اپنا سیدھا راستہ ہم پر کھول دے، اس پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اور اپنے فضل و کرم کو ہمارا دستگیر رکھ! طلبِ ہدایت کی یہی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راہرو بھٹکا ہوا ہے اور وہ راستہ دریافت کر رہا ہے، دوسرے یہ کہ راہ تو مل چکی ہے، درخواست اسی پر قائم رہنے کی ہے، یہاں مراد یہی دوسری قسم کی دستگیری ہے۔

ای وفقنا الثبات علیه (ابن جریر عن ابن عباس) اهدنا ای ثبتنا (کشاف عن علیؓ و ابیؓ)

جو پہلے ہی سے ہدایت یاب ہیں، ان کی طرف سے یہ درخواست ہدایت پر ثبات و استقامت اور مزید ہدایت کی ہے، اور چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا نہیں، اس لیے جو جس مرتبہ پر ہے اس کی دعا اس سے بھی بلند تر مرتبہ کی رہتی ہے، اور مومن کی ہوسِ ہدایت طلبی کبھی بجھتی نہیں، یہ اعتراض محض طفلانہ ہے کہ ہدایت یاب کو درخواستِ ہدایت کی ضرورت نہیں

## صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے ؏ۖ

نَعْبُدُ، نَسْتَعِيْنُ، اِهْدِنَا سب میں ضمیر متکلم کا صیغہ جمع میں آنا بہت ہی پُرمعنی ہے، خواہ اظہارِ عبودیت کرنے والا اپنی جگہ پر فرد واحد ہی ہو، اس میں یہ تعلیم بھی آگئی کہ فرد کا رابطہ اُمت سے کسی حال میں نہ چھوٹنے پائے۔

صراط۔ اس کا مفہوم شاہراہ، شارعِ عام کا ہے، محض گلی یا گزرگاہ کا نہیں۔

المنهاج الواضح (مجاز)

عبادت کرتے ہیں تو ایک "میں" نہیں بلکہ "ہم سب"، طلبِ اعانت کرتے ہیں تو "ہم سب" درخواستِ ہدایت کرتے ہیں تو "ہم سب" اُمت و ملت کی یہ زبردست و ہمہ وقتی شیرازہ بندی اسلام ہی کا حصہ ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ مطلوب و مقصود صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی جو ساری مخلوق کے لیے خود بخود عام ہے۔

؏ۖ (بابِ ہدایت میں)

یہ مزید شرح و تفسیر ہے اسی سیدھے راستہ یا صراطِ مستقیم کی تعلیمات و ہدایات تو ساری کی ساری قرآن مجید کے لفظ و عبارت میں آگئیں، لیکن مشیتِ الٰہی نے مزید شفقت و کرم سے ان تعلیمات و ہدایات کے عملی نمونے بھی انسانی روح و قالب میں، بشری صورت و سیرت میں بکثرت بھیج دیئے کہ اس صراطِ مستقیم پر چلنا اور زیادہ آسان ہو جائے، یہ انعام پائے ہوئے لوگ انبیاء و مرسلین ہیں، ان کی زندگی کے واقعات و حالات قرآن مجید میں بہ کثرت نقل ہوئے ہیں اور ان میں بھی علی الخصوص اس پاکیزہ جماعت کے پاکیزہ ترین سردار محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، آپ کی سیرتِ مبارکہ کا ایک ایک جزئیہ تک محفوظ ہے، پھر اس کے بعد آپ کے جو صحیح نائب و جانشین آپ کے مابعد ہوئے ہیں، اور ہر دور میں ہوتے آئے ہیں یعنی اولیائے اُمت صدیقین، یا پھر شہیدانِ راہِ حق اور عام صالحین کہ یہ بھی اپنے اپنے درجہ میں نمونہ کا کام اپنے بعد آنے والوں کے لئے دے سکتے ہیں۔ خود قرآن ہی میں ایک دوسری جگہ ان انعام پائے ہوؤں کی فہرست کے خاص خاص عنوانات گنا دیئے ہیں

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (سورۃ النساء ـ ۶۹)

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے لفظ سے امام ابن جریر نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جن لوگوں کو یہ مرتبہ نصیب ہوا ہے اس کی تہ میں اصل شئے محض انعامِ الٰہی و فضلِ خداوندی ہے۔

وفی هذه الآية دليلٌ واضحٌ على ان طاعة الله جل ثناءه لا ينالها المطيعون الا بانعام الله بها عليهم وتوفيقه اياهم لها.

ابھی طلب صراطِ مستقیم کی ہو چکی تھی، اب اس کی مزید تشریح کر کے گویا یہ اشارہ بھی کر دیا کہ وہ صراطِ مستقیم کوئی فرضی، خیالی اور موہوم چیز نہیں بلکہ وہ ایسی راہ ہے جس پر اللہ کے بندے اب تک چل بھی چکے ہیں اور کامیاب ہو چکے ہیں، اور اس میں بڑی تسکین نئے چلنے والوں کے لیے ہے۔

الفاظ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ پر خوب غور کر لیا جائے، تعلیم طلب صراطِ مستقیم کی محض مجرد صورت میں

# غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝۷

نہ وہ لوگ جو زیرِ غضب آچکے ہیں قلہ اور نہ جو بھٹکے ہوئے ہیں قلہ

کافی نہ ہوتی، اس لیے متعیّن صورت انعام پائے ہوؤں کی دی جانا بھی ضروری ٹھہری، اس میں صاف اشارہ ادھر کا نکل آیا کہ دین محض کتاب پر عمل ہی کا نام نہیں بلکہ کتاب لانے والے کی سنّت وطریق کی پیروی بھی لازمی ہے، شخصیتوں، مقدّس، ملکوتی شخصیتوں کے اتباع بغیر چارہ نہیں۔

ابن قیم نے سوال اٹھایا ہے کہ نعمتِ الٰہی آیا کافروں کے نصیب میں بھی آتی ہے یا صرف اہلِ ایمان کے؟ پھر جواب دیا ہے کہ نعمتِ مطلقہ تو صرف اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہے اور وہ فلاحِ دائمی کی بات ہوتی ہے، البتہ مطلق نعمت میں کافر و مومن دونوں شریک رہتے ہیں۔

فالنعمة المطلقة لأهل الايمان ومطلق النعمة يكون للمؤمن والكافر (تفسیر القیم)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے اشارہ اس طرف ہوگیا کہ صراطِ مستقیم میسّر نہیں ہوتا بغیر اس کے کہ پیروی اہلِ صراطِ مستقیم کی کی جائے اور اس کے لیے محض اوراقِ کتب کافی نہیں۔

**قلہ** (اپنی دانستہ وارادی کج روی کی بدولت)

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کی تقدیرِ کلام غیرِ صراط المغضوب علیہم بھی سمجھی گئی ہے، صرف مضاف الیہ بیان کیا گیا اور مضاف محذوف ہے، عربی ادب وانشاء میں حذفِ موصوف وحذفِ مضاف کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

اكتفى بالمضاف اليه عن ذكر المضاف وقد دل عليه سياق الكلام (ابن كثير)

دوسرا ترجمہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا جو بالکل صاف وبے تکلف ہے، وہ ہے جو یہاں اختیار کیا گیا۔

عَلَيْهِمْ کا اعراب عَلَيْهُمْ (بضمّہ ہا) بھی جائز ہے۔

ولهما لغتان لكل لغة مذهب في العربية (معانی)

زیرِ غضب سے مراد زیرِ غضبِ الٰہی ہے انعامِ الٰہی کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے، وہاں صیغۂ معروف استعمال ہوا تھا، اور ضمیر فاعلی صریح تھی، یہاں غضب کے موقع پر صیغۂ مجہول کر دیا گیا ہے اور فاعل کی کوئی صراحت نہیں، یہ اثر ہے غلبۂ رحمتِ الٰہی کا۔

غضبِ الٰہی کا ذکر اگلے آسمانی نوشتوں میں صراحت کے ساتھ ہے توریت میں بھی اور انجیل میں بھی۔

توریت میں ہے کہ "اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے اور میں انھیں بھسم کر دوں" (خروج ۳۲: ۱۱- نیز خروج ۳۲: ۱۲ و ۱۳- استثنا ۹: ۲۰ و ۲۱ وغیرہ)

انجیل کو عام طور پر سر تا سر حلم و رافت و شفقت کا صحیفہ سمجھا گیا ہے، وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں، ملاحظہ ہو متی ۳: ۸ و ۱۰، مکاشفہ ۱۹: ۱۵ وغیرہا۔

صراطِ مستقیم کی ایجابی واثباتی تعریف اوپر آچکی تھی، صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ، اب

اسی مفہوم کو سلبی و منفی شکل میں ادا کیا جا رہا ہے گویا جس طرح مقصود و مطلوب محبوبین و مقربین کے طور طریقوں کی اتباع ہے، اسی طرح ممنوع و ناجائز منکروں اور نافرمانوں کی ہم مسلکی ہے۔

حیرت ہے کہ بعض جدید اہلِ قلم نے مسیحی پادریوں کے طعن و طنز سے متأثر بلکہ مرعوب ہو کر اسلام میں غضبِ الٰہی کے وجود ہی سے انکار کر دینا چاہا ہے، گویا حق سبحانہ و تعالیٰ ان کم فہموں کے خیال میں ایک بڑے پیمانہ پر کوئی سادھو سنیاسی مہاتما ہیں جو بدبخت چاہے ان کے بنائے اور اُتارے ہوئے قوانین کو، جو سرتاسر بندوں ہی کے نفع و مصلحت، فلاح و بہبود کے لیے ہیں، آزادی و بے تکلفی سے توڑتا پھوڑتا، چیرتا پھاڑتا ہے اور وہ اہنسا پر عمل کر کے شانتی کے ساتھ جمود و تعطل کے ساتھ سارا تماشہ دیکھتا ہے اور اصلاحِ حال کے لیے نہ اپنی غیر محدود قوت اور نامتناہی توانائی کو حرکت میں لائے اور نہ دفع فساد کے لیے کوئی عملی اقدام کرے! پادریوں کے اعتراض کی اصل و بنیاد ہی غلط ہے انھوں نے غضبِ الٰہی کو بھی قیاس کیا انسانی غصہ اور طیش پر، جو نتیجہ ہوتا ہے نفس کی ایک انفعالی کیفیت کا، حق تعالیٰ پاک ہے ہر قسم کے انفعال اور تأثر سے، وہ صرف فاعل ہے تمام تر مؤثر ہے اس کے اصلاحی اقدامِ عمل اس کی تعزیری حرکتِ ارادی کا نام بندوں کی زبان میں غضبِ الٰہی ہے، اس کی حاکمانہ قوت مربیانہ شفقت دونوں کا عین مقتضی یہی ہے کہ وہ گنہگاروں، باغیوں، مجرموں کو ان کے جرم و بغاوت کے آخری عملی نتائج تک پہنچائے اس کا غیظ و غضب درحقیقت تتمہ اور ضمیمہ ہے، اس کی رحمتِ بے حساب کا اور لازمی نتیجہ ہے اس کی شفقتِ بیکراں کا۔

اہلِ تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں، احادیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں، اور آیت کریمہ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے لیکن ایک گروہ نے مشرکین مراد لی ہے عجب نہیں کہ آیت ان سب کے حق میں عام ہو جو ازراہ شرارت و خبثِ نفس حق کی مخالفت دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں

۲۵ یعنی ان کی راہ بھی نہیں جو اپنی غفلت، بے التفاتی، نادانی کی بنا پر حق کی طرف رُخ بھی نہیں کرتے۔

اہلِ تفسیر عموماً اس طرف گئے ہیں کہ الضالین سے مُراد نصاریٰ ہیں، حدیث و آثار بھی اسی کی تائید میں ہیں اور آیۂ کریمہ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا کے لفظ سے بھی یہی استنباط کیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغضوب علیھم اور ضالین کے مصداق کا حصر انھیں ۲ دو مذہب والوں کے ساتھ کر دینا صحیح نہیں جو کھلے ہوئے مشرک و ملحد ہیں ظاہر ہے کہ وہ ضلالت میں ان سے بھی بڑھے ہوئے اور غضبِ الٰہی کے ان سے مستحق تر ہیں۔ المحقق رازی کی رائے میں بہتر یہ ہے کہ کل عملی غلطیوں والوں کو زمرۂ مغضوب علیھم میں رکھا جائے اور کل اعتقادی غلطیوں والوں کا شمار طبقۂ ضالین میں کیا جائے۔

فالاولی ان یحمل المغضوب علیھم علی کل من اخطأ فی الاعمال الظاھرۃ وھم الفساق ویحمل الضالون علی کل من اخطأ فی الاعتقاد لأن اللفظ العام والتقیید خلاف الاصل (کبیر)

ولا الضالین میں لا تاکید نفی کے لیے ہے اور عربی میں یہ اُسلوب عام ہے جیسے یہ فقرہ جئت بلا خیر ولا برکۃ ولیس عندک نفع ولا دفع۔

لا تاکید لأنہ نفی کما دخلت لا لتوکید النفی (مجاز)

لا ان حروف زائدہ میں سے ہے جو تتمیم کلام کے لیے آتے ہیں۔

لامن حروف الزوائد لتتمیم الکلام (مجاز)

سورہ کے ختم پر آمین کہنا مستحب ہے آمین خود ایک دعا ہے اس کے معنی ہیں اِستَجِب یعنی اے رب قبول فرما۔

یعنی آمین عند اکثر اھل العلم اللھم استجب لنا (قرطبی)

# تذییل

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحید الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کا بیان آگیا ہے اس کی نظیر سے مذاہب عالم کے دفتر خالی ہیں اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دنیائے مذاہب عاجز ہے، مسیحی دنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دعا LORDS, PRAYER پر ہے لیکن اول تو اس کا ضعفِ اسناد بھی خود مسیحی فاضلوں کو مسلّم ہے یعنی اس کی تحقیق نہیں کہ الفاظ خود حضرت مسیح کے ہیں بھی پھر چیز جہاں سے بھی آئی ہو، یہاں اس کے الفاظ سورۂ فاتحہ کے بالمقابل درج کیے جاتے ہیں، ہر منصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن مجید کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دعا کے درمیان کیا نسبت ہے!

| سُورۃ الفاتحۃ | انجیلی دُعا |
|---|---|
| ۱۔ ساری تعریف اللہ کے لیے ہے (وہ) سارے جہانوں کا مُربّی۔ | ۱۔ اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔ (متی ۶: ۹-۱۴) |
| ۲ (وہ) نہایت رحم کرنے والا (وہ) بار بار رحم کرنے والا۔ | ۲۔ تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی ہو۔ |
| ۳۔ (وہ) مالک روزِ جزا کا۔ | |
| ۴۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد مانگتے ہیں | |
| ۵۔ چلا ہم کو سیدھا راستہ۔ | ۳۔ ہماری روز کی روٹی ہمیں آج دے اور |
| ۶۔ اوران لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے۔ | ۴۔ جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض کو معاف کر۔ |
| ۷۔ نہ ان کا (راستہ) جو زیرِ غضب ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا۔ | ۵۔ اور ہمیں آزمائش میں نہ لا، بلکہ بُرائی سے بچا۔ |

۱۔ کہاں ربّ العالمین کی لامحدود وسعت و ہمہ گیری اور کہاں آسمان پر بیٹھے رہنے والی بعید اور محدود اور پھر باپ جیسی محض، مادّی تعلق رکھنے والی ہستی۔

۲۔ ایک طرف اعلان ہو رہا ہے ہمہ گیر صفاتِ ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت کا اور دوسری طرف ان کی بجائے ذکر ہے صرف زمین پر آسمانی بادشاہت کے آنے کا۔

۳۔ توحید خالص پر جو زور قرآنی عبارت میں منع عبادتِ غیر و منع استعانت بالغیر میں ہے انجیلی دعا میں کہیں اس کا پتہ تک نہیں۔

۴۔ انجیلی دعا کی آیت نمبر ۳ میں روٹی کی اس درجہ اہمیت، مادّیت کی انتہا ہے۔

۵۔ محض بُرائی سے بچنے کی دُعا، صراط مستقیم پر قائم رہنے کی نسبت سے کہیں زیادہ ہلکی ہے۔

(۲)

رکوعہا ۴۰ چالیس رکوع

# سُورَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ

ایاتہا ۲۸۶ دو سو چھیاسی آیتیں

سورۂ بقرہ لہ مدنی ۲ہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے ۳ہ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾

الف لام میم ۴ہ

لہ سورت کے اور بھی متعدد نام ہیں، سب سے زیادہ مشہور نام یہی ہے۔ "بقرۃ" کے لفظی معنی گائے کے بھی ہیں اور بیل کے بھی، لفظ بقرۃ سورہ کے آٹھویں رکوع میں آیا ہے اور وہیں ایک قصہ بھی اس کے متعلق درج ہے، سورت کا یہ نام بھی اسی مناسبت سے پڑا، بزرگ و معظم تو ہر سورت قرآن کی ہے لیکن اس سورت کا شمار بزرگ ترین سورتوں میں ہے، عقائد و اعمال دونوں کے باب میں اسلام کی اہم ترین تعلیمات کہنا چاہئے کہ سب کی سب اس کے اندر آگئی ہیں اور یہ جو بعض روایتوں میں آیا ہے کہ فلاں فلاں صحابی کو اس کے سیکھنے اور حاصل کرنے میں کئی کئی سال لگ گئے ہیں تو یہاں سیکھنے سے محض تلاوت یا اس کے الفاظ کا حفظ نہیں بلکہ اس کے احکام و مسائل پر عبور ہے، احادیث میں اس سورت کی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں ایک یہ کہ شیطان اور سورۂ بقرہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے، شیطان مصدرِ ظلمت و ضلالت ہے ظاہر ہے کہ وہ مرکزِ نور و ہدایت کے ساتھ کیوں کر اکٹھا ہو سکتا ہے۔

ان الشیطان یفر من البیت الذی تقرء فیها سورۃ البقرۃ (مسلم، ترمذی عن ابی ہریرہ)

اقرؤا سورۃ البقرۃ فان اخذها برکۃ و ترکها حسرۃ ولا تستطیعها البطلۃ وھی فسطاط القرآن (دارمی، عن خالد بن معدان رضی اللہ عنہ)

بالفرض یہ روایتیں نہ موجود ہوتیں جب بھی سورت کے مضامین کی بلندی، معنویت و جامعیت سورت کو بجائے خود اس مرتبۂ فضیلت کا مستحق بنانے کو کافی تھیں۔

۲ہ یعنی اس سورت کی بیشتر بلکہ تقریباً تمام تر آیتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مدینہ کے زمانہ میں بعد ہجرت نازل ہوئی ہیں، کہیں کہیں کسی آیت کا شامل ہو جانا سورت کے مدنی ہونے کے منافی نہیں۔

۳ہ اللہ اور رحمٰن اور رحیم سب پر حاشیے گزر چکے۔

۴ہ الٓمّٓ لفظ کے تینوں حروف پڑھنے میں پوری پوری آواز کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں جیسا کہ اوپر

## ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

### یہ کتاب ۵ہ

ترجمے میں اُردو رسم الخط میں ظاہر بھی کر دیا گیا ہے اور یہ حروف مُقطّعات کہلاتے ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ صحابی اور بعض تابعینؒ کا قول ہے کہ الٓمّٓ مخفف اور قائمؒ مقام ہے پورے فقرہ أنا الله اعلم کا (ابن جریر) زجاج لغوی نے یہی قول اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ حروف مُقطّعات میں سے ہر حرف کسی متعیّن معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور "عربی شاعری" سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں (قرطبی) بعض نے کہا ہے کہ یہ سورت کا نام ہے اکثر متکلّمین اور خلیل نحوی اور سیبویہ نحوی اسی طرف گئے ہیں۔

انها اسماء السور وهو قول اکثر المتکلّمین واختیار الخلیل وسیبویه (کبیر)

ابو عبید لغوی نے کہا ہے کہ اس کے معنی ابتدائے کلام کے ہے اور یہ سورت کا شعار (نام) ہے۔

ومعنی الٓمّٓ افتتاح یبتدأ کلام وشعار للسورة۔ (مجاز)

بعض کا قول ہے کہ یہ قرآن ہی کا ایک نام ہے اور قول بھی نقل ہوئے ہیں، بعض صوفیہ نے انھیں عارفانہ اشارات و مرموزات قرار دیا ہے اور ان سے طرح طرح کے "نکتے" اور "لطیفے" پیدا کئے ہیں، ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ خطباتِ عرب کے دستور کے مطابق یہ حروف محض افتتاحِ کلام کے لیے لائے گئے ہیں اور یہ بات اس لیے دل کو زیادہ لگتی ہے کہ عرب اگر اس طرزِ خطاب و خطابت سے آشنا و مانوس نہ ہوتے تو اس پر اعتراض ضرور ہی کرتے، اعتراض کے لیے تو مخالفین بہانے ہی ڈھونڈتے رہتے تھے، لیکن اس قسم کا کوئی بھی اعتراض اہلِ زبان سے منقول نہیں۔

مشاہیر صحابہؓ و تابعینؒ میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف ان متشابہاتِ قرآنی میں سے ہیں جن کا علم کسی مصلحت سے عام بندوں کو نہیں دیا گیا۔

اِنَّ هٰذا علمٌ مستورٌ وسرٌّ محجوب استأثر الله تعالٰی وتبارك به (کبیر)

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، اور شعبی، سفیان ثوری، ربیع بن خثیم وغیرہ سب کا یہی مذہب ہے۔ (قرطبی وابن کثیر)

یہ اعتراض کہ قرآن کے مخاطب جب ہم ہیں تو ان حروف کو بھی ہمارے لیے قابلِ فہم ہونا لازمی ہے کچھ زیادہ باوقعت و باوزن نہیں، قرآن مجید کے اندر اور جتنے مضامین و مطالب ہیں کیا وہ سب ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آ گئے ہیں؟ یا کائناتِ خارجی میں جو کچھ موجود ہے کیا ان موجودات میں سے سب کا مصرف بڑے سے بڑے فاضلوں اور محققوں کی بھی سمجھ میں آ گیا ہے؟

۵ہ محض زبانی یادداشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ، ایک صحیفۂ مکتوب، قرآن مجید اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے کراتا ہے کہ وہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا، ایک کتابی شکل میں مرتّب،

صحیفۂ آسمانی ہے، وہ دوسرے مذہبوں کی کُتبِ الہامی کی طرح نہیں کہ صاحبِ مذہب کے دماغ میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ اور یہاں تک کہ صدیوں بعد جب نوبت جمع و کتابت کی آئے، تو صحتِ لفظی اور استنادِ حرفی تو خیر بہت دُور کی چیز ہے نفسِ مفہوم و معنی تک مسخ ہو کر رہے اور نام تو ایک کتاب کا ہو، لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور بشری قلم شریک ہو جائیں۔

دلائل و شواہد کو چھوڑیے، محض دعویٰ کی حد تک بھی تو اس باب میں قرآن کی حریف و مقابل دُنیا کی کوئی بھی الہامی کتاب نہیں، توریت، انجیل، وید، کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں کہ وہ لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل شدہ کتاب ہے اور نہ ان کے پیرو انھیں اس حیثیت سے پیش ہی کر رہے ہیں، یہ دعویٰ تنزیلِ لفظی کا تو صرف قرآن مجید ہی کا ہے، آج دنیا میں اس کاغذ اور قلم کے دور میں "کتابیں" (بہ صیغۂ جمع و عموم) جتنی بھی چاہیں تیار کر ڈالی جائیں الکتٰب (بہ صیغۂ واحد و بہ تخصیص الف و لام) یا "کتاب واحد" کا مصداق صرف قرآن ہی نکلے گا، زمخشری معتزلی کا مرتبہ اللہ بلند کرے کیا خوب بات کہہ گیا ہے:۔

معناہ ان ذلک الکتاب ھو الکتاب الکامل کان ماعداہ من الکتب فی مقابلتہ ناقص۔ (کشاف)

مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی ایک کتابِ کامل ہے اور اس کے سامنے کتابیں جتنی بھی لائی جائیں گی سب ناقص ہی ہوں گی۔

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ / ۱۱۴۴ء) بہرحال مومن و خادمِ قرآن تھے، اور آج سے آٹھ یا ساڑھے آٹھ سو سال قبل کے مومن، اگر وہ یہ کہہ گئے تھے تو انھیں کہنا ہی چاہیے تھا، یہ دیکھئے کہ قرآن کا منکر اور مادیت و عقلیت کا پرستار اور وہ بھی اس بیسویں صدی کا، کیا کہہ رہا ہے، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم کی شہادت ہے کہ قرآن وہ کتاب ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ THE MOST WIDELY - READ BOOK IN THE WORLD پڑھی جاتی ہے (جلد ۱۵ صـ۸۹۸) اور پرنسٹن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر ہِٹّی کا بیان ہے کہ قرآن "عہد آخر کی کتابوں میں سب سے کم سن ہے لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی یہی ہے۔" (تاریخ اہل عرب صـ۱۲۶، مطبوعہ ۱۹۳۷ء)۔

ذٰلِكَ اسم اشارہ ہے اور اشارۂ بعید کا ترجمہ اُردو میں "وہ" سے کیا جاتا ہے، لیکن بُعد ہمیشہ بُعدِ مکان یا بُعدِ زمان ہی نہیں ہوتا، بُعدِ منزلت و علوئے مرتبت بھی بُعد ہی کی قسمیں ہیں اور ھٰذا کے مقابلہ میں ذٰلِكَ اسی بلندیِ منزلت کے اظہار کے لیے آتا ہے اور محاورۂ عرب میں مخاطب کے لیے برابر صیغۂ غائب سے آیا کرتے ہیں۔

یقال بازاء ھذا فی المستبعد بالشخص او بالمنزلۃ ذلک و ذاک (راغب) انما قال ذلک لبُعد منزلتہ فی الشرف والتعظیم (تاج) معناہ ھذا القرآن وقد تخاطب العرب الشاھد فتظہر لہ مخاطبۃ الغائب (مجاز)

* اردو اور فارسی زبانوں میں بھی اشارۂ بعید "آں" بارہا اظہارِ تکریم و علوئے منزلت کے موقع پر آتا ہے، آنحضرت، آنمخدوم، آنجناب، آنعزیز وغیرہ، صحابی ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعتِ کثیر مجاہد، عکرمہ، سعید ابن جبیر، سدّی، مقاتل، زید بن اسلم وغیرہ سے ذٰلِكَ، ھٰذا کے معنی میں مروی ہوا ہے (ابن کثیر)

## لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٢﴾

(کہ) کوئی شبہہ اس میں نہیں[6] ہدایت ہے (اللہ سے) ڈر رکھنے والوں کے لیے[7]

نحو ذلك اور هذا دونوں اسموں کے درمیان تبادلہ محاورۂ عرب میں بالکل جائز ہے۔

يستعملون كلا منهما مكان الآخر وهذا معروف فى كلامهم۔ (ابن کثیر)

اشارہ کا مشارٌ الیہ اس کے مابعد کا اسم یعنی الکتٰب ہے، گویا فقرہ کا صحیح اردو ترجمہ یہ ہوا "یہ مکرم و معظم کتاب"

[6] (کہ یہ کتاب الٰہی ہے، اس کا ہر مضمون برحق اور اس کا ہر لفظ صدق ہے)

اى لا شك فيه انه من عند الله وانه الحق والصدق (معالم)

یہ معنی تابعین کو، صحابہ کو، سب کو مسلّم ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

قال ابن حاتم لا اعلم فى هذا خلافًا (ابن کثیر)

اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھئے، قرآن بجائے خود ایک عالم ہے، اس عالمِ قدس کے اندر گزر نہ کسی شک و تردد کا ہے نہ خلجان و اضطراب کا، یہاں تو جو کچھ ہے تسکین و اطمینان ہے، علم و ایقان ہے، یکسوئی و اذعان ہے، ہر دعویٰ مدلّل ہے اور ہر حقیقت ثابت شدہ۔ اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں قصور شپرہ چشمی کا ہے، اسی لیے ارشاد یہ نہیں ہوا ہے کہ اس کے باب میں کسی کو شک و تردد لاحق ہو ہی گا نہیں بلکہ ارشاد صرف یہ ہوا ہے کہ خود یہ کتاب اس کے مضامین شک و شبہہ سے بالاتر ہیں۔

ما نفى ان احدا لا يرتاب فيه وانما المنفى كونه متعلقا للريب ومظنة له (کشاف)

المراد انه بلغ فى الوضوح الى حيث لا ينبغى لمرتاب ان يرتاب فيه۔ (کبیر)

لاریب فیہ۔ مقصود چونکہ نفیِ رَیب کی تاکید ہے، اس لیے ترکیب کلام بجائے لا فیہ ریبٌ کے لَا رَيْبَ فِيهِ رکھی گئی کہ اس میں زور اُس سے زیادہ ہے۔ (کبیر)

[7] قرآن مجید کے مطالعہ کے وقت اُس کا یہ اپنا بتایا ہوا وصفِ اوّل ہی سے خوب ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ وہ کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں سنہ وار ترتیب کے ساتھ پچھلے زمانہ کے واقعات درج ہوں، کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ علوم طبعی و ریاضی کے مسائل کا حل اس کے اوراق میں ڈھونڈھا جائے، کوئی فلسفہ کا مقالہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون اور نظریات میں اُلجھے رہیں، افسانہ و محاضرات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اسے تفریح اور دل بہلانے کے لیے پڑھیں اس کی اصلی اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ ہدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل و مفصّل نقشۂ زندگی ہے۔

لِلْمُتَّقِينَ۔ یہ قید لگا کر صاف بتا دیا کہ اس قانونِ عام و ہدایتِ تام سے فائدہ اٹھانے والے صرف وہ لوگ ہوں گے جن کے اندر خوفِ خدا موجود ہو، کتابِ ہدایت نازل تو ساری دنیا کے لیے ہوئی ہے

# الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ۵ ؎

خطاب سارے عالم سے کر رہی ہے لیکن عملاً اس سے نفع صرف وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے اندر حق کی طلب اور تلاش ہے اور جن کا ضمیر زندہ ہے، آفتاب اپنی جگہ عالمتاب سہی لیکن جن کی بصارت ہی ضائع ہو چکی، ان کے لیے تیز سے تیز شعاعیں بے کار ہیں، زمین اگر مُردہ ہے تو اس کے حق میں بڑی سی بڑی بارش بھی بے اثر ہے، غذا بہتر سے بہتر بھی ہیضہ کے مریض کے لیے لاحاصل بلکہ مُضر ہے، قرآن مجید سے استفادہ کے لیے اولین شرط دل کے اندر کا تقویٰ ہے

ھو فی نفسہ ھدی ولکن لاینالہ الا الأبرار (ابن کثیر)

جن کے دلوں میں ہدایتِ خداوندی کی کوئی طلب ہی سرے سے نہیں، وہ اس کتابِ ہدایت سے کوئی نفع نہیں اُٹھا سکتے۔

۵ ؎ (اور وہ بھی رسول کی تعلیمات و تصریحات کے مطابق نہ کہ اپنے ظن و تخمین، وہم و گمان سے)

يُؤْمِنُوْنَ۔ ایمانیات کے دائرہ کے اندر جتنی چیزیں بھی ہیں سب کو تصریحاتِ نبوی کے مطابق و ماتحت ہونا ضروری ہے کسی اور راہ سے آیا ہوا علم اس دائرہ میں نامقبول ہے، ایمان کی کیفیتِ نفسی شک و ریب، تردد و تذبذب کی بالکل ضد ہے، ایمان سے اس کے برعکس دماغ کو سکون، دل کو اطمینان، روح کو تسلّی نصیب ہوتی ہے، دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی صاحبِ ایمان کو خودکشی کرتے نہیں پایا گیا، ایمان کے بغیر دل میں بےکلی اور بےچینی ہی رہا کرتی ہے، لیکن ایمان والے کو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ڈھارس بندھی رہتی ہے کہ وہ بڑا سہارا اور مضبوط آسرا رکھتا ہے۔

بِالْغَيْبِ یعنی ایمان ایسے عالَم پر رکھتے ہیں جو محسوسات اور معقولات سے ماوراء ہے اور جس کی بابت خبریں صرف نبی کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتی ہیں، اس قید سے یہ صاف ہو گیا کہ جن لوگوں کی ذہنیت مادّیت و مادّیات تک محدود ہے اور کسی لطیف عالَمِ بالا کے وجود کے، کسی فوق المادّۃ عالَمِ غیب کے قائل ہی نہیں، وہ حقیقی راہِ فلاح سے ہمیشہ محجوب و محروم ہی رہیں گے۔

غَيْب۔ لغت میں شہود کی ضد ہے، ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو، یا مشاہدہ و تجربہ سے باہر ہو۔

الغیب کل ماغاب عنک (لسان) استعمل فی کل غائب عن الحاسّۃ (راغب)

یہ لغوی تشریح تھی آیت میں الغیب سے مراد ائمۂ تفسیر نے وہ عالَم لیا ہے جو حواس و عقل سے ماوراء ہے، اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وہ حضرات انبیاء کے توسّط سے، مثلاً احوالِ حشر و نشر، حور و ملائک، جنت و دوزخ وغیرہا، اور یہ تفسیر خود جماعت صحابہؓ سے مروی ہے۔

اما الغیب فما غاب عن العباد من امر الجنۃ وامر النار وما ذکر اللہ تعالیٰ وتبارک فی القرآن (ابن جریر عن ابن مسعود وناس من أصحاب النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم) وھو قول جمھور

المفسرین، ان الغیب ھو الذی یکون غائبًا عن الحاسّۃ (کبیر)

غیب کی تفسیر منقول اسی قدر ہے لیکن اسے ذرا سی وسعت دینے سے اس کے اندر پیمبر کے سارے علوم داخل ہوجاتے ہیں اور پیمبر جن جن اُمور سے وحی جلی یا وحی خفی کی روشنی میں لوگوں کو روکتا ہے ان کی باریک باریک بُرائیوں کا اُمت کے نقطۂ نظر سے داخل غیب ہونا صاف معلوم ہوجاتا ہے وحی الٰہی کی خوردبین سود، شراب، زنا وغیرہ کی خرابیوں اور مفسدوں کو جس طرح اپنی گرفت میں لے آتی ہے وہ انسان کے لیے غیب ہی کا حکم رکھتی ہے۔

لیکن جب غیب کی حقیقت یہ معلوم ہوگئی کہ وہ شہود یا علم کے مقابلہ کی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ جس طرح ہر شخص کا علم و مشاہدہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اسی نسبت سے ہر ایک کا غیب بھی دوسرے سے جُدا گانہ ہوتا ہے طبیب کے لیے مرض و مریض سے متعلق بہت سے اُمور شہود میں ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے غیب کے حکم میں داخل ہوتے ہیں اسی طرح ہر فن کا ماہر ایسی چیزیں جانتا ہے جو عامی کے لیے غیب یا خفا میں ہوتی ہیں گویا جس شخص کا دائرۂ علم جس قدر وسیع ہوگا، اُسی نسبت سے اس کا دائرۂ غیب چھوٹا ہوگا، یہاں تک کہ حق تعالیٰ پر چونکہ ہر چیز روشن و عیاں ہے اس لیے کوئی شے اُس کے لیے غیب میں داخل ہی نہیں اور اس لیے اُسے جب عالم الغیب کہا جاتا ہے تو اُس کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو بھی جانتا ہے جو سب بندوں کے لیے غیب میں ہوتی ہیں "غیب" کی اضافت یہاں صرف بندوں کی جانب ہوتی ہے، ورنہ حق تعالیٰ کے لیے تو جس طرح دور و نزدیک آسان و دشوار، بڑا اور چھوٹا سب یکساں ہیں، اور ان کے باہمی فرق بے معنی ہیں، اسی طرح غیب و شہود بھی بالکل ایک ہیں۔

ویقال الشیٔ غیبٌ وغائبٌ باعتبارہ بالناس لا باللّٰہ تعالٰی فانہ لایغیب عنہ شیٔ (راغب)

بڑے سے بڑے عالم و عارف کے لئے بھی اس کے مرتبۂ علم و معرفت کے بعد اور اسی کے ماتحت درجہ بدرجہ حدود غیب شروع ہوتے ہیں، یہیں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ پیمبر چونکہ تمام دوسرے انسانوں سے دانا تر و عالم تر ہوتے ہیں اور ان کا دائرۂ ادراک و معرفت ساری دوسری مخلوق سے وسیع تر ہوتا ہے اس لیے قدرۃً انھیں بے شمار ایسی مخفیات کا علم ہوتا ہے جو غیر انبیاء کے لیے تمام تر مجہول ہوتی ہیں لیکن اس ساری وسعت کے باوجود کہیں نہ کہیں، کسی منزل پر پہنچ کر ان کے علم کی بھی انتہا ہوجاتی ہے اور دائرۂ غیب ان کا بھی شروع ہوجاتا ہے، غیب پر ایمان لانا تو آیت میں متقین کی سب سے پہلی علامت بیان کیا گیا ہے، اب اگر کسی کا غیب ہی نہیں تو وہ ایمان کس چیز پر لائے گا، انبیائے کرام تو متقی ہی نہیں متقیوں کے سردار و پیشوا ہوتے ہیں ان کا ایمان بھی اگر مغیبات و مخفیات پر نہ ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ ہاں البتہ ان کا غیب انھیں کے ظرف و مرتبہ و بساط کے موافق ہوتا ہے ہم شما کا سا غیب ان کا نہیں۔

دین کا مغز کہئے یا ایمان کی روح یہی عالم غیب کا عقیدہ ہے یعنی یہ اعتقاد کہ اس عالم مادی سے ماوراء اس کائنات حسی سے اوپر کچھ اور ایک عالم ہے ضرور، جو اس عالم کے وجود کا قائل نہیں، وہ سرے سے مذہب ہی کا قائل نہیں اور سب سے بڑا غیب تو خود وجود باری ہے سب سے بڑھ کر روشن و عیاں مگر سب سے زیادہ مخفی و نہاں، عالم غیب کے منکر اور محض مادیات کے قائل کو جس طرح تقویٰ سے کوئی واسطہ نہیں اسی طرح ایمان سے بھی کوئی تعلق نہیں۔

وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

اور نماز کی پابندی کرتے ہیں ۹ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے رہتے ہیں ۱۰

خوب خیال کر لیا جائے کہ فلاح پانے والوں کے لیے اولین، مقدم ترین شرط یہ ہے کہ ان کا ایمان غیب پر ہو، سائنسی اکتشافات، فلسفیانہ نکتہ آفرینیوں، منطقی موشگافیوں اور سارے دوسرے علوم وفنون کی اس راہ میں کوئی پرسش نہیں۔

۹ (وقت کے، خشوع کے، تعدیل ارکان کے، غرض جملہ لوازم باطنی و شرائط ظاہری کے ساتھ) صَلٰوۃ کے لفظی معنی دعا کے ہیں، اصطلاح شریعت میں ایک مخصوص ہئیت کی معروف عبادت کا نام ہے اور یہ نام بھی اسی سے پڑا کہ دعا ہی اس عبادت کا جزو اعظم ہے۔

الصلوٰۃ التی ھی العبادۃ المخصوصۃ اصلھا الدعاء۔ (راغب)

محققین نے کہا ہے کہ نماز تو یکسر دعا ہے، دعا زبان سے بھی، دل سے بھی، اعضاء ظاہری سے بھی یعنی دعاء قولی، دعاء قلبی، دعاء فعلی کا مجموعہ اقامۃ صلوٰۃ اور محض ادائے صلوٰۃ میں فرق ہے، اقامت صلوٰۃ میں نماز کی تکمیل صوری و معنوی ہر طرح کی آگئی۔

کسی شے کی اقامت کرنے کے معنی ہی عربی میں یہ ہوتے ہیں کہ اسے اس طرح ادا کیا جائے جو اس کا حق ہے۔

اقامۃ الشیٔ توفیۃ حقہ (راغب)

اور اقامت صلوٰۃ کی تعبیریں مداومت سے، تعدیل ارکان سے، اور مختلف طریقوں سے کی گئی ہیں (ابن جریر، کبیر وغیرہ) سب سے زیادہ جامع تشریح یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ کی صاحب جلالین نے اپنے دو لفظوں میں کر دی ای یاتون بھا بحقوقھا۔

اَن دیکھے خدا کے آگے جھکنے، سر عبودیت خم کرنے، اس سے گہرا ربط و تعلق پیدا کرنے اور خود افراد ملت میں باہم نظم پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے، اور بدنی عبادتوں میں یہی فریضہ سب سے اعلیٰ اور ایمان توحید کا سب سے بڑا عملی مظہر ہے، فرد کے لیے اسلامی نماز با جماعت کے جو اخلاقی، طبی، مادی فائدے ہیں، نیز ملت کے لیے جو معاشرتی اجتماعی مصلحتیں ہیں ان کی جھلک کہیں دور سے دیکھ کر یہود، مسیحی اور منکرین تک اس کے دلدادہ ہو گئے ہیں، اور ان کے اہل علم اپنی تحریروں میں بار بار اس کا ذکر داد و مدح کے لہجہ میں کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)

متقین کی پہلی علامت یہ ارشاد ہوئی تھی کہ وہ عقیدۂ غیب کے قائل ہیں دوسری علامت یہ بیان ہو رہی ہے، کہ عملی زندگی میں وہ نماز کے پابند ہیں۔

۱۰ (مناسب و ضروری موقعوں پر جائز اور مفید کاموں میں)

رِزْق کا لفظ کلام عرب میں بڑے وسیع معنی رکھتا ہے، اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں مثلاً مال و صحت، اولاد یا معنوی و روحانی ہو، مثلاً علم و حکمت، فہم سلیم وغیرہ۔

یقال للعطاء الجاری تارۃ دنیویا کان ام اخرویا وللنصیب تارۃ (راغب) الرزق فی کلام

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ

اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو آپ پر اتارا گیا ۱۱ اور (اس پر) جو آپ سے قبل اتارا گیا ہے ۱۲

العرب هو الحظ (کبیر) اسم لكل ما ينتفع به (معالم) الرزق فى اللغة النصيب والعطاء ويطلق على الحسى والمعنوى كالمال والولد والعلم والتقوى (منار)

رَزَقْنٰهُمْ میں ہر رزق کو اپنی جانب منسوب کرکے بتا دیا کہ جو نعمت جتنی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے، سب اللہ ہی کے فیض و عطاء کا ثمرہ ہوتی ہے، انسان کی اپنی کوئی چیز بھی نہیں ہوتی۔

يُنفِقُونَ متقین کی تیسری صفت یہ ارشاد ہوئی کہ اللہ کے ہاں سے انھیں جو بھی ظاہری و معنوی نعمتیں عطا ہوئی ہیں، انھیں وہ اللہ ہی کے دین برحق کی راہ میں صرف کرتے ہیں، اللہ کی مخالفت، عدوان وعصیان میں صرف نہیں کرتے۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ ہم نے انھیں جو انوار معرفت عطا کیے ہیں ان کا وہ طالبین پر افاضہ کرتے رہتے ہیں۔

۱۱ (اے ہمارے رسول)

یعنی ان متقین کا چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتے ہیں رسول کے لائے ہوئے ہر پیام پر، خواہ قرآن ہو یا اس کے علاوہ۔

آیت کی عبارت سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ تین چیزیں الگ الگ ہیں (۱) ایک کلام کا نازل کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ (۲) دوسرے وہ شخص جس پر کلام نازل ہوا ہے یعنی اللہ کا رسول برحق (۳) تیسرے خود کلام۔ بروز، تمثل، حلول، اور وحدۃ الوجود (اپنے عوامی مفہوم میں) ان سب مشرکانہ و نیم مشرکانہ عقائد کی جڑ اس سے کٹ جاتی ہے، نہ کلام متمثل ہوا ہے اور نہ رسول (نعوذ باللہ) اللہ کے اوتار انسانی قالب میں خدا ہیں بلکہ ایک مستقل انسانی شخصیت رکھتے ہیں۔

۱۲ (دوسرے پیغمبروں پر خواہ وہ کسی ملک، کسی قوم، کسی زمانہ کے ہوں)

پانچواں وصف متقین، مہتدین کا یہ ارشاد ہوا کہ وہ (بخلاف یہود و نصاریٰ کے) اعتماد، اعتقاد دوسرے انبیاء پر بھی رکھتے ہیں۔

قرآن مجید نے اس امر کو صاف کر دیا ہے کہ سلسلۂ ارشاد و ہدایت کوئی نو پیدا چیز نہیں، یہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان دنیا میں آئے، سلسلۂ وحی کی عمر اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانیت کی، اور مومن کے لیے تصدیق صرف خاتم المرسلین کی کافی نہیں بلکہ سارے انبیاء و رسل کی کرنا ضروری ہے، خواہ وہ درجۂ اجمالی ہی میں ہو۔

محققین نے دونوں ایمانوں بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ کے درمیان فرق یہ بھی کیا ہے کہ پہلا ایمان تفصیلی ہونا چاہئے، سارے اصول و فروع پر لازمی اور دوسرا ایمان محض اجمالی و عمومی کافی ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اور یقین تو بس آخرت ہی پر پورا رکھتے ہیں ۱۳؎

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ طالب کو اعتقاد تو تمام شیوخ اہلِ حق کے ساتھ ایسا ہی رکھنا چاہئے جیسا اپنے شیخ کے ساتھ، لیکن اتباع صرف اپنے شیخ کا کرنا چاہئے، جیسا بعینہٖ یہی حکم انبیاء علیہم السلام کے باب میں ہے۔

۱۳؎ یہ چھٹا اور آخری وصف اُن متقین اہلِ ضمیر کا بیان ہوا، جو قرآن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔

**الْاٰخِرَةِ** سے مراد ہے دارالآخرۃ یا عالمِ آخرت، یعنی وہ عالم جو موجودہ سلسلۂ زندگی کے بعد شروع ہوگا، اُسے آخرت کہا ہی اس لحاظ سے جاتا ہے کہ وہ اس ناسوتی زندگی کے خاتمہ کے بعد پیش آئے گا، قرآن مجید میں اس کا ذکر کہیں دارالآخرۃ سے آیا ہے اور کہیں صرف آخرۃ سے۔

ويعتبر بالدار الآخرة عن النشأة الثانية وربما ترك ذكر الدار (راغب) انما وصفت بذلك لمصيرها آخرة لاولى كانت قبلها. (ابن جرير)

جزاوسزا کے لیے ایک مستقل آئندہ عالم پر یقین رکھنا دینِ صحیح کے لوازم میں سے ہے، یہیں سے تردید ہوگئی اُن باطل مذہبوں کی جو کہنے کو تو مذہب ہیں، لیکن یا تو سرے سے جزاءِ اعمال ہی کے قائل نہیں یا قائل تو ہیں لیکن اس جزا کا محل ومکان اسی عالمِ ناسوت کو سمجھتے ہیں خواہ ایک ہی قالب میں یا کئی کئی قالبوں میں۔ بعض جدید اہلِ باطل نے الآخرۃ کا ترجمہ کیا ہے "زمانۂ آخر کی وحی" لیکن یہ نہ ترجمہ ہے نہ تفسیر، یہ صرف تعصب ہے، قرآن مجید اور لغتِ عربی دونوں کے ساتھ۔

**يُوْقِنُوْنَ** ۔ ایقان یا یقین کے معنی یہ نہیں کہ محض عقل کسی عقیدہ کو اس طرح مان لے کہ یا منطق یا دلِ ناخواستہ سکوت پر مجبور ہو جائے یا دماغ اس کے مان لینے کا محض سرسری، رسمی، سطحی طور پر لفظی اقرار کرلے، جیسا کہ اکثر فلسفیانہ نظریوں کے ساتھ معاملہ رہتا ہے، بلکہ یقین یہ ہے کہ اس مسئلہ پر دل وجان سے اعتقاد جم جائے اور عقل وجذبات، ارادہ سب پر وہی چھا جائے، یقین کی راہ شک، گمان، خیال سب سے الگ ہے۔

اليقين ازاحة الشك (تاج) اليقين من صفة العلم فوق المعرفة والدراية واخواتها (راغب) الايقان اتقان العلم بانتفاء الشك والشبهة عنه (كشاف) اليقين العلم دون الشك (قرطبی)

لسان العرب میں ہے کہ علم مقابل ہے جہل کے اور یقین مقابل ہے شک کے۔

**وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ** ۔ یقین کا مرتبہ یوں بھی محض علم سے قوی تر تھا، پھر فقرہ کی ترکیب یعنی فعل يُوْقِنُوْنَ کے تاخر، وَبِالْاٰخِرَةِ کے تقدم اور هُمْ کے اضافہ نے قوت کئی درجہ اور بڑھا دی، مطلب یہ ہوا کہ مومنین متقین کے نزدیک آخرت اس درجہ اہم ہے کہ گویا وہ بس اسی پر یقین رکھتے ہیں، یہی عقیدہ ان کی زندگی میں رچا بسا رہتا ہے، عقیدۂ آخرت کی جو اہمیت اسلام میں ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کا ذکر اس مستقل عنوان سے کیا گیا اور وہ بھی ایسے پُرزور طریقہ پر۔

# اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں[۱۴] اور (پورے) بامراد تو بس یہی ہیں[۱۵]

[۱۴] سورۂ فاتحہ میں دعا بندوں کی زبان سے طلبِ ہدایت کی تھی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ دعا منظور قبول ہوئی، کتاب ہدایت نازل ہوگئی۔ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ اب ارشاد ہوا کہ فلاں فلاں علامتیں جن میں موجود ہوں وہی ہدایت یاب لوگ ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ۔

اُولٰٓئِکَ۔ ان ہدایت یاب لوگوں کے خصوصیاتِ ذیل قرآن مجید ہی سے معلوم ہو چکے ہیں۔

۱۔ ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے ان کے دلوں میں خوفِ خدا کی جگہ ہوتی ہے (اَلْمُتَّقِیْنَ)

۲۔ ان کا اعتقاد اس مادی دنیا سے پرے ایک عالمِ غیب پر ہوتا ہے (یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ)

۳۔ ان کے تعلق مع اللہ کا عملاً اظہار یوں ہوتا ہے کہ یہ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور نماز کا حق ادا کرتے رہتے ہیں (یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ۔)

۴۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو یہ اللہ کی مخلوق پر صرف کرتے رہتے ہیں (مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ۔)

۵۔ یہ رسول کے رسول برحق اور بہترین معلم و ہادی ہونے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں (یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ۔)

۶۔ پورے سلسلۂ وحی و نظامِ نبوت کی تصدیق کرتے رہتے ہیں (وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ۔)

۷۔ ان کا کامل اعتقاد یومِ آخرت یا روزِ جزا پر رہتا ہے (وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝)

[۱۵] (دنیا اور آخرت دونوں میں)
دنیا کی فلاح تو یہ کہ انھیں راہِ ہدایت نصیب ہوگئی اور انفرادی و اجتماعی، شخصی و قومی ہر حیثیت سے جامع ترین و بہترین دستورِ حیات منازلِ زندگی کے طے کرنے کا ہاتھ آگیا، اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا صلہ مل کر رہے گا۔

ای الذین ادرکوا ما طلبوا ونجوا من شر ما منه هربوا۔ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

فلاح عربی میں بڑے ہی وسیع معنی میں آتا ہے، دنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے اس لیے المفلحون کا پورا ترجمہ "کامیاب" "بامراد" وغیرہ کسی اردو لفظ سے ہونا دشوار ہی ہے امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ ائمۂ لسان کا اس پر اتفاق ہے کہ کلامِ عرب میں جامعیتِ خیر کے لیے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں۔

لیس فی کلام العرب کله اجمع من لفظة الفلاح لخیری الدنیا والآخرة کما قال ائمة اللسان (تاج) کل من اصاب شیئا من الخیر فهو مفلح (مجاز)

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کی ترکیب نے معنی میں حصر و تاکید پیدا کر دی اور ھُمْ بطور کلمۂ فصل کے تاکیدِ نسبت و تخصیص کے لئے ہے۔

وهم فصل یفصل الخبر عن الصفة ویؤکد النسبة ویفید اختصاص المسند بالمسند الیه (بیضاوی) وادخال هو فی مثل هذا الترکیب احسن لانه محل تاکید ورفع توهم (بحر)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

بیشک جو لوگ کفر (اختیار) کیے ہوئے ہیں ۲۶ ان کے حق میں یکساں ہے خواہ آپ انھیں ڈرائیں یا آپ

لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

انھیں نہ ڈرائیں ۲۷ وہ ایمان نہ لائیں گے ۲۸

مفسر تھانوی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاحِ کامل سے ہے نہ کہ فلاحِ مطلق سے، اور المفلحون سے مراد الکاملون فی الفلاح ہے اور معتزلہ و خوارج جنھوں نے آیت سے یہ نکالنا چاہا ہے کہ کبائر کا مرتکب فلاحِ مطلق یعنی نجات سے محروم رہے گا، انھوں نے فلاحِ مطلق (نجات کاملہ) کے اور مطلق فلاح کے درمیان خلط کر دیا ہے۔

المراد به الفلاح الکامل المستفاد من الاطلاق فالحصر للفلاح المطلق لا مطلق الفلاح۔ (تھانوی)

بامراد اور فلاح یاب لوگوں کے، عام اس سے کہ وہ قومیں اور جماعتیں ہوں یا افراد۔ قرآن مجید نے جو اوصاف گنا دیے ہیں، ان میں کہیں بھی یہ ذکر آنے پایا ہے کہ بڑے بڑے تاجر، بڑے بڑے صنّاع، بڑے بڑے کشورکشا و جنگ آزما ہوں گے؟ قرآن مجید جس فلاحِ حقیقی کی طرف بُلا رہا ہے اس کا دائرہ ان سب سے الگ ہے۔

صاحب المنار نے مادہ فلح سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ اَلْمُفْلِحُوْن انھیں نہیں کہتے جنھیں کوئی نعمت از خود بلا تعب و مشقت ہاتھ آجائے بلکہ وہ لوگ ہیں جنھیں فلاحِ کامل شرائط ایمان و اطاعت پوری طرح بجالانے کے بعد حاصل ہوگی۔

۲۶ (اور قیامِ دلائل کے باوجود اس پر اڑے ہوئے ہیں۔)

ای اثبتوا علی الکفر۔ (ابن عباس)

ایسے لوگ ظاہر ہے کہ علم الٰہی میں کفر ہی پر مرنے والے ہیں، جو لوگ دلائلِ حق میں غور نہیں کرتے اور باطل پر جمے رہتے ہیں، ان کی استعداد قبولِ حق کے باب میں روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بالکل مُردہ ہو جاتی ہے۔ آیت میں خصوصی اشارہ یہودِ مدینہ کی جانب ہے، ان کا کفر کفرِ جحود کی قسم کا تھا یعنی یہ نبی آخر الزماں کی بابت پیشین گوئیاں اور ان کی علامتوں سے اچھی طرح واقف تھے اور پھر دانستہ اغماض و اخفا کرتے رہتے تھے کہ اپنی دینی ریاست اور دنیوی سیادت میں فرق نہ پڑنے پائے۔

واما معنی الکفر فانه الجحود ذلک ان الاحبار من یهود المدینة جحدوا نبوة محمد صلی الله علیه وسلم وستروه عن الناس وکتموا امره۔ (ابن جریر)

۲۷ (لیکن آپ کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے، آپ کا اجر اس سے ثابت ہوتا رہے گا۔)

آج معمولی مبلغ بھی اپنی دھن کے پکے ہوتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا کے لیے مبلغ اعظم تھے، دینِ الٰہی کی اشاعت کے لیے آپ کی تڑپ کا کیا کہنا۔ آپ کو حرص اگر تھی تو اسی کی کہ کافر سب کے سب دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں، یہاں یہ حقیقت آپ کو بتلائی گئی ہے کہ آپ کچھ بھی کر ڈالیے ان کے حق میں سب یکساں ہے، یہ بدبخت

## خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ

مُہر لگا دی ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کی شنوائی پر ۱۹

اپنی صلاحیتِ حق شناسی کو ضائع کر چکے ہیں، لیکن آپ کا اجرِ تبلیغ بہرحال ثابت ہے۔

فلا تذھب نفسك علیھم حسرات فمن استجاب لك فله الحظ الأوفر ومن تولی فلا تحزن علیھم (ابن کثیر)

ظاہر ہے کہ یہ صرف ایک خبر ہے جو خبیرِ مطلق اپنے بندہ کو دے رہا ہے، ایک اطلاع ہے جو علیمِ کُل اپنے رسول کو پہنچا رہا ہے، مرضیِ الٰہی سے اسے شائبۂ تعلق بھی نہیں، "علم" و "مرضی" کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے عوام کے ذہن ان دو بالکل مختلف قانونوں کے درمیان خلط مبحث کر کے اپنے کو عجیب الجھنوں میں ڈال لیتے ہیں، طبیبِ حاذق اپنے علم کی رو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بدپرہیز، خودرائے مریض اچھا نہ ہوگا، کیا اس پیش خبری، اس اخبارِ غیب میں اُس شفیق طبیب کی خواہش و مرضی کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے؟

بقول مفسر تھانویؒ اس کافر کا ناقابل ایمان ہونا اللہ کے اس خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابل ایمان ہونے کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور ناقابل ایمان ہونے کی صفت خود اس کی شرارت و عناد و مخالفتِ حق کے سبب پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ استعدادِ قبولِ حق کی رکھی ہے جیسا حدیث میں آگیا ہے، مگر یہ شخص خود اپنی ہوائے نفسانی اور خود غرضی کی وجہ سے اور قوتِ ارادی سے غلط کام لے کر حق کی مخالفت کرتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے

۱۸ (اس لیے کہ وہ ایمان لانے کا قصد ہی نہیں کرتے اور نہ خلوصِ ذہن کے ساتھ تعلیماتِ اسلامی پر غور کرتے ہیں)

ای لایریدون ان یؤمنوا (ابن عباس)

اس سے پہلے فقرہ کی مزید تاکید اور توثیق ہوگئی اور اہل عناد کے حق میں ان کی بے التفاتی اور عدم احساس کی بنا پر انذار اور عدم انذار کا یکساں ہونا اور روشن ہوگیا، اکثر ائمۂ تفسیر نے آیت کی ترکیب نحوی یوں ہی سمجھی ہے اور لایؤمنون کو جملہ مؤکدہ و مفسرہ فقرۂ ماقبل کا سمجھا ہے۔

جملة مؤكدة للتی قبلها (ابن جریر) جُملة مفسّرة لاجمال ما قبلها او حال مؤكدة (بیضاوی)

لیکن ایک دوسری ترکیب بھی انھیں بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ لایؤمنون خبر ہے ان الذین کفروا کی، اور پورا فقرہ سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے آگیا ہے۔

خبرٌ لانّ والجملة قبلها الاعتراض (کشاف) خبر انّ والجملة قبلها الاعتراض (بیضاوی)

خبرٌ لأنّ والجملة قبلها الاعتراض (مدارك) ويحتمل ان يكون لايؤمنون خبرًا (ابن کثیر)

اصل مقصود دونوں ترکیبوں کی صورت میں ایک ہی رہتا ہے۔

۱۹ (کہ وہ نہ سمجھتے ہیں اور نہ سنتے)

وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ز

اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے ۲۰ؔ

خَتَمَ اللّٰهُ اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا یہ فعل بندہ کے کفرِ اختیاری کے بعد ہوتا ہے نہ کہ اس کے قبل، بندہ کے کفرِ اختیاری کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا مسبّب جیسا کہ دوسری جگہ اور زیادہ صاف ارشاد ہوا ہے۔

بَل طبع اللّٰه علیها بکفرهم، واجمعت الامة علی ان اللّٰه عزوجل قد وصف نفسه بالختم والطبع علی قلوب الکافرین مجازاۃ لکفرهم (قرطبی وابن کثیر)

فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوئی ہے اور اس فطرتِ سلیم میں دلائلِ حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے، لیکن انسان جب اپنے ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے، اور آسمانی ہدایتوں اور خداوندی نشانیوں سے مسلسل منہ موڑے ہوئے قانونِ شیطانی پر چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت میں آجاتا ہے، انبیاء علیہم السلام کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے، اور نصرتِ الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آنے لگتی ہے اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا وہی اللہ تعالیٰ اسے بحیثیت علّت العلل و مسبّب الاسباب اپنے قانونِ تکوینی (نہ کہ قانونِ رضا) کے ماتحت دینے لگتا ہے اور یہی معنی ہیں، انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ مُہرِ خداوندی کوئی مادّی چیز نہیں۔

امامِ لغت راغب اصفہانی نے اس عنوان پر اپنے عام دستور کے خلاف بسط و تفصیل سے گفتگو کی ہے، ان کی تحقیق انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

اشارۃ الی ما اجری اللّٰه به العادۃ ان الانسان اذا تناهی فی اعتقادٍ باطلٍ او ارتکاب محظورٍ ولا یکون منه تلفتٌ بوجهٍ الی الحق یورثه ذلك هیئۃ تمرّنه علی استحسان المعاصی وکأنما یختم بذلك علی قلبه۔

اور دوسرے ائمۂ لغت نے ختمِ قلب سے مراد یہ لی ہے کہ اب اس شخص کی نہ سمجھ میں کوئی چیز آتی ہے اور نہ اب کوئی چیز اس سے نکل سکتی ہے گویا قلب ہر طرف سے بند ہو گیا ہے۔

ومن المجاز ختم علی قلبه اذا جعله لا یفهم شیئًا ولا یخرج منه شیٔ کانّه طبع (قاموس۔ تاج)

قُلُوۡبِهِمۡ قلب سے مراد سینے کے اندر کا وہ مضغۂ گوشت نہیں جو طبّی اصطلاح میں دل کہلاتا ہے بلکہ وہ دل مُراد ہے جو محاورۂ زبان میں احساس، عقل، ارادہ سب کا مرکز ہے انسانی بول چال میں ہر زبان میں دل اسی کو کہا جاتا ہے، اور افعالِ ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے، قرآن مجید نے رعایت محاورۂ انسانی کی ہر جگہ رکھی ہے، علوم و فنون کے مصطلحات کا اتباع کہیں نہیں کیا ہے، توریت، انجیل وغیرہ دوسرے الہامی صحیفوں میں دل اسی معنی میں آیا ہے۔

۲۰ؔ (چنانچہ کھلے ہوئے دلائلِ حق اور روشن آیاتِ الٰہی بھی انھیں نظر نہیں آتے)

یہ سب ثمرہ ہے ان کافروں کے ارادی اِعراض عن الحق اور دانستہ کج روی کا، حق تعالیٰ کی جانب

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ⑦ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ ع ۱

اور اُن کے لیے بڑا (ہی) عذاب ہے ۲۱؎ اور کچھ لوگ ایسے (بھی) ہیں جو کہتے ہیں ۲۲؎

ان افعال کا انتساب جو کچھ ہے وہ محض تکوینی حیثیت سے ہے، یعنی بطور علّت العلل و مسبّب الاسباب کے۔ ارادۂ حق جس طرح بندہ کے زہر کھا لینے پر موت کا ثمرۂ طبعی مرتّب کر دیتا ہے، اُسی طرح بندہ کی ارادی کج روی پر موتِ روحانی کا ثمرہ بھی مرتّب کر دیتا ہے۔ مرضیِ حق کا تعلق نہ اوّل الذکر سے ہے نہ آخر الذکر سے۔ قرآن کے اس اسلوب بیان کی اور فہم، سماعت و بصارت کی قوتوں سے سزا کے طور پر محرومی کی مثالیں قدیم صحیفوں میں بھی کثرت سے ملتی ہیں:۔

"خدا نے تم کو وہ دل جو سمجھے اور وہ آنکھیں جو دیکھیں اور وہ کان جو سُنیں آج تک نہیں دیے" (استثناء ۲۹ : ۴) "تم سنا کرو پر سمجھو نہیں، تم دیکھا کرو پر بوجھو نہیں۔ تو ان لوگوں کے دلوں کو چربا دے اور ان کے کانوں کو بھاری کر" (اسعیاہ ۶ : ۱۰) "وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ آنکھیں لیپی گئیں سو وہ دیکھتے نہیں اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں" (اسعیاہ ۴۴ : ۱۸) "تمھاری آنکھیں جو کہ نبی ہیں موندی ہیں اور تمھارے سروں پر جو کہ غیب بیں ہیں حجاب ڈالا ہے" (اسعیاہ ۲۹ : ۱۰) "میں نے انھیں اُن کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۱ : ۱۱ و ۱۲)۔

انجیل میں اس قسم کی مثالوں کے لیے ملاحظہ ہو، رومیون ۱۱ : ۷ و ۸، اور ۲ تھسلنیکون ۲ : ۱۱

۲۱؎ (آخرت میں)

اسلام مسلسل حیات کا قائل ہے، یہ ناسوتی، مادّی زندگی صرف ایک حصہ ہے کل زندگانی کا، باقی اس کا پورا ظہور و بُروز حیاتِ اُخروی ہی میں ہوگا، اُخروی زندگی تتمہ و نتیجہ ہے اُس دُنیوی زندگی کا۔ اور یہاں کی مسلسل قانون شکنی و نافرمانی عذاب الٰہی کی شکل میں ظاہر ہوگی، گویا جو تخم آج ڈالے گئے ہیں کل وہی تناور درختوں کی صورت میں نمودار ہوں گے۔

عَظِيمٌ۔ عذاب اُخروی کے شدید و عظیم ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں اور قرآن مجید میں اُسے مختلف پیرایوں میں سمجھایا اور بتایا گیا ہے۔ پھر بھی اُس کی تفصیلی کیفیت اور نوعیت اِدراکِ بشری سے بالاتر و مافوق ہے۔ اور بعض نے عظیم کے کلمۂ نکرہ ہونے سے بھی یہی استنباط کیا ہے کہ وہ کسی خاص و غیر متعارف ہی نوعیت کا ہوگا۔

من الآلام العظام نوع عظيم لا يعلم كنهه الا الله (مدارك و بيضاوى) والتنكير فيه للنوعية اى لهم فى الآخرة نوع من العذاب غير متعارف فى عذاب الدنيا (روح)

۲۲؎ (محض زبان سے، شرکتِ قلب کے بغیر)

النَّاس۔ ناس جمع ہے انسان کی اور اصل میں یہ اُناس ہے۔

اصله عند سيبويه والجمهور أناس وهو جمع او اسم جمع لانسان (روح)

مَن، واحد، تثنیہ، جمع، تینوں موقعوں پر یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، حالتِ افراد میں بلحاظ اس کی لفظی

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞۸

کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ اور روزِ آخرت پر حالانکہ وہ (بالکل ہی) ایمان والے نہیں ۲۳

حیثیت کا کیا جاتا ہے، اور جمع میں نظر اس کے معنی و مفہوم پر رکھی جاتی ہے۔

اب تک قرآن مجید نے ذکر ۲ دو قسم کے انسانوں کا کیا ہے، ایک مومن، فرمانبردار، قانون الٰہی کے مطیع، دوسرے کافر، نافرمان، قانون الٰہی کے منکر و باغی، اب ذکر ایک تیسری صنف کا شروع ہو رہا ہے، ہوتے یہ بھی کافر و منکر ہی ہیں لیکن اپنے کفر خالص پر پردہ مکر و فریب کا ڈالے رکھتے ہیں یعنی زبان پر دعوئ اسلام رکھتے ہیں اور دل میں کفر خالص، زبان سے اقرار ایسا کہ جس میں قلب کی تصدیق کسی درجہ میں بھی شامل نہیں، ان ننگ انسانیت انسانوں کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہتے ہیں، نفاق کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اعلان و اظہار بھلائی کا کرتا پھرے اور شر کو اندر ہی اندر چھپائے رکھے۔

النفاق هو اظهار الخير و اسرار الشر (ابن کثیر)

پھر نفاق کی بھی ۲ دو قسمیں ہیں، ایک نفاق حقیقی یا اعتقادی جس میں ایمان سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اس کی سزا ابدی خلود جہنم ہے۔ دوسرا نفاق عملی یا مجازی، اس میں ایمان کا استحضار نہیں رہتا اور انسان گناہ پر بے دریغ جری ہو جاتا ہے۔

هو انواع اعتقادی وهو الذی یخلد صاحبه فی النار و عملی هو من اکبر الذنوب۔ (ابن کثیر)

سورۂ بقر مدنی ہے اور مدینہ میں منافقین کثرت سے تھے، اسلام سے عداوت میں اور رسول اسلام سے عناد میں، یہ لوگ کھلے ہوئے کافروں سے کچھ کم نہ تھے، شاید کچھ بڑھے ہی ہوئے تھے۔

نفاق یعنی جھوٹا اظہارِ اسلام مکہ میں نہ تھا بلکہ مکہ میں تو اس کے برعکس صورت حال یہ تھی کہ لوگ مومن ہو کر بھی ایمان کو چھپائے رکھتے اور بہ ظاہر کافروں ہی میں شامل رہتے، نفاق کی بنیاد مدینہ میں پڑی، وہ بھی غزوۂ بدر کے بعد جب اسلام کو روز بہ روز دنیوی عظمت و شوکت حاصل ہونی شروع ہو گئی۔

اس وقت بعض لوگوں نے اپنے کو محض تقیۃً بلا شائبۂ ایمان و صداقت مومن و مسلم کہنا شروع کر دیا، اس پارٹی کا سرغنہ یا سرخیل بنو خزرج کا سردار عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا، اس کا اثر و اقتدار حریف قبیلہ بنی اوس پر بھی تھا، یہ اپنے وقت کا کامیاب ترین لیڈر تھا، یہاں تک کہ مدینہ کی ساری آبادی اس کی سرداری پر متفق ہو چکی تھی، اور قریب تھا کہ اس کی بادشاہی کا اعلان ہو جائے کہ یک بیک اسلام کے قدم مدینہ میں جم گئے، اس نے اپنی دوکان یوں اجڑتے دیکھی تو اپنے پیروؤں کے کان میں یہ افسوں پھونک دیا کہ زبان سے کلمۂ اسلام کا پڑھتے جاؤ لیکن دل میں اپنے ہی عقائد پر جمے رہو، اوس و خزرج کے علاوہ یہود کی بھی ایک غدار و ضمیر فروش جماعت نے خوشی سے اس تحریک پر لبیک کہا، البتہ مکہ کا کوئی مہاجر اس میں شریک نہیں ہوا، ابن کثیر نے تفصیل سے لکھا ہے اور یہاں بھی زیادہ تر اسی کی تلخیص ہے۔

۲۳ یعنی ان کے دل میں ایمان کا گذر ذرہ برابر بھی نہیں ہے، ایمان انھیں چھو بھی نہیں گیا ہے۔

وقف لازم منزل ۱

## يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ

دھوکا دیتے رہے (اپنے خیال میں) اللہ کو اور ایمان والوں کو ۲۴؎ ۲۵؎

یقولون ذلک قولا لیس وراءہ شئ آخر (ابن کثیر) انھم لیسوا من الایمان فی شئ (بیضاوی)

**اٰمنّا ...... الاٰخر**۔ ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرۃ۔ خدائے واحد اور روزِ آخرت پر ایمان۔ یہی دو عقیدے تو سارے ایمان کی جان ہیں، ایمان بالرسالت انھیں بنیادی عقیدوں کی اہم ترین فرع ہے۔

**بِمُؤْمِنِيْنَ**۔ حرف باء تاکید کے لیے ہے۔

اکد النفی بالباء (بیضاوی)

ظاہر سیاق کا تقاضہ یہ تھا کہ فعل ماقبل "قالوا آمنّا" کی تردید و تغلیط میں "ما آمنوا" یا اسی قسم کا کوئی اور فعل ماضی ہی لایا جاتا لیکن یہاں تاکید اور زور کے لیے بجائے فعل کے، اسم فاعل لایا گیا کہ ان لوگوں سے نفی ایمان کی ماضی، حال، مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔

وفیہ من التوکید والمبالغۃ ما لیس فی غیرہ (کشاف) تاکید او مبالغۃ فی التکذیب لان اخراج ذواتھم من عداد المومنین ابلغ من نفی الایمان عنھم فی الماضی الزمان (بیضاوی) کان ذلک مبالغۃ فی تکذیبھم۔ (کبیر)

**وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ** میں **و** عاطفہ نہیں حالیہ ہے۔

۲۴؎ یعنی محض مسلمانوں سے نفع حاصل کرنے کے لیے ان کی گرفت سے اپنے کو بچانے کے لیے اپنے کو مسلمان کہہ رہے ہیں اور جرم کفر پر اضافہ جرم خدع کا کر رہے ہیں۔

**يُخٰدِعُوْنَ**۔ باب مفاعلہ سے ہے اور اس کا خاصّہ طرفین سے شارکت ہے لیکن یہاں یخدعون کے معنی میں ہے۔

فی معنی یخدعون ومعناھا یظھرون غیر ما فی انفسھم (مجاز)

اور یہاں یہ وزن محض زور اور تاکید کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

المفاعلۃ لافادۃ المبالغۃ فی الکیفیۃ (ابوسعود) اخرج فی زنۃ فاعلت للمبالغۃ (بیضاوی)

**يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ**۔ رسولؐ کی رسالت پر ان کا ایمان ہی کب تھا، یہ تو انھیں اپنا ہی جیسا ایک معمولی بشر سمجھ رہے تھے، اور دھوکے دھڑی کا معاملہ ان سے بھی ایسا ہی رکھنا چاہتے تھے جیسے دنیا میں عام انسانوں سے رکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے گرفت کی اور کہا کہ دیکھو بات کہاں تک پہنچتی ہے یہ تو عین اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش ہوئی۔

اجترؤا علی اللہ حتی ظنوا انھم یخدعون اللہ (ابن جریر۔ عن ابن عباس) یخدعون اللہ

وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩

حالانکہ (فی الواقع) دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے بجز اپنی ذات کے ۲۵؎ اور اس کا بھی احساس نہیں رکھتے ۲۶؎

فی زعمھم (مدارک)

قرآن مجید ہی میں اس باب کے اس طرز استعمال کی ایک دوسری مثال قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ میں ملتی ہے جہاں مراد محض قتلھم اللّٰہ ہے (مجاز)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود رسول ؐ کو دھوکا دینے کی کوشش کو قرآن مجید نے عین اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے تعبیر کیا ہو جیسا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ سے بھی واضح ہو رہا ہے۔

ای یخدعون رسولہ واولیاءہ ونسب ذلک الی اللّٰہ تعالیٰ من حیث ان معاملۃ الرسول کمعاملتہ (راغب) ای رسول اللّٰہ (مدارک) ذکر نفسہ واراد بہ رسولہ علی عادتہ فی تفخیم امرہ (کبیر)

اس طرز تعبیر کی اور بھی نظیریں قرآن مجید میں مل جاتی ہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا مثلاً عداوت یا فریب کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ کرنا۔

۲۵؎ یعنی ان کے اس نفاق سے نقصان کسی اور کا نہیں، خود انھیں کا ہو رہا ہے اور ہوگا، آخرت میں عذاب، اور دنیا میں رسوائی، فضیحت اور منافقت کی پردہ دری۔

ضررھا یلحقھم ومکرھا یحیق بھم (کشاف) یفتضحون فی الدنیا ویستوجبون العقاب فی العقبیٰ (معالم)

۲۶؎ (کہ اس منافقت کا وبال خود انھیں پر ہو کر رہے گا۔)

لا یعلمون ان وبال خداعھم یعود علیھم (معالم)

يَشْعُرُوْنَ۔ بجائے يَعْلَمُوْنَ کے یہاں يَشْعُرُوْنَ وارد ہوا ہے، شعور عربی میں علم حسی کو کہتے ہیں اور اسی کا نام اردو میں احساس ہے اور مشاعر انسان کے آلات حواس کو کہتے ہیں۔

المشاعر الحواس (راغب) الشعور علم الشیٔ علم حس من الشعار ومشاعر الانسان حواسہ (کشاف)

شعور میں مفہوم خفی وباریک چیزوں کے ادراک کا شامل ہے۔

الشعور ادراک ما خفی (المنار)

اس لفظ کے لانے میں نکتۂ بلاغت یہ ہے کہ منافقوں کو اس مکر و فریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے، لیکن یہ احمق فرط غفلت سے اس کا بھی احساس نہیں رکھتے۔

فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا

ان لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے ۲۷ سو اللہ نے بڑھادی اُن کی بیماری ۲۸

والمعنی ان لحوق ضرر ذلك بهم كالمحسوس وهم لتمادي غفلتهم كالذي لاحس له (کشاف) ای لاتدرکونه بالحواس (راغب)

۲۷ (کفر کی اور نفاق کی اور رشک کی، جو انھوں نے اپنے ہاتھوں پیدا کر رکھی ہے)

شك ونفاق وخلاف وظلمة (ابن عباس)

دوسرا پہلو ان کم اعتقادوں کے مرض کا یہ تھا کہ جوں جوں مسلمانوں کو ترقیاں اور کامیابیاں حاصل ہوتی جاتی تھیں، ان کے رشک و حسد میں بھی ترقی ہوتی جاتی تھی، چنانچہ ہمارے ائمۂ تفسیر کی نظر سے یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں ہونے پایا ہے۔

والمعنى ان المنافقين مرضت قلوبهم لها۔ او اثبات امر النبي صلى الله عليه وسلم واستعلاء شانه يوما فيوما (کبیر) والمراد به هنا ما في قلوبهم ..... من الغل والحسد والبغضاء لأن صدورهم كانت تغلي على رسول الله صلى الله عليه وسلم والمؤمنين (کشاف)

مَرَضٌ ۔ لغوی اعتبار سے نام ہے انسان کے حالتِ طبعی سے خروج کا۔

المرض الخروج عن الاعتدال الخاص بالانسان (راغب) على ما ذهب اليه اهل اللغة حالة خارجة عن الطبع ضارة بالفعل (روح)

رذائل نفسانی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور مجازاً نفاق و کفر کو بھی مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کے لیے ادراکِ فضائل اور تحصیلِ حیاتِ اخروی کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ (راغب)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ امراضِ قلب کا معاصی کے معنی میں اثبات خود قرآن مجید سے ہو گیا۔

۲۸ (رسولِ اسلام اور جماعت مومنین کو مزید ترقیاں اور فتحمندیاں دے دے کر یا اپنے کلام کے مسلسل نزول سے)

منافقوں کے دل کے روگ کو ترقی دو طریقوں سے ہوتی رہی، یا تو یوں کہ جوں جوں اسلام کو مزید غلبہ واقتدار حاصل ہوتا گیا، ان لوگوں کے دل کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی اور یا یوں کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و تبغض میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ اہل تفسیر نے یہ دونوں پہلو اختیار کیے ہیں۔

كلما زاد رسوله نصرة وتبسطا في البلاد ونقصا من اطراف الارض ازدادوا حسدا وغلا وبغضا (کشاف) كلما نزل على رسوله الوحي كفروا به فازدادوا كفرا الى كفرهم (کشاف)

فَزَادَهُمُ میں حرف "ف" بہت اہم ہے یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس فعل کا ذکر آ رہا ہے وہ محض بطور ثمرہ یا نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔

والفاء للدلالة على ترتب مضمونها عليه (ابو سعود)

## وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ۝١٠

اور اُن کے لیے عذاب دردناک (ہونا) ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے ۲۹

حق تعالیٰ کی جانب اس قسم کے افعال کا انتساب صرف مجازی حیثیت رکھتا ہے یعنی یہ نہیں کہ اللہ نے خواہ مخواہ ان سے یہ افعال کرا چھوڑے، بلکہ اس نے تو صرف وہ حالات واسباب پیدا کر دیے، جن سے ان بدنصیبوں نے اپنے مرض کے بڑھانے کا کام لیا، ورنہ اگر وہ اپنی عقل وارادہ کا صحیح استعمال کرتے تو انھیں اسباب وحالات سے ہدایت بھی پاسکتے تھے۔

وكان اسناد الزيادة الى الله تعالى من حيث انه مسبّب من فعله (بيضاوی)

یہ سزا جو کچھ ملی جرم کے مناسب حال ملی۔

وهو الجزاء من جنس العمل (ابن كثير)

اس قسم کے افعال کا حق تعالیٰ کی جانب انتساب، قدیم صحیفوں کا بھی ایک محاورۂ عام ہے:۔

"اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے انھیں ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا" (زبور ۸۱: ۱۰ و ۱۱)

"پس خدا نے منھ موڑ کر انھیں چھوڑ دیا کہ آسمانی فوج کو پوجیں"۔ (اعمال ۷: ۴۲)

"خدا نے ان کے دلوں کی خواہش کے مطابق انھیں ناپاکی میں چھوڑ دیا کہ ان کے بدن آپس میں بے حرمت کیے جائیں"۔ (رومیون ۱: ۲۴)

۲۹ یعنی اپنے مومن ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرتے تھے، یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے منافقوں پر مطلق کفر پر نہیں بلکہ ان کی منافقت پر یا جھوٹے دعوئ ایمان پر ہوگا۔

عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ کافروں کے لیے جس عذاب کی خبر اوپر دی جاچکی ہے (آیت ۷ میں) اس کی صفت عظیم آئی ہے اور یہاں منافقوں کے لیے جس عذاب کی وعید ہے، وہ الیم ہوگا، اور الیم کے معنی ہیں مُؤْلِمٌ یعنی دکھ پہنچانے والا۔ گویا تکلیف واذیت کا پہلو اسی میں زیادہ نمایاں ہوگا۔

وصف به العذاب للمبالغة (بيضاوی) اراد مؤلم موجع (ابن الانباری)

خوب سمجھ لیا جائے کہ جو منافق تھے، وہ کافر تو تھے ہی لیکن کافر کے علاوہ بھی کچھ اور تھے یعنی خادع و کاذب تو عذاب عظیم کے مستحق تو وہ اپنے کفر کی بنا پر ہو ہی چکے، یہ منافقت کا عذاب الیم اس پر مستزاد۔ گویا منافقوں پر دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا۔

قد حصل للمنافقين مجموع العذابين فصار المنافقون اشدّ عذابا من غيرهم من الكفار (بحر)

بِمَا میں ب سببیہ ہے اور مَا مصدری۔

الباء للسببيّة وما مصدرية (ابو سعود) ما للمصدر (معالم)

منافقوں اور ریاکاروں سے انجیل کا طرز خطاب حسب ذیل ہے:۔

"تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری قبروں کے مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر اندر

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (۱۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر بگاڑ مت پھیلاؤ ۳۰؎ تو کہتے ہیں کہ ارے ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۳۱؎

مُردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہوئی ہیں۔" (متی۔ ۲۳: ۲۷)

اور شیوخ واکابر یہود کے الفاظ ان کی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یوں منقول ہیں:۔

"جو اولیاء کی صحبت میں منافقت کے ساتھ رہتے ہیں خدا انھیں غارت کرکے رہے..... جو کوئی منافقت برتنے خدا کرے چیل کوے اس کی آنکھیں نکال کر رہیں۔" (جلد ۶ صفحہ ۵۱۴)

اور انھیں کے تالمود میں ہے:۔

"جو کوئی منافقت برتتا ہے وہ غضب (خداوندی) دنیا پر لاتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں اور جو بچے ابھی رحم مادر میں ہیں، وہ تک اس پر لعنت کرتے ہیں، اور اس کی جگہ جہنّم ہے۔" (ایوری مینس تالمود صفحہ ۱۰۷)

۳۰؎ اس سے معلوم ہوا کہ قانونِ شریعت کے علاوہ کسی دینِ جاہلی پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مرادف ہے، امنِ عالم ونظامِ اقوام قائم جب ہی رہ سکتا ہے جب عملدرآمد قانونِ شریعت پر رہے۔ اس راہ سے انحراف بلکہ سرِ مو تجاوز کرنا بھی دنیا کو بدنظمی، ابتری، بے حیائی، کشت وخون، ظلم، خیانت اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ وکشمکش کو دعوت دینا ہے، چنانچہ دنیا عملاً اس کا تجربہ بارہا کر چکی ہے، اور اس وقت بھی کر رہی ہے۔ **وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ** اس قول کا قائل کون تھا؟ بعض نے اس کا قائل رسول اللہؐ کو قرار دیا ہے اور بعض نے عام مومنین کو، اور کسی نے اللہ تعالیٰ کو بھی۔ الفاظ میں گنجائش ان سب کی ہے۔

وکلّ ذٰلک محتمل (کبیر)

**لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ**۔ فساد عربی میں اردو کے مفہوم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے اور کسی ایک ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی برائی اور خرابی پر حاوی ہے۔

الفساد خروج الشیٔ عن الاعتدال ویضادہ الصلاح (راغب)

۳۱؎ (اور الٹا ہم ہی پر الزام فساد وتخریب کا لگ رہا ہے) جواب بعینہ وہ ہے جو آج بھی خدا معلوم امت کے اندر کتنے منافقوں کی زبان پر ہے، دین میں رخنے قدم قدم پر ڈالتے جاتے ہیں، اور زبان پر دعوے وہی تجدّد کے، اصلاح کے، تعمیر کے ہیں۔ **نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ**۔ کے معروف معنی تو یہی ہیں کہ یہ لوگ زبانی دعوے اپنے دینِ حق پر قائم ہونے کا رکھتے تھے۔

قالوا انما نحن علی الھدیٰ مصلحون (ابن جریر۔ عن مجاھد)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم تو لوگوں کے درمیان صلح کرانے والے ہیں، محمدی اور غیر محمدی کے درمیان جو کشمکش ہے، اس کے مٹانے والے ہیں۔

قالوا انما نرید الاصلاح بین الفریقین من المؤمنین واھل الکتٰب (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

**اِنَّمَا** کلمۂ حصر ہے اردو میں زور کا یہ مفہوم لفظ "ارے" سے ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ

کیا خوب یہی لوگ تو بگاڑ پیدا کرنے والے ہیں۔ اور یہ اس کا بھی احساس نہیں رکھتے ۳۲ اور جب ان سے

اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ

کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں ۳۳ تو کہتے ہیں ۳۴ کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لائیں جیسا کم عقل ایمان لائے ہیں ۳۵

۳۲ (اگر بگاڑ تو تمام تر انھیں کی ذات سے پھیل رہا ہے)

کیا ٹھکانا ہے ان کی غباوت کا، مسخ شدہ ذہنیت کا! سیاہ کو سفید کہہ رہے ہیں، تاریکی کا نام کا نور رکھ رہے ہیں اور احساس اپنے اس جہل کا بھی نہیں رکھتے!

الا کلمۂ تنبیہ ہے، عربی میں "خبردار ہو جاؤ" "آگاہ رہو" کے معنی میں یہاں سیاق میں اس کا پورا مفہوم اُردو کا "کیا خوب" یا "کیوں نہ ہو" سے ادا ہوتا ہے۔

۳۳ (اسلام اور رسولِ اسلام پر صدق و اخلاص کے ساتھ)

دعویٰ ایمان کا تو اب بھی ان لوگوں کو تھا، سمجھانے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔

ای ایمانا مقرونا بالاخلاص بعید اعن النفاق (کبیر) اخلصوا فی ایمانکم (خازن)

النَّاس۔ ناس اَلْ کے داخلہ کے بعد معرفہ ہو گیا، اب مراد ساری نوع انسانی نہ رہی بلکہ وہ متعین و مخصوص افراد رہ گئے، جو مخاطبین کے لیے معلوم و معروف تھے، روایتوں میں عبداللہ بن سلام وغیرہ حق شناس یہود کے نام آئے ہیں جنھوں نے اسلام کی صداقت کو قبول کر لیا تھا۔

ھم بعض الناس لا جمیعھم (ابن جریر) کما صدق المھاجرون والمحققون من اھل یثرب (قرطبی) ھم ناس معھودون کعبداللہ بن سلام واشیاعہ (کشاف)

یہ بھی جائز ہے کہ الناس کو انسان کامل کے معنی میں لیا جائے، اور اس صورت میں مراد ہو گی کہ ایمان ان کی طرح لاؤ جو صفتِ انسانیت میں کامل ہیں۔ اور واقعی انسان کہلانے کے مستحق ہیں۔

الکاملون فی الانسانیۃ (کشاف) واللام فی الناس للجنس والمراد بہ الکاملون فی الانسانیۃ۔ (بیضاوی)

اس سے اشارہ یہ نکلا کہ جو منکرین ہیں وہ صورۃً انسان ہیں لیکن حقیقتاً اپنی نافہمی کے لحاظ سے چوپائے ہیں۔

ومن عداھم کالبھائم فی فقد التمییز بین الحق والباطل (کشاف)

۳۴ (اس کے جواب اور اپنی صفائی میں)

۳۵ یہ طنز ہے اس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں پر، رسول ﷺ کے صحابیوں رضی اللہ عنہم پر۔

یعنون اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر۔ عن ابن عباس وابن مسعود)

یہی سنت آج تک چلی آ رہی ہے "ترقی پسندوں" "روشن خیالوں" اور "اہل تجدد" کے دربار سے آج بھی

**اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا**

کیا خوب! کم عقل تو خود یہی لوگ ہیں۔ اور اس کا بھی علم نہیں رکھتے ۳۶ اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان

**الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ**

لاچکے ہیں ۳۷ تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لاچکے ہیں ۳۸ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں ۳۹

"جمود پسند" "رجعت پسند" "تاریک خیال" وغیرہ کیسے کیسے خطابات خالص ومخلص اہلِ ایمان کو عطا ہوتے رہتے ہیں

۳۶ کیا ٹھکانا ہے ان کے حمق اور نافہمی کا! پہلے اِفساد کو اصلاح کہہ رہے تھے اب حمق بالائے حمق یہ ہے کہ عقل، دور اندیشی، حکمت کو بے عقلی ٹھہرا رہے ہیں! ایمانی حقائق سے انکار وتکذیب کا ایک وبال یہ بھی پڑتا ہے کہ خود عقل بھی ماری جاتی ہے اور ہر سیدھی چیز اُلٹی نظر آنے لگتی ہے۔

سَفِیہ کہتے ہیں اس کم عقل کو جسے اپنے نفع نقصان کی پوری تمیز نہ ہو۔

السفیہ الجاھل ضعیف الرأی القلیل المعرفة بمواضع المنافع والمضار (ابن جریر)

المراد بالسفہ الطیش وخفّة العقل وضعف الرأی (المنار)

**اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَآءُ** کی ترکیب میں بڑا ہی زور منافقین کی سفاہت پر ہے کس درجہ بے وقوف لوگ یہ ہیں کہ اپنے نفع نقصان میں تمیز ذرا نہیں کرتے۔

۳۷ (اور جو صاحبِ وجاہت اور صاحبِ اثر بھی ہیں) جیسے حضرت ابوبکر جو زمانۂ جاہلیت میں ایک بڑے تاجر تھے اور اب ایمان لاچکے تھے۔

ای ابابکر واصحابہ (ابن عباس)

۳۸ (اور آپ ہی جیسے مسلمان ہیں)

آمنا کإیمانکم (معالم)

یہ بات یہ لوگ ذی اثر مسلمانوں کی رضاجوئی اور خوشنودی کے لیے کہتے۔

غرورًا منهم للمؤمنین ومصانعة وتقیة (ابن کثیر)

منافقین کی ایک ذہنیت یہ بھی تھی کہ غریب عوام مسلمانوں کے مقابلہ میں تو اکڑتے رہتے لیکن مسلمانوں میں جو صاحبِ اثر واقتدار ہوتے اُن کے آگے خود جھک جاتے اور اُن سے بہ تملق پیش آتے، منافقتِ ایمانی کے بعد طبیعت میں تملق پیدا ہو جانا بھی کچھ قدرتی سا ہے۔

۳۹ یعنی اپنے شریر رفیقوں یا سرداروں کے پاس۔

**شَیٰطِیْنِهِمْ** مادہ شطن کے معنی خیر وحق سے بُعد کے ہیں اور شاطن شیطن دونوں بعید کے معنی میں ہیں۔ (تاج)

شیطان (بہ صیغۂ نکرہ) کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، ہر سرکش اور ہر بھڑکانے والے کو شیطان

## قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ

تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمھارے ساتھ ہیں ۵۵

کہتے ہیں، انسان، جنات، حیوانات سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، گو شیطان بہ طور ایک اسم وصفی کے مخصوص ہے ابلیس کے لیے۔

کل عات متمرد من الجن والانس والدواب فھو شیطان (مجاز) الشیطان کل عارم متمرد من انس او جن او من دابۃ (تاج) والشیطان اسم لکل عارم من الجن والانس والحیوانات (راغب) والشیطان معروف وکل عات متمرد من الجن والانس والدواب (لسان)

حدیث نبوی میں شیطان اور بھی وسیع مفہوم میں آیا ہے، چنانچہ تنہا سفر کرنے والے کو بھی "شیطان" بتایا گیا ہے چنانچہ نہایہ ابن اثیر میں اس پر بسط سے کلام ہے۔

شیطان کے ایک معنی انسان کے اخلاقی اور روحانی مرض کے ہیں اور لفظ کا یہ استعمال حدیث نبوی میں آیا ہے۔

وسمّی کل خلق ذمیم للانسان شیطانا فقال علیہ السلام الحسد شیطان والغضب شیطان (راغب)

اور تاج العروس نے بھی یہ معنی سنداً نقل کیے ہیں۔

یہاں شیاطین سے مراد رؤساء یہود و منافقین لیے گئے ہیں جو اپنی سرکشی و طغیان کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے، نیز ان کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے۔

کھنتھم ورؤساءھم (ابن عباس) رؤسھم فی الکفر (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود)

شیاطینھم سے ایک کھلی مراد یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جب اپنے بھڑکانے والوں سے ملتے ہیں۔

من دعاۃ الفتنۃ وعمال الافساد وانصار الباطل الذین یصدون عن سبیل الحق (المنار)

**خَلَوْا اِلٰى** خلی کا صلہ جب اِلٰی آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں کسی کے ساتھ تنہا ہونے کے، تنہائی میں ملنے کے۔

خلا الیہ اجتمع معہ فی خلوۃ (لسان) خلا الیہ ای انتھی الیہ فی خلوۃ (راغب)

**اِلٰی** حرف الی جب کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر لایا جاتا ہے تو اس کی معیت کا مفہوم ذہن میں پیدا ہو جاتا ہے، چنانچہ یہاں بھی اسی مفہوم معیت میں آیا ہے۔

"الی" حرف جار تأتی للمعیۃ وذلک اذا ضممت شیئًا الی اخر کقولہ تعالی واذا خلوا الی شیاطینھم (تاج)

**۵۵** (اپنے اصلی عقائد و خیالات میں)

یعنی ہم مسلمانوں کے ساتھ تو محض ظاہر داری کے طور پر ہیں اور مصلحۃً اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں ورنہ حقیقۃً تو ہم تمھارے ہی ہم عقیدہ و ہم مذہب ہیں۔

انا معکم ما انتم علیہ من التکذیب بمحمد (ابن جریر)

إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ

ہم تو محض بنا رہے تھے ۴۱؎ انھیں اللہ بنا رہا ہے ۴۲؎ اور وہ انھیں ڈھیل دے رہا ہے ۴۳؎

يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

(تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں ۴۴؎

---

۴۱؎ (ان مسلمانوں کو اور ان کے پیمبر اور ان کے صحابیوں کو)

بمحمد واصحابه (ابن عباس)

مطلب یہ ہوا کہ عوام منافقین جب تنہائی میں اپنے سرداروں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم دل وجان سے تو آپ ہی کے ساتھ ہیں، باقی مسلمانوں کے بنانے کے لیے ان کی سی کہہ دیتے ہیں۔

استهزاء کے معنی تمسخر کرنے، ہنسی اڑانے، بنانے کے ہیں۔

۴۲؎ یعنی ان کے تمسخر کو انھیں پر پلٹے دیتا ہے، مجازات، سزا، معاوضہ کے موقع پر محاورۂ عرب میں یہ طریقہ عام ہے کہ جزائے فعل کو اصل فعل ہی کا نام دے دیا جاتا ہے۔

ای یجازیھم جزاء الھزو (راغب) مثل قول نسوا الله فنسیھم ای جازاھم جزاء النسیان (ابن قتیبه) جزاء الاستھزاء باسمه کما جزاء السیئة سیئة (بیضاوی) انما ھو علی مقابلة اللفظ بمثله ومزاوجته له وتقول العرب الجزاء بالجزاء والاول لیس بجزاء ومنه قول الشاعر۔

ألا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

ومعلوم انه لم یمتدح بالجھل ولکنه جری علی عادتھم فی ازدواج الکلام ومقابلته (جصاص)

ہنسی اور تمسخر کا انتساب ذات باری تعالیٰ کی جانب قدیم صحیفوں میں برابر موجود ہے۔

"تو اے خداوند ان پر ہنسے گا، تو ساری قوموں کو مسخرہ بنا دے گا۔" (زبور ۵۹: ۸)

"میں تمھاری پریشانیوں پر ہنسوں گا، اور جب تم پر دہشت غالب ہوگی تو میں ٹھٹھے ماروں گا۔" (امثال ۱: ۲۶)

۴۳؎ (اپنے قانون تکوینی کے مطابق)

خالق کائنات نے بندوں کو جو آزادی واختیار دے رکھا ہے، اس میں وہ خواہ مخواہ دست اندازی کبھی نہیں کرتا، سانپ کو کاٹنے کی، زہر کو ہلاک کرنے کی، آگ کو جلانے کی، یہ ساری اجازتیں اور آزادیاں اسی کے قانون تکوینی کے مطابق ہیں۔

۴۴؎ یہ خود ایک تفسیر ہوگئی اللہ کے "استہزاء" کی۔

عمہ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سجھائی نہ دے اور وہ ادھر ادھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔

ھو التردد فی الضلال والتحیر فی منازعة (تاج) العمی فی العین والعمه فی القلب (قرطبی)

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی خرید کرلی ہدایت کے بدلے ۴۵ سو نہ اُن کی تجارت ہی سود مند ہوئی

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

اور نہ وہ راہ یاب ہوئے ۴۶

وحی الٰہی کی روشنی سے محرومی کے بعد بڑے سے بڑے روشن خیال انسان کی بھی واقعی یہی حالت ہوجاتی ہے، اپنی محدود و ناقص "عقل" کے سہارے وہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے طرح طرح کے "نظریے" قائم کرتا ہے، "اصول" و "کلیات" بناتا ہے ہر طرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے بھلا ہوا راستہ جس سے قلب کو سکون کامل حاصل ہوجائے کوئی نہیں سجھائی دیتا ہے، شک، ارتیاب، بے اطمینانی کے دلدل میں اور زیادہ پھنستا جاتا ہے۔

۴۵ ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ انھوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنس بے بہا قیمت میں دے کر خریدی بھی تو کیسی نکمی اور بے حقیقت چیز، گمراہی و کفر۔

اشْتَرَوْا۔ اشتراء یا خریداری کے معنی کسی چیز کا معاوضہ میں لینا۔ ایمان کا قبول کرلینا ان منافقین کے بالکل اختیار کے اندر تھا، لیکن اس کے بجائے انھوں نے روش کفر کی اختیار کرلی، اہل عرب ہر استبدال کے موقع پر اشتراء بولتے ہیں۔

اختاروا الکفر علی الایمان (ابن عباس) ای استبدلوا الکفر بالایمان (معالم) والعرب تستعمل ذلک فی کل من استبدل شیئاً بشیء (قرطبی) ویجوز الشراء والاشتراء فی کل ما یحصل به شیء (راغب)

بِالْهُدَىٰ میں ب کے معنی بعوض۔

ای بدلاً منه (ابوسعود)

عرب کے باشندوں کا تجارتی کاروبار خوب پھیلا ہوا تھا، اور تجارت کی اصطلاحیں ان کی زبان و ادب کا ایک جزو بن گئی تھیں، جیسا کہ آج کل انگریزوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے اور ان کی کاروباری تجارتی اصطلاحیں انگریزی زبان و ادب کا جزو بن چکی ہیں۔

۴۶ (اور ہوتے بھی کیسے، جب کہ اپنی قوتِ ارادہ و فیصلہ سے صحیح کام نہ لے کر خود گمراہی خرید رہے تھے) تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے یہاں منافق کا فروں نے نفع کا کیا ذکر، عقل سلیم کے سرمایہ ہی کو اُلٹا برباد کر ڈالا۔ (کبیر)

رِبح بھی تجارتی اصطلاح ہے، اردو کے لفظ نفع کے معنی میں۔

فَمَا رَبِحَتْ میں حرف "ف" نے صاف کردیا کہ یہ عدم نفع نتیجہ اور معلول رہا خریداریِ ضلالت کا۔

اتی بالفاء للاشارۃ الی تعقیب نفع الربح للشراء (روح)

مَثَلُهُمۡ كَمَثَلِ الَّذِى اسۡتَوۡقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتۡ مَا حَوۡلَهٗ

ان کی (عجیب) مثال تو ان کی سی (عجیب) مثال ہے ۴۷ جنھوں نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اپنے اِرد گرد کو

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوۡرِهِمۡ وَتَرَكَهُمۡ فِىۡ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ ﴿۱۷﴾

روشن کر دیا ۴۸ تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کرلی، اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں ۴۹

۴۷ (محرومی و خسران کے لحاظ سے)

الَّذِى لفظاً واحد ہے لیکن یہاں معناً بطور جمع کے استعمال ہوا ہے۔

یقع للواحد والجمع (قرطبی) وضع الذی موضع الذین (کشاف)

عربی میں متعدد نظائر اس طریق استعمال کے کہ لفظ واحد لاکر مراد جمع لی گئی ہے، خود قرآن مجید ہی میں مل جاتے ہیں مثلاً خضتم کالذی خاضوا۔ الذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون ماخلقکم ولابعثکم الا کنفس واحدۃ، وغیرھا۔

مَثَل کے مفہوم میں ایک پہلو ندرت وغرابت کا بھی شامل رہتا ہے یعنی ایسا حال جو عجیب وغریب ہو۔

ولم یضربوا امثلا الا قولا فیہ غرابۃ من بعض الوجوہ (کشاف)

۴۸ یعنی مسائل وحقائق خوب واضح اور روشن ہوگئے۔

۴۹ (اور طرح طرح سے ٹھوکریں کھا رہے ہیں)

مطلب صرف اس قدر ہے کہ منافقین کا اندرونی نورِ بصارت سلب ہوگیا ہے، یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں میں طلبِ حق مطلق نہ تھی اور قانونِ اسلام کے مقابلہ میں وہ راہ تمام تر انکار وبغاوت کی، اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ادنیٰ وحقیر مصلحت کوشیوں کی بناء پر زبان سے اظہارِ اسلام کیے جاتے تھے، یہاں ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جب حقانیت کی آگ خوب روشن ہوگئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا، تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے، منافقین نے خود اپنے اندرونی حاسۂ بصارت کو ضائع کر دیا اور اس روشنی سے محروم ہوگئے، سلبِ بصارت اور گمراہی میں چھوڑ دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب محض تکوینی حیثیت سے ہے یعنی جب منافقوں نے گمراہ رہنا چاہا اور دعوتِ حق کو قبول و توجہ کے کانوں سے سنا ہی نہیں تو مشیتِ الٰہی نے بحیثیت علت العلل کے اس پر نتیجہ بھی وہی مرتب کر دیا۔ رضاءِ الٰہی کو اس میں مطلق دخل نہیں۔

نُوۡرِهِمۡ ..... ظُلُمٰتٍ، نور کے صیغۂ واحد اور ظلمات کے صیغۂ جمع میں لانے سے نکتہ یہ پیدا کیا گیا ہے کہ راہ حق وہدایت خطِ مستقیم کی طرح صرف ایک ہی ہے اور گمراہیاں خطِ منحنی کی طرح بے شمار ہو سکتی ہیں۔

فانّ الحق واحد وھو صراط اللہ المستقیم ....... بخلاف طرق الباطل فانھا متعددۃ متشعبۃ (ابن القیم)

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ

(وہ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں ۵۰ تو اب وہ واپس نہ ہوں گے ۵۱ یا پھر جیسے آسمان سے

فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ

زور کا مینھ برس رہا ہو ۵۲ اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی ۵۳

۵۰ یعنی صدائے حق گویا سنتے ہی نہیں، اور کلمۂ حق و ایمان کے ادا کرنے سے ان کی زبان گنگ ہے اور دیدِ حق کی طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہوچکی ہیں، اور یہ سب کچھ اپنی اختیاری گمراہی کے نتیجہ کے طور پر۔

۵۱ (اور باطل سے حق کی طرف، کفر سے ایمان کی طرف، اندھیرے سے روشنی کی طرف)

عن کفرھم وضلالتھم (ابن عباس) الی الھدیٰ ولا الی خیر (ابن جریر عن ابن عباس)

۵۲ منافقین مدینہ کے بھی دو طبقے تھے، ایک تو وہ تھے، جن کے دلوں میں سرتاپا کفر تھا، ایمان کا گزر ہی نہ تھا، اس طبقہ کی تمثال ابھی اوپر گزر چکی ذھب اللہ بنورھم وترکھم فی ظلمٰت لایبصرون دوسرا طبقہ ان منافقین کا تھا جو کبیر منکر نہ تھے بلکہ آج کل کے بعض انتہائی "روشن خیالوں" کی طرح متشککین ومذبذبین میں تھے، اسلام کی ظاہری قوت وشوکت اور مادی اقتدار وتمدنی کو دیکھ کر کبھی چند قدم اس کی طرف بڑھتے اور جب سلسل کامیابی نہ پاتے تو پھر پیچھے ہٹ جاتے، آیت میں تمثال اسی طبقہ کے منافقین کی بیان ہورہی ہے۔

ھذا مثل اٰخر ضربہ اللہ تعالیٰ لضرب اٰخر من المنافقین وھم قوم یظھر لھم الحق تارۃ ویشکون تارۃ اخری (ابن کثیر) ھذا ھو المثل الثانی للمنافقین (کبیر)

كَصَیِّبٍ۔ تمثیل میں اس باران رحمت سے اشارہ ہے طلوع اسلام کی جانب۔

المراد من الصیب ھو الایمان والقرآن (کبیر) وھو مثل القرآن الذی بہ حیات القلوب کالمطر الذی بہ حیات الارض والنبات والحیوان (ابن القیم)

صَیِّب کے معنی بارش کے ہیں اور یہی تابعینؒ وصحابہؓ سے منقول بھی ہیں۔

والصیب فی المشھور المطر وھو المراد ھنا عن ابن عباس وابن مسعود ومجاھد وقتادہ وعطاء وغیرھم (روح) المطر الذی یصوب من السماء ای ینزل منھا بسرعۃ (ابن القیم) جعل الصوب لنزول المطر اذا کان بقدر ما ینفع (راغب)

السَّمَآء یہاں کثرت سے اس کے معنی بادل یا سحاب کے نقل ہوئے ہیں۔

ای من السحاب (معالم) قیل المراد بالسماء السحاب (بیضاوی)

اُفق بھی اس کے معنی لیے گئے ہیں۔ والمراد بالسماء ھنا الاُفق (روح)

سماء کے خود لفظی معنی میں بھی اس مفہوم کی پوری گنجائش موجود ہے کہ ہر چیز جو انسان سے اوپر کی طرف ہو لغت میں سماء ہی ہے۔

يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ

وہ ٹھونسے ہوئے ہیں اپنے کانوں میں انگلیاں کڑک کے سبب اور موت کے اندیشہ سے ۵۴

وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

حالانکہ اللہ گھیرے ہوئے ہے کافروں کو ۵۵

السماء کل ما علاك فأظلك (صحاح)

سماء کے معنی بارش کے بھی برابر مستعمل ہیں۔

والسماء المطر (صحاح)

أَوْ کو بعض نے یہاں بَل کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے وَ کے معنی میں (کبیر) صاحبِ روح نے بھی یہ قول نقل کیے ہیں۔

وزعم بعضهم ان او هنا بمعنى الواو وقيل بمعنى بل۔

لیکن خود ان کو رد کر کے صاحبِ بحر کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ او یہاں تفصیل کے لیے ہے کہ دیکھنے والا اوپر کی دونوں تمثیلوں میں سے ایک اختیار کر سکتا ہے۔

نعم اختار ابو حيان انها للتفصيل۔ (روح)

۵۳ اشارہ ہے اُن شدائد کی طرف جو آغاز اسلام میں امت کو برداشت کرنے پڑتے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شرعی پابندیاں مراد ہوں جو اظہار اسلام کے بعد بہرحال منافقین پر بھی عائد ہو جاتی تھیں، مثلاً ادائے نماز، فریضۂ جہاد، ترکِ امارتِ قدیم، اطاعتِ رسول وغیرہا (کبیر)

مما فيه من الاوامر الشديدة بكلها والاعداد والصبر على الامر والاوامر الشاقه على نفوس التي هي على خلاف اهوائها۔ (ابن القيم)

فيه میں ضمیر کا مرجع صَيِّب بھی ہو سکتا ہے اور السماء بھی۔

ظلمت کا تعلق فی صَيِّب سے بھی ہو سکتا ہے اور فی السماء سے بھی حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

۵۴ یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے والے وہی اندھیریوں میں راہ چلنے والے ہیں یعنی منافقین ومذبذبین مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنی بزدلی، پست ہمتی، دونِ فطرتی کی بنا پر اسلام لانے میں ہر وقت خطرے ہی دیکھ رہے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی نقل ہوئے ہیں کہ منافقین قرآن مجید کے بیانات اور احکام ومواعید کی تصریحات سننے ہی سے بچنا چاہتے تھے، اور کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں یہ کلام اثر نہ کر جائے اور انھیں اسلام لاتے ہی نہ بن پڑے۔

من الصواعق. یہاں اشارہ ہے قرآن مجید کے بیانات اور اس کے وعیدوں کی جانب۔

اى من بيان القرآن ووعده ووعيده (ابن عباس)

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙۗ وَاِذَآ

قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اُچک لے جائے ٥٦ وہ جب اُن پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چلنے ہیں

اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ

اور جب ان پر اندھیرا ہوا (تو بس) کھڑے رہ جاتے ہیں ٥٧ اللہ اگر چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کر لیتا ٥٨

حَذَرَ الْمَوْتِ ای مخافۃ میل القلب الیہ (ابن عباس)

الموت۔ موت عام خیال کے مطابق ختم زندگی اور عدم محض کا نام ہے لیکن قرآن اُسے زندگی ہی کی طرح ایک مستقل اثباتی وجود دیتا ہے اور یہی اہلِ سنّت کا مسلک ہے۔

وصحح محققوا اھل السنۃ ان الموت صفۃ وجودیۃ خُلقت ضد للحیاۃ (روح)

٥٥ (اپنے علم سے، قدرت سے، ہر لحاظ سے)

سو کافر اس کی گرفت سے بچ کر جا کہاں سکتے ہیں اور اس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں اور حیلے بے اثر رہیں گے جیسے محیط سے وہ چیز نہیں بچ سکتی جو اُس کے احاطہ میں ہو۔

ای عالم بھم وجامعھم فی النار (ابن عباس)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق پر محض علم ہی کے لحاظ سے محیط نہیں، بلکہ ذاتاً بھی محیط ہے بلا کسی کیفیت کے۔ اور عارف رومی نے کہا ہے ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

٥٦ (اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں)

تشبیہ مرکب کے سلسلہ میں بیان ہو رہا ہے آثار غلبۂ اسلام کی قوت و شدت کا، کہ یہ منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے کے لیے اور انھیں مرعوب کرنے کے لیے کافی ہے۔

وھذا تمثیل لشدۃ الامر علی المنافقین۔ (کشاف)

٥٧ یعنی جب اسلام کی مادّی فتحمندیاں اور کامیابیاں دیکھتے ہیں تو ان منافقین و مذبذبین کے قدم گویا اضطراراً اسلام کی طرف بڑھنے لگتے ہیں، طلبِ حق تو ان کے دل میں ہوتی ہی نہیں، البتہ مرعوبیت کچھ دیر کے لیے آمادہ کر دیتی ہے لیکن جب اہلِ ایمان کو ابتلاء پیش آنے لگتے ہیں تو یہ منافقین و مذبذبین انکار اور بے یقینی کے مقام پر ٹھٹک جاتے ہیں اور اسلام کی طرف ان کے بڑھتے ہوئے قدم رُک جاتے ہیں۔

كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ۔ کلما اصاب المنافقین من عزّ الاسلام اطمأنوا الیہ (ابن کثیر عن ابن عباسؓ)

وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا۔ واذا اصاب الاسلام نکبۃ قاموا لیرجعوا الی الکفر (ابن کثیر عن ابن عباسؓ)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ ایسا ہی حال اس سالک کا ہے جو حالتِ بسط میں طاعات میں لگا رہتا ہے اور حالتِ قبض میں چھوڑ بیٹھتا ہے۔

٥٨ (جیسا معاملہ کہ بعض اگلی قوموں کے ساتھ بھی پیش آ چکا ہے۔)

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۰﴾ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۹ اے انسانو! ۶۰ عبادت (اختیار) کرو اپنے پروردگار کی ۶۱

الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾

جس نے تمہیں پیدا کیا ۶۲ اور تم سے قبل والوں کو (بھی) ۶۳ عجب نہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۴

توریت میں ہے :-

"جب وہ اس کی طرف کو اُترے تو اَلِیشع نے خداوند سے دعا مانگی اور کہا مہربانی کر کے اُن لوگوں کو اندھا کر دیجئے سو اس نے جیسا کہ الیشع نے کہا تھا ان کو اندھا کر دیا۔" (۲ سلاطین ۶ : ۱۸)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ یعنی مشیتِ الٰہی اگر یہی ہوتی، قانونِ تکوینی اگر اب بھی یہی ہوتا۔

اس سے اشارہ یہ بھی نکل آیا کہ مؤثرِ حقیقی صرف ارادۂ الٰہی ہے، اور اسباب ظاہری میں تاثیر جو کچھ بھی پیدا ہوتی ہے مشیتِ الٰہی سے پیدا ہوتی ہے بذاتِ خود نہیں۔

والتنبیہ علی ان تاثیر الاسباب فی مسبّباتہا مشروط بمشیۃ اللّٰہ تعالٰی (بیضاوی)

۵۹ (چنانچہ اس پر قادر ہے اور اب بھی یہی کر سکتا ہے)

قَدِیْرٌ۔ صیغۂ مبالغہ ہے، زور و قوت میں قادر سے زیادہ، اسلام کا خدا قادرِ مطلق ہے، ہمہ تواں ہے۔

القدیر فعیل منہ وھو للمبالغۃ (نہایۃ)

مصری، ہندی، یونانی خداؤں کی طرح ناقص اور محدود القویٰ نہیں۔

قدیر کے مفہوم میں ایسا فاعل داخل ہے جس کا فعل ہمیشہ عین مقتضائے حکمت ہی ہوتا ہے نہ اس سے کم نہ اس سے زائد۔ اور اسی لیے اسم قدیر کا اطلاق بجز اللہ تعالٰی کے کسی کی ذات پر نہیں ہوتا۔

القدیر والفاعل بما یشاء علٰی قدر ما تقتضی الحکمۃ لا زائدا علیہ ولا ناقصا عنہ ولذٰلک لا یصح ان یوصف بہ الا اللّٰہ تعالٰی (راغب)

ابھی ارشاد ہوا تھا کہ مشیتِ الٰہی بندوں کو مسلوب الاختیار بنا کر رکھنے کی نہیں اب ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اللہ کی قدرت کسی سے مجبور نہیں، اس کا ارادہ ہر قانون پر غالب ہے اس کی صفت قدرتِ کاملہ کے باب میں کوئی دھوکا نہ ہو۔

۶۰ قرآن مجید کا مخاطب سارا عالمِ انسانیت ہے کوئی مخصوص نسل مثلاً بنی اسرائیل اور کوئی مخصوص قوم مثلاً اہل عرب نہیں۔

خطاب لجمیع من یعقل (بحر) وھو ھھنا عام (معالم)

یہ طرزِ خطاب خود ایک دلیل ہے تخاطب کے عام ہونے پر اور قرآن مجید کے خطاب کی عالمگیری پر پچھلے دو رکوعوں میں موجوداتِ انسانی کی سہ گانہ تقسیم ازروئے اعتقاد بیان ہو چکی ہے یعنی مومن، کافر، منافق، اب سارے عالمِ انسانی کو خطاب مجموعی طور پر شروع ہو رہا ہے۔

# الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ص

وہ وہی (پروردگار) ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش اور آسمان کو ایک چھت بنا دیا ہے ۶۵

۶۱ قرآن مجید کے اصل پیام کا آغاز گویا اب ہو رہا ہے۔ اور اس کا عنوان اول ہے مسئلۂ توحید کہ وہی اصل و اساس ہے سارے عقائد و مسائلِ اسلامی کی۔

رَبَّکُمُ۔ اسماء الٰہیہ میں سے یہاں سب سے اول اِسم رب کو لانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ صفاتِ الٰہی میں کتنی بڑی اہمیت صفتِ ربوبیت کو حاصل ہے۔

۶۲ (تن تنہا بلا کسی کی شرکت و اعانت کے)

خَلَقَکُمْ۔ عملِ تخلیق خالص خدائی عمل ہے، ہمسر و مساوی ہونا تو خیر الگ رہا، ماتحت و معاون کی حیثیت سے بھی کوئی شریکِ تخلیق نہیں، پھر خَلَقَکُمْ سے اس پر بھی زور دینا مقصود ہے کہ کائنات "خلق" ہوئی ہے یعنی نیست سے ہست ہوئی ہے، عدم سے وجود میں آئی ہے، یہ نہیں کہ پہلے سے کوئی غیر مخلوق مادہ موجود تھا، اللہ نے اس کی صورت میں کوئی خاص صفت و ترتیب پیدا کر دی۔ بہت سے باطل مذہبوں کا رد اسی سے نکل آیا۔

الخلق اختراع الشئ علی غیر مثال سبق (معالم) یستعمل فی ابداع الشئ من غیر اصل ولا احتذاء (راغب)

۶۳ (پس الوہیت و معبودیت کا سزاوار وہی ایک ہے جو تمہارا رب بھی ہے اور خالق بھی)

اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ۔ اس سے پچھلی انسانی نسلوں کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ خلقتِ انسانی سے قبل ہوئے زمین پر کوئی اور مخلوق بھی آباد ہو، جیسا کہ توریت میں درج بھی ہے، قرآنی لفظ ان سب ممکن مخلوقات پر حاوی ہے۔ "تم کو (یعنی موجودین بصیغۂ حال) اور تم سے قبل والوں کو" (یعنی موجودین بصیغۂ ماضی) یہ دو لفظ لا کر قرآن مجید نے اشارہ ادھر بھی کر دیا کہ توحید کا درس ماضی و حال، تاریخ و مشاہدہ دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۶۴ (کہ توحید ہی درجۂ تقویٰ تک پہنچانے کا بے خطا نسخہ ہے)

تکونوا من المتقین الذین رضی اللہ عنھم ربھم (ابن جریر)

لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے "تاکہ تم اس طریقہ سے بچ جاؤ" (اپنے پروردگار سے) لَعَلَّ ہے تو اظہارِ شک اور امید و آرزو کے لیے لیکن قرآن مجید میں جہاں حق تعالیٰ کی طرف سے ادا ہوا ہے تو کسی فعل کی آرزو کی جگہ اس کے وقوع کا اور شک و احتمال کی جگہ یقین کا مفہوم پیدا ہو گیا ہے۔ اردو ترجمہ "تاکہ" سے بھی جائز ہو گیا ہے۔

ھی کلمۃ رجاء وطمع وشك وقد جاءت فی القرآن بمعنی کی (لسان) وقد جاءت فی القرآن بمعنی کی (تاج) ذکر بعض المفسرین ان لعل من اللہ واجب وفسر فی کثیر من المواضع بکی (راغب) قال سیبویہ لعل وعسی حرفا ترج وھما من اللہ واجب (معالم)

۶۵ آیت کے اس ٹکڑے کی جان یا اصل روح جَعَلَ لَکُمُ ہے مقصود زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا

یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت بیان کرنا کسی درجہ میں بھی نہیں، بیان صرف یہ کرنا ہے کہ زمین ہو یا آسمان کوئی بھی از خود نہیں بن گئے ہیں بلکہ جو کچھ اور جیسے بھی کچھ ہیں، اللہ کے بنائے ہوئے اور اسی قادر مطلق کے زیر فرمان ہیں۔

رَبَّكُمُ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الخ دوسری تعلیم ساتھ ہی ساتھ یہ ملی کہ زمین و آسمان انسان کے لیے خلق ہوئے ہیں، انسان زمین و آسمان کے لیے خلق نہیں ہوا ہے، مقصود و مطلوب انسان ہے، زمین و آسمان دونوں باذن الٰہی اسی خلیفۃ اللہ کے خادم ہیں، پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان اپنے ان خادموں کے آگے خود ہی جھکنے لگے اور اُلٹا انھیں معبود قرار دے کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

اَرْض۔ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے قدموں کے نیچے ہو۔

کلّ ما سفل فھو ارض (تاج) یعبر بھا عن اسفل الشیٔ کما یعبّر بالسماء عن اعلاہ (راغب)

اسی طرح سماء ہر اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اوپر ہو۔

السماء کل ما علاک (تاج) کل ما علا فاَظَلّ قیل له سماء (قرطبی) سماء کل شیٔ اعلاہ (راغب) السماء سقف کل شیٔ و کل بیت (لسان) وقال الزجاج السماء فی اللغة یقال لکل ما ارتفع وعلا قد سمایسمو وکل سقف فھو السماء (لسان) السماء ارتفاع والعلوّ (لسان) السماء مجموع ما فوقنا من العالم (المنار)

اَرْض میں اصل تخیّل پستی کا ہے اور انسان کے تعلق میں اس کا اصلی وصف فراش یا ما یفرش کا ہے یعنی وہ ایسی چیز ہے جو بچھا دی گئی ہے یا بچھی ہوئی ہے، ہمارے لیے فرش ہے یا ایسی ٹھوس اور ہموار چیز ہے جس پر ہم قدم رکھ سکتے ہیں، چل سکتے ہیں، بیٹھ سکتے ہیں، لیٹ سکتے ہیں نہ کہ کوئی ایسی کھردری یا پلپلی چیز ہے جس پر بیٹھنا، چلنا، قدم رکھنا ناممکن ہو، یہ زمین اپنی ہیئت کے لحاظ سے گول ثابت ہو یا چپٹی، بہرحال و بہرصورت اس کا تعارف انسان اور انسانیت کے سلسلے میں اس سے بہتر ممکن نہیں کہ وہ انسان کے لیے فرش کا کام دے رہی ہے اور اس کام پر اسے اللہ ہی نے لگایا ہے، چنانچہ قرآن نے یہاں اس کا یہی وصف بیان کر دیا۔

اسی طرح سماء میں اصل تخیّل بلندی کا ہے، زمین جس طرح بطور فرش ہمیں نیچے سے سنبھالے ہوئے ہے، آسمان اُسی طرح ہمیں اوپر سے ڈھانپے ہوئے ہے، ظاہر ہے کہ جو محسوس و مرئی چیز اس قدر بلند ہے کہ بڑے بڑے بلند میناروں کی بلندیاں اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں، پرندوں اور طیاروں کی بڑی سے بڑی بلند پروازیاں سب اس کے اندر سما جائیں اور سب اس سے پست ہی رہیں تو چھت کا اطلاق اس پر بھی نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا۔

زمین کی طرح آسمان کی ہیئت سے قرآن مجید یعنی دنیا کے اس اخلاقی اور روحانی نظام نامہ کو کوئی تعلق نہیں، آسمان کوئی ٹھوس مادّی جسم رکھتا ہے یا محض خلا و منتہائے نظر ہے، اس قسم کے مسائل کا تعلق تمام تر دنیوی تجربی علوم سے ہے، قرآن کو تو آسمان کا صرف وہی وصف بیان کرنا تھا جو سلسلۂ عبدیت بشری و خلافت الٰہی سے تعلق رکھتا ہے اور یہی اس نے کر دیا، زمین و آسمان کی پوجا ہر مشرک جاہل ”متمدن“ قوم نے کی ہے اور آسمان کو تو بہت بڑا دیوتا یونانیوں سے لے کر ہندیوں تک سب نے مانا ہے، قرآن کے تعارفِ زمین و آسمان کی اصلی زد انھیں مشرکانہ تخیلات اور جاہلی اوہام پر آکر پڑتی ہے۔

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا

اور آسمان سے پانی اُتارا ۶۶ پھر تمہارے لیے غذا کو پھل پیدا کیے ۶۷ سو تم

تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ ۶۸ اور تم جانتے (بوجھتے) بھی ہو ۶۹

۶۶ (اسی معبودِ واحد و برحق اور اسی خالقِ یکتا و مطلق نے نہ کہ کسی دیوی دیوتا نے)

السَّمَآءِ بالکل جائز ہے کہ یہاں ابر کے معنی میں ہو۔

ومن هذا قيل للسحاب السماء لانها عالية (لسان) هي سقف كل شئ.... والسحاب والمطر (ابو البقاء) السماء بناء وهي مسقف والمراد به السحاب هھنا۔ (ابن کثیر)

مقصود اس حقیقت کی تعلیم ہے کہ آسمان اور بارش سب خدائے واحد ہی کی مخلوق و مصنوع ہیں نہ کوئی آکاش دیوتا ہیں نہ کوئی اِندر دیوتا اور نہ کوئی FATHER - ZEUS بلکہ یہ کلدانیوں مصریوں، ایرانیوں ہندیوں، یونانیوں، رومیوں کے سب گڑھے ہوئے خرافات ہیں آسمان اور بارش کی پرستش دنیا سے بالکل ختم ابھی نہیں ہوئی ہے ایشیا، افریقہ، امریکہ تینوں براعظموں کے خدا معلوم کتنے گوشوں میں اب بھی یہ شرک جاری ہے لفظ سماء کے معنی اوپر کے حاشیہ میں ابھی گزر چکا ہے کہ بہت وسیع ہیں اس لیے سماء سے پانی کا اترنا، بخارات کے منجمد ہونے اور پھر گرمی پاکر برس پڑنے، یا اور اسی طرح کے درمیانی واسطوں کے ہرگز منافی نہیں۔

۶۷ (اسی معبود واحد اور خالق یکتا نے نہ کہ کسی اور دیوی دیوتا نے)

خدا جانے کتنی مشرک قومیں الگ الگ دیوی دیوتا، زراعت کے، نباتات کے، پھل پھلاریوں کے مان چکی ہیں، قرآن مجید کا کام مسائلِ طبعیات، فلکیات، جغرافیہ طبعی وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ان عالمگیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کی تردید ہے کائنات میں جو کچھ ہے یا جو کچھ ہورہا ہے تمام تر قادرِ مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے۔

بِهٖ یعنی پانی کے واسطہ یا ذریعہ سے۔

المعنى انه جعل الماء سببا في خروجها ومادة لها (کشاف)

پانی خصوصاً بارشی پانی کو جو دخل عظیم ہر قسم کی زمینی پیداوار اور نباتات میں ہے اور پھر بالواسطہ بھی اور براہِ راست حیوانی اور انسانی زندگی کے قیام و بقا میں، ان سب کی تفصیل اگر لکھی جائے تو بجائے تفسیر قرآن کے ایک ضخیم سائنسی مقالہ تیار ہوجائے۔

۶۸ (کسی کو کسی حیثیت سے بھی)

خلیفۃ اللہ جب کبھی اپنے مقام و مرتبہ کو بھول کر پستی میں گرا ہے تو اس نے اپنا سر جھکایا اور ہاتھ پھیلایا ہے درختوں کے آگے، ان کے پھلوں کے آگے، بارش کے دیوتا کے آگے، زمین کے آگے۔ آسمان کے آگے قرآن مجید اسی حماقت و سخافت پر اُسے تنبیہ کر رہا ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ

اور اگر تم اُس (کتاب) کے بارہ میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اُتاری ہے تو کوئی ایک سورت اس جیسی تم بھی لے آؤ

فَلَا تَجْعَلُوْا میں ف سببیہ ہے یعنی جس نے تمہیں ان نعمتوں کے ساتھ پیدا کیا وہ ہے ہی اسی لائق کہ کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

اَنْدَادًا۔ ندّ عربی میں کہتے ہیں مثل و مشابہ کو بھی، اور مخالف و مدِّ مقابل کو بھی۔

النِّدّ المثل والنظیر وقال الأخفش النِّدّ الضِّدّ والشبه (تاج)

چنانچہ اَنداد کے معنی اضداد اور اشباہ دونوں کے لیے گئے ہیں۔

لفظ کی جامعیت میں نکتہ یہ ہے کہ شرک دُنیا میں دونوں قسم کا مروّج رہا ہے، بہت سی قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو محض ایک خدائے اصغر یا ماتحت خدا تسلیم کیا ہے اور مجوس نے اہرمن کو یزداں کے حریف و مدِّ مقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

٦٩ (اپنے الہام فطری اور عام فہم بشری کی بنا پر کہ سب کا حاکم، سب کا خالق بس وہی ایک ہے) اتنی بصیرت جو توحید تک پہنچا دے ہر قلب بشری میں ودیعت رکھ دی گئی ہے بشرطیکہ غلط تعلیم و تربیت اور ناقص ماحول اس فطرت ہی کو مسخ نہ کر ڈالے۔

وانتم تعلمون انّ صانع هذه الأشياء (ابن عباس) انّكم لكمال عقولكم تعلمون ان هذه الأشياء لا يصحّ جَعْلُها انداداً لله تعالىٰ (كبير)

مغربی محققین و مفکّرین نے بھی بڑے ردّ و قدح کے بعد مانا کہ نوعِ بشری کا اوّلین و قدیم ترین عقیدہ توحید کا رہا ہے نہ کہ شرک کا۔

٧٠ (یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے کے باب میں اے کافرو اور منکرو!)

خطاب یہاں یٰاَیُّھَا النَّاس کے تحت ساری نوعِ انسانی سے ہو رہا ہے، صرف قریش بلکہ صرف اہلِ عرب سے ہی نہیں ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہارے خیال میں یہ کلام الٰہی نہیں تو یقیناً ایک انسانی تصنیف ہوگی اور جب کوئی ایک انسان ایسی تصنیف پر قادر ہے تو کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے چہ جائیکہ لائق و فائق انسانوں کا ایک پورا مجمع۔

کلمۂ اسلام کے اجزاء ترکیبی دو ہیں: ایک توحیدِ باری، دوسرے رسالتِ محمدی، توحید کا بیان اوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا، اب دعوت تصدیقِ رسالت کی دی جا رہی ہے۔

٧١ (جن کا نام محمدؐ ہے)

سیاق و موقع ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خاص قُرب و اختصاص کے اظہار کا ہے نیز آیت میں ایک پُرزور اور دائمی چیلنج منکرین کو دیا جا رہا ہے لیکن اس انتہائی زور اور اہمیت کے موقع پر بھی جو سردارِ انبیاء اور سردارِ رُسل تھے، وہ قرآن کی زبان میں محض ایک "عبد" بندہ بتائے جا رہے ہیں نہ خدا کے بیٹے اور اکلوتے بیٹے، نہ خدا کے مثل، نہ خدا کے بُروز یا اوتار، نہ خدا کے وزیر یا مشیر، بلکہ محض عبد یا محض بندے! توریت میں خداوند کے خادموں

کا لقب ایسے ہی اعزاز و اکرام کے موقع پر آیا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نبی، اسحاق نبی اور یعقوب نبی کو خداوند کا خادم ہی ٹھہرایا ہے۔

نَزَّلْنَا یعنی جس کلام کو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے بہ تدریج حسب ضرورت و مصلحت اُتارا ہے، شک و تردد کا ایک بڑا سبب یہی نزولِ تدریجی تھا، منکرین کہتے تھے کہ جس طرح اور شاعر سوچ سوچ کر شعر کہتے ہیں، یہ "رسول" بھی وقفوں کے ساتھ اُسے گڑھتے رہتے ہیں، خدائی کلام ہوتا تو ایک بارگی سب کا سب نہ آجاتا (مظہری)

عَبْدِنَا سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ آپ عبدیت میں کامل اور احکام الٰہی کے پورے پورے مطیع و فرمانبردار تھے۔ (مظہری)

لکھ (معانی کی بلندی، مطالب کی جامعیت، مضامین کی ندرت کے لحاظ سے)

قرآن مجید اپنی زبان کی فصاحت اور حسنِ انشاء کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر ہے، جیسا کہ بڑے بڑے ماہرین ادب تسلیم کرچکے ہیں، لیکن یہاں جو تحدی کی جارہی ہے اس کا مخاطب یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ کے ماتحت سارے انسان ہیں، صرف قریش یا اہل عرب نہیں، اس لیے قرآن مجید کی بے نظیری کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام و عالمگیر چیلنج کو محدود کردینا ہے، قرآن نے اپنی حقیقت خود بیان کردی ہے وہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کتابِ ہدیٰ ہے، یعنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامہ یا مکمل ہمہ گیر و ہمہ جہتی دستور العمل، اس کے علاوہ اس کی اور جتنی حیثیتیں ہیں، تبعی و ضمنی ہیں، وہ یہاں پیش اپنے اسی سب سے بڑے وصف کو کررہا ہے اور پکارے کہہ رہا ہے کہ ہدایتیں اور بصیرتیں میرے ایک ایک سورہ کے اندر موجود ہیں، اب اگر تم اپنی متحدہ کوشش اور جدوجہد سے بھی اس کے مقابلہ کی کوئی چیز پیش کرسکتے ہو تو لاؤ دکھاؤ۔

مِّنْ مِّثْلِهٖ مثلیت کی تفسیر پر بہترین روشنی خود قرآن مجید ہی سے پڑتی ہے:۔

قل فأتوا بكتٰب من عند الله هو اهدىٰ منهما اتبعه ان كنتم صٰدقين (قصص آیت ۴۹)

هو اهدىٰ کے ایجاز میں سب کچھ آگیا۔

مِّنْ مِّثْلِهٖ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال کثرت سے مثلہ فی البلاغة اور حسن نظم کے منقول ہوئے ہیں لیکن اعجاز میں من وجہ المعنی کا پہلو بھی اہلِ تحقیق سے چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ یعنی

مثل هذا القرآن حقا وصادقا لا باطل فيه ولا كذب۔ (ابن جریر عن قتادہ)

اور امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں متعدد پہلو اختیار کیے ہیں۔

بِسُوْرَةٍ۔ میں پورا قرآن نہ سہی، اس کا نصف یا ثلث بھی نہیں، اس کی کسی ایک سورۃ ہی کے برابر تم تصنیف کر دیکھو۔

(لفظ سورۃ پر حاشیہ شروع میں گزر چکا ہے)

مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ مِنْ بعض نے کہا تبعیض کے لیے ہے، بعض نے کہا ہے تبیین کے لیے ہے اور بعض نے کہا ہے کہ زائد ہے

من للتبعيض أو للتبيين وزائدة عند الأخفش (بیضاوی)

مِثْلِهٖ میں ضمیر قرآن کی جانب ہے۔

اى من مثل القرآن (مجاز) الهاء كناية عن القرآن (معانی)

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

اور اپنے حمایتیوں کو بھی اللہ کے مقابلہ میں بلا لو ۴۳ اگر تم سچے ہو ۴۴

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ

اور اگر تم (یہ) نہ کر سکو، اور ہرگز نہ کر سکو گے ۴۵ تو پھر اس آگ سے ڈرو ۴۶ جس کا

۴۳ شُهَدَآءَ میں شہداء سے عموماً مراد حامیوں اور ناصروں سے لی گئی ہے۔

یعنی اعوانکم ما انتم علیہ (ابن جریر عن ابن عباس) معناہ اعوانکم ونصراءکم (قرطبی)

المراد من الشہداء اکابرھم او من یوافقھم فی انکار امر محمد علیہ السلام (کبیر) قیل انہ

اراد جمیع من یصدقکم ولیوافقکم علی قولکم (جصاص)

لیکن اگر شہداء کے وہی لفظی معنی گواہ کے رکھے جائیں جب بھی مراد یہ ہوگی کہ ان لوگوں کو بھی بلا دیکھو، جو تمہارے اس دعوے کی کہ تم نے کسی قرآنی سورت کا جواب لکھ لیا ہے تصدیق کر دیں۔

......ای ادعوا کل من تعتمدون علیہ یشھد لکم (المنار)

۴۴ (اپنے اس زعم و گمان میں کہ قرآن انسانی دماغ کی پیداوار ہے)

قرآن کا سیدھا سادہ دعوے یہ ہے کہ وہ انسان کا نہیں، خدا کا کلام ہے، اور اپنے اس دعوی پر دلیل اس نے کیسی قطعی، اور عوام و خواص دونوں کی سمجھ میں آجانے والی یہ پیش کر دی ہے کہ اگر کوئی اسے امکانِ بشری کے اندر سمجھتا ہے تو ذرا اس کا ادنیٰ اور ہلکا ہی نمونہ سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے! قرآن کی اس تحدی کو اب چودہ سو سال ہوا چاہتے ہیں، اور دنیا جہان کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں بھی قرآن کے برابر کیا معنی تقریباً برابر کی کتاب سے یکسر خالی ہیں۔

فقہاءِ مفسرین نے ان آیتوں سے نکالا ہے کہ دین میں دلائل کا استعمال بھی شامل ہے، اثباتِ توحید و رسالت پر مجرد دعوت و تصدیقِ خبر پر دین ختم نہیں ہو جاتا اس لیے کہ قرآن مجید نے دعوتِ دین کے ساتھ ساتھ ان پر دلائل بھی قائم کیے ہیں۔

وقد تضمنت ھذہ الآیات مع ذکرنا من التنبیہ علی دلائل التوحید واثبات النبوۃ الامر باستعمال حجج العقول والاستدلال بدلائلھا وذلک یبطل من نفی الاستدلال بدلائل اللہ تعالیٰ واقتصر علی الخبر بزعمہ فی معرفۃ اللہ والعلم بصدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (جصاص)

۴۵ (قیامت تک)

اللہ اکبر کس زور کی تحدی ہے اور وہ بھی ایک اُمّی کی زبان سے، اپنی عقل و حکمت، اپنی زبان وادب، اپنے علوم و فنون پر ناز رکھنے والوں کو کیسا کیسا جوش اُس وقت بھی آیا ہوگا اور آج بھی آ رہا ہے۔ ع

"لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی!"

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

ایندھن آدمی اور پتھر ہیں ۷۶؎ (اور) وہ کافروں کے لیے تیار کی ہوئی ہے ۷۷؎

کتنے نئے نئے مسلک روز بہ روز پیدا ہو رہے ہیں، کیسی کیسی "ISM" ہر روز اُٹھ رہی ہیں یہ سب گویا قرآن کے جوابات ہی ہیں، ہر جواب ناکام اور شرمناک حد تک ناکام۔

۷۶؎ یہ دنیا کی نہیں دوزخ کی آگ ہوگی، وہ دنیا کی آگ سے کہیں زیادہ تیز اور جلانے والی ہے یہاں تک بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ وہ اس سے ستر حصہ زیادہ تیز ہوگی، آخرت کے عذابِ آتشیں کا ذکر توریت میں بھی ہے، ملاحظہ ہو یسعیاہ ۳۳: ۱۴ نیز ۶۶: ۲۴۔

انجیل کی تعلیم تمام تر رافت و حلم، عفو و درگزر کی سمجھی جاتی ہے، لیکن آگ کے جہنم کا ذکر حضرت مسیحؑ کے ٹھنڈے مواعظ میں بھی موجود ہے۔ ملاحظہ ہو متی ۱۸: ۸ و ۹۔

فَاتَّقُوْا جوابِ شرط ہے اور حرف "ف" نتیجہ کو بتلا رہا ہے یعنی جب قرآن کی پیش کی ہوئی دلیل کے جواب سے عاجز آچکے ہو اور اپنے انکار پر کوئی دلیل خود رکھتے نہیں، تو اب انکارِ حق کیے چلے جانا بجز عناد و خبثِ نفس کے اور کس چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے، اور جہنم کا عذابِ آتشیں اسی معاندانہ انکارِ حق کا لازمی اور قدرتی نتیجہ ہے۔

۷۷؎ جہنم کی اصل غذا تو خود اہلِ کفر و شرک ہوں گے، سزا انھیں کو ملے گی، لیکن اس سزا میں اضافہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کی مورتیوں، ان کے ٹھاکروں کو بھی ان کے پہلو میں رکھ دیا جائے گا اور گویا ان سے کہا جائے گا کہ لو اب اپنے انھیں معبودوں سے کام لو جنھیں دنیا میں پوجتے رہے تھے، پتھر کی مورتیوں کو تو کوئی احساس ہوگا نہیں البتہ اُن کے پجاری یہ منظر دیکھ دیکھ کر اور زیادہ تڑپیں گے، جلیں گے کلپیں گے، شرک اور مورتی پوجا میں تعلق بہت قدیم، بہت وسیع، بہت گہرا ہے، دنیا کی تقریباً ہر مشرک قوم نے بت پرستی بھی ضرور کی ہے، کلدانیہ، مصر، عرب، یونان، روم سب بُت پرست رہ چکے ہیں اور ہندوستان کی بُت پرستی تو مشہور ہی ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

والمراد بها حجارة الاصنام والانداد التی کانت تعبد من دون الله (ابن کثیر)

اراد بها الاصنام۔ (معالم)

جدید جاہلی متمدن و مہذب قوموں کا ذوقِ سنگ تراشی و مجسمہ سازی بھی بُت پرستی سے کچھ بہت زیادہ دور نہیں گیا۔

۷۸؎ یہیں سے اہلِ سنت نے یہ استنباط کیا ہے کہ جہنم کی اصل غایت کافروں ہی کی تعذیب ہے نہ کہ محض اہلِ فسق و عصیاں کی۔

اور اس مسئلہ کے ماخذ علاوہ احادیثِ نبوی کے قرآن مجید ہی کی متعدد آیات بھی ہیں، مثلاً لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِیْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (واللیل) والعذاب علی الکافرین (النحل) وغیرہا۔

ہاں عارضی طور پر تادیب کے لیے اہلِ فسق و عصیاں بھی اس میں داخل کر دیے جائیں تو یہ اس حقیقت کے منافی نہیں۔

وکون الاعداد للکافرین لا ینافی دخول غیرهم فیها علی جهة التطفل (روح)

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ

اور ان لوگوں کو خوش خبری سنا دیجئے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ۷۹ کہ ان کے لیے (بہشت کے) باغ ہیں کہ

تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ

ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی ۸۰ انہیں اُن میں سے جب کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا

۷۹ (اے ہمارے پیغمبر!)

بَشِّرْ۔ گویا مومنین صالحین اس کے مستحق ہیں کہ مخاطب انہیں مبارک باد پہنچائیے، اور اس میں ان لوگوں کی تکریم زائد ہے بہ مقابلہ اس کے کہ انہیں براہ راست خود ہی بشارت دے دی جاتی۔

اٰمَنُوْا۔ یعنی توحید و رسالت پر ایمان لے آئے۔

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی عمل مطابق شریعت اسلام کئے۔ "نیک عمل" کے سمجھنے میں بہتوں کو دھوکا ہوا ہے اور یہ مغالطہ آج کل عام ہو گیا ہے، سمجھا یہ جانے لگا ہے کہ نیکی اور ایمان ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق چیزیں ہیں اور پھر اس مفروضہ کی ایک فرع یہ قائم کی گئی ہے کہ کوئی شخص ممکن ہے کہ بہت صالح اعمال کا ہو لیکن ایمان سے یک لخت محروم ہو، حالانکہ یہ تخیل ہی سرتاسر غلط ہے، نیکی ایمان سے الگ نہیں، ایمان ہی کی عملی شکل کا نام ہے، ایمان جب تک قلبی ہے، ایمان ہے، اگر قولی و لسانی ہے تو اسلام ہے، اور وہی ایمان جب عمل سے ظاہر ہونے لگتا ہے تو اس کا نام حسنِ عمل، حسنِ کردار یا عملِ صالح پڑ جاتا ہے اور حسنِ عمل کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ عمل رضائے الٰہی کے مطابق ہو، کوئی نیکی اگر ایسی پیش کی جاتی ہے جس کی تہہ میں جذبۂ ایمانی خفیف سا بھی موجود نہیں تو وہ نیکی نہیں، نیکی کی صرف صورت ہے، نیکی کی صرف نقل ہے، اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں، اسی طرح کسی نیکی کی نقل پر اطلاق نیکی کا نہیں ہو سکتا، عمل نیک کی تو تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل ضابطۂ شریعت کے موافق ہو۔

فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں اٰمَنُوْا اور عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ دو الگ الگ چیزیں بیان ہو رہی ہیں، دونوں کے درمیان عطف ہے اور معطوف معطوف علیہ کے علاوہ ہوتا ہے، یہ دلیل ہے اس گروہ کے خلاف جو ایمان اور عملِ صالح کو مترادف سمجھتا ہے۔

والاٰية حجة على من جعل الأعمال ايمانا لأنه عطف الأعمال الصالحة على الايمان والمعطوف غير المعطوف عليه (مدارک)

۸۰ یہ عالم آخرت کے انعام کا بیان ہے، جنت کے انعامات اس قسم کے جتنے بھی بیان کیے گئے ہیں، سب عمومی اور اکثری کے حکم میں داخل ہیں، حصر اور کلیہ کی صورت میں نہیں، چنانچہ عموماً انسان کو لطف دریا اور باغ میں ملتا ہے، اس لیے اس کے لیے یہ سامان آخرت میں موجود ہوگا، لیکن بالفرض کوئی شخص ایسا ہے جسے بجائے سبزہ و گلزار کے دشت و ریگستان پسند ہے تو جنت میں یہ سامان مہیا ہوتے بھی دیر نہ لگے گی، آیت سے معلوم ہوا کہ بشارتِ جنت کے استحقاق کے پورے اسباب ایمان اور عمل دونوں وصف ہیں۔

## قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

تو وہ بول اُٹھیں گے ۵۱ کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں (اس کے) قبل مل چکا ہے ۵۲ اور انھیں وہ (واقعی) دیا ہی جائے گا ملتا جلتا ہوا ۵۳

لَهُمْ میں "لِ" استحقاق کا ہے یعنی اہلِ جنت ان نعمتوں کو اپنے حق سے پائیں گے اور استحقاق سے مراد استحقاق ذاتی نہیں بلکہ استحقاق بر بنائے وعدۂ الٰہی۔

واللام فی لھم، تدل علی استحقاقھم ایاھا لاجل ما ترتب علیه من الایمان والعمل الصالح (بیضاوی) ولام الجر للاستحقاق ولا استحقاق بالذات فھو بمقتضی وعد الشارع الذی لا یخلفه فضلا وکرما (روح)

جنّٰت، جنت کے لفظی معنی مطلق گھنے باغ کے ہیں لیکن قرآن مجید میں جس جنت کا وعدہ مومنین صالحین سے ہے وہ مخصوص دائمی باغ ہیں جو آخرت میں ملیں گے۔

۵۱ (فرطِ مسرت وانبساط سے)

خوب خیال کر لیا جائے کہ اسلام نے جس جنت کا نقشہ پیش کیا ہے وہ مادی وروحانی دونوں ہی قسم کی نعمتوں راحتوں لذتوں کا مجموعہ ہوگی، یہ نہ ہوگا کہ جسمانی اور حواس کی مسرتیں وہاں حذف کر دی جائیں جس طرح اس دنیا میں انسان نام ہے جسم وروح کے مجموعہ کا جنت میں بھی اُسے جسمانی تقاضوں اور روحانی مطالبوں دونوں کی آسودگی نصیب ہوگی۔

مِنْهَا میں پہلا مِنْ، من الجنّات کے معنی میں ہے اور دوسرا مِنْ تبعیضیہ ثَمَرَةٍ کی تفصیل کے لیے۔

من الاولی للابتداء والثانیة للتبعیض (المنار)

۵۲ (دنیا میں یا جنّت میں)

یعنی جنّتیوں کو جب کوئی پھل پھلاری کھانے میں آئے گا تو اُنھیں پچھلا مزہ بھی تازہ ہو جائے گا اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ بول اُٹھیں گے کہ اے یہ تو وہی لذیذ میوہ ہے جس کا مزہ ہمیں خوب یاد ہے۔

مِنْ قَبْلُ۔ یہ قبل والے پھل دنیا کے باغوں کے بھی ہو سکتے ہیں اور جنت کے باغوں کے بھی اہلِ تفسیر سے دونوں منقول ہیں، ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی اہلِ جنت میں شوق آفرینی ورغبت افزائی۔

یعنی فی الدنیا وقیل یعنی فی الجنة (قرطبی) فیھا وجھان الاول انه من ارزاق الدنیا والثانی ان المشبه به رزق الجنة ایضا (کبیر) ای من قبل ھذا فی الدنیا جعل ثمر الجنة من جنس ثمر الدنیا لتمیل النفس الیه أو فی الجنة لأن طعامھا متشابه فی الصورة کما حکی ابن کثیر عن الحسن (بیضاوی)

یہ نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ دنیا میں تو انسان کے لیے اکل وشرب ایک ضرورتِ طبعی کی چیز ہے بدل ما یتحلّل کے لیے زندگی قائم رکھنے کے لیے۔ جنت میں اس قسم کی کوئی ضرورت ظاہر ہے کہ باقی نہ رہے گی، وہاں جنتیوں کا کھانا پینا جو کچھ بھی ہوگا محض لذت حاصل کرنے کے لیے۔

۵۳ یعنی یہ تشابہ محض اہلِ جنت کے خیال کے مطابق نہ ہوگا واقعہ ونفس الامر بھی یہی ہے یہ تشابہ کس سے

وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾

اور ان کے لیے اس میں پاکیزہ بیویاں ہوں گی ۸۴ اور وہ (ان بہشتوں) میں ہمیشہ کے لیے ہوں گے ۸۵

ہوگا؟ بعض نے کہا کہ دنیا کے پھل پھلاریوں سے اور بعض کا قول ہے کہ جنت ہی کے میوے ایک دوسرے سے مشابہ ہوں گے۔ لیکن اگر دنیا ہی کے پھلوں سے تشابہ مراد لی جائے تو یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ یہ مشابہت صرف صوری اور ظاہری ہی ہوگی ورنہ اصل لذت، ذائقہ، خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے جنت اور دنیا کی نعمتوں میں آسمان وزمین کی نسبت ہے، چنانچہ محققین نے کہہ دیا ہے کہ دونوں میں اشتراک صرف نام کا ہوگا۔

ليس في الدنيا مما في الجنة الا الأسماء (ابن جرير عن ابن عباس)

بعض اہل لطائف واسرار نے آیت سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اسی دنیا کے اعمالِ حسنہ جنت میں طرح طرح کی نعمتوں کی شکل وتمثل اختیار کرلیں گے اور اہل جنت کو اپنے حسناتِ دنیوی اور ان کے ثمراتِ اُخروی کے درمیان ایک خاص تشابہ وتناسب محسوس ہوگا۔

أي هذا الذي وعدنا به في الدنيا جزاء على الايمان والعمل الصالح (المنار)

۸۴ خوب پاک وصاف ہر طرح اور ہر اعتبار سے جسم کی، روح کی، ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری، پاکیزہ۔

مطهرة من القذر والأذى (ابن جرير عن ابن عباس) قيل مطهرة من مساوي الاخلاق (معالم) فالمراد طهارة أبدانهن وطهارة ازواجهن من جميع الخصال الذميمة (كبير) ان التطهير يستعمل في الأجسام والأخلاق والأفعال (بيضاوي) ومن كل قذر ومن كل أذى يكون من نساء الدنيا فطهر مع ذلك باطنها من الاخلاق السيئة والصفات المذمومة (ابن القيم)

مُطَهَّرَةٌ میں طاہرۃ سے زور اور قوت زیادہ ہے۔

ولم يقل طاهرة لأن مطهرة ابلغ لانها تكون للتكثير (مدارك)

بعض "روشن خیالوں" کو پاکیزہ بیویوں کے نام سے خدا معلوم کیوں اتنی شرم آئی کہ انھوں نے اس معنی ہی سے انکار کردیا اور أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے، گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت وراحت کے موقع پر بیویوں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا بڑے ہی شرم وندامت کی بات ہے! جنت کے نفس وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے، جب تو بات ہی اور ہے ایسے مخاطب کے سامنے پہلے جنت کا اثبات کیا جائے گا لیکن اگر جنت کا اقرار ہے تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنی نہ نقل کے لحاظ سے صحیح ہیں نہ عقل کے اعتبار سے جنت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ وہ مادی اور روحانی ہر قسم لذتوں، مسرتوں، راحتوں کا گھر ہوگا۔ یا پھر یہ ہے کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے ہی سے انکار ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس عقیدہ کا رشتہ اسلام سے کہیں زیادہ رہبانیت او رمسیح کی لائی ہوئی نہیں پولوس کی پھیلائی ہوئی مسیحیت سے وابستہ ہے۔ زوجیت جب دنیا میں اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم میں اس سے محرومی ہوجائے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ جسمانی، مادی، حسی خصوصاً ازدواجی نعمتوں کو حقیر سمجھنا، یا ان سے شرمانا تمام تر جاہلی مذہبوں خصوصاً

## اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ

اللہ اس سے ذرا نہیں شرماتا ۵۸۶

پولوسی مسیحیت سے دماغی مرعوبیت کا نتیجہ ہے اسلام تو حسّی اور معنوی، مادّی اور روحانی، جسمانی اور عقلی ہر قسم کی نعمت کی قدر کرنے کی تعلیم دیتا ہے ایسی خشک لذت جس میں کوئی شائبہ نہ لامسہ کا ہو نہ باصرہ کا، نہ ذائقہ کا نہ سامعہ کا اور صرف اسی پر قانع رہنا کمال نہیں نقص ہے، ہنر نہیں عیب ہے، اور معلوم ہے کہ نقص و عیب جنت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ عملِ زوجیت سے ایک دوسرا مقصود جو دنیا میں حاصل ہوتا رہتا ہے یعنی بقائے نوع یا افزائشِ نسل، وہ تو جنت میں موجود نہ ہوگا، غذا کی طرح صحبت کی نفس لذت ہی وہاں مقصود رہ جائے گی۔

۵۸۵ سب سے بڑی اور آخری بات جنت کے سلسلہ میں یہ فرما دی گئی کہ اس کی لذتیں اور مسرتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں اور داخلۂ جنت کے بعد زوالِ عیش کا امکان ہی نہیں، دنیا کی بڑی سے بڑی لیکن کیسی فانی اور عارضی نعمتیں اس کے سامنے تصور میں بھی لائی جا سکتی ہیں؟

خٰلِدُوْنَ۔ خلود کے معنی ایسی حالت میں رہنے کے ہیں، جس میں کبھی تغیّر اور خرابی نہ پیدا ہو۔

الخلود هو تبری الشیئ من اعتراض الفساد وبقاؤه علی الحالة التی هو علیها (راغب)

اور جب اس کا ذکرِ جنت و اہلِ جنت کے سیاق میں آئے گا تو معنی یہ ہوں گے کہ اس حالتِ لذت و نعمت کو دوام ہوگا اور وہ کبھی فنا نہ ہوگی۔

فلا اخر له ولا انقضاء بل فی نعیم سرمدی ابدی علی الدوام۔ (ابن کثیر)

اور اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد وہ حالت ہے جسے کبھی فنا نہیں، ابدی، سرمدی زندگی۔

وفی الشرع الدوام الابدی ای لا یخرجون منها ولا هی تفنی بهم فیز ولوا بزوالها۔ وانما هی حیاة ابدیة لا نهایة لها۔ (المنار)

۵۸۶ (جیسا کہ بعض کج فہم اور معاند معترضین کے خیال میں شرمانا چاہئے)

لَا یَسْتَحْیٖۤ۔ یہ لفظ ممکن ہے کہ خود معترضین طاعنین نے استعمال کیا ہو کہ یہ کیسا محمدؐ کا خدا ہے جو ایسی حقیر چیزوں کو پیش کرتے بھی نہیں شرماتا اور قرآن مجید نے جواب میں بہ رعایت مشاکلت اس لفظ کو دہرا دیا ہو۔

یجوز ان تقع هذه العبارة فی کلام الکفرة فقالوا اما یستحی رب محمّد اذ یضرب مثلا بالذباب والعنکبوت فجاءت علی سبیل المقابلة واطباق الجواب علی السؤال وهو حق من کلامهم وطراز عجیب۔ (کشاف)

قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع اور محل پر تذکرہ بڑی سے بڑی مخلوق کا بھی آیا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی کا بھی، جانوروں میں ایک طرف ہاتھی اونٹ، شیر کا، اور دوسری طرف چیونٹی، مکھی اور مچھر کا، اسی تذکرہ پر بعض معاصر نافہموں نے کہنا شروع کیا کہ واہ دعویٰ تو کلامِ الٰہی ہونے کا، اور مضامین اس کے اندر ایسے حقیر اینا فہم

# اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

کہ مثال بیان کرے مچھر تک کی یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور چیز کی) ۸۷ سو جو لوگ ایمان لائے

۸۵ کم عقل معترضین بعض روایتوں میں آتا ہے کہ یہود تھے، بعض میں کہ مشرکین تھے، بعض میں کہ منافقین عجب نہیں کہ تینوں ہوں۔

نزلت فی الیھود (روح عن ابن عباس) نزلت فی المنافقین (روح عن مجاھد) والقول الثالث ان ھذا الطعن کان من المشرکین قال القفال الکل محتمل ھٰھنا۔ (کبیر)

بہر حال وہ جو کوئی بھی ہوں اتنی موٹی سی بات ان کی سمجھ سے باہر تھی کہ چیزیں چھوٹی یا بڑی تو انسان کی نسبت سے ہوتی ہیں، حق تعالےٰ کے نزدیک تو بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی سب یکساں ہے۔

۸۶ (کسی دینی حقیقت کی توضیح کے لیے)

مثال کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے اب یہ مقصد جس مثال سے پورا ہو سکے اسی کو بہترین کہا جائے گا، خواہ وہ چیز جو مثال میں پیش کی گئی ہے بجائے خود کیسی ہی ہو مچھر بظاہر ایک بہت حقیر اور بے حقیقت سی مخلوق ہے اب جہاں مخلوق کی بے حقیقتی بیان کرنا ہوگی وہاں موزوں مثال ظاہر ہے کہ مچھر ہی کی ہوگی، پھر اس پر اعتراض کرنا کیسی سفاہت کی دلیل تھی، امام رازی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صانعِ عالم اور خلاقِ عالم کی بنائی ہوئی کوئی شے بھی درحقیقت حقیر و بے حقیقت نہیں، بلکہ جو چیز بظاہر جتنی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوگی، اسی قدر اس کا بیان کمالِ علم، کمالِ اطلاع، اور کمالِ حکمت پر اور زیادہ دلالت کریگا (کبیر)

مَثَلًا مَّا۔ مثلاً کا لفظ خود نکرہ تھا مَا کے اضافہ نے اس کے وصف تنکیر کو اور بڑھا دیا، بلکہ اسے درجۂ ابہام تک پہنچا دیا، چنانچہ بعض اہلِ نحو کی اصطلاح میں مَا ابہامیہ ہے۔

مَا ھذہٖ ابھامیۃ وھی التی اذا اقترنت باسم نکرۃ ابھمت ابھاما وزادتہ شیاعا وعموما کقولک اعطنی کتابا ما ترید ای کتاب کان۔ (کشاف)

مَا حرف زائد کہا گیا ہے کہ تاکید کلام کے لیے ہے۔

مَا توکید للکلام من حروف الزوائد (مجاز) قال الزجاج ما حرف زائد للتوکید عند جمیع البصریین (مغنی) وقال ابن فارس وکثیر من علماء ناینکرون زیادۃ ما ویقولون لایجوزان یکون فی کتاب اللّٰہ جل عزہ حرف یخلو من فائدۃ ولھا تاویل یجوزان یکون جنسا من التاکید (تاج)

فَمَا فَوْقَھَا۔ یعنی مچھر سے بھی بڑھ کر ہو اپنے جُثّہ کے صِغر یا ظاہری بے حقیقتی کے اعتبار سے۔

فما فوقھا فی الصغر (راغب) اراد بما فوقھا فی الصغر والمحققون مالوا الی ھذا القول (کبیر) ما دونھا فی الصِغر والحقارۃ وھذا قول الکسائی وابی عبیدۃ قالہ الرازی واکثر المحققین (ابن کثیر) ای فما تجاوزھا وزاد علیھا فی المعنی الذی ضربت فیہ مثلا وھو القلّۃ والحقارۃ (کشاف) یقال فلانٌ فی اللوم والدناءۃ ای ھو اکثر لوما ودناءۃ منہ وکذا اذا قیل ھنا فوق ذلک فی الصِغر وجب ان یکون اکبر صغرا منہ (ابوالبقاء)

فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا

وہ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ (مثال) یقیناً حق ہے اُن کے پروردگار کی جانب سے٨٨ البتہ جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے

أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا

ہیں وہ یہی کہتے رہیں گے٨٩ کہ اللہ کا اس مثال سے مطلب کیا تھا؟٩٠ گمراہ بھی کرتا ہے بہتوں کو اسی٩١

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت میں اصل ہے اُس عادت صوفیہ کی کہ مثال لانے میں حیاءِ عرفی کی پروا نہیں کرتے۔

٨٨ (اور اپنے مقصود و غایت اور توضیح مراد میں بالکل کافی و وافی)

اَنَّهٗ میں ضمیر مَثَل کی طرف راجع ہے۔

هذا المثل (ابن کثیر عن ابی العالیه) المثل هو (معالم) والضمیر للمثل۔ (کشاف)

دوسرا قول یہ ہے کہ ضمیر خود قرآن کی طرف راجع ہے۔

ای یعلمون انه کلام الرحمٰن وانه من عند الله (ابن کثیر عن قتادۃ)

اَمَّا حرف اَمَّا آغازِ کلام میں لے آنے سے فقرے میں قوت اور تاکید کی زیادتی ہو جاتی ہے۔

حرف فیه معنی الشرط ولذالك یجاب بالفاء وفائدته فی الکلام ان یعطیه فضل توکید (کشاف) قال سیبویه اما زید فذاهب معناه مهما یکن من شئ فزید ذاهب ای هو ذاهب لامحالة فانه منه عزیمة (بیضاوی) توکید ما صدر به (أبو سعود)

٨٩ (استفساراً نہیں، طنز و تعریض کی راہ سے)

٩٠ یعنی وہ اسی میں اُلجھے رہیں گے کہ ایسی مثالوں سے حاصل کچھ بھی نہیں، ھذا کے لفظ میں ایک پہلو تحقیر و اہانت کا ہے۔

وفی قولهم ماذا اراد الله بهذا استحقار (کبیر) وفی هذا استحقار واسترذال (بیضاوی)

اردو روزمرہ کے مطابق ھذا مثلاً کا ترجمہ ہوگا "ایسی ویسی مثال سے"!

٩١ (اپنے قانون تکوینی کے مطابق)

اللہ کو خالقِ شر ماننے میں دنیا کے مذہبوں کو بڑی بڑی دقتیں پیش آئی ہیں چنانچہ انھیں سے بچنے کے لیے ایک دوسرا خالقِ شر بھی فرض کر لیا گیا ہے لیکن اس دشواری کی اصل یہ ہے کہ خیر کی طرح شر کا بھی کوئی ایجابی یا مثبت وجود فرض کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ شر تو اشیائے کائنات کے، موجوداتِ عالم کے، اور اپنے قویٰ کے صرف غلط و ناجائز طریقِ استعمال کا نام ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان کو آزادی دے رکھی ہے، مختلف راہوں میں سے ایک کے انتخاب کی، اور اسی کا نام ارادہ ہے، چنانچہ انسان جب اپنے ہی ارادہ و اختیار سے غلط کام کے کرغلط راہ کا انتخاب کرتا ہے تو اسی کو شر میں مبتلا ہو جانا کہتے ہیں۔ اللہ علاوہ احکم الحاکمین، مالک الملک اور آخری اور اصلی قانون ساز ہونے کے تکوینی حیثیت سے ہر شے کا آخری مسبب الاسباب بھی تو ہے، وہ بدی کا خالق صرف اسی معنی میں ہے، جس معنی میں زہر کا، زہریلے جانوروں کا، خونخوار درندوں کا خالق ہے۔

وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ (٢٦)

اور راہ بھی دکھاتا ہے بہتوں کو اسی سے ۹۲ اور وہ گمراہ کسی کو (بھی) اس سے نہیں کرتا بجز بے حکمی کرنے والوں کے ۹۳

يُضِلُّ بِهِ کے معنی صرف اسی قدر ہیں کہ بندہ جب اپنی رائے اور ارادہ سے گمراہی اختیار کرنے لگتا ہے تو حق تعالیٰ اس کا بھی سامان بہم پہنچا دیتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ سامان تو اکٹھے ہو جائیں اور نتیجہ نہ برآمد ہونے دے۔

بِهِ یعنی اس سے اور اسی طرح دوسری قرآنی تمثیلات سے۔ ضمیر کا مرجع مَثَلًا ہے

الضمیر فی به للمثل (روح) ای یضل بالمثل او بالکلام المضروب فیه المثل (المنار)

كَثِيرًا۔ بہتوں کو یہ "بہت" وہ ہیں جو اپنی قوت فکر و نظر سے صحیح کام نہیں لیتے اور اس لیے اپنے ارادہ سے کفر و ضلالت اختیار کیے رہتے ہیں حق تعالیٰ کی رضا کو ان کے کفر میں ذرا بھی دخل نہیں۔

۹۲ (اللہ اپنے اسی قانون تکوینی کے مطابق) بِهِ ضمیر کا مرجع یہاں بھی مَثَلًا ہے۔

كَثِيرًا۔ یہ "بہت" وہ ہیں جو اپنی قوت فکر و نظر سے صحیح کام لیتے رہتے ہیں، مومنین مہتدین کا شمار گو کہ فریق مُضلّین کے مقابلہ میں کمتر ہو پھر بھی بجائے خود ایک بہت بڑی تعداد میں ہے اور اسی لیے کثیر کا لفظ اس کے لیے بھی آیا ہے۔

۹۳ آیت نے خود اس مضمون کو صاف کر دیا کہ گمراہی تو انھیں کے حصہ میں آتی ہے جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ گمراہی کسی پر چپک نہیں دیتا، بار بار کی ارادی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ کر رہ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی نہیں رہ جاتی، بلکہ اس کے برعکس باطل او ناحق پر جمود پیدا ہو جاتا ہے اور اس سلسلہ کا خاتمہ کفر و انکار پر ہوتا ہے۔

فِسق کہتے ہیں احکام سے تجاوز کر جانے کو اور فاسق وہ ہے جو دائرۂ اطاعت سے باہر نکل جائے۔

الفسق العصیان والترک لامر اللہ عزّوجلّ والخروج عن طریق الحق (لسان) المنافق والکافر سمّیا فاسقین لخروجهما عن طاعة ربهما۔ (ابن جریر)

ائمۂ لغت نے کہا ہے کہ فاسق کے استعمال کی مثال عربی میں اسلام سے قبل عہد جاہلی میں نہیں ملتی فیروز آبادی کا قول ہے:

لیس فی کلامهم ولا شعرهم فاسق علی انه عربی (قاموس)

اور ابن الاعرابی نے کہا ہے:-

لم یسمع فی کلام الجاهلیة ولا فی شعرهم فاسق هذا عجیب وهو کلام عربی (لسان)

فسق بحیثیت فعل کے بے جان چیزوں کے سلسلہ میں ضرور استعمال میں تھا لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال انسان کے لیے قدیم کلام عرب میں نہیں ملتا۔

لم یسمع الفاسق فی وصف الانسان فی کلام العرب (راغب عن ابن الاعرابی)

جس اصطلاحی معنی میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہے اس میں یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے اور ان چند لفظوں میں سے ہے جو قرآن نے آکر عربی زبان کو دیے۔

لا یعرف اطلاقها علی هذا المعنی قبل الاسلام۔ (تاج)

الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَیَقْطَعُوْنَ

جو اللہ سے اپنے معاہدہ کو اس کے استحکام کے بعد توڑتے ہیں ۹۴ اور جس چیز کو اللہ نے

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ

حکم دیا تھا جوڑے رکھنے کا اُسے کاٹتے ہیں ۹۵ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں ۹۶

جاہلی عربی کی طرح آج انگریزی زبان بھی باوجود اپنی اتنی وسعت کے حلّت، حرمت، طہارت، تقویٰ کے دائرہ کے بہت سے الفاظ سے محروم ہے۔ ع۔ ایں حدیثے را بیانِ دیگر است۔

۹۴ عَهْدَ اللّٰهِ۔ یعنی معاہدۂ طاعت کو عہد ایمان کو توحید کے حاشۂ فطری کو اقرار توحید ربوبیت تو ایسا سیدھا سادہ صاف مسئلہ ہے کہ ہر انسان کی فطرتِ سلیم اس عقیدہ پر گواہ ہے، نافرمان و فاسق خود اپنی اس فطرتِ سلیم سے اقرار فطری سے بغاوت کرتا رہتا ہے اور اس لیے یہاں فاسقین کے تحت میں ہر قسم کے اہل کفر آگئے۔

عنی بهذه الآیة جمیع اهل الکفر والشرك والنفاق وعهده الی جمیعهم فی توحیده ما وضع لهم من الأدلة الدالة علی ربوبیته۔ (ابن کثیر)

مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ۔ اس عہد فطرت کی توثیق ہر دور اور ہر زمانہ میں پیغمبروں کی تعلیمات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے۔

والمراد به ماوثق الله به عهده من الآیات والکتب (بیضاوی)

۹۵ آیت کے وسعتِ مفہوم میں سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں یعنی وہ سارے فرائض جو ہر انسان پر خالق و مخلوق دونوں سے متعلق عائد رہتے ہیں۔

ان یوصل من الایمان والأرحام (ابن جریر عن ابن عباس) صلة الأرحام والقرابات وقیل المراد اعم من ذلك۔ (ابن کثیر)

امام رازیؒ نے ایک معنی یہ بھی کیے ہیں کہ حکم الٰہی تو مومنین کے ساتھ رشتہ جوڑے رکھنے کا ہے یہ اہل فسق اپنا رشتہ کافروں سے جوڑ لیتے ہیں۔

۹۶ (اپنے عقائدِ کفریہ باطلہ سے)

اس فساد کے اندر رُوحانی، مادّی ہر قسم کے مفسدے شامل ہیں، اسلام کی حقیقت ہی چونکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور ایک ہمہ گیر نظام حیات اس لیے اس سے اعراض و انحراف کے کھلے ہوئے معنی یہی ہیں کہ کسی ناقص دستورِ زندگی اور چھوٹے نصب العین کو قبول کر لیا گیا ہے اور اس ناقص پروگرام کا لازمی نتیجہ ہے انفرادی انتشار اور اجتماعی اختلال

والاظهران المراد منه الصدعن طاعة الرسول علیه الصلوة والتسلیم لان تمام الصلاح فی الارض بالطاعة۔ (کبیر)

مشاہدہ ہے کہ آج دنیا اتنی ترقیوں اور علمی کمالات کے باوجود کیسی کیسی مصیبتوں میں بھٹک رہی ہے انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اور یہ صلاح و فلاح سے محرومی نتیجہ ہے اسلامی زندگی کو گم کر دینے کا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٢٧﴾ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا

بس یہی لوگ تو ہیں گھاٹے میں رہنے والے ٩٧ تم لوگ کس طرح کفر کر سکتے ہو اللہ سے ٩٨ درانحالیکہ تم بے جان تھے ٩٩

فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾

سو اس نے تمہیں جاندار کیا ١٠٠ پھر وہی تمہیں موت دے گا ١٠١ پھر وہی تمہیں زندہ کریگا ١٠٢ پھر اسی کی طرف تم واپس کیے جاؤ گے ١٠٣

٩٧ اس نقصان میں خسارۂ عاجل بھی شامل ہے اور خسارۂ آجل بھی۔ عاجل اس لحاظ سے کہ عدمِ ایمان سے دلوں سے سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے اور قوم و افرادِ قوم طرح طرح کی بداخلاقیوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور آجل اس اعتبار سے کہ آخرت میں ہر نعمت سے محرومی رہے گی۔

مغبونون بذهاب الدنيا والآخرة۔ (ابن عباس)

٩٨ (اے کافرو اور منکرو!)

یعنی کفر و انکار کی جرأت و ہمت کس طرح رکھتے ہو؟ سوال سے مقصود اُن کی جسارت پر اظہارِ تعجب ہے۔

على وجه التعجب (ابن عباس) فالمراد به التكبيت والتعيير كبيرٌ على وجه التعجب والتوبيخ لا على استفهام الجمل (معالم) اخرج مخرج التعجب (ابوالبقاء)

لفظ کیف کا استعمال قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی حق تعالیٰ کے سلسلہ میں آیا ہے، سیاق ہمیشہ تنبیہ یا توبیخ ہی کا رہا ہے۔

وكل ما اخبر الله تعالىٰ بلفظة كيف عن نفسه فهو استخبار على طريق التنبيه للمخاطب او توبيخًا۔ (راغب)

٩٩ (صُلبِ پدر میں)

یعنی ابھی تمہاری تشکیل ہوئی بھی نہ تھی۔

بیان خلقتِ انسانی کا ہو رہا ہے کہ انسان پر تکوین کے مختلف دور گزرتے رہتے ہیں۔

١٠٠ (رحمِ مادر میں)

نعمتوں میں سب سے مقدم صفتِ حیات ہے کہ دوسری ساری نعمتوں سے استفادہ اسی کے بعد ممکن ہے، اس لیے ذکر میں بھی اُسے یہاں سب سے مقدم رکھا۔

١٠١ یعنی جسد کو بے روح کر دے گا اس دنیوی مدتِ زندگی کے خاتمہ پر۔

سبق توحیدِ کامل کا مل رہا ہے کہ خلق، احیاء، افناء سب قوتیں باری تعالیٰ ہی کی ہیں۔ یہ نہیں جیسا کہ بعض مُشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ موجد و خالق کوئی ایک ہیں برہما کے نام سے، اور قائم و باقی رکھنے والے کوئی دوسرے ہیں وِشنو کے نام سے، اور موت و ہلاکت لانے والے ایک تیسرے ہیں شیو کے نام سے۔

١٠٢ (حشر میں)

حشر کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں ہے کہ بغیر وقوعِ حشر کے اس محدود و مختصر زندگی میں نظامِ عدل کا تحقق ممکن ہی نہیں۔

## هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ

وہ وہی (خدا) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب[۱۰۴]

۱۰۳ (نہ کہ کسی اور کی طرف حساب و کتاب کے لیے)
انسان کو جزا و سزا اور اعمال کی جواب دہی کے لیے براہ راست اللہ تعالیٰ ہی کے حضور میں پیش ہونا ہے اس میں
رد آگیا مسیحی مشرکوں کے اس عقیدہ کا کہ حشر میں پیشی مسیح ابن اللہ کے حضور میں ہوگی، اس ایک آیت میں پورا بیان
خلقتِ انسانی کا آگیا کہ انسان پہلے بے جان ہوتا ہے پھر اس میں روح سے جان ڈالی جاتی ہے اور ایک مدتِ
متعین پر روح کے نکل جانے کے بعد وہ پھر بے جان ہو جاتا ہے اور آخری بار حشر میں از سر نو زندہ کیا جائے گا۔
۱۰۴ خطابِ عام نوعِ انسانی سے ہے، ان سے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ تم تو خود ہی ساری کائناتِ ارضی کے مقصود
و مطاع ہو پھر یہ کیسی حماقت ہوگی کہ تم اور کسی مخلوق کو مقصود و مطاع بنا لو، آیت ہر قسم کے شرک ہر قسم کی مخلوق پرستی کی جڑ
کاٹ دینے کے لیے کافی ہے، اس فرشِ زمین پر جو کچھ بھی ہے سب انسان ہی کے لیے ہے نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لیے ہو،
مشرک انسان اس فطری اور قدرتی ترتیب کو اُلٹ دیتا ہے، حدیث نبوی کا یہ ٹکڑا جو مسلمان ہر جمعہ کو خطیب کی زبان
سے سنتا ہے کہ انما الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرة (دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم پیدا کیے گئے ہو
آخرت کے لیے) اسی مفہوم کا ترجمان ہے، اور خلیفۃ اللہ کی بیشک یہی شان ہونا چاہیے سب کچھ اس کے لیے ہو اور وہ خود
خدا کے لیے ہو، وہ جس چیز کو جس طرح بھی چاہے اپنے تصرف میں لائے اور اس کا جواب وہ صرف اپنے مالک و خالق کے سامنے ہو،
مرتبۂ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام ہی کا قائم کیا ہوا ہے، ڈارون کے "ترقی یافتہ" بندر "غریب" کو اس رتبہ و مقام
سے کیا واسطہ، ارتقاء کائنات کا اصل اصول بالکل صحیح مان لیا جائے جب بھی اس کی ڈارونی تعبیر کی گمراہی تو بدستور رہے گی۔
لَکُمْ۔ یعنی تمہارے ہی نفع کے لیے۔

ای لاجلکم ولانتفاعکم به فی دنیاکم ودینکم (کشاف) هو یدل علی ان المذکور بعد قوله
خلق لأجل انتفاعنا فی الدین والدنیا (کبیر)

فقہاء نے آیت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ زمین پر جو کچھ بھی انسان کے نفع کے لیے پیدا کیا گیا ہے
اصلاً ان پر حکم اباحت ہی کا ہے، تاوقتیکہ کوئی دلیل عقلی ان کے منع یا حرمت پر نہ قائم ہو۔

وقد استدل الکرخی، وابوبکر الرازی والمعتزلة بقوله "خلق لکم" علی ان الاشیاء التی یصح ان
ینفع بها خلقت مباحة فی الاصل (مدارک) هی نص الدلیل القطعی علی القاعدة المعروفة عند الفقهاء
ان الاصل فی الاشیاء المخلوقة الاباحة والمراد اباحة الانتفاع بها اکلا وشربا ولباسا وتداویا ورکوبا وزینة (المنار)

اَلْاَرْضِ سے مراد لازمی طور پر زمین ہی نہیں بلکہ مطلق سمتِ سفلی بھی مراد ہو سکتی ہے جس طرح السماء
سے مراد مطلق سمت علوی ہو سکتی ہے۔

ارید جهة السفل کما یراد بالسماء جهة العلو (بیضاوی) ان اراد بالارض الجهات السفلیة
دون الغبراء کما تذکر السماء وتراد الجهات العلویة جاز ذلك (کشاف)

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾ ع ۳

پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ کی ۵؎ اور انھیں سات آسمان درست کر کے بنا دیے ۶؎ اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

جَمِیْعًا۔ اِس "سب" میں گنگا مائی بھی شامل ہیں اور رنگا پربت بھی گئو ماتا بھی اور ہنومان جی بھی، حجر پرستی، شجر پرستی، دریا پرستی ——— کوہ پرستی، ناگ پوجا وغیرہ مخلوق پرستی اور مظاہر پرستی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب بے معنی اور زنگ خوردہ ہیں۔

۵؎ لفظ ثُمَّ سے یہ لازم نہیں آتا کہ آفرینش اَرض وَمَافِی الْاَرْض کے بعد تسویۂ سما ہوا ہے ثُمَّ کا استعمال عام ہے محض فرقِ زمانی ظاہر کرنے کو، دو علیحدہ زمانے ظاہر کرنے کو، نہ کہ لازمی طور پر تقدیم و تاخیر ظاہر کرنے کو۔

ثم لعله لتفاوت ما بين الخلقين لا للتراخي في الوقت فانه يخالفه ظاهر (بیضاوی) ثم ليس للترتيب ههنا وانما هو على جهة تعديد النعم (کبیر)

سَمَآء۔ واحد اور جمع دونوں کے معنی میں آتا ہے۔

يستعمل للواحد والجمع۔ (راغب)

چنانچہ یہاں لفظاً واحد ہے لیکن معنیً جمع ہے کہ جنس سماء کے معنی میں ہے۔

والسماء ههنا اسم جنس (ابن کثیر) فانها في معنى الجنس (ابو سعود)

اس لیے ضمیر جمع هُنَّ سے کوئی خلجان نہ ہونا چاہیے سَمَاء کی وسعتِ مفہوم پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے (۶۵)

یہاں مراد اجرام علوی سے بھی لی گئی ہے اور سمتِ علوی سے بھی۔

المراد بالسماء هذه الأجرام العلوية أو جهات العلو۔ (بیضاوی)

گویا مفہوم یہ ہوا کہ وہ بلندی کی طرف متوجہ ہوا:

المراد بالسماء جهات العلو كأنه قيل ثم استوى الى فوق (کشاف)

اِسْتَوٰی کا صلہ جب اِلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں قصد کیا، توجہ کی، التفات کیا، انتظام کیا، تدبیر کی

اذا عدی بالٰی اقتضی معنی الانتهاء اليه اِمّا بالذات او بالتدبير (راغب۔ تاج)

چنانچہ یہاں ائمۂ تفسیر عموماً اسی طرف گئے ہیں۔

عمد الى خلق السماء (ابن عباس) قال بعضهم اقبل عليها وقال بعضهم عمد اليها (ابن جریر) قصد اليها اى بخلقه واختراعه (قرطبی عن سفيان وابن كيسان) اقبل وعمد الى خلق السموات (مدارک) والاستواء ههنا متضمن معنى القصد والاقبال لانه عدّى بالٰى (ابن کثیر) والمراد ان ارادته توجهت الى مادة السماء۔ (المنار)

یہ معنی بھی لیے گئے ہیں کہ ہر شے کا انتظام اس نے اپنی مرضی کے مطابق کر لیا۔

اى استقام الكل على مراده بتسوية الله تعالى (راغب)

۶؎ آسمانوں کا تعداد میں سات ہونا توریت و انجیل دونوں کو مسلّم ہے ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے:
"عہدِ عتیق و عہدِ جدید دونوں میں آسمانوں کا جو تخیل ہے...... وہ سات آسمانوں کا ہے" (جلد ۲ صفحہ ۳۲۲)

سَوّٰىهُنَّ۔ تسویہ کے معنی ہیں تکمیل تک پہنچا دینے اور ہر طرح درست کر دینے کے، ضمیر هُنَّ السماء کی طرف راجع ہے، خواہ اس کی تفسیر اجرام سے کی جائے یا خود اس کو معنیً جمع قرار دیا جائے (بیضاوی)

# وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً

اور (وہ وقت یاد کرو ۹۸) جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا ۹۹ کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں ۱۰۰

ومعنی تسویتھن تعدیل خلقھن واخلاءہ من العوج والفطور واتمام خلقھن (کبیر)
فان السماء فی معنی جمع (معانی) فاتمّ خلقھن من تلک المادۃ الدخانیۃ فجعلھن سبع
سمٰوات تامات منتظمات الخلق (المنار)

اس لیے فسوّٰھن کا ترجمہ ٹھیٹھ اُردو میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "انھیں ٹھیک ٹھاک کردیا"۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ۔ قدیم اہلِ ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لیے ہیں یعنی کرۂ قمر، کرۂ عطارد، کرۂ زہرہ، کرۂ شمس، کرۂ مریخ، کرۂ مشتری، کرۂ زحل (کبیر) صاحب تفسیر مظہری نے ایک حدیث سے استنباط کرکے لکھا ہے کہ عرش اور اس کے اندر جتنے سماوات ہیں سب کروی ہیں اور عرش زمین کے اطراف کو محیط ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہر کوکب اپنے فلک میں ایک خاص چال سے چلتا ہے اور آسمان کو حرکت نہیں یہ ساری تشریح پرانی فلکیاتی تحقیق کے مطابق تھی جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے قرآن سے باہر نہیں قرآن کے اندر ہی ہوگی۔

۹۷ (چنانچہ اپنے بندوں کی ساری ضرورتوں کا بھی اُسے پورا علم ہے اور اس نے اپنے بندوں کو محض پیدا ہی نہیں کیا بلکہ از راہ بندہ پروری اُس نے ان کی ہر ضرورت کے پورا کرنے کا بھی سامان کردیا)۔
صفتِ خلق کے بعد صفتِ علم کا اثبات بھی ضروری تھا۔ جاہلی قوموں نے بکثرت اپنے دیوی دیوتاؤں کو ان کے معبود تسلیم کرلینے کے باوجود ان کے علم کو ناقص مانا ہے۔

۹۸ اِذْ ظرف زمان ہے، کسی گزشتہ واقعہ کی یاد دلانے کے موقع پر آتا ہے جس طرح اِذَا کسی آئندہ مستقبل پر آتا ہے۔
اذ ظرف موضوع لزمان نسبۃ ماضیۃ وقع فیھا نسبۃ اخریٰ مثلھا (ابوسعود)
بعض نے اُذْکُرْ اس کے قبل مقدر مانا ہے۔
ھو نصب باضمار الذکر والمعنی اذکر لھم (کبیر) واذکروا فعلی بابیکم (کبیر)
ابوعبیدہ لغوی نے کہیں کہہ دیا تھا کہ اِذْ یہاں زائد ہے اس کی شدومد سے تردید اہل لغت اور ائمۂ تفسیر و نحو نے کی ہے۔
قال ابن اسحاق ھذا اقدام عن ابی عبیدۃ (لسان) قال الزجّاج ھذا اجتراءٌ عن ابی عبیدۃ
(ابن کثیر) ردّہ ابن جریر قال القرطبی وکذا ردّہ جمیع المفسرین (ابن کثیر)

۹۹ (آفرینش آدمؑ کے وقت)
سورہ کے رکوع اول میں بیان فطرتِ انسانی کا تھا کہ قرآن کے مخاطبین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک اُس کے پیام کو قبول کرنے والے، صالح و سلیم فطرت رکھنے والے، دوسرے بدفطرت یعنی پیام الٰہی سے انکار کرنے والے، دوسرے رکوع میں مخاطبین کی ایک تیسری نوع کا بیان تھا تیسرے رکوع میں اصل پیام کا لُبّ لباب سنا دیا گیا یعنی توحید و رسالت کی تبلیغ کردی گئی، اب اس چوتھے رکوع میں اس تبلیغ کی تاریخ شروع ہوتی ہے یعنی یہ پیام ابتداءً نسلِ انسانی کے بانی و مورث حضرت آدمؑ کو دیا گیا اور ان سے نسل بہ نسل منتقل ہوتا آیا ہے۔

رَبُّکَ۔ ذکرِ آفرینشِ انسانی کے موقع پر خصوصیت کے ساتھ اللہ کی صفتِ ربوبیت کو یاد دلانا بہت پُر معنی ہے، ربوبیت تدریجی ترقی کی پوری طرح حامل ہے۔

مَلٰٓئِکَۃ۔ جمع ہے مَلَاَکٌ کی اور وہ اَلُوْکٌ سے ہے جس کے معنی پیامبری یا پیام رسانی کے ہیں۔

الأَلوك الرسالۃ ومنہ الکتی ای ابلغہ رسالتی (راغب) من الالوکۃ وھی الرسالۃ (روح)

ملٰئکۃ کو ملائکہ کہتے ہی اس لیے ہیں کہ ان کا اصل کام پیام رسانی ہوتا ہے، اور یہ خالق کے پیامات مخلوق تک لایا کرتے ہیں، یہ اللہ کے ایجنٹ یا واسطے ہیں۔

لأنہم وسائط بین اللہ تعالیٰ وبین الناس فھم رُسل اللہ أو کالرسل الیھم (بیضاوی)

اُردو میں انھیں کو فرشتہ کہتے ہیں، فرشتے نوری مخلوق ہوتے ہیں، وجود خارجی رکھتے ہیں محض صفاتِ الٰہی یا قوائے طبیعی کے مرادف نہیں، عادۃً انسان کے لیے غیر مرئی رہتے ہیں حسبِ ضرورت مختلف شکلیں اختیار کرسکتے ہیں

اجسام لطیفۃ ھوائیۃ تقدر علی التشکل بأشکال مختلفۃ مسکنھا السموات وھذا قول اکثر المسلمین (کبیر) وذھب اکثر المسلمین الی انھا اجسام لطیفۃ قادرۃ علی التشکل بأشکال مختلفۃ مستدلین بان الرسل کانوا یرونھم کذالک (بیضاوی)

ان کی لاانتہا تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے، وجود میں انسان پر تقدمِ زمانی رکھتے ہیں سرشت معصومانہ ہوتی ہے یعنی بدی کی صلاحیت نہیں رکھتے، خالق کے خاص فرمانبردار خادم ہوتے ہیں مخلوق، محکوم، بندے ہونے میں بالکل انسانی جیسے ہیں خود کوئی معبودانہ یا نیم معبودانہ حیثیت دیوی دیوتا کی قسم کی مطلق نہیں رکھتے اور یہیں سے رد ہوجاتا ہے ان باطل مذہبوں کا جنھوں نے ملائکہ کو خواہ اسی نام کے ساتھ خواہ انھیں دیوی دیوتا قرار دے کر خالق و مخلوق کے درمیان ایک برزخی درجہ دے رکھا ہے۔

لِلْمَلٰٓئِکَۃِ میں لام تبلیغ کا ہے۔

اللام الجارۃ للتبلیغ (روح)

خَلِیفَۃ (عنقریب اپنی حکومت کی تنفیذ کے لیے)

اللہ اللہ خاک کے پتلے کا یہ شرف و مرتبہ! اللہ کی مخلوق تو اس وقت تک بھی بے شمار تھی، اب اُن میں انسان نامی محض ایک نئی صنف کا اضافہ نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اللہ کا نائب زمین پر پیدا کیا جا رہا ہے! بعض اہلِ تحقیق نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ تخلیق تو ساری ہی موجودات کی ہوئی، جنات کی بھی اور ملائکہ کی بھی جنت کی بھی اور عرش کی بھی لیکن اور کسی کے بھی قصدِ تخلیق کے ذکر کا اہتمام قرآن نے نہیں کیا ہے یہ فخر صرف خلقتِ آدم کے حصہ میں آیا اور یہ دلیل ہے آدم کی افضلیت و اشرفیت کی۔

ولم ینقل انی خالق عرشاً أو جنۃً أو ملکاً وان قال ذالک تشریفاً وتخصیصاً لآدم (بح)

أَتَجْعَلُ۔ ہمزۂ استفہامی کہا گیا ہے کہ یہاں استفہام کا نہیں بلکہ ایجاب کا کام دیتا ہے۔

جاءت علی لفظ الاستفہام ولکن معناھا معنی الایجاب (مجاز)

خَلِیفَۃ۔ جو کسی کی نیابت کرے، خواہ اس لیے کہ وہ موجود نہیں یا اس لیے کہ فوت ہو چکا، یا اس لیے کہ

معذور ہے اور خواہ اس لیے کہ اس سے مُستخلف کی تعظیم ظاہر ہو۔

الخلافة النیابة من الغیر اما لغیبة المنوب عنه واما لموته واِمّا لعجزہ واِمّا لتشریف المستخلف (راغب)

اور خلیفۃ اللہ وہ ہے جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے۔

یخلفنی فی الحکم بین خلقی وذٰلک الخلیفة ھو اٰدم ومن قام مقامه فی طاعة اللّٰه والحکم بالعدل بین خلقه (ابن جریر عن ابن عباس وابن مسعود) خلیفة اللّٰه فی ارضه لاقامة أحکامه وتنفیذ قضایاہ (معالم)

یہیں سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ انسان کو جو قویٰ ملیں گے وہ اس غایت و مقصود یعنی منصبِ خلافتِ الٰہی کے متناسب ملیں گے نسلِ انسانی خود اپنی صلاح و فلاح کے لیے اس کی محتاج تھی، اور محتاج ہے کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطے سے شریعتِ الٰہی سے استفادہ کرے اور سلسلۂ نبوت اسی غرض سے قائم ہوا ہے۔

والمراد به اٰدم وکذٰلک کل نبی استخلفهم اللّٰه فی عمارة الارض وسیاسة الناس وتکمیل نفوسهم وتنفیذ امرہ فیهم۔ (بیضاوی)

واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے بھی انسان، نوعِ انسان کو اس بلند مرتبہ یعنی خلافت و نیابتِ الٰہی پر نہیں رکھا ہے اور خیر جاہلی مذہبوں کا تو ذکر ہی نہیں، خود یہودیت اور اس کا مسخ شدہ ضمیمہ مسیحیت، دونوں اس باب میں اسلام سے کہیں پیچھے ہیں، بائبل میں اس موقع پر ذکر اس قدر ہے۔

”خداوند خدا نے زمین پر پانی نہ برسایا تھا، اور آدم نہ تھا کہ زمین کی کھیتی کرے اور زمین سے بُخار اُٹھتا تھا، اور تمام روئے زمین کو سیراب کرتا تھا اور خداوند خدا نے زمین کی خاک سے آدم کو بنایا اور اس کے نتھنوں میں زندگی کا دم پھونکا سو آدم جیتی جان ہوا۔“ (پیدائش ٢: ٥-٧)

گویا جس طرح اور سب حیوانات پیدا ہو رہے تھے، ایک ”جاندار“ آدم بھی پیدا ہو گیا اس کا کام زیادہ سے زیادہ یہ تھا کہ ”زمین کی کھیتی“ کرے کہاں یہ اتنا طویل لیکن بے مغز، انسان کو کاشتکاری تک محدود رکھنے والا بیان، اور کہاں قرآن مجید کا باوجود شدّتِ اختصار انسان کو مرتبۂ خلافتِ الٰہی پر پہنچا دینے والا، بلند و جامع اعلان! بعض صوفیہ نے یہیں سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جوہرِ خاک کو شرفِ خلافت اس لیے عطا ہوا کہ کثافت ہی فیضانِ اتم کے قابل اور تحملِ نورانیت کے لائق ہے اور بعض عارفین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ نورِ آفتاب کا فیض کامل و ذاتی زمین ہی پر ہے، بسبب اس کے کمالِ کثافت کے، اور پانی اور ہوا اور آگ پر یہ فیضان صرف صفاتی ہے اس لیے کہ کثافت اُن میں کم ہے اور اجرامِ علویہ تو اس نورانیت کے صرف سایہ و عکس ہی سے مستفیض ہو سکتے ہیں بہ سبب کمالِ لطافت کے، اور آدم کی ترکیبِ جسمی چونکہ خاکی عنصر سے ہوئی ہے اور اُن کے اخلاق کی عالمِ ملکوت سے اور ان کی روح کی عالمِ امر و نور سے اس لیے اُن میں صلاحیتِ فیضان بھی غایتِ کمال کی قرار پائی ہے! اور خیر یہ ساری تشریح تو اس لحاظ سے تھی کہ انسان کو زمین پر احکامِ شریعت کی تنفیذ کرنا ہے لیکن اللہ سارے عالم کا رب بھی تو ہے تو اس کی حاکمیت سارے عالم پر طبیعی مادی تکوینی حیثیت سے بھی تو چھائی ہوتی ہے اور جس طرح اس نے چوری اور زناکاری اور قتل کو جرائم قرار دے کر ان کی سزائیں اس دنیا میں رکھی ہیں اور جس طرح اس نے کفر و شرک نفاق وغیرہ کو شدید ترین معاصی قرار دے کر ان کی سزائیں آخرت پر اٹھا رکھی ہیں، اسی طرح وہ خالقِ کائنات مادی کا اور حاکم عنصریات کا بھی تو ہے اور ہوا، پانی، آگ، مٹی کی ترکیب و تحلیل حرارت، روشنی، بجلی، کشش، بارش، چاند، سورج، ستاروں وغیرہ

قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِيۡهَا مَنۡ يُّفۡسِدُ فِيۡهَا وَيَسۡفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ

وہ بولے کیا تو اس میں ایسے کو بنائے گا جو اس میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا، درآنحالیکہ ہم

بِحَمۡدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ

تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اللہ اور تیری پاکی پکارتے رہتے ہیں ؟!

کے بھی سارے قاعدے قانون بھی اسی کے بنائے ہوئے چلائے ہوئے پھیلائے ہوئے ہیں' اس لیے لازم ہے کہ انسان کو جب خلافت تفویض ہو تو رب الارباب کی اسی کائناتی تکوینی حیثیت سے بھی ہو' اور انسان ان سارے قوانینِ فطرت پر غالب و متصرف ہو کر رہے' انسان مادی، مشینی ترقیاں جتنی بھی کرتا جائے گا وہ سب شواہد اس کی اسی خلافت تکوینی کے ہوں گے' یہ نت نئے ایجادات و انکشافات' اس کی فلاحِ روحانی اور نجاتِ اُخروی نقطۂ نظر سے جتنے ہی لاحاصل ہوں' عبث اور بے کار ہوں بہرحال ہیں سب اس کی خلافت تکوینی ہی کے مظاہر۔

اللہ اللہ معاف کرے' یہاں کلام کے سمجھنے میں بعض اکابر سے تسامحات ہو گئے ہیں' فرشتوں کا یہ قول بطور اعتراض یا گستاخی کے نہ تھا، فرشتے تو گستاخی کر ہی نہیں سکتے۔ ''باغی فرشتوں'' کا تخیل تمام تر مسیحی ہے اور عجب نہیں کہ مسیحیوں کے ساتھ تعلقات قائم ہو جانے سے یہ خیال مسلمان علماء میں سرایت کر گیا ہو، فرشتوں کا یہ قول تمام تر وفورِ نیازمندی، اقرارِ وفاداری اور جوشِ جاں نثاری کا نتیجہ تھا، جیسا کہ ہمارے بعض محققین نے صراحۃً سمجھا ہے۔

لیس علی وجه الاعتراض علی الله ولا علی وجه الحسد لبنی آدم کما قد یتوهمه بعض المفسرین (ابن کثیر) ولیس باعتراض علی الله تعالٰی ولا طعن فی بنی آدم علی وجه الغیبة فانهم اعلٰی من ان یظن بهم ذلك (بیضاوی) لیس المقصود الا الاستفسار عن المرجح لا العجب والتفاخر (روح) علی طریقة قول من یجد فی خدمة مولاه وهو یامر بها غیره اتستخدم العصاة وأنا مجتهد فیها (ابو سعود)

بہترین تقریر اس سلسلہ میں وہ ہے جو ہمارے شیخِ وقت مفسرؒ تھانویؒ نے کی ہے وہ ذیل میں بجنسہٖ نقل ہے:۔

''مطلب یہ ہے کہ ہم تو سب کے سب آپ کے فرمانبردار ہیں' اور ان میں کوئی، کوئی مفسد سفاک بھی ہوگا سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اس کو انجام دیں گے اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے البتہ جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں' خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا، کوئی نہ ہوگا، اس خدمت کے لیے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ بطور اعتراض کے نہیں کہا نہ اپنا استحقاق جتلایا جو ان مقدس خدمت گاروں پر شبہات پیدا ہوں بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کر کے اس کے لیے ایک مستقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے قدیمی عملہ سے اس کا اظہار کرے وہ لوگ اپنی جاں نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کے لیے تجویز ہوئے ہیں ہم کو کسی طرح تحقیق ہوا ہے کہ بعض بعض تو اس کو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے جن سے حضور کا مزاج ناخوش ہوگا، آخر ہم کس مرض کی

دواہیں، ہر وقت حضور پر جان قربان کرنے کو تیار ہیں اور حضور کی جان ومال کو دعا دیتے رہتے ہیں کیسا ہی کام کیوں نہ ہو، حضور کے اقبال سے اس کو انجام دے نکلتے ہیں، کبھی کسی خدمت میں ہم غلاموں نے عذر نہیں کیا، اگر وہ تمنیٰ خدمت بھی ہم کو عنایت ہوگی تو ہم کو کوئی عذر وانکار نہ ہوگا، اسی طرح فرشتوں کی عرض ومعروض اظہار نیازمندی کے واسطے تھی، اور یہ بات کیسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرادی ہوگی کہ بنی آدم میں بُرے بھلے سب ہی طرح کے ہوں گے۔"

تَجْعَلُ فِيهَا۔ مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا۔ ضمیر ھا دونوں جگہ ارض (روئے زمین) کے لیے ہے۔ فِيهَا کی تکرار شدتِ فساد کے اظہار کے لیے ہے۔

وتکرار الظرف للدلالة علی الافراط فی الفساد (روح)

مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا۔ فرشتوں کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ خلیفہ سے یہاں اشارہ محض ذاتِ آدم کی طرف نہیں کیونکہ ان سے فساد فی الارض اور خونریزی کہاں ظاہر ہوئی بلکہ خلیفہ سے اشارہ جنسِ آدم یا نسلِ آدم کی جانب ہے

ولیس المراد ھھنا بالخلیفة آدم فقط کما یقوله طائفة من المفسرین...... والظاھر انه لم یرد آدم عینا اذ لو کان کذلک لما حسن قول الملئکة اتجعل فیھا من یفسد فیھا فانھم ارادوا ان من ھذا الجنس من یفعل ذلک۔ (ابن کثیر)

اَتَجْعَلُ فِيهَا۔ الخ مطلب یہ ہے کہ یہ جدید مخلوق اور اس کی ذریات آپ کے قوانین کی نافرمانی بھی کرے گی اور نافرمانی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ روئے زمین پر مادی ومعنوی دونوں حیثیتوں سے فساد برپا ہو کر رہے گا، فرشتوں کی یہ ساری عرض ومعروض ان کی کسی غیب دانی کی بنا پر نہیں بلکہ نیابتِ الٰہی وخلافتِ ربانی کا نام سن کر خود ہی انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا، قوائے بشری کی ترکیب کا بھی اور زمینی مخلوق کی ضرورتوں اور طبعی تقاضوں کا بھی اور اس سے یہ نتیجہ خود بخود ان کے سامنے آگیا تھا کہ زمین پر شر وفساد بھی ہوگا اور انسانوں میں سے باغی ونافرمان بھی پیدا ہوں گے۔

انھم عرفوا خلقته وعرفوا انه مرکب من ھذه الاخلاط الاربعة...... والاحتیاج الی الحاکم والقاضی انما یکون عند التنازع والتظالم فکان الاخبار عن وجود الخلیفة اخبارا عن وقوع الفساد بطریق الالتزام (کبیر) علموا ذلک من تسمیته خلیفة لان الخلافة تقتضی الاصلاح وقھر المستخلف علیکم وھو یستلزم ان یصدر منه فساد (روح)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسانی آبادی سے قبل روئے زمین پر جو جنات آباد تھے، ان کی سرشت وفطرت پر قیاس کر کے فرشتے انسان کے حق میں بھی یہی سمجھے۔

کما فعل بنو الجان فقاسوا الشاھد علی الغائب (معالم) أو انھم قاسوھم علی من سبق (ابن کثیر)

توریت میں اس مخلوق کا ذکر بصراحت موجود ہے۔

بِحَمْدِكَ میں ب تسبیح کے ساتھ حمد کے دوام معیت کے اظہار کے لیے ہے۔

الباء لاستدامة الصحبة والمعیة (روح)

لَكَ میں ل اظہارِ تخصیص کے لیے ہے یعنی تقدیس خاص تیری رضا ہی کے لیے ہے۔

اشعارا بان ایقاع الفعل لاجل اللہ تعالیٰ وخالصا لوجھه سبحانه (روح)

قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

(اللہ نے) فرمایا یقیناً میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۱۱۲ اور اللہ نے آدمؑ کو اسم سکھلا دیئے کل کے کل ۱۱۳

تسبیح اور تقدیس کے درمیان یہ فرق کیا گیا ہے کہ تسبیح کا اطلاق باعتبار طاعات کے ہوتا ہے اور تقدیس کا باعتبار اعتقادات کے۔ (روح)

وَنَحْنُ میں و حالیہ ہے۔

والواو للحال (کبیر) والواو فی ونحن للحال (کشاف)

نَحْنُ ..... لَكَ۔ دنیا میں دیوتا پرستی کی بیماری فرشتوں ہی کے فرائض کی غلط تشخیص سے پیدا ہوئی ہے آگ کے فرشتوں کو جاہلی قوموں نے اگنی دیوتا مان لیا، بارش کے فرشتہ کو اِندر دیوتا وقس علی ہذا۔

قرآن نے نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ فرشتوں کی زبان سے کہلا کر ان کی عبدیتِ محض پر انھیں کی زبان سے ایک اور مہر لگا دی، فرشتے یہاں صاف صاف عرض کر رہے ہیں کہ ہم خدام تو اپنی سرشت کے لحاظ سے بجز حضور والا کی تحمید و تقدیس کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے، فرشتہ اور دیوتا دونوں کے تصور کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے فرشتہ تمام تر مخلوق اور عبد ہوتا ہے اللہ کے حکم سے موجودات کے کسی خاص شعبہ پر مامور جس سے اثنائے خدمت میں کسی غلطی لغزش یا خیانت کا احتمال ہی نہیں، دیوتا اس کے برعکس خود ایک مستقل بالذات و خود مختار وجود ہوتا ہے اور عبد نہیں بلکہ معبود۔

۱۱۲ (مصالح کائنات و مخلوقی حاجات کے سلسلہ میں)

مطلب یہ ہوا کہ تمھیں اس کی کیا خبر کہ عبدیت کے علاوہ نیا کام خلافتِ الٰہی کا جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے اور اس کے لیے جن صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے وہ تمہارے اندر کہاں تک موجود ہیں۔

انا اعلم من المصلحة الراجحة فی خلق هذا الصنف علی المفاسد التی ذکرتموها ما لا تعلمون (ابن کثیر)

دیوتا پرستی پر ایک اور ضرب لگی، ملائکہ پرستوں کو ان کے جہل پر ایک اور تنبیہ کی گئی کہ صفاتِ خلق، قدرت وغیرہ تو الگ رہیں محض ان مصالح کے علم کے لحاظ سے بھی فرشتوں کو اللہ تعالیٰ سے کیا نسبت؟ کہاں علم محدود کہاں علم نامحدود؟

۱۱۳ یعنی آدم کو اشیائے کائنات کے اسماء اور آثار و خواص کا علم دے دیا۔

آیت کے ان الفاظ سے اہلِ سنت و جماعت نے انبیاء کی تفضیل ملائکہ پر نکالی ہے۔

وفیه دلیل علی ان الانبیاء افضل من الملٰئکة وان کانوا رسلا کما ذهب الیه اهل السنة والجماعة (معالم)

اور آدم کی فضیلت ملائکہ پر اسی علم کی بنا پر تو اور مفسرین نے بھی لکھی ہے۔

واعلم ان هذه الآیات تدل علی شرف الانسان ومزیة العلم وفضله علی العبادة ......

وان ادم افضل من هؤلاء الملٰئکة لانه اعلم منهم والاعلم افضل (بیضاوی)

آدمؑ ہی سب سے پہلے بشر تھے، اسی لیے ابو البشر کہلاتے ہیں اور خلیفۃ اللہ کے اولین مصداق جنت سے جب زمین پر آئے تو غالباً دجلہ و فرات کے دوآبہ میں آباد ہوئے جو اب ملک عراق کہلاتا ہے توریت میں تین صاحبزادوں کا نام آتا ہے، ہابیل، قابیل، شیث، توریت ہی کی حسب روایت عمر ۹۳۰ سال کی پائی، عربی میں آدم کا یہ نام کس مناسبت

سے پڑا ہو، کسی نے کہا کہ زمین کی جلد (ادیم) سے پیدا ہوئے اس لیے آدم کہلائے، کسی نے کہا کہ اپنی جلد کی سُرخی کی بنا پر

خلق آدم من ادیم الارض فسمّی آدم (ابن جریر۔ عن سعید بن جبیر) قیل سمی بذلک لکون جسدہٖ من ادیم الارض وقیل لسمرۃ فی لونہ (راغب)

**اَسْمَاء**۔ اسم کا مفہوم عربی میں اُردو کے "نام" سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اسم وہ ہے جس کے ذریعہ سے کوئی چیز جانی جائے، پہچانی جائے۔

اسم الشئ علامتہ (قاموس) الاسم مایعرف بہ ذات الشئ (راغب)

اور یہ شناخت ممکن نہیں جب تک اعراض، خواص، آثار کا علم بھی ساتھ ساتھ نہ ہو، اسی طرح اہلِ لغت نے بھی تشریح میں اس کا لحاظ رکھ لیا ہے۔

قال ابن سیدہ الاسم ھو اللفظ الموضوع علی الجوھر او العرض للتمییز ای لیفصل بہ بعضہ عن بعض (تاج)

اسم کے ساتھ اگر مسمّٰی کا علم نہ ہو تو اسم محض ایک آواز کانوں تک رہے گی اور ذہن کے سامنے کوئی مفہوم نہ پیدا ہوگا، علامہ راغب نے اسی لیے اس پر شرح و بسط سے کلام کر کے آخر میں کہا ہے:

انّ معرفۃ الاسماء لاتحصل الا بمعرفۃ المسمّٰی و حصول صورتہ فی الضمیر (کہ اسم کی معرفت بغیر مسمّٰی کی معرفت کیے اور ذہن میں اس کی تصویر کیے ہو نہیں سکتی) اور ایک دوسرے امامِ لغت نے اس کی داد ان الفاظ میں دی ہے:

ھو کلام نفیس (تاج)

اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسم مرادف ہے ذات شئ اور عین شے کے:

یقال ذاتٌ ونفس وعینٌ واسمٌ بمعنی (قرطبی)

یہ تو لفظی معنی ہوئے آیت کی تفسیر میں محققین نے مراد معلوماتِ اشیاء سے لی ہے اور اسماء کے ساتھ مسمّیات اور ذوات و خواصِ اشیاء کو شامل کیا ہے اور اشیاء کے اسماء سے مراد اُن کے آثار و خواص کا علم لیا ہے، گویا سارے علومِ تکوینی آدم و بنی آدم کو ودیعت کر دیے گئے۔

فالمراد الانواع الثلاثۃ من الکلام وصورۃ المسمّیات فی ذواتھا (راغب) علّم آدم مسمّیات الاسماء (کشاف) الھمہ معرفۃ ذوات الاشیاء وخواصھا واسمائھا واصول العلوم وقوانین الصناعات وکیفیۃ آلاتھا (بیضاوی) علّمہ صفات الاشیاء ونعوتھا وخواصھا (کبیر) یدل علی انہ علّم الاسماء کلّھا لآدم اعنی الاجناس بمعانیھا لعموم اللفظ فی ذکر الاسماء...... وانہ علّمہ ایاھا بمعانیھا اذلا فضیلۃ فی معرفۃ الاسماء دون المعانی (جصاص) ای اودع فی نفسہ علم جمیع الاشیاء من غیر تحدید ولا تعیین فالمراد بالاسماء المسمّیات عبّر عن المدلول بالدلیل (المنار)

صاحبِ تفسیر مظہری نے کہا کہ مراد اسماء سے اسماءِ الٰہی ہیں، انھیں کا علم اجمالی کامل آپ کو مل گیا تھا اور ہر اسم و صفت کے ساتھ ایسی مناسبت تامّہ آپ کو پیدا ہو گئی تھی کہ آپ جب کسی اسم یا صفت کی طرف توجّہ کرتے وہ اسم یا صفت فوراً آپ پر متجلّی ہو جاتی مثلاً جب اسم پاک الاول کی تجلّی آپ پر ہوئی تو ہر گزری ہوئی چیز آپ پر منکشف ہو گئی اسی طرح جب اسم پاک الآخر کی تجلّی ہوئی تو ہر آنے والی چیز معلوم ہو گئی اور اسی پر قیاس سارے اسماءِ الٰہی کا

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ

پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا ۴۴ اللہ پھر فرمایا بتلاؤ تو ان کے اسم

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾

اگر تم صحیح القول ہو ۴۵ اللہ

کیا جاسکتا ہے، اللہ اکبر! یہ مقام ہے انسان کی فضیلت کبریٰ کا جیسے کہ یہ خلیفۃ اللہ دیو پرستی ملائکہ پرستی میں مبتلا ہوجائے۔ كُلَّهَا۔ کی تصریح سے ذہن اسی طرف منتقل ہوتا ہے کہ تکوینی سلسلہ میں معرفت اشیاء ساری کی ساری انسان کو ہو کر رہے گی اور اسی لیے علوم کے سلسلہ میں ابھی اسے بے شمار منزلیں طے کرنا ہیں۔

۴۴ اللہ (تاکہ انسان کی اعلیٰ صلاحیت اور منصبِ خلافتِ الٰہی سے اس کی مناسبت فرشتوں پر بھی ظاہر ہوجائے) عَرَضَهُمْ۔ سوال یہ ہے کہ کیا چیز اب فرشتوں کے سامنے پیش کی جارہی ہے؟ اگر چیزوں کے محض نام مراد ہوتے تو لفظ قرآنی عَرَضَهَا ہوتا، ضمیر هُمْ ذوی العقول کے لیے ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً و تبعاً اس میں شامل ہوجائیں گے، یہ دلیل ہے اس پر کہ پیش صرف نام نہیں ہورہے تھے، بلکہ اصل موجودات، گویا پہلے صورتِ مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام اور خواص سے اطلاع بخشی گئی، پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔

عرض الخلق علی الملئکۃ (ابن جریرؒ عن ابن عباسؓ وابن مسعودؓ وغیرھما من اصحاب النبیؐ) عرض تلک الاشیاء علی الملئکۃ (ابن جریر۔ عن قتادۃؒ) ای عرض المسمّیات (کشاف) المراد بہ ذوات الاشیاء او مدلولات الالفاظ (بیضاوی)

تقدیر کلام یوں تھی اسماء المسمّیات۔ مضاف الیہ حذف کردیا گیا کہ مضاف اس کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔ (بیضاوی)

۴۵ اللہ (اپنے اس گمان میں کہ تم ہر منصب کی اہلیت اور ہر خدمت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہو۔) خطاب فرشتوں سے ہورہا ہے۔

اَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ۔ اسماء پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا، مراد یہاں بھی محض نام نہیں خواص و آثار بھی مراد ہیں۔

المسمّیات والغرض من الانباء باسمائھا الابانۃ عن معرفتھا۔ (المنار)

صٰدِقِيْنَ۔ صدق سے مراد یہاں ارادی سچائی اور راست گفتاری نہیں کہ اس کے خلاف کا تو فرشتوں میں احتمال ہی نہیں بلکہ مراد محض ان کے دعوے کا صحیح ہونا یا ان کے خیال کا مطابقِ واقعہ ہونا ہے، صدق کا اطلاق لغت عربی میں اردو کی "سچائی" سے کہیں زیادہ وسیع ہے، وہ جس طرح ارادی راست گفتاری کے لیے آتا ہے اسی طرح اصابتِ رائے، صحتِ خیال و نفس واقعیت کے لیے بھی۔

وقد یستعمل الصدق والکذب فی کل ما یحق و یحصل فی الاعتقاد (راغب) والصدق ھو الصواب

صدق و کذب، عربی کے ان دو لفظوں کے صحیح مفہوم پر نظر نہ ہونے سے اردو خواں طبقہ قرآن و حدیث (بھی)

قَالُوا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾

وہ بولے تو پاک ہے ۱۱۶ ہمیں تو کچھ علم نہیں مگر ہاں وہی جو تو نے ہمیں علم دیدیا ۱۱۷ بیشک تو ہی تو ہے علم والا ۱۱۸ حکمت والا ۱۱۹

سے تعلق کتنی ہی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

اُردو میں سچ اور جھوٹ کا تعلق لازمی طور پر فاعل کے قلب اور اس کی نیت سے ہوتا ہے اور کسی انسان کا سچا جھوٹا ہونا اس کے اخلاقی صفات میں داخل ہے۔ عربی صدق و کذب میں یہ مفہوم لازمی نہیں۔ یہاں اکثر مفہوم صرف واقعیت و عدمِ واقعیت کا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس میں فاعل کی نیت یا ارادہ کو مطلق دخل نہ ہو۔

مرشد تھانوی ؒ نے فرمایا کہ مدارِ خلافت مجاہدۂ اعمال نہیں بلکہ علم و فہم ہے بشرطیکہ بدعملی نہ ہو اور اسی لیے مشائخِ طریقت، عطائے خلافت کے وقت اُسی کی زیادہ رعایت کرتے ہیں۔

۱۱۶ (ہر نقص سے اور شائبۂ بے علمی سے بھی اور اس سے برتر اور منزہ کہ تیرا کوئی سا بھی فعل حکمت سے خالی اور مصلحت سے عاری ہو)

ملائکہ کی زبان سے بار بار عبدیت اور توحید پرستی کے کلمات ادا کرانا دنیا میں پھیلی ہوئی ملائکہ پرستی (دیوی دیوتا پوجا) پر ضرب شدید لگانا ہے۔

۱۱۷ (اور ہم ناچیز بندوں کے علم کی تیرے لامتناہی اور لامحدود علم کے سامنے بساط ہی کیا؟)

صفتِ خلق، صفتِ قدرت وغیرہ دوسری صفاتِ عالیہ کا تو خیر ذکر ہی کیا خود صفتِ علم کے بھی معیار سے کہاں فرشتوں کا علمِ جزئی اور کہاں حق تعالٰے کا علمِ کلی۔۔ نور کے بنے ہوئے فرشتے عرض کرتے ہیں اور کس سچائی اور سادگی کے ساتھ کہ ہمارا علم ہی کیا ہے ہاں وہی بس تھوڑا بہت جو تو نے ہمیں عطا کر دیا ہے۔ کم ظرف انسان جو اپنے علم پر ناز کرنے لگتا ہے، ذرا سوچے کہ یہ اعترافِ بے علمی فرشتے کر رہے ہیں اور کس شانِ خشیت و عبدیت کے ساتھ مناجات کر رہے ہیں کہ بارِ اِلٰہا علم ہمارے پاس کہاں؟ ہمیں علم سے واسطہ کیا؟ علیم و حکیم تو آپ ہی ہیں اور ہمیں یہ کہیے کہ علم جو کچھ ملا بھی ہے وہ بھی محض آپ ہی کا عطیہ اور آپ ہی کے لطف و کرم کا صدقہ ہے۔

۱۱۸ (جس کے علم کے لیے حاضر و غائب، قریب و بعید، حال و مستقبل سب یکساں! اور جو بحیثیت ہمہ داں و ہمہ بیں کے ہر مخلوق کے ظرف سے، استعداد سے، ملکاتِ طبع سے پوری طرح واقف)

الْعَلِیْمُ فعیل کے وزن پر صیغۂ مبالغہ ہے، مراد ہے وہ علم والا جس کا علم سارے ہی اشیاء کے ظاہر و باطن، روشن و خفی کا کامل احاطہ کیے ہوئے ہو۔

العلیم ھو العالم المحیط علمه بجمیع الاشیاء ظاھرھا و باطنھا، دقیقھا، و جلیلھا علی اتم الامکان۔ وفعیل من ابنیة المبالغة (نھایة)

اِنَّكَ کے ساتھ اَنْتَ کا اضافہ تاکیدِ مفہوم کے لیے ہے یعنی علم تو بس تیرا ہی کامل ہے۔

۱۱۹ (اور اسی قانونِ حکمت کے ماتحت بشر و ملک ہر مخلوق میں اس کی استعداد کے مطابق اس کے ظرف کے تناسب علم کا تقسیم کرنے والا اور کام لینے والا)

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ

(اللہ نے) فرمایا اے آدم ! بتلا دو انہیں ان کے اسم ۱۳۰؎ پھر جب انہوں نے انہیں ان کے اسم بتلا دیئے ۱۳۱؎ تو فرمایا

اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا

(اللہ نے) ۱۳۲؎ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے اور جو کچھ

كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہوں ۱۳۳؎

الْحَكِيْمُ ، وہ حکمت والا ہے جس کی معرفت بہترین اشیاء سے بہترین طریقے پر ہو، بڑی سے بڑی باریکیاں سب اس پر روشن ہوں۔

الحکیم ذو الحکمۃ والحکمۃ عبارۃ عن معرفۃ افضل الاشیاء با فضل العلوم ویقال لمن یحسن الصناعات متقنا حکیم (نہایۃ)

فرشتے یہ کہہ رہے ہیں کہ تیرا ہر حکم حکمت و معدلت سے لبریز ہی ہوتا ہے۔

ای الحکیم فی خلقک وامرک وفی تعلیمک ماتشاء ومنعک ماتشاء ولک الحکمۃ فی ذلک والعدل التام (ابن کثیر)

۱۳۰؎ (یا صفات) یعنی فرشتوں کو اشیائے کائنات کے آثار و خواص بتا دو۔ اسماء پر حاشیہ اوپر گزر چکا جب فرشتے اظہار عجز کر چکے تو اب آدمؑ سے ارشاد ہوا کہ تم اپنے معلومات کا اظہار کرو، آدم کی فضیلت اس علم تکوینی ہی کی بناء پر تو تھی۔

اَنْۢبِئْهُمْ۔ ضمیر جمع مذکر ملائکہ کی جانب ہے۔

بِاَسْمَآئِهِمْ۔ ضمیر جمع مذکر غائب اشیاء کائنات یا مسمّیات کی جانب ہے۔

۱۳۱؎ (اور اس طرح آدم کا شرف عیاناً ملائکہ پر ثابت ہوگیا)

اَنْۢبَاَهُمْ۔ ضمیر ملائکہ کی جانب ہے۔

بِاَسْمَآئِهِمْ۔ ضمیر اشیاء کائنات یا مسمّیات کی جانب ہے، فرشتوں کو علم انسان کی اس استعداد اعلیٰ کا نہ تھا، اور امتحان سے مقصود انسان کے اسی شرف استعداد کو کھول کر دکھا دینا تھا۔

۱۳۲؎ خطاب کا یہاں سے براہ راست ملائکہ سے ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن بالواسطہ اس میں وہ ساری مخلوق بھی آگئی جو فرشتوں سے فروتر ہے۔

۱۳۳؎ گویا آیت نمبر ۳۰ میں اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی جو اجمالی حقیقت بیان ہوئی تھی اب اس کی تفصیل ہوگئی اور ضمناً ان مسائل کی تعلیم آگئی کہ علم کل صرف ذات باری کا خاصہ ہے اور خالق کے لامحدود

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا ۱۲۴ کہ آدم کے آگے جھکو ۱۲۵ تو (وہ سب) جھکے مگر ابلیس (نہ جھکا) ۱۲۶

ولا متناہی علم سے مخلوق، اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق کے بھی علم کو کوئی نسبت نہیں۔

مفسرین نے یہاں ایک روایت نقل کی ہے کہ آدم کا ابھی جسدِ خاکی ہی تیار ہوا تھا اور روح ابھی اس میں نہیں پڑی تھی کہ اُدھر سے ابلیس کا گزر فرشتوں کی ایک جماعت کے ساتھ ہوا، ہمراہیوں سے پوچھا کہ یہ نئی مخلوق اگر ہم سب پر حاکم بنادی گئی تو کیا کروگے؟ فرشتے بولے کہ جان و دل سے اطاعت کریں گے اور کیا کریں گے۔ اس پر ابلیس نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے تو اطاعت نہ ہوگی میں تو خود ہی اس پر غلبہ حاصل کروں گا اور مفسرین کا خیال ہے کہ آیت میں مَا تُبْدُوْنَ کا تعلق فرشتوں کے اعلانِ اطاعت اور اظہارِ طاعت سے ہے اور مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ کا تعلق ابلیس کے اخفاءِ بغاوت سے۔ لیکن خطاب کو اگر شروع ہی سے ساری مخلوق کے لیے عام لے لیا جائے (جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیہ میں گزر چکا) تو پھر اس روایت سے استناد کی کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ غیب سے مراد وہ چیزیں ہیں جو مخلوق کی نظر سے پوشیدہ ہیں، ورنہ حق تعالیٰ کے لیے غیب و شہود دونوں ایک ہی حکم میں ہیں۔

۱۲۴ یہاں صراحت صرف فرشتوں کی ہے لیکن جب یہ حکم فرشتوں کو مل رہا تھا تو جنات وغیرہ جو نسبتاً ادنیٰ مخلوق تھے، وہ اس حکم کے مخاطب بدرجۂ اولیٰ ٹھہرے۔ بادشاہ کا حکم جب وزیر یا نائب السلطنت کو ملتا ہے تو ادنیٰ عہدہ دار بدرجۂ اولیٰ اس کے مخاطب ہوتے ہیں۔

۱۲۵ (بہ طور اظہارِ عجز و نیاز بہ حیثیت علامتِ تسلیم و اطاعت۔)

اُسْجُدُوْا۔ سجدہ سے مراد سجدۂ اصطلاحی، فقہی و سجدۂ نماز نہیں مطلق سجدہ مراد ہے۔ سجود اور سجدہ کے لفظی معنی محض تواضع و تذلل کے ہیں۔

سجد ای خضع (قاموس) السجود اصله التطامن والتذلل (راغب) کل من ذل و خضع لما امر به فقد سجد (لسان۔ عن الفراء)

سجدۂ نماز کو بھی سجدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ تذلل و تواضع کا بہترین مظہر ہے۔

ویکون السجود علی جهة الخضوع والتواضع (لسان)

خود محاورۂ قرآن میں سجود کا استعمال اس معنی میں عام ہے، مثلاً:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اے مخاطب کیا تو نہیں دیکھتا کہ آسمان و زمین میں جو بھی مخلوق ہے سب اللہ کے آگے جھکی ہوئی ہے) مفرداتِ راغب میں اور بھی مثالیں اس کی دی ہیں، اور یہاں بھی قولِ اصح یہی ہے کہ یہ حکمِ سجدہ اپنی ہیئتِ معروف کے ساتھ زمین پر پیشانی رکھنے کے معنی میں نہ تھا بلکہ صرف جھکنے کے معنی میں تھا۔

كان ذلك انحناء ولم يكن خروا على الذقن (مدارك عن ابن عباس) قيل المعنى اللغوى ولم يكن فيه وضع الجباه بل كان ذلك مجرد تذلل وانقياد (روح) قال قوم لم يكن هذا السجود المعتاد اليوم ولكنه يبقى على اصل اللغة فهو من التذلل والانقياد (قرطبی) هو سجود لا نعرف صفته ولكن اصول الدين تعلمنا انه ليس سجود عبادة اذ لا يعبد الا الله تعالى (المنار)

لیکن جن لوگوں نے اسے سجدۂ متعارف کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بھی تصریح کردی ہے کہ یہ سجدۂ تعظیمی تھا جو اگلی شریعتوں میں جائز تھا، سجدۂ عبادت ہرگز نہ تھا، مقصود تمام تر آدم کا اعزاز و اکرام تھا نہ کہ ان کی پرستش۔

تكرمة لآدم لا عبادة لآدم (ابن جرير) كان ذلك سجود تعظيم وتحية لا سجود عبادة (معالم) كان السجود تحية لآدم (مدارك) والسجدة لآدم اكراما واعظاما واحتراما وهى طاعة لله عزوجل لانها امتثال لأمره تعالى وقد قواه الرازى فى تفسيره وضعف ما عداه (ابن كثير)

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ عالمِ ارواح کا ہے، عالمِ ناسوت کا ہے ہی نہیں اور تکلیفاتِ شرعیہ کا تعلق اسی عالمِ ناسوت سے ہے۔

**لِاٰدَمَ** یعنی خلیفۃ اللہ کے آگے، نائب سلطان حقیقی کی طرف رُخ کرکے ــــ نہ یہ کہ اس کو، لَ یہاں اِلٰی کا مرادف ہے یعنی سمت اور طرف کے معنی میں ہے، سجدہ صرف سمتِ آدم میں تھا، جیسے آج بھی سمتِ کعبہ میں ہوتا ہے، مسجود جس طرح آج بھی کعبہ نہیں، ربِّ کعبہ ہے اسی طرح اُس وقت بھی ذاتِ باری ہی تھی، قرآن مجید ہی کی ایک اور آیت میں لَ عند کے معنی میں آیا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ۔ چنانچہ متعدد اکابر تفسیر یہاں اسی طرف گئے ہیں۔

قيل اى الى آدم فكان آدم قبلة والسجود لله تعالى (معالم) فالمسجود له بالحقيقة هو الله تعالى وجعل آدم قبلة لسجودهم (بيضاوى) اى اسجدوا الى مستقبلى وجه آدم (قرطبی) نصبه الله قبلة لسجودهم كالكعبة (بحر عن الشعبى)

**۱۳۶ اِبْلِیْسَ** لفظی معنی ہیں یاس زدہ کے، قرآن مجید میں مصدرِ ابلاس مختلف موقعوں پر اسی مفہوم میں آیا ہے يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۔ فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ وغیرہا، ابلیس اسی سے مشتق ہے اور یہاں بطور علم کے شیطان کے لیے آیا ہے۔

الابلاس الحزن، الحزن المعترض من شدة اياس منه اشتق ابليس (راغب) ابليس افعيل من الابلاس وهو الاياس من الخير والندم والحزن۔ (ابن جرير)

یہ ابلیس کوئی فرشتہ نہ تھا جیسا کہ یہود و نصاریٰ کی تقلید میں ایک عام خیال مسلمانوں میں بھی پھیل گیا ہے اور اچھے اچھے صاحبِ علم بھی اس میں مبتلا ہوگئے ہیں بلکہ جنّی تھا جیسا کہ قرآن مجید میں مصرح ہے كَانَ مِنَ الْجِنِّ (کہف آیت ۵۰) نور کا بنا ہوا فرشتہ نہیں جو نافرمانی پر قادر ہی نہیں ہوتا بلکہ آگ کا بنا ہوا جن تھا خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ (اعراف آیت ۱۲)

أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۖ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ

اس نے انکار کیا اور تکبر میں آگیا ۱۲۷ف اور کافروں میں سے ہوگیا ۱۲۸ف اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور

اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪

تمھاری بیوی بہشت میں رہو سہو، اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ ۱۲۹ف

ان صریح نصوص کے مقابلہ میں قول کسی کا بھی ہو قابلِ اعتنا نہیں۔

۱۲۷ف اَبٰی انکار کیا حکم کی تعمیل سے۔ وَاسْتَكْبَرَ اس نے صاف کر دیا کہ تعمیلِ ارشاد سے انکار کسی اشتباہ یا غلط فہمی کی بنا پر نہیں محض پندارِ تفوّق کی بنا پر تھا، انکار اس نے اپنی بڑائی کی راہ سے کیا، نہ یہ کہ افراطِ عشقِ الٰہی میں اور اس حکم کو منافی توحیدِ خالص جان کر جیسا کہ بعض شاعروں اور بعض شاعر منش صوفیوں سے منقول ہے۔ اِسْتَكْبَرَ کے بابِ استفعال سے یہ نکتہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ ابلیس میں یہ کبر فطری و خلقی نہ تھا بلکہ اس نے اپنے میں پیدا کیا۔

وکان السین والتاء للاشعار بأن الکبر لیس من طبیعتہ ولکنہ مستعد لہ (المنار)

۱۲۸ف یعنی اس نافرمانی نے اُسے کافروں میں داخل کر دیا، یہ معنی نہیں کہ وہ پہلے سے کافروں میں تھا ہی۔ کَانَ کے معنی محض "تھا" کے نہیں "ہوگیا" کے بھی آتے ہیں جیسا کہ اسی مقام پر۔

ومن اقسام کان الناقصۃ ان تاتی بمعنی صار کقولہ تعالیٰ کان من الکافرین (تاج) صار من الکافرین بإبائہ واستکبارہ (مدارک) صار منھم باستقباحہ امر اللہ تعالیٰ ایاہ بالسجود لآدم (بیضاوی) وصار من الکافرین (معالم) قیل بمعنی صار وھو مما اثبتہ بعض النحاۃ (روح)

جن اہلِ تفسیر نے کَانَ کو "ہوگیا" کے بجائے "تھا" کے معنی میں لیا ہے، انھوں نے فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ (اللہ کے علم میں) محذوف مانا ہے، ابلیس پر کفر کا اطلاق حکمِ الٰہی کے ردّ و انکار کی بنا پر ہوا محض ترکِ عمل (سجدہ) کی بنا پر نہیں، ترکِ عمل کو گناہ کیسا ہی ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کے لیے اہلِ سنت کے مذہب میں کافی نہیں اور اس تصریح کے بعد خوارج کو یہ کہنے کا موقع نہ رہا کہ ابلیس محض ایک (ترکِ سجدہ) سے کافر ہوگیا۔

قال ابن فورک ثم ان کفرہ لیس لترک الواجب بل باستقباحہ امر اللہ بالسجود (روح) تقول انہ انما کفر لاستکبارہ واعتقادہ کونہ محقًّا فی ذلک التمرّد واستدلالہ علی ذلک بقولہ انا خیر منہ (کبیر) وصار من الکافرین بإبائہ واستکبارہ وردّہ الامر لا بترک العمل بالامر لأنّ ترک السجود لا یخرج من الایمان ولا یکون کفرا عند اہل السنۃ خلافا للمعتزلۃ والخوارج (مدارک)

۱۲۹ف جَنَّة۔ لفظی معنی ہر اس باغ کے ہیں، جس کے درخت زمین کو چھپا لیں۔

کل بستان ذی شجر یستر باشجارہ الأرض۔ (راغب)

اَلْجَنَّة۔ سے اصطلاحِ شرعی میں مراد وہ عظیم الشّان باغ ہے جو بے شمار نعمتیں لیے ہوئے عالمِ آخرت میں نیک کاروں کے لیے مخصوص ہے اور آج نظروں سے مستور ہے اس کا نام جنت یا تو اس لیے پڑا کہ وہ دنیا کے

## وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

اور اس درخت کے پاس نہ جانا ۱۳۰

باغوں سے مشابہ ہے گو مشابہت بہت دور کی سہی۔ اور یا اس لیے کہ اس کی نعمتیں ابھی مستور ہیں۔

سمیت الجنۃ اما تشبیھا بالجنۃ فی الارض وان کان بینھما بون واما لسترہ نعمھا عنا (راغب)

اَنْتَ۔ اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ مخاطبِ اصلی حضرت آدمؑ تھے حضرت حواؑ کی حیثیت تابع کی سی تھی

زَوْجُكَ۔ مراد حضرت حواؑ ہیں، جو اس وقت پیدا ہو چکی تھیں۔

ابن القیمؒ نے ایک بڑی طویل بحث کر کے یہ دکھلایا ہے کہ قرآن مجید میں زوج محلِ تعظیم واکرام میں آیا ہے اور امرأۃ میں اس کے برخلاف پستی وتحقیر کا اشارہ ہے تا وقتیکہ کوئی اور سبب خاص اس لفظ کے لانے کا باعث نہ ہو۔

یہ روایت کہ حضرت حواؑ کی پیدائش حضرت آدم کی پسلی سے ہوئی ہے توریت کی ہے:۔

"اور خداوند خدا نے کہا کہ اچھا نہیں آدم اکیلا رہے میں اس کے لیے ایک ساتھی اس کے مانند بناؤں گا...... اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا نے اس کی پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کہ وہ نر سے نکالی گئی"۔ (پیدائش ۲: ۱۸ و ۲۴)

بعض حدیثی روایتیں جو اس مضمون کی مروی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی ایسی نہیں جسے قطعی صحت کا درجہ حاصل ہو اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں سورۃ النساء اور سورۃ الاعراف میں جو کچھ کہا ہے اس کی تعبیر اور طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے۔

حَيْثُ شِئْتُمَا۔ اس سے جنت کی وسعتِ عظیم کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔

آیت کے الفاظ سے اس پر بھی روشنی پڑ گئی کہ زوجیت کا ہونا یا خوب کھانا پینا شرفِ آدمیت اور کسی روحانی فضیلت کے منافی ہرگز نہیں کہ یہاں کھانے پینے کا تو عین حکم ہی ابو البشر کو مل رہا ہے اور زوجیت ان کے ساتھ شروع ہی سے چپکا دی گئی ہے یہ صرف غیر اسلامی رہبانیت ہے جس نے زوجیت اور کھانے پینے کو کمالِ انسانی کے منافی قرار دے لیا ہے۔

۱۳۰ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ ظاہر ہے کہ یہ درخت جنت کے درختوں میں سے کوئی متعین اور حضرت آدم کے لیے معلوم ومعروف درخت تھا، لیکن اب اس کی تعیین وتصریح سے کوئی نتیجہ نہ تھا اس لئے قرآن حکیم جو کبھی بے نتیجہ بات نہیں کہتا، اس کی تصریح سے خاموش ہے اور حدیث صحیح میں بھی اس باب میں کچھ وارد نہیں ہوا ہے اقوال البتہ کثرت سے نقل ہوئے ہیں، جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ وہ درخت محض مجازی معنی میں تھا، یعنی شجرِ علم یا شجرِ معرفت تھا۔

وقال قتادۃ شجرۃ العلم وفیھا من کل شیٔ (معالم) وقال الکلبی شجرۃ العلم علیھا من کل

# فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

ورنہ تم گنہگاروں میں سے ہوجاؤ گے ۱۳۱؎ پھر شیطان نے دونوں کو پھسلا یا اسی درخت کے باعث ۱۳۲؎

لون ومن أكل منها علم الخير والشر (بحر)

لیکن محققین امام ابن جریرؒ امام رازیؒ علامہ ابن کثیرؒ وغیرہم کا مسلک اس باب میں خاموشی کا ہے۔

قال الامام العلامة ابوجعفر ابن جرير والصواب فى ذلك ان يقال لاعلم عندنا باى شجرة كانت على التعيين لان الله لم يضع لعباده دليلا على ذلك فى القرآن ولا فى السنة الصحيحة .... وكذلك رجح الامام الرازى فى تفسيره وغيره وهو الصواب (ابن كثير) واعلم انه ليس فى الظاهر مايدل على التعيين فلاحاجة ايضا الى بيانه لانه ليس المقصود من هذا الكلام ان يعرفنا تلك الشجرة (كبير) والاولى عدم تعيينها غير قاطع (ابوسعود) وقيل شجرة لم يعلمنا الله ما هى وهذا هو الاظهر (بحر) والاولى ان لاتعيين من غير قاطع كما لم يعين فى الآية (بيضاوى) والاولى عدم القطع والتعيين (روح)

توریت میں یہ بیان ایک بڑی طویل عبارت میں آیا ہے اور اس کا آخری ٹکڑا یہ ہے:۔

"اور خداوند خدا نے آدم کو حکم دے کر کہا کہ تو باغ کے ہر درخت کا پھل کھایا کر لیکن نیک و بد کی پہچان کے درخت سے نہ کھانا کیونکہ جس دن تو اس سے کھائے گا ضرور مرے گا۔" (پیدائش ۲: ۱۶ و ۱۷)

یہ بات بھی مجمل ہی رہی، ہماری تفسیروں میں مادی درختوں میں سے گیہوں، خرما، کافور، انجیر، حنظل وغیرہ سے لے کر شجرِ محبت، شجرِ علم وغیرہ معنوی درختوں تک بہت سے نام گنا دیے گئے ہیں۔

قيل الحنطة وقيل النخلة وقيل التين، قيل الحنظل وقيل شجرة المحبة وقيل شجرة الطبيعة والهوى وقيل وقيل (روح)

۱۳۱؎ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ یعنی ان لوگوں میں سے جو اپنے آپ پر ظلم کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی نافرمانی سے بڑھ کر کون سا ظلم اپنے آپ پر ہوگا۔

اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جنت اس وقت تک دار الجزاء یا دار الخلد نہ تھی جیسی کہ اب ہے بلکہ اس وقت وہاں کے قیام کے کچھ مخصوص قوانین تھے، شرائط تھے، اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا، وہاں وسوسۂ شیطانی کے پہنچ جانے پر، یا کسی متنفس کے وہاں سے نکالے جانے پر۔ مرشد تھانویؒ نے لَا تَقْرَبَا سے یہ نکتہ خوب پیدا کیا کہ اصلاً صرف اکل ممنوع تھا، لیکن ممانعت قربِ شجر سے بھی کردی گئی، اسی طرح مشائخ محققین بعض دفعہ مباحات سے روک دیتے ہیں کہ کہیں غیر مباح کی طرف منجر نہ ہوجائے۔

۱۳۲؎ شیطان وہ ہے جو خیر اور برکت اور رحمتِ الٰہی سے دور ہوگیا۔

شطن عنه بعد واشطنه ابعده .... والشاطن البعيد .... والشيطن البعيد والشاطن الخبيث (معالى) تشطن اى باعد (راغب) الشيطن فيعال من شطن اى بعد (معالم)

ابلیس کا ذکر اوپر آچکا ہے وہی جب نافرمانی کی پاداش میں جنت سے نکالا جاچکا اور ہر طرح کی خیر و برکت سے محروم و مہجور ہوچکا تو اب اس کا وصفی نام الشیطان پڑگیا، لہٰذا اسی کو اب اس وصفی لقب سے یاد کیا جارہا ہے۔

سُمّی به لبعده عن الخير وعن الرحمة (معالم) والشيطان هو ابليس بلااختلاف هنا (بحر)

یہ شیطان یا الشیطان بنی آدم سے شدید بُغض و حسد رکھے ہوئے ہے اور دن رات انھیں بہکانے اور گمراہ کرنے میں مشغول رہتا ہے لیکن اس کے پاس اور کوئی قوت نہیں انسان کو مجبور ذرا بھی نہیں کرسکتا البتہ پروپیگنڈے کے فن کا وہ امام ہے، ترغیب خوب دے سکتا ہے، سیاہ کو سفید خوب کہہ سکتا ہے اور وسوسہ اندازی کی طاقت غضب کی رکھتا ہے، نزدیک اور دُور اپنا عمل سب کہیں سے کرسکتا ہے، فاصلہ اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا اور مادی رُکاوٹیں کسی قسم کی بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتیں، جنت کی حیثیت اس وقت تک دارالجزاء کی متعین نہیں ہوئی تھی اس لیے وہاں بھی اس کا عمل بے تکلف اثر کرسکتا تھا۔

أَزَلَّ زَلّة سے ہے اور اس کے معنی ہیں، جگہ سے ہٹا دیا، ڈگا دیا، پھسلا دیا، بغاوت، سرکشی یا ارادی نافرمانی کا کوئی مفہوم اس میں شامل نہیں۔

اى استزلهما (مجاز) الزّلة فى الاصل استرسال الرجل من غير قصد (راغب) انه اسم لفعل يقع على خلاف الامر من غير قصد الى الخلاف كزلة الماشى فى الطين (مدارک)

قرآن مجید نے پیغمبروں کی غلطیوں، لغزشوں، فروگزاشتوں کا ذکر بار بار کیا ہے لیکن بائبل کے برخلاف کوئی اخلاقی جرم، کوئی دانستہ نافرمانی، کوئی حقیقی معصیت کبھی بھی ان کی جانب منسوب نہیں کی نہ صراحۃً نہ کنایۃً ___ یہ بحث بھی چھڑی ہے کہ آیا کسی نبی کے کسی عمل پر زلّت (لغزش) کا اطلاق ہو بھی سکتا ہے؟ جن علماء و فقہاء نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، انھوں نے استدلال اسی آیت سے کیا ہے:۔

وهذا دليل على انه يجوز اطلاق اسم الزلة على الأنبياء كما قال مشائخ بخارى (مدارک)

اور مُلا علی قاری کی شرح الفقہ الاکبر میں اسی بحث میں ہے:۔

فقد كانت منهم اى من بعض الانبياء ...... زلات اى تقصيرات وخطيات اى عثرات ......

هذا ما عليه اكثر العلماء خلافا لجماعة من الصوفية وطائفة من المتكلمين حيث نفوا السهو والنسيان والغفلة

عَنْهَا میں ضمیر ھا، شَجَرَۃ کی جانب ہے اور عَن تعلیلیہ ہے معنی "اس کے سبب سے" اکثر اہل تفسیر نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

يصح ان يكون عائدا على اقرب المذكورين وهو الشجرة ...... وعنها اى بسببها (ابن كثير) والضمير فى عنها للشجرة اى فحملهما الشيطن على الزلة بسببها (كشاف) اى حملهما على الزلة بسببها (روح)

قرآن مجید میں عَن کثرت سے اس معنی میں آیا ہے مثلاً اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ (التوبۃ ۱۴) وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ (ھود ۵۳) وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ (الکھف ۸۲)

ضمیر ھا سے اشارہ جنت کی طرف بھی سمجھا گیا ہے، اس قول پر مراد یہ ہوگی کہ شیطان انھیں ورغلا لے گیا جنت سے

وقيل ازلهما اى اذهبهما الضمير حينئذ للجنة (روح) يصح ان يكون الضمير عائدا الى الجنة

فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ‌ وَقُلۡنَا اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ ‌ۚ وَلَـكُمۡ

اور جس میں تھے اس سے انھیں نکلوا دیا ۱۳۳ اور ہم نے کہا (اب) تم سب نیچے اتر جاؤ ۱۳۴ ایک دوسرے کے دشمن ہو کر ۱۳۵

فِى الۡاَرۡضِ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ ﴿۳۶﴾

اور تمہارے لیے زمین ہی پر ٹھکانا اور ایک میعاد تک نفع اٹھانا ہے ۱۳۶

فتكون معنى الكلام فنحاهما (ابن كثير) اى نحاهما الشيطن عن الجنة (معالم)

روایات میں آتا ہے کہ شیطان نے پہلے تو قسم کھا کر آدم و حوا کو اپنی دوستی، ہوا خواہی واخلاص کا یقین دلایا، ان بیچاروں کے خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ خدا کی قسم جھوٹی بھی کھائی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد کہا کہ:-

"اس درخت کا پھل اگر کھاؤ گے تو جنت میں قیام مستقل ہو جائے گا۔ اس میں تاثیر یہ ہے کہ پھر یہاں سے ہٹائے نہیں جا سکو گے اور وہ ممانعت جو ہوئی تھی وہ تو ایک عارضی حکم تھا کہ اس وقت تک تمہاری استعداد پختہ نہیں ہوئی تھی:"

حضرت آدمؑ قرب الٰہی کے اس محل (جنت) سے بڑھ کر اور کس نعمت کے حریص ہو سکتے تھے، مکار کے فریب میں آ گئے، دانستہ نافرمانی کا سایہ بھی پڑنا الگ رہا، وہ تو درخت کے پھل کو بُعد کے بجائے قرب کا ذریعہ سمجھے، یہ فہم اجتہاد کی غلطی جیسی اور جس درجہ کی بھی ہو، بہر حال فسق و معصیت سے تو اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور روایتوں سے قطع نظر، قرآن مجید میں بھی جا بجا جو تصریحات ملتی ہیں ان سے بھی تائید اسی صورت واقعہ کی نکلتی ہے، بائبل میں ہے کہ یہ بہکانے والا سانپ کی صورت میں گیا اس نے آ کر پہلے حوا کو بہکایا اور پھر انھوں نے حضرت آدمؑ کو ترغیب دی، ہمارے مفسرین نے بھی ایک طویل قصہ نقل کیا ہے جس میں شیطان، سانپ، طاؤس سب کا ذکر آتا ہے، یہ قصہ بجائے خود کہاں تک صحیح ہے، اس سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ یہ اسلامی عقائد میں بہر حال داخل نہیں اور اس کا ماخذ قرآن و سنت نہیں بلکہ اسرائیلی روایات ہیں، اسی لیے جو اہل تفسیر زیادہ محتاط و محقق ہوئے ہیں، وہ اس سے الگ ہی رہے ہیں بلکہ اس سے احتیاط ہی کی تنبیہ کر گئے ہیں:-

اعلم ان هذا وامثاله مما يجب ان لا يلتفت اليه (كبير) وقد اكثر المفسرون فى نقل قصص كثيرة فى قصة ادم وحوا والحية والله اعلم بذلك (بحر) وقد ذكر المفسرون ههنا اخبارا اسرائيلية (ابن كثير)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ کاملین بھی شیطان کے مکر سے محفوظ نہیں کہ حضرت آدمؑ کے اس وقت بھی کامل ہونے میں شک نہیں۔

۱۳۳ مِمَّا كَانَا فِيۡهِ، ترجمے دو ہو سکتے ہیں "اس حالت سے جس میں وہ تھے" یا "اس مقام سے جس میں وہ تھے" منقول دونوں قول ہیں۔

اى من النعيم والكرامة او من الجنة (كشاف) من الطاعة الى المعصية او من نعمة الجنة الى شقاء الدنيا (بحر)

اور حاصل بھی دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

یہ بھی خوب خیال رہے کہ یہاں جن افعال کی بھی نسبت شیطان سے کی گئی ہے (مثلاً ازلال یا اخراج) محض مجازی ہے ورنہ فاعلِ حقیقی ہر موقع پر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ونسب الازلال والازالة والاخراج لابليس على سبيل المجاز والفاعل للأشياء هو الله تعالىٰ (بحر)

۱۳۴ (زمین پر)

اِهْبِطُوْا، یہ جنت زمین کے کسی حصہ میں نہیں آسمان پر تھی اور قولِ محقق یہی ہے۔

اي انزلوا الى الارض (ابن کثیر۔ معالم) كان امرا بالهبوط من الجنة الى الارض (بحر)

خود ہبوط کا مقتضیٰ بھی یہی ہے جب تک کوئی اور قرینہ موجود نہ ہوگا، ہبوط کے معنی بلندی سے پستی میں اترنے ہی کے لیے جائیں گے۔

الهبوط النزول الى الارض (مدارك) الهبوط الانحدار على سبيل القهر۔ واذا استعمل في الانسان فعلي سبيل الاستخفاف (راغب)

اِهْبِطُوْا۔ خطاب اب بجائے صیغۂ تثنیہ (تم دونوں) کے صیغۂ جمع (تم سب) میں ہو رہا ہے گویا مخاطب اب تنہا آدمؑ وحواؑ ہی نہیں بلکہ ان کی ساری نسل بھی ہے۔

المراد هما وذريتهما (مدارك) اجمع الضمير لأنهما اصلا الجنس فكأنهما الانس كلهم (بیضاوی) اجمع الضمير لتنزيلهما منزلة البشر كلهم (روح)

۱۳۵ یہ مختصر لفظوں میں کل زمینی زندگی کا نقشہ آگیا یعنی یہاں جنت کے سکون و اطمینان کے برعکس کشمکش، بغض، حسد، نفسانیت، خود غرضی کا زور رہا کرے گا۔

مسئلۂ ارتقاء کے علمبرداروں نے جس قانون تنازع للبقاء پر اتنا زور دیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک پرتو اسی حقیقتِ قرآنی کا آگیا ہو۔

۱۳۶ (اور اس کے بعد واپس آتا)

فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ۔ آیت کا یہ جزو خود اس امر پر دلیل ہے کہ آدم علیہ السلام زمین پر اب پہلی بار بھیجے جا رہے ہیں اور اب تک جس جنت میں وہ تھے، وہ زمین پر نہیں آسمان پر تھی، اور اس وقت سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہو رہا ہے، نئی زندگی اور نیا ماحول، اور اب یہیں انھیں رہنا سہنا ہے۔

مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ یعنی قیام زمین پر دائمی نہ ہوگا صرف ایک مدتِ موعود تک رہنا ہوگا۔ متاع میں خود ہی مفہوم ایک محدود الوقت نفع کا ہے۔

تنبيها ان لكل انسان في الدنيا تمتعا مدة معلومة (راغب)

اور اس پر الیٰ حین کے اضافہ نے اس مفہوم کو اور واضح و مؤکد کر دیا، گویا شروع ہی سے یہ بات ابو البشر کے کان میں ڈال دی گئی ہے کہ موت کسی حادثہ کا نام نہیں وہ تو داخلِ فطرت اور لازمی و ناگزیر ہے۔ خود زمینی زندگی البتہ ایک عارضی صورت کا نام ہے۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ الفاظ سیکھ لیے ۱۳۷؎ پھر اللہ نے انکی توبہ قبول کر لی ۱۳۸؎ وہ تو ہے ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا ۱۳۹؎ بڑا مہربان ۱۴۰؎

۱۳۷؎ (توبہ و انابت کے) خطاوار کو توبہ و انابت کے الفاظ اپنی طرف سے تلقین کر دینا خود ایک بڑی فرد رحمتِ خداوندی اور رحمتِ الٰہی کی ہے، اور پھر اس سے بڑھ کر بندہ نوازی کا کمال یہ ہے کہ اس تعلیم و تلقین کی نسبت تک اپنی جانب نہیں فرمائی گئی بلکہ اُسے حضرت آدمؑ ہی کی جانب منسوب کر دیا گیا کہ انھوں نے یہ الفاظ سیکھ لیے! کیا حد ہے شفقت و بندہ پروری کی! یہ کلمات و الفاظ کیا تھے؟ روایتیں جو اس باب میں نقل ہوئی ہیں مختلف ہیں، لیکن خود قرآن مجید میں تو یہ الفاظ حضرت آدمؑ و حواؑ کی زبان سے نقل ہوئے ہیں۔

"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ" (الاعراف ۲۳)

مِنْ رَّبِّهٖ۔ ایسے موقع پر اللہ کی صفتِ ربوبیت کو یاد دلانا، اور اسماءِ الٰہی میں سے چن کر اسم رب لانا نہایت ہی بلیغ ہے، بندہ کی لغزش اس کا رب نہ معاف کرے گا تو اور کون کرے گا۔

۱۳۸؎ (اور ان کی خطا سے درگزر کر دی)

تَابَ عَلَيْهِ۔ تاب کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو معنی ہوتے ہیں کہ رحمت کے ساتھ رجوع و توجہ کی، یا توبہ کی توفیق دی، یا توبہ کے اسباب آسان کر دیے۔

تاب الله عليه اى قبل توبته منه (راغب) رزقه التوبة من خطيئته (ابن جرير) رجع اليه بالرحمة والقبول (كشاف) عبارة عن قبول التوبة والعفو عن الذنب والتوفيق لها والتيسير لاسبابها. (روح)

ایک سوال یہ اُٹھایا گیا ہے کہ گنہگار تو دو تھے، آدمؑ اور زوجۂ آدمؑ، اب یہاں صرف صیغۂ واحد مذکر کیوں آیا؟ اور جواب یہ دیا گیا ہے کہ عورت مرد کے تابع ہے اور متبوع کے ذکر میں خود تابع کا ذکر آجاتا ہے۔

ولم يقل جل شانه فتاب عليهما لان النساء تبع يغنى عنهن ذكر المتبوع ولذا طوى ذكرهن فى كثير من الكتب والسنة (روح) وقد جاء طى ذكر النساء فى اكثر القرآن والسنة. (بحر)

اور ایسا ہی تفسیر کبیر و مدارک میں ہے۔

۱۳۹؎ صیغۂ مبالغہ کی اہمیت ملحوظ رہے، اسلام کا خدا یہی نہیں کہ توبہ قبول فرماتا ہے بلکہ توبہ کے سامان اور اسباب اور اس کے لیے سہولتیں بھی بہم پہنچاتا رہتا ہے۔

يقال لله ذالك لكثرة قبوله توبة العباد حالا بعد حال (راغب) وهو الكثير القبول لتوبة العبد او الكثير الاعانة عليها (بحر) الرجاع على عباده بالمغفرة او الذى يكثر اعانتهم على التوبة (بيضاوى) وهذا من لطفه بخلقه ورحمته لعبده (ابن كثير)

اِنَّهٗ کی ترکیب نے اور زیادہ زور و قوت پیدا کر دی۔

۱۴۰؎ معنی یہی نہیں کہ وہ صرف خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہی ہو، بلکہ اپنی طرف سے اوپر بھی فضل و کرم کرنے والا ہے۔

اشارة الى مزيد الفضل (روح) المبالغ فى الرحمة وفى الجمع بين الوصفين وعد للتائب

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ

(اور) ہم نے حکم دیا کہ تم سب اس سے نیچے اتر جاؤ ۱۴۱ پھر اگر تمھیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے ۱۴۲ تو جو کوئی پیروی

فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

میری ہدایت کی کرے گا، سو اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے ۱۴۳

بالاحسان مع العفو (بیضاوی)

یہی وہ رَحِیْم اور تَوَّاب اور غَفُوْر (تینوں صفات بہ صیغۂ مبالغہ!) خدا ہے جس کے لیے معاندوں نے باربار کہا ہے کہ اسلام کا خدا ایک غضب ناک اور سخت گیر خدا ہے!

۱۴۱ (اے اولاد آدم)

جَمِيْعًا۔ مراد ذریتِ آدم ہے۔ والمراد الذریۃ۔ (ابن کثیر)

مِنْهَا میں ضمیر جنت کی طرف ہے یعنی جنت سے نیچے اُترو۔

یہ حکم بہ طور سزا وعتاب نہیں مل رہا ہے اس لیے کہ خطا تو اب معاف ہی ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجۂ طبیعی کا ظہور ہے شجر ممنوع کا پھل کھالینے سے جو طبعی اثرات مرتّب ہو رہے تھے ان کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی۔ رُوح کے داغ دُھل جانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ جسم و مادّہ سے بھی غلط کاری کے نقش مٹ جائیں۔ کوئی شخص خودکشی کے ارادہ سے اگر زہر کھالے اور معًا اسے اپنی عصیاں کاری پر تنبّہ ہو جائے اور وہ روئے، گڑگڑائے، دل سے توبہ کرے اس سے گناہ تو عجب نہیں کہ معاف ہو جائے لیکن زہر کے طبعی اثرات جو نظامِ جسم پر مرتّب ہونے ہیں وہ تو بہر حال ہو کر رہیں گے۔ خشوع، خضوع، انابتِ قلب ان مادّی اثرات کو ٹالنے کے لیے کافی نہیں۔

۱۴۲ (اور وہ یقیناً پہنچے گی، پیمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعہ سے)

اب ناسوتی دنیا میں گزر بسر کرنے، رہنے سہنے کا سرکاری، خدائی قانون بتایا جارہا ہے۔

۱۴۳ (روزِ جزا میں)

هُدَايَ۔ جو پیغام ہدایت رسولوں کے ذریعہ سے آتا ہے اسے براہ راست حق تعالیٰ کی جانب بھی منسوب کیا جا سکتا ہے۔

لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ۔ ان کے اوپر کوئی خوفناک واقعہ پیش نہ آئے گا یعنی ان کے لیے فی نفسہ کوئی بات خطرہ یا تشویش کی نہیں، یہ مطلب نہیں کہ صالحین طبعی طور پر بھی اپنے انجام کی نسبت اندیشہ نہ کریں گے یہ فکر و اندیشہ تو صالحین کو دوسروں سے کہیں زیادہ لگا رہتا ہے۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن کا تعلق ماضی سے۔ مطلب یہ ہوا کہ حشر میں مومنین صالحین کو نہ کوئی سزا پیش آنے والی ہے اور نہ وہ اپنی ناسوتی زندگی پر حسرت و تأسف کریں گے۔

مَنْ موصولہ کا استعمال واحد، جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔

ویعبر بہ عن الواحد والجمع (راغب)

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے سو وہی دوزخی ہیں ۱۴۴ؔ اور وہ اس میں

خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ ع ۴

(ہمیشہ) پڑے رہیں گے ۱۴۵ؔ

۱۴۴ؔ گویا جو لوگ ضابطۂ شریعت سے انکار اور قانونِ الٰہی کی تکذیب میں لگے ہوئے ہیں، انھوں نے اپنا مستقل تعلق دوزخ اور آتشِ دوزخ سے پیدا کر لیا ہے، آخرت میں یہی تعلق جو ابھی مخفی اور غیر مرئی ہے مجسّم و متشکل ہو جائے گا۔ عذابِ آخرت سے ڈرانا قرآن مجید کے ساتھ مخصوص نہیں گو جتنا زور اس پر قرآن مجید نے دیا ہے اس کی نظیر بیشک کہیں نہیں ملتی۔ جہنم کے عذابِ آتشیں بلکہ اس کے دوام و خلود کے ذکر سے بائبل کے صفحات بھی خالی نہیں۔

"خداوند سلطنت کرتا ہے ..... ایک آگ اس کے آگے آگے جاتی ہے اور اس کے دشمنوں کو ہر طرف جلاتی ہے" (زبور۔ ۹۷ : ۱ و ۲)

"فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جُدا کر دیں گے اور انھیں آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے وہاں رونا اور دانتوں کو پیسنا ہوگا۔" (متی ۱۳ : ۴۹ و ۵۰)

"اے ملعونو! میرے سامنے سے اس ہمیشہ کی آگ میں چلے جاؤ جو ابلیس اور اس کے فرشتوں کے لیے تیار کی گئی ہے ...... اور یہ ہمیشہ کی سزا پائیں گے۔" (متی ۲۵ : ۴۱ و ۴۶)

"جہنم میں ڈالا جائے جہاں اس کا کیڑا نہیں مرتا اور آگ نہیں بجھتی۔" (متی ۲۵ : ۴۱ و ۴۶)

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ۔ اہلِ جنت کے ذکر میں ذاتِ حق کے لیے ضمیرِ متکلم صیغۂ واحد کی اوپر ابھی گزر چکی ہے تَبِعَ هُدَايَ۔ اہلِ جہنم کے سلسلہ میں وہی ضمیرِ متکلم صیغۂ جمع میں ہو گئی ہے۔ بِاٰيٰتِنَا۔ اہلِ لطائف نے لکھا ہے کہ وہ موقع اظہارِ خصوصیت و شفقت کا تھا، اس لیے "میری" ہی مناسب تھا، اب محل حاکمانہ جلالت و اقتدار کا ہے اس لیے یہاں "ہماری" ہی موزوں ہے۔

اَصْحٰبُ النَّارِ یعنی دوزخ والے۔ وہ لوگ جو دوزخ کے ہو چکے۔ گویا وہ دوزخ ہی کی آبادی ہیں۔

الصاحب الملازم (راغب) ومعنى الصحبة اقتران بالشئ والغالب فى العرف ان تطلق على الملازمة (روح)

۱۴۵ؔ خلود کے اصل معنی ہیں کسی چیز کا ایک حال پر قائم و برقرار رہنا اور اس کے اندر کوئی تغیر، کوئی خرابی نہ پیدا ہونا۔

الخلود هو تبرى الشئ من اعتراض الفساد وبقاءه على الحالة التى به عليها (راغب)

اس سے ثانوی مفہوم دوام و ہمیشگی کا پیدا ہو گیا۔

ثم استعير للمبقى دائمًا (راغب) الخلد البقاء والدوام فى دار لا يخرج منها كالخلود ودار الخلد الآخرة لبقاء اهلها۔ (تاج)

# يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ

اے بنی اسرائیل ۱۴۶ا میرا وہ انعام یاد کرو جو

"خلود" قرآن مجید میں اس معنی میں بہت صاف طور پر آیا ہے، جہاں خالد کو باقی کے معنی میں لے کر فانی سے اس کا تقابل کیا ہے۔

وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ (انبیاء۔ ۳۴)

اور خلود فی الجنہ اور خلود فی النّار سے مراد ہے جنت کی نعمتوں یا جہنم کے عذاب کا دوام اور اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کا کبھی اپنے اپنے مقام سے باہر نہ نکلنا، اہلِ جنت کے تنعّم اور اہلِ جہنم کے عذاب کا دائم وغیر منقطع ہونا اُمت کے اجماعی مسلّمات میں سے ہے۔

ای مخلدون فیھا لامحید لھم عنھا ولا محیص (ابن کثیر) فھم اصحٰب العذاب الدائم (کبیر) والخلود ھھنا الدوام علی ما انعقد علیہ الاجماع (روح) ماکثون ابدا لایفنون ولا یخرجون (جلالین)

۱۴۶ا بَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ، مشہور و نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام عراقی ثم شامی ثم حجازی (۲۱۶۰ء یا ۱۹۸۵ء ق م) سے مشہور و نامور دو نسلیں چلیں، ایک بی بی ہاجرہ علیہا السلام مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے، یہ نسل بنی اسمٰعیل کہلائی۔ اور آگے چل کر قریش اسی کی ایک شاخ پیدا ہوئی، ان کا وطن عرب رہا، دوسری بی بی سارہ علیہا السلام عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب عُرف اسرائیل علیہ السلام سے یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ مُلک نہ تھا، شام ہی کا جزو تھا ایک تیسری نسل تیسری بیوی حضرت قطورہ سے چلی اور بنی قطورہ کہلائی، لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ کی اہمیت حاصل نہیں۔

بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا، توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی، انبیاء و مرسلین ان کے درمیان ہوتے رہے، بڑے بڑے عابد و زاہد ان میں پیدا ہو گئے، حکمران، سلاطین اور فوجی جنرل بھی ان میں بڑے بڑے پیدا ہوتے رہے، نزولِ قرآن کے وقت ان کا دنیوی اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا، اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر، وغیرہ اطراف و جوانب میں پھیل چکے تھے اور ان کے..... بعض قبیلے حجاز و اطرافِ حجاز خصوصاً یثرب (اسی کا نام بعد کو مدینۃ النبی پڑا) اور حوالی یثرب میں آباد ہو چکے تھے۔

"بنی اسرائیل" تو ایک قومی و نسلی اصطلاح ہے، مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے، اہلِ کتاب تھے، توریت محرّف و مسخ شدہ ہو کر لیکن بہرحال موجود ان کے درمیان تھی، سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدۂ جزا و سزا کے کسی نہ کسی صورت میں قائل تھے، علوم انبیاء و معارفِ اولیاء کے حامل تھے، مالدار تھے، ساہوکار تھے، ساتھ ہی ساتھ سفلی عملیات سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے، حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوّق کی بناء پر اہمیت انھیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی، مُلک کی عام آبادی مشرکوں اور بُت پرستوں کی تھی، وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے، اور دوسری طرف اکثر ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے، گویا دینی و دنیوی اکثر حاجتوں میں انھیں کو مشکل کُشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم و قاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم

## اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ

میں نے تم پر کیا ۱۴۷ اور مجھ سے وعدہ پورا کرو تو میں تم سے وعدہ پورا کروں ۱۴۸

قومیں مرعوب و متاثر ہو جاتی ہیں، مشرکین عرب بھی اسرائیلی اخلاق، اسرائیلی روایات بلکہ اسرائیلی عقائد سے بہت کچھ متاثر ہو چکے تھے اور بہت سے مسائل میں یہود کو اپنا استاد جانتے تھے، ان سب چیزوں کے علاوہ یہود کے مذہبی نوشتوں اور اسرائیلیوں کی مقدس زبانی روایتوں، دونوں میں ایک آنے والے نبی کی بشارت موجود تھی اور یہ لوگ اس نبی موعود کے منتظر رہتے تھے، ان اسباب عام و خاص دونوں کی بنا پر یہ بالکل قدرتی تھا کہ قرآن مجید میں تخاطب اس قوم کے ساتھ ہو اور خوب مفصّل ہو۔

اس منزل پر پہنچ کر بہتر ہوگا کہ ایک نظر قرآن مجید کے ترتیب بیان پر بھی کر لی جائے، قرآن مجید کا اصل تخاطب ساری کائناتِ انسانی سے ہے، اسی مناسبت سے رکوع اول میں بیان اس کا ہوا کہ نوعِ انسان کی حقیقی تقسیمیں دو ہیں، ایک اچھے یا مومن، دوسرے بُرے یا کافر، مومن یا نیک وہ جو قرآن مجید کے دستورِ حیات کو تسلیم کرتے ہیں۔ کافر یا بد وہ جو اس سے انکار کرتے ہیں، دوسرے رکوع میں بیان کافروں ہی کی ایک خاص قسم منافق کافروں کا ہوا اور یہ بتایا گیا کہ یہ لوگ بھی ایمان و نجات سے محروم ہی رہیں گے، تیسرے رکوع میں مخاطب ساری نسل انسانی کو کیا گیا، اور قرآن مجید کا اصل پیام یعنی توحید و رسالت بیان کر دیا گیا، چوتھا رکوع تاریخ نسل انسانی پر ہے اس میں یہ بیان ہوا کہ انسان کی اصلی غرضِ آفرینش دنیا میں قانونِ الٰہی کی تنفیذ ہے اور حاکمیتِ الٰہی کی نیابت۔ ذرا سی غفلت میں نسل انسانی کا دیرینہ دشمن شیطان اس کو بچھاڑ سکتا اور حق سے باطل کی طرف نور سے ظلمت کی جانب اُسے موڑ سکتا ہے لیکن انسان اگر ذرا بھی ہمت اور توجہ صرف کرتا ہے اور انبیاء کی بتائی ہوئی اور دکھائی ہوئی صراطِ مستقیم پر قائم رہے تو وہی غالب و منصور رہے گا، اب پانچویں رکوع میں بیان اس کا شروع ہوتا ہے (اور اس کی تفصیل متعدد رکوعوں تک چلتی رہے گی) کہ مدت دراز ہوئی ایک بڑے مقبول برگزیدہ بندہ کی اولاد میں ایک خاص نسل کو توحید کی نعمتِ خاص سے سرفراز کیا گیا تھا، مگر وہ قوم اس کی نااہل ثابت ہوئی، موقعے اُسے بار بار دیے گئے، رعایت اس کے ساتھ بار بار کی گئی لیکن ہر بار اُس نے اس نعمت کو اپنے ہاتھوں ضائع کیا، یہاں تک کہ اپنی نسل کے آخری پیغمبر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی مخالفت میں تو حد سے ہی گزر گئی، طویل و مسلسل مراعات کے بعد اب حکومتِ الٰہی کا دستور ایک نیا ضابطہ اختیار کرتا ہے، اس ناشکر گزار نافرمان عصیان پیشہ قوم کو اس منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور یہ نعمت اس سے چھین کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے دنیا کی تمام قوموں اور ساری نسلوں کے واسطے عام کی جا رہی ہے۔

۱۴۷ اس انعامِ خداوندی کی تصریح کے لیے ملاحظہ ہوں حواشی ۱۳۶ و ۱۶۲، بہرحال کوئی ایسا انعام تھا جو نسلِ اسرائیل پر نسل اسرائیل کی حیثیت سے تھا۔

۱۴۸ توریت نسل اسرائیل پر احساناتِ الٰہی اور خداوندی نعمتوں کی یاددہانیوں سے بھری پڑی ہے۔

عَهۡدِیۡ یعنی تمہارا وہ عہد جو میرے ساتھ ہے اور وہ عہد اطاعتِ الٰہی و اطاعتِ انبیاء کا ہے۔

بما عاهدتمونی من الایمان بی والطاعة لی (کشاف) بامتثال امری (معالم)

توریت میں بھی اسی عہد کا ذکر جا بجا ہے۔ مثلاً:۔

"تو نے آج کے دن اقرار کیا ہے کہ خداوند میرا خدا ہے ...... اور میں اس کی راہوں پر چلوں گا اور اس کی شرطوں

وَاِيَّایَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا

اور تم صرف مجھی سے ڈرتے رہو ۱۴۹ اور اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے تصدیق کرتی

تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪

ہوئی اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے اور مت بنو اس کے ساتھ کفر کرنے والوں کے مقتدا ۱۵۰

اور اس کے حقوق اور اس کے حکموں کی محافظت کروں گا۔ اور اس کی آواز کا شنوا ہوں گا۔" (استثناء ۲۶: ۱۷)

عَهْدِكُمْ ۔ یعنی جو عہد میں نے تم سے تمہارے ایمان وطاعت پر بطور انعام کر رکھا ہے۔

ای ارضی عنکم وادخلکم الجنة (کبیر۔ عن ابن عباس)

توریت میں اس کا ذکر بھی جا بجا ہے۔ مثلاً:۔

"اور خداوند نے بھی آج کے دن تجھ سے اقرار فرمایا" (استثناء ۲۶: ۱۷)

"اگر تم میری آواز کے فی الحقیقت سننے والے ہوگے اور میرے عہد کو حفظ کرو گے تو تم ساری قوموں سے زیادہ میرے ایک خزانۂ خاص ہوگے۔" (خروج ۱۹: ۵)

اَوْفُوْا ۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ وفائے عہد جس کا یہاں ذکر ہے اس کے مراتب میں بہت وسعت ہے ادنیٰ مرتبہ بندہ کی طرف سے ادائے کلمۂ شہادت ہے اور حق تعالیٰ کی طرف سے حفاظتِ جان ومال۔

۱۴۹ (نہ کہ اپنی ہی جیسی مخلوق سے)

توحید کے لیے خطابِ عام جملہ عالمِ انسانیت سے رکوع تین میں ہو چکا ہے اب خطابِ خاص اسی مخصوص حاملِ توحید قوم بنی اسرائیل سے ہے لیکن یہاں اشارہ شرک جلی اور بت پرستی سے زیادہ شرک خفی اور ضعفِ ایمان کی جانب ہے یہ اخلاقی بیماری اسرائیلیوں کی ساری قوم میں پھیل چکی تھی اور خالق کی رضا اور عدم رضا کے بجائے انسانوں کو راضی رکھنے کی پروا اور ان کی ناخوشی سے بچنے کی اہمیت اچھے اچھے علماء ومشائخ یہود کے دلوں میں گھر کر چکی تھی، انجیل میں حضرت مسیحؑ کے مواعظ میں اس قسم کی ہدایتیں اور تنبیہیں کثرت سے ملتی ہیں۔

مشرکین اور بت پرستوں کے معاملہ میں جو آیتیں ہیں ان کا پرواز دوسرا ہے اور یہاں جو موحد قوم کو سرزنش ہو رہی ہے کہ رضائے الٰہی کے بجائے رضائے مخلوق کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اس کا عنوان دوسرا ہے۔

۱۵۰ (رسول اللہؐ کی رسالت سے انکار کر کے)

بِمَآ اَنْزَلْتُ ۔ اشارہ ہے قرآن کی طرف۔

یعنی القراٰن (معالم) یعنی به القراٰن (ابن کثیر)

لِمَا مَعَكُمْ ۔ اشارہ ہے توریت کی طرف۔

من التوراة (معالم)

كَافِرٍ ۔ صورۃً واحد ہے معنیً جمع ہے یعنی یا تو تقدیر کلام یہ ہے کہ:۔

# وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ز وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ (۴۱)

اور میری آیتوں کو فروخت مت کر ڈالو تھوڑی سی قیمت پر ۱۵۱ اور صرف مجھی سے ڈرو ۱۵۲

ولا تکونوا اوّل فریق کافر (قرطبی)

اور یا بقول اخفش نحوی و فراء نحوی اعتبار معنی فعل کا کیا گیا ہے اور یہ ترکیب کلام عرب میں بالکل جائز و فصیح ہے۔

لان المعنی اول من کفربه (قرطبی) وذلك من کلام العرب فصیح جید فی الاسم اذا کان مشتقا من فعل (معالم)

بِهٖ ۔ضمیر قرآن کی طرف ہے اور ہو سکتا ہے کہ رسول کی جانب ہو اور ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

وکلا القولین صحیح لانهما متلازمان (ابن کثیر)

**اَوَّلَ**۔ اول ہمیشہ تقدم زمانی ہی کے موقع پر نہیں آتا چنانچہ امام راغب نے قرآن مجید کی ان آیتوں اَنَا اَوَّلُ المسلمین۔ انا اوّل المومنین میں اوّل کے معنی اسلام و ایمان میں امام و مقتدا کے لیے ہیں۔

فمعناه انا المقتدی بی فی الاسلام والایمان (راغب)

**اَوَّلَ کَافِرٍ بِهٖ**۔ مشرکین عرب اسرائیلیوں کی دماغی و ذہنی بالادستی کے پوری طرح قائل تھے ان کے انکار و مخالفت کو سند میں پیش کرتے رہتے، یہود بہرحال اہل کتاب تھے کتاب آسمانی کی قدر انھیں کو ہونا چاہئے تھی اور بہ طور مقتدائے عرب انھیں کی ذمہ داری سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۴۷ و ۱۶۲)

ای لاتکونوا ممن یقتدی بکم فی الکفر۔ (راغب)

وعندکم فیه من العلم ما لیس عند غیرکم (ابن جریر عن ابن عباس) فان وظیفتکم ان تکونوا اوّل من امن به لما انکم تعرفون حقیقة الامر (روح) اذهم منظور الیهم فی مثل هذا الانهم حجة مظنون بهم علم (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا کہ اوّل سے مراد اولیت و اقدمیت زمانی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ کفر کی طرف سبقت و مبادرت نہ کرو، اور یہ طرز تعبیر کلام عرب میں عام ہے۔

ای ولا تبادروا الی الکفر به وهذا الاستعمال معروف فی الکلام البلیغ لهذا المعنی لا یقصد بالاولیة فیه حقیقتها۔ (المنار)

**۱۵۱** حق کو کسی بھی دنیوی، مادی مصلحت کی بناء پر چھوڑ دینا، آخرت کی ابدی دولت کو دنیا کے ثمن قلیل (تھوڑی سی قیمت پر) فروخت کر ڈالنا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ عقبیٰ کو تھوڑے دام پر نہ بیچا جائے اور زیادہ دام پر بیچ ڈالا جائے، دنیا کی بڑی سے بڑی دولت بھی آخرت کے مقابلہ میں بہرحال قلیل ہی ہے۔

کل کثیر الیه قلیل وکل کبیر الیه حقیر (کشاف)

امام رازی نے کہا ہے کہ اشتراء یہاں استبدال کے معنی میں ہے یعنی بدلنے اور معاوضہ کرنے کے۔

یہود کی حق فروشیوں کے کاروبار کا ذکر عہد نامۂ جدید میں بھی ہے مثلاً:۔

"یہ لوگ ناجائز نفع کی خاطر ناشائستہ باتیں سکھا کر گھر کے گھر تباہ کر دیتے ہیں۔" (طیطس ۱: ۱۱)

اور دوسرے مقامات پر بھی ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور حق کو ناحق کے ساتھ خلط ملط مت کرو ۱۵۳ اور حق کو مت چھپاؤ ۱۵۴ دراں حالیکہ تم جان بھی رہے ہو ۱۵۵

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ جھکتے رہو ۱۵۶

۱۵۲ (نہ کہ کسی مخلوق سے) خوفِ خداوندی کی تاکید سے توریت اور انجیل دونوں بھرے پڑے ہیں۔ قرآن مجید نے صرف تاکید مزید کر دی ہے۔

آیت کا تعلق صرف یہود کی حق فروشی سے ہے لیکن بعض فقہاء مفسرین نے مناسبتِ بعید کی بنا پر اس کے ذیل میں یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ آیا دینی تعلیم پر معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں؟ چنانچہ قرطبی اور ابن کثیر میں اس پر تقریریں موجود ہیں اور قول فیصل روح المعانی میں ملے گا۔

۱۵۳ (کلام الٰہی میں لفظی یا معنوی تحریف کر کے)

لَا تَلْبِسُوْا۔ تلبیس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ لینا، چھپالینا۔

واصل اللبس ستر الشیٔ (راغب)

ادھوری بات کہنا کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے یا جھوٹ کو لفظی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا بعض وقت بالکل گڑھے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطے کا سبب بن جاتا ہے، اسی سے ملتی جلتی ہوئی شے کا نام پروپیگنڈا ہے، موجودہ فرنگیوں کی طرح یہود بھی اس فن میں اُستاد رہ چکے ہیں۔

۱۵۴ احکامِ الٰہی کو بدل دینے کی ممکن صورتیں دو ہیں ایک ان میں اندرونی تحریف، تلبیس و تخلیط، دوسرے ان کا اخفا و کتمان، یہود نے اپنے دینی صحیفوں میں دونوں طرح کے عمل جاری کر رکھے تھے، توریت کے اصل نسخہ کے دو دو بار تلف ہو جانے سے اول تو یوں ہی کتنے احکام سرے سے غائب اور گم ہو گئے تھے پھر جو باقی رہ گئے تھے انھیں حاملانِ توریت نے اپنے اپنے اغراض و مصالح کے ماتحت کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔

۱۵۵ (کہ تم تلبیس و کتمان کے مرتکب ہو رہے ہو۔)

یعنی تحریف تمہارے ارادہ و اختیار سے باہر نہیں، دیدہ و دانستہ تمہارے علم کے اندر ہو رہی ہے۔

فی حال علمکم انکم لابسون کاتمون (کشاف)

یعنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تم اپنے ان اعمالِ تلبیس و کتمان کی شناعت سے بھی خوب واقف ہو۔

ودل ھذا علی تغلیظ الذنب علی من واقعہ علی علم وانہ اعصی من الجاھل (قرطبی)

۱۵۶ یعنی ایمان کے بعد عملاً بھی ارکانِ اسلام کی پابندی کرو۔ ایمان لانے کا حکم ابھی ایک آیت قبل وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ میں مل چکا ہے۔ اب تعلیم اہم جزئیاتِ احکام کی ہو رہی ہے۔

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ نماز کے پابند ہو جاؤ کہ اس سے مرضِ حُبِّ جاہ کا علاج ہو جائے گا (تھانوی)

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ؕ

کیا تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو؟ ۱۵۷ درانحالیکہ تم کتاب (الٰہی) پڑھتے رہتے ہو ۱۵۸

أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۴۴﴾

سو کیا تم عقل سے کام (ہی) نہیں لیتے؟

اٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ زکوٰۃ دیتے رہو کہ اس سے مرضِ حُبِّ مال کی اصلاح ہو جائے گی۔ (تھانویؒ)

ارْكَعُوا مَعَ الرّٰكِعِينَ۔ جھکنے والوں کے ساتھ جھکو کہ تواضع باطنی کے حصول میں بڑا دخل اہلِ تواضع کی معیت کو ہوتا ہے۔ (تھانویؒ)

ارْكَعُوا۔ رکوع اسلامی نماز کے ایک معروف رکن کا نام ہے مقصدِ ارشاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ نماز جماعت میں شریک رہو۔ فقہاء میں ایک بحث یہ پیدا ہوئی کہ آیا کافروں کو فروع کا مخاطب بنانا درست ہے؟ ایک گروہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے جواب اثبات میں دیا ہے لیکن دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے یہ سارے احکام ایک آیت کے قبل کے حکم ایمان وَاٰمِنُوا بِمَآ اَنْزَلْتُ کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ پھر ان احکام پر عمل کرو۔

۱۵۷ یعنی کیسے غضب کی بات ہے کہ دوسروں کو تو ایمان لانے کا مشورہ دے دیتے ہو اور خود ایمان نہیں لاتے۔ خطاب بنی اسرائیل سے چلا آرہا ہے اور پر گزر چکا ہے کہ اسرائیلی اپنے صاحب علم و کتاب ہونے کی بناء پر مشرکین عرب کی نظر میں محترم و قابل وقعت تھے اہل عرب اکثر ان کے پاس آکر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے باب میں استفادہ کرتے کہ اس مدعی نبوت کے دعووں میں کہاں تک صداقت ہے؟ ہم اس کی تصدیق کریں یا نہ کریں؟ وغیرہ۔ احبار یہود ایسے موقعوں پر بارہا مشورے دے اٹھتے کہ بےشک ان میں علامتیں تو ہمارے ہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق پائی جاتی ہیں۔

قالوا هو صادق وامره حق فاتبعوه (کبیر) نزلت فی احبار المدینة کانوا یامرون سرًا من نصحوه باتباع محمد صلی الله علیه وسلم (روح۔ عن ابن عباس)

ضمیر و دیانت کے لحاظ سے تو ان کا مشورہ یہ تھا لیکن اپنے عمل کے وقت ہوائے نفس حائل ہو جاتی اور خیال یہ گزرنے لگتا کہ اسلام لانے کے بعد ماتحتی اور پابندی کی زندگی بسر کرنا ہوگی، سیادت کے یہ مالی اور جاہی مزے کہاں حاصل رہیں گے۔

وهم کانوا لایتبعونه لطمعهم والصلات التی کانت تصل الیهم من اتباعهم (کبیر) ولا یتبعونه۔ (روح۔ عن ابن عباس)

الْبِرّ۔ بِرّ کے لفظی معنی نیکی کے ہیں، اور یہ اپنے اطلاق میں عام ہے یعنی ہر قسم کی نیکی پر شامل۔

البر ای التوسع فی الخیر الکامل (راغب) هو اسم جامع لاعمال الخیر (کبیر) یتناول جمیع اصناف الخیرات (ابن مسعود)

یہاں اشارہ قبولِ اسلام و تصدیق رسالتِ محمدی کی طرف ہے۔

اَتَأْمُرُوْنَ۔ ہمزہ یہاں اظہار حیرت اور ملامت کے لیے ہے۔

والهمزة للتقریر مع التقریع والتعجب (کبیر) الهمزة للتقریر مع التوبیخ والتعجب من حالهم (کشاف)

۱۵۸ یعنی کتاب توریت جس میں علامتیں اور شہادتیں ان خاتم النبیین کی درج ہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو ۱۵۹ کہ وہ بیشک گراں ہے مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنھیں اس کا خیال رہتا ہے

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع ۵

کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا (بھی) ہے اور اس کا کہ انھیں اس کی طرف واپس ہونا ہے۔ ۱۶۰

یعنی بالکتب التورٰة۔ (ابن جریر عن ابن عباس)

**۱۵۹** (ایمان کی ثابت قدمی اور شعائر کفر کے ترک پر)

ایمان لے آنے اور صراط مستقیم اختیار کرلینے کے بعد طرح طرح کی کلفتیں اور بندشیں ناگزیر ہیں، ان تلخیوں اور ناخوشگواریوں کو ہلکا کرنے کے لیے یہاں علاج یہ بتایا جارہا ہے کہ عادت صبر کی ڈالو اور نمازیں پڑھتے رہو۔

الصَّبْرِ۔ صبر کی ایک تفسیر صوم یا روزہ سے آئی ہے۔

وقال مجاهد الصبر الصوم (معالم)

دوسرے معنی ترک شہوات کے کئے گئے ہیں۔

**۱۶۰** اِنَّهَا۔ ضمیر نماز کی طرف ہے۔

قال المورج ردّ الکنایة الی الصلاة لانها اعم (معالم)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ ضمیر استعانة کی طرف ہے۔

نماز کا حکم ابھی ابھی ملا ہے اب بیان ان طریقوں کا ہو رہا ہے جن سے خود نماز کی پابندی آسان ہوجائے۔

خٰشِعِيْنَ۔ خشوع کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے اب یہاں آیت میں خشوع قلب کے دو خاص اثرات کا بیان ہو رہا ہے۔ پہلا اثر یہ ہے کہ خاشعین کو اس کا استحضار رہتا ہے کہ یہ عبادتیں رائیگاں جانے والی نہیں۔ اپنے شفیق و کریم پروردگار کے حضور میں بہر حال حاضر ہونا ہے۔ اس وقت یہ ساری محنت وصول ہوجائے گی اور استحقاق سے کہیں بڑھ کر اجر ملے گا، شوق نماز اس مراقبہ سے پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ دوسرا اثر خشوع قلب کا یہ ہے کہ خاشعین کے دل میں یہ بات جم جاتی ہے کہ آخر تو ایسی مالک حقیقی کے روبرو ہوگی، حساب جس طرح ہر عمل کا ہوگا اسی طرح ترک عمل کا بھی ہوگا۔ ترک نماز کی عادت اس مراقبہ سے خود بخود ترک ہوجائے گی۔ عمل میں ساری سہولتیں یقین ہی کی مضبوطی اور قوت سے پیدا ہوتی ہیں اور یقین کے ایجابی و سلبی دونوں پہلو یہاں بیان میں آگئے۔

نفسیات جدیدہ میں محرک عمل دو ہی چیزیں مانی گئی ہیں۔ ترغیب و ترہیب۔ ترغیب کا جز وانهم ملقوا ربهم میں جزا و اجر کے استحضار سے آگیا اور ترہیب کا جز وانهم الیه راجعون میں مراقبۂ مواخذہ سے آگیا۔

لَكَبِيْرَةٌ۔ کبیرہ یہاں ثقیل کے معنی میں ہے طبیعت پر بھاری، گراں۔

يَظُنُّوْنَ۔ ظن لغت میں شک اور یقین دونوں کے معنی میں آیا ہے۔

العرب تسمّی الیقین ظنًّا والشك ظنًّا (ابن جریر) الظن من الاضداد یکون شکًّا ویقینًا (معالم)

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ

اے بنی اسرائیل، میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا ۱۶۱ے اور تمھیں

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۱۶۲ے

مفردات راغب میں ہے کہ ظن کبھی قوی ہو کر حدّ علم تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی صفت ہو کر "وہم" کے مترادف رہ جاتا ہے۔ اور کلام عرب میں ظن بمعنی یقین کے استعمال کے نظائر بے انتہا ہیں۔

والشواھد من اشعار العرب وکلامھا علی ان الظن فی معنی الیقین اکثر من ان تحصی (ابن جریر)

الظن بمعنی الیقین او الترجیح مشھور عن العرب (نہر)

یہاں اکثر ائمۂ تفسیر نے یقین ہی کے معنی میں لیا ہے۔

فقوله الذین یظنون الخ فمن الیقین (راغب) ای یعلمون ویستیقنون (ابن جریر عن ابن عباس) الظن ھھنا الیقین (ابن جریر عن ابی العالیة) ای یستیقنون (معالم) وروی عن مجاھد والسدی والربیع بن انس وقتادة نحو قول ابی العالیة (ابن کثیر) معناہ یوقنون قاله الجمھور (بحر)

بعض نے یہاں بھی مراد توقع و امید سے لی ہے اور اس قدر بھی کافی ہے۔

یظنون ای یتوقعون (کشاف)

۱۶۱ے ملاحظہ ہوں حواشی ۱۴۶ے و ۱۶۲ے

۱۶۲ے خوب خیال رہے کہ یہاں ذکر مذہب یہود کا نہیں ایک مخصوص قوم و نسل کا ہے۔ بنی اسرائیل نام کسی مذہب یا فرقہ یا عقیدہ کا نہیں ایک خاص نسل کا ہے۔ افضلیت یہاں مذہب یہودیت کی نہیں نسل اسرائیل کی بیان ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نسل کی افضلیت سارے عالم پر کس معنی میں ارشاد ہو رہی ہے؟ اور وہ کون سی ایسی نعمت تھی جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی؟؟ اگر کہئے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرت آبادی، تو اول تو یہ انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان و اہتمام کے ساتھ کیا جائے اور انھیں کو معیار فضیلت و افضلیت بنایا جائے، اور پھر یہ نعمتیں تو بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب رہ چکی ہیں، کلدانیہ، مصر، ہندوستان ان سب ملکوں کا تمدن اپنے زمانہ میں اسرائیلیوں سے قبل عروج پر رہ چکا ہے اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا دنیوی جاہ و حشم اسرائیلیوں سے بڑھ چڑھ کر رہا ہے پھر آخر قوم اسرائیل کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی اعلیٰ ترین نعمت "مسلک توحید" کی تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں یا اس کی طرف بہی چلی جارہی تھیں، یہ نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی، جو من حیث القوم توحید کی علمبردار رہی عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے رسالت کی

قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدۂ توحید واضح اور پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رُسُل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے نسل اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے، ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں کبھی کبھی پیدا ہوگئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں، ذکر یہاں افراد کا نہیں نسل و قوم کا ہو رہا ہے، دنیا کی ساری دوسری قوموں میں جس وقت ہُوَ رَاوِنَارْوَن" کا ہو رہا تھا اور وہ قومیں عناصر پرستی، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بُت پرستی، غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی شکل میں گرفتار تھیں، انبیاء و رسل اور ان کی تعلیمات کا چرچا صرف بنی اسرائیل میں تھا۔ ہندوستان کی آریہ نسل میں فلسفہ، ہندسہ، ریاضیات، معقولات کے ماہرین و علماء جیسے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں بہرحال حلولیت کا ترک اس میں حلول ہی کئے ہوئے تھا، اور توحید و رسالت کی دعوت صرف سامی نسل کی شاخ اسرائیلی کے حصہ میں آئی تھی، موجودہ یہود کو بھی اپنے اسلاف کی امتیازی حیثیت یاد ہے جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"بنی اسرائیل پر خاص فرض عائد ہوا تھا کہ توحید باری کی دعوت دیتے رہیں اور آفتاب پرستی، ماہتاب پرستی کواکب پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہیں۔" (جلدہ ۶ ص ۵) "بنی اسرائیل کا واحد فریضہ دنیا میں خدا کا گواہ بننا تھا۔" (جلد ۶ ص ۲) "مخلوقات کے مراتب مختلف ہیں، ذی شعور مخلوق غیر ذی شعور سے فائق و برتر ہیں، انسان فائق ترین ہے، انسانوں میں بنی اسرائیل بحیثیت موحد پرستارانِ حق کے مشرکوں سے افضل و بالاتر ہیں" (جلد ۶ ص ۱۱) "سامی قوموں میں سب سے پہلے عبرانیوں ہی کی رسائی اپنے انبیاء کی تعلیم سے توحید باری تک ہوئی۔" (جلد ۹ ص ۶۵۹)

مسیحی فرنگی مؤرخین نے بھی اسی تاریخی حقیقت کا اعادہ کیا ہے، ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے:

"دین توحید کی بنیاد بنی اسرائیل ہی میں پڑی" (جلد ۲ ص ۳) "انسانیت کی موجودہ روحانی کائنات عام اس سے کہ مسیحی ہو یا اسلامی، سب کی تہہ میں اسی عقیدۂ توحید کی بازگشت ہے جس کی دعوت سب سے پہلے اسرائیلیوں نے دی تھی۔" (جلد ۲ ص ۳)

خود توریت کی تصریحات بھی اس سلسلہ میں نظر انداز کرنے کے قابل نہیں:

"تو خداوند اپنے خدا کے لیے ایک پاک قوم ہے۔ خداوند تیرے خدا نے چن لیا کہ تو سب گروہوں کی نسبت جو زمین پر ہیں اس کے خاص گروہ ہو، خداوند نے تم سے محبت رکھی اور تمھیں برگزیدہ کیا، نہ اس لیے کہ تم اور گروہوں سے گنتی میں زیادہ تھے، کیونکہ تم سب گروہوں سے کمتر تھے بلکہ اس لیے کہ خداوند عالم نے تم سے محبت رکھی" (استثناء ۷: ۶ و ۷) "خداوند کو خوش آیا کہ تمھارے باپ داداؤں سے محبت رکھے اس لیے ان کے بعد ان کی اولاد کو یعنی تم کو سارے گروہوں کی بہ نسبت پہلے برگزیدہ کیا، جیسا کہ آج ہے" (استثناء ۱۰: ۱۵) "تم میرے گواہ ہو، خداوند فرماتا ہے، اور میرا بندہ بھی جسے میں نے برگزیدہ کیا ...... سو تم میرے گواہ ہو"۔ (یسعیاہ ۴۳: ۱ و ۲)

قوم بنی اسرائیل اور اُمتِ موسوی دو تو بالکل اور قطعاً علٰحدہ چیزیں ہیں۔ اس لیے آیت کی تفسیر میں اُمتِ موسوی اور اُمتِ محمدیؐ کے تقابل و تفاضل کا سوال ہی سرے سے نہیں پیدا ہوتا، اس سوال کا یہاں اٹھانا قطعاً بے ضرورت ...... بلکہ بے محل ہے، افضلیت بنی اسرائیل کو کسی خاص زمانہ کے اندر محدود و مقید کرنے کی ضرورت ہمارے قدیم مفسرین کو محض اس لیے پیش آئی کہ "امتِ موسوی" اور "قوم اسرائیل" کے درمیان خلط ہوگیا اور دونوں کا عظیم الشان فرق نظر میں نہ رہا، اُمتِ محمدیؐ کی فضیلت بہ لحاظ دین و عقیدہ ہے نہ کہ کسی نسلی یا قومی اعتبار

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

اور اس دن سے ڈرتے رہو جب نہ کوئی کسی کے حق میں بدل بن سکے گا اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی

شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور نہ کسی سے معاوضہ قبول کیا جائے گا نہ انھیں مدد ہی پہنچ سکے گی ۱۶۳

ہے اور آیت میں ذکر ایک خاص نسل کی افضلیت کا ہے، یہ کوئی نظریہ یا اجتہادی مسئلہ نہیں ایک مسلّم تاریخی حقیقت ہے کہ جس وقت دنیائے تہذیب طرح طرح کی مشرکانہ وہم پرستیوں میں مبتلا تھی، موحدِ اعظم ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل کی ایک شاخ توحید کا علم بلند کیے ہوئے تھی، ہمارے قدیم مفسرین میں سے بھی کسی کسی کے ذہن کی رسائی اس حقیقت تک ہوگئی ہے اور وہ صاف لکھ گئے ہیں کہ نسل اسرائیلی کی افضلیت اس میں سلسلۂ نبوت وانبیاء کے لحاظ سے تھی۔

بما جعل فیھم من الانبیاء وھذا خاصۃ لھم ولیست لغیرھم۔ (قرطبی)

۱۶۳ یَوْمًا "اس دن" سے مراد ظاہر ہے کہ یوم قیامت ہے، قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی، حشر ونشر، جزا وسزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسئولیت اور ذمہ داری کی روح ہے اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں، کہنا چاہیے کہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے مٹ چکا تھا، آگے روز قیامت کے جو اوصاف بیان ہو رہے ہیں، سب میں مقصود کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدہ ہی کا رد ہے۔

لَا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ۔ اس سے مقصود اُس اسرائیلی عقیدہ کی تردید ہے جو آج تک جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یوں لکھا چلا آتا ہے:۔

"بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے" (جلد ۶، ص ۶۱)

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (جب کہ موت حالتِ کفر پر اور عدمِ ایمان میں ہوئی ہو) یہاں بھی تردید ہے اس اسرائیلی عقیدہ کی کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں، بہر حال اپنے اسلاف کرام شفاعت کرکے بخشوا ہی لیں گے، شفاعت اور شفیعِ مستقل کا یہی وہ مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے مسیحیت میں آکر انتہائی شکل اختیار کرلی اور کفارہ ہی کی طرح شفاعت پر مسیحیت کی بنیاد ہے۔

لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ۔ اس میں اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدۂ کفارہ پر ہے، مسیحیوں کے ہاں عقیدۂ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے لیکن خود یہود بھی ایک بڑی تعداد میں اسی عقیدۂ کفارہ سے متأثر ہوکر اس کے قائل ہوگئے تھے۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۲۷۵)

وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ۔ ایمان نہ رکھنے والوں کو کسی طرف سے مدد و نصرت بھی نہ پہنچے گی کہ سزا میں کچھ تخفیف ہی ہوسکے، چہ جائیکہ نجاتِ کامل ہوسکے، گمراہ قوموں نے طرح طرح کے سہارے گڑھ رکھے تھے کہ فلاں اور فلاں عذابِ الٰہی کی گرفت سے بچا لیں گے، یہاں سب کی جامع تردید آگئی۔

## وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمہیں فرعون والوں سے نجات دی تھی جو تمہارے اوپر بڑا عذاب توڑ رہے تھے ۱۶۴

۱۶۴ (جس پر تمہاری تاریخ کے اوراق روشن گواہی دے رہے ہیں)

آل۔ لغت میں اَھل کا مرادف ہے اور مراد اس سے اہل و عیال، اتباع، ہم مذہب اور ہم نسب ہوتے ہیں۔

اھل الرجل عیالہ واتباعہ واولیاءہ (تاج) قومہ واھل دینہ ومثلھا (مجاز)

فرق یہ ہے کہ اہل کا استعمال عام ہے اور آل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لیے آتا ہے۔

لایستعمل الآل الا فیما فیہ شرف غالبا (تاج)

فِرْعَوْن۔ یہ کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام یا عَلَم نہیں قدیم شاہانِ مصر کا عام لقب تھا جیسے ہمارے زمانہ میں ابھی کل تک جرمنی کے بادشاہ کو قیصر، روس کے تاجدار کو زار، ترکی کے فرمانروا کو سلطان، والیِ مصر کو خدیو اور والیِ دکن کو نظام کہتے تھے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے ہمعصر کوئی ایک بادشاہ نہیں بلکہ یکے بعد دیگرے دو بادشاہ ہوئے ہیں۔ یہ اگر صحیح ہے تو اسے بھی قرآن کا اعجاز ہی کہنا چاہیے کہ وہ بجائے شخصی نام کے عمومی لفظ لایا جس کے بعد شخصیتوں کے ایک یا دو یا چند ہونے کا سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

مصر سے نکل کر بنی اسرائیل کے سفر جزیرہ نمائے سینا کا نقشہ ایک جدید مغربی فاضل کی تحقیق کے مطابق حسب ذیل ہے:

يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یعنی ظالم و جابر حکمرانوں کی طرح تمہیں رعایا بنائے ہوئے تمہارے اوپر طرح طرح کی سختیاں کر رہے تھے۔ توریت میں ہے:۔

"مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انھوں نے سخت محنت سے گارا اور اینٹ کا کام اور سب خدمت

يُذَبِّحُونَ أَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ وَفِي ذَٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن

تمھارے لڑکوں کو قتل کر ڈالتے تھے ۱۶۵؎ اور تمھاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے ۱۶۶؎ اور اس میں تمھارے پروردگار

رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿۴۹﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنجَيْنَٰكُمْ

کی طرف سے تمھاری بڑی آزمائش تھی ۱۶۷؎ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تمھارے لیے سمندر پھاڑ دیا تھا ۱۶۸؎ پھر ہم نے تمھیں نجات دی

کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی اور ان کی ساری خدمتیں جو وہ اُن سے کراتے تھے مشقت کی تھیں" (خروج ۱: ۱۳ و ۱۴)

قدیم ترین اسرائیلی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود (HISTORY OF JEWISH-ANTI QUITIES) میں تفصیلات اور زیادہ موجود ہیں۔

قرآن مجید اور توریت کے بیان کا یہ فرق بھی قابل لحاظ ہے کہ توریت نے حاکمانہ سخت گیریوں کو سارے مصریوں کی جانب منسوب کر دیا اور قرآن نے حسب معمول محتاط اور انتہائی صادقانہ لہجہ میں نام صرف "فرعونیوں" کا لیا۔ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے ایسی ہی الگ ہیں جیسے انگریزی قوم اور انگریزی حکومت ہندوستان پر گرفت انگریزی حکومت کی تھی۔ نہ کہ انگریزی قوم کی۔

نَجَّيْنَا۔ باب تفعیل سے ہے، اور اس باب کی ایک خاصیت فعل کی تدریج ظاہر کرنا بھی ہے بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سارے اسرائیلی مصر سے دفعۃً نہیں نکلے تھے بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف ٹولیوں میں نکلتے رہے اور ان کا سب سے بڑا اور آخری دستہ وہ تھا جو حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں روانہ ہوا، اور راہ بھٹک کر سمندر پار ہوا۔ ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل میں ہے۔

"ممکن ہے کہ مصری اسرائیلیوں کے گروہ وقتاً فوقتاً مصر سے نکل کر اپنے اجداد کے مقبروں کے گرد آباد ہوتے رہے ہوں" (جلد ۳ صفحہ ۸۶) اگر تاریخ نے کبھی اس مفروضہ کی تصدیق کر دی تو قرآن مجید کے لفظ نَجَّيْنَا (باب تفعیل سے) لانے کی اعجازی قدر اس وقت ہوگی

۱۶۵؎ توریت میں ہے۔

"اگر بیٹا ہو تو اُسے ہلاک کر دو ...... اور فرعون نے اپنے سب لوگوں کو تاکید کر کے کہا کہ ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو" (خروج ۱: ۵ و ۲۲)

فرعون سرکار کا حکم یہ نافذ ہوا تھا کہ اسرائیلی رعایا کا فرزند نرینہ کوئی سا بھی جینے نہ پائے۔

۱۶۶؎ یہ لڑکیوں کا قتل نہ کرنا اور انھیں عورت بننے کے لیے زندہ رکھنا غالباً اس لیے تھا کہ انھیں آئندہ فرعونی امراء اپنے حرم میں داخل کریں۔ ملمین کی "ہسٹری آف دی جیوز" (جلد اول صفحہ ۱۴۷)

توریت میں ذکر قرآن کی طرح صرف ان کے زندہ رکھنے کا ہے وجہ و مصلحت درج نہیں۔

"اگر بیٹا ہو تو اسے ہلاک کر دو اور اگر بیٹی ہو تو اسے جینے دو ...... ان میں جو بیٹا پیدا ہو تم اسے دریا میں ڈال دو، اور جو بیٹی ہو جیتی رہنے دو" (خروج ۱: ۱۵ و ۲۲)

۱۶۷؎ مشہور اور قدیم یہودی مؤرخ جوزیفس (جس کا زمانہ حضرت مسیحؑ سے متصلاً بعد کا ہے) کے الفاظ بھی تقریباً بالکل یہی ہیں:-

"یہ ایک بہت سخت ابتلا تھا" (تاریخ آثار یہود۔ باب ۲، فصل ۹)
تاریخ اسرائیل کی کتابیں اس کڑی آزمائش کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔

۱۶۸ فرعون اور مصری گورنمنٹ کے مظالم سالہاسال تک برداشت کرنے کے بعد بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ساری قوم اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو چلا جانا طے کر لیا، سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا، زمانہ وہ تھا کہ راستہ میں لیمپ لالٹین وغیرہ ہونا الگ رہا، آج کل کی طرح باقاعدہ سڑکیں نہ تھیں، شب کی تاریکی میں اسرائیلی راستہ بھول گئے اور بجائے اس کے کہ شمال کی طرف بڑھتے اور آگے بڑھ کر اپنے داہنی پر مشرق کی طرف مڑتے، پہلے ہی ادھر گھوم پڑے، اُدھر فرعون کو خبر ہوگئی اور وہ اپنے لشکر کی کمان خود کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں آ پہنچا، اب اسرائیلیوں کے سامنے یعنی مشرق کی جانب بحر قلزم کا شمالی سرا تھا، اور دائیں بائیں یعنی شمال و جنوب میں پہاڑیاں تھیں، اور پشت پر یعنی مغرب کی جانب مصری لشکر تھا، قرآن مجید میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، توریت میں اس کو خروج بنی اسرائیل سے موسوم کیا ہے زمانہ کی تعیین جزم کے ساتھ مشکل ہے۔ جدید ترین تحقیقات کے مطابق پندرھویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار پایا ہے، بلکہ بعض نے جرأت کر کے سنہ بھی متعین کر دیا ہے یعنی ۱۴۴۷ء ق م۔

بِكُمُ تمہارے لیے، یعنی تمہیں بچانے کے لیے تمہیں راستہ دینے کے لیے۔
ای فرقنا لکم (معالم) ای فرقنا بسببکم و بسبب انجائکم (کشاف) بسببکم (جلالین)

بشر کے محدود نقطۂ نظر اور انسان کے ناقص علم کے اعتبار سے جو مستبعد، خلاف معمول اور حیرت انگیز واقعہ کسی نبی کی تائید میں ظاہری، مادی اسباب سے بے تعلق ظہور میں آئے اُسے اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں، ایسے کسی واقعہ کو جس کا ثبوت یقینی روایت، مشاہدہ یا نقل صحیح سے مل جائے "خلاف عقل" کہہ کر اس کے امکان سے انکار کر بیٹھنا خود ایک انتہائی نادانی اور بے عقلی ہے، تاریخی عجائب سے آخر تاریخ لبریز ہی ہے، اور خوارق، نوادر، حوادثِ عجیبہ سے دنیا کا کون سا گوشہ زمانہ کا کون دَور خالی رہا ہے؟ آج کس دن کہیں تاریخ کے اخبارات عجائب سے خالی رہتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ ایسے واقعات کو خلافِ معمول، خلاف عادتِ عامہ کہا جا سکتا ہے اور ان کے روایتی ثبوت کا مطالبہ یقیناً کرنا چاہیے، راویوں پر جرح بھی خوب کر لینا چاہیے لیکن اس سے تجاوز کر کے ان کے نفسِ امکان میں تشکک کرنا یا انھیں خلافِ عقل یا محال قرار دینا اپنی کم عقلی کا اظہار کرنا ہے۔ استبعاد جو کچھ ہے وہ تو صرف انسانی معیار سے ہے، انسان کے بہت ہی محدود و مختصر رقبۂ علم و تجربہ کے اعتبار سے، ورنہ جو قادرِ مطلق ہے اُس کے لیے تو "حسبِ معمول" اور "خلافِ معمول" سب ایک ہے، اور غریب و مانوس کا فرق اس کے لیے تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا "وقوع" اور "امکان" دو بالکل الگ چیزیں ہیں اور انھیں کے خلط مبحث نے معجزہ کے مسئلہ میں اتنی الجھن پیدا کر دی ہے، امکان تو ہر چیز کا ہے، قادرِ مطلق کے دائرۂ قدرت کے اندر ہر بڑی سے بڑی چیز ہے، ناممکن یا محال اس کے لیے تو کوئی سی بھی چیز نہیں، لیکن وقوع پر یقین کرنے کے لیے ضرورت شاہدوں کی ہوتی ہے اور جو واقعہ جس قدر عجیب اور معمول عام سے ہٹا ہوگا، اسی نسبت سے اس پر یقین لانے کے لیے شہادت بھی زبردست ہونی چاہیے۔ یہ تو معجزات پر اصولی گفتگو تھی، باقی یہاں جس فرق البحر کا ذکر ہے، یہ تو سمندر کا پھٹ جانا اور درمیان میں خشکی کی راہ بن جانا کچھ ایسا زیادہ خارق عادت بھی نہیں کہ اس کی نظیر کہیں ملتی ہی نہ ہو، بحری زلزلہ کے وقت ایسی صورتیں

# وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور فرعون والوں کو غرق کر دیا، درانحالیکہ تم دیکھ رہے تھے ۱۶۹ ؎

پیش آتی رہتی ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۳۴ء (رمضان ۱۳۵۲ھ) میں جو عظیم الشان زلزلہ بہار و اطراف بہار میں آیا، اس موقع پر صوبہ بہار کے صدر مقام شہر پٹنہ میں دن دوپہر کوئی ڈھائی بجے کے وقت ایک مجمع کثیر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ گنگا جیسے وسیع و عریض دریا کا پانی چشم زدن میں غائب ہوگیا، اور اتنے چوڑے پاٹ میں بجائے دریا کے دھالیے کے خشک زمین نکل آئی اور یہ حیرت انگیز اور دہشت ناک منظر چند سکنڈ نہیں، چار پانچ منٹ تک قائم رہا، یہاں تک کہ دریا اُسی برق رفتاری کے ساتھ یک بیک زمین سے اُبل کر پھر جاری ہوگیا! —— واقعہ کی مفصل روئداد ایک قلم نگار کے قلم سے انگریزی روزنامہ "پانیر" (لکھنؤ) کی ۲۰ جنوری ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں درج ہے۔

اَلْبَحْرَ۔ بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہوگیا ہے بلکہ بحر قلزم (یا بحر احمر) مراد ہے۔ دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن اور محلّہ سے مغرب جانب واقع تھا، اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا، نیل سے اس راستہ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا، اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ مصر کے مشرق میں جہاں بعد کو نہر سوئز کھدگئی اور پہلے خشکی تھی، اس سے متصل جنوب میں (نقشہ اٹھا کر دیکھئے) سمندر دو شاخوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا، یہاں ان دو میں سے مغربی شاخ مراد ہے۔ اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کر کے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔

۱۶۹ ؎ اسرائیلی اپنے کو ہر طرف سے محصور پا کر قدرۃً سخت پریشان ہوئے لیکن رہنمائی اللہ کے ایک پیمبر کر رہے تھے، آپ نے وحی الٰہی کے اشارے سے فرمایا کہ بلا توقف سمندر میں چل پڑو، سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ جیسی دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا، درمیان میں خشک راستہ پیدا ہوگیا، اسرائیلیوں کا قافلہ عبور کر گیا، اتنے میں فرعونی بھی لب ساحل پہنچ گئے، اور یہ منظر دیکھ کر وہ بھی پیدل اور سوار خشک سمندر میں در آئے، لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے، کہ پانی کی وہ کھڑی دیواریں آناً فاناً آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی حسب سابق رواں ہوگیا اور دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو کر رہ گیا۔ توریت میں تصریحات ذیل ملتی ہیں:—

"پھر موسٰی نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا۔ اور خداوند نے بسبب بڑی پوربی آندھی کے تمام رات میں دریا کو چلایا اور دریا کو سکھا دیا اور پانی کو دو حصہ کر دیا، اور بنی اسرائیل دریا کے بیچ میں سے سوکھی زمین پر ہو کر گزر گئے، اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی۔" (خروج ۱۴: ۲۱ و ۲۲)

"بنی اسرائیل خشک زمین پر دریا کے بیچ میں چلے گئے اور پانی کی ان کے داہنے اور بائیں دیوار تھی سو خداوند نے اُس دن اسرائیلیوں کو مصریوں کے ہاتھ سے یوں بچایا۔" (خروج ۱۴: ۲۹ و ۳۰)

"اور مصریوں نے پیچھا کیا اور ان کا پیچھا کئے ہوئے وہ اور فرعون کے سب گھوڑے اور اس کی گاڑیاں اور اس کے سوار دریا کے بیچوں بیچ تک آئے اور موسٰیؑ نے اپنا ہاتھ دریا پر بڑھایا اور دریا صبح ہوتے ہی اپنی اصلی قوت پر ٹوٹا اور مصری اس کے آگے بھاگے۔ اور خداوند نے مصریوں کو دریا میں ہلاک کیا اور پانی پھرا۔ اور گاڑیوں اور سواروں اور فرعون کے سب لشکر کو جو ان کے پیچھے دریا میں آئے تھے چھپا لیا اور ایک بھی اُن میں سے باقی نہ چھوٹا۔" (خروج ۱۴: ۲۳-۲۸)

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا ١٧٠ پھر تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کرلیا ١٧١

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾

اور تم (سخت) ظالم تھے ١٧٢

واقعہ کا زمانہ جدید ترین اثری تحقیق کے مطابق ١٤٤٧ق.م، یا اس سے لگ بھگ قرار پایا ہے۔

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ فقرہ غیر ضروری یا برائے بیت نہیں، بنی اسرائیل پر اس حقیقت کا پُرزور طریقہ پر اعلان مقصود ہے کہ اپنے ایسے پُرقوت دشمن کی ہلاکت و بربادی کا نظارہ محض تائید خداوندی سے تم نے اپنی آنکھوں سے کرلیا توریت میں ہے

"اسرائیلیوں نے مصریوں کی لاشیں دریا کے کنارہ پر دیکھیں"۔ (خروج۔ ١٤۔٢١)

١٧٠ جب حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو مصری حکومت کے پنجۂ غضب سے نکال لائے تو اب مشیت خداوندی یہ ہوئی کہ اس قوم کو ایک پورا نظام شریعت اور دستورِ زندگی عطا ہو، چنانچہ حضرت موسیٰؑ جزیرہ نمائے سینا کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہ طور پر نوشتۂ غیبی لینے کے لیے ایک چلّے کے لیے طلب کیے گئے۔

مُوْسٰى۔ موسیٰ بن عمران سلسلۂ اسرائیلی کے سب سے زیادہ مشہور و جلیل القدر پیمبر کا نام ہے، توریت میں ہے کہ "عمر ایک سو بیس ١٢٠ سال کی پائی"۔ (استثناء۔ ٣٤ : ٧)

آپ کا زمانہ مؤرخین اور اثریئین کا تخمینہ ہے کہ پندرھویں اور سولھویں صدی قبل مسیحؑ کا تھا۔ سال ولادت غالباً ١٥٢٠ق.م، سال وفات غالباً ١٤٠٠ق.م۔

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً۔ چالیس ٤٠ رات دن مراد ہیں۔ قمری حساب سے ٢٤ گھنٹہ والا دن بجائے صبح کے شام سے شروع ہوتا ہے اس لیے عربی محاورہ میں بجائے چالیس ٤٠ دن کے چالیس ٤٠ رات آتا ہے۔ توریت میں ہے:۔

"اور موسیٰؑ پہاڑ پر چالیس ٤٠ دن رات خداوند کے پاس رہا"۔ (خروج۔ ٣٤۔٢٨)

اسلامی روایتوں میں آتا ہے کہ یہ زمانہ ذیقعدہ کے پورے مہینہ اور ذی الحجہ کے پہلے عشرہ کا تھا:۔

قیل انہا ذوالقعدۃ بکمالہ وعشر من ذی الحجۃ (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہلِ سلوک کے یہاں جو چلّے کی میعاد متعارف ہے اس کی اصل یہیں سے ہے۔

١٧١ (بطور اپنے معبود کے)

مِنْۢ بَعْدِهٖ۔ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں، اُدھر حضرت موسیٰ پہاڑ پر تشریف لے گئے اِدھر ان کی مُوَحّد قوم نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کی دیکھا دیکھی ایک گوسالہ کی مورت سونے کی بنا کر اس کی پرستش شروع کردی۔ توریت میں خروج کا باب ٣٢ پورا اسی گوسالہ پرستی کی تفصیلات..... کی نذر ہے۔

١٧٢ (اپنے حق میں)

قرآن مجید نے اس قسم کے فسق شدید بلکہ شرک کو اکثر ظلم ہی سے تعبیر کیا ہے اور واقعی اس سے بڑھ کر ظلم انسان کا

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ

پھر ہم نے تم کو اس کے بعد بھی معاف کر دیا ۱۷۳؎ کہ شاید تم شکر گزار بن جاؤ ۱۷۴؎ اور

اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

(وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان دیے تاکہ تم راہ یاب ہو جاؤ ۱۷۵؎

اپنے حق میں ورہی کیا سکتا ہے۔ اسرائیلیوں میں یہ گمراہی آگئی کہاں سے؟ اس سوال کے جوابات مختلف دیے گئے ہیں، ایک قول ہے کہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا عکس تھا، دوسرا قول ہے کہ مشرک کنعانیوں (فلسطینیوں) کے ہم جوار ہونے کا اثر تھا، تیسرا قول ہے کہ گوسالہ مورت تھی چندرماں دیوتا کی اور گوسالہ پرستی مرادف تھی ماہتاب پرستی کی، بہر حال یہ شرک جس راہ سے بھی آیا ہو، قرآن نے اسے شرک ہی قرار دیا، خواہ وہ مورتی (نعوذ باللہ) خدائے واحد ہی کی کیوں نہ بنائی گئی ہو۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ حلول باری تعالیٰ کی جناب میں محال ہے، ورنہ اگر محض غلطی ہوتی تو اسرائیلی اس میں معذور سمجھے جاتے۔

۱۷۳؎ (تمہارے توبہ و استغفار اور تم میں سے ایک خاص گروہ کی سزایابی کے بعد)

گوسالہ پرستی اور شرک جیسے انتہائی جرم کی سزا چاہیے تو یہ تھا کہ ساری قوم کو ملتی، شرک کرنے والوں کو شرک کی اور باقی تماشہ دیکھتے رہنے والوں کو سکوت عن الحق اور اعانتِ جرم کی، لیکن واقعۃً سزا صرف ایک مخصوص گروہ کو ملی، جیسا کہ ابھی آتا ہے اور باقی ساری قوم توبہ و استغفار کے بعد بچ گئی۔

۱۷۴؎ (کہ شکر گزاری اور منت پذیری تو جوہر شرافت اور لازمۂ انسانیت ہے)

توحید و طاعت پر ثابت قدمی ہی اس موقع پر عملی شکر گزاری تھی۔

۱۷۵؎ (اور جزئیات تک کے لیے زندگی کا ایک دستور العمل ہاتھ آجائے)

اجمالاً راہِ ہدایت یعنی توحید کی تعلیم تو اسرائیلیوں کو پہلے سے ملی ہوئی تھی اور پیمبران کے درمیان موجود ہی تھے اب کتاب اس لیے نازل فرمادی گئی کہ ایک مستقل و مرتب دستور العمل جزئیاتِ زندگی کا ان کے ہاتھ میں آجائے اور آئندہ یہ راہ سے بھٹکنے نہ پائیں۔

اَلْكِتٰبَ۔ یعنی توریت۔ قرآن مجید میں مطلق الکتٰب کا لفظ علاوہ قرآن کے توریت کے لیے بھی آیا ہے۔

اَلْفُرْقَانَ۔ فرقان اپنے لفظی معنی میں ہر وہ چیز ہے جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے۔

كل ما فرق به بين الحق والباطل فهو فرقان (لسان)

اَلْفُرْقَانَ۔ قرآن کا بھی ایک نام ہے اس مناسبت سے کہ قرآن حق و باطل، حرام و حلال کے درمیان فارق ہے اور اسی مناسبت سے اس کا اطلاق علاوہ قرآن کے توریت و انجیل پر بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کتابیں بھی فارق ہیں بہ لحاظ عقائد، حق و باطل کے درمیان، بہ لحاظ اقوال صدق و کذب کے درمیان اور بہ لحاظ اعمالِ نیک و بد کے درمیان (راغب) اس مقام پر الفرقان کی متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ۱۷۶ کہ اے میری قوم یقیناً تم لوگوں نے اپنے اوپر (بڑا) ظلم کیا اپنی گوسالہ

الْعِجْلَ فَتُوْبُوْۤا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ

گیری سے ۱۷۷ سو اب اپنے خدا سے توبہ کرو ۱۷۸ پھر اپنے اشخاص کو قتل کرو ۱۷۹

شلاً ایک یہ کہ الکتٰب والفرقان کے درمیان عطف تفسیری ہے اور مراد دونوں سے ایک ہی ہے یعنی توریت۔ توریت ہی کی دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت کتابیت دوسری صفت فرقانیت اول کے لحاظ سے وہ الکتٰب ہے اور دوسری کے لحاظ سے الفرقان۔

یعنی الجامع بین کونہ کتابا منزلا وفرقانا یفرق بین الحق والباطل یعنی التوراۃ (کشاف)

الفرقان نعت والواو زائدۃ یعنی الکتاب الفرقان (معالم عن الکسائی)

۲۔ دوسرے یہ کہ اس سے مراد یہاں توریت اپنے احکام و شرائع کے لحاظ سے ہے۔ ابن عباسؓ اور بہت سے تابعین کا یہی مذہب ہے۔ یہ قول قول اول سے معنیً بالکل ملتا ہوا ہے۔

۳۔ مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئے تھے شلاً معجزۂ عصا معجزۂ ید بیضا وغیرہا یہی مذہب مجاہد تابعی کا ہے۔

انه معجزات الفارقة بين الحق والباطل (روح)

۴۔ مراد وہ فتح و غلبہ ہے جو بنی اسرائیل کو حکومتِ فرعونی کے مقابلہ میں عطا ہوا تھا۔

النصر والفرج الذی اٰتاہ اللّٰه بنی اسرائیل علی قوم فرعون (کبیر) الفرقان الفرج من الکرب لانھم کانوا مستعبدین مع القبط (قرطبی)

یہود کا عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتاب توریت کے علاوہ زبانی بھی بہت سے اسرار و مسائل کی تعلیم حضرت موسیٰؑ کو ہوئی تھی اور وہ ان کے بعد سے سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسل ان کی قوم میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں، سو یہود کے نقطۂ خیال سے فرقان سے مراد اس علم سفینہ کے علاوہ یہ علم سینہ ہے۔

۱۷۶ (بعد اس کے کہ بنی اسرائیل شرک اور گوسالہ پرستی کے مرتکب ہو چکے تھے)

۱۷۷ (کہ توحید جیسی دولتِ بے بہا پاکر پھر شرک اور مخلوق پرستی کی سفلیت پر اتر آئے)

۱۷۸ فَتُوْبُوْۤا۔ میں فاء سببیہ ہے کہ نہ انھوں نے ظلم کیا ہوتا نہ آج توبہ کی نوبت آتی۔

والفاء للتسبیب (بیضاوی) لانّ الظلم سبب للتوبة (بحر)

توریت میں اس موقع پر ہے:۔

”اور موسیٰؑ نے کہا آج خداوند کے لیے اپنے تئیں مخصوص کرو، ہر ایک مرد اپنے بیٹے اور بھائی پر حملہ کرے تاکہ وہ تمھیں برکت دیوے“ (خروج ۔ ۳۲ : ۲۹)

بَارِئِكُمْ۔ اسماء حسنیٰ میں سے ایک اسم البارئ بھی ہے جو قرآن مجید میں صرف تین جگہ آیا ہے، دو جگہ تو

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

یہی بہتر ہے تمہارے حق میں تمہارے خدا کے نزدیک ۱۸۰ پھر اس نے تمہاری توبہ قبول کرلی ۱۸۱ بیشک وہ ہے ہی

الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا مہربان ۱۸۲

کے ساتھ معنانہ ہوکر۔ اسی آیت میں؛ اور ایک جگہ الباری ہوکر سورۃ الحشر (پ ۲۸) کے ختم کے قریب۔ بَرِئَ کے معنی خلق کے ہیں، اور الباری متقارب ہے معنی میں الخالق کے گو دونوں میں فرق کیا گیا ہے۔

وبینہما فرق وذلك ان الباری ہو المبدع المحدث والخالق ہو المقدر الناقل من حال الی حال (قرطبی) الباری ہو الذی خلق الخلق بریئا من التفاوت ومتمیزا بعضہ عن بعض بالأشکال المختلفۃ والصور المتباینۃ (کبیر) الباری ہو الذی خلق الخلق لا عن مثال (نہایہ)

**۱۷۹** (اپنے ہاتھ سے یعنی غیر مجرمین، مجرمین کو قتل کریں۔)

فلیقتل الذی لم یعبد العجل الذی عبدہ (ابن عباس)

شرک شریعتِ موسوی اور آئینِ اسرائیلی میں علاوہ معصیتِ مذہبی کے فوجداری کا بھی ایک سنگین جرم تھا مستوجبِ قتل۔ توریت کی قانونی آیتوں میں مشرک ومشرکہ کے لیے یہ تصریح ہے کہ:

"اس مرد یا اس عورت پر یہاں تک پتھراؤ کیجیو کہ وہ مرجائیں ..... گواہوں کے ہاتھ اس پر پہلے اٹھیں تاکہ اس کو قتل کریں اور ان کے بعد باقی سب لوگوں کے ساتھ تم یوں ہی اپنے بیچ سے شرارت کو نیست ونابود کیجیو" (استثناء ۱۷: ۵-۷)

اور ظاہر ہے کہ شریعت کا نفاذ صاحبِ شریعت کے سامنے بھی نہ ہوتا تو اور کب ہوتا، شرک کے مجرمین پکڑ پکڑ کر سامنے لائے گئے اور اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُترے۔ توریت میں ہے:—

"تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ایک دروازہ سے دوسرے دروازہ تک تمام لشکرگاہ میں گزرتا پھرے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق کیا چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار آدمی مارنے پڑے"۔ (خروج ۳۲: ۲۷ و ۲۸)

**فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ** میں قتل سے مراد یہی اہلاک ہے جسے سب جانتے ہیں اور محققین کا گروہ اسی معروف معنی میں قتل کا قائل ہے۔

والمتبادر من القتل القتل المعروف من ازہاق الروح (روح) ظاہر ہذا انہ ہو القتل المعروف من ازہاق الروح (بحر) والصحیح انہ قتل علی الحقیقۃ ہنا (قرطبی)

اس کھلے ہوئے معنی کو چھوڑ کر، بلاوجہ وبلاضرورت قتل کے مجازی معنی مجاہدہ یا ریاضت یا نفس کشی کے کرنا نہ کسی نقلی سند کے مطابق ہے نہ کسی عقلی دلیل کے ماتحت، یہ واقعۂ قتل تاریخ بنی اسرائیل کا ایک مشہور ومسلّم واقعہ ہے۔ توریت کی سند ابھی گزر چکی۔ تاریخ کی سب کتابیں اس کو دہرا رہی ہیں۔ سارے دفترِ نقل وروایت میں کوئی لفظ اس کے خلاف موجود نہیں۔ رہی "عقل" سو خدا معلوم دنیا کے پردہ پر آج بھی وہ کون سی گورنمنٹ ہے جو اپنے

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز نہ باور کریں گے تمہارے (کہنے سے ۱۸۳) جب تک

الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾

ہم خدا کو دیکھ نہ لیں علانیہ ۱۸۴ سو (اس پر) تم کو آلیا کڑک نے ۱۸۵ اور تم (اس کا آنا) دیکھ رہے تھے ۱۸۶

قانون فوجداری کے شدید مجرموں، لٹیروں، ڈاکوؤں، نقب زنوں کو محض معافی طلب کرنے پر چھوڑ دیتی ہے۔

۱۸۰ (اور اس خیریت اور بہتری کا ظہور آخرت میں ہوگا)

خَیْرٌ سے اشارہ یہاں نجات، مغفرت اور گناہ کی گندگی سے پاک صاف ہونے سے ہے یہاں ذکر خیال ہے کہ اسلامی نہیں اسرائیلی ضابطۂ شریعت کا ہو رہا ہے۔

۱۸۱ (من حیث القوم)

تَابَ عَلَيْكُمْ یعنی تمہاری توبہ من حیث القوم قبول کر لی سزا صرف انہیں افراد کو ملی جو شرک کے مجرم واقعۃً اور عملاً تھے، آبادی کا بڑا حصہ جو صرف اپنی خاموشی سے شریک جرم رہا، اس کی خطا معاف ہو گئی۔

۱۸۲ دنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا یہ عقیدہ رہ چکا ہے اور اب بھی ہے (مثلاً بدھ مذہب والوں کا) کہ خدا کو معاف کر دینے کا کوئی اختیار ہی نہیں کیونکہ وہ خود قانون مکافات عمل کا پابند ہے۔ مسیحیت بھی اسی اساسی گمراہی میں مبتلا ہے، خدا چونکہ از خود کسی کو معاف نہیں کر سکتا اور اپنی رحم دلی کی بنا پر چاہتا ہے معاف کر دینا، اس لئے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطور کفارہ سزا دے دی، اور دوسروں کو معاف کر دیا۔ یہودیت نے بھی خدا کی قہاریت پر اتنا زور دیا کہ اس کی رحمت و رحمانیت کی تصویر بالکل دھندلی پڑ گئی۔ قرآن مجید نے توبہ و قبولِ توبہ اور رحمتِ الٰہی کی وسعت پر بار بار زور دے کر ان ساری گمراہیوں کی تردید کر دی۔

اَلتَّوَّابُ وَالرَّحِيْمُ دونوں پر حاشیے گزر چکے۔

۱۸۳ (کہ جو مخاطبہ تم سے ہوا وہ مخاطبۂ الٰہی ہی تھا، اور جو کلام تم ہمیں سناتے ہو وہ کلام الٰہی ہی ہے)

قُلْتُمْ "تم نے کہا تھا" یعنی تمہاری قوم کے ستر بڑے بوڑھے نمائندوں نے۔

والقائلون هم السبعون الذين اختارهم موسىٰ للميقات (بیضاوی) لن نؤمن لك اي لاجل قولك (بیضاوی)

تاریخ اسرائیل کے اہم ترین واقعات دہرائے جا رہے ہیں اور اسرائیلیوں پر حجت اُن کی قومی تاریخ سے قائم کی جا رہی ہے۔ اب ذکر اس وقت کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا میں ستر بزرگان قوم کو ہمراہ لے کر لشکر گاہ سے کوہ طور پر گئے ہیں۔ دامنِ کوہ میں اُنھیں چھوڑ کر خود آگے بڑھ گئے ہیں اور مکالمہ و مخاطبۂ الٰہی سے مشرف ہونے کے بعد اس کی اطلاع اور خوشخبری ان بزرگانِ قوم کو پہنچائی ہے۔

۱۸۴ (اپنی انھیں مادی اور ظاہری آنکھوں سے)

گویا اللہ تعالیٰ بھی کوئی مادی جسم رکھتا ہے جس کا مشاہدہ ہر شخص کر سکتا ہے اور گویا رسول کے حواس عام

بشری حواس سے کسی طرح بھی ممتاز نہیں ہوتے اس لیے جو کچھ وہ دیکھ اور سن سکتا ہے وہی سب ہی دیکھ اور سن سکتے ہیں

**۱۸۵** (اس گستاخانہ مطالبہ کی پاداش میں)

لفرط العناد والتعنت وطلب المستحیل۔ (بیضاوی)

**اَخَذَتْکُمُ** "پکڑ لیا تم کو" یعنی انھیں ستر بزرگان قوم کی جماعت کو۔ معتزلہ نے آیت سے استدلال کیا ہے کہ رؤیت باری ممکن ہی نہیں، ورنہ اگر جائز ہوتی تو اس سوال پر سرداران اسرائیل کو اتنی سخت سزا نہ ملتی لیکن اہل سنت کا مذہب ہے کہ رؤیت باری جنت میں تو مؤمنین کو ہو ہی کرے گی۔ ہاں دنیا میں بھی مخصوص افراد کو بہ طور فضل خاص ممکن ہے، البتہ ہر جہت، جسم اور مادی کم و کیف سے پاک:۔

وقد اختلف فی جواز رؤیۃ اللہ تعالیٰ فاکثر المبتدعۃ علی انکارھا فی الدنیا والآخرۃ واھل السنۃ والسلف علی جوازھا فیھما ووقوعھا فی الآخرۃ (قرطبی) الممکن ان یری رؤیۃ منزھۃ عن الکیفیۃ وذلک للمؤمنین فی الآخرۃ ولأفراد من الانبیاء فی بعض الاحوال فی الدنیا (بیضاوی)

رہی ان کی یہ سزا تو اس کے اسباب بالکل دوسرے ہیں مثلاً یہ کہ وہ پیغمبر کی بات کو جھٹلا رہے تھے (حالانکہ ظہور معجزات و دلائل کے بعد پیمبر پر ایمان لانا فرض ہو جاتا ہے) یا یہ کہ وہ سوال اپنے رفع جہل کے لیے نہیں بلکہ بہ طور انکار از راہ عناد کر رہے تھے۔

انما عوقبوا بکفرھم لأنھم امتنعوا عن الایمان بموسیٰ بعد ظھور معجزاتہ والایمان بالانبیاء واجب بعد ظھور معجزاتھم ولأنھم لم یسئلوا سوال استرشاد بل سوال تعنت وعناد (مدارک)

**۱۸۶** توریت میں ہے:۔

"اور یوں ہوا کہ تیسرے دن صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا امڈی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی چنانچہ سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے۔" (خروج - ۱۹ : ۱۶)

**وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔** مفسر ابن حیان نے کہا ہے کہ تَنْظُرُوْنَ عربی میں یَنْتَظِرُوْنَ کے معنی میں بھی آتا ہے اس لیے اگر کوئی یہ مراد لے کہ "تم سوال رؤیت کے مقبول ہونے کا انتظار کر رہے تھے" تو اس معنی کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے اگرچہ کسی سے یہ مفہوم منقول نہیں۔

ولکن ھذا الوجہ لیس بمنقول فلا اجسر علی القول بہ وان کان اللفظ یحتملہ (بحر)

**الصاعقۃ** سے یہاں مراد موت کا ہونا اگرچہ اکابر سے منقول ہے لیکن امام رازی نے اس معنی کے لینے میں خاصی جرح کی ہے ان کا ایک استدلال یہ ہے کہ یہی لفظ قرآن مجید میں خود حضرت موسیٰؑ کے لیے استعمال ہوا ہے خَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا لیکن وہیں فَلَمَّآ اَفَاقَ بھی وارد ہوا ہے اور معلوم ہے کہ افاقہ موت سے نہیں صرف غشی سے ہوتا ہے اور اسی سے ملتا ہوا کلام ابن جریر طبری کا بھی ہے:۔

وانہ تعالیٰ قال فی حق موسیٰ وخر موسیٰ صعقا اثبت الصاعقۃ فی حقہ مع انہ لم یکن میتا لأنہ قال فلما افاق والافاقۃ لاتکون عن الموت بل عن الغشی (کبیر) ومما یدل علی انہ قد یکون مصعوقا وھو حی غیر میت قول اللہ تعالیٰ وخر موسیٰ صعقا یعنی مغشیا علیہ (ابن جریر)

ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

پھر ہم نے تم کو جلا اٹھایا تمھارے مرے پیچھے ۱۸۷؎ کہ شاید تم شکر گزار بنو ۱۸۸؎

صاعقہ کے اصل معنی شدید فضائی آواز (کڑک، گرج) کے ہیں، اس سے بھی وہی مفہوم موت اور عذاب اور آگ کے پیدا ہو گئے ہیں:۔

والصاعقة هي الصوت الشديد من الجو ثم يكون منه نار فقط او عذاب او موت (راغب)

اور دوسرے متقدمین مفسرین کے ہاں بھی کچھ ایسا ہی وسیع مفہوم رکھتا ہے اور ان کی تحقیق بھی اس باب میں کچھ ایسی ہی ہے۔

واصل الصاعقة كل امر هائل اتاه وعاينه او اصابه حتى يصير من هوله وعظم شانه الى هلاك وعطب والى ذهاب عقل وغمور فهم وفقد بعض آلات الجسم صوتا كان ذلك أو نارا او زلزلة او ترجفا (ابن جرير)

ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ موت سے مراد جہل ہے اور بعث سے مراد عطائے علم ہے:۔

وقال بعضهم بعثناكم من بعد موتكم علمناكم بعد جهلكم (قرطبی) وكذلك اذا حمل الموت على الجهل كان مجازا وقد يكنى عن العلم بالحياة وعن الجهل بالموت (بحر)

۱۸۷؎ یہ احیاء حضرت موسیٰ کی سفارش پر ہوا تھا، اسرائیلی روایات اس باب میں خاموش ہیں۔

بَعَثْنٰكُمْ ۔ "جلا اٹھایا تم کو" یعنی انھیں سترؑ بزرگانِ قوم کو۔

بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ ۔ موت اور بعث دونوں کے کھلے ہوئے معنی مرنے اور جی اٹھانے کے ہیں اور ایسا ہی مفسرین نے عموماً سمجھا ہے، بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ بعد موت کی قید لگائی ہی اسی لئے گئی کہ "بعث" کو کوئی غشی یا نیند کے بعد نہ سمجھے۔

اى احييناكم (قرطبی) ماتوا وذهبت ارواحهم ثم ردوا لاستيفاء آجالهم (قرطبی) وقيد البعث لانه قد يكون عن اغماء أو نوم (بيضاوی) والموت هنا ظاهره مفارقة الروح عن الجسد وهذا هو الحقيقة (بحر)

لیکن معتبر تفسیروں میں ایک دوسرا قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ موت حقیقی نہ تھی۔ بلکہ بیہوشی کی قسم سے مجازی موت تھی، اور بعث سے بھی مراد محض غشی سے افاقہ ہے۔

قيل معنى البعث الافاقة من الغشية ويتخرج على قول من قال انهم صعقوا ولم يموتوا (روح) فسمي موتا على سبيل المجاز (بحر) اوعبر بالموت عن الغشي وبالبعث عن الافاقة (نهر) ومن الناس من قال كان هذا الموت غشيانا وهمودا لاموتا حقيقة (روح) وقيل ماتوا موت همود يعتبر به الغير ثم ارسلوا واصل البعث الارسال (قرطبی)

۱۸۸؎ (اور آئندہ توحید اور ایمان پر پوری طرح قائم رہو)

بعض تفسیروں میں یہاں یہ قصہ نقل ہوا ہے کہ یہ ستر اشخاص بعد کو حضرت موسیٰؑ کی دعا سے نبی ہو گئے لیکن یہ قصہ بے اصل ہے۔

# وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط

اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا ۱۸۹؎ اور ہم نے تمہارے اوپر منّ و سلویٰ اُتارا ۱۹۰؎

هذا غريب جدًا (ابن كثير) وهو بعيد۔ (روح)

۱۸۹؎ (تمھیں آفتاب کی تپش سے بچانے کے لیے جب کہ تم صحرائے سینا میں بھٹک رہے تھے)

جزیرہ نمائے سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان کی دھوپ میں سایہ میسّر آجانا واقعی سایۂ رحمت سے کم نہیں، توریت میں ستون ابر اور ستون آتش دونوں کا ذکر بطور معجزہ کے ہے، بسیاق قرآنی سے معجزہ کا پہلو لازم نہیں آتا۔ ذکر عام نعمتوں کا ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کے اہم ترین دَور میں برابر نازل ہوتی رہیں، اور قرآن مجید نے عام مستقل اور بظاہر طبیعی اسباب سے پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ و خارقانہ نعمتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ توریت میں ہے:

"اور خداوند دن کو بدلی کے ستون میں، تاکہ انھیں راہ بتائے۔ اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کے تاکہ انھیں روشنی بخشے۔ ان کے آگے چلا جاتا تھا، تاکہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اُٹھاتا تھا۔" (خروج ۱۳: ۲۱ و ۲۲)

روایات یہود میں حسب بیان جیوش انسائیکلوپیڈیا (جلد ۴ صفحہ ۱۲۳) یہ تصریح بھی موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرتِ معاصی میں مبتلا ہو جاتے تھے تو یہ ابر اُن پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا تھا۔

**اَلْغَمَامَ**۔ قرآن مجید نے اسے محض ابر بتایا ہے، یہود اسے تخت خداوندی سمجھتے تھے۔

غمام مطلق ابر نہیں ہے، سحاب کی لطیف ترین و نفیس ترین شکل کا نام ہے۔

عن مجاهد قال ليس بالسحاب (ابن جرير) عن ابن عباس قال وغمام ابرد من هذا واطيب (ابن جرير)

عن مجاهد وكأنه يريد والله اعلم انه ليس من زي هذا السحاب بل احسن منه واطيب وابهى منظرا۔ (ابن كثير)

۱۹۰؎ (اسی دشت سینا میں)

**اَنْزَلَ**۔ "اُتارا" سے یہ مراد لازمی طور پر نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبیعی معجزانہ طریق پر اُتری ہو، پانی، لباس، لوہا، کھانے کے سامان وغیرہ جو اپنے معمولی اور طبیعی طریقوں پر انسان کے کام کے لئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان سب کے لیے قرآن مجید کی زبان میں اُتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔

اہل لغت نے بھی کہا ہے کہ نعمت ہو یا مصیبت، بندوں پر اللہ کی طرف سے اس کے نزول کے معنی صرف "عطاء" کے ہوتے ہیں۔

فانزال الله نعمه ونقمه على الخلق اعطاء هم اياها۔ (راغب)

بلکہ یہ عطا خواہ براہ راست ہو خواہ بالواسطہ یعنی محض اس کے اسباب کی فراہمی، ان سب کے لیے فعل انزال ہی آتا ہے۔

وذلك بانزال الشئ نفسه واما بانزال اسبابه والهداية اليه (راغب) ثم ان انزال الشئ قد يكون بنفسه وقد تكون بانزال اسبابه والهداية اليه (تاج)

**اَلْمَنَّ**۔ اہل لغت کی تحقیق میں یہ ایک میٹھی رطوبت تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔

المن شئ كالطل فيه حلاوة يسقط على الشجر۔ (راغب)

عربی میں اسم جنس ہے خیر و شر کی طرح جس کا واحد نہیں آتا۔

اسم جنس لا واحد له من لفظه مثل الخير والشر قاله الاخفش۔ (قرطبی)

معنی اس کے متعدد بیان کئے گئے ہیں، میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مرادف ہے۔

الترنجبين وعلى هذا اكثر المفسرين (قرطبی) الاكثرون على ان المن هو الترنجبين (معالم)

اور ترنجبین سے متعلق قدیم طب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی لذیذ اور دانہ دار آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔

الترنجبين طل يقع من السماء وهو ندی شبيه بالعسل جامد متحبب (مفردات ابن البیطار)

بہر حال اتنا یقینی ہے کہ کوئی لذیذ قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانہ میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھی، توریت کی تصریحات اس بارہ میں حسب ذیل ہیں:-

"صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ مَن ہے، کیونکہ انھوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انھیں کہا کہ یہ روٹی ہے، جو خداوند نے کھانے کو تمھیں دی ہے"۔ (خروج۔ ۱۶: ۱۴ و ۱۵) "اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام مَن رکھا۔ اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سفید تھی اور مزہ اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلوری کا تھا" (خروج۔ ۱۶: ۳۱) "اور مَن سوکھے دھنیے کی مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانہ کا سا تھا، لوگ اِدھر اُدھر جا کر اُسے جمع کرتے تھے اور چکی میں پیستے تھے، یا اوکھلی میں کوٹتے تھے، اور توؤں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے، اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا، اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تھی تو مَن بھی ان پر پڑتا تھا"۔ (گنتی۔ ۱۱: ۸-۱۱)

**سلوٰی**، ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نمائے سینا کا خاص جانور ہے، بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے، گرمی میں شمال کی جانب چلا جاتا ہے، جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے، اُڑتا اونچا نہیں، بہت نیچے رہتا ہے۔ تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۰ صفحہ ۲۸۵) اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی جانب عموماً مارچ میں ہوتا ہے اور جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں، اسرائیلی بٹیر وہ تھے جو مارچ اپریل میں رات کے وقت اپنے شمالی پرواز میں ہوتے ہیں، بحر قلزم شمال میں جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے، وہاں تک یہ اپنے سالانہ اُڑان میں آتے ہیں اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کا راستہ اختیار کرتے ہیں، سمندر کی ہوا ان کی بے شمار تعداد بہ آسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی (ڈکشنری آف دی بائبل، از ڈاکٹر ہیسٹنگز جلد ۴ صفحہ ۱۹) ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے، رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، کالم ۳۹۹۹)

واضح رہے کہ سارے رکوع میں اور اس کے بعد بھی ذکر بنی اسرائیل کے ساتھ حق تعالیٰ کے معاملات کا ہے اور ان معاملات کو حق تعالیٰ نے بطور اپنے احسانات و انعامات کے گنایا ہے، ضرور نہیں کہ یہ سارے واقعات اپنے عام طبیعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہوں۔ اصل مقصود یہاں احسانات و انعامات خداوندی کی یاد دہی ہے خواہ وہ حسب عادت ہوں، خواہ بطور خرق عادات یعنی قانون تکوینی کی عام دفعات کے ماتحت، یا کسی خصوصی دفعہ کے مطابق اہل تاریخ

كُلُوا مِن طَيِّبٰتِ مَا رَزَقۡنٰكُمۡ ؕ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ

کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دے رکھی ہیں ۱۹۱ اور انھوں نے زیادتی ہم پر

يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۵۷﴾

نہیں کی بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے ۱۹۲

عموماً ابر کی سایہ افگنی، مَن و سلویٰ کے نزول اور چٹان سے چشمے کی روانی، سب کو معجزات میں شمار کیا ہے، لیکن کسی کی تحقیق میں اگر یہ سب امور عام واقعات طبیعیہ میں داخل ہوں اور ان کی توجیہ عام اور معمولی قوانین تکوینی کے ماتحت ہو جائے، یا آج کل کی اصطلاح میں ان کے سائنٹفک اسباب دریافت ہو جائیں تو اس کا اثر ارشاداتِ قرآنی پر مطلق نہیں پڑے گا۔ ان کی احسانی اور انعامی حیثیت بہرصورت قائم رہتی ہے اور اسی کی تذکیر قرآن کا مقصود ہے۔ توریت میں البتہ اس کے برعکس سارا زور ان واقعات کی معجزانہ حیثیت پر ہے۔ نزول مَن و سلویٰ کے سلسلے میں یہ جو خیال عام طور پر قائم ہو گیا ہے کہ اسرائیلیوں کو بجز ان دو چیزوں کے اور کوئی غذا ملتی ہی نہ تھی، اس حصر پر کوئی دلیل قرآن مجید سے موجود نہیں۔ قرآن مجید سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو غذائی نعمتیں ان لوگوں کے لیے عام تھیں، لیکن یہ کسی اور غذا کی نفی کو مستلزم نہیں۔ اسرائیلیوں کے ساتھ جانوروں کے جو جھنڈ اور گلّے تھے ان سے اگر حیوانی غذا کا وہ کام لیتے ہوں تو اس کے خلاف کوئی دلیل قائم نہیں۔ ریگستان میں نباتاتی غذا سے البتہ وہ محروم تھے، اور اسی کی انھوں نے اپنے پیغمبر سے فرمائش کی۔

۱۹۱ (اور ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو، روز کی روز خرچ کرتے رہو)
حکم اسرائیلیوں کو یہ ملا تھا کہ بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرتے جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ "ذخیرہ اندوزی" کی عادت یہودیوں کی آج کی نہیں، بہت قدیم ہے۔
طَیِّبٰت کی تحقیق کہیں آگے آئے گی، یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ اس کے تحت میں ساری پاکیزہ لطیف و لذیذ چیزیں آگئیں۔ اسلام نے بعض خشک مذہبوں کی طرح انسان کو خواہ مخواہ بھوکے رہنے کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ لذائذ دنیوی سے پوری طرح استفادہ کی ترغیب دی ہے بشرطیکہ اس سے کسی قانون الٰہی کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔

۱۹۲ (اس حکم کی خلاف ورزی کر کے)
حرص میں مبتلا، توکل سے ناآشنا اور نافرمانی کے عادی بنی اسرائیل سے تعمیل اتنے معمولی حکم کی بھی نہ ہو پائی۔ لگے ان غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرنے، ادھر لطیف غذائیں باسی ہو ہو کر سڑنے لگیں۔ توریت میں ہے:۔
"اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے، وہ اس کے سننے والے نہ ہوئے اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا، سو اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا۔" (خروج ۔ ۱۶ : ۲۰)
یہود جو مشرک قوموں کے اثر سے عقیدۂ تجسیم کے قائل تھے، یعنی خدا تعالیٰ کو بھی بشری اوصاف سے متصف جانتے تھے اور اس کے تاثر و انفعال کے معتقد تھے، انھیں یہ بار بار بتلانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ خدا تعالیٰ کسی نفع نقصان سے متاثر نہیں ہوا کرتا، یہ انسان ہی ہے جو احکام الٰہی کی نافرمانی کر کے نقصان اٹھاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں ۱۹۳ف داخل ہو جاؤ ۱۹۴ف اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ پیو ۱۹۵ف اور

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

دروازۂ (شہر) میں عاجزی سے جھکے ہوئے داخل ہونا ۱۹۶ف اور کہتے جانا توبہ ہے ۱۹۷ف ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور نیک کاروں کو زیادہ دیں گے ۱۹۸ف

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ باوجود معاصی کے نعمتوں کا جاری رہنا استدراج اور سخت خطرناک ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے چنانچہ وہ کثرتِ جاہ و مال کو علامت مقبولیت کی سمجھتے ہیں۔

۱۹۳ف (بنی اسرائیل سے ان کے پیمبر کی وساطت سے)

یہ واقعہ اگر حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے تو وہی مراد ہیں اور اگر ان کے بعد کا ہے تو ان کے جانشین حضرت یوشعؑ۔ قرآن مجید جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے توریت کے بعض حصوں کی طرح تاریخ کی کوئی کتاب نہیں اس لیے اس کے بیانات میں تسلسل زمانی اور ترتیبِ تاریخی ہرگز ضروری نہیں، اس کا مقصود نتائج اور عبرتیں ہیں اور ان سے اخلاقی و روحانی سبق، نہ کہ واقعات کی روئیداد۔ اس ایک حقیقت کو پیش نظر نہ رکھنے سے یہود و نصاریٰ آج قرآن فہمی میں طرح طرح کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ یہ واقعہ جس کا ذکر اب شروع ہو رہا ہے تاریخ اسرائیلی ہی کا ایک مسلّم واقعہ ہے زمانۂ تاریخی اس کا جو بھی ہو۔

۱۹۴ف یہ بستی کون سی تھی؟ ممکن ہے کہ فلسطین کا مشہور شہر اریحا ہو جو موجودہ نقشوں میں (JERICHO) کے نام سے ملے گا۔ یہ بحرِ مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشعؑ کے زمانہ میں فتح کیا تھا، قدیم ائمہ کا رخ، بیت المقدس کے بعد پھر اسی شہر کی جانب ہے

قرية اريحا (ابن عباس) هي اريحا قريبة من بيت المقدس (ابن جرير۔ عن ابن زيد)

اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں بعض شہروں کے نام تک اب بدل گئے ہیں، مثلاً ایلہ کہ اب اُسے عقبہ کہتے ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ مراد شہر سطیم ہو یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحرِ مردہ کے مشرق میں ہے شہر دریائے یردن کے مشرقی (بائیں) کنارہ پر ہے، بحرِ مردہ کے شمال و مشرق میں بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانہ میں یہ شہر گویا ان کا سرحدی ناکہ تھا، عربی میں اُسے وادی النار بھی کہتے ہیں اور وادی تنی مریم بھی بعض مفسرین نے جو دردون کا نام لیا ہے اس سے بھی یہی مراد معلوم ہوتا ہے۔

۱۹۵ف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر خوب وسیع اور خوب آباد و پُر رونق تھا، آیت کی تصریح سے یہ اشارہ بھی نکل آیا کہ کھانے پینے کی آزادیاں شریعت الٰہی میں ہمیشہ رہی ہیں، بشرطیکہ حدود سے باہر خواہ مخواہ نکل نہ آیا جائے

۱۹۶ف (بہ طور اظہار عجز و نیاز و عبودیت کے) کہ یہی شان مومنین مخلصین کی ہے۔

الْبَابَ۔ دروازہ سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے اردگرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے مشہور ہوتی تھی شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ کے پھاٹک سے گزرنا ہوتا تھا۔
سُجَّدًا۔ یہاں اپنے لغوی معنی میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ سجدۂ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ

مگر ان زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتلایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا ۱۹۹ سو ہم نے ان زیادتی

ظَلَمُوا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿٥٩﴾

کرنے والوں پر ایک بلا آسمان سے نازل کی ۲۰۰ اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہے تھے ۔

سجدًا ای متذللین منقادین (راغب) خاشعة خاضعة (ابن جریر۔ عن ابن عباس)

اُرادبه الخضوع وهو الاقرب (کبیر) قیل متواضعین خضوعا لا علی هیئة متعینة (قرطبی)

توریت اس اہم جزو کے تذکرہ سے خالی ہے ۔

۱۹۷ گویا زبان بھی قلب و اعضاء کی طرح اظہار تذلل کرتی رہے ۔ یہ فرق ہے اللہ والوں کے لشکر اور دنیا دار بادشاہوں کے لشکروں کے داخلہ میں ۔ ایک کے ہاں قومی بینڈ اور ترانے بجتے ہوتے ہیں یعنی قدم قدم پر قومی شیخی اور وطنی بڑائی کا اظہار ۔ دوسرے کے ہاں قلب خشوع سے لبریز اور زبان پر تسبیح ۔

قُولُوا حِطَّةٌ سے یہ مراد نہیں کہ بعینہ لفظ حِطَّةٌ کا تلفظ ادا کرتے جاؤ ۔ یہ لفظ تو عربی ہے اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں عبری یا عبرانی تھی ۔ مراد یہ ہے کہ انہیں زبان سے بھی کلمات توبہ و استغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا

وقد روی عن ابن عباس انهم امروا بهذه اللفظة بعينها وهذا محتمل ولكن اقرب خلافه بوجهين احدهما ان هذه اللفظة عربية وهم ما كانوا يتكلمون بالعربية وثانيهما وهو الاقرب انهم امروا بان يقولوا قولا دالا على التوبة والندم والخضوع (کبیر) ولا تتوقف التوبة على ذكر لفظة بعينها (روح)

اور ایسا ہی صاحب بحر نے بھی کہا ہے ۔ قرطبی کی احکام القرآن اور ابن العربی مالکی کی احکام القرآن میں یہاں طویل بحث اس کی موجود ہے کہ آیا شریعت کے الفاظ میں تبدیلی جائز ہے ؟ خلاصۂ جواب یہ ہے کہ جہاں الفاظ ہی تعبدی ہوں یعنی حکم انہیں الفاظ ہی کا ہو وہاں تبدیلی جائز نہیں جہاں اصل مقصود معانی ہوں وہاں لفظی تبدیلی جائز ہے بشرطیکہ معنوی تغیر تک نہ پہنچ جائے ۔

۱۹۸ یعنی ان لوگوں کو جو نیک کاری میں اخلاص کامل سے لگے ہوئے ہیں ۔ عفو و مغفرت کا وعدہ تو سب ہی توبہ کرنے والوں سے ہو چکا ۔ اس کے بعد یہ ذکر مزید فضل و کرم کا ہے ۔

۱۹۹ یعنی جو الفاظ انہیں تلقین کئے گئے تھے انہیں چھوڑ چھاڑ کچھ اور کلمے ہزل اور تمسخر کے زبان پر لے آئے ۔ یہ کلمے کیا تھے اس میں روایتیں مختلف ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہی ہے کہ بجائے توبہ و انابت کے اب وہ کام تمسخر و استہزاء سے لے رہے تھے ۔

ومعنى الآية انهم وضعوا مكان ما امروا به من التوبة والاستغفار قولا مغائرًا له مشعرا باستهزاءهم بما أمروا به كل ذلك عدم مبالاة بأوامر الله (بحر)

۲۰۰ رِجْزًا ۔ رجز عام ہے ہر عذاب کے لئے خواہ وہ کسی صورت میں ہو ۔

الرجز هو العذاب (لسان)

لفظ کی تنوین عذاب کی شدت وہیبت کے اظہار کے لیے ہے۔

والتنوین للتھویل والتفخیم۔ (ابوسعود)

مِنَ السَّمَآءِ، سے مراد یہ نہیں کہ وہ عذاب، برف، بارش وغیرہ کی طرح آسمان سے نازل ہوتا ہوا دکھائی دیا، مگر یہ فقرہ اس حقیقت کے نمایاں کرنے کے لئے ہے کہ وہ عذاب آسمانی حاکم کی طرف سے نازل ہوا تھا ارضی اسباب سے طبعی طور پر پیدا نہیں ہوگیا تھا۔

ای مقدر من السماء (بیضاوی)

الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ کی تکرار آیت میں ان ظالموں کے ظلم کو نمایاں کرنے کے لئے ہے۔

فی تکریر الذین ظلموا زیادۃ فی تقبیح امرھم وایذ انا بأن انزال الرجز علیھم لظلمھم (کبیر)

ولم یضمرہ تعظیما للامر۔ (قرطبی)

یہ عذاب تھا کس صورت میں؟ ہمارے ہاں روایتیں طاعون کی نقل ہوئی ہیں۔

بعث اللہ علیھم الطاعون (کبیر عن ابن زید) الطاعون (کبیر عن ابن وھب) والمراد بہ الطاعون (بیضاوی)

تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر باربار آیا اور بائبل میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ آیت ماقبل میں اگر قریہ سے مراد شہر سطیم ہی لیا جائے جو موآب کے علاقہ میں ہے تو اس طاعون کا تو مفصل ذکر بائبل میں موجود ہے:۔

"سو اسرائیل سطیم میں مقیم ہوئے اور ان لوگوں نے موآبیوں کی بیٹیوں سے حرام کاری شروع کی انھوں نے اپنے معبودوں کی قربانی پر لوگوں کی دعوت کی، لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا۔ اور اسرائیلی بعل فغور سے ملے۔ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا" (گنتی۔ ۲۵: ۲۔۴)

"وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے" (گنتی۔ ۲۵: ۹)

۲۰۱ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ۔ یعنی ان کی مسلسل نافرمانیوں کے باعث۔ ب یہاں سببیہ ہے۔

ای بسبب فسقھم (جلالین) ای بسبب فسقھم المستمر (ابوسعود)

کانوا یفسقون کا صیغہ دوام، عادت واستمرار پر دلالت کر رہا ہے یہاں یہ صاف کر دیا کہ طاعون کا اصل سبب طبی یا طبعی نہ تھا، روحانی یا اخلاقی بدپرہیزیاں یا نافرمانیاں تھیں، قانون تکوینی کی خلاف ورزی نہیں، اصل باعث شریعت موسوی کی خلاف ورزی تھی ...... شریعت کی خوردبین نگاہ امراض ومعاصی کے ان خفی ومخفی تعلقات تک بہ آسانی پہنچ جاتی ہے جو دنیا کے بڑے بڑے حاذق طبیبوں کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

فقہاء نے آیت سے اہل بدعت کا ظالم اور سزاوار غضب ہونا نکالا ہے، بدعت کہتے ہیں دین حق میں ایسے نئے امر کے پیدا کرنے کو جس کا نشان اصل شریعت میں موجود نہ ہو، اور قرطبی نے کہا ہے کہ جب لفظی تبدیلی یہ نوبت پہنچا دیتی ہے تو عملی تحریف کی شناعت کا کیا ٹھکانا!

والقول انقص من العمل فکیف بالتبدیل والتغییر فی الفعل (قرطبی)

# وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا مانگی ۲۰۲ سو ہم نے کہا (اے موسیٰ) اپنا عصا (فلاں) پتھر پر مارو ۲۰۳

۲۰۲ اب قوم اسرائیل فلسطین سے دور اور مصر سے الگ دونوں کے درمیان معلق جزیرہ نمائے سینا کے لق ودق بیابان وریگستان میں اپنے خیمہ وخرگاہ کے ساتھ کوچ درکوچ کرکے ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک منزل سے دوسری منزل کو منتقل ہورہی ہے۔ قدیم گلہ بان قوموں میں یہ دستور عام تھا اور آج بھی بہت سی خانہ بدوش قوموں میں عام ہے خشک ملک اور پھر ملک کے جغرافیہ سے ناواقفیت چلتے چلتے یہ لوگ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی نایاب تھا اور ساتھ کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا صورت حال کا ذرا تصور کیجئے، پیاس سے بے حال اور بیدم تو ہو ہی رہے تھے، مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئے اور لگے اپنی جھنجھلاہٹ اور غصہ اپنے رہبر اور سردار حضرت موسیٰ پر اتارنے توریت میں ہے:

”تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرا کیا، وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا، سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پیویں....... موسیٰ نے خداوند سے فریاد کرکے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں، وہ سب تو مجھے ابھی سنگسار کرنے کو تیار ہیں“ (خروج۔ ۱:۱۷۔۴)

اور قدیم ترین یہودی مؤرخ جوزیفس کی تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

”وہ مقام رفیدیم میں پہنچے۔ جہاں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہے تھے...... یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر موسیٰ پر ٹوٹ پڑے...... لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہوگیا“ (باب ۳ فصل ۲)

پھر بھی عجب نہ تھا، وہ رہبر میں نہیں ہوتے جب تلاش کے بعد مایوسی ہوچکی تھی تو بجز دعا اور مناجات کے اور کیا کرتے؟ البتہ توریت ہی میں ایک دوسری جگہ مقام کا نام رفیدیم کے بجائے قادس (قدیش) درج ہے اور تفصیلات تقریباً سب وہی:۔

”بعد اس کے بنی اسرائیل کی ساری جماعت پہلے دشت صین کو آئی اور قادس میں رہنے لگی...... وہاں جماعت کے لئے پانی نہ تھا، سو وہ جمع ہوکے موسیٰ وہارون کے برخلاف اٹھے اور ان لوگوں نے موسیٰ سے جھگڑا کیا اور کہا...... یہاں تو پینے کو پانی ہی نہیں، تب موسیٰ وہارون جماعت کے سامنے، جماعت کے خیمہ کے دروازے پر گئے اور منھ کے بل گرے“۔ (گنتی ۲۰:۱۔۶)

اس بنا پر علماء اہل کتاب میں سخت اختلاف پڑگیا کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا، وہ مقام کون سا تھا، لیکن بہرحال وہ مقام کوئی سا بھی ہو، اور ایک ہو یا دو ہوں نفس اس واقعہ کا وقوع کوئی اختلافی ونزاعی مسئلہ نہیں اور یہ تاریخ بنی اسرائیل کے مسلمات میں سے ہے۔

**اسْتَسْقٰى** لفظی معنی ہیں کہ پانی طلب کیا، پانی کی تلاش کی اور مراد یہ ہے کہ پانی کے لئے دعا کی۔

ای دعا لھم موسیٰ بالسقیا۔ (کشاف)

مشہور ماہر اثریات سر فلنڈرز پٹری (PETRIE) تیس ۳۰ آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ ۵۔۱۹۰۴ء میں اسی جزیرہ نمائے سینا کی تحقیقی مہم پر روانہ ہوئے ان کے مشاہدات کا خلاصہ ایک دوسرے ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کی زبانی سنئے:

”یہ وسیع بیابانی علاقہ سیاہ اور سرخ رنگ کی پہاڑیوں سے لبریز ہے جن میں کہیں کہیں سبزہ زار بھی ہیں اور گہری گہری وادیاں اور شگاف جابجا نخلستانوں کے ساتھ فاصلے جو نقشہ پر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں، ان ناہموار یوں

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

تو اس میں سے بارہ[12] چشمے پھوٹ نکلے ۲۰۴ (اور) ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کر لیا ۲۰۵

کے باعث علاوہ بڑے لمبے ہیں پینے والے پانی کے کافی ذخیرہ کی فراہمی کی مشکلات جو اسرائیلیوں کو اپنی صحرانوردی کے زمانہ میں پیش آئی تھیں، آج بھی ان کا تجربہ ہو رہا ہے“۔

۲۰۳ (تاکہ اسی چٹان سے پانی کا چشمہ جاری ہو جائے)

پہاڑی چشمے، پہاڑوں کے اندر سے پانی کے اُبلتے ہوئے دھارے ہر ایک کے مشاہدہ میں آچکے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب پانی کے لئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی تو انھیں ہدایت ہوئی کہ فلاں پہاڑی تک چلے جاؤ وہاں چٹان پر اپنا عصا مارو، پانی اُبلنے لگے گا۔ توریت کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہاڑی جس سے چشمہ اُبلا حورب یا حریب میں واقع تھی:

”خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریا پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے اور جا، دیکھ میں وہاں حورب کے چٹان پر تیرے آگے کھڑا ہوں گا تو اس چٹان کو مار یو اس سے پانی نکلے گا تاکہ لوگ پیویں۔ چنانچہ موسیٰ نے بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے یہی کیا“۔ (خروج ۱۷: ۵ و ۶)

**عصا**۔ معروف و متعارف معنی لاٹھی یا ڈنڈے کے ہیں۔ موسیٰ کے اس عصا کا ذکر قرآن مجید میں بکثرت آیا ہے اس کے یہ کھلے ہوئے معنی چھوڑ کر ایک مجازی معنی (جو صرف عصا المسلمین وغیرہ کی ترکیب میں جائز ہے) ”جماعت یا گروہ“ کے کرنا لغت پر ظلم کرنا ہے۔

**الحجر** سے مراد کوئی خاص چٹان ہے جو حضرت موسیٰ کے علم میں تھی۔

الاشارۃ الی حجر معلوم (کبیر) اللام فیہ للعھد (بیضاوی) کان حجرا معینا بدلیل انہ عرفہ بالالف واللام (معالم)

**فاضرب** ضرب کے عام و معروف معنی مارنے کے ہیں۔ ”چلنے“ کے معنی اُسی صورت میں ہوتے ہیں جب فعل ضرب کا صلہ فی کے ساتھ آئے مثلاً ضَرَبَ فِی الْاَرْضِ۔ بعض معاصرین نے آیت کا ترجمہ ”اے موسیٰ اپنی جماعت کے ساتھ پہاڑ پر چلے جاؤ“ کیا ہے۔ یہ جس طرح لغت و قواعدِ زبان کے خلاف ہے اسی طرح تاریخ کے بھی بالکل مخالف ہے اور اپنی تائید میں کوئی دلیل کسی قسم کی نہیں رکھتا نہ عقلی نہ نقلی۔

۲۰۴ یعنی اس پہاڑی چشمہ سے بارہ[12] دھارے یا بارہ[12] ٹونٹیاں الگ الگ جاری ہو گئیں۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے عین مطابق۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں، قرآن نے کہاں سے گڑھ کر کہہ دیا؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوا دیا۔

جارج سیل انگریزی میں قرآن کریم کا قدیم ترین مترجم ہے۔ آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے :۔

”ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے، تصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ[12] مقامات سے نکلتا تھا“۔

اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے :۔

”چٹان میں اس وقت چوبیس[24] سوراخ موجود ہیں جو بآسانی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بارہ[12] ایک طرف ہیں

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

کھاؤ پیو اللہ کے (دیے ہوئے) رزق میں سے، اور زمین پر شرارتی بن کر مت پھرو ۲۰۶

اور بارہ ان کے مقابل جانب "۔

پادری ڈین اسٹینلی (DEAN STANLEY) نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں، صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لئے بنفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے شاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف SINAI AND PALESTINE کے نام سے شائع کی اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :-

" یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور اس صفحہ کے قریب ایک وسیع وادی میں واقع ہے شگاف اور دراز جا بجا پڑے ہوئے ہیں کچھ بڑے ہوئے ہیں کچھ چھوٹے گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں۔ اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے یہ اشارہ انھیں شگافوں کی طرف ہے" (ص ۳۶-۳۷) عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جایئے صدیاں گزر جانے پر اس کے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق ہو رہی ہے اور وہ بھی منکرین و معاندین کی زبان سے۔

۲۰۵ اُنَاس یعنی اسرائیل کے بارہ گروہوں میں سے ہر گروہ نے۔

ای من کل سبط (بیضاوی) ای من قومه الذین استسقی لهم (بحر)

اُنَاس صیغۂ جمع ہے لفظاً اس کا کوئی واحد نظر نہیں آیا۔

جمع لا واحد له من لفظ (روح)

مَشْرَبَهُمْ یعنی اپنے لئے پانی لینے کی جگہ۔

ای عینهم اللتی یشربون منها (کشاف) ای موضع شربهم (جلالین)

۲۰۶ جب قوم کی قوم قانون الٰہی کو چھوڑ کر اپنے ہوائے نفس کے مطابق کوئی روش اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ دنیا میں لازمی طور پر فتنہ و فساد، حرب و ضرب اور کثرت جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور امن انفرادی و اجتماعی دونوں طرح پر اٹھ کر رہتا ہے فضل و انعام سے سیراب کر کے بنی اسرائیل کو ہدایت ہو گئی کہ جو فارغ البالی نصیب ہے اس کو غنیمت سمجھو۔ قانون الٰہی کی پابندی کرو۔ اس قانون کو توڑ کر امن و نظام عالم میں اختلال کے باعث نہ ہو۔

رِزْقِ اللّٰهِ میں رزق کی نسبت اپنی جانب کر کے گویا ایک بار پھر انھیں جتا دیا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ سب خدا ہی کے فضل و عطا سے ہے، تمھارے زور بازو کا نتیجہ نہیں۔

لَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ عثی کے معنی خود فساد میں حد سے گزر جانے کے ہیں۔

العیث شدة الفساد (قرطبی) العثی اشد من الفساد (معالم)

مُفْسِدِينَ جو ترکیب میں حال واقع ہوا ہے ہر پہلو سے فساد پر زور دینے کے لیے ہے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے ۲۰۷ سو اپنے پروردگار سے ہمارے

مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ

لئے دعا کر دیجئے، ان چیزوں کی جنھیں زمین اگاتی ہے ۲۰۸ ساگ ہوا، ککڑی ہوئی، گیہوں ہوا، مسور ہوئی، پیاز ہوا ۲۰۹

تکرر المعنی تاکیداً لِاختلاف اللفظ (قرطبی)

عیث وعثی کے معنی ایک ہی ہیں۔ عثی لغتِ قرآنی ہے (قرطبی) ایک باریک فرق دونوں میں یہ ہے کہ عیث کا تعلق فسادِ حسّی سے ہے اور عثی کا فسادِ معنوی سے (راغب)

کُلُوْا..... الْمُفْسِدِیْنَ۔ اسلام سختیوں کا مذہب نہیں۔ حدود کے اندر رہ کر کھانے پینے کی پوری آزادیاں اس میں موجود ہیں۔ قرآن مجید نے بار بار اس کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ترغیب بھی دی ہے۔ ممانعت جو کچھ ہے وہ صرف حدود سے تجاوز کرنے اور باعثِ فتنہ و فساد بن جانے کی ہے۔

۲۰۷ (اور لے کھانے کھاتے اُکتا گئے ہیں)

یہ ذکر بھی اُسی دشتِ سینا کے زمانہ خانہ بدوشی کے کسی اور موقع کا ہے۔ قرآن مجید بیانِ واقعات میں ان کی تاریخی ترتیب کے تسلسل کا ہرگز پابند نہیں۔ بنی اسرائیل عرصۂ دراز تک ایک ہی قسم کی غذا کھا کھا کر اُکتا گئے تھے اور اب اپنے پیمبر سے فرمائش کر رہے تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کہیں دوسری جگہ لے چلئے، جہاں قسم قسم کے شہری اور دیہاتی کھانے موجود ہوں۔

طَعَامٍ وَّاحِدٍ یعنی ایک ہی قسم کا کھانا، بٹیر اور ترنجبین جو انہیں ہر روز ملے چلا جاتا ہے۔ طعام واحد سے مراد ایک عدد طعام نہیں اس لئے کہ کھانے کے تو دو عدد تو انہیں بہرحال مل ہی رہے تھے بلکہ مراد ایک ہی قسم کا کھانا ہے جو انہیں ہر روز ملے جاتا تھا۔

ووصفوا الطعام بالواحد مع انّه نوعان لانّهما طعام کلّ یوم والعرب تقول لمن یاکل کلّ یوم عدّة الوان لا تتغیّر انه یاکل من طعامٍ واحدٍ (المنار)

معلوم ایسا ہو رہا ہے کہ غذائے حیوانی تو انہیں روز ہی ملے جاتی تھی۔ اب اُس سے اُکتا کر غلہ، سبزی وغیرہ چاہتے تھے چنانچہ اپنی فرمائش میں نام انھیں چیزوں کے گنائے ہیں۔

۲۰۸ (اور جن کے خوگر ہم مصر میں رہ چکے ہیں۔)

مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح یہی زمینی پیداوار تھی:۔

"مصر میں آج کی طرح اُس وقت بھی بڑی مانگ سبزی، پیاز، ہلدی وغیرہ کی تھی" (انسائیکلوپیڈیا ببلیکا کالم ۱۲۰۹)

اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھیں:۔

"اسرائیلیوں کی اصل غذا سبزی تھی خصوصاً غلّہ کی اقسام" (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۵ صہ ۴۳۰)

"قدیم اسرائیلی، سبز ترکاریوں اور پھلوں پر بسر کرتے تھے" ( " " جلد ۵ صہ ۵۹۶)

۲۰۹ توریت کی روایت اس سے ملتی جلتی، مگر کسی قدر مختلف حسب ذیل ہے:۔

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا

(موسیٰ نے) کہا تو کیا جو چیز ادنیٰ ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے (تو خیر) کسی شہر

فَاِنَّ لَکُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ ۗ

میں اُتر پڑو (وہیں) مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو ۲۱۵ اور ان پر جمادی گئی ذلت اور محتاجی ۲۱۱

"اور بنی اسرائیل بھی پھرے اور روتے ہوئے بولے، کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا، ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے، اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور پیاز اور وہ لہسن پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی، یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من"۔ (گنتی۔ ۱۱: ۴۔ ۶)

فوم کے معنی گیہوں کے علاوہ لہسن کے بھی آتے ہیں۔

ھا۔ ضمیر ھا ہر جگہ اَرض کی طرف راجع ہے۔ اُردو میں اس کا ترجمہ خلاف محاورہ ہونے کے سبب سے ساقط کر دیا گیا، جیسا کہ شاہ عبد القادر دہلویؒ اور مولانا تھانویؒ کے ترجمہ میں بھی یہی ساقط ہے۔

۲۱۵ (کہ بڑے شہروں میں سبزیاں اور پھل علاوہ فصل اور موسم کے بھی مل جایا کرتے ہیں۔)

مِصْرًا۔ کوئی شہر۔ یہاں مراد جزیرہ نمائے سینا یا اُس کے مضافات کا کوئی آباد شہر ہے مصر کے لفظی معنی شہر کے ہیں جس کی حد بندی ہو چکی ہو۔

اسم لکل بلد محصور ای محدود۔ (راغب)

اور یہاں تو تنوین کے ساتھ کھلا ہوا اسم نکرہ ہے لیکن بڑے بڑے فاضل انگریز مترجمین نے بے کھٹکے اس کا ترجمہ "ملک مصر" کر ڈالا ہے!

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انھیں سمجھایا کہ تمھاری فرمائش بیجا ہے، نامعقول ہے، جب دیکھا کہ اصرار جاری ہے تو پھر یہ کہا کہ اچھا اگر یہ منظور ہے تو شہری تمدن اختیار کرلو، ساری گفتگو سمجھنے کے لیے قوم اسرائیل کے اس وقت کے طرز معاشرت کو پیش نظر رکھنا چاہیے صورت حال یہ ہے کہ مصر جیسے متمدن و مہذب ملک سے لاکھوں کی تعداد میں یہ نکل تو آئے ہیں لیکن ابھی دوسرے مہذب و متمدن ملک اور اپنے قدیم وطن یعنی فلسطین (یا کنعان) تک نہیں پہنچ پائے ہیں بلکہ دونوں کے درمیان اور فلسطین کے جنوب میں جزیرہ نمائے سینا کے بیابان میں معلق ہیں، یہ علاقہ اس وقت تک غیر متمدن ہے مکان، باغ، عمارتیں، کھیت وغیرہ جو لوازم تمدن ہیں اس لق و دق بیابان میں کہیں موجود نہیں اسرائیلی اس وقت مکانوں میں سکونت پذیر نہیں بلکہ اپنے خیموں ڈیروں کے ساتھ کہ آج یہاں سے کوچ ہے تو کل وہاں مقام، خانہ بدوش قبیلوں کی طرح ایک مستقل سفر اور مستمر نقل و حرکت اس بیابان میں کر رہے ہیں۔ البتہ بیابان کے خاتمہ کے بعد ملک سرے سے ویران اور بے آب و گیاہ نہیں غیر بیابانی علاقے اچھے خاصے آباد تھے۔ اور شہری اور حضری تمدن کے نمونے جابجا موجود تھے، یہ علاقہ مصر کے زیر حکومت تھا گویا لفظ نام مِصْرًا میں اشارہ اسی قسم کے کسی شہر کی طرف ہے۔

اَتَسْتَبْدِلُوْنَ۔ استبدال کے معنی ہیں کسی شے کے بدلے میں دوسری شے کو طلب کرنا۔

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ

اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے ۲۱۳ یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں سے انکار کرتے رہتے تھے ۲۱۳

والاستبدال طلب شئ بدلا من اٰخر۔ (المنار)

۲۱۱ ضُرِبَتْ کے معنی ہیں لیس دی گئی، مسلط کر دی گئی۔

ذِلَّةُ کے معنی ہیں خواری اور رسوائی اور مَسْكَنَةُ سے مراد ہے فقر اور محتاجی۔

الذلۃ الذل والصغار (قرطبی) المسکنۃ الفقر والفاقۃ وتشدید المحنۃ (کبیر)

عَلَيْهِمُ۔ میں ضمیر هم کے مرجع کو خوب سمجھ لینا چاہئے، یہ ہیں کون لوگ جن کے اوپر ذلت اور تنگ حالی مسلط کر دی گئی ہے؟ ضمیر کا مرجع الیہود یا اَلَّذِيْنَ هَادُوْا نہیں بلکہ بنی اسرائیل ہے یعنی اس وعید کے مورد فلاں فلاں عقیدے رکھنے والے فلاں مسلک کے ماننے والے نہیں بلکہ اسرائیلی نامی ایک متعین قوم و نسل ہے۔ سبحان اللہ ایک ذرا سا لفظ جانِ بلاغت ہے اس نے اس حقیقت کو بالکل واضح کر دیا کہ جو ذلت، نکبت، افلاس، مقہوریت تقریباً چودہ سو ۱۴۰۰ سال گزر جانے پر بھی ایک حد تک چپکی لپٹی چلی آ رہی ہے، اس کی مورد و حامل ایک مخصوص نسل و قوم ہے نہ کہ کسی مخصوص مذہب و ملت کے پیرو۔ خود لفظ ARTI-SEMITISM بتا رہا ہے کہ یہود سے جو مستقل عداوت نازی جرمنی کو خصوصاً اور اٹلی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ کو رہ چکی ہے اس کی بنا نسلی یا قومی تھی نہ کہ دینی یا اعتقادی۔

مفلسی، محتاجی، تنگدستی کے انتساب پر عجب نہیں کہ ناظرین کو حیرت ہو اور سوال دل میں پیدا ہو کہ تمول تو یہود کا ضرب المثل ہے پھر اس قوم کو محتاج و تنگدست کیسے قرار دیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض دھوکا اور عام طور سے چلا ہوا مغالطہ ہے۔ دولت و ثروت جتنی بھی ہے۔ وہ قوم یہود کے صرف اکابر و مشاہیر تک محدود ہے، ورنہ عوام یہود کا شمار دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہے۔ یہ بیان خود محققین یہود کا ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"گو یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا ہے لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں وہاں کی آبادی میں انھیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" (جلد ۱۰ ص ۱۵۱)۔

"عوام یہود دوسری قوموں سے کہیں زیادہ غریب ہیں یا اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زائد دولت مند ہیں" (جلد ۶ ص)

۲۱۲ (اسی دنیا میں اپنی ہی جیسی مخلوق کے ہاتھوں)

بَآءُوْ کے معنی اور بھی کئے گئے ہیں لیکن اکثر محققین اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد استحقاق ہے۔

ای استوجبوا اللعنۃ (ابن عباس) ای استحقوا غضبا۔ (بحر) أی استحقوا (کبیر)

نسل اسرائیل پر اس قدرتی غضب کا ظہور برابر انسانوں ہی کے ہاتھوں ہوتا چلا آ رہا ہے اس آخر زمانہ میں ہٹلر جیسے چنگیزی فرمانروا کی یہود دشمنی و یہود بیزاری اخبار بیں و تاریخ خواں طبقہ سے پوشیدہ نہیں۔

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ عارف کے لئے اس قصہ میں بڑا سبق ہے ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑنا چاہئے جنھوں نے نہ بلا پر صبر کیا نہ نعمت پر شکر ادا کیا اور نہ قضائے الٰہی پر راضی رہے، ایسوں پر ذلت طغیان لگا دی گئی، حب دنیا ان کے قلب میں جما دی گئی اور انھیں درجات عالیہ سے گرا دیا گیا۔

يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

انبیاء کو ناحق قتل (تک) کر ڈالتے تھے ۲۱۴؎ یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے ۲۱۵؎

۲۱۳؎ لفظ یہاں کَفَرُوْا نہیں کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ استعمال ہوا ہے، ذکر کسی خاص موقع کا نہیں کہ اس وقت وہ منکر ہو بیٹھے تھے بلکہ ذکر ان کی مستقل قومی خصلت کا ہو رہا ہے کہ انکار کرتے ہی رہتے تھے، انکار کو شعار ہی بنا لیا تھا۔

ذٰلِكَ یعنی ان کا یہ مستحقِ غضب ہو جانا۔

اشارۃ الی ماسبق من ضرب الذلۃ والمسکنۃ والبوء بالغضب (بیضاوی۔ الکشاف)

اٰيٰتُ اللّٰهِ کا لفظ عام ہے۔ معجزات و خوارق بھی مراد ہو سکتے ہیں اور کتب آسمانی بھی۔

ای المعجزات مطلقا...... او الکتب المتلوّۃ مطلقا (روح) المعجزات التسع وغیرھا

او القرآن او جمیع آیات اللہ المنزلۃ علی الرسل (بحر)

بِاَنَّهُمْ میں باء سببیہ ہے یعنی یہ سزا انہیں کفر عادی اور مسلسل قتل انبیاء کی پاداش میں ملی تھی۔

بسبب کفرھم بالمعجزات وقتلھم الأنبیاء (بیضاوی)

۲۱۴؎ "قتل تک" یعنی دوسری بیہودگیاں، شرارتیں، فتنہ پردازیاں تو تھیں ہی حد یہ ہے کہ قتل تک سے نہ چوکے، یسعیاہ نبی کا قتل، یرمیاہ نبی کا قتل، زکریا نبی کا قتل، یحییٰ نبی کا قتل، اور عیسیٰ مسیح کا اقدامِ قتل (بلکہ اپنے خیال میں قتل ہی) یہ اسرائیل کی تاریخِ جرائم کے چند جلی عنوانات ہیں ـــ یہ قوم اس قابل رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی رعایتیں روا رکھی جائیں؟ اسے زندہ رہنے کی بھی کچھ مہلت دی جاتی؟

بِغَيْرِ الْحَقِّ نبی کا قتل تو جب ہوگا ناحق ہی ہوگا، نبی کے قتل جائز کی کوئی صورت ہی نہیں پھر قرآن جس میں ایک لفظ بھی بے کار یا بطور حشو نہیں اسے کیوں لایا؟ قرآن کا مقصود تو اس اضافہ سے یہ ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی قتل ناحق و ناجائز تھے یعنی خلافِ عدل تو خیر ہوتے ہی، قانونِ وقت کے لحاظ سے خلافِ قانون اور بے ضابطہ ہی تھے!

ای عندھم ایضا (مدارک) قتلوھم من غیر ان کان ذلک القتل حقا فی اعتقادھم وخیالھم

(کبیر) ای لم یدّعوا فی قتلھم وجھا یستحقون بہ القتل عندھم (بحر)

بعض نے کہا ہے کہ اس تصریح سے مقصود قتل کے ناحق ہونے پر زور اور تاکید ہے۔

کان ھذا تعظیما للشنعۃ علیھم (قرطبی) تعظیم للشنعۃ والذنب الذی أتوہ (قرطبی)

سلسلۂ اسرائیلی کے خاتمِ نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے، زمانہ بھی آپ کا نسبۃً بہت قریب کا ہے یعنی عہدِ تاریخی کے اندر کا۔ اس وقت کی تاریخ ایک اچھی حد تک محفوظ ہے، حال میں اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ روزیڈی (ROSADI) اور انگلستان کے ایک بیرسٹر انیس (INNES) نے قدیم کاغذات کی چھان بین کر کے آپ کے مقدمہ کی روداد الگ الگ شائع کی ہیں، پڑھنے کے قابل ہیں، ان سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے سزائے صلیب کا فیصلہ سنانے میں کوئی اجتہادی غلطی ہو گئی، بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے ایک بالکل جھوٹا استغاثہ گڑھا اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں اور پھر ملک کی عام فوجداری عدالت میں بالکل ہی بے ضابطہ کارروائیاں کر کے سزا دلانے میں کامیاب

ہوگئے ـــــ رومی اور جیسے بھی کچھ ہوں، آئین دوستی اور قانون پرستی تو ان کی مشہور ہے جب ان تک کے عہد میں یہ اندھیر ہوا تو پھر قدیم ترین انبیاء کی مظلومیت کا کیا ٹھکانا جن کے قتل میں عجب نہیں کہ ضابطہ کی ظاہری اور رسمی صورت بھی نہ برتی گئی ہو۔

۲۱۵ اسرائیلیوں کے مسلسل تمرّد، سرکشی، نافرمانی کے تذکروں سے توریت وانجیل دونوں کے صفحات لبریز ہیں، سب کی نقل کرنے کی نہ گنجائش نہ ضرورت۔ مشتے نمونہ از خروارے صرف دوچار نمونے دیکھتے چلئے:۔

"انھوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑادیا اور اس کی باتوں کو ناچیز جانا اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی، یہاں تک کہ خدا کا غضب ایسے لوگوں پر ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ نہ رہا"۔ (۲ تواریخ ۳۶: ۱۷)

"تمھاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمھارے نبیوں کو کھا گئی ہے" (یرمیاہ۔ ۲: ۳۰)

"اے اہلِ یعقوب اور اہل اسرائیل کے سب خاندانو! خداوند کا کلام سنو۔ خدا یوں فرماتا ہے کہ تمھارے باپ دادوں نے مجھ میں کون سی ناانصافی پائی جو وہ مجھ سے دور بھاگے اور بُطلان کے پیرو ہوئے اور آپ باطل ہوگئے" (یرمیاہ ۲: ۴ و ۵) "وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھر لائیں قتل کیا اور انھوں نے کاموں سے تجھے غصہ دلایا" (نحمیاہ ۹: ۲۶)

یہ مختصر اور بہت ہی مختصر اقتباسات عہد قدیم کے نوشتوں سے تھے، اب عہد جدید کے نوشتوں کے ایسے ہی مختصر نمونے ملاحظہ ہوں:

"اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو!..... نبیوں میں سے کس کو تمھارے باپ دادوں نے نہیں ستایا؟" (اعمال ۷: ۵۱ و ۵۲) "تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں..... دیکھو میں نبیوں، داناؤں اور فقیہوں کو تمھارے پاس بھیجتا ہوں ان میں سے بعض کو قتل کروگے اور صلیب پر چڑھاؤگے اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے تاکہ سب راست بازوں کا خون جو زمین پر بہایا گیا ہے تم پر آئے..... اے یروشلم! اے یروشلم! تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ہیں انھیں سنگسار کرتی ہے"۔ (متی۔ ۲۳: ۲۹ و ۳۷۔ لوقا۔ ۱۲: ۳۴، ۳۵)

غرض توہین انبیاء اور پیمبر کشی کا الزام یہود پر قرآن مجید نے دنیا میں پہلی بار نہیں لگایا ہے، ان کی فرد جرم کا یہ عنوان تو قدیم نوشتوں میں موجود چلا ہی آتا تھا، قرآن مجید نے محض اس کی تصدیق و توثیق کردی۔

ذٰلِكَ اس مکرر اسم اشارہ کا مشارٌ الیہ کفر اور قتلِ انبیاء بھی ہوسکتا ہے اور عام اسبابِ اعتداء بھی۔

قیل الاشارۃ الی الکفر والقتل (بیضاوی) یجوز ان یشار بذالک الی الکفر وقتل الأنبیاء۔ (مدارک)

بِمَا عَصَوا میں باء سببیہ ہے۔

ای بسبب ارتکابھم انواع المعاصی واعتداءھم حدود اللہ فی کل شی (مدارک)

ہوسکتا ہے کہ یہاں مع کے مرادف ہو۔

والباء بمعنی مَعَ (بیضاوی)

وَكَانُوا يَعْتَدُونَ صیغہ محض ماضی کا نہیں ماضی استمراری کا ہے یعنی طغیان وعدوان اس قوم کی عادت میں داخل ہوگیا تھا، مرشد تھانوی ؒ نے فرمایا کہ کسی گناہ کو بھی خفیف نہ سمجھنا چاہئے، ایک گناہ برابر دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے یہاں تک کہ کفر کا، چنانچہ یہاں بھی عصیان اور تجاوز حدود تھا جو ان کو

## اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ الَّذِیۡنَ ہَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی

بیشک جو لوگ ایمان لاچکے ہیں ۲۱۶ اور جو لوگ یہودی ہوئے ۲۱۷ اور نصاریٰ ۲۱۸

کفر آیاتِ الٰہی اور قتل انبیاءؑ تک لایا۔

مفسر بیضاوی نے بھی یہاں یہی کہا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک نوبت پہنچا دیتی ہے چنانچہ یہاں بھی خوئے عصیان نے رفتہ رفتہ کفر و قتل انبیاءؑ تک پہنچا دیا۔

جرّهم العصيان والتمادي والاعتداء فيه الى الكفر بالآيات وقتل النبيين، فان صغار الذنوب سبب يؤدي الى ارتكاب كبارها۔ (بیضاوی)

۲۱۶ (آخری رسولؐ اور آخری کتاب پر یعنی مسلمان ہو چکے ہیں۔)

ایمان لانے کے معنی کل عقائدِ ضروری کے تسلیم کر لینے کے ہیں، توحید پر ایمان، رسالت پر ایمان، فرشتوں پر ایمان آسمانی کتابوں پر ایمان، سب کچھ اس میں شامل ہے اور الذین آمنوا مطلق صورت میں قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے مراد اس سے مسلمان ہی ہیں، یہاں بھی مراد مومنین ہی ہیں۔

اي من امن بمحمد صلى الله عليه وسلم (بحر عن ابن عباسؓ) هم المصدقون رسول الله صلى الله عليه وسلم في ما آتاهم من الحق من عند الله (ابن جریر)

اور رازیؒ نے بھی متکلمین سے یہی معنی نقل کئے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور پھر دین پر قائم و ثابت رہے۔

الذين امنوا في الماضي وثبتوا على ذلك واستمروا عليه في المستقبل وهو قول المتكلمين (کبیر)

۲۱۷ جو لوگ دین یہودیت کے پیرو ہیں۔

يقال هاد وتهوّد اذا دخل في اليهودية۔ (بیضاوی)

خواہ پہلے سے یہودی چلے آرہے ہوں نسلاً یہودی ہوں یا پہلے مشرک وغیرہ کچھ اور رہے ہوں اور اب یہودی عقیدے اور شعار اختیار کر لئے ہوں۔

اب تک تو کہ بنی اسرائیل نام ایک خاص نسل و خاندان کا چلا آرہا تھا اور ان کی تاریخ کے اہم ترین منظر سامنے لائے جا رہے تھے اب کہ ان کے مسلک اور عقیدوں کا شروع ہوتا ہے اور پہلی بار الذین ھادوا آیا ہے بنی اسرائیل ایک نسلی نام تھا، ایک کنبہ یا قبیلہ یا قوم کا نام تھا جسے اپنی عالی نسبی پر فخر تھا، اپنے آباء و اجداد کی مقبولیت پر ناز تھا تاریخ کے دہراتے وقت ضروری تھا کہ اُس نسلی نام کو لیا جائے، اب بیان ایک دینی مسلک کا، ایک اعتقادی نظام کا شروع ہو رہا ہے ضروری ہوا کہ اب نام ایسا لیا جائے، کوئی وصف ایسا بیان کیا جائے جو بجائے نسل و نسب خاندان کے رہنمائی مسلک و عقیدہ کی جانب کرے۔ الذین ھادوا اسی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے۔

قرآن مجید کی بلاغت کے وجوہِ اعجاز بے شمار ہیں، انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ متقارب لیکن متمائز معانی کے لئے لفظ بھی وہ مختلف لاتا ہے اور ان کے دقیق باہمی فرق کا لحاظ رکھ لیتا ہے، مذہب یہود ایک نسلی مذہب ہے تبلیغی مذہب نہیں کسی غیر اسرائیلی کو باضابطہ یہودی بنانے کا طریقہ اُن کے ہاں نہیں عرب میں متعدد قبیلے ایسے

آباد تھے جو نہ پیدائشی یہودی تھے اور نہ نسلاً اسرائیلی بلکہ عرب یا بنی اسماعیل تھے لیکن یہود کی صحبت سے متاثر و مرعوب ہو کر انھوں نے پہلے یہود کے طور طریقے اور پھر ان کے عقیدے اختیار کر لئے اور رفتہ رفتہ اُن کا شمار بھی یہودی آبادی میں ہونے لگا۔ بجائے الیھود کے الذین ھادوا لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے عقائد اختیاری کی جانب دلالت خوب واضح ہو جائے۔ بنی اسرائیل کی قومی حکومت و وجاہت کا خاتمہ تو ظہور اسلام سے مدتوں پہلے بلکہ کہنا چاہئے کہ نشأۃ مسیحؑ سے بھی پہلے اس وقت ہو چکا تھا جب رومیوں نے قبضہ کیا تھا اور دولت یہود کا رہا سہا نشان مشرک رومیوں کے ہاتھوں بیت المقدس کی بربادی کے بعد ہی ہو گیا تھا، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے معاصرین یہود کی حیثیت صرف ایک مذہبی اور دینی فرقہ کی رہ گئی تھی اسی لئے خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کا لفظ جہاں جہاں استعمال کیا ہے، سیاق عبارت ہر جگہ تاریخی ہے اور الیھود کا ذکر جہاں جہاں کیا ہے، ان کی دینی و اعتقادی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے، مدینہ و جوار مدینہ بلکہ یمن میں بھی جو یہود تھے وہ نسلاً بنی اسرائیل نہ تھے بنی اسمٰعیل ہی تھے لیکن اسرائیلیوں کی صحبت میں رہ کر تمدن و معاشرت یہاں تک کہ عقیدے بھی انھیں کے اختیار کر لئے تھے، اَلَّذِیْنَ هَادُوْا میں کھلا ہوا اشارہ اسی حقیقت کی طرف آ گیا۔

۲۱۸ النَّصٰرٰی۔ نصاریٰ جمع ہے نصرانی کی۔ ملک شام (حال فلسطین) میں ایک قصبہ ہے ناصرہ (NAZARETH) علاقہ گلیلی میں، بیت المقدس سے ستر میل شمال میں، اور بحر روم سے شرق میں تیس میل کے فاصلہ پر موجودہ آبادی آٹھ نو ہزار کے درمیان ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا آبائی وطن یہی قصبہ ہے اور آپؑ یسوع ناصری اسی مناسبت سے کہلاتے ہیں۔ ناصرہ ہی کو عربی تلفظ میں نصران بھی کہتے ہیں۔ نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی جانب ہے۔

سمّوا بذلک انتسابا الی قریۃ یقال لھا نصران (راغب) نصران قریۃ بالشام ینسب الیہ النصاریٰ۔ (صحاح جوھری)

یہی اشتقاق ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ صحابی سے آیا ہے:۔

سمّیت النصاریٰ نصاریٰ لأنّ قریۃ عیسی ابن مریم کانت تسمّی ناصرۃ وکان اصحابہ یسمّون الناصریین (ابن جریر عن ابن عباس)

اور یہی قول قتادہ و ابن جریج تابعین کا ہے، نیز بعد کے محقق مفسرین کا:۔

وھو قول ابن عباس وقتادۃ وابن جریج (کبیر) قیل سمّوا بذلک لقریۃ تسمّی ناصرۃ کان ینزلھا عیسیٰ فلمّا نسب اصحابہ الیہ قیل النصاریٰ (قرطبی) وقیل انھم سمّوا بذلک من اجل انھم نزلوا ارضا یقال لھا ناصرۃ قالہ قتادۃ وابن جریج وروی عن ابن عباس ایضا (ابن کثیر) فلمّا نسب اصحابہ الیہ قیل النصاریٰ۔ قالہ ابن عباس وقتادۃ (قرطبی)

بعض نے اسے عربی کا لفظ فرض کر کے نصرت سے مشتق سمجھا ہے لیکن قول صحیح وہی ہے جو ابھی گزر چکا۔ خوب خیال کر لیا جائے قرآن یہاں ذکر مسیحیوں کا نہیں نصاریٰ کا کر رہا ہے اور قرآن حکیم کا ہر لفظ پر حکمت ہوتا ہے، یہی وہ ہیں جو ایمان اناجیل اربعہ پر رکھتے ہیں، مسیحؑ کو خدا کا نبی نہیں خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدا انکے قالب میں حلول کر آیا تھا، آخرت میں نجات دینے والا (SAVIOUR) خدا کو نہیں مسیحؑ "ابن اللہ" کو یقین کرتے ہیں اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابل فہم فلسفہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر اقنوم بجائے خود ایک خدا ہے اور تینوں اقنوم مل کر بھی ایک ہی خدا بنتے ہیں — اس کھلے ہوئے شرک کے قائلوں کا ذکر ہرگز اس مقام پر

# وَالصّٰبِـِٕیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ

اور صابی ۲۱۹ (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے ۲۲۰

مقصود نہیں اسی لئے نام بھی جو مشہور اور چلا ہوا تھا اُسے ترک کرکے نصاریٰ لایا گیا۔
نصرانی معرب ہے NAZARENE کا۔ حضرت مسیح کے بیچے پیرو نبی کو ماننے والے ابتدائی زمانہ میں NAZARENES کہلاتے تھے یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے آگے چل کر یہی لوگ ابونیہ (EBONITES) بھی کہلائے۔ چنانچہ جب خود پولوس پر عدالت میں الزام لگا تو وکیل ترطلس نے اسے فرقۂ ناصریہ کا فرد کہہ کر اپنی تقریر میں پیش کیا:
"ہم نے اس شخص کو مفسد اور دنیا کے یہودیوں میں فتنہ انگیز اور ناصریوں کے بدعتی فرقہ کا سرگروہ پایا" (اعمال ۲۴: ۵)
مسیح کے ساتھ لفظ ناصری اسی اعمال میں کئی جگہ آیا ہے (۲: ۲۲، ۳: ۶، ۴: ۱۰ وغیرہ) اور خود انجیل متی میں بھی یہ ذکر یوں آگیا ہے:
"یوسف خواب میں ہدایت پاکر گلیل کے علاقہ کو روانہ ہوگیا اور ناصرہ نام ایک شہر میں جا بسا تاکہ جو نبیوں کی معرفت کہا گیا تھا پورا ہو کہ وہ ناصری کہلائے گا" (متی ۲: ۲۳)
لیکن جب مشرکانہ عقائد کا زور بڑھا اور اصل مسیحیت، حلولیت اور تثلیث ہی قرار پاگئی تو قدرتاً نصرانیت کا ستارہ بھی گردش میں آیا اور نصرانی و نصرانیہ کے الفاظ بجائے عزت و تکریم کے تحقیر کے موقع اور ذم کے محل میں استعمال ہونے لگے۔ موجودہ مسیحیت سرتاپا پولوسیت ہے اور تمام تر پولوس (PAUL) طرسوسی کی تعلیمات پر مبنی ہے یہ حضرت مسیح کے بعد ہی روز بعد شروع ہوگئی تھی اور نصرانی اس کے بالکل منکر تھے، قرآن مجید نے محلِ مدح میں ایک موقع پر بھی تثلیثی مسیحیت کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کا ذکر جب کبھی آیا ہے تو ہمیشہ ملامت بیزاری کے ساتھ مثلاً ان آیتوں میں:
لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ثالث ثلٰثۃ (المائدۃ ۷۳) لقد کفر الذین قالوا ان اللّٰہ ھو المسیح ابن مریم (المائدۃ ۷۲) وغیر ذلک۔

۲۱۹ الصَّابِئُوْنَ۔ صابی کے لفظی معنی ہیں جو کوئی بھی اپنے دین کو چھوڑ کر دوسرے دین میں آجائے یا اس کی طرف مائل ہو جائے۔
قال ابو اسحٰق الزجاج الصابئون الخارجون من دین الی دین (تاج) قیل لکل خارج من الدین الی دین آخر صابی (راغب)
خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو شروع میں صابی اسی لئے کہا جانے لگا تھا کہ آپ نے دین قریش کو چھوڑ کر دین اسلام اختیار کیا ہے۔
وکانت العرب تسمی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم الصابی لأنہ خرج من دین قریش الی دین الاسلام۔ (نہایہ، تاج)
اصطلاح میں صابیوں (SABIANS) کے نام کا ایک مذہبی فرقہ جو عرب کے شمال و مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر آباد تھا، یہ لوگ دین توحید اور عقیدۂ رسالت کے قائل تھے اور اس لئے اصلاً اہل کتاب تھے انھیں کو نصاریٰ بھی کہا جاتا تھا گویا نسبت ایک پیغمبر حضرت یحییٰ کی جانب رکھتے تھے حضرت عمرؓ جیسے مبصر و نکتہ رس خلیفۂ راشد اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ جیسے محقق صحابی نے صابیوں کا شمار اہل کتاب میں کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے ان کا ذبیحہ بھی حلال مانا ہے۔
قال عمر بن الخطاب وابن عباس ھم قوم من اھل الکتب۔ قال عمر تحل ذبائحھم مثل ذبائح اھل الکتاب (معالم)
اور اہل لغت بھی اسی طرف گئے ہیں:۔
ھم قوم من اھل الکتاب (صحاح جوہری)

تابعین میں سے متعدد اکابر ان کے اہل کتاب یا موحد ہونے کے قائل ہیں:۔

ھم طائفۃ من اھل الکتب (ابن جریر عن السدی) فرقۃ من اھل الکتب (ابن کثیر عن ابی العالیۃ والربیع بن انس والضحاک والسدی واسحاق بن راھویہ)

ابن زید ان کے موحد ہونے کے قائل تھے، اور قتادہ اور حسن بصری سے تو یہاں تک منقول ہے کہ اہل قبلہ تھے اور نماز پانچ وقت کی پڑھتے تھے (ابن جریر) اور ہمارے امام ابوحنیفہ جو خود بھی عراقی تھے اور اس لئے صابیوں سے براہ راست واقفیت کا موقع رکھتے تھے، ان کا فتوےٰ ہے کہ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ بھی حلال ہے اور ان کے ہاں کی عورتوں سے نکاح بھی جائز، اور یہی قول بعض اور قدیم فقہاء امت کا ہے:۔

ولھذا قال ابوحنیفۃ واسحاق لاباس بذبائحھم ومناکحتھم (ابن کثیر) قال ابوحنیفۃ لابأس بذبائحھم ونکاح نسائھم۔ (قرطبی)

تاریخ ایران پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کا فرنچ سے اردو ترجمہ ابھی حال میں نکلا ہے (انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۱ء) صفحہ ۴۷ پر فاضل مترجم شیخ محمد اقبال مرحوم پرنسپل اورینٹل کالج لاہور لفظ مینڈین (MANDAEAN) پر حاشیہ دیتے ہیں:

"مینڈین بہ زبان آرامی یعنی اولو العلم۔ اس فرقہ کے لوگ عراق میں اب بھی موجود ہیں اور صابئون کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں ہیں، تاہم جان دی بپٹسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق میں عوام الناس ان کو حضرت یحییٰ کی امت کہتے ہیں"۔ (ایران بعہد ساسانیان)

اور یہاں خود قرآن مجید ان کے نام کا عطف دو اہل کتاب قوموں پر کر رہا ہے، یہ خود ایک قرینہ ان کے اہل کتاب اور اہل توحید ہونے کا ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ان کے لقب "نصارائے یحییٰ" کو اگرچہ ایک غلط تسمیہ ٹھہرایا گیا ہے تاہم یہ تصریحات اس میں درج ہیں:۔

"مینڈینز (MANDAEAN.) مشرقی مذہبی فرقہ ہے جس کے عقائد و اعمال مسیحیوں، یہودیوں اور مشرکوں کے دین کا مخلوطہ ہیں، یہ لوگ جنوبی بابل یعنی واسط و بصرہ کے علاقہ میں خوزستان کے قریب آباد ہیں اور مقامی زبانیں یعنی عربی و فارسی بولتے ہیں، ان کے مذہبی نوشتے آرامی زبان میں ہیں جو بابل کے تالمود سے قوی مشابہت رکھتی ہے...... یہ اپنے کو دوسرے فرقوں کے سامنے صابی ہی کہتے ہیں"۔ (جلد ۸ صفحہ ۲۸۸)

اسی میں آگے ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اور انبیائے برحق حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہ کے منکر ہیں لیکن حضرت یحییٰؑ کی نبوت کے قائل ہیں۔ "انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس" میں اس فرقہ کی تاریخ عقائد وغیرہ پر مقالہ بڑی ہی شرح و بسط کے ساتھ ہے (جلد ۸ صفحہ ۳۸۰ تا ۳۹۲) ان کا دوسرا لقب مغتسلہ بھی لکھا ہے کہ یہ غسل اور بپتسمہ اور پانی میں غوطہ دینے کے بہت قائل ہیں، ان کی تعداد قریب چار ہزار کے بیان کی ہے۔ نماز ان کے ہاں پانچ وقت کی فرض ہے، تین بار دن میں اور دو بار رات میں اور ان کا قبلہ قطب تارہ یا سمت شمال ہے۔ چیمبرز انسائیکلوپیڈیا (نیوایڈیشن) میں ان کی آبادی عراق میں چھ ہزار بیان کی گئی ہے (جلد ۸ صفحہ ۸۰)

۲۲۰؎ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی ذات و صفت پر ایمان لائے جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے اور وہ ایمان ہر قسم کی شرک آمیزی سے پاک ہو۔ اس ایمان باللہ کے تحت میں سارے لوازم و تضمنات بھی داخل ہیں

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور نیک عمل کرے ۲۲۱ سو ان (سب) کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا اجر ہے، اور نہ کوئی اندیشہ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

ان کے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے ۲۲۲

ورنہ خدا پر مطلق ایمان تو کسی نہ کسی صورت میں تقریباً ہر انسان کا ہے اور ان لوازمِ توحید میں سب سے اونچے نمبر پر ایمان بالرسل ہے کہ بندوں کا صحیح تعلق اللہ کے ساتھ قائم کرنے والی اس کا سیدھا راستہ بتانے والی ذات رسول ہی کی ہوتی ہے۔

قد دخل فی الایمان باللہ الایمان بما اوجبہ اعنی الایمان برسلہ (کبیر) وقد اندرج فی الایمان بالیوم الآخر الایمان بالرسل اذا بعث لایعرف الامن جھۃ الرسل (بحر) وفی الایمان باللہ وبالیوم الآخر اندراج الایمان بالرسل والکتب والبعث۔ (قرطبی)

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ یومِ آخرت پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ سارے احکامِ آخرت پر ایمان لایا جائے۔

دخل فی الایمان بالیوم الآخر جمیع احکام الآخرۃ۔ (کبیر)

بعض نے کہا ہے کہ یہ ایمان آخرت لازمی طور پر شامل ہے ایمان بالرسل کو:۔

وقد اندرج فی الایمان بالیوم الآخر الایمان بالرسل اذ البعث لایعرف الامن جھۃ الرسل (بحر) وفی الایمان باللہ وبالیوم الآخر اندراج الایمان بالرسل والکتب والبعث (قرطبی)

تناسخ، حلول وغیرہ کے گمراہانہ عقائد کی بنیاد صرف یہی ہے کہ دوسرے مذہبوں میں یوم حشر کا ایمان صحیح باقی نہیں رہا اور انھوں نے جزا و سزا کی اور صورتیں تجویز کر لیں۔

۲۲۱ (اور عمل صالح کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ عمل وحی الٰہی یعنی شریعتِ اسلامی کے ماتحت ہو) دورِ حاضر کی چلتی ہوئی گمراہیوں میں سے ایک سوال جو بار بار پیش ہوتا رہتا ہے، یہ ہے کہ ایک شخص صاحبِ ایمان ہے مگر بدعمل اور دوسرا شخص خوش عمل ہے مگر ایمان سے خالی، تو ان دو میں نجات کس کی ہوگی؟ علماء اس کے جوابات مختلف دیتے رہتے ہیں، لیکن سب سے سیدھا اور بے تکلف جواب یہ ہے کہ حسنِ عمل کا ایک لازمی عنصر تو خود ایمان ہی ہے بغیر صحیح ایمان کے بغیر حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے کوئی عمل، عمل صالح کی تعریف میں آہی کب سکتا ہے ایمان سے خالی شخص کا "حسنِ عمل" تو صرف صورۃً عمل ہوگا، ورنہ اس کی حقیقت (یعنی خالق کونین کی رضا طلبی) تو اس سے خارج ہی ہوگی۔

۲۲۲ اعتقادِ صحیح اور عملِ صحیح بس یہی دو شرائطِ نجات ہیں، گویا مذہبی دنیا کو یہ بشارت پہلی بار کھلے لفظوں میں پہنچی کہ اصل شئے عقیدہ اور عمل ہیں اور ان دو کی تصحیح کے بعد قوم، نسل وغیرہ کی ساری بحثیں ہیچ ہیں۔

عِنْدَ رَبِّهِمْ میں عِنْدَ سے مراد عندیتِ مکانی نہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حق میں جو مکان و جہت سے پاک منزہ ہے محال ہے بلکہ مراد اجر کا یقینی اور قطعی ہونا ہے۔

لیس المراد العندیۃ المکانیۃ فان ذلک محال فی حق اللہ تعالیٰ بل المراد ان اجرھم متیقن جار مجری۔ (کبیر)

# وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا ۲۲۳ اور ہم نے تمہارے اوپر (کوہ) طور ۲۲۴ بلند کیا ۲۲۵ مضبوطی کے ساتھ اس (کتاب) کو پکڑے رہو جو ہم نے تم کو دی ہے ۲۲۶

قرآن مجید کا ایک بلیغ و حکیمانہ اسلوب یہ بھی ہے کہ جزئیات کے ضمن میں بڑے بڑے اہم کلیات بیان کر جاتا ہے بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانی اور پشتہا پشت کی سرکشی کا ذکر چلا آ رہا تھا، مخاطبین پر یہ اثر پڑنا بالکل طبعی تھا کہ ایسے مجرموں کے لئے اب نجات کی کوئی گنجائش ہو ہی کیا سکتی ہے، معاً یہ آیت درمیان میں لا کر اس مایوسی کو رفع کر دیا گیا ہے کہ جو کوئی بھی اپنا عقیدہ اور عمل درست رکھے گا، خواہ مسلمان ہو یا یہودی یا نصرانی یا صابی غرض کوئی بھی ہو رحمت و مغفرت کی راہیں سب کے لئے کھلی ہوئی ہیں، کام کی چیزیں صرف ایمان صحیح اور عمل صحیح ہیں۔

لیعرف ان جمیع ارباب الضلال اذا رجعوا عن ضلالھم وآمنوا بالدین الحق فان اللہ سبحانہ وتعالیٰ یقبل ایمانھم وطاعتھم ولا یردھم عن حضرتہ البتۃ (کبیر)

**لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ** ۔ بیان آخرت کا ہو رہا ہے یعنی قیامت کے دن، جو کشف و حقائق کا دن ہوگا، اہل ایمان کو نہ اپنے ماضی پر حسرت ہوگی نہ اپنے مستقبل کی طرف سے تشویش۔ خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے، اور غم و حزن کا ماضی سے۔

**مَنْ آمَنَ ..... يَحْزَنُونَ** ۔ سوال یہ ہوا ہے کہ مَنْ تو صیغۂ واحد غائب ہے پھر اس کی خبر (ھُمْ یحزنون) صیغۂ جمع میں جا کر کیسے نکلی؟ جواب یہ ہے کہ مَنْ لفظاً واحد ہے لیکن اس کا اطلاق واحد، تثنیہ، جمع سب پر ہوتا ہے اور اس کی متعدد نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔

من یقع علی الواحد والتثنیۃ والجمع فجائز ان یرجع الضمیر مفردا ومثنی ومجموعا (قرطبی)

مَنْ پر حاشیہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

**۲۲۳** (اے بنی اسرائیل تمہارے پیغمبر کے واسطہ سے اس مضمون کا کہ تم توریت پر عمل کرو گے۔)
تاریخ اسرائیل کا بیان مسلسل چل رہا ہے اور تخاطب بنی اسرائیل ہی سے ہے۔

**۲۲۴ الطور** ۔ طور مطلقاً پہاڑ کو بھی کہتے ہیں اور جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص و متعین پہاڑ کا بھی نام

الطور اسم جبل مخصوص وقیل اسم لکل جبل ۔ (راغب)

جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑیوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں، متعدد چوٹیاں ہیں، انھیں میں سے کسی کا نام طور ہوگا، قوم کے اوپر پہاڑ بلند کرنے سے کیا مراد ہے؟ توریت میں اس کی کچھ مجمل سی کیفیت درج ہے:۔

”وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا زیر و بالا دھواں تھا، کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور شور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔“ (خروج ۱۹: ۱۷ و ۱۸)

اور تالمود جو توریت کی مشہور و مستند اور نہایت ضخیم شرح یہود کے ہاں موجود ہے اس میں اس اجمال کی تفصیل میں اقوال

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ

اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بن جاؤ ۲۲۶ پھر تم اس (عہد) سے اس کے بعد (بھی) پھر گئے ۲۲۷

ذیل درج ہیں :۔

"حق تبارک و تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ سینا کو اُلٹ دیا جس طرح کوئی بڑا ظرف اُلٹ دیا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم توریت کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۴ ص ۳۲)

"خدا نے پہاڑ کو ان لوگوں پر اُلٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ توریت کو اگر قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہے گا" (ایضاً)

ہمارے مفسرین نے جو آثار صحابہ و تابعین کی زبان سے نقل کئے ہیں، ان میں بھی روایتیں اسی سے ملتی جلتی ہیں۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

۲۲۵ یہ پورا مقولہ اسی وقت کا ہے جب کتاب نازل ہوئی تھی کتابِ ہدایت کے نزول اور رفع طور کے ساتھ ساتھ ہدایت اس کی بھی ہوئی تھی کہ اس کتاب کی محافظت کرنا اور اس کے احکام پر مداومت۔

اعملوا بما اعطیتکم من الکتب (ابن عباس)

ما اتیتکم سے مراد کتاب توریت ہے احکام توریت کے اس اخذ و تمسک کی تاکید اور اس کے ترک پر وعید خود توریت میں بھی جابجا مذکور ہے :۔

"جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت، سب جماعت کہے آمین" (استثناء ۲۷ : ۲۶) "اگر تو کوشش کرکے خداوند اپنے خدا کی آواز سنے تاکہ ان سب حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی نسبت تجھے سرفراز کرے گا" (استثناء ۲۸ : ۱) "لیکن اگر تو خداوند اپنے خدا کی آواز کا شنوا نہ ہوگا کہ اس کے سارے شرعوں اور حکموں پر جو آج کے دن میں تجھ کو بتاتا ہوں، دھیان رکھ کے عمل کرے تو ایسا ہوگا کہ یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی" (استثناء ۲۸ : ۱۵)

۲۲۶ (اور تقویٰ کی راہ یہی ہے کہ کتابِ الٰہی پر عمل کیا جائے)

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ۔ یاد رکھو اس کے مضامین کو تاکہ ان پر عمل کر سکو۔ احکامِ الٰہی کا یاد رکھنا اصلاً اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔ حکم کے تحت میں حفظ، قراءت وغیرہ بھی داخل ہیں لیکن مقصود اصلی وہی عمل ہے۔

اقرؤا ما فی التوراۃ واعملوا به (ابن کثیر عن ابی العالیہ) ای تدبروہ واحفظوا اوامرہ ووعیدہ ولا تنسوہ ولا تضیعوہ هذا هو المقصود من الکتب العمل بمقتضاها لا تلاوتها باللسان وترتيلها۔ (قرطبی)

لَعَلَّ کے لئے پوری تصریح اوپر گزر چکی ہے کہ یہ جب خدا تعالیٰ کی طرف سے استعمال ہوتا ہے تو مفہوم شک و احتمال کا نہیں رہتا، بلکہ معنی یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

۲۲۷ (اور حسب سابق پھر نافرمانی کرنے لگے)

مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اس قول و قرار کے بعد کتابِ ہدایت و احکام مل جانے کے بعد۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ

سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں سے ہوتے ۲۲۸ے اور تم خوب

عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

جان چکے ہو ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا ۲۲۹ے

ای من بعد البرھان (قرطبی)

۲۲۸ے یعنی فی الفور ہلاک کر دیے گئے ہوتے اور ساری قوم کی قوم دنیا سے اسی طرح بے نشان کر دی گئی ہوتی جیسے اور پرانی متعدد قومیں ہو چکی ہیں فضل و رحمتِ خداوندی بنی اسرائیل کے حق میں یہی تھی کہ ان کی خطاؤں اور جرائم سے مزید چشم پوشی کی گئی اور انھیں مہلت سنبھلنے اور اپنے کو درست کرنے کی دی گئی۔

یہ ایک مزید تصریح قرآن مجید کی ہے کہ قوم اسرائیل الطافِ خداوندی خصوصی کی مورد ہمیشہ سے رہی ہے۔

۲۲۹ے لَقَدْ عَلِمْتُمْ۔ علم کا لفظ خود ہی تحقیق کے معنی میں قرآن مجید میں بارہا استعمال ہوا ہے پھر لَ حرفِ تاکید قَدْ حرفِ تاکید۔ لَقَدْ جس فعل پر داخل ہوتا ہے اس میں معنی شدتِ تاکید کے پیدا کرتا ہے گویا قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا کوئی واقعہ ان کے لئے خوب اچھی طرح جانا بوجھا ہوا یاد دلا رہا ہے اور ان سے کہہ رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل! جس واقعہ کا ذکر آگے آ رہا ہے، وہ تمھاری تاریخ کا ایک مسلّم و متعارف واقعہ ہے اور تم اس سے بلا شک و اشتباہ خوب واقفیت رکھتے ہو۔

مِنْكُمْ۔ یعنی تمھارے اسلاف و اجداد میں سے۔

فِي السَّبْتِ۔ یعنی احکام سبت کے بارہ میں۔

السَّبْتِ۔ سبت کے لفظی معنی ہیں ہفتہ کا ساتواں دن سنیچر یا شنبہ۔ شریعت یہود کی اصطلاح میں یہ ایک مقدس دن مسیحیوں کے اتوار کی طرح ہے۔ یہ دن صرف یادِ خدا اور عبادت کے لئے مخصوص تھا اور اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کے دنیوی کام سب ممنوع تھے، اور ممانعت بھی اس شدت کے ساتھ کہ جو اس حکم کو توڑے اس کی سزا قتل۔ توریت کے الفاظ ہیں:

"پس سبت کو مانو اس لئے کہ وہ تمھارے لئے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے،

..... پس جو کوئی روز سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے" (خروج ۔ ۳۱ : ۱۴ و ۱۵)

اعْتَدَوْا۔ تجاوز کر جاتے تھے، شریعتِ موسوی کے حدود سے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انھیں کا ہے۔ حضرت داؤد کا زمانۂ حکومت ۱۰۱۳ ق م تا ۹۷۳ ق م کا ہے۔ مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر توریت میں ایلات (ELATH) کے نام سے آتا ہے (استثنا ۔ ۲ : ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر (قدیم علاقۂ ادوم میں) بحر قلزم کی شرقی خلیج میں لب ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ اس کو عقبہ کے نام سے پہچانتا ہے اور عقبہ خلیج عقبہ کا مشہور بندرگاہ ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنی شریعت کے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتے اور مچھلی کا شکار ایک خاص چالاکی کے ساتھ اور اسے ظاہری صورتِ جواز دے کر سبت کے دن کیا کرتے۔

فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ

تو ہم نے ان سے کہا کر ذلیل بندر ہو جاؤ ۲۳۰؎ پھر ہم نے اسے (موجب) عبرت بنا دیا اس زمانہ کے

يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے ۲۳۱؎ اور ایک (موجب) نصیحت (بنا دیا) خوف خدا رکھنے والوں کے لئے ۲۳۲؎

۲۳۰؎ اس سلسل نافرمانی پر سزا تو ان مجرموں کو یقیناً ملی، رہا یہ کہ کیا ملی؟ اس کی تفصیلات اس درجہ قطعی نہیں جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ سزا اسی طرح واقع ہوئی جیسی قرآن کے ظاہر الفاظ میں مذکور ہے یعنی وہ انسان بندر بنے اور تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے، اس تفسیر پر عقلاً کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا، جو لوگ اللہ کے قانون تشریعی کے توڑنے میں اتنے جری و بیباک ہوں ان کے حق میں خالق کائنات اپنے قانون تکوینی کو کسی حد تک کر بدل دے اور بجائے "ارتقاء" کے کبھی اگر "ارتقاء معکوس" ہو جائے تو اس میں عدم امکان تو خیر کیا ہوتا استبعاد بھی تو کچھ ایسا زائد تو نہیں لیکن روایتیں خود اس نتیجہ پر تمام تر متفق نہیں، بلکہ یہ قول تابعین ہی کے زمانہ سے تفسیروں میں لکھا چلا آ رہا ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا صوری نہیں یعنی ان کے عادات و اخلاق بندروں کے سے کر دیئے گئے تھے، اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہونے لگا تھا، ورنہ حقیقتاً وہ بندروں کے جسم و قالب میں تبدیل نہیں کئے گئے تھے۔

لم یمسخوا قردۃ انما ھو مثل ضربہ اللہ لھم (ابن جریر۔ عن مجاھد) مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ وانما ھو مثل ضربہ اللہ کمثل الحمار یحمل اسفارا (ابن جریر۔ عن مجاھد) رُوِیَ عن مجاھد فی تفسیر ھذہ الآیۃ انہ انما مسخت قلوبھم وردت افھامھم کأفھام القردۃ (قرطبی)

مفردات میں بھی ایک قول اسی معنی میں نقل ہوا ہے:۔

قیل بل جعل اخلاقھم کأخلاقھا وان لم تکن صورتھم کصورتھا۔ (راغب)

اور صاحب المنار کا قول ہے کہ آیت ان لوگوں کے واقعی مسخ ہو کر بندر بن جانے کے باب میں نص قطعی نہیں۔

والآیۃ لیست نصا فیہ ولم یبق الا النقل۔ (المنار)

لیکن جمہور مفسرین کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ قول غریب اور ظاہر سیاق قرآنی کے خلاف ہے:۔

قول غریب خلاف الظاھر من السیاق فی ھذا المقام وفی غیرہ (ابن کثیر) وظاھر القرآن انھم مسخوا قردۃ علی الحقیقۃ وعلی ذلک جمھور المفسرین وھو الصحیح (روح)

قرطبی میں آیت نمبر (۷۶) اتحدثونھم بما فتح اللہ علیکم۔ کے تحت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ایک کلام یہود و قریظہ سے معرکہ خیبر کے دن کا نقل کیا ہے جس میں قردۃ و خنازیر صاف مجازی معنی میں آیا ہے فقرہ یہ ہے:۔

انقضتم العھد یا اخوۃ القردۃ والخنازیر اخزاکم اللہ وانزل بکم نقمتہ۔ — اے بندروں اور سوروں کے بھائیو تم نے عہد توڑ ڈالا ہے اللہ تمہیں غارت کرے اور تم پر اپنا عذاب نازل کرے۔

۲۳۱؎ سزا کی تفصیلی نوعیت کچھ بھی ہو بہرحال تھی وہ کوئی بہت سخت اور عبرت ناک سزا قرآن کا مقصود

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ؕ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمھیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو ۲۳۳

اس سزا کی تفصیل بیان کرنا نہیں، بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے، واقعہ جو کچھ بھی ہو یہود کا جانا بوجھا ہوا تھا قرآن اُسے صرف یاد دلا رہا ہے۔

جَعَلْنٰھَا میں ھا کی ضمیر عقوبت کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور اس مسخ شدہ امت کی طرف بھی، ماحصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

ای جعلنا تلك العقوبة (ابن جریر عن ابن عباس) یعنی بہ فجعلنا الامة التی اعتدت فی السبت (ابن جریر)

نَکَالًا۔ نکال وہ سخت سزا ہے جو دوسروں کے لئے باعثِ عبرت ہو۔

ای عبرة تنکل المعتبر بھا (بیضاوی) عبرة تنکل من اعتبر بھا۔ (کشاف)

مَا بَیْنَ یَدَیْھَا وَمَا خَلْفَھَا۔ مَا دونوں جگہ مَنْ کے معنی میں آیا ہے یعنی مَا کا استعمال جاندار، صاحبِ عقل مخلوق کے لئے ہوا ہے۔

ما بین یدیھا۔ معاصرین کے معنی میں ہے اور ما خلفھا بعد کے آنے والوں کے معنی میں۔

ما بین یدیھا ای معاصریھم (ابن عباس) ما خلفھا ای من خلفھم (ابن عباس) بما قبلھا وبما بعدھا من الامم والقرون (کشاف) للامم التی فی زمانھا وبعدھا (جلالین)

یدیھا اور خلفھا دونوں میں ضمیر ھا عقوبت کی طرف ہے۔

والضمیران للعقوبة (قرطبی)

گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک نسلاً بعد نسلٍ اس کا چرچا رہے، اور لوگ اس کا تذکرہ سُن سُن کے ڈرتے اور لرزتے رہیں۔

۲۳۲ یعنی تاکہ متقین کو اس واقعہ کی حکایت سے راہِ تقویٰ کی طرف ترغیب اور زیادہ ہو، یا یہ مراد لی جائے کہ نصیحت کو قبول کرنے والے اور اس سے فائدہ اُٹھانے والے متقین ہی ہوں گے۔ صاحبِ روح المعانی نے یہاں یہ نکتہ اہلِ عرفان کے لئے لکھا ہے کہ اللہ نے عبادتوں کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ خاص اوقات میں متعین کیا ہے تاکہ طبعی ظلمتیں دور ہوں، جو شخص ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نورِ استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحابِ سبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہیں، انھیں کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے اگرچہ اس اُمت کے لئے مسخِ صورت نہیں، پس انسان کو چاہیے کہ اوامرِ شرعیہ کے ذریعہ سے اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے، چنانچہ بعض اہلِ کشف اس زمانہ میں ایسے بھی پائے گئے ہیں جو انسان کو اسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں، جس کی صفتِ حیوانی اس پر غالب ہوتی ہے مثلاً جس میں ظلم و شقاوت غالب ہوتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں کہ بھیڑیا آ رہا ہے، جس پر حرام خوری کی گندگی غالب ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یوں بول اٹھتے ہیں کہ سُور آ رہا ہے اور اس قسم کا کشفِ تکوینی صرف اہلِ حق و مقبولین کے ساتھ مخصوص نہیں۔

۲۳۳ اسرائیلیوں میں ایک واقعہ قتل کا ہو گیا تھا، اور قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا، ذبحِ گاؤ کا حکم اسی سلسلہ

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾

وہ بولے آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں کیا؟ ۲۳۴ (موسیٰ نے) کہا اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں ۲۳۵

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو ۲۳۶ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے

لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾

نہ بوڑھی ہو اور نہ بن بیائی (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان ہو ۲۳۷ سو (اب) کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے۔

میں ملا، اس کی کچھ تصریح اگلے رکوع میں آرہی ہے۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ صدیوں تک مصر میں اور مصر والوں کے درمیان رہتے رہتے بہت سے مشرکانہ رسوم توحید کے علمبردار اسرائیلیوں میں پھیل چکے ہیں اور گائے کی عظمت بلکہ تقدیس ان کے دلوں میں رچ چکی ہے، ہندوستان کی طرح مصر میں بھی گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جزو تھی، توریت میں اسرائیلیوں کو ذبح گاؤ کا حکم خاص خاص قیدوں اور شرطوں کے ساتھ بار بار ملا ہے مثلاً:۔

"بنی اسرائیل کو کہو کہ ایک لال گائے جو بے داغ اور بے عیب ہو اور جس پر کبھی جوا نہ رکھا گیا ہو تجھ پاس لائیں تم اسے الیعزر کاہن کو دو کہ اسے خیمہ گاہ سے باہر لے جائے اور وہ اس کے حضور ذبح کی جائے" (گنتی۔۱۹: ۲) "جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ سے ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کوئی خدمت نہ لی گئی ہو اور جو بے تلے نہ آئی ہو اور اس شہر کے بزرگ اس بچھیا کو ایک بیہڑ وادی میں جو نہ جوتی گئی ہو نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں"۔ (استثناء۔ ۲۱: ۳ و ۴)

بَقَرَۃٌ۔ اصلاً صرف گائے کے لئے ہے اور ثور کا مؤنث ہے۔

قیل للذکر ثور (راغب) البقرۃ اسم للانثیٰ والثور اسم للذکر (قرطبی)

لیکن بعض مفسرین نے اسے گائے اور بیل دونوں کے لئے عام رکھا ہے اور یہاں اس سے بیل مراد لی ہے۔

۲۳۴ بنی اسرائیل "گئو ماتا" کے احترام و تقدیس کے جذبہ سے سرشار تھے یقین ہی نہ آیا کہ ایسے مقدس و محترم جانور کے ذبح کر ڈالنے کا حکم ملا ہوگا، بس یہی سمجھے کہ حضرت موسیٰ ہنسی اور تفنن طبع کی راہ سے کہہ رہے ہیں۔

۲۳۵ (اور احکام خداوندی کی پیام رسانی میں ہنسی دل لگی سے کام لینے لگوں)

کوئی جہالت اور جاہلیت اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اللہ کی طرف سے پیام رسانی میں بندہ اپنی طرف سے تفریح و تفنن برتنے لگے۔ جَاهِلِيْن جہل کے لغوی معنی ہیں کسی کام کو اس کے برخلاف ادا کرنا جو اس کے ادا کرنے کا حق ہے۔

الجهل فعل الشیء بخلاف ما حقه ان يفعل (راغب)

اللہ کی طرف سے پیام گڑھ لینے کی جسارت وہی کر سکتا ہے جو خود اللہ تعالیٰ سے غافل و جاہل ہو۔

انما یکون ذلک من الجهل باللہ تعالیٰ (بحر)

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا

وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو ۲۳۸ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ

بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ

وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو ۲۳۹ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو ۲۴۰ وہ بولے اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے

يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾

درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ (اور) کیسی ہو؟ اس لئے کہ گائے میں ہم کو اشتباہ پڑ گیا ہے ۲۴۱ اور خدا نے چاہا تو ہم ضرور راہ پا جائیں گے ۲۴۲

یا وہ کرسکتا ہے جو امورِ دینی میں استہزاء کے نتائج و عواقب سے بے خبر ہو۔

ان اکون من الجاھلین بما فی الاستھزاء فی امر الدین من العقاب الشدید (کبیر)

فقہاء و مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ دین و معظماتِ دین کے ساتھ استہزاء حکم جہل اور گناہِ عظیم میں داخل ہے اور اس کا مرتکب مستحق وعید ہے۔

وفی الآیة دلیل علی منع الاستھزاء بدین اللہ ودین المسلمین ومن یجب تعظیمہ وان ذلک جھل وصاحبہ مستحق للوعید (قرطبی) یدل علی ان الاستھزاء من الکبائر العظام (کبیر)

لیکن ساتھ ہی یہ ضروری تصریح بھی کر دی ہے کہ مزاح یا خوش طبعی کو استہزاء یا تمسخر سے کوئی مناسبت نہیں، دونوں میں بڑا فرق ہے، خوش طبعی تو خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور ائمۂ دین میں برابر رائج رہی ہے۔

ولیس المزاح من الاستھزاء بسبیل الا تری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یمزح و الائمة بعدہ (قرطبی) والفرق بین الھزء والمزاح ظاھر فلا ینافی وقوعہ من الأنبیاء (روح)

اور قرطبی نے اس سلسلہ میں ابن خویز منداد کے حوالہ سے شہر کوفہ کے قاضی (رح) کی ایک دلچسپ حکایت بھی نقل کی ہے۔

**۲۳۶** (بہ لحاظ عمر)

مَا ھِیَ سے مراد بیانِ حقیقت نہیں۔ مقصود توضیح مزید ہے۔

ای ما حالھا وصفتھا (بیضاوی)

**۲۳۷** نہ ایسی بوڑھی ہو نہ بالکل بچہ۔

فَارِض وہ ہے جس کے بچہ جننے کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہو۔

بِکْر وہ ہے جس نے ابھی بچہ جنا ہی نہ ہو۔

الفارض المسنّة التی لا تلد والبکر الفتیة التی لم تلد قط (معالم)

یہیں سے خیال ہوتا ہے کہ بَقَرَۃ سے مراد بیل نہیں گائے ہی ہے۔

عَوَان کے معنی درمیانی سن رکھنے والی۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي

کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی

الْحَرْثَ ج مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ط قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط

دیتی ہو ۲۴۳ سالم، اس میں (کوئی) داغ (دھبہ) نہ ہو ۲۴۴ وہ بولے اب آپ ٹھیک پتہ لائے ۲۴۵

ع ۸

فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

پھر انھوں نے اسے ذبح کیا، اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے ۲۴۶

العوان المتوسط بین السنین (راغب)

۲۳۸ اہل مصر بیل کی تقدیس کے باوجود اُسے قربانی میں بھی چڑھایا کرتے تھے، مگر قربانی کے بیل میں بڑی بال کی کھال نکالا کرتے تھے، اس کا رنگ یکسر سفید ہو، اس کے جسم پر بال ایک بھی سیاہ نہ ہو، دُم بالکل صحیح اور طبعی حالت میں ہو، کوئی داغ دھبّہ نہ ہو، غرض طرح طرح کی قیدیں اور شرطیں تھیں۔ یہ سب پوری ہولیتیں جب کہیں جا کر قربانی کی نوبت آتی اسرائیلیوں نے جو اتنی موشگافیاں کیں عجب نہیں کہ مصریوں ہی کی صحبت کا اثر ہو۔

۲۳۹ یعنی رنگ خوب شوخ کھلتا ہوا ہو، فلسطین و سینا کی بعض گائیں یقیناً اس رنگ کی ہوتی ہوں گی۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہلِ کشف خود نفس کو بھی زردہی رنگ کا بتاتے ہیں۔ اور صوفیا نے جو نفس کو اُس گائے سے تشبیہ دی ہے تو اس سے وہ مشابہت اور بڑھ جاتی ہے۔

۲۴۰ یعنی وہ گائے خوش نما، خوش منظر، خوش رنگ ہو۔ بد رنگ، بد نما، بد منظر نہ ہو۔

۲۴۱ یعنی ذرا اور متعیّن و محدود کیجئے، اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے، اس حلیہ اور اس رنگ کی گائیں تو بہت سی ہیں۔

۲۴۲ (گائے تک۔ اور اُسے ضرور ذبح کرکے رہیں گے)

ای الی عین البقرۃ المامور بذبحھا (بحر)

۲۴۳ ہندوستان میں عام رواج صرف بیل سے کاشتکاری کا کام لینے کا ہے گائے سے نہیں لیکن دوسرے ملکوں میں یہ کام گائے سے بھی لیا جاتا ہے۔

۲۴۴ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۳۸۔

اسرائیلیوں کے ہاں کسی عیب دار یا داغ دار جانور کا قربانی کے لئے ذبح کرنا ناجائز تھا:۔

"تو خداوند اپنے خدا کے بیل یا بھیڑ بکری جس میں کوئی عیب یا برائی ہو، ذبح مت کیجیو کیونکہ خداوند تیرے خدا کو اس سے نفرت ہے۔" (استثناء ۱۷: ۱) "تمھارا جانور بے عیب چاہئے۔" (خروج - ۱۲: ۵)

"اگر اُس کی قربانی سوختنی گائے بیل ہے تو بے عیب نر لاوے" (احبار - ۱: ۳)

۲۴۵ یعنی مفصل اور پورا پتہ تو اب بتایا ہے۔

وَاِذۡ قَتَلۡتُمۡ نَفۡسًا فَادّٰرَءۡتُمۡ فِیۡهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخۡرِجٌ مَّا كُنۡتُمۡ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا ٢٤٧ پھر تم اس باب میں لڑنے جھگڑنے لگے ٢٤٨ اور اللہ کو وہ ظاہر

تَكۡتُمُوۡنَ ﴿٧٢﴾ فَقُلۡنَا اضۡرِبُوۡهُ بِبَعۡضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحۡىِ اللّٰهُ الۡمَوۡتٰى ۙ

کر دینا تھا جسے تم چھپا رہے تھے ٢٤٩ تو ہم نے کہا کہ اس میت پر اس (گائے) کا کوئی ٹکڑا مارو ٢٥٠ یوں ہی اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا ٢٥١

٢٤٦ یعنی ان کی مسلسل موشگافیوں سے تعمیل حکم بعید ہی معلوم ہوتی تھی۔

٢٤٧ (اپنے ہی میں سے)

"تم نے" یعنی تم میں سے کچھ لوگوں نے۔ ذکر بنی اسرائیل ہی کا بدستور چل رہا ہے، یہاں بھی اشارہ ان کی قومی تاریخ ہی کے کسی واقعہ کی طرف ہے لیکن اس خاص واقعہ کی تعیین کے لئے یہود کے ذخیرۂ تاریخ و روایات میں بہت زیادہ گھسنے اور کُرید کرنے کی ضرورت ہے، انشاء اللہ کوئی آئندہ مفسر ہمت کرکے اس فرض کو ادا کرے گا، گو ہمارے مفسرین کی قطعی رائے یہ ہے اور پر جو حکم ذبح گاؤ کا ملا ہے وہ اسی واقعۂ قتل کے سلسلہ میں ہے، قرآن مجید نے بیان میں صرف ترتیب اقتضاءً تقدیم و تاخیر کر دی ہے۔

قوله تعالى واذ قتلتم نفسا وان كان مؤخرا فى التلاوة فهو مقدم فى المعنى على جميع ما ابتدء به من شان البقرة (جصاص) قوله تعالى ان الله يامركم ان تذبحوا بقرة مقدم فى التلاوة وقوله قتلتم نفسا مقدم فى المعنى على جميع ما ابتدء به من شان البقرة (قرطبى)

٢٤٨ (اور ایک دوسرے پر الزام رکھنے لگے)

یعنی اصل قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا، کوئی کہتا تھا کہ قاتل فلاں ہے، اور کوئی کہتا کہ فلاں، یک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے۔ فَادّٰرَءۡتُمۡ۔ درء کے معنی جھگڑنے کے بھی ہیں اور دفع کرنے کے بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دفع کرنے ہی کے معنی میں آیا ہے۔

فادرءوا عن انفسكم الموت۔ ويدرؤا عنها العذاب۔ يدرءون بالحسنة السيئة۔

یہاں اِدّٰرَءۡتُمۡ بروزن اِفّٰاعَلۡتُمۡ سے مراد آپس میں جھگڑنے اور ایک دوسرے پر الزام ڈالنے سے ہے۔

اى ينفى كل واحد منكم القتل عن نفسه ويضيفه الى غيره (كبير) اختلفتم واختصمتم فى شانها (كبير)

٢٤٩ یعنی اصل قاتل کا پتہ۔ رکوع سابق میں جو حکم ذبح گاؤ کا ملا ہے، وہ جیسا کہ مفسرین کا خیال ہے۔ شاید اسی موقع کے لئے تھا۔

٢٥٠ تفصیلات کا علم تو عالم الغیب کو ہے، البتہ اتنا پتہ تو یہود کے قانون شریعت (توریت) کے مطالعہ سے بہرحال چلتا ہے کہ قتل کے موقع پر جب قاتل کی تحقیق ہو رہی ہو، چند خاص شرائط کی پابندی کے ساتھ ایک جوان گائے کو جس سے کوئی خدمت نہ لی گئی ہو ذبح کیا جاتا تھا، اور اس کے لاشہ پر بزرگان قوم ایک خاص طریق پر دعا کرکے خون کے گناہ سے اپنی بخشائش چاہتے تھے، کتاب استثناء کے باب ۲۱ میں آیت ۱-۹ میں تفصیلاً درج ہیں یہاں صرف چند سطریں نقل کی جاتی ہیں:۔

"اگر اس سرزمین میں جس کا خداوند تیرا خدا تجھے ارشاد کرتا ہے، کسی مقتول کی لاش کھیت میں پڑی ہوئی ملے اور

وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ

اور وہ تم کو اپنی نشانیاں ۲۵۲ دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو ۲۵۳ اس پر بھی تمہارے دل اور اس کے

مِّن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ۚ

بعد بھی سخت ہی رہے ۲۵۴ چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں ان سے بھی بڑھ کر ۲۵۵

معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے، تب تیرے بزرگ اور تیرے قاضی باہر نکلیں اور ان بستیوں تک جو مقتول کے گرد اگرد ہیں، درمیان کو ناپیں۔ اور یوں ہوگا کہ جو شہر مقتول سے زیادہ نزدیک ہے اسی شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے ہنوز کچھ خدمت نہ لی گئی ہو اور جوئے تلے نہ آگئی ہو...... اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن کاٹیں...... پھر اس شہر کے سارے بزرگ جو مقتول سے نزدیک ہیں اس بچھیا کے اوپر جو اس وادی میں گردن ماری گئی ہے اپنے ہاتھ دھوئیں اور جواب دے کے کہیں کہ ہمارے ہاتھوں نے یہ خون نہیں کیا، نہ ہماری آنکھوں نے دیکھا؟ تفسیری روایات میں آتا ہے کہ مقتول زندہ ہو گیا تھا اور قاتل کا نام اور پتہ بتا کر پھر مر گیا، واللہ اعلم۔

**۲۵۱** (قیامت کے دن)

جعل تبارك وتعالیٰ ذلك الصنيع حجة لهم على المعاد (ابن کثیر)

قرآن مجید نے اپنی عام خصوصیت یعنی خاص سے عام کی تعلیم کی یہاں بھی نہ چھوڑی۔ اور ایک جزئی واقعہ سے اپنی قدرت اور امکانِ بعث کا پہلو نمایاں کیا۔

**۲۵۲** (اور نمونے اپنی قدرتِ کاملہ اور اختیارِ مطلق کے)

**۲۵۳** (اور کم از کم اس نظیر کے مشاہدہ کے بعد امکانِ بعث اور وقوعِ قیامت کے انکار سے تو باز آجاؤ)

**۲۵۴** یعنی قبول کی طرف ذرا نہ مائل ہوئے۔

**ثُمَّ** یہاں استبعاد کے لئے ہے، یعنی جو نتیجہ نہ نکلنا چاہئے تھا وہ نکلا۔

ثم لاستبعاد القسوة بعد مشاهدة ما يزيلها (ابو سعود)

**مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ**۔ اس تصریح نے اس استبعاد کو اور زیادہ قوی و شدید کر دیا۔

مؤكد للاستبعاد اشد تاكيدًا (جمل)

**۲۵۵** (عدم قبول حق کے باب میں)

اسرائیلی صحیفوں میں بھی یہ مضمون بار بار آیا ہے مثلاً:

"وہ تربیت پذیر نہ ہوئے انھوں نے اپنے چہرہ کو چٹان سے سخت تر بنایا، انھوں نے پھرنے سے انکار کیا ہے"۔

(یرمیاہ۔ ۵: ۳) "سارے اہل اسرائیل بے حیائی کی پیشانی رکھتے اور سنگدل ہیں" (حزقیل ۳: ۷)

**أَوْ** یہاں شک کے مفہوم میں تو بہر حال نہیں آیا ہے اتنے پر سارے علماء ادب کا اتفاق ہے اختلاف جو کچھ ہے وہ اس کے بعد ہے کہ پھر کس معنی میں ہے؟

وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ

اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس سے ندیاں بھی پھوٹ نکلتی ہیں ۲۵۶ اور کوئی ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ

فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ

پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے پانی نکلتا ہے ۲۵۷ اور کوئی ان میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آگرتا ہے ۲۵۸

اختلف علماء العربیة بعد الاجماع علی استحالة کونہا فی الشك (ابن کثیر)

چنانچہ ایک قول یہ ہے کہ "بلکہ" کے معنی میں ہے۔

کلمة أو بمعنی بل (کبیر) أو بمعنی بل (جمل) قال آخرون أو ھھنا بمعنی بل (ابن کثیر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ او یہاں بطور کلمۂ اباحت آیا ہے یعنی خواہ انھیں پتھر سمجھو یا پتھر سے بھی بڑھ کر سخت، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ او کو کلمۂ تنویع قرار دیا جائے اور آیت کے معنی یہ کیے جائیں کہ: ان کے قلب دو قسم کے ہیں کچھ تو پتھر جیسے سخت، اور کچھ اس سے بھی زیادہ سخت۔

فالمعنی ھم فرقتان۔ فیھم من قلبه کالحجر، فیھم من قلبه اشد من الحجر (قرطبی) کان قلوبھم علی قسمین قلوب کالحجارة قسوة وقلوب اشد قسوة من الحجارة (بحر) او للتنویع ای بعض کالحجارة وبعض اشد۔ (روح)

ایک گروہ ادھر بھی گیا ہے کہ عندکم آخر میں محذوف ہے۔

وقال آخرون معنی ذلك فھی کالحجارة او اشد قسوة عندکم حکاہ (ابن جریر۔ ابن کثیر)

۲۵۶ (اور ان سے ایک عالم سیراب ہوتا ہے)

اس قسم کے پتھر یا چٹان کی مثال انسانی آبادی میں حضرات انبیاء و رسل ہیں ان کے چشمۂ فیض سے ایک عالم اپنی روحانی پیاس بجھاتا اور سیراب ہوتا رہتا ہے۔

۲۵۷ (اور ان سے بھی کسی درجہ میں اللہ کی مخلوق سیراب ہوتی رہتی ہے۔)

اس نوعیت کے پتھر یا چٹان کی مثالیں اولیاء امت اور ابرار و متقین ہیں کہ ان سے بھی انسانوں کا ایک بڑا طبقہ فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔

۲۵۸ (اور اس طرح خود اپنے تأثرات کا ثبوت پہنچاتا رہتا ہے)

اس طرح کے پتھر یا چٹان کی مثال عام مومنین صالحین ہیں کہ دوسروں کی اصلاح و ہدایت اگر نہ کر سکیں جب بھی اپنا ایمان تو سلامت لے ہی جاتے ہیں اور اپنے قبولِ حق کا ثبوت تو دے ہی جاتے ہیں۔

مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ۔ اوپر سے ذکر پتھروں ہی کا چلا آرہا ہے پتھروں کا جمود تو مسلم اور ان کی قساوت مشاہد ہے پھر ان میں خشیت اللہ کا گزر کیسے اور ہیبت الٰہی کا اثر کیونکر؟ اہل سنت کا ایک گروہ کہتا ہے کہ خشیتِ الٰہی کا یہ اثر پتھروں میں اپنے حقیقی اور لفظی معنوں میں ہے یعنی بعض پتھروں میں گداز کا جز و ہوتا ہے۔

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ

اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ۲۵۹ تو کیا تم اس کی توقع رکھتے ہو ۲۶۰ کہ وہ لوگ (تمہارے کہنے سے) ایمان لے آئیں گے ۲۶۱

گو ان کے مرتبۂ جمادی کے مطابق، اور ان میں فہم وادراک کی قوتیں ہوتی ہیں، گو ان کی سطح حجری کے متناسب جیسے طور کہ آخر پہاڑ ہی تھا لیکن تجلّیٔ الٰہی کے وقت جلالتِ ربانی سے چور چور ہوگیا۔

ذلک بانّ اللّٰہ جلّ ذکرہ اعطی بعض الحجارۃ المعرفۃ والفہم (ابن جریر) قیل المراد بہ حقیقۃ الخشیۃ (مدارک) مذہب قوم وہو المروی عن مجاہد وغیرہ انہا ہنا حقیقۃ (روح) مذہب اہل السنۃ ان للّٰہ تعالیٰ علما فی الجمادات وسائر الحیوانات سوی العقلاء لا یقف علیہ غیر اللّٰہ فلہا صلوٰۃ وتسبیح وخشیۃ (معالم)

لیکن ایک دوسرا گروہ بھی اہل سنت کا ہے یہ کہتا ہے کہ خشیت سے یہاں مراد محض خشیت مجازی یا انقیاد تکوینی ہے عقل وفہم، شعور وارادہ سے اس کا تعلق نہیں لیکن بہرحال طبعی واضطراری طور پر تو موجودات کا ایک ایک ذرہ قوانین الٰہی ہی کے تابع ہے اسی کو یہاں مجازاً خشیتِ الٰہی سے تعبیر کر دیا گیا ہے جیسے خود محاورۂ قرآنی ہی میں ایک دوسری جگہ ارادہ کو بے جان وبے روح دیوار کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جدارا یرید ان ینقضّ (الکہف ۷۷) حالانکہ سب جانتے ہیں کہ دیوار میں کوئی قوت نہ ارادہ کی ہوتی ہے نہ خواہش کی۔

وقال آخرون بل قولہ من خشیۃ اللّٰہ کقولہ جدارا یرید ان ینقض ولا ارادۃ لہ قالوا وانما ارید بذلک من عظم امر اللّٰہ یری کانہ ہابط خاشع من ذل خشیۃ اللّٰہ (ابن جریر) قیل ہو مجاز عن انقیادہا لامر اللّٰہ (مدارک) والخشیۃ مجاز عن الانقیاد (بیضاوی) قال قوم ان الخشیۃ مجاز عن انقیاد لامر اللّٰہ (روح)

دونوں گروہ اہل حق ہی کے ہیں اور دونوں تفسیریں اپنی اپنی جگہ درست ہیں بعض نے مجاز لفظ یہبط میں تسلیم کیا ہے۔

قیل لفظۃ الہبوط مجاز (قرطبی)

ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ مِنْہَا میں ضمیر الحجارۃ کی طرف نہیں بلکہ القلوب کی جانب ہے۔

ان الضمیر فی قولہ تعالیٰ وانّ منہا راجع الی القلوب لا الی الحجارۃ ای من القلوب لما یخضع من خشیۃ اللّٰہ (قرطبی)

۲۵۹ خدائے تعالیٰ نہ بے علم وبے خبر ہے نہ بے طاقت وبے اختیار ہے، اور اس کے علم وطاقت دونوں کا حال عنقریب منکشف اور مشاہد ہو کر رہے گا۔

۲۶۰ (اے مسلمانو! اسرائیلیوں کی ان ساری بدکرداریوں کی روداد سننے کے بعد بھی)

خطاب اس آیت میں اسرائیلیوں سے نہیں مسلمانوں سے ہے حسن بصری تابعی کا قول ہے کہ اس کے مخاطب رسول اور مومنین ہیں (کبیر)

قال القاضی وہذا الیق بالظاہر (کبیر) یرید محمدا واصحابہ (معالم)

بلکہ خصوصیت کے ساتھ خطاب انصار سے ہے جو ہم وطنی اور ہم عہدی کی بنا پر یہود کے ایمان لے آنے پر خصوصیت سے حریص تھے۔

وَقَدۡ كَانَ فَرِيقٌ مِّنۡهُمۡ يَسۡمَعُونَ كَلَـٰمَ ٱللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُۥ

درآں حالیکہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ کا کلام سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں بعد اس کے کہ اُسے سمجھ

مِنۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُونَ ﴿٧٥﴾

چکے ہیں اور وہ اُسے (خوب) جانتے بھی ہیں ۲۶۲

والخطاب لاصحاب النبی وذلک ان الانصار کان لهم حرص علی اسلام الیهود للحلف والجوار الذی کان بینهم۔ (قرطبی)

اَفَتَطۡمَعُونَ۔ میں جو ہمزۂ استفہامی ہے اس سے مقصود استبعاد ہے یعنی بھلا ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے؟

الهمزة للانکار الواقع استبعادہ (ابوسعود) الاستفهام للاستبعاد او للانکار التوبیخی (روح)

تَطۡمَعُونَ طمع کے عام معنی لالچ کرنے، حرص رکھنے کے ہیں لیکن دوسرے معنی امید، توقع کے بھی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔

طمع فیه وبه ای حرص علیه ورجاہ (لسان) افترجوا یا محمد (ابن عباس)

شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فارسی میں ترجمہ "امید" سے اور مفسر تھانویؒ نے اردو میں "توقع" سے کیا ہے۔

۲۶۱ "وہ لوگ" یعنی عہدِ رسول کے معاصر یہود، جن کی قساوتِ قلب کی اتنی مفصل و مسلسل سرگزشت ابھی بیان ہو چکی۔

هم الیهود الذین کانوا فی زمن الرسول علیه السلام (کبیر)

لَكُمۡ یعنی تمہاری خاطر سے، تمہارے کہنے سے، تمہاری دعوت پر۔

ای لاجل دعوتکم ویستجیبوا لکم (کشاف) لام السبب ای یؤمنوا لاجل دعوتکم لهم (بحر)

اَنۡ يُّؤۡمِنُوا۔ اَنۡ موضع نصب میں ہے اور تقدیر کلام یوں ہے فی ان یؤمنوا۔ (قرطبی)

۲۶۲ (کیسی سخت جسارت کر رہے ہیں)

وَقَدۡ كَانَ فَرِيقٌ مِّنۡهُمۡ۔ کَانَ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور لغت و نحو دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں ایک یہ کہ ایک ایسا فریق تھا اسرائیلیوں کے درمیان گویا ذکر ماضی کا اور یہود معاصرین کے اسلاف کا ہو رہا ہے دوسرے یہ کہ ایک ایسا فریق رہا ہے ان کے درمیان گویا ذکر حال کا اور معصر یہود کا ہو رہا ہے، ائمۂ تفسیر سے دونوں قسم کے اقوال منقول ہیں لیکن سیاق دوسرے معنی کے زیادہ موافق ہے کہ بحث معاصرین ہی پر قائم کی جا رہی ہے اور ملزم انہیں کو قرار دینا زیادہ مناسب ہو گا۔

المراد بالفریق من کان فی زمان محمد علیه الصلوٰة وهذا اقرب (کبیر)

فَرِيقٌ مِّنۡهُمۡ۔ لفظ فریق پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

كَلَـٰمَ ٱللَّهِ۔ یعنی یہود کے آسمانی صحیفے۔ اپنے ہاں کے صحیفوں کی تحریف یہود کو خود مسلم رہی ہے، یرمیاہ نبی اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ

اور جب وہ ان سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان لے آئے ہیں ٢٦٣ اور جب آپس میں تنہا

قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ

ہوتے ہیں ٢٦٤ تو کہتے ہیں کہ ارے کیا تم انہیں وہ بتا دیتے ہو جو خدا نے تم پر منکشف کیا ہے ٢٦٥ جس سے

رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (٧٦)

وہ تمہیں تمہارے پروردگار کے حضور میں قائل کر دیں گے ٢٦٦ سو کیا تم نہیں سمجھتے؟ ٢٦٧

"تم نے زندہ خدا رب الافواج، ہمارے خدا کی باتوں کو بگاڑ ڈالا ہے"۔ (یرمیاہ۔ ۲۳: ۳۶)

قرآن مجید کی اعجازی کامیابیوں میں سے ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اب خود یہود بھی اپنے آسمانی صحیفوں کی تنزیل لفظی کے قائل نہیں رہے ہیں اور اُن کے علماء و اکابر اب صاف صاف اقرار کرتے ہیں کہ صرف مضامین و مطالب کا القاء ہمارے انبیاء و اصفیاء کے قلب صافی پر ہوتا تھا اور وہ حضرات انہیں الہاماتِ معنوی کی روشنی میں اپنے لفظ و عبارت میں نوشتے تیار کر دیتے تھے۔

مِنۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ۔ یعنی نادانستگی میں نہیں، دیدہ و دانستہ سب کچھ جان لینے، سمجھ لینے کے بعد۔ آیت سے عالم معاند کی گم کردہ راہی اور زیادہ نکلتی ہے۔

ودل هذا الكلام ايضا على ان العالم بالحق المعاند فيه بعيد من الرحمة لانه علم الوعد والوعيد ولم ينهه ذلك عن قتاده (قرطبی)

٢٦٣ اب ذکر منافقین یہود کا شروع ہو رہا ہے، یہود کی بڑی تعداد تو مدینہ میں علانیہ دشمن اسلام تھی ہی، لیکن کچھ ان کے علاوہ اس قماش کے بھی تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اپنا مسلمان ہونا ظاہر کرتے تھے، یہ ذکر انہیں منافقین کا ہے۔

یعنی المنافقین من الیهود۔ (ابن جریر۔ عن ابن عباس)

٢٦٤ یعنی یہ دیکھ لیتے ہیں کہ آس پاس کوئی مسلمان تو نہیں سن رہا ہے۔

فعل خلا کا صلہ جب الی کے ساتھ آتا ہے اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا واذا خلوا الی شیاطینهم کے تحت میں۔

٢٦٥ یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں مثلاً آخری نبی کی بشارتیں اور علامتیں یہود جب آپس میں ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے ہاں کی پیشین گوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں پر کیوں ظاہر کرکے خواہ مخواہ ان کے ہاتھ میں ہتھیار اپنے خلاف دے دیتے ہو، انہیں معلومات سے وہ ہمیں قائل کرتے ہیں، یہی دلائل وہ ہمارے تمہارے خلاف استعمال کرتے ہیں، گویا یہ احمق سمجھے ہوئے تھے کہ رسول اسلام اور پیروان اسلام کو جو کچھ بھی علم ہوگا محض ان کے بتانے ہی سے ہوگا اور بجز اس کے سوا ان پر علم و معلومات کے کل دروازے بند ہیں! یہ جہل مرکب بالکل اسی طرح کا تھا جس میں آج سارا فرنگستان مبتلا ہے، یہ لوگ قرآن مجید پر جب تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس مفروضہ کو بنیاد کار

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ

کیا یہ (اتنا بھی) نہیں جانتے کہ اللہ کو اس کی بھی خبر ہے جسے یہ چھپاتے ہیں اور اسکی بھی جسے یہ جتلاتے ہیں ۲۶۸ف اور ان میں

أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾

ان پڑھ (بھی) ہیں جو کتاب (الٰہی) کا کوئی علم نہیں رکھتے بجز جھوٹی آرزوؤں کے اور یہ محض تخیلات ہی میں پڑے رہتے ہیں ۲۶۹ف

بنا لیتے ہیں کہ اس میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ یہود کی توریت مروّجہ، مسیحیوں کی انجیل مروّجہ اور اسی طرح کے دوسرے انسانی ہی ذرائع سے ماخوذ و منقول ہے اور اس کا تو کوئی امکان دُور کا بھی نہیں کہ اس میں کوئی غیبی امداد وحی والہام کے قسم کی شامل ہو۔

لفظ الخراب تو ایک اسلامی اصطلاح ہے لیکن پہلے بھی اس کا استعمال صرف اہل عرب کی زبان پر تھا، یہاں ایسے لوگوں کی زبان سے نقل ہوا ہے جو نہ مسلم تھے نہ عرب۔ اس لئے بجائے اسی کو بجنسہٖ لانے کے اس کا ترجمہ یہاں "خدا" درج کیا گیا۔

یہ روایت بھی نقل ہوئی ہے کہ کچھ یہود مسلمان ہوگئے تھے، ایک روز اپنے اسلاف پر نزولِ عذاب کی حکایات مسلمانوں سے بیان کر رہے تھے، اس پر انھیں باقی یہود نے ٹوکا کہ یہ کیا غضب کی باتیں مسلمانوں کو سناتے رہتے ہو، انھیں معلومات سے یہ مسلح ہو کر تو وہ ہمارے اوپر اور حملہ کریں گے۔ (قرطبی)

۲۶۶ف عِنْدَ رَبِّكُمْ۔ کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن اور آخرت میں تمھیں قائل کریں گے، چنانچہ ایک گروہ نے یہی معنی لئے ہیں۔

المراد لیحاجوکم یوم القیامة (کبیر عن الاصم) ای عند ربکم یوم القیامة (جلالین)

لیکن زیادہ لگتے ہوئے معنی یہ ہیں کہ اسی دنیا میں تم پر حجتِ قوی قائم کردیں گے اور عند ربکم یہاں عند اللہ کی طرح حجتِ قوی و معروف کے معنی میں ہے، اس لئے کہ اول تو یہود عالم آخرت کے پوری طرح قائل نہ تھے، دوسرے وہاں حجت قائم کرنے کے لئے کسی ایسے ظاہری سہارے کی ضرورت بھی نہ تھی، وہاں تو کشفِ حقائق از خود ہو کر رہے گا، اس لئے یہاں گویا احتجاج بہ کتاب کو عند اللہ سے تعبیر کیا ہے اور یہ امر قدیم ائمہ تفسیر کی عظمت پر بس کرتا ہے کہ انھوں نے یہود کے عقائد متعلق بہ آخرت کا پورا علم رکھے بغیر بھی یہی پہلو اختیار کر لیا ہے۔

هو فی کتاب الله هكذا وهو عند الله هكذا بمعنی واحد (کشاف) ای فی حکم الله (کبیر عن القفال) قیل هذا علی اضمار المضاف ای عند کتاب ربکم (مدارك) لیحتجوا علیکم بما انزل ربکم فی کتابه (بیضاوی) ای فی کتابه وحکمه (روح)

یہ مفہوم مان کر عِنْدَ کو فِیْ کے معنی میں لینا ہوگا۔

قیل عند هو معنی فی ای لیحاجوکم به فی ربکم (قرطبی)

۲۶۷ف (جو مسلمانوں کو اپنے رازوں کی اپنی زبان سے واقف کئے دیتے اور ان کے ہاتھوں میں اپنے خلاف ہتھیار دیے دیتے ہو)

اب یہاں پر اکابر یہود کی تقریر اپنے ہم قوموں سے ختم ہوئی۔

۲۶۸ف (اور وہی اللہ جب چاہے رسولؐ اور مومنین کو اطلاع دے سکتا ہے)

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ

سو (بڑی) خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب (الہی) کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا

عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

کی طرف سے ہے ٢٧٠ تاکہ اس سے قدرے قلیل معاوضہ حاصل کریں ٢٧١

موٹی سی بات ہے کہ اللہ کے لئے ایسے امور کی اطلاع اپنے پیمبر کو دے دینا مشکل ہی کیا تھا لیکن بے مغز یہود اس امکان ہی کی طرف اپنا ذہن نہیں لے جاتے تھے کہ شاید اس مدعی نبوت کا تعلق خدائے تعالٰی کے ساتھ واقعی کچھ ہو ٹھیک اسی طرح جیسے آج بے مغز فرنگی اس امکان ہی کی طرف ذہن نہیں لے جاتے کہ کہیں قرآن انسانی تصنیف کے بجائے واقعی خدا ہی کی کتاب ہو

٢۶٩ (کہ "ہمارے بزرگ ہمیں بخشوالیں گے" "ہم خدا کے خاص محبوبوں کی اولاد ہیں، ہمیں کیا غم" وغیرہ) اشارہ اسی قسم کے خرافات عقائد کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یہ ذکر عوام یہود کا ہے۔ یہ عوام کالانعام پڑھے نہ لکھے، باپ دادا کی لکیر کے فقیر، اپنے دل کی گڑھی ہوئی آرزوؤں اور دل خوش کن روایتوں میں پڑے مست رہتے تھے انجیل میں کہیں تو مسیح کی زبان سے اور اس سے بڑھ کر پولوس کی زبان سے یہود کی انھیں باطل پرستیوں اور حماقت نوازیوں کا ذکر بار بار آیا ہے اَمَانِیَّ، اُمْنِیَّۃٌ کی جمع ہے ایک معنی تو یہ ہیں کہ محض اپنی آرزوؤں کو پالتے رہتے ہیں جنھیں واقعیت وحقیقت سے اصلاً تعلق نہیں۔

امنیۃ ما تخیلہ الانسان (کبیر) التمنی فی ہذا الموقع ہو تخلق الکذب وتخرصہ۔ (ابن جریر)

دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں کہ یہ جھوٹی روایتوں، بے ثبوت و بے سند خرافات میں پڑے رہتے ہیں اور یہ معنی اکثر اکابر سے منقول ہیں۔

اکاذیب مختلفۃ سمعوہا من علماءہم فنقلوہا علی التقلید (بحر عن ابن عباس ومجاہد والفراء)

٢٧٠ پچھلی آیت میں ذکر عوام یہود کا تھا، اب ذکر خواص واکابر یہود کا ہے توریت کی تحریف اب کوئی اختلافی یا نزاعی مسئلہ نہیں، دوست دشمن سبھی کو اب تسلیم ہو چکا ہے کہ یہ کلام الہی نہیں اور اس کے دوست زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں کہ یہ خدا رسیدہ انسانوں کی تصنیف ہے کسی جامد سے جامد یہودی میں بھی اب یہ ہمت باقی نہیں کہ توریت کو قرآن مجید کی طرح تنزیل لفظی قرار دے اب زیادہ سے زیادہ جو کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خاصان خدا نے الہام خداوندی سے مشرف ہو کر اسے اپنے طور پر اور اپنی عبارت میں ترتیب و تالیف دیا اور خدائے تعالٰی کی جانب اس کا انتساب صرف مجازاً یا بالواسطہ ہے حقیقی اور براہ راست کے مفہوم میں نہیں پھر وقتاً فوقتاً جو تصحیفات ہوتی رہی ہیں وہ بالفرض کسی مصلحت یا ضرورت ہی سے ہوئی ہوں بہرحال نفس ان کے وقوع کا اعتراف اگلے پچھلے سب کو ہے اور بائبل کی تنقید عالیہ ( HIGHER CRITICISM ) ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر چکی ہے جرمن، فرنچ، انگریزی وغیرہ میں چھوٹی بڑی صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اس موضوع پر تیار ہو چکی ہیں، اور مقالات ومضامین کا تو شمار ہی نہیں، پھر فن بھی مختلف شاخوں میں تقسیم ہو چکا ہے انتقاد متن ( TEXTUAL CRITICISM ) انتقاد تاریخی ( HISTORICAL CR TICISM ) وغیرہ اور ہر شاخ کے الگ الگ ماہرین پیدا ہو رہے ہیں — کاش سید احمد خاں مرحوم (اللہ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے) آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ یہود ونصاری

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

سو خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں ۲۷۲ اور خرابی ہے ان کے لئے اس کی بدولت جو وہ حاصل کرتے ہیں ۲۷۳

کی طرف سے جس الزام کی صفائی خواہ مخواہ انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی اُس جرم کا اقبال اب کھلے لفظوں میں وہی لوگ کس کثرت سے کر رہے ہیں! یورپ اب جا کر چونکا ہے اور یہ فن ابھی پچھلی صدی یعنی انیسویں صدی سے پیدا ہوا ہے، عرب کے اُمّی کے لائے ہوئے کلام کا اعجاز ہے کہ اس نے تیرہ صدی پیشتر ہی اہل کتاب کی "کتاب" (جو لفظی ترجمہ ہے بائبل کا) کو تمام تر محرّف و ناقابل اعتماد قرار دے دیا تھا۔

بِأَيْدِيهِمْ۔ اس تصریح کا اضافہ زور اور تاکید کلام کے لئے ہے، اس لئے کہ کتابت ہاتھوں سے تو بہر حال ہوتی ہی ہے جیسا کہ اُردو محاورہ میں بھی زور اور تاکید کے موقع پر بولتے ہیں "میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" "اپنے کانوں سے سنا ہے" حالانکہ دیکھنا اور سننا تو ہمیشہ آنکھوں اور کانوں ہی سے ہوتا ہے، خود قرآن مجید میں بھی اس کی نظیریں ملتی ہیں یقولون بأفواههم۔ وطائر يطير بجناحيه الا امم امثالكم وغيرہما۔ محققین نے لکھا ہے کہ اس آیت اور آیت ماقبل دونوں میں بڑی وعید شریعت میں ہر قسم کے اضافہ و ترمیم وغیرہ پر موجود ہے۔

في هذه الآية والتي قبلها التحذير من التبديل والتغيير والزيادة في الشرع فكل من بدل وغير او ابتدع في دين الله ما ليس منه ولا يجوز فيه فهو داخل تحت هذا الوعيد الشديد والعذاب الأليم۔ (قرطبی)

اَللّٰہ کا لفظ یہاں یہود کی زبان سے ادا ہوا ہے، اس لئے ترجمہ خدا سے کیا گیا۔

**۲۷۱** امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت کے اندر دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے، ایک یہود کی انتہائی شقاوت قلب کی جانب کہ کلامِ ربانی تک میں تحریف سے نہ چوکے، دوسرے اس امر کی طرف کہ اس تحریف سے بھی مقصود کوئی خدمتِ دین نہ تھی، تمام تر تحصیل جاہ و مال ہی تھی۔

ثَمَنًا۔ ثمن کے معنی صرف نقد یا زرِ قیمت کے نہیں بلکہ جو چیز بھی کسی چیز کے معاوضہ میں حاصل ہو وہ اس کی ثمن ہے۔

كل ما يحصل عوضا عن شئ فهو ثمنه (راغب)

مفسرین نے بھی اسے یہاں اُسی وسیع مفہوم یعنی مطلق دنیوی معاوضہ کے معنی میں لیا ہے۔

الثمن هنا هو عرض الدنيا (بحر)

قليلا۔ کلامِ ربانی کی تصحیف و تحریف جیسے شدید و عظیم جرم سے جو بھی مادّی نفع کسی قسم کا بھی حاصل ہو گا، ظاہر ہے کہ وہ حقیر و بے وقعت ہی ہو گا۔

بعض خشک اہل ظاہر نے آیت کے ظاہر الفاظ پر جا کر یہ فتوے دے دیا ہے کہ قرآن مجید کی خرید و فروخت دونوں ناجائز ہیں لیکن مذہب صحیح یہ ہے کہ دونوں بالکل جائز ہیں، بیع و شرا یہاں جو کچھ بھی ہوتی ہے وہ کاغذ کتابت وغیرہ کی ہوتی ہے نہ کہ آیاتِ الٰہی کی، آیت سے اگر کوئی وعید لازم آتی ہے تو وہ جھوٹے مسئلہ بنانے والوں اور موضوع حدیثیں بیان کرنے والوں کے حق میں ہے۔

**۲۷۲** قرآنی اور اسلامی معیارِ صداقت و دیانت سے ہر تحریف اور ہر تصحیف موجبِ لعنت ہے اور حد سے

## وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً

اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو تو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز چند گنے چنے دنوں کے ۲۷۴ے

بڑھی ہوئی جسارت اور اسی لئے یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلام الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کی ہمت کر کیسے سکتا ہے لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے ناآشنا ہیں، بلکہ بعض اہل کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لئے ہر برائی درست اور "خدا کی سچائی" اور "خداوند کے جلال" کے اظہار کے لئے ہر جھوٹ جائز۔ آج دنیا میں مسیحیت کے نام سے جو تبلیغی ترک پھیلا ہوا ہے اس مذہب کے بانی پولوس PAUL اسرائیلی ہوئے ہیں۔ آپ کا یہ مقولہ آج تک انجیل مروج میں لکھا چلا آرہا ہے:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟ اور ہم کیوں نہ برائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو"۔ (رومیون ۔ ۳ : ۷)

۲۷۳ے (اپنی تحریفی جسارتوں سے)

مِمَّا يَكْسِبُونَ ۔ سے مراد کیا ہے؟ یعنی وہ کیا چیز ہے جو وہ اپنی حرکتوں سے حاصل کرتے رہتے ہیں؟ اس کے دو جوابات دیئے گئے ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے گناہوں کا ذخیرہ مراد ہے یعنی وہ لوگ اپنی ان حرکتوں سے اپنے معاصی ہی کا انبار بڑھاتے چلے جاتے ہیں۔

يقال من المعاصي (معالم) والمراد بذلك سائر معاصيهم۔ (كبير)

دوسرے یہ کہ جو مالی نفع وہ اپنی غرضمندانہ تحریف اور (بقول خود) دروغ مصلحت آمیز سے حاصل کرتے ہیں وہ یہاں مراد ہے۔

يصيبون من الحرام والرشوة (ابن عباس) اى مما اكلوا به من السحت (ابن كثير) المال الماخوذ على هذا الوجه (كبير) يريد به الرشى (بيضاوى)

فَوَيْلٌ .... وَوَيْلٌ ۔ ویل کی تکرار معصیتِ تحریف و تصحیف کی اہمیت کے اظہار کے لئے ہے۔

وكرر الويل تغليظا لفعلهم۔ (قرطبى)

۲۷۴ے اور یہ چند دن وہی ہیں (جیسا کہ پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے حاشیے میں اکابر یہود کے حوالے سے لکھا ہے) جن میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی یعنی کوئی چالیس ۴۰ دن۔ اور یہی بات ہمارے بعض ائمۂ تفسیر نے بھی نقل کی ہے:۔

قدر اربعين يوما التى عبد فيها آباؤنا العجل۔ (ابن عباس)

اور ایک دوسرے مسیحی مترجم قرآن سیل نے یہ مدت گیارہ مہینہ یا ایک سال نقل کی ہے اسی طرح ایک میعاد ۷ دن کی بھی نقل ہوئی ہے بہرحال وہ تھی کوئی محدود و متعین مختصر ہی مدت، بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیلی اپنے کو آتش دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھے رہے تھے چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے:

"آتش دوزخ گنہگاران قوم یہود کو چھوئے گی بھی نہیں اس لئے کہ وہ در جہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے"۔ (جلد ۵ صفحہ ۵۸۳)

اور یہود کے بڑے مقدس نوشتہ تالمود کے انتخابات کا جو مجموعہ انگریزی میں ڈاکٹر کوہن (KOHAN) کا مرتب

قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ

آپ کہئے کیا تم اللہ کے ہاں سے کوئی وعدہ پا چکے ہو، جو اللہ اب اپنے وعدہ کے خلاف نہ کرے گا؟ یا (یوں ہی) اللہ

عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ

پر وہ جوڑ رہے ہو جس کا علم تم نہیں رکھتے ۲۷۵ (نہیں) بلکہ اصل یہ ہے کہ جو کوئی بھی بدی اختیار کرے گا اور

خَطِيْٓــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

اس کا گناہ اس کو گھیرے گا سو یہی لوگ تو اہل دوزخ ہیں ۲۷۶ اس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے ۲۷۷

کیا ہوا EVERYMAN'S LIBRARY SERIES میں شائع ہوا ہے، اس میں یوں آیا ہے:۔

"قیامت کے دن ابراہیم درِ دوزخ پر تشریف رکھتے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں گرنے نہ دیں گے" ص ۲۰۴ "جہنم کی آگ اسرائیلی گنہگاروں پر کوئی قدرت نہیں رکھتی" ص ۲۰۵

حاصل یہ کہ بنی اسرائیل اپنی قوم کو خدا کی لاڈلی اور دلاری سمجھے ہوئے تھے اور اس پر حد سے زیادہ نازاں تھے یہود کی زبان سے اس سلسلہ میں "ہم" صیغۂ جمع متکلم جہاں بھی آیا ہے، اجتماعی معنی رکھتا ہے یعنی مراد قوم اسرائیل ہے۔

۲۷۵ یہود سے بطور حجت الزامی سوال ہو رہا ہے کہ یہ جو اپنی قوم کی محبوبیتِ خاصہ کا، عذاب آخرت سے محفوظیت کا، عدم مسئولیت کا عقیدہ تم نے اپنے دل میں جما رکھا ہے تو آخر یہ یوں ہی اپنے دل سے گڑھ لیا ہے یا اس کی کوئی سند بھی اپنے مقدس نوشتوں میں دکھا سکتے ہو؟ آخر یہ اعتماد کہاں سے قائم کر لیا ہے۔

تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ۔ قال کا صلہ جب علی کے ساتھ ہو تو معنی ہوتے ہیں کسی پر کوئی بات جوڑ لی، کسی پر بہتان باندھ دیا

قال علیہ ای افتری (تاج)

۲۷۶ نجات و عدمِ نجات کا اصل قانون اب بیان ہو رہا ہے کہ اسے نسل و قوم سے کوئی واسطہ نہیں بلیٰ۔ ایسے اقرار کے موقع پر آتا ہے جہاں کوئی انکار قبل سے واقع نہ ہو۔

وضعت بلیٰ لکل اقرار فی اولہ جحد ووضعت نعم للاستفہام الذی لاجحد فیہ (معانی)

اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــَٔتُهٗ۔ قصداً بدی کی راہ اختیار کرنا اور معصیت سے پوری طرح گھر جانا کہ خود ایمان کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہ جائے، صرف انھیں کے لئے ممکن ہے جو سرے سے اہل باطل ہوں، اور ان کی موت کفر و بے دینی ہی پر آئے، مومن کیسا ہی بدعمل ہو، بہرحال اس آیت کا مصداق تو نہ ہو گا، کم از کم زبان سے اقرار اور قلب سے تصدیق کا درجہ تو اسے حاصل ہی ہو گا، تمام اکابر اہل سنت نے یہاں مراد کفر ہی سے لی ہے۔

ای اشرک باللہ ومات علیہ (ابن عباس) السیئۃ الکفر والشرک قال ابن عباس ومجاہد (بحر) المومنون لایخلدون فی حکم ھذہ الآیۃ (معالم عن الواحدی) فاما اذا مات مؤمنا فاعظم الطاعات وھو الایمان معہ فلا یکون الذنب محیطا بہ فلا یتناولہ النص (مدارک)

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا

اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو یہی لوگ اہل جنت ہیں اس میں ہمیشہ رہنے

۹ ع ۱۱ ۹ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ

والے ۲۷۷ے اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ۲۷۹ے کہ عبادت نہ کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے ۲۸۰ے

بعض اہل باطل نے اس آیت سے جو مومن عاصی کی عدم مغفوریت پر استدلال کرنا چاہا ہے وہ صریحاً باطل ہے۔ سَيِّئَةً خود سیئۃ کے معنی ہی شرک کے کئے گئے ہیں۔

السَّيِّئَةُ الشرك (قرطبی) وافرد السيئة لأنه كنى به عن مفرد وهو الشرك (بحر)

۲۷۷ے خُلُوْد کے معنی اگرچہ مدت طویل کے بھی ہیں، لیکن اہلِ دوزخ اور اہلِ جنت کے سلسلہ میں جہاں جہاں اس لفظ کا استعمال قرآن مجید میں ہوا ہے، اہلِ سنت کا اجماع ہے کہ اس سے مراد دوام یا ہمیشگی ہے اور اس کی تاکید و تائید میں قرآن مجید میں خَالِدِيْنَ فِيْهَا کے ساتھ جا بجا اَبَدًا بھی آیا ہے۔

والمراد بالخلود الدوام (روح) ومن الناس من حمل الخلود على اصل الوضع وهو اللبث الطويل ليس بشيء لأن فيه تهوين الخطب في مقام التهويل مع عدم ملائمته حمل الخلود في الجنة على الدوام (روح)

۲۷۸ے دونوں آیتوں میں نجات کا پورا قانون ایجاز و اختصار کے ساتھ آگیا کہ نجات کو نسل و قوم سے کوئی تعلق نہیں، جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے بدعقیدگی و بدکرداری کی راہ پر چلے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے جو کوئی اپنے قصد و اختیار سے ایمان و عمل صالح کی روش کا انتخاب کرے گا، اس کی منزل جنت ہے۔

اُولٰٓئِكَ ۔ فَاُولٰٓئِكَ ۔ اوپر کی آیت کے الفاظ تھے فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ اور اس آیت میں ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ گویا ایک ہی قسم کا حکم لگانے میں ایک جگہ اُولٰٓئِكَ فَ کے ساتھ ہے اور ایک جگہ بغیر فَ کے، یہ فرق گو خفیف اور لفظی ہی نہیں محض حرفی ہے لیکن اتنا فرق بھی آخر کیوں؟ اہل تحقیق نے جواب میں کہا ہے کہ پہلا موقع وعید کا تھا اہلِ جہنم کے لئے اور وعید میں امکانِ تخلف وعید کا ہے اس لئے اس پر زور دیا گیا ہے اور دوسرے موقع پر صرف وعدہ تھا اہلِ جنت سے، جس سے تخلف کا کوئی امکان ہی نہیں۔ اس لئے محض اُولٰٓئِكَ بغیر فَ کے بالکل کافی ہو گیا اور دوسرا جواب اس کے برعکس یہ بھی دیا گیا ہے کہ اہلِ نحو کہتے ہیں کہ اس فقرہ من دخل داری فاکرمہ میں اس کا امکان رہ جاتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے والے کا اکرام نہ بھی کیا جائے لیکن دوسرے فقرہ من دخل داری اکرمہ میں اکرام کرنا یقینی ہو جاتا ہے عدم اکرام کا احتمال نہیں باقی رہتا، اسی نمونہ پر قرآنی فقرہ میں نیک کاروں کو جنت ملنا بالکل یقینی ہے (روح)

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جو ترتیب یہاں ہے قرآن نے ہر جگہ اور بڑی کثرت سے ملحوظ رکھی ہے اور اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ گو عمل صالح اپنی جگہ پر نہایت اہم اور ضروری ہے، لیکن ایمان اس سے بھی اہم تر ہے اور بغیر ایمان کے مجرد عمل صالح کے کوئی معنی ہی نہیں، ایمان کی حقیقت نیت عمل اور فکر کی تصحیح ہے اور قرآن مجید نے بالکل فطری ترتیب کے مطابق تصحیح فکر کو تصحیح عمل پر مقدم رکھا ہے، محض عمل اگر نیت سے قطع نظر کر لی جائے تو صرف صورتِ عمل رہ جاتا ہے حقیقتِ عمل نہیں

## وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا

اور حسنِ سلوک سے پیش آنا (اپنے) ماں باپ سے اور قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں (سے بھی) ۲۸۱ اور لوگوں سے

## لِلنَّاسِ حُسْنًا

(بالعموم) بھلی بات کہنا ۲۸۲

۲۷۹ (ان کے پیغمبروں کے واسطہ سے)
عَہد جب اس کا تعلق خدائے تعالیٰ سے ہوتا ہے، محاورۂ توریت میں حکم کے معنی میں آتا ہے مثلاً:۔
"اور اس نے اپنا عہد تمہارے آگے بیان کیا جس پر عمل کرنے کا حکم بھی اس نے تمہیں دیا یعنی دس احکام"۔ (استثناء ۴: ۱۳)
بعض شارحینِ قرآن نے بھی یہاں "عہد لینے" کو "حکم دینے" کے معنی میں لیا ہے۔
ای اُمرنا بذلك (ابن قتیبه)
۲۸۰ توریت اثباتِ توحید و ممانعتِ شرک سے بھری پڑی ہے صرف دو تین مقام بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:۔
"میرے حضور تیرے لئے دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی پر زمین کے نیچے ہے مت بنا، تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر"۔ (خروج ۲۰: ۲-۵)
"میرے آگے تیرا کوئی دوسرا خدا نہ ہووے تو اپنے لئے تراشی ہوئی مورت یا کسی چیز کی صورت جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے مت بنا، تو انھیں سجدہ نہ کر نہ ان کی بندگی کر"۔ (استثناء ۵: ۷-۸) "سن لے اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا اکیلا خداوند ہے"۔ (استثناء ۶: ۴) "تم اور معبودوں کی قوموں کے معبودوں میں سے جو تمہارے آس پاس ہیں پیروی نہ کرو، کیوں کہ خداوند تیرا خدا جو تمہارے درمیان ہے غیور خدا ہے، نہ ہو کہ خداوند تیرے خدا کے قہر کی آگ تجھ پر بھڑکے اور تمہیں روئے زمین سے فنا کر دے"۔ (استثناء ۶: ۱۴ و ۱۵)
تَعْبُدُوْنَ۔ صورۃً صیغۂ مضارع ہے، لیکن معنیً امر ہے۔
هو اخبار فی معنی النهی (کشاف)
بلکہ امر صریح سے بلیغ تر ہے۔ یعنی اس سے یہ نکلتا ہے کہ گویا اس حکم کی تعمیل ہو چکی۔
وهو ابلغ من صریح الامر والنهی لأنه كأنه سورع الی الامتثال (کشاف) هو ابلغ من صریح النهی لما فيه من ابهام ان المنهی سارع الی الانتهاء فهو يخبر عنه (بیضاوی)
۲۸۱ اس سے ملتے جلتے احکام توریتِ موجودہ میں اب بھی موجود ہیں:۔
"تو اپنے ماں باپ کو عزت دے"۔ (خروج ۲۰: ۱۲) "اپنے باپ اور اپنی ماں کو عزت دے جیسا خداوند تیرے خدا نے فرمایا ہے"۔ (استثناء ۵: ۱۶) "اور اپنے مفلس بھائی کی طرف سے اپنے ہاتھ مت بند کیجیو، بلکہ تو اس پر اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو اور کسی کام میں جو وہ چاہے بقدر اس کی احتیاج کے ضرور اس کو قرض دیجیو"۔ (استثناء ۱۴: ۲۹) "مسکین زمین پر سے کبھی جاتے نہ رہیں گے اس لئے یہ کہہ کے میں تجھے حکم کرتا ہوں کہ تو اپنے بھائی کے واسطے اور

**وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ**

اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا ۲۸۳ پھر تم (سب ان احکام سے) پھر گئے بجز تم میں سے

**وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ**

(معدودے) چند کے اور تم ہی ہو گردن کش ۲۸۴ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا ۲۸۵

**وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾**

اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے مت نکالنا، پھر تم نے اس کا اقرار کر لیا اور تم (اس کے) گواہ ہو ۲۸۶

اپنے مسکین کے لئے اور اپنے محتاج کے واسطے جو تیری زمین پر ہے اپنا ہاتھ کشادہ رکھیو" (استثناء۔ ۱۵: ۱۱)
"اور مسافر اور یتیم اور بیوہ جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہیں آویں اور کھاویں اور سیر ہوویں" (استثناء ۱۵: ۸ و ۹)

۲۸۲ یعنی عام طور پر لوگوں سے حُسنِ گفتار کو قائم رکھو۔

ای قولوا للناس مقالۃ حسنۃ (بحر) قولوا لھم القول الطیّب (بحر عن ابی العالیۃ)

بات چیت میں اچھی طرح پیش آتے رہنا، سہل ترین اور ادنیٰ ترین فریضۂ انسانیت ہے اس لئے یہ حکم عام ہے یعنی خوش خلقی سے سب ہی کے ساتھ پیش آتے رہنا چاہیئے، چاہے وہ نیک و بد، فاسق و صالح کیسا ہی انسان ہو، بس احتیاط اتنی رہے کہ اس خوش خلقی و خندہ روئی سے کہیں مخاطب کی بدعت یا بد مذہبی کی تائید نہ پیدا ہو جائے۔

وھذا کلّہ حضّ علی مکارم الاخلاق فینبغی للانسان ان یکون قولہ للناس لیّنا و وجھہ منبسطا طلقا مع البرّ والفاجر والسنّی والمبتدع من غیر مداھنۃ ومن غیر ان یتکلم معہ بکلام یظن انہ یرضی مذھبہ (قرطبی)

بعض نے کہا ہے کہ اس حکم کی تعمیم آیاتِ قتال سے منسوخ ہو گئی لیکن حضرت ابو جعفر باقرؒ سے مروی ہے کہ یہ حکم اب بھی عام ہے، تحدید و تخصیص پر کوئی دلیل نہیں اور یہی مذہب قوی ہے۔

زعم ابو جعفر بن محمّد بن علی الباقر ان ھذا العموم باق علی ظاھرہ وانہ لاحاجۃ الی التخصیص ھذا ھو الاقوی (کبیر)

توریتِ موجودہ میں اب حُسنِ سلوک کے جتنے بھی احکام ملتے ہیں ان کا دائرہ محدود ہے بنی اسرائیل کے ساتھ اس لئے یا تو اس حکم کو اہلِ توریت نے بدل ڈالا اور یا حکم ہے ہی خاص شریعتِ محمدیؐ کا حکم جیسا کہ متعدد اہلِ تفسیر کا گمان ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا۔ والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک یہ ہے کہ ان کے ساتھ حُسنِ معاشرت اختیار کیا جائے ان سے با ادب پیش آیا جائے ان کے احکام کی تعمیل کی جائے اور ان کی وفات کے بعد ان کے حق میں دعائے خیر کی جائے اور ان کے دوستوں سے بہ حُسنِ سلوک پیش آیا جائے۔

الاحسان الی الوالدین معاشرتھما بالمعروف والتواضع لھما وامتثال امرھما والدعاء لھما بعد مماتھما وصلۃ اھل ودّھما (قرطبی)

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو (اور

دِيَارِهِمْ ز تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ

ان کے مقابلہ میں گناہ و ظلم کے ساتھ (اُن کے مخالفین کی) مدد بھی کرتے ہو ۲۸۷

حکم توحید کے معاً بعد بندوں کے ساتھ ان احکام سلوک و حُسنِ معاشرت کو لے آنا اس کی دلیل ہے کہ خدائے اسلام کے ہاں حقوق العباد (بندوں کے حقوق) کی اہمیت کتنی زیادہ رہی ہے۔

۲۸۳ صلوٰۃ، اقامتِ صلوٰۃ، زکوٰۃ، اب یہ سب مخصوص اسلامی اصطلاحیں ہیں، یہ نہ سمجھا جائے کہ اسرائیلیوں کو یہ سب احکام انھیں مخصوص ہیئتوں اور انھیں متعین قیود کے ساتھ ملے تھے، انھیں جو احکام ملے تھے وہ تھے انہیں عبادتوں سے متعلق، لیکن ان کی مخصوص ہیئتیں اور ان کے حالات و ماحول کے مطابق، خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور دعا و عبادت کی تاکید اب بھی توریت میں مختلف عنوانات سے موجود ہے۔

۲۸۴ خطاب اب قرآن کے معاصر یہود سے ہے کہ اب تم سارے قول و قرار سے پھر گئے اور تم میں سے صرف چند (عبداللہ بن سلام وغیرہ) دینِ حق پر قائم رہ گئے۔

الخطاب لمعاصری محمد صلی اللہ علیہ وسلم الا قلیلا کعبد اللہ بن سلام واصحابہ (قرطبی)

وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ چند شہادتیں اسی مضمون کی خود توریت سے ملاحظہ ہوں:۔

"وہ اس راہ سے جو میں نے انھیں فرمائی جلد پھر گئے" (خروج ۳۲: ۸) "میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے" (خروج ۳۲: ۹) "اس لئے کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳: ۳) "بنی اسرائیل کو کہہ دو کہ تم گردن کش لوگ ہو" (خروج ۳۳: ۵)

یہ چند حوالے صرف نمونہ کے طور پر دیے گئے ورنہ توریت کا تو یہ ایک خصوصی موضوع ہی ہے۔

تَوَلَّيْتُمْ، معرضون۔ تولّی اور اعراض کے درمیان فرق یہ کیا گیا ہے کہ تولّی جسمانی ہوتا ہے اور اعراض قلبی یا روحانی

وقیل التولّی بالجسم والاعراض بالقلب (قرطبی)

۲۸۵ "عہد لیا" یہاں بھی "حکم دیا" کے معنی میں ہے، ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۷۹

خونریزی کی ممانعت توریت مروّجہ میں بھی متعدد مقامات پر ملتی ہے۔ مثلاً:

"تو خون مت کر" (خروج۔ ۲۰: ۱۳) "بے گناہ کا لہو تیری زمین پر جسے خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے بہایا نہ جائے کہ خون تجھ پر ہو" (استثناء۔ ۱۹: ۱۰)

۲۸۶ یعنی ان احکام کی اطاعت کا اقرار تم نے صاف صاف کیا جو آج تک تمہارے نوشتوں میں لکھا چلا آتا ہے، اور تمھیں اس سے مجال انکار نہیں۔ توریت میں ہے:۔

"وہ بولے کہ سب کچھ جو خداوند نے فرمایا ہے ہم کریں گے اور تابع رہیں گے" (خروج۔ ۲۴: ۷)

۲۸۷ یہود کے جو قبیلے عہد نبوی میں مدینہ اور جوار مدینہ میں آباد تھے، ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ باہم خانہ جنگیوں میں مصروف رہا کرتے تھے، مشرکین مدینہ کی دو بڑی ٹکڑیوں میں آج کل کی "مہذب" فرنگی قوموں کی طرح بٹے ہوئے تھے، ایک تحا

وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ

اور اگر وہ تم تک اسیر ہو کر پہنچ جاتے ہیں تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو ۲۸۸ حالانکہ ان کا (وطن سے) نکالنا ہی تم پر حرام تھا ۲۸۹

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ

تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ سے انکار کرتے ہو ۲۹۰ پس تم میں سے جو ایسا کرے

يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

اس کی سزا کیا ہے بجز دنیوی زندگی میں رسوائی کے؟ ۲۹۱

اوس کا تھا، دوسرا خزرج کا، اسرائیلیوں کے بھی بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ یہی کیا کرتے کہ ان میں سے ایک مشرکوں کے ایک جتھے کے ساتھ ہو جاتا، اور دوسرا مشرکوں کی دوسری پارٹی کے ساتھ۔ اور پھر جنگ جب شروع ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ وہ سب ہی کچھ ہوتا جو جنگ میں ہوا کرتا ہے، جلاوطنی، اسرائیلی کا قتل اسرائیلی کے ہاتھ سے، وغیرہا، یہاں عہد نبوی کے معاصر اسرائیلیوں کے یہی خصوصیات بے نقاب کئے جا رہے ہیں۔

بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ یہ ٹکڑا بڑھا کر قرآن نے بتلا دیا کہ پھر یہ نہیں کہ اس خانہ جنگی اور مشرک نوازی کی بنیاد کسی جذبۂ صادق وصحیح اور حسن نیت واخلاص پر ہو، بلکہ تمام تر جن اخلاقی گندگیوں میں دنیوی اہل سیاست عموماً مبتلا رہتے ہیں اور مشرکین خاص طور سے مبتلا تھے، وہی ان محاربات کا باعث تھیں، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آج بھی یہ درج ہے کہ جنگ بعاث مشرکین کی باہمی جنگ تھی یہود اس میں فریقین کی جانب سے شریک ہو گئے اور نمایاں حصہ لیا، بنی نضیر اور بنی قریظہ نے اوس کا ساتھ دیا، اور بنی قینقاع خزرج کی حمایت میں نکل پڑے جنگ نے طول کھینچا اور بڑے گھمسان کا رن پڑا، بالآخر شکست خزرج کے فریق کو ہوئی۔ (جلد ۹ صفحہ ۴۲۳) اسی انسائیکلوپیڈیا میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ یہود کی قبیلے مشرکین مدینہ کے ساتھ شادی بیاہ کرتے تھے، اور جنگ میں دونوں فریقوں کے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔"

۲۸۸ (اور اس کو اپنے نزدیک دینداری کا بڑا کارنامہ سمجھ کر اس پر فخر کرتے اور احسان جتلاتے ہو)

۲۸۹ توریت محرف میں بھی آج تک اسی قسم کے احکام لکھے چلے آتے ہیں:۔

"تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔" (خروج ۲۰: ۱۷)

لیکن بالفرض کوئی صراحت اس قسم کی نہ ملے جب بھی کسی کو بلا عذر شرعی وطن سے بے وطن کرنا شقاوت کی انتہائی صورت ہے۔ ھُوَ ضمیر اخراج کے لئے ہے۔

یرید اخراجھم محرم علیکم ثم اعاد الاخراج مرۃ اخری تکریرا علی ھو (معالم)

۲۹۰ الکتٰب سے اس بیان میں مراد ظاہر ہے کہ اسرائیلیوں ہی کی آسمانی کتاب توریت ہے۔ حجت الزامی یہود پر قائم ہو رہی ہے کہ قرآن پر ایمان لانا تو الگ رہا، تم خود توریت ہی کے کب پابند ہو؟ بلکہ جس بیباکی سے تمہارے اکابر اس کے بعض احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں اس سے تو صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ تم اپنے اوپر حجت

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ

اور قیامت کے دن یہ سخت ترین عذاب میں ڈالے بھی جائیں گے ۲۹۲ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے

عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا

بے خبر نہیں ۲۹۳ یہی لوگ ہیں جنھوں نے دنیوی زندگی خرید لی ہے آخرت کے معاوضہ

بِالْاٰخِرَةِ ز فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

میں ۲۹۴ سو ان پر سے نہ عذاب ہلکا کیا جائے گا ۲۹۵ اور نہ انھیں مدد ہی پہنچے گی ۲۹۶

اور اپنے لئے واجب العمل توریت کے صرف بعض ہی اجزا کو سمجھتے ہو اور بعض اجزا پر تمہارا ایمان ہی نہیں۔

۲۹۱ پیشین گوئی چند ہی روز میں لفظ بہ لفظ پوری ہو کر رہی، حجاز میں یہود کے تین زبردست قبیلے رہتے تھے، بنی نضیر، بنی قریظہ، بنی قینقاع۔ تینوں دولت و وجاہت، قوت، علم و ہنر میں ممتاز تھے، تینوں چند سال کی مختصر مدت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارک ہی میں تہس نہس ہو کر رہے۔

۲۹۲ اسرائیلیوں کے لئے جہنم کی وعید خود ایک اسرائیلی نبی اور سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم حضرت مسیحؑ کی زبان سے بھی منقول ہے، انجیلِ موجودہ میں ہے:۔

"تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم اپنے نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے"؟ (متی ۔ ۲۳ : ۲۴)

۲۹۳ (اور وہ سب کو سزا مناسب وقت پر دیتا ہے یا آخرت میں ضرور دے گا۔)
آیت میں اشارہ یہود کے خفیہ طریق کار اور سازشی کارروائیوں اور ریشہ دوانیوں سے متعلق ہے۔

۲۹۴ (حالانکہ آخرت کا سودا بھی بہت ارزاں تھا۔ ایمان وطاعت سے اُسے بہ آسانی خرید سکتے تھے۔)
یہود کی مذہبی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فکرِ اُخروی باقی ہی نہیں رہ گئی تھی، ان کے مقدس مذہبی نوشتوں تک کی تعلیمات کا خلاصہ صرف یہ رہ گیا تھا کہ مذہب کی راہ پر چلو تاکہ دنیوی فلاح حاصل ہو، قوم کو آزادی ملے اور تم ایک اقبال مند قوم بن جاؤ، آخرت کی جزا و سزا جس سے قرآن مجید بھرا پڑا ہے، اس حد پر ہے کہ توریت تک تقریباً خالی ہے۔

۲۹۵ آخرت میں شدید ترین عذاب الٰہی اوپر ہی والی آیت میں آچکا ہے۔ اب تاکیداً ارشاد ہو رہا ہے کہ اس بے پناہ عذاب سے رہائی پانے کا کیا ذکر ہے، تخفیف تک کی صورت اس میں ممکن نہ ہوگی۔
فَلَا کی ف کا ترجمہ "سو" سے کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یہ عذاب تکذیبِ انبیاء کے جرم میں اس کے نتیجہ کے طور پر اور ایمان نہ لانے کی پاداش میں ہوگا۔

۲۹۶ (کہ ان کے اکابر و اجداد ہی آکر سفارش کردیں۔)
یہود کو بڑا غرہ اس کا تھا کہ ہم انبیائے مقبولین کی اولاد ہیں، ہمیں کیا غم ہے، ہماری نصرت و شفاعت کے لئے ہمارے

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ز

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی ۲۹۷ اور ان کے پیچھے ہم نے پے در پے پیمبر بھیجے ۲۹۸

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط

اور عیسیٰ ابن مریمؑ کو ہم نے روشن نشانات عطا کئے ۲۹۹ اور ہم نے روح القدس (کے ذریعہ) سے ان کی تائید کی ۳۰۰

یہ اسلاف کافی ہیں قرآن کو اسی لئے اس عقیدہ کی تردید بار بار کرنی پڑی' اور مختلف پیرایوں میں انھیں تنبیہ کی گئی کہ قانون الٰہی کے باغیوں کا ہمدرد و سفارشی کوئی بھی نبی یا ولی نہیں ہو سکتا اور جو ایمان سے خالی ہیں ان کی امداد و نصرت کسی سمت و جہت سے بھی نہ ہوگی۔

۲۹۷ (اور ایک مستقل دستورِ شریعت سے قوم اسرائیل کو بطور انعام خاص مشرف و ممتاز کیا۔)

الْكِتٰب سے مراد وہی توریت ہے۔ حضرت موسیٰؑ کون تھے کس زمانہ میں تھے یہ سب ذکر پہلے حاشیوں میں آچکا ہے۔

۲۹۸ (تمھاری ہی نسل اسرائیل میں)

اسرائیلیوں میں حضرت موسیٰؑ کے بعد بھی انبیاء کا متواتر اور بہ کثرت آتے رہنا تاریخ کا ایک مشہور و مسلّم واقعہ ہے حضرت یوشعؑ نبی، حضرت داؤدؑ نبی، حضرت زکریاؑ نبی، حضرت یحییٰؑ نبی کے نام سے اُردو داں طبقہ بھی واقف ہے۔ متعدد انبیاءؑ کے صحیفے کیسے ہی محرّف سہی بہر حال "عہد نامۂ عتیق" کے موجودہ مجموعہ میں شامل ہیں۔

۲۹۹ (ان کی پیمبری و صداقت کے)

الْبَيِّنٰت۔ اس میں دلائل، خوارق، معجزات سب آگئے۔

عِيْسَى۔ آپ سلسلۂ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں سنہ عیسوی آپ ہی کے نام سے جاری ہے آپ کے بعد صرف نبوت محمدی ہوئی، ملک شام کے علاقہ ارض گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے' وہی آبائی وطن ہے' ولادت بیت المقدس کے ایک گوشہ میں ہوئی، خاندان یوسف بن یعقوب بن ماثان نامی ایک حکیم کا تھا جناب یوسف لکڑی کا کام کرتے تھے' اسی لئے یوسف نجار کے نام سے مشہور تھے، شام اس وقت رومی مملکت کا ایک نیم خود مختار صوبہ تھا اور اس وقت والی شام ہیرود تھا، مسیحی تقویم میں تین سال کی غلطی شروع سے چلی آرہی ہے اس لئے آپ کا سالِ ولادت وہ نہیں جس سے مسیحی تقویم شروع ہوئی ہے بلکہ اس سے تین سال بعد کا ہے اس لحاظ سے کہنا یہ چاہئے کہ آپ کی ولادت ۴ ق م میں ہوئی۔ ۳۲ سال کی عمر میں آپ جمہور امت کے عقیدہ کے مطابق زندہ اور مسیحی عقیدہ کے مطابق تین دن کے لئے وفات پاکر آسمان پر اٹھا لئے گئے، آپ کے رفعِ آسمانی سے انکار صرف بعض جدید فرقوں نے کیا ہے۔

مَرْيَم بنت عمران بن ماثان قوم اسرائیل کے ایک بڑے معزز خاندان سے تھیں۔ اور خود بھی باعصمت اور خوبصورت تھیں۔ سال وفات مسیحی روایتوں کے مطابق ۴۸ء ہے۔

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ۔ ابن مریم کے لفظ میں اشارہ ہے کہ عیسیٰ مسیحؑ اپنے پیمبرانہ عظمت کے باوجود محض بشر ہی تھے ایک عورت کے بطن سے پیدا۔ خدا یا مثیلِ خدا یا فرزندِ خدا وغیرہ کچھ بھی نہ تھے۔

۳۰۰ رُوْحُ الْقُدُس۔ اسلامی اصطلاح میں مشہور، ممتاز و مقرب فرشتہ حضرت جبرئیل کو کہتے ہیں۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ

تو کیا جب کبھی کوئی پیمبر تمہارے پاس ان (احکام) کے ساتھ آیا جو تمہارے نفس کو نہ بھائے ۳۰۱ تو تم اکڑنے لگے ۳۰۲

فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

پھر بعض کو تم نے جھٹلایا ۳۰۳ اور بعض کو تم قتل ہی کرنے لگے ۳۰۴

ای بجبریل علیه السلام واطلاق روح القدس علیه شائع (روح) الروح الامین سمّی به جبریل وسماہ بروح القدس (راغب) ذھب جمھور المفسرین الی ان المراد بروح القدس الملک المسمّی بجبریل الذی ینزل علی الانبیاء ومنه یستمدون الشرائع عن اللہ تعالیٰ (المنار)

مسیحی اصطلاح میں روح القدس "تثلیث مقدس" کے اقنوم ثالث کو کہتے ہیں اس سے یہاں کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں، اصطلاح کے مشترک ہونے سے بعض دفعہ بڑے بڑے مغالطے اور غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش چونکہ خداوندی مصالح کے مطابق عام بشری طریق سے الگ ایک نئے قانون کے ماتحت مسِ ملکوتی سے ہوئی تھی، اس لئے عجب کیا جو بعد میں بھی آپ کو مناسبت عالم ملائکہ سے زیادہ رہی ہو اور اسی مناسبت سے استفاضہ بھی ملائکہ سے زیادہ ہوتا رہتا ہو۔

أَيَّدْنَٰهُ میں اشارہ ادھر بھی نکلتا ہے کہ آپ اپنی بشریت کی بناء پر اعانتِ خداوندی کے محتاج تھے، اور وہ اعانت ایک فرشتہ کے ذریعہ کرائی جاتی تھی۔

**۳۰۱** (اور اسی طرح کے احکام تو کم و بیش سب ہی پیمبر لائے)

مخاطبت انھیں بنی اسرائیل سے ہے، روئے سخن دفعۃً صیغۂ غائب سے صیغۂ مخاطب کی طرف (یا کسی ایک صیغہ سے دوسرے کی طرف) پلٹ دینا صنعتِ التفات کہلاتا ہے اور عربی ادب و انشاء میں یہ عیب نہیں، حسن ہے، قرآن مجید میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

**۳۰۲** (اور اس پیغمبر کی اطاعت و اتباع سے عار محسوس کرنے لگے۔)

انسان کی یہ شامت شروع سے رہی ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلہ میں حاکم و قاضی وہ اپنے ہوائے نفس ہی کو رکھنا چاہتا ہے اور جو احکام اُسے اپنی خواہشوں یا اپنی محدود و ناقص اور جذبات زدہ عقل کے منافی نظر آتے ہیں، جھٹ ان سے انکار اور ان کے مقابلہ میں علم بغاوت بلند کردیتا ہے ـــ آج جس چیز کا نام "روشن خیالی" ہے تحلیل کرکے اور خوب غور کرکے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں اصلاً صرف یہی ملے گا، استکبار نفس اور پیمبر کے اقتدا و اتباع سے عار۔

**۳۰۳** (اور ہر طرح ان کی ایذا کے درپے ہوگئے۔)

**۳۰۴** جیسے زکریاؑ نبی، یحییٰؑ نبی وغیرہما۔ تفصیلی حاشیہ رکوع ۷ کے ذیل میں گزر چکا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ کبر ہی اکثر معاصی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ یہاں قرآن نے تکذیب انبیاء و قتلِ انبیاء کو کبر ہی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں [۳۰۵] (نہیں) بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کر رکھی ہے، [۳۰۶] ان کے کفر کے باعث [۳۰۷] اور وہ ایمان بہت ہی تھوڑا رکھتے ہیں [۳۰۸]

**۳۰۵** (اور دعوتِ اسلام ہمارے اوپر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔)
یہود فخریہ اور علانیہ کہتے تھے کہ یہ "نئے پیغمبر" کچھ بھی کر ڈالیں ہم ان کے کہے میں نہیں آنے کے۔
غُلْفٌ۔ جمع غلاف کی ہے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے قلوب گنجینۂ علوم ہیں۔ معارفِ موسوی سے لبریز ہیں، ہمیں ضرورت کسی نئی تعلیم کے قبول کرنے کی نہیں۔

ھی جمع غلاف (راغب) ای ھی اوعیۃ للعلم تنبیھا انا لانحتاج ان نتعلم منک فلنا غنیۃ بما عندنا (راغب)

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اَغلَف کی جمع ہو اور اَغلَف کہتے ہیں غیر مختون کو اس کو جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔

قیل ھو جمع اَغلف (راغب) مستعارا من الاغلف الذی لم یختتن (کشاف) قیل واصلہ ذو القلفۃ الذی لم یختتن (روح)

"مختون" و "نامختون" کہنے کا محاورہ یہود کی زبان پر عام طور سے چڑھا ہوا تھا، کبھی اپنے کو "نامختون" کہنے، کبھی اپنے دل و جسم کو یا کبھی اپنے اعضاء و جوارح کو —— توریت میں بار بار اس کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً:۔

"بس میں جو نامختون ہونٹ رکھتا ہوں، فرعون میری کیونکر سنے گا"۔ (خروج ۶: ۱۲) "تب دل کے نامختون اور جسم کے نامختون اجنبی زادوں کو میرے مقدس میں لائے"۔ (حزقی ایل ۴۴: ۷)

بلکہ کہیں کہیں انجیل میں بھی آیا ہے:۔

"اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو! تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو" (اعمال ۷: ۵۱)

قرآن کا یہ اندازِ بیان بھی ایک اعجازی پہلو رکھتا ہے کہ جب یہود کا قول نقل کیا تو زبان بھی انھیں کی اختیار کی۔

**۳۰۶** قرآن مجید یہود کے فخریہ قول کے جواب میں کہتا ہے کہ جس "محفوظیت" پر انھیں اس قدر غرہ ہے یہ کوئی فخر و ناز کی چیز نہیں، یہ تو ایک نشانی ہے صداقت سے ان کے دُور ہو جانے اور حق سے ان کے بُعد پیدا ہو جانے کی اور یہی حقیقت ہے لعنت کی۔ لعنت۔ پر پہلے حاشیہ گزر چکا ہے کہ وہ نام ہے رحمتِ الٰہی سے بُعد و ہجران کا۔

بِكُفْرِهِمْ۔ اس میں یہ بتا دیا کہ یہ ملعونیت اور مغضوبیت جو ان پر طاری ہوگی، ان کے کفر اختیاری کے باعث ہوگی اللہ کے پیمبر سے مخالفت و عناد پر اصرار رکھنے کے باعث ہوگی۔ بٍ سببیہ ہے۔

ای بسبب کفرھم (ابو سعود)

لعنت کا محاورہ توریت میں بہت عام ہے صرف ایک مقام کا اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"یہ ساری لعنتیں تجھ پر اتریں گی اور تجھ تک پہنچیں گی، تو شہر میں لعنتی ہوگا اور تو کھیت میں بھی لعنتی ہوگا، تیرا ٹوکرا اور تیرا کٹھرا لعنتی ہوگا، تیرے بدن کا پھل اور تیری زمین کا پھل، تیری گائے بیل کی بڑھتی اور تیرے بھیڑ بکری کے گلے لعنتی ہو جائیں گے تو بھیتر آنے کے وقت لعنتی ہوگا اور تو باہر جاتے کے وقت لعنتی ہوگا، خداوند سارے کاموں میں جن میں تو کرنے کے لئے ہاتھ لگائے تجھ پر لعنت اور حیرت اور ملامت نازل کرے گا"۔ (استثناء ۲۸: ۱۵-۲۰)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا

اور جب اُن کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی تصدیق کرنے والی اُس کی جو اُن کے پاس (پہلے سے) موجود ہے ۳۰۸

مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ

اور اس کے قبل یہ (خود ہی) کافروں سے بیان کیا کرتے تھے ۳۰۹

لعنت انجیل میں بھی منقول ہے حضرت مسیحؑ کی زبان سے، نہ صرف کاہنوں اور فریسیوں کے لئے بلکہ انجیر کے خشک درخت کے لئے بھی۔

۳۰۷ (اور یہ تھوڑا ایا برائے نام ایمان نجات کے لئے کافی نہیں۔)

قَلِيْلًا۔ قلیل یہاں ایمان کی صفت ہے جو ایمان نجات کے لئے ضروری ہے اور جس کا حکم ہر مکلّف کے لئے ہے، اس کے متعدد اجزاء ہیں۔ یہود کا ایمان جو کچھ بھی تھا، صرف ان میں سے بعض پر تھا۔

(ای لایؤمنون الا بقلیل مما کلّفوا به (کبیر) قلیلا صفة مصدر محذوف ای فایمانا قلیلا یؤمنون۔ (مدارک)

مَا يُؤْمِنُوْنَ میں ما مزیدہ ایمان کی قلّت پر زور دینے کے لئے ہے یعنی نہایت ہی قلیل ایمان برائے نام۔

ما مزیدة للمبالغة فی التقلیل (بیضاوی) ما مزیدة للمبالغة (ابوسعود) ما زائدة لتاكيد القلة۔ (جلالین)

ما کا زائدہ ہونا نحویوں کی ایک خاص اصطلاح ہے، یہ مراد نہیں کہ یہ بے کار یا عبث ہے۔

انما قال هذه لافادة العموم تارة ولتفخيم الشئ تارة۔ (المنار)

قَلِيْلًا صفت مؤمن کی بھی ہو سکتی ہے مفہوم اس صورت میں یہ ہوگا کہ ان میں سے بہت ہی تھوڑے ایمان لاتے ہیں، چنانچہ بعض اکابر ادھر بھی گئے ہیں:۔

ای لایؤمنون منهم الا قلیل (ابن جریر عن قتادة) قال بعضهم فقليل من يؤمن منهم (ابن کثیر)

اور امام رازیؒ نے ترجیح اسی آخری ترکیب کو دی ہے لیکن محاورہ میں قلیل کا استعمال نفی مطلق کے موقع پر بھی ہوتا ہے:

یجوز ان تکون القلّة بمعنی العدم (کشاف) وقلیل یعبّر عن النفی، نحو قلّما یفعل فلان .....

وعلی ذلک حمل قوله قلیلا ما تؤمنون۔ (راغب)

معنی اس صورت میں یہ ہوں گے کہ یہ ایمان سے بالکل خالی ہیں:۔

والمعنی فیه نفی جمیعه (ابن جریر) معناه لایؤمنون اصلا لا قلیلا ولا کثیرا (کبیر)

۳۰۸ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یعنی قرآن۔ لِمَا مَعَهُمْ یعنی توریت۔ قرآن مجید نے اپنی یہ صفت جا بجا بیان کی ہے اور اس پر زور دیا ہے کہ بجائے خود صادق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پچھلی آسمانی کتابوں کا مصدّق بھی ہے اور ان پچھلی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور توریت ہے۔

۳۰۹ (کہ عنقریب آخری نبی نجات دہندہ کا ظہور ہونے والا ہے)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سے مراد اس سیاق میں مشرکین عرب ہیں۔ ایک نو مسلم انصاری صحابی سے روایت ہے کہ زمانۂ قبل اسلام میں جب ہم یہود کو شکست دیتے تھے تو وہ کہا کرتے کہ اچھا ٹھہر جاؤ عنقریب ایک نبی ظاہر ہونے والا ہے، ہم اُس کے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ؗ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

پھر جب ان کے پاس وہ آگیا جس کو (خوب) پہچانتے تھے تو اسی سے کفر کر بیٹھے ۳۱۰ے سو اللہ کی لعنت ہو کافروں پر ۳۱۱ے

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ

بُری ہے وہ چیز جس کے عوض میں انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے ۳۱۲ے کہ انکار کرتے ہیں اس (کلام) کا جو اللہ نے

يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ

نازل کیا ہے (محض) اس ضد پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل (خاص) نازل کیا ۳۱۳ے

ساتھ ہو کر تمھیں قتل کر کے رکھ دیں گے۔ سیرۃ ابن ہشام۔ باب خبر انذار یہود برسول اللہ۔ یہود نے حضرت عیسیٰؑ کے مسیح ماننے سے تو انکار کر دیا تھا لیکن اس کے بعد سے برابر ایک مسیح (نجات دہندہ) کے ظہور کے منتظر رہا کرتے تھے اور اس کا ذکر مشرکین مکہ سے اکثر کرتے رہتے تھے۔ یَسْتَفْتِحُوْنَ یہاں یَفْتَحُوْنَ کے مرادف قرار دیا گیا ہے اور فتح کے معنی عربی میں خبر دینے اور بیان کرنے کے ہیں۔

ای یعرفون المشرکین ان نبیا یبعث منھم (روح) ای یفتحون علیھم ویعرفونھم (کشاف)

لیکن یَسْتَفْتِحُوْنَ اپنے عام اور مشہور معنی کے لحاظ سے مفہوم طلب فتح و نصرت کا رکھتا ہے اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ اس کے قبل یہود اس پیغمبرِ منجی کا واسطہ دلا دلا کر خدا سے مدد چاہا کرتے تھے اور ائمۂ تفسیر کی اکثریت نے یہی مراد لی ہے۔

ای یستنصرون اللہ ببعثۃ محمد علیہ السلام (راغب) یستنصرون بمحمد والقرآن (ابن عباس)

ومعنی الاستفتاح الاستنصار (ابن جریر) یسئلون الفتح والنصرۃ (کبیر)

۳۱۰ے (اور اسی سے انکار کرنے لگے کہ یہ کلام کلامِ الٰہی ہے یا یہ شخص اللہ کا پیمبر ہے)

مَا عَرَفُوْا سے مراد قرآن بھی ہو سکتا ہے اور ذاتِ رسالت بھی۔ حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

کنی عن الکتب ویحتمل ان یراد بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ (روح)

مقصد یہ ہے کہ یہود اس آخری نبی اور اس کی نبوت کی علامتوں سے اپنے ہی دینی نوشتوں کے ذریعہ سے خوب واقف ہو چکے تھے نبی کا ظہور بالکل اچانک اور ان کے علم و واقفیتِ سابق کے بغیر نہیں ہوا، انجیل یوحنا میں حضرت یحییٰ نبی (انجیلی زبان میں ان کا نام یہی یوحنا ہی ہے) کے ظہور کا حال یوں درج ہے کہ:۔

"جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لیوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں لیں انھوں نے اس سے کہا، پھر تو ہے کون؟" (یوحنا۔ ۱: ۱۹۔ ۲۰)

اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ یہود صدیوں سے ایک جانے بوجھے ہوئے نبی ("وہ نبی") کے انتظار میں تھے۔

۳۱۱ے یعنی اُن پر جو جان بوجھ کر عناد و تعصب کی راہ سے کفر و انکار کر بیٹھیں۔

لعنت پر ایک حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾

سو وہ مستحق ہوگئے غضب پر غضب کے ۳۱۴ اور کافروں کے لئے عذاب ذلّت والا ہے ۳۱۵

۳۱۲ یعنی کیسی بُری وہ حالت ہے جسے اختیار کرکے وہ بزعم خود اپنی جانوں کو عقوبتِ آخرت سے چھڑانا چاہتے ہیں۔

بئس ما باعوا به حظ انفسهم ای اختاروا الکفر و بذلوا انفسهم للنار (معالم)

اشتراء لغاتِ اضداد میں سے ہے، خریدنے اور فروخت کرنے دونوں کے معنی میں آتا ہے یہاں بیچنے کے معنی میں ہے۔

الاشتراء ههنا بمعنی البیع (معالم) معناه باعوا (بیضاوی)

۳۱۳ قرآن نے اس حقیقت کو بار بار واضح کیا ہے کہ یہود کا یہ کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس غصہ و عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرد کو کیوں مل رہی ہے؟ ـــــ وہی نسلیت یا قومیت کی ملعون عصبیت جو آج تک دنیا پر مسلط ہے، امام رازی کی خداداد نظر قرآن حکیم کے عجیب عجیب نکتوں تک پہنچ جاتی ہے، اس مقام پر لکھا ہے کہ یہود تو نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھنے لگے تھے ایک عرب کو اس کا مدعی پاکر اُلٹے اُس کے رشک و حسد پر اُسے محمول کرنے لگے۔

ظنوا ان هذا الفضل العظیم بالنبوة المنتظرة یحصل فی قومهم فلما وجد ولا فی العرب حملهم ذلک علی البغی والحسد (کبیر)

کیا حد ہے اس ضد اور نفسانیت کی کہ نسلی اور خاندانی عصبیت کی بنا پر تصدیقِ نبوت تک سے انکار کردیا!

مِنْ فَضْلِهٖ میں فضل سے مراد فضل وحی ہے۔

یعنی الوحی (بیضاوی)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ احوال موہوبہ محض فضل و مشیت کے تابع ہوتے ہیں کسب و اکتساب کو دخل نہیں۔

۳۱۴ غَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ کی تفسیر میں بہت سے قول نقل ہوئے ہیں ان میں سے ایک قول تابعی حضرات سے منقول یہ ہے کہ یہود کی پہلی مغضوبیت کی بنیاد رسالتِ عیسوی سے انکار ہے اور دوسری مغضوبیت کی بنیاد رسالتِ محمدی سے انکار۔

وهو قول الحسن والشعبی وعکرمة وابی العالیة وقتادة (کبیر)

یہ تفسیر بھی اپنی جگہ پر خوب ہے لیکن اس سے بھی زیادہ دلنشین اور بے تکلف قول یہ ہے کہ پہلا عتاب اُن کے بالکل بلاوجہ اور دلیلِ واضح و صریح کی موجودگی میں انکار و تکذیبِ رسالت پر ہے اور دوسرا عتاب ان کے جذباتِ حسد و عناد پر۔

لانهم کفروا بنبی الحق وبغوا علیه (کشاف) للکفر والحسد (بیضاوی) بما اقترفوا من الکفر والحسد (روح)

یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مقصودِ کلام غضب کی تکرار نہیں بلکہ اس کی تاکید اور اشدیت ہے۔

المراد به تاکید الغضب وتکثیره (کبیر) ویحتمل ان یراد الترادف والتکاثر لاغضبان (روح)

غَضَبٍ کا صیغہ نکرہ شدتِ غضب کے اظہار کے لئے ہے۔

والتنکیر للتعظیم (جلالین)

۳۱۵ عذابِ الٰہی کا نہایت شدید و الیم ہونا تو ظاہر ہی ہے پھر اس عذاب کی بنا چونکہ یہود کی قومی و نسلی

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَا أُنزِلَ عَلَيْنَا

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اُس (کلام) پر جو اللہ نے نازل کیا ہے ۳۱۶ تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر تو ایمان رکھتے

وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَاءَهُ ۖ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ

ہیں جو ہمارے اوپر نازل ہوا ہے ۳۱۷ اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اس سے کفر کرتے ہیں ۳۱۸ حالانکہ وہ (خود بھی) حق ہے اور اس کی بھی تصدیق

فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے ۳۱۹ آپ کہئے کہ اچھا تم اس کے قبل انبیاء کو کیوں قتل کرتے رہے ہو اگر تم (واقعی) ایمان والے تھے ۳۲۰

عصبیت ہے اس مناسبت سے یہ سزا ان کے غرور کو توڑنے والی، ان کی توہین و ذلت و رسوائی کو بڑھانے والی بھی ہوگی۔

۳۱۶ (اپنے بندہ اور آخری رسول محمدؐ پر)

ذکر وہی بنی اسرائیل کا چل رہا ہے، اور انھیں سے کہا جاتا تھا کہ آخری کتابِ الٰہی قرآن پر ایمان لاؤ۔

۳۱۷ (اور وہ ہمارے لئے بالکل کافی ہے)

أُنزِلَ عَلَيْنَا۔ ہمارے اوپر یعنی ہماری قوم و نسل کے اوپر نازل ہوا ہے، یہود کا کہنا یہ تھا کہ ہم کوئی سلسلۂ وحی یا سلسلۂ رسالت کے منکر تھوڑے ہی ہیں، ہم بھی تو مومن ہی ہیں، اور اپنی نسلِ اسرائیل کے انبیاء کے قائل ہیں۔

۳۱۸ یہ یہود کے قول کا تتمہ ہے۔ قرآن مجید نے یہ اضافہ کر دیا کہ یہ لوگ اپنے اسرائیلی سلسلہ کے باہر کسی اور نبوت کے قائل نہیں۔ ایک عرصہ تک الطافِ الٰہی و عنایاتِ خداوندی کے موردِ خاص بنے رہنے، اور اسی نسل کے اندر انبیاء کے مسلسل پیدا ہوتے رہنے سے بنی اسرائیل کے دل میں یہ جم گیا تھا کہ نبوت خاندانِ اسرائیل کے باہر جا ہی نہیں سکتی۔

وَرَاءَهُ۔ وراء یہاں علاوہ کے معنی میں ہے بالاتر کے معنی میں نہیں۔

یرید سواہ (معانی)

۳۱۹ هُوَ الْحَقُّ۔ ضمیر هُوَ قرآن کی جانب ہے۔ اس کی حقّانیت دلائل سے ثابت اور شواہد سے روشن ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ۔ یعنی وہ تصدیق کرتا ہے توریت اور انبیاء بنی اسرائیل کے دوسرے صحیفوں کی، قرآن یہاں یہود کے مقابلہ میں اپنے دو وصف بیان کر رہا ہے:

۱۔ ایک یہ کہ وہ فی نفسہٖ حق ہے، اس کی حقّانیت دلائل سے ثابت ہے۔ اس لئے اس پر ایمان لانا بجائے خود واجب ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ توریت اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں کے ساتھ اس کا تعلق منافات کا نہیں، اس کا رشتہ اتحاد و تصدیق کا ہے۔

۳۲۰ تیسرا جواب قرآن مجید نے یہود کو یہ دیا کہ خود یہی دعویٰ تمہارا کب صحیح ہے کہ تم اپنی قوم کے انبیاء پر ایمان رکھتے ہو؟ ایمان و تصدیق الگ رہی، تم نے خود اس زور و شور سے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت و عداوت پر اس حد تک اُتر آئے کہ انھیں قتل تک کر ڈالا، اور تمہاری قومی تاریخ کے تو صفحات رنگین ہیں انبیاء کے خون سے، اسرائیل اور قتل انبیاء پر مفصل حاشیے رکوع (۷) کے ذیل میں گزر چکے، بائبل کے اُن حوالوں کے علاوہ ایک حوالہ

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

اور بالیقین موسیٰ تمہارے پاس کھلے ہوئے نشان لے کر آئے ۳۲۱ اس پر بھی تو تم نے ان کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا ۳۲۲

وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ

اور تم تو ہو ہی ظالم ۳۲۳ اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا تھا ۳۲۴

اور ملاحظہ ہو نحمیاہ نبیؑ کے زمانہ میں خود اکابر بنی اسرائیل اپنے باپ دادوں سے متعلق مناجات میں کہتے ہیں :-

"وہ نافرمانبردار نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انھوں نے تیری شریعت کو اپنی پشت کے پیچھے پھینکا اور تیرے نبیوں کو جو اُن کو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھر لائیں قتل کیا اور انھوں نے اپنے کاموں سے تجھے غصہ دلایا۔" (نحمیاہ ۹: ۲۵ و ۲۶)

ظاہر ہے کہ قرآن کے مخاطبین معاصرین نے انبیاء پیشین کو قتل نہیں کیا تھا بلکہ موجودہ اسرائیلیوں کے اسلاف نے انھیں قتل کیا تھا لیکن چونکہ موجودہ نسل یہود بھی اپنے بزرگوں کی اس روش سے متفق تھی اسے بھی جرم قتل کا مرتکب قرار دیا گیا

ولیس الذین خوطبوا بالقتل ھم القتلۃ انما قتل الانبیاء اسلافھم الذین مضوا فتولوھم علی ذلک ورضوبہ فنسب القتل الیھم (معانی القرآن)

۳۲۱ (اور ان کھلے ہوئے نشانوں کا اثر طبعی طور پر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تم خدا کی طاعت اور نبی کی طاعت میں دل سے لگ جاتے)

حضرت موسیٰؑ کے کھلے ہوئے نشانات اور معجزات جو فرعون کے مقابلہ میں تھے عصاء، ید بیضاء وغیرہ، وہ تو مشہور ہی ہیں لیکن جَآءَكُمْ سے اشارہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ معجزاتِ موسوی خود بنی اسرائیل کے لئے بھی تھے۔

۳۲۲ (پرستش کے لئے اور بہ طور معبود)

وحذف مفعول۔ ای اتخذ تموہ الٰھاً (المنار)

یہ ہے تمہارے دعوئے توحید کی حقیقت! گوسالہ پرستی پر حاشیے رکوع (۶) کے ذیل میں گزر چکے۔

ثُمَّ یہاں محض تاخرِ زمانی کے لئے نہیں بلکہ یہ بھی ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ تم کیسی پستی میں اُتر گئے اور یہ کہ تم نے یہ اس وقت کیا جب تمہارے پاس دلائل و شواہد اس کے خلاف پہنچ چکے تھے۔

ثم للتراخی فی الرتبۃ والدلالۃ علی نہایۃ قبح ما صنعوا (ابو سعود) کلمۃ ثم للاستبعاد (روح)

مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی حضرت موسیٰؑ کی عارضی غیر حاضری کے زمانہ میں، حضرت موسیٰؑ اس وقت اپنی قوم کو میدان میں چھوڑ کر بہ شمول منتخب افراد کے ہمراہ کوہ طور پر گئے ہوئے تھے تفصیلات رکوع (۶) کے ذیل میں گزر چکیں۔

۳۲۳ (اپنے حق میں)

یعنی تمہاری تاریخ گواہ ہے کہ تم اپنی جانوں پر، اپنی روحوں پر ظلم کرنے کے کیسے عادی ہو! یہ گویا جواباتِ سابق کا تتمہ ہے اسرائیلیوں سے ارشاد ہو رہا ہے کہ اور زمانوں میں تو خیر تم نے جو کچھ کیا خیر وہ تو کیا ہی، شرک تو تم نے خود حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانہ میں شروع کر دیا اور شرک بھی کیسا جلی، گوسالہ پرستی! اور وہ بھی پیمبرؑ کی صرف

خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ

(کہ) جو کچھ ہم نے تمھیں دیا ہے ۳۲۵ اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو ۳۲۶ یہ (اس وقت) بولے تھے کہ (ہاں) ہم نے سن لیا

وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ

مگر ہم نے مانا نہیں ۳۲۷ اور ان کے دلوں میں گوسالہ ان کے کفر سابق کے سبب پیوست ہو گیا تھا ۳۲۸

چند روزہ غیر حاضری کے زمانہ میں بھی تمھارے لئے مانع نہ ان کے لائے ہوئے نشانات اور دلائل ہو سکے اور نہ یہ امر کہ وہ تو ابھی زندہ سلامت موجود ہیں، غرض کہ نافرمانیوں میں دلیر تم آج سے نہیں مدت دراز سے ہو!

**۳۲۴** (تمھارے اوپر نزولِ شریعت کے وقت)

طور و رفعِ طور وغیرہ پر حاشیہ رکوع (۷) میں گزر چکا۔

**۳۲۵** یعنی یہ احکام و شرائع جو ابھی تم پر نازل کئے ہیں۔

**۳۲۶** (ان احکام و شرائع کو گوشِ دل سے سنو اور ان پر عمل کرو)

ای اقبلوا ما سمعتم (بحر) قال الماتریدی معنی اسمعوا اقیموا (بحر) وقیل اعملوا (بحر) المعنی اسمعوا اطیعوا...... انما المراد اعملوا ما سمعتم والتزموہ (قرطبی)

**۳۲۷** آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ لفظ عَصَيْنَا (ہم نے نہیں مانا) ان لوگوں نے زبان سے بھی کہا ہو۔

قال ابو مسلم وجائز ان یکون المعنی سمعوہ وتلقوہ بالعصیان فیعبّر عن ذلک بالقول وان لم یقولوہ (کبیر) قال اھل المعانی انّھم لم یقولوا ھذا بألسنتھم ولکن لما سمعوہ وتلقوہ بالعصیان نُسب ذلک الی القول اتّساعًا۔ (معالم)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ قول یہاں بطور مجاز، زبان حال کے معنی میں استعمال ہوا ہے نُطقِ لسانی مراد نہیں۔

قیل یعبّر بالقول للشیٔ عما یفھم به من حاله وان لم یکن نطق (بحر) وقیل المعنی قالوا بلسان القال سمعنا وبلسان الحال عصینا (روح) اختلف ھل صدر منھم ھذا اللفظ حقیقة باللسان نطقا او یکونوا فعلوا فعلا کان قام مقام القول فیکون مجازا۔ (قرطبی)

چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی اس لئے گویا زبانِ حال سے یہی کہہ رہے تھے۔ (تھانویؒ)

قول کا لفظ یوں بھی عربی زبان میں نہایت وسیع معنی رکھتا ہے زبان سے ادا کرنا اس کے لئے لازمی نہیں راغب نے اپنے مفردات میں خود قرآن ہی سے اس کے متعدد معنی نقل کئے ہیں اور چوتھے نمبر پر اس کے معنی دلالتِ حالی لکھے ہیں اور ایک شاعر کا مصرعہ بھی سند میں پیش کیا ہے۔

یقال للدلالة علی الشیٔ نحو قول الشاعر امتلأ الحوضُ وقال قطنی۔

اور تاج العروس میں سیبویہ وغیرہ ائمۂ لغت کے حوالہ سے اس سے بھی زیادہ وسیع معنی بیان کئے گئے ہیں، لیکن اگر ان سرکشوں اور گستاخوں نے یہ لفظ زبان سے بھی نکالا ہو تو ان کی عادی اور مسلسل نافرمانیوں کو دیکھتے ہوئے،

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ

آپ کہہ دیجئے (کیسی) بُری ہے وہ بات جس کا حکم تمہارا ایمان تمہیں دے رہا ہے اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو۔ ۳۲۹ آپ

لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ

کہہ دیجئے کہ اگر عالمِ آخرت خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسروں کو چھوڑ کر ۳۳۰

تعجب ذرا سا بھی نہیں، یرمیاہ نبیؑ کے صحیفہ میں ایک تصریح بالکل اس سے ملتی جلتی، گو ایک دوسرے موقع کے لئے موجود ہی ہے:

"خداوند یوں کہتا ہے کہ راہوں پر کھڑے ہو اور دیکھو اور پرانے رستوں کی بابت پوچھو کہ بھلی راہ کہاں ہے
اسی پر چلو کہ تم اپنے جیون میں آرام پاؤ گے، پر انھوں نے کہا کہ ہم اس میں نہ چلیں گے، اور میں نے تمہارے اوپر
نگہبان بھی ٹھہرائے اور کہا کہ نرسنگے کی آواز سنو۔ پر انھوں نے کہا کہ ہم نہ سنیں گے"۔ (یرمیاہ ۶: ۱۶، ۱۷)

۳۲۸ چنانچہ بیل کے تقدس کا اعتقاد اسرائیلی قوم میں مدت دراز تک قائم رہا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ صفحہ ۲۵۳)

العجل سے مراد حُبّ العجل ہے، اور اس قسم کا حذف مضاف کلام عرب میں عام ہے۔

اراد حبّ العجل ومثل ھذا ممّا تحذفہ العرب کثیر۔ (معانی)

اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ۔ مراد یہ ہے کہ گوسالہ کی محبت ان کے رگ رگ میں رچ گئی تھی، جیسے پانی رگ رگ میں پہنچکر جزو بدن بن جاتا ہے۔ اشربوا یہ استعارہ شدید محبت اور شدید نفرت دونوں کو قعوں پر اہل عرب کی زبان میں عام ہے۔

وان من عادتھم اذا ارادوا العبارۃ عن مخامرۃ حبّ او بغض استعاروا الی اسم الشراب لانّہ ھو ابلغ انجاع فی البدن (راغب)

یا یہ استعارہ رنگ سے ہو کر وہ کبھی کپڑے کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔

کما یدخل الثوب الصبغ (کشاف) کما یتداخل الصبغ الثوب والشراب اعماق البدن۔ (بیضاوی)

الْعِجْلَ۔ چنانچہ یہاں بھی العجل سے مراد حُبّ العجل لی گئی ہے۔

ای حبّ العجل ..... المعنی جعلت قلوبھم تشربہ وھذا تشبیہ ومجاز عبارۃ عن تمکن امر العجل فی قلوبھم۔ (قرطبی)

بِكُفْرِهِمْ۔ ب سببیہ ہے یعنی ان کے کفر کے باعث، نتیجۂ کفر کے طور پر۔

الباء للسبب ای الحامل لھم علی عبادۃ العجل ھو کفرھم السابق (بحر)

۳۲۹ حجتِ الزامی ہے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں، گویا قرآن کا کہنا یہ ہے کہ دعویٰ تو یہ کہ ہم صاحبِ ایمان و توحید ہیں، اور عمل یہ کہ گوسالہ کی تنزیہ و تقدیس میں لگے ہوئے ہو! کیا اچھا تمہارا ایمان ہے!

۳۳۰ (جیسا کہ تم اپنے زعم و پندار میں سمجھ رہے ہو۔)

بنی اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کا ابتدائی خاکہ تو خود موجودہ توریت میں موجود ہے مثلاً:

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو" (استثناء ۱۴: ۱) "تو خداوند اپنے خدا کے لئے مقدس قوم ہے" اور

# فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

تو موت کی آرزو کر دیکھو اگر تم سچے ہو ۳۳۱

خداوند نے تجھ کو چن لیا تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لئے خاص قوم ہو" (استثناء ۱۴: ۲) رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کر کے اس درجہ تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی اور کو الطافِ خداوندی کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے، نجاتِ اخروی کو اپنا مخصوص حق سمجھنے لگے تھے اپنے کو خدا کا محبوب اور خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے اور خیال یہ جما لیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ایک ناقابلِ تبدیل طور پر ہے وہ دنیا جہان میں کسی اور کے ساتھ نہیں نسلی تقدیس کی یہی وبا ہے جو ہندوستان میں برہمنیت کے نام سے جلوہ گر ہے۔

الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ ۔ مراد ہے جنت اور نجات کا حاصل ہونا۔

دُوْنِ النَّاسِ ۔ ناس سے مراد نوعِ انسانی ہے اور دون الناس سے مراد اپنی قوم و نسل کی خصوصیت کا اظہار اور اس میں دوسروں کی شرکت سے انکار ہے۔

دون هنا لفظ يستعمل للاختصاص وقطع الشركة۔ (بحر)

۳۳۱ (اپنے اس دعوے میں کہ ہماری نجات یقینی اور قطعی ہے)

قدیم مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ یہی مطالبہ یہود بھی تو الٹ کر مسلمانوں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کر سکتے تھے اور پھر اپنے اپنے مذاق پر اس کے جوابات دیئے ہیں لیکن حقیقتاً یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کوئی مسلمان کب اپنی نجات کو محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہو جانے سے یقینی سمجھتا ہے؟ مسلمان تو خود ہی ایمان اور عملِ صالح کے دہرے دہرے اختیاری معیار سے ڈرتا، لرزتا رہتا ہے کہ دیکھا چاہیئے حشر میں اس امتحان میں پورا اترتا بھی ہے یا نہیں؟ یہ اطمینان اور یہ زعم کہ چونکہ ہم فلاں گھرانے فلاں خاندان میں پیدا ہو گئے ہیں اس لئے بغیر کسی جہد و اکتساب کے ہماری نجات تو یقینی ہو چکی یہ عقیدہ اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص تھا، مسلمان اس کے قریب ہی کب گیا، جو یہ سوال اس پر عائد ہو سکے؟ اسلام تو اس نسلی تقدس اور اضطراری نجات کے عین مٹانے کے لئے ہے مسلمان تو خود ہی کہتا ہے کہ مجھے اپنا انجام نہیں معلوم میں ایمان اور اطاعت کی راہ اپنی طرف سے اختیار کر کے آگے فضلِ خداوندی کا منتظر ہوں مسلمان کے سامنے اس سوال کو پیش کرنے کا کوئی محل ہی نہیں، پھر یہ بھی ہے کہ یہ مطالبہ ہر اسرائیلی سے، ہر زمانہ کے لئے ہے بھی نہیں اس کا دائرہ صرف انھیں معاند یہود کے ساتھ مخصوص ہے جو رسول اللہ علیہ وسلم کے معاصر تھے، اور سارے شواہد کے بعد بھی آپ کے منکر تھے۔

وهذا خاص بالمعاصرين له صلى الله عليه وسلم۔ (روح)

یہ حدیث خود صحابی حضرات سے مروی ہے بلکہ حضرت ابن عمرؓ نے تو اپنے زمانہ کے ایک گستاخ یہودی کے جواب میں یہ مضمون بڑی حدت و شدت کے ساتھ ادا کیا ہے۔

توهم هذا الكلب اللعين الجاهل ان هذا لكل يهودي او لليهود في كل وقت لا انما هو لاولئك الذين كانوا يعاندون ويجحدون نبوة النبي صلى الله عليه وسلم بعد ان عرفوا۔ (روح)

وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٩٥﴾

لیکن وہ اس کی آرزو ہرگز کبھی بھی نہ کریں گے بہ سبب ان (اعمالِ بد) کے جو یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں ۳۳۲ے

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ

اور اللہ ظالموں سے (خوب) واقف ہے ۳۳۳ے اور آپ انھیں زندگی پر حریص سب لوگوں سے بڑھ کر پائیں گے ۳۳۴ے (یہاں)

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ

تک کہ) مشرکوں سے بھی بڑھ کر ۳۳۵ے ان میں سے ایک ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار (ہزار) برس کی عمر پائے ۳۳۶ے

ابن القیم نے آیت کا ایک دوسرا ہی مفہوم لیا ہے' ان کا کہنا ہے کہ یہ مطالبہ اس کا نہیں کہ یہود خود اپنے حق میں موت کی دعا کریں' بلکہ اس کا ہے کہ اگر رسول ؐ کو کاذب تسلیم کرتے ہیں تو کاذب کے حق میں بددعا کریں' لیکن اس کی ہمت انھیں نہ پڑی اور وہ رسول کے حق میں بددعا نہ کر سکے اور یہ ایک مزید و نمایاں ثبوت اعجازِ محمدیؐ کا ہے۔

فلیس المراد تمنّوا لانفسکم خاصۃ بل اُدعوا بالموت وتمنوہ للمبطل وھذا ابلغ فی اقامۃ الحجۃ و برھان الصدق واسلم من ان یعارضوا بقولھم فتمنّوہ انتم ایضًا ان کنتم محقّین فی دعواکم انکم اھل الجنۃ (تفسیر القیم ص ۱۳۶) ولا وقع من احد منھم فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم البتۃ وذٰلک لعلمھم بصحۃ نبوّتہ وصدقہ وکفرھم بہ حسدًا وبغیًا ولا یتمنّونہ لعدا یعلمھم انھم ھم الکاذبون وھذا القول ھو الذی نختارہ۔ (ایضًا)

اور سیرۃ ابن ہشام میں خود ایک روایت بھی اس کے متعلق موجود ہے جس میں آیت کے بعد اس کی شرح یوں درج ہے:

| | |
|---|---|
| ای اُدعوا بالموت علی ای الفریقین اکذب عند اللہ۔ | موت کی دعا کرو اس فریق کے لئے جو اللہ کے یہاں باطل پر ہو۔ |

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ موت کی محبت' خواہ طبعی ہو یا عقلی' ولایت کی علامتوں میں سے ہے۔

۳۳۲ے یعنی ان کا دل خود چور ہے' اُن کا ضمیر ان پر ملامت کر رہا ہے' لقائے رب کا کوئی ولولہ کوئی جذبہ ان میں باقی ہی کہاں ہے جو یہ عالمِ آخرت کی تمنّا کر سکیں۔

اَبَدًا۔ احتجاج بالا جب صرف یہود معاصرینِ رسول ؐ کے ساتھ مخصوص ہو گیا تو اَبَدًا کے معنی بھی لازمی طور پر یہ ہوں گے کہ یہ اپنی زندگی بھر ایسا نہ کریں گے۔

ویعنی بالابد ھنا ما یستقبل من زمان اعمارھم (بحر) ای لن یتمنّوہ ما عاشوا (روح)

۳۳۳ے یعنی اُن لوگوں سے جو اپنے ہتھکنڈوں سے خود اپنے حق میں ظلم کرتے رہتے ہیں۔

الظلم ھو تجاوز ما حد اللہ۔ (بحر)

۳۳۴ے یعنی اس زندگی پر حریص جو پلیدی اور گندگی سے لبریز ہے' زندگی سے محبت اور موت سے وحشت

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع ۱۱

حالانکہ اگر اتنی عمر وہ پا بھی جائے تو یہ (امر) اسے عذاب سے تو نہیں بچا سکتا ۳۳۷ اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے (خوب) دیکھ رہا ہے ۳۳۸

تو ایک حد تک طبعی ہے اور ان طبعی حدود کے اندر ہرگز اسلام میں کوئی ملامت نہیں لیکن یہود کا جذبۂ حبِّ دنیا طبعی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، دنیا پرستی مقصود بالذات بن گئی تھی اور روحانیت کا ذوق بالکل مردہ ہو چکا تھا ہندوستان میں بھی جن قوموں نے جنتر منتر وغیرہ ظاہری رسوم میں غلو اور ان پر تکیہ کر رکھا ہے ان کے دل بھی ذوقِ آخرت سے یکسر محروم ہو چکے ہیں اور یہود کی حبِّ دُنیا و حبِّ مال آج بھی ضرب المثل ہے، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں تالمود وغیرہ کے حوالہ سے اس مضمون کے متعدد قول نقل ہوئے ہیں کہ دنیوی زندگی بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے معصیت گوارا کر لینا چاہئے لیکن موت نہ گوارا کرنا چاہئے، وقس علی ھذا۔ ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۳۳۵ (جو بیچارے کتاب آسمانی اور پیام انبیاء کی دولتوں سے محروم ہیں)
مطلب یہ ہے کہ مشرکین تو سرے سے اُخروی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں وہ اگر ادھر سے غیر ملتفت ہو کر اپنا مرکزِ توجہ و محورِ زندگی اسی مادی زندگی کو بنائے رکھیں تو کچھ ایسا حیرت انگیز نہیں، غضب تو یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور پیمبرانہ ہدایتوں کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دنیا سے لپٹے ہوئے ہیں۔
ومشرکوا العرب لایعرفون الا ھذہ الحیاۃ ولا علم لھم من الآخرۃ (قرطبی) وذھب الحسن الی ان الذین اشرکوا ومشرکوا العرب خصوا بذلک لانھم لایؤمنوا البعث فھم یتمنون طول العمر (قرطبی)
ایک عجیب بات اسی سلسلہ میں یہ ہے کہ تطویلِ عمر کے جو عجیب عجیب نظریئے آج یورپ میں قائم ہو رہے ہیں اور طرح طرح کی تدبیریں اور نسخے اس کے لئے ایجاد ہو رہے ہیں، ان میں پیش پیش جو ڈاکٹر اور اہل سائنس ہیں، وہ عموماً یہودی ہیں۔

۳۳۶ اَحَدُهُمْ۔ ضمیر ھُمْ کا مرجع یہود ہیں۔
ای یودّ احد الیھود (ابن کثیر عن السدی) والضمیر فی احدھم یعود فی ھذا القول علی الیھود (قرطبی)
بعض نے مرجع الذین اشرکوا کو ٹھہرایا ہے لیکن سیاق قولِ اول کو صاف ترجیح دے رہا ہے۔
ای یودّ احد الیھود کما یدل علیہ نظم السیاق (ابن کثیر)
اَلْفَ سَنَةٍ۔ لازمی نہیں ہے کہ اَلف سے مراد پورے دس سَو کا عدد ہو، اَلف مطلق انتہائی طولِ عمر کے اظہار کے لئے بھی آسکتا ہے۔
وخص الألف بالذکر لأنھا نھایۃ العقد فی الحساب (قرطبی) ومعنی ألف سنۃ الکثرۃ یشمل من یودّ ان لا یموت ابداً۔ (روح)

۳۳۷ بالفرض اس قدر طویل زندگی حاصل بھی ہو گئی تو کیا نتیجہ؟ بہر حال خاتمہ تو ایک روز اس طویل سے طویل زندگی کا بھی ہوتا ہے اور پھر اُسی مواخذۂ اُخروی کا سامنا ہو۔ ایسی لایعنی اور لغو تمناؤں کے پھیر میں پڑے رہنا کسی دیندار شخص کے لئے ممکن ہی کیونکر ہے۔
ہٖ ضمیر اسی اَحَد کی جانب ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔

# قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

آپ کہہ دیجئے کہ جو کوئی جبریل کا مخالف ہے ۳۳۹ تو انھوں نے اس (قرآن) کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اُتارا ہے ۳۴۰

قیل بہ ضمیر الاحد للمتقدم (قرطبی) الضمیر لاحد ھم (بیضاوی)

**۳۳۸** (اور ہر طرح کی جزا و سزا پر قادر ہے۔)

خدا تعالیٰ کی ہمہ بینی، و ہمہ دانی، ہمہ توانی کا استحضار انسان کو راہ راست پر قائم رکھنے کے باب میں اکسیر ہے، انسان غفلت و معصیت کی طرف قدم اسی وقت رکھتا ہے جب ذہن سے ایک حاضر و ناظر حاکم کا تصور غائب ہوتا ہے یہی راز ہے اس کا کہ قرآن مجید میں اللہ کی صفات ہمہ بینی، ہمہ دانی کی یاد دہانی اس کثرت و تکرار کے ساتھ ہوئی ہے۔

بَصِیْرٌ۔ یعنی اس پر ہر خفی سے خفی چیز روشن ہے۔

وقال العلماء وصف اللہ عزّ وجلّ نفسہ بانہ بصیر علی معنی عالم بخفیات الامور والبصیر فی کلام العرب العالم بالشئ الخبیر بہ (قرطبی)

ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ وہ بصارت آفریں ہے، مخلوق میں قوتِ بصارت اس نے رکھی ہے، اور مخلوق کو صاحبِ بصر اس نے پیدا کیا ہے۔

قیل وصف تعالیٰ نفسہ بانّہ بصیر علی معنی جاعل الاشیاء المبصرۃ ذوات البصائر ای مدرکۃ للمبصرات بما خلق لھا من الآلۃ المدرکۃ والقوۃ فاللہ بصیر بعبادہ ای جاعل عبادہ مبصرین (قرطبی)

**۳۳۹** جِبْرِیْل۔ اسلامی اصطلاح میں ایک فرشتۂ اعظم کا نام ہے، ان کے سپرد ایک اہم خدمت انبیائے کرام تک وحی الٰہی کے پہنچانے کی ہے، انسان بڑے سے بڑا مقبول انسان بھی بشر ہی ہوتا ہے اور جسم خاکی ہی رکھتا ہے اس کے محدود اور کثیف خاکی قویٰ علی العموم اتنا تحمّل نہیں رکھتے کہ براہ راست تجلّیاتِ لاہوتی کی شعاعوں کو قبول کر سکیں، اس غرض کے لئے عموماً لطیف الجسم نور کے بنے ہوئے فرشتوں سے سفارت و توسّط کا کام لیا جاتا ہے، یہود بھی وجود ملائکہ کے قائل تھے بلکہ خود حضرت جبرئیل کو بھی ایک فرشتۂ اعظم مانتے تھے، اور ان کا ذکر توریت میں آج تک موجود ہے لیکن اپنی نادانی سے خیال یہ جما لیا تھا کہ وہ ایک فرشتۂ عذاب ہیں، ان کا کام وحی لانا نہیں عذاب لانا ہے، اور وحی لانا تو کام ایک دوسرے فرشتہ حضرت میکائیل کا ہے اپنے ان مفروضہ مقدمات و مسلّمات کے بعد وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر معترض ہوتے تھے کہ یہ نئے مدعیٔ نبوت اپنی وحی کے سلسلہ میں نام حضرت جبرئیل کا کیوں لاتے ہیں ــــ یہاں تعرض یہود کی اسی غلط اندیشی سے کیا جا رہا ہے، موجودہ توریت میں بار بار ذکر ایک ایسے فرشتہ کا آتا ہے "جو لوگوں کو مارتا تھا" (۲ سموئیل۔ ۲۴: ۱۶ و ۱۷) اور علمائے یہود نے اس سے مراد فرشتۂ جبرئیل ہی سے رکھی تھی، آج بھی یہود حضرت جبرئیل کو حضرت میکائیل کا ہمسر و ہم پلّہ نہیں، اُن سے کمتر ہی سمجھتے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵ صفحہ ۵۴۱)

**۳۴۰** (پھر اُن سے مخالفت و عداوت و بدگمانی کے کیا معنی؟)

انّہ ضمیر جبرئیل کی طرف ہے۔

الھاء الاولیٰ یعود علی جبریل۔ (کبیر)

نَزَّلَہٗ ضمیر قرآن کی جانب ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ

(وہ) تصدیق کرنے والا ہے اس (کلام) کا جو اس کے قبل سے ہے اور ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے ۳۴۱

عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ

جو کوئی مخالف ہو اللہ کا یا اس کے فرشتوں کا یا اس کے پیغمبروں کا یا جبریل کا یا میکائیل کا ۳۴۲ ہے تو اللہ

عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

(بھی) بالیقین مخالف ہے ایسے کافروں کا ۳۴۳

والثانیۃ علی القراٰن وھذا قول ابن عباس واکثر اھل العلم۔ (کبیر)

عَلٰى قَلْبِكَ۔ امام رازیؒ نے یہاں سوال یہ پیدا کیا ہے کہ قرآن تو محمدؐ پر اُترا ہے پھر یہاں قلب محمدؐ کی تخصیص کیوں کی ہے اور پھر جواب یہ دیا ہے کہ اس تنزیل کی محافظت تو آپ کے قلب ہی نے کی اس لئے اس کا تخصیصی ذکر ہوا۔ یہاں یہود کے جہل کو رفع کیا گیا، اور بتایا گیا کہ حضرت جبرئیل کے نام سے چڑھنا کیا معنی وہ تو خدا کے ایک معتمد سفیر ہیں، اور خدمتِ سفارت پر مامور۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اِذن کے معنی لغت میں علاوہ اجازت کے، حکم یا ارشاد کے بھی ہیں۔

ویکون باذنہ ای بامرہ (لسان) ویکون الامر اذنًا۔ (تاج)

چنانچہ یہاں بھی اذن اللہ سے مراد اللہ کا حکم یا ارشاد ہی ہے۔

ای بامر اللہ (جلالین) فالاظھر بامر اللہ (کبیر) ای بامرہ (بیضاوی) ای باذن اللہ۔ (معالم)

۳۴۱ یہاں کلام مجید نے اپنے تین وصف متعین طور پر بیان کئے :۔
ایک یہ کہ وہ گزشتہ انبیاء اور سابق صحیفوں کی تصدیق کرتا ہے، اس کا پیام کوئی نرالا اور انوکھا نہیں وہی توحید کا پرانا سبق ہے جو سارے سلسلۂ وحی میں مشترک رہا ہے دوسرے یہ کہ وہ فی نفسہٖ ایک ہدایت نامہ ہے، تیسرے یہ کہ وہ اہلِ ایمان کے حق میں مایۂ بشارت ہے۔

۳۴۲ یعنی جو شخص بھی اللہ یا اس کے پیمبروں یا اس کے فرشتوں خصوصًا جبرئیل و میکائیل جیسے مقرب فرشتوں سے وہ رشتہ و تعلق قائم رکھتا ہے جو ان کے مرتبۂ واجب کے منافی ہے۔

عَدُوٌّ عربی میں بطور مصدر بھی آتا ہے اور اس معنی میں یہ ضد ہے دوستی و محبت کا۔

منافاۃ الالتئام۔ (راغب)

دوسرا استعمال اس کا بحیثیت اسم کے ہے جیسا کہ یہاں ہے اور اس معنی میں مقابل ہے دوست کے۔

العدوّ للشخص ضد الصدیق۔ (روح)

اور اس کے مفہوم میں محض عداوت نہیں بلکہ انکار، نافرمانی، حق ناشناسی، غرض دوستی و محبت کے منافی جو کچھ ہے سب داخل ہے

میکال یا میکائیل، جبرئیل کی طرح ایک فرشتۂ مقرب کا نام ہے۔ مشہور روایتوں میں آیا ہے کہ ان کے ذمہ مخلوق کی رزق رسانی اور بارش ہے گویا جس طرح احکامِ تشریعی کے لئے واسطۂ خاص حضرت جبرئیل ہیں، احکامِ تکوینی کے لئے واسطۂ خاص میکائیل ہیں، پہلے کا تعلق خاص بارگاہِ اُلوہیت سے ہے، دوسرے کا کارگاہِ ربوبیت سے۔ اور دونوں کا نام ایک ساتھ عطف کرکے لاتے میں اشارہ یہ ہے کہ دونوں اپنی اصل فطرت وحقیقت کے لحاظ سے ایک ہی ہیں۔

لان فطرتھما واحدۃ وحقیقتھما واحدۃ۔ (المنار)

توریت میں ان کا ذکر بڑے تعظیمی لہجہ میں موجود ہے۔ یہود نے اپنے سارے تعلقات انھیں سے جوڑ رکھے تھے، اور انھیں اپنا قومی محافظ سمجھتے تھے۔ یہود نے جب حضرت جبرئیل کے حاملِ وحی ہونے سے انکار کیا تھا (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۳۹) تو اپنی عداوت ورغبت کا اظہار انھیں دو فرشتوں کا نام لے کر کیا تھا، اسی مناسبت سے قرآنی جواب میں بھی تصریح انھیں دونوں کے نام کی ہے اور ساتھ ہی جیسا کہ قرآن مجید کا عمومی دستور کسی واقعۂ خاص سے ایک ہدایتِ عام بیان کر دینے کا ہے، ایک عام قاعدہ تمام معصوموں (یعنی انبیاء وملائکہ) سے متعلق بیان کر دیا گیا۔

و۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ حرف واو ہمیشہ عطف وجمع ہی کے لئے نہیں آتا بلکہ "یا" کے معنی بھی کبھی دیتا ہے۔

تکون بمعنی اَوْ (قاموس)

چنانچہ یہاں چاروں جگہ اسی معنی میں ہے یعنی ان اسماء کا مجموعہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جو کوئی ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہے۔

یعنی من کان عدوًّا لأحد ھٰؤلاء انہ عدو للکل (معالم) یعنی من کان عدوًّا لأحد من ھٰؤلاء (کبیر) التنبیہ علی ان معاداۃ الواحد والکل سواء فی الکفر۔ (بیضاوی)

یہاں یہ سوال نہ پیدا ہو کہ جبرئیل ومیکائیل تو عمومی لفظ ملٰئکۃ میں داخل ہی ہو چکے پھر اب ان کے الگ ذکر کی کیا ضرورت تھی، نام کے ساتھ یہ ذکر محض تفصیل وتخصیص کے لئے ہے، جیسا کہ سورۂ رحمٰن میں فاکھۃ کا عمومی لفظ لاکر پھر اس کے دو افراد نخل ورمان کا ذکر خصوصی کیا گیا ہے۔ عطف خاص کا عام پر عربی ادب کا ایک مسلّم قاعدہ ہے۔

تفصیلا وتخصیصا لقولہ تعالٰی فیھما فاکھۃ ونخل ورمان فخص النخل والرمان بذکر مع دخولھما فی ذکر الفاکھۃ للتفصیل (معالم) فھذا من باب عطف الخاص علی العام کانھما دخلا فی الملائکۃ فی عموم الرسل ثم خصصا بالذکر (ابن کثیر) وخص الملکان بالذکر لفضلھما کانھما من جنس آخر اذ التغایر فی الوصف ینزل منزلۃ التغایر فی الذات (مدارک) افراد الملکین بالذکر لفضلھما۔ (بیضاوی)

آیت سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ جبرئیل ومیکائیل ساری جماعتِ ملائکہ میں افضل ہیں۔

۳۴۳ یعنی ایسا ہر شخص کافر سمجھا جائے گا اور اس کے ساتھ معاملہ وہ کیا جائے گا جو دشمن کے ساتھ دشمن کرتا ہے۔

فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ معصوموں کی اطاعت عین اطاعت الٰہی اور معصوموں کی مخالفت عین مخالفتِ حق ہے، فرشتہ کی اطاعت توریت میں بھی عین اطاعت رب بتائی گئی ہے:۔

"دیکھ میں ایک فرشتہ تیرے آگے بھیجتا ہوں کہ راہ میں تیرا نگہبان ہو اور تجھے اس جگہ جو میں نے تیار کی ہے لاوے۔ اس کے آگے ہوشیار رہ اور اس کا کہا مان، اسے مت چڑھا کیونکہ وہ تیری خطا نہ بخشے گا کہ میرا نام اس میں ہے، پر اگر تو سچ مچ

وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ‌ۚ وَمَا يَكۡفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الۡفٰسِقُوۡنَ (۹۹)

اور بالیقین ہم نے آپ پر روشن نشان اتارے ہیں ۳۴۴ اور ان سے کوئی (بھی) انکار نہیں کرتا بجز نافرمانوں کے ۳۴۵ کیا یہ کہ

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوۡا عَهۡدًا نَّبَذَهٗ فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ‌ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (۱۰۰)

انھوں نے جب کبھی بھی کوئی عہد کیا ہے ۳۴۶ تو انھیں میں سے کسی (نہ کسی) جماعت نے اسے توڑ ہی پھینکا ہے ۳۴۷ اصل یہ ہے کہ ان میں سے زیادہ تر تو اعتقاد ہی نہیں رکھتے ۳۴۸

اس کا کہا مانے اور سب جو میں کہتا ہوں کرے تو میں تیرے دشمنوں کا دشمن اور تیرے بیریوں کا بیری ہوں گا۔" (خروج ۲۳: ۲۰ و ۲۱)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خلفائے راشدینؓ و اصحابِ رسولؐ جن کے فضائل گویا تواتر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں، ان کی مخالفت و عداوت بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ سے عداوت رکھنا خود اللہ تعالیٰ کی عداوت کا سبب بن جاتا ہے۔

۳۴۴ (آپ کی صداقت اور نبوت کے)

یعنی ایک تو قرآن خود ایک معجزہ ہے، پھر دوسرے تائیدی شواہد و دلائل، بشارت و معجزات۔

اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہو سکتی ہیں، یہ جن بے نظیر تعلیمات کی حامل ہیں، ان پر نظر کر کے بعض محققین نے یہی پہلو اختیار کیا ہے۔

الاظهر ان المراد آيات الفرقان الذي لا ياتي بمثله الجن والانس (کبیر)

لیکن لفظ آیات ہے عام و وسیع، اس لئے دوسرے بزرگوں نے سارے اقوال کو جمع کر کے لکھا ہے کہ اس سے مراد بھی کچھ ہے، قرآن بھی، معجزات بھی، کتبِ سابقہ پر اطلاع بھی، معجزات سابقہ پر اطلاع بھی، قرآن کا قانونی نظام بھی، وقس علی هذا۔

اي القرآن والمعجزات المقرونة بالتحدي عما خفي واخفي في الكتب السابقة او الشرائع والفرائض او مجموع كل ما تقدم (بحر) وقال بعضهم لا يمتنع ان يكون المراد من الآيات البينات القرآن مع سائر الدلائل ...... وسائر المعجزات۔ (کبیر)۔

یہود جو اپنے پیغمبروں کے معجزات کی روایتوں کے خوب عادی ہو چکے تھے، بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ یہ کیسے نبی ہیں؟ نبی ہیں تو کوئی نشانی تو دکھلائیں، جواب ملا کہ تم ایک نشانی کو کہتے ہو، ہم تو انھیں متعدد نشانات (بہ صیغۂ جمع) دے چکے ہیں، اور وہ بھی دقیق و خفی نہیں، نمایاں و روشن، سب کو نظر آجانے والے۔

۳۴۵ یعنی ان شواہدِ صریح اور دلائلِ روشن سے انکار کوئی فطرتِ سلیم والا تو کرتا نہیں، بس وہی لوگ کرتے ہیں جو قانونِ الٰہی کو توڑتے رہنے اور شرائعِ ربانی سے بغاوت کرنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ انجیل میں یہود کی قساوتِ قلب کے سلسلہ میں ہے کہ مسیحؑ نے "اگرچہ ان کے سامنے اتنے معجزے دکھائے تو بھی وہ اُس پر ایمان نہ لائے۔" (یوحنا ۱۲: ۳۷)

الۡفٰسِقُوۡنَ سے مراد اس سیاق میں الکافرون ہی ہیں، اس لئے کہ ذکر یہاں فسقِ اعمال کا نہیں، فسقِ عقائد کا ہے۔

المراد بالفاسقين هنا الكافرون لانه كفر آيات الله تعالىٰ هو من باب فسق العقائد فليس من باب فسق الافعال (بحر) وكني بالفسق هنا من الكفر لان الفسق خروج الانسان عما حد له (بحر)

۳۴۶ (خدا یا اس کے کسی نبی کی اطاعت کا)

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

اور جب ان کے پاس پیمبر اللہ کی طرف سے آئے تصدیق کرتے ہوئے اس (کتاب) کی جو اُن کے پاس موجود

فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ

تھی ۳۴۹ تو (ان) اہل کتاب میں سے ایک جماعت نے کتاب اللہ کو اپنی پشت کے پیچھے پھینک مارا ۳۵۰ گویا وہ

كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿١٠١﴾

جانتے ہی (بوجھتے) نہیں ۳۵۱

ذکر انھیں عصیان پیشہ یہود کا چل رہا ہے۔

۳۴۷ بنی اسرائیل کی تاریخ، غداری، عہد شکنی، نافرمانی، سرکشی کی ایک مسلسل تاریخ ہے، توریت کے صفحے، انجیل کے ورق، قدیم مؤرخین یہود جوزیفس وغیرہ کے دفتر سب اسی سرگزشت سے لبریز ہیں، اور یہاں اشارہ ان کی اسی قومی خصوصیت کی جانب ہے۔

فَرِيقٌ کا ترجمہ اس سیاق میں ٹکڑی یا ٹولی ہی سے ہو سکتا ہے، فریق اسم جنس ہے جس سے واحد نہیں آتا اور اس کا اطلاق قلیل، کثیر دونوں پر ہوتا ہے۔

اسم جنس لا واحد له يقع على القليل والكثير۔ (بحر)

۳۴۸ (اپنے کسی عہد و پیمانِ اطاعت کا)

لَا يُؤْمِنُونَ۔ یعنی ایفائے عہد تو الگ رہا، ان میں سے بہتیرے اسی کے قائل نہیں ملتے کہ کبھی اطاعت کا عہد و پیمان کیا بھی تھا، گویا لا یؤمنون میں ایمان اپنے اصطلاحی معنی میں نہیں لفظی معنی میں ہے۔

لَا يُؤْمِنُونَ کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ایمان کو ایمانِ اصطلاحی کے مفہوم میں لیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ لوگ خود اپنی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان کب رکھتے ہیں۔

لا يصدقون بكتابهم (كبير) لا يؤمنون بالتوراة (مدارك)

ماحصل دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ وہ پاسِ عہد خصوصاً آخری نبی کی تصدیق کرنے کے عہد کا اپنے کو پابند ہی کب سمجھتے ہیں۔ یہ مسئلہ بھی سمجھ لیا جائے کہ کتاب الٰہی کی کسی ایک آیت سے بھی انکار یا اللہ کے لئے ہوئے عہدوں میں سے کسی ایک عہد سے روگردانی انسان کو کافر بنانے کے لئے کافی ہے۔

واجمع المسلمون على ان من كفر باٰية من كتاب الله او نقض عهد الله الذى اخذه على عباده فى كتبه فهو كافر (بحر)

۳۴۹ یعنی کتاب توریت کی۔ یہود کو بتایا یہی جا رہا ہے کہ نئے نبی جو آئے ہیں یہ تمھاری کتاب اور اس کے دین کو مٹانے کے لئے نہیں، یہ تو عین اُسے تازگی بخشنے، اُسے حیاتِ تازہ دینے کے لئے آئے ہیں۔

# وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ

اور (یہ لوگ) پیچھے لگ گئے ۳۵۲ اُس (علم) کے جو سلیمانؑ کی بادشاہت میں شیطان پڑھا کرتے تھے ۳۵۳

رَسُوْلٌ۔ یہ کسی پیمبر کے آنے کا ذکر ہے؟ جائز ہے کہ رسولؐ کو مطلق رسول کے معنی میں لیا جائے اور مراد اس سے کوئی بھی پیمبر سمجھا جائے یہ معنی بھی یہود کی عام عادتِ تکذیبِ انبیاء ورسل کے لحاظ سے صحیح ہیں لیکن ترجیح اس پہلو کو ہے کہ یہاں مراد رسولِ موعود، نبی آخر الزماںؐ ہیں اور رَسُوْلٌ کا صیغہ نکرہ میں ہونا اس کے منافی نہیں صیغۂ نکرہ جس طرح تعمیم کے لئے آتا ہے، عظمت وتکریم کے لئے بھی آتا ہے اور وہی یہاں مقصود ہے۔

والتنکیر للتعظیم (ابو سعود) التنکیر للتفخیم (روح)

۳۵۰ نَبَذَ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ۔ کتاب کے پسِ پشت پھینک دینے سے محاورہ میں مراد اس کی طرف سے بے التفاتی برتنے اور اس کی عملی مخالفت کرنے سے ہے۔

ای طرحوہ بقلۃ اعتداد ھم بہ (راغب) مثل بما یرمی بہ وراء الظھر استغناءً عنہ وقلۃ الالتفات الیہ (کشاف)

کتاب اللہ سے یہاں کیا مراد ہے؟ یہود کی بے التفاتی اور بے تعلقی قرآن سے تو ظاہر ہی تھی اور یہ کوئی بات ایسی ذکر کرنے اور توجہ دلانے کی نہ تھی غضب یہ تھا کہ قرآن وصاحب قرآن سے مخالفت کی دُھن میں خود اپنی کتاب آسمانی کی طرف سے بھی وہ بے پروا اور بے تعلق ہو گئے تھے کہ آخر توریت میں بھی تو نبی آخر الزماں کی بابت پیشین گوئیاں اُن کی علامتیں اور اُن پر ایمان لانے کی تاکید درج تھی اس لئے محققین نے ترجیح اس کو دی ہے کہ کتاب اللہ سے یہاں مراد توریت ہے۔

یعنی التوراۃ (کشاف) قیل انہ القراٰن وقیل انہ التوراۃ وھذا ھو الاقرب (کبیر) یعنی بقولہ کتاب اللہ التوراۃ (ابن جریر عن السدی)

۳۵۱ (کہ اس کتاب کے اندر بھی کوئی مضمون اس قسم کا موجود ہے)

لا یعلمون ما فی التوراۃ من الامر باتباع محمد صلے اللہ علیہ وسلم وتصدیقہ (ابن جریر)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ تشبیہ آیت میں یہود کی ان لوگوں سے دی گئی ہے جو جاہل ہیں گو یادانستہ وہ حرکت جاہلوں کی سی کر رہے تھے۔

تشبیہ بمن لا یعلم اذ فعلہ فعل الجاھل فیجیٔ من اللفظ انھم کفروا علی علم (قرطبی)

۳۵۲ ذکر اسرائیلیوں کا چل رہا ہے اور وہی یہاں مراد ہیں۔ خصوصاً یہودِ عرب۔

وَاتَّبَعُوْا تصدیق کرنے لگے، پیروی کرنے لگے۔

ای اقتدوا بہ اماما (بحر) وَاتَّبَعُوْا کا عطف نَبَذَ فَرِيْقٌ پر ہے۔

۳۵۳ یعنی بجائے اس کے کہ وحی الٰہی کا اتباع اور رسولِ برحقؐ کی تصدیق کرتے یہ یہود تو ایک اور ہی علم کے پیچھے لگ گئے اور وہ علم بھی کس کا؟ شیطان کا، قرآن مجید وقت کی اہم ترین قوم یہود کے پَتّرے تو کھول ہی رہا ہے اب اس نے ان کی فردِ جرم میں ایک اس عنوان کا بھی اضافہ کیا کہ یہ لوگ وحی الٰہی کی اتباع کے بجائے ایک دوسرے سفلی علم میں پڑے ہوئے ہیں اور اس ضمن میں قرآن مجید بعض اہم تاریخی اور دینی حقیقتوں کو زبردست روشنی میں لے آیا ہے۔

اس علم سے مراد فنِ سحر ہے فنونِ سحر وکہانت میں یہود کی مہارتِ تامّہ تاریخ میں مسلّم چلی آرہی ہے اُن کے اکابر و مشاہیر

اس کا ذکر برابر کرتے آئے ہیں بلکہ اکثر فخر کے ساتھ، قرآن مجید نے اکثر تاریخی حقائق کی طرح ان کی تفصیلات میں گئے بغیر یہاں صرف اشارہ کر دینا کافی سمجھا ہے، یہود کا یہ شوق ان کی قدیم تاریخ سے قطع نظر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی قائم تھا آکسفورڈ یونیورسٹی کا یہودی النسل پروفیسر مارگولیس آنجہانی جس کی اسلام دشمنی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اپنی انگریزی سیرۃ رسول میں معاصر یہودِ عرب کے سلسلہ میں لکھتا ہے :۔

"یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدان جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے"۔ (ص ۱۸۹)

اصل عبارت اور مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اور ہمارے مفسرین نے اس سحر پرستی میں یہود عہد سلیمانی اور یہود عہد محمدیؐ کو شریک سمجھا ہے۔

قیل یہود زمان سلیمان وقیل یہود زماننا واللفظ فیھم عام ولجمیعھم محتمل وقد کان الکل منھم متبعا لھذا الباطل (ابن العربی) وقد روی فیہ عن ابن عباس ان المراد بہ الیھود الذین کانوا فی زمن سلیمان بن داؤدؑ وفی زمن النبیؐ (بصائر)

شَیٰطِیْنُ جب صیغۂ جمع میں ہے تو ظاہر ہے کہ ابلیس تو یہاں مراد ہو نہیں سکتا اہلِ لغت اور اکابر اہلِ تفسیر دونوں کی رائے ہے کہ شیطانوں سے مراد یہاں خبیث و سرکش قسم کے جنات ہیں جو حضرت سلیمانؑ کے تابع تھے۔

ای مردۃ الجن (راغب) المراد شیاطین الجن وھو قول الاکثرین (کبیر)

والمتبادر من الشیاطین مردۃ الجنّ وھو قول الاکثرین (روح) وھم المتمردون من الجنّ (الوسیط)

لیکن خود جنات کیا ہیں؟ جنات سے مراد وہ صاحبِ شعور و ارادہ ہستیاں ہیں جن کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور جو انسانی آنکھ کو عموماً اور عادۃً نظر نہیں آتے انسان کی طرح وہ بھی مکلّف ہیں، گو یہ ضرور نہیں کہ ان کی شریعت بھی جزئیات و تفصیلات کے لحاظ سے شریعتِ انسانی ہو، اس مخلوق کا وجود دلائلِ نقلی و شواہد سے پوری طرح ثابت ہے اور اس وجود سے انکار پر کوئی ایک دلیل بھی قائم نہیں نہ عقلاً نہ نقلاً۔

بعض کا قول ہے کہ مراد شیاطینِ انس ہیں یعنی وہ سرکش و خبیث انسان جو حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت میں پیش پیش تھے اور آپ پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے، اور سحر و کہانت کے بھی ماہر تھے، فرقۂ معتزلہ کے متکلمین کا رجحان اسی معنی کی طرف ہے

قیل شیاطین الانس وھو قول المتکلمین من المعتزلۃ (کبیر)

راغب لغوی نے بھی معنی جس طرح سرکش جنات کے دیئے ہیں اسی طرح سرکش انسانوں کے بھی جائز رکھے ہیں۔

فھم مردۃ الجنّ ویصح ان یکونوا ھم مردۃ الانس ایضاً۔ (راغب)

اور مفسرین اہلِ سنت نے بھی گنجائش دونوں کے لئے رکھی ہے۔

الشیاطین من الجنّ والانس اومنھما (بیضاوی) وھو یرید شیاطین الجن والانس (جصاص)

اگر انسان ہی مراد لئے جائیں یعنی دربار سلیمانی کے باغی سردار و سرغنہ تو ان کا مفصل ذکر عہدِ عتیق کے بعض صحیفوں میں ملتا ہے، ملاحظہ ہو سلاطین باب ۱۱ و ۱۲۔

عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ یعنی آپ کے عہدِ حکومت میں علیٰ صرف استعلاء کے لئے نہیں بلکہ مصاحبت تعلیل وغیرہ کے علاوہ ظرفیت کے لئے بھی آتا ہے اور فی کے معنی میں اس کا استعمال عام ہے، ابن جریر جو عربیت کے بھی امام ہیں لکھ گئے ہیں

والعرب تضع فی موضع علی وعلی فی موضع فی — اور عرب "فی" کا استعمال "علی" کی جگہ کرتے ہیں اور "علی" کا "فی" کے موقع پر۔

# وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

اور سلیمانؑ نے (تو کبھی) کفر نہیں کیا ۳۵۴؎

اور الاتقان (سیوطی) اور مغنی اللبیب میں بھی اس معنی کی تصریح ہے، اور اہلِ لغت لکھتے ہیں :—

کان ذلک علی عهد فلان ای فی عهد فلان (تاج)     فلان واقعه علی عهد فلان هو العنی فی عهد فلان۔

خود قرآن مجید میں بھی علی ایک دوسری جگہ صاف فِیْ کے معنی میں آیا ہے :—

ودخل المدينة على حين غفلة (القصص - ۱۵)

اور فراء نحوی نے کہا ہے کہ ایسے موقع پر "فی" اور "علی" مرادف ہوتے ہیں۔

تصلح "فی" و "علی" فی مثل هذا الموضع (معانی)

چنانچہ یہاں بھی اہلِ تحقیق نے یہی معنی لئے ہیں کہ سلیمانؑ کے عہد حکومت میں

ای علی عهد سليمان (ابن کثیر) ای فی عهد ملکه (ابو سعود) ای فی عهد سليمان (ابن جریر)

ای فی ملکه وعهده (معالم) ای فی ملکه (مغنی)

سُلَيْمٰن سلیمان بن داؤدؑ (۹۹۰ھ ق م تا ۹۳۰ھ ق م) اسرائیلی سلسلہ کے ایک نامور پیمبر گزرے ہیں اور اپنے والد ماجد ہی کی طرح ایک بڑے تاجدار بھی، شام و فلسطین کے علاوہ آپ کے حدودِ حکومت مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک، اور مغرب میں سرحدِ مصر تک وسیع تھے، آپ کی سلطنت کی عظمت و شوکت پر دوست و دشمن سب کو اتفاق ہے، اسلام میں اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی و اخلاقی مرتبہ یعنی نبوت و رسالت کے ساتھ جس طرح فقر و مسکنت جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح دولت و امارت، حکومت و ریاست بھی، اسلام کا خدا غریبوں اور امیروں، ناداروں اور زرداروں سب کا یکساں خدا ہے۔

آیت کا حاصل یہ ہے کہ جس طرح ان یہود کے آبا و اجداد عہدِ سلیمانی میں شیطانی شغلوں (سحر و کہانت) میں لگے رہے اسی طرح آج خود بھی بجائے نبی کی ہدایتوں پر چلنے کے انھیں سفلی شغلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

۳۵۴؎ (جیسا کہ ناسپاسوں کافروں، افترا پردازوں نے مشہور کر رکھا ہے)

آیت کے اس مقام پر پہنچکر مومن کے قلب میں ذرا کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ یہ کہنے والی کون سی بات تھی جو قرآن نے فرما دی؟ جب حضرت سلیمان پیغمبرِ برحق تھے، تو یہ کھلی ہوئی اور موٹی سی بات ہے کہ آپ شائبۂ کفر و شبۂ کفر سے بمراحل دور تھے، پیمبر کے حق میں یہ نازل ہونا کہ وہ کفر سے بری تھے، یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی، جیسے کسی ملک کا بادشاہ یہ فرمان جاری کرکے رعایا کو بتائے کہ ہمارا نائب السلطنت باغی و غدار نہیں ہے، کھٹک بجا ہے، قرآن مجید کبھی کوئی چھوٹا سا بیان بھی بے ضرورت نہیں دیتا، مگر یہاں قرآن کو اس اعلان و اعلام کی ضرورت تھی؟ اس ضرورت کا علم سادہ دل مسلمان کو کیا ہو سکتا ہے؟ اس کا علم تو اسی ہمہ بیں و ہمہ داں پروردگار ہی کو ہو سکتا تھا، سلیمانؑ کو پیمبر ماننے والی دو قومیں مسلمانوں سے پہلے بھی ہو چکی ہیں، یہ دونوں وہی ہیں جو اہلِ کتاب کہلاتی ہیں یعنی یہود و نصاریٰ، ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت و پیمبری کے قائل ہیں اور دوسری طرف ان کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیے ہیں، یہاں تک کہ کفر و شرک بھی، کہ اللہ کی عدالت میں کوئی جرم اس سے بڑھ کر یا اس کے برابر بھی سنگین تصور میں نہیں آ سکتا۔

یہودی قصص وحکایات اور مسیحی آثار وروایات کی کتابوں کو چھوڑیئے، خاص الخاص بائبل یعنی عہد عتیق کے صحائف، جن پر یہود ونصاریٰ دونوں کا ایمان ہے، انھیں ملاحظہ فرمالیجئے کہ اس مجموعہ میں آج تک کیا تصریحات لکھی چلی آرہی ہیں:۔

"جب سلیمان بوڑھا ہوا تو اس کی جوروؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کیا اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف سے کامل نہ تھا۔" (۱۔سلاطین۔ ۱۱: ۴، ۶، ۱۰)

یعنی محض غفلت یا عدم اعتناء کی بنا پر عملی کوتاہی یا عصیان نہیں، صریح بدعقیدگی، توحید ہی کی طرف سے بےیقینی ـــ آگے اور ملاحظہ ہو:۔

"سو ازبس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا، اس لئے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اُسے حکم دیا تھا کہ وہ اجنبی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا۔" (۱سلاطین ۱۱: ۹، ۱۰)

معاذ اللہ، خدا کا پیمبر اور کفر وشرک میں مبتلا! چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی، دنیا سیکڑوں سال تک، ہزار ڈیڑھ ہزار سال تک انھیں یہودیانہ تحریفات واختراعات کا شکار ہو کر اس موحد اعظم کو نعوذ باللہ کافر ومشرک سمجھتی رہی، یہاں تک کہ قرآن آیا، جو ہر قوم، ہر زمانہ کے سچے پیمبروں کی عزت وناموس کا محافظ ہے اور اس نے آکر یقین نہ کرنے والی دنیا کے سامنے آکر اعلان کیا کہ سلیمانؑ کو معاذ اللہ کافر کہتے ہو! وہ تو کفر کے قریب تک نہیں گئے تھے، قرآن کی صدائے حق فضا میں بلند ہو کر خاموش ہوگئی، جن کے کان تھے، انھوں نے سنا، دنیا اپنے کاروبار میں لگی رہی، پھنسی رہی، بائبل والے بائبل کی پرستاری نہ چھوڑی، یہاں تک کہ تیرہ ساڑھے تیرہ $13\frac{1}{2}$ صدیاں اور گزر گئیں اور اب قدرت حق کا اعجاز دیکھئے کہ اب جو محققانہ وفاضلانہ کتب جوامع وحاویات بائبل ہی کے پرستاروں کے قلم سے نکل رہی اور شائع ہو رہی ہیں، وہ تائید اور تصدیق، بائبل کی الزام دہی کی نہیں، قرآن کے جواب صفائی کی کر رہی ہیں! انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، برطانوی کاوش وتحقیق کا لُبِّ لباب ہوتا ہے اس کے سب سے آخری اڈیشن میں مقالہ زیر عنوان سلیمان نکال کر دیکھئے، صاف یہ مضمون ملے گا:

"سلیمان خدائے واحد کے مخلص پرستار تھے۔" (جلد ۲۰ صفحہ ۹۵۲ طبع چہاردہم)

انسائیکلوپیڈیا ببلیکا، خاص مسیحی فضلاء اور پرستاران بائبل کی تحقیق وتدقیق کا ثمرہ ہے، اس میں تو یہاں تک ہے کہ بائبل کی جو آیتیں ابھی اوپر نقل ہو چکی ہیں، ان کا حوالہ دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کو بڑھائی گئی ہیں، الحاقی ہیں! اور پھر لکھا ہے:۔

"یہ تو غالباً صحیح ہے کہ سلیمان کی بیویاں متعدد تھیں اسرائیلی بھی اور غیر اسرائیلی بھی لیکن انھوں نے نہ تو سب کے لئے قربان گاہیں ہی تیار کرائیں، اور نہ خود خدائے واحد کی پرستش کے ساتھ اپنی بیویوں کے دیوتاؤں کی پرستش کا تجربہ ہونے دیا۔" (کالم ۴۶۸۹)

خیر یہ اعجاز تو کلام الٰہی کا تھا، اس سے بڑھ کر بھی ہوتا تو ہو سکتا تھا، لیکن محدود وناقص عقل اور زمان ومکان سے مقید علم رکھنے والے بندوں نے اپنی ایمانی فراست واشراقیت سے جو کام کر دکھایا، وہ بھی اعجاز سے کچھ کم نہیں، امام المفسرین امام ابن جریرؒ آج کے نہیں آج سے ایک ہزار سال قبل کے شخص ہیں اور یہود ونصاریٰ کی کتابوں سے شاید زیادہ واقف بھی نہ ہوں، آج نہیں اس وقت اپنی تفسیر میں ابن اسحاق کے حوالہ سے یہ روایت بصراحت درج کر گئے ہیں کہ: آیت بالا یہود ہی کے گندے عقائد اور افتراء کے رد میں نازل ہوئی ہے جو آپس میں کہتے تھے کہ:۔

قال بعض احبار الیھود الا تعجبون من محمد یزعم ابن داؤد کان نبیا واللہ ما کان

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ

البتہ شیطان (ہی) کفر کیا کرتے تھے ۳۵۵ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ۳۵۶

الأساحرا فأنزل الله فى ذلك من قولهم وما كفر سليمان . الخ

"ان نئے مدعی نبوت کی نادانی تو دیکھو کہ ابن داؤد کو یہ نبی اللہ کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں حالانکہ خدا وہ تو بس ایک ساحر تھا، اللہ نے انھیں کے قول کے رد میں یہ آیت نازل کی ہے۔ وما کفر سلیمٰن ؟"

اور جصاص رازی نے اس قسم کی روایت میں حوالہ علاوہ محمد بن اسحاق کے ابن عباس صحابی اور سعید بن جبیر اور قتادہ تابعین کا بھی دیا ہے۔

۳۵۵ (اور اُسے منسوب حضرتؑ کی جانب کر دیتے تھے)

ان شیطانوں کی (خواہ وہ جن ہوں یا انس) ایک شیطنت یہ بھی تھی کہ اپنی کافرانہ، ساحرانہ حرکتوں کی نسبت حضرت سلیمانؑ کی جانب کر دیتے تھے اور شہرت یہ دیتے تھے کہ ہم تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں ان کی رضامندی بلکہ ان کے اشارہ ہی سے کر رہے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے نبی برحق کو ان گندگیوں سے کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ قرآن کریم نے کس کس طرح دوسری اُمتوں کے انبیاء کی طرف سے صفائی پیش کی ہے، انھیں کے اُمتیوں کے لگائے ہوئے داغ دھبے ان کی پاک سیرتوں سے دور کئے ہیں اور یہ ناشکرگزار قومیں ہیں کہ اُلٹی قرآن ہی کی دشمنی پر تلی ہوئی ہیں۔

۳۵۶ السِّحْرَ. اس کی حقیقت، ماہیت اور اقسام اور اس کے شرعی احکام پر بعض قدیم مفسرین نے بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے خصوصاً ابوبکر جصاص رازی اور امام فخرالدین اور ابن کثیر نے یہاں مختصراً اتنا جان لینا کافی ہے کہ یہ نام ہے اسباب خفی مثلاً تاثیر کواکب، استعانت شیاطین الجن وغیرہ سے کام لے کر تصرفات عجیب کرنے کا خاص خاص منتروں اور ریاضتوں سے یہ فن حاصل ہو جاتا ہے مشرک جاہل قوموں میں اس کا رواج پہلے بھی زور و شور سے رہ چکا ہے اور اب بھی ہے، شریعت اسلام نے اسے حرام قرار دیا۔

يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ. يُعَلِّمُوْنَ کا فاعل شیاطین ہونا ظاہر ہی ہے اکثر مفسرین نے اسی ترکیب کو اختیار کیا ہے، اور یہاں بھی ترجمہ اسی لحاظ سے کیا گیا، لیکن اس کی بھی گنجائش ہے کہ فاعل بجائے شیاطین کے یہود ہی کو قرار دیا جائے یعنی فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کو معنی اس صورت میں بجائے ماضی کے حال کے ہو جائیں گے یعنی یہ یہود لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے ہیں سحر کی۔ سحر و کہانت تاریخ بنی اسرائیل کا ایک مسلم و ناقابل انکار جزو ہے خود عہد عتیق کے صحیفوں میں اس کی شہادت موجود ہے:

"انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا، اور فال گیری اور جادوگری کی ...... ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نپٹ غصہ ہوا، اور اپنی نظر سے انھیں گرا کر دور کر دیا"۔ (۲۔ سلاطین ۱۷: ۱۷ و ۲۱)

مفسر ابوبکر جصاص رازی نے "احکام القرآن" میں عبارت کی ترکیب سب سے مختلف قرار دے کر معنی بھی قدرتاً سب سے الگ لئے ہیں اس پر بھی وہ پہنچے اسی نتیجہ پر ہیں جس پر اور اہل سنّت پہنچے ہوئے ہیں آیت کا مفہوم یہ لکھا ہے کہ اللہ نے اپنے دو فرشتے بھیجے کہ وہ دنیا پر سحر کا مفہوم روشن کر دیں اور یہ بتا دیں کہ یہ تمام تر کذب و کفر ہے جس سے بچنا واجب ہے۔

معناه والله اعلم ان الله ارسل الملكين ليبينا للناس معانی السحر ويعلموهم انه كفر و

# وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ط

اور (وہ پیچھے لگ گئے) ۳۵۷ اُس (علم) کے بھی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اتارا گیا تھا ۳۵۸

کذب وتمویۃ لاحقیقۃ لہ حتی یجتنبوہ لما بیّن اللہ علی السنۃ رسلہ سائر المحظورات والمحرمات لیجتنبوہ

۳۵۷ بیان انھیں عرب یہود کا چل رہا ہے۔

واؤ عاطفہ کبھی فقرہ کو فقرہ سے جوڑتا ہے کبھی لفظ کو لفظ سے اور کبھی فقرہ کو لفظ سے۔ یہاں فقرہ وما انزل علی الملکین کا عطف ہے فقرۂ ماقبل ما تتلوا الشیٰطین پر اور دونوں فقرے تابع ہیں فعل اتبعوا کے گویا تقدیر کلام یوں ہے۔ واتبعوا ما تتلوا الشیٰطین۔ الخ۔ واتبعوا ما انزل علی الملکین۔ بعض نے ما انزل الخ کا عطف السحر پر مانا ہے۔ عطف علی السحر وقیل ھو عطف علی ما تتلوا ای واتبعوا ما انزل (کشاف۔ مدارک) معنی میں کوئی بڑا فرق اس سے بھی نہیں پڑتا، اور حاصل دونوں صورتوں میں ایک ہی رہتا ہے۔

قرآن جو کچھ بھی کہتا ہے حقِ مطلق کی شانِ بے نیازی کے ساتھ بالکل بے خوف اور بے دھڑک کہتا ہے اُسے کسی خارجی سہارے کی تلاش نہیں ہوتی، خارجی سہارے از خود اس کی طرف کھنچتے چلے آتے ہیں، اسے اپنی جگہ پر اطمینانِ کامل ہے کہ اس کے کسی بیان میں تردید کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ تاہم تشکیک و تردد بھی کسی طالبِ حق کو نہیں پیدا ہوگا۔ یہودِ عرب کا طویل فردِ جرم اوپر سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ ابھی ابھی ذکر ان کے فلسطینی سحر کا آچکا ہے (سلیمان علیہ السلام نبی بادشاہ فلسطین کے تھے، ان کے عہد کا سحر فلسطینی ہی سحر کہا جائے گا) اب وہ یہ بھی کہے ڈالتا ہے کہ یہ توحید کے پرانے امانتدار اور کتاب و سنت کے قدیم قدرشناس یہی نہیں کہ عہدِ سلیمانی کے شیاطین جن و انس کی روایات سحر و کہانت کا حق ادا کر رہے ہیں، بلکہ اس فلسطینی سحر کے علاوہ بابل یا عراق کے بھی سحر کے وارث بنے ہوئے ہیں، مدعی ہیں علم و فضل، دین و روحانیت کے، لیکن عملاً غرق ہیں تعویذ سحر کے انواع و اقسام میں۔ تاریخ قدیم کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ عہدِ رسالت و طلوعِ اسلام سے صدیوں قبل قوم بنی اسرائیل دو مستقل حصوں میں بٹ چکی تھی، ایک ٹکڑا وہ جو بخت نصر کے ہاتھوں جلاوطنی یا جبری ہجرت کے بعد کلدانیہ یا بابل (موجودہ عراق) میں رہ پڑا تھا اور وہیں بس گیا تھا، دوسری شاخ وہ جو ایک مدتِ دراز کے بعد وہاں سے واپس آکر پھر فلسطین میں آباد ہوئی، آیت اس تاریخی راز کو فاش کر رہی ہے کہ عہدِ رسالت کے معاصر یہودِ عرب جامع ہیں فلسطینی اور بابلی دونوں قسم کے رذائل و خبائث کے۔ تاریخ قدیم کے یہ نازک دقائق، اور اپنی جگہ پر بالکل مسلّم و مستند حقائق، جو عام طور پر اچھے اچھے اہل علم کے علم میں بھی نہیں ادا کرائے جارہے ہیں کسی مؤرخِ اعظم کی زبان سے نہیں، عرب کے ایک اُمّی کی زبان سے۔ اللہ اللہ۔

۳۵۸ (کسی خاص حکمت و مصلحت کے ماتحت)

دو باتوں کا اس سلسلہ میں استحضار رہے تو ان شاء اللہ آیت کی تفسیر میں کوئی اُلجھن ذہن میں پیدا نہیں ہونے پائے گی۔

۱۔ ایک یہ کہ نزول و انزال کا اطلاق صرف احکامِ تشریعی میں نہیں ہوتا، امورِ تکوینی میں بھی برابر ہوتا رہتا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ تکوینیات کے سلسلہ میں جو کام گندے سے گندا بھی کیا جاتا ہے اس کے لئے واسطہ اور وسیلہ بہرحال فرشتے ہی ہوتے ہیں، اور یہ امر ان کی نزاہت و معصومیت کے ذرا بھی منافی نہیں۔

مَآ اُنْزِلَ میں مَا موصول ہے الذی کے معنی میں۔ بعض نے مَا کو نافیہ قرار دے کر ما انزل کا عطف مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ پر کیا ہے لیکن محققین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور ابن جریر میں اس پر مفصل گفتگو موجود ہے۔

ثم شرح ابن جریر فی ردّ ھذا القول وان ما بمعنی الذی واطال القول فی ذلک (ابن کثیر) الظاھر ان ما موصولۃ (بحر) عطف علی السحر ای یعلمونھم ما انزل علیھما (ابو سعود) الجمھور علی ان ما بمعنی الذی (مدارک)

اُنزِلَ۔ اللہ کی طرف سے "نازل" صرف کتاب و حکمت، وحی و الہام ہی نہیں ہوتا، قحط بیماری یا موت سب کا نزول وانزال بہ حیثیت مُسبّب الاسباب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا رہتا ہے، محاورۂ قرآنی میں انزال کا لفظ رزق (روزی) ماء (پانی) لباس (پوشاک) حدید (لوہے) اَنعام (چوپائے) کے سلسلہ میں صراحت کے ساتھ آیا ہے یہاں تک کہ رجز (عذاب یا بلا) کے لئے بھی یہی لفظ صراحۃً مستعمل ہوا ہے انا منزلون علی اھل ھٰذہ القریۃ رجزا من السماء (عنکبوت۔ آیت ۳۴)

______ سو جن لوگوں نے نزول سحر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب کرنا اس کی قدوسیت کے منافی سمجھا وہ خود ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، ایک سحر ہی پر کیا موقوف ہے کائنات میں تمام اچھا برا حق و باطل ایمان و کفر، طاعت و معصیت جو کچھ بھی موجود ہے سب کا وجود تکوینی حیثیت سے مسبب الاسباب ہی کے نازل کرنے سے تو ہوا ہے انزال یہاں اپنے اسی وسیع معنی میں ہے یعنی انھیں یہ بات بتا دی گئی، ان کے دل میں یہ ڈال دیا گیا کوئی اظہار شرف و تکریم مقصود نہیں

الانزال بمعنی التعلیم والالھام (معالم) الانزال اِمّا علی ظاھرہ او بمعنی القذف فی قلوبھما (روح) قلنا کل خیر او شر او طاعۃ او معصیۃ او ایمان او کفر منزّل من عند اللّٰہ تعالیٰ (ابن العربی) انزل ای قذف فی قلوبھما مع النھی عن العمل (مدارک) الانزال بمعنی الخلق لا بمعنی الایحاء (ابن کثیر)

الْمَلَكَيْنِ۔ لفظ کی قراءت مشہور مَلَک (بہ فتح لام) ہے۔

القراءۃ المشھورۃ بفتح اللام (کبیر)

لیکن دوسری قرأت مَلِک (بہ کسر لام) کی بھی صحابہ و تابعین ہی کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے ابن عباسؓ، ضحاکؒ و حسن بصریؒ کی روایت ہے۔

قرأ الحسن بکسر اللام وھو مروی ایضاً عن الضحاک وابن عباسؓ۔ (کبیر)۔

چنانچہ اسی دوسری قراءت کی بنا پر مفسرین اسی طرف چلے گئے ہیں کہ یہ دونوں اصلاً فرشتے نہ تھے، بشر تھے، اور بادشاہ اور انھیں جو دوسری روایتوں میں فرشتہ کہا گیا ہے تو وہ محض مجازاً ہے یعنی ان کے صفات ملکوتی کی بنا پر۔

قیل رجلان سمّیا ملکین باعتبار صلاحھما۔ (بیضاوی)

لیکن جمہور کا قول وہی قراءتِ مشہور کی بناء پر ان کے فرشتہ ہونے کا ہے۔

ذھب کثیر من السلف الی انّھما کانا ملکین من السماء وانھما اُنزلا الی الارض (ابن کثیر)

اور نظام تکوینی میں فرشتوں کے اور حقیقت سحر کا نزول ان کی نزاہت کے ذرا بھی منافی نہیں خصوصاً جب کہ ان پر اس فن کے الہام کئے جانے سے مقصود ہی تمام تر اصلاحِ خلق تھا یعنی لوگوں کو سحر و کہانت سے بچانا نہ کہ اس پر آمادہ کرنا مجسٹریٹوں کو پولیس کے افسروں کو جرائم سے علمی واقفیت حاصل کرتے کس نے نہیں دیکھا ہے ظاہر ہے اس سے یہ نتیجہ نہیں ہوتا کہ وہ خود جرم کریں بلکہ اس لئے کہ اپنی علمی واقفیت کو مجرموں کے ارتکاب جرم سے باز رکھنے میں کام میں لائیں۔

بَابِلَ جس قدیم ملک کا نام ہے وہ موجودہ نقشہ میں عراق عرب کہلاتا ہے ملک کے پایہ تخت کا بھی یہی نام تھا، شہر بابل دریائے فرات کے کنارے واقع تھا، موجودہ بغداد سے کوئی ساٹھ میل سمت جنوب میں تقریباً وہیں جہاں آج ہلہ

کی آبادی ہے، شہر بہت بڑا تھا اور قبہ میلوں کا تھا، ملک اپنے عروج کے زمانہ میں بڑا سر سبز، شاداب، خوشحال، مہذب و متمدن رہ چکا ہے، شہروں، باغوں، محلوں، شاہی قصر و ایوان، زبردست قلعوں کے آثار اب بھی موجود ہیں، ان سے اتنا تو بہرحال ثابت ہو جاتا ہے کہ ملک میں ماہرین فن انجینیروں کی کمی نہ تھی، دجلہ و فرات دو دو مشہور دریا اس کے علاقہ کو سیراب کر رہے تھے، سلطنت کے عروج کا زمانہ تخمینی طور پر ۳۰۰۰ ق م سمجھا گیا ہے، ملک کی ایک خاص شہرت علوم سحر، عملیات، نقش اور جنتر منتر کے لحاظ سے تھی، جنھیں آج انگریزی میں OCCULT SCIENCES (علم نیرنجات) کہتے ہیں۔ اسی ملک کا دوسرا قدیم نام کالڈیا (کلدانیہ) ہے اور انگریزی میں آج تک لفظ کالڈین (کلدانی) ساحر کا مرادف چلا آرہا ہے، یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں اس ملک کا ذکر کثرت سے آیا ہے، ذکر اس ملک کی عظمت کا بھی اور اس کی بدعملیوں، تباہ کاریوں کا بھی، ملاحظہ ہو صحیفۂ دانیال۔ ۴:۳۔ مکاشفہ۔ ۱:۵ و ۱۸: ۳۰ وغیرہا، لیکن اس فہرستِ جرائم کا عنوانِ اول سحر کاری تھا، بائبل کی شہادت ملاحظہ ہو:۔

"تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے، تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہو گئیں اور نبیوں اور مقدسوں اور زمین کے اور سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا۔" (مکاشفہ۔ ۱۸: ۲۳ و ۲۴)

پرانے کتبے اور نوشتے آج جو کچھ دریافت ہوئے ہیں، ان کی متفقہ شہادت ہے کہ دین بابلی کا جزو اعظم سحر و کہانت، جنتر منتر، ٹونے ٹوٹکے تھے۔

"بابلی مذہب کا جزو اعظم سحر و کہانت کے انواع و اقسام ہیں...... بابلی مذہب کی کتابوں کو اٹھا کر دیکھئے تو ہر جگہ کہانت کے منتر ہی منتر نظر آئیں گے۔" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنس اینڈ ایتھکس، جلد ۲ ص ۱۱۶)

ایک اور فاضل کی تحقیق ہے:۔

"مذہب بابل و نینوا کا جزو اعظم بھوت پریت کا اُتارنا جھاڑنا تھا۔" (راجرس کی ریلیجن آف بابلونیا اینڈ اسیریا ص ۱۴۵)

یہ سحر پیشہ و کہانت دوست قوم جب ۵۳۶ ق م میں تاجدار ایران کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی، اپنے ساتھ اپنے فنون سحر و کہانت کو بھی لیتی گئی، تاریخ کا بیان ہے:۔

"یہ لوگ جہاں جہاں گئے، اپنے علوم کو اپنے ساتھ لیتے گئے، ان کی تعلیم دیتے رہے اور ضعیف العقیدہ خلقت انھیں ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیتی رہی۔" (رگیوزین کی "کالڈیا" ص ۲۵۵)

یہود ان اُستادوں کے شاگرد رشید ثابت ہوئے:۔

"بابل کے میل جول نے اسرائیلیوں کے عقائد متعلق ملائکہ و شیاطین کو متاثر کرنا شروع کیا۔"
(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۳ ص ۱۸۴ طبع یازدہم)

یہود کے اکابر کا اعتراف ہے کہ:۔

"بابل کا مذہبی احترام ہر خطہ کے یہود میں قائم رہا۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۲ ص ۴۱۳)

ہمارے قدیم مفسرین کی تو جتیں اللہ ٹھنڈی رکھے، بغیر اس کے کہ ان کے کان میں بھنک بھی ان آوازوں کی پڑے کہ انیسویں صدی کے آخر میں سر ہنری رالنسن کو اور بیسویں صدی میں سر لیونارڈ وولی اور دوسرے ماہرین آثار کو بابل کے کھنڈروں میں کیسے کیسے کتبے عملیات اور نقوش سے لبریز مل گئے، محض اپنی قوتِ ایمانی کی بخشی ہوئی جلادتِ فراست

# وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ

اور وہ دونوں کسی کو بھی (اس فن کی باتیں) نہ بتلاتے تھے ۳۵۹ جب تک یہ نہ کہہ دیتے ۳۶۰ کہ ہم تو بس ایک (ذریعۂ) امتحان ہیں ۳۶۱ سو تم (کہیں) کفر نہ اختیار کر لینا ۳۶۲

یہ کام لے کر مَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ کا عطف مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر کر کے اس تاریخی حقیقت کو صفا اور بے نقاب کر گئے کر یہود کی فردِ جرم دونوں جرموں سے سیاہ ہے اتباعِ سحرِ فلسطین سے بھی اور اتباعِ سحرِ بابل سے بھی! ــــ خود قرآن کا اعجاز تو خیر بہت بڑی چیز ہے، حق یہ ہے کہ قرآن والوں کا اعجاز بھی اپنی جگہ دلوں کو ہلا دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

بابل کی اسی سحر پرور و کہانت خیز سرزمین میں جب عملیاتِ سفلیہ اور علوم سحریہ کا زور حد سے بڑھ گیا اور عوام کے ذہن میں ہادیانِ حق، انبیائے کرام اور اولیائے صالحین کی حیثیت خلط ملط اور ملتبس ہو کر کاہنوں، ساحروں، عاملوں، شعبدہ بازوں کی ہو کر رہ گئی تو مشیتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی نے حق و باطل کے ان دو علمبردار گروہوں میں نمایاں فصل و امتیاز کرانے اور لوگوں کی اصلاحِ خیال کے لئے دو فرشتوں کو انسانی صورت و قالب میں بھیجا۔

**ہاروت وماروت**۔ یہ نام ہیں ان دونوں فرشتوں کے، دونوں اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے فرشتے تھے لیکن جب ایک غرضِ خاص کے ساتھ انسانوں کے درمیان رہنے بسنے کے لئے بھیجے گئے تھے تو ظاہر ہے ان کی شکل و شباہت رنگ و روپ، جسم و قالب انسانوں ہی کا ہوگا اور ان کی عادتیں اور ان کے جذبات بھی بالکل بشری ہو گئے بعض اہل تفسیر نے یہاں ایک قصہ یہود کا بیان کیا ہوا، ملک عراق کی مشہور قاصرہ و رسوا زہرہ کا نقل کیا ہے لیکن اول تو آیت کی تفسیر اس قصہ پر موقوف کسی درجہ میں بھی نہیں، دوسرے خود محدثین اور محققین تفسیر نے اس کی صحت سے بالکل انکار کر دیا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ قصہ گڑھا ہوا اور لغو و مردود ہے، اس گروہ میں قاضی عیاض مالکیؒ، امام رازیؒ، شہاب الدین عراقی وغیرہم شامل ہیں اور ابن کثیر نے تو بڑی لمبی بحث کے بعد یہ کہہ دیا ہے کہ اگرچہ یہ قصہ بڑے بڑے تابعین نے نقل کیا ہے، لیکن اس کی سند حدیث صحیح سے ذرا بھی نہیں ملتی بلکہ اسرائیلیات ہی پر ختم ہوتی ہے۔

اعلم ان هذه الرواية فاسدة مردودة غير مقبولة (كبير) وهذا كله لا يعتمد منه شيء (بحر)
ونص الشهاب العراقي على ان من اعتقد في هاروت وماروت انهما ملكان يعذبان على خطيئتهما مع الزهرة فهو كافر بالله تعالى (روح) وحاصلها راجع في تفصيلها الى اخبار بني اسرائيل اذ ليس فيها حديث مرفوع صحيح متصل الاسناد الى الصادق المصدوق (ابن كثير)

لیکن بالفرض صحیح ہو بھی تو جب کسی خاص حکمت و مصلحت سے کسی فرشتہ کو پیکرِ انسانی اور جذباتِ بشری دیئے گئے تو اگر کسی وقت وہ ملکوتی الاصل بشری جذبات سے مغلوب بھی ہو جائے تو اس میں کوئی استحالہ نہ شرعی ہے نہ عقلی۔

**وَمَا يُعَلِّمٰنِ** تعلیم کے متعارف مفہوم کی بنا پر اس لفظ سے یہ شبہ نہ ہو کہ ملائکہ سحر کا درس یا سبق دیا کرتے تھے، استغفر اللہ، تعلیم کے معنی علاوہ سکھانے اور سبق دینے کے اعلام یعنی جتلانے، بتلانے، آگاہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔

والتعليم ربما يستعمل في معنى الاعلام (راغب)

چنانچہ ماہرین قرآن کی ایک جماعت نے یہاں بھی یہی معنی لئے ہیں۔

والتعليم بمعنى الاعلام (معالم) وقالت طائفة هو هنا بمعنى يعلمان بالتخفيف فهو من باب الاعلام (بحر)

اور خود ایک قراءت بھی مصدر اِعلام کے ساتھ منقول ہے۔

وقرء طلحۃ بن مصرف یعلمان بالتخفیف من الاعلام (روح)

مِنْ اَحَدٍ میں مِنْ زائد ہے تاکیدِ استغراق کے لئے، معنی ہوں گے "کسی کو بھی" یا "کسی ایک کو بھی"۔

من زائدۃ لتاکید استغراق الجنس (بحر)

**۳۶۰ے** (بہ نظرِ احتیاط مزید)

ملائکہ اس باب میں اتنی احتیاط رکھتے کہ خیر خود سے تو کسی کو کیا بتلاتے سکھلاتے، جو لوگ پوچھنے آتے انھیں بھی پہلے متنبہ کر دیتے

حتی ینصحاہ اولا (معالم) حتی ینبہاہ وینصحاہ (مدارک) لایعلمانہ حتی یبالغا فی نہیہ (جصاص)

**۳۶۱ے** امتحان یعنی وہ چیز جس سے کھل جائے کہ سحر و کہانت سے بچا کون کون رہا اور مبتلا ان میں کون ہو گیا۔

فِتْنَۃٌ کے معنی امتحان، آزمائش، جانچ پڑتال کے آتے ہیں۔

تارۃ یستعمل فی الاختبار (راغب)

اور یہاں بھی آزمائش مراد ہے۔

ومعناھا فی ھذا الموضع الاختبار والابتلاء (ابن جریر عن ابن جریج) ای ابتلاء واختبار من اللہ (کشاف)

مطلب یہ ہوا کہ انسان نما ملائکہ کسی پر بھی حقیقتِ سحر کو نہ کھولتے، کسی کو کلماتِ سحر پر مطلع نہ کرتے، جب تک کہ اُسے متنبہ نہ کر دیتے، ہوتا یہ تھا کہ فسق پیشہ لوگ آکر ہاروت و ماروت کو گھیرتے اور ان سے اصرار کر کے دریافت کرتے کہ آپ ہمیں سحر سے روک تو رہے ہیں، لیکن یہ تو بتلائیے کہ سحر کہتے کسے ہیں؟ وہ ہیں کون سے اعمال و اقوال جن پر سحر کا اطلاق ہوتا ہے؟ فرشتے انھیں اس تنبیہ و باددہانی کے بعد کہ اس فن سے کام لینا کفر ہے، جب انھیں آگاہ و خبردار کرنے کے لئے ان اعمال و اقوال کی نقل و حکایت ان کے سامنے کرتے تو وہ فسق پیشہ لوگ اس سے فائدہ یہ اٹھاتے کہ خود اس فن ہی کے سیکھ جانے کا کام لینے لگتے ——— بالکل ایسی ہی بات جیسے آج کوئی کسی فقیہ عالم سے یہ دریافت کرے کہ رشوت اور سود کا اطلاق کن کن آمدنیوں پر ہوتا ہے، اور پھر اُن سے بچنے کے بجائے الٹا انھیں طریقوں پر عمل شروع کر دے!

یہ مفہوم طبعزاد نہیں، حضرت علیؓ سے ایک اثر ٹھیک اسی معنی میں مروی ہے۔

قال علی کان یعلمان تعلیم انذار لاتعلیم دعاء الیہ کانھما یقولان لاتفعل کذا کما لو سأل سائل عن صفۃ الزنا او القتل فاخبر بصفۃ لیجتنبہ (بحر)

**۳۶۲ے** (ان اعمال و اقوالِ سحر کو اختیار کر کے)

ای لاتجعل ما تسمع منّا سببا للکفر (ابن العربی) وقولھما فلا تکفر یدل علی ان عمل السحر کفر (جصاص)

فقہاء نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اعمال و اقوالِ سحر بد کا اعتقاداً اختیار کر لینا کفر کے مرادف ہے۔

ای لاتکفر بعمل ھذا السحر واعتقادہ فثبت ان ذلک کفرا اذا عمل بہ واعتقدہ (جصاص)

فَلَا تَکْفُرْ۔ اس جزو کا اضافہ تاکیدِ بیان کے لئے ہے۔

ھذا تاکیدٌ للبیان (ابن العربی)

اس میں فقہاء امت کا اختلاف شروع سے چلا آرہا ہے کہ آیا مطلق سحر یعنی اس کا سیکھنا بھی حرام ہے یا محض اس پر عمل

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ؕ

مگر (لوگ) ان دونوں سے وہ (سحر) سیکھ ہی لیتے ۳۶۳ جس سے وہ جدائی ڈال دیتے درمیان مرد اور اس کی زوجہ کے ۳۶۴

شروع سے قول دونوں قسم کے ملتے ہیں بعض نے تعلم کو بالکل جائز رکھا ہے اور صرف عمل کو حرام قرار دیا ہے اور بعض نے نفسِ تعلم کو بھی۔

قیل فلا تفعله لتحصل به وھذا اعلی من قال تعلمه جائز والعمل به کفر وقیل لا تکفر بتعلم السحر وھذا اعلی قول من قال ان تعلمه کفر (بحر)

بعض نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سحر کا سیکھنا بہر صورت حرام ہے یہاں تک کہ کافر ساحروں کے رد کے لئے سیکھا جائے جب بھی حرام ہے اس لئے کلام الٰہی فلا تکفر دلالت کرتا ہے مفہوم کی علی الاطلاق حرمت پر اور وہ سحر ہے (رد المحتار) لیکن یہ تحقیق خود حنفیہ کے یہاں بھی متفق علیہ نہیں، اور شافعیہ کو تو اس سے بالکل اختلاف ہے۔

فلا تکفر باعتقاد جوازه والعمل به وفیه دلیل علی ان تعلم السحر وما لا یجوز اتباعه غیر محظور وانما المنع من اتباعه والعمل به (بیضاوی) ای لا تتعلم السحر فتعمل به فتکفر (معالم) فلا تکفر بتعلمه والعمل به علی وجه یکون کفرا۔ (مدارک)

مفسر تھانویؒ کی تحقیق اس موقع پر بھی قابلِ قدر ہے:۔

"سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس میں کلمات کفریہ ہوں مثل استعانتِ شیاطین و کواکب وغیرہ تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے اور اگر کلماتِ مباحہ ہوں تو اگر کسی کو خلاف اذنِ شرعی کسی قسم کا ضرر پہنچایا جائے یا کسی اور غرضِ ناجائز میں استعمال کیا جائے تو وہ فسق و معصیت ہے اور اگر ضرر نہ پہنچایا جائے اور نہ کسی اور غرض ناجائز میں استعمال کیا جائے تو اسے عرف میں سحر نہیں کہتے بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے اور اگر کلمات مفہوم نہ ہوں تو بوجہ احتمالِ کفر ہونے کے واجب الاحتراز ہے۔ اور کفر عملی کا اطلاق ہر ناجائز پر صحیح ہے"۔

۳۶۳ یعنی وہ فسق پیشہ اور معصیت دوست لوگ سحر سیکھ ہی جاتے، ملائکہ کی نیت کا بخیر ہونا بالکل ظاہر ہے وہ تو نفس مسئلہ سمجھاتے سحر کی حقیقت بیان کرتے، اس کی حرمت کا حکم صادر کرتے، لیکن فاسد الطبع لوگ اس سے فن سیکھ جاتے اور اسے کام میں لانے لگتے۔

۳۶۴ ذکر (ایک بار پھر حافظ کو تازہ کر لیجئے) یہود کا چل رہا ہے، یہود عہد سلیمانی کا نسل کی اولاد در اولاد کا، قرآن ایک اُمّی کا لایا ہوا قرآن، ان کی فردِ جرم سناتے سناتے یک بیک یہ بھی کہہ ڈالتا ہے کہ یہود سحر اور عملیات سفلی میں تو مشغول رہتے ہی تھے، ان میں بھی خصوصًا ان اعمال میں جن کا تعلق میاں بیوی کے افتراق سے تھا، قرآن نے تو ضمنًا اور گویا بالکل لپیٹ میں ایک بات کہہ ڈالی، اب دیکھئے بیسویں صدی کے علمائے یہود اور محققین اسرائیل اپنے اسلاف کے مشغلۂ سحر و ساحری کی نوعیت سے متعلق کیا شہادت دیتے ہیں؟

"سحر کی سب سے زیادہ عام متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لئے دیا جاتا تھا، خاص کر وہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کے لئے لکھا جاتا تھا، اس قسم کے سحر کی ماہر عورتیں ہی زیادہ ہوتی تھیں، چنانچہ ذکر بھی سحر اور

## وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

حالانکہ وہ (فی الواقع) کسی کو بھی اس کے ذریعہ سے نقصان نہ پہنچا سکتے مگر ہاں ارادۂ الٰہی سے ۳۶۵ اور یہ

## مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ

چیز سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان تو پہنچا سکتی ہے اور انھیں نفع نہیں پہنچا سکتی ۳۶۶

حرام کاری کا عموماً ساتھ ہی ساتھ آیا ہے۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۸، ص ۲۵۵)

**۳۶۵** (یعنی بجز مشیتِ تکوینی کے)

اسلام نے شرک کی جڑ جس جس طرح کاٹی ہے اس کے لحاظ سے یہ صراحت ضروری بھی تھی، ارشاد ہو رہا ہے مؤثرِ حقیقی ان عملیاتِ سحریہ کو، ان ٹونے ٹوٹکوں کو ہرگز نہ سمجھ لینا ان میں قوت ذرا سی بھی نہ تھی، مؤثر و فاعلِ حقیقی جس طرح ہر حال میں صرف ہماری مشیت، صرف ہماری تجلی ارادی تکوینی رہتی ہے اس موقع پر بھی صرف وہی رہی۔ اِذنِ اللہ کے معنی یہاں تقدیرِ الٰہی، مشیتِ تکوینی، قضا و قدر کے ہیں۔

الاذن ھنا العلم (جصاص) ای بعلمہ ومشیتہ (مدارک) معناہ الا بقضائہ وقدرتہ ومشیتہ (معالم عن سفیان ثوری) ای بارادتہ وقضائہ لا بأمرہ (قرطبی) ای بعلمہ وتکوینہ فالساحر یسحر واللہ یکوّن. (معالم)

بس اتنا یاد رہے کہ یہ اللہ کی قدرت، مشیت یا حکمتِ تکوینی ہرگز مرادف اللہ کے حکم یا رضا کے نہیں۔

یعنی بحکمہ وقضائہ لا بامرہ (ابن العربی)

زہر کے اثر سے بے گناہوں کی ہلاکت، کافروں کے ہاتھوں اولیاء و انبیاء کی اہانت و اذیت، مشرکوں کا مسلمانوں پر غلبہ و تسلط، جس قانونِ حکمتِ تکوینی کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے اسی کے ماتحت سحر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے اور رضائے الٰہی سے بُعد جس قدر غلبۂ کفر وغیرہ کو ہے اسی قدر تاثیرِ سحر کو، ہر ہر ارادۂ الٰہی کے اندر کتنی کتنی تکوینی حکمتیں اور کائناتی مصلحتیں ہوتی ہیں، اس کا علم بھی بجز اسی دانا و بینا، علیم و خبیر کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔

سلف کا مذہب سارے اسباب و مسبّبات کے بارے میں یہی رہا ہے کہ مؤثرِ حقیقی مشیتِ الٰہی ہے، وہی جب چاہتی ہے سبب و نتیجہ کے درمیان حائل بن جاتی ہے اور جب نہیں چاہتی ہے تو حائل نہیں ہوتی۔

وفیہ دلیل علی ان فیہ ضرراً اودعہ اذا شاء اللہ تعالیٰ حال بینہ وبینہ واذا شاء خلاہ وما اودعہ فیہ وھذا مذھب السلف فی سائر الاسباب والمسبّبات (روح)

**۳۶۶** (جیسا کہ ہر معصیت کا قاعدہ ہے کہ اس کی تحصیل مُضر اور غیر مفید ہوا کرتی ہے۔)

یعنی یہ بدبخت یہود اپنا وقت اور اپنی توتیں کیسی ضائع کر رہے ہیں، ان علوم و فنون کی تحصیل میں جو ان کے حق میں نافع تو ذرا سی بھی نہیں اور مضر ہی ہیں، ضمناً اس سے علوم سحریہ کے سیکھنے کی ممانعت بھی نکل آئی جیسے ان علوم عقلیہ و فلسفہ کی جو گمراہی کی طرف لے جائیں۔

فیہ دلیل علی انہ واجب الاجتناب کتعلم الفلسفۃ التی تجر الی الغوایۃ (مدارک)

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛ

اور (یہ بھی) خوب جانتے ہیں ۳۶۷ کہ جس نے اسے اختیار کر لیا اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۳۶۸

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور بہت ہی بری ہے وہ چیز ہے جس کے عوض میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے ۳۶۹ کاش وہ (اتنا ہی) جانتے ۳۷۰

یَضُرُّھُمْ۔ یَنْفَعُھُمْ۔ ضرر کی حقیقت مذہب اہل سنت میں یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ دکھ ہے کہ جس کے معاوضہ میں کوئی نفع نہ ہو۔

حقیقۃ الضر عند اھل السنۃ کل الم لا نفع یوازیه (ابن العربی)

اور نفع کی حقیقت یہ ہے کہ جس کے پیچھے نہ تکلیف ہوتی ہو اور نہ اس پر عذاب مرتب ہو۔

وحقیقۃ النفع کل لذۃ لا یتعقبھا عذاب ولا یلحق فیه ندامۃ (ابن العربی)

اور سحر میں ضرر اور عدم نفع جمع ہوتے ہیں۔

والضرر وعدم المنفعۃ فی السحر متحقق (ابن العربی)

۳۶۷ (خود اپنے مذہبی نوشتوں کی تصریحات سے)

اشارہ عہدِ رسالت کے یہود کی جانب ہے یعنی یہود معاصرین عہدِ رسول ؐ سے متعلق۔

متعلق بقوله تعالیٰ ولما جاءھم وقصۃ السحر مستطردۃ فی البین فالضمیر لاولئك الیھود۔ (روح)

قرآن نے کس دعوے سے کہہ دیا کہ لَقَدْ عَلِمُوْا؟ یہ یہود ہی خوب جانتے ہیں کہ سحر و ساحری کیسی گندی چیز ہے یہود کہہ سکتے تھے کہ ہم کہاں جانتے ہیں؟ کس نے ہمیں یہ خبر دی ہے؟ ہمارے مقدس نوشتوں میں کہاں یہ موجود ہے؟ مگر نہ کہہ سکے اس لئے کہ آج کی تحریف شدہ، مسخ شدہ توریت تک میں یہ تصریحات باقی ہیں:۔

”تو جادوگری کو جینے مت دے“ (خروج ۲۲: ۱۸) ”اور جادو نہ کرو، اور ساعتوں پر لحاظ مت کرو“ (احبار ۱۹: ۲۶)

”اور نہ رمال و ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خداوند کی نفرت کے باعث ہیں“ (استثناء ۱۸: ۱۲)

۳۶۸ یعنی آخرت میں نیکی اور اجر کا مطلق کوئی حصہ نہیں۔

وھو النصیب من الخیر (جصاص)

اِشْتَرٰىهُ۔ ضمیر سحر کی طرف ہے۔

ای اختار السحر (معالم) ای استبدل ما تتلوا الشیاطین بکتاب اللہ واستبدل السحر بدین اللہ (جصاص)

نکتہ شناسوں نے کہا ہے کہ یہ اشارہ پھر اسی حقیقت کی طرف ہے کہ سحر کفر ہے۔

وقال الحسن ماله من دین وھذا یدل علی ان العمل بالسحر وقبوله کفر (جصاص)

یہود کو دعوتِ حق دی جا رہی تھی، پیام ان کے پاس مذہبِ توحید کا پہنچ رہا تھا، اور وہ تھے کہ ادھر سے غافل و بے پروا، فارغ و غیر متوجہ، اپنے انہیں علوم سحر و کہانت میں لگے ہوئے اور انہیں خرافات کو

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَیْرٌ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ع

اور اگر وہ لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اس کا ثواب اللہ کے ہاں کہیں بہتر ہوتا کاش وہ (اتنا) جانتے ۳۷۱

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا

اے ایمان والو! "رَاعِنَا" مت کہا کرو ۳۷۲ اور "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور سنتے رہا کرو ۳۷۳

کمال کے درجہ میں رکھے ہوئے تھے، اشارہ ان کی اسی محرومی وبدنصیبی کی جانب ہے۔

۳۶۹ ۔ اپنے آپ کو بیچ ڈالا" یعنی اپنی جان کو عذاب وہلاکت میں ڈالا۔

بِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ ۔ وہ بری چیز کفر واعمال سحریہ ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ بندوں کے حال پر کمال شفقت سے تأسف وحسرت کے لہجہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ دین برحق جیسی نعمت سے منہ موڑے ہوئے یہ کفر وسحر اختیار کئے ہوئے ہیں، گویا دوزخ کی خریداری کر چکے ہیں۔

حیث اختاروا السحر والکفر علی الدین والحق (معالم) وھذا ایضا یؤکد ان قبوله والعمل به کفر (جصاص)

۳۷۰ یعنی افسوس کہ اس حد تک بھی انھوں نے اللہ کی دی ہوئی عقل سلیم سے کام نہ لیا!

۳۷۱ (اور اپنی موجودہ روش کفر وفسق سے تائب ہو جاتے)

گنہگار بلکہ سرکش ونافرمان وغدار بندوں کے حق میں اس قدر تأسف اسی مالکِ حقیقی ہی کا حصہ ہے، کیا حد ہے اس شفقت وکرم بے حساب کی!

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا سے بعض فقہاء نے سحر کے کفر ہونے پر استدلال کیا ہے۔

یقتضی ذلك ایضا (جصاص) وقد استدل بقوله ولو انهم اٰمنوا واتقوا من ذهب الی تکفیر الساحر کما هو روایة عن الامام احمد بن حنبل وطائفة من السلف وقیل بل لا یکفر ولکن حده ضرب عنقه۔ (ابن کثیر)

تفسیر ابن کثیر میں ابن ہبیرہ کی کتاب الاشراف علی مذاہب الاشراف کے حوالہ سے ہے کہ بجز امام ابو حنیفہؒ کے جو حقیقتِ سحر ہی کے منکر ہیں، دوسرے علماء حقیقت سحر کے قائل ہیں۔

وقد ذکر الوزیر ابو المظفر یحییٰ بن محمد هبیرة رحمه الله فی کتابه الاشراف علی مذاهب الاشراف بابا فی السحر فقال اجمعوا علی ان السحر له حقیقة الا ابا حنیفة فانه قال لا حقیقة له عنده

۳۷۲ (مجمع میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب ومتوجہ کرتے وقت)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مجمع میں قرآن سناتے یا تبلیغ کرتے ہوتے اور لوگ کوئی بات سن نہ پاتے تو قدرتًا دوبارہ آپ کو اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتے، یہود نے ایسے موقع کے لئے از راہ شرارت لفظ رَاعِنَا استعمال کرنا شروع کیا تھا اس کے اصل معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ "ہماری رعایت کیجئے" لیکن رَاعِنَا کے "عین" کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے اس کے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے مسلمان اس شرارت سے غافل بے خبر خالی الذہن خود بھی بعض اوقات یہ لفظ بولنے لگتے یہاں انھیں کو یہ ممانعت ہو رہی ہے، یہود تو خیر اسے طنز وتمسخر کی راہ سے کہتے ہی تھے

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٠٤﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ

اور کافروں کے لئے عذاب دردناک ہے ٣٧٤ جو لوگ کافر ہیں (خواہ) اہلِ کتاب میں سے ہوں یا مشرکین

اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

میں سے ٣٧٥ وہ اسے (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے کہ تمہارے اوپر کوئی بھی بھلائی تمہارے پروردگار کی طرف سے اتر آئے ٣٧٦

یوں بھی عرب میں یہ کلمہ ذرا پہلوئے ذم لئے ہوئے تھا۔

قال قطرب هي كلمة الحجاز على وجه الهزء (جصاص)

اُنظُرنا کے معنی ہیں "ہمارے اوپر نظر کیجئے" اور یہ پہلوئے ذم سے خالی ہے، آیت سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مرتبۂ رسالت کا ادب صرف معنوی ہی حیثیت سے نہیں لفظی حیثیت سے بھی ضروری ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے احتمال بھی اہانت کا نکلتا ہے، ان سے احتیاط لازم ہے۔

وهذا دليل على تجنب الالفاظ المحتملة التي فيها التعرض للتنقيص (ابن العربي) وهذا يدل على ان كل لفظ احتمل الخير والشر فغير جائز اطلاقه حتى يقيد بما يفيد الخير (جصاص)

بلکہ امام مالکؒ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہو جاتی ہے، فقہاءِ حنفیہ نے جو اپنی باریک بینی کے لئے سب سے ممتاز ہیں یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اس بحث کا فیصلہ کہ فلاں مقام پر مراد امر خیر ہے یا شر، واضع کی نیت کے لحاظ سے ہوگا، تلمیع کی رائے سے نہیں، صحابہ کرامؓ ظاہر ہے کہ سوءِ ادب کے شائبۂ قصد سے بھی بری تھے، ممانعت جو کی گئی، وہ یہود کی نیت پر حکم کر کے۔ ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ مقصد اس حکم سے مسلمانوں کو کافروں کے تشبہ قولی و عملی سے روکنا ہے۔

والغرض ان الله تعالى نهى المومنين عن مشابهة الكافرين قولا وعملا۔

اور آگے حدیث من تشبه بقوم فهو منهم درج کر کے اس سے استدلال کیا ہے کہ مسلمانوں کو شدید مؤکد ممانعت کافروں کے قول فعل، وضع ولباس، فیشن وغیرہ کے اختیار کرنے سے ہے۔

ففيه دلالة على النهي الشديد والتهديد والوعيد على التشبه بالكفار في اقوالهم وافعالهم ولباسهم واعيادهم وعباداتهم وغير ذلك من امورهم التي لم تشرع لنا ولا نقر عليها (ابن کثیر)

**٣٧٣** (رسولؐ کے ارشادات، ادب و تعظیم کے ساتھ)

حال کے بعض گمراہ فرقوں نے ایمان و اسلام کے لئے رسولؐ کی شخصیت سے بالکل قطع نظر کر کے محض قرآن کے اتباع کو کافی سمجھ لیا ہے، ان کی گمراہی آیت سے ظاہر ہے۔

**٣٧٤** (پیمبرِ برحق کی توہین اور اپنی دناءتِ اخلاق کی پاداش میں)

خصوصاً اُن کافروں کے لئے جو رسولؐ کے ساتھ شدتِ بغض و عداوت میں اس حد تک پہنچ جائیں اور عام انسانیت و تہذیب کے حدود کا لحاظ نہ رکھیں ـــ ایسے بدتمیز معاندین کی اصلاح کی توقع بھی کیا ہو سکتی تھی۔

**٣٧٥** اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ کافروں یعنی طریقِ اسلام کے منکروں کی بڑی قسمیں دو ہیں، ایک مشرک جو

سرے سے توحید، رسالت، ملائکہ وحشر ہی کے قائل نہیں، بلکہ ان کے بجائے عجب عجب تخیلات اور اوہام گڑھ رکھے ہیں، دوسرے اہل کتاب جو ان بنیادی حقائق پر لفظاً ایمان رکھتے ہیں، لیکن عملاً ومعناً ان میں سے ہر حقیقت کو مسخ کر چکے ہیں، پہلا جملہ میں آگے جو خبر نکلے گی اس کا مبتدا بھی الذین کفروا ہے، مزید صراحت کے لئے اس کی دونوں قسموں کو بھی کھول کر بیان کر دیا ہے۔

اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ یہ لفظ قرآن مجید میں پہلی بار آیا ہے، قرآنی اصطلاح میں یہ لفظ مومنین اور مشرکین کا درمیانی درجہ رکھتا ہے اور اس کا اطلاق یہود ونصاری پر ہوتا ہے جو اصلاً توحید، نبوت ومعاد کے قائل تھے، اور آسمانی صحیفے بھی اپنے پاس رکھتے تھے، گو معنوی اور لفظی تحریفات کے لحاظ سے بالکل مسخ شدہ، اور قرآن کے منکر تھے۔ گویا نفس سلسلۂ وحی کے قائل تھے

وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ۔ من المشرکین کے معنی میں ہے۔ ای ومن المشرکین (معانی)

الْمُشْرِكِيْنَ۔ مشرک وہ تھے جو سرے سے توحید ونبوت ہی کے قائل نہ تھے، بجائے ایک خدائے واحد کے مختلف فرشتوں کو مختلف قویٰ کا مستقل مالک ومتصرف سمجھتے تھے، ان کو دیویوں، دیوتاؤں کے نام سے پکارتے اور انھیں کی پرستش کرتے، اور مختلف عناصر اور مظاہر فطرت کی بھی الوہیت کے قائل رہتے، گویا سلسلۂ وحی ہی کے سرے سے منکر تھے۔

حیرت وافسوس ہے کہ انگریزی کے تقریباً کل مترجمین قرآن اور اردو کے متعدد شارحین نے شاید افراط "روشن خیالی" کے اثر سے ترکیب عبارت کو بالکل نظر انداز کر کے ترجمہ یوں کر دیا ہے:۔

"اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں وہ اور مشرکین (ذرا بھی) پسند نہیں کرتے"

حالانکہ یہ ترجمہ کسی طرح بھی صحیح نہیں، اول تو اَهْلِ الْكِتٰبِ کا مفہوم ہی کافر اہل کتاب کا ہے، اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو اہل کتاب کہے ہی کیوں جائیں، مومن ہی نہ کہلانے لگیں، اس لئے یہ کہنا کہ ان میں سے جو کافر ہیں خود ہی بے معنی ہے، پھر اس سے بڑھ کر صریح اور قاطع المشرکین کا اعراب ہے، المشرکین حالت جری میں ہے اور من حرف جار کا مجرور۔ اس کا عطف صریحاً اهل الكتب پر ہے اگر الذین کفروا پر ہوتا تو حالت رفعی میں ہوتا اور بجائے المشرکین کے المشرکون ہوتا، ایک حدیث میں کافروں کی یہ دوگونہ تقسیم اہل کتاب ومشرکین میں صراحۃً کر کے دونوں کے حق میں عذاب کی دعا آئی ہے۔

اللّٰهمّ عذّب الكفرة اهل الكتٰب والمشركين الذين يجحدون آياتك ويكذّبون رسلك ويصدّون عن سبيلك ويتعدّون حدودك ويدعون معك الٰها آخر لا اله الا انت تبارکت وتعاليت عما يقولون الظالمون علوًّا كبيرًا۔

مِن یہاں بیان وتفصیل کا ہے جنس الذین کفروا کے دو طبقوں کے اظہار کے لئے، جیسا کہ سورۃ البینۃ میں آیا ہے، لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ۔

من للبيان (جلالين) من للتبيين (بيضاوی) من للبيان لان الذين كفروا جنس تحته نوعان اهل الكتب والمشركون (كشاف۔ كبير۔ مدارك)

۳۷۶ھ (اے مسلمانو!)

مطلب یہ ہے کہ کافروں کو تو چاہے وہ اہل کتاب ہوں یا مشرک، یہ کسی طرح گوارا ہی نہیں بلکہ دل سے شاق گزر رہا ہے کہ خیر ورحمت کا نزول مسلمانوں پر ہو۔

وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۱۰۵)

حالانکہ اللہ اپنی رحمت سے جسے چاہے مخصوص کر لے ۳۷۸ اور وہ بڑے ہی فضل والا ہے ۳۷۹

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ

ہم جس نشان کو موقوف کر دیتے ہیں یا اُسے بھلا دیتے ہیں ۳۸۰ تو (کوئی) اس سے بہتر ہی ۳۸۱ یا مثل

اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۶)

اُس کے لے آتے ہیں۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۸۲

الخیر۔ خیر سے مراد عموماً وحی و نبوت لی گئی ہے۔

الخیر الوحی (کبیر) فسر الخیر بالوحی (بیضاوی)

لیکن بہتر یہ ہے کہ اسے ہر قسم کی فلاح دنیوی و اُخروی کا جامع سمجھا جائے اور اس کے تحت میں علم، نصرِ غیبی، فتوحاتِ ملکی وغیرہ سب کو شامل کر لیا جائے۔

ای بالعلم وبالنصرۃ ولعل المراد به مایعم ذالک (بیضاوی) ھنا عام فی جمیع انواع الخیر (بحر) عام فی انواع الخیر کلھا۔ (روح)

کم۔ خطاب عام اُمتِ اسلامی سے ہے اور آیت کے الفاظ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ غیر مسلم خواہ وہ کسی طبقہ کے بھی ہوں مسلمان کے حقیقی ہوا خواہ و وفادار کسی حال میں نہیں ہو سکتے، مسلمانوں کے بغض و عداوت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

یبین بذالک شدۃ عداوۃ الکافرین من اھل الکتٰب والمشرکین الذین حذر اللہ تعالٰی من مشابھتھم للمؤمنین لیقطع المودۃ بینھم وبینھم (ابن کثیر) واعلم انه تعالٰی لما بین حال الیھود والکفار فی العداوۃ والمعاندۃ حذر المؤمنین منھم (کبیر)

۳۷۸ (اپنے قانونِ حکمت و مصالحِ تکوینی کے ماتحت)

یہود کو اصل حسد اس کا تھا کہ نعمتِ نبوت کے حقدار تو ہم ہیں یعنی اولادِ اسرائیل، اہل عرب کہ بنی اسمٰعیل ہیں، یہ دولتِ نبوت کہاں سے مل جاتی ہے اور کیسے مل سکتی ہے؟ اور اہل الکتٰب سے اشارہ زیادہ تر یہود کی طرف ہے اور الحمد للہ کہ ہمارے قدیم مفسرین نے بھی آیت کو اسی مفہوم میں لیا ہے۔

معنی الآیۃ ان اللہ تعالٰی بعث الانبیاء من ولد اسحٰق فلما بعث النبی صلعم من ولد اسمٰعیل لم یقع ذالک بود الیھود (معالم)

۳۷۹ (وہ جس فرد، جس نسل، جس جماعت کو چاہے اپنے فضل و کرم سے نواز دے۔)

اور اب اگر کسی قوم یا نسل کو محروم کیا جا رہا ہے تو اس کی بنا یہ نہیں کہ ادھر سے فضل و کرم میں کچھ کمی ہو گئی ہے بلکہ یہ ہے کہ خود اس قوم نے اپنی مسلسل نالائق روش سے اپنے کو اس فضل و کرم کا نااہل ثابت کر دیا اور اب اُسے اس نعمت سے

نوازے جانا آئینِ حکمت کے منافی ہے۔

**۳۷۹** (لوگوں کے دماغ یا حافظہ سے)

انساءھا ای من ف ذکرھا عن القلوب (راغب) انساء آیۃ ای إذھابھا عن القلوب (بیضاوی)

'ایۃ' کا مفہوم بہت وسیع ہے اس کا اطلاق آیت مکتوبی پر بھی ہوتا ہے اور نشان' دلیل معجزہ پر بھی، یہاں مراد اگر دلائل و معجزات ہی لی جائے جب تو آگے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایک کے بجائے دوسرا نشان حقانیتِ قرآن کا وجود میں اب بھی آتا ہی رہتا ہے اور زمانۂ نزول قرآن میں تو خارقِ عادت نشانوں کی کبھی کمی نہ تھی۔

البتہ اگر آیت مکتوبی ہی مراد لی جائے جب بھی دو شقیں موجود ہیں آیتیں یا قرآن مجید کی ہوں گی یا کتب سابق کی، اگر کتبِ سابق کی آیتیں مراد ہیں جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کا مذہب ہے جب بھی بحث آگے نہیں بڑھتی' پرانی آیتوں کا قرآنی آیتوں سے منسوخ ہونا تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جس میں نہ کوئی اختلاف ہے نہ نزاع، ہاں اگر آیاتِ قرآنی مراد ہوں تو سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ان کے نسخ سے مفہوم کیا ہے؟

نسخ سے مراد کسی نے آج تک یہ تو لی نہیں کہ فلاں عقیدہ کسی زمانہ میں واجب تھا، اور اب وہ منافیِ ایمان قرار پا گیا' یا جھوٹ، چوری، زنا، قتل پہلے حرام تھے پھر حلال قرار پا گئے، یا فلاں حکایت پہلے جس طرح قرآن میں بیان ہوئی تھی بعد کو اس کی تردید ہو گئی، غرض نسخ کی گنجائش کا عقائد میں، کلیاتِ اخلاق میں، امورِ حسی میں، قصص گزشتہ اور حکایاتِ ماضی میں، اخبارِ غیب میں، غرض قرآن مجید کے بیشتر حصہ میں تو کوئی بھی قائل نہیں، نسخ کی گنجائش جو کچھ بھی ہے لے دے کے بس بابِ احکام میں ہے، اور احکام کی مثال طبیب کے نسخہ کی ہے طبیب کی تشخیص اپنی جگہ پر بدستور رہتی ہے لیکن مریض کی حالت بدلتی رہتی ہے اور پھر موسم اور آب و ہوا میں بھی فرق ہوتے رہتے ہیں ان حالات میں کوئی حاذق سے حاذق طبیب بھی اپنے نسخہ کے اجزاء میں ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق ترمیم کرنے میں تامل نہ کرے گا، قرآن کے بعض احکامِ قانون کے نسخ کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خود قانون ساز و قانون آفریں کے قلم سے عین وضع قانون کے دوران میں بعض قانون جو عارضی و ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں بدل دیئے گئے اور ان کی جگہ مستقل و دوامی قوانین نے لے لی' انسان کے دانت اور جبڑے مستقل طور پر غذاؤں کے چبانے، پیسنے، چیرنے کاٹنے اور پھاڑنے ہی کے کام کے لئے ہیں لیکن ابتدائی شیر خوارگی میں دانت نکلنے سے قبل دوسری قسم کی شربتی و نیم شربتی غذائیں ہی اس کے لئے موزوں ہیں اس موٹی اور سیدھی سی بات میں خدا معلوم اتنا گھبرانے کا کون سا پہلو ہے جو آج بعض مفسرین جدید خود مسئلۂ نسخ ہی سے انکار پر تل گئے ہیں یہ بھی خوب واضح رہے یہ نسخ جو کچھ بھی ہو گا محض علم بشری ناقص و محدود کے اعتبار سے ہو گا، ورنہ علم الٰہی میں تو ہر حکم ازل سے وقتِ معین کے لئے مقرر و ثابت ہی ہے جمہور کا مذہب اسی وقوع نسخ کا ہے گو ایک گروہ عدم نسخ کا بھی قائل رہا ہے

وبروی عن بعض المسلمین انکار النسخ واحتج الجمھور من المسلمین علی جواز النسخ ووقوعہ کبیس والمسلمون کلھم متفقون علی جواز النسخ فی احکام اللہ تعالیٰ لما لہ فی ذالک من الحکمۃ البالغۃ وکلھم قال بوقوعہ (ابن کثیر)

اور ابن کثیر میں ابو مسلم اصفہانی کا قول قرآن میں عدم وقوع نسخ کا نقل کر کے اس کا بڑی سختی سے رد کیا ہے۔

وقال ابو مسلم الاصفہانی المفسر لم یقع شیٔ من ذلک فی القرآن وقولہ ضعیف مردود مرذول (ابن کثیر)

فقیہ جصاص نے کسی صاحب کا قول بھی جو فقہ میں فاضل نہ تھے مگر ادب و لغت کے ماہر تھے اس معنی میں نقل کیا ہے کہ شریعتِ محمدی کے اندر کوئی نسخ نہیں، ناسخ خود یہ شریعت ساری شریعتوں کی ہے۔

# اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے سلطنت آسمانوں اور زمین کی ہے ۳۸۲

زعم بعض المتأخرین من غیر اھل الفقہ انہ لا نسخ فی شریعۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وان جمیع ما ذکر فیھا من النسخ فانما المراد بہ نسخ شرائع الانبیاء المتقدمین (احکام القرآن)

اصل مغالطہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اصطلاح نسخ کو اردو کی "منسوخی" کے مرادف سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ اصطلاحِ شریعت میں نسخ کے معنی ازالہ یا مٹا دینے کے ہیں ہی نہیں بلکہ کسی مطلق و غیر مقید کو صرف محدود و مقید کر دینے کے ہیں۔

وتفسیر النسخ لغۃ التبدیل وشریعۃ بیان انتھاء الحکم الشرعی المطلق الذی تقرر فی أوھامنا استمرارہ بطریق التراخی فکان تبدیلا فی حقنا بیانا محضا فی حق صاحب الشرع (مدارک) وفی الشریعۃ ھو بیان انتھاء الحکم الشرعی الذی فی تقدیر أوھامنا استمرارہ لولاہ بطریق التراخی (ابو البقا)

اور نسخ کتاب کے معنی عربی میں کتاب کے مٹا دینے کے نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کی صورت کو دوسرے قالب میں منتقل کر دینے کے ہوتے ہیں۔

ونسخ الکتاب نقل صورتہ المجردۃ الی کتاب آخر وذلک لا یقتضی ازالۃ الصورۃ الاولی بل یقتضی اثبات مثلھا فی مادۃ اخری۔ (راغب)

نسخ کے جو معنی اصطلاحِ فقہاء میں ہیں، وہ تو بہت بعد کی اصطلاح ہے اور خود "آیت" بھی آیتِ قرآنی کے معنی میں بعد کی اصطلاح ہے، اس لئے سب سے صاف اور بے تکلف ترجمہ یہ ہوگا کہ "ہم جو موقوف کرتے ہیں کسی نشان کو" اور لفظ "موقوف" بھی قدیم ترین دہلوی ترجموں میں آیا ہے۔

۳۸۰ (یعنی وقت و موسم بدلے ہوئے حالات کے زیادہ مطابق)

ای بما ھو أنفع لکم واسھل علیکم (معالم)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو حال یا وارد، بلا اختیارِ عبد زائل یا مغلوب ہو جائے حق تعالیٰ اس سے بہتر یا اس کے مثل ہی دوسرا عطا کر دیتا ہے سو اس پر افسوس و حسرت نہ کرنا چاہئے

۳۸۱ (سو ایسے قادرِ مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ احوال و مصالح کی رعایت برابر کرتا رہے)

خطاب یہاں معترض، معاند، منکرِ نسخ سے ہے۔

قیل لمنکر النسخ (روح)

اور بعض نے مطلق سامع کو مخاطب قرار دیا ہے۔

والاولی ان یکون المخاطب السامع (بحر)

۳۸۲ (اور اسی کو ہر طرح کا اختیارِ کامل و تصرفِ مطلق حاصل ہے)

خطاب یہاں عام ہے ہر سامع اور مخاطب کے لئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب رسول سے ہے اور آپ کے واسطے سے امت سے

الخطاب للنبی والمراد ھو وأمتہ (بیضاوی)

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٠٧﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ

اور اللہ کے سوا کوئی (بھی) تمھارا یار و مددگار نہیں ۳۸۳ تم تو یہ چاہتے ہو کہ

اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ

اپنے رسول سے سوال کرو ۳۸۴ جیسا کہ (اس کے) قبل موسیٰ سے سوال کئے جاچکے ۳۸۵ اور جو کوئی ایمان

الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿١٠٨﴾

کے بدلے میں کفر اختیار کرے گا ۳۸۶ سو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔

۳۸۳ (اے بنی آدم)

آیت بجائے خود ایک درس توحید کامل کا ہے، ملک، ولایت، نصرت، سب اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔

۳۸۴ (از راہِ عناد و اعتراض) مخاطب یہاں غالباً یہود ہیں۔

نزلت فی الیھود (معالم)

اور اور قول بھی نقل ہوئے ہیں، لیکن ترجیح اسی قول کو ہے۔

اختلفوا فی المخاطب بہ علی وجوہ احدھا انھم المسلمون والقول الثانی انہ خطاب لأھل مکۃ والقول الثالث المراد الیھود وھذا القول اصح (کبیر) ورجح انھم الیھود (بحر)

رَسُوْلَكُمْ سے مراد اس صورت میں رسول وقت سے ہوگی۔ تمھارے زمانہ کے رسول سے لیکن مسلمان ہی اگر مخاطب سمجھے جائیں جب بھی یہ تہدیداً جائز ہوگا۔

اَمْ بعض اہل نحو نے اسے ہمزہ کا مرادف اور سوالیہ یا استفہامیہ مانا ہے۔

قال بعض البصریین ھی بمعنی الاستفھام (ابن جریر)

لیکن اکثر نے اسے منقطعہ قرار دیا ہے اور بَل کے معنی میں لیا ہے۔

أم اذا جرد عن الف الاستفھام فمعناہ بل (راغب) ام ای بل (جلالین) ام منقطعۃ التقدیر بل تریدون (مدارک) ام ھھنا منقطعۃ والتقدیر بل تریدون (عکبری) فیھا الأضراب والانتقال عن حملھم علی العمل بموجب علمھم (ابوسعود)

۳۸۵ سوال اگر کسی مسئلہ کی سنجیدہ تحقیق و دریافت کے لئے ہوں تو باعثِ رحمت ہیں لیکن جب ضد اور لفاظت اور شرارت سے ہوں، اور اعتراض محض اعتراض کی غرض سے ہو تو وہی سوالات ایک لعنت بن جاتے ہیں حضرت موسیٰ سے جیسے جیسے گستاخانہ سوالات اور بیہودہ فرمائشوں کی بھرمار بنی اسرائیل کرتے رہے ان کے تذکرہ سے تاریخ اسرائیل اور خود بائبل کے صفحات لبریز ہیں قرآن کا اس کو اتنی کھلی ہوئی تلمیح کے طور پر لے آنا بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ قرآن بھیجنے والا، اس سے خوب واقف تھا اور یہ کلام عرب کے ایک ان پڑھ انسان کی تصنیف ہو نہیں سکتا۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا

بہت سے اہل کتاب تو دل ہی سے چاہتے ہیں کہ تمھیں ایمان (لے آنے) کے بعد پھر سے کافر بنا لیں ۳۸۶ حسد کی

مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا

راہ سے جو ان کے نفسوں میں ہے ۳۸۸ (اور یہ بھی) بعد اس کے کہ ان پر حق واضح ہو چکا ۳۸۹ سو معاف

وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۱۰۹

کرتے رہو اور درگزر کرتے رہو ۳۹۰ تا آنکہ اللہ اپنا حکم بھیج دے ۳۹۱ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۲

الثلثة

۳۸۶ (جس کی ایک شکل یہی رسول سے معاندانہ اور گستاخانہ سوال و جواب ہے)
يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایمان کے بدلہ اور مقابلہ میں راہِ کفر کو اختیار کیا۔
من يتبدل الكفر اى يختاره ويأخذه لنفسه (ابوسعود) بالايمان اى بمقابلته بدلا منه (ابوسعود)
سیاق میں ذکر یہود کا ہے اس لئے انھیں کے ایک نبی کے صحیفہ کا اقتباس بے محل نہ ہوگا:۔
"سنو اے آسمانو! اور کان لگا اے زمین کہ خداوند یوں فرماتا ہے کہ لڑکوں کو میں نے پالا پوسا پھر انھوں نے مجھ سے سرکشی کی، بیل اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور گدھا اپنے صاحب کی چرنی کو، بنی اسرائیل نہیں جانتے، میرے لوگ کچھ نہیں سوچتے، آہ خطا کار گروہ، ایک قوم جو گناہ سے لدی ہوئی ہے، بدکاروں کی نسل خراب اولاد کہ انھوں نے خداوند کو ترک کیا، اسرائیل کے خدا ہی کو حقیر جانا، اس سے بالکل پھر گئے"۔ (یسعیاہ ۔ ۱: ۳، ۴)

۳۸۷ (اے ایمان والو)
شانِ نزول کے ایک مخصوص واقعہ کی بنا پر عموماً مفسرین نے یہاں اہل کتاب سے مراد یہود یا احبار یہود کو لیا ہے لیکن لفظ قرآنی عام ہے، اور یہود و نصاریٰ دونوں اس کے عموم میں یکساں داخل ہیں، مسیحیوں کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم اور علماء یہود کی طرف سے نسبۃً ہلکا اور مخفی پروپیگنڈا عقائدِ اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی، جغرافی، تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی آبادیوں کے درمیان جاری رہتا ہے وہ سب اسی حقیقت کے مظاہر ہیں، غایت ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کی یہی رہتی ہے کہ مسلمان اگر یہودیت و مسیحیت کو نہ بھی قبول کریں جب بھی کم سے کم اپنے دین کی طرف سے تو ضرور بدگمان و برگشتہ ہو کر رہیں۔ ۔۔۔ پرانے مفسروں نے بھی کہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ایک زبردست انتباہ کافروں کی مسلم دشمنی سے متعلق ہے۔
يحذر تعالى عباده المؤمنين عن سلوك طريق الكفار من اهل الكتب ويعلمهم بعداوتهم لهم فى الباطن والظاهر (ابن کثیر)

۳۸۸ یعنی یہ کوششیں اور سرگرمیاں بھی اخلاص و خیر خواہی کی راہ سے نہیں، رشک و حسد سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، یہود کا حسد تو خود اپنے پیغمبر و ہادی تک سے رہا ہے اور اس پر خود عہد عتیق ناطق ہے:۔
"انھوں نے خیمہ گاہ میں موسیٰ کے برادر و خداوند کے مقدس مرد ہارون پر حسد کیا"۔ (زبور ۔ ۱۰۶: ۱۶)
اور عہد جدید کی شہادتیں بھی حسد کے باب میں کچھ کم واضح و صریح نہیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ

اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو ۳۹۳ؔ اور جو کچھ بھلائی تم اپنے واسطے آگے بھیجدو گے اسے

تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ

اللہ کے پاس پالو گے ۳۹۴ؔ یقیناً تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے ۳۹۵ؔ اور یہ کہتے ہیں کہ

يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ

جنت میں کوئی ہرگز نہ داخل ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا نصرانی ہو ۳۹۶ؔ یہ ان کی (نری) آرزوئیں ہیں ۳۹۷ؔ

"یہودیوں نے حسد میں آکر بازاری آدمیوں میں سے کئی بدمعاشوں کو اپنے ساتھ لیا اور بھیڑ لگا کر شہر میں فساد کرنے لگے" (اعمال ۔ ۱۷ : ۵) "یہودی اتنی بھیڑ دیکھ کر حسد میں بھر گئے" (اعمال ۱۳ : ۵۱)

۳۸۹ؔ یعنی اہلِ کتاب کے اس انکار و مخالفت کی بنیاد کوئی اشتباہ یا مغالطۂ عقلی نہیں، مخصوص ضد اور عناد اور استکبار ہے، وضوحِ حق ان پر پوری طرح ہوچکا ہے۔

۳۹۰ؔ (سردست اے مسلمانو، ان سے کسی طرح کا انتقام نہ لو)

یہود کی مغویانہ کوششوں پر مسلمانوں کا اشتعال ایک امر طبعی تھا، ان کو ہدایت ہو رہی ہے کہ سرِ دست عفو و درگزر ہی سے کام لیتے رہو اور انتقامی تعزیری کارروائیاں فوراً نہ شروع کر بیٹھو۔

سورۃ اور آیت مدنی ہے، مکی زندگی مدت ہوئی ختم ہوچکی ہے اور رسول اور سب صحابی رفعِ شر کے لئے وطن سے بے وطن ہو کر اب مدینہ آچکے ہیں، حکمِ قتال یہاں آتے ہی فوراً نازل نہیں ہو جاتا، صبر کے ساتھ انتظار کرنے کی ہدایت یہاں بھی خاصی مدت تک ملتی رہتی ہے۔

۳۹۱ؔ (جہاد و قتال کے لئے)

اکثر صحابہ و تابعین سے حکم کی تفسیر حکمِ جہاد و قتال کے ساتھ منقول ہے۔

انه الأمر بالقتال وهو قول اكثر الصحابة (كبير) الذى هو الاذن فى قتالهم (بيضاوى) المراد به الأمر بالقتال (روح)

حکمِ قتال اس وقت تک نہیں نازل ہوا تھا، آیت سے صاف اشارہ اس طرف نکل آیا کہ آئندہ ہونے والا ہے۔

۳۹۲ؔ (پس ایسے قادرِ مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ سرکش اور زور آور کافروں سے پورا بدلہ لے اور ان کا زور توڑ دے اور مظلوم و مغلوب مسلمانوں کو دیکھتے دیکھتے مظفّر و منصور، حاکم و غالب بنا دے۔)

۳۹۳ؔ (اس درمیان میں اے مسلمانو!)

مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جہاد کے احکام دوسرے ہیں، جب تک وہ نافذ نہ ہوں، ان کے انتظار میں عام احکامِ اسلامی کی پابندی میں غفلت و تساہل کو راہ نہ دو، یہ مالی اور بدنی عبادتیں تو ہر حال و صورت میں واجب العمل ہیں۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ

آپ کہہ دیجئے کہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو ۳۹۸ ہاں البتہ ۳۹۹ جو کوئی (بھی)

وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ أَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ

اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکائے اور وہ مخلص بھی ہو ۴۰۰ تو ایسے کے لئے اس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے

۳۹۴ نیکی کچھ جہاد و قتال ہی پر موقوف نہیں، اعمالِ صالحہ جو کچھ بھی میسر آجائیں سب یکساں مقبولیت رکھتے ہیں، برابر انھیں میں لگے رہو۔

لِأَنْفُسِكُمْ۔ حذف مضاف ہے یعنی اپنے نفع، اپنی نجات و مغفرت کے واسطے۔

وهو على حذف مضاف اى لنجاة أنفسكم (بحر)

تَجِدُوْهُ۔ اسے پالوگے یعنی اس کے اجر و ثواب کو پالوگے۔

تجدوه اى ثوابه (بیضاوی) المراد وجدان ثوابه وجزائه (کبیر)۔

۳۹۵ (سو اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی نیکی ضائع ہوجائے گی، اجر ہر نیکی کا پورا پورا ملے گا۔)

ان آیتوں میں تردید ہے اس گروہ کی جو دین کو جہاد و قتال کے ساتھ مخصوص سمجھتا ہے جب حالات تکوینی ایسے پیش آجائیں کہ جہاد و قتال ممکن العمل نہ رہے تو باقی احکامِ اسلام کی تعمیل پر بھی پورا ہی اجر دینے والا اللہ ہے۔

بَصِيْرٌ۔ پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

۳۹۶ یہ کہنے والے یہود و نصاریٰ تھے، قرآن مجید نے انھیں کی ترجمانی کی ہے، یہود کا یہ عقیدہ شروع سے چلا آرہا ہے کہ نجات انھیں کی قوم اور وابستگانِ قوم کے ساتھ مخصوص ہے، چنانچہ انجیل میں بھی انکا یہ قول نقل ہوا ہے کہ:

"نجات یہود میں ہے۔" (یوحنا۔ ۴ : ۲۲)

یہود و نصاریٰ دونوں کے ہاں کے مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی، ظہورِ اسلام کے وقت یہود و نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ اس نئے دین کے قبول کرنے کی ضرورت کیا، نجات تو ہمارے دینوں کے ساتھ وابستہ ہے

۳۹۷ (جو کبھی پوری ہونے والی نہیں اور جن کی تائید میں نہ کوئی دلیل معقول ہے اور نہ سند منقول)

محض بزرگ زادگی اور نسلی و نسبی شرافت جب پیغمبروں کی اولاد کے کام نہ آسکی تو ہمارے زمانہ کے پیرزادوں اور شاہزادوں کا اپنے شرفِ نسلی پر قناعت کئے رہنا کس درجہ بے عقلی ہے۔

أُمْنِيَّة واحد ہے امانی کا منی سے مشتق۔ اضحوکہ۔ اعجوبہ کے وزن پر۔

۳۹۸ (اپنے اس دعویٰ میں کہ نجات یہودیت یا نصرانیت کے ساتھ وابستہ ہے)

پیغمبر علیہ السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ اہل کتاب سے کہئے کہ خالی زبانی دعووں اور خالی آرزوؤں سے کیا ہوتا ہے اگر حقانیت کے مدعی ہو تو اپنی تائید میں کوئی دلیل عقلی یا نقلی لاؤ۔

امام رازی نے آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ دعوے نفی کا ہو یا اثبات کا مدعی کے ذمہ بہرصورت برہان کا پیش کرنا ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾ ع وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ ۱۳ع ۹ ۱۲

اور ایسوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے ۴۰۱ اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی

النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ ص وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَىْءٍ لا

بنیاد پر نہیں ۴۰۲ اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں ۴۰۳ درانحالیکہ

وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ط كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ج

وہ سب (ایک ہی) کتاب (آسمانی) پڑھتے ہیں ۴۰۴ اسی طرح وہ لوگ بھی کہنے لگے انھیں کا سا قول جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے ۴۰۵

وتمت الآية على ان المدعى سواء ادعى نفيا او اثباتا لابد له من الدليل والبرهان وذلك من اصدق الدلائل على بطلان القول بالتقليد۔ (کبیر)

۳۹۹ یعنی نجات کا صحیح قانون یہ ہے جو آگے بیان ہو رہا ہے۔

بَلٰی۔ اپنے ماسبق کی نفی و تردید کے لئے ہے یعنی تمہارا دعویٰ غلط محض ہے صحیح قاعدہ یہ ہے جو آگے آرہا ہے۔

۴۰۰ (اپنے اس ایمان و اعتقاد میں)

یعنی اس کا عمل بھی اس کے عقیدۂ توحید کے مطابق ہو گویا ایمان و حسنِ عمل دونوں جمع ہوں۔

وجہ کے لفظی معنی چہرہ کے ہیں لیکن محاورۂ عرب میں اکثر مراد ذات سے یا عینِ شے سے ہوتی ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔

ربما عبّر عن الذات بالوجه (راغب) فالوجه اِمّا مستعار للذات واِمّا مجاز عن القصد (روح) وخص الوجه بالذكر لكونه اشرف ما يرى من الانسان ولانه موضع الحواس وفيه يظهر العزّ والذل والعرب تخبر بالوجه عن جملة الشئ (قرطبی)

اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ یعنی توحید کا پوری طرح قائل ہو جائے بلا آمیزشِ شرک۔

اى اخلص نفسه له لا يشرك به غيره (کشاف) لم يقصد سواه (روح) ومعنى اسلم استسلم وخضع وقيل اخلص عمله (قرطبی)

۴۰۱ خوف و اندیشہ کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن و غم ماضی کے واقعات پر ہوتا ہے ذکر قیامت کا ہے کہ اس روز اہلِ ایمان نہ اپنے ماضی پر حسرت و تاسف کریں گے نہ آئندہ کے لئے دہشت زدہ ہوں گے یہ پورا فقرہ اور اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے۔

۴۰۲ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے یہودی قوم عقیدۃً بہرحال موحد تھی نصرانیت کا شرک اور الوہیت کی تثلیث وہ برداشت ہی نہ کر سکتی تھی اور نہ اس کی قائل ہو سکتی تھی کہ ایسے گڑھے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۴۰۳ یعنی ان کا دین تمام تر باطل ہے شریعتِ موسوی سے متعلق موجودہ انجیلوں میں تذکرہ الفاظِ ذیل میں ملتا ہے

"آدمی شریعت کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع مسیح پر ایمان لانے سے راست باز ٹھہرتا ہے" (گلتیوں ۲: ۱۶)

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ

سو اللہ ان کے درمیان قیامت کے دن اس باب میں فیصلہ کر دے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں ۴۰۶ اور اس سے

اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ

بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اس سے روک دے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے ۴۰۷ اور ان کی بربادی کی کوشش کرے ۴۰۸

"شریعت کے اعمال سے کوئی بشر راستباز نہ ٹھہرے گا"۔ (ایضاً ۲: ۱۶) "راستبازی اگر شریعت کے وسیلے سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا"۔ (ایضاً ۲: ۲۰) ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اصطلاح انجیل میں مطلق شریعت (LAW) سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہوتی ہے۔

۴۰۶ اَلْكِتٰبَ۔ یعنی مجموعۂ صحائف انبیاء بنی اسرائیل۔ اسی کو آج عہد نامۂ عتیق کہتے ہیں، یہود و مسیحی دونوں ان صحیفوں کے الہامی و مقدس ہونے کے قائل ہیں۔

وَهُمْ میں وَ حالیہ ہے عطف کے لئے نہیں۔

الواو للحال۔ (کشاف)

افسوس ہے کہ انھیں گمراہ قوموں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی باوجود اپنی مشترک کتاب قرآن کے گروہ در گروہ ہو کر ایک دوسرے کی تحقیر بلکہ تفسیق و تضلیل شروع کر دی اور نوبت تکفیر کی آجاتی ہے، حد یہ ہے کہ شافعیہ حنفیہ کو ذلیل سمجھنے لگے، اور اشعریہ ماتریدیہ کے نزدیک حقیر ہو گئے، ہدایت ان کے اپنے اپنے مختصر حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی!

۴۰۵ (وحی اور نبوت کا)

وہ کہنے لگے کہ اہل کتاب میں سے کوئی بھی حق پر نہیں۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ علم سے آیت میں مراد کتاب آسمانی کا علم ہے، یہ کہنے والے کون تھے؟ عموماً ان سے مراد مشرکین عرب لئے گئے ہیں، اور ہر ایسے مذہب کے پیرو جس کی بنیاد کسی کتاب آسمانی پر نہ ہو یعنی ہر دین جاہلی کے پیرو اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

قال بعضھم عنی بذلك مشرکی العرب لانھم لم یکونوا اھل الکتب فنفی عنھم من اجل ذلك العلم (ابن جریر)

ای الذین لا علم عندھم ولا کتاب کعبدۃ الاصنام والمعطلة ونحوھم (کشاف، مدارك) وھم مشرکو العرب فی قول الجمھور (روح)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ کے مفہوم کو عموم ہی پر رکھنا بہتر ہوگا، جس کے تحت میں سب ہی اہل باطل آجاتے ہیں۔

واختار ابو جعفر ابن جریر انھا عامة تصلح للجمیع ولیس لھم دلیل قاطع یعین واحدا من ھذہ الاقوال والحمل علی الجمیع اولی (ابن کثیر)

قرآن مجید نے علم اور اس کے مختلف صیغوں یعلمون وغیرہ کو جہاں جہاں استعمال کیا ہے عموماً علم حقیقی علم وحی و نبوت ہی کے معنی میں کیا ہے، ان آیتوں سے آج کے رواجی "علوم و فنون" اور اسکولوں کالجوں یونیورسٹیوں کی "تعلیم" پر استدلال کرنا کس قدر ظلم قرآن مجید اور فہم سلیم دونوں پر ہے!

مِثْلَ قَوْلِهِمْ یعنی یہود و نصاریٰ جس طرح ایک دوسرے کو باطل قرار دیتے تھے اسی طرح اہل عرب رسول اسلام (علیہ السلام) کو باطل پر کہنے لگے۔

وقال السدی فہم العرب قالوا لیس محمد علی شیئ (ابن کثیر۔ ابن جریر) قال مقاتل یعنی مشرکی العرب کذلک قالوا فی نبیہم محمد و اصحابہ انہم لیسوا علی شیئ من الدین (معالم)

۴۰۶ فیصلہ سے عملی حسی فیصلہ مراد ہے، ورنہ جہاں تک دلائل و شواہد کا تعلق ہے، حق و باطل، کفر و ایمان کے درمیان یقینی فیصلہ تو اس دنیا میں بھی موجود ہے۔

بَیْنَهُمْ سے مراد ایک فریق اہل حق و ایمان کا، اور دوسرا گروہ اہل باطل و کفر کا۔

یقضی بین المحق والمبطل (معالم) یحکم بین المحق والمبطل (کبیر)

۴۰۷ (جیسا کہ مشرکین مکہ نے عین حرم کعبہ میں ذکر عبادت الٰہی سے مسلمانوں کو روک دیا تھا، خصوصاً واقعۂ حدیبیہ میں)

ھؤلاء المشرکون حین حالوا بین رسول اللہ صلعم یوم الحدیبیۃ و بین ان یدخل مکۃ (ابن جریر عن ابن زید)

حیرت ہے کہ بعض مفسرین یہاں بے احتیاطی سے برابر یہ روایت نقل کرتے گئے ہیں کہ یہاں اشارہ مسیحیوں کی جانب ہے جنھوں نے بخت نصر کلدانی کے حملۂ بیت المقدس کے وقت اس کی مدد کر کے بیت المقدس قبلۂ یہود کی بربادی میں شرکت کی تھی، حالانکہ بخت نصر کا زمانہ ولادت مسیحؑ سے کئی صدی قبل کا تھا، اس وقت مسیحیوں کا وجود ہی کیسے ہو سکتا تھا، خوشی کی بات ہے کہ اس روایت کی پوری تردید خود ہی ایک قدیم مفسر جصاص رازی نے کردی ہے جو فقہ میں تبحر کے ساتھ تاریخ پر بھی پوری نظر رکھتے تھے، اور امام رازی نے بھی تفسیر کبیر میں اُسے دُہرایا ہے۔

لاخلاف بین اھل العلم باخبار الاولین ان عھد بخت نصر کان قبل مولد المسیح علیہ السلام بدھر طویل والنصاریٰ انما کانوا بعد المسیح (احکام القرآن)

بخت نصر کلدانی یا بابلی کی بربادی بیت المقدس کی تاریخ ۵۸۶ ق۔ م ہے۔

بعض نے مراد بیت المقدس سے لی کہ وہاں ٹائیٹس (طیطاؤس) رومی کے عہد میں رومی مشرکین نے یہود اہل توحید کو ذکر الٰہی سے روک دیا تھا، بہر حال حکم عام ہے، قریبی سبب نزول جو کچھ بھی رہا ہو، حکم کو کسی خاص مسجد یا خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص کرنا درست نہیں۔

انہ کل مسجد وھو الصحیح لان اللفظ عام ارد بصیغۃ الجمع فتخصیصہ ببعض المساجد او فی بعض الأزمنۃ محال (ابن العربی)

مَسٰجِدَ اللّٰهِ مسجد کے لفظی معنی جائے سجدہ کے ہیں، مراد اس سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہوتی ہے، مسجد کے حسن و تاثر، کشش و دل آویزی، صفائی و سادگی کی شہادت غیر مسلموں کی زبان سے بھی منقول ہے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

اَظْلَمُ یعنی ظالم تر، خبیث تر، مجرم تر۔

فقہاء نے تصریح کی ہے کہ منع ذکر و داخلۂ مسجد اگر کسی ضرورتِ دینی اور مصلحتِ شرعی سے ہو تو بالکل درست ہے، کہ ایسے موقع پر یہ امور مسجد کی بربادی و ویرانی میں نہیں، عین اصلاح و آبادی میں داخل ہیں، مسائل ذیل بھی فقہاء نے آیت کے تحت میں درج کئے ہیں

ا۔ مسجد میں اذنِ عام ہونا شرط ہے۔

أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي

یہ لوگ اس لائق ہی نہیں کہ ان میں داخل ہوں مگر ہاں یہ کہ ڈرتے ہوئے ف۴۰۹ اُن کے لئے

الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۱۴﴾

دنیا میں (بھی بڑی) رُسوائی ہے اور آخرت میں (بھی) بڑا عذاب ہے ف۴۱۰

۲۔ مسجد کا دروازہ کسی مملوک زمین پر نہ ہو۔

بعض عارفوں نے لکھا ہے کہ جب اینٹ اور چونے کی بنی ہوئی عمارت میں ذکرِ حق روک دینے والوں کے حق میں قرآن نے یہ وعید اور پھٹکار رکھی ہے تو اس قوم یا شخص کے جرم کی اہمیت یا عظمت کا کیا ٹھکانا ہے جو قلوبِ انسانی کو کہ وہ معنوی سجدگاہِ حق ہیں ذکرِ حق سے روکے، اسلامی تعلیم کی روک تھام میں سعی کرنا اشاعت مذہب کے حق میں روڑے اٹکانا سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

ف۴۰۸ فقہاء نے کہا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے ممنوعات و بدعات کے ارتکاب سے مسجد کی بربادی بھی سمجھی جائے گی نیز وہ تمام اُمور جو نمازیوں کی کمی اور مسجد کی ویرانی کا باعث ہوں، آیت کے تحت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

ف۴۰۹ (مسلمانوں کے رُعب و دبدبہ سے)

یعنی داخلہ کی اجازت غیر مسلم کو صرف اس حال میں دی جا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کا محکوم ہو اور اس کا داخلہ سرکشانہ نہیں مطیعانہ ہو، قرآن مجید میں لفظ مساجد بہ صیغۂ جمع ہے لیکن ایک قول ہے کہ مساجد سے یہاں مراد مسجد حرام یا حرم کعبہ ہی ہے۔

المراد بالمساجد المسجد الحرام۔ (معالم عن ابن زید)

اور اس شبہ کا کہ لفظ جمع سے مراد واحد کیوں کر ہو گی، جواب یہ دیا گیا ہے کہ محاورۂ زبان میں یہ جائز ہے، مثلاً اگر کوئی محض ایک ہی مردِ نیک کو ایذا پہنچائے تو یہ کہنا درست ہو گا کہ نیکوں کا ستانے والا بڑا ظالم ہے۔

کما تقول لمن اٰذی صالحا واحدا ومن اظلم ممّن اٰذی الصالحین۔ (کشاف)

ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت سارے کافروں کے حق میں ہے کہ عبادت سے روکنے والے تو سارے ہی کافر ہیں اور مساجد سے مُراد کل روئے زمین ہے چنانچہ کافروں کو دار الاسلام میں داخلہ کا کوئی حق نہیں بجز اس کے کہ مسلمانوں ہی کی شرائط پر ہو اور یہ قول امام ماتریدی کی جانب منسوب ہے (روح) مراد اگر مسجد حرام لی جائے تو قانونی و تشریعی حیثیت سے قطع نظر، واقعاتی رنگ میں بات بالکل صحیح نظر آئے گی، چنانچہ مسجد حرام اس وقت سے آج تک بحمد اللہ مسلمانوں ہی کے قبضہ میں چلی آ رہی ہے۔

مَسَاجِدَ اللّٰہِ کی ترکیب سے فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ جو جگہ عبادت کے لئے مخصوص کر دی جائے اور اس کے لئے اذنِ عام دے دیا جائے، وہ شخصی ملکیت سے خارج ہو جاتی ہے، البتہ اگر کسی نے اپنے گھر کا کوئی حصہ عبادت کے لئے مخصوص کر لیا اور اس کے لئے اذنِ عام نہیں رکھا تو اس پر مسجد کا اطلاق ہی نہ ہو گا، اور وہ اس شخص کی ذاتی مِلک باقی رہے گی (ابن العربی)

ف۴۱۰ عذاب آخرت کا تجربہ تو آخرت ہی میں ہو گا، باقی دنیا میں ان لوگوں کی ذلت و رسوائی کا مشاہدہ تو چند روز میں سب کو ہو گیا، یہود، مشرکین، منافقین، سارے اعدائے اسلام، جزیرۂ عرب میں اور اس کی سرحدوں میں دیکھتے دیکھتے نیست و نابود ہو کر رہے اور قرآن مجید کی پیش گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ

اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی) ۴۱۱ سو تم جدھر کو بھی منہ پھیرو ۴۱۲ ادھر ہی اللہ کی ذات ہے ۴۱۳

وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ

بیشک اللہ بڑا وسعت والا ہے ۴۱۴ بڑا علم والا ہے ۴۱۵ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے ۴۱۶ کیا پاک ہے وہ! ۴۱۷

**۴۱۱** (بہ حیثیت مخلوق و بہ حیثیت مملوک بھی)

یعنی انهما له ملكا وخلقا (ابن جریر)

لِلّٰهِ میں لام اختصاص کا ہے، نحو میں لام جارّہ کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک لام اختصاص بھی ہے یعنی مشرق و مغرب سب اسی کے ہیں۔

(اللام لام الاختصاص ای هو خالقهما ومالكهما (کبیر)

اُمّتِ محمدیؐ جواب ساری دنیا کے لئے اُمّتِ عادلہ بنا کر بھیجی جا رہی تھی لازمی تھا کہ اس کی مرکزیت و یکجہتی کے لئے ایک قبلہ بھی ہو اور وہ قبلہ اب خانۂ کعبہ مقرر ہو رہا تھا، اہل کتاب نے اس پر اعتراضات شروع کئے، یہ نقل اعتراض و جواب اعتراض کی تمہید ہے۔ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ . دونوں سمتیں اور انھیں دو پر کیا موقوف ہے، ہر سمت اور ہر جہت اللہ تعالیٰ کے لئے یکساں ہے، وہ سب کا یکساں خالق ہے، حاکم ہے، مالک ہے، کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدیس، کوئی شائبہ اُلوہیت، کوئی شانِ حق نمائی موجود نہیں۔ یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے، بات سرسری نہیں بہت گہری ہے۔ مذاہبِ جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں، جہالتوں، وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے، ایک مشترک گمراہی مشرک قوموں میں یہ رہی ہے کہ خدا چونکہ متمکن ہے اور مجسّم ہے اس لئے لازمی ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی متعین سمت یا جہت میں ہو اور اس تلبّس کی بنا پر خود وہ سمت یا جہت مقدّس ہے، مصری، ہندی، رومی، تمام مشرک قوموں نے خدا کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کر کے اسی جہت کو مقدس مانا ہے اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہبِ شرکیہ میں عموماً اہم و مقدم رہا ہے اس لئے شاہ خاور کے طفیل میں سمت مشرق ہی عموماً مقدّس سمجھی گئی اور دنیا کے اکثر علاقوں میں پجتی رہی، مسلمان جس کی آنکھیں ہی توحید کے آغوش میں کھلی ہیں اس کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ سمت و جہت جیسی خیالی چیز بھی قوموں کی معبود ہو سکتی ہے، مشرکوں ہی کے اثر سے یہ سمت پرستی کا شرک اہل کتاب میں سرایت کر گیا اور مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات دونوں میں اپنے وقت کے رائج و شائع رومی مذہب ہی کا نقش بہ نقش چربہ تو ہے اس لئے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا، یہود جنھیں اپنی توحید پر ناز تھا، وہ بھی تمام تر محفوظ نہ رہ سکے، بلکہ ان کے بعض فرقے تو پوری طرح اس صف میں آگئے، بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، انھوں نے دیکھا کہ مشرق اگر خطۂ حیات کی بنا پر مقدّس ہے، تو مغرب بھی خطۂ موت و دیار ہلاکت ہے، شاہ خاور طلوع اگر ادھر سے ہوتا ہے تو روزانہ غروب و رفتا تو ادھر ہی ہوتا ہے، پھر اس کے تقدس کا بھی کیوں نہ قائل ہو لیا جائے، چنانچہ یہ دونوں سمتیں خوب پجتی رہیں، مشرق زیادہ اور مغرب اس سے کچھ کم، اصل انگریزی حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی، دنیا کی دنیا اس سمت پرستی کے شرک اس مشرق پرستی اور مغرب پرستی کی ضلالت میں مبتلا تھی کہ توحید قرآنی نے ساری دنیا

کے عقائد کو چیلنج کر کے اس شرکانہ عقیدہ پر ضرب لگا کے ایک عالم کو چونکا دیا، قدیم مذاہب یہ آواز سن کر بھونچکے سے رہ گئے۔

**۴۱۲ؔ** (دعا کے لئے، نماز کے لئے، یا کسی عبادت کی بھی غرض سے، اے مسلمانو!)

خطاب اہل ملت سے ہو رہا ہے جس کا کام ہی دنیا میں خدائے واحد کی پرستاری تھی اور شرک اور ہر شائبۂ شرک سے بیزاری۔

اَیۡنَمَا کے معنی حَیۡثُمَا بھی کئے گئے ہیں۔

عن مجاھد قال حیثما کنتم (ابن جریر)

**۴۱۳ؔ** یعنی وہ خدائے واحد جو ہر مکان، ہر ظرف کی قید سے پاک، ہر سمت و جہت سے منزہ ہے اس کی ذات پاک کی تجلیات ہر طرف ہیں، سب کہیں ہیں، جدھر بھی رخ کرو گے جلوہ اسی کا پاؤ گے اس کی تجلیات کو کسی خاص جہت کے ساتھ محدود و مخصوص کر لینا عین جہل ہے۔

وَجۡهُ لفظی معنی چہرہ کے ہیں، ثانوی معنی ذات یا وجود کے ہیں، وجہ اللہ کی ترکیب جب آئے گی مراد اللہ کا چہرہ نہیں، ذات یا وجود ہی سے ہوگی اور وہی یہاں بھی مراد ہے۔

ربما عبّر عن الذات بالوجه (راغب) فثم ذاته (بیضاوی) قیل الوجه بمعنی الذات جعل ھنا کنایة عن علمه واطلاعه بما یفعل ھناك (روح) قال الحذاق ذلك راجع الی الوجود والعبارة عنه بالوجه من مجاز الکلام..... وقال ابن فورك قد تذکر صفة الشیٔ والمراد به الموصوف توسعًا..... کذلك اذا ذکر الوجه ھنا والمراد من له الوجه ای الوجود (قرطبی)

آیت میں پوری تردید آگئی عقیدۂ تجسیم کی جس کے لئے انگریزی میں ایک لمبا سا نام ANTHROPOMORPHISM ہمارے اکابر نے بھی آیت کو اسی معنی میں لیا ہے۔

الآیة من اقوی الدلائل علی نفی التجسیم واثبات التنزیه (کبیر) ھذا یدل علی نفی الجھة والمکان عنه تعالی لاستحالة ذلك علیه (ابن العربی)

مسیحیوں کے ہاں آج تک ایک مذہبی اصطلاح (ORIENTATION) شرق روئی کی چلی آ رہی ہے اور گرجے شرق رویہ ہی بنائے جاتے ہیں، آیت سے اس کی بھی تردید ہو رہی ہے۔

فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ بعض صوفیاء نے کہا ہے کہ ہم بھی اسی طرح کائنات میں جس چیز پر نظر ڈالتے ہیں انوار حق ہی کا جلوہ دیکھتے ہیں

**۴۱۴ؔ** وہ تو خود ہی بے پایاں وسعتوں والا ہے، بڑی سے بڑی وسعت خود اس کے اندر شامل، اُسے بھلا کون اپنے اندر لے سکتا ہے؟ اس کی سمائی کس بڑے سے بڑے ظرف و مکان میں ہو سکتی ہے؟ ہر سمت اور ہر جہت تو خود ہی اس کی مخلوق ہے، مملوک ہے، وہ لامحدود بھلا کسی محدود سمت و جہت میں گھر سکتا ہے؟

واسع باحاطته بالاشیاء (بیضاوی)

یہاں پہنچ کر صوفی منش ناظرین حضرت رومی کی مثنوی کے یہ شعر بھی مستحضر کر سکتے ہیں:-

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ است　　من نہ گنجم ہیچ در بالا و پست

در زمین و آسمان و عرش نیز　　من نگنجم ایں یقیں داں اے عزیز

**۴۱۵ؔ** وہ اپنے اس علم کامل اور حکمتِ بالغہ کے لحاظ سے جو قبلہ چاہے مقرر کر دے اس کی مصلحتوں اور حکمتوں کا احاطہ کون

بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اصل یہ ہے کہ اسی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ۴۱۸ سب اسی کے حکم بردار ہیں ۴۱۹

کر سکتا ہے؟ وہ وحدتِ امت کے لئے تعیینِ قبلہ جب کرے گا مناسب ہی کرے گا اس میں کسی جہت کی ذاتی قدوسیت کو مطلقاً کوئی دخل نہیں

۴۱۶ یہ کہنے والے کون تھے؟ مراد بہت سے اہلِ باطل لئے جا سکتے ہیں لیکن خاص طور پر اشارہ اس گڑھے ہوئے مذہبِ تثلیث کی جانب ہے جس کا نام ایک پیغمبرِ برحق کی جانب منسوب کر کے مسیحیت رکھ دیا گیا ہے حالانکہ اس کے عقائدِ باطلہ سے (نعوذ باللہ) حضرت مسیحؑ کو کوئی نسبت نہیں۔

اِتَّخَذَ وَلَدًا کا صحیح ترجمہ ہے بنا لے رکھا ہے ایک بیٹا ''بنا رکھا ہے ایک بیٹا'' یہاں مسیحیوں کا قول یہ نہیں نقل ہوا ہے کہ خدا کے ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ اِتّخاذِ ولد کا صاف مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گویا کسی کو متبنّٰی کر لیا ہے۔ قرآن مجید کی تلمیحات کو پوری طرح سمجھنے کے لئے قرآن کے صدہا مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی ضرورت ہے کہ نظر اہلِ باطل کے عقائد و خیالات پر ذرا گہری ہو۔ مسیحیوں کے ہاں ایک زبردست فرقہ ADOPTIONISTS اِتّخاذیوں کے نام سے گزرا ہے ان کے مرکزی عقیدہ کے لئے اصطلاحی لفظ تبنّیت یا اِتّخاذیت (ADOPTIONISM) کا ہے۔ عقیدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خِلقۃً خدا نہیں، وہ خدا پیدا نہیں ہوئے، وہ خدا شروع سے بیٹے بنائے اور خود بخود نہیں ہیں بلکہ اصلاً اور خلقۃً یہ انسان ہی تھے، البتہ اقنومِ ثالثہ یعنی روح القدس کا فیضان ان پر شروع ہی سے ہونے لگا تھا، اس لئے وہ قدوسیت کے ایسے اوجِ کمال پر پہنچ گئے اور روحِ الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنومِ اوّل یعنی خدائے برتر و اعظم نے انھیں اپنا بیٹا قرار دے کر، اپنا متبنّٰی بنا کر شریکِ الوہیت کر لیا، اور اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفاتِ الٰہی میں شریک و سہیم ہیں۔ اس عقیدہ کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۷۸۵ء میں ملتی ہے آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق قرار پائے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

آیت میں صاف اشارہ مسیحیت کی اس شاخ کی جانب ہے۔ بڑے سے بڑا محقق مفسر بھی بہرحال بندہ اور بشر ہی ہوتا ہے، کسی کی نظر سے کوئی پہلو رہ جاتا ہے کسی کی نظر سے کوئی۔ مسیحیت کے سلسلہ میں یہ خوب یاد رہے کہ مسیحی مذہب میں عقیدۂ ابنیت کوئی ثانوی درجہ یا فرعی حیثیت نہیں رکھتا، مسیحیت کی روح اور جان یہی عقیدہ ہے۔

۴۱۷ (ہر قسم کی بشری رشتہ داریوں سے جو اس کے لئے ہر حال میں پست اور باعثِ توہین ہیں) کلمۂ سُبْحٰن میں اللہ کی پاکی کے اثبات کے ساتھ اس کے برعکس عقیدہ پر اظہارِ حیرت بھی ہے۔

نزّہ تعالٰی نفسہ بکلمۃ سبحانہ التی تفید التنزیہ مع التعجب ممّا بیّنا فیہ (المنار)

تنبیہ ہے مسیحیوں کو کہ معاذ اللہ، خدا کو خدا بھی کہے جاتے ہو اور پھر اس کے لئے یہ بشری سطح والی رشتہ داریاں بھی مانے جاتے ہو، الوہیت کے باب میں کتنا گھٹیا تخیّل اور کیسا کریہہ نظریہ رکھتے ہو۔

۴۱۸ مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف مملکیت و مملوکیتِ مطلقہ کا ہے نہ کہ فرزندی و دلبندی وغیرہ خرافات کا۔ توحید کی صاف و سادہ تعلیم یہی ہے کہ حق تعالٰی اُن سارے امتیازات و تعینات سے پاک ہے جو اہلِ شرک نے اس کے گڑھ رکھے ہیں۔ ضمناً آیت شرک کی دوسری قسموں پر بھی ضرب لگاتی جاتی ہے، ہر ہستی اللہ کی مملوک ہے کوئی ہستی اس کی

# بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

## (وہ) مُوجد ہے آسمانوں اور زمین کا۴۲۰

ملوکیت سے خارج نہیں اور ہر ہستی صرف اللہ ہی کی مملوک ہے، یہ نہیں کہ کچھ ہستیاں اس کی مملوک ہوں اور کچھ کسی اور کی۔

۴۱۹ (اگر ارادۃً نہیں تو جبلّۃً واضطرارًا)

اللہ کی تکوینی محکومی اور فرمانبرداری سے چارہ کسی کو بھی نہیں۔

کُلٌّ۔ یعنی جمیع مخلوق، مومن وکافر، بلند وپست، کبیر وصغیر، زندہ وبے جان۔

قَانِتُوْنَ۔ سب اسی کے آگے جھکے ہوئے، سب کی تقدیر اسی کی مشیت سے وابستہ۔

ای منقادون لایمتنع شیٔ منهم علی تکوینه وتقدیره ومشیته (کشاف) منقادون لایمتنعون عن مشیته وتکوینه (بیضاوی)

قنوت کے بہترین معنی یہی کئے گئے ہیں کہ اپنے جسم کی شہادت سے اور زبانِ حال سے اللہ کی عبودیت وطاعت کا اقرار کیا جائے۔

واولیٰ معانی القنوت الطاعة والاقرار لله عزوجل بالعبودیة بشهادة اجسامهم بما فیها من آثار الصنعة (ابن جریر)

بڑی یا چھوٹی، وحشی یا ترقی یافتہ کس مخلوق کی مجال ہے، جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کے چوبیس گھنٹوں کے علاوہ کوئی گھنٹہ، کوئی منٹ، کوئی لمحہ اپنے لئے پیدا کر سکے، بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں سے کسی کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز، ایک فٹ ایک انچ جگہ اپنے لئے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان اور مکان کی جو حدیں مقرر کر دی ہیں، اُن سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے جو اس کے خلق کے ہوئے قانونِ حرارت، بُرودت، رُطوبت سے بے نیاز رہ سکے؟ کون ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانون کشش اجسام سے بغاوت کر سکے، عدد، وزن، مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں، کس میں اتنی ہمت ہے کہ گنجائش ان سے عدول وانحراف کی پا سکے؟ بڑے سے بڑے موجد بڑے سے بڑے صناع کا کمال بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے نظامِ تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کر لیا ہے، اور مسبب الاسباب کے حضور میں وہ دوسروں سے بڑھ کر بندۂ قانت ہے۔

كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ۔ اس میں رد آگیا ہر مشرک قوم کا کہ جن جن کو تم ابن اللہ یا دیوی یا دیوتا مانتے ہو وہ اللہ کے شریک وسہیم وہمسر تو کسی حیثیت سے کیا ہوتے سب کے سب اس کے محکوم، اس کے مخلوق، اس کے قوانینِ تکوینی کے تابع ومسخّر ہیں۔

۴۲۰ (اور اسی طرح ساری مخلوق کا، نیز ان سب سے سابق ومقدم بھی ہے)

بَدِيعُ۔ یہاں صیغۂ مبالغہ میں فعیل کے وزن پر مُبدِع کے معنی میں ہے جیسے اَلِیم مُؤلِم کے معنی میں اور سَمِیع مُسمِع کے معنی میں آتا ہے۔

البدیع یقال للمبدع (راغب) ای مبدعها وانما هو مفعل صرف الی فعیل کما صرف المؤلم الی الیم۔ (ابن جریر)

وَاِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اور جب کسی کام کا کرنا ٹھہرالیتا ہے ۴۲۱ تو بس اتنا ہی اس کے لیے کہتا ہے (کہ) ہوجا ۴۲۲ بس وہ ہوجاتا ہے ۴۲۳

اور مصدر ابداع کے معنی ہیں نیست سے ہست کرنا، عدم محض سے وجود میں لانا بغیر کسی مثال یا نمونہ کے اور بغیر کسی سابق مادہ یا ہیولیٰ کے۔

الابداع انشاء صنعة بلا احتذاء واقتداء (راغب) واذا استعمل فی اللّٰه تعالیٰ فهو ایجاد الشیٔ بغیر آلة ولا مادة ولا زمان ولا مكان (راغب)

بدیع وہ ہے جو نہ کسی آلہ کا محتاج ہو، نہ کسی مال مسالہ کا، نہ مقام و مکان کا پابند، نہ زمان و وقت کے مقید محتاج نہ کسی نمونہ کا، نہ استاد کا، وہ صناع نہیں کاریگر نہیں، اصلی اور حقیقی معنی میں خالق اور موجد ہے بغیر کسی اعانت و شرکت کے وجود میں لانے والا۔

معنی المبدع المنشئ والمحدث ما لم یسبقه الی انشاء مثله واحداثه احد (ابن جریر) هو بارئها وخالقها وموجدها من غیر اصل ولا مثال احتذاها علیه (ابن جریر) موجدهما لا علی مثال سبق (جلالین) ای منشئها وموجدها ومبدعها ومخترعها علی غیر حد ولا مثال (قرطبی)

بدیع کا لفظ ان مشرک قوموں کے رد میں ہے جو خدا کو محض صناع کی حیثیت دیتے ہیں اور روح یا مادہ پر دونوں کو کسی نہ کسی درجہ میں اس کا شریک و سہیم رکھتے ہیں گویا مادہ پہلے سے موجود ہی تھا، وہ قدیم و غیر حادث ہے یا روح بھی اس کے ساتھ ساتھ قدیم و غیر حادث ہے اب خدا نے صرف اتنا کیا کہ ایک اعلیٰ درجہ کے کیمسٹ کی طرح ان میں باہمی ترکیب و ترتیب سے نئی نئی صورتیں نمودار کردیں۔

ابداع کا لفظ ان سارے مشرکانہ تخیلات کی تردید کے لئے کافی ہے تقدم ذاتی کے علاوہ تقدم زمانی بھی تمام صفات کمال کی طرح اس کی ذات کے لئے ثابت ہے، وہ سب پر زمانہ بھی مقدم ہے ایک ایسا زمانہ تھا کہ صرف وہ تھا، اور کچھ بھی نہ تھا، نہ جہات نہ اعیان۔

انه تعالیٰ خالق الجهات كلها والخالق متقدم علی المخلوق لا محالة (كبیر) فقد كان الباری تعالیٰ قبل خلق العالم منزها عن الجهات والاعیان (كبیر)

۴۲۱ محض اپنے ارادہ و مشیت سے اور محض اپنی حکمت مطلقہ کے مقتضیٰ کی حیثیت سے۔

ومعنی قضیٰ هنا اراد (بس) حكم بانه یفعل شیئا (كبیر) ای حكم...... (مدارك)

قرآن کا خدا صاحب ارادہ، ذی حیات، صاحب اقتدار خدا ہے یونان کے فلسفیوں اور دوسرے مشرکوں کے خدا کی طرح صرف ایک بے جان، مسلوب الارادہ، علت العلل یا آخری سبب نہیں۔

۴۲۲ یعنی عدم محض سے وجود میں آجا، نیست سے ہست ہوجا، یَقُوْلُ کہتا ہے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح یہ دو حرفی لفظ کُن بولتا ہے لفظ و حرف تو خود ہی حادث ہیں اور نہ حق تعالیٰ کا تلفظ زبان، ہونٹ یا اعصاب کا محتاج ہے بندوں کی سمجھ کے لائق آخر اس کے سوا قریب تر پیرایہ بیان اور اسلوب تعبیر اور کیا اختیار کیا جاتا

# وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ

اور جنھیں علم سے بہرہ نہیں ۴۲۴ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا ۴۲۵

اے بروں از وہم و قال و قیل من　　　خاک بر فرقِ من و تمثیل من ․

مقصود صرف اس قدر ہے کہ اُدھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا اور ادھر معًا اور بلا توسط و توقف اس کا ظہور عملاً ہو گیا۔

وھذا مجاز عن سرعة التكوين والتمثيل اذلا قول ثمّ (مدارك) قلنا ان كن ليس بامر حقيقة اذلا فرق بين ان يقال واذا قضى امرا فانما يكوّنه فيكون وبين ان يقال فانّما يقول لكن فيكون (معالم) ليس المراد به حقيقة امر وامتثال بل تمثيل حصول ما تعلّقت به ارادته بلا مهلة بطاعة المامور المطيع بلا توقف (بيضاوی) المراد من هذه الكلمة سرعة نفاذ قدرة الله فى تكوين الأشياء وانه تعالى يخلق الاشياء لابفكرة ومعاناة وتجربة (كبير)

لَہٗ میں ضمیر اس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج میں نہیں ہوا، لیکن علم الٰہی میں تو بہر حال موجود ہی ہے، اور امر الٰہی کے اعتبار سے مامور و موجود میں کوئی فرق ہی زمانی حیثیت سے نہیں ہر مامور کے معنی موجود ہونے کے ہیں، اور ہر موجود کے معنی مامور ہونے کے ہیں۔

امره للشئ بكن لايتقدم الوجود ولايتأخر عنه فلا يكون الشئ ماموراً بالوجود الا وهو موجود بالامر ولا موجوداً بالامر الا وهو مامور بالوجود (ابن جرير) اطلق على تعلق الارادة الالٰهية بوجود الشئ من حيث انه يوجب (بيضاوی) هو بمنزلة الموجود اذ هو عنده معلوم (بحر) المخاطب هو ذلك الشئ الموجود فى علم الله تعالىٰ المامور به الدخول فى الوجود الخارجى (كازرونى)

كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ کَانَ یہاں تامہ ہے ناقصہ نہیں یعنی "ہو جاؤ" وجود میں آ جانے کے مرادف ہے "فلاں چیز ہو جا یا بن جا" کے مرادف نہیں۔

من كان التامّة بمعنى احدث فيحدث ۔ (بيضاوی)

۴۲۳ یعنی بس وہ شے معًا وجود میں آ جاتی ہے، اس کے ہونے میں نہ کچھ دیر لگتی ہے نہ اس کے لئے کسی اعانت وساطت، شرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔

المراد من هذه الكلمة سرعة نفاذ قدرة الله تعالىٰ فى تكوين الاشياء (كبير)

یہ بھی گویا مشرکین ہی سے خطاب ہے کہ تم عملِ تخلیق خداوندی کو سمجھے بھی ہو؟ اس میں بجز ارادۂ الٰہی کے اور کسی چیز کی شرکت کا گزر ہی نہیں اور اس سے تمھارے شرک کی بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے۔

۴۲۴ یعنی علم حقیقی سے، علوم آسمانی سے مُراد مشرکین ہیں۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ سے یہاں مُراد وہی لوگ ہیں جو علم حقیقی سے بے بہرہ ہیں۔

وهم كفار العرب (ابن جرير عن قتادة والربيع) والمراد جهلة المشركين فى قول ذلك عن قتادة والسدّى والحسن وجماعة، وعليه اكثر المفسرين (روح) قال ابن عباس والحسن والربيع والسدّى نزلت فى كفار العرب (بحر)

اَوْ تَاْتِیْنَآ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّثْلَ قَوْلِھِمْ ؕ

یا ہمارے پاس کوئی نشانِ (عظیم) کیوں نہیں آجاتا ۴۲۶ اسی طرح وہ لوگ کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے ہو چکے ہیں انھیں کا سا کہنا ۴۲۷

تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ان کے قلوب تشابہہ ہو گئے ۴۲۸ ہم نے اپنے نشان تو کھول کھول دیئے ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ۴۲۹

۴۲۵ (براہ راست اور بلا واسطہ انبیاء و رسل)

کما یتکلم رسلہ وانبیاءہ (ابن جریر)

لولا یہاں ھلا کے معنی میں ہے اور ھلا کا اردو ترجمہ "کیوں نہیں" ہی سے ہو سکتا ہے اور محاورۂ قرآنی میں لولا عموماً اسی معنی میں آتا ہے۔

یعنی ھلا یکلمنا اللہ (ابن جریر) وکل ما فی القراٰن لولا فھو بمعنی ھلا الا واحد (معالم)

اور سیوطی نے بھی اتقان (نوع۔ ۴۰) میں یہ قول خلیل نحوی اور ہالک سے نقل کیا ہے مشرکین کا ایک اعتراض یہ تھا کہ خدا اگر اپنے فلاں فلاں بندوں سے بہ قول انھیں کے کلام کر سکتا ہے اور کرتا ہے تو آخر ہم سے کیوں نہیں کرتا ہم بھی تو انسان ہی ہیں۔

۴۲۶ (جس سے ہم چار و ناچار ان پیمبر کے دعوی کی تصدیق کر ہی دیں)

اٰیۃ کے لفظی معنی نشان کے ہیں قرآن مجید میں بکثرت معجزہ کے معنی میں آیا ہے اور یہاں بھی یہی مراد ہے اور معجزہ سے مراد وہ واقعہ ہے جو معمول عام سے ہٹا ہوا اور بلا اسباب ظاہری اس کا ظہور تائید رسول کے لئے ہو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر معنوی دلائل و شواہد تو کثرت سے موجود تھے، لیکن مشرکین کی طرف سے پیہم فرمائشیں جاری رہیں کہ کوئی عظیم الشان حیرت انگیز حسی معجزہ دکھایا جائے جس کے بعد گنجائش ہی چون و چرا کی نہ رہے جن لوگوں کی عقلی و روحانی، اخلاقی سطح پست ہے ان کی طرف سے اولیاء ربانی سے فرمائشیں آج بھی اسی قسم کی خارقِ عادت کرامات کی ہوتی رہتی ہیں۔

اٰیۃ کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے یعنی کوئی عظیم الشان، لرزہ انگیز معجزہ۔

۴۲۷ (اپنے اپنے زمانہ کے پیغمبروں و داعیان حق سے)

یعنی ان کی یہ فرمائشیں کوئی انوکھی اور ان کا یہ مطالبہ کوئی نرالا نہیں جاہلوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اسی قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں رسالتِ محمدی سے حضرات انبیاء میں قریب ترین زمانہ حضرت عیسی کا گزرا ہے آپ عرب میں نہیں شام میں تھے، آپ سے بھی تعلیمات اور اصل پیام کو چھوڑ کر تقاضے انھیں آسمانی نشانوں کے ہوتے رہتے تھے:

"فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لئے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشان دکھا" (متی ۱:۱۶)

یہاں تک کہ خود حق تعالے کو لا دکھانے کی فرمائش شروع ہو گئی تھی۔

"فلپس نے اس سے کہا کہ اے خداوند ہمیں باپ کو دکھا، بس ہمیں کافی ہے"۔ (یوحنا۔ ۱۴: ۸)

الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ سے مراد پرانے زمانے کے مشرکین جاہلین ہیں۔

۴۲۸ یعنی اگلوں اور پچھلوں کے قلب بالکل ایک سے ہیں، بے بصیرتی اور ناحق شناسی میں۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ

ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر ۴۳۰ اور آپ سے اہل دوزخ کی بابت کچھ بھی

الْجَحِيمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ

پوچھ نہ ہوگی ۴۳۱ اور آپ سے یہود و نصاریٰ ہرگز خوش نہ ہوں گے ۴۳۲ جب تک کہ آپ ان کے مذہب کے پیرو نہ ہو جائیں ۴۳۳

انجیل میں یہی مضمون غضب ناکی کے لہجہ میں ہے:۔

"اس زمانے کے بُرے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یونس کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا۔" (متی۔ ۱۶: ۴) "اے گردن کشو اور دل اور کان کے نامختونو، تم ہر وقت روح القدس کی مخالفت کرتے ہو جیسے تمہارے باپ دادا کرتے تھے، ویسے ہی تم بھی کرتے ہو۔ نبیوں میں کس کو تم نے نہیں ستایا؟" (اعمال۔ ۷: ۵۱ و ۵۲)

۴۲۹ مطالبہ ایک نشان (اٰیةٌ بہ صیغۂ واحد) کا تھا، جواب یہ ملا کہ یہاں تو نشان پر نشان (الاٰیات بہ صیغۂ جمع) پیش کئے جا چکے ہیں۔ تاریخ اور سیرت میں جن معجزوں کا ذکر آتا ہے ان سے قطع نظر دو معجزے تو بالکل بیّن و نمایاں تھے:۔

۱۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سچائی، امانت، پاکبازی، عقل و فہم کے لحاظ سے بے نظیر ہونا، آپ کی سیرت مبارک کے ایک ایک جزو کا بجائے خود معجزہ ہونا۔

۲۔ قرآن مجید کا لفظی، معنوی، ظاہری، باطنی، تعلیمی و ادبی اعتبار سے بے مثل ہونا۔

بَيَّنَّا۔ یعنی یہ نشانات کچھ ان سے چھپے ہوئے نہیں ہیں، ہم نے انھیں بالکل واضح و آشکارا کر رکھا ہے، ان میں کسی طرح کا خفا نہیں۔

قَدْ بَيَّنَّا۔ قَدْ کی تاکید نے بَيَّنَّا کی صراحت کو اور زیادہ زوردار بنا دیا، اور اسی کے اظہار کے لئے اردو میں ترجمہ "کھول کھول" لایا گیا ہے۔

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ یعنی یہ کھلے ہوئے نشان بھی نظر انھیں لوگوں کو آتے ہیں جن کے قلب جہل و عناد کی گندگی اور شک و ارتیاب کی آلودگیوں سے پاک ہیں، شواہد و دلائل مادی قسم کے ہوں یا معنوی، بہرحال ان سے نفع حاصل کرنے کے لئے دیدۂ بصیرت و چشم بینا ضروری ہے۔ آنکھ رکھنے والے کے لئے پیمبری کتابِ زندگی کی ایک ایک سطر معجزہ ہے۔ عارف رومیؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔

در دل ہر کس کہ از دانش مزہ است  روئے و آواز پیمبر معجزہ است

اما من کان فی ارتیاب او شك او تغافل او جهل فلا ینفع فیه الآیات ولو كانت فی غایة الوضوح (بحر)

یقین۔ شک کی ضد ہے اور علم و تحقیق کے مرادف ہے۔

الیقین ازاحة الشك والعلم وتحقیق الامر ونقیضه الشك۔ (تاج)

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جو یقین کی طلب اور پیاس اپنے اندر رکھتے ہیں

ای طالبون معرفة حقائق الاشیاء علی یقین وصحة (ابن جریر) ای یطلبون الیقین (بیضاوی)

۴۳۰ (سارے عالم کے لئے اے ہمارے پیغمبر)

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی (بتلائی ہوئی) یہی تو بس راہ ہے ۴۳۴ اور اگر آپ بعد اس علم کے جو آپ کو پہنچ چکا ہے

الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے ۴۳۵ تو آپ کے لئے اللہ (کی گرفت) کے مقابلہ میں نہ کوئی یار ہوگا نہ مددگار ۴۳۶

بِالْحَقِّ حق کے ساتھ یعنی دینِ حق کے ساتھ یا راہِ حق کا ہادی بنا کر، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ حقانیت و صداقت کے ساتھ مع اس کی ساری قوتوں اور دلائل کے۔

بَشِيْرًا مومنین مطیعین کے حق میں کہ جو آپ کے پیغام کو مان لیں گے ان سے دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا وعدہ ہے۔
نَذِيْرًا منکروں اور سرکشوں کے حق میں کہ جو آپ کے پیام سے بغاوت کریں گے۔ ان کی آخرت تو یقیناً اور دنیا اکثر تباہ ہو کر رہے گی۔ اقبال

لطف و قہرِ او سراپا رحمتے آں بہ یاراں ایں بہ اعدا رحمتے

۴۳۱ (اور اہلِ دوزخ وہی ہوں گے جو آپ کے پیام کے منکر ہیں)
تو مطلب یہ ہوا کہ منکرین کے انجام کی ذمہ داری آپ پر کیا ہے؟ آپ کیوں اُن کے لئے اس قدر فکر و تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں؟ آپ کا فرض تو پیام پہنچا دینے پر ختم ہو جاتا ہے آگے کی ذمہ داری آپ پر ذرا بھی نہیں۔
مرشد تھانوی نے فرمایا کہ جو کوئی خود اپنی اصلاح نہ چاہے مرشد کو اس کے زیادہ درپے نہ رہنا چاہئے۔

۴۳۲ (خواہ آپ اُن کی کتنی ہی رعایت ملحوظ رکھیں اور ان کے ساتھ برتاؤ کتنی ہی غمخواری و دل سوزی کا رکھیں) یہ حکم نصرانیوں سے متعلق ہے جو بہرحال اہلِ کتاب تھے اور مسلمانوں کے ساتھ مشترک ایمان سلسلۂ وحی و نبوت پر رکھتے تھے تو جو کھلے ہوئے اہلِ شرک ہیں اور اسلامی عقائد سے اشتراک کسی درجہ کا بھی نہیں رکھتے ان کی رضاجوئی اور ان سے توقعِ صلح رکھنے کا جو حکم ہوگا ظاہر ہی ہے۔

۴۳۳ (یعنی اس مذہب کے پیرو جو انھوں نے گڑھ رکھا ہے اور اپنے دینِ حق سے دست بردار نہ ہو جائیں)
مِلَّة کے معنی مذہب اور طریقہ کے ہیں۔
الملّة الشريعة او الدّين (قاموس) قال ابو اسحٰق الملّة السنّة والطريقة (تاج)
دین اور ملّت میں فرق یہ ہے کہ دین کا استعمال اللہ اور افرادِ امت کے سلسلہ میں ہوتا ہے مثلاً دین اللہ یا دین زید اور ملّت کا استعمال نبی اور جماعت کے سیاق میں ہوتا ہے مثلاً ملّتِ ابراہیم یا ملّتِ یہود۔ (راغب)
یہودیت و نصرانیت دو مذہبوں کے باوجود ان کے لئے لفظ ملّت کے صیغۂ واحد لانے سے اکثر فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کفر جس قسم کا بھی ہو بہرحال ایک ہی ملّت کے حکم میں ہے۔
وقد استدلّ كثير من الفقهاء على انّ الكفر كلّه ملّة واحدة (ابن کثیر)
اور اسی اصل کی بنا پر اکثر فقہاء نے کہ اُن سے مراد شافعیہ و حنفیہ بہرحال ہیں، وراثت کا فرول اور مسلموں کے درمیان جائز نہیں رکھی ہے لیکن کافروں کا فروں کے درمیان جائز رکھی ہے خواہ ان کا کفر آپس میں مختلف ہی ہو۔

وقف منزل

وھذا مذھب الشافعی وابی حنیفة واحمد فی روایة عنه (ابن کثیر)

۴۳۴ (حق وصواب کی نہ کسی اور کی نکالی اور بتلائی ہوئی راہ)

اسی پر عقل ونقل کے دلائل کا اتفاق ہے اور اسی اللہ کی بتلائی ہوئی راہ کا نام طریقِ اسلام ہے۔

۴۳۵ (مسائل دین میں، اور یہ پیروی اب اُن کے لئے محال ہے)

لَئِنِ میں لام قسم کا ہے، تاکید وقطعیت کے لئے۔

لامُ قسم۔ (جلالین)

قرآن ہے خدا کا کلام لیکن ہے بہرحال محاورۂ انسانی ہی میں انسانی کلام میں جہاں جہاں قسم کا موقع آتا ہے قرآن میں بھی اس کی رعایت کی جائے گی۔

اَھوآء سے مراد وہ رائیں اور خیالات ہیں جو علم وحقیقت کے بجائے نفسانی خواہشوں پر مبنی ہوں۔

ای آراء ھم الزائغة (بیضاوی) والھوی رأی یتبع الشھوة (بیضاوی)

العلم سے مُراد علم وحی ہے، ہر طرح پر قطعی ویقینی اور ہر اشتباہ سے بالاتر۔

العلم الوحی (بیضاوی) ای من بعد الذی اقتصصت علیك من نبئھم (ابن جریر) الدین المعلوم صحته بالدلائل القاطعة (کبیر)

گویا ایک سرے پر العلم ہے حقیقت سے تمام تر لبریز، اور دوسرے سرے پر اَھوآء ہیں حقیقت سے تمام تر خالی استدلالِ قرآنی کی منطقی شکل اب یہ ہوئی:

۱۔ یہود ونصاریٰ کی رضا طلبی کے لئے لازمی ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں لیکن ان کا دین سرتاسر محرّف و باطل ہے، اس لئے ان کی رضا طلبی کے لئے لازم ہوا کہ آپ دین محرّف وباطل اختیار کریں۔

۲۔ جو رحمتِ خداوندی سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہو، اس کے لئے باطل کی پیروی محال ہے آپ رحمتِ خداوندی سے مالامال اور توفیق الٰہی سے سرفراز ہیں، اس لئے آپ کے لئے پیروئ باطل محال ہے۔

۳۔ اور جب آپ کے لئے پیروئ باطل محال ہے تو ملت یہود ونصاریٰ کی پیروی جو خود ایک شکل زیغ وباطل ہی کی ہے اس کی پیروی بھی آپ کے لئے محال ہے، اور اس لئے ان باطل پرستوں کی حصولِ رضا کی بھی کوئی شکل آپ کے لئے نہیں، آگے جو وعید اتباع باطل پر آئی ہے اور اس کے ساتھ قید بَعْدَ الَّذِی جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ کی لگی ہوئی ہے اس قید سے امام رازیؒ نے استنباط کیا ہے کہ وعید ہمیشہ دلائل صریح کے بعد ہی ہوگی اور اس کے حق میں ہوگی جو عمل پر قدرت بھی رکھتا ہو اور یہیں سے تردید اس عقیدہ کی بھی ہوگئی کہ اللہ تکلیف مالایُطاق بھی دیتا ہے۔

یدلّ علی انه لایجوز الوعید الابعد نصب الأدلّة واذا صحّ ذلك فبأن لایجوز الوعید الابعد القدرة اولی فبطل به قول من یجوز تکلیف مالایطاق۔ (کبیر)

۴۳۶ ولی (یار) اس دنیا میں۔ اور نصیر (مددگار) عالمِ آخرت میں۔

خوب خیال رہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے یہ بات محض بطور فرض کے کہی گئی ہے اور فرض جب محالاتِ عقلی تک کے جاسکتے ہیں تو محالاتِ عادی یا منفیاتِ شرعی کے فرض کرلینے میں تو اور بھی کوئی اشکال نہیں اور اس طرح

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَتۡلُوۡنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ ؕ اُولٰٓئِکَ یُؤۡمِنُوۡنَ

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے اور وہ اُسے اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اس کے پڑھنے کا حق ہے ۴۳۷ وہ لوگ اس پر

بِہٖ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ ع یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ۱۴ ع ۱۴

ایمان لے آئیں گے ۴۳۸ اور جو کوئی اس سے کفر (اختیار) کرے گا تو یہی لوگ (پورا) نقصان اٹھانے والے ہیں ۴۳۹ اے بنی اسرائیل!

اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۲۲﴾

میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں ۴۴۰ اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی ۴۴۱

مخاطبت سے مقصود بھی غالباً مسئلہ کی اہمیت پر زور دینا ہے۔ منکروں کی طرف میلان پر اتنا تشدد جب خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے۔

فیہ تھدید ووعید شدید للأمة عن اتباع طرائق الیھود والنصاریٰ (ابن کثیر)

اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں خطاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے صرف لفظاً ہے ورنہ مراد اُمت ہی ہے اور اصل حکم اسی کو ہے۔

الخطاب مع الرسول والامر لأمتہ (ابن کثیر) قیل الخطاب مع النبی والمراد بہ الامة (معالم) قیل المقصود منہ اُمتہ (روح)

امام رازیؒ نے کہا ہے کہ شفاعت کافر کے حق میں نہیں ہو سکتی۔

وعندنا لاشفاعة فی الکفر (کبیر)

**۴۳۷** یعنی دل سے اس کی تعظیم واحترام کرتے ہیں، اس کے احکام پر عمل کرتے ہیں، اس میں تحریف وتغیر کو راہ نہیں دیتے۔ حق تلاوت ادا کرنے میں یہ سب کچھ آگیا۔

یتبعونہ حق اتباعہ (ابن عباس) لا یحرفون الکلم عن مواضعہ ولا یتأولونہ علی غیر الحق (کبیر)

الۡکِتٰبَ سے مراد توریت ہے۔

یعنی التوراة (ابن عباس) وھو التوراة (ابن جریر)

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ سے مراد یہود ونصاریٰ ہیں۔

ھم الیھود والنصاریٰ وھو قول عبد الرحمٰن بن زید واختارہ ابن جریر (ابن کثیر)

**۴۳۸** (اور اسلام قبول کرلیں گے)

مطلب یہ ہے کہ جو اہل کتاب ضد، نفسانیت، ہٹ دھرمی سے کام نہیں لیتے، وہ خود اپنی کتاب کے مطالعہ سے قرآن کی حقانیت وصداقت کے قائل ہو جائیں گے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں گے۔

یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ میں ضمیر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب بھی پھیری جا سکتی ہے، اس تاویل سے کہ اوپر آپ کا ذکر اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ بِالۡحَقِّ میں مضمر ہے۔

قیل یعود علی النبیّ صلعم وقد تقدم ذکرہ فی قولہ انا ارسلنٰک بالحق (بحر)

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا

اور اس روز سے ڈرو جب نہ کوئی کسی کے بھی کام آئے گا اور نہ اس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اسے

عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى

سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ انھیں مدد ہی پہنچ سکے گی ۴۴۲ اور (وہ وقت یاد کرو) جب ابراہیم کو ۴۴۳

اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ

ان کے پروردگار نے چند امور میں آزمایا ۴۴۴ اور انھوں نے وہ انجام دے دیئے ۴۴۵

اکثر نے الکتٰب کی طرف پھیری ہے۔

ظاھرہ ای الضمیر فی بہ یعود الی ما یعود الضمیر فی یتلونہ ای الکتٰب (بحر)

لیکن انسب یہ ہے کہ ضمیر میں مرجع الحق (آیت ۱۱۹) اور العلم (آیت ۱۲۰) کو مانا جائے اور معنی یہ کئے جائیں کہ یہ لوگ اس دین حق اور علم وحی پر ایمان لے آئیں گے محقق تھانویؒ اور مفسر دہلویؒ (شاہ عبدالعزیزؒ) دونوں نے یہی ترکیب اختیار کی ہے یہ اختلافات صرف ترکیب نحوی کے لحاظ سے ہیں، مآل و مقصودِ کلام ہر صورت میں تقریباً ایک ہی ہے۔

۴۳۹ (دنیا و آخرت میں اور ان کا شمار کافروں ہی میں ہوگا) منکرین اسلام یہود کی ہلاکت آخرت میں تو یقینی ہے دنیا میں بھی ان کی بربادی سب کے مشاہدہ میں آچکی ہے۔ یکفر بہ میں ضمیر کے مرجع کے بارہ میں اختلافات ہیں اور انسب یہاں بھی یہی ہے کہ الحق و العلم کو مانا جائے۔

۴۴۰ قوم بنی اسرائیل اور ان پر جو احسانات خداوندی تھے ان کا تعارف رکوع ۵ میں مفصل کرایا جا چکا ہے، وہیں کے حاشیے ملاحظہ فرمائے جائیں شروع میں تاریخ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے زمانہ سے بیان ہوئی یعنی اسرائیل کے اس عہد کی جب وہ مستقل صاحب کتاب شریعت ہو کر آزاد و خود مختار قوم رہے اور ہر طرح کی نافرمانی و سرکشی میں بھی مبتلا رہے اب اُسی کے قدیم ترین دور یعنی عہد ابراہیمی کی طرف توجہ کیا جاتا ہے حضرت ابراہیمؑ ہی کے بعد سے تو آپ کی نسل کی دو شاخیں ہوئیں اور ان میں سے ایک کا نام دو پشتوں کے بعد بنی اسرائیل پڑا۔

۴۴۱ (توحید کے علمبردار اور مبلغ کی حیثیت سے)

قرآن مجید جو بھی دعویٰ کرتا ہے کسی کی پرواہ کئے بغیر بے تکان اور بے دھڑک کرتا ہے، بنی اسرائیل کو اس نے مطلق صورت میں بلا کسی قید و شرط کے اس وقت تک کی تمام قوموں کے مقابلہ میں افضل قرار دیا ہے، یہ افضلیت اسی نعمتِ توحید کی بنا پر تھی، دنیا کی دنیا شرک کی لعنت میں مبتلا تھی، توحید پر قائم صرف یہی قوم تھی اور سلسلۂ نبوت کی قائل صرف یہی نسل تھی، تفصیل کے لئے رکوع ۶ کے حاشیے ملاحظہ فرمائے جائیں، بنی اسرائیل کو ان کے عروج اور ان کی گمراہیوں کی سرگزشت سنا کر یاد دلایا جا رہا ہے کہ ان کی افضلیت و اشرفیت کا راز تھا کیا؟ یہی تھا کہ وہ موحدِ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں تھے اور توحید و نبوت کی امانت انھیں کی نسل کے سپرد کی گئی تھی، انھیں اگر پھر استفادہ انھیں انعامات سے منظور ہے تو چاہیے کہ اسی دینِ ابراہیمی کی طرف رجوع کریں۔

۴۴۲ (کسی طرف سے بھی اور نہ ان کی فریاد رسی کسی سے بھی ہو سکے گی۔)

یہ آیت بھی رکوع چھ میں گزر چکی اور وہیں اس پر متعدد حاشیے بھی دیئے جا چکے ہیں۔

بنی اسرائیل نے اس وقت ایک تو عقیدۂ قیامت کو بالکل بھلا دیا تھا، اور جزا و سزا کی ساری صورتیں اسی دنیا میں منحصر و محدود سمجھ لی تھیں، چنانچہ موجودہ توریت میں بھی جہاں جہاں سعادت و شقاوت کے ثمرات مذکور ہیں، اسی دنیا کی خوشحالی و بدحالی کا بیان ہے، اس لئے پہلے تو انہیں یوم آخرت کی یاد دلائی گئی اور پھر ان کے گڑھے ہوئے ایک ایک مرکزی عقیدے شفاعت، کفارہ و فدیہ پر ضرب لگائی گئی، آیت کے الفاظ اتنے جامع ہیں کہ یہودیت کے ساتھ نصرانیت کی بھی جڑ کٹ جاتی ہے، نصرانیت کی تو بنیاد ہی شفاعت، کفارہ و فدیہ ہی کے عقائدِ باطلہ پر ہے۔

**۴۴۳** یہ نام پہلی بار قرآن میں آیا ہے، قرآن کے مخاطبِ اول اہلِ عرب تھے، جو شخصیتیں ان کے لئے معلوم و معروف تھیں قرآن ان کے نام ان کے سامنے بے تکلف بغیر کسی مزید تعارف کے لے آتا ہے اور پھر ابراہیمؑ تو وہ بزرگ تھے جن سے علاوہ مشرکینِ عرب کے یہود و نصاریٰ بھی خوب ہی واقف تھے، ان کا تعارف اور بھی غیر ضروری تھا، یہ ابراہیم علیہ السلام وہی ہیں جو اسلامی عقیدہ کے علاوہ یہودی و نصرانی عقیدہ میں بھی بڑے جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں، توریت میں آپ کا نام ابرام اور ابراہام دونوں طرح سے آیا ہے، توریت کی روایت ہے کہ آپ کے اور نوحؑ کے درمیان دس پشتوں کا فرق ہوا ہے یعنی آپ ان کی گیارھویں پشت میں تھے، لیکن خود توریت ہی کے شارحین کا خیال بعض قوی قرائن کی بنا پر یہ ہے کہ توریت میں نسب نامہ کی کچھ پشتیں چھوٹ گئی ہیں، سال ولادت سر چارلس مارسٹن محققِ اثریات کی جدید ترین تحقیق کے مطابق ۲۱۶۰ ق م ہے اور عمر شریف توریت میں ایک سو پچھتر سال درج ہے، سال وفات اس حساب سے ۱۹۸۵ ق م ٹھہرتا ہے، والد کا نام تارح تھا یا عربی تلفظ میں آزر، نام کا تلفظ قدیم زبانوں میں کئی کئی طرح آیا ہے، مسلمانوں کے لئے قرآنی لفظ آزر کافی ہے، وطن آبائی ملک بابل یا کلدانیہ (انگریزی تلفظ میں کالڈیا) تھا، جدید جغرافیہ میں اسی کو ملک عراق کہتے ہیں، جس شہر میں آپ کی ولادت ہوئی اس کا نام توریت میں اُور (UR) آیا ہے، مدتوں یہ شہر نقشہ سے غائب تھا، اب از سر نو نمودار ہو گیا ہے، کھدائی کے کام کی داغ بیل ۱۸۹۴ء ہی میں پڑ گئی تھی، ۱۹۲۲ء میں برطانیہ اور امریکہ کے ماہرینِ اثریات کی ایک مشترک تحقیقی مہم برٹش میوزیم اور پنسلوینیا یونیورسٹی کے زیر اہتمام عراق کو روانہ ہوئی اور کھدائی کا کام پورے سات سال جاری رہا، رفتہ رفتہ پورا شہر نمودار ہو گیا اور عراق گورنمنٹ کے محکمۂ آثار قدیمہ نے عجائب خانہ کے حکم میں لا کر ان کھنڈروں کو محفوظ کر دیا ہے، یہ شہر خلیج فارس کے دہانہ فرات اور عراق کے پایۂ تخت بغداد کے تقریباً درمیانی مسافت پر ہے، ابراہیم علیہ السلام کی بزرگی اور نبوت چونکہ مسلمانوں کے علاوہ یہود اور نصرانیوں کو بھی مسلّم ہے اس لئے ان قوموں کے علماء نے بھی آپ کے حالات کی تحقیق و جستجو میں کوئی درجہ کاوش کا اٹھا نہیں رکھا ہے، موجودہ محرف بائبل میں تاریخی غلطیوں کی کثرت سے اکتا کر بعض روشن خیال محققین نے انیسویں صدی کے ربع آخر میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیم نام کی کوئی تاریخی شخصیت گزری ہی نہیں بلکہ محض ایک توہمی نام تھا یا ہر شیخ قبیلہ کا لقب لیکن اب پھر تحقیق کا رخ بدلا اور بیسویں صدی کے ربع اول کے ختم ہوتے ہوتے پھر آپ کی تاریخی شخصیت کا پوری طرح قائل ہونا پڑا ہے۔

نسل اسرائیلی اور نسل اسمٰعیلی دونوں میں ایک طرح کی رقابت اور چشمک مدتوں سے چلی آرہی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں سلسلوں کے مورثِ اعلیٰ تھے، اللہ کی نعمت خاص الخاص یعنی توحید کی علمبرداری نسل اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھین کر ایک اسمٰعیلی پیغمبر کے واسطہ سے اب ساری دنیا کے لئے عام ہو رہی ہے، ضرورت تھی کہ ابراہیمی شخصیت (اور ان کے ضمن میں اسمٰعیلی شخصیت) کی مرکزیت اور اہمیت سے دنیا کو روشناس کر دیا جائے، چنانچہ یہاں یہی ہو رہا ہے، لفظ ابراہیم کے سریانی زبان میں جو بھی معنی ہوں، عربی اہل لغت نے اپنی زبان میں اَبٌ رحیمٌ کے معنی میں لیا ہے،

# قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًاؕ

ارشاد ہوا کہ میں یقیناً تمھیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ ۴۴۶

اس لئے کہ آپ کی شفقت بچوں کے ساتھ مسلّم و معروف ہے۔

قال السھیلی وکثیرًا ما یقع الاتفاق بین السریانی والعربی او یقاربه فی اللفظ۔ الا تری ان ابراھیم تفسیرہ اَبٌ رحیمٌ لرحمته بالاطفال (قرطبی) وابراھیم عَلَمٌ اعجمیٌّ قیل معناہ قبل النقل اب رحیم (روح)

حدیث نبوی میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ مسلمانوں کے چھوٹے بچوں کی بعد وفات قیامت تک کفالت و تربیت حضرت ابراہیم کے ذمہ رہے گی۔

۴۴۴ (اور وہ چند امور) احکام تھے اوامر و نواہی کے قسم کے)

اِبْتَلٰی۔ آزمایا۔ اپنی واقفیت کے لئے نہیں کہ وہ تو خود علیم کل ہے بلکہ علی الاعلان تاکہ دوسروں کو ان کے ایمان کامل کا شاہد ہوجائے، اللہ تعالیٰ کے سلسلہ میں آزمانے کا لفظ جب کبھی استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے۔

وابتلاء اللہ العباد لیس لیعلم احوالھم بالابتلاء فانه عالم بھم ولکن لیعلم العباد احوالھم۔ (معالم)

کَلِمٰتٍ، یہ کلمات کیا تھے، ان کی تعیین میں بڑا اختلاف ہے اور نص کوئی موجود نہیں۔

قد اختلف العلماء فیھا اختلافًا کثیرًا (ابن العربی) واختلف العلماء فی المراد بالکلمات علی اقوالٍ (قرطبی)

لیکن تفصیل ان کی جو کچھ بھی ہو بہرحال تھے وہ احکام و شرائع ہی۔

ای شرائع الاسلام (معالم عن ابن عباس) ای اختبارًا له بما کلّفه من الاوامر والنواھی (ابن کثیر)

بابه قولان احدھما انھا شریعة الاسلام (ابن العربی)

۴۴۵ یعنی آپ ان امتحانوں میں پورے اُترے اور ان احکام کی تعمیل کردی۔

عمل بھنّ (معانی) ای فأدّاھنّ (ابن جریر عن ابن عباس) ای عمل بھن (ابن جریر۔ عن قتادہ)

ای قام بھن کلّھن (ابن کثیر)

اِتْمَام مقابل ہے نقص کا یعنی آپ نے ان احکام کی ادائی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انھیں کامل طور پر انجام دیدیا۔

اتمّ ذلك کلّه ووفّٰی به وقام به علی حسب ما امرہ اللہ تعالیٰ من غیر نقصان لأن ضدّ الاتمام النقص وقد اخبر اللہ باتمامھنّ (جصاص)

روایاتِ یہود میں بھی یہ ذکر آیا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۴۴۶ (کہ امور دین و شریعت میں تمھاری اقتداء کریں۔)

ای یأتمّون بك فی دینك (کبیر) ای یأتمّون بك فی دینھم (مدارك)

اِمَامًا۔ امام کہتے ہی اسے ہیں جس کی پیروی کی جائے لغت میں بھی اور اصطلاح شریعت میں بھی۔

ھو اسم من یؤتمّ به (مدارك) اسم الامامة مستحق لمن یلزم اتباعه والاقتداء به فی امور الدین او فی شیءٍ منھا (جصاص) الامام القدوۃ (قرطبی)

قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ﴿١٢٤﴾

بولے اور میری نسل سے بھی؟ ۴۴۷ ارشاد ہوا کہ میرا وعدہ نافرمانوں کو نہیں پہنچتا ۴۴۸

توریت میں بھی یہ وعدۂ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے :۔
"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں، برکت دوں گا، اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنتی کروں گا اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے۔" (پیدائش۔ ١٢ : ١ و ٢)

یہ دینی سرداری اور امامت پورے ایک عالم کی آج تک آپ کے حصہ میں چلی آرہی ہے اور اسلام کے علاوہ بھی جو مذاہب توحید سے کچھ بھی لگاؤ رکھتے ہیں یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں، ایک نامور فرنگی فاضل، بیسویں صدی کے ثلث اول کے ختم پر آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے :۔
"ابراہیم کی ہستی کسی بدوی سرداری کی نہ تھی کہ وہ لوٹ مار کرتے اور ملک گیری کرتے رہتے، ان کی اصلی اہمیت مذہب کے دائرہ میں ہے، وہ حقیقۃً مورثِ اعلیٰ کسی نسل کے نہیں، بانی و امام وہ مذہبی تحریک کے تھے، محمدؐ کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے وہ سامی قوموں اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے، اور توریت کے حسب روایت وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد اول صنہ ٦٠ طبع چہاردہم)

جن لفظوں کو یہاں ترجمہ میں زیرِ خط کر دیا گیا ہے انھیں ایک بار پھر پڑھ لیا جائے، یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیبؐ اور اللہ کے خلیلؑ کے درمیان مماثلت کا یہ اعتراف بس اللہ ہی کی شان ہے۔
آیت سے ایک نتیجہ فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ احکام کی تعمیل اور امتحان الٰہی میں کامیابی انسان کو دینی پیشوائی و سرداری کا مستحق بنا دیتی ہے اور انبیائے کرام کے بعد اولیائے امت اور علمائے امت کی امامت، اپنے اپنے ظرف و حیثیت کے مطابق اسی قانون کی مظہر ہیں۔
فقیہ جصّاص رازیؒ نے کہا ہے کہ :۔
فالانبیاء علیھم السلام فی اعلٰی مرتبۃ الامامۃ ثم الخلفاء الراشدون بعد ذٰلک ثم العلماء والقضاۃ العدول ومن الزم اللّٰہ باقتداءھم ثم الامامۃ فی الصلوٰۃ ونحوھا (احکام القرآن)
(امامت کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس کے لحاظ سے امامت کے اعلیٰ مرتبہ پر تو حضرات انبیاء فائز ہوتے ہیں ان کے بعد خلفائے راشدین ہیں پھر نمبر علماء اور عادل ججوں کا آتا ہے اور ان کا جن کی پیروی خدا نے لازم کر دی ہے پھر امامتِ نماز ہے وغیرہا)

۴۴۷ (امام ہوتے رہیں گے)
عالم کی پیشوائی، سرداری و امامت کی بشارت پاکر ابراہیم علیہ السلام کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہوگیا اور اس جوشِ مسرت میں سوال کر بیٹھے کہ اس انعام میں میری نسل اور میری اولاد بھی شریک ہے نا؟
ذُرِّيَّة کے معنی ہیں اولاد اور اولاد در اولاد۔ اس میں سارا سلسلۂ نسل آگیا، اور یہ سلسلۂ ابراہیمی شاخِ اسرائیلی اور شاخِ اسمٰعیلی دونوں کو شامل ہے، اسرائیلیوں کو جو دعویٰ تخصیص تھا اس کی جڑ یہیں سے کٹ گئی۔

مِنْ ذُرِّيَّتِي مِیں مِنْ تبعیضیہ ہے اور فقرہ کی ترکیب نے اسے صاف کردیا کہ ابراہیم کی یہ دعا (سوال کے رنگ میں) اپنی ساری نسل سے متعلق نہیں اس کے ایک جزو سے متعلق تھی۔

من تبعیضیۃ ای وجاعل بعض ذریتی (ابو سعود) ومن ذریتی یدل انه علیه السلام طلب ان یکون بعض ذریته ائمة للناس (کبیر)

من ذریتی کا عطف جاعلك کے ك پر ہے گویا تقدیرِ کلام یوں ہے، وجاعلك بعض ذریتی، محاورۂ عرب میں جب سَأُكْرِمُكَ بولا جاتا ہے تو جواب استفہامی میں بجائے پورے فقرہ سَأُكْرِمُ زَيْدًا کے صرف زَيْدًا کافی ہے (کشاف)

بعض نے آیت کی ترکیب یوں مانی ہے کہ گویا آپ دعا کر رہے ہیں کہ میری نسل میں بھی امام پیدا کئے جائیں۔

وقاله ان یجعل من ولده ائمة لانه عطف علی الاول فکان بمنزلة واجعل من ذریتی ائمة (جصاص)

آیت سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف امر طبعی ہے بلکہ سنتِ انبیاء بھی ہے۔

۴۲۸ یعنی برکت و فضل کا سلسلہ تمہاری نسل میں بھی ضرور رہے گا لیکن اس کے تحقق کے لئے محض ارث نسب نسل کافی نہیں بلکہ ایمان و عملِ صالح بھی حاصل کرنا ہوگا، گویا دعائے ابراہیمی اولادِ صالح کے حق میں قبول ہوگئی۔

دل علی انه ینالہ غیر الظالم (جلالین)

اور حضرت کو خبر دے دی گئی کہ آپ کی نسل میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان، صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی اور ظالم اس سے محروم کر دیئے گئے۔

تنبیه علی انه قد یکون من ذریته ظلمة وانهم لاینالون الامامة لأنها أمانة من الله وعهد، والظالم لایصلح لها وانما ینالها البررة الأتقیاء منهم (بیضاوی) ای لا أجعل عهدی لمن کان ظالما. (راغب)

عَهْدِي۔ میرا وعدہ یعنی منصبِ امامت و پیشوائی کا وعدہ۔

معنی العهد عهد الامامة (ابن جریر عن مجاهد) هذا العهد هو الامامة المذکورة فی ما قبل (کبیر)

عہد کے معنی امان کے بھی لئے گئے ہیں۔

العهد الأمان قال الله تعالیٰ لاینال عهدی الظّٰلمین (کتاب الاجناس)

الظّٰلِمِيْنَ۔ ظلم سے یہاں مراد کفر لی گئی ہے:۔

ای اهل الکفر (مدارك) قد فسر الظلم ههنا بالکفر وهو قول ابن جُبیر (بحر) المراد بالظالم الکافر ههنا اذ هو الظالم المطلق (مدارك) المتبادر من الظلم الکفر (روح)

اور کافر کو امامتِ دینی نہ ملنی بالکل ظاہر اور متفق علیہ ہے۔

اخبران امامة المسلمین لاتثبت لاهل الکفر (مدارك)

ظالم کی ایک تفسیر فاسق بھی آئی ہے۔

والظلم یستعمل فی الذنب الکبیر والذنب الصغیر (راغب) الظالم العاصی غیر الکافر (بحر)

فقہائے امت نے آیت سے یہ استنباط کیا ہے کہ فاسق کی امامت کا انعقاد جائز نہیں امام کو عادل و صالح اور صاحبِ قوت ہونا ضروری ہے

استدل جماعة من العلماء علی ان الامام یکون من اهل العدل والاحسان والفضل مع قوة

## وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ط

اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے خانہ (کعبہ ۴۴۹) کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقامِ امن قرار دیا ۴۵۰

علی القیام بذلك (قرطبی) فاما اهل الفسوق والجور والظلم فلیسوا له باهل (قرطبی)
جصاص نے احکام القرآن میں آیت کے تحت میں امامتِ فاسق کے غیر نافذ و ناجائز ہونے پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ مرشد تھانوی نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اختیاری بدعملی کے ساتھ فضل الٰہی و انعام خداوندی جمع نہیں ہوتے۔

۴۴۹ بیت کے لفظی معنی گھر کے ہیں (جہاں رات بسر کی جائے)
البیت سے متفقہ طور پر مراد بیت الحرام یا حرم کعبہ ہے، شہر مکہ معظمہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر خداوند عالم کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے اور قرآن نے اس حقیقت کا اعلان کھلے لفظوں میں ادا کر دیا ہے:۔
ان اوّل بیت وُضع لِلنّاس لَلّذی بِبکّۃ مُبٰرکًا۔
مسیحیت کو کعبہ کی تقدیس و برکت کے ساتھ ساتھ کعبہ کی یہ قدامت بھی نہایت شاق ہے لیکن انکارِ قدامت پر کوئی دلیل ہر ممکن کوشش کے بعد آج تک قائم نہیں ہو سکی ہے بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف کو لکھنا پڑا:۔
"یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے پرے ہے"۔ (محمد اینڈ محمدنزم صفحہ ۱۶۶)
پھر آگے مشہور و قدیم رومی مورخ ڈایوڈورس سکولس (DIODORUS SECULUS) جس کا زمانہ خود حضرت مسیحؑ سے ایک صدی قبل کا ہے، کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا (صفحہ ۱۶۶) ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔
البَیْت سے مراد کعبہ کا ہونا تو ظاہر ہی ہے جیسا کہ جمہور مفسرین کا قول بھی ہے:۔
البیت هنا الكعبة علی قول الجمهور (بحر)
لیکن فقہائے مفسرین اس طرف بھی گئے ہیں کہ مراد سارا حرم ہے نہ کہ صرف خانۂ کعبہ۔
والمراد جميع الحرم (جصاص) وقیل المراد البیت الحرام لا نفس الكعبة لانه وصفه بالأمن وهذه صفة جميع الحرم لا صفة الكعبة فقط ويجوز اطلاق البيت ويراد به كل الحرم (بحر)

۴۵۰ مَثَابَةً۔ مصدر ثَوْب کے معنی ہیں کسی شے کا اپنی حالتِ اصلی یا حالتِ مقصودہ کی طرف لوٹنا۔
رجوع الشيء الی الحالة الاولیٰ التی کان علیها او الی الحالة المقدرة المقصودة (راغب)
اور جب کچھ لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو کہا جاتا ہے ثَابَ الْقَوْمُ اور اسی سے مَثَابَة اسم ظرف ہے۔
المثابة مفعلة من ثاب القوم الی الموضع اذا رجعوا الیه فهم یثوبون الیه مثابا ومثابة۔ (ابن جریر)
مَثَابَةً میں ۃ مبالغہ کی ہے، اس میں زور و تاکید مثاب سے زائد ہے۔
والتاء فی مثابة للمبالغة قاله الاخفش (بحر)
گویا مثابۃ کے معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار رجوع کرے اور پھر بھی نہ بھرے۔

# وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور مقامِ ابراہیمؑ کو نماز کی جگہ بنالو ۴۵۱

مرجعاً للناس ومعاذاً یأتونه کل عام ویرجعون الیه فلا یقضون منه وطراً۔ یہی معنی امام جریر نے خود بھی لئے ہیں، اور یہی ابن عباس صحابیؓ اور مجاہدؒ، سدیؒ، عطا وغیرہ تابعین سے بھی نقل کئے ہیں، اور بیت الحرام کا یہ وصف شاہد بھی ہے، لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس سے اکتاتے نہیں، پھر چونکہ البیت مرجع اربابِ حج وعمرہ کا ہے اس لئے اجتماع ورجوع کے ساتھ عبادت کا مفہوم بھی لازماً اس لفظ میں شامل ہوگیا ہے۔

مباءۃً ومرجعاً للحاج والعمّار یتفرقون عنه ثم یثوبون الیه (کشاف)

للنّاس۔ عام زائرین کا تانتا جو کعبۃ اللہ کی زیارت اور عمرہ کا سال کے ہر موسم، ہر فصل، ہر زمانہ میں لگا رہتا ہے، اس سے قطع نظر تصوّر میں نقشہ ان لاکھوں انسانوں کا جمایئے جو صرف حج کے موقع پر کھنچے چلے آتے ہیں، صرف حجاز یا ملک عرب ہی کے ہر حصہ سے نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ، ہر علاقہ، ہر ملک سے اور پھر یہ بھی ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ سلسلہ دس بیس سال سے نہیں، حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے اجب جا کر للنّاس کی تفسیر ذہن میں آسکے گی۔

اَمْنًا۔ مامونیت اس سے ظاہر ہے کہ صرف عمارت کعبہ یا مسجد الحرام ہی نہیں بلکہ اردگرد کی سرزمین میلوں تک داخلِ حرم ہے اور حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان لینا الگ رہا، جانور تک کا شکار جائز نہیں، اور یہ حکم تو خیر شریعتِ اسلامی کا ہے، ارضِ حرم کا مامن ہونا جاہلیتوں کو بھی مسلّم رہا ہے، بڑے بڑے مجرم، مشرکوں کے دورِ حکومت میں بھی جرم کرکے خانۂ کعبہ کی دیواروں کے درمیان آکر پناہ پاجاتے تھے، فرنگی قاموس علم ودانش میں ہے:۔

"اتنا تو بہر حال ہے کہ محمدؐ کے دَور سے بہت قبل مکہ کی دو حیثیتیں ہم مسلّم پاتے ہیں، ایک تجارتی مرکز کی، ایک مقدّس معبد کی جس کے اردگرد کی زمین بھی حرم ہے"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۵ ص ۱۵۰ طبع چہاردہم)

غرض کہ قرآن نے البیت کے جو دو وصف یہاں ذکر کئے ہیں وہ اعتقاد سے زیادہ تو مشاہدۂ ماضی وحال کی چیزیں ہیں، فقہائے مفسرین نے بھی تصریح کردی ہے کہ یہاں اس کی محض خبر نہیں دی گئی ہے بلکہ مامونیت کا حکم بھی مراد ہے۔

انما هو حکم منه بذلك لا خبر (جصاص)

۴۵۱ (اے مسلمانو!)

اتَّخِذُوْا صیغۂ امر ہے اور یہ خطاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اُمّتِ اسلامیہ سے ہے۔

الخطاب لأمة محمدٍ صلی الله علیه وسلم (بیضاوی) المامور به الناس کما هو ظاهر (روح)

والخطاب علی هذین الوجهین لامة محمد صلے الله علیه وسلم وهو صلی الله علیه وسلم رأس المخاطبین (روح)

مَقَامِ اِبْرٰهٖمَ کے معنی اُس پتھر ہی کے لئے گئے ہیں جس پر کھڑے ہوکر حضرت ابراہیمؑ خانۂ کعبہ کی تعمیر کرتے تھے اور یہ پتھر خانۂ کعبہ سے چند ہی فٹ کے فاصلہ پر اب بھی ایک حجرہ میں محفوظ ہے، یہ اصطلاح اگرچہ نزولِ قرآن سے بعد کی ہے لیکن ایک بہت بڑے گروہ نے یہی معنی لئے ہیں، حج کے موقع پر اس حجرہ کے سامنے طواف کے

# وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ

اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی طرف حکم بھیجا ۴۵۲

سات چکروں کے بعد دو رکعت نماز پڑھی جاتی ہے حنفیہ اور مالکیہ کے ہاں یہ نماز واجب ہے اور شافعیہ کے ہاں محض سنت۔ محققین کے دوسرے گروہ نے جس میں ابن عباسؓ صحابی، مجاہد و عطا تابعین اور امام فقہ نخعی وغیرہ شامل ہیں اس کے معنی سارے حرم یا کل مشاہد حج کے لئے ہیں۔

قال ابن عباس الحرم کلّه (ابن کثیر) وروی عن مجاهد وعطاء مثل ذلك (ابن کثیر) وذهب النخعی ومجاهد الی انّ المراد من مقام ابراهیم الحرم کلّه وابن عباس وعطاء الی انه مواقف الحج کلّها (روح) وعن ابن عباس ایضًا ومجاهد وعکرمة وعطاء ——— الحج کلّه (قرطبی)

مِنْ مَقَامِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی اس کا صرف ایک حصہ ظاہر کرنے کے لئے بعض نے فِی کے معنی میں لیا ہے۔

ومِنْ امّا للتبعیض او بمعنی فی او زائدة والاظهر الاول (روح)

مُصَلًّی۔ نماز کی جگہ یا دعا کی جگہ صلیت دعوتُ کے معنی میں بھی آیا ہے، اصل مصدر کے اعتبار سے جائے نماز اور جائے دُعا میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے اور اب اسے اور زیادہ صاف ہو جانا چاہئے کہ قرآن مجید اپنے مخاطبات میں تاریخ انسانی کی ترتیب کا پابند نہیں بار بار پاس پاس کی آیتوں میں بلکہ کبھی خود ایک ہی آیت کے اندر معنوی مناسبت کی بنا پر دو ایسے واقعات جمع کر دیے جاتے ہیں جن کے درمیان زمانی حیثیت سے صدیوں کا فاصلہ ہوتا ہے اور اسی میں یہ بھی شامل ہے کہ واقعاتِ ماضی کے بیان سے متصل ہی اور گویا انھیں کے ضمن میں کوئی مستقل حکم حال و مستقبل کے لئے دے دیا جائے اور صیغۂ امر لا کر اس کا عطف صیغۂ ماضی پر کر دیا جائے، قرآن اصلاً کتابِ ہدایت ہے اور وہ اپنے اس مقصدِ اصل کے آگے پروا کسی انسانی حد بندی اور کسی مصنوعی و اختراعی تکلف کی نہیں کرتا۔

۴۵۲ عَهِدْنَا کے معنی ہیں ہم نے حکم دیا، یا ہم نے وحی کی۔

ای امرنا (ابن جریر عن ابن زید) امرناهما (کشاف) قیل معناه امرنا وقیل اوحینا (قرطبی)

عَهِدَ۔ بہ معنی امر پر حاشیہ عہد بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اوپر گزر چکا ہے۔

اِبْرٰهٖمَ۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا، اسمٰعیلؑ ابراہیمؑ کے فرزند اکبر تھے آپ کی مصری بیوی حضرت ہاجرہؓ کے بطن سے، سال ولادت غالباً ۲۰۷۴ ق م۔ سال وفات غالباً ۱۹۳۷ ق م۔ توریت میں ہے کہ عمر ۱۳۷ سال کی پائی، آپ کے ۱۲ بارہ فرزند ہوئے اور ان سے ۱۲ بارہ نسلیں چلیں، توریت میں ان ۱۲ بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں، اور یہ تصریح ہے کہ "یہ اپنی اُمتوں کے ۱۲ بارہ رئیس تھے" (پیدائش۔ ۲۵: ۱۲)

عرب کا مشہور و عالی نسب قبیلہ قریش آپ ہی کی نسل سے ہے، اس لئے آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بھی مورث اعلیٰ ہوئے اہل کتاب کہلانے والوں نے آپ کے خلاف زہر اُگلنے اور اپنے خُبث و عناد کا مظاہرہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے تاہم اپنی کتاب کی تصریحات کو کیا کریں گے جو تحریف و تلبیس کی ہر ممکن کوشش کے بعد بھی نہ مٹ سکیں ان میں ابراہیم خلیلؑ کی دعا بھی شامل ہے اور خداوند کریم کے وعدے بھی اور تاریخ کا بیان بھی:۔

أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْعٰكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ﴿۱۲۵﴾

کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک صاف رکھو۴۵۳ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے ۴۵۴

"اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسمٰعیلؑ تیرے حضور جیتا رہے" (پیدائش۔ ۱۷: ۱۸) "اسمٰعیلؑ کے حق میں میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اُسے بہت بڑھاؤں گا" (پیدائش ۱۷: ۲۰) "اسے اپنے ہاتھ سے سنبھال کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا" (پیدائش۔ ۲۱: ۱۸) "اور خدا اُس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا، اور بیابان میں رہا کیا اور تیرانداز ہوگیا۔" (پیدائش ۲۱: ۲۱)

یہاں حکم جو کچھ مل رہا ہے وہ آپ کو اور آپ کے والد ماجد کو مشترک مل رہا ہے، گویا خدمتِ کعبہ میں آپ اپنے والد ماجد کے برابر کے شریک تھے۔

۴۵۳ (ہر طرح کے شرک و بُت پرستی کی گندگی سے)

طَهِّرَا۔ طہارت سے اصلاً یہاں مراد یہ ہے کہ نجاستِ معنوی واعتقادی سے دور اور ذکرِ توحید وعبادتِ الٰہی سے معمور رکھو، ضمناً ظاہری صفائی کا حکم بھی آجاتا ہے۔

هو تطهيره من الاصنام وعبادة الاوثان فيه ومن الشرك بالله (ابن جرير عن مجاهد وقتادة وابن زيد) من الاوثان الخبائث والانجاس كلها (مدارك) والتطهير المامور به هو التنظيف من كل ما لا يليق به (بحر۔ نهر)

طَهِّرَا۔ تثنیہ کا صیغہ ہے، حکم حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ حضرت اسمٰعیلؑ کو بھی مل رہا ہے اور اقامتِ توحید میں برابر کے شریک بنائے جارہے ہیں، فقہاء نے خطاب کے اس صیغہ سے مفہوم عموم کا لیا ہے یعنی تطہیر کی ذمہ داری ہر فرد پر ہے خواہ وہ ابراہیمؑ کی طرح متبوع ومقتدا ہو یا اسمٰعیلؑ کی طرح تابع ومقتدی ہو۔

طَهِّرَا۔ بالتشدید مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب اچھی طرح پاک وصاف رکھو، فقہاء نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ مسجد کی صفائی فرض ہے۔

بَيْتِيَ۔ اضافت تشریفی ہے "میرے گھر کی" ترکیب کو خوب سمجھ لینا چاہئے، اسلام کا خدا کوئی مرئی ومجسّم دیوی دیوتا تو ہے نہیں، جو اسے رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے کے لئے کسی گھر یا مکان کی ضرورت ہو، اس لئے "میرے گھر" سے مراد "میرے رہنے کا گھر" تو ہو ہی نہیں سکتا، مراد صرف یہ ہے کہ وہ گھر جو میری یاد وعبادت کے لئے مخصوص ونامزد ہوچکا ہے، اضافت سے مقصود اظہارِ شرف وعظمت ہے۔

هذه اضافة تشريف لان مكانا محل لله تعالى (بحر) الاضافة للتشريف كناقة الله (روح) اضافة البيت الى ضمير الجلالة للتشريف (ابو سعود)

آیت میں کوئی اشارہ مخصوص کعبہ کے لئے نہیں، ذکر صرف وصف یعنی بیت کے ساتھ فرمادیا ہے۔

اس سے فقہاء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہی حکم تطہیر ہر عبادت خانۂ الٰہی یعنی مسجد کے لئے رہے گا۔

دخل فيه بالمعنى جميع بيوته تعالى فيكون حكمها حكمه في التطهير والنظافة (قرطبی)

أَنْ۔ أَنْ یہاں مفسرہ یعنی اَے کے معنی میں لیا گیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنادے اور اس کے رہنے

الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ

بسنے والوں کو روزی دے پھلوں سے ۴۵۵ (یعنی) ان بسنے والوں کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں ۴۵۶ (اللہ نے) ارشاد

فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶

فرمایا کہ جو کفر کرے گا میں اسے بھی کچھ دن مزہ اٹھانے دوں گا پھر اسے کشاں کشاں عذابِ جہنم تک پہنچا دوں گا اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے ۴۵۷

اَنْ بمعنیٰ اَیْ مفسّرۃ (قرطبی)

۴۵۴ للطائفین میں لام تخصیص کے لئے ہے یعنی کعبہ (اور اسی طرح ہر مسجد) پر حق انھیں لوگوں کا ہے جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ عمارت بن کر تیار ہو چکی تو اب غایتِ تعمیر بیان ہو رہی ہے کہ مقصود اس عمارت سے قیامِ توحید و استیصالِ شرک ہے۔

الطائفین۔ خانۂ کعبہ کا طواف کرنے والے طواف کے معنی پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا۔ حج و عمرہ کے سلسلہ میں تو طواف جزو فرض ہے لیکن یوں بھی بجائے خود بڑے اجر کی چیز ہے اور ساتھ ہی بڑے لطف کی بھی جیسا کہ ہر صاحبِ ذوق کا تجربہ شاہد ہے اس نامہ سیاہ نے اس کا بیان اپنے سفرنامۂ حجاز میں کسی قدر تفصیل سے کیا ہے خانۂ کعبہ کو تمام دنیائے اسلام کی مسجدوں بلکہ نمازوں سے جو مرکزی نسبت حاصل ہے اسی مناسبت سے اہمیت طواف کعبہ کو بھی حاصل ہے، کعبہ مظہرِ اعظم ہے دینِ توحید کا اس کے گرد چکر لگانا گویا زبانِ حال سے اقرار کرنا ہے کہ ہماری ساری عبادتوں کا، سارے اعمال کا، ساری زندگی کا مرکزی نقطہ بس توحیدِ الٰہی ہے۔

عاکفین۔ عکوف کے لفظی معنی ہیں کسی جگہ کے رہنے کو تعظیماً لازم کرلینا۔

العکوف الاقبال علی الشیء وملازمتہ علی سبیل التعظیم لہ (راغب)

اور اعتکاف اصطلاحِ شریعت میں نام ہے مسجد کے اندر بہ نیتِ عبادت قیام کو کسی مدت کے لئے لازم کرلینے کا، کہ بجز بشری ضرورتوں کے اور کسی حال میں باہر نہ نکلا جائے:

ھو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربۃ (راغب)

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف سنتِ کفایہ مؤکدہ ہے، اس میں روزہ بھی شرط ہے نفس اعتکاف ہر حال میں موجبِ اجر و قربت ہے۔

الرُّکَّعِ السُّجُوْدِ۔ رکوع و سجدہ نماز کی دو مشہور و متعارف ہیئتیں ہیں طائفین اور عاکفین اور رکع و سجود، چار لفظوں کے لانے کے بجائے یہ بھی ممکن تھا کہ صرف عابدین یا ذاکرین کہہ دیا جاتا لیکن تفصیل و تصریح سے ایک ایک عبادت کی تخصیص اور بزرگی کا الگ الگ اظہار ہو گیا۔

وخص الرکوع والسجود بالذکر لانھما اقرب احوال المصلی الی اللہ تعالیٰ۔ (قرطبی)

۴۵۵ ابراہیم خلیل اللہ کی یہ دعائیں جس حیرت انگیز طریقہ پر پوری ہوئیں وہ خود ایک معجزہ ہے پہلی دعا یہ تھی کہ شہر مکہ کو امن والا بنا دیا جائے، آس پاس کے رہنے والے لٹیرے اور خونخوار لوٹ مار قتل و خون کا بازار گرم

وسائلِ سفر محدود، خطرناک راستے غیر محفوظ، اس پر بھی حج و زیارت کے لئے حاجیوں کا تانتا صدیوں سے بندھا ہوا، اور اب امن و امان کے لحاظ سے مکہ اور حوالی مکہ آپ اپنی نظیر ہیں، نہ ڈاکے پڑتے ہیں نہ قافلے لٹتے ہیں نہ لاشیں تڑپتی نظر آتی ہیں، اور شریعت اسلامی نے تو شہر و مضافاتِ شہر کو "حرم" ہی قرار دے دیا، یعنی ان حدود کے اندر جانور تک کا شکار نہیں کیا جا سکتا اور خونی بھی اگر آکر خانہ کعبہ کے اندر پناہ گزیں ہو جائے تو اُسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا، شہر اور خانہ کعبہ کا اتنا احترام جاہلیت نے بھی اپنے زمانہ میں ملحوظ رکھا، دوسری دعا یہ تھی کہ مکہ والوں کو پھل پھلاری کھانے کو ملتے رہیں۔ مکہ واقع ایسی جگہ ہے کہ ساری زمین سخت ریتلی ہے یا سخت پتھریلی، بارش بھی بہت ہی قلیل مقدار میں ہوتی ہے، غرض یہ کہ تازے پھلوں اور میوہ دار درختوں کا ذکر ہی نہیں، معمولی سے معمولی پھل پھول کے درخت بلکہ تازہ و سبز گھاس بھی ابھی چند روز قبل تک نہیں پیدا ہوتی اور کاشتکاری و باغبانی کو چند روز پیشتر کوئی جانتا بھی نہ تھا، ایک بے آب و گیاہ سرزمین کہیں ریگستان، کہیں گرم و خشک پہاڑیوں کے چٹان لیکن ان سب کے باوجود جتنے تازہ پھل، میوے، ترکاریاں، غلے چاہئے، شہر تک میں خرید لیجئے اور اب اس بیسویں صدی کے وسط میں تو زمین تک خاصی گل و گلزار ہو گئی۔

بَلَدًا اٰمِنًا۔ فقہاء مفسرین نے یہاں بھی کہا ہے کہ مقصود محض خبرِ امن دینا نہیں، بلکہ حکمِ ماموریت ہے۔

کل ھذا من طریق الحکم لا علی وجہ الاخبار (جصاص)

**۴۵۶** ابھی ابھی حضرت ابراہیمؑ کو بتایا جا چکا تھا کہ فضل و برکت کے خاصہ وعدۂ ایمان و عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں، ان کے بغیر نہیں۔

لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ (آیت ۱۲۴) اللہ کے پیغمبر نے اللہ کے اس ارشاد کو گرہ باندھ لیا اور اب جو دعا کی اس میں خود ہی یہ قید لگا دی کہ پُر امن شہر اور رزق ثمرات کی برکتیں صرف اہلِ ایمان و طاعت کے لئے مقصود و مطلوب ہیں۔

دعاء للمؤمنین خاصۃ (معالم) الرزق علی الامامۃ فخص المؤمنین (مدارک) خصص دعاءہ بالمؤمنین دون الکافرین۔ (کبیر)

حضرات انبیاء کی ادب شناسی کا کیا کہنا! حق تعالیٰ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ امامت یا دینی سرداری مخصوص ہے اہلِ ایمان و طاعت کے ساتھ، خلیل جلیلؑ نے یہ اشارہ پا کر دنیوی منفعت و تمتع کو بھی اہلِ ایمان و طاعت کے ساتھ مخصوص کر دیا، حالانکہ اس کا تعلق ربوبیت سے ہے جو مومن و کافر سب کے لئے اس عالم میں عام ہے۔

فنبہ سبحانہ علی ان الرزق رحمۃ دنیویۃ تعم المؤمن والکافر بخلاف الامامۃ والتقدم فی الدین قد کان ابراھیم قاس الرزق علی الامامۃ فنبۃ سبحانہ علی ان الرزق رحمۃ دنیویۃ لا تخص المؤمن (بیضاوی)

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔ ایمان کے اجزاء یہاں دو ہی بیان کئے گئے ہیں، اللہ پر ایمان اور روزِ آخرت پر ایمان، انھیں کے ضمن میں ایمان کے دوسرے ضروری اجزا بھی آگئے، اس کی ضرورت مطلق نہیں کہ ایمان کا ذکر جہاں کہیں بھی آئے ہر جگہ اس کے سب ہی اجزاء کی تصریح ہو۔

لما کان الایمان باللہ والیوم الآخر یتضمن الایمان بجمیع ما یجب ان یؤمن بہ اقتصر علی ذلک (بحر) واقتصر فی متعلق الایمان بذکر المبدأ والمعاد لتضمن الایمان بھما الایمان بجمیع ما یجب الایمان بہ (روح)

**۴۵۷** قَلِیۡلًا۔ کچھ دن یہاں مراد ہے زندگی بھر سے کہ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوتی ہے۔

# وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ

اور (وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے) جب ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے ۴۵۸

متاعا یتمتع بہ الی وقت مماتہ (ابن جریر) الی منتھی اجلہ (معالم)

فعل اُمَتِّعُہٗ سے خود ہی اشارہ تمتع کے عارضی اور چند روزہ ہونے کا نکل رہا تھا وصف قَلِیْلًا لا کر اسے اور مؤکد اور روشن کر دیا۔

مطلب یہ ہوا کہ وہ فضلِ خداوندی جو اہلِ ایمان و اہلِ ہدایت کے ساتھ مخصوص ہے اور جس سے اہلِ ضلالت و کفر محروم رہیں گے اس کا تعلق نفع آخرت سے ہے امامت دین سے ہے رہے اس دنیوی زندگی کے انعامات اور منافع، غذا اور مسکن وغیرہ تو ان سے محروم کافروں اور منکروں تک کو نہ کیا جائے گا کہ یہ قانونِ ربوبیت کا عین تقاضا ہے اَضْطَرُّہٗٓ اِلٰی عَذَابِ النَّارِ۔ دوزخ جیسی جگہ کوئی شخص خوشی سے تو جائے گا نہیں، ہر ایک کشاں کشاں ہی لے جایا جائے گا، قرآن نے یہاں جو اس کی تصریح کر دی ہے وہ جہنم کی ہولناکی کا نقش واضح کرنے کے لئے۔

۴۵۸ الْبَیْت سے مراد خانۂ کعبہ ہے اور اس میں کوئی اختلاف رائے نہیں، الکتاب جس طرح قرآن کریم ہے، النبی جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ البیت اسی طرح کعبۃ اللہ ہے۔

یَرْفَعُ۔ کا لفظ قابل غور ہے، بنیادیں اول بار رکھی نہیں جا رہی تھیں، وہ تو غالباً حضرت آدمؑ ہی اپنے عہد میں رکھ گئے تھے، عمارت کے منہدم ہو جانے کے بعد اب انھیں از سر نو اٹھایا جا رہا تھا۔ مسیحیوں کو خانۂ کعبہ سے جو ضد اور اس کی قدامت سے جو کد ہے بالکل ظاہر ہے، ہر امکانی کوشش اپنے قلم سے اس کی مخالفت میں کر چکے ہیں، لیکن حقیقت اس کے باوجود حقیقت ہی ہے، مترجم قرآن جارج سیل (SALE) اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنی مقام اجتماع عظیم کے ہیں، یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے اور بعض کی رائے میں توریت کے (شہر) میسا سے یہی مراد ہے۔"

اور پھر وہی آگے لکھتا ہے:۔

"مکہ کا معبد اہلِ عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمدؐ سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا تھا۔"

باسورتھ اسمتھ اپنے لکچرز آن محمد اینڈ محمڈن ازم میں لکھتے ہیں:۔

"بناء کعبہ کا سلسلہ حسب روایات اسمٰعیل اور ابراہیم تک پہنچتا ہے بلکہ شیث و آدم تک اور اس کا نام بیتِ ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے ہی بزرگ نے تعمیر کیا ہے۔" (صفحہ ۱۶۶)

سب سے بڑھ کر قابلِ لحاظ شہادت سر ولیم میور کے قلم سے ہے:۔

"مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے، جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبہ میں مسلّم ہو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانہ سے چلی آتی ہے۔" (لائف آف محمدؐ۔ مقدمہ صفحہ ۱۰۲ و صفحہ ۱۰۳)

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا

اے ہمارے پروردگار ہم سے (یہ) قبول کر ۴۵۹ یقیناً تو ہی (سب کچھ) سننے والا ہے (سب کچھ) جاننے والا ہے ۴۶۰ اے ہمارے

مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ص

پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنا دے ۴۶۱ اور ہماری نسل سے اپنی ایک فرمانبردار امت پیدا کر ۴۶۲

یہ شہادتیں مخالفوں کی تھیں، باقی ہمارے ہاں کی روایتوں میں خانۂ کعبہ کی قدامت کی جو روایتیں ہیں ان سے تو تفسیر، حدیث، سیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔

اِسْمٰعِيْل۔ اسمٰعیلؑ کی عمر اور زمانہ وغیرہ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے، ایک پیغمبر برحق کی حیثیت سے اسلام میں آپ کا جو مرتبہ ہے ظاہر ہے لیکن آپ کا ایک مستقل معجزہ یہ ہے کہ جن قوموں نے آپ کی اور آپ کی والدۂ ماجدہ کی ہجو اور بدگوئی کو اپنا شعار بنا لیا ہے ان تک کے نوشتوں میں آپ کی تعظیم منقول چلی آتی ہے چنانچہ بعض احبار یہود کا یہ قول آج تک یہود ہی کی دائرۃ المعارف میں لکھا چلا آتا ہے کہ:۔

"جو کوئی خواب میں اسمٰعیل کو دیکھے حق تعالیٰ کے ہاں اس کی دعا قبول ہو جائے گی"۔ (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ ص ۶۴۸)

آپ کی والدۂ ماجدہ حضرت ہاجرہ شاہ مصر کی صاحبزادی تھیں اور مصر کا شاہی خاندان حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کی ایک شاخ تھا، عراق سے منتقل ہو کر مصر میں آباد ہو گیا تھا جب حضرت ابراہیمؑ اپنے سفر میں ادھر سے گزرے تو بحیثیت ایک شیخ قبیلہ کے آپ کو شاہ مصر نے اپنا مہمان بنایا، اور رخصت کے وقت آپ کے اعزاز و اکرام میں اپنی صاحبزادی کو بطور تحفہ پیش کیا، اور تواضع و انکساری کی راہ سے کہ مشرقی میزبانی کا خاصہ ہے کہا کہ یہ آپ کی کنیزی کے لئے ہدیہ ہے، اردو زبان میں یہ محاورہ آج تک چلا ہوا ہے شادی بیاہ کے موقع پر بڑے سے بڑا معزز شخص بھی اپنی لڑکی کو کنیز ہی کہہ کر داماد اور سمدھی کے سامنے پیش کرتا ہے، مشرقی تواضع کے اس عام پیرایۂ بیان سے معاندین کو گویا ایک بڑی معتمد و مستند دستاویز ہاتھ آ گئی، اور ام اسمٰعیل ان کے ہاں آج تک کنیز ہی چلی آ رہی ہیں! واقعات بہرحال واقعات ہیں انہیں کوئی کہاں تک جھٹلا سکتا ہے؟ اسی جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ایک بڑا احبار یہود کے حوالہ سے ہے:

"ہاجرہ فرشتہ ہی کو دیکھ کر ہیبت زدہ ہوئیں، ان کی عصمت مآبی اس سے ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ نے انہیں اپنے پاس سے الگ کر دیا جب بھی ان کی وفاداری میں فرق نہ آیا...... ان کے نام کے ایک معنی "آراستہ" بھی بیان ہوئے ہیں اور یہ اس بنا پر کہ وہ زیور اخلاق و حسن عمل سے آراستہ تھیں"۔ (جلد ۶ ص ۱۳۸)

اور اسی میں ایک دوسری جگہ یہ روایت بھی درج ہے کہ:۔

"بادشاہ نے خود اپنی صاحب زادی بطور کنیز ہدیہ کر دی"۔ (جلد ۱ ص ۵۵)

اور قصص یہود کا جو مجموعہ گنزبرگ (GINZBERG) نے چار جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا ہے اس میں ہے:۔

"بادشاہ مصر نے عہد کر لیا کہ وہ ابراہیمؑ کو ہر طرح پر قوت و شوکت بنا کر رہے گا..... چنانچہ اپنی بیٹی تک ہدیہ دے دی، سارہ کی تعلیم و تربیت میں رہ کر وہ بھی ویسی ہی باخدا بن گئیں اور ہر طرح ابراہیم کی رفاقت کے قابل"۔ (جلد ۱ ص ۲۲۳ و ص ۲۳۸)

۴۵۹ (محض اپنے فضل و رحمت سے)

کیا ٹھکانا ہے اس خشیتِ قلب کا! اخلاص کے مجسّمے ہیں، صداقت کے پُتلے ہیں' اس پر بھی ڈرتے جاتے ہیں کہ دیکھئے نذرِ قبول بھی ہوتی ہے یا نہیں۔!

بابِ تفعّل کا ایک خاصّہ تکلّف ہے' اس لئے بعض نکتہ سنجوں نے لفظ تَقَبَّلْ سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ فعل بذاتِ خود ہرگز قابلِ قبول نہیں' تمام تر ناقص ہے اور مقبولیت محض لطف و کرم سے ہو رہی ہے نہ کہ کسی استحقاق کی بنا پر۔

انّ التقبل عبارۃ عن ان یتکلّف الانسان فی قبولہ (کبیر) فی اختیار صیغۃ التفعّل اعتراف بالقصور لما فیہ من الاشعار بالتکلّف فی القبول (روح)

مزدور اور معمار جب کام کرتے ہیں تو عمومًا اور عادۃً کچھ گنگناتے بھی جاتے ہیں' اللہ کے گھر کے یہ معمار بھی اللہ کے گھر کی دیواریں اٹھاتے وقت خاموش نہ تھے' یہاں ان کی مناجات بیان ہو رہی ہے۔

فقہاء کا استنباط ہے کہ ہر عملِ صالح کے بعد دعا کرنا مستحب ہے' چنانچہ ختمِ نماز پر دُعا اور افطارِ صوم کے وقت دُعا اسی قبیل سے ہیں۔

۴۶۰ سَمِیْعُ۔ سننے والا زبان سے نکلے ہوئے لفظ و قول کا۔

عَلِیْمُ۔ جاننے والا دل کے اندر کے اخلاص کا۔

مشرک قوموں کے حکماء و فلاسفہ نے سب سے زیادہ ٹھوکر حق تعالٰی کی صفتِ علم ہی کے باب میں کھائی ہے اور باری تعالٰی کا علم ناقص اور محدود فرض کیا ہے' قرآن جو علمِ باری کے کامل و محیط ہونے کا تشدّد سے اثبات کرتا ہے اور اللہ کے عَلِیْمٌ، سمیع، بصیر ہونے کو بار بار پیش کرتا ہے' اس کا ایک مقصد فلاسفہ کے اس وہم باطل کی تردید کرنا ہے۔

۴۶۱ (اور زیادہ)

مُسْلِمَیْنِ کے معنی یہاں دو طرح کئے گئے ہیں' ایک اللہ کی توحید کے ماننے والے بلا شائبۂ شرک و شرکت۔

ای موحّدین مخلصین لانعبد الا ایاک (کبیر)

دوسرے اسلام کے عام احکام کے پابند۔

ای قائمین بجمیع شرائع الاسلام (کبیر)

لیکن دونوں معنی ایک دوسرے کے منافی بالکل نہیں' مُسْلِم کے ترجمہ فرمانبردار میں نہ وہ وسعت ہے نہ وہ لُطف جو خود لفظ مُسْلِمْ میں ہے۔

مسلمون ای منقادون للحق مذعنون لہ (راغب)

فرمانبردار بندے یا مسلم تو وہ اُس وقت بھی تھے' جب دعا کر رہے تھے' دعا کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہماری فرمانبرداری میں مزید ترقی دے

والمعنی زدنا اخلاصا واذعانا لک (کشاف) والمراد طلب الزیادۃ فی الاخلاص والاذعان او الثبات علیہ (بیضاوی)

۴۶۲ اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً کے ترجمہ "فرمانبردار امت" میں وہ بلاغت و معنویت کہاں' جو قرآنی لفظ امتِ مسلمہ میں ہے' دعا کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ وہ امت آج تک اسی نام سے مشہور چلی آتی ہے' دوست دشمن سب کی زبان پر' ایک یہودی ٹوری (TOWRY) نامی امریکہ کی ییل (YALE) یونیورسٹی کا اُستاد اپنی اسلام دشمنی میں آکسفورڈ والے مارگولیس آنجہانی کا پورا جانشین ہے' لیکن ایک بات بڑے پتے کی اس کی زبان سے بھی نکل گئی ہے' کہتا ہے:۔

"اسلام کی بنیاد تو حقیقۃً اسمٰعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہلِ عرب کے مورثِ اعلیٰ ہیں" (جیوش فاؤنڈیشن آف اسلام صفحہ ۸)

وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

اور ہم کو ہمارے دینی قاعدے بتلا دے ۴۶۳ اور ہمارے حال پر توجہ رکھ ۴۶۴ یقیناً تو ہی تو ہے بڑا توجہ فرمانیوالا اور مہربان ۴۶۵

مِنْ ذُرِّيَّتِنَا۔ یعنی ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی مشترک نسل سے۔

دُعا دونوں بزرگوار مل کر کر رہے تھے اس لئے ذریت سے مراد بنی اسمٰعیل ہی ہو سکتے تھے۔

برنابا (BARNABAS) نامی حضرت مسیح کے ایک بلند پایہ حواری (صحابی) ہوئے ہیں ان کی انجیل کو مسیحیوں نے اپنے مذاق و مسلک کے بالکل ناموافق پا کر اس کی اصلیت ہی سے انکار کر دیا ہے، اس انجیل کے نسخے انگریزی، عربی، اردو، تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔

اس میں صراحت کے ساتھ ہے کہ عہد الٰہی اسمٰعیل کے ساتھ ہوا تھا نہ کہ اسحٰق کے ساتھ:۔

وقولی لانی اقول لکم الحق ان العہد صنع باسمٰعیل لا باسحٰق (۳۱، ۴۳)

میری بات کا یقین کرو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحٰق سے۔

اور پھر ہے:۔

وان الموعد صُنع باسمٰعیل لا باسحٰق (۱۸:۱۴۲) وعدہ اسمٰعیل سے کیا گیا تھا نہ کہ اسحاق سے۔

۴۶۳ مَنَاسِكَنَا۔ یعنی عام دینی قاعدے خصوصاً بیت اللہ کے حج و زیارت کے آداب و شعائر، مناسک جمع ہے نسک کی اور نسک ہر عبادت ہے۔

قیل مناسک الحج ومعالمہ قالہ قتادۃ والسدی وقیل جمیع المتعبدات وکل ما یتعبد بہ الی اللہ تعالٰی، یقال لہ مَنْسَکٌ ومَنْسِکٌ (قرطبی) وفی الشرع اسم للعبادۃ یقال رجل ناسک ای عابد (جصاص) واصل النسک العبادۃ والناسک العابد (معالم)

اَرِنَا۔ اِراءۃ کے معنی یہاں آنکھ سے دکھلا دینے کے نہیں بلکہ سکھلا دینے، بتلا دینے کے ہیں۔

ای علّمنا وعرّفنا (معالم) علّمنا (جلالین) قال عطاء اخبرہا لنا علّمناھا (ابن جریر)

فعل رأی کا تعدیہ جب دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی رؤیت کے نہیں علم کے ہو جاتے ہیں۔

رأی اذا عُدّی الی مفعولین اقتضی معنی العلم (راغب) الرؤیۃ ھٰھنا بمعنی العلم (ابن قتیبہ)

ابن حاجب نحوی اور ابوحیّان مفسر نے اس معنی کے قبول کرنے سے انکار بھی کیا ہے لیکن جب تائید میں راغب اور زمخشری جیسے مستند امامان ادب و لغت کی شہادتیں موجود ہیں تو کسی کا انکار چل نہیں سکتا۔

وانکر ابن الحاجب واتبعہ ابوحیّان ثبوت رأی بمعنی عرف وذکرہ الزمخشری فی المفصل والراغب فی مفرداتہ وھما من الثقات فلا عبرۃ بانکارھما۔ (روح)

۴۶۴ (رحمت و شفقت و مغفرت کے ساتھ، جیسی کہ اب تک رکھی ہے۔)

وتوبۃ الربّ علی عبدہ عودہ علیہ بالعفو لہ عن جرمہ والصفح لہ عن عقوبۃ ذنبہ مغفرۃ لہ منہ وتفضلا علیہ (ابن جریر)

رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے ہمارے پروردگار! ان میں ایک پیغمبر انھیں میں سے بھیج ۴۶۶ جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتاب (الٰہی)

الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۱۵

اور دانائی کی تعلیم دے اور انھیں پاک (وصاف) کرے ۴۶۷ یقیناً تو ہی تو ہے بڑا زبردست بڑا حکمت والا ۴۶۸

عصمتِ انبیاء کا عقیدہ ایک الگ شے ہے اور بجائے خود ثابت و مسلّم، لیکن خود نبی پر تو خشیت و عبدیت کا غلبہ ہر ولی سے بھی بڑھ کر رہتا ہے، وہ تو بہر صورت اپنے لئے ہر وقت عفو و مغفرت اور رحمت ہی کا طالب رہتا ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہ طلب توجہ، رحمت کے ثبات و دوام کے لئے تھی:۔

وقالت طائفة طلبا للتثبيت والدوام لا انهما كان لهما ذنب (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ عوام کی توبہ اور ہے خواص کی اور، اور اخص الخواص کی ان سے بھی بلند و ممتاز۔

وتوبة خواص الخواص لرفع الدرجٰت والترقی فی المقامات (روح)

۴۶۵ (تو تیرے لئے ہماری اس دعا کو شرف قبول بخش دینا کچھ بھی دشوار نہیں) آیت سے بڑی تعلیم آداب کی بھی مل رہی ہے، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ جیسی مقدس ہستیاں بھی جب دعا و مناجات کرتی ہیں تو کن نمایاں آثار عبودیت کے ساتھ!

۴۶۶ مِنۡهُمۡ۔ یہ قید خوب خیال میں رہے دعائے ابراہیمی ابھی چل رہی ہے ابھی ابھی آپؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ دونوں مل کر عرض کر چکے ہیں کہ اے پروردگار ہم دونوں کی نسل میں سے ایک امتِ مسلمہ، ایک اپنی فرمانبردار امت پیدا کر، اور اس کے معاً بعد مِنۡهُمۡ کا لفظ لاتے ہیں کھلی ہوئی مراد نسل اسمٰعیلی سے ہے، لفظ هُمۡ کا مرجع ذرّیۃ کو سمجھا گیا ہے اور امتِ مسلمہ کو بھی۔

والضمير فی منهم يحتمل ان يعود على الذرية ويحتمل ان يعود على امّة مسلمة (بحر)

ماحصل دونوں کا ایک ہی یعنی نسلِ اسماعیلی، اور یہ جزء تاریخ سے اپنی جگہ ثابت ہے کہ صحیح النسب نسل اسماعیلی قوم عرب ہی رہ گئی تھی، اس لئے لازمی تھا کہ یہ پیغمبر عرب ہی میں پیدا ہو۔

رَسُوۡلًا۔ اس کا ایک تو صیغہ واحد اور پھر اعراب کی تنوین، گویا یہ اشارہ قریب بہ صراحت پہنچ گیا کہ وہ رسول ایک ہی ہوگا، متعدد نہ ہوں گے۔

یہود کا دعوٰے ہے (اور نصاریٰ بھی انھیں کا ساتھ دیتے ہیں) کہ نبوت و رسالت تو بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص تھی، یہ نیا پیغمبر بنی اسمٰعیل میں کیسے پیدا ہو گیا؟ لیکن انھیں کی توریت باوجود ان کی ساری تحریفات کے اب تک شہادت کچھ اور ہی دے رہی ہے، ایک جگہ حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

"خداوند تیرا خدا تیرے لئے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی طرف کان دھرو۔" (استثناء ۱۸: ۱۵)

قطع نظر اس سے کہ بنی اسرائیل میں تو ایک نبی نہیں خدا معلوم کتنے انبیاءؑ حضرت موسیٰؑ کے بعد پیدا ہوتے رہے،

خود "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی تصریح بتارہی ہے کہ مراد بنی اسرائیل نہیں، بلکہ ان کے ہم جد بھائی بنی اسمٰعیل ہیں اگر خبر اسرائیلی ہی نبی کی دینا ہوتی تو بجائے "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کے عبارت "تجھ ہی میں سے" ہوتی' یہ الفاظ تو صرف مخاطبین کی وحشت دُور کرنے اور ان میں جذبۂ اُنس و موانست پیدا کرنے کے لئے ہیں کہ اے میرے ہم قوم واجب وہ نبی آئے تو اس کی اطاعت کرنا، وہ بھی تمھارا غیر نہیں تمھارے ہی بھائیوں میں سے ہوگا، اور پھر دو ہی آیتوں کے بعد توریت میں بعینہ یہی مضمون براہ راست حق تعالیٰ کی جانب سے ادا کیا گیا ہے:۔

"خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا، میں ان کے لئے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا۔" (استثناء۔ ۱۸: ۱۸)

اب دیکھئے کہ "اپنا کلام اس کے منھ میں ڈالوں گا" یعنی لفظی کلام الٰہی ہونے کا مصداق بجز قرآن کے ساری آسمانی کتابوں میں اور ہے ہی کون؟ لفظی کلام الٰہی ہونے کا دعویٰ کس دوسری کتاب کا ہے؟ پھر دیکھئے کہ "تجھ سا" یعنی "موسیٰ کا سا" ہونے کا مصداق تاریخ کی دنیا میں بجز ذات محمدی کے اور ہوا کون ہے؟ اور کیا اس سے بھی قطع نظر ممکن ہوگی کہ یہاں بھی بجائے "ان میں سے" کے یا "اسرائیلیوں میں سے" کے صراحت "ان کے بھائیوں میں سے" ہونے کی موجود ہے۔ اور پھر یہی پیش گوئی انھیں لفظوں میں موسیٰؑ نبی کی زبان سے نکلی ہوئی، نصاریٰ کی انجیل میں بھی دہرائی ہوئی موجود ہے

"موسیٰؑ نے کہا کہ خداوند خدا تمھارے بھائیوں میں سے تمھارے لئے مجھ سا نبی پیدا کرے گا، جو کچھ وہ تم سے کہے تم اس کی سننا۔" (اعمال۔ ۳: ۲۲)

۴۶۷ے ذرا سا غور کرنے سے نظر آجائے گا کہ رسول اعظمؐ کے جملہ فرائض کمال ایجاز کے ساتھ ان چند فقروں میں آگئے ہیں۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ۔ رسول کا پہلا کام اپنی امت کے سامنے تلاوت آیات ہوتا ہے یعنی اللہ کا کلام پہنچانا، گویا رسول کی پہلی حیثیت مبلّغ اعظم کی ہوتی ہے۔

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ۔ رسول کا کام محض تبلیغ و پیام رسانی پر ختم نہیں ہو جاتا، اس کا کام کتاب الٰہی کی تبلیغ کے بعد اس کی تعلیم کا بھی ہے' اس تعلیم کے اندر کتاب کی شرح، ترجمانی، تعمیم میں تخصیص، تخصیص میں تعمیم سب کچھ آگئی اور یہیں سے ان کج فہموں کی بھی تردید ہوگئی، جو رسول کا منصب (معاذ اللہ) صرف ڈاکیہ یا قاصد کا سمجھے ہوئے ہیں' گویا رسولؐ کی دوسری حیثیت معلّم اعظم کی ہوئی۔

وَالْحِكْمَةَ۔ پھر رسول تعلیم محض کتاب ہی کی نہ دیں گے بلکہ حکمت و دانائی کی تلقین بھی امت کو کریں گے' احکام و مسائل' دین کے قاعدے اور آداب' عوام و خواص سب کو سکھائیں گے اور خواص کی رہنمائی اسرار و رموز میں بھی کریں گے' گویا رسول کی تیسری حیثیت مُرشد اعظم کی ہوئی۔

يُزَكِّيهِمْ۔ تزکیہ سے مراد دلوں کی صفائی ہے' رسول کا کام محض الفاظ اور احکام ظاہر کی تشریح تک محدود نہیں رہے گا، بلکہ وہ اخلاق کی پاکیزگی اور نیتوں کے اخلاص کے بھی فرائض انجام دیں گے' گویا رسول کی یہ چوتھی حیثیت مصلح اعظم کی ہوئی۔

۴۶۸ے (تو تو اس دعا کو کیوں نہ قبول کرے گا۔)

اِنَّكَ اَنْتَ۔ عربی کے اس دہرے فقرۂ مخاطبت کا مفہوم اردو میں یقیناً "تو تو" (پہلا "تو" واؤ معروف او

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ

اور ابراہیم کے مذہب سے کون پھرے گا مگر وہی جس نے اپنے کو احمق بنالیا ہو ۴۶۹

دوسرا "تو" واؤ مجہول کے ساتھ) ادا ہوتا ہے۔

الْعَزِیْزُ۔ ہر دعا کے قبول کرنے پر، ہر آرزو کے پورا کرنے پر قادر جس کی مشیت پر مانع اور غالب کوئی چیز نہیں آسکتی۔ عزۃ کے معنی شدت اور قوت اور غلبہ کے ہیں، اور العزیز وہ ہے جس کی قوت پر کوئی غالب نہ آسکے۔

هو الغالب القوی الذی لا یغلب والعزة فی الاصل القوة والشدة والغلبة (نہایہ)

الْحَكِیْمُ۔ قادر مطلق ہونے کے ساتھ حکیم مطلق بھی، قبول وہی دعائیں کرتا ہے، بندوں کی آرزوئیں وہی پوری کرتا ہے جو قانونِ حکمت کے مطابق و ماتحت ہوتی ہیں، الحکیم کے معنی حکمران و قاضی کے بھی ہیں اور چیزوں کے پختہ و کامل کرنے والے کے بھی اور صاحبِ حکمت کے بھی اور خود حکمت کے بھی بہترین علوم کے ساتھ بہترین اشیاء کی معرفت کے۔

الحکیم بمعنی الحاکم وهو القاضی والحکیم فعیل بمعنی فاعل او هو الذی یحکم الاشیاء ویتقنها فهو فعیل بمعنی مُفعل وقیل الحکیم ذو الحکمة والحکمة عبارة عن معرفة افضل الاشیاء بافضل العلوم ویقال لمن یحسن دقائق الصناعات ویتقنها حکیم (نہایہ)

اللہ اکبر! خلیل و ذبیحؑ کی ادب شناسیوں کا کیا کہنا! دعائیں بھی کیسے کیسے نکتے ملحوظ رکھ لئے ہیں۔۔۔ حضرات انبیاء سے بڑھ کر ادب شناس اور ہو بھی کون سکتا ہے؟

۴۶۹ (اور اپنے کو نفع و نقصان کی موٹی تمیز سے بھی محروم کر لیا ہو۔)

یعنی ملتِ ابراہیمی تو عین دینِ فطرت ہے، اس کی تعلیمات عین طبعِ سلیم کی ترجمان ہیں، اس سے کنارہ کشی تو صرف وہی اختیار کر سکتا ہے جس کی فطرت ہی سلیم نہ باقی رہی ہو، بلکہ مسخ ہو چکی ہو، اس مقدمہ کی تصدیق انسان جب چاہے اعتقاد سے نہیں آزمائش سے کرلے، اسلام نے جماعت (سوسائٹی) کا جو نظام قائم کیا ہے وہی بہترین نظامِ اجتماعی ہے، ہر فرد کے لئے جو ضابطۂ عمل بنا دیا وہی بہترین ضابطۂ شخصی ہے، عقل و جذبات، فرد و جماعت، دل و دماغ، جسم و روح، حریت و اطاعت، حیاتِ بشری کے متضاد و متناقض عنصروں کی جتنی باہمی رعایت شریعتِ اسلام نے ملحوظ رکھی ہے، دنیا کے کسی قانون میں کہیں اس کی نظیر نہ ملے گی۔

دعائے ابراہیمی ختم ہوئی، اب بیان ملتِ ابراہیمی کا شروع ہو رہا ہے کہ یہ تو وہی دین توحید ہے جس کی دعوت آج اسلام دے رہا ہے اور جسے تم سب باوجود اپنے مشترک بزرگ ابراہیمؑ کی پیروی کے دعوے کے چھوڑے بیٹھے ہو۔

مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ۔ قرآن نے عجب بلاغت و نکتہ سنجی سے کام لے کر یہاں اپنے دینِ اسلام کی نسبت نہ حق تعالیٰ کی جانب کی، نہ رسولِ وقت حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی جانب، بلکہ صرف ابراہیمؑ خلیل کی جانب کی، یہاں مخاطب اصلاً یہود و نصاریٰ اور مشرکین عرب ہیں اور یہ تینوں قومیں مسلمانوں ہی کی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اپنا مقدس پیشوا مانتی تھیں اس اسلوبِ بیان کو اختیار کر کے گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ قرآن تمہیں کسی نئے دین کی دعوت نہیں دے رہا، بلکہ تمہارے ہی بزرگ و محترم پیشوا ابراہیمؑ ہی کے دین کی جانب تمہیں بلا رہا ہے!۔۔۔ تلطف اور حسنِ تبلیغ کا پیرایہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا، مشرکین عرب

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اور ہم نے تو انھیں دنیا میں بھی برگزیدہ کرلیا تھا ۴۷۰ اور آخرت میں بھی وہ زمرۂ صالحین میں ہوں گے ۴۷۱ اور (وہ

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب ان سے اُن کے پروردگار نے فرمایا کہ حکم بردار بن جاؤ ۴۷۲ وہ بولے میں حکم بردار ہوں سارے جہان کے پروردگار کا ۴۷۳

کے پاس آسمانی کتاب کی قسم سے کوئی کتاب تو نام کے لئے بھی موجود نہ تھی۔ البتہ یہود و نصاریٰ کے نوشتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے فضائل اس وقت بھی درج تھے اور آج تک لکھے چلے آتے ہیں۔ توریت مروجہ میں ہے:۔

"اپنے باپ ابراہام پر اور سرہ پر جو تمھیں جنی نگاہ کرو کہ جب میں نے اسے بلایا وہ اکیلا تھا، پھر اس کو برکت دی اور اس کو بہت بنایا۔" (یسعیاہ۔ ۵۱: ۲) "اے ابراہام تو مت ڈر۔ میں تیری سپر اور تیرا بہت بڑا اجر ہوں" (پیدائش۔ ۱۵: ۱) "اور وہ خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے صداقت محسوب ہوا۔" (پیدائش ۱۵: ۶)

اور مسیحیوں کی انجیل مروجہ میں ہے:۔

"ابراہیم خدا پر ایمان لایا اور یہ اس کے لئے راستبازی گنا گیا، بس جان لو کہ جو ایمان والے ہیں وہی ابراہیم کے فرزند ہیں۔" (گلیتون۔ ۳: ۶) نیز (رومیون۔ ۴: ۳)

مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ ہماری شریعت وہی شریعت ابراہیمی ہی ہے، بجز ان حصوں کے کہ جواب منسوخ ہوگئے ہیں:۔

وقد یستدل بھذہ الآیۃ من قال ان شریعۃ ابراھیم شریعۃ لنا الا ما نسخ منھا (قرطبی)
یدل علی لزوم اتباع ابراھیم فی شرائعہ فیما لم یثبت نسخہ (جصاص)

۴۷۰ (ان کی اسی توحید پرستی اور ایمان باللہ کے صلہ میں ہر قسم کی نعمتوں اور سرفرازیوں کے لئے، یہاں تک کہ منصب رسالت و نبوت کے لئے)

ایک مسیحی مؤرخ ریونڈ ولیم ڈین (DEANE) ایم۔ اے نے ایک مستقل سیرت ابراہیم انگریزی میں لکھی ہے، اس سے آپ کے دنیوی عروج و اقبال پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے ان "روشن خیال" لامذہبوں کی تردید کے لئے یہی کافی ہے جنھوں نے اسی انیسویں صدی کے آخر میں آپ کے وجود کو فرضی قرار دیا تھا۔

۴۷۱ (ایک پیمبر جلیل القدر کے شایان شان)

یہود و نصاریٰ نے اہل کتاب ہونے اور نبوت و سلسلۂ وحی پر ایمان رکھنے کے باوجود اپنے اپنے نوشتوں میں کوئی کسر عصمت انبیاء کے داغدار بنانے میں اٹھا نہیں رکھی اس لئے قرآن مجید جہاں جہاں انبیائے سابق کا ذکر کرتا ہے اکثر ان حضرات کی اخلاقی و روحانی عظمت پر بھی زور دیتا ہے اور اس طرح انبیائے برحق کی نصرت و حمایت کا فرض توریت و انجیل کی عائد کی ہوئی فرد جرم کے مقابلہ میں ادا کرتا جاتا ہے۔ یہ عجیب و غریب اہل کتاب نبی اور نبوت کے قائل گویا ان الفاظ کے صرف لفظی معنی میں تھے یعنی نبی وہ ہے جو کاہنوں اور جوتشیوں کی طرح غیب کی خبریں دے سکے اور اسے انھیں

# وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ

اور ابراہیمؑ اس کی ہدایت کر گئے اپنے بیٹوں کو ۴۷۵ اور ایسی ہی یعقوب بھی ۴۷۶ (اپنے بیٹوں کو) ۴۷۷

کوئی بحث ہی نہ تھی کہ اس کے اخلاق کا کیا عالم تھا، اس کے روحانی کمالات کس درجہ کے تھے، اس کی تعلیمات کیا تھیں، وقس علی ہذا۔ ابراہیم خلیل تو اکثر انبیاء کے ابو الآباء ہیں، آپ کی عصمت کے تحفظ کا تو قرآن نے اور زیادہ اہتمام رکھا ہے۔

۴۷۲ (اور وہ ہو گئے)

یعنی وہ اسلام لے آئے، ایک بار پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیا جائے کہ قرآن میں ہر بیان لازمی طور پر تاریخی ترتیب کے اعتبار سے نہیں ہوتا، یہ ارشادِ خداوندی بہت قبل کا ہے اور ابراہیمؑ اس وقت اسلام لے آئے تھے۔

وکان ھذا القول من اللہ تعالیٰ حین ابتلاہ بالکوکب والقمر والشمس (قرطبی)

اسلام سے مراد اسلام کامل ہے، اور ابراہیمؑ جیسے پیغمبر جلیل کے شایانِ شان۔

والاسلام ھنا علی اتم وجوھہ (قرطبی)

لفظی معنی سر رکھ دینے، جھک جانے اپنے کو سپرد کر دینے کے ہیں۔

والاسلام فی کلام العرب الخضوع والانقیاد للمستسلم (قرطبی)

ایمان کا تعلق باطن سے ہے اور اسلام کا ظاہر سے اور اکثر ایمان و اسلام بہ طور مترادف بھی آتے ہیں۔

دل علی ان الایمان لیس الاسلام فان الایمان باطن والاسلام ظاھر وھذا بیّن وقد یطلق

الایمان بمعنی الاسلام والاسلام یراد بہ الایمان للزوم احدھما الآخر وصدورہ عنہ (قرطبی)

۴۷۳ یعنی میں خدائے پروردگارِ عالم پر اسلام لے آیا، یہاں گویا حضرت ابراہیمؑ نے اشارۃً اپنے ایمان لانے کی وجہ بھی بیان کر دی یعنی اسلام میں کیوں نہ لاتا، ایک ہی پروردگار، ایک ہی حاکمِ مطلق، ایک ہی مالک، ربوبیت کے سارے شعبوں کا ناظم وہی ایک ہی تو ہے میں اس پر ایمان کیوں نہ لاتا؟ اس کے قانون سے باغی کیسے رہ سکتا؟

۴۷۴ (جن کی تعداد حسب تصریح توریت آٹھ تھی)

بِهَا۔ یعنی اس دینِ توحید کی، ملتِ اسلام کی۔

ضمیر خواہ ملت کی جانب ہو خواہ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کی طرف، ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

والضمیر فی بھا لقولہ اسلمت لرب العٰلمین (کشاف) والضمیر للملّۃ او لقولہ اسلمت (بیضاوی) وھی الاسلام الذی امر بہ نبیّہ صلی اللہ علیہ وسلم (ابن جریر)

وَصّٰى عربی کا لفظ وصیّۃ اردو کے وصیّت سے کہیں زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے بسترِ مرگ کی خواہشوں اور مرنے والوں کی آخری ہدایتوں تک محدود نہیں ہر حکم، ہر ہدایت پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے وصیّتہ ھکذا کے معنی ہیں "میں نے اس کو حکم دیا"، "میں نے اس سے یہ کرنے کو کہا"۔

ای عھد الیھم بذلک وامرھم بہ (ابن جریر)

اور محققین نے یہ بھی کہا ہے کہ بجائے اوصٰی بِهَا کے وَصّٰى بِهَا لانے میں نکتہ یہ ہے کہ گویا اس حکم دینے

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۳۲)

اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے تمہارے لئے دین کا انتخاب فرما لیا ہے ۴۷۷ سو ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ تم مرتے وقت بجز مسلم کے کچھ اور ہو

اور عہد لینے کا سلسلہ قائم رہا۔

انہ یعنی بذلک انہ عھد الیھم عھد ابعد عھدٍ واوصٰی وصیۃ بعد وصیۃ (ابن جریر)

فیہ معنی التکثیر۔ (قرطبی)

بَنِیہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے صاحبزادے آٹھ تھے: (۱) حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے (۲) حضرت اسحاقؑ، حضرت سارہ عراقی کے بطن سے (۳) زمران (۴) یقسان (۵) مدان (۶) مدیان (۷) ایباق (۸) سوخ۔ یہ سب حضرت قطورہ کے بطن سے تھے (پیدائش ۲۵: ۱ و ۲)

۴۷۵ (ہدایت کر گئے۔)

یعقوبؑ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے پوتے اور حضرت اسحاقؑ نبی کے صاحبزادہ تھے اور نبی زادہ ہونے کے علاوہ خود بھی نبی تھے، اسرائیل آپ ہی کا دوسرا نام ہے، توریت میں ہے:۔

”اور خدا نے اُسے کہا کہ تیرا نام یعقوب ہے، تیرا نام آگے کو یعقوب نہ کہلائے گا بلکہ تیرا نام اسرائیل ہوگا، سو اس نے اس کا نام اسرائیل رکھا۔“ (پیدائش۔ ۳۵: ۱۰ و ۱۱)

عمر حسب روایت توریت ایک سو سینتالیس ۱۴۷ سال کی پائی، زمانہ غالباً ۲۰۰۰ ق م تا ۱۸۵۳ ق م۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی ۱۸۷۰ ق م میں اپنے نامور فرزند یوسفؑ نبی کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے، وفات یہیں ہوئی۔

۴۷۶ چار ازواج طاہرات سے آپ کے بارہ ۱۲ فرزند تھے، ان کے نام حسب تصریح توریت حسب ذیل ہیں:۔

روبن، شمعون۲، لادی۳، یہوداہ۴، اشکار، زبلون۶، یوسف، بن یامین۸، دان۹، نفتالی، جد، آشر۱۲،

(پیدائش ۳۵: ۲۴۔۲۶)

(انہیں صاحبزادوں میں سے جہاں تک خاندانی شجرہ اور نسب نامہ سے پتہ چلا ہے لادی کی نسل سے ان سطور کا راقم نامہ سیاہ بھی ہے۔)

۴۷۷ الدِّین۔ یعنی اس دین توحید کا، ملتِ اسلام کا، ال عہد کا ہے یعنی جانا پہچانا ہوا دینِ اسلام۔

والالف واللام فی الدّین للعھد لانھم قد کانوا عرفوہ (قرطبی)

اصطفٰی۔ اصطفاء کے معنی ہیں چن لینا اور ملاوٹ یا آمیزش سے پاک کر دینا۔

لکُم۔ میں لام تخصیص کا ہے یعنی یہ دین تمہارے لئے ہے اور تم اس دین کے لئے ہو۔

مطلب یہ ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو قوم عرب اور نسل یہود دونوں کے مورث اعلیٰ ہوئے ہیں اور نصاریٰ کے بھی مقتدا، اور حضرت یعقوب جو نسل اسرائیلی کے جد امجد ہوئے ہیں، یہ دونوں تو اپنی اولاد کو خود اپنے اختیار کئے ہوئے اور خدا کے پسند کئے ہوئے دین کو منتقل ہی کر گئے اور فرما گئے کہ تمہیں کسی مزید تلاش میں حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت ہی نہیں تمہارے لئے تو یہ اللہ کا بنایا ہوا، اور بتایا ہوا دین توحید موجود ہی ہے۔ قرآن کے مخاطبین

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ

بھلا اس وقت تم کیا موجود تھے جب یعقوبؑ کو موت آ پہنچی ۴۷۹ اور اس وقت انھوں نے اپنے بیٹوں سے

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ

کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ ۴۸۰ وہ بولے ہم عبادت کریں گے آپ کے خدا اور آپ کے

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۳)

باپ دادوں ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے خدا کی (اس) خدائے واحد کی اور ہم تو اسی کے فرمانبردار ہیں ۴۸۱

اول سے کے سب اسلاف پرستی کے مرض میں گرفتار تھے، ان سے خطاب کا یہ بہترین اسلوب ہے کہ اچھا اگر دین کے بارے میں اپنے اسلاف ہی کو حکم بنا رہے ہو تو دیکھو وہی کیا کہہ گئے ہیں۔

۴۷۸ (اور چونکہ موت کا وقت انسان کے علم میں نہیں، اس لئے تیار اس کے لئے ہر وقت اور ہمیشہ رہو) مطلب یہ ہوا کہ مسلم ہمہ وقت بنے رہو، ایمان کو ہر لحظ دل میں جگہ دیئے رہو۔

معناہ داوموا علی الاسلام حتی لا یصادفکم الموت الا وانتم مسلمون (معالم) ای احسنوا فی حال الحیاۃ والزموا ھذا لیرزقکم اللہ الوفاۃ علیه (ابن کثیر) ای الزموا الاسلام وداوموا علیه ولا تفارقوہ حتی تموتوا (قرطبی)

دین کے مطالبات میں بس ایک ایمان ہی کا مطالبہ ایسا ہے جو ہمہ وقتی اور ہمہ حالی ہے، ورنہ اعمال جتنے بھی ہیں سب حالات کے تابع ہیں اور حالات خود تغیر پذیر ہیں۔ ضمناً اہل کتاب کو بھی فہمائش ہو رہی ہے کہ تم جس دین کو نیا اجنبی اور انوکھا سمجھ کر اس سے بدکتے اور بھڑکتے ہو وہ تو پیدا نہیں، وہ تو عین تمھارے ہی بزرگوں کا تعلیم کیا ہوا دین آبائی ہے۔ (راقم سطور نا رسیاہ سے اگر فرمائش کی جائے کہ سارے قرآن مجید سے کسی ایک آیت کا اپنے لئے انتخاب کرے تو اس کی نظر انتخاب اسی آیت بلکہ اس کے آخری جز پر پڑے گی۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ جی میں ہے کہ زندگی کی ہر ساعت میں یہی آیت ورد زبان رہے اور دل میں اسی کے معنی کا استحضار رہے، موت کے وقت بھی دل وزبان پر ہو اور بعد موت بھی کفن پر بھی لکھ دی جائے اور قبر کے کتبہ پر بھی کندہ کردی جائے، بارہا اس آیت پر وجد طاری ہو چکا ہے، بارہا اس آیت پر آنسو جاری رہ چکے ہیں، اور دل یہ کہتا ہے کہ احکام کی حد تک سارے قرآن مجید کا لُبِّ لباب یہی آیت ہے)

۴۷۹ (اور آپ کو اس کے علامات و آثار محسوس ہونے لگے)

حَضَرَ الْمَوْتُ۔ یعنی وقت موعود قریب آگیا، یہ مراد نہیں کہ خود موت ہی آپ پر طاری ہوگئی۔

ای مقدماته واسبابه (قرطبی) کنی بالموت عن مقدماته لانه اذا حضر الموت نفسه لا یقول المحتضر شیئًا (بحر) ای حین تقرب یعقوب من الموت (معالم)

قرآن مجید ہی میں ایک اور دوسری جگہ ہے وَیَاْتِیْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَیِّتٍ۔ یہاں بھی موت سے مراد موت کے دواعی واسباب ہی لئے گئے ہیں۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ۔ خطاب اہل کتاب سے ہے اور استفہام میں لہجۂ زجر شامل ہے۔

والخطاب للیهود والنصارٰی ..... وقال لهم علی جهة التوبیخ (قرطبی) معنی الاستفهام هٰهنا الزجر والتوبیخ وهو فی معنی المنفی (بحر) والخطاب مع اهل الكتاب (كبیر)

یعنی تم جو واہیات خرافات حضرت یعقوبؑ کی جانب منسوب کررہے ہو تو تمہارا اس وقت وجود ہی کہاں تھا؟ صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن بیان کررہا ہے۔

اَمْ۔ بَلْ کے معنی میں بھی لیا گیا ہے۔

ای بل اَشَهِدَ اسلافكم یعقوب (قرطبی)

۴۸۰ آیت سے اس کی تعلیم ملتی ہے کہ حضرات انبیاءؑ کو زندگی بھر کی طرح اپنے آخر وقت میں بھی سب سے مقدم فکر دین ہی کی ہوتی ہے اور اپنی اولاد کے حق میں ان کی سب سے بڑی شفقت یہی ہے۔

الآیة دالة علی ان شفقة الانبیاء علی اولادهم كانت فی باب الدین وهمتهم مصروفة الیه دون غیره (كبیر)

مَا تَعْبُدُوْنَ میں مَا عام ہے ای شیئ کے معنی میں۔ بیجان کے ساتھ مخصوص نہیں۔

ما عام فی كل شیئ والمعنی ای شیئ تعبدون (كبیر)

مِنْۢ بَعْدِیْ۔ یعنی میری وفات کے بعد مضاف محذوف ہے۔

ای من بعد موتی (ابو سعود)

۴۸۱ یعنی "ہم سب اس پر اسلام لاچکے ہیں"۔

توریت موجودہ کے اوراق تو اس اہم اور ضروری تذکرہ سے کسی مصلحت سے خاموش ہیں، البتہ احبار یہود کا یہ قول نقل ہو کر پہنچا ہے کہ:۔

"یعقوب نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹوں کو یہ تین احکام دیئے (۱) بت پرستی نہ کرنا (۲) خدا کی بے حرمتی نہ کرنا (۳) میرے جنازہ کو کوئی کافر ہاتھ نہ لگانے پائے" (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۷ صفحہ ۲۲)

روایات وحکایات یہود کی جو دوسری کتابیں ہیں اُن میں صراحت اس سے بڑھ کر ملتی ہے:۔

"یعقوب نے اپنے بیٹوں سے کہا..... مجھے اندیشہ ہے کہ تم میں سے کوئی بت پرستی کا میلان رکھتا ہے اس کے جواب میں بارہ ۱۲ بیٹوں نے کہا "سن لے اسرائیل، اے ہمارے باپ، ہمارا خدا وہی خدائے لم یزل ہے جس طرح تیرا دلی ایمان ایک خدا پر ہے، اسی طرح ہم سب کا دلی ایمان ایک خدا پر ہے" (گنز برگ کی قصص یہود، جلد ۲ صفحہ ۱۴۱)

اٰبَآئِكَ۔ اسمٰعیلؑ یعقوبؑ کے بڑے چچا (یا تایا) تھے، فرزندانِ یعقوبؑ نے کمال سعادت مندی سے ان کا شمار بھی آبائے یعقوبؑ میں کیا جیسا کہ اردو محاورہ میں بھی باپ چچا کو ایک ہی حکم میں رکھا جاتا ہے۔ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے، آپ کے چچا حضرت عباسؓ کے لئے بھی لفظ اَب آیا ہے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ۴۸۲؎ اُن کے آگے اُن کا کیا ہوا آئے گا اور تمہارے آگے تمہارا کیا ہوا

تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾

اور وہ جو کچھ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ۴۸۳؎

هذا بقية آبائی یعنی میرے بڑوں یا بزرگوں میں یہی باقی ہیں۔

آیت میں دادا اور چچا دونوں کے لئے لفظ آب ہی آیا ہے۔

اسحٰق۔ یہ نام پہلی بار آیا ہے حضرت ابراہیم کے دوسرے صاحبزادے تھے، حرم اول حضرت سارہ کے بطن سے سال ولادت غالباً ۲۰۶۰ ق۔م، سال وفات ۱۸۸۰ ق۔م۔ عمر شریف توریت میں ایک سو اسّی سال درج ہے، یہ بھی درج ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی عمر سو ۱۰۰ سال تھی۔

آپ کے بستر مرگ کا منظر قصص الیہود میں یوں دکھایا گیا ہے:۔

"جب اسحٰق نے دیکھا کہ ان کا وقت موعود آپہنچا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بُلالیا اور کہا کہ میں تمھیں خدائے تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات علی، عظیم، قیوم، عزیز ہیں اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی ہر شے کا خالق ہے کہ تم خوف اُسی کا رکھنا اور عبادت اُسی کی کرنا۔" (جلد اول ص ۴۱۶)

۴۸۲؎ (اور ان کے فضائل و کمالات بھی ان کے ساتھ گزر چکے تمھیں آخر ان کے نام گنانے سے کیا حاصل؟) تِلْكَ أُمَّةٌ سے مراد یہی اجداد یہود ہیں جن کا شمار جماعت انبیاءؑ میں ہے، خطاب یہاں یہود سے ہے جو آبائی مفاخرت، نسلی عظمت اور پیرزادگی کے نشہ میں چُور تھے اس میں بڑا سبق آج کے پیرزادوں، رسمی مشائخ زادوں اور بہت سے بدعتی فرقوں کے لئے موجود ہے، بلا سعیِ عمل بزرگوں کی محض نسبت سے فائدہ اٹھانے کی جڑ ہی اسلام نے کاٹ دی ہے۔

۴۸۳؎ اسلام کے طفیل اب یہ بات معمولی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اس وقت بہت ہی اہم اور گویا ایک نادر سی بات تھی شخصی و ذاتی ذمہ داری اور انفرادی مسئولیت کی تعلیم اسلام کے خصوصیات امتیازی میں سے ہے ورنہ مشرک تو مشرک یہود اہل توحید تک اس سفاہت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی ضرورت ہی کیا ہے، مقبولانِ الٰہی کی جانب انتسابِ نسلی اور بزرگوں کی طرف نسبتِ نسبی بالکل کافی ہے، مسیحیوں کا گڑھا ہوا مسئلہ "معصیتِ متوارث" سب کو معلوم ہے یعنی جو معصیت ابو البشر سے سرزد ہو گئی تھی وہ ہر نسل آدم میں منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، یہود نے اس کے مقابل ایک عقیدہ "نجاتِ متوارث" کا وضع کر لیا تھا، اور یہ سمجھ لیا تھا کہ:۔

"خدائے تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور یہ طور اپنے افضال کے باپ کے حسنات اولاد کی طرف منتقل کرتا رہتا ہے۔" (جیوش انسائیکلوپیڈیا۔ جلد ۱۲ ص ۴۴۷)۔

توریت مروجہ میں ایک آیت اس مضمون کی ملتی ہے:۔

"میں خداوند تیرا خدا غیور خدا ہوں، جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی

وَقَالُوۡا کُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰی تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ

اور (یہ لوگ) کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو راہ یاب ہو جاؤ گے ۴۸۴ آپ کہہ دیجئے ۴۸۵ کہ نہیں بلکہ (ہم نے تو) ابراہیمؑ یکسو راہ والے کا مذہب پالیا ۴۸۶

پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں، لیتا ہوں۔" (استثناء ۵ : ۹)

بس تنکے کی اوٹ پہاڑ، یہ کھڑا کر لیا گیا کہ ہر نسل کو انتقال ثواب اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی یعنی اسلاف واخلاف دونوں کی طرف سے ہوتا رہے گا، اور پھر اولاد ابراہیم کو تو کوئی ڈر ہی نہیں:۔

"بعض کو ثواب اپنے اسلاف کے اعمال کا ملے گا، اور بعض کو ثواب اپنے اخلاف کے اعمال کا۔"

(جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۶ صفحہ ۶)

"افراد یہود کی امیدیں سب اسلاف کے تقدس پر قائم ہو گئی تھیں (یعنی اس پر کہ) ہم ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۱۳ طبع یازدہم صفحہ ۱۸۴)

مفسرین نے بھی آیت سے یہی مطلب لیا ہے کہ گمراہ قوموں خصوصاً یہود کی آباء پرستی پر ضرب لگائی جا رہی اور شخصی وانفرادی مسئولیت کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

یعنی یسئل کل عن عمله لا عن غیره (معالم) ای ان السلف الماضین من آباءکم من الانبیاء ولا ینفعکم انتسابکم الیهم اذا لم تفعلوا خیرا یعود نفعه علیکم (ابن کثیر)

آیت سے ان لوگوں کی بھی تردید نکل آئی ہے جنھوں نے مشرکین کے بچوں کو ان کے والدین کے جرم کی پاداش پر معذب ہونا مانا ہے۔

یدل علی ثلث معان احدها ان الابناء لا یثابون علی طاعة الآباء ولا یعذبون علی ذنوبهم وفیه ابطال مذهب من یجوز تعذیب اولاد المشرکین بذنوب الآباء ویبطل مذهب من یزعم من الیهود ان الله تعالٰی یغفر لهم ذنوبهم بصلاح آباءهم (جصاص)

۴۸۴ قرآن مجید کی صاف اور سیدھی تعلیمات اور اس کے واضح دلائل کو سن کر چاہیئے تو یہ تھا کہ اہل کتاب ان سے متاثر ہوتے اور قبول حق پر آمادہ ہو جاتے لیکن بجائے اس کے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر الٹی مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا دین قبول کر لو تو تمھیں دنیا کی فلاح اور آخرت میں نجات حاصل ہو جائے

۴۸۵ (ساری امتِ اسلامیہ کی طرف سے ان لوگوں کے جواب میں، اے ہمارے پیغمبر)

۴۸۶ (اس کی اصلی اور غیر محرف شکل میں)

مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ۔ یہود اور نصاریٰ دونوں، نومسلموں اور نیم مسلموں کو اپنی اپنی طرف کھینچتے تھے کہ "فلاح ونجات منظور ہو تو ہمارے مذہب میں آؤ، اس نئے مذہب میں کیا رکھا ہے؟" مسلمانوں کو تعلیم اس جواب کی مل رہی ہے کہ "تمھارے ہاں کیا رکھا ہے بجز تحریفات کے؟ رہا ہمارا دین تو وہ نو پیدا ذرا بھی نہیں وہ تو بس قدیم دین توحید ابراہیم علیہ السلام کا ہے اور ہم اسی کی اصلی اور غیر محرف شکل پر قائم ہیں"۔

حَنِيۡفًا۔ ترکیب میں حال واقع ہوا ہے مضاف الیہ ابراہیم کا، اکثر اکابر تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

اور وہ مشرکین میں کے نہ تھے ۴۸۷ کہہ دو کہ ہم تو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس پر

اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

جو ہم پر اتارا گیا ۴۸۸ اور جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ

(یعقوبؑ) پر اتارا گیا ۴۸۹ اور جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ کو دیا گیا اور اس پر جو دوسرے انبیاء کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا

حال من المضاف الیہ (کشاف) ھو حال من المضاف الیہ (ابو سعود)

دوسرا قول یہ ہے کہ حَنِیْفًا صفت ابراہیمؑ کی نہیں بلکہ ملّۃ کی ہے اور حال مضاف الیہ کا نہیں بلکہ مضاف کا واقع ہوا ہے۔

وھو حال من المضاف بتاویل الدین او تشبیھا لہ بفعیل بمعنی مفعول (روح)

اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا۔ "ہم نے پا لیا ہے مذہب ابراہیمؑ کا جو سیدھی راہ ہے"۔

خود حنیف کے معنی لغت میں دو آئے ہیں، ایک مستقیم اور محمد بن کعب قرظی سے یہاں یہی مروی ہے۔

الحنیف ھو المستقیم...... قالوا فکل من اسلم للہ ولم ینحرف عنہ فی شیٔ فھو حنیف وھو مروی عن محمد بن کعب القرظی (کبیر) فاما الحنیف فانہ المستقیم من کل شیٔ (ابن جریر)

اور دوسرے معنی جھکے ہونے یا مائل کے ہیں اور اس مفہوم میں مراد یہ ہوگی کہ دین حق کی طرف جھکے ہوتے تھے۔

الحنیف المائل فالمعنی ان ابراھیم حنف الی دین اللہ ای مال الیہ (کبیر) الحنف ھو میل عن الضلال الی الاستقامۃ والحنیف ھو المائل الی ذلک (راغب)

۴۸۷ یہ تعریض ہے اہل کتاب پر کہ تم کس منہ سے اپنے کو دین ابراہیمؑ کی جانب منسوب کرتے ہو، وہ تو شرک کے قریب ہو کر بھی نہیں گزرے تھے، ابراہیم علیہ السلام کی توحید خالص پر یہود، نصاریٰ سب ہی متفق تھے، مگر عملاً ان کی روش چھوڑے ہوئے تھے، بلکہ مسیحی تو صریح شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔

۴۸۸ (اللہ کے ہاں سے ہمارے پیمبر کے واسطے سے)

خطاب عام مسلمانوں سے ہے، یعنی ہمیں تو نسلی یا قومی تعصب کسی سے بھی نہیں، ہمارا رشتہ اسمٰعیلی، اسرائیلی، ہر شریعت الٰہی سے بس اعتقاد و انقیاد ہی کا ہے۔

۴۸۹ (اللہ کے ہاں سے)

الْاَسْبَاط جمع ہے سبط کی، اور معنی ہیں اولاد کی اولاد (یا پوتے اور نواسے)۔

الاسباط اولاد الاولاد وقیل اولاد البنات (تاج) السبط ولد الولد کانہ امتداد الفروع...

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۱۳۶)

اور ہم ان میں سے کسی کے درمیان بھی فرق نہیں کرتے ۴۹۱ اور ہم اللہ ہی کے حکم بردار ہیں ۴۹۲

والاسباط ای قبائل کل قبیلۃ من نسل رجل (راغب)

اختلاف اس میں ہوا ہے کہ آیا یہ مخصوص ہے پوتوں یا نواسوں کے لئے لیکن قول فیصل یہ ہے کہ پوتوں اور نواسوں دونوں کے لئے عام ہے۔

کلام الائمۃ صریح فی انہ یشمل ولد الابن او الابنۃ کما صرح بہ ابن سیدۃ (تاج)

جس طرح بنی اسمٰعیل کی شاخیں قبائل میں تقسیم ہوگئیں اسی طرح بنی اسرائیل کی شاخیں اسباط کہلائیں اور اس طرح یہ لفظ اسرائیلی شاخوں کے لئے مخصوص ہوگیا۔

قال الازھری الاسباط فی بنی اسحٰق بمنزلۃ القبائل فی بنی اسمٰعیل (تاج) فی بنی اسحٰق ویعقوب کالقبائل فی بنی اسمٰعیل .... انما سموا ھولاء بالاسباط وھولاء بالقبائل لیفصل بین ولد اسمٰعیل وولد اسحٰق (سجستانی)

نسل اسرائیل میں نبوت بہت وسیع پیمانہ پر پھیلی رہی، فقرہ کا مطلب یہ ہوا کہ ہم مسلمان کسی پیمبر کے بھی منکر نہیں۔

وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔ یہ دونام اس سیاق اور اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل توجہ ہیں، اسمٰعیل علیہ السلام کا نام لانا تو اس لئے ضروری تھا کہ اہل کتاب انھیں سے تعلق رکھتے تھے، بغیر ان کا نام لائے اسلام کے دعویٰ کا اثبات ہی نہیں ہوسکتا تھا لیکن اسحٰق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کے نام لانا خود ایک دلیل روشن ہے اسلام کے طریق عدل اور بے تعصبی کی، قرآن اگر بشری کلام ہوتا تو بشری فطرت تو یہ تھی کہ اہل کتاب کے شدید اور مسلسل اشتعال انگیز تعصب کے جواب میں اسمٰعیلؑ کی نصرت وحمایت میں اسحاقؑ ویعقوبؑ کے نام ہی نظر انداز کردیئے جاتے۔ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ تینوں کی تاریخی شخصیتوں پر حاشیے اوپر گزر چکے۔

۴۹۰ (کلام الٰہی یا کتاب آسمانی میں سے)

مُوْسٰی۔ آپ کی تاریخی شخصیت پر حاشیہ گزر چکا۔

عِیْسٰی۔ ابن مریم، بجائے والد کے اپنی والدہ کی جانب منسوب ہیں بنی اسرائیل کے آخری اور مشہور نبی ہوئے ہیں آپ پر سلسلہ اسرائیلی رسالت کا، بلکہ قومی ونسلی رسالت کا، ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا، ولادت صوبۂ یہودیہ (ملک شام) کے قصبہ بیت اللحم میں یا بیت المقدس میں حاکم شام ہیرود کے زمانہ میں ہوئی، شام اس وقت روم کی شہنشاہی کا ایک نیم آزاد علاقہ تھا، سال ولادت اغلباً ۴ سنہ ق م ہے یہ بات سننے میں بہت ہی عجیب معلوم ہوگی لیکن اس پر اتنی حیرت نہ کیجئے سنہ عیسوی جو اس وقت رائج ہے خود اسی تقویم کے قائم کرنے میں شروع ہی سے غلطی رہ گئی اور اس کا پتہ بعد کو چلا، چنانچہ سنہ عیسوی کا پہلا سال آپ کا سال ولادت نہیں آپ کی ولادت کے چوتھے سال سے یہ سنہ جاری ہوا ہے آپ کی عمر غالباً تینتیس ۳۳ سال کی تھی اور ۳۰ سنہ عیسوی تھا کہ اسرائیلیوں نے آپ کی تعلیم وتبلیغ سے نہایت درجہ آزردہ ہو کر آپ پر مقدمہ پہلے تو اپنی آزاد وخود مختار مذہبی عدالت میں چلایا، اور پھر سرکاری قانون کا بھی مجرم بنا کر رومیوں کی ملکی عدالت میں پیش کیا، وہاں سے سزائے موت (بذریعہ صلیب) کا حکم صادر ہوا، اس کے بعد

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ

تو اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان رکھتے ہو تو بیشک وہ راہ پا گئے ۴۹۳ اور اگر وہ منھ موڑے رہیں تو

فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾

بس وہ (بڑی) مخالفت میں پڑے ہیں ۴۹۴ سو اب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں بس ہے ۴۹۵۔ اور وہ (بڑا) سننے والا (بڑا) جاننے والا ہے ۴۹۶

کیا گزری، اس کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ کے تحت میں انشاء اللہ آئے گا۔

۴۹۱ (کہ ان میں سے کسی کو نبی مرسل مانیں کسی کو نہ مانیں)

اسلام کے ایک جدید و نو پیدا مذہب ہونے کی یہ تردید ایک بار پھر کی جا رہی ہے، عالمگیر مذہب آج ہر شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ آیا وہ ہو سکتا ہے جو ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل ہر زمانہ کے پیغمبروں اور سچے ہادیوں کی علانیہ اور پُر زور تصدیق کر رہا ہے، یا وہ مذہب ہو سکتے ہیں، جو آسمانی ہدایت کو فلاں ملک، فلاں قوم، فلاں نسل کے ساتھ مخصوص و مقید کئے ہوئے ہیں؟

بَيْنَ اَحَدٍ۔ احد یہاں جماعۃ کے معنی میں ہے، اور اس لئے اس پر بَیْنَ کا لانا درست ہے۔

واحد فی معنی الجماعۃ ولذا صحّ دخول بین علیہ (مدارک) قد ارید بہ ھنا الجماعۃ ولھذا ساغ ان یضاف الیہ بین ویفید عموم الجماعات کذا قال بعض المحققین (روح) وھو للعموم (بحر) احد ھھنا ھو المستعمل فی النفی لان بین لا یضاف الا الی جمع او الی واحد معطوف علیہ وقیل احد ھنا بمعنی الفریق (عکبری)

۴۹۲ (وہ ہم کو جس کی بھی اطاعت کا حکم دے گا ہم اس کے پیرو ہو جائیں گے، ہمیں کسی سے نہ تعصب نہ عناد ہم تو بس امر الٰہی کے فرمانبردار ہیں)

اسلامی تعلیمات کا عطر بلکہ لُبّ لُباب بس یہی مسئلۂ توحید ہے۔

۴۹۳ (اور اپنے ایمان کی بنا پر نجات کے مستحق ہو گئے)

خطاب مسلمانوں سے ہے اور "یہ لوگ" سے مراد وہی منکرو کافر اہل کتاب ہیں، جن کا سلسلہ اوپر سے چلا آ رہا ہے اس میں بشارت ہے کہ اتنی ضد و عناد کے باوجود اگر اب بھی وہ ایمان لے آئیں تو ان کا پچھلا کفر و عناد ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا

فَاِنْ اٰمَنُوْا میں ف سے اشارہ اس طرف ہے کہ اب جب کہ تعلیم اسلامی کا مغز ان پر پوری طرح واضح ہو چکا۔

بِمِثْلِ۔ ب مؤکدہ ہے اور مثل بطور صلۂ کلام ہے۔

قیل ان الباء زائدۃ مؤکدۃ ومثل زائدۃ کما فی قولہ تعالٰی لیس کمثلہ شیء ای لیس کھو شیء (قرطبی) اما زائدۃ للتاکید (روح)۔

تقدیر کلام یوں بھی سمجھی گئی ہے ایمانا مثل ایمانکم (عکبری)

بِهٖ ضمیر اللہ کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے اور قرآن اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (۱۳۸)

(ہمارے اوپر) اللہ کا رنگ ہے ۴۹۷ اور اللہ سے بہتر کون رنگ (دینے والا) ہے ۴۹۸ ہم تو اسی کی بندگی کرنے والے ہیں ۴۹۹

والهاء ترجع الى الله او القرآن او محمد (عکبری)

۴۹۴ (حق وراہِ راست سے)

یعنی اتنی واضح ہدایت پہنچ جانے کے بعد اگر اب بھی ایمان نہ لائیں تو اب جو انہیں مخالفت ہے وہ مخالفت ہی کی غرض سے ضد اور عداوت ہی کی بنا پر ہے' اس لئے نہیں کہ وضوحِ حق میں کوئی خفا یا ابہام باقی رہ گیا ہے' اب جو وہ دین کو نہیں سمجھتے تو محض اس لئے کہ سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

علمنا انه ليس غرضهم طلب الدين والانقياد للحق وانما غرضهم المنازعة واظهار العداوة (کبیر) اى فما هم الا فى خلاف وعداوة وليسوا من طلب الحق فى شئ (مدارک)

۴۹۵ پیمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تسکین اور تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ہجوم اعداء اور قوت وکثرت مخالفین سے ذرا بھی تشویش وفکر نہ کریں' یہ حق کے معاندین آپ کو اور آپ کے دین کو گزند پہنچانے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اب اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ آیت میں بڑا سبق صبر وتسکین کا امت کے لئے ہجوم اعداء ومخالفین کے وقت ہے۔

۴۹۶ اس پر ہر مخالفت جلی وخفی روشن ہے۔

السمیع۔ سننے والا ان کے الفاظ واقوال' اُن کے حرف وعبارت کا یعنی جو کچھ ان کی زبانوں پر ہے ان کی گفتگوئیں اور تقریریں سب اللہ پر روشن ہیں۔

سَمِیْع' فَعِیْل کے وزن پر صیغۂ مبالغہ ہے اور اَلسَّمِیْع وہ ہے جو بڑا ہی سننے والا ہے اور ہر خفی سے خفی آواز کو بغیر اس کے کہ اس کے پاس سننے کا عضو یعنی کان موجود ہو۔

السميع الذى لا يعزب عن ادراكه مسموع وان خفى فهو يسمع بغير جارحة وفعيل من ابنية المبالغة (نہایہ)

العَلِیْم۔ جاننے والا ان کے دلوں کے احوال واسرار کا یعنی ان کے ظاہر کی طرح ان کا باطن بھی اس عالم کُل پر روشن ہے اور ان کی اندرونی کارروائیاں اور سازشیں سب اس کے سامنے بے نقاب موجود ہیں۔

عَلِیْم بروزن فعیل صیغۂ مبالغہ ہے۔

العليم هو العالم المحيط علمه بجميع الاشياء ظاهرها وباطنها ودقيقها وجليلها على اتم الامكان وفعيل من ابنية المبالغة (نہایہ)

۴۹۷ یعنی اس کے دین کا رنگ' دینِ فطرت کا رنگ جو اہلِ حق میں اس طرح جذب وپیوست ہو گیا جیسے کپڑے میں رنگ جذب وپیوست ہو جاتا ہے۔

يعنى تعالىٰ ذكره بالصبغة صبغة الاسلام (ابن جریر) اى دين الله قاله ابن عباس وسمى صبغة لظهور اثر الدين على صاحبه كظهور اثر الصبغ على الثوب ولانه يلزمه ولا يفارقه (بحر) قال الضحاك وعن ابن عباس دين الله وكذا روى عن مجاهد وابى العالية وعكرمة وابراهيم والحسن

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ

آپ کہیے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے باب میں حجت کیے جاتے ہو ۵۰۰ درانحالیکہ وہ ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی

اَعْمَالُکُمْ ۚ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ

پروردگار ہے ۵۰۱ اور ہمارے عمل ہمارے لئے ہیں اور تمہارے عمل تمہارے لئے ہیں اور ہم تو اسی کے لئے خالص ہیں ۵۰۲

وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ

کیا تم (یہ) کہتے ہو کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولاد (یعقوبؑ) یہودی یا نصرانی تھے ۵۰۳

وقتادہ والضحاک وعبد اللّٰہ بن کثیر وعطیۃ العوفی والربیع بن انس والسدی نحو ذلک (ابن کثیر)

تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔ صبغنا اللّٰہ صبغۃ (بیضاوی) صبغنا اللّٰہ بالایمان صبغۃ (مدارک)

یعنی ہمیں اللہ نے (اپنے) رنگ میں رنگ دیا ہے۔

روئے سخن اوپر سے یہود و نصاریٰ کی طرف چلا آرہا ہے' ان دونوں کے ہاں بڑی اہمیت ایک خاص قسم کے رسمی تطہیری غسل کی تھی جسے بپتسمہ یا اصطباغ کہا جاتا تھا، انھیں کی اصطلاح میں ارشاد ہو رہا ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے' لازم پکڑنے کی چیز تو توحید ہے۔

یعنی الزموا دین اللّٰہ (معالم)

۴۹۸ (جس کا دین ایمان کے رنگ کو نکھار دیتا ہے' اور کفر و ضلالت کی نجاستوں کو دور کر دیتا ہے)

فالمراد انہ یصبغ عبادہ بالایمان ویطھرھم بہ من اوساخ الکفر فلا صبغۃ احسن من صبغتہ (کشاف، کبیر)

۴۹۹ (اور سارے عقائدِ باطل، شعائرِ باطل، معبودانِ باطل کے منکر ہیں)

نحن۔ ہم یعنی مسلمان یا امتِ مسلمہ۔

۵۰۰ خطاب اگرچہ سارے اہلِ باطل کے لئے عام ہے لیکن سیاق میں خاص طور پر مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔

ذکروا فیہ وجوھا احدھا انہ خطاب للیھود والنصاریٰ وھو الیق بنظم الآیۃ (کبیر)

فی اللّٰہ۔ یعنی اللہ کے دین کے باب میں۔

ای فی دین اللّٰہ والقرب منہ (قرطبی)

۵۰۱ (تو کم از کم اس کی ذات و صفات کے باب میں تو تمھیں کوئی مغالطہ یا غلط فہمی نہ رہنا چاہیے)

یعنی اے اہلِ کتاب جب ہمارے تمھارے درمیان کوئی اختلاف پروردگار کے تعین میں نہیں تو اول تو اس کی توحید پر قائم رہنا چاہئے اور تثلیث فی التوحید یا توحید فی التثلیث اور خدا کے فرزند عزیر و مظہر وغیرہ قسم کے خرافات سے بالکل بچنا چاہئے دوسرے جب اس کی صفاتِ کمالیہ پر ایمان ہے تو وہ اپنی حکمت و ربوبیت کے تقاضے سے جس نسل کے جس فرد کو بھی چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز کر دے وہ ہر طرح مالک و مختار ہے' اسرائیلی، غیر اسرائیلی کسی خاص نسل کا اجارہ نہیں۔

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ

آپ کہیے تم واقف تر ہو ۵۰۴ یا اللہ ۵۰۵ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اس شہادت کو چھپائے

مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

جو اس کے پاس اللہ کے ہاں سے پہنچ چکی ہے ۵۰۶ اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر تو ہے نہیں ۵۰۷

۵۰۲ (اپنے عقائد اور اپنی عبادات میں ہر شرک، ہر ضلالت سے پاک صاف ہو کر)
برے اعمال تو ہمارے اور اپنے اعمال کے فرق کا اثر آخرت میں تو تمہیں بھی نظر آجائے گا، آج جتنا چاہو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر لو۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ میں تعریض ہے مخاطبین (یہود و نصاریٰ) پر کہ ہم تمہاری طرح نہیں، جو خدائے واحد کے کلام میں غیر اللہ کی اور اس کی عبادت میں شرک کی آمیزش کر دیتے تھے۔

فیه تعریض للیھود والنصاریٰ بالشرك الذی ھم علیه (نہر)

۵۰۳ یعنی کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ان پیغمبروں، بزرگوں اور تمہارے مورثوں کے عقائد ذات و صفاتِ باری کے باب میں بجائے دینِ توحید و اسلام کے، یہودیت و نصرانیت کے تھے۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ۔ خطاب اہلِ کتاب خصوصاً یہود سے ہے، اور لہجۂ خطاب میں زجر کا پہلو شامل ہے۔

صیغة استفھام ومعناہ التوبیخ (معالم) اورد الله ھذا الکلام فی معرض الاستفھام علی سبیل الانکار والغرض منه الزجر والتوبیخ (کبیر)

جتنے اسماء و اعلام یہاں آئے ہیں، ان سب پر حاشیے آیت ۱۳۶ کے ذیل میں اور اس کے قبل گزر چکے۔

۵۰۴ (ان حضرات کے دین و عقائد کے باب میں)
یہ مخاطبین پر بہ طور طنز و تعریض کے ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم سے کسی بندہ کا بھی کیا مقابلہ ہے؟ چہ جائیکہ منکرو کافر بندوں کے علم کا۔

ذلك علی سبیل التھکم بھم والاستھزاء (بحر)

۵۰۵ (اور اللہ کی شہادت یہ ہے کہ یہ سب توحید خالص کے پیرو تھے)
نزول قرآن کے وقت یہود میں بڑے بڑے عالم و فاضل موجود تھے، ان سب کو چیلنج دے کر ایک اُمّی کی زبان سے کہلایا جا رہا ہے کہ تم واقعات کو توڑ مروڑ کر، صداقتوں کا گلا گھونٹ کر جو کچھ بھی کہے جاؤ، واقعہ و حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حضرات خالص موحد اور توحید کے مبلغ ہوئے ہیں، آج یورپ کے بڑے بڑے ماہرینِ تاریخ اور محققینِ اثریات جو کچھ ان حضرات کے دین کی بابت کہہ رہے ہیں وہ اسی قرآنی متن کی شرح اور اسی اُمّی کے لائے ہوئے کلام کے اجمال کی تفصیل ہے۔

۵۰۶ (اور وہ شہادت ہے دین اسلام کے برحق ہونے کی، ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ و یعقوبؑ کے مومن کامل اور مبلغِ توحید ہونے کی، اور آخر زمانہ میں ایک رسول برحق کے ظہور کی)

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا

یہ ایک جماعت ہے جو گزر چکی ۵۰۸ ان کا کیا ہوا ان کے آگے آئے گا اور تمہارا کیا ہوا تمہارے آگے آئے گا ۵۰۹

تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

اور جو کچھ وہ کرتے رہے اس کی پوچھ گچھ تم سے نہ ہوگی ۵۱۰

اس شہادت کو چھپانے والے ظاہر ہے کہ اہلِ کتاب خصوصاً یہود کے علماء تھے اور یہ شہادت محفوظ تھی ان کی مسلّم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں۔

شهادة فی کتمانهم امر محمد صلی الله علیه وسلم ونبوته (ابن جریر) وهی شهادة الله لابراهیم بالحنفیة (مدارك) وفیه تعریض بکتمانهم شهادة الله لمحمد علیه السلام بالنبوة فی کتبهم وسائر شهاداته (مدارك)

۵۰۷ (اور وہ وقت آنے پر انھیں کے مطابق تم سے معاملہ کرے گا) مطمئن اور بے فکر نہ ہو جاؤ، وہاں رتّی رتّی کی خبر ہے اور ویسا ہی معاملہ پیش آئے گا، وہاں بزرگوں کے ساتھ نسبی و نسلی انتساب ہرگز کام نہ دے گا، منکروں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے اس سے بہتر اور مؤثر کوئی ذریعہ نہیں کہ اللہ کے عالم الغیب ہونے کا استحضار ذہن کے سامنے بار بار ہوتا رہے، اور قرآن مجید یہی کرتا رہتا ہے۔

۵۰۸ (اور محض ان کے نام کا انتساب بغیر اُن کے سے اعمال و عقائد کے ہرگز کافی نہیں۔) تِلْكَ اُمَّةٌ سے مراد ہیں قوم اسرائیل کے اکابرِ سلف خصوصاً اجدادِ ثلثہ ابراہیمؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ جن کی اولاد ہونے پر اسرائیلیوں کو حدودِ جائز سے زیادہ ناز تھا، نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۴۸۳۔

۵۰۹ (آخرت میں) یعنی نہ ان کے ایمان و اعمالِ صالحہ سے تمھیں کچھ نفع پہنچے گا اور نہ تمھارے کفر و اعمالِ سیئہ سے انھیں کوئی ضرر ہوگا

۵۱۰ یہود کی کتابوں میں آج تک یہ تعلیمات موجود ہیں کہ "جس طرح انگور کی زندہ و شاداب بیل ایک بے جان ستون کے سہارے بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے اسی طرح زندہ یہودی اپنے آنجہانی اور مرحوم مُورثوں اور بزرگوں کے بل بوتے پر پروان چڑھتا رہتا ہے اور تینوں اجدادِ اسرائیل نیز دوسرے صالحین و اخیار نے اعمالِ صالحہ کا جو انبارِ عظیم لگا دیا ہے اسی سے ان کی اولاد کو مجموعاً و منفرداً برابر حصّہ ملتا رہتا ہے، اور اس طرح کسی فرد میں خواہ کتنی ہی کمزوریاں ہوں اس کی نجات یقینی ہے" قرآن حکیم اس "نجاتِ متوارث" کے عقیدہ پر برابر ضرب شدید لگاتا جاتا ہے، نیز ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۴۸۴۔

یہ آیت ابھی پہلے ہی گزر چکی تھی، مکرّر تاکید کی غرض سے لائی گئی۔

کرّرت للتاکید (مدارك) کرّرها لانها تضمّنت معنی التهدید والتخویف (قرطبی) تکریر للمبالغة فی التحدید والزجر عمّا استحکم فی الطباع من الافتخار بالآباء والاتکال علیهم (بیضاوی)

## سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي

اب بیوقوف لوگ (ضرور) کہیں گے ٥١١ کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اُن کے (اس) قبلہ سے جس پر وہ اب تک

**٥١١** (بہ طور استفہام و استفسار نہیں، بلکہ بہ طور طنز و تعریض)

اِسْتِفْهَامٌ عَلٰى جِهَةِ الْاِسْتِهْزَاءِ وَالتَّعَجُّبِ (کبیر)

سَيَقُولُ. س، ہو سکتا ہے کہ مستقبل کے لئے ہو، اور اس کے معنی عنقریب کے ہوں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مطلق تاکید کے لئے ہو اور معنی صیغۂ ماضی کے دے، اور چونکہ آیت کا نزول، ایک قول کے مطابق حکم تحویل قبلہ سے قبل نہیں اس کے بعد ہوا ہے، اس لئے مُفسرین کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ یہاں ماضی مراد ہے اور اردو محاورہ میں اس کی مثال ایسی ہو گی جیسے کسی گزرے ہوئے واقعہ سے متعلق کہا جائے کہ ہم تو جانتے ہی تھے کہ یہ لوگ ضرور اس پر اعتراض کریں گے

قَالَ الْقَفَّالُ اَنَّ الْاٰيَةَ نَزَلَتْ بَعْدَ تَحْوِيْلِ الْقِبْلَةِ وَاَنَّ لَفْظَ سَيَقُوْلُ مُرَادٌ مِنْهُ الْمَاضِيْ (روح)

قِيْلَ اَنَّ سَيَقُوْلُ بِمَعْنٰى قَالَ. (فتح)

اور اسی سے ملتا ہوا یہ قول بھی ہے کہ صیغۂ ماضی یہاں اُس اعتراض کے استمرار کو ظاہر کرنے کو لایا گیا ہے یعنی یہ لوگ برابر اس طرح کہتے رہیں گے۔

اِنَّمَا عَبَّرَ عَنِ الْمَاضِيْ بِلَفْظِ الْمُسْتَقْبِلِ لِلدَّلَالَةِ عَلَى الْاِسْتِدَامَةِ وَالْاِسْتِمْرَارِ عَلَيْهِ (فتح) سَيَقُوْلُ بِمَعْنٰى قَالَ جَعَلَ الْمُسْتَقْبَلَ مَوْضَعَ الْمَاضِيْ دَلَالَةً عَلٰى اِسْتِدَامَةِ ذٰلِكَ وَاَنَّهُمْ يَسْتَمِرُّوْنَ عَلٰى ذٰلِكَ الْقَوْلِ (قرطبی) وَسَيَقُوْلُ ظَاهِرٌ مِنَ الْاِسْتِقْبَالِ (بحر)

اس صورت میں بالکل درست ہو گا اگر آیت کو ایک سچی پیشین گوئی یا اخبار بالغیب کی مثال میں بھی پیش کیا جائے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى اَخْبَرَ عَنْهُمْ قَبْلَ اَنْ ذَكَرُوْا هٰذَا الْكَلَامَ اَنَّهُمْ سَيَذْكُرُوْنَهٗ (کبیر) وَاَنَّهٗ اِخْبَارٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰى لِنَبِيِّهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ يَصْدُرُ مِنْهُمْ هٰذَا الْقَوْلُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ (بحر) اِخْبَارُ اللّٰهِ نَبِيَّهٗ وَالْمُؤْمِنِيْنَ بِهٖ قَبْلَ وُقُوْعِهٖ (المنار)

انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی قیام مکہ کے زمانہ میں اسی قبلۂ قدیم کے رُخ پر نماز جاری رکھی، بلکہ جب مدینہ ہجرت فرمائی جب بھی اُسی قبلہ کو برقرار رکھا، بیت المقدس مدینہ سے سمت شمال میں واقع ہے آپ کا دل بار بار یہ چاہتا تھا کہ اپنے جد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے خانۂ کعبہ کو قبلہ بنائیں لیکن حکم الٰہی اب تک یہ نہیں ہوا تھا آخر ورود مدینہ کے سولہ مہینہ بعد تحویل قبلہ کا حکم ملا کہ اب نماز بجائے بیت المقدس کے خانۂ کعبہ کی طرف منھ کر کے پڑھی جائے حکم کی تعمیل معاً ہوئی، خانۂ کعبہ مکہ میں مدینہ سے ٹھیک جنوب میں واقع ہے اور اس طرح مدینہ کے نمازیوں کے رُخ دفعۃً شمال سے جنوب کی جانب پھر گئے۔

بیت المقدس یہود کا قبلہ تھا۔ اس کی منسوخی کا اعلان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہود کو بہت ہی ناگوار گزرا، وہ یوں بھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا دشمن اور اپنے دین کا بیخ کن سمجھنے لگے تھے تحویل قبلہ کے اس تازہ اعلان کو وہ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی سمجھے اور اس پر طرح طرح کے اعتراضات وارد کرنے لگے ان کے ہمنوا

# كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ

تھے ۵۱۲ ہٹا دیا۔ آپ کہہ دیجئے ۵۱۳ کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی ملک ہیں ۵۱۴ وہ جسے چاہے ۵۱۵

کچھ اور لوگ بھی منافقوں اور بددینوں میں سے ہو گئے۔

السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ سے یہی لوگ مراد ہیں سُفَهَاءُ جمع ہے سَفِيهٌ کی اور سَفِيهٌ کے معنی کم عقل یا بدعقل کے ہیں۔

السَّفِيهُ خَفِيفُ الْعَقْلِ (تاج) وَاسْتُعْمِلَ فِي خِفَّةِ النَّفْسِ لِنُقْصَانِ الْعَقْلِ (راغب)

یہاں سفاہت کا اطلاق احکام الٰہی میں قیل وقال کرنے والوں کے حق میں ہے۔

السُّفَهَاءُ سے مراد یہود کا ہونا صحیح بخاری میں موجود ہے۔

السُّفَهَاءُ هُمُ الْيَهُودُ۔ (بخاری کتاب التفسیر عن البراء)

مفسرین اکثر اسی طرف گئے ہیں۔

وَالْمُرَادُ بِالسُّفَهَاءِ هُنَا الْيَهُودُ الَّذِينَ بِالْمَدِينَةِ قَالَهُ مُجَاهِدٌ (قرطبی)

بعض روایتیں منافقین مدینہ سے متعلق بھی ملتی ہیں۔

نَزَلَتْ فِي الْمُنَافِقِينَ (ابن جریر۔ عن السدی)

راجح یہ ہے کہ آیت عام رکھی جائے تمام معترضین کے لئے۔

وَالْآيَةُ عَامَّةٌ فِي هٰؤُلَاءِ كُلِّهِمْ (ابن کثیر) يَدْخُلُ فِيهِ الْكُلُّ لِأَنَّ لَفْظَ السُّفَهَاءِ لَفْظُ عُمُومٍ (کبیر) الْأَقْرَبُ أَنْ يَكُونَ الْكُلُّ (کبیر) وَالْمُتَبَادِرُ فِيهِمْ مَا يَشْمَلُ سَائِرَ الْمُنْكِرِينَ لِتَغْيِيرِ الْقِبْلَةِ مِنَ الْمُنَافِقِينَ وَالْيَهُودِ وَالْمُشْرِكِينَ۔ (روح)

**۵۱۲** یعنی بیت المقدس سے۔

قِبْلَةٌ۔ وہ مکان ہے جس کے مقابل منھ کرکے نماز پڑھی جائے۔

صَارَ اسْمًا لِلْمَكَانِ الْمُقَابِلِ الْمُتَوَجَّهِ إِلَيْهِ لِلصَّلٰوةِ (راغب۔ روح)

یہ حکم سب سے زیادہ ناگوار یہودیوں کو گزرا، اب تک وہ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ مسلمان کم از کم اُن کے ہم قبلہ تو ہیں، اب یہ مسرت بھی اُن سے چھن گئی۔

آیت سے یہ حقیقت بھی صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نماز پہلے غیر کعبہ کی طرف پڑھی جاتی رہی، اور اس کے بعد سمت خانۂ کعبہ مقرر ہوئی۔

وَقَدْ نَصَّ اللّٰهُ فِي هٰذِهِ الْآيَاتِ عَلٰى أَنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ إِلٰى غَيْرِ الْكَعْبَةِ ثُمَّ حَوَّلَهَا إِلَيْهَا (جصاص)

فقہاء و مفسرین نے کتاب اللہ سے سنت کے نسخ کا مثال میں اس حکم کو بھی پیش کیا ہے۔ حضورؐ بیت المقدس کی طرف رُخ تو اپنے اجتہاد سے کئے ہوئے تھے، قرآن مجید میں اس کا کوئی حکم نہ تھا قرآن مجید نے تو اسے صرف منسوخ کیا ہے۔

هٰذِهِ الْآيَةُ يُحْتَجُّ بِهَا مَنْ يُجَوِّزُ نَسْخَ السُّنَّةِ بِالْقُرْاٰنِ لِأَنَّ النَّبِيَّ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يُصَلِّي إِلٰى بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَلَيْسَ فِي الْقُرْاٰنِ ذِكْرُ ذٰلِكَ ثُمَّ نُسِخَ بِهٰذِهِ الْآيَةِ (جصاص) وَدَلَّتْ عَلٰى

اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا

سیدھی راہ چلا دیتا ہے ۵۱۶ اور اسی طرح ہم نے تمہیں بنادیا ۵۱۷ ایک امت عادل ۵۱۸ تاکہ تم

جَوَازِ نَسْخِ السُّنَّۃِ بِالْقُرْاٰنِ وَذٰلِکَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ صَلّٰی نَحْوَ بَیْتِ الْمَقْدِسِ وَلَیْسَ فِیْ ذٰلِکَ قُرْاٰنٌ فَلَمْ یَکُنِ الْحُکْمُ اِلَّا مِنْ جِھَۃِ السُّنَّۃِ ثُمَّ نُسِخَ ذٰلِکَ بِالْقُرْاٰنِ (قرطبی)

۵۱۳ (اُن کے جواب میں، اے ہمارے پیغمبر)

۵۱۴ (اور کسی خاص سمت وجہت میں کوئی تقدس رکھا ہوا نہیں ہے اس کے لئے سب برابر ہیں وہ جدھر اور جس چیز کو بھی چاہے نماز کے لئے رُخ مقرر کردے سوال اصلاً یہ ہو ہی نہیں سکتا۔)

معترضین کا اعتراض تمام تر جہت پر تھا، اور افسوس ہے کہ مفسرین بھی اس بحث میں اُلجھ گئے ہیں قرآن مجید نفسِ اس اعتراض ہی کو ہٹاتا ہے، اور بار بار کہتا ہے کہ کسی جہت کی کیا خاص اہمیت ہے، جہت سب اللہ کے نزدیک ایک ہی ہیں۔

لِلّٰہِ میں لام ملکیت کا ہے، مشرق ومغرب سب اللہ کی مِلک ہیں، مخلوق ہیں اور دوسری مخلوق کی طرح تابع ومحکوم ہیں، یہ ضرب ہے مشرق پرستی، مغرب پرستی اور ہر قسم کی سمت پرستی پر، جو مختلف مشرک جاہلی قوموں کا مذہب رہی ہے، شرک کی اس خاص سمت پرستی، یا جہت پرستی پر حاشیہ اوپر گزر چکا، پارہ اول رکوع ۱۴، آیت ۱۱۵ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ کے تحت میں۔

۵۱۵ (اور اس کا چاہنا ہمیشہ قانون حکمت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔)

مَنْ یَّشَآءُ یعنی قانون مشیت کے ماتحت ومطابق، اور مشیت کے تحت میں سارے ہی مصالح تکوینی آگئے۔

۵۱۶ (اور اُسے بے چون وچرا، رسول یا وقت کے سب سے بڑے حکیم الٰہی وعالم ربانی کے اتباع کی توفیق دیتا ہے)

فقہاء مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ قرآن کا نزول تدریجاً ہوا ہے اور احکام مختلف حالات کے لحاظ سے بدلتے رہے ہیں۔

فِیْھَا دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الْقُرْاٰنَ کَانَ یَنْزِلُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ شَیْئًا بَعْدَ شَیْءٍ وَفِیْ حَالٍ بَعْدَ حَالٍ عَلٰی حَسَبِ الْحَاجَۃِ اِلَیْہِ حَتّٰی اَکْمَلَ اللّٰہُ دِیْنَہٗ (قرطبی)

۵۱۷ (اے مسلمانو!)

وَکَذٰلِکَ۔ اسی طرح یعنی ایک اسی مسئلہ پر موقوف نہیں، ہر معاملہ میں۔

۵۱۸ یعنی ایسی امت جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے غایت اعتدال پر ہو، ہر کجی اور ہر افراط وتفریط سے پاک اُردو محاورہ کے مطابق متوازن۔

وَسَطًا عربی زبان میں یہ لفظ خاص مدح کے لئے آتا ہے۔

وَاَمَّا الْوَسَطُ فَاِنَّہٗ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ الْخِیَارُ (ابن جریر) اُسْتُعِیْرَ لِلْخِصَالِ الْمَحْمُوْدَۃِ لِوُقُوْعِھَا بَیْنَ طَرَفَیْ اِفْرَاطٍ وَتَفْرِیْطٍ۔ (بیضاوی)

# شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ

گواہ رہو لوگوں پر ۵۱۹ اور رسول

معنوی اعتبار سے لفظ کہنا چاہیے کہ تمام خصالِ محمودہ کا جامع ہے یعنی ایسی اُمت جو ساری روحانی واخلاقی قدروں کی حامل ہو۔

حدیث نبوی میں وسط کی تفسیر عدل سے آئی ہے۔

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُمَّۃً وَّسَطًا قَالَ عَدْلًا (ابن کثیر عن احمد)

اور عدل کا لفظ عربی میں خود بڑا وسیع اور جامع ہے اور ائمۂ لغت سے یہی معنی منقول ہیں۔

قَالَ الْجَوْھَرِیُّ فِی الصِّحَاحِ اُمَّۃً وَّسَطًا اَیْ عَدْلًا وَھُوَ الَّذِیْ قَالَہُ الْاَخْفَشُ وَالْخَلِیْلُ وَقُطْرُبُ۔ (کبیر)

آیت سے یہ فقہی استنباط بھی کیا گیا ہے کہ اجماعِ اُمت خود ایک حجت ہے۔

اِحْتَجَّ جَمْھُوْرُ الْاَصْحَابِ وَجَمْھُوْرُ الْمُعْتَزِلَۃِ بِھٰذِہِ الْاٰیَۃِ عَلٰی اَنَّ اِجْمَاعَ الْاُمَّۃِ حُجَّۃٌ (کبیر) وَفِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی صِحَّۃِ الْاِجْمَاعِ وَوُجُوْبِ الْحُکْمِ بِہٖ (قرطبی) وَاسْتَدَلَّ الشَّیْخُ اَبُوْ مَنْصُوْرٍ رَحِمَہُ اللّٰہُ بِالْاٰیَۃِ عَلٰی اَنَّ الْاِجْمَاعَ حُجَّۃٌ لِاَنَّ اللّٰہَ وَصَفَ ھٰذِہِ الْاُمَّۃَ بِالْعَدَالَۃِ وَالْعَدْلُ ھُوَ الْمُسْتَحِقُّ لِلشَّھَادَۃِ وَقُبُوْلِھَا فَاِذَا اجْتَمَعُوْا عَلٰی شَیْءٍ وَّشَھِدُوْا بِہٖ لَزِمَ قُبُوْلُہٗ (مدارک)

آیت سے استدلال کیا گیا ہے اُمتِ محمدی کے خیر وعادل ہونے پر لیکن پھر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ وصف تو عارضی ہے اور اپنے وجود کے لئے ہر فرد میں مستقل ثبوت کا محتاج ہوگا۔

قَالُوْا فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ دَلَالَۃٌ عَلٰی اَنَّ الْاَصْلَ فِی الْمُسْلِمِیْنَ الْعَدَالَۃُ وَھُوَ مَذْھَبُ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَاسْتَدَلَّ بِقَوْلِہٖ اُمَّۃً وَّسَطًا اَیْ عَدْلًا وَّخِیَارًا وَقَالَ بَقِیَّۃُ الْعُلَمَاءِ الْعَدَالَۃُ وَصْفٌ عَارِضٌ لَا یَثْبُتُ اِلَّا بِبَیِّنَۃٍ وَاخْتَارَ الْمُتَاَخِّرُوْنَ مِنْ اَصْحَابِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ مَا عَلَیْہِ الْجُمْھُوْرُ لِتَغَیُّرِ اَحْوَالِ النَّاسِ وَلِمَا غَلَبَ عَلَیْھِمْ فِیْ ھٰذَا الْوَقْتِ (بحر) فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ دَلَالَۃٌ عَلٰی صِحَّۃِ اِجْمَاعِ الْاُمَّۃِ مِنْ وَّجْھَیْنِ اَحَدُھُمَا وَصْفُہٗ اِیَّاھَا بِالْعَدَالَۃِ وَاَنَّھَا خِیَارٌ..... وَالْوَجْہُ الْاٰخَرُ قَوْلُہٗ لِتَکُوْنُوْا شُھَدَاءَ عَلَی النَّاسِ بِمَعْنَی الْحُجَّۃِ عَلَیْھِمْ۔ (جصاص)

۵۱۹ ملتِ اسلامی انفرادی واجتماعی دونوں حیثیتوں سے ساری دنیا کے لئے بطور نمونہ کے تیار کی گئی تھی کائنات کی ہر اُمت کو اسی سانچہ میں ڈھلنا اور اسی معیار پر پورا اُترنا چاہیے تھا نہ یہ کہ خود یہ اُمت اپنے کو بھول کر ہر مشرک ملحد بے مذہب اُمت کی تقلید ونقالی میں لگ جائے آیت سے کمال درجہ کی فضیلت اُمتِ اسلامی کی ثابت ہورہی ہے

قَالَ عُلَمَاءُنَا اَنْبَاَنَا رَبُّنَا تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہٖ بِمَا اَنْعَمَ عَلَیْنَا مِنْ تَفْضِیْلِہٖ لَنَا بِاسْمِ الْعَدَالَۃِ وَتَوْلِیَۃِ خَطِیْرِ الشَّھَادَۃِ عَلٰی جَمِیْعِ خَلْقِہٖ۔ (قرطبی)

شُہَدَاءَ سے یہ تنبیہ بھی نکل رہی ہے کہ مسلمانوں کو اخلاقی پستی اور فسق وفجور کی ہر صورت سے بچے رہنا چاہیے ورنہ پھر ادائے شہادت کے قابل ہی کہاں رہ جائیں گے اور دوسروں کے مقابلہ میں حجت کیسے ہوسکیں گے۔

عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا

گواہ رہیں تم پر ۵۲۰ اور جس قبلہ پر آپ (اب تک) تھے ۵۲۱ اُسے تو ہم نے اسی لئے رکھا تھا

لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ط

کہ ہم پہچان لیں رسول کا اتباع کرنے والوں کو اُلٹے پاؤں واپس چلے جانے والوں سے ۵۲۲

۵۲۰ جس طرح دنیا کی ہر اُمت کے لئے نمونہ اور معیار کا کام دینے کے لئے اُمّت اسلامیہ ہے خود اس اُمت کے لئے معیار کا کام دینے کے لئے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے حضورؐ کی وفات کی خبر پاکر حضرت عمرؓ کا بے خود ہو جانا ایک مشہور و معلوم تاریخی واقعہ ہے سیرۃ ابن ہشام میں خاتمہ کے قریب خود حضرت عمرؓ کی زبان سے یہ روایت درج ہے کہ اس وقت مجھے غلط فہمی اسی آیت سے ہوئی تھی میں اس سے یہ سمجھے ہوئے تھا کہ آپ قیامت تک زندہ رہیں گے اور اُس روز اپنی امت کے اعمال پر گواہی دیں گے۔

قَالَ فَاِنَّهٗ وَاللّٰهِ اِنْ كَانَ الَّذِيْ حَمَلَنِيْ عَلٰى ذٰلِكَ اِلَّا اَنِّيْ كُنْتُ اَقْرَءُ هٰذِهِ الْاٰيَةَ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا فَوَاللّٰهِ اِنْ كُنْتُ لَاَظُنُّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَيَبْقٰى فِيْ اُمَّتِهٖ حَتّٰى يَشْهَدَ عَلَيْهَا بِاٰخِرِ اَعْمَالِهَا فَاِنَّهُ الَّذِيْ حَمَلَنِيْ عَلٰى اَنْ قُلْتُ مَا قُلْتُ۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۳۱۱ ۔ مطبوعہ مطبع مصطفےٰ محمد مصر)

اس کا باعث یہ تھا کہ میں اس آیت کو پڑھا کرتا تھا۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ اور میں یہ سمجھتا تھا کہ حضورؐ اپنی اُمّت میں قیامت تک زندہ رہ کر اُن کے اعمال کے گواہ ہوں گے پس اسی سبب میں نے اُس روز وہ گفتگو کی تھی۔

۵۲۱ (اور اس پر بھی اِذن الٰہی ہی سے تھے)

یعنی بیت المقدس۔ اس سلسلہ میں یہ خوب ملحوظ رہے کہ اسلام میں قبلہ خواہ بیت المقدس ہو یا خانۂ کعبہ بہرحال ایک متعیّن و مخصوص مکان کا نام ہے خواہ وہ کسی مقام سے کسی طرف پڑے، نہ کہ کسی متعیّن سمت و جہت کا جیسا کہ مشرکوں کے ہاں اور مسیحیوں کے ہاں ہے۔

اس قبلہ پر آپؐ مدینہ میں آکر بھی سولہ ۱۶، سترہ ۱۷ مہینے تک قائم رہے تھے۔

۵۲۲ (اور فرمانبرداروں کا امتیاز نافرمانوں سے کرلیں)

لِنَعْلَمَ۔ علم کے معنی یہاں تمیز و شناخت کے ہیں۔

اى ليتميّز به الثابت على دينه من المرتد (بحر) على اطلاق العلم على معنى التمييز لأن بالعلم يقع التمييز (بحر) الا لنميز هؤلاء من هؤلاء ...... فسمّى التمييز علماً (كبير)

علم الٰہی کلی میں تو ہر واقعہ شروع ہی سے موجود ہے لیکن کائنات میں جب تک کوئی واقعہ واقع نہ ہولے اُس پر

وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللّٰهُ ۗ وَمَا كَانَ

اور یہ (حکم) بہت گراں ہے، مگر اُن لوگوں کو نہیں جنھیں اللہ نے راہ دکھادی ہے ۵۲۳ اور اللہ ایسا

اللّٰهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ

نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو ۵۲۴

واقعہ کا اطلاق نہ ہوگا، قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے، مراد اس کے وقوعِ ظاہری، عملی سے ہوتی ہے۔

اور علم یہاں رویت کے معنی میں حضرت علیؓ سے مروی ہے:۔

قَالَ عَلِيٌّ مَعْنَى لِنَعْلَمَ لِنَرَى (قرطبی) عِلم عربی میں بہت دفعہ رُؤیت کے مُرادف آجاتا ہے۔

وَالْعَرَبُ تَضَعُ الْعِلْمَ مَكَانَ الرُّؤْيَةِ وَالرُّؤْيَةَ مَكَانَ الْعِلْمِ۔ (قرطبی)

۵۲۳ (اور وہ اطاعتِ رسول کے ذوقِ سلیم سے بہرہ ور رہیں۔)

وَإِنْ كَانَتْ۔ یعنی یہی حکم تحویلِ قبلہ۔

أَيْ تَحْوِيلُهَا قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ۔ (قرطبی)

بعض علماء نے یہیں سے یہ استنباط کیا ہے کہ اہلِ قبلہ جتنے بھی ہیں، درجۂ ضروری تک راہ ہدایت پر ہیں، قبلہ پر قائم رہنا ایک بڑے امتحان سے گزرنا ہوا، اور اہلِ قبلہ کی عدم تکفیر کی ایک بنیاد مل گیا، گویا اشتراکِ قبلہ فارق ہے اہلِ اہتدا اور اہلِ ضلال کے درمیان۔

آیت سے مدح و فضیلتِ صحابہ کرامؓ بھی نکلتی ہے، انھوں نے بے چون و چرا محض تقلیدِ عملِ رسولؐ میں معاً اپنا منھ شمال سے جنوب کی جانب پھیر دیا۔

يَدُلُّ عَلَى كَمَالِ طَاعَتِهِمْ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ وَانْقِيَادِهِمْ لِأَوَامِرِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ أَجْمَعِينَ۔ (ابن کثیر)

۵۲۴ (اور اعمالِ ایمانی کو)

بعض مسلمانوں کو یہود کے ورغلانے سے یا از خود یہ وہم ہو گیا تھا کہ جب اصل قبلہ خانۂ کعبہ ہے اور بیت المقدس محض ایک عارضی قبلہ تھا تو اُس رُخ پر جتنی نمازیں پڑھی گئیں وہ بیکار گئیں اور جو مسلمان اس حکم جدید سے قبل وفات پا چکے، وہ تو سرتا سر گھاٹے میں رہے، جواب انھیں کو مل رہا ہے کہ یہ وہم کیسا، قبلہ کوئی سا بھی ہو، اجر تو تعمیلِ احکام کرنے والوں کا ہے، جنھوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی، انھوں نے بھی بہر حال حکم ہی کی تعمیل کی تھی، اجر اُن کا تمام و کمال ثابت رہا۔

إِيمَانَكُمْ۔ ایمان سے اس سیاق میں کھلی ہوئی مُراد اس عملِ ایمان یا نماز سے ہے جو قبلۂ منسوخ کی جانب پڑھی جا چکی، ایمان اُسے اُس لحاظ سے کہا گیا کہ وہ لازمۂ ایمان ہے اور ملزوم پر لازم کا اطلاق مجازی عام ہے۔

أَيْ صَلَاتَكُمْ إِلَى الْقِبْلَةِ الْمَنْسُوخَةِ ..... فَالْإِيمَانُ مَجَازٌ مِنْ إِطْلَاقِ اللَّازِمِ عَلَى مَلْزُومِهِ وَالْمَقَامُ قَرِينَةٌ وَهُوَ التَّفْسِيرُ الْمَرْوِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (روح) يَقُولُ عُلَمَاؤُنَا مِنَ الْفُقَهَاءِ إِنَّهَا تُسَمَّى إِيمَانًا وَهِيَ مِنْ أَرْكَانِ الْإِسْلَامِ وَعَهْدِ الْإِسْلَامِ (ابن العربی) سُمِّيَ الصَّلٰوةُ إِيمَانًا لِاشْتِمَالِهَا

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿١٤٣﴾ قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ

اور اللہ تو لوگوں پر بڑا شفیق ہے، بڑا مہربان ہے ۵۲۵ بے شک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منھ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ۵۲۶

عَلٰی نِیَّۃٍ وَقَوْلٍ وَعَمَلٍ (قرطبی) وَاَکْثَرُ الْمُفَسِّرِیْنَ عَلٰی اِنَّ الْمُرَادَ بِالْاِیْمَانِ ھُنَا الصَّلٰوۃُ۔ (المنار)

اِیْمَانَکُمْ۔ مخاطبت براہ راست زندہ مسلمانوں سے ہے لیکن ایمان ان کا نہیں بلکہ وفات یافتہ مسلمانوں کا مُراد ہے۔

ای الایمان الی الاحیاء من المومنین والمعنیٰ فی من مات قبل ان تحوّل القبلۃ ..... یرید ایمانھم لانھم داخلون معھم فی الملۃ۔ (معانی)

۵۲۵ چنانچہ دوسرے احکام کی طرح یہ حکم تحویل قبلہ بھی مع اپنے سارے متعلقات و تضمّنات کے تمام تراس کی شفقت و مہربانی، رافت و رحمت ہی کا نتیجہ ہے۔

خاص مومنین متبعین پر تو حق تعالیٰ کا فضل و کرم ظاہر ہی ہے باقی یہاں ذکر عموم کے ساتھ کُل بندوں پر شفقت و رحمت کا ہے اور اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں ایک نہیں، متعدد ہیں۔

رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ ماہرین زبان کا بیان ہے کہ رأفت کا درجہ رحمت سے بڑھا ہوا ہے۔

الرَّافَۃُ اَشَدُّ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَقَالَ ابوعمرو بن العلاء الرَّافَۃُ اَکْثَرُ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَالْمَعْنٰی مُتَقَارِبٌ۔ (قرطبی)

۵۲۶ (انتظار وحی میں اے پیمبرؐ!)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو صحیح جذبۂ دینی کے ماتحت اس کا یقین تھا کہ اب جب کہ امامت بنی اسرائیل سے چھن چکی ہے تو اُن کا قبلہ بھی قبلۂ اُمّت نہیں رہ سکتا، تحویل قبلہ کا حکم اب آ کر رہے گا، اور فرشتۂ وحی کے انتظار میں آپ کی نظر بار بار آسمان کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی، یہاں اسی کیفیت کا بیان ہے۔

حق تعالیٰ اگرچہ ہرگز کسی جہت کا پابند، کسی مکان سے محدود نہیں تاہم تجلیاتِ خاصہ کو قرآن میں آسمان کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور ہر ایسے تعظیم کے موقع پر نام آسمان کا لیا گیا ہے جیسے بہ سلسلۂ وحی و رحمت و بارش۔

وَخَصَّ السَّمَاءَ بِالذِّکْرِ اِذْ ھِیَ مُخْتَصَّۃٌ بِتَعْظِیْمِ مَا اُضِیْفَ اِلَیْھَا وَیَعُوْدُ مِنْھَا۔ (قرطبی)

اسی لئے محققین نے لکھا ہے کہ بوقت اضطرار و دعا آسمان کی طرف مُنھ کرنا موجباتِ قبول میں سے ہے بلکہ اس نسبت عُلوی سے کمال یقین اور تصفیۂ قلب میں اور مدد ملتی ہے۔

قَدْ نَرٰی۔ گو صیغۂ مضارع ہے لیکن مراد ماضی ہے۔

لَفْظُہٗ مُسْتَقْبَلٌ وَالْمُرَادُ بِہِ الْمَاضِیْ۔ (عکبری)

نَرٰی سے اشارہ یہ بھی ہو گیا کہ آپ حیران و مضطر کیوں ہوتے ہیں، ہم نے خوب دیکھ لیا ہے آپ کے تعلق خاطر کو، اور اس میں کمال تسکین ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔

فِی السَّمَاءِ میں فِیْ، اِلٰی کے معنی میں ہے۔

فِیْ جِھَۃِ السَّمَاءِ (کشاف) نَحْوَ السَّمَاءِ وَقِبَلَھَا۔ (ابن جریر)

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

سو ضرور آپ کو متوجہ کر دیں گے اس قبلہ کی طرف جسے آپ چاہتے ہیں ۵۲۷ اچھا اب کر لیجئے اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف ۵۲۸

۵۲۷ یعنی خانۂ خدا و قبلۂ ابراہیمی کی جانب، یہ وعدہ ہے تحویل قبلہ کا، یہاں بجائے براہ راست یہ ارشاد فرمانے کے کہ ہم کعبہ کی طرف آپ کو پھیر دیں گے، ارشاد یہ ہوا ہے کہ ہم اسے آپ کا قبلہ قرار دے دیں گے جسے آپ خود قبلہ بنانا چاہتے ہیں، اس سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کمال رفعت مراتب اور کمال درجۂ فنا و قبولیت ظاہر ہے. مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل طریقت کے ہاں جو اصطلاح مقام مُرادیت و محبوبیت کی آئی ہے اُس کی اصل یہی آیت ہے. کیا ٹھکانا ہے اس بلندی مرتبہ کا کہ مولا خود طالب رضائے عبد ہو جائے! اس کے آگے کوئی مرتبہ تصور میں بھی نہیں آسکتا. اقبالؒ نے اسی مقام کی تشریح کی ہے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ کے دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ہم آپ کو اس کا والی و حاکم اور اس پر متصرّف بنا دیں گے.

اى لنمكننك من استقبالها. (مدارک ـ روح)

ابھی وعدہ ہوا تھا تحویل قبلہ کا، اب حکم ہو گیا تحویل قبلہ کا.

اَلْوَجْهُ لفظی معنی ہیں چہرہ کے، لیکن حکم میں کل جسم کے ہے.

اَلْمُرَادُ مِنَ الْوَجْهِ هٰهُنَا جُمْلَةُ بَدَنِ الْاِنْسَانِ (کبیر) وَقَدْ يُعَبَّرُ عَنْ كُلِّ الذَّاتِ بِالْوَجْهِ (کبیر)

وَجْه پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے.

۵۲۸ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. عزت و حرمت والی مسجد سے مُراد مکۂ معظمہ کی وہ مسجد اعظم ہے جس کے اندر خانۂ کعبہ واقع ہے، خانۂ کعبہ بہت ہی مختصر عمارت کا نام ہے، مدینہ والوں یا اور کہیں کے لوگوں کو اس کی جہت کی تعیین بہت دشوار تھی اس لئے اُمّت کی سہولت کے لئے نام نسبۃً ایک بہت بڑی عمارت کا لے لیا گیا (مدارک. بیضاوی) محققین کے نزدیک یہاں مسجد حرام سے مُراد کعبہ ہی ہے.

وَمُرَادُهُ الْبَيْتُ نَفْسُهُ (جصاص) وَالْمُرَادُ بِهِ الْبَيْتُ لِاَنَّهُ تَعَالٰى خَاطَبَنَا بِلُغَةِ الْعَرَبِ وَهِيَ تُعَبِّرُ عَنِ الشَّيْءِ بِمَا يُجَاوِرُهُ اَوْ بِمَا يَشْتَمِلُ عَلَيْهِ (ابن العربی) اَيْ فِيْ جِهَتِهِ وَسَمْتِهِ لِاَنَّ اِسْتِقْبَالَ عَيْنِ الْقِبْلَةِ مُتَعَسِّرٌ عَلَى النَّائِيْ وَذِكْرُ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ دُوْنَ الْكَعْبَةِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْوَاجِبَ مُرَاعَاةُ الْجِهَةِ دُوْنَ الْعَيْنِ (مدارک)

اور امام مالکؒ سے یہ منقول ہے کہ مسجد حرام قبلہ ساری دنیا کی ہے اور خانۂ کعبہ قبلہ ہے اُس مسجد کا، مسجد حرام یا حرم شریف کی موجودہ عمارت کا نقش اول خلیفۂ مہدی عباسی کے زمانہ کا ہے، بعد کے خلفاء و سلاطین برابر اس میں اضافہ کرتے رہے خصوصاً ترک سلاطین، موجودہ ہیئت سلطان سلیم ثانی (متوفی ۱۵۷۴ء) کے عہد سے تقریباً قائم ہے، صحن کی وسعت ۶۰۰ فٹ بیان کی گئی ہے، متعدد بڑے بڑے عالی شان اور فراخ دالان چاروں طرف اس کے علاوہ ہیں، داخلہ کے ۴۱ دروازے ہیں، منارے چھ ہیں اور گنبد گمزیوں کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہے، ایک دوسرے بیان کے مطابق شمالی غربی وسعت ۵۴۵ فٹ ہے، جنوبی و مشرقی ۵۵۳ فٹ شمالی مشرقی ۳۶۰ فٹ اور جنوبی و غربی ۳۶۴ فٹ.

شَطْر سے مراد ہے مسجد حرام کی سمت میں یا اُس کے رُخ پر نہ کہ عین اُس کے مقابل کہ اس کی تعمیل دور دراز

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو اپنے چہرے کرلیا کرو اسی کی طرف ۵۲۹ اور جن لوگوں کو کتاب مل چکی ہے وہ یقیناً

لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (١٤٤)

جانتے ہیں کہ وہ (حکم) واقعی ہے ان کے پروردگار کی طرف سے ۵۳۰ اور اللہ بے خبر نہیں اُن کی کارروائیوں سے ۵۳۱

کے علاقوں میں ممکن ہی نہیں۔

شَطْرَهٗ ای نَحْوَهٗ وَتِلْقَاءَهٗ قَالَهٗ ابن عباس وابُو العالیة ومُجاهد والرّبیع بن انس (جصاص) الشّطر لَهٗ معامل یَکُوْنُ النَّاحِیَةُ وَالْجِهَةُ کَمَا فِیْ هٰذِهِ الْاٰیَةِ (قرطبی) وَفِیْهِ دَلَالَةٌ عَلٰی اَنَّهٗ لَوْ اَتٰی نَاحِیَةً مِنَ الْبَیْتِ فَتَوَجَّهَ اِلَیْهَا فِیْ صَلٰوتِهٖ اَجْزَأَهٗ لِاَنَّهٗ مُتَوَجِّهٌ شَطْرَهٗ وَنَحْوَهٗ (جصاص) وَالْقَوْلُ الْاٰخَرُ وَعَلَیْهِ الْاَکْثَرُوْنَ اَنَّ المراد المُوَاجِهَة کَمَا رواہ الحاکم عن... علیؓ ... وهٰذا قولُ ابی العالیة ومُجاهد وعِکرمة وسعید بن جبیر وقتادة والرّبیع بن انس وغیرهم (ابن کثیر) وَفِی الْاٰیَةِ قَوْلَانِ الْاَوَّلُ هُوَ قَوْلُ جُمْهُوْرِ الْمُفَسِّرِیْنَ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِیْنَ وَالْمُتَاَخِّرِیْنَ واختیارُ الشّافعیؒ فِیْ کِتَابِ الرسالة اَنَّ المُرَادَ جِهَةُ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَتِلْقَاءَهٗ وَجَانِبَهٗ (کبیر)

فقہاء نے لکھا ہے کہ نماز میں جو استقبال قبلہ فرض ہے وہ سینہ کا ہے چہرہ کا استقبال قبلہ صرف مسنون ہے، نماز سے باہر ہونا صرف اُس وقت ممکن ہے جب چہرہ کے ساتھ سینہ بھی کعبہ کی طرف سے پھر جائے صرف گردن پھر جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے مالکیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ نمازی کی نظر اپنے سامنے کی جانب رہنا چاہئے بخلاف امام ابو حنیفہؒ و شافعیؒ و احمدؒ کے جنھوں نے اپنی فقہ میں یہ رکھا ہے کہ نظر سجدہ گاہ پر جمی رہے۔

وَقَدِ اسْتَدَلَّ الْمَالِکِیَّةُ بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ عَلٰی اَنَّ الْمُصَلِّیْ یَنْظُرُ اَمَامَهٗ لَا فِیْ مَوْضِعِ سُجُوْدِهٖ کَمَا ذَهَبَ اِلَیْهِ الشَّافِعِیُّ وَاَحْمَدُ وَاَبُوْ حَنِیْفَةَ (ابن کثیر)

**۵۲۹** (حالت نماز میں)

وُجُوْهَکُمْ۔ چہرہ یہاں سارے جسم انسانی کا قائم مقام ہے، یہ مُراد نہیں کہ قبلہ رُخ انسان صرف اپنے چہرہ کو رکھے اور سارے جسم کو دوسری طرف۔

اَرَادَ بِالْوَجْهِ جُمْلَةَ الْبَدَنِ لِاَنَّ الْوَاجِبَ اِسْتِقْبَالُهَا بِجُمْلَةِ الْبَدَنِ وَکَنّٰی بِالْوَجْهِ عَنِ الْجُمْلَةِ لِاَنَّهٗ اَشْرَفُ الْاَعْضَاءِ.... وَیُرَادُ بِهٖ نَفْسُ الشَّیْءِ۔ (بحر)

خطاب سارے مسلمانوں یا امت محمدی سے ہے ابھی ابھی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم ملا تھا کہ اپنے پسندیدہ قبلہ کی طرف نماز پڑھا کیجئے، اب عام حکم صراحت کے ساتھ ساری اُمت کو مل رہا ہے۔ حَیْثُ مَا کُنْتُمْ سے فقہاء نے یہ نکالا ہے کہ نماز، انسان کہیں بھی موجود ہو، درست ہے، کچھ مسجد ہی کی قید نہیں۔

حَیْثُ مَا کُنْتُمْ یعنی دنیا کے کسی حصہ میں اور کہیں بھی ہو کعبہ کی طرف رُخ کرنا وقت نماز میں فرض ہے۔

اَمَرَ تَعَالٰی بِاسْتِقْبَالِ الْکَعْبَةِ مِنْ جَمِیْعِ جِهَاتِ الْاَرْضِ شَرْقًا وَغَرْبًا وَشِمَالًا وَجُنُوْبًا (ابن کثیر)

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ

اور اگر آپ ان لوگوں کے سامنے جنھیں کتاب مل چکی ہے ساری ہی نشانیاں لے آئیں ۵۳۲ (جب بھی) یہ آپ کے قبلہ کی

وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ

پیروی نہ کریں گے ۵۳۳ اور نہ آپ اُن کے قبلہ کی پیروی کرنے والے ہیں ۵۳۴ اور نہ وہ (آپس میں) ایک دوسرے کے قبلہ کو ماننے والے

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

ہیں ۵۳۵ اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہش کی پیروی کرنے لگیں ۵۳۶ بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے ۵۳۷

۵۳۰ علماء و اکابر یہود کو اپنے وہاں کی روایتوں اور نوشتوں کی بنا پر خوب علم تھا کہ پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کا قبلہ وہی ہوگا جو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام کا تھا کہ وہی قبلۂ اصلی اور حقیقی ہے بیت المقدس کا قبلہ ہونا عارضی تھا۔ اَنَّهُ میں ضمیر سے مراد یہی حکم تحویل قبلہ ہے۔

اَنَّ التَّحْوِيْلَ اِلَى الْكَعْبَةِ (کشاف) وَالضَّمِيْرُ لِلتَّحْوِيْلِ اَوِ التَّوَجُّهِ۔ (بیضاوی)

مِنْ رَّبِّهِمْ کی قید نے اس حقیقت کو اور واضح کر دیا کہ استقبالِ کعبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا امر اجتہادی نہیں تمام تر حکم ربانی ہے۔

۵۳۱ ان الفاظ کے ضمن میں یہ حقیقت بھی آگئی کہ اللہ اپنے بندوں کی کارروائیوں کا احتساب کرتا رہتا اور مجرموں کی سزا پر بھی قادر ہے۔

اِعْلَامٌ بِاَنَّ اللّٰهَ تعالیٰ لَا يُهْمِلُ اَعْمَالَ الْعِبَادِ وَلَا يَغْفُلُ عَنْهَا وَضِمْنَهُ الْوَعِيْدُ۔ (قرطبی)

۵۳۲ یعنی اپنی پیغمبری کے سارے ممکن دلائل و معجزات بھی۔

اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ سے مراد یہود ہیں۔

۵۳۳ (یہ حد ہے اُن کے ضد عناد و تعصّب کی، اس لئے آپ کا اُن کے اعتراضات کی طرف اعتنا کرنا ہی بے کار ہے)

۵۳۴ (اس لئے کہ اسرائیل کی امامت کے خاتمہ پر آپ کو ایک مستقل امتیازی عالمگیر قبلہ عطا ہو چکا ہے اور یہود و نصاریٰ کو آپ کی طرف سے اب ہمیشہ کے لئے مایوس ہو جانا چاہئے۔)

۵۳۵ چنانچہ یہود کا قبلہ آج تک ہیکل بیت المقدس ہے، اور نصاریٰ کسی عمارت یا مکان کو نہیں، بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں، اور عجب نہیں کہ اندرونی اختلافات اس سے بھی زائد ہوں، بحمد اللہ کہ ہمارے قدیم مفسرین بھی یہود و نصاریٰ کے قبلوں کے فرق سے صحیح طور پر واقف تھے، چنانچہ لکھتے ہیں:

فَالْيَهُوْدُ يَسْتَقْبِلُ بَيْتَ الْمَقْدِسِ وَالنَّصَارٰى مَطْلَعَ الشَّمْسِ۔ (مدارک)

اور خیر نسفی تو بعد کے شخص کے ہیں، ابن جریر تو متقدمین میں ہیں، وہ تک اس سے باخبر تھے۔

وَذٰلِكَ اَنَّ الْيَهُوْدَ تَسْتَقْبِلُ بَيْتَ الْمَقْدِسِ لِصَلَاتِهَا وَمِنَ النَّصَارٰى تَسْتَقْبِلُ الْمَشْرِقَ۔ (ابن جریر)

وقف لازم

اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ

تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے ۵۳۸ جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں ۵۳۹ وہ آپ کو پہچانتے ہیں

وقف منزل

اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

اس طرح جیسے کہ اپنی نسل کو پہچانتے ہیں ۵۴۰ اور بے شک ان میں کے کچھ لوگ خوب چھپاتے ہیں حق کو حالانکہ جانتے ہوتے ہیں ۵۴۱

وقف غفران

۵۳۶ (تحویل قبلہ کے باب میں، حالانکہ عصمتِ نبوت خود ہی اس مفروضہ کے منافی ہے)
اہل کتاب کی اتباع واسترضاء تو مطلقاً ممنوع ہے لیکن قبلہ جیسے بنیادی دینی مسئلہ میں ان کی اتباع معصیت ہی نہیں کفر ہے

۵۳۷ یعنی علم ثابت بالوحی، قرآنی اصطلاح میں اَلْعِلْمِ سے یہی علم حقیقی مراد ہوتا ہے، دنیوی "علوم" کی کوئی صنف نہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ آیت میں تہدید ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم صحیح کے باوجود بجائے اس کے اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔

وَفِيْ ذٰلِكَ تَحْذِيْرٌ لِمَنْ يَتْرُكُ الدَّلِيْلَ بَعْدَ اِنَارَتِهٖ وَيَتَّبِعُ الْهَوٰى۔ (مدارک)

۵۳۸ اللہ کے قانون میں رُو رِعایت کی گنجائش کسی کے لئے نہیں، یہاں تک کہ انبیاء کے لئے بھی نہیں، اور نفسِ فطرت بشری کے لحاظ سے گناہوں کی صلاحیت اُن میں بھی ویسی ہی ہوتی ہے، جیسی دوسری انسانوں میں، یا وربات ہے کہ توفیق الٰہی ان کا تعلق ہر وقت اور ہر حال میں اپنے سے قائم رکھتی ہے اور انھیں خطاسے محفوظ اور معصیت سے معصوم بنائے رکھتی ہے امام رازیؒ نے آیت سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ عالم کے حق میں وعید شدید تر ہے، غیر عالم کے مقابلہ میں۔

دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى اَنَّ تَوَجُّهَ الْوَعِيْدِ عَلَى الْعُلَمَاءِ اَشَدُّ مِنْ تَوَجُّهِهٖ عَلٰى غَيْرِهِمْ (کبیر)

فَاِنَّ الْعَالِمَ الْحُجَّةُ عَلَيْهِ اَقْوَمُ مِنْ غَيْرِهٖ (ابن کثیر)

۵۳۹ عموم لفظ کے تحت میں مسیحی بھی داخل ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ مراد یہود ہیں، توریت وصُحُف قدیم کو مسیحی بھی مانتے ہیں، علماءِ بلاغت نے اشارہ کیا ہے کہ اس موقع پر صیغۂ معروف اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ضمیر متکلم کی تصریح کے ساتھ صیغۂ مجہول اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے کہیں زیادہ بلیغ وپُر معنی ہے۔

۵۴۰ یعنی خوب اچھی طرح بغیر کسی اشتباہ والتباس کے مطلب یوں ہوا کہ پچھلے نوشتوں میں ایک نبی آخرالزماں کی آمد کی بابت پیشین گوئیاں اس صراحت سے مذکور ہیں کہ یہود کو آپؐ کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی وہ جس طرح اسرائیلی انبیاء کو پہچان لیتے تھے، ٹھیک اُسی طرح آپ کو بھی پہچان سکتے ہیں۔

اَبْنَآءَهُمْ کے لفظی معنی اپنے لڑکوں کے ہیں، لیکن ضمیر هُمْ سے مراد افراد واشخاص نہیں، بلکہ قوم یہود ونسل اسرائیل مجموعاً ہے یعنی ابنائے اسرائیل اَبْنَآء کا لفظ عربی میں اولاد سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے اور ہمیشہ صلبی بیٹوں ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ جن جن پر فرزندی کا اطلاق مجازاً ہو سکتا ہے اُن سب پر حاوی ہے۔

يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیرہٗ سے کیا مراد ہے؟ قدماء عموماً اور اکثر علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس سے مراد بیت الحرام کو بہ حیثیت قبلۃ الانبیاء کے پہچاننا ہے، چنانچہ تفسیر ابن جریر میں ابن عباسؓ صحابی سے لے کر قتادہ، ابن زید، سُدّی

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ ﴿۱۴۷﴾ ع وَلِکُلٍّ وِّجۡهَةٌ ع ۱

(یہ امر) حق ہے تیرے پروردگار کی طرف سے پس تو کہیں شک کرنے والوں میں ہرگز نہ ہو جانا ف۵۴۲ اور ہر ایک کے لئے کوئی

هُوَ مُوَلِّيۡهَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ

رُخ ہوتا ہے جدھر وہ متوجہ ہوتا ہے ف۵۴۳ سو تم نیکیوں کی طرف بڑھو ف۵۴۴

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ابن جریج تابعین کے اقوال اسی معنی میں منقول ہیں لیکن متوسطین اور متاخرین میں تقریباً سب کا اس پر اتفاق ہوگیا ہے کہ مُراد ذاتِ رسالتؐ سے ہے اور دلائل اسی کے زیادہ مؤید ہیں، اور سند اس کی بھی تابعین سے مل جاتی ہے۔

یَعۡنِیۡ یَعۡرِفُوۡنَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ (معالم) ای یَعۡرِفُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ (کشاف) ذَکَرُوۡا فِیۡهِ وُجُوۡهًا اَحَدُهَا اَنَّهٗ عَائِدٌ اِلٰی رَسُوۡلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ ...... وَالۡقَوۡلُ الثَّانِیۡ .. وَاعۡلَمۡ اَنَّ الۡقَوۡلَ الۡاَوَّلَ اَظۡهَرُ (کبیر) وَالضَّمِیۡرُ لِرَسُوۡلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَاِنۡ لَّمۡ یَسۡبِقۡ ذِکۡرُهٗ بِدَلَالَةِ الۡکَلَامِ عَلَیۡهِ (بیضاوی) وَالضَّمِیۡرُ عَائِدٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ مُجَاهِدٌ وَّقَتَادَةُ وَغَیۡرُهُمَا (بحر، قرطبی)

ظاہر ہے کہ ضمیر غائب ہے لیکن اُردو میں نہایت تعظیم کے موقع پر غائب "وہ" کے بجائے حاضر "آپ" لاتے ہیں۔

ف۵۴۱ یہود اور دوسرے معاندین کا یہ اخفائے حق دانستہ اور بالارادہ ہے کسی معذوری، دانستہ غلط فہمی یا دلائل میں خفاء کا نتیجہ نہیں۔

اَلۡحَقُّ۔ حق سے مُراد یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا وہ مفصل و مکمل تعارف ہے، جو توریت اور دوسرے الہامی نوشتوں میں موجود ہے۔

مَا فِیۡ کُتُبِهِمۡ مِنۡ صِفَةِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ (ابن کثیر) ای یَکۡتُمُوۡنَ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ (ابن جریر عن مجاهد) وَالۡحَقُّ الۡمَکۡتُوۡمُ هُنَا هُوَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ قَتَادَةُ وَمُجَاهِدٌ (بحر) یَعۡنِیۡ مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ مُجَاهِدٌ وَّقَتَادَةُ۔ (قرطبی)

دوسرے معنی امر تحویل قبلہ کے بھی لئے گئے ہیں۔

قِیۡلَ اَمۡرُ تَحۡوِیۡلِ الۡقِبۡلَةِ (کبیر)

وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ اس ٹکڑے سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ یہ انکار کرنے والے عوام و جہلائے یہود نہیں اُن کے علماء و اکابر تھے۔

ف۵۴۲ (اے مخاطب!)

آیت کا یہ جزو تاکید کلام کے لئے ہے یعنی یہاں جو کچھ بیان ہو رہا ہے، خواہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت سے متعلق ہو یا امر تحویل قبلہ سے متعلق، بہر حال و بہر صورت یہ اللہ ہی کا کلام ہے اور ہرگز بے التفاتی یا کم التفاتی کے قابل نہیں۔

ف۵۴۳ ع ہر قوم را راست راہے دینے و قبلہ گاہے!

یعنی ہر قوم، ہر اُمت نماز و عبادت کے لئے ایک مرکزی رُخ مقرر رکھتی ہے، سو اُمتِ اسلامیہ کے لئے بھی ایک متعین قبلہ ناگزیر ہے۔

لِکُلٍّ "ہر ایک" سے مُراد ہر قوم یا ہر اُمت ہے اور حذفِ مضاف کی طرح حذفِ مضاف الیہ کی مثالیں عربی میں عام ہیں۔
وَلَمْ یَقُلْ لِکُلِّ قَوْمٍ اَوْ اُمَّۃٍ لِاَنَّہٗ مَعْرُوْفُ الْمَعْنٰی عِنْدَ ھُمْ (کبیر) یَعْنِیْ بِذٰلِکَ اَھْلَ الْاَدْیَانِ (ابن کثیر) لِکُلِّ طَائِفَۃٍ مِّنْ اَھْلِ الْاَدْیَانِ (بحر)

مُوَلِّیْھَا۔ تَوْلِیَۃ یہاں اقبال (رُخ کرنے) کے معنی میں ہے۔
یُرِیْدُ مُوَلِّیْ وَجْھِہٖ اِلَیْھَا وَالتَّوْلِیَۃُ فِیْ ھٰذَا الْمَوْضِعِ اِقْبَالٌ۔ (معانی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بعض صوفیۂ عارفین نے آیت کو حدیثِ نبوی کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَہٗ (ہر ایک کے لئے وہی آسان ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے) سے مؤید کر کے اس کی شرح میں کہا ہے کہ تکوینی و تشریعی دونوں حیثیتوں سے اللہ نے انسانوں کے حالات مختلف رکھے ہیں، اور متعدد طبقے ان کے پیدا کئے ہیں کوئی کاشتکاری میں لگا ہے کوئی تجارت میں، اور کوئی صنعت و حرفت میں، اسی طرح دینی حیثیت سے بھی کوئی احادیثِ نبوی جمع کر رہا ہے، کوئی حفظِ قرآن کر رہا ہے کوئی مسائلِ فقہ کا استنباط کر رہا ہے، کوئی قرآن کی تفسیر و ترجمانی میں لگا ہوا ہے، یہ سب مختلف طریقے راستے ہیں اللہ کی طرف سے، اللہ ان سارے طریقوں کو اپنے بندوں کے ذریعے سے آباد رکھنا چاہتا ہے تو جو شخص جس طریق پر بھی اللہ کی رضا کے قصد سے چلے گا، اللہ اُس کے لئے قبول و وصول آسان کر دے گا۔

ھُوَ۔ اخفش نحوی اور زجاج لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ یہ ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے، مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہی رُخوں کا پھیرنے والا ہے۔
قِیْلَ ھُوَ عَائِدٌ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی قَالَ الْاَخْفَشُ وَالزَّجَّاجُ (بحر) اَوْ ھُوَ لِلّٰہِ تَعَالٰی اَیِ اللّٰہُ مُوَلِّیْھَا اِیَّاہُ۔ (مدارک)

۵۴۴ (اے مسلمانو!)
خطاب اُمّتِ اسلامیہ کو ہے کہ حُسنِ عمل کی طرف بڑھو اور جملہ مذاہب و ادیان کے اتحادِ قبلہ کے خیالِ خام میں نہ پڑے رہو۔
خَیْرَات۔ خَیْر کی جمع وسیع و عام مفہوم میں ہے، رضائے الٰہی کے لئے موافقِ شرع جملہ امور کو شامل، وصول الی اللہ کے بے شمار راستوں پر حاوی، اور آیت میں حکم اُنھیں کی طرف بڑھنے کا ہے۔
یُرِیْدُ.... بِالطَّاعَاتِ وَالْمُرَادُ الْمُبَادَرَۃُ اِلَی الْقَوْلِ (ابن کثیر) فَمَعْنَاہُ الْاَمْرُ بِالْبِدَارِ اِلَی الطَّاعَۃِ فِیْ وَقْتِھَا (کبیر) یَعْنِی الْمُبَادَرَۃُ وَالْمُسَارَعَۃُ اِلَی الطَّاعَاتِ (جصاص) مَعْنَاہُ اِفْعَلُوا الْخَیْرَاتِ مِنَ السَّبْقِ وَھُوَ الْمُبَادَرَۃُ فِی الْاَوَّلِیَّۃِ (ابن العربی)

فَاسْتَبِقُوْا۔ عارفین نے کہا ہے کہ ہر وقت جو چیز اُس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو، اس کی طرف بڑھنا ہی استباقِ خیرات ہے۔
اَلْخَیْرَات۔ فَاسْتَبِقُوْا کا صلہ اِلٰی محذوف ہے۔
اَیْ اِلَی الْخَیْرَاتِ۔ (قرطبی۔ معالم)
نمازِ فرض کی ادائی اول وقت میں اکثر مفسرین نے اس آیت سے نکالی ہے اور اس باب میں کوئی اختلاف نہیں، اُس کے آگے فقہاء مفسرین نے سوال یہ پیدا کیا ہے کہ ایک طرف نماز کا اول وقت ہے، اور دوسری طرف انتظار کرنے میں جماعت مل رہی ہے، تو ترجیح کس کو ہے؟ اور جواب یہ دیا ہے کہ ترجیح انتظارِ جماعت کو ہے۔
وَلَاخِلَافَ فِیْ مَذْھَبِنَا اَنَّ تَاخِیْرَ الصَّلٰوۃِ لِاَجْلِ الْجَمَاعَۃِ اَفْضَلُ مِنْ تَقْدِیْمِھَا لِاَنَّ نَفْیَ الْجَمَاعَۃِ

اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یَاْتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیْعًا ۚ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۴۸﴾

تم جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تم سب کو پالے گا ۵۴۵ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۵۴۶

وَمِنْ حَیْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ

اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں ۵۴۷

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾

اور یہ آپ کے پروردگار کی طرف سے امر حق ہے ۵۴۸ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کر رہے ہو ۵۴۹

مُقَدَّرٌ مَعْلُوْمٌ وَفَضْلُ اَوَّلِ الْوَقْتِ مَجْهُوْلٌ وَتَحْصِیْلُ الْمَعْلُوْمِ اَوْلٰی (ابن العربی) اور اسی کو قرطبی نے بھی نقل کر دیا ہے۔

**۵۴۵** (اور تمہاری نمازوں میں وحدت پیدا کر دے گا۔)

ساری امت کا قبلہ ایک خاص مکان کو مقرر کر دینے سے ایک خیال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ تو ایک صورت انتشار کی سی پیدا ہو گئی، کوئی شمال کی طرف رخ کرے گا، کوئی جنوب کی طرف وقس علیٰ ہذا۔ شبہہ کے جواب میں ارشاد ہو رہا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہے شبہہ محض سطحی ہے مقصود تو نماز اور نمازیوں میں وحدت پیدا کرنا ہے، تم شمال و جنوب، شرق، غرب دنیا کے کسی خطہ کسی علاقہ میں بھی متفرق و منتشر ہو، عالم الغیب و الشہادۃ کو تو بہرحال علم ہے کہ تم رخ ایک ہی طرف کئے ہوئے ہو، وہ کعبہ کی طرف پڑھی ہوئی ساری نمازوں کو ایک حکم میں رکھے گا۔

یَجْعَلُ اللّٰہُ تَعَالٰی صَلَاتَکُمْ مَعَ اِخْتِلَافِ جِهَاتِهَا فِیْ حُکْمِ صَلَاةٍ مُتَّحِدَةِ الْجِهَةِ (روح)

اَیْ یَجْمَعُکُمْ وَیَجْعَلُ صَلَاتَکُمْ کُلَّهَا اِلٰی جِهَةٍ وَاحِدَةٍ قَالَهُ الزَّمَخْشَرِیُّ۔ (بحر)

دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اشارہ یہاں موت و قیامت کی طرف ہے یعنی تم دفن جہاں کہیں بھی ہوگے اللہ تعالیٰ سب کو حشر میں یکجا کر دے گا۔

یَعْنِیْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (قرطبی۔ معالم)

**۵۴۶** (اور اس کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز بھی خارج نہیں)

یہ ایک اصولی جواب بہت سے شبہات کا ہے اللہ کے بتائے ہوئے مسائل میں انسان کو جہاں کہیں بھی استبعاد عقلی معلوم ہوتا ہے اس کی بنیاد ہمیشہ اسی مغالطہ پر ہوتی ہے کہ اپنے اوپر قیاس کر کے اللہ کے قویٰ کو بھی محدود اور اس کی قدرت کو بھی زمان و مکان وغیرہ کی قیود کا پابند سمجھ لیا جائے قرآن مجید نے ہمیشہ اس بشری ذہنیت (سائیکالوجی) کو پوری طرح سمجھ کر بار بار اسی حقیقت کی طرف تنبیہ کی ہے کہ خدائی فعلیت پر حکم لگاتے وقت خدائی قدرت کی بھی وسعت بے پایاں کو یاد رکھا کرو۔

**۵۴۷** مطلب یہ کہ یہ حکم استقبال کعبہ سفر و حضر سب کہیں کے لئے ہے محض قیام مدینہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

بَیَّنَ بِهٰذَا التَّسَاوِیْ فِی الْحَالَیْنِ اِقَامَةً وَسَفَرًا فِیْ اَنَّهٗ مَامُوْرٌ بِاسْتِقْبَالِ الْبَیْتِ الْحَرَامِ۔ (بحر)

**۵۴۸** یعنی امر ثابت شدہ جس میں اب کسی نسخ و تبدیلی کا امکان نہیں۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ

اور آپ جس جگہ سے بھی (باہر) نکلیں اپنا منھ مسجد حرام کی طرف موڑ لیا کریں ۵۵۰ اور تم لوگ (بھی)

مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۙ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ

جہاں کہیں ہو اپنا منھ اُس کی طرف موڑ لیا کرو ۵۵۱ تاکہ لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں حجت نہ رہ جائے ۵۵۲

حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ

سوا اُن لوگوں کے جو اُن میں سے ظالم ہیں ۵۵۳ سو تم اُن سے نہ ڈرو ۵۵۴ بلکہ (صرف) مجھی سے ڈرو ۵۵۵

هُوَ الْحَقُّ اَيِ الثَّابِتُ الَّذِي لَا يَعْرِضُ لَهٗ نَسْخٌ وَّلَا تَبْدِيْلٌ۔ (بحر)

اِنَّهٗ میں ضمیر حکم استقبال قبلہ کی طرف ہے۔

اَيِ الْاِسْتِقْبَالُ اَوِ الصَّرْفُ اَوِ التَّوْلِيَةُ (روح)

۵۴۹ ایک جزئی حکم کے بعد کلی تنبیہ اسلوبِ قرآنی کے خصائص میں سے ہے، اور صیغۂ واحد سے صیغۂ جمع کی طرف منتقل ہو جانا عربی اسلوبِ بلاغت میں عام ہے۔

۵۵۰ الفاظ کی تکرار غالباً تاکید معنی کے لئے ہے، اور یہ اہلِ عرب کا عام دستور ہے۔

كُرِّرَتْ تَوْكِيْدًا (بحر) هُوَ الْاَكْثَرُ الْمَعْهُوْدُ فِيْ لِسَانِ الْعَرَبِ وَهُوَ اَنْ تُعَادَ الْجُمْلَةُ مَرَّةً وَاحِدَةً۔ (بحر)

بعض نے لکھا ہے کہ پہلا حکم تعمیم حال کے لئے ہے یعنی سفر حضر میں جس حال میں بھی ہوں توجہ کعبہ کی طرف کر لی جائے، اور دوسرا حکم تعمیم مکان کے لئے ہے یعنی دور و نزدیک، حاضر و غائب جہاں کہیں بھی ہوں توجہ کعبہ کی طرف کر لی جائے۔ مفسرین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق دوسری حکمتیں بھی اس تکرارِ حکم کی لکھی ہیں۔

۵۵۱ (اے مسلمانو)

یعنی یہ حکم رسول ؐ کے ساتھ مخصوص نہیں، ساری اُمت پر اس کی تعمیل فرض ہے۔ یہاں تک یہ حکم استقبال کعبہ کل ملا کر چھ بار آچکا ہے۔ اہلِ لطائف و اسرار نے لکھا ہے کہ ہر بار کے حکم سے ایک ایک خاص اشارہ مقصود ہے، مثلاً (۱) پہلی بار سے مطلق حکم وجوب (۲) دوسری بار سے تعمیم احوال یعنی سفر ہو یا حضر (۳) تیسری بار سے تعمیم مکان یعنی نزدیک ہو یا دور، حاضر ہو یا غائب (۴) چوتھی بار سے تعلیم ادب یعنی قبلہ رُو رہنے کا استحباب (۵) پانچویں بار سے توجہ قلبی یعنی دل اُسی طرف لگا رہے جدھر پروردگار کی خاص توجہ ہے (۶) چھٹی بار سے تاکید یعنی رفع احتمال نسخ۔

۵۵۲ (مثلاً اہلِ کتاب کو اس اعتراض کی گنجائش کہ ہمارے نوشتوں کے بموجب تو آخری نبی کا قبلہ، قبلۂ ابراہیمی ہوتا تھا، یا مشرکین عرب کو اس اعتراض کا موقع کہ یہ نبی دینِ ابراہیمی کے مدعی ہو کر قبلۂ ابراہیمی کیوں ترک کئے ہوئے ہیں۔)

لِلنَّاسِ میں النّاس سے مراد جملہ مخالفین و معترضین ہیں۔

۵۵۳ یعنی رہے وہ کج فطرت معاندین جو اس کے بعد بھی اعتراضات اڑاتے رہیں گے، سو اُن کی کچھ پرواہی نہ کرو

وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْكُمْ

تاکہ میں اپنا انعام تم پر پورا کروں ۵۵۶ اور تاکہ تم راہ پر (قائم) رہو ۵۵۷ (اسی طرح) جیسے ہم نے تمہارے

رَسُوْلًا مِّنْكُمْ یَتْلُوْا عَلَیْكُمْ اٰیٰتِنَا وَیُزَكِّیْكُمْ وَیُعَلِّمُكُمُ

درمیان ایک رسول تمہیں میں سے بھیجا ۵۵۸ جو تمہارے رُوبرو ہماری آیتیں پڑھتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے ۵۵۹ اور

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں اس کی تعلیم دیتا ہے ۵۶۰ جو تم نہیں جانتے تھے ۵۶۱

اَلَّا لِلْمُعَانِدِیْنَ مِنْهُمْ (کشاف) لَاحُجَّةَ لِاَحَدٍ عَلَیْكُمْ اِلَّا الْحُجَّةَ الدَّاحِضَةَ لِلَّذِیْنَ مِنَ الْیَهُوْدِ وَغَیْرِهِمْ (بحر)

اِلَّا کو یہاں ابو عبیدہ لغوی نے واوؔ کے مرادف قرار دیا ہے اور مفہوم استثناء سے انکار کیا ہے۔ (جصاص)

مَوْضِعُ اِلَّا ههُنَا لَیْسَ بِمَوْضِعِ اسْتِثْنَاءٍ اِنَّمَا هُوَ وَاوُ الْمُوَالَاةِ وَمَجَازُهَا وَلِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ (مجاز)

لیکن فرّاء نے کہا ہے کہ یہ قول معنی کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن ترکیب زبان کے اعتبار سے غلط ہے۔

فَهٰذَا صَوَابٌ فِی التَّفْسِیْرِ وَخَطَاءٌ فِی الْعَرَبِیَّةِ (معانی) اسی طرح زجاج لغوی نے بھی اس کی تغلیط کی ہے۔

وَاَبْطَلَ الزَّجَّاجُ هٰذَا الْقَوْلَ۔ (قرطبی)

**۵۵۴** (اور نہ ان کی بکواس کی کچھ پرواہ کرو)

فَلَا تَخَافُوْا مَطَاعِنَهُمْ فِیْ قِبْلَتِكُمْ (بحر)

**۵۵۵** (کہ میری ہی نافرمانی تمہیں نقصان پہونچا سکتی ہے)

**۵۵۶** اتمامِ نعمت کے مفہوم اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن اس سیاق میں کھلی ہوئی مُراد تعیینِ قبلہ سے ہے۔

بِهِدَایَتِیْ اِیَّاكُمْ اِلٰی قِبْلَةِ اِبْرَاهِیْمَ (معالم) وَاِتْمَامُ النِّعْمَةِ بِمَا هَدَاهُمْ اِلَیْهِ مِنَ الْقِبْلَةِ (بحر)

لِاُتِمَّ کا عطف لِئَلَّا یَكُوْنَ پر ہے (جلالین)

خانۂ کعبہ کا محلِ نزولِ رحمت مرکزِ تجلّیات ہونا مسلّم ہے ساتھ ہی نماز کا افضل عبادات ہونا مسلّم ان دونوں حقیقتوں کے استحضار کے بعد ظاہر ہو جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعیینِ قبلہ سے بڑھ کر عنایت اور تکمیل نعمت اور کیا ہوگی۔

**۵۵۷** (اور اپنے درجاتِ ہدایت میں مزید ترقی کرتے رہو۔)

شریعت اسلامی دنیا کا مکمل ترین محکم نظام ہے اور اس مکمل ترین نظام کا ایک اہم جزو تعیینِ قبلہ و استقبالِ کعبہ بھی ہے لَعَلَّكُمْ میں لَعَلَّ کَے کا مُرادف ہے، شک کے لئے نہیں "تاکہ" کے معنی میں ہے۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جو لوگ پہلے ہی سے ہدایت پر ہیں اُن کو ہدایت یابی سے سرفراز کرنا دلیل اس امر کی ہے کہ مدارجِ قُرب میں ترقی کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔

**۵۵۸** كَمَا کا تعلق آیت ماقبل سے ہے یعنی یہ اتمامِ نعمت اب استقبالِ کعبہ کے واسطے سے اسی طرح

۱۸
ع
۵
۲

# فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

سو تم مجھے یاد کرتے رہو ۵۶۲ میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں گا ۵۶۳ اور میری شکرگزاری کرتے رہو ۵۶۴ اور میری ناشکری نہ کرو ۵۶۵

سے ہوگا، جیسے بعثتِ رسول کے ذریعہ سے اس کے قبل ہو چکا ہے۔

كَمَا اَرْسَلْنَا مُتَعَلِّقٌ بِاُتِمَّ اَيْ اِتْمَامًا كَاِتْمَامِهَا بِاِرْسَالِنَا الرَّسُوْلَ۔ (جلالین)

۵۵۹ (ہر طرح کے فسق وعصیان اور اخلاقی آلودگیوں سے)

رسول کی حیثیت محض پیام رساں اور مُبلّغ کی نہیں ہوتی، مُزکّی (پاک کرنے والے) کی بھی ہوتی ہے، رسول کی گوناگوں حیثیتوں پر حاشیے آیت نمبر (۱۲۹) کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

۵۶۰ رسول کی حیثیت مُعلّم اور شارح کی بھی ہوتی ہے۔

يُعَلِّمُكُمْ لفظ تعلیم سے اشارہ ادھر بھی ہوگیا کہ پیغمبر کے ارشادات محض لفظ وعبارت تک محدود نہیں رہتے وہ حکمت ودانائی کے سبق، روحانیت کے اصول ومسائل کی تعلیم بھی دیتا رہتا ہے یعنی انھیں اپنے سامعین کے رگ وریشہ میں اتارتا رہتا ہے۔

۵۶۱ وحی الٰہی کو عقلِ بشری سے وہی نسبت ہے جو خدا کو بندہ سے ہے اور رسول چونکہ وحی سے مؤیّد رہتا ہے اس لئے قدرۃً اس کی باریک بیں، دُور رس اور دقیقہ سنج نگاہ اُن دقیق حقائق تک پہونچ جاتی ہے جو بڑے بڑے عقلاء ومفکرین سے بھی مخفی رہتے ہیں اور رسول کی رسائی عالمِ حقیقت کی اُن گہرائیوں تک ہوجاتی ہے جو علم وعقل، کشف واشراق سب سے ماوراء ہیں۔

لِكَوْنِ اِرْسَالِهٖ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نِعْمَةً عَظِيْمَةً وَلَوْلَاهُ لَكَانَ الْخَلْقُ مُتَحَيِّرِيْنَ فِيْ اَمْرِ دِيْنِهِمْ لَا يَدْرُوْنَ مَاذَا يَصْنَعُوْنَ (روح) مَا لَا سَبِيْلَ اِلٰى مَعْرِفَتِهٖ اِلَّا بِالْوَحْيِ۔ (مدارک)۔

۵۶۲ (طاعت وعبادت کے ذریعہ سے)

بندہ کا اپنے مالک کو یاد کرنا یہی ہے کہ اُس کی بتلائی ہوئی راہ پر ہمت اور شوق سے چلتا رہے اور یہ یادِ الٰہی کسی خاص وقت کے ساتھ محدود ومقید نہیں، لکھتے پڑھتے، بولتے چالتے، ملتے جلتے، سوتے جاگتے، سب میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھنا یہی بندہ کی طرف سے یادِ الٰہی ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْ۔ ذکر سے مراد لی گئی ہے آیاتِ الٰہی اور ان کی عظمت وقدرت کا تفکّر۔

وَاذْكُرُوْا بِالْفِكْرِ فِيْ دَلَائِلِهٖ وَاٰيَاتِهٖ وَقُدْرَتِهٖ وَعَظَمَتِهٖ (جصاص)

اور اسی کو سارے اذکار سے افضل اور ان کی اصل قرار دیا گیا ہے۔

وَهُوَ اَفْضَلُ الذِّكْرِ، سَائِرُ وُجُوْهِ الذِّكْرِ مَبْنِيَّةٌ عَلَيْهِ وَتَابِعَةٌ لَهٗ (جصاص)

ذِکر سے مُراد ذکرِ قلبی سے لی گئی ہے کہ یہی اس کے اصل معنی بھی ہیں، اور اسی ذکرِ قلبی کو انسان پابندی کے ساتھ ہمیشہ جاری رکھ سکتا ہے۔

وَاَصْلُ الذِّكْرِ التَّنَبُّهُ بِالْقَلْبِ لِلْمَذْكُوْرِ وَالتَّيَقُّظُ لَهٗ ..... وَاَنَّ الْمُرَادَ ذِكْرُ الْقَلْبِ الَّذِيْ يَجِبُ اِسْتِدَامَتُهٗ فِيْ عُمُوْمِ الْحَالَاتِ۔ (قرطبی)

۵۶۳ (اپنے لطف وعنایتِ خاص سے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (۱۵۳)

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو ۵۶۵ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۵۶۶

اللہ کا اپنے بندوں کو یاد کرنا یہی ہے کہ ان پر دنیا و آخرت دونوں میں اپنے خصوصی فضل و کرم کی بارش کرتا ہے۔

وَمَعْنَى الْاٰيَةِ اُذْكُرُوْنِيْ بِالطَّاعَةِ اَذْكُرْكُمْ بِالثَّوَابِ وَالْمَغْفِرَةِ۔ (قرطبی)

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اور اَذْكُرْكُمْ میں ضمیر متکلم کو صیغۂ واحد میں لانا علامت تخصیص کی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بندہ ادھر سے یاد میں لگا رہے تو اُدھر سے بھی سرفرازی ہوتی رہے گی، اور یہی اصلی ثمرہ اور انعام ہے بندہ کے ذکر الٰہی کا، سو اگر ذہن کے سامنے اُن کا استحضار رہے تو بندۂ ذاکر و شاغل کو نہ کبھی تشویش ہو اور نہ بے حاصلی کی شکایت پیدا ہو۔

۵۶۴ وَاشْكُرُوْا لِيْ۔ توحید، ایمان و اسلام کے حقوق ادا کرتے رہنا، یہی اللہ کی شکرگزاری کرتے رہنا ہے، اور شکر کی بہترین تعریف یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ ہی کے کاموں میں لگایا جائے۔

وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ کفر و شرک الحاد و ارتیاب، فسق و بدعت میں پڑے رہنا یہی اللہ کی ناشکری اور اس کی نعمتوں سے کفران کرنا ہے، اور ناشکری کا اصلی مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے دیئے ہوئے قوتوں کو اللہ کی نافرمانی میں صرف کیا جائے۔

۵۶۵ یعنی ہجوم مشکلات کے وقت بھی مشکل کشائے حقیقی سے تعلق برابر جوڑے رہو، اُس پر بھروسہ رکھو، اسی کے آگے جھکتے رہو ـــــ روزمرّہ کا مشاہدہ ہے کہ کسی بڑی اور پُرقوت ہستی سے تعلق قائم ہو جانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہو جاتی ہے، خطرہ کے وقت پولیس کے پہونچ جانے سے کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کو کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے، شدید بیماری کے وقت کسی نامور طبیب کے آجانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جڑ جاتی ہے، پھر جب دل کا ربط ہمہ بیں و ہمہ داں، ناصرِ حقیقی و محافظِ حقیقی سے قائم ہو جائے، تو انسان بے بیان کی تسکینِ خاطر و تقویتِ قلب کا کیا پوچھنا! دنیا میں رہ کر زندگی کی کشمکش میں پڑ کر مشکلات و مصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے، افراد کو بھی اور اُمت و جماعت کو بھی، اور وہ دستور العمل ناقص ہے، جو مشکلات کے دفاع اور مصائب سے مقابلہ کا طریقہ نہ بتائے، قرآن مجید نے بجائے غیر ضروری اور نامتناہی تفصیلات میں جانے کے یہاں اشارہ اصل اصول کی جانب کر دیا۔

بِالصَّبْرِ۔ صبر کے لفظی معنی تنگی و ناخوشگواری کی حالت میں اپنے کو روکے رکھنے کے ہیں۔

اَلصَّبْرُ الْاِمْسَاكُ فِيْ ضِيْقٍ۔ (راغب)

اور اصطلاحِ شریعت میں اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو عقل پر غالب نہ آنے دیا جائے، اور قدم دائرۂ شریعت سے باہر نہ نکالا جائے۔

اَلصَّبْرُ حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الْعَقْلُ وَالشَّرْعُ (راغب)

صبر کے یہ معنی نہیں کہ جو امور طبعی اور بشری ہیں ان کے آثار کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے، بھوک کے وقت مضمحل اور نڈھال ہو جانا، درد کی تکلیف سے کراہنا، رنج کے وقت آہ سرد بھرنا، عزیزوں قریبوں کی موت پر آنسوؤں سے رونا، ان میں سے کوئی شے بھی صبر کے منافی اور بے صبری میں داخل نہیں، قرآنی فرمان کا مطلب صرف

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (۱۵۴)

اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انھیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں ۵۶۷ البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے ۵۶۸

اس قدر ہے کہ ہجوم مشکلات کے وقت گھبرا نہ جاؤ، ثابت قدم رہو، دل قابو میں رکھو، خود دل کے بس میں نہ آجاؤ۔

اَلصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ۔ صبر ایک سلبی کیفیت اور صلوٰۃ ایک ایجابی عمل ہے ان دو کلیدی لفظوں سے اشارہ ادھر ہو گیا کہ انفرادی اصلاح اور اجتماعی فلاح دونوں کا راز صرف ان دو چیزوں میں ہے، ایک معاصی سے حفظ و احتیاط، دوسرے اوامر کا اتباع۔

۵۶۶ اللہ کی معیّتِ عام تو کافر و مومن، فاسق و صالح اپنے ہر بندہ کے ساتھ ہے وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ یہاں یہ معیّتِ عام مُراد نہیں، بلکہ معیّتِ خصوصی مُراد ہے جس کے آثار حفاظت، اعانت و توجّہ خاص ہیں، یہ اُسی معیّتِ الٰہی کا احساس و استحضار تھا، جس نے رسول کریم ؐ کے صحابہؓ کو بے پناہ قوت، جرأت، بے خوفی کا مالک بنا دیا تھا اور حق یہ ہے کہ اس مراقبہ سے بڑھ کر نہ روح کے لیے کوئی لذیذ غذا ہے اور نہ جراحتِ قلب کے لئے کوئی مرہم تسکین یہی ایک تصور ہے اہلِ ایمان کے لئے جو ہر ناگوار کو خوشگوار، ہر تلخ کو شیریں، ہر زہر کو قند بنا دینے کو کافی ہے، دورِ حاضر کے مغربی مفکرین اور فلسفیوں نے بھی اس تعلق باللہ پر روشنی ڈالی ہے اور تسلیم کیا ہے کہ قلب کی اُداسی، غمگینی، افسردگی کے وقت تعلق باللہ سے بڑھ کر مونس، رفیق و دمساز کوئی نہیں، ملاحظہ ہو JAMES کی VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCES کے مختلف مقامات۔

مَعَ معیت کی مختلف قسمیں (مکانی، زمانی، معنوی، وغیرہ) گنانے کے بعد اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ اس میں مفہوم نصرت و اعانت کا شامل رہتا ہے۔

یَقْتَضِیْ مَعْنَی النُّصْرَۃِ۔ (راغب)

اور وہی یہاں مُراد ہے۔

قَالُوْا الْمَعِیَّۃُ ھُنَا مَعِیَّۃُ الْمَعُوْنَۃِ۔ (المنار)

صبر کی فضیلت ابھی ابھی اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ میں آچکی تھی، اب اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کہہ کر اُسے اور زیادہ واضح و مؤکد کر دیا، مشکلات تکوینی ہوں یا تشریعی حقیقۃً اُن سے مقابلہ کرنے کی بہترین سپر انسان کے ہاتھ میں اسی صبر کی ہے اور اس سے اُمت کے ہر ہر فرد کو ہر وقت مسلح رہنا لازمی ہے۔

صَبْر اپنے وسیع مفہوم میں ایک جامع لفظ ہے صَلٰوۃ اسی کی ایک ممتاز صورت ہے، معیّتِ الٰہی کی یہ نعمت جب صابرین کو ملے گی تو نمازیوں کو بدرجۂ اولیٰ ملے گی، اور اسی لئے اس کی صراحت کی ضرورت نہ رہی۔

وَلَمْ یَقُلْ مَعَ الْمُصَلِّیْنَ لِاَنَّہٗ اِذَا کَانَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ کَانَ مَعَ الْمُصَلِّیْنَ مِنْ بَابِ اَوْلٰی لِاِشْتِمَالِ الصَّلٰوۃِ عَلَی الصَّبْرِ (روح)

۵۶۷ (عالم برزخ میں ایک خاص حیات کے ساتھ اور عام انسانوں کی طرح مُردہ نہیں)

آیت سے مقصود حیاتِ شہداء کا اثبات ہے، یہ مُراد نہیں کہ انھیں زندہ جان کہا بھی جائے۔

اَنَّ الْمَقْصُوْدَ اِثْبَاتُ الْحَیٰوۃِ لَھُمْ لَا اَمْرُھُمْ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا فِیْ شَاْنِھِمْ اَنَّھُمْ اَحْیَاءٌ وَاِنْ کَانَ ذٰلِکَ اَیْضًا صَحِیْحًا (روح)

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یعنی دینِ حق کی راہ میں، مذہبِ صحیح کی خاطر۔

اَیْ فِیْ طَاعَتِہٖ وَاِعْلَاءِ کَلِمَتِہٖ (روح)

غزوۂ بدر میں جب کچھ صحابی شہید ہوگئے تو نافہم کافروں نے کہنا شروع کیا کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوادی، اور زندگی کے لطف سے محروم ہوگئے، انھیں جواب مل رہا ہے کہ تم جس معنی میں انھیں مردہ سمجھ رہے ہو اس میں وہ سرے سے مردہ ہی نہیں، بلکہ زندوں سے کہیں بڑھ کر لذت سے لذت یاب ہورہے ہیں، اصطلاح میں ایسے مقتول کو شہید کہتے ہیں، برزخی زندگی اپنی عام صورت میں تو سب ہی کے لئے ہے لیکن شہیدوں کو اس عالم میں ایک خصوصی اور امتیازی زندگی نصیب ہوگی، آثارِ حیات میں دوسروں سے کہیں زیادہ قوی، بقول مفسر تھانوی رح شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر اس کے جسدِ ظاہری تک بھی پہونچتا ہے کہ اس کا جسد باوجود گوشت پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا، اور مثل جسدِ زندہ کے صحیح وسالم رہتا ہے جیسا کہ احادیث ومشاہدات شاہد ہیں، اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء شہیدوں سے بھی زیادہ قوت وامتیاز رکھتے ہیں۔

تَخْصِیْصُ الشُّھَدَاءِ لِاخْتِصَاصِھِمْ بِالْقُرْبِ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَمَزِیْدِ الْبَھْجَۃِ وَالْکَرَامَۃِ (بیضاوی)

ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ حیات روحانی ہوتی ہے لیکن ترجیح اسی قول کو ہے کہ جسمانی وروحانی دونوں ہوتی ہیں۔

ذَھَبَ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ السَّلَفِ اِلٰی اَنَّھَا حَقِیْقَۃٌ بِالرُّوْحِ وَالْجَسَدِ وَذَھَبَ الْبَعْضُ اِلٰی اَنَّھَا رُوْحَانِیَّۃٌ وَالْمَشْھُوْرُ تَرْجِیْحُ الْقَوْلِ الْاَوَّلِ (روح) قِیْلَ حَیَاۃٌ رُوْحَانِیَّۃٌ مَحْضَۃٌ۔ (المنار)

اور یہ عقیدہ جمہور امت کا، عہدِ صحابہ سے لے کر اب تک چلا آرہا ہے کہ روح کو، جو جسم کے علاوہ ایک جوہر قائم بالذات ہے احساس موت یعنی جسم سے الگ ہونے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

وَفِیْھَا دَلَالَۃٌ عَلٰی اَنَّ الْاَرْوَاحَ جَوَاھِرُ قَائِمَۃٌ بِاَنْفُسِھَا مُغَایِرَۃٌ لِمَا یُحَسُّ بِہٖ مِنَ الْبَدَنِ تَبْقٰی بَعْدَ الْمَوْتِ دَرَّاکَۃٌ وَعَلَیْہِ جُمْھُوْرُ الصَّحَابَۃِ وَالتَّابِعِیْنَ وَبِہٖ نَطَقَتِ الْاٰیَاتُ وَالسُّنَنُ (بیضاوی)

آیت سے بقاعدۂ دلالۃ النص یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جان ومال صرف کرنے والے اور انھیں ہوائے نفس میں لٹانے والے یکساں نہیں ہوتے، حیاتِ شہداء کے معتقد یہود بھی بعض فرقے ہوئے ہیں (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۶ صفحہ ۵۶۶) ابن العربی رح مالکی نے کہا ہے کہ اسی آیت سے تمسک کرکے بعض ائمہ نے شہید کے لئے غسل ونماز جنازہ دونوں غیر ضروری بتائے ہیں کہ ان کی تطہیر تو شہادت سے ہو چکی لیکن امام ابوحنیفہ رح نے نماز جنازہ کو ضروری برقرار رکھا ہے (احکام القرآن) اور جب شہید زندہ ہیں اور رزق بھی پاتے رہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ہے بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ تو اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ اسی طرح کافروں کو عذاب بھی بعد موت ہوتا ہوگا، اور اس سے اثباتِ عذابِ قبر کا ہوتا ہے۔

وَاِذَا کَانَ اللّٰہُ یُحْیِیْھِمْ بَعْدَ الْمَوْتِ لِیَرْزُقَھُمْ فَیَجُوْزُ اَنْ یُّحْیِیَ الْکُفَّارَ لِیُعَذِّبَھُمْ وَیَکُوْنُ فِیْہِ دَلِیْلٌ عَلٰی عَذَابِ الْقَبْرِ (قرطبی) جَازَ اَنْ یُّحْیِیَ الْکُفَّارَ فِیْ قُبُوْرِھِمْ فَیُعَذِّبُوْا وَھٰذَا یُبْطِلُ قَوْلَ مَنْ یُّنْکِرُ عَذَابَ الْقَبْرِ (جصاص)

امام رازی نے آیت کے تحت میں حدیث نبوی اَلْقَبْرُ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِّیَاضِ الْجَنَّۃِ اَوْ حُفْرَۃٌ مِّنْ حُفَرِ النِّیْرَانِ (قبر یا تو ایک باغ ہوتی ہے جنت کے باغوں میں سے، یا ایک گڑھا ہوتا ہے آگ کے گڑھوں میں سے) درج کرنے کے بعد لکھا ہے کہ عذاب وثواب قبر کے باب میں حدیثیں گویا حد تواتر کو پہونچی ہوئی ہیں۔

وَالْاَخْبَارُ فِیْ ثَوَابِ الْقَبْرِ وَعَذَابِہٖ کَالْمُتَوَاتِرَۃِ (کبیر)

۵۶۸ اس لئے کہ برزخ حواس ناسوتی سے مدرک نہیں ہوتا اور انسان اس حیاتِ عالی ولطیف کا ادراک اپنے حواس ظاہری کے ذریعہ سے نہیں کرسکتا۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُم بِشَيۡءٖ مِّنَ ٱلۡخَوۡفِ وَٱلۡجُوعِ وَنَقۡصٖ مِّنَ ٱلۡأَمۡوَٰلِ وَٱلۡأَنفُسِ

اور ہم تمہاری آزمائش کر کے رہیں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے کچھ نقصان

وَٱلثَّمَرَٰتِۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴿١٥٥﴾ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتۡهُم مُّصِيبَةٞ

سے ۵۶۹ اور آپ صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ۔ ۵۷۰ کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آ پڑتی ہے ۔

اِنَّمَا هِیَ اَمْرٌ لَا یُدْرَکُ بِالْعَقْلِ بَلْ بِالْوَحْیِ (بیضاوی) لِاَنَّهَا مِنْ اَحْوَالِ الْبَرْزَخِ الَّتِیْ لَا یَطَّلِعُ عَلَیْهَا وَلَا طَرِیْقَ لِلْعِلْمِ بِهَا اِلَّا بِالْوَحْیِ (روح) لِاَنَّ حَیَاتَهَا الشَّهِیْدِ لَا تُعْلَمُ حِسًّا (مدارک)

ابن کثیر نے ایک حدیث نبوی نقل کر کے اور اس سے استنباط کر کے لکھا ہے کہ ایسی حیات عام مومنین کو حاصل رہتی ہے البتہ شہداء کا ذکر خاص طور پر ان کی عظمت واکرام کے لئے قرآن مجید میں کر دیا گیا ہے ۔

فَفِیْهِ دَلَالَةٌ لِعُمُوْمِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَیْضًا وَاِنْ کَانَ الشُّهَدَاءُ قَدْ خُصِّصُوْا بِالذِّکْرِ فِی الْقُرْاٰنِ تَشْرِیْفًا لَهُمْ وَتَکْرِیْمًا وَتَعْظِیْمًا ۔

**۵۶۹** (بہ تقاضائے حکمت)

خطاب مومنین صادقین سے چلا آرہا ہے اُنھیں بتایا ہے کہ مصیبتیں اور بلائیں اُن پر بھی یقیناً آئیں گی لیکن بطور سزا وعذاب نہیں بلکہ ابتلاء و امتحان کے رنگ میں، اور اس ارشاد سے اُن کی تسلی و تسکین کا بہترین سامان بہم پہونچا دیا، آزمائش خداوندی سے مقصود نتائج کو دنیا پر ظاہر کر دینا ہوتا ہے، ورنہ حق تعالیٰ کو تو یہ علم ظاہر ہے کہ ہمیشہ سے ہے زمین و آسمان کا فرق ہے اُس چوٹ کے درمیان جو دشمن کے ہاتھ سے پہونچتی ہے اور اُس نشتر کے جو شفیق ڈاکٹر لگاتا ہے کہ ایک کی بنیاد تمام تر بدخواہی پر ہوتی ہے اور دوسرے کی یکسر اخلاص و ہواخواہی پر، عام انسان کو جو دُکھ درد دُنیا میں پہنچتے رہتے ہیں اُن سے کتنی مختلف وہ تکلیفیں ہوتی ہیں جو محض بہ طور آزمائش اور محض ازدیاد مراتب کی خاطر ایک مومن کو حکیم مطلق و شفیق مطلق پروردگار کی طرف سے پہونچائی جاتی ہیں ۔

بِشَیْءٍ سے یہ بتا دیا کہ امتحان بہت سخت نہیں ہوگا بلکہ ملک کے جزء قلیل ہی سے متعلق ہوگا، کُل سے متعلق نہیں ۔

اَیْ بِقَلِیْلٍ مِنْ ذٰلِکَ (بیضاوی) بِقَلِیْلٍ مِنْ کُلِّ وَاحِدَةٍ مِنْ هٰذِهِ الْبَلَایَا وَطَرَفٍ مِنْهُ ۔ (مدارک)

اَلْخَوْفِ ۔ خوف کا لفظ جامع ہے، جان، مال، عزت ہر چیز سے متعلق، اندیشہ و ہراس اس کے اندر آ گیا ۔

اَلْجُوْعِ ۔ بھوک کا امتحان یہ ہے کہ کسی حاجت کے باوجود ہر مال حرام سے بچے، اور نہ روزہ سے ہچکچائے اور نہ فقر و فاقہ سے ڈرے

اَمْوَالِ ۔ رشوت، سود، خیانت، بیع فاسد، ہر غیر شرعی معاملت سے دستبردار ہو جائے اور جو مالی نقصانات تکوینی طور پر واقع ہوں، چوری ہو جائے، آگ لگ جائے، ان سب پر صبر سے کام لے ۔

اَلْاَنْفُسِ ۔ موت، بیماری، جہاد کے حادثوں میں صبر سے کام لے ۔

اَلثَّمَرٰتِ ۔ اولاد سے بھی مُراد ہو سکتی ہے اور تجارت، زراعت وغیرہ کے منافع سے بھی، ہر قسم کی نیک نامی، ناموری کے موقع بھی اس میں شامل ہیں، محققین نے کہا ہے کہ بندہ کا ہر امتحان شرک و توحید کے درمیان فارق ہوتا ہے عوام کا امتحان شرک جلی سے متعلق ہوتا ہے، اور خواص کا شرک خفی سے ۔

قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۱۵۶)

تو وہ کہتے ہیں ۵۷۱ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بے شک ہم اُسی کی طرف واپس ہونے والے ہیں ۵۷۲

مُرشد تھانوی نے فرمایا کہ آیت نص ہے اس باب میں کہ مجاہدۂ اضطراری بھی نافع ہوتا ہے۔

۵۷۰ صبر کرنے والوں کو یعنی اُن بندوں کو جو حالتِ غم میں بھی حدودِ شریعت سے قدم باہر نہیں نکالتے۔ صبر کرنے کے معنی یہ نہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہو جائے اور غم کو غم محسوس ہی نہ کرے اس کا نام صبر نہیں، بے حسی ہے۔ صبر یہ ہے کہ انتہائی غمناک و درد انگیز واقعہ پر عقل کو نفس پر غالب رکھے، زبان کو شکوہ اور ناشکری سے آلودہ نہ ہونے دے اور نظر کو مسبب الاسباب پر اس کی مصلحت و حکمت پر، اس کی شفقت و رحمت پر رکھے۔

غم میں بھی قانونِ فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں ۔۔۔ یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں! (اکبرؔ)

۵۷۱ (حضورِ قلب کے ساتھ)

تحصیلِ صبر میں عقیدۂ قلب تلفظِ زبانی پر مقدم ہے۔

مُصِيْبَة کے لغوی معنی اُفتاد کے ہیں اور حدیث میں اس کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ سَاءَ الْمُؤْمِنَ فَهُوَ مُصِيْبَةٌ (جو شے بھی مسلمان کو ناگوار گزرے بس وہی اُس کے حق میں مصیبت ہے) اہلِ شرح و تفسیر سے بھی ایسے ہی قول منقول ہیں۔ اَلْمُصِيْبَةُ كُلُّ مَا يُؤْذِي الْمُؤْمِنَ وَيُصِيْبُهٗ (قرطبی) اَلْمُصِيْبَةُ كُلُّ مَا اٰذَى الْمُؤْمِنَ فِيْ نَفْسٍ اَوْ مَالٍ اَوْ اَهْلٍ صَغُرَ اَوْ كَبُرَ (بحر) وَالْمُصِيْبَةُ تَعُمُّ مَا يُصِيْبُ الْاِنْسَانَ مِنْ مَكْرُوْهٍ فِيْ نَفْسٍ اَوْ مَالٍ اَوْ اَهْلٍ قَلِيْلًا كَانَ الْمَكْرُوْهُ اَوْ كَثِيْرًا۔ (روح)

گویا اس کا اطلاق نہایت وسیع اور عام ہے اور اس کے تحت میں چھوٹا بڑا ہر ناخوشگوار واقعہ آگیا، بیماری ہو، مالی نقصان ہو، دوستوں، عزیزوں کی مفارقت کا صدمہ ہو، موت کا غم ہو، لاولدی ہو، توہین و بے عزتی ہو، وقس علیٰ ہذا۔

حدیث نبوی میں اسے آیت استرجاع سے تعبیر کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ جو کوئی مصیبت کے وقت اسے پڑھ لیا کرے گا، اللہ اس کی بگڑی بنائے گا اور اُس کی عقبیٰ بخیر کرے گا۔ وَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنِ اسْتَرْجَعَ عِنْدَ الْمُصِيْبَةِ جَبَرَ اللّٰهُ مُصِيْبَتَهٗ وَاَحْسَنَ عُقْبَاهُ۔

زبان سے اس آیت کی تلاوت کا دستور بحمد اللہ اب بھی اکثر مسلمان گھروں میں پایا جاتا ہے لیکن تحصیلِ صبر کے لئے محض زبانی اعادہ ہرگز کافی نہیں، قلب کے سامنے بھی استحضار پوری طرح ہونا چاہیئے۔

اَلْاِسْتِرْجَاعُ تَسْلِيْمٌ وَاِذْعَانٌ (مدارک) وَلَيْسَ الصَّبْرُ بِالْاِسْتِرْجَاعِ بِاللِّسَانِ بَلْ بِهٖ وَبِالْقَلْبِ۔ (بیضاوی۔ روح)

قَالُوْا۔ صورۃً صیغہ ماضی کا ہے لیکن مقصود مومنین صابرین کی عادت کا بیان ہے۔

اِذَا۔ بیان کسی ایک اور اتفاقی واقعہ کے لئے نہیں، عام عادت کے اظہار کے لئے آیا ہے، یعنی جب جب یا کبھی بھی کوئی ناخوشگواری پیش آتی ہے۔

وَالْمَعْنٰى فِيْ اِذَا هُنَا عَلَى التَّكْرَارِ وَالْعُمُوْمِ۔ (بحر)

۵۷۲ (خواہ آج خواہ چند روز بعد)

آیت کے اندر تعلیم تین چیزوں کی ملی۔

ایک یہ کہ ہم سب عبدِ محض ہیں اور تمام تر اُسی کی ملک، ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی اپنی کوئی شے ہی نہیں،

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (۱۵۷)

یہی لوگ تو وہ ہیں کہ اُن پر نوازشیں ہوں گی ان کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ راہ یاب ہیں ۵۷۳

نہ بیوی نہ بچے، نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان، نہ جسم نہ جان! ع

جو کچھ ہے سب خدا کا، وہم وگماں ہمارا! (اکبرؒ)

انسان کے سارے رنج وغم، درد وحسرت کی بنیاد صرف اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہوگیا، اور کوئی سی بھی شئے ہو، سرے سے اپنی رہی ہی نہیں، تو اب اُن محبوبات، مالوفات، مرغوبات کے چھن جانے پر گلہ وشکوہ رنج وملال کا موقع ہی کیا؟

دوسری بات یہ کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی عارضی اور فانی ہیں، رہ جانے والے کوئی بھی نہیں، عنقریب اُنھیں چھوڑ چھاڑ، مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔

تیسرے یہ کہ وہاں پہونچتے ہی سارے قرضے بیباق ہوجائیں گے ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی۔

یہ تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے اُسی قدر اُس کے دل کو دنیا میں امن وسکون حاصل رہے گا، غم وحزن کے بار کو ہلکا کرنے کا جو عارفانہ اور زبردست نسخہ یہاں بتا دیا گیا ہے، یہ صحائفِ کائنات میں بے نظیر ہے بلکہ حق یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر صرف یہی ایک آیت ہوتی تو یہی اُسے حکیم مطلق کا کلام ثابت کرنے کے لئے واللہ کافی تھی۔

صَبْر۔ ایک کیفیتِ نفسی کا نام ہے، اور اصلاً اس کا تعلق قلب سے ہے، زبان سے کلمۂ صبر دُہرانے کا حکم اسی کیفیت کو قوی اور مؤکد بنانے کے لئے ہے محققین کہتے ہیں کہ آیت میں جو حکم ہے اُس کی تعمیل کے تینؔ مرتبے ہیں:—

(۱) درجۂ اعلیٰ، دل میں آیت کے معنی منقش ہوں، اور زبان پر بھی اُس کے الفاظ جاری ہوں (۲) درجۂ اوسط، دل میں معنی کا خیال کرلے، اور زبان سے ادا نہ کرے (۳) درجۂ ادنیٰ، دل میں استحضار نہ ہو مگر زبان سے دُہرا دے، چوتھی ممکن صورت یہ ہے کہ دل میں اعتقاد کسی درجہ میں بھی موجود نہ ہو محض زبان سے دُہرا دے اس مقام کا نام منافقت ہے اور یہ ایمان والوں کی دنیا سے خارج ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بابت تاریخ کا بیان ہے کہ آپؐ ادنیٰ ادنیٰ تکلیف یا ناگواری کے موقع پر بھی یہ کلمہ زبان پر لاتے رہتے تھے اور یہی معمول آپؐ کے صحابیوںؓ کا رہا ہے۔

رَاجِعُوْن۔ سے یہ مراد نہیں کہ انسان ابھی کہیں اور ہے، اور پھر کسی ایسے مقام یا جہت میں آجائے گا جہاں خدا ہے، خدا کے پاس تو وہ اب بھی ہے، مراد یہ ہے کہ عالم آخرت میں جس طرح اللہ کی ملکیت وربوبیت سارے ظاہری اسباب کے ٹوٹ جانے سے بالکل واضح ونمایاں ہوجائے گی، اُسی طرح یہ خدا ہی کی طرف رجوع بالکل آشکار ہو کر رہے گا، درمیانی واسطے سب غائب ہو کر رہیں گے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ کلمۂ استرجاع تمام مصیبتوں کا علاج ہے، اور انھیں میں قبض بھی داخل ہے جو سالکوں کو اکثر پیش آتا رہتا ہے۔

۵۷۳ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

اور واقعی ان سے بڑھ کر عبودیت کے تقاضوں کو پورا کرنے والا اور ہو کون سکتا ہے کہ عین نزولِ

## اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ

**صفا و مروہ بے شک اللہ کی یادگاروں میں سے ہیں ۵۷۴**

مصیبت کے وقت بھی ان حقیقتوں سے غافل نہ ہوئے کہ ہم بندے ہیں اپنے مالک نہیں بلکہ اللہ کے مملوک ہیں، ہماری جان، ہمارا مال، ہماری بیوی بچے سب اسی کی ملک اور اُس کے عطیہ ہیں، وہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ کر رہا ہے ہر طرح ہمارے حق میں بہتر ہی ہے، ہم کو پلٹ کر بس اسی کے پاس جانا ہے اور اُسی سے ہمارا آخری سابقہ پڑنے والا ہے۔

اوپر کی آیت میں صابرین کے حق میں جس خوشخبری کا ذکر تھا، یہ سب اُسی کا بیان ہو رہا ہے۔

عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ. یعنی یہ لوگ عنایتِ خاصہ کے مورد ہوں گے، ہر شخص اپنے اپنے درجہ کے تناسب۔

وَرَحْمَةٌ ۚ یعنی یہ لوگ رحمتِ عام کے مورد رہیں گے، اور کوئی ان نعمتوں کی حد و نہایت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

وَهِيَ النِّعْمَةُ الَّتِي لَا يَعْلَمُ مَقَادِيْرَهَا اِلَّا اللّٰهُ تَعَالٰى۔ (جصاص)

هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ دنیا میں ان کی رسائی اس حقیقت تک ہو چکی تھی کہ کوئی چیز بھی اپنی نہیں، یہاں تک کہ خود اُن کے جسم و جان، نفس و روح کا مالک حق تعالیٰ ہی ہے، چنانچہ جب یہ اُس کے پاس پہونچیں گے تو سب ہی کچھ پالیں گے، اور جس نے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ و خاصہ کو پالیا، اُس سے دنیا اور آخرت کی بچی ہی کون سی نعمت؟

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَائِزُوْنَ بِمَطَالِبِهِمِ الدِّيْنِيَّةِ وَالدُّنْيَوِيَّةِ فَاِنَّ مَنْ نَالَ تَزْكِيَةَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَرَحْمَتَهٗ لَمْ يَفُتْهُ مَطْلَبٌ۔ (روح)

عوامی زبان میں اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ کا ترجمہ ہوگا "بس یہی لوگ تو پہونچے ہوئے ہیں"۔

**۵۷۴** (نہ کہ دیوی دیوتاؤں کی یادگاروں میں سے)

الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ۔ کسی زمانہ میں مسجد الحرام کے پاس دو پہاڑیاں تھیں، اب معمولی بلندیاں محض چٹان کی سی رہ گئی ہیں، صفا حرم شریف کی داہنی جانب ہے، اور مروہ بائیں جانب، دونوں کے درمیان فاصلہ ۴۹۳ قدم کا ہے، یا تقریباً ۱/۴ فرلانگ۔

جاہلیت کے زمانہ میں ان دونوں پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہو گئی تھی، جس کی پوجا ہوتی تھی۔

قَالَ الشَّعْبِيُّ كَانَ عَلَى الصَّفَا صَنَمٌ فِي الْجَاهِلِيَّةِ يُسَمّٰى اِسَافًا وَعَلَى الْمَرْوَةِ صَنَمٌ يُسَمّٰى نَائِلَةُ (قرطبی)

ذَكَرَ مُحَمَّدُ بْنُ اِسْحَاقَ فِي كِتَابِ السِّيْرَةِ .... فَكَانَ مَنْ طَافَ بِالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ يَسْتَلِمُهُمَا۔ (ابن کثیر)

صفا کے لغوی معنی صاف پتھر یا خالص چٹان کے ہیں، اور مروہ کے بھی لفظی معنی سفید نرم پتھر کے ہیں۔

اَلصَّفَا الْحِجَارَةُ الصَّافِيَةُ (راغب) قَالَ الْمُبَرِّدُ وَهُوَ كُلُّ حَجَرٍ لَا يُخَالِطُهٗ غَيْرُهٗ مِنْ طِيْنٍ اَوْ تُرَابٍ (روح) اَلْمَرْوَةُ فِي الْاَصْلِ الْحَجَرُ الْاَبْيَضُ۔ (روح)

حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ حضرت ہاجرہؑ حضرت اسماعیلؑ کو شیرخوارگی کے زمانہ میں خانۂ کعبہ کے پاس پیاسا اور تنہا چھوڑ کر اسی تلاش میں نکلی تھیں کہ کہیں کوئی قافلہ آتا جاتا نظر آجائے، تو اُس سے پانی ہاتھ آئے، اور اسی اضطراب میں دوڑ کر اس پہاڑی سے اُس پہاڑی پر جاتی تھیں کہ شاید بلندی سے کسی قافلہ پر نظر پڑ جائے۔

شَعَآئِرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے دین کی نشانیاں یا علامتیں، دینِ الٰہی کے وہ شعائر جو طاعتوں میں بطورِ علَم کام دیں۔

# فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ

سو جو کوئی بیت (اللہ) کا حج کرے یا عمرہ کرے ۵۷۵ اس پر (ذرا بھی) گناہ نہیں کہ اُن دونوں کے درمیان آمد و رفت کرے ۵۷۶

شَعَائِرُ جمع ہے شَعِيْرَةٌ کی اور اس کے معنی ہیں علامت کے۔

جمع شعيرة وهي العلامة (مدارك) اى اعلام طاعة وكل شيء جعل علما من اعلام طاعة الله فهو من شعائر الله (كبير) هى العلائم التى ندب الله اليها وامر بالقيام بها (بحر عن الزهرى) المتعبدات التى اشعرها الله تعالى اى جعلها اعلاما للناس من الموقف والسعى والنحر والشعار العلامة (قرطبى)

اصطلاح میں مراد مناسکِ حج کی علامتیں ہیں۔

اى من اعلام مناسكه ومتعبداته (مدارك) من معالم الله فى الحج (ابن العربى) اى من معالمه ومواضع عباداته (قرطبى)

۵۷۵ حَجَّ الْبَيْتَ۔ حج عبادتِ اسلامی کا چوتھا رکن یا نماز، روزہ، زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ۔ لفظی معنی قصد کے ہیں، اب اصطلاح میں یہ خانۂ کعبہ کی سالانہ زیارت متعین قاعدوں کے مطابق و ماتحت کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔

اى قصد واصل الحج القصد ثم اختص هذا الاسم بالقصد الى البيت الحرام لافعال مخصوصة (قرطبى) اصل الحج القصد للزيارة ... خص فى تعارف الشرع بقصد بيت الله تعالى اقامة للنسك (راغب)

حج اُمت کے ہر فرد پر خواہ دنیا کے کسی علاقہ کا باشندہ ہو بشرطِ استطاعت وصحت وامنِ راہ، عمر میں ایک بار فرض ہے، گویا دنیائے اسلام کی بین الاقوامی سالانہ کانگرس، ارکانِ حج میں جو چیزیں فرض ہیں وہ تین ہیں (۱) پوشش احرام یعنی حدودِ حرم میں داخلہ سے پہلے عام لباس اُتار کر احرام یا بے سلا ہوا لباس پہن لینا (۲) میدانِ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاضری، اصطلاح میں اُسے وقوف کہتے ہیں (۳) طوافِ زیارت یعنی وقوف کے بعد خانۂ کعبہ کا طواف۔ اور واجباتِ حج چار ہیں (۱) ۹، ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں مزدلفہ میں قیام (۲) صفا و مروہ کے درمیان آمد و رفت، اصطلاحی نام سعی ہے (۳) مزدلفہ کے قیام کے بعد منیٰ میں کنکریاں پھینکنا، اصطلاحی نام رمی جمرات ہے، (۴) طوافِ کعبہ (یہ طواف فرض کے علاوہ اور طوافِ صدر کہلاتا ہے) قربانی کرنا، سر کے بال اُتروانا وغیرہا بہت سے سنن و مستحبات ان کے علاوہ ہیں۔

اَوِ اعْتَمَرَ۔ عمرہ یا حجِ اصغر لفظی معنی زیارت کے ہیں، شریعت میں اصطلاح زیارت بیت اللہ کے لئے بن گئی ہے بلا قیدِ وقت و تاریخ۔

الاعتمار والعمرة الزيارة التى فيها عمارة الود وجعل فى الشريعة للقصد المخصوص (راغب) وهى العمرة الحج الاصغر (راغب۔ تحت الحج) اعتمر اى زار والعمرة الزيارة۔ (قرطبى)

اس میں حج کی طرح مہینہ اور تاریخ کی قید نہیں اور نہ اس میں وقوفِ عرفات ہے، اور نہ قیام مزدلفہ ومنیٰ، سال کے ہر موسم میں اور ہر وقت ہو سکتا ہے، عمرہ کی نیت سے احرام حدودِ حرم سے باہر باندھے، طوافِ کعبہ اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کر کے بال اُتروائے بس عمرہ ہوگیا احرام کھول دے۔

۵۷۶ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ۔ صفا و مروہ کو نسبت تو توحید کے خاص الخاص گھرانے سے حاصل تھی یعنی ہاجرہ

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ (١٥٨)

اور جو کوئی خوشی سے کوئی امر خیر کرے سو اللہ تو بڑا قدردان ہے بڑا علم رکھنے والا ہے ۵۷۷

اور اسماعیل اور ابراہیم علیہم السلام سے ہے، لیکن زمانۂ جاہلیت میں قبضہ ان پر بھی مشرکوں کا ہو گیا تھا، اور ایک ایک پہاڑی پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہو گئی تھی، بعض مشرک قبیلے تبرک کرتے جاتے تو انھیں بھی دوڑ دوڑ کر چھوتے اور چومتے، قرن اول کے مسلمانوں صحابیوں کی توحید پرستی اور شرک بیزاری کا کیا پوچھنا، قدرۃً خیال گزرا کہ کہیں ان پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت شعائر شرک میں نہ قرار پائے آیت میں انھیں کا شبہہ دور کیا گیا ہے، اور ارشاد ہوا ہے کہ یہ جاہلیت کی نہیں عین توحید کی یادگاریں ہیں، اس لئے اگر ان کے درمیان آمد و رفت اسلامی و توحیدی حج کا جزو رکھی جائیں تو اس میں مطلق مضائقہ نہیں۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ عَلَى الصَّفَا تَمَاثِيلُ وَأَصْنَامٌ وَكَانَ الْمُسْلِمُونَ لَا يَطُوفُونَ عَلَيْهَا لِأَجْلِ الْأَصْنَامِ (جصاص)

يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ طوف کے اصلی معنی کسی چیز کے گرد گھومنے یا چکر کاٹنے کے ہیں، لیکن وسعت دے کر اس کے معنی مطلق آس پاس جانے کے بھی کئے گئے ہیں، اور یہاں مراد دو مقاموں کے درمیان آمد و رفت سے ہے۔

اَلطَّوْفُ الْمَشْيُ حَوْلَ الشَّيْءِ (راغب) وَالْمُرَادُ هُنَا السَّعْيُ بَيْنَهُمَا۔ (مدارک)

یہ سعی صفا و مروہ کے درمیان حنفیہ کے ہاں واجب ہے، امام احمدؒ کے ہاں سنّت ہے، اور مالکیہ و شافعیہ کے ہاں فرض ہے، یہ آمد و رفت سات بار ہوتی ہے، درمیان کا کچھ فاصلہ تقریباً دو فرلانگ دوڑ کر چلنا ہوتا ہے اسی لئے اس کا نام سعی (دوڑ) ہے اس فاصلہ کی علامت کے طور پر سڑک کے کنارے دو پتھر سبز رنگ کے نصب کر دیئے گئے ہیں، کسی زمانہ میں یہاں بالکل ویرانہ تھا لیکن اب تو عین بازار ہے اور صفا و مروہ کے درمیان خوب آبادی اور چہل پہل رہتی ہے۔

۵۷۷ (اس لئے اس کے ہاں نہ اعزاز و اکرام کی کمی کسی نیک کار کے لئے ہوگی، اور نہ وہ کسی کے اخلاصِ عمل سے ناواقف ہے)

تَطَوَّعَ۔ تطوّع۔ ہر وہ چیز ہے فرض کے علاوہ جو انسان اپنی خوشی سے انجام دے۔

خَيْرًا۔ خیر عام معنی میں ہے، ہر عملِ خیر کو شامل۔

اَلْمُرَادُ مِنْهُ جَمِيعُ الطَّاعَاتِ۔ (کبیر عن الحسن) وَهٰذَا اَوْلٰى لِاَنَّهٗ اَوْفَقُ لِعُمُوْمِ اللَّفْظِ (کبیر)

مطلب یہ کہ کوئی سا بھی نیک کام ہو کسی نوعیت اور کسی درجہ کا جو بھی انسان خوشی سے انجام دے گا اس کا اجر اُسے مل کر رہے گا۔

شَاكِرٌ۔ شکر کا لفظ جب اللہ کے لئے آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندہ کی تھوڑی سی طاعت پر معاوضہ بہت زائد دیتا ہے۔

اَلشُّكْرُ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى اَنْ يُّعْطِيَ لِعَبْدِهٖ فَوْقَ مَا يَسْتَحِقُّهٗ يَشْكُرُ الْيَسِيْرَ وَيُعْطِي الْكَثِيْرَ (معالم)

عَلِيْمٌ۔ یعنی نیتوں تک سے واقف۔ علیم پر حاشیہ گزر چکا ہے۔

عَلِيْمٌ بِنِيَّتِهٖ (معالم)

ابھی ایک ہی آیت اوپر ذکر فضائل صبر کا ہو رہا تھا، اس کے معاً بعد ذکر حج کا شروع ہو جانا، علاوہ اور بہت کی

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس چیز کو جو ہم کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کر چکے ہیں، بعد اس کے کہ ہم

بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ

اسے لوگوں کے لئے کتاب (الٰہی) میں کھول چکے ہیں ۵۷۸

حکمتوں اور مصلحتوں کے ایک خاص مناسبت بھی صبر سے رکھتا ہے، ان سطور کے راقم نامہ سیاہ کا ذاتی تجربہ ہے کہ موسم حج کے ہجوم و چقلش اور مسلسل کوچ و مقام میں فرائض تک کی پابندی مشکل پڑجاتی ہے سُنن و مستحبات کا کیا ذکر ہے، اشتعال کے باوجود زبان پر قابو رکھئے، ہاتھ پیر پر قابو رکھئے، کان اور آنکھ پر قابو رکھئے، غرض صبر کا پورا امتحان ہو جاتا ہے۔

۵۷۸ یعنی کتب سابق کے مضامین اور پیش گوئیوں کو دانستہ چھپاتے ہیں، مراد یہود و نصاریٰ ہیں، اور اس پر ابن عباس صحابیؓ اور مشاہیر تابعین سب کا اتفاق ہے۔

نَزَلَتْ فِي أَهْلِ الْكِتَابِ مِنَ الْيَهُودِ وَالنَّصَارَىٰ (کبیر عن ابن عباس والمجاہد والحسن وقتادہ والربیع والسدّی والاصم) الْأَقْرَبُ أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الْيَهُودِ وَالْحُكْمُ عَامٌّ (روح)

يَكْتُمُونَ ۔ اور حق پوشی بھی اس غضب کی کہ محض سکوت پر کفایت نہیں کرتے، بلکہ اُلٹی حق کے مخالف شہادت دے گزرتے ہیں، کتمان کا اطلاق اس اخفاء پر ہوتا ہے جو قصداً کیا جائے اور اس موقع پر جہاں اظہار ضروری ہو۔

الْكِتْمَانُ تَرْكُ إِظْهَارِ الشَّيْءِ قَصْدًا مَعَ مَسَاسِ الْحَاجَةِ إِلَيْهِ (روح)

الْبَيِّنَاتُ وَالْهُدَىٰ ۔ بیّنات وہ نشانیاں ہیں جو بجائے خود واضح و صریح ہیں، الہدیٰ وہ ہے جو دوسروں کے لئے ذریعۂ ہدایت بن سکے، یہاں بیّنات سے مراد رسالتِ محمدیؐ کے دلائل و شواہد ہیں اور ہدیٰ سے مراد احکام شریعت ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اَلْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ کے عموم میں منصوص و مستنبط دونوں قسم کے احکام آگئے۔

يَعُمُّ الْمَنْصُوصَ عَلَيْهِ وَالْمُسْتَنْبَطَ لِشُمُولِ اسْمِ الْهُدَىٰ لِلْجَمِيعِ (قرطبی) وَذَٰلِكَ يَشْمَلُ عَلَىٰ سَائِرِ أَحْكَامِ اللَّهِ فِي الْمَنْصُوصِ عَلَيْهِ وَالْمُسْتَنْبَطِ لِشُمُولِ اسْمِ الْهُدَىٰ لِلْجَمِيعِ (جصاص)

اور فقہاء مفسرین نے یہیں سے یہ بھی نکالا ہے کہ چونکہ عدم کتمان یعنی بیان اس قول کا واجب ہے جس کا قبول واجب ہے اس لئے خبرِ احاد بھی واجب العمل ہے۔

وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَىٰ وُجُوبِ الْعَمَلِ بِقَوْلِ الْوَاحِدِ لِأَنَّهُ لَا يَجِبُ عَلَيْهِ الْبَيَانُ إِلَّا وَقَدْ وَجَبَ قَبُولُ قَوْلِهِ (قرطبی) عَامٌّ فِي الْجَمِيعِ وَكَذَٰلِكَ مَا عُلِمَ مِنْ طُرُقِ أَخْبَارِ الرَّسُولِ قَدِ انْطَوَتْ تَحْتَ الْآيَةِ لِأَنَّ فِي الْكِتَابِ الدَّلَالَةَ عَلَىٰ قَبُولِ أَخْبَارِ الْآحَادِ وَعَنْهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَكُلُّ مَا اقْتَضَى الْكِتَابُ إِيجَابَ حُكْمِهِ مِنْ جِهَةِ النَّصِّ فَقَدْ تَنَاوَلَتْهُ الْآيَةُ (جصاص) وَيُحْتَجُّ بِهَٰذِهِ الْآيَاتِ فِي قَبُولِ الْأَخْبَارِ الْمُقَصِّرَةِ عَنْ مَرْتَبَةِ إِيجَابِ الْعِلْمِ لِمُخْبِرِهَا فِي أُمُورِ الدِّينِ (جصاص)

اور علوم دین پر اُجرت لینے کے عدم جواز پر بھی اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

وَفِي الْآيَةِ حُكْمٌ آخَرُ وَهُوَ أَنَّهَا مِنْ حَيْثُ دَلَّتْ عَلَىٰ لُزُومِ إِظْهَارِ الْعِلْمِ وَتَرْكِ كِتْمَانِهِ فَهِيَ دَالَّةٌ عَلَىٰ

أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا

یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر لعنت کرتا ہے اور اُن پر لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں ۵۷۹ البتہ جو لوگ توبہ کرلیں ۵۸۰

وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾

اور درست ہوجائیں ۵۸۱ اور ظاہر کردیں ۵۸۲ یہ وہ لوگ ہیں کہ میں اُن پر متوجہ ہوجاؤں گا رحمت سے ۵۸۳ اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا رحمت والا ہوں ۵۸۴

اِمْتِنَاعِ جَوَازِ أَخْذِ الْأُجْرَةِ عَلَيْهِ فَثَبَتَ بِذٰلِكَ بُطْلَانُ الْإِجَارَةِ عَلٰى تَعْلِيْمِ الْقُرْاٰنِ وَسَائِرِ عُلُوْمِ الدِّيْنِ (جصاص)

بَيَّنّٰهُ میں ہٗ کی ضمیر مَا اَنْزَلْنَا کی طرف ہے، یعنی اُس مضمون کو، اس مفہوم کو۔

وَالْكِنَايَةُ فِيْ بَيَّنّٰهُ تَرْجِعُ اِلٰى مَا اُنْزِلَ مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى۔ (قرطبی)

اَلْكِتٰبُ سے مُراد جنس کتاب یعنی قدیم کتب آسمانی۔

وَالْكِتٰبُ اِسْمُ جِنْسٍ فَالْمُرَادُ جَمِيْعُ الْكُتُبِ الْمُنَزَّلَةِ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ایسے شخص کی مذمت ہے جو اپنے مُریدوں کے سوا دوسروں سے علومِ شریعت کو چھپاتا ہے کہ یہ علوم مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کے عموم میں داخل ہیں، البتہ علوم مکاشفہ کا حکم دوسرا ہے، وہ منزل نہیں بلکہ بعض اوقات ان کے اظہار میں خوف فتنہ بھی ہے۔

۵۷۹ (خواہ لعنت کرنے والے جنس آدم سے ہوں یا جنّات ہوں یا ملائکہ ہوں یا اور کوئی مخلوق ہوں)

لَعْنَة پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے، اللہ کی لعنت یہ ہے کہ وہ اُن لوگوں کو اپنے سے دُور اور اپنے فضل وکرم سے مہجور کردیتا ہے

اَیْ یُبْعِدُهُمْ عَنْ رَحْمَتِهٖ (روح) وَذٰلِكَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى فِي الْاٰخِرَةِ عُقُوْبَتُهٗ وَفِي الدُّنْيَا انْقِطَاعٌ مِنْ قُبُوْلِ رَحْمَتِهٖ وَتَوْفِيْقِهٖ۔ (راغب)

مخلوق کی لعنت یہ ہے کہ ان بدکاروں کے لئے بددعا کی جائے، ان کے لئے حق تعالیٰ کی رحمت سے دُوری اور اُس کے فضل وکرم سے مہجوری طلب کی جائے۔

وَمِنَ الْاِنْسَانِ دُعَاءٌ عَلٰى غَيْرِهٖ (راغب) بِمَعْنَى الدُّعَاءِ عَلَيْهِمْ بِالْاِبْعَادِ عَنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (روح)

لفظ لعنت قدیم صحیفوں کا بھی چلا ہوا محاورہ ہے، ملاحظہ ہوں توریت میں استثناء ۱۱: ۲۶ و ۲۷ نیز ۸: ۱۵-۲۱ وغیرہ اور انجیل میں مرقس ۱۱: ۲۱۔ یوحنا ۷: ۴۹ وغیرہ۔

فقہاء نے آیت ماقبل سے استدلال کیا ہے کہ عالم پر تبلیغ حق اور اپنے علم کا بیان واجب ہے۔

اِسْتَدَلَّ بِهَا عُلَمَاؤُنَا عَلٰى وُجُوْبِ تَبْلِيْغِ الْحَقِّ وَبَيَانِ الْعِلْمِ عَلَى الْجُمْلَةِ۔ (ابن العربی)

۵۸۰ (اپنے پچھلے جرائم سے)

توبہ کرنے سے مُراد باز آنا، نادم ہونا، اور عزمِ ترک کے ساتھ عذر خواہی کرنا ہے۔

۵۸۱ یعنی آئندہ کے لئے اپنی اصلاح حال کرلیں۔

۵۸۲ (اپنی آسمانی کتابوں کے اُن مضامین کو جنھیں وہ اب تک چھپاتے رہے ہیں)

یہاں مُراد ہیں اسلام وپیمبرِ اسلام سے متعلق پچھلے صحیفوں میں پیش خبریاں، خلاصہ یہ کہ یہ مجرم اگر ماضی پر نادم ہوکر

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ

بے شک جو لوگ کفر کرتے ہیں اور مرجائیں اسی حال میں کہ وہ کافر ہیں، سو یہ وہی لوگ ہیں کہ ان پر لعنت ہے

وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾

اللہ کی، اور فرشتوں کی اور آدمیوں کی سب کی ۵۸۵

اب بھی ایمان لے آئیں، اور تلافیٔ مافات پر آمادہ ہو جائیں۔

۵۸۳ یعنی یہ تائبین نہ صرف لعنت کی زد سے باہر ہو جاتے ہیں، بلکہ رحمت و مغفرتِ الٰہی کے تحت بھی آجاتے ہیں، البتہ جو لوگ اپنی انھیں بدکرداریوں پر اصرار رکھتے ہیں اُن پر سزا ابھی قائم رہتی ہے۔

وَأَمَّا الَّذِينَ مَاتُوا عَلَى الْكِتْمَانِ وَلَمْ يَتُوبُوا عَنْهُ فَقَدِ اسْتَقَرَّتْ عَلَيْهِمُ اللَّعْنَةُ وَلَمْ تَزَلْ عَنْهُمْ (روح)

أَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا۔ توبہ و قبول توبہ کا مضمون قرآن مجید میں بار بار آیا ہے، یہاں توبہ کے ساتھ قید اصلاح اور تبیین کی لگی ہوئی ہے یعنی جو فساد پھیلایا تھا اُس کی اصلاح اور جو چھپایا تھا اس کا اظہار۔ محققین نے لکھا ہے کہ جن گناہوں سے صرف حقوق اللہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے مثلاً نماز یا روزہ کا ترک اُن کے لئے محض توبہ و استغفار کافی ہے کہ اس کا تعلق صفات رحمانیت و رحیمیت سے ہے، لیکن جن گناہوں سے بندوں کی حق تلفی لازم آتی ہے مثلاً قتل، چوری، رشوت، غصب، فساد، بدامنی، سُود خواری، عقائدِ باطلہ کا اعلان، اُن کے لئے ضروری ہے کہ ہر متعین معصیت کے ضرر کا عملی تدارک بھی بقدر امکان کرے جب جا کر توبہ قبول ہوگی کہ یہاں واسطہ حق تعالیٰ کی صفت عدل سے ہے۔

۵۸۴ قرآن مجید کا بار بار صفت رحیمی اور قبول توبہ پر زور دینا ایک طرف اُن گمراہ قوموں (مثلاً بودھ مت والوں) کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ قانون مکافاتِ عمل (ہندی اصطلاح میں "کرم") بہرحال اور ہر صورت میں اپنا عمل کرکے رہتا ہے، اور کوئی خدائی قوت اس پر غالب نہیں آسکتی اور دوسری طرف اُن گمراہ قوموں (مثلاً مسیحیوں) کے مقابلہ میں ہے جو سمجھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ صفت رحیمی کا اظہار پوری طرح کر ہی نہیں سکتا، اور اس کی صفتِ عدل کے تقاضہ کو پورا کرنے اور گنہگاروں کو معافی دلوانے کے لئے کسی کفّارہ کا وجود لازمی ہے۔

۵۸۵ أَجْمَعِينَ کا لفظ تاکید کے لئے آیا ہے، اور اس کا تعلق اللہ اور ملائکہ اور الناس تینوں سے ہے محض الناس سے نہیں

وَأَجْمَعِينَ تَأْكِيدٌ بِالنِّسْبَةِ إِلَى الْكُلِّ لَا لِلنَّاسِ فَقَطْ۔ (روح)

لَعْنَةُ اللَّهِ۔ اہلسنت کے ہاں کسی متعین گنہگار پر لعنت کرنا ہرگز جائز نہیں، البتہ بغیر کسی کو متعین کئے ہوئے مبہم و مطلق صورت میں جائز ہے، مثلاً یہ کہ چور پر لعنت ہو۔

فَأَمَّا الْعَاصِي الْمُعَيَّنُ فَلَا يَجُوزُ لَعْنُهُ اتِّفَاقًا وَأَمَّا لَعْنُ الْعَاصِي مُطْلَقًا يَجُوزُ إِجْمَاعًا (ابن العربی)

وَذَكَرَ ابْنُ الْعَرَبِيِّ الِاتِّفَاقَ عَلَى أَنَّهُ لَا يَجُوزُ لَعْنُ الْعَاصِي وَالْمُتَجَاهِرِ بِالْكَبَائِرِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ (بحر)

بلکہ حدیث صحیح میں تو مومن پر لعنت اُس کے قتل کے مثل بتائی گئی ہے۔

وَفِي صَحِيحِ مُسْلِمٍ لَعْنُ الْمُؤْمِنِ كَقَتْلِهِ (ابن العربی)

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

وہ اس میں پڑے رہنے والے ہیں ۵۸۶؎ کہ نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہونے پائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ۵۸۷؎

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع ۱۹ ۱۱ ۲

اور تمہارا خدا ایک خدا ہے بجز اس کے کوئی خدا نہیں ۵۸۸؎ بے انتہا رحم و کرم کرنے والا، بار بار رحم کرنے والا ۵۸۹؎

وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ۔ بلکہ زندگی میں تو کافرِ متعین تک پر بھی لعنت کی اجازت نہیں وَمَاتُوْا کی قید نے صاف کر دیا کہ یہاں جن پر لعنت آئی ہے اُن کی موت ہی کفر پر ہو چکی تھی اور اصل مدار ختمِ اعمال یا وفات پر ہے۔

قَالَ لِيْ كَثِيْرٌ مِنْ اَشْيَاخِيْ اَنَّ الْكَافِرَ الْمُعَيَّنَ لَا يَجُوْزُ لَعْنُهٗ لِاَنَّ حَالَهٗ عِنْدَ الْمُوَافَاةِ لَا تُعْلَمُ (ابن العربی) وَقَدْ شَرَطَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ فِيْ اِطْلَاقِ اللَّعْنَةِ الْمُوَافَاةَ عَلَى الْكُفْرِ (ابن العربی) وَجُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ عَلٰى جَوَازِ لَعْنِ الْكُفَّارِ جُمْلَةً مِنْ غَيْرِ تَعْيِيْنٍ.... وَاَمَّا الْكَافِرُ فَجُمْهُوْرُ الْعُلَمَاءِ عَلٰى اَنَّهٗ لَا يَجُوْزُ لَعْنُهٗ (بحر) فَاَمَّا الْكَافِرُ الْمُعَيَّنُ فَقَدْ ذَهَبَ جَمَاعَةٌ مِنَ الْعُلَمَاءِ اِلٰى اَنَّهٗ لَا يُلْعَنُ لِاَنَّا لَا نَدْرِيْ بِمَا يَخْتِمُ اللّٰهُ لَهٗ۔ (ابن کثیر)

عبرت حاصل کرنا چاہیے اُن مسلمانوں کو جو اپنے کسی بھائی کو لغزش میں مبتلا دیکھ کر اس پر لعنت بھیجنے لگتے ہیں۔

۵۸۶؎ (ہمیشہ ہمیش کے لئے)

خٰلِدِيْنَ۔ خُلُوْد کے معنی ہیں لازم پکڑ لینے کے یعنی اسی لعنت و عذاب میں جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

اَلْخُلُوْدُ اللُّزُوْمُ الطَّوِيْلُ وَمِنْهُ يُقَالُ اَخْلَدَ اِلٰى كَذَا اَيْ لَزِمَهٗ وَرَكَنَ اِلَيْهِ۔ (کبیر)

فِيْهَا میں ضمیر دوزخ کی طرف ہے اور بعض نے لعنت کی طرف راجح کی ہے مقصود ہر صورت میں ایک ہی ہے۔

اَيْ فِي اللَّعْنَةِ اَوِ النَّارِ (بیضاوی۔ مدارک) يَعْنِيْ فِي اللَّعْنَةِ اَيْ فِيْ جَزَائِهَا وَقِيْلَ خُلُوْدُهُمْ فِي اللَّعْنَةِ اِنَّهَا مُؤَبَّدَةٌ عَلَيْهِمْ۔ (قرطبی)

اور بجائے اسم کے ضمیر لانے سے مقصود اظہارِ عظمت و اہمیت ہے۔

اَنَّهَا اُضْمِرَتْ تَفْخِيْمًا لِشَاْنِهَا وَتَهْوِيْلًا۔ (کشاف)

۵۸۷؎ تخفیف کا تعلق بعد عذاب سے ہے اور مہلت کا تعلق قبل عذاب سے یعنی دوزخ میں پڑنے کے بعد نہ کسی قسم کی تخفیف ان کے عذاب میں ہوگی اور نہ عذاب میں پڑنے سے قبل ہی کوئی مہلت انہیں ملے گی۔

۵۸۸؎ (نہ بڑا نہ چھوٹا، نہ ملکی نہ غیر ملکی)

یہاں خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے نفس وجود باری تو مشرکین عرب کو بھی تسلیم تھا جس طرح آج بھی ساری مشرک قوموں کو تسلیم ہے لیکن مشرکین علاوہ اُس خدائے عظیم یا خدائے بزرگ کے اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا یا دیوتا تسلیم کرتے ہیں بلکہ مشرکین قدیم تو اپنی قوم کے علاوہ دوسری قوموں کے یہاں تک کہ اپنی دشمن قوموں کے بھی دیوتاؤں کے وجود کے قائل تھے ان کی قوت کے قائل تھے ان کی خدائی کے قائل تھے بس صرف اُن کی عبادت کے منکر تھے اور اس کی توجیہ یہ کرتے تھے کہ دشمن کا دیوتا بھی دشمن ہی ہوگا۔ گویا خدا بھی جذبات و احساسات کے لحاظ سے انسان کا

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے اُدل بدل میں اور جہازوں کے چلنے میں جو

الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ

سمندر میں اُن چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہونچاتی ہیں، اور (اس) پانی میں جسے اللہ نے آسمان

مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ

سے اُتارا پھر اُس سے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد جلا اُٹھایا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے اور

وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

ہواؤں کے بدلنے میں، اور بادل میں (جو) آسمانوں اور زمین کے درمیان مُقیّد ہے (ان سب میں) اُن لوگوں

لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

کے لئے جو عقل رکھتے ہیں نشانیاں موجود ہیں ۵۹۰

مُنتفی ہوتا ہے، قرآن نے آکر اس عقیدہ پر بھی ضرب کاری لگائی، اور دعوے سے بار بار اعلان کیا کہ قابل پرستش وناقابل پرستش ہونا کیسا، کسی دوسرے خدا یا دیوتا کا وجود ہی سرے سے نہیں نہ بڑے کا نہ چھوٹے کا، نہ ملکی کا نہ غیر ملکی کا! اور اللہ کے ساتھ شریک کا وجود محض وہم انسانی کی ایک اختراع ہے! ہمارے قدیم مفسرین بھی بغیر جدید علم الاقوام (انتھراپولوجی) کی کسی تحقیق کے اس نکتہ تک پہونچ گئے تھے۔

إِزَاحَةً لِأَنْ يُتَوَهَّمَ أَنَّ فِي الْوُجُودِ إِلٰهًا وَلٰكِنْ لَا يَسْتَحِقُّ مِنْهُمُ الْعِبَادَةَ۔ (بیضاوی)

خدائے واحد کے وجود کا دعوے اور تمام دوسرے خداؤں سے انکار اس شدومد سے اُس قوم کے سامنے کیا جا رہا ہے جس کے دو چار نہیں۔ ۳۶۰ بُت اس کے سب سے بڑے مندر میں موجود تھے۔

وَكَانَ لِلْمُشْرِكِينَ ثَلَاثُ مِائَةٍ وَسِتُّونَ صَنَمًا۔ (قرطبی)

۵۸۹ یعنی مظہر کامل رحمانیت کا بھی اور رحیمیت کا بھی دونوں صفتیں اُسی پر ختم ہیں، کوئی اس کا شریک نہ اِس صفت میں اور نہ اُس صفت میں۔

۵۹۰ (اللہ کی حکمت و ربوبیت، قدرت، صنّاعی اور اس کی فردیت کی)

زمین و آسمان کے یہ سارے کارخانے، جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز، اور انسانی سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہیں، بجائے خود اس کی دلیل ہیں کہ نہ یہ اپنے آپ وجود میں آسکتے ہیں نہ باقی رہ سکتے ہیں جب تک کوئی صاحب شعور صاحب ارادہ قادر مطلق ہستی اُن کی صانع و خالق نہ ہو ان سارے مظاہر فطرت کا تسلسل و استمرار ان کی یک رنگی

وباقاعدگی ان کا نظم وانضباط، ہر عقل سلیم کو مجبور کررہے ہیں کہ اُن کے عقب میں ایک ذی اختیار فعّال کا ہاتھ تسلیم کیا جائے، اُسی عقل سلیم کو جو ایک معمولی سی گھڑی کو بھی بغیر کسی ماہر فن اور صنّاع گھڑی ساز کے تسلیم کرنے سے انکار کردیتی ہے۔ یہ خلّاق ہستیاں اگر بہ صیغۂ جمع یعنی ایک سے زائد فرض کی جائیں، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک خالق ان سارے امور کے لئے کافی نہ تھا، اس سے اس کا عجز ثابت ہوا، اور جو عاجز یا کسی بات میں ناقص ہے، وہ خالق نہیں ہوسکتا، اس لئے اگر کسی کی ربوبیت اور خالقیت پر اعتقاد ہے تو اسے لامحالہ واحد ویکتا بھی ماننا پڑے گا۔

خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آسمان ہوں یا زمین، سب مخلوق ہی ہیں، غیر مخلوق یا خود آفریدہ کوئی نہیں، مشرک قوموں نے انھیں معبود مانا ہے، اور صاحب تصرّف وحاجت روا دیوی دیوتاؤں کی حیثیت سے ان کی پرستش کی ہے، قرآن مجید نے لفظ "خلق" سے ادھر اشارہ کردیا کہ یہ عظیم الشّان موجودات بھی کائنات کے ادنیٰ سے ادنیٰ ذرّہ کی طرح مخلوق ہی ہیں، اور آکاش دیوتا، دھرتی ماتا وغیرہ قسم کے الفاظ نرے بے معنی اور مہمل ہیں۔

اَلَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔ دنیا ایسی مشرک قوموں سے بھی خالی نہیں رہی ہے جنھوں نے رات اور دن کو ذی حیات اور صاحب ارادہ وتصرّف مان کر انھیں دیوی دیوتا کا درجہ دیا ہے، اور ان کی پوجا کی ہے، یہاں ان کے اختلاف (اَدل بَدل) کا ذکر کرکے یہ بتادیا کہ ان کا غیر مخلوق یا خود آفریدہ ہونا الگ رہا، یہ وقت وزمان کے بے حس، بے جان اجزاء تو خود اپنی حرکت تک پر قادر نہیں، قادرِ مطلق ہی اُن میں رات دن اُلٹ پھیر کرتا رہتا ہے۔

اَلْفُلْكُ۔ فلک مرکب بحری۔ واحد وجمع دونوں صیغوں میں آتا ہے۔

وَاِفْرَادُهٗ وَجَمْعُهٗ بِلَفْظٍ وَّاحِدٍ (قرطبی) تَقَعُ عَلَى الْوَاحِدِ وَعَلَى الْجَمْعِ وَهِيَ السَّفِيْنَةُ وَالسُّفُنُ (مجاز)

اور قدیم فقہاء مفسّرین نے اُس کی بھی تصریح کردی ہے کہ بحری سفر عبادت کی غرض سے ہو ... اور تجارت کے لئے ہو ... بہرصورت جائز ہے، اور بحری تجارت کے پُرمنافع ہونے کا اشارہ بھی اس میں شامل ہے۔

فَدَلَّ الْكِتَابُ وَالسُّنَّةُ وَالْمَعْنٰى عَلٰى اِبَاحَةِ رُكُوْبِهٖ لِلْمُتَعَبِّدِيْنَ جَمِيْعًا الْعِبَادَةِ وَالتِّجَارَةِ (قرطبی) دَلَالَةٌ عَلٰى اِبَاحَةِ رُكُوْبِ الْبَحْرِ غَازِيًا وَّتَاجِرًا اَوْ مُبْتَغِيًا لِسَائِرِ الْمَنَافِعِ اِذْ لَمْ يَخُصَّ ضَرْبًا مِّنَ الْمَنَافِعِ دُوْنَ غَيْرِهٖ (جصاص) دَلَّ عَلٰى اِبَاحَةِ رُكُوْبِهَا وَعَلٰى اِبَاحَةِ الْاِكْتِسَابِ وَالتِّجَارَةِ وَعَلَى الْاِنْتِفَاعِ بِاللَّذَّاتِ۔ (کبیر)

ہندوستان میں جب شروع شروع میں ریل نکلی ہے تو دیہاتیوں میں خود اس کی پوجا شروع ہوگئی تھی اور بہت سے "خوش عقیدہ" مشرکوں نے اپنی معبودوں کی فہرست میں ایک "انجن دیوتا" کا بھی اضافہ کرلیا تھا، ایسی ہی وہم پرست قوموں نے اگر کبھی بادبانی جہازوں اور دُخانی کشتیوں کی بھی پوجا کی ہو تو کچھ عجب نہیں، فُلْك کے عموم کے تحت میں اسٹیمر، لائنرز، ڈریڈناٹ ہر قسم کے چھوٹے بڑے جہاز اور آب دوز، تباہ کن ہر قسم کی چھوٹی بڑی کشتیاں، غرض کل بحری سواریاں آگئیں جو اس وقت موجود ہیں یا قیامت تک ایجاد ہوسکیں، سامان جنگ کے لئے یا سامان تجارت کے لئے یا بغرض تفریح۔

مَا يَنْفَعُ النَّاسَ۔ (انسان کو فائدہ پہونچانے والی چیز) کا وصف سب میں عام ومشترک ہے مَا يَنْفَعُ النَّاسَ کے عموم کی وسعت لحاظ رکھنے کے قابل ہے، انسانی نفع ومنفعت کی ہر ممکن قسم اس میں آگئی۔

اَيْ بِالَّذِيْ يَنْفَعُهُمْ مِّنَ التِّجَارَاتِ وَسَائِرِ الْمَآرِبِ الَّتِيْ تَصْلُحُ بِهَا اَحْوَالُهُمْ وَبِرُكُوْبِ الْبَحْرِ تُكْتَسَبُ الْاَرْبَاحُ وَيَنْتَفِعُ مَا يُحْمَلُ اِلَيْهِ الْمَتَاعُ اَيْضًا (قرطبی) لِمَعَايِشِ النَّاسِ وَالْاِنْتِفَاعِ بِمَا عِنْدَ اَهْلِ ذٰلِكَ الْاِقْلِيْمِ وَنَقْلِ هٰذَا اِلٰى

هٰؤُلَاءِ وَمَا عِنْدَ اُولٰئِكَ اِلٰی هٰؤُلَاءِ (ابن کثیر) یَعْنِی رُكُوْبَهَا وَالْحَمْلَ عَلَيْهَا فِی التِّجَارَاتِ وَالْمَكَاسِبِ وَاَنْوَاعِ الْمَطَالِبِ.

امام قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ ایک معترض نے سوال کیا ہے کہ قرآن کی جامعیت کا دعویٰ ہے تو اس میں نمک مرچ وغیرہ کھانے کے مسالوں کا ذکر کہاں ہے؟ جواب یہ ہے کہ مَا یَنْفَعُ النَّاسَ کا عموم ان سب کو شامل ہے۔ (معالم)

مِنَ السَّمَآءِ۔ السماء کا لفظ جیسا کہ اوپر تشریح ہو چکی ہے، بادل، آسمان وغیرہ ہر اوپر والی چیز کے لئے عام ہے، مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ لا کر یہ یاد دلا دیا کہ بارش میں حیات بخشی کی جو قوت ہے، یہ اُسی خدائے واحد وحیات آفریں کی ودیعت کی ہوئی ہے۔

دَآبَّةٍ۔ عام ہے ہر حیوان کے لئے، حیوان پرستی شرک کا ایک جزو اعظم تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے، بابل، مصر، ہندوستان وغیرہ میں گائے، بیل، بندر، لنگور، سانپ، بچھوے وغیرہ کی پوجا برابر ہوا کی ہے۔

السَّحَابِ۔ اسم جنس ہے واحد سحابۃ ہے۔

هُوَ اِسْمُ جِنْسٍ وَاحِدُهٗ سَحَابَةٌ۔ (روح)

زمین اگر ۲۵ ہزار میل کے محیط کا کوئی گولا ہے تو یا اگر غیر پیمائش شدہ وسعت کی کوئی چپٹی چیز ہے تو بھی اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی ہر حال میں اور ہر صورت فرض کرنے کے بعد بھی کیسی عظیم الشان کاریگری کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے! فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے تھامے ہوئے سنبھالے ہوئے ہے؟ اس کے اور چاند، سورج اور ستاروں سیاروں کے درمیان فاصلہ کا ایک خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے؟ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے تعیین کر دی ہے؟ آفتاب سے اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہونچا رہا ہے؟ چاند سے روشنی اور خنکی ایک تعیین حساب کے ساتھ کس کا دست قدرت اس تک لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس، مادی اجسام ہیں تو یا اگر خلا میں محض حد نظر ہیں تو بھی ہر صورت میں ان کی وضع، ساخت، ترکیب، ہیئت انسانی دسترس سے کتنی بالاتر ہے! ان گنتی شمار سے باہر ثوابت وسیارے کے سکون وحرکت کا انتظام کون قائم کئے ہوئے ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع وغروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے؟ نظام فلکی کے بے شمار اجزاء وعناصر میں یہ ترتیب اور باہمی تناسب کس کی حکمت وصنعت کے دم سے زندہ ہے؟ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں؟ گرمی اور سردی اور برسات ہر موسم میں ان کے اندر مناسب وقت تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں ان کے طلوع وظہور کے وقت کیسے بندھے ہوئے ہیں؟ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت کلکتہ میں دن نکلتا ہے، دمشق میں بھی دن نکل آئے نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جائے، جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جون میں وہی باقی رہ جائیں آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون کی زنجیر میں جکڑے ہوئے تغیرات کس کی حکومت قاہرہ اور حکمت کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں؟ بحر ذخار سارے بر اعظموں کو اپنی گرفت میں لئے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چہار چند، اپنی اس ساری عظمت وہیبت کے باوجود کس طرح مشت خاک انسان کے قبضہ میں آ گیا ہے؟ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک ٹھانک کر ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے بڑے مہیب فاصلوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے! اس میں جزر ومد جب ہوگا قمری مہینوں کی فلاں فلاں ہی تاریخوں پر ہوگا، اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا، ایک مخصوص ومتعین ہی وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اوپر تیرائے گا، اور اس کے علاوہ وزن والیوں کو ڈبو دے گا، اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ خاص مزہ ہوگا، کنوؤں کے پانی سے مختلف، دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح سیکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی شریک بنائے ہوئے ہیں ۵۹۱ اُن سے ایسی محبت رکھتے

كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

ہیں جیسی اللہ سے ۵۹۲ (رکھنا چاہئے) اور جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی محبت سب سے قوی رکھتے ہیں ۵۹۳

بارش کا خاص خاص فصلوں میں، خاص خاص موسموں میں، خاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا، بخارات کا ایک خاص گرمی پاکر سمندری ذخیرۂ آب سے اٹھنا، ایک خاص فاصلہ تک اوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پاکر اُن دُخانی و ہوائی اجزاء کا منجمد ہوجانا، اُن کا بادل کی شکل اختیار کرلینا، ایک خاص درجۂ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں سنبھلے رہنا پھر فلاں فلاں فضائی تغیرات کے ماتحت فلاں فلاں علاقہ تک جانا، پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت تک اندر برس پڑنا، اس سے از سر نو خشک زمین میں جان پڑجانا، یہ سارے ردوبدل کسی حکیم کی حکمت، کسی آمر کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی ہوئی شہادت دے رہے ہیں! پھر حیات نباتی کے علاوہ خود حیات حیوانی جن عجائب کا مجموعہ ہے، ہر زندہ جسم میں بے شمار ذروں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ان میں جو ایک مخصوص ترتیب و متعین ترکیب ہوتی ہے، ایک خاص درجہ کی حرارت جو حیات کو قائم رکھتی ہے، ایک خاص مقدار سے بڑھی ہوئی سردی جو اس لف میں نشر، اس اجتماع میں انتشار پیدا کردیتی ہے، نظامِ تغذیہ، نظامِ تنفس، نظامِ تناسل، نظامِ عصبی وغیرہ جسم کے اندر متعدد نظامات، پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے، اس سارے نظامِ اعظم کی تکوین و قیام پر کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت کار فرما ہے؟ اس قسم کے سیکڑوں ہزاروں سوالات پر انسان جتنا زیادہ غور اور نکتہ سنجی سے کام لے گا، توحید اور توحیدی حکمتوں کا نقش دل پر اور زیادہ ہوتا جائے گا، جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطۂ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہوجائے، اور ان علومِ مادی کا مطالعہ اگر ایمانی نقطۂ نظر سے شروع کردیا جائے تو بجائے الحاد، ارتیاب و تشکک کے عرفان و ایقان کی راہیں روز بروز روشن تر ہوتی جائیں۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ آیت میں مصنوعات سے صانع پر استدلال ہے اور یہی اصل ہے مراقبۂ صوفیہ کی۔

**۵۹۱** اَنْدَادًا۔ نِدّ کے لفظی معنی کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ ۶۳ پ۱ کسی شے کا نِدّ یا نَدِیْد اُسے کہتے ہیں جو اُس کے اصل جوہر میں شریک ہو۔

نَدِيْدُ الشَّيْءِ مُشَارِكُهٗ فِيْ جَوْهَرِهٖ وَذٰلِكَ ضَرْبٌ مِّنَ الْمُمَاثِلَةِ۔ (راغب)

اَنْدَاد سے مُراد عموماً مورتیوں، بُتوں، دیوتاؤں سے لی گئی ہے۔

اَلْمُرَادُ الْاَوْثَانُ وَالْاَصْنَامُ الَّتِيْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَهَا (قرطبی) اَلْمُرَادُ بِهَا الْاَصْنَامُ كَمَا هُوَ الشَّائِعُ فِي الْقُرْاٰنِ وَالْمَرْوِيُّ عَنْ قَتَادَةَ وَمُجَاهِدٍ وَاَكْثَرِ الْمُفَسِّرِيْنَ۔ (روح)

رؤساء، سردار اور مقتدایانِ قوم بھی مُراد لئے گئے ہیں۔

قِيْلَ الرُّؤَسَاءُ الَّذِيْنَ يُطِيْعُوْنَهُمْ طَاعَةَ الْاَرْبَابِ مِنَ الرِّجَالِ (روح) اَلسَّادَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُطِيْعُوْنَهُمْ (كبير عن السدی) وَالْاَنْدَادُ عِنْدَ جُمْهُوْرِ الْمُفَسِّرِيْنَ اَعَمُّ مِنَ الْاَصْنَامِ وَالْاَوْثَانِ

## وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ

اور کاش ظالم جب عذاب کو دیکھ لیتے ۵۹۴ تو سمجھ لیتے

فَيَشْمَلُ الرُّؤَسَاءَ الَّذِيْنَ خَضَعَ بَعْضُ النَّاسِ خُضُوْعًا دِيْنِيًّا۔ (المنار)

تیسرا قول یہ ہے کہ مفہوم ان سب سے وسیع تر ہے اور لفظ کا عموم ہر ایسی چیز کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا قلب پر مسلّط ہو جائے اور امام رازی نے اس قول کو صوفیہ اور عارفین کی جانب منسوب کیا ہے۔

اَلْقَوْلُ الثَّالِثُ ——— قَوْلُ الصُّوْفِيَّةِ وَالْعَارِفِيْنَ وَهُوَ اَنَّ كُلَّ شَيْءٍ شَغَلَتْ قَلْبَكَ سِوَى اللّٰهِ تَعَالٰى فَقَدْ جَعَلَهٗ فِيْ قَلْبِكَ نِدًّا لِلّٰهِ تَعَالٰى (کبیر) وَقِيْلَ الْمُرَادُ اَعَمُّ مِنْهُمَا وَهُوَ مَا يَشْغَلُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰى (روح)

۵۹۲ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی مسیحیوں کو محبت اور تعلقِ خاطر خدا سے کہیں زیادہ "خدا کے بیٹے" اور پھر "روح القدس" اور "مقدس کنواری" سے ہے، اور ہندوؤں کی محبت اور تعلقِ خاطر اپنے ایشور اور پرماتما سے کہیں زیادہ درگا ائی، لکشمی مائی، اگنی دیوتا وغیرہ دیویوں، دیوتاؤں کے ساتھ اور رشیوں، منیوں، سادھوؤں کے ساتھ ہے۔

كَحُبِّ اللّٰهِ۔ اس فقرہ نے اسے بالکل صاف کر دیا کہ غیر اللہ سے نفسِ محبت ممنوع نہیں، بلکہ ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹے، بیٹی، عزیزوں، دوستوں، رفیقوں سے تو محبت درجۂ طبعی میں رکھ ہی دی گئی ہے، ائمۂ شریعت و طریقت سے بھی محبت رکھنا مستحب بلکہ کسی حد تک تو واجب بھی ہے، البتہ جو محبت حرام ہے، وہ محبوب کو درجۂ ربوبیت پر پہنچانے والی محبت ہے "یا علی" "یا حسین" "یا خواجہ" "یا غوث" "یا وارث" کے نعرے لگانے والے ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ محبت کا کتنا حصہ اللہ کے لئے باقی رہ گیا، اور کتنا دوسروں کی نذر ہو چکا ہے۔

ابن القیمؒ نے یہاں اپنی اور اپنے شیخ ابن تیمیہ کی طرف سے یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ یہ غیر اللہ کے ساتھ شرک صفتِ خلق و ربوبیت میں نہ تھا، اس لئے کہ غیر اللہ کو رب و خالق کون تسلیم کرتا ہے بلکہ افراطِ تعظیم و محبت کے اعتبار سے تھا، مومن کو تو انتہائی اعتقاد و اخلاص جو ہوتا ہے وہ بس اللہ ہی سے ہوتا ہے نہ کہ غیر اللہ سے۔

فَهٰذَا اَنْدَادٌ فِي الْمَحَبَّةِ لَا فِي الْخَلْقِ وَالرُّبُوْبِيَّةِ فَاِنَّ اَحَدًا مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ لَمْ يُثْبِتْ هٰذَا النِّدَّ بِخِلَافِ نِدِّ الْمَحَبَّةِ فَاِنَّ اَكْثَرَ اَهْلِ الْاَرْضِ قَدِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا فِي الْحُبِّ وَالتَّعْظِيْمِ ..... وَكَانَ شَيْخُ الْاِسْلَامِ ابْنُ تَيْمِيَّةَ يَقُوْلُ اِنَّمَا ذُمُّوْا بِمَا شَرَكُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَبَيْنَ اَنْدَادِهِمْ فِي الْمَحَبَّةِ وَلَمْ يُخْلِصُوْهَا لِلّٰهِ كَمَحَبَّةِ الْمُؤْمِنِيْنَ لَهٗ (تفسیر ابن القیم ص ۱۴۰)

۵۹۳ یعنی مومن کی محبتِ عقلی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُس کی تمام دوسری محبتوں پر غالب و حاکم رہتی ہے، آیت نے ضمناً اس مسئلہ کو بھی واضح کر دیا کہ مومن کا تعلق اللہ کے ساتھ اصلاً اُنس و محبت ہی کا ہوتا ہے، کاش اس آیت کو وہ مسیحی مشنری آنکھ کھول کر پڑھیں جن کے نزدیک اسلام کا خدا ایک دہشت ناک قسم کا معبود ہے۔

۵۹۴ (تو پھر عذاب کی نوبت ہی کیوں آتی)

يَرٰى یہاں يَعْلَمُ کے معنی میں ہے۔

اَيْ يَعْلَمُ لَيْسَ بِرُؤْيَةِ عَيْنٍ (مجاز) وَيَرٰى بِمَعْنٰى يَعْلَمُ (قرطبی) اَيْ لَوْ يَعْلَمُ هٰؤُلَاءِ (روح)

أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا ۙ وَّأَنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ

کہ قوت اللہ ہی کی ہے ساری کی ساری ۵۹۵ اور یہ کہ اللہ کا عذاب بہت ہی سخت ہے ۵۹۶ (اس وقت کا خیال کرو) جب

اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

مقتدا (یا متبوع) اپنے مقتدیوں (یا پیروؤں) سے الگ ہو جائیں گے ۵۹۷ اور عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ کر رہ جائیں گے ۵۹۸

لَوْ کا جواب محذوف ہے یعنی یہ کہ اللہ کا عذاب شدید و بے پناہ ہے۔

وَجَوَابُ لَوْ مَحْذُوفٌ وَالْمَعْنٰى لَعَلِمُوا فِي الدُّنْيَا شِدَّةَ عَذَابِ اللّٰهِ (جلالین) قَالَ أَبُو عُبَيْدٍ الْمَعْنٰى لَوْ يَرَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فِي الدُّنْيَا عَذَابَ الْآخِرَةِ لَعَلِمُوا حِينَ يَرَوْنَهُ أَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيعًا (قرطبی)

الَّذِينَ ظَلَمُوا اپنے حق میں، اپنے نفس پر ظلم کرنے والے، یعنی مشرکین۔

۵۹۵ (اور کوئی شخص اس عذاب کے دور کرنے پر قادر نہیں۔)

"اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم مشرکین جب دنیا میں کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، اور اسی مصیبت کی شدت میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آخرت میں کہ دار الجزاء ہے، اور بھی سخت ہوگا، تو اس طرح غور کرنے سے تراشے ہوئے معبودین کا عجز، اور حق تعالیٰ کی قدرت و عظمت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے۔" (تھانوی)

۵۹۶ (آخرت میں)

اس شدتِ عذاب کا پورا ظہور عالمِ آخرت ہی میں ہوگا۔

۵۹۷ (قیامت میں)

یہاں اس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے، جب قیامت میں مشرکین کے خواص علماء اور امراء اپنے عوام اور اپنے مقلدین اور رعایا سے علیحدگی کا اعلان کر دیں گے، اور انھیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔

۵۹۸ اہل باطل کے جتنے بھی باہمی تعلقات اور رابطے ہیں، استادی شاگردی کے، ہم نسبی و قرابت کے، ہم وطنی اور دوستی کے، یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں، آخرت میں جو حقائق کے شاہدہ اور معائنہ کا وقت ہوگا، سب ایک دوسرے سے بے تعلق بلکہ آپس میں مخالف نظر آئیں گے، یہ قرآن ہی کی نص ہے اَلْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ۔ (سورۃ الزخرف۔۴۳:۶۷)

الْأَسْبَابُ۔ وُصْلَات کے معنی میں ہے یعنی وہ رشتے جو انھیں دنیا میں جوڑے رکھتے تھے۔

أَيِ الْوُصْلَاتِ الَّتِي كَانُوا يَتَوَاصَلُونَ عَلَيْهَا فِي الدُّنْيَا۔ (مجاز)

بِهِمْ میں ب، عَنْ کے معنی میں بھی لی گئی ہے۔

بِهِمْ أَيْ عَنْهُمْ (معالم) قِيلَ بِهِمْ بِمَعْنٰى عَنْهُمْ۔ (عکبری)

اور ب سببیہ بھی مانی گئی ہے یعنی یہ قطع تعلق بہ سبب کفر کے ہوگا۔

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ

اور پیرو کہنے لگیں گے ۵۹۹ کاش ہم کو پھر ایک دفعہ (جانا) مل جاتا ۶۰۰ تو ہم بھی اُن سے الگ ہو جائیں جیسے یہ ہم سے

كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ

الگ ہو گئے بس اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو انہیں (خالی) ارمان (کرکے) دکھائے گا ۶۰۱ اور وہ دوزخ سے کبھی بھی

مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا

ع ۲۰

نہ نکل پائیں گے ۶۰۲ اے انسانو! زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اس میں سے کھاؤ (پیو) ۶۰۳

اَلْبَاءُ هُنَا السَّبَبِيَّةُ وَالتَّقْدِيرُ وَتَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمْ (عکبری) اَلْبَاءُ السَّبَبِيَّةُ أَيْ تَقَطَّعَتْ بِسَبَبِ كُفْرِهِمُ الْأَسْبَابُ الَّتِي كَانُوا يَرْجُونَ مِنْهَا النَّجَاةَ ۔ (روح)

وَرَأَوُا الْعَذَابَ۔ عذابِ الٰہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے، اب اس کا درجہ خبر کا نہ رہے گا، مشاہدہ کا ہو جائے گا۔

۵۹۹ (غم و غصہ اور جذبات انتقام کے ساتھ)

کشفِ حقائق کے بعد ذہنیتیں قدرۃً بدل جائیں گی۔

۶۰۰ (دنیا میں)

کافروں کی زبان سے آخرت میں دنیا میں ایک بار پھر جانے کی تمنا و حسرت کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔

۶۰۱ یعنی یہ حسرت پوری نہ ہوگی اور یہ خلش کانٹا بن کر ہمیشہ کھٹکتی ہی رہے گی۔

حَسَرَاتٍ۔ حسرت پشیمانی کے انتہائی درجہ کا نام ہے۔

اَلْحَسْرَةُ أَشَدُّ النَّدَامَةِ (مجاز)

۶۰۲ سزائے دوزخ کے دوام و خلود پر یہ ایک نص صریح ہے۔

بِخَارِجِينَ میں ب خبر کی تاکید اور تابید کا کام دے رہی ہے، اردو ترجمہ کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔

دَلِيلٌ عَلَى خُلُودِ الْكُفَّارِ فِيهَا وَأَنَّهُمْ لَا يَخْرُجُونَ مِنْهَا وَهٰذَا قَوْلُ جَمَاعَةِ أَهْلِ السُّنَّةِ لِهٰذِهِ الْآيَةِ (قرطبی) بَلْ هُمْ فِيهَا دَائِمُونَ (مدارک) إِفَادَةٌ لِلْمُبَالَغَةِ فِي الْخُلُودِ وَالْإِقْنَاطِ عَنِ الْخَلَاصِ وَزِيَادَةُ الْبَاءِ لِتَأْكِيدِ النَّفْيِ (روح) أَصْلُهُ وَمَا يَخْرُجُونَ فَعُدِلَ بِهِ إِلَى هٰذِهِ الْعِبَارَةِ لِلْمُبَالَغَةِ فِي الْخُلُودِ (بیضاوی)

شیخ رشید رضا مصری نے اپنے شیخ و اُستاذ محمد عبدہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مفسرین نے ایسی آیتوں کے تحت میں یہ جو لکھ دیا ہے کہ یہ مخصوص ہیں کافروں کے لئے تو اس سے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ اُن کے لئے کوئی نکیر و وعید ہے ہی نہیں اور ان کے لئے صرف کلمۂ توحید کا اقرار کافی ہو جائے گا۔

۶۰۳ یعنی کھا سکتے ہو، بالکل جائز ہے کہ کھاؤ پیو، کھانے کی اجازت مل رہی ہے نہ کہ حکم مراد نہیں کہ لازمی طور پر کھاؤ، خطاب عام نسلِ انسانی سے ہے، دینِ حنیف ابراہیمی کو چھوڑ کر یہود، نصاریٰ، مشرکین سب ہی کھانے پینے کے باب میں طرح طرح کی

وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا

اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو ۶۰۴ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۶۰۵ وہ تو تمہیں

يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

بس برائی اور گندگی ہی کا حکم دیتا ہے ۶۰۶ اور اس کا کہ تم اللہ پر ایسی باتیں گڑھ لو جس کا تم علم نہیں رکھتے ہو

غلط روی اور کج راہی میں مبتلا ہو گئے تھے اور خلط کر کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کے حکم میں رکھ رہے تھے۔

مِمَّا فِي الْاَرْضِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

مِنْ لِلتَّبْعِيْضِ اِذْ لَا يُؤْكَلُ كُلُّ مَا فِي الْاَرْضِ (بیضاوی)

حَلٰلًا۔ جو غذائیں بجائے خود جائز ہیں، اور حرام نہیں کی گئی ہیں۔

فَالْحَلَالُ مَا اَحَلَّهُ الشَّرْعُ (معالم) اَلْمُرَادُ مِنْهُ مَا يَكُوْنُ جِنْسُهٗ حَلَالًا (کبیر)

طَيِّبًا۔ یعنی جو غذائیں حاصل بھی جائز ذرائع سے ہوئی ہوں، اور جن پر غیر کا حق نہ ہو مثلاً بیع فاسد نہ ہو، اجرت فاسد نہ ہو، وغیرہا۔

اَلْمُرَادُ مِنْهُ اَنْ لَّا يَكُوْنَ مُتَعَلِّقًا بِهٖ حَقُّ الْغَيْرِ (کبیر) اَلطَّيِّبُ الطَّاهِرُ۔ (معالم)

ترجمان القرآن میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ سعد بن ابی وقاصؓ صحابی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے حضورؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا! کہ لقمۂ حلال کا التزام کرو، خود بخود مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے —— یہ ہے اسلام میں اکل حلال کی اہمیت

طَيِّبًا۔ طَیِّب کے معنی لذیذ کے بھی ہیں، اور اس کی تفسیر لذیذ و نفیس سے ہی آئی ہے۔

وَاَصْلُ الطَّيِّبِ مَا تَسْتَلِذُّهُ النَّفْسُ (راغب) وَالطَّيِّبُ فِي الْاَصْلِ مَا هُوَ مَا يُسْتَلَذُّ بِهٖ وَيُسْتَطَابُ (کبیر) وَقَالَ الشَّافِعِيُّ الطَّيِّبُ الْمُسْتَلَذُّ (قرطبی) قِيْلَ مَا يُسْتَطَابُ وَيُسْتَلَذُّ (معالم) مَعْنَاهُ مُغَايِرٌ لِمَعْنَى الْحَلَالِ وَهُوَ قَوْلُ الشَّافِعِيِّ وَغَيْرِهٖ (بحر) وَقَالَ السَّجَاوَنْدِيُّ حَلَالًا مُطْلَقَ الشَّرْعِ طَيِّبًا مُسْتَلَذَّ الطَّبْعِ (بحر)

اسلام راہبوں، سنیاسیوں، ترک لذات کرنے والوں کا مذہب نہیں، لذیذ و ذائقہ دار چیزوں کو تو قرآن مجید نے موقع مدح پر یاد کیا ہے۔

۶۰۴ (اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام، اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرا کر) حکم تو عام ہے ہر شیطانی روش کے لئے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ تعلق حرام و حلال غذاؤں سے ہے۔

وَالصَّحِيْحُ اَنَّ اللَّفْظَ عَامٌّ فِيْ كُلِّ مَا عَدَا السُّنَنِ وَالشَّرَائِعِ مِنَ الْبِدَعِ وَالْمَعَاصِيْ (قرطبی)

۶۰۵ (اور اسی دشمنی کے تقاضہ سے انسان کو الٹی صلاحیں اور قانون الٰہی توڑنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے، اس سے کسی نفع کی، خیر خواہی کی توقع ہی نہ رکھو)

۶۰۶ (خواہ اس کا ظاہری قالب یا روپ جیسا بھی معصومانہ یا خوشنما ہو)

# وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اُس کی پیروی کرو ۶۰۸،۶۰۷

یہاں یہ خوب سمجھ لیا جائے کہ شیطان جب بھی بندوں کے پاس آتا ہے اپنی مجرد اصلی و نفرت انگیز شکل میں آنے کے بجائے ہمیشہ کسی نہ کسی ظاہر فریب خوشنما قالب ہی میں آتا ہے۔

اِنَّمَا کلمہ حصر کا ہے اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ شیطان سے ہمیشہ شیطنت ہی کا ظہور ہوگا، کبھی نیکی کے صدور کا اس سے امکان نہیں۔

دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى اَنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَاْمُرُ اِلَّا بِالْقَبَائِحِ لِاَنَّهٗ تَعَالٰى ذَكَرَهٗ بِكَلِمَةِ اِنَّمَا وَهِيَ لِلْحَصْرِ (کبیر)

اور بعض وقت جو بظاہر شیطان نیکی کی طرف دعوت دیتا معلوم ہوتا ہے تو وہاں بھی اس سے اس کی غرض یہی ہوتی ہے کہ بالآخر بدی و معصیت ہی کی طرف لائے۔

وَقَالَ بَعْضُ الْعَارِفِيْنَ اِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَدْعُوْا اِلَى الْخَيْرِ لٰكِنْ لِغَرَضٍ اَنْ يَّجُرَّهٗ مِنْهُ اِلَى الشَّرِّ۔ (کبیر)

سُوْٓءٌ وَفَحْشَاءُ دو لفظ متقارب المعنی ہیں، لیکن متحد المعنی نہیں، سُوْٓءٌ تو وہ چیز ہے جو عقلاً بھی ناپسندیدہ ہو، اور فحشاء وہ ہے، جسے شریعت نے بُرا ٹھہرایا ہے۔

اَلسُّوْٓءُ وَالْفَحْشَاءُ مَا اَنْكَرَهُ الْعَقْلُ وَاسْتَقْبَحَهُ الشَّرْعُ وَالْعَطْفُ لِاِخْتِلَافِ الْوَصْفَيْنِ۔ (بیضاوی)

یہ فرق بھی کیا گیا ہے کہ سُوْٓء میں کوئی حد شرعی مقرر نہیں اور فحشاء میں حد شرعی معین ہوتی ہے اور یہ معنی ابن عباسؓ سے منسوب ہیں

اَلسُّوْٓءُ مَا لَا حَدَّ فِيْهِ وَالْفَحْشَاءُ مَا فِيْهِ حَدٌّ حُكِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَغَيْرِهٖ۔ (قرطبی)

اَلْفَحْشَاءُ کا اطلاق زنا اور دواعی زنا تک محدود نہیں بلکہ اس کے تحت میں ہر وہ معصیت آجاتی ہے جو بدنامی کا باعث ہو، اس کا درجہ اَلسُّوْٓءُ سے بڑھ کر ہے۔

وَاَمَّا الْفَحْشَاءُ فَكُلُّ مَا يُقْبَحُ فِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ مِنَ الْمَعَاصِيْ وَالْاٰثَامِ وَلَا يَخْتَصُّ بِنَحْوِ الزِّنَا كَمَا قَالَ بَعْضُهُمْ وَالْفَحْشَاءُ فِي الْغَالِبِ اَقْبَحُ وَاَشَدُّ مِنَ السُّوْٓءِ (المنار)

۶۰۷ یعنی اپنی طرف سے نکالی ہوئی چیزوں کو احکام خداوندی کی طرح سمجھنے لگو۔

تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ قول کا صلہ جب عَلٰی کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ہونے ہیں کسی کے خلاف گڑھ لینا، کسی پر بہتان لگانا۔

قَالَ عَلَيْهِ اَيْ اِفْتَرٰى۔ (تاج)

مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ علم سے یہاں مراد علم یقینی یا علم ثابت بالوحی ہے پس اس وعید کے تحت میں صرف کفر ہی کے نہیں، بلکہ بدعت کے اقوال بھی داخل ہو جاتے ہیں۔

فَيَدْخُلُ فِيْ هٰذَا كُلُّ كَافِرٍ وَكُلُّ مُبْتَدِعٍ اَيْضًا (ابن کثیر) وَيَدْخُلُ فِيْهِ كُلُّ مَا يُضَافُ اِلَى اللّٰهِ مِمَّا لَا يَجُوْزُ عَلَيْهِ۔ (مدارک)

۶۰۸ (اور شریعتِ الٰہی کی ماتحتی میں آجاؤ)

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی اللہ نے جو کچھ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے اُتارا ہے، پس اس کی تحقیق اتباع سے قبل کر لینا ضروری ہے کہ وہ حکمِ خدائی ہے بھی۔

قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ

تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ (دادوں) کو پایا ہے ۶۰۹ خواہ اُن کے باپ (دادا)

شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ

نہ ذرا بھی عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں ۶۱۰ اور جو لوگ کافر ہیں اُن کا حال تو اُس شخص جیسا ہے ۶۱۱ جو ایسے (جانور)

يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

کے پیچھے چلا رہا ہے جو کچھ سنتا ہی نہیں بجز بلانے اور پکارنے کے (یہ لوگ) بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو (کچھ بھی) نہیں سمجھتے ۶۱۲

۶۰۹ گویا طریقِ آبائی میں خطا وغلطی کا امکان ہی اُن کے نزدیک نہیں، اور یہی جمود عین جہالت وضلالت ہے، آج مشرک قوموں اور مبتدع فرقوں کا بھی یہی حال ہے، جب انھیں اتباعِ حق کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں اپنے آباؤ اجداد کے رسوم کو پیش کر دیتے ہیں، اور یہ تحقیق ذرا بھی نہیں کرتے کہ کون حکم آسمانی ہے اور کون نہیں۔

۶۱۰ یعنی نہ فہم دین اور اس کے حقائق ومعارف کی رکھتے ہوں، اور نہ ہدایت کسی کتابِ آسمانی کے ماتحت رکھتے ہوں۔

لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا. اَلْمُرَادُ اَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا مِّنَ الدِّيْنِ۔ (کبیر)

لَا يَهْتَدُوْنَ اَىْ لَا يَهْتَدُوْنَ اِلَى الْحَقِّ۔ (روح)

بعض کج رائے فرقوں نے آیت سے تقلیدِ فقہی کا عدم جواز ثابت کرنا چاہا ہے حالانکہ قاعدۂ اقتضاء النص اس کا مقتضی ہے کہ آیت سے تقلید کے عدم جواز پر نہیں عین جواز پر استدلال کیا جائے۔ آیت میں جس امر کی مذمت وارد ہوئی ہے وہ نفس تقلید نہیں، بلکہ گمراہ وناداں اسلاف کی تقلید ہے، اور یہ قید خود اس امر کی دلیل ہے کہ محققین اہلِ علم کی تقلید جائز ہی نہیں بلکہ عین مطلوب ہے، کسی مریض سے اگر یہ کہا جائے کہ تم نے بھی کیا حماقت کی کہ ایک اناڑی اور اَن پڑھ کا علاج شروع کر دیا، تو ظاہر ہے کہ اس فقرہ سے مذمت نفس علاج کی نہیں بلکہ اناڑی اور اَن پڑھ سے علاج کی نکلی، اور نفس علاج کی مقصودیت یا مطلوبیت ہی ظاہر ہوئی۔

البتہ محققین نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ تقلید عقائد میں نہیں ہوتی تقلید صرف احکام میں ہوتی ہے، عقائد کے باب میں حکم اور معیار کتاب وسنت کی تصریحات ہی ہیں۔

قَالَ ابْنُ عَطِيَّةَ اَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰى اِبْطَالِ التَّقْلِيْدِ فِى الْعَقَائِدِ (قرطبی) لِاَنَّهٗ فَرْضٌ عَلٰى كُلِّ مُكَلَّفٍ تَعَلُّمَ اَمْرِ التَّوْحِيْدِ وَالْقَطْعِ بِهٖ وَذٰلِكَ لَا يَحْصُلُ اِلَّا مِنْ جِهَةِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ (قرطبی)

۶۱۱ (بے حسی اور نافہمی میں)

ذکر داعیِ حق کی دعوتِ حق کا ہو رہا ہے، ایک تشبیہ رسول ؐ اور اُس کی امت دعوت کے رویہ سے متعلق پیش کی جا رہی ہے، مضاف داعی محذوف ہے۔

عَلٰى حَذْفِ مُضَافٍ تَقْدِيْرُهٗ مَثَلُ دَاعِى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (بیضاوی) مَثَلُ دَاعِيْهِمْ اِلَى الْاِيْمَانِ (کشاف)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا

اے ایمان والو! پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں دے رکھی ہیں کھاؤ (پیو) ۶۱۳ اور اللہ کا

لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۷۲)

شکر ادا کرتے رہو ۶۱۴ اگر تم خاص اُسی کی بندگی کرنے والے ہو ۶۱۵

فِیْهِمَا مُضَافٌ مَحْذُوْفٌ اِمَّا مِنْ جَانِبِ الْمُشَبَّهِ اَوِ الْمُشَبَّهِ بِهٖ (روح)

فراء نحوی، لغوی نے تقدیر کلام یوں مانی ہے، مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الْبَهَائِمِ الَّتِیْ لَا تَفْقَهُ مَا يَقُوْلُ الرَّاعِیْ اَكْثَرَ مِنَ الصَّوْتِ۔ (معانی)

۶۱۲ یعنی اُس جانور کی طرح جس کے کان میں پکارنے والے کی آواز اور الفاظ تو آرہے ہیں باقی وہ معنی و مفہوم کچھ نہیں سمجھتا بس یہی معاملہ منکرین دعوتِ حق کے ساتھ کر رہے ہیں، داعی کے الفاظ تو سُن لیتے ہیں لیکن اُن کے مفہوم و معنی پر غور ہی نہیں کرتے۔

اَیْ لَا يَعْرِفُ اِلَّا الصَّوْتَ الْمُجَرَّدَ دُوْنَ الْمَعْنٰى (راغب) مَثَلُ الدَّابَّةِ تُنَادٰى فَتَسْمَعُ وَلَا تَعْقِلُ مَا يُقَالُ لَهَا كَذٰلِكَ الْكَافِرُ يَسْمَعُ الصَّوْتَ لَا يَعْقِلُ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

صُمٌّ۔ یعنی بہرے ہیں، آوازِ حق کی طرف سے۔

صُمٌّ عَنِ الْحَقِّ فَلَا يَسْمَعُوْنَهٗ وَلَا يَنْتَفِعُوْنَ بِهٖ (ابن جریر عن قتادہ)

بُكْمٌ۔ یعنی اقرارِ حق کے لئے اُن کی زبان گونگی ہے۔

بُكْمٌ عَنِ الْحَقِّ فَلَا يَنْطِقُوْنَ بِهٖ (ابن جریر عن قتادہ)

عُمْیٌ۔ یعنی اندھے ہیں خود اپنے نفع و نقصان کے باب میں۔

عُمْیٌ عَنِ الْهُدٰى فَلَا يُبْصِرُوْنَهٗ (ابن جریر عن قتادہ)

دُعَآءً وَّ نِدَآءً۔ دُعا اور نِدا میں فرق یہ کیا گیا ہے کہ دعا قریب کے لئے ہے اور نداء بعید کے لئے۔

وَالنِّدَآءُ لِلْبَعِيْدِ وَالدُّعَآءُ لِلْقَرِيْبِ وَلِذٰلِكَ قِيْلَ لِلْاَذَانِ بِالصَّلٰوةِ نِدَآءٌ لِاَنَّهٗ لِلْاَبَاعِدِ (قرطبی)

قِيْلَ اِنَّ الدُّعَآءَ لِلْقَرِيْبِ وَالنِّدَآءَ لِلْبَعِيْدِ۔ (روح)

اس سے ملتا جلتا ایک فقرہ توریت میں بھی موجود ہے:۔

”وہ نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے کہ ان کی آنکھیں لے لی گئیں، سو وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے دل بھی سو وہ سمجھتے نہیں۔“ (یسعیاہ۔ ۴۴: ۱۸)

۶۱۳ یعنی کھا پی سکتے ہو، کھانے پینے کی اجازت ہے صیغۂ امر یہاں بمعنی اجازت ہے بہ معنی حکم نہیں۔

كُلُوْا فِیْ هٰذَا الْمَوْضِعِ لَا يُفِيْدُ الْاِيْجَابَ وَلَا النَّدْبَ بَلِ الْاِبَاحَةَ۔ (کبیر)

لیکن بہرحال یہ صیغۂ اباحت بھی محلِ ترغیب میں ہے۔ اللہ اپنے پرستاروں کو اپنی نعمتوں سے لذت گیر ہونے کی دعوت دے رہا ہے مطلق صورت میں ان پر کوئی قدغن عائد نہیں کر رہا ہے۔ اسلام کا مزاج خشک راہبانہ جوگیانہ مذہبوں سے کس درجہ مختلف ہے؟ كُلُوْا یہاں لفظی معنی میں صرف کھانے تک محدود نہیں، بلکہ ہر قسم کا جائز انتفاع اس میں آگیا۔

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ

اس نے تم پر بس مُردار اور خون اور سُور کا گوشت اور جو (جانور) غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو حرام کیا ہے ۶۱۶

اَلْمُرَادُ بِالْاَكْلِ الْاِنْتِفَاعُ مِنْ جَمِيْعِ الْوُجُوْهِ (قرطبی) وَكُلُوْا الْعُمُوْمُ جَمِيْعُ وُجُوْهِ الْاِنْتِفَاعِ دَلَالَةً وَعِبَارَةً (روح)
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا. خطاب اب تک عامۃ الناس سے تھا، حلال و حرام کے باب میں مشرکین کی غلطی کے اظہار کے لئے اب خطاب صرف مومنین سے ہے، اُن سے ارشاد ہو رہا ہے کہ حلال و حرام کے باب میں اہل جاہلیت کی پیروی نہ کریں۔

طَيِّبٰتِ. کا دوسرا ترجمہ "لذیذ چیزوں" بھی ہو سکتا ہے۔
اَىْ مِنْ مُسْتَلَذَّاتِهٖ (کشاف)
طَيِّبٰت کے لئے مزید ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۶۰۳ جو ابھی دو ایک صفحہ اوپر گزر چکا ہے۔

۶۱۴ (زبان سے بھی اور عمل سے بھی)
یعنی ان نعمتوں کی قدر کرتے رہو، ان کے حق ادا کرتے رہو، بخل سے کام نہ لو، انھیں ناجائز محل پر استعمال نہ کرو، وغیرہا۔
اُشْكُرُوْا. شکر اس امر کا کہ اُس نے یہ رزق عطا کیا، اور رزق بھی حلال و طیب۔
یہاں صیغۂ امر وجوب کے لئے ہے نہ کہ صرف اباحت کے معنی میں۔
اُشْكُرُوْا لِلّٰهِ اَمْرًا وَلَيْسَ بِاِبَاحَةٍ. (کبیر)

۶۱۵ یعنی اگر اپنے دعوے ایمان و اخلاص میں سچے ہو تو اللہ کے حکم پر عمل کرو اور اس کے مقرر کئے ہوئے حق ادا کرتے رہو۔

۶۱۶ یعنی حیوانات کے سلسلہ میں تو شریعتِ الٰہی کی حرام کی ہوئی بس یہ چیزیں ہیں، نہ وہ چیزیں جو تم نے اپنی تجویز سے گڑھ رکھی ہیں، یہاں تردید تمام تر مشرکوں کے خود تراشیدہ محرمات کی ہو رہی ہے، باقی جو چیزیں حدیثِ صحیح کی بناء پر یا کسی اور دلیل شرعی سے حرام ہیں، ان سے آیت کو کوئی بحث نہیں۔
لَيْسَ الْمُرَادُ مِنَ الْاٰيَةِ قَصْرُ الْحُرْمَةِ عَلٰى مَا ذُكِرَ مُطْلَقًا بَلْ مُقَيَّدًا بِمَا اعْتَقَدُوْهُ حَلَالًا (روح)
اَلْمَيْتَةَ. میتہ یا مُردار وہ جانور ہے جو بغیر کسی کے ہلاک کئے از خود مر جائے، یا ہلاک تو کیا جائے لیکن ذبح شرعی کے مطابق نہ ہو۔
هُوَ غَيْرُ الْمُذَكّٰى اِمَّا لِاَنَّهٗ لَمْ يُذْبَحْ اَوْ لِاَنَّهٗ ذُبِحَ وَلٰكِنْ لَمْ يَكُنْ ذَبْحُهٗ ذَكَاةً (کبیر) وَهِىَ كُلُّ مَا فَارَقَهُ الرُّوْحُ مِنْ غَيْرِ ذَكَاةٍ مِمَّا يُذْبَحُ (مدارک)
زندہ جانور کے اگر گوشت کا کچھ حصہ کاٹ لیا جائے تو وہ بھی مُردار ہی کے حکم میں داخل ہوگا، حنفیہ کے ہاں مُردار سے کسی قسم کا بھی نفع حاصل کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ مُردار گوشت کتوں اور شکاری پرندوں کو کھلانا بھی درست نہیں کہ یہ بھی اُس سے نفع اُٹھانا ہی ہوا، درانحالیکہ قرآن میں مُردار کی حُرمت مطلق صورت میں ہے۔
قَالَ اَصْحَابُنَا لَا يَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ بِالْمَيْتَةِ عَلٰى وَجْهٍ وَلَا يُطْعِمُهَا الْكِلَابَ وَالْجَوَارِحَ لِاَنَّ ذٰلِكَ ضَرْبٌ مِنَ الْاِنْتِفَاعِ بِهَا وَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ الْمَيْتَةَ تَحْرِيْمًا مُطْلَقًا مُعَلَّقًا بِعَيْنِهَا. (جصاص)
لیکن عملِ دباغت کے بعد مُردار کی ہڈی کھال وغیرہ پاک ہو جاتی ہے اور مُردار کے حکم میں رہتی ہی نہیں، یہ مسئلہ احادیث و آثار سے ثابت ہے، اور حنفیہ اور بعض دوسرے ائمۂ فقہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

قَالَ اَبُوْحَنِیْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ وَالْحَسَنُ بْنُ صَالِحٍ وَسُفْیَانُ الثَّوْرِیُّ وَعُبَیْدُاللّٰهِ بْنُ الْحَسَنِ الْعَنْبَرِیُّ وَالْاَوْزَاعِیُّ وَالشَّافِعِیُّ یَجُوْزُ بَیْعُهٗ بَعْدَ الدِّبَاغِ وَالْاِنْتِفَاعُ بِهٖ (جصّاص) وَالْحُجَّةُ لِمَنْ طَهَّرَهَا وَجَعَلَهَا زَکَاةً مَا وَرَدَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْاٰثَارِ الْمُتَوَاتِرَةِ مِنَ الْوُجُوْهِ الْمُخْتَلِفَةِ بِالْاَلْفَاظِ الْمُخْتَلِفَةِ کُلُّهَا یُوْجِبُ طَهَارَتَهَا وَالْحُکْمَ بِذَکَاتِهَا۔ (جصّاص)

اور احادیث اس قسم کی وارد ہوئی ہیں:۔

اَیُّمَا اِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ (عن ابن عباسؓ) زَکَاةُ الْاَدِیْمِ دِبَاغَتُهٗ (عن سلمۃ بن المحبق)

دو جانور ایسے ہیں جو حدیث صحیح کی رو سے بغیر ذبح بھی جائز ہیں، ایک مچھلی دوسرے ٹڈی۔

وَقَدْ اُحِلَّتِ الْمَیْتَتَانِ بِالْحَدِیْثِ السَّمَکُ وَالْجَرَادُ (مدارک) هٰذِهِ الْاٰیَةُ فَلَهَا التَّخْصِیْصُ لِقَوْلِهٖ عَلَیْهِ السَّلَامُ اُحِلَّتْ لَنَا الْمَیْتَتَانِ الْحُوْتُ وَالْجَرَادُ اَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِیُّ۔ (قرطبی)

فقہاء مفسرین نے اس سلسلہ میں اس مسئلہ کو بھی بیان کر دیا ہے کہ جن غذاؤں میں ذبیحہ کا سوال ہی نہ پیدا ہو، وہ مجوس اور مشرکوں اور سب غیر کتابیوں کے ہاں کی بھی جائز ہیں۔

وَقَالَ اَبُوْعُمَرَ لَا بَاْسَ بِاَکْلِ طَعَامِ عَبَدَةِ الْاَوْثَانِ وَالْمَجُوْسِ وَسَائِرِ مَنْ لَا کِتَابَ لَهٗ مِنَ الْکُفَّارِ مَا لَمْ یَکُنْ مِنْ ذَبَائِحِهِمْ۔ (قرطبی)

اَلدَّمَ۔ یعنی خون جاری یا سیّال۔

اَلْمُرَادُ بِالدَّمِ الْجَارِیْ (معالم) یَعْنِی السَّائِلَ (مدارک) دَلَّ ذٰلِكَ عَلٰی اَنَّ الْمُحَرَّمَ مِنَ الدَّمِ هُوَ الْمَسْفُوْحُ دُوْنَ غَیْرِهٖ۔ (جصّاص)

اور سورۂ انعام میں دمِ مسفوح کی قید خود موجود ہے، اور فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ دم جو یہاں مطلق صورت میں ہے وہ اسی قید مسفوحیت کے ساتھ حرام ہے۔

وَحَمَلَ الْعُلَمَاءُ هٰهُنَا الْمُطْلَقَ عَلَی الْمُقَیَّدِ اِجْمَاعًا۔ (ابن العربی۔ قرطبی)

اس پر فقہاء امت کا اجماع ہے کہ خونِ جاری حرام بھی ہے اور نجس بھی، نہ اس کا کھانا جائز ہے، نہ اس سے کوئی نفع اٹھانا جائز ہے۔

اِتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اَنَّ الدَّمَ حَرَامٌ نَجِسٌ لَا یُؤْکَلُ وَلَا یُنْتَفَعُ بِهٖ۔ (ابن العربی)

حدیث صحیح کی رو سے دو منجمد خون حلال ہیں، ایک جگر، دوسرے تلی، اور ان کی حلت پر فقہاء امت کا اجماع ہے

اُحِلَّتْ لَنَا دَمَانِ الْکَبِدُ وَالطِّحَالُ اَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِیُّ۔ (قرطبی)

گو علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ جگر و طحال خون کی تعریف میں آتے ہی کب ہیں، وہ تو گوشت کی قسم کی چیزیں ہیں، نہ کہ خون کی قسم کی، اور نہ اس تخصیص و استثناء کا سوال ہی پیدا ہوتا ہے۔

وَالصَّحِیْحُ اَنَّهٗ لَمْ یُخَصَّصْ وَاَنَّ الْکَبِدَ وَالطِّحَالَ لَحْمٌ یَشْهَدُ بِذٰلِكَ الْعِیَانُ الَّذِیْ لَا یُعَارِضُهٗ بَیَانٌ وَلَا یَفْتَقِرُ اِلٰی بُرْهَانٍ۔ (ابن العربی)

وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ۔ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ حرمت لحم خنزیر کی آئی ہے لیکن فقہاء امت کا

اجماع ہے کہ سور کا صرف گوشت ہی نہیں، بلکہ اس کی چربی، ہڈی، کھال، بال سب ہی حرام ہیں' اور لحم کی تصریح تو اس لئے ہے کہ گوشت ہی ہر جانور کے جسم کا اہم ترین حصہ ہوتا ہے' اور جب گوشت کہہ دیا تو اس کے تحت و تابعیت میں، جانور کے دوسرے اجزاء بھی آگئے۔

يَعْنِي الْخِنْزِيرَ بِجَمِيعِ أَجْزَائِهِ وَخُصَّ اللَّحْمُ لِأَنَّهُ الْمَقْصُودُ بِالْأَكْلِ (مدارك) اِتَّفَقَتِ الْأُمَّةُ عَلَى أَنَّ الْخِنْزِيرَ حَرَامٌ بِجَمِيعِ أَجْزَائِهِ (ابن العربي) وَاللَّحْمُ وَإِنْ كَانَ مَخْصُوصًا بِالذِّكْرِ فَإِنَّ الْمُرَادَ جَمِيعُ أَجْزَائِهِ وَإِنَّمَا خُصَّ اللَّحْمُ بِالذِّكْرِ لِأَنَّهُ أَعْظَمُ مَنْفَعَةً وَمَا يُبْتَغَى مِنْهُ (جصاص)

جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ اس کی نظیر ایک دوسرے مسئلہ سے بھی ملتی ہے' جہاں قرآن مجید نے شکار کے قتل کو محرم کے لئے حرام کہا ہے' حالانکہ مراد وہاں صرف ہلاک ہی نہیں' بلکہ شکار کے جملہ افعال کی حرمت حالتِ احرام میں ہے۔

بعض مبتدع فرقوں کے اس قول کے جواب میں کہ گوشت کی حرمت سے چربی کی حرمت کہاں لازم آتی ہے' فقیہ ابن العربی مالکی کہتے ہیں کہ یہ اعتراض اہل عجم کی طرف سے ہوا ہے' جو یہ نہیں جانتے کہ لفظ لحم میں شحم شامل ہے البتہ شحم میں لحم شامل نہیں جس طرح ہر حمد شکر ہے، لیکن ہر شکر حمد نہیں ہے۔

وَهُمْ أَعَاجِمُ لَا يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مَنْ قَالَ لَحْمًا فَقَدْ قَالَ شَحْمًا وَمَنْ قَالَ شَحْمًا فَلَمْ يَقُلْ لَحْمًا إِذْ كُلُّ شَحْمٍ لَحْمٌ وَلَيْسَ كُلُّ لَحْمٍ شَحْمًا مِنْ جِهَةِ اخْتِصَاصِ اللَّفْظِ ..... كَمَا أَنَّ كُلَّ حَمْدٍ شُكْرٌ وَلَيْسَ كُلُّ شُكْرٍ حَمْدًا مِنْ جِهَةِ ذِكْرِ النِّعَمِ (ابن العربي)

اور ایسا ہی قرطبیؒ نے بھی کہا ہے اور ادیب شہیر (زمخشریؒ) نے کہا ہے کہ عرب جب "لَحْمٌ سَمِينٌ" بولتے ہیں تو اس سے مراد "لحم شحیم" (چربیلا گوشت) لیتے ہیں، اور شحم تو لحم کے تابع اور اسی کی ایک صفت ہے۔

لِأَنَّ الشَّحْمَ دَاخِلٌ فِي ذِكْرِ اللَّحْمِ لِكَوْنِهِ تَابِعًا لَهُ وَصِفَةً فِيهِ بِدَلِيلِ قَوْلِهِمْ لَحْمٌ سَمِينٌ يُرِيدُونَ أَنَّهُ شَحِيمٌ (کشاف)

رہی اس کے جسم کی نجاست تو جمہور فقہاء اس کے بھی قائل ہیں۔

قَالَ جُمْهُورُ الْعُلَمَاءِ أَنَّهُ نَجِسٌ۔ (ابن العربي)

البتہ امام مالکؒ کا اصول چونکہ یہ ہے کہ زندگی خود دلیل طہارت ہے' اور ہر زندہ جانور پاک ہے' اس لئے وہ سور کی نجاست کے بھی قائل نہیں۔

قَالَ مَالِكٌ أَنَّهُ طَاهِرٌ وَكَذَلِكَ كُلُّ حَيَوَانٍ عِنْدَهُ لِأَنَّ عِلَّةَ الطَّهَارَةِ عِنْدَهُ هِيَ الْحَيَاةُ (ابن العربي)

سور کا سارا جسم تو ناپاک ہوتا ہی ہے' البتہ اُس کے بالوں سے نفع اُٹھانے کی گنجائش ہے' چنانچہ ایک حدیث میں اس کا جواز مذکور ہے۔

لَا خِلَافَ أَنَّ جُمْلَةَ الْخِنْزِيرِ مُحَرَّمَةٌ إِلَّا الشَّعْرَ فَإِنَّهُ يَجُوزُ الْخِرَازَةُ بِهِ وَقَدْ رُوِيَ أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْخِرَازَةِ بِشَعْرِ الْخِنْزِيرِ فَقَالَ لَا بَأْسَ بِذَلِكَ۔ (قرطبي)

امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ و اوزاعیؒ سور کے بالوں سے انتفاع کے جواز کے قائل ہیں اور امام شافعیؒ عدم جواز کے اور امام ابو یوسفؒ سے جواز و کراہت دونوں کی روایتیں منقول ہیں۔

وَقَدِ اخْتَلَفَ الْفُقَهَاءُ فِي جَوَازِ الْانْتِفَاعِ بِشَعْرِ الْخِنْزِيرِ فَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَمُحَمَّدٌ يَجُوزُ الْانْتِفَاعُ

بِهٖ لِلْخَرْزِ وَقَالَ الشَّافِعِيُّ لَا يَجُوْزُ الْاِنْتِفَاعُ بِشَعْرِ الْخِنْزِيْرِ۔ (جصاص)

فقہی احکام اور شرعی حرمت سے قطع نظر، خنزیر ہے ہی ایسی نجس چیز کہ خود فطرتِ سلیم اُسے گندہ سمجھتی ہے اور نظافتِ طبع کو اُس کی جانب رغبت کرنے سے کراہت آتی ہے، یہاں تک کہ لفظ خنزیر بھی عربی فیلالوجی (لسانیات) کے بعض ماہرین کا خیال ہے کہ قَذِرَ الشَّیْءُ (وہ چیز گندی ہوگئی) سے بنا ہے، انگریزی زبان میں بھی جتنے نام اس جانور کے مثلاً HOG, SWINE, PIG یا اس جانور کے گوشت کے لئے ہیں، مثلاً HAM, PORK, BACON بھی سب کے سب دلالتِ ثانوی گندگی وغلاظت پر کرتے ہیں اور اس کے گوشت کے جو طبی نقصانات ہیں خصوصاً امراضِ عدودی میں جس طرح معین ہوتا ہے اس پر تو آج کل کے ڈاکٹر بہت کچھ لکھ چکے ہیں، سُور کی گندگی اور ناپاکی اتنی روشن وعیاں ہے کہ بعض پرانی قومیں مثلاً اہلِ مصر بھی اُسے نجس سمجھتی رہی ہیں، بلکہ خود یہود کے ہاں بھی یہ حرام تھا، آج مسیحی قومیں جس ذوق وشوق سے یہ گندہ گوشت تازہ اور خشک دونوں صورتوں میں کھایا کرتی ہیں، اور اس کی چربی سے جو طرح طرح کے کام لیتی رہتی ہیں، بلکہ اس کی نسل کی پرورش کا انتظام جس بڑے پیمانہ پر جا بجا کئے ہوئے ہیں اُسے دیکھ کر تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ کراہت کیسی؟ عجب نہیں کہ کچھ فضائل اس جانور کے مسیحیت میں وارد ہوئے ہوں حالانکہ اس کی حرمت اور نجاست دونوں صراحت کے ساتھ بائبل میں موجود ہیں:۔

"اور سُور کہ کھُر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جُگالی نہیں کرتا، وہ بھی تمہارے لئے ناپاک ہے" (احبار ۱۱:۷)

"اور سُور کہ کھُر اُس کے چرے ہوئے ہیں، پہ جُگالی نہیں کرتا بھی تمہارے لئے ناپاک ہے، تم اس کا گوشت نہ کھائیو نہ اس کی لاش کو ہاتھ لگائیو" (استثناء ۱۴:۸)

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔ اِہلال کے اصلی معنی آواز بلند کرنے، پکار کر دینے، شہرت دے دینے کے ہیں۔

هُوَ رَفْعُ الصَّوْتِ عِنْدَ رُؤْيَةِ الْهِلَالِ ثُمَّ يُسْتَعْمَلُ لِكُلِّ صَوْتٍ (راغب) اَلْاِهْلَالُ رَفْعُ الصَّوْتِ (قرطبی)

مراد یہ ہے کہ جس جانور کو بہ طریقِ تعظیم وعبادت یا بہ قصدِ تقرب کسی مخلوق کے لئے نامزد کر دیا جائے، اور نیت کسی مخلوق کی نذر ونیاز یا بھینٹ کی کر لی جائے، وہ حرام ہو جاتا ہے، خواہ اُس کے ذبح کے وقت بسم اللہ بھی کیوں نہ پڑھ لی جائے، شیخ سدو کے نام کے بکرے اور اس قبیل کی تمام چیزیں اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں۔

وَلَا خِلَافَ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ اَنَّ الْمُرَادَ بِهِ الذَّبِيْحَةُ اِذَا اُهِلَّ بِهَا لِغَيْرِ اللّٰهِ عِنْدَ الذَّبْحِ (جصاص)

"در حدیث وارد است کہ مَلْعُوْنٌ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ یعنی ہر کہ بہ ذبح جانور تقرب غیر خدا نماید ملعون است خواہ در وقت ذبح نام خدا گیر د زیرا کہ چوں شہرت داد کہ ایں جانور برائے فلانے است ذکر نامِ خدا وقت ذبح فائدہ نہ کرد۔" (تفسیر فتح العزیز)

"جس جانور کو غیر اللہ کے نامزد اس نیت سے کیا ہو کہ وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ہماری کارروائی کرائیں گے، جیسا کہ عام جاہلوں کی عادت ہوتی ہے کہ اس نیت سے بکرا، مرغا وغیرہ مقرر کر دیتے ہیں، وہ حرام ہو جاتا ہے اگرچہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا ہو۔ البتہ اگر اس طرح نامزد کرنے کے بعد اس سے توبہ کر لے پھر حلال ہو جاتا ہے۔" (تھانویؒ)

بعض فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کسی حاکم یا سردار کے آنے پر بطور بھینٹ کے ذبح کرے گا تو وہ بھی حرام ہو جائے گا، اگرچہ اس پر اللہ کا نام لے لیا گیا ہو۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ؕ

لیکن (اس میں بھی) جو شخص مضطر ہو جائے ۶۱۷ اور نہ بے حکمی کرنے والا ہو اور نہ حد سے نکل جانے والا ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں ۶۱۸

ذَبَحَ لِقُدُومِ الْأَمِيرِ وَنَحْوِهِ كَوَاحِدٍ مِنَ الْعُظَمَاءِ يَحْرُمُ لِأَنَّهُ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَوْ وَاصِلَةً ذِكْرُ اسْمِ اللّٰهِ تَعَالَى. (الدر المختار)

بلکہ بعض فقہاء نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ کوئی مسلمان اگر جانور کو تقرب غیر اللہ کے قصد سے ذبح کرے گا تو وہ مرتد ہو جائے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ سمجھا جائے گا۔

قَالَ الْعُلَمَاءُ لَوْ أَنَّ مُسْلِمًا ذَبَحَ ذَبِيحَةً وَقَصَدَ بِذَبْحِهَا التَّقَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللّٰهِ صَارَ مُرْتَدًّا وَذَبِيحَتُهُ ذَبِيحَةُ مُرْتَدٍّ. (کبیر)

فقہاء مفسرین سے آیت کے تحت میں یہ تصریح نقل ہوئی ہے کہ مجوسی اور مشرک اور لامذہب کے ہاتھ کے ذبیحے ناجائز ہیں۔

وَهِيَ ذَبِيحَةُ الْمَجُوسِيِّ وَالْوَثَنِيِّ وَالْمُعَطِّلِ فَالْوَثَنِيُّ يَذْبَحُ لِلْوَثَنِ وَالْمَجُوسِيُّ لِلنَّارِ وَالْمُعَطِّلُ لَا يَعْتَقِدُ شَيْئًا فَيَذْبَحُ لِنَفْسِهِ. (قرطبی)

**۶۱۷** یعنی حرام غذا کے استعمال پر مجبور ہو کر۔

أَيْ فَمَنِ اضْطُرَّ إِلَى شَيْءٍ مِنْ هٰذِهِ الْمُحَرَّمَاتِ أَيْ أُحْوِجَ إِلَيْهَا. (قرطبی)

اُضْطُرَّ۔ اِضْطِرَارٌ۔ ضرورت سے مشتق ہے، اور اس کے باب افتعال سے ہے، مطلب یہ ہے کہ شدت ضرورت کے وقت ان حرام غذاؤں کو بھی بقدر کفایت کھایا جا سکتا ہے، شدید ضرورت کی صورتیں دو ۲ ہو سکتی ہیں:۔

(۱) یہ کہ بھوک کی شدت سے معلوم ہوتا ہو کہ دم نکلا جاتا ہے، اور حلال غذا سرے سے دستیاب ہی نہیں ہو رہی ہے؛ یا افلاس کی بنا پر اس تک دسترس نہ ہو، اور یا پھر کسی مرض کی بنا پر حلال غذا ناقابل استعمال ہو۔

(۲) یہ کہ کوئی حاکم اُس حرام غذا کے استعمال پر مجبور کر رہا ہو۔

وَهٰذِهِ الضَّرُورَةُ لَهَا سَبَبَانِ أَحَدُهُمَا الْجُوعُ الشَّدِيدُ وَالثَّانِي إِذَا أُكْرِهَ عَلَى تَنَاوُلِهِ مَضَرَّةٌ (کبیر) الْاِضْطِرَارُ لَا يَخْلُو أَنْ يَكُونَ بِإِكْرَاهٍ مِنْ ظَالِمٍ أَوْ بِجُوعٍ فِي مَخْمَصَةٍ وَالَّذِي عَلَيْهِ الْجُمْهُورُ مِنَ الْفُقَهَاءِ وَالْعُلَمَاءِ فِي مَعْنَى الْآيَةِ هُوَ مَنْ صَيَّرَهُ الْعَدَمُ وَالْغَرَثُ وَهُوَ الْجُوعُ إِلَى ذٰلِكَ. (قرطبی)

غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ۔ یہ مجموعہ حال ہے مضطر کا، اور تقدیر کلام یوں ہے فَمَنِ اضْطُرَّ لَا بَاغِيًا وَّلَا عَادِيًا (معالم)

**۶۱۸** (ان حرام چیزوں کے کھا لینے میں) بلکہ اکثر تو ایسے موقع پر نہ کھانا گناہ ہے۔

بَلْ رُبَّمَا يَأْثَمُ بِتَرْكِ التَّنَاوُلِ (روح) وَهٰهُنَا يَتَحَقَّقُ مَعْنَى الْوُجُوبِ. (کبیر)

اس لئے کہ حفظ نفس تو اولین فرائض میں سے ہے، اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے جو حرام خوری سے شدید تر ہے، مریض کو آخر افطار کرا ہی دیا جاتا ہے۔

وَلَا خِلَافَ أَنَّهُ لَا يَجُوزُ لَهُ قَتْلُ نَفْسِهِ بِالْإِمْسَاكِ عَنِ الْأَكْلِ وَأَنَّهُ مَأْمُورٌ بِالْأَكْلِ عَلَى وَجْهِ الْوُجُوبِ (قرطبی) لَوْ تَرَكَ الْأَكْلَ تَلِفَ نَفْسُهُ بِذٰلِكَ أَكْبَرُ الْمَعَاصِي (قرطبی) وَقَالَ الطَّبَرِيُّ لَيْسَ الْأَكْلُ عِنْدَ الضَّرُورَةِ رُخْصَةً

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ

بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحمت والا ہے۔ ۶۱۹ بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں،

الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي

اور اُس کے معاوضہ میں قلیل قیمت حاصل کرتے ہیں ۶۲۰ سو ایسے لوگ تو اپنے پیٹوں میں بس آگ ہی

بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ

(آگ) بھرتے ہیں ۶۲۱ اور اللہ قیامت کے دن اُن سے کلام نہ کرے گا ۶۲۲ اور نہ اُنھیں پاک کرے گا ۶۲۳ الف

بَلْ ذٰلِكَ عَزِيْمَةٌ وَاجِبَةٌ وَلَوِ امْتَنَعَ مِنَ الْاَكْلِ كَانَ عَاصِيًا (بحر) وَقَالَ مَسْرُوْقٌ بَلَغَنِيْ اَنَّهٗ مَنِ اضْطُرَّ اِلَى الْمَيْتَةِ فَلَمْ يَاْكُلْ حَتّٰى مَاتَ دَخَلَ النَّارَ كَاَنَّهٗ اَشَارَ اِلٰى اَنَّهٗ قَاتِلُ نَفْسِهٖ بِتَرْكِهٖ مَا اَبَاحَ اللّٰهُ لَهٗ (بحر) وَهٰذَا يَقْتَضِيْ اَنَّ اَكْلَ الْمَيْتَةِ لِلْمُضْطَرِّ عَزِيْمَةٌ لَا رُخْصَةٌ قَالَ ابوالحسن الطبری المعروف بالکیا الهراسی رفیق الغزالی فی الاشتغال وھذا ھو الصحیح عندنا کالافطار للمریض ونحو ذلک۔

غَیْرَ بَاغٍ۔ یعنی اس کی نیت اور ارادہ نافرمانی اور قانون شکنی کا نہ ہو، اور وہ محض طالبِ لذّت نہ ہو، ضرورت واقعی ہو، یہ ہرگز نہ ہو کہ کسی شخص کے دل میں قانونِ الٰہی کا احترام ہی ہلکا ہو، یا وہ حرام چیزوں سے لذّت ہی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ بَاغٍ کے معنی دو ہو سکتے ہیں، ایک دوسرے پر ظلم کرنے والا، دوسرے طالبِ لذّت۔

وَلَا عَادٍ۔ اور نہ حدودِ شرعی سے تجاوز کرنے والا یعنی مقدار میں بھی بس محض بقدرِ ضرورت کھائے، یہ نہ ہو کہ خوب سیر ہو کر کھانے لگے قَالَ الشَّافِعِيُّ وَاَبُوْحَنِيْفَةَ وَاَصْحَابُهٗ لَا يَاْكُلُ الْمُضْطَرُّ مِنَ الْمَيْتَةِ اِلَّا قَدْرَ مَا يُمْسِكُ رَمَقَهٗ (کبیر)

۶۱۹ غَفُوْرٌ۔ ایسا مغفرت والا کہ بعض حالات میں جرائم پر بھی مواخذہ نہیں کرتا، بلکہ اُنھیں جرائم ہی باقی نہیں رہنے دیتا رَحِیْمٌ۔ ایسا شفقت والا کہ تنگی کے موقعوں پر آسانی بہم پہونچا دیتا ہے، ان صفات کے استحضار سے ہر مومن مسلم کو جو طبعی کراہت حرام اشیاء کی طرف ہوتی ہے وہ کم ہو جائے گی، اور وہ اجازت سے فائدہ اُٹھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔

۶۲۰ یہود کی جانب اشارہ ہے جو اپنے ہاں کی اصل آسمانی تعلیمات کو چھپاتے تھے، اور اس اخفا و کتمان سے ان کا مقصود کچھ نفع دنیوی حاصل کرنا ہوتا تھا۔

يَعْنِيْ عُلَمَاءَ الْيَهُوْدِ (قرطبی) يَعْنِي الْيَهُوْدَ (ابن کثیر)

ثَمَنًا قَلِيْلًا۔ سے یہ مُراد نہیں کہ زیادہ قیمت اور بڑے معاوضہ پر دین فروشی جائز ہے، مُراد اس سے محض دنیوی معاوضہ ہے جو نفع آخرت کے مقابلہ میں ہمیشہ قلیل و حقیر ہی ہوگا۔

سَمَّاهُ قَلِيْلًا لِاِنْقِطَاعِ مُدَّتِهٖ وَسُوْءِ عَاقِبَتِهٖ۔ (قرطبی)

۶۲۱ (کہ یہ جرم کتمانِ حق اُنھیں صریح آتشِ جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے)

یہود کا جرم اخفائے حق اور کتمانِ وحیِ آسمانی، اُن کی معصیت اکلِ حرام سے کہیں بڑھا ہوا تھا، اس لئے

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ

اور ان کے لئے دردناک عذاب ہی ہے ۶۲۳ (ب) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو خرید لیا ہے ہدایت کے بدلے میں اور عذاب

بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ

کو نجات کے بدلے میں، اور یہ لوگ کیسی جیوٹ رکھتے ہیں دوزخ کے لئے ۶۲۴ اور یہ (سزا) اس لئے ہوگی کہ اللہ نے کتاب کو (بالکل)

بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿١٧٦﴾ ع

ٹھیک ٹھیک اتارا تھا ۶۲۵ اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال رہے ہیں وہ (بڑے) دور دراز کے خلاف میں پڑے ہوئے ہیں ۶۲۶

اس جرم کی سزا بھی سخت تر مذکور ہوئی۔

۶۲۲ (بہ طریق لطف وملاطفت)

عِبَارَةٌ عَنِ الْغَضَبِ عَلَيْهِمْ وَإِزَالَةُ الرِّضَا عَنْهُمْ (قرطبی) وَقِيلَ نَفْيُ الْكَلَامِ عِبَارَةٌ عَنْ غَضَبِهِ عَلَيْهِمْ (کشاف) قِيلَ أَرَادَ بِهِ أَنَّهُ يَكُونُ عَلَيْهِمْ غَضْبَانَ (معالم)

جو خطاب بہ طریق عتاب ہوگا، وہ ظاہر ہے کہ اس سے مستثنیٰ ہے، قیامت کے دن اللہ کی اپنے بندوں سے گفتگو اُن کی انتہائی خوش قسمتی ہوگی، اور اس سے محرومی ان کی انتہائی بدنصیبی۔

۶۲۳ (الف) برزخ کے بعد حشر میں بھی جو لوگ اپنے ایمان اور دوسری نیکیوں کی بنا پر اپنے گناہوں سے دھلا دھلایا اور ہر گرفت سے پاک پائیں گے، وہ بھی گویا بڑے سستے چھوٹ گئے، بڑی اور اصلی مصیبت ان کی ہے جن میں قیامت کے دن کوئی شائبۂ ایمان بھی نہ پایا جائے گا۔

۶۲۳ (ب) فقرہ کی ترکیب یعنی اس کے الفاظ کی ترتیب نے مفہوم میں تاکید اور زور شامل کردیا۔

۶۲۴ (کہ اس کے لئے تیار ہو گئے اور یہاں دنیا میں ایمان وطاعت پر آمادہ نہ ہوئے!)

مَا۔ کلمۂ تعجب ہے کہ اپنی حرکتوں کے ثمرے اور دہشتناک نتیجے معلوم ہیں، اس پر بھی یہ شوخ چشمی!

مَذْهَبُ الْجُمْهُورِ مِنْهُمُ الْحَسَنُ وَمُجَاهِدٌ أَنَّ مَا مَعْنَاهُ التَّعَجُّبُ (قرطبی) تَعَجُّبٌ مِنْ حَالِهِمْ فِي الْتِبَاسِهِمْ بِمُوجِبَاتِ النَّارِ مِنْ غَيْرِ مُبَالَاةٍ مِنْهُمْ۔ (کشاف)

اِشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ۔ اس کا تعلق اسی دنیا سے ہے یعنی ہدایت کے بدلے گمراہی کو لے لیا، اسی دنیا میں۔

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ۔ اس کا تعلق عالم آخرت سے ہے یعنی لازمی نتیجہ عدم ایمان کا یہ ہوگا کہ آخرت میں مغفرت کے بجائے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

۶۲۵ (اور ناہنجار بندوں نے اُس میں خواہ مخواہ خلط وتلبس کردیا)

اَلْكِتَابَ۔ یہاں بہ طور اسم جنس استعمال ہوا ہے، مُراد ہیں تمام کتبِ آسمانی۔

بِالْحَقِّ۔ یعنی بالکل صحیح یا دلائل وشواہد کے ساتھ۔

# لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

طاعت یہ نہیں ہے ۶۲۷ کہ تم اپنا منھ مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لیا کرو ۶۲۸

اَىْ بِالصِّدْقِ وَقِيْلَ بِالْحُجَّةِ (قرطبی)

ذٰلِكَ۔ یہ اشارہ عذاب وغیرہ کی طرف ہے۔

اَىْ ذٰلِكَ الْعَذَابُ (کشاف۔ بیضاوی) اَىْ مَجْمُوْعُ مَا ذُكِرَ مِنْ اَكْلِ النَّارِ وَعَدَمِ التَّكْلِيْمِ وَالْعَذَابِ الْمُرَتَّبِ عَلَى الْكِتْمَانِ۔ (روح)

۶۲۶ (اور اس کے نتائج بھگت کر رہیں گے)

اِخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ۔ یعنی خواہ مخواہ اور اپنے اغراض کے لئے اپنی کتاب آسمانی میں جھگڑے نکال کھڑے کئے ورنہ تعلیماتِ الٰہی میں کمال وضوح کی بنا پر اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

فِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ۔ یعنی بھٹک کر حق وصداقت سے بہت ہی دور جا پڑے ہیں، یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ یہ غفلت اُن میں اس سے پیدا ہو گئی ہے کہ اللہ کے سچے کلام میں انھوں نے ازراہِ نفسانیت خواہ مخواہ اختلاف کیا اور اس لئے اور زیادہ بھٹک گئے۔

۶۲۷ (جیسا کہ گمراہ اور مشرک قومیں سمجھ رہی ہیں)

قرآن مجید کے متعدد مقامات کی طرح یہ آیت بھی اصلاً گمراہ ومشرک قوموں کے رد میں ہے اور اس کا مفہوم پوری طرح جبھی روشن ہوگا، جب اُن کے عقائدِ باطل کو پیش نظر رکھا جائے۔

اَلْبِرّ۔ بِر کے معنی لغتِ عربی میں بہت وسیع ہیں، نیکی کے جملہ اقسام پر شامل ہے، اُردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔

اَلْبِرُّ التَّوَسُّعُ فِىْ فِعْلِ الْخَيْرِ فَمِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى الثَّوَابُ وَمِنَ الْعَبْدِ الطَّاعَةُ (راغب) اَلْبِرُّ الطَّاعَةُ (تاج) قَالَ بَعْضُهُمْ اَلْبِرُّ الْخَيْرُ قَالَ وَلَا اَعْلَمُ تَفْسِيْرًا اَجْمَعَ مِنْهُ لِاَنَّهٗ يُحِيْطُ بِجَمِيْعِ مَا قَالُوْا۔ (تاج)

اہلِ لغت ہی کو نہیں اہلِ تفسیر کو بھی بِر کے مفہوم کی وسعت مسلّم ہے۔

اَلْبِرُّ اِسْمٌ جَامِعٌ لِلطَّاعَاتِ وَاَعْمَالِ الْخَيْرِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى (کبیر) اِسْمٌ عَامٌّ لِجَمِيْعِ مَا يُؤْجَرُ عَلَيْهِ الْاِنْسَانُ (کبیر) اِسْمٌ جَامِعٌ لِاَنْوَاعِ الْخَيْرِ وَالطَّاعَةِ الْمُقَرِّبَةِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى (روح) اَلْبِرُّ كُلُّ فِعْلٍ مَرْضِىٍّ (بیضاوی) اِسْمٌ لِلْخَيْرِ وَكُلِّ فِعْلٍ مَرْضِىٍّ (کشاف)

۶۲۸ (حالتِ نماز میں یا عبادت کے وقت)

ظہورِ اسلام سے قبل دنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی سمت پرستی تھی یعنی بے جان دیوتاؤں، دیویوں، مورتیوں، پتھروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کے علاوہ خود سمتوں یا جہتوں کی بھی پرستش جاری ہو گئی تھی اور مختلف جاہلی قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے قرآن مجید یہاں شرک کی اسی صورتِ خاص کی تردید کر رہا ہے اور ارشاد کر رہا ہے کہ کسی جہت میں

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ

بلکہ طاعت یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن اور فرشتوں اور کتاب اور پیمبروں پر ایمان لائے ۶۲۹

کیا تقدس رکھا ہوا ہے، اور کوئی سمت بہ حیثیت سمت، ہرگز قابل تقدیس نہیں، طاعت (البر) سے اس کا کوئی تعلق نہیں، ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو اشکال نظر آیا، وہ محض اس لئے کہ ان کی نظر مذاہب غیر کی اس گمراہی پر نہ تھی، اسلام نے ظاہر ہے کہ نماز کے لئے کوئی سمت بہ حیثیت سمت، ہرگز متعین نہیں کی ہے، اس نے نہ صرف ایک متعین مکان یعنی خانۂ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے، اور اسے قبلۂ توجہ ٹھہرایا ہے، خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ مصر و طرابلس و حبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے، ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں، شام و فلسطین و مدینہ سے جنوب میں، اور یمن اور بحر قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں، اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں یہ حقیقت پیش نظر رہے تو اشکال از خود رفع ہو جاتا ہے اور مختلف تاویلوں کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔

اَلْمَشْرِقِ۔ سورج دیوتا دنیائے شرک کا معبودِ اعظم رہا ہے مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اس لئے عموماً جاہلی قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا، اور عبادت کے لئے مشرق رخی اختیار کرلی، حضرت مسیحؑ کے چند ہی سال بعد جب مسیحیوں میں ایک شخص پولوس نامی اٹھا (جسے ایک دنیا آج سینٹ پال کے نام سے یاد کرتی ہے) اور اس نے مسیحیت کا رخ بجائے تجدید موسویت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا، رومی اس وقت حاکم قوم تھی، اور جیسے ابھی کل تک ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں انگریزیت اور ”مسیحیت“ کا بول بالا تھا، فلسطین میں محکوموں کے دلوں میں رومی مشرکوں ہی کے علوم و فنون، تہذیب و معاشرت، دین و عقائد کا تسلط چھایا ہوا تھا، اور رومی مذہب کا ایک جزو آفتاب پرستی بھی تھا، پولوسی مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ مراسم رومیوں سے دھڑا دھڑ اخذ کرلئے، وہیں اس مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا، اور عبادت مشرق کی طرف رخ کرکے کرنے لگے، چنانچہ مسیحیوں کے گرجے آج تک مشرق رویہ چلے آتے ہیں، قرآن مجید نے اس مشرق رخی پر زبردست ضرب لگائی اور بتا دیا کہ یہ سمت دار تقدس تو کسی درجہ میں بھی طاعت یا عبادت نہیں، بلکہ طاعتیں وہ ہیں، جن کی تفصیل یہی آیت آگے کر رہی ہے۔

وَالْمَغْرِبِ۔ مشرق پرستی سے تو بہر حال کم اور بہت کم پھر بھی بہت کچھ عام اور وسیع وبا مغرب پرستی کی بھی شرک کی دنیا میں رہ چکی ہے آفتاب کے طلوع و غروب پر قیاس کرکے مشرک ذہنیت نے یہ نتیجہ نکالا کہ جس طرح مصدر حیات سمت مشرق ہے اسی طرح مستقر موت و اجل سمت مغرب ہے، اور اسی لئے یہ بھی مستحق تعظیم و تقدیس ہے، ملاحظہ ہوں حواشی نمبر ۱۱۴۱ و ۱۲۱۴ پ۔

اَلْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ یہ دونوں نام صراحت کے ساتھ صرف مثال کے طور پر لئے گئے ہیں، مقصود تمام سمتوں کی تعمیم ہے انہی دو سمتوں کی تحدید یا تخصیص نہیں۔

وَالْمُرَادُ مِنْ ذِكْرِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ التَّعْمِيْمُ لَا تَعْيِيْنُ السَّمْتَيْنِ (روح)

۶۲۹ مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اصلی طاعت یہ ہے جس کا بیان اب شروع ہے

آیت کے اس جزو میں عقائد کی تصحیح آگئی۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ۔ تقدیر کلام یوں ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ۔ طاعت اس کی ہے جو اللہ پر ایمان لایا۔ الخ
وَالتَّقْدِيرُ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ بِرُّ مَنْ (قرطبی) حُذِفَ الْمُضَافُ وَهُوَ كَثِيرٌ فِي الْكَلَامِ وَهٰذَا اِخْتِيَارُ الْفَرَّاءِ وَالزَّجَّاجِ وَقُطْرُبٍ۔ (کبیر)

دوسری تقدیر کلام یوں بھی مانی گئی وَلٰكِنَّ الْبَارَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اس لئے کہ عربی میں مصدر کا استعمال صفات کے موقع پر بھی ہوتا رہتا ہے۔

فَالْعَرَبُ تَجْعَلُ الْمَصَادِرَ صِفَاتٍ فَمَجَازُ الْبِرِّ هٰهُنَا مَجَازُ صِفَةٍ لِمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ (مجاز)

فرّاء نحوی نے یہ بھی کہا ہے کہ عربی میں اسم کو فعل کی خبر بنا دیا جاتا ہے اور فعل کو اسم کی خبر (معانی)

اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اس میں دہریت والحاد کی جلی وخفی ہر صورت کی تردید آگئی، ایمان و طاعت میں داخلہ کا یہی دروازہ ہے کوئی ایسا نظام یا مسلک (خواہ اس کی بنیادیں عقلی ہوں یا اخلاقی یا معاشی یا سیاسی) جس میں اللہ کی آیات وصفات پر ایمان کامل داخل نہ ہو، طاعت سے کوئی علاقہ ہی نہیں رکھتا، مادیت و عقلیت (ریشنلزم) لاادریت (ایگناسٹی سزم) اشتمالیت (کمیونزم) وغیرہ سب اسی حکم کے تحت میں آجاتی ہیں، اور بودھ مذہب اور جین مت بھی، اگر ان کی بابت یہ بیان صحیح ہے کہ ان میں توحید باری موجود نہیں۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اس میں تردید اُن تمام گمراہ قوموں کی آگئی جو وجود باری کی تو قائل تھیں، لیکن اس عقیدہ سے خالی ہیں کہ ایک عالم آخرت بھی ہے، جہاں ایک روز جزائے اعمال کا سامنا کرنا اور زندگی کے ایک ایک معاملہ کا حساب دینا ہے، اور تو اور یہود نے اپنی زبردست توحید کے باوجود، عالم آخرت سے اپنا تعلق نہایت درجہ ضعیف کر رکھا تھا، جزا و سزا اسی دنیا میں سمجھنا، خواہ قومی و اجتماعی عروج و زوال سے، خواہ بہ قاعدۂ تناسخ مختلف قالبوں میں روح کے الٹ پھیر سے یہ سب انکار آخرت ہی کی شکلیں ہیں۔

وَالْمَلٰٓئِكَةِ۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ ان نورانی اور مجرد مخلوقات کا وجود اللہ کے بندوں اور کارساز مطلق کے قاصدوں، خادموں اور کارندوں کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے، نہ یہ کہ خود انھیں کو مستقل قوتوں کی طرح فاعل عامل، متصرف مان کر ان سے دعائیں مانگی جائیں، اور انہی کو ایک چھوٹے پیمانہ پر حاجت روا قرار دے لیا جائے، اس ایمان بالملائکہ سے یونان، روم، ہندوستان، ایران کی ان تمام مشرک قوموں کی تردید ہوگئی، جنھوں نے فرشتوں ہی کے تخیل کو مسخ کر کے کائنات کے مختلف شعبوں کے لئے دیویاں اور دیوتا تجویز کر لئے ہیں۔

وَالْكِتٰبِ۔ کتاب یہاں بہ طور اسم جنس آیا ہے اس کا اطلاق صحیفۂ آسمانی کے نفس تخیل پر ہوگا، کتاب آسمانی کا عقیدہ بھی ایک تمام تر اسلامی عقیدہ ہے، مشرک قومیں تو خیر اس تخیل ہی سے ناآشنا ہیں کہ اللہ کے ہاں سے کوئی کتاب کسی بندہ پر نازل ہوتی ہے، "اہل کتاب" تک اب اسلامی اصطلاح کے مطابق کسی "کتاب الٰہی" کے قائل نہیں، ان کے ہاں "کتاب" کے معنی صرف اس قدر ہیں کہ خدا نے ہدایت کے لئے بعض اشخاص کو چن لیا اور ان کے قلوب میں کچھ مضامین بطور الہام القا کر دیئے، اور ایسا الہام ہر عارف کو ہو سکتا ہے، نبوت اس کی کوئی لازمی شرط نہیں، پھر بعد کو ان بزرگوں اور عارفوں نے انہی مضامین و معانی کو اپنے لفظ و عبارت میں مرتب کر کے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو سنا دیا، پھر ان سامعین نے

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

اور اس کی محبت میں مال تقسیم کرے قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور راہ گیروں

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ

اور سائلوں پر ۶۳۰ اور گردنوں کے آزاد کردینے میں ۶۳۱

انھیں اپنے طور پر لکھ لیا (بجز توریت کی ابتدائی پانچ سورتوں کے کہ وہ یہودی عقیدہ کے مطابق خود حضرت موسیٰؑ کی نوشتہ ہیں) گویا ان الہامی کتابوں کی حیثیت کل وہ ہے جو ہمارے ہاں بزرگوں کے جمع کئے ہوئے ملفوظات کی ہوتی ہے! کہاں یہ تخیل، اور کہاں مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف تک وحی شدہ ہے جس میں خلط اور خطا کا امکان ہی نہیں! اور مسیحی تو جب حضرت مسیحؑ کی رسالت و نبوت ہی کے سرے سے قائل نہیں بلکہ ان کی الوہیت کے مدعی ہیں تو حضرت مسیحؑ کا صاحب کتاب رسول ہونا انکے ہاں کوئی معنی ہی نہیں رکھتا، کوئی آپ اپنے اوپر بھی بھلا کتاب نازل کیا کرتا ہے؟ وَالنَّبِيّٖنَ یعنی عقیدہ یہ ہو کہ اللہ انسانوں کو پیمبر بنا کر بھیجتا ہے یہ نہ ہو کہ خود حق تعالیٰ مجسم ہو کر اس دنیا میں آجاتا ہے یا کسی قالب میں حلول کر آتا ہے۔ اسی عقیدہ میں صاف تردید ہوگئی اوتار پرستی کی، مظہر پرستی کی، حلول کی، تجسم باری تعالیٰ کی۔ "اوتار" ٹھیک ضد اور مقابل ہے "پیمبر" کے۔ اوتار کا مفہوم یہ ہے کہ خالق کائنات خود کوئی مادی پیکر اختیار کرکے دنیا میں آجاتا ہے اور یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ قالب انسان ہی کا ہو، شیوجی یا شن جی جس طرح رام چندر جی بن کر یا سری کرشن بن کر آسکتے ہیں، اسی طرح سانپ بن کر، شیر بن کر یا مچھلی یا کچھوے کا قالب اختیار کرکے بھی آسکتے ہیں، غرض یہ کہ اوتار معنی و حقیقت کے اعتبار سے خدا ہوتا ہے، اور صورت اور ظاہر کے اعتبار سے انسان یا جانور، پیمبر اس کے برعکس صرف بشر ہوتا ہے اور ہمیشہ بشر ہی، نہ کبھی فوق البشر، نہ کبھی تحت البشر اور بجز اس کے کہ صاحب وحی ہوتا ہے (اور اس لئے اخلاق کی پاکیزگی میں بے نظیر اور جرم و عصیان سے پاک) اور کسی حیثیت سے شکل و صورت میں، چلنے پھرنے میں، بولنے چالنے میں، بھوک پیاس میں، غم و مسرت میں، صفات بشری سے ممتاز نہیں ہوتا، آیت کے اتنے جزو میں قرآن مجید نے اپنی معجزانہ بلاغت و ایجاز سے تمام اعتقادی گمراہیوں کی جڑ کاٹ دی، اور سارے مذاہب باطلہ کی تردید کردی، اعتقادی گمراہی جب کبھی بھی انسانوں کو گھیرے گی، ہمیشہ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، ایمان بالملائکہ ایمان بالکتاب اور ایمان بالانبیاء ہی کی کسی نہ کسی غلطی یا غلط فہمی کی راہ سے آئے گی۔

۶۳۰ عقائد کی تصحیح ہو چکی تو اب اعمال کی تصحیح شروع ہوئی اور اعمال میں بھی ابتدا شعبۂ معاملات سے ہوئی۔ عَلٰى حُبِّهٖ۔ اس کی محبت میں، یا اس کی محبت کے باوجود، جائز دونوں ترجمے ہیں، اور حُبِّهٖ کی ضمیر غائب اللہ کی طرف بھی ہو سکتی ہے ــــ اور مال کی طرف بھی۔

اَیْ وَاَعْطَى الْمَالَ لِاَجْلِ حُبِّهٖ تَعَالٰى اَوْ عَلٰى حُبِّهٖ اِيَّاهُ الْمَالَ (المنار)

ایک گروہ ضمیر کو اللہ کی طرف لے گیا ہے۔

یَعْنِیْ یُعْطُوْنَ الْمَالَ عَلٰى حُبِّ اللہِ اَیْ عَلٰى طَلَبِ مَرْضَاتِهٖ (کبیر) قِیْلَ عَلٰى حُبِّ اللہِ (کشاف) قِیْلَ الضَّمِیْرُ لِلّٰهِ تَعَالٰى (بیضاوی)

گویا یہ بتادیا کہ صَرفِ مال فی نفسہٖ ہرگز محمود و مطلوب نہیں مطلوب و مقصود صرف وہ صَرفِ مال ہے جو اللہ کی راہ میں، اللہ کی رضاجوئی کے لئے، اللہ کے دین کے فروغ کے لئے ہو۔

لیکن دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ صَرفِ مال، مال کی محبت کے باوجود ہو یعنی ضمیرِ غائب کا مرجع بجائے اللہ کے لفظ قریب مال کو قرار دیا گیا ہے۔

وَهُوَ قَوْلُ الْاَكْثَرِيْنَ اَنَّهٗ رَاجِعٌ اِلَى الْمَالِ (کبیر) اَىْ مَعَ حُبِّ الْمَالِ وَالشُّحِّ بِهٖ كَمَا قَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ (کشاف) قِيْلَ فِيْهِ اَنَّهٗ يَعْنِىْ حُبَّ الْمَالِ (جصاص) اَىْ اَخْرَجَهٗ وَهُوَ مُحِبٌّ لَّهٗ رَاغِبٌ فِيْهِ نَصَّ عَلٰى ذٰلِكَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَسَعِيْدُ بْنُ جُبَيْرٍ وَغَيْرُهُمَا مِنَ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ (ابن کثیر)

اس میں بھی ایک پختہ مومن کی تصویر آگئی ہے، مال و زر کی محبت اور قدر اس کے دل میں ہے، خواہشیں اس کی زندہ ہیں، اپنی ذات پر، اپنے محبوبات و مرغوبات پر وہ خرچ کرنا چاہتا ہے لیکن امرِ الٰہی کے آگے اپنی گردن جھکا دیتا ہے، اپنی خواہشات کو دبا دیتا ہے، اپنے شوق کو حکمِ خداوندی پر قربان کر دیتا ہے وہ عمل اسی پر کرے گا جو حکمِ ربّانی ہے اور خرچ وہیں کرے گا جہاں شریعت حکم دیتی ہے۔

ذَوِى الْقُرْبٰى الخ مصارفِ خیر کی اسلام نے یہ کتنی مناسب اور حکیمانہ ترتیب قرار دے دی ہے آیت کے اس جزو میں اُمّت کا پورا انظامِ معاشی ایک خلاصہ کی شکل میں آگیا ہے، مالی اعانت سب سے پہلے اپنے عزیزوں قریبوں کی کرنا چاہئے، یہ نہ ہو کہ بھائی کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہیں اور بہن جھونپڑے کو ترس رہی ہے، چچا کے پاس موٹریں ہوں اور بھتیجے کو بیکہ کے پیسے بھی میسّر نہ ہوں، ہر زردار کو سب سے پہلے خبرگیری اپنے نادار عزیزوں، کنبہ والوں، بھائیوں، بہنوں بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے قریبیوں کی کرنا چاہئے، اس کے بعد نمبر محلہ کے، بستی کے، شہر کے یتیم بچوں، بچیوں کا آتا ہے جن کا کوئی والی وارث، سرپرست باقی نہیں رہا ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ نمبر اُمّت کے عام مُفلسوں محتاجوں، اور پھر اُن مسافروں، راہ گیروں کا آتا ہے جو زادِ راہ سے محروم ہیں، اور اس لئے اپنے ضروری سفروں سے محروم رہ جاتے ہیں، یا بستی میں کہیں باہر سے وارد ہو گئے ہیں، اور کوئی اُن کے ٹھہرانے، کھلانے پلانے کا روادار نہیں ہو رہا ہے، اور پھر آخر میں اہلِ حاجت سوالی رہ جاتے ہیں، اس پورے معاشی پروگرام پر اگر قاعدہ سے عمل ہونے لگے تو اُمّت میں کہیں مفلسی، تنگدستی، بے معاشی، بے روزگاری کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟

**۶۳۱ (قیدیوں اور غلاموں کی)**

فِى الرِّقَابِ۔ رِقَاب، رَقَبَةٌ کی جمع ہے لفظی معنی گردن کے ہیں، محاورہ میں اس سے مُراد وہ ہوتے ہیں جن کی گردنیں آزاد نہیں یا جو بندھے ہوئے ہیں یعنی غلام جو دوسروں کی رعایا ہیں، یا قیدی جو کسی جُرم فوجداری یا دیوانی کی علت میں گرفتار ہو کر محبوس ہیں۔

اَلرَّقَبَةُ جُعِلَ فِى التَّعَارُفِ اِسْمًا لِلْمَمَالِيْكِ كَمَا عُبِّرَ بِالرَّاْسِ وَبِالظَّهْرِ مِنَ الْمَرْكُوْبِ (راغب)

وَالرَّقَبَةُ مَجَازٌ عَنِ الشَّخْصِ۔ (روح)

تقدیرِ کلام یوں ہے فِىْ تَخْلِيْصِ الرِّقَابِ يَا فِىْ فِكَاكِ الرِّقَابِ۔ گویا مضاف محذوف ہے اور یہ ترکیب قرآن مجید میں عام ہے، مُراد وہی زرِ معاوضہ دے کر قیدیوں کو قید سے اور غلاموں کو غلامی سے آزادی دلانا ہے۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ

اور نماز کی پابندی کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ۶۳۲ اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جب کہ وعدہ کر چکے ہوں

وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور تنگی میں اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ۶۳۳ یہی لوگ ہیں جو سچے

صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اترے اور یہی لوگ تو متقی ہیں ۶۳۴

يَعْنِى الْمُكَاتِبِيْنَ قَالَهٗ اَكْثَرُ الْمُفَسِّرِيْنَ (معالم) وَهُمُ الْمُكَاتِبُوْنَ (ابن کثیر) اَىْ فِىْ تَخْلِيْصِهَا بِمُعَاوَنَةِ الْمُكَاتِبِيْنَ اَوْ فَكِّ الْاُسَارٰى (بیضاوی) اَىْ فِىْ تَخْلِيْصِهَا الرِّقَابَ وَفِكَاكِهَا (روح) وَقِيْلَ فِدَاءُ الْاُسَارٰى (معالم)

مصارفِ خیر و اعانت کی ایک ضروری مد رہی جاتی تھی، قرآن مجید نے آخر میں اس کا بھی اضافہ کر دیا اور اب یہ فہرست امت کے اجتماعی نقطۂ نظر سے ہر طرح مکمل ہو گئی۔

۶۳۲ تصحیح عقائد کی ہو چکی، تصحیح معاملات کی ہو چکی، اب نمبر عبادات کا آتا ہے، عبادات بے شمار ہیں، بنیادی اور بڑی تقسیم عبادتِ بدنی اور عبادتِ مالی کی ہے، یہاں الصَّلٰوة والزَّكٰوة لا کر دونوں کی جنس کی طرف اشارہ کر دیا، نماز ساری بدنی عبادتوں کی قائم مقام ہو گئی، زکوٰۃ ساری مالی عبادتوں کی۔

اَقَامَ الصَّلٰوةَ۔ یعنی نمازیں وقت مقرر پر، شرائط و قواعدِ معلوم کے ساتھ ادا کرتے رہتے ہیں۔

اٰتَى الزَّكٰوةَ۔ یعنی زکوٰۃ حسب آداب و شرائطِ شریعت باقاعدہ ادا کرتے رہتے ہیں۔

۶۳۳ عقائد ہو چکے، معاملات ہو چکے، عبادتیں ہو چکیں، اب ذکر اخلاق کا شروع ہوا۔

اَلْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ۔ فقرہ ہر قسم کے معاہدات کا جامع ہے، خواہ وہ معاہدہ بندہ کا اپنے خالق کے ساتھ ہو یا معاہدہ بندوں کا بندوں کے درمیان ہو، مومن جھوٹا وعدہ کرنا یا جھوٹا عہد لینا جانتا ہی نہیں۔

اَىْ فِيْمَا بَيْنَهُمْ بَيْنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَفِىْ مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ النَّاسِ (قرطبی)

اَلْبَاْسَآءِ۔ مصیبت اور تنگدستی میں بأساء کا اصل تعلق مالی پریشانیوں سے ہے۔

اَىِ الشِّدَّةُ وَالْفَقْرُ (قرطبی) اَلْبَاْسَآءُ فِى الْاَمْوَالِ كَالْفَقْرِ (بیضاوی عن الازہری) هُوَ الشِّدَّةُ وَالْفَقْرُ (المنار)

اَلضَّرَّآءُ۔ بیماری کی تکلیفوں میں ضراء کا اصل تعلق جسمانی آزار اور قلبی پریشانی سے ہے۔

اَىِ الْمَرَضُ وَالزَّمَانَةُ (قرطبی) اَلضَّرَّآءُ فِى الْاَنْفُسِ كَالْمَرَضِ (بیضاوی عن الازہری) مَا يَضُرُّ الْاِنْسَانَ مِنْ نَحْوِ مَرَضٍ اَوْ قَرْحٍ اَوْ فَقْدِ مَحْبُوْبٍ مِنْ مَالٍ وَاَهْلٍ۔ (المنار)

حِيْنَ الْبَاْسِ۔ یعنی جنگ کے وقت دشمنانِ دین کے مقابلہ میں۔

اَىْ وَقْتَ مُجَاهَدَةِ الْعَدُوِّ (بیضاوی) اَىْ وَقْتَ الْحَرْبِ (قرطبی) وَفَسَّرُوا الْبَاْسَ بِاشْتِدَادِ الْحَرْبِ۔ (المنار)

# يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلْقِصَاصُ فِى ٱلْقَتْلَى ۖ

اے ایمان والو! تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کردیا گیا ہے ۶۳۵

ثبات و صبر کے ظاہر کرنے میں اور جوہر سیرت و مردانگی کی چمک کھانے کے یہی تین خاص موقع ایک مومن کے لئے ہوتے ہیں۔

۶۳۴ یعنی کمالاتِ حقیقی کے ساتھ موصوف اور طاعت و پرہیزگاری (برّ و تقویٰ) میں پورے اترنے والوں کی علامتیں یہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکیں، اس معیار سے جس کو چاہو جانچ لو، پرکھ لو۔

اَیْ صَدَقُوْا فِی الدِّیْنِ وَاتِّبَاعِ الْحَقِّ وَطَلَبِ الْبِرِّ۔ (بیضاوی)

قرآن مجید کی ہر آیت بجائے خود معظم، محترم و واجب العمل ہے، لیکن اس آیت کے باب میں تو حدیث نبوی میں یہاں تک صراحت موجود ہے کہ مَنْ عَمِلَ بِھٰذِہِ الْاٰیَةِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ (جس نے اس آیت پر عمل کرلیا، اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا) اور محققین کا قول نقل ہوا ہے کہ یہ آیت اہم ترین آیتوں میں سے ہے، اور اس کے اندر دین و شریعت کے سولہ احکام آگئے ہیں۔

قَالَ عُلَمَاءُنَا ھٰذِہٖ اٰیَةٌ عَظِیْمَةٌ مِّنْ اُمَّھَاتِ الْاَحْکَامِ لِاَنَّھَا تَضَمَّنَتْ سِتَّ عَشْرَةَ قَاعِدَةً اَلْاِیْمَانِ بِاللّٰہِ وَبِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَالنَّشْرِ وَالْحَشْرِ وَالْمِیْزَانِ وَالصِّرَاطِ وَالْحَوْضِ وَالشَّفَاعَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكُتُبِ الْمُنَزَّلَةِ وَاَنَّھَا حَقٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاِنْفَاقِ الْمَالِ فِیْمَا یَعِنُّ مِنَ الْوَاجِبِ وَالْمَنْدُوْبِ وَاِیْصَالِ الْقَرَابَةِ وَتَرْكِ قَطْعِھِمْ وَتَفَقُّدِ الْیَتِیْمِ وَعَدَمِ اِھْمَالِهٖ وَالْمَسَاكِیْنِ كَذٰلِكَ وَمُرَاعَاتِ ابْنِ السَّبِیْلِ وَالسُّؤَالِ وَفَكِّ الرِّقَابِ (قرطبی)

اور بعض صوفیوں نے آیت کے اجزاء کی جامعیت پر نظر کرکے کہا ہے کہ آیت اصل و مدار ہے شریعت و طریقت کی، آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے لئے کافی نہ صرف باطنی اعتقاد ہے اور نہ صرف ظاہری، بلکہ دل میں ایمان ہونا بھی لازمی ہے اور ظاہر میں احکام کی اطاعت بھی۔ اور یہ باتیں تو سب اپنوں کی تھیں، فرنگیوں میں سے ایک ذات شریف پادری ویری (WHERRY) نامی ہوئے ہیں، مسلمانوں اور اسلام کے بڑے "عنایت فرما" سن سفید داڑھی کے بال اسلام کی عداوت ہی میں سفید کئے ہیں، سیل (SALE) کے انگریزی ترجمۂ قرآن پر تفسیر کا اضافہ انہی کے قلم سے ہے، اس آیت پر پہونچ کر قدرت ان کے قلم سے یوں لکھواتی ہے:

"یہ (آیت) قرآن کی بلند ترین آیتوں میں ہے.... ذات باری پر ایمان، اور نوعِ انسانی کے ساتھ حُسنِ سلوک اس کو اس میں واضح طور پر مذہب کا جوہرِ اصلی بتایا گیا ہے، اس میں لُبِّ لُباب عقائد اور اعمال کا آگیا!"

خیر یہی بہت غنیمت ہے کہ پادری صاحب کو کچھ تو آیتیں قرآن مجید میں "بلند" نظر آگئیں۔

۶۳۵ (اس حال میں کہ جب تم اپنی حکومت رکھتے ہو، اور سزاؤں کے نفاذ پر باقاعدہ قدرت رکھتے ہو) اسلام اپنے پیرووں سے توقع دنیوی سربلندی ہی کی رکھتا ہے اور اسے ایک بطور مسلّمہ کے فرض کئے رہتا ہے کہ امت دنیوی اقتدار کی بھی مالک ہوگی، مسلمانوں کا صدیوں تک مسلسل کافروں کے تسلط و اقتدار میں رہنا اسلام کے مفروضات اولین میں گویا داخل ہی نہیں، قانون فوجداری اور قانون دیوانی دونوں کی اکثر دفعات کا نفاذ نظامِ حکومت کے اسلامی ہونے پر معلق ہے یعنی امت کو ان قوانین الٰہی کے تنفیذ کی باقاعدہ قدرت بھی تو ہو۔

لَاخِلَافَ اَنَّ الْقِصَاصَ فِی الْقَتْلِ لَا یُقِیْمُهٗ اِلَّا اُولُوا الْاَمْرِ فَرْضٌ عَلَیْھِمُ النُّھُوْضُ بِالْقِصَاصِ وَاِقَامَةِ الْحُدُوْدِ وَغَیْرِ ذٰلِكَ (قرطبی) اِتَّفَقَ اَئِمَّةُ الْفَتْوٰی عَلٰی اَنَّهٗ لَا یَجُوْزُ لِاَحَدٍ اَنْ یَّقْتَصَّ مِنْ اَحَدٍ

# اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ط

آزاد کے بدلے میں آزاد، اور غلام کے بدلے میں غلام اور عورت کے بدلے میں عورت ۶۳۶

حقہ دون السلطان ولیس للناس ان یقتص بعضھم من بعض (قرطبی)

قصاص۔ یہ انتقام محض کا مرادف نہیں کہ ہر فرد دوسرے فرد سے از خود لینا شروع کر دے بلکہ قانون فوجداری کے ماتحت سزا کی منظم، مہذب و منضبط ترین شکل کا نام ہے، اُمت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے اس کے اجراء کی ذمہ داری حکومت یا اہل حل وعقد پر عائد ہوتی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ میں مومنین سے خطاب اجتماعی حیثیت سے ہے انفرادی حیثیت سے نہیں، مسلم حکومت سے ہے، مسلم افراد سے نہیں، جیسا کہ اسی حاشیہ میں ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

قَتْلٰی۔ قتل عمد کی سزا دنیا کے ہر قانون میں عموماً قتل ہی ہے، البتہ خود قتل عمد کی تعریف میں بہت کچھ اختلافات ہیں، شریعت اسلامی کی اصطلاح میں قتل عمد وہ ہے کہ کوئی کسی کو ارادہ کر کے کسی آہنی سلاح سے یا کسی اور حربہ سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہ سکے قتل کرے۔

اما العمد فما تعمد ضربہ بسلاح او ما یجری مجری السلاح فی تفریق الاجزاء (کافی)

السلاح ما یکون آلۃ قاتلۃ اعدت للقتال (نہایہ)

اور فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ قصاص یعنی سزاء قتل اسی قتل کے ساتھ خاص ہے۔

قَتْلٰی۔ کے عموم میں غلام اور ذمی، مرد و عورت سب ہی مقتول داخل ہیں۔

سواء کان المقتول عبدا او ذمیا ذکرا او انثی لشمول لفظ القتلی للجمیع (جصاص)

کُتِبَ عَلَیْکُمْ۔ یعنی قتل عمد کے لئے یہ سزا فرض ہے۔

معناہ فرض علیکم ... فاقتضی وجوب القصاص علی قاتل عمدا بحدیدۃ (جصاص)

لیکن فرض ہونے کے یہ معنی نہیں کہ قصاص ہر صورت میں لیا ہی جائے استثناء کی صورتیں تو خود آیت ہی میں ابھی آرہی ہیں، فرضیت سے مقصود یہ ہے کہ حدود قصاص سے آگے نہ بڑھا جائے اور اندھا دھند انتقام در انتقام کی کارروائی نہ شروع ہو جائے۔

ولیس القصاص بلازم انما اللازم الا یتجاوز القصاص وغیرہ من الحدود الی الاعتداء (قرطبی)

کتب علیکم العدل فی القصاص ایھا المؤمنون ..... ولا تجاوزوا ولا تعتدوا کما اعتدی من قبلکم۔ (ابن کثیر)

کُتِبَ عَلَیْکُمْ۔ قرآن مجید میں جہاں بھی آیا ہے فرضیت کے لئے آیا ہے۔

معناہ فی کل القرآن، فرض علیکم۔ (معالم)

۶۳۶ مراد یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ رہے گی، اور خون خون سب کا برابر سمجھا جائے گا، یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے، یا ایک مقتول کے عوض میں پورا کنبہ یا قبیلہ یا قوم تباہ کر دی جائے۔ عرب جاہلی میں ایک دستور یہ پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا، تو قصاص میں جان اُس آزاد کی لینے کے بجائے کسی غلام کی لی جاتی، یہود عرب کا دستور منقول ہوا ہے کہ اُن کے اعلیٰ قبیلہ (مثلاً

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ

ہاں جس کسی کو اُس کے فریقِ مقابل کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے ۶۳۷ سو مطالبہ معقول (اور نرم) طریق پر کرنا چاہئے ۶۳۸

بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ

اور مطالبہ کو اُس (فریق) کے پاس خوبی سے پہونچا دینا چاہئے ۶۳۹ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے ۶۴۰

بنی نضیر) کے ایک مقتول کے عوض، قاتل اگر کسی ادنیٰ قبیلہ (مثلاً بنی قریظہ) سے تعلق رکھتا، تو اُس کے دو شخصوں سے قصاص لیا جاتا۔۔۔ دنیا کی تاریخ دوسرے ملکوں میں بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں، اور امریکہ میں تو آج تک ایک گورے (WHITE) کا خون ایک کالے (NEGRO) کے خون سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہے، اور فرنگی حکومتیں اپنے ایک ایک مقتول کے عوض، قاتل قوم کے کئی کئی شخصوں کی جانیں بے تکلف لیتی رہتی ہیں، یہاں پہونچ کر داد اُن فقہاء و مفسرین کی نکتہ سنجی کی دینا پڑتی ہے جنھوں نے آیت کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے۔ اَیِ الْمُسَاوَاۃُ بَیْنَھُمْ لَا الزِّیَادَۃُ۔

اسلام نے ان ظالمانہ دستوروں کو مٹایا، اور اعلان کر دیا کہ زندگی ہر مؤمن کی اُمّت کے ہر فرد کی یکساں قابلِ احترام ہے، اور مرد ہو، عورت ہو، آزاد ہو، غلام ہو، کوئی ہو جس کا جو قاتل ہو گا وہی سزا پائے گا۔

اَلْقِصَاصُ عِبَارَۃٌ عَنِ الْمُسَاوَاۃِ وَالْمَعْنٰی فُرِضَ عَلَیْکُمْ اِعْتِبَارُ الْمُمَاثَلَۃِ وَالْمُسَاوَاۃِ مِنَ الْقَتْلٰی۔ (مدارک)

فقہ حنفی کے دو مسئلے اس سلسلہ میں قابل خیال رکھنے کے ہیں:۔

(۱) مقتول اگر کافر ہے لیکن ذمّی تو اس کا بھی قصاص قاتل ہی سے لیا جائے گا، اگرچہ وہ مسلم ہو، ہاں کافرِ حربی چونکہ کھلا ہوا باغی اور دشمن ہوتا ہے اسلامی "اسٹیٹ" کا بھی اور اسی لئے تو اسے حربی کہا ہی جاتا ہے، سو اس کے قتل میں ظاہر ہے کہ قصاص نہیں (۲) دوسرے یہ کہ قتلِ عمد میں آزاد کے عوض میں تو آزاد قتل کیا ہی جائے گا، غلام کے عوض میں بھی آزاد قتل کیا جائے گا اگر وہ قاتل ہے، اور عورت کے عوض میں عورت تو ماری ہی جائے گی لیکن مرد بھی قتل کیا جائے گا، اگر وہ قاتل ہے۔

آیت میں ایک پہلو ایسا بھی ہے، جس سے معتزلہ کا رد نکل آیا، معتزلہ گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از ایمان سمجھتے ہیں، حالانکہ آیت میں اکبر الکبائر یعنی قتلِ مسلم کا بیان ہے اور قاتل کو دائرۂ اسلام سے خارج نہیں کیا ہے، مسلمان ہی شمار کیا ہے۔

وَفِی الْاٰیَۃِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الْقَاتِلَ لَا یَصِیْرُ کَافِرًا بِالْقَتْلِ لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی خَاطَبَہٗ بَعْدَ الْقَتْلِ بِخِطَابِ الْاِیْمَانِ (معالم)

شریعتِ موسوی کی جو تصریحات اس باب میں درج ہیں وہ قابل ملاحظہ ہیں:۔

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا وہ مار ڈالا جائے گا" (احبار۔ ۲۴: ۱۷) "اور جو انسان کو مار ڈالے، جان سے مارا جائے" (احبار۔ ۲۴: ۲۱) "توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اُس سے ویسا ہی کیا جائے" (احبار۔ ۲۴: ۲۰)۔

۶۳۷ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ ظاہر ہے کہ اس سے مُراد قاتل یا قاتلین ہی ہو سکتے ہیں۔

یُرَادُ بِھَا الْقَاتِلُ ھٰذَا قَوْلُ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَتَادَۃَ وَمُجَاھِدٍ وَجَمَاعَۃٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ (قرطبی) مَنْ ھُوَ قَاتِلٌ مَعْفُوٌّ لَہٗ (مدارک)

مِنْ اَخِیْہِ یعنی مقتول کی طرف ہے مدعی یا مستغیث کی طرف سے، لفظ اَخِیْہِ کی بلاغت اور معنویت اس سیاق میں سر دُھننے کے قابل ہے، شدید ہیجانِ جذباتِ انتقام و اشتعال پذیری کا موقع قتل سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے، اس انتہائی نازک موقع پر یہ لفظ لا کر بتلا دیا کہ قاتل باوجود اتنے سنگین جرم کے کافر نہیں ہو جاتا، اخوتِ اسلامی کے دائرہ سے خارج نہیں ہو جاتا، مقتول کا ولی و وارث، قاتل کا دینی بھائی اس وقت بھی رہتا ہے۔

وَالْمُرَادُ بِالْاَخِ وَلِیُّ الدَّمِ (روح) سَمَّاہُ اَخًا اِسْتِعْطَافًا بِتَذْکِیْرِ اُخُوَّۃِ الْبَشَرِیَّۃِ وَالدِّیْنِ (روح) یَعْنِیْ وَلِیَّ الدَّمِ وَذَکَرَہٗ بِلَفْظِ الْاُخُوَّۃِ الثَّابِتَۃِ بَیْنَھُمَا مِنَ الْجِنْسِیَّۃِ وَالْاِسْلَامِ لِیَرِقَّ لَہٗ وَیَعْطِفَ عَلَیْہِ (بیضاوی) وَالْاَخُ وَلِیُّ الْمَقْتُوْلِ وَذَکَرَ بِلَفْظِ الْاُخُوَّۃِ بَعْثًا لَہٗ عَلَی الْعَطْفِ لِمَا بَیْنَھُمَا مِنَ الْجِنْسِیَّۃِ وَالْاِسْلَامِ (مدارک)

شَیْءٌ۔ لفظ اہم ہے یعنی سزائے واجب کا کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے۔

ذَھَبَ جُمْھُوْرُ الْمُفَسِّرِیْنَ اِلٰی اَنَّ شَیْءٌ ھُنَا نَائِبٌ عَنِ الْمَصْدَرِ اَیْ عُفِیَ لَہٗ شَیْءٌ مِّنَ الْعَفْوِ (المنار)

یہ نہ ہو کہ تمام تر معاف کر دیا جائے مطلب یہ ہوا کہ مقتول کے عزیز اور وارث اگر قاتل کو سزائے قتل نہ دینا چاہیں، بلکہ اُسے کوئی ہلکی سزا دے کر، یا خونبہا کی پوری رقم میں سے کچھ حصہ معاف کر کے اُسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں۔

رُومیوں کی مشرک قوم میں قتل تمام تر ایک جرم قانون فوجداری کا تھا، قانون دیوانی سے اُسے کوئی علاقہ ہی نہ تھا، موجودہ فرنگی قانون چونکہ تمام تر رومیوں ہی کے قانون (رومن لا) پر مبنی ہے اس لئے اس میں بھی قتل محض ایک فوجداری کا جرم ہے، شریعتِ اسلامی کی نظر فطرتِ بشری کی گہرائیوں اور مصالح اجتماعی کی باریکیوں پر اس سے کہیں زائد ہے اس نے اپنے اصول قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل جس طرح فوجداری کا جرم ہے دیوانی کا بھی ہے، اس جرم سے محض (اسٹیٹ) حکومت اور (سوسائٹی) ہیئتِ اجتماعیہ ہی کے ایک قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ یہ فرد پر بھی اس کی شخصی حیثیت میں ایک حملہ ہے، گویا یہ جرم ایک پبلک حیثیت رکھتا ہے اور ایک پرائیوٹ اور جب اس کی یہ دوگونہ حیثیت ہے، تو مقتول کے وارثوں یا خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ چاہیں تو مجرم کو پوری سزا اسٹیٹ (حکومت) سے دلائیں، اور چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دستبردار ہو جائیں، اسی مالی معاوضہ کو اصطلاح شریعت میں دِیَۃ یا خوں بہا کہتے ہیں، اور اس میں گھٹ بڑھ برابر ہو سکتی ہے (دیت کا ذکر خود قرآن مجید میں آگے آ رہا ہے) آج بھی انٹرنیشنل (بین الاقوامی) قانون میں یہ بالکل جائز ہے کہ جب ایک (اسٹیٹ) ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک (اسٹیٹ) کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے، اور غیر ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانے میں دقتیں اور دشواریاں محسوس ہوں تو بجائے فوجداری استغاثہ اور اس کی پیروی کے صرف "ہرجانہ" (DAMAGES) کی رقم پر کفایت کر لی جائے، یہ "ہرجانہ" اسی خوں بہا کے لئے ایک خوشنما اور جدید اصطلاح ہے۔

۶۳۸ (اور خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ شر و فساد کا موقع نہ نکالنا چاہیئے)

یعنی مقتول کا فریق کہ وہی اب مدعی یا مستغیث ہوگا، خوں بہا کی مطلوبہ رقم کا مطالبہ معقولیت و آدمیت سے کرے خواہ مخواہ ضد اور اشتعال سے فریق مقابل کو تنگ نہ کرے اور اس کے جوش کو نہ بڑھائے کہ اس سے فساد کو مزید تحریک ہوگی، عین حدت و اشتعالِ طبع کے نازک موقعوں پر یہ رکھ رکھاؤ، اتنی احتیاط اور حُسنِ معاشرت کو سنبھالے رکھنے کا اہتمام شریعت اسلامی کا مخصوص حصہ ہے۔

۶۳۹ اب یہ تاکید قاتل اور اُس کے فریق کو ہو رہی ہے، اُن ملزموں یا مدعا علیہم کو بھی اپنی طرف سے یہی چاہیئے کہ جتنی رقم کی قرارداد ہو چکی ہو اُسے بغیر مزید طوالت یا پیچیدگی و بدمزگی کے، فریق مقتول یعنی مدعیوں یا مستغیثوں تک

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِى

سو جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے گا اُس کے لئے (آخرت میں) عذاب دردناک ہے ۶۴۱ اور تمہارے لئے اے اہلِ فہم!

الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

(قانونِ) قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ۶۴۲

خوبصورتی اور خوش اُسلوبی سے پہونچا دیں۔

اِلَيْهِ میں ضمیر فریقِ مقتول کی جانب ہے۔

وَالضَّمِيْرُ فِى اِلَيْهِ لِلْاَخِ (مدارک)

فطرتِ بشری کی ان نزاکتوں کا لحاظ، اور قاتل و مقتول ہر ممکن فریق کے مصالح و جذبات کی رعایت کون انسانی قانون رکھ سکتا ہے؟ قانون ساز انسان تو محض ایک خشک انسان ہوتا ہے اتنے متعدد اور باریک پہلوؤں کی رعایت تو صرف خدائی ہی قانون کی شان ہو سکتی ہے۔

۶۴۰ ذٰلِكَ یعنی یہی حکم جو اوپر فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ کے اندر مذکور ہو چکا۔

يَعْنِى الْحُكْمُ الْمَذْكُوْرُ مِنَ الْعَفْوِ وَاَخْذِ الدِّيَةِ (مدارک) اَىْ ذٰلِكَ الَّذِىْ ذَكَرْتُ مِنَ الْعَفْوِ عَنِ الْقِصَاصِ وَاَخْذِ الدِّيَةِ (معالم)

ایک طرف قصاص کی بہ ظاہر سختی، دوسری طرف دیت اور عفو کی نرمی یہ حسنِ امتزاج اور اعتدال و توازن کا یہ مکمل قوام اسی قانون کا حصہ ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں، حکمتِ مطلق سے نکلا ہو۔

۶۴۱ (آخرت میں)

اِعْتَدٰى یعنی زیادتی کی صورتیں بہت سی ہو سکتی ہیں، مثلاً ایک یہی کہ کسی بے گناہ پر قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا، یا یہ کہ قاتل کو پہلے تو معاف کر دیا، اور پھر معافی کے بعد لوٹے قصاص کے درپے ہو گئے، وقس علیٰ ہذا، ایسے بے دردوں اور خدا ناترسوں کو صرف خوفِ آخرت ہی بیجا جسارتوں سے روک سکتا ہے۔

۶۴۲ یعنی تمہارا سارا معاشرہ پرہیزگاروں، عدل شعاروں کی قوم بن جائے۔

قانونِ قصاص عین عدل و مساوات کا قانون ہے اور ہیئتِ اجتماعی کے نظم و قیامِ ریاست کا بہترین ضامن و کفیل کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے اور قوی و ضعیف سب کے حقوق کا تحفظ ہو جائے، یہ نہ ہو کہ جو زبردست ہوں وہ زیردستوں پر ستم ڈھا کر رہیں، اُمت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اطمینان و دلجمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے، اور جب اس قانون پر عملدرآمد ایک عرصہ تک رہے گا، اس قانون کی روح اُمت میں سرایت کر جائے گی تو ساری قوم کا مزاج صالح ہو جائے گا، اور آئین پسندی، باہم صلح و سازگاری، خدمت و معاونت جزوِ زندگی بن جائے گی، اور اُمت دیکھتے ہی دیکھتے اُمتِ صالحین و ابرار، اُمتِ عادلہ کہلانے کی مصداق بن جائے گی۔

آیت میں اشارہ یہ بھی آگیا کہ بعض مذاہب کے اثر سے، یا کسی دوسرے ناقص غیر معقول فلسفہ کے اثر سے، قانونِ قصاص کو سرے سے اُڑا دینے اور سزائے موت کو یکسر منسوخ کرا دینے کی تبلیغ و تحریک سر تا سر نامعقول و خلافِ حکمت ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی معلوم ہو، بہ شرطیکہ کچھ مال بھی چھوڑ رہا ہو، تو وہ

لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

والدین اور عزیزوں کے حق میں معقول طریقہ سے وصیّت کر جائے، یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ۶۴۳؎

قصاص کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ حنفیہ کے ہاں بالاتفاق اور بعض دوسرے ائمۂ فقہ کے ہاں بھی ذمّی کے قصاص میں مسلمان ضرور قتل ہوگا۔

قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَبُو يُوسُفَ وَمُحَمَّدٌ وَزُفَرُ وَابْنُ أَبِي لَيْلَى وَعُثْمَانُ الْبَتِّيُّ يُقْتَلُ الْمُسْلِمُ بِالذِّمِّيِّ (جصاص)

وَقَالَ أَبُو بَكْرٍ سَائِرُ مَا قَدَّمْنَا مِنْ ظَوَاهِرِ الَّذِي يُوجِبُ قَتْلَ الْمُسْلِمِ بِالذِّمِّيِّ عَلَى مَا بَيَّنَّا إِذْ لَمْ يُفَرِّقْ شَيْءٌ مِنْهَا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالذِّمِّيِّ وَقَوْلُهُ تَعَالَى كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى عَامٌّ فِي الْكُلِّ (جصاص) وَلَيْسَ فِي الْآيَةِ فَرْقٌ بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْكَافِرِ فَوَجَبَ إِجْرَاءُ حُكْمِهِمَا عَلَيْهِمَا وَيَدُلُّ عَلَيْهِ قَوْلُهُ عَزَّ وَجَلَّ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا وَقَدْ ثَبَتَ بِالْاِتِّفَاقِ أَنَّ السُّلْطَانَ الْمَذْكُورَ فِي هٰذَا الْمَوْضِعِ قَدِ انْتَظَمَ الْقَوَدَ وَلَيْسَ فِيهَا تَخْصِيصٌ لِمُسْلِمٍ مِنْ كَافِرٍ (جصاص) وَيُقْتَلُ الْمُسْلِمُ بِالذِّمِّيِّ۔ (کنز۔ ھدایہ)

۶۴۳؎ یہ حکم وصیت آیت میراث کے نزول سے (جس میں حقداروں کے حصّے معیّن کر کے بتا دیے گئے ہیں) بہت قبل کا ہے۔

نَزَلَتْ قَبْلَ نُزُولِ الْفَرَائِضِ وَالْمَوَارِيثِ (قرطبی)

اس لئے قدرۃً اب اس پر عملدرآمد اُس آیت متأخر و مابعد ہی کے ماتحت ہوگا، اور اسی کو مفسّرین اپنی اصطلاح میں ایک آیت کا دوسری آیت سے منسوخ ہو جانا کہتے ہیں۔ جائداد کی تقسیم اب آیت میراث کے بموجب ہوگی اور وصیّت کا اب کوئی محل ہی نہ رہا بجز جائداد کے ایک ثُلث کے کہ اتنے میں وصیّت چل سکتی ہے اور اس کی تصریح بھی اُسی سورۃ النساء کی آیت میراث میں موجود ہے۔

وَصِيَّة کے لفظی معنی النصیحت کے ہیں، اصطلاح شریعت میں اس سے مُراد وہ ہدایتیں ہوتی ہیں جو وصیّت کر جانے والے کی موت کے بعد قابلِ عملدرآمد ہوتی ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ وصیّت کی بھی کئی قسمیں ہیں:۔

(۱) بعض وصیّتوں کی تعمیل درجۂ واجب میں ہے۔ مثلاً ادائے زکوٰۃ و کفّارہ کی وصیّت یا ادائے امانت یا ادائے قرض کی وصیّت (۲) بعض مستحب کا درجہ رکھتی ہیں، مثلاً کسی کارِ خیر کے لئے وصیت کر جانا، یا کسی ایسے عزیز کو میراث دے جانا جسے حصّہ نہ پہونچ رہا ہو (۳) بعض صرف مباح ہوتی ہیں، جیسے کسی امرِ جائز کے لئے وصیت کر جانا (۴) اُن کے علاوہ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کی تعمیل ممنوع ہے، وہ وصیّتیں کالعدم سمجھی جائیں گی، مثلاً کسی کافر حربی کے حق میں یا کسی فعل حرام کے لئے وصیت کر جانا (۵) اور بعض وصیّتیں موقوف کہلاتی ہیں، ان کی تعمیل شرط کے ساتھ معلّق ہوتی ہے، مثلاً ترکہ کے ایک ثُلث سے زائد میں وصیت کر جانا، اس کی تعمیل دوسرے ورثاء کی رضامندی پر موقوف رہے گی۔

اَلْوَصِيَّةُ یہاں اَلْإِيصَاءُ کے معنی میں ہے، اور اسی معنی کا لحاظ کر کے اس کے لئے فعلِ مذکر (كُتِبَ) لایا گیا ہے، ورنہ اصل قاعدہ کے لحاظ سے فعل مؤنّث (كُتِبَتْ) آنا چاہئے تھا، اور تاءِ تانیث کے حذف کی ایک وجہ یہ بھی

## فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ

پھر جو کوئی اُسے اُس کے سُننے کے بعد بدل ڈالے، سو اُس کا گناہ بس اُن ہی پر ہوگا جو اسے بدل ڈالیں ۶۴۴

بیان کی گئی ہے کہ اسمِ وصیّت اپنے فعل سے بہت فاصلہ پر ہے، اور اتنا فاصلہ حائل ہو جانے پر محاورۂ زبان میں فعل کی تاءِ تانیث حذف ہو جاتی ہے۔ (قرطبی)

خَيْرًا۔ خیر کے ایک معنی علاوہ مشہور معنی کے مالِ طیّب کے بھی آتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں اس استعمال کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں، مثلاً قُلْ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ (سورۂ بقرہ) وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ (سورۂ بقرہ) وقس علی ھذا۔

بہر حال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں "خیر" مال ہی کے معنی میں ہے۔

اَلْخَيْرُ هٰهُنَا الْمَالُ مِنْ غَيْرِ خِلَافٍ (قرطبی) قَالَ بَعْضُ الْعُلَمَاءِ اِنَّمَا سُمِّيَ الْمَالُ هٰهُنَا خَيْرًا تَنْبِيْهًا عَلٰى مَعْنًى لَطِيْفٍ وَهُوَ اَنَّ الَّذِيْ يُحْسِنُ الْوَصِيَّةَ بِهٖ مَا كَانَ مَجْمُوْعًا مِنَ الْمَالِ مِنْ وَجْهِ الْمَحْمُوْدِ (راغب) ای مالاً کما قالہ ابنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ (روح) اَیْ مالاً قالہ ابنُ عَبَّاسٍ وَمُجَاهِدٌ وعطاءٌ وَسَعِيْدُ ابْنُ جُبَيْرٍ وَاَبُو الْعَالِيَةِ وَعَطِيَّةُ الْعَوْفِيُّ وَالضَّحَّاكُ وَالسُّدِّيُّ وَالرَّبِيْعُ ابْنُ اَنَسٍ وَمُقَاتِلُ بْنُ حَيَّانَ وَقَتَادَةُ وَغَيْرُهُمْ (ابن کثیر)

ایک گروہ نے لفظ وجوب سے استناد کر کے کہا ہے کہ کچھ نہ کچھ وصیّت بہر حال کر جانا چاہیئے، دوسرے گروہ نے آیتِ میراث کی موجودگی میں اسے بالکل غیر ضروری ٹھہرایا ہے، امام نخعیؒ کا قول اس باب میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے دونوں قسم کے اُسوۂ حسنہ موجود ہیں، ابو بکر صدیقؓ وصیّت کر گئے تھے، لیکن خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کوئی وصیّت نہیں فرمائی۔

وَقَالَ النَّخَعِيُّ مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُوْصِ وَقَدْ اَوْصٰى اَبُوْبَكْرٍ فَاِنْ اَوْصٰى فَحَسَنٌ وَاِنْ لَّمْ يُوْصِ فَلَا عَلَيْهِ شَيْءٌ (قرطبی)

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی پسندیدہ طریقہ پر، عقل کی رعایت سے، حاجت کا لحاظ کر کے، حسنِ معاشرت و حسنِ معاملت دونوں قسم کے احکام کے موقع پر قرآن مجید میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔

عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ مُتَّقِیْن سے یہاں مُراد مؤمنین ہیں، ان کے وصفِ تقویٰ کا ذکر کر کے مُراد خود ان ہی سے لی گئی ہے۔

مُرَادٌ بِالْمُتَّقِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّقَوُا الْكُفْرَ (بحر) وَالْمُرَادُ بِالْمُتَّقِيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (روح)

۶۴۴ (نہ کہ حاکموں پر جو عالم الغیب نہیں ہوتے، بلکہ گواہوں کے بیانات ہی پر فیصلہ کی بنیاد رکھتے ہیں)

بَدَّلَهٗ اور سَمِعَهٗ دونوں میں ضمیر وصیّت کی طرف ہے۔

وَالضَّمِيْرُ فِيْ بَدَّلَهٗ يَرْجِعُ اِلَى الْاِيْصَاءِ وَكَذٰلِكَ الضَّمِيْرُ فِيْ سَمِعَهٗ۔ (قرطبی)

یعنی جن گواہوں کے سامنے وصیّت کی گئی کہ فلاں فلاں عزیز کو اتنا اتنا حصّہ ملے، اور وہ گواہ اُس میں اپنی طرف سے کچھ قطع و برید کر دیں جس سے بعض کی حق تلفی لازم آتی ہے۔

اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ۔ یہ حاکموں، قاضیوں کو اطمینان دلایا ہے کہ تمھارا اس غلط اجراء میں

إِنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا

بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے، بڑا جاننے والا ہے ۶۴۵ البتہ جس کسی کو وصیت کرنے والے سے متعلق کسی بے عنوانی یا گناہ کا

فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ

علم ہو جائے ۶۴۶ پھر وہ ان لوگوں کے آپس میں صلح کرادے ۶۴۷ تو اس پر کوئی گناہ نہیں ۶۴۸

کیا قصور، قصور تو بس انہی جھوٹے گواہوں کا ہے۔

۶۴۵ سَمِيعٌ۔ اس پر خوب روشن ہے کہ گواہوں نے کس کس طرح جھوٹ سے کام لیا، اور اصل وصیت میں کیا کیا کتر بیونت کی۔

عَلِيمٌ۔ اُس پر خوب روشن ہے کہ قاضی یا ثالث ایسے موقع پر کیسا معذور و بے بس ہوتا ہے۔

۶۴۶ (اور وہ اس بناء پر ازراہِ اخلاص و خیر خواہی وصیت میں تبدیلی کردے جس سے اُس بے ضابطگی یا معصیت کی اصلاح ہو جائے)

خَافَ۔ خوف عربی میں ہمیشہ اندیشہ و ڈر ہی کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ کبھی علم کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں بھی یہی معنی مراد ہیں۔

اَیْ فَمَنْ تَوَقَّعَ وَعَلِمَ وَهٰذَا فِیْ کَلَامِهِمْ شَائِعٌ (کشاف) وَالْخَوْفُ وَالْخَشْيَةُ الْعِلْمُ (کبیر) وَمَعْنٰی خَافَ تَوَقَّعَ وَعَلِمَ (روح) اَیْ قَدْ ظَهَرَ لَهٗ مِنْ اَحْوَالِ الْمُوْصِیْ مَا يَغْلِبُ مَعَهٗ عَلٰی ظَنِّهٖ اَنَّهٗ يُرِيْدُ الْجَوْرَ وَصَرْفَ الْمِيْرَاثِ عَنِ الْوَارِثِ۔ (جصاص)

جَنَفًا۔ جنف کہتے ہیں نادانستہ غلطی یا بے ضابطگی کو، مراد ہے سہو یا خطائے فہم سے۔

اَلْجَنَفُ الْخَطَاءُ (ابن جریر عن ابن عباسؓ) اَلْجَنَفُ الْخَطَاءُ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُ بِهٖ (کبیر) مَيْلًا عَنِ الْحَقِّ بِالْخَطَاءِ (کشاف)

إِثْمًا۔ یعنی دانستہ غلطی کھلی ہوئی حق تلفی جس پر گناہ کا اطلاق ہو سکے۔

اَلْاِثْمُ الْعَمَدُ (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) اَلْاِثْمُ هُوَ الْعَمَدُ (کبیر)

۶۴۷ (مضمون وصیت میں ترمیم کرکے اور وارثوں کی حق تلفیوں کو دور کرکے)

بَيْنَهُمْ۔ میں ضمیر جمع غائب وارثوں کی جانب ہے۔

اَیْ بَيْنَ الْمُوْصٰی لَهُمْ (روح) اَلْکِنَايَةُ عَنِ الْوَرَثَةِ۔ (قرطبی)

یعنی وصیت اگر بے ضابطہ ہے یا خلاف قاعدۂ شرعی ہے اور کوئی شخص وارثوں کے درمیان وقوعِ نزاع یا احتمالِ نزاع ہی دیکھ کر مضمونِ وصیت میں ایسی ترمیم کردے جس سے حق تلفیوں کی اصلاح ہو جائے، اور وارثوں میں باہم مصالحت ہو جائے، بعض فقہاء نے اس حکم کے ماتحت وسعت دے کر کہا ہے کہ حکم صرف وصی اور گواہانِ وصیت اور حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں، اُمت کا ہر فرد اس پر عمل کر سکتا ہے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ سَائِرِ النَّاسِ مِنْ مُّوْصٍ مَيْلًا عَنِ الْحَقِّ وَعُدُوْلًا اِلَی الْجَوْرِ فَالْوَاجِبُ عَلَيْهِ اِرْشَادُهٗ اِلَی الْعَدْلِ وَالصَّلَاحِ (جصاص) اَلْخِطَابُ لِجَمِيْعِ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (ابن العربی)

اس لئے کہ اس حکم کا تعلق باب امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے ہے، اور وہ ساری اُمت پر فرض ہے۔

وَلَا يَخْتَصُّ بِذٰلِكَ الشَّاهِدُ وَالْوَصِیُّ وَالْحَاكِمُ دُوْنَ سَائِرِ النَّاسِ لِاَنَّ ذٰلِكَ مِنْ بَابِ الْاَمْرِ

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ ۲۲ ع ۶

بے شک اللہ تعالیٰ بڑا مغفرت کرنے والا ہے، بڑا رحم کرنے والا ہے ۶۴۹ اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے ۶۵۰

الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾

جیسا کہ اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے قبل ہوئے ہیں ۶۵۱ عجب نہیں کہ تم متقی بن جاؤ ۶۵۲

بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیِ عَنِ الْمُنْکَرِ (جصاص) لِاَنَّ اِصْلَاحَ الْفَسَادِ فَرْضٌ عَلَی الْکِفَایَۃِ (ابن العربی)

فقہاء نے اس آیت سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ غلبۂ ظن کے بعد رائے وعمل کا اجتہاد جائز ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وصیّت کرنے والے کی طرف سے ظلم و زیادتی کا اندیشہ تو ظنِّ غالب ہی کے حکم میں رہے گا۔

وَفِیْھَا الدَّلَالَۃُ عَلٰی جَوَازِ الْاِجْتِھَادِ وَالرَّأْیِ وَالْعَمَلِ عَلٰی غَالِبِ الظَّنِّ لِاَنَّ الْخَوْفَ مِنَ الْمَیْلِ یَکُوْنُ فِیْ غَالِبِ ظَنِّ الْخَائِفِ (جصاص) وَفِیْ ھٰذَا دَلِیْلٌ عَلَی الْحُکْمِ بِالظَّنِّ (ابن العربی) وَفِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃِ دَلِیْلٌ عَلٰی اَنَّ الْحُکْمَ بِالظَّنِّ لِاَنَّہٗ اِذَا ظَنَّ قَصْدَ الْفَسَادِ وَجَبَ السَّعْیُ فِی الصَّلَاحِ۔ (قرطبی)

**۶۴۸** (اس تبدیل و ترمیم مضمونِ وصیّت کے باب میں)
بلکہ وہ تو اور مستحق اجر و ثواب کا ہوگا۔

لِاَنَّہٗ تَبْدِیْلُ بَاطِلٍ اِلٰی حَقٍّ (مدارک۔ بیضاوی)

**۶۴۹** اللہ تو گنہگاروں تک کے حق میں غفور و رحیم ہے چہ جائیکہ یہ شخص جو گنہگار بھی نہیں بلکہ اپنی سعی اصلاح میں تو مطیعِ حکم اور مستحقِ اجر ہے۔

غَفُوْرٌ۔ یعنی گناہوں کا بخشنے والا۔

رَحِیْمٌ۔ یعنی خطاکاروں کے حال پر رحم کرنے والا۔

**۶۵۰** صیام (روزہ رکھنا) مصدر ہے باب نَصَرَ سے۔

صَوْم۔ یا روزہ اصطلاحِ شریعت میں اُسے کہتے ہیں کہ انسان طلوعِ فجر سے غروبِ آفتاب تک اپنے کو کھانے پینے اور عملِ زوجیت سے روکے رہے، جو روزے فرض ہیں وہ ماہِ رمضان کے ہیں، غیبت، فحش، بدزبانی وغیرہ زبان کے تمام گناہوں سے روزہ میں بچے رہنے کی سخت تاکید یا حدیث میں آئی ہیں، جدید و قدیم سب طبیب اس پر متفق ہیں کہ روزہ جسمانی بیماریوں کے دُور کرنے کا بہترین علاج اور جسمِ انسانی کے لئے ایک بہترین مُصلح ہے پھر اس سے سپاہیانہ ہمت اور ضبطِ نفس کی روح جو ساری اُمّت میں تازہ ہو جاتی ہے اس کے لحاظ سے بھی مہینہ بھر کی یہ سالانہ مشق ایک بہترین نسخہ ہے۔

**۶۵۱** روزہ کسی نہ کسی صورت میں تو دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ہر قوم میں پایا جاتا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع چہاردہم کی جلد ۹ ص۱۰۶ اور جلد ۱۰ ص۱۹۳ سے ظاہر ہے، لیکن قرآن مشرکانہ مذہبوں سے بحث نہیں کرتا۔

اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ سے اس کی اصل مُراد اہلِ کتاب ہی سے ہو سکتی ہے چنانچہ اہلِ نظر مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں:

یَعْنِیْ بِذٰلِکَ اَھْلَ الْکِتَابِ (ابن کثیر) قِیْلَ ھُمْ اَھْلُ الْکِتَابِ (ابن العربی)

أَيَّامًا مَّعْدُودَٰتٍ ۚ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ

(یہ روزے) گنتی کے چند روز کے (ہیں) ۶۵۳ پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو ۶۵۴ یا سفر میں ہو ۶۵۵

فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ

اس پر دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) ۶۵۶

اور یہی قول ابن جریر نے مجاہد تابعی سے نقل کیا ہے، اور جصاص نے مجاہد کے ساتھ قتادہ کے نام کا بھی اضافہ کیا ہے۔ روزہ شریعت موسوی کا ایک اہم اور مشہور جزو ہے، مذاہب عالم سے اتنی گہری واقفیت کر صاف صاف ان میں روزہ کے جزو مذہب ہونے کی خبر دے دی، ڈاک اور ریل کے زمانہ سے صدیوں قبل، اور اخبارات اور کتب خانوں کے دور سے ہزار بارہ سو سال پیشتر عرب جیسے دور افتادہ اور دنیا کے ہر ملک سے بے تعلق جزیرہ نما میں ایک اُمّی کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔ بجز وحی الٰہی کے توسط کے۔ كَمَا۔ یہ تشبیہ دوسری ملتوں کے ساتھ صرف فرضیت صیام میں ہے، نہ کہ تعداد و شرائط صیام میں۔

فَهُوَ تَشْبِيهُ الْفَرْضِيَّةِ وَلَا تَدْخُلُ فِيهِ الْكَيْفِيَّةُ وَالْكَمِّيَّةُ۔ (المنار)

۶۵۲ روزہ تعمیل ارشاد خداوندی میں تزکیۂ نفس، تربیت جسم دونوں کا ایک بہترین دستور العمل ہے، اشخاص کے انفرادی اور اُمّت کے اجتماعی ہر دو نقطۂ نظر سے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کے ارشاد سے اسلامی روزہ کی اصل غرض و غایت کی تصریح ہو گئی کہ اس سے مقصود تقویٰ کی عادت ڈالنا اور اُمّت و افراد کو متقی بنانا ہے، تقویٰ نفس کی ایک مستقل کیفیت کا نام ہے جس طرح مضر غذاؤں و مضر عادتوں سے احتیاط رکھنے سے جسمانی صحت درست ہو جاتی ہے اور مادی لذتوں سے لطف و انبساط کی صلاحیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، بھوک خوب کھل کر لگنے لگتی ہے، خون صالح پیدا ہونے لگتا ہے اسی طرح اس عالم میں تقویٰ اختیار کر لینے سے (یعنی جو چیزیں عادۃً صحت روحانی و حیات اخلاقی کے حق میں مضر ہیں اُن سے بچے رہنے سے) عالم آخرت کی لذتوں اور نعمتوں سے لطف اُٹھانے کی صلاحیت و استعداد انسان میں پوری طرح پیدا ہو کر رہتی ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں اسلامی روزہ کی افضلیت تمام دوسری قوموں کے گرے پڑے روزوں پر علانیہ ثابت ہوتی ہے، اور غیر مشرک قوموں کے ناقص ادھورے اور بے نام روزوں کا تو ذکر ہی نہیں، خود مسیحی اور یہودی روزوں کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ یا تو کسی بلا کو دفع کرنے کے لئے رکھے جاتے ہیں یا کسی فوری اور مخصوص روحانی کیفیت کے حاصل کرنے کو، یہود کی قاموس اعظم جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:

"قدیم زمانہ میں روزہ یا تو بطور علامت ماتم کے رکھا جاتا تھا، اور یا جب کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا، اور یا پھر جب سالک اپنے میں قبول الہام کی استعداد پیدا کرنا چاہتا تھا۔" (جلد ۵ ص ۳۴۷)

اسلام میں روزہ نام ہے اپنے قصد و ارادہ سے ایک مدت متعین تک کے لئے اپنی جائز اور طبعی خواہشوں کی تکمیل سے دستبرداری کا، اور اس سے ایک طرف طبی اور جسمانی، دوسری طرف روحانی اور اخلاقی جو فائدے حاصل ہوتے ہیں فرد اور اُمّت دونوں کو اُن کی تفصیل کی گنجائش تو یہاں بہرحال نہیں، اسناد ثریا کی متعدد تحریریں اس موضوع پر پرچۂ صدق اور سچ میں چھپ چکی ہیں اور ضمیمہ کے طور پر اسی سورہ کے آخر میں شامل کی جا رہی ہیں۔

۶۵۳ یعنی ان فرض روزوں کی ایک متعین تعداد ہے جیسا کہ سلسلہ تنظیم یا باقاعدگی کا اقتضا ہے یہ نہیں کہ

جب جس کا جی چاہے جتنے دنوں کے لئے رکھ ڈالے، وحدتِ اُمت کے لحاظ سے لازمی تھا کہ ایک متعین زمانہ میں متعین حدود کے ساتھ ساری اُمت کے لئے مقرر ہو، ضمناً یہ پہلو بھی نکل آیا کہ ان فرض روزوں کی تعداد کچھ بہت بڑی نہیں، یہ نہیں کہ سال سال بھر روزے رکھتے ہی چلے جاؤ، چھ مہینے بلکہ تین مہینے بھی نہیں، سال بھر میں کُل اُنتیس ۲۹ یا تیس ۳۰ دن۔

**۶۵۴** (اور بیماری کے باعث روزہ اس پر شاق ہو)

اَیْ مَرِیْضًا یَعْسُرُ عَلَیْہِ الصَّوْمُ مَعَہٗ (روح) یَخَافُ مِنَ الصَّوْمِ زِیَادَۃَ مَرَضٍ (مدارک)

بیماری کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں، بیماری بہت شدید بھی ہوسکتی ہے، اور بہت خفیف برائے نام بھی ہوسکتی ہے، اور پھر موسم، عمر، جثّہ وغیرہ کے اختلافات بھی اثر انداز ہوا کرتے ہیں، یہاں مُراد ایسی بیماری ہے جو روزہ رکھنے سے بڑھ جاتی ہو، یا جس کے ساتھ روزہ رکھنے میں شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑے، اگر روزہ رکھا ہی نہ جاسکتا ہو جب تو قضائے روزہ یعنی افطار واجب ہے، اور اگر رکھا تو جاسکتا ہو لیکن ضرر و تعب کے ساتھ تو قضائے روزہ یعنی افطار مستحب ہے۔

لِلْمَرِیْضِ حَالَتَانِ اَحَدُھُمَا اَلَّا یُطِیْقَ الصَّوْمَ بِحَالٍ فَعَلَیْہِ الْفِطْرُ وَاجِبًا، اَلثَّانِیَۃُ اَنْ یَّقْدِرَ عَلَی الصَّوْمِ بِضَرَرٍ وَّمَشَقَّۃٍ فَھٰذَا یُسْتَحَبُّ لَہُ الْفِطْرُ وَلَا یَصُوْمُ اِلَّا جَاھِلٌ (قرطبی۔ ابن العربی)

مرض کی مدّت یا شدّت میں اضافہ کے اندیشہ سے جمہور علماء کے نزدیک افطار جائز ہے۔

قَالَ جُمْھُوْرٌ مِّنَ الْعُلَمَاءِ اِذَا کَانَ بِہٖ مَرَضٌ یُّؤْلِمُہٗ اَوْ یَخَافُ تَمَادِیَہٗ اَوْ یَخَافُ تَزَیُّدَہٗ صَحَّ لَہُ الْفِطْرُ (قرطبی) وَذَھَبَ الْاَکْثَرُوْنَ اِلٰی اَنَّہٗ مَرَضٌ یَخَافُ مَعَہٗ مِنَ الصَّوْمِ زِیَادَۃَ عِلَّۃٍ غَیْرَ مُحْتَمِلَۃٍ وَفِی الْجُمْلَۃِ اِذَا اَجْھَدَہُ الصَّوْمُ اَفْطَرَ وَاِنْ لَّمْ یُجْھِدْہُ فَھُوَ کَالصَّحِیْحِ۔ (معالم)

ابن سیرینؒ ایک نامور تابعی گزرے ہیں، ان کی بابت یہ روایت قرطبی، معالم وغیرہ میں طریف بن تمام العطاردی کی زبانی درج ہے کہ میں رمضان میں اُن کے ہاں گیا تو وہ کھانا کھا رہے تھے، اور جب فارغ ہوچکے تو مجھ سے بولے کہ میری اس اُنگلی میں درد تھا۔ گویا نتیجہ یہ نکلا کہ خفیف مرض میں بھی افطار کی گنجائش ہے، انھیں ابن سیرینؒ کا یہ قول بھی قرطبی وغیرہ میں نقل ہوا کہ جیسے جب کسی انسان پر مسافر کا اطلاق ہونے لگے اسی طرح جب کسی پر مریض کا اطلاق ہونے لگے، تو اس کے لئے افطار جائز ہوجاتا ہے، عطاء تابعیؒ کا بھی قول قرطبی میں نقل ہوا ہے کہ ان سے جب سوال کیا گیا کہ افطار کس مرض میں جائز ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ جو بھی مرض ہو، اور عطاء تابعیؒ ہی کے سلسلہ میں خود امام بخاریؒ سے قرطبی نے یہ حکایت نقل کی ہے کہ میں نیشاپور میں معمولی طور پر رمضان میں بیمار تھا (اِعْتَلَلْتُ بِنَیْسَابُوْرَ عِلَّۃً خَفِیْفَۃً وَّذٰلِکَ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ) اور میں نے روزہ نہیں رکھا، اور عبداللہ بن راہویہ کچھ لوگوں کے ساتھ مجھے دیکھنے آئے تو اُن سے میں نے یہی کہہ دیا ۔ خود قرطبی نے ابن سیرینؒ کے مسلک کی تائید کی ہے (قَوْلُ ابْنِ سِیْرِیْنَ اَعْدَلُ شَیْءٍ فِیْ ھٰذَا الْبَابِ) حسن بصریؒ و ابراہیم نخعیؒ سے یہ قول نقل ہوا ہے کہ جس مرض میں نماز بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے، اُس میں روزہ کے بجائے افطار بھی جائز ہے۔

وَقَالَ الْحَسَنُ وَ اِبْرَاھِیْمُ النَّخَعِیُّ ھُوَ الْمَرَضُ الَّذِیْ یَجُوْزُ بِہِ الصَّلٰوۃُ قَاعِدًا۔ (معالم)

جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت کے ظاہر الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی مریض ہو اُس کے لئے افطار درست ہے، عام اس سے کہ روزہ اس کے لئے مُضر ہو یا نہ ہو، لیکن فقہاء اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ افطار جائز اُس مریض کے لئے ہے، جسے روزہ سے مرض بڑھ جانے کا احتمال ہو، ورنہ افطار جائز نہیں۔

ثبت باتفاق الفقہاء ان الرخصۃ فی الافطار للمریض موقوفۃ علی زیادۃ المرض بالصوم وانہ لم یخش الضرر فعلیہ ان یصوم (جصاص) انا لا نعلم خلافا ان المرض الذی لا یضرہ الصوم غیر مرخص لہ فی الافطار فقال ابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد اذا خاف ان تزداد عینہ وجعا او حماہ شدۃ افطر۔ (جصاص)

خلاصہ یہ کہ بیماری کی متعین حد شریعت نے نہیں بتائی، ہر مریض اپنے حالات کے لحاظ سے اپنے لئے اپنے ضمیر و دیانت کی روشنی ہی میں فیصلہ کر سکتا ہے۔

**۶۵۵** سفر کی بھی کوئی متعین حد جس کے بعد افطار جائز یا ضروری ہو جائے، قرآن و حدیث میں موجود نہیں، البتہ فقہائے امت نے اندازے مقرر کئے ہیں، اور ان اندازوں میں اختلاف فاصلہ اور وقت دونوں کے لحاظ سے شروع ہی سے چلا آتا ہے، کسی نے فاصلہ کا معیار ۴۸ میل کا رکھا ہے، کسی نے ۱۶ فرسخ کا، اسی طرح مدت کے لحاظ سے بھی کسی کا قول ایک دن رات کے سفر کے حق میں ہے، کسی کا دو دن اور کسی کا تین دن کے حق میں۔

اختلف العلماء فی السفر الذی یجوز فیہ الفطر والقصر.... واختلف العلماء فی قدر ذلک فقال مالک یوم ولیلۃ ثم رجع فقال ثمانیۃ واربعون میلا.... وقال ابن عمر وابن عباس والثوری الفطر فی سفر ثلاثۃ ایام (قرطبی) والذی فی البخاری وکان ابن عمر وابن عباس یفطران ویقصران فی اربعۃ برد وھی ستۃ عشر فرسخا (قرطبی) واباح اللہ تعالی للمسافر الافطار ولیس للسفر قدر معلوم فی اللغۃ یفصل بہ بین اقلہ وبین ما ھو دونہ واختلفوا فیہ فقال اصحابنا مسیرۃ ثلاثۃ ایام ولیالیھا وقال اخرون مسیرۃ یومین وقال اخرون مسیرۃ یوم (جصاص) فقال مالک والشافعی اقل السفر یوم ولیلۃ وقال ابو حنیفۃ اقلہ ثلاثۃ ایام (ابن العربی) ولم یرد فیہ من الشارع نص (ابن العربی)

وقت و مسافت کے اختلافات سے قطع نظر، حدیث نبوی سے ترجیح حالت سفر میں افطار ہی کی معلوم ہوتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو جیسے روزہ رکھنا مسافر کے لئے ایک جرم ہے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ:۔

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرج عام الفتح الی مکۃ فی رمضان فصام حتی بلغ کراع الغمیم فصام الناس ثم دعا بقدح من ماء فرفعہ حتی نظر الناس الیہ ثم شرب فقیل لہ بعد ذلک ان بعض الناس قد صام فقال اولئک العصاۃ اولئک العصاۃ۔

(مسلم۔ ترمذی)

فتح مکہ کے سال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ماہ رمضان میں مکہ کی طرف چلے اور روزہ رکھا یہاں تک کہ مقام کراع الغمیم پہونچ گئے لوگ روزہ سے تھے تو آپ نے پانی کا پیالہ منگایا اور اس کو اوپر اٹھایا یہاں تک کہ لوگوں نے اسے دیکھ لیا، اس کے بعد آپ نے پانی نوش فرمایا، پھر آپ کو اطلاع پہونچی کہ بعض لوگ اب بھی روزے میں ہیں (یعنی انھوں نے افطار نہیں کیا) تو آپ نے فرمایا کہ وہ گنہگار ہیں، گنہگار ہیں۔

اور اسی سے ملتی ہوئی ایک حدیث بخاری و مسلم اور موطا وغیرہ میں ابن عباسؓ سے روایت ہوئی ہے اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی روایت میں تو یہاں تک آگیا ہے کہ:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صائم رمضان فی السفر کالمفطر فی الحضر۔ (ابن ماجہ)

سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہی ہے جیسے کوئی گھر میں بیٹھنے والا روزہ نہ رکھے۔

اور حضرت جابرؓ ہی سے یہ مروی ہے کہ :-

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي سَفَرٍ فَرَأَى رَجُلًا قَدِ اجْتَمَعَ النَّاسُ عَلَيْهِ وَقَدْ ظُلِّلَ عَلَيْهِ فَقَالَ مَا لَهُ فَقَالُوا رَجُلٌ صَائِمٌ فَقَالَ لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تَصُومُوا فِي السَّفَرِ۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سفر میں تھے کہ آپؐ نے دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں، اور اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں، آپؐ نے پوچھا تو لوگوں نے کہا کہ یہ روزہ رکھے ہوئے ہے آپؐ نے فرمایا کہ سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کوئی طاعت نہیں۔

بہ حیثیت مجموعی مسافر کے لئے بھی مریض ہی کی طرح حکم شریعت یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر بلا زحمت معتد بہ ممکن ہو تو روزہ رکھ ہی لیا جائے، اگر زحمت و تعب معتد بہ ہو تو قضا کر دینا جائز ہے، اور اگر نوبت ہلاکت ہی کی آئی جا رہی ہے تو ترکِ صوم واجب ہو جائے گا۔

باقی اختلافِ مذاق و مسلک اس باب میں شروع سے چلا آ رہا ہے صوم و افطار دونوں کے جواز پر مسافر کے لئے تو سب قائل ہیں۔

يَجُوزُ لِلْمُسَافِرِ أَنْ يُفْطِرَ أَوْ أَنْ يَصُومَ۔ (بحر)

اختلاف جو کچھ ہے وہ اس میں ہے کہ افضل کون سا پہلو ہے سو بعض صحابہ اور اکثر ائمۂ فقہ افضلیتِ صوم کے قائل ہیں۔

وَاخْتَلَفُوا فِي الْأَفْضَلِ فَذَهَبَ أَبُو حَنِيفَةَ وَأَصْحَابُهُ وَمَالِكٌ وَالشَّافِعِيُّ فِي بَعْضِ مَا رُوِيَ عَنْهُمَا إِلَى أَنَّ الصَّوْمَ أَفْضَلُ وَبِهِ قَالَ مِنَ الصَّحَابَةِ عُثْمَانُ بْنُ أَبِي الْعَاصِ الثَّقَفِيُّ وَأَنَسُ بْنُ مَالِكٍ۔ (بحر)

اس کے مقابلہ میں بعض اجلۂ صحابہ اور متعدد تابعین و فقہاء افضلیتِ افطار کی طرف گئے ہیں۔

وَذَهَبَ الْأَوْزَاعِيُّ وَأَحْمَدُ وَإِسْحَاقُ إِلَى أَنَّ الْفِطْرَ أَفْضَلُ وَبِهِ قَالَ مِنَ الصَّحَابَةِ ابْنُ عُمَرَ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَمِنَ التَّابِعِينَ ابْنُ الْمُسَيَّبِ وَالشَّعْبِيُّ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَمُجَاهِدٌ وَقَتَادَةُ (بحر) نَقَلَ ذٰلِكَ ابْنُ عَطِيَّةَ عَنْ عُمَرَ وَابْنِهِ عَبْدِ اللهِ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ الْفِطْرَ فِي السَّفَرِ عَزِيمَةٌ۔ (بحر)

**۶۵۶** (اگر اس بیماری یا سفر کے دوران میں روزے چھوٹ گئے ہیں۔)

اور ان کی تعداد گن کر، مرض یا سفر کے بعد پوری کر لی جائے، عام اہلِ سنّت نے اس حکم کو صرف رخصت یا اجازت کے معنی میں لیا ہے، لیکن ظاہر یہ اس کے وجوب کے قائل ہیں، اور صحابیوں میں یہی مسلک حضرت ابوہریرہؓ کی جانب منسوب ہے۔

وَهٰذَا عَلَى سَبِيلِ الرُّخْصَةِ وَقِيلَ عَلَى الْوُجُوبِ وَإِلَيْهِ ذَهَبَ الظَّاهِرِيَّةُ وَبِهِ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَؓ (بیضاوی) وَرُوِيَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّهُ قَالَ مَنْ صَامَ فِي السَّفَرِ فَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ تَابَعَهُ عَلَيْهِ شَوَاذٌّ مِنَ النَّاسِ (بحر)

اور تابعین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ دونوں میں سے جو آسان تر ہے، وہی افضل بھی ہے۔

وَقَالَ مُجَاهِدٌ وَعُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ وَغَيْرُهُمَا أَيْسَرُهُمَا أَفْضَلُهُمَا (بحر) وَقَالَتْ طَائِفَةٌ أَفْضَلُ الْأَمْرَيْنِ أَيْسَرُهُمَا وَهُوَ قَوْلُ مُجَاهِدٍ وَقَتَادَةَ وَعُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ۔ (معالم)

ایک گروہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے یہ بھی کہا ہے کہ مسافر کے لئے روزہ ہے نہیں، اُسے ہمیشہ قضا ہی رکھنا چاہیے، اس لئے کہ آیت میں حکم مطلق صورت میں ہے، اور حدیث نبوی لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ سے اس کی تائید و تقویت ہوتی ہے۔

اِسْتَدَلَّ بِهٰذِهِ الْآيَةِ مَنْ قَالَ أَنَّ الصَّوْمَ لَا يَنْعَقِدُ فِي السَّفَرِ وَعَلَيْهِ الْقَضَاءُ أَبَدًا ...... أَيْ فَعَلَيْهِ

## وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ

اور جو لوگ اُسے مشکل ہی سے برداشت کر سکیں ۶۵۷ اُن کے ذمہ فدیہ ہے (کہ وہ) ایک مسکین کا کھانا ہے ۶۵۸

عِنْدَهٗ وَلَا حَذْفَ فِي الْكَلَامِ وَلَا إِضْمَارَ وَبِقَوْلِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ. قَالَ مَالَمْ يَكُنْ مِنَ الْبِرِّ فَهُوَ مِنَ الْإِثْمِ فَيَدُلُّ ذٰلِكَ عَلٰى أَنَّ صَوْمَ رَمَضَانَ لَا يَجُوْزُ فِي السَّفَرِ۔ (قرطبی)

**۶۵۷** یعنی روزہ رکھنے کو رکھ تو ڈالیں لیکن روزہ کا تحمل انھیں دشواری ہی سے ہو سکے، مشقت بہت زائد اٹھانی پڑے، جیسے زیادہ بوڑھے اشخاص، یا حاملہ اور مرضعہ عورتوں کے لئے عموماً ہوتا ہے۔

يُطِيقُونَهٗ میں ضمیر ہٗ صوم کی طرف ہے۔

وَعَلَى الْمُطِيقِيْنَ لِلصِّيَامِ (بیضاوی۔ مدارک۔ روح) قَالَ الْفَرَّاءُ يَجُوْزُ أَنْ تَعُوْدَ عَلَى الصِّيَامِ (قرطبی) قَالَ الْقَائِلُوْنَ هُوَ عَائِدٌ عَلَى الصَّوْمِ وَقَالَ اٰخَرُوْنَ إِلَى الْفِدْيَةِ وَالْأَوَّلُ أَصَحُّ۔ (جصاص)

آیت میں اشکال اس لئے پیش آیا ہے کہ يُطِيقُونَهٗ کے مصدر طَاقَة اور وُسْعَة کے درمیان فرق نظر انداز ہو گیا، دونوں لفظوں کا مفہوم لغت میں الگ الگ ہے وُسْعَة اردو کے مفہوم "امکان" کے مرادف ہے اور طَاقَة میں یہ مفہوم شامل ہے کہ وہ کام، کرنے والے کی قدرت میں تو ہو لیکن اس کے کرنے میں تعب بہت زائد اٹھانا پڑے، کام ہونے کو ہو تو جائے لیکن بمشکل تمام ہو پائے عربی میں إِطَاقَة اور إِسْتِطَاعَة دونوں کے مفہوم میں بڑا فرق ہے۔

هُوَ إِسْمٌ لِمِقْدَارِ مَا يُمْكِنُ أَنْ يَفْعَلَهٗ بِمَشَقَّةٍ مِنْهُ (تاج) الطَّاقَةُ إِسْمٌ لِمِقْدَارِ مَا يُمْكِنُ لِلْإِنْسَانِ أَنْ يَفْعَلَهٗ بِمَشَقَّةٍ (راغب) اَلْوُسْعُ فَوْقَ الطَّاقَةِ فَالْوُسْعُ إِسْمٌ لِمَنْ كَانَ قَادِرًا عَلَى الشَّيْءِ عَلٰى وَجْهِ السُّهُوْلَةِ وَأَمَّا الطَّاقَةُ فَهُوَ إِسْمٌ لِمَنْ كَانَ قَادِرًا عَلَى الشَّيْءِ مَعَ الشِّدَّةِ وَالْمَشَقَّةِ (کبیر) وَهُوَ مَنْ لَا يَسْتَطِيْعُ الصَّوْمَ إِلَّا بِمَشَقَّةٍ شَدِيْدَةٍ۔ (المنار) قَالَ الْأُسْتَاذُ الْإِمَامُ الْإِطَاقَةُ أَدْنٰى دَرَجَاتِ الْمُكْنَةِ وَالْقُدْرَةِ عَلَى الشَّيْءِ فَلَا تَقُوْلُ الْعَرَبُ أَطَاقَ الشَّيْءَ إِلَّا إِذَا كَانَتْ قُدْرَتُهٗ عَلَيْهِ فِي نِهَايَةِ الضُّعْفِ بِحَيْثُ يَتَحَمَّلُ بِهٖ مَشَقَّةً شَدِيْدَةً۔ (المنار)

اور یہاں طاقۃ کا مادہ استعمال ہوا ہے جس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ "وہ لوگ جو تکلیف کے ساتھ روزہ رکھ سکیں، مثلاً بوڑھے اور بوڑھیاں، حاملہ اور مرضعہ"۔

أَيْ يَصُوْمُوْنَهٗ جُهْدَهُمْ وَطَاقَتَهُمْ وَمَبْلَغَ وُسْعِهِمْ (کشاف) أَيِ الَّذِيْنَ يَقْدِرُوْنَ عَلَى الصَّوْمِ مَعَ الشِّدَّةِ وَالْمَشَقَّةِ (کبیر) فَيَصِيْرُ الْمَعْنٰى وَعَلَى الَّذِيْنَ يَصُوْمُوْنَهٗ مَعَ الشِّدَّةِ وَالْمَشَقَّةِ فَيَشْمَلُ نَحْوَ الْحُبْلٰى وَالْمُرْضِعِ (روح) يُكَلَّفُوْنَهٗ أَوْ يَتَكَلَّفُوْنَهٗ عَلٰى جُهْدٍ مِنْهُمْ وَهُمُ الشُّيُوْخُ وَالْعَجَائِزُ (کشاف) فَالْمُرَادُ بِالَّذِيْنَ يُطِيقُوْنَهٗ هُنَا الشُّيُوْخُ الضُّعَفَاءُ وَالْحَوَامِلُ وَالْمَرَاضِعُ...... وَرَوَى الْبُخَارِيُّ أَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ حَمَلَ الْاٰيَةَ عَلَى الشَّيْخِ وَالشَّيْخَةِ۔ (المنار)

اور ابن عباسؓ کی قرأت میں تو يُطَوَّقُوْنَهٗ ہے جو صاف مرادف يُكَلَّفُوْنَهٗ کا ہے۔

وَمَشْهُوْرُ قِرَاءَةِ ابْنِ عَبَّاسٍ يُطَوَّقُوْنَهٗ بِفَتْحِ الطَّاءِ وَتَشْدِيْدِ الْوَاوِ بِمَعْنٰى يُكَلَّفُوْنَهٗ (قرطبی)

تابعین بلکہ صحابیوںؓ کی متعدد روایتوں میں اس سے مراد بوڑھے اور بوڑھیاں ہی لی گئی ہیں اور متعدد مفسروں نے بھی یہی سمجھا ہے اور آیت کے منسوخ قرار دینے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔

# فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ

اور جو کوئی خوشی خوشی نیکی کرے ۶۵۹ اُس کے حق میں بہتر ہے

ھُوَ الشَّیْخُ وَالشَّیْخَۃُ (ابن جریر عن علی) نَزَلَتْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ فِیْ حَقِّ الشَّیْخِ الْھَرِمِ (کبیر) قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَیْسَتْ مَنْسُوْخَۃً ھُوَ الشَّیْخُ الْکَبِیْرُ وَالْمَرْأَۃُ الْکَبِیْرَۃُ لَا یَسْتَطِیْعَانِ اَنْ یَّصُوْمَا (ابن کثیر عن عطاء) رَوٰی اَبُوْدَاؤُدَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ قَالَ اُثْبِتَتْ لِلْحُبْلٰی وَالْمَرَاضِعِ (قرطبی) فَرُوِیَ عَنْہُ اَیْضًا اَنَّہٗ قَالَ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامٍ لَیْسَتْ بِمَنْسُوْخَۃٍ ھُوَ الشَّیْخُ الْکَبِیْرُ وَالْمَرْأَۃُ الْکَبِیْرَۃُ لَا یَسْتَطِیْعَانِ اَنْ یَّصُوْمَا فَیُطْعِمَا مَکَانَ کُلِّ یَوْمٍ مِّسْکِیْنًا وَھٰذَا اَصَحُّ (قرطبی) وَحُکْمُ ھٰؤُلَاءِ الْاِفْطَارُ وَالْفِدْیَۃُ وَھُوَ عَلٰی ھٰذَا الْوَجْہِ ثَابِتٌ غَیْرُ مَنْسُوْخٍ۔ (کشاف)

مفسر قرطبی کا فیصلہ اس باب میں قول فیصل ہے کہ ابن عباسؓ کا قول سند صحیح سے ثابت ہے کہ آیت منسوخ نہیں، بلکہ جن کے حق میں نازل ہوئی ہے محکم ہے۔

فَقَدْ ثَبَتَ بِالْاَسَانِیْدِ الصِّحَاحِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ الْاٰیَۃَ لَیْسَتْ بِمَنْسُوْخَۃٍ وَاَنَّھَا مُحْکَمَۃٌ فِیْ حَقِّ مَنْ ذُکِرَ۔

اور یہی مذہب امام شافعیؒ کا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّہٗ قَالَ رُخِّصَ لِلشَّیْخِ الْکَبِیْرِ اَنْ یُّفْطِرَ وَیُطْعِمَ وَلَا قَضَاءَ عَلَیْہِ وَھٰذَا الظَّاھِرُ فِیْ مَعْنَی الْاٰیَۃِ وَھُوَ مَذْھَبُ الشَّافِعِیَّۃِ فِی الشُّیُوْخِ وَالْعَجَائِزِ وَمَنْ فِیْ حُکْمِھِمْ۔ (المنار)

**۶۵۸** یعنی جن بوڑھوں، بوڑھیوں، ناتوانوں کے لئے روزہ رکھنا بہت تعب کا باعث ہو انھیں پورا اختیار ہے کہ بجائے روزہ رکھنے کے افطار کرتے رہیں اور ایک نادار کو روز کھانا کھلا دیا کریں۔

وَاَجْمَعُوْا عَلٰی اَنَّ الْمَشَائِخَ وَالْعَجَائِزَ الَّذِیْنَ لَا یُطِیْقُوْنَ الصِّیَامَ اَوْ یُطِیْقُوْنَہٗ عَلٰی مَشَقَّۃٍ شَدِیْدَۃٍ اَنْ یُّفْطِرُوْا (قرطبی)

بلکہ بعض ائمۂ فقہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ان کے ذمہ کوئی فدیہ واجب نہیں۔

وَاخْتَلَفُوْا فِیْ مَا عَلَیْھِمْ فَقَالَ رَبِیْعَۃُ وَمَالِکٌ لَا شَیْءَ عَلَیْھِمْ غَیْرَ اَنَّ مَالِکًا قَالَ لَوْ اَطْعَمُوْا کُلَّ یَوْمٍ مِّسْکِیْنًا کَانَ اَحَبَّ اِلَیَّ (قرطبی)

لیکن امام ابوحنیفہ اور متعدد صحابہ و تابعین کا مذہب یہ ہے کہ فدیہ دیتے رہیں۔

وَقَالَ اَنَسٌ وَابْنُ عَبَّاسٍ وَقَیْسُ بْنُ سَائِبٍ وَاَبُوْھُرَیْرَۃَ عَلَیْھِمُ الْفِدْیَۃُ وَھُوَ قَوْلُ الشَّافِعِیِّ وَاَصْحَابِ الرَّأْیِ وَاَحْمَدَ وَاِسْحَاقَ اِتِّبَاعًا لِقَوْلِ الصَّحَابَۃِ۔ (قرطبی)

اور امام مالکؒ نے اپنے قول کی دلیل میں یہ کہا ہے کہ ایسے معذوروں کے پاس تو کبرسنی کا خود ایک معقول عذر موجود ہے اس لئے اُن پر مسافر و مریض کی طرح کھانا دینا واجب نہیں اور اس مذہب کی تائید اور بھی بعض فقہا نے کی ہے۔

وَالدَّلِیْلُ لِقَوْلِ مَالِکٍ اَنَّ ھٰذَا مُفْطِرٌ لِعُذْرٍ مَّوْجُوْدٍ فِیْہِ وَھُوَ الشَّیْخُوْخَۃُ وَالْکِبَرُ فَلَمْ یَلْزَمْہُ اِطْعَامٌ کَالْمُسَافِرِ وَالْمَرِیْضِ۔ وَرُوِیَ ھٰذَا عَنِ الثَّوْرِیِّ وَالْمَکْحُوْلِ وَاخْتَارَہُ ابْنُ الْمُنْذِرِ۔ (قرطبی)

فدیہ یعنی نادار کو اپنے معاوضہ میں کھانا کھلا دینے میں کھانے کا معیار وہی ہو جو خود روزہ دار کا ہوتا ہے اور کھانے کی مقدار میں مختلف فقہاء سے مختلف قول منقول ہیں لیکن سب سے صاف اور آسان صورت یہ ہے کہ جتنے میں اُس نادار کا پیٹ بھر جائے۔

**۶۵۹** (اسی ادائے فدیہ کے باب میں)

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ

اور اگر تم علم رکھتے ہو ۶۶۱ تو تمہارے حق میں بہتر ہے کہ تم روزے رکھو ۶۶۰ ماہ رمضان وہ ہے

الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

جس میں قرآن اُتارا گیا ہے ۶۶۲

یعنی اتنا فدیہ تو بہر حال واجب ہے، اب گر اس میں کوئی اضافہ کرنا چاہے مثلاً ایک شخص کے بجائے دو شخصوں کو کھلادے، کھانوں کی تعداد بڑھادے، کھانے کی قسم بہتر کردے، فدیہ کے ساتھ روزہ کو بھی جمع کرلے تو اور بہتر ہے، صحابہ و تابعین سے یہ سب مختلف صورتیں منقول ہیں۔

خیر خیرات، فیاضی و سیر چشمی، حُسن سلوک و حُسن معاشرت کی تاکید تو اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال میں موجود ہے، لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں اس کی اہمیت اور زیادہ ہے چنانچہ ماہ مبارک کے ختم پر یا ختم سے ذرا قبل جو صدقۂ فطر واجب بنایا گیا ہے کہ آس پاس کا کوئی کلمہ گو بھوکا نہ رہنے پائے وہ اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فیاضی، سخاوت، جود و کرم میں اپنی نظیر آپ تھے، تاہم متعدد حدیثوں میں آتا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں آپ کا جوش کرم اور بڑھ جاتا تھا، اور آپ فیاض سے فیاض تر ہوجاتے تھے۔

۶۶۰ (کہ صوم رمضان کی کیا کیا برکتیں اور فضیلتیں ہیں، اس کے کیا کیا منافع و مصالح ہیں، اور پھر اُن پر کیا کیا اجر مرتب ہوتا ہے)

۶۶۱ (اگرچہ معقول عذر روزہ کو قضا کردینے یا اس کے بجائے فدیہ دینے کے موجود ہوں)

یہاں خطاب میں وہ تمام طبقے شامل ہیں جن کے لئے بہ طور معذورین اور گنجائشیں رکھ دی گئی ہیں۔

اس میں ترغیب اور تشویق ہے کہ روزہ رکھنے کے جو منافع اور مصالح ہیں، وہ تو روزہ رکھنے ہی سے حاصل ہوں گے، ہاں معذوروں کے لئے دوسری گنجائشیں بھی رکھ دی گئی ہیں۔

وَعَلَى الْجُمْلَةِ فَاِنَّهٗ يَقْتَضِي الْحَضَّ عَلَى الصَّوْمِ اَيْ فَاعْلَمُوْا ذٰلِكَ وَصُوْمُوْا۔ (قرطبی)

۶۶۲ یعنی اُترنا شروع ہوا۔

اَيْ اُبْتُدِيَ فِيْهِ اِنْزَالُهٗ (مدارک، بیضاوی، روح) مُبْتَدِئٌ بِاِنْزَالِهٖ فِيْهِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ (بحر)

کل قرآن مجید کا نزول تو بڑی تدریج کے ساتھ کوئی ۲۱-۲۲ سال کی مدت میں ہوا ہے، یہاں مراد ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نزول قرآن کی ابتداء ماہِ رمضان میں ہوئی، وحی قرآنی کی سب سے پہلی آیتیں سورۃ العلق کا ابتدائی حصہ ہے اور وہ غارِ حرا میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اسی مہینہ میں نازل ہوئی تھیں (سلسلہ نبوی تقریباً فروری ۶۱۰ء)

بہت سے مفسر اس جانب بھی گئے ہیں کہ قرآن مجید کا نزول آسمانِ دنیا پر اسی مہینہ میں ہوا، اور پھر وہاں سے فرشتۂ وحی حضرت جبرئیل کے توسط سے بتدریج رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اترتا رہا۔

اَلْقُرْاٰنُ لغوی معنی میں قرآن وہ چیز ہے جو پڑھی جائے، جیسے پینے والی چیز کو شراب اور لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے ہیں

وَھُوَ بِمَعْنَی الْمَقْرُوْءِ کَالْمَشْرُوْبِ یُسَمّٰی شَرَابًا وَالْمَکْتُوْبِ کِتَابًا (قرطبی) وَیُسَمَّی الْمَقْرُوْءُ قُرْاٰنًا عَلٰی عَادَۃِ الْعَرَبِ فِیْ تَسْمِیَتِھَا الْمَفْعُوْلَ بِاِسْمِ الْمَصْدَرِ کَتَسْمِیَتِھِمْ لِلْمَعْلُوْمِ عِلْمًا وَلِلْمَضْرُوْبِ ضَرْبًا وَلِلْمَشْرُوْبِ شُرْبًا۔ (قرطبی)

اور اَلْقُرْاٰن اب اصطلاح میں بطور علَم کے اس کتاب الٰہی کے لئے مخصوص ہوگیا ہے، اس لئے بھی کہ یہ مختلف سورتوں کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔

وَقَدْ خُصَّ بِالْکِتَابِ الْمُنَزَّلِ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَصَارَ لَہٗ کَالْعَلَمِ (راغب)......

ثُمَّ اشْتَھَرَ الْاِسْتِعْمَالُ فِیْ ھٰذَا وَاقْتَرَنَ بِہِ الْعُرْفُ الشَّرْعِیُّ فَصَارَ الْقُرْاٰنُ اِسْمًا لِکَلَامِ اللّٰہِ (قرطبی) وَمَعْنَی الْقُرْاٰنِ مَعْنَی الْجَمْعِ وَیُسَمّٰی قُرْاٰنًا لِاَنَّہٗ یَجْمَعُ السُّوَرَ فَیَضُمُّھَا۔ (لسان)

جس طرح اَرْض کا اطلاق سارے روئے زمین پر بھی ہوتا ہے اور زمین کے ہر ہر ٹکڑے پر بھی اسی طرح قُرْاٰن کا اطلاق ۳۰ پاروں والی مکمل کتاب پر بھی ہوتا ہے اور اس کے ہر ہر حصہ پر بھی۔

رَمَضَان سنہ قمری اسلامی کے نویں مہینہ کا نام ہے۔ شریعت نے اعتبار قمری مہینوں کا کیا ہے اور اپنے حساب میں اسی تقویم سے کام لیا ہے۔ قمری مہینے چونکہ مختلف موسموں میں اُدل بدل کرتے رہتے ہیں، مسلمان روزہ دار بھی رمضان کی اس گردش سے ہلکی گرمی اور ہلکی سردی، شدید گرمی اور شدید سردی، خشک و تر، ہر ہر موسم میں بھوک اور پیاس کے ضبط و تحمل کا خوگر ہو جاتا ہے، روزوں کی تعداد تو شریعت نے مقرر کر ہی دی ہے زمانہ بھی ایک متعین و مقرر ہے۔ یہ نہیں کہ محض تعداد جس کا جب جی چاہے پوری کرے۔ انفرادی اصلاح تو شاید ان حسب مرضی متفرق روزوں سے ہو بھی جاتی لیکن اجتماعی منافع و مصالح کے لئے تعداد کی طرح تعیین بھی ناگزیر تھی، وحدتِ اُمّت کے لئے لازمی تھا کہ عرب و چین، مصر و ہندوستان، طرابلس و جاپان، حبش و آسٹریلیا، افغانستان اور کناڈا، سائبریا اور میکسیکو، برطانیہ و ترکیہ، غرض سارے روئے زمین پر اسلامی آبادی جہاں کہیں بھی ہو، سب ایک ہی وقت میں روحانیت کی اس سالانہ پریڈ میں شریک ہو، علم الاجتماع کے ماہرین جانتے ہیں کہ وحدتِ اُمّت و تنظیم ملّت میں کتنا زیادہ دخل اس ہم وقتی یا وقت کی ہم آہنگی کو ہوتا ہے۔

قرآن کی مناسبت رمضان کے ساتھ ہر صاحبِ نظر پر بالکل روشن ہے، اہلِ سنّت اسی لئے قرآن مجید کے اس نزول کی سالانہ یادگار اس مہینہ بھر راتوں کو اپنی مسجدوں میں مناتے ہیں، اور تراویح کی رکعتوں میں سارے قرآن کو اپنے حافظہ میں تازہ کر لیتے ہیں، تراویح سے متعلق بحثوں کا تعلق حدیثِ نبوی سے ہے، قرآن مجید سے نہیں، تاہم اتنا تو اس مبارک عبادت و عادت سے متعلق قرآن مجید کے ذیل میں کہا ہی جا سکتا ہے۔

حدیث نبوی، ماہ رمضان کے فضائل سے لبریز ہیں، صرف ایک حدیث، جو صحابی عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے حوالہ سے سُنَنِ نسائی میں درج ہے، یہاں نقل کی جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی فَرَضَ صِیَامَ رَمَضَانَ عَلَیْکُمْ وَسَنَنْتُ لَکُمْ قِیَامَہٗ فَمَنْ صَامَہٗ وَقَامَہٗ اِیْمَانًا وَّاحْتِسَابًا خَرَجَ مِنْ ذُنُوْبِہٖ کَیَوْمِ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ۔ | اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے، اور میں نے اس میں رات کے جاگنے کی سنت قائم کی تو جو کوئی روزہ رکھے گا اور ایمان و حُسنِ نیت کے ساتھ شب بیداری کرے گا تو گناہوں سے ایسا دھل جائیگا کہ جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ |

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ

وہ لوگوں کے لئے ہدایت ہے ۶۶۳ اور (اس میں) کھلے ہوئے (دلائل ہیں) ہدایت اور (حق و باطل ہیں) امتیاز کے ۶۶۴

مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ

سو تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے لازم ہے کہ وہ (مہینہ بھر) روزہ رکھے ۶۶۵

۶۶۳ یعنی اس میں خفاو التباس کسی قسم کا نہیں، اور اس کے سارے ہدایات و احکام لوگوں ہی کے نفع کے لئے ہیں۔ لِلنَّاسِ۔ سے اس پر بھی روشنی پڑگئی کہ قرآن کی مخاطب ساری دنیا ہے محض قریش یا عرب نہیں۔

۶۶۴ قرآن مجید ایک کتاب محکم ہے نہ صرف دلالتِ احکام میں وضاحتِ کامل کی بنا پر بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اس کے دلائل حق کو باطل سے واضح اور نمایاں طور پر ممتاز کردینے والے ہیں۔

اَلْفُرْقَان۔ پر حاشیہ پہلے گزر چکا۔

۶۶۵ فَلْيَصُمْهُ۔ بعض کج فہموں نے خدا معلوم کس قاعدۂ زبان سے اس لفظ کے یہ معنی نکال کر کہ رمضان "میں" یا رمضان کے "اندر" روزے رکھے جائیں، یہ حکم لگا دیا ہے کہ صرف تین دن کے روزے بھی کافی ہیں۔ یہ ایجاد بندہ تمام تر گندہ ہے آیت کے صاف و صریح معنی اس مہینہ کو روزہ میں گزارنے کے ہیں، اور اردو میں اس مفہوم کو "مہینہ بھر" ہی سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ فَيَصُمْ نَقِيْضُهُ مَنْ شَهِدَ جُزْءًا مِنْ اَجْزَاءِ الشَّهْرِ فَلْيَصُمْ كُلَّ الشَّهْرِ (کبیر) اَىِ الشَّهْرَ كُلَّهُ۔ (معالم)

شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ۔ قمری مہینہ کا آغاز ہر ۲۹ یا ۳۰ دن کے بعد چاند دیکھنے سے ہوتا ہے اسلام دینِ فطرت ہے اور یہ رنگ اس کی اخلاقی و معاشرتی، تعبدی، جزئی، کلی ہر تعلیم میں نمایاں ہے، طاعتوں اور عبادتوں کے باب میں جہاں اس نے ایک طرف یہ تاکید رکھی ہے کہ وقتِ مقررہ پر اور زمانۂ معین ہی میں ادا ہوں، وہاں یہ نہیں کیا کہ خود اوقات کو یا زمان کی مقداروں کو ماہرینِ ہیئت و حساب کا محتاج و پابند بنا دیا ہو، جیسی تقویم رکھنے والے بیچارے آہنی گھڑی گھنٹہ کے لئے تمام تر دست نگر رہتے ہیں ہیئت دانوں اور فلکیات کا حساب کتاب رکھنے والوں کے، اور اگر کسی ملک یا قوم کا تمدن ابھی اس درجہ تک نہ پہنچا ہو کہ رصد خانے بن سکے ہوں، دوربینیں ایجاد ہو چکی ہوں، طرح طرح کے آلات سے کام لیا جانے لگا ہو، ریاضیات کا طویل و عریض نظام وجود میں آچکا ہو تو وہاں کے لوگ بیچارے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ اسلام تو اس سیدھے سادے فطری حساب کا قائل ہے کہ بغیر کسی آلہ کی مدد کے بغیر ریاضیاتِ اعلیٰ کے توسط کے بس آنکھ سے جب چاند دیکھو روزہ رکھنا شروع کردو۔

آیت کے اتنے ٹکڑے نے اسے صاف کردیا کہ صوم رمضان سارے مکلف انسانوں پر فرض نہیں، بلکہ صرف انھیں پر ہے جنھیں "شہود شہر" ہو، جو ماہ رمضان اپنے ہاں پائیں۔

فِيْهِ عِدَّةُ اَحْكَامٍ هٰذَا اِيْجَابُ الصِّيَامِ عَلٰى مَنْ شَهِدَ الشَّهْرَ دُوْنَ مَنْ لَّمْ يَشْهَدْ ..... يَعْنِىْ اَنَّ لُزُوْمَ صَوْمِ الشَّهْرِ مَقْصُوْرٌ عَلٰى بَعْضِهِمْ دُوْنَ بَعْضٍ وَهُوَ مَنْ شَهِدَ دُوْنَ مَنْ لَّمْ يَشْهَدْهُ (جصاص)

شَهِدَ وسیع معنی میں ہے یعنی جب ماہ رمضان کے شروع ہونے کا علم ہوجائے خواہ چاند کو براہ راست دیکھ کر، خواہ دوسروں سے رویت کی خبر سن کر، تو بیماروں، مسافروں، معذوروں کو چھوڑ کر اور سب لوگ روزہ رکھنا شروع کردیں۔

وَشَهِدَ مِنَ الشُّهُوْدِ وَالتَّرْكِيْبُ يَدُلُّ عَلَى الْحُضُوْرِ اِمَّا ذَاتًا اَوْ عِلْمًا (روح) اِمَّا بِالرُّؤْيَةِ وَاِمَّا بِالسَّمَاعِ۔ (کبیر)

رؤیتِ ہلال معتبر کہاں کی ہوگی؟ فقہاء نے اس کے جواب میں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں، لیکن صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ اسی شہر یا بستی کی یا قرب و جوار کی بستیوں کی، سیکڑوں ہزاروں میل دور سے رؤیتِ ہلال کی خبریں منگانے کا تار، ٹیلیفون، ریڈیو وغیرہ کے ذریعہ سے انتظام کرنا، یا کلکتہ کی رؤیت کو ۱۹۰۰ میل دور بمبئی پر حجت گردانا شریعتِ اسلامی کی اصل روح پر ظلم کرنا ہے، اختلافِ مطالع ایک صریح شاہدہ کی چیز ہے اُسے کیونکر جھٹلایا جا سکتا ہے، وحدتِ اُمت یقیناً ایک بڑی اہم چیز ہے لیکن اس کے لئے یہ زبردستی کی کوشش کرنا طبعی کو غیر طبعی کی حد تک پہونچا دینا ہے۔

وَاخْتَلَفُوْا اِذَا اَخْبَرَ مُخْبِرٌ عَنْ رُؤْيَةِ بَلَدٍ فَلَا يَخْلُوْا اَنَّهٗ يَقْرُبُ اَوْ يَبْعُدُ فَاِنْ قَرُبَ فَالْحُكْمُ وَاحِدٌ وَاِنْ بَعُدَ فَلِاَهْلِ كُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتُهُمْ رُوِيَ هٰذَا عَنْ عِكْرِمَةَ وَالْقَاسِمِ وَسَالِمٍ وَرُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَبِهٖ قَالَ اِسْحٰقُ وَاِلَيْهِ اَشَارَ الْبُخَارِيُّ حَيْثُ بَوَّبَ لِاَهْلِ كُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتُهُمْ۔ (قرطبی)

اسی تفسیر قرطبی میں ایک روایتِ صحیح مسلم کے حوالہ سے اس مضمون کی درج ہے کہ ایک بار ماہِ رمضان کے سلسلہ میں شام کی رؤیت کی خبر مدینہ میں پہونچی، دونوں جگہوں کی تاریخوں میں فرق نکلا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ صحابی نے حدیثِ نبوی کا حوالہ دے کر فتوی دیا کہ ہم تو یہیں کی رؤیت کا اعتبار کریں گے، اس کے بعد امام قرطبی لکھتے ہیں قال علماء نا قول ابن عباس هكذا امرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم كلمة تصريح برفع ذٰلِكَ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِاَمْرِهٖ فَهُوَ حُجَّةٌ عَلٰى اَنَّ الْبِلَادَ اِذَا تَبَاعَدَتْ كَتَبَاعُدِ الشَّامِ مِنَ الْحِجَازِ فَالْوَاجِبُ عَلٰى اَهْلِ كُلِّ بَلَدٍ اَنْ تَعْمَلَ عَلٰى رُؤْيَتِهٖ دُوْنَ رُؤْيَةِ غَيْرِهٖ۔

امام مسلم کا شمار فقہاء محدثین میں ہے انھوں نے اپنی صحیح کی كِتَابُ الصِّيَامِ کے باب کا عنوان یہی قرار دیا ہے باب بيان اِنَّ لِكُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتَهُمْ وَاِنَّهُمْ اِذَا رَاَوُا الْهِلَالَ بِبَلَدٍ لَا يَثْبُتُ حُكْمُهٗ لِمَا بَعُدَ عَنْهُمْ یعنی باب اس بیان میں کہ ہر شہر کی رؤیت وہیں کی معتبر ہے، اور اس میں کہ جس بستی میں چاند دکھلائی دے وہاں سے دور کی بستیوں پر وہاں کا حکم عائد نہ ہوگا، اور باب کے تحت میں وہی حدیث لائے ہیں جو قرطبی کے حوالہ سے اوپر گزر چکی، اور اس حدیث کو محدث ابن منذر اور امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے۔

وَحَكَاهُ ابْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ عِكْرِمَةَ وَالْقَاسِمِ وَسَالِمٍ وَاِسْحٰقَ وَحَكَاهُ التِّرْمِذِيُّ (فتح الباری)

اور امام نووی شارح مسلم نے لکھا ہے کہ:

| | |
|---|---|
| وَالصَّحِيْحُ عِنْدَ اَصْحَابِنَا اَنَّ الرُّؤْيَةَ لَا تَعُمُّ النَّاسَ بَلْ تَخْتَصُّ بِمَنْ قَرُبَ عَلٰى مَسَافَةٍ لَا تُقْصَرُ فِيْهَا الصَّلٰوةُ وَقِيْلَ اِنِ اتَّفَقَ الْمَطْلَعُ لَزِمَهُمْ وَقِيْلَ اِنِ اتَّفَقَ الْاِقْلِيْمُ وَاِلَّا فَلَا۔ | صحیح مسلہ ہمارے علماء کے یہاں یہ ہے کہ رؤیت سارے انسانوں پر حجت نہیں بلکہ صرف اتنی مسافت والوں پر ہے جہاں تک نماز قصر نہ کی جائے اور ایک قول ہے کہ جہاں تک مطلع متحد ہو اور ایک قول ہے کہ ایک اقلیم کے حدود کے اندر اور اس سے آگے نہیں۔ |

اور پھر اس کے آگے یہ لکھا ہے کہ ابن عباسؓ نے غیر مقام کی رؤیت پر بے اعتباری نہیں کی۔

| | |
|---|---|
| اِنَّمَا رَدَّهٗ لِاَنَّ الرُّؤْيَةَ لَا يَثْبُتُ حُكْمُهَا فِيْ حَقِّ الْبَعِيْدِ۔ | انھوں نے اس پر عمل کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ رؤیت کا حکم دور دراز مقامات پر صادق نہیں آتا۔ |

اور فقیہ قاضی ابن رشد مالکی نے اس حدیث سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہر بستی کے لئے وہیں کی رؤیت معتبر ہے

چاہے بستیاں آس پاس کی ہوں یا دُور کی۔

فَظَاهِرُ هٰذَا الْاَثَرِ يَقْتَضِيْ اَنَّ لِكُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتَهٗ قَرُبَ اَوْ بَعُدَ۔ (بدایۃ المجتہد)

مالکیہ کا مذہب مشہور تو یہ ہے کہ ایک جگہ کی رؤیت سب جگہ کے لئے کافی ہوگی، لیکن ابن عبد البر نے اجماع اس کے برخلاف نقل کیا ہے یعنی ایسے دور دراز ممالک جیسے خراسان اور اسپین ہیں ان میں سے ایک کے ہاں کا اعتبار دوسری جگہ نہیں کیا جائے گا۔

لٰكِنْ حَكَى ابْنُ عَبْدِ الْبَرِّ الْاِجْمَاعَ عَلٰى خِلَافِهٖ وَقَالَ اَجْمَعُوْا عَلٰى اَنَّهٗ لَا تُرَاعَى الرُّؤْيَةُ فِيْ مَا بَعُدَ مِنَ الْبِلَادِ كَخُرَاسَانَ وَالْاَنْدَلُسِ (فتح الباری) وَحَكٰى اَبُوْ عُمَرَ الْاِجْمَاعَ عَلٰى اَنَّهٗ لَا تُرَاعَى الرُّؤْيَةُ فِيْ مَا بَعُدَ مِنَ الْبُلْدَانِ كَالْاَنْدَلُسِ وَخُرَاسَانَ قَالَ وَلِكُلِّ بَلَدٍ رُؤْيَتُهُمْ اِلَّا مَا كَانَ كَالْمِصْرِ الْكَبِيْرِ وَمَا تَقَارَبَتْ اَقْطَارُهٗ مِنْ بُلْدَانِ الْمُسْلِمِيْنَ (قرطبی) وَرَوَى الْمَدَنِيُّوْنَ عَنْ مَالِكٍ اَنَّ الرُّؤْيَةَ لَا تَلْزَمُ بِالْخَبَرِ عِنْدَ غَيْرِ اَهْلِ الْبَلَدِ الَّذِيْ وَقَعَتْ فِيْهِ الرُّؤْيَةُ اِلَّا اَنْ يَّكُوْنَ الْاِمَامُ يَحْمِلُ النَّاسَ عَلٰى ذٰلِكَ وَبِهٖ قَالَ ابْنُ الْمَاجِشُوْنِ وَالْمُغِيْرَةُ مِنْ اَصْحَابِ مَالِكٍ وَاَجْمَعُوْا عَلٰى اَنَّهٗ لَا يُرَاعٰى ذٰلِكَ فِي الْبُلْدَانِ النَّائِيَةِ كَالْاَنْدَلُسِ وَالْحِجَازِ (بدایۃ المجتہد) وَاخْتُلِفَ فِيْ تَاْوِيْلِ قَوْلِ ابْنِ عَبَّاسٍ هٰذَا فَقِيْلَ رَدَّهٗ لِاَنَّهٗ خَبَرُ وَاحِدٍ وَقِيْلَ رَدَّهٗ لِاَنَّ الْاَقْطَارَ مُخْتَلِفَةٌ فِي الْمَطَالِعِ وَهُوَ الصَّحِيْحُ۔ (ابن العربی)

الشَّهْرَ۔ اس دنیا کے پردے پر کچھ ملک ایسے بھی آباد ہیں، جہاں کا طلوع و غروب ہمارے عام معیار کے لحاظ سے بالکل غیر معمولی ہے، مثلاً فن لینڈ، یا قطبین کے قریب کے علاقے جہاں رُویتِ ہلال کے اُنتیسویں ۲۹ دن یا تیسویں ۳۰ دن کے واقع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں، اور جب یہ نہیں تو وہاں شہود الشہر یعنی طلوعِ ماہِ رمضان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ قرآن مجید کے اس اعجازِ بلاغت کے قربان جایئے کہ صرف ایک لفظ شَهِدَ الشَّهْرَ کے لے آنے سے کتنے سوالات اور شبہات کی جڑ کاٹ دی بہ طور تطوع یا بہ خیال تقوے کوئی وہاں بھی روزہ رکھنا چاہے تو سونے، جاگنے، کھانے پینے، غرض دنیا کے اور سارے کاروبار کے لئے وہاں اوقات کا جو معیار ہو اُسی انداز اور حساب سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔

ہمارے زمانہ کے نامور فاضل، محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ حیدر آبادی نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ اس قابل ہے کہ یہاں پورا نقل کر دیا جائے:۔

"...... یہ امر ناگزیر ہے کہ کرۂ زمین کو اسی ضرورت کے پیش نظر معمولی اور غیر معمولی دو منطقوں میں تقسیم کر دیا جائے، خطِ استواء سے ۴۵ درجہ شمالاً و جنوباً عرض البلد تک تو معمولی معمولی منطقہ ہو اور اس کے آگے قطبین تک دونوں جوانب غیر معمولی منطقے شمار کئے جائیں اور ان غیر معمولی منطقوں کے لئے وہی اوقات سحر و افطار ہوں، جو معمولی منطقے کے انتہائی اوقات سحر و افطار ہو سکتے ہیں۔"

اس کے آگے ایک مفصل گوشوارہ یکم جنوری سے لے کر ۳۱ دسمبر تک کے نقشہ کے لئے اوقات طلوع و غروب کا تفصیل سے پیش کیا ہے، جو دوکنگ (لندن) کے انگریزی ماہ نامہ اسلامک ریویو (مارچ ۱۹۵۶ء) میں دیکھا جا سکتا ہے، نیز لاہور کے ماہ نامہ ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۶ء میں، اور اس کے بعد یہ نقشۂ اوقات موصوف نے اپنی انگریزی کتاب (INTRODUCTION TO ISLAM) میں بھی شامل کر دیا ہے۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ؕ يُرِيدُ اللّٰهُ

اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (اُس پر) دوسرے دنوں کا شمار رکھنا (لازم ہے) ۶۶۶ اللہ تمہارے

بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ؗ

حق میں سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا ۶۶۷

۶۶۶ ابتداء میں حکم صرف اسی قدر تھا کہ تندرست اور مقیم بھی جو ماہ رمضان میں روزہ نہ رکھنا چاہیں قضا کر سکتے ہیں، جب آیت فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ نازل ہوئی اُس وقت سے تندرستوں اور مقیموں سے یہ اختیار چھن گیا، اور رمضان کے روزے ان کے لئے اختیاری نہیں رہے، لازمی ہو گئے، لیکن مریضوں، ناتوانوں، مسافروں کے لئے قضا کا اختیار بدستور باقی رہا، آیت کے اسی جزو مَنْ كَانَ مَرِيضًا الخ کو ایک بار پھر اسی لئے دُہرا دیا گیا کہ مَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی تعلیم سے کوئی بھی یہ نہ سمجھ لے کہ معذوروں سے رعایت ختم کر دی گئی، اس لئے حکم کی تکرار صرف صوری اور ظاہری ہے، حقیقی اور معنوی نہیں۔

كَرَّرَ لِئَلَّا يُتَوَهَّمَ نَسْخُهُ بِتَعْمِيمِ مَنْ شَهِدَ (جلالین) مُخَصِّصًا لَهُ لِأَنَّ الْمُسَافِرَ وَالْمَرِيضَ مِمَّنْ شَهِدَ الشَّهْرَ وَلَعَلَّ تَكْرِيرَهُ لِذٰلِكَ لِئَلَّا يُتَوَهَّمَ نَسْخُهُ۔ (بیضاوی)

۶۶۷ چنانچہ شریعتِ اسلامی کے سارے احکام و قوانین اسی ایک اصل پر مبنی ہیں، اور خود اسی روزۂ رمضان کے معاملہ میں معذور کے لئے کتنی گنجائش کتنی سہولتیں رکھ دی گئیں، حدیثِ نبوی میں جو آیا ہے دِيْنُ اللّٰهِ يُسْرٌ وہ اسی آیتِ قرآنی کی شرح یا تتمہ ہے، اور واقعی اگر غور کر کے دیکھا جائے تو شریعت کا ایک حکم بھی ایسا نہ ملے گا جس میں عامل کے حالات، عمر، صحت، جنس، موسم اور دوسری مشکلات کا لحاظ نہ کر لیا گیا ہو، اور جو احکام بظاہر سخت معلوم ہوتے ہیں، اُن کی تہ میں بھی ہمیشہ یہی حقیقت پائی جائے گی کہ فرد یا امت کی راہ میں کچھ آسانیاں ہی پیدا ہوں، امتِ اسلامی کے فخر و مسرت کے لئے یہ کافی ہے کہ جو احکام غیروں کو سخت معلوم ہوتے ہیں، اُن کی تعمیل میں وہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر جانے کے بعد، ساری مخالفانہ فضا و ماحول کے باوجود اسی خوش دلی اور بے تکلفی کے ساتھ لگی ہوئی ہے کہ اغیار دیکھ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں۔

سر ولیم میور لکھتے ہیں:۔

"روزہ کی سختیاں بدستور قائم ہیں، خواہ وہ کسی موسم میں پڑیں، اور آج تک مشرق کے میدانوں میں جھلجلاتی دھوپ اور جھلساتی ہوئی سموم میں گرمیوں کے لمبے لمبے دنوں میں محمد کے پیرو صبح سے شام تک پانی کا ایک قطرہ حلق کے نیچے نہیں اُتارتے ..... اتنی سخت ریاضت، قوتِ ایمانی اور ضبطِ نفس کا پورا امتحان ہے۔" (لائف آف محمد ص ۱۹۳)

اَلْيُسْرُ سے مراد حالتِ سفر میں افطار اور اَلْعُسْرُ سے مراد حالتِ سفر میں صوم سے بھی کی گئی ہے۔

قَالَ مُجَاهِدٌ وَضَحَّاكٌ اَلْيُسْرُ الْفِطْرُ فِي السَّفَرِ وَالْعُسْرُ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (قرطبی) رُوِيَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَقَتَادَةَ وَمُجَاهِدٍ وَالضَّحَّاكِ أَنَّ الْيُسْرَ الْإِفْطَارُ فِي السَّفَرِ وَالْعُسْرَ الصَّوْمُ فِيهِ وَفِي الْمَرَضِ۔ (جصاص)

لیکن فقہاء مفسرین نے اس کے عموم میں سارے ہی مسائلِ دین کو شامل سمجھنا چاہا ہے، اور اس کو ایک بڑی اصل قرار دے لیا ہے۔

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ

اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم شمار کی تکمیل کر لیا کرو ۶۶۸ اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کیا کرو، اس پر کہ تمہیں راہ بتادی ۶۶۹ عجب نہیں کہ

تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ

تم شکر گزار بن جاؤ ۶۷۰ اور جب آپ سے میرے بندے میرے باب میں دریافت کریں ۶۷۱ تو میں تو قریب ہی ہوں ۶۷۲

وَالْوَجْهُ عُمُوْمُ اللَّفْظِ فِيْ جَمِيْعِ اُمُوْرِ الدِّيْنِ (قرطبی) وَهٰذِهِ الْاٰيَةُ اَصْلٌ فِي التَّاَكُّلِ مَا يَضُرُّ بِالْاِنْسَانِ وَيُجْهِدُهٗ وَيَجْلِبُ لَهٗ مَرَضًا...... اَنَّهٗ غَيْرُ مُكَلَّفٍ بِهٖ لِاَنَّ ذٰلِكَ خِلَافُ الْيُسْرِ (جصاص)

يُرِيْدُ اللّٰهُ . لفظ يُرِيْدُ سے اہل سنت نے استدلال کیا ہے کہ اللہ صاحبِ ارادہ ہے اپنے ارادۂ قدیم وازلی کے ساتھ۔ دَلَّتِ الْاٰيَةُ عَلٰى اَنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ مُرِيْدٌ بِاِرَادَةٍ قَدِيْمَةٍ اَزَلِيَّةٍ زَائِدَةٍ عَلَى الذَّاتِ هٰذَا مَذْهَبُ اَهْلِ السُّنَّةِ كَمَا اَنَّهٗ عَالِمٌ بِعِلْمٍ قَادِرٌ بِقُدْرَةٍ . (قرطبی)

۶۶۸ یعنی جتنے روزے قضا ہو جائیں اُن کی تکمیل کر تو تو پورا پورا اجر روزوں کی ادائی ہی کا مل جائے گا۔

وَلِتُكْمِلُوا . یہ نحوی حیثیت سے ماتحتی میں يُرِيْدُ اللّٰهُ کے ہے اور عطف اَلْيُسْرَ پر ہے۔

يَجُوْزُ اَنْ يُّعْطَفَ عَلَى الْيُسْرِ اَيْ وَيُرِيْدُ بِكُمْ لِتُكْمِلُوْا . (بیضاوی)

فراء نحوی نے کہا ہے کہ یہ ل، کَے کے معنی میں ہے۔

فَهٰذِهِ اللَّامُ لَامُ كَيْ . (معانی)

۶۶۹ (تمہارے ہی نفع اور فلاح کی)

اور راہ بھی ایسی جس میں نہ زیادہ مشقت و تعب، بلکہ ہر ایک کے حالات کی پوری پوری رعایت۔

۶۷۰ شکر گزار بن جانے کا کتنا آسان نسخہ اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ ہے، بندہ بس اسی پر غور کرتا رہے کہ اللہ نے شریعتِ اسلامی کے ذریعہ سے کیسے کیسے پُر سہولت طریقے، اُس کے اجر اور نفع کے بتا دیے ہیں۔

۶۷۱ (اے پیغمبر)

یعنی میرے قرب و بُعد سے متعلق کہ آیا وہ ہم سے قریب ہے کہ ہم اُس سے سرگوشی کریں یا بعید ہے کہ اپنی آواز چلا کر اُس تک پہونچیں۔

قَالَ الْحَسَنُ سَبَبُهَا اَنَّ قَوْمًا قَالُوْا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَقَرِيْبٌ رَبُّنَا اَمْ بَعِيْدٌ فَنُنَادِيْهِ . (قرطبی)

عجب نہیں کہ ایسا سوال اور وہ بھی مجادلانہ رنگ میں یہود کی طرف سے پیش ہوا ہو جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم بھی ہوتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ كَيْفَ يَسْمَعُ رَبُّنَا وَاَنْتَ تَزْعُمُ اَنَّ بَيْنَنَا وَبَيْنَ السَّمَاءِ خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ . (قرطبی)

گمراہ قوموں نے باری تعالٰی کے وجود کا اقرار تو اکثر کیا ہے لیکن ذاتِ باری کو انسان سے اس قدر پرے، مادی و معنوی دونوں حیثیتوں سے فرض کیا ہے کہ وہاں تک بندوں کی رسائی گویا ممکن ہی نہیں۔

اِذَا سَاَلَكَ اہلِ لطائف نے اس سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ قرب قبولِ طلب پر موقوف ہے اور خطاب اس لیے

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ

پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے ۶۷۳ پس (لوگوں کو) چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور

يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

مجھ پر ایمان لائیں ۶۷۴ تاکہ ہدایت یاب ہو جائیں ۶۷۵

اختیار کیا گیا ہے کہ یہ توسط آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے کسی اور کی طرف گمان نہ جائے۔

**۶۷۲** (اور یہ آپ بندوں سے میری طرف سے کہہ دیجئے)

قَرِيبٌ قریب باعتبار کمالِ علم، یا باعتبار قبولِ دعا۔

اَیْ قَرِیْبٌ بِالْاِجَابَةِ (ابن عباس) قَرِیْبٌ بِالْعِلْمِ لَا یَخْفٰی عَلَیَّ شَیْءٌ (معالم) اَیْ بِالْاِجَابَةِ وَقِیْلَ بِالْعِلْمِ (قرطبی) عِلْمًا وَاِجَابَةً لِتَعَالِیْهِ عَنِ الْقُرْبِ مَكَانًا (مدارک) اِنَّهٗ تَعَالٰی یَسْمَعُ دُعَاءَهُمْ وَیَرٰی تَضَرُّعَهُمْ اَوِ الْمُرَادُ مِنْ هٰذَا الْقُرْبِ الْعِلْمُ وَالْحِفْظُ۔ (کبیر)

قرب سے ظاہر ہے کہ قربِ مادّی یا مکانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، قربِ معنوی ہی مراد ہوگا۔

تَمْثِیْلٌ لِكَمَالِ عِلْمِهٖ بِاَفْعَالِ الْعِبَادِ وَاَقْوَالِهِمْ وَاطِّلَاعِهٖ عَلٰی اَحْوَالِهِمْ۔ (بیضاوی)

حق تعالے کا قرب اپنے بندوں سے رہتا تو ہمیشہ ہی ہے، ماہِ رمضان میں اسی عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے اور یہ قرب یا تعلق خاص اور بڑھ جاتا ہے۔

بندوں کی تسکین اور تسلی کا کس قدر سامان اس ایک آیت کے اندر موجود ہے! انہیں اپنے خدا کو ڈھونڈھنے کہیں اور نہیں جانا ہے، وہ تو ہم سے قریب ہی، ہم سے متصل ہی ہے۔

**۶۷۳** (اور جن دعاؤں کا قبول کرنا میری حکمتِ کاملہ اور مشیتِ مطلقہ کے منافی نہیں ہوتا)

عَنِّیْ، اِنِّیْ، اُجِیْبُ، دَعَانِ۔ متکلم کی ساری ضمیریں آیت میں بجائے جمع کے واحد کی ہیں، دونوں صیغوں کا عموی فرق ملحوظ رہے، صیغۂ جمع عموماً قدرت، عظمت، قوت کا مظہر ہے، اور واحد اس کے برعکس التفات، اختصاص، توجہ کی جانب مُشیر ہوتا ہے، اور یہاں توجہ و التفات کا مشیر ہونا تو بالکل ظاہر ہے، آیت کے الفاظ سے دعا کی ترغیب و تشویق بھی نکل آئی، اور اشارہ اس جانب بھی ہوگیا کہ دعا بندہ کا کوئی سرتاسر خود غرضانہ اور دنیوی عمل نہیں، بلکہ عین عبادت اور موجبِ تقرب ہے ایک حدیث صحیح میں یہ مضمون آیا ہے کہ جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل جاتا ہے یعنی دعا کی توفیق ہو جاتی ہے اُس کے لئے رحمت کا بھی دروازہ کھل جاتا ہے۔

دَعْوَة۔ کے معنی یہاں عبادت کے بھی لئے گئے ہیں اور اجابت سے مراد قبول سمجھی گئی ہے، یعنی بندہ جب میری عبادت کرتا ہے تو میں اُسے قبول کرتا ہوں۔

اَیْ اَقْبَلُ عِبَادَةَ مَنْ عَبَدَنِیْ فَالدُّعَاءُ بِمَعْنَی الْعِبَادَةِ وَالْاِجَابَةُ بِمَعْنَی الْقَبُوْلِ (قرطبی)......

ثَالِثُهَا اَنْ یَكُوْنَ الْمُرَادُ مِنَ الدُّعَاءِ الْعِبَادَةُ (کبیر) وَالْوَجْهُ الرَّابِعُ اَنْ یَكُوْنَ الدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ۔ (بحر)

# اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ

جائز کردیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی بیبیوں سے مشغول ہونا ٦٦٦

٦٧٤ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ۔ یعنی میری دعوتِ ایمان و طاعت قبول کریں جس طرح میں اُن کی دعائے حاجات قبول کرتا ہوں۔ اِذَا دَعَوْتُهُمْ لِلْاِيْمَانِ وَالطَّاعَةِ كَمَا اَنِّيْ اُجِيْبُهُمْ اِذَا دَعَوْنِيْ لِحَوَائِجِهِمْ (مدارک) اَلْمَعْنٰى فَلْيُجِيْبُوْا لِيْ فِيْمَا دَعَوْتُهُمْ اِلَيْهِ مِنَ الْاِيْمَانِ اَيِ الطَّاعَةِ وَالْعَمَلِ۔ (قرطبی عن مجاہد وغیرہ)

حکیم مطلق کے کسی حکم کے نامناسب ہونے کا احتمال ہی نہیں بخلاف بندوں کی درخواستوں کے کہ ان میں بہت سی نامناسب بھی ہوتی ہیں، اور اس لئے مرتبۂ قبول سے محروم رہتی ہیں۔ (تھانوی)

وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ۔ یعنی یقین رکھیں نہ صرف میرے وجود پر بلکہ میرے حاکم ہونے پر، میرے حکیم ہونے پر اور میری عنایتِ مصالح پر،

٦٧٥ (پوری طرح۔ اور ان پر فلاح دارین کا دروازہ کھل جائے۔)

احکامِ الٰہی پر تعمیل اور ایمانِ کامل کے بعد درجۂ رُشد تک پہونچ جانے میں امر مانع ہی کون سا ہو سکتا ہے۔

لَعَلَّ۔ اوپر بیان ہو چکا کہ کلامِ الٰہی میں جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر یہ لفظ آتا ہے تو اس کے معنی محض اُمید یا احتمال کے نہیں رہتے، بلکہ اس میں یقین پایا جانے لگتا ہے، مُراد یہ ہوئی کہ احکامِ الٰہی پر عمل کرنے اور اُس کے حکیم و حاکم ہونے پر یقین رکھنے سے دروازہ فلاحِ دارین کا کھل کر رہے گا۔

٦٧٦ یہ اجازت شروع میں نہ تھی جیسا کہ لفظ اُحِلَّ سے خود اشارہ نکل رہا ہے، ابتداءً روزہ کی حالت میں رات میں بھی دن ہی کی طرح بیویوں سے علیحدگی کا حکم تھا، شریعتِ اسلامی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ رسالت میں بتدریج نازل ہوئی، کہیں تو ایسا ہوا کہ احکامِ شریعت میں نرم تھے، رفتہ رفتہ سخت ہو گئے، مثلاً شراب نوشی کہ پہلے صرف ناپسند کی گئی اور پھر ہوتے ہوتے اس کی حرمت کا حکم آگیا، اور کہیں اس کے برعکس ہوا ہے یعنی ابتداءً قانون سخت تھا، رفتہ رفتہ اس میں سہولتیں اور رعایتیں زیادہ ہوتی گئیں، چنانچہ یہی روزہ کا معاملہ ہے کہ پہلے صحبت رات میں بھی حرام تھی، بعد کو جائز کر دی گئی۔

رَفَثٌ کے لغوی معنی شہوت انگیز کلام کے ہیں لیکن جب صیغۂ متعدّی میں اسے لایا جاتا ہے تو اس سے مُراد صحبت یا مباشرت ہوتی ہے چنانچہ یہاں الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ہے۔

عُدِّيَ بِاِلٰى لِاَنَّهٗ فِيْ مَعْنَى الْاِفْضَاءِ (لسان) جُعِلَ كِنَايَةً عَنِ الْجِمَاعِ وَعُدِّيَ بِاِلٰى لِتَضَمُّنِهٖ مَعْنَى الْاِفْضَاءِ (راغب) كُنِّيَ بِهٖ عَنِ الْجِمَاعِ (کشاف) وَالْمُرَادُ بِهٖ هٰهُنَا الْمُبَاشَرَةُ (ابن العربی) كِنَايَةٌ عَنِ الْجِمَاعِ لِاَنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ كَرِيْمٌ يُكَنِّيْ قَالَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ وَالسُّدِّيُّ وَقَالَ الزَّجَّاجُ اَلرَّفَثُ كَلِمَةٌ جَامِعَةٌ لِكُلِّ مَا يُرِيْدُ الرَّجُلُ مِنِ امْرَاَتِهٖ (قرطبی)

یہیں سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیوی کی طرف میل و رغبت ذرا بھی کمالِ روحانیت و تزکیۂ نفس کے منافی نہیں جیسا کہ بہت سے مشرکانہ اور جاہلی مذہبوں نے سمجھ لیا ہے اور ماہِ صیام کی طاعت و عبادت اور بیوی سے خلوت و صحبت کے درمیان منافات ذرا بھی نہیں، جیسا کہ مذہبِ جوگیانہ اور راہبانہ تخیل نے دلوں میں بٹھا دیا ہے، شریعتِ اسلامی نے جس چیز کو سخت پیرا بٹھا رکھا ہے، وہ شہوتِ حرام اور اُس کے مبادی و مقدمات ہیں، نہ کہ نفسِ شہوت، بھوک، پیاس، نیند کی طرح

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

وہ تمہارے لباس ہیں اور تم اُن کے لباس ہو ۶۷۷ اللہ کو خبر ہو گئی کہ تم اپنے کو خیانت میں مبتلا

كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ

کرتے رہتے تھے ۶۷۸ پس اس نے تم پر رحمت سے توجہ فرمائی اور تم سے درگزر کردی ۶۷۹

جنسی بھوک بھی اگر اپنے حدود کے اندر رہے تو ایک طبعی اور بے ضرر خواہش ہے۔ قصداً اور بلا ضرورتِ شرعی روزۂ رمضان توڑ دینے کی سزا شریعت نے دو مہینے یعنی ساٹھ دن کے مسلسل روزے رکھی ہے اور شوہر و بیوی اگر اپنے مشترک عمل سے روزہ توڑ دیں تو دونوں کی یہی سزا ہے، لیکن اگر بیوی رضامند نہ ہو اور شوہر اُسے دن میں ہمبستری پر مجبور کردے تو بیوی پر گناہ نہیں، البتہ خود جبر کا تحقق ہونا چاہیئے، مجبور کے لئے صرف ایک روزہ کی قضا کافی ہے، کفارہ کی بنیاد قصد و تعمد پر ہے۔

۶۷۷ (قربِ اتصال کے لحاظ سے، یا ایک دوسرے کے پردہ دار اور موجبِ تسکین ہونے کے لحاظ سے۔)

گویا اُردو محاورہ میں، دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ اُن کے حق میں اوڑھنا بچھونا ہیں اور یہ اُن کے حق میں، یہ لباس کی تشبیہ کس اعتبار سے ہے؟ مختلف زبانوں سے اس کے مختلف جوابات ملتے ہیں بعض نے کہا کہ ایک دوسرے کے محتاج ہونے کی بنا پر، کسی نے کہا کہ اجسام کی ملابست و ملامست کی بنا پر وقس علیٰ ہذا، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسان کے حق میں لباس کا ایک وصفِ امتیاز اس کی پردہ پوشی ہے، لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے، اس حسن و خوبی کو اُبھارتا ہے، تشبیہ سے خاص اشارہ اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے، گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیئے اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا، جو انتہائی گہرا رشتہ اور تعلق میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے، اس کی بنا پر ظاہر ہے کہ جتنا موقع ایک کو دوسرے کے جسمانی، اخلاقی، روحانی عیبوں اور کمزوریوں پر مطلع ہونے کا ملتا ہے، اتنا نہ کسی دوست کو مل سکتا ہے نہ کسی عزیز کو، اور نہ ایک کا راز دوسرے سے مخفی رہ سکتا ہے، اس صورتِ حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہ ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے، اس پر صبر کرے اسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے اور ؏

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من

کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرے، علیٰ ہذا مرد کے بھی کمالِ اخلاق کی یہی معراج ہے۔

دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ موثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں بغیر کسی شدید اور پُر تعب مجاہدہ میں ڈالے ہوئے، روزمرہ کے لطیف و سہل مجاہدات کے ذریعہ بتا دیا، یہ اُس مذہب کی تعلیم ہے جو فرنگی "محققین" کی نظر میں پست اس لئے ہے کہ اُس میں عورت کی تحقیر کی گئی ہے۔! ؏

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا!

کون جھوٹ اس سے بڑھ کر سخت، کون سا اتہام اس سے بڑھ کر صریح ہوگا؟ منوسمرتی والے ہندو مذہب کا ذکر نہیں، عہد عتیق و جدید والے یہودی و نصرانی مذہب سے سوال ہے کہ ان کے سارے دفترِ کتب و اسفار میں کون سی

# فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ

سو اب تم اُن سے ملو ملاؤ ۶۸۰ اور اُسے تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے ۶۸۱

تعلیم زن وشو کے باہمی تعلق، محبت واعتماد کے باب میں اس درجہ کی ہے؟

۶۷۸ یعنی رات کو چھپ چھپ کر بیویوں سے صحبت کرتے تھے اور جی میں ڈرتے بھی جاتے تھے کہ کہیں حکم الہی کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی ہے۔

عَلِمَ اللّٰہُ یعنی جو بات اللہ کے علم میں تو ہمیشہ سے ہی ہے اب واقع ہو کر مشاہدہ میں بھی آگئی۔

ای علم وقوع هذا منکم مشاهدة۔ (قرطبی)

یہ تفسیر جمہور مفسرین کی تقلید میں تھی لیکن راغب لغوی نے خیانۃ اور اختیان کے معنی میں فرق کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر عملِ خیانت کا صدور مقصود ہوتا تو تخونون انفسکم آتا تختانون سے مراد محض قصدِ خیانت کے لئے جذبات کا حرکت میں آنا ہے، اور اختیان کے معنی خیانت کرنا نہیں، بلکہ خیانت کے لئے حیلہ کرنا ہے۔

الاختیان مراودۃ الخیانۃ..... الاختیان تحرک شھوۃ الانسان لتحری الخیانۃ (راغب) ولم یقل تخونون انفسکم لانہ لم تکن منھم الخیانۃ بل کان منھم الاختیان (راغب)

اور آگے تائید ایک اور آیت ان النفس لامارۃ بالسوء سے حاصل کی ہے۔

اور صاحبِ تاج نے بھی راغب کے قول کو بلا اختلاف واعتراض نقل کیا ہے۔

۶۷۹ یعنی پچھلے گناہوں کو معاف کر دیا، اور آئندہ کے لئے رمضان میں رات کو بیویوں کے ساتھ خلوت اور صحبت کی اجازت دے دی۔

تَابَ اور عَفَا سے لازم نہیں آتا کہ پہلے کوئی گناہ صادر بھی ہو چکا ہے محض توسع اور تسہیلِ مزید کے موقع پر بھی ان الفاظ کا استعمال جائز ہے۔

یَحْتَمِلُ الْعَفْوُ مِنَ الذَّنْبِ وَیَحْتَمِلُ التَّوْسِعَۃَ وَالتَّسْھِیْلَ۔ (قرطبی)

۶۸۰ (اپنے معمولی طریقہ پر جیسے رمضان کے علاوہ دوسرے زمانوں میں کرتے رہتے تھے۔)

بَاشِرُوْا صیغۂ امر ہے مُراد اجازت ہے نہ کہ حکم، مباشرت سے مراد عورت سے صحبت کرنا ہے۔

کنایۃ عن الجماع (قرطبی) کنی بہ عن الجماع (بیضاوی)

آیت سے ایک اور حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی، عورت سے صحبت، کھانے پینے اور نیند لینے ہی کی طرح تمام تر ایک امر طبعی ہے جس پر نہ کسی قسم کی ملامت ہے اور نہ کسی تحقیر واستہزاء کی گنجائش، ملامت کے قابل صرف اس جنسی قوت کا بےمحل استعمال ہے جس طرح ملامت چوری کے کھانے اور حرام کھانوں پر ہے۔

۶۸۱ (بصورتِ اولاد اور بطور میاں بیوی کی یکجائی کے قدرتی نتیجے کے)

مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ سے مُراد اولاد، اور اولادِ صالح ہے، عملِ مباشرت اگر صحیح سن پر اور مناسب وقت پر ہو، بڑی گہری طبعی لذت بھی رکھتا ہے لیکن اسلام نے اس عمل سے اصلی اور بڑا مقصد افزائشِ نسل اور حصولِ اولاد

رکھا ہے کہ اُمّت کی قوت اور کثرت میں برابر اضافہ ہوتا رہے، اور ذاتی لذت اجتماعی منفعت کا زینہ بنتی رہے ٹھیک اسی طرح جیسے کھانے پینے کی لذّت طبعی ذریعہ بنتی رہتی ہے فرد کی حیات و بقا کا، اور اس کی تقویتِ جسم کا۔

ما قضی اللہ لکم من ولد صالح (ابن عباس) یعنی الولد قالہ اکثر المفسّرین (معالم)

اور ابن کثیر نے اسی معنی کی تائید میں حضرت ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، انسؓ جیسے صحابیوں سے لے کر قاضی شُریحؒ، مجاہدؒ، حسن بصریؒ، ضحاکؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ، عطاءؒ، سعید بن جبیرؒ وغیرہ اکابر تابعین تک سب کا اجماع نقل کر دیا ہے۔

کَتَبَ "لکھ رکھا ہے" یعنی لوحِ محفوظ میں اپنی مشیتِ تکوینی میں۔

ای فی اللوح المحفوظ (معالم) ای اثبت فی اللوح من الولد۔ (کشاف)

وَابْتَغُوْا۔ بعض نے وَابْتَغُوْا سے مراد شبِ قدر کی تلاش اور کتب اللہ لکم کے معنی اس کے اجر و ثواب کے لئے ہیں لیکن اہلِ تحقیق نے رد کر دیا ہے۔

ہو قریب من بدع التفاسیر (کشاف) وجمہور المحققین استبعد وا ہذا الوجہ (کبیر)

ابن قیم نے یہاں ایک نادر نکتہ یہ پیدا کیا ہے کہ آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ جنسی لذّت میں تمام تر محو نہ ہو جاؤ بلکہ اس میں پڑ کر بھی رضائے الٰہی ملحوظ رکھو اور طالبِ اولادِ صالح و سعید کے رہو۔

وکان المجامع یغلب علیہ حکم الشہوۃ وقضاء الوطر حتی لا یکاد یخطر بقلبہ غیر ذالک ارشدہم سبحانہ الی ان یطلبوا رضاہ فی مثل ہذہ اللذۃ ولا یباشروہن بحکم مجرد الشہوۃ بل یبتغوا ما کتب اللہ لہم من الاجر والولد الذی یخرج من اصلابہم یعبد اللہ ولا یشرک بہ شیئا۔ (التفسیر القیم)

وَابْتَغُوْا سے صاف اشارہ نکل رہا ہے کہ مطلوب افزائشِ نسل ہے، نہ کہ ارادی لاولدی یا عزل۔

قیل ہو نہی عن العزل (کشاف) قیل النہی من العزل (بیضاوی) فیہا حث علی طلب الولد (جصاص)

منعِ حمل اور قطعِ نسل کی جس جدید تحریک کا اس وقت زور ہے اور جو "ضبطِ تولید" وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے قرآن مجید نے اپنے بلیغ انداز میں اس سب کی تردید کر دی اور بتا دیا کہ مباشرت کا جو نتیجہ قدرۃً اور طبعاً نکلتا ہے اسی کی توقع رکھنا چاہیئے اور اسی کا انتظار کرنا چاہیئے، عام قاعدہ اور اصل عمومی یہی ہے باقی اجتماع تزویج کے قدرتی نتیجوں کو بلاوجہ خاص و ضرورت شدید مصنوعی ذریعوں اور تدبیروں سے روکنا، اور ربڑ وغیرہ کے آلات کو کام میں لانا، مصیبتوں کو دور کرنا نہیں جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد و قوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے انتہائی سرگرم کوششوں کے باوجود اوّل تو ابھی تک کوئی پوری طرح "حمل روک" آلہ دریافت ہی نہیں ہو سکا ہے۔

"اب تک کوئی مانعِ حمل ایسا نہیں دریافت ہو سکا ہے جو ہر طرح قابلِ اطمینان ہو، یعنی قطعی ہو، بے ضرر ہو اور سادہ ہو" (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا۔ جلد ۳ ص ۶۵۱ طبع چہار دہم)

اور پھر اگر کوئی بے خطا اور حکمی تدبیر دریافت ہو بھی گئی تو منعِ حمل کی جسمانی مضرتوں کے تدارک کی کیا صورت ہوگی؟

"یہ باور کرنا دشوار ہے کہ یہ عمل (امتناع) بار بار کیا جائے اور اس کے مضر اثرات مرد و عورت کے اعلیٰ صفات پر مرتب ہوں" (ایضاً ص ۶۵۱)

یہ اگر مان بھی لیا جائے کہ جلد جلد استقرارِ حمل اور وضعِ حمل سے عورت کی صحت خراب ہو جاتی ہے تو بھی خود طبِ جدید کا فتویٰ یہ ہے کہ عورت کو زمانۂ حمل میں صنفی اعمال سے جو مہلت مل جاتی ہے نیز وضعِ حمل کے بعد رضاعت وغیرہ کی

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط

الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ

سے نمایاں ہو جائے ۶۸۲

مشغولی و توجہ، یہ سب عورت کی صحت کے لئے ضروری ہے، اور پھر یہ بھی تو ہے کہ اولاد کی پیدائش ہمیشہ والدین کے ارادہ کے تابع نہیں رہتی، چنانچہ ایسے والدین کی مثالیں بارہا شاہدہ میں آچکی ہیں کہ پہلے تو انھوں نے امتناع کی صناعی تدبیریں اختیار کر کے اپنے اعضاء تولید کی صلاحیتوں کو ضائع کر دیا، اور پھر آگے چل کر جب اولاد کی خواہش یا ضرورت محسوس کی تو اپنی سابقہ حرکتوں پر پچھتائے ہیں، یہ سب تصریحات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ہی سے ماخوذ ہیں، باقی متعدد دوسرے ڈاکٹروں اور انھیں میں لیڈی ڈاکٹر بھی ہیں، اور سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بیہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں، بلکہ یورپ کے متعدد ملک تو اس تحریک کے نتائج سے تنگ آ کر اور طویل تجربوں کے بعد بالآخر اس پر مجبور ہوئے کہ ماؤں کے لئے انعام قرار دیا اور ہر نئی زچگی پر ایک نیا انعام دیں، جرمنی، اٹلی وغیرہ سے تو یہ خبریں کئی سال سے آنا شروع ہو گئی تھیں اور ابھی روس اور فرانس وغیرہ سے عین دورانِ جنگِ عظیم (۱۹۴۳ء) میں آنے لگی ہیں، اور بالآخر بات اُسی کی سچی نکلی اور اُسی کی بلند رہی جس نے کہا تھا کہ تَزَوَّجُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ، شادیاں کرو زیادہ بچے پیدا کرنے والی بیویوں سے۔

۶۸۲ یعنی طلوعِ صبحِ صادق تک کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت ہے۔

خَيْطُ الْاَبْيَضِ، خَيْطُ الْاَسْوَدِ۔ فجر کی سفید دھاری کا سیاہ دھاری سے ممتاز ہو جانا کنایہ ہے تاریکیِ شب کے دور ہونے اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے یعنی طلوعِ فجر سے۔

الخیط اللون (مجاز) ای بیاض النہار من سواد اللیل (راغب) یعنی بیاض النہار من سواد اللیل (معالم)

خود شارعِ اسلام علیہ السلام سے یہی تفسیر مروی ہے۔

ھو سواد اللیل وبیاض النہار (صحیح بخاری)

خَيْط سے عموماً یہی کنایہ رنگ سے ہوتا ہے، اور یہاں انھیں خَيْط سے یوں تعبیر کیا گیا ہے کہ شروع میں یہ واقعۃً دھاریاں ہی سی نظر آتی ہیں۔

الخیط فی کلامہم عبارۃ عن اللون (قرطبی) الخیط الابیض ھو اول ما یبدو من الفجر (کشاف)

سُمّیا خیطین لان کل واحد منہما یبدو فی الابتداء ممتدًا کالخیط۔ (معالم)

احادیث میں بڑی تاکید کے ساتھ ترغیب دی گئی ہے کہ روزہ دار کی رات بھی حتی الامکان ذکر و عبادت میں بسر ہونی چاہئے، چنانچہ اہلِ سنت نے اپنے ہاں جو نماز تراویح پر اتنا زور دیا ہے، وہ صاف اسی منشاء نبوی کی تعمیل ہے، مشقت و راحت، تعب و لذت کی جو خوشگوار اور حکیمانہ آمیزش، شریعتِ اسلامی کی ساری عبادتوں میں ہے،

اس کا ایک نمایاں نمونہ یہ رمضان کے روزے ہیں، دن بھر صبر وضبط کی مشق، کھانے پینے کا انتظار جس سے کھانے پینے کا لطف اور بڑھ کر رہتا ہے، شام کے وقت فرحت وتفریح، پھر شام سے لے کر صبح صادق تک عبادتوں اور مادی لذتوں کا ملا جلا ہوا تسلسل، یہ اسلام ہی کے خصوصیات میں سے ہے۔

مِنَ الْفَجْرِ۔ فجر شرعی سے مراد صبح کاذب نہیں جب کچھ دیر کے لئے اُجالا شمال وجنوب میں معلوم ہوتے لگتا ہے بلکہ وہ نور کا تڑکا مراد ہے جو صبح کاذب کے کچھ دیر بعد ہوتا ہے اور روشنی شرقاً غرباً پھیلنے لگتی ہے۔

قال الجمھور ذالك الفجر المعترض فی الافق یمنۃ ویسرۃ وبھذا جاءت الأخبار ومضت علیہ الأمصار۔ (قرطبی)

فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ طلوع فجر ثانی (صبح صادق) تک رات کا آخری حصہ باقی رہتا ہے اور طلوعِ فجر کے بعد کا وقت دن میں شامل ہوتا ہے۔

وفیھا الدلالۃ علی ان اٰخر اللیل الی طلوع الفجر الثانی ...... فثبت ان اللیل الی طلوع الفجر وان ما بعد طلوعہ فھو من النھار۔ (جصاص)

حدیث میں سحری میں تاخیر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے، صحیح مسلم میں سمرۃ بن جُندب صحابی کی روایت درج ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا ہے کہ بلال رضؓ تو لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لئے بہت سویرے اذان دے دیتے ہیں ان کی اذان سے یا محض شمال وجنوب میں روشنی دیکھ کر سحری نہ ختم کردو بلکہ روشنی کے پھیل جانے کو یعنی وہی شرقی وغربی سپیدی کو معتبر جانو۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یغرنکم من سحورکم اذان بلال ولا بیاض الافق المستطیل ھکذا حتی یستطیر ھکذا (کتاب الصیام باب فضل السحور) روی الائمۃ قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم لا یمنعنکم اذان بلال من سحورکم فانہ یوذن بلیل لیرجع قائمکم ویوقظ نائمکم۔ (ابن العربی)

بلکہ سنن نسائی کی ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرات صحابہ رضؓ بالکل صبح ہو جانے تک سحری سے شغل فرماتے رہتے بس اس کا لحاظ رہتا کہ کہیں آفتاب ہی نہ نکل آئے۔

عن زید قال قلنا لحذیفۃ ای ساعۃ تسحرت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ھو النھار الا ان الشمس لم تطلع۔ (کتاب الصیام، باب السحور)

زید کہتے ہیں کہ ہم نے حذیفہ صحابی سے دریافت کیا آپ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سحری کس وقت تک کھائی ہے؟ انھوں نے کہا کہ صبح تک سوا اس کے کہ آفتاب طلوع نہیں ہوگیا تھا۔

حاصل اس قسم کی روایتوں کا یہ ہے کہ حضرات صحابہ اُس وقت تک سحری کھاتے رہتے کہ شبہ طلوعِ فجر کا ہونے لگتا تھا، کوئی سمجھتا تھا کہ فجر ہو گئی، کوئی سمجھتا تھا کہ نہیں ہوئی۔

انھم تسحروا ولم یتیقنوا طلوع الفجر حتی ان بعضھم ظن طلوعہ وبعضھم لم یتحقق ذالك۔ (ابن کثیر)

محدثین نے سحری میں اتنی تاخیر مستحب بتائی ہے کہ طلوع فجر بالکل قریب آجائے اور حضرت زید بن ثابت رضؓ صحابی کے حوالہ سے یہ روایت بخاری ومسلم سے نقل کی ہے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سحری کھاتے تھے اور اس کے بعد نماز فجر کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے۔

وقد یستحب تاخیرہ الی وقت انفجار الفجر کما جاء فی الصحیحین عن انس بن مالك عن زید بن ثابت قال تسحرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم قمنا الی الصلوۃ۔ (ابن کثیر)

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ

پھر روزہ کو رات (ہونے) تک پورا کرو ۶۸۳ اور بیبیوں سے اس حال میں صحبت نہ کرو جب تم اعتکاف کئے ہو۔

ائمہ سلف کا جن میں اجلۂ صحابہ بھی شامل ہیں اور اجلۂ تابعین بھی، عام دستور سحری میں اتنی تاخیر کا تھا کہ طلوع فجر بالکل قریب آجاتا تھا۔

وقد روی عن طائفة كثيرة من السلف انهم تسامحوا فى السحور عند مقاربة الفجر (ابن کثیر)

اور ابن کثیر نے نام اس سلسلہ میں حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ و ابن مسعودؓ و ابوہریرہؓ و ابن عمرؓ و ابن عباسؓ وغیرہم صحابہ کرام کا، اور محمد باقرؒ اور ابراہیم نخعی اور عطاء اور حسن بصری اور مجاہد وغیرہم تابعین کے گنائے ہیں چنانچہ ایک گروہ کا تو یہ فتویٰ ہے کہ سحری اس وقت تک درست ہے جب تک کہ صبح کی روشنی راستے اور مکانوں پر نہ پھیل جائے۔

قالت طائفة ذالك بعد طلوع الفجر وتبينه فى الطرق والبيوت۔ (قرطبی)

اور حضرت عمرؓ اور حضرت حذیفہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور متعدد تابعین سے یہ منقول ہے کہ کھانے پینے سے احتیاط اس وقت سے واجب ہے جب صبح راستوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر ظاہر ہو جائے

ان الامساك يجب بتبيين الفجر فى الطرق وعلى رؤس الجبال۔ (قرطبی)

حاجت غسل کی حالت میں اگر صبح ہو گئی، اور ہنوز غسل کی نوبت نہیں آئی تو روزہ بلا اختلاف جائز ہوگا۔

وفى تجويز المباشرة الى الصبح دلالة على جواز تاخير الغسل اليه وصحة صوم من اصبح جنبًا (ابوسعود) والجمهور من العلماء على صحة صوم من طلع عليه الفجر وهو جنب (قرطبی) اذا زعجناله الوطى قبل الفجر ففى ذلك دليل على جواز طلوع الفجر عليه وهو جنب وذلك جائز اجماعا (ابن العربی) ومن جعله تعالى الفجر غاية لاباحة الجماع والطعام والشراب لمن اراد الصيام يستدل على من اصبح جنبا فليغتسل وليتم صومه ولا حرج عليه وهذا مذهب الائمة الاربعة وجمهور العلماء سلفا وخلفا لما رواه البخارى ومسلم من حديث عائشة وام سلمة رضى الله تعالى عنهما۔ (ابن کثیر)

۶۸۳ اِلَى الَّيْلِ یعنی جب رات داخل ہونے لگے بس اس وقت روزہ کو تمام کردو۔ یہ مطلب نہیں کہ رات کی تاریکی چھا جانے کے وقت تک روزہ رکھے رہو، روزہ رات آتے ہی ختم ہو جانا چاہئے، یہ نہ ہو کہ رات کا کوئی جزو روزہ میں شامل و داخل ہو جائے۔

الى الليل اى الى دخول الليل (ابن عباس) فجعل الليل غاية الصيام ولم تدخل فيه (جصاص) فانه تعالى ذكره حد الصوم بان آخر وقته اقبال الليل (ابن جرير) كلمة الى لانتهاء الغاية فظاهر الاية ان الصوم ينتهى عند دخول الليل (كبير) الليل ليس من جنس النهار فيكون الليل خارجا عن جنس النهار (كبير) الى غاية فاذا كان ما بعدها من جنس ما قبلها فهو داخل فى حكمه (قرطبی)

اَلَّيْل اور خود لیل کا اطلاق عربی میں کچھ خاتمہ یعنی غروب آفتاب پر معاً ہو جاتا ہے اور اعتبار شرع (والآثار) شرعی کا کیا گیا ہے۔

الليل من مغرب الشمس الى طلوع الفجر الصادق (قاموس۔ تاج) الليل عقب النهار ومبدءه من مغرب الشمس (لسان)

اَتِمُّوا الصِّيَامَ۔ اس کے معنی صاف یہ ہوئے کہ افطار عین غروب آفتاب کے ساتھ ہونا چاہئے، اَتِمُّوا صیغہ امر کا ہے

## فِي الْمَسٰجِدِ

### مسجدوں میں ۶۸۴

اور وجوب کے معنی دیتا ہے۔

یقتضی الافطار عند غروب الشمس حکمًا شرعیًا (ابن کثیر) کما جاء فی الصحیحین عن امیر المومنین عمر بن الخطاب امر یقتضی الوجوب من غیر خلاف ... فشرط تعالٰی تمام الصوم حتی یتبین اللیل کما جوز الاکل حتی یتبین النہار (قرطبی) والامر للاتمام مضافًا للوجوب (بحر) جعل اللیل غایۃ الصیام فلم تدخل فیہ (جصاص)

صوم وصال یعنی بلا افطار کئے دن اور رات کے مسلسل روزہ کی ممانعت بھی اسی آیت سے بہت سے فقہاء نے نکالی ہے اور حدیث میں اس کی ممانعت صراحۃً موجود ہے۔

فیہ ما یقتضی النہی عن الوصال اذ اللیل غایۃ الصیام وقالتہ عائشۃ (قرطبی) تدل الآیۃ علی نفی کون اللیل محل الصوم وان یکون صوم الیومین صومۃ واحدۃ وقد استنبط النبی صلی اللہ علیہ وسلم منہا حرمۃ الوصال (روح) ای الکف عن ہذہ الاشیاء دلیل علی جواز النیۃ بالنہار فی صوم رمضان وعلی جواز تاخیر الغسل الی الفجر وعلی نفی الوصال (مدارک) ولہذا وردت الاحادیث الصحیحۃ النہی عن الوصال (روح)

معصیت کسی قسم اور کسی درجہ کی بھی ہو مسلمان کے لئے ہر زمانہ اور ہر موسم میں حرام ہے لیکن رمضان کے ماہ مبارک میں یہ ممانعت اشد و آکد ہو جاتی ہے روزہ دار کی رات بھی گویا عبادت میں بسر ہوتی ہے اور دن تو خیر اتنی بڑی عبادت یعنی حکم الٰہی کے احترام میں لذائذ نفس و طبیعت سے اجتناب میں بسر ہوتا ہی ہے بدگوئی بدنظری بدزبانی حرام ہمیشہ ہی ہیں، رمضان میں کہنا چاہیئے کہ حرام تر ہو جاتی ہیں پورے مہینہ بھر کے رات اور دن کا ایک ایک حصہ بیادِ اسلام کی روحانی پریڈ کا زمانہ ہے غفلت میں کسی لمحہ نہ ہونا چاہیئے، مسٹر ڈبلو۔ ٹی آرنلڈ مسلمان نہیں، مسیحی ہیں، تاہم جذبۂ انصاف پسندی و حق گوئی سے مجبور ہو کر بے دردیجی معاندین کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"ماہ رمضان کے روزوں کے سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا ہے کہ دین کا یہ رکن بجائے خود اس خیال کی تردید کے لئے کافی ہے کہ اسلام کی ترویج عیش پرستیوں کے جائز کر دینے سے ہوئی ہے کارلائل کے بقول محمدؐ کا مذہب تن آسانی کا مذہب نہیں، سخت سخت روزے، طہارت کے ضابطے، عبادت کے سخت اور پیچیدہ طریقے، دن میں پانچ پانچ مرتبہ نماز، شراب کی حرمت، یہ احکام جس مذہب میں ہوں اس کی مقبولیت تن آسانیوں کا نتیجہ تو نہیں ہو سکتی۔" (پریچنگ آف اسلام ص۲۱۵ طبع ثالث)

ملاحظہ ہو ضمیمہ سورۂ بقرہ کے خاتمہ پر۔

۶۸۴ (بلکہ کسی قسم کا بھی شہوانی میل جول اُن سے نہ رکھو)

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ۔ لفظ مباشرت یہاں وسیع معنی میں ہے یعنی عمل مجامعت کے علاوہ اس کے مقدمات و دواعی، بوس و کنار وغیرہ بھی شامل ہیں۔

انہ اللمس والقبلۃ (ابن العربی) لا یمس المعتکف امرأتہ ولا یباشرہا ولا یتلذذ منہا بشیء قبلۃ ولا غیرہا (ابن جریر عن مالک بن انس) المراد بالمباشرۃ انما ہو الجماع ودواعیہ من تقبیل ومعانقۃ ونحو ذلک (ابن کثیر)

یہ تفسیر حنفیہ و مالکیہ کے مسلک کے مطابق تھی، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ چیزیں اعتکاف میں کراہت پیدا کر دیتی ہیں، اُسے باطل نہیں کرتیں۔

اما ما دون الجماع من المباشرة کالقبلة واللمس بالشهوة فمکروه ولا یفسد به الاعتکاف عند اکثر اهل العلم وهو اظهر قول الشافعی۔ (معالم)

عٰكِفُوْنَ۔ اعتکاف کے لغوی معنی ہیں، اپنے کو کسی شے پر روک رکھنے یا لازم کر لینے کے، اصطلاحِ شریعت میں اس سے مُراد مسجد میں بیٹھ کر اپنے کو عبادت کے لئے مُقیّد کر لینا۔

هو الاحتباس فی المسجد علی سبیل القربة (راغب) اعتکف فی المسجد ای اقام به ولازمه وحبس نفسه فیه (تاج) الاعتکاف فی اللغة الملازمة وهو فی عرف الشرع ملازمة طاعة مخصوصة فی وقت مخصوص علی شرط مخصوص فی موضع مخصوص (قرطبی) العکوف هو الاقامة علی الشیء والاعتکاف فی الشرع هو الاقامة فی المسجد علی عبادة الله۔ (معالم)

معتکف کے لئے لازم ہے کہ ہر وقت مسجد ہی میں رہے سہے، کھائے پیئے، سوئے جاگے، اور بغیر مادّی یا شرعی ضرورتِ شدید کے مسجد سے باہر قدم نہ نکالے۔

یجب ان لا یخرج الا لما لا بدّ منه من حاجة الانسان وقضاء فرض الجمعة (جصّاص) لیس للمعتکف ان یخرج من معتکفه الا لما لا بدّ له منه۔ (قرطبی)

مدّتِ اعتکاف کے زیادہ سے زیادہ ہونے کی کوئی حد نہیں، البتہ اقل مدت امام شافعیؒ کے نزدیک ایک لحظہ بھی ہو سکتی ہے لیکن امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے مسلک میں کم از کم ایک شب و روز ہونا چاہیئے۔

واقل الاعتکاف عند مالك وابی حنیفة یوم ولیلة وقال الشافعی اقله لحظة ولا حدّ لاکثره (قرطبی) هو غیر مقدر عند الشافعی واقله لحظة وقال مالك وابو حنیفة هو مقدر بیوم ولیلة۔ (ابن العربی)

اعتکاف ایک بہت لطیف قسم کا مجاہدہ ہے اس لئے اُمت پر فرض کیا معنیٰ واجب بھی نہیں، صرف ایک اعلیٰ درجہ کی نفل ہے اور اس کے مرتبے کی بلندی اسی سے ظاہر ہے کہ خود رسول اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ازواج و اصحاب جیسی عالی ظرف ہستیوں نے اس پر عمل کیا ہے۔

واجمع العلماء انه لیس بواجب وهو قربة من القرب ونافلة من النوافل عمل بها رسول الله صلی الله علیه وسلم واصحابه وازواجه۔ (قرطبی)

فِی الْمَسٰجِدِ۔ اس سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ اعتکاف ہمیشہ مسجد ہی میں ہونا چاہیئے۔

اجمع العلماء علی ان الاعتکاف لا یکون الا فی المسجد۔ (قرطبی)

البتہ عورتوں کا اعتکاف بجائے مسجد کے گھر کے کسی گوشہ میں بھی ہو سکتا ہے جسے نماز و عبادت کے لئے مخصوص کر لیا جائے، بلکہ مسجد میں عورت کے اعتکاف کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔

اما المرأة فتعتکف فی مسجد بیتها ولو لم یکن لها فی البیت مسجد تجعل موضعا فیه فتعتکف فیه (هدایه) والمرأة تعتکف فی بیتها (شرح وقایه) ویکره فی المسجد ولا یصح فی غیر موضع صلاتها من بیتها۔ (دُرِّ مختار)

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ

یہ اللہ کے ضابطے ہیں سو اُن (سے نکلنے) کے قریب بھی نہ جانا ۶۸۵ اللہ اسی طرح اپنے احکام لوگوں کے لئے

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

کھول کھول کر بیان کرتا ہے ۶۸۶ تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں ۶۸۷

دوسرے دنیوی معاملات مثلاً لوگوں سے بات چیت کرنا حالتِ اعتکاف میں جائز ہیں بشرطیکہ ان میں کوئی بات احترامِ مسجد یا آدابِ اعتکاف کے منافی نہ پیدا ہو جائے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک تھی کہ ماہِ مبارک کے آخری عشرہ میں پورے دس دن کے لئے مسجد میں اعتکاف فرماتے، اور علائق دنیوی سے انقطاع جو یوں بھی کامل رہتا، اس عرصہ کے لئے کامل تر ہو جاتا، اعتکاف مسنون بھی ہے اور اسی کو فقہاء نے سنّتِ کفایہ قرار دیا ہے یعنی بستی بھر میں اگر کوئی بھی کرلے تو پوری بستی کی طرف سے وہ سنّت ادا ہو جائے گی، باقی نفسِ اعتکاف ہر مدت کے لئے، ہر زمانہ میں بہرحال استحباب و فضیلت کی چیز ہے، روحانی قوت و توانائی کا ذخیرہ اپنے اندر بھرنے کے لئے، اپنے کو روحانی و ایمانی اعتبار سے تازہ دم کرنے کے لئے اس سے بہتر اور مؤثر تر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عین اُس زمانہ میں جب کہ بیس دن کی مسلسل طاعت و عبادت اور شب و روز کے ذکرِ الٰہی و فکرِ ایمانی سے روح پر صیقل ہو چکی ہو، ملکوتیت بیدار ہو چکی ہو، انسان اپنے کو ایک عشرہ کے لئے کامل یکسوئی اور انقطاع کے عالم میں لے آئے، اور اخلاص و للّٰہیت کی مشقوں کو دعاؤں سے، عبادتوں سے ذکر و فکر سے انتہائے کمال پر پہونچا دے لیکن یہ بھی خیال رہے کہ ہر کس و ناکس کا ظرف اس مرتبہ کا متحمل نہیں ہو سکتا، عجیب عجیب غیر متوقع صورتیں ابتلاء کی پیش آجاتی ہیں (جیسا کہ ان سطور کے راقم نامۂ سیاہ کو اپنی ذات سے متعلق تلخ و قابلِ لغزش تجربات ہو چکے ہیں) مثلاً یہی کہ کھانا لانے والا آدمی گھر سے کھانا دیر میں لایا، اور معتکف بے اختیار اُس پر غصہ سے برس پڑا تو فقہاء نے کہا ہے کہ ایسی صورت میں اعتکاف نہ کرنا ہی بہتر ہے کہ معصیت شدید عبادت (اعتکاف) کے اسی طرح منافی و ناقض ہے جس طرح نماز و طہارت کی ناقض جسمانی ناپاکیاں (بول و براز) ہیں، اور جو شخص اعتکاف کے حقوق نہ ادا کر سکے اس کے لئے اعتکاف کرنا ہی مکروہ ہے۔

المعتکف اذا اتی کبیرۃ فسد اعتکافہ لان الکبیرۃ ضد العبادۃ کما ان الحدث ضد الطہارۃ والصلوٰۃ

قالہ ابن خویز منداد عن مالک (قرطبی) ویکرہ الدخول فیہ لمن یخاف علیہ العجز عن الوفاء بحقوقہ (قرطبی)

**۶۸۵** بہت ہی برمحل یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ سب ضابطے اور قاعدے خدائے دانا و بینا کے مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ احکام و ہدایات حکیمِ مطلق و حاکمِ برحق ہی کی طرف سے ہیں، انھیں خاطی انسانوں کے قانون قاعدہ پر قیاس کر کے معمولی باتیں نہ سمجھنا۔

تِلْكَ سے اشارہ اُن چھ یا سات احکام کی جانب ہے، جو آیت میں مذکور ہو چکے۔

ای ھذہ الاوامر والنواھی (قرطبی) ای الاحکام الستۃ المذکورۃ (روح)

فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ یعنی ان پابندیوں سے باہر نکلنے کے قریب بھی نہ جانا۔

ای لا تتجاوزوھا ولا تعتدوھا۔ (ابن کثیر)

**۶۸۶** یعنی جس طرح اس نے یہاں روزہ، اس کے حدود و اوقات، اعتکاف اور اس کے متعلقات کے احکام تفصیل سے

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ ۶۸۸ اور نہ اُسے حکام تک پہونچاؤ کہ جس سے

لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۱۸۸ ع ربع

لوگوں کے مال کا ایک حصّہ تم گناہ سے کھا جاؤ، درآں حالیکہ تم جان رہے ہو ۶۸۹

بیان کردیے ہیں، اسی طرح وہ اپنے سارے ہی احکام و شرائع، انسان کے سود و بہبود کے لئے تفصیل سے بیان فرما رہا ہے۔

المراد انه كما تبين ما امركم به ونهاكم عنه فى هذا الموضع كذٰلك يبين سائر ادلته على دينه وشرعه (كبير) اى كما بين الصيام واحكامه وشرائعه وتفاصيله كذٰلك يبين سائر الاحكام على لسان عبده ورسوله۔ (ابن كثير)

اٰيٰتِهٖ۔ آیات سے مُراد احکام یا دلائل شرعی ہیں۔

اى امره ونهيه (ابن عباس) اى اٰيٰته الدالة على بقية مشروعاته (بحر) اى العلامات الهادية الى الحق (قرطبی)

۶۸۷ (ان احکامِ الٰہی پر مطلع ہوکر)

احکامِ الٰہی کی عین تعمیل ہی پرہیزگاری ہے۔

لعلّ سے متعلق اوپر بیان ہوچکا ہے کہ حق تعالٰے کی طرف سے جب اس کا استعمال ہوتا ہے، تو معنیٰ میں شک و تردد نہیں، بلکہ یقین کا مفہوم پیدا ہوجاتا ہے یعنی احکام کی تعمیل تمھیں پرہیزگار بنا ہی دے گی، تجربہ کرلو۔

۶۸۸ (اے اہل ایمان!)

لَاتَاْكُلُوْٓا۔ اکل یہاں لفظی معنیٰ میں نہیں، یعنی صرف کھانا مُراد نہیں، بلکہ کسی طرح اپنے تصرّف میں لے آنا ہے۔

عبر بالاكل عن انفاق المال (راغب) عبر به عن الاخذ والاستيلاء (بحر)

اُردو محاورہ میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں، فلاں صاحب روپیہ کھا گئے، یا ہضم کرگئے۔

بِالْبَاطِلِ۔ باطل سے مُراد ہے ہر ناجائز طریق۔

فاكل المال بالباطل صرفه الى ما ينافيه حق (راغب) اى بالوجه الذى لايبيحه اللّٰه تعالىٰ (بيضاوى) والمراد بالباطل الحرام وكل مالم يأذن باخذه الشرع۔ (روح)

گویا دو مختصر لفظوں میں تقویٰ مالی کی ساری تعلیم آگئی، ہر خیانت سے احتیاط کی تاکید اور ہر قسم کی امانت و دیانت کا حکم، اور فقہاء نے اکلِ باطل کی جو تفصیل لکھی ہے، اسی میں قمار، غصب، حق تلفی وغیرہ کے ساتھ ایک مد یہ بھی بڑھادی ہے کہ وہ مال بھی باطل ہی کے حکم میں آجاتا ہے جو مالا تطيب به نفس مالكه او حرمه الشريعة وان طابت به نفس مالكه۔ (قرطبی)

(اس مال کے مالک سے بغیر اس کی خوشدلی کے حاصل کیا جائے، یا مالک گو اُسے خوشدلی سے دے رہا ہو، لیکن خود شریعت نے اس مد کو ناجائز قرار دیا ہو)

اَمْوَالَكُمْ۔ خطاب تمام مومنین کو ہے، اور حکم کے مخاطب افرادِ اُمّت ہیں۔

الخطاب بهذه الآية يتضمن جميع امة محمد صلى الله عليه وسلم۔ (قرطبی)

اردو میں اموالکم کا صحیح مفہوم "اپنا مال" سے نہیں بلکہ "ایک دوسرے کا مال" سے ظاہر ہوگا جیسے اُقْتُلُوْا اَنْفُسَکُمْ سے مراد "ایک دوسرے کا قتل کرنا" ہے۔

والمعنى لا يأكل بعضكم مال بعض (بحر) والمعنى لا يأكل بعضكم مال بعض بغير حق۔ (قرطبی)

ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس نے ایک کتاب قرآن مجید کے قوانین معاشری پر لکھی ہے، اس میں اس آیت کو نقل کر کے لکھا ہے:۔

"یہ آیت اس امر کی شہادتِ مزید ہے کہ محمدؐ نے اپنے پیروں میں کتنی تاکید باہمی حسنِ معاملت کی رکھی ہے"۔

(سوشل لاز آف دی قرآن، ص ۱۰۸)

بَیْنَکُمْ کے دائرہ کی وسعت میں فقہاء نے ساری نسل آدم کو داخل کیا ہے، اور صرف مسلمانوں کے مال تک حکم کو محدود نہیں رکھا ہے، مسلم ہو یا کافر کسی کا بھی مال دغا، فریب، ظلم وغیرہ سے لینا جائز نہیں، صرف کافر حربی کے مال پر تصرف و تسلط جائز ہے کہ اس سے تو اعلانِ جنگ ہو ہی چکا ہے، لیکن اس سے بھی علی الاطلاق نہیں، بلکہ خاص خاص قیود و شرائط کے ساتھ، رشوت، جعلسازی، خیانت، کافرِ حربی کے معاملات میں بھی درست نہیں۔

**۶۸۹** (کہ تم ناحق اور زیادتی پر ہو)

دنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو اور کوئی حاکم عادل سے عادل سہی، بہرحال دنیوی فیصلے علم غیب کی بنا پر نہیں، روائداد مقدمہ ہی کی بنا پر صادر ہوں گے، اور ان میں غلطی، لغزش، ناانصافی، دھوکے کا احتمال ہر وقت ہے، آیت اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ جو حق ہے وہ عند اللہ حق ہی رہے گا، اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے ہاں ناحق ہی شمار ہوگا، اگرچہ حکام کا فیصلہ اس کے برعکس ہی ہو، قاضی کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے، اصل شے انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود اس کا ضمیر اور تقویٰ ہے، حدیث میں اس مضمون کی صراحت بہت زور کے ساتھ آچکی ہے، اور مفسرین بھی اُسے خوب صاف کر چکے ہیں۔

اعلم ابن آدم ان قضاء القاضي لا يحل لك حراما ولا يحق لك باطلا انما يقضي القاضي بنحو ما يرى ويشهد به الشهود والقاضي بشر يخطي ويصيب (ابن جریر) ومن الاكل بالباطل أن يقضي القاضي لك وانك تعلم انك مبطل فالحرام لا يصير حلالا بقضاء القاضي لانه انما يقضي بالظاهر وهذا اجماع فى الاموال (قرطبی) على القول بهذا الحديث جمهور العلماء وائمة الفقهاء وهو نص فى ان حكم الحاكم على الظاهر لا يغير حكم الباطن (قرطبی) وهذا رسول الله صلى الله عليه وسلم المصطفى للاطلاع على الغيب سترا من الباطن فكيف بغيره من الخلق۔ (ابن العربی)

بلکہ جو لوگ اپنی چرب زبانی سے، سخن سازی سے اپنے "اثر" و "پیری" سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں، انہیں اور زیادہ ڈرنا چاہیے کہ ان پر علاوہ اور دوسرے جرائم اور فریقِ ثانی کی حق تلفی کے ایک مزید جرم حاکمِ عدالت کو فریب میں مبتلا کرنے کا بھی عائد ہوگا۔

تُدْلُوْا بِهَا۔ ھا کی ضمیر اموال کی طرف ہے۔ الهاء ترجع الى الاموال (قرطبی) والضمير المجرور للاموال (روح)

بِ فعل اِدْلَاء کا صلہ ہے تُدْلُوْا۔ اِدلاء کے معنی کنوئیں میں ڈول ڈالنے، اور پھر مجازاً کسی چیز کو کہیں پہونچانے یا اُسے ذریعہ یا وسیلہ بنانے کے ہیں۔

ادليتها اى اخرجتها وقيل يكون بمعنى ارسلتها واستعير للتوصل الى الشيء (راغب) واصل الادلا

# يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ

## آپ سے (لوگ) نئے چاند کے باب میں دریافت کرتے ہیں ۶۹ ؎

ارسال الرجل الدلو فی سبب متعلقا به۔ (ابن جریر)

مطلب یہ ہوا کہ مال کو حکام تک پہونچنے کا، اپنی رسائی اور رسوخ پیدا کرنے کا ذریعہ نہ بناؤ اور رشوت وغیرہ مالی تحفہ و تحائف سے حکام پر اثر نہ ڈالو۔

ای لا ترشوھا الیھم (کبیر) ای تلقوا بعضھا الی حکام السوء علی وجه الرشوۃ (مدارک)

اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سارے قانون دیوانی و فوجداری کا نافذ ہونا تو خیر بڑی چیز ہے قرآن مجید کی صرف اسی آیت پر اگر آج عملدرآمد ہوجائے تو جھوٹے دعووں جعلی کاغذات جھوٹی گواہیوں جھوٹے حلف ناموں اہلکاروں و عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام کی خدمت میں نذر نذرانوں قیمتی ڈالیوں شاندار دعوتوں کا وجود کہیں باقی رہ جائے بِالْاِثْمِ گناہ کا لفظ عام ہے ہر قسم کی معصیتیں جو عدالتی کارروائیوں اور انتظامی معاملت کے سلسلہ میں کام میں لائی جاتی ہیں، اس کے تحت میں آجاتی ہیں۔

معناہ بالظلم والتعدی (قرطبی) بشھادۃ الزور او بالأیمان الکاذبۃ او بالصلح مع العلم بان المقضی له ظالم۔ (مدارک)

فَرِيْقًا۔ فریق کے معنی یہاں پارٹی یا گروہ کے نہیں، بلکہ حصہ یا جزو کے ہیں۔

ای قطعة وجزء (قرطبی) قطعة وجملة (روح)

۶۹ ؎ (اے پیغمبر!) ان کے گھٹنے بڑھنے کی غایت کیا ہے؟

اَلْاَهِلَّةِ۔ نیا چاند یا ہلال تو ایک وقت میں ایک ہی ہوتا ہے، لیکن یہاں سوال اھلۃ (بصیغۂ جمع) سے متعلق ہے سوال عَنِ الْاَهِلَّةِ کے معنی یہی ہوئے چاند کے مہینوں کے بابت دریافت کرنا یعنی پہلے چاند کا طلوع ہونا پھر تاریخ وار اس کا بڑھنا، اور پھر تاریخ وار اس کا گھٹنا، یہاں تک کہ اس کا غائب ہوجانا۔

یرید بالأھلۃ شھورھا قد یعبر بالھلال عن الشھر لحلوله فیه (قرطبی) ای عن زیادۃ الاھلۃ ونقصانھا لماذا (ابن عباسؓ) سئل رسول اللہ عن زیادۃ الاھلۃ ونقصانھا واختلاف احوالھا (ابن جریر)

ھِلَال۔ اردو محاورہ میں تو صرف پہلی تاریخ کے چاند کو کہتے ہیں، لیکن عربی میں اس کے مفہوم میں پہلی سے لے کر تیسری تاریخ تک کے چاند شامل رہتے ہیں۔

الھلال اول لیلة والثانیة والثالثة (صحاح) وھو القمر فی لیلتین او ثلاث من اول الشھر علی الاشھر (المنار)

چاند کے روزانہ (بلکہ شبانہ) تغیرات مشاہدہ کی چیزیں ہیں، اس لئے سوال بھی ان کی بابت آسانی سے دلوں میں پیدا ہوتا ہے آفتاب کے تغیرات عام نظروں کے لئے غیر مشاہد رہتے ہیں۔

وقد کانوا سألوہ عن علة نهلله وتغیرہ (راغب)

قرآن کا ایک ایک فقرہ توحید کے اعلان اور شرک کی تردید میں ہے دنیا میں مشرک قومیں کثرت سے قمر پرستی میں مبتلا رہی ہیں، اور بعض ہلال پرستی میں بھی نئے چاند کو دیوتا مان کر اس کی پوجا کثرت سے کی گئی ہے اور بڑھتے چاند کو

قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا

آپ کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے شناختِ اوقات ہیں ۶۹۱ اور یہ تو (کوئی بھی) نیکی نہیں کہ تم گھروں میں

الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ

اُن کی پُشت کی طرف سے آؤ ۶۹۲ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے ۶۹۳

مبارک اور اُترتے چاند کو منحوس سمجھنے کا رواج تو آج خدا معلوم کتنے مسلمان گھرانوں میں موجود ہے اور ہندوستان میں چھپی ہوئی جس جنتری کو چاہئے آج اٹھا کر دیکھ لیجئے، اس کے کتنے خانے اس سے بھرے نظر آئیں گے کہ فلاں تاریخ فلاں کام کے لئے سعد ہے اور فلاں تاریخ نحس، قرآن مجید نے عروج و زوالِ قمر کی یہ غایت بتا کر کہ وہ انسان کے کام آنے والی چیزیں ہیں هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ ہلال پرستی اور اس کے ماتحت سارے خرافات کی جڑ ہی کاٹ دی!

احمق انسان! تو چاند کی کیا پوجا کر رہا ہے، چاند تو خود تیری خدمت کے لئے ہے!

۶۹۱ مَوَاقِيتُ جمع ہے میقات کی اور اس کے معنی وقت کے بھی ہیں اور منتہائے وقت کے بھی اور وقتِ موعود و متعین کے بھی۔

جمع المیقات وھو الوقت وقیل المیقات منتھی الوقت (قرطبی) الوقت المضروب للشیٔ۔ (راغب)

مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ۔ یعنی ان کے معاملات دنیوی اور حساباتِ شرعی میں بھی، سنہ قمری میں، دنوں تاریخوں مہینوں کا حساب چاند کے عروج و زوال سے ہوتے رہنا ظاہر ہی ہے، مفسر تھانویؒ نے یہاں سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ جب اعمالِ شرعی کا مدار حسابِ قمری پر ٹھہرا تو اس حسابِ قمری کا اہتمام و انضباط بھی فرض کفایہ ہوا، جنھیں انگریزی سنہ سے کاروبار رکھنا ضرورت کے درجہ میں آپڑا ہے، ان کے لئے تو خیر عذر بھی ہے، لیکن بلا ضرورت سنہ ہجری قمری اسلامی کو چھوڑ کر سنہ شمسی مسیحی انگریزی اختیار کر لینا واقعی بڑے افسوس کی بات ہے۔

وَالْحَجِّ۔ قمری مہینے عام مواقیتِ انسانی کا تو کام دیتے ہی ہیں، اور ان کے علاوہ حج اور دوسری طاعتوں اور عبادتوں کے لئے بھی معیار و مدار وہی ہیں، حج کا ذکر تخصیص کے ساتھ شاید اس لئے فرمایا گیا ہو کہ اس کی اہمیت عرب کے ہر شعبۂ زندگی میں بہت نمایاں تھی۔

۶۹۲ (جیسا کہ مشرکین عرب اپنی سفاہت سے سمجھ رہے ہیں)

جاہلی عرب جب احرامِ حج کی حالت میں ہوتے تو گھر میں جانے کے لئے دروازہ سے داخل ہونے کو نحوست اور بدشگونی سمجھتے، بلکہ پُشت کی دیوار میں ایک بڑا سا روزن پیدا کر دیتے، اور اس کے اندر سے مکان میں داخل ہوتے، یا پیچھے کی طرف سے چھت پر چڑھ جاتے، اور اس سے اندر پھاندتے، اور اسے اپنے نزدیک کوئی بڑی عبادت اور خانۂ کعبہ کی تعظیم سمجھتے۔

کانوا اذا احرموا فی الجاھلیۃ اتوا البیت من ظھرھا (بخاری) کانوا اذا حجوا المرید خلوا بیوتھم من ابوابھا بل کانوا ینقبون فی ادبارھا (ابن جریر) اذا احرم الرجل منھم نقب کوۃ فی ظھر بیتہ فجعل سلما فجعل یدخل منھا۔ (ابن جریر)

بعض قبیلوں کے نو مسلم صحابی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، انھیں کے اصلاحِ خیال کے لئے آیت نازل ہوئی، اور عقیدۂ جاہلی کی تصحیح کی گئی۔!

وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱۸۹)

اور گھروں میں ان کے دروازوں ہی سے آؤ ۶۹۴ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کئے رہو، تا آنکہ فلاح پا جاؤ ۶۹۵

نزلت فی نفر من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم کنانۃ وخزاعۃ کانوا ین خلون بیوتہم فی الاحرام من خلفہا او من سطحہا کما فعلوا فی الجاہلیۃ۔ (ابن عباسؓ)

مفسر قرطبیؒ نے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ انصار مدینہ جب حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتے تھے تو اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا تقویٰ اور آدابِ احرام کے خلاف سمجھتے تھے اور واپسی پر اپنے مکان میں دروازوں سے نہیں داخل ہوتے تھے۔

وکان الانصار اذا حجوا وعادوا لاید خلون من ابواب بیوتہم...... فکانوا یرون ھذا من النسک والبر۔ (قرطبی)

یہ رسم چونکہ حج ہی کے سلسلہ میں تھی، اس لئے اس کا ذکر بھی حج ہی کے متصل فرمایا گیا۔

۶۹۳ (اور تقویٰ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی منع کی ہوئی اور حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے ڈرا جائے بچا جائے)

ای مخافۃ وتجنّب محارمہ واطاعۃ باداء فرائضہ التی امرہ بہا۔ (ابن جریر)

ضمناً یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ اصل نیکی تقویٰ الٰہی ہے، یعنی احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کا خوف، نہ کہ اپنے کسی گڑھے ہوئے دستور و رواج کا اتباع۔

البرّ یہاں بارّ کے معنی میں ہے۔

البرّ ھنا فی موضع البارّ۔ (مجاز)

۶۹۴ (جب آنا چاہو، اور گویا رسومِ شرک و جاہلیت کو پامال کرتے ہوئے)

آیت سے فقہاءِ امت کو ایک بڑی اصل ہاتھ آگئی ہے جس سے صدہا ہزارہا اعمال کا حکم معلوم ہو سکتا ہے، وہ اصل یا قاعدہ یہ ہے کہ جو شے شریعت میں صرف مباح ہو یعنی کتاب و سنّت میں اس کی کوئی نظیر یا مثال طاعت یا عبادت کے حکم میں نہ ملے اسے اپنے دل سے طاعت و عبادت ٹھہرا لینا، یا اسی طرح اسے بلا دلیلِ شرعی معصیت و محلِ ملامت یقین کر لینا، یہ دونوں اعتقاد گناہ ہیں، اور ہر بدعت اسی حکم میں داخل ہے۔

ھٰذا دلیل علی مسئلۃ من الفقہ وھی ان الفعل بنیۃ العبادۃ لایکون الا فی المندوبات خاصۃ دون المباح ودون المنھی عنہ وھذا اصل حسن (ابن العربی) فی ھٰذہ الآیۃ بیان ان ما لم یشرعہ اللّٰہ قربۃً ولا ندب الیہ لا یصیر قربۃ بان یتقرب بہ متقرب (قرطبی) قال ابن خویزمنداد اذا اشکل ما ھو بر وقربۃ مما لیس ھو بر وقربۃ ان ینظر فی ذالک العمل فان کان لہ نظیر فی الفرائض والسنن فیجوز ان یکون وان لم یکن فلیس ببر ولا قربۃ۔ (قرطبی)

قرطبیؒ نے ابن عباسؓ کی سند سے حدیثِ نبوی بھی نقل کی ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑا ہے، دریافت فرمایا، معلوم ہوا کہ وہ ابو اسرائیل انصاری ہیں، اور اس کی نذر مانے ہوئے ہیں کہ روزہ رکھ کر بیٹھیں گے نہیں، کھڑے ہی رہیں گے، اور سایہ میں نہ کھڑے ہوں گے، اور کسی سے بات چیت نہ کریں گے، خاموش رہیں گے، آپ نے فرمایا کہ:۔

مروہ فلیتکلم ویتنظل انھیں وہاں سے ہٹا لاؤ، یہ بات چیت کریں اور

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ط

اور اللہ کی راہ میں لڑو اُن لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں ۶۹۶ اور حد سے باہر مت نکلو۔

ولیقعد ولیتم صومہ — سایہ میں رہیں اور بیٹھ بھی جائیں اور اس حال میں روزہ تمام کریں۔

اسلام نام صرف امتثالِ امر کا ہے اور ایمان کی حقیقت فقط تعمیلِ احکام کی ہے خود رائی اس راہ میں سر تا سر کج رائی ہے۔

۶۹۵ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

تقویٰ (خوفِ خدا) اور فلاح (انتہائی کامیابی) کے قریب ترین تعلق کو آیت ایک بار پھر واضح کرتی ہے اور اس حقیقت کو ذہن میں تازہ کرتی ہے کہ فلاحِ دارین کا اصل اصول تقویٰ ہے خشیتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی کے درمیان نسبت تضاد، تخالف بلکہ تباین کی بھی بالکل نہیں، بلکہ علاقہ توافق و مناسبت کا ہے، مخلوقات میں جس کسی چیز سے خوف کیا جاتا ہے اس میں خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے بھگاتی ہے، ہٹاتی ہے، دُور کرتی ہے لیکن خشیتِ الٰہی میں تو اس کے برعکس ایک کشش ہوتی ہے وہ اللہ کی طرف لاتی ہے کھینچتی ہے، بلاتی ہے، اللہ سے قریب تر کرتی ہے، اور اس طرح عملاً محبتِ الٰہی کے مرادف ہے اہلِ تقویٰ اور صالحین سے جس خوف کی نفی کی گئی ہے، وہ "دہشت" کے مرادف ہے اور وہ "وحشت" سے پیدا ہوتا ہے خشیتِ الٰہی اس کے ٹھیک برعکس، احساسِ عظمت سے پیدا ہوتی ہے، اور وہ ربِّ عظیم و معظم سے قریب تر لانے والی ہوتی ہے۔

خوفِ خدا کی ترغیب اور خشیتِ الٰہی کی تاکید سے قدیم صحیفے بھی لبریز ہیں۔ مثلاً:۔

"خداوند کا خوف دانش کی ابتداء ہے" (امثال سلیمانی۔ ۱:۷) "خداوند کا خوف دانائی کا شروع ہے" (امثال سلیمانی۔ ۹:۱۰) "خدا سے ڈر اور اُس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرضِ کلی یہی ہے" (وعظ کی کتاب۔ ۱۲:۱۳)

۶۹۶ قَاتِلُوا۔ قتال کا یہ حکم اُن مظلوم مسلمانوں کو مل رہا ہے جو دو چار مہینے نہیں پورے تیرہ ۱۳ برس مکہ میں ہر طرح کے شدائد پر اور شدائد کیسے، یہ کہئے شقاوت، سفاکی، بہیمیت پر، صبر کے امتحان میں پورے اُتر چکے تھے، اور اب وطن سے بے وطن ہو کر، گھر بار چھوڑنے پر بھی، مدینہ میں چین سے نہیں بیٹھنے پاتے تھے اللہ تربت ٹھنڈی رکھے لارڈ ہیڈلے انگریزی نو مسلم کو کیا بات پتہ کی کہہ گیا ہے کہ تین ابتدائی اسلامی غزوات کے جغرافی محل وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کرو کہ لڑائی کی ابتدا کس نے کی، اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا؟ حملہ اور جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا اور حفاظتِ خود اختیاری و مدافعت میں کون لڑ رہا تھا؟ مکہ کے جنگجو اہلِ فساد یا مدینہ کے صابر و شاکر مومنین؟

(۱) غزوۂ بدر۔ بدر مدینہ سے ۳۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔

(۲) غزوۂ اُحد۔ اُحد تو مدینہ سے کل ۲ ۱/۲ ہی میل ہے۔

(۳) غزوۃ الاحزاب۔ یا جنگ خندق، اس میں محاصرہ تو خاص مدینہ ہی کا ہوا۔

غرض ہر دفعہ قریشِ مکہ یا اُن کے حلیف و مددگار ہی مدینہ چڑھ کر آئے۔

مفسرین کا بیان ہے کہ یہ سب سے پہلی آیت ہے جو سلسلۂ قتال میں نازل ہوئی ہے ورنہ اس سے پہلے جہاد ممنوع تھا۔

هذه الآية اول اية نزلت فى الامر بالقتال۔ (قرطبی)

ورنہ ہجرت کے قبل قتال ممنوع تھا، بلکہ آیتیں اس کے روک تھام کی نازل ہوتی رہتی تھیں۔

ولا خلاف فی ان القتال کان محظورا قبل الہجرۃ (قرطبی) لم تختلف الامۃ ان القتال کان محظورا قبل الہجرۃ (جصاص)

اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ۔ خود یہ لفظ کیا بتا رہے ہیں؟ دو باتیں بالکل صاف ہوئی جاتی ہیں (۱) ایک یہ کہ جنگ کی ابتدا کرنے والے مسلمان نہ تھے ابتداء دوسرا فریق ہی کر رہا تھا۔

ای الذین یبدؤنکم بالقتال (ابن عباس) ای یناجزونکم القتال دون المحاجزین (معالم) ای یحل لکم القتال ان قاتلکم الکفار۔ (قرطبی)

(۲) دوسرے یہ کہ قتال کا حکم صرف انہی افراد کے مقابلہ میں ہے جو واقعی لڑ رہے ہوں یا آج کل کی اصطلاح میں صرف مصافیوں (COMBATANTS) کے مقابلہ میں غیر مصافی (NON-COMBATANTS) آبادی کے سر پر بم برسا دینے، پُر امن شہریوں پر ہوائی تاخت کرنے اور ان پر زہریلی گیسیں چھوڑنے کے "مہذب ترین" آئین حرب سے اسلام کا قانون جنگ نا آشنا ہے۔ بوڑھوں بچوں عورتوں اپاہجوں بیماروں گوشہ نشینوں غرض ایسے کل لوگ جو جنگ سے معذور ہوں انھیں رسول کے خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تو صراحت کے ساتھ مستثنیٰ قرار دیا ہے لیکن خود یہ آیت بھی اس استثنا کی جانب صاف مشیر ہے۔

لا تقتلوا النساء ولا الصبیان ولا الشیخ الکبیر ولا من القی الیکم السلم وکف یدہ (ابن عباس) ای لا تقاتلوا من لا یقاتلکم یعنی النساء والصبیان والرھبان (ابن جریر عن عمر بن عبد العزیز) عن ابن عمر قال وجدت امرأۃ فی بعض مغازی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مقتولۃ فانکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قتل النساء والصبیان۔ (بخاری ومسلم) کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا بعث جیشا قال اغزوا بسم اللہ وفی سبیل اللہ .... ولا تقتلوا امرأۃ ولا ولیدا ولا شیخا کبیرا (معالم عن بریدہ) والقتال لا یکون فی النساء ولا فی الصبیان ومن اشبھھم کالرھبان والزمنی والشیوخ والاجراء فلا یقتلون (قرطبی) والمراد بہ من لم یکن من اھل القتال فی الاغلب لضعفہ وعجزہ لان ذلک حال النساء والذریۃ وقد روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی آثار شائعۃ النھی عن قتل النساء والولدان وروی عنہ ایضا النھی عن قتل اصحاب الصوامع (جصاص)

امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اصل حکم میں تو پھل دار درخت کو کاٹنے تک کی ممانعت ہے آپ نے یہ حکم خلافتِ اسلامیہ کے پہلے سپہ سالار فوج (کمانڈر انچیف) یزید بن ابی سفیانؓ کو دیا تھا، اور ان کی مشایعت آپ نے پاپیادہ چل کر کی تھی۔ اس حکم نامہ کے الفاظ یہ نقل ہوئے ہیں:۔

انی موصیک بعشر لا تقتلن امرأۃ ولا صبیا ولا کبیرا ھرما ولا تقطعن شجرا مثمرا ولا تخربن عامرا ولا تعقرن شاۃ ولا بعیرا الا لماکلۃ ولا تحرقن نخلا ولا تغرقنہ (طبقات ابن سعد۔ قرطبی)

لیکن اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ سے یہ بھی مراد نہیں کہ جب دشمن واقعۃً سر پر آجائے اور لڑائی شروع کر دے جبھی تم قتال کرو، اتنے انتظار اور توقف کے یہ معنی ہوں گے کہ آدھی جیت اُن کی ہو گئی، جیسا کہ اس زمانہ کی لڑائیوں میں برابر مشاہدہ بھی ہو رہا ہے، بلکہ غنیم کا ارادہ اور آمادگی ہی اُسے اس حکم کے تحت میں لے آنے کے لئے کافی ہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ یہ قید کتنی اہم اور دنیا کی تاریخ محاربات میں کیسی انقلاب انگیز ہے! دنیا میں لڑائیاں ہمیشہ لڑی گئیں، اب بھی لڑی جا رہی ہیں، آئندہ بھی لڑی جائیں گی، لیکن کاہے کے لئے؟ زر کے لئے، یا زن کے لئے، یا زمین کے لئے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ "قوم" اور "وطن" کے لئے! یعنی زر و زمین کی طلب فرد کے لئے نہیں بلکہ

## اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (۱۹۰)

کہ اللہ حد سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ ۶۹۷

قوم کے لئے رہ جائے، یہ خصوصیت صرف اسلامی جہاد "بدنام و رسوا" اسلامی جہاد کی ہے کہ جب کبھی اور جن حالات میں شروع ہو، اللہ کی راہ میں ہو، شرک کو مٹانے اور توحید کو بلند کرنے کے لئے ہو، دین حق کی حمایت و نصرت میں ہو، انسانی حکومت مٹا کر خدائی حکومت قائم کرنے کے لئے ہو، خودی کے لئے نہیں خدا کے لئے ہو، نفس کے لئے قبیلہ کے لئے "حلقۂ اثر" کی توسیع کے لئے "آزادیٔ تجارت" کے لئے "آزادیٔ سمندر" کے لئے "نوآبادیوں کے تحفظ" کے لئے "برآمد کی منڈیاں" پیدا کرنے کے لئے، غرض نئی اور پرانی کسی قسم کی بھی عصبیتِ جاہلی کے جھنڈے کے نیچے نہ ہو، صاف صاف فی سبیل اللہ ہو، اور فی سبیل اللہ کے معنی ہیں لاعزاز دین اللہ۔

الجهاد لاعلاء كلمة الله واعزاز الدين (مدارك) اى جاهد والاعلاء كلمته واعزاز دينه (بيضاوى) يعنى دينا واظهار اللكلمة (قرطبى) اى فى طاعته وطلب رضوانه۔ (كبير)

قتال، دوسری امتوں سے نرالا کچھ امتِ محمدی کے ساتھ مخصوص نہیں، بائبل میں اس کا ذکر ایک دو جگہ نہیں، بیسیوں جگہ موجود ہے، اور محارباتِ یہود سے تو تاریخ کے دفتر کے دفتر رنگین ہیں، رہیں مسیحی قومیں اور ان کی خونریزیاں اور خوں آشامیاں، تو ان کی نظیر تو دنیا کے پردہ پر کہیں نہ ملے گی، عیاں را چہ بیاں! اور عملاً جو نمایاں فرق اسلامی فاتحین کی رحمدلی اور مسیحی فاتحین کی سنگدلی کے درمیان رہا ہے، اس کا اعتراف تو خود مسیحی اہلِ قلم کو ہے، مثال کے لئے ملاحظہ ہو:

FINLAYS' GREECE UNDER THE ROMANS ص ۳۵۳ نیز

BOSWORTH SMITH'S MOHAMMED & MOHAMMEDANISM ص ۲۱۷ و ص ۲۱۸

امام رازیؒ نے فرمایا کہ آیت ماقبل میں ابھی ابھی تقویٰ کی تاکید آچکی ہے، اب اسی مناسبت سے ذکر تقویٰ کی شدید ترین اور نفس کے لئے دشوار ترین قسم یعنی قتال و جہاد کا شروع ہوا ہے۔

لما امرها لتقوى امر فى هذه الأية باشد اقسام التقوى واشقها على النفس (كبير)

۶۹۷ وَلَا تَعْتَدُوْا۔ اِعْتِدَاء۔ کے لغوی معنی حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں، مجاوزة الحق، اور اس تجاوز کی متعدد صورتیں ممکن ہیں، حد سے مراد حدِ شریعت بھی ہو سکتی ہے، مثلاً یہ کہ انتقام کے جوش یا فتحمندی کے زور میں بے تحاشا غنیم کے مصافی و غیر مصافی سب کو قتل کرنا شروع کر دیا جائے، ان کے کھیتوں، باغوں، چراگاہوں میں آگ لگا دی جائے، ان کے بے زبان جانور تلوار کے گھاٹ اتار دیے جانے لگیں، وقس علیٰ ہذا، قرآن نے دنیا کو یہ سبق دیا کہ قوت کا استعمال صرف اسی حد تک جائز ہے جس حد تک ناگزیر ہے، حد سے مراد حدِ معاہدہ بھی ہو سکتی ہے، مثلاً یہ کہ بدعہد و پیماں شکن قوموں کی دیکھا دیکھی خود بھی معاہدوں کی پروا نہ کی جائے، اور عہد شکنی کی ابتدا اپنی طرف سے کر کے ہلّہ بول دیا جائے، اسی طرح اور بھی پہلو تجاوزِ حدود کے نکل سکتے ہیں، حق یہ ہے کہ اعتداء کا لفظ زیادتی کے ہر پہلو کو جامع ہے اور ہر قسم کی زیادتیوں کی ممانعت اس سے نکل آئی۔

اى لا تعتدوا بابتداء القتال او بقتال المعاهد او المفاجاة به من غير دعوة او المثلة وقتل من نهيتم عن قتله (بيضاوى) اى لا تعتدوا والوجه من الوجوه ويؤيد بان الفعل المنفى يفيد العموم۔ (روح)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ

اور اُنھیں جہاں کہیں پاؤ قتل کرو اور جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا ہے تم انھیں نکالو ٦٩٨

اللہ اللہ! ہر قسم کی زیادتی سے ممانعت کی تاکید عین اُس وقت کے لئے ہو رہی ہے، جب دل جوشِ انتقام سے بھرے بڑے ہوتے ہیں، اور جب غنیم کے ہر ظلم و زیادتی کا جواب جی یہی چاہتا ہے کہ بھرپور انتقام سے دیا جائے! اس تعلیم کو آج کی "ترقی یافتہ" دنیا دیکھے، جو (REPRISALS) کا نام لے کر ہر سنگدلی، ہر بربریت، ہر درندگی، ہر جلّادی روا رکھے ہوئے ہے۔ اور اعتداء اور تجاوز کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ قتال علاوہ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ کے کسی اور غرض کے لئے شروع کردیا جائے، چنانچہ بعض دقیق النظر مفسرین نے یہ پہلو بھی لیا ہے:-

ای لاتقاتلوا علی غیرالدین (ابن العربی) المعنی لاتعتدوا فی القتال لغیر وجه اللہ، کالحمیة وکسب الذکر...... وقیل لاتعتدوا" ای لاتقاتلوا من لم یقاتل۔ (قرطبی)

غلبہ و اقتدار کے وقت انتقام کے حدود کے اندر رہنا اخلاق کے مرتبۂ اعلیٰ کا مقام ہے، اچھے اچھوں کی عقل، متانت اور قوتِ عدل و توازن اس وقت جواب دے دیتی ہے، اور کل کے مظلوم بے ساختہ اور شاید بے شعوری کے عالم میں آج کے ظالم بن جاتے ہیں، قرآن مجید کا اس موقع پر اپنے پیروؤں کو ضبط و احتیاط کی تلقین کرنا، افرادِ اُمت کو حکمت و اخلاقِ فاضلہ کے بلند سے بلند مقام تک پہونچا دیتا ہے، اور پھر جب یاد کرلیا جائے کہ آیت کا موقعِ نزول ذی قعدہ ٧ھ ہجری ہے، جب معاہدۂ حُدیبیہ کے دوسرے سال مسلمان عُمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہورہے تھے، اور اندیشہ تھا کہ مشرکین معاہدہ کو توڑ کر جنگ شروع کردیں گے، اور اس کے جواب میں قدرۃً مسلمان بھی اشتعال سے لبریز ہوجائیں گے، تو آیت کے اس تاکیدی اور امتناعی حکم کی قدر و منزلت کس درجہ اور بڑھ جاتی ہے! پھر فتحمندی کی گھڑیوں میں ایسی ہدایت پر عمل دنیا کی کسی قوم نے آج تک کیا ہے، بجز رسول کے صحابیوں اور خلافتِ اسلامیہ کے سپاہیوں کے؟ سوال عقیدت کا نہیں، محض تاریخ کا ہے۔

٦٩٨ وَاقْتُلُوْهُمْ میں هُمْ کی ضمیر انھیں لوگوں کی طرف ہے جو مسلمانوں سے لڑنے نکلے ہیں۔

والضمیر عائد الی الذین أمر بقتلهم فی الأیة الاولی۔ (کبیر)

حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ یعنی ان مقاتلین محاربین کو جہاں کہیں بھی پکڑ پاؤ، اور جب کبھی اُن پر غلبہ حاصل کرپاؤ قتل کردو۔

هم الکفار من اهل مکة فامر اللہ تعالٰی بقتلهم حیث کانوا فی الحل والحرم وفی الشهر الحرام (کبیر) ای حیث وجدتموهم من حل او حرم (ابو سعود)

وَاقْتُلُوْا کے صیغۂ جمع سے فقہاء حنفیہ نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ قتال و جہاد فریضۂ انفرادی نہیں ہے، امام کی معیت میں ہے، لشکر کا وجود وجوب بہ طور عبارۃ النص کے نکلا اور امام کا بطور اقتضاء النص کے کہ لشکر کا انتظام و اجتماع بغیر ایک امام کے ممکن نہیں۔

مِنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ یعنی سرزمینِ مکہ سے مِنْ حَيْثُ کے معنی "جہاں سے" کے علاوہ "جس طرح" کے بھی ہیں۔

وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوۡهُمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ

اور فتنہ تو قتل سے (بھی) سخت تر ہے ۶۹۹ اور اُن سے مسجد حرام کے قریب قتال نہ کرو،

الۡحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوۡكُمۡ فِيۡهِ ۚ فَاِنۡ قٰتَلُوۡكُمۡ فَاقۡتُلُوۡهُمۡ ؕ

جب تک وہ (خود) تم سے قتال نہ کریں ۷۰۰ ہاں اگر وہ (خود) تم سے قتال کریں تو تم بھی انھیں قتل کرو

وَاقۡتُلُوۡهُمۡ وَاَخۡرِجُوۡهُمۡ۔ مراد یہ ہے کہ سرزمین مکہ سے انھیں چاہے مارو، چاہے نکالو، جو بھی تمھیں اپنی قدرت و مصلحت کے مطابق نظر آئے۔

والمراد افعلوا کل ما تیسر لکم من ھٰذین الامرین فی حق المشرکین۔ (روح)

۶۹۹ (اپنی مضرتوں اور مفسدوں کے لحاظ سے)

مفسر تھانویؒ نے خوب لکھا ہے کہ مشرکوں کی شرارت جسے یہاں فتنہ سے تعبیر کیا گیا ہے، وہی تو اصل جڑ تھی، اور اخراج و قتل وغیرہ اس کی سزائیں تو محض فروع ہوئیں۔

اَلۡفِتۡنَةُ۔ فتنہ سے مراد شرک یا اس کی ترغیب و تحریص اور اہل توحید کی تخویف ہے۔

الفتنة، الشرک باللّٰہ وعبادة الاوثان (ابن عباس) اقدام الکفار علی الکفر وعلی تخویف المؤمنین (کبیر) روی عن جماعة من السلف ان المراد بالفتنة ھٰھنا الکفر وقیل انھم کانوا یفتنون المؤمنین التعذیب ویکرھونھم علی الکفر۔ (جصاص)

کفر و ترغیب کفر کو فتنہ سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ نظام کفر آخر دنیا کو فتنہ و فساد، کشت و خون، غدر و بدامنی ہی کی طرف لے جاتا ہے۔

انما سمی الکفر بالفتنة لانه فساد فی الارض یؤدی الی الظلم والھرج وفیه الفتنة (کبیر)

اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ۔ یعنی حرم میں قتل و خون سے بھی شناعت میں کہیں بڑھا ہوا درجہ اس مرکز توحید و ایمان میں شرک و اشاعتِ شرک و تبلیغِ شرک کا ہے۔

اشد من القتل فی الحرم (ابن عباس) ای شرکھم باللّٰہ اعظم من القتل الذی یحل بھم منکم (مدارک) یجوز ان یراد فتنتھم ایاکم بصدکم عن المسجد الحرام اشد من قتلکم ایاھم فی الحرم (کشاف)

یعنی کفرھم وتعذیبھم المؤمنین فی البلد الحرام فی الشھر الحرام اشد واعظم اثما من القتل فی الشھر الحرام۔ (جصاص)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مکہ والوں کی یہ مسلسل و غیر منقطع تعدیاں اور مظالم قتل سے بھی کہیں زیادہ سخت و ناقابل برداشت ہیں، اور بعض قدیم اکابر کی نظر بھی اسی پہلو کی طرف گئی ہے۔

ای المحنة التی یفتتن بھا الانسان کالاخراج من الوطن اصعب من القتل لدوام تعبھا وبقاء تألم النفس بھا (بیضاوی) ای المحنة والبلاء الذی ینزل بالانسان یتعذب به اشد علیه من القتل (کشاف) الاخراج من الوطن لما فیه من مفارقة المألوف والاحباب وتنغیص العیش دائما۔ (بحر)

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

یہی سزا ہے کافروں کی ۶۰۱ پھر اگر وہ باز آجائیں ۶۰۲ تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے ۶۰۳

ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد وہ ابدی عذابِ اُخروی ہے جو انھیں کفر کی سزا میں ملے گا گویا ارشاد یہ ہے کہ وہ دائمی عذابِ دنیا کی سزائے قتل سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور عذاب پر اس معنی میں فتنہ کا اطلاق جائز ہے

المراد من الفتنة العذاب الدائم الذی یلزمهم بسبب کفرهم (کبیر) واطلاق اسم الفتنة علی العذاب جائز وذلک من باب اطلاق اسم السبب علی المسبّب (کبیر) والکفر باللّٰه یقتضی العذاب دائما والقتل لیس کذلک۔ (بحر)

۶۰۰ (کہ یہاں قتال کی ابتدا بلا وجہ اور بلا ضرورت کر دینے سے حدودِ حرم کی ہتک لازم آتی ہے)

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ یعنی حرم شریف یا مسجدِ کعبہ کے گرد و نواح میں کئی میل کا پورا علاقہ جو اصطلاح میں حرم کہلاتا ہے اور اس کے احترام کے خاص آداب و قواعد ہیں۔

عندنا المسجد الحرام یقع علی الحرم کله۔ (مدارک)

نزولِ آیت کے وقت مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان عارضی صلح کا معاہدہ تھا، یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ اس پاسِ معاہدہ کے علاوہ مسلمانوں کے لئے یہ دوسرا مانعِ احترام حدودِ حرم کا بھی تو ہے بعض تابعین اور فقہائے حنفیہ نے آیت سے یہ مستقل حکم نکالا ہے کہ مسجدِ حرام میں قتل و قتال ناجائز ہے تاوقتیکہ وہ جوابِ مدافعت میں نہ ہو۔

قال مجاهد لا یجوز قتال احد فی المسجد الحرام الا بعد ان یقاتل وبه قال طاؤس وهو الذی یقتضیه نص الأیة (قرطبی) والیه ذهب ابوحنیفة واصحابه (قرطبی) فیه قولان احدهما انه محکم قاله مجاهد وابوحنیفة (ابن العربی)

۶۰۱ حفاظتِ خود اختیاری حدودِ حرم کے اندر بھی قتال کو جائز کر دے گی۔

كَذٰلِكَ۔ یعنی یہی سزائیں جو اوپر گزر چکیں، وطن سے اخراج اور حدودِ حرم کے اندر قتل۔

جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی ایسے معاند، پیمان شکن، بے ادب کافروں کی سزا۔

"کفار کے ساتھ جب کہ شرائطِ جواز کے پائے جائیں، ابتداءً قتال کرنا درست ہے اور اس مقام پر جو ابتداء بالقتال سے ممانعت فرمائی ہے تو وہ صرف بوجہ معاہدہ کے ہے تو معاہدہ میں ابتدا ناجائز ہے، البتہ اگر معاہدہ کا باقی رکھنا مصلحت نہ ہو تو صاف اطلاع کر دی جائے کہ ہم وہ معاہدہ باقی نہیں رکھتے، پھر قتال جائز ہے، اسی طرح اگر وہ لوگ معاہدہ توڑ دیں تب بھی قتال جائز ہے۔" (تھانوی)

۶۰۲ (محض جنگ سے نہیں، جسے انھوں نے شروع کیا تھا، بلکہ عقائدِ کفر و شرک سے جو محرک اور باعث بنے ہوئے تھے جنگ و قتال کے)

ای عن الکفر والشرک وتابوا (ابن عباسؓ) ای فان تابوا (ابن جریر عن مجاهد) عن قتالکم وکفرهم باللّٰه (ابن جریر) عن الشرک والقتال (مدارک) یعنی انتهوا بالایمان (ابن العربی) فان ترکوا القتال فی الحرم

# وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ

اور اُن سے لڑو یہاں تک کہ فسادِ (عقیدہ) باقی نہ رہ جائے ۷۰۳ اور دین اللہ ہی کے لئے رہ جائے ۷۰۴

وانابوا الی الاسلام (ابن کثیر) عن الکفر بالتوبۃ منہ کما روی عن مجاھد وغیرہ اوعنہ وعن القتال۔ (روح)

فَاِنِ انْتَھَوْا۔ میں ضمیر غائب کفار محاربین کی طرف ہے، حرفِ تعقیب ف سے مراد ہے، جنگ شروع کرنے کے بعد۔ جن مفسرین جدید نے اِنْتَھَوْا سے صرف جنگ سے باز آجانا مراد لیا ہے، انھوں نے بہت کمزور پہلو اختیار کیا ہے۔

۷۰۳ (اس لئے ان کی توبہ قبول کرلی جائے گی، انھیں دائرۂ اسلام میں داخل سمجھا جائے گا، اور ان کے اسلام کو لاحاصل یا بے قدر نہیں سمجھا جائے گا)

آیت کے اس جزو نے اِنِ انْتَھَوْا کے اس مفہوم کو خود قرآن ہی سے واضح کردیا کہ مراد کفر و شرک سے باز آجانا ہے، نہ کہ محض جنگ و قتال سے، صفاتِ مغفرت و رحمت کا ترتب کفر ہی سے تائب ہوتے پر ہوسکتا ہے نہ کہ محض ترک جنگ پر۔ جو کفر سے تائب ہوگیا اس کے پچھلے گناہ بھی معاف ہوجائیں گے اور آئندہ بھی اس کے ساتھ معاملہ رحمت کا ہوگا، جیسا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ ہے قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفرلھم ما قد سلف۔

— غفور لمن تاب ورحیم لمن مات علی التوبۃ (ابن عباسؓ) فان اللہ یغفر لھم جمیع ما تقدم ویرحم ھم کلًّا منھم بالعفو عما اجترم (ابن العربی) ولذالک علق علیہ الغفران والرحمۃ وھما لایکونان مع الکفر (بحر) فان اللہ یغفر ذنوبھم ولو کانوا قد قتلوا المسلمین فی حرم اللہ فانہ تعالٰی لایتعاظمہ ذنب ان یغفرہ لمن تاب منہ الیہ۔ (ابن کثیر)

فقہاءِ مفسرین نے اس آیت سے قاتل کی قبول توبہ کا مسئلہ بھی مستنبط کیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ جب کفر کی توبہ قبول ہوسکتی ہے تو قتلِ عمد تو کفر سے خفیف تر ہے، اس کی توبہ کیوں نہ قبول ہوگی۔

دلت الآیۃ علی ان التوبۃ من کل ذنب مقبولۃ وقول من قال التوبۃ عن القتل العمد غیر مقبولۃ لہ خطاء لان الشرک اشد من القتل فاذا قبل اللہ توبۃ الکافر فقبول توبۃ القاتل اولی (کبیر) وفیہ دلالۃ علی قبول قاتل العمد اذ کان الکفر اعظم ماثما من القتل وقد اخبر تعالٰی انہ یقبل التوبۃ من الکفر (بحر۔ روح) ھٰذا یدل علی ان قاتل العمد لہ توبۃ اذ کان الکفر اعظم ماثما من القتل وقد اخبر اللہ انہ یقبل التوبۃ منہ ویغفر لہ۔ (جصاص)

۷۰۴ (ان لوگوں میں، یا سرزمین عرب پر)

قٰتِلُوْھُمْ میں ھُمْ کی ضمیر کس کی طرف ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا حکم کس کے مقابلہ میں دیا جارہا ہے؟ ظاہر ہے کہ مراد کفار مطلق صورت میں بھی ہوسکتے ہیں اور مشرکین عرب بھی سمجھے جاسکتے ہیں لیکن فقہاءِ حنفیہ اور بہ کثرت تابعین نے مراد مشرکین مکہ ہی سے لی ہے۔

ومن راھا غیر ناسخۃ قال المعنٰی قاتلوا ھٰؤلاء الذین قال اللہ فیھم فان قاتلوکم (قرطبی) وھم کفار مکۃ والفتنۃ ھٰھنا الشرک ولا یبن بھم سنۃ اھل الکتاب فی قبول الجزیۃ قالہ ابن عباسؓ

وقتادۃ والربیع والسدی (بحر) عطف علیٰ قاتلوا الذین یقاتلونکم ویؤیدہ ان مشرکین العرب لیس فی حقھم الا الاسلام او السیف (روح) وھذہ الاٰیۃ خاصۃ فی المشرکین دون اھل الکتب۔ لان ابتداء الخطاب جریٰ بذکرھم فی قولہ عزّوجل واقتلوھم حیث ثقفتموھم واخرجوھم من حیث اخرجوکم وذلک صفۃ المشرکین اھل مکۃ الذین اخرجوا النبی صلی اللہ علیہ وسلم واصحابہ فلم یدخل اھل الکتاب فی ھذا الحکم۔ (جصاص)

حَتّٰی۔ یہاں اظہارِ غایت کے لئے ہے اور کَیْ یا اِلٰی اَنْ کے مرادف ہے۔

وھذا البیان غایۃ القتال (روح) حتّٰی بمعنیٰ کَیْ او اِلٰی اَنْ (مدارک)

لَاتَکُوْنَ فِتْنَۃٌ۔ یعنی حدودِ حرم اور حدودِ عرب کے اندر شرک و کفر باقی نہ رہنے پائے، فتنہ سے یہاں کفر و شرک مُراد ہونے پر کہنا چاہیئے کہ محققینِ اُمّت کا اجماع ہے۔

ای شرک قالہ ابن عباس وابوالعالیۃ ومجاھد والحسن وقتادۃ والربیع ومقاتل بن حیان والسدی (ابن کثیر) ای الشرک باللہ فی الحرم (ابن عباسؓ) ای حتی لاتکون شرک باللہ وحتّٰی لایعبد دونہ احد (ابن جریر) قال ابن عباس وقتادۃ ومجاھد والربیع بن انس الفتنۃ ھٰھنا الشرک وقیل انما سمّی الکفر فتنۃ لانہ یؤدّی الی الھلاک کما یؤدی الیہ الفتنۃ (جصاص)۔

اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو گوار کفار سے جزیہ دینے کے اقرار پر قتال سے دستکش ہونے کا حکم ہے لیکن یہ خاص کفار چونکہ اہلِ عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں ہے بلکہ ان کے لئے اسلام ہے یا قتل (تھانویؒ)

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اس کے لئے ضروری تھا کہ اس کا ایک جغرافی مرکز ہو مستقر ہو، اور روئے زمین پر کم از کم ایک خِطّہ تو ایسا ہو جو شرک و کفر سے قطعاً پاک اور اہلِ توحید کے لئے صحیح معنی میں "پاکستان" ہو، اور اس غرض کے لئے مولدِ رسولؐ اور مہبطِ قرآن سے بڑھ کر سرزمین اور کون ہو سکتی تھی؟ قدرۃً انتخاب اس کے لئے سرزمینِ عرب کا ہوا، کفارِ عرب اگر اسلام نہ لائیں تو ان کے لئے صرف قتل کا قانون ہے، اگر وہ جزیہ دینا چاہیں تو نہ لیا جائے گا۔ (تھانویؒ)

۵۰۷ (خالصۃً۔ اور کفر و شرک ہر دینِ باطل کا زور ٹوٹ کر رہے)

ذکر وہی خطۂ عرب کی خالص اسلامی حکومت کا چل رہا ہے کہ کم از کم اس "پاکستان" میں کفر و ترغیباتِ کفر کے لئے موقع ہی باقی نہ رہے۔

یکون الاسلام والعبادۃ للہ فی الحرم (ابن عباسؓ) ای یکون دین اللہ ھو الظاھر العالی علیٰ سائر الادیان (ابن کثیر) خالصا لیس للشیطان فیہ نصیب (مدارک)

الدِّیْنُ۔ دین سے مراد اللہ کی عبادت اور اُس کے احکام کی اطاعت ہے۔

اما الدین الذی ذکرہ اللہ فی ھذا الموضع فھو العبادۃ والطاعۃ للہ فی امرہ ونھیہ (ابن جریر) الدین ھنا الطاعۃ ای یکون الانقیاد خالصًا للہ (بحر) والدین الشرعی ھو الانقیاد للہ عزّوجل والاستسلام لہ علیٰ وجہ المداومۃ والعادۃ۔ (جصاص)

آیت کے اس جُزو نے خود ہی واضح کر دیا کہ جزوِ سابق میں فِتْنَۃ سے مراد شرک ہی تھا۔

فھذا یدل علیٰ حمل الفتنۃ علی الشرک لانہ لیس بین الشرک وبین ان یکون الدین کلہ للہ واسطۃ (کبیر)

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩٣﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ

سو اگر وہ باز آجائیں ۶۰۶ تو سختی (کسی پر بھی) نہیں بجز (اپنے حق میں ظلم کرنے والوں کے ۶۰۷ حرمت والا مہینہ تو

بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ

حرمت والے مہینہ کے عوض میں ہوتا ہے ۶۰۸ اور حرمتیں معاوضہ کی چیزیں ہیں ۶۰۹

۶۰۶ (اپنے کفر وانکار سے اور ملتِ اسلامیہ میں داخل ہو جائیں)

عن قتالکم ودخلوا ملتکم واختروا ما الزمکم اللہ من فرائضہ (ابن جریر) عن الکفر واسلموا (معالم)

۶۰۷ (جو اسی بے انصافی کی راہ سے اب تک دین توحید تک سے منکر ہیں۔)

اور جب یہ تائب ہو کر مسلمان ہو گئے تو ظاہر ہے کہ اب اپنے حق میں ظالم باقی نہیں رہے اور اب ان کے حق میں سزائے قتل وغیرہ کا حکم باقی نہ رہا۔

فلا سبیل لکم بالقتل (ابن عباس)

عُدْوَان۔ اس کے لفظی معنی زیادتی کے ہیں، یہاں سزا اور سزائے قتل کے معنی میں ہے۔

والمراد من العدوان ھھنا المعاقبۃ والمقاتلۃ (ابن کثیر) ای العقوبۃ بالقتل۔ (روح)

عربی اسلوب بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزاء عمل کے موقع پر بعینہ وہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کے لئے ہوتا ہے مثلاً مکر کے جواب میں مکر ہی کا لفظ، کید کی سزا کے موقع پر لفظ کید کا استعمال، اِستہزاء کے مقابلہ میں لفظ اِستہزاء وقس علیٰ ہذا۔ اس صنعت کا نام مشاکلت ہے، اور قرآن مجید نے عربی بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے، چنانچہ یہاں سزائے عُدوان کے موقع پر خود لفظ عُدوان کا لانا اسی طرز پر ہے

ومن العدوان الذی ھو علیٰ سبیل المجازاۃ قولہ فلا عدوان الا علی الظالمین (راغب) انہ ذالک علیٰ وجہ المجازاۃ لما کان من المشرکین من الاعتداء (ابن جریر) سمّی جزاء الظالمین ظلما للمشاکلۃ (کشاف) اراد ھا بالعدوان الجزاء یقول لاجزاء ظلم الا علیٰ ظالم (ابن قتیبہ)

۶۰۸ یعنی کسی مہینہ کی حرمت کی بنیاد تو بس اسی پر ہے کہ دوسرا فریق بھی اس کی حرمت لازم رکھے گا اور اگر یہ نہیں تو پھر کسی مہینہ کی حرمت کی بنیاد ہی نہیں، یہ چیز تو محض عوض معاوضہ کی اور طرفین کے تعامل پر مبنی ہے۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ۔ کے لفظی معنی ہیں "حرمت والا مہینہ" عرب کے قبائل آپس میں سخت جنگجو چلے آرہے تھے، لیکن آپس میں یہ بھی ٹھہر گئی تھی کہ سال میں چار مہینے جنگ بند رہے اور یہ زمانہ امن وصلح کے ساتھ گزارا جائے، اور یہ چار مہینے یہ تھے۔

محرم سنہ قمری کا پہلا مہینہ، رجب سنہ قمری کا ساتواں مہینہ، ذی قعدہ سنہ قمری کا گیارھواں مہینہ، ذی الحجہ سنہ قمری کا بارھواں مہینہ، یہاں اشارہ ذی قعدہ سنہ ۶ھ کی جانب ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم بقصد عمرہ اس وقت صحابیوں کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے لیکن مشرکین آمادہ قتال ہو گئے تھے، بلکہ تیراندازی اور سنگ اندازی شروع کر دی تھی، عرب جاہلیت اپنی جہالت نفاق وجنگجوئی کے لئے بدنام اور بالکل بجا طور پر بدنام ہے لیکن اس کے باوجود سال کے

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی

تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے۔

عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو ۷۱۰ اور جانتے رہو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے ۷۱۲ ۷۱۱

دو تہائی حصہ لڑتے تھے اور باقی ⅓ حصہ امن و آشتی ہی کے مشغلہ میں گزار دیتے تھے ۔ یہ کمال تو جاہلیت جدید یا جاہلیتِ فرنگ ہی کے لئے اٹھ رہا تھا کہ فرنگی قوموں کے بڑے بڑے سورما، نہ اَنوار دیکھیں نہ تہوار، نہ کوئی موسم نہ کوئی مہینہ، ہر روز اور ہر ہفتہ، اور ہر موسم میں توپیں اور ٹینک اور ہوائی بم ہیں بلکہ اب تو ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم ہیں کہ ایک دوسرے کی جانیں لینے پر تلے ہوئے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے پر اڑے رہتے ہیں!

۷۰۹ (پس جو تم سے ان حرمتوں کی رعایت کرے تم بھی اُن سے حرمتوں کی رعایت ملحوظ رکھو)

قِصَاص کے لفظی معنیٰ بدلہ کے ہیں، خواہ وہ معاوضہ قولی ہو، یا عملی یا جسمانی، اور یہاں عملی بدلہ مراد ہے یعنی جیسا تمہارے فریقِ مقابل نے تمہارے ساتھ کیا، تم اس کے ساتھ کرو۔

قصاص ای بدل (ابن عباسؓ) القصاص ھو المجازاۃ من جھۃ الفعل او القول او البدن وھو فی ھذا الموضع من جھۃ الفعل (ابن جریر) القصاص المساوات والمماثلۃ وھو ان یفعل بالفاعل مثل ما فعل۔ (معالم)

یہاں کافروں پر تعریض ہے کہ خود تو ان مقدس مہینوں کا ذرا پاس لحاظ نہیں کرتے اپنی کسی حرکت سے کبھی باز نہیں رہتے اور مسلمانوں سے توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ اُن کے سارے ظلم اور زیادتیوں پر اس لئے خاموش رہیں گے کہ یہ مقدس مہینے ہیں!

والحاصل ان حرمۃ الشھر الحرام لما لم تمنعھم عن الکفر والافعال القبیحۃ فکیف جعلوہ سببا فی ان یمنع القتال من شرھم وفسادھم (کبیر)۔

۷۱۰ یعنی اگر فریقِ مقابل قتال شروع کردے تو تم بھی برابر جواب دو۔

اِعْتَدٰی عَلَیْکُمْ۔ مثلاً ایک زیادتی یہی کہ دشمن ان مہینوں کا احترام نہ کرے، بلکہ تم سے جنگ شروع کردے۔

فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ۔ یہاں مسلمانوں کی اس جوابی اور دفاعی کارروائی کو محض مجازاً اور محاورۂ زبان کے اعتبار سے (اعتداء) فرما دیا گیا ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ زیادتی کے جواب میں جو کارروائی بطور سزا کی جائے اُس پر حقیقتاً زیادتی کا اطلاق کیوں کر سکتا ہے، عربی زبان کے قاعدۂ مشاکلتِ الفاظ پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے، بس وہی صورت یہاں بھی ہے اور محض لفظی تطابق کی بناء پر یہاں سزائے اعتداء کو خود اعتداء سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر دونوں کے ہاں یہ تصریح منقول ہے۔

ای قابلوہ بحسب اعتداءہ وتجاوزوا الیہ بحسب تجاوزہ (راغب) انہ بمعنی المجازاۃ واتباع لفظ لفظا وان اختلف معناھما (ابن جریر) انما سمّی الفعل الثانی اعتداءً وھو مفعول بحق حملاً للثانی علی الاول علی محاورۃ العرب۔ (ابن العربی)

۷۱۱ (ان سارے احکام و معاملات میں، اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں)

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۛ

اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو ۷۱۳ اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو ۷۱۴

یہ اسلام کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک طرف تو قتال اور انتقام کی اجازت پوری پوری دی اور دوسری طرف آخر میں پھر یہ بھی یاد دلا دیا کہ دیکھنا، حدود سے تجاوز کسی حال میں بھی نہ ہو، جوش پر قابو بہر صورت رکھنا، یہ نہ ہو کہ اُلٹی زیادتی تم اپنی طرف سے حالتِ انتقام میں کرنے لگو، خوفِ خدا، باز پرس کا خیال، ہر وقت مستحضر رہے، جو کچھ بھی ہو شدید اشتعال کے موقع پر بھی ہیجانِ نفس کے ماتحت نہیں خشیتِ الٰہی ہی کے ماتحت ہو!

واتقوا ایها المؤمنون فی حرماته وحدوده ان تعتدوا فیها۔ (ابن جریر)

اللہ اکبر! اس حکیمانہ امتزاج کی نظیر، دنیا کے کسی قانون، کسی آئین، کسی نظام کے اندر ملے گی؟

۷۱۲ اللہ اللہ! کتنی بلند و پُر حکمت تعلیم ہے، ابھی ابھی انتقام میں بھی اہل ایمان پر تقویٰ کی زبردست قید عائد کی جا چکی ہے، اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان احکام سے کہیں پست ہمت نہ ہو جانا اور یوں نہ خیال کرنے لگنا کہ "حدود و قیود" عائد کرکے پُر زور مقابلہ سے رُوکا جا رہا ہے، اور ان کے بعد دل کے حوصلے پوری طرح کیونکر نکل سکیں گے؟ تو یہ بات نہیں ہے بلکہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ کی فتح و نصرت، رحمت و عنایت شاملِ حال انہی لوگوں کے رہتی ہے جو اس کی خشیت و عظمت اپنے دل میں رکھتے ہیں اور متقی ہوتے ہیں! تقویٰ کی تاکید عین نصرت و ہمت افزائی کے لئے ہے، ضعف پیدا کرنے کے لئے نہیں۔

مَعَ الۡمُتَّقِیۡنَ۔ متقین کے ساتھ اللہ کی معیت کی آخر نوعیت کیا ہوتی ہے؟ محققین کا فیصلہ ہے کہ اللہ کی معیت بلحاظ اس کی نصرت، اعانت، حفظ، علم وغیرہ کے ہوتی ہے نہ کہ کسی جسمانی یا مادّی اعتبار سے۔

ای بالمعونة والنصرة والحفظ والعلم (کبیر) النصر والعون (روح) بالنصرة والتمکین والتائید (بحر)

اور یہیں سے امام رازیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ حق تعالیٰ نہ مجسّم ہے، اور نہ وہ کسی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے، جیسا کہ ہر جسم کسی متعین جگہ کو اپنے سے لبریز کر دیتا ہے۔

وھذا من اقوی الدلائل علی انه لیس بجسم ولا فی مکان۔ (کبیر)

۷۱۳ (اپنا مال)

جان قربان کر ڈالنے کا حکم تو قتال کے ذیل و ضمن میں آچکا، اب حکم صرفِ مال کا مل رہا ہے۔

فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ۔ اس قید کا خوب خیال رہے، اسلام میں جس طرح محض جان دے دینا مطلوب و مقصود نہیں، بلکہ وہ جان دینا مطلوب و مقصود ہے جو خدا کی راہ میں ہو، اللہ کے دین کی بڑائی کے لئے ہو، اسی طرح مطلق صرفِ مال کی ہرگز کوئی وقعت و قدر نہیں، قدر صرف اُس صرفِ مال کی ہے، جو باطل کی راہ میں نہیں، حق کی راہ میں ہو، ہوائے نفس کی تکمیل کے لئے نہیں، رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہو، یہاں اشارہ خاص جہاد و قتال کی جانب ہے لیکن فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ کے الفاظ عام ہیں، ہر دینی خدمت میں مالی امداد اس کے تحت میں آجاتی ہے۔

یعنی فی طاعة اللہ (قرطبی)

۷۱۴ (جان یا مال میں بُخل کرکے)

وَ اَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾ وَ اَتِمُّوا الۡحَجَّ وَ الۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ؕ

اور اچھے کام کرتے رہو یقیناً اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۵۱۵ اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو ۵۱۶

قرآن مجید میں جب صیغہ جمع حاضر آتا ہے تو کبھی تو افراد مُراد ہوتے ہیں اور کبھی جماعت، یہاں اصل مخاطبت اُمت سے بہ حیثیت مجموعی ہے اور بیان یہ حقیقت ہو رہی ہے کہ افرادِ امت نے اگر جہاد و قتال سے جان چرائی، اور مجاہدین کو مالی امداد دینے میں بخل کیا تو نتیجہ لازمی طور پر ساری امت کی تباہی، بربادی، ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ۔ اصل تقدیر کلام یوں ہے:۔ وَلَا تُلۡقُوۡا اَنۡفُسَكُمۡ بِاَيۡدِيۡكُمۡ یا اَنۡفُسَكُمۡ (اپنے آپ کو) محذوف ہے۔

قیل تقدیرہ ولا تلقوا انفسکم بایدیکم (کشاف) ای لا توقعوا انفسکم فی الھلاک (بیضاوی)

اَلتَّهۡلُكَةِ۔ لفظی معنی ہلاکت کے ہیں، یہاں مُراد یہ ہے کہ اُمت کی ضرورت کے موقع پر بخل کرکے اُمت کو بربادی میں نہ ڈالو، اور یہی معنی ابن عباسؓ، ابو ایوب انصاریؓ اور حذیفہؓ صحابیوں سے اور حسن اور قتادہ اور عکرمہ اور عطاء تابعین سے مروی ہیں، اور محدث جلیل امام بخاری نے بھی یہی معنی اختیار کئے ہیں۔

بترک الانفاق فی سبیل اللہ وھو قول حذیفۃ والحسن وقتادۃ وعکرمۃ وعطاء (معالم) وقال حذیفۃ بن سلیمان وابن عباس وعکرمۃ وعطاء ومجاھد وجمھور الناس المعنی لا تلقوا بایدیکم ان تترکوا النفقۃ فی سبیل اللہ ولا تخافوا عیلۃ والی ھذا المعنی ذھب البخاری اذ لم یذکر غیرہ (قرطبی)

التھلکۃ الاقامۃ فی الاھل والمال وترک الجھاد (کشاف عن ابی ایوب انصاری)

بعض نے یہ معنی بھی لئے ہیں کہ بہت زیادہ خرچ کرکرکے اپنے کو تباہ حال نہ کردو۔

وقال الجبائی التھلکۃ الاسراف فی الانفاق (روح) ای بالاسراف وتضییع وجہ المعاش (بیضاوی) قیل ھو الاسراف فی الانفاق حتی لا یجد ما یاکل ویشرب فیتلف (جصاص)

**۵۱۵** قرآن مجید نے اللہ تعالیٰ کی جانب رغبت والتفات، ناپسندیدگی و بیزاری کے افعال و صفات بارہا منسوب کئے ہیں، چنانچہ یہاں بھی اللہ کے لئے ہے کہ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ۔ ان سارے افعال و صفات کے لانے سے ایک بڑا مقصود اُن گمراہ قوموں کی تردید ہے جو وجودِ باری کے تو قائل ہیں لیکن خدا تعالیٰ کو صفاتِ کمال و جمال سے مُعرّیٰ، ایک طرح کا جامد، بے جان، بے حس، عِلت العِلل سمجھے ہوئے ہیں ـــ اسلام کا خدا، قرآن کا خدا، ہر معنی میں ایک زندہ خدا، بیدار، متحرک، فعّال خدا ہے، خوش بھی ہوتا ہے ناخوش بھی، مخلوق کو محبوب بھی رکھتا ہے، مبغوض بھی، صلہ بھی دیتا ہے اور سزا بھی۔

اَحۡسِنُوۡا۔ یعنی جو کچھ بھی کرو حُسنِ نیت و اخلاص کے ساتھ کرو، محض بیگار سمجھ کر بوجھ سا نہ اُتارو، صحابیوں سے اسی قسم کے معنی مروی ہیں۔

ای احسنوا اعمالکم بامتثال الطاعات روی ذلک عن بعض الصحابۃ (قرطبی) احسنوا اعمالکم واخلاقکم۔ (بیضاوی)

**۵۱۶** یعنی جب یہ عبادتیں بجالاؤ تو اللہ کی رضا جوئی ہی کے لئے بجالاؤ، اخلاصِ نیت کے ساتھ، اور

## فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ

پھر اگر گھر جاؤ، تو جو بھی قربانی کا جانور میسر ہو (اُسے پیش کر دو) ۷۱۷

اللہ کے مقرر کیے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ، تمام ممنوعات سے محترز رہ کر، یہ نہ ہو کہ کسی طرح اُلٹے سیدھے ادا کر کے ان عبادتوں کو بھی ناقص و فاسد بنا دو۔

اى افعلوا الحج والعمرة على نعت الكمال والتمام (كبير) وظاهر السياق باكمال افعالهما بعد الشروع فيهما (ابن كثير) اى اَدّوهما تامين بشرائطهما وفرائضهما لوجه الله تعالىٰ بلا توان ولا نقصان۔ (مدارك)

حضرات صحابہؓ و تابعینؒ سے متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں، لیکن سب سے جامع تفسیر مقاتل تابعی کی ہے کہ اس درمیان میں کوئی ایسی چیز نہ کرو کہ جو ان عبادتوں کے غیر شایاں ہو۔

الّا تفعلوا فيهما ما لا ينبغى لكم (قرطبى)

لِلّٰهِ کی تفسیر میں ایک فقیہ مفسر ابن العربی مالکیؒ نے یہ نکتہ بہت خوب پیدا کیا ہے کہ اعمال تو سارے کے سارے اللہ کی جانب منسوب ہوتے ہی ہیں، خلق، علم، ارادہ وغیرہ ہر لحاظ سے یہاں اس تائید و تخصیص سے مقصود اس امر کی تنبیہ ہے کہ حج و عمرہ کا قصد، میلا ٹھیلا سمجھ کر نہ ہو، تفاخر کی راہ سے نہ ہو، تجارتی ضروریات سے نہ ہو، اخلاصِ محض کے ساتھ، قرب و رضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔

وفائدة هذا التخصيص ان العرب كانت تقصد الحج للاجتماع والتناصر والتظاهر والتنافر والتفاخر وقضاء الحوائج وحضور الاسواق وليس لله تعالىٰ فيه حظ يقصد ولا قربة تعتقد فامر الله تعالىٰ سبحانه بالقصد اليه لاداء فرضه وقضاء حقه۔ (احكام القرآن)

۷۱۷ یعنی اگر کسی دشمن کی روک تھام کے باعث یا کسی بیماری وغیرہ سے معذور ہو کر راستہ ہی میں رک جانا پڑے اور منزلِ مقصود تک نہ پہونچ سکو تو قربانی کا جانور جو ساتھ میں ہو اُسے وہیں ذبح کر دو، اور احرام کھول ڈالو۔ عازمِ حج جب کسی معذوری کی بناء پر راہ ہی میں رُک گیا، اور اب قصدِ حج پورا نہیں کر سکتا، تو احرام سے باہر آنے کا طریقہ اُسے بتایا جا رہا ہے۔

إِنْ أُحْصِرْتُمْ۔ احصار کے لفظی معنی گھر جانے کے ہیں، خواہ کسی سبب سے بھی ہو، ائمہؒ لغت سے یہی عام مفہوم منقول ہے۔

الاحصار المنع من طريق البيت يقال فى المنع الظاهر كالعدو والمنع الباطن كالمرض (راغب) قال الفراء ان لفظ الاحصار يفيد الحبس والمنع سواء كان بسبب العدو او بسبب المرض (كبير) قال الكسائى وابو عبيدةؒ واكثر اهل اللغة الاحصار المنع بالمرض او ذهاب النفقة۔ (جصاص)

چنانچہ فقہاء حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں لیا ہے اور یہی معنی بعض فقہاء صحابہؓ و تابعین سے منقول ہیں۔

ذهب الامام ابو حنيفة الى انه المراد به ما يعمّ كل منع من عدوّ ومرض وغيرهما (روح) روى عن ابن مسعود وابن عباس العدو والمرض سواء وهو قول ابى حنيفة وابى يوسف ومحمد وزفر والثورى (جصاص) ولما كان اصل الحصر الحبس قالت الحنفية المحصر من يصير

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ

اور جب تک قربانی اپنے مقام پر پہونچ نہ جائے اپنے سر نہ منڈاؤ ۷۱۸ لیکن اگر تم میں سے

مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ

کوئی بیمار ہو ۷۱۹ یا اُس کے سر میں کچھ تکلیف ہو ۷۲۰ تو وہ روزوں سے یا خیرات سے

اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ

یا ذبح سے فدیہ دے دے ۷۲۱

ممنوعا من مكة بعد الاحرام بمرض او عدو او غير ذالك واحتجوا بمقتضى الاحصار مطلقا (قرطبی)

ای منعتم بای عذر كان قاله مجاهد وقتادة وابو حنيفة (ابن العربی)

البتہ امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک احصار صرف دشمن کے باعث ہو سکتا ہے۔

المراد من الاحصار ههنا حصر العدو عند مالك والشافعی (روح) وعند الشافعی الاحصار بالعدو وحده (مدارك) ای بالعدو وخاصة قاله ابن عمر وابن عباس وانس والشافعی هو اختيار علمائنا (ابن العربی)

۷۱۸ (جو علامت ہے مناسکِ حج کے تمام ہو جانے اور حالتِ احرام سے باہر آجانے کی)

مَحِلَّهٗ یعنی موضعِ حرم۔ قربانی کی اصل جگہ وہی ہے۔

ای مكانه الذی يجب نحره فيه وهو الحرم۔ (مدارك)

جب عازمِ حج خود وہاں پہونچنے سے معذور ہو جائے تو قربانی کا جانور وہاں بھیج دے وہیں اُس کی قربانی کر دی جاۓ گی۔ هَدْی کے لفظی معنی محض اُس پیشکش کے ہیں، جو خانۂ کعبہ کے لئے بھیجی جائے۔

الهدی مختص بما يهدی الى البيت (راغب) وهو ما يهدی الى بيت الله من بدنة او غيرها. (قرطبی)

حنفیہ نے بھی اسی عام معنی میں رکھا ہے، اور قربانی کا ہر جانور اس سے مراد لیا ہے، اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔

فقال ابو حنيفة وابو يوسف ومحمد وزفر ومالك والشافعی الهدی من اصناف الثلاثة الابل والبقر والغنم وهو قول ابن شبرمة۔ (جصاص)

بعض ائمہ کے نزدیک اس کا اطلاق قربانی کے صرف اونٹ پر ہوتا ہے۔

۷۱۹ (ایسے مرض میں کہ اس کی وجہ سے سر کے بال اُتروانے کی ضرورت پڑ جائے)

مرضا يحوجه الى الحلق۔ (بیضاوی)

۷۲۰ مثلاً درد، زخم، وغیرہ سے، اور اس لئے سر منڈانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔

۷۲۱ معذوروں کو اجازت ہے کہ قبل از وقت ہی سر منڈا لیں، اور اس کا شرعی فدیہ دے دیں۔

فَإِذَآ أَمِنتُمْ فَمَن تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

لیکن جب تم حالتِ اطمینان میں ہو ۷۲۲ تو پھر جو شخص عمرہ سے مستفید ہوا سے حج سے ملا کر تو جو قربانی بھی اُسے میسر ہو وہ کر ڈالے ۷۲۳

فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ

اور جس کسی کو میسر ہی نہ آئے ۷۲۴ وہ تین دن کے روزے زمانۂ حج میں رکھ ڈالے اور سات روزے جب تم واپس ہو،

فَفِدْيَةٌ ۔ من رأسہ کے بعد عبارت مقدر یوں ہے۔ فحلق فعلیہ فدیۃ۔

فیہ اضمار ای فحلق فعلیہ فدیۃ۔ (معالم)

اور اس فدیہ کی تین صورتیں ہیں یا روزے رکھ لئے جائیں یا مسکینوں کو صدقہ دیا جائے یا قربانی کر دی جائے۔

مِن صِيَامٍ۔ جمہور فقہاء کا مسلک حدیث صحیح کی بناء پر تین روزے رکھنے کا ہے۔

جمہور فقہاء المسلمین علی ان الصوم ثلاثۃ ایام وھو محفوظ صحیح فی حدیث کعب بن عجرۃ۔ (قرطبی)

أَوْ صَدَقَةٍ۔ کھانا اگر دیا جائے تو چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کی مقدار کے مساوی دیا جائے۔

علی ستۃ مساکین لکل مسکین نصف صاع من بر (مدارک) فیحصل من ذلک ان یکونوا من التمر ستۃ اصع ومن الحنطۃ ثلاثۃ أصع وعدد المساکین الذین یتصدق علیھم ستۃ بلا خلاف (جصاص)

أَوْ نُسُكٍ۔ نسک سے مراد بالاتفاق ذبیحہ ہے۔

یقال نسکت للہ ای ذبحت للہ (ابن قتیبہ) النسیکۃ مختصۃ بالذبیحۃ۔ (راغب)

یہ قربانی کم از کم ایک بکری کی ہونی چاہیئے اور اس سے بہتر یہ ہے کہ ایک گائے یا اونٹ کی ہو۔

ولا خلاف بین الفقہاء ان ادناہ شاۃ وان شاء جعلہ بعیرا او بقرۃ (جصاص) اعلاہ بدنۃ واوسطہ بقرۃ وادناہ شاۃ (معالم عن الحسن وقتادۃ)

روزہ، صدقہ، قربانی یہ تینوں صورتیں فدیہ و کفارہ کی یکساں ہیں جو شق بھی پسند آئے، اختیار کی جاسکتی ہے۔

لا خلاف انہ مخیر بین ھذہ الاشیاء الثلاثۃ یبتدئ بایھا شاء وذلک مقتضی الآیۃ والتخییر (جصاص) وعامۃ الآثار عن کعب بن عجرۃ وردت بلفظ التخییر وھو نص القرآن وعلیہ مضی عمل العلماء فی کل امصار وفتواھم۔ (قرطبی)

۷۲۲ بمقابلہ اس حالتِ خطر و مرض کے جس کا ذکر شروع آیت فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ میں آچکا ہے اور جس طرح وہاں ایک عام وجامع لفظ احصار آیا تھا، یہاں بھی ایک عام وجامع لفظ امن آیا ہے، جو مرض کے دُور ہو جانے پر بھی اسی طرح حاوی ہے، جس طرح خطرۂ دشمن کے دفع ہو جانے پر۔

اصل الامن طمانیۃ النفس وزوال الخوف (راغب) معناہ برأتم من المرض وقیل خوفکم من العدو قالہ ابن عباس وقتادۃ وھو اشبہ باللفظ الا ان یتخیل الخوف من المرض فیکون الامن منہ (قرطبی) جاء بلفظ الامن وھو عام فی العدو والمرض لیکون اٰخر الکلام علی نظام اولہ (ابن العربی)

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۗ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ

یہ پورے دس (روزے) ہوئے ۲۲۵ یہ ۲۲۶ اس کے لئے (درست) ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قریب نہ رہتے

الْحَرَامِ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

ہوں ۲۲۷ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ سخت گرفت کرنے والا ہے ۲۲۸

اِذَا شرطیہ ہے اس سے فقہاء نے یہ نکالا ہے کہ بعد حصر اگر وقت حج میں مانع دُور نہ ہو تو عاصی نہ ہوگا.

اَمِنْتُمْ فقہاء کہتے ہیں کہ صحت کو بھی امن ہے اس لئے تعبیر کیا کہ صحت اچھی ہو جانے پر بہ ظاہر فوت حج کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے

۲۲۳ (اور اگر کسی نے صرف حج یا صرف عمرہ کیا ہو تو اس پر یہ قربانی واجب العمل نہیں)

فَمَنْ تَمَتَّعَ۔ تمتع کے لفظی معنی فائدہ اُٹھانے کے ہیں، اصطلاح فقہ میں مراد حج اور عمرہ کے ملا لینے سے ہوتی ہے یعنی زمانۂ حج میں ایک احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا جائے، اور پھر دوسرے احرام سے حج بھی کر لیا جائے، دونوں احراموں کی درمیانی مدت میں حالتِ احرام کے ممنوعات سے پوری طرح تمتع کیا جا سکتا ہے، دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر عرب جاہلی جہاں اور بہت سے اوہام میں گرفتار تھے، وہاں ایک عقیدہ یہ بھی گڑھ لیا گیا تھا کہ موسم حج میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہے

لانّ العرب فی الجاھلیة کانت لاتعرف العمرة فی أشھرالحج وتنکرھا اشد الانکار (جصاص)

یُروٰی عن ابن عباس وعن طاؤس انّ ذٰلك عند ھم کان من أفجرالفجور۔ (جصاص)

۲۲۴ (ان ایام حج میں بسبب ناداری یا کسی اور معذوری کے)

۲۲۵ تین زمانۂ حج میں اور سات زمانۂ حج کے بعد۔ یہ "پورے دس" کی تصریح تاکید در تاکید کی غرض سے ہے

کاملة توکید الکلام، کما یقول القائل سمعتہ باذنی رأیتہ بعینی (ابن جریر) قیل ھو توکید کما تقول کتبت بیدی وقولہ کاملة تاکید اٰخر۔ (قرطبی)

اِذَا رَجَعْتُمْ۔ فقہاء حنفیہ اور بعض اکابر تابعین کے ہاں اس رجوع سے مراد اعمال حج سے فراغت ہے، خواہ واقعۃً کوئی حج سے واپس ہو جائے یا ابھی وہیں مقیم رہے۔

ای بعد الفراغ من اعمال الحج وھو المراد من الرجوع المذکور فی الاٰیة (معالم) قال ابوحنیفة المراد من الرجوع الفراغ من اعمال الحج (کبیر) ای فرغتم ونفرتم من أعمالہ (روح) قال المجاھد وعطاء وابراھیم المعنیٰ اذا رجعتم نفرتم وفرغتم من اعمال الحج وھو مذھب ابی حنیفة۔ (بحر)

بعض دوسرے اکابر کے نزدیک مکہ سے وطن کی واپسی مراد ہے۔

یعنی الیٰ بلادکم قالہ ابن عمر وقتادة والربیع ومجاھد وعطاء قالہ مالك فی کتاب محمد وبہ قال الشافعی (قرطبی) اذا رجع الیٰ اھلہ ومصرہ (ابن جریر)

۲۲۶ یعنی موسم حج میں عمرہ کے ساتھ حج کا ملا لینا۔

ذٰلِكَ۔ یہ اشارہ تمتع کی جانب ہے، جس کا ذکر ذرا اوپر فَمَنْ تَمَتَّعَ کے ضمن میں آچکا ہے۔

ای التمتع بالعمرۃ الی الحج (ابن جریر) اشارۃ الی التمتع۔ (مدارک)
یہ تفسیر امام ابو حنیفہ اور بعض تابعین کے مسلک کے مطابق تھی جن کے ہاں حج میں تمتع اور قران یعنی موسم حج میں عمرہ کے ساتھ حج کر لینے کی دونوں صورتیں صرف آفاقیوں کے لئے درست ہیں، مکہ اور جوار مکہ والوں کے لئے نہیں۔

اذ لا تمتع ولا قران لحاضری المسجد الحرام عندنا (مدارک) وقال ابو حنیفۃ ان قولہ ذلک اشارۃ الی الابعد وھو ذکر التمتع المفہوم من قولہ فمن تمتع عند ابی حنیفۃ۔ (روح)

امام شافعیؒ کے نزدیک ذلک کا اشارہ اصل حکم یعنی وجوب قربانی کی جانب ہے۔

**۷۲۷** یعنی جو مکہ کے باشندے یا شہر مکہ سے بالکل متصل کے باشندے نہ ہوں بلکہ حدود میقات سے باہر کے رہنے والے ہوں۔ میقات اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سے حرم کے حدود شروع ہو جاتے ہیں، اور وہاں پہنچ کر ہر آفاقی پر حج یا عمرہ کی نیت کر لینا اور احرام باندھ لینا واجب ہو جاتا ہے، ہر ہر سمت سے آنے والوں کی میقات الگ الگ ہے۔

لِمَنْ لَّمْ یَکُنْ میں ل بمعنی عَلیٰ کے ہے۔

ای وجوب الدم علی من لم یکن من اھل مکۃ (قرطبی)

حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ سے خاص اہل مکہ کا مراد ہونا اور ان کے لئے تمتع کا ناجائز ہونا سب کو مسلم ہے۔

اجماع جمیعھم علی ان اھل الحرم ممنوعون بہ وانہ لامتعۃ لھم (ابن جریر)

لیکن فقہاء حنفیہ اور بعض تابعین کا مذہب یہ ہے کہ اس میں مکہ کے علاوہ جوار مکہ کے باشندے بھی شامل ہیں، اور حدود میقات کے ادھر تک کل رہنے والے حَاضِرِی الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے حکم میں داخل ہیں۔

عن مکحول قال من کان دون المواقیت (ابن جریر) ھم اھل مواقیت فمن دونھا الی مکۃ (مدارک) قال عطاء ومکحول من دون المواقیت وھو قول اصحابنا (جصاص)

امام شافعیؒ کے نزدیک مکہ سے قصر نماز کی مسافت تک رہنے والے اہل مکہ ہی کے حکم میں رہتے ہیں۔

المراد بالموصول من کان من الحرم علی مسافۃ القصر عند الشافعی ومن کان مسکنہ وراء المیقات عند ابی حنیفۃ (روح)

اور مفسر طبری نے بقاعدۂ عربیت لفظ حاضر کے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے، جو امام شافعیؒ کا اختیار کیا ہوا ہے۔

واولی الاقوال بالصحۃ عندنا قول من قال ان حاضری المسجد الحرام من ھو حولہ فمن بینہ وبین المسافۃ ما لا تقتصر الیہ الصلوٰۃ لان حاضر الشیء فی کلام العرب ھو الشاھد لہ بنفسہ۔ (ابن جریر)

لیکن محقق جصاص رازی نے قرآن مجید ہی کی متعدد آیتوں کے سیاق سے یہ دکھایا ہے کہ محاورۂ قرآنی میں اَلْبَیْت سے خانۂ کعبہ نہیں، بلکہ مکہ، اور صرف مکہ ہی نہیں بلکہ جوار مکہ مراد لیا گیا ہے۔

کان مراد اللہ تعالی بذکر البیت اقرب من مکۃ وان کان خارجا منھا۔ (احکام القرآن)

اور المسجد الحرام سے بھی مراد مکہ اور مضافات مکہ ہی لی گئی ہے۔

وھی مکۃ وما قرب منھا۔ (احکام القرآن)

**۷۲۸** ان کی جو احکام الٰہی کی مخالفت کرتے رہتے ہیں، اور تقوائے الٰہی اختیار نہیں کرتے۔

لمن لم یتقہ۔ (بیضاوی)

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ

حج کے (چند) مہینے معلوم ہیں ۷۲۹ جو کوئی ان میں اپنے اوپر حج مقرر کرے ۷۳۰ تو پھر حج میں نہ کوئی

وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ

فحش بات ہونے پائے اور نہ کوئی بے حکمی اور نہ کوئی جھگڑا ۷۳۱

وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہو۔ ان تمام احکام کی بجا آوری میں۔ اصل شے اور مدارِ کار تمام احکام و مسائل میں بس یہی تقویٰ الٰہی یا خوفِ خدا ہے، باقی تعبیر و تفسیر میں جزئی اختلافات تو اپنی اپنی فہم و بصیرت، فکر و نظر کے مطابق علماء و فقہاء، شارحین و مفسرین میں ہوتے ہی رہیں گے۔ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ۔ یہاں جس سیاق میں آیا ہے، اس سے بعض علماء نے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ مقدس و متبرک مقامات میں جس طرح قبولیت و سعادت کے مواقع بہت زیادہ ہیں، اسی طرح گناہ و عقوبت کا خطرہ بھی زیادہ لگا ہوا ہے۔

۷۲۹ اور چونکہ وہ مشہور و معلوم ہیں، اس لئے قرآن کو ان کی تصریح کی بھی ضرورت نہیں اور وہ تین مہینے شوالؔ، ذیقعدہ و ذی الحجہ ہیں۔ اصل ارکانِ حج تو ذی الحجہ کے دوسرے ہفتہ میں ادا ہوتے ہیں، لیکن احرامِ حج شوال ہی سے بندھنا شروع ہو جاتا ہے، احرام اس خاص پوشش کا نام ہے جو حدودِ حرم یا میقات میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی و زائر پر واجب ہو جاتی ہے، یہ پوشش اور کچھ نہیں، صرف بے سلی ہوئی چادریں ہونی چاہئے، حنفیہ کے ہاں احرام جب چاہے باندھا جا سکتا ہے، گو قبل شوال ناپسندیدہ ہے، جائز ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حنفیہ کے ہاں احرام رکنِ حج نہیں، صرف شرطِ حج ہے، جیسے وضو کہ رکنِ نماز نہیں، صرف شرطِ نماز ہے، امام شافعیؒ کے ہاں شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا ناجائز ہے، یہ اس لئے کہ شافعیؒ کے نزدیک احرام رکنِ حج ہے، اور کسی رکنِ حج کی ادائی قبل موسمِ حج درست نہیں۔

اَلۡحَجُّ۔ روزانہ پنج وقتہ نماز باجماعت، مہینہ بھر کے روزوں، اور مال کے ۱/۴۰ حصہ کی زکوٰۃ کی طرح حج بیت اللہ بھی اسلام کی اُن عبادتوں میں سے ہے، جس نے اپنوں ہی کو نہیں بیگانوں کو بھی خاص طور پر متاثر کیا ہے، اور مستشرقین کے رعب افگن نام سے فرنگی اہل علم و اہل قلم کا جو طبقہ ہے، اُس نے تو اس کے ظاہری منافع اور اجتماعی مصالح پر بار بار رشک کیا ہے اور اسے اکثر نے ”عالم اسلامی کی سالانہ کانگریس“ سے تعبیر کیا ہے۔

۷۳۰ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ۔ یعنی موسمِ حج میں ادائے حج کی نیت کرلے، اور اُسے اپنے اوپر واجب کرلے۔

ای اوجبه علی نفسه (ابن قتیبه) فمن الزمه نفسه (کشاف) الفرض اصله وجوب الشیٔ (ابن قتیبه)

لیکن اپنے اوپر لازم کر لینے کی عملی اور معتبر علامت کیا ہے، بعض ائمہ کے نزدیک صرف نیت کر لینا کافی ہے، لیکن حنفیہ نے بعض صحابیوں اور تابعین کی طرح اس کی علامت پوششِ احرام کو قرار دیا ہے۔

الفرض الاحرام (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) فرض الحج الاحرام (ابن جریر۔ عن عطاء والحسن) ولزم علی نفسه بالاحرام (مدارک) قال ابن عباس والحسن و قتادۃ فمن احرم۔ (جصاص)

۷۳۱ (بلکہ اس سارے زمانہ میں اپنے آپ کو عبادت و ذکر الٰہی میں مشغول رکھو)

ایامِ صوم کی طرح ایامِ حج کو بھی اعمالِ خیر کے ساتھ مناسبتِ خاص حاصل ہے، اور جو چیزیں حرام ہیں، وہ تو خیر ہمیشہ ہی حرام ہیں، باقی جو اُمور جائز و مباح ہیں ان میں بھی بہت سی چیزوں سے زمانۂ صیام کی طرح حالتِ احرام میں دستبردار ہونا چاہئے، جملہ صورۃً خبریہ ہے، لیکن معنیً نہی ہے، اور وہ بھی تاکید کے ساتھ، یعنی اُن سب اُمور سے ممانعت کا قطعاً حکم ہورہا ہے۔

وان کان ظاهرہ الخبر فهو نهی عن هٰذہ الافعال وعبّر بلفظ النهی عنها لان المنهی عنه سبیله ان یکون منفیا غیر مفعول (جصاص) نفی الثلاثة علی قصد النهی للمبالغة۔ (بیضاوی)

فِی الْحَجِّ۔ یعنی اس زمانۂ حج میں حالتِ احرام میں۔

لاجدال فی وقته ولا فی موضعه (قرطبی) ای فی ایامه۔ (روح)

فَلَا رَفَثَ۔ رفث کا مفہوم عام ہے ہر قسم کی شہوانیت یعنی مباشرت کے دواعی و مبادی اس میں شامل ہیں۔

الرفث کلام متضمن لما یستقبح ذکرہ من ذکر الجماع ودواعیه (راغب) الرفث کلمة جامعة لما یریدہ الرجل من اھله (قرطبی) وقال قوم الرفث الافحاش بذکر النساء کان ذلک بحضرتھن ام لا (قرطبی) الجماع ومقدماته (المنار)

یہاں مُراد شہوانی تذکرے ہیں، تابعین اور بعض صحابیوں سے بھی یہی مروی ہیں، فقہاءِ حنفیہ نے صراحت کے ساتھ دواعی و مبادیِ مباشرت کو اس کے تحت میں شامل رکھا ہے۔

قال ابن عمر وطاؤس وغیرھم الرفث الافحاش للمرأة بالکلام (قرطبی) قال ابن عباس ھو التعریض بالجماع (ابن جریر) الرفث التعریض للنساء وبالجماع (ابن جریر عن ابن طاؤس) قال عطاء الرفث الجماع وما دونه من قول الفحش (ابن جریر) الجماع ودواعیه محظورة علی المحرم (جصاص) وقال الحسن المراد من کل ما یتعلق بالجماع۔ (کبیر)

اللہ اکبر! ایک معیار یہ ہے عبادت میں طہارت و پاکبازی کا، اسلام کا قائم کیا ہوا کہ اشارۃً و کنایۃً بھی اس زمانہ میں جائز شہوانی خیالات زبان پر نہ لائے جائیں، اور دوسری طرف مشرک قوموں کے میلے ٹھیلے تیرتھ وار، نیر تھ جاترا اور اشنان اور جلسے ہیں جن کی گرم بازاری ہی فحش کاریوں اور شہوت انگیزیوں سے ہے، اور پھر عرب جاہلیت کے تو ارکانِ حج تک میں فحش داخل تھا۔

وَلَا فُسُوْقَ۔ اس کے تحت میں بڑے چھوٹے ہر قسم کے گناہ کی ممانعت آگئی۔

قال بعضھم الفسوق ھی المعاصی کلھا (ابن جریر) عن محمد بن کعب القرظی قال الفسوق معاصی کلھا (ابن جریر) یعنی جمیع المعاصی کلھا قاله ابن عباس وعطاء وحسن وکذلک قال ابن عمر وجماعة (قرطبی) ای ولا خروج عن حدود الشرع بارتکاب المحظورات (روح) ھو الخروج عما یجب علی المحرم الی الاشیاء التی کانت مباحة فی الحل (المنار)

حالتِ احرام میں جب متعدد جائز مشغلے مثلاً شکار، ناجائز ہوجاتے ہیں تو بڑی چھوٹی کسی قسم کی معصیت کی گنجائش ظاہر ہے کہاں نکل سکتی ہے، یہاں یہ حکم محض تاکید کے لئے ہے۔

## وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ

اور جو کوئی بھی نیک کام کرو گے اللہ کو اس کا علم ہو کر رہے گا ۷۳۲ؑ اور زادِ راہ لے لیا کرو ۷۳۳ؑ اور بہترین زادِ راہ

وَلَا جِدَالَ۔ جدال اپنے عام و وسیع معنی میں ہے، مار پیٹ، ہاتھا پائی الگ رہی، زبانی حجت و تکرار جو اکثر مسابقت مفاخرت کے موقعوں پر ہو جاتی ہے، سب احرام کی حالت میں ممنوع ہے۔

قال محمد بن کعب القرظی الجدال ان تقول طائفۃ حجنا ابر من حجکم ویقول الآخر مثل ذلک (قرطبی) وقیل الجدال کان فی الفخر بالآباء (قرطبی) ای لاخصام مع الخدام والرفقۃ (روح) لامراء مع الرفقاء والخدام (مدارک) ای الجدال فی تقریر الباطل وطلب المال والجاہ (کبیر) ھو ما کان یجری بین القبائل من التنازع والتفاخر فی الموسم۔ (المنار)

حج کے موقع پر دنیا کے گوشہ گوشہ کی آبادیاں کھنچ کر آجاتی ہیں، ہر قسم، ہر عمر، ہر قماش، ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں، بوڑھے بھی، جوان بھی، بچے بھی، بڑے تیز مزاج اور غصہ ور بھی، آوارہ مزاج بھی، حریص و طامع بھی، حسین و نوجوان عورتیں بھی، پھر تکلیفیں اور صعوبتیں بھی، راہ اور سواری کے سلسلہ میں طرح طرح کی پیش آتی ہیں، سب پر مستزاد زبانوں کا اختلاف، وہ ان کی نہیں سمجھتے یہ اُن کی نہیں، بڑے بڑے حلیم و عفیف بھی دامنِ صبر و ضبط چھوڑ بیٹھتے ہیں، رشک و منافقت، بدنظری و بدکاری، نزاع و جدال کے موقع قدم قدم پر رکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ حکیمِ مطلق کی حکیمانہ نگاہ نے رَفث اور فسوق اور جدال سب کی تصریحاً اور تاکیداً ممانعت کرکے کمزور بندوں کے حق میں کیا خوب انتظام کر دیا ہے۔ محققین نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ فقرہ کے آخر میں یعنی فِي الْحَجِّ" میں جو بجائے ضمیر کے اصل اسم لایا گیا ہے یہ تعظیم و تاکید کے لئے ہے۔

الاظہار فی مقام الاضمار لاظہار کمال الاعتناء بشانہ۔ (روح)

**۷۳۲ؑ** (اور وہ اسی کے مطابق صلہ بھی دے گا۔)

حاجیوں کے اعمالِ خیر کی تشویق و رغبت افزائی کے لئے یہ بہترین و مؤثر ترین یاد دہانی ہے، اللہ کے عالمِ کل و عالمِ جزئیات ہونے کا پورا استحضار رکھو، اہلِ جاہلیت کی طرح کہیں اس تذبذب میں نہ پڑ جاؤ کہ ہمارے فلاں فلاں عملِ خیر کا صلہ ملے یا نہ ملے، علمِ الٰہی میں وہ آئے بھی، یا آنے سے رہ جائے، مومن کے لئے تو بڑی سی بڑی ہمت بھی اسی عقیدہ کا استحضار پیدا کر سکتا ہے کہ خفی سے خفی باریک سے باریک نیکی بھی عالم الغیب کی نظر سے مخفی نہیں، اطباء یونانی موسمِ بہار میں مصفّیات پلاتے ہیں، اور جاڑے کے زمانہ میں مقوّیات استعمال کراتے ہیں کہ ان موسموں کو ان دواؤں کے ساتھ خاص مناسبت ہے ۔۔۔ رمضان کا مہینہ اور حج کا موسم بھی روحانیت کے عالم میں اپنی صحت بخش آب و ہوا کے لئے ممتاز ہیں، تو طبیبِ حقیقی اِن موسموں میں اعمالِ خیر کی طرف خصوصی توجہ کیسے نہ دلاتا!

**۷۳۳ؑ** جب ارادۂ حج سے نکلا کرو۔

اس ہدایت کی قدر اس وقت ہو گی جب جاہلی قوموں کے زائرین کی ذہنیت پر نظر ہو خصوصاً جاہلیتِ عرب کی تاریخ پر، آج بھی ہندوستان میں کتنی ہی قومیں ایسی ہیں، جو تیرتھ جاترا کے وقت گھر سے مُفلس و تہیدست نکلنا ہی اپنی

# التَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

تقویٰ ہے ۷۳۴ اے اہل فہم میرا ہی تقویٰ اختیار کئے رہو ۷۳۵

روحانیت کا کمال سمجھتے ہیں! راستہ میں مانگتے ہوئے جائیں گے، کوئی دوسرا انہیں کھلا پلا دیا کرے گا، یہ اپنے فقیر ہونے پر فخر کریں گے، اس قسم کے سارے تخیلات واوہام اسلام نے مٹادیے اور حکم دیا کہ جب گھر سے حج و زیارت کے لئے نکلو تو ضرورت بھر کا روپیہ پیسہ لے کر نکلو، راستہ میں دوسروں پر بار بننے کی کوشش نہ کرو۔

عرب جاہلیت میں یہ مرض اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، بلکہ بعض گروہوں کو تو یہ غلو تھا کہ احرام پہننے کے بعد جو کچھ سرمایہ ہوتا تھی اُسے بھی پھینک دیتے!

کانوا یحجون بغیر زاد وکان بعضھم اذا احرم رمی بما معہ من الزاد (ابن جریر) کان اھل الیمن یحجون ولا یتزودون ویقولون نحن المتوکلون فاذا قدموا مکۃ سألوا الناس (بخاری عن ابن عباسؓ) طائفۃ من العرب کانت تجیء الی الحج بلا زاد ویقول بعضھم کیف نحج بیت اللہ ولا یطعمنا فکانوا یبقون عالۃ علی الناس۔ (قرطبی)

اسلام ایسے دستور کا جو جھوٹی اور نمائشی روحانیت پر مبنی تھا، اور ایک طرف شخصی غیرت وخودداری کے بھی منافی تھا، اور دوسری طرف معاشیات اجتماعی پر ایک خواہ مخواہ کا بار تھا، کیسے روادار ہو سکتا تھا، اور اسے کیونکر باقی رہنے دیتا۔

تَزَوَّدُوْا کے صیغۂ امر سے فقہاء نے نکالا ہے کہ زاد راہ لینے کا وجوب آیت سے بقاعدۂ عبارت النص ثابت ہے، فقہاء نے یہ بھی صاف لکھ دیا ہے کہ آیت اُن "توکل پیشہ" صوفیہ کے مذہب کی بھی تردید کر رہی ہے جو کسب معاش کو چھوڑ بیٹھے ہیں، اور اُسے کوئی بڑا روحانی کمال سمجھ رہے ہیں۔

ھذا یدل علی بطلان مذھب المتصوفۃ الذین یتسمون بالمتوکلۃ فی ترکھم التزود والسعی فی المعاش (جصاص) ھم المقصرون عن درجۃ التوکل الغافلون عن حقائقہ۔ (ابن العربی۔ قرطبی)

ابن جوزیؒ کی تلبیس ابلیس میں ہے کہ:۔

وقد لبس ابلیس علی قوم یدعون التوکل فخرجوا بلا زاد وظنوا ان ھذا ھو التوکل وھم علی غایۃ الخطاء۔ (الباب الثامن)

کچھ لوگوں پر ابلیس نے تلبیس ڈالی تو وہ توکل کے دعویدار ہو کر بلا زاد سفر لئے چل دیتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ یہی عین توکل ہے حالانکہ وہ شدید غلطی پر ہیں۔ (باب فی تلبیسہ علی العباد فی العبادات)

۷۳۵ (خصوصاً گداگری اور دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنے سے احتیاط)

ای اتقوا الاستطعام وابرام الناس والتثقیل علیھم (کشاف) فان خیر زادھما تکفون بہ وجوھکم عن السوال (کبیر) ای الاتقاء عن الابرام والتثقیل علیھم (مدارک)

زائروں اور حاجیوں کی گداگرانہ عادت اور جھوٹے توکل کو خاص طور پر روکنا تھا، اس لئے حکم تزودوا کے بعد مزید تاکید کے لئے یہ تصریح اور بڑھا دی، ابھی ارشاد ہوا تھا کہ مصارف سفر کا انتظام کر کے چلو اب ارشاد ہو رہا ہے کہ بڑا انتظام یہی ہے کہ راہ میں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا اور دوسروں کے لئے باعث گرانی نہ بننا پڑے۔

## لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّکُمۡ ؕ

تمہیں اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو ۳۶ے۔

فقہاء نے لکھا کہ زاد سے جب زادِ راہ اور زادِ عمل دونوں مراد ہو سکتے ہیں، تو واجب یہی ہے کہ دونوں کا اہتمام والتزام رکھا جائے۔

لما احتملت الأیة الامرین من زاد الطعام وزاد التقویٰ وجب ان یکون علیھما اذ لم تقم دلالة علی تخصیص زاد من زاد۔ (جصاص)

قرطبی نے ایک حکایت حضرت امام احمدؒ سے متعلق نقل کی ہے کہ ایک شخص نے ان کی خدمت میں آکر کہا کہ میرا ارادہ مکہ معظمہ کی حاضری کا ہے، بغیر کسی زادراہ کے محض توکل پر، آپ نے پوچھا، تنہا یا قافلہ کے ساتھ، اس نے کہا قافلہ کے ساتھ، آپ نے فرمایا تو تمہارا توکل قافلہ والوں کے سامان پر ہے۔

**۷۳۵ے** (ان احکام کی تعمیل کے باب میں)

اس اہم حکم کے بعد تقویٰ الٰہی کی تاکید اس کی دلیل ہے کہ اسلام صرف احکام کی ظاہری تعمیل کو کافی نہیں سمجھتا، بلکہ چاہتا ہے کہ بندوں کی اصلاح باطن سے ہو جو بھی نیک عمل انسان کرے وہ صرف اعضاء و جوارح سے نہیں بلکہ ضمیر اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ۔

**۷۳۶ے** بہ سلسلۂ سفرِ حج۔

اسلام جس طرح فلاحِ اُخروی کا ضامن ہے، فلاحِ دنیوی کا بھی داعی ہے، اور اس کی یہ جامعیت اس کی ہر عبادت سے بالکل صاف ظاہر ہو رہی ہے، وضو، نماز، نمازِ باجماعت، روزہ، زکوٰۃ سب روح کو جِلا دینے اور باطن کو صیقل کرنے کے ساتھ ساتھ دنیوی، مادی، جسمانی، معاشی فائدوں اور مصلحتوں سے کتنے لبریز ہیں! یہی اصول حج کے بارے میں بھی کام کر رہا ہے، حج کا منزل در منزل سفر، بری و بحری طویل سفر، اور امت کے مختلف طبقوں کا دنیا کے مختلف گوشوں سے یہ عظیم الشان اجتماع ایک خشک عبادت اور محض ذکرِ الٰہی کے لئے نہیں، فرد و ملت دونوں کے لئے یعنی انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے فائدے اس سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اور کئے جانے چاہئیں — حج کے روحانی اسرار و حقائق کا ادراک تو فرنگی دماغوں کے لئے آسان نہیں، لیکن اس "بین الاقوامی سالانہ کانگریس" سے جو سیاسی، ملی، اجتماعی ہر قسم کے فائدے وابستہ ہیں اور اس "بین الاقوامی سالانہ بازار" سے جو مالی، تجارتی، معاشی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اور ان کا اعتراف تو فرنگیوں کی زبان سے بھی بارہا ہو چکا ہے — یہاں خاص طور پر توجہ اس سفر و اجتماع کے معاشی و تجارتی پہلو پر دلائی ہے اور جو رکاوٹ ایک خالص دیندار شخص کو ان فوائد کے حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے، اُسے دُور کر دیا ہے۔

فَضۡلًا۔ سب کا اتفاق ہے کہ فضل سے یہاں مُراد مال اور نفعِ تجارت ہے۔

یعنی المال وما یکتسب (راغب) ھو النفع والربح بالتجارۃ (کشاف)

لوگوں کا غلو اس باب میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ جو تاجر مالِ تجارت لے کر منیٰ اور مکہ کے بازاروں کے لئے جاتے، یا جو اونٹ والے اپنے اونٹ مزدلفہ، عرفات و منیٰ کے لئے لے جاتے، سمجھا جاتا تھا کہ ان کا حج ہی نہیں ہوتا کہ جہاں

فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪

پھر جب تم جوق در جوق عرفات سے واپس ہونے لگو ۳۷۔ تو اللہ کا ذکر مشعر حرام کے پاس کرلیا کرو ۳۸۔

تجارت آگئی، وہاں عبادت کا وجود کہاں باقی رہا، قرآن مجید نے اس مغالطۂ عامۃ الورود کی تردید کردی۔

نزلت ردًا علی من یقول لا حج للتجار والاجراء والجمالین (کبیر) فی ھذا دلیل جواز التجارۃ فی الحج للحاج مع اداء العبادۃ ولا یخرج بہ المکلف عن رسم الاخلاص للمفترض علیہ (ابن العربی) بل علی ان الحج لا یمنع التجارۃ وعلی ھذا امر الناس من عصر النبی علیہ السلام الی یومنا ھذا فی مراسم منیٰ ومکۃ فی ایام الحج۔ (جصاص)

ابن عباسؓ صحابی سے لے کر حسن، عطاء، مجاہد، قتادہ وغیرہ تابعین تک بلا اختلاف سب سے یہی تفسیر مروی ہے۔

روی نحو ذلک من جماعۃ من التابعین منھم الحسن وعطاء ومجاھد وقتادۃ ولا نعلم احدا روی عنہ خلاف ذلک (جصاص)

صرف ایک روایت کسی حد تک اس سے مخالف ملتی ہے لیکن محققین نے تصریح کردی ہے کہ وہ ظاہر قرآن واجماع عام دونوں کے منافی ہے۔

ھذا قول شاذ خلاف ما علیہ الجمھور وخلاف ظاھر الکتاب۔ (جصاص)

مِنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی حسب تقدیر الٰہی۔

بات بات میں بات پیدا کرنا قرآن مجید کا تو ایک مستقل اعجاز ہے، یہ ذرا سا لفظ لا کر یاد دلا دیا کہ اس نفع وتجارت کو بھی اپنے قوتِ بازو کا ثمرہ نہ سمجھ لینا، جو کچھ بھی حاصل ہو گا سب کو کارسازِ حقیقی ہی کے لطف وکرم کا ثمرہ سمجھنا، نظر تجارت وکاروبار میں بھی ہر وقت اسی پر رہے، اس ہدایت پر عمل کے بعد تجارت کی کوئی بڑی سی بڑی مشغولیت بھی تجارت باقی رہ سکتی ہے؟ تجارت اس حال میں اگر عبادت نہ بن جائے تو آخر کیا ہو۔

۳۷۔ (۹ ذی الحجہ کی شام کو عرفات میں وقوف اور ادائے آدابِ وقوف کے بعد)

حج کے اعمال (واجبات، سنن و مستحبات) تو بہت سے ہیں لیکن فرض تین ہی ہیں، احرام پوشی ۹ ذی الحجہ کو عرفات میں حاضری یا وقوف اور طوافِ فرض، ان تینوں ارکان میں بھی اہم ترین رکن یہی وقوفِ عرفات ہے۔

اَفَضْتُمْ۔ افاضہ کے لفظی معنی، انبوہ در انبوہ چلنے یا واپس ہونے کے ہیں۔

ای دفعتم منھا بکثرۃ (راغب) الافاضۃ الاندفاع فی السیر بکثرۃ۔ (کبیر)

اصطلاحِ فقہ میں اِفاضہ عرفات سے مزدلفہ جانے کو کہتے ہیں۔

عَرَفٰت۔ مکہ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل کے رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان پڑتا ہے، اور اس کا نام عرفات ہے اسی نام کی ایک پہاڑی بھی اسی میدان میں واقع ہے، سطح زمین سے کوئی ۲۰۰ گز بلند، سال بھر یہ میدان بالکل سنسان پڑا رہتا ہے، صرف ایک دن ۹ ذی الحجہ کو اس کی پوری کسر نکل آتی ہے، اس روز یہ میدان انسانوں اور ان کی سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے، حاجیوں کو ۸ ذی الحجہ کی دوپہر تک منیٰ میں آجانا چاہئے اور ۹ کی صبح کو بعد اشراق قافلے عرفات کے لئے روانہ ہوجائیں تاکہ ۸-۹ میل

وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ ۚ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ ﴿١٩٨﴾

اور اس کا ذکر اس طرح کرو جیسا اُس نے تمھیں بتایا ہے ۷۳۹ اور اس سے قبل تم یقیناً محض ناواقفوں میں تھے ۷۴۰

درمیانی فاصلہ دوپہر تک طے ہو جائے، دوپہر سے لے کر آخر وقت عصر تک اسی میدان میں رہنا چاہئے، اور اسی کا اصطلاحی نام وقوف ہے یہی حاضری اعمالِ حج کی جان ہے، اور یہ سارا وقت توبہ و استغفار، عبادت، انابت ہی میں صرف ہونا چاہئے قریب غروب مُزدلفہ (مشعر الحرام) کے لئے کوچ ہونا چاہئے، اور جس طرح آج ظہر کے ساتھ عصر کی نماز (بہ قاعدۂ تقدیم) عرفات کی مسجد نمرہ میں ملا لی گئی تھی اسی طرح آج مغرب کی نماز (بہ قاعدۂ تاخیر) عشاء سے ملا کر اُس وقت پڑھی جائے گی جب قافلے مُزدلفہ پہونچ جائیں۔

۷۳۸ اَلْمَشْعَرَ الْحَرَامِ۔ مشعر کے لفظی معنی نشانی یا علامت کے ہیں، اور حرام یعنی محترم یا مقدس اس کی تعظیمی صفت ہے، نام اس خاص مقام کا بھی ہے جو مُزدلفہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ہے، اور خود سارے مُزدلفہ کو بھی مشعر الحرام کہتے ہیں۔

لم یختلف اھل العلم ان المشعر الحرام ھو المزدلفة (جصاص) والمشھور ان المشعر مزدلفة کلھا۔ (روح)

مُزدلفہ مکہ سے کوئی چھ میل کے فاصلہ پر ہے منیٰ سے عرفات جانے کا ایک تو سیدھا راستہ ہے، حاجی ۹ کو عرفات جاتے اسی راستہ سے ہیں، واپسی میں حکم ہے کہ دوسرے راستہ سے لوٹیں یہ ذرا چکر کا ہے، اور مُزدلفہ اسی راستہ میں پڑتا ہے حاجیوں کے قافلے شب ۱۰ کے اول حصہ میں یہاں پہونچ جاتے ہیں اور رات یہاں تسبیح و تہلیل نماز و استغفار میں گزارتے ہیں مسجد پہاڑی کے اوپر ہے

جبل یقف علیه الامام وانما سُمّی مشعرا لانه معلم العبادة ووصف بالحرام لحرمته۔ (بیضاوی)

عِندَ الْمَشْعَرِ یعنی اس مسجد کے گرد و پیش خصوصیت کے ساتھ، اور یوں تو سارا مُزدلفہ (بجز وادی محسر کے) متبرک و محترم ہے

خص اللّٰه تعالیٰ الذکر عنده مع انه مامور به فی جمیع المزدلفة لانها کلها موقف لمزید شرفه وفضله (روح)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ نے یاد دلا دیا کہ یہ رات رنگ رلیاں منانے کی نہیں، جاہلی قوموں کے میلوں ٹھیلوں کی طرح روشنی و آتشبازی کے لئے نہیں، خوابِ غفلت میں پڑے رہنے کے لئے نہیں، فخریہ قصیدوں اور شعر و شاعری میں صرف کرنے کے لئے نہیں، ذکر و عبادتِ الٰہی کے لئے ہے۔

۷۳۹ (اپنے رسول کے ذریعہ سے، اور انسان کے اختراعی طریقوں سے بچو)

الحاد و انکار سے بڑھ کر دین و مذہب کے دائرہ میں آجانے کے بعد پھر جو خطرہ اہلِ مذہب کو شیطان کے ہاتھوں سب سے بڑھ کر درپیش رہتا ہے، وہ بدعات و محدثات کا ہے، انسان اپنے دل سے طرح طرح کے طریقے عبادت و ذکر الٰہی کے ایجاد کرتا رہتا ہے اور انھیں مذہب میں داخل کرتا رہتا ہے حالانکہ دین صرف وہ ہے جو شارع ؑ اللہ کی طرف سے پہونچائے یا اپنے اجتہاد سے بتائے یہاں اگر ایک طرف اس کی تاکید ہے کہ برابر یادِ الٰہی میں لگے رہو تو دوسری طرف اسی کی بھی صراحت ہے کہ اس یاد کے طریقے اپنے ایجاد کردہ نہ ہوں، اللہ اور اللہ کے رسول ؐ ہی کے بتائے ہوئے ہوں، حکم ذکر کی تکرار تاکید کے لئے ہے۔

کرّرہ الامر تاکید ا (قرطبی) کرّر علیٰ سبیل التوکید والمبالغة فی الامر بالذکر۔ (بحر)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلا حکم مشعر الحرام میں ذکر کرتے رہنے کے لئے ہو، اور دوسرا حکم اہتمامِ اخلاص کے لئے ہو۔

قیل الاول امر بالذکر عند المشعر الحرام والثانی امر بالذکر علیٰ حکم الاخلاص۔ (قرطبی)

۷۴۰ (عبادت اور ذکرِ الٰہی کے صحیح طریقوں سے)

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ ۚ

ہاں تو تم وہاں جاکر واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں ۷۴۱ اور اللہ سے مغفرت طلب کرو،

إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٩٩﴾

بے شک اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے ۷۴۲

ضَالّ ہمیشہ گمراہ ہی کے معنی میں نہیں آتا، ناواقف کے معنی میں بھی آتا ہے، اور ضلال سے مراد احکامِ الٰہی سے ناواقفیت ہوسکتی ہے۔

الضلال ضربان ضلال فی العلوم النظریۃ وضلال فی العلوم العملیۃ کمعرفۃ الاحکام الشرعیۃ التی ھی العادات۔ (راغب)

اور یہاں یہی مراد ہے۔

والمراد من الضلال الجھل بالایمان ومراسم الطاعات (روح)

اِنْ یہاں اِنَّ کے معنی میں تحقیق وتوثیق کے لئے ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ قَدْ کے مرادف ہے۔

ای وانکم کنتم (روح) ان ھنا عند البصریین التی للتوکید المخففۃ من الثقیلۃ (بحر) وان مخففۃ من الثقیلۃ۔۔۔۔ او بمعنی قد (قرطبی)

مِنْ قَبْلِهٖ میں ضمیر ہٖ، ھُدیٰ کی طرف راجع ہے، جو ھَدٰکُمْ سے مفہوم ہوتا ہے۔

والھاء فی قبلہ عائدۃ علی الھدی المفھوم من قولہ ھداکم (بحر) عائد الی الھدی وقیل الی القرآن (قرطبی)

۷۴۱ یعنی عرفات سے، قریش کے گڑھے ہوئے عقیدوں میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہمیں حج میں عرفات کی حاضری کی کیا ضرورت ہے، وہاں تک سب کے ساتھ جانا ہماری عُلُوِّ شان کے منافی ہے ہمارے لئے مزدلفہ تک جانا کافی ہے۔

کانت قریش ومن دان دینھا یقفون بالمزدلفۃ وکانوا یسمون الحمس وکانت سائر العرب یقفون بعرفات (صحیح بخاری عن عائشۃ رضی اللہ عنہا) کانت قریش ومن کان علی دینھا وھم الحمس یقفون بالمزدلفۃ یقولون نحن قطین اللہ (ابن جریر عن عائشۃ) کانوا یقولون لا نخرج من الحرم فکانوا لایشھدون وقف الناس بعرفۃ معھم (ابن جریر) کانوا یقولون نحن قطین اللہ فینبغی لنا ان نعظم الحرم ولا نعظم شیئا من الحل (قرطبی)

آیت انھیں کی اصلاح کے لئے ہے۔

اَلنَّاسُ۔ سے مراد جنس انسان ہے۔

المراد من الناس الجنس کما ھو ظاھر۔ (روح)

ثُمَّ۔ یہاں تاخیرِ زمانی کے لئے نہیں فصل کلام کے لئے ہے یعنی ایک بات ختم ہوئی، اب دوسری ہدایت سنو، جیسے اُردو میں ایسے موقع پر "اچھا تو" یا "ہاں تو" کہتے ہیں۔

ثم لیست فی ھذہ الآیۃ للترتیب وانما ھی لعطف جملۃ کلام ھی ھٰھنا منقطعۃ (قرطبی)

ثم للترتیب فی الذکر لا للترتیب فی الزمان الواقع فیہ الافعال۔ (نہر)

۷۴۲ (تو آج عرفہ کے دن تو اس کی شانِ غفوریت ورحیمیت کا ظہور اور سب دنوں سے زیادہ ہو کر رہے گا)

فَاِذَا قَضَیْتُمْ مَّنَاسِکَکُمْ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا ؕ

پھر جب تم اپنے مناسک ادا کر رہے ہو ۷۴۳ تو اللہ کی یاد کرو اپنے باپ دادوں کی یاد کی طرح بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو ۷۴۴

وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ حدیث صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں یَوْمَ عَرَفَۃَ سے زیادہ بندے آگ سے آزاد کئے جاتے ہوں۔

حج کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے، دیکھتے آیئے تزکیۂ قلب کا قدم قدم پر کس درجہ اہتمام ہے، حرم شریف نہیں، حدودِ حرم بھی ابھی منزلوں فاصلہ پر ہیں کہ ساری عمر کا مالوف و مانوس لباس جسم سے اتر گیا، اور اب نہ سر پر ٹوپی ہے نہ کسی قسم کی پگڑی صافہ، اور جسم پر نہ شیروانی ہے نہ کوٹ نہ عبا نہ قمیص، شاہ و گدا، رئیس و رعایا، حکام و عوام سب کے سب دو دو چادروں میں ملبوس! پھر احرام پہنتے ہی جو چیزیں حرام تھیں ان کا ذکر ہی نہیں، جو ہمیشہ حلال تھیں، اور فی نفسہ جائز ہیں، ایک خاصی طویل مدت کے لئے بالکل ممنوع! کتنی ہی مرغوبات و مالوفات سے اس درمیان میں دست برداری کرنی ہوتی ہے، یہ سب بھی کافی نہیں گھڑی گھڑی لبیک کہتے رہو، اللہ کے دربار میں حاضری بولتے رہو، مسلسل ذکرِ الٰہی کرتے رہو، اور اب یہ حکم مل رہا ہے کہ خطاؤں کو گناہوں کو، سیہ کاریوں کو یاد کر کے ان سے معافی چاہتے رہو — اتنے پاکیزہ، ایسے ستھرے اس قدر اصلاحی اجتماع سے دنیا جہان کے میلوں ٹھیلوں، بت پرستانہ، وطن پرستانہ، وہم پرستانہ، ہوس پرستانہ میلوں تہواروں کو کوئی بھی مناسبت ہے؟ ع

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو!

کیا صریح ظلم وہ اہلِ قلم خود اپنی بصارت و بصیرت پر کرتے ہیں، جو اسلام کو دوسرے ادیان و مذاہب کی سطح پر سمجھے ہوئے ہیں!

غَفُوْرٌ آیت کے آخر میں یاد دلا دیا کہ تمہارے رب کی صفتِ غفر بہت بڑی ہے، اس سے مغفرت طلب کر کے دیکھو تو، طالبینِ مغفرت کی مغفرت وہ کیوں نہ کرے گا؟

رَّحِیْمٌ اور ساتھ ہی اس کی صفت رحمت بھی تو بے پایاں ہے، طالبانِ مغفرت کے ساتھ وہ رحمت کا معاملہ کیوں نہ کرے گا؟

۷۴۳ (اور ابھی منیٰ سے منتشر نہیں ہوئے ہو)

عرفات و مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام تین دن۔ ۱۰ / ۱۱ / ۱۲ ذی الحجہ کو لازمی ہے اور بعض ائمۂ فقہ کے نزدیک ۱۳ کو بھی اِذَا کے لفظ سے دھوکا نہ ہو کہ یہاں حکم ادائے مناسک کے بعد کے لئے مل رہا ہے، اِذَا ہمیشہ بعد کے لئے نہیں آتا ہے، ہم زمانی کے موقع پر بھی قرآن مجید میں آیا ہے مثلاً فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا جہاں اس کے معنی ہیں کہ جب تم نماز پڑھتے ہو (نہ یہ کہ جب تم نماز ختم کر چکو) اسی طرح یہاں بھی معنی یہ ہیں کہ جب تم ادائے مناسک کر رہے ہو۔

مَنَاسِکَکُمْ۔ مناسک شعائرِ حج کو کہتے ہیں۔

قیل ھی شعائر الحج (قرطبی) النسک العبادۃ المختص بأعمال الحج والمناسک مواقف الحج واعمالھا۔ (راغب)

قَضَیْتُمْ۔ قضا کے معنی کسی عبادت کے ادا کر چکنے یا بجا لانے کے ہیں۔

قضیتم ھنا بمعنی ادیتم و فرغتم (قرطبی) قضاء المناسک ھو فعلھا علی تمام (جصاص)

۷۴۴ قومی عظمت و قومی خودداری، نسلی مفاخرت جس طرح جدید جاہلی تہذیب کا عنصرِ اعظم ہیں، عرب کے بھی

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِى

اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا (ہی) میں دے دے ۴۲۵ اور ایسے شخص کا

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِى

آخرت میں کوئی حصہ نہیں ۴۲۶ اور کوئی ان میں ایسے ہوتے ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو

الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

دنیا میں (بھی) بہتری دے اور آخرت میں (بھی) بہتری، اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچائے رکھنا ۴۲۷

دینِ جاہلی کے رکنِ اعظم تھے، عرب جب منیٰ میں جمع ہوتے تو ہر قبیلہ اپنے قبائل کی جے پکارتا اور اپنے بزرگوں کے مفاخر و مناقب کے پُرزور بیان سے دلوں کو گرماتا۔

کان اھل الجاھلیۃ یجلسون بعد الحج فیذکرون ایام اٰباءھم (ابن عباس) کان القوم فی جاھلیتھم بعد فراغھم من حجھم ومناسکھم یجتمعون فیتفاخرون بمآثر اٰباءھم (ابن جریر)

کَذِکْرِکُمْ اٰبَاءَکُمْ۔ مسلمانوں کو حکم ملتا ہے کہ یہی جوش و خروش تم اللہ کے ذکر میں دکھاؤ، تمہاری نہ کوئی قوم ہے، نہ کوئی نسل، نہ تمہارا کوئی وطن، تم ان سب کے بدلے اللہ کی عظمت دلوں میں بٹھاؤ، بساؤ، اور اللہ کا نام زبانوں پر لاؤ۔

اَوْ۔ یہاں تخییر کے لئے نہیں بلکہ ترقی کا مفہوم دے رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ حق تعالٰی کے ساتھ ربط و تعلق کم سے کم اس درجہ کا تو رکھو جتنا اپنے خاندان، اپنے قبیلے، اپنی قوم کے ساتھ رکھتے ہو، بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر۔

قیل بمعنی بل (بحر)

اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا۔ مولانائے رومیؒ نے اسی کو اپنی شاعرانہ و عاشقانہ زبان میں یوں ادا کیا ہے ؎

عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود  گوئے گشتن بہرِ اُو اولیٰ بود

۴۲۵ دنیا میں ایسی بھی قومیں ہیں جو خدا کی قائل ہوتی ہیں، اُسے معبودِ اعظم سمجھتی ہیں، لیکن حشر و نشر، جزا و سزا کی قائل نہیں، ایسے لوگوں کی دعائیں، التجائیں، تمنائیں قدرۃً اسی مادّی دنیا کی ترقیوں تک محدود رہتی ہیں، مشرکینِ عرب کے عقیدے بھی اسی قسم کے تھے، اور یہ لوگ جب دعا بھی مانگتے تھے تو تمام تر سامانِ دنیوی اور دشمن پر فتح و نصرت وغیرہ کی، ابن زید، سُدّی وغیرہ تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

المراد المشرکون، قال ابو وائل والسدی وابن زید کانت العرب فی الجاھلیۃ تدعو فی مصالح الدنیا فقط فکانوا یسئلون الابل والغنم والظفر بالعدو ولا یطلبون الاٰخرۃ۔ (قرطبی)

مَنْ یَّقُوْلُ سے یہ لازم نہیں کہ دعائیں بالکل انہیں الفاظ کے ساتھ کی ہی گئی ہوں، "قول" کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے، تمنا کرنا، زبانِ حال سے کہنا، دل میں خیال لانا سب اس میں شامل ہیں۔

۴۲۶ وہی آخرت جس کے تسلیم کرنے سے عمر بھر انکار رہا۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ۷۴۸ حصہ ملے گا، بعوض اس کے جو انھوں نے عمل کر رکھا ہے اور اللہ حساب بہت جلد لے گا ۷۴۹

اذ کانوا لایعرفون ولا یؤمنون بها۔ (قرطبی)

۷۴۷ یہ اشارہ انسانیت کے پسندیدہ طبقہ یعنی اہل ایمان کی جانب ہے۔ مومنین کی دعائیں، مناجاتیں آرزوئیں، دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی جامع ہوتی ہیں۔

حَسَنَةً۔ وہ چیز ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ و بہتر ہے، اور اس کے اندر ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی۔

ان حسنة نكرة في بيان الدعاء فهو محتمل لكل حسنة من الحسنات على البدل (قرطبی) والحسنة الكاملة في الدنيا ما يشمل جميع حسناتها۔ (روح)

دنیا میں حَسَنَةً توفیق خیر ہوئی، اور آخرت میں حَسَنَةً ثمرۂ خیر۔

والذی علیه اکثر اهل العلم ان المراد بالحسنتین نعم الدنیا والآخرة وهذا هو الصحیح فان اللفظ یقتضی هذا کله۔ (قرطبی)

دعا کی بے نظیر جامعیت بالکل ظاہر ہے۔

هذه الآية من جوامع الدعاء التي عمت الدنيا والآخرة۔ (قرطبی)

ایسی جامع و ہمہ گیر دعا کی نظیر سے ادیان و ملل کے صحیفے خالی ہیں، رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم خود اس دعا کی کثرت رکھتے تھے

كان اكثر دعوة يدعو بها النبي صلى الله عليه وسلم يقول اللهم اتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار۔ (بخاری ومسلم عن انس)

مال، اولاد، صحت، اطمینان وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیل خیر میں معین ہو سکتی ہیں، خواہ بظاہر کیسی ہی دنیوی اور مادی ہوں، سب مومن کا مقصود و مطلوب بن سکتی ہیں، البتہ خود دنیا ہرگز کسی مومن کا مدعا و مقصود نہیں بن سکتی، آیت کی ترکیب نحوی پیش نظر رہے۔

اٰتِنَا کا مفعول صرف حَسَنَةً ہے یعنی جس چیز کی طلب و تمنا کی جا رہی ہے وہ حَسَنَةً یا بہتری ہے فِي الدُّنْيَا اور فِي الْآخِرَةِ صرف ظرف یا محل ہیں، ترتیب میں یہ مفعول یا معنی کے لحاظ سے مقصود کسی طرح بھی نہیں ہو سکتے مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے صرف بھلائی یا بہتری درکار ہے، دنیا میں بھی ہو تو بھی اور آخرت میں ہو تو بھی، مزید تفسیر یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمال خیر عنایت ہوں، اور آخرت میں ثمرات خیر۔

بعض سطحی دماغ والے اہل قلم نے آیت سے یہ عجیب و غریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مومن کا مقصود بن سکتی ہے بلکہ قرآن خود طلب دنیا کی تعلیم و ترغیب دیتا ہے — تعالی اللہ علوا کبیرا۔ مغالطہ کی قلعی اوپر کھولی جا چکی ہے، مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پسندی سے مرعوب ہو کر خود مسلمانوں کو طلب دنیا کی تعلیم دینا بلکہ اسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمت اسلام کی عجیب و غریب صورت ہے!

۷۴۸ (دونوں جہانوں میں، اور یہ گمراہ قوموں کی طرح بے بہرہ نہ رہیں گے۔)

۷۴۹ (اور یوم حساب خود ہر لحظہ قریب آتا جا رہا ہے، پس اس سے غفلت ہرگز مقتضائے عقل و دانش نہیں)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ

اور اللہ کو (ان چند) گنے ہوئے دنوں میں (برابر) یاد کرتے رہو ۷۵۰ جو شخص (ان) دو دنوں میں جلدی کرے

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ

اس پر (بھی) کوئی گناہ نہیں، اور جو تاخیر کرے اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں ۷۵۱ (یہ) اس کے لئے ہے جو ڈرتا رہتا ہے ۷۵۲

مِمَّا كَسَبُوْا میں مِنْ سببیہ ہے۔

ای من اجل ما کسبوا (بحر) من اجلہ (بیضاوی)

سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ اُس جیسے قدرتِ کاملہ کے مالک کو حساب کرتے یا بندوں کو اُن کے اعمال کی جزا دیتے دیر ہی کیا لگ سکتی ہے۔

ای سریع المجازاۃ للعباد باعمالھم (قرطبی)

جاہلی قوموں نے اس وصف خاص میں بھی اپنے دیوی دیوتاؤں کے باب میں بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔

**۷۵۰** یعنی ایامِ تشریق میں، زمانۂ قیامِ منیٰ میں۔

منیٰ مکہ معظمہ سے شمال و مغرب میں ۴ میل کے فاصلہ پر ہے، پہلے کبھی محض میدان تھا، اب بہت سی پختہ اور عالی شان عمارتیں بن گئی ہیں، سال بھر تو خالی پڑی رہتی ہیں، موسمِ حج میں خوب آباد ہو جاتی ہیں، صاحبِ حیثیت حاجی انھیں بڑے بڑے کرایوں پر لے لیتے ہیں، بعض سرکاری عمارتیں ہیں، بازار بھی اس زمانہ میں یہاں بہت بڑا اور بہت پُر رونق لگتا ہے، دنیا جہان کی چیزیں بکنے آجاتی ہیں۔

تشریق کے معنی قربانی سکھانے کے ہیں، ایامِ تشریق۔ ۱۰، ۱۱، ۱۲ رذی الحجہ ہیں، حاجیوں کے قافلے عرفات و مزدلفہ سے واپسی میں ۱۰ کو صبح یہاں پہونچ جاتے ہیں، اور ۱۲ رکی شام تک تو بہر حال یہاں قیام رہتا ہے، حج کے سلسلہ میں متعدد واجبات، سُنن و مستحبات یہیں انجام پاتے ہیں، مثلاً قربانی کرنا، سر کے بال اتروانا، شیطانوں کو کنکریاں مارنا، جامۂ احرام اتارنا۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ۔ ادھر حج کا بیان آیا، اُدھر ذکرِ الٰہی کی تاکید پھر شروع ہو گئی، تکبیر کی کثرت قیام زمانۂ منیٰ کا ایک خاص جزو ہے۔

اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ اس پر صحابہ و تابعین سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مُراد زمانۂ تشریق ہے۔

لاخلاف بین اھل العلم ان المعدودات ایام التشریق وقد روی ذٰلک عن علی وعمر وابن عباس وابن عمر وغیرھم۔ (جصاص)

**۷۵۱** یعنی منیٰ سے مکہ معظمہ کی طرف روانگی کے لئے، دونوں صورتیں بالکل جائز ہیں، اب اگر کوئی شخص ۱۰ ر کے بعد صرف دو دن قیام کرکے ۱۲ رکی شام کو مکہ چلا آئے تو بھی درست ہے اور جس کا جی چاہے ۱۳ ر تک وہیں ٹھہر الہے، جب بھی درست ہے، امام شافعیؒ کے ہاں اگر ۱۲ ر کو واپس ہوتا ہے تو قبل غروب رمیِ جمرات (کنکریاں پھینکنے) سے فراغت کرلے، اور امام ابو حنیفہؒ کے ہاں اگر ۱۳ ر تک ٹھہرتا ہے تو قبل طلوعِ آفتاب ہی رمیِ جمرات کر ڈالے۔

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ نفی دونوں صورتوں سے گناہ کی کی گئی ہے گویا بہ لحاظ جواز دونوں شقیں یکساں ہیں، یہ مُراد نہیں کہ دونوں میں کوئی افضل و مفضول نہیں، اور بہ لحاظ درجہ بھی دونوں مساوی ہیں، فقہاءِ حنفیہ کے ہاں ۱۳ ر کا قیام افضل ہے

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَمِنَ النَّاسِ

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ تم (سب) اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے ۵۵۳ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے ۵۵۴

مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى

کہ اس کی گفتگو جو دنیوی غرض سے اچھی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اُس پر وہ اللہ کو گواہ

مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

لاتا ہے! درآں حالیکہ وہ شدید ترین دشمن ہے ۵۵۵

۵۵۲ یعنی یہ سب احکام نافع اسی کے حق میں ہو سکتے ہیں جو دل میں خوفِ خدا و خشیتِ الٰہی رکھتا ہو تقویٰ الٰہی کی اس تشدّد و مدّ سے تاکید یوں ہی اور بیکار نہیں، مومن کے دل پر تقویٰ کی اہمیت نقش کرنے کے لئے ہے، وہ مومن ہی کیا جو متقی نہ ہو۔

۵۵۳ (اور اُسی کے سامنے سارے اعمال کا جواب دِہ ہونا ہوگا۔)

یہ یاد دہانی حفظِ اعمال میں کس درجہ مؤثر ہے! سارا کھیل اسی استحضار ہی کا تو ہے۔

۵۵۴ (اُس کی چرب زبانی کی بنا پر، اس کے دعوئ اسلام و حُبِّ اسلام کے باعث)

اوپر دو قسم کے انسانوں کا ذکر تھا، آخرت کے قائلین و معتقدین کا اور آخرت کے منکرین و منافقین کا، اور ابتدا منافقین کے بیان سے ہوتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ۔ لازمی نہیں کہ ایک ہی شخص مراد ہو، ایک بھی ہو سکتا ہے، بہت سے بھی ہو سکتے ہیں۔

اشارۃ الٰی بعضھم فیحتمل الواحد ویحتمل الجمع۔ (کبیر)

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ فِیْ اظہارِ مقصودیت کے لئے ہے یعنی گفتگو سے مقصود اُسے محض حصولِ دنیا ہوتی ہے طلبِ آخرت نہیں۔

یطلب بہ حظا من حظوظ الدنیا (کشاف) لطلب مصالح الدنیا (کبیر)

فِیْ "باب میں" یا "درباره" کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس صورت میں معنی ہوں گے کہ "دنیوی امور سے متعلق"۔

ای ما یقولہ فی امور الدنیا واسباب المعاش (بیضاوی) درباب زندگانی دنیا (شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

شانِ نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ قبیلۂ ثقیف کا ایک شخص خوش منظر و خوش تقریر اخنس بن شریق نامی تھا، مجلسِ رسولؐ میں جب آتا تو خوب لمبے چوڑے دعوے اپنے ایمان و اسلام کے کرتا، بات بات پر خدا کو گواہ ٹھہراتا، لیکن جب مجلس سے اُٹھ کر چلا جاتا تو طرح طرح کی عملی شرارتوں میں لگ جاتا۔

نزلت فی اخنس بن شریق الثقفی (ابن جریر) کان رجلا حلو الکلام، حلو المنظر (معالم) کان منافقا حسن العلانیۃ خبیث الباطن (کبیر)

مگر شانِ نزول کی روایتوں سے یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ آیت کا انطباق صرف اسی خاص شخص تک محدود ہے، بلکہ جہاں کہیں بھی وہ صفات پائے جائیں گے، وہاں وہ آیت بھی چسپاں ہوگی۔

وَ اِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا وَ یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ

اور جب پیٹھ پھیر جاتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں رہتا ہے کہ زمین پر بگاڑ پیدا کرے اور کھیتی اور جانوروں کو تلف کرے ۵۵۵ ۵۵۶

القول الثانی فی الآیۃ وھو اختیار اکثر المحققین من المفسرین ان ھذہ الآیۃ عامۃ فی حق کل من کان موصوفا بھذہ الصفات المذکورۃ۔ (کبیر)

وقال قتادۃ ومجاھد وجماعۃ من العلماء نزلت فی کل مبطن کفرا ونفاقا وکذبا واضرارا وھو یظھر بلسانہ خلاف ذالک فھی عامۃ۔ (قرطبی)

۵۵۵ (اللہ کے دین کا، اللہ کے رسول ؐ کا)

یُشْھِدُ اللّٰہَ۔ یعنی آپ کو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے، قسم کا مفہوم بھی شہادت میں پیش کرنا ہوتا ہے،

یقول انی لاحبک ویحلف باللہ علی ذالک (معالم)

رسول سے علم غیب کلی کی نفی پر دلائل بہت سے قائم ہیں، ایک مزید دلیل اس آیت سے نکلتی ہے منافق کے نفاق کا علم آیت کے ذریعہ سے حق تعالیٰ آپ کو کرا رہا ہے، ورنہ آپ تو اس کی باتوں سے خوش ہو رہے تھے، اگر آپ اُسے منافق پہچان گئے ہوتے تو ظاہر ہے کہ اس سے گفتگو میں لطف ہی کیوں لیتے۔

۵۵۶ (جیسا کہ اخنس نے کیا بھی کہ قبیلۂ ثقیف کے کھیت جلوا دیے اور ان کے مویشیوں کو ہلاک کر ڈالا۔)

کما فعلہ الاخنس بثقیف اذ بیتھم واحرق زروعھم واھلک مواشیھم۔ (بیضاوی)

آیت اپنے حکم و تعبیر کے لحاظ سے عام ہے یعنی جو کوئی بھی ایسی حرکتیں کرے اس پر یہ صادق آئے گی۔

صارت عامۃ لجمیع الناس فمن عمل مثل عملہ استوجب تلک اللعنۃ والعقوبۃ (قرطبی)

وَاِذَا تَوَلّٰی۔ یعنی جب مجلس رسول سے اُٹھ کر چلا گیا۔

ای اذا خرج من عندک (ابن عباسؓ) ای ادبر واعرض (روح عن الحسن)

تَوَلّٰی کے دوسرے معنی "حاکم بن گیا" "حکومت پا گیا" کے بھی ہو سکتے ہیں اور کئے گئے ہیں یعنی جب وہ ملک میں حاکم و مسلط ہو جاتا ہے۔

قال مجاھد من الولایۃ ای صار والیا (بحر) ای ملک الامر وصار والیا (معالم عن الضحاک)

چوں ریاست پیدا کند (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) اور جب حاکم ہوتا ہے (شاہ رفیع الدین دہلویؒ)

لیکن نظم کلام و سیاق عبارت کے لحاظ سے ترجیح معنی اوّل کو ہے کہ نفاق پر روشنی یہی معنی لے کر پڑتی ہے۔

القول الاول اقرب الی نظم الآیۃ لان المقصود بیان نفاقہ (کبیر)

سَعٰی کے معنی ہیں سرگرم عمل ہونا، دوڑ دھوپ کرنا۔

السعی فی کلام العرب العمل (ابن جریر)

فِی الْاَرْضِ عام طور پر اس سے مراد منافقین کی کثرت سعی اور وسعت عمل تخریب لی گئی ہے۔

یدل علی کثرۃ سعیہ ونقلتہ فی نواحی الارض (بحر)

لیکن الارض کے ال سے مراد کوئی زمین معہود یعنی شہر مدینہ بھی ہو سکتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِیْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ

درآنحالیکہ اللہ بگاڑ کو (بالکل) پسند نہیں کرتا۵۵۷ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خوفِ خدا کر، تو اسے نخوت گناہ پر

بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ

(اور زیادہ) آمادہ کردیتی ہے۵۵۸ سو اس کے لئے جہنم بس ہے اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔ اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی

یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

ہوتا ہے جو اپنی جان (تک) اللہ کی رضا جوئی میں بیچ ڈالتا ہے۵۵۹ اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے۵۶۰

واذا کان المراد الاخنس فالارض ارض المدینۃ فالالف واللام للعھد۔ (بحر)

الْحَرْثُ وَالنَّسْلُ کھیتوں میں اُس نے آگ لگادی، اور مویشیوں کو ہلاک کردیا النَّسْل سے ہر قسم کے جانور مُراد لئے گئے ہیں

النسل نسل کل دابۃ (ابن عباسؓ) النسل من کل شیٔ من الحیوان (ابن جریر۔ عن مجاھد)

الْحَرْثُ۔ ازہری لغوی کا قول نقل ہوا ہے کہ حرث سے یہاں عورتیں مُراد ہیں، اور نسل سے اولادِ انسانی۔

ذکر الازھری ان الحرث ھنا النساء والنسل الاولاد۔ (روح)

اور جعفر صادقؒ سے منقول ہے کہ حرث سے مُراد دین ہے اور نسل سے انسان۔

عن الصادق ان الحرث فی ھذا الموضع الدین والنسل الناس (روح)

۵۵۷ شریعتِ اسلام کا تو عینِ مشن یہ ہے کہ دنیا کو عدل و امن سے بھر دے، بدامنی و فساد عین غضبِ الٰہی کی چیزیں ہیں، اور ہدایاتِ اسلامی کے برعکس عمل کرنے ہی سے پھیلتی ہیں۔

الْفَسَادُ۔ فساد۔ آیت میں عام ہے، دینی و دنیوی ہر قسم کے فساد کو۔

والاٰیۃ بعمومھا تعم کل فساد کان فی ارض اومال اودین وھو الصحیح۔ (قرطبی)

۵۵۸ یعنی جب اسے اس کا کوئی مُخلص ہوا خواہ سمجھاتا ہے، اور اسے تقویٰ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا ہے تو بجائے سنبھلنے کے وہ اور بگڑ جاتا ہے اور اپنی کج روی میں اور زیادہ دلیر ہوجاتا ہے، یہ بیان ہورہا ہے اس کا کہ ایسے کافر معاندیں مخالفتِ حق اور ایذاءِ مخلوق کے ساتھ ساتھ کبر و پندار بھی کس درجہ کا ہوتا ہے۔

الْعِزَّةُ۔ عزۃ کے معنی یہاں خود بینی اور حمیتِ جاہلی کے ہیں۔

والعزۃ القوۃ والغلبۃ وقیل العزۃ ھنا الحمیۃ وقیل العزۃ ھنا المنعۃ وشدۃ النفس (قرطبی)

وقد تستعار العزۃ للحمیۃ والانفۃ المذمومۃ (راغب)

بِالْاِثْمِ۔ ب یہاں ل کے معنی میں ہے۔

الباء بمعنی اللام ای اخذتہ العزۃ والحمیۃ عن قبول الوعظ للاثم الذی فی قلبہ (قرطبی)

۵۵۹ اب بیان پھر مومنینِ کاملین کا ہورہا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ ۶۶۱ھ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو

الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۲۰۸

۶۶۲ھ وہ تو تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۶۶۳ھ

ولما ذکر صنیع المنافقین ذکر بعدہ صنیع المؤمنین۔ (قرطبی)

۶۶۰ھ عِبَاد کا لفظ ہے عام لیکن سیاق چاہتا ہے کہ یہاں مراد بندگانِ مقبولین ہوں۔

حیث ارشد ھم الیٰ مثل ھذا الشراء (بیضاوی) لفظ العباد لہ فی استعمال القرآن تشریف واختصاص (بحر)

۶۶۱ھ حکم خاص طور پر قابلِ غور ہے اسلام صرف چند عقائد یا صرف چند عبادات یا صرف چند قوانین کا نام نہیں، وہ تو ایک جامع و مانع نظامِ حیات ہے، ایک مکمل و منظم دستورِ زندگی ہے، انسانیت کے ایک ایک شعبہ ہر ہر گوشہ پر حاوی، اور اس کا ہر جزو اس کے کل سے، اس کے دوسرے اجزاء سے نہایت درجہ ملحق و مرتبط، یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص توحید تو اسلام سے لے لے لیکن عبادات کے لئے مسجد، مندر، کلیسا سب کو یکساں سمجھے، یا رسالت پر تو ایمان لے آئے لیکن معاشیات کے قاعدے کارل مارکس سے اور اخلاق کے ضابطے گوتم بدھ سے لینے جائے، معادیات، معاشیات، اخلاقیات، اجتماعیات اسلام کے سب اپنے ہیں، کسی اور فلسفہ کسی اور دین کسی اور نظریہ کی پیوندکاری اس کے ساتھ نبھ ہی نہیں سکتی، آیت کا حکم عام ہے لیکن شانِ نزول کی روایتوں سے پایا جاتا ہے کہ خطاب خاص نومسلم یہود کی طرف تھا، یہ اسلام لانے کے بعد بھی چاہتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ رعایت اپنے عقائدِ قدیم کی کئے جائیں، اور اسلام کی ایک مستقل شاخ یہودیانہ اسلام قائم کرلیں، جس طرح بعد کو گمراہ فرقوں کے اثر سے معتزلی اسلام، شیعی اسلام، نیچری اسلام، قادیانی اسلام، وغیرہ بہت سے "اسلام" قائم ہو کر رہے۔

اُدْخُلُوْا خود ہی صیغۂ امر وجوب کے معنی دے رہا ہے پھر اس کے حال كَاۗفَّةً نے اسے کس درجہ مؤکد کردیا ہے، اور بقاعدۂ اشارۃ النص واجب ہوگیا کہ ظاہری، باطنی، انفرادی، اجتماعی، اعتقادی، عبادتی سارے اعمال و امور پر اسلام ہی کا رنگ چڑھا ہے۔

اَلسِّلْمِ۔ سلم کے لفظی معنی صلح و امن کے ہیں، اور یہ لفظ حرب کے مقابل آتا ہے۔

السلم والسلم الصلح وقیل السلم اسم بازاء الحرب (راغب)

لیکن السلم سے مراد دینِ اسلام لی گئی ہے، اہلِ لغت نے بھی اسے قبول کیا ہے اور صحابیوں اور تابعین سے بھی مروی ہے۔

السلم الاسلام (جان) ای فی الاسلام (تاج) ای ادخلوا فی الاسلام (ابن جریر عن ابن عباس ومجاھد وقتادۃ) وفسر السلم بالاسلام۔ (فہم)

۶۶۲ھ یہ اس طرح مثلاً کہ اپنے کو کہلاتے تو رہو مسلمان لیکن رسمیں اختیار کرلو مجوسِ عجم کی، معاشرت لے لو مشرکینِ ہند کی، قانونِ فوجداری اختیار کرلو ملحدینِ فرنگ کا، معاملات کرنے لگو دستورِ یہود کے مطابق شیطان کے نقش قدم پر چلنا یہی ہے کہ اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کی جانے لگے اور اسے کوئی اصلاحی یا تجدیدی کارنامہ سمجھا جانے لگے۔

"اسلام کامل فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جب ہے کہ جو امر اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو اس کی رعایت دین کی

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

پھر اگر تم بعد اس کے کہ تمہارے پاس کھلی ہوئی نشانیاں پہونچ چکی ہیں ڈگمگا گئے تو جانے رہو کہ اللہ بڑا

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِىْ ظُلَلٍ

زبردست ہے بڑا حکیم ہے ۷۶۴ (یہ لوگ) تو بس اسی کا انتظار کررہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں

مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ ؕ

میں آجائے اور فرشتے (بھی) ۷۶۵ اور قصہ ہی ختم ہو جائے،

حیثیت سے نہ کی جائے، اور ایسے امر کو دین سمجھنا یہ ایک شیطانی لغزش ہے اور بہ نسبت ظاہری معاصی کے اس کے اشد ہونے کے سبب یہ عذاب کا زیادہ مظنّہ ہے۔" (تھانویؒ)

۷۶۳ (وہ تو تمہیں طرح طرح کی آمیزشوں اور جدتوں کا مشورہ دیتا ہی رہے گا، خوشنما سے خوشنما عنوانات کے ساتھ) آیت میں وعید و تنبیہ شدید ہے ایک طرف جاہل و مبتدع اہل تصوف و طریقت کے لئے، دوسری طرف "روشن خیال" اہل تجدد کے لئے۔

۷۶۴ (ہر سزا پر قادر، اور سزا کو وقت مناسب ہی پر دینے والا)

اَلْبَيِّنٰتُ۔ مراد اس سے کھلے ہوئے احکام بھی ہو سکتے ہیں، جن میں کسی قسم کا خفا یا ابہام نہیں، مثلاً عقیدۂ توحید، عقیدۂ رسالت، حکم نماز، حکم جہاد اور ہر وہ چیز بھی اس میں داخل ہے، جو دین اسلام کی حقانیت یا قانون اسلام کی صداقت پر روشن دلیل کا کام دے سکے، یہ بیّنٰت خواہ جس معنی میں بھی لئے جائیں، بہرحال اُن نومسلم یہود کے پاس پہونچ چکے تھے، اور اُنھیں کوئی وجہ اب قدم پیچھے ہٹانے یا لڑکھڑانے کی نہیں رہی تھی۔

زَلَلْتُمْ۔ زلّت کے لفظی معنی پھسل جانے کے ہیں، جو بے اختیاری میں بھی ہوتا ہے، یہ لفظ لا کر ڈرا دیا ہے، کہ قصداً و دانستہ مخالفت تو پھر بڑی چیز ہے، غلطی یا بے خیالی سے بہک جاتے میں بھی گرفت کا احتمال ہے۔

عَزِيْزٌ۔ یاق آیت میں وہ ہے جو جب اور جو کچھ چاہے سزا دے سکتا ہے۔

حَكِيْمٌ۔ وہ ہے جو ہمیشہ وقت مناسب ہی پر سزا دیتا ہے۔

۷۶۵ (جن کا کام ہی تعمیل ارشاد کرنا ہوتا ہے)

اب پھر اشارہ انھیں نومسلم یہود کی طرف ہے، جن کا ذکر دو آیت قبل آچکا ہے، یہ اسلام میں اگرچہ داخل ہوئے ہیں، لیکن کفر و یہودیت سے پوری طرح نہیں نکل پائے ہیں۔

هَلْ یہاں، استفہامیہ نہیں، بلکہ قطعیت و اظہار کے لئے ہے قَدْ کے قریب المعنیٰ۔

على التقرير تنبيها وتبكيتا ونفيا.... ذلك تنبيه على قدرة الله وتخويف من سطوته (راغب) تأتی بمعنی قد وذلك مع الفعل (اقرب) يراد به هنا الجهد اى ما ينظرون الا ان الخ (قرطبی)

يَاْتِيَهُمُ اللّٰهُ۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ۔ عقائد کا یہ اصولی اور مسلّم مسئلہ ہے کہ ذات باری کے لئے نہ محل ہے نہ ظرف اس لئے

اسلامی عقیدہ کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے "آنے" یا "جانے" کے کوئی معنی ہی نہیں، امام رازیؒ کہتے ہیں :۔

اجمع المعتبرون من العقلاء علی انہ سبحانہ وتعالیٰ منزہ عن المجئ والذھاب (کبیر)

اور آگے اس پر متعدد دلائل قائم کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں :۔

ثبت انہ تعالیٰ لیس بجسم ولا بمتحیز وانہ لا یصح المجئ والذھاب علیہ (کبیر)

اس لئے اکثر مفسرین نے آیت کو متشابہات میں سے مانا ہے، اور صاف لکھ دیا ہے کہ اس پر اجمالی ایمان کافی ہے، تفصیل عقل بشری سے ماوراء ہے، چنانچہ مفسر تھانویؒ کا ارشاد ہے کہ :۔

"اللہ تعالیٰ کے لئے آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں کیونکہ جس طرح اس کی ذات کی حقیقت کسی کو مدرک نہیں ہوئی ہے اسی طرح اس کی صفات و افعال کی کنہ معلوم نہیں ہو سکتی، البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً بلا تعیین کیفیت ایمان لے آنا چاہیے کہ اس سے زیادہ فکر میں پڑنا مالا یطاق کا قصد کرنا ہے۔"

اور صاحب روح المعانی نے یہ لکھ کر چھوڑ دیا ہے کہ :۔

یأتیھم اللہ بالمعنی اللائق بہ جل شانہ منزھا عن مشابھۃ المحدثات والتقید بصفات الممکنات۔

اور سلف صالح کا مذہب یہ نقل ہوتا چلا آرہا ہے کہ :۔

فالاولی السکوت عن التاویل و تفویض معنی الآیۃ علی سبیل التفصیل الی اللہ تعالیٰ (کبیر)

اور مفسر و محدث بغوی کو یہ لکھنا پڑا :

الاولی فی ھذہ الآیۃ وفی ما شاکلھا ان یؤمن الانسان بظاھرھا ویکل علمھا الی اللہ تعالیٰ ویعتقد ان اللہ عز اسمہ منزہ عن سمات الحدث علی ذلک مضت ائمۃ السلف وعلماء السنۃ۔ (معالم)

اور قرطبی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ ممکن ہے اتیان یہاں جزا کے معنی میں ہو، جیسا کہ قرآن مجید ہی کی بعض دوسری آیتوں میں ہے

وقد یحتمل ان یکون معنی الاتیان راجعا الی الجزاء فسمی الجزاء اتیانا کما سمی التخویف والتعذیب فی قصۃ نمرود اتیانا فقال فاتی اللہ بنیانھم من القواعد وقال فی قصۃ النضیر فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا (قرطبی)

اور بہتوں نے آیت میں یأتیھم اللہ کے درمیان کوئی اور لفظ مثلاً امر یا بأس یا آیات وغیرہ محذوف مان کر معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ کا حکم آپہونچے یا عذاب آجائے۔

ای یأتیھم ثوابہ وحسابہ وعذابہ (ابن جریر) ای امرہ وبأسہ (مدارک) ای آیات اللہ (کبیر) ای امر اللہ (کبیر) یأتیھم اللہ بما وعدھم من الثواب والعقاب قالہ الزجاج۔ (بحر)

یعنی بیاید عذاب او (شاہ ولی اللہؒ)

اور ایک جماعت نے ملائکہ کی آمد اور قُضِیَ الْاَمْرُ کے پہلو کو مد نظر رکھ کر ان واقعات کو روز قیامت سے متعلق کیا ہے کہ یہ منکرین و معاندین قبول حق کے لئے اب شاید آمد قیامت ہی کے منتظر ہیں۔

قولہ یأتیھم اللہ اخبار عن حال القیامۃ۔ (کبیر)

یہ سب مذہب اپنی اپنی جگہ صحیح اور حق ہیں، لیکن ان سب میں بناء مشترک یہ ہے کہ آیت کا روئے سخن عام منکرین یا منافقین و اہل کتاب کی جانب سمجھا گیا ہے۔

ای یکون یوم یجیئ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (ابن جریر) اذید بہ المنافقون او اھل الکتاب (روح)

لیکن سیاقِ کلام پر نظر کرکے اگر روئے سخن صرف یہود تک محدود کردیا جائے تو بات بالکل صاف ہوئی جاتی ہے اور بجائے اوپر کی تفسیر ایک صرف اتنا بڑھا دینا ہوگا، "حسبِ اعتقاد یہود" اس لئے کہ یہود کا مذہب تشبیہ و تجسیم کا تھا، لوگ خدا کی جسمانیت کے پوری طرح قائل تھے، اور جلوۂ حق کو بادلوں سے خاص طور پر متعلق سمجھتے تھے بلکہ بادلوں کو گویا حق تعالیٰ کی سواری سمجھے ہوئے تھے ان کے مقدس صحیفوں اور نوشتوں میں اب تک اس قسم کی تعلیمات محفوظ ہیں:۔

"وہ نور کو پوشاک کی مانند پہنتا ہے، اور آسمانوں کو پردہ کے مانند پھیلاتا ہے، وہ اپنے بالاخانوں کو پانیوں میں بناتا ہے، اور بدلیوں کو اپنی رتھ ٹھہراتا ہے، اور ہوا کے بازوؤں پر وہ سیر کرتا ہے" (زبور ۔ ۱۰۴: ۳) "خداوند ایک تند رو ابر پر سوار ہوکر مصر کو آوے گا، اور مصر کے بت اس کے حضور میں لرزاں ہوں گے" (یسعیاہ ۔ ۱۹: ۱) "کروبی گھر کی داہنی طرف کھڑے ہوئے اور اندرونی صحن بادل سے بھر گیا، تب خداوند کا جلال کروب سے اٹھ گیا، اور گھر کے آستانہ پر آیا اور گھر بادل سے بھر گیا، اور صحن خداوند کے جلال کی چمک سے معمور ہوا" (حزقی ایل ۔ ۱۰: ۴)

غرض خدائے تعالیٰ کا بادلوں سے بطور مرکب یا سواری کے قریب ترین تعلق یہود کے تخیل میں رچ گیا تھا، یہاں تک کہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری مکمل اڈیشن (طبع چہاردہم) میں حق تعالیٰ کی جو تصویر نیم یہودی نیم مسیحی تخیل کے مطابق دی ہے (جلد ۲ صفحہ ۱۰) اس میں (معاذ اللہ) حق تعالیٰ کو صاف صاف بدلیوں پر سوار دکھایا ہے!

تو قرآن مجید نے آیت میں اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے، صرف یہود کے خیال کی ترجمانی، اس کی صحت وغلطی سے بحث کئے بغیر کردی ہے کہ بنی اسرائیل اسی خیال میں پڑے ہوئے ہیں کہ خداوند خدا مع فرشتوں کے بدلیوں پر سوار ہوکر ان کے سامنے آجائے گا، اور ہر امر قطعی کا فیصلہ کرکے رکھ دے گا؟ اللہ بڑے اونچے مرتبے کرے امام المفسرین امام رازیؒ کے ان کی نظر سے یہ نکتہ بھی نہ بچا، صاف اپنی تفسیر میں لکھ گئے ہیں، اور صرف لکھ ہی نہیں گئے ہیں اسی کو پہلے وھوا وضح عندی من کل ما سلف اور پھر ھذا الوجہ اظہر عندی من کل ما سبق کہہ کر بہترین توجیہ بھی قرار دے گئے ہیں کہ یہود حق تعالیٰ کی تشبیہ اور تجسیم کے قائل تھے، اور قرآن نے یہاں بجنسہٖ ان کے اعتقاد کو اس پر تنقید کئے بغیر دہرا دیا ہے، اس لئے اس کے بعد نہ مجاز وغیرہ کسی تاویل کی حاجت رہتی ہے اور نہ کوئی اشکال ہی رہ جاتا ہے۔

اذا کان ھذا حکایۃ عن حال الیھود ولم یمتنع اجراء الآیۃ علٰی ظاھرھا وذٰلک لان الیھود کانوا علٰی مذھب التشبیہ وکانوا یجوزون علی اللّٰہ المجیئ والذھاب وعلٰی ھذا التقدیر یکون ھذا الکلام حکایۃ عن معتقد الیھود القائلین بالتشبیہ فلا یحتاج حینئذ الی التاویل ولا الی حمل اللفظ علی المجاز..... ولیس فی الآیۃ دلالۃ علٰی انھم محقون فی ذٰلک الانتظار او مبطلون وعلٰی ھذا التقدیر یسقط الاشکال۔ (کبیر)

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ ۔ ھَلْ یہاں استفہامیہ نہیں بلکہ جب اِلَّا کے ساتھ آتا ہے تو نفی کے معنی دیتا ہے، قرآن مجید میں اس کے اس استعمال کی اور بھی مثالیں ہیں مثلاً هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۔

ھل ھنا للنفی ..... وکونھا بمعنی النفی اذجاء بعدھا الا کثیر الاستعمال فی القرآن و فی کلام العرب (بحر) معناہ النفی ولھذا جاء بعدہ الا ۔ (عکبری)

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ

اور اللہ ہی کی طرف (سارے) معاملات رجوع کئے جائیں گے ۷۶۶ (آپ) بنی اسرائیل سے پوچھ دیکھئے ہم نے انھیں

مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ

کھلی نشانیاں کتنی دے رکھی تھیں ۷۶۷ اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے بعد اس کے کہ وہ اس کو پہنچ چکی

فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

ہو تو اللہ بھی سزا دینے میں بڑا سخت ہے ۷۶۸

۷۶۶ (آخری فیصلہ اور تصفیہ کے لئے۔)
کلام بطور تہدید کے ہے۔

۷۶۷ اور پھر وہ ہر آیت کا انکار بھی کس شدّ و مدّ سے کرتے رہے۔
اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ۔ یہ کھلی ہوئی نشانیاں کس چیز کی تھیں؟ خدائے تعالیٰ کے مخصوص فضل و کرم کی اور بنی اسرائیل کی مخصوص سرافرازیوں کی مثلاً کتاب توریت اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا نزول یا اس نسل میں انبیاء کرام کا مسلسل ظہور، وقس علیٰ ہذا۔
سَلْ۔ لفظ سَلْ سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہ وہ تاریخی حقائق ہیں کہ اسرائیلی ان سے انکار کر ہی نہیں سکتے۔

۷۶۸ (عام اس سے کہ اس سزا کا ظہور فوری اور اسی دنیا میں ہو، یا بہ تاخیر عالم آخرت میں)
نِعْمَةَ اللّٰهِ۔ نعمت ادنیٰ بھی ہو جب بھی نعمت ہی ہے، اور بہر صورت قابلِ قدر، چہ جائیکہ ایسی اعلیٰ نعمتیں جن سے بنی اسرائیل کو مدتوں سرفرازی حاصل رہی۔
يُّبَدِّلْ۔ تبدیل کے معنی ہیں کسی شے کی اصل حقیقت کو کچھ کا کچھ کر دینا، اس شے کے اندر تحریف کر دینا، اُسے مسخ کر دینا، اور اللہ کی نعمتوں کے اندر تبدیلی ایک تو یہ ہوئی کہ جو چیزیں ہدایت و استفادہ کے لئے تھیں الٹا انھیں کو فسق و کفر کے کاروبار میں لگا دیا گیا، اور یا پھر یہ کہ جو کلام باعثِ ہدایت ہونا تھا، اسی میں تصحیف و تحریف کا عمل شروع کر دیا گیا، اہل تفسیر نے دونوں شقیں اختیار کی ہیں۔
وتبدیلھم ایاھا ان اللّٰہ اظھرھا لتکون اسباب ھداھم فجعلوھا اسباب ضلالتھم او حرفوا اٰیات الکتاب الدالۃ علیٰ دین محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم (کشاف۔ مدارک) یجعلھا سبب الضلالۃ وازدیاد الرجس او بالتحریف والتاویل الزائغ (بیضاوی)
شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ نعمۃ اللّٰہ۔ کی وسعت اطلاق، دینی و دنیوی ہر قسم کی نعمتوں کو شامل ہے اور یہاں ہر نعمت کے مسخ کر ڈالنے پر عذاب شدید کی وعید ہے، اب نعمت اگر دینی ہے مثلاً کتابِ الٰہی یا ظہورِ انبیاء تو اس میں تحریف یا انکار پر عذاب اُخروی کا وقوع ظاہر ہی ہے لیکن نعمت اگر محض دنیوی ہے مثلاً دولت صحت سلطنت تو اس کے

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

خوشنما کر دی گئی ہے دنیوی زندگی اُن لوگوں کی نظر میں جو کافر ہیں ٧٦٩ اور وہ ان لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو ایمان لے آئے ہیں

سُوءِ استعمال کا خمیازہ بیماری، ناکامی، افلاس، بغاوت، انتشار، غلامی، ذلّت وغیرہ کی شکل میں اٹھانا بھی مشاہدہ کی چیزیں ہیں۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ۔ کا فقرہ زور دینے اور تاکید کے لئے ہے یعنی بعد اس کے کہ اس نعمت کا پوری طرح تحقق ہو چکے اس کے پوری طرح فہم و معرفت میں آجانے کے بعد پھر جو کوئی اس کے ساتھ کفران کرے۔

آیت آج امت کے کس قدر حسبِ حال اور کس درجہ قابلِ غور ہے اللہ کی عطا کی ہوئی ہر دینی و دنیوی نعمت کے ساتھ آج ہمارا کیا معاملہ ہے؟ کس نعمت کا حق ہم ادا کر رہے ہیں؟ کون سی نعمت ایسی ہے جس کی روح ہم نے نہیں بدل ڈالی ہے؟ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج ہماری ساری عبادتیں تک مغز و روح سے خالی، محض ان عبادتوں کے خالی ڈھانچے رہ گئے ہیں، اخلاق و اتحاد کی دولت ہم نے الگ برباد کر ڈالی نتیجہ جو نکلا سب کی آنکھوں کے سامنے ہے، پاکستان، عراق، انڈونیشیا وغیرہ مسلم مملکتوں کا آج جو عبرت انگیز حشر ہو رہا ہے ان سب کی تہ میں یہی خدائی نعمتوں کی ناقدری ہے۔

مسیحیوں کے ہاں ایک عربی داں انگریز پادری ڈاکٹر وہیری (WHERRY) ابھی حال میں گزرے ہیں مسلمانوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے، انگریزی میں مختصر سی تفسیر بھی لکھی ہے، اس آیت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں نے متنِ قرآن کی جو اتنی سخت حفاظت رکھی ہے، اس کا ایک سبب اسی قسم کی تہدیدی آیتیں ہیں"۔

خیر اس سے بہرحال محفوظیتِ قرآن پر شہادت تو ایک دشمنِ اسلام کی زبان سے ہاتھ آگئی۔

٧٦٩ (اور دنیا کا ساز و سامان، جاہ و حشم، باغ و مکان، موٹر اور ریڈیو، کوٹھی اور فرنیچر، سب باوجود فانی و بے حقیقت ہونے کے انھیں نہایت اہم و قابلِ وقعت نظر آتا ہے، اور ان کے دلوں کے لئے خاص کشش رکھتا ہے) جو کافر ہے وہ اسی دنیوی زندگی کی مادّی لذّت و دولت، عیش و عشرت پر مٹا رہتا ہے، اسی کو مہتم بالشان سمجھے ہوئے ہے، اسی پیمانہ سے سب کو ناپتا رہتا ہے، وہ بے حد تنگ نظر ہوتا ہے، وہ اس برائے نام عیش پر عیشِ سرمدی و عشرتِ لازوال کو قربان کئے رہتا ہے، آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کافر اس باب میں معذور ہے حُبِّ دنیا طبعًا اس پر اتنی غالب کر دی گئی ہے کہ وہ اس کے ترک ہی پر قادر نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، کافر تو کہتے ہی اس کو ہیں جو بلا کسی معذوری کے اپنے قصد و اختیار سے حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کرے اور دنیا کی خوشنمائی کا آنکھوں میں بس جانا، یہ تو کفر کا نتیجہ اور معلول ہے، نہ کہ اس کا باعث و سبب، اپنے ارادہ کا سُوءِ استعمال تو وہ پہلے ہی کر چکا، محض نتیجہ کے طور پر مشیّتِ تکوینی نے اس کی کوشش کو کامیاب کر دیا۔

٧٧٠ (اور سامانِ دنیوی سے محروم ہیں۔)

کافر اسی غلط معیار کی بناء پر، اسی کج نگاہی سے کام لے کر اپنے کو بڑا سمجھتا، اور ایمان و طاعت کی بے وقعتی اور تحقیر کرتا رہتا ہے، نگاہ کی یہ کجی، یہ غلط بینی ہی دنیا کا شدید ترین ابتلاء ہے، حدیثِ نبوی کی یہ دعا اسی فتنہ سے بچنے کے لئے ہے اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا۔ اور عارفِ رومی کی یہ مناجات بھی اسی موقع کے لئے ہے ۔ ؎

وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ

درآنحالیکہ جو لوگ ڈرتے رہتے ہیں وہ اُن سے (کہیں) اوپر ہوں گے قیامت کے دن ۱۰۷۲ اور اللہ جسے چاہتا ہے

بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً

بے شمار رزق دیتا رہتا ہے ۱۰۷۲ لوگ ایک ہی اُمت تھے ۱۰۷۳

انچہ در کون است اشیا ہر چہ ہست | وانما جاں را بہر صورت کہ ہست
آب خوش را صورتِ آتش بدہ | اندر آتش صورتِ آبے منہ

۱۰۷۱ (کہ وہ دن ہوگا کشف حقائق کا)

اَلَّذِيْنَ اتَّقَوْا۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں، یا کفر و شرک سے بچتے رہتے ہیں۔

فَوْقَهُمْ یعنی درجہ و مرتبہ میں ان سے ہزار چند بڑھے ہوئے ہوں گے۔

(لانهم في عليين وهم في اسفل السافلين۔ (بیضاوی)

۱۰۷۲ (اُس کے ناپنے کا جو پیمانہ منکرینِ آخرت نے مان رکھا ہے وہی غلط ہے)

مطلب یہ ہوا کہ دنیوی مال و دولت کا تعلق مصالح تکوینی سے ہے سو یہ مال و دولت کی افراط، یہ روپیہ کی ریل پیل، یہ بڑی بڑی تجارتی کوٹھیاں اور بڑے بڑے ساہوکارے، ہرگز کوئی معیار مقبولیت یا حق و صداقت کا نہیں، چاہے وہ جاہ و تموّل ذاتی و شخصی ہو یا قومی و اجتماعی، کوئی اس میں بھول نہ پڑے، اور "قومی اقبال مندی" پر نہ مغرور ہو، نہ اس سے مرعوب ہو۔

۱۰۷۳ (آغازِ فطرت میں)

آیت نے ایک بڑی گرہ کھول دی، فرنگی "محققین" حسبِ معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے، اور ان میں اکثر یہی کہے گئے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعدد آلہ تھا، شروع شروع وہ ایک ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدۂ توحید تک تو نسلِ انسانی بہت سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اور عقلی و دماغی ارتقاء کے بڑے طویل سفر کے بعد پہونچی ہے، قرآن مجید نے اس خرافاتی نظریہ کو ٹھکرا کر صاف اعلان کر دیا کہ نسلِ انسانی آغازِ فطرت میں دینی حیثیت سے ایک، اور واحد تھی، اس میں "مذاہب" و "ادیان" کے تفرقے کچھ بھی نہ تھے، نوعِ انسانی فطری اور جبلّی طور پر دینِ توحید ہی پر تھی۔

اُمَّةً وَّاحِدَةً میں جس وحدت کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ اس سے دینی و اعتقادی ہی وحدت مُراد ہے یعنی عقیدۂ توحید۔

كانوا على شريعة من الحق (ابن جرير عن ابن عباس) كانوا على الهدى جميعا (ابن جرير عن قتادة) انهم كانوا على دين واحد وهو الايمان والحق هذا قول اكثر المحققين۔ (کبیر)

صدیوں کی اُلٹ پھیر، قیل و قال کے بعد اب آخری فیصلہ بڑے بڑے ماہرین اثریات و انسانیات و اجتماعیات کا (سر چارلس مارسٹن، پروفیسر لینگڈن، پروفیسر شمڈٹ کا) یہی ہے کہ انسان کا دینِ اوّلین، دینِ توحید تھا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

پھر اللہ نے انبیاء بھیجے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ؎۴ اور ان کے ساتھ کتاب حق نازل

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ

کی ؎۵ کہ وہ لوگوں کے درمیان اس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے ؎۶ اور کسی نے اس میں اختلاف

اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ

نہیں کیا مگر انھیں نے جنھیں وہ ملی تھی آپس کی ضد کے باعث بعد اس کے کہ انھیں کھلی ہوئی نشانیاں پہونچ چکی تھیں ؎۷

؎۴ (بھٹکے ہوؤں کو)

اور یہ ڈرانا بھی گمراہوں کو واپس لانے اور انھیں راہ دکھانے کی خاطر ہی ہوگا۔

فَبَعَثَ میں ف سے مُراد ہے کہ ایک مدت کے بعد جب اہلِ باطل اپنے اختراعی عقائد و اعمال سے بہت سے فرقے اور مذاہب پیدا کر چکے تھے۔

مُبَشِّرِيْنَ یعنی خوشخبری سُنانے والے اہل ایمان کو، اُن لوگوں کو جو خدائی دستورِ حیات کو قبول و اختیار کر لیں۔

مُنْذِرِيْنَ یعنی ڈرانے والے اہل کفر کو، اُن لوگوں کو جو خدائی دستورِ حیات کے مقابلہ میں انکار و طغیان قائم رکھیں۔

؎۵ الْكِتٰبَ سے کوئی مخصوص و متعین کتابِ الٰہی مُراد نہیں بلکہ "ال" جنس کتاب کے لئے ہے اور کتاب سے مُراد وہ تمام کتابیں ہیں جو مختلف پیغمبروں پر مختلف زمانوں میں اُترتی رہیں گویا لفظ کتاب صورۃً واحد ہے اور معنیً جمع۔

یرید به الجنس۔ (بیضاوی)

بِالْحَقِّ۔ حق کو لے کر یا اظہارِ حق کے لئے، ترکیب میں بِالْحَقِّ حال واقع ہوا ہے کتاب کا۔

بتبیان الحق (مدارک) حال من الکتاب ای ملتبسا بالحق شاهدا به۔ (بیضاوی)

؎۶ یعنی عقائد و اعمال کے باب میں۔

لِيَحْكُمَ۔ تاکہ وہ فیصلہ کر دے انھیں انبیاء یا کتب کے واسطہ سے۔ فیصلہ کون کر دے؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ، کہ وہی اصلی فیصلہ کرنے والا ہے اس لئے يَحْكُمَ کی ضمیر غائب کا مرجع اللہ ہے لیکن بعض نے نبی اور بعض نے کتاب بھی مُراد لی ہے، اور یہ دونوں بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔

ای لیحکم الله او النبی المنزل علیه او الکتاب (کبیر) والضمیر عائد علی الله هذا هو الظاهر وقیل عائد علی الکتاب (بحر) مسند الی الکتاب فی قول الجمهور (قرطبی)

؎۷ (تصدیق حق کی) اور اس طرح اصول دین کے باب میں کسی قسم کا التباس اور خفاء باقی نہیں رہا۔

بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ۔ یہاں یہ صاف کر دیا کہ اختلاف اور نزاع کا باعث آپس کی ضد اور نفسانیت ہوئی، نہ یہ امر کہ اصل احکام الٰہی یا پیام حق میں کسی طرح کا ایچ پیچ تھا، اور نہ یہ کہ مسائلِ اجتہادی میں رائے یا اجتہاد کا اختلاف ہوا۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ

پھر اللہ نے اپنے فضل سے انھیں جو ایمان والے تھے، وہ امرِ حق بتا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے ۷۷۸

وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ

اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست بتا دیتا ہے ۷۷۹ کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ

اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ

جنت میں داخل ہو جاؤ گے ۷۸۰ درآں حالے کہ (ابھی) تم پر ان لوگوں کے حالات پیش نہیں آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں ۷۸۱

الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ۔ یعنی وہی لوگ جنھیں کتاب بواسطۂ انبیاء ملی تھی، مراد ہیں علماء و مشائخ و پیشوایانِ قوم۔ گمرہی اور کج روی کی طرح یہی لوگ ڈالتے ہیں، عوام محض ان کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔

۷۷۸ (چنانچہ اہلِ حق کو نزاع و اختلاف کبھی مُضر نہیں پڑا۔)

لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ میں ذکر اہلِ حق کے اختلاف کا ہے اہلِ باطل سے۔

بِاِذْنِهٖ میں اِذن کے معنی فضل، توفیق و لطف کے ہیں۔

الاذن التوفیق (تاج) بارادتہ ولطفہ (بیضاوی) بتوفیقہ وتیسیرہ (روح)

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر سوال ہوا ہے کہ جو اس کے مصداق ہو چکے تھے، وہ تو خود ہی ہدایت یافتہ تھے، پھر اب انھیں ہدایت کیسی؟ جواب یہ ہے کہ ایمان سے یہاں مراد قصدِ ایمان و صلاحیتِ ایمان ہے یعنی جو ایمان کے طالب تھے، انھیں ہدایت حاصل ہو گئی۔

۷۷۹ (اور اس کی مشیتِ ہدایت ہمیشہ ان لوگوں سے متعلق ہو جاتی ہے جو اس کی طرف بڑھنا چاہتے اور ضد و تعصب کو چھوڑ کر طلبِ حق اختیار کرتے ہیں۔)

اس میں مومنین کی تشفی و تسلی کا پہلو بھی نکل رہا ہے کہ مخالفین و معاندین کی سرگرم کوششوں اور زبردست پروپیگنڈے سے خوف و ہراس نہ کریں، اپنی طلب اگر صادق ہے تو کوئی مکر و تدبیر کوئی قوت یا شوکت انھیں ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

۷۸۰ (بلا مشقت اور بغیر امتحان، اے گروہ مومنین!)

خطاب براہِ راست عہدِ رسالت کے مومنین سے ہے۔

ایھا المؤمنون باللہ ورسلہ (ابن جریر)

۷۸۱ یعنی ان مومنینِ سابقین، ان انبیاءِ قدیم کی امتوں کی سی آزمائش اور مصیبتیں۔

مَثَلٌ کے معنی غیر معمولی حالات و تجربات کے ہوتے ہیں۔

المثل الشبہ الا انہ مستعار لحال غریبۃ او قضیۃ عجیبۃ لھا شان (بحر)

یہاں مراد ان پچھلی امتوں کے تحمّلِ شدائد سے ہے۔

ماینال من اذی الکفار والفقر والمجاھدۃ فی سبیل اللہ (بحر) حالھم التی ھی مثل فی الشدۃ (کشاف)

مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ

انھیں تنگی اور سختی پیش آئی اور انھیں ہلا ڈالا گیا ۷۸۲ یہاں تک کہ پیمبر اور جو لوگ

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (۲۱۴)

ان کے ہمراہ ایمان لائے تھے بول اٹھے ۷۸۳ کہ اللہ کی امداد (آخر) کب آئے گی ۷۸۴ سن رکھو اللہ کی امداد یقیناً قریب ہی ہے ۷۸۵

آیت سے یہ مُراد نہیں کہ کوئی مؤمن محض ایمان کی برکت اور فضل خدا سے جنت میں داخل ہی نہ ہوسکے گا جب تک مجاہداتِ شدیدہ کی منزل سے گزر نہ لے، بلکہ مراد یہ ہے کہ صحابہؓ جن درجاتِ عالیہ کے طالب تھے، اور بقول مُرشد تھانویؒ ہر مومن کو طلب ایسی ہی رکھنی چاہئے، ان درجاتِ عالیہ تک پہونچنے کے لئے عام شرط ان منزلوں سے گزرنے کی ہے، باقی نفس مجاہدہ تو ہر مؤمن کو اپنے درجہ وبساط کے لحاظ سے کرنا ہی ہوتا ہے۔

۷۸۲ (شدتِ تکلیف سے)

ای مُزْکوا بانواع البلایا والرزایا۔ (کبیر)

اَلْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ۔ یعنی مخالفین کے ہاتھوں انھیں جو مصیبتیں جھیلنا پڑیں دونوں لفظ قریب المعنی ہیں، فرق یہ کیا گیا ہے کہ بَاْسَآء میں راحت و آسائش کے فقدان کا پہلو نمایاں ہے، اور ضَرَّآء میں واقعی درد و اذیت کا۔

الباساء عبارۃ عن تضییق جہات الخیر والضراء عبارۃ عن انفتاح جہات الشر (کبیر)

ان آزمائشوں کے تذکرے قدیم صحیفوں میں بھی بکثرت ملتے ہیں، مثلاً:۔

"صادق پر بہت سی مصیبتیں ہوتی ہیں" (زبور۔ ۳۴: ۱۹) "چاندی کے لئے کٹھالی ہے اور سونے کے لئے بھٹی، پر خداوند دلوں کو تپاتا ہے" (امثال ۱۷: ۳) "ضرور ہے کہ ہم بہت سی مصیبتیں سہ کر خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں" (اعمال ۱۴: ۲۲)

۷۸۳ (شدتِ غم و حُزن سے بے قرار ہوکر)

اَلرَّسُوْلُ۔ سے مُراد ہر زمانہ کے پیمبر ہیں۔

المراد من الرسول الجنس لا واحد بعینہ (روح) الرسول ھھنا اسم جنس (نہر)

۷۸۴ نَصْرُ اللّٰهِ۔ یعنی نصرتِ موعود۔

انبیاء و مؤمنین کا یہ قول حالتِ اضطرار میں دعا و مناجات کے طور پر تھا، نہ بہ طور اعتراض و شکوہ، وعدہ نصرتِ الٰہی کا تھا، مگر یہ تعیین تو نہ تھا کہ کس وقت ہوگی، جب ہجوم شدائد ہوتا تو نصرتِ غیبی کی ضرورت محسوس کرتے اور اپنا اجتہاد سے بہ الحاح وزاری پکارتے کہ حضرت یہی تو وقت دستگیری و نصرتِ غیبی کے نزول کا ہے (تھانویؒ)

آیت میں اشارہ ہے کہ امّتِ محمدی کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی، جیسی کہ اگلی امتوں کو پیش آچکی ہیں۔

۷۸۵ یہ جواب ان امتوں کو ان کی درخواست کا مِلا کرتا، اس میں مؤمنین کو ہمیشہ کے لئے بشارت اور تسلی مل گئی اور اس حقیقت کا بیان آگیا کہ نصرتِ الٰہی اپنے وقت پر ضرور آکر رہے گی مجاہدات سے گھبرانا اور بد دل نہ ہونا چاہئے۔ صوفیہ نے آیت سے یہ تعلیم بھی اخذ کی ہے کہ حالاتِ مخالف کے ہجوم سے بہ تقاضائے بشریت اضطراب تو کاملین تک کو ہوتا ہے، مگر ساتھ ہی ثابت قدمی اور اتباع احکام کی برکت سے نصرتِ الٰہی ہوکر رہتی ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ

آپ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں ۷۸۶ آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمھیں مال سے خرچ کرنا ہے ۷۸۷ سو وہ

وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ

حق ہے والدین کا اور عزیزوں کا اور یتیموں کا اور مسکینوں کا اور مسافروں کا ۷۸۸ اور جو بھی نیکی کروگے،

خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اللہ کو اس کا پورا علم رہتا ہے ۷۸۹

**۷۸۶** (اور کن موقعوں پر)

سأل المؤمنون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم این یضعون اموالھم (روح عن ابن جریج)

المطلوب بالسؤال ان مصرفہ ای شی ھو (کبیر عن القفال) مرادھم من قولھم لیس ھو طلب لماھیۃ بل طلب المصرف۔ (کبیر)

سوال مسلمانوں کی طرف سے تھا، اور اس باب میں تھا کہ اپنی حسب ہمّت وحیثیت اور خوش دلی سے کب خرچ کریں باقی جو خرچ کہ فرض ہو چکا تھا، یعنی زکوٰۃ، اس کا حساب تو کھلا ہوا تھا، سوال اس کی بابت نہ تھا۔

الاکثرون علی ان الآیۃ فی التطوّع (روح) عن الحسن ھی فی التطوّع (مدارک)

قرآن جو مکمل دستورِ حیات ہے اس میں معاشیات کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے اپنی جگہ پر وہ پوری اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں

**۷۸۷** خَیر کا ایک مفہوم علاوہ نیکی اور بھلائی کے معروف ومتعارف معنی کے مال کا بھی ہے خصوصاً محمود اور نیک کمائی والے مال کا۔

المال من وجہ محمود (راغب) والمال (تاج) والمال مطلقا (اقرب الموارد)

اور یہاں تو کھلا ہوا بیان اِنفاق کا ہے اس لئے یہاں یہی مُراد ہے۔

**۷۸۸** مصارفِ خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے، سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے جتنی بھی مالی خدمت ہو سکے ان کی جائے پھر دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے اور اس میں بھائی بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ سب آگئے — شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی اہمیت دی ہے، اس پر یہ ایک اور دلیل ہے — پھر امت کے وہ فرزند ہیں جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سایہ سے محروم ہو چکے ہیں، پھر وہ اللہ کے بندے ہیں، جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا اور کسی خارجی سبب سے معاش کے عام ذریعے بند یا قریباً بند ہو چکے ہیں اور اپنی ضرورتوں کے پوری ہونے کے لئے بیرونی امداد کے محتاج ہیں، اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں جو اپنے وطن سے علیحدہ ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگدستی میں مبتلا ہیں، قریبی اور دُور کے حقدار اور ملی رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر کس خوبصورتی سے ایک فریم کے اندر "فٹ" ہو گئے، مقصودِ شریعت یہ ہرگز نہیں کہ پڑوس میں ہمارا بھائی بھوک سے تڑپ رہا ہو اور ہم اس کی طرف سے بے فکر ہو کر چندہ لکھوا رہے ہوں چین یا جاپان کے کسی ریلیف فنڈ میں۔!

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا

تمہارے اوپر قتال فرض کر دیا گیا۔ ۷۹۰ درآں حالیکہ وہ تم پر گراں ہے ۷۹۱ لیکن کیا عجب کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو

وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ

اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور کیا عجب کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں (باعثِ خرابی ہو) ۷۹۲

**۷۸۹** (اور اس لئے اس کا اجر بھی پورا ادا کر رہے گا۔)

خَیْرٌ عام ہے بدنی، مالی، بڑی، چھوٹی، ہر قسم اور درجہ کی نیکی کو شامل ہے خَیْرٌ کا تعلق یہاں اِنفاق کے ساتھ نہیں "فعل" کے ساتھ ہے، اور اس معنی میں وہ عام ہے۔

آیت میں تنبیہ ہے کہ گمراہ قوموں نے اپنے دیویوں، دیوتاؤں سے متعلق جو عقیدے گڑھ لئے ہیں، اُن پر قیاس کر کے یہ نہ سمجھ لینا کہ اسلام کے خدا کا بھی علم ناقص یا محدود ہے یا جزئیات یا مخفیات پر محیط نہیں۔

**۷۹۰** (جب اس کے شرائط کا تحقق ہو جائے، اے مسلمانو!)

قتال کے آداب، شرائط و قواعد میں سے کچھ پہلے اسی پارہ میں بیان ہو چکے ہیں، کچھ آئندہ حسب موقع بیان ہوتے رہیں گے، غیر مصافی کو قتل نہ کرنے پر اسلام نے جو "زور" دیا ہے، اس کو یاد رکھ کے ذرا ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو، ایسی کتاب سے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے نزدیک مقدس ہے:۔

"سو اب تو جا، اور عمالیق کو مار، اور جو کچھ اس کا ہے یک لخت حرم کر، اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت ننھے بچے شیر خوار اور بیل بھیڑ، اور اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر" (۱۔ سموئیل۔ ۱۵: ۲)

**۷۹۱** جیسا کہ بالکل قدرتی اور طبعی ہے۔

عَسیٰ ہر جگہ شک ہی کے لئے نہیں آتا، یہاں ممکن ہے کہ تیقن کے لئے ہو۔

قیل عسیٰ بمعنیٰ قد قاله الاصم۔ (قرطبی)

اپنی جان کس کو عزیز نہیں ہوتی، اور اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہوئے ہر جاندار قدرۃً ہچکچاتا ہے، پھر مکہ کے غریب مہاجرین جو ابھی ترک وطن کر کے مدینہ میں آکر پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے، وہ تو روپیہ پیسہ میں، ساز و سامان میں، تعداد میں، غرض مادی اعتبار سے کسی معنی میں بھی اپنے حریفوں کے مدِ مقابل نہ تھے، ان شکستہ دلوں، شکستہ بازوؤں کو حکم جنگ و قتال پا کر اگر طبعی گرانی محسوس ہوئی ہو تو یہ ان کے مرتبۂ اخلاص اور قوتِ ایمانی کے ذرا بھی منافی نہیں۔

شاق علیکم مکروہ طبعا (بیضاوی) مکروہ بالطبیعة (بحر) ھذا الکرہ من حیث نفور الطبع عنه لما فیه من مؤنة المال ومشقة النفس وخطر الروح لا انھم کرھوا امر الله تعالیٰ۔ (معالم)

ھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ۔ آیت پوری تردید کر رہی ہے، اُن بے عزت "مستشرقین" کی جنھوں نے یہ لکھ ڈالا کہ مسلمان مال غنیمت کی حرص میں خود ہی مشتاقِ جنگ و قتال کے تھے۔!

کُرْہٌ لفظاً مصدر ہے، معنیٰ مفعول کے دے رہا ہے، جیسے خُبْزٌ سے مَخْبُوزٌ مراد ہو جاتی ہے، اور نقض سے مراد منقوض

ع ۲۶ ۱۰

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ع ﴿۲۱۶﴾ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ

اور علم تو اللہ ہی رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے ۷۹۳ اور آپ سے حرمت والے مہینے کی بابت (یعنی) اس میں قتال کی

قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

بابت دریافت کرتے ہیں ۷۹۴ آپ کہہ دیجیے کہ اس میں قتال کرنا بڑا (گناہ) ہے ۷۹۵ اور اس سے کہیں بڑے (جرم) اللہ کے نزدیک اللہ کی

۷۹۲ تعداد میں قلیل اور قوت و شوکت میں ضعیف و مضمحل جن مسلمانوں کو جہاد و قتال پر آمادہ کرنے کے لئے قرآن مجید کو اس تصریح و اہتمام سے کام لینے کی ضرورت پیش آرہی ہے، انکی بابت اسلام کے مشہور و معروف "کرم فرما" اور مسیحی دنیا کے نامور مؤرخ و سیرت نویس پروفیسر مارگولیس کا یہ قول کس قدر "سچائی" اور "دیانت" سے لبریز ہے کہ: (نعوذ باللہ) محمد نے اپنے شورش پسند پیروؤں کو مشغول رکھنے کیلئے جہاد کے ذریعہ لوٹ میں لگا دیا۔ گویا کمزوروں کا زور آوروں کے سامنے اپنی جانیں دینے کے لئے آنا شکار کی قسم کا کوئی مشغلۂ سیر و تفریح تھا!۔۔۔

دین کے دشمنوں پر یہ بھی اللہ کی کیسی پھٹکار ہے کہ عقلیں بھی مسخ ہو جاتی ہیں۔

شَيْئًا۔ صیغۂ نکرہ ہے اور اس سے یہ اشارہ نکل آیا کہ یہاں کوئی کلی قاعدہ نہیں بیان ہو رہا ہے، یعنی ہر طبعی مرغوب و محبوب کا شر ہونا اور ہر طبعی مکروہ و مبغوض کا خیر ہونا لازمی نہیں۔

۷۹۳ یعنی اللہ ہی کا علم کامل اور ظاہر و باطن ہر پہلو کو محیط ہے، اس لئے اس کے احکام ہمیشہ بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں، انسانی علم اس کے برخلاف کسی چیز کا بھی کامل اور جامع نہیں ہوتا ہے اس لئے خود انسان کی عافیت و مصلحت اسی میں ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل بے چون و چرا کر لیا کرے۔

۷۹۴ اوپر اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ کے ذیل میں گزر چکا ہے کہ قمری سال کے چار مہینے محرم، رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، عرب جاہلیت میں متبرک و محترم تھے قتل و غارت تو ان لوگوں کا پیشہ ہی تھا لیکن اس زمانہ میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی تھی۔

اَلشَّهْرِ الْحَرَامِ سے یہاں مراد ماہ رجب ہے، ہوا یہ کہ ۲ھ ہجری یعنی ہجرت مدینہ سے کوئی ۱۷ مہینہ بعد ایک بار سفر میں بعض صحابیوں کا مقابلہ مشرکین سے ہو گیا اور ایک مشرک مقابلہ میں جان سے مارا گیا، واقعہ کی تاریخ صحابیوں کے خیال میں ۳۰ جمادی الثانی کی تھی بعد کو علم ہوا (جیسا کہ آج بھی قمری مہینوں میں بار بار ہوتا رہتا ہے) کہ چاند ۲۹ کا ہو گیا تھا، اور وہ تاریخ یکم رجب کی تھی، مشرکین نے سہو و غلطی کی اس رائی کو لیکر پہاڑ بنا دیا، اور طعن و اعتراض شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو اب محترم مہینوں کی حرمت کا بھی لحاظ نہیں۔

ان محمدا بعث سرية فلقوا عمرو بن الحضرمي في آخر ليلة من جمادى الاخرى ليلة من رجب وان اصحاب محمد صلى الله عليه وسلم كانوا يظنون ان تلك الليلة من جمادى الاخرى وكانت اول رجب ولم يشعروا فقتله رجل منهم واخذوا ما كان معه (ابن جرير عن ابن عباس) لقي واقد بن عبد الله عمرو بن الحضرمي اول ليلة من رجب وهو يرى انه من جمادى فقتله (ابن جرير۔ عن مقسم)

قِتَالٍ فِيْهِ ترکیب میں بدل ہے اَلشَّهْرِ الْحَرَامِ سے۔

بدل اشتمال من الشهر الحرام (بیضاوی) وهذا يسمى بدل الاشتمال كقولك اعجبني زيد علمه وانفعني زيد كلامه (کبیر)

۷۹۵ (جب کہ دانستہ یعنی ماہ حرام کا علم رکھنے کے باوجود ہو، اور یہ جرم مسلمانوں سے سرے سے سرزد ہی نہیں ہوا)

وما وقع من اصحابه عليه السلام كان من باب الخطاء في الاجتهاد وهو معفو عنه (روح)

وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ

راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دینا ہیں ۷۹۶

فقہاء مفسرین میں ایک بڑی بحث اس کی ہوئی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال اب بھی جائز ہے یا نہیں محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کفار اس مہینہ میں قتال شروع کر دیں تو مسلمانوں کی حیات کی حفاظت کے لئے دفاعی وجوابی قتال تو بہرحال جائز ہے

لاخلاف فی جواز القتال فی الشہر الحرام اذا بدؤا (زاد المعاد۔ فصل احکام غزوۂ خیبر)

گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے بھی اس میں ابتداء جائز ہے؟

انما الخلاف ان یقاتل فیہ ابتداءً۔ (زاد المعاد)

سو امام ابو حنیفہؒ و امام مالکؒ و امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور جمہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قرآن ہی کی دوسری آیتوں سے یہ حکم حرمت کالعدم ہو گیا ہے اور اب جہاد ان مہینوں میں بھی شروع ہو سکتا ہے۔

فالجمہور جوّزوہ وقالوا تحریم القتال فیہ منسوخ وھو مذھب الائمۃ الاربعۃ (زاد المعاد) قال سائر العلماء ھی منسوخۃ (ابن العربی)

عن سلیمان بن یسار وسعید بن المسیب ان القتال جائز فی الشہر الحرام وھو قول فقہاء الامصار (جصاص)

لیکن عطاء تابعیؒ اور بعض اکابر اس کے قائل ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا حکم دائمی وقطعی ہے بلکہ عطاء تو اپنے فتوے کی صحت پر حلف اٹھا لینے کو تیار رہتے۔

مذھب عطاء وغیرہ الی انہ ثابت غیر منسوخ وکان عطاء یحلف باللّٰہ ما یحل القتال فی الشہر الحرام (زاد المعاد) کان عطاء یحلف انھا ثابت لان الایات التی بعدھا عامۃ فی الازمنۃ وھذا خاص والعام لاینسخ بالخاص باتفاق (ابن العربی) قالت طائفۃ حکمہ باق لم ینسخ فیمن قال ذالک عطاء بن ابی رباح۔ (جصاص)

۷۹۶ (سو بالفرض وہ جرم مسلمان سے سرزد ہوا بھی ہوتا، جب بھی ایسے شدید بلکہ اشد جرائم کے مجرموں کو کیا حق ہے ایک اتفاقی واقعۂ قتل پر اعتراض واحتجاج کا؟)

صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ اللہ کی راہ سے مراد اسلام ہے، اس سے روکنا یعنی اسلام قبول کرنے والوں کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالنا، اُن پر ظلم وستم توڑنا۔

سَبِيْلِ اللّٰهِ ای الاسلام او ما یوصل العبد الی اللّٰہ (بیضاوی)

كُفْرٌۢ بِهٖ۔ یعنی اللہ سے کفر اختیار کرنا، اللہ کے دین وشریعت کو نہ قبول کرنے، اور اللہ کا شریک دوسروں کو ٹھہرانے کا عین کفر ہونا ظاہر ہی ہے۔

وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ مسجد کعبہ خاص اہلِ توحید ہی کا معبد و مرکز ہے، اس کا ہر وقت اللہ کے پرستاروں کے لئے کھلا رہنا اسلامی حکومت کے فرائضِ اوّلیں میں سے ہے۔

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا عطف ترکیب میں سَبِيْلِ اللّٰهِ پر نہیں، بلکہ تقدیرِ کلام یوں ہے:۔

ویصدّون عن المسجد الحرام۔ ولا یحسن عطفہ علی سبیل اللّٰہ (بیضاوی) تقدیرہ ویصدون عن المسجد (عکبری) واختار ابو البقا کونہ متعلقا بفعل محذوف دل علیہ الصد ای ویصدون عن المسجد الحرام۔ (روح)

وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ

اور فتنہ قتل سے (کہیں) بڑھ کر ہے ۷۹۷ اور یہ لوگ تو تم سے جنگ جاری ہی رکھیں گے تاآنکہ اگر ان کا بس چلے تو

عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ

تمہیں تمہارے دین سے پھیر ہی کر رہیں ۷۹۸ اور جو کوئی بھی تم میں سے پھر جائے اپنے دین سے

اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ ۔ دونوں ضمیریں المسجد الحرام کی طرف ہیں یعنی رسول اور مومنین کو ہر طرح تنگ و پریشان کرکے مسجد الحرام سے نکال دینا، وہاں ان کا داخلہ بند کردینا، انھیں اَهْل اس لئے کہا گیا کہ یہی لوگ تو اس حرمت والی مسجد کے حقوق ادا کرنے والے تھے۔

انما کان اھلہ لانھم القائمون بحقوقہ ۔ (روح)

گویا کافروں کے اعتراض کے جواب میں دو باتیں ارشاد ہوئیں ایک یہ کہ مسلمانوں سے وہ گناہ عمداً ازمانہ حرمت میں قتل کرنے کا عمل صادر ہی نہیں ہوا، دوسری بات یہ کہ بالفرض صادر ہوتا بھی تو تمہارے سنگین و شدید جرائم سے اس کا کیا مقابلہ؟

۷۹۷ (اپنے مفاسد اور اپنی مضرتوں کے اعتبار سے)

اَلْفِتْنَةُ سے مراد وہ شدید مزاحمتیں اور رکاوٹیں ہیں جو معاندین نے دین حق کی راہ میں پیدا کر رکھی تھیں ۔ اُس دین کی راہ میں جس کا مقصد ہی دنیا کو راہ امن دکھانا اور تمام زحمتوں اور کلفتوں سے نجات دلانا ہے۔

ای مما یفتتن بہ المسلمون ویعذبون بہ لیکفروا (روح) والمعنی عند جمھور المفسرین الفتنۃ التی کانت تفتن المسلمین عن دینھم حتی یھلکوا (بحر) الفتنۃ ھی ما کانوا یفتنون المسلمین عن دینھم تارۃ بالقاء الشبھات فی قلوبھم وتارۃ بالتعذیب (کبیر)

فِتْنَة کے معنی یہاں مطلق کفر کے بھی کئے گئے ہیں، لیکن زیادہ چسپاں نہیں ہوتے' یہ قول امام رازیؒ کے

وھو عندی ضعیف (کبیر) قول محقق وہی ہے جو اوپر درج ہوا۔

اَكْبَرُ کی تفسیر ابن عباسؓ صحابی و تابعین کے قول میں اَشَدّ سے آئی ہے۔

مِنَ الْقَتْلِ یعنی اس خاص واقعۂ قتل سے مقصد ارشاد یہ ہے کہ دین حق کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، اور لوگوں کو اس کی طرف آنے سے طرح طرح کی سازشوں، تدبیروں سے روکتے ہیں، وہ حقیقتاً دنیا کو امن و عدل و عافیت سے محروم کردینا چاہتے ہیں اور اس لئے وہ نوع و نسل انسانی کے مجرم ہیں، اسلامی جہاد کی تو غایت ہی دنیا سے ہر قسم کی خودغرضیوں اور فریب کاریوں، ظلم و جور، شورش و بدامنی کو دور کرنا ہے، جو احمق اس کو اور عام دنیوی حکومتوں کے قتل و قتال کو یکساں سمجھ رہے ہیں، وہ جراح کے نشتر اور ڈاکو کے خنجر کو ایک سطح پر رکھ رہے ہیں۔

۷۹۸ یہ بیان ہے اس کا کہ مشرکین عرب اسلام سے کس درجہ بیزار اور حق کے کس درجہ دشمن تھے۔

لَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ میں اشارہ انھیں دشمنان حق کی جانب ہے۔

ایک انگریز مترجم قرآن کیمبرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر پامر ہوئے ہیں، اس موقع پر طنز و تعریض کا نشتر یوں چلاتے ہیں:

## فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

اور اس حال میں کہ وہ کافر ہے مرجائے، تو یہی وہ لوگ ہیں کہ اُن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے ۷۹۹

"اب اسلام نے کافروں پر ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا"

دھاوا چاروں طرف سے یقیناً بول دیا گیا تھا، لیکن اس جھوٹ میں سچ صرف اتنا ہے کہ یہ دھاوا اسلام کا نہ تھا، خود اسلام پر تھا۔

حَتّٰی کے معنی یہاں "تاکہ" کے ہیں، اور غرض و مقصود کے اظہار کے لئے ہے۔

حتی للتعلیل (بیضاوی) یجوز ان یکون بمعنی الی (عکبری) ای الی ان یردوکم وقیل المعنی لیردوکم (کبیر)

اِنِ اسْتَطَاعُوْا میں اشارہ یہ پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا اپنے دین سے ہٹنا اور کافروں کا انھیں اپنی کوششوں سے ہٹا لینا کچھ آسان نہ تھا۔

استبعاد لاستطاعتهم (کبیر) اشارۃ الی تصلبهم فی الدین وثبات قدمهم فیه کانه قیل وانّی لهم ذلك (ابو سعود)

۷۹۹ حَبِطَتْ ... الْاٰخِرَةِ حبطِ اعمال کا اثر آخرت میں تو یوں ظاہر ہوگا کہ یہ بدنصیب مُرتد اپنے کو ہر طاعت کے اجر اور ہر عبادت کے ثواب سے محروم پائے گا، اور دنیا میں اس کا ظہور یوں ہوگا کہ نہ مسلمان بیوی سے اس کا نکاح قائم رہ سکتا ہے نہ مسلمان کی میراث میں اُسے حصہ مل سکتا ہے، بلکہ حکومت اگر اسلامی ہو تو ایسے بدعہد باغی و غدّار کو زندہ رہنے کا بھی حق باقی نہیں رہتا۔ شریعتِ یہود میں ارتداد ہی نہیں، سعیِ ارتداد اور ترغیبِ ارتداد کی بھی سزا قتل و سنگساری ہے۔ توریت میں ہے:-

"اگر تیرا بھائی جو تیری ماں کا بیٹا ہے یا تیرا ہی بیٹا ہے یا تیری بیٹی یا تیری ہمکنار جورو یا تیرا دوست جو تجھے جان کے برابر عزیز ہے، تجھے پوشیدہ میں پھسلاوے اور کہے کہ آج غیر معبودوں کی بندگی کریں جن سے تو اور تیرے باپ دادے واقف نہیں تھے، تو تُو اس سے موافق نہ ہونا، اور اس کی بات نہ سُننا، تو اس پر رحم کی نگاہ نہ رکھنا، تو اس کی رعایت نہ کرنا، تو اُسے پوشیدہ نہ رکھنا، بلکہ اُسے ضرور قتل کرنا، اس کے قتل پر پہلے تیرا ہاتھ بڑھے اور بعد اس کے قوم کے ہاتھ، اور تو اُسے سنگسار کرنا تاکہ وہ مرجائے"۔ (استثناء۔ ۱۳: ۶-۱۰)

اور نصرانیوں کے ہاں بھی:-

"دانستہ ارتداد ناقابلِ تلافی گناہ ہے قتل اور زناکاری کے درجہ کا"۔ (انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱ صفحہ ۶۲۳)

چنانچہ انگلستان میں ایک چھوٹے پادری نے جب تیرھویں صدی مسیحی میں ایک یہودن سے شادی کے پھیر میں دینِ نصرانیت کو ترک کر دیا تھا تو اُسے آکسفورڈ میں ۱۷ اپریل ۱۲۳۲ء کو جلا دیا گیا (ایضاً صفحہ ۶۲۴)

فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ "اسی حالتِ کفر ہی میں اس کی موت آجائے"۔ یہ فقرہ بڑھا کر گویا یہ ترغیب دے دی کہ اگر خدانخواستہ کوئی مرتد ہو ہی گیا تو اب بھی موقع ارتداد سے پھر اپنے دین کی طرف واپس آجانے کا باقی ہے۔ امام شافعیؒ نے اس فقرہ سے یہ استنباط کیا ہے کہ محض ارتداد سے اعمال کا حبط نہیں ہو جاتا جب تک کہ مرتد کی موت بھی ارتداد پر نہ ہو۔

وبها احتج الشافعیؒ علی ان الردۃ لا تحبط العمل حتی یموت علیها (مدارك) قید الردۃ بالموت علیها فی احباط الاعمال کما هو مذهب الشافعی (بیضاوی)

لیکن حنفیہ کے پاس جواب ہے کہ یہ مسئلہ تو خود قرآن ہی نے صاف کر دیا ہے، اور ایک دوسری آیت میں صاف

وَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِۚ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ

اور یہ اہل دوزخ ہیں، اُسی میں (ہمیشہ) پڑے رہنے والے ۸۰۰۔ بے شک جو لوگ

اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۙ

ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ۸۰۱۔

حبطِ عمل کو نفس ارتداد پر معلق کر دیا ہے۔

ومن یکفر بالایمان فقد حبط عملہ۔ (المائدۃ ۔ ۵)

اور یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے۔

قال مالک یحبط بنفس الردۃ (ابن العربی)

یَرْتَدِدْ۔ باب افتعال سے ہے اور افتعال میں ایک مفہوم تکلّف کا بھی نکلتا ہے، چنانچہ بعض اہلِ معانی نے یہ بھی لکھا ہے کہ فعل کے اس باب میں لانے سے اسی عمل ارتداد کے استبعاد پر توجہ دلانا ہے۔

وجاء افتعل ھنا بمعنی التعمل والتکسب لانہ تکلف اذ من باشر دین الحق یبعد ان یرجع عنہ

عَنْ دِیْنِہٖ۔ دین سے یہاں کُھلی ہوئی مُراد دینِ اسلام ہے کہ خطاب یہاں مومنین ہی سے ہے، یہ مُراد نہیں کہ کسی دین سے کوئی پھر جائے۔

۸۰۰۔ (نجات و رہائی کی طرف سے مایوس)

خٰلِدُوْنَ۔ خُلُوْد کے معنی ہیں کسی چیز کا ایک حالت پر بغیر کسی قسم کا خلل پڑے ہوئے قائم و باقی رہنا۔

الخلود بقاء الاشیاء علی الحالۃ التی علیھا من غیر اعتراض الفساد (راغب)

اس تصریح نے اور صاف کر دیا، ورنہ یوں بھی عالمِ آخرت ہمیشگی کا عالم ہے، وہاں کی ہر سزا و جزا (تا وقتیکہ موقّت و محدود نہ کر دی جائے) دائمی و جاودانی ہوتی ہی ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ قدیم محقق مترجمین نے اپنے ترجموں میں اس پہلو کو واضح کر دیا ہے، ایشاں دراں جاوید اند (شاہ ولی اللہ دہلویؒ) وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہیں گے (شاہ رفیع الدین دہلویؒ)

۸۰۱۔ (خواہ قتال سے یا بغیر قتال کے)

اَلَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا۔ دین کے تحفظ و بقا کی خاطر وطن جیسی عزیز و محبوب چیز کو مع وہاں کے تمام مرغوبات و مالوفات کے چھوڑنا اور کفر کی بستی کو ترک کر کے ایمان کی بستی میں آ جانے کا نام اصطلاحِ شریعت میں ہجرت ہے۔

الخروج من الکفر الی دار الایمان (راغب)

جٰھَدُوْا۔ جہاد کے معنی شدید کوشش اور جدّ و جہد کے ہیں، اس میں سب طرح کی بلائیں اور تکلیفیں آ گئیں، اور اس کی ایک بڑی فرد قتال ہے۔

فاطرِ کائنات کے قانون میں ہجرت و جہاد دونوں کے بڑے فضائل اور بڑے مرتبے ہیں، ایمان خود ہی کیا کم دولت ہے، اور جب اس کے ساتھ یہ دونوں مرتبے بھی حاصل ہو جائیں تو اس کے درجہ کا کیا ٹھکانا ہے! نفس ایمان تو

أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ

تو یہی لوگ اللہ کی رحمت کی امید رکھیں گے ٨٠٢ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ٨٠٣ (لوگ) آپ سے شراب

الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

اور قمار کی بابت دریافت کرتے ہیں ٨٠٤ آپ کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا گناہ ہے ٨٠٥ اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں ٨٠٦

سب صحابیوں میں مشترک تھا ہی، کثرت سے صحابہ ان دونوں مزید دولتوں سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔

فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ یہ قید لگا کر پھر اس حقیقت کو صاف کر دیا کہ ہجرت وجہاد، بجائے خود کیسے ہی مجاہدے ہی اللہ کے یہاں مقبول جب ہی ہیں جب خدا کی راہ میں ہوں، دین خدا کے واسطے ہوں، ورنہ محض محنت ہی محنت ہاتھ رہے گی۔ وطن، قوم، نسل، رنگ کے نام پر جانیں دے دینے والے، بڑی سی بڑی مصیبتیں جھیل لے جانے والے آج ہندوؤں، پارسیوں، جرمنوں، انگریزوں، روسیوں، امریکیوں، جاپانیوں ہر مذہب وملت اور ہر قوم وملک میں لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے، لیکن سب فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور الَّذِينَ آمَنُوا کے وصف سے خالی، اکبرؔ نے خوب کہا ہے ؎

ثواب جب ہے کہ ناخوش ہو اس بنا پر تم — دلوں کو طاعتِ حق سے یہ دور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز — ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

٨٠٢ یہ بشارت وتسلی اپنے اطلاق میں عام ہے ہر مومن مہاجر ومجاہد کے لئے، لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ ان مومنین کے حق میں ہے جن کے ہاتھ سے ایک مشرک کا قتل یکم رجب کو بغیر صحیح تاریخ سے واقفیت کے ہو گیا تھا، اوپر کے حاشیوں میں ضروری تفصیل گزر چکی۔

٨٠٣ ان صفات کے اثبات سے مقصود مومنین کی مزید تشفی وبشارت ہے۔

غَفُورٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ غفوریت کے تقاضے سے اس سہو وخطا کو معاف کرے گا۔

رَحِيمٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ رحیمیت کے تقاضے سے اجر بھی مرحمت فرمائے گا۔

٨٠٤ یعنی ان کے حکم شرعی کی بابت، ان کے جواز وعدم جواز کی بابت۔

والمعنیٰ یسئلونک عما فی تعاطیھما بدلیل (کشاف) دل تخصیص الجواب علیٰ ان ذٰلک السؤال کان واقعا عن الحل والحرمۃ۔ (کبیر)

الْخَمْرِ۔ خمر ومیسر یہاں دونوں اپنے عام ووسیع معنیٰ میں ہیں۔ خمر کے تحت میں ہر وہ نشیلا مشروب داخل ہے جو عقل کو مختل کر دے۔

اسم لکل مسکر خامر العقل (تاج) الخمر ما اسکر من عصیر کل شئی (تاج) سُمّیت لکونھا خامرۃ لمقر العقل۔ (راغب)

شریعت نے بھی اسی لغوی مفہوم کو قبول کر لیا ہے، صحابیوں اور تابعین سب سے یہی معنیٰ منقول ہیں۔

الخمر ما خامر العقل (بخاری عن ابن عمرؓ) الخمر کل شراب خمر العقل فستره وغطی علیه (ابن جریر)

الْمَيْسِرِ۔ بھی ایسے ہی وسیع معنیٰ میں ہے اور جوئے کے تمام اقسام پر شامل ہے۔

کل شئی فیه قمار فھو من المیسر (تاج)

علمائے شریعت نے بھی اسی لغوی مفہوم پر مُہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

المیسر وھو القمار (ابن کثیر) یعنی القمار (معالم) وفی حکم المیسر انواع القمار والنرد والشطرنج وغیرھما۔ (مدارک)

شراب اور جُوا جس طرح آج فرنگی تہذیب میں جائز ہی نہیں، بلکہ عین اس تہذیب کا جزو بنے ہوئے ہیں، اور دلیل اعزاز ہیں، اسی طرح قدیم عربی تہذیب کا بھی جزو تھے، اور لوازم شائستگی میں سمجھے جاتے تھے، اور اکیلے عرب ہی پر موقوف نہیں، یہ مشغلے سارے روئے زمین پر پھیلے ہوئے تھے، اور ہندی تہذیب، مصری تہذیب، یونانی تہذیب، رومی تہذیب تو خیر خود ہی جاہلی تہذیبیں تھیں، اسرائیلی اور مسیحی تہذیبیں، جو شرف نبوت کے تعلق سے مشرف تھیں، وہ بھی ان کی روک تھام نہ کر سکی تھیں، شریعتِ اسلامی ہی دنیا کا وہ قانون ہے جس نے آکر ان کی قطعی حرمت کا اعلان کیا، یہ آیت سلسلۂ حرمت کی سب سے پہلی آیت ہے، قطعی حکم بعد کو نازل ہوا۔

علامہ آلوسی بغدادی، صاحبِ تفسیر روح المعانی نے اس مقام پر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ کے فاسقوں نے نشیلے مشروبات کے لئے طرح طرح کے خوشنما نام اور لقب رکھ لئے ہیں، عرق عنبری، ماء الاکسیر وغیرہا لیکن نام کے بدل دینے سے حقیقت اور حکم شرعی نہیں بدل جایا کرتا، نشہ آور چیزیں بہرحال حرام ہیں، علامہ کا سال وفات ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۲ء ہے اور تفسیر کا زمانۂ تصنیف تو اس سے چند سال قبل ہے گویا آج (۱۹۶۳ء) سے سوا سو سال قبل کے عراق میں آں مرحوم کو یہ حسرتناک تجربے ہو چکے تھے، غریب کو کیا اندازہ ہو سکتا تھا کہ آج فرنگیوں کے اثر سے ان کے وطن عراق ہی میں نہیں بلکہ مصر، ایران، ترکی، شام وغیرہ میں شراب نوشی کتنی اور کن کن شکلوں کے ساتھ پھیل چکی ہے! اور خمر ہی نہیں میسر بھی کیسے کیسے نئے اور خوشنما ناموں کے ساتھ "تہذیب و تمدن" کا جزو بن چکا ہے، اور تہذّبِ زندگی کے کتنے گوشوں میں اپنی مستقل جگہ بنا چکا ہے۔

**۸۰۵** (جیسا کہ مشاہد ہے)

اِثم کا لفظ ہر ایسے فعل کے لئے آتا ہے جو نیکی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والا ہو۔

اثم للافعال المبطئۃ عن الثواب۔ (راغب)

اثم کا اطلاق کسی عمل پر خود اسے حرام قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

الاثم کلہ محرم (جصاص)

چہ جائیکہ جب اس پر تاکید بھی کبیر کے ساتھ موجود ہو! اِثمٌ کَبِیرٌ ہی سے فقہاء نے نکالا ہے کہ شراب کی مقدار قلیل بھی حرام ہے

ولاحد علی تحریم القلیل منہ (جصاص)

اور اس لحاظ سے قرآن مجید ان دونوں کے حق میں لفظ اِثمٌ بہت خوب لایا، معاشرہ میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں، گالیاں یہ بکوائے، بے حیائی یہ پھیلائے، حرام کاری کی طرف یہ لائے، بلوے، دنگے یہ کرا دے، طرح طرح کی خطرناک اور مہلک بیماریاں یہ پیدا کر دے، چوری، ٹھگی پر یہ آمادہ کرے، قتل کی نوبت یہ لے آئے، دوستوں، عزیزوں کے درمیان جوتا یہ چلوا دے، ہر عبادت سے، طہارت سے، پاکیزہ نفسی سے یہ روک دے، اور اسرافِ شدید تو اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں، پھر قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں کچھ کم ہیں؟ فرنگستان کے سب سے بڑے قمار خانہ مونٹے کارلو (MONTE CARLU) میں ہر سال بے شمار و بے اندازہ دولت تلف ہوتی رہتی ہے! دیوالی اور جگھٹ کی راتوں کو ہندوستان کے اندر کیا کچھ نہیں ہوتا؟ اور پھر جُوے کی جدید ترین شکلوں، بیمہ کمپنیوں کے جُوئے، گھوڑ دوڑ کے جُوئے، چٹھیوں (لاٹریوں) کے جُوئے، سٹے وغیرہ کو کوئی

## وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

اور ان کا گناہ ان کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے ۸۰۵

۸۰۵ کہاں تک شمار کرے؟ سچ کہا ان مفسرین نے جنھوں نے کہا کہ ان دونوں شغلوں کے اندر نیکیوں سے بڑی رکاوٹ ہے۔
فی تناولهما ابطاء عن الخيرات (راغب) من حيث ان تناولهما مؤدّ الی ما يوجب الاثم وهو ترك المامور وفعل المحظور۔ (روح)

بعض صحابیوں مثلاً حضرت عمرؓ اور حضرت معاذؓ کی بابت منقول ہے کہ انھوں نے شراب کی بابت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ازخود دریافت کرنا شروع کر دیا تھا کہ ایسی چیز جو عقل اور مال دونوں کو غارت و برباد کر دینے والی ہو، اس کے باب میں کیا حکم ہے۔
كان المسلمون يشربونها وهي حلال لهم ثم ان عمر ومعاذا ونفرا من الصحابة قالوا يا رسول الله افتنا في الخمر فانها مذهبة للعقل مسلبة للمال (کبیر)
صحبتِ رسولؐ کی برکت سے اگر قلوب میں ازخود اتنی جلا پیدا ہو گئی ہو تو اس میں حیرت ہی کیا ہے؟

۸۰۶ (کچھ تھوڑے بہت)
حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سرے سے محض ہی محض ضرر اور ہر طرح نفع و مصلحت سے خالی کوئی شئے موجود ہی نہیں یہاں تک کہ شراب نوشی اور قماربازی جیسے گندے مشغلے بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے، بعض شرابیں منفعت رکھتی ہیں، شراب سے فوری لذت و سرور حاصل ہوتا ہے، بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہو جاتی ہے، یا اسی طرح جوئے میں جو جیتتا ہے اسے بلا مشقت و تعب تھوڑی ہی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔
ای باللذة والفرح فی الخمر واصابة المال بلا كدّ فی الميسر (جلالین)
مفسرین نے آیت کے اس جزو کے تحت شراب کے بہت سے منافع و مصالح اپنی اپنی بصیرت و دائرۂ علم کے لائق گنائے ہیں، اور یہیں سے ایک اور مسئلہ نکل آیا۔ کسی حرام اور ناجائز شے کے جزوی منافع و مصالح بیان کرنا اس کی حرمت کے منافی اور اس کی حرمت سے انکار کے مرادف ہرگز نہیں، اور بہ حقیقت اسی آیت سے بالکل واضح ہو گئی کہ کسی شئے کے معصیت ہونے اور اس کی نافعیتِ جزئی کے درمیان کوئی تناقض نہیں، خود فرنگی تہذیب بھی اپنے اندر بہت سے محاسن اور روشن پہلو رکھتی ہے، پاسِ عہد، پابندیِ وقت، عام جذبۂ خدمتِ خلق وغیرہ، تاہم اعلیٰ اخلاق و روحانی قدروں سے انکار اور ان کی ناقدری کی بنا پر اس پر اطلاق بہ حیثیت مجموعی خیر کا نہیں شر کا ہوگا، اور ایسا ہی حال قدیم عرب کے جاہلی تمدن کا تھا، پاسِ عہد، مہمان نوازی، فیاضی، وغیرہ متعدد جوہرِ شرافت اس کے عناصرِ ترکیبی تھے، با ایں ہمہ وہ تمدنِ رحمانی نہیں شیطانی ہی تھا۔
آج جو "اسپرٹ" ملی ہوئی انگریزی دوائیں کثرت سے چل پڑی ہیں، یہ عموماً تیزاب کے قسم کی ہوتی ہیں، اور فقہاء نے انھیں زہر کے حکم میں رکھا ہے۔

۸۰۷ (اس لئے عقلِ سلیم کے لحاظ سے یہ دونوں چیزیں قابلِ ترک اور واجب الاحتراز ہیں۔)

فقہاء نے کہا اور بالکل صحیح کہا ہے کہ حرمتِ خمر پر دوسری آیتیں اس سے واضح تر اور صحیح تر موجود نہ ہوتیں، جب بھی خود یہ آیت حرمت کے لئے کافی تھی۔

ھذہ الآیۃ قد اقتضت تحریم الخمر لو لم یرد غیرھا فی تحریمھا لکانت کافیۃ مغنیۃ (جصاص)

قال قوم من اھل النظر حرمت الخمر بھذہ الآیۃ لان اللہ تعالیٰ قد قال قل انما حرم ربی الفواحش ماظھر منھا وما بطن فاخبر فی ھذہ الآیۃ ان فیھا اثم فھو حرام۔ (قرطبی)

یہ فخر تاریخ میں اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ایک اشارہ سے اپنے حدودِ مملکت سے کہنا چاہئے کہ ان خبائث کا خاتمہ ہی کر دیا اور اشخاص و افراد کی کارستانیوں سے قطع نظر، امت کی نظر میں بہ حیثیت مجموعی لفظ "شرابی" اور لفظ "جواری" دونوں کو انتہائی تحقیر و ذلت کا لقب ٹھہرا دیا، یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو جہاں تک ان اخلاقی نجاستوں کا تعلق ہے، پاکیزگی اور ستھرائی کے اس بلند مقام پر پہونچا دیا، جہاں تک باوجود علم و فضل، فہم و دانش کے بلند بانگ دعووں کے، آج تک نہ کوئی "ٹمپرنس ایسوسی ایشن" (اعتدال، احتیاط کی تبلیغ کرنے والی انجمن) پہونچا سکی ہے نہ کوئی پروہیبیشنسٹ ( PROHIBITIONIST ) گورنمنٹ (قانونِ امتناع جاری کرنے والی حکومت) اسر ولیم میور اپنے نہیں بیگانے ہیں، معتقد نہیں منتقد ہیں، باوجود اس کے لکھتے ہیں:۔

"اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترکِ میکشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے"۔ (لائف آف محمد ص ۵۲۱)

انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگریس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحاق ٹیلر نے کہا تھا:۔

"دنیا میں انسدادِ مے نوشی کی سب سے بڑی انجمن خود اسلام ہے، برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہونچتے جاتے ہیں، مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے"۔

ٹمپرنس کے نام سے مے نوشی میں اعتدال و احتیاط پیدا کرنے کے لئے یورپ اور امریکا اور ہندوستان میں آج بھی خدا معلوم کتنی انجمنیں بہترین نظم و نظام اور شہرتِ کارکردگی کے ساتھ قائم ہیں، اور امریکہ کے مشہور کارکن "گربہ پاجانسن" ( PUSSY FOOT JOHNSON ) نے تو ۴۰۔۵۰ سال ہوئے اپنی سرگرمیوں کی دھوم ساری دنیائے متمدن میں مچا دی، اور بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرین سائنس شراب کے نقصانات پر بیانات اور اعداد برابر شائع ہی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان ساری سرگرم کوششوں کے باوجود خود انھیں لوگوں کو یہ اقرار ہے کہ شراب کو قطعی حرام کئے بغیر کوئی چارہ نہیں (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، جلد ۲۶ ص ۵۹ طبع یازدہم) ہندوستان میں ابھی چند ہی سال ہوئے متعدد صوبہ سرکاروں نے اپنے علاقوں میں قانون امتناع نافذ کر دیا تھا، لیکن کئی جگہ آگے چل کر وہ قانون واپس لیتے ہی بنا!۔۔۔ محکمۂ آبکاری کی لکھوکھا روپیہ کی آمدنی سے دستبردار ہو جانا کوئی آسان بات ہے؟ رہی قمار بازی سو اس باب میں قانون اسلام سے باغی و منحرف ہو کر یورپ اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کر رہا ہے، وہ عالم آشکارا ہے، خودکشی اور اقدامِ خودکشی کے کتنے واقعات، مے نوشی اور قمار بازی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں، پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگِ عظیم سے قبل، اکیلے ملک انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پاؤنڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہونچتی رہتی ہے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن

وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۵ قُلِ الْعَفْوَ ط كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

اور (لوگ) آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں ۸۰۸ آپ کہہ دیجئے کہ جتنا (بھی) آسان ہو ۸۰۹ اللہ اسی طرح

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط

تمہارے لئے کھول کر احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم سوچ لیا کرو، دنیا اور آخرت (کے معاملات) میں ۸۱۰

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ط قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط

اور (لوگ) آپ سے یتیموں کے باب میں دریافت کرتے ہیں ۸۱۱ آپ کہہ دیجئے کہ ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے ۸۱۲

انیڈانیکس جلد ۶ ص ۱۶۴) یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا، اور وہ بھی پہلی جنگ عظیم سے قبل کا، یورپ کے کل ملکوں (اور اس فہرست میں دنیائے معلوم کا مشہور ترین قمار خانہ مانٹی کارلو بھی شامل ہے) اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کے لئے تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میزان حساب کن ہندسوں تک پہونچے! رہیں قانون وقت کی ناکام کوششیں تو اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی مقالہ میں ہے کہ:۔

"قانون اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کر رہا ہے بجز اسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے" (ص ۱۶۵)

یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے "عقلائے فرنگ" کی اس "ناممکن کوشش" کو اپنے حدود میں ممکن ہی نہیں واقع کر کے دکھا دیا۔

۸۰۸ (خیر خیرات میں)

فرض زکوٰۃ کی تو شرح متعین تھی، یہ سوال اس کے علاوہ دوسرے نیک کاموں میں صرف سے متعلق تھا۔

قال جمهور العلماء هي من نفقات التطوع۔ (قرطبی)

۸۰۹ اور اس آسانی کا معیار قول مفسر تھانویؒ یہ ہے کہ اس سے کسی حقدار کا حق ضائع نہ ہو اور اپنے ضروری مصارف میں تنگی نہ اٹھانا پڑے۔

اَلْعَفْوُ۔ عفو سے مراد اتنا خرچ کرنا ہے جو اپنے اوپر بار نہ ہو۔

العفو نقيض الجهد وهو ان ينفق ما لا يبلغ انفاقه منه الجهد (کشاف) ای ما لا يجهد (روح عن الحسن)

ای انفقوا ما فضل عن قدر الحاجة (مدارک)

۸۱۰ (ان احکام پر عمل کے وقت)

اُمورِ آخرت میں غور و فکر کرتے رہنے کی اہمیت تو ظاہر ہے، یہاں حکم اس کا بھی رہا ہے کہ امورِ دنیا میں بھی سوچ بچار سے کام لیا کرو — تو کیا دنیا بھی اس قابل ہے کہ اس کے معاملات میں غور و تدبر سے کام لیا جائے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ راز اس کا یہ ہے کہ انسان خلوِ ذہن کے ساتھ جس قدر دنیا اور اس کے کاروبار کو سوچے گا، اسی قدر اس کی بے ثباتی اور بے قدری اس کے دل پر جمتی جائے گی۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ

اور اگر تم ان کے ساتھ (خرچ) شامل رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں ۸۱۳ اللہ کو علم ہے کہ مُفسد (کون) ہے اور مصلح (کون) ۸۱۴

۸۱۱ (کہ ان کے خرچ کا کیا انتظام رکھا جائے، آیا اپنے حساب میں شامل رکھا جائے، یا ان کا حساب بالکل الگ کر دیا جائے) یہ سوال کرنے والے یتیموں کے اولیاء تھے جن کی ولایت و سرپرستی میں یتیم بچے پل رہے تھے، اللہ رے صحابہؓ کی احتیاط اور مرتبۂ تقویٰ! صراحت کے ساتھ آکر سوال کیا کہ یتیموں کی جائیدادوں سے انتفاع کی آیا کوئی بھی شکل اولیاء اور سرپرستوں تک کے لئے جائز ہے؟ جائداد کی طمع بھی بُری ہوتی ہے، عرب جاہلیت میں بہتیرے لوگ اس لئے یتیموں کو اپنی ولایت و سرپرستی میں لیتے تھے کہ ان کی جائداد میں خورد و بُرد کا موقع مل جائے گا، بلکہ کوئی یتیم لڑکی اگر مالدار نظر آتی تو اسے اپنے لڑکے کی شادی بھی اسی طمع میں کر لیا کرتے تھے۔

اَلْيَتٰمٰى۔ یتیم کی جمع ہے، اور یتیم سے مُراد وہ لڑکا یا لڑکی ہے جس کے سر سے باپ یا ماں کا سایہ اُٹھ گیا ہو۔ احکامِ شریعت میں یتیمی باپ کی طرف سے معتبر مانی گئی ہے۔

اليتيم المنفرد عن احد ابويه (جصاص) انما المراد بالايتام الفاقدون لآبائهم وهم صغار (جصاص)

۸۱۲ سو وہ جس طریق پر حاصل ہو، وہی صورت اختیار کی جائے۔

یہاں اصل اصول بیان کر دیا کہ مقدّم شرط جائداد یتیم کے مصالح کی رعایت ہے، اگر اس کا تقاضہ یہ ہو کہ اپنا اور یتیم کا حساب ایک میں رکھا جائے تو یہی کیا جائے ورنہ اس کے برعکس۔

اِصْلَاح۔ کا لفظ عام ہے، اگرچہ اس کا قریبی تعلق مالی مصالح سے ہے، لفظ کے عموم میں جسمانی، مالی، اخلاقی ہر قسم کی اصلاح آگئی، فقہاء نے بہ قاعدۂ اقتضاء النص اس عموم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یتیم پر جو تہدید، تنبیہ، تعلیم و تربیت کی ضرورت سے ہو وہ بالکل درست ہے، اسلام کی یتیم نوازی، یتیم پروری کا اعتراف اپنوں ہی کی طرح بیگانوں اور منکروں کو بھی ہے، برطانوی مصنف باسورتھ اسمتھ نے لکھا ہے :۔

”پیمبر کی توجہ خصوصی کے مرکز غلاموں کی طرح یتیم بھی رہے ہیں، وہ خود بھی یتیم رہ چکے تھے، اس لئے دل سے چاہتے تھے کہ جو حُسنِ سلوک خدا نے ان کے ساتھ کیا وہی وہ دوسروں کے ساتھ رکھیں۔“ (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۲۵۱)

امریکی ماہر اجتماعیات ڈاکٹر رابرٹس لکھتے ہیں :۔

”قرآن کے مطالعہ سے ایک خوشگوار ترین چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمدؐ کو بچوں کا کس قدر خیال تھا خصوصاً اُن بچوں کا جو والدین کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہوں، بار بار تاکید بچوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی ملتی ہے۔“ (سوشل لاز آف دی قرآن ص ۴۰ و ۴۱)

اور پھر کہا ہے :۔

”محمدؐ نے یتیموں کے باب میں اپنی خاص توجہ مبذول رکھی، یتیموں کے حقوق کا بکثرت ذکر اور اُن سے بدسلوکی کرنے والوں اور اُن کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت وعیدیں سیرتِ محمدی کے اُس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں جس پر مسلمان مصنفین کو بجا طور پر ناز ہے۔“ (ص ۴۱)

۸۱۳ (بھائی ہیں، اور اس لئے مشترک خرچ میں کوئی مضائقہ نہیں۔)

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ

اور اللہ اگر چاہتا تو تم کو پریشانی میں ڈال دیتا ۸۱۵ اللہ یقیناً زبردست ہے، حکمت والا ہے ۸۱۶ اور نکاح مشرک عورتوں کے

حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ

ساتھ نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۸۱۷ کہ مومنہ کنیز تک بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو ۸۱۸

اِخْوَانُكُمْ۔ لفظ اخ یا بھائی انتہائی اخلاص، یگانگت و مودّت کا مظہر ہے، اس ذرا سے لفظ میں بہت کچھ آ گیا، جب تم اور وہ بھائی ہی بھائی ٹھہرے تو بھائی بھائی میں تکلّف کیا؟ — اور عرب میں تو یہ رشتہ اور زیادہ قوی تھا۔

فهم اخوانكم والاخوان يعين بعضهم بعضا ويصيب بعضهم من اموال بعض على وجه الاصلاح والرضاء۔ (معالم)

"چونکہ اس وقت اکثر مسلمانوں کے پاس مسلمان ہی یتیم تھے، اس لئے اِخْوَانُكُمْ فرمایا، ورنہ اگر دوسرے مذہب کا بچہ بھی اپنی تربیت میں ہو، اس کا بھی بجنسہ یہی حکم ہے، اور اس کی دلیل دوسری آیات و احادیث ہیں جو الفاظِ عامّہ سے وارد ہیں، بلکہ اس کے ساتھ مذہبی رعایت اتنی اور زائد ہے کہ اس بچہ پر بعد بلوغ قبولِ اسلام کے لئے جبر نہیں کیا جاتا، مذہبی آزادی دی جاتی ہے۔" (تھانویؒ)

**۸۱۴** یعنی اُس پر سب کی نیک نیتی اور بدنیتی دونوں خوب روشن ہیں۔

**اَلْمُفْسِدُ۔ یعنی یتیموں کی مصلحت کو ضائع کرنے والا۔**

الذى يقصد بالمخالطة الخيانة وافساد مال اليتيم۔ (معالم)

**اَلْمُصْلِحُ۔ یعنی یتیموں کی مصلحت کا لحاظ رکھنے والا۔**

الذى يقصد الاصلاح۔ (معالم)

مُفسّر ابوسعود نے کہا ہے کہ لفظ اَلْمُفْسِدُ کو اَلْمُصْلِحُ پر مقدّم رکھنے میں وعید میں تاکید اور تہدید اور زیادہ پیدا ہو گئی۔

**۸۱۵** یعنی بجائے ان آسانیوں کے اس باب میں کوئی سخت قانون بنا دیتا۔

قال القتيبى لضيق عليكم وشدد۔ (قرطبی)

**وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی اگر اس کی حکمت و مشیّتِ تکوینی کا اقتضاء یہی ہوتا۔**

**۸۱۶** یہاں اپنی دونوں صفات یاد دلا دیں، پہلی صفت عَزِیْز کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ جو حکم چاہتا دے سکتا تھا، کوئی قوّت اس سے بالاتر، کوئی حاکم اس کے اوپر ممکن نہیں، سب پر بالادست خود ہی ہے، لیکن دوسری صفت حَكِیْم کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ احکام وہی دیتا ہے جو بندوں کے لئے نرم و آسان و قرینِ مصلحت ہوں۔

**۸۱۷** (اے مسلمان مردو!)

میاں بیوی کا رشتہ انتہائی اُلفت و رفق کا، اور باہمی مناسبت و موانست کا ہوتا ہے، بیوی کو اگر شوہر سے اس درجہ نامناسبت ہے کہ وہ اس کی ساری شعوری اور اختیاری زندگی کے اصل اصول یعنی توحید و رسالت ہی کی منکر ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں باہمی مناسبت کی بنیاد درجۂ ضعیف میں بھی موجود نہیں، مرد کو ایسی عورت کے ساتھ عمر بھر

نباہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہئے، موافقتِ کامل کے دوسرے اجزاء و عناصر موجود نہ ہوں، نہ سہی، لیکن کم از کم وہ بنیادی عقیدہ تو مشترک ہو جس کے تابع و ماتحت چھوٹا بڑا، زندگی کا ہر معاملہ ہے فطرتِ بشری خود ایسے بے جوڑ ازدواج سے ابا کرتی ہے، دینِ فطرت اسے کیونکر جائز رکھ سکتا تھا، پھر نکاح اسلام میں ایک دینی اور مذہبی عمل ہے، محض معاہدۂ دیوانی (CIVIL CONTRACT) نہیں، جب ایک فریق دین و مذہب کی بنیاد ہی سے منحرف ہے تو اس کے ساتھ معاہدہ ممکن کیونکر ہے؟

الْمُشْرِكَاتِ۔ لفظ مشرک یہاں اپنے عام و وسیع معنی میں ہے، ہر قسم کی کافر یا غیر مسلم عورت اس حکمِ ممانعت میں داخل ہوگئی، اس کا بت پرست ہونا لازم نہیں، قول محقق یہی ہے۔

عن ابن عمر انہا عامۃ فی الکتابیات وغیرھن (جصاص) المشرکات ھنا الکفار (نہر) والاکثرون من العلماء علی ان اللفظ المشرک یندرج فیہ الکفار من اہل الکتاب وھو المختار۔ (کبیر)

امام مالکؒ و امام شافعیؒ بس اسی آیت پر رک گئے ہیں، اور ان کی فقہ میں ہر قسم کی غیر مسلم عورت سے نکاح ناجائز ہے

لا یجوز العقد بنکاح علی مشرکۃ کانت کتابیۃ او غیر کتابیۃ قال عمر فی احدی روایتیہ وھو اختیار مالک والشافعی (ابن العربی)

لیکن فقہاءِ حنفیہ کی نگاہ مزید نکتہ سنجی کے ساتھ قرآن مجید ہی کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی گئی، اور وہ آیت سورۂ مائدہ کی ہے وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ الخ اور انھوں نے پہلی آیت کے عموم کو اپنی جگہ پر رکھ کر اس کا خصوص اس دوسری آیت سے پیدا کیا یعنی عام قاعدہ کے لحاظ سے تو ہر غیر مسلمہ کے ساتھ نکاح ناجائز ہے لیکن کتابیہ یعنی یہودی یا نصرانی عورت اس حکم سے مستثنٰی ہے اور یہی مذہب ابن عباسؓ اور بعض تابعین سے مروی ہوا ہے۔

وھو عموم خص بجواز نکاح الکتابیات (نہر) عن ابن عباسؓ قال فی ولا تنکحوا المشرکٰت نسخ من ذالک نکاح نساء اہل الکتٰب احلھن للمسلمین وحرم المسلمات علی رجالھم وعن الحسن ومجاہد مثل ذلک۔ (روح)

تفسیر تھانوی کے چند فقہی افادات اس موقع پر نقل کرنے کے قابل ہیں:۔

"(۱) ہندو عورت یا آتش پرست عورت سے نکاح نادرست ہے (۲) کتابی عورت سے نکاح جائز ہے، لیکن بہتر نہیں، حضرت عمرؓ نے اسے ناپسند فرمایا ہے، اور خود حدیث میں نکاح کا حکم دیندار ہی عورت سے کرنے کا ہے (۳) ایسی عورت سے جو وضع و طرز سے کتابیہ معلوم ہوتی ہو لیکن بعد تحقیق اس کے عقائد کتابیوں کے سے نہ نکلیں، اس سے بھی نکاح نادرست ہے۔"

یہودیت چونکہ ایک نسلی مذہب ہے، اس لئے اسرائیلیوں کو غیر اسرائیلیوں سے نکاح کرنے کی سخت ممانعت ہے۔ (خروج ۳۴۔۳۱۔ استثناء ۷: ۱۔۴۔ عزرا ۔ ۹ و ۱۰)

مسیحی مذہب میں بھی "بے ایمانوں" یعنی غیر مسیحیوں سے ازدواج کی ممانعت ہے (۲ کرنتھیوں ۶: ۱۴ و ۱۵) ویسٹر مارک کی کتاب مختصر تاریخ نکاح (شارٹ ہسٹری آف میرج) میں ہے "سینٹ پال کی تعلیم ہے کہ کوئی عیسائی کسی کافر سے ہرگز نکاح نہ کرے، اور ٹرٹولین کے نزدیک تو ایسے ازدواج کا نام حرام کاری ہے۔" (ص۵۸)

اور ہندوؤں کے ہاں نکاح تو نکاح مذہب سے باہر ہونا کیا معنی "ذات" کے باہر بلکہ برادری کے باہر بھی درست نہیں۔

حَتّٰی یُؤْمِنَّ۔ یہ قید لگا کر بتا دیا کہ ممانعت کی بنیاد تمام تر دینی و اعتقادی ہے نسلی، قومی، جغرافی وغیرہ ہرگز نہیں، جو بھی عورت، ایمان لے آئے اسی سے نکاح جائز ہو جاتا ہے۔

۸۱۸ (اپنے حسن و جمال، مال و دولت وغیرہ کی بنا پر)

## وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ

اور اپنی عورتوں کو (بھی) مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں ۸۱۹

آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر قرآن کی نظر میں کس قدر مبغوض ہے کافر عورت میں جو بھی خوبیاں ہوں، کُل ایک طرف اور اُس کے کفر کی گندگی دوسری طرف۔

لَاَمَةٌ۔ میں لَ زور اور تاکید کے لئے ہے، اردو میں ایسے موقع پر "تک" لاتے ہیں۔

لام الابتداء الشبیھۃ بلام القسم فی افادۃ التاکید (ابوسعود) واللام فی افادۃ التوکید (کبیر عن ابی مسلم)

مطلب یہ ہوا کہ ہر مسلم عورت، یہاں تک کہ نعمتِ آزادی سے محروم اور عُرفاً حقیر و ذلیل سمجھی جانے والی باندی تک، آزاد، خوش حال، خوش جمال کافر عورت سے بہتر ہے، نکاح کی یہ حقیقت اگر پیش نظر رہے کہ وہ ایک گہرا اخلاقی، تمدنی معاشری، ہمہ وقتی، اور ہر جہتی رشتہ نہ صرف دو۲ افراد کے، بلکہ دو۲ خاندانوں کے درمیان ہے، تو ایسے حکمِ امتناع پر حیرت ذرا بھی نہیں ہوتی، بلکہ اس کی حکیمانہ گہرائی کی داد دینا پڑتی ہے، شرک کے جراثیم اپنے ساتھ اسلامی معاشرہ کے لئے اخلاقی و روحانی قدروں کے لئے پورے تباہ کن خطرات بھی رکھتے ہیں اور انھیں ہلکا یا ناقابلِ التفات سمجھنا کیسر بے دانشی ہے

۸۱۹ (اور گروہِ مومنین میں نہ شامل ہو جائیں)

حَتّٰى يُؤْمِنُوْا۔ یہ ٹکڑا یہاں بھی اسی حقیقت کے زوردار اظہار کے لئے ہے کہ اصل مانع وحائل اُن مردوں کے شوہر ہونے سے ان کا کفر ہے جب یہ مانع دُور ہو جائے تو پھر کوئی امر مانع نہیں۔

اَلْمُشْرِكِيْنَ۔ "مُشرک" یہاں بھی اسی عام و وسیع معنی میں ہے جیسے "مُشرکہ" جو ابھی اوپر آچکا ہے، یعنی ہر قسم کے کافر کے مُرادف ہے، قانونِ اسلام کا منکر جو کوئی جس قسم کا بھی ہو مؤمن خاتون نہ اُس کے نکاح میں دی جاسکتی ہے، نہ رہ سکتی ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ شوہر اگر پہلے سے مسلمان ہے، اور بعد کو خدانخواستہ مرتد ہو گیا تو مسلمان عورت اسی وقت اُس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی، اور جو نکاح ابھی تک صحیح تھا معاً ٹوٹ جائے گا، اور یہ عورت عدت پوری کر کے کسی مسلمان شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میاں بیوی پہلے سے کافر ہیں، اور عورت مسلمان ہو گئی، تو اب بقائے نکاح کی کوئی صورت نہیں، بجُز اس کے کہ شوہر بھی اسلام قبول کرلے، مزید تفصیل اس قسم کے مسائل کی کتب فقہ میں ملے گی۔

لَا تُنْكِحُوْا۔ خطاب مَردوں سے ہے، کہ تم اپنی عورتوں کو کافروں کے نکاح میں نہ دو، حکم خود عورتوں کو براہِ راست نہیں مل رہا ہے کہ تم کافروں کے نکاح میں نہ جاؤ، یہ طرزِ خطاب بہت پُر معنی ہے، صاف اس پر دلالت کر رہا ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح مَردوں کے واسطہ سے ہونا چاہیئے۔

بعض فقہائے مُفسّرین نے ولایتِ نکاح کا وجوب اسی آیت سے نکالا ہے۔

فی ھٰذہ الاٰیۃ دلیل بالنص علیٰ ان لانکاح الّا بولیٍ۔ (قرطبی)

فقہائے حنفیہ کے ہاں یہ استدلال مطلق صورت میں درست نہیں۔

واستدل بھا علیٰ اعتبار الولی فی النکاح مطلقا وھو خلاف مذھبنا (روح)

وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدۡعُوۡنَ

اور مومن غلام تک بہتر ہے مشرک (آزاد) سے اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو۔۸۲۰؎ وہ لوگ دوزخ کی طرف

اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡۤا اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ

بلاتے ہیں ۸۲۱؎ اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بُلا رہا ہے اپنی مشیت سے ۸۲۲؎

ع ۲۷ ۵ ۱۱ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

اور لوگوں سے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں ۸۲۳؎

۸۲۰؎ (علمی قابلیت کی بنا پر، اونچی ڈگریوں کی بنا پر، بڑے عہدوں کی بنا پر، کسی بھی دنیوی بنیاد پر)

لَعَبۡدٌ کا لَ یہاں بھی تاکید اور زور کے لئے ہے، اُردو کے "تک" کے معنی ہیں، یعنی نعمت آزادی سے محروم، اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھے جانے والے غلام تک کو اختیار کر سکتے ہو، لیکن نہ اختیار کرو تو کسی کافر کو، خواہ وہ دنیاوی اعتبار سے کیسا ہی بڑا آدمی ہو۔

۸۲۱؎ (اپنی زبانِ حال سے)

اِلَى النَّارِ۔ دوزخ کی طرف یعنی اُن اعمال اور اُن عقائد کی طرف، اس طریقِ زندگی کی طرف جس کا انجام دوزخ ہے اور وہ طریق کفر و شرک ہے۔

ای الی الاعمال الموجبة الی النار (معالم) ای الکفر المؤدّی الی النار۔ (بیضاوی)

اُولٰٓئِكَ۔ اشارہ انھیں کافر مردوں اور کافر عورتوں کی جانب ہے، ان کی طرف سے مزید نفرت دلانے کے لئے یہ فقرہ بھی بڑھا دیا گیا ہے، گویا جتا دیا ہے کہ ایسے گئے گزرے ہوئے اور خطرناک لوگ تو معمولی تعلقات رکھنے کے بھی قابل نہیں، اچہ جائیکہ ان سے ازدواج کا سا گہرا رشتہ پیدا کیا جائے۔

۸۲۲؎ (چنانچہ اس رحمت و مغفرت ہی کے تقاضہ سے اُس نے یہ حکم بھی دے رکھا ہے کہ کافروں سے ازدواجی تعلق نہ رکھو، نہ اُن کے گہرے تعلق کا کوئی اثر تم پر پڑنے پائے، اور نہ تم جنت و مغفرت سے دُور ہوتے جاؤ)

اِلَى الۡجَنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ۔ یعنی اللہ ترغیب دیتا ہے ایمان و اسلام کی اور اس طریقِ زندگی کی جس کا انجام جنت و مغفرت ہی ہے۔

بِاِذۡنِهٖ۔ اِذن کے معنی یہاں توفیق یا ارادہ یا اعلامِ احکام کے ہیں۔

باعلامه ایاکم سبیله وطریقه (ابن جریر) ای قضائه وقدرہ وارادته (معالم) بتیسیر الله وتوفیقه للعمل (کشاف)

۸۲۳؎ (اور نصیحت پر عمل کر کے جنت و مغفرت کے حقدار بن جائیں)

اس مفہوم کی اور بھی متعدد آیتیں قرآن میں ہیں، اور اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ جنت انسان کا پیدائشی حق ہے، سوا اس کے کہ انسان اپنی دانستہ بے راہ روی سے راستہ جہنم والا اختیار کرلے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى

اور لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں ۸۲۴ آپ کہہ دیجئے کہ وہ ایک (طرح کی) گندگی ہے ۸۲۵ سو تم عورتوں کو

الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ

حیض کے دوران میں چھوڑے رہو ۸۲۶ اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان سے قربت نہ کرو ۸۲۷

۸۲۴ یعنی عورت کے زمانۂ خاص میں اس سے ہم بستری کا حکم، قرآن زندگی کا مکمل دستور العمل ہے، وہی زندگی جس میں کھانا، پینا، سونا، جنسی خواہش کا پیدا ہونا، بچہ کا ماں یا باپ بننا سب کچھ داخل ہے، زندگی کا ہر شعبہ جو کچھ بھی تعلق تعمیر سیرت سے رکھتا ہے، اس کی بابت ہدایات و احکام وہ لازمی طور پر دے گا، وہ محض درویشانہ و عارفانہ ملفوظات و مواعظ کا مجموعہ نہیں، معاشیات، معاشرت، اخلاقیات، قانون، غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے ضروری ابواب کا ذکر اس میں ناگزیر ہے خدانخواستہ ایسا نہ ہوتا، تو اس ہدایت نامہ کی جامعیت و کاملیت پر حرف آجاتا۔ مَحِيْض مصدر میمی ہے معنًا حیض کے مرادف، اور اس کے وقت و موضع کے بھی مرادف۔

المحیض الحیض ووقت الحیض وموضعہ علی ان المصدر فی ھذا لا البحو من الفعل یجی علی مفعل (راغب) المحیض ھو الحیض المعروف ولا حاجۃ الی تقدیر محل المحیض۔ (المنار)

۸۲۵ (جیسا کہ دنیا میں عموماً دوسری قوموں نے بھی سمجھا ہے اور سامی نسل والوں نے علی الخصوص)

والاذی کنایۃ عن القذر علی الجملۃ (قرطبی)

طب قدیم و جدید دونوں کو مسلم ہے کہ یہ ایک خاص قسم کا ناقص خون ہے رنگ و بو و ترکیب میں عام خون سے الگ۔

۸۲۶ (عمل ہم بستری کی حد تک)

فَاعْتَزِلُوْا۔ یہ اعتزال یا عورتوں کو چھوڑے رہنے کا حکم صرف ہم بستری کے عمل خاص تک محدود ہے، مجالست و مواکلت وغیرہ عام معاشرت سے اس کا تعلق نہیں، بعض قوموں میں عورتیں اپنے اس زمانہ میں نہ دوسروں کے ساتھ کچھ کھا پی سکتی ہیں، نہ لیٹ بیٹھ سکتی ہیں، بعض قوموں میں اس زمانہ میں عورت کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ناپاک سمجھا جاتا ہے، بعض مشرک قوموں میں یہ دستور ہے کہ اس زمانہ میں عورت کو میلے کچیلے کپڑے پہنا کر گھر کے ایک الگ گوشہ میں اچھوت بنا کر بٹھا دیا جاتا ہے، غرض دوسری قوموں نے عام طور پر اس طبعی ناپاکی سے متعلق بہت مبالغہ آمیز تخیل قائم کر لیا ہے، شریعت اسلامی میں اس قسم کے کوئی امتناعی احکام موجود نہیں۔

۸۲۷ مشرک قوموں نے اس باب میں جو سختیاں روا رکھی ہیں، ان سے قطع نظر خود توریت کے قانون کا تشدد بھی اس باب میں اپنی مثال آپ ہے، عورت اپنے ایام ماہوار کے زمانہ میں خود ہی ناپاک نہیں ہوتی، بلکہ جو شخص یا جو چیز بھی اس سے چھو جاتی ہے، وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے، اور سلسلہ در سلسلہ یہ ناپاکی متعدی ہوتی جاتی ہے۔

"جو کوئی اسے چھوئے گا شام تک نجس رہے گا ...... اور جو کوئی اس کے بستر کو چھوئے، اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے، اور شام تک ناپاک رہے ــــ اور جو کوئی اس چیز کو جس پر وہ بیٹھی ہے چھوئے، اپنے کپڑے دھوئے

فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ

پھر جب وہ پاک ہو جائیں ۸۲۸ تو ان کے پاس آؤ جس جگہ سے اللہ نے تمھیں اجازت دے رکھی ہے ۸۲۹ بے شک

التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ

اللہ محبت رکھتا ہے توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں سے ۸۳۰ تمھاری بیویاں تمھاری کھیتی ہیں ۸۳۱

اور پانی سے نہائے اور شام تک ناپاک رہے ..... اگر مرد اس کے ساتھ سوتا ہے اور اس کی نجاست اس پر ہو تو وہ سات دن تک ناپاک رہے گا، اور ہر ایک بستر جس پر یہ مرد سوئے گا، ناپاک ہو جائے گا۔" (احبار ۱۵: ۱۹-۲۴)

یہ احکام تو خود توریت کے ہوئے، باقی فقہاء یہود تو اپنے تشددات میں ان حدود سے بھی کہیں آگے بڑھ گئے ہیں، اور ایسی ایسی قیدیں بیچاری عورت پر عائد کر دی ہیں کہ گویا وہ عورت نہیں ہے کوئی بلا ہے، ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۱۱ صفحہ ۳۰۱، نیز ہیسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل، جلد ۴ صفحہ ۸۲۷۔

۸۲۸ یعنی خون نجس کا آنا بالکل بند ہو جائے اور عورت غسل کرلے، شریعت میں یہ غسل واجب ہے "صفائی" جس چیز کا نام ہے، اس سے تو خیر دوسری قومیں بھی واقف ہیں لیکن جسے "پاکی" سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے قاعدے قانون اسلام کے باہر مشکل ہی سے کہیں ملیں گے۔

۸۲۹ یعنی جائز و فطری طریق کے مطابق، اس عام و فطری طریق قربت کے سوا حصول لذت کے اور سارے طریقے ناجائز ہیں، فراء نحوی نے یہ نکتہ مِنْ حَيْثُ اور فِي حَيْثُ کے فرق سے پیدا کیا ہے۔

ولم يقل في حيث وهو الفرج ..... يقال ايت الفرج من حيث شئت۔ (معالم)

۸۳۰ (اور اس صفائی میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی گندگی سے پاک ہو جانا آگیا۔)

اَلتَّوَّابِيْنَ۔ تَوَّابِيْنَ۔ اس سیاق میں وہ لوگ ہیں، جن سے قوانین بالا کے باب میں کوئی اتفاقی خلاف ورزی ہو جائے، اور وہ بعد کو توبہ کریں، اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔

اَلْمُتَطَهِّرِيْنَ۔ مُتَطَهِّرِيْنَ۔ اس سیاق میں وہ لوگ ہیں جو عورت کی مواصلت سے اس کی طبعی ناپاکی کے زمانہ میں محترز رہتے ہیں، اسی لفظ سے فقہاء نے اشارۃ النص سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو اعمال صریحاً نجس ہیں (مثلاً اغلام) وہ سب حرام ہیں۔ صفائی و طہارت کی یہ روح قرآنی عام ہے اور اس کے تحت میں جسمانی اور ظاہری صفائی پوری طرح آجاتی ہے، اسلام کی اس لطافت پسندی، نظافت پسندی، طہارت پسندی کے مقابلہ میں، دوسرے سرے پر وہ مذاہب ہیں، جن میں قرب حق کا ذریعہ صفائی کو نہیں، عین جسمانی گندگی، کثافت و غلاظت کو قرار دیا گیا ہے، مشرک قوموں میں جو فرقے اگھور پنتھی کے نام سے ہیں، ان کے تفصیلی ذکر سے تو ان صفحات کو نجس کرنے کی جرأت نہیں، خود مسیحیت کی تاریخ میں صدیوں تک راہبوں کے لئے غسل یا جسم کی شست و شو ایک مستقل معصیت رہی ہے۔

۸۳۱ اور کھیت کہتے ہیں اس موضع زمین کو جس میں تخم ریزی ہوتی ہے، اور اس میں سبزی، غلہ، نباتات کا نشو و نما ہوتا ہے، کھیت والے اسے اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر نہایت درجہ عزیز رکھتے اور اس کی ہر طرح نگہداشت

فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ؗ

سو تم اپنے کھیت میں آؤ جس طرح چاہو ۸۳۲

اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں، اسلام نے ہم بستری کا اصل مقصد طلبِ ولادہی کو رکھا ہے گو اس کے دوسرے پہلو یعنی طلب لذت کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ آیت کے الفاظ سے ضمناً روشنی منع حمل کے مسئلہ پر بھی پڑجاتی ہے اور کسی جہت سے بھی مسئلہ کی عمومی صورت کی تائید نہیں نکلتی، بلکہ ایک گونہ تردید ہی نکلتی ہے کون کاشتکار زمین میں بیج محض ضائع کردینے کے لئے ڈالے گا؟

۸۳۲ (اس تشبیہ اور اس کے مضمرات کو خوب سوچ سمجھ کر)
فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ کنایہ ہے عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے اور قرآن حکیم ایسے موقعوں پر اکثر کنایہ ہی سے کام لیتا ہے
من الکنایات اللطیفۃ والتعریضات المستحسنۃ (کشاف۔ مدارک)
فقہاء مفسرین نے یہیں سے استنباط کیا ہے کہ ہر ایسے موقع پر مسلمان کو یہی چاہیئے کہ حتی الامکان یا اشارہ و کنایہ ہی میں کہے
وھذہ واشباھھا فی کلام اللہ اداب حسنۃ علی المؤمنین ان یتعلموھا ویتأدبوا بھا ویتکلفوا مثلھا فی محاوراتھم ومکاتباتھم (کشاف) فعلی کل مسلم ان یتأدب بھا ویتکلف مثلھا فی المحاورات والمکاتبات۔ (مدارک)
حَرْثَكُمْ "کھیت" کا یہ جواب خوب ملحوظ رہے، اتیان یا داخلہ کھیت ہی میں ہونا چاہیئے، قبولِ تخم ہی کے موضع یا عضو میں ہونا چاہیئے، نہ کہ اس کے سوا اس سے خارج کسی اور موقع اور محل میں۔
ای نساؤکم مزرع اولادکم فاتوا مزرعکم کیف شئتم واین شئتم۔ (ابن جریر)
اَنّٰى کے مشہور و معروف معنی کَیْفَ اور اَیْنَ کے ہیں یعنی جس طرح کے، جس کیفیت کے ساتھ اور جدھر سے جس جہت سے۔
للبحث عن الحال والمکان (راغب) ھو بمعنی این وکیف (راغب) ھو اعم باللغۃ من کیف ومن این ومن متی، ھٰذا ھو الاستعمال العربی فی انّٰی وفسرھا سیبویہ بکیف ومتی این باجتماعھا (قرطبی) ومجیٔ انّٰی بمعنی این وکیف ومتی مما اثبتتہ الجمّ الغفیر۔ (روح)
بلکہ ادب میں کَیْفَ ہی کے معنی میں زیادہ آیا ہے اور اَیْنَ کے مفہوم میں کمتر۔
تستعمل غالبا بمعنی کیف وتستعمل بمعنی این قلیلاً۔ (المنار)
خود قرآن مجید میں بھی اَنّٰی بار بار کَیْفَ کے معنی میں آیا ہے مثلاً اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا یہاں اَنّٰی یُحْیٖ صاف کَیْفَ یُحْیٖ کے معنی میں ہے، یا پھر اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ اس آیت میں بھی قرآنیات کے بہترین ماہرین ابن عباسؓ صحابی نے اور مجاہدؒ، قتادہؒ، عکرمہؒ وغیرہ تابعین نے اَنّٰی کو اسی معنی میں لیا ہے چنانچہ اس آیت میں بھی اَنّٰی اسی کَیْفَ ہی کا مرادف ہے
ای کیف شئتم (معانی) یأتیھما کیف شاء (ابن جریر عن ابن عباسؓ وعکرمہ ومجاھد) ای کیف شئتم (ابن جریر عن السُّدّی) وقال مجاھد کیف شئتم (روح) معناہ کیف شئتم وحیث شئتم بعد ان یکون فی صمامٍ واحدٍ (معالم) معناہ کیف شئتم۔ (المنار)
گویا یہاں صاف رد ہورہا ہے یہود کا جو صحبت کی صرف ایک ہی وضع و ہیئت کو جائز سمجھتے تھے، اور باقی سب کو ناجائز، متعدد آثار و روایات اسی مضمون کی تفسیروں میں منقول ملیں گے، اور آیت میں بتایا جارہا کہ

وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ

اور اپنے حق میں آئندہ کے لئے کچھ کرتے رہو ۵۸۳ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے ۵۸۴

وضع فطرت کے اندر ہر صورت و ہیئت کی اجازت ہے۔

ای مقبلات و مدبرات و مستلقیات یعنی بذلك موضع الولد (قرطبی) معناه عند الجمهور من الصحابة والتابعین وائمة الفتوی من ای وجه شئتم مقبلة و مدبرة (قرطبی) یجوزان یکون المستفاد حینئذ تعمیم الجهات من القدام والخلف والفوق والتحت والیمین والشمال لا تعمیم مواضع الاتیان (روح)

اس کھلے ہوئے مفہوم کو چھوڑ کر بعض اہل قلم نے اَنّٰی میں ایک مفہوم مکان کا ڈھونڈھ نکالا ہے، اور اس معنی کو لے کر ان لوگوں نے اس کی مزید تشریح میں اپنی گندہ مذاقی کے عجیب عجیب مظاہرے کئے ہیں، حالانکہ ظاہر ہے کہ لفظ قرآنی سے موضع و محل میں کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ابن کثیر نے تو اس معنی پر ابوحنیفہؒ و شافعیؒ و احمد بن حنبلؒ جیسے ائمۂ فقہ اور ان کے شاگردوں اور بہت سے تابعین کا اجماع نقل کرکے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس معنی سے تجاوز کرکے جواز ڈھونڈھنے والوں کا ان تمام علماء و فقہاء نے شدت سے انکار کیا ہے، بلکہ بعض نے تو اس تجاوز کو کفر کے حکم میں داخل کردیا ہے۔

انهم انکروا ذلك اشد الانکار و بینهم من یطلق علی فعله الکفر وهو مذهب جمهور العلماء (ابن کثیر)

سئل ابن عباس عن الذی یأتی امرأته فی دبرها فقال هذا یسألنی عن الکفر (جصاص)

غرض موضع و مکان تو بہرحال متعین ہے، آزادی صرف موضع و مکان میں داخلہ کے لئے، ہر رخ، ہر جہت کی دی جارہی ہے

ای علی ای شق من الاحوال وذلك فی مکان الحرث (بحر) قال قتادة والربیع من این شئتم (روح)

اور حدیث میں تو وعید شدید اس غیر فطری طریق مقاربت پر آئی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا۔ من اتی امرأة فی دبرها لم ینظر الله الیه یوم القیامة اور مفسر قرطبی نے تصریح کی ہے کہ ایک نہیں، بارہ صحابیوں نے مختلف عبارتوں کے ساتھ احادیث صحیح و مستند میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اس عمل لوطیت کی حرمت پر نقل کیا ہے، اور ابن کثیر میں بھی بڑی شرح و بسط کے ساتھ، حدیثوں کے حوالہ سے اس پر کلام کیا گیا ہے، لیکن ان دو معروف و متداول معنوں کے علاوہ اَنّٰی کے ایک تیسرے معنی مَتٰی، یعنی جب اور جس وقت کے بھی نقل ہوئے ہیں، گویا اَنّٰی یہاں ظرف زمان کے طور پر استعمال ہوا ہے، ضحاک تابعی اور بعض محققین قرآن اس طرف گئے ہیں۔

اَنّٰی بمعنی مَتٰی قال الضحاك (بحر۔ روح) ای متی شئتم (ابن جریر عن الضحاك) ای فی متی زمان اردتم (بحر) متی شئتم من لیل ونهار (کبیر) انّٰی شئتم من اللیل والنهار (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

جس خدا کی بنائی ہوئی دنیا کی عملی زندگی میں اس قسم کے سوالات و مسائل روزمرہ پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں، اسی خدا کے اُتارے ہوئے ہدایت نامہ میں اگر ان سے متعلق ہدایات و احکام صاف و مفصل نہ ہوتے، تو یہ بہت عجیب سی بات ہوتی، اور یہ سکوت شرم نہیں عیب ہی قرار پاتا۔

۵۸۳ آئندہ کے لئے کچھ بھیجنے کی چیز عمل صالح ہی ہو سکتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ

اور آپ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے ف۸۳۵ اور اللہ کے (نام) کو اپنی قسموں کے ذریعہ سے اپنی نیکی کے اور اپنے تقوی کے

تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اور اپنی اصلاحِ خلق کے کاموں کے حق میں حجاب نہ بنالو ف۸۳۶ اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ف۸۳۷

والمعنی: قدموا لانفسکم الطاعة والعمل الصالح (قرطبی) ما یصلح للتقدیم من العمل الصالح (روح)

بعض لوگوں نے آیت کے اس جزو سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا ہے کہ اپنی نسل کو آگے بڑھاؤ — اگر یہ مطلب صحیح ہے تو اس نئے شیطانی فلسفۂ منع حمل کے خلاف ایک اور ہدایت ہاتھ آجاتی ہے۔

یہ گویا اس کی تاکید ہے کہ عین لذت و التذاذ کے مشغلوں کے وقت بھی اپنی عبدیت کو، اپنی ذمہ داری کو بھول نہ جاؤ، تمام تر لذت پرستی ہی میں غرق نہ ہو جاؤ، بلکہ ہو سکے تو اپنی لذتوں کو بھی عین طاعت و عبادت بناؤ۔

ف۸۳۴ (کہ اسی کا استحضار، تقوی و خشیت کو آسان بنا دے گا)

آیت میں تعلیم اس کی ہے کہ مومن کے ہاتھ سے تقویٰ الٰہی کا سر رشتہ کسی حال میں چھوٹنے نہ پائے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی ہر حال میں، ایامِ حیات کے ہر ہر لمحہ میں، تقویٰ الٰہی پر قائم رہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ۔ قرآن مجید صرف احکام ہی نہیں دیتا، بلکہ وہ طریقہ اور تدبیر بھی بتاتا جاتا ہے جس سے ان احکام پر عمل آسان ہو جائے، حکم ابھی تقوائے الٰہی کا ملا ہے اور اب اس کی آسان تدبیر ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ لقائے آخرت کا استحضار ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا سے محض جان لینا مراد نہیں، بلکہ اس علم کا تر و تازہ رکھنا مراد ہے۔

ف۸۳۵ (اے پیغمبر)

یہاں جو اہل ایمان مراد ہیں، اُن کے صفات ابھی اوپر بیان ہو چکے ہیں کہ وہ اعمال صالحہ کا اہتمام رکھتے ہیں (قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ) اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں (وَاتَّقُوا اللّٰهَ) اور جزا و سزا کا عقیدہ تر و تازہ رکھتے ہیں (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ)

ف۸۳۶ عرب جاہلیت کے جاہلانہ دستوروں میں سے ایک دستور یہ بھی تھا کہ خدا کی قسم کھا کر یہ کہہ بیٹھتے کہ ہم فلاں فلاں کام نیکی کا، تقوی کا، اصلاحِ خلق کا نہ کریں گے، اور جب کوئی کہتا تو یہی عذر پیش کر دیتے کہ ہم تو اس کی قسم کھا چکے ہیں، ان اعمالِ خیر کا ترک یوں بھی ہر صورت میں مذموم تھا، چہ جائیکہ حضرت حق کے اسم بزرگ و اس کی قسم کو بجائے قربِ حق کے اس سے دوری کا ذریعہ بنا لیا جائے! آیت اسی شعار جاہلی کی تردید میں ہے۔

عُرْضَةً کے عام و متداول معنی ہدف یا نشانہ کے ہیں، اور بعض نے یہاں بھی یہی معنی رکھے ہیں۔

عرضة لایمانکم ای نصبا لها (جوهری) جعلته عرضته لکذا۔ نصبته له۔ (قاموس)

لیکن ایک دوسرے معنی حجاب یا مانع حجاب کے بھی ہیں، اور یہاں یہی زیادہ چسپاں ہیں۔

العرضة ما یجعل معترضا الشیٔ (راغب) ای حاجزا لما حلفتم علیه (کشاف) قالوا العرضة عبارة

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا

اللہ تمہاری قسموں میں سے لایعنی (قسم) پر مواخذہ نہ کرے گا، البتہ تم سے اُس (قسم) پر مواخذہ کرے گا جس پر

كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ

تمہارے دلوں نے قصد کیا ہے ۸۳۸ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا بردبار ہے ۸۳۹ جو لوگ اپنی بیویوں سے (ہم بستری

نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

کرنے کی) قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لئے مہلت چار ماہ تک ہے ۸۴۰ پھر اگر یہ لوگ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۸۴۱

عن المانع (کبیر)

فقہاء نے بلا ضرورت اور کثرت سے قسمیں کھاتے رہنے کو یوں بھی ناپسند کیا ہے کہ اس میں اللہ کے نام کی بے توقیری ہے، چہ جائیکہ قصداً جھوٹی قسمیں کھانا!

۸۳۷ (اس لئے ہر بات سوچ سمجھ کر منہ سے نکالو، اور اسی لئے نیت میں ہر وقت اخلاص رکھو) یعنی تمھیں سابقہ ایسے رب سے ہے جو سننے والا تمھارے ایک ایک قول کا، اور جاننے والا تمھارے ایک ایک حال کا ہے۔

۸۳۸ یعنی گرفت اُن قسموں پر ہوگی، جن میں جھوٹ کی آمیزش بالقصد کی گئی ہے، آخرت میں بھی انھیں پر داروگیر ہے اور دنیا میں بھی اُن کے لئے کفارہ ہے۔

بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ۔ مراد اُن قسموں سے ہے، جو ناواقفیت کی بنا پر یا بے خیالی میں محض عادۃً زبان سے نکل جاتی ہیں، اور جھوٹ کی آمیزش ان میں بلا قصد ہو جاتی ہے، فقہاء نے اس نوعیت کی ساقط الاعتبار قسموں کی کئی قسمیں کی ہیں، ان کا تعلق ماضی کے واقعات سے بھی ہو سکتا ہے، اور آئندہ کے ارادوں سے بھی، ان کی تفصیلات اور ان کے احکام کتب فقہ میں ملیں گے۔

۸۳۹ (چنانچہ انھیں صفات کے تقاضہ سے اُس نے لایعنی قسموں پر مواخذہ سرے سے معاف کر دیا اور ارادی جھوٹی قسموں پر بھی گرفت فوراً نہ کی، بلکہ اس کو قیامت تک کے لئے ملتوی کر دیا)۔

۸۴۰ اِیلَاء۔ عرب جاہلی کا ایک شعار یہ بھی تھا کہ شوہر غصہ میں آکر قسم کھا بیٹھتے تھے کہ اپنی بیویوں سے ہم بستری نہ کریں گے، اصطلاح میں اس کو ایلاء کہتے ہیں)

لاخلاف انه قد أضمرت فيه اليمين على ترك الجماع (جصاص)

شریعتِ اسلامی نے اس میں جو اصلاحیں کیں، اور اس باب میں جو احکام دیے یہاں ان کا ذکر ہے۔

تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ۔ عرب جاہلی ایلاء کر لینے کے بعد، جو ایک طرح کی طلاق ہی تھی، بیوی کے نان و نفقہ اور ہر قسم کے ادائے حقوق سے مستقلاً دست بردار ہو جاتے تھے، اسلام نے اس کی ایک اصلاح یہ کی کہ اس کو خلع نکاح یا فسخ نکاح کا مرادف نہیں، بلکہ اس کی صرف تمہید قرار دے کر غور و فکر کے لئے ایک مدت مقرر کر دی اور پھر

# وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ

اور اگر طلاق (ہی) کا پختہ ارادہ کرلیں ۸۴۳ تو بے شک اللہ

اس مدت کی میعاد چار مہینے کی رکھی جو اس کے لئے بالکل کافی ہے کہ سارے پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے غور کرلیا جائے۔

۸۴۱ (چنانچہ ایسی قسم توڑنے کا گناہ ایک خفیف سے کفارہ کے بعد معاف کردے گا، اور جو شوہر از سر نو ادائے حقوق پر متوجہ ہو جائے گا، اس پر نظر رحمت سے کرے گا۔)

فَاِنْ فَآءُوْ۔ یعنی اگر اپنے قصد انقطاعِ تعلق سے رجوع کرلیں، اور رشتۂ نکاح کو برقرار رکھنا چاہیں۔ فئے کے اصل معنی رجوع کے ہیں، اور بہتر حالت کی طرف رجوع کے ہیں۔

الفئ الرجوع الی الشئ (جصاص) الفئ والفیئۃ الرجوع الی حالۃ محمودۃ (راغب) معناہ رجعوا۔ (قرطبی)

اور رجوع کی ایک عملی شکل صحبت کرلینا ہے چنانچہ یہاں بھی کنایہ سمجھا گیا ہے، اور صحابہ سے لے کر تابعین وسلف کی ایک بڑی تعداد اسی طرف گئی ہے۔

ای رجعوا الی ما کانوا علیہ وھو کنایۃ عن الجماع قالہ ابن عباس ومسروق وسعید بن جبیر وغیر واحد ومنہم ابن جریر رحمہ اللہ (ابن کثیر)

غَفُوْرٌ۔ بڑا مغفرت والا ہے۔

رَحِیْمٌ۔ بڑا مہربان ہے۔

۸۴۳ (اتنے دنوں کے غور و فکر کے بعد بھی)

طلاق۔ شریعت میں نام ہے زن وشو کے باہمی تعلق کے باضابطہ وکامل انقطاع کا، یا نکاح کی گرہ کے کھل جانے کا۔

والطلاق حل عقدۃ النکاح والمطلقات المخلیات (قرطبی)

اسلام سے قبل دنیا میں طلاق سے متعلق عجب افراط وتفریط قائم تھی، افراط یہود کے ہاں تھی اور تفریط مسیحیوں کے ہاں، یہود کے ہاں نہ کوئی قید طلاق پر عائد تھی، نہ شوہر پر اس باب میں کوئی ذمہ داری تھی اس کا جب جی چاہتا، وجہ بلاوجہ بس ایک طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا کرلیتا بیوی اُسی وقت دوسرا امر کرسکتی تھی توریت کے قانون کے الفاظ یہ ہیں:-

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کے اُس سے بیاہ کرے، اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو اس سبب کہ اس نے اس میں سے کوئی پلید بات پائی، تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کے اُس کے ہاتھ میں دے اور اُسے اپنے گھر سے باہر کرے، اور جب وہ اس گھر سے نکل گئی تو جاکے دوسرے مرد کی ہو وے۔" (استثناء ۲۴: ۱ و ۲)

اس آزادی اور بے قیدی کے مقابلہ میں مسیحیوں نے یہ سختی اور تنگی اختیار کی کہ زن وشو میں علٰحدگی کی کوئی گنجائش ہی نہ رکھی انجیل کے موجودہ الفاظ ہیں:-

"جسے خدا نے جوڑا ہے اُسے آدمی جُدا نہ کرے ..... جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری سے بیاہ کرے، وہ اس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے، اور اگر عورت، اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو زنا کرتی ہے" (مرقس ۱۰: ۹، ۱۲)

"میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی شوہر سے علٰحدہ نہ ہو" (۱- کرنتھیون ۷: ۱۰)

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ

بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۸۴۳ اور طلاقنیں اپنے کو تین میعادوں تک رُوکے رہیں ۸۴۴

چنانچہ مسیحی آبادی کے سوادِ اعظم یعنی فرقۂ کیتھولک کے ہاں تو طلاق مطلقاً ناجائز ہے، اور بجز موت کے کوئی صورت میاں بیوی میں افتراق کی ممکن نہیں اور یہی فرقہ اسلام سے قبل موجود تھا، پروٹسٹنٹ فرقہ ظہورِ اسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوا، اس کے ہاں البتہ اجازت ہوئی ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ پہلے عدالت میں گواہوں کے بیان سے کسی ایک فریق کا ارتکاب زنا یا ظلم وجور ثابت ہولے!

یہ حال اُن قوموں کا تھا جو اہل کتاب تھیں، یعنی اصلاً اُن کے قانون کی بنیاد آسمانی کتابوں ہی پر تھی، رہیں قدیم جاہلی اور مُشرک "مہذّب" "ترقی یافتہ" قومیں سو ایک طرف یونانیوں میں، ہندوؤں میں، اور ایک عہدِ خاص تک رومیوں میں طلاق سے کوئی واقف ہی نہ تھا، بلکہ ہندو مذہب میں تو آج تک طلاق ناجائز چلی آرہی ہے، گو حالات سے مجبور ہو کر اس کے جائز کرانے کے آج بڑے زور ہند کی پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں لگ رہے ہیں۔

دوسری طرف رومیوں میں عہدِ جمہوریت کے خاتمہ پر طلاق کے جائز ہونے کے ساتھ ہی اس کا جو زور بندھا تو گویا شرافت اور طلاق لازم وملزوم ہو گئے!

دنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبوں اور بڑی بڑی "مہذّب" قوموں کی یہ بے اعتدالیاں اور افراط تفریط پیش نظر رہیں، جب جا کر شریعت اسلام کی حکمتوں اور اس کے پیدا کئے ہوئے توازن واعتدال کی قدر ہوگی، اسلام نے فطرتِ بشری کا بالکل صحیح اندازہ کر کے یہ حکم دیا کہ جب زوجین میں ناموافقت لاعلاج حد تک پہونچ جائے (اور اس ناموافقت کے اسباب کا احاطہ واستقصاء ممکن ہی نہیں، ہر شخص کے لئے الگ الگ سبب ومحرک ہوتا ہے) اور دوسری صورتیں موافقت پیدا کرنے کی ناکام ہولیں تو آخری علاج یہ ہے کہ فریقین ہنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کر کے ایک دوسرے سے مستقل علیحدگی اختیار کر لیں، اور اسی کا اصطلاحی نام طلاق ہے اور اس انقطاعی عمل کو بھی مطلق نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس پر متعدد پابندیاں بھی عائد کر دی ہیں، آگے ذکر انھیں قیود وشرائط کا آئے گا۔

ف ۸۴۳ (اس لئے خوب اپنی ذمہ داری محسوس کر کے عمل کا کوئی قدم اُٹھاؤ)

سَمِيْعٌ۔ وہ تو بڑا سننے والا ہے، اس لئے زن وشو کے ظاہر قول کو اور شوہروں کی قسموں کو، سب کو سنتا رہتا ہے۔

عَلِيْمٌ۔ وہ تو بڑا جاننے والا ہے، اس لئے زن وشو کے دلوں کے اندر کی مخفی باتوں کو جانتا ہے، اُن کے ارادوں اور نیتوں سے واقف ہے، اور ان کے مناسبِ حال ہی حکم دیتا ہے۔

آیات کے آخر میں صفات باری کا اثبات محض یوں ہی اٹکل سے نہیں ہوتا، ہمیشہ پُر معنی اور سیاقِ کلام کے لحاظ سے بلیغ ہی ہوتا ہے، یہاں مقصود زن وشو کو خصوصاً شوہروں کو، اُن کی ذمہ داریوں پر متنبہ کرنا ہے، اس لئے انھیں صفات باری کا لانا نہایت موزوں ومناسب ہوا۔

ف ۸۴۴ (دوسرے نکاح سے)

اَلْمُطَلَّقٰتُ۔ لفظی معنی کے اعتبار سے ہر طلاق والی عورت کے لئے وسیع ہے لیکن یہاں مراد صرف اُن بیویوں سے لی گئی ہے،

جو آزاد ہوں (کنیز شرعی نہ ہوں) بالغ ہوں (نابالغ نہ ہوں) اور جن سے خلوتِ صحیحہ ہو چکی ہو (غیر ملموس نہ ہوں) یہاں احکام صرف انھیں آزاد و شوہر دیدہ بیویوں سے متعلق بیان ہوں گے، دوسری قسم کی عورتوں کے طلاق کے احکام دوسرے مقامات پر ملیں گے

المراد المدخول بھن من ذوات الاقراء (مدارک) ای ذوات الاقراء من الحرائر المدخول بھن (روح)

يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ۔ اپنے کو روکے رہیں، یہ نہ ہو کہ ادھر شوہر نے طلاق دی، اور ادھر بیوی نے فوراً دوسرا شوہر کر لیا، یہ پہلی پابندی طلاق پر عائد ہوئی، اس سے پہلے نکاح سے آزادی کے بعد کا جو تعطل کا زمانہ ہے اُسے اصطلاحِ شریعت میں عدت کہتے ہیں، عورت کے لئے انتظار کی اس مدتِ متعین میں متعدد حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، ایک طرف تو شوہر کو ٹھنڈے دل سے غور و فکر کا پورا موقع مل جاتا ہے، دوسری طرف عورت کے حمل کی بابت پوری طرح تحقیق ہو جاتی ہے، دوسرے مذہب اور دوسری قومیں سب شریعتِ اسلامی کے قائم کئے ہوئے زمانۂ تعطل و وقفہ کے مصالح و فوائد سے محروم ہیں۔

ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ۔ قرء کے لفظی معنی محض ایک زمانۂ معلوم یا مدتِ متعین کے ہیں۔

اصل القرء فی کلام العرب الوقت (ابن قتیبہ) اھل اللغۃ اتفقوا علی ان القرء الوقت (ابن العربی)

لیکن اس سے میعاد کا آغاز بھی مراد ہو سکتا ہے، اور میعاد کا اختتام بھی، دونوں مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں، لیکن لغتِ عرب میں دونوں ہی مستعمل ہیں۔

قال ابو عبیدۃ الاقراء من الاضداد فی کلام العرب (کبیر) واصل القرء فی کلام العرب الوقت لمجیئ الشیٔ المعتاد مجیئہ لوقت معلوم ولادبار الشیٔ المعتاد ادبارہ لوقت معلوم (ابن جریر) کلمۃ محتملۃ للطھر والحیض (ابن العربی)

اسی لئے یہاں بھی اہل شرح و تفسیر کے دو گروہ ہوئے ہیں، ایک جماعت نے معنی طُہر یا پاکی قرار دیے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ اور بعض صحابہ و تابعین سے یہی معنی مروی ہیں، اور امام شافعیؒ اسی طرف گئے ہیں۔

قالت عائشۃ الاقراء الاطھار (جصاص) قال اھل الحجاز ھی الاطھار وھو قول عائشۃ وزید بن ثابت والزھری وابان بن عثمان والشافعی۔ (قرطبی)

لیکن دوسری طرف حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابو موسیٰؓ جیسے تیرہ صحابیوں کا قول یہ نقل ہوا ہے کہ یہاں قرء حیض یا ناپاکی کے معنی میں ہے (جصاص) اور یہی قول امام ثوریؒ، امام اوزاعیؒ، امام ابو حنیفہؒ اور تمام فقہاء حنفیہ کا ہے۔

قال اصحابنا جمیعا الاقراء الحیض وھو قول الثوری والاوزاعی والحسن بن صالح (جصاص) قال اھل الکوفۃ ھی الحیض وھو قول عمر وعلی وابن مسعود وابی موسیٰ ومجاھد وقتادۃ والضحاک وعکرمۃ والسدی (قرطبی)

اور ائمۂ لغت و لسان سے بھی سند اس معنی کی زیادہ مل رہی ہے۔

یقال اقرءت المرأۃ اذا حاضت ذکرہ الاصمعی والکسائی والفراء (جصاص) قرأت المرأۃ رأت الدم واقرأت صارت ذات قرء (راغب) والقرء فی الحقیقۃ اسم للدخول فی الحیض عن الطھر (راغب)

اور فقہاء حنفیہ نے حدیث نبوی سے قرء کے اس معنی پر شہادت بہم پہونچائی ہے، ملاحظہ ہو جصاص جلد اول ص ۴۳۳، اور یہی پہلو زمخشری جیسے ادیب و ماہر عربیت نے اختیار کیا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيٓ أَرْحَامِهِنَّ

اور ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو پیدا کر رکھا ہے اُسے وہ چھپائے رکھیں ۸۴۵

إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۗ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ

اگر وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتی ہیں ۸۴۶ اور ان کے شوہر اُن کے واپس لے لینے کے

بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ إِنْ أَرَادُوٓا

اس (مدت) میں زیادہ حقدار ہیں ۸۴۷ بشرطیکہ اصلاح حال کا

القروء جمع قرء وھو الحیض بدلیل قولہ علیہ السلام دعی الصلوٰۃ ایام اقرائک (کشاف)
بہر حال حنفیہ کے ہاں کا متفقہ مسئلہ یہی ہے کہ مطلقہ اپنے تین ۳ ایام ماہواری کے آتے تک اپنے کو عدت میں سمجھے، اور اس مدت میں نکاح ثانی اپنے لئے جائز نہ سمجھے۔

۸۴۵ اس لئے کہ چھپانے کی یہ کوشش زمانۂ عدت کے شمار و حساب میں خلل انداز ہوگی، اور اس طرح شریعت نے جو مصلحتیں اس کے اندر رکھی ہیں، وہ ضائع ہو کر رہیں گی۔
مَا خَلَقَ اللّٰهُ میں مَا لفظ عام ہے، رحم کے اندر جو چیز بھی ہو، جاندار بچہ ہو یا ایام ماہواری کا خون ہو، دونوں پر شامل ہے، مطلب یہ ہے کہ خواہ حمل قائم ہو چکا ہو، خواہ ایام ماہواری کا دور ہو، کوئی بھی صورت حال ہو اُسے چھپانا نہ چاہیئے۔

۸۴۶ دنیا کے ہر علم و فن کا یہی حال ہے کہ وہ جس درجہ مکمل و منظم ہوگا، اسی قدر اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء سے مربوط و مرتبط ہوگا۔
شریعت اسلامی جملۂ دنیوی علوم و فنون سے منظم تر ہے، اس لئے اس کے کسی معمولی سے جزئیہ کی طرف سے بے التفاتی دوسرے اجزاء حیات پر لازمی طور پر مؤثر ہوگی، آیت کا یہ جزو بڑھا کر گویا یہ تاکید و تصریح کر دی ہے کہ جس کسی کو اللہ کی ہمہ گیر حکومت اور آخرت کی باز پرس کا پورا عقیدہ ہے اُس کی یہ شان نہیں کہ ایک جزئیہ کی بھی خلاف ورزی کی دانستہ جسارت کر سکے۔

۸۴۷ (اور یہ واپسی بلا تجدید نکاح ہو جائے گی۔)
فِيْ ذٰلِكَ۔ یعنی تین ۳ مہینے کی میعاد و مدت کے اندر۔

ای فی ذلک التربص (مدارک) ای زمان التربص (روح)
أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ۔ اس سے اشارہ یہی نکلتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اُسے پختہ نہ ہونے دے، اور میاں بیوی از سر نو آباد ہو جائیں، طلاق کو شریعت الٰہی نے صرف ضرورت کے موقع پر بطور علاج اور آخری تدبیر کے جائز رکھا ہے، خواہ مخواہ اس کی ترغیب نہیں دی ہے، اور نہ بلا ضرورت اسے پسند فرمایا ہے، اور حدیث نبوی میں جو اُسے ابغض المباحات سے تعبیر فرمایا ہے یعنی اللہ کی قانوناً جائز ٹھہرائی ہوئی چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند، تو اسی حقیقت کی ترجمانی ہے، تین ۳ مہینہ کی مدت غور و فکر کے لئے اور ناگواری و بیزاری کے ہنگامی جذبات کے سرد پڑ جانے کے لئے، بہت ہوتی ہے،

# اِصۡلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثۡلُ الَّذِیۡ عَلَیۡهِنَّ

قصد رکھتے ہوں ۸۴۸ اور عورتوں کا (بھی حق) ہے جیسا کہ عورتوں پر (حق) ہے ۸۴۹

اس اثناء میں اگر شوہر بیوی کو واپس لینا چاہے تو طلاق کو قول یا عمل سے منسوخ کرسکتا ہے اور اسی کو اصطلاح میں رجعت کہتے ہیں

۸۴۸ (اس رجوع و رجعت سے، نہ یہ کہ فسخ طلاق سے مزید اذیت رسانی مقصود ہو) اگرچہ رجعت کا نفاذ قانونی وظاہری تو بہر صورت ہوجائے گا۔

ثم من فعل ذلك فالرجعة صحيحة وان ارتكب النهي وظلم نفسه۔ (قرطبی)

قانونی احکام اور اخلاقی ہدایات دو الگ الگ چیزیں ہیں، قانونِ ظاہری کا نفاذ اسی دنیا تک ہے، مؤمن کو اپنا معاملہ حق تعالیٰ سے درست رکھنا چاہیے کہ اجر و ترقی درجات کا مدار اسی پر ہے، اسی لئے قانونی احکام کے بیچ بیچ تصحیحِ نیت و اخلاص کی تاکید برابر آتی رہتی ہے۔

۸۴۹ یہ قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اتنا بڑا مضمون اتنے مختصر سے فقرہ میں آگیا، اردو میں یہ مضمون اس طرح ادا ہوگا:۔ "جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے، اسی طرح عورتوں کا حق بھی مردوں پر ہے"۔

گویا دنیا کو یہ بتادیا کہ یہ نہ سمجھو کہ بس مردوں کے حقوق عورتوں پر اور شوہروں ہی کے حقوق بیویوں پر ہوتے ہیں، نہیں بلکہ اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق مردوں پر اور بیویوں کے حقوق بھی شوہروں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔ حقوقِ نسواں کا یہ نام عرب کے ایک اُمّی (صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبان پر اُس وقت لایا جارہا ہے جب کہ دنیا کی دنیا اس تخیل سے ناواقف تھی، اور یہودیت و نصرانیت کی مذہبی دنیا میں تو عورت گویا ہر بُرائی کا سرچشمہ تھی، اور ذلت و حقارت کا ایک مُرقّع، یہود کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"معصیتِ اول چونکہ بیوی ہی کی تحریک پر سرزد ہوئی تھی، اس لئے اس کو شوہر کا محکوم کرکے رکھا گیا اور شوہر اس کا حاکم ہے، شوہر اس کا مالک و آقا ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے" (جلد ۶ صفحہ ۵۰۰)

اور مسیحی سے متعلق مسٹر لیکی LECKY فرنگی مسیحی اپنی تاریخ اخلاقِ یورپ HISTORY OF EUROPEAN MORALS میں لکھتے ہیں:۔

"عقیدہ یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام آفاتِ بشری کا باعث ہے، اسے اپنے کو ذلیل سمجھتے رہنے کے لئے یہی وجہ کافی ہے کہ وہ عورت ہے"۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۴۲)

یہ حال وقت کے اونچے اونچے مذہبوں کا تھا، شرک و جاہلیت کے پست مذہبوں کا ذکر ہی بیکار ہے، اور خود ملک عرب کا یہ حال تھا کہ عورتیں گویا انسان نہیں، جانور یا جائداد تھیں کہ شوہر کے بعد بیویاں بھی ترکہ میں سوتیلے بیٹوں کے مِلک و تصرّف میں آنے لگی تھیں۔

مِثۡلُ الَّذِیۡ۔ یہ مثلیت و مماثلت کس لحاظ سے ہے؟ کیفیت یا کمیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ نفسِ وجوب کے لحاظ سے ہے

والمراد بالمماثلة الواجب فی کونه حسنة لا فی جنس الفعل (کشاف۔ روح) ای فی الوجوب واستحقاق المطالبة علیها۔ (بیضاوی)

بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ع ﴿۲۲۸﴾ ۴۸ ع ۷ ۱۲

موافق دستور (شرعی) کے ۸۵۰ اور مردوں کو ان کے اوپر ایک گونہ فضیلت حاصل ۸۵۱ ہے اور اللہ بڑا زبردست ہے ۸۵۲ بڑا حکمت والا ہے ۸۵۳

یعنی یہ مراد نہیں کہ جو حقوق شوہر کی طرف سے بی بی پر عائد ہوتے ہیں بس بالکل وہی بی بی کی طرف سے شوہر پر عائد ہو جاتے ہیں، یکسانیت صرف وجوب ادائے حقوق میں ہے، شوہر کہیں اس بھول میں نہ پڑ جائیں کہ ان کے صرف حقوق ہی حقوق ہیں، اور فرائض کچھ نہیں، فرائض ان پر بھی اسی طرح عائد ہوتے ہیں جس طرح ان کی بیویوں پر اسی طرح بیویاں کہیں اس افراط "روشن خیالی" میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ خدمت کرنا ہمارا کام نہیں یہ سب کام مردوں کا ہے، ہمارا کام خدمت لینا ہے۔

۸۵۰ لیکن حقوق باہمی کا آخر معیار کیا ہے؟ آیت کا یہ ٹکڑا اسی سوال کا جواب ہے یعنی ان حقوق کی جزئیات و تفصیلات کو شریعت ہی کے اصول و کلیات کے ماتحت ہونا چاہئے، یا پھر عقل سلیم کے ماتحت۔

ای بالوجه الذی لاینکر فی الشرع وعادات الناس۔ (مدارک)

یہ نہیں کہ محض ہوائے نفس سے یا جاہلی مزعومات کے ماتحت کوئی دستور گڑھ لیا جائے، اور ان کا نام "ضابطۂ حقوق نسواں" رکھ دیا جائے۔

۸۵۱ تہذیب جاہلی ہر زمانہ میں عجیب عجیب بے اصل اور تمام تر غلط دعوے کرتی رہتی ہے اور بعد کو ان دعووں کی عملی تردید بھی ہوتی رہتی ہے، تہذیب جدید کے انھیں بے بنیاد مفروضوں میں سے ایک دعوے یہ بھی ہے کہ مرد و عورت ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے ہم درجہ ہیں محض دعویٰ کتنی ہی کثرت سے دہرایا جائے دعوے ہی رہے گا، دلیل نہ بن جائے گا، قرآن ابھی ابھی جاہلیت ہی کے ایک مفروضہ کی تردید میں کہہ چکا ہے کہ عورت بے حق نہیں ہے وہ بھی مردوں کی طرح اپنے حقوق رکھتی ہے اب وہ جاہلیت کے دوسرے دعوے کی تردید میں بے دھڑک اعلان کر رہا ہے کہ دونوں جنسوں میں مساوات مطلق و مساوات کامل نہیں بلکہ مرد کو عورت پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے۔

دَرَجَةٌ قرآنی لفظ دَرَجَةٌ خوب خیال میں رہے، مرد عورت کے مالک نہیں، عورت اس کی کنیز یا باندی نہیں، بلحاظ حقوق دونوں ایک سطح پر ہیں، پھر بھی مرد کو عورت پر ایک گونہ فضیلت و ترجیح حاصل ہے۔

معناه فضيلة فی الحق (معالم) ای زیادة فی الحق (کشاف) ای منزلة۔ (قرطبی)

جدید علوم و طبیات کے ماہرین جنھوں نے مرد و زن کی جسمانی ساخت و ترکیب، دماغی و ذہنی قوئے اور طبعی خصوصیات کے مطالعہ و تحقیق میں عمریں بسر کر دی ہیں، اُن کی بڑی جماعت آخر اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے متمم و مکمل ہیں، تاہم بہ لحاظ قوت و بہ لحاظ عقل مرد ہی کو فضیلت حاصل ہے اور عورت جن ملکوں میں مردوں کے برابر ثابت بھی ہوئی ہے وہاں اپنی نسائیت کا خون کر کے۔

لیکن اس اثبات افضلیت سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ افضل مفضول پر ظلم یا سختی ہی شروع کر دے، بلکہ قوی کو تو کمزور سے اور زیادہ لطف و حسن مراعات رکھنا چاہئے ـــــ اور یہ تعلیم ایک بزرگ اور مفسر صحابی تک سے منقول ہے۔

وقال ابن عباس الدرجة اشارة الی حض الرجال علی حسن العشرة والتوسع للنساء فی المال والخلق ای ان الافضل ینبغی ان یتحامل علی نفسه قال ابن عطیة وھذا قول حسن بارع۔ (قرطبی)

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ

طلاق تو دو ہی بار کی ہے ۸۵۳ اس کے بعد (یا تو) رکھ لینا ہے قاعدے کے مطابق یا پھر خوش عنوانی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے ۸۵۴

لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا

اور تمہارے لئے جائز نہیں کہ جو مال تم انھیں دے چکے ہو اس میں سے کچھ واپس لو ۸۵۵ ہاں بجز اس صورت کے کہ جب اندیشہ ہو کہ اللہ کے

وَلِلرِّجَالِ. بجائے ضمیر لَهُمْ لانے کے، صراحۃً لفظ لِلرِّجَالِ لا کر، گویا اس طرف اشارہ کر دیا کہ فضیلت کی بنیاد یہی وصف رجولیت ہے۔

ای بالمظهر عوض المضمر.... للتنويه بذكر الرجولية التي بها ظهرت المزية للرجال على النساء (بحر)

**۸۵۲** معاشرتِ انسانی اور معاملاتِ باہمی کے بہت سے صیغوں کے اہم مسائل اس آیت میں آ گئے، اس لئے حق تھا کہ آیت کا خاتمہ انھیں صفاتِ باری کے اثبات پر کیا جائے۔

عَزِيْزٌ. وہ بڑی قوت والا ہے، ہر مانع پر غالب، جو احکام وہ چاہے دے سکتا ہے۔

حَكِيْمٌ. لیکن ساتھ ہی وہ بڑا حکمت والا بھی تو ہے، اس لئے وہ وہی احکام دیتا ہے جو بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کے جامع ہوتے ہیں، بندوں بیچاروں کی نظریں وہاں تک پہونچ کہاں سکتی ہیں۔

**۸۵۳** (جب تک کہ واپسی کی گنجائش باقی ہے)

طلاق سے یہاں مراد طلاق رجعی ہے، دو بار تک لفظِ طلاق ادا کرنے پر رجوع کر لینے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

**۸۵۴** یعنی دو ماہ کے بعد تیسرے مہینہ تیسری پاکی کے زمانہ میں، زبان سے الفاظ طلاق ادا کرے، یا خاموش رہے، دونوں صورتوں میں طلاق واقع ہو جائے گی، اب بغیر کسی دوسرے شوہر سے نکاح کئے اور طلاق پائے، اُس پہلے شوہر سے نکاح دُرست نہ رہے گا۔

تو ایک صورت تو یہ ہوئی کہ اب پُختہ ارادہ کر کے اس طلاق کو مکمل اور قطعی کر دیا جائے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ آخری گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق واپس لے لی جائے، اور تعلقِ زناشوئی از سر نو قائم ہو جائے۔

فَاِمْسَاكٌ. یعنی اس کچی طلاق پائی ہوئی بیوی کو رجعت کر کے پھر اپنے پاس رکھ لینا ہے۔

بِمَعْرُوْفٍ. یعنی قواعدِ شرعی کے مطابق، تفصیلی احکامِ طلاق کتبِ فقہ میں ملیں گے۔

بِاِحْسَانٍ. یعنی طلاق سے مقصود رفعِ نزاع ہو نا خوشگوار صورتِ حال کا خاتمہ ہو، یہ نہ ہو کہ عورت کی دل شکنی تحقیر و تذلیل مقصود ہو۔ قرآن مومن کے خاندان کی، اُس کے گھر بار کی کتنی عزت و حرمت محفوظ رکھتا ہے! اس کی بے حرمتی کسی حال میں اسے گوارا نہیں، آج مسلمانوں کو خود اپنی اور اپنے خاندان کی عزت و حرمت کا اتنا بھی خیال ہوتا جتنا ان کے خدا کو ہے، تو آج خانگی فضیحتوں کا کوئی وجود بھی کہیں باقی نہ رہتا!

**۸۵۵** (طلاق کے وقت)

اکثر انسان جب غصہ میں آ کر طلاق دیتا ہے تو یہ بھی کر گزرتا ہے کہ اب تک جو کچھ بیوی کو دیا لیا ہے اُس سے

حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ

ضابطوں کو دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے ۵۵۶ سو اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ دونوں اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے ۵۵۷

عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ

تو دونوں پر اس (مال) کے باب میں کوئی گناہ نہ ہوگا، جو عورت معاوضہ میں دیدے ۵۵۸ یہ (سب) اللہ کے ضابطے ہیں سو ان سے باہر نہ نکلنا۔

چھین لیتا ہے، عرب جاہلیت میں یہ دستور اور زیادہ پھیلا ہوا تھا، یہاں اسی ظالمانہ دستور کی ممانعت ہے اور بتایا ہے کہ مہر وغیرہ جو کچھ انھیں پہلے دے چکے ہو اب اس کے چھیننے یا واپس لینے کا کوئی محل نہیں۔

مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا۔ عام مفسرین اور فقہا نے اس سے مُراد مہر کی رقم رکھی ہے لیکن مسلک مالکی کے ایک مُفسّر فقیہ نے اُسے ہر اُس مال تک وسعت دی ہے، جو شوہر بیوی کو دے چکا ہو، اور بعض اور اہل تفسیر بھی اس عموم کی طرف گئے ہیں۔

قال قوم يعني من الصداق وعندي ان من كل شيء اعطاها (ابن العربي) وهي مما اٰتيتموهن ظاهر في عموم ما اتوا على سبيل الصداق اوغيره من هبة وقد فسّره بعضهم بالصدقات واللفظ عام (بحر) اذا طلّقها لا يأخذ منها شيئا من الذي اعطاها من المهر والثياب وسائر ما تفضّل به عليها (كبير)

حُسنِ معاشرت، حُسنِ معیشت، حُسنِ سُلوک کی تاکید ہر صورت میں ہے، بیویوں کو رکھو تو بھی خوش اُسلوبی کے ساتھ، رخصت کرو تو بھی ہنسی خوشی، خوش عُنوانی کے ساتھ۔

شَيْئًا۔ یعنی کچھ بھی، چھوٹی بڑی کوئی سی بھی چیز واپس نہ لو، یہ تاکید اسی لئے ہے کہ غصّہ اور ناگواری کے موقع پر نفسِ بشری میں عمومًا اسی کی تحریک ہوتی ہے۔

شَيْئًا۔ اشارة الى حظر الاخذ منه قليلا كان اوكثيرا وشيئا نكرة في بيان النهي فتعمّ۔ (بحر)

**۵۵۶** (ادائے حقوقِ زوجیت کے باب میں)

يَخَافَا، يُقِيْمَا۔ وہ دونوں، یعنی میاں بیوی۔

خَوف۔ یہاں ایک ناگوار نتیجے کے اغلبًا ظہور پذیر ہونے کے معنی میں ہے، اُردو میں "اندیشہ" کا لفظ اسی موقع کے لئے ہے۔

قيل هذا الخوف هو بمعنى العلم اي ان يعلم ان لا يقيما حدود الله وهو الاشفاق من وقوع المكروه وهو قريب من معنى الظن (قرطبی) فُسّر ذلك بعرفتم (راغب)

**۵۵۷** یعنی حقوقِ زوجیت درجۂ اقل میں بھی ادا نہ ہو سکیں اور موافقت کی کوئی صورت ہی نظر نہ آئے۔

خِفْتُمْ۔ مخاطبت حکّام سے ہے اور ان سے جو ایسے معاملات میں واسطہ اور مُعین بن سکتے ہیں۔

والمخاطبة للحكّام والمتوسطين لمثل هذا الامر۔ (قرطبی)

حُدُوْدَ اللّٰهِ۔ یعنی معاشرتِ زوجی کے فرائض۔

قال طاؤس فيما افترض على كل واحد منهما في العشرة والصحبة (جصّاص) اي فيما يجب عليهما من حسن الصحبة وجميل العشرة۔ (قرطبی)

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا

اور جو کوئی اللہ کے ضابطوں سے باہر نکل جائے گا، سو ایسے لوگ تو (اپنے حق میں) ظلم کرنے والے ہیں ۸۵۹ پھر اگر

فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ

کوئی اپنی عورت کو طلاق دے ہی دے ۸۶۰ تو وہ عورت اس کے لئے اس کے بعد جائز نہ رہے گی یہاں تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح کرے ۸۶۱

۸۵۸ یعنی بیوی اگر قیدِ نکاح سے خلاصی پانے اور شوہر سے طلاق حاصل کرنے کے لئے اپنے مہر سے یا اس کے کچھ حصہ سے دست بردار ہونا چاہے تو یہ بھی ایک جائز صورت علٰحدگی کی ہے، اور اس مال کا قبول کرلینا شوہر کے لئے درست ہوگا، طلاق کی اس خاص صورت کا نام جس میں طلاق کی خواستگار عورت ہو، اصطلاحِ شریعت میں خلع ہے، اور احکامِ خلع کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی، مفسر تھانویؒ کی بیان القرآن میں بھی کلام بسوط ملے گا۔

خلع کے جائز صورتِ طلاق ہونے اور اس کے طلاقِ بائن کے درجہ پر رکھنے پر حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جیسے صحابیوں اور حسن اور ابی سلمہ اور قاضی شریح اور ابراہیم اور شعبی اور مکحول جیسے تابعین کا اتفاق جصاص نے نقل کیا ہے، اور اس کو فقہاء کا متفقہ قول بھی قرار دیا ہے۔

وهو قول فقهاء الامصار لاخلاف بينهم۔ (جصاص)

فقہاء کے ہاں ایک بحث یہ بھی چلی ہے کہ خلع آیا صرف اسی اندیشہ کے وقت جائز ہے، جس کا آیت میں ذکر ہے یا یوں بھی عام طور پر جمہور فقہاء و مجتہدین اسی طرف گئے ہیں کہ خلع ہر صورت میں اور ہر حال میں جائز ہے۔

اما الجمهور المجتهدين فقالوا الخلع جائز فى حالة الخوف وفى غير حالة الخوف (کبیر)

صرف گنتی کے چند فقیہوں زہری نخعی اور داؤد ظاہری کا مذہب یہ نقل ہوا ہے کہ خلع کی اجازت صرف خوف اور غصہ کی حالت میں ہے اور انھوں نے اس آیت کے ظاہر سے حجت پکڑی ہے۔

وقال الزهرى والنخعى وداؤد لايباح الخلع الا عند الغضب والخوف (کبیر) تمسك بهذه الاية من رأى اختصاص الخلع بحالة الشقاق والضرر وانه شرط فى الخلع (قرطبی)

جمہور فقہاء نے اس قول کو رد کردیا ہے، اور کہا ہے کہ آیت میں یہ شرط خلع کی ہرگز مذکور نہیں، بلکہ صرف ایک عام حالت کا بیان کیا ہے کہ عموماً خلع کی نوبت ایسی ہی صورتوں میں آتی ہے۔

والذى عليه الجمهور من الفقهاء انه يجوز الخلع من غير اشتكاء ضرر كما دل عليه حديث البخارى وغيره واما الاية فلا حجة فيها لان الله عزوجل لم يذكرها على جهة الشرط وانما ذكرها لانه الغالب من احوال الخلع (قرطبی)

۸۵۹ یہ تاکید ہے اس امر کی کہ احکامِ شرعی میں کسی خفیف جزئیہ کو بھی ناقابلِ التفات نہ سمجھا جائے اور شریعت جیسے بے انتہا منظم فن میں ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ مشین جتنی نازک اور اعلیٰ صناعی کا نمونہ ہوگی، اسی قدر اس کا ایک ایک ننھا پُرزہ بھی اپنی جگہ پر بے بدل ہوگا جس طرح یہ تنبیہ احکامِ نکاح و طلاق سے متعلق آئی ہے اسی طرح مسائل و احکامِ صوم کے آخر میں بھی وارد ہوئی ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ فقہاء و مفسرین نے اس کے

یہ نکلا ہے کہ حُدُوْدُ اللہِ کی دو قسمیں ہیں، ایک کا تعلق امر سے ہے اور دوسری کا نہی سے۔

قسم الحد ودقسمین منہا حدود الامر بالامتثال وحدود النہی بالاجتناب۔ (قرطبی)

امام راغب نے اپنی لغت میں حدودِ الٰہی کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

**۸۶۰** یعنی ان پہلی دو طلاقوں کے بعد رجعت نہ کرے، اور طلاق پر قائم ہی رہے تو اب تیسری بار، یا پہلی طلاق سے تین مہینے گزر جانے کے بعد، طلاق قطعی طور پر نافذ ہو جائے گی۔ تین مہینے کی مدت غور و فکر کے لئے اور سعی مصالحت و مفاہمت کے لئے بہت کافی ہے۔

اس طلاق سے مراد وہ تیسری ہی طلاق ہے، جو ہر طرح قطعی ہوتی ہے اور یہ مراد سب کے نزدیک متفق ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

المراد الطلقۃ الثالثۃ فلا تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ وھذا المجمع علیہ لاخلاف فیہ۔ (قرطبی)

**۸۶۱** (اور وہ شوہر اس سے ہم بستری بھی کرے)

دوسرے شوہر سے یہ نکاح پہلے شوہر سے طلاق قطعی پانے کے تین مہینہ بعد یعنی ایام عدت گزرنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔ تَنْکِحَ۔ نکاح یہاں اپنے اصطلاحی شرعی معنی میں یعنی عقد نکاح کے مرادف نہیں، بلکہ اپنے اصلی اور لغوی معنی میں یعنی ہم بستری کے مرادف ہے، محض عقد کا مفہوم تو خود لفظ زَوْجًا سے نکل آتا ہے تَنْکِحَ سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا ہے۔

العقد فُہم من زوجا والجماع من تنکح (روح) یحتمل ان تفسیر النکاح بالاصابۃ۔ (بیضاوی)

اور امام ابن جریر اس سوال کے جواب میں کہ ہم بستری کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن میں موجود نہیں تو آخر یہ دلالت کہاں سے پیدا کی گئی ہے، لکھتے ہیں کہ معنیٰ کی یہ دلالت ساری اُمت کے اجماع نے پیدا کی ہے۔

الدلالۃ علیٰ ذٰلک اجماع الامۃ جمیعا علیٰ ان ذٰلک معناہ۔

اور امام رازی نے لکھا ہے کہ قول مختار یہی ہے کہ ہم بستری کی شرط حدیث سے نہیں، قرآن ہی سے ثابت ہے۔

واختلف العلماء فی ان شرط الوطی بالسنۃ اوبالکتاب قال ابومسلم الاصفہانی الامران معلومان بالکتاب وھذا ھو المختار۔ (کبیر)

اور آگے اسے بہت تفصیل سے لکھا ہے کہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں ہے جب تو مراد عقد زوجیت سے ہو گی، لیکن جب اضافت زوجتہ وامرأتہ کے ساتھ ہو گی تو ہم بستری ہی ہو گی، اور آخر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قولہ نکح یدل علی الوطی وقولہ زوجا یدل علی العقد (کبیر)

بہر حال جمہور فقہاء و ائمہ مجتہدین کا مذہب یہی ہے کہ مطلقہ کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح جب ہی درست ہے جب دوسرا شوہر اس کے ساتھ ہم بستری کر کے اسے طلاق دیدے، اور اس طلاق پر بھی تین ماہ کی مدت گزر لے۔

مذھب جمھور المجتھدین ان المطلقۃ بالثلاث لا تحل لذٰلک الزوج الا بخمس شرائط تعتد منہ وتعقد للثانی ویطؤھا ثم یطلقھا ثم تعتد منہ (کبیر)

اختلاف صرف دو تابعین سے منقول ہے، ان کے خیال میں مجرد عقد ثانی بھی بغیر ہم بستری کے، طلاق کے بعد شوہر اول سے یا کسی اور سے عقد کے لئے کافی ہے۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ

پھر اگر وہ (بھی) اُسے طلاق دیدے ۸۶۲ تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ پھر مل جائیں ۸۶۳ بشرطیکہ دونوں گمان غالب رکھتے

يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

ہوں کہ اللہ کے ضابطوں کو قائم رکھیں گے ۸۶۴ اور یہ بھی اللہ کے ضابطے ہیں انھیں وہ کھول کر ان لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۸۶۵

قال سعید بن جبیر وسعید بن المسیب تحل بمجرد العقد (کبیر) قال سعید بن المسیب ومن وافقه مجرد العقد کاف (قرطبی) وقد قال بقول سعید بن المسیب سعید بن جبیر (قرطبی)

لیکن مذہبِ جمہور ہی قوی اور شریعتِ اسلامی کے عین مزاج کے مطابق ہے شریعت نے طلاق کو پسند یقیناً نہیں کیا ہے اس کے نفاذ میں طرح طرح کی قیدیں لگا دی ہیں ترغیب یہ دی ہے کہ خوب سوچ سمجھ کر ہی طلاق دی جائے لیکن ان سب مرحلوں سے گزر جانے کے بعد جب طلاق نافذ ہی ہو جائے تو پھر اب رعایت کا کوئی موقع نہیں، شوہر کو اب دوبارہ آسانی سے وہ بیوی واپس نہیں مل سکتی' اب اُسے ذرا خونِ جگر کھا لینا پڑے گا جب وہ حاصل ہو سکتی ہے — سزائے زنا میں بھی قانونِ شرعی کی یہی اصل کار فرما ہے ثبوت زنا نہایت ہی قوی بلکہ قطعی ہونا چاہیئے، ذرا سے بھی شبہہ کا فائدہ ملزم ہی کو ملے گا لیکن جب یہ سب مرحلے طے ہو چکیں تو پھر اب نفاذِ سزا میں کسی رعایت کی گنجائش نہیں۔

مِنۡۢ بَعۡدُ۔ یعنی طلاقِ ثالث کے بعد۔

ای التطلیقة الثالثة (مدارک)

اس شرط کے ساتھ نئے شوہر کا کسی مُطلّقہ کے ساتھ نکاح کرنا کہ بعد صحبت طلاق دے دی جائے گی تا کہ وہ اپنے شوہرِ اول کے لئے جائز ہو جائے حلالہ کہلاتا ہے، حدیث میں مُحَلِّل یعنی وہ دوسرا شوہر جو نکاح جیسے اہم، سنجیدہ اور مقدس معاہدہ کو پہلے شوہر کی خاطر ایک کھیل اور تفریح کی چیز بنائے دیتا ہے اور مُحَلَّل لہٗ یعنی وہ پہلا شوہر جس کی خاطر معاہدۂ نکاح کی اہمیت، سنجیدگی و تقدیس خاک میں ملائی جا رہی ہے ان دونوں پر لعنت آئی ہے، اور اکثر فقہاء کے ہاں یہ نکاح، نکاحِ فاسد کے حکم میں آتا ہے حنفیہ کے ہاں ایسا نکاح منعقد ہو جائے گا یعنی اس کا نفاذ قانونی ہو جائے گا، اگرچہ اس سے گناہ عائد ہوگا — نفاذِ قانونی اور شرعی و اخلاقی استحسان دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اس امتیاز و تفریق کی نظیر شریعت کے اور بھی مسائل میں مل جاتی ہے۔

۸۶۲ (اور اس دوسری طلاق پر بھی تین۳ مہینے کی عدت گزر جائے)

یہ طلاق دینے والا، ظاہر ہے کہ دوسرا شوہر ہوگا۔

۸۶۳ (بہ دستورِ سابق، دوبارہ نکاح کرے)

مُطلّقہ اپنے شوہر کے لئے ہمیشہ کو حرام اب بھی نہیں ہو جاتی، ان درمیانی مرحلوں سے گزرنے کے بعد اب بھی اس کا نکاح اپنے شوہرِ اول سے ممکن ہے، ہر ہر فریقِ معاملہ کے حقوق کی پوری رعایت کا جو حکیمانہ اہتمام و التزام

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو ۸۶۶ اور وہ اپنی مدت گزرنے پر پہونچ جائیں ۸۶۷ تو (اب یا تو) انھیں عزت

اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ

کے ساتھ روکے رکھو اور یا عزت کے ساتھ رہائی دے دو ۸۶۸

شریعت اسلامی کے سارے اجزاء میں ہے اُس کا ایک اعلیٰ نمونہ یہ طلاق کے جزئیات احکام ہیں، انسانی ذہن اور بشری دماغ اپنی ساری کوششیں کر تھکے، اتنے دقائق کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔

۸۶۴ (اور آئندہ کی خواہ مخواہ کی رنجشیں پیدا کر کے اتلاف حقوق میں نہ مبتلا ہوں گے۔)

یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ۔ حدود اللہ کی اقامت اس سیاق میں یہی ہے کہ حسن معاشرت کی رعایت رکھی جائے۔

ای یتعاشرا بالمعروف (ابن کثیر) ای یکون بینھما الصلاح وحسن الصحبۃ (معالم) قال طاؤس ان ظنا ان کل واحد منھما یحسن عشرۃ صاحبہ (قرطبی)

اِنۡ ظَنَّآ یعنی اگر امید و ارادہ بھی رکھتے ہوں، باقی یقین کے ساتھ مستقبل کا حال کون جان سکتا ہے۔

ای رجوا لان احد الا یعلم ما ھو کائن الا اللہ عزوجل (معالم) ای متی حصل ھذا الظن حصل لھما العزم علی اقامۃ حدود اللہ حسنت ھذہ المراجعۃ (کبیر) ای ان کان فی ظنھما انھما یقیمان حقوق الزوجیۃ (مدارک) ومن فسر الظن ھھنا بالعلم فقد وھم من طریق اللفظ۔ (کشاف)

۸۶۵ اہل فہم و دانش کے لئے، ان لوگوں کے لئے جو احکام و اوامر الٰہی کا علم رکھتے ہیں۔

یعنی یعلمون ما امرھم اللہ تعالیٰ بہ (معالم) یرید من لہ عقل وعلم (کبیر) ای یفھمون ما تبین لھم (مدارک)

حُدُوۡدُ اللّٰهِ یعنی اللہ کے احکام و قوانین۔

ای احکامہ وشرائعہ (ابن کثیر)

۸۶۶ یعنی وہی ایک بار یا دو بار دی ہوئی طلاق رجعی، جو ابھی قطعی نہیں ہوئی ہے اور جس میں ابھی رجوع کر لینے کی گنجائش ہے۔

۸۶۷ (لیکن وہ مدت ابھی پوری گزر چکی نہ ہو)

یعنی زمانۂ عدت اب ختم ہونے ہی پر ہو لیکن پوری طرح ختم ہو چکا نہ ہو، ورنہ بالکل ختم ہو جانے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ اب کوئی گنجائش ہی رجعت کی نہیں باقی رہی۔

بَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ۔ المراد مقاربۃ البلوغ والاشراف علیہ لاحقیقتہ (جصاص) المراد مقاربتہ دون انقضائہ ونظائرہ کثیرۃ فی القرآن واللغۃ (جصاص) معناہ قارب البلوغ (ابن العربی) معنی بلغن قاربن باجماع من العلماء (قرطبی) ای اخر عدتھن وشارفن منتھاھا۔ (مدارک)

اَجَلَهُنَّ۔ اجل کا اطلاق ساری مدت پر بھی ہوتا ہے اور آخر مدت پر بھی۔

والاجل یقع علی المدۃ کلھا وعلی اٰخرھا وکذلک الغایۃ والامد (کشاف) ویقع فی البلوغ ایضا

وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ

اور اُن کو تکلیف پہونچانے کی غرض سے نہ روکے رہو ۸۶۹ اور جو کوئی ایسا کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم

نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ؗ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ

کرے گا ۸۷۰ اور اللہ کے احکام کو ہنسی (کھیل) نہ سمجھو ۸۷۱ اور اللہ کی نعمتیں اپنے اوپر یاد

عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ

کرو ۸۷۲ اور (اس) کتاب و حکمت کو بھی جو اُس نے تم پر اتاری ہے کہ اُس سے وہ تمہیں نصیحت کرتا رہتا ہے ۸۷۳

فیقال بلغ البلد اذا شارفه ودانا (کشاف) جعل لفظ بلغ بمعنی قارب کما یقال اذا بلغت مکة فاغتسل

(ابن العربی) والاجل یقع علی المدة کلها وعلی اٰخرها (مدارک)

۸۶۸ یعنی جب وہ مطلقہ اپنی مدتِ عدت ختم ہونے پر آ گئے تو شوہر کو اب دو اختیار ہیں، یا یہ کہ اپنی اُس نیم مطلقہ بیوی کو پھر شرافت و عزت کے ساتھ اپنی زوجیت میں واپس لے لے اور یا پھر اُسے شرافت و عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت کر دے اور مستقل علیحدگی اختیار کرلے ــــ غرض دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کی جائے تمام تر شریعت و اخلاق کے قانون و آداب کے موافق ہو۔

۸۶۹ گویا مطلقہ کی حق تلفی کی گنجائش کسی صورت اور کسی حال میں بھی نہیں ــــ زوجیت میں واپسی اگر ہو تو خانہ آبادی کے لئے ہو، نہ کہ خانہ بربادی کے لئے۔

۸۷۰ (اور اپنی زیادتیوں کی سزا دُنیا یا آخرت میں بھگتے گا۔)

بیویوں کے حقوق ادا نہ کرنے والے حقوقِ زوجیت میں برابر اور شدید کوتاہیاں کرتے رہنے والے خیال کرتے رہیں کہ ایسوں کے حق میں کیسی کیسی وعیدیں کتاب اللہ میں وارد ہو رہی ہیں ــــ وہ لوگ بھی یہ آیتیں غور کر کے پڑھیں، جو اس خیال میں ہیں کہ شریعت نے عورتوں کو حقوق دلانے میں بخل سے کام لیا ہے۔

۸۷۱ (کہ جس پر جی چاہا عمل کیا، اور جسے چاہا یوں ہی چھوڑ دیا)

شریعتِ اسلامی میں حیاتِ اجتماعی و معاشری کا سنگ بنیاد خاندان اور خاندانی زندگی ہے اور خاندان کا کلیدی نقطہ میاں بیوی کے صحیح تعلقات ہیں، اس لئے کہ ایک معنی میں کہنا چاہئے کہ سارے نظامِ معاشرت کی بنیاد یہی حقوقِ زناشوئی کی ادائی ہے اور جس طرح بعض بظاہر معمولی بے احتیاطیاں بڑی بڑی سخت بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں بعض جزئی احکامِ شریعت سے بے پروائی بڑے بڑے سخت فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے ــــ ان دقائق کو سنبھالے رہنا شریعت ہی جیسے حکیمانہ نظام کا کام ہے۔

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ احکام محض ہزل نہیں، پوری سنجیدگی سے ہر حال میں نافذ ہو جائیں گے، یہ نہیں کہ پہلے تو زبان سے صاف الفاظ میں طلاق دیدی، اور پھر بعد کو یہ کہہ کر ٹال دینا چاہا کہ یہ تو ہنسی میں کہا تھا، بعض تابعین اسی طرف گئے ہیں۔

۸۷۲ (اور انھیں نعمتوں میں سے آئینِ معاشرت کی یہ مکمل، مفصل، جامع تعلیم بھی ہے۔)

۲۹ ع ۱۳

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۲۳۱) وَاِذَا

اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۸۷۴ اور جب تم طلاق

طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ یَّنْكِحْنَ

دے چکو اپنی عورتوں کو، اور پھر وہ اپنی مدت کو پہونچ چکیں ۸۷۵ تو تم انھیں اس سے مت روکو ۸۷۶ کہ

اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَیْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

وہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں، جب کہ وہ آپس میں شرافت کے ساتھ راضی ہوں ۸۷۷

۸۷۳ یَعِظُكُمْ بِهٖ۔ اس سے یعنی اس کے ذریعہ وہ تمھیں نصیحت کرتا رہتا ہے۔
بِهٖ میں ضمیر مَآ اَنْزَلَ کی طرف ہے۔

۸۷۴ (اور چھوٹے بڑے ہر حکم کی مصلحتوں سے بھی وہی خبردار ہے)
وَاتَّقُوْا، وَاعْلَمُوْٓا۔ تقوئے الٰہی اور علم الٰہی کی کاملیت کا استحضار یہی دو تو بنیادیں ہیں ہر عملِ صالح اور صالحانہ زندگی کی

۸۷۵ (اور عدت پوری کرکے دوسرے نکاح کی آرزومند ہوں)
اِذَا طَلَّقْتُمُ۔ یہاں یہ خطاب صرف شوہروں سے نہیں، عام اُمت سے ہے۔
خطابا للاولیاء وللازواج ولسائر الناس والعموم یقتضی ذٰلک (جصّاص)
بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔ یہاں زمانۂ عدت کا قربِ ختم مراد نہیں جیسا کہ آیت ماقبل میں تھا، بلکہ عینِ ختم مراد ہے۔
المراد حقیقة البلوغ بانقضاء العدة (جصاص) البلوغ ههنا حقیقة لا مجاز فیها (ابن العربی)
بلوغ الاجل فی هٰذا الموضع تناهیه (قرطبی) ای انقضت عدتهن فدل سیاق الکلامین علی
افتراق البلوغین لان النکاح یعقبه هنا وذا یکون بعد العدة وفی الاولی الرجعة وذا یکون فی العدة۔ (مدارک)

۸۷۶ (جیسا کہ عرب میں بہت سے موقعوں پر اولیاء و اقرباء کی طرف سے روکنے کا رواج تھا۔)
عَضْل کے معنی منع، حبس کے ہیں۔
معناه تحبسوهن .... وقیل العضل التضییق والمنع وهو راجع الی معنی الحبس (قرطبی) تجوزبه
فی کل منع شدید (راغب)

۸۷۷ اَزْوَاجَهُنَّ۔ یعنی ان کے تجویز کئے ہوئے شوہر، عام اس سے کہ وہ نئے ہوں یا وہی پرانے ہوں جو ایک بار انھیں چھوڑ چکے ہیں۔
ای الذین یرغبن فیهم ویصلحون لهن (مدارک)
یَنْكِحْنَ۔ اس لفظ سے معلوم ہوا کہ عورتیں خود بھی اپنا نکاح کرسکتی ہیں، اور یہیں سے حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ نکاح بغیر ولی کے بھی جائز ہے۔

ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ

اس (مضمون) سے نصیحت کی جاتی ہے تم میں سے اُس شخص کو جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے ۸۷۸

اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ

یہی تمہارے حق میں پاکیزہ تر اور صاف تر ہے، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۸۷۹ اور مائیں اپنے بچوں کو

يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

دودھ پلائیں پورے دو سال ۸۸۰ (یہ مدت) اس کے لئے ہے، جو رضاعت کی تکمیل کرنا چاہے ۸۸۱

قد دلت هذه الاٰية من وجوه على جواز النكاح اذا عقدت على نفسها بغير ولى ولا اذن فيها احدها اضافة العقد اليها من غير شرط اذن الولى (جصاص) واحتج بها اصحاب ابى حنيفة على ان تزوج المرأة نفسها (قرطبى) وفيه اشارة الى انعقاد النكاح بعبارة النساء (مدارك)

تَرَاضَوْا۔ حنفیہ نے اس لفظ سے استنباط کیا ہے کہ ایجاب و قبول رکنِ نکاح ہیں، یہ اور بات ہے کہ کبھی بجائے زوجین کے ان کے ولی یا وکیل کر دیں۔

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یہ قید ان احکام میں ہر جگہ لگی ہوئی ہے اور کس کثرت سے اس کا اعادہ ہو چکا ہے مقصد یہ ہے کہ کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ بات بھی دین و اخلاق کے قانون کے خلاف نہ ہونے پائے اور ایک صالح معاشرہ کے عین معیارِ شرافت کے مطابق ہو۔

اى بما يحسن فى الدين والمروءة من الشرائط۔ (مدارك)

۸۷۸ ان تعلیمات و ہدایات کی پوری قدر ان ہی کو ہوگی جو مومنِ کامل ہیں۔

۸۷۹ دینی حکمتوں اور حقیقی مصلحتوں کا علم ہمہ دانی و ہمہ بینی ہمہ دان خدائے تعالیٰ کو ہو سکتا ہے، یا علم کے ناقص عقل کے ناقص گندے بندوں کو؟

اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ۔ یعنی احکام مفید، حکیمانہ، قابلِ عمل، آسان اور وہ بھی ذاتی و ملی ہر اعتبار سے شخصی ہیر توں اور اجتماعی مصلحتوں دونوں کے معیار سے۔

دوسرے مذہبوں کے برعکس اسلام جس نظام کو لے کر آیا ہے، وہ محض صوفیوں، راہبوں، جوگیوں، فلسفیوں کے لئے نہیں، صرف نفس کشی و ریاضت کرنے والوں کے لئے نہیں، عامۃ الناس کے لئے ہے اور اس مادی دنیا کے بھی معاشری، اجتماعی، فوائد کا تقاضہ یہی ہے کہ عمل اُس کے قانون پر کیا جائے۔

ذٰلِكُمْ۔ اى الاتعاظ به والعمل بمقتضاه۔ (روح)

۸۸۰ رضاعت اصلی حق ماں کا ہے اور ماں سے بہتر کوئی مُرضعہ ہو نہیں سکتی، پرانے طبیبوں اور نئے ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں سب کو اس پر اتفاق کرنا پڑا ہے۔

يجعل الام احق برضاع الولد هذه المدة (جصاص)

اَلْوَالِدٰتُ۔ خواہ ان ماؤں کا نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو۔

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ

اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا موافق دستور کے ۸۸۲ کسی شخص کو حکم نہیں

نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ

دیا جاتا بجز اس کی برداشت کے بقدر ۸۸۳ نہ کسی ماں کو تکلیف پہونچائی جائے اس کے بچے کے باعث اور نہ کسی

بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ

باپ ہی کو تکلیف پہونچائی جائے اس کے بچے کے باعث ۸۸۴ اور اسی طرح (کا انتظام) وارث کے ذمہ بھی ہے ۸۸۵

اَوْلَادَهُنَّ ۔ اس قید نے یہ صاف کر دیا کہ مراد مائیں ہی ہیں، نانیاں دادیاں مُراد نہیں، رضاعتِ کامل کے لئے دو برس کی مدت پر بھی طبیبوں کا اتفاقِ رائے موجود ہے۔

۸۸۱ یعنی جو پورے نصاب کی تکمیل کسی ضرورت یا مصلحت سے نہ کرنا چاہے اس کے لئے کم مدت کی بھی اجازت ہے اور دودھ بڑھائی دو سال سے قبل بھی ہر سن میں جائز ہے۔

دلیل على ان ارضاع الحولين ليس حتما فانه يجوز الفطام قبل الحولين (قرطبی)

۸۸۲ مرضعہ کی تنخواہ اور کھلانے کپڑے کی ذمہ داری بہرحال باپ کے سر ہے، اور مرضعہ عام حالات میں ماؤں ہی کو ہونا چاہئے، خواہ وہ مائیں ہنوز قیدِ نکاح میں ہوں یا قیدِ عدت میں۔

بِالْمَعْرُوفِ ۔ یعنی ملک کے عرفِ شریفانہ کے موافق، جو کسی قاعدۂ شرعی کے خلاف نہ ہو۔

اى بما يحسن فى الدين والمروءة (مدارك) اى بما لا يكون مستنكرا شرعا ومروءة (روح)

اى بما جرت به عادة امثالهن فى بلادهن من غير اسراف ولا اقتار بحسب قدرته فى يساره وتوسطه واقتاره (ابن کثیر)

فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کھلانے پہنانے میں مرد کی واجبی حالت کا اعتبار کیا جائے گا، اُسے نہ خسّت سے کام لینا چاہئے، نہ اِسراف کی حاجت۔

يدل على ان الواجب من النفقة والكسوة هو على قدر حال الرجل فى اعساره ويساره (جصاص)

اى بالمتعارف فى عرف الشرع من غير تفريط ولا افراط (قرطبی) بلا اسراف ولا تقتير۔ (مدارك)

۸۸۳ (اور اس کے قوائے ترکیبی کے مناسبِ حال)

چنانچہ یہاں بھی رضاعت کا حکم ملا تو ماں کو کہ یہ چیز عورت ہی کے فرائض میں داخل ہے اور مرضعہ کو کھلانے پہنانے کی ذمہ داری رکھی گئی ہے، باپ کے سر کہ یہ کمانا اور خرچ کرنا مرد ہی کی زندگی سے مناسبت رکھتا ہے، جزئیات کے درمیان درمیان کلئے لے آنا یہ انشاء قرآنی کے خصوصیات میں سے ہے۔

۸۸۴ آیت میں تنبیہ ہے باپ اور ماں دونوں کو، باپ کو تو یہ کہ وہ لڑکے کی ماں پر خواہ مخواہ سختی روا نہ رکھے اور ماں کو یہ کہ وہ لڑکے کے باپ سے خواہ مخواہ سخت مالی مطالبے نہ کرے، عدل واعتدال، توازن جو سارے ہی

فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ

پھر اگر دونوں اپنی باہمی رضامندی اور مشورہ سے دودھ چھڑا دینا چاہیں ۸۸۶ تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

احکام شریعت میں سرایت کئے ہوئے ہے' یہاں بچے کے ماں اور باپ دونوں کے حق میں کیسا نمایاں ہے۔!

۸۸۶ (جب باپ زندہ نہ ہو)

اَلْوَارِثِ۔ وارث سے فقہی اصطلاح میں وہ قرابت ذی رحم محرم مراد ہے' جو بچہ کا شرعی وارث بنے' امام ابوحنیفہؒ اور بعض اور قدیم فقہاء سے یہی معنی مروی ہیں۔

خص الامام ابوحنیفۃ ھذا الوارث بمن کان ذا رحم محرم من الصبی وبہ قال حماد (مدارک)

عند ناس کان ذا رحم محرم منہ۔ (مدارک)

مِثْلُ ذٰلِكَ۔ یعنی جس طرح باپ پر بچہ کی ماں کا حفظِ حقوق واجب ہے' اسی طرح باپ کے بعد اپنے قریب ترین عزیزوں پر بھی واجب ہے۔

علیہ مثل ما علی والد الطفل من الانفاق علی والدۃ الطفل والقیام بحقوقھا وعدم الاضرار بھا (ابن کثیر) وبہ قول الجمھور وقد استقصٰے ذلک ابن جریر فی تفسیرہ (ابن کثیر)

باپ کے ہوتے ہوئے بچہ کی پرورش کا خرچ صرف باپ کے ذمہ ہے' اور جب باپ مرجائے تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک ہے تب تو اسی مال میں اس کا خرچ ہوگا، اور اگر مال کا مالک نہیں ہے تو اس کے مالدار عزیزوں میں جو اس کے محرم ہیں یعنی اس بچہ سے ان کا رشتہ ایسا ہے کہ دونوں میں سے ایک کو مرد اور ایک کو عورت فرض کریں تو باہم نکاح درست نہ ہو' اور محرم ہونے کے علاوہ شرعًا اس کے مستحقِ میراث بھی ہیں' پس ایسے محرم وارث رشتہ داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا، اور ان رشتہ داروں میں ماں بھی داخل ہے' مثلاً ایک ایسے بچہ کی ایک ماں ہے' ایک دادا ہے' تو اس کے خرچ کا ایک ثُلُث ماں کے ذمہ ہے' اور دو ثلث دادا کے ذمہ کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچہ کی میراث بھی اسی نسبت سے پاسکتے ہیں۔ (تھانویؒ)

شیرخوار کے مصارف جو دوسروں پر واجب کئے گئے ہیں' اس کی علت یہی ہے کہ بچہ بذاتِ خود اپنی پرورش کی صلاحیت نہیں رکھتا، اسی اشتراکِ علت سے فقہاءِ حنفیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ محتاج عورتوں' اپاہج مردوں اور نابالغوں کے مصارف اُن کے اقارب کے ذمہ ہیں، اور یہی مسلک حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہے۔

وقد استدل بذلک من ذھب من الحنفیۃ والحنبلیۃ الی وجوب نفقۃ الاقارب بعضھم علی بعض وھو مروی عن عمر بن الخطابؓ وجمھور السلف۔ (ابن کثیر)

وَمِثْلُ ذٰلِكَ۔ ایک گروہ نے اس سے اشارہ صرف تحریمِ اضرار کی جانب سمجھا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور تابعین میں قتادہ و حسن بصریؒ نے اس سے مراد اوپر کے کل احکام لئے ہیں یعنی وجوبِ نفقہ اور تحریمِ اضرار دونوں اور یہی معنی حضرت عمرؓ سے بھی مروی ہیں۔

اشارۃ الی ما تقدم فمن الناس من ردہ الی جمیعہ من ایجاب النفقۃ وتحریم الاضرار منھم ابوحنیفۃ من الفقھاء ومن السلف قتادۃ والحسن ویسند الی عمر۔ (قرطبی)

وَإِنْ أَرَدتُّمْ أَن تَسْتَرْضِعُوٓا۟ أَوْلَـٰدَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا

اور اگر تم لوگ اپنے بچوں کو (کسی اور انا کا) دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جب کہ

سَلَّمْتُم مَّآ ءَاتَيْتُم بِٱلْمَعْرُوفِ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ

تم (ان کے) حوالے کر دو جو کچھ انہیں تم کو دینا ہے موافق دستور کے ۸۸۷ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۸۸۸ اور

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٣﴾ وَٱلَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ

جانے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کا خوب دیکھنے والا ہے ۸۸۹ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں

أَزْوَٰجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ

چھوڑ جاتے ہیں، وہ بیبیاں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن تک روکے رکھیں ۸۹۰

۸۸۶ (تکمیلِ رضاعت سے قبل یعنی دو برس کی مدت کے اندر ہی)

تَرَاضٍ۔ تَشَاوُرٍ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ماں کو جذبۂ شفقت اور حقِ پرورش زیادہ ہوتا ہے، اس لئے اس قسم کے امور کو محض باپ کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، بلکہ ماں کی رائے اور رضامندی کی بھی شرط لگا دی گئی مفسر تھانویؒ نے کہا کہ باہمی مشورہ کی صورت یہ ہے کہ خود بچہ کی مصلحت پر نظر کر لیں۔

۸۸۷ مقصد یہ ہے کہ بعض دفعہ ماں سے چھڑا کر کسی اور سے رضاعت کرانے کی ضرورت یا مصلحت بھی پیش آجاتی ہے، چنانچہ جب ایسی صورت پیش آجائے تو کسی انا سے رضاعت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ بالکل جائز ہے بشرطیکہ اجرت حسب قرارداد ادا کر دی جائے۔

بِالْمَعْرُوفِ یعنی حسب معاہدہ و قرارداد۔ بِالْمَعْرُوفِ کا نحوی تعلق سَلَّمْتُمْ سے بھی ہو سکتا ہے اور اٰتَیْتُمْ سے بھی۔

متعلق بسلّمتم (کشاف) متعلق بسلّمتم وجوّزان یتعلق باٰتیتم (روح)

۸۸۸ (سارے احکام و اوامر کے باب میں)

چنانچہ یہاں بھی یہ ہے کہ اجرت نہ دو گے تو گنہگار ہو گے ــــــ معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے، قرآن مجید نے سارے دائرۂ زندگی میں قدم قدم پر تقوائے الٰہی کو شمع راہ رکھا ہے۔

۸۸۹ انسان کو بدمعاملگی، بددیانتی پر لانے والی چیز صرف یہی ذہول و غفلت ہے، اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناظر ہونے کا، اس کی ہمہ بینی، ہمہ خبری کا استحضار اگر ہر وقت رہے تو کوئی لغزش ہونے ہی نہ پائے، قرآن مجید بار بار اسی جذبہ کو بیدار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی خانگی زندگی کی کسی منزل میں بھی اس طرف سے غافل نہ ہونے پائے۔

۸۹۰ (نکاح اور قریبی مقدّماتِ نکاح سے)

دنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں طلاق کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا، بیوہ کے ساتھ

فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي

پھر جب وہ اپنی مدت تک پہونچ جائیں ۸۹۱ تو تم پر اس باب میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے بارے میں

أَنفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۳۴﴾

کچھ (کارروائی) کریں شرافت کے ساتھ ۸۹۲ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے ۸۹۳

دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص اعتنا برتا ہی نہیں، بلکہ بعض مذہبوں نے تو ستی وغیرہ کو جائز کر کے بیوہ کو زندہ ہی جلا دیا ہے، اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے، پوری طرح زندہ رہنے کا، سہاگنوں ہی کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے، اور یہ باب بھی جہاں تک دنیوی برکتوں کا تعلق ہے اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے۔

تَرَبُّص۔ انتظار کی اس مدت کا اصطلاحی نام عدت ہے۔

طلاق کی عدت پورے تین ماہ کی تھی، بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن یا کل ۱۳۰ دن تجویز ہوئی ہے، اس زمانہ میں بیوہ کے لئے بناؤ سنگار سب ناجائز ہے، بیوہ اگر حاملہ ہے تو اسکی عدت، وضع حمل ہے اور اس پر محدثین و فقہاء کا اجماع ہے۔

والاحادیث من النبی صلی اللہ علیہ وسلم متظاهرة بان التربص فی الوفاة انما هو بالاحداد وهو الامتناع من الزينة ولبس المصبوغ الجميل والطيب ونحوه وهذا قول جمهور العلماء (قرطبی)

۸۹۱ یعنی عدت بیوگی ختم ہو جائے۔

وهو عبارة عن انقضاء العدة (قرطبی) ای انقضت عدتهن (معالم۔ ابن کثیر)

۸۹۲ یعنی جب عدت ختم ہو گئی تو اب نکاح کی تجویز وغیرہ میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اس درمیان میں احکام ترک زینت وغیرہ کی تعمیل کرانا اعزا و اولیاء کے ذمہ ہے۔

وفی هذه الاٰیة دلیل ان للاولیاء منعهن من التبرج والتشوف للزوج فی زمان العدة۔ (قرطبی)

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ خطاب عام ہے اہل امت کو یعنی تم پر ایسی بات کے جائز رکھنے میں کوئی گناہ یا حرج نہیں۔

ایها الائمة والحکام (جصاص) هذا الخطاب للاولیاء (ابن العربی) ایها القادرون علیهن فهو الخطاب لجمیع المسلمین (روح)

اس طرز خطاب سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ کوئی شخص اگر خلاف شرع کام کرے تو دوسروں پر واجب ہو جاتا ہے کہ بہ شرط قدرت اُس کو روکیں، ورنہ یہ بھی گنہگار ہوں گے۔

فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنفُسِهِنَّ۔ یعنی نکاح اور متعلقات نکاح کی تجویزیں بھی جو شرعاً جائز ہوں۔

بِالْمَعْرُوفِ۔ جو بھی کارروائی ہو، قانون شریعت و آئین اخلاق کے باہر نہ ہو۔

ای بالوجه الذی یعرفه الشرع ولا ینکره (روح)

۸۹۳ (چنانچہ کوئی بات خلاف شریعت اگر خود کرو گے یا اُسے بے روک ٹوک ہونے دو گے تو اس کی ذمہ داری پاؤ گے) مشرک قوموں نے اپنے خداؤں سے علم کامل اور باخبری کی نفی کی ہے قرآن مجید نے ان صفات کے اثبات میں علاوہ دوسری مصلحتوں کے ایک پہلو رد شرک کا بھی رکھا ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ

اور تم پر کوئی گناہ اس میں نہیں کہ تم ان (زیر عدت) عورتوں کے پیغام نکاح کے باب میں کوئی بات اشارۃً کہو یا

فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ

(یہ ارادہ) اپنے دلوں ہی میں پوشیدہ رکھو ۸۹۴ اللہ کو تو علم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر ضرور کرو گے ۸۹۵ البتہ ان سے کوئی

سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ

وعدۂ خفیہ (بھی) نہ کرو ۸۹۶ مگر ہاں کوئی بات عزت و حرمت کے موافق (چاہو تو) کہہ دو ۸۹۷ اور عقد نکاح کا عزم اس وقت

النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ

تک نہ کرو جب تک کہ میعاد مقرر اپنے ختم کو نہ پہونچ جائے ۸۹۸

۸۹۴ دوران عدت میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کوئی مرد کسی بیوہ سے نکاح کا ارادہ اپنے دل میں قائم کرے، اور زبان پر نہ لائے یا اگر لائے بھی تو محض اشارۃً و کنایۃً، صراحت کے ساتھ البتہ اجازت اس زمانہ میں نہیں۔

۸۹۵ (سو محض تذکرہ کی حد تک رہنے کا کوئی مضائقہ نہیں)

یہ عین فطرت بشری ہے کہ جو عورت دل میں بس جاتی ہے، مرد ادھر ادھر گھوم گھما کر اس کا ذکر ضرور لاتا ہے، اور اس کا تذکرہ چھیڑنے کا بہانہ ڈھونڈھا کرتا ہے، آیت کا یہ ٹکڑا عین اسی فطرت بشری کا ترجمان ہے۔

۸۹۶ دوران عدت میں عورت سے وعدۂ نکاح کر لینا، علانیہ نہ سہی بطور راز کے بھی جائز نہیں، اور یہ ٹکڑا اسی حکم کی تاکید کے لئے ہے۔

سِرًّا۔ سِرّ کے عام معنی جو راز کے ہیں، ظاہر ہیں، جمہور مفسرین نے وہی قبول کئے ہیں، لیکن ایک مجازی معنی خود نکاح کے بھی ہیں، اور ابن سیدہ لغوی، فراء نحوی وغیرہما نے یہاں اس سے کنایۃً نکاح ہی کا سمجھا ہے۔

وکنی عن النکاح بالسر (راغب) ومن المجاز السر للنکاح وقال ابن السیدۃ وھو کنایۃ عنہ (تاج) وھو ان یصف احد ھم نفسہ للمرأۃ فی عدتھا فی النکاح وبہ فسر الفراء (تاج)

اور لغویوں اور نحویوں ہی کا نہیں، صحابہ، تابعین و ائمۂ فقہ کا بھی ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔

قیل معناہ نکاحا ... ھذا قول ابن عباس وابن جبیر ومالک واصحابہ والشعبی ومجاھد وعکرمۃ والسدی وجمھور اھل العلم۔ (قرطبی)

اس صورت میں آیت کا ترجمہ ہوگا "البتہ ان سے وعدۂ نکاح نہ کرو"۔

۸۹۷ اور وہ عزت و حرمت کے ساتھ بات کہنا یہی ہے کہ جو کچھ بھی کہنا ہو اشارۃً و کنایۃً ہی کہا جائے نہ کہ صراحۃً۔

۸۹۸ یعنی ختم عدت سے قبل عزم نکاح کر لینا بھی درست نہیں، چہ جائیکہ عقد نکاح یا وعدۂ نکاح۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

اور جانے رہو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اُسے جانتا ہے ۸۹۹؎ سو اس سے ڈرتے رہو اور جانے رہو کہ اللہ

غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ ع ۱۴

بخشنے والا ہے بڑا بُردبار ہے ۹۰۰؎ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اُن بیبیوں کو جنھیں تم نے نہ ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لئے

اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ

مہر مقرر کیا طلاق دے دو ۹۰۱؎ اور انھیں خرچ دے دو وسعت والے کے ذمہ اس کی

وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے کے ذمہ اس کی حیثیت کے لائق ۹۰۲؎ (یہ) خرچ شرافت کے موافق ہو (اور یہ) واجب ہے خوش معاملہ لوگوں کیلئے ۹۰۳؎

والمقصود منه المبالغة فى النهى عن النكاح فى زمان العدة فاذا ورد النهى عن العزم فلان يكون النهى متاكدًا عن الاقدام على المعزوم عليه۔ (کبیر)

عَزْم سے مُراد قصد مُصمّم و قطعی ہے۔

۸۹۹؎ سو جو اُمور ناجائز ہیں، ان کے ارتکاب کا عزم بھی اس کے علم میں رہتا ہے۔

اللہ اللہ! مسلم خاتون کی حفظِ عصمت اور اس کے جزئیات تک کا اہتمام کس درجہ منظور ہے!

۹۰۰؎ (اس لئے اگر اس باب میں غلطیاں کر چکے ہو تو اب بھی تلافی و استغفار کا پورا موقع باقی ہے)

غَفُوْرٌ۔ چنانچہ توبہ کے بعد نافرمانوں کو بھی معاف کر دیتا ہے۔

حَلِيْمٌ چنانچہ بہت دفعہ نافرمانوں کو سزا نہیں دیتا، بلکہ مہلت دے دیتا ہے۔

۹۰۱؎ یعنی کوئی باز پُرس نہیں مہر کے باب میں۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتوں میں شوہر کے ذمہ مہر واجب بھی نہیں۔

لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ۔ یہاں مَس سے مراد ہم بستری کی دونوں قسمیں ہیں، حقیقی اور واقعی، حکمی اور فقہی (یعنی خلوتِ صحیحہ) طلاق ہم بستری کے قبل بھی بالکل جائز ہے بغیر کسی مہر کی ذمہ داری کے، نکاح بلا تعیین مہر بھی صحیح رہتا ہے۔

۹۰۲؎ غرض یہ کہ طلاق ان کو رخصت کرو، تو خالی ہاتھ اور مفلس بنا کر نہیں، بلکہ اپنے حسب حیثیت کچھ دے دلا کر۔

مَتِّعُوْهُنَّ کا لفظ قرآن میں عام ہے اور مذاقِ بشری کی ہمہ گیری اس عموم کو چاہتی بھی ہے یعنی اس میں قید کسی تعین مقدار یا تعداد کی نہیں۔

معناه اعطوهن شيئا يكون متاعا لهن (قرطبی) اى ملكوهن ما يتمتعن به وذلك الشئ يسمى متعة (روح)

بلکہ امام مالکؒ نے تو صاف صاف ہر قید اُڑا دی ہے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ

اور اگر تم نے انھیں طلاق دے دی ہے قبل اس کے کہ انھیں ہاتھ لگایا ہو، لیکن ان کے لئے کچھ مہر مقرر

فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ

کر چکے ہو تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہے اُس کا آدھا واجب ہے، بجز اس صورت کے کہ (یا تو) وہ عورتیں خود

بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ط

معاف کردیں یا وہ (اپنا حق) معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے ۹۰۴

قال مالك ليس للمتعة عند نا حد معروف فى قليلها وكثيرها (قرطبى)

اور متعہ کا اطلاق لباس یا لباس کے ایک جوڑے پر محدود نہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی کے ترجمہ میں ہے "بہرہ دہید ایں چنیں مطلقات را" اور شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمہ میں ہے "اور فائدہ دو اُن کو" اور شاہ عبدالقادر کے ترجمہ میں "اور ان کو خرچ دو" البتہ بعض صحابہ سے کچھ اندازے منقول ہیں۔

متعة الطلاق اعلاها الخادم ودون ذلك الورق ودون ذلك الكسوة (روح عن ابن عباسؓ)

ادنى مايكون من المتعة ثلاثون درهما (روح عن ابن عمرؓ)

فقہاء حنفیہ نے عموماً تین کپڑوں کا جوڑا مراد لیا ہے لیکن یہ جوڑا بھی یقیناً حسب رواج ملک و قوم ہی ہوگا۔

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ۔ قَدَرُهٗ خود اسی فقرہ سے وجوب متاع پر دلالت سمجھی گئی ہے۔

دليل على وجوب المتعة ۔ (قرطبى)

۹۰۳ اور خوش معاملہ تو سارے مسلمانوں کو ہونا چاہئے، اس لئے مُراد ہیں سارے مسلمان، لفظ مُحسنین لاکر اُن کے اس وصف کو نمایاں کردیا ہے۔

والاحسان انما على وجه التاكيد (جصاص) اى على المسلمين (مدارك) حقا تاكيد للوجوب ومعنى على المحسنين وعلى المتقين اى على المؤمنين ۔ (قرطبى)

طلاق ان کو کچھ مال دے کر ہی رخصت کرنا چاہئے، اور اس وجوب کے قائل متعدد صحابہ و تابعین ہوئے ہیں۔

وحمله ابن عمر وعلى بن ابى طالب والحسن بن ابى الحسن وسعيد بن جبير وابو قلابة والزهرى وقتادة والضحاك بن مزاحم على الوجوب (قرطبى) فهذه التى دلت هذه الأية الكريمة على وجوب متعتها وهذا قول ابن عمر ومجاهد (ابن كثير) وفى هذا دليل على وجوب المتعة مع الامر بها (قرطبى)

بِالْمَعْرُوْفِ۔ یعنی ایسے شریفانہ عُرف کے مطابق جو شریعت کو بھی تسلیم ہو۔

اى بما عرف فى الشرع من الاقتصاد ۔ (قرطبى)

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۭ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۭ

اور اگر تم (اپنا حق) معاف کردو تو یہ بہت ہی قریب تقویٰ ہے ۹۰۵ اور آپس میں لطف و احسان کو نظرانداز نہ کرو ۹۰۶

۹۰۴ طلاق کی ایک صورت وہ تھی جو ابھی اوپر بیان ہو چکی یعنی نہ مہر طے ہوا تھا اور نہ ابھی خلوت ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی، دوسری صورت اب بیان ہو رہی ہے کہ مہر تو متعین ہو چکا تھا لیکن خلوت نہیں ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی، عام قاعدہ ایسے موقع کے لئے یہ ہے کہ مہر مقرر کا نصف شوہر کے ذمہ واجب الادا ہوگا لیکن دو صورتیں اس حکم عام سے استثناء کی ہیں، ایک یہ کہ بیوی اپنے حق سے تمام تر دستبردار ہو جائے اور نصف مہر بھی نہ لے، اور دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے یعنی جو نصف مہر اُسے رکھ لینے کا حق تھا اُسے بھی وہ نہ رکھے اور بجائے نصف کے پورا مہر ادا کر دے۔

يَّعْفُوْنَ۔ عورت اپنا حق معاف کر دے، اور اُس کا حق ہے وہی مہر مُعیّن کا نصف گویا عورت مہر تمام تر چھوڑ دے۔

نِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ۔ تعدادِ مہر اگر معیّن تھی جب تو اس کا نصف ظاہر ہے، اور اگر تعداد معیّن نہ تھی تو فیصلہ مہرِ مثل پر ہو گا۔ (یعنی خاندانی مہر پر)۔

الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ یعنی جو نکاح کی گرہ کو توڑے اور جوڑے رکھنے کا اختیار رکھتا ہے، مُراد شوہر ہے، یہ الفاظ اس پر ناطق ہیں کہ معاہدہ نکاح میں شریکِ غالب کی حیثیت شوہر ہی رکھتا ہے۔

وھوالزوج (معالم)

۹۰۵ قانون اور ضابطہ ابھی ابھی بیان ہو چکا ہے کہ شوہر طلاق کی اس صورت میں نصف مہر روک سکتا ہے، اب مکارم اخلاق کے افضل و اعلیٰ مقام کی طرف رہنمائی کر دی گئی کہ حق وصول کرنے سے کہیں بہتر و برتر اس حق کا معاف کر دینا ہے جائز و برتر، مباح و افضل، ضابطہ و اخلاقِ فاضلہ کا یہ مسلسل امتزاج قرآن کے معنوی معجزات میں سے ہے۔

۹۰۶ چنانچہ طلاق کے موقع پر بھی، جو تعلقات کی بقا کا نہیں، ان کے اختتام و انقطاع کے اعلان کا نام ہے، باہمی حسنِ سلوک، مروّت، رعایت سے نہ چوکو۔

آیت سے صاف اشارہ ادھر نکل رہا ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آجانے سے صحبتِ قدیم و محبتِ سابق کے حقوق زائل نہیں ہو جاتے، بلکہ حالتِ طیش و ناگواری میں بھی لحاظ تقویٰ اور حسنِ اخلاق اور عفو و احسان کا برابر رکھنا چاہئے۔

وَلَا تَنْسَوُا۔ نسیان یہاں بھول کے معنی میں نہیں کہ وہ تو غیر اختیاری ہے، بلکہ ترک کرنے اور نظرانداز کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ اہل تفسیر اور اہل لغت دونوں نے کیا ہے۔

قال ابو محمد والنسیان ھھنا الترک (ابن قتیبہ)

المراد منہ الترک فقال لا تترکوا الفضل فی ما بینکم (کبیر) ای لا تقصد وا الترک والاھمال (اقرب) واکثر اھل اللغۃ فسروہ بالترک وھو المشھور القدیم (تاج)

اور نسیان قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی موقع ہجو و ذم میں آگیا ہے وہاں مُراد اسی نسیانِ اختیاری یا تغافل شعاری سے ہے۔

وکل نسیان من الانسان ذمہ اللہ تعالیٰ بہ فھو ما کان اصلہ عن تعمد وما عذر فیہ (راغب)

اور خود نسیان یعنی حافظہ سے کسی چیز کے نکل جانے کی تین قسمیں کی گئی ہیں، ایک ضعفِ قلب سے، دوسرے غفلت سے، تیسرے قصد و ارادہ سے۔

إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۲۳۷﴾ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ

تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ یقیناً اس کا خوب دیکھنے والا ہے۹۰۷ (سب ہی) نمازوں کی پابندی رکھو اور (خصوصاً)

الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ ﴿۲۳۸﴾ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۖ

درمیانی نماز کی۹۰۸ اور اللہ کے سامنے عاجزوں (کی طرح) کھڑے رہا کرو۹۰۹ لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو تو تم پیدل ہی (پڑھ لیا کرو)

فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۹﴾

۹۱۲
یا سواری پر۹۱۰ پھر جب تم امن میں آجاؤ تو اللہ کو یاد کیا کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے جس کو تم جانتے (بھی) نہ تھے

النسیان ترک الانسان ضبط ما استودع إمّا لضعف قلبه وامّا عن غفلة وامّا عن قصد حتی ینحذف عن القلب ذکرہ (راغب)

۹۰۷ سو اس کے ہاں تمہاری کوئی سی نیکی بھی، کسی درجہ اور کسی موقع کی ہو، رائیگاں نہ جائے گی، ایک بار پھر یہ خیال میں لے آیا جائے کہ معاملات اور قانونی ضابطوں میں بھی شریعت کے احکام کتنے تاکیدی ہیں، اور قرآن ان کی اہمیت کس کس طرح جتلاتا جاتا ہے۔

۹۰۸ اوپر سے ذکر برابر بیویوں کے حقوق کا چلا آرہا تھا اور آگے پھر یہی ذکر چلے گا، درمیان میں احکام نماز سے متعلق آگئے، یہیں سے اس حقیقت پر ایک بار اور روشنی پڑ رہی ہے کہ اسلام میں معاشرت، معاملت، قانون، اخلاق کے مسائل، عبادات سے الگ نہیں، اور نظامِ شریعت میں خالق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق دوش بدوش چل رہے ہیں۔

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ۔ محققین نے محافظتِ صلوٰۃ کے تین درجے قرار دیئے ہیں، ادنیٰ یہ کہ نماز وقت پر پڑھی جائے اور فرائض و واجبات ترک نہ کئے جائیں، اوسط یہ کہ جسم ہر طرح طہارتِ ظاہری سے آراستہ ہو، طبیعت اکل حلال کی خوگر ہو، دل میں خشوع و خضوع ہو، سنن و مستحبات کی پوری رعایت رہے، اعلیٰ یہ کہ نماز گویا حق تعالیٰ کے مواجہہ میں ہو رہی ہے، ایسا حضور قلب و استغراق رہے۔

حَافِظُوا۔ محافظت سے مراد پابندی اور ہمیشگی ہوتی ہے۔

والمحافظة هی المداومة علی الشیٔ والمواظبة علیها (قرطبی) یأمر تعالیٰ بالمحافظة علی الصلوات فی اوقاتها وحفظ حدودها وادائها فی اوقاتها۔ (ابن کثیر)

الصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ۔ اس درمیانی نماز سے کیا مراد ہے؟ اکثر ائمہ تفاسیر نے نمازِ عصر مراد لی ہے، اور یہی معنی ابن جریر میں حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابوہریرہؓ صحابیوں اور قتادہ و ضحاک تابعین اور امام ابوحنیفہؒ و امام نخعیؒ سے مروی ہیں، اگرچہ ابن جریر ہی میں دوسرے قول نماز ظہر اور نماز مغرب اور نماز فجر کے بھی اسی پایہ کے حضرات سے منقول ہیں، لیکن ابن کثیر نے اجماع نقل کیا ہے، اسی عصر والے قول پر۔

قیل انها صلوٰۃ العصر قال الترمذی والبغوی وهو قول اکثر علماء الصحابة وقال القاضی الماوردی هو قول جمهور التابعین۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیبیاں چھوڑ جائیں (اُن پر لازم ہے) اپنی بیبیوں کے حق میں

لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ

نفع اٹھانے کی وصیت (کر جانے) کی کہ وہ ایک سال تک (گھر سے) نکالی نہ جائیں ۹۱۲ھ

بعض نے لفظی پہلو پر زور دے کر یہ تفسیر کی ہے کہ ہر نماز چونکہ اپنی جگہ پر عبادات و حسنات کا درجۂ متوسط ہے اور پھر ہر نماز کے ادھر اُدھر کچھ نمازیں بھی ہوتی ہیں، نماز وسطیٰ کا اطلاق ہر نماز پر ہو سکتا ہے، اور اس سے کسی خاص وقت کی نماز مقصود نہیں۔ معاذ بن جبلؓ نے اسے ہر نماز سے متعلق سمجھا ہے، اور نافع ابن عمرؓ نے اسے غیر معیّن چھوڑ دیا ہے، (قرطبی) ابن کثیر میں اور اور اقوال بھی نقل ہوئے ہیں۔

۹۰۹ھ (حالتِ نماز میں)

قَانِتِيْنَ۔ لفظ قنوت یہاں بہت جامع ہے، اور حاوی ہے، ذکر اور دعا اور خشوع و خضوع پر۔ "عاجزی" سے ترجمہ میں اس کا صرف ایک ہی پہلو آیا تا ہے۔

قال ابو محمد ولا ادري اصل هذا الحرف الا الطاعة لان جميع هذه الخصال من الصلوة والقيام فيها والدعاء وغير ذلك يكون عنها (ابن قتيبه) القنوت لزوم الطاعة مع الخضوع وفسر بكل واحد منهما (راغب)

۹۱۰ھ (جس طرح بھی بن پڑے اور جس حد تک حالات اجازت دیں)

فَاِنْ خِفْتُمْ۔ یعنی اگر عام قاعدہ کے مطابق نماز با جماعت میں کسی دشمن کے حملہ کا خوف ہو۔

اسلام کی یہ روزانہ پنج وقتہ پریڈ یا دربار الٰہی میں حاضری اس درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ بالکل معاف عین حالتِ جنگ میں بھی نہیں ہوتی، محافظتِ صلوٰۃ کا حکم بہر حال قطعی اور دائمی ہے، ترکِ نماز کی اجازت اس خطرہ کے حال میں نہیں، البتہ رعایتِ ماحول کی پوری گنجائش دوسرے موقعوں کی طرح اس محل میں بھی رکھ دی گئی ہے۔

نمازِ خوف کی تفصیلات کتبِ فقہ میں ملیں گی۔

بعض محققین نے یہ بھی تصریح کر دی ہے کہ نمازِ خوف کی اجازت صرف فوجی دشمن ہی سے خطرے کے وقت تک محدود نہیں، بلکہ دوسرے سارے خطرات پر بھی حاوی ہے۔

وهذه هي صلاة الفذ الذي قد ضايقه الخوف على نفسه في حال المسايفة او من سبع يطلبه او من عدو يتبعه او سيل يحمله وبالجملة فكل امر يخاف على روحه فهو مبيح ما تضمنته هذه الآية (قرطبي) من عدو وغيره (روح)

۹۱۱ھ یعنی اب نماز عام قاعدوں کے موافق و ماتحت ادا کرو۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ۔ یعنی جب دشمن کی طرف سے اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے۔

۹۱۲ھ یہ وصیّت کا حکم اُس وقت تھا جب میراث کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے، جب میراث کے مستقل

فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِي مَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ

لیکن اگر (خود) نکل جائیں تو کوئی گناہ تم پر نہیں اس باب میں جسے وہ (بیبیاں) اپنے باب میں شرافت کے

مَّعْرُوفٍ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ ۖ

ساتھ کریں ۹۱۳ اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے ۹۱۴ اور طلاق والیوں کے حق میں بھی نفع پہونچانا دستور کے موافق مقرر ہے ۹۱۵

احکام نازل ہوگئے اور شوہر کے ترکہ میں ایک مستقل حصہ بیوہ کا بھی مقرر ہوگیا، تو ظاہر ہے کہ اب حکمِ وصیت پر عمل کا کوئی محل باقی نہ رہا — اسی کو مفسرین اپنی اصطلاح میں نسخ سے تعبیر کرتے ہیں — اور اسی کو اُردو خوانوں نے اُردو کی منسوخی کے معنی میں لے کر اس پر اعتراضات شروع کر دیے ہیں۔

اُس وقت یعنی احکامِ میراث کے نزول سے قبل شریعت نے بیوہ عورتوں کے لئے حسبِ ذیل رعایتیں رکھی تھیں:

(۱) وہ اگر شوہر ہی کے گھر رہنا چاہیں تو ایک سال تک انھیں کوئی بے دخل نہیں کر سکے گا۔

(۲) انھیں کھانا کپڑا بھی اس مدت تک شوہر ہی کے ترکہ سے ملتا رہے گا۔

(۳) وہ خود ہی اگر اپنی کسی مصلحت سے اس گھر میں رہنا نہ چاہیں تو بعد ختم عدت ان کے لئے یہ بالکل جائز تھا، اور دوسرے حقوق کی طرح اس حق سے بھی دستبرداری کا انھیں حق حاصل تھا۔

مَتَاعًا۔ یہ نفع اٹھانا، کھانے اور کپڑے اور سکونتِ مکان کے متعلق ہوگا۔

المتاع عام شامل للانفاق والاسکان جمیعا۔ (روح)

بیوہ غریب ظہورِ اسلام کے وقت یوں بھی ہر مذہب میں کس مپرسی میں پڑی ہوئی تھی اور عرب جاہلیت میں تو کوئی اس کی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا، اسلام ہی نے آکر دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیوہ کی عزت اور اس کے حقوق کی نصرت کی — مشرکانہ مذہبوں میں تو بیوگی اور نحوست مترادف تھیں، اور بیوہ کو گھر بھر کی تحقیر و طعن کا ہدف بننا پڑتا تھا۔

**۹۱۳** مثلاً یہی نکاح یا نکاح کی بات چیت۔

مِنْ مَّعْرُوفٍ کی قید نے اسے واضح کر دیا کہ وہ کارروائی نہ کسی ضابطۂ شریعت کے خلاف ہوگی (مثلاً قانونِ عدت کی خلاف ورزی) اور نہ کسی آئینِ اخلاق کے منافی۔

**۹۱۴** آیاتِ احکام کا خاتمہ عموماً ایسی ہی تہدیدی یا دہانیوں پر ہوتا ہے۔

عَزِيزٌ۔ یاد دلا دیا کہ وہ بڑا قوت والا ہے، سو اس کے حکم کی خلاف ورزی کیسی زبردست نادانی ہے۔

حَكِيمٌ۔ یاد دلا دیا کہ اس کے احکام سارے کے سارے قریب و بعید، جلی و خفی مصالحِ بشری ہی کے جامع ہوتے ہیں۔

**۹۱۵** (کسی نہ کسی درجہ میں)

مطلب یہ ہے کہ جس عورت کو طلاق دی جائے، یہ نہ ہو کہ اُسے ننگا بُوچا کر کے بھوکا پیاسا اُسی وقت گھر سے نکال دیا جائے، بلکہ ایک مدت تک اس کی آسائش کا خیال اور اُس کی ضرورتوں کی کفالت شوہر کے ذمہ ہے، فقہا نے حدیث و سنت کی روشنی میں ایک سہ ماہی کی مدت مقرر کی ہے کہ اتنی مدت تک کھانے پہننے اور رہنے سہنے کا انتظام شوہر پر واجب ہے۔

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

(یہ) پرہیزگاروں پر واجب ہے ۹۱۶ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر اپنے احکام بیان کرتا ہے تا بد کہ تم

تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ ع ۱۵

سمجھو ۹۱۷ کیا تجھے خبر نہیں ۹۱۸ اُن لوگوں کی کہ جو اپنے گھروں سے نکل گئے تھے موت سے بچنے

اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ

کے لئے، اور وہ ہزاروں ہی تھے ۹۱۹ تو اللہ نے اُن سے کہا کہ مر جاؤ ۹۲۰

مُطلقہ پر اگر تینوں طلاقیں ابھی نہیں پڑی ہیں جب تو یہ حکم متفق علیہ ہے، اور اگر پڑ چکی ہیں تو حنفیہ کے ہاں جب بھی یہی حکم ہے۔

۹۱۶ عَلَى الْمُتَّقِيْنَ۔ یعنی مسلمانوں پر کہ اس درجہ میں پرہیزگار ہر مسلمان ہوتا ہے۔

ای متقی الشرک (بحر) علی کل من کان متقیا عن الکفر (کبیر) بمعنی المؤمنین متقین الشرک (معالم)

۹۱۷ (اور سمجھ کر ان پر عمل کرو)

مفسر تھانویؒ نے یہاں یہ خوب لکھا ہے کہ ان احکام طلاق وغیرہ میں اِتَّقُوا اللّٰهَ اور حُدُوْدُ اللّٰهِ اور سَمِيْعٌ اور عَلِيْمٌ اور عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ اور بَصِيْرٌ اور خَبِيْرٌ اور هُمُ الظّٰلِمُوْنَ اور فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وغیرہ کا اس کثرت سے آنا جو سب مخالفت پر وعیدیں ہیں، اس امر پر دلیل قطعی ہیں کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں، محض مشورہ کے طور پر نہیں ہیں کہ اُن میں ترمیم و تبدیل کا ہمیں حق و اختیار حاصل ہو۔

۹۱۸ (اے مخاطب)

اَلَمْ تَرَ عربی میں یہ طرزِ خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم اور معروف واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے، رویت سے ہمیشہ چشم بصارت ہی سے دیکھنا مراد نہیں ہوتا، بلکہ وہم و تخیل اور غور و فکر اور عقل کی راہ سے بھی مطالعہ و مشاہدہ مراد ہوتا ہے اور جب اس فعل کا صلہ الی کے ساتھ آتا ہے تو مقصود کوئی اہم نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔

واذا عدی رأیت بالی اقتضی معنی النظر المؤدی الی الاعتبار (راغب) هذه رؤیة القلب بمعنی الم تعلم (قرطبی) هذا الکلام جری مجری المثل فی معنی التعجب (کشاف)

۹۱۹ (عین موقع جہاد پر)

حَذَرَ الْمَوْتِ۔ یہ تصریح ہے اس کی کہ اتنی بڑی تعداد میں اپنے گھروں سے باہر نکل جانا محض امر اتفاقی نہ تھا، موت کے خوف سے تھا، ذکر کسی قدیم قوم کا ہے، اور اشارہ کسی ایسے واقعہ کی جانب ہے، جو مخاطبینِ اوّل اہلِ عرب کے لئے معروف و متعارف تھا۔ ترکیب میں حَذَرَ الْمَوْتِ کو بِحَذَرِ الْمَوْتِ کے مُرادف سمجھا گیا ہے۔

مفسرین نے مختلف قوموں اور مقاموں کے نام لئے ہیں، ممکن ہے ان ہی میں سے کوئی صحیح ہو، ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کوئی قوم و مقام ہو، پوری تحقیق انشاء اللہ مستقبل میں قرآنیات کا کوئی متعلم کرے رہے گا، کچھ کام آخر آئندہ کے مفسرین و محققین کے لئے بھی تو اٹھا رہے

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ

پھر اس نے انھیں جلا دیا ۹۲۱ بے شک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے ۹۲۲ البتہ اکثر

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

انسان ہی شکر ادا نہیں کرتے ۹۲۳

اُلُوْفٌ۔ الف کی جمع کثرت ہے، اور اس سے مراد کم سے کم دس ہزار کی جماعت ہوتی ہے۔

فیہ دلیل علی الالوف الکثیرۃ (کشاف) وھو جمع الکثرۃ ولا یقال فی عشرۃ فما دونھا اُلوف (قرطبی) وکانوا فوق عشرۃ آلاف علی ما استظھرہ الاکثر۔ (روح)

بہرحال قرآن کا جو اصل مقصد موعظت و تذکیر ہے، وہ قوم و مقام کے ابہام و عدم تعین کے باوجود بھی حاصل ہے۔

عہد عتیق کی کتاب حزقی ایل (۳۷: ۱-۱۰) میں ایک روایت بصورت کشف و رؤیا اس سے ملتی جلتی موجود ہے۔

سید رشید رضا مصری صاحب تفسیر المنار نے یہاں ایک بالکل ہی دوسرا پہلو اختیار کیا ہے، اور آیت میں موت (مُوْتُوْا) اور تجدید حیات (فَاَحْيَاهُمْ) دونوں کو محض معنوی و مجازی قرار دیا ہے کہ قوم کی قوم اپنی آزادی و خود مختاری کو کھو کر اور دوسروں کی غلامی میں آکر مردہ ہو گئی تھی، اور پھر اللہ نے اسے نئے سرے سے زندگی یا آزادی بخشی۔

موتوا۔ ای اماتھم بامکان العدو منھم فالامر امر التکوین (المنار) ثم احیاھم وانما یکون الاحیاء بعد الموت والکلام فی القوم لا فی افراد..... ومعنی حیاتھم ہذا ان عوا الاستقلال الیھم (المنار) ومعنی حیاۃ الامم وموتھا فی عرف الناس جمیعھم معروف (المنار)

اور موت و حیات کے اس مجازی معنی میں یہ استناد خود قرآن مجید ہی کی دوسری آیتوں سے کیا ہے مثلاً اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال) اومن کان مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ (الانعام)

بہرحال گنجائش اس تفسیر و تاویل کی بھی ہے، گو بہ تکلف۔

۹۲۰ (وبا سے، یا کسی اور طریق سے، چنانچہ وہ سب مر گئے۔)

یعنی وطن سے نکل کھڑے ہوئے جان بچانے کو اور حکم جہاد کی تعمیل سے جی چرانے ہوئے لیکن یہ تدبیر کچھ بھی کام نہ آئی، اور الٹے موت کا شکار ہو کر رہے۔

فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا۔ مقصود محض اس قول کا نقل کرنا نہیں، مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب یہ ارادہ کر لیا، تو کوئی امر اس میں مانع نہ ہو سکا، اور عمل ہو کر رہا، عربی میں یہ اسلوب بیان عام ہے۔

المراد انہ تعالیٰ متی اراد ذلک وقع من غیر منع وتاخیر ومثل ھذا عرف مشھور فی اللغۃ۔ (کبیر)

۹۲۱ (اور انھیں مشاہدہ کرا دیا کہ موت و زندگی کا سر رشتہ کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے عقل و تدبیر انسانی کے ہاتھ میں نہیں، اور اس لئے جہاد یا دوسرے احکام شریعت کی تعمیل سے جی چرانا انتہائی سخافت و نادانی ہے) فقہاء، مفسرین نے یہاں طاعون سے فرار کی بحث چھیڑ دی ہے اور فرمان نبوی نقل کیا ہے کہ جس سرزمین پر طاعون ہو،

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور اللہ کی راہ میں قتال کرو ۹۲۴ اور جانتے رہو کہ اللہ بڑا سننے والا ہے، خوب جاننے والا ہے ۹۲۵

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا

کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرضہ قرض دے ۹۲۶

وہاں سے بھاگو نہیں، اور جہاں ہو وہاں جاؤ نہیں، اس پر ایک عقلی اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طاعون زدہ مقام میں داخل ہونا اور طاعون زدہ مقام سے نہ ہٹنا، یہ دونوں عملاً متضاد ہدایتیں ہوئیں، اگر طاعون بچنے کی چیز ہے تو وہاں سے ہٹنے کا بھی حکم ملنا چاہئے، اور اگر بچنے کی چیز نہیں، تو اس شہر میں پہونچ جانے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے!

اصل یہ ہے کہ وبا زدہ مقام سے بھاگنے اور ہٹنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایک کو اجازت ملی تو سب ہی بھاگنا شروع کریں گے، اور شہر خالی ہو جائے گا، اس بے تحاشا بھگدڑ (PANIC) سے آبادی کو جن مالی، معاشی، تمدنی، اخلاقی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا — وہ بالکل ظاہر ہیں، اور بہ کثرت تجربہ و مشاہدہ میں بھی آچکے ہیں، پھر ایک طرف یہ عادت اگر ہمت، ثباتِ قلب، شجاعت اور باہمی ہمدردی کے منافی ہے تو دوسری طرف اسبابِ ظاہری پر ضرورت سے زیادہ تکیہ و اعتماد کی دلیل، اور توکل، اعتماد علی اللہ کے منافی، اور ایک مذہبی قوم کے بالکل غیر شایاں ہے لیکن جہاں وبا ہے اور موت کا بازار دھڑا دھڑ گرم ہے، وہاں بے دھڑک داخل ہو جانا اور احتیاط نہ برتنا، ایک طرف سلسلۂ اسبابِ ظاہری کو بالکل نظر انداز کر دینا ہے، اور دوسری طرف انسان میں جو درجۂ خوف و اندیشۂ طبعی کا رکھ دیا گیا ہے اس کے مقتضے کو پامال کرنا ہے، ان متضاد پہلوؤں کے درمیان اعتدال و سلامتی کی راہ ڈھونڈھ نکالنا اسلام ہی جیسے حکیمانہ مذہب کا کام تھا، اس نے عقلی اور طبعی دونوں پہلوؤں کی رعایت رکھ کر معتدل و عادلانہ حکم دیا کہ جہاں طاعون ہو وہاں نہ خواہ مخواہ جاؤ، نہ خواہ مخواہ وہاں سے نکل بھاگو۔

۹۲۲ (چنانچہ انھیں کے فائدہ والے احکام انھیں دیتا رہتا ہے)

بندے کے دل میں اللہ سے متعلق تمام تر محبت ہی کے جذبات پیدا ہونے چاہئیں، ایسی آیتیں اسی کیفیت کے استحضار کے لئے ہیں۔

۹۲۳ (بلکہ اُلٹے احکام الٰہی کی مخالفت میں لگے رہتے ہیں)

حکمِ قتال معاً آگے آتا ہے، اس کے قبل ایسی حکایت بیان کرنا جس سے قلوب میں بے خوفی اور اللہ پر اعتماد پیدا ہو، عین تقاضائے حکمت ہے۔

۹۲۴ (اے اُمّتِ اسلامی)

قَاتِلُوْا۔ وَاقْتُلُوْا کے بجائے صیغۂ مفاعلۃ (قَاتِلُوْا) کے لانے سے اشارہ خود بخود ہو گیا کہ قتل کی ابتداء مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے مسلمان تو صرف جوابی قتال کریں گے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ کی قید نے واضح کر دیا کہ قتال اپنے نفس کی خاطر نہیں، جاہ و مال کی خاطر نہیں، صرف اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کے لئے ہوگا۔ اسلامی جہاد اپنی اس نوعیتِ خصوصی کے لحاظ سے محاربات عالم کی تاریخ میں ایک بے نظیر مقام رکھتا ہے۔

اس تمہیدی حکایت کے بعد کہ موت و زیست سب کا آخری سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے، اب حکم ملتا ہے کہ اسی کے

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقۡبِضُ وَيَبۡصُۜطُ ۖ وَاِلَيۡهِ

پھر اللہ اُسے بڑھا کر اُس کے لئے کئی گُنا کر دے ۹۲۷ اور اللہ ہی تنگی بھی پیدا کرتا ہے اور فراخی بھی ۹۲۸ اور تم سب

تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ۘ

وقف لازم

اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۹۲۹ کیا تجھے خبر نہیں موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی ۹۳۰

حکم سے، اُسی کے دین و آئین کی خدمت و نصرت کے لئے، جہاد و قتال میں مشغول ہو جاؤ۔ حکم کی مخاطب اُمت بہ حیثیت جماعت ہے، افرادِ اُمت نہیں کہ جس فردِ اُمت کا جب جی چاہے تلوار اُٹھا کر اُسے چلانا شروع کر دے۔

۹۲۵ (اس لئے اُس پر ہر ایک کا ظاہر بھی عیاں ہے اور باطن بھی)

سَمِيۡعٌ۔ وہ خوب سُن رہا ہے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی باتوں کو۔

عَلِيۡمٌ۔ وہ خوب جانتا ہے جہاد کرنے والوں اور نہ کرنے والوں دونوں کی نیتوں کو۔

۹۲۶ یعنی اللہ کی راہ میں اخلاص کے ساتھ خرچ کرے۔

ای ینفق فی طاعۃ اللّٰہ (معالم)

جہاد و قتال کا حکم ابھی ملا ہے، قدرۃً سامانِ جنگ کے لئے اُمتِ اسلامی کو بڑے سرمایہ کی ضرورت ہو گی، اس لئے پہلے ہی تمبر برامرائے ملّت کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔

قَرۡضًا حَسَنًا۔ اصطلاحِ قرآنی میں اس لفظ سے مُراد ہر وہ رقم ہے جو دین کی کسی مد میں خرچ ہو سکے، یہاں مراد مصارفِ جہاد ہیں۔

اس ملّی چندہ کو، قرض اور پھر قرض حسنہ سے تعبیر کرنا عین محاورۂ عرب کے مطابق ہے کہ اہلِ عرب ہر اچھے معاوضہ والے عمل کو اچھے قرض اور ہر بُرے معاوضہ والے عمل کو بُرے قرض سے تعبیر کرتے تھے۔

والعرب تقول لکل من فعل الیہ خیرا قد احسنت قرضی وقد اقرضتنی قرضا حسنا (تاج) قال الزجاج القرض ھو کل ما یفعل لیجازیٰ علیہ تقول العرب لک عندی قرضٌ حسنٌ وسیّئٌ (کبیر)

عرب ایک مشہور تجارت پیشہ قوم تھے، قرض، ربح، تجارۃ، بیع، شراء وغیرہ کے الفاظ اگر ان کی زبان کے جُزو بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ایک بد دین، اُردو خواں جاہل، قرآن مجید میں "قَرۡض" کا لفظ دیکھ اور اُسے اُردو کے قرضہ پر قیاس کر تمسخر کی راہ سے بولا کہ خدا بھی محتاج ہو گیا ہے، جو اُسے بندوں سے اُدھار مانگنے کی ضرورت پڑی! — جہلِ مرکب بھی انسان کے لئے کیسی لعنت ہے! — ع مردم اندر حسرتِ فہم درست!

۹۲۷ (یعنی اصل استحقاق سے کہیں بڑھا چڑھا کر)

يُضٰعِفَهٗ۔ اس کو، یعنی اس کے اجر و ثواب کو۔

۹۲۸ (سو اس کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرنے سے کیوں رُکو، کیوں گھبراؤ۔)

إِذْ قَالُوا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

جب کہ ان لوگوں نے اپنے نبی سے کہا ۹۳۱ کہ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں قتال کریں ۹۳۲

صاف بتا دیا کہ معاشیات کے سارے قوانین اللہ ہی کے مٹھی میں ہیں، اس کی راہ میں خرچ کرنے سے یہ نہ سمجھو کہ مفلس ہو جاؤ گے۔ قرآن جہاں اسباب ظاہری، مادی، قریبی کی رعایت پوری پوری کرتا ہے، وہیں یہ بھی قدم قدم پر یاد دلاتا جاتا ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں مُسبّب الاسباب اور احکم الحاکمین حق تعالیٰ ہی ہے۔

۹۲۹ (اور وہی دین کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو جزا دے گا اور نہ خرچ کرنے والوں کو سزا)

وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ میں قرآن مجید دُہرے پہلو سامنے رکھتا ہے، ایک تو یہ کہ مراجعت کو یقینی سمجھو، یہ نہ ہوگا کہ سرے سے معدوم ہو جاؤ گے، ایک دوسرے عالم میں ایجابی و اثباتی طور پر پہونچنا ہے، دوسرے یہ کہ یہ مراجعت اللہ ہی کی طرف ہوگی، کسی اور کی طرف نہیں، جیسا کہ دوسرے مذہبوں میں غلط طور پر فرض کر لیا گیا ہے۔

۹۳۰ (اے مخاطب)

أَلَمْ تَرَ کی معنویت پر ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۱۸

الْمَلَإِ۔ ملاء اسم جمع ہے جیسے قوم یا رہط مراد مطلق جماعت نہیں بلکہ اہل الرائے یا اہل حل وعقد کی جماعت ہے۔

الْمَلَأُ جماعة يجتمعون على رأي (راغب) الملاء من القوم وجوههم واشرافهم۔ (معالم۔ روح)

الملاء الاشراف من الناس كأنهم ممتلئون شرفا (قرطبی)

توریت میں اس موقع پر "اسرائیلی بزرگ" ہے۔

مِنْ بَعْدِ مُوسَىٰ۔ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوئی تین صدی بعد اور حضرت داؤد علیہ السلام سے کچھ ہی قبل کے زمانہ کا ہے، سنہ مسیحی کے آغاز میں ابھی کوئی ہزار گیارہ سو سال کی مدت باقی تھی۔

۹۳۱ مراد حضرت شموئیل (۱۱۰۰ ق۔ م تا ۱۰۲۰ ق م) ہیں، ملک شام قدیم میں ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا، اس کے شہر رامہ میں آپ رہتے تھے۔

۹۳۲ (اور اس امیر کی ماتحتی میں ہم سب منظم ہو کر دشمنوں سے جنگ کریں۔)

اسرائیلی اُس وقت خاص طور پر دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے اور لڑائی میں اُن سے مغلوب و عاجز آچکے تھے اور توریت میں اس کی بھی تصریح ہے کہ حضرت شموئیل نبی اُس وقت بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کے صاحبزادوں میں امارت و سرداری کی کوئی صلاحیت نہ تھی۔

مَلِكًا۔ عربی میں مَلِك کا لفظ بہت وسیع ہے، ہر صاحب قوت و اقتدار جو اپنے احکام و قوانین نافذ کر سکے مَلِك ہے۔

الْمَلِكُ هو المتصرف بالامر والنهي في الجمهور (راغب) من تولى السلطنة بالاستعلاء على امة او قبيلة او بلاد مطلقة او مقيدة قيل الملك (اقرب)

اور یہاں مَلِك سے مراد امیر جیش یا سالار لشکر لی گئی ہے اور یہی سیاق کے مطابق ہے۔

بيّن لنا ملك الجيش (ابن عباس) اى انهض لنا من تصدر عنه تدبير الحرب ونَنتهي الى امره (بحر)

قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ أَلَّا تُقَاتِلُوا ۖ قَالُوا

(نبی نے) کہا کہیں ایسا تو نہیں کہ اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو تم قتال نہ کرو ۹۳۳ وہ بولے بھلا

وَمَا لَنَا أَلَّا نُقَاتِلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَدْ أُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا

ہمارے لئے کون سا ایسا سبب ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کی راہ میں نہ لڑیں، درآنحالیکہ ہم نکالے جا چکے

وَأَبْنَائِنَا ۖ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۗ

ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے ۹۳۴ لیکن جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو وہ (سب) پھر گئے بجز ان میں ایک قلیل تعداد کے ۹۳۵

اى اقم لنا اميرا (روح) طلبوا من نبيهم نحو ما كان يفعل رسول الله صلى الله عليه وسلم من التامير على الجيوش۔ (کشاف)

اردو میں رئیس و امیر کے الفاظ، اور سرحدی قبیلوں میں خان کا لفظ مَلِك کا مرادف ہے۔

توریت میں اس موقع پر "بادشاہ" کا لفظ آیا ہے، اور اسرائیلی تخیل میں بادشاہ کے لئے فوج کی سرداری لازمی تھی، اور ہر سردار اعلیٰ کو بادشاہ کہتے بھی تھے، جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:۔

"بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی امارت اور سپہ سالاری کرے۔" (جلد ۷، صفحہ ۵۰۱) اور یہ تصریح بھی ہے کہ "فلسطین میں تقریباً ہر بڑا سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا۔" (جلد ۷، صفحہ ۵۰۰)

توریت میں اسی موقع کا بیان ان الفاظ میں ہے:۔

"تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آئے اور اس سے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا، اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے، اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر، جو ہم پر حکومت کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے۔" (۱۔ سموئیل ۔ ۸ : ۴ و ۵)

"ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو تاکہ ہم بھی اور سب گروہوں کے مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لئے لڑائی کرے۔" (۱۔ سموئیل ۸ : ۱۹ و ۲۰)

۹۳۳ یہ سب حضرت شموئیل نے کچھ تو اپنی فراست ایمانی سے فرمایا، اور کچھ اپنی قوم کی افتاد طبیعت کے تجربوں کی بنا پر عَسَيْتُمْ أَلَّا تُقَاتِلُوا کے معنی ہیں کہ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ تم نہ لڑو گے۔

يعنى اتوقع جبنكم عن القتال (کشاف)

هَلْ عَسَيْتُمْ میں هَلْ تاکید کلام کے لئے ہے۔

اراد بالاستفهام التقرير والتثبيت ان المتوقع كائن۔ (کشاف)

۹۳۴ وہ لوگ بولے کہ واہ بھلا یہ بھی کہیں ممکن ہے، حکم شرعی سے قطع نظر ہم لوگ انتہائی مظلوم اور ستائے ہوئے بھی تو ہیں ۔۔ اس دور میں فلسطینیوں کی جو شدید اور بے پناہ یورش اسرائیلیوں پر جاری تھی اور اسرائیلیوں کا ملک جس بے اندازہ حد تک ان کے ہاتھوں تاراج ہو رہا تھا اس کی تفصیلات قدیم اسرائیلی مؤرخ جوزیفس

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ

اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے ۹۳۶ اور ان لوگوں سے اُن کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے

لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ۭ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ

طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے ۹۳۷ وہ بولے اُسے ہمارے اوپر کیسے امیری حاصل ہو سکتی ہے،

اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۭ

درآنحالیکہ ہم اس سے بڑھ کر امیری کے مستحق ہیں اور اُسے مال میں بھی تو وسعت نہیں دی گئی ۹۳۸

کے صفحات اور یہود کی دوسری تاریخوں میں ملتی ہیں توریت بھی ان معرکہ آرائیوں کے ذکر سے خالی نہیں ایک جگہ ہے:۔

"اور وہ جب باہم مقابل ہوئے تو اسرائیلی نے فلسطینیوں سے شکست پائی اور انھوں نے ان کے لشکر میں سے قریب چار ہزار آدمی مارے۔" (۱۔سموئیل۔۴:۲)

اور دوسری جگہ ہے:۔

"سو فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی، اور ہر ایک اپنے اپنے خیمہ کو بھاگا، اور وہاں نہایت خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی مارے مارے پڑے اور خدا کا صندوق لوٹا گیا۔" (۱۔سموئیل۔۴:۱۰)

**۹۳۵** آخر اُن کے نبی کا کہا ان کے آگے آیا، اور بنی اسرائیل اتنے دعوؤں کے باوجود پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو کر رہے، جوزیفس کی مشہور تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

"اُن پر دہشت طاری ہو گئی یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے بعض نے زیر زمیں غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن عبور کر گئے۔" (باب ۶۔ فصل ۶۔ فقرہ ۱)

**۹۳۶** (اور اُن کی سزا پر بھی پوری طرح قادر)

الظّٰلِمِيْنَ سے یہاں مراد اپنے نفس پر ظلم کرنے والے ہیں یعنی اللہ کے نافرمان بندے۔

هم الذين ظلموا بانفسهم عن القتال وترك الجهاد (روح) وعيد لهم على ظلمهم في القعود عن القتال وترك الجهاد۔ (کشاف)

**۹۳۷** طالوت بن کش تاریخ میں قوم اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کئے گئے ہیں زمانۂ حکومت ۱۰۳۵ ق م تا ۱۰۱۲ ق م یہ وہی ہیں جن کا ذکر توریت میں ساؤل (SAUL) کے نام سے آیا ہے توریت میں ان کی نصب حکومت کا ذکر حسب دستور طوالت کے ساتھ موجود ہے:۔

"اور خداوند نے ساؤل کے آنے سے ایک دن پیشتر سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص کو بنی یامین کی سرزمین سے تجھ پاس بھیجوں گا، سو تو اُس پر تیل ملیو کہ وہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تا کہ میرے لوگوں کو فلسطیوں کے ہاتھ سے چھڑائے ۔۔۔۔ سو جب سموئیل ساؤل سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ

(نبی نے) کہا کہ اُسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں انتخاب کرلیا ہے ۹۳۹ اور اُسے علم اور جسم دونوں میں کشادگی زیادہ دی ہے ۹۴۰

کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھے کہا تھا، یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا"۔ (۱سموئیل ۔ ۹: ۱۵۔۱۶)

مَلِكًا۔ یہاں ترکیب میں طالوت سے حال واقع ہوا ہے۔

**۹۳۸** حضرت سموئیل نبیؑ کا کہنا بالکل ٹھیک نکلا، اسرائیلی کہاں تو امیر کے تقرر کا خود ہی تقاضہ کررہے تھے، اور کہاں اب جو اس کا خدائی تقرر ہوگیا، تو لگے نکتہ چینی بھی کرنے اور کہنے کہ "ایسے شخص کا انتخاب ہو کیوں کرسکتا ہے"۔

فلما بعث لهم ملكا انكروا ذلك وعجبوا (ابن جرير) واستبعد واجدّا ان يكون هو ملكا عليهم (كبير)

اَنّٰى مِنْ اَيْنَ کا بھی مُرادف ہوسکتا ہے اور کَيْفَ کا بھی، حاصل دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے یعنی کمالِ تعجب، مقصود نبی کی تکذیب نہیں، صرف اُس کے قول پر کمالِ حیرت ہے۔

كيف ومن اين، وهو انكار لتملكه عليهم واستبعاد له (كشاف) الاستفهام حقيقي او للتعجب لا لتكذيب نبيهم (روح) اى من اىّ جهة (قرطبى)

ایک خاص قبیلہ کی طرف سے اعتراض وانکار کا ذکر توریت میں بھی ہے:۔

"بنی بعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اس کی تحقیر کی، اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے"۔ (۱سموئیل ۔ ۱۰: ۲۷)

بنی اسرائیل حضرت یعقوبؑ کی بارہ [12] اولادوں کی نسل ہیں، نسلی بنا پر بارہ [12] فرقوں یا قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے، ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بنی یامین کا تھا، اور توریت میں تصریح ہے کہ طالوت اسی قبیلہ سے تھے (۱سموئیل ۔ ۹: ۲۱) تو ایک وجہ تو ان کے حقیر سمجھے جانے کی یہی ہوئی۔

نسل وخاندان کی اہمیت جب جائز حد سے بڑھ جاتی ہے تو ہندوؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے، اسرائیلیوں کا بھی اب یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ نبوّت حقِ مخصوص ہے قبیلہ بنی لاوہ کا اور حکومت حقِ مخصوص ہے قبیلہ بنی یہوداہ کا۔

وكان فى بنى اسرائيل سبطان سبط نبوة وسبط مملكة ولم تكن طالوت من سبط النبوة ولا من سبط المملكة۔ (ابن جرير، كبير)

جیسے آج عام ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص جو نہ برہمن ہو نہ چھتری، وہ اعلیٰ حاکم و سردار کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا اعتراض اسرائیلیوں کا یہ تھا کہ یہ مالی اعتبار سے بھی تو منصبِ امارت کے لائق نہیں۔ جیسے ہندو کسی کے متعلق یہ اعتراض کریں کہ یہ برہمن اور چھتری نہ سہی، یہ شخص ویش (مہاجن یا ساہوکار) کے درجہ کا بھی تو نہیں۔

**۹۳۹** (اور اللہ کا انتخاب ظاہر ہے کہ ہر طرح پُر حکمت وپُر مصلحت ہی ہوگا)

حضرت شموئیل نبیؑ نے پہلا اور اصلی جواب تو یہی دیا کہ یہ انتخاب انسانی نہیں خدائی ہے، اس لئے ہر طرح یہی مناسب وپُر مصالح ہے، ایسا کہ تمہارا تو ذہن بھی ان باریک مصلحتوں تک نہیں پہونچ سکتا ع۔ پیمبر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

توریت میں اس مقام پر ہے:۔

"اور سموئیل نے جماعت کو کہا کہ تم اُسے دیکھتے ہو کہ جسے خداوند نے چن لیا کہ اُس کے مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں"۔ (۱۔سموئیل ۱۰: ۲۴)

وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۤءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور اللہ اپنا ملک جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۹۴۱ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۹۴۲

۹۴۰ یہ شموئیل نبی کا دوسرا اور "عقلی" جواب ہے آپ نے فرمایا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو، تمہارے معیار سے سردار فوج میں بھی دو چیزیں ضروری ہیں، ایک یہ کہ اُسے سپہ داری و ملک گیری کے فنون سے واقفیت ہونا چاہیے، سو وہ طالوت کو حاصل ہے اور دوسرے خود اس کی جسمی قوت و توانائی، سو اُس میں بھی وہ ممتاز ہے۔ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ۔ عِلْم سے مُراد یہاں وہی علوم و فنون ہیں جن کا تعلق ملک گیری و ملک داری سے ہے۔

ای علم الحروب (ابن عباسؓ) لیتمکن به من معرفة الامور السیاسیة (روح) وکان اعلم بنی اسرائیل بالحروب والدیانات فی وقته۔ (مدارک)

وَالْجِسْمِ۔ بسطة فی الجسم سے مُراد ہے کہ طالوت قد و قامت و وجاہتِ ظاہری میں دوسروں سے بڑھ چڑھ کر تھے

ای الطول والقوة (ابن عباسؓ) الطول من کل انسان برأسه ومنکبه (مدارک)

توریت میں دی ہوئی تفصیلات سے اُن کے حُلیہ کا نقشہ ذہن میں خود کھنچ لیجیے:۔

"بہت خوب جوان تھا، اور بنی اسرائیل کے درمیان اُس سے خوبصورت کوئی شخص نہ تھا، یہ ساری قوم میں کاندھے سے لے کر اوپر تک ہر ایک سے اونچا تھا"۔ (۱۔سموئیل۔ ۹ : ۱۰)

"اور وہ جب کہ جماعت کے درمیان کھڑا ہوا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا"۔ (اسموئیل ۱۰ : ۱۳)

اور دراز قامتی اسرائیلیوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لیے تھی، توریت کے بعد ان کے ہاں کا مقدس ترین نوشتہ تالمود ہے، اس کی تصریح ملاحظہ ہو:۔

"خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی سکینت کا نزول صرف اُس شخص پر کرتا ہے، جو دانشمند ہو، مضبوط ہو، متموّل ہو اور دراز قامت ہو"۔ (EVERY MAN'S TALMUD ص ۱۲۸)

قرآن مجید کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ اُس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے بلند قامتی کی جانب پورا اشارہ ہو جائے، چنانچہ اہلِ تحقیق کا ایک گروہ اس جانب گیا ہے کہ طالوت دراصل طولوت تھا اور طول سے مشتق۔

کان طالوت اسمه بالعبرانیة ساؤل فسُمّی طالوت لطوله (معالم) قیل انه عربی من الطول واصله الطولوت (روح)

۹۴۱ (کہ وہی مالک و مختار ہے، اور اس کی ہر عطا اقتضاء حکمت کے موافق ہی ہوتی ہے۔)

مُلْكَهٗ۔ مُلک کی نسبت اپنی جانب کر کے اللہ نے بتا دیا کہ حقیقت میں وہی ایک مالک سارے ملکوں کا ہے۔

۹۴۲ (جس کا اختیار بھی غیر محدود، اور جس کا علم بھی مُحیطِ کُل)

وَاسِعٌ۔ وہ بڑی ہی وسعت والا ہے، جس کے اختیار میں سب کچھ ہے، وہی ہر پست کو بلند اور ہر ادنیٰ کو سرفراز کر سکتا ہے۔ وَاسِعٌ کی تفسیر وَاسِعُ الْفَضْلِ وَالرِّزْقِ وَالرَّحْمَةِ سے بھی آئی ہے اور مُوَسِّعٌ سے بھی اور ذُوْسَعَةٍ سے بھی (کبیر)

عَلِيْمٌ۔ اس کا علم مُحیط و کامل ہے، وہی خوب جانتا ہے کہ کس میں ملک گیری و ملک داری کی صلاحیت موجود ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ

اور اُن سے اُن کے نبی نے کہا کہ اس کی امارت کا نشان یہ ہے ۹۴۳ کہ تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا

فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ

جس میں (سامانِ) تسکین تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے ۹۴۴ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی جنھیں آلِ موسیٰؑ

۹۴۳ (یا وہ غیبی تصرف جو تمہارے اطمینان کا کام دے سکے)

کچھ عجب نہیں جو بنی اسرائیل نے اپنی قدیم اعجوبہ پرستی کی بنا پر طالوت کے لئے کسی غیبی نشان کا مطالبہ اپنے پیمبر سے کیا ہو، اور وہ اس کے جواب میں بہ ایماءِ الٰہی یہ فرمارہے ہوں۔

نَبِيُّهُمْ۔ نَبِيٌّ۔ نَبَا سے مشتق فعیل کے وزن پر ہے بلفظی معنی خبر دینے والے کے ہیں، صیغہ مبالغہ کا ہے، پیمبر کو اصطلاح شریعت میں نبی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے خبر پہونچانے والا ہوتا ہے۔

فعیل بمعنی فاعل للمبالغۃ من النبا لانہ انبأعن اللہ (نہایہ)

اور نبوۃ اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان سفارت کا نام ہے جس سے بندوں کو امورِ معاد و معاش میں تعلیمِ الٰہی حاصل ہو

سفارۃٌ بین اللہ وبین ذوی العقول من عبادہ لازاحۃ علتھم فی امر معادھم ومعاشھم (راغب)

۹۴۴ (درآنحالیکہ تم مدت دراز سے اپنی اس متاعِ عزیز سے محروم ہو)

يَأْتِيَكُمُ۔ یعنی از خود بغیر تمہاری کسی خاص جد و جہد کے آجائے گا۔

التَّابُوتُ۔ اس خاص صندوق کا اصطلاحی نام تابوتِ سکینہ ہے، یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملّی و قومی ورثہ تھا، اس کے اندر اصل نسخۂ توریت مع تبرکاتِ انبیاء محفوظ تھا، اسرائیلی اس کو انتہائی برکت و تقدیس کی چیز سمجھتے تھے، اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اُسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا، موجودہ علماء یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسبِ ذیل تھی:۔

طول ۲½ فٹ عرض ۱½ فٹ بلندی ۱½ فٹ

بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے، مدت ہوئی فلسطینی اُسے اُن سے چھین لے گئے تھے، اسرائیلی اُسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بد طالعی سمجھ اس کی واپسی کے لئے نہایت درجہ بیتاب و مضطرب تھے۔

فقہائے مفسرین نے اس آیت سے اس کی دلیل حاصل کی ہے کہ بد اعمالی اور نافرمانی کرتے رہنے سے قوم دنیوی نعمتوں سے بھی محروم ہوجاتی ہے۔

وھذا اول دلیل علی ان العصیان سبب الخذلان وھذا بیّن۔ (قرطبی)

طالوت کے وقت میں یہ تابوت واپس آجانے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمانؑ (متوفی ۹۳۳ ق م) تک رہا، اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کے بعد اُسی میں اُسے بھی رکھ دیا تھا، اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا، یہود کا عام خیال یہ ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ

اور آلِ ہارون چھوڑ گئے ہیں ۹۲۵ اس (صندوق) کو فرشتے لے آئیں گے ۹۲۶ بے شک اس (واقعہ) میں تمہارے لئے

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ

ایک نشان ہے ۹۲۷ اگر تم ایمان والے ہو پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر بڑھے تو بولے ۹۲۸

سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی توریت کا نسخۂ شفا۔

۹۲۵ یعنی ان دونوں حضرات اور ان کی مقدس اولاد کے آثار و تبرکات۔

بعض اہلِ طریق نے کہا ہے کہ اولیاء اللہ کے احترام کا جو طریقہ چلا آرہا ہے اس کی اصل و رسند اس قصۂ تابوت سے مل جاتی ہے۔

۹۲۶ تاریخ کا بیان ہے کہ فلسطینی اس تابوتِ سکینہ کو چھیننے کو تو چھین لائے لیکن جس تاریخ سے اُسے لے کر آئے ایک دن بھی چین نہ اُٹھانے پائے، ابھی وبا کا زور ہے، ابھی کوئی اور مصیبت، آخر عاجز آکر یہ طے کیا کہ (نعوذ باللہ) اس نحوست کی پوٹ کو کہیں اور پھنکوا دیا جائے، ایک بیل گاڑی پر اسے لادا، گاڑی کو بغیر کسی گاڑیبان کے یوں ہی ہانک دیا، بیل سیدھے علاقۂ بنی اسرائیل کی طرف روانہ ہوگئے، اور گاڑی صوبۂ یہوداہ کے شہر بیت شمس میں آکر ٹھہر گئی۔

تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ تکوینی تصرفات جتنے بھی ہوتے رہتے ہیں، سب فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتے رہتے ہیں، چنانچہ بیلوں کا رُخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں ہی کا کام تھا، اور یہی غیبی نشان تھا طالوت کی تائید میں۔ بائبل میں تابوتِ سکینہ کی بازیابی عہدِ طالوت سے بہت پیشتر درج ہوگئی ہے، قرآن مجید نے یہاں یہ تصریح کرکے حسبِ معمول بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی ہے۔ مسیحیوں اور اُن کے حلیفوں کی یہ کوشش جس قدر مضحکہ خیز ہے اُسی قدر عبرت انگیز بھی کہ بجائے اس کے کہ قرآن جیسی محکم محفوظ مستند دستاویز کو بائبل پر پیش کریں، اور اس کی روشنی میں بائبل کے بیانات کو جانچیں، برعکس اُلٹے بائبل جیسی مشتبہ، غیر محفوظ بے سند تحریر کی روشنی میں قرآن مجید کے بیانات کو جانچنا، پرکھنا چاہتے ہیں! گویا آفتاب کی روشنی میں لالٹین کو دیکھنے کی بجائے لالٹین سے آفتاب کو دیکھنے کی کوشش۔

۹۲۷ (تصرفِ غیبی کا)

فِىْ ذٰلِكَ۔ یعنی اسی واپسیٔ تابوت کے واقعہ میں۔

اى فى رجوع التابوت اليكم (مدارک) اى فى اتيان التابوت (بحر)

لَّكُمْ۔ تمہارے لئے، یعنی تمہارے اطمینان کے لئے۔

۹۲۸ (اپنی فوج والوں سے)

فَصَلَ۔ یعنی دشمن کے مقابلہ میں بڑھے۔

۹۲۹ (صبر و ثبات، ضبط اور ڈسپلن میں)

نَهَرٍ۔ دریا سے یہاں مُراد دریائے یردن (JORDAN) ہے یہ دریا بڑا نہیں، براہ راست لمبائی کل ۶۵ میل کی ہے، البتہ اس کے خم و پیچ ملا کر کوئی ۲۰۰ میل کی ہے، علاقۂ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے اور گویا ملک کی

قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّیْ ۚ

کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعہ سے لینا چاہتا ہے[۹۴۹] سو جو کوئی اس میں سے پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہے[۹۵۰]

وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّیْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ

اور جو کوئی اُسے نہ چکھے سو وہی میرا ہے، مگر ہاں جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے (اس کا مضائقہ نہیں)[۹۵۱]

فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ

لیکن ان (سب) نے اس سے پی لیا بجز ان میں سے تھوڑے سے (آدمیوں) کے[۹۵۲] پھر جب طالوت خود اور مومنین بھی ان کے

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ

ساتھ اُس (دریا) سے اُتر گئے تو وہ لوگ بولے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اُس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں[۹۵۳]

قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے چنانچہ یردن کے اِس پار اور اُس پار علاقوں کی تقسیم خود توریت میں درج ہے (یوشع۔ ۱: ۱۴ و ۱۵) اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی جانب ہے، اور یہ بحر جلیل اور بحر طبریہ ہوتا ہوا بحر مردہ (DEAD SEA) میں جا گرتا ہے، اس کا پانی شروع میں تو صاف، شفاف، شیریں ہے لیکن آگے چل کر گندلا، بدبودار اور مُضرِ صحت ہو جاتا ہے۔

**۹۵۰** یعنی میرے ہمراہیوں رفیقوں میں سے نہیں یہ معنی نہیں کہ وہ سرے سے ایمان ہی سے خارج ہو گیا۔

ای من اشیاعی (روح) لیس من اتباعی واشیاعی (مدارک) لم یخرجهم بذلک عن الایمان (بحر)

شَرِبَ مِنْهُ۔ یعنی جی بھر کر اُس میں سے پانی پی لے گا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ موسم گرمی کا تھا، اور طالوت کے سپاہیوں کو پیاس قدرۃً زور کی لگی ہوئی تھی۔

**۹۵۱** معلوم ہوتا ہے کہ اصل حکم وہی پہلا تھا کہ کوئی راستہ میں یہ پانی زبان ہی پر نہ رکھے، اور یہ دوسرا حکم بطور رخصت و اجازت تھا کہ خیر ایک آدھ چلّو سے مُنھ تر کر لینے میں مضائقہ نہیں۔

مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ۔ طعام یہاں چکھنے کے معنی میں ہے۔

ای من لم یذقه (روح) من لم یذقه من طعم الشئ (مدارک) یقال طعمت الشئ ای ذقته (قرطبی)

اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ۔ یعنی چلّو بھر پی لینے میں مضائقہ نہیں۔

معناه الرخصة فی اغتراف الغرفة بالید دون الکرع (مدارک)

**۹۵۲** (کہ ان کی تعداد حسب روایت توریت چھ ہزار تھی۔)

"تب ساؤل نے اُن لوگوں کو جو اُس کے پاس حاضر تھے گنا اور وہ مرد چھ ہزار کے قریب تھے"۔ (۱۔ سموئیل۔ ۱۳: ۱۵)

شَرِبُوْا مِنْهُ۔ یعنی خوب سیر ہو کر پیا، جس کے بعد چلنا خصوصاً فوجی مارچ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

**۹۵۳** (بہ نظر احوالِ ظاہر)

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ

اور وہ لوگ جنھیں یقین تھا کہ اللہ کے روبرو پیش ہوں گے ۹۵۴ بولے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

پر اللہ کے حکم سے غالب آگئی ہیں ۹۵۵ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۹۵۶

یہ گفتگو اُن میں آپس میں ہونے لگی، دشمن کی کثرتِ تعداد اور اس کی عظمت و سامان پر نظر کر کے اس کی ہیبت سے لرز بیٹھ جانا اور اپنی طرف سے مایوس ہو جانا، ایک امر طبعی تھا، اچھے اچھے اہلِ ایمان کی بھی ہمت ایسے موقع پر طبعی طور پر چھوٹ جاتی ہے، جو زیفس اسرائیلی کی تاریخ آثار یہود میں ہے:۔

"طالوت اور اُس کے لشکری یہ سامان دیکھ کر سہم اُٹھے" (باب ۶-۹:۱)

خود توریت کی روایت ہے:۔

"جس وقت ساؤل اور سارے اسرائیل نے اُس فلسطی کی باتیں سنی تو ان کی دلاوری نکل گئی اور وہ نپٹ ڈر گئے" (۱ سموئیل ۱۷:۱۱)

جالوت فلسطینیوں کے لشکر کا مشہور سردار بڑے تن و توش کا پہلوان تھا، انسان کیوں تھا گویا دیو زاد تھا، توریت میں اس کی جسامت، قد و قامت، اس کی شہ زوری، اس کے ہتھیار اور اس کی مبارزت کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قد ۹ فٹ کا تھا، بجز چہرہ کے سر سے پیر تک آہن پوش رہتا تھا، اور اس کی زرہ بکتر کا وزن کوئی تین من کا تھا۔

هُوَ، ضمیر هُوَ کا استعمال جو بظاہر زائد معلوم ہوتا ہے، تاکید کلام کے لئے ہے۔

هو توکید۔ (قرطبی)

۹۵۴ (آخرت میں)

لشکر طالوت میں مؤمن تو سب ہی تھے، بہتوں پر لشکرِ جالوت کی ہیبت طبعی طور پر طاری ہو گئی، لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن کا ایمان خدا اور آخرت پر بالکل پختہ و غیر متزلزل رہا، اُس وقت بھی اُن کے ذہن میں یہ عقیدہ مستحضر تھا اور وہ ہنگامی طور پر بھی مرعوب، و دہشت زدہ نہ ہوئے، بلکہ بڑے استقلال کے ساتھ بولے۔

يَظُنُّوْنَ۔ ظَنٌّ یہاں گمان کے معنی میں نہیں علم و یقین کے معنی میں ہے۔

(ای یعلمون و یستیقنون (ابن عباسؓ) ای یوقنون بالشہادۃ (مدارک) یحتمل ان یکون الظن بمعنی الایقان ای یوقنون بالبعث والرجوع الی اللہ قالہ السدی (بحر) قال کثیر من المفسرین انہم یعلمون ویوقنون الا انہ اطلق لفظ الظن علی الیقین علی سبیل المجاز (کبیر) والظن ھنا بمعنی الیقین (قرطبی)

آخرت کا یقین اور اس کا استحضار دلوں میں ہر طرح جرأت، ثبات، بے خوفی پیدا کر دیتا ہے۔

۹۵۵ (اس لئے دشمن کی کثرتِ تعداد سے خوف ہی کیا۔)

ان مومنینِ راسخین نے اُس وقت بھی کہا کہ اصل شئے تو ایمان کی مضبوطی ہے، ایمان سے لبریز اقلیت بارہا اکثریت پر غالب آچکی ہے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا

اور جب وہ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابل آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہمارے اوپر صبر ڈال دے

وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾

اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہمیں غالب کر کافر لوگوں پر ۹۵۷

فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ

پھر انہوں نے ان کو اللہ کے حکم سے شکست دے دی ۹۵۸ اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا ۹۵۹

بِاِذْنِ اللّٰهِ میں اِذْن، مشیّتِ تکوینی کے معنی میں نہیں، حکم و توفیقِ الٰہی کے معنی میں ہے۔

ای بحکمه وتیسیره (روح)

بِاِذْنِ اللّٰهِ کی قید نے اسے بھی واضح کر دیا کہ فتحیابی میں اہم ترین شے ذاتی ہمت و شجاعت نہیں بلکہ تائید غیبی ہوتی ہے۔

۹۵۶ (اس لئے اہم و مقدم شے صبر و ثبات و اعتماد علی اللہ ہے)

مَعَ سے اللہ کی معیّتِ جسمانی مراد نہیں، اس کی معیّت نصرت و امداد کے ساتھ مراد ہے۔

المراد منه المعية بالنصر والاحسان (روح) ای بالنصر (مدارک) المراد به معية نصره وتوفيقه (ابو سعود)

۹۵۷ ان دونوں آیتوں میں اللہ کے لشکر کے سپاہیوں کو آدابِ جنگ کی تعلیم ہے کہ بر خلاف عام دنیوی سپاہیوں کے ان کا تکیہ قوت و شوکت پر نہیں، بلکہ نصرتِ الٰہی پر ہوتا ہے۔

قرآن اور توریت موجودہ کے بیانوں کا مقابلہ کر دیا جائے تو توریت نفس جنگ کے خشک خارجی واقعات کی تفصیل قرآن سے کہیں زائد ہے لیکن وہ بس اسی پر قانع ہے گویا کوئی کتاب تذکرہ و تاریخ کی ہے، قرآن مجید اس کے برخلاف ہر موقع پر تعلیم اصولِ دین اور اخلاقِ عالیہ کی دیتا جاتا ہے، اور یہی اس نے یہاں بھی کیا۔

اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا۔ یعنی ہمیں ثباتِ قلب کی توفیق دے۔

ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔ یعنی ہمیں ثباتِ قدم نصیب کر۔

فَانْصُرْنَا۔ ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کے بعد کافروں پر غلبہ تو قدرتی نتیجہ کے طور پر شاید حاصل ہو ہی جاتا لیکن مومنینِ عارفین کی نظر اپنے سارے انتظامات اور ساری سعی سے کہیں بڑھ کر تائیدِ الٰہی پر رہتی ہے، اس لئے صراحت کے ساتھ فتح و غلبہ کی دعا بھی ان کی زبان سے نقل کی گئی۔

۹۵۸ فَهَزَمُوْهُمْ۔ انہوں نے انہیں یعنی طالوت کے لشکر نے جالوت والوں کو شکست دے دی۔

اِذْن۔ یہاں بھی حکم و توفیق کے معنی میں ہے۔

ای بارادته انهزامهم (روح)

توریت میں فلسطیوں کی اس شکستِ فاش کی منظر کشی یوں کی گئی ہے:-

وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْلَا

اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جو کچھ چاہا انہیں سکھایا ۹۶۰ ۔ اور اگر اللہ

دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ

بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو (روئے) زمین پر فساد برپا ہو جاتا ۹۶۱ لیکن اللہ تو جہان

لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے ۹۶۲

"اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ ان کا پہلوان مارا پڑا تو بھاگ نکلے اور اسرائیل اور یہوداہ کے لوگ اُٹھے اور للکارے اور فلسطیوں کو وادی تک اور عقران کے پھاٹک کی راہ تک رگیدا۔" (۱۔سموئیل۔ ۱۷: ۵۲)

**۹۵۹** داؤدؑ۔ داؤد بن یسی بن عوبید (۱۰۳۴ ق م تا ۹۶۳ ق م) ایک پیغمبر برحق ہوئے ہیں، قرآن مجید میں آپ کا ذکر سولہ مقام پر آیا ہے، طالوت کی فوج میں محض ایک نوجوان کی حیثیت سے شامل تھے، اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے، نہ ملک و سلطنت سے، توریت میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ درج ہے:۔

"اور ایسا ہوا کہ جب فلسطی اُٹھا اور آگے بڑھ کر داؤد کے مقابلہ کے لئے نزدیک ہوا تو داؤد نے پھرتی کی اور صفوں کی طرف داؤد سے مقابلہ کرنے دوڑا، اور داؤد نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا، اور اس میں سے ایک پتھر لیا اور فلاخن میں دھر کے فلسطی کے ماتھے پر ایسا مارا کہ وہ پتھر اُس کے ماتھے میں غرق ہو گیا، اور وہ زمین پر مُنھ کے بل گر پڑا، سو داؤد ایک فلاخن اور ایک پتھر سے اُس فلسطی پر غالب ہوا، اور اس فلسطی کو مارا اور قتل کیا۔" (۱۔سموئیل ۱۷: ۴۸۔۵۰)

**۹۶۰** (یہ سب کچھ اس واقعہ کے بعد ہوا)

اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ۔ یہ بادشاہی خدائی عطیہ تھی، پہلے تو اسی کو قرآن نے صاف کیا، یہ فرمان روائی قوم اسرائیل کو عطا ہوئی تھی حضرت۔۔ داؤدؑ نسلِ اسرائیلی کے دوسرے بادشاہ ہیں، تاجدار اول طالوت تھے آپؑ انھیں کے داماد تھے، طالوت جب مع اپنے بڑے فر۔۔ند کے میدانِ جنگ میں کام آگئے تو قبیلۂ یہودا نے داؤدؑ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا، اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپؑ ہی پر اتفاق کر لیا، سات سال تک آپؑ نے اپنا پایۂ تخت حبرون (یعنی الخلیل) کو رکھا اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضہ سے نکال کر اُسے دار السلطنت بنایا، آپؑ نے اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مسخر و مغلوب کیا اور اپنے حدودِ سلطنت کو خوب وسیع کیا، آپ کا عہد حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحات اور حسن انتظام دونوں کے لئے یادگار ہے۔

اَلْحِكْمَةَ۔ حکمت سے یہاں مُراد نبوت ہے، جو حکمت کا بلند ترین مقام ہے، حکمت کے عام معنی تمیز و دانائی بھی مُراد ہو سکتے ہیں۔ قيل الحكمة العلم والعمل بها وفسرها بعضهم بالنبوة (بحر) اى النبوة (بيضاوى) الحكمة به وضع الامور مواضعها على الصواب والصلاح وكمال هذا المعنى يحصل بالنبوة فلا يبعد ان يكون المراد ههنا النبوة (كبير)

عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ۔ علومِ انبیاءؑ کا احاطہ کون کر سکتا ہے؟ مِمَّا يَشَآءُ کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع آگئے

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۵۲)

یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم انھیں آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک ۹۶۳ اور آپ یقیناً مرسلین میں سے ہیں ۹۶۴

جو حضرت داؤد کو سکھا دیے گئے تھے۔

یَشَآءُ۔ گو صیغۂ مضارع ہے، مگر معنی ماضی کے دیتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ہے۔

ای مماشاء وقد یوضع المستقبل موضع الماضی (قرطبی)

مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ نہیں، ابتدائیہ ہے۔

۹۶۱ (غلبۂ بدی و بدکاری سے)

بَعْضَهُمْ۔ یعنی مفسدوں، نافرمانوں، قانون شکنوں، باغیوں کو۔

بِبَعْضٍ۔ یعنی دوسرے بندوں کو مشیت تکوینی کا آلۂ کار بنا کر۔

یہاں یہ عام قانون بتا دیا کہ دنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوا کرتے ہیں یہ یوں ہی بلا ضرورت و مصلحت "گردش گردوں" سے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ہمیشہ با مقصد و پُر حکمت ہی ہوا کرتے ہیں، اور ان سے ظلم و عصیان و طغیان کی اصلاح مدّنظر ہوتی ہے۔

آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس عالمِ اسباب میں مشیت تکوینی جو کام بھی لیتی ہے بندوں کے واسطہ اور ذریعہ سے لیتی ہے۔

۹۶۲ (اس لئے وہ اپنے فضل و کرم سے روئے زمین پر اس فسادِ عظیم کی نوبت ہی نہیں آنے دیتا اور بدکاروں اور نافرمانوں کے غلبہ و تسلط کو نیک کاروں، فرماں برداروں کے ذریعہ سے ہٹاتا اور مٹاتا رہتا ہے)

غرض یہ کہ ہر ایسے انقلابِ حکومت کے عقب میں رحمتِ الٰہی ہی کام کرتی رہتی ہے۔

۹۶۳ (اور غرضِ صحیح کے ساتھ)

بِالْحَقِّ۔ یعنی بالکل بے کم و کاست، اپنی اصلی حالت میں، اور غرضِ صحیح کے ساتھ۔

بالیقین الذی لایشك فیه اهل الکتٰب (مدارك) بالوجه المطابق الذی لایشك فیه اهل الکتٰب وارباب التواریخ (بیضاوی) ای ملتبسة بالیقین الذی لایرتاب فیه احد من اهل الکتٰب وارباب التواریخ۔ (ابوسعود)

گویا یہاں یہ ظاہر کر دیا کہ صحیح و مستند بیان صرف قرآن ہی کا ہے، دوسری الہامی کتابوں اور مذہبی نوشتوں کی طرح اس کے قصے غلط سلط اور مسخ شدہ ہو کر نہیں رہ گئے ہیں، اور اس کی ایک مثال خود یہی قصۂ طالوت ہے، بائبل والوں نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔

۹۶۴ (بس آپ اپنے پیغمبر برحق ہونے میں اصلاً شک نہ کیجئے، ان حقائق کا نزول پیغمبروں ہی پر ہوتا ہے)۔

اَلْمُرْسَلِیْنَ۔ لفظ مُرْسَلِیْنَ کی معنویت قابل غور ہے انبیاء کی حیثیت اسلام میں تمام تر قاصدوں، سفیروں، بھیجے ہوؤں کی ہے، اور جو مُرسَل (بھیجا ہوا) ہوتا ہے ظاہر ہے کہ کسی کی طرف سے کسی اور کے پاس ہی بھیجا ہوا ہوتا ہے، یہ مُرسَلِیْن یا پیامبر نہ اوتار ہوتے ہیں، نہ دیوتا، نہ خدائی کے مظہر، نہ ان میں خدائی حلول کئے ہوتی ہے، معبودیت یا نیم معبودیت کی صلاحیت یہ ذرا سی بھی نہیں رکھتے۔ اللہ اکبر! شرک بلکہ شائبۂ شرک سے بھی بچنے کا قرآن مجید کو کس درجہ اہتمام ہے اور الفاظ تک کے انتخاب میں وہ اس کا کیسا لحاظ رکھ لیتا ہے۔

# تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ م

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی ہے ۹۶۵

مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ط

ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے ۹۶۶ اور ان میں سے بعض کے درجے (اللہ نے) بلند کئے ہیں ۹۶۷

لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ کی ترکیب سے یہ پہلو بھی نکل آیا کہ آپ دنیا سے انوکھے اور نرالے کوئی "مرسل" نہیں بلکہ آپ اُس زُمرۂ مرسلین کے ایک فرد ہیں، جو آپ سے پہلے گزر چکا ہے۔

**۹۶۵** (مراتبِ قرب و منزلت میں)

تِلْكَ الرُّسُلُ مراد وہی مرسلین ہیں جن کا ذکر ابھی ابھی آچکا ہے۔ الرسل کے اعرابِ رفعی کی بنا پر ترکیبِ کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

تلك الجماعة الرسل۔ (کبیر)

اور اسی بنا پر بجائے ذالك کے لفظ تلك آیا ہے، اس لئے کہ جماعة مؤنث ہی ہے۔

قال تلك ولم يقل ذالك مراعاة لتانيث لفظ الجماعة (قرطبی)

فضل کے لفظی معنی بزرگی کے ہیں، یعنی ایسی صفت جس سے انسان دنیا میں مدح و ثنا کا مستحق ہو اور آخرت میں اجر سے سرفراز فَضَّلْنَا میں ضمیر متکلم کا لحاظ رہے۔ یہ تفضیل یا باہمی فضیلت و افضلیت جو کچھ ہے محض عند اللہ ہے، خالق کے ہاں درجات و مراتبِ قرب کے لحاظ سے۔ خلق کے لئے بحیثیت مُطاع سب یکساں ہیں، عام خلقت کے لئے رسول سب برابر ہیں، اطاعت و تعظیم سب کی یکساں واجب ہے، اور اس معنی میں قرآن مجید کی دوسری آیت اسی سورت کے آخر میں اسی پارہ میں آرہی ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔

ليس مقام التفضيل اليكم انما هو الى الله عزوجل وعليكم الانقياد والتسليم له والايمان به۔ (ابن کثیر)

اہل لطائف نے آیت سے یہ نکالا ہے کہ انبیاء کے نائبین یعنی اولیائے کاملین خصوصاً صحابۂ کرام کے بھی فرقِ مدارج کے باب میں عوام کو بحث و گفتگو جائز نہیں، صحابہ سب کے سب بہرحال فضیلتِ صحبتِ نبوی میں شریک ہیں، ان کا تقابل و تفاضل عوام کے منصب سے باہر ہے، ہاں بجائے خود اُن کے مقامات و احوال و اقعات و فضائل ذکر کرنے کا مضائقہ نہیں، جیسا کہ یہاں بھی آگے ہو رہا ہے۔

وهكذا القول فى الصحابة إن شاء الله تعالى اشتركوا فى الصحبة ثم تباينوا فى الفضائل بما منحهم الله من المواهب والوسائل فهم متفاضلون تلك مع ان الكل شملتهم الصحبة والعدالة والثناء عليهم (قرطبی)

**۹۶۶** (براہِ راست اور بلا توسطِ ملائکہ)

جیسا کہ خصوصیت کے ساتھ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے ساتھ ہوا۔

اتفقوا على ان موسى عليه السلام مراد بقوله تعالىٰ (کبیر) وهو موسى عليه السلام۔ (مدارک)

ورنہ وسیع و عام معنی میں تو ہر صاحبِ وحی نبی کلامِ الٰہی سے مشرف ہوتا ہی ہے۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ

اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو ۹۶۸ شواہد عطا کئے ۹۶۹ اور ہم نے ان کی تائید روح القدس کے ذریعہ سے کی ۹۷۰

۹۶۷ (بہت زائد)

اشارہ ہے جامعِ کمالات و خاتمِ نبوت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف۔

المراد ببعضھم ھنا النبی صلعم (روح) وھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم وھو قول مجاھد (بحر) قال النحاس بعضھم ھنا علی قول ابن عباس والشعبی ومجاھد محمد صلعم (قرطبی) والظاھر انہ اراد محمد صلعم (کشاف)

زمخشری نے یہاں یہ نکتۂ ادب و بلاغت خوب لکھا ہے کہ جہاں شناخت و تعیین میں کوئی دقت ہی نہ ہو، وہاں کنایہ و ابہام صراحت و تفصیل سے بڑھ کر بلیغ و موثر ہوتا ہے۔

۹۶۸ (کہ وہ بھی انھیں پیمبرانِ برحق میں سے تھے۔)

ابن مریم یعنی مریم نامی ایک خاتون کے فرزند نہ کہ ابن اللہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام بایں شرف و سروری بہرحال ایک انسانی شکل و صورت اور بشری گوشت پوست رکھنے والی عورت ہی کے اولاد تھے، نہ خدا تھے نہ خدازادے، اُلوہیت کا کوئی سا بھی جُزو ان میں نہ تھا، انھیں خدا کا بیٹا ٹھہرالینا نری جہالت تھی، اور اس کی وضاحت کے لئے ضرورت تھی انھیں صراحت کے ساتھ ابن مریم کہنے کی کہ محض اس نشان دہی اور پتے ہی سے عقیدۂ نصرانیت پر ضرب لگ جائے، ورنہ نام تو اور بھی پیمبروں کے لئے گئے ہیں، کہیں ابن فلاں کرکے تعارف نہیں کرایا گیا ہے! نہ ابن داؤد نہ ابن ابراہیم، نہ ابن اسحاق نہ ابن یعقوب، نہ ابن زکریا نہ ابن عمران، اس طرح کا تعارف صرف ابن مریم کے لئے مخصوص ہے کہ انھیں کے لئے ابن اللٰہیت کی تردید کی ضرورت تھی۔

۹۶۹ (اُن کی حقانیت اور پیمبری کے)

یہاں یہ فرمایا گیا کہ عیسیٰ علیہ السلام رسولِ برحق اور مؤید من اللہ تھے، نہ کہ نعوذ باللہ کوئی مُفتری یا کذّاب، جس طرح نصاریٰ نے غلو و افراط سے کام لے کر آپ کو حدِ عبدیت و عبودیت ہی سے باہر نکال رکھا تھا، اُسی طرح یہود نے تفریط و عناد کو کام میں لاکر آپ کو سرے سے ایک بازی گر اور شعبدہ باز قرار دے لیا تھا، قرآن مجید ابھی ابھی نصرانی شرک کی تردید کرچکا ہے، اب یہودی دجل کی تردید کررہا ہے۔

البیّنات۔ بیّنات کے تحت میں وہ تمام کھلی ہوئی چیزیں شامل ہیں جنھیں دیکھ کر ہر عقلِ سلیم والا منصف مزاج نبوتِ عیسوی کا قائل ہوجائے۔

ھی ما یتبیّن بہ الحق من الاٰیات والدلائل (المنار) البیّنۃ الدلالۃ الواضحۃ عقلیۃ کانت او محسوسۃ (راغب) کلھا یدل علی نبوتہ (روح) الحجج والدلائل القاطعات (ابن کثیر)

۹۷۰ کہ وہ قدم قدم پر دشمنوں سے ان کی حفاظت کرتے رہتے تھے۔

روح القدس۔ قرآن مجید اور اسلام کی اصطلاح میں اس سے مراد فرشتۂ اعظم حضرت جبرئیل ہیں، نصرانی تثلیث کے اقنومِ ثانی سے یہاں کوئی واسطہ نہیں، جبرئیل ملکوتی مخلوق ہیں، اور بہت مقرب لیکن بہرحال

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ

اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو ان کے بعد کے لوگ آپس میں خونریزی نہ کرتے بعد اس کے کہ ان کے پاس شواہد آچکے

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ

تھے ۹۷۱ لیکن (لوگ) آپس میں جھگڑے ۹۷۲ کوئی تو ان میں سے ایمان

مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۲۵۳ ع ۳۳ ۵ ۱

۹۷۵

لے آیا اور کوئی ان میں سے کفر ہی کرتا رہا ۹۷۳ اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو وہ آپس میں خونریزی نہ کرتے ۹۷۴ لیکن اللہ وہی کرتا ہے جو ارادہ کرتا ہے

مخلوق ہی ہیں، اُلوہیت کا کوئی شائبہ بھی اپنے اندر نہیں رکھتے۔

ایدنٰہ۔ ان کی تائید ہم نے کی جو ہر طرح قادرِ مطلق ہیں، یہ تائید خود بخود نہیں ہوگئی، آیت سے اس حقیقت پر بھی روشنی پڑ گئی کہ عیسیٰ مسیح باہیں کمالات و فضائل بہرحال انسان ہی تھے اور وہ انسانوں کی طرح دفعِ ضرر اور حصولِ نفع دونوں کے محتاج، قدرتِ کاملہ نے ان کی محافظت و تقویت و رفاقت کے لئے ایک دوسری مخلوق لطیف و غیر مرئی جنس کی مقرر کردی۔

**۹۷۱** البیّنات پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے، بیّنات کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے، عقلی و حسّی دونوں قسم کے روشن شواہد یعنی ایک طرف دلائل و براہین اور دوسری طرف خوارق و معجزات سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

لوشآء اللہ۔ یعنی اگر مصالحِ تکوینی کے اعتبار سے مشیتِ الٰہی کا اقتضاء یہی ہوتا۔

من بعدھم۔ ضمیر پیمبروں (الرُّسُل) کی طرف ہے، یعنی ان پیمبروں کے ظہور کے بعد۔

وقیل من بعد جمیع الرسل وھو ظاھر اللغۃ (قرطبی)

ما اقتتل الذین من بعدھم۔ یہ باہم خونریزی کرنے والے کون لوگ تھے؟ یقیناً پیمبروں کے منکرین اور انکار کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک یہ کہ ظاہری اور صوری تو اقرار ہو لیکن حقیقی و معنوی انکار ہی ہو جیسے یہود و نصاریٰ اہلِ کتاب کا ظاہر میں اقرار اور معنوی انکار، دوسرے یہ کہ انکار صورۃً و معنیً دونوں طرح پر ہو، جیسے مشرکین کا انکارِ توحید و رسالت۔

**۹۷۲** گویا بیّنات کا تقاضائے طبعی تو یہی تھا کہ ایمان سب کے سب لے آتے، لیکن ایک گروہ نے کج روی اور کج رائی سے کام لیا، اور یہ لوگ منکر ہی رہے۔ یہاں اس حقیقت کا بیان ہے کہ چونکہ مشیتِ الٰہی سب کو اضطراراً ایک ہی دین پر جمع کرنے کی نہ ہوئی اور حکمتِ کاملہ نے اس عالم کو عالمِ ابتلاء ہی رکھنا چاہا، اس لئے خلقت کا باہم مختلف ہونا بھی ناگزیر ہوا۔

**۹۷۳** (تو جب یہ اختلافِ دینی شروع سے اور انبیاء سابقین کے وقت سے چلا آرہا ہے تو آپ اے پیمبر اپنے زمانہ کے کافروں پر بہت زیادہ رنج و غم نہ کریں، اور اپنے کو اس فکر و مشقت میں نہ ڈالیں کہ سب کے سب ایمان لے ہی آئیں۔

مِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ۔ سو جو لوگ ایمان لے آئے وہ تو نجات پا ہی گئے۔

مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ۔ جو لوگ کفر پر قائم رہے وہ سزائے ابدی کے مستحق قرار پائے۔

مَنْ اٰمَنَ اور من کفر۔ دونوں کے صیغوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمان اور کفر بندہ کی اپنی اختیاری چیزیں ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ

اے ایمان والو! جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو ۹۷۶ قبل اس کے کہ وہ دن آجائے ۹۷۷

يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۵۴)

جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں ۹۷۸

خالق کی طرف سے جبر کسی صورت میں نہیں۔

۹۷۴ یعنی اگر سب کی خلقت ہی یکساں رکھ دی گئی ہوتی، اور کفر و گمراہی کی آزادی ہی سلب کرلی گئی ہوتی، جب البتہ نہ اختلاف ہوتا اور نہ نوبت قتل و قتال کی پہنچتی۔

۹۷۵ یعنی نہ اس کی قدرت و قوتِ فاعلہ پر کوئی قیدیں و حد بندیاں عائد ہیں اور نہ اس کی تجویزوں ارادوں میں کسی غلطی یا سہو و خطا کا امکان ہے، ارسطو جیسے مشہور فلسفی نے خدا کی قدرت و قوت کو محدود مانا ہے اور سہو و خطا کا امکان تو مشرکوں نے اپنے خداؤں میں کثرت سے تسلیم کیا ہے، آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ چھوٹی بڑی اچھی بری کوئی سی شے بھی ہو، بہرحال مشیتِ الٰہی سے باہر نہیں۔

وفی الاٰیة دلیل علیٰ ان الحوادث تابعة لمشیّة اللّٰه تعالیٰ خیرا کانت او شرًّا ایمانًا او کفرا۔ (روح)

اللّٰه یفعل۔ اللہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ بہ مقتضائے قدرتِ کاملہ۔

ما یُرید۔ اللہ جو چاہتا ہے، وہ بہ مقتضائے حکمتِ بالغہ۔

۹۷۶ (اللہ کی راہ میں، مصارفِ خیر میں)

رَزَقْنٰكُمْ۔ ضمیرِ متکلم لاکر اور رزق کو اپنی جانب منسوب کرکے صاف بتادیا کہ مال و دولت جو کچھ بھی بندوں کے پاس ہے، خود سے نہیں، خدا ہی کا بخشا ہوا عطیہ ہے، اسی کی دین ہے، اور اسی کو حق حاصل ہے کہ جن کاموں میں چاہے اُن کے صَرف کرنے کا حکم دے دے۔

انفقوا۔ انفاق سے یہاں مراد انفاقِ واجب لی گئی ہے کہ وعید اُسی کے ترک پر ہوسکتی ہے۔

قالوا اِن المراد بالانفاق ھنا الانفاق الواجب لِاَنّ الکلام یتضمن الوعید علی الترك وھو لا یکون اِلّا علی ترك الواجب (المنار)

۹۷۷ یعنی روزِ قیامت مطلب یہ ہے کہ مصارفِ خیر میں صرف کرنے اور نیکیاں جمع کرنے کا موقع جو کچھ ہے اسی دنیا میں ہے وقت کی قدر کرو، فرصتِ عمر کو نعمت سمجھو۔

۹۷۸ (اپنے حق میں)

ظلم کے اصل معنی وضع الشئ فی غیر محلہٖ (کسی شے کو اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنے) کے ہیں۔

اللہ یا اس کے قانون کو نہ ماننے سے بڑھ کر کون سا ظلم انسان کا اپنے حق میں ہوگا۔

لا بیع۔ جاہلی اور نیم جاہلی قوموں کی گمراہیاں ایک سے بڑھ کر ایک عجیب رہی ہیں، مشرک قومیں تو سرے سے روزِ جزا ہی کی قائل نہیں، اہلِ کتاب نے اس کے وقوع کو مانا، تو اس میں بھی یہ بخیں لگا دیں کہ وہاں بھی دنیا کی طرح لین دین ہوسکے گا،

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اللہ (وہ ہے کہ) کوئی معبود اس کے سوا نہیں۔ ۹۷۹ وہ زندہ ہے ۹۸۰ جو سب کا سنبھالنے والا ہے۔ اُسے نہ اونگھ آسکتی ہے نہ نیند ۹۸۱

کوئی کسی سے نیکیاں خریدلے گا، کوئی کسی کے ہاتھ اپنی بدیاں فروخت کردے گا، وقس علیٰ ہٰذا۔ قرآن نے اس ساری لغو خیالی کا خاتمہ کردیا

ولا خلّة۔ خُلّة۔ گہری، جگری دوستی کو کہتے ہیں۔ مقصود ایسی دوستی کے نافع ہونے کا ابطال ہے جو ایمان کے بغیر کام دے سکے اور کفر کے مجرم کو نجات دلا سکے۔ اہل کتاب نے سمجھ رکھا تھا کہ یہاں کی نسبی رشتہ داریوں اور ذاتی خانگی دوستیوں سے وہاں بھی کام چل جائے گا۔ جب گہری اور دلی دوستی کے نافع ہونے کی نفی ہوگئی تو محض زبانی و رسمی ظاہری تعلق کا لاحاصل ہونا تو اور زیادہ ظاہر ہے۔

ولا شفاعة۔ پہلی دو گمراہیوں کا بھی تعلق مسیحیوں سے تھا اور یہ تیسری گمراہی تو مسیحیت کے خصوصیات میں سے ہے۔ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ ابن اللہ کی حیثیت شافعِ مطلق کی ہے۔ انسان کے قالب میں آنحضرت اسی لئے تو جنم لیا تھا کہ اپنی جان کا فدیہ سب گنہگاروں کی طرف سے دے کر اور رب کی طرف سے صلیب پر اپنے خون کا چڑھاوا چڑھا کر قیامت میں شافعِ مطلق کی حیثیت سے ظاہر و نمودار ہوں، اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھے گی۔ ہمارے ہاں کے عام واعظوں اور نعت گو شاعروں نے شفاعتِ مصطفوی پر حد سے زیادہ زور دینا جو شروع کیا ہے، یہ صاف مسیحیت سے تاثر کا نتیجہ ہے۔

الکافرون۔ یہاں وہی کافر مراد ہیں جو مذکورۂ بالا قسم کے عقائد کفریہ میں مبتلا ہیں۔

بعض فقہا نے لکھا ہے کہ آیت سے بخیل کی مذمت نکلتی ہے، جو لوگ ضروری مصارفِ خیر میں خرچ نہیں کرتے وہ اپنے کو اہل کفر اور اہلِ جہنم کے حکم میں لا رہے ہیں۔

ایک تابعی سے یہ قول بھی منقول ہے کہ خوب ہوا جو اللہ نے کافروں کو ظالم بتایا، ظالموں کو کافر نہیں قرار دیا۔

قال عطاء بن ابی رباح والحمد للّٰہ الذی قال والکافرون ھم الظالمون ولم یقل والظالمون ھم الکافرون (قرطبی۔ کبیر)

۹۷۹ (نہ بڑا نہ چھوٹا، نہ اصلی نہ ظلّی، نہ خدا نہ خدازادہ)

خدا کے نفسِ وجود کے قائل تو جاہلی مذاہب بھی ہوئے ہیں، البتہ وہ اس معبودِ اعظم (ہندوؤں کی اصطلاح میں ایشور) کے علاوہ تحتانی معبودوں اور دیوتاؤں کے بھی قائل رہے ہیں، یہ تعلیم اسلام ہی کی ہے کہ اس ایک خدا کے سوا کسی اور خدا کا سرے سے وجود نہیں، یہ نہیں کہ وہ تو معبودِ اعظم ہے باقی چھوٹے چھوٹے معبود اور بھی موجود ہیں۔ عیسائی بھی چونکہ شرک میں مبتلا ہو چکے تھے اس لئے ان کے مقابلہ میں بھی توحیدِ کامل کے اثبات اور پھر غیر اللہ کی اُلوہیت کی نفی کی اس قدر ضرورت تھی۔

یہ آیت آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے، اس کی برکتوں اور فضیلتوں سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو، احادیث میں اس کے فضائل بہ کثرت وارد ہوئے ہیں، اس کی معنویت اور جامعیت بھی اتنی نمایاں اور اس درجہ کی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی ہیں، بیگانے (جیسے سیل مترجمِ قرآن مجید) اور معاندین (جیسے میور اور وہیری) نے بھی بے ساختہ اس کی داد دی ہے۔

روایتوں میں آیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے۔

ھٰذہ اٰیة الکرسی سیدة ای القراٰن واعظم اٰیة (قرطبی) ھٰذہ اٰیة الکرسی ولھا شان عظیم (ابن کثیر)

۹۸۰ اَلْحَيُّ۔ وہ مستقلاً زندہ ہے، وہ ازلی اور ابدی ہے، صفتِ حیات اس کی جزوِ ذات ہے، موت یا عدمِ حیات اس پر نہ پہلے کبھی طاری ہوئی اور نہ آئندہ کبھی طاری ہو سکتی ہے۔

الحی فی نفسه الذی لایموت ابداً (ابن کثیر)

تو کیا کوئی قوم ایسی بھی ہوئی ہے جس نے اپنے معبود کی ایسی کھلی ہوئی اور موٹی صفت میں بھی شبہ کیا ہے؟

ایک نہیں متعدد قوموں نے شک و اشتباہ کیا معنی انکار تک اس صفت کا کیا ہے۔ بحر روم کے ساحل پر متعدد قومیں اس عقیدہ کی گزری ہیں کہ ہر سال فلاں تاریخ پر اُن کا خدا وفات پا جاتا ہے، اور دوسرے دن از سر نو وجود میں آجاتا ہے، چنانچہ ہر سال اس تاریخ کو خدا یا بعل کا پتلا بنا کر جلایا جاتا تھا، اور دوسری صبح اس کے جنم کی خوشی میں رنگ رلیاں شروع ہو جاتی تھیں۔

ہندوؤں کے ہاں اوتاروں کا مرنا اور پھر جنم لینا اسی عقیدہ کی مثالیں ہیں، اور خود مسیحیوں کا عقیدہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ خدا پہلے تو انسانی شکل اختیار کر کے دنیا میں آتا ہے، اور پھر صلیب پر جا کر موت قبول کر لیتا ہے۔ مسلمان کے گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے شروع ہی سے ایک ازلی، ابدی، باقی و غیر فانی خدا کے عقیدہ سے چونکہ مانوس ہو جاتے ہیں، بڑے ہو کر ان کے خیال ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا کبھی اور کسی حال میں کسی معنی میں اور کسی لحاظ سے حادث و فناپذیر بھی ہو سکتا ہے لیکن آخر آج بھی کروڑوں کی تعداد میں پڑھے لکھے لوگ خدا کی اسی فناپذیری کو اپنا عقیدہ بنائے ہوئے ہیں یا نہیں؟

اَلْقَیُّوْمُ۔ مسیحیوں نے جس طرح حضرتِ حق کی صفتِ حیات کے باب میں سخت ٹھوکر کھائی ہے، اُسی طرح صفتِ قیومیت سے متعلق بھی عجیب گمراہی میں پڑ گئے ہیں، اُن کا عقیدہ ہے کہ جس طرح بیٹا بغیر باپ کی شرکت و آمیزش کے خدا نہیں، اسی طرح باپ پر بھی بغیر بیٹے کو شریک کئے خدا کا اطلاق نہیں ہو سکتا، گویا جس طرح نعوذ باللہ مسیح ابن اللہ خدا کے محتاج ہیں، اسی طرح خدا بھی اپنی خدائی کے اثبات کے لئے مسیح کا محتاج ہے، صفتِ قیومیت کا اثبات کر کے قرآن نے اسی مسیحی عقیدہ پر بھی ضرب لگائی ہے۔

قیوم۔ وہ ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ دوسروں کے بھی قیام کا سبب و باعث ہے، اور سب کو سنبھالے ہوئے ہے، اس کے سب محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

هو القائم بنفسه مطلقاً لا بغیره وهو مع ذلك یقوم به کل موجود حتی لا یتصور وجود شیء ولا دوام وجوده الا به (نهایه۔ تاج) القیوم القائم الحافظ لکل شیء والمعطی له مابه قوامه (راغب)

وہ وہ ہے، جس کی کوئی ابتداء ہی نہ ہو، شروع ہی سے موجود ہو۔

الذی لا بدء له (اقرب)

ائمۂ تفسیر نے بھی اسی معنی میں لیا ہے۔

القیم لغیره وکان ابن عمر یقرأ القیام فجمیع الموجودات مفتقرة الیه وهو غنی عنها ولا قوام لها بدون امره (ابن کثیر) وقال الحسن معناه القائم علی کل نفس بما کسبت حتی یجازیها بعملها من حیث هو عالم بها لا یخفی علیه شیء منها وقال ابن عباس معناه الذی لا یحول ولا یزول۔ (قرطبی)

یہ بھی روایتوں میں آیا ہے کہ جسے اسم اعظم کہا جاتا ہے، وہ یہی الحی القیوم ہے۔

وقد قیل ان هذا الاسم هو اسم الله الاعظم۔ (قرطبی)

**۹۸۱** (جیسا کہ مُشرک قوموں نے سمجھ لیا ہے)

جاہلی مذہبوں کے دیوتا نیند سے جھوم بھی جاتے ہیں، اور سونے بھی لگتے ہیں، اور اسی غفلت کی حالت میں ان سے طرح طرح کی فروگزاشتیں ہو جاتی ہیں، مسیحیوں اور یہود کا بھی عقیدہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چھ روز میں آسمانوں

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ

اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے ۹۸۲ کون ایسا ہے جو اس کے سامنے بغیر اس کی اجازت کے

عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ

سفارش کرسکے ۹۸۳ وہ جانتا ہے جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اس سب کو ۹۸۴

اور زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن اُسے سستانے اور آرام لینے کی ضرورت پڑ گئی، اسلام کا خدا دائم، بیدار، ہمہ خبردار، غفلت، سستی اور تھکن سب سے ماوراء خدا ہے۔

۹۸۲ لَهٗ کو مقدم کردینے سے معنی میں زور اور تاکید آگئی اور مفہوم حصر کا پیدا ہوگیا، یعنی ساری کائنات کی ملکیت و مالکیت صرف اسی کی ہے کوئی اس صفت میں اُس کا شریک نہیں، اور اس کی ملک سے مخلوق کا کوئی گوشہ کوئی شعبہ خارج نہیں، مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو کائنات کا مالک مانا بھی ہے تو اندھے لولے، لنگڑے ناقص قسم کا، اسلام نے آکر اس پر زور دیا کہ صحیح رشتہ و تعلق خالق کا مخلوق کے ساتھ ملکیتِ کامل ہی کا ہے لَهٗ میں ل متفقہ طور پر ملک کے معنی میں ہے۔

واللام للملك (بحر۔نہر) اى بالملك فهو مالك الجميع وربه۔ (قرطبی)

۹۸۳ من ذا الذی۔ کون ایسا ہے؟ استفہام انکاری ہے، یعنی کوئی ایسا نہیں۔

یشفع عندہ۔ شفاعت پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا، مسیح کی شفاعت کبریٰ مسیحیوں کا ایک عقیدۂ خصوصی ہے، مسیح کے لئے ان کے ہاں نہ صرف بالاستقلال شفاعت ثابت ہے، بلکہ تخلیق کائنات بھی خدا نے (نعوذ باللہ) اپنے اسی فرزند کے واسطے سے کی ہے، قرآن مجید مسیحیوں سے مخاطبہ کے وقت اُن کے مخصوص مرکزی عقائد کفارہ و شفاعت وغیرہ پر برابر ضرب لگاتا جاتا ہے۔

بِاِذْنِهٖ۔ یہ تصریح بھی بہت ضروری تھی، مسیحیوں نے جہاں نجات کا دار و مدار شفاعت پر رکھا ہے وہیں اس کے برعکس بعض مشرک قوموں نے خدا کو قانونِ مکافات (ہندی میں "کرم") کے ضابطوں میں ایسا جکڑا ہوا سمجھ لیا ہے کہ اس کے لئے معافی کی اور اس کے ہاں شفاعت کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے، اسلام نے توسط و اعتدال کی شاہراہ اختیار کرکے بتایا کہ نجات کا مدار کسی شفاعت پر ہرگز نہیں، البتہ اللہ نے اس کی گنجائش رکھی ہے، اور اپنی اجازت کے بعد مقبول بندوں کو دوسروں کی شفاعت کا (جو درحقیقت دُعا کی ہی ایک صورت ہے) موقع دے گا اور ان کی دعائیں قبول کرے گا، اور مقبولین کے سب سے بڑے رئیس و سردار ہمارے رسول کریم صلعم ہیں۔

اہلِ سنّت نے مسئلہ شفاعت کا استنباط اسی آیت اور ایسی ہی آیتوں سے کیا ہے۔

وتقرر فی هذه الآية ان الله ياذن لمن يشاء فی الشفاعة وهم الانبياء والعلماء والمجاهدون والملائكة وغيرهم ممن اكرمهم وشرفهم الله ثم لا يشفعون الا لمن ارتضى۔ (قرطبی)

۹۸۴ یعنی حاضر و غائب، محسوس و معقول، مدرک و غیر مدرک، سب کا علم اُسے پورا پورا حاصل ہے۔

ما كان قبلهم وما كان بعدهم۔ (کشاف)

نام یہاں آگے اور پیچھے صرف دو ہی سمتوں کا لیا گیا ہے لیکن مراد جمیع جہات ہیں اور یہ کنایہ عربی زبان میں عام ہے۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ

اور وہ اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو بھی گھیر نہیں سکتے ۹۸۵ سوا اس کے کہ جتنا وہ خود چاہے ۹۸۶ اس کی کرسی نے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

سما رکھا ہے آسمانوں اور زمین کو ۹۸۷

ھٰذا کنایۃ عن احاطۃ علمہ تعالیٰ بسائر المخلوقات من جمیع الجھات ۔ (بحر)

ایدیھم اور خلفھم میں ضمیر جمع یا تو من ذا کے مدلول کی جانب ہے جس میں انبیاء اور ملائکہ سب آگئے اور یا فی السّمٰوات والارض کی جانب ہے اور ضمیر مذکر اس لئے کہ مراد زمین وآسمان کے اہلِ عقل سے ہے۔

الضمیر لما فی السّمٰوات والارض لِاَنّ فیھم العقلاء او لما دل علیہ من ذا من الملائکۃ والانبیاء (کشاف) الضمیران عائدان علیٰ کلّ من یعقل ۔ (قرطبی)

صفاتِ باری میں حیات کا، قیّومیت کا، مالکیت کا، اثبات اوپر ہو چکا ہے اب بیان اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ حق تعالیٰ کی صفتِ علم بھی کامل ہے، سعی وسفارش کا ایک موقع دنیا میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جس حاکم یا مالک کے سامنے مقدمہ پیش ہو، اس کا علم محیط وکامل نہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ خارجی ذرائع سے اس کے معلومات میں اضافہ کیا جائے اور اس کے علم کو کامل کر دیا جائے، یہاں یہ بتلا کر کہ اللہ کا علم خود ہر خفی وجلی پر حاوی ہے گویا یہ بتا دیا کہ اس کے علم پر کسی اضافہ کرنے اس کے آگے کسی کی خوبیاں جتلانے، اسے کسی نامعلوم شے پر آگاہ کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں، اور اس طرح مسیحی عقیدۂ شفاعت پر ایک اور ضرب لگی۔

۹۸۵ کون نہیں گھیر سکتے؟ وہی مخلوقات جن میں پیر، پیمبر، فرشتے سب شامل ہیں۔

من علمہ۔ علم سے مراد معلوماتِ الٰہی سے ہے۔

ای من معلوماتہٖ (کشاف) العلم ھنا المعلوم (بحر)

بڑے سے بڑے صاحبِ علم ومعرفت کے بھی بس میں یہ نہیں کہ معلوماتِ الٰہی میں سے کسی ایک ہی چیز کی کنہ وحقیقت سے پوری طرح واقف ہو جائے، محدود ولامحدود کے علم کا مقابلہ ہی کیا۔

۹۸۶ (اپنی حکمت ومصلحت کے موافق)

یہاں اس حقیقت کا بیان ہے کہ بندہ بڑے سے بڑا بھی عالم وعارف ہو، بہرحال اس کا علم محدود ہوتا ہے اور عین مشیتِ الٰہی کے ماتحت ومطابق۔

ومعنی الآیۃ لا معلوم لاحدٍ الّا ما شاء اللہ ان یعلمہ۔ (قرطبی)

۹۸۷ (تو وہ خود کسی چیز میں کیسے سما سکتا ہے؟)

اس کی کرسئ علم وقدرت تو خود سارے کائنات پر محیط ہے، اس کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، تو وہ آسمان پر عرش پر یا کسی اور وسیع سے وسیع چیز کے بھی اندر کیسے سما سکتا ہے؟ وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے، اُسے کون گھیر سکتا ہے؟ اس صفت کے اثبات سے ان مشرکوں کے بھی عقیدہ کی تردید ہو گئی جو خدائے تعالیٰ کے مجسم ہونے اور کسی مکان میں اس کے محدود ومقید ہونے کے قائل ہیں۔

## وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾

اور اس پر ان کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ۹۸۸ اور وہ عالی شان ہے عظیم الشان ہے ۹۸۹

کرسی سے مراد علمِ الٰہی لی گئی ہے ابن عباسؓ صحابی سے یہی معنی منقول ہیں اور متعدد اہل تفسیر نے اس کی پیروی کی ہے۔

کرسیہ ای علمہ (ابن جریر عن ابن عباسؓ) الکرسی ھو العلم (کبیر) قیل مجاز عن العلم (روح) ای علمہ ومنہ الکراسۃ لتضمنھا العلم (مدارک) ای وسع علمہ وسمی العلم کرسیا تسمیۃ بمکان الذی ہو کرسی العالم (کشاف)

کرسی کے عام متعارف معنی وہی ہیں جو اُردو میں بھی چلے ہوئے ہیں لیکن حق تعالٰے کے سلسلے میں کہیں وہ معنی تھوڑے ہی مراد ہو سکتے ہیں، کیا نعوذ باللہ اللہ تعالٰے بھی کوئی جسم رکھتا ہے، جو وہ اس عام معنی میں کرسی نشین ہو گا۔

ولا کرسی فی الحقیقۃ ولا قاعد۔ (بیضاوی)

کرسی کے اصلی معنی علم ہی کے ہیں اور کراسۃ جو علمی صحیفوں کے لئے آتا ہے، وہ اسی اصل سے ماخوذ ہے، اور اہل لُغت نے کرسی کے جہاں ایک معنی سریر کے دیئے ہیں، وہاں دوسرے معنی علم کے کئے ہیں۔

الکرسی السریر والعلم (قاموس) اصل الکرسی العلم ومنہ قیل للصحیفۃ یکون فیھا علم مکتوب کراسۃ (ابن جریر) الکرسی العلم یقال ھو من اھل الکرسی ای العلم (اقرب)

کرسی کے دوسرے معنی قدرت وحکومت کے بھی ہیں، چنانچہ یہاں بھی بہتیرے اہلِ لغت و اہل تفسیر اسی طرف گئے ہیں

وقیل کرسیہ ملکہ (راغب) المراد من الکرسی السلطان والقدرۃ والملک (کبیر) قیل کرسیہ ملکہ وسلطانہ والعرب تسمی الملک القدیم کرسیًّا (معالم) قال قوم کرسیّہ قدرتہ التی یمسک السموات والارض (کشاف)

وسع کرسیہ السموات والارض۔ اُس کی کرسیِ علم و مملکت نے سارے عالم کو گھیر رکھا ہے۔

ای وسع ملکہ تسمیۃ بمکانہ الذی ھو کرسی الملک۔ (کشاف)

غرض یہ کہ اس کی کرسیِ علم ہو یا کرسیِ حکومت وہ جمیع کائنات کو احاطہ کئے ہوئے ہے، بڑی چھوٹی لطیف وکثیف، جلی وخفی، ہر چیز اُس پر عیاں وروشن ہے، اور ہر چیز اُس کی محکوم وتابع۔

۹۸۸ (کہ اس سے تھک کر اُسے کسی شریک یا مددگار کی ضرورت پڑے)

مشرک قوموں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اتنے وسیع اور لق ودق سلسلۂ موجودات کی نگرانی تنہا خدا کہاں تک کر سکتا ہے، اس لئے نعوذ باللہ وہ کبھی غافل بھی ہو جاتا ہے، اور یہ سارا کاروبار سنبھالنے کے لئے اُسے ضرور شریکوں اور مددگاروں کی بھی پڑ گئی ہے، خود یہود اور مسیحیوں کا عقیدہ خدا کے ستانے اور آرام لینے کے باب میں بھی اسی تخیل کی طرف مُشیر ہے۔

حفظھما میں تثنیہ کے صیغہ سے مراد ہے ایک طرف سلسلۂ سماوات اور دوسری طرف زمین، اور اسی لئے قرآن مجید نے ہر ایسے موقع پر صیغہ بجائے جمع کے تثنیہ کا استعمال کیا ہے۔

۹۸۹ یعنی ایک طرف ہر نقص سے ماوراء، ہر عیب سے بالاتر، دوسری طرف تمام صفاتِ کمال کا جامع۔ عَلِیٌّ اور عَظِیمٌ دونوں صفتوں کا لانا معنی سے خالی اور بےکار نہیں، عُلُو کا حاصل ہے تمام صفاتِ نقص کی نفی، سارے عوارضِ حدوث سے برتری۔

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَىِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ

دین میں کوئی زبردستی نہیں ۹۹۰ ہدایت تو گمراہی سے صاف صاف کھل چکی ہے ۹۹۱ سو جو کوئی طاغوت

بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ

سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لے آئے اس نے ایک بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا ۹۹۲

لا یحل المتعالی عن الاشباہ والانداد والامثال والاضداد وعن امارات النقص ودلالات الحدوث (روح) العلی الذی لیس فوقہ شئی فی المرتبۃ والحکم قیل بمعنی فاعل (نہایہ) العلی الرفیع فوق خلقہ، المتعالی عن الاشباہ والانداد (معانی۔ بحر)

اور عظمت کا حاصل ہے تمام صفات کمال کا اثبات اور ایسی ذات کا ایجاب کہ نہ اس کے مرتبہ کی انتہا ہو اور نہ اس کی کنہ و حقیقت تک رسائی ہو سکے

ای ذو العظمۃ وکل شئی بالاضافۃ الیہ حقیرا (روح) ھو الذی جاوز قدرہ وقیل عن حدود العقول حتی لا تتصور الاحاطۃ بکنھہ وحقیقتہ (نہایہ) العظیم الذی لا منتہی لعظمتہ ولا یتصور کنہ ذاتہ (روح) العظیم ذو العظمۃ الذی کل شئی دونہ فلا شئی اعظم منہ (بحر) الکبیر الذی لا شئ اعظم منہ (معالم)

گویا ان دو صفات کے اندر عظمت و کمال کے سلبی و ایجابی پہلو سارے کے سارے آگئے، اور ہر اس ضلالت کی تردید ہو گئی جو شرک فی الصفات سے پیدا ہو سکتی ہے۔

۹۹۰ دین کا تعلق اصلاً عقیدۂ قلب سے ہے اور قلب پر جبر و اکراہ کی گنجائش ہی نہیں، اسی لئے گویا یہاں اس حقیقت کا اعلان ہے کہ ایمان کا تعلق اپنے ارادہ و اختیار سے ہے، جبر و اضطرار سے نہیں۔

ای لم یجبر اللہ امر الایمان علی الاجبار والقسر ولکن علی التمکین والاختیار (کشاف) ولولا ذلک لما حصل الابتلاء ولبطل الامتحان والی ذلک ذھب القفال (روح) قال ابو مسلم والقفال معناہ انہ مابنی تعالی امر الایمان علی الاجبار والقسر وانما بناہ علی التمکین والاختیار۔ (بحر)

آیت کے اس ٹکڑے سے ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آگئی، اس کے بعد لوگوں کو جبریہ مسلمان بنانے کی گنجائش نہ رہی

قاعدۃ کبری من قواعد دین الاسلام ورکن عظیم من ارکان سیاستہ فھو لا یجیز اکراہ احد علی الدخول فیہ (المنار)

جزیہ کو کم فہموں نے اسلام میں جبر کی اصل سمجھا ہے حالانکہ اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ جزیہ کی مشروعیت عین اس کے برعکس خود اس کی دلیل ہے کہ مقصودِ اصلی قانونِ اسلام و حکومتِ اسلام کو غالب رکھنا ہے نہ کہ فرداً فرداً ہر کافر کو بہ جبر مسلم بنانا۔ مفسر تھانویؒ نے کہا ہے کہ اکراہ کی نفی سے مقصود اکراہ فی نفسہ کی نفی ہے، اس لئے کہ اگر مرتد پر یا کافر حربی پر بوجہ خفائے دلیل کے اکراہ کیا جائے جیسا شریعت میں حکم ہے تو یہ نفی اکراہ فی نفسہ کے معارض نہیں اور یہ اکراہ بھی صورتِ دین پر ہوگا نہ کہ حقیقتِ دین پر، کیونکہ قلب پر اطلاع کا کوئی یقینی طریق نہیں اور اس نفی اکراہ سے نہی عن الاکراہ بھی لازم آگئی، اس لئے بعض نے نہی کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے یعنی دین میں اکراہ مت کرو۔

ای لا تکرھوا احدا علی الدخول فی دین الاسلام فانہ بیّن واضح جلی دلائلہ وبراھینہ

لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ

جس کے لئے کوئی شکستگی نہیں ۹۹۳؎ اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے ۹۹۴؎ اللہ ان لوگوں کا حمایتی ہے

اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۬ؕ

جو ایمان لے آئے ۹۹۵؎ وہ انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے ۹۹۶؎

لایحتاج الی ان یکرہ احد علی الدخول فیہ (ابن کثیر) ای ھو من وضوح الدلائل والحجج بحیث لایکون فیہ اکراہ بل یجب الدخول فیہ بانشراح صدر واختیار۔ (نہر)

الدّین۔ دین سے مراد مطلق دین نہیں کہ کوئی سا بھی ہو، بلکہ دینِ اسلام ہے۔

والدّین ھنا ملّۃ الاسلام واعتقادہ۔ (بحر)

۹۹۱؎ اور دلائل و شواہد نے دونوں کے درمیان علانیہ امتیاز پیدا کر دیا ہے۔

الرُّشد۔ یعنی راہِ اسلام۔

الغیّ۔ یعنی طریق کفر۔

یعنی اب تو کفر و اسلام کے درمیان بہت کھلے ہوئے فرق و امتیازات پیدا ہو چکے ہیں، اب کسی پر خفا و التباس کی کوئی وجہ نہیں۔

۹۹۲؎ یعنی جس نے دینِ اسلام قبول کر لیا اور جو باطل کی پیروی سے باز آ گیا اسے دنیا و آخرت میں ایک بڑا زبردست سہارا ہاتھ آ گیا۔

الطّاغوت۔ طاغوت کا صحیح ترجمہ مشکل ہی ہے اردو میں اس کے لئے قریب ترین لفظ شیطان کا ہو سکتا ہے، اپنے عام و وسیع معنی میں عربی میں اس کا اطلاق ہر معبودِ باطل اور ہر سرکش پر ہوتا ہے۔

قال ابو اسحٰق کل معبود من دون اللہ جبتٌ وطاغوتٌ (لسان) الطاغوت عبارۃ عن کلّ معتد ومعبود من دون اللہ۔ (راغب)

مالک بن انس اور بعض اور اہلِ تفسیر بھی اسی عموم کی طرف گئے ہیں۔

قال مالک ابن انس کل ما عبد من دون اللہ تعالیٰ (روح) مردۃ من الجن والانس وکل ما یطغی (کبیر) ما عبد من دون اللہ تعالیٰ قالہ الطبری (بحر) وھو کلّ ما تکون عبادتہ والایمان بہٖ سبباً للطغیان والخروج عن الحق من مخلوق یعبد ورئیس یقلد وھوی یتبع۔ (المنار)

۹۹۳؎ (نہ دنیا میں نہ آخرت میں)

بندہ کے فاطرِ کائنات سے صحیح و فطری تعلق ہی کا نام دینِ اسلام ہے، یہ وہ زبردست سہارا ہے جس کے ہاتھ لگ جانے کے بعد زندگی کا ہر مرحلہ آسان ہو جاتا ہے اور ہر عُقدہ کا حل مل جاتا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر آخرت کی بھی منزلیں آسان رہتی ہیں، اس ایک سہارے کے سوا باقی سارے سہارے ناقص، کمزور اور بودے ہیں۔

بعض محققین صوفیہ نے کہا ہے کہ عروۃ الوثقیٰ نسبت مع اللہ ہے وہ حاصل ہو جانے کے بعد منقطع نہیں ہوتی۔

۹۹۴؎ سَمِیْعٌ۔ سننے والا الفاظ کا اور اقوال کا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ

اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے حمایتی طاغوت ہیں جو انھیں روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے

۳۴ ع ۲ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲۵۷)

ہیں ۹۹۷ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے ۹۹۸

عَلِیْمٌ۔ جاننے والا احوال کا اور اعمال کا۔

یعنی اللہ کو ظاہر و باطن، کلّی، جزئی ہر قسم کا علم و اطلاع ہے ــ اللہ کی باخبری و ہمہ علمی مسلمانوں کو ایک معمولی اور موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن جاہلی قوموں میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسی ہیں جو حق تعالیٰ کی صفتِ علم میں بھی شبہہ کر چکی ہیں، یہاں تک کہ بعض جاہلی فلاسفہ یہ بھی کہہ گزرے ہیں کہ خدا کو علم صرف کلیات کا ہے جزئیات کا نہیں ہے، کلام مجید کی اس قسم کی آیتوں کی پوری قدر جب ہی ہوتی ہے، جب دنیا کی جاہلی قوموں کے عقائدِ باطلہ پر نظر ہو۔

۹۹۵ وَلِیُّ۔ ولی کا ترجمہ بھی کسی ایک لفظ سے مشکل ہی ہے، رفیق، دوست، پشت پناہ، سرپرست سب کے مفہوم اس میں شامل ہیں، اور اہلِ تفسیر سے یہ سب معنی منقول ہیں۔

مُحِبّہم ومُتولّی امورھم (بیضاوی) نصیرھم وظہیرھم یتولاھم بعونہ (ابن جریر)

الولی المتکفل بالمصالح (کبیر) محبتھم ومحبھم او متولی امورھم (روح)

اہل ایمان کے بگڑے کام بنانے والا، آڑے وقت میں ان کے کام آنے والا اللہ ہی ہے نہ کہ ابن اللہ یا کوئی دیوی دیوتا، خفی رد مسیحیوں اور مشرکوں کا یہاں بھی کیا گیا۔

بعض صوفیہ نے آیت سے ولایتِ عامّہ کے اثبات پر استدلال کیا ہے۔

۹۹۶ (اور مومنین کے حق میں یہی سب سے بڑی اور کارآمد نصرت و پشت پناہی ہے)

الظلمات سے مراد کفر، انواعِ کفر اور متعلقات و ملحقاتِ کفر ہیں، مثلاً شک و ارتیاب شہوتِ ممنوع میں غلو وغیرہا۔

النور۔ سے مراد ایمان و انوارِ ایمان ہیں، عقل سلیم و ذوق شوق وغیرہا۔

کفر و ظلمات کی قسمیں بے شمار ہیں اس لئے ظلمات کو صیغۂ جمع میں لائے، انواعِ کفر و اسبابِ کفر بہت زائد ہیں، جیسا کہ دو نقطوں کے درمیان منحنی یا ٹیڑھے خط بے شمار ہو سکتے ہیں، لیکن سیدھا خط ایک ہی ہو سکتا ہے، راہ راست ایک ہی ہے اس لئے النور قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی آیا ہے صیغۂ واحد ہی میں آیا ہے۔

۹۹۷ (ترغیب، تحریص و تخویف کے ہر ممکن حربہ سے کام لے کر)

طاغوت۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے، اس کا اطلاق واحد جمع دونوں پر ہوتا ہے، یہاں معنی جمع ہے۔

جب فضا ہی ساری ظلماتی ہو تو ظاہر ہے کہ شیطنت اور بدی کے محرکات کتنے بڑھ جاتے اور ایمان و تقویٰ کے محرکات کتنے گھٹ جاتے ہیں، شیطان بدی کے چہرہ پر طرح طرح کے خوشنما نقاب ڈال، اس کے نام طرح طرح کے خوبصورت رکھ اُسے سامنے لانے لگتا ہے، یہاں تک کہ خلقت انھیں کے ساتھ ہو لیتی ہے، اور جو اہل ایمان و اہلِ تقویٰ ہیں،

# اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ

کیا تو نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی ۹۹۹ جس نے ابراہیمؑ سے ان کے رب کے بارے میں مباحثہ کیا تھا ۱۰۰۰

الٹے وہی نکوبن کر رہ جاتے ہیں، اکبر الہ آبادی ؎

منوی کو بھی بدنہ کہئے ترغیب ہے یہ　　کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن　　اک شور مچا خلافِ تہذیب ہے یہ

**۹۹۸** (اس لئے کہ انھوں نے اپنی قوتِ فیصلہ سے کام نہ لے کر راہِ کفر و ضلالت اختیار کی)

**۹۹۹** (اے مخاطب)

اَلَمۡ تَرَ اِلٰى. عربی ادب میں یہ اُسلوبِ بیان حیرت و استعجاب کے موقع کے لئے ہے، اور وہ بھی پہلوئے ذم لئے ہوئے، جب کبھی کسی کے کسی حیرت انگیز نقص یا عیب کی طرف توجہ دلانا مقصود ہوتا ہے، تو اسے شروع اس طریقہ پر کرتے ہیں جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ "تم نے فلاں کی حرکت دیکھی؟"

وکذٰلک تفعل العرب اذا ارادت التعجب من رجل فی بعض ما انکرت من فعله قالوا ما تری الی هٰذا (ابن جریر) وفی الکلام معنی التعجب ای اعجبوا له (قرطبی) الاستفهام تعجیب (المنار) هی کلمة یوقف بها المخاطب علی تعجب منها ولفظها لفظ الاستفهام (کبیر)

**۱۰۰۰** (منکر و مخالف کی حیثیت سے)

یہ بحث و مناظرہ کرنے والا کون تھا؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کوئی معاصر بادشاہ تھا، یہ تصریحات تو قرآن مجید بلکہ اس آیت کے اندر موجود ہیں۔ مفسرین نے اس موقع پر نمرود کا نام لیا ہے اور چونکہ اس خاص قصہ کا ذکر اہلِ کتاب کی کتاب میں موجود نہیں اس لئے وہ اس روایت ہی کے ماننے میں تامل کر رہے ہیں، حالانکہ قرآن مجید توریت کی اس طرح کی خدا جانے کتنی فروگزاشتوں کی تصحیح کرتا گیا ہے، اتنا تو بہرحال تاریخ توریت اور روایاتِ یہود میں تسلیم ہے کہ نمرود نامی بادشاہ کا وجود تھا، بادشاہ بہت بڑا تھا اور ساتھ ہی سخت ظالم اور مشرک اور آزر اس کا وزیر تھا۔

توریت میں ہے :- "اور کوش سے نمرود پیدا ہوا، زمین پر جبار ہونے لگا، خداوند کے سامنے وہ صیاد و جبار تھا، اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیاد و جبار" (پیدائش ۱۰ : ۸۔۹) "اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا" (۱۔ تواریخ ۱۰ : ۶۰)

اور حسب روایت یہود "یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے آل یافث کو شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہوگیا، اور آزر کو اُس نے اپنا وزیر بنایا اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں نمرود خدا سے بیگانہ ہوگیا، اور بہت سخت قسم کا مشرک ہوگیا" (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد ۹ صفحہ ۳۰۹)

بابل (کلدانیہ) ہی کی تاریخ میں ایک اور بادشاہ کا نام آتا ہے جو بابل کا سب سے پہلا انسانی خدا تھا، بعض مؤرخین نے اُسے نمرود کا مرادف قرار دیا ہے (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۶ صفحہ ۳۴۶)

انیسویں صدی عیسوی کے ثلثِ آخر میں فرنگی مادیت و عقل پرستی اور اس کی تقلید میں ہندوستانی "روشن خیالی"

اَنۡ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۙ

وقف لازم

اس سبب سے کہ اللہ نے اسے بادشاہت دے رکھی تھی ۱۰۱۵ جبکہ ابراہیمؑ نے اس سے کہا ۱۰۱۶ میرا رب تو وہی ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے ۱۰۱۷

اور "نیچریت" کا شدید تقاضہ یہ تھا کہ ان قصوں ہی سے سرے سے انکار کر دیا جائے لیکن جوں جوں خود فرنگی مورخین کے قدم آگے بڑھتے گئے یہ تشکیک و بے اعتقادی بھی ضعیف ہوتی چلی گئی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے سب سے آخری یعنی چودھویں ایڈیشن میں اعتراف ہے کہ نصف صدی پیشتر ان قصوں کو جیسا بے اصل و نامعتبر سمجھ لیا گیا تھا، وہ خیال اب مزید تحقیق سے قائم نہیں رہا، یہاں تک کہ نمرود کے ساتھ مناظرۂ ابراہیمی کا قصہ بھی (جلد ۱۳ ص ۱۶۵)

ربّہٖ میں ضمیر ابراہیم کی طرف ہے لیکن بعض نے الذی حاجّ کی جانب بھی جائز رکھی ہے، اور اس صورت میں ترجمہ ہوگا، "اپنے رب کے باب میں"۔

والضمیر یحتمل ان یعود الی ابراھیم ویحتمل ان یرجع الی الطاغی والاول اظھر۔ (کبیر)

بہرحال قابلِ لحاظ لفظ یہاں رب ہے گفتگو "رب" کے بارے میں تھی "اِلٰہ" کے بارے میں نہ تھی مسئلۂ ربوبیت میں تھی، بابِ اُلوہیت میں نہ تھی۔

**۱۰۱۵** یعنی اُسے وسعتِ سلطنت ہی نے اتنا دلیر، سرکش اور برخود غلط بنا رکھا تھا۔

روایاتِ یہود میں یہاں تک تصریح ملتی ہے کہ وہ اپنی تعظیم بلکہ پرستش خدا ہی کی طرح کراتا تھا، اور اپنے لئے اس نے ایک عرشِ الٰہی تیار کرایا تھا، جس پر اجلاس کیا کرتا تھا (ملاحظہ ہو گنزبرگ GINZBERG کی حکایاتِ یہود LEGENDS OF THE JEWS، جلد اول ص ۱۷۸)

اَنۡ۔ اَن یہاں سببیہ ہے، لِاَن کے معنی میں۔

ای ابطرہ ایتاء الملک وحملہ علی المحاجۃ (بیضاوی)

کلدانیوں کا ملکی اور قومی مذہب خوب خیال رہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے وقت میں اصلاً شمس پرستی تھا یعنی سورج دیوتا کی پوجا، اور یہی سب دیوتاؤں کا سردار تھا، نمرود کلدانی، فرعون مصری کی طرح، اپنے کو اسی خدائے اعظم کا مظہر یا بروز یا اوتار سمجھتا تھا، اور اہلِ توحید کو ملک کا غدار و باغی اور سرکاری مذہب کا دشمن و منکر قرار دیتا تھا۔ رفتہ رفتہ اہلِ توحید کے خدائے واحد سے بھی جلنے لگا تھا، جوزیفس، یہود کا مورخ قدیم اپنی تاریخ آثار یہود میں لکھتا ہے:۔ "وہ لوگوں کی خوشحالی کو خدا کی جانب نسبت دینے سے روکنے لگا، گویا کہ وہ خود قادر علی الاطلاق ہے، وہ کہتا تھا کہ اگر اب کی خدا نے طوفانِ نوح کی طرح دنیا کو ڈبویا تو میں اس سے انتقام لوں گا۔" (باب اول ۴: ۲)

**۱۰۱۶** (اس کے اس سوال کے جواب میں کہ وہ کون سا خدا ہے جس کے تم پرستار ہو؟)

نمرود تو مدعی اپنے خدا ہونے اور مظہرِ خدا ہونے کا تھا، اس نے داعیٔ توحید کو چیلنج دے کر پوچھا کہ وہ کون سا خدا ہے جس کی طرف تم دعوت دے رہے ہو؟ ذرا میں تو اس کے اوصاف سنوں ۔۔۔ مشرک افراد آج بھی بڑے اچنبھے کے ساتھ پوچھا کرتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دیوتا اور فلاں فلاں دیوی کے علاوہ اور ان سے ماوراء آخر خدا ہے کون سا؟ کہاں ہے؟ کیسا ہے؟ اس کے افعال و صفات کیا ہیں؟

قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ

وہ بولا کہ زندگی اور موت تو میں دیتا ہوں ۱۰۰۴ ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے۔

مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِھَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ؕ

تو اُسے مغرب سے نکال دکھا ۱۰۰۵ اس پر وہ جو کافر تھا دنگ رہ گیا ۱۰۰۶

۱۰۰۳ یعنی حیات و موت کی ساری قوتیں اُسی کے ہاتھ میں ہیں، وہی سارے نظامِ ربوبیت کا سرچشمہ ہے، کائناتِ حیاتی کی بقا و فنا کے سارے قانون اور ضابطے آخر میں اسی پر جا کر ٹھہرتے ہیں، کسی بندہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس نظامِ حیاتی و فنائی کو بدل دے یا اس میں کوئی ادنیٰ تصرّف کر دکھائے۔

فقہاءِ مفسرین نے کہا ہے کہ آیت سے مداہنت کا ابطال ہو رہا ہے۔

محققین نے محاجۂ ابراہیمی سے یہ استنباط کیا ہے کہ ضرورتِ دین کے وقت بحث و مناظرہ ہرگز تجرید و تفرید کے منافی نہیں خصوصاً کامل کے لئے، اور علمِ کلام کا سنّتِ انبیاءؑ میں سے ہونا تو بیان سے بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔

وھذہ الأیۃ تدل علی صحۃ المحاجّۃ فی الدین واستعمال حجج العقول والاستدلال بدلائل اللہ تعالیٰ علی توحیدہ وصفاتہ الحسنیٰ (جصاص) تدلّ علی اثبات المناظرۃ والمجادلۃ واقامۃ الحجۃ وفی القرآن والسنّۃ من ھذا کثیر لمن تاملّہ (قرطبی)

اور ایک محقق نے یہ نکتہ بھی خوب نکالا ہے کہ حضرات انبیاءؑ توحیدِ باری میں صرف افعالِ حق سے استدلال کرتے تھے اور ایسی صفات کو پیش نہ کرتے جن سے مذہبِ تشبّہ و تجسّم کے لئے گنجائش نکل سکے۔

تدل علی ان اللہ تعالیٰ لایشبہ بشئ وان طریق معرفتہ ما نصب من الدلائل علی توحیدہ لان انبیاء علیھم السلام انّما حاجّوا الکفار بمثل ذالک ولم یصفوا اللہ تعالیٰ بصفۃ توجب التشبیہ وانّما وصفوہ بافعالہ واستدلوا بھا علیہ (جصاص)

آیت سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ کافر کو بھی جب اُسے سلطنت و اقتدار حاصل ہو، ملک کہنا جائز ہے۔

ھذہ الأیۃ تدلّ علی جواز تسمیۃ الکافر ملکا اذا اٰتاہ اللہ الملک والعزّ والرفعۃ فی الدنیا (قرطبی)

اور قرطبی نے آگے چل کر اس مناظرہ و مجادلۂ حق کی متعدد نظیریں بھی کتاب و سنّت سے پیش کی ہیں۔

۱۰۰۴ نمرود نے موت و حیات کے اسبابِ بعید و خفی کو چھوڑا اور صرف اسبابِ ظاہری و سطحی کو سامنے رکھ کر جواب دیا کہ سامانِ معیشت تو سب میرے ہاتھ میں ہیں، جسے چاہوں روزی دوں اور جسے چاہوں بھوکوں مار ڈالوں، یا کسی اور طریقہ سے اس کی زندگی ختم کر دوں۔

۱۰۰۵ (اگر تو اپنے دعوائے قدرت و تصرّف میں کچھ بھی سچائی رکھتا ہے)

اسی استدلال کو اور زیادہ قریب الفہم بنانے کے لئے موحّدِ اعظمؑ نے یہ دوسری مثال پیش کر دی، آپ نے فرمایا کہ تم تو سورج دیوتا کے قادر و متصرّف ہونے کے قائل ہو تو زیادہ نہیں یہی کر دکھاؤ کہ سورج اپنے ارادہ سے عام سنّتِ الٰہی کے

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ﴿٢٥٨﴾ أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ

اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا ۷۰۰۱ یا (پھر) اس شخص (کے حال پر نظر کی) ۸۰۰۱ جو

وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوشِهَا

ایک بستی سے گزرا تھا اس حال میں کہ وہ (بستی) اپنی چھتوں کے بل گری ہوئی تھی ۹۰۰۱

خلاف ذرا اپنا رُخ ہی بدل دے؟ دوسروں پر قدرت رکھنا الگ رہا، خود اپنے ہی پر ذرا اپنا ارادہ صرف کر دکھائے اور ارادہ بھی اتنا ہلکا کہ صرف رُخ بدل دینے کا۔ کسی خدا کی بے بسی کا منظر اس سے بڑھ کر اور کیا پیش ہو سکتا تھا! حضرت ابراہیمؑ نے استدلال وہی قائم رکھا، صرف مخاطب کی سطحی ذہنیت کا لحاظ کر کے اس کی مثال دوسری پیش کر دی اور فرمایا کہ اچھا کائناتِ حیاتی نہ سہی کائناتِ طبعی ہی کے خدائی نظام میں ایک ادنیٰ تصرف کر کے دکھا دو، نمرود سورج دیوتا کا اوتار تھا، اور سورج کے خدائے اعظم ہونے کا قائل۔ اس کے عقیدہ کے ابطال و تردید میں سورج ہی کو مثال میں پیش کرنا اُس پر بہترین گرفت تھی۔

۶۰۰۱ یعنی عاجز و لاجواب ہو گیا، اس کا جواب کسی مشرک و آفتاب پرست کے پاس ہو کیا سکتا تھا؟ نہ اُس وقت کسی سے بن پڑا، نہ آج کسی سے بن پڑنا ممکن ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ جس ہستی کے متعلق صاحبِ ارادۂ عظیم ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ حقیقۃً تو ارادۂ خفیف سے بھی معرّیٰ ثابت ہو رہی ہے۔!

۷۰۰۱ عاجز و لاجواب ہو جانے کے باوجود وہ ایمان نہ لایا، اور ایمان لاتا ہی کیسے؟ جو لوگ عصہ اور عناد سے کجروی اختیار کئے رہتے ہیں انھیں ہدایت کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔

الظّٰلمین وہی لوگ ہیں جو خلوصِ ذہن کے ساتھ حق و حقیقت پر غور ہی نہیں کرتے اور اپنی ضد و نفسانیت پر قائم رہتے ہیں، آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمانِ مستقیم اور فہمِ سلیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۸۰۰۱ (اے مخاطب!)

آیت کا عطف معنوی ہے آیتِ سابق پر۔ اور تقدیرِ کلام اکثر نحوئین کے نزدیک یہ ہے۔

ارأیت کالذی حاج ابراھیم او کالذی مر علی قریۃ۔ وھو قول الکسائی والفراء وابی علی الفارسی واکثر النحویین

اور دوسری ترکیب یہ بھی مانی گئی ہے: ارأیت مثل الذی مر الخ۔ زمخشری بیضاوی وغیرہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ (کبیر)

۹۰۰۱ یعنی اس کی عمارتیں بالکل منہدم و مسمار ہو چکی تھیں۔

خاویۃ علی عروشھا عربی کا ایک خاص محاورہ ہے، مراد یہ ہے کہ بستی بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی، پہلے چھتیں گریں پھر چھتوں کے اوپر دیواریں۔

بان سقط السقف اولا ثم تھدمت الجدران علیہ (روح) قال السدی یقول ھی ساقطۃ علی سقفھا ای سقطت السقف ثم سقطت الحیطان علیھا واختارہ الطبری (قرطبی) معناہ وھی خالیۃ من السکان واقعۃ علی عروشھا۔ (المنار)

یہ گزرنے والے کون صاحب تھے، اور کس تباہ شدہ بستی سے ان کا گزر ہوا تھا؟

# قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ ھٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۚ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ

وہ کہنے لگا اللہ اس (آبادی) کو اس کے مرے پیچھے کیونکر جلا اٹھائے گا [۱۰۱۰] سو اللہ نے اس (شخص) کو سو سال تک مردہ رکھا پھر اسے جلا اٹھایا [۱۰۱۱]

الذی مرّ۔ مفسرین نے زیادہ تر مُراد حضرت عُزیر نبی سے لی ہے، سلسلۂ اسرائیلی کے ایک مشہور پیمبر یا کاتب توریت گزرے ہیں اُن کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح تھا، ۴۵۷ ق م میں ڈیڑھ ہزار یہود کو ان کی قید اور جلا وطنی سے چھڑا کر فلسطین لائے، بائبل میں اُن کا نام عزرا کاتب یعنی کاتب توریت کی حیثیت سے آتا ہے، ایک صحیفہ بھی اُن کے نام سے منسوب ہے، قتادہ، سُدّی وغیرہ تابعین اسی طرف گئے ہیں، بلکہ یہی قول حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ صحابہ سے بھی مروی ہوا ہے۔

ذکر انہ عزیر (ابن جریر عن قتادۃ) ھو عزیر (ابن جریر عن السدی) المار ھو عزیر کما اخرجہ الحاکم عن علی واسحاق بن بشر عن ابن عباسؓ وعبد اللہ بن سلام الیہ ذھب قتادۃ وعکرمۃ والربیع والضحاک والسدی وخلق کثیر (روح)

دوسرا قول حضرت یرمیاہ نبی سے متعلق نقل ہوا ہے، یہ بھی اسرائیلی سلسلے کے پیمبر ہوئے ہیں، یہ ساتویں صدی قبل مسیح میں تھے اور تاریخ یہود میں آتا ہے کہ انھیں نبوت ۶۲۶ ق م میں ملی تھی، تاریخی اعتبار سے امکان ان کے لئے بھی ہے گو روایۃً ضعیف، حضرت جعفر باقرؒ اور وہبؒ سے روایت انہی کے متعلق ہے۔

قیل ھو ارمیا بن حلقیا وھو المروی عن ابی جعفر والیہ ذھب وھب (روح)

بائبل میں اس سے ملتا جلتا ہوا ایک قصہ حضرت حزقیل نبی سے متعلق درج ہے، جو یرمیاہ نبی کے ہم عصر اور چھٹی صدی قبل مسیح میں تھے، لیکن بائبل میں یہ قصہ بہ صورت واقعہ نہیں، بلکہ کشف یا رؤیا کے طور پر ہے (حزقیل، باب ۳۶ و ۳۷)

قریۃ۔ یہ بستی کون سی تھی؟ نام مختلف شہروں کے لئے گئے ہیں، لیکن اکثریت یروشلم یا بیت المقدس کی طرف گئی ہے، یہ شہر بخت نصر شاہ بابل کے ہاتھوں ۵۸۶ ق م میں پوری طرح تاخت و تاراج ہو چکا تھا، بظاہر یہ واقعہ اسی شہر سے متعلق اس کی تباہی کے بعد قریب ہی زمانہ کا ہے۔

القریۃ بیت المقدس قالہ وھب وقتادۃ والضحاک وعکرمۃ والربیع۔ (بحر)

کالذی میں کٓ مثل کے معنی میں ہے۔

الکاف بمعنی مثل (المنار)

**۱۰۱۰** (قیامت میں)

ھٰذِہٖ۔ اشارہ مُردہ شہر کے مُردہ باشندوں کی جانب ہے۔

المشار الیہ اما نفس القریۃ بدون تقدیر او تقدیر مضاف ای اصحاب ھذہ القریۃ (روح) ای اھل ھذہ۔ (مدارک)

اہل بصیرت کے لئے ہر حسرت ناک منظر ایک درسِ عبرت و معرفت ہوتا ہے، عجب کیا جو خدا کے نبی کا ذہن اپنے پیش نظر منظر سے کائنات کے ہولناک ترین منظر کی طرف منتقل ہوا ہو، اور اس سے انھوں نے ایک درسِ معرفت کا حاصل کرنا چاہا ہو۔

انّٰی یہاں کیف کے مرادف اور کس طرح یا کس کیفیت کے ساتھ کے معنی میں ہے۔

اعتراف العجز عن معرفۃ طریقۃ الاحیاء (کشاف) ای علی ای حال یحیی (روح) من ای طریق وبای سبب (قرطبی)

آخرت میں حشرِ اجساد پر یقین ایک نبی کیا معنی ہر مومن کو ہوتا ہے، سوال سے نبی کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے نفس وقوع میں شبہ ظاہر کیا جائے، وہ صرف اس کی نوعیت جاننے اور کیفیت سمجھنے کے آرزومند تھے۔

**۱۰۱۱** (بہ طور خارقِ عادت)

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِائَةَ

پھر پوچھا تو کتنی مدت (اس حالت میں) رہا اُس نے کہا میں رہا (اس حالت میں) کوئی دن بھر یا اس کا کچھ حصہ ۱۰۱۲ ارشاد ہوا

عَامٍ فَانظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ

فرمایا نہیں بلکہ تو سو سال (کی مدت تک) رہا، اپنے کھانے پینے کی طرف تو دیکھ (کہ اب تک) وہ سڑا گلا نہیں ہے ۱۰۱۳ اور اپنے گدھے کو دیکھ ۱۰۱۴

معجزات یا خوارق پر کوئی عقلی اعتراض اگر کسی ملحد کی طرف سے ہو تو خیر اس کے لئے تو کچھ گنجایش بھی ہے لیکن خدا کے ماننے والے کی طرف سے "عقلی اعتراض" یا اس کے امکان میں گفتگو بالکل بے معنی ہے جب معجزہ کا فاعل خدا تعالیٰ ہے تو وہ قادر مطلق تو جس طرح اپنی عادت یا معمول عام کے اجراء و بقا پر قادر ہے ٹھیک اسی طرح اور بعینہ اسی درجہ میں اس کے ترک و خرق پر بھی! اس کے نزدیک تو یہ اور وہ، ایسا اور ویسا، دونوں بالکل یکساں و مساوی ہیں بلکہ اس ہستی مطلق کے لئے نہ "عادت" و "خلاف عادت" کے معنی ہی کیا؟ یہ موافق عادت و خارق عادت کی اصطلاحیں تو محض بندوں کے علم کے لحاظ سے ہیں، یہ تو ہم نے جس چیز کا بار بار اور متواتر مشاہدہ کیا اُسے عادت الٰہی میں داخل کر دیا، اور جس چیز کو ایسا نہ پایا اُسے خلاف عادت اور خارق عادت سے تعبیر کرنے لگے۔ — لفظ "معجزہ" تو خود ہمارے جہل کا پردہ پوش ہے، حق تعالیٰ کے لئے کون سی چیز معجز ہو سکتی ہے؟ غرض کوئی مدعی شخص کسی بڑے سے بڑے معجزہ کے نفس امکان میں تو زبان کھول ہی نہیں سکتا، گفتگو جو کچھ بھی چلے گی رُویت و روایت معتبر کے لحاظ سے چلے گی، اور یہ بحث ظاہر ہے کہ تمامتر نقلی اور تاریخی ہوگی نہ کہ عقلی، وقوع معجزہ کے راوی اگر معتبر اور شاہد عینی ہیں تو وہ خارق عادت بھی ہمارے لئے ایسا ہی قابل یقین ہوگا جیسا کہ روزمرہ کے عام واقعات ہوتے ہیں، اور پھر جس معجزہ کے راوی خود حق تعالیٰ یا نبی معصوم ہو اس کے باب میں تو ظاہر اور بالکل ظاہر ہے کہ آگے کوئی گفتگو چل ہی نہیں سکتی، کس وقت کس خارق عادت کے ظہور کی کیا کیا حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں، یہ حال بجز حکیم مطلق کے اور کون جان سکتا ہے۔

ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ "موت" سے یہاں متعارف موت مراد نہیں جس میں روح جسم سے الگ ہو جاتی ہے، بلکہ صرف ایک طویل مدت کامل بے حسی اور فقدان شعور سے مراد ہے۔

ان من الموت ما يمتد زمنا طويلا وهو ما يكون من فقد الحس والحركة والادراك من غير ان تفارق الروح البدن بالمرة وهو ما كان لاهل الكهف (المنار)

اور لغت سے بھی اس مفہوم کی تائید ہو جاتی ہے، راغب نے اپنی "مفردات القرآن" میں "موت" کے ضد و معنی "حیات" کے متعدد معنوں کے مقابل دیئے ہیں، اور ان میں "موت" کی یہ قسمیں شامل کی ہیں زوال قوت نامیہ، زوال قوت حاسہ، زوال قوت عاقلہ، حزن مفرط، نوم عمیق وغیرہا الموت کے اصل معنی ہیں ضد الحیاۃ (صحاح) یا زوال الحیات (اقرب) اس سے ظاہر ہے کہ جن جن صورتوں پر حیات یا زندگی کا اطلاق ہے اتنی ہی ان کی مقابل صورتوں پر "موت" کا بھی ہوگا۔ اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے مفردات کے دیئے ہوئے سب معنی نقل کر کے لکھا ہے کہ موت مجازی معنی میں فقر و ذلت و معصیت وغیرہ کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ حدیث نبوی میں بہ سلسلہ ابلیس اولین معصیت پر موت کا اطلاق ہوا ہے۔

وقد يستعار الموت للاحوال الشاقة كالفقر والذل والسؤال والهرم والمعصية وغير ذالك ومنه الحديث اول من مات ابليس لانه اول من عصى۔ (تاج)

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ

اور (یہ سب) اس لئے کہ ہم تجھے ایک نشان لوگوں کے لئے بنائیں ۱۰۱۵ اور ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم انھیں کس طرح ترتیب دیتے

نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ

ہیں اور پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں ۱۰۱۶ پھر جب اس پر (یہ سب) روشن ہوگیا تو اس نے کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز

شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ

پر قادر ہے ۱۰۱۷ اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب ابراہیمؑ نے عرض کی کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح جلائے گا ۱۰۱۸

**۱۰۱۲** یہ جواب اُس بندہ نے اپنے علم و شعور اور اپنے احساس و اندازہ کے مطابق دیا، اور بشری اندازہ و تخمین کی یہ غلطی ذرا بھی حیرت انگیز نہیں، جب دماغ و دل ہی شعور و اندازہ کی مشینوں کی حرکت ہی سرے سے باطل ہوگئی تھی تو کوئی بشر اندازہ کر ہی کیونکر سکتا تھا، اور یوں بھی گھنٹوں اور دنوں بلکہ مہینوں اور برسوں کی مدت کو خواب اور بیہوشی کی حالت میں ہم روز مرہ منٹوں اور سکنڈوں کے اندر سمٹے اور سمٹائے ہوئے آخر دیکھتے ہی ہیں۔

فقہاء مفسرین نے اس جواب سے جوازِ اجتہاد پر دلیل حاصل کی ہے۔

فیہ دلیل جواز الاجتھاد (مدارک)

اور ایسے ظن و تخمین پر اطلاق "کذب" کا نہیں ہوسکتا۔

انما قال ھذا علی ما عندہ وفی ظنہ وعلی ھذا لایکون کاذبا فی ما اخبر بہ (قرطبی) قال ذلک علی حسب الظن ولایکون مواخذا بھذا الکذب۔ (کبیر)

**۱۰۱۳** (اتنی مدت کے باوجود)

اور یہ نظیر ہے اس کی کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کو جتنی مدت تک بھی چاہے محفوظ و سالم رکھ سکتا ہے۔ بشری عقل و فہم مادی مثالوں اور نظیروں کی ہمیشہ حریص رہی ہے اور آج کی "روشن خیالی" اور تجربیت کے سارے مطالبات کا لُبِّ لُباب صرف یہی نظیر کی فراہمی ہے۔

**۱۰۱۴** (جس کی ہڈیاں اس وقت تک باقی تھیں اور گوشت پوست سب خاک میں مل چکا تھا)

جانوروں کے ڈھانچے مدتوں باقی رہتے ہیں بعض بعض ڈھانچے سیکڑوں ہزاروں سال کے بعد سالم محفوظ برآمد ہوئے ہیں۔ حِمار۔ گدھے سے ہندوستان میں تو نہیں لیکن عرب، شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں سواری کا کام گھوڑے ہی کی طرح لیا جاتا تھا، اور اب بھی لیا جاتا ہے توریت اور انجیل دونوں میں گدھے کا ذکر سواری کے جانور کی حیثیت سے بہ کثرت آیا ہے اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت مسیحؑ دونوں کا اس پر سوار ہونا بیان ہوا ہے اس لئے یہاں حضرت عزیرؑ کی سواری میں گدھے کے ذکر پر کوئی حیرت نہ ہونا چاہیے۔

**۱۰۱۵** (اپنی قدرتِ کاملہ کا، یعنی ایک نظیر واقعۂ بعث کی۔)

فاطر کائنات و حکیم مطلق جب کبھی کوئی واقعہ انسانی معیار سے غیر معمولی یا خارق دنیا ظہور میں لانا چاہے

قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ ؕ

ارشاد ہوا کیا آپ کو یقین نہیں ہے ۱۰۱۹؎ عرض کی ضرور ہے لیکن (یہ درخواست) اس لئے ہے کہ قلب کو (اور) اطمینان ہو جائے ۱۰۲۰؎

تو اس سے مقصود کسی مقصدِ اہم ہی پر دلالت کرنا ہوتا ہے۔

۱۰۱۶؎ یعنی اپنے مردہ صد سالہ گدھے کے ڈھانچے کو بچشم خود دیکھ کہ ہم اس کا جوڑ جوڑ بٹھاتے ہیں اور پھر ازسرِ نو روح پھونک کر زندہ کر اٹھاتے ہیں۔

۱۰۱۷؎ (اور جس چیز کو جس طرح چاہے ظہور میں لا سکتا ہے، خواہ اسبابِ عادیہ کے واسطے سے خواہ اسبابِ غیر عادیہ سے)

ان پیمبر پر جب یہ ساری کیفیتیں تجربۃً اور مشاہدۃً گزرلیں تو وہ تر و تازہ جوشِ ایمانی کے ساتھ بے اختیار پکار اٹھے کہ بے شک میرا پروردگار ہر چیز پر قادر ہے اور اب میرا ایمان و اعتقاد بہ مدارج اور بڑھ گیا۔

اَعۡلَمُ۔ علم سے یہاں مراد علمِ مشاہدہ و رویت ہے، ورنہ علم بالدلیل تو پہلے ہی سے حاصل تھا۔

تاویلہ انی قد علمت مشاهدة ما کنت اعلمه قبل ذلك الاستدلال (کبیر) ای انا عالم بهذا وقد رأیته عیانا (ابن کثیر) ای اعلم هذا الضرب من العلم الذی لم اکن اعلمه علی معاینة (قرطبی)

۱۰۱۸؎ (حشر کے دن)

کیف۔ یعنی کسی خاص کیفیت کے ساتھ کسی متعین طریقہ پر۔

فی ای حال او علی ای حال (ابو سعود)

وقوع تو انھیں پوری طرح مسلّم تھا، سوال اس کی صرف کیفیت کے بارے میں کر رہے تھے۔

الاستفهام بکیف انما هو سؤال عن حالة شیٔ موجود متقرر الوجود عند السائل والمسئول... انما هی استفهام عن هیئة الاحیاء والاحیاء متقرر (قرطبی) ای ارنی بعینی کیفیة احیائك للموتٰی۔ (المنار)

محققین نے کہا ہے کہ سوال کے الفاظ سے خود یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ سائل کو کوئی شبہ احیاء موتٰی کے نفسِ وقوع میں نہیں، وہ صرف اس کی کیفیت جاننا چاہتا ہے۔

صوفیہ اہلِ لطائف نے اس قصۂ ابراہیمی سے ذیل کے نکات پیدا کئے ہیں:۔

(۱) اللہ تعالیٰ سے کشفِ مقامات کا سوال موجبِ قبول ہے (۲) مقبولین کو جو مشاہدات ہوتے ہیں ان سے مراتبِ عرفان و کمالاتِ ایقان میں اور ترقی ہوتی ہے (۳) اور پھر ان سے ان کے تقرب و اعزاز حضوری میں اضافہ ہوتا ہے۔

۱۰۱۹؎ سوال سے مقصود یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمانِ کامل کا اقرار خود ان کی زبان سے کرا لیا جائے اور دنیا کو یہ تعلیم بھی مل جائے کہ ایسے سوالات ہمیشہ بے اعتقادی یا فقدانِ ایمان ہی سے نہیں پیدا ہوتے۔

۱۰۲۰؎ (اور علمِ استدلالی علمِ مشاہدہ کی حد تک پہنچ جائے)

ای سألتك لیطمئن قلبی بحصول الفرق بین المعلوم برهانا والمعلوم عیانا۔ (قرطبی)

حضرت ابراہیمؑ عرض کرتے ہیں کہ ایمان کے درجہ تک تو یقین اب بھی حاصل ہے، ہاں صرف یہ چاہتا ہوں کہ مشاہدہ کے بعد اطمینان اور زیادہ حاصل ہو جائے۔

قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ

ارشاد ہوا کہ اچھا چار پرندے لیجئے ۱۰۲۱ء پھر اُنھیں اپنے سے ہلا لیجئے پھر ان میں کا ایک ایک

عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا

حصہ پہاڑ پر رکھ دیجئے ۱۰۲۲ء

ای بالعیان بعد خبر الوحی والبرھان ۔ (المنار)

اس مرتبہ کو اصطلاح میں عین الیقین کہتے ہیں، ورنہ یقین مرتبۂ تصدیق تک تو جسے اصطلاح میں علم الیقین کہتے ہیں ہر مومن کو حاصل ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ جیسے مومنِ اعظم کو کیوں نہ حاصل ہوتا۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایمان ہی بڑھتے بڑھتے اطمینانِ قلب پیدا ہو جاتا ہے اور محققین کہتے ہیں کہ یہ ترقی کبھی مشاہدہ و معائنہ سے ہوتی ہے اور کبھی محض وجدان سے اطمینان یہاں مقابل ہے سکون کے۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عدمِ سکون کی کیفیت ایمان وعرفان کے منافی نہیں اور طمانیت کا جو درجۂ ولایت و تقلید کے مناسب ہے وہ حضرت ابراہیمؑ کو اب بھی حاصل تھا اور آپؑ کو طلب اُس طمانیت کی تھی جو درجۂ نبوت کے مناسب مقام ہو۔

۱۰۲۱ء ان پرندوں کے نام بھی تفسیروں میں نقل ہوئے ہیں لیکن اوّل تو سند کچھ قوی نہیں اور پھر تعیین ہی سرے سے غیر ضروری ہے۔ البتہ اہلِ لطائف واشارات نے ان چار پرندوں سے نکتے خوب پیدا کئے ہیں چنانچہ بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ ان سے اشارہ انسان کے ان چار قویٰ کی جانب ہے جو شاہدۂ حق اور حیاتِ حقیقی سے مانع ہوتے رہتے ہیں اور وہ چار قوتیں یہ متعین کی ہیں:۔ (۱) خود بینی و خود ستائی (حُبِّ جاہ) (۲) افراطِ شہوتِ جنسی (۳) حرص وطمع (حبِّ مال) (۴) طولِ امل یا محبتِ دنیا۔

۱۰۲۲ء (اُن کو ذبح کرکے اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد)

صُرْهُنَّ اِلَيْكَ یعنی ان پرندوں کو پال کر اور اپنے پاس رکھ کر انھیں اپنے سے خوب مانوس کرلیجئے کہ پھر شناخت میں دقت نہ ہو صُرْهُنَّ کا مصدر صور ہے معنی میل کے ہیں، اسی لئے صرھن کی تفسیر عموماً املھن اور وجھھن سے کی گئی ہے۔

ای اضممھن الیک ووجھھن نحوک (ابن جریر) فاملھن واضممھن الیک (کشاف)

فصرھن کے آگے اتنی عبارت محذوف مانی گئی ہے کہ اپنے سے ہلا چکنے کے بعد ان پرندوں کو ذبح کرکے ان کے ٹکڑے پہاڑوں پر رکھ دیجئے قرآن مجید کے اُسلوبِ بلاغت میں اس قسم کے محذوفات و مقدرات کی مثالیں نایاب نہیں، اسی سورۂ بقر کے شروع کے رکوعوں میں ہے فقلنا اضرب بعصاك الحجر (ہم نے حکم دیا کہ اپنا عصا چٹان پر مارو) اور اس کے معاً بعد آتا ہے فانفجرت منه اثنتا عشرة عينا (پس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے) یہاں سب اتنا کلام محذوف مانا ہے کہ موسیٰؑ نے حکم کی تعمیل کی اور عصا کی ضرب چٹان پر لگائی، ایسے محذوفات و مقدرات کی نظیریں اچھے شاعروں کے کلام میں بھی بکثرت ملتی ہیں۔

بعض ائمۂ لغت وتفسیر ادھر گئے ہیں کہ فعل صار یصور اور صار یصیر کے معنی ہی قطع کرنے کے ہیں، اس لئے کسی حذف وتقدیر کے ماننے کی ضرورت ہی نہیں بلکہ آیت کے معنی ہی براہ راست یہی ہیں۔

صار الشئ یصورہ صوراً قطعہ وفصلہ صورۃ صورۃ (تاج) قیل قطعھن صورۃ صورۃ (راغب) قال ابو عبیدۃ معناہ قطعھن والصور القطع (معالم)

علامہ ابن جریر نے جو تفسیر کے ساتھ لغت کے بھی امام ہیں بسط و تفصیل کے ساتھ گفتگو اس پر کی ہے کہ صار یصور اور صار یصیر دونوں کے معنی لغتِ عرب میں قطع کے مشہور و معروف ہیں اور آخر میں لکھتے ہیں:۔ ففی ذالک اوضح الدلیل علی جھل من زعم ان قول القائل صار یصور وصار یصیر غیر معروف فی کلام العرب بمعنی قطع۔

گو اس معنی پر یہ جرح بھی ہوئی ہے کہ جب قطع کرنے کے معنی ہوں گے تو صارہ یصیرہ ہی آئے گا فعل کا صلہ الیٰ نہیں آئیگا۔

صارہ یصیرہ قطعہ وفصلہ صوراً صار یتعدی بنفسہ... اذا کان بھذا المعنی لایتعدی بالی (المنار)

بہرحال حذف مانا جائے تو اور نہ مانا جائے تو، دونوں صورتوں میں اتنے پر بجز ایک ابو مسلم اصفہانی کے سب کا اتفاق ہے کہ مراد یہاں ذبح کرکے پارہ پارہ کرنے ہی سے ہے۔

اجمع اھل التفسیر علی ان المراد بالآیۃ قطعھن (کبیر) کل المفسرین الذین کانوا قبل ابی مسلم اجمعوا علی انہ حصل ذبح تلک الطیور وتقطیع اجزائھا فیکون انکار ذالک انکاراً للاجماع (کبیر) فان کان بمعنی التقطیع فلاحذف او بمعنی الامالۃ فالحذف و قطعھن اجزاءا (نھر) واجمع اھل التفسیر علی ان ابراھیم قطع اجزاءھا (بحر)

ابن عباسؓ صحابی اور حسن بصری، سعید بن جبیر وغیرہ بہ کثرت تابعین اسی طرف گئے ہیں۔

معناہ قطعھن وھو قول ابن عباس وسعید بن جبیر ومجاھد (کبیر) قالہ ابن عباس ومجاھد وضحاک وابن اسحاق (بحر) قال ابن عباس وعکرمۃ وسعید بن جبیر وابو مالک وابو الاسود الدؤلی ووھب بن مُنَبِّہ والحسن والسدّی وغیرھم۔ (ابن کثیر)

اور ابو مسلم کا جو قول آج چودھویں صدی ہجری میں پھر چمکایا گیا ہے اس کی بابت صاحبِ روح المعانی کہتے ہیں: لایخفی ان ھذا خلاف اجماع المسلمین وضرب من الھذیان لایرکن الیہ ارباب الدین۔

صُرْھُنّ۔ کی دوسری قرأت متواتر صِرْھُنّ (بہ کسرِ صاد) کی ہے اور اس قرأت پر تو کھلے ہوئے معنی قطع و تشقیق ہی کے ہوتے ہیں گو اس صورت میں اس کا صلہ الیٰ یا کسی اور حرف کے ساتھ نہیں آتا۔

علی کل جبل یعنی جو پہاڑیاں آپ کے آس پاس ہیں، اُن پر یہ مُراد نہیں کہ روئے زمین پر جتنی بھی پہاڑیاں ہوں سب کو تلاش کرکے سب پر رکھئے۔

المعنی علی کل جبل من الجبال التی بحضرتک (کشاف) العموم فی کل جبل مخصّصٌ بوصفٍ محذوفٍ ای یلیک او بحضرتک قالہ المجاھد (بحر)

منھن جُزْءً۔ یعنی ان کے ملے جلے ہوئے گوشت کا ایک ایک حصہ۔

جُزْءً۔ کے اصلی معنی عربی میں ٹکڑے کے ہیں، جس کا فارسی مرادف پارہ ہے۔

الجزء النصیب والقطعۃ من الشئ (تاج) جزء الشئ مایتقوم بہ جملتہ کاجزاء السفینۃ واجزاء البیت (راغب) جزء بالفتح پارہ پارہ کردن (صراح) وھن اجزاءٌ متفرقات (ابن جریر) ای ربعًا من کل طائر (ابن قتیبہ)

بلکہ امام ابن جریرؒ جن کی نگاہ لغوی اور ادبی نکتوں پر خوب رہتی ہے انھوں نے تو یہ بھی صراحت کردی ہے کہ جزء

ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

پھر ان کو اپنی طرف بلایئے (تو) وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس چلے آئیں گے ۱۰۲۳ اور یقین رکھئے کہ اللہ بڑا زبردست ہے بڑا

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ

حکمت والا ہے ۱۰۲۴ جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ان کے مال کی مثال ایسی ہے ۱۰۲۵ جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ

اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ

اس سے سات بالیاں اُگیں ہر ہر بالی کے اندر سو سو دانے ہوں ۱۰۲۶

اور سہم کے استعمال میں بھی فرق ہے کہ سہم کا اطلاق مسلم حصہ پر ہوتا ہے اور جُزء کا لفظ عام ہے۔

الجزء من كل شيء هو البعض منه كان منقسما جميعه عليه على صحة او غير منقسم فهو بذلك من معناه مخالف معنى السهم لأن السهم من الشيء هو البعض المنقسم عليه جميعه على صحة۔ (ابن جریر)

اور ایسا ہی دوسروں نے بھی کہا ہے۔

وظاهر ثم اجعل على كل جبل منهن جزءًا يدل على ان تلك الطيور جعلت جزءًا جزءًا (بحر) اى قطعة وبعضا

منهن سے پہلے تو مراد چاروں پرندوں کا مجموعہ لینا اور پھر جزءًا سے مراد اِس مجموعہ کا ایک ایک جُز یا ایک ایک (روح) مسلم پرندہ لینا خواہ مخواہ کا تکلف اور ایک غلط قسم کا لغوی اجتہاد ہے صحابیوں اور تابعین کے بعد سے لے کر اس وقت تک جتنے بھی اہلِ تفسیر عربی کا ذوقِ سلیم رکھنے والے ہوئے ہیں سب نے مراد ہر ہر پرند کے ٹکڑے ٹکڑے سے لی ہے۔

جزأهن اجزاءً وجعل على كل جبل منهن جزءًا (ابن کثیر) جزئهن وفرق اجزائهن على الجبال (کشاف)

لیکن چودھویں صدی ہجری کے ایک مصری فاضل نے اس تفسیر کی اچھی خاصی تضعیف یہ لکھ کر کر دی ہے کہ الفاظِ قرآنی سے نہیں نکلتا۔ ولايدل الكلام على ذالك۔ (المنار)

۱۰۲۳ صحیح وسالم اس طرح کہ زندہ ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متفرق و منتشر اجزاء آپس میں مل ملا کر ٹھیک ہو جائیں گے۔

ادْعُهُنَّ۔ یعنی آواز دے کر انھیں اپنی طرف پکاریئے۔

۱۰۲۴ (تو ایسے عزیز و حکیم کے لئے احیاءِ موتیٰ میں دشواری ہی کیا ہے جب بھی وہ اپنی حکمت کے لحاظ سے مناسب سمجھے گا، حشر برپا کر دے گا)

عزیز۔ یعنی ایسا زبردست جو ہر شے پر یکساں قادر ہے، محال و ممکن، اشدّ اور اسہل کی تفریقیں اور تقسیم تو انسان کی قائم کی ہوئی ہیں ورنہ قادرِ مطلق کے ہاں کسی چیز کے اشدّ یا محال ہونے کے کوئی معنی ہی سرے سے نہیں۔

حکیم۔ یعنی باوجود عموم قدرت و اختیارِ مطلق کے وہ کرتا صرف وہی ہے جو عین اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے صاحب "المنار" نے بڑی تفصیلی گفتگو کر کے جمہور مفسرین کے قول کو خلافِ نظمِ قرآنی بتایا ہے اور داد ابو مسلم اصفہانی کی قرآن فہمی کی دی ہے

۱۰۲۵ (اللہ کی نظر میں اور برکت و افزائش اجر کے لحاظ سے)

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ

اور اللہ جسے چاہے افزونی دیتا رہتا ہے ۱۰۲۷ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۰۲۸ جو لوگ

يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا

اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ خرچ کر چکے ہیں اس کے عقب میں احسان و اذیت

مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

سے کام نہیں لیتے ۱۰۲۹ ان کے لئے اس کا اجر ان کے پروردگار کے پاس ہے۔

فی سبیل اللہ۔ یعنی احکام شریعت کے مطابق نیک کاموں میں۔

اَمْوَالَهُمْ۔ اور فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ دونوں کے عموم میں تمام مصارف خیر ان میں آجاتے ہیں۔

۱۰۲۶ (تو جس طرح غلے کے ایک دانہ سے سات سَو دانے پیدا ہو گئے اسی طرح اللہ کار خیر میں صرف کرنے والوں کو ان کے حسن عمل کا اجر سات سَو گنا دیتا ہے)

ایک عام فہم مادّی مثال دے کر یہ سمجھا دیا کہ اس تکثیر اجر پر اتنی حیرت کیوں کی جائے ایسی مثالیں تو مادّیات میں روزمرہ مل جاتی ہیں۔

تجارتی اور کاروباری تلمیحیں تو قرآن مجید میں بہ کثرت ملتی ہی ہیں، زرعی اور کاشتکارانہ تلمیحیں بھی مفقود نہیں۔

۱۰۲۷ (اس کے اجر میں جس حد تک بھی چاہے یا بہ قدر اس کے اخلاص و شفقت کے)

یہ جو نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی لطیف تشبیہ کھیتی سے دی گئی ہے اس سے اہل لطائف نے دو نکتے اور پیدا کئے ہیں: (۱) ایک یہ کہ اپنے مصارف خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہل زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہئے ریا، نمائش، عجب، تکبر، ایذا اور احسان رکھنے سے انھیں برباد نہ کر دیا جائے (۲) دوسرے یہ کہ جس طرح تخم ریزی آبپاشی وغیرہ کے اختلاف سے پیداوار بہ لحاظ محنت و قیمت و نفع مختلف ہوتی رہتی ہے اسی طرح اجر گو مقدار میں برابر ہو تاہم حسن قبول و قرب درجات وغیرہ کی کیفیات میں نیت و اخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

۱۰۲۸ وَاسِعٌ صفت وسعت لا کر یہ بتا دیا کہ اس کے ہاں کمی کس چیز کی ہے؟ سب کو سب کچھ دے سکتا ہے عَلِیْمٌ صفت علم لا کر یہ جتا دیا کہ وہ ہر ایک کی نیت، ظرف، اخلاص وغیرہ کا بھی تو علم کامل رکھتا ہے اور اسی مناسبت سے سب کو دیتا ہے۔

۱۰۲۹ یعنی جس کے ساتھ کچھ سلوک کیا ہے اس پر نہ کچھ احسان رکھتے ہیں اور نہ اسے اپنے برتاؤ سے تکلیف پہنچاتے ہیں۔

حقارت سے پیش آنا بھی تکلیف دہ برتاؤ میں داخل ہے کسی کی کچھ خدمت اپنے سے بن پڑ جائے تو یہ خود اپنے لئے باعث اجر و موجب سعادت ہے نہ یہ کہ اس پر فخر کیا جائے، اور جس کے ساتھ سلوک کیا گیا ہے اسے کسی درجہ میں بھی ذلیل ٹھہرایا جائے

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

اور اُن پر نہ کوئی خوف (واقع) ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۳۰ مناسب بات اور درگزر ایسی خیرات سے

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾

بہتر ہے جس کے عقب میں اذیت ہو ۱۰۳۱ اور اللہ بڑا غنی ہے، بڑا بردبار ہے ۱۰۳۲

قرآن مجید ہی میں "ابرار" کی ایک علامت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ لوگ دوسروں کو کھلائیں پلائیں گے اور ساتھ ہی یہ کہتے جائیں گے انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاءً ولاشکورًا (کہ ہم یہ تمہیں کھلاتے پلاتے خالص اللہ کی راہ میں ہیں، نہ کہ تم سے کوئی معاوضہ لینے یا تم سے شکریہ وصول کرنے)

منًّا۔ منّ کے معنی احسان رکھنے، اپنے احسان کے یاد دلانے کے ہیں۔

المن ذکر النعمة علیٰ معنی التعدید لھا والتقریع بھا۔ (قرطبی)

اذًی۔ اذیٰ اذیت رسانی ہے، اور یہ منّ سے عام تر ہے۔

والاذی السبّ والتشکی وھو اعمّ من المن (قرطبی)

**۱۰۳۰** (قیامت کے دن)

اجرھم عند ربّھم یعنی ان لوگوں کو پورا پورا اجر ملے گا ان کے درجۂ اخلاص کی مناسبت سے۔

اجرھم کے لئے۔ اس کا اجر، قصداً لایا گیا ہے کہ اردو محاورہ میں مفہوم اسی سے ادا ہوتا ہے۔

**۱۰۳۱** یعنی اس قسم کے احسان سے تو کہیں بہتر یہ ہے کہ سرے سے صدقہ دیا ہی نہ جائے، اور نرم الفاظ میں اس سے معذرت کردی جائے۔

قول معروف۔ یعنی معذرت کی نرم بات کہہ دینا۔

ای کلام حسن وردّ علی السائل جمیل۔ (معالم)

مغفرة۔ یعنی سائل یا حاجت مند کی بات کو اس وقت ٹال جانا جب وہ سختی یا بدتہذیبی سے پیش آنے لگے۔

قیل تجاوز عن الفقیر اذا استطال علیه عند ردّہ۔ (معالم)

آیت میں صاف تعلیم ہے کہ صدقہ یا خیرات مقصود بالذات نہیں مقصود اصلاح قلب ہے، اور اس کے بعد دینے والا، لینے والے پر کوئی احسان نہیں رکھتا، بلکہ دینا اپنا فرض سمجھتا ہے بلکہ الٹا لینے والے کا شکر گزار ہوتا ہے کہ اس نے قبول کرکے اس کو ایک بار سے ہلکا کردیا۔

اذیٰ کا لفظ عام ہے، ہر قسم کے آزار کو شامل، زبان سے یا عمل سے احسان جتانا بھی اس میں آگیا۔

خیر۔ ناداری کے وقت نرمی سے جواب دے دینا، اور سائل کی سختی کو پی جانا موجب قرب و اجر ہے اس لئے انھیں خیر سے تعبیر فرمایا۔

ای قول معروف اولیٰ وامثل۔ (قرطبی)

**۱۰۳۲** وہ نہ کسی کے زر و مال کا محتاج، اور نہ ہر اشتعال پر فوری سزا دینے والا۔

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى

اے ایمان والو! اپنے صدقوں کو احسان (رکھ کر) اور اذیت (پہنچا کر) باطل نہ کرو ۱۰۳۳ے جس طرح وہ شخص جو اپنا

كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھاوے کو، اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ہے ۱۰۳۴ے

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا

سو اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک چکنا پتھر ہے جس پر کچھ مٹی ہے پھر اس پر زور کی بارش ہو سو وہ اس کو بالکل صاف کر دے ۱۰۳۵ے

غَنِیٌّ۔ وہ تمہارا مال تمہارے ہی فائدے کے لئے خرچ کراتا ہے، اور جو کوئی کچھ خرچ کرتا ہے وہ اپنے ہی دائمی نفع کے لئے کرتا ہے، کوئی مشرک یا مشرک صفت احمق یہ نہ سمجھ لے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ خود خدا کو دیا جاتا ہے یا یہ کہ خدا ہمارے زر و مال کا محتاج ہے۔

حَلِیْمٌ۔ اس لئے مجرموں اور قانون شکنوں کو سزا فی الفور نہیں دیتا، سائل کی بدتہذیبی غنی کی بددماغی سب کو ایک مدت تک معاف کرتا رہتا ہے۔

۱۰۳۳ے (اور اپنے کو اضافۂ اجر و ازدیاد ثواب سے محروم نہ کر دو)

لَا تُبْطِلُوا۔ ابطال سے یہاں مراد مزید فضل و کرم کا ابطال ہے۔

قیل المراد بالآیة ابطال الفضل دون الثواب۔ (قرطبی)

فقہاء نے لکھا ہے کہ جس طرح صدقہ کا ابطال یہاں حرام و ممنوع قرار دیا گیا ہے اسی طرح کوئی سا بھی نیک عمل ہو اسے باطل کر ڈالنا حرام و ممنوع ہے، چنانچہ نفل نماز کی نیت باندھ کر اسے توڑ ڈالنے کی حرمت و ممانعت اسی قاعدہ کے ماتحت ہے۔

۱۰۳۴ے (اور ایسا شخص صدقہ کے نفس اجر و ثواب ہی کو ضایع کرتے رہتا ہے)

دو صورتیں یہاں الگ الگ بیان ہوئی ہیں، دونوں کا فرق ملحوظ رہے، پہلی صورت میں خطاب اہل ایمان سے ہے نفس صدقہ تو ان لوگوں کا پورا ہو جائے گا لیکن احسان جتانے یا اذیت پہنچانے سے ترقی درجات و اضافۂ اجر سب سلب ہو جائے گا، دوسری صورت میں ذکر اہل کفر کا ہے، یہ جب خدا اور آخرت پر ایمان ہی سے محروم ہیں تو ان کے صدقہ و خیرات سے بہ ظاہر جو کچھ بھی مقصود ہو سب کا حاصل دنیا ہی ہوگا، ایسوں کو اجر کس چیز کا، رضائے الٰہی کی طلب تو کسی درجہ میں بھی ان کے عمل کا جز نہیں۔

رِئَآءَ النَّاسِ۔ انجیل میں بھی اس سے ملتی جلتی ہدایت موجود ہے (متی ۔ ۶ : ۲)

محققین نے لکھا ہے کہ ریاء کی مذمت میں یہ آیت نصِ صریح ہے۔

ایک معیار خدمتِ خلق کا یہ ہے اسے کیا مناسبت اُن لوگوں سے ہے، جو چندے دینے ہی اس غرض سے ہیں کہ اخباروں میں خوب اُن کا ڈھنڈھورا پٹے، اور مجلسوں اور کانفرنسوں میں اُن کے تشکر کے رزولیوشن پاس ہوں!

۱۰۳۵ے (اور وہ ویسا ہی کورا رہ جائے جیسا پہلے تھا)

لَا يَقْدِرُونَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ (۲۶۴)

(ایسے لوگ) کچھ بھی نہ حاصل کر سکیں گے اپنی کمائی سے ۱۰۳۶ اور اللہ کافر لوگوں کو راہ ہدایت نہ دکھائے گا ۱۰۳۷

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ

اور ان لوگوں کی مثال جو اپنا مال رضائے الٰہی کی طلب میں خرچ کرتے رہتے ہیں اور اپنے نفس میں پختگی (پیدا

اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ

کرنے کی غرض سے) ۱۰۳۸ ایک باغ کی طرح ہے جو کسی ٹیکرے پر ہو اور اس پر زور کا مینھ پڑا ہو پھر وہ دوگنے پھل لایا ہو ۱۰۳۹

تشبیہ کا ماحصل یہ ہے کہ کافر اسی طرح اپنے کو قیامت کے دن ہر خیر و خیرات کے اجر سے محروم پائے گا۔ اس کا انفاقِ مال حقیقۃً کسی صدقہ وخیرات کے حکم میں آتا ہی نہیں۔

خوب خیال کر لیا جائے، اسلام میں مقبول وہی صدقہ ہے جو رضائے الٰہی کی خاطر کسی درجہ میں تو ہو۔

کمثل صفوان۔ تشبیہ محرومیٔ اجر کے لحاظ سے دی گئی ہے۔

۱۰۳۶ ذکر انھیں لوگوں کا ہے جو نعمتِ ایمان سے محروم ہیں۔

مما کسبوا۔ یعنی جسے وہ اپنے خیال وپندار میں اپنی کمائی سمجھ رہے ہیں، ورنہ بندہ کی کمائی تو حقیقۃً وہی ہے جس پر عملِ صالح کا اطلاق ہو سکے اور عملِ صالح کی پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے۔

۱۰۳۷ (قیامت کے دن، ثواب کے گھر یعنی جنت کی۔)

یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ جو کفر اختیار کئے ہوئے ہیں اور اپنی قوتِ فیصلہ سے صحیح کام نہیں لے رہے ہیں انھیں زبردستی راہِ ہدایت دکھا دینے کا قانونِ الٰہی ہے ہی نہیں۔

۱۰۳۸ (جیسا کہ ہر مومن مخلص کا شیوہ ہوتا ہے)

تثبیتا من انفسھم۔ اتنے سے ٹکڑے میں نفسیاتِ بشری کی ایک گہری حقیقت بیان ہو گئی ہے، معصیت کی طرح ہر طاعت کا یہی خاصہ ہے کہ وہ متجانس اعمال کو کھینچتی ہے، چنانچہ ہر عملِ صالح کے بعد نفس میں دوسرے اعمالِ صالح کے لئے آمادگی وپختگی پیدا ہو جاتی ہے، اور نفسِ بشری کا یہ ایک خاصہ ہے کہ ہر عمل سے تکرار وعادت کے بعد اس عمل سے متعلق ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے مزاحمت کی قوت مغلوب وضعیف ہوتی جاتی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں دلیل ہے کہ عملِ صالح سے جس طرح حصولِ اجر مقصود ہوتا ہے اسی طرح اصلاحِ نفس بھی مقصود ہوتی ہے۔

یہ معنی تو ظاہر ہی ہیں کہ وہ خرچ اس لئے کرتے ہیں کہ کمالِ ایمان اور ثابت قدمی اور اطمینان حاصل ہو، ایک دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ ان کے دل اللہ کے کرم اور ثواب پر مطمئن ہیں، وہ صرفِ مال کو نہ نقصان سمجھتے ہیں نہ باعثِ گرانی

۱۰۳۹ (کہ ہوا کی لطافت وزمین کی صلاحیت اور بارش کی کثرت مل ملا کر قوتِ بارآوری کو خوب بڑھا دیں گی)

فَإِنْ لَمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

اور اگر زور کا مینھ نہ بھی پڑے تو ہلکی پھوار (ہی کافی ہے) ۱۰۴۰ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو خوب دیکھنے والا ہے ۱۰۴۱

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو جس کے نیچے ندیاں پڑی بہ رہی ہوں

مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ

(اور) اس کے ہاں اس باغ میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اس کا بڑھاپا آچکا ہو اور اس کے

الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ

عیال کمزور ہوں۔ اس (باغ) پر ایک بگولا آئے کہ اس میں آگ ہو تو وہ (باغ)

ع ۳۶ ۴ فَاحْتَرَقَتْ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾ ع

جل جائے۔ اللہ اسی طرح تمہارے لئے کھول کر نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر سے کام لو ۱۰۴۲

اصابہا۔ ضمیر مؤنث ربوۃ کی جانب ہے۔

یعنی الربوۃ (قرطبی)

وابلٌ۔ خوب زور کی بارش، بڑے بڑے بوند والا پانی۔

ای مطر شدید (قرطبی) المطر الثقیل القطار (راغب)

**۱۰۴۰** تمثیل کی زبان میں بیان اس حقیقت کا ہو رہا ہے کہ اخلاص اگر درجۂ اعلیٰ میں نہ ہو جب بھی محض ایمان اور عدمِ موانع (یعنی احسان نہ رکھنا اور ایذا نہ پہنچانا) بجائے خود صدقات و خیرات کو مقبول بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔

**۱۰۴۱** (اور اس لئے ہر ایک کے درجۂ اخلاص کا بھی خوب جاننے والا ہے)

خطاب یہاں عام نسلِ انسانی سے ہے یعنی اللہ تعالےٰ کافر، مومنِ مخلص، غیر مخلص سب کے محرکاتِ عمل اور سب کے درجۂ اخلاص و عدمِ اخلاص سے خوب واقف ہے۔

**۱۰۴۲** (اور اپنے انجام کو سوچ کر اس کے مطابق عمل کرتے رہو)

من نخیلٍ واعناب۔ قرآن میں تصریح کے ساتھ نام انھیں میووں کا لیا گیا جو اہلِ عرب کے لئے خاص اہمیت اور خصوصی معنویت رکھتے تھے، ملاحظہ ہوں حواشی تفسیر انگریزی۔

تحتہا الانہٰر۔ یہ یہ ظاہر کرنے کو ہے کہ وہ باغ خوب سرسبز و شاداب بھی تھا۔

من کل الثمرات۔ یہ مالک باغ کی مرفہ الحالی اور شانِ غنا ظاہر کرنے کو ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا

اے ایمان والو! جو تم نے کمایا ہے اُس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو ۱۰۴۳ اور اس میں سے (بھی) جو ہم نے تمہارے لئے

لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ

زمین سے نکالی ہیں ۱۰۴۴ اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو گے حالانکہ تم خود بھی اس کے

بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

لینے والے نہیں ہو بجز اس صورت کے کہ چشم پوشی ہی کر جاؤ ۱۰۴۵ اور جانے رہو کہ اللہ بے نیاز ہے ستودہ صفات ہے ۱۰۴۶

اصابہُ الکبر۔ یعنی وہ مالک باغ اب محنت و مشقت کے قابل نہ رہے۔

تمثیل کے پیرایہ میں بیان اس کا ہے کہ قیامت کا دن آجائے اور اس شخص کی عمل سے معذوری اس پر عیاں ہو جائے

ذریّۃٌ ضعفآءُ۔ یعنی اولاد بھی اس قابل نہ ہو کہ تحصیلِ معاش میں اس کے کچھ کام آسکے گویا اس کی معذوری ہر طرح روشن و آشکارا ہو جائے۔

فاصابہا اعصارٌ۔ کہ وہی باغ وجہ معاش تھا۔

تمثیل کے پیرایہ میں بیان اس کا ہے کہ اُس شخص کا بھروسا ظاہری طاعت و اعمالِ صالحہ پر تھا۔

فاحترقت۔ یعنی اس شخص کی ساری اُمیدیں غارت ہو کر رہ جائیں۔

تمثیل کی زبان میں مراد یہ ہے کہ ایک شخص اپنے خیال میں نیک کام کر رہا ہے اور اپنے نزدیک ساری توقعات اس سے لگائے بیٹھا ہے مگر عین احتیاج کے وقت یعنی قیامت کے دن اُسے نظر آئے کہ وہ عمل تو شرائطِ قبول و مقبولیت ملحوظ نہ رکھنے کے باعث خود ہی نابود ہو چکا ہے اس لئے اجر و ثواب کیسا، اب تو حرمانِ محض اس کے نصیب میں آیا۔

الآیات۔ یہاں مثالوں اور نظیروں کے معنی میں ہے۔

لکم۔ یعنی تمہارے نفع کے لئے تمہیں سمجھانے کو۔

ذرا صورتِ حال کی حسرتناکی کا تصور کیجئے، ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک باغ ہے، سرسبز و شاداب خوب پھلا پھولا ہوا، ہر طرح کے میووں پھلوں سے لدا ہوا، باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے اور اب کسی نئی محنت کے قابل نہیں، بچے موجود ہیں مگر کمزور اور کم سن جو بجائے اس کے کہ کسبِ معیشت میں باپ کا ہاتھ بٹائیں اُلٹے اس کے لئے بار ثابت ہو رہے ہیں، عین اس وقت شدید ترین حاجت مندی کے وقت یک بیک معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر خاک سیاہ ہو گیا، باغ کے مالک کے غم و حسرت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس سے کہیں بڑھ کر بُرا گنا اور لاکھ گنا بڑھ کر حالت اُس بدنصیب انسان کی ہو گی جس کی آنکھیں زندگی بھر غفلت سے بند رہیں اور پہلی بار اُس وقت کھلیں گی جب عمل کی مہلت بالکل ختم ہو چکے گی اور اب وہ دیکھے گا کہ کوئی چیز بھی اُس کے دفترِ عمل میں ایسی نہیں جو اس کے کام آسکے کچھ ٹھکانا! کوئی اندازہ! اس کی حسرت و حرماں نصیبی کا ہو سکتا ہے!

۱۰۴۳ (اللہ کی راہ میں، نیک کاموں میں)

ماکسبتم۔ جو کچھ تم نے کمایا ہے جائز، پاک طریقہ سے، اور اس میں ملازمت، تجارت اور میراث سب داخل ہیں۔

الکسب یکون بتعب ببدن وھی الاجارۃ او مقاولۃ فی تجارۃ وھو البیع والمیراث داخل فی ھذا الاٰن غیر الوارث قد کسبہ (قرطبی)

فقہاء نے بہ قاعدۂ اشارۃ النص ماکسبتم ہی سے نکالا ہے کہ زکوٰۃ اس مال میں ہے جو اپنا کمایا ہوا ہو، اور جو اضطراراً حاصل ہو جائے، اس میں زکوٰۃ نہیں۔

طیبات یعنی اپنی حاصل کی ہوئی چیزوں میں سے بہترین، یا اپنی جاگیر پاک طریقہ سے حاصل کی ہوئی۔

وجمہور المتاولین قالوا معنی من طیبات من جید مختار ماکسبتم وقال ابن زید من حلال ماکسبتم۔ (قرطبی)

**۱۰۴۴ا** یعنی نباتات، معدنیات وغیرہ۔

لکم۔ یعنی تمہارے کام کے لئے۔

من الارض۔ اس کے تحت میں زراعت، باغبانی، معدنیات وغیرہ کی ساری شاخیں آگئیں جس طرح ماکسبتم کے تحت میں تجارت اور کاروبار کے اقسام آگئے تھے۔

یعنی النبات والمعادن والرکاز (قرطبی)

فقہاء نے من الارض سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ زکوٰۃ زمینی پیداوار (زراعت، معدنیات وغیرہ) پر واجب ہوئی، برخلاف موتی موں گے وغیرہ کے کہ وہ زمین سے نہیں، سمندر سے نکلتے ہیں۔

**۱۰۴۵ا** مطلب یہ ہوا کہ ایسی ناکارہ، ناقص، ردی چیزیں کہ اگر خود تمہیں ملنے لگیں تو تمہیں لینا گوارا نہ ہو بجز اس صورت کے کہ تم ارادۃً ان کی طرف سے چشم پوشی کر لو، تو اللہ کی راہ میں تو ایسی چیزوں کے صرف کرنے کا تو تمہیں خیال بھی نہ کرنا چاہئے۔

الخبیث۔ ردی، ناکارہ چیز۔

تنفقون۔ مراد وہی اللہ کی راہ میں، نیک کام میں خرچ کرنا ہے۔

لستم باٰخذیہ۔ یعنی جب وہ تمہیں قیمتاً یا ہدیۃً مل رہی ہو۔

**۱۰۴۶ا** (اور اس کے استحضار کے بعد تم ناکارہ نذروں کے پیش کرنے سے خود ہی محتاط رہو گے۔)

غنیٌّ۔ وہ تمہارے صدقات کا محتاج نہیں کہ جو چیز تمہارے معیار سے بھی ناکارہ ہو اس کی نذر اس کے دربار میں پیش کرنے لگو، نیز اس کے ہاں اجر میں کوئی بخل نہیں، اس سے معاملہ کرنے والا کبھی نادم و خاسر نہیں ہو سکتا۔

حمید۔ وہ خود ہر طرح ستودہ صفات و جامع کمالات ہے، تمہاری داد و دہش سے اس کی محمودیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، خود تمہارے لئے شرم کی بات ہے کہ ناقص اور ناکارہ چیزوں کی نذر ایسے جامعِ کمالات کے حضور میں پیش کرنے کا خیال کرو۔ ضمناً یہ پہلو بھی آ گیا کہ جب وہ ستودہ صفات ہے تو اس کے ہاں مقبولیت بھی انہیں بندوں کو نصیب ہو سکتی ہے جو خود بھی کوئی مناسبت اس کے صفاتِ حسنہ سے رکھتے ہوں۔

مُشرک قومیں اپنے دیوتاؤں کو نذر اور چڑھاوے کا محتاج مانتی ہیں، صفت غنی لانے سے اس عقیدہ کی تردید ہو گئی، اور دیوتاؤں میں سے کسی نہ کسی حیثیت سے نقص تو بھی مشرک قوموں کے ہاں مسلّم ہے، صفت حمید نے ان خرافات کی بھی تردید کر دی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ

شیطان تمھیں محتاجی سے ڈراتا ہے اور حکم دیتا ہے تمھیں بُخل کا ۱۰۴۷ اور اللہ تم سے اپنی طرف سے مغفرت

مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ

کا اور فضل کا وعدہ کرتا ہے ۱۰۴۸ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۰۴۹ وہ جسے چاہے حکمت

مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوگئی اُسے یقیناً خیر کثیر عطا ہوگئی ۱۰۵۰

۱۰۴۷ (کہ راہِ خدا میں خرچ کر ڈالو گے تو خود مفلس رہ جاؤ گے)

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جو چیز نیکی اور بھلائی کے کاموں میں صرف کرنے سے روکتی ہے، وہ یہی بُخل ہوتا ہے کہ سب کچھ خرچ کر ڈالنے کے بعد پھر اپنی ضرورتوں کے لئے کیا رہ جائے گا؟ قرآن مجید نے الشیطان یعدکم کے بلیغ الفاظ سے یہ تعلیم دے دی کہ یہ خیال تمام تر ایک وسوسۂ شیطانی ہے، اور یوں اس خیال کے باطل ہونے کا بہترین پیرایہ اختیار کیا۔

الفحشآء عربی میں فحش و فحشآء کا اطلاق ہر شدید بُرائی، ہر بُری صفت پر ہوتا ہے۔

هو كل ما يشتد قبحه من الذنوب والمعاصي (تاج) وقيل كل خصلة قبيحة فهي فاحشة من الاقوال والافعال (تاج)

بُخل سے اس کا تعلق خصوصی ہے۔

الفاحش البخيل (قاموس) قيل الفاحش هو البخيل جداً (تاج) والعرب تسمي البخيل فاحشا والبخل فحشا وفحشاء (جصاص) وكان البخل عند العرب من الفحش (المنار)

اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہاں الفحشاء سے مراد ادائے زکوٰۃ و صدقات میں بُخل ہے۔

قال المفسرون اي يامركم بان لا تتصدقوا (تاج) الفحشاء هٰهنا البخل في اداء الزكوٰة (راغب) يعني باعظم القبيح في البخل (راغب) يغريكم على البخل ومنع الصدقات (كشاف) المراد بها في هٰذا الموضع البخل (جصاص)

۱۰۴۸ (خوش دلی کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے پر)

مغفرة و فضلا وعدۂ مغفرت کا تعلق آخرت سے ہے اور وعدۂ فضل کا دنیا سے۔ ماحصل یہ ہے کہ خدائی احکام پر خدائی قانون کے مطابق چلو گے تو دنیا آخرت دونوں کی فلاح و بہبودی یقینی ہے۔ شیطانی راہ بربادی و ہلاکت کی ہے، اور خدائی راہ فلاح و صلاح کی۔

۱۰۴۹ وَاسِعٌ۔ ایسے وسعت والے کے ہاں انعام و اکرام کی کیا کمی۔

علیم۔ ایسے علمِ کامل والے پر نیتوں کا حال رتی رتی روشن ہے، اس لئے ثمرہ بھی نیتوں کے مطابق ہی ملے گا۔

۱۰۵۰ (جس کے مقابل دنیا کی کوئی اور نعمت نہیں)

الحکمۃ حکمت کی تشریحیں بہت سی کی گئی ہیں لیکن بہترین اور جامع ترین تشریح یہ ہے کہ وہ امورِ دین میں فہمِ صحیح کا نام ہے

وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ

اور نصیحت تو بس صاحبانِ فہم ہی قبول کرتے ہیں ۱۰۵۱ اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو یا جو بھی نذر

نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا

مانتے ہو یقیناً اللہ (سب کچھ) جانتا ہے اور نا انصافوں کا حامی

لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ

کوئی بھی نہ ہوگا ۱۰۵۲ اگر تم صدقات کو ظاہر کردو جب بھی اچھی بات ہے۔

قال ابن زید الحکمۃ العقل فی الدین (قرطبی) قال ابراہیم النخعی الحکمۃ الفہم فی القرآن وقالہ زید بن مسلم (قرطبی)

اور دین کی اس فہم صحیح میں بخل سے بیزاری اور صرف میں توازن بھی شامل ہے۔

من یشاء۔ یہ حکمت کی تقسیم وعطا مشیتِ تکوینی کے ماتحت ومطابق ہوتی رہتی ہے۔

من یؤتی الحکمۃ۔ یہ حکمت و دانائی ہرگز نہیں کہ جو کچھ بھی کمایا جائے سب یہیں اپنے نفس کی لذتوں اور خواہشوں پر اڑا دیا جائے عین دانائی اور حکمت یہ ہے کہ اس آج سے کل کا ذخیرہ جمع کیا جائے آج تخم ریزی ایسی کی جائے کہ کل پھل ہی پھل ہاتھ لگیں اور ایمان و طاعت کا ایسا بیمہ کرا دیا جائے جو آیندہ کی دائمی اور غیر منقطع زندگی میں برابر کام آتا رہے

خیرا کثیرا۔ صیغۂ نکرہ اظہارِ عظمت کے لئے ہے یعنی بہت ہی بڑی نعمت۔

تنکیر تعظیم۔ (مدارک)

**۱۰۵۱** (اس لئے خطابِ خصوصی بھی انہیں سے ہے)

اُولوا الالباب۔ یعنی عقلِ سلیم سے کام لینے والے نصیحت سے مراد راہِ حق پر چلنے اور اہتمامِ دین کی اطاعت کی نصیحت ہے اہلِ لطائف نے کہا ہے کہ آیت میں شیطانی وسوسہ کا علاج علم (حکمت) کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے جس طرح اس سے قبل تثبیتا من انفسھم میں عمل سے بتایا جا چکا ہے۔

**۱۰۵۲** (یوم جزا میں)

ما انفقتم۔ جو کچھ خرچ کرتے ہو اچھے بُرے کسی مصرف میں۔

من نذر۔ نذر وہ چیز ہے جسے عوامی زبان میں منت ماننا کہتے ہیں، فقہ میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ کسی مراد کے پورے ہونے پر اپنے اوپر کوئی ایسی چیز لازم کرلینا ہے جو واجب نہ تھی۔

النذر عقد القلب علی شیء والتزامہ علی وجہٍ مخصوص (روح) النذر ما یلتزمہ الانسان بایجابہ علی نفسہ (کبیر)

یہ نذر عبادتِ بدنی کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے مثلاً نماز یا روزہ اور عبادتِ مالی کی صورت میں بھی۔

یعلمہ۔ یعنی اس کا علم رکھتا ہے کہ وہ کس نیت سے اور کس کی راہ میں مانی گئی ہے اور اس علمِ کامل کے مطابق جزا و سزا بھی ہوگی

کنایۃ عن مجازاتہ سبحانہ علیہ (روح) لیجازیکم علیہ (بیضاوی)

وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ

اور اگر انھیں چھپاؤ اور فقیروں کو دو جب تو یہ تمہارے حق میں اور بہتر ہے ۱۰۵۳ اور اللہ تم سے

عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٧١﴾

تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دے گا ۱۰۵۴ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے ۱۰۵۵

للظّٰلمین۔ یعنی قانونِ الٰہی توڑنے والوں کا، اپنے حق میں ناانصافی کرنے والوں کا۔

۱۰۵۳ ہر نیکی کی طرح صدقات و خیرات کے بھی مخفی ادا کرنے کی فضیلت تو ظاہر ہی ہے لیکن زندگی میں ایسے مواقع بھی برابر پیش آتے رہتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان و اظہار ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ہے کہ بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے، ہم قریب سے گزر رہے ہیں، اور بالکل ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اُسے کھلا پلا کر یا دوا دے کر از سر نو اٹھا کھڑا کریں، لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریا و نمائش میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے کتراتے اور خاموش گزرتے چلے جاتے ہیں، یہ تقویٰ نہیں، عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہوئی۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی تھی خواہ اس کے لئے اعلان بہ بانگِ دہل ہی کرنا پڑے، نہ یہ کہ شبۂ ریا و شائبہ نمائش سے بچنے کے لئے تلاش پہلے گوشۂ تنہائی کی کرلی جائے۔ جن مذہبی طبقوں نے نیکی کے اہتمام یا اخفاء میں تاکید حد سے زیادہ کی ہے، اور خدمتِ خلق کو اخفاء کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے، ان کی تعلیم یقیناً ناقص ناتمام، ایک طرفہ ہے، اور انھوں نے زندگی میں شب و روز اس قسم کے پیش آنے والے بہ کثرت واقعات کو نظر انداز ہی کر دیا ہے۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ صحیح مسلک یہ ہے کہ عملِ خیر کے اعلان و اخفاء میں اختیار ہے اور ساتھ ہی افضلیت اخفاء کی ہے، جب اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔

اِن تبدوا و اِن تخفوا۔ یعنی حسبِ ضرورت و مصلحتِ دین، اعلان و اخفاء جو بھی مناسب ہو۔

تؤتوھا الفقرآء۔ یعنی فقیروں کے حوالے کرو اہتمامِ اخفاء کے ساتھ۔

تخفو۔ یعنی وہی اہتمامِ اخفاء۔

ای فالاخفاء خیر لکم۔ (روح)

الفقرآء۔ بجائے فقراء کم کے محض فقراء کے لفظ سے استنباط یہ کیا گیا ہے کہ صدقہ دینے کے لئے شرط اسلام کی نہیں، مسلم و کافر سب کو صدقہ دیا جا سکتا ہے، جو بھی حاجت مند ہو۔

الحق فی الآیۃ لفظ الفقراء لم یقل فقراء کم فدلّ ذٰلک علیٰ ان الصدقۃ تستحب علی کل فقیر وان کان کافرًا۔ (المنار)

فقہاء نے جس مد کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص رکھا ہے، وہ زکات ہے، جس کی ادائی ارکانِ اسلام میں سے ہے، یا پھر صدقۂ فطر، عام صدقات پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں۔

۱۰۵۴ (ان نیکیوں کی برکت سے)

قرآن مجید نے ازالۂ سیئات کی جہاں اور صورتیں رکھی ہیں وہاں ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہیں اور حسنات سیئات کو محو کرتی رہتی ہیں، یہ چیز محض عقیدہ کی نہیں، مشاہدہ اور تجربہ کی بھی ہے کہ خلق کی نظر سے

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ

ان کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ۱۰۵۶ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ۱۰۵۷

چھپا کر طاعت اور نیکیوں کی عادت اگر ڈال لی جائے تو ایک عرصہ کی مشق کے بعد نفس کی اصلاح خود بخود ایک بڑی حد تک ہو جاتی ہے، اور جو کچھ خرابیاں پھر بھی باقی رہ جائیں اُن سے درگزر کرنے کے لئے خدائے رحمٰن و رحیم کا لطف و کرم کافی ہے جو خوبیوں کو خرابیوں کا، اور بھلائیوں کو بُرائیوں کا عوض بناتا رہتا ہے، یہاں پہنچ کر مسیحیوں کے اس بنیادی عقیدہ کو ایک بار پھر یاد کر لیا جائے کہ گنہگاروں کی نجات اور گناہوں کے دُھلنے کی کوئی صورت بجز اس کے نہیں کہ "خداوند خدا کا اکلوتا بیٹا" انسان کے قالب میں دنیا میں آئے اور اپنی جان کو صلیب پر دے کر سب کی طرف سے کفارہ ادا کرے۔

من سیاتکم۔ من تبعیضیہ ہے یعنی یہ صدقہ سارے گناہوں کا نہیں، البتہ کچھ گناہوں کا کفارہ بن جائے گا

من للتبعیض۔ (بحر۔ نہر)

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ تبعیض کا یہ ابہام مصلحتہً رکھا گیا ہے، اور گناہوں کی یہ تفصیل قصداً مخفی رکھی گئی ہے کہ فلاں فلاں گناہوں کا کفارہ صدقات سے ہو جائے گا، تاکہ بندہ اُن گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے۔

ابہم الکلام فی ذلک البعض لأن بیانہ کالاغراء بارتکابھا اذا علم انھا مکفرۃ بل الواجب ان یکون العبد فی کل احوالہ بین الخوف والرجاء۔ (کبیر)

بعض نے مِن کو مِن اجل کا مرادف قرار دیا ہے، اور فقرے کے معنی کئے ہیں من اجل ذنوبکم (کبیر) اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ مِن صلۂ زائد ہے جیسے من کل الثمرات میں، اور مراد سارے گناہوں کے کفارے سے ہے۔

والثالث انھا صلۃ زائدۃ والتقدیر ونکفر عنکم جمیع سیاٰتکم (کبیر) قیل مزیدۃ علی رأی الاخفش (روح)

۱۰۵۵ (اور اس لئے وہ اجر بھی اعمال و احوال کے مطابق دے گا۔)

گناہوں سے باز رکھنے میں خدائے علیم و خبیر کے علمِ کل و نظرِ محیط کا استحضار اکسیر کا حکم رکھتا ہے، اور اس لئے قرآن مجید نے اسے ہر ایسے موقع پر دُہرایا ہے۔

۱۰۵۶ (اے پیغمبر!)

هُدٰٮهُمۡ ان کی یعنی کافروں کی ضمیر جمع کا مرجع الناس بھی ہو سکتا ہے۔

اور جب یہ ذمہ داری آپ پر نہیں تو اُمت پر تو اور بھی نہیں، اسی لئے مراد میں آپؐ کے ساتھ اُمت کو بھی شامل رکھا گیا ہے

المراد بہ ھو وأمتہ (کبیر)

۱۰۵۷ (اپنی مشیتِ تکوینی کے ماتحت و مطابق)

رسول کا کام صرف تبلیغ ہے یعنی ہدایت کا پیام دنیا تک پہنچا دینا، باقی کس کو قبولِ حق کی توفیق ہوتی ہے اور کس کو نہیں، اس کا تعلق تمام تر مشیتِ الٰہی سے ہے، شانِ نزول کی روایتوں میں آتا ہے کہ صحابۂ کرامؓ بعض وقت کسی کافر مشرک صاحبِ حاجت کو خیر دینے سے اس مصلحت سے رُک جاتے تھے کہ شاید یہ احتیاج ہی کی بنا پر اسلام قبول کر لیں، آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ اتنے بعید اہتمام کی ضرورت نہیں، محض تبلیغ کافی ہے، فقہاء اُمت نے کہا ہے کہ کافر کو خیرات دینا بالکل جائز ہے بشرطیکہ وہ حربی نہ ہو

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ

اور تم جو کچھ بھی مال میں سے خرچ کرتے ہو سو اپنے لئے (کرتے ہو) ۱۰۵۸ اور تم اللہ ہی کی رضاجوئی کے لئے خرچ کرتے ہو ۱۰۵۹

المراد اباحة الصدقة عليهم وان لم يكونوا على دين الاسلام وقد روى ذالك عن جماعة من السلف (جصاص)

حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ تیرا کھانا خاص متقی کھایا کریں، مراد اس سے طعامِ دعوت ہے اور آیت میں مراد طعامِ حاجت پس تعارض کا شبہ نہ کیا جائے (تھانویؒ)

کافر حربی کو صدقہ وغیرہ جائز نہیں (تھانویؒ) کافر ذمّی یعنی غیر حربی کو زکوٰۃ دینا تو جائز نہیں اور دوسرے صدقاتِ واجب ونفل سب جائز ہیں (تھانویؒ)

آیت میں ذکر زکوٰۃ کا نہیں، عام صدقات کا ہے۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ کسی کے زیادہ درپے نہ ہو اور تدبیر میں بھی بہت زیادہ انہماک نہ رکھے، کفار کو صدقہ نہ دینا تدبیر ہی کی ایک قسم تھی۔

۱۰۵۸ یعنی اپنے ہی اجرِ اُخروی کے لئے نہ کہ کسی اور کے لئے۔

فهو لانفسكم لا ينتفع به غيركم۔ (کشاف)

یہاں بعض مشرک قوموں کا یہ عقیدہ مستحضر کر لیجئے کہ نذرانے اور چڑھاوے فلاں دیوی اور فلاں دیوتا کے نفع کے لئے ہوتے ہیں۔

ما تنفقوا۔ یعنی اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہو۔

من خير۔ یعنی اپنے مال میں سے خیر یہاں مال کے مرادف ہے۔

من مالٍ (کشاف) اى من مالٍ (معالم)

خیر۔ اصلاً شر کے مقابل ہے اور اس کے مفہوم میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کو انسان اچھا سمجھتا ہے مثلاً عقل، اخلاق، پُرمنفعت شے وغیرہ۔

الخير ما يرغب فيه الكلّ كالعقل مثلا والعدل والفضل والشئ النافع۔ (راغب)

اور قرآن مجید میں مال کے لئے خیر کا لفظ متعدد مقامات پر مال ہی کے حُسنِ استعمال کے سلسلہ میں آیا ہے مثلاً ان ترك خيرًا وانه لحبّ الخير لشديد۔ ما انفقتم من خير فللوالدين وغيرها۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خیر کا اطلاق اُس مال پر ہوتا ہے، جو بڑی مقدار میں ہو، اور حلال جائز ذریعہ سے حاصل ہوا ہو۔

وقال بعض العلماء لا يقال للمال خير حتّٰى يكون كثيرًا ومن مكان طيّب (راغب)

۱۰۵۹ (سو یہ مقصد ہر حاجت مند کی حاجت براری سے پورا ہو جاتا ہے خواہ اُس کے عقائد کچھ بھی ہوں)

كان النبى صلعم لا يتصدق على المشركين فنزلت وما تنفقون الا ابتغاۗء وجه الله فتصدق عليهم (ابن جریر)

مطلب یہ ہوا کہ مقصود جب اپنے لئے نفعِ اُخروی یا حصولِ اجر ہے تو وہ تو ہر حاجت مند کی امداد سے ہو سکتا ہے، صدقہ کو مسلمانوں ہی پر محدود رکھنے کی قید کیوں لگائی جائے۔

وجه الله کے معنی عام طور پر ذاتِ الٰہی کے کئے گئے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو (سب) تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر (ذرا بھی) زیادتی نہ کی جائے گی ۱۰۶۰

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(اصل) حق اُن حاجتمندوں کے لئے ہے جو اللہ کی راہ میں گھر گئے ہیں ۱۰۶۱

ربما عبر عن الذات بالوجه (راغب) وجعله كثير من الخلق بمعنى الذات ۔ (روح)

لیکن دوسرے معنی رضاءِ الٰہی کے بھی ہو سکتے ہیں اور بعض محققین اسی طرف گئے ہیں۔

عبر بالوجه عن الرضا كما قال ابتغاء مرضاة الله وذلك عادة العرب (بحر) و بعضهم حمله هنا على الرضا (روح)

اى رضاء الله (مدارك)

محض للہ کے مقابلہ میں ابتغاء وجہ اللہ کہنے میں ایک تو زور زیادہ پیدا ہو گیا، دوسرے یہ معنی بھی پیدا ہو گئے کہ کسی اور کی شرکت مقصود و مطلوب نہیں صرف اللہ ہی کی رضا مقصود ہے گویا یہ ترکیب تاکید اور حصر دونوں کی جامع ہے۔

اى ما تنفقون بسبب من الاسباب الا لهذا السبب (روح) اى ثوابه لا لغيره من اغراض الدنيا۔

آیت میں رد ہے ان جاہل صوفیہ کا جو ثواب اور اجر کے مقصد کو اخلاص کے منافی سمجھتے ہیں (حالانکہ) قرآن مجید نے تو بار بار ضمناً نہیں صراحۃً ترغیب ہی ہے اجر و ثواب کے تلاش کرنے کی۔

آیت کا یہ جزو بظاہر بیانیہ ہے لیکن مقصود اس سے حکم ممانعت یا نہی ہے یعنی تم خرچ نہ کرو بجز اس کے کہ اللہ کی رضا جوئی کے لئے ہو

هذا نفى معناه النهى اى ولا تنفقوا الا ابتغاء وجه الله (مدارك) لفظه خبر ومعناه نهى (معالم) وورد الخبر بمعنى الامر والنهى كثيرا (كبير)

۱۰۶۰ (کہ اجر میں کچھ کسر رہ جائے اور ثواب کا کوئی حصہ کاٹ لیا جائے)

من خیر۔ خیر کے مرادف مال ہونے پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا۔

یوف الیکم۔ سب تم کو پورا پورا لوٹا دیا جائے گا یعنی آخرت میں سارا اجر و ثواب۔

۱۰۶۱ یعنی صدقات کے اصل مستحق تو وہ حاجتمند ہیں جن کا ذکر آ رہا ہے مبتدا یہاں محذوف ہے اصل ترکیب یوں ہے

هذه الصدقات للفقراء۔ (مدارك)

اُحصروا فی سبیل اللہ۔ یعنی دین ہی کے کسی کام میں گھر گئے اور اب آزادی سے کسبِ معاش نہیں کر سکتے اصل مراد یہاں مجاہدین ہیں

هم الذين احصرهم الجهاد فمنعهم من التصرف (مدارك)

احصار میں بڑی گنجایش ہے یہ گھر جانا خواہ وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے لحاظ سے، سب اس کے تحت میں آ جاتا ہے فقراء المہاجرین کی تصریح تو صرف اس لئے ہے کہ اُس وقت یہی ایک گروہ ایسا تھا۔

انما خص الفقراء المهاجرين بالذكر لانه لم يكن هناك سواهم (قرطبی)

اسی طرح فی سبیل اللہ میں بھی بڑی وسعت ہے دین کا کوئی سا کام، کوئی سی ضرورت ہو، سب اس میں شامل ہو سکتی ہیں گو اصل مراد یہاں ہے

لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِی الۡاَرۡضِ یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ

ملک میں کہیں چل پھر نہیں سکتے ۱۰۶۲ ناواقف انہیں غنی خیال کرتا ہے ان کی احتیاطِ سوال کے

التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُہُمۡ بِسِیۡمٰہُمۡ ۚ لَا یَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ

باعث ۱۰۶۳ تو انہیں اُن کے بُشرہ ہی سے پہچان لے گا ۱۰۶۴ وہ لوگوں سے لگ لپٹ کر نہیں مانگتے ۱۰۶۵

ای حبسھم الجھاد او العمل فی مرضاۃ اللّٰہ۔ (روح)

مرشد تھانویؒ نے کہا ہے کہ آیت کے مصادق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دین میں مشغول ہیں کہ علم دین میں جس مشغولی وانہماک کی ضرورت ہے اُس کے ساتھ اگر فکرِ معاش کی مصروفیت کو جمع کر لیا جائے تو علم دین کی خدمت ناتمام رہ جائے گی۔

۱۰۶۲ (آزادی سے طلب معاش کے لئے)

یعنی اُن کا وقت خدمتِ دین میں ایسا گھرا رہتا ہے کہ کسبِ معاش کے لئے انہیں مہلت نہیں ملتی۔

۱۰۶۳ یعنی اُن کی غیرت وخودداری گوارا نہیں کرتی کہ وہ لوگوں سے سوال کریں، ناواقفوں کو اس سے گمان یہ گزرتا ہے کہ یہ لوگ خوش حال ہیں، محتاج و مستحق امداد نہیں۔

غنیٰ یا تونگری شریعت میں حاجتِ اصلی سے مال کے زائد ہونے کو کہتے ہیں۔

الغنی ھو ما یفضل عن مقدار الحاجۃ۔ (جصاص)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سالکین کو کوئی ایسی خاص وضع نہ بنانا چاہئے جس سے عام اہل دنیا سے ان کا امتیاز ظاہر ہوتا ہو۔ فقہاء نے آیت کے الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اسم فقیر کا اطلاق ایسے پر بھی جائز ہے جو حیثیت والے کپڑے پہنے ہوئے ہو، اور اُسے زکوٰۃ بھی دی جا سکتی ہے۔

وفیہ دلیل علی ان اسم الفقیر یجوز ان یطلق علی من لہ کسوۃ ذات قیمۃ ولا یمنع ذالک من اعطاء الزکوٰۃ الیہ (قرطبی) فدلت الاٰیۃ علی جواز صرف الصدقۃ الی من لہ ثیاب وکسوۃ وزی فی التجمل (قرطبی)

۱۰۶۴ (کہ یہ محتاج و مستحق امداد ہیں، اے مخاطب!)

یعنی یہ لوگ زبان سے کچھ بھی نہ کہیں لیکن ان کا چہرہ بُشرہ غور سے دیکھنے کے بعد خود ان کے فقر و فاقہ کی غمازی کرے گا۔ بعض فقہاء نے یہیں سے قرائن اور بشرہ حلیہ سے استنباطِ نتائج کا جواز نکالا ہے۔

فیہ دلیل علی ان للسیما اثرا فی اعتبار من یظھر علیہ ذالک۔ (قرطبی)

۱۰۶۵ (شدتِ احتیاج کے باوجود)

اور یہ دلیل ہے ان کے کمالِ غیرت کی۔

الحافاً اوپر من التعفف کے ضمن میں ابھی آچکا ہے کہ یہ غیور و خوددار لوگ سرے سے سوال ہی نہیں کرتے اور اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ لگ لپٹ کر نہیں مانگتے، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ اس میں اشارہ ہے کہ الحاف (لگ لپٹ کر مانگنے کی عادت) بُری عادت ہے۔ بعض محققین نے معنی مطلقاً عدمِ سوال کے کئے ہیں۔

ع ۳۷
۵

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ

اور تم مال میں سے جو کچھ خرچ کرتے ہو اللہ اس کا خوب جاننے والا ہے ۱۰۶۶ جو لوگ اپنا مال رات اور دن

اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ

(اور) پوشیدہ اور آشکارا خرچ کرتے رہتے ہیں سو اُن لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ

نہ ان کے لئے کوئی خوف (واقع) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۶۷ جو لوگ سود کھاتے رہتے ہیں ۱۰۶۸

وقف منزل

والمعنی انہم لایسئلون اصلا وھو المروی عن ابن عباس والیہ ذھب الفراء والزجاج واکثر ارباب المعانی (روح)

**۱۰۶۶** (تمہارے اخلاص کا، اور اسی نسبت سے اجر بھی دے گا)

وما تنفقوا۔ یعنی ایسے لوگوں پر خرچ کرتے رہو۔

**۱۰۶۷** (قیامت کے دن اپنے پروردگار کے پاس پہنچ کر)

باللیل والنھار۔ یعنی جس وقت جس گھڑی بھی ضرورت و مصلحت ہو۔

سرًّا وعلانیۃً۔ یعنی پوشیدہ تو حسبِ عادت اور علانیہ حسبِ ضرورت و مصلحت۔

الذین ینفقون۔ یعنی اللہ کی راہ اور خدمتِ دین میں انفاق کی ترغیب جہاد، جہاں بھی ہے مطلق انفاق کی نہیں، بلکہ مراد وہی انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدمتِ دین میں خرچ ہے۔

**۱۰۶۸** (اُسے جائز قرار دے کر)

یاکلون الربٰوا۔ محاورہ میں اس سے مراد سود لینا ہے خواہ وہ کسی صرف میں بھی لایا جائے محض کھانا مراد نہیں۔

والمراد یکسبون الربا ویفعلونہ فاللباس والسکنٰی والادخار والانفاق علی العیال داخل فی قولہ الذین یاکلون (قرطبی) فالمراد الذین یعاملون بہ وخص الاکل لانہ معظم الامر (کبیر)

اردو محاورہ میں بھی "سود خواری" عام ہے محض "خورش" تک محدود نہیں۔

الرّبٰوا۔ ربوا کے لغوی معنی ہر زیادتی اور اضافہ کے ہیں خصوصًا سرمایہ میں اضافہ کے۔

ربا ای زاد وعلا (راغب) الربا الزیادۃ فی راس المال (راغب)

اصطلاحِ شریعت میں ربوا کہتے ہیں اصل قرضہ پر زیادتی کو یا بلا معاوضۂ مال، مال پر زیادتی کو خواہ بڑی ہو یا چھوٹی

خُصّ فی الشرع بالزیادۃ علی وجہٍ دون وجہٍ (راغب) وفی الشرع عبارۃ عن فضل مال لایقابلہ عوض فی معاوضۃ مالٍ بمالٍ (روح) ھو فضل مالٍ خالٍ عن العوض فی معاوضۃ مالٍ بمالٍ (مدارک)

اہلِ عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لئے استعمال کرتے تھے، جو قرض خواہ اپنے قرض دار سے مہلت کے معاوضہ میں وصول کرتا تھا، اردو میں اسی کا ترجمہ سود ہے، اور سود کا مفہوم ہر ایک سمجھتا ہے۔

الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ

وہ لوگ نہ کھڑے ہو سکیں گے سوا اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی بنادیا ہو ۱۰۶۹

یہ آیت اُن عام عاصیوں کے حق میں نہیں، جو سودخواری کا محض ارتکاب کرتے رہتے ہیں؛ بلکہ ان لوگوں کے حق میں ہے جو سرے سے حرمتِ ربوٰی کے منکر ہیں، جیسا کہ چند لفظوں کے بعد اسی آیت کے اندر اُن کا قول نقل ہوا ہے، قالوا انما البیع مثل الربوٰا کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔

معناہ ہٰذہ جمیع ما ذکر لیس فی الکفار و لھم قیل فلہ ما سلف ولا یقال ذلک لمومن عاص (قرطبی) یحتمل ان یکون ذلک اشارۃ الی اکلھم الربٰوا ای ذلک الاکل الذی استحلوہ بسبب قولھم واعتقادھم ان البیع مثل الربا (بحر) ای مستحلین ذلک۔ (فہم)

۱۰۶۹ اصل منظر تو یہ قیامت کے دن کا ہے کہ آخرت میں اپنی قبروں سے اٹھنے پر یہ سودخوار سیدھے کھڑے تک نہ ہو سکیں گے، کھڑے ہوں گے بھی تو متوالوں، خبطیوں، دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے، لیکن اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دنیا ہی میں نظر آجاتا ہے، مہاجن ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ باؤلا رہتا ہے، واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جن یا بھوت چمٹ گیا ہے، اور اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، سوتے جاگتے اس پر سود یا بیاج ہی سوار رہتا ہے، اور جس کی حرص و طمع کی پیاس دنیا میں اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے لازم ہے کہ اس کا حشر بھی اسی مخبوط، جنون زدہ حالت کے ساتھ ہو۔ اہلِ کشف اور محققین صوفیہ کا بیان ہے کہ حشر میں انسان اسی صورت کے ساتھ اٹھے گا جس قسم کی سیرت اور خصلتیں دنیا میں اسی پر غالب رہی ہوں گی، قال العارف الرومی ؎

سیرتے کو بہر نہادت غالب است ہم برآں تصویر حشرت واجب است

من المس۔ مس اور مسِ شیطانی سے مراد عربی محاورہ میں جنون ہوتا ہے۔

کنی بالمس عن الجنون (راغب) المس الجنون (کشاف)

اِن الفاظ کے آجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن مجید خود بھی اس عقیدہ کی تعلیم دے رہا ہے کہ جنون مسِ شیطانی ہی سے پیدا ہوتا ہے بلکہ قرآن بعض اوقات ایسے موقع پر صرف مخاطبین کے معتقدات کو دہرا دیتا ہے اور چونکہ اہل عرب کا عقیدہ یہی تھا اس لئے ہو سکتا ہے کہ قرآن انھیں کی فہم کی مناسبت اور مذاق کی رعایت سے یہ فقرہ لے آیا ہو۔

قیل اضیف الی الشیطان علی زعمات العرب ان الشیطان یخبط الانسان فیصرعہ فورد علی ما کانوا یعتقدون (بحر)

چنانچہ معتزلہ اور قفال شافعی کا یہی مذہب ہے کہ قرآن مجید میں یہ قول حسب اعتقاد مخاطبین لے آیا گیا ہے۔

وقال المعتزلۃ والقفال من الشافعیۃ ان کون الصرع والجنون من الشیطان باطل لانہ لا یقدر علی ذلک ... وما ھٰھنا وارد علی ما یزعم العرب ویعتقدونہ من ان الشیطان یخبط الانسان فیصرع وان الجن یمسہ فیختلط عقلہ ولیس لذلک حقیقۃ (روح) وذکر القفال فیہ وجہا اٰخر وھو ان الناس یضیفون الصرع الی الشیطان والی الجن فخوطبوا علی ما تعارفوہ من ھٰذا (کبیر)

قفال ہی نے یہ بھی کہا ہے کہ عرفِ انسانی میں جب کسی شے کی شدید بُرائی مقصود ہوتی ہے تو اُسے منسوب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ

یہ (سزا) اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں ۱۰۶۰ کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے ۱۰۶۱ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے

الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ

اور سود کو حرام کیا ہے ۱۰۶۲ پھر جس کسی کو نصیحت اس کے پروردگار کی طرف سے پہنچ گئی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا وہ اسی کا ہو چکا ۱۰۶۳

شیطان کی جانب کر دیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن مجید نے بھی دوسری جگہ اسی محاورۂ انسانی سے کام لیا ہے۔

وایضًا من عادة الناس انهم اذا ارادوا تقبیح شیٔ ان یُضیفوه الی الشیطان کما فی قوله تعالیٰ طلعها کانّه رؤس الشیاطین (کبیر)

اور شیطان عربی میں نہایت وسیع مفہوم رکھتا ہے، چنانچہ ہر خُلق ذمیم شیطان ہی ہے۔

وسُمّی کل خلق ذمیم للانسان شیطانًا فقال علیه السلام الحسد شیطانٌ والغضب شیطانٌ (راغب)

**۱۰۶۰** (حکم حُرمتِ ربوٰ کے جواب میں بطور استدلال کے)

یہ کہنے والے عہدِ جاہلیت کے "روشن خیال" سود خوار اور جوازِ سود کے قائل تھے۔

**۱۰۶۱** (حصولِ نفع واضافۂ دولت کے لحاظ سے)

آج کل کے "روشن خیالوں" کی طرح عہدِ جاہلیت قدیم کے بھی سفیہوں کا کہنا یہ تھا کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہو؟ ان نافہموں نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا کہ دونوں کی ایک سطح نہ اخلاقی حیثیت سے ہے نہ معاشی حیثیت سے، سود کی تو ایک متعیّن رقم بے کھٹکے ہر حال میں مہاجن کو ملتی رہتی ہے، برخلاف اس کے تجارت میں نفع ونقصان دونوں کے احتمالات ہر وقت لگے رہتے ہیں، اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لئے وقت، محنت، ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، پھر تجارتی معاملت تو بروقت ختم ہو جاتی ہے برخلاف اس کے مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سود خوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات قرضدار کی نوبت بالکل تباہ حالی اور بربادی کی پہنچ جاتی ہے

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں حرمتِ سود کے جو عقلی دلائل لکھے ہیں، وہ طرزِ ادا وتعبیر کی تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد آج بھی پوری طرح پڑھنے کے قابل ہیں، امام رازیؒ نے نمبر اول پر یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ سود کی رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہوتی ہے؟ بجز مُفت خوری کی بدترین شکل کے اور یہ ہے کیا؟

**۱۰۶۲** (اور معلوم ہے کہ اللہ وہ ہے جو شرائع اور احکام کا مالک ہے اور حکیم بھی ہے اور حاکم بھی)

جب حکیمِ مطلق نے ایک معاملت کو جائز اور دوسری کو حرام ٹھہرا دیا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جائز کے اندر بے شمار منافع ومصالح اور حرام کے اندر بے شمار مفاسد ونقصانات ہیں اور بالفرض کسی کی سمجھ میں یہ مصالح ومفاسد نہ بھی آئیں، جب بھی حاکمِ مطلق کا حکم واجب العمل تو بہرحال ہے۔

اسلام کے جو احسانات ساری دنیا پر اور بہت روشن ونمایاں حیثیت سے ہیں، اُن میں سے ایک حرمتِ سود بھی ہے، اس کے مفاسد روشن سب پر ہو چکے تھے، اس سے عاجز سب ہی آچکے تھے، لیکن قطعی اور کلّی صورت میں حرام اُسے دنیا کے ضابطوں اور شریعتوں میں صرف اسلام ہی نے قرار دیا، سود خوار کے دل میں شقاوت وسنگدلی، اور حرصِ مال، اور

وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا

اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے رہا ۱۰۷۴ اور جو کوئی پھر عود کرے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں وہ

خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ

ہمیشہ پڑے رہیں گے ۱۰۷۵ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے ۱۰۷۶

بلا مشقت مال ہاتھ آجانے سے نفس میں ناءت اور زر پرستی، اور ساہوکاروں کا بخل اور باہمی حسد و رقابت، اور قرضدار بیچارہ کی بے حرمتی و تذلیل، یہ واقعات و مشاہدات کہنا چاہئے کہ پیش پا افتادہ تھے لیکن اس کی قطعی بندش کا خیال کسی انسانی دماغ کو نہ آیا، اصلاح حال کی جو کوششیں زیادہ سے زیادہ ہوئیں وہ بس شرح سود کی تحدید تک رہیں یونان میں سولن، انگلستان میں ہیکن اور یورپ میں آبائے کلیسا کے جوشِ اصلاح و افادۂ خلق کی کائنات کل اسی قدر ہے یہ فخر قیامت تک کے لئے عرب کے امیؐ کے ساتھ مخصوص ہو گیا کہ اس انسانیت کش رسم کی حرمت کی منادی اس کی زبان سے کرائی گئی اور حرّم الرّبٰوا کا زلزلہ افگن نعرہ اس کے دہن سے بلند کرایا گیا۔

۱۰۷۳ (اور وہ اس کھائے ہوئے نوالے کے اگلنے پر مجبور نہیں)

موعظۃٌ من ربّہ۔ یعنی یہی حرمتِ سود کا حکم۔

فانتھیٰ۔ یعنی وہ باز آگیا سود لینے اور اُسے جائز ٹھہرانے سے۔

فلہٗ ما سلف۔ یعنی اسی حکمِ حرمت سے قبل جو کچھ وہ لے چکا سو لے چکا، توبہ کے بعد اس کے لئے گنجائش ہے کہ اس مال کو اپنے پاس رہنے دے، پچھلی رقموں کی واپسی پر شریعتِ اسلام نے مجبور نہیں کیا ہے۔

وھٰذا ھو المروی عن الباقر و سعید بن جبیر۔ (روح)

۱۰۷۴ (جو دلوں کے اسرار و خفایا کا عالم ہے)

مقصود یہ ہے کہ یہاں بیان بندوں کے سامنے معاملہ کے صرف ظاہری اور قانونی پہلوؤں کا ہو رہا ہے، باقی قلب کے تقویٰ و طہارت اور نفس کی اصلاح کا معاملہ اللہ پر چھوڑنا چاہئے۔

امرہٗ۔ میں ضمیر باز رہنے والے من انتھیٰ کی طرف ہے۔

الظاھر ان الضمیر فی امرہ عائد الی من انتھیٰ۔ (بحر)

۱۰۷۵ یعنی جو کوئی اس تبلیغ کے بعد بھی عقیدۂ جوازِ سود پر قائم رہے یا سودی معاملت کرتا رہے۔

اولٰئک اصحٰب النار۔ یہ سزا ہے سودی معاملت کرنے والوں کی، معاملتِ سود گناہ کبیرہ ہوا اور گناہ کبیرہ کی سزا جہنم ہے۔

ھم فیھا خالدون۔ یہ سزا ہے جوازِ سود کے قائلوں کی، جوازِ سود کا عقیدہ کفر ہے اور کفر کی سزا خلودِ جہنم ہے۔

ای ماکثون ابدا لکفرھم (روح) لانّ من احلّ ما حرّم اللّٰہ عزّوجلّ فھو کافر فلذا استحق الخلود (مدارک)

معتزلہ نے آیت کے اتنے جزء سے مومن اہلِ معاصی کی عدم مغفرت پر استدلال کرنا چاہا ہے لیکن تفسیر کا جو پہلو یہاں اختیار کیا گیا اس پر یہ سوال وارد ہی نہیں ہوتا، امام رازیؒ نے بھی تفسیر کبیر میں اس مقام پر خوب تقریر کی ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٧٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

اور اللہ پسند نہیں کرتا کسی کٹے کافر گنہگار کو ۱۰۷۶ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اور

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا

نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دی ان کے لئے ان کا اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے نہ اُن پر

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٧﴾

کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱۰۷۷

۱۰۷۶ آخرت میں تو اس وعدہ ووعید دونوں کا مشاہدہ پوری طرح ہو کر رہے گا کہ سود میں برکت و خیریت برائے نام بھی نظر نہ آئے گی، اور صدقات کا اجر بے حساب ملے گا، لیکن دنیا میں بھی اس کا ظہور کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی رہتا ہے سود خوار قوموں کا انجام بارہا آپس کی خونریزی اور تباہی وبربادی ہی پر ہوا ہے اور افراد میں بھی مشاہدہ ہے کہ سود خواری کی عادت بنیوں، مہاجنوں کے دل میں روپیہ کو فی نفسہٖ محبوب بنا دیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سود خوار زر و دولت سے دُنیوی لُطف بھی نہیں اٹھا پاتا، اس کے مقابلہ میں صدقہ کی برکتیں، دلی غمخواری وہمدردی، ایک دوسرے کی مشارکت ومعاونت قوم و افراد دونوں میں مشاہدہ کی چیزیں ہیں بینکوں کے آئے دن ٹوٹتے مہاجنوں اور بنیوں کے دیوالہ نکلتے رہتے اور پھر اس سے ہزاروں گھروں کی تباہی وبربادی کس نے نہیں دیکھی ہے؟ معاشرہ کی اس ابتری کا راز یہی سودی کاروبار کی ترویج ہے۔

۱۰۷۷ اس کے اندر دونوں قسم کے نافرمان آگئے، وہ جو سود کا کاروبار کرتے ہیں اور وہ جو اپنے عمل کے ساتھ ساتھ حرمتِ سود کے عقیدۃً بھی منکر ہیں۔

کفّار۔ کافر کا صیغۂ مبالغہ ہے ناشکرے اور کفرانِ نعمت کرنے والے کے مفہوم میں کفور کا مرادف اور اس سے بلیغ تر۔

الكفور المبالغ فی كفران النعمة والكفّار ابلغ من الكفور (راغب)

یہاں مُراد وہ لوگ ہیں، جو جوازِ سود کے قائل ہیں۔

مُصِرّ علی تحليل المحرمات (بیضاوی) ای عظيم الكفر باستحلال الربوا (مدارک)

اردو محاورہ میں کافر کے مفہوم کو اور زوردار بنانے کے لئے "کٹا کافر" بولتے ہیں۔

اثیم۔ بڑے گنہگار، یعنی سود خواری جیسی شدید معصیت میں مبتلا۔

متماد فی الاثم باكله (مدارک) منهمك فی ارتكابه (بیضاوی)

کفّار کے لفظی معنی بڑے ناشکرے کے ہیں، جس شخص پر اللہ اپنا اتنا فضل کرے کہ اُسے اس کی اپنی ضروریات سے زیادہ مال دے اور وہ اس مال کو بندوں کی آزار رسانی پر صرف کرے تو اس سے بڑھ کر سوء استعمال کی مثال اللہ کے فضل کی اور کیا ہوگی اور ایسے بدبخت سے بڑھ کر ناشکرا اور کون قرار پائے گا۔

۱۰۷۸ (قیامت میں)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان

مُؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ

والے ہو ۱۰۷۹ لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ جنگ کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ۱۰۸۰

خیر آخرت میں تو ایسے نیک کردار، متقی، خاشع، خادم خلق انسانوں کی خوش انجامی ظاہر ہی ہے لیکن دنیا میں بھی جو سکونِ قلب یکسوئی، طمانیتِ خاطر اور قناعت کی راحتیں اور مسرتیں ایسے لوگوں کو حاصل رہتی ہیں، ان کا اندازہ وہ بدنصیب کر نہیں سکتا جو چوبیس ۲۴ گھنٹے آنہ پائی کی میزان لگاتا رہتا ہے، جو مخلوق کی ایذا رسانی کا خوگر ہو کر پیٹ بھر کر ستاتا رہتا ہے اور جس پر ہر گھڑی یہی کھٹکا سنبھالے رہنے کا بھوت سوار رہتا ہے۔

واقاموا۔ الزکوٰۃ۔ نماز اور زکات، اِن دو طاعتوں کا نام بہ طور نمونے کے لئے دیا گیا، مراد ساری ہی بدنی مالی طاعتیں ہیں، یہ دو طاعتیں اپنی اپنی نوعیت میں سب سے افضل ہیں۔

وخص الصلوٰۃ والزکوٰۃ بالذکر وقد تضمنهما عمل الصالحات تشريفا لهما وتنبيها على قدرهما اذهما رأس الاعمال الصلوٰۃ فی اعمال البدن والزکوٰۃ فی اعمال المال۔ (قرطبی)

**۱۰۷۹** (کہ ایمان کا مقتضیٰ سارے ہی احکام قرآنی پر عمل کرنا ہے)

محققین نے اس ٹکڑے سے یہ استدلال کیا ہے کہ شریعت کے کسی ایک جزو سے بھی انکار کرنا ساری شریعت سے انکار کرنا ہے۔

فيه دليل على ان من كفر بشريعة واحدة من شرائع الاسلام كان كافرا كما لو كفر بجميع شرائعه (کبیر)

اتقوا الله۔ خوفِ خدا ہی اصل ہے تمام نیکیوں کی اور اجتنابِ معاصی کی۔

وذروا مابقی یعنی حرمتِ سود کے نزولِ حکم سے قبل جو رقم سود کی تم ٹھہرا چکے ہو اُس کا وصول کر لینا اب جائز نہیں، اُسے چھوڑ دو

**۱۰۸۰** یعنی تم پر باغیوں اور مرتدوں کی طرح جہاد کیا جائے گا۔

كما يحارب الفئة الباغية (کبیر) كحرب المرتد وكحرب البغاة (روح) اعلام بانهم ان لم يفعلوا ما أمروا به فهم محاربون لله ورسوله (جصاص)

اتنی شدید تہدید قرآن مجید میں کسی دوسری معصیت کے لئے نہیں آئی ہے۔

العظمۃ للہ! حرمتِ سود کا کس درجہ اہتمام ہے اور اس باب میں کس درجہ شدید احکام ہیں! اس کے بعد کچھ حد ہے اس ڈھٹائی اور جسارت کی کہ اپنے کو مسلمان کہلا کر رسالے "جوازِ سود" پر شائع کئے جائیں؟! اور اپنی تحریر و تقریر سے لوگوں کو سودی کاروبار کی ترغیب دلائی جائے۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابیٔ رسول سے یہ جو قول منقول ہے کہ سود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے مشابہ چیزوں کو بھی، وہ اسی قرآنی تہدید کا قدرتی نتیجہ ہے، جب جسمانی بیماریوں کا یہ حال ہے کہ کسی مرض کو طبیب اگر سخت مرض سے مشابہ پاتا ہے تو احتیاطاً علاج اس سخت تر مرض کا شروع کر دیتا ہے تو جو مسلمان تقویٰ کا ادنیٰ درجہ بھی رکھتے ہیں، اُن پر بھی یہی لازم ہے کہ نہ صرف کھلے ہوئے سود سے بچیں بلکہ ایسی

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿٢٧٩﴾

اور اگر تم توبہ کرلو گے تو تمہارے اصل اموال تمہارے ہی ہیں ۱۰۸۱ نہ تم (کسی پر) ظلم کرو گے اور نہ تم پر (کسی کا) ظلم ہوگا ۱۰۸۲

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ

اور اگر تنگ دست ہے تو اس کے لئے آسودہ حالی تک مہلت ہے ۱۰۸۳ اور اگر معاف کردو تو تمہارے حق

لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ قف

میں (اور) بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو ۱۰۸۴ اور اس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم (سب) اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۱۰۸۵

مالی وکاروباری صورتوں سے بھی احتیاطاً بچتے رہیں، جن کا سودی ہونا قطعی نہیں، صرف اغلب ہے۔

ان لم تفعلوا۔ یعنی اگر اس حکم حرمتِ سود پر عمل نہ کرو گے۔

۱۰۸۱ یعنی حکومتِ اسلامی تمہارا اصل سرمایہ تمہیں واپس لادے گی اگر توبہ نہ کرو گے تو راس المال بھی بحقِ حکومتِ اسلام ضبط ہوجائے گا۔

ان تبتم۔ یعنی اگر سود خواری کی معصیت سے توبہ کرلو گے۔

۱۰۸۲ یہاں شریعتِ اسلامی کی ایک کلی حقیقت بیان کردی ہے کہ تم نہ کسی پر زیادتی کرو، اور نہ کوئی تم پر زیادتی کرے

لَا تَظْلِمُوْنَ۔ ظالم بننے کی صورت تو یہ ہے کہ کوئی رقم قرض دی اور وصول کرتے وقت اصل سے زائد وصول کرلی یعنی سود لینا بطلب الزیادۃ علیٰ رأس المال۔ (کبیر)

لَا تُظْلَمُوْنَ۔ مظلوم بننے کی صورت یہ ہے کہ جتنی رقم قرض لی تھی اب ادا کرنا اس سے زائد کا پڑ رہا ہے یعنی سود دینا ای بنقصان رأس المال (کبیر)

۱۰۸۳ یعنی مدیون یا قرضدار اگر وقت پر تنگدست ہے تو اُسے اسی وقت تک کے لئے مہلت دیدی جائے جب تک وہ ادا کرنے کے قابل ہوجائے۔

۱۰۸۴ (کہ اس احسان وحسنِ سلوک پر کتنا اجرِ عظیم موعود ہے)

اَنْ تَصَدَّقُوْا۔ یعنی نادار مدیون کو اپنا مطالبہ بالکل معاف ہی کردو۔ عقائدِ اسلامی کی طرح قوانینِ اسلامی کی بھی پوری قدر اس وقت ہوتی ہے جب ان کے مقابلہ میں اپنے کو مہذب اور ترقی یافتہ کہلانے والی قوموں کے قوانین رکھے جائیں، خود اس قرضہ کے معاملہ میں دوسری قوموں کے قانون قرضداروں کے حق میں سرتاسر ظالمانہ ہیں۔ رومی قانون یا مرعوب کن "رومن لا" میں مدیون کو قتل تک کیا جاسکتا تھا، اور رومی تاریخ میں دائنوں کی ظلم وزیادتی سے بارہا نوبت شدید بلووں تک آگئی ہے ایک ورنکتہ! اسلامی نظامِ معاشیات کی بنیاد ماديات سے کہیں بڑھ کر انسانیت وروحانیت و تقویٰ الٰہی پر رکھی ہے، اور یہ خصوصیت اُسے دنیا کے قدیم وجدید سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کئے ہوئے ہے۔

۱۰۸۵ (اپنے اپنے اعمال کی پیشی کے لئے)

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ يٰٓاَيُّهَا

پھر ہر شخص کو اس کا معاوضہ پورا پورا ملے گا اور ان پر ظلم (ذرا بھی) نہ ہو گا ۱۰۸۶ اے ایمان والو!

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

جب اُدھار کا معاملہ کسی مدتِ مُعیّن تک کرنے لگو تو اس کو لکھ لیا کرو ۱۰۸۷

مراد یوم حشر ہے۔

وجمهور العلماء على ان هذا اليوم المحذ رمنه هو يوم القيامة والحساب والتوفية (قرطبی)

یوم موت بھی مراد لیا گیا ہے۔

وقال قوماهو يوم الموت (قرطبی)

خطاب یہاں نوعِ انسان سے ہے۔

والاٰية وعظٌ لجميع الناس۔ (قرطبی)

۱۰۸۶ (کہ کسی کا نیک عمل بلا معاوضہ رہ جائے یا کسی کے نامۂ عمل میں کوئی بدی خواہ مخواہ لکھ دی جائے)

تُوَفّٰى مَا كَسَبَتْ۔ یعنی اعمال کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا، ماکسبت میں پورا مفہوم اعمالِ اختیاری کا آگیا، اور ضمناً رد فرقۂ جبریہ کا نکل آیا۔

وفى هذه الاٰية نصٌّ على ان الثواب والعقاب متعلق بكسب الاعمال وهو ردٌّ على الجبرية (قرطبی)

متعدد اقوالِ تابعین میں آیا ہے کہ قرآن مجید کی یہی آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے اور حضور صلعم اس کے بعد جلد ہی وفات پا گئے، تفصیلات قرطبی وغیرہ میں درج ملیں گے۔

۱۰۸۷ (اور اس صاف صاف لکھا پڑھی کو نہ دلیل بے اعتمادی کی سمجھو اور نہ اس میں شرماؤ)

دَین۔ دَین کا لفظ بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے، عربی میں یہ عین کے مقابلہ میں ہے اور اس کا اطلاق ہر اس معاملت پر ہوتا ہے، جس کے معاوضہ کا ایک جزو فی الفور ادا نہ ہو۔

هو عبارة عن كل معاملة كان احد العوضين فيها نقدًا والاٰخر فى ذمة النسيئة كان العين عند العرب ما كان حاضرًا والدين ما كان غائبًا۔ (ابن عربی۔ قرطبی)

تداینتم بدین۔ دَین یا اُدھار معاملت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ چیز ابھی خریدی اور قیمت کے لئے طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد دیں گے، دوسری یہ کہ قیمت اسی وقت دیدیں اور چیز کے لئے یہ طے پا گیا کہ اتنی مدت کے بعد لیں گے شرعاً دونوں صورتیں جائز ہیں تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی ــــ تداینتم کے بعد دَین کی تصریح تاکید کے لئے ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ فقہاء مفسرین نے اس سے یہ اشارہ سمجھا ہے کہ قرضہ کے معاملات میں مدت بالکل صاف اور متعین ہونا چاہیئے، گول اور مجمل نہ رہے "جاڑوں کے زمانہ میں" "برسات کے موسم میں" "ربیع کی فصل میں" ان مبہم مدتوں کے بجائے تعین و صراحت ہونا چاہیئے کہ فلاں سنہ کے فلاں مہینہ کی فلاں تاریخ فقیہ ابن العربی مالکی نے اس ایک آیت کے

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ

اور لازم ہے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا ٹھیک ٹھیک لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے

كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ

اس کو سکھا دیا ہے ١٠٨٨ پس چاہئے کہ وہ لکھ دے اور چاہئے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق واجب ہو ١٠٨٩

ذیل میں ٥٢ مسئلے لکھے ہیں اور لکھا ہے کہ آیت مسائلِ بیع میں اہم ترین آیت ہے۔ ھی اصل فی مسائل البیوع وکثیر من الفروع۔
اور قرطبی نے بھی اتنے مسئلے اس کے تحت میں درج کئے ہیں۔
فاکتبوہ۔ یعنی مقدار قرضہ کو بھی اور مدتِ ادائیگی، دونوں کو لکھ لو۔
یعنی الدّین والاجل (قرطبی) ای الدّین باجلہ لِاَنّہٗ اوفق واوثق۔ (روح)
یہ کتابتِ دستاویز کا حکم جمہور فقہاء کے ہاں استحبابی ہے۔
والجمھور علی استحبابہ (روح) مذھب الجمھور الی انّ الامر بکتابۃ الدّین للندب (المنار)
لیکن ایک معتدبہ جماعت نے اسے وجوب کے معنی میں بھی لیا ہے۔
وذھب اقوام الی ان الامر للوجوب وبہ قال عطاء والشعبی وابن جریر فی تفسیرہ (المنار)
عامی صوفیہ اور جاہل مشائخ نے جو یہ سمجھ رکھا ہے کہ معاملت و معاشرت کی اصلاح و درستی سلوک و طریقت کے منافی ہے وہ غور کریں کہ قرآن کو اس باب میں کتنا اہتمام بلکہ اس کے ادنیٰ جزئیات تک کا انضباط مدِّنظر ہے۔

**١٠٨٨** باہمی لین دین اور قانونی معاملات کے سلسلہ میں ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک کے لئے شریعت کا یہ اہتمام! اللہ اللہ! عالمگیر ہدایت و رہنمائی کا حق اگر کسی کتاب کو پہنچتا ہے تو بے شک وہ یہی کتاب ہو سکتی ہے کہاں ایک طرف یہ مکمل نظامِ زندگی اور مفصل ضابطۂ حیات اور کہاں اس کے مقابلہ میں انجیل جس کے صفحات قانون و معاملت کی موٹی موٹی ہدایات تک سے خالی ہیں!
کما علمہ اللہ۔ اللہ کی تعلیم سے مراد محض فنِ کتابت کی تعلیم نہیں بلکہ سارے علومِ فقہ و شریعت کے لئے عام ہے۔
فَاِنّ تعلیم اللہ ایاہ لیس خاصًا بصناعۃ الکتابۃ بل ھو یعمّ ما وفقہ من علم الاحکام والفقہ فیھا۔ (المنار)
بالعدل۔ یعنی کسی فریق سے متاثر ہوئے، کسی کی رُو رعایت کئے ہوئے بغیر لکھے، فقہاء نے یہاں سے یہ بھی نکالا ہے کہ کاتب کو متدیّن اور شرائط تحریر کا عالم ہونا چاہئے اور فریقین پر لازم ہے کہ ایسے ہی کاتب کی تلاش کریں۔
فیہ دلیل ان یکون الکاتب فقیھا عالمًا بالشروط وھو امر للمتداینین بتخییر الکاتب (مدارک)
لا یاب کاتب۔ فقہاء نے کہا ہے کہ کاتب کو اپنی محنت کی اُجرت لینا جائز ہے۔
آیت میں کاتب کے لکھنے سے انکار کی صریح ممانعت ہے۔
نھی اللہ الکاتب عن الاباء۔ (قرطبی)
بالعدل میں ب کا تعلق جس طرح ولیکتب سے جائز ہے اسی طرح کاتب سے بھی درست ہے، اور دونوں ہی قول اختیار کئے گئے ہیں۔

**١٠٨٩** دستاویز کا ماحصل کسی حق کا اپنی طرف اقرار کرنا ہے یہ قدرۃً اسی کو کرنا چاہئے جس کے ذمہ کوئی حق واجب الادا ہو۔

وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ

اور چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرتا رہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے ۱۰۹۰ پھر اگر وہ جس کے ذمہ حق واجب ہے

الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ

عقل کا کوتاہ ہو یا کمزور ہو ۱۰۹۱ اور اس قابل نہ ہو کہ وہ خود لکھوا سکے ۱۰۹۲ تو لازم ہے کہ اس کا کارکن

وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ

ٹھیک ٹھیک لکھوا دے ۱۰۹۳ اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ کر لیا کرو ۱۰۹۴

ولیملل۔ یعنی دستاویز کو لکھانا۔

۱۰۹۰ یعنی جو حق جس طرح اور جتنا اس پر واجب ہے اس میں سے کاتب دستاویز کو بتلائے اور لکھاتے وقت کچھ بھی کتر بیونت نہ کرے۔ ولیتق اللّٰہ ربہ۔ خوفِ خدا تو مسلمان کے لئے جزوِ زندگی اور اس کی زندگی بھر رہنا چاہیے، دستاویز لکھاتے وقت اس کی تاکید اور یاددہانی کی حکمتیں اور مصلحتیں بالکل واضح ہیں۔

۱۰۹۱ اور یہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ دستاویز لکھانے والا وہی ہونا چاہیے۔

سفیہ۔ یہ مراد نہیں کہ پاگل ہو بلکہ صرف ضعیف العقل مراد ہے۔

ضعیف الرأی ناقص العقل من البالغین (کبیر)

ضعیف۔ یہاں ایک جامع لفظ ہے، نابالغ اور پیر فرتوت سب اس کے اندر آجاتے ہیں۔

الصغیر والمجنون والشیخ الخرف وھم الذین فقدوا العقل بالکلیۃ۔ (کبیر)

۱۰۹۲ (کسی اور عذر یا مانع سے)

مثلاً یہ کہ گونگا ہو، پردیسی ہو، ملک کی زبان سے ناواقف ہو۔

۱۰۹۳ (الیٰ ہر صورت میں اس کی طرف سے ٹھیک ٹھیک)

ولیّ سے مراد ولیِ شرعی ہے یا وکیل یا مختار (یا پردیسی کے لئے ترجمان) تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔ مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی صورت جب ایسی پیش آجائے کہ صاحبِ معاملہ کا اقرار اور بیان معتبر نہ رہ جائے تو اعتبار اس کے کارکن کے بیان و اقرار کا کیا جائے۔

ولیہ۔ ضمیرہ، الذی علیہ الحق کی طرف ہے۔

قیل ھو عائد علی الذی علیہ الحق وھو الصحیح۔ (قرطبی)

۱۰۹۴ (جو عاقل ہوں، بالغ ہوں، آزاد ہوں، دیندار ہوں)

من رجالکم۔ اس تصریح کے بعد علاوہ کافر کے، مسلمان بچے اور عورتیں اور غلام دائرۂ شہادت سے نکل گئے۔

ای من رجال المومنین والحریۃ والبلوغ مشروط مع الاسلام (مدارک) نص فی الکفار والصبیان والنساء (قرطبی)

فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ

پھر اگر دونوں مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ان گواہوں میں سے جنھیں تم پسند

الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى‌ ؕ

کرتے ہو ۱۰۹۵ تاکہ ان دو عورتوں میں سے ایک دوسری کو یاد دلادے اگر کوئی ایک ان دو میں سے بھول جائے ۱۰۹۶

دلالۃ علی اشتراط الاسلام والبلوغ والذکورۃ فی الشاھدین والحریۃ لان المتبادر من الرجال الکاملون (روح)

فقہ امامیہ میں حرّیت، قبولِ شہادت میں شرط نہیں، صرف اسلام اور عدالت کافی ہیں، اور یہی مذہب تابعین میں سے بعض فقہائے اہلِ سُنّت کا ہے۔

وذھب الامامیۃ الی عدم اشتراط الحریۃ فی قبول الشھادۃ وانما الشرط فیہ عندھم الاسلام والعدالۃ والی ذالک ذھب شریح وابن سیرین وابو ثور وعثمان البستی۔ (روح)

غیر مسلموں کی گواہی غیر مسلموں کے معاملات میں مقبول ہوسکتی ہے گو ان کے دین ایک دوسرے سے مختلف ہوں۔

وشھادۃ الکفار بعضھم علی بعض مقبولۃ عندنا (مدارک) ولم تعرض الآیۃ لشھادۃ الکفار بعضھم علی بعض واجاز ذالک قیاماً الامام ابوحنیفۃ وان اختلفت مللھم۔ (روح)

واستشھدوا۔ گواہوں کی یہ گواہی تحریر و دستاویز کے علاوہ ہونا چاہیئے، فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ اصل مدارِ ثبوت انھیں گواہوں کی گواہی ہوگی۔

۱۰۹۵ (یعنی جو تمہارے نزدیک ثقہ و قابل اعتبار ہوں)

فان لم یکونا رجلین۔ یعنی دو مرد گواہی کے لئے اگر میسر نہ آئیں۔

رجل وامراتان۔ یہودی قانون میں گواہی صرف مردوں کی معتبر ہے اور عورت کی شہادت سرے سے قابلِ تسلیم نہیں، اسلام نے اُسے یہ حق تو دیا ہے لیکن ساتھ ہی اپنے علمِ کامل اور تحقیق مطلق کی بنا پر عورت کی گواہی کا مرتبہ مرد کے مقابلہ میں نصف مانا ہے

ممن ترضون۔ دیانت، ضمیر، سیرت، کردار کا ایک خاص معیار اسلام نے زندگی کے چھوٹے بڑے ہر شعبہ اور معاشرت کے بعید سے بعید گوشہ میں بھی قائم رکھا ہے، چنانچہ یہاں یہ قید لاکر صاف بتادیا کہ شہادت بھی ایک خاص اعزاز و منصب ہے، ہر کس و ناکس اس کا اہل نہیں، اس کے اہل وہی ہیں جن کے سیرت و کردار پر اسلامی معاشرہ کو اطمینان ہو اور جن کی دیانت کم سے کم عام طور پر مشتبہ نہ ہو۔

دوسرے ائمہ فقہ نے آیت سے مراد یہ لی ہے کہ گواہوں کی عدالت بھی ثابت ہونی چاہیئے۔

الناس لیسوا محمولین علی العدالۃ حتی تثبت لھم وذالک معنی زائد علی الاسلام وھذا قول الجمھور (قرطبی)

لیکن امام ابوحنیفہ رح کا قول ہے کہ ہر کلمہ گو، جب تک کہ اس میں فسق کی کوئی کھلی ہوئی علامت نہ ہو عادل (ثقہ) ہی سمجھا جائے گا

وقال ابوحنیفۃ کل مسلم ظاھر الاسلام مع السلامۃ من فسق ظاھر فھو عدل وان کان مجھول الحال (قرطبی)

ممن ترضون۔ میں خطاب عام اُمت سے سمجھا گیا ہے بعض نے حکام مراد لی ہے۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا

اور گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں ۱۰۹۷ اور اس (معاملت) کو خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو اس کی میعاد

اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا

تک لکھنے میں کاہلی نہ ہو، یہ (کتابت) اللہ کے نزدیک زیادہ قرین عدل ہے ۱۰۹۸ اور شہادت کو درست تر رکھنے والی ہے اور زیادہ قریب ہے کہ تم شبہ میں نہ پڑو

والخطاب للمؤمنين وقيل للحكام (روح)

۱۰۹۶ (اور اس طرح شہادت مکمل ہو جائے)

اَنْ تَضِلَّ۔ بھول جائے شہادت کے کسی حصہ کو، واقعہ کے کسی جزو کو، رہا یہ امر کہ عورت کی شہادت مرد کے مقابلہ میں ضعیف کیوں مانی گئی ہے اور نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا؟ تو یہ سوالات قبح و حسن و اخلاق کی دنیا میں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے جسم و مادیات کی دنیا میں دریافت یہ کیا جائے کہ حمل و رضاعت کا تعلق صرف عورت ہی سے کیوں رکھا گیا اور مرد کو باوجود اس کی قوت و جسامت کے اس بار کے برداشت کے کیوں ناقابل سمجھ لیا گیا؟ جو فاطر کائنات ظاہر ہے کہ جسمیات و مادیات کے ایک ایک ذرہ سے واقف ہے، اس کے پیش نظر ذہنیات و اخلاقیات کی بھی باریک سی باریک حقیقتیں ہیں۔ مغرب کے ماہر نسائیات ہیولاک ایلس HAVELOCK ELLIS نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ عورت کے لئے دھوکا اور فریب بہ منزلہ امر طبعی کے ہوتا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)

۱۰۹۷ (کہ اس میں اعانت ہے معاملات امت کی اور خدمت ہے دین کی)

ولا یاب الشهداء۔ یعنی گواہ بننے اور گواہی دینے سے انکار نہ کریں۔

لاداء الشهادة (روح)

آیت سے استدلال کیا گیا ہے کہ شہادت دینا امت کے لئے فرض کفایہ ہے۔

ومن هٰهنا استنبط ان عمل الشهادة فرض كفاية قيل وهو مذهب الجمهور (ابن کثیر)

۱۰۹۸ (یعنی وہی کتابت معاملۂ دین سے متعلق)

عند الله۔ یعنی اللہ کے قانون و ضابطہ میں۔

اى فى حكمه سبحانه (روح)

لا تسئموا۔ بار بار لکھنے لکھانے سے طبیعت میں ایک طرح کی کاہلی یا اکتاہٹ پیدا ہو جانا تقریباً قدرتی ہے۔

تکتبوہ۔ میں ضمیر اسی معاملۂ دین سے متعلق ہے۔

خطاب وہی عام امت سے ہے۔

والخطاب للمؤمنين۔ (روح)

ایک شور برپا ہے کہ اب زمانہ اس کا نہیں کہ مذہب خصوصاً اسلام کو عقائد معاد سے پرکھا جائے اب تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دنیا کے لئے سب سے زیادہ عملی مذہب کون ہے؟ اور روزانہ مسائل زندگی کے حل کرنے میں کون مذہب سب سے زیادہ زور دے رہا ہے؟ یہ معیار بجائے خود کس حد تک صحیح ہے یہ تو ایک الگ سوال ہے لیکن بہرحال جو لوگ اسی معیار کو مانے ہوئے ہیں کم سے کم وہ تو

إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ

لیکن اگر کوئی سودا دست بدست ہو جسے تم باہم لیتے ہی رہتے ہو سو تم پر اس میں کوئی الزام نہیں کہ تم

عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا ۗ وَأَشْهِدُوٓا۟ إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَآرَّ

اسے نہ لکھو ۱۰۹۹ اور جب خرید و فروخت کرتے ہو (تب بھی) گواہ کر لیا کرو ۱۱۰۰ اور کسی کاتب یا گواہ کو

كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ ۚ وَإِن تَفْعَلُوا۟ فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ بِكُمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ

نقصان نہ پہنچایا جائے ۱۱۰۱ اور اگر (ایسا) کرو گے تو یہ تمہارے حق میں ایک گناہ (شمار) ہوگا ۱۱۰۲ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۱۱۰۳

خلوئے ذہن کے ساتھ غور کریں کہ ساری شریعتوں میں اسلام سے بڑھ کر کس شریعت نے روزانہ زندگی کے چھوٹے بڑے تمام مسائل کے حل کرنے کا اہتمام رکھا ہے۔

۱۰۹۹ یہ اس لئے کہ دستگرداں معاملتیں کثرت سے برابر واقع ہوتی رہتی ہیں اور عموماً مقداریں بھی انکی خفیف ہوتی ہیں اور عموماً ان میں احتمال نزاع و اختلاف کا بھی کم ہی ہوتا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر کتابتِ دستاویز کے التزام سے ہرج لازم آتا تھا، اس لئے شریعت نے التزام کو یہاں سے اٹھا دیا، لیکن اگر کوئی معاملت ایسی ہو کہ شکل کے اعتبار سے تو دست بدست لیکن مالیت بڑی ہو یا آئندہ اختلاف و نزاع کے احتمالات موجود ہوں یا اور کسی اعتبار سے حالات و ہاں وہ نہ ہوں جو عموماً تجارتِ حاضرہ یا معاملۂ دستگرداں میں ہوا کرتے ہیں تو ایسے موقع پر ترکِ کتابت کی علت مفقود ہوگی اور اہتمامِ کتابت مطلوب ہوگا۔

۱۱۰۰ یعنی ایسے موقع پر گواہی کرا لینا بہتر ہوگی۔

وَأَشْهِدُوٓا۟ صیغۂ امر یہاں وجوب کے لئے نہیں صرف استحسان کے لئے ہے امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور اکثر ائمہ کی یہی رائے ہے۔

وذهب الشعبي والحسن الى ان ذالك على الندب والارشاد لا على الحتم ويحكى ان هذا قول مالك والشافعي واصحاب الرأى (قرطبى) والامر للندب (مدارك) والاوامر التى فى هذه الآية للاستحباب عند اكثر الائمة (بيضاوى)

۱۱۰۱ یعنی کوئی فریق اپنی مصلحت کی خاطر کاتب یا گواہ کو زحمت میں نہ ڈالے اوپر کاتب اور گواہوں کو حکم مل چکا ہے کہ کتابت اور گواہی سے پہلو تہی نہ کریں۔ اب فریقین کو حکم مل رہا ہے کہ وہ بھی کاتب اور گواہوں کی مصلحت و آسائش کا خیال رکھیں۔

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ۔ کاتب کو نقصان پہنچانا مثلاً یہ کہ اُسے بلا اُجرت کتابت پر مجبور کیا جائے یا اس کے کسی ضروری شغل میں ہرج ڈال کر اس سے کتابت کرائی جائے۔

وَلَا شَهِيدٌ۔ گواہ کو تکلیف میں ڈالنا مثلاً یہ کہ باوجود احتیاج اسے آمد و رفت کا خرچ بھی نہ دیا جائے، یا اس کے کسی ضروری شغل میں ہرج ڈال کر اُسے گواہی کے لئے طلب کیا جائے۔

۱۱۰۲ (کہ جس کام سے منع کیا گیا وہی کر رہے ہو)

فَإِنَّهُۥ فُسُوقٌۢ۔ کی تصریح کر کے حکم کی اہمیت کو کس درجہ بڑھا دیا ہے ــــ انّہٗ یعنی وہی نقصان پہنچانا۔

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰی سَفَرٍ

اور اللہ تمہیں سکھاتا ہے ۱۰۰۴ اور اللہ ہر چیز کا بڑا جاننے والا ہے ۱۰۰۵ اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ پاؤ ۱۰۰۶

وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

تو رہن رکھنے کی چیزیں ہی قبضہ میں دے دی جائیں ۱۰۰۷ اور تم میں سے اگر کوئی کسی پر اعتبار رکھتا ہے ۱۰۰۸ تو جس کا

فَلْيُؤَدِّ الَّذِی اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا

اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے کہ دوسرے کی امانت (کا حق) ادا کردے اور چاہیے کہ اللہ (یعنی) اپنے پروردگار سے ڈرتا رہے ۱۰۰۹

الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع ۳۹ ۲ ۷

اور گواہی کو مت چھپاؤ اور جو کوئی اُسے چھپائے گا اس کا قلب گناہگار ہوگا ۱۰۱۰ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کا بڑا جاننے والا ہے ۱۰۱۱

یعنی المضارّۃ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا کہ اس تکلیف دہی کو معمولی بات نہ سمجھو، یہ ایک مستقل معصیت ہے۔

**۱۰۰۳** (چھوٹے بڑے سارے معاملات اور کارروائیوں میں)

سبحان اللہ! تقویٰ الٰہی کی تاکید کن کن موقعوں پر کی ہے، اور حقوقِ عباد کی ادائی پر کتنا زور دیا ہے۔

**۱۰۰۴** (تمام تر حکمت کی باتیں)

بعض اہلِ علم نے "يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ" کو فقرۂ سابق "وَاتَّقُوا اللّٰهَ" سے بالکل مربوط پاکر استنباط یہ کیا ہے کہ علمِ حقیقی عین نتیجہ ہوتا ہے تقویٰ الٰہی کا، تقویٰ اختیار کرو اور ازخود علمِ الٰہی مرحمت ہونے لگے گا۔

وعدٌ من اللّٰه تعالٰی بانّ من اتقاہ علّمه (قرطبی)

لیکن بعض دوسرے اہلِ علم نے اسی شدت کے ساتھ اس کا انکار بھی کیا ہے، چنانچہ صاحبِ المنار نے بھی۔

**۱۰۰۵** چنانچہ وہ اپنے اس علم کے مطابق معاملت بھی مطیع و عاصی سے کرے گا، اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کا کوئی خفیف سا عمل بھی اللہ کے علم سے باہر رہے گا۔ مختصر سے جملہ میں لفظ "اللہ" کا تین تین بار لانا اظہارِ جلالت و تاکیدِ حکم کے لئے ہے۔

کرر لفظ اللّٰه فی الجملة الثلاث لاستقلالها فان الاوّل حثّ علی التقوی والثانیة وعد بانعامه والثالثة تعظیم لشانه (بیضاوی) کرر لفظ الجلالة لکمال التذکیر وقوة التاثیر (المنار)

**۱۰۰۶** (کتابتِ دستاویز کے لئے، جبکہ معاملۂ رہن کی ضرورت آپڑے)

رہن کے سلسلہ میں سفر کی تصریح شاید اس لئے کردی گئی ہے کہ سفر کی حالت میں اس معذوری کے پیش آجانے کا احتمال زیادہ ہے، ورنہ بیان دراصل معذوری کا ہے، اور یہ سفر کے ساتھ محدود و مقید نہیں، فقہائے مفسرین نے اسے عام معذوری کے لئے رکھا ہے۔

نصّ من احوال العذر علی السفر الذی ھو غالب الاعذار ویدخل فی ذٰلک بالمعنٰی کل عذر (قرطبی) قال جمھور

من العلماء والرھن فی السفر بنص التنزیل وفی الحضر ثابتٌ بسنۃ الرسول صلعم۔ (قرطبی)
ولم تجد واکاتبا۔ یعنی کاتب نہ موجود ہو، یا سامان کتابت (قلم، دوات، کاغذ وغیرہ) نہ موجود ہو۔
قال ابن عباس او وجدوہ ولم یجد وا قرطاسا او دواۃ او قلما۔ (ابن کثیر)

**۱۱۰۷** (صاحب حق کے مدیون کی طرف سے)
یعنی جب کتابت ممکن نہ ہو تو رہن بالقبضہ ہی اس کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔
رھنٌ۔ ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ بھی ہوتا ہے، فقہاء نے تصریح کر دی ہے کہ رہن بالقبضہ تو صرف قرض دینے والے کے اطمینان کے لئے ہے، اسے یہ حق نہیں کہ وہ شئے مرہون سے فائدہ بھی اٹھاتا رہے۔

**۱۱۰۸** (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہیں سمجھتا)

**۱۱۰۹** معاملات کے سلسلہ میں یہ تقویٰ الٰہی کی تاکید ایک بار پھر ملاحظہ ہو۔
الذی اؤتمن امانتہ۔ یعنی مدیون۔
فلیؤدّ۔ ادا کرے پورا پورا۔ حکم وجوبی ہے۔
وھو امرٌ معناہ الوجوب (قرطبی)

**۱۱۱۰** (اور اصل شئے قلب ہی کی گنہگاری ہے)۔
اٰثمٌ قلبہٗ۔ سب سے بڑا گناہ تو قلب ہی کا گناہ ہے، چنانچہ کفر جو سارے کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے قلب ہی کا گناہ ہے اس لئے اس اسلوب بیان نے خود یہ ظاہر کر دیا کہ کتمان شہادت شدید ترین گناہ ہے۔
الا تری ان اصل الحسنات والسیات الایمان والکفر وھما من افعال القلوب واذا جعل کتمان الشھادۃ من اٰثام القلوب فقد شھد لہ بانہ من معاظم الذنوب (مدارک) فیکون فی الکلام تنبیہٌ علی ان الکتمان من اعظم الذنوب۔ (روح)
قلبہٗ سے اشارہ اس جانب بھی ہو گیا کہ اخفاء شہادت گناہ زبان کا نہیں، گناہ قلب کا ہے۔
ولا تکتموا الشھادۃ۔ اور گواہی کو مت چھپاؤ ادائے شہادت کے وقت۔
یہ ادائے شہادت کا حکم عام ہے تمام معاملات قانونی کے لئے، مثلاً نکاح، مہر، وصیت وغیرہ، صرف معاملۂ رہن کے ساتھ مخصوص نہیں، اور شہادت چھپانے کی ساری صورتیں اس ممانعت کے اندر آجاتی ہیں، مثلاً ادائے شہادت سے گریز کرنا یا شہادت میں واقعات صحیح نہ بیان کرنا، وقس علیٰ ہذا۔
ومن یکتمھا۔ اور یہ کتمان خواہ جزئی ہو یا کلی بہر صورت معصیت ہے، ایک صحت مند معاشرہ کے لئے لازمی ہے کہ اس کا ہر فرد سچی گواہی دینے کے لئے ہر وقت آمادہ رہے، شریعت کی نگاہ میں اخفائے شہادت اور جھوٹی شہادت دونوں سخت ترین جرم ہیں۔
قال ابن عباس وغیرہ شھادۃ الزور من اکبر الکبائر وکتمانھا کذالک۔ (ابن کثیر)
فرنگی تمدن و معاشرت نے اسلام کی اس تعلیم کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔
ادائے شہادت چونکہ واجب ہے، فقہاء نے اس پر اجرت لینا ناجائز قرار دیا ہے البتہ آمد و رفت و سواری کا جو کچھ خرچ ہو اس کا بقدر واقعی وصول کرنا جائز ہے۔

**۱۱۱۱** (اور اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دے گا)۔
بما تعملون۔ مثلاً ایک عمل اخفاءِ شہادت ہے جو معصیت ہے اور دوسرا عمل ادائے شہادت ہے جو طاعت ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے ۱۱۱۲ اور جو کچھ تمہارے نفسوں کے اندر ہے اگر تم اس کو

اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

ظاہر کرو ۱۱۱۳ یا اسے چھپائے رکھو بہرحال اللہ اس کا حساب تم سے لے گا ۱۱۱۴ پھر جسے چاہے گا بخش دے گا ۱۱۱۵ اور جسے چاہے گا عذاب

وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ؁ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ

دے گا ۱۱۱۶ اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱۱۱۷ پیغمبر ایمان لائے اس پر جو اُس پر اُس کے پروردگار کی طرف سے

رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ

نازل ہوا ہے ۱۱۱۸ اور مومنین (بھی) یہ سب ایمان رکھتے ہیں، اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ۱۱۱۹

۱۱۱۲ (اور کسی دیوی، دیوتا، بزرگ، مظہر، اوتار وغیرہ کی شرکت اس میں نہیں)

قرآن مجید کی طویل ترین سورہ کا اب آخری رکوع شروع ہو رہا ہے، یہاں عقیدۂ توحیدِ کامل کا ایک بار پھر اعادہ و اثبات ہے۔ سورہ کا آغاز اصولِ دین سے متعلق جامع تعلیم سے ہوا تھا، سورہ کا خاتمہ بھی اسی جامعیت و مانعیت کے ساتھ بنیادی عقائد پر ہو رہا ہے۔

۱۱۱۳ (زبان سے یا عمل سے)

مافی انفسکم۔ جو کچھ دلوں کے اندر ہے افعالِ ارادی و اختیاری میں سے، مثلاً کوئی عقیدۂ فاسد یا عزمِ معصیت، اس میں وسوسہ اور گزرنے والے خیالات داخل نہیں کہ وہ حدودِ مواخذہ سے خارج ہیں۔

ولا تدخل الوساوس وحدیث النفس فیما یخفیہ الانسان لان ذلک مما لیس فی وسعہ ولکن ما اعتقدہ وعزم علیہ (مدارک)

۱۱۱۴ (شرک اور تمام معصیتوں کے)

یہ "چھپانے" اور "ظاہر کرنے" کا فرق تو بندوں کے اعتبار سے ہے، ورنہ اللہ کے لئے تو دونوں حالتیں یکساں ہیں۔

والمعنی ان الحالتین من الاخفاء والابداء بالنسبۃ الیہ تعالیٰ سواء (بحر)

۱۱۱۵ (قانونِ فضل و رحمتِ عامہ کے مطابق)

ذکرِ مغفرت کی تقدیم ذکرِ تعذیب پر شاید اسی لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خود صفتِ عفو مقدم ہے صفتِ غضب پر۔

وتقدیم المغفرۃ علی التعذیب لتقدم رحمتہ علی غضبہ (روح)

آیت سے اہلِ سنت نے مومنِ عاصی و صاحبِ کبائر کی مغفرت پر استدلال کیا ہے، اس لئے کہ مومنِ مطیع تو بہرصورت ماجور ہوگا اور کافرِ منکر بہرصورت معذب، درمیانی حالت مومن صاحبِ کبائر ہی کی باقی رہ جاتی ہے۔

الاصحاب قد احتجوا بہذہ الآیۃ علی جواز غفران ذنوب اصحاب الکبائر (کبیر)

۱۱۱۶ (اپنے قانونِ عدل و حکمتِ کاملہ کے تحت)

لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ

ہم اس کے پیمبروں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے ۱۱۲۰ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور ہم نے اطاعت کی ۱۱۲۱ اے ہمارے پروردگار!

رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

ہم تجھ ہی سے بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف واپسی ہے ۱۱۲۲ اللہ کسی کو ذمہ دار نہیں بناتا مگر اس کی بساط کے مطابق ۱۱۲۳ اُسے ملے گا وہی

وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِیْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ

جو کچھ اُس نے کمایا اور اس پر پڑیگا وہی جو کچھ اُس نے کمایا ۱۱۲۴ اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں ۱۱۲۵

تعذیب کو مشیتِ الٰہی پر معلق رکھنے سے اہلِ سنت کو ایک دلیل اپنے مسلک کی تائید میں ہاتھ آگئی ہے۔

وفی الآیۃ دلیل لاھل السنۃ فی نفی وجوب التعذیب حیث علق بالمشیئۃ۔ (روح)

۱۱۱۷ اللہ فاعل بالارادہ ہے، مختارِ کُل ہے اور اس سے منزہ ہے کہ عفو و مغفرت کے لئے اُسے ضرورت بطور فدیہ یا کفارہ کے کسی "خدائے مصلوب" کی ہو۔ آیت میں اشارۃً رد آگیا عقیدۂ نصاریٰ اور متعدد مشرک قوموں کے عقائد کا۔ خدا اس بجز اپنے ہی ارادہ یا مشیت کے کسی اور قانون کا پابند نہیں، جیسا کہ ہندی مشرک قوموں نے عقیدۂ "کرم" (مکافات) سے خیال کر رکھا ہے۔

۱۱۱۸ (یعنی قرآن پر)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ۔ اپنی رسالت یعنی پیامِ حق کی حقانیت کامل پر ایمان لانے والے سب سے پہلے خود پیغمبر ہی ہوتے ہیں۔ ایمان ایمان تو سب کا برابر ہے لیکن بہ اعتبار ظرف و بہ لحاظ کیفیت پیمبر کے ایمان اور عام افرادِ اُمت کے ایمان کے درمیان آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ ہر ایک کے ایمان کا مرتبہ بھی اس کی حیثیت اور مرتبہ کے متناسب ہوتا ہے۔

۱۱۱۹ اس جامع آیت کے اندر تمام لوازمِ ایمان بیان ہو گئے ہیں۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ۔ اللہ پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس کی ذات اور صفت دونوں کی تصدیق کی جائے حسب تصریحاتِ قرآنی و تعلیماتِ نبوی، یہ تردید ہو گئی دہریت، لاادریت، ارتیاب وغیرہ کی، خدائے واحد کی تصدیق جزم کے ساتھ کرنا لازمی ہے۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ۔ فرشتہ کی تعریف اوپر گزر چکی ہے کہ وہ ایک نوری مخلوق ہے جس سے صدورِ معصیت کا امکان نہیں۔ کثرت سے مشرک قوموں کو ٹھوکر اسی عقیدہ میں لگی ہے۔ فرشتوں کو بجائے تمام تر خدائی کارندے سمجھنے کے ان کی عظمت سے متاثر ہو کر انھیں کائنات کے مختلف شعبوں میں مستقلاً متصرف سمجھنے لگے اور انھیں دیوی دیوتا کہہ کر پکارنے لگے مثلاً فلاں آگ کا دیوتا ہے، فلاں ہوا کی دیوی ہے، فلاں بارش کا دیوتا ہے، وقس علیٰ ہذا۔ قرآن مجید نے جو فرشتوں کے عقیدہ پر بار بار زور دیا ہے اس کا مقصد شرک کی اس خاص قسم یعنی دیوتا پرستی کا استیصال ہے۔ فرشتے گو نوری ہوتے ہیں، معصوم ہوتے ہیں لیکن بہرحال خالقِ کائنات کے سامنے انسان ہی کی طرح ایک عاجز و بے بس مخلوق ہوتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ اُن کی ذات یا صفات کو مدغم کر دینا انتہائی جہل و غباوت ہے۔

وَكُتُبِهٖ۔ آسمانی نوشتوں اور ہدایت ناموں کے باب میں بھی بڑی افراط و تفریط ہوتی آئی ہے۔ کسی کسی قوم نے تو ان کے وجود ہی سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ خدا ہے تو لیکن کوئی ہدایت نامہ نہیں بھیجتا، اور بہت سی قوموں نے ان کتابوں کو ذہنِ انسانی کی

پیدا وار قرار دیا، جنھیں چند بڑے اور ہدایت یاب انسانوں نے مل کر لکھ لکھا لیا۔

وَرُسُلِہٖ۔ رسالت کا عقیدہ بھی شرک تو موتی نے بالکل مسخ کردیا تھا، دنیا رسولوں کو بھول چکی تھی اور قائل اس کی رہ گئی تھی کہ جس کے ذریعہ سے ہدایت اور پھر نجات ہوتی ہے وہ یا تو خدا کا اکلوتا بیٹا ہوتا ہے یا خود خدا کسی انسانی یا حیوانی قالب میں۔ قرآن مجید نے اکر بتایا کہ یہ انسان اور بندے ہی ہوتے ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی نازل ہوتی رہتی ہے سلسلۂ وحی کو ماننا ہی گویا "اوتار" کے عقیدہ پر ضرب لگانا ہے۔ آیت سے واضح ہوگیا کہ ایمان کے ارکان ضروری یہ چار ہیں: ایمان باللہ، ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتب، ایمان بالرسل۔

اعلم ان ھٰذہ الاٰیۃ دلت علٰی ان معرفۃ ھٰذہ المراتب الأربعۃ من ضرورات الایمان۔ (کبیر)۔

۱۱۲۰ (کہ بعض کے قائل ہوں اور بعض کے منکر، بلکہ سب کو برحق سمجھتے ہیں اور سب کے مسلکِ ہدایت پر اللہ کی طرف سے ہونے کا یقین رکھتے ہیں) یہ مقولہ مومنین کا ہے۔

ای یقولون لانفرق (بیضاوی۔ مدارک)

یہود کی طرح نہیں کہ بجز اپنی نسل یعنی اسرائیلی انبیاء کے اور کسی کو نہ مانیں اور ان میں سے بھی جس کے لئے جی چاہے انکار کردیں، یہاں تک کہ سلسلۂ اسرائیلی کے خاتم (حضرت مسیحؑ) سے تو وہ عداوت رکھیں کہ اپنے خیال میں ان کی جان ہی لے ڈالیں، اور نہ نصرانیوں کی طرح کہ ایک اسرائیلی نبی کے ماننے میں تو وہ غلو کریں کہ پیمبری سے اٹھا کر الوہیت کے مرتبہ تک پہنچادیں اور اسمٰعیلی شاخ سے پیمبری پانے والے سے عداوت ہی ٹھان لیں۔ انگریزوں میں ایک مشہور مؤرخ گبن ہوا ہے، قرآن مجید اس کے نزدیک کلامِ الٰہی نہیں، کلامِ محمدی ہے، بایں ہمہ اس آیت کی وسعت پر حیران ہو کر کہتا ہے:۔ "محمد کی وسیع المشربی نے اپنے پیش رووں کے لئے بھی وہی درجہ رکھا جو خود اپنے لئے اور ہبوطِ آدمؑ سے لے کر نزول قرآن تک سلسلۂ وحی کو قائم رکھا" (تاریخ زوال رومن امپائر، جلد ۵ صفحہ ۳۴۰)

حضرات انبیاء میں باہم جو تفاضل و فرقِ مراتب ہو، آیت کو اس سے بحث نہیں۔ آیت میں غرض صرف اس کا ہے کہ نفسِ نبوت سے انکار کسی نبی کا بھی جائز نہیں۔ لانفرق۔ بعض اہلِ طریق نے اسی پر قیاس کرکے کہا ہے کہ اولیاء کاملین میں بھی یہ تفریق نہ کرنا چاہئے کہ کسی سے اعتقاد رکھے اور کسی سے انکار کرے۔

۱۱۲۱ سَمِعْنَا۔ سن لیا ہم نے اللہ کے پیام کو گوشِ قبول سے۔

فیہ حذف ای سمعنا سماع قابلین وقیل سمع بمعنی قبل کما یقال سمع اللّٰہ لمن حمدہ (قرطبی) ای اَجبنا وھو المعنی العرفی للسمع (روح)

اَطَعْنَا۔ اطاعت کی ہم نے اللہ کے پیمبر کی، رضا و رغبت کے ساتھ۔

الطاعۃ قبول الامر (قرطبی) ای قبلنا عن طوع ما دعوتنا الیہ فی الاوامر والنواھی (روح)

۱۱۲۲ (نہ کہ کسی اور کی طرف)

غُفْرَانَکَ رَبَّنَا۔ یعنی وہ مغفرت جو تو ہی عطا کرے گا، اس میں رد آگیا نصرانیوں اور دوسری قوموں کا، جو مغفرت کو عطیۂ الٰہی نہیں، بلکہ "ابن اللہ" یا کسی اور کی عنایت کا ثمرہ سمجھتے ہیں۔

ترکیب میں عاملِ فعل مقدر سمجھا گیا ہے۔

تقدیرہ اغفر غفرانک قالہ الزجاج وغیرہ نطلب او اسأل غفرانک (قرطبی)

وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔ میں بھی رد ہے نصرانیوں کا، جو خلقت کی واپسی حشر میں "ابن اللہ" کی جانب سمجھتے ہیں۔

۱۱۲۳ (احکامِ شرعیہ میں)

احکامِ شرعی کی قید لگا دینے سے امورِ تکوینی خارج ہوگئے اور ذمہ دار بنا دینے سے مراد ہے ان اعمال سے متعلق سوال و باز پرس ہونا

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

اے ہمارے پروردگار ہم پر بوجھ نہ ڈال جیسا تونے ڈالا تھا ان لوگوں پر جو ہم سے پیشتر تھے۔ ۱۱۳۶

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ

اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ نہ اٹھوا جس کی برداشت ہم سے نہ ہو ۱۱۳۷ اور ہم سے درگزر کر اور ہم کو بخش دے ۱۱۳۸

وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع

ع ۴۰ ۸

اور ہم پر رحم کر تو ہی ہمارا کارساز ہے ۱۱۳۹ سو ہم کو غالب کر کافر لوگوں پر۔ ۱۱۳۰

اِلَّا وُسْعَهَا۔ یعنی اس کے اختیار کے اندر ہوں، گو بعض کسی قدر مشکل ہوں۔

الوسع من القدرۃ ما یفضل عن قدر المکلّف (راغب) قال لا یکلّف اللہ نفسا الا وسعہا تنبیہا انہ یکلّف عبدہ دُوین ما ینوء بہ قدرتہ (راغب) الا طاقتہا وقدرتہا لان التکلیف لا یرد بفعل لا یقدر علیہ المکلّف (مدارک) الا ما تسعہ قدرتہا فضلا ورحمۃ (بیضاوی)

یہ قیدِ وسعت کی قید بڑی اہم ہے اس کے بعد وسوسے اور خیالاتِ غیر اختیاری سب حدِ محاسبہ سے نکل گئے۔ صوفیۂ محققین نے اس آیت سے ایک سبق تو یہ لیا ہے کہ مجاہدہ میں طالب کی طاقت واستعداد کی رعایت رکھنا ضروری ہے اور دوسرا نتیجہ یہ نکالا ہے کہ تجلیات کا ورود ونزول بھی طالب کی طاقت واستعداد کے تناسب ہی ہوتا ہے اور اگر ان میں کبھی کمی ہو تو طالب کو تنگ دل نہ ہونا چاہئے۔

۱۱۳۴ یعنی اس نیک عمل پر ثواب وجزا جو بندہ اپنے ارادہ واختیار سے کرے اور اس بدعمل پر عذاب وسزا جو بندہ اپنے ارادہ واختیار سے کرے۔

یہ رد ہے ہندؤں اور بدھ مت کے عقیدۂ کرم کا یعنی انسان جو بھی کرے گا وہ لازمی نتیجہ ہوگا پچھلے جنم میں اس کے افعال واعمال کا، گویا اس قالب میں انسان اپنے ارادہ واختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتا، یہ جبریت کی انتہائی شکل ہے اور تناسخ اور عقیدۂ جبریت لازم وملزوم ہیں قرآن مجید نے اس فاسد عقیدہ پر ضرب لگائی اور بتایا کہ نیکی اور بدی کی راہیں تو انسان کے اپنے اختیار کی چیزیں ہیں اور وہیں سے نصاریٰ کے عقیدۂ کفارہ کا بھی رد نکل آیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو اب عملِ صالح کی ضرورت ہی نہیں ابن اللہ سب کی طرف سے بحیثیت جرمانہ چڑھ گئے ہیں اور سب کی نجات کا سامان انکی مصلوبیت سے ہوگیا۔

آیت میں اعمالِ خیر کے لئے لفظ کسب آیا ہے، اور اعمالِ شر کے لئے لفظ اکتساب۔

قیل خص الکسب ھٰھنا بالصالح والاکتساب بالسیٔ (راغب)

آیت سے اہلِ سنّت کو بھی سند ہاتھ آگئی جو اعمالِ عباد کے لئے الفاظ 'کسب' و 'اکتساب' لایا کرتے ہیں۔

فی ھٰذہ الآیۃ دلیل علی صحۃ اطلاق ائمتنا علی افعال العباد کسبا واکتسابا (قرطبی)

متکلمین نے آیت سے اس حقیقت پر بھی استدلال کیا ہے کہ بچوں پر کوئی مواخذہ ان کے والدین کے گناہوں کا نہ ہوگا۔

احتج کثیر من المتکلمین بھٰذہ الآیۃ علی ان اللہ تعالیٰ لا یعذب الاطفال بذنوب اٰبائھم ووجہ الاستدلال ظاھر فیہ (کبیر)

**ف۱۱۲۵** یہ مومنین کو ایک جامع وکامل دعا کی تعلیم ہو رہی ہے۔

اِنْ نَّسِیْنَآ۔ یعنی باوجود یاد رکھنے کی کوشش کے بھول جائیں۔

اَخْطَأْنَا۔ یعنی باوجود عزم اہتمام کے بھی چوک جائیں۔

**ف۱۱۲۶** (اور جیسی جیسی آزمائشوں سے انھیں دوچار ہونا پڑا، وہ ہم پر نہ ڈال)

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا۔ یعنی بعض سابق اُمتوں پر۔ انجیل میں پطرس حواری مسیحؑ کا قول غیر اسرائیلی مسیحیوں کے باب میں نقل ہوا ہے کہ اب تم ان کی گردن پر ایسا جُوا رکھو کہ جس کو نہ ہمارے باپ دادا اٹھا سکتے تھے نہ ہم، خدا کو کیوں آزماتے ہو؟ (اعمال ۱۵: ۱۰)

گویا اسرائیلی شریعت اُن کے حق میں ایسا سخت جُوا تھا جو اُٹھائے اُٹھ نہ سکتا تھا۔

اِصْرًا سے مراد ہے سخت حکم جو حدِ بشری سے خارج تو نہ ہو لیکن اس کی تعمیل میں مشقت وکلفت زیادہ پڑے۔

استعیر للتکلیف الشاق (کشاف) والمراد به التکالیف الشاقة. (روح)

قرآن مجید نے ضمناً اس انجیلی مبالغہ بیانی کی بھی اصلاح کر دی اور یہ اشارہ کر دیا کہ گو وہ احکام سخت ضرور تھے لیکن نہ ایسے کہ اُن پر ناقابلِ برداشت ہونے کا اطلاق ہو سکے۔

**ف۱۱۲۷** (نہ حوادثِ تکوینی میں نہ احکامِ شرعی میں، اور حق پرستی کو ہمارے لئے آسان کر دے)

دعا کا یہ جزو کمالِ عبدیت کا مظہر ہے، شانِ رحمت کا اقتضاء تو خود ہی یہ ہے کہ ایسا بار ہم پر نہ ڈالا جائے گا لیکن عقلاً اس کا امکان تو بہر حال تھا اور ہے — مالکِ کامل کو مملوک پر اور خالق کو عبد پر اختیار و تصرف تو ہر وقت ہر طرح کا حاصل ہے۔

**ف۱۱۲۸** (بلا کسی رکاوٹ کے، بغیر ادنیٰ شائبۂ سزا کے)

عَنَّا۔ ہم سے یعنی ہماری بھول چوک سے۔

**ف۱۱۲۹** (ہر عالم میں)

وَارْحَمْنَا۔ یعنی ہم پر رحمتِ کامل ہو دنیا اور آخرت دونوں میں۔

اَنْتَ مَوْلٰىنَا۔ فقرہ کا اضافہ دعا میں غایتِ تذلّل وخضوع کے لئے ہے۔

هٰذه الكلمة تدل على نهاية الخضوع والتذلل والاعتراف بانه سبحانه هو المتولى لكل نعمة يصلون اليها. (کبیر)

عفو۔ مغفرت، اور رحمت تینوں کی طلب کی تعلیم یہاں مل گئی۔

**ف۱۱۳۰** (کہ یہ دشمن ہیں تیرے دین اور تیرے آئین کے)

فَانْصُرْنَا عَلٰى۔ نصر کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو معنی غالب کرنے یا غلبہ دینے کے ہو جاتے ہیں۔

نصر فلانًا على عدوه: نجاه منه وخلّصه واعانه وقواه عليه. (اقرب)

اور غلبہ سے مراد دونوں ہیں یعنی بہ لحاظ دلائل وعلوم غلبۂ علمی ومعنوی، اور بہ لحاظ تسخیرات جہاد غلبۂ مادی وملکی

اى فى محاربتنا معهم وفى مناظرتنا بالحجة معهم وفى اعلاء دولة الاسلام على دولتهم (کبیر)

انصرنا على الجاحدين والمرتابين منهم بالحجة والبرهان وعلى المعتدين بالسيف والسنان (المنار)

النصر بالحجة هو اعلى النصر وافضله لانه نصر على الروح والعقل والنصر بالسيف انما هو نصر على الجسد. (المنار)

دعا کے اِس جزو سے معلوم ہوا کہ اعدائے دین پر غلبہ بھی مسلمانوں کا ایک مطلوب بلکہ مقصود ہے۔

# ضمیمہ

## سورۃ البقرۃ، آیت ۱۸۳، حاشیہ ۶۵۲

[اس نامۂ سیاہ کی متعدد تحریریں روزہ کے موضوع پر پرچہ "صدق" اور "سچ" میں چھپ چکی ہیں، قارئین کے استفادہ کے لئے یہاں بطور ضمیمہ پیش ہے۔]

## روزہ

### (۱)

کھانا انسان کی زندگی قائم رکھنے کے لئے ہے، یا انسان کی زندگی اس لئے ہے کہ اُسے کھانے پینے کی لذتوں میں بسر کیا جائے؟ موجودہ مادی دنیا نے شقِ دوم کو اختیار کیا ہے، اور اس کا عمل بھی اسی پر ہے۔ مذہب نے شقِ اول کو اختیار کیا ہے، اور اپنے پیروؤں کو اس پر عمل کی ہدایت کی ہے۔

اسلام دینِ فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس میں کوئی شے فطرتِ انسان و فطرتِ کائنات کے مخالف ہو نہیں سکتی وہ ایک طرف اپنے پیروؤں کو جائز لذتوں سے لطف اُٹھانے کی بار بار دعوت دیتا ہے اور دوسری طرف قدم قدم پر "لَا تُسْرِفُوْا" دائرۂ اعتدال سے قدم باہر نہ رکھو کی بھی تاکید کرتا جاتا ہے۔ لذتوں پر جھک پڑنے کا نام فسق ہے، اور لذتوں سے بالکل کنارہ کش ہو جانے کو رہبانیت کہتے ہیں۔ اسلام نے جو شاہراہِ ہدایت دنیا کے سامنے پیش کی ہے، وہ فسق و رہبانیت، دونوں سے بچ کر ان کی درمیانی راہ ہے۔

خواص جب گمراہ ہوتے ہیں، تو رہبانیت کے ڈھرے پر پڑ جاتے ہیں۔ عوام کی گمراہی کا نام فسق ہے۔ نفس انسانی میں لذتوں پر جھک پڑنے کا قدرتی میلان موجود ہے۔ انسان اکثر انہی لذتوں پر گرتا ہے اور ایسا گرتا ہے کہ انسانیت سے گزر کر بہیمیت کے غار تک پہنچ جاتا ہے۔ رُوح کو چاہیئے کہ روز بروز لطافت کی جانب ترقی کرتی جائے تاکہ جب جسم سے جُدا ہو جانے کا وقت آئے تو اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کر کے، جو از سرتاپا نور و لطافت ہے، وصل و وصال کا وہ انتہائی لُطف و سرور حاصل کرے جس کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنت ہے۔ لیکن انسان جب فسق میں مبتلا ہو جاتا ہے، یعنی اُن مادی لذتوں میں پڑ جاتا ہے (جو اس کی رُوحانی صحت کے حق میں مُضر ہیں) تو رفتہ رفتہ اس کی رُوح کثافت اور گندگی میں آلودہ رہنے لگتی ہے، یہاں تک کہ جسم سے جُدا ہونے کے بعد اُس میں اپنے مرکزِ اصلی کی جانب پرواز کی صلاحیت باقی نہیں رہتی اور مجبوراً اُسے تنزل کر کے مادہ کی کثافتوں اور آلائشوں کے مرکز سے آمیز ہونا پڑتا ہے جو اس سے کوئی بھی طبعی و خلقی مناسبت نہیں رکھتے اس لئے اسے انتہائی اذیت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے، اور اس کو مذہب کی اصطلاح میں دوزخ کہتے ہیں۔

اسلام خلق اللہ کو راحت و سُرور کی انتہائی منزل تک پہنچانے کا بہترین راہبر ہے۔ اس نے چُن چُن کر اپنے

نظام و آئین میں وہی باتیں رکھی ہیں، جو رُوح کی فطری صلاحیت کو بڑھائیں اور گندگی و کثافت میں آلودہ ہونے سے اُسے محفوظ رکھیں۔ ان سب تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر کا نام روزہ ہے محض بھوکا اور پیاسا رہنا یا خواہ مخواہ کسی کو اپنے نفس گرسنگی و تشنگی کی تکلیف میں مبتلا کرنا، ہرگز روزہ کا مدعا نہیں۔ روزہ کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ انسان کچھ دیر کے لئے تمام اہم لذاتِ مادی کی طرف سے بے توجہ ہو کر روح کو اپنی صفائی و پاکیزگی کی جانب متوجہ ہونے کا موقع دے۔ قرآن پاک میں روزہ کی غایت دو لفظوں میں فرما دی ہے۔ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" (تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ) "تقویٰ" کے معنی "بچنے" کے ہیں، بچنا کس شے سے؟ ہر اس شے سے جو روح کی پرواز ترقی میں حائل ہوتی ہے۔ ہر اس شے سے جو روح کے جوہرِ لطیف کے حق میں زہر کا اثر رکھتی ہے۔ ہر اس شے سے جو روح کو کثافتوں اور آلائشوں کی دلدل میں پھنسائے رکھتی ہے، قرآنی بلاغت کا یہ معجزہ ہے کہ اس سارے مفہوم کو ایک لفظ "تَتَّقُونَ" کے ذریعہ سے ادا کر دیا۔

نماز اور روزہ اپنی حقیقت کے لحاظ سے دو جداگانہ چیزیں نہیں، بلکہ ایک ہی حقیقت کے ایجابی و سلبی، مثبت و منفی دو پہلو ہیں۔ نماز کی حیثیت فاعلی ہے یعنی دربارِ خداوندی میں حاضری دو، اپنی رُوحِ جزئی کا براہِ راست تعلق رُوحِ کلی سے پیدا کرو۔ روزہ کی حیثیت انفعالی ہے، یعنی ان چیزوں سے بچو جو اس راہ میں حائل ہوتی ہیں، جو رُوح کو اس رفتارِ ترقی کے ناقابل بناتی ہیں۔ طبیبِ حاذق علاج بھی کرتا ہے، اور پرہیز بھی بتاتا ہے۔ شفا اُسی وقت ممکن ہے جب مریض دونوں ہدایتوں پر عمل کرے۔ نماز بمنزلۂ دوا ہے، اور روزہ بمنزلۂ پرہیز۔ دوا اور پرہیز دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ پر ظاہر ہے۔

یہیں سے ہے کہ دنیا کے کامل ترین انسان کو نماز کے بعد جو عبادت سب سے زیادہ محبوب تھی، وہ روزہ تھا۔ رسولِ خدا صلعم اس کثرت سے روزہ رکھا کرتے تھے کہ اہلِ خاندان اور اصحابؓ بعض اوقات دنگ رہ جاتے، وجہ کھلی ہوئی ہے۔ اعلیٰ ترین رُوح کو رُوحانی پاکیزگی و صفائی کے نمونے بھی بہترین اور کامل ترین دکھانے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا جس جس نے عمل کیا وہ اپنی مراد کو پہنچ کر رہا۔

کھانے پینے میں زیادتی کرنا، عورت سے میل ملاپ پر حریص ہونا، جھوٹ بولنا، سخت کلامی کرنا، کسی کا دل دکھانا، کسی کے پیچھے اس کا برائی سے ذکر کرنا، مال و دولت کی ہوس کرنا، یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو رُوح کی لطافت کو صدمہ پہنچاتی ہیں، اس کی بالیدگی کو روک دیتی ہیں، اس میں تازگی کے بجائے پژمردگی پیدا کرتی ہیں۔ اور جسم و مادہ کی کثافتوں کو بڑھاتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی تمام چیزوں سے بچنے اور پرہیز کرنے کا نام روزہ ہے۔ اور روزہ دار کے لئے یہ سب اُمور ممنوع ہیں۔

انسان اگر اپنی عمر کا بیشتر حصہ ان پابندیوں کے ساتھ گزار سکے تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا، لیکن کم از کم سال کا بارہواں حصہ تو اس طرح گزارنا اپنے لئے لازمی سمجھے۔ اور اگر بہت سے بندے مل کر ایک خاص زمانہ اس کے لئے مقرر کر لیں جس میں وہ سب شریک ہوں تو شرکت و اجتماع کی بنا پر نفسِ روزہ کی برکتیں بدرجہا بڑھ سکتی ہیں۔ مگر سب کا اپنے ارادہ سے ایک خاص زمانہ مقرر کرنا ممکن نہیں، کسی کو کبھی سہولت ہوگی، کسی کو کبھی۔ اس لئے خود شریعت نے (راحت و سرورِ ابدی کی منزل کے بہترین، ہموار ترین و محفوظ ترین راستہ کا نام شریعت ہے) ایک خاص

مہینہ کا تعین کر دیا۔ جسے رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔

خدائے اسلام جس طرح ہمارے رکوع و سجود، ہماری تکبیر و تسبیح سے بے نیاز ہے، اسی طرح اُسے ہمارے بھوکے اور پیاسے رہنے، ہمارے روزہ و تراویح ہماری سحری و افطار کی بھی کوئی حاجت نہیں۔ یہ تمام اُمور صرف ہمارے نفع و فائدہ کے لئے ہیں۔ ہماری طبیعتیں اور سرشتیں چونکہ شیطانی اثرات سے مسخ ہو چکی ہیں۔ اس لئے آج بہتوں کو روزہ کی پابندی ایک بار معلوم ہوتی ہے لیکن کل جب حجابات دُور ہو جائیں گے، جب آنکھیں کھل جائیں گی، اس وقت اندازہ ہو سکے گا کہ رُوح میں اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لئے اور ابدی سرور دائمی راحت حاصل کرنے کے لئے روزہ کتنا سہل، آسان، مفید، مؤثر نسخہ تھا۔ کاش ہمارے سب بھائیوں کی آنکھیں آج ہی کھل جائیں۔ (منقول از "سچ" لکھنؤ ہفتہ وار۔ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۵ء۔ ایڈیٹر عبدالماجد)

## (۲)

بہار کا موسم آتے ہی چمن دہر میں رُوح پرور ہوائیں چلنے لگتی ہیں، خشک درخت سبز ہو جاتے ہیں، پھول کھلنے لگتے ہیں، جسم انسانی کی رگوں میں تازہ خون کی گردش ہونے لگتی ہے، سوئی ہوئی اُمنگیں جاگ اٹھتی ہیں، اور چستی و توانائی کا دَور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ جسم و مادّہ کی کائنات میں آفتاب کا ایک پورا دورہ گزر جانے کے بعد یہ موسم آتا ہے، اور طبیبوں کا بیان ہے کہ جسم سے مادّۂ فاسد کے دفع کرنے اور مُسہل لینے کا یہ بہترین زمانہ ہے، ٹھیک اسی طرح رُوح و جان کی کائنات میں بھی چاند کا ایک پورا دَورہ گزر جانے کے بعد موسم بہار آتا ہے، ماہتاب کو عشق کے سودازدوں سے مناسبت ہے۔ ظاہر ہے، ماہتاب جب اپنے سالانہ سفر کا چکر ختم کرتا ہے تو عشق و محبت کی اقلیم میں پھر فسردگی و جنون کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں، اور سال کے گیارہ مہینے کے اندر عزیزیت کی جو کدورتیں جم جاتی ہیں، طبیعت ان کے دفع کرنے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہے، اسی لئے رحمتِ کاملہ و محبوبیتِ مُطلقہ نے اپنے وفا شعاروں، اپنے سرمستوں کے لئے ایک خاص مہینہ، ماسوا سے بے تعلق و بے نیاز رہنے کا مقرر کر دیا جس کو اصطلاح میں ماہِ رمضان سے موسوم کرتے ہیں۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" اے جس ازل سے پیمانِ وفا باندھنے والو! اے اپنے محبوب کی یکتائی کا کلمہ پڑھنے والو! اگر اپنے دعویٰ میں سچے ہو آؤ، اپنے طریقِ عشق و آئینِ اُلفت میں، ایک مہینہ تک ماسوا پر نظر کرنا تک ناجائز سمجھو، اور اپنی تمام نفسانی لذتوں کو اس بڑی اور حقیقی لذت کے تصور پر قربان کرتے رہو، کہ یہی نفسانی لذتیں اس شاہدِ حقیقی کے وصال کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں۔

یہ شرط محض تمہارے ساتھ مخصوص نہیں، اکیلے تم ہی اس آزمائش میں نہیں ڈالے گئے ہو، بلکہ تمہارے اگلوں میں سے جس جس گروہ نے ہم سے پیمانِ وفا باندھا، جس جس جماعت نے راہِ اُلفت میں قدم رکھنے کا دعویٰ کیا، اُن سب کو اپنے دعوے کا کچھ ایسا ہی ثبوت پیش کرنا پڑا ہے، ان سب کو کچھ ایسی ہی آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے، ہراساں نہ ہو، بہتوں کی آزمائش اسی طرح ہو چکی ہے۔ "كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ" اور اس حکم سے غرض تمہیں تکلیف میں ڈالنا نہیں،

---

لہ صوم کے معنی ہیں باز رہنے اور رُکنے کے، خواہ کھانے سے ہو یا کلام کرنے سے، یا کسی اور چیز سے، جس پر نفس حریص ہو یا جو طبیعت کو مرغوب ہو۔ الصوم فی الاصل الامساک عن الفعل مطعماً کان او کلاماً او شیئاً (راغب) الصوم امساک عن طعام او کلام او نحوھما (سجستانی) الصوم فی اللغۃ الامساک عمّا تنازع الیہ النفس (بیضاوی)

تمہاری جان کو ہلکان کرنا نہیں، بلکہ مقصود صرف تمہاری ہی فلاح وبہبود ہے۔ تمہارے ہی کمالات کی نشو ونما، اور تمہاری ہی ترقی ہے۔ تمہی میں ضبطِ نفس پیدا کرنا ہے۔ تمہی کو خواہشاتِ نفسانی پر حاکم بننے کی تعلیم دینا ہے۔ تمہاری پاکیزگی کی چھپی ہوئی قوت کو اُبھارنا، اور تمہیں حیوانیت کے غار سے نکال کے ملکوتیت کے آسمان پر پہنچانا ہے۔ تمہاری بوالہوسی جو تمہاری خودداری پر غالب آجاتی ہے، اسی کو توڑنا منظور ہے۔ تمہاری ہی راہِ عروج میں ہر طرح کی سہولت پیدا کرنی مدِ نظر ہے، اور تمہارے ہی چھپے ہوئے اندرونی دشمنوں یعنی بدی کی طاقتوں کو ہلاک و نابود کرنا مقصود ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اور پھر یہ آزمائش بھی دائمی نہیں، تمہاری ساری عمر کے لئے نہیں، کسی بڑی طویل مدت کے لئے نہیں، بلکہ صرف گنتی کے چند روز یعنی گیارہ مہینہ کے بعد رمضان کا ایک مہینہ[1]۔ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۔

پھر ان عاشقین صادقین اور مؤمنین مخلصین میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو باوجود اپنے صدق وخلوص کے، اپنی جسمانی کمزوری یا پردیس میں ہونے کی بنا پر، آسانی کے ساتھ اس حکم کی تعمیل نہ کر سکیں گے، ان کے لئے یہ آزمائش زیادہ سخت ہوگی۔ ایسے معذوروں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ انہیں جب اطمینان و فراغت نصیب ہو تو اس ماہِ مبارک کے چھوٹے ہوئے روزوں کو پورا کرلیں۔ "بلبلِ بیمار" اگر اپنے جذبۂ دل میں صادق ہے تو اس کے لئے سال کا ہر موسم، موسمِ گل کا حکم رکھتا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ بعض بیچارے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو بہ سبب اپنی جسمانی کمزوری یا کسی اور مجبوری کے ماہِ مبارک کے بعد بھی روزہ رکھنے میں سخت مشقت محسوس کرتے ہیں[2]۔ ایسوں کے لئے یہ رعایت ہے کہ وہ اپنی معذوری کے کفارہ کے طور پر کسی صاحبِ احتیاج کو پوری طرح کھانا کھلا دیا کریں۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ اس رخصت واجازت کے باوجود بھی اگر کوئی شخص محنت ومشقت گوارا کرکے اس بڑی نیکی یعنی روزہ کو اختیار کرتا ہے، یا ایک مسکین سے زائد کو کھلاتا پلاتا ہے، تو اس کے مرتبہ کا کیا پوچھنا۔ ایسی نیکی جو فرض نہ رہی ہو، اگر اختیار کی جائے تو اس کے افضل وبرتر ہونے میں کیا شبہ۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ۔ یہ ایک عام اصول بتایا گیا۔ باقی اگر روزہ کی حقیقت پر نظر ہو جائے، روزہ سے جو باطنی ترقیاں مقصود ہیں۔ اگر ان کا علم ہو جائے تو کون ایسا ہے جو روزہ کی جانب بہ شوق ورغبت نہ دوڑے۔

یہ ماہِ مبارک صرف اسی لحاظ سے مبارک نہیں کہ اس میں انسان صبر وضبط کی خدائی طاقتوں سے نوازا جاتا ہے، بلکہ اس خیر وبرکت والے مہینہ کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اسی ماہ میں اوّل اوّل دنیا کے لئے بہترین کامل ترین

---

[1] واولی ذلک بالصواب عندی قول من قال عنی اللہ جل ثناءہ بقولہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ایام شھر رمضان (ابن جریر) والمراد بھا رمضان (بیضاوی) المراد بھذہ الایام المعدودات شھر رمضان (ابو مسلم)

[2] عن عبد اللہ قال یقول وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ای یتجشمونہ (ابن کثیر) وقرأ ابن عباس یطوقونہ بمعنی الطاقۃ والقلادۃ ای یکلفونہ او یتکلفونہ علی جھد منھم وعسر وھم الشیوخ والعجائز (زمخشری) یصومونہ جھدھم وطاقتھم ومبلغ وسعھم (زمخشری) وھو الرخصۃ لمن یتعبہ الصوم ویجھدہ وھم الشیوخ والعجائز فی الافطار والفدیۃ (بیضاوی) من صام بالکلفۃ والمشقۃ فعلیہ فدیۃ طعام مسکین (گازرونی)

وجامع ترین ہدایت نامہ اُتارا گیا۔ اسی چاند میں انسانیت کے ظلمت کدہ کو نورانیت کے بدرِ کامل سے پُرانوار بنایا گیا، اور اسی بابرکت موسم میں انسان کے کان میں پہلی بار[1] نغمۂ ازل کی سُریلی آواز، بیہوشوں کو بیدار اور ہوشیاروں کو مست کرنے والی پکار پہنچی جس سے بڑھ کر کوئی دولت جس سے اونچی کوئی نعمت جس سے برتر کوئی رحمت، عالمِ تصور میں بھی موجود نہیں۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ـــ قیس عامری کے پاس اگر لیلیٰ کا کوئی مکتوب یا پیام آجاتا، تو کس طرح وہ اپنی جان نثار کرنے کو تیار ہوجاتا اور اس مبارک گھڑی کو کس قدر عزیز رکھتا! حسنِ ازل کے شیدائی بھی، نامۂ یار کے ورود کے زمانہ کو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ جب جب یہ زمانہ آئے گا، اس کی یاد میں بیتاب ہوجائیں گے، اور اس پاک گھڑی کی پاک سالگرہ منانے میں اپنی بھوک پیاس تک کو بھول جائیں گے۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔

موسم بہار کی فرحتیں، طراوتیں اور نشاط انگیزیاں، بڑے سے بڑے افسردہ دلوں تک میں اُمنگ پیدا ہی کردیتی ہیں اور گل وگلزار کی سیر سے کوئی محروم رہنا نہیں چاہتا۔ ماہ مبارک کی برکتوں فضیلتوں اور نعمتوں کا ذکر سن کر بڑے سے بڑے بدہمت اور افسردہ دل کی رگوں میں جوش پیدا ہوجاتا، اور بڑے سے بڑے فرزانہ ودُور اندیش میں شورش وشوریدگی کا اُبھر آنا قدرتی ہے۔ حالانکہ یہ آزمائش صرف ان کے لئے ہے جو اس کی جسمانی قوت بھی رکھتے ہیں۔ معذوروں پر خواہ مخواہ بارِ مشقت ڈالنا ہرگز مقصود نہیں۔ ان کے جذبۂ شوق کو تسکین دینے کے لئے ایک بار پھر اس ارشاد کی ضرورت ہوئی کہ معذوروں کو ان دنوں کی گنتی بعد میں پوری کرلینی چاہیئے کہ مقصد آسانی راہ ہے نہ کہ تنگی۔ اللہ کی بڑائی کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا مقصد، بعد کو بھی گنتی کے دن پُورے کرلینے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

یہ پُربہار موسم جب کسی کے شوق وارمان میں گزرے گا۔ یہ متبرک گھڑیاں جب کسی کی یاد میں بسر ہوں گی، یہ مبارک دن جب کسی کے اشتیاق میں بغیر بھوک پیاس کے صرف ہوں گے، یہ برکت والی راتیں جب کسی کے انتظار میں آنکھوں ہی میں کٹیں گی، تو ناممکن ہے کہ روح میں لطافت، قلب میں صفائی، اور نفس میں پاکیزگی پیدا نہ ہوجائے۔ حیوانیت دُور ہوگی، ملکوتیت نزدیک آئے گی اور انسان خود اپنی ایک جدید زندگی محسوس کرے گا، ایسی حالت میں بالکل قدرتی ہے کہ سوزِ دل اور تیز ہوجائے، قرب ووصل کی تڑپ اور بڑھ جائے، تزکیہ ومجاہدہ کے اثر سے، زنگ دُور ہوکر، کسی کا عکس قبول کرنے کے لئے آئینۂ قلب بے قرار ومضطر ہونے لگے۔ ٹھیک یہی گھڑی، ذوقِ طلب اور ذوقِ عطا، سوال اور اجابت، دعا اور مقبولیت، حاجت مندی اور کریمی، گدائی اور شاہی، بندگی وبندہ پروری کے درمیان ناز ونیاز کی ہوتی ہے، اس لئے قدرۃً اس منزل پر پہنچتے ہی،

---

[1] ای ابتدیٔ فیہ انزالہ (بیضاوی) ابتدیٔ فیہ انزالہ (زمخشری) ابتدی فیہ انزالہ (روح المعانی) یکون ابتداء نزول القراٰن علی محمد صلعم فی شہر رمضان وھو قول ابن اسحاق وابی سلیمان الدمشقی (خازن) اولت الاٰیۃ بان المراد انہ ابتدیٔ فیہ انزالہ ھذا قول محمد بن اسحاق (نیشاپوری)

حجاب غیب سے یہ صدائے بشارت کان میں آنے لگتی ہے کہ اے ہمارے پیام پہنچانے والے! ہمارے شیدائی، ہمارے پرستار، ہمارے بندے! اگر تم سے ہمارا پتہ پوچھیں تو اُن کو بتا دو کہ ہم اُن سے کچھ دُور نہیں، ہم تو ان سے بہت ہی قریب ہیں، ہمیں دل کی تڑپ کے ساتھ پکاریں تو سہی، ہم فوراً اُن کی پکار کو سنیں گے۔ وہ صرف ہم سے اپنی لَو لگائے رہیں، اور ہم پر بھروسہ رکھیں، اس سے وہ سیدھی راہ پا کر اور منزلِ مقصود تک پہنچ کر رہیں گے۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار۔ ۳ اپریل ۱۹۳۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

## (۳)

دو شخص ہیں۔ ایک وہ جو اپنی خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے، دوسرا وہ جو اُن پر حاکم و آقا ہے۔ ایک وہ جو اپنی ہر ہوائے نفس سے مغلوب ہو جاتا ہے، دوسرا وہ جو اُسے اپنے قابو و اختیار میں رکھتا ہے۔ ایک شخص وہ ہے جو اپنی بھوک، اپنی پیاس، اپنی نیند، اپنی حرص، اپنے غصہ، کسی شے پر قابو نہیں رکھتا، دوسرا وہ جو ان میں سے ہر شے کے ضبط پر قدرت رکھتا ہے۔ آپ ایسے دو شخصوں میں سے کس کو ترجیح دیں گے؟ آپ خود ان دونوں میں سے کیا بننا پسند کریں گے؟ آپ کے نزدیک نفس کی غلامی بہتر ہے؟ یا اس پر حکمرانی؟ اگر آخر الذکر بہتر و پسندیدہ ہے تو پھر یہ کیا ہے کہ ماہِ رمضان کی پیشوائی کو آپ ذوق و شوق، مسرت و خندہ جبینی کے ساتھ نہیں بڑھتے؟

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ دائم الصوم تھے۔ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی عمر کے سالہا سال روزہ رکھ کر گزارے، حضرت جنید بغدادیؒ کا مقولہ مشہور ہے کہ مجھے جو کچھ ملا، سب بھوک اور گرسنگی ہی کی طفیل میں ملا۔ حضرت مولانائے رومؒ کا عمل خود انہی کی اس تعلیم پر تھا کہ منزلِ حق کی جتنی راہیں کھلتی ہیں، سب بھوک اور پیاس سے۔ ہر سلسلے کے جتنے مقدس بزرگ اور مستند صوفی گزرے ہیں، سب کا عمل یہی رہا ہے اور تعلیم بھی یہی۔ مگر پھر یہ کیوں ہے کہ آپ باوجود ان حضرات سے اعتقاد ظاہر کرتے، اور باوجود ان کے ماننے کے، اس باب میں ان کی تعلیم سے اس قدر بے پروا، اور ان کے عمل سے اس قدر بے نیاز ہیں؟

نماز میں جس طرح عبدیت کی تکمیل ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح روزہ دار کو اخلاقِ الٰہی کے ساتھ کس درجہ مناسبت و مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، بھوک اور پیاس سے بے نیازی، صبر و ضبط، قوت و اختیار، حلم و تحمل، عفو و درگزر، یہ سب شانیں بندہ کی ہیں، یا مولیٰ کی؟ عبد کی یا معبود کی؟ خاک کے پتلے کی یا آسمان کے فرمانروا کی؟ پھر یہ کیوں کر ہے کہ جو شے کچھ ہی دیر کے لئے سہی آپ میں اس کیفیت سے مناسبت پیدا کر رہی ہو، جو شے ذرہ میں آفتاب کا پرتو ڈال رہی ہو، جو شے آئینہ میں جلا پیدا کر کے اُسے نورانیتِ کاملہ کا عکس قبول کرنے کے قابل بنا رہی ہو، آپ اس نعمتِ عظیمہ کی جانب لپکنے میں تامل کر رہے ہیں؟

حدیثِ قدسی کے الفاظ یاد کیجئے: "الصوم لی وانا اجزی بہ"۔ روزہ میرے لئے ہے اور اس کا اجر خود میں ہوں۔" حوریں نہیں، جنت کے قصر و محل نہیں، کوئی اور ایسی نعمت نہیں، جسے مادی عقل سمجھ سکے، بلکہ "میں خود اس کا اجر ہوں"۔ یہ کون کس سے کہہ رہا ہے؟ آفتاب ذرہ سے نہیں، مخدوم خادم سے نہیں، شاہ گدا سے

نہیں، بلکہ خالق مخلوق سے، معبود عبد سے، خدا بندہ سے! کیا زمینوں اور آسمانوں کی ساری نعمتیں، ساری برکتیں، ساری بادشاہتیں، مل کر بھی اس ایک اجر کے سامنے پیش کی جاسکتی ہیں؟ کیسی دردناک نادانی ہوگی، کہ اتنے ارزاں سودے کو بھی اپنی غفلت وبے پروائی کے نذر کردیا جائے۔!

(منقول از سچ (لکھنؤ) ہفتہ وار۔ ۲۶ر مارچ ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبدالماجد)

(۴)

کھانا کھانے میں آپ کو لطف کس وقت آتا ہے؟ اُس وقت جب کہ بھوک کھُل کر لگی ہو، یعنی کچھ دیر پیشتر سے کھانا نہ کھایا ہو، پانی کے گلاس میں مزہ کس وقت ملتا ہے؟ اُس وقت جب کہ پیاس لگی ہوئی ہو اور پانی پینے کی طلب بے قرار کررہی ہو۔ نیند سُکھ سے کس وقت آتی ہے؟ اُس وقت جبکہ کچھ گھنٹے قبل سے آپ برابر جاگ رہے ہوں، ان ساری مثالوں میں آپ کو روزمرّہ، ہر وقت اور ہر جگہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ مادّی لذّتوں سے بھی پوری طرح لطف اٹھانے کے لئے کسی قدر ضبط صبر واحتیاط لازمی ہے، یہی آپ کا مشاہدہ ہے، یہی آپ کا تجربہ ہے اور اسی پر آپ کا عمل ہے۔ یہ آپ کبھی نہیں کرتے کہ مسلسل چوبیسوں گھنٹے منہ میں نوالے چباتے رہیں۔ یہ کوئی بھی نہیں کرتا کہ ہر منٹ لگاتار پانی کے گھونٹ اُتارتا رہے۔ یہ کسی کو بھی نہیں دیکھا کہ دن اور رات، صبح اور شام، ہر وقت برابر پڑا سوتا ہی رہے۔

"روشن خیالی" جب ایک قدم آگے بڑھاتی ہے، تو تعطیل اور چھٹی کو بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو بنادیتی ہے، اسکولوں کے کمرے، کالجوں کے ہال، عدالتِ عالیہ کے ایوان، ہفتوں سے بند چلے آرہے ہیں، اس لئے کہ موسمِ گرما کی تعطیل کلاں کا زمانہ ہے! کچہریاں اور دفتر بند ہیں، اس لئے کہ آج بڑا دن ہے۔ ڈاک خانہ اور تارگھر بنک اور خزانے بند ہیں، اس لئے کہ آج اتوار ہے! یہ سب اس لئے ہے کہ دماغ کو آرام ملتا ہے، اور تازہ دم ہونے کے بعد کام بہتر طور پر انجام پاتا رہے، آپ اپنے اس نظام اور اس انتظام پر شرماتے نہیں فخر کرتے ہیں۔ اور آپ کی عقلیت وروشن خیالی کا یہ ایک مسلّمہ ہے کہ کام میں زیادہ مستعدی اور بہتر کارگزاری EFFICIENY کے لئے جسم اور اعضائے جسم کو آرام دیتے رہنا لازمی ہے! یہ نہیں کہتے کہ اس سے کام نہیں خواہ مخواہ ہرج اور نقصان ہوتا ہے۔

لیکن جب مذہب آپ سے کہتا ہے کہ سال کے ایک خاص زمانہ میں چند گھنٹوں کے ایک محدود وقت کے لئے معدہ کو آرام دیتے رہو، بھوک اور پیاس کو ضبط کرتے رہو تو معاً آپ کی عقلیت وروشن خیالی بغاوت پر آمادہ ہوجاتی ہے، آپ اپنے روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ، نظریات وعملیات سب کو پسِ پُشت ڈال دیتے ہیں، رمضان کی آمد کو اپنے لئے ایک قہر ومصیبت سمجھنے لگتے ہیں، اور اگر زبان سے نہیں تو کم از کم دل میں تو یہ ضرور کہنے لگ جاتے ہیں کہ روزہ کی یہ قیدیں کیسی سخت ہیں۔ اور آپ کے کمزور قویٰ ہرگز اتنی بڑی محنت کو نہیں برداشت کرسکتے! بیشک اگر آپ ہزاروں روپیہ کمانے اور اُڑانے والے بیرسٹر ہیں، اگر آپ اپنی ٹسر کار اید قرار کے بنائے ہوئے جج یا کلکٹر ہیں، اگر آپ صوبہ یا ملک کی کونسل کے ممبر ہیں، اگر آپ لاٹ صاحب اور بڑے لاٹ صاحب کی

پارٹیوں میں شریک ہوتے والوں میں ہیں، اگر آپ کے پاس سواری کے لئے موٹریں، اور رہنے کے لئے اونچی اونچی کوٹھیاں موجود ہیں تو آپ کی محرومی اور حرماں نصیبی نے اجرِ روحانی و راحتِ سرمدی کی طرح روزمرہ کی مادی لذتوں اور جسمانی فنیدوں کا بھی دروازہ آپ پر بند کر رکھا ہے۔ اور آپ کی اس بے مائیگی پر جن و بشر، حور و ملائک جتنا بھی ترس کھائیں کم ہے لیکن اگر آپ اپنی خوش بختی سے کوئی غریب کاشتکار ہیں، کوئی مفلس مزدور ہیں، کوئی کم حیثیت خدمت گار ہیں، بھاری بھاری بوجھ کی گٹھریاں اور گٹھے اپنے سر پر لادنے والے ہیں، دھوپ میں جل جل کر اور کھٹن کھٹن کر کام کرنے والے ہیں تو انشاء اللہ آج آپ اپنے خالق و مالک کے حکم کی تعمیل میں رمضان مبارک کے بارانِ رحمت سے سیراب ہو رہے ہوں گے، یقین کیجئے کہ آج آپ کے مرتبہ پر زمین پر بسنے والے نہیں، آسمان پر اُڑنے والے فضائے قدس میں سانس لینے والے، حریم عرش کے پایہ تھامنے والے رشک کر رہے ہیں! ممکن ہے کہ آج یہ شاعری معلوم ہو رہی ہو لیکن کل انشاء اللہ حقیقت ہو کر رہے گی، اور اُن بے خبروں کو بھی خبردار کر کے رہے گی، جو آج روزہ داری کے طبی فوائد اور مادی لذتوں سے بھی محرومی میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔!

(منقول از سچ لکھنؤ ہفتہ وار ۳ مارچ ۱۹۲۶ء ایڈیٹر عبد الماجد)

## ( ۵ )

نیند پورے سکھ کے ساتھ کس کو آتی ہے؟ اُس کاہل کو جو رات دن بستر پر پڑا رہتا ہے، یا اُس محنتی کو جو دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد تھک کر اپنے دماغ و جسم کو چند گھنٹوں کے لئے آرام دینے کو لیٹتا ہے؟ کھانے میں اصلی مزہ کس کو ملتا ہے؟ اُس امیر کو جو سارے دن اپنے ذائقہ کی خاطر داریوں میں لگا رہتا ہے، اور طرح طرح کی بدپرہیزیاں کرتا رہتا ہے یا اُس غریب کو جو محنت و مشقت کے بعد دن میں ایک یا دو بار سادہ اور معمولی کھانا کھاتا ہے؟ سو کر اٹھنے کے بعد فرحت اور چابکی کس کو حاصل ہوتی ہے؟ اُس کو جو ساری رات پریشان اور ہولناک خواب دیکھتا رہتا ہے، یا وہ جو شروع سے آخر تک میٹھی نیند لیتا رہتا ہے؟ پس اگر کسی کو نیند پورے سکھ کے ساتھ نہیں آتی، کھانے میں پورا مزہ نہیں ملتا، یا سو کر اٹھنے کے بعد طبیعت سے کسل پوری طرح دور نہیں ہوتا، تو اُس کی ذمہ داری اور تنہا ذمہ داری، اُسی کی بے احتیاطیوں، بدپرہیزیوں، اور بے اعتدالیوں پر آتی ہے۔

روزہ جسم و رُوح دونوں کے ایک خاص ضبط و انضباط، تزکیہ و تنقیہ، پرہیز و احتیاط کا نام ہے، اس کے تمام ہونے پر انتہائی لطف و راحت، لذت و فرحت محسوس ہونی چاہئے۔ اگر آپ اس میں کمی محسوس کرتے ہیں تو یقیناً یہ آپ ہی کا قصور ہے، اور یہ لازمی ہے کہ روزہ کی کچھ شرطیں آپ توڑ چکے ہیں، اور اس کے جو آداب نگاہ رکھنے کے تھے وہ آپ نے نہیں رکھے جسم و دماغ کو اگر آپ دن بھر صحیح طور پر کام میں لگائے ہوئے ہیں تو شب کو نیند کی حالت میں بھی سکھ ملے گا اور نیند پوری کرنے کے بعد بھی فرحت حاصل ہوگی ٹھیک اسی طرح اگر جسم و روح کو آپ ٹھیک طور پر دن بھر مشغول رکھے ہوئے ہیں، اگر آپ وہی کرتے رہے ہیں جو ایک روزہ دار کو کرنا چاہئے تو آپ کا دن اور آپ کی رات، آپ کی صبح اور آپ کی دوپہر آپ کا سہ پہر اور آپ کی شام، غرض آپ کے وقت کی ہر گھڑی، آپ کے دل کی کلی کو کھلی رکھے گی۔ افسردگی اور اُداسی آپ کے لئے بے مفہوم ہوگی اور سرور و نشاط کی ہوائیں آپ کی

روح کو تر و تازہ رکھیں گی۔

روزہ کے معنی یہ ہیں کہ آپ اپنے پیدا کرنے والے، آپ کے سامانِ زندگی کے مہیا کرنے والے، اور آپ کی موت و زندگی، بیماری و تندرستی، ہر چیز پر قدرت رکھنے والے کے سامنے عہد کرتے ہیں کہ سارے دن آپ اپنے تئیں اپنی آنکھ اور کان، اپنے منہ اور زبان، اپنے دل اور اپنے دماغ اپنے ہاتھ اور پیر، اپنے جسم اور جان، غرض اپنے سارے وجود کو ہر ٹیڑھی راہ سے روکے رہیں گے، ہر کجی اور کج روی سے باز رکھیں گے اور صرف اسی کے لئے وقف رکھیں گے جو اُس کا اصلی کام اُس کی سیدھی راہ اُس کا فطری حق اور اُس کی سچی غایت ہے۔ زبان اگر کھلے گی تو صرف کلمۂ حق پر، کان اگر سنیں گے تو صرف سچی آواز، آنکھ اگر دیکھے گی تو صرف امرِ حق کو، دل کو اگر سوچے گا تو صرف سچائیوں کو، ہاتھ اور پیر اگر حرکت کریں گے تو صرف سچائی کی راہ میں۔ مادّی زندگی کے سب سے بڑے اور طاقتور مظہر، سورج کے ڈوب جانے پر جب آپ اُس ذات کے شکر کے ساتھ جس نے آپ کو یہ توفیق دی، اپنا جائزہ لیں اور اپنی اس نذر کی ہر شرط کو پوری طرح ادا کیا ہوا پائیں تو ——— دنیا کے کس لفظ اور کس عبارت میں اس کیفیت کو ادا کرنے کی قدرت ہے! رضائے الٰہی آپ میں اور آپ رضائے الٰہی میں جذب ہوں گے! راحت و لذت، لطف و مسرت، سرور و نشاط، شادی و انبساط یہ سارے الفاظ اس بڑی فرحت (افطار) کی کیفیت کو ادا کرنے کے لئے ناکافی ہیں جو اُس سب سے بڑی فرحت (دیدارِ الٰہی) کا پیش خیمہ ہے، جس سے موسیٰ کلیم اللہؑ جیسے برگزیدہ پیمبر، باوجود شوق و تمنا، اس دنیا میں محروم رہے!

(منقول از سچ لکھنؤ۔ ۱۴ر مارچ ۱۹۲۶ء)

## (۶)

آپ کو معلوم ہے کہ اطبّائے یونانی کتنے متعدد امراض میں فاقہ کو مفید بتاتے ہیں؟ آپ کو خبر ہے کہ ڈاکٹروں کے اصول سے اب فاقہ کتنے امراض کا علاج ثابت ہو چکا ہے؟ آپ واقف ہیں کہ ہر طریقۂ علاج کے ماہرینِ فن نے کتنی شدید اور مہلک بیماریوں کا علاج اپنے تجربہ میں فاقہ ہی کو پایا ہے؟ خود آپ کا ذاتی تجربہ کیا ہے؟ آپ کو جب کبھی بیماری میں طبیب یا ڈاکٹر فاقہ کا مشورہ دیتے ہیں تو آپ کیسی خاموشی کے ساتھ بے چون و چرا اور بغیر بحث و مناظرہ اُس کے حکم کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں اور اُس کی ہدایتوں کے مطابق کھانے اور پینے کی لذتوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں! لیکن جب اس سے کم تکلیف اور اس سے ہزاروں گنی زاید راحتوں اور نعمتوں کے وعدہ کے ساتھ اس قسم کی احتیاط خورد و نوش کا حکم آپ کو سب سے بڑے حکیم کے مطب سے ملتا ہے تو یہ کیا ہے کہ آپ اس خوش دلی کے ساتھ اُس کی تعمیل پر آمادہ نہیں ہو جاتے بلکہ طرح طرح کی تاویلوں سے جن سے اکثر خود آپ کا دل بھی مطمئن نہیں ہوتا اُسے ٹال جانا چاہتے ہیں۔!

آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے فضل سے روزہ دار ہیں اور ماہِ رمضان کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں لیکن پھر یہ کیا ہے کہ آپ کی اندرونی زندگی میں کوئی نمایاں فرق نہیں محسوس ہوتا۔ غصہ اب بھی آپ کو برابر آتا رہتا ہے بلکہ شاید کچھ اور بڑھ ہی گیا ہے۔ دوسروں کے عیب چینی میں اب آپ کو ویسا ہی مزہ آ رہا ہے۔ نفسانی خواہشوں اور لڑنے جھگڑنے کے منصوبوں میں اب بھی کوئی کمی نہیں معلوم ہوتی۔ دن میں بے شبہ آپ کھاتے پیتے نہیں ہیں لیکن وقت کا بڑا حصہ

بجائے عبادتوں کے، سونے اور بیکاری میں گزارتے ہیں، یا پھر سحری، طعامِ شب اور افطار پارٹیوں کے اہتمام و انتظام میں! وہ وہ لذیذ اور ثقیل غذائیں جن سے آپ کا ذائقہ سال میں گیارہ مہینے بالکل نامانوس رہتا ہے، آپ صرف اسی ماہِ صبر و تقویٰ کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں اور وقت اور روپے کا اچھا خاصا حصہ اسی ماہِ مبارک کی دعوتوں اور ضیافتوں میں صرف فرماتے رہتے ہیں! کیا اسی روزہ داری پر آپ خوش ہیں؟ کیا اسی کا نام آپ کے خیال میں ماہِ مبارک کا احترام ہے؟

ایک شخص قند اور دودھ کا نفیس شربت تیار کرتا ہے مگر اُس میں کچھ مکھیاں بھی پیس کر ملا دیتا ہے، آپ ایسے شخص کی صحتِ دماغی کی بابت کیا رائے قائم کریں گے؟ ایک شخص لذیذ سے لذیذ اور بہتر سے بہتر کھانا خوان میں لگا کر لاتا ہے لیکن اُس میں ایک جزو غلاظت کا بھی ملا دیتا ہے، آپ اس بدنصیب کی عقل و فہم پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں؟ یقین فرمائیے کہ اس سے کہیں زائد موجبِ تأسف و مستحقِ ماتم اُس بے عقل و بدنصیب کی حالت ہے جو روزہ رکھ کر بھی غصہ کر کرکے عیب چینی میں مصروف رہ رہ کے نفسانی خواہشوں کے منصوبوں میں مبتلا رہ رہ کے، روزہ کی نعمتوں اور راحتوں، لذتوں اور فرحتوں کو اپنے ہاتھوں غارت کرتا رہتا ہے! اور جو حرماں نصیب سرے سے روزہ ہی کو ترک کئے ہوئے ہیں اُن بیچاروں کو تو بس اللہ ہی سیدھی سمجھ اور نیک ہدایت کی توفیق نصیب کرے!

(منقول از سچ۔ لکھنؤ۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء)

(۳)

# سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ

رکوعہا ۲۰ — بیس ۲۰ رکوع

آیاتہا ۲۰۰ — دوسو ۲۰۰ آیتیں

سورۂ آل عمران ۱ مدنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ۝۱ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۝۲

الف، لام، میم ۲ اللہ وہ ہے کہ کوئی خدا نہیں بجز اس کے ۳ زندہ ۴ (خدا ہے) سب کا سنبھالنے والا (خدا ہے) ۵

۱ عرب کا نقشہ سامنے ہو تو جنوب و مشرق میں جو علاقہ یمن کے نام سے موسوم ملے گا اس کے شمالی حصہ میں ایک مقام نجران ہے۔ عہدِ نبوت میں یہاں مسیحیوں کی آبادی تھی۔ سنہ ۱۰ ہجری میں ان کے چودہ ۱۴ اکابر ایک وفد کی صورت میں رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضورؐ نے دورانِ گفتگو میں ان کے عقائدِ تثلیث و ابنیت کی لغویت ان پر پوری طرح واضح کردی۔ سورہ میں اشارے جابجا اسی طرف ہیں۔ سورۂ بقرہ میں خطاب جس طرح خاص طور پر یہود کی جانب تھا، کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح اس سورۃ میں مسیحیوں کی جانب ہے۔ سورۂ بقرہ ہی کی طرح آل عمران کے فضائل بھی احادیث میں بکثرت وارد ہوئے ہیں!

۲ یہ حروف مقطعات کہلاتے ہیں، ان پر حاشیہ سورہ بقرہ کے آغاز میں گزر چکا۔ منقول ہے کہ یہاں بھی یہ حروف مخفف ہیں فقرہ اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ کے۔

۳ (نہ بہ حیثیت اقنوم کے، نہ کسی اور حیثیت سے)

یعنی اس خدائے واحد کا شریک کوئی نہ ذات میں ہے نہ صفات میں نہ افعال میں۔ دنیا میں بہ کثرت ایسے مشرک مذہبوں کا وجود رہ چکا ہے اور اب بھی ہے جو کہتے ہیں کہ خدائے اعظم تو بیشک ایک ہی ہے لیکن اس کے ماتحت شعبہ وار چھوٹے چھوٹے خدا، دیوتا اور دیویاں تو بہت سی ہیں۔ قرآن مجید ان سب کی تردید کر کے کہتا ہے کہ نفسِ وجود ہی کسی دوسرے خدا کا نہیں، نہ چھوٹے کا نہ بڑے کا، الوہیت و ربوبیت تمام تر ایک ہی ذات میں ہے۔ آیت علاوہ ان جاہلی مذاہب کے خاص طور پر مسیحی عقائد کے بھی رد میں ہے۔

۴ اَلْحَیُّ۔ وہ وہ خدا ہے جو ہمیشہ زندہ ہی ہے، زندہ ہی رہا ہے اور زندہ ہی رہے گا۔ موت کا اس کے لئے کوئی امکان ہی نہیں، نہ صلیب کے اوپر نہ کسی اور طرح۔ اس کی حیات جس طرح آج قائم ہے ہمیشہ سے قائم ہے۔ یہ نہیں کہ اُسے بار بار قالب بدلتے رہنے کی ضرورت پیش آئے، کبھی وہ انسان بن جائے اور کبھی نعوذ باللہ حیوان، پھر وہ زندہ اس طرح کا نہیں کہ ہر سال اس پر موت طاری ہوا کرے اور پھر وہ حیاتِ تازہ حاصل کرتا رہے۔ الحی کے ایک لفظ نے اس کی قدیم ولازوال صفتِ حیات کا اثبات کر کے ان سارے خرافات کی تردید کردی، جو دوسرے مذہبوں میں اس وقت تک موجود رہی تھیں۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۰۸ سورۂ بقرہ۔

اَلْقَیُّوْمُ۔ وہ بذاتِ خود قائم ہے اور ساری مخلوقات اس کے وجود سے قائم ہے۔ یہ نہیں کہ وہ خود بھی کسی معنی

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ

اس نے (یہ) کتاب آپ پر نازل کی ہے قطعیت کے ساتھ ۵ؔ ان کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے آچکی ہیں ۶ؔ

التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ

اور اس نے اتارا تھا توریت اور انجیل کو (اس سے) پیشتر لوگوں کی ہدایت کے واسطے ۷ؔ

ہر کسی دوسرے کا محتاج ہو جیسا کہ مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ:۔

"جس طرح بیٹا بغیر باپ کے تنہا خدا نہیں اسی طرح باپ بغیر بیٹے کے تنہا خدا نہیں" (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ انھکس جلد ۷، صفحہ ۵۳۶)

گویا (نعوذ باللہ) ابن اللہ اور اللہ دونوں اپنی خدائی میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، صفتِ قیومیت کا اثبات کر کے قرآن مجید نے فرزندئ خدا کے عقیدہ کی جڑ ہی کاٹ دی، بہت سے جاہلی مذہب ایسے بھی ہیں جو ایک طرف خدا کو خدا بھی مانتے جاتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کے بھی قائل ہیں کہ وہ پیدا کسی اور سے ہے (ملاحظہ ہو حاشیہ ۹۸ سورۂ بقرہ) قرآن مجید کا یہ خصوصی وامتیازی اعجاز ہے کہ اپنے ایک ایک لفظ سے وہ تردید متعدد اور بڑی بڑی گمراہیوں کی کرجاتا ہے۔

۵ؔ (لفظاً لفظاً، اے پیغمبر!)

نَزَّلَ۔ کا مصدر تنزیل ہے، یہ لفظ قرآن مجید میں، قرآن مجید کے لئے بہ کثرت آیا ہے، بہ خلاف اَنْزَلَ (مصدر، انزال) کے جو عموماً دوسری کتب آسمانی کے لئے آیا ہے۔

تَنْزِيل۔ میں تدریج اور ٹکڑے ہو کر نازل ہونے کا تخیل تو موجود ہی ہے۔

القرآن نزل نجوما شیئا بعد شیٔ والتنزیل مرۃ بعد مرۃ (قرطبی) قیل التنزیل یکون تدریجیا و مرۃ بعد مرۃ والانزال اعم منہ (اقرب)

لیکن عجب نہیں کہ اس کے مفہوم میں قرآن کا لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف نازل ہونا بھی شامل ہو اور کیا عجب ہے کہ اس معنی کی سند آگے چل کر کسی محقق کو عربی لغت و زبان ہی سے ہاتھ آجائے۔

بِالْحَقِّ۔ حق کے تحت میں حکمت بھی داخل ہے اور راستی بھی اور قوتِ دلائل بھی اور یہ لفظ ھزل کے مقابل بھی ہے

انہ قول فصل ولیس بالھزل (کبیر) نزل بالحق لا بالمعانی الفاسدۃ المتناقضۃ (کبیر) بالصدق وقیل بالحجۃ الغالبۃ (قرطبی)

۶ؔ (کتب آسمانی میں سے)

مُصَدِّقًا۔ قرآن نے بار بار صراحت کر دی ہے کہ اس کا تعلق کتب قدیم سے تصدیق کا ہے اور قرآن اجمالاً ان کے مضامین کی تصدیق و توثیق ہی کرتا ہے، یہیں سے اُن دشمنان دین کی نادانی بھی ظاہر ہو جاتی ہے جو کسی قرآنی بیان کے مثل کوئی مضمون توریت و انجیل وغیرہ کا اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا انھوں نے کوئی خاص انکشاف کیا ہے، اور نعوذ باللہ گویا قرآن کی بڑی چوری پکڑی ہے

۷ؔ (اُن کے زمانہ میں)

اَلتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ۔ توریت اور انجیل قرآن مجید کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں، اور قرآن تصدیق انہی کی کرتا ہے۔

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ڛ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ

اور اسی نے فرقان کو اتارا ۸ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے کفر کیا ان کے لئے عذاب سخت ہے ۹ اور اللہ بڑا زبردست

عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ۝۵ۭ

ہے (بدی کا) بدلہ لینے والا ہے ۱۰ بے شک اللہ ایسا ہے کہ اس سے کوئی چیز چھپی نہیں رہتی نہ زمین میں اور نہ آسمان میں ۱۱

لیکن موجودہ بول چال میں توریت نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا، جن میں سے ہر صحیفہ کسی نہ کسی نبی کی جانب منسوب ہے۔ لیکن اُن میں سے کسی ایک صحیفہ کی بھی تنزیل لفظی کا دعویٰ کسی یہودی کو نہیں، اسی طرح انجیل نام ہے متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا، جن میں حضرت مسیحؑ سے متعلق مجہول الحال لوگوں کی جمع کی ہوئی حکایتیں اور ملفوظات ہیں، لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی مسیحیوں کے عقیدہ میں آسمانی نہیں، بلکہ مسیحی مصنفین کہتے ہیں کہ یہ مجموعہ "حواریوں کے دور میں بلا ارادہ اور بلا توقع تیار ہو گیا"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۳ صفحہ ۵۱۳ طبع چہاردہم) خوب سمجھ لیا جائے کہ ایسے بے سند "مقدس نوشتوں" کی تصدیق و توثیق کی ذمہ داری قرآن ہرگز نہیں لیتا اور موجودہ بائبل، یعنی عہدِ عتیق و عہدِ جدید کا کوئی جزو بھی قرآن مجید کے ماننے والوں پر حجت نہیں۔

مِنْ قَبْلُ۔ یعنی قرآن سے قبل، عہدِ موسیٰؑ اور عہدِ عیسیٰؑ میں ان کی اُمتوں کے لئے۔

۸ (اب، سب کی ہدایت کے لئے)

اَلْفُرْقَانَ۔ اور فرق اصلاً ہم معنی ہیں بجز اس کے کہ فرق کے معنی تو محض اور مطلق امتیاز کے ہیں خواہ وہ کسی کے درمیان ہو اور فرقان مخصوص اس امتیاز کو کہتے ہیں جو حق و باطل کے درمیان ہو۔

الفرقان ابلغ من الفرق لانه يستعمل فى الفرق بين الحق والباطل۔ (راغب)

بعض کے نزدیک الفرقان اسم جنس ہے کُل کتبِ آسمانی کے لئے۔

جنسٌ للكتب السماوية۔ (کشاف)

ایک محقق کا قول ہے کہ اس سے مراد معجزات و دلائلِ نبوت ہیں جو ہر پیغمبر کو عطا ہوتے رہتے ہیں۔

والمختار عندی ان المراد من هذا الفرقان المعجزات التى قرنها الله تعالىٰ بانزال هٰذه الكتب (کبیر)

لیکن محققین کی اکثریت اس طرف گئی ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید ہی ہے۔

هو القرآن انزل علىٰ محمد وفرّق به بين الحق والباطل (ابن جرير عن قتادة) اى القرآن (قرطبی)

الفرقان ههنا القرآن (ابن كثير عن قتادة والرّبيع) المراد هو القرآن (کبیر)

۹ (آخرت میں تو یقیناً اور دنیا میں بھی احتمالاً)

کفروا۔ یعنی باوجود اس کے کہ ان پر تبلیغ دین پوری طرح ہو چکی تھی، وہ کفر اختیار کئے رہے۔

'ایات اللہ' سے مراد آیاتِ قرآنی بھی ہو سکتی ہیں، اور نشانیاں بھی یعنی توحید کے دلائل و شواہد۔

۱۰ خوب خیال رہے کہ سورۃ کا اصل موضوع مسیحیت کی تردید ہے اس لئے عموماً ایسی ہی صفات کا اثبات کیا گیا ہے جن سے مسیحیت ہی کے کسی نہ کسی پہلو پر ضرب لگے۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلَٰهَ إِلَّا

وہ وہی (خدا) ہے جو تمھاری صورتیں رحموں کے اندر بناتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے ف۱۲ ۔ کوئی خدا نہیں بجز اس کے ف۱۳

هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦﴾ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ

وہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے ف۱۴ وہ وہی (خدا) ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے

مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ

اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل مدار ہیں ف۱۵ اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں ف۱۶

عَزِیْزٌ ہر سزا پر قادر ہے اور ہر حال میں سب سے بالادست وقوی تر ہے۔
وہ (معاذ اللہ) مسیحیوں کا خدا نہیں کہ انسانی قالب اختیار کرکے طرح طرح کی کمزوریوں اور بیچارگیوں کا شکار بن جائے، اور دشمنوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر سولی پر موت تک پا جائے، اس کی صفتِ عزیزیت اس سارے تخیل ہی سے ابا کرتی ہے۔
ذُوانْتِقَامٍ۔ وہ رحمٰن ورحیم ورؤف ہونے کے ساتھ عادل بھی ہے، اور صفتِ معدلت کا اظہار مجرموں اور سرکشوں کے مقابلہ میں سزا وانتقام ہی سے ہو سکتا ہے، اسے سزا دینے میں ہرگز کوئی عار نہیں آتا کہ اس عار سے بچنے کے لئے اُسے "مصلوبیت" اور کفارہ کے پیچ در پیچ راستے اختیار کرنے پڑیں، جن مذہبوں نے اپنے خدا کو صرف رحیم ہی رحیم مانا ہے ان کا خدا کامل نہیں، ایک پہلو سے ناقص ہے۔

ف۱۱ جاہلی قوموں اور مذہبوں کے حکماء تک آخر جاہلی تھے! یونان کے نامی گرامی عقلاء وحکماء یہ کہہ گئے اور سکھلا گئے کہ علمِ باری صرف کلیات تک محدود رہتا ہے، جزئیات کو محیط نہیں ہوتا، اور مسیحیوں نے خیر نبوت کی برکت سے کھلم کھلا اس عقیدہ کو تو نہ مانا، تاہم مرعوب اس "حکیمانہ" تعلیم سے اچھے خاصے رہے، قرآن مجید نے للکار کر بتایا کہ یہ علمِ باری کا کمال نہیں عین نقص ہوا، علمِ باری ہر حیثیت سے کامل ہے اور چھوٹی بڑی ہر چیز پر حاوی ہے۔
الارض والسماء۔ آسمان اور زمین کے نام اس سلسلہ میں اس لئے لے دیئے گئے کہ علمِ انسانی کی وسعتِ گرفت انہی حدود کے اندر محدود ہے، ضمناً خطاب مسیحیوں سے بھی ہے کہ تم جو مسیح کو خدا مانتے ہو تو بتاؤ ان کا علم کامل کہاں سے تھا اور خدا نے بندہ کی شکل اختیار کرکے کیسے اتنا بڑا نقص اپنے اندر گوارا کر لیا؟

ف۱۲ (خواہ بغیر باپ کے بنائے خواہ باپ کی وساطت سے)
قادر وہ ہر طرح اور ہر صورت سے ہے، باپ محض واسطۂ تخلیق ہوتا ہے اور خالق جس واسطہ کو جب چاہے ہٹا دے۔
یُصَوِّرُکُمْ۔ میں خطاب عام ہے، سارے انسان مخاطب ہیں۔
فِی الْاَرْحَامِ۔ یعنی ماؤں کے رحم میں، اور حضرت مسیحؑ کی صورت بھی رحمِ مادر ہی میں بنی تھی۔
اوپر ذکر اللہ کے علمِ کامل کا آچکا ہے، اب اشارہ اس کی قدرت کی طرف ہو رہا ہے کہ جس طرح اس کا علم کامل محیطِ کل وغیر محدود ہے، اسی طرح اس کی قدرتِ تخلیق بھی غیر محدود ونامتناہی ہے، انسان کا اس کی حد بندی کرنا خود انسان کا جہل ہے۔

ف۱۳ (نہ ذات کے لحاظ سے نہ صفات کے)

پھر یاد دلا دیا کہ کون اُس کے معاملات تخلیق میں دخل دے سکتا ہے یا مشورہ کا حق رکھتا ہے، وہ ذاتِ پاک ہر اعتبار سے یکتا، بے مثل اور بے مثال ہے۔

**۱۴ ؎** الْعَزِيزُ۔ عزیز۔ پر حاشیہ ابھی گزر چکا، خدائے تعالیٰ تخلیق کی ہر صورت پر یکساں قادر ہے۔

الحکیم۔ اس کی صفتِ حکمت کا اثبات ہے، یعنی جو صورت جہاں قرین حکمت و مصلحت ہوتی ہے وہ وہاں وہی اختیار کرتا ہے۔

**۱۵ ؎** (اور انھیں کو معیار بنا کر ان پر باقی کلام کو پیش کرنا چاہیئے)

مُّحْكَمَاتٌ۔ محکم قرآن مجید کی وہ واضح و صریح آیتیں ہیں جن کی دلالتیں متعین ہیں، اور ان کے معانی میں کوئی خفا و اشتباہ نہیں۔

المحکم مالا یعرض فیہ شبہۃ من حیث اللفظ ولا من حیث المعنی (راغب) واضحۃ المعنی، ظاهرة الدلالۃ، محکمۃ العبارۃ، محفوظۃ من الاحتمال والاشتباہ (روح) المحکمات فی آی القرآن ماعرف تاویلہ وفہم معناہ وتفسیرہ (قرطبی عن جابر بن عبد اللہ والشعبی وسفیان الثوری) قال النحاس احسن ما قیل فی المحکمات أن المحکمات ماکان قائما بنفسہ لایحتاج ان یرجع فیہ الی غیرہ (قرطبی) فالمراد بہ اللفظ الذی لا اشتراک فیہ ولا یحتمل عند سامعہ الا معنی واحدا (جصاص)

اُمٌّ ہر شے کی اصل کو کہتے ہیں۔

یقال لکل ماکان اصلا لوجود شیء او تربیتہ او اصلاحہ او مبدئہ اُمٌّ (راغب) ای اصلہ والعمدۃ فیہ یرد الیہا غیرہا (روح)

یہاں اس حقیقت کو بیان کر دیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں بالکل واضح و صاف ہیں، جن سے ایک ہی معنی نکلتے ہیں، وہی اصل مدار و معیار ہیں، دوسری آیتوں کو جن کے کئی کئی معنی ہو سکتے ہیں، انھیں پر پیش کرنا چاہیئے۔

فبین اللہ تعالی ان القرآن یشتمل علی محکم وعلی متشابہ والتمسک بالمتشابہات غیر جائز (کبیر) والام ھی التی منہا ابتداءہ والیہا مرجعہ فسماہا اُمًّا فاقتضی ذلک بناء المتشابہ علیہا وردہ الیہا (جصاص)

**۱۶ ؎** مُتَشَابِہ۔ ایسے کلام کو کہتے ہیں جو دوسرے کلام سے ایسا ملتا جلتا ہو کہ باہم تفریق و تمیز مشکل ہو اور اس کی تعبیر و تفسیر میں مختلف پہلو نکلتے ہوں۔

ما اشکل تفسیرہ لمشابہتہ بغیرہ اما من حیث اللفظ او من حیث المعنی (راغب) واما المتشابہ فھو ان یکون احد الشیئین مشابہا للآخر بحیث یعجز الذہن عن التمییز (کبیر) انما المتشابہ فی ھذہ الآیۃ من باب الاحتمال والاشتباہ وقیل ان المتشابہ مایحتمل وجوھا (قرطبی) المتشابہات لھن تصریف وتحریف وتاویل ابتلی اللہ فیھن العباد (قرطبی۔ عن مجاھد وابن اسحٰق)

آیت متشابہ کی ایک تفسیر یہ کی گئی ہے کہ اس پر ایمان رکھنا تو بہرحال واجب ہو لیکن اس پر عمل کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا ہو، مثلاً گزشتہ قوموں سے متعلق خبریں، یہ رائے ابن تیمیہؒ کی ہے۔

ان المتشابہ مایؤمن بہ ولا یعمل بہ ذکرہ ابن تیمیہ والظاہر انہ جمیع الاخبار (المنار)

اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ صفاتِ باری سے متعلق آیات، متشابہات میں داخل ہیں اور یہ قول بھی ابن تیمیہؒ کا ہے۔

ان المتشابہ آیات الصفات (ای صفات اللہ) خاصۃ ذکرہ ابن تیمیۃ ایضا۔ (المنار)

اور اس پر کہنا چاہیئے کہ سب کا اجماع ہے کہ قرآن مجید میں متشابہات صرف وہی آیات ہیں جن میں اخبارِ

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ

سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے (اسی حصہ کے) پیچھے ہو لیتے ہیں جو متشابہ ہے ۱۷ شورش کی

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ

تلاش میں اور اس کے (غلط) مطلب کی تلاش میں ۱۸ درآنحالیکہ کوئی اس کا (صحیح) مطلب نہیں جانتا بجز اللہ کے

وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ

اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لے آئے

غیب یعنی صفاتِ آخرت وغیرہ کا بیان ہے۔

ھٰذا رای جمھور المفسرین وذھب جمھور عظیم منھم الی انه لامتشابه فی القرآن الا اخبار الغیب کصفة الآخرة واحوالھا من نعیم وعذاب۔ (المنار)

۱۷ (اور محکمات سے قطع نظر کر لیتے ہیں)

اَلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ کھلا ہوا اور براہ راست اشارہ ہے مسیحیوں کی جانب جنھوں نے اپنے پیمبر کی صاف و واضح و صریح ہدایاتِ توحید کو پس پشت ڈال کر ان کی بعض تشبیہات کو توڑ مروڑ کر اصل قرار دے لیا تھا، لیکن الفاظ عام و وسیع ہیں، ہر کج رائے و کج رو ہر زندیق و صاحبِ بدعت اس کے تحت میں آجاتا ہے۔

ھذہ الآیة تعم کل طائفة من کافر و زندیق وجاھل وصاحب بدعة وان کانت الاشارة بھا فی ذالك الوقت الی نصاری نجران (قرطبی) ھم اھل البدع۔ (مدارك)

محققین نے اہلِ اسرار کے باب میں تصریح کر دی ہے کہ ان سے اگر ایسا کلام منقول ہو جو اپنی ظاہری صورت میں شریعت کے مطابق نہ ہو تو سلامتی اس میں ہے کہ نہ اس کلام کے ظاہر کو قبول کیا جائے اور نہ ان اشخاص ہی سے انکار کر دیا جائے۔

۱۸ (تاکہ عقائد و احکام کے باب میں اس کلام سے اپنی گمراہیوں کی سند حاصل کریں)

جن کے دلوں میں حق طلبی، حق جوئی و تلاشِ صداقت نہیں ہوتی وہ اسی دھیڑ بُن میں لگے رہتے ہیں کہ دین میں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کریں اور بجائے اس کے کہ خود دین کی راہ پر چلیں، دین کو اپنی راہ پر چلانا چاہتے ہیں، اور یہ لوگ نصوص کلامِ الٰہی کو توڑنے مروڑنے میں کوئی باک نہیں رکھتے، جیسا کہ آج کل بھی ہر فرقۂ باطل کی تاویلات میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

الفتنة ھی الکفر والضلال فی ھذا الموضع (جصاص)

اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ۔ اس غلط تعبیری میں بھی یہ لوگ مخلص نہیں، مقصود یہی ان کا عوام مسلمین کو تشویش میں ڈالنا اور وحدتِ دین میں رخنہ پیدا کرنا ہے۔

طلبًا للتشکیك فی القرآن واضلال العوام کما فعلته الزنادقة والقرامطة (قرطبی)

وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ۔ یعنی تاکہ اس سے غلط سلط معنی اپنی مرضی کے موافق تلاش کر لیں، تاویل یہاں تحریف کے مرادف ہے۔

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿٧﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ

(وہ) سب ہی ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے ۲۰ اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں ۲۱ اے ہمارے پروردگار

قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

ہمارے دلوں کو کج نہ کر بعد اس کے تو ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت عطا کر ۲۲

ای تحریفہ علی ما یریدون (ابن کثیر) الاضافۃ فی تاویلہ للعھد ای بتاویل مخصوص وھو مالم یوافق المحکم بل ماکان موافقا للتشھی (روح) المراد منہ انھم یطلبون التاویل الذی لیس فی کتاب اللہ علیہ دلیل ولا بیان (کبیر) ای التاویل الذی یشتھونہ (مدارک)

۱۹ (اور وہی جس کو جتنا چاہے بتلادے، چاہے نصوص قرآنی ہی سے اشارۃً یا دلالۃً یا اقتضاءً، چاہے اقوال رسول سے صراحۃً)

۲۰ (اور سارے کا سارا حق ہے، تشابہات کے معنی جو کچھ بھی ہوں بہر حال وہ ہیں حق ہی)

الرّٰسخون فی العلم یعنی علم دین میں پختہ اور صاحبان عقل سلیم، اکثر محققین کا مذہب یہ ہے کہ وقف تام وما یعلم تاویلہ الا اللہ پر ہے اور الرّٰسخون فی العلم سے دوسرا جملہ شروع ہوتا ہے جس کی خبر یقولون ہے قرطبی نے صحابہ و تابعین میں حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عروہ بن زبیرؓ، ابی بن کعبؓ اور عمر بن عبدالعزیزؒ کا اور ائمہ لغت و نحو میں کسائی اور اخفش اور فراء اور ابو عبید کا مذہب یہی بتلایا ہے اور حنفیہ بھی عموماً اسی کے قائل ہوئے ہیں۔

وھو الذی ذھب الیہ الحنفیۃ (روح) والوقف عند الجمھور علی قول الا اللہ (مدارک)

بلکہ اکثر صحابہ و تابعین و محققین اہل سنت کا یہی مذہب ہوا ہے۔

ھو مذھب الاکثرین من اصحاب رسول اللہ والتابعین واتباعھم خصوصا اھل السنۃ وھو اصح الروایات عن ابن عباس۔ (روح)

رسوخ کے معنی مضبوط ہوجانے اور جڑ جم جانے کے ہیں۔

الرّسوخ الثبوت فی الشیئ کل ثابت راسخ۔ (قرطبی)

تو الرّٰسخون فی العلم وہ ہوئے جن کے دلوں میں دین کے حقائق ثبت ہو چکے ہیں۔

کل مّن عند ربّنا۔ خواہ اس کے بعض حصوں کے معنی بالکل ظاہر و واضح ہوں اور خواہ اس کے بعض حصوں کے مفہوم میں خفا و اشتباہ ہو، تقدیر کلام یوں ہے کلّہ من عند ربّنا اور کلّہ میں ضمیر کتاب اللہ کی طرف ہے۔

۲۱ (جو دین کے باب میں عقل و فہم سے کام لیا کرتے ہیں)

بیان فہم سلیم رکھنے والوں کی عادت کا ہے کہ ان لوگوں نے جب قرآن کے مجموعہ اور کل کو کلام الٰہی مان لیا تو اب اس کے کسی حصہ کے متعلق بھی بے اعتقادی اور ریب دل میں نہیں لاتے۔

۲۲ یعنی ہم کو اس صراط مستقیم پر قائم رکھ اور ہمارا حال کہیں یہود و نصاریٰ کا سا نہ ہوجائے جو کتاب و نبوت

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿٨﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ

بیشک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے ۲۳ اے ہمارے پروردگار بیشک تو (تمام) لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اس دن جس کے

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿٩﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ ع ١ / ٩ / ٩

وقوع میں (ذرا) شک نہیں ۲۴ بیشک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں جاتا ۲۵ بیشک جن لوگوں نے کفر کیا، اُن کے مال اور ان کی اولاد

اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ﴿١٠﴾

اللہ کے مقابلہ میں اُن کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور یہی لوگ آگ کے ایندھن ہوں گے ۲۶

کے بعد بھی گمراہ ہو گئے، یہ ساری دعا الرّٰسخون فی العلم کی زبان سے ہے یعنی علم دین میں پختہ کاروں کی زبان سے لوگ اپنے رسوخ فی العلم اور پختہ کاری پر نازاں نہیں ہوتے بلکہ اس نعمت کے زوال سے ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں۔

مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً۔ انہیں خود اپنے کسی عمل پر ناز یا دعویٰ نہیں ہوتا، یہ نہیں کہتے کہ ہمیں ہمارے حسنِ عمل کے انعام میں راہِ راست پر قائم رکھ بلکہ کہتے ہیں کہ محض اپنے فضل و کرم، لطف و عنایت سے راہِ ہدایت پر مستقیم رکھ۔

اے من عندك ومن قبلك فضلًا لا عن سبب بيننا ولا عمل. (قرطبی)

گویا اس میں ادبِ دعا کی تعلیم آگئی۔

"رَحْمَةً" کا صیغۂ نکرہ اس کی عظمت اور بڑائی کے لئے ہے۔

وتنوينه للتفخيم (روح)

۲۳ (تو ایسے کے لئے اِس درخواست کا قبول کر لینا مشکل کیا ہے)

مفسّر قرطبی نے کہا ہے کہ جاہل صوفیہ اور باطنیہ، زنادقہ نے اس آیت سے یہ مَن گھڑت مسئلہ نکالا ہے کہ علم وہی ہے جو اللہ کی طرف سے محض وہبی ہو، کسبی نہ ہو اور علم کتابی حجاب کے حکم میں ہے۔

۲۴ (اس لئے قیامت کا آنا برحق اور بندوں کو اُس کی یاد اور اس کا اہتمام ضروری)

مومنینِ کاملین کی یہ دعائیں خوفِ آخرت سے ہوتی ہیں، کسی مادّی دنیوی غرض سے نہیں۔

جَامِعُ النَّاسِ۔ یعنی لوگوں کی موت کے بعد اٹھانے والا اور اکٹھا کرنے والا۔

اے باعثهم ومحييهم بعد تفرقهم (قرطبی)

۲۵ (جیسا کہ بعض جاہلی قوموں اور فرقوں نے گمان کر رکھا ہے)

جاہلی قوموں کے عجیب عجیب معتقدات میں سے یہ عقیدے بھی ہیں کہ خدا کے لئے جائز ہے کہ وعدہ کر کے بھول جائے یا وعدہ کا ایفاء اُسے خلافِ مصلحت نظر آئے اور اس لئے اسے وہ ٹال جائے، اور افسوس ہے کہ بعض مسلمان کہلانے والے فرقوں نے ان خرافات میں ان کی تقلید شروع کر دی ہے، خلفِ وعید کا مسئلہ جو اہلِ سنّت کے ہاں ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے، اور اس سے حق تعالیٰ کی شان میں کوئی منقصت نہیں نکلتی بلکہ عظمت و کرمت کچھ اور بڑھ ہی جاتی ہے

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

جیسا کہ معاملہ فرعون والوں کے ساتھ ہوا اور ان سے قبل والوں کے ساتھ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾

سو اللہ نے ان کی گرفت کی ان کے گناہوں کے باعث، اور اللہ بڑا سخت سزا دینے والا ہے ۲۷ف

ف۲۶ (عالمِ آخرت میں)

اَلنَّارُ۔ یعنی آتشِ جہنم جہنم کے عذابِ آتشیں پر توریت و انجیل کے حوالے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں، آیہ کریمہ فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ کے تحت میں۔

مِنَ اللّٰهِ۔ یعنی عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکیں گے۔

اے من عذاب اللہ۔ (قرطبی)

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ۔ یعنی جاہلی قوموں کا ایک عقیدہ یہ بھی رہا ہے کہ اولادِ نرینہ اگر مرے ہوئے ماں باپ کی طرف سے دان پُن کر دے تو والدین کی نجات ہو جائے گی خواہ وہ ایمان سے محروم ہی دنیا سے اٹھے ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ سوال ہوا ہے کہ کون سے کافر یہاں مراد ہیں، اور مختلف جوابات دیئے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ الفاظِ قرآنی عام ہیں، کافروں کی ہر صنف و نوع پر شامل۔

الظاھر ان المراد بھم جنس الکفرۃ الشامل لجمیع الاصناف۔ (روح)

ف۲۷ (مجرموں اور باغیوں کو)

ذُوانْتِقَامٍ۔ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔

اللہ کوئی بے بس اور ہمہ عجز قسم کا مہاتما نہیں کہ بندوں کو ہر طرح کے ظلم و عدوان کا مرتکب دیکھے اور پھر دم نہ مارے، وہ جب بالآخر سزا دینے پر آجاتا ہے تو سب کو پتا چل جاتا ہے کہ کوئی گرفت اس کی گرفت سے شدید تر و الیم تر نہیں

كَدَاْبِ۔ دأب کے معنی حالت یا معاملہ کے ہیں۔

الدأب العادۃ والشان۔ (قرطبی)

ک۔ یہ تمثیل بے سود ہونے میں ہے، گویا تاریخ سے استشہاد ہے کہ جس طرح ماضی میں فرعونیوں کے کام ان کا مال اولاد کچھ نہ آسکا، اور عذابِ الٰہی سے انھیں کوئی چیز نہ بچا سکی، اسی طرح ان کافروں کے حق میں بھی یہ سارے مادی سہارے بالکل عبث ولاحاصل ثابت ہوں گے۔

اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون اور فرعونیوں پر مفصل حاشئے پارۂ اول میں گزر چکے، فرعونیوں کی ہلاکت کے ذکر میں ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ ان کی ہلاکت مسیحیوں کو مسلّم تھی اور سورہ کا روئے سخن خاص طور پر مسیحیوں ہی کی جانب ہے

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ یعنی وہ نافرمان قومیں جو عہدِ موسوی سے بھی قدیم تر ہوئی ہیں۔

اٰيٰتِنَا۔ یہ نشانیاں خواہ آسمانی صحیفوں اور نوشتوں کی صورت میں ہوں، یا معجزات و خوارقِ نبوت ہوں، یا دلائلِ توحید ہوں

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ

آپ (ان) کفر والوں سے کہہ دیجئے کہ تم عنقریب مغلوب کئے جاؤ گے اور جہنم کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہ

الْمِهَادُ ⑫ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ

بُرا ٹھکانا ہے ۲۸؎ بیشک تمہارے لئے ایک نشانی (ان) دو گروہوں میں ہے جو باہم مقابل ہوئے، ایک گروہ

فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ

اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافر (تھا) ۲۹؎ یہ (کافر) ان کو کھلی آنکھوں دیکھ رہے تھے اپنے سے کئی گنا ۳۰؎

یحتمل ان یرید الاٰیات المتلوۃ ویحتمل ان یرید الاٰیات المنصوبۃ للدلالۃ علی الوحدانیۃ (قرطبی)

اما المتلوۃ فی کتاب اللہ تعالیٰ او العلامات الدالۃ علی توحید اللہ تعالیٰ وصدق انبیآئہ (روح)

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ۔ اور انہیں ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں مع اُن کی ساری عظمت و شوکت کے نیست و نابود کر دیا خطاب یہ حق سے بغض و عناد رکھنے والوں سے ہے، رسول کے واسطہ سے۔

۲۸؎ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ۔ کا تعلق تو ظاہر ہے کہ آخرت ہی سے ہے سوال آیت کے وعید اول سَتُغْلَبُوْنَ سے تعلق ہے کہ معاصر دشمنانِ دین کی اس مغلوبیت و مقہوریت کا تحقق کہاں ہوگا؟ آخرت میں تو خیر ہوہی گا لیکن آیا اس کے قبل اہلِ حق کے ہاتھوں سے اس دنیا میں بھی؟ اہلِ تفسیر نے بالاتفاق اس کا جواب اثبات میں دیا ہے، اور تصریح کی ہے کہ اس کا وقوع عنقریب اس دنیا میں ہوگا، چنانچہ ہوا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ باقی یہ کہ اس سے کافروں کا کون سا گروہ متعین طور پر مراد ہے، بعض نے پیش گوئی کا مصداق بدر میں مشرکین مکہ کی ہزیمت کو ٹھہرایا ہے۔

المراد مشرکی مکۃ (معالم عن مقاتل) قل لمشرکی مکۃ ستغلبون یعنی یوم بدر (بیضاوی)

قیل نزلت فی قریش قبل بدر بسنتین۔ (بحر)

لیکن اکثر نے مدینہ میں یہود کے پُرقوت جتھوں اور جرگوں کی شکست و پامالی مُراد لی ہے۔

یعنی الیھود ای تھزمون (قرطبی عن ابن عباس) فالمراد من الموصول الیھود (روح)

ستغلبون میں س قُربِ وقوع کے لئے ہے یعنی اس دنیا میں اس کا مشاہدہ ہو کر رہے گا۔

والسین لقرب الوقوع ای ستغلبون عن قریب واُرید منہ فی الدنیا۔ (روح)

بہتر یہ ہوگا کہ لفظ کے اطلاق کو عام رکھا جائے اور یہود و مشرکین جو بھی رسول اللہ (صلعم) کے عہد میں مسلمانوں کے ہاتھ خوار و مغلوب ہوئے، سب کو آیت کا مصداق یکساں ٹھہرایا جائے۔

والظاھر ان الذین کفروا یعم الفریقین المشرکین والیھود وکل قد غلب بالسیف والجزیۃ والذلۃ وظھور الدلائل والحجج۔ (بحر)

وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

اور اللہ اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے مدد کر دیتا ہے [۳۱] بیشک اس (واقعہ) میں اہل بصیرت کے لئے (بڑا) سبق ہے [۳۲]

بہر حال قرآنی پیشگوئی کا اعجازی رنگ ہر صورت میں عیاں ہے، نزولِ آیت کے وقت مسلمانوں کی بے بسی، بے سر و سامانی و زبوں حالی دیکھ کر کوئی بھی انسانی دماغ یہ پیشگوئی نہیں کر سکتا تھا کہ مشرکینِ مکہ یا یہودِ مدینہ کسی سے بھی یہ ایسی زبردست ٹکر لے سکتے ہیں۔

**۲۹ے** (جو شیطان کی راہ میں لڑ رہا تھا)

اشارہ غزوۂ بدر کی جانب ہے، جو ۲ھ ہجری یا ۱۵ نبوی میں ہوا تھا۔

لکم۔ مخاطبِ خصوصی یہاں یہودِ مدینہ ہیں، جنھیں اپنے فنونِ حرب پر بڑا غرہ تھا۔

اٰيَةٌ۔ نشان اللہ کی قدرت و کارسازی اور رسول اللہ صلعم کی صداقت کا۔

يعنی علامة ودلالة على صدق ما اقول انكم ستغلبون وعبرة۔ (ابن جریر)

فِىْ فِئَتَيْنِ۔ یعنی دو گروہوں کے واقعہ میں، ایک گروہ مومنین بے سر و سامان کا، دوسرا گروہ مشرکین باساز و سامان کا۔

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ گروہ مومنین کا تھا، تعداد میں قلیل اور سامان میں حقیر، تعداد میں کل ۳۱۳ تھے، اور وہ بھی بغیر سامانِ حرب کے، اونٹ اتنے کم کہ چار چار پیادوں کے حصہ میں ایک ایک پڑتا تھا، گھوڑے لشکر بھر میں کل دو۔ آہنی زرہیں اتنے آدمیوں میں کل سات۔

وَّاُخْرٰى كَافِرَةٌ۔ یہ لشکر ریاستِ مکہ کا تھا، تعداد میں مسلمانوں سے سہ چند تھا یعنی ۹۵۰ افراد پر مشتمل قریش کے بہترین سواروں کے زیرِ قیادت اور ہر ضروری سامان سے آراستہ، شتر سوار اُن میں ۷۰۰ تھے اور اسپ سوار و زرہ پوش ۱۰۰ تھے۔

**۳۰ے** (لیکن یہ کثرتِ تعداد پھر بھی کچھ کام نہ آئی اور آخر کار ذلت و شکست لشکرِ مکہ ہی کو نصیب ہوئی)

يَرَوْنَهُمْ رَاْىَ الْعَيْنِ۔ یعنی یہ محض وہم و خیال نہ تھا بلکہ واقعۃً مشاہدہ کر رہے تھے۔

رُؤْيَة۔ آیت میں رویتِ چشم کے لئے ہے۔

قال ابو على الرؤية فى الاٰية رؤية عين ولذلك تعدت الى مفعول واحد (قرطبی) يعنی رؤية ظاهرة مكشوفة (کشاف)

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ۔ کون کس کو کتنا دیکھ رہے تھے؟ سوال کے جواب یا ضمیروں کی تعیین میں اہلِ تفسیر کے درمیان شدید اختلاف ہے لیکن سب سے سہل و بے تکلف ترکیب وہ ہے جو امام ابن جریر طبری نے اختیار کی ہے اور وہی یہاں لے لی گئی ہے، علامہ آلوسی نے بھی اسی کو سدی تابعی کے حوالہ سے اختیار کیا ہے۔

والمراد كما قال السدى ترى الفئة الاخيرة الكافرة الفئة الاولى المؤمنة مثلى عدد الرائين۔ (روح)

مِّثْلَيْهِمْ سے مراد دو چند بھی لی گئی ہے اور سہ چند بھی، اور مطلق کثرتِ تعداد بھی بغیر کسی عدد خاص کے تعین کے۔

زعم الفراء ان معنى يرونهم مثليهم ثلاثة امثالهم (بحر) المراد بالمثلين مطلق الكثرة لاخصوص المثلين۔ (جمل)

**۳۱ے** (چنانچہ اس موقع پر اس کی مشیت نصرتِ مومنین سے متعلق ہو گئی، اور کافروں کے کام نہ ان کی تیاریاں آسکیں نہ ان کی کثرتِ تعداد ہی)

مَنْ يَّشَآءُ۔ اس جزو نے یہ صاف کر دیا کہ اس تائید کی تعیین اس عالمِ ابتلاء میں مصالحِ تکوینی کے لحاظ سے ہوتی ہے، یہ لازمی نہیں کہ ہر حال میں اور ہر موقع پر تائید و نصرت اہلِ حق ہی کی ہو۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

لوگوں کے لئے خوشنما کردی گئی ہے مرغوبات کی محبت (خواہ) عورتوں سے ہو یا بیٹوں سے، یا ڈھیر لگے ہوئے

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

سونے اور چاندی سے، یا نشان پڑے ہوئے گھوڑوں سے، یا مویشیوں سے، یا زراعت سے ۳۳

۳۲ یعنی بڑا سبق ہدایت کا اُن لوگوں کے لئے ہے جو بصیرت سے کام بھی لیتے رہتے ہیں۔

عِبْرَةً۔ تنوین عظمت کے لئے ہے، یعنی ہدایت و بصیرت کا بہت بڑا سبق۔

التنوین للتعظیم ای عبرۃ عظیمۃٌ کائنۃ۔ (روح)

۳۳ اور انہی سب کی محبت اکثر افراد میں حدود جائز سے تجاوز کر کے معصیت کا سبب بن جاتی ہے

لِلنَّاسِ۔ الناس سے یہاں مراد مکلّف افراد ہیں، اس لئے مجنون اور بچے خود بخود اس فہرست سے نکل گئے

الناس ھم المکلفون۔ (المنار)

حُبُّ الشَّھَوَاتِ۔ شھوات یہاں شتہیات کے معنی میں ہے، یعنی مرغوب و دل پسند چیزیں۔ عربی زبان میں یہ استعارہ

تعلق و اتصال کی بنا پر عام ہے۔

وقد یسمی المشتھی شھوۃ (راغب) الشھوات ھھنا ھی الاشیاء المشتھیات سمیت بذلک علی الاستعارۃ

للتعلق والاتصال .... وھذہ استعارۃ مشھورۃ فی اللغۃ (کبیر) والمراد بھا ھنا المشتھیات علی طریق المبالغۃ

وھی شائعۃ الاستعمال (المنار) جعل الاعیان التی ذکرھا شھوات مبالغۃ فی کونھا مشتھاۃ (کشاف)

ان مرغوبات کے نام صرف مثال اور نمونہ کے طور پر دیئے گئے ہیں، شوق و رغبت کی چیزوں کا حصر مراد نہیں

اَلْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ۔ یعنی نشان زدہ گھوڑ دوڑی گھوڑے، جو بڑی قیمتی اور قابل قدر چیز سمجھے جاتے تھے۔

خیل۔ اسم جمع ہے، بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ اس کا واحد فرس ہے، اور اصلاً اس کا مفہوم جامع ہے سواری و سوار دونوں کا۔

الخیل فی الاصل اسم للافراس والفرسان جمیعًا ویستعمل فی کل واحد منفرد (راغب) اجمعت

الفرس علی غیرسطھا فقیل خیلٌ (اقرب) وقال قومٌ لا واحد لہ من لفظہ بل ھو اسم جمع واحدہ فرس

(روح) قال الواحدی الخیل جمع لا واحد لہ من لفظہ کالقوم والنساء والرھط۔ (کبیر)

زُیِّنَ لِلنَّاسِ۔ اس سے واضح ہو گیا کہ انسان کی نظر میں ان چیزوں کی رغبت و کشش بطور امر طبعی کے ہے، اور

بذاتِ خود معصیت نہیں، انسان مکلّف ان کے شوق کے ازالہ کا نہیں، انہیں صرف عقلِ سلیم و احکامِ شریعت کے ماتحت رکھنا چاہئے

والمراد بہ خلق حبھا فی القلوب وھو بھذا المعنی مضاف الیہ تعالیٰ (روح)

مِنَ النِّسَآءِ۔ عورتوں کا ذکر شاید اس لئے سب پر مقدم رکھا گیا ہو کہ یہی لذت ساری مادی لذتوں کی سردار ہے۔

وانما قدمھن علی الکل لان الالتذاذ بھن اکثر والاستئناس بھن اتم۔ (کبیر)

القناطیر۔ قنطار کی جمع ہے۔ بقول بعض اس کی کچھ مقداریں اور تعدادیں بھی لکھی ہیں، لیکن سب سے بہتر قول یہ ہے کہ اس کا اطلاق عام ہے

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۱۴) قُلْ

یہ (سب) دنیوی زندگی کے سامان ہیں ۳۴؎ اور حسن انجام تو اللہ ہی کے پاس ہے ۳۵؎ آپ کہئے کہ کیا میں تمہیں

اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ

ایسی چیز کی خبر دوں جو ان (چیزوں) سے (کہیں) بہتر ہے ۳۶؎ ان لوگوں کے لئے جو ڈرتے رہتے ہیں ان کے پروردگار

جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ

کے پاس باغ ہیں کہ ان کے نیچے ندیاں پڑی بہہ رہی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں ۳۷؎ اور صاف ستھری کی ہوئی

مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۱۵)

بیبیاں ہوں گی ۳۸؎ اور اللہ کی خوشنودی ہوگی ۳۹؎ اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھنے والا ہے ۴۰؎

ھو المال الکثیر کما اخرجہ ابن جریر عن الضحاک (روح) وقیل القنطار عند العرب وزن لا یحد (روح) والکثرۃ تختلف بحسب الاعتبارات والاضافات (روح) قد اختلف المفسرون فی مقدار القنطار علی اقوال وحاصلہا انہ المال الجزیل (ابن کثیر)

۳۴؎ (سو اس حقیقت کو سمجھ کر ان کی محبت جائز حدود کے اندر محدود رکھنی چاہیے)

متاع کہتے ہی اس چیز کو ہیں جس سے کسی حیثیت سے نفع کچھ مدت کے لئے حاصل کیا جائے۔

المتاع انتفاع ممتد الوقت (راغب) وکل ما ینتفع بہ علی وجہ ما فھو متاع (راغب)

مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ مقصود یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں بہت زیادہ دل لگانے کے قابل نہیں البتہ دنیوی زندگی برتنے میں مفید ومعین یقیناً ہیں، سو ان کی قدر اسی حد تک کرنا چاہیے، یہ نہ ہو کہ یہ مقاصد حیات بن جائیں دنیا خود ہی فانی ہے اور اس کے یہ سارے ساز وسامان بھی فانی۔

والمعنی تحقیر امر الدنیا والاشارۃ الی فنائھا وفناء ما یستمتع بہ فیھا (بحر)

۳۵؎ (سو دائمی اور غیر فانی راحت کے لئے فکر واہتمام صرف اللہ کی رضا کا رکھنا چاہیے، اس کے آگے دنیا کی آنی وفانی بڑی سے بڑی لذت بھی بے بساط ہی ہے۔

ومعنی الآیۃ تقلیل الدنیا وتحقیرھا والترغیب فی حسن المرجع الی اللہ فی الآخرۃ (قرطبی)

امام رازی نے اس کے تحت میں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ انسان کا اصل مرجع تو جنت ہی ہے اس لئے کہ اللہ نے خلقت کی تکوین رحمت ہی کے لئے کی ہے نہ کہ عذاب کے لئے، اور دوزخ جو مرجع ہے وہ محض ضمناً اور ثانوی حیثیت سے ہے۔

المآب المقصود بالذات ھو الجنۃ فاما النار فھی المقصود بالعرض لانہ سبحانہ خلق الخلق للرحمۃ لا للعذاب (کبیر)

۳۶؎ (کیا بہ لحاظ کیفیت، کیا بہ لحاظ کمیت اور کیا بہ لحاظ قیام ودوام)

خطاب عام انسانوں سے رسول علیہ السلام کے واسطہ سے ہے۔

الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾

(یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے رہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم یقیناً ایمان لے آئے سو ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے ۴۱

ذٰلِکُمْ۔ یعنی یہ چیزیں جو سراسر بے ثبات و بے حقیقت ہیں۔

۳۷ الذین اتقوا۔ یعنی جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔

خوفِ خدا پر رحمتِ الٰہی کے مرتّب و متوجہ ہونے کا ذکر قرآن مجید ہی میں نہیں اگلے صحیفوں میں بھی بار بار آیا ہے، چنانچہ توریت کے حوالے پارۂ اوّل کے حواشی میں گزر چکے، مسیحیوں کے مقدّس نوشتے بھی خوف و خشیت کے ذکر سے خالی نہیں۔

"اور اس کا رحم ان پر جو اس سے ڈرتے ہیں پشت در پشت رہتا ہے۔" (لوقا ۱ : ۵۰)

"آؤ اپنے آپ کو ہر طرح کی جسمانی آلودگی سے پاک کر دیں اور خدا کے خوف کے ساتھ پاکیزگی کو کمال تک پہنچائیں۔" (۲۔ کرنتھون ۷ : ۱)

"وہ وقت آپہنچا ہے کہ تیرے بندے نبیوں اور مقدّسوں اور ان چھوٹے بڑوں کو جو تیرے نام سے ڈرتے ہیں اجر دیا جائے۔" (مکاشفہ ۱۱ : ۱۸)

۳۸ (اُن کے لئے جنّت میں)

مطھّرۃٌ۔ پاک صاف کی ہوئی ہر جسمانی آلودگی و نجاست سے۔

المطھّرات ممّا یعھد فی نساء الدنیا من الشوائب۔ (المنار)

قرآن مجید نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ اہلِ جنّت کے لئے راحت و لذّت کا سامان ہر قسم کا ہوگا، مادّی لُطف کا بھی، ذہنی لُطف کا بھی، روحانی لطف کا بھی، پھر اگر انھیں وہاں بیویاں بھی عنایت ہوں، ہر طرح پاک صاف اور لطف ازدواجی بھی پوری طرح اُٹھانے کا موقع ملے تو اس میں "روشن خیالی" کے آخر شرمانے کی کون سی بات ہے؟

۳۹ (جو حاصل اور عطر ہے ساری نعمتوں، لذّتوں، راحتوں کا)

رضوانٌ۔ کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے۔

ای رضاء عظیم علی مایشعربہ التنوین۔ (روح)

۴۰ (اور ان کے احوال، اقوال، اعمال کے ایک ایک جزئیہ سے پوری طرح خبردار ہے۔)

پس اس کا احتمال ہی نہیں کہ کوئی چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی حساب یا صدورِ جزاء سے رہ جائے۔

۴۱ یہ کہنے والے کون ہیں؟ وہی ہیں جن کا ذکر الذین اتقوا کے ماتحت چل رہا ہے، یہ اپنے اعمال و احوال پر نازاں ہونا الگ رہا، اُلٹے فرطِ خشیت و ہیبت سے اپنی مغفرت و حُسنِ خاتمہ کے لئے مناجات کرتے رہتے ہیں۔

اٰمنّا۔ یعنی ہم اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی شریعت پر ایمان لے آئے۔

اٰمنّا فاغفرْ لنا۔ ایمان پر معاً طلبِ مغفرت کو مرتّب کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ مغفرت میں اصل حائل عدمِ ایمان ہی ہوتا ہے جب یہ مانع رفع ہوگیا تو اب کیا ہے، اب ہماری باقی خطاؤں، لغزشوں کو تو معاف کر ہی دیجئے، ایمان بہت بڑی نعمت ہے اور اس کی انتہائی اہمیت اس آیت سے ظاہر ہو رہی ہے، امام المفسرین امام رازیؒ نے اس موقع پر بہت خوب تقریر کی ہے

ذٰلک یدل علی انھم توسلوا بمجرد الایمان الی طلب المغفرۃ واللہ تعالیٰ حکی ذٰلک عنھم فی معرض المدح لھم والثناء علیھم فدل ھٰذا علی ان العبد بمجرد الایمان یستوجب الرحمۃ والمغفرۃ من اللہ تعالیٰ۔ (کبیر)

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷

(یہ) صبر کرنے والے ہیں اور راستباز ہیں اور فروتنی کرنے والے ہیں اور خرچ کرنے والے ہیں اور پچھلے پہر گناہوں سے بخشش چاہنے والے ہیں ۴۲

اور ان ہی کی پیروی صاحب بحر و صاحب روح اور قاضی بیضاوی نے بھی کی ہے۔

علی مجرد الایمان دلیل علی کفایة فی استحقاق المغفرة والوقایة من النار من غیر توقف علی الطاعات (روح) فدل علی ان الایمان یترتب علیه المغفرة ولا یکون الایمان عبارة عن سائر الطاعات (بحر) علی مجرد الایمان دلیل علی انه کاف فی استحقاق المغفرة او الاستعداد لها (بیضاوی)

ذُنُوْبَنَا۔ ذنوب کے تحت میں گناہ کبیرہ اور صغیرہ سب ہی آگئے۔

والمراد من الذنوب الکبائر والصغائر (روح)

**۴۲** مغفورین و مقبولین کے کتنے طبقات اس ایک آیت کے اندر شمار کر دیئے گئے۔

بِالْاَسْحَارِ۔ سحر۔ نام اس وقت کا ہے جب رات کی تاریکی صبح کی روشنی سے مل رہی ہو۔

السحر والسحرة اختلاط ظلام آخر اللیل بضیاء النهار وجعل اسماً لذلک الوقت (راغب)

آخر شب کی خصوصیت اس لئے ہے کہ وہ وقت خاص طور پر دجمعی اور روحانی قویٰ کی بیداری و بالیدگی کا ہوتا ہے اور نفس پر اس وقت کا اٹھنا شاق بھی زائد ہوتا ہے، یہ مراد نہیں کہ استغفار بجز اُس وقت کے اور کسی وقت ہو نہیں سکتا۔ پچھلے پہر توبہ و استغفار میں مشغول رہنے والے، یہ نہیں کہ ناچ رنگ کی محفلوں کو زینت دینے والے، مشاعروں اور قوالیوں کی مجلسیں جمانے والے۔

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ۔ یعنی صبر کرنے والے اور راستی برتنے والے اپنے سارے معاملات میں۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ بجائے صیغۂ فعل یعنی یصبرون اور یصدقون کے اسم فاعل الصابرین اور الصادقین اس لئے لائے گئے کہ ان سے ان اشخاص کی یہ عام و مستقل عادت ظاہر ہو۔

یدل علی ان هذا المعنی عادتهم وخلقهم وانهم لا ینفکون عنها (کبیر)

اَلْقٰنِتِیْنَ۔ یعنی فروتنی کرنے والے اللہ کے حضور میں۔

اَلْمُنْفِقِیْنَ۔ یعنی خرچ کرنے والے اللہ کی راہ میں، اس کے تحت میں وہ تمام نیک اور جائز خرچ آگئے جو انسان اپنی ذات پر یا اپنے بیوی بچوں پر یا بہ سبیل زکوٰۃ و جہاد وغیرہ کرتا ہے۔

ویدخل فیه انفاق المرء علی نفسه واهله واقاربه وصلة رحمه وفی الزکاة والجهاد وسائر وجوه البر (کبیر)

عارفوں نے کہا ہے کہ یہ تمام صفات اولیاء اللہ کے ہوتے ہیں۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایک صفت بھی اِن صفاتِ پنجگانہ سے کسی میں موجود ہوئی تو وہ بھی اسی اجر و مدح میں داخل ہوگا۔

والظن والعلم عند الله ان کل من کان معه واحدة من هذه الخصال دخل تحت المدح العظیم واستوجب هذا الثواب الجزیل۔ (کبیر)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىِٕمًا

اللہ کی گواہی ہے کہ کوئی معبود نہیں ہے بجز اس کے اور فرشتوں اور اہل علم کی (بھی گواہی یہی ہے) ۴۳ وہ عدل سے

بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؕ (۱۸) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۟

انتظام رکھنے والا (معبود ہے) ۴۴ کوئی معبود نہیں ہے بجز اس زبردست حکمت والے کے ۴۵ یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے ۴۶

النصف

**۴۳** (اس لئے شرک ہر درجہ اور نوعیت کا باطل ہے۔)

شَهِدَ اللّٰهُ۔ اللہ کی یہ گواہی کتبِ آسمانی سے بھی ظاہر ہو رہی ہے، اور صحیفۂ کائنات سے بھی۔

ومن وحدانیتہ بنصب الدلائل الدالّة علیها وانزال الاٰیات القاطعة بها (بیضاوی)

کتبِ الٰہی کی شہادت دلیلِ نقلی کا حکم رکھتی ہے، اور مصنوعاتِ فطرت کی دلالت دلیلِ عقلی کا۔

شہادت سے مراد وہ گواہی ہے جو یا بصارت سے حاصل ہو یا بصیرت سے، مشاہداتِ حسّی سے یا معنوی سے۔

الحاصل ان الشهادة بالشیٔ هی الاخبار به عن علم بالمشاهدة الحسية او المعنوية وهی الحجة والدليل وهو المختار هنا۔ (المنار)

اَلْمَلٰٓئِكَةُ۔ یہ وہی مخلوق ہے جسے اکثر مشرک قومیں دیوتا کا لقب دے کر شریکِ خدائی سمجھ رہی ہیں۔

اُولُوا الْعِلْمِ۔ "علم" سے مراد علمِ حقائق ہے نہ کہ علومِ دنیوی و تجربی۔ محققین نے آیت سے علماء کا خاص شرف و فضل نکالا ہے۔

فی هذه الاٰية دليل علی فضل العلم وشرف العلماء (قرطبی)

**۴۴** (ساری کائنات کا)

قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ۔ عدل سے مراد ہے کہ ہر شے اپنے محلِ مناسب میں ہو۔ بعض جاہلی قوموں نے خدا کا وجود تو تسلیم کیا ہے، لیکن وجودِ معطّل، یا ایسی صفات سے موصوف جو کمالاتِ الٰہیہ کے منافی ہیں، اسلام کا خدا خدائے معطّل نہیں، منتظم ہے، کارساز ہے، ہر ایک کا اور ہر کام بنانے والا ہے۔

فقرے کی ترکیب میں قول مختلف ہیں، جمہور کا قول ہے کہ یہ شهد الله کا حال واقع ہوا ہے۔

وهو قول جمهور المفسرين انه حال من شهد الله (کبیر)

**۴۵** (اس لئے اُسے کسی شریک کی حاجت ہی نہیں، نہ قوت کے لحاظ سے نہ علم کے اعتبار سے)

العزیز۔ وہ جس کی قوت سب پر غالب ہے، اور اس پر کوئی غالب نہیں۔

اشارة الی كمال القدرة (کبیر)

الحکیم۔ وہ جس کی حکمت سب سے بڑھی ہوئی ہے۔

اشارة الی كمال العلم (کبیر)

اور جو العزیز بھی ہے اور الحکیم بھی، اس کے لئے قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ہونا دشوار ہی کیا ہے۔

**۴۶** (نہ کہ مطلقاً ہر وہ چیز جسے دین کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔)

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ

اور جو اختلاف کیا اس میں اہلِ کتاب نے سو وہ آپس کی ضد سے کیا ۴۷ؔ بعد اس کے کہ انھیں صحیح علم

الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ

پہنچ چکا تھا۔ اور جو اللہ کی آیتوں سے انکار کرے گا سو اللہ یقیناً جلد حساب لینے والا

الْحِسَابِ ⑲ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ

ہے ۴۸ؔ پھر اگر یہ لوگ آپ سے حجت کئے جائیں ۴۹ؔ تو خیر آپ کہہ دیجئے کہ میں تو اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں (وہ بھی) ۵۰ؔ

یہ رد ہے بادشاہ اکبر اور دوسرے بددینوں کے اس عقیدہ کا کہ ہر دین، دینِ حق ہے، اور ہر مسلک خداہی کی راہ ہے، اور دیر و حرم، کفر و ایمان میں فرق صرف لفظی و اصطلاحی ہے، خطِ مستقیم حقیقت یہ ہے کہ دو نقطوں کے درمیان صرف ایک ہی ممکن ہے، باقی سب خطوط منحنی و کج ہوں گے، راہِ مستقیم خدا اور بندہ کے درمیان صرف ایک ہی ہے، اور وہ اسلام ہے جو انبیاء و ہادیانِ حق کا دین ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

الدّین یعنی دینِ مقبول۔ الدّین اور الاسلام دونوں کا معرفہ ہونا حصر کے معنی دے رہا ہے یعنی دینِ مقبول صرف یہی ہے اور قرآنی فقرہ کا مفہوم یہی ہے کہ الاسلام کے سوا کوئی سا بھی دین اللہ کے ہاں مقبول نہیں۔

وتعریف الجزئین للحصر ای لا دین مرضی عند اللہ تعالیٰ سوی الاسلام (روح) ای لا دین مرضی عند اللہ سوی الاسلام (بیضاوی) ھو الدّین عند اللہ وما عداہ فلیس عندہٗ فی شیٔ من الدین (کشاف)

۴۷ؔ (نہ کہ کسی اجتہادِ فکری اور اختلافِ فہم کی بنا پر)

یہاں پھر ایک بار اسے کھول کر بیان کر دیا ہے کہ اہلِ کتاب کا راہِ حق سے انحراف کسی خطاءِ اجتہادی کی بنا پر نہیں، نفسانیت و ہواپرستی کی بنا پر ہے، یہود پہلے سے بھی یہی کہتے چلے آرہے تھے کہ راہِ حق ہماری راہ ہے اس لئے کہ فلاں فلاں بزرگ ہمارے مورث ہوئے ہیں، اور سرورِ کائنات ؐ کے زمانہ میں بھی ان کا کہنا یہ تھا کہ نبوت تو اسرائیلیوں ہی کا حق رہی ہے، یہ نعمت ایک اسمٰعیلی کے حصہ میں کیوں کر جا سکتی ہے۔؟

۴۸ؔ (اور حساب کا جو انجام منکرین و معاندین کے حق میں ہونے والا ہے، بالکل ظاہر ہے)

بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ۔ یعنی نفسانفسی اور ضدم ضدا۔ آپس میں بھی اور دینِ حق سے بھی۔

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ۔ یعنی ان پر دینِ حق کی تبلیغ پوری طرح ہو چکی اور دینِ برحق کی حقانیت و صداقت کے دلائلِ واضح انھیں پہنچ چکے۔

۴۹ؔ (خواہ مخواہ از راہِ عناد اور پوری تبلیغ کے بعد بھی۔)

اشارہ اہلِ کتاب کی جانب عموماً ہے اور نصرانیوں کی جانب خصوصاً۔

حَآجُّوْكَ۔ یہاں کٹ حجتی کے معنی میں ہے، نہ کہ کسی استدلالِ صحیح کے مفہوم میں۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا

اور آپ اہلِ کتاب سے اور اُمّیوں سے دریافت کیجئے کہ آیا تم اسلام لاتے ہو ۵۱ سو اگر وہ اسلام لے آئے تو

فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ

بس راہِ ہدایت پا گئے ۵۲ اور اگر وہ روگردان رہے تو آپ کے ذمہ صرف تبلیغ ہی ہے ۵۳

اے جادلوك بالاقاويل المزورة والمغالطات (قرطبی)

۵۰ (اب تم مانو یا نہ مانو، تمھیں اختیار ہے۔)

اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ۔ پورا رُخ اللہ کی جانب کرلینا مترادف ہے اسلام کے یعنی میرا اپنا سب کچھ اللہ کے سپرد کرچکا
وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ میں ہوسکتا ہے کہ و عطف کا نہ ہو بلکہ مع کا مُرادف ہو۔

ویجوز ان یکون الواو بمعنی مع (کشاف)

اہلِ طریق نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جب وضوحِ حق کی پوری کوشش ہولے اور مخاطب پھر بھی قبول نہ کرے تو اب بحث و مباحثہ، قیل و قال ترک کردینا چاہیئے۔

۵۱ ءَاَسْلَمْتُمْ کے ایک صاف و صریح معنی تو وہی ہیں جو متنِ ترجمہ میں درج ہو چکے ہیں لیکن بعض اہلِ علم نے صیغۂ امر میں معنی "اسلام لاؤ" کے بھی لئے ہیں اور نحویین نے کہا ہے کہ الف استفہام کبھی امر کے بھی معنی دیتا ہے، بلکہ امر کے معنی میں زور اور زیادہ پیدا کردیتا ہے۔

المقصود منه الامر (کبیر) قال النحويون انما جاء الامر فی صورة الاستفهام (کبیر) لفظه استفهام و معناه امر (معالم)

استفہام کی صورت میں بھی استفسار محض مراد نہیں بلکہ مقصود تہدید ہے جیسے اردو محاورہ میں بھی تہدید کے موقع پر کہتے ہیں "کیوں جی سُنتے ہو کہ نہیں"۔

قال الزجاج ءاسلمتم تهديد وهٰذا احسن لان المعنى ءاسلمتم ام لا۔ (قرطبی)

وَالْاُمِّيّٖنَ۔ مطلقاً ان پڑھ۔

الامی هو الذی لایکتب ولایقرء من کتاب (راغب)

یا وہ لوگ جو کتبِ آسمانی سے لاعلم و نابلد ہیں۔

اے الذین لاکتاب لهم (ابن جریر) الذین لا کتاب لهم (قرطبی) الذین لم یاتهم الانبیاء بالکتب (مجاز)

مُراد بہر صورت مُشرکینِ مکہ ہیں۔

وهم مشرکو العرب (قرطبی) انما وصف مشرکی العرب بانهم اُمّیون (کبیر)

۵۲ (اور اب ان کی نجات و مغفرت میں بھی شبہ نہ رہا)

جاہلیت کے نظریۂ حیات (IDEOLOGY) میں انقلاب و اصلاح ہوجانے ہی کا نام اسلام ہے۔ پس جس کسی نے اسلام کے نظریۂ حیات کو قبول کرلیا وہ کسی بھی نسل، قوم، رنگ، وطن کا ہو، بہرحال اب اس کا تعلق کائنات و خالقِ کائنات کے ساتھ صحیح نوعیت کا قائم ہوگیا

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھتے رہنے والا ہے ۵۴ بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ

پیغمبروں کو ناحق ہلاک کر ڈالتے ہیں ۵۵ اور ان لوگوں کو جو عدل کا حکم دیتے ہیں انہیں مار

بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

ڈالتے ہیں۔ پس آپ انہیں عذاب دردناک کی خوشخبری سنا دیجئے ۵۶ یہی وہ لوگ ہیں

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۵۷

**۵۳** (اور آپ پر نتائج کی ذمہ داری ذرا بھی نہیں)
رسول اللہ صلعم کو تسکین دی گئی ہے کہ اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو آپ ملول و فکرمند نہ ہوں، آپ کا کام تو صرف تبلیغ ہے۔

**۵۴** (وہ خود ہی سب کے اعمال و احوال دیکھ کر مناسب جزا و سزا دے گا۔)
اللہ اور رسول کے باہمی فرق کو قرآن مجید کتنی بار واضح کرتا چلا گیا ہے۔

**۵۵** يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ. کسی کتابِ الٰہی سے یا اس کے کسی جزو سے انکار یہ سب کفر بآیات اللہ کی صورتیں ہیں۔
بِغَيْرِ حَقٍّ. یعنی خود قاتلوں کے بھی آئین، قانون و ضابطہ کے خلاف، ورنہ قتلِ انبیاء فی الحقیقت اور عند اللہ تو ہمیشہ ہی ناحق رہے گا۔ یہود کے قتلِ انبیاء و قتلِ ناحق پر حاشیہ پارۂ اول رکوع ۷ میں گزر چکا۔

**۵۶** (آخرت میں)
يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ. یعنی لوگوں کو اخلاق و معاملات میں عدل کی ہدایتیں کرتے رہتے ہیں، ظاہر ہے کہ مراد انبیاء اور ان کے نائبین ہیں۔
يَقْتُلُوْنَ. یہ سب اشارے یہود کی حق دشمنی سے متعلق اور ان کی تاریخ کی جانب ہیں۔ عہد عتیق کے متعدد صحیفوں میں یہود کی حق بیزاری کی تصریح موجود ہے۔ مثلاً "وہ اس کا کینہ رکھتے ہیں جو دروازہ پر سرزنش کرتا ہے، اور وہ اس سے نفرت رکھتے ہیں جو حق بات کہتا ہے" (عموس ۵: ۱۰)
"قتل" یہاں اپنے اصلی اور لغوی معنی یعنی مطلق ہلاک کر ڈالنے کے مفہوم میں ہے، فقہی اصطلاح یعنی "دھاردار آلہ سے ہلاک کرنے" کے معنی میں نہیں۔
عَذَابٍ اَلِيْمٍ. ایسے مجرموں اور خطاکاروں پر دنیوی لعنت حضرت داؤد نبی کی کتاب میں مفصل موجود ہے:۔
"وہ جلد ہی گھاس کے مانند کاٹ ڈالے جائیں گے، اور ہرے سبزے کی طرح مرجھا جائیں گے، اور شریر نہ ہوگا تو غور کرے اس کا مکان ڈھونڈے گا، اور وہ نہ ہوگا، ان کی تلوار انہی کے دلوں میں بیٹھے گی، ان کی کمانیں ٹوٹ جائیں گی" الخ (زبور ۳۷: ۱-۳۰)
آیت سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ سابق امتوں میں امر بالمعروف واجب تھا اور یہ فرض انبیاء اور ان کے نائبین انجام

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَٰبِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتابِ الٰہی سے حصہ دیا گیا تھا، انھیں کتاب اللہ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ

كِتَٰبِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم

وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے پھر ان میں سے ایک فریق بے رُخی کرتا ہوا منھ پھیر لیتا

مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا

ہے ۵۸ف یہ اس سبب سے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز (چند) گنے ہوئے

مَّعْدُودَٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

دنوں کے ۵۹ف اور جو کچھ یہ تراشتے رہتے ہیں اس نے انھیں ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے ۶۰ف

دیتے تھے۔

وتدل ھٰذہ الاٰیۃ علی ان الامر بالمعروف والنھی عن المنکر کان واجبًا فی الامم المتقدمۃ وھو فائدۃ النبوۃ (قرطبی)

۵۷ف (سزا کے وقت کہ انھیں عذاب سے چھڑا لے، یا اُس میں کچھ تخفیف ہی کرا دے۔)

اَعْمَالُھُمْ۔ منکرین کے وہ اعمال جن پر انھیں دنیا میں فخر و ناز تھا، اور جنھیں وہ اپنے حسنات وفضائل میں شمار کرتے تھے

۵۸ف حق و داعیانِ حق سے یہ سلسل انحراف و اعراض تاریخ بنی اسرائیل کا کوئی نیا یا انوکھا واقعہ نہیں، اُن کے مقدس نوشتے اور صحیفے ان شکایات سے بھرے پڑے ہیں۔ مثلاً:۔

"تم کاہے کو مجھ سے محبت کروگے، تم سب مجھ سے پھر گئے ہو" (یرمیاہ ۔ ۲ : ۲۸ و ۲۹ ۔ نیز ہوسیع ۱۰ : ۲۷) مفصل حاشئے پارۂ اول رکوع ۶، ۷ کے ذیل میں گزر چکے۔

اَلَمْ تَرَ۔ خطاب یہاں رسول اللہ صلعم سے ہے۔

الم تر یا محمد۔ (ابن جریر)

اَلَّذِیْنَ ۔۔۔۔ مِنَ الْکِتٰبِ۔ ذکر وہی یہود کا چل رہا ہے۔

اَلْکِتٰبِ۔ یہاں بطور اسم جنس استعمال ہوا ہے یعنی کتابِ الٰہی اپنے عمومی و کلّی مفہوم میں کہ اسی کا ایک جزو توریت ہے۔

کِتٰبِ اللّٰہِ۔ اسی عمومی و کلّی کتاب کا دوسرا اور آخری جزو قرآن ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔

لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ۔ یعنی مذہبی اختلافات کے باب میں فیصلہ کردے۔

۵۹ف ذٰلِکَ۔ یعنی یہ سرکشی اور عدوان کی عادت اس سبب سے قائم ہے کہ یہ لوگ اپنے کافر ہونے ہی کے قائل نہیں۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ۔ یعنی وہ چالیس روز کی مدت جو بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی میں بسر کی تھی، آیت کا یہ جزو پارۂ اول میں بھی یہود کی زبان سے نقل ہو چکا ہے، اور وہیں اس پر مفصل حاشیہ بھی گزر چکا ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ

سو اس روز جس میں ذرا شک نہیں جب ہم انھیں اکٹھا کریں گے تو کیا حال ہوگا ۶۱ اور ہر شخص کو جو کچھ اس نے

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي

کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر (ذرا) ظلم نہ کیا جائے گا ۶۲ آپ کہہ دیجئے اے سارے ملکوں کے مالک!

الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫

تو جسے چاہے حکومت دے دے اور تو جس سے چاہے حکومت چھین لے ۶۳

یہود کا یہ ایک مستقل عقیدہ بن گیا تھا کہ ہم عذابِ آخرت سے اصلاً بالکل محفوظ ہیں، بجز اس قلیل مدت کے، جو ہمارے اسلاف نے گوسالہ پرستی کے شرک میں گزاری تھی۔

۶۰ (چنانچہ اپنی نجات کا یقین کئے ہوئے بیٹھے ہیں)

مَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ۔ عقائد کے باب میں کوئی بات بے دلیل عقلی یا نقلی کے اپنی طرف سے گڑھ لینا افتراء علی اللہ کی ایک صورت ہے۔ یہود کے پیشواؤں اور سرداروں نے اس طرح قسم قسم کے عقائد کا ایک طومار گڑھ رکھا تھا، اور ان ہی میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہود پر آتشِ دوزخ (بجز برائے نام مدت کے) حرام ہے، ان کے لئے ان کے بزرگوں کی نسبت و شفاعت کافی ہے اور ان کی نجات و مغفرت بلا ایمانِ صحیح و عملِ صحیح خود بخود محض نسلاً اسرائیلی ہونے کی بنا پر ہو جائے گی۔

۶۱ (ان بدبختوں اور شامت زدوں کا)

يَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ یعنی قیامت کے دن، اس طرزِ تسمیہ سے مقصود قیامت کا محض ذکر ہی کر دینا نہیں بلکہ اس کے وقوع کی قطعیت کو ذہن میں تازہ کر دینا ہے۔

فَكَيْفَ۔ اس طرزِ استفہام سے مقصود عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے۔

وهو استعظام لما اعد لهم وتهويل لهم (کشاف) استعظام لما يحيق بهم في الآخرة (بیضاوی)

برہان زرکشی میں ہے کہ "کیف" موقعِ توبیخ کے لئے بھی ہے۔

لِيَوْمٍ میں ل فی کے معنی میں ہے۔

واللام في قوله ليوم بمعنى في قاله الكسائي (قرطبی)

۶۲ (کہ کسی کو سزا بلا جرم یا زائد از جرم مل جائے یا کسی کی کوئی نیکی بغیر اجر کے چھوٹ جائے)

مَا كَسَبَتْ۔ جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے، خواہ وہ حسنات ہوں یا سیئات۔

۶۳ رسول ؐ کے واسطہ سے طریقِ دعا کی تعلیم امت کو دی جا رہی ہے۔

مٰلِكَ۔ الملک کا لفظ دعا کے شروع ہی میں لا کر یاد دلا دیا کہ مالکانہ تصرف کا حق و اختیار اسی کو حاصل ہے جس سے دعا کی جا رہی ہے۔

وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ

اور تو جسے چاہے عزت دے ۶۴ اور تو جسے چاہے ذلت دے ۶۵ تیرے ہی ہاتھ میں بھلائی ہے بے شک تو ہی

شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ؗ

ہر چیز پر قادر ہے ۶۶ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات میں دن کو داخل کرتا ہے۔

الْمُلْكِ ۔ ملک سے مراد سارا جہان ہے۔

قیل الدنیا والآخرۃ۔ (قرطبی۔ روح)

تُؤْتِی ..... وَتَنْزِعُ ۔ حکومت کی نعمت دینا یا اس نعمت کو واپس لے لینا تمام تر احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے اور نفس بادشاہت یا حکومت میں تقدس یا الوہیت ذرا سی بھی نہیں، اس میں رد آ گیا کثرت سے پھیلے ہوئے اس جاہلی عقیدہ کا، کہ بادشاہی خود ایک درجۂ الوہیت یا نیم الوہیت کا ہے اور کسی کا بادشاہ ہو جانا گویا خدا کے اوتار کے مرتبہ پر پہنچ جانا ہے، مصر میں فرعون کی پرستش ہوتی رہی، ہندوستان میں چندر بنسی اور سورج بنسی راجہ مہاراجہ خدائی اوتار سمجھے گئے، جاپان میں میکاڈو ابھی تک مظہرِ خدا کی حیثیت رکھتا رہا، یہ سب اسی عقیدۂ شاہ پرستی کے مظاہر ہیں، اسلام نے آ کر بتلایا کہ بادشاہی بھی ساری دوسری نعمتوں کی طرح ایک خدائی تصرف ہے، اور بادشاہ بھی بندگی کی ویسی ہی بے چارگی میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے دوسرے سارے بندے، یہ حقیقت ہمیشہ سے اپنی جگہ پر قائم ہے، ہمارے زمانے میں اس کا نظارہ پوری قوت و شدت کے ساتھ مسولینی (آمرِ اٹلی) و ہٹلر (آمرِ جرمنی) کے انجام سے کرا دیا گیا، دوسرے چھوٹے چھوٹے آمروں (ڈکٹیٹروں) کا انجام ان کے علاوہ

## ۶۴

(اپنی حکمتِ کاملہ کے مطابق)

اس مَنْ تَشَآءُ (جسے تو چاہے) کی وسعتِ اطلاق میں قومیں بھی آ گئیں، اور فرد بھی اور عزت کا سب سے بڑا ممکن مرتبہ یاد کر لیا جائے کہ نبوت ہے، اس طرح گویا اہلِ کتاب کو یہ بھی یاد دلا دیا کہ جس قوم کے جس فرد کو وہ چاہے مرتبۂ نبوت سے سرفراز کر دے، اس پر حسد بالکل بے معنی ہے۔

## ۶۵

(اس کے پاداشِ عمل میں)

مَنْ تَشَآءُ کا عموم اطلاق یہاں بھی فرد و قوم دونوں پر حاوی ہے، کوئی فرد تو مرتبۂ نبوت سے معزول ہوا نہیں ہے البتہ یہ نعمت قوموں سے سلب ہو سکتی ہے چنانچہ قوم اسرائیل صدیوں تک اس نعمت سے سرفراز رہنے کے بعد معزول کی گئی اور یہ نعمت اپنی انتہائی اور آخری شکل میں اسمٰعیلی نسل اور قوم کے ایک ممتاز فرد کے حصہ میں آئی۔

## ۶۶

(تو اہلِ کتاب اس پر حیرت کیوں کر رہے ہیں کہ نعمتِ نبوت سے عرب قوم کے ایک فرد کو سرفراز کیا جا رہا ہے)

الْخَیْرُ ۔ یعنی بھلائی ہر قسم کی اور ہر مرتبہ، درجہ کی۔

کائنات میں وجودِ ایجابی صرف خیر کا ہے اس لئے ذکر اسی کا کیا گیا اس کے مقابل کی چیز یعنی شر محض ایک سلبی حقیقت کا نام ہے یہاں جو بجائے بیدك الخیر والشر کے صرف بیدك الخیر کا ارشاد واقع ہے اس سے عارفین صوفیہ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ جس چیز میں بندہ کے ارادہ و اختیار کو دخل نہ ہو وہ محض خیر ہی ہے اسے ناگوار نہ جانے اور اسے اپنے حق میں عذاب و مصیبت نہ سمجھے

وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ

اور تو بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور تو جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور تو جسے چاہتا ہے

مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢٧﴾ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ

بے حساب رزق دیتا ہے ۶۷ؒ مومنوں کو نہ چاہیئے کہ مومنوں کے ہوتے ہوئے کافروں

اَوْلِيَآءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ج وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ

کو (اپنا) دوست بنائیں ۶۸ؒ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں کسی شمار میں

فِي شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ط

نہیں ۶۹ؒ مگر ہاں ایسی صورت میں کہ تم اُن سے کچھ اندیشہ (ضرر کا) رکھتے ہو

۶۷ؒ (غرض یہ کہ تقلبات و تصرفات کائنات کا ہر ہر جزئیہ تیری ہی مشیّت و قدرت کے تابع و محکوم ہے)

تُوْلِجُ الَّيْلَ. تُوْلِجُ النَّهَارَ. یہ سارے تصرفات و تقلبات بغیر کسی کی شرکت و اعانت کے محض ارادۂ الٰہی سے رات دن ہوتے رہتے ہیں، جاہلی قوموں نے لیل (رات) اور نہار (دن) دونوں کو دیوی دیوتاؤں کی حیثیت دے رکھی ہے آیت میں ضمناً ان خرافات کا بھی رد آگیا

تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ. اس کی ایک نمایاں مثال پرند کو انڈے سے نکالنا ہے۔

تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ. اس کی ایک نمایاں مثال پرند سے انڈے کی پیدائش ہے۔

تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ. سو ایسا قادرِ مطلق اگر ــــــ ضعیفوں، عاجزوں کو بڑی بڑی سلطنتوں کا بھی مالک بنادے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔

او رتقسیم رزق، عطائے دولت وغیرہ تکوینی انعامات کے سلسلہ میں مَن تشآء کی قید جو ہر جگہ لگی ہوئی ہے اس سے محققین نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ دولت، حکومت، امارت وغیرہ کی تقسیم محض مشیّتِ تکوینی کے مصالحِ کائناتی کے اعتبار سے ہوتی رہتی ہے اسے قُربِ الٰہی، اخلاقی افضلیت وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۸ؒ (کیا ظاہر میں اور کیا باطن میں)

جسے دوستی کا علاقہ کہتے ہیں، وہ ایک کیفیتِ قلب اور پھر عملی برتاوے کا نام ہے، مسلمانوں کو کافروں منکروں اللہ کے باغیوں کے ساتھ یہ تعلق قائم کرنے کی قطعی ممانعت ہے اور عقلاً بھی یہ ملی خودداری اور قومی تشخص کے بالکل منافی ہے۔

مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ. یعنی مومنین کے ہوتے ہوئے۔

بعض اہلِ حق نے یہیں سے تمسک کرکے اپنے مُریدوں، معتقدوں، شاگردوں کو منکروں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کردیا ہے

۶۹ؒ یعنی دشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی رکھنے والے کی دوستی اللہ کے ساتھ کسی درجہ میں بھی معتبر و مقبول نہیں

لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ. من اللہ سے مراد من دین اللہ یا من ولایۃ اللہ سمجھی گئی ہے۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

اور اللہ تم کو اپنے سے ڈراتا ہے ۱۵ اور اللہ ہی کی طرف آنا ہے ۱۶

ای من ولایتہ فی شیء (بیضاوی) ای من ولایتہ او من دینہ۔ (روح)

۱۰ (رفع ضرر کے لئے بہ قدر ضرورت ظاہری تعلقات دوستانہ کی اجازت ہے)

کافروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تین ہی ممکن صورتیں ہیں:۔

(۱) موالات یا دوستی (۲) مدارات یا ظاہری خوش خلقی وخاطرداری (۳) مواسات یا احسان ونفع رسانی۔

علمائے شریعت کی تحقیق ہے کہ شق اول یعنی موالات یا حقیقی دوستی تو کسی حال میں جائز نہیں، شق سوم بھی اختلافی نہیں، مواسات صرف اہل حرب کے ساتھ ناجائز ہے، باقی کے ساتھ جائز، رہی شق دوم، سو وہ تفصیل طلب ہے، مدارات تین حالتوں میں درست ہے ایک اپنے رفع ضرر کے لئے، دوسرے خود اس کافر کی مصلحت دینی ہو یعنی توقع ہدایت کے موقع پر، تیسرے اکرام ضیف کے طور پر یعنی کافر جب مہمان ہو اس وقت کے لئے، ان تین صورتوں کے سوا اپنے نفع یا حصول مال وجاہ کے لئے مدارات درست نہیں، اور جب اس سے ضرر دین کا اندیشہ ہو تو یہ اختلاط بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا۔

تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً۔ یہ بتا رہا ہے کہ آیت میں ذکر اندیشہ کا ہے محض توہم یا احتمال بعید اس کے لئے کافی نہیں۔ اور یہ جس ضرر کا خوف واندیشہ ہو، اسے بھی معتد بہ ہونا چاہیے۔

الا ان تخافوا من جھتھم امرا یجب اتقاءہ (کشاف۔ بیضاوی)

یہ بہ ظاہر عام ہے لیکن اہل سنت نے اذیت عظیم کی قید صاف لگا دی ہے۔

التقیۃ لا تحل الا مع خوف القتل او القطع او الایذاء العظیم (قرطبی) یعنی ان تخافوا تلف النفس او بعض الاعضاء وھذا ھو ظاھر ما یقتضیہ اللفظ وعلیہ الجمھور۔ (جصاص)

آیت میں ایک طرف رد ہے فرقۂ امامیہ کا جس نے تقیہ کے حدود بہت وسیع کرکے اسے اپنے مذہب کا ایک جزو بنا لیا ہے، اور دوسری طرف فرقۂ خوارج کا جس نے جواز تقیہ سے سرے سے انکار کر دیا ہے۔

وقد استدل بعضھم بالآیۃ علی جواز التقیۃ وھی ما یقال او یفعل مخالفا للحق لاجل توقی الضرر.... وقیل انھا خاصۃ بحال الضعف وقیل بل عامۃ وینقل عن الخوارج انھم منعوا التقیۃ فی الدین مطلقا وان اکرہ المومن وخاف القتل۔ (المنار)

عدل واعتدال کا مسلک افراط وتفریط دونوں سے یکساں الگ، اہل سنت کا ہے، صاحب روح المعانی نے اس ذیل میں ماشاء اللہ بہت خوب لکھا ہے۔

۱۵ (کہ حقیقۃً صاحب اقتدار وقابل عظمت صرف وہی ہے)

نفسہ۔ مراد یہ لی گئی ہے کہ اللہ اپنے عذاب سے تم کو ڈراتا ہے۔

المعنی یحذرکم اللہ عقابہ (قرطبی) ای عقاب نفسہ۔ (روح)

۱۶ (سو اس کے احکام کی ظاہری، باطنی ہر مخالفت سے باز رہو)

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِي

آپ کہہ دیجئے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے تم اُسے خواہ پوشیدہ رکھو یا ظاہر کرو اللہ اس کو جانتا ہے ۷۳ اور

السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اس (سب) کو جانتا ہے ۷۴ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے ۷۵ جس روز

تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۖ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ

ہر شخص اپنے ہر نیک عمل کو سامنے لایا ہوا پائے گا ۷۶ اور (اسی طرح) ہر برے کام کو بھی (اُس روز)

سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ

وہ تمنا کرے گا کہ کاش اُس شخص اور اُس دن کے درمیان مسافتِ بعید حائل ہوتی ۷۷ اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے ۷۸

خطاب عامۃ الناس سے ہے، رسول اللہ صلعم کے واسطہ سے۔

ہر معصیت سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ یہی مسئولیتِ آخرت کا استحضار ہے۔

۷۳ یعنی اس کا علم ہر طرح کامل ہے، جزئیات و کلیات سب پر حاوی، حاضر و غائب سب پر شامل ہے، اس کے ہاں ظاہر و مخفی دونوں یکساں ہیں۔ اس میں ردّ آ گیا یونان اور دوسری قوموں کے اُن جاہلی فلسفیوں کا جنھوں نے خدا کی صفتِ علم کو ناقص و محدود مانا ہے۔

۷۴ السموات والارض۔ کی تصریح صرف محاورۂ زبان کے مطابق ہے جو آسمان و زمین کو سارے موجودات کے مرادف سمجھتی ہے۔ مراد صفتِ علم کی کاملیت و جامعیت کا اثبات ہے، یہ مراد ہرگز نہیں کہ اگر کوئی مقام آسمان و زمین کے باہر ہے تو وہاں کا علم اللہ تعالیٰ کو نہیں۔

۷۵ (اور جب علم کے ساتھ اس کی قدرت بھی کامل ہے، تو وہی اس کا مستحق ہے کہ اسی کی سزا سے ڈرا جائے) مشرک قوموں کو اصلی ٹھوکر صفتِ علم کے ساتھ صفتِ قدرت میں بھی لگی ہے اسی لئے بار بار زور ان ہی صفات پر دیا گیا ہے۔

۷۶ (جزاءِ اعمال کے لئے)

یوم۔ یعنی قیامت کے دن۔

ماعملت... محضرا۔ یعنی دنیا میں جو کچھ بھی عمل کیا ہے اس کو نامۂ اعمال میں درج پائے گا، یا اُن اعمال کی جزا سے دوچار ہو گا۔

لدیھا مشاھدًا فی الصحف۔ وقیل تجد جزاء اعمالھا محضرًا (روح) تقدیرہ یوم تجد کل نفس جزاء ماعملت محضرًا (قرطبی) صحائف اعمالھا وجزاء اعمالھا۔ (بیضاوی)

بعض صوفیۂ عارفین نے یہ معنی کئے ہیں کہ انسان بجنسہٖ اس عمل کو کرتے ہوئے اپنے کو پائے گا۔

قیل ظاھرًا فی صورٍ (روح)

اکبر الٰہ آبادی مرحوم اردو کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ ہی حکیم و عارف بھی تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہر وقت ہم بولا کرتے ہیں کہ "وقت چلا گیا" وقت جاتا کہاں ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہیں جمع رہتا ہے قیامت کے دن حق تعالیٰ

ع۱۰ ۱۱

وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ

اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا شفقت کرنے والا ہے ۵۷۹ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو ۵۸۰ تو تم میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کرو ۵۸۱ اللہ تم کو چاہنے لگے گا ۵۸۲ اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے ۵۸۳

اسی "وقت" کو واپسی کا حکم دیں گے پس جب وقت واپس آئے گا تو مع اپنے مشمولات کے یعنی جو کچھ بھی وقت کے اندر ہوتا رہتا ہے اس سب کو لئے ہوئے آئے گا، اس لئے کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے سب اس روز بجنسہٖ دوبارہ واقع ہو رہے گا۔

۵۷۷ (کہ اعمالِ بد یا ان کی جزاء کا معاینہ نہ کرنا پڑتا)

یہ حسرت اُن لوں میں پیدا ہوگی جن کے پاس اعمال خیر و شر کا مجموعہ ہوگا، تو جس بدنصیب کے پاس شر ہی شر ہوگا، اس کی حسرت نصیبی کا کیا کہنا!

بَيْنَهَا۔ میں ضمیر نفس کی طرف اور بینہ یوم کی طرف ہے۔

والضمیر فی بینه للیوم حین تجد کل نفس خیرها وشرها حاضرین۔ (کشاف)

۵۷۸ (کہ قابلِ عظمت و صاحبِ اقتدار ذات صرف اسی کی ہے۔)

نفسهٗ۔ سے مراد عقاب نفسہ سمجھی گئی ہے اور آیت کا یہ ٹکڑا ابھی اوپر گزر چکا ہے۔

۵۷۹ (چنانچہ یہ بار بار کی تنبیہ و تہدید بھی اسی شفقت و رافت ہی کا نتیجہ ہے کہ کاش بندے اب بھی سنبھلیں اور راہِ ہلاکت پر چلنے سے باز رہیں)

شریف طبیعتوں کو نافرمانی سے باز رکھنے کے لئے صرف اِس حقیقت کا استحضار کافی ہے کہ ان کا مالک و خالق کس درجہ رحیم و شفیق ہے!

۵۸۰ (جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے اور اپنے اسی زعم کی بنا پر توقع رکھتے ہو کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا)

خطاب رسول ؐ کے واسطہ سے عامّۃ الناس سے ہے۔

تُحِبُّوْنَ۔ محبت کے جو معنی عربی میں ہیں اُس میں ارادہ کا شمول ضروری ہے۔

قال ابن عرفة المحبة عند العرب ارادة الشئ علی قصد له۔ (قرطبی)

۵۸۱ (کہ میں جامع کمالاتِ انسانی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور میری زندگی ساری کائناتِ انسانی کے لئے ہر شعبہ میں معیار اور نمونہ کا کام دے گی۔)

محبتِ الٰہی کے دعوے کی جانچ کے لئے کیا اچھا معیار بتا دیا گیا، یعنی جتنا اتباعِ رسول ؐ ہوگا اسی قدر اس کی محبتِ الٰہی مسلّم و معتبر ہوگی، اسی معیار پر آج بڑے بڑے مدعیانِ مشیخت و مدعیانِ محبتِ الٰہی کے دعووں کو جانچئے تو بہتوں کی قلعی کھل کر رہے۔

۵۸۲ (کہ اس کے آگے اور کوئی درجۂ کمال نہیں)

یہ طریقہ جو پچھلوں کو بتایا گیا یہی آواز اگلوں کے کان میں ڈال دی گئی ہے، حضرت مسیحؑ کے جو الفاظ اناجیل

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو[۵۸۴] اس پر بھی اگر وہ روگردان رہیں تو اللہ کافروں سے (ذرا) محبت نہیں رکھتا[۵۸۵]

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

بے شک اللہ نے آدمؑ اور نوحؑ اور خاندانِ ابراہیمؑ اور خاندانِ عمرانؑ کو سارے دنیا جہان پر برگزیدہ کیا ہے[۵۸۶]

مروجہ میں نقل ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں:۔ "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔" (یوحنا ۱۴: ۱۵و۱۶)

یہ "مددگار" کا لفظ اردو انجیلوں کے متن میں ہے، حاشیہ پر "وکیل" اور "شفیع" دونوں لفظ درج ہیں گویا اصل یونانی لفظ کے یہ سب معنی ہوسکتے ہیں۔ انگریزی انجیل میں لفظ "کمفارٹر" (COMFORTER) آیا ہے جس کے معنی تسلی دہندہ کے ہیں تو چوتھا مفہوم اس لفظ کا یہ ہوا، بہرحال وہ سب کا مددگار اور وکیل اور شفیع اور تسلی دہندہ، اس پیشگوئی کرنے والے مسیحؑ کے پانچ صدی بعد آیا، اور ایک ابدی اور غیر منسوخ شریعت لے کر ابد تک ساتھ رہنے ہی کے لئے آیا، اور اسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لئے خاتم النبیینؐ کہلایا۔

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اللہ کی بڑی محبت بندہ کے ساتھ یہی ہے کہ اسے مغفرت سے سرفراز فرمائے۔
محبة الله للعباد انعامه عليه بالغفران۔ (قرطبی)

۵۸۳ غَفُوْرٌ۔ اس کی شانِ غفر کا تقاضا ہے کہ تمہارے معاصی و ذنوب کی مغفرت کردے گا۔

رَّحِيْمٌ۔ اس کی شانِ رحمت کا تقاضا ہے کہ وہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔ وہ تمہاری تقصیروں کو نظرانداز کردے گا اور تمہارے مراتبِ قرب میں ذرا کمی نہیں آنے دے گا۔

۵۸۴ خطاب پیمبرؐ کے واسطہ سے عامۂ ناس سے ہے۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ۔ اللہ کی اطاعت اصالۃً اور بہ طور مقصود کے ہے۔

وَالرَّسُوْلَ۔ رسول کی اطاعت تبعاً و نیابتہً ہے بطور آلہ و واسطہ کے یعنی اس حیثیت سے کہ پیمبر اللہ ہی کا پیغام لے کر آتا ہے۔

۵۸۵ (اور یہ لوگ کافر ہی تو ہیں جو اطاعتِ رسول سے منہ موڑے ہوئے ہیں خواہ محبتِ الٰہی کے کیسے ہی دعوے ان کی زبانوں پر ہوں)

فَاِنْ تَوَلَّوْا یعنی ایسے صاف و صریح حکم کے ماننے سے انکار کریں۔

۵۸۶ (چنانچہ وہ خود اور اُن کے گھرانے والے توحید کے علمبردار رہے ہیں)

اِصْطَفٰى۔ یہ برگزیدگی توحید کے علمبرداری کی حیثیت سے رہی ہے۔

اٰدَمَ۔ حاشیے پارۂ ۱ رکوع ۴ کے ذیل میں گزر چکے۔

نُوْحٌ۔ حضرت نوحؑ بن لامخ (یا لمک) عراق میں ایک نہایت قدیم پیمبر گزرے ہیں، حسبِ روایتِ توریت حضرتِ آدمؑ سے دسویں پشت میں تھے، عمر ۹۵۰ سال پائی، زمانہ غالباً ۲۹۴۶ء تا ۱۹۹۶ء ق م۔

اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ۔ آلِ ابراہیم ہی کے تحت میں اسمٰعیلؑ اور خاندانِ اسمٰعیلؑ بھی آگئے، ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ دونوں پر حاشیے پارۂ ۱ رکوع ۱۵ میں گزر چکے ہیں۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ

ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ (خوب) سننے والا ہے (خوب) جاننے والا ہے ۵۸۷ (اور وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی

عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ

بیوی نے عرض کیا کہ ۵۸۸ اے میرے پروردگار! میں نے تیری نذر مانی ہے اس (بچہ) کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ (وہ) آزاد رکھا جائیگا ۵۸۹ سو تو (اسے) مجھ سے قبول کر

اٰلِ عِمْرَانَ عمران کے نام کی تاریخی شخصیتیں دو گزری ہیں، ایک حضرت موسیٰؑ کے والد ماجد عمران بن یصہر، دوسرے اُن کے کئی صدی بعد حضرت مریمؑ کے والد ماجد اور حضرت مسیحؑ کے جدّ مادری عمران بن ماثان، یہاں مُراد دونوں سے ہو سکتی ہے لیکن بہ لحاظِ سیاق ترجیح عمرانِ ثانی کو ہے، حسنؒ اور وہبؒ تابعین سے یہی قول منقول ہے۔

والمراد بعمران هٰذا هو والد مريم بنت عمران (ابن کثیر) والمراد بآل عمران عيسىٰ عليه السلام وامه مريم بنت عمران قاله الحسن ووهب (روح) فقد اختلفوا فيه فمنهم من قال المراد عمران والد موسىٰ وهارون ومنهم من قال بل المراد عمران بن ماثان (کبیر) والظاهر فى عمران انه ابو مريم (بحر)

لیکن مفسرین کا ایک گروہ اِدھر بھی گیا ہے کہ حضرت مریمؑ کے والد عمران کا تو ذکر ابھی آگے آئے گا، اور اس خاص آیت میں ذکر حضرت موسیٰؑ کے والد عمران کا ہے۔

ورد ذكر عمران فى هٰذه الاٰيات مرتين فبعضهم يقول انهما واحد وهو ابو مريم ويستدل على ذلك بورودهما فى سياقٍ واحد واكثرهم يقول ان الاوّل ابو موسىٰ والثانى ابو مريم وبينهما نحو الف وثمان مئة سنة تقريبًا۔ (المنار)

۵۸۷ (سو اُس کے علم و خبر کے احاطہ سے کون چیز باہر رہ سکتی ہے؟)

سَمِيْعٌ۔ سننے والا تمام زبان سے نکلے ہوئے الفاظ و کلمات کا۔

عَلِيْمٌ۔ جاننے والا تمام دل کے اندر کے جذبات و خیالات کا۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ۔ حضرت آدمؑ کی اولاد میں حضرت نوحؑ ہیں اور حضرت ابراہیمؑ ان دونوں کی اولاد میں، اور حضرت عمران ان تینوں کی اولاد میں۔

۵۸۸ (بہ طور مناجات)

اِمْرَاَةُ عِمْرَانَ۔ یہ حضرت مریمؑ کی والدہ اور حضرت عیسیٰؑ کی جدّۂ مادری تھیں، مسیحی نوشتوں میں اُن کا نام حنّہ (HENNAH) آیا ہے ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ شام وغیرہ کے مسیحی کلیسا، کلیسائے حنّہ کے نام سے مشہور ہیں اور ان کی قبر دمشق میں ہے۔

ودير حنّة بالشام معروف وثم دير اٰخر يعرف بدير حنه (بحر) وقبر حنة جدة عيسىٰ بظاهر دمشق۔ (بحر)

۵۸۹ (ہر قسم کے دُنیوی کاروبار سے اور تیری ہی خدمت و عبادت کے لئے وقف رہے گا۔)

حضرت مریمؑ کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر نیاز مانی تھی اس کی بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگانِ کلیسا نے جب کاٹ چھانٹ کر کے "مستند" اناجیل اربعہ مرتب کرنا شروع کیں تو ان مضامین اور بیانات کو اُن سے خارج کر دیا، اور اس کی شہادت آج انھیں کے اکابر دے رہے ہیں، ملاحظہ ہو کیتھولک ڈکشنری ص ۴۸ نیز ہسٹنگز کی ڈکشنری آف دی بائبل جلد ۳ ص ۲۸۸

اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتۡهَا قَالَتۡ رَبِّ اِنِّىۡ

تو تو خوب سننے والا ہے خوب جاننے والا ہے ۹۰ پھر جب اس نے (مریم) کو جنا تو بولی کہ اے میرے پروردگار میں نے

وَضَعۡتُهَاۤ اُنۡثٰىؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا وَضَعَتۡؕ وَلَيۡسَ الذَّكَرُ كَالۡاُنۡثٰىۚ

تو لڑکی جنی ۹۱ اور اللہ تو خوب جانتا تھا کہ اس نے کیا جنا ہے اور لڑکا (اس) لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا تھا ۹۲

وَاِنِّىۡ سَمَّيۡتُهَا مَرۡيَمَ وَاِنِّىۡۤ اُعِيۡذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ ﴿۳۶﴾

اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں ۹۳

نَذَرْتُ۔ سادہ اردو میں ”میں نے منت مانی ہے“۔

لَكَ۔ میں لام تعلیل ہے یعنی مخصوص تیری خدمت و عبادت کے لئے۔

اے لعبادتك (قرطبی) لخدمة بيتك (روح)

مُحَرَّرًا۔ اے حقيقا خالصا للہ تعالیٰ خادما للكنيسة حبيسا عليها۔ (قرطبی)

ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کی خدمت اور مجاوری کے لئے اولاد ذکور کو نذر کر دینے کا دستور یہود کے ہاں جاری تھا۔

۹۰ (سننے والا میری دعاؤں کا، جاننے والا میرے اخلاص کا)

اللہ اللہ! اللہ والوں کی طرح اللہ والیاں بھی اپنی دعاؤں میں کس درجہ باادب ہوتی ہیں!

۹۱ (اور لڑکی کس طرح تیرے معبد میں مجاور بن سکے گی؟)

حضرت مریمؑ کی والدہ ماجدہ بہ صد حسرت و یاس بارگاہ الٰہی میں مناجات کر رہی تھیں کہ تمنا تو لڑکے کی اٹھی تھی کہ اُسے ہیکل کی نذر کر دیا جاتا، اور وہ اس کی جاروب کشی اور مجاوری میں عمر بسر کر دیتا، اولاد تو ہوئی مگر لڑکی نکلی! لڑکی سے کیسے یہ نذر پوری ہو سکتی ہے؟ — اسرائیلی قانون و معاشرہ میں لڑکی کے لئے اس خدمت کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔

والدۂ حضرت مریمؑ کا یہ قول بہ طور اخبار نہ تھا، بطور انشاء تھا، اس میں کسی واقعہ کی خبر دہی نہ تھی اظہار رنج و ملال تھا۔

خبرا لايقصد به الاخبار بل التحسّر والتحزن والاعتذار فهو بمعنى الانشاء (المنار)

۹۲ یہ پورا فقرہ والدۂ مریمؑ کی تقریر کا حصہ نہیں بطور ایک مستقل جملۂ معترضہ کے براہ راست ارشاد باری تعالیٰ ہے، مفہوم یہ ہے کہ اس لڑکی کی عظمت و منزلت سے تو خدائے تعالیٰ ہی خوب واقف تھا، ماں غریب کیا سمجھ سکتی تھی۔

قال مكى هو اعلام من اللہ تعالیٰ لنا على طريق التثبيت۔ (قرطبی)

الذَّكَرُ۔ یعنی جو لڑکا والدۂ مریمؑ کے حسب خواہش ہوتا۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ۔ یعنی اس مولود سے جو جو عظمتیں وابستہ تھیں اُن کی خبر ماں غریب کو کیا ہو سکتی تھی، ان سے تو بس اللہ ہی خوب واقف تھا۔

اے اللہ اعلم بالشیٔ الذی وضعته وما علق به من عزائم الامور ودقائق الاسرار وواضح الآيات وهى

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَّأَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ

پھر اس کے پروردگار نے اس کو بوجہ احسن قبول کر لیا ۹۴ اور اس کو اچھا نشو ونما دیا ۹۵ اور اس کا سرپرست زکریا کو بنا دیا ۹۶

غافلة عن ذٰلك كله۔ (روح)

**۹۳** (کہ خدمتِ دین سے کسی منزل میں بھی منحرف نہ ہونے پائیں)

والدۂ مریمؑ کی توحید پرستی مناجات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے۔ اللہ والوں اور اللہ والیوں کو اپنی اولاد کے لئے فکر اُن کے دینی و اخلاقی تحفظ کی ہوتی ہے۔

وَذُرِّيَّتَهَا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ والدۂ مریمؑ اللہ سے امید لگائے ہوئے تھیں کہ لڑکی کا سلسلۂ نسل چلے گا۔

مریم۔ سُریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی "بلند" کے ہیں۔

علم امرأة سريانية معناها مُرتفعة۔ (اقرب)

اسرائیلیوں میں عورتوں کا ایک چلا ہوا نام تھا۔

**۹۴** یعنی والدۂ مریمؑ کی نذر کو اس لڑکی کی شکل میں بھی اللہ نے قبول کر لیا، اور یہ خدمتِ ہیکل کی ساری تاریخ میں ایک نئی بات تھی، مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت مریمؑ تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کر لی گئی تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر خوب خوش ہوتے تھے، ملاحظہ ہو ہیسٹنگز (HASTINGS) کی "ڈکشنری آف دی بائبل" جلد ۳ صفحہ ۲۸۸ نیز بج (BUDGE) کی "حکایات خاتون مریمؑ" (LEGENDS OF LADY MARY)

**۹۵** یہ اچھا نشو ونما ممکن ہے کہ قوائے جسمانی کے اعتبار سے ہو اور ممکن ہے قوائے روحانی و اخلاقی کے اعتبار سے ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں حیثیت سے ہو۔

يعني سوّى خلقها من غير زيادة ولا نقصان (قرطبي) اي ربّاها الرب تربية حسنة في عبادة وطاعة لربها قاله ابن عباس (روح) مجاز عن تربيتها بما يصلحها في جميع احوالها (بيضاوي) عبارة عن حسن النشأة والجودة في خَلق وخُلق فانشأها على الطاعة والعبادة (بحر)

عجیب لطیفہ ہے کہ حضرت مریمؑ کے شرف و عظمت کی یہ ساری تفصیلات انجیل میں نہیں، قرآن مجید ہی میں مل رہی ہیں، انجیل اس قسم کے جزئیات سے خاموش ہے۔

**۹۶** زَكَرِيَّا۔ اللہ کے پیغمبر تھے، مسیحی صحیفے ان کے تذکرہ سے گویا بیگانہ ہیں، چار مقدس و مستند انجیلوں میں لے دے کر صرف ایک جگہ ان کا ذکر انجیل لوقا میں آتا ہے، وہ بھی پیغمبر کی حیثیت سے نہیں صرف ایک بزرگ و راستباز کاہن کی حیثیت سے "یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن کا تھا"۔ (لوقا۔ ۱:۵)

یہ حضرت زکریاؑ رشتہ میں حضرت مریمؑ کی والدہ کے بہنوئی تھے، یعنی آپ کی والدہ کی بہن کے شوہر، حضرت مریمؑ کے والد ماجد جناب عمران کی وفات آپ کے بچپن ہی میں ہو گئی تھی اور ان کی وفات کے بعد ہیکل کے خادموں (یا یہود کی اصطلاح میں کاہنوں) کی سرداری حضرت زکریاؑ کے حصہ میں آئی تھی، آپ ایک تو مریمؑ کے عزیز قریب اور پھر خدامِ ہیکل کے سردار، حضرت مریمؑ کی تربیت کا واسطہ و ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو بنایا، آپ حضرت یحییٰؑ کے والد ماجد تھے جو حضرت عیسیٰؑ کی

## كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ

جب کبھی زکریا ان کے پاس حجرہ میں آتے تو ان کے پاس کوئی چیز کھانے (پینے) کی پاتے ۹۷

کے ہم سن تھے، اسی سے آپ کے زمانہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

كُلَّمَا کے لفظ میں اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ یہ سب خدائی انتظامات تھے زکریا کی حیثیت محض واسطہ یا ذریعہ کی تھی۔

۹۷ (اور اس پر وہ قدرۃً حیرت کرتے)

المحراب۔ محراب حجرہ کو کہتے ہیں، جہاں کوئی سب سے الگ تھلگ ہوکر بیٹھے، محرابِ مسجد کو بھی محراب اسی لئے کہتے ہیں کہ اس دَر میں امام نماز سب سے الگ اور تنہا کھڑا ہوتا ہے۔

المحراب الغرفة (قاموس) قال الازهری وسمی المحراب محرابًا لانفراد الامام فيه وبُعدِهٖ من الناس (لسان)

كُلَّمَا۔ ہیکلِ سلیمانی کے خادموں کے رہنے اور عبادت کرنے کے لئے ہیکل کے ادھر اُدھر زاویئے، حجرے یا خلوت خانے بنے ہوئے تھے، انہی میں سے ایک حجرہ حضرت مریم کا تھا، حضرت زکریا ایک تو یوں بھی سردارِ خدام تھے، اور اس حیثیت سے ہر خادم وخادمہ کی نگرانی رکھنا آپ کے فرائض میں داخل تھا، اور پھر حضرت مریم کے تو آپ عزیز قریب بزرگ سرپرست بھی تھے، ان کے حجرہ میں قدرۃً آپ کی آمد ورفت رہا کرتی، قرآنِ حکیم کے ایک ذرا سے لفظ كُلَّمَا نے اس سارے مفہوم یعنی حضرت زکریا کی کثرتِ آمد ورفت اور غیر متوقع وجودِ رزق سب کی طرف اشارہ کردیا۔

وكلما تقتضی التكرار فيدل علی كثرة تعهده وتفقده لاحوالها ودلت الاٰية علی وجود الرزق عندها كل وقت يدخل عليها۔ (بحر)

رِزْقًا۔ کھانے پینے کا سامان، مثلاً تر وتازہ میوے بعض قدیم "جدت پسندوں" نے یہاں رزق کے معنی فیض اور علم وحکمت کے لئے ہیں، لیکن محققین نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کے حدود سے تجاوز کرجانا، اور باطنیہ کی زبان اختیار کرنا ہے۔

ابعد من فسر الرزق هنا بانه "فيض" (بحر) هذا شبيه بتفسير الباطنية (بحر)

رِزْقًا کی تنوین تعظیم وتفخیم کے لئے ہے یعنی وہ رزق کوئی ندرت کا پہلو رکھتا تھا۔

التنكير فی قوله رزقًا يدل علی تعظيم حال ذالك الرزق كانه قيل رزقًا ای رزق غريب عجيب (كبير)

مریم اپنی ساری عظمت وجلالت کے باوجود بہرحال پیمبر نہ تھیں اسی بناپر محققینِ اہلِ سنت نے آیت کو اثباتِ کراماتِ اولیاء کے باب میں نص قرار دیا ہے، اور علمائے فرقۂ شیعہ بھی اس باب میں اُن سے متحد ہیں، اختلاف صرف معتزلہ کو ہے۔

واستدل بالاٰية علی جواز الكرامة للاولياء لان مريم لانبوة لها وهذا هو الذی ذهب اليه اهل السنة والشيعة وخالف فی ذالك المعتزلة (روح) وهو دليل جواز الكرامة للاولياء (بيضاوی) احتج اصحابنا علی صحة القول بكرامة الاولياء بهذه الاٰية۔ (كبير)

لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس "رزق" میں کرامت اور خرقِ عادت کا کوئی پہلو نہ تھا۔

دليل فی الاٰية علی ان الرزق كان من خوارق العادات واسناد المؤمنين الامر الی الله فی مثل هذا المقام معهود فی القديم والحديث (المنار)

قَالَ يٰمَرۡيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتۡ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

(ایک بار) بولے کہ مریمؑ یہ کہاں سے تجھے مل جاتی ہیں؟ ۹۸ وہ بولیں یہ اللہ کی طرف سے آجاتی ہیں ۹۹ بے شک اللہ

يَرۡزُقُ مَنۡ يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ

جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دے دیتا ہے ۱۰۰ (بس) وہیں زکریاؑ اپنے پروردگار سے دعا کرنے لگے ۱۰۱

اور عجائب وخوارق رزق کے باب میں کوئی بات نہ اللہ ورسول سے منقول ہے اور نہ تاریخ ہی سے ثابت ہے۔

واللہ لم ینقل ذلک ولا قالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا ھو مما یعرف بالرای ولم یثبتہ تاریخ یسند بہ (المنار)

**۹۸** یعنی لاتا تو میں ہی لاتا، میرے سوا اور کون اس سامان کا پہنچانے والا ہو سکتا ہے؟ سوال اظہار حیرت کے لئے ہے۔

استغرب زکریا وجود الرزق عندھا وھو لم یکن الآتی بہ فسأل علی سبیل التعجب من وصول الرزق الیھا۔ (بحر)

آیت سے اس مسئلہ کا بھی اثبات ہو گیا کہ پیمبر تک کے لئے بھی اسباب ظاہر تک محدود ومقصور رہنا بالکل جائز ہے۔

**۹۹** (براہ راست اور بلا کسی واسطۂ ظاہری کے)

اہل اللہ کے ساتھ اس قسم کے خوارق کا ظہور کوئی انوکھی بات نہیں، ہوتے ہی رہتے ہیں، اور بالفرض اس مومنہ قانتہ کو یہ سامان کسی ظاہری واسطہ ہی سے پہنچ رہے تھے، جب بھی اس کی نظر تو اس واسطہ پر نہیں براہ راست اللہ تعالیٰ پر تھی۔

**۱۰۰** (خواہ واسطوں سے ہو، خواہ بلا واسطہ اور بلا استحقاق)

اللہ جس طرح اپنی مشیت تکوینی کے ہر جزئیہ میں آزاد ہے، اسی طرح تقسیم رزق کے باب میں بھی ہے اس میں رد آ گیا اُن مشرک قوموں کا جنھوں نے خوشحالی اور بدحالی کو لازمی نتیجہ پہلے جنم کے اعمال کا قرار دیا ہے۔

**۱۰۱** (قدرت الٰہی کے تازہ کرشموں سے متاثر ہو کر)

هُنَا کا دوسرا ترجمہ "وہیں" کے علاوہ "معًا" بھی ہو سکتا ہے، هُنَا ظرفیت کے لئے ہے، اور اس میں ظرف مکان اور ظرف زمان دونوں شامل ہیں، یعنی اُسی جگہ بھی اور اُسی وقت بھی۔

اسم یشار بہ للمکان القریب وقد یشار بہ للزمان اتساعًا۔ (جمل)

گو اصلی مفہوم ظرف مکان ہی کا ہے۔

یستعمل للزمان والمکان واصلہ للمکان (قرطبی) اسم اشارۃ للمکان القریب (اقرب) ای فی ذلک المکان اوفی ذلک الوقت فقد یستعار ھنا وثم وحیث للزمان (کشاف) ھنا ظرف مکان وجوزان یراد بھا الزمان مجازًا (روح) والاستعمال الفصیح فیھا انھا للمکان ای فی ذلک المکان الذی خاطبتہ فیہ مریم۔ (المنار)

هُنَالِكَ دَعَا۔ آیت سے استدلال مکان مبارک میں دعا کی مقبولیت پر کیا گیا ہے، علیٰ ہذا، وقت مبارک میں بھی دعا کی مقبولیت پر حضرت زکریاؑ کو جب یہ مشاہدہ ہو گیا کہ یہ مقام خرق عادت کے صدور کا ہے تو آپ بھی وہیں دُعا کرنے لگے۔

فی قولہ ھنالک دعا دلالۃ علی ان یتوخی العبد بدعائہ الامکنۃ المبارکۃ والازمنۃ المشرفۃ (بحر)

قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

عرض کی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے کوئی پاکیزہ اولاد عطا کر ۱۰۲ بے شک تو دعا کا (بڑا) سننے والا ہے ۱۰۳

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

پس انہیں فرشتوں نے آواز دی اس حال میں کہ وہ حجرہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے ۱۰۴

۱۰۲ (جو میرے سلسلۂ روحانی کو آگے چلا سکے)

هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ۔ مجھے بھی اپنی عنایت سے اُسی طرح دے جیسے کہ والدۂ مریمؑ کو مریمؑ عنایت ہو چکی ہیں۔ حضرت زکریاؑ کا سن زیادہ ہو چکا تھا اور بیوی صاحبہ بھی عقیم سمجھ لی گئی تھیں۔ ایک خارقِ عادت واقعہ کو دیکھ کر آپ کا ذہن معاً اس طرف منتقل ہوا کہ جو خدا اس پر قادر ہے کہ بلا اسبابِ ظاہری یہاں پر تر و تازہ میوے پہنچا دے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس سن میں مجھے نعمتِ اولاد سے سرفراز کر دے۔

مِنْ لَّدُنْكَ ۔ یہ خبر صاف ظاہر کر رہی ہے کہ دعا کرنے والے کی نظر اس عالمِ اسباب میں بھی اسباب سے کہیں زیادہ مُسبّب الاسباب پر ہے۔

ذُرِّيَّةً ۔ اولاد کی خواہش ایک امرِ طبعی ہے اور زہد کیا معنی کمالِ زہد کے بھی منافی نہیں۔ قرآن مجید نے بار بار پیمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں نقل کر کے بتا دیا کہ وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دور ہیں جنھوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے۔ ہماری شریعتِ حقہ میں اولاد کی خواہش تو عین سُنّتِ انبیاء و صدیقین بتائی گئی ہے اور صحیح بخاری میں تو مستقل عنوانات طلبِ ولد کے فضائل میں ہیں۔

دلت هٰذه الاٰية علٰى طلب الولد وهي سُنّة المرسلين والصدّيقين (قرطبی) وقد ترجم البخاری علٰى هٰذا باب طلب الولد والاخبار فی هٰذا المعنی کثیر ماتحث علٰى طلب الولد وتندب اليه (قرطبی)

ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۔ طیبہ کے اضافہ نے اسے صاف کر دیا کہ اہل اللہ کی نظر آخرت پر بہرحال رہتی ہے، کوئی مضائقہ اولاد کی مطلق خواہش میں بھی نہ تھا لیکن حضرت زکریاؑ اپنی دعائیں محض اولاد ہی نہیں چاہتے، اولادِ صالح چاہتے ہیں، جو ان کے بعد تبلیغِ توحید کے مشن کو جاری رکھے، اللہ والوں کی نگاہ میں اخلاقی و روحانی فضائل بہرصورت مقدّم رہتے ہیں۔

مُرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ ایسے اُمور کے لئے دعا کرنا جو اسبابِ قریبہ سے ہٹ کر ہوں، آدابِ دعا کے منافی نہیں۔

انجیل میں ہے کہ "زکریا نام کا ایک کاہن تھا، اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی، اور اس کا نام الیشبع تھا، اور اُن کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشبع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے۔" (لوقا۔ ۱: ۵۔۷)

۱۰۳ (اور بڑا قبول کرنے والا ہے)

حق تعالیٰ کی اس صفت پر بار بار زور دینا مادی اور نیچری عقیدہ کے لوگوں کے رد میں ہے جو واقعات کو تمام تر اسبابِ ظاہری ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور ارادۂ حق تعالیٰ کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں رکھتے۔

۱۰۴ دعا معاً قبول ہو گئی، اور آپ کو حالتِ نماز ہی میں فرزند کی بشارت مل گئی۔

الْمَلٰٓئِكَةُ ۔ صیغۂ جمع اسمِ جنس کا بھی کام دیتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ آواز دینے والا فرشتہ ایک ہی ہو، عربی میں محاورۂ عام

مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۳۹)

جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہوں گے اور مقتدا ہوں گے اور بڑے ضبطِ نفس کرنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے ف۱۰۵

ہے فلان یرکب الخیل (فلاں شخص گھوڑوں پر سوار ہوتا ہے) حالانکہ وہاں مراد گھوڑے کی صرف جنس ہوتی ہے۔

وجائز فی العربیۃ ان یخبر عن لفظ الجمع (قرطبی) انّما قیل الملائکۃ علی قولھم فلان یرکب الخیل (کشاف) قال الزجاج ای اتاہ النداء من ھذا الجنس الّذین ھم الملائکۃ (ابوسعود) قالوا ان العرب تخبر الواحد بلفظ الجمع ترید بہ الجنس (المنار) ذالک جائز فی کلام العرب بان تخبر عن الواحد بمذھب الجمع (ابن جریر)

یَحْیٰی۔ عہد جدید کے صحیفوں میں ان کے نام کا املا یُوحنّا آتا ہے، انجیل میں اس موقع پر ہے:۔

”فرشتہ نے اس سے کہا اے زکریا خوف نہ کر کیونکہ تیری دعا سُنی گئی اور تیری بیوی الیشبع تیرے لئے بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنّا رکھنا اور تجھے خوشی و خرّمی ہوگی“ (لوقا۔ ۱: ۱۴)

حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی اور آپ سے سِن میں حسب روایت انجیل صرف چھ مہینے بڑے تھے، ۳۰ء میں والی شام ہیرود کے حکم سے شہید کر دیئے گئے۔

ف۱۰۵ كَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ۔ جس طرح روح القدس لقب حضرت جبرئیلؑ کا ہے کلمۃ اللہ سے مراد حضرت مسیحؑ ہیں۔

یعنی عیسیٰ فی قول اکثر المفسرین (قرطبی) وھو اختیار الجمھور (کبیر) قالہ ابن عباس ومجاھد والحسن وقتادۃ والسدّی وغیرھم (بحر)

مُصَدِّقًا۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی تصدیق کرنے والا۔

مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ کی اصل حیثیت مسیحؑ کے پیش رَو اور نقیب ہی کی تھی۔

بعض اہل تفسیر نے مراد کتاب اللہ بھی لی ہے۔

قال ابو عبید معنی بکلمۃ من اللہ بکتاب من اللہ (قرطبی)

سَيِّدًا۔ یعنی دین کے باب میں مقتداء و پیشوا، مسیحی تو خیر آپ کے تقدّس کے قائل ہی ہیں، یہود جو آپ کے منکر اور آپ کے سخت دشمن ہیں، وہ بھی آپ کی مرجعیت و مقبولیت سے انکار نہیں کرتے۔

حَصُوْرًا۔ یعنی لذات و شہوات پر اُسے قابو حاصل ہوگا، اور وہ نہایت درجہ محتاط و متقی ہوگا، انجیل میں آپ کے زہد و تبتّل کا ذکر تصریح کے ساتھ ہے مثلاً:۔ ”وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پئے گا اور اپنی ماں کے پیٹ ہی سے روح القدس سے بھر جائے گا۔“ (لوقا۔ ۱: ۱۶) ”اور بہت سے بنی اسرائیل کو خداوند کی طرف جو اُن کا خدا ہے پھیرے گا، اور وہ انبیاء کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا کہ والدوں کے دل اولاد کی طرف اور نافرمانوں کو راستبازوں کی دانائی پر چلنے کی طرف پھیرے اور خداوند کے لئے ایک مستعد قوم تیار کرے“ (لوقا۔ ۱: ۱۷، ۱۸) ”اور وہ لڑکا بڑھتا اور روح میں قوت پاتا گیا، اور اسرائیل پر ظاہر ہونے کے دن تک جنگلوں میں رہا۔“ (لوقا۔ ۱: ۸)

نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ حضرت یحییٰؑ کی نبوت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں ہے، جو نعوذ باللہ آپ کو ایک بناہوا انسان سمجھتے تھے، اور آپ کی صالحیت کا اثبات یہود کے مقابلہ میں تو ہونا ہی ہے لیکن خود مسیحیوں کے مقابلہ میں بھی ہے

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ

(زکریاؑ) بولے اے میرے پروردگار! میرے بیٹا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے بڑھاپا آپہنچا ہے اور میری بیوی بانجھ ہیں ف۶

قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ

ارشاد ہوا اسی طرح اللہ کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے ف۷ (زکریاؑ) بولے اے میرے پروردگار! میرے لئے کوئی

اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ

نشانی مقرر کر دیجئے ف۸ ارشاد ہوا کہ تمہارے لئے نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے بات نہ کر سکو گے تین دن تک بجز اشارہ کے ف۹

جن کے نزدیک عصمت و تقویٰ لازمۂ نبوت نہیں، صالحیت تو نبوت سے پست اور ہلکی چیز ہے لیکن یہ صرف اسلامی عقیدہ ہے اہل کتاب کا یہ عقیدہ نہیں، ان کے ہاں نبی غیر صالح بھی ہو سکتا ہے۔

ف۶ انجیل میں اس موقع پر ہے:۔ "زکریا نے فرشتہ سے کہا میں اس بات کو کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بھی عمر رسیدہ ہے" (لوقا۔ ۱: ۱۸) "اُن کے اولاد نہ تھی کیونکہ الیشع بانجھ تھی اور دونوں عمر رسیدہ تھے"۔ (لوقا۔ ۱: ۷)

اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ۔ یعنی اس بشارت کے تحقق کی متعین صورت آخر کیا ہوگی؟ آیا میری جوانی عود کر آئے گی یا اور کوئی خاص انقلاب ہوگا؟ وعدۂ الٰہی سے بے اعتباری کا یہاں کوئی سوال نہیں۔ حضرت تو محض متعین صورت جاننا چاہتے تھے، لیکن بالفرض عدمِ اطمینان مراد لی جائے جب بھی خلافِ اسبابِ عادیہ کسی شئے کی خبرِ وقوع پر حیرت بالکل طبعی ہے اور پیمبر بھی امورِ طبعی میں بالکل بشر ہی ہوتے ہیں۔ غیر طبعی اور خارقِ عادت پر حیرت جس طرح ہر بشر کے لئے جائز ہے، پیمبر کے لئے بھی ہے۔

ف۷ (کہ اس حقیقت کا مراقبہ ہر استبعاد کے رفع کر دینے کے لئے کافی ہے)

استحضار قدرتِ الٰہی کے لئے پیمبر کو ایک اشارہ کافی ہوگیا۔

كَذٰلِكَ۔ عودِ شباب وغیرہ کچھ بھی نہ ہوگا بس اسی موجودہ حالت کے ساتھ ولادتِ فرزند ہوگی۔

ف۸ (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ گھر میں حمل ہے اور زمانۂ ولادت قریب ہے اور میں ادائے شکر کا سامان کر سکوں)

اٰيَةً۔ ہر ایسی چیز ہے جس سے قدرتِ الٰہی، نصرتِ غیبی خاص طور پر ظاہر ہو رہی ہو۔ ایسی چیز کو قدرۃً معمولِ عام سے کسی قدر ہٹا ہوا ہونا چاہیئے اور اس نشان میں اعجازی رنگ ضرور ہونا چاہیئے۔

ف۹ (اور تسبیح و عبادتِ الٰہی اس حال میں بھی جاری رہے گی۔)

اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ۔ انجیل کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی معصیت حضرت زکریا سے سرزد ہوگئی تھی، اور اس کی سزا میں اُن کی قوتِ گویائی چند روز کے لئے سلب کر لی گئی تھی" اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا، اس لئے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو اُن سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اُس نے مقدس میں رؤیا دیکھی ہے، اور وہ اُن سے اشارے کرتا تھا، اور وہ گونگا ہی رہا"۔ (لوقا۔ ۱: ۲۰۔۲۲)

قرآن مجید جو تمام قدیم صحیفوں پر مُہیمن یا نگران و نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْإِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۴ ۱۱ ۱۲

اور اپنے پروردگار کو بہ کثرت یاد کرتے رہو اور تسبیح کرتے رہو دن ڈھلے بھی اور صبح بھی ۱۰۹

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ بے شک اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا ہے ۱۱۰

جاتا ہے یہاں بھی اس نے حسبِ معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریاؑ سے یہ بہتان رفع کر کے صحیح صورتِ حال یہ بیان کی کر ایک علامتِ غیبی و اعجازی کی تو انھوں نے خود ہی درخواست کی تھی اور اُن کی اس درخواست پر یہ علامتِ غیبی عطا ہوئی تھی کہ آپ تسبیح و ذکرِ الٰہی تو اپنی جگہ پر بدستور کرتے رہیں گے البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت آپ کو تین دن کے لئے حاصل نہ رہے گی۔

تکلم الناس میں الناس ہی تو فقرہ کی جان ہے کہ لوگوں سے بات چیت پر قدرت نہ رہے گی، ورنہ ذکرِ الٰہی کے لئے تو زبان چلتی رہے گی۔

انما خص تکلیم الناس لیعلم انہ یحبس لسانہ عن القدرۃ علی تکلیمھم خاصۃ مع ابقاء قدرتہ علی التکلم بذکر اللہ (کشاف۔ مدارک)

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ۔ تین دن اور تین راتیں، دن کہنے سے رات اس میں تبعاً شامل ہو گئی ہے، سکوتِ طویل خصوصاً صومِ سکوت کی حالت میں قدیم مذاہب و ادیان میں جزءِ عبادت رہ چکا ہے۔

رَمْزًا۔ رمز عام ہے اس میں سر کے اشارے بھی آگئے اور ہاتھوں کے بھی اور ان کے علاوہ بھی۔

الاشارۃ بید او راس او غیرھما۔ (کشاف)

انجیل میں اس مقام پر ہے:۔ "اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا" (لوقا۔ ۱: ۲۲)

فقہاء مفسرین نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ اشارہ بھی کلام کا قائم مقام ہے۔

فی ھٰذہ الاٰیۃ دلیل علی ان الاشارۃ تنزل منزلۃ الکلام وذالک موجود فی کثیر من السنۃ۔ (قرطبی)

۱۰۹ (دل و زبان سے)

وَاذْكُرْ۔ وَسَبِّحْ۔ یعنی ذکرِ الٰہی و تسبیح کا شغل دل میں بھی جاری رہے اور زبان سے بھی، یہ نہ ہو گا کہ آپ کی زبان بطور مرض یا عذابِ الٰہی کے مطلقاً بند ہو جائے اور آپ بالکل "گونگے" ہو جائیں (جیسا کہ غلط طور پر انجیل میں درج ہے) بلکہ ذکر و تسبیح میں آپ برابر لگے رہیں گے، البتہ لوگوں سے گفتگو پر قادر نہ رہیں گے اور یہی اس امر کی علامت ہو گی کہ حمل قرار پا گیا اور ظہورِ یحییٰؑ کا زمانہ قریب آ گیا۔

عَشِيّ۔ زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک کا سارا وقت اس میں آ گیا۔

العشی من حین ان تزول الشمس الی ان تغیب (کشاف)

اِبْكَار۔ طلوعِ فجر سے دن چڑھے تک کا وقت اس میں شامل ہے۔

الابکار من طلوع الفجر الی وقت الضحٰی۔ (کشاف)

محاورہ میں مرادِ صبح و شام کے اوقات کی تعیین و تخصیص ہی نہیں، بلکہ مطلق دوام بھی ہو سکتی ہے۔

۱۱۰ (بعض خصوصیات کے لحاظ سے)

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ۔ یہ قول خواہ بطور الہام ہو جس کا تعلق محض قلب و باطن سے ہے، خواہ بطور ندا، ہو جس کا تعلق سمع اور ظاہر سے ہے۔

وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ

اور پاک کردیا ہے اور آپ کو دنیا جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کرلیا ہے ۱۱۲ اے مریمؑ! اپنے پروردگار کی اطاعت

وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ

کرتی رہئے اور سجدہ کرتی رہئے اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہئے ۱۱۳ یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں ہم آپ کے

نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ

اوپر ان کی وحی کررہے ہیں ۱۱۴ اور آپ تو ان لوگوں کے پاس تھے نہیں اُس وقت جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے ۱۱۵ کہ ان میں سے کون مریمؑ کی سرپرستی کرے

مَلٰٓئِكَةُ کے صیغۂ جمع سے یہ لازم نہیں آتا کہ کہنے والے کئی کئی فرشتے ہوں، مَلٰٓئِكَةُ سے مراد جنس ملائکہ بھی ہو سکتی ہے۔

محققین نے کہا ہے کہ ملائکہ کا غیر انبیاءؑ کے ساتھ ہم کلام ہونا آیت سے ثابت ہے، البتہ ملائکہ کے لائے ہوئے پیام تبلیغ صرف انبیاءؑ کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اِصْطَفٰكِ۔ اس اصطفاء کا تعلق مریم علیہا السلام کے بچپن سے ہے یعنی اللہ نے تو شروع ہی سے آپ کو بزرگی دے رکھی ہے، آپ کی والدہ کی دعاؤں کو سُن کر آپ کو خلعتِ وجود بخشا گیا، پھر ہیکل کی خدمت کا کام لڑکوں اور مردوں کے لئے مخصوص تھا، آپ کو لڑکی ہونے کے باوجود اس کا موقع عنایت کیا گیا، پھر آپ کو آپ کے حجرہ میں غذائیں حسنِ اعجازی رنگ میں پہنچائی گئیں اُس نے زکریاؑ نبی تک کو متحیر کردیا، یہ سب شواہد آپ کی برگزیدگی ہی کے تو ہیں۔

طَهَّرَكِ۔ یعنی آپ کو گناہوں کی آلائش سے پاک صاف کردیا، آپ کو اخلاقی پاکیزگی کا ایک نمونہ بنادیا۔

اے نزّھکِ عن الاخلاق الذمیمۃ والطباع الردیۃ (روح) روی عن الحسن و ابن جبیر ان المراد طھرک بالایمان عن الکفر و بالطاعۃ عن المعصیۃ (روح) طھرک من الافعال الذمیمۃ والعادات القبیحۃ (کبیر) عن مجاھد عما یعتم النساء فی خلق وخُلق ودین۔ (بحر)

یہ خصوصیت کے ساتھ یہود کی رد میں ہے جو گندے الزامات حضرت مریمؑ پر لگائے ہوئے تھے اور آج تک لگاتے چلے آرہے ہیں۔

۱۱۲ اِصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ۔ پہلے اصطفاء کا تعلق مریمؑ کے بچپن سے تھا، یعنی پیدائش ہی ایسی ہوئی، اس اصطفاء کا تعلق اُن کے بلوغ کے بعد سے ہے، یہ دوسری برگزیدگی خاص خاص حیثیات سے تھی، مثلاً اس صفت میں کہ مرد کے توسط کے بغیر مسِّ ملکی سے انھیں ماں بنادیا گیا، انجیل میں بھی فضیلتِ مریمؑ کا ذکر ہے، لیکن قرآن مجید سے کہیں ہلکے لفظوں میں:۔

"اس کنواری کا نام مریم تھا اور فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے خداوند تیرے ساتھ ہے" (لوقا ۱: ۲۷، ۲۸)

۱۱۳ آیتِ ماقبل اگر یہود کے رد میں تھی جنھوں نے مریمؑ کی ذات کو اتہامات کا ہدف بنا رکھا تھا تو یہ آیت یہود و نصاریٰ دونوں کے رد میں ہے، یہود کو تو یہ بتایا گیا کہ آپؑ بڑی عبادت گزار و طاعت شعار خاتون تھیں اور نصرانیوں کو یہ جتلا دیا گیا کہ مریمؑ نہ (نعوذ باللہ) خدا کی ماں تھیں، نہ کسی قسم کی دیوی کہ اُن کی پرستش کی جائے یا انھیں کسی درجہ میں بھی شریکِ عبادت کیا جائے، بلکہ اُن کی ساری بزرگی و برگزیدگی تو بس یہ تھی کہ وہ اپنے مالک و مولیٰ کی مخلص پرستار، فرمانبردار اور نہایت درجہ

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾ إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ

اور نہ آپ ان کے پاس اُس وقت تھے جب وہ باہم اختلاف کر رہے تھے ۱۱۶ (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا کہ

إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

اے مریمؑ! اللہ آپ کو خوش خبری دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی ان کا نام (ولقب) مسیح عیسیٰؑ ابن مریمؑ ہوگا ۱۱۷

عبادت گزار و طاعت شعار تھیں ــــ آیت سے مقصود حضرت مریمؑ کے کمالِ عبدیت کا اظہار ہے "سجدہ" اور "رکوع" کے الفاظ سے فقۂ اسلامی کے اصطلاحی سجود و رکوع لازم نہیں آتے، مطلق عبادت مراد ہے۔

**۱۱۴** (اے پیغمبر!)

یعنی یہ واقعات وہ ہیں جو آپ سے کئی سو سال قبل اور وہ بھی ایک دوسرے ملک میں پیش آئے تھے اور اب دنیا سے ان کی صحیح تاریخ تک مٹ چکی ہے اور ان کے علمِ واقعی کا کوئی ذریعہ بھی اب بجز وحیِ الٰہی کے باقی نہیں آپ کو بالکل ٹھیک ٹھیک وحی کے ذریعہ سے القاء کئے جا رہے ہیں، اور یہ بجائے خود ایک دلیل آپ کی صداقت کی ہے۔

**۱۱۵** (شام کے دریائے یردن میں تفاؤل کے لئے)

إِذْ يُلْقُونَ ۔ اس فعل کے فاعل کون تھے؟ یروشلم کے ہیکلِ مقدس کے خُدّام اور کاہن (بہ اصطلاحِ یہود) أَقْلَامَهُمْ ہیکلِ سلیمانی کی خدمت و نگہداشت کے لئے خادموں کی ایک بڑی جماعت رہا کرتی تھی جیسے کہ بڑی مسجدوں کی خدمت کے لئے جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں، مؤذنوں وغیرہ کا پورا عملہ رہتا ہے حضرت مریمؑ کے والد حضرت عمران اپنے زمانہ میں ان خادمانِ حرم کے سردار تھے، اُن کی وفات پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب مریمؑ کا سرپرست کون ہو، رشتہ ان خادموں میں سب سے قریب حضرت زکریاؑ کا تھا کہ آپ مریمؑ کے خالو تھے طے یہ پایا کہ سوال کا حل فال کے ذریعہ سے کیا جائے، فال اشارۂ غیبی کی قائم مقام تھی، اور اس کا طریقہ یہ رائج تھا کہ تیر کے قلم جو توریت کے لکھنے کے ہوتے تھے، ان پر توریت شریف ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انھیں دریائے یردن میں ڈال دیا جاتا تھا، اور قلم عموماً دریا ہی کے رُخ بہنے لگتے، لیکن بعض قلم مخالف رُخ کو بہتے اور یہی مخالف بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھی جاتی، جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی سمجھی جاتی، گویا غیب سے ڈگری اُس کے حق میں ہو گئی، یہی صورت یہاں ہوئی اور قرعہ حضرت زکریاؑ کے نام پر پڑا۔

**۱۱۶** (مریمؑ کی سرپرستی کے باب میں)

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ ۔ خطاب رسول اللہ صلعم سے ہے، یعنی جب مریمؑ کی کفالت و سرپرستی کا قضیہ طے ہو رہا تھا تو آپ خود وہاں موجود نہ تھے اور نہ کوئی معتبر و چشم دید شہادت ہی آپ تک پہنچی، پھر جو آپ اتنی صحیح اور سچی خبریں اپنی زبان سے ادا کر رہے ہیں، اُن کا ذریعہ بجز وحیِ الٰہی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟

**۱۱۷** الْمَلٰٓئِكَةُ کے صیغۂ جمع پر حاشئے دو بار ابھی اوپر گزر چکے۔

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ ۔ كلمة الله پر حاشیہ ابھی چند آیتیں قبل گزر چکا ہے، بشارت یہاں مریمؑ کو بیٹے کی مل رہی ہے وہ بیٹا جسے بن باپ کے ہونے کی بنا پر کلمۃ اللہ کہا گیا ہے حضرت مریمؑ اس وقت تک بعد کی رسم ورواج کے لحاظ سے نا کتخدا اور کنواری تھیں البتہ آپ کی

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿۴۵﴾

دنیا اور آخرت (دونوں) میں معزز اور مقرّبوں میں سے ؁۱۱۸

منگنی آپ ہی کے کفو وقبیلہ آلِ داؤد کے ایک نوجوان یوسف نامی سے ہو چکی تھی جن کے ہاں کاروبار لکڑی کا ہوتا تھا انجیل کا بیان ہے: "جبریل فرشتہ خدا کی طرف سے گلیل کے ایک شہر میں جس کا نام ناصرہ تھا ایک کنواری کے پاس بھیجا گیا جس کی منگنی داؤد کے گھرانے کے ایک مرد یوسف نام سے ہوئی تھی، اور اُس کنواری کا نام مریم تھا" (لوقا۔ ۱: ۲۶، ۲۷) "یسوع مسیح کی پیدائش اس طرح ہوئی کہ جب آپ کی ماں مریم کی منگنی یوسف کے ساتھ ہو گئی تو ان کے اکٹھے ہونے سے پہلے وہ روح القدس کی قدرت سے حاملہ پائی گئی" (متی ۱: ۱۸)

رسمِ منگنی کی جو اہمیت یہود کے ہاں تھی اس کے لحاظ سے ہمیں اپنے ہاں کی اصطلاح و زبان میں کہنا چاہیے کہ آپ کا عقد ہو گیا تھا، مگر رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی، گویا خلوت کی اجازت ابھی عرفاً نہیں ہوئی تھی۔

اِسْمُهُ۔ اسم کی وسعتِ مفہوم وجامعیت پر حاشیہ پارۂ اول میں عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کے تحت میں گزر چکا ہے، اسم مسمّٰی کے تعارف کے لئے ہوتا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے تعارف کے لئے یہ پوری عبارت ضروری تھی۔ المسیح عیسی بن مریم۔

اَلْمَسِيحُ۔ لفظ مسیح کے اشتقاق میں اختلاف ہے لیکن خواہ یہ لفظ عربی الاصل ہو خواہ عبرانی کے کسی لفظ کا مُعرّب بہر صورت اپنے معنی کے لحاظ سے اردو کے "مبارک" کا مرادف ہے۔

الممسوح بالدُّھن وبالبرکۃ (اقرب)

روایتوں میں یہ جو آتا ہے کہ دجّال کی داہنی آنکھ ممسوح ہو گئی، اور حضرت عیسیٰؑ کی بائیں آنکھ، تو اس سے مراد یہ ہے کہ دجّال نیکی کی قوتوں سے محروم ہو گا، اور حضرت عیسیٰؑ سے بدی کی صفات فنا ہو چکی ہوں گی۔

یعنی بانّہ الدّجال قد مسحت عنہ القوۃ المحمودۃ من العلم والعقل والحلم والاخلاق الجمیلۃ وانّ عیسیٰ مسحت عنہ القوۃ الذمیمۃ من الجھل والشرہ والحرص وسائر الاخلاق الذمیمۃ (راغب)

عیسیٰ۔ انجیل کے تلفّظ اور املا میں "یسوع" اصلاً عبرانی یا سُریانی زبان کا لفظ ہے۔

اسمٌ عبرانیٌ او سُریانیٌ وقیل ھو مقلوب یسوع۔ (اقرب)

؁۱۱۸ (اللہ تعالیٰ کے)

یہودیت اور مسیحیت دونوں کے رد ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

ابن مریم۔ کہہ کر قرآن مجید نے یہ حقیقت بیان کردی کہ عیسیٰ علیہ السلام خود تو بشر تھے ہی، فرزند بھی کسی دیوی دیوتا، کسی مافوق البشر کے نہ تھے، محض عورت ذات کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

اِبْنُ مَرْيَمَ۔ سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ دنیا کے عام قاعدہ کے خلاف، عیسیٰ علیہ السلام کا انتساب بجائے باپ کے ماں کی جانب رہے گا، اور اس سے روشنی آپؑ کی خارقِ عادت طریقِ ولادت پر بھی پڑ گئی۔

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ یہود کے رد میں ہے کہ جس کے حق میں ہر قسم کی توہین افترا روا رکھتے ہو وہ صاحبِ عزت و اکرام ہیں۔ یہود کی قدیم کتابوں میں کوئی دقیقہ حضرت مسیحؑ کی توہین و تحقیر کا اٹھا نہیں رہا ہے، یہ قرآن ہی کی برکت و اعجاز ہے کہ اس کے نزول کے بعد سے رفتہ رفتہ اب خود یہود کے لہجہ کی تلخی نرمی میں تبدیل ہوتی جارہی ہے اور تالمود کے الزامات دہراتے ہوئے،

وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں بھی اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوں گے ۱۱۹

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ

وہ بولیں اے میرے پروردگار میرے لڑکا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے ۱۲۰

یہود کو شرم آنے لگی ہے آخرت کے اعزاز کا مشاہدہ تو خیر جب ہوگا، ہوگا، دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ روئے زمین کے ۴۰-۵۰ کروڑ مسلمان آج انھیں اللہ کا پیغمبر حق مان رہے ہیں، اُن کا نام بغیر "علیہ السلام" کے نہیں لیتے اور کروڑوں کی تعداد میں عیسائی ہیں جو انھیں رسول کے مرتبہ سے بھی بلند تر سمجھ رہے ہیں، یہ عقیدہ گو باطل اور احمقانہ ہے لیکن بہرحال آپ کی تعظیم و احترام ہی کا نتیجہ ہے۔

مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ قرآن مجید کا یہ کمالِ اعجاز ہے کہ اس کے ایک ہی لفظ سے پورا پورا مضمون ادا ہو جاتا ہے، یہاں اس لفظ سے ایک طرف تو مسیحیت کے رد میں آپ کا اصل مقام بتا دیا، یعنی خدا کے مُقرّب، نہ کہ خود خدا، دوسری طرف یہودیت کے رد میں آپ کی مقبولیت کی شہادت دے دی، تیسری طرف من المقرّبین کی ترکیب سے یہ ظاہر کر دیا کہ اس مقبولیت میں وہ منفرد نہیں، دوسرے بندے بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں اور مسیح با ایں عظمت و اجلال بہرحال عبدیت سے مافوق کوئی مرتبۂ یکتائی نہیں رکھتے۔

۱۱۹ (نہ کہ معاذ اللہ ساحر یا شعبدہ باز یا بد اخلاق جیسا کہ یہود نے افتراء کر رکھا ہے)

مِنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ لیکن با ایں عظمت و اجلال بہرحال دوسرے ہی بندگانِ صالح کی طرح ہوں گے، نہ کہ ان سے مافوق کچھ اور جیسا کہ مسیحیوں نے اپنے دل سے ٹھہرا لیا ہے۔

يُكَلِّمُ النَّاسَ۔ اس سے اشارہ نکلتا ہے آپ کے جوشِ تبلیغ کی جانب لوگوں سے آپ کی گفتگو قصہ کہانی کی نہیں یقیناً توحید و تصحیحِ عقائد ہی پر ہوگی، انجیلوں سے بھی جتنی شہادتیں ملتی ہیں سب سے تائید آپ کے جوشِ تبلیغ ہی کی ہوتی ہے۔

فِي الْمَهْدِ۔ یعنی بالکل بچپن سے یا اُس سن سے جو گہوارہ میں لیٹے رہنے کا ہوتا ہے۔

اے طفلاً (کشاف) حال کونہ طفلاً (بیضاوی)

اتنی کم سنی سے گفتگو پر یہ قدرت اعجازی رنگ میں تھی، انجیلی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بارہ سال کے سن میں تبلیغ کرنے لگے تھے، اور اچھے اچھے دانا آپ کی گفتگو سن کر دنگ رہ جاتے تھے (لوقا۔ ۲: ۴۲، ۴۶، ۴۷)

كَهْلًا سے مراد پختہ عمر سے ہے، یعنی جوانی اور بڑھاپے کا درمیانی زمانہ، اس کا اطلاق ۳۰ یا ۳۴ سے اوپر ۵۰ سال کے سن تک ہوتا ہے۔

الکھل بین حال الغلومۃ وحال الشیخوخۃ (قرطبی) الکھل مابین الشاب والشیخ (روح)

حضرت مسیح کے بچپن اور پھر پختہ عمری کے ذکر سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ ہر انسان کی طرح آپ کا نشوونما بھی تدریجاً ہوتا رہا، اور یہ نشوونما خود ایک مستقل دلیل ردِّ اُلوہیت میں ہے۔

۱۲۰ (بہ طریق مواصلت)

حسب بیانِ انجیل حضرت مریم کی رخصتی ابھی نہیں ہوئی تھی، اور رخصتی کے قبل نامزد شوہر سے خلوت یہودی قانون میں بالکل ممنوع تھی۔

قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ

ارشاد ہوا ایسے ہی اللہ پیدا کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے ۱۲۱؎ جب وہ کسی بات کو پورا کرنا چاہتا ہے تو بس اس سے کہتا ہے کہ

كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ

ہوجا سو وہ ہوجاتی ہے ۱۲۲؎ اور (اللہ) اُسے کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل سکھا دے گا ۱۲۳؎

وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ

اور وہ پیغمبر ہوگا بنی اسرائیل کے لئے ۱۲۴؎

قَالَتْ رَبِّ. انجیل میں اس مقام پر ہے کہ "مریم نے فرشتہ سے کہا" (لوقا۔ ۱: ۳۴)

قرآن مجید نے اپنے حسبِ دستور اس موقع پر بھی انجیل کے بیان کی تصحیح کرکے یہ بتادیا کہ مریمؑ کی مخاطبت اب فرشتے سے نہیں براہ راست حق تعالےٰ سے تھی، اور ہر صاحبِ نظر پر واضح ہے کہ اس سے مریمؑ کا مرتبۂ معرفت و ایمان کتنا بڑھ جاتا ہے۔

اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ. فرشتے کی زبان سے وہ پوری تقریر سُن کر اب حضرت مریمؑ اپنے مالک و مولیٰ سے یہ عرض کر رہی تھیں، آپ کا یہ سوال ظاہر ہے کہ حیرت اور واقعہ کی غرابت کی بنا پر تھا نہ کہ شک و انکار کی بنا پر، فرشتے یا فرشتوں سے دو بدو ہوجانے اور ان کی گفتگو سن لینے کے بعد انکار کا تو اب کوئی محل رہا ہی نہیں تھا، استبعاد البتہ باقی تھا جو عین لازمۂ بشریت تھا۔

فالمس كناية ظاهرة والاستفهام على حقيقة فى وجه ومعناه هل يكون ذٰلك بزواج يطرأ أم بمحض القدرة وفى وجه اٰخر للتعجب من قدرة الله والاستعظام لشانه. (المنار)

انجیل نے اس موقع پر جو تفصیلات بیان کی ہیں، وہ درج ذیل ہیں:۔

"فرشتہ نے اس کے پاس اندر آکر کہا، سلام تجھ کو جس پر فضل ہوا ہے، خداوند تیرے ساتھ ہے، وہ اس کلام سے بہت گھبرا گئی، اور سوچنے لگی کہ یہ کیسا کلام ہے، فرشتہ نے اس سے کہا اے مریم خوف نہ کر کیونکہ خدا کی طرف سے تجھ پر فضل ہوا ہے اور دیکھ تو حاملہ ہوگی، اور بیٹا جنے گی، اس کا نام یسوعؑ ہوگا وہ بزرگ ہوگا۔۔۔۔ مریمؑ نے فرشتہ سے کہا، یہ کیونکر ہوگا جس حال میں کہ میں مرد کو نہیں جانتی، اور فرشتہ نے جواب میں اس سے کہا کہ روح القدس تجھ پر نازل ہوگا، اور خدا تعالےٰ کی قدرت تجھ پر سایہ ڈالے گی" (لوقا۔ ۱: ۲۸، ۳۴)

**۱۲۱؎** رفعِ استبعاد کے لئے حضرتِ مریمؑ کو یہاں یاد دلایا جارہا ہے کہ نظر مسبّب الاسباب پر رکھنی چاہئے کہ وہی فاعلِ حقیقی ہے نہ کہ اسبابِ طبعی و ظاہری پر کہ ان کی حیثیت محض واسطہ اور ذریعہ کی ہے۔

كَذٰلِكِ۔ یعنی مسِّ بشر کے بغیر ہی۔

يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ. ابھی چند ہی آیتیں قبل ذکر زکریا علیہ السلام اور بڑھاپے میں اُن کی اولاد کا آچکا ہے وہاں اس موقع کے لئے جو آیت تھی اس کے الفاظ تھے كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔ وہاں يَفْعَلُ اور یہاں يَخْلُقُ کا استعمال محض اتفاقی نہیں مفسرِ محقق ابوحیان غرناطی نے خوب لکھا ہے کہ وہاں تو ولادت عام سُنّتِ الٰہی کے مطابق یعنی مرد و زن کے اتصال سے تھی، اگرچہ وہ مرد و زن سن سے اتر چکے تھے، وہاں قدرتِ الٰہی کے اظہار کے لئے يَفْعَلُ بالکل کافی تھا، برخلاف اس کے یہاں

عام وجاری سنّتِ الٰہی سے ہٹ کر بغیر مرد وزن کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا ہے اس لئے یہاں لفظ بھی یخلق لایا گیا، جو حق تعالیٰ کی صفتِ ایجاد واختراع پر دلالت کر رہا ہے۔

هنالك يفعل لانه محكي اذهومن ذكر وانثى مسنّين فهنا يخلق لانه لم يعهد مولود من غير ذكر فجاء بلفظ يخلق الدال على الاقتراع الصرف من غير مادة ذكر (نهر) من حيث ان امر زكريا داخل في الامكان العادي الذي يتعارف وان قل وفي قصة مريم يخلق لانه لا يتعارف مثلاً وهو وجود ولد من غير والد فيه ايجاد واختراع من غير سبب عادي فلذلك جاء بلفظ يخلق الدال على هذا المعنى (بحر)

اور ایسا ہی مفسر آلوسی بغدادی نے بھی لکھا ہے :-

التعبير هنا بيخلق وهناك بيفعل لاختلاف القصّتين في الغرابة فانّ الثانية اغرب (روح)

اور صاحب المنار نے اسی کو اور زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔

**۱۲۲** (اور وہ ہو جاتا ہے، خواہ اسباب کے واسطہ سے ہو یا بلا کسی سببِ ظاہری کے)

اس قسم کی آیتیں برابر ان فلسفیوں اور باطل مذہبوں کے رد میں ہیں جو حادث پر قیاس کر کے قدیم کو بھی سلسلۂ اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ لہٗ۔ نادانوں نے ایک سوال یہ پیدا کیا ہے کہ کوئی شے جب ابھی سرے سے موجود ہی نہیں ہے تو حق تعالیٰ کا خطاب اس سے ہوتا کس طرح ہے؟ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں تو موجود ہی ہے تو اب اس کو حکم ہوتا ہے کہ خارج میں بھی موجود ہو جا۔ یقول لہٗ کن فیکون۔ قول کن سے مراد اس دو حرفی لفظ کا تلفّظ نہیں کہ یہ حروف تو خود ہی حادث ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کا قول اُس کیفیت کے ساتھ ہے جو اس کی شانِ کمال کے لائق ہے اور جس طرح اس کی تمام صفات کی تفصیلات فہم بشری کی گرفت سے باہر ہیں اس کے قول کی بھی کیفیت تفصیل سے نہیں سمجھی جا سکتی، مراد صرف یہ کہ ارادۂ الٰہی اور اس کی تعمیل کے درمیان کوئی شے حائل یا حاجب نہیں۔

قَضٰٓى اَمۡرًا۔ قضاء کے معنی اس سیاق میں تہیّہ کر لینے، ارادہ کر لینے کے ہیں۔

فالقضاء بمعنى الارادة (المنار) القضاء فصل الامر قولاً كان ذلك او فعلاً (راغب)

**۱۲۳** (جیسا کہ اللہ کا معاملہ دوسرے انبیاء کے ساتھ بھی رہتا ہے)

یُعَلِّمُهٗ۔ میں ضمیرہ کا محول ظاہر ہے کہ ولدِ مریمؑ یعنی حضرت عیسیٰؑ کی جانب ہے حضرت کا جو مقامِ عظمت ان الفاظ سے بیان کرنا مقصود ہے وہ تو ظاہر ہی ہے لیکن خود مریمؑ کی بھی تشفیٔ خاطر کا کتنا سامان ضمناً ہوا جا رہا ہے ارشاد گویا یہ ہو رہا ہے کہ تم غم نہ کرو اور پریشان نہ ہو، بے شوہری اولاد کی بنا پر خلق تمھیں جتنا بدنام اور مطعون کرے گی اس کی تلافی کے لئے اولاد بھی تمھیں کس پایہ کی مرحمت کی جا رہی ہے!

الکتاب۔ یعنی کتب سماوی لفظ کتاب بہ طور اسمِ جنس استعمال ہوا ہے۔

ذهب كثيرون الى انّ ال فيه للجنس والمراد جنس الكتب الالٰهيّة۔ (روح)

الحکمۃ۔ حکمت سے مراد یا تو جمیع امورِ دین ہیں (اور اس سے ضمناً اس پر بھی روشنی پڑ جاتی ہے کہ پیمبر دینی تعلیم اپنی کتاب یا صحیفہ کے علاوہ بھی لے کر آتے ہیں) اور یا تہذیب اخلاق۔

جميع ما علمه من امور الدين (روح) المراد بالحكمة تعليم العلوم وتهذيب الاخلاق۔ (كبير)

اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـٴَـةِ

(اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں ۱۲۵ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندوں کی مانند

الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ

صورت بنا دیتا ہوں پھر اس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور

وَ اُحْیِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ

کوڑھی کو اچھا کر دیتا ہوں اور میں اللہ کے حکم سے مُردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم جو کچھ کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ جمع کرتے ہو۔

**۱۲۴** (جیسا کہ اب تک ہر پیمبر اپنی اپنی قوم کی جانب مبعوث ہوتا رہا ہے)

رَسُوْلًا۔ آپ کا مرتبہ پیمبری کا ہوگا، نہ آپ معاذ اللہ ساحر و شعبدہ باز ہوں گے جیسا کہ بدتمیز یہود نے آپ کو سمجھا، اور نہ (نعوذ باللہ) آپ خود خدا یا فرزندِ خدا ہوں گے، جیسا کہ نصرانیوں نے گڑھ لیا۔

اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ۔ یہ بالکل صریح ہے اس باب میں کہ آپ کی دعوت بنی اسرائیل تک محدود تھی اور دوسرے بنی اسرائیلی پیمبروں کی طرح آپ بھی صرف قومی نبی تھے۔ انجیل تک میں یہ تصریح، اتنی تحریفوں کے بعد بھی باقی رہ گئی ہے:۔ "ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انھیں حکم دے کے کہا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانہ کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا" (متی ۱۰: ۵۔ ۷) "اس نے جواب میں کہا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس بھیجا نہیں گیا۔" (متی ۱۶: ۲۴)

تقریباً دو ہزار سال کی کلیسا کی ساری ملمع سازیوں کے بعد بھی آج بھی خود مسیحی فاضلوں کو اقرار ہے کہ تبلیغ نصرانیت کی یہ عالمگیری ایجادِ بندہ ہے ورنہ خود حضرت مسیح کے ہاں اس تعلیم کا پتہ نہیں "مسیح نے اسرائیل کے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کئے"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۵ ص ۶۳۱ طبع چہاردہم) اور مسیح تو مسیح حواریوں تک کا بھی یہ خیال نہ تھا۔

"اولین شاگردوں کو تعلیم مسیح کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا۔" (ایضاً ص ۶۳۲)

**۱۲۵** (جیسا کہ دوسرے پیمبر بھی خدائی نشانیاں لے کر آتے رہے ہیں)

جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ۔ اٰیة کے لفظی معنی نشان کے ہیں، یہاں مُعجزہ کے مفہوم میں آیا ہے، مُعجزہ ایسے واقعہ کے ظہور کا نام ہے جو عام و متعارف سلسلۂ اسباب سے الگ ہو، پیمبر کے ذریعہ سے ایسے غیر عادی واقعہ کا وقوع اس امر کی دلیل ہوتا تھا کہ نُصرتِ حق و تائیدِ الٰہی پیمبر کے ساتھ ہے، مُعجزہ کا فاعل کائنات کے بڑے چھوٹے معمولی غیر معمولی ہر واقعہ کی طرح صرف اللہ تعالٰی ہوتا ہے، پیمبر محض واسطہ یا ذریعہ ہوتا ہے، جو لوگ ایک قادرِ مطلق کے وجود کے قائل ہیں، اُن کے لئے کسی بڑے سے بڑے معجزہ کا نفسِ امکان تو قابلِ انکار بلکہ قابلِ اشتباہ بھی نہیں ہو سکتا، طبعی و غیر طبعی، عادی و غیر عادی، متعارف و مجہول، جلی و خفی اسباب کی تفریق تو بشری تجربات کے لحاظ سے ہے، قادرِ مطلق کے لئے سب بالکل یکساں ہیں، اب رہا کسی متعین معجزہ کا ثبوت تو اس کا تعلق منطق سے نہیں تاریخ سے، عقل سے نہیں نقل سے، درایت سے نہیں روایت سے ہے، ظن و تخمین کا یہاں دخل نہیں، اب گفتگو صرف سندِ متصل اور شہادتِ معتبر کی رُو سے ہوگی، معجزاتِ مسیح کا ذکر انجیلوں میں بہ کثرت آیا ہے۔

فِي بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾

وہ تمھیں تبلادیتا ہوں۔ بے شک ان (سارے واقعات) میں تمھارے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو ۱۳۶

مِنۡ رَّبِّكُمۡ۔ یہ اضافہ اس حقیقت کی تاکید اور اس پر زور دینے کے لئے ہے کہ معجزہ کا ظہور حق تعالے ہی کی طرف سے ہوتا ہے، نہ کہ پیمبر کے اختیار و قدرت سے، یہ اور بات ہے کہ اس سے مقصود پیمبر ہی کی تائید و نصرت ہو۔

۱۳۶ یعنی اگر تم خبثِ باطن اور ضد و عناد کو چھوڑ کر ایمان کے طالب اور یقین و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہو۔

اَخۡلُقُ۔ فعل خلق کا انتساب جب خالق کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد نیست سے ہست کرنا، عدم سے وجود میں لانا ہوتا ہے اور جب انسان کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد ہوتا ہے اندازہ کرنا، ایک خاص انداز سے بنانا، اور صورت پیدا کرنا، اور یہاں کھلی ہوئی مراد یہی ہے۔

خلقه تقديره ولم يرد انه يحدث معدوما (تاج) الخلق اصله التقدير المستقيم (راغب) الذي يكون بالاستحالة فقد جعله الله تعالىٰ بغيره في بعض الاحوال والخلق لا يستعمل في كافة الناس الا على وجهين احدهما في معنى التقدير (راغب) اي أقدر واصور (كبير) والمراد بالخلق التصوير والابراز على مقدار معين (روح)

لَكُمۡ۔ یعنی تم میں یقین پیدا کرنے کے لئے۔

اي لاجل تحصيل ايمانكم ودفع تكذيبكم اياي (روح) واللام في لكم معناه التعليل (بحر)

عوام ہمیشہ بجائے دلائل و عقلیات کے معجزہ و خارقِ عادت ہی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہود تو اپنی عجوبہ پسندی میں خصوصیت کے ساتھ بڑھے ہوئے تھے۔

مِنَ الطِّيۡنِ۔ اس فقرہ نے اور زیادہ کھول کر اس حقیقت کو حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے ادا کردیا ہے کہ میں عدمِ محض سے وجود میں ہرگز نہیں لاتا، صرف مادہ میں ایک خاص ترکیب و ترتیب کے ساتھ تصرف کردیتا ہوں۔

تقييد بانه لا يوجد من العدم الصرف بل ذكر المادة التي يشكل منها صورة الطير (بحر)

كَهَيۡـَٔةِ الطَّيۡرِ۔ یعنی پرندوں کی شکل کے کھلونے مٹی سے بناتا ہوں۔

طَيۡر۔ یہاں بطور اسم جنس کے ہے۔

فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًا۔ یعنی میرے نفخ دم سے ان میں جان پڑجاتی ہے، اور وہ سچ مچ کے پرندے بن کر اڑنے لگتے ہیں، چاروں انجیلیں جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے نزدیک مستند ہیں، ان میں اس معجزہ کا ذکر نہیں لیکن جو انجیل کلیسائے قبط (مصر) COPTIC CHURCH کی مستند الیہ ہے اس میں یہ صاف مذکور ہے جیسا کہ ڈاکٹر بج BUDGE نے اپنی کتاب LEGENDS OF LADY MARY کے مقدمہ صـ۲۹ میں نقل کیا ہے:۔

"وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے جو اڑ سکتے تھے"۔

بِاِذۡنِ اللّٰهِ۔ یعنی یہ جو کچھ بھی میں کردکھاتا ہوں، اسے کہیں میری قوت و قدرتِ تخلیق کا نتیجہ نہ سمجھ لینا، یہ جو بھی ہوتا ہے، سب محض ارادۂ خداوندی و قدرتِ الٰہی کا ثمرہ ہے۔

الۡاَكۡمَهَ۔ اندھوں کو بغیر آپریشن کے بینا کردینا یوں بھی آسان نہیں، چہ جائیکہ مادرزاد اندھوں کو، اور اکمہ ایسے ہی کو کہتے ہیں، اس معجزۂ مسیحؑ کا ذکر انجیلوں میں متعدد مقامات پر ہے، مثلاً انجیل متی۔ ۹: ۲۷ و ۳۰، میں اور انجیل مرقس ۸: ۲۲ تا ۲۵

میں ہیں لیکن سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا ۹: ۱-۷ میں ہے، اور اس میں تصریح اندھے کے مادرزاد یا پیدائشی ہونے کی ہے۔

اَلْاَبْرَصَ۔ کوڑھیوں کے اچھا کرنے کا ذکر انجیل میں دو جگہ ہے ایک جگہ ایک کوڑھی کو شفا دینے کا، اور دوسری جگہ دس کوڑھیوں کو۔ "جب وہ اس پہاڑ سے اترا تو بہت سی بھیڑ اس کے پیچھے ہولی اور دیکھو ایک کوڑھی نے پاس آکر اُسے سجدہ کیا اور کہا: اے خداوند اگر تو چاہے تو مجھے پاک صاف کر سکتا ہے اس نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھوا اور کہا میں چاہتا ہوں تو پاک صاف ہو جا، اور فوراً کوڑھ پاک صاف ہو گیا" (متی ۸: ۱-۳) "اور ایسا ہوا کہ یروشلم کو جاتے ہوئے وہ سامریہ اور گلیل کے بیچ سے ہو کر جا رہا تھا، اور ایک گاؤں میں داخل ہوتے وقت دس کوڑھی اس کو ملے، انھوں نے دور کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا، اے یسوع، اے صاحب ہم پر رحم کر، اس نے انھیں دیکھ کر کہا، جاؤ اپنے تئیں کاہنوں کو دکھاؤ اور ایسا ہوا کہ وہ جاتے جاتے پاک صاف ہو گئے" (لوقا ۱۷: ۱۱-۱۴)

انجیل کے جدید ناقدوں نے طرح طرح پر جرح کر کے پچھلی صدی میں اناجیلِ اربعہ کا گوشہ گوشہ مجروح کر ڈالا ہے لیکن اتنے جزو پر یہ ناقدین بھی متفق ہیں کہ مسیح کے معجزاتِ شفا بخشی ثابت شدہ ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۵ ص ۶۲ طبع چہاردہم) نیز انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جو خاص انہی تنقیدات کے لئے ہے اس کا کالم ۲۴۴۵۔

اُحْیِ الْمَوْتٰی۔ برنا باحواری کی جو انجیل چلی آ رہی ہے، اس میں تو معجزۂ احیاءِ اموات کی تصریح بھی موجود ہے، (ص ۴۳۷ و ۴۴۱ انگریزی ایڈیشن) رہیں اور انجیلیں جو موجودہ مسیحیوں کو مسلم اور اُن کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں بلکہ ان میں متعدد مثالیں اس قسم کے معجزہ کی مذکور ہیں چنانچہ لوقا جو یونانی طبیب کی حیثیت سے مشہور تھے ان کی جانب منسوب انجیل میں یہ درج ہے: "تھوڑے عرصے کے بعد ایسا ہوا کہ وہ نائین نامی ایک گاؤں کو گیا اور اس کے شاگرد اور بہت سے لوگ اس کے ہمراہ تھے جب وہ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھا ایک مردے کو باہر لئے جاتے تھے، وہ اپنی ماں کا اکلوتا تھا اور وہ بیوہ تھی، اور شہر کے بہتیرے لوگ اس کے ساتھ تھے اُسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا اور اس سے کہا رو نہیں پھر اس نے پاس آکر جنازے کو چھوا اور اُٹھانے والے کھڑے ہو گئے اور اس نے کہا اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اٹھ! وہ مردہ اٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور اس نے اُسے اس کی ماں کو سونپ دیا اور سب پر دہشت چھا گئی (لوقا ۷: ۱۱-۱۶) نیز (۷: ۲۲) انجیل متی (۹: ۱۸-۲۵) میں ایک تازہ میت (ایک سردار کی لڑکی) کے جِلا اٹھانے کا ذکر ہے، اور انجیل یوحنا (۱۱: ۱-۴۴) میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک چار روز کے دفن شدہ مردہ لعزر کے احیاء کا۔

بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ مزید تاکید و تصریح کے لئے اس فقرہ کو مکرر لایا گیا ہے کہ کہیں ان اعجازی تصرفات کو میری جانب نہ منسوب کر دینا، جو کچھ بھی ہوا محض خدائے برحق کی قدرت و مشیت سے ہوا۔

صوفیۂ عارفین نے کہا ہے کہ بعض اہلِ حال سے جو ایسے اقوال منقول ہیں جن میں وہ اپنی جانب ایسے افعال کو منسوب کر گئے ہیں جو حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں، تو بشرطِ صحتِ نقل وہ دعوے غلبۂ حال پر محمول ہوں گے لیکن اُن میں جو اہلِ ادب ہیں وہ ہر ایسے موقع پر حضرت مسیح ہی کی طرح باذن اللہ یا اس کے مرادف کسی فقرہ کی قید لگا دیتے ہیں۔

اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ۔ یہ بات آپ نے مثال اور نمونہ کے طور پر فرمائی یعنی تمھاری مخفی چیزوں پر بھی اللہ مجھے مطلع کر دیتا ہے۔

اٰيَةً۔ یعنی نشان میرے پیمبر اور مؤید من اللہ ہونے کا، حضرت مسیحؑ کے ہاتھ سے خوارق کا بہ کثرت صادر ہونا تاریخ کا ایک مسلّم واقعہ ہے خواہ ان کی توجیہ منکرین کچھ بھی کرتے رہے ہوں یہود نے انہی خوارق کو دیکھ کر آپ کو ساحر و شعبدہ باز کہنا شروع کر دیا، چنانچہ جوزیفس (متوفی ۱۰۰ء) نے اپنی تاریخ "آثار یہود" میں آپ کا ذکر اُسی

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اپنے سے پیشتر آئی ہوئی توریت کی اور (اس لئے آیا ہوں) کہ تم پر جو کچھ حرام کر دیا گیا

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾

تھا اس میں سے تم پر کچھ حلال کر دوں [۱۲۷] اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے پاس سے نشان لیکر آیا ہوں [۱۲۸] سو تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو [۱۲۹]

حیثیت سے کیا ہے اور جیوش انسائیکلوپیڈیا میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں لکھا چلا آتا ہے :۔

”یسوع نے بہ حیثیت معلمِ دین یا قانون ساز کے نہیں بلکہ بہ حیثیت شعبدہ باز کے اپنی زندگی میں شہرت و ناموری گلیل کے سادہ مزاج باشندوں میں حاصل کی۔“ (جلد ۷، صفحہ ۱۶۷)

**۱۲۷** (بہ ارشادِ خداوندی)

مُصَدِّقًا ...... التَّوْرٰىةِ ۔ کوئی نیا نبی پرانے نبی کی تردید و تغلیط کے لئے نہیں آتا (اس قسم کی تحقیقات صرف حکماء و فلاسفہ کو مبارک رہے) بلکہ ہر جدید پیامبر پیامِ قدیم کی تجدید و تکمیل ہی کے لئے آتا ہے۔ حضرت مسیحؑ بھی یہاں یہود سے یہی کہہ رہے ہیں کہ میں شریعتِ موسوی کے مٹانے کے لئے نہیں، ان کی تجدید و تصدیق کے لئے آیا ہوں، اس قسم کی تصریحات مروجہ انجیل میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً ”یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں، بلکہ پورا کرنے آیا ہوں“ (متی ۔ ۵ : ۱۷) ”آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے مٹ جانے سے آسان ہے۔“ (لوقا ۔ ۱۶ : ۱۷) (انجیلی زبان میں شریعت سے مراد شریعتِ موسوی ہی ہوتی ہے)۔

حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ۔ یعنی شریعتِ موسوی میں جو چیزیں تم پر حرام تھیں — قانونی جزئیات اور فقہی فروع میں ترمیم و تسہیل، عمومی تصدیق و تائید کے ذرا بھی منافی نہیں۔

اُحِلَّ لَكُمْ ۔ مسیحی تعلیم نے قدیم موسوی شریعت میں جو بعض سہولتیں اور آسانیاں پیدا کر دی تھیں ان کا ذکر انجیلِ مروجہ میں بھی موجود ہے۔ مثلاً :۔

”اے محنت اٹھانے والو اور بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ، میں تمہیں آرام دوں گا، میرا جوا اپنے اوپر اٹھا لو اور مجھ سے سیکھو کیونکہ میں حلیم ہوں اور دل کا فروتن تو تمہاری جانیں آرام پائیں گی کیونکہ میرا جوا نرم ہے اور میرا بوجھ ہلکا۔“ (متی ۔ ۱۲ : ۲۸ ۔ ۳۰)

یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ تمہارے حبروں اور ربّیوں نے اپنی طرف سے جو احکام توریت میں خلط ملط کر دیئے ہیں، میں اس سارے بوجھ کو تم سے دور کرنے آیا ہوں۔

**۱۲۸** (اور اپنی نبوت و رسالت کا)

اٰيَةٍ ۔ نشان کا لفظ دلائل و معجزات دونوں پر حاوی ہے، اور لفظ کے مفرد ہونے سے یہ خیال نہ ہو کہ معنی بھی صیغۂ واحد میں ہے، اور کوئی ایک مخصوص نشان مراد ہے۔

اٰيَةٍ ۔ بطور اسم جنس کے ہے اور مراد اس سے سارے ثبوت اور شواہد حضرت کی صداقت کے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

بے شک اللہ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے سو اُس کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے ۱۳۰ے

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ

پھر جب عیسیٰ نے اُن کی طرف سے انکار ہی پایا ۱۳۱ے تو بولے میرا کون مددگار ہوگا اللہ کے لئے

انما وحد وهي ايات لانها جنس واحد في الدلالة على رسالته۔ (قرطبی)

خطاب بنی اسرائیل سے ہے۔

**۱۲۹ے** (بہ حیثیت رسولِ خدا ہونے سے)

فَاتَّقُوا اللّٰہ۔ یعنی اللہ سے ڈرو، اور اس کے رسول کی تکذیب کی جرأت نہ کرو۔

**۱۳۰ے** (جس کی تعلیم ابتداء سے لے کر آخر تک سارے ہی پیمبر دیتے آئے ہیں)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم اسی عبدیت اور اسی توحید کی تھی، ظالموں نے اُسے مسخ کر کے تثلیث بنا دیا جو شرک ہی کی ایک کھلی ہوئی شکل ہے۔

رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اللہ کے مخلوق، مربوب اور عبد ہونے کے اعتبار سے پیمبر اور اُمتی سب یکساں ہیں۔

فَاعْبُدُوْهُ۔ یعنی صرف اسی کی پرستش کرو، بغیر کسی کی شرکت و آمیزش کے۔ آج جو انجیلیں دنیا کے پردہ پر موجود ہیں، اُن میں سے ایک انجیل برنابا بھی ہے، اس کے انگریزی، عربی، اُردو ترجمے موجود ہیں اور وہ حضرت برنابا سا نامی حضرت مسیح کے ایک حواری کی جانب منسوب ہے۔ اس میں ظہورِ اسلام کی خبریں اور حضرت ختمِ رسل کی بابت پیش گوئیاں ایسے صاف و صریح لفظوں میں موجود ہیں کہ مسیحیوں کو مفر اسی میں نظر آیا کہ اُسے جعلی کہہ کر الگ کر دیں خیر وہ تو ہر سچے سفیرِ الٰہی کے کلام کی طرح توحید کی تعلیم و تاکید سے لبریز ہی ہے، لیکن دوسری انجیلیں بھی جو خود کلیسا کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس تعلیم سے خالی نہیں۔ مثلاً:۔

"یسوع نے اس سے کہا، اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر" (متی ۴: ۱۰)

تثلیث کا شرک جن ظالموں کی بھی ایجاد ہو بہرحال حضرت مسیح کا دامنِ اقدس اس کی آلودگی سے بالکل پاک و منزہ ہے۔

**۱۳۱ے** (اپنی ہر سعی اور تبلیغ کے باوجود)

اَحَسَّ یعنی پایا یا محسوس کیا حواسِ ظاہری سے۔

معناه علم ووجد قاله الزجاج وقال ابو عبيدة معنى احس عرف (قرطبی) لا يقال ذالك الا في ماكان من جهة الحاسة (راغب) تحقق مايدرك بالحواس (بیضاوی)

منھم۔ یعنی اپنے مخاطبین کی طرف سے جو بنی اسرائیل یا یہود تھے۔

اے من بنی اسرائیل۔ (قرطبی)

اَلْکُفْرَ۔ یعنی انکارِ نبوتِ عیسوی سے اور انکار بھی ظلم و تعدّی کے ساتھ۔

یہ انکار و طغیان علانیہ اور برملا تھا، کوئی دقیق و مخفی شے نہ تھی جو مستنبط کی جاتی بلکہ حواسِ ظاہری ہی سے محسوس ہونے والی

قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ۚ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٥٢﴾

حواری بولے ہم ہیں اللہ کے مددگار ۱۳۲ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں ۱۳۳

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ﴿٥٣﴾

اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے اس پر جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اور ہم نے پیروی (اختیار) کرلی رسول کی سو ہم کو بھی گواہوں کے ساتھ لکھ لے ۱۳۴

کھلی ہوئی چیز تھی اور یہی نکتہ ہے کہ یہاں فعل احسّ استعمال کیا گیا جس کے معنی بالکل ظاہر ظہور پانے کے ہیں۔

فتنبیہ انه قد ظهر منهم الکفر ظهورًا بان للحس فضلًا عن الفهم (راغب)

۱۳۲ آپ نے اپنی قوم کو نصرتِ دین کے لئے جو پکارا اس سے محققین نے یہ استنباط کیا ہے کہ اہلِ دین سے دین کے بارہ میں مدد طلب کرنا توکل کے ذرا بھی منافی نہیں ان سے یہ مدد طلب کرنا اسی حیثیت سے ہوتا ہے یہ انصار نصرتِ الٰہی کے مظہر ہوتے ہیں۔

اِلَى اللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی راہ میں، اللہ کے دین کے لئے۔

قال الحسن المعنی من انصاری فی السبیل الی اللّٰه (قرطبی) قال ابوعلی الفارسی معنی الی اللّٰه لله (بحر)

الی ھٰهنا بمعنی مع او فی او اللام۔ (بیضاوی)

اَلْحَوَارِيُّونَ۔ حواری کے لفظی معنی کپڑا دھو کر اسے صاف اور اجلا کر دینے والے کے ہیں۔

حوّرت الشئ ای بیّضته ودوّرته (راغب) واصل الحوَر فی اللغة البیاض وحوّرت الثیاب بیّضتها (قرطبی)

حضرت مسیحؑ کے ابتدائی مرید چونکہ عموماً دریا کے کنارے کام کرنے والے ماہی گیر تھے اس لئے آپ کے بعد بھی رفیقوں شاگردوں کا یہی لقب پڑ گیا، مجازی معنی مخلص و مددگار کے ہیں چنانچہ حدیث میں حضرت زبیرؓ کے لئے یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

الحواری ایضاً الناصر (قرطبی) وقوله صلی اللّٰه علیه وسلم لکل نبی حواری وحواری الزبیر (راغب)

حواری الرجل صفوته وخالصته (کشاف)

بہرحال وجہ تسمیہ جو کچھ بھی ہو، مسیحؑ کے صحابیوں کے لئے لقب یہی چلا ہوا تھا۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ۔ حضرت عیسیٰؑ نے تو اپنے مددگار طلب کئے تھے (مَنْ انصاری) گو وہ مددِ خدا ہی کے کام کے لئے ہو، حواری جواب میں اپنے کو خدا کے مددگار انصار اللّٰه کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ نحن انصارك لله۔

محققین نے اس سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا۔

۱۳۳ مُسْلِمُوْنَ۔ مسلم۔ کا لفظی ترجمہ فرمانبردار ہے، "مسلم" کا اطلاق ہر نبی کے پیرو پر ہوتا ہے کہ حقیقۃً ہر نبی کی دعوت اللہ کی فرمانبرداری ہی کی ہوتی ہے۔

اٰمَنَّا بِاللّٰهِ۔ حواریوں کا سارا زور ایمان باللہ پر ہے، "ابن اللہ" کے تو تخیل سے بھی وہ بیچارے آشنا نہ تھے۔

۱۳۴ مسیحؑ کے صحابی ابھی مسیحؑ سے گفتگو کر رہے تھے، دفعۃً براہِ راست حق تعالیٰ سے مناجات کرنے لگے، قرآن مجید اکثر ایسے موقعوں پر یہی کرتا ہے کہ بندوں کے خطاب کا رخ یک بیک اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیتا ہے کیا ٹھکانا ہے اس اہتمام توحید کا!

وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ۔ حضرت مسیحؑ کے معاصر مسیحی آپ کو رسول ہی تسلیم کرتے تھے، "ابن اللہ" "اقنوم" وغیرہ کے

ع ۵ / ۱۴ الثلثة

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ع ﴿۵۴﴾

اور انھوں نے بھی خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی، اور اللہ سب خفیہ تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے [۱۳۵]

خرافات اس وقت تک نہ ایجاد ہوئے تھے نہ ہو سکتے تھے۔

الشّٰھدین۔ گواہ تیری توحید کے اور تیرے پیمبروں کی پیمبری کے۔

**۱۳۵** (اس لئے اس کی تدبیر کو تو سب پر غالب رہنا ہی تھا)

مَکَرُوْا۔ کا اسم فاعل یہود ہیں، یہود کے اکابر اور سرداروں نے مخالفت و ایذا کے بہت سے درجے طے کرنے کے بعد بالآخر یہ طے کیا کہ یسوع نامے اسرائیلی مدعیٔ نبوت کو ختم ہی کر دینا چاہیئے، چنانچہ پہلے اپنی مذہبی عدالت میں الحاد کا الزام لگا آپؑ کو واجب القتل قرار دیا، پھر رومی حاکموں کی ملکی عدالت میں لا کر آپؑ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔

حضرت عیسیٰؑ اور آپؑ کے مخالفین کا یہ معرکہ ملک شام کے صوبۂ فلسطین میں پیش آیا تھا، شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک جزو تھا، اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں نیم آزادی اور نیم خود مختاری حاصل تھی جیسے انگریزی حکومت کے ماتحت ہندوستان میں ریاست حیدرآباد وغیرہ کو حاصل تھی، شہنشاہ رومہ کی طرف سے ایک نائب السلطنت (وائسرائے) سارے ملکِ شام کا تھا، اور اس کے ماتحت ایک والی یا امیر صوبۂ فلسطین کا تھا، رومیوں کا مذہب شرک و بت پرستی کا تھا، یہود کو اتنا اختیار حاصل تھا کہ اپنے لوگوں کے مقدمات اپنی مذہبی عدالتوں میں لائیں لیکن سزاؤں کے نفاذ کے لئے انھیں پھر انھی مجرموں کو ملکی عدالت کے سامنے لانا پڑتا تھا، جرمِ الحاد میں فتویٔ قتل خود یہود کی مذہبی عدالت دے سکتی تھی اور اُسی سزا کا حکم سنایا، لیکن واقعتہً سزائے موت کا نفاذ صرف رومی ملکی عدالت کے ہاتھ میں تھا، اور سزائے موت رومی حکومت میں سولی کے ذریعہ دی جاتی تھی، یہود کی اس گہری اسکیم کی جانب اشارہ قرآن مجید کے لفظ مکروا میں ہے۔

وَمَکَرَ اللّٰہُ۔ یعنی اللہ نے مخالفین و معاندین کی ساری تدبیریں، ساری سازشیں اُلٹ دیں اور حضرت مسیحؑ کو سولی کی موت سے بچا لیا، عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے، یعنی کسی فعل کی سزا یا جواب کو بھی بجنسہٖ اسی فعل کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے، اور اس طرزِ ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا، اور زید نے اس کا جواب دیا، تو عربی محاورہ میں یوں کہیں گے کہ اُس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اُس پر حملہ کیا، حالانکہ زید کا "حملہ" مطلق صورت میں نہ ہوگا، بلکہ صرف سزائے حملہ ہوگی یا زیادہ سے زیادہ اُسے "جوابی حملہ" کہہ لیا جائے، یا مثلاً کوئی مجھے ٹھگ لے اور میں اُس سے انتقام لوں تو عربی میں پیرایۂ ادا یہ ہوگا کہ اُس نے مجھے ٹھگا، اور میں نے بھی اُسے ٹھگ لیا، حالانکہ ظاہر ہے کہ میری طرف سے ٹھگنے کی سزا یا ٹھگنے کا انتقام ہی ہوگا۔

اس اصل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن مجید کی اس قسم کی آیتوں سے کہ:-

(۱) مکروا ومکر اللہ انھوں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی "مکر" کیا۔

(۲) انھم یکیدون کیدًا و اکید کیدًا وہ "کید" سے کام لیتے ہیں اور میں بھی "کید" سے کام لیتا ہوں۔

(۳) جزآء سیّئۃٍ سیّئۃٌ مثلھا۔ "برائی" کا بدلہ ویسی ہی ایک "برائی" ہے۔

(۴) قالوا انما نحن مستھزءون اللہ یستھزئ بھم۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو محض ہنسی کرتے ہیں، اللہ ان سے "ہنسی" کرتا ہے۔

(۵) فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ۔ جو تم پر "زیادتی" کرتا ہے، تم اس پر "زیادتی" کرو۔

# إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰىٓ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ

(وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ نے فرمایا ۱۳۶ اے عیسیٰ! میں تم کو موت دینے والا ہوں ۱۳۷ اور تم کو اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں ۱۳۸

جو اشکال محض ترجمہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے وہ از خود ساقط ہو جاتا ہے، اس لئے کہ دوسری زبانوں میں یہ جوابی محاورہ رائج ہی نہیں، ان تمام مثالوں میں جوابی اور سزائی "مکر" نہ مکر ہے نہ "کید" کید ہے، نہ "سیئہ" سیئہ ہے نہ "استہزاء" استہزاء، ہے نہ "زیادتی" زیادتی ہے، بلکہ ہر موقع پر مراد صرف سزائے مکر، سزائے کید، سزائے سیئہ، سزائے استہزاء اور سزائے اعتداء ہے تو اس جوابی و تعزیری مکر الٰہی پر کوئی سوال ہی نہیں عائد ہوتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں لفظ مکر میں (بہ خلاف اردو زبان کے) لازمی طور پر کوئی پہلو ذم کا ہے بھی نہیں، مکر عربی میں محمود بھی ہو سکتا ہے اور مکر مذموم بھی، اصل معنی صرف خفیہ تدبیری، گہری تدبیر یا انگریزی میں PLAN کے ہیں

المكر الخديعة والاحتيال وقال الليث احتيال فى خفية (تاج) وفى البصائر المكر ضربان محمود وهو ما تحرى به امر جميل ومذموم وهو ما تحرى به فعل ذميم (تاج) المكر صرف الغير عما يقصده بحيلة وذلك ضربان مكر محمود ومذموم۔ (راغب)

پس جس کسی ہندی نے اردو کے مکر و فریب پر قیاس کر کے قرآن کے مکر اللہ پر حرف گیری کی ہے، اس نے خود اپنی جہالت کا پردہ فاش کیا ہے۔

واللہ خیر الماکرین۔ اور اللہ کی تدبیریں سب سے اونچی اور سب پر غالب آنے والی ہیں، اس کا مقابلہ جس طرح کوئی جسمانی قوت اور مادی زور سے نہیں کر سکتا، اسی طرح کسی کی عقل، تدبیر بھی اس سے پیش نہیں پا سکتی چنانچہ یہاں بھی اسی کی حکمت و تدبیر کارگر رہی، حضرت عیسیٰؑ زندہ و سلامت رہے اور صلیب دیتے وقت یہود عوام نے تو ہجوم و اژدہام کے گڑبڑ اور وقت کی تنگی سے اور سولی گھر کے رومی سپاہیوں نے شناخت نہ ہونے کی بنا پر یوں سمجھا کہ سولی حضرت عیسیٰؑ کو دے رہے ہیں، حالانکہ آپؑ کے دھوکے میں آپ ہی کے کسی ہم شکل، ہم عمر، ہم وضع، ہم قوم کو سولی پر چڑھا دیا۔

کلیسائے مسیحی کا آج عام عقیدہ حضرت مسیحؑ کے مصلوب ہو جانے صلیب پر وفات پا جانے اور پھر تیسرے دن جی اٹھنے کا ہے لیکن مسیحیوں کے بعض قدیم فرقے BASILIDES (باسلیدیہ وغیرہ) ٹھیک اسی اسلامی عقیدہ کے قائل ہوئے ہیں۔

**ف ۱۳۶** (حضرت عیسیٰؑ سے ان کی گرفتاری کے موقع پر)

واقعات و حالات کی رفتار سے حضرت عیسیٰؑ کو اپنا انجام یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہود انھیں گرفتار کئے، ان پر مقدمہ چلائے بغیر نہ رہیں گے، اور پھر رومیوں کی ملکی عدالت میں لے جا کر انھیں سزائے موت دلوائیں گے، یہ ارشادِ الٰہی حضرتؑ سے ان کی تسکین کے لئے اسی موقع گرفتاری پر ہو رہا ہے۔

**ف ۱۳۷** (تمہارے وقتِ معہود پر، سو تم ان ظالموں کی سازش و عداوت سے گھبراؤ نہیں، یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)

لفظ مُتَوَفِّيكَ سے یہ لازم نہیں آتا کہ موت اسی وقت اور فی الفور واقع ہو گی، ہمارے اکابر مفسرین اسی طرف گئے ہیں، بلکہ امام رازی نے تو اسی کو بہتر تفسیر قرار دیا ہے۔

اى مستوفى اجلك ومعناه انى عاصمك من ان يقتلك الكفار ومؤخرك الى اجل كتبته لك (كشاف) مميتك

حتف انفك لاقتلا بايديهم (مدارك) مؤخرك الى اجلك المسمّٰى عاصمًا ايّاك من قتلهم (بيضاوي) انى متمم عمرك فحينئذٍ اتوفاك فلا اتركهم حتى يقتلوك بل انا رافعك الى سمائى ومقربك بملائكتى واصونك عن ان يتمكنوا من قتلك وهذا تاويل حسن (كبير)

توفّی میں مفہوم "پورا پورا لینے کا" بھی شامل ہے اس لئے اشارۃً گویا یہ بھی ارشاد ہوگیا کہ تمہیں طولِ حیات پورا پورا ملے گا۔

التوفّى فى اللغة اخذ الشئ وافيًا تامًا ومن ثم استعمل بمعنى الاماتة فالمتبادر فى الأية انى مميتك وجاعلك بعد الموت فى مكان رفيع عندى (المنار)

اور ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ توفی سے یہاں مراد وفات موت نہیں، بلکہ مرتبہ کی بلندی ہے۔

وقد قيل توفى رفعة واختصاص لاتوفى موت (راغب)

**۱۳۸** (اس درمیان میں)

یعنی تمہاری وفات تو اپنے وقتِ مقرر پر جب ہوگی، ہوگی، تمہارے دشمن تمہاری ہلاکت کے کسی منصوبے میں کامیاب نہیں ہوسکتے، سردست اس کا انتظام یوں کیا جارہا ہے کہ تمہیں ان کے درمیان سے اٹھا لیا جائے گا۔

اِلَیَّ یعنی آسمان کی طرف، ملاء اعلیٰ کی جانب، امام رازیؒ نے کہا ہے کہ قرآن میں یہ محاورہ عام ہے جہاں تعظیم و تفخیم مقصود ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنی جانب منسوب کردیتا ہے مثلاً ہجرتِ ابراہیمی کی عظمت کا اظہار مقصود تھا تو پیرایۂ بیان میں یہ رکھا گیا اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ حالانکہ ظاہر ہے کہ ہجرتِ ابراہیمی ایک ملک سے دوسرے ملک، ملکِ عراق سے ملکِ شام کی طرف ہوئی تھی۔

اے الى سمائى ومقر ملائكتى (كشاف) اے محل كرامتى ومقر ملائكتى (بيضاوى) اے سمائى ومقر ملائكتى (مدارك) والله تعالى يضيف اليه ما يكون فيه الابراز من عالم الغيب قبل البعث وبعده۔ (المنار)

رَافِعُكَ حضرت مسیحؑ کے رفعِ جسمانی کی صراحت تو قرآن مجید میں موجود نہیں لیکن قریب بہ صراحت ہونے کے یہ عقیدہ قرآن مجید کی اسی آیت میں موجود ہے اور احادیث نے اُسے اور صاف اور مؤکّد کردیا ہے۔

واولٰى هٰذه الاقوال بالصحة عندنا قول من قال معنى ذلك انى قابضك من الارض ورافعك الىّ لتواتر الاخبار عن رسول الله صلى الله عليه وسلم (ابن جرير) مميتك فى وقتك بعد النزول من السماء ورافعك الأن (مدارك)

ابن جریر کی عبارت میں لتواتر الاخبار عن رسول اللہ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ غور ہیں اس لئے یہی عقیدہ اب جمہور اہلِ سنّت کا ہے۔

حضرت مسیحؑ کی جب پیدائش، عام انسانی قاعدۂ توالد و تناسل سے الگ یعنی بغیر باپ کے توسط کے محض نفخۂ جبرئیل سے ہوگئی تو اب رفعِ جسمانی میں آخر اس قدر استبعاد کیا ہے، بلکہ یہ تو بالکل قرینِ قیاس ہے کہ آپ کا انجام ظاہری بھی معمول عام سے ہٹ کر ہوا ہو اور عجب کیا مسِّ ملکی نے آپ کے جسم میں لطافت بھی شروع سے ایسی رکھ دی ہو جو آپ کے صعودِ آسمانی میں معین ہوسکے۔

—— اور یہ دلیل تو بالکل بودی ہے کہ آپ کے رفعِ آسمانی سے آپ کی افضلیت دوسرے انبیاءؑ خصوصاً سید الانبیاءؐ پر لازم آجاتی ہے، آخر خدا معلوم کتنے فرشتے دن رات زمین سے آسمان پر جاتے ہی رہتے ہیں تو کیا اس بنا پر وہ سب سید الانبیاءؐ سے افضل ہوگئے؟ ایک یوروپین فاضل DE BUNSEN ڈی بنسن نے پچھلی صدی عیسوی میں ایک مختصر لیکن فاضلانہ کتاب "اسلام یا حقیقی مسیحیت" ISLAM OR TRUE CHRISTIANITY کے نام سے لکھی تھی، اس کے صفحہ ۱۴۳ کے حاشیہ میں اپنے قدیم مسیحی

مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ

اور اُن لوگوں سے جو کافر ہیں تمھیں پاک کرنے والا ہوں ۱۳۹ اور جو تمھارے پیرو ہیں انھیں قیامت تک

كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ

اُن لوگوں پر غالب رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں ۱۴۰

فرقوں میں سے متعدد کے نام لے لے کر لکھا ہے کہ فلاں فلاں فرقہ کا عقیدہ مسیحؑ کے رفعِ جسمانی کا نہ تھا کہ وفاتِ مسیحؑ کا جس پر اب مسیحائی صدیوں سے جمے چلے آتے ہیں، اسی طرح SALE نے بھی اپنے انگریزی ترجمہ کے حاشیہ میں اس عقیدہ کے مسیحی فرقوں کے نام گنائے ہیں حیرت ہے کہ کلمہ گویوں کے ایک جدید فرقہ نے وفاتِ مسیحؑ کا عقیدہ مسیحیوں سے لے لیا ہے اور اُسے اپنی خوش فہمی سے کمال "روشن خیالی" سمجھ رہا ہے۔

۱۳۹ یعنی ان کے لگائے ہوئے گندے الزامات سے۔

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ لفظ میں بڑا عموم ہے لیکن سیاق سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہی لوگ مراد ہیں جو حضرتؑ کی نبوت و صداقت کے منکر تھے یعنی یہود۔

المراد من الموصول الیھود (روح)

من الذین کفروا۔ یعنی ان لوگوں کی تہمتوں سے اُن کی افترا پردازیوں سے۔

مما قالوہ فیك وفی امك (بحر) واما تطھیرہ من الذین کفروا فھو انجاؤہ مما کانوا یرمونه منه (المنار)

مطلب یہ ہے کہ یہود کی ساری سازشیں کھل کر رہیں گی اور انھوں نے جیسے جیسے گندے الزامات لگائے ہیں سب کی قلعی اُتر کر رہے گی۔

۱۴۰ (تمھاری نبوت و صداقت کے)

الذین کفروا سے یہاں بھی مراد یہود ہی ہیں، جیسا کہ ابھی اوپر کے حاشیہ میں گزر چکا ہے۔

وھم الیھود (کبیر) وھم الیھود وسائر من شمله ھٰذا المفھوم (روح)

الذین اتّبعوك۔ یعنی جو لوگ عیسٰیؑ کی رسالت و نبوت کے قائل ہیں، مراد مسلمان تو ہیں ہی اور سچے عیسائی بھی اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔

وقیل اراد به النصاریٰ (معالم) قال قتادۃ والربیع والشعبی ومقاتل والکلبی ھم اھل الاسلام (معالم) واما بعد الاسلام فھم المسلمون واما النصاریٰ فھم ان اظھروا من انفسھم موافقته فھم مخالفونه اشد المخالفة من حیث ان صریح العقل یشھد انه علیه السلام ما کان یرضی بشیٍٔ مما یقوله ھٰؤلاء الجھال (کبیر)

فوق الذین کفروا الٰی یوم القیٰمة۔ یہ مسلمانوں اور سچے عیسائیوں کا غلبہ یہود و معاندینِ مسیحؑ پر قیامت تک کس معنی میں اور کس حیثیت سے رہے گا؟ قوتِ دلائل کے لحاظ سے اور معنوی حیثیت سے تو بالکل ظاہر ہے لیکن اگر مادی، حربی، ملکی و سیاسی حیثیتیں مراد ہوں تو بھی اس وقت تک جو کیفیت یہود کی دنیا کے غالب حصہ میں ہے، وہ بھی ان کی فوقیت کا نہیں، ان کی پستی ہی کا اظہار کر رہی ہے۔

بہر حال احتمال اگرچہ دوسری شق کا بھی ہے لیکن اظہر و اغلب شقِ اول ہی ہے۔

ای ظاھرین قاھرین بالعزۃ والمنعة والحجة (معالم) المراد من ھٰذہ الفوقیة فوقیة بالحجة والدلیل (کبیر)

ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَیْنَكُمْ فِیْمَا كُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

پھر تم سب کی واپسی میری طرف ہوگی سو میں تمہارے درمیان اُس باب میں فیصلہ کروں گا جس میں تم (باہم) اختلاف کرتے رہتے تھے ۱۴۱

فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا

سو جن لوگوں نے کفر (اختیار) کیا انھیں دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۱۴۲

وَالْاٰخِرَةِ٘ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل (بھی) کئے سو اللہ انھیں ان کے پورے پورے

الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۵۷﴾

صلے دے گا اور اللہ ناانصافوں کو دوست نہیں رکھتا ۱۴۳

ای بالقهر والسلطان والاستعلاء (کبیر) یعلونهم بالحجة (کشاف۔ بیضاوی۔ بحر۔ جلالین۔ مدارک) فوقیة روحانیة دینیة۔ (المنار)

اور راغب نے اپنے لغت "مفردات القرآن" میں "فوق" کا ایک مفہوم فضیلتِ اُخروی کا دیا ہے اور اس کی مثال میں اسی ٹکڑے فوق الذین کفروا کو پیش کیا ہے۔

الٰی یوم القیٰمة۔ محاورہ میں اس سے مراد دوام یا ہمیشگی ہوتی ہے۔

وجعل التقیید بیوم القیٰمة للتأبید (روح) مستیقی کذٰلک ما دامت السمٰوٰت والارض (المنار)

۱۴۱ (اور وہ فیصلہ عملی شکل میں اور انقطاعی طور پر ہوگا، ورنہ جہاں تک حجت اور دلیل کا تعلق ہے وہ فیصلہ تو اس وقت بھی ہو چکا ہے)

مرجعکم خطاب یہاں مومن و کافر مسلمان و یہود و نصاریٰ سب سے ہے۔

فیه تختلفون۔ لفظ عام ہے لیکن سیاق میں جس اختلافی و نزاعی امر کا ذکر ہے وہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت ہے۔

۱۴۲ (جو انھیں اس گرفت سے بچا سکے)

فی الدنیا۔ دنیوی سزا کا حال تاریخ یہود کے صفحات سے پوچھ دیکھیے، کون سی تباہیاں ہیں جو اس دو ہزار سال کی مدت میں بیچاروں پر نہیں آچکی ہیں، بلکہ جیسا کہ جیوش انسائیکلوپیڈیا کے حوالہ سے پارۂ اول کے ایک حاشیہ میں گزر چکا ہے ان کی قومی ثروت و تمول کا خیال بھی ایک افسانہ ہی ہے ورنہ حقیقتاً قوم پر بجائے دولت کے افلاس مسلط ہے، جرمنی، اٹلی، ہنگری، روس، وغیرہ مختلف ملکوں سے جس بے سروسامانی سے انھیں چند ہی سال قبل نکلنا پڑا ہے، وہ داستانِ خونی ابھی تازہ ہے۔

والاٰخرة۔ رہی آخرت تو سزا کا پورا پورا ظہور تو وہیں ہوگا۔

۱۴۳ (اور ناانصاف اُن سے بڑا کون ہوگا، جو انبیاء و مرسلین کے باب میں افراط یا تفریط سے کام لیتے ہیں)

الظّٰلمین۔ ظلم کی حقیقت افراط و تفریط ہے یہاں ظالموں سے مراد یہود کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، جو حضرت عیسیٰؑ

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى

یہ جسے ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں، نشانیوں میں سے ہے اور پرحکمت مضمون میں سے ۱۴۴ے بے شک عیسیٰؑ کا حال اللہ

عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾

کے نزدیک مثل آدمؑ کے حال کے ہے، اللہ نے اُن کو مٹی سے بنایا پھر اُن سے کہا وجود میں آجاؤ چنانچہ وہ وجود میں آگئے ۱۴۵ے

کی نبوت و صداقت بلکہ شرافتِ نسب تک کے منکر تھے لیکن دوسری طرف اس کے تحت میں مسیحی بھی آئے جاتے تھے، جو حضرتؑ کو عبد کے بجائے معبود اور رسول کے بجائے مظہر یا اوتار قرار دے رہے ہیں اور اس طرح حضرتؑ کے باب میں یہود و نصرانی دونوں ہی ظالم ہیں یعنی مقامِ عدل و اعتدال سے بہت ہٹے ہوئے۔

الذین اٰمنوا اور عملوا الصالحات۔ یہ دو وصف الگ الگ بیان کرنے سے ظاہر ہوگیا کہ عملِ صالح کا اطلاق ایمان سے خارج ہے۔

وذالک یدل علی ان العمل الصالح خارج عن مسمی الایمان (کبیر)

۱۴۴ے (اے ہمارے پیغمبرؐ!)

ذالک۔ یعنی صحیح قصۂ مسیحؑ۔ اشارۂ بعید اظہارِ شرف و تکریم کے لئے ہے۔

اشارۃ الی ما تقدم من نبأ عیسیٰ وزکریا وغیرھما (کبیر) والاتیان بما یدل البعد للاشارۃ الی عظم شان المشار الیہ وبُعد منزلتہ فی الشرف۔ (روح)

من الاٰیات۔ یعنی آپ کی صداقت و نبوت کی نشانیوں میں سے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ حضرت مسیحؑ کے حالات و واقعات جن پر یہود اور نصرانیوں دونوں کی تاریخوں نے غلو و افتراء کے گہرے پردے ڈال رکھے ہیں یہ جو آپ قرآن کے ذریعہ سے بالکل صحیح و معتبر طور پر سنا رہے ہیں یہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ آپ مؤید من اللہ ہیں اور آپؐ وہی کہہ رہے ہیں جو عالم الغیب والشہادۃ آپؐ سے کہلا رہا ہے۔

الذکر الحکیم۔ اشارہ اس طرف ہے کہ آپ کی رسالت پر دلیل ہونے سے قطعِ نظر یہ مضامین بجائے خود بھی پرحکمت و پرمعرفت ہیں

۱۴۵ے (اسی طرح عیسیٰؑ ابن مریمؑ بشر محض اور حادث و مخلوق ہیں، انھیں قدیم اور غیر مخلوق کس طرح مان رہے ہو)

کمثل۔ یہ تمثیل کس لحاظ سے ہے؟ بشر محض ہوتے اور بغیر باپ کے پیدا ہونے میں ہے۔

والمثل ھنا لیس ھو المثل المستعمل فی التشبیہ بل بمعنی الحال والصفۃ العجیبۃ (روح)

اٰدم۔ جو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے اور پھر بھی بشر محض تھے۔

ای کصفتہ وحالہ العجیبۃ التی لا یرتاب فیھا مُرتاب (روح)

لہٗ۔ ضمیر حضرت آدمؑ کے خاکی پتلے کی طرف ہے، یہ جواب ہے اس مشہور مسیحی شبہ کا کہ جب مسیحؑ کی پیدائش ساری دنیا کے عام ضابطہ کے خلاف بغیر باپ کے توسط کے ہوئی، تو انھیں بجائے فوق البشر کے محض بشر کیسے تسلیم کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ آدمؑ کو بشر تو تم خود تسلیم کرتے ہو درآنحالیکہ اُن کی پیدائش تو عجیب تر طور پر واقع ہوئی تھی یعنی وہاں ماں اور باپ دونوں میں سے کسی کا بھی توسط نہ تھا، مخلوق ہونے اور حادث ہونے کا دار و مدار کسی خاص و متعین

اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ﴿٦٠﴾ فَمَنۡ حَآجَّكَ

یہ امرِ حق تیرے رب کی طرف سے ہے سو (کہیں) تو شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا ۱۴۶ پھر جو کوئی آپ سے اس باب

فِيۡهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ فَقُلۡ تَعَالَوۡا نَدۡعُ

میں حجت کرے بعد اس کے کہ آپ کے پاس علم (صحیح) پہنچ چکا ہے ۱۴۷ تو آپ کہہ دیجئے ۱۴۸

طرزِ ظہور و وجود پر نہیں، مطلق حدوث پر ہے، اور وہ آفرینشِ عیسیٰؑ میں پوری طرح موجود تھا۔

مسیحیوں میں ایک قدیم فرقہ ایرین ARIANS ہوا ہے، اس کا بانی ARIUS چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں اسکندریہ کا لاٹ پادری تھا، اس کی تعلیم یہی تھی کہ مسیحؑ قدیم وغیر مخلوق نہیں، مخلوق وحادث ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱ صفحہ ۵۰۰ طبع چہاردہم)

اس سے قبل انطیوخ (انطاکیہ) کے بطریق پال سموسطوی (مشہور و معروف پولوس طرسوسی سے اسے خلط نہ کیجئے) کی تعلیم تیسری صدی عیسوی میں یہی تھی کہ عیسیٰ مسیحؑ کی پیدائش ایک دوشیزہ کے بطن سے ہوئی تھی بہ واسطۂ روح القدس اس لئے وہ بشر محض تھے، روح القدس کے توسط نے انھیں بھی مقدس بنا دیا تھا، اور اس لئے وہ مسیحؑ تھے لیکن شریکِ الوہیت بہرحال نہ تھے (ایضاً جلد ۱۷ صفحہ ۳۹۵ نیز انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس جلد ۱ صفحہ ۱۷۱)

مسیحیوں کے صاحبِ فہم طبقہ میں برابر اس طرح کی تحریکیں صحیح عقیدہ کی اٹھتی رہی ہیں، لیکن کلیسا کے عام جمود و تصلب نے کبھی ان اصلاحی تحریکوں کو عام اور سرسبز نہ ہونے دیا۔

کن فیکون۔ ہو سکتا ہے کہ یہی کلمۂ تکوین ہو، اور مراد یہ ہے کہ جس وقت ارادۂ الٰہی کسی وجود کی خلقت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، معاً اس کی تکوین ہو جاتی ہے۔

یجوز ان تکون کلمة التکوین مجموع کن فیکون والمعنی ثم قال له کلمة التکوین التی ھی عبارة من توجه الارادة الی الشیٔ ووجوده بھا حالاً۔ (المنار)

۱۴۶ (اس حقیقت کے باب میں، اے مخاطب!)

قرآن مجید میں خطاب بہ صیغۂ واحد کہیں براہ راست رسول اللہ صلعم سے ہے اور کہیں مخاطب عام افرادِ امت ہیں اور ضمیرِ واحد حاضر دونوں کے لئے یکساں و مشترک ہے، دونوں کے درمیان فرق و امتیاز مفسر کے ذوق پر منحصر ہے، ان سطور میں زیادہ سے زیادہ اتباع مفسر تھانویؒ کے ذوق کا کیا گیا ہے۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ خطاب تو رسول اللہ صلعم سے ہے لیکن مراد آپ کی امت ہے، اس لئے کہ خود آپ سے تو اس کا احتمال ہی نہ تھا۔

الخطاب للنبی صلعم والمراد امته۔ (قرطبی)

الحق من ربک۔ یہ حقائق پروردگار عالم کی طرف سے بیان ہوئے ہیں، اس لئے شک وشبہ کی گنجائش سے بالاتر ہیں۔

فقہائے مفسرین نے آیت سے قیاسِ شرعی کی صحت پر استدلال کیا ہے۔

دلیل علی صحة القیاس۔ (قرطبی)

أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ

کہ اچھا آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بھی بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو بھی اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے آپ کو بھی

نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ

اور تمہارے تئیں بھی پھر ہم خشوع سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں ۱۴۹ بے شک یہی ہے سچا واقعہ

۱۴۷ (اے پیغمبر!)

فیہ۔ یعنی ربوبیت و الوہیت مسیح کے باب میں، اسی سورہ کے شروع میں جو حاشیے ہیں انھیں ایکبار پھر نظر میں لے آیا جائے۔ سورہ کا اصلی موضوع مسیحیت اور عقیدۂ الوہیت مسیح کا رد ہے۔ گفتگو نجران کے مسیحی وفد سے چل رہی ہے۔

فمن حاجک۔ یعنی ان مسیحیوں میں سے اب بھی کوئی آپؐ سے اپنی سخن پروری جاری رکھے۔

العلم۔ اور علم بھی کیسا؟ ظنی و تخمینی نہیں، حتمی، قطعی، یقینی۔

۱۴۸ (بہ طور اتمام حجت کے، اب جب کہ زبانی افہام و تفہیم اور دلائل کے سارے مرتبے طے ہو چکے اور مسیحی اپنی بات کی پچ پر اڑے ہوئے ہیں۔)

۱۴۹ اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں مباہلہ ہے۔ مباہلہ میں ہر فریق اپنے کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور تضرع و الحاح کے بعد اسی کے فیصلہ کا منتظر رہتا ہے۔

ندع۔ ضمیر متکلم سے مراد ہر دو فریق اور ان کے افراد ہیں۔

ابناء۔ ابن سے محض صلبی ہی بیٹے مراد نہیں ہوتے نواسے، داماد وغیرہ سب اس میں آجاتے ہیں۔ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے اس امر پر استدلال ہو سکتا ہے کہ نواسے پر "ابن" (بیٹے) کا اطلاق جائز ہے۔

ثبت ان ابن البنت قد یسمّی ابنا۔ (کبیر)

نساء۔ بیویاں اور بیٹیاں دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ۹ھ ہجری میں مسیحیان نجران کے چودہ اکابر رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، گفتگو الوہیت مسیح کے مسئلہ پر رہی۔ اسلامی عقیدہ بالکل صاف اور واضح تھا لیکن مسیحی نمایندے اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار آپؐ نے وہی کیا جو ایک سچا اور مخلص دیندار ایسے موقع پر کرتا۔ آپؐ نے فرمان خداوندی کے ماتحت مسیحیوں کو مباہلہ کی دعوت دے دی کہ زبانی گفتگو تو بہت ہو چکی اب آؤ ہم تم اپنے خاص اقربا کو لے کر اپنے پروردگار ہی سے بہ تضرع و الحاح عرض کریں کہ جو فریق ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو۔ آپ نے یہ فرمایا اور اپنی اولاد حقیقی و حکمی یعنی سیدہ فاطمہؓ، سیدنا علیؓ، سیدنا حسنؓ اور سیدنا حسینؓ کو ہمراہ لے کر آپؐ تشریف لے آئے لیکن تاریخ کے راوی کا بیان ہے کہ مسیحیوں کی ہمت عین وقت پر جواب دے گئی اور بجائے اس آزمائش میں پڑنے کے عافیت اسی میں نظر آئی کہ جزیہ دے کر اور ذمی رعایا بن کر اسلامی حکومت میں رہنا گوارا کر لیا جائے۔ سر ولیم میور مسلمان نہیں انیسویں صدی کے مسیحی تھے، اور محض مسیحی نہیں مشنری بھی، اُن کے قلم سے ملاحظہ ہو:۔

"سارے واقعہ میں محمد کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے نیز ان کے اس عقیدہ کی شہادت کہ اُن کا تعلق

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾

کوئی معبود نہیں ہے بجز اللہ کے اور بے شک اللہ ہی تو زبردست ہے حکمت والا ہے ۱۵۰

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ

سو اگر یہ (اب بھی) سرتابی کریں تو بے شک اللہ خوب جاننے والا ہے مفسدوں کا ۱۵۱ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب!

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا

ایسے قول کی طرف آجاؤ جو ہم میں اور تم میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہم بجز اللہ کے اور کسی کی نہ عبادت کریں اور

نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں ۱۵۲ اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا پروردگار ٹھہرائے ۱۵۳

عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اور اس لئے حق تمام تر انھیں کے ساتھ ہے، درآنحالیکہ اُن کے خیال میں مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے اور کچھ نہ تھا۔" (میور کی "لائف آف محمد" صفحہ ۲۶۰)

**۱۵۰** (نہ کہ کوئی اور)

انّ هٰذا۔ یعنی یہ سارا سلسلۂ واقعات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح و مادرِ مسیح دونوں بشر محض تھے۔

اے المذکور فی شان عیسیٰ علیہ السلام قاله ابن عباس (روح) اے ما قص من نبأ عیسیٰ ومریم (بیضاوی) وقیل الضمیر للقصر والتاکید وعلیه الجمهور (روح)

ما من اله الا الله۔ کوئی بھی شریکِ الوہیت نہیں، نہ بلحاظ ذات اور نہ بلحاظ صفات، اور اقنوم وغیرہ کے قصے سب خرافات ہیں۔

من۔ زائد و تاکیدِ کلام کے لئے۔

من زائدة للتوکید (قرطبی) فی افادة معنی الاستغراق (کشاف)

القصص۔ اسم ہے جس سے مصدر کا بھی کام لیا جاتا ہے۔

القصص بالفتح وضع موضع المصدر للشئ ما هو اغلب علیه (جوهری) مصدر واسم (اقرب)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں فعل بہ معنی مفعول استعمال ہوا ہے۔

اے هنا فعل بمعنی مفعول اے المخصوص الحق۔ (روح)

العزیز۔ ہر ارادہ پر غالب۔ قادرِ مطلق۔ اس صفت میں مسیح وغیرہ کوئی بھی باری تعالے کا شریک نہیں۔

الحکیم۔ حکیم مطلق، ہر جزوی اور ہر کلی ارادہ میں حکیم اس صفت میں مسیح وغیرہ کوئی بھی باری تعالیٰ کا شریک نہیں۔

**۱۵۱** (اور اپنے اسی علمِ کامل و محیط کے مطابق ہر ایک کو سزا دینے والا)

فان تولوا۔ یعنی اتنی توضیحات کے بعد بھی اپنی سرتابی جاری رکھیں۔

المفسدین یعنی جو لوگ دین و اعتقاد میں فساد برپا کرتے ہیں اور بجائے توحید کے شرک کی طرف بلاتے رہتے ہیں۔

ای من عدل عن الحق الی الباطل فھو المفسد (ابن کثیر) الذین یعبدون غیراللہ ویدعون الناس الی عبادۃ غیراللہ۔ (معالم)

**۱۵۲** (نہ فرزند کہہ کر، نہ اقنوم ٹھہرا کر، نہ مظہر یا اوتار بنا کر نہ کسی اور حیثیت سے)

لانعبد الا اللہ۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی صدی بعد کی چیز ہے، قرآن کے معاصر جو مسیحی تھے، وہ کیتھولک فرقہ یا کلیسائے رومی کے متبع تھے اور اس فرقہ میں مسیح پرستی اور روح القدس پرستی تو خیر تھی ہی اس کے علاوہ بھی خدا معلوم او کتنی پرستیاں موجود تھیں، مریم پرستی، پاپا پرستی، ولی پرستی وغیرہا، آیت کا یہ ٹکڑا شرک کی جلی خفی ساری صورتوں کی تردید کر رہا ہے۔

قل۔ خطاب رسول اللہ صلعم کو ہے۔

اھل الکتاب۔ لفظ کی تشریح سورۂ بقرہ کے حاشیوں میں ہو چکی ہے، مراد یہود و نصاریٰ دونوں ہو سکتے ہیں، گو یہاں اصلاً اشارہ نصرانیوں ہی کی جانب ہے۔

کلمۃ۔ صیغۂ واحد میں ہے لیکن اس سے مراد صیغۂ جمع، کلمات بھی ہوتی ہے اور یہ کلام کے مرادف استعمال ہوتا ہے۔

عبّر بالکلمۃ عن الکلمات لان الکلمۃ قد تطلقھا العرب علی الکلام والی ھٰذا ذھب الزجاج (بحر)

الکلمۃ تطلق علی الجملۃ المفیدۃ (ابن کثیر) والعرب تسمّی کل قصۃ لنا شرح کلمۃ (معالم)

بیننا۔ اس صیغۂ جمع متکلم سے مراد مسلمان ہیں۔

سوآءٍ بیننا وبینکم۔ یعنی وہ اصل جو ہم کو تم کو دونوں کو مسلّم ہے، جس کی قدر و قیمت و افادیت پر ہم سب کو اتفاق ہے جس کی تعلیم تمہارے ہاں کے پیمبران برحق ہمیشہ دیتے آئے ہیں، اور یہودیت و نصرانیت دونوں دینوں کی بنیاد ہی اسی اصل پر ہے۔ توریت تو خیر تاکید توحید و ممانعت شرک سے لبریز ہی ہے، انجیل تک میں بھی یہی تعلیم موجود ہے:" تو خداوند خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔" (متی۔ ۴:۱۰)

انجیل میں یہ کہیں بھی نہیں ہے، نہ صراحۃً نہ اشارۃً کہ کچھ پرستش صرف خدا کی کرو اور بعض پرستشوں میں خدا کے ساتھ فرزند خدا اور روح القدس کو بھی شامل کر لیا کرو۔

**۱۵۳** (کہ عملاً اسے مرتبۂ خدائی پر رکھ دے)

اربابًا من دون اللہ۔ مخلوق پرستی اور مخلوق کی الوہیت کی تردید تو اوپر ہو چکی، اب تردید مخلوق کی ربوبیت کی ہو رہی ہے، مخلوق میں سے کسی کو مطاع مطلق مان لینا بھی اس کو رب قرار دے لینا ہے۔

دون۔ یہاں غیر یا بجز کے معنی میں ہے۔

دون ھنا بمعنی غیر۔ (قرطبی)

پاپا کی عصمت کیتھولک مسیحیوں کا اور پادریوں کے اجماع یعنی کلیسا CHURCH کی عصمت کل مسیحیوں کا متفقہ عقیدہ ہے: "ایک محسوس کلیسا کے بغیر نجات ممکن نہیں، اس پر ہمیشہ روح القدس کا سایہ رہتا ہے، اس لئے مسائل میں کلیسا سے امکان خطا ہی نہیں۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۹۴۰)

قرآن مجید نے انسان کی ان ساری خود ساختہ عصمتوں پر ضرب لگا دی، یہیں سے ان گمراہ فرقوں کی بھی تردید نکل آئی جو اپنے مرشدوں یا اماموں کے مجرد قول بلا دلیل شرعی کو واجب القبول ٹھہراتے ہیں۔

فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡهَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۶۴﴾ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ

پھر اگر وہ روگردانی کریں تو تم کہہ دو ۱۵۴ کہ گواہ رہنا ہم تو فرمانبردار ہیں ۱۵۵ اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے

تُحَآجُّوۡنَ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَمَاۤ اُنۡزِلَتِ التَّوۡرٰٮةُ وَالۡاِنۡجِيۡلُ اِلَّا مِنۡۢ

میں کیوں جھگڑ رہے ہو ۱۵۶ درآنحالیکہ توریت وانجیل تو ان کے بعد ہی اتری ہیں تو تم عقل سے

بَعۡدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۵﴾ هٰۤاَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ

کام کیوں نہیں لیتے ۱۵۷ ہاں تم لوگ وہی تو ہو جو اس امر میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تو علم تھا

فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا لَـيۡسَ لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۶﴾

سو (اب) ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں (کچھ بھی) علم نہیں اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۱۵۸

ھذا یدل علی بطلان القول بالاستحسان المجرد الذی لایستند الی دلیل شرعی وفیہ رد علی الروافض الذین یقولون یجب قبول قول الامام دون ابانۃ مستند شرعی (قرطبی) ای لانطیع احبارنا فی ما احدثوا من التحریم والتحلیل (مدارک) انزلوھم منزلۃ ربھم فی قبول التحریم والتحلیل (بحر) کسی کو رب قرار دینے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ اس لفظ کا بھی اطلاق اس پر کیا جائے بلکہ اس کے اندر اگر صرف صفاتِ ربوبیت مان لئے گئے تو عملاً وہ رب ٹھہر ہی گیا۔

وان لم یطلقوا علیہ لفظ الرب الا انھم اثبتوا فی حقہ معنی الربوبیۃ۔ (کبیر)

بعضنا بعضاً۔ مفسر ابن حیان نے اس سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ الوہیت وربوبیت کی تردید تو بس اسی ایک فقرہ میں ہو گئی جب ایک دوسرے میں تثلیث اور رشتۂ ہم نسبی قائم ہو گیا تو سب بندے ہونے کی حیثیت سے برابر ہو گئے الوہیت وربوبیت اب باقی ہی کہاں رہ گئی۔

وفی قولہ بعضنا بعضاً اشارۃ لطیفۃ وھی ان البعضیۃ تنافی الالھیۃ اذھی تماثل فی البشریۃ (بحر)

**۱۵۴** (اے مسلمانو!)

یعنی اگر اب بھی قبولِ حق سے روگردانی کرتے رہیں اور اپنے اس گڑھے اور ٹھہرائے ہوئے شرک سے باز نہ آئیں۔

**۱۵۵** (اور بہرحال وبہر صورت ہم ہی توحید خالص کے علمبردار و مبلغ ہیں)

مسلمون۔ لفظی معنی فرمانبردار کے ہیں اور یہی اصطلاحی نام بھی اس امت کا پڑ گیا۔

اشھدوا۔ اور یہود ونصاریٰ تو آج بھی مسلمانوں کی توحید خالص کی شہادت دے رہے ہیں قرآن مجید کے اعجاز بیان کا ایک مزید نمونہ!

**۱۵۶** (اور انہیں خواہ مخواہ یہودی یا نصرانی ٹھہرا رہے ہو)

خطاب یہود ونصاریٰ دونوں سے ہے۔

فی ابراھیم۔ یعنی ابراہیمؑ کے دین ومذہب کے بارہ میں۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا

ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ راہِ راست والے مسلم تھے اور مشرکوں میں سے بھی نہ تھے ۱۵۹

مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ

بے شک ابراہیمؑ سے سب سے قریب لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی تھی، اور یہ نبی ہیں۔

لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

اور وہ لوگ ہیں جو (اُن پر) ایمان لائے اور اللہ ایمان لانے والوں کا حامی ہے ۱۶۰

لِمَ مخفف ہے لما کا خبر کے التباس سے بچانے اور محض استفہام کا مفہوم رکھنے کے لئے آخر سے الف گرا دیا گیا۔

الاصل لما فحذف الالف فرقا بین الاستفهام والخبر۔ (قرطبی)

**۱۵۷** یعنی جن کتابوں کو تم اپنی نام نہاد یہودیت اور نصرانیت کی بنیاد قرار دیتے ہو وہ تو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد کی چیزیں ہیں تو کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو کہ متاخر کتابوں کے سہارے اپنا مذہب ان تک سرچڑکانا چاہتے ہو۔

**۱۵۸** یعنی اسی دینِ ابراہیمی سے متعلق مراد یہ ہے کہ جب تم توریت و انجیل ہی کے مسائل میں بھٹکے اور ایسا بھٹکے حالانکہ ان کا کچھ تو واقفیت اور علم تمھیں حاصل تھا تو اب دینِ ابراہیمی کے بارے میں کیوں کٹ حجتی پر تلے ہو جس کے بارے میں تو شائبۂ علم بھی تمھیں حاصل نہیں

ھانتم میں ھا کا اشارہ مخاطبین کی تحقیر و تنقیص کے لئے ہے۔

والاشارۃ للتحقیر والتنقیص۔ (روح)

**۱۵۹** (بلکہ شرک سے سخت بیزار تھے اور دنیائے شرک میں توحید کے پہلے علمبردار)

حنیفًا مسلمًا۔ ٹھیٹھ اردو میں "سیدھے سادھے مُسلم"۔

یھودیا ولا نصرانیا۔ جس یہودیت اور جس نصرانیت کی نفی ہو رہی ہے وہ رواج پائی ہوئی گڑھی ہوئی یہودیت اور نصرانیت ہے ورنہ اصل حقیقت کے اعتبار سے جو دین حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تھا وہی حضرت ابراہیمؑ کا بھی تھا حضرت کی توحید پرستی یہود و نصاریٰ دونوں کو مُسلّم تھی حضرتؑ کے دینِ توحید پر حاشیے پارۂ اول کے رکوع آخر میں گزر چکے فقہائے مفسرین نے لکھا ہے کہ ان آیتوں سے دینِ حق کی حمایت میں دلائل قائم کرنے اور اہلِ باطل کے جواب دینے کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔

وفی ھذہ الآیات دلیل علی وجوب المحاجۃ فی الدین واقامۃ الحجۃ علی المبطلین (جصاص)

**۱۶۰** (دنیا اور آخرت دونوں میں)

اولی الناس بابراھیم۔ ابراہیمؑ سے قرب بہ لحاظ دین و عقائد۔

للذین اتبعوہ۔ وہ لوگ جنھوں نے آپؑ کے زمانہ میں آپؑ کی پیروی کی تھی۔

وھذا النبی۔ اور یہ نبی جو گویا اُنھی کا پیام لے کر آئے ہیں اور انھی کی نیابت اِس زمانہ میں کر رہے ہیں۔

والذین امنوا۔ یعنی مسلمان فرنگی مورخین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم اسرائیلی مذہب کا جانشین اب گویا

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا

اہل کتاب میں سے ایک گروہ تو یہی چاہتا ہے کہ تمھیں گمراہ کرکے رہیں حالانکہ وہ بجز اپنے اور کسی کو بھی گمراہ

يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

نہیں کرتے اور (اس کی بھی) خبر نہیں رکھتے ۱۶۱ اے اہل کتاب اِتم اللہ کی آیتوں سے

تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ

کیوں انکار کئے جاتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو ۱۶۲ اے اہل کتاب اِتم حق کی تلبیس

تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع

ع ۷/۸ ۱۵

باطل کے ساتھ کئے جاتے اور حق کو چھپا جاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہوتے ہو ۱۶۳

تو وہ مسیحیت نہیں جس کے اندر یونان اور روم کے جاہلی مشرکانہ عقائد جمع ہو گئے ہیں، بلکہ اسلام ہے' ملاحظہ ہو "مورخین کی تاریخ عالم" HISTORIANS HISTORY OF THE WORLD

۱۶۱ روایتوں میں آتا ہے کہ یہود کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے' اور انھیں باطل کی قوت پر اتنا غرہ تھا کہ خود تو اسلام قبول کرنا الگ رہا' مسلمانوں کو بھی ان کے عقائد سے برگشتہ کردینے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ آج بھی کتنے مسیحیوں کے دل میں یہ تمنا چٹکیاں لے رہی ہے کہ مسلمان خواہ مسیحیت قبول کریں یا نہ کریں لیکن اسلامی عقائد سے تو ڈگمگا ہی جائیں۔

طائفۃ من اھل الکتاب۔ خاص اشارہ یہود کی جانب ہے۔

یضلونکم۔ خطابِ عام مسلمانوں سے ہے۔

مایضلون الا انفسھم۔ یعنی حقیقۃً وہ مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں تو کیا ہوتے نہیں خود اپنے ہی نامۂ اعمال کو اور زیادہ سیاہ کرتے رہتے ہیں۔

مایشعرون۔ یعنی ایسے بے عقل و نافہم ہیں کہ حقیقتِ حال کا مطلق شعور نہیں رکھتے۔

۱۶۲ (ان کی واقعیت و صداقت کے)

بایٰت اللہ۔ یعنی اللہ کی ان آیتوں سے جو خود تمھاری کتابوں کے اندر موجود ہیں اور جن میں نبوتِ محمدی کی پوری پوری علامتیں اور بشارتیں درج ہیں۔

وانتم تشھدون۔ یعنی یہ انکار کچھ ناواقفیت اور لاعلمی کی بنا پر نہیں' جان بوجھ کر ان آیتوں میں تحریف کررہے ہو لفظی بھی اور معنوی بھی۔

۱۶۳ یہاں یہود پر تین الزامات متعین طور پر لگائے گئے ہیں:۔

۱۔ تلبسون الحق بالباطل۔ اپنی کتابوں کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں کہ حق بالکل باطل کے تحت میں دب کر

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے ۱۶۴ کہ ایمان لانے والوں پر جو نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

دن کے آخر میں اس سے انکار کر بیٹھو، عجب کیا کہ (وہ بھی) پھر جائیں ۱۶۵

رہ جاتا ہے، باطل حق کو ڈھانپ لیتا ہے اور تاویل بڑھ کر صریح تحریف بن جاتی ہے۔

فسر اللبس بالخلط والتغطية (بحر)

۲۔ تکتمون الحق۔ حق کو سرے سے چھپا ڈالتے ہو اور جہاں جہاں بشارتیں ظہورِ اسلام کی صاف موجود ہیں وہاں عبارتیں کچھ کی کچھ کر دیتے ہو۔

۳۔ وانتم تعلمون۔ یہ سب کچھ اپنے قصد و ارادہ سے کر رہے ہو، محض اتفاقی طور پر یہ نہیں ہو رہا ہے، تحریفاتِ اہل کتاب پر حاشیئے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔

**۱۶۴** (آپس میں)

قال بعضهم لبعض (قرطبی) فی ما بینهم (مدارک)

یہ اشارہ ہے یہودِ خیبر و عرینہ کی جانب۔

كان احبار قرى عرينة اثنى عشر حبرا فقالوا لبعضهم ادخلوا فی دين محمد اول النهار فاذا كان اخر النهار فاكفروا (ابن جرير)

**۱۶۵** (اس چال اور تدبیر سے)

اٰمنوا وجه النهار۔ یہاں ایمان اظہارِ ایمان کے معنی میں ہے یعنی صبح ایمان ظاہر کرو۔

ای اظهروا الايمان (كشاف) ادخلوا فی دين محمد باللسان دون الاعتقاد (معالم عن الحسن وقتادہ)

والمراد اظهروا الايمان لا يمكن ان يراد به التصديق۔ (بحر)

وجه النهار۔ یعنی صبح، دن کا اول حصہ۔

یعنی اوله (قرطبی) اول النهار (بیضاوی)

انزل على الذين اٰمنوا۔ یعنی جو ان مومنین کے خیال میں ان پر نازل ہوا ہے۔

ای على زعمهم۔ (بحر)

لعلهم۔ ضمیر اُن لوگوں کی جانب ہے جو واقعۃً مسلمان تھے۔

مدینہ و مضافاتِ مدینہ کے یہود کی چالیں مسلمانوں کے خلاف عجیب عجیب ہوتی تھیں، ایک بار آپس میں صلاح و مشورہ کے بعد یہ سوچا کہ ہم میں بعض صبح کے وقت صداقتِ اسلام کا اقرار کر لیا کریں اور پھر چند گھنٹوں کے بعد اس اقرار سے رجوع کر لیا کریں اور کہہ دیا کریں کہ غور و فکر اور مطالعۂ توریت کے بعد اس نئے دین کی تصدیق نہ ہوئی اس لئے ہم اس سے نکل آئے ہیں، اہلِ عرب پر ہمارے علم و اخلاق دونوں کی دھاک تو بیٹھی ہی ہوئی ہے لوگ کہیں گے آخر کوئی خرابی

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ

اور واقع میں بجز اس کے کہ جو تمہارے دین کا پیرو ہو اور کسی پر ایمان نہ لاؤ، آپ کہہ دیجیے کہ ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے ۱۶۶

اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ

اور یہ سب اس غصہ میں کر رہے ہو کہ کسی اور کو وہ چیز مل گئی جو تمہیں ملی تھی یا وہ لوگ تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں غالب آجائیں ۱۶۷

قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۷۳﴾

آپ کہہ دیجیے کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جسے جو چاہے عطا کرتا ہے ۱۶۸ اور اللہ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے ۱۶۹

یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ

وہ جسے چاہے اپنی رحمت کے ساتھ خاص کر لیتا ہے

تو اس نئے دین میں ہے جو ایسے ایسے لوگ اس سے باہر نکل گئے، اور عجب نہیں کہ اس تدبیر سے کچھ پرانے مسلمان بھی اکھڑ جائیں۔ تاریخ یہود میں منافقت کی یہی ایک مثال نہیں، خود اُن کی کتابوں میں یہ واقعہ بصراحت درج ہے کہ بارھویں صدی عیسوی میں جب اسپین میں اسلامی حکومت تھی تو حکومت کے "مظالم" فرضی یا واقعی کی بنا پر بہت سے یہود نے اپنے ربّیوں کی اجازت اور فتوٰی کے مطابق اپنے قبولِ اسلام کا اظہار شروع کر دیا تھا درآنحالیکہ دل میں سب کے سب منکر ہی تھے (جیوش انسائیکلوپیڈیا، جلد اول ص۴۳۲ و ص۴۳۳) اور آج یہ جو بڑے بڑے فرنگی "محققین" یہود و مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرۃ نبوی لکھنے کا طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اپنے علم و تحقیق، وسعتِ مشرب و بے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھاتے ہیں اور معلوم یہی ہونے لگتا ہے کہ "پیغمبر عرب" اور "مصلحِ عالم" کی نعت اور "مقننِ اعظم" اور "مثیلِ موسیٰ" کی منقبت میں دریا کے دریا بہا دیں گے لیکن آگے چل کر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) انہیں کچھ خللِ دماغ سا تھا یا یہود و نصاریٰ کی کتابوں کے مضامین کہیں سے سن سنا کر انہیں چرا لیتے تھے، وقس علیٰ ہذا، تو یہ بھی ٹھیک اسی قدیم یہودیانہ دجل و تلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے اور بس۔

۱۶۶ یعنی حقیقۃً اور دل سے تصدیق تو بس اپنے ہی والوں کی کیا کرو — وہی یہود کا قول چل رہا ہے۔

۱۶۷ (جواب اسلام کے نام سے ظاہر ہوئی ہے اور جس کی صداقت پر دلائلِ عقلی و نقلی قائم ہیں، نہ کہ تمہارے محدثات و مخترعات) قُلْ۔ خطاب پیغمبر علیہ السلام سے ہے، اور یہ فقرہ کلامِ یہود کے جواب میں ہے۔

۱۶۸ (اور اسی ڈر سے سہمے جا رہے ہو)

مِثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ۔ یعنی دولتِ نبوت خطاب قومِ یہود سے ہے یعنی تمہیں اصل خلش تو بس اس کی ہے کہ انبیاء تو ہمیشہ ہماری نسل و قوم سے پیدا ہوتے رہے ہیں اب ایک عرب اور اسمٰعیلی کو یہ دولت کیسے ملی جا رہی ہے۔

یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ۔ یعنی قیامت کے دن مسلمان یہود پر یہ کہہ کر غلبہ نہ حاصل کر لیں کہ ان لوگوں نے بھی تو دنیا میں

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ

اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے ۱۷۰ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تو اس کے پاس

بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ

ایک ڈھیر (کا ڈھیر) امانت رکھا دے تو (بھی) وہ تجھے ادا کردے ۱۷۱ اور ان میں سے کوئی ایسا بھی ہے کہ اگر تو اس کے پاس

اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا

ایک دینار امانت رکھا دے تو وہ تجھے اس کو واپس نہ کرے بجز اس صورت کے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے ۱۷۲ یہ اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ

فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

ہمارے اوپر اُمّیوں کے باب میں کوئی ذمہ داری ہی نہیں یہ لوگ اللہ کے اوپر جھوٹ گڑھتے ہیں درآنحالیکہ خوب جان رہے ہیں ۱۷۳

ہماری تصدیق کی تھی۔

مفسر واحدی نے کہا ہے کہ یہ آیت تفسیر کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے (روح)

**۱۶۹** (اپنی حکمتِ مطلقہ اور مصلحتِ کاملہ کے مطابق)

قُلْ۔ خطاب پیغمبر علیہ السلام سے ہے۔

وَاسِعٌ۔ اس کے کارخانۂ فضل و عطا میں کمی نہیں پھر یہ کیوں فرض کرلیا گیا کہ فلاں نسل یا قوم نعمتِ نبوت سے ہمیشہ محروم ہی رہے گی۔

عَلِيْمٌ۔ وہ اپنے علمِ کامل کے مطابق جس کی جیسی استعداد دیکھتا ہے اُسے وہ نعمت عطا کردیتا ہے۔

**۱۷۰** (بخل اور کمی کا اس کے ہاں گزر کہاں)

مَنْ يَّشَآءُ۔ وہ جسے چاہتا ہے حسبِ مصلحتِ تکوینی۔

**۱۷۱** (بہ احتیاط و دیانتِ تمام)

یعنی یہود سب کے سب یکساں نہیں بعض ان میں سے ایسے ایسے امین و متدین بھی ہیں، یہی لوگ آگے چل کر مسلمان ہوگئے یہود اُس وقت مدینہ و حوالیٔ مدینہ میں ساہوکار یا مہاجن کی حیثیت رکھتے تھے اس لئے مالی امانتیں بھی اُنھیں کے پاس اکثر رکھا دی جاتی تھیں

**۱۷۲** یہود کے حُبِّ زر کی یہ کتنی صحیح تصویر ہے۔

دینار (DENARIUS) رومی حکومت کا ایک طلائی سکہ، عرب میں بھی مستعمل تھا، آج بھی یورپ کے مختلف حصوں میں چل رہا ہے اردو میں اس کا مفہوم اشرفی سے ادا ہوسکتا ہے انجیل میں بھی اس کا ذکر کئی بار آیا ہے۔

مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا۔ یعنی وہ ادائے امانت میں برابر حیلہ و حوالہ کرتا رہے گا اور اس سے تقاضا برابر جاری رکھنا پڑے گا "قیام" کے لفظی معنی مراد نہیں کہ واقعۃً کھڑا ہی رہنا پڑے اور چلنے یا بیٹھنے یا لیٹنے کی نوبت نہ آئے۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ

کیوں نہیں جو شخص بھی اپنے عہد کو پورا کرے اور (اللہ سے) ڈرے تو بے شک اللہ سے ڈرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے ۱۷۴

الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ

بے شک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو قلیل قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں ۱۷۵ یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے

لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ

کوئی حصہ آخرت میں نہیں اور اللہ قیامت کے دن نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا،

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

اور نہ انھیں پاک کرے گا اور ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے ۱۷۶

ای ثابتًا علی طلبه (راغب) اراد بالقاء ادامة المطالبة لاعين القيام (قرطبی) ای دائمًا ثابتًا فی مطالبتك اياه فی المال (کبیر) قال ابو علی الفارسی القيام فی اللغة بمعنی الدوام والثبات (کبیر)

۱۷۳ (کہ ایسا کوئی مسئلہ ہرگز شریعتِ اسرائیلی وموسوی میں موجود نہیں)

الْاُمِّيّٖنَ یعنی اُمّ القریٰ مکہ کے باشندے، یہود نسلی فخر و عصبیت اور قومی غرور سے بھرے ہوئے یہود اہلِ مکہ کو اپنے سے بہت فروتر رکھتے تھے۔

لیس علینا فی الامیین سبیل۔ یہود غیر یہود یا GENTILES کے ساتھ کاروباری تعلق کے سلسلہ میں بدمعاملگی کے لئے برابر بدنام رہے ہیں۔ قومی مفاخرت اور نسلی نخوت کا نتیجہ عموماً یہی ہوتا ہے گوروں کا برتاؤ کالوں کے ساتھ آج دنیا کے ہر علاقہ میں کیا ہے؟

سبیل۔ سبیل کے معنی یہاں حجۃ کے ہیں اور یہ معنی قرآن اور کلامِ عرب میں عام ہیں۔

ويعبّر به عن الحجة (راغب) السبيل الحجة وقوله فاولٰٓئك ما عليهم من سبيل من هذا المعنی وهو كثيرٌ فی القراٰن وكلام العرب (بحر)

يقولون علی الله الكذب۔ یہ جھوٹے ہیں اپنے اس دعوٰی اور اس انوکھے اصولِ مذہب و اخلاق میں۔ اس تفصیل نے یہود کے جرم کی شناعت کہیں زیادہ بڑھا دی، وہ صرف فسقِ عمل ہی میں مبتلا نہ تھے، بلکہ ایک بے اصل عقیدہ بھی گڑھ لیا تھا، اور اعمال سے کہیں گزر کر عقائد کی خرابی میں مبتلا ہو چکے تھے۔

۱۷۴ (اور یہی خوفِ خدا اور تقوٰی ہی ساری خوش معاملگی کی بنیاد ہے)

بلٰی۔ یعنی ذمہ داری کیوں نہ ہوتی، ہے اور ضرور ہے۔

عهده۔ عہد، خالق کے ساتھ ہو یا مخلوق کے، اس کی پابندی بہرحال لازمی ہے، امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا

اور انھیں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنی زبانوں کو کتاب میں کج کرتے ہیں ۱۷۷ تاکہ تم اُس (جزو) کو بھی کتاب میں سے

هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ

سمجھو درآنحالیکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے درآنحالیکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور

وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ

یہ اللہ پر جھوٹ گڑھتے ہیں درآنحالیکہ (خوب) جانتے ہوتے ہیں ۱۷۸ کسی بشر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تو اُسے

اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ

کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ تم میرے بندے بن جاؤ بجائے اللہ کے ۱۷۹ بلکہ

اللّٰهِ وَلٰـكِنۡ كُوۡنُوۡا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡكِتٰبَ وَبِمَا كُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾

(وہ تو یہی کہے گا) کہ اللہ والے بن جاؤ ۱۸۰ (یہ) اس لئے (اور بھی) کہ تم پڑھاتے ہو کتاب (آسمانی) کو اور خود بھی (اُسے) پڑھتے ہو ۱۸۱

آیت سے وفاءِ عہد کی بڑی تعظیم نکل رہی ہے اس لئے کہ تمام طاعات کا خلاصہ صرف دو ہی چیزیں ہیں، ایک احکامِ الٰہی کی تعظیم، دوسری خلق اللہ پر شفقت، اور وفاءِ عہد ان دونوں قسموں کی طاعتوں کا مجموعہ ہے (کبیر)

**۱۷۵** یعنی کسی دنیوی طمع میں آکر ان پابندیوں کو توڑ رہے ہیں۔

ثمنًا قلیلًا۔ دُنیوی معاوضہ ہمیشہ اُخروی اجر کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوگا، یہ مراد نہیں کہ اگر زیادہ معاوضہ مل رہا ہو تو بددیانتی اور عہد شکنی جائز ہو جائے گی۔ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اپنے معاہدوں کی پابندی نہ کرنا اور بدمعاملگی کر بیٹھنا کسی بھی معاوضہ پر جائز نہیں۔

عھد اللہ۔ یعنی وہ عہدِ متابعت جو اللہ سے کر چکے ہیں۔

ایمانھم۔ یعنی جو قسمیں آپس میں معاملات سے متعلق کھاتے رہتے ہیں۔

فقہاء مفسّرین نے آیت کے تحت میں لکھا ہے کہ جو فریق یہ جانتا ہے کہ وہ باطل پر ہے، وہ اس بنا پر اپنے کو حق پر قرار نہیں دے سکتا کہ عدالتِ ظاہری سے فیصلہ اس کے موافق ہو گیا ہے۔

ودلت ھٰذہ الاٰیۃ والاحادیث ان حکم الحاکم لا یحلّ المال فی الباطن بقضاء الظاھر اذا علم المحکوم لہ بطلانہ (قرطبی)

**۱۷۶** (اس کفر و فسق کے پاداش میں)

لاخلاق۔ یعنی بھلائی کا کوئی حصہ نہیں۔

اے لاخیر۔ (بخاری)

لا یکلمھم۔ یعنی بطریق لطف اُن سے خطاب نہ کرے گا، جو خطاب برائے عتاب و مواخذہ ہو اس کی نفی مراد نہیں۔
لا ینظر الیھم۔ یعنی نگاہِ مہر و التفات سے ان کی طرف نظر نہ کرے گا، نگاہِ قہر کی نفی مراد نہیں۔
لا یزکّیھم۔ یعنی گناہوں کی گندگی سے پاک صاف نہ کرے گا۔
الیم۔ درد پہنچانے والے یا مؤلم کے معنی میں ہے۔
اے مؤلم موجع من الالم وھو فی موضع مُفعِل (بخاری)
**۱۷۷ا** (اپنے صحائفِ آسمانی پڑھتے وقت)
منھم۔ یعنی انھیں یہود میں۔
یلوٗن السنتھم۔ اس کے اندر تحریفِ لفظی و معنوی کی ساری صورتیں آگئیں، لَیِّ لسان سے عربی محاورہ میں مراد یہی ہوتی ہے جھوٹ، تلبیس، تحریف۔
لوی لسانہ بکذا کنایۃ عن الکذب وتخرّص الحدیث (راغب)
اور یہاں تحریف بالقصد مراد ہے۔
والمعنی یحرّفون الکلم ویعدلون بہ عن القصد (قرطبی)
**۱۷۸ا** یعنی ان کی یہ تحریفیں دانستہ ہوتی ہیں۔
لتحسبوہ۔ میں ضمیر مخاطب سے مراد سامعین ہیں اور ضمیر غائب سے مراد کتاب کا اختراعی حصہ۔
وھو المحرّف (کبیر)
یقولون۔ ضرور نہیں کہ ان کا یہ کہنا لفظاً و صراحتہً ہو، اگر اجمالاً و دلالتہً ہو جب بھی کافی ہے۔
وَمَا ھو من عند اللہ۔ فقیہ جلیل ابوبکر رازیؒ نے اس کے تحت میں لکھا ہے کہ آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ معاصی کی نسبت اللہ تعالیٰ یا اس کے فعل کی جانب کر دینا درست نہیں۔
فیھا دلالۃ علیٰ ان المعاصی لیست من عند اللہ ولامن فعلہ (جصّاص)
لیکن مفسّر و محدّث ابوحیان غرناطی کی تنقید اس پر یہ ہے کہ یہ مذہب تو معتزلہ کا ہے اور ابوبکر رازی کا میلان خود اسی مذہب کی جانب ہے
ھٰذا مذھب المعتزلۃ وکان الرازی یحتج الیٰ مذھبھم۔ (بحر)
صاحبِ کبیر اور صاحبِ روح المعانی دونوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ عربی داں ناظرین کے پڑھنے کے قابل ہے۔
**۱۷۹ا** (جیسا کہ مسیحیوں نے دعوت و پیامِ مسیح کا خلاصہ گڑھ رکھا ہے)
درمیان میں مناسبتِ مقام سے ردِّ یہود آ گیا تھا، اب یہاں سے ردِّ نصاریٰ پھر شروع ہوتا ہے۔
مَاکان لبشر... والنبوۃ۔ چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی جنھیں یہ ساری نعمتیں ملی تھیں یہ نہیں ہو سکتا جن کے نفس ایسے طاہر و مطہر ہوں، ان سے ایسے دعویٰ کا صدور ممکن ہی کیوں کر ہے۔
الحکم۔ حکم یہاں حکمت یا احکامِ شریعت کے معنی میں ہے۔
الحکم العلم والفھم وقیل ایضًا الاحکام (قرطبی) قیل بمعنی الحکمۃ والظاھر ان الحکم ھنا القضاء (بحر)
الکتٰب۔ کتاب۔ یہاں جنسِ کتاب کے معنی میں ہے۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ أَرْبَابًا ؕ أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ

اور وہ نہ تمہیں اس کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور پیمبروں کو پروردگار قرار دو ۱۸۲ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا

إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾ ع وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ ع ۹ / ۱۶

بعد اس کے کہ تم اسلام لا چکے ہو ۱۸۳ اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جب بھی تمہیں کتاب و

الکتب ھنا اسم جنس (بحر)

**۱۸۰** (جیسا کہ فی الواقع مسیح کی دعوت رہی ہے)

ربانیین۔ ربانی وہ ہے جو رب کی جانب منسوب ہو، ربی کا مرادف ہے، درمیان کلمہ میں الف نون کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے یعنی بڑا اللہ والا۔ بڑا باخدا۔

معنی الربّانی العالم بدین الرب الذی یعمل بعلمہ (قرطبی) قال محمد بن حنفیۃ یوم مات ابن عباسؓ الیوم مات ربّانی ھٰذہ الامۃ (قرطبی) ھو شدید التمسک بدین اللہ وطاعتہ (مدارک)

**۱۸۱** یعنی اس لئے تو تمہیں اور زیادہ ایسے لغو و مشرکانہ عقائد سے بچنا چاہیئے۔

ای بسبب کونکم معلّمین الکتاب وبسبب کونکم دارسین لہ (بیضاوی)

امام رازیؒ نے اس موقع پر لکھا ہے کہ علم و تعلیم و دراست کا اقتضاء یہی ہے کہ انسان باخدا بن جائے پس اگر کوئی ان مشغلوں سے یہ مقصود نہیں رکھتا تو وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے اور ایسے ہی علم اور قلب سے حدیث نبوی میں پناہ مانگی گئی ہے۔

نعوذ باللہ من علم لا ینفع وقلب لا یخشع۔ (کبیر)

خطاب نصاریٰ سے ہے یعنی تمہارے پاس تعلیم و تعلّم کے لئے کتاب آسمانی موجود اور پھر تم ایسے جہل و ضلالت میں گرفتار!

**۱۸۲** (جیسا کہ بعض گمراہ قوموں نے اپنے اکابر کی جانب منسوب کر رکھا ہے)

لا یامرکم میں لا معنی نفی کی تاکید مزید کے لئے ہے۔

لا مزیدۃ لتاکید معنی النفی (مدارک)

مسیحیوں کی تثلیث تو ایک معلوم و معروف حقیقت ہے لیکن یہ کمتر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ملائکہ پرستی بھی اُن کے ہاں زوروں پر رہ چکی ہے اور صدیوں تک یہ تعلیم اُن کے ہاں جاری رہی ہے کہ "خدا نے انسانوں اور آسمانوں کے نیچے ساری چیزوں کے انتظامات تمام تر فرشتوں پر چھوڑ رکھے ہیں"۔ (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ج [illegible] ص [illegible]) نیز یہ کہ "خدا کائنات کی صرف کلی ربوبیت کرتا ہے باقی جزئیات سب ملائکہ کے حوالے ہیں"۔ (ایضاً) مسیحیت کی تاریخ ملائکہ کی باضابطہ عبادت و پرستش سے بھی ناآشنا نہیں، ان کی مورتیاں تک ان کے ہاں پوجی گئی ہیں، ہمارے قدیم مفسرین بھی اس سے بے خبر نہ تھے

ھٰذا موجود فی النصاریٰ یعظمون الملٰئکۃ والانبیاء حتّٰی یجعلوھم لھم اربابًا (قرطبی)

**۱۸۳** (اور توحید خالص کا اقرار کر چکے ہو)

ایامرکم بالکفر۔ اس سے ظاہر ہے کہ انبیاء پرستی و ملائکہ پرستی صاف کفر کے حکم میں داخل ہے آیت سے سبق ان مسلمانوں

كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ

حکمت (کی قسم) سے دوں پھر تمہارے پاس رسول اس (چیز) کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اُس

وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ

(رسول) پر ایمان لانا اور ضرور اس کی نصرت کرنا[۱۸۴] (پھر) فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ہم اقرار کرتے ہیں

کو بھی لینا چاہیے جو اپنے شیوخ و اکابر کی، خواہ وہ زندہ ہوں یا گزر چکے ہوں، تعظیم و عقیدت میں غلو کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

جملہ کا سوالیہ انداز اظہارِ حیرت و انکار کے لئے ہے، جیسے اُردو میں کہتے ہیں کہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

علی طریق الانکار والتعجب (قرطبی) والھمزۃ للانکار (کشاف)

۱۸۴ (یہ ایمان دل و جان سے ہو، اور نصرت دست و زبان سے)

اخذ اللہ میثاق النبیین۔ یعنی ارواحِ انبیاء سے عہد لیا، عالمِ ارواح میں اس ناسوتی دنیا کے وجود سے قبل۔ یہاں یہ واضح رہے کہ جو احکام انبیاء کو ملے، اُن میں اُن کی اُمتیں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔

من کتاب وحکمۃ۔ کتاب سے مراد کتابِ آسمانی ہونا ظاہر ہے، حکمۃ سے مراد معرفتِ الٰہی بھی ہو سکتی ہے اور نبوت بھی۔

مصدق۔ یعنی وہ بعد کا آنے والا رسول خود اُن پچھلی تعلیمات و ہدایات کا مُصدِّق بھی ہو۔

لتؤمنن بہ ولتنصرنہ۔ عارفین صوفیہ نے کہا ہے کہ شیوخ پر لازم ہے کہ ان کا جو معاصر علم و عمل میں ان سے فوق ہو بلکہ ان کا مساوی ہو اس سے دعا کرانے میں عار نہ کریں۔

رسول۔ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ ایک فردِ معیّن کی جانب کر رہا ہے، اور یہ اُسلوب قرآن میں عام ہے چنانچہ یہاں مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہیں، اور صحابہ میں حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ اسی طرف گئے ہیں۔

الرسول ھنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی قول علیؓ وابن عباسؓ واللفظ وان کان نکرۃ فالاشارۃ الی مُعیّن (قرطبی) وھو مرویٌّ عن علی وابن عباس وقتادۃ والسدی رضوان اللہ علیھم (کبیر)

اور یہی مذہب عموماً اکابر مفسرین کا ہے۔

فالرسول محمد خاتم الانبیاء صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ الی یوم الدین (ابن کثیر) یعنی محمداً صلی اللہ علیہ وسلم (معالم) ھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ (کبیر)

اور ہمارے زمانے کے علامہ انور شاہ کاشمیری کی مشکلات القرآن میں ہے:۔

رسولٌ مُعیّن اے رسول وکونہ مصدقاً لما معھم عَلَمٌ فی رسولنا صلی اللہ علیہ وسلم (ص۶۳)

اور عارفوں سے یہ بھی منقول ہے کہ رسولِ حقیقی اور شارعِ مستقل تو حضرت محمد مصطفیٰ صلعم ہی ہیں اور باقی دوسرے انبیاء بہ طور آپ کے تابعین کے ہیں۔

ذھب العارفون الی انہ صلی اللہ علیہ وسلم ھو النبی المطلق والرسول الحقیقی والمشرع الاستقلالی وان من سواہ من الانبیاء فی حکم التبعیۃ لہ (روح) فذکر اخذ المیثاق علی انبیاءھم بالایمان برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (مجمع)

قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ

فرمایا تو گواہ رہنا اور میں (بھی) تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں ۱۸۵ پھر جو کوئی اس کے بعد بھی روگردانی کرے گا

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ

سو یہی لوگ تو نافرمان ہیں ۱۸۶ سو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا (کسی طریقہ کو) تلاش کر رہے ہیں؟ درآنحالیکہ اس کے

اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

فرمانبردار ہیں جو کوئی بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں (خواہ یہ فرمانبرداری) رضا و اختیار سے ہو یا بے اختیاری سے اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے ۱۸۷

لما اٰتیتکم۔ لما ظرفیہ ہے حین کے مترادف۔ یعنی جب کبھی بھی۔

ظرفیۃ بمعنی حین کما قالہ الجمھور (روح)

ایک گروہِ نحوئین نے اسے شرطیہ قرار دیا ہے۔

وتحصیل من کلام الخلیل وسیبویہ ان ما فی لما اٰتیتکم شرطیۃ وقد خرجھا علی الشرطیۃ غیرھولاء کالمازنی والزجاج وابی علی والزمخشری وابن عطیۃ (بحر)

حاصل دونوں صورتوں کا یہی ہے کہ اگر یا جب کبھی بھی یہ صورت پیش آئے، یہ مراد ہو نہیں سکتی کہ یہ سلسلہ علی الدوام قائم رہا ہے۔

۱۸۵ انبیاء کی زبان سے اقرار یوں بھی اقرارِ صالح اور حلفِ موکد کے برابر ہے۔ اللہ کی اس گواہی موکد کو موکد تر کر دیا۔

اصری۔ اصر کے لفظی معنی بوجھ کے ہیں، مراد عہد ہی سے ہے۔

الاصر فی اللغۃ الثقل فسمی العھد اصرا لانہ منع وتشدید (قرطبی)

۱۸۶ یعنی انبیاء کے پیروؤں میں جو کوئی اس عہد سے اعراض کرے گا، اس کا شمار پکے نافرمانوں میں ہوگا، خود انبیاءِ معصومین سے تو اس اعراض کا احتمال ہی نہیں اس لئے لامحالہ افرادِ اُمت مراد ہوں گے۔

ھٰذا الحکم بالنسبۃ الی اتباعھم (بحر۔ روح)

۱۸۷ (قیامت کے دن)

سو ڈرتے رہنا اس ہستی سے چاہئے جو آج بھی اسی قدر با اختیار ہے اور کل بھی سابقہ اسی سے پڑے گا اور اسی کی عبادت میں لگے رہنا چاہئے۔

یبغون۔ یہ باطل کے تلاش کرنے والے عام اہلِ باطل ہیں۔

دین اللہ۔ یہاں صراحت کے ساتھ اسلام کے لئے دین اللہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسلم من فی السمٰوٰت والارض۔ یہاں مراد ہے انقیادِ تکوینی یعنی اس کی مشیت کے باہر تو کوئی بھی نہیں جا سکتا۔

طوعًا۔ یعنی اپنے ارادہ و اختیار سے۔

کرھًا۔ یہ اشارہ غیر ذوی العقول حیوانات، نباتات، جمادات وغیرہ کی طرف ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ

آپ کہہ دیجئے کہ ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس پر جو ہمارے اوپر اُتارا گیا ہے اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور

وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰى وَعِیْسٰى وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ

اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ (یعقوبؑ) پر اُتارا گیا ہے اور اُس پر جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ اور (دوسرے) نبیوں کو دیا گیا اُن کے

رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۸۴) وَمَنْ یَّبْتَغِ

پروردگار کی طرف سے ۱۸۸؎ ہم ان میں سے باہم کوئی فرق نہیں کرتے ۱۸۹؎ اور ہم تو اسی (اللہ) کے فرمانبردار ہیں ۱۹۰؎ جو کوئی اسلام کے

غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۸۵)

سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا سو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا ۱۹۱؎

**۱۸۸؎** یہاں یہ حقیقت ایک بار پھر دہرا دی گئی ہے کہ اسلام کوئی نیا، نو پیدا اور انوکھا دین نہیں وہی پرانا دینِ توحید ہے سارے انبیاء و مرسلین اسی کی تبلیغ کرتے چلے آئے ہیں اور مسلمان کا ایمان سارے پیغمبروں پر یکساں ہوتا ہے۔

قُلْ۔ یعنی اے پیغمبر! آپ اپنی اُمت کی طرف سے کہہ دیجئے۔

اُنْزِلَ عَلَیْنَا۔ یعنی قرآن مجید۔ نزولِ قرآن کا انتساب جس طرح عموماً پیمبرؐ کی طرف کیا گیا ہے اسی طرح کبھی کبھی پیمبرؐ کی اُمت کی جانب بھی کر دیا گیا ہے اور فعل انزال کا صلہ قرآن مجید میں حرف علٰی اور اِلٰی دونوں کے ساتھ آتا ہے

الاسباط یعنی اولادِ یعقوبؑ میں سے جو جو پیمبر ہوئے ہیں۔ اس لفظ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔ انبیاء کے اسماء گرامی پر بھی حاشیے گزر چکے ہیں

**۱۸۹؎** (ان کی صداقت کے لحاظ سے کہ بعض کو مانیں اور بعض کو جھٹلائیں جیسا کہ یہود، نصاریٰ وغیرہ مقہور و مغضوب اُمتوں کا شیوہ ہے) یہ مراد نہیں کہ انبیاء کے درمیان فرقِ مراتب ہی نہیں ہوتا، تفاضل پر تو خود آیۂ کریمہ تلک الرسل فضّلنا بعضھم علٰی بعض ناطق ہے۔

**۱۹۰؎** (اور اسی لفظی معنی کی مناسبت سے ہمارا اصطلاحی نام بھی "مسلم" ہی ہے)

**۱۹۱؎** آیت بڑی اہم، اور ایمانیات میں کلیدی حیثیت کی ہے۔

الاسلام سے یہاں کھلی ہوئی مراد اصطلاحی دینِ اسلام ہے، ورنہ لفظی معنی کے لحاظ سے تو کائنات کا ذرّہ ذرّہ مسلم ہے۔

اعلم ان ظاھر ھٰذہ الاٰیة یدل علٰی ان الایمان ھو الاسلام۔ (کبیر)

انّ الدّین عند اللّٰه الاسلام۔ وغیرہ متعدد آیتوں میں یہ مضمون صاف صاف بیان ہو چکا ہے کہ سچا اور مقبول دین صرف یہی دین ہے جس کی کتاب قرآن ہے اور جس کے لانے والے اور سکھانے والے محمد رسول اللہ صلعم ہیں، اس ایک دین کے علاوہ اور جتنے بھی دین و مذہب اپنی موجودہ صورت میں موجود ہیں، اُن کی مثال فرسودہ اور ٹکسال باہر سکوں کی سی ہے کہ کہنے کو سکے وہ بھی ہیں لیکن جب چل نہ سکے تو اُن کا سکہ ہونا نہ ہونا برابر۔ یہ آیت اس حقیقت کو اور زیادہ مؤکد و آشکار کر رہی ہے۔

كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْۤا اَنَّ الرَّسُوْلَ

اللہ کیسے ایسے لوگوں کو ہدایت دے گا جنھوں نے اپنے ایمان کے بعد کفر (اختیار) کر لیا اور (بعد اس کے کہ) شہادت

حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ

دے چکے تھے کہ رسول برحق ہیں اور (بعد اس کے کہ) ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آ چکی تھیں اور اللہ (ایسے) ظالم لوگوں کو

جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾

ہدایت نہیں دیتا ۱۹۲ ایسوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور انسانوں کی سب کی لعنت ہوتی ہے ۱۹۳

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا

وہ اس میں (ہمیشہ ہمیش) پڑے رہنے والے ہیں، نہ ان پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انھیں مہلت دی جائے گی ۱۹۴

الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۟ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾

البتہ جو لوگ اس کے بعد توبہ کر لیں اور (اپنے کو) درست کر لیں سو بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحم والا ہے ۱۹۵

دوسرے ادیان و مذاہب کو بھی (گو وہ اصلاً کیسے ہی ہوں) ان کی موجودہ صورت میں اسی دین حق کی طرح سچا سمجھنا، ہر دین و مذہب کو نجات کے لئے کافی سمجھنا یا سب مذہبوں کو ملا جلا کر ان کا ایک ملغوبہ تیار کرنا، یا یہ کہنا کہ دیر و حرم، کعبہ و کلیسا سب یکساں ہیں، ضلالت ویے دینی ہی کی شکلیں ہیں اکبر دارا شکوہ وغیرہ ان ناکام کوششوں کے لئے بجا طور پر بدنام ہو چکے ہیں، اور بڑے قلق کا مقام ہے کہ ہمارے زمانے میں بھی بعض اہلِ قلم ایسی ہی نامراد کوششیں کر چکے اور کر رہے ہیں۔

**۱۹۲** (جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، اتنے بے باک ہیں)

کفروا بعد ایمانہم۔ یعنی دینِ حق سے مرتد ہو گئے۔

البینات۔ کھلی ہوئی نشانیاں رسولِ اسلام اور دینِ اسلام کی صداقت کی، دلائل معجزات سب ان بینات کے تحت میں داخل ہیں۔

**۱۹۳** (اور لعنت کی حقیقت رحمتِ الٰہی سے دوری و مہجوری ہے)

لعنت۔ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں۔

**۱۹۴** (جہنم میں پڑنے سے قبل)

لا یخفف عنہم العذاب۔ یعنی جہنم میں پڑنے کے بعد بھی کوئی تخفیف عذاب میں نہ ہوگی۔

فیہا۔ یعنی اسی حالتِ ملعونیت و مغضوبیت میں۔

ای خالدین فی اللعنۃ۔ (کبیر، ابن کثیر)

دوسرے معنی جہنم میں پڑے رہنے کے بھی مروی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ

بے شک جن لوگوں نے بعد اپنے ایمان (لانے) کے کفر اختیار کیا پھر کفر میں بڑھتے رہے اُن کی توبہ ہرگز قبول نہ

تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا

کی جائے گی ۱۹۶؎ اور یہی لوگ تو گمراہ ہیں ۱۹۷؎ بے شک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور وہ

وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا

مر گئے اس حال میں کہ وہ کافر تھے سو ان میں سے کسی سے ہرگز نہ قبول کیا جائے گا، زمین بھر (بھی) سونا

ع ۱۱ ۹ ۱۷ وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾

اگرچہ وہ اسے معاوضہ میں دینا چاہے ۱۹۸؎ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے عذاب دردناک ہے اور جن کے لئے کوئی بھی مددگار نہ ہوں گے۔

قال ابن عباسؓ اسفنی فی جھنم۔ (کبیر)

**۱۹۵؎** (سو ایسے کے لئے قبولِ توبہ دشوار ہی کیا ہے)

تابوا۔ یعنی صدق و اخلاص کے ساتھ توبہ کر لیں۔

غفورٌ۔ سو وہ اپنی اس صفتِ غفر کے تقاضے سے اُن کی پچھلی خطاؤں کو بخش دے گا۔

رحیمٌ۔ سو وہ اپنی صفتِ رحیمیت کے تقاضے سے ان پر مزید فضل فرمائے گا۔

**۱۹۶؎** (دوسرے معاصی و سیّئات سے)

یعنی پڑے تو رہیں کفر و ارتداد میں اور چاہیں کہ انھیں ان کے دوسرے اعمالِ حسنہ کا صلہ مل جائے، سو بغیر ایمان و اعتقادِ صحیح کے اُن اعمال پر سرے سے "حسنہ" و "صالحہ" کا اطلاق ہی نہ ہو سکے گا، جو اُن پر اجر و صلہ کی توقع رکھی جائے۔

**۱۹۷؎** یعنی گمراہِ کامل۔ انتہا درجہ کے گمراہ، ورنہ گمراہ تو سب ہی کافر ہوتے ہیں۔

ھذا محمول علیٰ انھم ھم الضآلون علیٰ سبیل الکمال۔ (کبیر)

**۱۹۸؎** (قیامت کے دن)

یعنی بالفرض قیامت کے دن کا فر مال کا مالک ہو اور اس کے دے ڈالنے پر بھی قادر ہو۔

ذھبًا۔ ذھب سے مقصود یہاں سونا نام مخصوص و متعین دھات ہی مراد نہیں بلکہ مراد عزیز سے عزیز اور زیادہ سے زیادہ قیمتی شے بہ طور فدیہ کے ہے۔

الذھب کنایۃ عن اعزّ الاشیاء (کبیر)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی شخص آج چاہے کہ حالتِ کفر میں قائم رہ کر روئے زمین کے برابر روپیہ کارِ خیر میں خرچ کر دے اور اس کے معاوضہ میں قیامت میں نجات حاصل کرے تو ایسا ہرگز نہیں ہونے کا۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵

جب تک اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو گے (کامل) نیکی (کے مرتبہ) کو نہ پہنچ سکو گے ۱۹۹ ؎

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ (۹۲)

اور جو کچھ بھی کسی چیز سے خرچ کرتے رہتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے ۲۰۰ ؎

ای من مات علی الکفر فلن یقبل منه خیرا ابدا ولو کان قد انفق ملء الارض ذهبا فیما یراه قربة (ابن کثیر)

**۱۹۹ ؎** (اے مسلمانو!)

البر۔ مطلق نیکی کو کہتے ہیں یہاں مراد کمالِ خیر ہے اور نیکی کا درجۂ اعلیٰ پایہ کہا جائے کہ حقیقتِ خیر یا ابوابِ خیر کی جامعیت مراد لی گئی ہے۔
البر الاحسان وکمال الخیر (روح) ای لن تبلغوا حقیقة البر (مدارک) قال ابو منصور البر خیر الدنیا والآخرة (تاج)
تنفقوا۔ یعنی اللہ اور اس کے دین کی راہ میں نہ خرچ کرو گے انفاق یہاں بہت وسیع معنی میں ہے اس میں خیر یا نیکی کے سارے ابواب آگئے
قیل هی سبل الخیر کلها وهی الصحیح لعموم الآیة (ابن عربی) قال الزجاج کل ما تقرب به الی الله من
عمل خیر (بحر) قال الزجاج قال بعضهم کل ما تقرب به الی الله عز وجل من عمل خیر فهو انفاق۔ (تاج)
مما تحبون۔ محبوب چیز کے ماتحت ہر وہ چیز آجاتی ہے جسے انسان عزیز رکھتا ہے مال، دولت، عزت، حکومت،
قوت، وقت وغیرہ، تنہا مال و دولت ہی مقصود نہیں بعض اوقات جاہ کی قربانی مال کی قربانی سے کہیں زیادہ سخت و دشوار ہوتی ہے
ای من المال او ما یعمه وغیره کبذل الجاه فی معاونة الناس والبدن فی طاعة الله وفی سبیله (بیضاوی)
مما میں من تبعیض کے لئے ہے۔
من فی مما تحبون للتبعیض (بحر)
آیت کا اتنا ٹکڑا کلام موزوں ہے اور ایسا ہی وزن قرآن مجید کی اور بھی متعدد آیتوں میں پایا جاتا ہے لیکن محض موزونیت کے پائے جانے سے کلام پر شعر کا اطلاق نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود متکلم شعر کا قصد بھی نہ کرے اسی بنا پر علماء نے یہ کہنا جائز نہیں رکھا ہے کہ قرآن مجید کا کوئی حصہ شعر میں بھی ہے۔
ولا یجوزان یقول ان فی القرآن شعرا۔ (بحر)
صاحب مثنوی، مولانائے رومی نے آیت کے ایک جزو کو لے کر اسے ایک مصرعہ بنا دیا ہے ؎

لن تنالوا البر حتی تنفقوا ہر چہ داری صرف کن در راہِ او

**۲۰۰ ؎** (اور وہ جزا بھی اسی کے مطابق دے گا)
فیجازیکم بحسبه۔ (کشاف)
مطلب یہ ہے کہ نیک کام کے لئے جو کچھ بھی لگاؤ گے اس کا اجر تو بہرحال ملے گا لیکن خیر کا جو درجۂ اعلیٰ ہے وہ تو اسی وقت حاصل ہوگا، جب راہِ حق میں اپنے محبوبات و مرغوبات کی قربانی پیش کرو۔
والحاصل انه لا وصول الی المطلوب الا باخراج المحبوب۔ (مدارک)

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ

ہر کھانا بنی اسرائیل کے لئے حلال تھا۔ بجز اس کے جو خود اسرائیل نے اپنے اوپر حرام

اِسۡرَآءِيۡلُ عَلٰى نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا

کر لیا تھا قبل اس کے کہ توریت اترے۔ تو آپ کہئے کہ

بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَآ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۳﴾

توریت لاؤ اور اسے پڑھو اگر تم سچے ہو۔ ۲۰۱

من شیٔ یعنی عام اس سے کہ وہ محبوب ہو یا نہ ہو۔

مِنۡ۔ یہاں تبیین کے لئے ہے۔

من للتبیین ای من ای شئ کان (مدارک) تبیین ما تنفقوا ای من ای شئ کان طیبًا تحبونہ اوخبیثًا تکرھونہ (کشاف) ای من ای شئ محبوب او غیرہ ومن لبیان ما (بیضاوی)

بہ علیم۔ آیت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ جس مالک و مولیٰ کی رضا کے لئے خرچ کر رہے ہو وہ تو بہر حال واقف و باخبر ہے پھر اس کار خیر کا اعلان اپنی طرف سے کیوں کرتے پھرو۔

وفی الاٰیۃ ترغیب وترھیب قیل وفیھا اشارۃ الی الحث علی اخفاء الصدقۃ (روح)

۲۰۱ (اپنے اس دعوی میں کہ فلاں فلاں غذائیں تو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حرام چلی آتی ہیں) یہود کو تو روز ایک نیا فتنہ مسلمانوں کے خلاف اٹھانا تھا آپ پر ایک نیا الزام یہ لگایا کہ فلاں فلاں غذائیں تم جائز سمجھتے ہو، اور اپنے کو دین ابراہیم کا متبع بھی کہے جاتے ہو، حالانکہ یہ چیزیں تو ابراہیم کے وقت سے حرام ہیں۔

الطعام۔ طعام ہر وہ چیز ہے، جو کھائی جائے۔

الطعام مایطعم ای یتناول لاجل الغذاء (المنار)

کل الطعام۔ یعنی وہ غذائیں جن کے باب میں یہود سے بحث و گفتگو ہو رہی ہے ساری دنیا کے کھانے مراد نہیں۔

ای مطعومات التی فیھا النزاع (مدارک)

حرم اسرآئیل علی نفسہٖ۔ اسرائیل حضرت یعقوبؑ کا دوسرا نام ہے آپ نے بعض طبی ضرورتوں سے بعض جائز غذائیں بالکل ترک کر دی تھیں، اسرائیلی روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کو مرض عرق النساء کی شکایت تھی تو آپ نے اونٹ کے دودھ اور گوشت سے پرہیز شروع کر دیا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس طبی پرہیز کا حرمت شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔

قیل فعل ذالک للتداوی باشارۃ الاطباء (بیضاوی) قیل اشارت علیہ الاطباء باجتنابہ ففعل ذالک باذن من اللہ فھو کتحریم اللہ ابتداءً (کشاف)

لیکن اس روایت کی صحت سے اس کے اسرائیل الاصل ہونے کی بنا پر انکار ہی کیا گیا ہے۔

فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

سو جو شخص اللہ پر اس کے بعد بھی جھوٹ گڑھے تو بس ایسے ہی لوگ تو ظالم

الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ

ہیں ۲۰۲ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے سچ بات فرمادی ہے ۲۰۳ تو تم سیدھی راہ والے ابراہیم کے دین کی

حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾

پیروی کرو، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے ۲۰۴

کل ذالک من الاسرائیلیات وصحۃ السند فی بعضہا عن ابن عباس او غیرہ کما زعم الحاکم لا یمنع ان یکون مصدرہا اسرائیلیا۔ (المنار)

بعض جاہل صوفیہ کا یہ سمجھنا کہ ترکِ حیوانات یا بعض دوسری غذاؤں کے ترک کو قربِ الٰہی میں کوئی دخل ہے، تمام تر نادانی ہے، عالموں کی مشقتیں اور ریاضتیں بالکل دوسری چیز ہیں، ورنہ جو غذائیں انسان کی روحانی ترقی میں مانع ہیں وہ خود ہی حرام کردی گئی ہیں، کسی غذا کے حلال ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ اس راہ میں مانع نہیں۔

وفی ہذہ الآیۃ دلالۃ علیٰ بطلان قول المتقشفین من اکل اللحوم والاطعمۃ اللذیذۃ تزھدًا لان اللہ تعالیٰ قد نہیٰ عن تحریمہا۔ (جصاص)

قُلْ۔ یعنی ان یہود سے کہئے جو معترض ہو رہے ہیں۔

فَأتوا بالتوراۃ۔ توریت میں تو آج تک یہ لکھا چلا آرہا ہے۔

"وہ سب جیتے چلتے جانور تمہارے کھانے کے لئے ہیں، میں نے ان سب کو نباتات کی مانند تمہیں دیا ہے" (پیدائش ۹:۳)

تفسیر میں ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ اسرائیل کی سے مراد یعقوبؑ کی ذات نہیں بلکہ مجموعی طور پر قوم اسرائیل یعنی ان کے بارھوں قبیلے ہیں، اور مفہوم ہے کہ قوم اسرائیل کی مسلسل نافرمانی کی پاداش میں بہت سی نعمتیں ان پر حرام کردی گئی تھیں

فالمراد باسرائیل شعب اسرائیل کما ھو مستعمل عندھم لا یعقوب نفسہ ومعنی تحریم الشعب ذالک علی نفسہ انہ ارتکب الظلم واجترح السیئات التی کانت سبب التحریم۔ (المنار)

**۲۰۲** (اپنے حق میں)

یعنی واضح اور صریح شہادتوں کے بعد بھی اپنے جھوٹ پر قائم رہیں اور یہ کہے جائیں کہ فلاں فلاں چیزیں خدا کی طرف سے حرام کی ہوئی تھیں۔

من بعد ذالک۔ یعنی اس واضح شہادت کے بعد۔

ای من بعد ما لزمتہم الحجۃ (بیضاوی) بعد ظہور الحجۃ (جلالین)

غذاؤں میں اصل ان کی حلت ہی ہے، حرمت صرف حکمِ خداوندی ہی سے ہو سکتی ہے۔

والاصل فی الاشیاء الحل حتّٰی یرد النص بالتحریم۔ (المنار)

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِلْعَالَمِينَ ﴿۹۶﴾

سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا ۲۰۵ وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے (سب کے لئے) برکت والا اور سارے جہان کے لئے راہنما ہے ۲۰۶

**۲۰۳** یعنی قرآن نے امرِ حق واضح کر دیا، اور تم نے جو جھوٹ اپنے ہی اکابر اور اپنے مقدس نوشتوں کی بابت گڑھ رکھے تھے ان کی قلعی کھول دی۔

**۲۰۴** (ابراھیم، ملة ابراھیم، حنیف) سب پر حاشیے پارہ اول کے ختم کے قریب سورۂ بقرہ کے رکوع ۱۵ و ۱۶ میں گزر چکے۔

فاتبعوا ملة ابراھیم۔ یعنی انھیں ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جنھیں تم بھی اپنا مقتدا و پیشوا مانتے ہو۔

**۲۰۵** (دنیا میں بہ طور عبادت گاہ کے)

مراد خانۂ کعبہ ہے جس کی اوّلین تعمیر حضرت آدمؑ نے کی تھی اور اس کے منہدم ہو جانے کے بعد از سرِ نو حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے۔

وُضِعَ للناس۔ یعنی لوگوں کی طاعت و عبادت کے لئے بنایا گیا۔

ای وضعه اللہ موضعًا للطاعات والخیرات والعبادات (کبیر) ای لعموم الناس لعبادتھم ونسکھم یطوفون به ویصلون الیه ویعتکفون عندہ (ابن کثیر) وضع للناس یعبد اللہ فیه (معالم)

اوّل بیت۔ حدیثِ نبویؐ اور اقوالِ تابعین سب میں اس اوّلیت اور اقدسیت کی تشریح ملتی ہے۔

ثبت فی صحیح مسلم عن ابی ذر قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم من اول مسجد وضع فی الارض قال المسجد الحرام (قرطبی) قال مجاھد خلق اللہ موضع ھذا البیت قبل ان یخلق شیئ من الارض بالفی سنة (قرطبی)

**۲۰۶** (بہ طور قبلہ کے)

کعبہ کو سب سے پہلا معبد بتا کر یہود کو یہ بھی جتلا دیا گیا کہ کعبہ تو بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔

بکّة۔ مکہ ہی کا دوسرا نام بکّة ہے، صرفِ عربی کے ایک قاعدہ کے مطابق جس سے حرف م اور حرف ب میں اکثر تبادلہ ہو جاتا ہے چنانچہ لازم اور لازب۔ راتم اور راتب، نمیط اور نبیط اسی کی مثالیں ہیں اسی قاعدہ کا عمل یہاں بھی ہوا۔

ھی علم للبلد الحرام ومکة وبکة لغتان فیه (کشاف) بکّة لغة فی مکة عند الاکثرین (روح) قال مجاھد بکّة ھی مکّة (قرطبی) من اسماء مکة علی المشھور۔ (ابن کثیر)

ایک قول یہ بھی ہے کہ مکّہ نام ہے کل شہر کا اور بکّہ کا اطلاق ہے مسجدِ حرام اور مطاف پر۔

بکّة ھو موضع المسجد (ابن عباس) بکّة موضع البیت ومکة ماسوی ذٰلک (ابن جریر عن ابی مالک) بکّة موضع البیت ومکة سائر البلد عن مالک بن انس (قرطبی) قال ابو مالک وابو صالح وابراھیم النخعی وعطیة العوفی ومقاتل بن حیّان بکة موضع البیت ماسوی ذٰلک مکة (ابن کثیر)

بائبل میں بھی ایک جگہ ذکر وادی بکہ کا، تحریفات کے باوجود رہ گیا ہے "وہ بکا کی وادی میں گزر کرتے ہوئے اسے ایک کنواں بناتے" (زبور۔ ۸۴: ۶) بائبل کے قدیم مترجموں نے اپنی بے احتیاطی کی عادت کے مطابق ترجموں میں اسے بجائے علم کے، اسم نکرہ قرار دے کر اس کا ترجمہ رونے کی وادی، کر ڈالا، صدیوں کے بعد اب غلطی کا احساس ہوا اور اب جیوش انسائیکلوپیڈیا میں اقرار ہے کہ یہ ایک مخصوص بے آب وادی کا نام ہے (جلد ۲ صفحہ ۴۱۶) اللہ ان کو اتنا سمجھنے کی توفیق اور دے دے کہ یہی "بے آب وادی" مکّہ معظمہ ہے۔

فِيهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ

اس میں کھلے ہوئے نشان ہیں (ان میں سے ایک) مقامِ ابراہیمؑ ہے ٢٠٧ اور جو کوئی اس میں داخل ہو جاتا ہے وہ امن سے

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ

ہو جاتا ہے ٢٠٨ اور لوگوں کے ذمہ ہے حج کرنا اللہ کے لئے اس مکان کا (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو ٢٠٩

كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾

اور جو کوئی کفر کرے تو اللہ سارے جہان سے بے نیاز ہے ٢١٠

مبارکاً۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مادّی اور روحانی، دُنیوی اور دینی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔

لَلَّذِی میں لام تاکید کا ہے۔

واللام توکید۔ (قرطبی)

مکہ کی قدامت پر مسیحی مورخین کو بھی اب شہادت دینی پڑی ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی)

مورخ مسعودی کے ایک بیان سے مکہ کی قدامت پر جاہلی نقطۂ نظر سے بھی روشنی پڑتی ہے اس عقیدہ کا تمام تر ایک مُشرکانہ وہم ہونا ظاہر ہے تاہم قدامت کی شہادت کا مقصد تو اس سے حاصل ہی ہو جاتا ہے۔

وقد ذهب قوم الی ان البیت الحرام علی مرور الدھور معظّم فی سائر الاعصار لانه بیت زحل وان زحل تولاه ولان زحل من شانه البقاء والثبوت فما کان له فغیر زائل ولا داثر عن التعظیم غیر خامل۔

(مروج الذهب الجزء الاول ص٢٦، مطبوعہ مصر ١٣٠٣ھ)

ایک گروہ کا خیال ہے کہ بیت الحرام جو اتنا زمانہ گزر جانے کے بعد بھی ہر زمانہ میں معزز رہا ہے وہ اس لئے کہ وہ ستارۂ زحل کا ہیکل ہے اور زحل ہی اس کا مُربّی ہے اور زحل کی خصوصیت بقاء دوام ہے جو چیز بھی اس کے نام پر ہو گی اس میں زوال و تغیر نہیں ہو گا بلکہ اس کی تعظیم و تکریم ہمیشہ باقی رہے گی۔

**٢٠٧** تقدیر کلام یوں ہے۔ مِنْهَا مَقَامُ اِبْرٰهِيْمَ۔

والتقدير منها مقام ابراهيم قال الاخفش (قرطبی)

فیہ۔ یعنی اس اوّل بیت میں۔

اٰیٰت بَیِّنٰت۔ کھلے ہوئے توحیدِ الٰہی کے شعائر یا حج کے شعائر۔

والمراد بالاٰيٰت شعائر الحج (کبیر)

مقام ابراهیم پر حاشیہ سورۂ بقرہ (پ۱) کے رکوع ١٦ میں گزر چکا ہے۔

بیت سے یہاں مراد خانۂ کعبہ نہیں سارا حرم شریف ہے مقامِ ابراہیم کے نام سے جو پتھر رکھا ہوا ہے وہ خانۂ کعبہ کے اندر نہیں باہر ہے

المراد بالبيت هنا الحرم كله لان هٰذه الاٰيات موجودة فی الحرم ومقام ابراهيم ليس فی البيت انما هو خارج البيت (جصاص)

**٢٠٨** (شریعتِ الٰہی کی نظر میں)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى

آپ کہئے کہ اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی نشانیوں سے کفر کر رہے ہو۔ درانحالیکہ اللہ تمہارے کرتوتوں کا

مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ

گواہ ہے ۲۱۱ف آپ کہئے کہ اے اہل کتاب، جو ایمان لا چکا اسے تم کیوں اللہ کی راہ سے ہٹا رہے ہو اس (راہ) میں

اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کجی نکال نکال کر درآں حالیکہ تم (خود) گواہ ہو اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں ۲۱۲ف

اٰمنا پر حاشیہ سورۂ بقر (پ۱) کے رکوع ۱۶ میں گزر چکا۔

۲۰۹ف (بہ لحاظ زادِ سفر و امنِ راہ وغیرہ)

استطاع الیہ سبیلا۔ استطاعتِ سبیل سے مراد وہاں تک پہنچ جانے کے ذرائع و اسباب ہیں۔

استطاعۃ السبیل الیہ ھی امکان الوصول الیہ (جصاص) استطاعۃ السبیل الی الشیٔ عبارۃ عن امکان الوصول الیہ (کبیر)

استطاعتِ سبیل کی تفصیل و تشریح، فقہ کا موضوع ہے۔

حج البیت۔ حج و فرضیتِ حج پر حواشی پارۂ دوم کے وسط میں گزر چکے۔

علی الناس۔ میں علیٰ شدتِ تاکید کے لئے ہے۔

ھی من اوکد الفاظ الوجوب عند العرب فاذا قال العربی لفلان علیّ کذا فقد وکّدہ واوجبہ (قرطبی)

۲۱۰ف (سو وہ سیاہ بخت اپنا نقصان آپ کرے گا، اللہ تعالیٰ کو کیا نقصان پہنچا سکے گا)

اللہ تعالیٰ کی صفتِ غنا کا اثبات ان مشرک قوموں کے رد میں ہے جن کے دیوی دیوتاؤں کا وجود ان کے پجاریوں ہی کے دم سے قائم ہے اور وہ دیوتا اپنے کھانے پینے تک کے لئے اپنے پجاریوں کے محتاج رہتے ہیں۔

۲۱۱ف (اور اُس حاضر و ناظر، ہمہ بیں، ہمہ داں حاکم کے آگے کوئی حیلہ، بہانہ نہ چل سکے گا)

اھل الکتاب سے اشارہ خاص طور پر یہود کی جانب ہے جو مسلمانوں کو طرح طرح بہکاتے رہتے تھے۔

تکفرون بایات اللہ۔ ایات اللہ سے مراد خاص طور پر نبوتِ محمدی کے شواہد و دلائل ہیں اور کفر سے مراد نبوتِ محمدی سے انکار ہے

المراد من ایات اللہ الایات التی نصبھا اللہ تعالیٰ علی نبوۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام والمراد بکفرھم بھا کفرھم بدلالتھا علی نبوۃ محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ (کبیر)

مشرکوں کو بار بار یہ جتلانے اور یاد دلانے کی ضرورت تھی کہ اللہ صرف موجود ہی نہیں بلکہ ذرہ ذرہ سے باخبر بھی ہے مشرکوں کے دیوتاؤں کی طرح بے خبر، ناقص العلم اور گم سم نہیں۔

۲۱۲ف (سو اس کی گرفت اور عذاب سے اپنے کو باہر نہ سمجھو)

تصدون عن سبیل اللہ۔ یہود خود تو اسلام سے منکر تھے ہی اب ان کی جرأتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اے ایمان والو اگر تم ان لوگوں میں سے کسی گروہ کا کہا مان لو گے جنھیں کتاب دی جا چکی ہے تو وہ تمھارے ایمان

يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ

لانے کے پیچھے تمھیں کافر بنا چھوڑیں گے ۲۱۳ ؎ اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو، درآنحالیکہ

تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ

تمھیں اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اور تمھارے درمیان اس کے رسول موجود ہیں ۲۱۴ ؎ اور جو کوئی

فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع

اللہ کو مضبوط پکڑتا ہے وہ ضرور سیدھی راہ کی طرف ہدایت کیا جاتا ہے ۲۱۵ ؎

رکوع ۱۰

طرح طرح کے مکر و فن سے دوسروں کو بھی دینِ حق سے ہٹانے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔

تبغونہا عوجا۔ یہود مسلمانوں کے آپس میں طرح طرح کی مخفی فتنہ انگیزی اور مفسدہ پردازی کرتے رہتے تھے کہ اگر اور کچھ نہیں بن پڑتا تو یہی ہو کہ آپس ہی میں کٹ کٹ کے تباہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک مجمع میں جہاں مدینہ کے دونوں مشہور اور جنگجو قبیلوں اوس اور خزرج کے مسلمان جمع تھے، ایک یہودی شماس بن قیس نے ان کی عہدِ جاہلیت کی مشہور لڑائی جنگِ بعاث کے پُرجوش جنگنامہ کے اشعار پڑھوا دیئے، دلوں میں گزشتہ عداوتوں کی یاد تازہ ہو گئی اور فریقین قدرۃً بھڑک اٹھے اور عین موقع پر اگر رسول اللہ صلعم خود تشریف نہ لے آتے تو خانہ جنگی شروع ہی ہو چکی ہوتی۔

تبغونہا میں ضمیر مونث غائب سبیل کی طرف ہے۔

الھاء فی تبغونھا عائدۃ الی السبیل (کبیر)

وانتم شھدآء۔ یعنی تمھارا ضمیر خود گواہی دے رہا ہے کہ اسلام دینِ حق ہے۔

۲۱۳ ؎ (عقیدۃً نہ سہی عملاً سہی، تو یہ عملی ارتداد بھی کیا کم ہے)

ان تطیعوا۔ یعنی اگر اپنے عقائد و اعمال میں ان لوگوں سے متاثر ہونے لگو گے۔

فریقا من الذین اوتوا الکتب۔ یہ نام کے تو اہلِ کتاب ہیں لیکن تُلے ہوئے ہیں عداوتِ اسلام پر۔ اہلِ کتاب کا فرد سے مخالطت، مجالست اور خلا ملا بڑھانے سے ممانعت کا صاف اشارہ آیت سے نکل رہا ہے۔ اور یہ حکم جب کتابی کافر سے متعلق ہے تو مشرکوں اور ملحدوں کے تسلط اور ان کے عقیدوں سے تاثر کے احکام تو ظاہر ہی ہیں۔

۲۱۴ ؎ مطلب یہ ہے کہ تمھارے لئے دینِ حق سے ارتداد کی گنجائش ہی کب ہے جبکہ تم میں قرآن اور سنتِ رسول موجود و محفوظ ہے۔

ذالک لان تلاوۃ ایات اللہ علیھم حالاً بعد حالٍ مع کون الرسول فیھم الذی یزیل کل شبھۃ ویقرر کل حجۃ کالمانع من وقوعھم فی الکفر (کبیر)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو اس سے ڈرنے کا حق ہے ۲۱۶ اور جان نہ دینا بجز اس حال کے کہ

مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا

تم مسلم ہو ۲۱۷ اور اللہ کی رسّی سب مل کر مضبوط تھامے رہو اور باہم نااتفاقی نہ کرو ۲۱۸ اور اللہ کا

نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ

یہ انعام اپنے اوپر یاد رکھو کہ جب تم (باہم) دشمن تھے تو اس نے تمہارے قلوب میں اُلفت ڈال دی ۲۱۹

کیف تکفرون۔ میں کفر سے مراد اعمالِ کفر کی بازگشت ہے اور کیف اظہارِ تعجب کے لئے ہے۔

قالہ تعالیٰ علی جھۃ التعجب (قرطبی) قیل المراد بکفرھم فعلھم افعال الکفرۃ (روح)

ایات اللہ۔ یعنی قرآن کی آیتیں اور قرآن تمہارے درمیان موجود و محفوظ ہے۔

وفیکم رسولہ۔ یعنی سرِدست تو وہ بنفسِ نفیس تشریف فرما ہیں، ہر شبہ مٹا سکتے اور راہ بتا سکتے ہیں باقی ان کے بعد ان کے سُنن و آثار یہی کام دیں گے۔

قیل الخطاب لجمیع الامۃ۔ لان اثارہ وسنتہ فیھم وان لم یشاھدوہ (بحر)

۲۱۵ یہ صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ دنیا میں فلاحِ کامل کی ہے اور آخرت میں جنّت کی۔

فقد ھدی۔ یعنی اللہ سے تمسک کرتے رہو، یہ راہِ راست ضرور ہی مرتّب ہو کر رہے گی۔

۲۱۶ (تمہاری طاقت اور استطاعت کے لحاظ سے)

ورنہ حق تعالیٰ سے اس کے مرتبہ کے لائق خشیت بھلا کون بشر اختیار کر سکتا ہے۔

والمعنی حق تقتہ ما استطعتم۔ (قرطبی)

۲۱۷ یعنی جیو تو قانونِ تقویٰ الٰہی کے ماتحت اور مرو تو قانونِ اسلام کے مطیع، زندگی اور موت دونوں کی منزلوں میں مسلمان کو اللہ کے تابع فرمان ہو کر ہی گزرنا ہے ــــ اعتبار انجام و خاتمہ ہی کا ہوتا ہے پس بندے کو زندگی ایسی ہی بسر کرنا چاہیے کہ موت بھی آئے تو اسلام ہی پر، آیت کا مقصود دینِ اسلام پر استقامت و دوام کی تاکید ہے۔

فمعناہ علی المختار استمروا علی الاسلام وحافظوا علی اعمالہ حتّی الموت۔ (المنار)

۲۱۸ اس تعلیم کے ایک عملی پہلو کا اعتراف ایک غیر مسلم کی زبان سے:۔

"اسلام نے ان قبیلوں کو متحد کر دیا جو اس وقت تک برابر ایک دوسرے سے ضرور برسرِپیکار رہتے تھے" (آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام ص ۳۴)

حبل اللہ محاورۂ عربی میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور مطلقاً ہر وہ شے جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔

یستعار الحبل للعھد (روح) واستعیر للوصل ولکل ما یتوصل بہ الی شیء۔ (راغب)

یہاں مراد شریعتِ اسلامی یا قرآن ہے، متعدد قول نقل ہوئے ہیں اور وہ سب متقارب ہیں۔

فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

سو تم اس کے انعام سے (آپس میں) بھائی بھائی بن گئے اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس نے

فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳

تمہیں اس سے بچالیا۲۲۰ اسی طرح اللہ اپنے احکام کھول کر سناتا رہتا ہے تاکہ تم راہ یاب رہو،

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

اور ضرور ہے کہ تم میں ایک ایسی جماعت رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۰۴

اور بدی سے روکا کرے اور پورے کامیاب یہی تو ہیں ۲۲۱

قال ابن مسعود حبل اللہ القرآن و رواہ علیؓ و ابو سعید الخدری عن النبی صلعم و عن مجاھد و قتادۃ مثل ذالک (قرطبی) حبل اللہ ھو القرآن کما ورد فی الحدیث الصحیح عن ابن مسعود و روی ابن ابی شیبۃ و ابن جریر عن ابی سعید مرفوعًا (المنار) العھد او القرآن او الدین او الطاعۃ او اخلاص التوبۃ او الجماعۃ او اخلاص التوحید او الاسلام اقوال للسلف یقرب بعضھا من بعض (بحر)

جمیعًا۔ یعنی اُمت مجموعًا بھی اور افرادِ اُمت بھی۔

۲۱۹ (اور سب کو رشتۂ اسلام میں متحد و منسلک کردیا۔)

نعمۃ اللہ اس انعام کے تحت میں علاوہ فلاحِ اُخروی کے اتحادِ قومی کی فلاحِ دنیوی بھی شامل ہے اتحادِ اُمت بجائے خود ایک بہت بڑی نعمت ہے۔

اذ کنتم اعداءً۔ ظہورِ اسلام سے قبل یعنی زمانۂ جاہلیت مکہ، عرب قبائل کی باہمی دشمنی اور جنگجوئی ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی تھی لڑائی بات بات میں چھڑ جاتی تھی جو لڑائیاں تاریخی روایات میں محفوظ رہ گئی ہیں انھیں کی تعداد ۱۷۰۰ ہوتی ہے۔

۲۲۰ (دینِ اسلام اور شریعتِ اسلامی مرحمت کرکے)

دنیا میں یوں انقلابِ عظیم برپا کردینا اسلام کا معجزہ ہی تھا، اس کا اعتراف آج فرنگی محققین بھی کررہے ہیں، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا۔ جس طرح عرب قبل اسلام کی عداوت حدِ ضرب المثل تک پہنچی ہوئی تھی اُسی طرح بعد اسلام عرب کی آپس کی محبت یگانگت، اخلاص بھی بے نظیر رہا، جہاں مکی مکی کا اور مدنی مدنی کا دشمن تھا، وہاں اسلام نے مکہ کے مہاجرین اور مدینہ کے انصار کو ایسا شیر و شکر کرادیا کہ دونوں واقعی آپس میں بھائی بھائی معلوم ہونے لگے۔ ان سائیکلوپیڈیا برٹانیکا، اور مورخ گبن دونوں کے صفحات میں اس کا اعتراف موجود ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

علی شفا حفرۃ من النار ذکر زمانۂ قبل اسلام کا ہے کہ اس وقت عقائد و اعمالِ مشرکانہ کی بنا پر اہلِ عرب

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ

اور ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جنھوں نے بعد اس کے کہ انھیں شواہد پہنچ چکے تھے باہم تفرقہ کرلیا اور مختلف ہوگئے ۲۲۲

وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٠٥﴾ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ

عذابِ عظیم انھیں کو تو ہونا ہے — اس روز (جس روز) بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض

فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ

چہرے سیاہ ہوں گے، پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے کہا جائیگا کہ) کیا تم ہی کافر ہوگئے تھے اپنے ایمان کے بعد؟ ۲۲۳

دوزخ کے کنارے تک پہونچ ہی چکے تھے۔

۲۲۱ کسی درجہ میں اور ایک چھوٹے پیمانہ پر تو یہ فرض ہر فردِ امت کا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ایک مستقل جماعت خاص اسی کام کے لئے ہو اس کا کام ہی یہی ہو کہ خلق کو دعوتِ خیر دے، معروف (بھلے کاموں) کی طرف بلائے، منکر (برے کاموں) سے روکے۔

اُمّۃ۔ یہ بھی کمالِ رحمت اور ضعفِ بشری کی انتہائی رعایت ہے کہ ساری امت کے بجائے اس فریضہ پر ایک مخصوص جماعت ہی کو مامور کیا گیا، ورنہ اس فریضہ کی ادائی کے لئے جن اوصاف اور شرائط کی ضرورت ہے کیا عجب کہ بہتوں کو وہ سخت شاق گزرتے۔

منکم۔ مِن کے متعلق اختلاف ہوا ہے کہ آیا یہ بیانیہ ہے (کل کے معنی میں) یا تبعیضیہ ہے (بعض کے معنی میں)۔

ذهب مفسرنا الجلال الى الاول لان ذلك فرض كفاية وسبقه اليه الكشاف وغيره وقال بعضهم بالثاني (المنار)

۲۲۲ (توحید، رسالت، وحی، جزا و سزا وغیرہ اصولی و بنیادی عقائد کے باب میں)

كالذين۔ مراد سابق اہلِ کتاب، یہود و نصاریٰ ہیں۔

يعني اليهود والنصارى في قول جمهور المفسرين۔ (قرطبی)

تفرقوا واختلفوا یعنی از راہِ نفسانیت و شرارت وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کردیا، اور اپنے الگ الگ مذہب گڑھ لئے مسائل و جزئیاتِ احکام میں اختلاف جو اخلاصِ نیت کے ساتھ اجتہاد کی بنا پر ہو وہ اسلام میں ہرگز ممنوع نہیں بلکہ وہ تو امت کے حق عینِ رحمت ہے — اختلافِ ماحول و اختلافِ مذاق و طبیعت کی بنا پر کسی کو کسی مسلک میں آسانی معلوم ہوتی ہے اور کسی کو کسی میں۔

البيّنات۔ اس کے تحت میں احکام، دلائل، معجزات سب آگئے۔

۲۲۳ یہ خطاب اہلِ دوزخ سے تو بہرحال ہوگا، گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ ان سب سے ہوگا یا ان کے صرف بعض گروہوں سے؟ ایک قول یہ ہے کہ یہ خطاب منافقین سے ہوگا اور ایمان سے یہاں مراد اظہارِ ایمان ہے۔

هم المنافقون۔ (ابن جریر عن الحسن)

ایک قول ہے کہ مخاطب اہلِ کتاب ہیں اور حجت ان پر قائم کی جائیگی کہ تمھاری کتابوں میں نبی آخر الزماں کا ذکر پوری طرح موجود تھا پھر تم کرگئے

المراد اهل الكتاب (کبیر عن عکرمہ والاصم والزجاج)

بعض اہلِ نظر نے ترجیح اسی قول کو دی ہے۔

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ

سو عذاب چکھو اپنے اپنے کفر کے پاداش میں — اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ

وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ

اللہ کی رحمت میں ہوں گے ۲۲۴ اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے — یہ اللہ کی آیتیں ہیں

نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٨﴾

ہم انہیں تم کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ مخلوقات پر ظلم نہیں چاہتا ۲۲۵

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿١٠٩﴾ ع ۱۱ / ۲

اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف (سارے) امور لوٹائے جائیں گے ۲۲۶

والظاهر من السياق والسباق ان هؤلاء اهل الكتاب (روح)

ابن جریر نے بعض تابعین سے استناد کرکے یہ شق اختیار کی ہے کہ خطاب سارے کافروں کے لئے عام ہے اور جس ایمان کا یہاں ذکر ہے وہ اظہارِ ایمان عالمِ ارواح میں عہدِ الست کے وقت کا ہے۔

هو الايمان الذى كان قبل الاختلاف فى زمان آدم (ابن جریر عن ابی بن کعب) عنى به الجميع اهل الكتاب (ابن جریر)

تبیض وجوہ۔ یومِ حشر تو کشفِ حقائق کا وقت ہوگا ضرور ہے کہ اہلِ حق کے چہرے اس ان انوارِ حق سے چمکتے جگمگاتے نظر آئیں۔

تسود وجوہ۔ کشفِ حقائق کے وقت یہ بالکل قدرتی ہے کہ اندر کی سیاہیاں اور باطن کی کدورتیں نکل کر اہلِ باطل کے چہروں پر چھا جائیں۔

عربی محاورہ میں ابیضا وجہ اور اسوادِ وجہ سے مراد علی الترتیب محض مسرت و غم بھی ہو سکتی ہے۔

عبّر عن الفضل والكرم بالبياض ..... فابيضاض الوجوه عبارة عن المسرة واسودادها عن الغم (راغب)

قيل ان بياض الوجوه وسواد ها هنا من باب الحقيقة ..... وقيل وهو الراجح انه من باب الكناية (المنار)

۲۲۴ اور اسی محلِ رضا و محلِ رحمت کا نام جنت ہے جنت کی ایک ایک نعمت کو قرآن مجید نے محلِ ترغیب میں ذکر کیا ہے وہ رضائے الٰہی سے الگ کوئی چیز نہیں جیسا کہ جاہل صوفیہ اور گستاخ شاعروں کے کلام سے ترشح ہوتا ہے۔

۲۲۵ (اس لئے اس کے فیصلے ہمیشہ عادلانہ اور حکیمانہ ہوتے ہیں)

اسلام کا خدا تمام تر رحیم ہے، عادل ہے، شفیق ہے، مشرک قوموں کے دیوی دیوتاؤں کی طرح ظالم و خونخوار نہیں ہے قرآن مجید کو بار بار خداوند تعالیٰ کی تنزیہ کا اثبات ان صفاتِ ذمیمہ سے کرنا ضروری ہو گیا تھا، اور توا ور توریت تک کے خدا میں صفاتِ قہری کہیں زیادہ زور و قوت کے ساتھ جلوہ گر نظر آ رہے ہیں۔

بالحق یعنی بالکل صحیح جس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔

اے بالصدق (قرطبی)

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ

تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے ۲۲۷ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے

عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ

روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو ۲۲۸ اور اہل کتاب بھی اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت خوب ہوتا ۲۲۹

**۲۲۶** اور کوئی دیوی دیوتا نہ اس مرجعیت امور میں اس کا شریک و سہیم ہے نہ آسمان و زمین کی کسی جزو کی ملک و تصرف میں) جاہل قوموں کی ان گمراہیوں کا ذکر پچھلے حاشیوں میں بار بار آچکا ہے۔

ترجع الامور۔ یہ تاکید اس امر کی ہے کہ آخری فیصلہ صرف اللہ تعالیٰ کا ناطق ہوگا، کسی کو بھی اس میں دخل دینے کی مجال نہیں۔

**۲۲۷** یعنی تم اس لئے بنائے گئے ہو کہ لوگ تمہارے نقش قدم پر چلیں، تم ساری دنیا کے لئے ایک نمونہ بنا کر بھیجے گئے ہو، خطاب امت محمدی اور ملت اسلامی سے ہے۔

کنتم۔ کان یہاں یا تو زائد ہے یا تامہ استعمال ہوا ہے اور اگر ناقصہ ہے جب بھی مراد دوام نسبت ہے۔

قیل: ھی کان التامۃ والمعنی خُلقتم و وُجدتم خیر امۃ، وقیل: کان زائدۃ والمعنی انتم خیر امۃ (قرطبی) بل المراد دوام النسبۃ (بحر)

**۲۲۸** (پورا پورا جیسا کہ حق ہے ایمان باللہ کا)

آیت کے اس جزو میں امت اسلامی کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی زندگی کے کامل و مکمل ہونے کا پورا نقشہ آگیا، مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمہ داری پوری طرح محسوس کرو، تم توحید کے امانت دار ہو، زمین پر اللہ کے نائب و خلیفہ ہو، بطور اس کی پولیس کے ہو، الٰہی قانون کے نفاذ و تحفظ کے لئے، دنیا کے نظام عدل کو برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تمہاری زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کو چلاؤ، نظام حق کے ایک ایک کل پرزہ کو درست رکھو اور نظام باطل کا زور چلنے ہی نہ دو ظلم ہوتا اگر اس ذمہ دار فعال (اگزیکیوٹیو) جماعت کو جدال و قتال کی آزادی کسی حال میں نہ ملتی، بلا اجازت جہاد، بلا اجازت اجراء حدود و تعزیرات، اس قوم پر ذمہ داریاں ڈال دینے کے معنی یہ ہوتے کہ ہاتھ پیر باندھ کر حکم دریا میں پیرنے کا دیا جا رہا ہے۔

کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دیں تو وہ ملک کے محسن، ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو اس کا شکر واجب، لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیامبر اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانون الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امن عالم کو غارت کر کے رکھ دینے والوں کی دار و گیر کریں تو "روشن خیالی" کے جبین تحمل پر شکن آجائے اور تہذیب کے پروپیگنڈسٹ اسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگیں!

تنھون عن المنکر۔ منکر کے تحت میں آج کے شراب خانے اور تھیٹر، سینما اور کنسرٹ، بال، ناچ گھر اور میوزک کالج، اسکول آف آرٹ اور تصویر خانے سب آجاتے ہیں، آیت سے ظاہر ہے کہ اس امت کی خیریت و افضلیت اسی وقت تک ہے جب تک وہ ان صفات کی حامل ہے، یعنی ایمان باللہ میں مضبوط، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (ایجابی و سلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں) پر قائم ہے۔ حضرت عمرؓ کے حوالے سے نقل ہوا ہے کہ جو کوئی اس امت میں داخل ہونے کی تمنا رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اللہ کی بتائی ہوئی یہی شرط پوری کرے

مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ

ان میں سے (کچھ تو) ہیں ایمان لانے والے ہیں، مگر اکثر ان میں سے نافرمان ہیں ۲۳۰ؔ وہ تم کو بجز خفیف اذیت کے ہرگز

وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۟ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ ضُرِبَتْ

کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے ۲۳۱ؔ اور اگر وہ تم سے مقابلہ کریں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے ۲۳۲ؔ پھر ان کو مدد بھی

عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ

نہ پہنچ سکے گی ۲۳۳ؔ ان پر لیس دی گئی ہے ذلت خواہ کہیں بھی وہ پائے جائیں سوا اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو

مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ

یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے ہیں ۲۳۴ؔ اور ان پر

عن عمر بن الخطاب قال من سرہ ان یکون من ھذہ الامۃ فلیود شرط اللہ فیھا (ابن جریر)

اور جس کسی میں یہ صفات نہ ہوں، وہ بس انھیں اہل کتاب جیسا ہے جن کی ہجو و مذمت یہاں آئی ہے۔

ومن لم یتصف بذالک اشبہ اھل الکتاب الذین ذمھم اللہ (ابن کثیر)

۲۲۹ؔ (حالاً بھی اور قالاً بھی، فی الفور بھی اور بہ لحاظ انجام کار بھی)

یہ ایمان لانا تو ان اہل کتاب کا فرض بھی تھا، اور عملی مثال مسلمانوں کی وہ دیکھ بھی رہے تھے۔

۲۳۰ؔ (اور حد عبودیت سے قدم باہر رکھنے والے)

فاسق۔ یہاں کافر کے معنی میں ہے یعنی حد عبودیت سے بالکل باہر نکل جانے والے۔

کامل فی فسقہ متمرد فی کفرہ (مجو) المتمردون فی الکفر (بیضاوی) عبر عن الکفر بالفسق (روح)

ای الکافرون (معالم) الضلالۃ والکفر والفسق والعصیان (ابن کثیر)

منھم المؤمنون۔ اس گروہ میں عبداللہ بن سلام یہودی کی طرح دوسرے اہل کتاب بھی داخل ہیں جو رسول اللہ صلعم ہی کے زمانے میں ایمان لے آئے تھے۔

۲۳۱ؔ اشارہ ہے یہود کی طرف جن کا خاص مدینہ اور حوالی مدینہ میں بڑا زور و غلبہ تھا، قرآن نے وقوع سے بہت قبل پیشگوئی کر دی کہ یہود اپنے بڑے مضبوط قلعوں کے باوجود اور بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود مسلمان کو ہرگز کوئی قابل ذکر نقصان نہ پہنچا سکیں گے

اذیٰ۔ ضرر کے مقابلہ میں بہت ہلکی اور چھوٹی چیز ہے۔

ای ضررا یسیرا کالطعن وتھدید (بیضاوی) الاذی بمعنی الضرر الیسیر (روح)

۲۳۲ؔ یعنی اگر وہ اتنی ہمت کر بھی جائیں کہ تم سے مقابلہ و مقاتلہ کو آئیں تو ہرگز غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ الٹی شکست کھا کر بھاگ جائیں گے۔ یہ پیشینگوئی ایک نہیں مجموعہ ہے کئی پیشینگوئیوں کا، اور سب کی سب ظاہری قرائن و قیاسات کے خلاف، اور آخر یہی پیشینگوئیاں صحیح نکلیں

عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ

پستی لپیس دی گئی، یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کے منکر ہو جاتے تھے، اور نبیوں کو بلا وجہ

الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ لَيْسُوْا سَوَآءً ۚ

قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ (سب) اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے نکل نکل جاتے تھے ۲۳۵ سب یکساں نہیں ۲۳۶

مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

انھیں اہل کتاب میں ایک جماعت قائم ہے، یہ لوگ اللہ کی آیتوں کو اوقات شب میں پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں ۲۳۷

بنو قریظہ، بنو نضیر، بنو قینقاع، یہود خیبر سب کے باب میں اس جزم کے ساتھ بجز خدائے علیم و خبیر کے اور کون جرأت بھی ایسی پیش خبریوں کی کر سکتا تھا۔

**۲۳۳** ایک اور پیش خبری، یہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ خود مظفر و منصور ہونا الگ رہا، عرب کے جن مشرک قبیلوں کی حمایت کا غرہ ان یہود کو ہے، ان میں سے کوئی ان کی مدد کو بھی تو نہ آئے گا اور نہ مدینہ کے منافقین ان کے کام آسکیں گے۔

**۲۳۴** بنی اسرائیل کی مغضوبیت اور پستی و ذلت پر حاشیے پارۂ اول رکوع ۷ کے ذیل میں مفصل گزر چکے۔

ضربت علیھم الذلۃ۔ یعنی ان کی جانوں، ان کے مالوں، ان کی عزتوں سب کی بے وقعتی اور ناقدری خلق اللہ کے دل میں پیدا ہو گئی ہے اور تاریخ کی شہادت ہے کہ یہود کی یہ خستہ حالی اور شکستہ پائی نہ صرف زمانۂ نزول تک رہی بلکہ اس کے بعد بھی صدہا سال تک اسی طرح قائم رہی۔

این ما ثقفوا۔ چنانچہ ابھی بیسویں صدی مسیحی کے بھی ثلث اول تک یہود کی جو گت جرمنی میں، ہنگری میں، اٹلی میں، زیکوسلاویکیا میں اور دوسرے ملکوں میں باوجود ان کی خوش حالی و زرداری کے بن چکی ہے، وہ بجائے خود اس آیت کی ایک تفسیر ہے۔

حبل من اللہ سے مراد ان کی ایسی آبادی ہو سکتی ہے جسے خود شریعتِ الٰہی نے قتل، ہلاکت اور تعزیری و انتقامی کارروائیوں سے مستثنیٰ رکھا ہے، مثلاً ان کے بچے، ان کی عورتیں، ان کے گوشہ نشین زاہد، درویش وغیرہ۔

حبل من الناس۔ مراد ان کی وہ جماعتیں ہو سکتی ہیں جو معاہدوں کے ذریعہ سے امن حاصل کر لیتی ہیں۔

حبل۔ کے معنی پہلے بیان ہو چکے ہیں، مراد عہد و ذمہ سے ہے۔

الحبل العھد والذمۃ والامان (لسان)

وحبل۔ و یہاں عطف کے لئے نہیں بلکہ او کے معنی میں ہے۔

**۲۳۵** یعنی حدودِ عبدیت و طاعت سے۔ یہود کی مسلسل سرکشی اور نافرمانی کی داستان سے عہد عتیق، عہد جدید اور خود یہود کی لکھی ہوئی تاریخیں سب بھری پڑی ہیں، وعیدوں کی اس سختی سے بظاہر ایسا متبادر ہوتا ہے کہ جیسے یہ مقہوریت اسرائیلیوں یا یہود کے حق میں ہمیشہ کے لئے مقدر ہو گئی۔

کانوا یکفرون وکانوا یعتدون۔ دونوں موقعوں پر فعل کے ساتھ کانوا لانے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ کوئی استثنائی یا اتفاقی واقعہ ان کی تاریخ میں نہ تھا، بلکہ کفر و عدوان جیسے ان کی قومی خصلت بن گئے تھے، ان کی سرشت میں داخل ہو چکے تھے، وہ ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

یہ اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہیں اور اچھی باتوں کی طرف دوڑتے ہیں، یہی لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں ۲۳۸

وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور جو بھی نیک کام یہ کریں گے اس سے ہرگز محروم نہ کیے جائیں گے، اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے ۲۳۹

عَصَوْا۔ نافرمانی ان لوگوں نے اپنے ہی خدا کے رسولوں کی نہیں کی بلکہ آخر میں خود خاتمِ رُسُل کی بھی کی۔

بغیرحق۔ یعنی انبیاء کو خود اپنے معیارِ عدل وقانون کے بھی خلاف ہی قتل کرتے تھے۔ مسکنت، قتلِ انبیاء،

کفر بآیاتِ اللہ وغیرہ پر مفصل حاشیے پارہ اول رکوع ۶ کے ذیل میں گزر چکے۔

**۲۳۶** (اپنی حق ناشناسی اور اسلام سے تعلق اپنے طرزِ عمل کے لحاظ سے)

لیس اھل الکتاب مستویًا (بحر) والضمیر لاھل الکتاب (بیضاوی)

اوپر جو کچھ ذکر ہوا، اہلِ کتاب کی اکثریت کا تھا، باقی ان میں سے بعض بعض حق شناس، انصاف دوست بھی تھے،

اور یہ لوگ بالآخر مشرف بہ اسلام ہو کر رہے۔

**۲۳۷** یعنی نماز پڑھتے رہتے ہیں۔

والمراد ھم یصلّون (روح) اے یصلون، عن الفرّاء والزجاج (قرطبی)

نمازِ شب کے فضائل آیت سے ظاہر ہیں۔

اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ۔ یہ وہ جماعت تھی جو دینِ حق پر قائم وثابت رہی۔

اے المستقیمۃ العادلۃ (بیضاوی) انھا ثابتۃ علی التمسک بالدین الحق ملازمۃ لہ (کبیر)

اٰیات اللہ۔ یعنی قرآن کی آیات۔

والمراد یقرؤن القرآن (روح)

مفسرین نے یہاں عبداللہ بن سلامؓ، ثعلبہؓ بن سعید، اسیدؓ بن سعید، اسد بن عبیدؓ وغیرہم کے نام درج کیے ہیں

جو یہودیت سے نکل کر رسولِ اسلامؐ پر ایمان لائے تھے۔

**۲۳۸** قرآن مجید جنھیں صالح قرار دیتا ہے ان کے اوصاف وخصوصیات یہاں کس جامعیت وایجاز کے ساتھ ارشاد کر دیئے گئے ہیں۔ پہلی بات یہ بتائی کہ وہ ایمان میں کامل ہوں گے، اور جو کچھ بھی خرچ کریں گے، مقصدِ صحیح کے ساتھ اور راہِ حق میں کریں گے، دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ وہ لوگ نہ صرف خود ہی ایجابی وسلبی ہر حیثیت سے اخلاق اور پاکیزہ کرداری کے پتلے ہوں گے، بلکہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر لائیں گے اور لگائیں گے اور نیکیوں کی طرف دلی شوق اور رغبت کے ساتھ بڑھیں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ

بے شک جن لوگوں نے کفر (اختیار) کیا ہرگز ان کے ذرا بھی کام اللہ کے مقابلے میں نہ ان کے مال آئیں گے نہ ان کی

مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ

اولاد۔ اور یہی لوگ تو دوزخ والے ہیں، اس میں (ہمیشہ) پڑے رہیں گے ۲۴۰ؐ یہ جو کچھ

مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ

اس دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جیسے ایک ہوا ہے جس میں سخت

أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ

سردی ہے (اور) وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے پھر وہ (ہوا) اس

اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾

(کھیتی) کو برباد کر دے تو اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں ۲۴۱ؐ

یسارعون فی الخیرات۔ یعنی نیکیوں کی طرف بے دلی اور بدشوقی کے ساتھ گویا ہارا اور تھک کر نہیں بلکہ بڑے شوق واشتیاق، چاؤ اور رغبت کے ساتھ لپکیں گے۔

المسارعة فی الخیر ناشئة عن فرط الرغبة (بحر)

من الصلحین کے معنی مع الصلحین کے بھی کئے گئے ہیں (قرطبی)

**۲۳۹ؐ** (اور چونکہ یہ پرہیزگار ہیں، اس لئے انھیں بھی خوب جانتا ہے)

یہ خیال نہ گزرے کہ کوئی متقی اللہ تعالیٰ کے علم میں آجانے سے رہ جائے گا، غیر قوموں کے عقائد کی تردید کے لئے اس جزو کا اضافہ ضروری تھا

فلن یکفروہ۔ یعنی کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ جب ماضی خراب رہ چکا ہے تو اب نجات و مغفرت کی امید ہی کیا، اور اب ایمان و حسن عمل سے حاصل کیا؟ غیر مذہب والوں نے ایسے ہی عقائد گڑھ رکھے تھے اس لئے تنبیہ ضروری تھی۔

یکفروہ۔ میں ضمیر عمل خیر کے اجر و ثواب کی جانب ہے، اور کفر سے مراد حرمان یا محرومی ہے۔

ای لن تمنعوا ثوابه وجزاءہ (کبیر) فکانه قیل فلن تحرموته بمعنی فلن تحرموا جزاءہ (کشاف)

**۲۴۰ؐ** (اور ان کی جہالتوں اور خام خیالیوں کا بطلان اس روز اُن پر پوری طرح واضح ہو کر رہے گا)

اولٰئک سے مراد ایمان سے محروم کفار ہیں، اور چونکہ اس لفظ سے حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، اہل سنت نے اس آیت سے معتزلہ کے خلاف استدلال کر کے کہا ہے کہ خلود نار کی سزا صرف کافروں منکروں کے لئے ہے، گنہگار مومنین کے لئے نہیں۔

ولما افادت هذه الكلمة معنى الحصر ثبت ان الخلود فی النار لیس الا للکافر (کبیر)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا

اے ایمان والو اپنوں کے سوا (کسی کو) گہرا دوست نہ بناؤ ۲۳۲ے وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھتے

لن تغنی عنهم اموالهم یعنی یہ تو نہ ہوگا کہ مال کو بہ طور کفارہ یا تو بہ پیش کر کے نجات حاصل کر لی جائے، یہود کے جو غلط سلط عقیدے اس باب میں ہو چکے تھے اس کا ذکر پارۂ اول کے حاشیوں میں آچکا ہے۔

ولا اولادهم، ہندوؤں اور جینیوں میں یہ گمراہی خاص طور پر بڑھی ہوئی ہے اولاد نرینہ کی اہمیت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ لڑکا ہی مرے ہوئے باپ کو پانی دے دے کر عذاب سے چھڑا لیتا ہے منوجی کا یہ قول کتابوں میں نظر سے گزرا ہے کہ بیٹے کو سنسکرت میں "پتر" کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ باپ کو "پت" (دوزخ) سے چھڑا لاتا ہے۔

مال و اولاد کے ذریعہ سے حصولِ نجات کی گمراہی جاہلی مذہبوں میں عام اور بہت پھیلی ہوئی تھی، اس لئے قرآن نے اس کی تردید اس صراحت کے ساتھ کی۔

۲۳۱ے آسان اور عام فہم مثال میں ان لوگوں کے مال کے ضائع جانے کو بیان کیا ہے جو ایمان سے محرومی کی حالت میں اس دنیا کے حصول کے لئے ریا و ناموری کے لئے اپنی دولت خرچ کرتے رہتے ہیں۔

کمثل۔ مثال ضائع جانے اور عبث ہونے میں ہے۔

صر۔ سخت ٹھنڈی چیز کو کہتے ہیں جیسے پالا یا برف۔

قال ابن عباس الصر البرد الشدید (قرطبی) قال اکثر المفسرین واهل اللغة الصر البرد الشدید قاله ابن زید وغیره

ظلموا انفسهم۔ اپنے ہاتھوں اپنی جان پر ظلم کیا یعنی کفر اور بے دینی کر کر کے۔

ما ظلمهم الله۔ اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا کہ ان کے صرف مال کو خواہ مخواہ بے حاصل اور ضائع کر دیا ہو۔

ولكن انفسهم يظلمون۔ وہ خود ہی تو اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں کہ مال کو بے محل اور خلاف اذنِ الٰہی خرچ کر رہے ہیں۔

۲۳۲ے (ایسا کہ اس سے اپنے ذاتی اور ملی راز کو کہہ ڈالو)

من دونكم۔ یعنی بجز اپنی ملت والوں کے۔

بطانة۔ کسی بھی رازدار دوست کو۔

ای مختصا بکم یستبطن امورکم (راغب) بطانة الرجل خاصته الذین یستبطنون امره (قرطبی)

قانونِ اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم، اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کو ضرر کے اندیشے اور خطرے کھلے ہوئے ہیں اور اس صریح، معقول، مناسب اور ضروری انتظام کا نام بعض عقل کے دشمنوں نے "تنگ نظری" رکھا ہے ــــ سبحان اللہ! امراض و بائی میں پرہیز و احتیاط کا نام تو فخر کے ساتھ "اصولِ حفظانِ صحت" رکھا جائے اور جو انتظام کفر و طغیان یعنی دنیا و آخرت دونوں کی بربادی سے بچنے کے لئے کیا جائے اس کا نام "تنگ نظری" پڑ جائے، عقل دشمنی کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے۔

فقہائے مدینہ بلکہ فقہائے حجاز نے عموماً آیت سے استنباط کیا ہے کہ دشمنوں کی شہادت دشمن کے حق میں معتبر نہیں، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں جائز ہے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ

اور تمہارے دکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بغض تو ان کے مونہوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جو کچھ وہ اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں

صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

وہ اور بھی بڑھ کر ہے ۲۴۳ہم تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر چکے ہیں ۲۴۴

هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ

اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو، تم تو ایسے ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور یہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے،

كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ

تم کتاب (آسمانی) پر اس کے کل پر ایمان رکھتے ہو ۲۴۵ اور یہ جب تم سے ملتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر

وفی ھٰذہ الآیة دلیل علٰی ان شھادة العدو علٰی عدوہٖ لا تجوز وبذالک قال اھل المدینه والحجاز وروی عن ابی حنیفة جواز ذالک۔ (قرطبی)

افسوس ہے کہ مسلمانوں نے آیت کے حکم پر عمل میں سستی اور مداہنت شروع سے برتنی شروع کر دی اور ابھی رسول اللہ صلعم کے زمانہ کو چند صدیاں بھی نہیں ہونے پائی تھیں کہ سلطنت کے کاروبار میں کھلم کھلا مسیحیوں، مجوسیوں وغیرہ کو شریک کیا جانے لگا امام قرطبیؒ کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کا ہے حسرت، قلق اور درد کے لہجہ میں لکھتے ہیں:۔

وقد انقلبت الاحوال فی ھٰذہ الازمان باتخاذ اھل الکتاب کتبة وامناء وتسودوا بذالک عند الجھلة الاغنیاء من الولاة والامراء۔ (قرطبی)

یہ حال جب اس زمانہ کا تھا تو آج چودھویں صدی ہجری میں جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں منکروں کا غلبہ و تسلط مسلمانوں پر نمایاں ہے صورت حال پر اظہار خیال کن لفظوں میں کیا جائے!

فقہاء مفسرین نے آیت کے ذیل میں یہ بھی لکھا ہے کہ کافروں سے تشبہ تک جب جائز نہیں تو ان کے ساتھ مصاحبت تو بدرجۂ اولیٰ ممنوع ہوگی۔

لاخلاف بین علماءنا ان المراد به النھی عن مصاحبة الکفار من اھل الکتاب حتّٰی نھی عن التشبه بھم۔ (ابن العربی)

۲۴۳ یعنی ان کی مخفی عداوت کا درجہ تو اس سے بھی کہیں بڑھا ہوا ہے۔

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ فقرہ کافرانہ ذہنیت کا پورا ترجمان ہے اس کے اندر گہری تعلیم اس بات کی آگئی کہ کوئی کافرِ معاند مسلموں کا حقیقی دوست اور ہوا خواہ ہو نہیں سکتا۔

بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ شدتِ عداوت میں غیر اختیاری طور پر زبان سے بھی ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں اشارہ زیادہ تر یہود مدینہ کی جانب ہے یہ لوگ اب اپنا بغضِ اسلام مسلمانوں سے چھپا بھی نہیں رکھ سکتے تھے اور بے اختیار ان کی زبانوں سے ظاہر ہی ہو ہی جاتا تھا۔

الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ

(شدت) غیظ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں ۲۴۶ آپ کہہ دیجئے کہ تم غیظ میں مر رہو بے شک اللہ دلوں کی باتوں کو

الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۫ وَاِنْ تُصِبْكُمْ

خوب جانتا ہے ۲۴۷ اگر تمہیں کوئی اچھی حالت پیش آجاتی ہے تو یہ ان لوگوں کو دکھ پہنچاتی ہے اور اگر تم پر

سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ

کوئی بری حالت آپڑتی ہے تو یہ اس سے خوش ہوتے ہیں ۲۴۸ اور اگر تم صبر و تقویٰ اختیار کئے رہو تو تم کو ان کی چالیں

شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع ۱۲ ع ۱۱ ۲

ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی، بے شک اللہ ان کے اعمال پر (پورا) احاطہ رکھتا ہے ۲۴۹

۲۴۴ آیت کے معنی دو طرح پر کئے گئے ہیں، ایک یہ کہ ان کافروں کے بغض و عداوت کے آثار و علامات تم پر روشن ہو گئے ہیں، جن سے تم انھیں فوراً پہچان سکتے ہو۔

ثم بین اللہ تعالیٰ ان اظہار ھذہ الاسرار للمومنین من نعمہ علیھم۔ (کبیر)

دوسرے معنی یہ کہ تمہارے لئے اُن سے ترکِ موالات کی آیتیں کھول کر بیان کی جا چکی ہیں۔

ای اظہرنا لکم الاٰیات الدالۃ علی النھی عن موالاۃ اعداء اللہ تعالیٰ ورسولہ (روح) الدالۃ علی موالاۃ المومنین ومعاداۃ الکافرین۔ (بیضاوی)

۲۴۵ یعنی ساری کتبِ الٰہی پر۔

الکتٰب۔ بہ طور اسم جنس استعمال ہوا ہے۔

والکتاب اسم جنس قالہ ابن عباس (قرطبی) بجنس الکتاب کلہ۔ (بیضاوی)

تحبونھم۔ یہ مسلمانوں کی سادہ دلی اور نیک طبعی کا ذکر ہے۔

ولا یحبونکم۔ یہ محبت تو تم سے کیا رکھتے، اُلٹے عداوت رکھتے ہیں اور تمہاری کتاب الٰہی کے منکر ہیں، مطلب یہ ہوا کہ تم تو ان کی کتابوں تک پر ایمان رکھتے ہو اور وہ پھر بھی تم سے کسی درجہ میں بھی علاقۂ محبت نہیں رکھتے۔

۲۴۶ غصہ سے انگلیاں کاٹ کاٹ کھانا عربی محاورہ میں کنایہ شدید جھنجھلاہٹ سے ہے جیسے اردو محاورہ میں "اپنی بوٹیاں نوچنا" "بوٹیاں چبانا" "دانت پیسنا" وغیرہ۔

ذکر منافقین مدینہ کا ہے۔

یعنی المنافقین (قرطبی)

۲۴۷ (چنانچہ اس نے تمہارے دلوں کے اندر کے کینہ اور عداوت کو کھول کر بیان کر دیا ہے)

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ط

اور (وہ وقت یاد کیجئے) جب آپ صبح کو اپنے گھر والوں (کے پاس) سے نکلے مسلمانوں کو قتال کے لئے مناسب مقامات

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ

پر لے جاتے ہوئے ۲۵۰ اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا جاننے والا ہے ۲۵۱ جب تم سے دو جماعتیں اس کا خیال کر بیٹھی تھیں کہ ہمت ہار دیں ۲۵۲

وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

درانحالیکہ اللہ دونوں کا مددگار تھا ۲۵۳ اور مسلمانوں کو تو اللہ ہی پر اعتماد رکھنا چاہیے ۲۵۴

موتوا بغیظکم یعنی شدتِ ناکامی و نامرادی میں مر رہو اس لئے کہ جو تمھاری تمنا ہے یعنی اسلام کی مغلوبیت، ہزیمت وہ پوری ہونے کی نہیں۔

۲۴۸ منافقوں کی خباثتِ نفس اور کینہ پروری کا بیان ہے کہ مسلمانوں کی تکلیف سے خوش ہوتے ہیں اور ان کی خوشی اور خوشحالی سے رنجیدہ۔

حسنۃٌ۔ مسلمانوں کی اندرونی تنظیم یا کافروں پر ان کا فتح و غلبہ۔

سیئۃٌ۔ مثلاً کوئی ہنگامی شکست۔

۲۴۹ (اللہ اُن کی سزا پر ہر طرح قادر ہے)

وان تصبروا منافقین کے کید و مکر اور شدید مخالفین کے عناد و مخالفت کے نتائج سے محفوظ رہنے کا کتنا آسان اور سہل الحصول نسخہ یہاں مسلمانوں کو بتا دیا گیا ہے تم اپنے کام سے کام رکھو اپنی اصلاح میں لگے رہو استقامت علی الحق کا دامن ہاتھ سے نہ دو، کوئی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

وان تصبروا وتتقوا۔ صبر و تقویٰ، ان دو مختصر سے عنوانات کے اندر امت کی ساری تنظیمی جد و جہد و مشغولیت کس ایجاز و جامعیت کے ساتھ آ گئی، آیت میں اس کی تعلیم بھی آ گئی کہ دشمن سے محفوظ رہنے کے لئے بہترین حربہ صبر و تقویٰ کا ہے۔

ھذا تعلیم من اللہ وارشاد الی ان یستعان علی کید العدو بالصبر والتقوی (مدارک)

۲۵۰ (دامنِ جبلِ اُحد کی طرف اور آپ سب کی جگہیں متعین کر رہے تھے کہ یہاں سوار کھڑے ہوں، یہاں پیادے یہاں تیر انداز وغیرہا) اب کہ جنگِ اُحد کا شروع ہو رہا ہے اُحد مدینہ منورہ سے شمال کی جانب ڈھائی تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑی ہے بدر میں شکست کھائے ہوئے مشرکین مکہ جوشِ انتقام سے دیوانے ہو رہے تھے ہجرت کا تیسرا سال قریب ختم کے تھا اور واقعہ بدر پر ایک سال گزر چکا تھا، کہ مکہ والوں کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اب کی تیاریاں بڑے انتظام و اہتمام کے ساتھ اور بہت بڑے پیمانہ پر ہوئی تھیں، قریش کی جمعیت ۳ ہزار کی تھی ان میں ۷۰۰ جوان زرہ پوش تھے ۲۰۰ سوار اور باقی شتر سوار تھے، قوم اور قبیلہ کے بڑے بڑے سردار سب ساتھ ہوئے بڑی بات یہ کہ عورتیں بھی شریکِ جنگ ہوئیں ہاتھوں میں باجے لئے ہوئے پرجوش ترانے گاتی جاتی تھیں اور مقتولینِ بدر کے انتقام پر اپنے عزیزوں، قریبوں کو ابھارتی جاتی تھیں ــــ جنگ میں عورتوں کی

عورتوں کی شرکت آج بیسویں صدی کی "جدّت" نہیں جاہلی مشرک قوموں کا پرانا شعار ہے۔

اسلامی فوج اس کے مقابلہ میں کل ایک ہزار تھی اور سامان کی کیفیت یہ تھی کہ علاوہ رسول اللہ (صلعم) کی سواری مبارک کے فوج بھر میں صرف ایک گھوڑا اور تھا، اس سے بڑھ کر ستم یہ ہوا کہ صبح سویرے عین اس وقت جب غنیم سامنے نظر آیا اور مسلمان اپنے مقدس امیر الجیش کے ساتھ ابھی نماز ہی میں مشغول تھے عبداللہ بن اُبی مدینہ کا پرانا اور ذی اثر لیڈر یہ عذر کر کے کہ جب ہماری رائے نہیں سُنی جاتی اور شہر کے اندر ہی محصور ہو کر نہیں لڑا جاتا تو ہم بیکار اپنی جانیں دوسروں کے کہنے پر کیوں دیں اپنے ۳۰۰ ساتھیوں کو لے کر شہر کو واپس چلا گیا، اور اب لشکر اسلام کی کُل جمعیت ۷۰۰ کی رہ گئی، ان میں بھی زرہ پوش کل ۱۰۰۔ مقابل فوج تعداد میں چوگنی سے زائد اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی کہیں زیادہ آراستہ!

واذ غدوت من اھلک۔ مِن یہاں عند کے معنی میں ہے اور آنحضرت صلعم اس وقت حضرت عائشہؓ کے حجرہ سے برآمد ہوئے تھے۔

کان الخروج من حجرۃ عائشۃ (روح) یعنی خرجت بالصباح من منزلک من عند عائشۃ۔ (قرطبی)

یہ ۷ شوال ۳ھ ہجری، یوم شنبہ کی صبح کا وقت تھا۔

مقاعد للقتال۔ ترتیب صفوف اور مورچوں کی متناسب موضعیت کی اہمیت جس طرح سکندر و دارا کے زمانہ میں تھی جدید فنِ حرب میں بھی مسلّم ہے، اور ملٹری سائنس کی کتابوں میں "پوزیشن" POSITION کی اہمیت کی تشریح میں صفحے کے صفحے وقف رہتے ہیں، امت کا رہبر کامل، مقدس نبی ہونے کے علاوہ سپہدار اعظم کی حیثیت سے بھی بے نظیر تھا۔

TOM ANDRE نامی بیسویں صدی کا ایک فرنگی مورخ اسلام ہے وہ اپنی سوانح محمدی میں آپ کے اس کمال خصوصی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے "برخلاف اپنے مخالفین کے جو محض ہمت و شجاعت ہی رکھتے تھے محمدؐ نے کہنا چاہیے کہ فنِ حرب کی بھی نئی راہ نکالی، کم اولو کی بے دھڑک اور اندھا دھند جوش کے مقابلہ میں محمدؐ نے خوب دوراندیشی اور سخت قسم کے نظم و انضباط سے کام لیا۔" ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

مولانا شبلی مرحوم نے الفاظ کے ذریعہ سے گویا پورا معرکہ احد کا کھینچ دیا ہے: "آنحضرت صلعم نے اُحد کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی مُصعب بن عُمیر کو علم عنایت کیا، زبیر بن عوام رسالہ کے افسر مقرر ہوئے حضرت حمزہؓ کو اس حصہ فوج کی کمان ملی جو زرہ پوش نہ تھے پُشت کی طرف احتمال تھا کہ دشمن ادھر سے آئیں اس لئے پچاس تیراندازوں کا دستہ متعین فرمایا اور حکم دیا کو لڑائی فتح ہو جائے تاہم وہ جگہ سے نہ ہٹیں عبداللہ بن جبیر ان تیراندازوں کے افسر مقرر ہوئے قریش کو بدر میں تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے انھوں نے نہایت ترتیب سے صف آرائی کی میمنہ پر خالد بن ولید کو مقرر کیا، میسرہ عکرمہ کو دیا جو ابوجہل کے فرزند تھے سواروں کا دستہ صفوان بن اُمیّہ کی کمان میں تھا، جو قریش کا مشہور رئیس تھا، تیراندازوں کے دستے الگ تھے جن کا افسر عبداللہ بن ابی ربیعہ تھا، طلحہ علمبردار تھا، اور سو گھوڑے کوتل رکاب میں تھے کہ ضرورت کے وقت کام آئیں" (سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۷۳ طبع اول)

**۲۵۱** سمیع و علیم کی دونوں صفات کو یاد دلا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اس وقت مخالفین و موافقین جو کچھ اپنی اپنی جگہ پر کہہ سن رہے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں آچکا، اور اس موقع پر مخالفین و موافقین دونوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا، اس میں سے کوئی شئے اس سے مخفی نہ رہی۔

**۲۵۲** (اور جنگ سے الگ ہو بیٹھیں لیکن اس ارادہ پر عمل نہیں کرنے پائیں)

ھمّت۔ ھمّ کے معنی عربی میں پختہ قصد و عزم کے بھی ہیں اور محض خفیف سے خیال اور شائبہ قصد کے بھی۔

الھمّ قد یراد بہ العزم وقد یراد بہ الفکر وقد یراد بہ حدیث النفس۔ (کبیر)

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ

اور یقیناً اللہ نے تمہاری نصرت کی بدر میں حالانکہ تم پست تھے، تو اللہ سے ڈرتے رہو۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

عجب کیا کہ شکر گذار بن جاؤ ۲۵۵ ؎

یہاں مراد یہی آخری معنی ہیں، یعنی حدیث نفس یا وسوسہ۔

والظاهر ان هذا الهم لم يكن عن عزم بل كان مجرد حديث نفس و وسوسة (روح) لايدل على ان معصية وقعت منهما

طائفتان۔ ان دو جماعتوں سے مراد قبیلۂ اوس کے بنی حارثہ اور قبیلہ خزرج کے بنی سلمہ ہیں۔ (کبیر)

الطائفتان بنو سلمة من الخزرج وبنو حارثة من الاوس۔ (ابن ہشام)

ان دونوں دستوں نے عبداللہ بن اُبی کی شال دیکھ کر آن کی آن کمزوری اور بدہمتی محسوس کی لیکن اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور وسوسہ کو وسوسہ کے درجہ سے آگے بڑھنے نہ دیا اور یہ خیال بھی جو انھیں پیدا ہوا، اپنی قلتِ تعداد، قلتِ سامان غرض ضعفِ مادی کی بنا پر پیدا ہوا، جو ایک امر طبعی تھا، نہ کہ ضعفِ ایمان سے، یا دین کی حقانیت میں کسی شک و شبہ سے اور بالفرض یہ خیال جم کر معصیت کے درجہ تک پہنچ جاتا، جب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا، مومنین مخلصین کی جماعت بہرحال معصومین کی جماعت نہ تھی۔

انما كان ذلك منهما من ضعف او وهن اصابهما من غير شك في دينهما (ابن ہشام)

انیسویں صدی عیسوی کا انگریز باسورتھ اسمتھ ابتدائی غزوات سے متعلق جو عموماً تاریخی استناد رکھتے ہیں کہتا ہے کہ "یہ مظاہرے اخلاص و ایثار و شجاعت کے لحاظ سے ہومر کے افسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں" (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۲۰۷)

۲۵۳ ؎ (چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے دستگیری کی اور اپنا فضل قائم رکھا)

آیت ان دونوں ٹکریوں پر اظہارِ عتاب کے لئے نہیں، اظہارِ عنایتِ خاص و التفات کے لئے ہے۔

حافظهما و ولاهما عن ذلك (ابن عباسؓ)

۲۵۴ ؎ (اور چاہئے کہ آئندہ یاس و بدہمتی کے جذبات کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں)

توکل۔ طریقت کے اعلیٰ صفات میں سے ہے اور محققین صوفیہ نے اس کی حقیقت پر مفصل بحثیں کی ہیں۔

۲۵۵ ؎ یعنی تقویٰ کی عادت تمہیں شکر گزار بنا دے گی۔

بدر۔ مدینہ کے جنوب و مغرب میں اس سے کوئی ۸۰ میل کے فاصلہ پر اور ساحلِ بحر احمر سے ایک منزل پر ایک پڑاؤ اور منڈی کا نام ہے یہ مقام نہ صرف شام اور مکہ و مدینہ کی سڑکوں کا تراہا تھا اور قریش کے تجارتی قافلے آمد و رفت میں یہیں سے گزرتے تھے، بلکہ اسے اہمیت اس لئے بھی حاصل تھی کہ یہاں پانی کی افراط تھی اور یہ عرب میں ایک بڑی چیز تھی، توحید اور شرک کے درمیان سب سے پہلا قابلِ ذکر لشکری تصادم یہیں بروز جمعہ ۱۷ رمضان ۲ ھجری (۱۱ مارچ ۶۲۴ء) کو پیش آیا تھا، اس غزوہ نے گویا اسلام کی اور اس طرح بالواسطہ ساری دنیا کی تاریخ کا رخ ہی پلٹ دیا، فرنگی مورخین بھی اس کی اہمیت کی پوری طرح قائل ہیں، ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے: "فتوحاتِ اسلامی کے سلسلہ میں جنگِ بدر انتہائی اہمیت رکھتی ہے" (جلد ۸ ص ۱۲۲)

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ

(وہ وقت یاد کیجئے) جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد تین ہزار

مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ ﴿۱۲۴﴾ بَلَىٰ ۚ إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُمْ مِّنْ

اتارے ہوئے فرشتوں سے کرے ۲۵۶ کیوں نہیں، بشرطیکہ تم نے صبر و تقویٰ قائم رکھا ۲۵۷ اور اگر وہ تم پر

فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ﴿۱۲۵﴾

فوراً آپڑیں گے ۲۵۸ تو تمہارا پروردگار تمہاری مدد پانچ ہزار نشان کئے ہوئے فرشتوں سے کرے گا ۲۵۹

اور امریکی پروفیسر ہٹی HATTI کی ہسٹری آف دی عربس میں ہے:۔ یہ اسلام کی سب سے پہلی فتح مبین تھی (ص ۱۱۷)

وانتم اذلۃ یعنی تعداد میں قلیل اور ساز و سامان میں حقیر، مسلمان تعداد میں کُل ۳۱۳ تھے۔

اس "فوج" کے ہمراہ گھوڑے صرف دو تھے اور اونٹ ۷۰ کی تعداد میں، انہی پر لوگ باری باری سوار ہوتے تھے۔

ای لقلۃ العدد والسلاح (جلالین) معناہ قلیلون (قرطبی) فی حالۃ قلۃ وذلۃ (بحر) یعنی ما کانوا علیہ

من الضعف وقلۃ السلاح والمال والرکوب (بحر)

فاتقوا اللہ یعنی جیسا کہ ابھی واقعۂ بدر کی مثال میں تم نے دیکھ لیا، تم نے اپنی طرف سے تقویٰ کا حق ادا کردیا

تو اُدھر سے فضلِ باری اور نصرتِ الٰہی نے بھی کیسی دستگیری کی۔

ولقد نصرکم اللہ ببدر۔ خطاب مومنین سے ہے انھیں مستقبل میں ثابت قدم رکھنے کے لئے ماضی قریب سے نظیر لائی جارہی ہے

کہ دیکھو ابھی پچھلے ہی سال تم نے کس قدر نازک موقع پر اعتماد علی اللہ سے کام لیا تو فضلِ الٰہی نے تمھیں کیسے حیرت انگیز طریقہ پر کامیاب کر دکھایا

لعلکم لعلّ پر حاشیہ گزر چکا ہے کہ اس کا استعمال جب حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے تو مفہوم میں شک و احتمال کے

نہیں، جزم و یقین کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ یہاں بھی مراد یہی ہے کہ تقویٰ الٰہی اختیار کرو تو شکر گزار بن جاؤ گے

یہ نہیں کہ "شاید" شکر گزار بن جاؤ۔

آیتوں کا موقع نزول غزوۂ احد کا زمانہ ہے۔

۲۵۶ (جو آسمان سے خاص اسی غرض کے لئے اتارے گئے ہوں)

اذ تقول۔ میں ذکر اس وقت کا ہے جب میدانِ بدر میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ غنیم کو زبردست کمک پہنچ گئی ہے،

اور آپ مومنین کو تسلّی دے رہے تھے۔

الن یکفیکم۔ تمہارے لئے کافی نہیں یعنی کیا تمہاری تسکین و تسلّی کے لئے یہ کافی نہیں۔

یمدکم ربکم۔ امدادِ غیبی کے موقع پر صفتِ ربوبیت کا اظہار اور وہ بھی مخاطبین کی طرف اضافت کے ساتھ بہترین

پیرایۂ بلاغت و اسلوب بیان ہے آج کے ماہرین فن حرب پر بھی خوب روشن ہے کہ سپاہ کی ہمت قائم رکھنا ان کے

MORALE کا درست رکھنا جنگ میں کامیابی کا ایک بڑا اور اہم عنصر ہے۔

**۲۵۷** (میدانِ جنگ میں، اور اطاعتِ رسولؐ سے منھ نہ موڑا)

غور کرکے دیکھ لیا، سارا زور صبر و ثبات اور اطاعتِ رسول پر ہے۔ جنگِ اُحد سے قبل اُمت کے پیشوائے اعظم نے جو خطبہ اپنی سپاہ کے سامنے دیا تھا، اور جو حدیث کی کتابوں منقول چلا آتا ہے اس میں یہ مضمون خصوصیت کے ساتھ ہے کہ: "اگر ثابت قدم رہو گے تو البتہ تم ہی کو مظفر و منصور کرے گا۔ اپنے پروردگار پر اعتماد رکھو، ثابت قدم رہو، اور فتح تم ہی کو نصیب ہوگی"۔

اور یہ شرط بڑی اہم ہے اور اس کی اہمیت کا عملی ظہور بدر و اُحد کے دونوں معرکوں میں ہوگیا، وہی خدا مدد دینے والا وہی مسلمان امداد کے محتاج، لیکن بدر میں لشکرِ اسلام ہر طرح رسول کا مُطیع و مُنقاد رہا، اور اسبابِ ظاہر پر تکیہ دارانہ کیا، اللہ نے امدادِ غیبی فرشتوں سے پہنچائی، اُحد میں صورتِ حال اس کے برعکس رہی، لشکر ہی کے ایک حصہ نے عدولِ حکمی کی اور بہاں خاصہ اعتماد اپنی طاقت پر ہونے لگا، اللہ نے ایک وقت تک کے لئے امداد سے دست کشی کرلی، اور شکست کا تجربہ بھی کرادیا۔

حصولِ برکت و نزولِ برکت کے لئے بڑی شئے، بندوں کی طرف سے اطاعت و انقیاد ہے۔

**۲۵۸** (اور اچانک حملہ کی حالت میں امدادِ "بشری" عادۃً ممتنع ہوتی ہے)

یأتوکم۔ کے فاعل وہی مخالفین و معاندین ہیں۔

اے المشرکون (روح)

من فورھم۔ یعنی بالکل اچانک۔

لفظة الفور تدل علی السرعة والعجلة (بحر) استعیر للسرعة۔ (بیضاوی)

**۲۵۹** (اور تمھاری ہمت و حوصلہ کے لئے یہ کتنی بڑی خوشخبری ہے!)

مُسوّمین۔ یعنی کسی امتیازی علامت کے ساتھ ممتاز۔

اے معلّمین بعلامات (قرطبی)

رہا یہ امر کہ واقعۃً نزولِ ملائکہ ہوا اور انھوں نے کافروں سے قتال کیا، تو قرآن اس باب میں خاموش ہے اور روایتوں میں قول دونوں قسم کے ملتے ہیں، دلیلِ قطعی کسی فریق کے پاس نہیں۔

لم تتعرض الآیة الکریمة لنزول الملٰئکة ولا لقتالھم المشرکین وقتلھم بل ھو امر مسکوت عنه فی الآیة (بحر) قال ابن عباسؓ ومجاھد لم تقاتل الملائکة الایوم بدر وقال بعضھم انما کانت الفائدة فی کثرة الملٰئکة انھم کانوا یدعون ویسبّحون ویکثرون الذین یقاتلون یومئذ فعلٰی ھذا لم تقاتل ملائکة یوم بدر وانّما حضروا للدعاء بالتثبیت والاول اکثر۔ (قرطبی)

عامر شعبی کی روایت ہے کہ مسلمانوں کو خبر یہ پہنچی تھی کہ مشرکین کی مدد کے لئے کرز بن جابر محاربی آرہا ہے، اس ڈر کو مسلمانوں کے دل سے دور کرنے اور انھیں ڈھارس بندھانے کے لئے ان سے کہا گیا کہ تمھاری کمک پر بھی تو فرشتوں کے جھنڈ موجود ہیں، لیکن ادھر نہ کرز مع اپنی جماعت کے آیا اور نہ ادھر فرشتوں کو قتال کی ضرورت پڑی۔

فبلغت الکرز الھزیمة فرجع ولم یمدھم بالخمسة (ابن جریر) فبلغ کرزا واصحابه الھزیمة فلم یمدھم ولم تنزل الخمسة۔ (ابن جریر)

علامہ آلوسی بغدادی نے لکھا ہے کہ اگر اس کلام کا تعلق غزوۂ اُحد سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس موقع پر امدادِ ملائکہ نہیں آئی

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ

اور یہ تو اللہ نے اس لئے کیا کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمھیں اس سے دلجمعی حاصل ہو جائے، ورنہ نصرت

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ

تو بس زبردست اور حکمت والے اللہ ہی کی طرف سے ہے ۳۶۰ (اور یہ نصرت

طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾

اس غرض سے تھی) تاکہ کفر کرنے والوں میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انھیں خوار کر دے کہ وہ ناکام ہو کر واپس جائیں ۳۶۱

اور اگر غزوۂ بدر سے ہے، تو یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔

وفی ذلك تردید وتردد لكن هذا الكلام ان كان فی غزوة أحد فلا شبهة فی عدم وقوع ذلك ولايملك واحد لعدم وقوع الشرط ولذا وقعت الهزيمة وان كان فی غزوة بدر كما هو المعتمد فقد وقع اختلاف فی انهم امدّ وابهذا الخمسة الالاف اولا فذهب الشعبی الی انهم امد وابغيرها. (روح)

اکثر کا قول تو یہ ہے کہ بدر میں امدادِ ملائکہ نازل ہوئی تھی لیکن ابوبکر اصم تابعی کو اس سے شدید انکار ہے۔

اجمع اهل التفسير والسير ان الله تعالىٰ انزل الملٰئكة يوم بدر وانهم قاتلوا الكفار.... وهذا قول الاكثرين واما ابوبكر الاصم فانه انكر ذلك اشد الانكار واحتج عليه بوجوه (كبير)

پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوا ہے کہ نزولِ ملائکہ سے بدر میں نصرت کس طور پر ہوئی ہے آیا انھوں نے واقعی قتال کیا، یا یہ کہ مسلمانوں کے دل کو قوی کر دیا، اور مشرکین کے دل پر رعب بٹھا دیا۔

اختلفوا فی كيفية نصرة الملٰئكة قال بعضهم بالقتال مع المومنين وقال بعضهم بل بتقوية نفوسهم واشعارهم بان النصرة لهم وبالقاء الرعب فی قلوب الكفار (كبير۔ بحر)

۳۶۰ (نہ کہ فرشتوں، یا اور کسی مخلوق کی طرف سے)

یہاں صاف طور پر بتا دیا کہ حقیقۃً منصرف ذاتِ باری تعالیٰ ہے فرشتے ہوں یا کوئی اور کسی کا بھی ذریعہ امداد ہونا سببِ ظاہری یا سببِ قریبی کے درجہ سے زیادہ نہیں۔ ملائکہ پرستی، دیوتا پرستی کی جڑ یہیں سے کٹ جاتی ہے ضمناً اس جانب بھی اشارہ ہو گیا کہ اسلام کی کامیابی اور فتحمندی حقیقۃً تمام تر تائیدِ غیبی کا نتیجہ ہے۔

وما جعله میں ضمیر اسی وعدۂ امدادِ ملائکہ کی جانب ہے۔

الهاء للوعد (او الامداد (قرطبی) الهاء لان يمدكم (كشاف) ای الامداد (روح)

اِلَّا بشرٰی لكم ولتطمئن قلوبكم به۔ یعنی یہ تو فتح و نصرت کا صرف مقدمہ تھا۔

وما النصر۔ سے مراد نصرتِ حقیقی و واقعی ہے۔

العزیز۔ اس پر قادر کہ جب اور جس کو چاہے بلا اسبابِ ظاہری بلکہ خلاف اسبابِ ظاہر فتح دلا دے اور کامیاب کرا دے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ

آپ کو اس امر میں کوئی دخل نہیں (اللہ) خواہ ان کی توبہ قبول کرے، خواہ انھیں عذاب دے اس لئے کہ وہ

ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ يَغْفِرُ لِمَنْ

ظالم ہیں ۲۶۲ اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ جسے چاہے

۳۶ ع ۹/۴ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے ۲۶۳

الحکیم۔ عام فطرتِ بشری کی رعایت سے اسبابِ ظاہری کا جمع کر دینے والا۔

۲۶۱ ذکر ابھی غزوہ بدر کا چل رہا ہے، اور اشارات و تلمیحات اسی کی جانب ہیں۔

لیقطع طرفاً۔ قطع یہاں ہلاک کرنے کے معنی میں ہے۔

لیھلک جماعۃ منھم (راغب) لیھلک طائفۃ منھم بالقتل والاسر (کشاف)

ل کا تعلق آیت ماقبل کے نصرکم سے ہے اور نظم آیت یوں ہے ولقد نصرکم اللہ ببدر لیقطع طرفا من الذین کفروا یعنی کافروں کو تمھارے ہاتھوں تباہ و ہلاک کرا دے جیسا کہ جنگ بدر کے موقع پر ہوا کہ قریش کے لیڈروں میں سے ستر کی تعداد میں اس روز قتل ہوئے اور اسی تعداد میں قید بھی۔

یکبتھم۔ یعنی انھیں دنیا کی نظروں میں ذلیل و رسوا کریں۔

۲۶۲ (اور اس لئے فوری عذاب کے مستحق)

روایتوں میں آتا ہے کہ آپ نے چند شریر اور موذی قسم کے کافروں کے حق میں بددعا کی تھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یتوب علیھم۔ یعنی انھیں قبولِ اسلام کی توفیق دے دے اتنے ہی ٹکڑے سے ظاہر ہو گیا تھا کہ مکہ کے کافروں میں سے کچھ ضرور ایمان لے آئیں گے، چنانچہ لے آئے۔

یعذبھم۔ یعنی اسی دنیا میں عذاب دے دے۔

لیس لک من الامر شیئاً۔ ان الفاظ سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ مشیتِ الٰہی میں دخل کسی مخلوق اور بندے کو نہیں یہاں تک کہ مقرب ترین بندے کو بھی نہیں ــ چہ جائیکہ کسی ولی کسی بزرگ کو اس کی مشیت میں دخیل سمجھ لیا جائے!

۲۶۳ (سو معاملۂ مغفرت و رحمت کرنے کے لئے اسے کسی خاص سبب کی ضرورت نہیں)

یغفر لمن یشاء۔ یہ مغفرت اس کے عام قانونِ رحمت کے مطابق ہو گی۔

یعذب من یشاء۔ یہ عذاب اس کے خاص قانونِ حکمت کے ماتحت ہو گا۔

وللہ ..... الارض۔ یعنی ایک اسی معاملہ پر کیا موقوف ہے، زمین و آسمان کی ساری ہی حکومت میں دخل و تصرف اللہ ہی کا ہے ــ نہ کوئی اس کا شریک، نہ کوئی اس کا وزیر، نہ کوئی اس کا مشیر۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا

اے ایمان والو! سود کئی کئی حصے بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم

اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

فلاح پا جاؤ ۲۶۴ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۲۶۵

اللہ کی ملکیت زمین و آسمان کے لئے ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع کے شروع کا حاشیہ۔

**۲۶۴** (اور فلاح کا لفظ دنیوی، اخروی، شخصی و اجتماعی ہر قسم کی فلاح کو جامع ہے)

وَاتَّقُوا ... تُفْلِحُوْنَ۔ تقویٰ اور فلاح میں یہ لزوم بتا کر گویا اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ فلاح و کامیابی یا دنیا میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا راز احکام تقویٰ پر عمل کرنے میں ہے۔

لَعَلَّكُمْ۔ لعلّ کے لفظی معنی "عجب نہیں کہ" کے ہیں لیکن اوپر گزر چکا ہے کہ لعل جب وعدۂ الٰہی کے بیان میں آتا ہے تو اس کے مفہوم میں بجائے شک و تردد کے یقین پیدا ہو جاتا ہے اور ترجمہ "تاکہ" سے صحیح ہوتا ہے۔

قال اهل التفسير ان لعل وعسى من الله للتحقيق (مدارك)

لا تاكلوا الربوا۔ یعنی سود کا کاروبار جس کو بالکل حرام سمجھو۔ حرمت سود پر حاشیے پارہ سوم میں ختم سورۂ بقرہ کے قریب گزر چکے۔ الربوا سے مراد وہی ربا ہے جس سے اہل جاہلیت خوب واقف تھے نہ کہ مطلق ربا اپنے لغوی معنی زیادتی کے مفہوم میں۔

والمراد بالربوا الربوا الجاهلية المعهود عند المخاطبين عند نزولها لا الاطلاق المعنى اللغوي هو الزيادة فما كل ما يسمى زيادة محرم (القاسمي)

اضعافا مضعفة۔ سود کی خاصیت یہ ہے کہ جو مفلس ہے وہ مفلس تر اور جو امیر ہے وہ امیر تر ہوتا جائے یہ قید سود کی اسی بڑھتے جانے والی وصف کی طرف اشارہ ہے یہ مراد نہیں کہ سود مرکب نہ کھاؤ اور سود مفرد لے سکتے ہو۔

تقوا ... اس آیت سے فرقۂ مرجیہ کا رد نکل رہا ہے جن کا عقیدہ یہ تھا کہ ایمان کے بعد کوئی معصیت کفر نہیں اور مومن کے لئے کسی حال میں دوزخ کا عذاب ہے۔

فيه رد على المرجئة في قولهم لا يضر مع الايمان ذنب ولا يعذب بالنار اصلاً (مدارك)

آیات احکام میں نازل ہونے والی یہ سب سے آخری آیت ہے۔

**۲۶۵** یعنی جہنم کی آگ اصلاً تو کافروں ہی کے لئے ہے لیکن تم کافروں کے سے اعمال کر کے اپنے ایمان کی حیثیت میں نہ ڈالو۔ اکثر اہل تفسیر اس طرف گئے ہیں کہ یہ وعید ان لوگوں کے لئے ہے جو سود خواری کو عقیدۃً حلال سمجھتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ کفر تھا۔

قال كثير من المفسرين وهذا الوعيد لمن استحل الربوا ومن استحل الربوا فانه يكفر (قرطبي) وقال ابن عباس هذا تهديد للمؤمنين لئلا يستحلوا الربوا (بحر) وقال الزجاج والمعنى اتقوا ان تحلوا ما حرم الله فتكفروا (بحر)

امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ یہ قرآن مجید کی بہت زیادہ ڈرانے والی آیت ہے کہ اس میں دوزخ سے جو حقیقۃً کفر کی سزا ہے ان لوگوں کو بھی ڈرایا گیا ہے جو اللہ کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیزوں سے نہیں بچتے۔

كان ابو حنيفة يقول هي اخوف آية في القرآن حيث اوعد الله المؤمنين بالنار المعدة للكفرين

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى

اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۲۶۶ اور مغفرت کی طرف جو تمھارے

مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ

پروردگار کی طرف سے ہے، دوڑو اور جنت کی طرف (دوڑو) ۲۶۷ جس کا عرض سارے آسمان اور زمین ہیں اور

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ

جو پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے ۲۶۸ یہ وہ لوگ ہیں جو فراغت اور تنگی (دونوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو

الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾

پی جانے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۶۹

ان لم یتقوہ فی اجتناب محارمہ (مدارک)

۲۶۶ (دنیا اور آخرت دونوں میں)

لعل پر حاشیہ ابھی اوپر گذر چکا ہے۔

واطیعوا۔ یعنی اللہ اور رسول کی اطاعت خوش دلی کے ساتھ کرو۔

آیت سے واضح ہوگیا کہ رحمتِ الٰہی کے جلب وجذب کرنے کا ذریعہ اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔

۲۶۷ (اپنے اعمال کے ذریعہ سے)

الیٰ مغفرۃ من ربکم۔ ہر مومن کا منتہائے عمل اور حاصل زندگی یہی مغفرتِ پروردگار ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام محض ایک سلبی حقیقت کا نام نہیں محض گناہوں سے بچنا کافی نہیں بلکہ مسلمانوں کو حکم اس کا بھی ملا ہے کہ اسلام کے ایجابی پہلو کا بھی پورا حق ادا کریں، نیکیوں کی جانب لپکیں اور اس طرح جنت کو حاصل کر کے رہیں، جو رضاءِ الٰہی کا محل اور ظہور رحمتِ کامل کا مقام ہے۔

۲۶۸ (اور گویا انھیں کے انتظار میں ہے)

عرضها السمٰوٰت والارض۔ وہ بے انتہا وسیع ہے اس میں سب کی گنجائش ہے، وہاں چپقلش اور عدم گنجائش کا احتمال ہی نہیں جنت کی بجنسہٖ پیمائش بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار مقصود ہے، عربی محاورہ میں انتہائے وسعت کے اظہار کا یہی پیرایہ ادا ہے۔

کنایۃ عن غایۃ السعۃ بما ھو فی تصور السامعین (روح) المقصود المبالغۃ فی وصف سعۃ الجنۃ وذالک لانہ لا شیٔ عندنا اعرض منہما (کبیر)

عرض سے مراد یہاں چوڑان نہیں، بلکہ مطلق وسعت وگنجائش ہے۔

قال القفال لیس المراد ھھنا ما ھو خلاف الطول بل ھو عبارۃ عن السعۃ (کبیر)

۲۶۹ آرنلڈ وغیرہ فرنگی فاضلوں نے کہا ہے کہ عرب جیسی تند خو، جنگجو، جدل پیشہ قوم کے سامنے حلم وضبط، صلح و آشتی کے ایسے معیار پیش کرنا، اور پھر اس تعلیم کو کامیاب بنانا بجائے خود ایک اعجاز ہے۔

ینفقون۔ یعنی راہ حق میں دین کی خدمات میں خرچ کرتے رہتے ہیں، مطلق خرچ کرنا ظاہر ہے کہ شریعت میں ہرگز پسندیدہ نہیں۔ فی السرآء والضرآء یعنی ہر حال اور ہر صورت میں دین اور امت کی مالی ضرورتوں سے متعلق خرچ کرتے ہیں، یہ نہیں کہ خوش حال ہوئے تو مسرفانہ عیش پرستیوں میں پڑ کر نیک کاموں سے ہاتھ ہی روک لیا، یا تنگ دست ہوئے تو ناشکری میں آکر اپنی بساط بھر بھی خرچ کرنے سے رک گئے۔

الکاظمین الغیظ۔ کظم کہتے ہیں غصہ کے ضبط کر جانے کو، تو یہ لوگ وہ ہوئے جو غصہ سے مغلوب نہیں ہو جاتے، بلکہ اس سے مقابلہ کر کے اسے زیر کر لیتے ہیں، اور اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں بعض اہل تحقیق نے یہ خوب لکھا ہے کہ یہاں فاقدین الغیظ ارشاد نہیں ہوا ہے یعنی مدح اس کی نہیں آئی ہے کہ غصہ سرے سے آتا ہی نہ ہو بلکہ اس کی آئی ہے کہ غصہ قابو میں رکھا جائے اور عقل جذبات کے اوپر حاکم رہے ان کی محکوم نہ ہو جائے، غصہ پیدا ہوتا ہے حرارت طبعی یا حمیت سے اسے فنا کر دینا ہرگز اسلام کا مقصود نہیں، مقصود اسے صرف حدود کے اندر رکھنا ہے، غصہ مطلق صورت میں ہرگز ممنوع نہیں نہ شرعاً معصیت نہ عقلاً مضر، بلکہ اگر حدود کے اندر ہے اور محل مناسب پر پیدا ہو تو عیب نہیں، ہنر ہے، غصہ کے ضبط کر جانے کی فضیلتیں حدیث نبوی میں بکثرت وارد ہوئی ہیں، مثال کے لئے صرف ایک حدیث ملاحظہ ہو۔

من کظم غیظا وھو یقدر علی انفاذہ ملا اللہ قلبہ امنا وایمانا۔

قدرت نفاذ کے باوجود جو شخص اپنے غصہ کو روک لے جائے اللہ اس کا قلب امن اور ایمان سے لبریز کر دے گا۔

مثنوی میں حضرت رومیؒ نے حکایت لکھی ہے کہ کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ کائنات میں سخت ترین چیز کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ خدا کا غضب جس سے دوزخ تھر تھراتی رہتی ہے، اس نے پوچھا کہ پھر اس سے بچاؤ کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنے غصہ کو پی جانا ؎

گفت عیسیٰ را یکے ہشیار سر | چیست در ہستی زجملہ صعب تر
گفت اے جاں صعب تر خشم خدا | کز ہماں دوزخ ہمی لرزد چو ما
گفت ازاں خشم خدا چہ بود اماں | گفت کظم خشم خویش اندر جہاں

العافین عن الناس۔ یعنی لوگوں کے قصوروں اور خطاؤں کو معاف بھی کر دیتے ہیں، یہی نہیں کہ باوجود قدرت واستطاعت خطاوار سے انتقام نہیں لیتے، بلکہ اسے معاف بھی کر دیتے ہیں یہ درجہ کاظمین الغیظ سے بلند تر ہے وہ اگر محض ایک سلبی کیفیت تھی تو یہ ایک ایجابی مرتبہ ہے۔

المحسنین۔ محسنین۔ کا درجہ کاظمین وعافین دونوں سے بلند تر ہے یعنی عفو سے بھی آگے بڑھ کر یہ لوگ حسن سلوک سے پیش آتے ہیں، اخلاقی تعلیم کے موقع پر قرآن نے اکثر تدریج کو پیش نظر رکھا ہے اور اس کی بہترین مثال یہ آیت ہے، تینوں مقامات فضیلت کے ہیں، لیکن یہ تیسرا مقام فاضل ترین ہے۔

محدث بیہقی نے سیدنا علی بن حسینؓ سے متعلق روایت نقل کی ہے کہ آپ کو ایک جاریہ وضو کرا رہی تھی کہ لوٹا

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی بیجا حرکت کر بیٹھتے یا اپنے ہی جان پر کوئی ظلم کر ڈالتے ہیں تو اللہ کو یاد کر لیتے ہیں

اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا

اور اپنے گناہوں سے معافی طلب کرنے لگتے ہیں ۲۷۰ اور کون معاف کر سکتا ہے گناہوں کو بجز اللہ کے؟

اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵

اور یہ (لوگ) اپنے کئے ہوئے پر ہٹ نہیں کرتے درآنحالیکہ وہ جان رہے ہوں ۲۷۱

اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ پر گرا، غصہ آنا امر طبعی تھا، جاریہ نے فوراً الفاظ قرآنی الکٰظمین الغیظ اپنی زبان سے ادا کئے، آپ کا غصہ دور ہو گیا، پھر جاریہ نے العافین عن الناس پڑھا، آپ نے فرمایا میں نے معاف کر دیا، اب جاریہ کی زبان پر واللہ یحب المحسنین آیا، آپ نے فرمایا، جا میں نے تجھے آزاد کر دیا۔" (روح)
رسول اسلام کی زندگی تو خیر متن وعن قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی ہی، رسول ہی سے متعلق قرب قرابت رکھنے والے بھی کس بڑی حد تک نفس قدسی کے مالک بن چکے تھے!

۲۷۰ (قاعدۂ شرعی کے مطابق)

فعلوا فاحشۃ۔ فاحشۃ کا اطلاق ہر گناہ کے لئے عام ہے۔

الفاحشۃ مطلق علی کل معصیۃ (قرطبی) اصل الفحش مجاوزۃ الحد فی السوء (روح)
یہاں مراد وہ برائی ہے، جو کسی دوسرے کے ساتھ کی جائے یعنی کسی حق عبد کی ادائی میں کوتاہی ہو جائے۔
قیل الفاحشۃ الذنب الذی فیہ تبعۃ للمخلوقین۔ (بحر)
اوظلموا انفسھم۔ یعنی حقوق اللہ کا اتلاف اگر ان سے ہو جائے۔
ظلم النفس ما بین العبد وبین ربہ (بحر)
ذکروا اللہ کا اشارہ اس طرف ہے کہ نافرمانیاں ان سے پورے قصد و تعمد کے بعد خباثت نفس کی بنا پر سرزد نہیں ہوا کرتیں، بلکہ احکام الٰہی کا ذہول ان کے ذہن سے وقتی طور پر ہو جاتا ہے۔
آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاہ گاہ لغزشوں کا صادر ہوتے رہنا، قرب تعلق مع اللہ کے منافی نہیں، اصل اور مقدم شئے ہر غلطی اور کوتاہی کی تلافی اور تدارک کی فکر اور اس کی مناسب تدبیر ہے۔
فاستغفروا۔ استغفار صحیح و معتبر وہی ہے جو محض زبان سے نہیں دل کی حسرت و ندامت کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ ہو کہ اب وہ گناہ دوبارہ نہیں ہونے پائے گا، ورنہ اگر ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے اور دل بدستور گناہوں سے لذت لے رہا ہے تو اکابر نے کہا ہے کہ یہ استغفار خود قابل استغفار ہے اور عجب نہیں کہ ایسے استغفار کا شمار استہزاء میں ہو جائے۔
الاستغفار المطلوب ھو الذی یحل عقد الاصرار ویثبت معناہ فی الجنان لا التلفظ باللسان (قرطبی)

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا

ایسے لوگوں کی جزا ان کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور (بہشت کے) باغ ہیں جن کے نیچے ندیاں پڑی بہ رہی

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾ قَدْ خَلَتْ مِنْ

ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش) رہیں گے اور کام کرنے والوں کے لئے کیسا اچھا معاوضہ ہے ۲۷۲ یقیناً تم سے قبل

قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ ﴿۱۳۷﴾

(مختلف) طریقے (والے) گزر چکے ہیں، سو تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے ۲۷۳

روی عن الحسن البصری انه قال استغفارنا یحتاج الی استغفار (قرطبی) هذا یقوله فی زمانه فکیف فی زماننا هذا الذی یُری فیه الانسان قائمًا علی الظلم حریصًا علیه لایقلع والسبحة فی یده زاعما انه یستغفر الله من ذنبه وذلک استهزاء منه واستخفاف (قرطبی)

۲۷۱ (یعنی اپنی کسی غلطی پر جان بوجھ کر ہرگز جمے نہیں رہتے)

ومن یغفر الذنوب الا الله۔ یہ تنبیہ ہے اس پر کہ گناہوں کی معافی صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، کسی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کے ہاتھ میں نہیں اور اس میں خصوصیت کے ساتھ رد ہے اس مسیحی عقیدہ کا کہ گناہوں کی معافی مسیح بلکہ ان کے نائبوں کے اختیار میں ہے، ملاحظہ ہو انجیل مروجہ کا بیان:۔

"جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے میں تمہیں بھیجتا ہوں، اور یہ کہہ کر اُن پر پھونکا اور ان سے کہا کہ روح القدس کو لو جن کے گناہ تم بخشو ان کے بخشے گئے ہیں اور جن کے گناہ تم قائم رکھو ان کے قائم رکھے گئے ہیں" (یوحنا۔ ۲۰: ۲۱۔ ۲۴)

وهم یعلمون۔ یعنی اپنے عمل کی برائی جانتے بوجھتے ہوئے۔

ای یعلمون قبح فعلهم (روح) والمراد لم یصروا عالمین (روح)

۲۷۲ (ہر دنیوی مزد و صلہ سے کہیں بالاتر)

اولٰئک۔ کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ابھی آچکا ہے، غلطیاں، خطائیں، لغزشیں بھی ان سے صادر ہوتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی وہ ان کی تلافی اور تدارک بھی کرتے رہتے ہیں انہی کے لئے یہ جنت کی نعمتیں بیان ہو رہی ہیں۔

عاملین۔ لفظی معنی عمل کرنے والے کے ہیں، محاورۂ قرآنی میں اس سے مراد عمل صالح کرنے والے ہیں۔

۲۷۳ (اور اس انجام سے عبرت حاصل کرو)

سنن۔ یعنی مختلف طور طریقے اور یہاں مراد ہیں طور طریقوں پر عمل کرنے والے، مختلف مسلکوں اور مشربوں کے لوگ، مشرک و کافر بھی، موحّد و مومن بھی۔

قال الزجاج والمعنی اهل سنن فحذف المضاف (قرطبی)

ساری گذشتہ امتوں اور قوموں کی طرف جامع اشارہ ان الفاظ میں آگیا، اور سنة کے معنی خود اُمة

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوا

یہ ایک اعلان ہے (سارے) لوگوں کے لئے اور ڈرتے والوں کے لئے ہدایت ونصیحت ہے ۲۷۴ اور نہ ہمت ہارو

وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ

اور نہ غم کرو تم ہی غالب ہو گے اگر تم مومن رہے ۲۷۵ اگر تمھیں کوئی زخم پہونچ جائے

فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

تو ان لوگوں کو بھی تو ایسا ہی زخم پہونچ چکا ہے ۲۷۶ اور ہم ان ایام کی اُلٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں ۲۷۷

کے بھی کئے گئے ہیں، اس لئے سنن مرادفِ اُمم ہوگا۔

السنة الامة والسنن الامم (قرطبی) وقال المفضل ان المراد بها الامم وقد جاءت السنة بمعنی الامة فی کلامهم (روح)

سیروا۔ فانظروا۔ دونوں صیغے امر کے ہیں، لیکن مقصود سیاحت نہیں بلکہ سرکش جاہلی قوموں کے انجام سے تذکیر و عبرت ہے خواہ جس ذریعہ سے بھی وہ حاصل ہو، سیاحت سے یا مطالعۂ تاریخ سے۔

لیس المراد الامر بذٰلک لا محالة بل المقصود تعرف احوالهم فان حصلت هذه المعرفة بغیر السیر فی الارض کان المقصود حاصلا (کبیر)

جغرافیہ، تاریخ، اثریات، معاشیات وغیرہ کا مطالعہ اگر صحیح نقطۂ نظر اور ایمان و معرفت کے پہلوؤں سے کیا جائے تو یہ بجائے خود ایک عبادت ہے۔

المکذبین۔ یعنی دینِ حق کے جھٹلانے والی قوموں اور اُمتوں کا۔

۲۷۴ مطلب یہ ہوا کہ قرآن اعلان نامہ تو ہے ساری دنیا کے لئے لیکن اس سے نفع وہی لوگ اٹھائیں گے، جن کے دلوں میں خوفِ خدا موجود ہوگا۔

هٰذا۔ اشارہ قرآن مجید کی جانب ہے۔

یعنی القراٰن عن الحسن وغیرہ (قرطبی) قال الحسن وقتادة وابن جریج والربیع الاشارة الی القراٰن (بحر) ای هذا القراٰن (معالم) ای القراٰن او ما تقدم من الکتب (مدارک)

بعض نے وہ امرونہی، وعدہ و وعید مراد لئے ہیں، جو اوپر گزر چکے ہیں۔

یعنی بقول هذا ما تقدم بین امره ونهیه ووعده ووعیده (کبیر) الاشارة الی ما لخص من امر الکفار والمتقین والتائبین۔ (روح)

۲۷۵ (اے ایمان والو)

ان کنتم مؤمنین۔ وعدۂ غلبہ کے لئے خوب خیال رہے کہ شرطِ ثباتِ ایمان کی لگی ہوئی ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست

الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

نہیں رکھتا ۲۷۸ اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو میل کچیل سے صاف کردے اور کافروں کو مٹادے ۲۷۹

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ

شاید تم اس گمان میں ہو کہ جنت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو جانا ہی نہیں

وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ

جنھوں نے جہاد کیا اور نہ صبر کرنے والوں کو جانا ۲۸۰ اور تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے قبل اس کے کہ اس کے سامنے آؤ

الاعلون۔ یہ علو و غلبہ کا وعدہ ہر قسم کے علو و غلبہ کو حاوی ہے، خواہ وہ مادی ہو یا روحانی، گو سیاق پر نظر کرکے غلبۂ مادی ہی اغلب ہے۔

یعنی الغالبین علی الاعداء (قرطبی)

۲۷۶ (تو تمہاری کسی اُفتاد سے اُن مخالفوں کو آخر کیا خوشی ہو سکتی ہے انھیں بھی تو ایسی اُفتاد پیش آچکی ہے)

ان یمسسکم قرح۔ اشارہ ہے ہونے والی جنگِ اُحد کی طرف، اس میں مسلمانوں کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

مس القوم قرح مثلہ۔ اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف، اس میں قریش کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔

۲۷۷ (مصالحِ تکوینی کے اعتبار سے)

سو مجردِ فتح و شکست کو حق و باطل کا معیار نہ سمجھا جائے۔

تلک الایام۔ یہی فتح و ظفر کا زمانہ۔

والمراد بالایام اوقات الظفر والغلبۃ (کشاف)

۲۷۸ (سو ظالموں کے برسرِ حق ہونے کا تو گمان بھی نہ کیا جائے، خواہ تکوینی مصلحتوں کی بنا پر انھیں عارضی اور ہنگامی کامیابیاں کیسی ہی حاصل ہو جائیں)

لیعلم اللّٰہ الذین اٰمنوا یعنی مومنین کا ایمان عالمِ آشکار ہو جائے ان کے اعمال، ایثار اور جانبازی کی بنا پر۔

ویتخذ منکم شھدآء۔ شہادت راہِ حق، معلوم ہے کہ شریعتِ اسلامی میں روحانی ترقی کی معراج اور قربِ الٰہی کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔

۲۷۹ (انھیں اسی عارضی کامیابی پر اور زیادہ مغرور کرکے)

ذکر اسی غزوۂ اُحد کا چل رہا ہے، ایک فرنگی مورخ نے حال میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ گو قریش اُحد میں

۱۴۴ ع ۱۴ ۵

فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ج

سو اس کو تو اب تم نے کھلی آنکھوں سے دیکھ لیا ۲۸۱ے اور محمد تو بس ایک رسول ہی ہیں ۲۸۲ے

فتحمند ہوئے لیکن یہی عارضی فتحمندی ان کے مستقل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

ولیمحص اللہ الذین اٰمنوا۔ اہلِ ایمان کو ابتلاءِ تکوینی جب بھی پیش آیا ہے یا کفارۂ سیئات کے لئے ہوتا ہے اور یا رفع درجات کے لئے۔

۲۸۰ے (اُن کے اعمال کے ذریعہ سے)

اللہ تعالٰے کے علم سرمدی میں جو کچھ بھی ہو اشخاص کا استحقاقِ جنّت کسی درجہ میں بھی اس مادّی دنیا میں ان کے اعمال کے بعد ہی ثابت ہو سکتا ہے۔

ام۔ یہاں بَل کے معنی میں لیا گیا ہے اسی لئے ترجمہ میں مفہوم "شاید" سے ادا کیا گیا ہے۔

ام بمعنی بل (قرطبی) ام ای بل (جلالین)

ان تدخلوا الجنّۃ۔ یعنی جنّت میں امتیازِ خاص کے ساتھ پہنچ جاؤ گے۔ خطاب یہاں صحابۂ کرامؓ سے ہے، صحابۂ کرامؓ حصولِ جنّت ہی کے مشتاق نہ تھے بلکہ اس کے اعلیٰ درجوں اور مرتبوں کا بھی حوصلہ اور ظرف رکھتے تھے اور ان مدارج کے لئے جہاد کی کڑی کڑی منزلوں سے گزرنا ناگزیر تھا۔

۲۸۱ے (پھر اس سے خوف و ہراس کیوں ہے؟)

خطاب صحابہؓ کی ایک جماعت سے ہے۔

الخطاب للمؤمنین وظاھرہ العموم والمراد الخصوص (بحر) خوطب بہ الذین لم یشھد وا بدرًا (مدارک) الخطاب للذین لم یشھد وا بدرًا و تمنّوا ان یشھد وا مع رسول اللہ صلعم (بیضاوی)

معرکۂ بدر میں مسلمانوں کی غیر متوقع بلکہ خلاف ظاہر کامیابی سن کر بعض اشخاص کو خیال پیدا ہوا کہ افسوس ہے ہم اس موقع پر حاضر نہ تھے اب کاش کوئی معرکہ پھر اس قسم کا پیش آئے تو ہم بھی اپنی جانوں کی بازیاں لگا لگا کر شہداء بدر کا سا مرتبہ حاصل کریں یہاں انہی کو جواب دیا جا رہا ہے کہ پہلے تو یہ ہمت تھی، سو اب ایسی پست ہمتی کا اظہار کیوں؟

ویعلم الصّٰبرین۔ و یہاں حتّٰی کے معنی میں بھی لیا گیا ہے، یعنی جب تک ان کا صبر نہ ثابت ہو جائے۔

الواو ھنا بمعنی حتّٰی قالہ الزجاج (قرطبی) ای حتّٰی یعلم صبرھم (قرطبی)

من قبل ان تلقوہ۔ یعنی اس معرکۂ اُحد کے وقوع سے قبل۔

تمنّون الموت سے مراد یا تو سببِ موت اور ذریعۂ موت یعنی جہاد و قتال ہے یا خود موتِ شہادت۔

الموت او الموت بالشہادۃ (بیضاوی)

رَاَيْتُمُوْهُ۔ میں ضمیر واحد مذکر غائب موت یا سببِ موت کی جانب ہے۔

یعنی الموت (ابن کثیر) یعنی اسباب الموت (معالم)

۲۸۲ے (اور اس لئے فنا پذیر بھی ہیں، کوئی خدا یا جزوِ خدا یا مظہرِ خدا تو ہیں نہیں جو قانونِ حیات و ممات سے بالاتر ہو سکیں)

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

ان کے قبل اور بھی رسول گزر چکے ہیں ۲۸۳ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں

عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ

واپس چلے جاؤ گے ۲۸۴ اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس چلا جائیگا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا ۲۸۵

محمدؐ۔ اسم مبارک قرآن میں پہلی بار آیا ہے، لفظی معنی ہیں وہ شخص جس کی مدح بہت بار بار کی جائے یا جو صفات حسنہ کا مجموعہ ہو۔ یقال فلان محمد اذا کثرت خصاله المحمودۃ (راغب)

اسم عَلَم ہے ہمارے رسولؐ اور دنیا کے آخری نبی کا، حضور کی بعثت سے قبل اس نام کا رواج بہت کم تھا، علامہ ابوجعفر محمد بن حبیب بغدادی المتوفی ۲۴۵ھ نے کل سات آدمی اس نام کے گنائے ہیں (کتاب المحبر ص ۱۳۰)

اور ان میں سے ایک محمد بن سفیان بن مجاشع کی بابت یہ لکھا ہے کہ ان کے والد نے ایک شامی راہب سے یہی سن کر آئندہ پیمبر کا نام محمد ہوگا، یہ نام اپنے لڑکے کا رکھ دیا۔

کان سفیان اتی الشام نفزل علی راھب فاعجبته فصاحته وعقله فسأل الراھب عن نسبه فانتسب له الی مضر فقال له اما انه یبعث فی العرب نبی یقال له محمد فسمی سفیان ابنه محمداً۔

تاج العروس اور لسان العرب میں بھی یہی سات نام نقل ہوئے ہیں، عام طور سے یہ نام عرب میں شائع نہ تھا، اور تصریحات اس قسم کی ملتی ہیں کہ لم یکن شائعاً بین العرب ھذا الاسم (لسان) اور تاج میں بھی اسی سے ملتا جلتا قول موجود ہے ملاحظہ ہو اسم پاک "محمد" پر ضمیمہ اسی سورہ کے اخیر میں۔

۲۸۳ (اور ان سب نے اپنے اپنے وقت پر دنیا کو خیر باد کہا سو یہ بھی اپنے وقتِ موعود پر وفات پائیں گے اور اس میں نہ کوئی بات حیرت کی ہوگی اور نہ کوئی پہلو آپؐ کی اہانت کا نکلے گا)۔

رسول کا مرتبہ اسلام میں خوب سمجھ لیا جائے، رسول محض عبد ہوتے ہیں، صاحبِ وحی۔ عقیدۂ حلول، مظہریت، ابنیت وغیرہ پر ضرب لگانے کے لئے مرتبۂ رسالت اور رسولیت کی بار بار تصریح ضروری تھی۔ حضورؐ کی وفات کا حادثہ اس قدر سخت تھا کہ حضرت فاروقؓ جیسے باوقار عالی ظرف بھی صبر و ضبط کھو بیٹھے اور بے اختیار ہو گئے، عین اس وقت ایک اُن سے بھی برتر شخصیت ابوبکر صدیقؓ اسی آیت کی برمحل تلاوت کر کے اُن کے اور سب کے جذبات کو قابو میں لے آئے تھے۔

۲۸۴ (کفر اور بے دینی کی طرف)

مطلب سوال کا یہ ہے کہ جب دین کی حقیقت تمہاری نظر میں ثابت ہو چکی تو اب قاصد یا پیغامبر کی زیست یا وفات کا اس حقیقت و صداقت پر کیا اثر؟ غزوۂ اُحد میں جب حضور صلعم کو زخم پہنچا اور کسی شیطان نے یہ افواہ اڑا دی کہ آپ دنیا سے رخصت ہو گئے تو بعض صحابہ نے اس انتہائی صدمہ انگیز خبر سے بددل اور شکستہ خاطر ہو کر میدانِ جنگ چھوڑنا شروع کر دیا تھا اور منافقین کی وقتی طور پر بن آئی تھی، انھوں نے برابر طنز کرنا اور ارتداد کی ترغیب دینا شروع کر دی تھی، آیت میں ان سب پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے ــ رسول اللہ صلعم کی وفات میں ابھی کئی سال کی مدت باقی تھی لیکن امت کو ابھی سے اس کے لئے تیار کیا جا رہا تھا

اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اشارہ طبعی اسباب سے آنے والی موت کی طرف ہے ــ جیسے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ وغیرہم اپنی

وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا

اور اللہ عنقریب شکر گزاروں کو بدلہ دے گا ۲۸۶ اور ممکن نہیں کسی جاندار کے لئے کہ وہ ایک میعاد

بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ

مقرر پر حکمِ الٰہی کے بغیر مرجائے ۲۸۷

میعادِ عمر پوری کر کے طبعی اسباب سے فوت ہوئے۔

او قتل اشارہ معرکۂ جنگ میں یا بغیر جنگ کے یوں ہی کسی دشمنِ دین کے ہاتھوں شہادت کی طرف ہے۔ جیسے حضرت زکریاؑ، حضرت یحییٰؑ وغیرہم دشمنانِ دین کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

انقلبتم علٰی اعقابکم۔ من ینقلب علٰی عقبیہ۔ محاورہ میں کنایہ ہے ارتداد سے جنگ سے فرار بھی مراد ہو سکتی ہے۔

مجاز من الارتداد او الانہزام (مدارک) اے صرتم کفارًا بعد ایمانکم، یقال لکل من عاد الی ماکان علیہ: رجع وراءہ وانقلب علٰی عقبہ ونکص علٰی عقبیہ (کبیر)

۲۸۵ (بلکہ اس کا وبال خود اپنے ہی سر لائے گا)

جاہلی مذہبوں میں دیوتاؤں اور ان کے پوجنے والوں کے درمیان ایک طرح کی مساوات ہمیشہ رہی ہے یعنی معبود بھی اپنی پرستش و عدم پرستش سے برابر متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن نے بار بار اسی جاہلی ذہنیت پر ضرب لگائی ہے۔

۲۸۶ (اور سب سے بڑی شکر گزاری اقرار توحید و رسالت ہے)

شاکرین۔ یہ شکر، کفر کے مقابلہ میں ہے، مطلب یہ ہوا کہ عنقریب جزائے خیر ان لوگوں کو ملے گی جو اللہ کی اصلی اور بڑی نعمت دینِ حق کا شکریہ اس کے قبول و اختیار کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

الشاکرین علٰی نعمۃ الاسلام بالثبات علیہ (بیضاوی) سماھم شاکرین لانھم شکروا نعمۃ الاسلام فی ما فعلوا (کشاف)

یہ شکر، کفر کی ضد ہے۔

الشکر تصور النعمۃ واظہارھا ویضادہ الکفر (راغب)

لیکن شکر کے عموم میں وہ تمام اجزاء و عناصر داخل ہیں جو انسان کو مخلوق کے حق میں نافع و خدا شکر گزار بناتے ہیں، اور خالق کے مقابلہ میں مطیع و فرمانبردار۔

۲۸۷ (اور اس میعاد مقرر کا علم بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں پھر آخر شرکت جنگ میں اتنا خوف و گریز کیوں؟) موت جب بھی آئے گی حکم خدا ہی سے آئے گی اس کے بدون نہیں آسکتی، اور پھر جب آئے گی وقت موعود ہی پر آئے گی اس کے قبل نہیں آسکتی خواہ خطرات کیسے ہی شدید ہوں۔ ان حقائق کا اگر استحضار رہے تو موت کا طبعی خوف بھی حدِ اعتدال سے زیادہ نہ بڑھنے پائے۔

کتابًا مؤجلا۔ یہ فقرہ اپنے فقرۂ ماقبل الا باذن اللہ کی تاکیدِ مزید میں ہے۔

اے اثبتہ مقرونًا باجل معیّن لا یتغیّر وموقتًا بوقت معلوم لا یتقدم ولا یتأخر (المنار)

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ

اور جو کوئی دنیا کا فائدہ چاہتا ہے ہم اس کو دنیا کا حصہ دے دیتے ہیں۔ اور جو کوئی آخرت کا نفع چاہتا ہے تو اسے

نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ

اس آخرت کا حصہ دے دیں گے اور عنقریب ہم شکرگزاروں کو بدلہ دے دیں گے ۲۸۸؎ اور کتنے ہی نبی ہو چکے ہیں کہ ان کے ساتھ

مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ

ہو کر بہت سے اللہ والے لڑے ہیں ۲۸۹؎

۲۸۸؎ (جنھوں نے نعمتِ الٰہی کا شکر یوں ادا کیا کہ جنگ میں شریک ہوئے اور جہاد سے جی نہیں چرایا۔)

الشاکرین سے اصلاً اور براہ راست وہ لوگ مراد ہیں جو ان اعمال میں آخرت کی نیت کئے ہوئے جہاد میں شریک ہوئے۔

الذین شکروا نعمۃ اللّٰہ فلم یشغلھم شیء عن الجھاد (بیضاوی)

ومن یرد ثواب الدنیا۔ دنیا کا نفع چاہنا مطلق صورت میں ممنوع نہیں ہے یہاں مراد اس نفع سے ہے، جو خالص دنیا ہی کے لئے ہو اور آخرت میں اس کا کوئی حصہ ہی نہ ہو۔

ثواب الدنیا سے مراد ہے کہ مقصود یہی دنیا ہو اور اسے فی الدنیا حسنۃ سے خلط نہ کیا جائے جس سے مراد یہ ہے کہ بھلائی حاصل ہو اور اس کا محل حصول یہ دنیا ہی ہو دونوں فقروں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نؤتہ منھا۔ یعنی اگر ہماری مشیت ہوئی تو اس کی یہ آرزو پوری کر دیں گے اور آخرت سے محروم کر کے اسے یہیں نقد کا نقد معاوضہ دے دیں گے۔

ومن یرد ثواب الاٰخرۃ نؤتہ منھا۔ یہ ثواب آخرت اللہ کی طرف سے موعود اور اس کے ذمہ ہے۔

سورہ بنی اسرائیل رکوع ۳ کی آیتوں میں نفع دنیوی اور اجر آخرت کی نوعیت کے فرق کو خوب واضح کر دیا گیا ہے من کان یرید العاجلۃ عجلنا فیھا ما نشاء لمن نرید۔ یہاں نفع دنیوی کو اپنی مشیت پر معلق و موقوف رکھا ہے ومن اراد الاٰخرۃ وسعی لھا سعیھا وھو مؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورا۔ یہاں مومن کے لئے آخرت کا وعدہ اس کی سعی پر وعدہ کی صورت میں ہے۔

آج جو قومیں توحیدِ الٰہی کی منکر اور آخرت فراموش ہیں وہ بھی بظاہر نیکی کے بڑے بڑے کام کر ڈالتی ہیں بڑے بڑے اسپتال، بڑے بڑے محتاج خانے قائم کر دیتی ہیں، بڑی بڑی نہریں کھدوا دیتی ہیں، بڑے بڑے بند بندھوا دیتی ہیں، بڑے بڑے پل بنوا دیتی ہیں اور اسی طرح کے دوسرے کام بھی رفاہ خلق کے لیکن غایت ان کی محض دنیا ہوتی ہے آخرت کسی درجہ میں بھی مقصود نہیں ہوتی اس لئے قدرۃً ان کا شمار خدا وندی رجسٹر میں "حسنات" میں نہ ہوگا، اور نہ انھیں کوئی توقع اجرِ اخروی کی ہو سکتی ہے

۲۸۹؎ (راہِ حق میں یا جہاد فی سبیل اللہ میں)

یہاں یہ بتلایا ہے کہ جہاد کی سنت انبیاء قدیم کے وقت سے چلی آتی ہے اور اس راہ کے رہروؤں کو برابر ان منزلوں سے

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا

سو جو کچھ انھیں اللہ کی راہ میں پیش آیا اس سے نہ تو انھوں نے ہمت ہاری اور نہ وہ کمزور

وَمَا اسْتَكَانُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ﴿١٤٦﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ

پڑے اور نہ وہ دبے، اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۲۹۰ ؎ اور ان کا کہنا تو بس اتنا ہی

إِلَّا أَن قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا

تھا کہ وہ کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور ہمارے باب میں ہماری زیادتی کو بخش دے

وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿١٤٧﴾

اور ہم کو ثابت قدم رکھ اور ہم کو کافروں پر غالب کر ۲۹۱ ؎

گزرنا پڑتا ہے۔

ربیّون۔ رِبّی۔ ربانی کے مُرادف ہے یعنی اللہ والے، اور مراد علماء وفقہاء بھی لئے گئے ہیں۔

اے ربانیون (کشاف)

اخرج سعید بن منصور عن الحسن انھم العلماء الفقھاء واخرجہ ابن جبیر عن ابن عباسؓ ایضًا فھو منسوب الی الرب (روح)

ایک معنی جماعتِ کثیر کے بھی اکابر سے منقول ہیں۔

اے الوف وقال ابن عباسؓ ومجاھد وسعید بن جبیر وعکرمۃ والحسن وقتادۃ والسدّی والربیع وعطاء الخراسانی الربّیون الجموع الکثرۃ (ابن کثیر) وقال الزجاج ھم الجماعۃ الکثیرۃ (کبیر)

کاین۔ کم کے مرادف ہے یعنی بہت سے، کتنے ہی۔

کاین بمعنی کم (قرطبی) صارت بمعنی کم (بیضاوی)

**۲۹۰ ؎** (اور دنیا اور آخرت میں ان کا درجہ اور مرتبہ بڑھتا رہتا ہے۔)

ما اصابھم فی سبیل اللہ۔ یعنی طرح طرح کی مصیبتیں اور پریشانیاں۔

وما ضعفوا۔ یعنی ہراس ودہشت کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دیا۔

وما استکانوا۔ یعنی کفر واہلِ کفر کے سارے سازوسامان، شان وشوکت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے۔

وھن۔ ضعف۔ استکانۃ۔ تین متقارب المعنی الفاظ کے درمیان ایک فرق امام رازیؒ نے یہ نقل کیا ہے کہ وھن تو کہتے ہیں قلب کی کمزوری یا بدہمتی کو اور ضعف مطلق ہے اس کا تعلق جسمانی قوت ومادّی قدرت کے انحطاط سے خصوصی ہے اور استکانۃ اظہارِ عجز کو کہتے ہیں ایک دوسرا فرق بھی امام موصوف ہی نے یہ نقل کیا ہے کہ وھن کی تفسیر غلبۂ خوف

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ

سو اللہ نے انھیں دنیا کا بھی عوض دیا اور آخرت کا بھی عمدہ عوض اور اللہ نیکوکاروں سے

الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ ع ۱۵ ۵ ۶

محبت رکھتا ہے ۲۹۲ف اے ایمان والو! اگر تم ان لوگوں کا کہنا مانو گے جو کافر ہیں تو وہ تمھیں پچھلے پیروں

عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾

واپس کردیں گے اور تم گھاٹے میں پڑ کر رہ جاؤ گے ۲۹۳ف تمہارا دوست تو اللہ ہے اور وہی بہترین مددگار ہے ۲۹۴ف

سے کی جائے، اور ضعف کی ضعفِ ایمانی اور شکوک و شبہات سے، اور استکانۃ کی تبدیلِ دین سے۔

واللّٰہ یحب الصّٰبرین۔ یہ جو اللہ کی راہ میں، اس کے دین کی راہ میں، دنیا میں طرح طرح کی تکلیفیں اور آزار جھیلتے رہتے ہیں، ان کے مرتبہ کا کیا کہنا! یہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں۔

**۲۹۱ف** آیت سے اشارہ اس طرف ہوگیا کہ ابرار کی بھی زبان اعترافِ عجز و قصور کے لئے وقف رہتی ہے۔

ذنوبنا۔ اسرافنا۔ ذنوب سے یہاں مراد صغائر سے لی گئی ہے اور اسراف سے کبائر مراد ہیں۔

ذنوبنا یعنی الصغائر واسرافنا یعنی الکبائر۔ (قرطبی)

امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ ذنوب عام ہے بڑے چھوٹے سارے گناہوں کے لئے اور اسرافِ امر سے مراد ہیں معاصیِ کبیرہ خصوصیت سے۔

ابن فورک نے کہا ہے کہ اس سے قدریہ کا رد بھی نکل رہا ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ افعالِ عبد کا خالق نہیں (بحر)

امام رازیؒ نے اس سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے۔

یدل علی ان فعل العبد خلق اللّٰہ تعالٰی، والمعتزلۃ یحملونہ علی فعل الالطاف (کبیر)

**۲۹۲ف** آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے انھیں دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب بنایا اور آخر میں نیکوکاری کی بشارت اللہ کی محبوبیت کی صورت میں دی ۔۔۔ دنیا و آخرت کے سارے انعامات سے بڑھ چڑھ کر۔

ثواب الدنیا۔ یعنی فتح و ظفر۔

حسن ثواب الاٰخرۃ۔ یعنی جنت اور وہاں کی نعمتیں۔

آیت کے الفاظ پر ذرا غور کرلیا جائے "دنیا" کے ساتھ محض "ثواب" (نتیجۂ عمل یا معاوضہ) کا لفظ ہے اور "آخرت" کے ساتھ "حُسنِ ثواب" کا ۔۔۔ حُسن تو آخرت ہی کے ساتھ مخصوص ہے، دنیا غریب کی قسمت میں حُسن کہاں؟ یہاں تو نری نمائش ہی نمائش رہتی ہے۔

**۲۹۳ف** سو کافروں کی ہم خیالی، ہم مذاقی سے بچو۔

یردوکم علی اعقابکم۔ یعنی تمھیں الٹے پاؤں ارتداد اور بے دینی کی طرف ڈھکیل لے جائیں گے۔

**۲۹۴ف** (سو اس کے ہوتے ہوئے تم نصرت و اعانت کے لئے مخلوق پر کیوں نظر رکھتے ہو؟)

سَنُلۡقِیۡ فِیۡ قُلُوۡبِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الرُّعۡبَ بِمَاۤ اَشۡرَکُوۡا بِاللّٰہِ

ہم ابھی کافروں کے دلوں میں رُعب ڈال دیں گے اس لئے کہ انھوں نے اللہ کا شریک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس کے

مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِہٖ سُلۡطٰنًا ۚ وَمَاۡوٰىہُمُ النَّارُ ؕ وَبِئۡسَ مَثۡوَی

لئے کوئی دلیل (اللہ نے) نہیں اتاری۔ اور اُن کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اور وہ کیسی بری جگہ ظالموں

الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰہُ وَعۡدَہٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَہُمۡ بِاِذۡنِہٖ ۚ

کے لئے ہے ۲۹۵ اور یقیناً تم سے اللہ نے سچ کر دکھایا اپنا وعدہُ (نصرت) جب کہ تم انھیں اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے ۲۹۶

اللہ مولٰکم۔ اللہ تمہارا دوست و محافظ ہے، سو وہی تمھیں بچائے گا۔ اللہ والوں کے دل اس بشارت اور تیقن کے بعد کتنے بڑھ جائیں گے!

بل کا مفہوم ترجمہ میں اُردو "تو" سے ادا کیا گیا ہے۔

**۲۹۵** (یعنی ان کے لئے جو خود اپنے اوپر ظلم کرتے رہتے ہیں)

مالم ینزل بہ سلطانا۔ یعنی شرک کی تائید میں نہ کوئی عقلی ہی دلیل موجود ہے اور نہ نقلی۔

سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرّعب۔ دشمنانِ دین کے دلوں میں القاءِ رعب یا ہیبتِ حق کے معجزانہ ظہور کی ایک یادگار مثال تاریخ کے صفحات میں یوں محفوظ ہے کہ معرکۂ اُحد میں جب آخری فتح بظاہر مشرکین مکہ کو ہوگئی تو اب قدرتی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ وہ لوگ وہیں سے شہر مدینہ پر چڑھ دوڑتے، فاصلہ اب رہ ہی کتنا گیا تھا۔ لیکن اس کی ہمت انھیں کسی طرح نہ پڑی بلکہ الٹے انھیں واپس ہی جاتے بنی۔ اور تعاقب اس کے برعکس خود "شکست خوردہ" مسلمانوں نے اپنے بے مثل و بے مثال سالار لشکر کے ماتحت مدینہ سے آٹھ میل دور حمراء الاسد تک کیا، یہاں تین دن تک مسلمانوں کا کیمپ رہا اور لگے ہاتھوں غنیم کا ایک آدمی بھی گرفتار کرتے لائے۔

قال ابن اسحاق فخرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتّٰی انتھٰی الٰی حمراء الاسد وھی من المدینۃ علی ثمانیۃ امیال فاقام بھا الاثنین والثلثاء والاربعاء (ابن ھشام)

اور یہ اہم جنگی کارروائی اس خدائی سپہدارِ اعظم نے کی ہی اس غرض سے کہ مشرکین مکہ پر پورا رعب پڑ جائے اور ان کا یہ وہم و گمان مٹ کر رہے کہ مسلمانوں نے ہار مان لی ہے۔

وانما خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرھبًا للعدو ولیبلغھم انہٗ خرج فی طلبھم لیظنوا بہٖ قوۃ وان الذین اصابھم من عدوھم۔ (ابن ھشام)

بما اشرکوا میں ب تعلیل کے لئے ہے، یعنی یہ رعب ان کے شرک کی بنا پر ڈالا گیا۔

ای کان سبب القاء الرعب فی قلوبھم اشراکھم (قرطبی) الباء للسبب ای بسبب اشراکھم باللّٰہ الھۃ (بحر)

**۲۹۶** (غزوۂ اُحد کے اندر)

حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَ عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ

یہاں تک کہ جب تم (خود ہی) کمزور پڑ گئے اور باہم جھگڑنے لگے حکم (رسول) کے باب میں اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ

مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ

اللہ نے تمہیں دکھا دیا تھا جو کچھ کہ تم چاہتے تھے ۲۹۷

پوری آیت میں بیان غزوۂ اُحد کے مختلف پہلوؤں کا ہے۔ یہاں ذکر اس وقت کا ہے جب تک مسلمان ابتداء معرکہ میں اطاعتِ احکام رسول ﷺ پر قائم تھے۔

تحسونھم۔ ھم سے اشارہ دشمنانِ دین مشرکین مکہ ہیں۔

حسّ کے معنی قتل کے ہیں۔

عبّر بہ عن القتل (راغب) ای تقتلونھم قتلا ذریعا (کشاف) قال ابو عبیدۃؓ الحس الاشتغال بالقتل۔ (قرطبی)

باذنہ میں اذن سے مراد اللہ کا حکمِ تکوینی ہے۔

ای بعلمہ او بقضاءہ وامرہ (قرطبی) ای بتیسیرہ وتوفیقہ (روح) ای بارادتہ (جلالین)

**۲۹۷** یعنی اپنی فتح اور غنیم کی شکست جس کا مشاہدہ تم براہ راست کر رہے تھے۔

حتّٰی اذا فشلتم۔ یعنی فتح و فیروزمندی کی کیفیت اس وقت تک قائم رہی، جب تک تم اپنی استقامت میں کمزور نہ پڑ گئے، اس وقت تم اپنی رائے میں متذبذب و متزلزل ہو گئے اور تمہارے تیر اندازوں کے دستے نے خود رائی سے کام لے کر اطاعت رسول کی پروا نہ رکھی۔

معرکۂ اُحد میں جنگ شروع ہونے سے قبل مسلمانوں کے مقدّس اور نہایت درجہ بالغ نظر سالارِ لشکر نے امکانات نقشۂ جنگ کا بالکل صحیح اندازہ کر کے ایک گھاٹی میں ایک بلند ٹیکری پر پچاس ۵۰ چیدہ و ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ متعین کر دیا تھا اور احکام دے دیئے تھے کہ اس مورچہ سے کسی حال میں نہ ٹلنا، یہاں تک کہ اگر ہماری اصل فوج شکست کھا جائے جب بھی اس کی مدد کے لئے نہ جھپٹنا، بلکہ اپنے عقب کا خیال رکھنا، جنگ شروع ہوئی اور مسلمانوں نے پورے جوش شجاعت کے ساتھ یلغار کی، مشرکین کا لشکر باایں فراوانی و باایں سروسامانی اس زبردست ٹکر کی تاب نہ لا سکا اور اس کے قدم اکھڑ گئے، مسلمان اور آگے بڑھے اور بدر کا جوش و خروش تازہ ہو گیا، لیکن افراطِ جوش میں توازن قائم نہ رہا، ان کا خط ٹوٹ گیا اور صفوف میں ترتیب باقی نہ رہی، اور انھیں کی ایک جماعت نے مزید پیش قدمی کر کے غنیم کے خیمے ڈیرے لوٹنے شروع کر دیئے، اُدھر ٹیکری والے تیر انداز دستے نے جو یہ دیکھا کہ دشمن میدان چھوڑ چکا ہے اور مالِ غنیمت لٹنا شروع ہو گیا ہے، تو یہ سوچا کہ اب یہاں مورچہ پر جمے رہنے کے کوئی معنی نہیں، حکم جس وقت تک کے قیام کے لئے تھا، اس کی تعمیل ہو چکی، چنانچہ اس خیال کے ماتحت ۵۰ میں ۴۰ تیر انداز سپاہی اپنی پوزیشن چھوڑ نیچے میدان میں دوسروں کے ساتھ غنیمت کی تاخت میں شریک ہو گئے، خالد بن ولید جو بعد کو ایمان لے آئے اور سیف اللہ کہلا کر مسلمانوں کے مشہور جنرل ہوئے اس وقت تک مشرکوں کے رسالے کے سردار تھے، ان کی دوربین نگاہ موقع کے گھات

مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمۡ

بعض تم میں وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے ۲۹۸ اور بعض تم میں ایسے تھے جو آخرت چاہتے تھے ۲۹۹ پھر اللہ نے تم کو ان سے

عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ ‌ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (۱۵۲)

ہٹا لیا تاکہ تمھاری (پوری) آزمائش کرے ۳۰۰ اور اللہ نے یقیناً تم سے درگزر کی اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے ۳۰۱

ہی میں تھی، اپنے سواروں کے ساتھ کاواکاٹ، اسی درّہ کی طرف سے ہلّہ بول دیا، گنتی کے دس سپاہی کتنی دیر ٹھہر سکتے تھے، جنگ کا پانسا آناً فاناً پلٹ گیا، اور فتح مسلمانوں کے ہاتھ آکر چھن گئی۔۔ قرآن اپنے معجزانہ رنگ میں اس سارے پس منظر پر قل ودلّ تبصرہ کر رہا ہے۔

فتنازعتم فی الامر۔ یعنی اپنے قائد اعظم کے حکم کے باب میں بحث کرنے لگے کہ آیا اب بھی وہ حکم قائم اور واجب الاتباع ہے، ۵۰ میں سے ۴۰ ناوک افگن سپاہی لوٹ پر ٹوٹ پڑے تھے اور باقی ۱۰ امیر لشکر کے حکم پر آخر تک قائم رہے۔

وعصیتم۔ یعنی اپنے سالار لشکر اور رسول برحق کے حکم کی خلاف ورزی کی یہ حالت ایک استثنائی تھی اور اسی لئے اس پر گرفت بھی اتنی سخت ہوئی ورنہ اسلامی فوجیں عام طور پر تو نظم وضبط، اطاعت و امتثال (ڈسپلن) کی تصویر ہوتی تھیں، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

**۲۹۸** (اور اسی لئے غنیمت کی لوٹ میں پڑ گئے)

اشارہ انھی ۴۰ جلد باز تیر اندازوں کی طرف ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ لوٹ بھی مبنی و متفرع دشمنانِ دین کی شکست ہی پر تھی، اس لئے ایسی دنیا طلبی بھی تمام تر مذموم نہیں، یہاں بُرا اسے اس لئے ٹھہرایا گیا کہ اس میں مخالفت تھی حکم رسول کی، گو وہ بھی اعتبار اً ہی تھی۔

"اُحد کی پہاڑی شہر مدینہ کے شمال میں شہر سے تقریباً تین میل پر واقع تھی، اور شرقاً غرباً پھیلی ہوئی تھی، شمالی چوٹی جبل ثور کہلاتی تھی، شمالی علاقہ کھلا ہوا تھا، مگر اس میدان کی زمین شور ہونے کی وجہ سے اس میں زراعت نہیں ہو سکتی تھی، مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر اسی راستے سے حملہ کا ارادہ کیا، اور جنوب کے راستے کو جو دشوار گزار وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا ہے استعمال نہیں کیا، اس میں لاوے کے پتھر اس طرح حائل ہیں کہ قافلے والے بھی اسے استعمال نہیں کرتے ۔۔۔ اس پہاڑ سے صرف ایک دشوار گزار پگڈنڈی گزرتی ہے، جو نعل کی شکل کی وادی سے ہو کر اس کی بلند چوٹیوں تک چلی گئی ہے، یہ وادی ایک مسطح و مرتفع میدان ہے جس میں دو چشمے بہتے ہیں، اسی وادی میں ایک چھوٹا سا پہاڑی ٹیلا ہے، جسے غالباً ان چشموں کی وجہ سے جبل عینین کہتے ہیں، آنحضرت صلعم نے یہاں تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تھا۔" ("حدیث دفاع" از میجر جنرل محمد اکبر خاں ص ۱۷۴ و ۱۷۵)

**۲۹۹** یہ وہ دس تیر انداز تھے جو نصِّ نبویؐ کے تمام تر متبع ہو کر آخر تک اپنی جگہ پر قائم رہے، ان پر جذبہ دینی اس قدر غالب تھا کہ نفع مادّی کی بڑی سی بڑی تحریک و ترغیب بھی انھیں جگہ سے نہ ہلا سکی۔

**۳۰۰** (ایک عارضی و ہنگامی شکست کے ذریعے)

یہ ثبوت ہے صحابۂ نبویؐ پر کمالِ رحمت کا، اور یہاں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عارضی شکست بھی غضب الٰہی یا عذاب کی کوئی فرد نہ تھی، بلکہ اس سے بھی مقصود صحابہ کی قوتِ ایمانی کا مزید امتحان ہی تھا۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ

(وہ وقت یاد کرو) جب تم چڑھے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے اور رسول تم کو پکار رہے تھے تمہارے

فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ

پیچھے کی جانب سے ۳۰۲ سو (اللہ نے) تمہیں غم دیا غم کے پاداش میں ۳۰۳ تاکہ تم رنجیدہ نہ ہوا کرو اس چیز پر جو تمہارے

وَلَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ ؕ وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنۡزَلَ عَلَیۡکُمۡ

ہاتھ سے نکل جائے اور نہ اس مصیبت سے جو تم پر پڑے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے ۳۰۴ پھر اس نے اس غم کے

مِّنۡۢ بَعۡدِ الۡغَمِّ اَمَنَۃً نُّعَاسًا یَّغۡشٰی طَآئِفَۃً مِّنۡکُمۡ ۙ

بعد تمہارے اوپر راحت نازل کی (یعنی) غنودگی کہ اس کا تم میں سے ایک جماعت پر غلبہ ہو رہا تھا ۳۰۵

ثم صرفکم عنھم۔ یعنی جب تم میں عدم ثبات و تزلزل پایا تو اللہ نے اپنی وہ آسمانی امداد و نصرت روک لی اور تمہیں مخالفین کے مقابلہ میں شکست سے دوچار کر دیا۔

ای ردّکم عنھم بالھزیمۃ (معالم)

**۳۰۱** (اس لئے اب مواخذۂ آخرت کا کھٹکا نہیں)

کیا ٹھکانا ہے مومنین پر بالعموم اور صحابۂ رسولؐ پر بالخصوص شفقت کا! کن کن عنوانات سے تسلی دی جا رہی ہے!

**۳۰۲** (کہ ادھر آؤ، میں ادھر ہوں)

یہ بیان ہو رہا ہے مسلمان سپاہ کی بھگدڑ اور شدتِ بدحواسی کا، اور واقعی بات ہے کہ جب فوج میں بھگدڑ پڑتی ہے تو ایسی ہی بدحواسی پھیل جاتی ہے نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے کوئی کسی کی نہیں سنتا، ہر ایک کو اپنی ہی جان بچانے کی فکر پڑ جاتی ہے۔

اذ تصعدون۔ یعنی جب بھاگتے ہوئے چڑھے جا رہے تھے۔

والرسول یدعوکم۔ رسولِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام، علاوہ اپنے دوسرے کمالات و فضائل کے ہمت و شجاعت میں بھی فردِ بے عدیل تھے، حال کے ایک مسلمان جنگی مؤرخ کے الفاظ ہیں:۔

"اس پورے معرکہ میں اسلامی جھنڈا کسی وقت بھی سرنگوں نہیں ہوا، جھنڈے کو اونچا رکھنے اور آنحضرت صلعم کی جان کی حفاظت کے لئے غزوۂ اُحد میں مجاہدین نے جس جانبازی، ایثار کا ثبوت دیا، وہ ابد تک یادگار رہے گا...... آنحضرت صلعم بھی انتہائی ماندہ اور زخمی ہونے کے باوجود دشمن سے برابر لڑتے رہے بھالے سے لڑنے میں آپ نے اس کمال کا ثبوت دیا کہ مسلمانوں کی ہمتیں دو چند ہو گئیں، لوٹ مار میں عجلت اور تیراندازوں کے مورچوں سے ہٹ جانے کی وجہ سے لشکرِ اسلام کو سخت نقصان پہنچا تھا، مگر آپ انتہائی مستقل مزاجی سے باقی آدمیوں کو ساتھ لے کر جنگ کرتے رہے" (حدیثِ دفاع صفحہ ۱۸۱)

**۳۰۳** یعنی اس رنج کے عوض میں جو تمہاری ذات سے رسول اللہ صلعم کو اٹھانا پڑا تھا تمہیں بھی ایک رنج دیدیا گیا

وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ

اور ایک جماعت وہ تھی کہ اُسے اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی یہ اللہ کے بارے میں خلافِ حقیقت خیالات جاہلیت کے خیالات قائم کر رہے تھے ۳۰۶

يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ

یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا کچھ اختیار چلتا ہے؟ ۳۰۷ آپ کہہ دیجئے کہ اختیار تو سارا اللہ کا ہے ۳۰۸

اے اثابکم غمًّا بسبب غم اذ قتموہ رسول اللہ صلعم بعصیانکم لہ فجازاکم امرہ۔ (روح)

۳۰۴ (اور اسی باخبری کے مطابق جزا و سزا بھی دے گا)

لکیلا تحزنوا۔ الخ۔ یہ اشارہ ہے ان حکمتوں اور مصلحتوں کی جانب جو اس واقعۂ شکست میں پوشیدہ تھیں۔ لکی۔ یعنی تاکہ آئندہ کے لئے اس واقعہ سے سبق لو اور ہمت و استقلال کو کام میں لاتے رہو۔

۳۰۵ مسلمان تو تھکے ماندے تھے ہی، دوپہر کے وقت اُن پر نیند کا غلبہ ہوا، اس سے تازہ دم ہو گئے، تھکی ہوئی فوج کو نیند جیسی نعمت کے میسّر آجانے کی قدر کوئی خستہ و ماندہ اہلِ فوج ہی کے دل سے پوچھے۔

۳۰۶ (اور مسلمانوں سے حجّت و تکرار کر رہے تھے کہ تم سے جو وعدۂ فتح و نصرت تھا، وہ کیا ہوا؟)

مراد منافقین ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے ہوئے تھے اس لئے خطاب بھی ان سے اکثر مسلمانوں کے ساتھ مشترک ہی ہے

یعنی المنافقین (قرطبی) ھم المنافقون۔ (بیضاوی)

اھمتھم انفسھم۔ یعنی اس قسم کا سوچ بچار کر دیکھئے کہ یہاں سے بچ کر بھی جانا ہوتا ہے؟ اپنی جان کی فکر بجائے خود کوئی بری چیز نہیں اگر یہ امر طبعی کے درجہ میں رہے، یہاں مراد یہ ہے کہ ان منافقین کو اپنی ہی پڑی تھی اور طبعاً نہ دین کی کوئی فکر تھی نہ رسولؐ کا کوئی خیال تھا۔

ماھمھم الا انفسھم و خلاصھا لاھمّ الدّین ولاھمّ رسول اللہ (مدارک)

یظنّون غیر الحق۔ اللہ سے متعلق ان کی بدگمانیاں خلافِ واقعیت و حقیقت تھیں، انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ مومنین کو نصرتِ حق و تائیدِ غیبی نصیب نہ ہوگی۔

ظنّ الجاھلیّة۔ اس سے بھی بڑھ کر ان کے خیالات اس حد تک پہنچ گئے تھے جو مشرک اور جاہلی قوموں کے ہوتے ہیں، ان منافقین کے نزدیک یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ کسی سے وعدۂ تائید و نصرت کرے اور پھر اسے پورا نہ کرے، ایسے عقائد مشرک قوموں میں عام تھے

الجاھلیّة۔ جاھلیة۔ محاورۂ قرآنی میں اسلام سے قبل کا دورِ شرک ہے، یہ جاہلیتِ توحید کے منافی ہے۔

ظن الجاھلیة کی ترکیب یوں سمجھی گئی ہے کظن اھل الجاھلیة۔

۳۰۷ (ورنہ ہم تو شروع ہی سے اس جنگ سے منع کر رہے تھے کسی نے ہماری نہ سُنی، ہماری سُن لی گئی ہوتی تو آج یہ مصیبت ہی کیوں پیش آتی) یہ منافقین اپنی خفت و ندامت مٹانے کے لئے کہہ رہے تھے۔

۳۰۸ (اور قضاءِ الٰہی ہر انسانی تدبیر پر غالب و حاکم ہے)

بلاغتِ قرآنی کا یہ ایک عام انداز ہے کہ جزئیات کے ضمن میں کلیات بھی بیان کر جاتا ہے چنانچہ یہاں بھی

يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ

یہ لوگ دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کرتے ۳۰۹ کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہمارا اختیار چلتا تو ہم

الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ

یہاں نہ مارے جاتے ۳۱۰ آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے (جب بھی) وہ لوگ تو جن کے

كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ

لئے قتل مقدر ہو چکا تھا، اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل ہی پڑتے ۳۱۱ اور (یہ سب اسی لئے ہوا) کہ اللہ تمہارے

وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

باطن کی آزمائش کرے اور تا کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے صاف کر دے ۳۱۲ اور اللہ باطن کی باتوں کو خوب جانتا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّھُمُ

یقیناً تم میں سے جو لوگ اس دن پھر گئے تھے جس دن کہ دونوں جماعتیں باہم مقابل ہوئی تھیں ۳۱۳ تو یہ تو بس اس سبب سے

الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ

ہوا کہ شیطان نے انہیں ان کے بعض کرتوتوں کے سبب لغزش دے دی تھی ۳۱۴

اس حقیقت کا اعلان ہو رہا ہے کہ ایک واقعۂ نصرت ہی پر کیا موقوف ہے اختیار تو چھوٹے بڑے ہر مسئلہ میں اللہ ہی کا ہے۔

۳۰۹ یعنی اپنا کفر و نفاق، اسی کو رسولؐ اور مومنین سے مخفی رکھنے کا تو خاص اہتمام ان منافقین کو تھا۔

۳۱۰ یعنی اگر ہمارے مشورہ پر عمل ہوتا تو نہ لڑائی ہی کی نوبت آتی اور نہ اس شکست اور نہ اتنے مقتولین کی۔

۳۱۱ مطلب یہ ہوا کہ احکامِ تکوینی تقدیری سے باہر رہنا کسی کے لئے کسی صورت میں ممکن نہیں کوئی نہ کوئی ظاہری سبب بھی مقتل تک ان کے کھنچ آنے کا ضرور نکل آتا۔

۳۱۲ (شیطانی اور نفسانی میل کچیل سے)

ولیمحص۔ تمحیص کے معنی ہیں آمیزشوں سے، کدورتوں سے پاک کرنا۔

ما فی صدورکم۔ یعنی تمہارے اخلاص کی آزمائش ہو جائے۔

۳۱۳ (میدانِ اُحد میں)

ان الذین تولوا۔ مراد وہی صحابی ہیں جن سے اُحد کے موقع پر کمزوری کا اظہار ہوا تھا، انہی کی تسکین و تسلی کے لئے نیز آیندہ کی تنبیہ و ہدایت کی غرض سے یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

ع ۷ ۱۶

وَلَقَدۡ عَفَا اللّٰهُ عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ

اور بیشک اللہ انھیں معاف کر چکا ہے ۳۱۵ بیشک اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا حلم والا ہے ۳۱۶ اے ایمان والو!

اٰمَنُوۡا لَا تَكُوۡنُوۡا كَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو (حقیقتاً) کفر اختیار کئے ہوئے ہیں ۳۱۷

۳۱۴ اور ان کرتوتوں سے یہاں مراد ہے حُبِّ حیات اور مالِ غنیمت کی ہوس۔

وقال بعض العلماء حُبّهم الغنيمة والحرص على الحياة (بحر) جوزوان يكون المراد الذي لك تحوّلهم عن ذالك الموقع بان يكون رغبتهم في الغنيمة۔ (كبير)

آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ہر پچھلی معصیت سبب بن جاتی ہے مزید و جدید معصیت کی جیسا کہ ہر پچھلی طاعت موجب بن جاتی ہے طاعتِ جدید و مزید کی۔

لان الذنب يجرّ الى الذنب كما ان الطاعة تجرّ الى الطاعة (كشاف) فان المعاصي يجرّ بعضها بعضًا كالطاعة (بيضاوى)

انما استزلهم الشيطن۔ اس میں اس ادب کی تعلیم آگئی کہ گناہ جو بھی سرزد ہو جائے اس کی نسبت اللہ سے نہیں بلکہ شیطان کی جانب دینا چاہیئے۔

قال الكعبي الاٰية تدل على ان المعاصي لاتنتسب الى الله فانه تعالى نسبها في هٰذه الاٰية الى الشيطان (كبير) فالاضافة الى الشيطان لطف وتقريب والتعليل بكسبهم وعظ وتاديب (مدارك)

خود کلام مجید میں بھی دوسری آئتیں اس قسم کی ہیں مثلاً حضرت موسیٰؑ کی زبان سے هٰذا من عمل الشيطان یا حضرت یوسفؑ کی زبان سے من بعد ان نزغ الشيطان بيني وبين اخوتي یا خادمِ موسیٰؑ کی زبان سے وما انسانيه الا الشيطان۔

۳۱۵ (ان کے توبہ و استغفار کی بنا پر)

یہی مضمون تین آیت قبل بھی بیان ہو چکا ہے ولقد عفا عنكم. تکرار سے ان صحابیوں کی مزید تسلّی و اطمینان مقصود ہے، جو لوگ ان صحابیوں کو اس واقعۂ اُحد کی بنا پر مورد طعن سمجھ رہے ہیں سمجھ لیں کہ یہ تو صاف آیاتِ قرآنی کی خلاف ورزی ہے۔

۳۱۶ یہاں دو صفاتِ باری کا اثبات کیا ہے۔

غفور، ایک صفتِ عفر کا، اس کا ظہور آخرت میں ہو گا۔

حلیم، دوسرے صفتِ حلم کا۔ اس کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے کہ فوراً مواخذہ نہیں کرتا بلکہ توبہ و استغفار کا موقع برابر دیتا رہتا ہے۔

۳۱۷ (لیکن زبان پر دعویٰ اسلام و ایمان کا رکھتے ہیں)

مراد منافقین ہیں۔

يعني المنافقين (بيضاوى) هٰؤلاء المنافقون اصحاب عبد الله بن أبي (ابن جرير عن السدّي)

وَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِی الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا

اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں جبکہ وہ لوگ زمین پر سفر کرتے ہیں یا کہیں غزوہ کرنے جاتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس

عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ

رہتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے ۳۱۸ (یہ بات اس لئے ان کی زبان پر آئی ہے) تاکہ اللہ اسے ان کے دلوں میں سبب حسرت بنا دے ۳۱۹

لا تكونوا كالذين كفروا۔ ہدایت مومنین کو ہو رہی ہے کہ تم اپنی گفتگو میں منافقین کے مثل نہ ہو جاؤ، ان کی سی باتیں نہ کرنے لگو کہ اس قسم کی باتیں صرف ان ایمان سے محروموں کے شایاں ہیں۔

نهى تعالى المؤمنين ان يكونوا مثلهم فى هذه المقالة الفاسدة (بحر)

امام رازی نے فرمایا ہے کہ یہاں منافقین پر الذین کفروا کا اطلاق ہوا ہے، حالانکہ منافقین کو زبانی دعوی اسلام کا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ مجرد دعوائے اسلام ایمان کے لئے کافی نہیں جب تک کہ تصدیق قلب بھی شامل نہ ہو۔

فالآية تدل على ان الايمان ليس عبارة من الاقرار باللسان كما تقول الكرامية (كبير)

۳۱۸ (اور مزے سے زندگی بسر کرتے رہتے اور کسی خطرہ میں نہ پڑتے)

لاخوانهم میں ل تبلیغ کا نہیں اس لئے اس کے معنی "سے" کے نہیں بلکہ تعلیل یا سببیت ہے، اس کے معنی "کی بابت" یا "کے باب میں" کے ہوں گے۔

اى لاجل اخوانهم (كشاف) واللام لام السبب اى لاجل اخوانهم وليست لام التبليغ (بحر) اى لاجلهم وفيهم۔ (بيضاوى)

اخوانهم سے مراد نسبی بھائی یعنی مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں اور اعتقادی بھائی یعنی دوسرے منافقین بھی تر جیح نسبی بھائیوں یا مسلمانوں کو ہے۔ مسلمانوں کی موت یا شہادت کی خبر جب منافقین سن پاتے تو اسی طرح کے فقرے کہتے۔

ومعنى الاخوة اتفاق الجنس او النسب (كشاف) فى النفاق والكفر وقيل فى النسب (معالم)

اذا ضربوا فى الارض۔ یعنی کسی اسلامی، دینی مقصد سے سفر کو جاتے اور وہیں وفات پا جاتے۔

او كانوا غزًّى۔ یعنی جہاد پر جاتے اور اسی میں شہید ہو جاتے۔

اذا۔ اگرچہ عموماً مستقبل کے لئے ہے لیکن اذ اور اذا دونوں کا ایک دوسرے کے بجائے لانا بھی درست ہے، چنانچہ یہاں اذا۔ اذ کے معنی میں ہے۔

قال قطرب كلمة اذ واذا يجوز اقامة كل واحدة منهما مقام الاخرى واقول هذا الذى قاله قطرب كلام حسن (كبير) فوقع اذا موقع اذ كما يقع الماضى فى الجزاء موضع المستقبل (قرطبى)

لو كانوا عندنا۔ یعنی اگر ہمارے ہی پاس ٹھہر گئے ہوتے اور جہاد یا اسلامی سفر پر روانہ نہ ہوئے ہوتے۔

۳۱۹ یعنی ایسے خیالات دماغ میں موجزن ہونا اور ان کا زبان پر لانا بجائے خود ایک دلیل ان کی منافقت کا اور نور ایمان سے محرومی کا ہے دل میں وہ ایقان تو ہوتا ہی نہیں جو تسکین پیدا کرتا ہے اس لئے ہر امر تکوینی تقدیری سے ان کے دلوں میں

وَاللّٰهُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ

اور اللہ ہی جلاتا اور مارتا ہے ۳۲۰ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب دیکھتا رہتا ہے ۳۲۱ اور اگر تم اللہ کی راہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا

میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی مغفرت و رحمت اس سے کہیں بہتر ہے جسے یہ جمع کر رہے

يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

ہیں ۳۲۲ اور تم لوگ خواہ مر جاؤ یا مارے جاؤ ضرور اللہ ہی کے پاس اکٹھے کئے جاؤ گے ۳۲۳

حسرت اور کڑھن ہی کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ای یجعل ظنھم انھم لولم یخرجوا ما قتلوا حسرۃ۔ (قرطبی)

۳۲۰ موت و زندگی دونوں کے اسباب تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہیں، اس مسبّب الاسباب و علّتِ حقیقی کو چھوڑ کر نظر ظاہری اور قریبی اسباب پر جانا اور سفر یا جہاد کو موت یا قتل کی علّتِ تامّہ قرار دینا ایک شدید جہالت و سفاہت ہے امریکہ میں اس وقت سوشیالوجی (عمرانیات) کا ایک ماہر فاضل ڈینی سن DENISON ہے وہ اپنی کتاب EMOTION AS THE BASIS OF CIVILISATION میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے اس عقیدۂ تقدیر یا ہر امر تکوینی کو خدا کے تفویض کر دینے کی عادت نے نیز عقیدۂ شہادت نے (کہ شہید معاً جنّت میں داخل ہو جاتا ہے جہاں اسے بہترین حوریں ملتی ہیں، اور کھانے کے لئے سونے کے ظروف) مسلمانوں میں معرکۂ جنگ کے اندر بڑی ہی قوت اور استقامت پیدا کر دی تھی"۔ (صفحہ ۲۰۶)

امریکی فاضل کا ایمان نہ عقیدۂ تقدیر پر ہے نہ عقیدۂ شہادت پر، اس پر بھی وہ ان عقیدوں کی نافعیت اور ان کی حیثیتِ افادی کی داد دینے پر اپنے کو مجبور پا رہا ہے۔

واللہ یحیی ویمیت۔ قرآن مجید نے بار بار اس کلیدی حقیقت کی یاد دہانی کی ہے کہ زیست و موت دونوں کے اسبابِ حقیقی صرف اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں اس لئے نظر اسبابِ ظاہری پر جمائے رکھنا ایک شدید نادانی ہے۔

۳۲۱ (اس کا علم کامل بھی ہے اور محیط بھی، سو اگر کہیں خدانخواستہ تم نے منافقین کے طرزِ خیال و گفتگو کی تقلید کی تو یہ بھی سب اس خدائے دانا و بصیر، ہمہ بیں و ہمہ داں کے علم میں آ کر رہے گا)

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی صفتِ علمِ کامل و محیط کے استحضار پر برابر توجہ دلاتا گیا ہے۔

۳۲۲ (حظوظِ دنیوی میں سے)

مطلب یہ ہے کہ موت تو اپنے وقتِ موعود ہی پر آئے گی، جہاد یا سفر فی سبیل اللہ سے خواہ مخواہ تو نہ آ جائے گی، البتہ اگر اس دینی خدمت کی حالت میں ہی وقتِ موعود آ گیا تو اجر اور ابدی زندگی کی نعمتیں بے شمار ہیں۔

اَوْ مُتُّمْ۔ یعنی چاہے وہ موت طبعی ہی ہو لیکن مشغولی اس وقت اللہ کے کام میں ہو۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ

پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرم رہے ۳۲۴ اور اگر آپ تُند خو سخت طبع ہوتے تو

الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۪

وہ لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے ۳۲۵

۳۲۳ (سو مومن کے لئے تو یہ کوئی خوف و ہراس کی بات ہی نہیں)

مُتُّمْ۔ یعنی طبعی موت سے اپنے وطن میں وفات پا گئے۔

قُتِلْتُمْ۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں مارے گئے۔

اسی حقیقت کا استحضار اگر قلبِ مومن کو برابر رہے تو ایک تو فسق و معصیت سے ہر طرح کی احتیاط رہے گی، دوسرے اپنے رحیم و شفیق مالک کے حضور میں حاضری کا انتظار بھی شوق و رغبت کے ساتھ رہنے لگے گا۔

۳۲۴ (حالتِ جنگ میں اُن کی نافرمانی کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی)

نافرمان سپاہیوں کے ساتھ، یعنی ان سپاہیوں کے ساتھ جو عین معرکۂ جنگ میں خود رائی سے کام لے کر لشکر کی تفضیح و رسوائی کا سبب بنے بجائے کورٹ مارشل کر دینے کے شفقت و ملاطفت کا معاملہ قائم رکھنا دنیا کی جنگی تاریخ میں شاید اپنی نظیر آپ ہی ہو۔

بما میں ما زائدہ تاکید کے لئے ہے، ترجمہ میں اسی لئے ''ہی'' لایا گیا ہے۔

وما مزيدة للتاكيد والتنبيه (بیضاوی) وما مزيدة للتاكيد وعليه اجلّة المفسرين وهو المأثور عن قتادة وحكى الزجاج الاجماع عليه (روح) صلة فيها معنى التاكيد (قرطبی)

۳۲۵ حضور انور کے حلم و تحمّل نرمی و خوش خوئی شفقت و ملاطفت کے واقعات سے تو حدیث اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں کوئی کہاں تک گنائے، اور یہ حقیقت تو خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اپنی ذات کے لئے آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا، غیروں (اور غیر بھی کیسے بعض معاندوں تک) کے دو ایک قول سننے کے قابل ہیں۔ لین پول نے کہا ہے:۔

''ظلم محمد کی سرشت ہی میں نہ تھا'' اور باسورتھ اسمتھ کا بیان ہے:۔

''انھوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے نہ از خود اس سے الگ ہوتے، گفتگو بہت نرم و شیریں کرتے۔''

اور ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے:۔

''پیمبر کا میلانِ طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا۔''

مفصل حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

لیکن نرمی و ملاطفت کے بھی شریعت میں حدود مقرر ہیں، جہاں دین کی توہین ہو رہی ہو یا احکام دین کے اجرا کی ضرورت ہو وہاں وہاں سختی اور سزا لازمی ہو جاتی ہے۔

اللين والرفق انما يجوز اذا لم يفض الى اهمال حق من حقوق الله فاما اذا ادّى الى ذالك لم يجز (کبیر)

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ

سو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان کے لئے استغفار کر دیجئے اور اُن سے معاملات میں مشورہ لیتے رہئے ۳۲۶؎ لیکن

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿۱۵۹﴾

جب آپ پختہ ارادہ کرلیں تو اللہ پر بھروسہ رکھئے ۳۲۷؎ بے شک اللہ ان سے محبت رکھتا ہے جو اس پر بھروسہ رکھتے ہیں ۳۲۸؎

آیت سے ایک بڑی اصل بھی ہاتھ آگئی، معلوم یہ ہوا کہ غلظتِ قلب یا دُرشت خوئی میں طبعی خاصیت لوگوں کو بھگانے، دُور کرنے، متنفر کرنے کی ہے اور قضیۂ بالعکس یہ ہے کہ دین کے داعی و مبلغ کو خصوصیت کے ساتھ خوش خلق و خندہ رُو ہونا چاہئے، دین کی طرف خلقت اگر کھنچے گی تو اسی راہ سے، داعی و مبلغ کی طرف سے خشونت یا تنگ دلی کا اظہار، خود مقصدِ تبلیغ کے حق میں ایک مانع قوی ثابت ہوگا۔

۳۲۶؎ (حسبِ دستورِ سابق)

گویا اسلام کے نظامِ شوریٰ جمہوری میں حکم یہ ہے کہ ایسے مجرموں کو بھی مسائلِ ملّی میں رائے زنی سے محروم نہ کیا جائے اور ان سے ووٹ کا حق سلب نہ کیا جائے ـــ کیا حد ہے اس رحمت کی!

آج دنیا کی بڑی بڑی آزاد جمہوریتیں بھی اس وُسعتِ قلب کی نظیر پیش کر سکیں گی؟

فاعف عنھم۔ یعنی جہاں تک آپؐ کے حقوق کے اتلاف کا تعلق ہے آپ معاف کر دیجئے، چنانچہ آپ نے اس حکم کی تعمیل میں ان خطاکاروں کو زبانی تہدید بھی نہ فرمائی۔

لم یخاطبھم الرسول صلعم بالتغلیظ والتشدید وانّما خاطبھم بالکلام اللّیّن (کبیر)

واستغفر لھم۔ یعنی جہاں تک حقوق اللہ کے اتلاف کا تعلق ہے آپؐ ان کے لئے دعائے مغفرت کر دیجئے۔

امام رازیؒ نے یہاں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ جہاد میں بھاگنے سے بڑھ کر گناہ کبیرہ اور کیا ہوگا لیکن قرآن مجید نے اُن اصحابِ نبی کے عفو و مغفرت کی بار بار تصریح کر کے یہ صاف کر دیا کہ ان حضرات کے کبائر بھی معاف ہو گئے تھے۔

وشاورھم فی الامر۔ مشورہ کی بڑی فضیلتیں حدیث میں آئی ہیں، اور ظاہر ہے کہ مشورہ کا حکم جب رسولؐ صاحبِ وحی کو مل رہا ہے تو دوسروں کے لئے اس کی احتیاج کتنی زائد رہے گی۔

فقہائے مفسرین نے اس آیت سے اجتہاد اور قیاس شرعی کے جواز کی دلیل پکڑی ہے۔

فیہ دلالۃ جواز الاجتہاد وبیان ان القیاس حجۃ (مدارک)

اسلام کے نظامِ سیاسی کو شخصی اور جمہوری (یا عمومی) دونوں سے الگ جو نظامِ شوریٰ قرار دیا گیا ہے، اس کی ایک اہم بنیاد یہی آیتِ قرآنی ہے۔

اسی مشورت کے بارے میں دونوں قول فقہاءِ اُمت سے منقول ہیں، ایک یہ کہ رسول پر یہ مشورہ لینا واجب تھا، دوسرا یہ کہ محض مستحب تھا۔

وقد اختلف الفقہاء ھل کان واجبًا علیہ او من باب الندب تطبیبا لقلوبھم علی قولین (ابن کثیر)

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي

اگر اللہ تمہارا ساتھ دے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ۳۲۹ اور اگر وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون

يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾

ایسا ہے جو اس کے بعد تمہارا ساتھ دے؟ ۳۳۰ اور ایمان والوں کو تو چاہیئے کہ صرف اللہ پر بھروسہ رکھیں۔

ظاهر الامر للوجوب فقوله شاورهم يقتضى الوجوب وحمل الشافعیؒ ذالك على الندب (کبیر)

بہرصورت عادتِ مبارک مشورت کی تھی بہت ہی زائد۔

عن عروة عن عائشةؓ قالت ما رأيت رجلاً اكثر استشارة للرجال من رسول الله صلعم (معالم)

۳۲۷ یعنی جب کسی امر میں مشورہ ہو لے تو بس اب تذبذب و تامّل کو دخل نہ دیجئے، اور عمل بلا تامّل اللہ کے بھروسہ پر اسی پختہ عزم پر کرنے لگئے — شخصیت و اجتماعیت، فردیت و عمومیت کا یہ کیسا حکیمانہ امتزاج ہے، اس میں اشارہ اس طرف بھی ہوگیا کہ اعتماد کی چیز اللہ کی ذات ہے نہ کہ انسانی مشورے۔

قال قتادة امر الله نبيه عليه السلام اذا عزم على شئ ان يمضى ويتوكل على الله لا على مشاورتهم۔ (قرطبی)

والمقصود ان لا يكون للعبد اعتماد على شئ الا على الله فى جميع الامور۔ (کبیر)

توکّل کے معنی یہ نہیں کہ انسان اسبابِ ظاہری کی رعایت چھوڑ دے، ورنہ پھر توکّل مشورے کے ساتھ جمع کیونکر ہو سکتا تھا بلکہ توکل کے لئے بھی رعایت اسبابِ ظاہری ضروری ہے البتہ اصل اعتماد و تکیہ صرف حق تعالیٰ پر رکھنا چاہیئے توکل کے معنی ترکِ اسباب کے نہیں، بلکہ حدود و قیود کے ساتھ اختیارِ اسباب کے ہیں۔

دلّت الاٰية على انهٗ ليس المتوكّل ان يهمل الانسان نفسه كما يقوله بعض الجهّال بل المتوكل هو ان يراعى الانسان الاسباب الظاهرة ولكن لا يعول بقلبه عليها بل يعول على عصمة الحق (کبیر) التوكل انما يكون مع الاخذ بالاسباب وان ترك الاسباب بدعوى التوكل لا يكون الّا عن جهل بالشرع او نسيان فى التعمل (المنار)

۳۲۸ اس تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اس گئی گزری حالت میں بھی نظام شرعی سے اس قدر بُعد کے بعد بھی مسلمانوں کو صبر و قناعت کی دولتِ لازوال حاصل ہے، اور خودکشی کے فیشن سے یہ امت اب تک ناواقف ہے۔

اور اہلِ توکل کے مرتبہ کا کہنا ہی کیا! یہ ارشاد نہیں ہو رہا ہے کہ وہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، بلکہ یہ ہو رہا ہے، کہ اللہ ان سے محبت رکھتا ہے! گویا وہ مرتبۂ محبوبیت پر فائز ہیں! اور اللہ کی محبوبیت جس طرح صبر سے (ان الله يحب الصابرين) احسان سے (ان الله يحب المحسنين) طہارت سے (ان الله يحب المتطهرين) قتال فی سبیل اللہ سے (ان الله يحب الذين يقاتلون فى سبيله) سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح توکّل سے بھی۔

۳۲۹ (جیسا کہ معرکۂ بدر میں تم نے دیکھ بھی لیا، اور یہ ثمرہ طاعت کا تھا)

المقصود من الاٰية الترغيب فى الطاعة والتحذير عن المعصية۔ (کبیر)

۳۳۰ (جیسا کہ معرکۂ اُحد میں تمھیں تجربہ ہوگیا اور یہ ثمرہ خود رائی کا تھا۔)

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

اور کسی نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے ۳۳۱ اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾

حاضر کرے گا ۳۳۲ پھر ہر شخص کو اس کے کئے ہوئے کا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا ۳۳۳

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ

کیا جو شخص رضاء الٰہی کا تابع ہے ۳۳۴ وہ بھلا اس جیسا ہو جائے گا جو غضبِ الٰہی کا مستحق ہے ۳۳۵

من بعدہ ۔ یعنی اس کی ترکِ نصرت کے بعد

ای من بعد خذلانہ (کشاف)

آیت سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ ایمان ثمرہ ہوتا ہے اعانتِ الٰہی کا اور کفر خذلانِ الٰہی کا۔

احتج الاصحاب بھذہ الآیۃ علی ان الایمان لایحصل الا باعانۃ اللہ والکفر لایحصل الا بخذلانہ۔ (کبیر)

۳۳۱ یعنی یہ شانِ نبوت کے بالکل منافی ہے۔

المراد ان النبوۃ والخیانۃ لایجتمعان (کبیر) والمعنی انہ لایمکن ذالک منہ لان الغلول معصیۃ والنبی صلعم معصوم وھذا النفی اشارۃ الی انہ لاینبغی ان یتوھم فیہ ذالک (بحر)

آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جنگِ بدر کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سرخ رنگ کا جُبّہ ذخیرہ سے غائب معلوم ہوا، اس پر کوئی بول اٹھا کہ رسولؐ نے لے لیا ہوگا، یہ قول اب اگر کسی منافق کا تھا تو اس بدبخت نے کھلا ہوا حملہ رسول اللہؐ کی دیانت پر کر دیا اور اگر کسی نو مسلم کی زبان سے نکلا تھا تو وہ یقیناً اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگا کہ رسول کو بغیر اطلاع بھی تصرّف کا حق حاصل ہے، آیت ان میں سے ہر مفروضہ کی تردید کر رہی ہے اور ایسے عمل کو خیانت سے تعبیر کر رہی ہے، مشرک غریب تو سرے سے جانتے ہی نہ تھے کہ مرتبۂ نبوّت کس منصبِ عظیم کا نام ہے اور پیمبرانہ اخلاق کے معنی کیا ہوتے ہیں، یہود و نصاریٰ البتہ پیمبروں کے نام اور کارناموں سے آشنا تھے، لیکن ان ظالموں نے بھی رفتہ رفتہ مرتبۂ نبوت کی اخلاقی عظمت کو بالکل ہی بھلا دیا تھا اور نبی کو کاہن قسم کا محض ایک پیشگوئی کرنے والا انسان سمجھ رکھا تھا، آیت ان سب غلط خیالیوں کی اصلاح کر رہی ہے۔

وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون ۔ توکل اور اہلِ توکل کی عظمت و مدح ابھی ایک آیت قبل گزر چکی ہے۔

۳۳۲ اتنی بڑی رسوائی اور فضیحت کو پیمبرانہ تقدیس سے کوئی دور کا بھی واسطہ ہو سکتا ہے۔؟

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ غلول یا خیانت معصیتِ کبیرہ ہے۔

قال العلماء الغلول کبیرۃ من الکبائر (قرطبی) وقد عظم النبی صلعم امر الغلول حتی اجراہ مجری الکبائر۔ (جصاص)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ حکام کا ہدیہ کو قبول کرنا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

ومن الغلول ھدایا العمّال وحکمہ فی الفضیحۃ فی الآخرۃ حکم الغالّ۔ (قرطبی)

وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ

اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بُری جگہ ہے وہ لوگ اللہ کے نزدیک (مختلف) طبقوں میں ہوں گے اور

بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ

اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے ۳۳۶ حقیقت میں اللہ نے (بڑا) احسان مسلمانوں پر کیا جبکہ انہی میں سے

فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ

ایک پیغمبر ان میں بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک صاف کرتا ہے

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ النصف

اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۳۳۷ اور بے شک یہ لوگ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے ۳۳۸

۳۳۳ پیمبروں کا اعزاز و اکرام قطعی ہے تو کسی نبی کی جانب خیانت جیسے ذلیل جُرم کی نسبت کی ہی کیونکر جا سکتی ہے؟

۳۳۴ (جیسا کہ ہر نبی لازمی طور پر ہوتا ہے)

اور یہاں نبی ہی کا ذکر ہے۔

۳۳۵ (جیسے خائن یا اور کوئی مجرم)

یعنی ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا — مومن مطیع اور کافر فاسق ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

۳۳۶ (اور اپنے اسی علم کامل کے مطابق جزا و سزا دینے والا)

ھم یعنی یہ سب لوگ جو رضائے حق پر چلنے والے ہیں وہ، اور جو راہ کی مخالفت کرنے والے ہیں وہ دونوں قسم کے۔

ھم درجاتٌ۔ اللہ کے یہاں طبقات کا یہ اختلاف محبوبیت اور مغضوبیت کے لحاظ سے ہوگا۔

اے ھم متفاوتون کما تتفاوت الدرجات (کشاف)

تقدیر کلام یوں ہے ھم ذو درجاتٍ یا یوں لھم درجٰتٌ۔

معنی ھم درجٰت اے ذو درجٰتٍ او لھم درجٰت (قرطبی) وقیل ذو درجٰت والمعنی تفاوت منازل

المثابین منھم ومنازل المعاقبین (کشاف) قال الحسن البصریؒ ومحمد بن اسحٰق یعنی اھل الخیر واھل الشر درجات۔ (ابن کثیر)

عند اللہ سے مُراد ہے اللہ کی عدالت میں۔

اے فی حکم اللہ وعلمہ (کبیر)

۳۳۷ اللہ کی بہترین نعمت ہونے کے لحاظ سے بعثتِ رسولؐ کا احسان ہے تو سارے ہی عالم پر۔ باقی مسلمانوں کی تخصیص ذکر کی وجہ ظاہر ہے کہ بعثت سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ تھے۔

من انفسھم یعنی انہی کی جنس میں سے۔ اس میں مومنین کے لئے بڑی بشارت ہے کہ پیمبر بھی بس تمہارے ہی جیسے ایک بشر ہیں۔

أَوَلَمَّآ أَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ

اور جب تمہیں ایسی ہار اٹھانی پڑی جس کی دوگنی تم (فریقِ مقابل پر) ڈال چکے تھے ۳۳۹ تو تم کہنے لگے یہ

قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾

کدھر سے ہوئی آپ کہہ دیجئے کہ وہ تمہارے ہی طرف سے ہوئی ۳۴۰ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۴۱

وَمَآ أَصَٰبَكُمْ يَوْمَ ٱلْتَقَى ٱلْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ ٱللَّهِ وَلِيَعْلَمَ

اور جو مصیبت تم پر اس روز پڑی جبکہ دونوں گروہ باہم مقابل ہوئے سو وہ اللہ کی مشیت سے

ٱلْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ ٱلَّذِينَ نَافَقُوا۟ ۚ

ہوئی ۳۴۲ تاکہ اللہ مومنین کو جان لے۔ اور ان کو بھی جان لے جنہوں نے منافقت اختیار کی ۳۴۳

اراد به المؤمنین کلهم ومعنی من انفسهم انه واحد منهم وبشر مثلهم۔ (قرطبی)

رسولؐ کی تلاوتِ آیات، تزکیۂ تقویٰ، تعلیمِ کتاب و حکمت پر حاشیے پارۂ اول کے اسی مضمون کی آیت کے ذیل میں گزر چکے۔

۳۳۸ قرآنی دستور العمل اور محمدیؐ نمونۂ عمل سے قبل دنیا پر عقائد، معاملات، عبادات، اخلاق ہر اعتبار سے اندھیرا ہی چھایا ہوا تھا اور انسانی آبادی صحیح معنی میں فی ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ کی تصویر تھی۔

اِنْ یہاں اِنَّ کا مخفف ہے اور تاکید کے معنی دے رہا ہے۔

ان هی المخففة یعنی الثقیلة (کشاف) ای ولقد کانوا (قرطبی)

۳۳۹ (اس کے قبل بدر میں)

اصابتکم مُّصیبۃٌ۔ یعنی اُحد میں جب تمہیں شکست ہوئی اور تمہارے ستر آدمی شہید ہوئے۔

اصبتم مِّثلیھا۔ یعنی بدر میں جب مشرکین کے ستر آدمی قتل ہوئے تھے اور ستر گرفتار۔

اَوَ میں وَ عطف کا ہے اور اَ تفریع واستفہام کا۔

الهمزة للتقریع والتقریر والواو عاطفة (بیضاوی) الالف للاستفهام والواو للعطف (قرطبی)

۳۴۰ یعنی تمہارے اپنے ہاتھوں ہوئی، ہمارا وعدۂ فتح ونصرت تمہاری طاعت واطاعت کے ساتھ مشروط تھا جب تم نے اس کا لحاظ نہ رکھا تو اب وعدہ کہاں باقی رہا۔

اَنّٰی ھٰذَا۔ حیرتِ طبعی میں مسلمان بار بار استعجاب سے کہتے تھے کہ ہم صاحبِ ایمان بندے، اللہ کی راہ میں لڑنے والے، پھر ہم میں نبیؐ بھی موجود اور فریقِ مقابل مشرکین، اور پھر بھی شکست ہم ہی کو!

۳۴۱ فتح دینے پر بھی قادر اور فتح سے محروم کر دینے پر بھی قادر۔

۳۴۲ اور اللہ کی ہر مشیت، اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنی حکمتوں اور مصلحتوں کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔

وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ

اور ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا دفعیہ بن جاؤ ۳۴۴ تو وہ بولے کہ اگر کوئی (ڈھنگ

قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ

کی) جنگ دیکھتے تو ضرور تمہارے پیچھے ہو لیتے ۳۴۵ یہ لوگ اس روز ایمان سے زیادہ کفر کے نزدیک ہو گئے ۳۴۶

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا

یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ۳۴۷ اور جو کچھ یہ چھپائے ہوئے ہیں اللہ

يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ

اسے خوب جانتا ہے۔ یہ لوگ درانحالیکہ (خود بیٹھے رہے اپنے بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کہا مانتے ۳۴۸ تو نہ مارے جاتے

باذن اللہ۔ اذن یہاں مشیت کے معنی میں ہے۔

المراد من الاذن قضاء اللہ بذالک (کبیر ابن عباسؓ) ای بقضاءہ وقدرہ (قرطبی) ای بقضاء اللہ وقدرہ (معالم)

یوم التقی الجمعٰن۔ یعنی معرکۂ احد میں، جب مکہ کا ایک لشکر جرار ابوسفیان کی کمان میں تھا اور مدینہ کی فوج محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں۔

المراد یوم اُحد (کبیر) جمع المسلمین وجمع المشرکین یوم اُحد۔ (بیضاوی)

۳۴۳ یعنی علانیہ اس کا امتحان ہو جائے کہ مومن کون کون ہے اور منافق کون کون۔ لیعلم کا صیغہ جب اللہ کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے تو مراد اسی علانیہ امتحان سے ہوتی ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں تو ہر چیز ہوتی ہی ہے۔

۳۴۴ یہ منافقین سے کہا گیا تھا۔

لھم۔ میں ضمیر ھم۔ منافقین کی جانب ہے۔

ای للمنافقین۔ (مدارک)

ادفعوا یعنی اگر لڑتے نہیں ہو تو کم از کم اپنے شمول ہی سے مسلمانوں کی تعداد کافروں کی نظر میں بڑھائے رہو۔

یعنی کثّروا سواد المسلمین (ابن کثیر عن ابن عباسؓ وعکرمہ وسعید بن جبیر والضحاک والوصالح والسدی) قال السدّی وابن جریج وغیرھما کثّروا سوادنا وان لم تقاتلوا معنا۔ (قرطبی)

یہ اس وقت کا ذکر ہے جب عبداللہ بن اُبی مدنی کی زیر قیادت منافقین کا تین سو کا گروہ آغاز جنگ میں مسلمانوں سے کٹ کر مدینہ کو واپس آرہا تھا۔

۳۴۵ (لیکن یہ تو جنگ نہیں صریح خودکشی ہے)

ولا یقال لمثلہ قتال ھو القاء بالانفس الی التھلکۃ (کشاف)

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ

آپ کہہ دیجئے کہ (اچھا تو) اگر تم سچے ہو تو اپنے کو موت سے بچا لینا ۳۴۹ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں

الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

مارے گئے انھیں ہرگز مردہ مت خیال کرو　بلکہ وہ لوگ اپنے پروردگار کے پاس زندہ ہیں رزق پاتے رہتے ہیں ۳۵۰

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ

ان (نعمتوں) سے مسرور ہیں جو اللہ نے انھیں اپنے فضل سے عطا کی ہیں اور جو لوگ ان کے بعد والے ابھی ان سے نہیں

يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وقف لازم

جا ملے ہیں ۳۵۱ ان کی بھی اس حالت سے خوش ہیں کہ ان پر نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

منافقین مدینہ کا یہ کہنا تھا کہ دشمن اول تو تعداد میں تم سے چوگنا، پھر ساز و سامان میں کہیں زائد، ایسی حالت میں شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کرنا سارے اصول جنگ کے خلاف، صریح دیوانگی ہے۔

۳۴۶ (یعنی ایمان ظاہری و لفظی سے بھی بہت دور ہو گئے اور حقیقی ایمان تو خیر کبھی تھا ہی نہیں) اور کفر سے قریب تر علانیہ بھی ہو گئے

یومئذٍ۔ یعنی جس روز ایسی باتیں زبان سے نکالیں۔

۳۴۷ (چنانچہ ان کا یہ عذر بھی مخلصانہ نہیں)

اصل نیت ان منافقین کی کسی حال میں بھی مسلمانوں کی اعانت کی نہ تھی، اور کیوں ہونے لگی تھی، جب کہ سرے سے ایمان ہی دلوں میں نہ تھا۔

یقولون بافواههم۔ بافواههم کا اضافہ زور اور تاکید کے لئے ہے جیسے اردو محاورہ میں کہتے ہیں: "یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، یا اپنے کانوں سے سنا ہے!"

والتقييد بالافواه للتاكيد (مدارك) واضافة القول الى الافواه تاكيد وتصغير (بيضاوى)

۳۴۸ (اور ہماری ہی طرح جنگ سے علیحدہ رہتے)

لاخوانهم۔ اخوان سے مراد اخوان دینی و اعتقادی نہیں، بلکہ اخوان نسبی و وطنی ہیں۔

ذکر منافقین کی زبان سے مسلمان شہداء کا ہو رہا ہے۔

فى النسب لا فى الدين هم شهداء احد (معالم) وهم اخوة نسب ومجاورة لا اخوة الدين۔ (قرطبی)

ل۔ واسطہ کا ہے۔

معناه لاجل اخوانهم۔ (قرطبی)

"اخوان" اور "ل" دونوں پر حاشیہ اوپر قریب ہی گزر چکا ہے، آیت ۱۵۶ کے تحت۔

۳۴۹ یعنی اگر تمہارا نظریہ یہ ہے کہ موت معرکۂ جنگ ہی میں جانے سے ہوئی ہے تو تم تو بہر حال جنگ سے

يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ

وہ لوگ خوش ہو رہے ہیں اللہ کے انعام اور فضل پر اور اس پر کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع

الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ۝۱۷۱ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ

نہیں کرتا ۳۵۲ جن لوگوں نے اللہ اور رسول کے کہنے کو مان لیا ۳۵۳ بعد اس کے کہ انھیں

اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۚ۝۱۷۲

زخم لگ چکا تھا ۳۵۴ اُن میں سے جو نیک اور متقی ہیں ان کے لئے اجر عظیم ہے ۳۵۵

احتراز کئے ہوئے ہو دیکھنا ہے کہ موت سے کب تک اپنے کو بچائے رہتے ہو۔

**۳۵۰** (عالمِ برزخ میں ایک حیاتِ مخصوص کے ساتھ)

ولا تحسبن..... امواتا۔ شہداء کی موت عام انسانوں کی موت کی طرح نہیں ہوتی بلکہ انھیں برزخ میں ایک مخصوص قسم کی زندگی حاصل رہتی ہے۔

احیاءٌ.... یرزقون۔ یہ حیات اور یہ رزق سب اسی عالمِ برزخ کے مناسب ہوتے ہیں۔

عند ربھم۔ یہ اپنے پروردگار کے مقرب بھی ہوتے ہیں۔

عند ھنا تقتضی غایة القرب (قرطبی) بمعنی القرب والشرف (روح)

سورۃ البقرۃ، ع ۱۹ (پ ۲) کے حاشیے ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات کے تحت بھی ملاحظہ کر لئے جائیں۔

**۳۵۱** (مگر آخر کار شہید ہو کر ان سے جا ملنے والے ہیں)

من فضلہ۔ اس فضلِ خداوندی کے اندر ہر قسم کی نعمتیں اور سرفرازیاں آگئیں۔

**۳۵۲** اس حقیقت کا تو انھیں عینی مشاہدہ ہو رہا ہے۔

نعمةٍ من اللہ۔ نعمت یہ کہ اجر انھیں پورا پورا مل رہا ہے۔

اے ثواباً لاعمالھم (بیضاوی)

فضلہ۔ فضل یہ کہ انعام و اکرام استحقاق سے کہیں بڑھ کر ملا۔ اے زیادۃ علیہ (بیضاوی)

لاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ پر حاشیے پہلے بھی گزر چکے۔

**۳۵۳** (اور رسول کی اطاعت میں خوش دلی کے ساتھ جنگ کے لئے نکل پڑے)

استجابوا۔ یہاں اجابوا کے معنی میں ہے اور بارہا دونوں لفظ بہ طور مترادف آئے ہیں۔

الاستجابة قیل ھی الاجابة..... عبّر بہ عن الاجابة بقلة انفکاکھا۔ (راغب)

بمعنی اجابوا (قرطبی) استجاب بمعنی اجاب (کبیر) اے اطاعوا (بیضاوی)

**۳۵۴** (جنگِ اُحد میں۔ اور وہ زخم ابھی تازہ ہی تھا)

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان سے کہنے والوں نے کہا کہ ۳۵۶ لوگوں نے تمہارے خلاف بڑا سامان اکٹھا کر لیا ہے ۳۵۷ ان سے ڈرو

فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿۱۷۳﴾

لیکن اس نے ان کا (جوش) ایمان اور بڑھا دیا۔ اور یہ لوگ بولے کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے ۳۵۸

مع

معرکۂ احد میں لشکرِ اسلام کو جو صدمہ پہنچا تھا، اس نے مشرکین مکہ کی ہمتیں بڑھا دی تھیں، سال ہی بھر بعد ایک بار پھر ابوسفیان صخر قریشی اموی کی قیادت میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ جنگ بدر میں ابوجہل، ابولہب، عتبہ وغیرہ کے کام آ جانے کے بعد اب قوم قریش کی سرداری کی باگ خاندان امیہ کے لیڈر ابوسفیان صخر بن حرب ہی کے ہاتھ میں تھی اس کی جمعیت ۲ ہزار پیادہ فوج، اور ۵۰ سواروں کی تھی لیکن ظاہری اور وقتی کامیابی کے باوجود وہی ایک روز بعد خود ان لوگوں پر کچھ ایسی ہیبت سوار ہوئی کہ بھاگے چلے گئے اور الٹا تعاقب خود مسلمانوں نے ان کا کیا، آیات قرآنی میں اشارہ انہی واقعات کی جانب ہے

۳۵۵ (اور نیک اور متقی تو یہ سب ہی ہیں)

منھم۔ من جس طرح تبعیض کے لئے آتا ہے یعنی کل میں سے کسی ایک جزو کے بتانے کو اسی طرح تبیین یعنی توضیح کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے۔

ومن للبیان (بیضاوی) ذھب غیر واحد انھا للبیان۔ (روح)

احسنوا اور اتقوا کے لے آنے سے مقصود اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ الذین استجابوا کی ممدوحیت کی علت یہی دو اوصاف، احسان و تقوی ہیں۔

والمقصود من ذکر الوصفین المدح والتعلیل لا التقیید لان المستجیبین کلھم محسنون متقون (بیضاوی)

قد احسنوا کلھم واتقوا لا بعضھم (مدارک)

۳۵۶ (اور یہ کہنے والے ابوسفیان صخر کے سکھائے پڑھائے ہوئے تھے اور اس کی طرف سے پروپیگنڈا کرنے والے)

تاریخ میں اس پروپیگنڈسٹ جماعت کے لیڈر کا نام نعیم بن مسعود اشجعی آتا ہے یہ شخص قبیلہ ثقیف کا تھا۔

۳۵۷ (اور تم کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے)

ان الناس۔ یہاں ناس سے مراد قوم قریش ہے اس روایت کی نشر و اشاعت سے مقصود مسلمانوں کے دلوں میں قریش کا رعب بٹھانا اور ان کی طرف سے دہشت پیدا کرنی تھی۔ "حرب اعصاب" جس طرح آج حرب اسلحہ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اس کا ایک اہم جزو ہے زمانہ قدیم میں بھی ہوتی رہتی تھی اور ابوسفیان صخر اپنے وقت اور اپنی قوم میں اس فن کا ماہر تھا، اس نے اپنے آدمی چھوڑ رکھے تھے کہ مسلمانوں سے مل جل کر انہیں قریش کی عسکری قوت اور حربی عظمت سے ایسا مرعوب کر دیں کہ ان کی ہمت پست پڑ جائے اور مقابلہ کا حوصلہ ہی ان میں باقی نہ رہے۔

۳۵۸ (ہماری حمایت، حفاظت سب کے لئے)

یعنی اس خبر کی اشاعت اور پروپیگنڈے نے بجائے ان میں پست ہمتی پیدا کرنے کے مسلمانوں میں جوش ایمانی اور تیز کر دیا" اور وہ

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا

سو یہ لوگ اللہ کے انعام اور فضل کے ساتھ واپس آئے کہ انہیں کوئی ناگواری (ذرا) نہ پیش آئی، اور یہ لوگ

رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۱۷۴) اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ

رضائے الٰہی کے تابع رہے ۳۵۹ اور اللہ بڑا فضل والا ہے ۳۶۰ یہ تو شیطان ہی ہے جو تمہیں اپنے دوستوں کے ذریعہ

اَوْلِيَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۱۷۵) وَلَا

سے ڈراتا ہے ۳۶۱ سو تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھی سے ڈرو اگر ایمان والے ہو ۳۶۲ اور آپ کے

يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْــًٔا ۗ

لئے یہ لوگ جو جلدی سے کفر میں جا پڑتے ہیں، باعث غم نہ بنیں ۳۶۳ یقیناً یہ لوگ اللہ کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۶۴

توکل اور اعتماد علی اللہ کی پوری قوت کے ساتھ بول اٹھے کہ غنیم جو چاہے کرے ہمارا کارساز تو اللہ ہے اور وہی ہمارے لئے کافی ہے۔

زادھم قول الناس ایمانًا۔ (قرطبی)

۳۵۹ (اور یہی رضائے الٰہی سرچشمہ ہے دنیوی اور اُخروی ہر قسم کے نفع و راحت کا)

فانقلبوا۔ یعنی مقامِ بدر تک جا کر مسلمان واپس آئے اہلِ سیر و تاریخ کی زبان میں یہ واقعہ غزوۂ بدر ثانیہ کے نام سے موسوم ہے اور اس کا زمانہ شعبان ۴ھ ہجری کا ہے۔ مہاجر مسلمان عام اہلِ قریش کی طرح، اہلِ تجارت بھی تھے جب دیکھا کہ میدانِ رزم خالی ہے تو بساطِ تجارت بچھا دی۔

سیرت ابن ہشام میں ہے:۔ "آپ نے ابوسفیان کے چیلنج کے جواب میں بدر کا قصد فرمایا چنانچہ وہاں پہونچ گئے اور یہاں آپ نے ابوسفیان کا انتظار آٹھ دن تک کیا اور ابوسفیان بھی مکہ والوں کو لے کر روانہ ہوا، مگر نواحی ظہران میں پہونچا تو اس کی رائے مکہ واپس چلے آنے کی ہوئی اور اس نے قریش سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارے سفر کے لئے تو ایسا موسم مناسب ہے جس میں تم اپنے جانوروں کو چرا بھی سکو اور دودھ بھی خوب پی سکو اور یہ موسم تو خشکی کا ہے سو میں تو واپس چلا تم بھی واپس چلے چلو چنانچہ وہ لوگ واپس ہو گئے"۔

بنعمۃٍ من اللہ۔ یعنی نعمت مقبولیت اور ترقی ایمان کے ساتھ۔

فضل۔ یعنی دنیوی نفع کے ساتھ بھی، چنانچہ مال کی نکاسی خوب ہوئی فضل کے ایک معنی مال اور آمدنی کے بھی ہیں۔

ھو الربح فی التجارۃ (کشاف) یعنی المال وما یکتسب (راغب)

۳۶۰ چنانچہ یہاں اس کا فضل مسلمانوں پر ان صورتوں میں ظاہر ہوا، ان کے درجۂ ایمان میں ترقی ہوئی، انہیں معرکہ جہاد میں نکلنے کی توفیق ہوئی، وہ پُر قوت دشمن کی شوکت و صولت سے ذرا مرعوب نہ ہوئے مقابلہ کی ہمت قائم رکھی، مالی و تجارتی نفع حاصل ہوئے، اجرِ عظیم کی بشارت ملی۔

۳۶۱ شیطان کہیں کبھی اپنی اصلی صورت میں آ کر حملہ نہیں کرتا جب وار کرتا ہے کسی نہ کسی انسانی شکل

يُرِيدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٦﴾

اللہ کی یہی مشیت ہے کہ ان کے لئے آخرت میں ذرا بھی حصہ نہ رکھے ۳۶۵ اور انھیں کے لئے بڑا عذاب ہے

اِنَّ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ

یقیناً جن لوگوں نے ایمان کے عوض کفر کو خرید لیا ہے وہ اللہ کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۶۶ اور انھیں کے

عَذَابٌ اَلِيمٌ ﴿١٧٧﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ

لئے دردناک عذاب ہے اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں یہ نہ خیال کریں کہ ہم جو انھیں مہلت دے رہے

لِّاَنْفُسِهِمْ ۚ اِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿١٧٨﴾

ہیں ۳۶۷ یہ ان کے حق میں بہتر ہے ہم تو انھیں بس اس لئے مہلت دے رہے ہیں کہ وہ جرم میں اور بڑھ جائیں ۳۶۸ اور انھیں کے لئے رسوا کن عذاب ہے

وقالب ہی میں آگرہ اور یہی اولیاء الشیطان کہلاتے ہیں یہاں اس جماعت کا لیڈر نعیم ثقفی تھا۔

اولیاءہ اے باولیاءہ (قرطبی) یخوفکم اولیاءہ الذین ہم ابوسفیان واولیاءہ (کشاف)

۳۶۲ (کہ اللہ کے خوف کو مخلوق کے خوف پر غالب رکھنا لازمۂ ایمان تھا)

لاتخافوھم۔ ھم سے مراد ہیں شیطان کے دوست یا اللہ کے دشمن، اور ضمیر کا مرجع یا الناس ہے (ان الناس قد جمعوا میں) یا اولیاءہ ہے۔

۳۶۳ یعنی ان لوگوں کے لئے آپ فکر و غم میں نہ پڑیں۔

الذین یسارعون فی الکفر۔ مراد منافقین ہیں، ادھر مسلمانوں کو خفیف سی بھی شکست ہوئی اور ادھر یہ کھلم کھلا کفر میں جا پڑے اور کافروں کے شریک علانیہ بھی ہونے لگے۔

نزلت فی المنافقین (کبیر) وھم المنافقون من المتخلفین (بیضاوی)

۳۶۴ یعنی اللہ کے دین کو ذرا نقصان نہیں پہنچا سکتے، آیت سے مقصود پیغمبرؐ کو تسکین دینا ہے کہ آپ کو بڑی فکر اس کی تھی کہ منافقین کی چالوں سے کہیں اشاعتِ اسلام نہ رک جائے، سو اطمینان رکھئے، ان کی چالیں ذرا بھی کامیاب نہ ہوں گی۔

۳۶۵ (خود ان کے کفرِ اختیاری کی پاداش میں)

ارادتہ ان لایکون لھم ثواب فی الاٰخرۃ لاتکون بدون ارادۃ کفرھم ومعاصیھم (مدارک)

۳۶۶ (بلکہ اُلٹے خود ہی ہر طرح کے خسارہ میں رہیں گے)

اَلّذین اشتروا الکفر بالایمان۔ اس سے مراد ہیں اسلام کے دشمن خفیہ و علانیہ ہر قسم کے آگئے۔

۳۶۷ یعنی حسب اقتضائے حکمتِ کاملہ فوراً انہیں عذاب کی گرفت میں نہیں لے رہے ہیں۔

۳۶۸ (عمر و مہلت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ)

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ

جس حال پر تم ہو اللہ اس پر ایمان والوں کو چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے

الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

الگ نہ کرے ۳۶۹ اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے ۳۷۰ البتہ اللہ جس کو چاہتا

يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ

ہے اپنے رسولوں میں سے انتخاب کر لیتا ہے ۳۷۱ تم اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ ۳۷۲ اور اگر تم

تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۱۷۹

ایمان لے آئے اور تم نے تقوی اختیار کر لیا تو تمہارے ہی لئے اجر عظیم ہے

یعنی ہمارے قانونِ تکوینی کا اقتضاء یہی ہے کہ جب گرفت فوری نہیں ہوتی تو غفلت و جسارت اور بڑھتی جاتی ہے۔

۳۶۹ (طرح طرح کے امتحانوں سے اور آزمائشوں کے ذریعہ سے)

علی ما انتم علیہ من اختلاط المؤمن بالمنافق (قرطبی) من اختلاط المؤمن المخلص والمنافقین (مدارک) المعنی لا یترککم مختلطین لا یعرف مخلصکم من منافقکم۔ (بیضاوی)

خطاب عام نوعِ انسانی سے ہے۔

علی ما انتم ایہا الناس (جلالین)

لیذر میں ل تاکید نفی کے لئے ہے۔

واللام لتاکید النفی (مدارک) قال الکوفیون اللام مزیدۃ للتاکید (روح)

الخبیث اور الطیب سے ظاہر ہے کہ منافقین اور مومنین مراد ہیں۔

۳۷۰ (مثلاً یہی کہ وہ بتلا دے کہ فلاں فلاں شخص منافق ہیں اور فلاں فلاں مومن)

یہ منافقین کے جواب میں ارشاد ہوا ہے جو مسلمانوں سے کہا کرتے تھے کہ اچھا بڑے سچے بنتے ہو تو یہی بتا دو کہ منافق کون کون سے ہیں۔

لیطلعکم میں خطاب یا عالم انسانی سے ہے یا صرف مسلمانوں سے۔

الغیب سے مراد وہ تکوینی حقیقتیں ہو سکتی ہیں جو انسان سے پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔

۳۷۱ (بعض امورِ غیب کی اطلاع کے لئے)

من یشاء۔ یعنی جسے وہ چاہتا ہے اپنی مصلحت و حکمتِ تکوینی کے ماتحت۔

متکلمین نے کہا ہے کہ آیت نص ہے عقیدۂ باطنیہ کے مقابلہ میں جو علمِ غیب کا اثبات علاوہ رسول کے اپنے امام کے لیے بھی کرتے تھے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا

اور جو لوگ اُس مال میں بخل کرتے رہتے ہیں ۳۷۳ اور جو کچھ اللہ نے انھیں اپنے فضل سے دے رکھا ہے وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ

لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

۳۷۴ یہ ان کے حق میں اچھا ہے نہیں بلکہ ان کے حق میں (بہت) بُرا ہے۔ یقیناً ان لوگوں کو قیامت کے دن طوق پہنایا جائے گا

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾

اس (مال) کا جس میں انھوں نے بخل کیا ۳۷۵۔ اور اللہ ہی وارث ہے آسمانوں اور زمین کا ۳۷۶۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبردار ہے ۳۷۷

الآية حجة على الباطنية فانهم يدعون ذلك العلم لامامهم. (مدارک)

**۳۷۲** (کہ یہی ایمان کی اصل و بنیاد ہے)

رسلہ۔ صیغہ جمع میں ہے مقصود تو اب صرف نبوت محمدیؐ پر ایمان لانے کی ترغیب دینا ہے لیکن اس ضمنی موقع پر بھی حکم تمام انبیاء پر ایمان لانے کا مل رہا ہے۔ کس قدر اہتمام قرآن کو وحدتِ پیام اور سلسلۂ وحی کی اہمیت و عظمت کا ہے!

**۳۷۳** (یہاں تک کہ زکوٰۃ اور صرفِ واجب کے موقع پر بھی)

البخل في اللغة ان يمنع الانسان الحق الواجب عليه (قرطبی) نزلت في مانعي الزكوٰة المفروضة قاله ابن مسعود وابو هريرة وابن عباسؓ والشعبي والمجاهد. (بحر)

**۳۷۴** (یعنی یہی شیوۂ بُخل)

هو اي البخل (مدارک۔ بیضاوی)

**۳۷۵** (اور یہ طوق سانپ کی شکل میں ہوں گے ان کی گردنوں میں لپٹے ہوئے)

حشر میں جب مجردات اور معانی مادی جسم اور شکلیں اختیار کرلیں گے، بخل اور منعِ زکوٰۃ حدیث میں آیا ہے کہ سانپ بن کر مجرموں کی گردن میں لپٹے گا۔

قال رسول الله صلعم ما من احد لا يؤدي زكوٰة ماله الا مثل له شجاع اقرع يطوقه (ابن جریر عن ابن مسعود) اور ابن کثیر میں اس مفہوم کی متعدد حدیثیں بخاری، واحمد، وترمذی، ونسائی وابن ماجہ وغیرہم سے نقل کی ہوئی ملتی ہیں۔

سیطوقون میں س تاکید کے لئے ہے۔

السين مزيدة للتاكيد (روح)

**۳۷۶** (اور وہی آج بھی سب کا مالکِ حقیقی ہے)

سو یہ لوگ بخل درحقیقت اپنے مال میں نہیں بلکہ اُس کے مال میں کررہے ہیں جو اور بھی قبیح ہے۔

وليس هٰذا بميراث في الحقيقة لان الوارث في الحقيقة هو الذي يرث شيئًا لم يكن ملكه قبل والله سبحانه تعالى مالك السمٰوات والارض وما بينهما (قرطبی) والمقصود من الآية انه يبطل ملك جميع المالكين الاملاك

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ

بے شک اللہ نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جنھوں نے کہا ہے کہ خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں ۳۷۸

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا

ہم لکھ رہے ہیں ان کے اس قول کو ۳۷۹ اور ان کے (اپنے) انبیاء کے ناحق مار ڈالنے کو بھی ۳۸۰ ہم کہیں گے

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ

کہ (اب) ۳۸۱ آگ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ اس (کرتوت) کی وجہ سے ہوا جو تم آگے بھیج چکے ہو اور اس لئے کہ اللہ بندوں

بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ۳۸۲

اللہ سبحانہ و تعالیٰ (کبیر)

۳۷۷ (اس لئے اخلاص کا اہتمام قدم قدم پر رکھنا لازمی ہے)

۳۷۸ یہ کہنے والے یہود تھے اور ان کا یہ قول بطور مضحکہ و تمسخر کے تھا، یہود کا ایک قبیلہ بنی قینقاع کے نام سے نواحِ مدینہ میں آباد تھا، یہ زرگروں اور مہاجنوں، ساہوکاروں کا گروہ تھا، انھی نے آیۂ کریمہ من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً سن کر بہ طور تعریض و تضحیک اس قسم کی بدگوئی شروع کردی تھی۔

یہود کی بدتمیزیوں اور گستاخانہ طنز و تمسخر کو کوئی آج سمجھنا چاہے تو آریہ سماجیوں کا وہ مناظرانہ لٹریچر اللہ اور رسول کے متعلق اٹھا کر پڑھ لے جو انیسویں صدی کے ثلث اخیر اور بیسویں صدی کے ثلث اول میں رائج رہا تھا اس سے پورا اندازہ ہو جائیگا۔

۳۷۹ یعنی فرشتوں کے ہاتھ سے ان لوگوں کے نامۂ اعمال میں لکھا کر رہیں گے اور ایسی گستاخانہ پھبتیوں کو ہرگز نظرانداز نہ ہونے دیں گے سنکتب۔ س یہاں بھی تاکید کے لئے ہے۔

السین للتاکید امی لن یفوتنا ابداثبته (روح)

۳۸۰ جو اس درجہ شقی القلب ہوں کہ اپنے پیغمبروں تک کو ہلاک کر ڈالیں، ان سے ایسی گستاخی کے کلمے بعید ہی کیا ہیں؟ قتلِ انبیاء اور ناحق قتل انبیاء پر حاشیے سورۃ البقرہ رکوع ۷ میں گزر چکے۔

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ جو یہود قتل انبیاء سے راضی و مطمئن رہے وہ بھی گویا عملاً قتل میں شریک اور قتل کے ذمہ دار ہوئے ہیں، اور پھر یہ حقیقت کلی درج کی ہے کہ رضا بالمعصیت بھی معصیت ہے۔

ھٰذہ مسألة عظمٰی حیث یکون الرضا بالمعصیة معصیةً۔ (قرطبی)

رسول اللہ صلعم کے معاصر یہود بھی اپنے اسلاف کی طرح ان حضراتِ انبیاء کی نبوت کے منکر اور انھیں جھوٹے مدعیانِ نبوت سمجھنے والے تھے، اور اس لئے انھیں واجب القتل بھی سمجھتے تھے۔

الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ عَهِدَ إِلَيْنَا أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا

(یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے ہیں ۳۸۳ کہ خدا نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے

بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ

سامنے ایسی نیاز نہ پیش کرے جسے آگ کھا جائے ۳۸۴ آپ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پیشتر تمہارے پاس رسول دلائل کے ساتھ

وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۸۳﴾ فَإِن كَذَّبُوكَ

اور اُس (معجزہ) کے ساتھ بھی آچکے جسے تم کہہ رہے ہو تو تم نے انہیں کیوں مار ڈالا اگر تم سچے ہو ۳۸۵ سو اگر یہ آپ کی تکذیب

فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ ﴿۱۸۴﴾

کررہے ہیں تو آپ سے پیشتر بھی پیغمبروں کی تکذیب ہوچکی ہے جو شواہد اور نوشتوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے ۳۸۶

**۳۸۱** (قیامت کے دن)

**۳۸۲** یہ عین اس کی صفتِ عدل کا تقاضا ہوگا کہ ایسے مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے، نہ یہ کہ اس میں ذرا بھی شائبہ ظلم ہو، ایسے ناانصافوں، ظالموں کا سزا سے بچ نکلنا خود مظلوموں پر ایک طرح کا ظلم ہوا۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کو ظالم، جابر سب ہی کچھ مانا ہے، یہاں ان عقائد کی بھی پوری تردید ہوگئی۔

بما قدمت ایدیکم۔ حشر میں عذاب تو صرف متشکل ہو کر سامنے آجائے گا، ورنہ ہوگا تو حقیقتاً ان مجرموں کے دُنیوی کرتوتوں ہی کا ثمرہ۔

**۳۸۳** (اور تمام تر جھوٹ کہتے ہیں)

**۳۸۴** یعنی مدعیِ نبوت کے لئے یہ دکھانا ضروری ہے کہ جو قربانی مذبح میں پیش کی جائے اسے آگ آسمان سے آکر جلا جائے، سوختنی قربانی کا ذکر توریت میں میں کثرت سے آیا ہے۔

عهد الینا۔ یعنی ہم نے نسلِ اسرائیل کو حکم دیا تھا۔

**۳۸۵** یعنی اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ مرتبۂ نبوت اور اس خاص معجزہ کا ظہور لازم و ملزوم ہیں تو آخر تمہاری قوم کے جن انبیاء نے یہ معجزہ دکھایا، تم خود اُن کے بھی منکر کیوں ہوئے؟

جاءکم رسل۔ یعنی تمہاری ہی نسل و قوم کے پیمبر جو تمہارے پاس آچکے ہیں۔

بالذی قلتم۔ توریت میں اس قسم کے متعدد واقعات مندرج ہیں مثلاً:-

"ایلیا نبی نزدیک آیا اور بولا۔۔۔۔ تب خداوند کی طرف سے آگ نازل ہوئی اور اس نے اس سوختنی قربانی اور لکڑیوں اور پتھروں اور پانی کو جلایا" (۱ سلاطین۔ ۱۸: ۳۷ و ۳۸) "اور جب سلیمان دعا مانگ چکا تو آسمان سے آگ اُتری اور سوختنی قربانی اور ذبیحوں کو کھا گئی اور وہ گھر خداوند کے جلال سے بھر گیا" (۲۔ تواریخ ۷: ۱)

**۳۸۶** (اس لئے آپ کچھ غم نہ کریں، یہ معاملہ تو سارے ہی انبیاء مرسلین کے ساتھ ہوتا آیا ہے)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے ۳۸۷ اور تم کو تمھاری پوری مزدوری تو بس قیامت ہی کے دن ملے گی ۳۸۸

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ

تو جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو وہی کامیاب ہوا ۔ اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی

الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِىْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

نہیں بجز ایک دھوکے کے سودے کے ۳۸۹ یقیناً تم اپنے مال اور جان سے آزمائے جاؤ گے ۳۹۰

بالبیّنٰت ۔ بینات دلائل عقلی اور معجزات سب کا جامع ہے ۔

اے الحجج والمعجزات (کبیر) الحجج والبراهین القاطعة (ابن کثیر)

الزبر ۔ زبور کی جمع ہے مراد وہ رسالے ہوتے ہیں جن میں صرف اخلاقی موعظے ہوتے ہیں ، اس کی بہترین مثالیں اناجیل اربعہ ہیں ۔

قیل الزبر المواعظ والزواجر (بیضاوی)

الکتاب ۔ اصطلاح قرآنی میں اس سے مراد ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں احکام و شرائع سب ہوں ۔

والکتاب فی عرف القراٰن ما یتضمن الشرائع والاحکام ۔ (بیضاوی ، روح)

۳۸۷ (خواہ وہ جاندار کوئی اور کیسا ہی ہو)

گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تتمہ اور تکملہ ہے حیات ناسوتی کا ، اسے نکوکاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ انسان کے لئے بطور سزا کے مقرر ہوئی ہے اس میں مسیحیوں اور یہود دونوں کا رد آگیا جن کے عقیدہ میں موت تمام ہے گناہ کی سزا یا نتیجہ کا ، انجیل کے صحیفوں میں ہے : "جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی اور موت سب آدمیوں میں پھیل گئی" (رومیون ۵ : ۱۲) "گناہ کی مزدوری موت ہے" (رومیون ۶ : ۲۳) "خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے" (یعقوب ۱ : ۱۵) یہود کا عقیدہ ہے کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا اُن کی معتبر و مستند جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ ص ۴۸۳ میں اُن کے ربیوں کے حوالہ سے درج ہے ۔

۳۸۸ (سو اگر آج کوئی شخص یہاں قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ بھی گیا تو اس کی یہ محفوظیت عارضی ہے کہ یہ دنیوی زندگی سلسلۂ حیات کا ایک بہت ہی ناقص اور ناتمام حصہ ہے)

خطاب یہاں عام نوعِ انسانی سے ہے ۔

المراد بالاٰیة المکلّفون الحاضرون فی دار التکلیف ۔ (کبیر)

اُجور ۔ اجر کا لفظ اپنے وسیع معنی میں جزاء کی طرح عذاب و ثواب دونوں کے لئے عام ہے ۔

فاجر المومن ثواب واجر الکافر عذاب (قرطبی) تعطون جزاء اعمالکم خیرا کان او شرا تاما وافیا (بیضاوی)

۳۸۹ (اور یہاں کے سارے عیش تمام تر عارضی ، فانی اور بے ثبات ہیں)

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ

اور یقیناً تم بہت سی دلآزاری کی باتیں ان سے (بھی) سنو گے جنھیں تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے اور

أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ

ان سے (بھی) جو مشرک ہیں ۳۹۱ اور اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ تاکیدی احکام

مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴿١٨٦﴾ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا

میں سے ہے ۳۹۲ اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب اللہ نے اہل کتاب سے عہد

الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ

لیا تھا کہ کتاب کو پوری طرح ظاہر کر دینا (عام) لوگوں پر اور اسے چھپانا مت ۳۹۳

اس ایک عقیدہ کا استحضار رہے تو ہر انسان فرشتہ خصلت ہی بن جائے۔

زحزح عن النار۔ یہ بچنا خواہ شروع ہی سے ہو، خواہ کچھ سزا بھگتنے کے بعد۔

حیٰوۃ الدنیا۔ حیاتِ دنیا سے یہاں مراد، اس کی لذتیں، خواہشیں، زینتیں ہیں۔

ای لذاتھا وشھواتھا وزینتھا (روح)

فمن ..... فاز بشری زندگی کا مقصودِ اعظم بس یہی ۲ دو چیزیں ہیں، جو یہاں فوزِ عظیم کی صورت میں جمع کر دی گئی ہیں، ایک عذاب سے نجات دوسرے منزلِ ثواب تک رسائی۔

اعلم انہ لا مقصود للانسان وراء ھذین الامرین الخلاص عن العذاب والوصول الی الثواب۔ (کبیر)

متاع الغرور اردو محاورے میں مرادف ہے "دھوکے کی ٹٹی" کے یعنی اس مادی، فانی دنیا کے کسی بھی ساز و سامان پر تکیہ کرنا اور غفلت میں پڑ کر اسے پائدار سمجھنے لگنا، انتہائی جہل و حمق ہے۔

۳۹۰ (اے مسلمانو!)

یعنی نقصانِ مال اور نقصانِ جان دونوں طرح تمھاری آزمائش ہوگی۔

وانفسکم۔ اس سے رد نکل آیا ان فلاسفہ اور متکلمین کا جنھوں نے مادیین کی طرح نفس کو جسم مادی و مرئی کے مرادف قرار دیا ہے

وھذہ الایۃ دلیل علی ان النفس ھی الجسم للمعاین وان ما فیہ المعنی الباطل کما قال بعض اھل الکلام والفلاسفۃ (مدارک)

۳۹۱ (سو صبر و ثبات، تحمل و استقامت کی عادت برابر قائم رکھنا چاہیئے)

اذًی کثیرًا۔ دین کی تحقیر، پیمبر کی توہین وغیرہ سب چیزیں آگئیں، قرآن مجید کی یہ پیش گوئی آج تک کیسی صحیح چلی آئی ہے! یہود کی، مسیحیوں کی، ہندوؤں کی زبانوں سے ہم مسلمانوں کو اپنے پیمبر، اپنے دین اور اپنی کتاب کے بارہ میں کیا کچھ سننا نہیں پڑ چکا ہے۔

۳۹۲ (اور اس لیے ہر طرح واجب العمل)

فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

سو انھوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک دیا اور اس کو ایک حقیر قیمت کے عوض میں بیچ ڈالا ۳۹۴ سو کیسی بُری چیز ہے جسے وہ خرید رہے ہیں!

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَاۤ اَتَوْا وَّ یُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ

ہرگز خیال نہ کرو کہ جو لوگ اپنے کرتوتوں پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جو کام نہیں کئے ہیں ان پر بھی ان کی

یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۸۸﴾

مدح کی جائے ۳۹۵ سو ایسے لوگوں کے لئے ہرگز نہ خیال کرو کہ وہ عذاب سے حفاظت میں رہیں گے۔ ان کے لئے تو دردناک عذاب ہے ۳۹۶

عزم۔ یہاں معزوم کے معنی میں ہے۔

اے من معزوماتہا التی یعزم علیہا (جلالین) فالعزم مصدر بمعنی المعزوم (روح) اے الامور التی ینبغی ان یعزمہا (روح) ایں از کارہائے مقصود است (ولی اللہ دہلویؒ)

ذٰلِکَ یعنی یہی صبر و تقویٰ۔

یعنی الصبر والتقویٰ (بیضاوی) اشارۃٌ الی المذکور ضمنًا من الصبر والتقویٰ (روح)

**۳۹۳** چنانچہ اس حکم کی شہادت کسی درجہ میں تو موجودہ محرّف توریت اور انجیل بھی دے رہی ہے۔

"تم اس کلام میں جو میں تمھیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو" (استثناء ۴: ۲)

"تو یہ باتیں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو سکھلا" (استثناء ۴: ۹)

"اس نے ...... بنی اسرائیل میں ایک شریعت بنا رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلادیں تاکہ آنے والی پشت وہ فرزند جو پیدا ہوویں سیکھیں اور وہ اٹھ کر اپنی اولاد کو سکھلادیں" (زبور ۷۸: ۵ و ۶) "جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اُجالے میں کہو اور جو کچھ تم کہتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" (متی ۱۰: ۲۷)

لتبیّننّہ۔ بیّن کے معنی خوب کھول کر بیان کرنے کے ہیں۔ ہٗ کی ضمیر کتاب کی طرف ہے یعنی جو کتاب تمھیں ملے اس کو اور اس کے مضامین کو خوب پھیلاؤ۔

ولا تکتمونہ۔ یعنی اس کے کسی حصہ کسی مضمون کو کسی غرض سے بھی نہ چھپاؤ۔

**۳۹۴** یعنی احکام الٰہی کو سستے داموں بیچ کر دنیا خرید کی!

ثمنًا قلیلًا۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا ہمیشہ کم قیمت ہی رہے گی، یہ مراد نہیں کہ ان نافرمانوں نے تحریف کا معاوضہ ہلکا لیا، انھیں اس سے زیادہ لینا تھا۔

نبذوہ۔ ضمیر اسی عہد کی طرف ہے۔

اے المیثاق (بیضاوی) من المیثاق (روح)

**۳۹۵** حکم تو عام ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اشارہ ہے معاصر علماء یہود اور منافقین کی جانب۔

۱۹ ع ۹ ۱۰

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۸۹﴾

اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۹۷

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ

بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ادل بدل میں اہل عقل کے لئے

لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا

(بڑی) نشانیاں ہیں ۳۹۸ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر

وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ

(برابر) یاد کرتے رہتے ہیں ۳۹۹ اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے رہتے ہیں ۴۰۰

عُنی بذٰلک قومٌ من اھل النفاق (ابن جریر) عُنی بذٰلک قومٌ من احبار الیھود (ابن جریر)

بما اٰتوا۔ چنانچہ اپنی اس کارگزاری پر اتراتے ہیں کہ حق کا اخفاء اور اپنی بدکرداریوں کا کتمان کرتے رہے۔

مالم یفعلوا۔ چنانچہ اس کو فخر کی بات سمجھتے ہیں کہ دینِ حق کی نشر و اشاعت نہ کی۔

۳۹۶ (آخرت میں)

بمفازۃ من العذاب۔ اس عذاب سے مراد اسی دنیا میں سزائیں ہیں، چنانچہ یہود چند ہی سال کے اندر قتل ہوئے، گرفتار ہوئے، جلا وطن ہوئے، اور منافقین یہود ذلیل و رسوا ہوئے۔

۳۹۷ (چنانچہ مجرموں کی دنیوی و اُخروی سزاؤں پر بھی)

اللہ کی ملکیتِ تامہ اور قدرتِ کاملہ کا استحضار رہے تو انسان سے شاید ایک بھی معصیت نہ سرزد ہونے پائے۔

۳۹۸ (اللہ کی توحید اور فردیت کی، اللہ کی حکمت و صنعت کی اور اللہ کی قدرت و حاکمیت کی)

نظامِ فلکی اور اس کی تفصیلات، چاند، سورج، تاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات و تاثرات، ان کی گردشوں کی پیمائش، گہن کے اسباب و اوقات، اُن کے طلوع و غروب، نور و حرارت وغیرہ کے قاعدے ضابطے، اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، رہی زمین تو ہیئتِ ارض، مساحتِ ارض، طبقاتِ ارض، معدنیاتِ ارض، کشش ارض، ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لئے تو کوئی ایک پورا فن بھی کافی نہ ہوا، بلکہ جغرافیہ، جغرافیۂ طبعی، جیالوجی، فزالوجی، میٹرولوجی، آرکیالوجی، خدا جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں، اور حکمتِ باری اور صنعتِ باری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے کے قریب بھی نہیں آرہے ہیں۔

آیت میں ضمناً اُن مشرک قوموں کا بھی رد آگیا جنھوں نے آسمان یا زمین یا رات دن کو دیوی دیوتا سمجھا ہے، معبودیت کی صلاحیت ان میں کسی میں بھی نہیں، یہ سب کے سب مملوک و مسخر ہیں ایک صانعِ اعظم کے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ

اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (سب) لایعنی نہیں پیدا کیا ہے ۴۰۱ تو پاک ہے ۴۰۲ سو محفوظ رکھیو ہم کو دوزخ کے عذاب سے ۴۰۳

اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

اے ہمارے پروردگار! تو نے جسے دوزخ میں داخل کیا اسے واقعی رسواہی کر دیا، اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ۴۰۴

۳۹۹ یعنی یادِ الٰہی خواہ دل سے ہو یا زبان سے، بہر حال اور ہر ہیئت کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ مقصود مداومتِ ذکرِ الٰہی کا اظہار ہے۔

المراد منه كون الانسان دائم الذكر فان الاحوال ليست الا هٰذه الثلاثة (كبير) قال سائر المفسرين اراد به المداومة على الذكر في عموم الاحوال۔ (معالم)

علىٰ جُنُوْبِهِمْ۔ سے مراد ہے لیٹے ہوئے۔ اى مضطجعين (قرطبی)

۴۰۰ کائنات کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانینِ طبعی اور قواعدِ تکوینی سے صانعِ اعظم و خالقِ عالم کی قدرت، حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہی نہیں، ایک اعلیٰ و اشرف عبادت ہے۔

هو افضل العبادات كما قال عليه الصلوٰة لا عبادة كالتفكر لانه المخصوص بالقلب والمقصود من الخلق (بيضاوى) دلّت الآية على ان اعلىٰ مراتب الصدّيقين التفكر فى دلائل الذات والصفات (كبير)

کاش آج ہماری قوم کے ماہرینِ فنِ ہیئت، فلکیات، ریاضیات وغیرہ علومِ طبعی پر دینی و ایمانی نقطۂ نظر سے قلم اٹھاتے!

۴۰۱ یعنی بلا غایت و بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے، بڑے بڑے مصالح و مقاصد اس کے اندر رکھے ہیں۔ اس میں رد آگیا علاوہ مادئیین و دہریین کے جو کائنات کو محض بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں، ان مذاہبِ باطلہ کا بھی جن کے نزدیک یہ نظامِ کائنات محض کسی دیوتا کا کھیل تماشہ یا ایک طرح کا طلسم و شعبدہ ہے۔

۴۰۲ (ہر فعل عبث و لاحاصل سے)

تنزيها عن الوصف بخلق الباطل (مدارك) لمعنى ان تخلق شيئًا باطلا۔ (ابن كثير)

۴۰۳ (اور وہ اس طرح کہ ہمیں راہِ ہدایت پر چلا، اور راہِ ضلالت کے سایہ سے بھی بچا)

یہ مراد نہیں کہ ہم تو اندھا دھند ہر طرح کے کفر و شرک میں مبتلا رہیں، اور تو ہمیں فقط ان کے قدرتی انجام سے محفوظ کر دے۔

۴۰۴ (کہ انھیں میرے عذاب سے کچھ بھی بچا سکے)

الظّٰلمین۔ ظالم سے یہاں کھلی ہوئی مراد کافر سے ہے۔

اى الكفّار (قرطبى) والمراد الكفار (مدارك) قال ابن عباس الظالمون هنا هم الكافرون وهو قول جمهور المفسرين (بحر) القرآن دلّ على انّ الظّالم بالاعلان هو الكافر۔ (كبير)

من تُدْخِلِ النَّار۔ مراد وہ لوگ ہیں جو کفر و شرک کی حالت میں مرے اور عذابِ ابدی کے لئے دوزخ میں جھونکے جائیں گے، وہ گنہگار مسلمان مراد نہیں ہیں جو گناہوں سے پاک و صاف ہونے کے لئے اور تطہیرِ روح کی غرض سے عارضی و وقتی طور پر آگ کی بھٹی میں ڈالے جائیں گے۔

قال سعيد بن المسيّب الآية خاصة فى قوم لا يخرجون من النار۔ (قرطبى)

حکماء و علماء کے ایک گروہ نے آیت سے یہ نکالا ہے کہ عذابِ روحانی عذابِ جسمانی سے بھی بڑھ کر زبردست و شدید ہوگا، اس لئے کہ

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ

اے ہمارے پروردگار ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی پکار کرتے ہوئے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ سو ہم ایمان لے آئے ٤٠٥

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ١٩٣

اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہم سے ہماری خطاؤں کو زائل کر دے اور ہمیں نیکوں کے طریقہ پر موت دے ٤٠٦

قرآن خزی (رسوائی) کا ذکر عذابِ دوزخ کے بعد کرتا ہے۔

**٤٠٥** (اس داعیِ حق کی ہدایات کے مطابق)

ایمان شریعت میں وہی معتبر و مستند ہے جو پیمبر کی ہدایت کے مطابق ہو نہ کہ اپنے ظن و تخمین کے ماتحت، امام ماتریدی نے یہیں سے یہ نکالا ہے کہ اپنے ایمان کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید و مشروط کرنا درست نہیں۔

قال الشیخ ابو منصورؒ فیہ دلیل بطلان الاستثناء فی الایمان (مدارک)

مُنَادِيًا۔ پکارنے والے سے مراد رسول اللہ صلعم ہیں۔

وھو الرسول صلعم (ابن کثیر) یعنی محمدا صلعم قالہ ابن مسعود وابن عباس والکثر الناس۔ (معالم)

اور منادیاً کا صیغہ نکرہ منادی کی عظمت کے اظہار کے لئے۔

والتنوین فی المنادی للتفخیم (روح) ذکر النداء مطلقا ثم مقیدا بالایمان تفخیما لشان المنادی (کشاف)

ینادی للایمان۔ یہ ضرور نہیں کہ پیمبر کی دعوت براہِ راست ہی پہنچی ہو کسی واسطہ سے بھی پہنچے بہرحال پیمبر ہی کی دعوت ہوگی۔ للایمان میں ل الی کے معنی میں ہے، نداء اور دعا اور اس قبیل کے افعال کا صلہ ل کے ساتھ بھی آتا ہے، اور الی کے ساتھ بھی، انتہاء اور اختصاص کے اظہار کے لئے۔

اللام بمعنی الی ای الی الایمان (قرطبی) والنداء والدعاء ونحوھما یعدیٰ بالی واللام لتضمنھا معنی الانتھاء والاختصاص (بیضاوی)

ربنا۔ آیت میں ربنا کی تکرار کمالِ تضرع و اعترافِ ربوبیت کے اظہار کے لئے ہے۔

تکریر للتضرع واظہار لکمال الخضوع وعرض للاعتراف بربوبیتہ تعالیٰ مع الایمان بہ (روح)

فاغفر لنا۔ آیت سے محققین اہلِ سنت نے استدلال کیا ہے کہ مغفرت بغیر توبہ بھی ہو جائے گی۔

احتج اصحابنا علی حصول العفو بدون التوبۃ (کبیر)

اور اس نظریہ کی بنیاد دُہری قائم کی ہے ایک یہ کہ بیان توبہ کا کوئی ذکر نہیں صرف سوالِ مغفرت ہے، اور دعا قبول ہو گئی، جیسا کہ ابھی آتا ہے فاستجاب لھم ربھم۔

وھذا صریح فی انہ تعالیٰ قد یعفو عن الذنب وان لم توجد التوبۃ (کبیر)

دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے اپنے ایمان کی خبر دیتے ہی معاً بعد طلبِ مغفرت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغفرت کا ترتب مجرد ایمان پر ہو جاتا ہے

فدلت ھذہ الآیۃ علی ان مجرد الایمان سبب لحصول الغفران (کبیر) فاغفر لنا مرتب علی الایمان

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

اے ہمارے پروردگار! ہمیں عطا کر وہ چیز جس کا تو ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت وعدہ کرچکا ہے اور ہم کو قیامت کے دن رسوا نہ کرنا ۴۰۷

اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

بے شک تو تو وعدہ خلافی نہیں کرتا ۴۰۸

به تعالیٰ والاقرار بربوبیته کما تدل علیه الفاء ای فاغفر لنا۔ (روح)

۴۰۶ (اور آخرت میں ان کی رفاقت نصیب کر)

مخصوصین بصحبتهم ومعدودین فی زمرتهم (بیضاوی) ای امتنا علی حالهم وطریقتهم۔ (المنار)

ذنوبنا۔ ذنوب سے مراد بڑے گناہ ہیں۔

ای کبائر (بیضاوی) الذنوب هی الکبائر۔ (بحر۔ عن ابن عباسؓ)

سَیّاٰتِنَا۔ سیّات سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔

ای صغائرنا (بیضاوی) السیّاٰت هی الصغائر (بحر۔ عن ابن عباسؓ)

ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ ذنوب سے مراد وہ گناہ ہیں جو بندہ سے اپنے ربِ خالق کے معاملہ میں ہوں، اور سیّات سے مراد وہ کوتاہیاں ہیں جو بندہ سے بندوں کے معاملات میں ہوں۔

الذنوب هی التقصیر فی عبادة الله تعالیٰ وکلّ معاملة بین العبد وربّه والسیّاٰت هی التقصیر فی حقوق العباد ومعاملة الناس بعضهم بعضًا۔ (المنار)

اور ذنوب کی مغفرت یہ ہے کہ ان پر گرفت نہ کی جائے، اور کفارۂ سیّاٰت یہ ہے کہ انھیں محو کردیا جائے۔

وغفر الذنوب عبارة عن سترها وعدم العقوبة علیها البتة وتکفیر السیّاٰت عبارة عن اسقاطها۔ (المنار)

۴۰۷ یعنی ہم پر ابتدا ہی سے برابر فضل وکرم رکھ۔

جہنم وغیرہ کے جو شدید ترین عذاب ہیں، وہ تو خیر انتہائی چیز ہی ہیں، باقی میدانِ حشر میں رسوائی، عام تفضیح یہ کچھ کم ہے! ذرا اس پر خیال تو کیا جائے۔

اٰتنا ما وعدتنا۔ یعنی اجرِ موعود، جنتِ معہود۔

علٰی رُسُلِكَ۔ اللہ کے وعدے معتبر تمام تر وہی ہیں جو پیمبروں کی وساطت سے ہوں۔ مہرِ تصدیق صرف انھی پر لگی ہے، نہ کہ اپنی عقل وذہانت سے فرض کئے ہوئے وعدوں پر۔

رَبَّنَا۔ دعا میں بار بار اس لفظ کی تکرار، اللہ کی صفتِ ربوبیت کو بار بار مخاطب کرنا اور گویا اسے اس کی صفت کا واسطہ دینا دلیل ہے، دعا کرنے والے کی خشیت اور الحاح اور تضرّع کی۔

۴۰۸ (اس لئے تیرے وعدہ پر تو قطعاً بھروسہ ہے لیکن اس کا اطمینان تو نہیں کہ ان وعدوں کا تحقّق ہمارے ہی حق میں ہو، ہم ہی ان وعدوں کے مصداق ٹھہریں)

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ

سو ان کی دعا کو ان کے پروردگار نے قبول کرلیا ۴۰۹ اس لئے کہ میں تم میں کسی عمل کرنے والے کے خواہ وہ مرد ہو

ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا

یا عورت عمل کو ضائع نہیں ہونے دیتا تم آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو ۴۱۰ تو جن لوگوں نے ہجرت کی (راہِ

مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

خدا میں) اور اپنے شہروں سے نکالے گئے اور (اور بھی) تکلیفیں انھیں میری راہ میں دی گئیں اور وہ لڑے

عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ

اور مارے گئے ان کی خطائیں ضرور ان سے

۴۰۹ (اور انھیں اپنے فضل و کرم کی جنت میں داخل کردیا)

استجاب۔ یہاں بھی اَجاب کے معنی میں ہے۔

استجابه لے اجابه (قرطبی)

۴۱۰ (اور تم دونوں الگ الگ قسم کی مخلوق نہیں، ایک ہی نوع کی دو شاخیں ہو۔)

اَنِّیْ لَآ اُضِیْع۔ ہر زبان کا ایک مخصوص اُسلوبِ بیان و طرزِ انشا ہوتا ہے، اوپر سے برابر صیغۂ غائب چلا آرہا ہے۔ اب دفعتہً اس آیت کے اندر صیغۂ متکلم آگیا، عربی ادب و انشا میں یہ فوری انتقالِ صیغہ داخلِ عیب نہیں، داخلِ ہنر ہے اور اپنے موقع و محل پر ایک خاص صنعت ہے جسے صنعتِ التفات کہتے ہیں۔ یہاں صیغۂ متکلم دلالت کررہا ہے تخصیص و تحقیق پر

مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ جاہلی مذہبوں میں بلکہ مسیحیت میں بھی عورت ہونا بجائے خود ایک نقص بلکہ جرم تھا، عورت غریب محض اس لئے کہ عورت تھی، بہت سے درجات سے، بہت سے ثوابوں سے محروم تھی۔ اس گمراہی کو مٹانے کے لئے صراحت کے ساتھ یہ بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ جنس مذکر و مؤنث سے عمل و اجرِ عمل پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا۔ عمل کے لحاظ سے مرد ہو یا زن، ہر عامل یکساں ہے، نماز اس کی بھی مقبول، اس کی بھی، روزہ اس کا بھی قبول اس کا بھی، عصمت اِس کی بھی قابلِ قدر، اس کی بھی، وقس علیٰ ہذا

لَا اُضِیْع۔ صیغۂ متکلم لاکر یہ بھی بتادیا کہ عمل پر ثمرات کا ترتب تمام تر اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نہیں کہ ارادۂ الٰہی کے بغیر ثمرات کا ترتب از خود اور میکانکی طور پر ہوجایا کرے۔

بعضكم من بعض۔ یہ تصریح ہے اس کی کہ انسانیت دونوں جنسوں میں مشترک ہے۔ اس لئے حکم بھی دونوں کا مشترک ہی رہے گا۔ اور عمل اور قبولِ عمل کے لحاظ سے دونوں جنسیں بالکل ایک ہیں۔

لأنهما من اصلٍ واحدٍ (بیضاوی) لا تفاوت فی الاجابة ولا فی الثواب بین الذکر والانثی (کبیر)

بیّنت فیها شرکة النساء مع الرجال فی ما وعد الله عباده الصالحین (مدارك)

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ

معاف کر دی جائیں گی ۴۱۱ے اور میں ضرور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی (یہ) اللہ کے

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۱۹۵ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ

پاس سے ثواب ملے گا۔ اور اللہ ہی کے پاس تو بہترین ثواب ہے ۴۱۲ے (یہ) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے

كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۱۹۶ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۣ ثُمَّ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ

میں نہ ڈال دے ۴۱۳ے (یہ) چند روزہ بہار ہے ۴۱۴ے پھر تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۱۹۷ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّھُمْ

اور وہ کیسی بری آرام گاہ ہے۔ البتہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ذرا اسے بھی یاد کر لیا جائے کہ دونوں جنسوں کے درمیان اشتراکِ انسانیت کی یہ تعلیم بیسویں صدی عیسوی میں نہیں ساتویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مل رہی ہے، جبکہ فرنگستان اور ہندوستان دونوں میں عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود مرادف تھا گندگی اور ناپاکی کے، اس تعلیم کی پوری قدر تاریخ کے اس استحضار کے بعد ہی ہوگی۔

مِنْ ذَکَرٍ میں مِنْ تاکید کے لئے ہے۔

دخلت من للتاکید (قرطبی) بیان لعامل، وتاکید لعمومه۔ (روح)

۴۱۱ے (اور یہ کفارۂ سیئات والا انعام علاوہ اُس اجر کے ہوگا جو انھیں اپنے اعمالِ شاقہ اور حسنات پر ملے گا)

الذین ھاجروا..... وقتلوا۔ یہ ذکر ہو رہا ہے حضورؐ کے رفیقوں اور صحابیوں کی جاں نثاریوں کا، اور بیان میں چند اعمال کا جو نام لے کر ذکر کیا گیا ہے یہ بطور مثال و نمونہ کے ہے، فہرستِ حسنات کے چند مہمات عنوان لا کر گویا بتا دیا کہ انہی پر سارے اعمالِ حسنہ کا قیاس کر لیا جائے۔ اس سے اُن حسنات کا حصر مقصود نہیں کہ یہی چند اعمال کفارے کا کام دے سکیں گے۔

لاکفرن عنھم سیاتھم۔ اس تصریح سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ حضرات باوجود ان مرتبوں کے، یا وجود صحابی، مہاجر اور مظلوم فی سبیل اللہ اور غازی اور شہید ہوتے کے معصوم نہ ہوں گے لغزش و خطا سے ماوراء نہ ہوں گے، صاحبِ سیئات ہوں گے، عام بشری لغزشوں کے یہ بھی مرتکب ہوں گے البتہ فضلِ خداوندی ان کے حسنات کو ان کے سیئات پر کہیں غالب رکھے گا ــــ آج جو ہر "شیخ" اور ہر "بزرگ" کو عملاً تقدس مآب و معصوم اور بشریت سے ماوراء سمجھا جانے لگا ہے، اس عقیدۂ فاسد کی تردید قرآن مجید قدم قدم پر کر رہا ہے۔

۴۱۲ے صیغہ حصر کا وارد ہوا ہے یعنی یہ بہترین و برترین نعمت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں۔

ای یختص به ولا یقدر علیه غیره (مدارک) ای یختص به وبقدرته وفضله لا یثیبه غیره ولا یقدر علیه (کشاف)

۴۱۳ے یعنی اے مخاطب! اہلِ کفر کا حظوظِ دنیوی سے بہرہ ور ہونا، مادی نعمتوں کا حصہ دار ہونا کہیں تجھے اس دھوکے میں نہ ڈال دے کہ ان کی حالت بھی قابلِ وقعت اور مستحقِ احترام ہے ـــــ یہ دھوکا بھی کتنا عام ہے اور آج دنیا کتنا زیادہ

لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا

ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے (یہ تو) مہمانی (ہو گی)

مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَھْلِ

الثلثین

اللہ کی طرف سے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکوں کے حق میں کہیں بہتر ہے ۴۱۵ اور اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی

الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ

ضرور ہیں جو اللہ پر اور تم پر جو کچھ اتارا گیا ہے اور جو کچھ اُن پر اتارا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اللہ سے

خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ

ڈرنے والے ہیں، اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے ۴۱۶

اس دھوکے میں پڑی ہوئی اور اس فریب پر مٹی ہوئی ہے۔

الخطاب لکل احد (مدارک) ھذا الخطاب لکل من سمعہ من المکلفین کانہ قیل لا یغرنک ایھا السامع۔ (کبیر)

۴۱۴ آخرت کی ابدی نعمتوں اور سرفرازیوں سے ان حظوظِ دُنیوی کو نسبت ہی کیا؟

حدیث نبوی میں آیا ہے کہ دنیا کو آخرت کے مقابلہ میں کوئی سمجھنا چاہے تو موجیں مارتے ہوئے سمندر میں انگلی کی نوک ڈالے اور نکال لے اور پھر دیکھے کہ کتنا پانی اس میں آیا ہے ـــــ دُنیوی لذّتوں کی بے حقیقتی، بے ثباتی، بے قدری کا سبق قرآن مجید نے قدم قدم پر دیا ہے اور اس کا استحضار اگر رہے تو کسی معصیت کے سرزد ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

متاع کے لفظ میں خود ہی عارضی اور زود فنا ہونے کا تصوّر آگیا۔ اس کی تاکید در تاکید صفتِ "قلیل" لا کر کر دی گئی۔

۴۱۵ (ہر دُنیوی لذّت و نعمت سے، کیا کیفیت میں، کیا کمیّت میں، کیا پائیداری میں، غرض ہر اعتبار و ہر حیثیت سے)

وماعند اللہ۔ یعنی اُخروی نعمتوں کی قسموں میں سے۔

ای من الأمور المذکورۃ الدائمۃ لکثرتہ ودوامہ۔ (روح)

اتّقوا ربّھم۔ اور اس تقویٰ الٰہی کی پہلی منزل قبولِ اسلام ہے۔

نُزُلًا مّن عند اللہ۔ اللہ نے اہلِ جنت کو اپنا "مہمان" ٹھہرا کر ان کا مرتبۂ اعزاز و اکرام جس حد تک اونچا کر دیا ہے، الفاظ ان کے ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

النّزل ما یھیّأ للضّیف (کبیر)

۴۱۶ یعنی کسی بھی مصلحت و منفعت کے خیال سے اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف، ترمیم، تصحیف، تلبیس گوارا نہیں کرتے۔

ثمنًا قلیلًا پر حاشیے اوپر گزر چکے، ہر دُنیوی معاوضہ بڑا ہو یا چھوٹا، آخرت کے مقابلہ میں بالکل حقیر ہی قیمت کا کہا جائیگا۔

یؤمن باللہ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر ان کا ایمان پورے توحیدی رنگ میں ہے اس میں شرک کی آمیزش نہیں۔

ما انزل الیکم۔ خطاب مؤمنین سے ہے یعنی قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ مدح جیسا کہ ظاہر ہے ان اہلِ کتاب کی ہو رہی ہے جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی اور اسلام قبول کر لیا۔

أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾ يَا أَيُّهَا

انھیں ان کا اجران کے پروردگار کے پاس ضرور ملے گا، بے شک اللہ حساب بہت جلد لے لینا ہے۔ ۴۱۷ اے ایمان والو!

الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾ ع ۲۰ / ۱۱

(خود) صبر کرو اور مقابلے میں صبر کرتے رہو، اور مقابلہ کے لئے مستعد رہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو عجب نہیں جو فلاح پا جاؤ ۴۱۸۔

۴۱۷ (سو وہاں کسی کو انتظار کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑے گی) حشر کے مجمع عظیم کو دنیوی مجمعوں کی چپقلش اور دنیوی عدالتوں کی تعویق اور تاخیر پر ہرگز قیاس نہ کیا جائے دم بھر میں وہاں سب کے حساب چک جائیں گے ــــ اور نافرمانوں کو جو وہاں امتدادِ وقت کی تکلیف ہوگی، وہ بطور عذاب ہوگی۔

۴۱۸ آیت میں جامع و مانع ہدایتِ فلاح ساری امت کے لئے آگئی، کیا انفرادی و شخصی، اور کیا اجتماعی و ملی۔

اصْبِرُوا۔ یعنی جو صعوبتیں راہِ حق میں از خود پیش آئیں، ان پر صبر کئے جاؤ۔ خواہ اس صبر کا تعلق مشقت و تعبِ عبادات سے ہو، خواہ نفس کی مرغوب و محبوب خواہشوں کے ضبط سے۔

ای علی مشاق الطاعات وما یصیبکم من الشدائد (بیضاوی) ای الصبر بالطاعات وعن الشهوات (قرطبی) قال الحسن وقتادة وابن جریج والضحاك اصبروا علی طاعة الله (جصاص)

صَابِرُوا۔ یعنی جو مصیبتیں مخالفین و معاندین کے ہاتھوں پیش آئیں، انھیں بھی برداشت کرو۔

ای غالبوا اعداء الله بالصبر علی شدائد الحرب (بیضاوی)

رَابِطُوا۔ یعنی خارجی دشمنوں اور اپنے اندرونی دشمن (نفس) دونوں سے مقابلہ کے لئے مستعد رہو۔

الرباط حمل النفس علی النیة الحسنة والجسم علی فعل الطاعة ومن اعظمه ارتباط الخیل فی سبیل الله وارتباط النفس علی الصلوٰة (ابن العربی)

مرابطہ۔ کے معنی دشمنوں سے مقابلہ کی تیاری (مبارزۃ الاعداء) کے ہیں۔ اور اس تحت میں ہر قسم کی جنگی تیاریاں آجاتی ہیں۔ جو عصر جدید کے تقاضوں کے تحت دشمنانِ دین کے مقابلہ میں کی جائیں۔

فیدخل فی ذالك مبارزتهم فی هذا العصر بعمل البنادق والمدافع والسفن البحریة والبریة والهوائیة وغیر ذالك من الفنون والعدد العسکریة ویتوقف ذالك کله علی البراعة فی العلوم الریاضیة والطبیعیة فهی واجبة علی المسلمین فی هذا العصر (المنار) متربصین بالغزو مستعدین له بالغین فی ذالك المبلغ الأوفی اکثر من اعدائکم (روح)

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ صبر یا مصابرہ یا مرابطہ سب کا اصلی مصدر اور آخری ماخذ تقویٰ الٰہی ہے آخر میں اسی کی تاکید ہے اور اسی کا نتیجہ دنیا و عقبیٰ میں فلاح ہے۔

ولابد للانسان فی کل فعل یفعله من داعیة وغرض فیجب ان یکون للانسان فی هذه المجاهدة غرض وباعث وذالك هو تقوی الله لنیل الفلاح والنجاح (کبیر) فاخبر سبحانه ان ملاك ذالك کله التقوی وان الفلاح موقوف علیها (ابن القیم)

اب جن لوگوں نے تحملِ شدائد و مصائب کا آخری مقصود و غایت، حبِّ وطن وغیرہ کسی چیز کو بجز رضائے الٰہی کے بنا رکھا ہے وہ اپنے حال پر ذرا ایک بار غور فرمائیں۔

# ضمیمہ

## سورۃ آل عمران، آیت ۱۴۴ حاشیہ ۲۸۲

[راقم عاصم کے ایک قدیم اور جوانمرگ دوست مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی مرحوم کا ایک مستقل مقالہ اسم پاک "محمدؐ" پر ہے۔ اس مقالہ کا بیشتر حصہ قارئین کے استفادہ کے لئے یہاں بطور ضمیمہ پیش ہے۔]

## اسم پاکؐ "محمدؐ"

حضورؐ کا نام نامی آپ کے دادا "عبدالمطلب" نے رکھا تھا۔ عام طور پر اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ رجاء ان یحمد عبدالمطلب نے آثار نیک دیکھ کر محمدؐ نام رکھا کہ مستقبل میں یہ مولود سید آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم مجموعۂ محامد اور مرجع خلائق بنے۔ ارباب تصوف موشگافی کی انتہا کر دیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ یہ لفظ "محمدؐ" خدا کے نام "احد" سے مشتق ہے۔

اگرچہ عام طور پر نام کی صرف اس قدر ضرورت سمجھی جاتی ہے کہ چند چیزوں میں باہم امتیاز قائم رہے لیکن نام کی صحیح اور حقیقی غرض یہ نہیں۔ اسم کو اپنے مسمّٰی کے صفات خواص اور حالات کا آئینہ ہونا چاہئے۔ افراد کے نام رکھنے میں تو اس کا کم لحاظ کیا جاتا ہے لیکن عموماً انواع واجناس کے نام اسی مقصد کو پورا کرتے ہیں مثلاً انسان بلکہ توم شاذ و نادر طریقہ پر افراد واشخاص کے ناموں میں بھی اس کا لحاظ کر لیا جاتا ہے جیسے "مسیح" اور "بدھ" یہ دونوں نام اپنے مسمّٰی کے اوصاف اور خواص کو بتلاتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جیسا کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ سے پہلے عرب میں کہیں اس نام کا پتہ نہیں چلتا مؤرخین اکثر لکھتے ہیں۔ ولم یکن شائعاً بین العرب ھذا الاسم اس حالت کو تسلیم کرتے ہوئے دیکھا جائے تو اتفاقی طور سے "نام مبارک" کا "عبدالمطلب" کے ذہن میں آنا منشاء خداوندی معلوم ہوتا ہے کہ جب اس نام کا محل کامل دنیا کو اپنے وجود گرامی سے مشرّف کر چکا تو پھر اسم بھی فطری طور سے نام رکھنے والے کے ذہن میں وارد ہوا۔

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہی کیا جاتا ہے کہ "وہ ذات جس کی تعریف کی گئی" اس ترجمہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن اس جامعیت کبری، برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل وکمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں۔ دنیا کے تمام حکیم فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح وتائش ہیں اس لئے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے نقص کو اور زیادہ وسعت دیں صاحب مفردات "محمدؐ" کے معنی لکھتے ہیں: الذی اجمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لفظ محمدؐ کے معنی مجموعۂ خوبی کے ہیں۔

ع اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

کارساز قدرت کی وسعت لامحدود اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی خلقت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے وا ہے۔ غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لئے ایک معیار مقرر کیا ہے مخلوقات

کی ہر نوع کا ایک درجۂ کمال ہے کہ جس کے آگے اُس کا قدم نہیں بڑھتا۔ حیوانات، "نباتات" اور جمادات تک میں اس کے نشواہد مل سکتے ہیں، صورتیں ایک ہیں شکلیں متحد ہیں، اوصاف مختلف ہیں، لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں، ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہوتے ہیں، ہم مقصود فطرت اور نقطۂ تخلیق کہہ سکتے ہیں ——————— اس نقطۂ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہئے یہ بات تھوڑے غور و فکر سے بہ آسانی سمجھ میں آ سکتی ہے تفحص اور تفتیش کے بعد تمام انواع مخلوقات کے اوصاف کا ایک درجۂ اعلیٰ پاتے ہیں کہ جس کے آگے انسانی معلومات میں کوئی درجہ نہیں۔

دوسرے تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے، دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سیکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و شباہت اس کے اعضاء و جوارح اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے، سب چیزیں وہی ہیں جو دنیا کے پہلے انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال اُن سے جداگانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اب اگر انسان کی اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ادیوں، زبانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی معلوم ہو سکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، لغات قاموس نے لفظ "حمد" کے ایک معنی قضاءُ الحق کے بھی بتلائے ہیں، پس لفظ "محمد" کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی قدرت کی جانب سے نوعِ انسان کو جس سرحدِ کمال تک پہنچنا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حقِ تخلیق مقرر تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا۔ علم و عمل خَلق و خُلق، دماغ و کیرکٹر ارتقائے ذہنی و ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لُبّ لباب ہیں، اوّل ثانی کے لئے بنیاد ہے عمل علم پر کیرکٹر دماغ پر، خُلق خَلق پر قائم ہے، یہ ایک عجیب نکتہ ہے جس کی تشریح کسی دوسرے مقام پر آئے گی کہ جتنی ہی کسی انسان کی حالت مکمل ہو گی اسی قدر اس کی خُلقی کیفیت راسخ و مستحکم ہو گی ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے، تاریخی طور پر یہ امر ثابت ہے کہ کیرکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت صلعم کی ذات مبارک نے پیش کیا عالمِ انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتیٰ کہ خود دشمنوں کے اقرار سے اس کو قرار دیا گیا۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ۔ محاوراتِ عرب سے حمد کے یہ بھی معنی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا جیسا میں نیزہ کے بھرپور پڑنے کے وقت حَمِدتُ بلاءہٗ (میں نے وار پورا کیا) کا محاورہ بہت مشہور ہے۔ اس معنی کو سامنے رکھتے ہوئے اور اوپر کے مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معنی مخلوق کامل کے بھی ہیں۔

منجملہ دیگر کمالاتِ نبوت و معجزاتِ رسالت کے ایک معجزہ گرامی حضور اقدس کا نامِ نامی بھی ہے۔ یہ زندۂ جاوید معجزہ بعثت کے وقت سے تا ہنوز اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحبِ قاموس نے لکھا ہے کہ محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ، جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جاتا ہے اور انسان اپنی سعی و کوشش کے مطابق جس درجہ ترقی کرتا جاتا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعۃً رسالت مآب روحی فداہ صلعم کے کمالات سے پردہ اٹھتا جاتا ہے۔ علماء و فضلاء یورپ کی اکثریت تاریخ اسلام کے ماتحت

اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جاتی ہے، دنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی ضرورت جتنی ہی اُن کے نزدیک بڑھتی جاتی ہے، بادلِ ناخواستہ انہیں اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور زبانِ اعتراف کھولنا پڑتا ہے کہ بے شبہ پیغمبرِ عرب کے قانون دنیا کی ضرورتوں کے کفیل اور ان کی زندگی عالمِ انسان کے لئے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہلِ ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے اسی قدر وہ پیغمبرِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، یہ دنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو برس پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے مستقبل میں دنیا کی عمر جس قدر دراز ہوگی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر امید نہیں اور خواہ اپنے پچھلے سبق دہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالاتِ نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا اس حیثیت سے نام مبارک محمد صلعم کا ترجمہ سلسلۂ اوصاف و محامد ہوگا۔

جیسا اوپر کہا گیا ہے عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام زندگی کا آئینہ اور اس کے تبصرۂ حیات کی تفصیل ہو۔ مگر نامِ نامی آقائے نامدار اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام کے رکھنے کے متعلق حضرت عبدالمطلب کو ایک غیبی تحریک ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ آنحضرت صلعم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دشمن کی یکساں تنقید، حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم و عمل، ظاہر و باطن خُلق و خَلق ہر حیثیت سے حضورؐ کی زندگی قابلِ تعریف تھی اور اسی خلاصۂ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

اس سے بھی زیادہ عجیب امر یہ ہے کہ نام مبارک حضورؐ کے نہ صرف نبی بلکہ خاتم النبیین ہونے کی دلیل بھی ہے۔ کمال و کمالِ اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں، دوسرے انبیاء علیہم السلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضورؐ کی جامعیت آپؐ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ لفظ "محمد" کے معنیٰ "مجموعۂ خوبی" اور "مخلوق کامل" کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس کے آگے کوئی نقطہ ہی نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمالِ کلّی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار ہا تنقیص اعترافِ کمال پر مجبور ہوئے ہیں۔ سر ولیم میور اور مارگولیتھ جیسے سخت لوگوں کو بھی کھلے اور چھپے لفظوں میں اس کا اقرار کرنا پڑا کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم انتہائی سچائی اور حقیقی صداقت پر مبنی نظر آتی ہے۔ عہدِ نبوت میں بھی اسی قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں کہ بعض سخت ترین منکر ایک توجہ نظرِ اقدس کی تاب نہ لاسکے۔ عبداللہ بن سلام جو نامور علماءِ یہود میں سے تھے وہ جس طرح اسلام لائے معلوم ہے بعثت کے حالات سیرتِ طیبہ، تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک میں بیان کیا گیا لفظ "محمد" عربی زبان میں تحمید سے مشتق ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے اس باب کے معنی کے خواص میں سے ہے کہ کسی کام کا وجود میں آنا اس طور پر مانا جائے کہ گویا کسی مخفی یا ظاہر طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لئے مجبور کیا جیسے صرّف (پھیر دیا)۔ یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کرکے پھیر دیا اسی طرح "محمد" کے معنی ہیں وہ جس کی تعریف بے اختیار کی گئی ہو۔ اس معنیٰ سے اسی قوتِ جاذبہ اور کششِ اصلی کی طرف اشارہ ہے۔ عبداللہ بن سلام کے متعلق مروی ہے کہ وہ چہرۂ اقدس کو دیکھتے ہی پکار اُٹھے

ھذا الیس نبیہ کہ اب یورپ میں بڑی ہوشیارانہ تدبیر سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدترین پیرایوں میں دکھلانے کی کوششیں کی گئی ہیں لیکن اب آج کل بعض جماعتوں اور خدا ترس بندوں کی طرف سے جو مساعی جمیلہ کی جارہی ہیں انھوں نے تجربہ کرادیا کہ جب کبھی اصل صورت ان کے سامنے پیش کی گئی ہے تو انھوں نے یہی کہا کہ یہی تو ہمارا گم گشتہ مقصود ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کے اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصاء کئے ہوئے ہے کوئی جزو اس سے چھوٹا ہوا نہیں استعمال میں آتا ہے قُتِّلُوا تَقْتِيلًا یعنی خوب خوب قتل کیا اس خاصیت کا لحاظ رکھتے ہوئے نام مبارک کے یہ معنی معلوم ہوتے ہیں کہ "محمد" یعنی جس کا جزء جزء قابل تعریف ہے "اصلاح نفس" "تدبیر منزل اور تدبیر مدن کی وہ کونسی شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلعم نے پیش نہیں کردیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد و نہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالم انسان کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جائے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھنے سے موسویانہ سختی مسیحانہ اخلاق ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آجائے۔ اور پھر ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی جامع اور برزخ کامل ذات پاک حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسی لئے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ "احمد" فرمایا یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہوگا۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب نے اپنی کامل نشو و نما جب ہی پائی ہے جب وہ معرفت و روحانیت کی آغوش سے نکل کر سلطنت اور حکومت کی گود میں چلے گئے ہیں مسیحی مذہب کی ترقی رومی بادشاہوں کی رہین احسان ہے۔ بودھ نے بہت کچھ تبلیغ کی لیکن اس کا عالمگیر مذہب بھی اسی وقت اپنی تکمیل کرسکا جب وہ اشوک خاندان کی سرپرستی میں آگیا لیکن اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے وہ جن جن ملکوں میں گیا اور جن جن جماعتوں میں پھیلا اخلاق و روحانیت سے گیا غریب تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی نظیریں اس بارہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خاص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کردیا گیا ہے۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ. بظاہر اسباب ان مفاسد کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی لیکن فطرت کی تدبیریں اندر اندر جاری رہتی ہیں اور ایک وقت معین پر ظاہر ہوجاتی ہیں فطرت کی رفتار ہوا کی طرح تیز اور سیلاب کی طرح نرم ہوتی ہے۔ خوش تدبیری اور حسن اسلوب کے موقع پر بھی حمد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، پس لفظ "محمد" کے ایک یہ بھی معنی قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش تدبیری نے ترقی کی آپ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی سُرعت اور بغیر جد و جہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دنیا متحیر ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے' ایک طرف وہ اپنے مسمّٰی کے کام اور کام کے انجام کی پیشین گوئی ہے' دوسری طرف اُس کے کاموں کی تاریخ اور اس کی تعلیم کا لُبّ لباب ہے۔

پاک ہے وہ اللہ جس نے اپنے نبی کا ایسا پاک نام رکھا، اور پاکیزہ ہے وہ نبی جسے اس کے معبود نے ایسی فضیلتوں سے آراستہ کیا۔

وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

(۴)

# سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ

رکوعاتہا ۲۴ | آیاتہا ۱۷٦

سورۂ نساء۔ مدنی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحمت کرنے والے کے نام سے

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

اے لوگو اپنے پروردگار سے تقوی اختیار کرو جس نے تم (سب) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ۱ؔ

۱ؔ یعنی ابوالبشر حضرت آدمؑ سے۔

وحدتِ نوعِ انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دور رس نتائج کے لحاظ سے نہایت اہم ہے آخری جدِ اعلیٰ گورے اور ہر کالے کے، ہر وحشی اور ہر مہذب کے، ہر ہندی اور ہر چینی کے، ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں، اور وہ آدمؑ ہیں، یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورثِ اعلیٰ کوئی اور تھے، اور فلاں نسل کے کوئی اور، اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے مُنہ سے پیدا ہوئے اور چھتری نسل والے ان کے سینے سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شودر ذات والے اُن کی ٹانگوں سے نہیں، بلکہ اصلاً انسان انسان سب ایک ہیں۔

خَلَقَكُمْ۔ مسئلۂ ارتقاء کس حد تک کس معنی میں صحیح ہے، قرآن مجید کو اس سے مطلق سروکار نہیں، انسان بہرحال وبہرصورت خلق ضرور ہوا ہے، قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کر رہا ہے، اور ہر اس نظریہ و عقیدہ کی تردید کر رہا ہے جو انسان کی "تخلیق" کے منافی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ خطاب ساری نوعِ انسانی سے ہے، خواہ کوئی کسی نسل کسی ہی رنگ کسی ہی قوم کسی ہی جنس کسی ملک کا ہو، ایمان اور ایک درجہ میں تقوی کے مکلف سب ہیں — قرآن کا پیام سارے ہی بنی آدم کے لئے ہے، جن مفسرین نے اسے اہلِ مکہ کے لئے خاص سمجھا ہے، ان کے پاس اس تخصیص کی کوئی دلیل نہیں خصوصاً جبکہ سورت مکی ہے بھی نہیں بلکہ بالاتفاق مدنی ہے، اور لفظ ناس ہے بھی نوعِ بشر کے لئے۔

خطاب عام ليس خاصًا بقوم دون قوم فلا وجه لتخصيصها باهل مكة.... ولفظ الناس اسم لجنس البشر. (المنار)

اتَّقُوْا رَبَّكُمْ۔ پروردگار سے ڈرنا، اُس کے احکام کی مخالفت سے ڈرنا ہے، ورنہ پروردگار عالم بجائے خود کوئی خوف کھانے والی چیز نہیں، وہ تو تمام تر محبت اور عظمت والی ہستی ہے، لفظ رب میں خود یہ اشارہ موجود ہے کہ جن احکام کی مخالفت سے ڈرایا اور روکا جا رہا ہے، خود ان کی غایت بھی بندے کی ربوبیت اور پرورش ہی ہے۔

## وَّخَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ۚ

اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا ۲ اور ان دونوں سے بہ کثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے ۳

۲ یعنی حضرت حوّا کو۔

تخلیقِ حوّا کی تفصیلی کیفیت سے قرآن مجید تو یکسر ساکت ہے، اور تقریباً یہی حال حدیث کا بھی ہے۔ جس مشہور حدیث کی رُو سے حضرت حوّا کا حضرت آدمؑ کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے، اس میں ذکر نہ حضرت آدمؑ کا ہے نہ حضرت حوّا کا، بلکہ محض عورت کی پیدائش اور اس کی کج سرشتی کا بیان ہے۔

آثار میں جو روایت ملتی ہے، وہ روایت توریت کی آواز باز گشت ہے، اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے:

"خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا، اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا" (پیدائش ۲: ۲۲، ۲۳)

منها۔ ضمیر ھا عموماً نفس کی طرف پھیری گئی ہے، لیکن ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ منها یہاں من جنسها کے مراد میں ہے۔

القول الثانی ما ھو اختیار ابی مسلم الاصفھانی ان المراد من قوله وخلق منها زوجها ای من جنسها (کبیر) ویحتمل ان یکون المعنی من جنسه لا من نفسه حقیقةً۔ (نہر)

اور یہی قول علاوہ ابو مسلم کے ابن بحر سے بھی منقول ہوا ہے۔

وقیل ھو علی حذف مضافٍ التقدیر وخلق من جنسها زوجها قاله ابن بحر وابو مسلم (بحر)

اور نفس کو جنس کے معنی میں قرآن مجید میں بار بار لایا گیا ہے، جیسا کہ صاحب المنار نے تصریح کے ساتھ اپنے ہاں نقل کر دیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے محض بطور تشبیہ کے ارشاد فرمائی گئی ہو اور مقصود محض اس کے عدمِ ثبات کو ظاہر کرنا ہو جیسا کہ قرآن مجید ہی میں ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی سے ہوئی ہے۔

یحتمل ان یکون ذالک علی جهة التمثیل لاضطراب اخلاقهن وکونهن لا یثبتن علی حالة واحدة کما جاء خلق الانسان من عجل (بحر)

اور اس معنی کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ حدیث میں ذکر جنس عورت کا ہے نہ کہ شخصاً حضرت حوّا کا۔

ویؤید ھذہ التاویل قوله ان المرأة فاتی بالجنس ولم یقل ان حوّاء (بحر)

اور بعض شارحین حدیث مثلاً کرمانی حدیث مذکور کی شرح میں اسی طرف گئے ہیں کہ یہ فطرتِ نسوانی کی کجی کی طرف صرف استعارہ ہے۔

استعارة للمعوج ای خلقهن خلقا فیه اعوجاج (مجمع بحار الانوار جلد ۲ ص ۲۹۴) وقد حمل العوج بعض العلماء علی المجاز والمعنی ان العوج ھو المیل عن الاعتدال وحب الشذ وذھو شان المرأة (حاشیۂ تفسیر ابن کثیر مطبوعہ مصر)

بخاری کی ایک حدیث میں تو بالکل صاف ہے کہ عورت مثل پسلی کے ہے۔

عن ابی ھریرةؓ ان رسول اللّٰه صلعم قال المرأة کالضلع ان اقمتها کسرتها (صحیح بخاری۔ کتاب النکاح)

اور یہی حدیث مسلم نے بھی (کتاب الرضاع میں) حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی سند سے نقل کی ہے۔

خود ضلع کا مفہوم پسلی کا تو ثانوی ہے، اصل معنی کجی و انحراف ہی کے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ

اور اللہ سے تقویٰ اختیار کرو جس کے واسطہ سے ایک دوسرے سے مانگتے ہو۔ اور قرابتوں کے باب میں بھی تقویٰ اختیار کرو ۔ بے شک اللہ

رَقِیْبًا ① وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ

تمہارے اوپر نگراں ہے اور یتیموں کو ان کا مال پہنچا دو اور پاکیزہ کو گندی (چیز) سے مت تبدیل کرو

وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ②

اور ان کا مال مت کھاؤ اپنے مال کے ساتھ بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے

الضلع المیل (کتاب لفائق۔ زمخشری) الضلع الاعوجاج ای الزیغ حتی یمیل صاحبہ عن الاستواء والاعتدال (نہایہ)

۳ دونوں جنسیں اسی ایک جوڑے یعنی حضرت آدمؑ و حضرت حواؑ سے دنیا میں چلی ہیں۔

منھما۔ خیال رہے کہ یہ ساری انسانی آبادی جو چلی ہے تنہا آدمؑ سے نہیں اس جوڑے سے مل کر چلی ہے۔

کثیرًا۔ آدمؑ کے وقت سے لے کر اب تک جو آبادی ہر ملک اور ہر زمانہ کی رہی ہے یا جو قیامت تک ہوگی اس کے مجموعہ پر بھی اگر کثیر کا اطلاق نہ ہوگا تو اور کس پر ہوگا؟

۴ (اپنے حقوق اور مراعات)

قال الزجاج تطلبون بہ حقوقکم (بحر)

بہٖ یعنی اس کے نام کا واسطہ دلا دلا کر۔ آیت سے اللہ کے واسطہ سے مانگنے کا جواز نکل آیا۔

وفی الآیۃ دلالۃ علی جواز المسئلۃ باللّٰہ تعالیٰ۔ (جصاص)

۵ (اور اس حکم کو ہلکا نہ سمجھو)

الارحام۔ رحم کی جمع ہے اور اس کا اطلاق بڑا وسیع ہے سارے عزیز و قریب اہلِ خاندان اس کے اندر آجاتے ہیں۔

الرحم اسم لکافۃ الاقارب من غیر فرق بین المحرم وغیرہ (قرطبی) من المجاز الرحم القرابۃ وبینھما رحم ای قرابۃ قریبۃ (تاج)

الارحام۔ کا عطف آیت میں خوب غور کر لیا جائے، اللہ پر ہے۔۔۔ یہ ہے قرابت یا رشتہ داری کی اہمیت اسلام میں! درحقیقت امت کے نظامِ اجتماعی کا سنگ بنیاد ہے، شریعت نے قرابت یا رحم ہی کو قرار دیا ہے، عزیزوں، قریبوں، خاندان اور برادری والوں کے ساتھ حسنِ سلوک اسلام میں کوئی دوسرے درجہ کی چیز نہیں اوّل درجہ کی اہمیت رکھنے والی ہے۔

وفی عطف الارحام علی اسم اللّٰہ دلالۃ علی عظم ذنب قطع الرحم (بحر) وقد نبہ سبحانہ تعالیٰ اذ قرن الارحام باسمہ الکریم علی ان صلتھا بمکان منہ (بیضاوی) فیہ تعظیم لحق الرحم وتاکید للنھی عن قطعھا (جصاص)

اور اسی معنی میں یہ حدیث بھی آئی ہے۔

الرحم معلقۃ بالعرش تقول الا من وصلنی وصلہ اللّٰہ ومن قطعنی قطعہ اللّٰہ۔

(رحم بھی عرشِ الٰہی سے معلق دعا کرتا رہتا ہے کہ جو مجھے جوڑے رکھے اللہ اسے جوڑے رہے اور جو مجھے کاٹے اللہ اسے کاٹے)

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے باب میں انصاف نہ کر سکو گے ؁ تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ؁

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ قرابت کا لحاظ واجب ہے اور اسے قطع کرنا جرم ہے۔

اتفقت الملۃ علی ان صلۃ الرحم واجبۃ وان قطیعتہا محرمۃ (قرطبی)

۶ (تمہارے ذاتی، خانگی، اجتماعی سارے ہی معاملات میں)
اگر اس کا استحضار رہے تو آج افرادِ اُمت کی خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں!

۷ یتیم یعنی بن باپ کے بچوں اور بچیوں کا مسئلہ ہر قوم میں اہم و نازک رہا ہے۔ قرآن اب یہاں اسی باب میں ہدایتیں دے رہا ہے۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَھُمْ یعنی ان یتیموں کے بالغ ہونے پر ان کی جائداد، ان کا سامان، ان کے حوالہ کر دو،

اور اس کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ یتیم اپنی جائداد کا مطالبہ کرے بھی۔

وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی وجوب تسلیم اموال الیتٰمٰی بعد البلوغ وایناس الرشد الیھم وان لم یطالبوا بادائھا (جصاص)

خطاب یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے ہے۔ یتیموں کے سپرد ان کی جائداد ان کے بالغ اور سمجھدار ہو جانے کے بعد ہی کرنا چاہئے۔ اس سے قبل نہیں۔

ان الیتیم لا یجب اعطاءہ مالہ قبل البلوغ (جصاص) انما یجب الدفع الیھم بعد البلوغ وایناس الرشد (جصاص)

وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ یعنی ایسا نہ ہونے پائے کہ ان نابالغ یتیموں کی اچھی چیز نکال کر اپنے مال میں ملالی اور اپنی طرف کی کوئی گھٹیا چیز ان کے حصہ میں شامل کر دی۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَھُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِكُمْ یعنی اپنے حصہ کے ساتھ یتیموں کے حصہ کو بھی خلط ملط کر کے۔

ای لا تاکلوھا مضمومۃ الی اموالکم (بیضاوی) الی اموالکم ای مع اموالکم (بحر)

لَا تَاْكُلُوْٓا یہاں اکل سے مراد "کھانا" لفظی معنی میں نہیں، بلکہ اپنے تصرف میں لانا، وسیع معنی میں ہے۔

وعُبّر بالاکل بانفاق المال (راغب) اراد بہ جمیع التصرفات المہلکۃ للمال (معالم) لیس المراد نفس الاکل .... عُبّر عن التصرفات بالاکل (قرطبی)

"اردو محاورہ میں کھانا علاوہ اپنے لفظی معنی کے مجازی معنی میں بھی مستعمل ہے مثلاً دو روپیہ کھا گیا"۔

اِنَّهٗ ضمیر اسی دست درازی اور یتیموں کے مال میں گڑبڑ کرنے کی طرف ہے۔

ای الاکل (قرطبی)

حُوْبًا حوب کے معنی بڑے گناہ کے ہیں۔

ای ذنبا عظیما (کشاف) الحوب الاثم الکبیر (کبیر)

ڈاکٹر رابرٹ رابرٹس مسلم نہیں، مستشرق ہیں۔ اس پر بھی اس کے قائل ہیں کہ قرآن اور پیمبر نے یتیموں کے حقوق کے تحفظ کا بہترین انتظام کر دیا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۸ یعنی جو یتیم لڑکیاں تمہاری نگرانی و سرپرستی میں ہیں ان کے حقوق مہر وغیرہ پوری طرح ادا نہ کر سکو گے۔

مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ

ان میں سے دو دو تین تین، چار چار سے تو نکاح کر ہی سکتے ہو ۱۰

خطاب یتیم لڑکیوں کے سرپرستوں سے ہے، جاہلیت میں ایک دستور یہ تھا کہ یتیم لڑکیاں جو مردوں کی سرپرستی میں ہوتیں تو ان کے وہی سرپرست اکثر یہ دیکھ کر کہ کوئی اور ان کی طرف سے مہر وغیرہ کا مطالبہ کرنے والا اور ان کی حمایت پر کھڑا ہونے والا ہے نہیں، ان کے حقوق مار لینا آسان ہے، انہی کو اپنے نکاح میں لے لیتے، ان کی جائداد اپنی طرف منتقل کر لیتے، اور اور طرح سے ان کے ادائے حقوق کی طرف سے بے التفاتی برتتے، یہاں خطاب اصلاً ایسے ہی اولیاء اور سرپرستوں سے ہے۔

۹ (ان یتیم، صاحبِ جائداد، مگر بے حمایتی لڑکیوں کے علاوہ)

اے غیرھن (قرطبی) أمروا ان ینکحوا سواھن من النسآء (جصاص) من غیرھن (بیضاوی)

ما طاب لکم سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ حسن و جمال کے معیار سے بھی طبیعت کے مقتضی پر عمل کی پوری اجازت شریعت میں موجود ہے۔

واصل الطیب ما تستلذہ الحواس وما تستلذہ النفس (راغب) قیل ما مالت لہ نفوسکم (روح)

قیل ما استطابتہ النفس ومال الیہ القلب۔ (بحر)

ما۔ ما یہاں من کے معنی میں ہے، اور کلام عرب میں دونوں لفظ ایک دوسرے سے ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔

والعرب تضع من و ما کل واحدۃ موضع الاخریٰ (معالم)

اور خود قرآن مجید میں اس کے نظائر موجود ہیں۔ والسماء وما بنٰھا۔ وما رب العٰلمین او ما ملکت ایمانکم وغیرھا۔

اور یہاں بجائے من کے ما اس لئے آیا ہے کہ مقصود یہاں صفاتِ نساء کا ذکر ہے، یعنی جس قسم کی بھی عورتیں پسند ہوں، نہ کہ ان کی ذات یا شخصیت کا ذکر۔

النکتۃ فی اختیار ما علی من۔۔۔۔ وھی ارادۃ الوصف کانہ قال فانکحوا التی صنف من اصناف ھن (المنار)

چنانچہ جب کسی کی ذات یا شخصیت سے متعلق سوال مقصود ہوتا ہے تو پوچھتے ہیں۔ من ھذا الرجل؟

اور جب سوال اس کی صفات سے متعلق کرنا ہوتا ہے، تو کہتے ہیں۔ ما ھذا الرجل؟ (المنار)

من النسآء۔ اس میں بالغ نابالغ سب آگئیں۔

والصغار والکبار داخلاتٌ فیھن۔ (جصاص)

۱۰ یعنی تم پر نکاح کے باب میں کوئی تنگی نہیں، اپنی زیر نگرانی یتیم لڑکیوں کو زیر عقد لانے میں اتلافِ حقوق کا اندیشہ بھی ہو تو اس خیال کو جانے دو، اور بجائے ان کے باہر والی آزاد عورتوں میں سے اپنے حسب پسند انتخاب کر لو، ایک ہی کا نہیں، بلکہ ایک سے لے کر چار تک کی گنجائش ہے۔

مثنٰی و ثلٰث و رُبٰع۔ میں وعطف کا نہیں، تخییر کا ہے اور اَوْ کے مرادف ہے۔

وقد تخرج الواو عن افادۃ مطلق الجمع وذالک علیٰ اوجہ احدھا تکون بمعنی اَوْ (تاج)

چنانچہ یہاں اسی معنی میں ہے۔

والواو بمعنی اَوْ للتخییر (معالم) والواو بمعنی اَوْ فی ھذا الفعل (خازن)

آیت کے ان الفاظ سے بعض فرقوں نے کہا جاتا ہے کہ ۲ + ۳ + ۴ کے مجموعہ یعنی نو ازواج کا جواز نکالا ہے اور بعض نے بیزان ۱۸ تک پہنچا دی ہے بلکہ بعض نے تو بغیر قیدِ عدد کے نفسِ تعدد کا جواز نکالا ہے۔

وذهب بعض الشيعة الى انه يجوز النكاح بلا عدد..... وذهب بعضهم الى انه يجوز نكاح تسع..... وذهب بعضهم الى ان هذه الاعداد كونها عطفت بالواو تدل على جواز نكاح ثمانية عشر۔ (بحر)

بلکہ فقہ کی بعض کتابوں میں تو نو کا قول بعض مستند اکابر اہلِ سنت مثلاً امام ابن ابی لیلیٰ اور امام ابراہیم نخعیؒ کی جانب بھی منسوب دیکھا گیا ہے۔

وعن ابن ابي ليلى وابراهيم النخعيؒ وبعض الروافض انه يجوز الجمع بين تسع نسوة تمسكا بهذا النص (الكفاية على الهداية. كتاب النكاح فصل في بيان المحرمات) وقالت فرقة ان يجوز تسع (بداية المجتهد، كتاب النكاح فصل مانع العدد)

لیکن حدیثِ رسولؐ اور اجماعِ امت دونوں نے اس شبہ کو بالکل دور کر دیا ہے اور تعدادِ جواز وقتِ واحد میں چار تک محدود کر دی ہے۔

والكلام على هذه الاقوال اشد لا لاوابط الا مذكور في كتب الفقه الخلافية واجمع فقهاء الامصار على انه لا يجوز الزيادة على اربع (بحر) واعلم ان معتمد الفقهاء في اثبات الحصر على امرين الاول الخبر..... والطريق الثاني وهو اجماع فقهاء الامصار على انه لا يجوز الزيادة على الاربع وهذا هو المعتمد (كبير) واما الامران اللذان اعتمد عليهما الفقهاء في هذا المقام ففي غاية الاحكام..... واقوى الامرين المعتمد عليهما في الحصر الاجماع (روح) واتفق المسلمون على جواز نكاح اربعة من النساء..... واما ما فوق الاربع فان الجمهور على انه لا يجوز الخامسة (بداية المجتهد. كتاب النكاح فصل مانع العدد) وليس له ان يتزوج اكثر من ذلك..... والتنصيص على العدد يمنع الزيادة عليه (هدايه) والمراد هو التخيير بين هذه الاعداد لا الجمع (كفايه) اجمعت الامة على ان لا يجوز لاحد ان يجوز مزيد على اربع نسوة (معالم خازن)

اگر نو ہی کی تعداد منظور تھی تو صاف یہی کیوں نہ ارشاد ہو گیا، اس قدر گھوم پھیر کر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

یہ تعددِ ازدواج کی اجازت ہرگز کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کسی مسلمان کو شرمانے اور اس کی طرح طرح کی تاویلیں کرنے کی ضرورت محسوس ہو، مرد کے قویٰ اور اس کی جسمانی ساخت و ترکیب ہی اس نوعیت کی ہے کہ بہ کثرت مردوں میں ایک بیوی مرد کی طبعی خواہش کی تشفی کے لئے کافی نہیں ہوتی، مرد و عورت کے اتحاد و تناسل کا جہاں تک تعلق ہے مرد کا عمل چند منٹ کے اندر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد مرد پر جسمانی حیثیت سے کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی، برخلاف اس کے عورت کے لئے اس وقتی عمل کے نتائج کا سلسلہ دنوں اور ہفتوں نہیں حمل اور رضاعت کی مدت ملا کر ڈھائی ڈھائی سال بلکہ اس سے بھی آگے تک پھیلا ہوا رہتا ہے پھر زمانۂ حمل کے علاوہ بھی ہر جوان تندرست عورت کے لئے ہر مہینے ایک ایک ہفتہ کی معذوری ایک امرِ طبعی ہے اور وہ قانونی نظام کامل نہیں ناقص ہے جو مرد کی طبعی ضرورتوں کی طرف سے آنکھ بند کر لے اور عورت کی طبعی معذوریوں کا لحاظ کر کے مرد کے لئے کوئی سہولت جائز نہ رکھے پھر یورپ کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور ماہرینِ جنسیات کی شہادتیں اس عام تجربے اور مشاہدے کی تائید میں ہیں کہ نفس خواہشِ جنسی سے قطع نظر مرد کی شہوانی جبلت تنوع پسند بھی ہے اس لئے جو شریعت مرد کی اس جبلت کی کوئی رعایت اپنے نظام میں نہیں رکھتی وہ اور کچھ بھی ہو بہر حال خدائی اور مطابقِ فطرت نہیں کہی جا سکتی یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے پتہ دیتی ہے داعیانِ توحید و پیمبرانِ برحق نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اسے اور زیادہ قوت پہنچا دی ہے حضرت ابراہیمؑ،

# فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

اور اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو ۱۱۵ یا جو کنیز تمھاری مِلک میں ہو ۱۱۶

حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ میں سے کسی کے یہاں بھی یک زوجی روایت کی سند نہیں ملتی، بلکہ بعض کی حرم سرا تو مشہور ہی کثرتِ تعداد کے لئے ہے، ہند قدیم میں اکابر ہنود کی بابت بھی زوجی روائتیں حدرت کی نہیں تعددی کی ہیں، اور یورپ و امریکہ میں آج عقدِ نکاح کو درمیان میں لائے بغیر جو شہوانی اندھیر کھلے بندوں ہو رہا ہے اس کی نقل وحکایت کی بھی تاب ان صفحات میں نہیں۔۔۔ اسلام نے ایک طرف تو یک زوجی کی قید اڑا کر تعدد کو سندِ جواز دے دی، اور دوسری طرف اس کی مناسب حدبندیاں بھی کئی کئی طرح کردیں اور یہی اس کی حکمت کا کمال ہے۔

وان خفتم۔ اِن کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ جوازِ تعددِ ازواج کے لئے یتیم لڑکیوں کے ساتھ نا انصافی کا اندیشہ، بطور شرطِ لازم کے ہے، یکسر غلط فہمی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیاتِ احکام ایسی ہیں جو شروع اِن سے ہوتی ہیں، مگر یہ مراد نہیں ہوتی، اگر وہ شرط پوری نہ ہوئی تو حکم کا نفاذ بھی نہ ہوگا، مثلاً ایک آیت سورۃ النور کی ہے:۔

ولاتکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا۔ اپنی باندیوں کو زنا کرنے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاکدامن رہنا چاہتی ہیں اس کا یہ مطلب کون لے سکتا ہے کہ اگر باندیاں پاکدامن نہ رہنا چاہیں تو انھیں زناکاری پر مجبور کردو؟ اسی طرح ان تعذبھم فانھم عبادک (اگر تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں) کا یہ مطلب کون لے سکتا ہے، اگر تو انھیں عذاب نہ دے تو یہ تیرے بندے نہیں؟ علی ھذا فان جنحوا للسلم فاجنح لھا (اگر یہ لوگ صلح کے لئے جھکیں تو آپ بھی صلح کے لئے جھک جائیے) سے یہ مفہوم کون لے سکتا ہے کہ کافروں سے صلح صرف اسی وقت ہوسکتی ہے جب وہ پہلے صلح کے لئے جھک لیں، اور اس کے سوا کوئی اور صورت جائز نہیں؟ اسی طرح جہاں قصرِ صلوٰۃ کا حکم ہے وہاں الفاظ یہ ہیں واذا ضربتم فی الارض فلیس علیکم جناح ان تقصروا من الصلوٰۃ ان خفتم ان یفتنکم الذین کفروا گویا قید یہ لگی ہوئی ہے کہ قصرِ نماز کا حکم مسافر کو اس صورت میں ہے، جب کافروں سے ستائے جانے کا خطرہ درپیش ہو، لیکن کس مفسر، کس فقیہ نے آج تک یہ معنی لئے ہیں؟ کس نے نمازِ قصر کے حکم کو سفر میں اس خوف کے ساتھ مقید کیا ہے؟ اجماعِ امت اور اُسوۂ رسول دونوں ہی سے قصرِ صلوٰۃ سفر کا حکم عام ہے۔

پھر اگر آیت کا مطلب وہی ہوتا جو بیسویں صدی کے مغرب زدہ مفسرین نے نکالا ہے تو خود رسولِ کریمؐ نے اور صحابۂ کرامؓ نے جو اس کثرت سے تعددِ ازواج کو برتا ہے تو کیا ہر جگہ یا اکثر جگہ، یہی صورت یتیم عورتوں سے نا انصافی کے اندیشہ کی پیش آرہی تھی؟

فانکحوا۔ صیغۂ امر یہاں جواز و اباحت کے لئے ہے، نہ کہ وجوب کے لئے، گو فرقۂ ظاہریہ اسی طرف گیا ہے۔

الظاھریۃ قالوا ان الامر للوجوب فالزواج واجب فی العمر مرۃ والجمھور علی ان الامر فیہ للاباحۃ۔ (المنار)

۱۱۵ (کہ جب تعدد کی صورت ہی نہ ہوگی تو عدل کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا)

الّا تعدلوا۔ یعنی بیویوں کے درمیان عدل نہ کرسکو گے، اور ان کے حقوقِ واجب ادا نہ کرپاؤ گے۔

عدل سے یہاں مُراد ادائے حقوقِ واجب میں عدل و مساوات ہے جو انسان کے قصد و اختیار کے اندر کی چیز ہے، مثلاً یہ کہ کوئی بیوی بغیر کھانے، کپڑے، مکان کے نہ رہے، باقی جہاں تک محبتِ طبعی اور تعلقِ قلب کا سوال ہے، اس میں مساوات قدرتِ بشری سے باہر ہے، اور اس باب میں شریعت نے کوئی گرفت نہیں رکھی ہے۔

اور عدلِ اختیاری میں بھی یہ لازم نہیں کہ ہر معاملہ مساواتِ عددی ہی کے ساتھ کیا جائے۔ ایک افریقی بیوی خوگر بالکل دوسری چیزوں کی ہوگی اور امریکی بیوی دوسری چیزوں کی۔ کمسن اور ادھیڑ عمر سن کی بیوی کی ضرورتیں، خواہشیں، دلچسپیاں سب الگ۔ کم سن نوجوان بیوی کی ضرورتوں، دلچسپیوں، خواہشوں سے مختلف ہوں گی۔ مقصود یہ نہیں کہ ساری بھیڑیں بے تحاشہ ایک ہی لاٹھی سے ہانکی جانے لگیں۔ مقصود ہر ایک کو بقدرِ اپنے امکان اور بہ لحاظ اس کے مرغوبات، مالوفات کے راحت پہنچانا ہے اور عمر، صحت، ماحول، وعادات کے اختلاف پر نظر رکھنا بہرحال ضروری ہے۔

فقہاء نے عدل بین الازواج کو فرض قرار دیا ہے۔ لیکن خود عدل کی تفسیر عدمِ ظلم سے کی ہے کہ کسی پر زیادتی نہ ہونے پائے۔

وظاهر الآية انه فرض ان يعدل لے ان لايجور (الدر المختار)

**فواحدۃ**۔ کوئی شوہر اگر ظلم وبے انصافی کے ساتھ دو یا زائد بیویاں رکھے گا، تو اس پر ظلم وبے انصافی کا گناہ برابر ہوتا رہے گا۔ لیکن یہ نہیں کہ دوسری بیوی یا بیویوں سے نکاح منعقد ہی نہ ہوگا۔ ظلم وجور قانونی انعقادِ نکاح کا مانع نہیں۔

**فان خفتم الا تعدلوا**۔ خوب خیال کر لیا جائے کہ آیت کے مخاطب کون ہیں؟ اور وحدتِ ازدواج کا حکم کس کو مل رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ خود شوہروں کو، نہ کہ حکامِ وقت کو۔

عقلاً بھی ظاہر ہے کہ عدل وحسن معاشرت کا فیصلہ شوہر خود ہی کر سکتا ہے نہ کہ کوئی دوسرا، اس لئے جو لوگ اس سراسر نجی اور ذاتی معاملہ میں حکومت کو مداخلت کی دعوت دیتے ہیں، وہ غلطی ہی پر ہیں۔

**۱۲** (جس کے ادائے حقوق کی ذمہ داریاں تمہارے اوپر بہ مقابلہ ایک آزاد خاندانی بیوی کے ہلکی ہیں)

**ماملکت ایمانکم** کے لفظی معنی ہیں "وہ جن کے مالک تمہارے داہنے ہاتھ ہیں" محاورہ میں اس سے مراد شرعی مملوک غلام اور کنیزیں ہوتے ہیں۔ جن کا اب مدتِ دراز سے ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں میں کہیں وجود ہی نہیں۔ اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم ودشوار معاملہ رہا ہے۔ یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے یہاں سے گرفتار ہو کر آئیں ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، انھیں کہاں اور کیسے رکھا جائے۔ کسی نے اس کا حل جبری مزدوری FORCED LABOUR یا بیگار کو نکالا، کسی نے کچھ اور۔ ہماری شریعت نے صاف، سہل اور سادہ حکم یہ دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بار حکومت STATE پر ڈالا جائے، اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ایک فرد اس نووارد کو اپنے خاندان کا ایک جز بنا لے۔ اس سے کام کاج یقیناً لے لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں ان سے ہم بستری کا حق بھی حاصل ہے۔ اس کا قیدی ہو کر آنا یہ خود اعلانِ نکاح کا قائم مقام ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی مزید ایجاب وقبول اور شاہدین کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں (شرائط کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی) بلکہ ان کے آزاد کرنے کی فضیلتیں اور اس کے لئے طرح طرح کی ترغیبات خود قرآن مجید ہی میں درج ہیں اور حدیث میں تو اور زائد ہیں۔ — حیرت ہے کہ ایسے صاف سیدھے، شریفانہ حکیمانہ قانون سے شرمانے اور اسے حتیٰ الوسع چھپانے کی ضرورت بعض تجدد زدہ مسلمان بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا ذہن معاً انگریزی کے لفظ SLAVE اور ان ساری سختیوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس لفظ کے تخیل کے ساتھ بجا طور پر وابستہ ہیں۔ حالانکہ ہمارے یہاں تو غلاموں اور غلام زادوں نے بارہا بادشاہتیں تک کی ہیں اور امراء تو ان میں کثرت سے ہوئے ہیں۔ یہ تو دنیوی حیثیت ہوئی، باقی دینی حیثیت سے بڑے بڑے علماء، فقہاء، وائمۂ فن ان ہی غلاموں اور غلام زادوں میں تابعین ہی کے زمانے سے پیدا ہونے لگے تھے۔ کنیز شرعی کے حقوق بی بی سے کمتر ہوتے ہیں، اس لئے ان کا ادا کرنا بھی قدرۃً سہل تر ہے

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ

اس میں زیادتی نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے ۱۳ اور تم بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو ۱۴ لیکن اگر وہ

طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــٴًـا مَّرِیْٓــٴًـا ۴

خوش دلی سے تمہارے لئے اس میں کا کوئی جزو چھوڑ دیں تو تم اسے ہنسی خوشی کھاؤ (پیو) ۱۵

جن مفسرین جدید نے شرط عدل کے نہ پائے جانے کی صورت میں جائز صرف وحدتِ ازواج کو مانا ہے وہ اپنی تحریروں میں خدا معلوم آیت کے اس ٹکڑے کو کیوں ہضم کر جاتے ہیں۔

۱۳ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی کے ساتھ نباہ کرنا ہوگا تو ظلم اور زیادتی کے امکانات بھی بہت گھٹ جائیں گے۔

ذٰلِكَ یعنی یہی ایک پر قناعت۔

اشارة الى اختيار الواحدة (مدارك)

اَلَّا تَعُوْلُوْا عول کے معنی ایک طرف جھک جانے اور جور کرنے کے ہیں لا تعولوا کے معنی ہوئے کہ ظلم اور زیادتی نہ کرو۔

العول هو ترك النصفة باخذ الزيادة (راغب) من قولهم عال الميزان عولاً اذا مال وعال الحاكم فی حکمه اذا جار (کشاف) معناه لا تجوروا ولا تميلوا وهذا هو المختار عند اكثر المفسرين (کبیر) لا خلاف بين السلف وكل من روى عنه تفسير هذه الآية ان معناه ان لا تميلوا وان لا تجوروا (جصاص)

۱۴ (اور اس کے ادائے حقوق کے سلسلہ کی ایک کڑی سمجھو)

صَدُقٰتِهِنَّ ۔صداق یا مہر شریعتِ اسلامی میں بی بی کی وہ قیمت نہیں جو شوہر اس کے اولیاء کو دے کر ان سے بی بی حاصل کرتا ہے، بلکہ مہر بطور ایک نذرانہ کے ہے جو شوہر بہ غرض اکرام و اعزاز براہ راست بی بی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے، ہمارے فقہاء نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا ہے۔

المهر واجب شرعًا ابانة لشرف المحل (هدايه)

عورت کی شرمگاہ نکاح ہو جانے سے شوہر کی ملک نہیں ہو جاتی، ملک عورت ہی کی رہتی ہے، شوہر کے لئے صرف جائز ہو جاتی ہے۔

الزوج لا يملك بدله شيئًا لان البضع فی ملك المرأة بعد النكاح كهو قبله (جصاص) وانما الذی یستحقه الزوج منها بعد النكاح هو الاستباحة لا الملك (جصاص)

وَاٰتُوا النِّسَآءَ شوہروں کو حکم مل رہا ہے کہ یہ رقم مہر اپنی بیبیوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء والدین کو، مہر کی اہمیت اور ادائے مہر کی تاکید شریعت میں بالکل ظاہر ہے، افسوس ہے کہ امت کا موجودہ عمل اس کے برعکس ہے۔ مہر کو عملاً محض ایک نمائشی اور فرضی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ خطاب یہاں شوہروں سے ہے، ادائے مہر واجب انھیں پر ہے۔

والخطاب علی ما هو المتبادر للازواج واليه ذهب ابن عباس وجماعة واختاره الطبری والجبائی وغيرهما (روح) قال الآخرون الخطاب للازواج وهذا اصح (معالم) القول الثانی ان الخطاب للازواج أمروا بايتاء النساء مهورهن وهذا قول علقمه والنخعی وقتادة واختيار الزجاج (کبیر)

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا

اور کم عقلوں کو اپنا وہ مال نہ دے دو جس کو اللہ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے اور اس مال

وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤

میں سے انہیں کھلاتے اور پہناتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کہتے رہو ۱۶

**۱۵** یعنی اس اجازت کے بعد بے تکلف اسے اپنے تصرف میں لا سکتے ہو۔

فان طبن لکم۔ خوب یاد رہے کہ بیبیوں کی طرف سے یہ ابراء یا دست برداری بغیر کسی جبر اور دباؤ اور شوہر کے کسی مکر و فریب کے ہونا چاہئے اگر شوہر نے کسی جبر یا مکر سے اس دست برداری کو حاصل کیا ہے تو قاضی کے یہاں سے یا عدالت سے جو کچھ بھی فیصلہ ہو جائے عند اللہ یہ قبول نہ ہوگی۔

عن شیء چاہے وہ جز چھوٹا ہو یا بڑا یہاں تک کہ کل کا کل بھی بی بی اگر شوہر سے مہر وصول کرکے پھر اسے واپس کر دے تو اسے ہبہ کہیں گے اور اگر لئے بغیر پہلے ہی معاف کر دے تو اس کا نام اصطلاح فقہ میں ابراء ہے اور شرعاً دونوں صورتیں بالکل درست ہیں۔

فکلوہ ھنیئا مریئا۔ محاورۂ زبان میں مراد اس کے لفظی معنی مزہ دار و خوشگوار طعام نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ بی بی کی اجازت کے بعد اس مال کو بے تکلف اپنے تصرف و استعمال میں لا سکتے ہو۔

تصرفوا فیہ تملکا (روح) لا اعتبار بلفظ الاکل فی ذٰلک وان المقصد فیہ جواز استباحتہ بطیبۃ من نفسھا (جصاص) لیس المقصود صورۃ الاکل وانما المراد بہ الاستباحۃ بای طریق کان (قرطبی)

**۱۶** (اخلاص اور خیر خواہی کی راہ سے)

السُّفَھَآءَ۔ سیاق میں سفہاء سے مراد وہ یتیم ہیں جو گو عمر کے اعتبار سے بالغ ہو چکے ہیں لیکن صرفِ مال کا سلیقہ و انتظام ان میں پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ وہ بے تکان اور بے تحاشہ اسراف میں مشغول رہتے ہیں۔

المبذرین اموالھم الذین ینفقونھا فی ما لا ینبغی ولا قدرۃ لھم علی اصلاحھا (مدارک) وصف الیتمیٰ بانھم سفھاء باعتبار خفۃ احلامھم واضطراب آرائھم لما فیھم من الصغر وعدم التدرب۔ (روح)

سفہ یا سفاہت سے یہاں کسی معصیت یا جرمِ اخلاقی کی طرف اشارہ کرنا نہیں بلکہ محض ان لوگوں کی انتظامی نااہلیت کا اظہار مقصود ہے۔

لیس السفہ فی ھؤلاء صفۃ ذم ولا یفید معنی العصیان للہ تعالٰی وانما سموا سفھاء لخفۃ عقولھم ونقصان تمییزھم عن القیام بحفظ المال (کبیر) السفہ استعمل فی خفۃ النفس لنقصان العقل وفی الامور الدنیویۃ والاخرویۃ..... قال فی السفہ الدنیوی ولا تؤتوا السفھاء اموالکم (راغب)

اموالکم۔ مراد اس مال سے ہے جو ملک یتیموں ہی کی ہے لیکن فی الحال سرپرستوں کی ولایت میں ہے۔

ای اموالھم التی فی ایدیکم (جلالین) انما اضاف الاموال الی الاولیاء لانھا فی تصرفھم وتحت ولایتھم۔ (بیضاوی)

لکم قیاما۔ ضمیر مخاطب سے مراد عالمِ انسانیت ہے یعنی مال جو انسان کے لئے مایۂ زندگی ہے جس کے

## وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ

اور یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ عمر نکاح کو پہونچ جائیں [۱۱]

اوپر انسان کی حیاتِ مادی و معاشرتی کا دار و مدار ہے۔

وبہ قواما لابن انکم ومعاشا لأھلکم واولادکم (مدارک) ای تقوم بہا معایشھم من التجارات وغیرھا (ابن کثیر) المراد من القیام ما بہ القیام (روح) اراد ھنا قوام عیشکم الذی تعیشون بہ (معالم)

مطلب یہ ہے کہ مال اللہ کی بڑی نعمت ہے اور بڑی قدر کی چیز، ابھی اُسے نافہم یتیموں کے ہاتھ میں نہ دے دو کہ وہ اس کی قدر و مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ ناقدری سے اُسے اڑا دیں گے۔

فقہاء نے آیت سے حفظِ مال و عدمِ تضییعِ مال کے وجوب پر بھی استدلال کیا ہے۔

وفیہ الدلالۃ علی النھی عن تضییع المال ووجوب حفظہ وتدبیرہ والقیام بہ (جصاص)

وَارْزُقُوْهُمْ..... مَعْرُوْفًا مطلب یہ ہوا کہ اسی جائداد سے یتیموں کی ضرورتیں پوری کرتے رہو، ان کی راحت و آسائش کے سامان کرتے رہو اور بجائے ان کے ہاتھ میں جائداد دے دینے کے ان سے تسلی کی باتیں کرتے رہو کہ یہ بلکہ تمہاری ہی ہے تمہاری ہی بہی خواہی کا تقاضا ہے کہ اسے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہ دیا جائے بلکہ انتظار کیا جائے کہ تم میں پوری طرح سمجھ آجائے۔

ان کی یہ سفاہت ان کے نان و نفقہ میں حائل نہیں ہو سکتی، اور یہیں سے فقہاء نے نالائق اولاد اور ناسمجھ بی بی کے نان و نفقہ کے وجوب پر استدلال کیا ہے:۔

فی ذالک دلیل علی وجوب نفقۃ الاولاد السفھاء والزوجات۔ (جصاص)

**معروفا** معروف کے اندر ہر وہ چیز داخل ہے جو علماً خواہ عملاً عقل و شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہو۔

کل ما سکنت الیہ النفس لحسنہ عقلا او شرعا من قول او عمل فھو معروف (مدارک) ای کلاما تطیب بہ نفوسھم (روح)

آیت کی تعلیم اس باب میں جامع ہے کہ اپنی زیر ولایت اولاد، ازواج و اہلِ خاندان کے ساتھ حُسنِ سلوک و حسنِ معاشرت، کھانے پہننے اور بات کرنے، سب میں رکھنا چاہئے۔

وھذہ الآیۃ الکریمۃ تضمنت الاحسان الی العائلۃ ومن تحت الحجر بالفعل من الانفاق فی الکساوی والارزاق بالکلام الطیب وتحسین الاخلاق (ابن کثیر)

**[۱۱]** یعنی سیانے اور بالغ ہو جائیں۔

یعنی القدرۃ علی الوطئ (ابن العربی) اذا بلغوا حد البلوغ (بیضاوی) بلغ الرجال والنساء (معالم)

اور بلوغ کی عمر حنفیہ کے ہاں لڑکے کے لئے ۱۸ سال اور لڑکی کے لئے ۱۷ سال کی رکھی گئی ہے۔

وشاع عن الامام الاعظم ان السن للغلام تمام ثمانی عشرۃ سنۃ وللجاریۃ تمام سبع عشرۃ سنۃ (روح) فکذا قالہ ابن عباس وتابعہ القتبی۔ (روح)

وابتلوا الیتامٰی یعنی ان کے بالغ ہونے سے پہلے ان کی جانچ انتظامی معاملات میں ہوشیاری اور تمیز داری کی کر لیا کرو۔

والاختبار فی استبراء حالہ فی المعرفۃ بالبیع والشری وضبط امورہ وحفظ مالہ (جصاص)

فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ

تو اگر تم ان میں ہوشیاری دیکھ لو تو ان کے حوالے ان کا مال کردو ۱۸ اور مال کو جلد جلد

اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ

اسراف سے اور اس خیال سے کہ یہ بڑے ہوجائیں گے مت کھاڈالو ۱۹

خطاب وہی یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں سے چل رہا ہے۔

**۱۸** (بغیر ان کے عمر بلوغ کا انتظار کئے)

من غیر تاخیر عن حد البلوغ (مدارک)

فان اٰنستم منهم رشدا۔ یعنی آزمائش کے بعد قبل بلوغ ہی اگر ان میں انتظام اور صرفِ مال کا سلیقہ پاؤ، یہاں دیکھنے کی چیز ان کی صرف انتظامی صلاحیت ہوگی نہ کہ ان کی عبادت و تقویٰ۔

رشدًا۔ رشد یہاں سلیقہ مندی اور انتظام کے مفہوم میں ہے، نہ کہ تقویٰ و ہدایت کے عام معنی میں۔

اے نوعًا من الرشد وهو الرشد فی التصرف والتجارة (کشاف) اے هدایة فی التصرفات وصلاحًا فی المعاملات (مدارک) وتنکیر الرشد یفید ان المراد رشد مخصوص وهو الرشد فی التصرف والتجارة (مدارک)

وہ رشد جو تقویٰ و تدین کے معنی میں ہے، اس سے بہت مختلف ہے۔

وبین الرُّشدین اعنی الرشد المونس من الیتیم والرشد الّذی اوتی ابراهیمؑ بون بعید (راغب)

فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ فاسق یتیم اگر انتظامی صلاحیت و سلیقہ مندی رکھتا ہے تو اس کا مال بلا تامل اس کے حوالہ کردیا جائے گا، اور اس کا فسق اس راہ میں مانع نہ ہوگا۔

فاعتبار الدین فی دفع المال غیر واجب باتفاق الفقهاء لانه لو کان رجلا فاسقًا ضابطًا لاموره عالمًا بالتصرف فی وجوه التجارات لم یجز ان یمنع ماله لاجل فسقه (جصاص)

**۱۹** (اور اس وقت تو بہرحال ان کے حوالہ کرنا ہی پڑے گا)

وما یکبروا فیطالبوا باموالهم۔ (جصاص)

حدِ کبر میں داخل ہونے کے بعد جائداد بہرحال صحیح الحواس اصل مالک کو مل جائے گی، خواہ رُشد سے انتظامی صلاحیت حاصل ہو یا نہ ہو، فاترالعقل کے احکام الگ ہیں۔

فیها دلالة علی انه اذا صار فی حد الکبر استحق المال اذا کان عاقلا من غیر شرط ایناس الرشد (جصاص)

اور حدِ کبر میں داخل ہونے کی عمر امام ابوحنیفہؒ کے یہاں ۲۵ سال کی ہے کہ اس سن میں انسان دادا بن سکتا ہے۔

وجعل ابوحنیفة حد الکبر فی ذالک خمسا وعشرین سنة لان مثله یکون جدًا ومحال ان یکون جدًا ولا یکون فی حد الکبار (جصاص)

بدارًا کے معنی جلدی کرنے کے ہیں۔

بدارًا اے مسارعة (راغب) بدارًا اے مبادرة (صحیح بخاری)

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ

بلکہ جو شخص خوشحال ہو وہ تو اپنے کو بالکل روکے رکھے ۲۰؎ البتہ جو شخص نادار ہو وہ مناسب مقدار میں

بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ

کھا سکتا ہے ۲۱؎ اور جب ان کے مال ان کے حوالے کرنے لگو تو ان پر گواہ بھی کر لیا کرو، اور اللہ

وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ⑥ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ

حساب کر لینے والا کافی ہے ۲۲؎ مردوں کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جس کو والدین اور نزدیک کے

وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ

قرابت دار چھوڑ جائیں۔ اور عورتوں کے لئے بھی اس چیز میں حصہ ہے جس کو والدین اور نزدیک کے قرابت دار

مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ⑦

چھوڑ جائیں اس (متروکہ) میں سے تھوڑا ہو یا زیادہ (بہر حال) ایک حصہ قطعی ہے ۲۳؎

**۲۰؎** (جائداد یتیم میں تصرف سے)

ومن کان غنیا۔ ذکر انھیں اولیاء یتامیٰ کا ہے حکم اُن کو مل رہا ہے کہ اگر وہ خوش حال ہیں تو انھیں فیس آنریم وغیرہ کے نام سے کوئی رقم بھی یتیم کے مال میں سے نہ لینا چاہیئے بلکہ اسے محض حسبۃً للہ کرتے رہنا چاہیئے۔ یہ ہے اہمیت اسلام میں مال یتیم کی تولیت کی۔

**۲۱؎** یعنی بقدر اپنی ضرورت کے۔

اے بقدر الحاجۃ (ابن العربی) بقدر حاجتہ الضروریۃ (روح)

یہ رقم محققین حنفیہ نے صاف کر دیا ہے کہ بہ طور اُجرت کے نہ ہوگی کہ نگرانی تو ولی کے فرائض میں ہے اور معلوم ہے کہ ادائے فرائض پر اُجرت جائز نہیں بلکہ یہ رقم تو الگ سے اللہ کی مقرر کی ہوئی ایک مد ہے۔

ان الرزق لیس باجرۃ لشئ وانما ھو شئ جعلہ اللہ لہ (جصاص)

فاخذ الاجرۃ للقاضی ولمن قام بشئ من امور الدین غیر جائز۔ (جصاص)

بالمعروف یعنی یہ نہیں کہ اس آمدنی سے خوب عیش کی زندگی بسر کرنے لگے بلکہ صرف اتنا معاوضہ لے جتنا اس معاشرہ میں متعارف ہو

**۲۲؎** یعنی یہ گواہوں کا حکم تو دنیوی ضابطہ کی تکمیل کے لئے دیا جا رہا ہے ورنہ حقیقتاً ہر نیت اور ہر نیت کا پورا علم تو اللہ ہی کو ہے۔

فاذا دفعتم الیھم یعنی جب بعد تحقق شرائط مذکور (بلوغ و قابلیت انتظام) یتیموں کے سپرد ان کی جائدادیں کرنے لگو۔

فاشھدوا علیھم۔ گواہ اس امر پر کہ یتیموں کا مال اُن کے سپرد کر دیا گیا۔

آیت کا خاتمہ قرآن مجید کے عام دستور کے مطابق وعید عام پر ہوا ہے یعنی ہر حق تلفی کرنے والا یہ سمجھے رہے کہ اللہ تعالیٰ

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ

اور جب تقسیم کے وقت اعزّہ اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو انھیں بھی اس میں سے (کچھ) دے دو

وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ

اور ان سے ہمدردی کی بات کہو ۲۴ے اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہئے کہ اگر وہ اپنے پیچھے چھوٹے بچے

ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ﴿٩﴾

چھوڑ جائیں، تو ان کی انھیں (کیسی) فکر رہے پس چاہئے کہ اللہ سے ڈریں اور بات پکی کہیں ۲۵ے

ہر حال وصورت میں حساب لینے والا ہے۔

ففی ھٰذا وعید لکل جاحد حق (قرطبی)

۲۳ے یعنی یہ مورث کی رائے اور اختیار پر موقوف نہیں حصوں کی ہر تقسیم اور ترکہ کا ہر استحقاق شریعت الٰہی کا مقرر کیا ہوا قانون ہے یہ نہیں کہ جو "روشن خیال" جب چاہیں اٹھیں اور جدید حالات کا عذر کر کے اس قانون میں قطع و برید کر کے رکھدیں۔

قال الفراء ھو کقولک قسما واجبا وحقا لازما۔ (قرطبی)

للرجال نصیبٌ.... وللنساء نصیبٌ۔ یعنی حق میراث مردوں عورتوں دونوں کو یکساں پہنچتا ہے اس میں رد آگیا ان مذہبوں کا جنھوں نے عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بناء پر حقِ وراثت سے محروم رکھا ہے ہندؤں کی طرح جاہلیتِ عرب میں بھی عورتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا۔

مما قلّ منہ او کثر۔ منہ میں ضمیر غائب ترکہ یا مال کی طرف ہے۔

والضمیر یعود الی ما ترک (مدارک) الضمیر عائد علی معنی القسمۃ (قرطبی)

۲۴ے یعنی نرمی اور شیریں زبانی سے کام لو خشونت کو کام میں نہ لاؤ۔

اذا حضر القسمۃ۔ یعنی جس وقت وارثوں کے درمیان تقسیم ترکہ ہو رہی ہو۔

ای قسمۃ الترکۃ (مدارک)

اولوا القربیٰ۔ ایسے عزیز مراد ہیں جن کا میراث میں کوئی حق نہیں۔

ای من لا یرث (مدارک) ممن لا یرث (بیضاوی)

منہ۔ ضمیر ترکہ کی طرف ہے۔

ای مما ترک الوالدان والاقربون۔ (مدارک)

یہ تقسیم صرف بالغوں کے حصہ میں ہوگی، نابالغوں کے حصہ میں سے خیر و خیرات یا کسی کی مراعات جائز نہیں۔

فارزقوھم منہ۔ یعنی انھیں بھی کچھ دے دلا کر انھیں خوش وقت کر دو۔

فاعطوھم شیئا من المقسوم تطییبا لقلوبھم وتصدقا علیھم۔ (بیضاوی)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ

بے شک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھالیتے ہیں، وہ بس اپنے پیٹ میں آگ ہی بھرتے

بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۚ

ہیں ۲۶ اور عنقریب وہ دہکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ اللہ تمہیں تمہاری اولاد کی میراث کے بارے میں حکم دیتا ہے ۲۷

ع ۱ ۱۲

اس میں بڑی بحث و گفتگو ہوئی ہے کہ یہ حاضر الوقت غیر وارثوں کو ترکہ میں سے دینے کا حکم وجوبی ہے یا محض استحبابی۔ تحقیق یہ ہے کہ یہ درجۂ استحباب کی چیز ہے، واجب نہیں ہے، اور اگر ابتدا میں واجب تھا بھی تو اب حکمِ وجوب منسوخ ہے۔ ابن عباسؓ صحابی ابن جبیرؒ تابعی حسن بصریؒ تابعی اور محققینِ حنفیہ کا یہی مذہب ہے، اور شافعی اور مالکی بھی اسی طرف گئے ہیں۔

قال ابن عباسؓ وابن جبیرؒ والحسن ھو ندب (بحر) ھٰذا کلہ یوجب ان یکون اعطاء ھؤلاء الحاضرین عند القسمۃ استحبابا لا ایجابا (جصاص) والصحیح ان ھٰذا علی الندب (قرطبی) وھو امر ندب (بیضاوی)

**۲۵** (اور اُن یتیموں کے حسبِ مصلحت)

یعنی ان کی تعلیم، تادیب، تسلّی، دلجوئی ہر پہلو کا لحاظ رہے۔

ذکروا بالنظر فی مصلحتھم (ابن العربی) القول السدید من الاوصیاء ان لا یؤذوا الیتامٰی ویکلموھم کما یکلّمون اولادھم بالادب الحسن والترحیب (کشاف)

مفسرین کا ایک گروہ اس طرف بھی گیا ہے کہ یہ خطاب اولیاء کو نہیں بلکہ قریب الموت شخص کے عزیزوں قریبوں کو ہے کہ وہ اسے سمجھائیں کہ اسے حق صرف ایک ثلث میں صدقہ کا ہے اور باقی مال مقررہ وارثوں کے لئے چھوڑ جائے۔

فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ۔ یعنی اللہ سے ڈرتے رہیں کہ کہیں خود ان کے چھوٹے یتیم بچّوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش آ کر رہے۔

ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا۔ ضعیف سے مراد بوڑھی نہیں، کمزور اور کم سن اولاد ہے۔

ای اولادًا صغارًا۔ (معالم۔ جلالین)

قَوْلًا سَدِيْدًا۔ یعنی سچّی اور صحیح بات جس میں کوئی پہلو شر و فساد و اتلافِ حقوق کا نہ نکلتا ہو۔

ھو العدل والحق الذی لا خلل فیہ ولا فساد فی رجحان بوارث او حرمان لذی قرابۃ (جصاص)

اور قولِ سدید (پکی، کھری بات) کی تعلیم اسلام میں اس موقع کے لئے نہیں، زندگی کے ہر قدم کے لئے ہے۔

**۲۶** خیانت، غصب، بددیانتی ہر صورت میں بُری ہیں، یتیموں کے مال میں ان کا وقوع قبیح تر ہے۔

يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى۔ يَاْكُلُوْنَ سے مراد یتیم کا مال کسی طریقہ سے بھی بے جا تصرف میں لے آنا ہے، یہ مراد نہیں کہ صرف کھانے ہی کے کام میں لائے۔

خص الاکل بالذکر لانہ اعظم ما یبتغی لہ الاموال (جصاص)

اِنَّمَا ...... نَارًا۔ یعنی اس حرام خوری کا انجام یہی ہوتا ہے۔

اردو محاورہ میں بھی "روپیہ کھا جانا" ایسے موقع پر بڑے وسیع معنی میں آتا ہے۔

**۲۷** ترکہ کی تقسیم اجتماعی و معاشرتی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے اور اس کی عادلانہ تقسیم پر معاشرہ کی فلاح

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ

مرد (کا حصہ) دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے ۲۸ے اور اگر دو سے زائد عورتیں (ہی) ہوں ۲۹ے

فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ

تو ان کے لئے دو تہائی (حصہ) اس (مال) کا ہے جو مورث چھوڑ گیا ہے ۳۰ے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کے لئے نصف (حصہ) ہے ۳۱ے

و بہبود کا بہت کچھ مدار ہے، اور وہ نام نہاد آسمانی کتابیں جو نیک کے ہدایت نامہ کی حیثیت سے کامل نہیں ناقص ہیں جو ایسے اہم مسئلہ کی تفصیلات سے خالی ہوں۔ یوصیکم اللہ۔ اس تصریح سے یہ یاد دلا دیا کہ یہ احکام کسی بندہ کے تجویز کئے ہوئے نہیں، حکیم مطلق اور عالم الغیب حاکم برحق کے ارشاد کئے ہوئے ہیں۔

فی اولادکم۔ اولاد کے معنی بھی سمجھ لینے کے قابل ہیں، اولاد جمع ہے ولد کی، اور ولد کے معنی جنے ہوئے کے ہیں، گویا ترکے کے یہ احکام حقیقی یا صلبی بیٹوں یا بیٹیوں کے حق میں ہیں، اور ان کے ہوتے ہوئے پوتے پوتیوں کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، اور اگر صلبی اولاد نہ موجود ہو تو مراد بیٹوں کی اولاد ہوگی، یعنی پوتے پوتیاں، بیٹیوں کی اولاد یعنی نواسے نواسیاں مراد نہ ہوں گی، اس لئے کہ نسب لڑکے ہی سے چلتا ہے لڑکی سے نہیں، فقہاء مفسرین نے اسے صاف کر دیا ہے۔

ولم یختلف اھل العلم فی ان المراد بقولہ تعالیٰ یوصیکم اللہ فی اولادکم اولاد الصلب وان ولد الولد غیر داخل مع ولد الصلب وانہ اذا لم یکن ولد الصلب فالمراد اولاد البنین دون اولاد البنات فقد انتظم اللفظ اولاد الصلب و اولاد الابن اذا لم یکن ولد الصلب۔ (جصاص)

۲۸ے یہ ایک عام اصل بیان کر دی کہ ہر لڑکے کو دہرا اور ہر لڑکی کو اکہرا حصہ ملے گا خواہ لڑکا اور لڑکی ایک ایک ہوں یا کئی حظ الانثیین۔ دنیا کی بہت سی مذہبی اور غیر مذہبی شریعتیں ایسی ہیں جن میں لڑکی کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں، اور عرب جاہلیت میں بھی ترکہ کے حصہ دار صرف مرد (اور مردوں میں بھی صرف بالغ اور قابل حرب مرد) تھے ایسے قانون کا ظالمانہ اور خلاف فطرت ہونا بالکل ظاہر ہے لیکن اب اسی کے رد عمل کے طور پر بعض حلقوں سے جو یہ صدا اٹھی ہے کہ مرد و عورت کا حصہ مساوی ہونا چاہیے، یہ دوسری بے اعتدالی اور افراط کی جگہ تفریط ہے، عورت کی فطری ساخت جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تولید، رضاعت اور تربیت نسل کے ساتھ ساتھ اس پر فکر معاش کی ذمہ داریاں بھی ڈال دی جائیں، قدرت نے اور اسی لئے صحیح اور سچی شریعت نے اس کا ذمہ دار مرد کو ٹھہرایا ہے گھر اور خاندان کا خرچ چلانا اسی کے سر رکھا ہے اس لئے یہ ظلم نہیں عین عدل ہے کہ ترکہ میں مرد کو حصہ بھی بڑا ملے پھر شادی شدہ عورت کو میراث کے موقع پر دوہرے حصے حاصل رہتے ہیں، ایک ادھر میکے میں باپ کے ترکہ میں حصہ، دوسرا ادھر سسرال میں شوہر کے ترکہ میں سے حصہ اس طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی عورت گھاٹے میں نہیں رہتی۔

۲۹ے (یا صرف دو ہی ہوں)

ان کن نساء۔ یعنی اگر وارث صرف لڑکیاں ہی ہوں۔

یعنی بنات لیس معھن ابن (کشاف)

فوق اثنتین۔ فوق کے معنی یہاں لازمی طور پر ''زائد'' کے نہیں، یہ صلہ بقول بعض مفسرین کے محاورۂ عرب میں

وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ

اور مورث کے والدین یعنی ان دونوں میں ہر ایک کے لئے اس (مال) کا چھٹا حصہ ہے جو وہ چھوڑ گیا ہے[۳۲] بہ شرطیکہ مورث کے کوئی اولاد

فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّ وَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ

ہو[۳۳] اور اگر مورث کے کوئی اولاد نہ ہو اور اسکے والدین ہی اسکے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے[۳۴] لیکن اگر مورث کے

لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ

بھائی (بہن) ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے[۳۵] وصیت کے نکالنے کے بعد کہ مورث اس کی وصیت کر جائے یا ادائے قرض کے بعد[۳۶]

اکثر زائد بھی آجاتا ہے اور خود قرآن مجید میں بھی صلہ کے زائد استعمال کی مثال موجود ہے مثلاً فاضربوا فوق الاعناق:

انّ ذکر فوق ھٰھنا صلة للکلام (جصاص) فوق صلة کقوله تعالیٰ فاضربوا فوق الاعناق (معالم)

لیکن مفسر ابن کثیرؒ نے اس معنی ترکیب کے اختیار اور اس مثالِ قرآنی دونوں پر سخت کلام کیا ہے اور کہا ہے کہ بلا معنی کوئی زائد کلمہ لے آنا بلاغتِ قرآنی کے منافی ہے۔ وھٰذا غیر مسلم لا ھٰھنا ولا ھٰھنا فانه لیس فی القراٰن شیٔ زائد لا فائدة فیه وھٰذا ممتنع اور ایسا ہی اس قول کو رد صاحبِ بحر المحیط نے بھی کیا ہے۔

امام رازیؒ نے یہاں یہ سوال پیدا کیا ہے کہ النساء تو خود ہی صیغۂ جمع ہے پھر اس کے ساتھ فوق اثنتین لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور خود ہی جواب دیا ہے کہ یہ تاکیدِ کلام کی غرض سے ہے جیسا کہ قرآن مجید کی بعض دوسری آیتوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً انما یاکلون فی بطونھم نارًا۔ یا لا تتخذوا الٰھین اثنین۔

**۳۰** لڑکیاں اگر صرف دو ہوں تو ان کا کل حصہ ⅔ ہونا ظاہر ہے ہر ایک کو ⅓ کے حساب سے لیکن یہ شرح یہیں ختم ہو جاتی ہے تین کو ⅔ یعنی کُل کا کُل نہیں مل جائے گا، بلکہ لڑکیاں جتنی بھی ہوں ان کا مجموعی حصہ ترکہ کا ⅔ ہی رہے گا، باقی ⅓ میں اور اعزۂ خاص شریک ہوں گے تفصیل فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔

**۳۱** (کُل ترکہ کا)

اور بقیہ نصف حصہ میں دوسرے متعین اعزّہ شریک ہوں گے لیکن اگر وہ نہ موجود ہوئے تو پھر وہ نصف بھی اسی لڑکی کی طرف عود کر آئے گا

**۳۲** اور بقیہ ⅚ اولاد اور دوسرے وارثوں میں تقسیم ہوگا۔

**۳۳** خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی، اور خواہ تعداد میں ایک ہو یا زاید۔

**۳۴** (اور بقیہ ⅔ دو تہائی باپ کا)

وورثهٗ ابواہ۔ یعنی علاوہ اولاد کے بھائی بہن بھی نہ ہوں صرف ماں باپ ہی وارث ہوں۔

**۳۵** (اور بقیہ ⅚ حصہ باپ کا)

باپ کے باعث بھائی بہنوں کو حصہ نہ ملے گا۔

ان کان له اخوة۔ یہ بھائی بہن خواہ سگے ہوں یا سوتیلے یہ وہ صورت ہے کہ میّت کے اولاد کوئی نہیں لیکن

اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيْضَةً

تمھارے باپ ہوں کہ تمھارے بیٹے، تم نہیں جانتے ہو کہ ان میں سے نفع پہنچانے میں تم سے قریب تر کون ہے ۳۷۔ یہ سب

مِّنَ اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾

اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ بے شک اللہ ہی علم والا ہے، حکمت والا ہے ۳۸۔

ماں باپ بھی ہیں اور بھائی بہن بھی۔

اخوۃ کا لفظ یہاں بھائی بہن دونوں کے لئے ہے صیغۂ مذکر قاعدۂ زبان کے مطابق محض تغلیباً لایا گیا ہے۔

سواء کان من الاخوۃ او الاخوات (بیضاوی) ذکوراً کانوا او اناثاً (معالم)

۳۶ (اگر کچھ ہو)

وارثوں کو حصہ اس وقت ملے گا جب پہلے مورث کا قرض ادا ہولے اور اگر وہ ایک ثلث جائداد سے متعلق کچھ وصیت کر گیا ہے تو اس وصیت کا اجرا ہولے، فقہا نے یہاں دو قاعدے اور بیان کئے ہیں ایک یہ کہ قرض اور وصیت میں ادائے قرض مقدم ہے گو قرآن مجید میں لفظ وصیت پہلے ہی مذکور ہے۔

الدین مؤخر فی اللفظ وھو مبتدأ بہ فی المعنی علی الوصیۃ (جصاص) انما قدمنا الدین علی الوصیۃ لقولہ علیہ السلام الا ان الدین قبل الوصیۃ (مدارک) قدم الوصیۃ علی الدین وھی متأخرۃ فی الحکم (بیضاوی)

دوسرے یہ کہ ادائے قرض اور اجراء وصیت ان دونوں سے بھی پہلے مورث کی تجہیز و تکفین کے لئے خرچ نکالنا ضروری ہے۔

او لفظ او لانے سے اشارہ ادھر نکل رہا ہے کہ وجوب کے لحاظ سے اجراءِ وصیت اور ادائے دین برابر ہی ہیں۔

وایثار أو علی الواو للایذان بتساویھما فی الوجوب (روح) انما قال بأو التی للاباحۃ دون الواو للدلالۃ علی انھما متساویان فی الوجوب۔ (بیضاوی)

اور ادائے دین کا تقدم حکم نبوی کی بنا پر ہے۔

۳۷ یعنی نفع دنیوی ہو یا اخروی، تمھیں کون زیادہ پہنچا سکے گا۔

اس لئے ان احکام میں تمھیں عقلی گدے لگانے کا کوئی موقع ہی نہیں۔

اٰباؤکم وابناؤکم۔ اٰباؤکم کے تحت میں صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا، پردادا، اوپر کے سارے اصول آگئے، اسی طرح ابناؤکم کے تحت میں نہ صرف صلبی بلکہ اولاد در اولاد نیچے کے سارے فروع آگئے، یہاں یہ جتا دیا ہے کہ ترکہ کی تقسیم مورث کی رائے و اجتہاد پر نہیں چھوڑی گئی ہے حکیم و خبیر حاکم مطلق نے خود ہی سب قاعدے ضابطے مقرر کر دیئے ہیں۔

آیت سے حسن معاملت کے ساتھ ساتھ حسن معاشرت کی بھی تعلیم نکل آئی، انسان کو چاہیے کہ شفقت و رحمت اور حسن سلوک اپنے سارے بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ رکھے، اسے کیا خبر کہ کون اس کے زیادہ کام آ رہے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

۳۸ اور اللہ کے علم و حکمت سے بھلا کسی بندہ کی فہم و دانش کو کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ آیت سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ احکام میراث کے باب میں قرآن مجید کو کس درجہ تاکید اور اہتمام منظور ہے شروع یوصیکم اللہ سے کیا، اور آیت کے خاتمہ پر پھر دہری دہری

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ

اور تمہارے لئے اس (مال) کا آدھا حصہ ہے جو تمہاری بیبیاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ ان کے کوئی اولاد نہ ہو ۳۹؎ اور اگر ان کے

لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَا

اولاد ہو تو تمہارے لئے بیبیوں کے ترکہ کی چوتھائی ہے ۴۰؎ وصیت (نکالنے) کے بعد جس کی وہ وصیت کر جائیں یا ادائے قرض

أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ

کے بعد ۴۱؎ اور ان بیبیوں کے لئے تمہارے ترکہ کی چوتھائی ہے ۴۲؎ بشرطیکہ تمہارے کوئی اولاد نہ ہو۔ لیکن اگر تمہارے کچھ اولاد

وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ

ہو تو ان (بیبیوں) کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا ۴۳؎ بعد وصیت (نکالنے) کے جس کو تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد

بلکہ ٹھیری تصریح و تاکید موجود ہے — اور پھر ہم لوگ بھی ٹھیک اس کے مقابل غفلت اور بے پروائی میں کس قدر پڑے ہوئے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فقہ کے بابِ معاملات میں علمائے اُمت کا جتنا اتفاق اس مسئلۂ میراث و فرائض میں ہے، شاید ہی اتنا اتفاق رائے معاملات کے کسی دوسرے مسئلہ میں ہو۔

کان۔ یہاں ماضی کے معنی میں نہیں، بلکہ دوام و استمرار کے اظہار کے لئے ہے۔

کان کذٰلک لانہ لم یزل موصوفاً بتلک الصفات۔ (روح)

فقہاء نے ذکر کیا ہے کہ چند حالات ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن میں میراث جاری نہ ہوگی مثلاً:۔

(۱) وارث مرتد ہو جائے (۲) وارث اپنے مورث کے قتلِ عمد کا مجرم ہو (۳) وارث جا کر دار الحرب میں قیام اختیار کرلے تفصیل ان موانع میراث کی، فقہ و فرائض کی کتابوں میں ملے گی۔

۳۹؎ (نہ تم سے نہ ان کے کسی اور شوہر سے)

ظاہر ہے کہ اس جزو میں خطاب شوہروں ہی سے ہے۔

۴۰؎ (اور بقیہ ۳/۴ دوسرے وارثوں کا حصہ ہے)

بی بی کے ترکہ میں ۱/۴ حصہ شوہر کا ہر صورت میں ہے، خواہ بی بی کوئی اولاد چھوڑے یا نہ چھوڑے۔

ان کان لھن ولد۔ یہ اولاد خواہ تم سے ہو یا متوفیہ کے پہلے شوہر سے۔

۴۱؎ حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ میراث کی تقسیم ہر حال میں اجرائے وصیت اور ادائے قرض کے بعد ہی ہوگی اور ان دونوں میں بھی ادائے قرض مقدم ہے۔

۴۲؎ اور بیبیاں اگر کئی ہوں تو شوہر کے ترکہ کی وہی چوتھائی سب میں برابر تقسیم ہو جائے گی۔

۴۳؎ (اور شوہر کے ترکہ کا بقیہ ۷/۸ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا)

وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ

اگر کوئی مورث مرد ہو یا عورت، ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں

وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي

میں سے ہر ایک کے لئے ایک چھٹا حصہ ہے۔ اور اگر یہ لوگ اس سے زائد ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک

الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ

ہوں گے ۴۴ بعد وصیت (نکالنے) کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی نقصان پہونچائے ۴۵

وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ

یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے ۴۶ اور اللہ بڑا علم والا ہے، بڑا بردبار ہے ۴۷ یہ سب خداوندی ضابطے ہیں ۴۸

بیبیوں کو ۱/۸ بہر صورت ملے گا خواہ اولاد ہو یا نہ ہو۔

ان کان لکم ولد۔ یہ اولاد خواہ انہی بیبیوں سے ہو یا کسی اور عورت سے۔

۴۴ (اور بقیہ ۲/۳ حصہ دوسرے وارثوں کی طرف جائے گا)

فھم شرکآء۔ یہ شرکت برابری کی رہے گی یعنی مذکّر و مؤنث کا حصّہ برابر رہے گا۔

کلالۃ۔ اردو میں اس کے لئے کوئی ایک لفظ موجود نہیں کلالۃ عربی میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ باپ دادا میں سے کوئی موجود ہو اور نہ اولاد، اولاد در اولاد میں سے۔

۴۵ یعنی خود کسی وارث کو نقصان نہ پہنچائے نہ عملاً نہ ارادۃً، عملاً کی مثال یہ کہ وصیت ۱/۳ سے زائد کی کر دی ایسی وصیت قانونِ شریعت کے خلاف ہونے کی بنا پر نا قابلِ نفاذ ہوگی، ارادۃً یہ کہ وصیت رکھے تو ۱/۳ کے اندر ہی لیکن نیت و مقصود یہ ہو کہ وارث کا حصہ کٹ جائے۔

ایسی وصیت نفاذ قانونی تو ہو جائے گا لیکن وصیت کرنے والا عنداللہ گنہگار ٹھہرے گا، اسلام اپنے پیروؤں سے قدم قدم پر عمل کے ساتھ نیت کا بھی اخلاص و صداقت چاہتا ہے۔

ضرار یعنی کسی وارث کو نقصان پہونچانے اسے حصے کے کل یا جزو سے محروم رکھنے کو شریعت نے ایک سخت گناہ قرار دیا ہے۔

قال ابن عباسؓ الضرار فی الوصیۃ من الکبائر ورواہ عن النبی صلعم من حدیث ابی ھریرۃ من ضارّ فی وصیتہٖ القاہ اللہ فی وادی جھنّم۔ (بحر)

۴۶ ختم کے قریب پھر یاد دلا دیا کہ یہ سارا قانونِ میراث شریعت کے ہر دوسرے حکم کی طرح حاکمِ مطلق اور حکیم برحق کا نازل کیا ہوا ہے کسی انسانی عقل و دماغ کا سوچا ہوا، کسی کونسل کمیٹی مجلس کا وضع کیا ہوا نہیں جو آج پاس ہوا اور کل اس میں ترمیم ہونے لگے۔

۴۷ چنانچہ علمِ کامل کی بنا پر وہ خوب واقف ہے کہ کون اس قانون پر عامل ہے اور کون اس سے منحرف اور

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ يُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی (پوری) اطاعت کرے گا اللہ اسے (بہشت کے) باغوں میں داخل کرے گا جن کے

خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا‌ ؕ وَذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ﴿۱۳﴾ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ

نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے ۴۹ے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی

وَيَتَعَدَّ حُدُوۡدَهٗ يُدۡخِلۡهُ نَارًا خَالِدًا فِيۡهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ ﴿۱۴﴾

نافرمانی کرے گا اور اس کے ضابطوں کے حدود سے باہر نکل جائے گا اسے وہ (دوزخ کی) آگ میں داخل کرے گا اس میں وہ

وَالّٰتِىۡ يَاۡتِيۡنَ الۡفَاحِشَةَ مِنۡ نِّسَآئِكُمۡ فَاسۡتَشۡهِدُوۡا عَلَيۡهِنَّ اَرۡبَعَةً

ہمیشہ ہمیش پڑا رہے گا اور اُسے ذلت دینے والا عذاب ہوگا ۵۰ے اور تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کا کام کریں ۵۱ے ان پر چار آدمی

مِّنۡكُمۡ‌ ۚ فَاِنۡ شَهِدُوۡا فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ فِى الۡبُيُوۡتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الۡمَوۡتُ

اپنے میں سے گواہ کرلو سو اگر وہ گواہی دے دیں تو ان (عورتوں) کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے ۵۲ے

حلم کامل کے اقتضاء سے بہت دفعہ مجرموں کی گرفت وہ فوراً نہیں کرتا۔

۴۸ے (جنہیں ہلکا سمجھنا خود اپنے کو خدائی عدالت میں مجرم بنانا ہے)

تلک کا اشارہ اُن تمام احکام کی جانب ہے، جو یتیموں اور وصیتوں اور ترکہ کے باب میں ابھی گزر چکے ہیں۔

اشارۃ الی الاحکام التی ذکرت فی باب الیتامٰی والوصایا والمواریث (مدارک ۔ بیضاوی)

۴۹ے اور یہ فوزِ عظیم جس اطاعتِ کامل پر مشروط ہے اس کے اندر اس قانونِ میراث کی پابندی بھی آگئی۔

یطع اللہ ورسولہ۔ اللہ اور رسول اللہ کی اطاعت سے مراد اس قانون کی پابندی ہے جو اللہ کا اتارا ہوا اور رسولؐ کا لایا ہوا ہے، خدائی قانون کی تشریح رسولؐ کی کی ہوئی بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

۵۰ے یہ عذاب اُخروی بھی ہوگا اور معذّب کے حق میں ذلت آفریں بھی، اِس عذاب کے مورد کافر ہی ہوں گے۔

یتعدّ حدودہ۔ یعنی حد سے اس قدر باہر نکل جائے کہ ان احکام کے احکامِ الٰہی ہونے ہی سے انکار کردے

انکافر ھو الذی تعدی الحدود کلھا (مدارک) ای یبغض حدودہ استحلالاً (مدارک عن الکلبی)

ومن یعص اللہ میں معصیت سے مراد معصیتِ کفر و شرک ہے۔

فسر الضحاک ھنا المعصیۃ بالشرک وقال الکلبی ومن یعص اللہ یکفرہ (مدارک)

احکام میراث کے خاتمہ پر ایسی شدید وعید کا آنا اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ کے ہاں ان احکام کی عظمت و اہمیت کس درجہ ہے

وفی ختم آیات المواریث بھذہ الآیۃ اشارۃ الی امر المیراث ولزوم الاحتیاط والتحری وعدم الظلم فیہ (روح)

اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ

یا اللہ ان کے لئے کوئی (اور) راہ نکال دے ۵۳ اور تم میں سے کوئی دو جو وہ کام کریں انھیں اذیت پہنچاؤ ۵۴

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۚ

پھر اگر دونوں توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں ۵۵ تو ان سے تعرض نہ کرو ۵۶

اور حدیث نبوی میں اور بھی وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔

احکام ظاہری فقہی کو حقیر سمجھنے والے کاش ان حقیقتوں پر نظر رکھیں!

**۵۱** (یعنی زنا کے مرتکب ہوں۔)

الفاحشة۔ فاحشة قولی وفعلی ہر بڑی برائی کے لئے عام ہے۔

الفاحشة ما عظم قبحه من الافعال والاقوال (راغب) الفعلة القبيحة (كبير)

کنایہ زنا سے بھی ہے۔

كناية عن الزنا (راغب)

اور یہاں یہی مراد لی گئی ہے۔

واجمعوا على ان الفاحشة ههنا الزنا (كبير) استعملت كثيرا فى الزنا لانه من اقبح القبائح وهو

المراد على الصحيح (روح) الفاحشة فى هذا الموضع الزنا (قرطبى)

نسآئکم۔ نساء۔ ہر عورت کے لئے عام ہے یہاں مراد بیبیاں ہیں۔

**۵۲** زنا کی ایک سزا ابتداء اسلام میں عمر قید یا دائم الحبس تھی۔

اربعة منكم۔ اربعة اول تو نصاب شہادت اس معاملہ میں دوگنا ہے یعنی جہاں مسلمان مرد یا عورت کی عزت کا سوال ہے

گواہوں کی تعداد بجائے دو کے چار ہونا چاہیے اور پھر یہ چاروں:۔ (۱) مسلم ہوں غیر مسلم نہ ہوں (۲) آزاد ہوں، غلام نہ ہوں

(۳) عاقل ہوں، فاترالعقل نہ ہوں (۴) بالغ ہوں نابالغ نہ ہوں (۵) گواہی چشم دید دیں، سماعی یا قیاسی شہادت کا لحاظ نہیں

فامسكوهن۔ یہ قید حکام یا اہل حل وعقد کے حکم سے ہونا چاہیے۔

هذا الخطاب للحكام (معالم)

فامسكوهن فى البيوت یعنی گھروں کے اندر انھیں قید یا نظربند کردو، بعض ظالموں نے جو اس سے

پردہ مراد لیا ہے انھوں نے اپنی عقل وفہم پر ظلم کیا ہے۔ فاحبسوهن فى البيوت واجعلوها سجنا عليهن۔ (بيضاوى)

**۵۳** (اپنے رسول پر وحی کے ذریعہ سے)

فقرہ خود اس پر دلالت کررہا ہے کہ گھروں کے اندر دائمی نظربندی کی سزا عارضی تھی اور آئندہ کوئی دوسری سزا تجویز

ہونے والی ہے چنانچہ کچھ روز بعد سورۃ النور میں قرآن ہی کے ذریعہ سے دوسری سزا تجویز ہوگئی یعنی زانی مرد۔ اور زانی

عورت دونوں کے لئے سو سو تازیانے۔ اور سنت رسول نے اس کی مزید تشریح یہ کی کہ یہ سزا زناء محض کی ہے اور جب

إِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيمًا ﴿١٦﴾ إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِينَ

بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے، بڑا مہربان ہے ۵۷۔ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو بس

يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ

انھیں لوگوں کی ہے جو بُری حرکت نادانی سے کر بیٹھتے ہیں ۵۸ اور پھر قریب ہی

ارتکابِ زنا سے حق شوہری کا بھی اتلاف ہو رہا ہو یعنی عورت بیاہی ہوئی ہو تو ایسے جرم کی سزا سنگساری ہے۔

وھذا کلہ قبل نزول الحدود فنسخت بالجلد والرجم والجلد فی القرآن والرجم فی السنۃ۔ (معالم)

۵۴ یعنی سزا اس جرم کے سارے ہی مجرموں کے لئے ہے کوئی طبقہ اس سے مستثنیٰ نہیں۔

بہت سی قومیں اپنے کو مُہذّب کہلانے والی آج بھی موجود ہیں، جن کے ہاں حرام کاری (جب تک کہ بہ جبر نہ ہو) سرے سے قابلِ تعزیر ہی نہیں، بہت سی قوموں میں حرام کاری صرف شادی کے بعد جُرم ہے، بن بیاہیوں اور بن بیاہوں کے لئے یہ کوئی جرم ہی نہیں آیت ان سارے غلط و گمراہ کن نظریات کی تردید کر رہی ہے۔

والذان یاتینھا میں ھا کی ضمیر فاحشۃ کی طرف ہے یعنی کوئی بھی جوڑا جو حرام کا مرتکب ہو اس عموم میں ہر طرح کے مرتکب آگئے بجز فاتر العقلوں کے الذان صیغہ تثنیہ مذکر ہے لیکن تغلیباً یہ ایک مرد اور ایک عورت کے لئے بھی آتا ہے، چنانچہ حنفیہ نے اس کو اسی معنی میں لے کر اس کا مفہوم زانی مرد اور زانیہ (عورت) کا رکھا ہے، دوسرے ائمہ نے البتہ لفظ کے معنی "دو مرد" لے کر اس کا تعلق زنا سے نہیں بلکہ لواطت سے سمجھا ہے تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی، پہلی آیت کا تعلق صرف زانیہ سے ہے، اور دوسری کا زانی و زانیہ دونوں سے۔

فاذوھما۔ اجراءِ سزا کا یہ حکم عامۃ الناس کو نہیں، صرف حکام یا اہلِ حل و عقد کو ہے۔

الخطاب ھنا للحکام۔ (روح)

۵۵ (اجرائے سزا کے بعد)

جن جرائم کی حدِ شرعی مقرر ہے، ان میں سزا کا نفاذ اسلامی حکومت میں بہرحال ضروری ہے۔

۵۶ یعنی مجرم جب سزا بھی بھگت چکا اور اب تائب بھی ہے تو اب اس پر مزید طعن و ملامت وغیرہ جائز نہیں۔

۵۷ اسلام کا خدا محدود و مقید قسم کا خدا نہیں کہ مغفرتِ ذنوب پر قادر نہ ہو اور کائنات کو ایک مشین کی طرح قانونِ مکافاتِ عمل کے ماتحت چلتا ہوا بس بیٹھا ہوا صرف دیکھ رہا ہو یا اگر مغفرت پر قادر ہے جب بھی کفارہ کا محتاج ہے ہندو مت اور مسیحیت دونوں باطل عقیدوں کی تردید آیت سے ہو گئی۔

۵۸ جو طبائع خبر سلیم ہیں اُن کے لئے ہر قسم کی بدعملی کی گنجائش آیت ماقبل سے نکل سکتی تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ سکتے تھے کہ جب توبہ قبول ہو ہی جائے گی تو پھر اطمینان سے ہم ہر قسم کے فسق و فجور میں پڑے رہ سکتے ہیں، جب مرنے لگیں گے، توبہ کر لیں گے اس خدشہ کو دور کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ قبولِ توبہ کے قیود و شرائط کو صاف کر دیا جاتا۔

السُّوٓءَ۔ لفظ جامع ہے گناہ کبیرہ اور صغیرہ دونوں کے لئے۔

(۱۷)

مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

(وقت میں) توبہ کر لیتے ہیں ۵۹ ایسے ہی لوگوں کی توبہ اللہ قبول کرتا ہے ۶۰ اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۶۱

اے المعصیة صغیرة کانت اوکبیرة (روح) ہو العمل القبیح الذی یسوء فاعلہ اذا کان عاقلاً

سلیم الفطرة کریم النفس او یسوء الناس ویصدق علی الصغائر والکبائر (المنار)

التوبة. توبہ کی حقیقت شریعت میں یہ ہے کہ ماضی پر ندامت ہو اور مستقبل کے لئے ترکِ معصیت کا عزم ہو

اور یہاں توبہ سے مُراد قبولِ توبہ ہے۔

التوبة عبارة عن الندم علیٰ مامضیٰ والعزم علی الترک فی المستقبل (کبیر) ای ان قبولها۔ (مدارک)

بجہالة. مُراد یہ ہے کہ معصیت کے ارتکاب کے وقت اس کے نتائج کا ذہن سے ذہول ہو گیا ہو اور عقل

شدتِ جذبات (یا ہوائے نفس) سے وقتی طور پر اندھی ہو گئی ہو۔

علی اللہ. بہ خلاف معتزلہ کے اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ اللہ پر حقیقةً واجب تو کوئی بھی چیز نہیں یہاں

مقصود محاورۂ عرب کے مطابق وعدہ کی تاکید ہے۔

ولیس المراد بہ الوجوب اذ لا یجب علی اللہ شیٔ ولکنہ تاکید للوعد (مدارک) لیس بایجاب موجب لہ

سلطة یوجب بہا علی اللہ تعالیٰ اللہ عن ذٰلک علواً وانما ذٰلک من جملة الکمال الذی اوجبہ تعالیٰ علیٰ نفسہ بمشیئتہ

واختیارہ وہٰذہ العبارة وامثالہا مما ظاہرہ وجوب بعض الاشیاء علی اللہ قد جاءت علیٰ طریق العرب فی التخاطب۔ (المنار)

۵۹ معصیت پر ندامت اور اس کے ترک کا عزم عملِ معصیت کے بعد جس قدر جلد بھی ہو سکے اس کا مطلوب

ہونا ظاہر ہے، اور اس میں جتنی تاخیر ہوتی جائیگی، قبولِ توبہ کے امکانات ضعیف ہی ہوتے جائیں گے۔

کلما قرب وقت التوبة من وقت اقتراب الذنب کان الرجاء اقویٰ وکلما بعد الوقت بالاصرار

وعدم المبالاة والتسویف کان الخوف من عدم القبول ہو الارجح (المنار)

لیکن شریعت نے انتہائی شفقت سے کام لے کر اس قُرب (من قریب) کی میعاد حضورِ موت سے قبل تک وسیع

کر دی ہے صحابیوں اور تابعین سے یہی مروی ہے۔

والقریب فی ما بینہ وبین ان ینظر الیٰ ملک الموت (ابن جریر عن ابن عباسؓ) کل شیٔ قبل الموت

فہو قریب (ابن جریر عن الضحاک) قال الحسن البصری ما لم یغرغر وقال عکرمة الدنیا کلہا قریب

(ابن کثیر) وہو ما قبل حضرة الموت (مدارک) قال عکرمة قبل الموت وقال الضحاک قبل معاینة ملک الموت (معالم)

دوسرے معنی یہ کئے گئے ہیں اور یہ معنی بھی لگتے ہوئے ہیں کہ قبل اس کے کہ بُرائی نفس پر چھا جائے، اور نیکیوں کو سوخت کر جائے۔

قیل معناہ قبل ان یحیط السوء بحسنات فیحبطہا۔ (معالم)

من قریب میں من تبعیض کے لئے ہے۔

معناہ التبعیض اے یتوبون بعض زمان قریب (کشاف)

۶۰ یعنی وعدۂ مغفرت مرتب ایسے ہی لوگوں کی توبہ پر ہوتا ہے۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں ہے ٦٣ جو (برابر) گناہ کرتے رہیں یہاں تک کہ موت ان میں سے کسی کے سامنے آکھڑی ہو ٦٣

قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَعْتَدْنَا

(اور تب) وہ کہنے لگے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ اُن لوگوں (کی توبہ) جو اسی حال میں مرتے ہیں کہ وہ کافر ہیں ٦٤

لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿١٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اے ایمان والو! تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم عورتوں

النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

کے جبراً مالک ہو جاؤ ٦٥ اور نہ انھیں اس غرض سے قید رکھو کہ تم نے انھیں جو کچھ دے رکھا ہے اس کا کچھ حصہ وصول کرو

فاولئك میں ف سببیہ ہے۔

الفاء للسببية اے اولٰئك الموصوفون (المنار)

٦١ سو وہ اپنی شانِ علم سے خوب جانتا ہے کہ کس کس نے دل سے توبہ کی ہے اور اپنی شانِ حکمت سے بے دل سے توبہ نہ کرنے والے کو بھی رسوا نہیں کرتا اور تائب مخلص ہو یا غیر مخلص بہرصورت اس کے لئے وہ مزید ملامت روا نہیں رکھتا۔

٦٢ یعنی ایسے لوگوں سے قبول توبہ کا وعدہ نہیں، باقی اگر او رکسی کے ساتھ محض فضل و کرم ہی کا معاملہ کرنا چاہے تو اس غفور رحیم کی راہ میں حائل ہونے کی مجال کس کو ہے؟

٦٣ (اور عالمِ برزخ اس پر منکشف ہونے لگے۔)

یعنی حالتِ نزع و سکرات شروع ہو جائے کہ اب عذاب و ملائکۂ عذاب کے مشاہدہ کے بعد جو توبہ ہوگی وہ اضطراری ہوگی اور اس لئے کسی درجہ میں بھی مقبول نہیں۔

الذین یعملون السیّاٰت۔ فقہاء نے کہا ہے کہ معصیت کا صدور اگر ایک ہی آدھ بار ہو لیکن اس سے توبہ نہ کی جائے تو اس کا شمار بھی اصرار علی المعصیت میں ہونے لگے گا، اور یہ عمل گناہِ متواتر کرتے رہنے کے حکم میں داخل ہو جائے گا۔

سیّاٰت صیغۂ جمع لانے سے یہ لازم نہیں کہ گناہوں کی مختلف قسمیں صادر ہوتی رہیں بلکہ ایک ہی معصیت کی عرصۂ دراز تک تکرار اسے صیغۂ جمع میں لانے کے لئے کافی ہے۔

جمعت باعتبار تكرر وقوعها في الزمان المديد (روح)

آیت ماقبل میں السّوٓء بہ صیغۂ واحد آیا ہے، اور یہاں السیّاٰت بہ صیغۂ جمع وارد ہوا ہے، یہ فرق قابلِ غور و لحاظ ہے، پہلی آیت میں ذکر جلد ہی توبہ کر لینے والوں کا ہے، اور اس دوسری آیت میں ذکر ان کا ہے، جو بے پروائی، نفسانیت یا ضد سے توبہ میں دیر کرتے جاتے اور اپنے مرض کو برابر بڑھاتے جاتے ہیں۔

إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِٱلْمَعْرُوفِ ۚ

بجز اس صورت کے کہ وہ صریح بدکرداری کی مرتکب ہوں ۶۶ ۔ اور بیبیوں کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کیا کرو ۶۷

۶۴ کافر کے ایمان کا مرتے وقت نامقبول رہنا تو اوپر کے فقرہ میں شامل تھا، مزید تصریح عجب نہیں کہ تاکید اور مزید تفصیح کے لئے ہو۔

۶۵ عرب جاہلیت میں میت کی جائداد کی طرح اس کی بیویاں بھی سوتیلے لڑکوں کے ورثہ میں آجاتی تھیں اور یہی دستور یونانی تمدن اور رومی تمدن کے بھی کسی کسی دور میں رہ چکا ہے (ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی) — قرآن مجید کتنے دور دراز کے پہلوؤں کو بھی سامنے رکھتا ہے، مفسر غریب یہ ہمہ گیر نظر کہاں سے لا سکتا ہے؟ عرب جاہلیت میں وارث اگر چاہتا تو اُن سے جبراً یا خود نکاح کر لیتا یا دوسرے کے نکاح میں دیدیتا ترثوا النسآء۔ میں بیویوں کے جسم کا مالک ہونا بھی آگیا اور ان کے مال و جائداد کا بھی عورتوں کے مال کے مالک ہوجانے کی تین صورتیں مفسر تھانوی نے لکھا ہے کہ عرب میں رائج تھیں، ایک یہ کہ عورت کا جو حقِ شرعی میراث میں نکل رہا ہو اسے خود لے لیا جائے اور عورت کو نہ دیا جائے، دوسرے یہ کہ عورت کو نکاح ثانی نہ کرنے دیا جائے اور جب وہ مر جائے تو اس کے مال پر خود قبضہ کر لیا جائے، تیسرے یہ کہ خاوند اپنی بیوی کو مجبور کرے کہ وہ اسے کچھ مال دے جب وہ اسے چھوڑے — دنیا بداخلاقی اور بدعملی کی کتنی مختلف صورتوں میں مبتلا تھی اور اسلام نے آکر کن کن چیزوں کی اصلاح کی ہے!

۶۶ (کہ اس صورت میں البتہ عورتوں کو قید رکھنا یا ان سے کچھ مال وصول کرنا جائز ہوگا) ایک دستور عرب جاہلیت میں یہ بھی تھا کہ مالدار بیوی کو وارث اس خیال سے کہیں نکاح نہ کرنے دیتے کہ یہ اپنا مال اپنے ساتھ لے جائے گی، یہاں تک کہ وہ مجبور و محبوس بیوہ اس کے گھر میں اپنی جان دے دیتی یا پھر اسے اپنا مال و متاع حوالہ کرکے اپنی جان چھڑاتی

مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ۔ یعنی جو چیزیں خود تم نے دی ہوں یا تمہارے قرابت والوں نے۔

فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ اس سے مراد زناکاری ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

وهو الزنا (ابن جرير عن السدى) اى الزنا (ابن جرير عن الحسن)

ابن کثیر نے یہ معنی دو صحابیوں، ابن عباسؓ و ابن مسعودؓ اور چودہ (۱۴) تابعین سے نقل کئے ہیں۔

لیکن دوسرے معنی شوہر کی نافرمانی کے بھی ائمۂ فن سے منقول ہیں۔

وهو النشوز (ابن جرير عن ابن عباسؓ) وهو النشوز (ابن جرير عن قتادة) وقال ابن عباسؓ وعكرمة والضحاك الفاحشة المبيّنة النشوز والعصيان (ابن كثير)

فیصلہ یہ ہے کہ لفظ کے اندر زناکاری اور نافرمانی دونوں ہی کے مفہوم شامل ہیں۔

كل فاحشة من بذاءة باللسان على زوجها واذى له وزنا بفرجها (ابن جرير) واختار ابن جرير انه يعم ذالك كله الزنا والعصيان والنشوز وبذاء اللسان وغير ذالك ..... وهذا اجيد والله اعلم (ابن كثير)

ويجوز ان يراد بها ما هو اعم من الامرين..... والصواب عدم تقييدها وتخصيصها باحد هذه الامور. (المنار)

خلاصہ یہ کہ سوءِ معاشرت کا سبب ان بیویوں کا پیدا کردہ نہ ہو۔

والمعنى إلا ان يكون سوء العشرة من جهتهن فقد عذرتم (كبير) اى الا ان يكون سوء العشرة من جهتهن. (كشاف)

۶۷ قرآن مجید کا یہ ایک عام اسلوبِ بیان ہے کہ جزئیاتِ احکام کے درمیان ایک کلی مسئلہ بھی بیان کر دیتا ہے اور کلیات

فَإِن كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا

اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو عجب کیا کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ اس کے اندر کوئی بڑی بھلائی رکھ

كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ

دے ٦٨ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ (دوسری) بیوی بدلنا چاہو ٦٩ اور تم اس بیوی کو (مال کا)

قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا ﴿٢٠﴾

انبار دے چکے ہو تو تم اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو ٧٠ کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اسے (واپس) لوگے ٧١

کے ضمن میں جزئیات بھی بے آتا ہے، یہاں بھی یہی ہے کہ جزئی احکام بیان کرتے کرتے اسنے ایک اہم اصل بیان کردی، عورتوں کے ساتھ معاشرت کی، حُسنِ معاشرت کا مرکزی، بنیادی، کلیدی حکم سہاگنوں، بیواؤں، طلاقنوں سب کے معاملہ میں واجب العمل ہے۔ — یہ ہدایت وہ مذہب دے رہا ہے جو کتنے ہی کور چشم معاندین کے نزدیک عورت کے حق میں ظالمانہ ہے!

٦٨ (حال یا مستقبل میں)

شکایت کرنے والے شوہروں کو صبر و تسکین قلب کے لئے اس مراقبہ سے بڑھ کر اور کون شئی مؤثر ہو سکتی ہے اور مراقبہ کی افادیت محض شوہروں تک کیوں محدود رہے، آیت کے الفاظ میں عموم ہے، ہر گلہ مند بندہ بجائے شکوۂ تقدیر کرتے رہنے کے صبر و تسلی اسی مراقبہ سے حاصل کر سکتا ہے، اللہ جس بندہ کو جس بھی تکوینی حالت میں رکھنا چاہتا ہے خود بندے ہی کی کتنی مصلحتیں اس سے معصوم رہتی ہیں۔

خیرًا کثیرًا۔ خیر کے اندر دنیوی و اخروی، عاجل و آجل ہر قسم کی فلاح اور بھلائی آگئی، اور پھر محض خیر ہی نہیں خیر کثیر، بھلائیوں کا ایک ڈھیر، ایک انبار! — تسکین دِہ اس سے بڑھ کر کون خیال ہو سکتا ہے۔

ان کرھتموھن۔ مراد وہ کراہت ہے جو طبعی طور پر یا خواہ مخواہ ہو، نہ کہ کوئی ایسا قابلِ شکایت امر جو عورت کے ارادی قصور سے پیدا ہوا ہو۔

٦٩ بلا اس کے کہ اس پہلی بی بی کا کوئی قصور ہو یعنی محض اپنی رغبت و خواہش سے تم ایک بی بی چھوڑ کر دوسری کرنا چاہتے ہو

٧٠ (اور اسی طرح اقرار کئے ہوئے مال کو روک بھی مت رکھو)

احدٰھن۔ یعنی اس پہلی بی بی کو جسے اب چھوڑ رہے ہو۔

قنطارًا۔ کے معنی مال کے انبار کے ہیں۔

(القنطار المال العظیم۔ کبیر۔ کشاف)

اس پر ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ حدیث میں تو مہر کی زیادتی کی ممانعت آئی ہے لیکن خلیفۂ راشد حضرت عمرؓ نے ایک بار مسجد میں سرِ منبر گو پہلے مہر کی زیادتی سے روکا لیکن ایک ضعیفہ کے ٹوکنے پر اس کا جواز بھی تسلیم کر لیا اور خود اس آیت سے بھی ڈھیروں مال کا جواز ثابت ہوتا ہے، سوال کا ایک مشہور جواب تو امام رازیؒ کے قلم و دماغ سے ہے یعنی آیت سے جواز کہاں ثابت ہوا، آیت نے تو محض ایک مفروض و مشروط حالت کا ذکر کیا ہے کہ اگر تم ڈھیروں مال دے چکے ہو جب بھی اس کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں، اس سے

وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ ۳ ع ۸ ۱۴

اور تم کیسے اسے (واپس) لے سکتے ہو درانحالیکہ ایک دوسرے سے خلوت کر چکے ہو اور وہ (بیبیاں) تم سے ایک مضبوط

مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ

اقرار لے چکی ہیں ۲۷۵ اور ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے

النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ

ہیں، مگر ہاں جو کچھ ہو چکا (ہو چکا) ۳۷۵ بے شک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات تھی۔

اس مفروضہ یا شرط کا صحیح ہونا تو لازم نہیں آتا، لیکن اس سے بھی صاف، دل نشین اور بے تکلف جواب ہمارے زمانہ کے امام شریعت مفسر تھانویؒ کے قلم سے نکلا ہے فرماتے ہیں کہ یہ جواز مفہوم من القرآن بمعنی صحت نفاذ ہے اور حدیث میں جواز بمعنی اباحت مطلقہ و عدمِ کراہت کی نفی ہے، پس کچھ تعارض نہیں، اور حضرت عمرؓ کا ایک اقرہ میں زیادہ مہر کے جواز کو مان لینا اس لئے تھا کہ سامعین اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں پس اس سے کراہت کا عدم ثابت نہیں ہوتا، نہ حضرت عمرؓ پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔

۱۷۵ یعنی بلا وجہ واپس لوگے تو یا تو صریح ظلم کے مرتکب ہوگے اور یا پھر بات بنانے کے لئے عورت پر کوئی جھوٹا سنگین الزام زناکاری یا نافرمانی کا لگا رکھوگے۔

۲۷۵ (نکاح کے وقت)

اور وہ عہدِ مستحکم یہی کہ تم مہر ادا کروگے۔

میثاقًا غلیظًا۔ یعنی عہد بھی کیسا، موثق و محکم۔

وصفه بالغلظ لقوّته وعظمه (کشاف) عهدًا وثيقا (مدارک)

وقد افضیٰ بعضکم الیٰ بعضٍ۔ یعنی جب انھوں نے اپنا جسم تمتّع و تلذّذ کے لئے تمہارے سپرد کر دیا تو اب مہر اُن سے واپس لینا یا اسے انھیں ادا نہ کرنا بڑی بے حمیتی بلکہ کم ظرفی کی بات ہے۔

افضیٰ۔ افضاء لغةً خلوتِ صحیحہ اور اصل عملِ صحبت دونوں کو شامل ہے جیسا کہ فرّاء لغوی وغیرہ سے منقول ہے، اور حنفیہ نے مراد خلوتِ صحیحہ لی ہے۔

افضی الی امرأته اے خلا بها (راغب) قال الكلبي الافضاء ان يكون معها في لحاف ولم يجامعها او لم يجامعها وهذا القول اختيار الفرّآء ومذهب ابي حنيفةؒ (کبیر) ذكر الفرّآء ان الافضاء هو الخلوة وان لم يقع دخول وقول الفرّآء حجّة فيما يحكيه من اللغة (جصاص) اے خلا بلا حائل (مدارک)

اور فقہائے امامیہ کے دو قولوں میں سے ایک قول یہی منقول ہے۔

وهو احد قولين للامامية (روح)

حنفیہ کے ہاں مہر خلوتِ صحیحہ ہی پر واجب ہو جاتا ہے۔

وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَ

اور بہت برا طریقہ تھا ۲۷ تمہارے اوپر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور

عَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ

تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں

وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ

دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیبیوں کی مائیں اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو تمہاری

حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ

پرورش میں رہتی ہیں اور جو تمہاری ان بیبیوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے لیکن اگر ابھی تم نے ان بیبیوں سے

بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ

صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں ان کی بیبیاں

والاٰية حجة لنا فى الخلوة الصحيحة انها تؤكد المهر. (مدارک)

۲۷۳ یعنی اس حکم کے نزول سے قبل جو ہو چکا، اب اس پر باز پرس نہیں۔

اى قبل نزول اٰية التحريم فانه معفو عنه (کبیر)

لا تنکحوا۔ نکاح عقدِ تزویج کے معنی میں تو ظاہر ہی ہے لیکن یہاں اس سے وسیع تر لغوی مفہوم مطلق صحبت کرنے کا لیا گیا ہے۔

فيه تحريم وطئ موطوئة الاٰب بنكاح او بملك يمين او بزنا كما هو مذهبنا وعليه كثير من المفسرين. (مدارک)

ما نکح اٰباءکم۔ عرب جاہلیت کے اس دستور کی طرف اشارہ ہے کہ سوتیلی ماؤں سے بھی نکاح کر لیا جاتا تھا اور مدینہ میں یہ دستور زیادہ تھا۔

قال ابن عباسؓ وجمهور المفسرين كان اهل الجاهلية يتزوجون ازواج اٰبائهم (کبیر)

وكانت هٰذه السيرة فى الانصار لازمة، وكانت فى قريش مباحة مع التراضى. (قرطبی)

ما نکح میں ما مَن کے معنی میں ہے۔

ما بمعنى مَن (جلالین) وتكون "ما" بمعنى "الذى" و"من" والدليل عليه ان الصحابة تلقت الاٰية على ذلك المعنى (قرطبی)

اٰباءکم۔ اس کے ذیل میں وہ بیویاں بھی آ گئیں جو دادا یا نانا کے نکاح میں رہ چکی تھیں۔

واسم الاٰباء ينتظم الأجداد (روح) والاٰباء هنا يشمل الاب ومن قبله من عمود النسب. (نہر)

۲۷۴ قرآن مجید نے تین لفظ استعمال کئے ہیں اور تینوں سے الگ الگ اشارے ہیں۔

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۲۳

اور یہ بھی (حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو یکجا کرو مگر ہاں جو ہو چکا (ہو چکا) بے شک اللہ بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۷۵

فاحشۃ۔ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز تھا۔

مقتاً۔ مذاقِ سلیم رکھنے والوں کے عُرف میں بڑی بے حیائی کی چیز تھا مقت کہتے ہیں ایسی بری چیز کو جسے دیکھ ہی کر طبیعت میں گھن یا کراہت پیدا ہو۔

المقت بغض شدید لمن تراہ تعاطی القبیح۔ (راغب)

خود اہل جاہلیت بھی اس نکاح کو بہت بُری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا۔

ساءَ سبیلا۔ یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح تھے۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ قبح کے تین درجے ہوتے ہیں، ایک قبح عقلی، دوسرے قبح شرعی، تیسرے قبحِ عُرفی۔ فاحشۃ میں اشارہ اول کی جانب ہے مقتاً میں دوم کی جانب ساءَ سبیلا میں سوم کی طرف۔

**۷۵** (اس لئے جو غلطیاں نزولِ حکم سے قبل ہو چکیں، ان پر وہ گرفت نہیں کرتا، اور ان پر وہ خط عفو کھینچ دیتا ہے)

قرآن مجید نے یہاں ایک مفصل فہرست دے کر بتا دیا کہ ان ان عزیزوں سے مطلقاً یا فلاں فلاں صورتوں میں نکاح حرام ہے، اور یہ فہرستِ محرمات قرآن مجید کی کاملیت کے دلائل میں سے ایک قوی دلیل ہے، موجودہ انجیل اور خدا معلوم کتنی نام نہاد آسمانی کتابوں میں تعلیم کا یہ ورق سرے سے سادہ ہی چھوٹ گیا ہے اور ان کے پیرو اس باب میں صاف و واضح تعلیم سے محروم ہیں۔

اُمّھٰتکم۔ تمہاری مائیں اور اسی طرح ماں کی مائیں، دادیاں، نانیاں وغیرہا۔

والجدۃ من قبل الام والاب ملحقۃ بھن (مدارک) والام حقیقۃ ھی الوالدۃ وفی معناھا کل امرأۃ رجع نسبك الیھا بالولادۃ من جھۃ أبیك أو من جھۃ أمك (نھر) الأمھات جمع أم ویدخل فیہ الجدات وان علون من قبل الأم ومن قبل الاب (معالم)

بنٰتکم۔ تمہاری بیٹیاں اور اسی طرح بیٹیوں کی بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں وغیرہا۔

وبنات الابن وبنات البنت ملحقات بھن (مدارک) وفی معناھا کل انثی رجع نسبھا الیك بالولادۃ بدرجۃ او درجات باناث اوذکور (نھر) ویدخل فیھن بنات الاولاد وان سفلن (معالم)

اخوٰتکم۔ اس میں حقیقی کے علاوہ سوتیلی بہنیں بھی آگئیں۔

لاب واُم اولاب اولاُم (مدارک) الاخت المحرمۃ کل من جمعك وایاھا صلب او بطن (نھر) سواء کانت من قبل الاب والاُم او من قبل احدھما۔ (معالم)

عمّٰتکم۔ اس باب میں باپ کی اور باپ سے اوپر والوں کی بہنیں آگئیں۔

من الاوجہ الثلاثۃ۔ (مدارک)

خٰلٰتکم۔ اس میں ماں کی اور ماں سے اوپر والوں کی بہنیں آگئیں۔

من الاوجہ الثلاثۃ (مدارک)

بنٰت الاخ۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھتیجیاں۔

کذٰلک۔ (مدارک)

بنات الاخت۔ یعنی سگی اور سوتیلی بھانجیاں کذٰلک (مدارک)

اُمّھٰتکم الّتی ارضعنکم۔ خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید دودھ پلائیوں کو ماں کے لقب سے یاد کر رہا ہے کیا حد ہے اس رعایت حقوق کی!

اخواتکم من الرضاعۃ۔ رضاعت کے اوقات گو مختلف ہوں، مگر دودھ ہو ایک ہی ماں کا۔

امّھات نسائکم۔ اس میں بی بی کی نانیاں، پرنانیاں وغیرہ بھی آگئیں اُن کی حرمت محض عقد سے لازم آجاتی ہے۔

وھی محرّمات بمجرد العقد۔ (کشاف)

ربائبکم۔ اس میں بیوی کی بیٹیوں کے علاوہ نواسیاں وغیرہ بھی آگئیں۔

فی حجورکم۔ لفظی معنی ہیں کہ "تمھاری گودوں میں ہوں" مراد ہے تمھاری تربیت و پرورش میں ہونا، یہ محض عام عادت و عُرف کا بیان ہے کوئی قید یا شرط نہیں۔

ذکرا لحجر علی غلبۃ الحال دون الشرط (مدارک)

من نّسائکم الّتی دخلتم بھنّ۔ یعنی ماں سے مجرد نکاح اس کی بیٹی کی حرمت کے لئے کافی نہیں، حرمت کے لئے ماں سے صحبت کا ہو چکنا ضروری ہے۔

دخلتم بھنّ۔ اصلاً کنایہ تو صرف صحبت سے ہے۔

وھی کنایۃ عن الجماع۔ (بیضاوی۔کشاف)

لیکن حنفیہ نے لمس شہوانی اور بوس و کنار کو بھی اسی حکم میں داخل کیا ہے اور امام مالکؒ و امام شافعیؒ اور بہت سے ائمہ فقہ اس میں حنفیہ کے ہمراہ ہیں۔

واللمس ونحوہ یقوم مقام الدخول (مدارک) ھو التمتع من اللمس والقبل قال المالک وابوحنیفۃ (ابن العربی)

واتفق اصحابنا والثوری ومالک واوزاعی واللیث والشافعی ان اللمس بشھوۃ بمنزلۃ الجماع فی تحریم اُمّ المرأۃ وبنتھا (جصاص) الجماع ھو الاصل ویحمل علیہ اللمس لانہ استمتاع مثلہ ویدخل تحت عمومہ (ابن العربی)

حنفیہ و مالکیہ نے علاوہ لمسِ شہوانی کے شہوانی نظر کو بھی سبب تحریم قرار دیا ہے۔

قال اصحابنا جمیعاً اذا نظر الی فرجھا بشھوۃ کان ذالک بمنزلۃ اللمس فی ایجاب التحریم (جصاص) وقال مالک اذا نظر الی شعر جاریتہ تلذّذاً او صدرھا او ساقھا او شیٔ من محاسنھا تلذّذاً حرمت علیہ امّھا وبنتھا (جصاص) واما النظر فانہ فی الدرجۃ الثالثۃ شبّہ فی الزنا ذریعۃ الذریعۃ (ابن العربی)

فلا جناح علیکم یعنی ایسی غیر مدخول بہا بیوی کی بیٹی سے نکاح کر لینے میں مضائقہ نہیں۔

من اصلابکم۔ یہ صلب یا نسل کی قید اس لئے لگادی کہ متبنّٰی یا محض مُنہ بولے بیٹوں کی بیبیاں اس میں شامل نہ ہو جائیں جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا۔

دون من تبنّیتم۔ (کشاف)

ان تجمعوا بین الاختین۔ بہنیں خواہ حقیقی ہوں یا رضاعی اُن کا نکاح میں جمع کرنا حرام ہے۔

جن آسمانی کتابوں کے صفحے ان ضروری فقہی ہدایتوں سے خالی ہیں، وہ خود اپنی جگہ انصاف کریں کہ وہ عالمگیر اور آفاقی مذہب کا سرچشمہ ہونے کے کہاں تک قابل ہیں!

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور وہ عورتیں بھی (حرام کی گئی ہیں) جو قیدِ نکاح میں ہوں بجز ان کے جو تمہاری مِلک میں آجائیں۶۶

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا

اللہ نے فرض کر دیا ہے (ان احکام کو) تم پر اور جو ان کے علاوہ ہیں وہ تمہارے لئے حلال کر دی گئی ہیں۶۷ یعنی تم

بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ

انھیں اپنے مال کے ذریعہ سے تلاش کرو (اس طور پر کہ) قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے۶۸

۶۶ (بہ طور کنیز شرعی)

اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ یعنی ایسی بیاہی ہوئی عورتیں جو اب مسلمانوں کے قید میں جہاد کے بعد آگئی ہیں اُن کی ازواج بن سکتی ہیں باوجود اس کے کہ اُن کے شوہر زندہ اور دار الحرب میں موجود ہیں، ان کا وہ نکاح کافرانہ دار الاسلام میں ان کے مسلمانوں کے مِلک میں جانے سے مانع نہیں ہو سکتا۔

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ کے لئے ملاحظہ ہو پ۴، حاشیہ ۱۲ آیت ۳ کے تحت۔

لفظی معنی ہیں "وہ جن کے مالک تمہارے دونوں ہاتھ ہو جائیں" مراد شرعی کنیزیں ہیں۔

اَلْمُحْصَنٰتُ۔ احصان کے معنی ہیں روک میں آجانا، قید میں آجانا۔

الاحصان هو ان يحمى الشئ ويمنع منه (ابن قتيبه) الاحصان فى اللغة المنع۔ (كبير)

مُحْصَنٰتٌ کے معنی ہوئے قید میں آجانے والیاں، مراد شادی شدہ عورتیں ہیں، عقدِ نکاح کو قید سے تعبیر کرنے سے یہ اشارہ نکلا کہ ازدواج خود محافظِ عفت ہے۔

اى هن النساء ذوات الازواج لان الازواج احصنوهن ومنعوا منهن (ابن قتيبه) المحصنت المزوّجات تصوّرًا انّ زوجها هو الذى احصنها (راغب) والمراد بالاحصان هنا العفّة (روح)

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے اب دوسرا نکاح حرام ہے۔ یہ تو عام قاعدہ ہوا، استثناء اس سے شرعی کنیزوں کا ہے جو کافر شوہروں کی زوجیت سے آئی ہیں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ کا عطف نحوی اعتبار سے ان محرمات پر ہے جو قبل میں مذکور ہو چکے۔

عطف على المحرمات المذكورات قبل۔ (قرطبى)

یعنی حرام ہے نکاح فلاں فلاں رشتہ دار عورتوں سے اور ہر اُس عورت سے جو کسی کے نکاح میں ہو۔

۶۷ نظامِ خانگی ہی کی درستی پر ساری ہیئتِ اجتماعی کی درستی کا انحصار ہے اور نظامِ خانگی کا ایک بڑا اہم جزیہ ہے کہ عقدِ نکاح کس کس کے ساتھ جائز ہے اور کس کس کے ساتھ ناجائز، ضروری تھا کہ اس کے اصول قرآن مجید ہی میں محفوظ کر دیے جاتے۔

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ تاکید و اظہارِ اہمیت کے لئے ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ

پھر جس مال کے عوض تم نے بعض عورتوں سے لطف اٹھایا ہے، سو انھیں ان کے طے شدہ مہر دے دو، اور تم پر اس مقدار کے

عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا (۲۴)

بارے میں کوئی گناہ نہیں جس پر تم آپس میں مہر طے ہو جانے کے بعد رضامند ہو جاؤ ۹۵ بے شک اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے ۹۶

اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ۔ حدیث و سُنّت سے جن دوسری عورتوں سے حُرمتِ نکاح ثابت ہے، مثلاً رضاعی بہنوں کے ساتھ، یا پھوپھی اور بھتیجی کا جمع کرنا، یا خالہ اور بھانجی کا جمع کرنا، تو یہ سب بھی قرآن مجید کی آیاتِ بالا میں آ گئیں، لیکن حدیث نے انھیں صاف اور کھول کر بیان کر دیا ہے۔

لانّ تحریم من ذکر داخل فی ما تقدم بطریق الدلالۃ کما مرت الیہ الاشارۃ عن بعض المحققین وبعد تخصیص ھذا العموم بالکتاب والسنۃ مشھور۔ (روح)

كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔ تقدیر کلام یوں مانی گئی ہے اور یوں بھی کہ:

الزموا ما کتب اللہ علیکم (معالم) کتب اللہ علیکم کتابا (مدارک) ای کتب اللہ علیکم تحریم ھؤلاء کتابا (روح)

۹۵ یعنی مقصود فرد و جماعت دونوں کے نزدیک یہ ہے کہ زوجین نکاح کے ذریعہ سے پاک و منزّہ، باعفت، مستقل زندگی بسر کریں گے

المراد بالاحصان ھنا العفۃ وتحصین النفس عن الوقوع فی ما لا یرضی اللہ تعالیٰ (روح) معناہ متعففین عن الزنا (قرطبی)

اور نکاح کی شرطیں معلوم و معروف ہیں، مثلاً میاں بیوی دونوں کا اعلانِ رضامندی کم سے کم دو گواہوں کے سامنے یا عقدِ نکاح کا موقّت نہ ہونا وغیرہا۔

غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ یعنی مقصود حیوانات کی طرح تمام تر ایک مادّی شہوت یا جنسی تقاضہ کا پورا کرنا نہ ہو، بیوی کے ساتھ مستقل تاہّل، رہنے سہنے نباہ کرنے کا ارادہ اور اس کی وقعت و محبت کسی درجہ میں تو ہو۔

تبتغوا باموالکم۔ مال سے مراد مہر ہے، یا ملکِ یمین کی قیمت۔

ان تبتغوا النساء باموالکم بالصرف فی مھورھن (بیضاوی) ای تنکحوا بصداق او تشتروا بثمن (معالم) یعنی المھور (مدارک)

فقہاء نے یہیں سے استدلال کیا ہے کہ مہر نکاح کا لازمی جزو ہے گو تعدادِ مہر معیّن نہ ہو۔

وفیہ دلیل علی ان النکاح لا یکون الا بمھر وانہ یجب وان لم یسم (مدارک)

مہر کی بار بار تاکید سے ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی کو عورتوں کے حقوق کا کس درجہ اہتمام مطلوب ہے۔

نفس خرچ نکاح و سفاح دونوں میں مشترک رہتا ہے، فرق یہ ہے کہ نکاح سے زندگی انسانوں کی طرح مقیّد و پابند ہو جاتی ہے اور سفاح میں انسان جانوروں کی طرح بے مہار چھوٹا ہوا رہتا ہے۔

تبتغوا۔ بغی کے معنی تلاش کرنے، طلب کرنے کے ہیں اور حکم کے مخاطب مرد ہیں، گویا نکاح کی درخواست کرنا، یا انگریزی محاورہ میں (پروپوز) کرنا مرد کا کام ہے، عورت کا کام صرف قبول کرنا، منظوری دینا ہے، نر و مادہ کے درمیان

یہ فاعلیت وانفعالیت کا فرق زندگی کے ہر شعبہ پر محیط وحاوی ہے۔

**۷۹** یعنی تعداد مہر ایسی شے نہیں، جو ایک مرتبہ بندھ جانے کے بعد پھر کسی طرح قابل تبدیل نہ ہو میاں بیوی باہمی رضامندی سے اُسے گھٹا سکتے ہیں، بڑھا سکتے ہیں یا بالکل معاف بھی کر سکتے ہیں۔

مِنْهُنَّ۔ مِنْ یہاں بیانیہ بھی لیا گیا ہے اور تبعیضیہ بھی۔

یحتمل ان یکون تبعیضاً وقیل یحتمل ان یکون للبیان (بحر) بیانیۃ او تبعیضیۃ (روح)

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ یعنی ان عورتوں کی صحبت سے لطف اٹھایا ہے، لذت حاصل کی ہے۔

الاستمتاع التلذذ (قرطبی) یعنی دخلتم بھن والاستمتاع ھو الانتفاع وھو ھھنا کنایۃ عن الدخول (جصاص)

اجر سے مراد مہر ہے۔

الاجور المھور (قرطبی) اجورھن ای مھورھن (معالم۔ بیضاوی)

استمتاع سے مراد نکاحی بیویوں سے لطف اُٹھانا تو ظاہر ہی ہے، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں لیکن اسی لفظ کے تحت ایک نزاعی بحث مُتعہ کی بھی چھڑ گئی ہے اور سوال یہ اٹھا ہے کہ آیا اس سے مراد متاعی بیویاں بھی ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ مسلک اہل سنت میں اب مُتعہ نکاح کی کوئی شرعی قسم نہیں اور اس لئے یہ عمل بالکل ناجائز ہے البتہ فقہ امامیہ میں جائز ہے، اور کچھ اقوال اس کی تائید میں ہمارے قدماء کے ہاں بھی مل جاتے ہیں۔

مُتعہ ایک طرح کا نکاح موقّت یا عقد عارضی ہے، مرد، عورت کو اپنی زوجیت میں اس شرط کے ساتھ لاتا ہے کہ فلاں رقم کے معاوضہ میں فلاں مدت تک یہ تعلق باقی رہ کر از خود ختم ہو جائے گا، نہ اس کے لئے طلاق کی ضرورت ہوگی اور نہ کوئی حق وراثت قائم ہوگا۔

ھو النکاح الی اجل معین (نہایۃ) ومتعۃ النکاح ھی ان الرجل کان یشارط المرأۃ بمال معلوم یعطیھا الی اجل معلوم فاذا انقضی الاجل فارقھا من غیر طلاق (راغب) لیس بینھما میراث لیس یرث واحد منھما صاحبہ (ابن جریر) ھو ان ینکح امرأتہ الی مدۃ معلومۃ بشئ معلوم فاذا انقضت تلک المدۃ بانت منہ بغیر طلاق ویستبرئ رحمھا ولیس بینھما میراث (خازن) وصورۃ المتعۃ اذ یقول اتمتع بک کذا مدۃ ھکذا من المال۔ (شرح وقایہ)

استمتاع سے اگر مراد صرف وہ لطف لیا جائے جو نکاح صحیح سے حاصل ہوتا ہے، جب تو آگے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور بیشتر صحابہ اور مفسرین نے یہی پہلو اختیار بھی کیا ہے لیکن بعض اجل صحابہ (مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ) کی قرأت میں اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی بھی منقول ہے۔

عن عمیر ان ابن عباس قرأ فما استمتعتم بہ منھن اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (ابن جریر) فی قرأۃ ابی فما استمتعتم بہ منھن الی اجل مسمّی وکذلک قرأ ابن عباس وابن مسعود رضی اللہ عنھم (روح) وکان ابن عباس وابی بن کعب وسعید بن جبیر والسدی یقرؤن فما استمتعتم منھن اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (ابن کثیر)

اور اسی لئے ابن عباسؓ اور بعض اکابر تابعین مثلاً مجاہد، سدی اس سے مراد عقد متعہ لیتے تھے، اور عمران بن حصین صحابی تو اور آگے بڑھ گئے تھے۔

قال آخرون ھو نکاح المتعۃ (معالم) وقد استدل بعموم ھذہ الآیۃ علی نکاح المتعۃ (ابن کثیر) قال ابن عباس ومجاھد والسدی وغیرھم الآیۃ فی نکاح المتعۃ (بحر) وھذا القول مروی عن ابن عباس وعمران ابن الحصین اما

عمران بن الحصین فانه قال نزلت اٰیة المتعة فی کتٰب اللّٰہ تعالیٰ لم ینزل بعدھا اٰیة تنسخھا وامرنا بھا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم وتمتعنا بھا ومات ولم ینھنا عنھا (کبیر) وروی عن ابن عباس جواز نکاح المتعة مطلقاً۔ (بحر)

اور عمران بن حصین رضؓ کے علاوہ خود حضرت علی رضؓ کے بھی ایک قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متعہ عہد رسالت میں بلکہ اس کے بعد بھی عرصہ تک جائز رہا ہے اور اس کی حرمت صرف حضرت عمر رضؓ کے ایک حکم سے قرار پائی ہے۔

وقال علیؓ لولا عمر نھی عن المتعة ما زنی الا شقی۔ (ابن جریر)

حضرت ابن عباس رضؓ آیت کو منسوخ نہیں محکم قرار دیتے تھے اور انھیں کی سند پر بعض صحابہ بعض اہل بیت، مجاہد تابعی اور مکہ و یمن کے مفتیوں نے اس کے جواز کا فتوی دے رکھا تھا۔

وقال ابوبکر الطرسوسی المر یرخص فی نکاح المتعة الا عمران بن حصین وابن عباس وبعض الصحابة و طائفة من اھل البیت..... وقال ابوعمر اصحاب ابن عباس من اھل مکة والیمن کلھم یرون المتعة حلالا علی مذھب ابن عباس (قرطبی) وکان یذھب ابن عباس الی ان الاٰیة محکمة وترخص فی نکاح المتعة (معالم) قال مجاھد نزلت فی نکاح المتعة (ابن کثیر) واشتھر عن ابن عباس تحلیلھا وتبع ابن عباس علی القول بھا اصحابه من اھل مکة واھل الیمن (بدایة المجتھد) واشتھر عن ابن عباس تحلیلھا وتبعه علی ذالک اکثر الصحابة من اھل الیمن ومکة (معدن الحقائق عینی) وکان ابن عباس یتاول قوله تعالی علی متعة النساء (جصاص)

بلکہ بعض اکابر حنفیہ مثلاً امام سرخسی صاحبِ "مبسوط" اور علامہ مرغینانی صاحبِ "ہدایہ" کے ہاں تو قول جواز ائمہ اربعہ میں امام مالکؒ کی جانب منسوب ملتا ہے۔

ھذا باطل عند نا جائز عند مالک بن انس (المبسوط، سرخسی) ونکاح المتعة باطل..... وقال مالک ھو جائز (ھدایة)..... خلاف مالک وھو جائز عندہ (کفایة) وقال مالک ھو جائز لانه کان مشروعا (معدن الحقائق عینی)

لیکن امام مالکؒ کی جانب اس نسبتِ جواز پر بڑی قیل و قال ہوئی ہے بعض اکابر حنفیہ نے جن میں پیش پیش ہدایہ کے نامور شارح ابن ہمام نے اس انتساب کو غلط ٹھہرایا ہے۔

النسبة الی مالک غلط (فتح القدیر) ونقل الحل عن مالک لا اصل له (روح)

اور بڑی بات یہ ہے کہ خود مالکیہ کی کتابوں سے بھی اس فتوی کے جواز کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ براہ راست یا بالواسطہ اس کی مخالفت ہی نکلتی ہے

یعنی النکاح الصحیح (ابن العربی) واما متعة النساء فھی من غرائب الشریعة لانھا ابیحت فی صدر الاسلام .... ثم حرمت بعد ذالک استقر الامر علی التحریم (ابن العربی) والانکحة التی ورد النھی فیھا اربعة نکاح منھا المتعة (بدایة المجتھد) تواترت الاخبار عن رسول اللّٰہ صلعم بتحریمه۔ (بدایة المجتھد)

سب سے بڑھ کر یہ خود حدیث نبوی میں اس کی صاف ممانعت آچکی ہے۔

صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث، سبرہ بن معبد جہنی سے نقل ہوئی ہے جس کے آخر میں حضور کا یہ ارشاد موجود ہے:۔

| | |
|---|---|
| یایھا الناس انی کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللّٰہ تعالیٰ قد حرم ذالک الی یوم القیامة فمن کان عندہ منھن شیء فلیخل سبیله ولا تاخذوا مما اٰتیتموھن شیئا | اے لوگو! میں نے تمھیں اجازت دے رکھی تھی عورتوں سے متعہ کر لینے کی لیکن اب اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے سو جس کسی کا عمل اس پر ہو وہ اب اس سے باز آجائے اور جو کچھ تم نے ان عورتوں کو دے رکھا ہے وہ ان سے واپس نہ لو۔ |

دوسری حدیثیں بھی بخاری، مسلم، نسائی وغیرہ میں نقل ہوئی ہیں، حاصل ان کا بھی یہی حکمِ حُرمتِ مُتعہ ہے۔
اسی لئے ابن عباس رضؓ سے رجوع فتوائے جواز سے منقول ہے۔

وقیل عنه بجوازها عند الضرورة والاصح عنه الرجوع الی تحریمها (بحر) وابن عباس صح رجوعه الی قولهم (هدایة) قیل ابن عباسؓ رجع عن ذلك (معالم)

اور اب فقہائے اہلِ سنّت کا حُرمتِ متعہ پر اتفاق ہے، اور ان کے سارے مفسرین نے یہی شق اختیار کی ہے، اختلاف صرف فرقۂ امامیہ تک محدود رہ گیا ہے۔

واحتج الجمهور علی حرمة متعة بوجوه (کبیر) وبالجملة الاستدلال بهذه الأیة علی حل المتعة لیس بشیء کما لایخفی ولاخلاف الأن بین الائمة وعلماء الامصار الا الشیعة فی عدم جوازها (روح) وهذه الأیة تدل علی الحل والقول بانها نزلت فی المتعة غلط وتفسیر البعض بها بذلك غیر مقبول لان نظم القرآن الکریم یاباه (روح) واتفق علی تحریمها فقهاء الامصار (بحر) والی هذا ذهب جمهور العلماء من الصحابة فمن بعدهم ای ان نکاح المتعة حرام والأیة منسوخة (خازن) وقال ابوعبید المسلمون الیوم یجمعون علی ان متعة النساء قد نسخت بالتحریم نسخها الکتاب والسنة هذا قول اهل العلم جمیعا من اهل الحجاز والشام والعراق من اصحاب الاثر والرای وانه لارخصة فیها لمضطر ولالغیره (خازن) وفی الباب اخبار کثیرة مرویة فی الصحاح والمسانید ولاحجة بعدها فی جوازها لاحد کائنا من کان (عمدة الرعایة)

اور جنھوں نے اس مذہب کے لئے صحابہ کے اجماعِ عام کا دعویٰ نہیں کیا ہے، انھوں نے بھی اسے مذہبِ "جمہور" اور مسلکِ "کثیر" صحابہ اور فتویٰ "عام" اہلِ علم تو بہرحال بتایا ہے۔

واکثر الصحابة وجمیع فقهاء الامصار علی تحریمها (بدایة المجتهد) والی هذا ذهب عامة اهل العلم ان نکاح المتعة حرام والأیة منسوخة (معالم) وفی هذه الأیة قولان احدهما وهو قول اکثر علماء الامة ان المراد منه ابتغاء الناس بالاموال علی طریق النکاح (کبیر) وسائر العلماء والفقهاء من الصحابة والتابعین والسلف الصالحین علی ان هذه الأیة منسوخة وان المتعة حرام ..... وحرمها سائر الناس (قرطبی)

مفسروں میں اس باب میں بہترین کلام احکام القرآن (جصاص) و روح المعانی میں ملے گا، اور پھر خازن میں۔
تاریخی روایتوں اور حدیثوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنگ یا طویل سفر کے موقع پر عقدِ موقت یا عارضی نکاح کی یہ صورت مجرد بیاہیوں کے لئے حسبِ ضرورت و مصلحت ایک بار یا چند بار جائز کردی گئی تھی اور بعض صحابہ اسی خیال میں عرصہ تک رہے، باقی مستقل حکم وہی عدمِ جواز ہی کا ہے۔
ابن مسعود صحابی جلیل کی یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں نقل ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| کنا نغزو مع النبی صلعم لیس معنا نساء فقلنا الا نختصی فنهانا عن ذلك ثم رخص لنا ان نستمتع۔ | ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں تھے اور بیویاں ہمارے ساتھ نہ تھیں تو ہم لوگوں نے کہا کہ کیا اپنے کو ہم آختہ کر ڈالیں تو رسول اللہ نے ہم کو اس سے روکا پھر ہمارے لئے متعہ کی اجازت دیدی گئی۔ |

اور یہ روایت بھی سلمہ بن اکوع کے حوالہ سے صحیحین میں نقل ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| رخص النبی صلعم عام اوطاس فی المتعة ثلاثا ثم نهی عنه۔ | رسول اللہ صلعم نے غزوۂ اوطاس کے سال میں متعہ کی اجازت تین بار دیدی تھی مگر اس کے بعد اس کی ممانعت کردی۔ |

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ

اور تم میں سے جو کوئی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ آزاد مومنات سے نکاح کر سکے ۸۱ تو وہ تمہاری (آپس کی) مسلمان کنیزوں

مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۚ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِكُمْ ۚ

سے جو تمہاری ملک (شرعی) میں ہوں (نکاح کرے) ۸۲ اور اللہ تمہارے ایمان (کی حالت) سے خوب واقف ہے ۸۳

اور صحیحین نے اور بعض ارباب سنن نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے :-

قال لابن عباس ان رسول اللہ صلعم نھی عن متعۃ النساء یوم خیبر۔

کہ آپ نے حضرت ابن عباسؓ سے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر متعہ سے ممانعت کر دی۔

چنانچہ اب بجز فرقۂ امامیہ کے سب کا اتفاق اس کی حرمت پر ہے۔

قد کان مباحا فی اول الاسلام ثم حرم وھو الآن جائز عند الشیعۃ (نہایہ)

قول فیصل محدث حازمی کا ہے جسے ابن ہمام نے فتح القدیر میں اور آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں نقل کیا ہے :-

قال الحازمی انہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن اباحھا لھم وھم فی بیوتھم واوطانھم انما اباحھا لھم فی اوقات الضرورۃ حتی حرمھا علیھم فی اخر سنتہ فی حجۃ الوداع وکان تحریم تابید لاخلاف فیہ من الائمۃ وعلماء الامصار الاطائفۃ من الشیعۃ۔

حازمی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے متعہ کو لوگوں کے لئے جائز نہیں کیا کہ وہ اپنے وطن یا گھروں میں بیٹھے ہوں، آپ نے اسے صرف ضرورت ہی کے موقعوں پر جائز کیا ہے اور پھر اپنی آخر عمر میں حجۃ الوداع کے موقع پر اسے ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے دیا، چنانچہ اس بارے میں ائمہ اور ملک کے علماء میں کسی کو بھی اختلاف نہیں بجز شیعوں کے ایک فرقہ کے۔

۸۰ عَلِیْمًا اور حَکِیْمًا۔ یہ دو صفات باری، قانونی احکام کے موقع پر اکثر بیان ہوئی ہیں یہاں بھی انھیں لا کر یہ یاد دلا دیا کہ اللہ کا علم کامل بھی ہے اور بندوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں پر محیط بھی اور اسی علم کامل ومحیط کے لحاظ سے اس نے قانون اور ضابطے بھی حکیمانہ مقرر کئے ہیں، کوئی انسان تمدن کے کسی دور میں اپنی حماقت سے یہ زعم نہ کر بیٹھے کہ میں شریعت الٰہی کے کسی جزئیہ میں کوئی مناسب ترمیم اپنی رائے سے کر سکتا ہوں۔

حضرت ابن عباسؓ سے تفسیر یہ منقول ہے کہ وہ علیم ایسا ہے کہ ہمارے اضطرار پر نظر کر کے اس نے متعہ کو حلال کر دیا تھا، اور حکیم ایسا کہ اپنی حکمت کاملہ کے تقاضہ سے اسے حرام بھی قرار دے دیا۔

علیما فی ما احل لکم المتعۃ وحکیما فی ما حرم علیکم المتعۃ ویقال علیما باضطرارکم الی المتعۃ وحکیما فی ما حرم علیکم المتعۃ (تنویر المقیاس)

۸۱ یعنی آزاد، شریف بیویوں کا مہر، نفقہ وغیرہ، پوری طرح ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔

اَلْمُحْصَنٰت سے یہاں مراد شریف آزاد بیویاں ہیں۔

ای الحرائر (معالم) یرید الحرائر وقالت فرقۃ معناہ ..... العفائف وھو ضعیف (قرطبی)

بَعۡضُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ‌ۚ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰ تُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ

تم (سب) آپس میں ایک ہو ۵۸۴ سو ان کے مالکوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لیا کرو ۵۸۵ اور ان کے مہر انھیں

بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَيۡرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ‌ ۚ

دیدیا کرو دستور کے موافق ۵۸۶ اس طرح کہ وہ قیدِ نکاح میں لائی جائیں نہ کہ مستی نکالنے والیاں ہوں اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں ۵۸۷

طول کے معنی وسعت و مقدرت کے ہیں۔

الطول السعة والغنیٰ قاله ابن عباس والمجاهد وسعید بن جبیر والسدی وابن زید (قرطبی)

۵۸۲ (اور کنیز کو بیوی بنا لینے میں عار محسوس نہ کرے)

یہ مشورہ اس مصلحت سے دیا گیا ہے کہ باندی کا مہر، نفقہ وغیرہ نسبۃً ہلکا ہوتا ہے اور پھر یہ بھی کہ ان کے مالک انھیں غریب شوہروں کے نکاح میں دے دینے میں عار بھی محسوس نہ کریں گے۔

فَتَیٰتِکُمۡ۔ فتاۃ کا لفظ جب باندیوں کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس میں جوان عمر کی قید باقی نہیں اور بوڑھی جوان ہر سن و سال کی باندیاں فتیات ہی کہی جائیں گی۔

العجوز الحرة لا تسمّی فتاة والامة الشابة والعجوز کل واحدة منهما تسمّی فتاة (جصاص) ای اماءکم (راغب) ای المملوکات وهی جمع فتاة (قرطبی)

فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ حنفیہ کے ہاں کنیز کتابیہ سے بھی نکاح جائز ہے اور آیت میں مومنات کی قید محض استحبابی ہے۔

ونکاح الامة الکتابیة یجوز عندنا والتقیید فی النص للاستحباب۔ (مدارک)

۵۸۳ (اور ایمان ہی معیار و مدار فضیلت ہے)

پھر کوئی آزاد کیوں بہ وقت ضرورت کسی باندی سے عقد کرنے میں عار محسوس کرے۔

فقہاء مفسرین نے آیت سے ظاہر ایمان کے قبول کرنے پر استدلال کیا ہے نیز اس پر کہ ایمان تصدیقِ قلب کا نام ہے نہ کہ اقرار زبانی کا

فیه تنبیه علی قبول ظاهر ایمانهن ودلیل علی ان الایمان هو التصدیق دون عمل اللسان (مدارک)

قیل جئ بها للاشارة الی ان الایمان الظاهر کاف فی صحة نکاح الامة ولا یشترط فی ذلک العلم بالایمان علما یقینیا اذ لا سبیل الی الوقوف علی الحقائق الا لعلام الغیوب (روح)

۵۸۴ (خواہ آزاد ہو خواہ غلام مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی اور اولادِ آدم ہونے کے لحاظ سے بھی)۔

انتم وارقاءکم متناسبون نسبکم من آدم ودینکم الاسلام (بیضاوی) ای لا تستنکفوا من نکاح الاماء فکلکم بنو آدم (مدارک) اما من حیث الدین واما من حیث النسب۔ (روح)

عرب سوسائٹی میں باندیوں سے نکاح کرنا عار اور ذلت کی چیز تھی کہ ان سے جو اولاد ہوگی وہ کنیز زادی کہلائے گی قرآن مجید نے اس عار کو مٹایا اور بتایا کہ بوقت ضرورت اس میں ذرا تکلف نہ کرنا چاہئے۔

ان العرب کانوا یفتخرون بالانساب فاعلم فی ذکر هذه الکلمة ان الله لا ینظر ولا یلتفت الیه (کبیر)

فَاِذَآ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَيۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيۡهِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَى

پھر جب وہ (کنیزیں) قیدِ نکاح میں آجائیں اور پھر اگر وہ (بڑی) بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان کے لئے

الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنۡ خَشِىَ الۡعَنَتَ مِنۡكُمۡ ؕ

اس سزا کا نصف ہے ۵۸۸ جو آزاد عورتوں کے لئے ہے ۵۸۹ یہ اس کے لئے ہے جو تم میں سے بدکاری کا اندیشہ رکھتا ہو

۵۸۵ مجرد نکاح سقوطِ ملک کے لئے کافی نہیں، اس لئے مالک کی اجازت بہر حال ضروری ہے۔

لاھلھن۔ اہل سے اس سیاق میں مراد مالک یا مولا ہے۔

المراد بہ الموالی لانہ لاخلاف انہ لا یجوز لھا ان تتزوج بغیر اذن مولاھا وانہ لا اعتبار باذن غیر المولی (جصاص) والمراد من الاھل الموالی (روح)

لیکن خود مولا سے مراد اس سے لی گئی ہے جو ولایتِ تزویج رکھتا ہو، عام اس سے کہ مالک ہو یا نہ ہو۔

وحمل الفقہاء ذلک علی من لہ ولایۃ تزویج ولو غیر مالک فقد قالوا للاب والجد والقاضی والوصی تزویج امۃ الیتیم (روح)

بہر حال نفس نکاح میں رضامندی خود باندیوں کی معتبر ہوگی نہ کہ ان کے مالکوں کی۔

وھو حجۃ لنا فی ان لھن ان یباشرن العقد بانفسھن لانہ اعتبر اذن الموالی لاعقدھم (مدارک)

۵۸۶ (اور ان کے کنیز ہونے کی بنا پر ادائے مہر کو غیر اہم یا غیر ضروری نہ سمجھو)

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ چونکہ مالک اپنی باندیوں کی کمائی کے مالک ہوتے تھے، اس لئے باندیوں کا مہر بھی ان کے مالکوں ہی کو دیا جائے گا اور تقدیر کلام یوں ہوگی:۔

وآتوا الیھن مھورھن۔ فکان اداؤھا الیھن اداء الی الموالی لانھن وما فی ایدیھن مال الموالی۔ (مدارک)

۵۸۷ یعنی یہ ادائے مہر بہ معاوضہ نکاح ہو، بہ طور اجرتِ زنا نہ ہو۔

آزاد شریف بیویوں کے مقابلہ میں باہر نکلنے والیوں کے بدچلنی کے امکانات یوں بھی زائد ہوتے ہیں چہ جائیکہ باندیاں جو عرفاً حقیر و غیر معزز ہی سمجھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے ذیل میں ان قیدوں کا ذکر صراحت کے ساتھ ضروری ہوا۔

مُسٰفِحٰتٍ سے مراد ہیں کھلی ہوئی اور عام کسبیاں، اور مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ سے مراد ہیں وہ جن کا کوئی ایک آدھ متعین آشنا ہوتا تھا، دنیائے فسق میں بیسواؤں کی دو قسمیں تقریباً ہر جگہ قائم رہی ہیں، ایک کھلی ہوئی کسبیاں، دوسرے چھپی ہوئی خانگیاں، یہی تفریق جاہلیت عرب کے تمدن میں بھی قائم تھی۔

قال اکثر المفسرین المسافحۃ ھی التی تؤاجر نفسھا مع ای رجل ارادھا والتی تتخذ الخدن فھی التی تتخذ خدنا معینا وکان اھل الجاھلیۃ یفصلون بین القسمین وما کانوا یحکمون علی ذات الخدن بکونھا زانیۃ (کبیر)

۵۸۸ (جیسا کہ قبل نکاح بھی تھا)

باندیاں خواہ نکاحی ہوں یا کنواری ان کی سزائے زنا ہر حال میں آزاد شریف بے نکاحی عورتوں کی سزا کی نصف ہے، باندیاں جس طرح اکثر حقوق میں بیویوں کا نصف مرتبہ رکھتی ہیں، اسی طرح اس جرم کی سزا بھی ان کے لئے

وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۵﴾ ع ۳ ۱

اور اگر تم ضبط سے کام لو تو تمہارے حق میں کہیں بہتر ہے ۹۱ اور اللہ بڑا بخشنے والا ہے اور بڑا مہربان ہے ۹۲

نصف ہی رکھی گئی ہے شاید اس لئے کہ جرم کی ترغیبیں بھی ان کے لئے زائد ہیں اور موانع کمتر۔

بِفَاحِشَةٍ۔ جرم بے حیائی، یہاں زناکاری کے معنی میں ہے۔

وھی الزنا۔ (ابن جریر)

من العذاب۔ سزا سے مراد حدِّ شرعی ہے۔

ای من الحد (مدارک)

عَلَی الْمُحْصَنٰتِ۔ محصنات سے یہاں مراد بیاہی ہوئی نہیں بلکہ بن بیاہی شریف خواتین ہیں۔ احصان کے تحقق کے لئے اس کا محض حُرّہ (آزاد) ہونا ہی کافی ہے۔

المحصنٰت ھنا الحرائر الآتی لم یزوجن (مدارک) ای الابکار الحرائر (قرطبی) ای ماعلی الحرائر الابکار۔ (معالم)

ایک آیت اوپر والمحصنٰت المؤمنٰت کے ذیل میں بھی محصنات مطلق شریف عورتوں کے معنی میں آچکا ہے۔

۸۹ یعنی باندی کی زناکاری کی سزا پچاس درّے ہے، شریف کنواری عورت کی سزائے زناکاری سو درّے ہے۔ فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ۔ اس کے نصف پچاس ہی درّے ہوتے ہیں۔ شریف نکاحی عورت کے لئے سزائے زنا سنگ ساری ہے اور اس کی تنصیف ممکن نہیں، پھر مملوکہ پر سرے سے رجم ہی نہیں اس کی سزا بہر صورت وہی پچاس درّے ہے۔

نصف ما علی المحصنٰت یدل علی انہ الجلد لا الرجم لان الرجم لا ینتصف۔ (مدارک)

غلاموں کی حرام کاری کی سزا قرآن مجید میں مذکور نہیں، فقہاء نے اسی آیت سے استنباط کر کے ان کی سزا بھی یہی پچاس درّے رکھی ہے۔ آج کے بعض نو پیدا فرقوں کے علاوہ، قدیم فرقۂ خوارج سزائے رجم کا بالکل منکر رہا ہے اور اس کا مستدل یہی آیت ہے۔ (کبیر)

۹۰ (خواہ اس لئے کہ طبعی تقاضہ مجبور کر رہا ہو، خواہ اس لئے کہ شریف بیوی میسر نہ آرہی ہو)

ذٰلِكَ۔ یعنی باندی سے نکاح۔

یعنی نکاح الامۃ عند عدم الطول (معالم) ای نکاح الاماء (مدارک)

الْعَنَتَ۔ عنت کے لفظی معنی اضرر و زیاں کے ہیں۔

اصل العنت الضرر والفساد (ابن قتیبہ)

یہاں مراد زنا میں پڑجانا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کون ضرر مسلمان کے لئے ہو سکتا ہے۔

ای الزلۃ والفجور منکم (ابن عباسؓ) العنت الزنا (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) ای الاثم الذی تؤدی الیہ غلبۃ الشھوۃ (مدارک)

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید ضبط جس سے انسان جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے، مثلاً اختناق الرحم کی شکایت ہو جائے یا مردوں کو ورم پشت وغیرہ کی۔ امام رازیؒ جو خود بھی اپنے زمانہ کے نامور طبیب تھے اس قول کو یوں نقل کرتے ہیں۔

والثانی ان الشبق الشدید والغلمۃ العظیمۃ قد تؤدی بالانسان الی الامراض الشدیدۃ اما فی حق النساء

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اللہ کو منظور ہے کہ تم سے (احکام) کھول کر بیان کر دے اور تم کو تم سے قبل والوں کے حالات بتلا دے اور

وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيدُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْكُمْ

تم پر توجہ فرمائے ۹۳ اور اللہ بڑا علم والا ہے اور بڑا حکمت والا ہے ۹۴ اور اللہ کو منظور ہے کہ تمھارے حال پر توجہ فرمائے ۹۵

وَيُرِيدُ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الشَّهَوَاتِ أَنْ تَمِيلُوا مَيْلًا عَظِيمًا ﴿٢٧﴾

اور جو لوگ خواہشوں کے بندے ہیں ۹۶ انھیں یہ منظور ہے کہ تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ ۹۷

فقد تؤدّی الی اختناق الرحم واما فی حق الرجال فقد تؤدّی الی اوجاع الورکین والظهر (کبیر)

۹۱ یعنی اگر خواہشِ نفس کا اتنا غلبہ نہیں ہے جس سے حرام کاری میں پڑ جانے کا قوی اندیشہ ہو رہا ہو تو پھر کنیزوں سے نکاح کرنے سے یہی بہتر ہے کہ خود خواہشِ نفس پر قابو حاصل کر لیا جائے۔

ای الصبر عن نکاح الاماء خیر لکم (ابن جریر) ظاهره الاخبار عن صبر خاص وهو عن نکاح الاماء قاله ابن عباس ومجاهد وابن جبیر والسدّی (بحر)

۹۲ چنانچہ اس کی صفتِ رحیمی اسی سے ظاہر ہے کہ ایسے نکاحوں کی حرمت کا حکم نہیں دیا اور شانِ غفوریت یہ ہے کہ کنیزوں سے بلا ضرورتِ شدید بھی نکاح کر لینا کراہتِ تنزیہی کے باوجود نجات کی راہ میں حائل کسی طرح نہیں۔

۹۳ (رحمت ومغفرت کے ساتھ)

لِيُبَيِّنَ لَكُمْ چنانچہ آیاتِ احکام ومسائل وہ تمھاری ہی مصلحت ونفع کے لئے نازل کرتا ہے۔

يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ چنانچہ آیاتِ قصص وحکایات وہ تمھاری ہی مصلحت ونفع کے لئے نازل کرتا ہے

۹۴ چنانچہ بندوں کی کوئی سی بھی ضرورت ومصلحت اس کے علمِ کامل سے باہر نہیں، اور اپنی حکمتِ کاملہ سے اس نے احکام ایسے رکھے ہیں جو ہر مصلحت کی پوری پوری رعایت کرنے والے ہیں۔

۹۵ (شفقت ورحمت کے ساتھ، انھیں احکام وتعلیمات کے ذریعہ سے)

۹۶ (اور ہوائے نفس ہی کو اپنا دین وایمان بنائے ہوئے ہیں)

یہ کون لوگ ہیں؟ الفاظ کا مصداق کفار کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، باقی فسق پیشہ افراد بھی مراد ہو سکتے ہیں صحابہ وتابعین سے اس کے معنی اہلِ کتاب کے بھی مروی ہوئے ہیں یہود کے بھی اور زانیوں کے بھی۔ وقس علیٰ ہذا۔

قیل المجوس (کبیر) قیل المجوس وقیل الیهود (بیضاوی) قال بعضهم هم الزناة وقال اٰخرون بل هم الیهود والنصاریٰ (ابن جریر) هم الزناة او الیهود والنصاریٰ او الیهود خاصة او المجوس۔ (بحر)

قولِ فیصل یہ ہے کہ الفاظ ان سارے معانی کے محتمل ہیں، اس لئے کہ جو شخص بھی نافرمانی پر دلیر ہے وہی اپنی خواہشِ نفس کا بندہ ہے

کان داخلا فی الذین یتبعون الشهوات الیهود والنصاریٰ والزناة وکل متبع باطلا لأن کل متبع ما نهاه الله عنه فمتبع شهوة

يُرِيدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۲۸ يٰاَيُّهَا

اللہ کو منظور ہے کہ تمہارے ساتھ تخفیف برتے اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے ۹۸ اے ایمان والو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ

آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ ۹۹ ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی

تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۲۹

سے ہو ۱۰۰ اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو ۱۰۱ بے شک اللہ تمہارے حق میں بڑا مہربان ہے ۱۰۲

نفسہ (ابن جریر) الفجرۃ (المدارک) ای متبعو کل شہوۃ قالہ ابن زید وتجہ الطبری لظاہرہ العموم (بحر)

۹۷ (اور راہ راست سے ہٹ کر ان ہی جیسے ہو جاؤ)

مَیْلًا عَظِیْمًا۔ اس سے بڑھ کر بھی اور کیا ہو گی کہ انسان یا تو حرام کو حرام سمجھنے ہی سے انکار کر دے اور یا بے باکانہ ارتکاب حرام کرتا ہے

۹۸ (کمزور جسم کے لحاظ سے بھی اور کمزور ارادہ کے لحاظ سے بھی)

اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ۔ چنانچہ شریعت کے سارے احکام میں انسان کی سہولتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ چنانچہ جتنے بھی احکام شرعی ہیں سب انسان کے ضعفِ جسمانی و ضعفِ ارادی کی پوری رعایت رکھتے ہیں۔

۹۹ یعنی غیر مشروع طریقوں پر۔

خیانت اور بددیانتی کی تمام صورتوں کی بندش اس ایک حکم کے اندر آگئی، کاش اسلام کے ایک اسی قانون پر عمل ہو تو آج دنیا کی کایا پلٹ ہو جائے۔

۱۰۰ مطلب یہ ہوا کہ دوسرے کے مال میں تصرف کی اجازت کسی باطل طریقہ سود، قمار وغیرہ سے تو سرے سے ہی نہیں صرف جائز طریقوں کے اندر ایک دوسرے کی رضامندی سے تصرف کر سکتے ہو مثلاً مال مشترک سے تجارت کر کے تو بعض بالبعض کر کے

۱۰۱ اَنْفُسَکُمْ کے معنی عموماً اخوانکم یا من جنسکم کے کئے گئے ہیں اور مراد یہ لی گئی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔

اتفقوا علی ان ھذا انہی عن ان یقتل بعضہم بعضا (کبیر) قتل بعضکم بعضا (ابن جریر عن عطاء) ای

اہل ملتکم (ابن جریر عن السدی) یعنی اخوانکم (معالم عن الحسن) من کان من جنسکم من المؤمنین (مدارک)

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ خودکشی نہ کرو۔

ولا یقتل الرجل نفسہ۔ (مدارک)

مسند ابوداؤد اور مسند احمد دونوں میں صحابی عمرو بن العاص سے روایت نقل ہوئی ہے کہ حالتِ سفر میں سردی کی ایک شب میں انھیں غسل کی ضرورت لاحق ہو گئی لیکن سردی کے مارے بجائے غسل کے انھوں نے صرف تیمم سے کام لیا اور اسی سے اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھا دی، اس کے بعد جب حضور کا سامنا ہوا اور آپ نے امامت نماز بلا غسل پر جواب طلب فرمایا تو اسی شدید سردی کا عذر پیش کر کے یہی آیت پڑھ دی، اس پر حضور نے تبسم فرما کر سکوت اختیار کیا۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ

اور جو کوئی ایسا کرے گا سرکشی اور ظلم کی راہ سے تو ہم عنقریب اس کو آگ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ

ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ

کے لئے آسان ہے ۳۰۳ اگر تم اُن بُرے کاموں سے جو تمھیں منع کئے گئے ہیں بچتے رہے تو ہم

عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

تم سے تمھاری معمولی برائیاں دور کردیں گے ۴۰۳ اور تمھیں ایک معزز مقام پر داخل کردیں گے ۵۰۳

بعض مذہبوں میں خودکشی خود ایک عبادت رکھی گئی ہے مثلاً جاپانیوں میں یا بعض قدیم ہندی مذہبوں میں ایک شکل اس کی خودکشی بھی ہے۔
بالبخع کما تفعله جهلة الهند (بیضاوی)

۲۰۳ (چنانچہ یہ سارے احکام بھی اسی شفقت و رحمت کا نتیجہ ہیں۔)

۳۰۳ یہ وعید اُن لوگوں کے لئے ہے جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی اتفاقی طور پر یا بہ طور خطائے اجتہادی کے نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ کرتے رہتے ہیں۔

ذٰلِكَ۔ ای ما نهی عنه (جلالین) یعنی ما سبق ذکرہ من المحرّمات (معالم)

عُدْوَانًا۔ یعنی حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے ہوئے یا دوسروں پر ظلم کرتے ہوئے۔

قیل اراد بالعدوان تعدّی علی الغیر (بیضاوی) العدوان تجاوز الحد (قرطبی)

ظُلْمًا۔ یعنی اپنی جان پر ظلم کرتے ہوئے۔

قیل اراد بالظلم ظلم النفس (بیضاوی)

كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ اللہ کی قوتِ لامحدود اور بے انداز کو یہ دیوتا پرست مشرک کہیں انسانوں یا دیوتاؤں کے محدود قوائے پر قیاس نہ کریں۔

۴۰۳ (اور نتیجۃً تمھیں عذاب سے بچالیں گے)

یہ قانون الٰہی ہے جس کی تکرار قرآن مجید میں کئی بار آئی ہے اور ایک جگہ اُسے بالکل کُلّی اور عمومی صورت میں یوں بیان کیا گیا ہے اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ اس قسم کی آیتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اولیاء و اتقیاء مقبولین میں بھی کوئی معصوم نہیں ہوتا، اللہ تعالٰے ان کی کثرتِ طاعات پر نظرِ رحمت کرکے اُن کی خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر کردیتا ہے اور انھیں اعلیٰ سے اعلیٰ مرتبوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے، عصمتِ انبیاء کا مسئلہ ایک دوسرے قانون سے ثابت ہے۔

كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ۔ کبائر یعنی بڑے بڑے گناہ۔ لیکن خود کبیرہ کا اطلاق کس عمل پر ہوتا ہے؟ اس کے جوابات متعدد دیئے گئے ہیں۔ سفیان ثوری تابعی کا قول نقل ہوا ہے کہ کبیرہ نام ہے بندوں کے اتلافِ حقوق کا اور صغیرہ صرف اللہ کے اتلافِ حقوق کا۔

قال سفیان الثوری الکبائر ما کان فیه المظالم بینك وبین عباد الله تعالٰی والصغائر ما کان بینك وبین الله تعالٰی۔ (معالم)

اور حسن بن فضل کا قول ہے کہ کبیرہ وہ عمل ہے جس پر قرآن مجید نے اطلاق کبیر یا عظیم کا کیا ہو۔

# وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ

اور تم ایسے امر کی تمنا نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دے رکھی ہے ۱۰۶

قال الحسین بن الفضل ما سماہ اللہ تعالیٰ فی القرآن کبیرا أو عظیما۔ (معالم)

یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ کبیرہ وہ معصیت ہے جسے حلال قرار دے کر کیا گیا ہو جیسے ابلیس کا سجدہ سے انکار، اور صغیرہ وہ معصیت ہے جس پر استغفار کیا گیا ہو، جیسے آدم کی ندامت شجر ممنوعہ کا پھل کھا لینے پر۔

قیل الکبائر ذنوب المستحلین مثل ذنوب ابلیس والصغائر ذنوب المستغفرین مثل ذنب آدم (معالم)

اس ہیچمدان کے خیال میں کبیرہ وہ عمل ہے جس کی ممانعت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں آچکی ہو اور اس کی معصیت ہونا کسی دقیق استنباط یا دلالت خفی کا محتاج نہ ہو، یا کم از کم یہ کہ حدیث صحیح میں اس کی ممانعت صراحت اور تاکید کے ساتھ آچکی ہو، ممتاز صحابیوں کے نزدیک کچھ ایسا ہی پایا جاتا ہے۔

قال علی بن ابی طالب ھی کل ذنب ختمہ اللہ بنار او غضب او لعنۃ او عذاب (معالم) أنھا المعصیۃ التی یلحق صاحبھا الوعید الشدید بنص کتاب او سنۃ وھذا اکثر ما یوجد لھم۔ (ابن کثیر)

اور حضرت علیؓ ہی کی تفسیر ابن جریر نے عبداللہ ابن عباسؓ سے بھی نقل کی ہے۔

سَيِّئَاتِكُمْ۔ سیئات سے مراد چھوٹی برائیاں یا گناہ صغیرہ ہیں۔

ای صغائرکم۔ (بیضاوی)

سدی تابعی سے منقول ہے کہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس سے اللہ نے روکا ہے، اور سیئہ اس گناہ کے مقدمات ہیں۔

وقال السدی الکبائر ما نھی اللہ عنہ من الذنوب الکبائر والسیئات مقدماتھا۔ (معالم)

ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ کبیرہ نام ہے شرک اور اس کے مقدمات کا اور باقی جو گناہ ہیں وہ سیئات ہیں۔

قیل الکبائر الشرک وما یؤدی الیہ وما دون الشرک فھو من السیئات۔ (معالم)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ کبیرہ پر عتاب کے ساتھ ساتھ فضل کا احتمال اور صغیرہ پر عفو کے ساتھ ساتھ عتاب کا احتمال خاص اہل سنت کا مذہب ہے، بہ خلاف معتزلہ کے جن کے نزدیک صغائر واجب المغفرۃ ہیں اور کبائر غیر مغفور ہیں۔

۱۰۵ یعنی جنت میں پہلا وعدہ عذاب سے محفوظ رکھنے کا تھا، اب بشارت دخول جنت کی مل رہی ہے، یہ بشارت خوب خیال کر لیا جائے کہ معصوموں کو نہیں بلکہ ان لوگوں کو مل رہی ہے جو صاحب سیئات ہیں، گناہوں کے باوجود مغفور۔

۱۰۶ (طبعی و وہبی طور پر بلا دخل کسی عمل و کسب کے)۔

مثلاً مردوں ہی کو ایک طبعی فضیلت عورتوں پر حاصل ہے، یا پھر مردوں ہی میں کوئی دولت مند ہے، کوئی حسین جمیل ہے، کوئی خوش آواز ہے، کسی کے قوائے جسمانی بہت مضبوط ہیں ــ اس قسم کے وہبی و طبعی فضائل کو قرب حق میں مطلق دخل نہیں، آیت میں تعلیم ہے کہ ان کی بنا پر ایک دوسرے پر رشک کرنا، ایک دوسرے کی جگہ پر ہونے کی حسرت و تمنا کرنا درست نہیں، قرب حق میں دخل صرف عمل و اکتساب کو ہے۔

شان نزول کی روایتوں میں آیا ہے کہ کچھ عورتوں نے اپنے احساس کمتری کی بنا پر مردوں پر رشک کا اظہار کیا تھا

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ

مردوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال کا حصہ (ثابت) ہے ۱۰۷

وَاسْأَلُوا اللَّهَ مِن فَضْلِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا ﴿٣٢﴾ وَلِكُلٍّ

اور اللہ سے اس کے فضل کی طلب کرو ۱۰۸ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے ۱۰۹ اور جو مال والدین

جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۚ وَالَّذِينَ عَقَدَتْ

اور قرابت دار چھوڑ جائیں اس کے لئے ہم نے وارث ٹھہرا دیئے ہیں ۱۱۰ اور جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے

أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا ﴿٣٣﴾

ہوئے ہیں انھیں ان کا حصہ دے دو ۱۱۱ بے شک اللہ ہر چیز پر مطلع ہے۔

ع ۵

اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی اور بتایا گیا کہ نجات و مغفرت اور قربِ حق کا مدار تو اپنے اعمالِ ارادی و اختیاری پر ہے اور اس لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل یکساں ہے، عورتوں کے لئے بھی قانونِ حسنِ عمل وہی ہے جو مردوں کے لئے ہے اور اس لئے انھیں مردوں پر رشک کا کوئی محل نہیں، یہ طبعی فرق تو محض تکوینی مصلحتوں سے رکھ دیئے گئے ہیں۔

لان ذلك التفضيل قسمة من الله تعالى صادرة عن حكمة وتدبير وعلم بأحوال العباد (مدارک)

**۱۰۷** (یہ نہ ہوگا کہ مرد کا اجر اس کے مرد ہونے کی بنا پر کچھ بڑھ جائے اور عورت کا اجر اس کے عورت ہونے کی بنا پر کچھ گھٹ جائے) مرد بحیثیت مرد ہرگز اللہ کے ہاں مقرب تر اور نجات کا مستحق تر نہیں، اور عورت اپنی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر و قرب سے محروم نہ رہے گی، جیسا کہ بعض دوسرے مذہبوں نے قرار دے رکھا ہے، اس میں عورت کے لئے تعلیم ہے کہ وہ اپنا احساس کمتری دور کرے اور سمجھ لے کہ ایک مکلف مخلوق کی حیثیت سے وہ اور مرد دونوں بالکل ایک سطح پر ہیں اور حصولِ نجات و قربِ حق میں وہ مردوں سے ذرا بھی فروتر نہیں، ہندوؤں نے اپنی منوسمرتی کے اوراق میں اور مسیحی کلیسا نے صدیوں تک اپنی کونسلوں میں جو فیصلے عورت کی پستی اور پستِ فطرتی کے کئے ہیں آیت ان سب کی تردید کر رہی ہے۔

مِمَّا اكْتَسَبُوا ۔ مِمَّا اكْتَسَبْنَ ۔ اکتساب سے مراد دونوں جگہ اعمالِ خیر کا کسب ہے۔

**۱۰۸** (توفیقِ اعمال میں)

رشک و تمنا کے قابل اور دعاؤں میں طلب کے قابل اصل چیز وہبی اور طبعی نعمتیں نہیں بلکہ توفیقِ حسنِ عمل ہے۔

**۱۰۹** (چنانچہ اپنے اس علمِ کامل کے مطابق اس نے ہر مخلوق کو صلاحیت و استعداد بخشی اور وہی ہر ایک کے فرد عمل پر پوری طرح مطلع بھی ہے) اسلام کا خدا جزئی و کلی ہر شے کا عالم ہے بر خلاف بعض یونانی فلاسفہ کے جنھوں نے خدا کو صرف عالمِ کلیات ہی مانا ہے۔

**۱۱۰** (قانونِ میراث کے ذریعہ سے)

وارثوں کی تفصیل اسی سورت میں چند رکوع قبل گزر چکی، تقسیم ترکہ کی کچھ عارضی صورتیں آغاز اسلام ہی میں بتا دی گئی تھیں،

# اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

مَرد عورتوں کے سردھرے ہیں ۱۱۲ اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دے رکھی ہے ۱۱۳

وہ مکمل قانونِ میراث کے نازل ہونے کے بعد اب قدرۃً منسوخ ہوگئیں۔ یہ قانون میراث شریعتِ الٰہی کا ایک اہم محکم قانون ہے۔

لِکُلٍّ۔ میں مضاف الیہ محذوف ہے، تقدیر کلام یوں ہے لِکُلِّ اَحَدٍ۔

۱۱۱ یعنی کُل ترکہ کا ۱/۶ حصہ۔

اَلَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ۔ اصطلاح میں یہ لوگ مولی الموالاۃ کہلاتے ہیں، عرب قدیم میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول و قرار کرکے ایک دوسرے کے اس طرح دوست و مددگار ہوجاتے کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اُسے ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اس کی میراث پائے اسی عہد کو عقدِ موالاۃ کہتے، شریعت نے شروع شروع اس دستور کو تھوڑی ہی ترمیم کے بعد قائم رکھا اور انصار و مہاجرین میں مواخاۃ قائم کرکے باہم میراث جاری کرادی، پھر اس عہد والے کا حصہ ۱/۶ متعین کیا، پھر جب سورۃ احزاب کی یہ آیت نازل ہوئی واولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض تو سب وارثوں کے حصے متعین ہوگئے، اور اب اس کے لئے گنجائش نہ رہی، شریعت کے کسی جزو کے منسوخ ہونے کے معنی بس اسی قدر ہوتے ہیں۔

۱۱۲ ابھی یہ معلوم ہوچکا ہے کہ روحانیت کی دنیا میں یعنی قُربِ حق اور حُسنِ عمل کے لحاظ سے مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے، نماز اور روزہ اور زکوٰۃ اور حج اور دوسری عبادتیں جس طرح مرد کی قبول ہوسکتی ہیں، وہی راہیں عورت کے لئے بھی کُھلی ہوئی ہیں، اب یہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ مرد و زن کی یہ مساوات دنیوی معاملات میں اور انتظامی حیثیت سے قائم نہیں، باپ اور بیٹے دونوں بہ حیثیت عبد بالکل ایک ہیں، عند اللہ اعمال کی مقبولیت کے معیار سے دونوں بالکل مساوی ہیں، لیکن دنیا میں شریعت ہی کا حکم ہے کہ باپ افسر ہوکر رہے، اور بیٹا ماتحت ہوکر، باپ حکم دے اور بیٹا حکم مانے، اب بتایا جارہا ہے کہ معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر غلبہ و تفوق حاصل ہے۔

الزوجان مشترکان فی الحقوق وللرجال علیھن درجۃ بفضل القوامیۃ۔ (ابن العربی)

قَوّٰمُوْنَ۔ قوّام کے معنی ہیں کسی شے کے محافظ، منتظم، مدبّر کے، اور یہاں مُراد یہ ہے کہ مرد عورتوں کے اُمور کا انتظام کرنے والے، ان کی کفالت کرنے والے، ان پر احکام نافذ کرنے والے ہیں، اہلِ لغت سے یہی تصریح منقول ہے:۔

قام الرجل المرأۃ ای قام متکفلا بامرھا فھو قوّام وقد یجیء القیام بمعنی المحافظۃ والاصلاح (راج) الرجال متکفلون بامور النساء (لسان)

ائمۂ تفسیر بھی اسی طرف گئے ہیں:۔

صاروا قوّاما علیھن نافذ الامر علیھن (ابن جریر) فکانّہ تعالٰی جعلہ امیرا علیھا ونافذ الحکم فی حقھا (کبیر) قیامھم علیھن بالتادیب والتدبیر والحفظ والصیانۃ۔ (جصاص)

قَوّام اور قَیِّم، ہم معنی ہیں، قوّام فصیح تر ہے۔

(القوّام والقیّم بمعنی واحد والقوّام ابلغ وھو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب (معالم)

بائبل نے عورت کو کیا درجہ دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کی عبارتوں سے ہوگا:۔

"خداوند خدا نے عورت سے کہا اپنے خصم کی طرف تیرا شوق ہوگا، اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔" (پیدائش ۳:۱۶)

وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ

اور اس لئے کہ مردوں نے اپنا مال خرچ کیا ہے ؀۱۱۴ سو نیک بیویاں اطاعت کرنے والی اور پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت

بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ

سے حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں ؀۱۱۵ اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم اُن کی سرکشی کا علم رکھتے ہو ؀۱۱۶ تو انہیں نصیحت کرو ؀۱۱۷

"اے بیویو اپنے شوہروں کی ایسی تابع رہو جیسے خداوند کی کیونکہ شوہر بیوی کا سر ہے جیسے کہ مسیح کلیسا کا سر ہے اور وہ خود بدن کا بچانے والا ہے لیکن جیسے کلیسا مسیح کے تابع ہے ایسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کے تابع ہوں"۔ (افسیون ۵: ۲۲-۲۴)

قرآن حق کا کلام ہے اور ہمیشہ حق ہی کہتا ہے، وہ کلیسا کی کونسلوں اور منوسمرتی کی طرح عورت کی تحقیر و تذلیل کا ہرگز قائل نہیں لیکن ساتھ ہی اسے جاہلیتِ قدیم و جاہلیتِ جدیدہ کی زن پرستی سے بھی ہمدردی نہیں، وہ عورت کو ٹھیک وہی مرتبہ و مقام دیتا ہے جو نظام کائنات میں فاطرِ کائنات نے اُسے دے رکھا ہے، بہ حیثیت ایک عبد اور مکلف مخلوق کے وہ مرد کے مساوی و ہم رتبہ ہے، لیکن دنیا کے انتظامی معاملات میں مرد کے ماتحت اور تابع ہے۔

؀۱۱۳ (طبعی اور تکوینی طور پر)

مرد کی یہ افضلیت اُس کے قوائے جسمانی کی مضبوطی اور دل و دماغ کی برتری دونوں سے عیاں ہے۔

بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ یعنی صنفِ ذکور کو صنفِ اناث پر۔

بعضهم وهم الرجال على بعض وهم النساء۔ (کشاف)

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ میں ب سببیہ ہے اور اس کا تعلق قَوّٰمُوْنَ سے ہے۔

الباء للسببية وهي متعلق بقوامون اى قوامون عليهن بسبب تفضيل الله تعالى اياهم عليهن (روح)

؀۱۱۴ (عورتوں پر ان کے مہر میں اور ان کے نفقہ میں)

مطلب یہ ہوا کہ مرد کی افضلیت عورت پر دُہری حیثیت رکھتی ہے ایک تو طبعی یعنی جسمانی و دماغی قویٰ میں خلقی برتری، دوسری قانونی یا معاشری کہ عورت خرچ میں مرد کے دست نگر رہتی ہے یہیں سے یہ بات بھی نکل آئی کہ قرآنی نظام کی رو سے کمانا یا کسبِ معاش کرنا اور بیوی کے خرچ کا بار اُٹھانا مردوں کے ذمہ ہے۔

دلت على وجوب نفقتها عليها۔ (جصاص)

؀۱۱۵ نیک بیویوں کی یعنی مومنات صالحات کی علامت یہ ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ شوہر کی غیبت میں اس کی عزت و ناموس اور اُس کے مال و جائداد کی نگہداشت کرنے والیاں ہوتی ہیں جدید اسکولوں اور کالجوں کی پڑھی ہوئی لڑکیاں غور کریں کہ انھیں اب اس قرآنی معیار سے کیا مناسبت باقی رہ گئی ہے؟

فَالصّٰلِحٰتُ میں فَ نتیجہ کا ہے یعنی اوپر کے مقدمات سے ایک کُھلا ہوا نتیجہ یہ نکلتا ہے۔

بِمَا میں بَ سببیہ ہے یعنی ان کا ایسا کرنا توفیقِ الٰہی ہی کے سبب سے ہوتا ہے۔

والباء سببية اى بسبب حفظ الله لهن (جمل) اى بتوفيقه لهن۔ (جمل)

## وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ

اور انھیں خواب گاہوں میں تنہا چھوڑ دو ۱۱۸ اور انھیں مارو ۱۱۹

۱۱۶ ذکر مہذب، شریف و شائستہ بیویوں کا ابھی اوپر ہو چکا ہے اب اس کے مقابل ناشائستہ اور رذیل فطرت کی بیویوں کے باب میں کچھ احکام بیان ہو رہے ہیں ـــ وہ نظامِ قانون کامل نہیں ناقص ہے جو ذکر صرف اچھوں کے انعام و اکرام کا کرتا ہے اور بدوں بدکرداروں کا تذکرہ ہی چھوڑ جاتا ہے۔

نُشُوْزَهُنَّ۔ عورت کے نشوز کے اصل معنی یہ ہیں کہ شوہر کی نافرمانی پر کمربستہ ہو جائے۔

نشزت المرأة بزوجها اى استعصت على زوجها وارتفعت عليه وأبغضته خرجت عن طاعته (تاج) نشوز المرأة بغضها الزوجها ورفع نفسها عن طاعته (راغب) واصل النشوز الترفع على الزوج بمخالفته (جصاص)

ائمۂ تفسیر نے اس معنی کی توثیق کی ہے۔

يعنى استعلاءهن على ازواجهن وارتفاعهن عن فرشهم بالمعصية منهن والخلاف عليهم فى مالزمهن طاعتهم فيه بغضا منهن واعراضا عنهم۔ (ابن جرير۔ عن محمد بن كعب)

گویا مسرتِ ازدواجی زندگی کے بجائے گھر میں تصادم و بغاوت شروع ہو جائے۔

تَخَافُوْنَ۔ خوف یہاں علم کے معنی میں ہے، یعنی جب ان کی بغاوت و نافرمانی تجربہ میں آجائے، یہ نہیں کہ محض بدگمانیاں یا دور کے احتمالات کو اس کے لئے کافی سمجھ لیا جائے۔

والخوف هنا قيل معناه اليقين ذهب فى ذلك الى ان الاوامر التى بعد ذلك انما يوجبها وقوع النشوز لا توقعه (بحر) حمل الخوف على العلم۔ (معالم) تخافون اى تعلمون (ابن عباسؓ)

فارسی مترجمین قرآن نے بھی یہاں خوف کا ترجمہ علم یا دانستن سے کیا ہے:

”آں زناں کہ معلوم کنید سرکشی ایشاں (ولی اللہ دہلویؒ)“ ”آں زنانے کہ میدانید نافرمانی ایشاں را“ (سعدیؒ)

۱۱۷ اب انھیں سرکش و نافرمان بیویوں کا علاج بیان ہو رہا ہے، پہلی منزل یہ ہے کہ انھیں نرمی و آشتی سے سمجھایا جائے، اگر عورت شریف طینت ہے، تو اتنا کافی ہو جائے گا، اسی میں شوہروں کو بھی تعلیم ہے کہ فوراً غصہ میں آ کر کوئی سخت کارروائی نہ کر بیٹھیں۔

۱۱۸ یعنی اس سے تعلقاتِ ہم بستری منقطع کر لو اور اس کے پاس لیٹنا چھوڑ دو، یہ سزا کی دوسری منزل ہے جب زبانی گفتگو و فہمائش سے اصلاحِ حال نہ ہو اور نافرمانی و سرکشی بدستور قائم رہے تو اب پہلا عملی قدم یہ اٹھاؤ لیکن تحقیق و تجربہ کے بعد، اس کے قبل محض ظن و بدگمانی کی بنا پر نہیں فقہائے نے تصریح کر دی ہے کہ محض بدگمانی پر دوسری اور تیسری سزاؤں کا قدم اٹھانا جائز نہ ہوگا۔

وَاهْجُرُوْهُنَّ۔ ہجر کے دوسرے معنی ترکِ کلام کے بھی لئے گئے ہیں، یعنی ان سے بات چیت کرنا چھوڑ دو۔

قال ابن عباس وعكرمة والضحاك والسدى هجر الكلام (جصاص) اى لا يكلمها وان وطئها قاله عكرمة وابو الضحى (ابن العربى)

۱۱۹ (ہلکے ہلکے)

ضربا غير مبرح ولا شائن (ابن عباس) قال الحسن ضربا غير مبرح وغير مؤثر (جصاص)

یہ تیسرا علاج اس وقت کے لئے ہے جب دوسرا علاج بھی ناکام ثابت ہو لے۔

فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا

پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنے لگیں تو ان کے خلاف بہانے نہ ڈھونڈو ۱۳۰ بے شک اللہ بڑا ہی رفعت والا

كَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَيۡنِهِمَا

بڑا ہی عظمت والا ہے ۱۳۱ اور اگر تمہیں دونوں کے درمیان کشمکش کا علم ہو ۱۳۲

والامور الثلاثة مرتبة ينبغى ان يدرج فيها (بيضاوی) الذی يدل عليه البيان والقرينة العقلية ان هذه الامور الثلثة مترتبة فاذا ثبت نشوز المرأة تنصح ثم تهجر ثم تضرب (روح) قال ابن عطية هذه العظة والهجر والضرب مراتب ان وقعت الطاعة عند احد اها لم يتعد الى سائرها (کبیر)

اس پر بھی سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی قسم کی ہو، ایسی نہ ہو جس سے چوٹ زیادہ آجائے یا جس سے رفیقِ زندگی کی توہین لازم آتی ہو، بلکہ مفسرِ صحابی ابن عباسؓ سے تو یہ منقول ہے کہ یہ مار مسواک جیسی ہلکی پھلکی چیز سے ہو۔

قال ابن عباس بالسواك ونحوه (بحر)

قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے (لیکن بار بار اُسے یاد کر لینے کی بھی ضرورت ہے) کہ کسی ایک طبقہ، کسی ایک قوم، کسی ایک تمدن سے نہیں، اس کے مخاطب عرب و عجم، چینی اور حبشی، انگریز اور ہندی، رومی اور جاپانی، اعلیٰ اور ادنیٰ، شریف و رذیل، عالم و عامی، فہیم اور کودن، چمار اور چوہڑے، نائی اور دھوبی، شہری اور دیہاتی، نیک بخت اور بد باطن ہر طبقہ، ہر سطح، ہر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی ہجری سے لے کر قیامت تک ہر زمانے اور ہر دور والے ہیں اور اس کے احکام و مسائل میں لحاظ ہر انسانی ضرورت اور ہر بشری ماحول کا کر لیا گیا ہے، چنانچہ یہ مشاہدہ ہے کہ بہت سے معاشرے اور طبقے ایسے ہیں جہاں عورت کے لئے جسمانی سزائیں عام ہیں، علاج کی یہ صورت ظاہر ہے کہ انھیں طبقوں کے لئے ہے پھر اتنی اجازت بھی ضرورت پڑنے ہی پر ہے ورنہ سیاق عبارت نرمی ہی کی سفارش کر رہا ہے

وسوق الكلام للرفق فی اصلاحهن (جمل) فالتخفيف مراعى فی هذا الباب على ابلغ الوجوه (کبیر)

وقال الشافعیؒ والضرب مباح وتركه افضل۔ (کبیر)

اور اہل تحقیق نے تصریح کر دی ہے کہ نرم تدبیر اگر کافی ہو جائے تو سخت تر صورت ہرگز جائز نہیں۔

مهما حصل الغرض بالطريق الاخف وجب الاكتفاء به ولم يجز الاقدام على الطريق الاشق (کبیر)

اور امیر المومنین حضرت علیؓ سے بھی منقول ہے کہ پہلے شوہر زبان ہی سے فہمائش کرے اور اس سے مقصد حاصل ہو جائے تو بس آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں، ہاں اگر یہ ناکافی ثابت ہو تو البتہ دوسرا قدم اٹھائے تا آنکہ یہ خوابگاہ بھی بے اثر رہے، جب البتہ ضرب سے کام لے۔

قال امير المؤمنين على بن ابى طالبؓ يعظها بلسانه فان انتهت فلا سبيل له عليها فان ابت هجر مضجعها فان ابت ضربها (کبیر)

یورپ میں بیویوں کی مار پیٹ کا دستور جیسا جاہل رہا ہے اس کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی قرآن مجید میں اس حکم کا ملنا قرآن مجید کے حق میں ذرا بھی مضر نہیں جیسا کہ بعض یورپ زدہ مسلمان سمجھ رہے ہیں بلکہ یہ تو عین دلیل ہے اس کی کہ قرآن مجید کے احکام ہر طبقہ اور ہر مزاج اور ہر سطح انسانی کے لئے ہیں

۱۳۰ (ان پر سختی اور زیادتی کرنے کے لئے)

فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ یُّرِیْدَاۤ

تو تم ایک حکم مرد کے خاندان سے اور ایک حکم عورت کے خاندان سے مقرر کر دو ۱۲۳ اگر دونوں کی نیت

اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ﴿۳۵﴾

اصلاح حال کی ہوگی تو اللہ دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا ۱۲۴ بےشک اللہ بڑا ہی علم رکھنے والا ہے، طرح باخبر ہے ۱۲۵

اوپر کی تدبیر تو محض ضرورت کے لئے ہے، بلا ضرورت اس کا استعمال بیوی کو ستانے اور تکلیف پہنچانے کے لئے ہرگز درست نہیں۔

۱۲۱ (اور تم ایسی رفعت وعظمت والے پروردگار کے حقوق میں کوتاہی سے خود کب بالاتر ہو؟)

یہ یاد دلا کر شوہروں کو گویا تنبیہ کر دی کہ بی بی سے ادائے فرائض کے بارے میں اپنے مطالبے بہت سخت نہ رکھو۔

۱۲۲ خطاب عام امّتِ اسلامیہ کو ہے اور حکّام اور اہلِ حلّ وعقد کو بدرجہ اولیٰ۔

الخطاب كما قال ابن جبير والضحاك وغيرهما للحكام (روح) وقال اٰخرون المراد كل واحد من صالحي الامة (كبير) خطاب لجميع المومنين (كبير)

بَیْنِهِمَا۔ یعنی میاں بیوی کے درمیان۔

شِقَاقَ۔ یعنی ایسی کشمکش جسے وہ باہم نہ سلجھا سکیں، اُمّت اور افرادِ امّت کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرۂ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بےتعلق رہ ہی نہیں سکتا، افراد ہی کی صالحیت پر تو اُمّت کی صالحیت کا مدار ہے، آیت میں تعلیم اس کی ہے کہ افراد کی خانگی نزاعوں کو اُمّت اپنا ہی معاملہ سمجھے۔

اِنْ خِفْتُمْ۔ خوف یہاں بھی عِلْم یا ظنِ غالب کے معنی میں ہے، ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۱۶

والمراد فان علمتم كما قال ابن عباسؓ (روح) والخوف بمعنى اليقين وقيل هو بمعنى الظن يعني ان ظننتم شقاقا بينهما۔ (معالم)

۱۲۳ (جو تصفیہ کی اہلیت رکھتے ہوں وہ جا کر تحقیقِ حال کریں۔)

فَابْعَثُوْا۔ یعنی تصفیہ کی غرض سے ان دو حکموں کو ان میاں بیوی کے پاس بھیجو۔

اسلامی معاشرہ میں میاں بیوی میں نزاع ہونے کی صورت میں یہ ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ فوراً طلاقم طلاقا ہو جائے یا نوبت کسی ایسی ہی شدید کارروائی کی فوراً آجائے بلکہ پہلے ہر کوشش مصالحت ومفاہمت کی ہو جانا چاہئے، رشتۂ ازدواج ایک اہم ترین رشتہ ہے، اس پر بےپروائی سے ضرب نہیں لگائی جاسکتی۔

۱۲۴ اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ اِنْ یُّرِیْدَا میں ضمیر دونوں حکموں کی جانب ہے اور بَیْنَهُمَا میں زوجین کی جانب

الضمير الاول للحكمين والضمير الثاني للزوجين (بيضاوی) والضمير في ان يريدا للحكمين في بينهما للزوجين (مدارك)

لیکن ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی موقعوں پر ضمیر میں زوجین ہی کے لئے ہوں۔

وقيل كلاهما للزوجين (بيضاوی) والضميران للزوجين۔ (مدارك)

اِنْ یُّرِیْدَاۤ اِصْلَاحًا۔ یعنی اگر اخلاص ودیانت کے ساتھ نیت مصالحت ومفاہمت کی ہوگی تو اللہ تعالےٰ

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي

اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو ۱۲۶ اور حسن سلوک (رکھو) والدین کے ساتھ اور

الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ

قرابت داروں کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں اور پاس والے پڑوسی اور دور والے پڑوسی اور ہم مجلس اور راہ گیر

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ

کے ساتھ اور جو تمہاری ملک میں ہیں اُن کے ساتھ ۱۲۷

نیت میں برکت ضرور دے گا، اور قلب کی صفائی کی کوئی صورت نکال ہی دے گا۔ فقیہ تھانویؒ نے لکھا ہے کہ فیصلہ کرنا حکام کے لئے واجب ہے اگر زوجین ان سے رجوع کریں، اور دوسروں کے لئے مستحب ہے اور من اَهْلِه وَاَهْلِهَا کی قید سب کے لئے مستحب ہے۔

۱۲۵ ہر انسانی ضرورت، ہر بشری مصلحت پر اس کا علم محیط ہے ـــــ کون سا راز اُس سے راز رہ سکتا ہے؟ اور کس جزئی سے جزئی خبر سے وہ بے خبر رہ سکتا ہے؟

۱۲۶ (نہ ذات میں نہ صفات میں)

۱۲۷ خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ حسن سلوک کی تاکید والدین سے لے کر غلاموں اور باندیوں غرض معاشرہ کے ہر طبقہ کے ساتھ ہو رہی ہے پھر اس حکم کا عطف توحید الٰہی پر! ۔دنیا کی کسی دوسری آسمانی کتاب میں اس بے نظیر تعلیم کی نظیر ملے گی؟ اور اس کے ساتھ محققین کی یہ تصریح بھی ملا لی جائے کہ "اہل حقوق اگر کافر ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زائد ہوگا" (تھانویؒ)

وَالْجَارِ۔ حدیث میں آیا ہے جیسا کہ مفسرین نے محدث ابو نعیم اور محدث براء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں (۱) ایک وہ جن پر تہرے حق ثابت ہیں، حقِ جوار، حقِ قرابت، حقِ اسلام (۲) دوسرے وہ جن پر دوہرے حق ثابت ہیں، حقِ جوار و حقِ اسلام (۳) تیسرے وہ جن پر ایک ہی حق ثابت ہے یعنی حقِ جوار اور یہ وہ پڑوسی ہے جو مشرک کتابی ہو۔

قرآن مجید کی یہ تصریح بھی ذہن میں رہے کہ حق دونوں قسم کے پڑوسی رکھتے ہیں، قریب والے اور قرابت والے بھی اور دور والے اور اجنبیت والے بھی، مسلمان اگر آج ایک اسی تعلیم کو یاد رکھیں تو کتنی خانہ جنگیوں کا خاتمہ ہو جائے بلکہ ایک تفسیر تو یہ بھی منقول ہے کہ جارِ ذی الْقُرْبٰی سے مراد مسلمان پڑوسی ہے اور جارِ الْجُنُبِ سے یہودی و نصرانی۔

والجار ذی القربٰی قال نوف الشامی هو الجار المسلم والجار الجنب هو الجار الیهودی والنصرانی فهی عنده قرابة الاسلام واجنبیة الكفر (بحر) یحتمل ان یراد بالجار ذی القربٰی من له مع الجوار قرب واتصال بنسب او دین وبالجار الجنب الذی لا قرابة له ولو مشركا (روح)

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ۔ اس ہم مجلسی یا صحبت میں وقت کی کوئی قید نہیں، رفاقت و مصاحبت خواہ سالہا سال کی ہو، خواہ چند منٹ کی، بہرحال اپنا حق قائم کر دیتی ہے، اس تعریف کے ذیل میں ہم جماعت، ہم سبق، ہم مدرسہ، ہم سفر، کھیل کود کے ساتھی، ریل اور جہاز کے ساتھی، شریک تجارت، شریک صنعت، شریک پیشہ سب آجاتے ہیں۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا ﴿٣٦﴾ الَّذِينَ

قطعاً اللہ ایسوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بیں فخار ہیں ۱۲۸ جو بُخل کرتے رہتے ہیں

يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُونَ مَا آتَاهُمُ

اور دوسروں کو بھی بُخل کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ انہیں اللہ نے اپنے فضل سے دے

اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ ۗ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ﴿٣٧﴾

رکھا ہے اُسے چھپاتے ہیں ۱۲۹ اور ہم نے کافروں کے لئے ذلّت والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۱۳۰

وَابْنِ السَّبِيلِ۔ یہ ضروری نہیں مسافر مہمان ہی بن کر آئے، خاطر تواضع بہ قدر وسعت و ہمت ہر آئندو روند کی ضروری ہے ابن السبیل۔ کا اصل مفہوم ایسا مُسافر تھا جو اپنے وطن، اپنے عزیزوں سب سے اس قدر دور اور بے تعلق ہو کر گویا مسافرت ہی اس کا گھر بار، اہل و خاندان بن کر رہ جائے۔

ھو المنقطع فی السفر لا یتصل باھل ولا قرابۃ کان السبیل ابوہ وامہ ورحمہ واھلہ (المنار)

اور اس سے معنی بہرحال مطلقاً مسافر کے نکل آئے۔

اسلامی نظامِ معاشرت عالی شان ہوٹلوں بلکہ مہمان سراؤں کا بھی محتاج نہیں، وہ اپنے قلمرو کے اندر مہمانداری، مسافر نوازی، بہ قدر وسعت و ظرف ہر ہر فرد پر عائد کرتا ہے۔

۱۲۸ اب یہاں سے ان موانع کا بیان ہے جو ادائے حقوق کی راہ میں حائل ہوتے رہتے ہیں ان میں سے پہلی چیز خود بینی ہے اور دوسری چیز نمائش و حُبِّ جاہ۔

مُخْتَال وہ ہے جو پندارِ تفوّق میں گرفتار رہتا ہے، عزیزوں، قریبوں، پڑوسیوں کی طرف التفات کرنے میں کسرِ شان سمجھتا ہے، اور اپنی بڑائی کے مظاہرے اپنے عمل سے کرتا رہتا ہے۔

ھو المتکبر الذی علی بدنہ اثر من کبرہ فی الحرکات والاعمال (المنار)

فَخُور وہ ہے جو دوسروں پر اپنا فخر زبان سے جتلاتا رہتا ہے۔

ھو المتکبر یظھر اثر الکبر فی قولہ (المنار)

۱۲۹ (اور یہ تینوں قسم کے لوگ اللہ کے ہاں ناپسندیدہ مخلوق میں داخل ہیں)

ادائے حقوق میں خود بینی اور فخّاری کے بعد تیسرا بڑا مانع یہی بُخل ہوتا ہے۔

مَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ سے مراد مال و دولت کا ہونا تو ظاہر ہی ہے، دوسرے معنی علمِ دین کی دولت کے بھی کئے گئے ہیں اور وعید میں وہ لوگ بھی شامل سمجھے گئے ہیں جو مسائلِ دین کے اظہار میں بُخل کرتے رہتے ہیں۔

... والبخل علی ھذہ الروایۃ ظاھر فی البخل بالمال وفی الروایۃ الاخری انہ البخل بالعلم (روح) الغنی والعلم (بیضاوی) عام فی البخل العلم والدین وفی البخل بالمال لان اللفظ عامٌ والکل مذموم (کبیر) وقال الراغب لم یرد البخل

وَالَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا

اور جو لوگ اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں اور نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور

بِالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ وَمَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا فَسَاءَ قَرِينًا ﴿٣٨﴾

نہ روزِ آخرت پر (تو یہ سب کافروں ہی کے حکم میں داخل ہیں) ف۱۳۱ اور جس کا مصاحب شیطان ہوا سو برا مصاحب ہوا ف۱۳۲

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ آمَنُوا بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَهُمُ

اور انہیں کیا خرابی لاحق ہوجاتی، اگر یہ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لے آتے اور جو کچھ اللہ نے انہیں دے رکھا ہے

اللَّهُ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِهِمْ عَلِيمًا ﴿٣٩﴾ إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۖ

اس میں سے خرچ کرتے رہتے ف۱۳۳ اور اللہ ان سے خوب واقف ہے بے شک اللہ ایک ذرہ بھر بھی ظلم نہیں کرے گا ف۱۳۴

بالمال بل بجمیع ما فیہ نفع للغیر (بحر) والبخل انواع بخل بالمال وبخل بالعلم... وکلّہا نقائص ورذائل ممنوعۃ عقلاً وشرعاً (بحر)

ف۱۳۰ انسان عموماً بخل اسی لئے کرتا ہے کہ مال بچا کر اس سے اپنے جاہ میں اضافہ کرے اس جاہ پرستی کی سزا قدرۃً یہ ملے گی کہ عذاب سخت دردناک ہونے کے علاوہ اسے خلق کی نظر میں ذلیل و رسوا کرنے والا بھی ہوگا۔

ف۱۳۱ یعنی جن لوگوں کا ایمان خدا اور روزِ جزا پر نہیں ہوتا، وہ جس موقع پر اور جس مقصد سے بھی خرچ کریں گے بہرحال کوئی نہ کوئی صورت رضائے خلق ہی کی ہوگی، حالانکہ اسلام نے جان کی طرح (گو یقیناً اس سے کم درجہ میں) مال کی بھی خرچ کی اجازت رضائے خالق ہی کے تحت دی ہے۔

رِئَاءَ النَّاسِ۔ یعنی یہ لوگ اہلِ حقوق پر خرچ نہیں کرتے بلکہ موقعِ نمود ہی پر خرچ کرتے ہیں۔

ف۱۳۲ (جو ہمیشہ برائی ہی کی ترغیب دیتا رہے گا)

مَنْ يَكُنِ الشَّيْطَانُ لَهُ قَرِينًا۔ یعنی جس کا مصاحب شیطان ہوا جیسا کہ ان سب لوگوں کا ہے۔

ف۱۳۳ (دین کی راہ میں اور اخلاص کے ساتھ)

مَاذَا عَلَيْهِمْ۔ محاورۂ عربی میں ایسے موقع پر آتا ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں: کیا غضب ہوجاتا یا کون سی بڑی بات تھی!

ف۱۳۴ (اور اس کے لئے اس کا امکان ہی کیا ہے، جب کہ اس کا علم کامل ذرہ ذرہ کو محیط ہے)

یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کی کوئی نیکی بلا اجر رہ جائے یا کوئی بدی کسی کے حساب میں خواہ مخواہ لکھی جائے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ۔ اللہ جو قادرِ مطلق ہے حقیقۃً ظلم کا اطلاق تو اس کے کسی فعل پر کسی حال میں ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ وہ ظاہر میں اور مجازی معنی میں بھی ظلم نہیں کرتا۔

آیت میں دو پہلو اور بھی ہیں ایک تو مشرک قوموں نے اپنی دیوی دیوتاؤں کو جو ظالم، ستمگر، خونخوار مانا ہے (مثلاً درگا دیوی، یا کالی مائی کو)

وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿۴۰﴾

اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اُسے دوگنا کر دے گا، اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم دے گا ۱۳۵ ؎

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ

سو اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر اُمّت سے ایک ایک گواہ حاضر کریں گے ۱۳۶ ؎ اور ان لوگوں پر آپ کو

شَهِيدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ

بطور گواہ پیش کریں گے ۱۳۷ ؎ جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور پیمبر کی نافرمانی کی ہے وہ اس روز تمنا کریں گے کہ

بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ اللَّهَ حَدِيثًا ﴿۴۲﴾

کاش زمین ان پر برابر کر دی جائے، اور اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے ۱۳۸ ؎

حق تعالیٰ کی تنزیہ اس قسم کی صفات سے کلیۃً ہوگئی، دوسری جن آیتوں میں حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلق اور اختیارِ کامل کا اثبات ہے ان سے ممکن تھا کہ مسلمانوں کو بھی یہ خیال ہو جاتا کہ ہر طرح کا ظلم اُس قادرِ مطلق کے لئے روا ہے اس کی تردید بھی آیت سے ہوگئی۔

۱۳۵ ؎ (سو کیا ٹھکانا ہے ایسے پروردگار کی رحمت و کرم کا!)

مِنْ لَدُنْهُ ۔ اپنے پاس سے یعنی زائد از استحقاق بلکہ بلا استحقاق، اسلام کا خدا نہ کوئی خونخوار دیوتا ہے کہ خواہ مخواہ کسی پر ظلم کرے نہ ایسا معذور کہ کسی پر کرم کرنا چاہے بھی تو اپنی صفتِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور پر ظلم اُسے کرنا پڑے!۔ شرک اور مسیحی شرک دونوں کی تردید آیت سے ہوگئی۔

۱۳۶ ؎ (قیامت کے دن، اس اُمّت سے متعلق اظہار دینے)

یہ گواہ ہر اُمّت کے مقابل اس اُمّت کے رسول ہوں گے جو اس کی شہادت دیں گے کہ وہ احکام کی پوری پوری تبلیغ کر آئے تھے۔

۱۳۷ ؎ (اے پیغمبر!)

هَٰؤُلَاءِ (ان لوگوں) کا اشارہ کس جانب ہے؟ بہ ظاہر وہ لوگ مراد معلوم ہوتے ہیں جو قرآن کے براہِ راست یا بالواسطہ مخاطب تھے، اور جن سے رسول اللہ (صلعم) کا سابقہ تھا۔

اى على امتك (ابن جرير) يعنى قومه المخاطبين بالقرآن (كبير)

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اشارہ اُمّت کی جانب نہیں، بلکہ گواہوں کی جانب ہے۔ یعنی ان گواہوں کے صدقِ بیان پر گواہ ہو کر۔

تشهد على صدق هؤلاء الشهداء لعلمك بعقائدهم (بيضاوى) اشارة الى الشهداء المدلول عليهم بما ذكر (روح)

بہرصورت جب رسول اللہ (صلعم) اس آیت پر پہنچتے تھے تو اپنی ذمہ داری کے احساس اور فرطِ خشیت سے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ آنسو چشمِ مبارک سے جاری ہو جاتے تھے۔

كان النبى صلى الله عليه وسلم اذا اتى عليها فاضت عيناه (ابن جرير)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْرَبُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ وَأَنتُمْ سُكَٰرَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا۟

اے ایمان والو! نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے میں ہو یہاں تک کہ جو کچھ (منھ سے) کہتے ہو اسے

مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِى سَبِيلٍ حَتَّىٰ تَغْتَسِلُوا۟ ۚ وَإِن

سمجھنے لگو ۱۳۹ اور نہ حالتِ جنابت میں جب تک کہ غسل نہ کرلو ۱۴۰ بجز اس حال کے کہ تم مسافر ہو ۱۴۱ اور اگر تم

كُنتُم مَّرْضَىٰٓ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَآءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ ٱلْغَآئِطِ

بیمار ہو یا سفر میں ہو ۱۴۲ یا تم میں سے کوئی استنجا سے آیا ہو ۱۴۳ یا تم نے بیویوں سے قربت

أَوْ لَٰمَسْتُمُ ٱلنِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوا۟ مَآءً فَتَيَمَّمُوا۟ صَعِيدًا طَيِّبًا

کی ہو ۱۴۴ پھر تم کو پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی سے تیمم کرلیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں

فَٱمْسَحُوا۟ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٤٣﴾

پر ہاتھ پھیر لیا کرو ۱۴۵ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے بڑا بخشنے والا ہے ۱۴۶

جن بے دردوں نے قرآن کو کلامِ محمدی ٹھہرایا، وہ غور کریں کہ کہیں اپنے گڑھے ہوئے کلام سے بھی انسان کے آنسو جاری ہو سکتے ہیں؟

۱۳۸ (بلکہ ہر گہرے سے گہرا چھپا ہوا راز اس روز ظاہر ہو کر رہے گا.)

يَوْمَئِذٍ. اس روز سے ظاہر ہے کہ روزِ حشر مراد ہے.

لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ ٱلْأَرْضُ. زمین ان کے اوپر برابر کردی جائے تاکہ وہ پیوندِ زمین ہو کر حشر کی رسوائی اور عذاب سے محفوظ رہیں.

۱۳۹ یعنی نشہ اتر جائے اور زبان قابو میں آجائے.

آیت اس وقت کی ہے جب کہ حرمتِ شراب کا حکم ابھی نازل نہیں ہوا تھا مطلب آیت کا ہے کہ اوقاتِ نماز میں تو شراب پینے سے باز رہو. یہ مطلب نہیں کہ شراب تو اسی طرح پیتے چلے جاؤ اور نشہ کی حالت میں نماز چھوڑے رہو.

۱۴۰ یعنی حالتِ جنابت کے بعد غسل کرنا فرض ہے بغیر اس کے نماز درست نہ ہوگی. مرد کو انزال ہو جانا، عورت کو ماہواری آجانا، مرد و عورت دونوں کا عملِ مباشرت کرنا (خواہ انزال کے بغیر ہو) یہ سب حالتیں جنابت کی ہیں.

الصلوٰۃ سے مراد مسجدیں بھی لی گئی ہیں. أی مواضع الصلاۃ وهی المساجد (مدارک)

ای مواضع الصلوٰۃ وهو قول الشافعی (قرطبی) قیل اراد بالصلوٰۃ مواضعها وهی المساجد (بیضاوی)

۱۴۱ یعنی بجز حالتِ سفر کے جب پانی کا ملنا اور غسل کا انتظام ہونا دشوار ہو. ایسی حالت کا حکم ابھی آگے آتا ہے.

ولا یصح لاحد ان یقرب الصلوٰۃ وهو جنب لابعد الاغتسال الا المسافر فانه یتیمم وهذا قول ابی حنیفة (قرطبی)

جن فقہاء نے الصلوٰۃ سے مراد مواضع الصلوٰۃ لی ہے انھوں نے إِلَّا عَابِرِى سَبِيلٍ سے جنبی کے لئے

ضرورت کے وقت مسجد سے گزرنے کا جواز نکالا ہے۔

فیجوز للجنب العبور فی المسجد عند الحاجة (مدارک) هذا یقتضی جواز العبور للجنب فی المسجد لا الصلوٰة (قرطبی)

**۱۴۲** (اور مرض اور سفر دونوں صورتوں میں پانی کا استعمال یا مُضر ہو یا اس کا بہم پہنچنا دشوار ہو یا غسل کا انتظام نہ ہوسکتا ہو)

**۱۴۳** (اور اس لئے وضو باقی نہ رہا ہو)

**۱۴۴** (اور اس لئے غسل فرض ہوگیا ہے)

لَمس اور مَس دونوں کے لفظی معنی چھونے کے ہیں، اس لئے بعض فقہاء نے یہاں بھی محض ملامست مُراد لی ہے اور ملامستِ نساء کو مُوجبات وضو میں سے قرار دیا ہے، لیکن لمس کے مجازی معنی ہم بستری کے ہیں۔

ویکنی به وبالملامسة عن الجماع (راغب) من المجاز اللمس والملامسة المجامعة (تاج)

اور مَس تو قرآن مجید میں بھی ہم بستری کے معنی میں آیا ہے ثم طلقتموهن من قبل ان تمسوهن اس لئے فقہاء حنفیہ نے یہاں لمس سے ہم بستری ہی مراد لی ہے اور یہی مذہب قوی ہے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے صحابیوں اور مجاہد وطاؤس، حسن بصری سعید بن جبیر وغیرہم تابعین سے بھی یہی منقول ہے۔

ای جامعتم النساء (ابن عباس) قال قوم هو المجامعة وهو قول ابن عباس والحسن والمجاهد وقتادة (معالم) روی عن علی والی ابن کعب ومجاهد وطاؤس والحسن وعبید بن عمیر وسعید بن جبیر والشعبی وقتادة ومقاتل بن حیان نحو ذلك (ابن کثیر) وکنی بالملامسة من الجماع والی ذلك ذهب علی کرم الله تعالی وجهه وابن عباس رضی الله تعالی عنهما والحسن۔ (روح)

**۱۴۵** یعنی ایسی مٹی ہو جو خود غیر طاہر یا گندی نہ ہو، دو دو بار ہاتھ مار کر پہلی بار پورے چہرے اور دوسری بار ہاتھوں پر کہنیوں تک پھیر لیا کرو۔

فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً۔ یعنی کسی سبب سے بھی سہی، پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو۔

ماء کے صیغۂ نکرہ میں آنے سے فقہاء نے استدلال کیا ہے کہ پانی کسی قسم کا بھی ہو، وضو کے لئے درست ہے۔

فهو عام فی کل ما کان من سماء او نهر او عین عذب او ملح۔ (قرطبی)

امام ابو حنیفہؒ نے اس میں اتنی وسعت یہ رکھی ہے کہ رنگ، مزہ یا بو بدلے ہوئے پانی تک کی اجازت دے دی ہے۔

واجاز ابو حنیفة الوضوء بالماء المتغیّر۔ (قرطبی)

پانی کی معدومیت ایک تو حقیقی ہے وہ یہی کہ پانی موجود نہ ہو، دوسری حکمی ہے یعنی موجود تو ہو لیکن اس کا استعمال مرض پیدا کردے یا مرض کو بڑھا دے یا کسی اور وجہ سے اس کے استعمال سے معذوری ہو، فقہاء نے نام صرف چند چیزوں کے گنائے ہیں۔

فلم تقدروا علی استعماله لعدمه او بعده او فقد اٰلة الوصول الیه او المانع من حیة او سبع او عدوٍ (مدارک) لو کان یجد الماء الا انه مریض فخاف ان استعمل الماء اشتد مرضه تیمم (هدایه) واما ان یخاف فوات الرفیق او علی الرحل بسبب طلبه او لصوصًا او سباعًا او فوات الرفیق او عطشا علی نفسه او علی غیره ولذالك یطبخ بطبخه لمصلحة بدنه فاذا کان احد هذه الاشیاء تیمم وصلّے۔ (قرطبی)

صَعِيۡدًا طَيِّبًا۔ صعید لغت میں کہتے ہیں زمین کے بالائی رُخ کو، نہ کہ نفس مٹی کو۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يَشْتَرُونَ الضَّلَالَةَ

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جنھیں کتاب سے حصہ ملا تھا وہ گمراہی کو مول لے رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم (بھی)

وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ وَكَفَىٰ

گمراہ ہو جاؤ ۱۴۷ ؎ اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے ۱۴۸ ؎ اور اللہ کا

بِاللَّهِ وَلِيًّا وَكَفَىٰ بِاللَّهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا

حمایتی ہونا کافی ہے اور اللہ کا مددگار ہونا کافی ہے ۱۴۹ ؎ جو لوگ یہودی ہو گئے ہیں ان میں سے

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا

ایسے بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقعوں سے پھیرتے رہتے ہیں ۱۵۰ ؎ اور کہتے ہیں کہ ہم نے سُنا مگر ہم نے

وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ

مانا نہیں اور (ہماری) سُنو اور تمھیں سنوایا نہ جائے اور "رَاعِنَا" میں زبانوں کو توڑ موڑ کر دین میں طعنہ زنی کی راہ سے

الصعید یقال لوجہ الارض (راغب) قال الزجاج لیس ھو التراب انما ھو وجہ الارض ترابا کان أو غیرہ (تاج) والذی یعضد الاشتقاق وھو صریح اللغۃ انہ وجہ الارض علی ای وجہ کان من رمل او حجر او مدر او تراب (ابن العربی)

اس لئے حنفیہ کے ہاں جنس ارض کی تمام چیزوں پر تیمّم جائز ہے خواہ اُن پر گرد پڑی ہو یا نہ پڑی ہو اور امام مالکؒ اور ثوریؒ وغیرہ دوسرے ائمۂ فقہ بھی اس باب میں حنفیہ کے ہم زبان ہیں۔

ویجوز التیمم عند ابی حنیفۃ ومحمد بکل ما کان من جنس الارض (ھدایۃ) یتیمم المطہر من جنس الارض وان لم یکن علیہ نقع (درمختار) یتیمم بوجہ الارض کلہ ترابا کان او رملا او حجارۃ او معدنا او صبغۃ ھذا مذھب مالکؒ وابی حنیفۃ والثوری والطبری۔ (قرطبی)

جنسِ ارض میں سے ہونے کی شناخت یہ ہے کہ وہ آگ میں نہ جل جائے نہ اس سے پگھل جائے، چنانچہ حنفیہ کے ہاں گیرو، پتھر، سُرمہ یا قوت، زبرجد وغیرہ پر اس قاعدہ کے موافق اور چونے پر اس قاعدہ کے خلاف عملِ تیمم جائز ہے، البتہ خاکستر (راکھ) پر جائز نہیں، امام شافعیؒ کے نزدیک تیمم صرف مٹی ہی پر جائز ہے۔

۱۴۶ ؎ (چنانچہ دشوار موقعوں کے لئے اُس نے کیسے آسان حکم دے رکھے ہیں اور بھول چوک اور معمولی غلطیوں کو وہ برابر معاف کرتا ہی رہتا ہے)

۱۴۷ ؎ (اے مسلمانو!)

یہود خود تو علمِ توریت کے باوجود کفر وضلالت اختیار کئے ہوئے تھے ہی، مسلمانوں کو بھی اسلام سے

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا

اور اگر یہ لوگ کہتے کہ ہم نے سُنا اور ہم نے قبول کیا اور (ہماری) سُنو اور "اُنظُرنا" تو ان کے حق میں کہیں بہتر

لَّهُمْ وَاَقْوَمَ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

اور درست تر ہوتا ۱۵۱ لیکن اللہ نے تو ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کی ہے ۱۵۲ سو وہ ایمان نہ لاویں گے مگر تھوڑے سے ۱۵۳

برگشتہ کرنے کی طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے یہ اشارہ اسی طرف ہے۔

مِنَ الْكِتٰبِ۔ کتاب سے مُراد جنس کتاب ہے یعنی توریت۔

اَلَمْ تَرَ۔ میں خطاب عام ہے ہر مخاطب کے لئے۔

۱۴۸ (اور اس نے تم کو بھی خبردار کر دیا)

اہلِ کتاب کی طرف سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں نئے نئے ناموں اور کنایوں سے آج بھی پوری طرح جاری ہیں۔

۱۴۹ اللہ کا حمایتی (ولی) ہونا یہ ہے کہ وہ مومن بندوں کی مصلحتوں کی رعایت کرتا رہتا ہے اور اس کا مددگار (نصیر) ہونا یہ ہے کہ وہ انھیں دشمنوں کی نقصان رسانی سے محفوظ رکھتا ہے۔

۱۵۰ (اور لفظی و معنوی ہر قسم کی تحریف کرتے رہتے ہیں)

اَلْكَلِمَ۔ کلام سے مُراد کلامِ الٰہی یا توریت ہے۔

اَلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ یہ وہ لوگ تھے جو نسلاً اسرائیلی نہیں بلکہ عرب تھے لیکن یہود کی طویل صحبت سے متأثر ہو کر خود بھی یہود کے شعائر و عقائد اختیار کر کے رفتہ رفتہ ان میں جذب ہو چکے تھے، شرارت و خباثت میں یہ بھی نسلی یہود سے کچھ کم نہ تھے تفصیل پارۂ اول میں گزر چکی۔

نحو یین کہتے ہیں کہ هَادُوْا اور يُحَرِّفُوْنَ کے درمیان مَنْ محذوف ہے۔

قال الفراء المحذوف من المعنی من الذین ھادوا من یحرفون (قرطبی)

۱۵۱ (یعنی ان کے حق میں نافع بھی اور مطابقِ واقعہ بھی)

یہودِ عرب کی مستمر شرارتوں اور خباثتوں میں سے یہ امر بھی تھا کہ رسول اللہ (صلعم) کو مخاطب کرتے وقت ایسے الفاظ قصداً بولتے جن میں پہلوئے ذم بھی نکلتا رہتا اور تحقیر یا بد دعا بیدا ہوتی، پارۂ اول میں یہ ذکر پوری وضاحت سے آچکا ہے۔ یہود کی ان گستاخیوں کا دار و مدار چونکہ تلفظ اور الفاظ ہی کے سوءِ استعمال پر ہے اس لئے ترجمہ سے اصل مفہوم پوری طرح ظاہر ہی نہیں ہو سکتا، اصل عربی الفاظ کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ ظاہری مطلب یہ تھا کہ ہم نے آپ کا ارشاد سُن لیا اور آپ کے گمراہ کُن مخالف و معاند کا قول نہیں مانا، لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ ہم نے تمہاری بات تو سُن لی لیکن اُسے قبول نہیں کیا۔

اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ۔ ظاہراً مطلب یہ تھا کہ کوئی مخالف اور رنج دِہ بات آپ کے کان میں نہ جائے لیکن اصل مطلب یہ ہوتا تھا کہ تمھیں کوئی اچھی بات سُنائی ہی نہ دے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا

اے وہ لوگو جنہیں کتاب مل چکی ہے! اس (کتاب) پر ایمان لاؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے تصدیق کرنے

مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ

والی اس (کتاب) کی جو تمہارے پاس ہے ۱۵۴ قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں اور چہروں کو ان کے پیچھے کی جانب

اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

الٹا دیں ۱۵۵ یا ہم ان پر (اس طرح) لعنت کریں جس طرح ہم نے سبت والوں پر لعنت کی تھی ۱۵۶ اور اللہ کا حکم پورا ہو کر ہی رہتا ہے ۱۵۷

رَاعِنَا۔ راعنا کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ہماری رعایت سے دوبارہ فرمایئے لیکن تلفظ میں ''ع'' کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے بالکل گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا تھا۔

لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ۔ یعنی بظاہر لہجہ سے تعظیم و توقیر نظر آتی تھی لیکن زبانیں تقیہ سے کام لیتی ہوتی تھیں اور دل کے بغض و عناد کو چھپائے ہوئے رہتی تھیں۔

طَعْنًا فِي الدِّيْنِ۔ اس تصریح نے بتا دیا کہ یہودِ عرب کی ساری حرکتیں بے خیالی سے ناشی نہ تھیں اور نہ تفریح طبع کے طور پر تھیں، بلکہ اللہ کے دین پر طعن کرنا، اُسے مجروح کرنا مقصود ہی تھا۔

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ اسمع، انظرنا۔ تعلیم ان الفاظ کے استعمال کی ہوئی کہ یہ پہلوئے ذم سے خالی ہیں۔

۱۵۲ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ۔ یعنی اللہ نے ان کے دلوں کو اپنی رحمتِ خاصہ سے دور کر دیا۔

لعنت۔ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔

بِكُفْرِهِمْ۔ اس سے یہ صاف ہو گیا کہ رحمتِ خاصہ سے بھی یہ دوری اور مہجوری خود بخود اور ابتداءً نہیں ہوئی بلکہ یہ انہی کے کرتوتوں کا ثمرہ ہے۔

۱۵۳ اور یہ تھوڑے سے وہی تھے جو آگے چل کر مسلمان ہو گئے باقی سب کا خاتمہ علمِ الٰہی کے مطابق کفر ہی پر ہوا۔

۱۵۴ یعنی توریت کی، اُس کی اصلی اور غیر محرف صورت میں۔

اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ میں کتاب سے مراد توریت ہے۔

بِمَا نَزَّلْنَا۔ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اب اپنے رسول پر نازل کیا ہے، یعنی قرآن پر۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ۔ یعنی قرآن تو اصل توریت کی تصدیق ہی کرنے والا ہے نہ کہ اس کی تردید کرنے والا۔ کسوٹی یہ ہے کہ تصدیق و تائید اُسی توریت کی جو اپنی اصلی و غیر محرف صورت میں موجود ہو۔

۱۵۵ (یا اسی طرح کے کسی بھی عذاب شدید و ہولناک میں مبتلا کر دیں)۔

نَطْمِسَ وُجُوْهًا۔ طمس وجہ سے مراد ہے، چہرہ کے نقش و نگار اور آنکھ ناک منہ وغیرہ اعضاء کو مٹا دینا

فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَا۔ یعنی اُن لوگوں کے چہروں کو گدیوں کی طرف پلٹ دیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ

اللہ اس کو تو بے شک نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے ۱۵۸ لیکن اس کے علاوہ جس کسی کو بھی چاہے گا

يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ﴿۴۸﴾

بخش دے گا۔ اور جو کوئی (کسی کو) اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس نے یقیناً ایک بڑا گناہ سمیٹا ۱۵۹

فَ ہمیشہ تعقیب ہی کے لئے نہیں آتی کبھی تفصیلِ اجمال کے لئے بھی آتی ہے، چنانچہ یہاں اسی غرض سے ہے اور یہ دوسرا فقرہ پہلے فقرہ کی تفصیل و توضیح کر رہا ہے۔

یہ ڈراوے سب عذابِ اُخروی کے ہیں لیکن وجوہ کے معنی مجازاً سرداروں اور رئیسوں کے بھی آئے ہیں۔

قیل عنی بالوجوہ الاعیان والرؤساء (راغب) یراد بالوجوہ رؤسھم ووجھاؤھم۔ (کشاف)

اس لئے فقرہ کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ ہم ان کے سرداروں کو ذلیل و خوار کریں، چنانچہ کشاف و کبیر وغیرہ میں یہ معنی بھی نقل ہوئے ہیں، اسی طرح اس کے متصل فقرہ کے معنی یہ ہوں گے کہ "ہم ان کی وجاہت و اقبال کو سلب کر لیں اور ان پر ذلت و ادبار نازل کریں" جیسا کہ کشاف، بیضاوی وغیرہ میں یہ قول بھی نقل ہوا ہے۔

مِنْ قَبْلِ۔ کا صحیح مفہوم پیشِ نظر نہ رہنے سے ایک سوال یہ پیدا ہو گیا ہے کہ طمس و مسخ کی یہ سزائیں ہی کب؟ ظاہر ہے کہ ان سزاؤں کا ظہور تو آخرت میں ہوگا اور من قبل ہمیشہ کسی واقعہ کے واقع ہو جانے ہی پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ صرف اس کے ہو سکنے پر بھی دلالت کرتا ہے اور محلِ تہدید میں آتا ہے تو اس معنی میں اس کا استعمال قرآن مجید میں کثرت سے ہوا ہے، حدیثِ نبوی میں ایک دعا آئی ہے

اللھم ارزقنی عینین ھطالتین تسقیان القلب بذروف الدمع من خشیتک قبل ان یکون الدموع دما والاضراس جمرا

قبل کے یہاں کوئی معنی بھی نہیں سمجھتا کہ بعد کا واقعہ صرف زمانًا مؤخر ہے اور واقع ہو کر رہے گا بلکہ مطلب صرف اس قدر ہے کہ اس کے وقوع سے اپنے کو بچا یا جائے، اردو ہی کے محاورہ میں ہم برابر کہتے رہتے ہیں کہ قبل اس کے کہ دوزخ میں پڑو گناہوں سے توبہ کر لو اسی طرح آیت کا خلاصۂ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ طمس و مسخ کی سزاؤں سے بچنے کے لئے قرآن اور صاحبِ قرآن کی تصدیق کر لو۔

۱۵۶ أَصْحَابَ السَّبْتِ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے۔

۱۵۷ (سو طمس، مسخ، لعنت جس چیز کا بھی حکم ہو گیا، وہ بہرحال پورا ہو کر رہے گا۔)

۱۵۸ (سو مشرک عذابِ دائمی میں مبتلا رہے گا)

مشرک کی نجات کی کوئی صورت ہی نہیں، اس نے جنت کی نعمتوں کو قبول کرنے کی استعداد و صلاحیت ہی اپنے میں باقی نہ رکھی۔

۱۵۹ (اور اس جرمِ عظیم کی بنا پر وہ قابلِ مغفرت نہ ہوگا)

افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا۔ "گناہ سمیٹا" کا محاورہ خاص اس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے ہے۔

مَا دُونَ ذَٰلِكَ۔ یعنی اور جتنے بھی گناہ ہو سکتے ہیں، وہ بہرحال شرک سے کمتر ہی ہوں گے۔

يَغْفِرُ ... لِمَنْ يَشَاءُ۔ یعنی شرک تو آسمانی حکومت سے صریح بغاوت کے مرادف ہے، بس اُسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت مغفرت کی گنجائش رکھتی ہے اور جس کسی کے حق میں مشیتِ الٰہی ہوگی اُسے معافی مل جائے گی، خواہ اس نے توبہ نہ بھی کی ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ بَلِ اللّٰهُ یُزَكِّیْ مَنْ یَّشَآءُ وَ لَا یُظْلَمُوْنَ

کیا تونے ان پر نظر نہیں کی جو اپنے کو پاکیزہ ٹھہراتے ہیں ۱۶۰ حالانکہ اللہ جسے چاہے پاکیزہ ٹھہرائے ۱۶۱ اور

فَتِیْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَیْفَ یَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَ كَفٰى بِهٖۤ اِثْمًا مُّبِیْنًا ﴿۵۰﴾

ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا ۱۶۲، دیکھ تو یہ لوگ اللہ پر کیسا جھوٹا طوفان باندھتے ہیں اور یہ کافی ہے جرم صریح کے لئے ۱۶۳

وقد ابانت هذه الآية ان كل صاحب كبيرة ففي مشيئة الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه عليه ما لم تكن كبيرته شركًا بالله (ابن جرير) اى يغفر ما دون الشرك وان كان كبيرة مع عدم التوبة (مدارك)

آیت میں رد ہے خوارج وغیرہ اُن گمراہ فرقوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ہر گناہ شرک ہے اور ہر گناہ کی سزا عذاب ابدی ہے۔

لِمَنْ یَّشَآءُ۔ مشیت کا اطلاق بلا کسی قید و شرط کے ہے، یہیں سے رد نکل آیا معتزلہ کا جو کہتے ہیں کہ مغفرت ان کی ہوگی جو توبہ کر لیں نہ ان کی جو توبہ نہ کریں گے توبہ کے بعد تو ظاہر ہے کہ اہل کفر و شرک کی بھی مغفرت ہو جاتی ہے تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے تھے کہ جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل نفع نہیں پہنچا سکتا ہے، اسی طرح میرا خیال ہے کہ توحید کے ساتھ کوئی عمل ضرر نہیں کرتا، یہ قول حضرت عمرؓ کے سامنے دہرایا گیا تو آپ نے اس پر سکوت اختیار کیا

۱۶۰ (محض اپنی عالی نسبی کی بنا پر یا او رکسی غیر شرعی بنا پر)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ۔ یعنی ایسے لوگوں کی حماقت بھی قابل دید ہے۔

اَلَّذِیْنَ یُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ یعنی اللہ نے توحید و تقویٰ کو جو معیارِ فضیلت و مقبولیت رکھ دیا ہے، اُسے چھوڑ چھاڑ لوگوں نے نسل وغیرہ کے طرح طرح کے معیارِ شرف و بزرگی گڑھ لئے ہیں، اور ان بنیادوں پر اپنے کو معظم و مقدس سمجھنے لگتے ہیں، یہ تمام تر حماقت و ضلالت ہے۔

آیت کا اشارہ خاص یہود کی جانب ہے، اپنے کو نسلِ انبیاء میں سے ہونے کی بنا پر مقدس سمجھ رہے تھے، باقی ہندوستان میں برہمن چھتری وغیرہ اپنے کو محض اونچے خاندانوں سے انتساب کی بنا پر مقدس سمجھنے والے، اپنے چندر نسبی، سورج بنسی ہونے پر فخر و ناز کرنے والے، یا جاپانیوں کی طرح اپنے کو دیوتاؤں کی نسل میں قرار دینے والے سب اس کے تحت میں آجاتے ہیں اور پھر اسی طرح کسی درجہ میں وہ مسلمان بھی جو اپنی پیرزادگی، مخدوم زادگی، سیدزادگی کے زعم میں اپنے کو دوسروں سے بالاتر سمجھتے رہتے ہیں

۱۶۱ یعنی معتبر پاکیزگی تو اسی کی ہے جسے اللہ پاکیزہ قرار دے ورنہ اپنے زعم و پندار میں اپنے کو پاکیزہ ٹھہرا لینے سے کیا ہوتا ہے۔

۱۶۲ یعنی جو سزا انھیں ملے گی، وہ اُن کے جرم سے ذرہ بھر بھی زائد نہ ہوگی، اُن کا جرم ہے ہی اسی سخت سزا کا مستوجب، سزا استحقاق سے زائد نہیں۔

فَتِیْلًا۔ فتیل کے لفظی معنی دھاگے کے ہیں، عربی محاورہ میں مراد حقیر سی حقیر چھوٹی سے چھوٹی چیز سے ہوتی ہے، جیسے ایک دوسری جگہ ولا یظلمون نقیرا بھی آیا ہے۔

يضرب به المثل في الشئ الحقير (راغب) يرجع الى الكناية عن تحقير الشئ وتصغيره (قرطبی) اشارة الى اقل شئ (بحر)

جیسے اُردو میں ایسے موقع پر "ذرہ بھر" "رتی بھر" "بال برابر" استعمال ہوتے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ

کیا تو نے اُن لوگوں پر نظر نہیں کی جنھیں کتاب سے بہرہ ور کیا گیا تھا ۱۶۴ (اس پر بھی) یہ جبت اور شیطان کو مانے ہوئے

وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا (۵۱)

ہیں ۱۶۵ اور کفر کرنے والوں کی بابت کہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں سے تو یہی لوگ زیادہ ہدایت یاب ہیں ۱۶۶

۱۶۳ (تو ایسے صریح جرم پر ایسی سزا کیا کچھ ظلم و زیادتی ہے؟)
بہ میں ضمیر افتراء یعنی افتراء علی اللہ کی جانب ہے۔
والضمیر فی بہ عائد علی الافتراء وھو الذی انکر علیھم (بحر)

۱۶۴ یعنی یہود۔ اور کتاب سے مراد کتابِ الٰہی یا توریت ہے۔
اَلَمْ تَرَ پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے کہ یہ فقرہ موقعِ حیرت پر آتا ہے۔

۱۶۵ اَلْجِبْت۔ جبت کا اطلاق تو اللہ کے سوا ہر معبود پر ہوتا ہے۔
یقال لکل ما عبد من دون اللہ جبت۔ (راغب)
لیکن خصوصیت کے ساتھ اس کا استعمال ساحروں اور کاہنوں کے لئے ہوتا ہے۔
سمی الساحر والکاھن جبتا (راغب)
صحابہ اور تابعین دونوں سے یہ معنی منقول ہیں۔
قال ابن عباس وابن جبیر وابو العالیۃ الجبت۔ الساحر (قرطبی) قال عمر الجبت السحر (ابن جریر)
یہود میں عملیات کا اور سحر، کہانت، نجوم وغیرہ علوم سفلی کا ذوق ابتداء سے چلا آ رہا ہے جیسا کہ پارۂ اول میں آیت واتبعوا ما تتلوا الشیاطین کے تحت میں دکھایا جا چکا ہے۔
جبت کا لفظ لا کر عجب نہیں کہ اشارہ ان کی اسی قومی خصلت کی جانب کرنا مقصود ہو۔
الطاغوت پر حاشیہ پارۂ سوم پر گزر چکا۔
طاغوت ہر وہ چیز ہے جو انسان میں طغیان و عدوان پیدا کر دے۔
الطاغوت کل ما یطغی الانسان (قرطبی)
عجب نہیں کہ یہ لفظ لا کر یہود کے رجحانِ مادیت اور ذوقِ مادہ پرستی کی طرف توجہ دلانا منظور ہو۔

۱۶۶ روایتوں میں آتا ہے کہ سردارانِ یہود مکہ میں آئے تو قریش نے ان سے پوچھا کہ ہمارا دین بہتر ہے یا پیروانِ محمد ﷺ کا، اور سوال میں اپنے دینی کارناموں مثلاً خدمتِ حجاج، خدمتِ کعبہ کا ذکر بھی کر دیا، سردارانِ یہود بولے کہ ان کے دین سے تو تمہارا ہی دین بہتر ہے اور ان سے زیادہ ہدایت یاب تم ہی ہو۔
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ الذین کفروا سے مراد قریش و مشرکینِ مکہ ہیں۔
ل کے معنی "بابت" یا "متعلق" کے ہیں۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ﴿٥٢﴾

یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے ۱۶۷؎ اور جس پر اللہ لعنت کرے تو اس کا کوئی مددگار تو ہرگز نہ پائے گا ۱۶۸؎

أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ﴿٥٣﴾

کیا انھیں بھی کچھ اقتدار نصیب ہے؟ تو ایسی حالت میں تو یہ لوگوں کو تل بھر بھی نہ دیں ۱۶۹؎

أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ

کیا یہ لوگوں پر حسد کر رہے ہیں ان چیزوں کے باعث جو انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھی ہے ۱۷۰؎

آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ﴿٥٤﴾

سو ہم نے تو آل ابراہیم کو کتاب و حکمت دی ہے اور انھیں بڑا اقتدار بھی دیا ہے ۱۷۱؎

لِلَّذِينَ ای فی حقھم (روح) واللام للتبلیغ (بحر)

الَّذِينَ آمَنُوا۔ سے مراد مسلمان ہیں۔

۱۶۷؎ خود دینِ توحید رکھ کر اور آئینِ انبیاء سے آشنا ہو کر، دینِ توحید سے اتنی بیزاری اور ذاتِ رسولؐ سے اتنا بغض کہ شرک اور مشرکین تک کو اُن سے بہتر بتا رہے ہیں! ملعونیت کا تحقق اُن سے بڑھ کر اور کس پر ہوگا۔

۱۶۸؎ (جو عذاب سے اُسے بچالے یا اس میں کچھ کمی ہی کرا دے)

مشرک قوموں اور قبیلوں نے خدا کے ساتھ ساتھ اپنے اور بھی حامیِ، سفارشی گڑھ رکھے تھے، یہ دا نھیں پر ہو رہا ہے۔

۱۶۹؎ یعنی دینی مقبولیت اور روحانی عظمت الگ رہی، یہود کو اگر دنیوی امارت یا سیادت نصیب ہوتی تو یہ اتنے بخیل اور تنگ دل ہیں کہ اس میں بھی کسی کو شریک نہ ہونے دیتے بلکہ لوگوں کے حقوق تک نہ ادا کرتے اور شاید اسی بخیلی اور تنگ دلی کی قومی جبلت کی بنا پر یہود دنیوی اقتدار سے بھی صدیوں محروم رکھے گئے۔

نَقِيرًا۔ نقیر کے لفظی معنی اس گڑھے کے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے، عربی محاورہ میں مثل فتیل کے اس سے مراد حقیر سے حقیر اور چھوٹی سے چھوٹی چیز ہوتی ہے جیسے اردو میں رائی بھر، رتی بھر، وغیرہ بولتے ہیں "تل برابر" ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی کا ہے۔

یضرب بہ المثل فی الشئ الطفیف (راغب) ھو مثل فی القلۃ (کشاف) لا یؤتون نقیرا ای یمنعون الحقوق (قرطبی)

فتیلا پر حاشیہ ابھی اوپر گزر چکا ہے۔ فتیلا۔ نقیرا تقریباً ایک ہی مفہوم کے ادا کرنے کو عربی میں آتے ہیں۔

۱۷۰؎ (مثلاً نعمتِ نبوت۔)

النَّاس کے لفظی معنی تو "لوگوں" کے ہیں لیکن محاورۂ قرآنی میں مراد متعین گروہ بھی لئے گئے ہیں یہاں اشارہ عرب یا بنی اسمٰعیل یا خود رسولؐ اور مومنین کی طرف سمجھا گیا ہے۔

فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾

اور ان میں سے کوئی کوئی تو اس پر ایمان لائے اور کوئی کوئی اس سے رُکے رہے اور دہکتا ہوا جہنم ہی کافی ہے ۱۷۲

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ

بے شک جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ کفر کیا ہم انھیں عنقریب (دوزخ کی) آگ میں جھونکیں گے جب کبھی

بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

ان کی جلدیں پک جائیں گی ہم ان کی جلدوں کو بدل کر دوسری کر دیا کریں گے تاکہ وہ (برابر تازہ) عذاب چکھتے رہیں ۱۷۳ بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۱۷۴

. الناس ھذا العرب حسد تھا بنو اسرائیل (بحر عن قتادۃ) حسدت الیھود قریشا لان النبوۃ فیھم (قرطبی عن الضحاک) المراد ھھنا الرسول ومن معہ من المؤمنین۔ (کبیر)

یہود کو اصلی خلش اسی کی تھی کہ انبیاء تو ہمیشہ اسرائیلیوں میں ہوئے ہیں یہ ایک عرب کو کیسے نبوت مل گئی۔

اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ مراد نبوت ہے، قتادہ و ابن جریج تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

معنی الفضل فی ھذا الموضع النبوۃ التی فضل اللہ بھا محمدا و شرف بھا العرب (ابن جریر عن قتادۃ و ابن جریج)

اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔

اولی التاویلین فی ذٰلک بالصواب قول قتادۃ و ابن جریج الذی ذکرناہ قبل (ابن جریر)

**۱۷۱** اس نسل ابراہیمی کی دو بڑی شاخیں ہیں، بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل یہاں بنی اسرائیل کو یاد دلایا گیا ہے کہ ہماری نعمتوں کے وعدے تو کُل نسلِ ابراہیمؑ سے ہیں نہ کہ اس کی ایک ہی شاخ سے، پھر تم تنہا اپنے ہی کو ان نعمتوں کا حقدار کیسے سمجھنے لگے ہو اور جب ایک اسماعیلی کو یہ نعمتیں مل رہی ہیں تو تمھیں اس پر حسد یا حیرت کیوں ہے؟ اَلْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ یہ دونوں روحانی نعمتیں ہیں، ان کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے اور ملک عظیم دُنیوی نعمت ہے اس کا ذکر الگ کر کے کیا ہے۔

**۱۷۲** (اسی لئے دنیا میں سزا ملنا اور نہ ملنا چنداں قابلِ التفات نہیں)

مَنْ اٰمَنَ بِهٖ۔ میں ضمیر کس طرف ہے؟ بعض نے مُراد کتاب لی ہے۔

من امن بالکتٰب۔ (بحر)

بعض نے وہ سارا فقرہ جو آل ابراہیمؑ سے متعلق گزرا ہے۔

بما ذکر من حدیث آل ابراھیم (کشاف۔ بیضاوی)

اور بعض نے ذات محمدیؐ کو۔

بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم (بیضاوی) یعنی بالنبی صلعم۔ (قرطبی)

اور ماحصل ان تینوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا

اور جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے انھیں ہم عنقریب باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے

الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ؗ وَّنُدْخِلُهُمْ

نہریں پڑی بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے ان کے لئے اُن باغوں میں صاف ستھری بیبیاں ہوں گی

ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ

اور ہم انھیں بڑے گنجان سایہ میں لا اُتاریں گے ۱۷۵ اللہ تمھیں حکم دیتا ہے کہ ذمہ داریاں اُن کے اہل کو سپرد کر دو ۱۷۶

**۱۷۳** آیت کا مقصود اہل دوزخ کے دوامِ عذاب کا اعلان ہے۔

نَضِجَتْ۔ نضج کے لفظی معنی پک جانے کے ہیں، یہاں مراد جل چکنے سے ہے، مقصود یہاں یہی ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا اور احساسِ عذاب ہمیشہ تازہ ہوتا رہے گا۔

لیدوم لهم ذوقه ولاینقطع (کشاف) المقصود بیان دوام العذاب وعدم انقطاعها (کبیر)

صاحب بحر نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے اگرچہ قبول نہیں کیا ہے ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ کھال جب جل جائے گی تو اس میں مزید الم کا ادراک ہی کہاں باقی رہے گا، نہیں بلکہ کھال کا احساس ہر دم تازہ ہوتا رہے گا اور جلد بے حس کبھی بھی نہ ہونے پائے گی، آخرت میں خواص اشیاء کو دنیا کے خواص طبعی پر قیاس کر لینا یوں بھی کمال بے دانشی ہے۔

**۱۷۴** چنانچہ صفتِ عزیز کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نئے پرانے ہر قسم کے عذاب پر ہر وقت قادر ہے اور صفتِ حکیم کا تقاضا یہ ہے کہ عذاب ہو یا تجدیدِ عذاب، کوئی بھی شے حکمتوں اور مصلحتوں سے خالی نہیں۔

**۱۷۵** یعنی انھیں عیش و راحت ہر طرح کی اور ہمیشہ حاصل رہے گی۔

اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ پر حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا۔

**۱۷۶** (اے انسانو!)

الامانات۔ امانۃ کا لفظ عربی میں بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے، ہر قسم کی ذمہ داریاں اس کے تحت میں آجاتی ہیں اور یہ لفظ حقوق اللہ و حقوق العباد کا جامع ہے۔

الامانة كلّ ما فرض على العباد (اقرب)

اور ائمۂ تفسیر بھی اسی وسعت و جامعیت کی طرف گئے ہیں، چنانچہ امام رازی نے تصریح و تفصیل سے لکھا ہے کہ اس کے تحت میں اعتقادیات، اخلاق و معاملات سب ہی آگئے۔

امر المؤمنين في هذه الآية باداء الامانات في جميع الامور سواء تلك الامور من باب المذاهب والديانات او من باب الدنيا والمعاملات (کبیر)

دوسروں نے بھی ایسا ہی کچھ کہا ہے۔

وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا

اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو ۱۷۷ بے شک اللہ تم کو بہت ہی اچھی

يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۵۸﴾

بات کی نصیحت کرتا ہے ۱۷۸ بے شک اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ۱۷۹

ھو یعم جمیع الامانات الواجبۃ علی الانسان من حقوق اللہ علی عبادہ ومن حقوق العباد ۶۶۵
بعضھم علی بعض (ابن کثیر) تعم الحقوق المتعلقۃ بذمۃ من حقوق اللہ تعالٰی وحقوق العباد سواء کانت فعلیۃ اوقولیۃ او اعتقادیۃ (روح) وقیل المراد من الامانات جمیع الامانات (معالم)

اور اسی لئے ان حضرات نے آیت کا خطاب صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ جمیع بنی آدمؑ سے سمجھا ہے۔

حکمھا عام ولھذا قال ابن عباس ومحمد بن الحنفیۃ ھی للبر والفاجر ای ھی امر لکل احد (ابن کثیر) والامانۃ تؤدی الی البر والفاجر والعھد یوفی بہ البر والفاجر (روح) قیل نزلت عامۃ وھو مروی عن أبی وابن عباس والحسن وقتادۃ (بحر) والظاھر فی یامرکم ان الخطاب عام لکل احد فی کل امانۃ (بحر) والاظھر فی الآیۃ انھا عامۃ فی جمیع الناس (قرطبی) والاظھر ان الخطاب عام یتناول الولاۃ فیما الیھم من الامانات فی قسمۃ الاموال ورد الظلمات وعدل الحکومات ومن دونھم من الناس فی الودائع والعواری والشھادات (بحر)

آیت بابِ احکام میں اہم ترین آیتوں میں سے ہے۔

ھذہ الآیۃ من امھات الاحکام تضمنت جمیع الدین والشرع (قرطبی)

مفہوم کی یہی وسعت صحابہؓ و تابعینؒ سے بھی منقول ہے۔

قال ابن عباس ھی مبھمۃ للبر والفاجر وقال محمد بن الحنفیۃ ھی عامۃ للبر والفاجر (ابن کثیر) وقال ابو العالیۃ الامانۃ ما امروا بہ ونھوا عنہ (ابن کثیر)

ضمناً یہ بات نکل آئی کہ نظامِ شریعت میں کوئی گنجائش بھی سعی و سفارش، اقربا پروری وغیرہ کی نہیں حکومت میں عہدے صرف انھیں کو ملنے چاہئیں جو ان خدمتوں اور منصبوں کے واقعی اہل ہوں۔

۱۷۷ (ان کے آپس کے حقوق کے باب میں)

اب خطاب حکام اور اہلِ حلّ و عقد سے ہو رہا ہے۔

انما نزلت فی الامراء یعنی الحکام بین الناس (ابن کثیر) والمراد بالحکم ما کان عن ولایۃ عامۃ او خاصۃ وادخلوا فی ذلک ما کان عن تحکیم (روح) وقال علی وابن اسلم وشھر وابن زید خطاب لولاۃ المسلمین خاصۃ فھو للنبی صلعم وامرائہ ثم یتناول من بعدھم (بحر)

۱۷۸ (کہ اس طریق معدلت سے دنیا میں بھی انتظام درست رہیں گے اور آخرت میں بھی اجر اسی کا ہے)

يَعِظُكُمْ بِهٖ سے اشارہ اسی طریق معدلت کی جانب ہے کہ اس کے سارے نظامِ حکومت و معاشرت و معیشت کی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور اپنے میں سے اہل اختیار کی اطاعت

مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

کرو ۱۸۰ پھر اگر تم میں باہم اختلاف ہو جائے کسی چیز میں تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹا لیا

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾

کرو ۱۸۱ اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۱۸۲ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوشتر ہے ۱۸۳

شیرازہ بندی قائم رہے گی۔

۱۷۹ چنانچہ وہ ادائے حقوق اور عدل گستری کے باب میں تمہارے لفظ و قول کو بھی سنتا رہتا ہے اور تمہاری نیتوں اور محرکاتِ عمل پر بھی نظر رکھتا ہے۔

۱۸۰ (کہ اُن کے احکام بھی احکامِ خدا و رسول پر مبنی اور ان ہی سے ماخوذ ہوں گے)

اَطِيْعُوا اللّٰهَ۔ مطاعِ اصلی اور حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ رسولِ مطاع مطلق اس اعتبار سے ہیں کہ اللہ کے احکام وہی پہنچانے والے اور وہی ان احکام کی شرح و تفصیل کرنے والے ہیں۔

اُولِي الْاَمْرِ۔ اولوا الامر کون ہیں؟ اس پر اچھی خاصی قیل و قال ہوئی ہے، علماء و فقہاءِ امت بھی مراد لئے گئے ہیں، اور امراء و حکام بھی، اور بہتر یہ ہے کہ دونوں ہی مراد لئے جائیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یہ دونوں ہوتے ہیں۔

اى الولاة او العلماء (مدارک) روى عن جابر بن عبد الله و ابن عباس رواية والحسن و عطاء و مجاهد انهم اولوا الفقه والعلم وعن ابن عباس فى رواية و ابى هريرة انهم امراء السرايا و يجوز ان يكونوا جميعا مرادين بالآية لان الاسم يتناولهم جميعه (جصاص)

اولوا الامر خواہ علماء و فقہاء ہوں یا امراء و حکام، بہرحال ان میں مستقل مطاع ہونے کی صلاحیت ذرا سی بھی نہیں، وہ مطاع صرف اس حیثیت سے ہیں کہ احکامِ شریعت کے نافذ کرنے والے یا بعض جزئیات میں شرح کرنے والے ہیں، اس حد کے آگے ان کی کوئی اطاعت نہیں۔

مِنْكُمْ۔ اس تصریح کے ہوتے ہوئے اس آیت سے جن صاحبوں نے کسی غیر اسلامی حکومت کی اطاعت پر استدلال کیا ہے، انھوں نے اپنی فہمِ سلیم پر بڑا ظلم کیا، اطاعت تو مسلم امیر کی بھی ہر صورت و حال میں جائز نہیں، چہ جائیکہ کسی غیر مسلم کی، وہ اگر جائز ہے بھی تو کم از کم اس آیت سے تو اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۸۱ (اور اس کی تحقیق مزید کر لیا کرو کہ اولوا الامر کا حکم احکامِ شریعت کے کہاں تک مطابق ہے)

اِلَى اللّٰهِ۔ اللہ کے احکام کی طرف مراجعت کرنا تو ظاہر ہے کہ کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ہر وقت ممکن ہے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

کیا آپ نے اُن لوگوں پر نظر نہیں کی جو دعوے رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں جو آپ پر نازل

مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ

کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے ۱۸۴ (لیکن) چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں ۱۸۵

يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰

حالانکہ انھیں حکم مل چکا ہے کہ اس کے مقابلہ میں کفر اختیار کریں ۱۸۶ اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انھیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے ۱۸۷

لیکن الی الرسول کی تعمیل کی کوئی صورت رسول اللہؐ کی وفات کے بعد بجز اس کے ممکن نہیں کہ دفترِ احادیث وسنن کی طرف رجوع کیا جائے ـــ حدیث وسنت کی حجیت اس طرح فرقۂ اہل قرآن کی سطحیت کے علی الرغم خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔

اِنْ تَنَازَعْتُمْ۔ ضمیر جمع مخاطب سے مراد اولوالامر اور عام افراد امت ہیں۔ اس تصریح نے یہ حقیقت اور کھول دی کہ حکام وعلماء سے عوام تک کا اختلاف بالکل جائز ہے آخری اپیل کتاب وسنت ہی کی عدالت میں ہونی چاہیئے اور وہی ساری شریعت کا ماخذ ہے یہیں سے اس فرقہ کا بھی رد نکل آئے گا جو رسولِ معصوم کے علاوہ مستقل ائمۂ معصوم کا بھی وجود تسلیم کئے ہوئے ہے، ہر امامِ وقت اپنی ساری بزرگیوں کے باوجود بہرحال غیر معصوم ہے۔

۱۸۲ (اور اس لئے شتر بے مہار نہیں ہو، بلکہ اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس رکھتے ہو)

یہ سوال آخرت کا استحضار ہی تو ہے جو مومن کو جادۂ مستقیم پر ہر وقت قائم رکھتا ہے۔

شیخ رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ قرآن مجید کی یہی دو آیتیں اِنَّ اللّٰہَ یَأمُرُکُمْ الخ اور یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا الخ حکومتِ اسلامی کی پوری بنیاد کا کام دے سکتی ہیں، اور اگر ان کے علاوہ قرآن مجید میں کچھ بھی اس موضوع پر نہ ہوتا تو یہی دو آیتیں ہی کافی تھیں سارے احکام کے استنباط کے لئے۔

ھاتان الآیتان ھما اساس الحکومۃ الاسلامیۃ ولو لم ینزل فی القرآن غیرھما لکفتا المسلمین فی ذالک اذا ھم بنوا جمیع الاحکام علیھما (المنار)

۱۸۳ یعنی دنیا میں بھی یہی ذریعۂ امن وراحت ہے اور آخرت میں بھی وسیلۂ نجات وسعادت۔

ذٰلِکَ یعنی یہی طریق عمل جس کا ذکر ابھی ہو چکا ـــ اصل اور غیر مشروط اطاعت اللہ کی اللہ ہی کے نائب معصوم کی حیثیت سے اطاعت رسول کی اور پھر ان دونوں کے واسطہ سے اور پھر ان ہی کی موافقت وسازگاری کے ساتھ مشروط اطاعتِ حکام وعلمائے اسلام کی

۱۸۴ مراد یہود اور منافقین ہیں۔

مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ۔ یعنی توریت۔

یَزْعُمُوْنَ۔ زعم کے اصل معنی مطلق قول کے ہیں، خواہ وہ حق ہو یا باطل لیکن عموماً اس کا استعمال جھوٹ یا مشکوک بات کے لئے ہوتا ہے۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰى مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوۡلِ

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس حکم کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی

رَاَيۡتَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾ فَكَيۡفَ اِذَاۤ

طرف آؤ تو آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کی طرف سے بڑی پہلو تہی کر رہے ہیں ۱۸۸ پھر کیسی گزرتی

اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡكَ

ہے جب ان پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے اپنے ہی ہاتھوں ۱۸۹ پھر آپ کے پاس آتے ہیں

يَحۡلِفُوۡنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّتَوۡفِيۡقًا ﴿۶۲﴾

اللہ کی قسم کھاتے ہوئے کہ ہمارا مقصد تو محض بھلائی اور مصلحت تھا ۱۹۰

الزعم القول الحق والباطل واكثر ما يقال فيما يشك فيه ولا يتحقق (تاج) واذا شك فيه فلم يدر لعله كذب او باطل قيل بزعم فلان (لسان)

محاورۂ قرآنی میں یہ ہمیشہ ذم ہی کا پہلو لئے ہوئے آیا ہے۔

جاء فی القرآن فی کل موضع ذم القائلون به (راغب) الزعم يستعمل فی الباطل والكذب وهو يرد على الزاعمين ولا يقرهم على شئ - (المنار)

اَلَمۡ تَرَ۔ اس عنوانی ترکیب سے ظاہر ہو گیا کہ آگے ذکر کسی اہم و عجیب ہی واقعہ کا آنے والا ہے۔

۱۸۵ (بجائے اس کے کہ اُسے شریعت کی عدالت میں لائیں)

طاغوت۔ پر حاشیہ پ۳، رکوع ۲ میں گزر چکا ہے، یہاں مراد ہر غیر اللہ کی حکومت و اقتدار ہے۔

وكل من يتحاكم اليه من دون الله ورسوله ممن يتحاكم بغير ما انزل الله على رسوله فهو راغب عن الحق الى الباطل وذلك عين الطاغوت (المنار)

۱۸۶ یعنی اس کی حاکمیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اور طاغوت کے اقتدار کے آگے گردن نہ جھکائیں۔

۱۸۷ یعنی بنی آدم کے دشمن ازلی شیطان کی تو تمنا ہی یہ رہتی ہے کہ آدم زادوں کو راہِ حق سے زیادہ سے زیادہ دور کر دے

۱۸۸ منافقین یوں تو اسلام کے مدعی تھے لیکن جب کبھی کوئی مقدمہ معاملہ آپڑتا تو فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم) کی خدمت میں حاضر ہونے سے بہت ہی گھبراتے کہ یہاں تو بہر حال بلا رو رعایت دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہو کر رہے گا، اور کسی قسم کی سخن سازی و خیانت نہ چل سکے گی۔

تعالوا.... الی الرسول۔ رسول کی طرف آؤ کہ آپ قانونِ شریعت کے موافق فیصلہ کر دیں۔

۱۸۹ مثلاً یہی کہ ان کی خیانت یا منافقت کا راز کھل گیا، اور اس پر اُن کی دھر پکڑ شروع ہو گئی۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ (اُسے) سب جانتا ہے تو آپ ان سے چشم پوشی کر جایا کیجئے ۱۹۱ اور انھیں نصیحت کرتے رہئے

لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾ وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

اور انھیں ان کے باب میں مؤثر بات کہتے رہئے ۱۹۲ اور ہم نے جو بھی رسول بھیجا وہ اس غرض سے کہ اس کی اطاعت اللہ کے حکم سے کی جائے ۱۹۳

**۱۹۰** یعنی جب ان کی دورنگی کھل جاتی ہے اور بازپرس شروع ہوجاتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر یقین دلانے لگتے ہیں کہ ہم بھی تو مومن ہیں اور ہمیں تو رسول کی حاکمیت سے کچھ انکار تھوڑے ہی ہے ہم تو محض نیک نیتی اور فریقین کی خیر خواہی کے خیال سے مقدمہ کو دوسری جگہ لے گئے تھے۔

آیتوں کی شانِ نزول میں آتا ہے کہ ایک یہودی اور ایک نام کے مسلمان یعنی منافق کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوا، یہودی نے رسول اللہ صلعم کی دیانت پر اعتماد کرکے کہا کہ چلو وہیں تصفیہ کرائیں منافق کا پہلو کمزور تھا، بولا کہ نہیں بلکہ سردار یہود کعب بن اشرف کے پاس چلیں، بالآخر مقدمہ رسول اللہ صلعم ہی کی خدمت میں آیا اور یہاں سے فیصلہ یہودی کے موافق ہوا کہ وہی اس معاملہ میں حق پر تھا، منافق نے کہا کہ چلو اب عمرؓ کے پاس چلیں، وہ غالباً اپنے دل میں یہ سمجھا کہ عمرؓ کی شدت و غلظت کافروں پر بہت بڑھی ہوئی ہے اور میں ظاہر میں تو بہرحال مسلمان ہوں وہاں میری ہی چل جائے گی۔

آیات میں تلمیح اسی واقعہ کی جانب ہے، منافقین اپنا یہ عذر پیش کرتے تھے کہ ہم کسی اور کے پاس مقدمہ کچھ اس خیال سے تھوڑے ہی لے جاتے ہیں کہ فیصلہ کا حق رسولؐ کے سوا کسی اور کو حاصل ہے، بلکہ ہم تو اس لئے لے جاتے ہیں کہ وہاں حق و انصاف و قانون سے زیادہ فریقین کی مصلحت اور دلجوئی پر نظر رہے گی۔

**۱۹۱** (اور اُن کے کرتوتوں کو علمِ خداوندی اور مواخذۂ خداوندی کے حوالہ رکھئے، خود مواخذہ سر دست نہ فرمایئے)

مَا فِي قُلُوبِهِمْ۔ یعنی جو کچھ یہ اپنے دلوں میں کفر و نفاق کی قسم سے چھپائے ہوئے ہیں۔

**۱۹۲** یعنی خاص ان کی اصلاح سے متعلق ان پر کافی مضامین کی تبلیغ کرتے رہئے کہ ان پر حجتِ الٰہی قائم رہے

وَعِظْهُمْ۔ انھیں نصیحت کرتے رہئے جیسا کہ منصبِ رسالت کا اقتضاء ہے۔

**۱۹۳** یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رسول کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کو حاکم اعلیٰ اور مقتدا تسلیم کیا جائے اور اُمت اُسی کے لائے ہوئے قانون اور بتلائی ہوئی شریعت پر چلنا سیکھے ورنہ محض زبانی رسول مان لینے سے تو کوئی حاصل ہی نہیں۔

مِنْ رَّسُوْلٍ میں مِنْ زائدہ تاکید کی غرض سے ہے۔

اور یہ ترکیب محض رسولاً سے اطلاقِ نفی میں کہیں زیادہ مؤکد ہے۔

من زائدۃ للتاکید (قرطبی) من رسول ابلغ فی استغراق النفی من ان یقال وما ارسلنا رسولاً (المنار)

بِإِذْنِ اللَّهِ۔ اس قید نے واضح کر دیا کہ مطاعِ ذاتی و حقیقی رسول بھی نہیں ہوتا، وہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہے رسول مطاع اُس کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

باذن اللہ تعالی الاحتراس لان الطاعۃ فی الحقیقۃ للہ تعالی فھذا القید من قیود القران المحکمۃ

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ

اور کاش کہ جس وقت یہ اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے آپ کے پاس آجاتے، پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور

الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ

رسول بھی اُن کے حق میں مغفرت چاہتے تو یہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے ۱۹۴ سو آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ

حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا

یہ لوگ ایمان دار نہ ہوں گے ۱۹۵ جب تک یہ لوگ اس جھگڑے میں جو ان کے آپس میں ہو آپ کو حکم نہ بنا لیں اور پھر جو فیصلہ

قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا

آپ کردیں اُس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اور اس کو پورا پورا تسلیم کرلیں ۱۹۶ اور اگر ہم نے اُن پر فرض کردیا ہوتا کہ اپنے آپ کو

اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ۭ

مار ڈالو یا یہ کہ اپنے وطن سے نکل جاؤ تو اس کو ان میں سے نہ کرتے کوئی مگر بجز تھوڑے سے لوگوں کے ۱۹۷

الی انہم یظنون ان الرسول یطاع لذاتہ بلا شرط ولا قید (المنار)

**۱۹۴** (اور ان کی توبہ قبول ہوگئی ہوتی)

اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ۔ اپنی جان پر ظلم اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ رسول زندہ و سلامت اپنے درمیان موجود اور پھر ان کی عدالت سے اعراض۔

فَاسْتَغْفَرُوا۔ مغفرت چاہتے اپنے اس گناہ کی اور گناہ نفاق کی۔

جَآءُوْكَ۔ آپ کے پاس ندامت کے ساتھ حاضر ہوتے، تقدیر کلام یہاں یوں سمجھی گئی ہے۔

ثم جاءوك فامنوا واستغفروا۔ استغفار کے لفظ میں خود ایمان کا مفہوم بھی شامل ہے اس لئے 'اٰمَنُوْا' کی تصریح کی ضرورت نہ رہی' ورنہ ظاہر ہے کہ بغیر ایمان لائے محض حاضری ہرگز کافی نہ تھی۔

وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ۔ رسول کی خدمت میں ایمان کے ساتھ حاضری اور پھر اللہ سے طلب مغفرت یہ دونوں چیزیں یقیناً آپ کے قلب سے اثر تاذی کو دور کردیتیں اور اس کے بجائے انشراح پیدا کردیتیں اور آپ ضرور اُن کے لئے مغفرت طلب کرنے لگتے، ایک نو پیدا باطل فرقہ کا آیت کے یہ معنی کرنا کہ ''کتاب اللہ'' بھی انہیں معافی دے دیتی، لغت اور قرآن دونوں کے ساتھ تحریف ہے۔

**۱۹۵** (عند اللہ)

یعنی اللہ کے ہاں ان کا ایمان اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جائے گا۔

اور ان لوگوں سے مراد وہی منافقین اور اسلام کے ظاہری اور زبانی دعوے دار ہیں۔

فلا وربک میں لا زائدہ تاکید قسم کے معنی میں ہے۔

فیہ لا زائدۃ لتاکید معنی القسم۔ (مدارک)

**۱۹۶** آیت سے ثابت ہو گیا کہ رسول کی اطاعت میں انقیاد محض ظاہر داری ایمان کے لئے کافی نہیں عملی و اعتقادی حیثیت سے بھی ان کے فیصلہ کو تسلیم کر لینا چاہئے بالآخر اس کے جو بھی کوئی بھی ہو باقی رہ جائے تو عمر بھر اسی کے بیچ رہنا ہوگا حتی یحکموک فیما شجر بینھم آپ کی حیاتِ مبارک میں تو آپ کا حکم ظاہر ہی تھا بعد وفات آپ کی شریعت تحکیم کے لئے کافی ہے فقہاء نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ جو کوئی شخص اس کے رسول کے کسی حکم میں شک و شبہ کرے یا ماننے سے انکار کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی ان من رد شیئا من اوامر اللہ تعالیٰ او اوامر رسول اللہ صلعم فھو خارج من الاسلام سواء ردہ من جھۃ الشک فیہ او من جھۃ ترک القبول والامتناع من التسلیم (جصاص)

رسول کے یوں مطاعِ مطلق ہونے کا تعلق صرف احکامِ دینی سے ہے، باقی دنیوی معاملات میں آپ نے خود بھی آزادیٔ رائے دے رکھی تھی، چنانچہ اس قسم کی حدیثیں متعدد موجود ہیں۔

| | |
|---|---|
| انما انا بشر اذا امرتکم بشیٔ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیٔ من رائی فانما انا بشر۔ (مسلم۔ نسائی۔ عن رافع بن خدیج) | میں بھی ایک بشر ہی ہوں، تو جب میں کوئی دینی حکم دوں تو تم اُسے قبول کرو اور جب میں کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں بھی ایک بشر ہی ہوں۔ |

اور اسی تعلیم کا یہ اثر تھا کہ صحابہؓ بار بار استفسار کر لیا کرتے تھے کہ فلاں ارشاد جو ہوا ہے، وہ وحی الٰہی سے ہے یا ذاتی رائے۔

ولاجل ھذہ الاحادیث کانوا یسألونہ اذا امرہم بامر لم یظھر لھم انہ الرای ھل ھو عن وحی او رای فان کان عن وحی اطاعوا وسلموا تسلیما وان کان رایا ذکروا ما عندھم وبما رجع الی رائھم کما فعل یوم بدر۔ (المنار)

**۱۹۷** (اور وہی تھوڑے مومن کامل ہوتے)

اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ۔ ایک معنی میں تو دونوں حکم اب بھی موجود ہیں، یعنی جہاد و قتال اور ترکِ وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور تحققِ شرائط پر اب بھی واجب ہیں، یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود بالذات ہوتے اور قتال و ہجرت ہر حال میں فرض ہوتے۔

كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ۔ قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ۔ یہ عَلَيْهِمْ اور مِنْهُمْ میں ضمیر جمع غائب کس کی جانب ہے؟ جائز ہے کہ منافقین کی جانب ہو۔

والضمیر قیل یعود علی المنافقین۔ (بحر)

لیکن بہتر یہ ہے کہ مطلق انسانوں یا النّاس کی جانب مانی جائے۔

لو کتب اللہ علی الناس ما ذکر لکیں یخبر تعالیٰ عن اکثر الناس۔ (ابن کثیر)

مَا فَعَلُوْهُ۔ ضمیر حکم کی جانب ہے۔

والضمیر للمکتوب ودل علیہ کتبنا۔ (بیضاوی)

اِلَّا قَلِيْلٌ۔ کی ایک قرأت بجائے رفع کے نصب کے ساتھ اِلَّا قَلِيْلًا بھی آئی ہے لیکن ائمۂ نحو نے ترجیح اسی مشہور قرأت کو دی

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾ وَّاِذًا

اور اگر یہ (لوگ) وہ کر ڈالتے جس کی انھیں نصیحت کی جاتی ہے تو اُن کے حق میں یہ بہتر بھی ہوتا اور انھیں ثابت قدم رکھنے والا بھی ۱۹۸

لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

اور اس وقت ہم انھیں ضرور اپنے پاس سے اجر عظیم دیتے ۱۹۹ اور ہم انھیں سیدھی شاہراہ دکھا دیتے ۲۰۰

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ

اور جو کوئی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا تو ایسے لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے اپنا (خاص) انعام

النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾

کیا ہے (یعنی) پیمبر اور اولیاء اور شہید اور صالحین اور یہ کیسے اچھے رفیق ہیں ۲۰۱

**۱۹۸** (ایمان کے معاملہ میں)

یعنی اگر شک، تذبذب، تزلزل کی راہ چھوڑ کر اطاعتِ رسول میں یکسوئی کے ساتھ لگ جائیں تو انھیں ایمان میں ثبات و استقلال اور اس کی برکتیں از خود نصیب ہونے لگیں، ذکر انھیں منافقین اور کمزور ایمان والوں کا چل رہا ہے۔

فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ۔ یعنی اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت اگر انھوں نے بہ دل و جان کر لی ہوتی۔

ای ما یؤمرون بہ من التوبۃ والاخلاص (ابن عباسؓ) من متابعۃ الرسول صلعم ومطاوعتہ طوعا ورغبا۔ (بیضاوی)

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ۔ یعنی دنیوی و اخروی، انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے ان کے فلاح کی صورت پیدا ہو جاتی۔

تَثْبِيْتًا۔ پہلے یہ بتایا کہ احکامِ دین پر اگر عمل کرتے تو یہ چیز اُنھی کے کام آتی اور اُنھی کے حق میں بہتر ہوتی، اب یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ احکام پر عمل کرنے سے خود قوتِ ایمانی ضعیف سے قوی اور قوی سے قوی تر ہو جاتی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد و یقین کی باطنی کیفیت کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

**۱۹۹** (آخرت میں)

اذًا۔ یعنی اگر انھوں نے احکامِ خدا اور رسول کا اتباع کیا ہوتا اور نتیجۃً انھیں خیر و صلاح بھی حاصل ہو چکتی اور دین میں ثبات و استقامت بھی نصیب ہو چکتی۔

ای لو اتبعوا۔ (جلالین)

**۲۰۰** (کہ بے روک ٹوک سیدھے رضاءِ الٰہی کے مقام جنت میں داخل ہو جائیں)

اور عجب نہیں کہ اسی کی برکت سے دنیا میں بھی سعی و عمل کی صراطِ مستقیم ان پر خوب روشن ہو کر رہے۔

**۲۰۱** دنیا کی مادی اور حسی نعمتیں چاہے جتنی بھی ہوں انسان ان سے لطف و لذت لینے میں کچھ کمی ہی محسوس کرتا رہتا ہے اگر ساتھ میں یارانِ بزم اور شرکاءِ صحبت بھی اپنے ہم مذاق اور دل پسند نہ ہوں، یہاں بشارت اسی نعمتِ عظیم کی مل رہی ہے کہ

ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰ ع

یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ ہی کا علم کافی ہے ۲۰۲

اہل جنت کو مادی و روحانی ہر قسم کی نعمتوں کے علاوہ صحبت بھی پاکیزہ ترین اور بہترین انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہونے والوں کی نصیب ہوگی۔

حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ میں ایک پہلو حیرت کا بھی ہے اور اسی لئے ترجمہ "کیسے اچھے" سے کیا گیا ہے۔

فیہ معنی التعجب کانّہ قیل وما احسن اولٰئک رفیقا۔ (کشاف۔ بحر)

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ۔ اس اطاعت کا تعلق فرائض و واجبات سے ہے ورنہ اگر فرائض و واجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل، تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہوجائے تو پھر درجۂ ولایت خود ہی حاصل ہوجائے گا اور رفاقتِ اولیاء بطورِ انعام نصیب ہونے کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔

اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یعنی باوجود اپنے اعمال میں کمی اور کوتاہی رہ جانے کے اور باوجود بالذّات اُن کاملین سے مرتبہ میں فروتر ہونے کے انھیں ان کاملین کی معیت نصیب ہوجائے گی۔

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ یہ انعام کمالِ قُرب و وصول کی صورت میں ہوگا۔

صِدِّيْقِيْنَ۔ یعنی بات کے کھرے اور معاملے کے سچّے، ایسے کہ سچائی اور حق پسندی گویا اُن کی فطرت میں رچ گئی اور ان کی طبیعت کا جزو بن گئی ہے، ایمان کے ہر جزو سے متعلق ان کی تصدیق کامل ہوتی ہے، ریب و شک کے حدود سے بالاتر۔

کل من صدق بکل الدین لایتخالجہ فیہ شک فھو صدّیق (کبیر) المبالغ فی الصدق اَوفی التصدیق (قرطبی)

اُردو میں ان ہی کو اولیاء اللہ یا محض اولیاء کہتے ہیں، قُربِ حق میں ان کا نام انبیاء کے بعد ہی ہوتا ہے۔

افضل الخلق ھم الانبیاء علیھم السلام وبعد ھم الصدّیقون (کبیر)

شُهَدَآءِ۔ شہید وہ ہے جو دین کی محبت میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کرے اور عمل سے ثابت کردے کہ جس چیز پر وہ ایمان لایا تھا، وہ اُسے اس قدر عزیز تھی کہ اس کی خاطر اس نے اپنی جان تک قربان کردی، لیکن محاورۂ قرآنی میں یہ لقب مقتولین فی سبیل اللہ تک محدود نہیں بلکہ ہر وہ شخص اس طبقہ میں آجاتا ہے جو اپنے قول و عمل سے دین کے ساتھ اپنی انتہائی شیفتگی کی شہادت پیش کردے

الشھادۃ لیست عبارۃ عن القتل بل نقول الشھید فعیل بمعنی الفاعل وھو الذی یشھد بصحۃ دین اللہ تعالٰی تارۃ بالحجۃ والبیان واخرٰی بالسیف والسنان فالشھداء ھم القائمون بالقسط (کبیر) وقال الاستاذ الامام وھم اھل العدل والانصاف الذین یؤیّدون الحق بالشھادۃ لاھلہ بانھم محقون یشھدون علی اھل الباطل انھم مبطلون ..... واقول ان الشھادۃ التی تقوم بھا حجّۃ اھل الحق علی اھل الباطل تکون بالقول والعمل والاخلاق والاحوال فالشھداء ھم حجۃ اللہ تعالٰی علی المبطلین فی الدنیا والآخرۃ بحسن سیرتھم۔ (المنار)

اور مقتولیت کوئی اپنے اختیار کی چیز ہے بھی نہیں۔

الصّٰلِحِيْنَ۔ صالحین وہ افرادِ امت کہلاتے ہیں جو پورے دیندار اور متبع شریعت ہوتے ہیں، اور جن کی صحت و صلاحیت ان کے غالب اعمال میں رہتی ہے گو ان کی شخصیتیں اس درجہ کی نہ ہوں جو دنیا کے سامنے بطور حجت و شہادت کے پیش ہوسکیں۔

ھم الذین صلحت نفوسھم واعمالھم ولم یبلغوا ان یکونوا حججا ظاھرین کما الذین قبلھم۔ (المنار)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا

اے ایمان والو اپنی احتیاط کر لو پھر گروہ گروہ کوچ کرو یا اکٹھے ۲۰۳

جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ

اور یقیناً تم میں کوئی ایسا بھی ہے جو دیر لگا دیتا ہے ۲۰۴ اور پھر تم پر اگر کوئی

قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾

مصیبت آپڑتی ہے تو کہتا ہے کہ بے شک مجھ پر اللہ نے بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ شریک نہ ہوا ۲۰۵

۲۰۲ اور اللہ کا علم حاوی و محیط ہے، اُن کی نیتوں کو بھی، ان کے عمل کو بھی، ان کے مقتضائے عمل کو بھی۔ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ یعنی تمام مومنین کو جو کاملین کی معیت و رفاقت نصیب ہوگی محض فضل خداوندی کا ظہور ہوگا، ان کے اعمال کا ثمرہ نہ ہوگا۔

۲۰۳ (جیسا موقع اور جیسی مصلحت ہو)

قرآن مجید کی اکثر آیتوں کی طرح ان آیتوں کو بھی پوری طرح سمجھنے کے لئے ان کا پس منظر پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اُحُد میں ابھی حال ہی میں مسلمانوں کو عارضی شکست ہوئی تھی اور مشرکین کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں اس سے قدرتاً بڑھ گئی تھیں اور اکیلے قریشِ مکہ ہی نہیں گرد و پیش کے دوسرے قبیلے بھی متحد ہو کر اسلام کے خلاف زبردست محاذ تیار کر چکے تھے مسلمانوں کو ہمت، ثبات و استقامت کے یہ درس عین اُس وقت دیئے جا رہے ہیں۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ۔ حذر کا مفہوم بہت وسیع و جامع ہے ہر وہ چیز جو دشمن سے بچاؤ کے کام آتی ہے اس میں شامل ہے خواہ ہتھیار ہوں خواہ تدبیریں و قس علیٰ ہذا گویا کہا یہ جا رہا ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں ہر طرح کیل کانٹے سے درست اور آمادہ ہو

حذرکم ای ما فیہ الحذر من السلاح وغیرہ (راغب) ما یحذر بہ کالحزم والسلاح (بیضاوی) خذ حذرک ای استعد بانواع ما یستعد بہ للقاء من تلقاہ (بحر)

۲۰۴ (ایسی کہ جہاد میں شریک بھی نہیں ہوتا اور پیچھے رہ جاتا ہے)

یہاں مراد منافقین ہیں جو جہاد میں شریک ہی نہیں ہوئے تھے۔

المبطؤن منافقوھم تثاقلوا وتخلفوا عن الجھاد (بیضاوی)

مِنْكُمْ۔ خطاب یہاں مومنین اور ظاہری مومنین (منافقین) کے مجموعہ سے ہے اور اس مضمون کی آیتوں میں قرآن مجید کا عام طریقِ خطاب یہی ہے۔

الخطاب لعسکر رسول اللہ صلعم المومنین منھم والمنافقین (بیضاوی) انما جمع بینھم فی الخطاب من جھۃ الجنس والنسب لا من جھۃ الایمان۔ (قرطبی)

۲۰۵ (نہیں تو میں بھی اسی مصیبت کا شکار ہوتا)

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ

اور اگر تمھیں اللہ کا فضل پیش آتا ہے تو بول اٹھتا ہے (اس بے تعلقی کے ساتھ کہ) گویا تمھارے اور اس کے

وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿۷۳﴾ فَلْيُقَاتِلْ

درمیان کوئی (رشتۂ) محبت تھا ہی نہیں کہ کاش میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا ۲۰۶ تو

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ

(اگر یہ ہے تو) اُسے چاہیئے کہ اللہ کی راہ میں لڑے ۲۰۷ اُن لوگوں سے جو دنیا کی زندگی خریدے ہوئے ہیں آخرت کے عوض میں ۲۰۸

اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ۔ مصیبت مثلاً جنگ میں شکست۔

قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ۔ یہ فخر و مسرت کے ساتھ کہتا ہے۔

۲۰۶ منافقین کی دورنگی اور سیرتِ منافقانہ کو آشکارا کیا ہے کہ مومنین کو جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو منافقین اپنی بے تعلقی اور علیحدگی پر جھٹ اپنی مسرت و فخر کا اعلان کرنے لگتے ہیں کہ خوب ہوا جو ہم شریک نہ تھے ورنہ ہم بھی اسی بلا میں پھنستے اور مسلمانوں کو جب فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے تو رشک کرنے لگتے ہیں کہ کاش! مالِ غنیمت ہمارے حصہ میں بھی آتا۔

فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ مثلاً جنگ میں فتح و نصرت۔

كَاَنْ .... مَوَدَّةٌ۔ یعنی اس خود غرضی کے ساتھ کہتا ہے جیسے تم مسلمانوں کی خوشی سے اس منافق کو کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور اُسے تأسّف و حسرت صرف اپنی ہی قوت و دولت پر ہے۔

یہیں سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ اُمتِ اسلامیہ کی خوشی سے خوش ہونا علاماتِ ایمان میں سے ہے۔

فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا۔ منافق کی زبان سے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں بھی خوب دولت حاصل کرتا مالِ غنیمت میں میرا بھی بڑا سا حصہ ہوتا!

۲۰۷ (اخلاصِ کامل اور اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے)

فَلْيُقَاتِلْ۔ میں ف کے معنی ہیں کہ اگر واقعی اُسے فوز عظیم ہی منظور ہے۔

۲۰۸ یعنی کافروں سے قتال کرے جو دین کی صحیح تعلیم کو بھلائے ہوئے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں۔

يَشْرُوْنَ۔ شراء لغات اضداد میں سے ہے یعنی اس کے معنی خریدنے کے بھی ہیں اور فروخت کرنے کے بھی، کچھ اس بنا پر اور کچھ آیت کی ترکیبِ الفاظ کی بنا پر، آیت کے ایک بالکل دوسرے معنی بھی کئے جا سکتے ہیں، اور کئے گئے ہیں یعنی "وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑیں جو دنیا کی زندگی آخرت کے عوض میں فروخت کر چکے ہیں" اور اس صورت میں آیت کا تعلق تمام تر مومنین مخلصین سے ہوگا جو اپنی ہر دنیوی خوشحالی اور کامرانی کو رضائے الٰہی پر قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں، ائمۂ تفسیر نے دونوں ہی پہلو اختیار کئے ہیں۔

وللمفسّرين وجهان الاول يشرون معناه يبيعون والقول الثانی معنی قوله يشرون ای يشترون (كبير)

وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں لڑتا ہے تو مارا جائے یا جیت جائے (بہر صورت) ہم اس کو عنقریب اجر عظیم دیں گے ۲۰۹

عَظِيْمًا ﴿۷۴﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ

اور تمہیں کیا (عذر) ہے کہ تم جنگ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں ۲۱۰ اور ان لوگوں کے لئے جو کمزور ہیں

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا

مردوں میں سے اور عورتوں اور لڑکوں میں سے ۲۱۱ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو اس بستی

مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ

سے باہر نکال جس کے باشندے (سخت) ظالم ہیں ۲۱۲ اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی دوست پیدا کردے

يشرون بمعنى يشترون ويبيعون (كشاف) نزلت في المنافقين ومعنى يشرون يشترون وقيل نزلت في المؤمنين المخلصين ومعنى يشرون يبيعون (معالم)

۲۰۹ (آخرت میں)

یہ آخرت کا اجر عظیم مجاہدین کے لئے غلبہ اور شکست (کہ اس کی انتہائی صورت کو فَیُقْتَلْ سے تعبیر کیا ہے) کی ہر صورت میں موعود ہے مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ فوز عظیم کو اجر سے تعبیر کرنا وعدہ کے تاکد اور ترتب کے تیقن کے لئے ہے۔

۲۱۰ (جب کہ اعلاء کلمۃ اللہ تو خود جہاد کا ایک مستقل محرک اور قوی داعی ہے)

مَا لَكُمْ۔ استفہام سے مقصود ترغیب و تحریص ہے اور خطاب مومنین صادقین سے ہے۔

خطاب للمامورين بالقتال على طريقة الالتفات مبالغة في التحريض والحث عليه وهو المقصود من الاستفهام (روح)

۲۱۱ یہ دوسرا داعی جہاد کے لئے ارشاد ہوا، کمزوروں کی دستگیری و نصرت اور مظلوموں کی اعانت اور انھیں ظالم کافروں کے پنجہ سے رہائی دلانا بجائے خود مقاصد جہاد میں سے ہے۔

والمستضعفین کا عطف لفظ اللہ پر ہے۔

یعنی فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ۔ زجاج اور زہری سے یہی ترکیب منقول ہے۔

عطف على اسم الله عزّ وجل اى وفي سبيل المستضعفين وهذا اختيار الزجاج وقاله الزهري۔ (قرطبی)

۲۱۲ (اور ہم ان کے ظلم و ستم کے تختۂ مشق بنے ہوئے ہیں۔)

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ۔ مراد مکہ کا شہر اور مکہ کی حکومت ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔

القرية هنا مكة باجماع من المتاولين۔ (قرطبی)

الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ مکہ والے ظالم دُہرے معنی میں تھے ایک تو مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم و ستم ڈھا رہے تھے

وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ

اور ہمارے لئے اپنی قدرت سے کوئی حمایتی کھڑا کر دے ۲۱۳ جو ایمان والے ہیں وہ تو اللہ کی راہ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

میں لڑتے ہیں ۲۱۴ اور جو کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں ۲۱۵

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿۷۶﴾ ع

سو تم لڑو شیطان کے ساتھیوں سے اور شیطان کی چال تو کچھ ہی ہوتی ہے ۲۱۶

دوسری طرف شرک کر کر کے خود اپنی جانوں پر بھی ظلم کر رہے تھے۔

ووصف اھلھا بالظلم اما لاشراکھم واما لما حصل منھم من شدۃ الوطأۃ علی المومنین واذلالھم (بحر) لاجل انھم کانوا یؤذون المسلمین ویوصلون الیھم انواع المکارہ (کبیر) بالشرک الذی ھو ظلم عظیم وباذیۃ المؤمنین ومنعھم عن الھجرۃ (روح)

۲۱۳ آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بچوں، عورتوں، مردوں کی ایک خاصی تعداد اسلام لا چکی ہے، مگر یہ لوگ شرارانِ قریش کے تشدد کے مقابلہ میں اپنے کو بے بس پا رہے ہیں، نہ دفعِ ظلم ہی پر قادر ہیں اور نہ ہجرت پر، یہاں مناجات اور فریاد ان ہی لوگوں کی زبان سے ادا ہو رہی ہے۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ظلم و شقاوت سے بچے، عورتیں، بوڑھے کوئی بھی محفوظ نہ تھے۔

مِنْ لَّدُنْكَ۔ لفظی معنی ہیں "اپنے پاس سے" اُردو محاورہ میں ایسے موقع پر "اپنی قدرت سے" آتا ہے یعنی غیب سے اس کا سامان کر دے۔

وَلِيًّا۔ ایسا دوست و ہمدرد جو اس مصیبت میں ہمارے ساتھ رہے، ہم سے ہمدردی و غمخواری کرے۔

نَصِيْرًا۔ ایسا حمایتی جو ان ظالموں سے ہمیں نجات دلائے۔

۲۱۴ (اور جیسا کہ خود حق تعالیٰ ہر قسم کی نفسانی آمیزش و آلائش سے منزہ و پاک ہے، اللہ والوں کا لشکر بھی کبھی عدوان و طغیان ظلم و خیانت، مے نوشی و بدکاری کے آلاتِ حرب سے مسلح ہو کر جنگ کر ہی نہیں سکتا۔)

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کی قید جو بار بار لگائی جا رہی ہے بے معنی نہیں، بہت ہی پر معنی ہے، درحقیقت یہ آیت سلسلۂ جہاد کی آیتوں میں سے ایک کلیدی آیت ہے۔ اس نے صاف صاف اسلامی جہاد کا فرق دنیا جہان کی تمام جنگوں اور جاہلی محاربات سے واضح کر دیا، اس نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا کہ سچا مسلمان جب اپنے ابنائے جنس پر ہاتھ اٹھائے گا تو توسیعِ ملک کے لئے نہیں، قومی تفوق کے لئے نہیں، تجارتی منڈیاں قائم کرنے کو نہیں، دوسرے کو نیچا دکھانے کو نہیں، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کو نہیں، رشک و ہوس اور جاہ پرستی کے جذبات سے متأثر ہو کر نہیں، بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد، انسانیت کے برترین نصب العین، کلمۂ توحید کی برتری اور سربلندی کے لئے!

—— رنگ و نسل پرستیوں اور قوم و وطن اور قبیلہ کی عزت و حمیت پر کٹ مرنے والے اسلامی نقطۂ نظر کی بلندی کو سمجھ بھی سکتے ہیں؟ اسلامی جہاد جب تک اسلامی جہاد رہا، کیا وہاں کبھی کسی لشکر کے لئے ہزاروں من اور سیکڑوں ٹن شرابوں کی ضرورت پڑی ہے؟ کیا اس لشکر میں بھی سوزاک و آتشک کے سیکڑوں ہزاروں مریض سپاہیوں اور افسروں کے لئے امراضِ خبیثہ کے مخصوص اسپتالوں کا انتظام کرنا پڑا؟

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ

کیا (اے مخاطب) تو نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رہو اور

وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ

نماز کی پابندی کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۲۱۴ پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے

يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ

ایسا ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا (ہوتا) ہے یا اس سے بھی بڑھ کر ڈرنا۲۱۵

مسلمان سپاہی کے سینہ میں تو یہ زندہ ایمان رہتا ہے کہ اُسے ایک ایک قدم کا حساب دینا ہے کبھی اس کا قدم ان گندہ راستوں پر پڑ بھی سکتا ہے؟!

۲۱۵ (اس لئے ان لڑنے والوں میں خصوصیات بھی سب طاغوتیوں ہی سے ملتے ہیں۔)

طاغوت کے لفظی معنی پر حاشیہ پ۳ میں آیۂ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ کے تحت گزر چکا، یہاں اس لفظ کو لا کر طاغوتی، جاہلی سپاہیوں کے تمرد، خدا فراموشی، نفس پرستی اور تجاوز عن الحدود کے پہلو کو نمایاں کرنا ہے، طاغوت کا ترجمہ اگر اس موقع پر نفس سے کیا جائے تو اُردو میں شاید پورا مفہوم ادا ہو جائے، طاغوت اور نفس کی راہ میں آج بھی جو قومیں وطن دوستی، قوم پروری، ملکی آزادی کے خوشنما لفظ اور لقب کے ساتھ جنگ کرتی رہتی ہیں ان کی اخلاقی حالت کا جائزہ لے لیا جائے، شقاوت و سنگدلی، فریب و خیانت، شراب خواری و حرام کاری، غرض جس معیار سے چاہے جانچ لیا جائے، جانوروں اور درندوں سے بھی بدتر حالت نکلے گی، یہ سب کرشمے فی سبیل الطاغوت لڑنے کے ہیں، محاسبۂ آخرت سے بے نیاز ہو کر جنگ و جدال کرنے کے ہیں، نفس قتال دونوں میں مشترک ہے لیکن آگے طاغوتیوں کو کوئی مناسبت لاہوتیوں سے نہیں رہ جاتی

۲۱۶ (اور شیطانی اور طاغوتی قوتوں کو کبھی بھی مستقل اور پائدار فتح حق کے مقابلہ میں نصیب نہیں ہو سکتی)

فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطٰنِ۔ مسلمانوں کو لڑنے کا حکم مل رہا ہے مگر کس کے مقابلہ میں؟ شیطانوں اور طاغوتیوں کے مقابلے میں مقاتلین فی سبیل الطاغوت کے مقابلے میں جو دنیا میں شر و فساد فسق و شرک ہی کی حکومت پھیلانا چاہتے ہیں

إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا۔ اس میں مسلمانوں کو ہمت دلائی ہے کہ شیطان کوئی ڈرنے اور سہمنے کی چیز نہیں، وہ تم پر حاکم و آمر نہیں، تم ذرا ہمت کر جاؤ تو وہ خود تم سے پناہ مانگتا ہوا بھاگے گا، اس میں جان تو ہے ہی نہیں۔ حربی زندگی سے قطع نظر، اخلاق و معاشرت، معاملات و عبادات کے میدان میں بھی شیطان سے مقابلہ کر لینا کچھ دشوار نہیں ضرورت صرف ہمت کی ہے، كَيْدَ الشَّيْطٰنِ جس کے ضعف کا یہاں اعلان ہے اپنے اعلان میں عام ہے حربی و غیر حربی ہر شعبۂ زندگی پر

۲۱۷ (کہ حالتِ امن میں اس قسم کی عبادات پر عمل کافی ہے)

كُفُّوْا أَيْدِيَكُمْ یعنی جوشِ انتقام اور قتال سے ابھی باز رہو، یہ ذکر کن لوگوں کا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے اس وقت کے حالات پیش نظر رکھنے ضروری ہیں، مسلمانوں کو مکہ میں قریش کے مظالم سہتے سہتے ایک زمانہ ہو گیا تھا،

وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ‌ۚ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ‌ؕ

اور وہ لوگ بولے کہ اے ہمارے پروردگار (تو نے) ہم پر قتال کیوں فرض کردیا، کاش تھوڑی مدت تو اور ہم کو (جینے کی) مہلت دے دیتا ۲۱۹

اور قدرتاً انتقام کی خواہش ان کے دلوں میں پیدا ہوگئی تھی، یہ مظلوم بھی آخر اُسی خون اُسی گوشت و پوست اُسی ہڈی، چمڑے کے تھے اور جوش میں آکر بار بار جنگ کی اجازت طلب کرنے لگے تھے، اُدھر وحیِ الٰہی برابر حلم و تحمل، مسالمت و درگزر کا سبق دے رہی تھی، یہاں تک کہ ہجرت کا حکم آگیا اور مسلمان مدینہ کی پُرامن فضا میں منتقل ہوآئے۔

تیرہ چودہ سال کی صحبتِ رسولؐ کی زبردست ٹریننگ کے بعد جب علمِ الٰہی میں مسلمانوں کے اخلاقِ فاضلہ پختہ ہوگئے، اور طاعت، اطاعت اور بےنفسی ان کے کردار کے جزو بن گئے تو حکمِ قتال نازل ہوا، لیکن اس اثناء میں مدینہ کی پُرامن فضا میں رہتے رہتے مسلمانوں کے جذباتِ انتقام دھیمے پڑ چکے تھے، اور وہ جوش و ولولۂ قتال باقی نہیں رہا تھا، اب طبعی تقاضے سے میدانِ جنگ میں جانے سے حیلے حوالے ڈھونڈھے جانے لگے، یہاں ذکر انہی عافیت کوش مسلمانوں کا ہے۔

۲۱۸ اللہ کے عتاب کا خوف لاکھ دل میں ہو، لیکن یہ عقیدہ بھی تو ساتھ ساتھ رہتا ہے کہ اللہ رحمٰن و رحیم ہے، غفور ہے، ارحم الراحمین ہے، عجب کیا جو تمام تر عفو و فضل ہی کا معاملہ فرمائے، برخلاف اس کے دشمنوں سے بجز ہلاکت و اذیت کے کسی برتاؤ کی توقع ہی کیا۔

امام ماتریدی نے فرمایا کہ یہ خوف خوفِ طبعی تھا اس لئے اس پر گناہ نہیں ہوا۔

قال الشیخ ابو منصور ھذہ خشیۃ طبع لأن ذلك منھم کراھۃ لحکم اللہ وأمرہ اعتقادًا فالمرء مجبول علی کراھۃ ما فیہ خوف ھلاکہ غالبا.

یہ خوف و جبن طبعی تھا، اعتقادی پہلو سے نہ تھا، اور پھر اس سے بھی بعد کو ان لوگوں نے توبہ کرلی تھی۔

فھی علی ما طبع علیہ البشر من المخافۃ لا علی المخالفۃ (قرطبی) قالوا خوفا وجبنا لا اعتقادا ثم تابوا (معالم)

اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً‌ اَوۡ یہاں "بلکہ" کے مفہوم میں ہے۔

قیل بمعنی بل (بحر، روح)

۲۱۹ (اور ہم دنیا میں کچھ دن اور اطمینان سے جی لیتے)

قَالُوۡا الخ مسلمانوں کی زبان سے یہ قول بطور تمنا کے تھا، بہ سبیل اعتراض نہ تھا۔

وقولھم محمول علی التمنی لتخفیف التکلیف لا علی وجہ الانکار (کبیر) لا علی وجہ الاعتراض علی حکمہ تعالیٰ والانکار لایجابہ بل علی طریق تمنی التکلیف۔ (ابو سعود)

یہ قول اگر زبان سے تھا جب بھی چونکہ درجۂ تمنا میں تھا اور اعتراض و انکار اس سے مقصود نہ تھا، اس لئے قابلِ مواخذہ جب بھی نہ تھا، لیکن خود لفظ قالوا سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبان سے بھی ادا کیا گیا ہو، قول عربی میں جس طرح کلامِ لسانی کے لئے آتا ہے، اسی طرح حدیثِ نفس کے لئے بھی۔

یقال للمتصور فی النفس قبل الابراز باللفظ قول، فیقال فی نفسی قول لم اظھرہ (راغب)

اور خود قرآن مجید میں یقولون فی انفسھم وارد ہوچکا ہے اور حدیثِ نفس یا وسوسہ کا معصیت نہ ہونا تو بالکل ظاہر ہے، ائمۂ تفسیر نے یہاں حدیثِ نفس ہی مراد لی ہے۔

قُلۡ مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ ۚ وَالۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۲۲۰ وَلَا

آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا سامان (بہت ہی) تھوڑا ہے اور آخرت اس کے لئے کہیں بہتر ہے جو تقوے (اختیار) کرے ۲۲۰

تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا ﴿۷۷﴾ اَيۡنَ مَا تَكُوۡنُوۡا يُدۡرِكْكُّمُ الۡمَوۡتُ وَلَوۡ كُنۡتُمۡ

اور تم پر دھاگے کے برابر بھی ظلم نہ کیا جائے گا ۲۲۱ تم جہاں کہیں بھی ہوگے وہیں تمھاری موت آئے گی خواہ تم مضبوط

فِىۡ بُرُوۡجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ حَسَنَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِ

قلعوں ہی میں ہو ۲۲۲ اور اگر انھیں کوئی سکھ پہنچ جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تو خدا کی طرف سے ہے

اللّٰهِ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ يَّقُوۡلُوۡا هٰذِهٖ مِنۡ عِنۡدِكَ ؕ

اور اگر انھیں کوئی دُکھ پیش آجاتا ہے تو کہتے ہیں یہ آپ کے سبب ہوا ۲۲۳

یحتمل انھم ماتفوھوا بہ ولکن قالوہ فی انفسھم فحکی اللہ تعالیٰ عنھم (بیضاوی) بألسنتھم او بقلوبھم (روح) یجوزان یکون اعتقدوہ وقالوا فی انفسھم فحکی ذلک تعالیٰ عنھم (بحر) قد جوزان یکون ھذا مما نطقت بہ ألسنۃ حالھم من غیر ان یتفوھوا بہ صریحا۔ (ابوسعود)

بہرصورت آیت اُن ظالم پادریوں کی پُرزور تردید کر رہی ہے جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ مسلمان تو غنیمت کی طمع میں جنگ کے لئے تُلے بیٹھے تھے، رسولؐ کو صرف اشارہ کی دیر تھی یا معاذ اللہ یہاں اُلٹے ان کو ترغیب دینے اور آمادہ کرنے کی ضرورت تھی۔

**۲۲۰** (اور حکم الٰہی کو بہ خوشی بجا لائے)

عدمِ فرضیت جہاد اور زیست مزید کی مہلت کی تمنا چونکہ حُبِّ دنیا اور رافی الدنیا سے پیدا ہوئی تھی اس لئے نہایت حکیمانہ انداز میں اصل جڑ ہی پر لگائی گئی اور ارشاد ہوا کہ اس دنیا میں رکھا ہی کیا ہے، جو کچھ ہے وہ بھی بالکل فانی اور سراسر بے ثبات، طلب و تمنا کے قابل شے تو آخرت ہے اور اس کی لذتوں اور نعمتوں کے حصول کا ذریعہ تقوے اور احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔

مَتَاعُ الدُّنۡيَا قَلِيۡلٌ۔ سو ایسی حقیر اور بے ثبات چیز کی خاطر التواءِ حکم جہاد کی تمنا!

خَيۡرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى۔ اور اس تقویٰ ہی کی ایک فرد جہاد ہے۔

**۲۲۱** (سو یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاد کے اعلیٰ ثمرات سے محروم رہ جاؤ)

فَتِيۡلًا بھی عربی میں نَقِيۡرًا ہی کی طرح تحقیر و تصغیر کے اظہار کے لئے آتا ہے جیسے اردو محاورہ میں رتّی بھر، رائی برابر، ذرہ بھر وغیرہا۔

**۲۲۲** اور موت کچھ میدانِ جنگ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔

یہاں یہ سمجھایا ہے کہ جب موت ایسی یقینی اور بے پناہ شے ہے تو آخرت میں جہاد کے اجر و مراتب بے حساب سے محروم اور خالی ہاتھ کیوں پہنچو؟ کیوں نہ غزا و قتال میں سُرخ رُو ہو کر وہاں پہنچو۔

**۲۲۳** ذکر اب منافقین کا ہو رہا ہے، ان کا حال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں کی بات بنی رہتی یہ لوگ بھی برابر ان کے

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ

کہہ دیجئے کہ ہر چیز اللہ ہی کی طرف سے ہے، سو ان لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ گویا یہ بات ہی نہیں سمجھتے

حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن

۲۲۴ تجھے جو بھی سُکھ پیش آتا ہے وہ بس اللہ ہی کی طرف سے ہے اور جو دُکھ پہنچتا ہے وہ تیرے

سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنَاكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا ﴿٧٩﴾

اپنے ہی سبب سے ہے ۲۲۵ اور ہم نے آپ کو انسانوں کی طرف پیمبر بنا کر بھیجا ہے اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۲۲۶

شریک بنتے اور کہتے کہ یہ تو عین فضلِ خداوندی ہے جس میں ہم تم سب یکساں شریک ہیں اور جب بات بگڑ جاتی تو جھٹ سارا الزام مسلمانوں اور ان کے سردارِ اعظم پر رکھ دیتے کہ یہ جو کچھ پیش آیا، سب آپ ہی کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے۔

تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو فتح ہوئی اور اس میں حصۂ رسدی ان منافقین کو بھی مل گیا۔

تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ۔ مثلاً جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی اور اس کا خمیازہ بحصۂ رسدی منافقین کو بھی اٹھانا پڑا۔

يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِندِ اللَّهِ۔ یعنی یہ کامیابی تو طبعی حالات کی بنا پر تکوینی اسباب سے حاصل ہو گئی اس میں مسلمانوں یا اُن کے سردارِ اعظم کے کسی حُسنِ تدبیر کو کیا دخل۔

منافقین کا یہ مِنْ عِندِ اللَّهِ کہنا بھی بطور حمد نہ تھا، یا بہ طور اثبات قدرت باری نہ تھا، بلکہ بطور محاورۂ زبان تھا، جیسے اُردو میں لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ تو تقدیری اُمور ہیں۔

۲۲۴ یہ توجہ دلائی ہے منافقین کی حماقت شعاری اور بے غوری کی عادت پر۔

كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ۔ یعنی دُکھ ہو یا سُکھ، رنج ہو یا راحت، سب کا مُسبّب الاسباب، حقیقی اللہ ہی ہے، سُکھ اور راحت اگر ہے تو یہ براہِ راست اس کے فضل و کرم کا ظہور ہے بلا توسطِ اعمال، اور دُکھ یا رنج اگر پیش آرہا ہے تو یہ اس کے عدل کا ثمرہ ہے بتوسطِ اعمال۔

۲۲۵ (اے انسان!)

خطاب اب عام نوعِ انسانی سے ہے۔

یا انسان خطابا عاما (کشاف) الخطاب عام کانه قیل ما اصابك یا انسان (بحر) والخطاب فیه کما قال الجبائی وروی عن قتادة عام لکل من یقف علیه لا للنبی صلعم۔ (روح)

فَمِنَ اللَّهِ۔ یعنی اس کے فضل و کرم کا نتیجہ۔

مِنَ اللَّهِ و مِنْ عِندِ اللَّهِ۔ یہ دو محاورے الگ الگ ہیں، زبان و ادب کے ماہرین نے دونوں میں فرق یہ بتایا ہے کہ دوسرا محاورہ بُرے بھلے سارے افعالِ تکوینی کے لئے عام ہے برخلاف اس کے پہلے محاورے کا استعمال صرف محلِّ رضا پر ہوتا ہے۔

نقل عن الراغب: بأن من عند الله أعم من حیث أنه یقال فیما کان برضاه سبحانه وبسخطه ..... ولا یقال هو من الله إلا فیما کان برضاه وبأمره۔ (روح۔ بحر)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی ۲۲۷ اور جو کوئی روگردانی کرے سو ہم نے آپ کو

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ﴿۸۰﴾ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۫ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ

ان پر نگراں کر کے نہیں بھیجا ہے ۲۲۸ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ طاعت (قبول ہے) ۲۲۹ لیکن آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ

ان میں سے ایک جماعت شب کے وقت اس کے برخلاف مشورہ کرتی ہے جو کچھ کہ وہ کہہ چکے تھے اور اللہ اُن کے رات

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾

والے مشوروں کو لکھتا جاتا ہے تو آپ اُن کی طرف سے بے التفات رہئے اور اللہ پر بھروسہ رکھئے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ۲۳۰

فَمِنْ نَّفْسِكَ ۔ یعنی اے بندے تیری ہی بداعمالی کے سبب سے اور بہ اقتضائے عدلِ الٰہی۔

سَيِّئَةٍ ۔ کا اطلاق اس سیاق میں صرف اس بُرائی پر ہوتا ہے جو واقعۃً بھی بُرائی ہو محض صورۃً ہی بُرائی نہ ہو، صالحین و ابرار کو جو حوادث و مصائب پیش آتے رہتے ہیں وہ صرف صورۃً ہی مصائب ہوتے ہیں حقیقت میں ان کی بلندیِ مراتب کے لئے ذریعۂ رحمت ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے حق میں بداعمالی کا ثمرہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۲۲۶ اور اللہ کی یہ گواہی دُنیا میں رسولؐ کے کمالات سے ظاہر ہو رہی ہے معجزات و خوارق بھی انہی کمالات کا ایک جزء ہیں۔

وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۔ یہاں صاف للناس فرمایا ہے للعرب نہیں فرمایا۔

خاتم النبیّین ۔ کے پیام کی عالمگیری پر دوسری آیات کے علاوہ یہ آیت بھی ایک نصِّ قاطع ہے۔

والناس عام عربهم وعجمهم (بحر) فيه ردّ لمن زعم اختصاص رسالته عليه السّلام بالعرب

فتعريف الناس للاستغراق (روح) تعريف الناس للاستغراق اى مرسلا لكل الناس لا لبعضهم۔ (ابوسعود)

۲۲۷ (کہ عام انسانوں کے پاس کوئی ذریعہ احکامِ الٰہی کی معرفت کا نہیں بجز واسطۂ رسول کے)

لان الله تعالىٰ لا يأمر الناس ولا ينهاهم الا بواسطة رسل منهم (المنار)

آیت میں رد آگیا ان گمراہ فرقوں کا جو رسولؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کے مستلزم نہیں سمجھتے آیت عصمتِ رسولؐ کے مضمون کو بھی واضح طور پر بیان کر رہی ہے یوں کہ اگر رسولؐ سے بھی خطا و غلطی کا امکان ہوتا تو اُن کی اطاعت عین اطاعتِ الٰہی کیسے قرار پا سکتی

من اقوى الدلائل على انه معصوم فى جميع الاوامر والنواهى وفى كل ما يبلغه عن الله۔ (كبير)

اور علاوہ حدیثِ نبوی کے جہاں یہ مضمون تصریحاً آیا ہے فقہاء نے خود اس آیت سے بھی نکالا ہے کہ رسولؐ کی نافرمانی عین حق تعالےٰ کی نافرمانی ہے۔

افاد بذلك ان معصيته معصية الله (جصاص)

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ (کلام) اللہ کے سوا کسی (اور) کی طرف سے ہوتا تو اس کے اندر بڑا

اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ

اختلاف پاتے ۲۳۱ اور انھیں جب کوئی بات امن یا خوف کی پہنچتی ہے تو یہ اُسے پھیلا دیتے ہیں ۲۳۲

۲۲۸ (سو اگر کوئی ایمان نہیں لاتا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں اور نہ آپ اس لئے زیادہ فکر و غم میں پڑیئے)
فَمَنْ تَوَلّٰى ۔ یعنی جو آپ کا کہنا نہ سُنے اور آپ کی طرف سے بے توجہی اختیار کرے ۔

۲۲۹ ذکر منافقین کا چل رہا ہے ۔

یعنی المنافقین ۔ (ابن عباسؓ)

یہ زبان سے تو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں یہی عرض کرتے تھے کہ آپ کے احکام سر آنکھوں پر آپ کے ارشادات کی تعمیل ہمیں قبول و منظور ۔

طَاعَةٌ خبر ہے مبتدا محذوف ہے ۔

وبہ امرنا وشأننا طاعة (کشاف)

۲۳۰ اس کی کارسازی یہ ہے کہ وہ دنیا میں آپ کو اُن کے شر سے اور سازشوں سے محفوظ رکھے گا اور آخرت میں انھیں شدید سزائیں دے گا ۔

طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ ۔ یعنی اِن منافقوں کے سردار اور سرغنہ ۔

بَيَّتَ ۔ رات کی تاریکی اور پوشیدگی میں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں اور منصوبے بنائے جاتے تھے ۔
وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا ۔ یعنی خدائی ریکارڈ میں اُن کی سازشیں اور منصوبے سب مندرج و محفوظ ہیں وقت آنے پر پیش کر دیا جائے گا ۔

۲۳۱ (جو بشری تالیف و تصنیف کا لازمہ ہے)

اِخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ اس کے مفہوم میں بہت کچھ قیل و قال ہوئی ہے کسی نے کہا کہ بیان میں تناقض مراد ہے اور کسی نے کہا کہ بیانات میں فرق مراتب اور کسی نے کہا کہ عبارت کی عدم یکسانی لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود اختلافِ کثیر کا لفظ بڑا وسیع اور جامع ہے ، معنوی اور ادبی ہر قسم کی بے آہنگی ہر طرح کا جھول جھال اس کے اندر داخل ہے ۔
قرآن مجید نے اس آیت سے دنیا کے سامنے اپنی یکتائی کا ایک مستقل چیلنج پیش کر دیا کہ ہر طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لو ، ہر طرح جانچ پرتال کر لو مضمون کی پستی و عبارت کی ناہمواری کسی قسم کی کوئی کمی کوتاہی اس کے اندر نہ پاؤ گے اور یہی دلیل ہے اس کی کہ یہ بشر او مخلوق کا کلام نہیں قرآن کے حملہ منکرین کے خلاف خواہ وہ کسی وجہ اور کسی پہلو سے ہوں قیامت تک کے لئے تحدی ہے ۔
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۔ قرآن میں تدبر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا لفظی و معنوی اعجاز بالکل واضح ہو جائے گا ، اور اس وضوح سے آپؐ کی رسالت کی جانب سے شبہات کافور ہو جائیں گے ۔
لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ ۔ جیسا کہ معاصر و متاخر منکرین کا خیال تھا اور جیسا کہ آج بھی بعض

وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ

اور اگر یہ لوگ اُسے رسولؐ کے اور اپنے میں سے صاحبانِ امر کے حوالہ کر دیتے ۲۳۳ تو ان میں سے جو لوگ استنباط کی

يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ

صلاحیت رکھتے ہیں اس کی حقیقت بھی جان لیتے ۲۳۴

"روشن خیال" مرتدین کا خیال ہے ـــ دنیا کا قدیم و جدید کوئی سا بھی علم و فن ہو، منطق، فلسفہ، طبیعیات، فلکیات شعر و ادب، تاریخ، غرض عقلی، نقلی کسی قسم کا بھی اس کے کسی بڑے سے بڑے ماہر و فاضل کے کلام میں معاصرین و متاخرین نے طرح طرح کے نقص و عیب نکال کر نہیں پیش کر دیئے ہیں، اور یہی دلیل اس کلام کے "غیر اللہ" ہی کی طرف سے ہونے کی ہے۔

يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ سے صحتِ قیاس پر بھی دلیل نکل آئی اور اُن فرقوں کا بھی رد ہو گیا جو سمجھتے ہیں کہ تفسیر قرآن کا حق صرف رسولؐ اور امام معصوم کے ساتھ مخصوص ہے۔

۲۳۲ (بغیر اس تحقیق کے کہ وہ خبر کہاں تک صحیح ہے اور بغیر اس پر غور کئے کہ اگر صحیح ہے بھی تو اس کی فوری اشاعت کہاں تک مناسب و قرینِ مصلحت ہے)

اشارہ منافقین اور کمزور ایمان والوں کی طرف ہے۔

نزل فی جماعة من المنافقين او ضعفاء المسلمين (جلالين)

ملتِ اسلامی شروع ہی سے ایک حد تک منظم بلکہ نیم عسکری جماعت تھی، اور یہ امر ہر اجتماعی تنظیم کے منافی عموماً اور عسکری تنظیم کے منافی تو خصوصاً ہے کہ اُمت کے عوام جس خبر کو جہاں اور جیسی سُن پائیں بلا اپنے سردار اولیا اور اہلِ حل و عقد کی طرف رجوع کئے بے تحقیق اُسے لے دوڑیں اور بے تحاشا اُسے پھیلانا شروع کر دیں۔

اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ۔ مثلاً کہیں باہر سے لشکرِ اسلام کی فتح و ظفر کی خبر آئی۔

اَلْخَوْفِ۔ مثلاً کہیں باہر سے مسلمانوں کی شکست و ہزیمت کی خبر آئی۔

۲۳۳ (بجائے اس کے اُلٹے خود اس خبر کی شہرت و اشاعت میں لگ گئے)

اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ۔ یعنی صاحبانِ فہم سلیم خصوصیت کے ساتھ مراد ہیں اکابر صحابہ مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ

ذوی العقل واللب من المومنين يعنى ابا بكرؓ واصحابه (ابن عباسؓ)

باقی اس کا اطلاق اُمت کے سارے ہی اہلِ حل و عقد پر ہو سکتا ہے۔

ذوى العلم والرای منهم (كبير) وهم اهل العلم والفقه عن الحسن وقتادة وغيرهما (قرطبی) يجوزان يريد به فريقين من اهل الفقه والولاة لوقوع الاسم عليهم جميعا۔ (جصاص)

۲۳۴ یعنی اس خبر کی صحیح حیثیت متعین کر لیتے۔

الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ۔ اس سے ایک بڑی اہم فقہی حقیقت روشنی میں آ گئی معلوم ہوا کہ استنباطِ مسائل و اجتہادِ احکام، ہر ایک کا کام نہیں اس کے لئے ایک خاص فہم و سلیقہ اور ذریعۂ تحقیق کی ضرورت ہے، ہر فردِ اُمت اس سے بہرہ ور نہیں ہوتا

وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۸۳﴾

اور اگر تم پر اللہ کی رحمت شامل نہ ہوتی تو تم (سب) بجز تھوڑے سے لوگوں کے شیطان کی پیروی کرنے لگ جاتے ۲۳۵

فَقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفۡسَكَ‌ وَحَرِّضِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ‌ۚ

تو آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجیے ۲۳۶ آپ پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی بجز آپ کی اپنی ذات کے ۲۳۷ اور آپ مسلمانوں کو بھی آمادہ کرتے رہیے ۲۳۸

مِنۡهُمۡ آیت میں دو جگہ آیا ہے، دونوں جگہ اس سے مراد مجموعۂ اُمت ہے۔ اس میں حسبِ دعویٰ ظاہر منافقین بھی شامل تھے۔

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ آیت سے چار امور ثابت ہوتے ہیں :۔

(۱) ایک یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت احکام نص سے نہیں استنباط سے حاصل ہوں گے۔

(۲) دوسرے یہ کہ استنباط بھی ایک حُجّتِ شرعی ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ احکام میں عامیوں پر اہلِ علم کی تقلید واجب ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ رسول اللہ صلعم اس پر مامور تھے کہ استنباطِ احکام کرتے رہیں۔

آیت سے عقیدۂ امامت کا بھی رد نکل رہا ہے، اگر کسی امامِ معصوم کا وجود اُمت میں ہوتا تو استنباطِ احکام کی ضرورت کیا تھی، امام خود ہی الہاماً ان احکام سے واقف ہوتا۔

هذه الآية تدل على بطلان قول القائلين بالامامة لانه لو كان كل شيء من احكام الدين منصوصا عليه لعرفه الامام ولزال موقع الاستنباط۔ (جصاص)

**۲۳۵** (اے اُمتِ محمدیہؐ!)

اے مسلمانو! تم گمراہیوں میں مبتلا ہو جاتے تو تم کو ان نعمتوں کی قدر خاص طور پر کرنی چاہیے کہ اللہ نے تمھیں قرآن دیا، شریعت دی، صاحبِ شریعت رسولؐ دیا۔

اِلَّا قَلِيۡلًا۔ اور یہ تھوڑے سے جو محفوظ رہ جاتے وہ عقلِ سلیم کی بدولت رہتے کہ وہ خود بھی فضل و رحمتِ خاص ہی کی صورت ہے

**۲۳۶** (اے پیغمبر!)

اوپر مضمون جہاد و قتال کا چل رہا تھا، درمیان میں دوسرے مضمون ضمنی مناسبتوں سے آ گئے تھے اب پھر اس مستقل مضمون کی طرف رجوع ہے۔

**۲۳۷** (نہ کہ کسی دوسرے کے عمل کی)

مقصد یہ ہے کہ آپ خود جہاد پر آمادہ ہو جائیے خواہ کوئی دوسرا ساتھ دے یا نہ دے آپ پر ذمہ داری کسی دوسرے کے عمل کی نہیں۔ تاریخ کا بیان ہے کہ غزوۂ اُحد جب شوال میں پیش آ چکا تو اس کے متصل بعد ذیقعدہ میں آپ مشرکین کی دھمکی کا خیال کر کے بدر کی طرف پھر چلنے پر آمادہ ہو گئے، منافقین تو اس وقت اپنی بے اعتقادی کے باعث نکل ہی گئے، باقی مومنین بھی ساتھ دینے میں پس و پیش کرنے لگے، کچھ تو اس لئے کہ ابھی اُحد کے زخم بالکل تازہ تھے اور کچھ اس لئے بھی کہ دشمن کی غیر معمولی قوت کی افواہی خبروں پر یقین کر بیٹھے تھے، مسلمانوں کا سپہ سالارِ اعظمؐ یہ رنگ دیکھ تن تنہا چل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ کیا ٹھکانا تھا

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ

اور عجب نہیں کہ اللہ کافروں کا زور روک دے ۲۳۹ اور اللہ بڑا ہی زور والا ہے بڑا ہی سزا دینے والا

تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ

ہے ۲۴۰ جو کوئی اچھی سفارش کرے گا اس کو اس میں سے حصہ ملے گا ۲۴۱ اور جو کوئی بری سفارش

يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

لائے گا اس پر اس میں سے بار رہے گا ۲۴۲ اور اللہ ہر چیز پر طاقت

شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَاۤ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ

رکھنے والا ہے ۲۴۳ اور جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر طور پر سلام کرو یا اُسی کو لوٹا دو۔

فرض شناسی اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کا! قلت وکثرت اور اکائی اور سیکڑوں کی عددی نامناسبت کا گویا خیال بھی سامنے نہ رہا۔

**۲۳۸** (جہاد پر)

یعنی درجۂ ترغیب میں تبلیغ آپ کے فرائضِ رسالت میں داخل ہے۔

حَرِّضِ۔ تحریض کے معنی ہیں کسی شے کی خوبیاں بہ کثرت بیان کر کر کے اس کی جانب شوق و رغبت دلانا، گویا صحیح اور سچا پروپیگنڈا کرنا

التحریض الحث علی الشیٔ بکثرۃ التزیین وتسھیل الخطب فیہ (راغب)

آیت ان ظالم اور بے درد پادریوں کا پول کھول رہی ہے جنھوں نے یہ جھوٹ اُچھال رکھا ہے کہ "پیروانِ محمد لوٹ مار کے شوق میں جہاد پر ٹوٹے پڑتے تھے"، کیا بار بار ترغیب دلانے اور آمادہ کرنے کی ضرورت لٹیروں کو ہوا کرتی ہے؟

**۲۳۹** (اور انھیں ان کی زور آوری کے باوجود مغلوب کر دے)

قرآن مجید کی یہ پیشین خبری مستقبل قریب و بعید دونوں میں پوری ہو کر رہی، مخالفین و معاندین میں سے قریش کا زور تو اُسی زمانہ میں ختم ہو کر رہا، رہیں دُور دراز کی پُرقوت، پُرشوکت بادشاہتیں اور حکومتیں سو وہ رفتہ رفتہ مغلوب ہوتی گئیں۔

عَسٰی۔ پہلے بھی حاشیہ گزر چکے ہیں کہ اس کلمہ کا استعمال جب اللہ تعالٰی کے کسی قول میں ہوتا ہے تو اس میں معنی محض امید یا توقع کے بجائے وعدہ اور یقین کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

عسٰی من اللہ واجب (ابن عباسؓ) اطماع۔ والاطماع من اللہ عزّوجل واجب (قرطبی)

**۲۴۰** (دنیا و آخرت میں)

اَشَدُّ بَاْسًا۔ اس قوت و شدّت کا ظہور اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔

اَشَدُّ تَنْكِيْلًا۔ اس صفتِ سزادہی کا پورا ظہور آخرت میں ہوگا۔

**۲۴۱** یعنی جو کوئی عملِ خیر میں بہ طریقِ مشروع ساعی ہوگا اُسے اس کا اجر مل کر رہے گا کہ وہ کسی درجہ میں

إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿۸۶﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ

بے شک اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے ۲۴۴ اللہ وہ ہے کہ کوئی معبود نہیں بجز اس کے، وہ ضرور

إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۗ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ حَدِيثًا ﴿۸۷﴾ ع

تم (سب) کو قیامت کے دن جمع کرے گا، اس میں کوئی شبہ نہیں اور کون اللہ سے بڑھ کر بات میں سچا ہے ۲۴۵

سبب بنا عملِ خیر کا — ہر قسم کے مخلصانہ صلاح مشورے اس وعدہ کے تحت میں آجاتے ہیں۔

۲۴۲ (اس لئے کہ وہ سبب اور ذریعہ بنا معصیت کا)

شَفَاعَةً سَيِّئَةً۔ اس کے تحت میں علاوہ عملِ بد کے وہ عملِ خیر بھی آجاتے ہیں جو غیر مشروع طریق پر کئے جائیں۔

۲۴۳ تو ہر نیکی پر اجر، ہر بدی پر عذاب کا ترتّب اس کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں چھوٹے بڑے ہر عمل پر جزائے عمل اس کی مُٹھی میں ہے۔

۲۴۴ (اس لئے معاشرت کے ان جُزئیات کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جائے)

سلام کے جواب میں سلام تو بہر حال واجب ہے، اس کے بعد اختیار دو دیے گئے ہیں، ایک یہ کہ جواب سلام سلام سے بہتر ہو دوسری یہ کہ ویسا ہی ہو، بہترین قول بعض صحابہؓ و تابعینؒ کا یہ ہے کہ سلام کرنے والا اگر مسلمان ہے، تو اس کا جواب زیادتی کے ساتھ دیا جائے اور اگر غیر مسلم ہے تو اس کے الفاظ دُہرائے جائیں۔

ردّوھا بافضل منھا فی الزیادۃ علی اھل دینکم وملتکم اور ردّوھا مثل ما سلم علیکم علی غیر اھل دینکم (ابن عباس)

إِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ۔ یعنی جب تمہیں سلام کیا جائے طریقِ مشروع پر، سلام کے شرعی طریقوں کی تفصیل کتبِ فقہ میں ملے گی۔

تَحِيَّةٍ۔ حَيَّاكَ اللهُ کے اصل معنی تو زندگی سے خبر دینے کے ہیں، پھر دعا، زندگی کے معنی ہو گئے۔

ذلک اخبار ثم مجعل دعاءً (راغب)

اہل عرب جب آپس میں ملتے تھے تو اس کلمۂ دعا کو استعمال کرتے تھے، اسلام نے اسے سلام کے معنی میں کر دیا۔

فلما جاء الاسلام ابدل ذلک بالسلام فجعلوا التحیۃ اسما للاسلام (کبیر)

۲۴۵ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے چھوٹے بڑے سارے ہی ارشادات سے متعلق قلب میں یقینِ محکم اور اذعانِ کامل قائم رہنا چاہئے۔ اگر ریب و تذبذب ذرا بھی باقی رہ گیا تو عمل بلکہ عزمِ عمل میں بھی کوتاہی رہ جائے گی۔

إِلَىٰ یہ کبھی فی کے معنی میں آتا ہے اور یہاں تو اسی معنی میں ہے۔

(الی بمعنی فی (جمل) المراد لیجمعنکم فی الموت (کبیر)

فِيهِ میں ضمیر یوم کی طرف بھی ہو سکتی ہے اور جمع کی طرف بھی۔

فی الیوم او فی الجمع۔ (بیضاوی)

معنی بہر صورت یہ ہیں کہ کوئی شبہ اس بیان کی حقیقت اور اس خبر کی صداقت میں نہیں۔

لاشک فی حقیقۃ ما اقول لکم فی ذلک واخبرلکم من خبری (ابن جریر)

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ

سو تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم منافقین کے باب میں دو گروہ ہوگئے ہو ۲۴۶ درانحالیکہ اللہ نے ان کے

اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ

کرتوتوں کے باعث انھیں اُلٹا پھیر دیا ۲۴۷ کیا تم چاہتے ہو کہ انھیں راہ دکھاؤ جنھیں اللہ نے

تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝۸۸ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ

گمراہ کر رکھا ہے، اور جسے اللہ گمراہ کردے اُس کے لیے تو ہرگز راہ نہ پائے گا ۲۴۸ یہ لوگ تو دل سے چاہتے ہیں کہ تم

سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ

بھی کفر کرو جیسے یہ لوگ کفر کررہے ہیں تاکہ تم (سب) برابر ہوجاؤ ۲۴۹ سو تم ان میں سے (کسی کو) دوست نہ بنانا جب تک اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں ۲۵۰

---

۲۴۶ (اے مسلمانو! کہ تم میں سے بعض ان کو اب بھی مومن کہے جارہے ہیں)

یہ آیت کس گروہِ منافقین کے باب میں ہے؟ روایتیں اس بارہ میں مختلف ہیں ہوسکتا ہے کہ یہ وہ منافقین ہوں جو غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی سیادت میں جنگ سے قبل ہی واپس چلے آئے تھے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ وہ گروہ ہو جس نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا تھا، اس کا بھی امکان ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں جو دارالحرب مکہ سے دارالہجرت مدینہ میں آئے، اپنا اسلام ظاہر کیا، مالِ تجارت لے کر مکہ گئے اور پھر واپس نہ آئے مشرکوں میں مِل جُل کر وہیں دارالحرب میں رہ پڑے اور سیاقِ قرآنی کی رُو سے یہی قول سب سے زیادہ قوی ہے۔ بہرحال وہ کوئی سے بھی ہوں تھے منافقین ہی جو مسلمانوں کے ساتھ نہ صرف شرکتِ جنگ سے جی چراتے تھے بلکہ ان کے خلاف طرح طرح کی سازشوں اور منصوبوں میں لگے رہتے تھے جیسا کہ قبل والے رکوع میں ذکر آچکا ہے بلکہ بعض تو دارالاسلام کا قیام جو اس وقت عین علامتِ اسلام تھی ترک کرکے دارالحرب میں کافروں سے جا ملے تھے۔

۲۴۷ (ان کے علانیہ کفر کی جانب)

کافر تو حقیقۃً وہ پہلے ہی سے تھے اب ان کی جسارتیں اتنی بڑھ گئیں کہ علانیہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ ہو کر میدان میں مسلمانوں کے مقابل آگئے۔

بِمَا كَسَبُوْا۔ یہ ان کا اکتسابی ردِّ عمل تھا کہ باوجود قدرت انھوں نے دارالاسلام کو چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت جب کہ ترکِ اقرارِ اسلام کی طرح یہ بھی ایک علامت کفر کی تھی۔

من ارتدادہم ولحوقہم بالمشرکین (مدارک)

۲۴۸ یعنی جب انھوں نے گمراہی کا قصد کرلیا تو اللہ کا قانون تکوینی یہ ہے کہ ہر عزم فعل پر فعل پیدا کردیا جاتا ہے، اور اسی قاعدہ کے مطابق مشیتِ تکوینی نے انھیں گمراہی میں ڈال دیا تو اب انھیں نکال کون سکتا ہے؟

مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ۔ اللہ کی طرف اس اضلال (گمراہ کرنے) کی نسبت منافقین کے کفر اختیاری کے نتیجہ کے طور پر ہے

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا

اور اگر وہ روگردانی کریں تو انھیں پکڑو اور جہاں کہیں انھیں پاؤ انھیں قتل کرو اور ان میں سے (کسی کو) دوست

مِنْهُمْ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ

اور مددگار نہ بناؤ ۲۵۱ بجز ایسوں کے جو ان لوگوں سے جا ملتے ہیں جن کے اور تمھارے درمیان عہد

مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا

ہے ۲۵۲ یا تمھارے ہی پاس اس طرح آتے ہیں کہ ان کے سینے اس سے تنگ ہو رہے ہیں کہ تم سے لڑیں یا اپنی

قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ

قوم سے لڑیں ۲۵۳ اور اگر اللہ چاہتا تو انھیں تمھارے اوپر مسلط کر دیتا تو وہ تم سے ضرور لڑتے ۲۵۴

اَتُرِیْدُوْنَ ..... اللّٰهَ ۔ کیا تم اُن کے قلوب میں زبردستی ایمان ڈال سکو گے جو سرے سے ارادہ ہی ایمان کا نہیں کرتے۔

۲۴۹ یعنی ان کے مومن ہونے کا کیا ذکر ہے، اُن کے غلو و کفر کا تو یہ حال ہے کہ اُلٹے وہ تم ہی کو اپنے رنگ میں رنگ لینے اور اپنے میں جذب کر لینے کی دُھن میں ہیں۔

۲۵۰ (اور دار الحرب کو ترک کر کے دار الاسلام میں نہ آجائیں)

اس وقت ہجرت بھی اسلام کے لئے اقرارِ شہادتین کی طرح لازمی تھی۔

لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِیَآءَ ۔ یعنی اُن سے مسلمانوں کا سا برتاؤ مت رکھو کہ دوستی کے جواز کے لئے شرط ہے۔

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ یہ قید بہت ضروری تھی ورنہ یوں تجارت وغیرہ کی غرض سے تو کافر بھی دار الہجرت میں آسکتے تھے، دنیا کے قانون میں اسلام کا ثبوت ان ہی ظاہری چیزوں سے ملتا ہے رہی تصدیقِ قلب، سو وہ صرف عند اللہ ہے، بندوں کے ذمہ اس کی تفتیش نہیں۔

۲۵۱ یعنی کسی حال میں کوئی علاقہ ان سے محبت کا نہ رکھو نہ حالتِ امن میں دوستی کا، نہ حالتِ خوف میں استعانت کا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا ۔ یعنی اگر یہ ہجرت اور اسلام سے رُوگردانی رکھیں اور بدستور دار الحرب میں کافر ہی بنے رہیں۔

عن الایمان والھجرۃ (ابن عباس) عن الایمان الظاھر بالھجرۃ (بیضاوی)

وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۔ اس لئے کہ یہ بھی مشرکین محاربین کے حکم میں داخل ہو گئے اور اُن کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوگا جو مشرکین محاربین کے ساتھ ہوتا ہے۔

کما کان حکم سائر المشرکین ۔ (مدارک)

۲۵۲ (اور اُن سے بھی جا کر ہم عہد ہو جاتے ہیں تو گویا اس طرح تمھارے بھی حلیف ہو جاتے ہیں) حلیف کا حلیف بالواسطہ سہی اپنا ہی حلیف ہو جاتا ہے اور اسی سے مصالحت و امن حاصل ہو جاتا ہے۔

فَاِنِ اعۡتَزَلُوۡكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ وَاَلۡقَوۡا اِلَيۡكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ

اب اگر وہ تمھیں چھوڑے رہیں اور تم سے قتال نہ کریں اور تمھارے ساتھ سلامت روی رکھیں تو اللہ نے ان کے

اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوۡنَ اٰخَرِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ

خلاف تمھارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی ہے ف۲۵۵ عنقریب کچھ لوگ اور بھی پاؤ گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی

يَّاۡمَنُوۡكُمۡ وَيَاۡمَنُوۡا قَوۡمَهُمۡ ؕ كُلَّمَا رُدُّوۡۤا اِلَى الۡفِتۡنَةِ اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا ۚ

امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں ف۲۵۶ انھیں جب کبھی فساد کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو اس میں پلٹ پڑتے ہیں ف۲۵۷

ایسوں کے اخذ وقتل کا حکم ان کا کفر نہیں بلکہ مادۂ ضرر رسانی ہے۔

ف۲۵۳ یعنی نہ وہ اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑنا چاہتے ہیں اور نہ تمھارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑنا چاہتے ہیں بلکہ دونوں سے صلح و آشتی رکھنا چاہتے ہیں، دوسرے لفظوں میں مسلمان ان کی طرف سے بھی امن میں ہیں۔ ان دونوں قسم کے منافقین کو حکم قتل واسیری سے مستثنیٰ کر کے قرآن مجید نے یہ بالکل صاف کر دیا کہ اصل مقصد مسلمانوں کو اذیت و نقصان سے محفوظ رکھنا ہے۔

ف۲۵۴ (لیکن اللہ نے ایسا نہیں ہونے دیا اور تمھیں کلفت و پریشانی سے بچالیا)

لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی اگر مشیت تکوینی یہی ہوتی۔

ف۲۵۵ یعنی ایسوں سے جنگ جائز نہیں، اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور ان کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں، اگرچہ وہ مسلمانوں کا بھی ساتھ کافروں کے مقابلہ میں نہ دیں، ان سے جنگ و قتال جائز نہیں۔

ف۲۵۶ اور ان کا یہ چاہنا مکر و خداع کی راہ سے ہے نہ اس لئے کہ ان کا دل واقعی لڑائی سے بھر گیا اور وہ اخلاص کے ساتھ صلح و امن چاہتے ہیں، یہ وہ منافقین تھے جو اپنی عقیدۂ اسلامی کی طرح اس صلح جوئی اور مصالحت پسندی میں بھی منافقت برت رہے تھے۔

سَتَجِدُوۡنَ میں س زمانۂ مستقبل کے معنیٰ میں بھی لیا گیا ہے اور استمرار کے معنیٰ میں بھی۔

قیل السین للاستمرار لا للاستقبال۔ (جمل)

ف۲۵۷ (اور موقع پا کر مسلمانوں سے لڑنے پر بلا تامل آمادہ ہو جاتے ہیں)

الۡفِتۡنَةِ سے مراد کفر و شرک یا فسادِ عقائد بھی ہو سکتی ہے لیکن سیاق کھلا ہوا اشارہ قتالِ مسلمین کی جانب کر رہا ہے، فسادِ عقائد میں تو وہ پہلے ہی سے مبتلا تھے اب موقع پا جانے پر مسلمانوں پر بھی ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ای کلما دعاهم قومهم الی قتال المسلمین۔ (کبیر)

اُرۡكِسُوۡا فِيۡهَا۔ یعنی اس میں اندھا دھند اُلٹے منھ گر پڑتے ہیں یہ ان کی شانِ کفر و بغضِ مسلمین کے اظہار کے لئے ہے۔

هذا استعارة لشدة اصرارهم علی الکفر و عداوة المسلمین۔ (کبیر)

گویا اُن کے کفر اور بدنفسی اور عداوتِ مسلمین کا اب عملی ثبوت بھی مل جاتا ہے۔

فَإِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوكُمْ وَيُلْقُوٓا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوٓا أَيْدِيَهُمْ

تو اگر یہ تمھیں چھوڑے نہ رہیں اور نہ تمھارے ساتھ سلامت روی رکھیں اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تم سے)

فَخُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ۚ وَأُولَٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ

روکیں تو تم بھی انھیں پکڑو اور انھیں قتل کرو جہاں کہیں بھی انھیں پاؤ، یہی لوگ تو ہیں جن کے خلاف ہم نے تم کو صاف

عَلَيْهِمْ سُلْطَٰنًا مُّبِينًا ﴿٩١﴾ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا ع ۱۲ / ۹

گرفت دے رکھی ہے ۲۵۸ اور یہ کسی مومن کے شایاں نہیں کہ وہ کسی مومن کو قتل کر دے بجز

إِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ

اس کے کہ غلطی سے ایسا ہو جائے ۲۵۹ اور جو کوئی کسی مومن کو غلطی سے قتل کر ڈالے تو ایک مسلمان غلام کا

وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ إِلَىٰٓ أَهْلِهِۦٓ إِلَّآ أَنْ يَصَّدَّقُوا ۚ

آزاد کرنا (اس پر واجب ہے) اور خون بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائے گا ۲۶۰

**۲۵۸** یعنی ان کا حکم کھلے ہوئے محاربین کا ہے اور ان پر کھلی ہوئی گرفت ان کی بدعہدی اور عملی عداوتِ اسلام کی ہے۔

لظهور عداوتهم ووضوح كفرهم وخيانتهم (روح) لظهور عداوتهم وانكشاف حالهم في الكفر والغدر واضرارهم باهل الاسلام۔ (بحر)

سلطان۔ یہ لفظ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی آیا ہے گرفت اور دلیل ہی کے مفہوم میں آیا ہے۔

قال عكرمة حيثما وقع السلطان في كتاب الله فالمراد به الحجة (بحر)

**۲۵۹** (خواہ وہ غلطی غصہ میں ہوئی ہو یا نفسِ عمل میں)

شرک کفر وغیرہ اعتقادی معصیتوں سے قطع نظر عملی گناہوں میں انسان کے لئے اکبر الکبائر قتل مومن ہے اتنے بڑے گناہ کی جسارت کسی مومن سے بہ ثبات ہوش و سلامتیِ عقل بہت مستبعد ہے ہاں غلطی اور دھوکے ہی سے ہو جائے تو اور بات ہے۔

أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا جرم قتل کی فقہاء نے دو قسمیں کی ہیں ایک قتلِ عمد جس میں آلۂ قتل سے کام لیا گیا ہو دوسرے قتل شبہ عمد جس میں کام آلۂ قتل سے نہ لیا گیا ہو جو قتل کسی حجتِ شرعی کی بناء پر مثلاً قصاص میں کیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس پر جرم قتل کا اطلاق ہی نہ ہوگا۔

إِلَّا خَطَـًٔا۔ فقہاء نے قتل خطا کی دو بڑی قسمیں کی ہیں ایک یہ کہ غلطی قصد و ظن میں ہوئی مثلاً دور سے آدمی کو شکار کا جانور سمجھ لیا یا آدمی ہوتا تو پہچانا مگر مومن کے اوپر کافر حربی کا دھوکا ہوا، دوسرے یہ کہ غلطی نفسِ عمل میں ہو گئی مثلاً نشانہ نہ لگا یا جانور کے بجائے پڑ گیا آدمی کے اوپر۔

**۲۶۰** (جو مقتول کے شرعی وارثوں کے درمیان بہ قدر ان کے حصۂ میراث کے تقسیم ہوگا)۔

فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

سوا اس کے کہ وہ لوگ (خود ہی) اُسے معاف کر دیں ۲۶۱ تو اگر وہ ایسی قوم میں ہو جو تمہاری دشمن ہے درانحالیکہ

مُّؤْمِنَةٍ ۗ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ

(وہ بذاتِ خود) مومن ہے تو ایک مُسلم غلام کا آزاد کرنا (واجب) ہے ۲۶۲ اور اگر ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے ۲۶۳

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ

تو خون بہا واجب ہے جو اس کے عزیزوں کے حوالہ کیا جائے گا اور ایک مسلم غلام کا آزاد کرنا (بھی) ۲۶۴

اگر کوئی وارث نہ ہو تو ان کا قائم مقام بیت المال قرار پائے گا۔

دِیَۃ۔ اس پر حاشیہ پہلے گزر چکا ہے، دِیت کی مقدار سنّت سے صرف سَو اونٹ ثابت ہے امام ابوحنیفہؒ نے اس پر قیاس کر کے ایک ہزار دینار شرعی یا دس ہزار درہم شرعی ٹھہرا دی ہے لیکن جس طرح عراق و مصر و شام کے حالات عرب سے مختلف تھے، اسی طرح ہندوستان وغیرہ کے حالات خود ان ملکوں سے مختلف ہیں اس لئے دِیت کی مقدار کو ہر ملک کے عُرف کے ماتحت قاضی کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے مگر شرط یہ ہے کہ قاضی شرعی مقدار سے کم و بیش نہ کرے البتہ مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے کہ خون بہا بالکل معاف کر دیں یا کم کر دیں۔

رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔ اس کے تحت میں جس طرح غلام ہے، کنیز بھی شامل ہے۔

**۲۶۱** (خواہ کُل، خواہ کوئی جُزء)

اَنْ يَّصَّدَّقُوْا۔ خون بہا کی معافی کو لفظ تصدّق سے تعبیر کرنے میں خود اشارہ اس طرف ہو گیا کہ افضل یہی ہے۔

سمّی العفو عنها صدقة حثا علیه وتنبیها علی فضله (بیضاوی)

**۲۶۲** (اور دِیت اس موقع کے لئے نہیں)

ظاہر ہے کہ مقتول جب کافروں کے درمیان رہتا تھا تو اس کی دِیت بھی کافروں ہی کے ہاتھ میں جائے گی، اور کافر کے لئے مسلم کی میراث ممنوع ہے۔

مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ یعنی مقتول تھا تو مومن لیکن کسی سبب سے حربی کافروں کے درمیان رہ رہا تھا۔ عَدُوٌّ۔ لفظاً واحد ہے لیکن معنًی یہاں جمع ہے، اعداء کے مرادف، مومن اگر دارالحرب ہی میں رہ گیا اور ہجرت کر کے دارالاسلام میں نہ پہنچ سکا تو اس کی جان تو بہرحال اس کے اسلام کی بنا پر محفوظ سمجھی جائے گی اور اس کے لئے کفّارہ دینا پڑے گا لیکن دِیت کا تعلق اس کے ایمان سے نہیں بلکہ اس کے مقام سے ہے اور وہ دارالاسلام ہے نہیں اس لئے یہ واجب نہ آئے گی۔

سقطت الدیة لوجهین احدهما ان اولیاء القتل کفار فلا یصح ان تدفع الیهم فیتقووا بها والثانی ان حرمة هذا الذی لم یهاجر قلیلة۔ (قرطبی)

**۲۶۳** (صلح کا یا ذمّہ کا)

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۟ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ

پھر جس کو یہ میسر ہو اس پر دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنا (واجب ہے) یہ توبہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اللہ

اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾ وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ

بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۲۶۵ اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں

خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اللہ اُس پر غضب ناک ہوگا اور اس پر لعنت کرے گا اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار رکھے گا ۲۶۶

یہاں حکم اس صورت کا بیان ہو رہا ہے کہ مقتول گو غیر مسلم ہے لیکن ایسی قوم کا فرد ہے جو مسلمانوں سے معاہدۂ صلح و اتحاد کئے ہوئے ہے یا فقہاء کی اصطلاح میں ذمّی یا مستامن ہے۔

ھم اھل الذمۃ من اھل الکتاب (کبیر عن ابن عباسؓ) ھم المعاھدون من الکفّار (کبیر عن الحسن) ھذا فی الذمّی والمعاھد یقتل خطأً فتجب الدیۃ والکفّارۃ قالہ ابن عباس والشعبی والنخعی والشافعی واختارہ الطبری (قرطبی)

۲۶۴ گویا کفّارہ یا دیت کے لحاظ سے ذمّی اور معاہد کافر بھی ایک مسلم کے برابر حق رکھتا ہے۔

وان کان من قوم کفرۃ معاھدین او اھل الذمۃ فحکمہ حکم المسلمین فی وجوب الکفّارۃ والدیۃ (بیضاوی) ان کان المقتول ذمیا فحکمہ حکم المسلم وفیہ دلیل علی ان دیۃ الذمّی کدیۃ المسلم۔ (مدارک)

فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَھْلِه۔ یعنی اس کافر کا بھی خون بہا اس کے کافر وارثوں کو دیا جائے گا۔

۲۶۵ بس ایسے علیم کل اور حکیم مطلق کے قانون میں کسی ترمیم، کسی تنسیخ کی گنجائش کسی بندہ کو نہیں۔

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ لفظ توبہ بہت اہم اور بلیغ ہے، ندامت، شرمساری، اصلاح کے سارے پہلو اس کے اندر آگئے، مِنَ اللّٰهِ میں اس کی تاکید و تصریح ہے کہ کفّارہ اور دیت کے یہ طریقے اللہ کی طرف سے شروع ہیں کسی بندہ کی طرف سے نہیں۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ۔ یعنی جس کو باندی یا غلام کی استطاعت ہی نہ ہو اور یہ صورت اس وقت ہندوستان میں تمام تر عائد ہے جبکہ شرعی کنیز اور غلام کا وجود نہیں۔

صِيَامُ شَهْرَيْنِ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔

فعلیہ صیام شھرین (قرطبی)

مُتَتَابِعَيْنِ۔ ان دو مہینوں میں اگر ایک دن کا بھی ناغہ بلا عذر شرعی ہو جائے گا تو پھر سے ان دو مہینوں کا شمار پورا کرنا ہوگا۔

حتی لو افطر یوما استأنف ھذا قول الجمھور۔ (قرطبی)

۲۶۶ اکٹھی اتنی سخت وعیدیں بجز کفر، شرک کے اور کسی جرم کی قرآن مجید میں وارد نہیں، اور اسی لئے قتل مومن، اشاعرہ اور معتزلہ سب کے نزدیک بالاتفاق اکبر الکبائر ہے اور یہ ڈرنے اور لرز جانے کی چیز ہے۔

مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا۔ قتل عمد کی جو معروف اور براہ راست صورتیں ہیں وہ تو ہیں ہی، لیکن

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا

اے ایمان والو! جب تم سفر کرو اللہ کی راہ میں تو خوب تحقیق کرلیا کرو ۲۶۷ اور جو شخص سلام

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ

کرتا ہو ۲۶۸ اُسے یہ مت کہہ دیا کرو کہ تو تو مسلمان ہی نہیں ۲۶۹

عجب نہیں کہ اس وعید کے تحت قتلِ مسلم کی وہ ساری صورتیں بھی آجائیں جو کسی غیر شرعی قانون کے مطابق اور کسی کافرانہ آئین ونظام کے تحت کی جاتی ہیں، مثلاً کسی کافر حکومت کی فوج یا پولیس ، یا داخل ہو کر اس حکومت کے باغی اور مجرم مسلمان پر گولی چلا دینا یا کسی غیر اسلامی عدالت کی کرسی پر مجسٹریٹ یا جج کی حیثیت سے بیٹھ کر کسی مسلمان کو سزائے موت کا حکم سنا دینا وقس علیٰ ہذا

مُتَعَمِّدًا ۔ تعمد کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ مقتول کے ایمان ہی کی بنا پر اُسے قتل کیا جائے، یہ صورت تو صاف کفر کی ہے، دوسری یہ کہ قتل مسلم کو جائز سمجھ کر، یہ صورت بھی کفر ہی کی ہوئی۔

اى قاصدا قتله لايمانه وهو كفر او قتله مستحلا لقتله وهو كفر ايضا۔ (مدارک)

فَجَزَآؤُهٗ ۔ آگے سزا ایسے قاتل کی مذکور ہو رہی ہے جو اس قتل کو جائز سمجھے یا بلا توبہ مر جائے۔

والجمهور على انه مخصوص بمن لم يتب (بیضاوی) وهو عندنا اما مخصوص بالمستحل له (بیضاوی)

پھر یہ بھی لحاظ رہے کہ نوعیت جرم کی شدت کے لحاظ سے اصل سزا یہی ہے جو یہاں مذکور ہوئی لیکن یہ لازی نہیں کہ ہر مومن کو بھی انتہائی سزا مل کر ہی رہے اور یہ تفسیر حدیث نبوی سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے، دنیوی قانون میں بھی جرائم کی ایک انتہائی سزا مقرر ہوتی ہے لیکن یہ حاکم کی رائے تمیزی پر ہوگا کہ اس حد کے اندر جتنی سزا مناسب سمجھے دے۔

معناه هى جزاؤه ان جازاه ولكنه ان شاء عذبه وان شاء غفرله بكرمه فانه يغفر لمن يشاء (معالم) قال عليه السلام هى جزاؤه ان جازاه (مدارک)

جمہور اہلِ سنت کا مذہب ہے کہ قاتل اگر مسلم ہے تو اس کی توبہ بھی بالآخر قبول ہو جائے گی اور خلود فی النار کی سزا صرف کافروں اور مشرکوں کے لئے رہ جائے گی، اس عقیدہ کے دلائل کتاب وسنت سے ماخوذ کلام وعقائد کی کتابوں میں اپنی جگہ پر مبسوط درج ملیں گے۔

۲۶۷ (ہر امر کی اور خصوصاً قتل کے باب میں)

یہ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ جب تم وطن سے باہر سفر جہاد میں ہو تو بلا خوب چھان بین کئے محض شک و شبہ کی بنا پر قتل میں جلد بازی نہ کر دیا کرو۔

فَتَبَيَّنُوْا ۔ خوب سوچ بچار لو ایسا نہ ہو کہ کافر کے خیال میں کسی کلمہ گو کو قتل کر ڈالو۔

تحققوا حتى يتبين لكم المؤمن من الكافر (ابن عباسؓ) المقصود من هذه الآية المبالغة فى تحريم قتل المؤمنين (کبیر)

یہ تحقیق واحتیاط سفر وحضر ہر حال میں واجب ہے، سفرِ جہاد کی قید آیت میں صرف اس لئے ہے کہ نزولِ آیت سے قبل ایسا واقعہ اتفاق سے سفرِ جہاد ہی میں پیش آیا تھا۔

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ؕ

تم دنیوی زندگی کا سامان تلاش کرتے ہو تو اللہ کے پاس تو (بہت) کثرت سے مالِ غنیمت ہے ۲۷۰

والتبيين اى التثبت فى القتل واجب حضرا وسفرا لاخلاف فيه وانما خص السفر بالذكر لان الحادثة التى فيها نزلت الآية وقعت فى السفر۔ (قرطبی)

احادیثِ نبوی میں یہ مضامین بار بار آئے ہیں کہ ایک کلمہ گو کا قتل ہو جانا اللہ کے ہاں ہزار کافروں کے زندہ بچ جانے سے، بلکہ ساری دنیا کے فنا ہو جانے سے شدید تر ہے۔

فان ابقاء ألف كافر اهون عند الله من قتل امرئ مسلم (بیضاوی) وفی الحديث زوال الدنيا اهون على الله من قتل امرئ مسلم (کشاف)

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ یعنی راہِ جہاد میں۔

ای خرجتم فی الجهاد۔ (ابن عباسؓ)

۲۶۸ (مسلمانوں کے طریقہ پر یا اور کسی ایسی ہی علامت سے اپنے اسلام کا اظہار کر رہا ہو۔)

۲۶۹ (بلکہ محض جان بچانے کو اظہارِ اسلام کر رہا ہے)

مقصد یہ ہے کہ قتل سے دست کشی اس شخص کے مجرد اظہارِ اسلام سے واجب ہو جاتی ہے، اس کے باطن کی تفتیش ہرگز تمہارے ذمہ نہیں، فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ جان و مال کو محفوظ کر دینے والی شے کلمۂ شہادت ہے کافر غیر معاہد بھی اگر اُسے پڑھ دے گا تو مسلم کے لئے اس پر تلوار اٹھانا حرام ہو جائے گی۔

المسلم اذا لقى الكافر ولا عهد له جاز له قتله فان قال لا اله الا الله لم يجز قتله لانه قد اعتصم بعصام الاسلام المانع من دمه وماله واهله (قرطبی)

آیت سے بعض فرقوں نے استدلال یہ کیا ہے کہ ایمان مجرّد قول کا نام ہے لیکن اہلِ تحقیق کا قول ہے کہ ایمان فقط اقرارِ لسانی کا نام نہیں اور زبان سے اقرار تو منافقین بھی کرتے تھے بلکہ ایمان کی حقیقت میں تصدیقِ قلب بھی شامل ہے، البتہ بندوں کے پاس علم کا کوئی ذریعہ بجز لفظ و قول کے نہیں۔

استدل بهذه الآية من قال ان الايمان هو القول۔ وليس فى ذالك ان الايمان هو الاقرار فقط الاترى ان المنافقين كانوا يقولون هذا القول وليسوا بمؤمنين فثبت ان الايمان هو الاقرار وغيره وان حقيقته التصديق بالقلب ولكن ليس للعبد طريق اليه الا ما سمع منه فقط (قرطبی)

۲۷۰ یعنی اگر مالِ غنیمت کی طمع تمہیں ایک مدعیِ اسلام کے قتل میں جلد بازی اور بے احتیاطی کی طرف لا رہی ہے تو یہ یاد رکھو کہ مال اور مالِ غنیمت کا سرچشمہ بھی تو اللہ ہی کی ذات ہے اور وہ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہیں اس کی بڑی سے بڑی مقدار قانونِ شریعت کے اتباع ہی سے دے دے۔

عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ عرض وہ چیز ہے جو بذاتِ خود قائم نہ رہ سکے اور اسی لئے متکلمین نے جوہر کے مقابل کی اصطلاح رکھی ہے۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ

ایسے ہی تم بھی تو پہلے تھے ۲۷۱ پھر اللہ نے تم پر کرم کیا ۲۷۲ تو (خوب) تحقیق کرلیا کرو بے شک تم

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۹۴﴾

جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کی خوب خبر رکھتا ہے ۲۷۳

العرض مالا یکون له ثبات ومنه استعار المتکلمون العرض لما لاثبات له الا بالجوهر (راغب)

یہاں عرض سے مراد مال ہے اور بجائے مال کے عرض اسی لئے لایا گیا ہے کہ اس سے مال کی بے ثباتی اور زود فنائی کی جانب بھی پورا اشارہ ہو جائے۔

شبه تعالیٰ بتسمیته عرضا علی کونه سریع الفناء قریب العرض والمال سمی به لسرعة فنائه (مدارک) الانقضاء (کبیر)

۲۷۱ یہ تو مسلم صحابیوں اور دوسروں کو یاد دلایا ہے کہ آخر تمہارے اوپر بھی تو یہ دور گزر چکا ہے کہ تمہارے پاس تمہارے اسلام و ایمان کا ثبوت بجز تلفظِ کلمہ اور زبانی دعوے کے اور تھا کیا؟ تمہارے اخلاصِ قلب اور تمہارے حسنِ اعمال کی شہادت تو بہت بعد کو پیش ہوئی۔

اوّل ما دخلتم فی الاسلام سمعت من افواهکم کلمة الشهادة فحصنت دماءکم واموالکم من غیر انتظار الاطلاع علی مواطاة قلوبکم لألسنتکم۔ (کشاف)

۲۷۲ (کہ تمہارے اس اعلام اور دعوے کو کافی سمجھ لیا گیا اور تمہارے ایمان کو معتبر قرار دینے کے لئے تفتیشِ باطن کا حکم نہیں دیا)

فعلیکم بان تفعلوا بالداخلین فی الاسلام کما فعل بکم وان تعتبروا ظاهر القول۔ هذا هو الذی اختاره اکثر المفسرین (کبیر)

دوسری صورت اللہ کے فضل و کرم کی یہ بھی قرار دی جاسکتی ہے کہ اس نے تمہارے اس ابتدائی اسلام کو اب مشہور و معلوم کرادیا اور تمہیں استقامت اور حسنِ عمل کی توفیق دی۔

بالاشتهار بالایمان والاستقامة فی الدین (بیضاوی) حیث نور نور الایمان فی قلوبکم ایمانکم علی العمل به والمحبة له (کبیر) بالاستقامة والاشتهار بالایمان (مدارک)

۲۷۳ (سو اگر تم نے کوئی بھی بے احتیاطی کی تو اس کے ساتھ تمہارا کون سا عذر چل سکے گا)

فَتَبَيَّنُوْا۔ تحقیق و احتیاط کے لئے یہ تکرار دعوت یا اہتمام حکم کی غرض سے۔

اعادة الامر بالتبیین تدل علی المبالغة فی التاکید من ذلک الفعل (کبیر) کرر الامر بالتبیین لیوکد علیهم (مدارک) اعاد الامر بالتبیین للتاکید۔ (قرطبی)

ایک سوال یہ پیدا ہوا ہے کہ آیا زندیق کی توبہ قبول ہوگی؟ فقہاء نے اس آیت کی رو سے جواب دیا ہے کہ قبول ہوگی۔

اختلفوا فی ان توبة الزندیق هل تقبل ام لا فالفقهاء قبلوها واحتجوا علیه بوجوه الاول هذه الآیة (کبیر)

امام ابو حنیفہ نے اس آیت سے استدلال کرکے فرمایا ہے کہ بچوں کا اسلام بھی قبول ہوگا، اس لئے کہ آیت عام

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَ

مسلمانوں میں سے بلاعذر (گھر) بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد

الْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ

کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے ۲۷۴

ہے، بالغ اور نابالغ کی اس میں کوئی قید نہیں۔

قال ابوحنیفۃؒ دلت هذه الآیة علی صحة اسلام الصبی لان قوله ولاتقولوالمن القی الیکم السلام لست مؤمنا عام فی حق الصبی وفی حق البالغ۔ (کبیر)

بلکہ منافقین خود بھی جو اپنے جان ومال کو مسلمانوں سے بچائے ہوئے تھے وہ کلمۂ اسلام کے تلفظ ہی کی بنا پر تو تھا در انحالیکہ عند اللہ ان کا کفر بالکل ظاہر تھا اور رسول اللہ پر بھی اکثر صورتوں میں روشن ہو گیا تھا۔

وقد کان المنافقون یعصمون دمائهم واموالهم باظهار هذه الکلمة مع علم اللہ تعالی باعتقادهم الکفر وعلم النبی صلعم بنفاق کثیر منهم۔ (جصاص)

**۲۷۴** (اللہ کے ہاں درجہ اور مرتبہ میں)

اُولِي الضَّرَرِ کے لفظی معنی تو ہوئے "دکھ والے" لیکن یہاں ضرر مرض سے کہیں زیادہ وسیع معنی میں ہے اور ہر قسم کے عذر و مانع کو شامل ہے اور اہل الضرر اہل العذر کے مرادف ہے۔

قال العلماء اهل الضرر هم اهل الاعذار (قرطبی) الضرر النقصان سواء کان بالعمی او العرج او المرض او کان بسبب عدم الأهبة۔ (کبیر)

الْقٰعِدُوْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ کی تقدیر کلام یوں ہے۔

القاعدون الذین هم غیر اولی الضرر۔ (قرطبی)

مطلب صاف: اللہ کی راہ میں جان ومال سے جہاد کرنے والے اور بلاعذر گھر میں بیٹھ رہنے والے اللہ کے ہاں فضیلت ومقبولیت میں برابر نہیں ہو سکتے۔

یہیں سے یہ مطلب بھی صاف ہو گیا کہ جہاد فرض عین نہیں، فرض کفایہ ہے، اگر فرض عین ہوتا یعنی ہر فرد پر فرض ہوتا تو ان بیٹھ رہنے والوں اور نہ شریک ہونے والوں پر یقیناً عتاب و وعید کے الفاظ وارد ہوتے رہتے۔

فیه دلالة علی ان الجهاد لیس بفرض عین بل هو فرض کفایة (ابن کثیر) قال الفقهاء وفیه دلیل علی ان فرض الجهاد علی الکفایة ولیس علی کل احد بعینه (کبیر) وهذا دلیل علی ان فرض الجهاد علی الکفایة ولیس علی کل احد بعینه (جصاص)

فرقہ شیعہ نے آیت سے استدلال یہ کیا ہے کہ حضرت علیؓ کی افضلیت حضرت ابوبکرؓ پر ظاہر ہو رہی ہے اس لیے کہ حضرت علیؓ نے جہاد و قتال حضرت ابوبکرؓ سے کہیں زیادہ کیا ہے اور اس کو آیت میں معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ استدلال باطل ہے، اگر مطلق قتلِ کفار ہی معیارِ فضیلت ہوتا تو بہ قول امام رازیؒ حضرت علیؓ خود رسول اللہ صلعم سے بھی افضل و اشرف ہوتے حالانکہ اس کے قائل

فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ

اللہ نے جان ومال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر درجہ میں فضیلت دے رکھی ہے

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ

اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے سب (ہی) سے کر رکھا ہے ۲۷۵؂ اللہ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجر عظیم کے لحاظ ع

۱۳ ع ۵ ۱۰ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾

سے برتری دے رکھی ہے ۲۷۶؂ یعنی اللہ کی طرف سے (بہت سے) درجے اور بخشش اور رحمت اور اللہ ہے ہی بڑا بخشش والا بڑا رحمت والا ۲۷۷؂

شیعہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ افضلیت کلی کے اجزا اور بھی متعدد ہیں مثلاً تبلیغ دین میں مصروفیت، اقامت احکام واستحکام ملت میں مشغولیت وغیرہا اور ان سارے امور میں حضرت صدیق رضؓ ٹھیک اپنے آقا وسردار کے نقش قدم پر چلنے والے تھے چنانچہ حضرت عثمان رضؓ، حضرت طلحہ رضؓ، حضرت زبیر رضؓ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ جیسے جلیل القدر صحابی بڑی تعداد میں آپ ہی کی سعی وتبلیغ سے ایمان لائے اور پھر یہ بھی ہے کہ حضرت علی رضؓ کے مجاہدانہ جوہر مدینہ میں آکر چمکے جب اسلام کو یک گونہ غلبہ حاصل ہو چکا تھا، برخلاف اس کے ابوبکر صدیق رضؓ نے دین کی گراں بہا خدمتیں اس وقت سے انجام دینا شروع کر دی تھیں جب ملت غایت ضعف وپستی میں تھی اور امت ہر طرف سے نرغۂ اعداء میں محصور (کبیر)

۲۷۵؂ (مجاہدین سے ان کے جہاد کی بنا پر، اور قاعدین سے ان کے دوسرے اعمال حسنہ کی بنا پر)

كُلًّا۔ یعنی مجاہدین اور قاعدین دونوں سے۔

ای کل فریق من القاعدین والمجاهدین۔ (قرطبی)

اَلْحُسْنٰی۔ یعنی جنت اور آخرت کی نعمتیں۔

المثوبة الحسنیٰ وهی الجنة (بیضاوی) الجنة والجزاء الجزیل۔ (ابن کثیر)

اَلْمُجٰهِدِيْنَ وَالْقٰعِدِيْنَ۔ دونوں لفظوں میں جہاد اور قعود کے عموم مفہوم کو پیش نظر رکھنا چاہئے، بیان یقیناً میدان جہاد میں جانے والوں اور میدان جنگ سے رہ جانے والوں کا ہے لیکن لفظ جہاد کو قتال کے معنی میں مخصوص ومحدود کر دینا صحیح نہیں بلکہ نصرت دین کی ہر سعی وفکر اس کے اندر آجاتی ہے جس کی ایک فرد یقیناً قتال بھی ہے) علیٰ هذا قعود یا خانہ نشینی کے تحت میں ہر امر شریعت میں سستی آجاتی ہے اور اسی کی ایک اہم فرد قتال سے جی چرانا بھی ہے گویا فضیلت دین کے ہر کام کرنے والے کو نہ کرنے والے پر حاصل ہے اور اس سے تو یہ شبہ مٹ گیا کہ لشکر قتال کا ایک ایک سپاہی ہر غیر مقاتل سے افضل ہے خواہ وہ غیر مقاتل کسی پایہ ومرتبہ کا محدث، مفسر، فقیہ، متکلم، وصوفی وغیرہ خادم دین ہو۔

۲۷۶؂ اہل لطائف نے یہاں یہ نکتہ لکھا ہے کہ اَلْمُجٰهِدُوْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ (جان ومال سے جہاد کرنے والوں) کا ذکر تو اوپر آچکا ہے اب یہاں ذکر مطلق مجاہدین کا بغیر کسی قید کے ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی زندگی کا رخ تمام تر غیر اللہ سے اللہ کی طرف پھیر لیں اور یہ مجاہدات صوفیہ کا اعلیٰ مقام ہے۔

وجب ان یکون المراد منه من کان مجاهدا اعلی الاطلاق فی کل الامور وهو اشرف انواع المجاهدة

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ

بے شک اُن لوگوں کی جان جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے (جب) فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ

كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ

تم کس کام میں تھے ۲۷۸ وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بے بس تھے ۲۷۹

وحاصل هذا الجهاد صرف القلب من الالتفات الى غير الله الى الاستغراق فى طاعة الله (كبير)۔

۲۷۷ چنانچہ شانِ غفوریت کے تقاضہ سے وہ ان کا ہر عذر قبول کرے گا اور شانِ رحیمیت کے تقاضہ سے انھیں اجر مزید عنایت کرے گا۔

۲۷۸ یعنی دارالکفر دارالحرب میں رہ کر دین کے کن کن کاموں میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت کو نہ نکلے؟ یہ تعریض ہے اُن کے ہجرت نہ کرنے پر اور دارالحرب میں رہنے پر قانع و راضی ہو جانے پر۔

التوبيخ بانهم لم يكونوا فى شئ من الدين حيث قدروا على المهاجرة ولم يهاجروا۔ (كبير)

یہ وہ لوگ تھے جو مکہ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ اقرارِ اسلام کر چکے تھے لیکن جب ہجرت فرض ہوئی تو یہ مسلمانوں کے ساتھ نہ آئے، مکہ ہی میں رہ گئے، یہاں تک کہ پھر مشرکین کا ساتھ دینے لگے۔

المراد بالجماعة من اهل مكة كانوا قد اسلموا واظهروا للنبى صلعم الايمان به فلما هاجر النبى صلعم اقاموا مع قومهم وفتن منهم جماعة فافتتنوا (قرطبی) نزلت فى اقوام من اهل مكة كانوا قد اسلموا وامنوا بالله وبرسوله وتخلفوا عن الهجرة مع رسول الله صلعم حين هاجر وعرض بعضهم على الفتنة فافتتن (ابن جرير) نزلت فى قوم من المنافقين كانوا يظهرون الايمان للمؤمنين خوفا اذا رجعوا الى قومهم اظهروا لهم الكفر ولا يهاجرون الى المدينة (جصاص)

یہ عتاب خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہجرت اس وقت فرض عین تھی۔

هذا يدل على فرض الهجرة فى ذلك الوقت (جصاص)

فتح مکہ کے بعد ہجرت واجب نہ رہی، حدیث نبوی میں ارشاد ہوا ہے: "لا هجرة بعد الفتح"۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ ہجرت کا وجوب اس وقت اس لئے تھا کہ منکرین کی ایذا اور مزاحمت سے محفوظ رہ کر مسلمان حکومتِ الٰہی کے اندر رہیں اور قانون الٰہی کا نفاذ اپنے ہاں کر سکیں جب لشکرِ اسلام کو کافی قوت حاصل ہو گئی اور منکرین کی مزاحمت کا زور ٹوٹ گیا تو ہجرت بھی واجب نہ رہی لیکن پھر بھی کہیں اور جب بھی وہی وجوہ ہجرت پائے جانے لگیں گے ہجرت واجب ہو جائے گی۔

الْمَلٰٓئِكَةُ۔ صیغۂ جمع ہے مُراد ہیں ملک الموت اور ان کے انصار۔

المراد ملك الموت واعوانه۔ (بحر)

لیکن جمہور کا قول یہ ہے کہ تنہا ملک الموت مراد ہے اور صیغۂ جمع ان کے لئے ان کی عظمت کے اظہار کے لئے لایا گیا ہے۔

قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ

فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا

مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ

ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے ۲۸۰ بجز ان لوگوں کے جو مردوں اور عورتوں،

الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ

بچوں میں سے کمزور ہوں (کہ) نہ کوئی تدبیر ہی کر سکتے ہوں اور نہ کوئی راہ پاتے

سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰۗىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْھُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾

ہوں ۲۸۱ تو یہ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا اور اللہ تو ہے ہی بڑا معاف کرنے والا، بڑا بخشنے والا ۲۸۲

الملٰئکۃ هنا قیل ملك الموت هو من باب اطلاق الجمع علی الواحد تفخیما له وتعظیما لشانه هذا قول الجمهور (بحر)

اور واحد پر لفظ جمع کا اطلاق محاورۂ عرب میں عام ہے۔

والعرب قد تخاطب الواحد بلفظ الجمع۔ (معالم)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا کہ اب تک ذکر جہاد کا تھا، جس کا خلاصہ ہے شرِ کفار کا دفع عام اب ذکر ہجرت کا شروع ہو رہا ہے جس کا ماحصل ہے شرِ کفار کا دفع خاص، پہلا حکم اجتماعی تھا، اور یہ دوسرا انفرادی ہے، دونوں میں غرض مشترک اقامتِ دین ہے۔

**۲۷۹** یعنی ہم اپنے ملک میں محض مغلوب اور بے بس تھے، احکامِ دین پر عمل کرنا ہمارے بس میں نہ تھا، اس لئے ترکِ فرائض میں معذور رہے۔

**۲۸۰** فقہا نے لکھا ہے کہ جب ایک ملک میں رہ کر فرائضِ دین پوری طرح نہ ادا ہو سکتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں فرائضِ دین ادا ہو سکتے ہیں تو پہلے سے دوسرے ملک کی طرف ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔

والآیۃ تدل علی ان من لم یمکنه اقامة دینه فی بلده کما یجب وعلم انه یمکن من اقامته فی غیره حقت علیه المهاجرة (مدارک) هذا یدل علی الخروج من ارض الشرك الی ای ارض کانت من ارض الاسلام (جصاص)

**۲۸۱** یعنی ایسے لوگ جو فی الواقع اپنے ضعفِ جسمانی کی بنا پر نہ سفرِ ہجرت پر قادر ہوں اور نہ کسی دار الاسلام کا پتہ نشان انہیں مل رہا ہو۔

ای لا یجدون اسباب الهجرة ومبادیها ولا یعرفون طریق الموضع المهاجر الیه (روح)

حِيْلَةً۔ عربی میں تدبیر کے لئے عام ہے، اردو کے "بہانہ" کے مرادف نہیں۔

**۲۸۲** عفو کا تعلق ماضی سے ہے اور غفر کا مستقبل سے یعنی ان کی پچھلی کوتاہیوں کو معاف کر دینے والا ہے، اور آئندہ ان کے حق میں مغفرت کرنے والا ہے۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا

اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین پر جانے کی بہت جگہ اور گنجائش پائے گا ۲۸۳

وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ

اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرتا ہوا نکلے اور اسے پھر موت ع

يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۱۰۰ ۱۴ ع ۱۱

آ جائے ۲۸۴ تو اس کا اجر یقیناً اللہ کے ذمہ ثابت رہا۔ اور اللہ تو ہے ہی بڑا بخشنے والا، بڑا مہربان ۲۸۵

اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ۔ یعنی ان سے یہ فریضۂ ہجرت سرے سے ساقط ہی کر دیا جائے۔

عَسَى اللّٰهُ۔ عسٰی سے متعلق اوپر ذکر گزر چکا ہے کہ جب اس کے فعل کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے تو مراد محض توقع یا امید نہیں رہ جاتی ہے بلکہ تیقّن پیدا ہو جاتا ہے۔

وعسٰی ان کان للاطماع فھو من اللہ واجب (مدارک)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ عدمِ ہجرت کا گناہ فی الاصل اس قدر سخت ہے کہ غَفُوْرًا کا ادھر اشارہ کر دیا گیا ہے کہ باوجود عذر موجود ہونے اور اس لئے گناہ نہ ہونے کے مشابہ اس کے ہے کہ گناہ ہوا، اگرچہ معاف بھی کر دیا ہے۔

۲۸۳ اقامتِ دین اور اظہارِ کلمۂ حق کے لئے)

یعنی کوئی ہجرت کر کے دیکھے تو، اللہ کی زمین تنگ نہیں۔ اس زمین پر اُسے متعدد جگہیں مل جائیں گی جہاں وہ آزادی سے اپنے دین کا اظہار کر سکے گا، بعض اہلِ لطائف نے کہا کہ مُراغم اور سعۃ دو الگ الگ لفظ لانے میں اشارہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اظہارِ دین کی جگہیں مل جائیں گی اور آخرت میں فراخ اور وسیع بہشتیں ملیں گی۔

۲۸۴ (قبل اس کے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود یا ہجرت گاہ تک پہنچ سکے، اور اس لئے گویا بظاہر ناکام رہے)

فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ ہر ایسی مجبوری جو انسان کو عاجز و بےبس کر دے موت ہی کے حکم میں داخل ہے۔

مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ یعنی ایسے مقام کی طرف چلے جہاں اللہ اور اس کے رسول کے دین کا اظہار کر سکے۔

ای الی حیث امر اللہ ورسولہ (مدارک)

محققین نے لکھا ہے کہ ہر ایسا سفر جو رضاء الٰہی کے لئے ہو مثلاً سفرِ حج، یا طلبِ علمِ دین کے لئے سفر، باجر کے لحاظ سے سفرِ ہجرت کے حکم میں داخل ہے۔

قالوا کل ھجرۃ لطلب علم او حج او جھاد او فرار الی بلد یزداد فیہ طاعۃ او قناعۃ او زھدا او ابتغاء رزق طیب فھی ھجرۃ الی اللہ ورسولہ (مدارک)

۲۸۵ (تو اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اس ناکامی پر بھی پورا وہی اجر دیدے جو کامیابی پر موعود تھا)

ھذا یدل علی ان من خرج متوجھا لفعل شیٔ من القرب ان اللہ یجازیہ بقدر نیتہ وسعیہ وان اقتطع دونہ (جصاص)

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا

اور جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر اس باب میں کوئی مضائقہ نہیں کہ نماز میں کمی کر دیا کرو

مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ کافر لوگ تمھیں ستائیں گے ۲۸۶

۲۸۶ یہ آخر کا فقرہ جیسا کہ شارع علیہ السلام کا عمل اس پر گواہ ہے اور سارے اہل علم بجز خوارج کے اس پر متفق ہیں بطور شرط کے نہیں کہ صرف اسی حالت میں نماز قصر کی جائے بلکہ اس فقرہ میں نزول آیت کے وقت کی صرف حالتِ اتفاقی کا بیان ہے ورنہ قصرِ صلوٰۃ کا حکم ہر سفر کے لئے عام ہے، خواہ موقع خوف کا ہو یا نہ ہو۔

والخوف شرط جواز القصر عند الخوارج بظاهر النص وعند الجمهور ليس بشرط (مدارك) والذي عليه الائمة ان القصر المشروع في الامن ايضًا وقد تظاهرت الاخبار على ذلك (روح)

اذا ضربتم فی الارض۔ ضرب فی الارض سے مراد سفر ہوتا ہے۔

الضرب في الارض عبارة عن السفر (المنار) الضرب في الارض الذهاب فيها۔ (راغب)

اور یہ لفظ عام ہے ہر نوع سفر کے لئے، خواہ وہ دینی ہو، مثلاً جہاد کے لئے، خواہ محض دنیوی ہو تجارت یا سیاحت کے لئے۔

هذا اعم فهي رخصة لكل مسافر (المنار)

رہا یہ کہ سفر کتنی دُور کا ہو جس پر سفرِ شرعی کا اطلاق ہو سکے گا، تو قرآن مجید اور سُنّت صحیح اس کے جواب سے خاموش ہیں فقہاء نے مختلف اندازے اور تخمینے قرار دیے ہیں، حنفیہ کے ہاں مسافت تین منزل کی ہونی چاہیے اور شافعیہ و مالکیہ کے ہاں دو منزل کی، اور منزل کا اندازہ بیس میل کا ہے، مسافت سے متعلق اور بھی بہت سے قول نقل ہوئے ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک ایسے اقوال بیس سے بھی زائد ہیں۔

وفي فتح الباري ان ابن المنذر وغيره نقلوا في المسئلة اكثر من عشرين قولا۔ (المنار)

جمہور فقہاء کا قول ہے کہ سفر جس جائز غرض و مقصد سے بھی ہو، شرعی سفر کے حکم میں داخل ہے۔

الجمهور على جواز القصر في السفر المباح كالتجارة ونحوها (قرطبي)

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ۔ یعنی بادی النظر میں رکعات نماز میں کمی کر دینا ایک گناہ کی چیز معلوم ہوتی ہے اور وسوسہ تمھیں بھی گناہ کا ضرور ہو رہا ہے لیکن اطمینان رکھو کہ اس میں مضائقہ نہیں اللہ کی طرف سے یہ جائز کیا جا رہا ہے۔

الصَّلٰوة۔ صلوٰۃ (نماز) سے مراد صلوٰۃِ مکتوب یا نماز فرض ہے، حنفیہ کے ہاں سفر میں نماز قصر مستحب ہی نہیں واجب ہے

قلنا القصر عزيمة غير رخصة ولا يجوز الاكمال (مدارك) روي عن جماعة انه فرض وهو قول عمر بن عبد العزيز والكوفيين والقاضي اسمٰعيل وحماد بن ابي سليمان (قرطبي)

اور یہ قصر چار رکعتوں والی تینوں نمازوں میں ہوتا ہے ظہر، عصر، عشاء میں فرض کی دو دو رکعتیں رہ جاتی ہیں، مسائلِ قصر کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

إِنَّ الْكَافِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿١٠١﴾ وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ

بے شک کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہی ہیں۔ اور جب آپ ان کے درمیان ہوں اور ان کے لئے

لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا

نماز قائم کریں تو چاہئے کہ ان میں کا ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو جائے اور وہ لوگ اپنے ہتھیار لئے رہیں ۲۸۷

سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا

پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو اب چاہئے کہ وہ تم لوگوں کے پیچھے ہو جائیں اور وہ دوسرا گروہ جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے

فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ وَلْيَأْخُذُوا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ

آجائیں اور وہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار (ساتھ) لئے رہیں ۲۸۸

فِی الْاَرْضِ سے مراد یہ نہیں کہ سفر صرف خشکی ہی میں ہو، اَرض کا لفظ برّ و بحر کے لئے عام و مشترک ہے اور مقصد یہ ہے کہ کوئی سا بھی سفر ہو۔

المراد من الارض ما یشتمل البر والبحر والمقصود التعمیم ای اذا سافرتم فی ای مکان یسافر فیہ من بر و بحر (روح)

۲۸۷ یعنی حالتِ نماز میں بھی مسلح رہیں۔

اِذَا كُنْتَ فِيهِمْ صیغۂ واحد حاضر ہے محض رسول اللہؐ ہی مراد نہیں آپ ہوں یا آپ کا کوئی قائم مقام۔

قال الائمۃ نواب عن رسول اللہ صلعم فی کل عصر (مدارک) ھذہ الآیۃ خطاب للنبی صلعم وھو یتناول الامراء الی یوم القیمۃ ھذا قول کافۃ العلماء (قرطبی)

فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ۔ یعنی جب وقت نماز آجانے پر آپ میدان جنگ میں امامتِ نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں اور اندیشہ ہو کہ دشمن موقع پا کر حملہ کر دے گا۔

فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ۔ یعنی ایسے موقع پر چاہئے کہ سپاہ کے دو گروہ ہو جائیں، کچھ لوگ تو نماز شروع کر دیں اور کچھ لوگ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑے ہو جائیں۔ یہ سب بیان صلوٰۃ الخوف کا ہو رہا ہے پوری تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا جائے۔

۲۸۸ فقہاء نے یہاں سے یہ استنباط کیا ہے کہ عین عباداتِ منصوص کی حالت میں بھی اسباب و انتظام پر نظر رکھنا اولیٰ ہے

فَاِذَا سَجَدُوْا۔ یعنی پہلا گروہ ایک رکعت تمام کر لے۔

فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ۔ یعنی پہلے گروہ والے تمہارے پاس سے ہٹ کر دشمن کے مقابلہ میں آجائیں۔

وَلْتَاْتِ ..... لَمْ يُصَلُّوْا۔ یعنی وہ لوگ جنھوں نے ابھی نماز شروع بھی نہیں کی ہے اور ابھی تک وہ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے، وہ اب پہلے گروہ کی جگہ پر آجائیں۔

فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ۔ یعنی نماز کی جو رکعت ابھی امام کے لئے باقی ہے اس میں آکر اُس کے شریک ہو جائیں۔

وَدَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ تَغْفُلُونَ عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيلُونَ

کافروں کی تو خواہش ہی یہ ہے کہ تم اپنے ہتھیاروں اور اپنے سامان سے (ذرا) غافل ہوجاؤ تو یہ لوگ

عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن كَانَ بِكُمْ أَذًى

تمہارے اوپر یک بارگی ہی ٹوٹ پڑیں ۲۸۹ اور تمہارے لئے اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر تمہیں بارش سے

مِّن مَّطَرٍ أَوْ كُنتُم مَّرْضَىٰ أَن تَضَعُوا أَسْلِحَتَكُمْ ۖ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ ۗ

تکلیف ہو رہی ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے ہتھیار اتار رکھو۔ اور اپنے بچاؤ کا سامان لئے رہو ۲۹۰

إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا (۱۰۲) فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا

بے شک اللہ نے کافروں کے لئے ایک رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ پھر جب تم (اس) نماز کو ادا کر چکو تو

اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۚ فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۚ

اللہ کی یاد میں لگ جانا کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ۲۹۱ اور پھر جب تمہیں اطمینان حاصل ہوجائے تو نماز کی اقامت کرو ۲۹۲

۲۸۹ کیا ٹھکانا ہے ہماری شریعت کی پیدا کی ہوئی اس چستی، مستعدی، ہر چستی اور ہمہ وقتی بیداری کا، دشمن سامنے ہے قتل و خون کا بازار گرم ہے، جان کا سودا ہو رہا ہے عین اس وقت نماز بھی ہوجائے اور ہتھیار بھی برابر ساتھ رہیں، سستی، کاہلی، غفلت، آرام طلبی کہیں شریعتِ اسلامی کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟

۲۹۰ نمازِ خوف کی جو صورتیں یہاں ارشاد ہوئی ہیں وہ سب اس وقت کے لئے ہیں جب سب سپاہی ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں اور حضور صلعم کی موجودگی میں سب کا آپ ہی کے پیچھے پڑھنے پر حریص ہونا بالکل قدرتی تھا جب امام ہی دو یا زائد ہوں تو پھر ان انتظامات کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ فقہائے نے لکھا ہے کہ خوف کی بھی دو حالتیں ہیں اور دونوں کے حکم الگ الگ ہیں:۔

(۱) ایک یہ کہ عین معرکۂ قتال گرم ہو اور جماعت کا اہتمام ہی سرے سے نہ بن پڑے ایسی حالت میں نماز جماعت اڑا دی جائے گی اور اس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۲۳۹ میں موجود ہے، شدتِ خوف کی حالت میں نماز الگ الگ پڑھی جائے گی سوار یا پیادہ ہر حال میں جائز ہے، رکوع و سجدہ کے لئے اشارہ کافی ہے استقبالِ قبلہ بھی ضروری نہ رہے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہو تو میدان جنگ میں لیکن قتال ابھی شروع نہ ہوا ہو اور نماز با جماعت کا موقع ہو جیسا کہ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ سے اشارہ ہو رہا ہے اس آیت میں جن انتظامات کی ہدایت ہوئی ہے وہ اسی صورت سے متعلق ہے۔

۲۹۱ (غرض ہر صورتِ حال کے مناسب)

عَلَىٰ أَيِّ حَالٍ كُنتُمْ (قرطبی)

عَلَىٰ جُنُوبِكُمْ کے لفظی معنی ہیں اپنے پہلوؤں پر یا اپنی کروٹوں پر، اردو محاورہ میں مراد لیٹنے سے ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾ وَلَا تَهِنُوْا فِی

بے شک نماز تو ایمان والوں پر پابندیٔ وقت کے ساتھ فرض ہے ۲۹۳ اور (مخالف) قوم

ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ

کے تعاقب میں ہمت نہ ہارو ۲۹۴ اگر تمہیں دکھ پہنچا تو وہ بھی تو دکھ اٹھائے ہوئے ہیں جیسے تم دکھ اٹھائے

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا یَرْجُوْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۵ ۴ ۱۲

ہوئے ہو، اور تم اللہ سے وہ امید لگائے ہوئے ہو جو وہ نہیں رکھتے ۲۹۵ اور اللہ تو ہے ہی بڑا علم والا، بڑا حکمت والا ۲۹۶

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ۔ مطلب یہ ہوا کہ تخفیف نماز میں تو یہ ہوگئی باقی ذکر الٰہی میں کوئی تخفیف نہیں اور اسی لئے ہے یہاں تک کہ عین قتال کے وقت بھی ذکر الٰہی دل سے تو جاری ہی رہ سکتا ہے محققین نے کہا ہے کہ احکام شریعت کا اتباع بجائے خود ذکر الٰہی ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوةَ۔ الصَّلٰوة سے یہاں مراد وہی نماز خوف ہے جس کی ایک ہیئت مخصوص ہے عام نماز کی ہیئت سے ہٹی ہوئی، اس نماز کے لئے لفظ قَضَیْتُمْ ارشاد فرمانا اس کی دلیل ہے کہ یہ بظاہر ناکمل، ناتمام نماز بھی عند اللہ ادا ہو جاتی ہے۔

۲۹۲ (اصلی قاعدہ کے مطابق اور پورے شرائط کے ساتھ)

اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ۔ صلوٰۃ اصلی کے لئے یہاں لفظ اقامت استعمال کرنا اس کی دلیل ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد نماز کا اس کے جملہ شرائط ہی کے ساتھ ادا کرنا ہوتا ہے۔

فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ۔ یعنی سفر اور خوف کی حالتیں ختم ہو جائیں۔

۲۹۳ یہاں نماز کی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ علاوہ فرض ہونے (کتٰبًا) کے پابندیٔ وقت کے لحاظ سے فرض ہے۔ مَوْقُوْتًا۔ اس لئے سوا حالتِ معذوری کے، اسے وقت سے ہٹا دینا جائز نہ ہوگا۔

موقوتا ای محدود الاوقات لا یجوز اخراجها من اوقاتها فی شیئ من الاحوال۔ (روح)

مفسر تھانویؒ نے فرمایا ہے کہ فرض ہونے کی وجہ سے اس کا ادا کرنا ضرور ہے اور موقّت ہونے کی وجہ سے وقت پر ہی ادا کرنا ضرور، اسی لئے مخصوص حالات میں اس کی ہیئت کچھ کچھ تبدیل کر دی گئی تھی جب وہ عارض دور ہو گیا تو اس کی اصل ہیئت واجب الحفظ ہو گئی۔

۲۹۴ (جب تعاقب کی ضرورت آ پڑے)

روایتوں میں آتا ہے کہ آیت غزوۂ حمراء الاسد کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی، اس کا ذکر غزوۂ احد کے سلسلہ میں سورۂ آل عمران رکوع ۱۸ میں آچکا ہے آیت اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ کے ماتحت

۲۹۵ یعنی اجرِ آخرت کی جس کے مقابل کوئی چیز منکروں کے پاس نہیں، تو قوتِ قلب کے لحاظ سے تم ان سے کہیں بڑھے چڑھے رہے، دنیوی فتحمندیوں اور کامیابیوں کی پیش گوئیاں بھی اس کے تحت میں آسکتی ہیں۔

۲۹۶ چنانچہ علیم کل ہونے کی بنا پر اس پر اعداء دین کا ضعف جسیم ضعفِ قلب خوب روشن ہے اور حکیم مطلق

إِنَّآ أَنزَلْنَآ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ بِٱلْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُ ۚ

یقیناً ہم نے آپ پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ اس کے مطابق کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھا دیا ہے ۲۹۷

وَلَا تَكُن لِّلْخَآئِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَٱسْتَغْفِرِ ٱللَّهَ ۖ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾

اور (ان) خائنوں کے طرفدار نہ ہو جائیے ۲۹۸ اور آپ اللہ سے مغفرت چاہیے، بیشک اللہ بڑا ہی مغفرت والا ہے بڑا ہی رحیم ہے ۲۹۹

ہونے کی بناء پر اس نے تمہاری قوت تحمل سے زیادہ سے تمہیں کوئی حکم نہیں دیا۔

۲۹۷ (اسی قرآن کے ذریعہ سے)

اَرَاكَ ۔ یہاں بتا دیا، سمجھا دیا، سکھا دیا کے مفہوم میں ہے۔

بما اراك الله ای بما علمك (راغب) بما علمك الله فی القرآن۔ (ابن عباس)

بالحق یعنی قانون عدل کے مطابق۔ آیت اس باب میں صریح ہے کہ فیصلے جو کچھ بھی کئے جائیں قرآن ہی کے مطابق وماتحت کئے جائیں نہ کہ اپنے ہوائے نفس کے موافق یا کسی انسانی دماغ کے گڑھے ہوئے آئین ودستور کے ماتحت آیت کا پس منظر یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنو اُبیرق کے ایک گھرانے میں تین بھائی بشیر، بشر اور مبشر مسلمان تھے اور ان کا ایک بھائی بُشیر منافق تھا، ایک مرتبہ جو حضرت رفاعہ بن زید انصاریؓ کے گھر میں نقب لگا کر ان کے ہتھیار اور میدہ کی ایک بوری لے گئے، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ بُشیر منافق اور اس کے بدمعاش ساتھیوں نے چوری کی ہے حضرت رفاعہؓ نے اپنے برادر زادہ جناب قتادہ بن نعمان سے کہا کہ تم آستانِ نبوت میں جا کر واقعہ بیان کرو تو عجب نہیں کہ ہمارا مال مل جائے، انھوں نے جا کر سارا واقعہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا۔ جب بُشیر کے اقرباء نے سنا کہ نبی علیہ السلام کے پاس استغاثہ ہوا تو وہ آ کر کہنے لگے "یارسول اللہ! قتادہ بن نعمان اور ان کے چچا رفاعہ ہمارے آدمی پر جو مسلمان ہو چکا ہے ناحق چوری کی تہمت لگاتے ہیں" اس کے بعد قتادہ حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے فرمایا تم ایسے شخص پر بغیر کسی ثبوت کے چوری کی تہمت لگاتے ہو جو دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکا ہے؟ یہ سُن کر قتادہ کے دل میں آرزو ہوئی کہ کاش میں نے آپ سے چوری کی شکایت نہ کی ہوتی، تھوڑی دیر گزری تھی کہ خالق کردگار نے اپنے رسول پاک پر یہ آیت نازل فرمائی (ترمذی ابواب تفسیر القرآن)

۲۹۸ خائنوں سے بنو اُبیرق مراد ہیں، جب یہ آیتیں نازل ہوئیں تو بنو اُبیرق نے بُشیر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر کے چوری کا مال برآمد کرایا اور تمام اسلحہ نبی صلعم کے پاس بھجوا دیے، بُشیر نفاق کا لباس فریب اُتار کر علانیہ مشرکوں سے جا ملا (ترمذی)

۲۹۹ یہ استغفار کا حکم رسول م کو کس کے لئے مل رہا ہے؟ اپنے حق میں یا امت کے حق میں؟ بہ ظاہر یہ حکم استغفار ان لوگوں کے حق میں معلوم ہوتا ہے جو برادری کے خیال سے اس مجرم منافق کے حق میں ساعی اور سفارشی تھے اور قرآن مجید میں اس اُسلوب بیان کی مثالیں اور جگہوں پر ملتی ہیں، مثلاً یایھا النبی اتق اللہ یا وان کنت فی شک وغیرہما۔ چنانچہ اہل تفسیر کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے۔

قیل الخطاب للنبی صلعم المراد بنو اُبیرق (قرطبی) والمعنی استغفر اللہ للمذنبین من اُمتك والمتخاصمین بالباطل (قرطبی) یحتمل ان یکون المراد واستغفروا اللہ لاولٰئك الذین

وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَنْ

اور ان لوگوں کی طرف سے وکالت نہ کیجئے جو اپنے حق میں خیانت کرتے رہتے ہیں ۳۰۰۔ اللہ کسی ایسے شخص کو نہیں چاہتا

كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ

جو بڑا خائن اور گنہگار رہو ۳۰۱۔ یہ لوگ آدمیوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے درانحالیکہ وہ ان کے

وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا

ساتھ اس وقت بھی رہتا ہے جب وہ رات میں اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اسے پسند نہیں اور وہ جو کچھ بھی

يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

کرتے ہیں اللہ اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۳۰۲۔ تم لوگوں نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے وکالت کرلی لیکن

فَمَنْ يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَمْ مَنْ يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

قیامت کے دن ان کی طرف سے اللہ کے سامنے کون وکالت کرے گا یا کون ان کا کام بنانے والا ہوگا ۳۰۳۔

یذبون عن طعمة ویریدون ان یظهروا براءته عن السرقة۔ (کبیر)

لیکن اگر دوسرے مفسرین کے مذاق کے مطابق یہ معنی لئے جائیں کہ اے پیمبر آپ اپنے حق میں مغفرت طلب کیجئے تو اس سے اشارہ آپ کے صرف اس میلانِ طبع کی جانب ہے کہ آپ نے بنو اُبَیرِق کی شکایت پر حضرت قتادہ بن نعمانؓ سے اظہار ناراضی فرمایا، یہ میلانِ طبع ظاہر ہے کہ معصیت کبیرہ کیا معنی صغیرہ کا بھی درجہ نہیں رکھتا، لیکن پیمبر تقوے اور طہارت قلب کے جس بلند ترین مقام پر ہوتے ہیں، اس لحاظ سے اس قدر ارادہ اور میلانِ طبع بھی قابل استغفار قرار پایا۔

۳۰۰ (یہ ہدایت آئندہ کے لئے ہے، جیسا کہ اب تک بھی آپ نے پیش کیا ہے)

۳۰۱ خوّان اور اثیم کے لانے سے یہ مقصود نہیں کہ جو کم درجہ کے خائن اور گنہگار ہیں، وہ اللہ کی نظر میں غیر محبوب نہیں، بلکہ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ منافق کی برادری کے جن لوگوں نے اُسے مجرم جان کر بھی خواہ مخواہ حق پوشی اور باطل کوشی کی، وہ خائن اور گنہگار بڑے درجہ کے تھے۔

اَلَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ خیانت کا ضرر و وبال بالآخر خود خائن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے اس لئے خیانت کو خیانتِ نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جعلت خیانة الغیر خیانة لانفسهم لان وبالها وضررها عائد علیهم (روح)

۳۰۲ (اس کے احاطۂ علم سے کون سی کارروائی مخفی سے مخفی بھی باہر رہ سکتی ہے؟)

اس حقیقت کا استحضار ہر مجرم، ہر معصیت سے باز رکھنے کو کافی ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ

اور جو کوئی بھی برائی کرے یا اپنی جان پر زیادتی کرے پھر اللہ سے مغفرت طلب کرے تو وہ اللہ کو بڑا مغفرت

غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى

والا بڑی رحمت والا پائے گا ۳۰۴ اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب اپنی ہی جان کے

نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً

خلاف کرتا ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۳۰۵ اور جو کوئی کسی قصور یا گناہ کا ارتکاب کرے

اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع

ع ۸ ۲۶/۱۴

پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دے تو درحقیقت اس نے ایک بڑا بہتان اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لے لیا ۳۰۶

يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ ۔ یعنی خلق کے سامنے ذلّت و رسوائی سے شرماتے ہیں۔

لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ ۔ یعنی اللہ کے حضور میں بطور مجرم پیش ہونے سے نہیں شرماتے ہیں۔

اِذْ يُبَيِّتُوْنَ .... الْقَوْلِ ۔ اشارہ ہے اس طرف کہ اس خاص معاملہ میں رات کو باہم رازدارانہ مشورہ ہوا تھا کہ صبح کو رسول اللہ صلعم کی خدمت میں گفتگو اسی طریقہ پر کی جائے گی۔

وَهُوَ مَعَهُمْ ۔ معتزلہ، قدریہ، جہمیہ وغیرہ نے اس قسم کی آیتوں سے حق تعالٰی کی معیّتِ مکانی پر استدلال کیا ہے۔

قال الجهمية والقدرية والمعتزلة هو بكل مكان تمسكا بهذه الآية وما كان مثلها (قرطبی)

لیکن اہلِ سنّت اُسے شانِ تنزیہی کے منافی سمجھتے ہیں اور انھوں نے مُراد صرف معیتِ علمی لی ہے۔

اى بالعلم والرؤية والسمع هذا قول اهل السنة (قرطبی) يعنى بالعلم والقدرة والرؤية (کبیر)

۳۰۳ اس حقیقت کبریٰ کو یاد دلایا ہے کہ اصل پیشی اور جواب دہی تو عدالتِ آخرت ہی کی ہے، یہاں کسی طرح اگر بات بنا بھی لی گئی تو کیا ہوتا ہے مومن کے لئے اصل خوف کی چیز تو وہی آخرت کی عدالت ہے، جہاں کسی قسم کی بھی تلبیس کی گنجائش نہیں۔

هٰٓاَنْتُمْ ۔ خطاب ہے مجرم کی برادری اور محلہ والوں کی طرف جنھوں نے سازش کر کے مجرم کی پُشت پناہی کی تھی۔

۳۰۴ اوپر کی وعید و انذاری آیتوں کے بعد گنہگاروں و کمزور ایمان والوں کے لئے یہ بھی چمکیانہ اور مناسبِ حال دلدہی ہے

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا ۔ متعدی برائی مُراد ہے یعنی کسی دوسرے کے ساتھ برائی کی جائے مثلاً ظلم، دغا، سود خواری، رشوت ستانی وغیرہا۔

يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ۔ وہ برائی جو خود اپنے ہی حق میں کی جائے مثلاً ترکِ نماز، شراب خواری وغیرہا۔

يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ۔ یہ استغفار قواعدِ شرعی کے مطابق ہونا چاہیے۔

۳۰۵ علیم کل ہونے کی حیثیت سے وہ سب کے چھوٹے بڑے گناہوں سے باخبر ہے حکیم ہونے کے اعتبار سے وہ جزا و سزا اسکے مناسبِ حال ہی تجویز کرتا ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ

اور اگر آپ پر اللہ کا فضل (خاص) اور رحمت نہ ہوتی، تو ان میں سے ایک گروہ نے تو تہیّہ ہی کر لیا تھا کہ آپ کو بھٹکا کر

اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ

رہیں گے۔ حالانکہ یہ بس اپنے ہی آپ کو بھٹکا کر رہتے ہیں اور آپ کو کسی چیز میں بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ۳۰۷

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ

اور اللہ نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور آپ کو وہ سکھا دیا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے ۳۰۸

تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾

اور آپ پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے ۳۰۹

اِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ۔ یعنی گناہ کا ضرر و وبال خود اسی کو بھگتنا ہوگا، اس لئے توبہ و استغفار، تدارک و تلافی لازمی ہے۔

**۳۰۶** (اور اپنے جرم کو کئی گنا بڑھا دیا)

توبہ نہ کرنا، اپنی جگہ پر نادم و منفعل نہ ہونا، تلافی و کفّارہ اور اپنی اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا، یہ جرائم بجائے خود کیا کم ہیں، چہ جائیکہ اپنا گناہ اُلٹا کسی بے گناہ کے سر تھوپ دیا جائے۔ قرآنی اخلاقیات میں یہ جرم ضمیر و اخلاق کی انتہائی پستی کا نمونہ ہے اور اس لئے لازمی طور پر اس پر گرفت بھی سخت رکھی گئی ہے۔

خَطِيْٓئَةً۔ وہ چھوٹا گناہ ہے جس میں قصد و تعمّد لازمی نہیں، یا وہ گناہ ہے جو صرف خدا اور بندہ کے درمیان ہو۔

الخطیئۃ قد تکون من قبل العمد وغیر العمد (ابن جریر) ای صغیرۃ او ما لا عمد فیہ من الذنوب (روح) ذنب بینہ وبین ربہ (مدارک)

اِثْمًا۔ وہ بڑا گناہ ہے جس میں قصد و تعمّد لازمی طور پر ہو، یا جو بندوں کا گناہ ہو۔

(الاثم لا یکون الا من العمد (ابن جریر) او کبیرۃ او ما لا یکون من العمد (روح) ذنب فی مظالم العباد (مدارک)

**۳۰۷** یعنی اپنی اس ناپاک کوشش میں کامیاب ہونا تو ان کے لئے ممکن نہیں، البتہ اس سعی سے اپنے ہی کو مستحق عقوبت بنا رہے ہیں۔ لَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ۔ اللہ کا فضل و کرم تو آپ پر عموماً اور ہر حال میں تھا، لیکن اس خاص قضیہ میں خصوصیت کے ساتھ اس کا ظہور رہا۔

اَنْ يُّضِلُّوْكَ۔ یعنی آپ کو غلطی اور دھوکے میں مبتلا کر کے آپ سے غلط فیصلہ حاصل کریں۔

ان یخطؤک عن الحکم (ابن عباسؓ) ای بان یضلوک عن القضاء بالحق۔ (روح)

**۳۰۸** (احکام دین و قضایا کے باب میں)

یعنی شیطان اور اس کے چیلوں (منافقین) کو یہ قوت نہیں دی گئی کہ وہ آپ کو دین کے کسی شعبہ میں کچھ بھی مغالطہ میں ڈال سکیں۔

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ

سرگوشیاں بہت سی ایسی ہیں جن میں کوئی بھلائی نہیں ہاں البتہ بھلائی یہ ہے کہ کوئی صدقہ کی ترغیب یا کسی

أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اور نیک کام کی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کی ۳۱۰ اور جو کوئی اللہ کی رضا حاصل کرنے کو ایسا کرے گا ۳۱۱

اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ﴿١١٤﴾ وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ

سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم دیں گے اور جو کوئی بعد اُس کے کہ اس پر (راہ)

مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ

ہدایت کھل چکی رسولؐ کی مخالفت کرے گا اور مومنین کے راستہ کے علاوہ (کسی راستہ کی) پیروی کرے گا ہم اُسے

نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿١١٥﴾ ع

کرنے دیں گے جو کچھ وہ کرتا ہے اور پھر ہم اُسے جہنم میں جھونکیں گے ۳۱۲ اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

۳۰۹ یہ کتاب کا نزول، حکمت کا نزول، علومِ خاصہ کی تعلیم یہ سب اسی فضلِ عظیم کے شواہد ہیں اور اللہ کا فضل جس پر عظیم ہو اس پر کسی کا قابو چل سکتا ہے؟

أَنزَلَ الْكِتَابَ۔ اور اس کتاب ہی کے ذریعہ سے منافقین کی معاندانہ روش کا پردہ بھی چاک کیا گیا۔

عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُن تَعْلَمُ۔ یعنی جو علوم عالیہ آپؐ پر قبل نبوت نزول قرآن منکشف نہ تھے اب سب منکشف ہو گئے۔

۳۱۰ (اور ان اغراض کے لئے خفیہ گفتگو اور سرگوشی کی ضرورت پڑ جائے تو اس میں البتہ کوئی حرج نہیں بلکہ ایسے موقع پر خیر و برکت ہو گی)

نَّجْوَاهُمْ۔ میں ضمیر هُمْ مطلق انسان کی جانب ہے۔

اى نجوى الناس جميعا (ابن جرير)

يعنى كلام الناس (ابن كثير)

۳۱۱ (نہ کہ اپنے ذاتی دُنیوی کی اغراض کے لئے)

اخلاص نیت اور حصول رضاء الٰہی کی شرط ہر اہم موقع کے لئے یہاں بھی لگی ہوئی ہے۔

۳۱۲ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ۔ اُسے صاف کر دیا کہ آیت میں بیان مُرتد کے خصائل رذیلہ کا ہو رہا ہے

نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ یعنی ہم اُسے اُسی طریق پر چھوڑے رکھتے ہیں اپنے قانونِ مشیت تکوینی کے موافق۔ مقصود یہ ہے کہ جبر و اکراہ سے کسی کو راہِ حق کے قبول کرنے اور ماننے پر مجبور نہیں کیا جاتا بلکہ وضوحِ حق کے بعد جو بدبخت اپنی کجروی پر قائم رہنا چاہتا ہے اُسی پر اُسے قائم رہنے دیا جاتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ

یقیناً اللہ اس کو نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا (اور گناہوں کو) بخش دے گا

يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِنْ

جس کے لئے منظور ہوگا اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے وہ یقیناً بڑی دور کی گمراہی میں پڑ گیا ۳۱۳ ف

يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ

یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے بھی ہیں تو بس زنانی چیزوں کو ۳۱۴ ف

وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ۔ اس اتباع کا تعلق امورِ دین سے ہے۔
يَتَّبِعْ ...... جَهَنَّمَ۔ آیت کے اس جزو سے فقہاء کو ایک بہت بڑی اصل ہاتھ آگئی ہے اور اس کو انھوں نے اجماعِ امت کے حجتِ شرعی ہونے کا مبنیٰ قرار دیا ہے اور تقریرِ استدلال یہ ہے کہ طریقِ مومنین سے الگ ہونا جب حرام اور مستحقِ جہنم ٹھہرا تو لازمی ہے کہ اس کا عکس یعنی اتباعِ طریقِ مومنین واجب ہو، اور اس کی مخالفت بھی کتاب و سنت کی مخالفت کے بعد ناجائز ٹھہرے اور یہاں قرآن مجید نے عدمِ اتباعِ طریقِ مومنین کو مخالفتِ رسولؐ کے ساتھ جمع کر کے فرمایا ہے۔

هو دليل على ان الاجماع حجة لا تجوز مخالفتها كما لا تجوز مخالفة الكتاب والسنة لان الله تعالى جمع بين اتباع غير سبيل المؤمنين وبين مشاقة الرسول في الشرط وجعل جزاءه الوعيد الشديد فكان اتباعهم واجبا كموالاة الرسول (مدارك) وقرن اتباع غير سبيل المومنين الى مباينة الرسول في ما ذكر له من الوعيد فدل على صحة اجماع الامة لالحاقه الوعيد بمن اتبع غير سبيلهم (جصاص) وتقرير الاستدلال ان اتباع غير سبيل المؤمنين حرام فوجب ان يكون اتباع سبيل المؤمنين واجبا (كبير) وهو من احسن الاستنباطات واقواها۔ (ابن كثير)

۳۱۳ ف (ایسا کہ اب حق کی طرف اس کی مراجعت ممکن نہیں)

أَنْ يُشْرَكَ بِهِ۔ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ۔ شرک ضد ہے توحید کی اور جس طرح توحید اصلِ اصول ہے تمام ممکن بھلائیوں اور نیکیوں کی اسی طرح شرک اصلی بنیاد ہے ساری شرآبیوں اور برائیوں کی، اس لئے اور کسی معصیت پر شرک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، راہرو کا رخ اگر منزلِ مقصود کی طرف ہو تو گرتا پڑتا، وقت ضائع کرتا کبھی نہ کبھی منزل تک پہنچ ہی جائے گا، لیکن اگر رخ ہی غلط ہے تو ظاہر ہے کہ ہر قدم اسے منزل سے دور تر ہی کرتا رہے گا اور قیامت تک بھی اگر چلتا رہے تو منزل تک نہ پہنچ سکے گا، شرک قبولِ رحمت کی ساری صلاحیتوں و استعدادوں ہی کو سوخت کر دیتا ہے اس لئے وہ آخرت کی کسی نعمت، کسی لذت، کسی راحت کے قابل ہی نہیں رہ جاتا، ملاحظہ ہوں اسی سورت کی آیت ۴۸ کے حاشیہ ۱۵۸-۱۵۹ آیت میں خوارج کے اس عقیدہ کا بھی رد آگیا کہ کبیرہ کا مرتکب کافر ہو جاتا ہے۔

فيه رد على الخوارج حيث زعموا ان مرتكب الكبيرة كافر۔ (قرطبی)

۳۱۴ ف مشرک قوموں کی دیومالا (میتھالوجی) میں ہمیشہ دیویوں دیوتاؤں کی ایک بڑی اور اہم تعداد رہی ہے

وقف لازم

وَاِنۡ يَّدۡعُوۡنَ اِلَّا شَيۡطٰنًا مَّرِيۡدًا ۙ‏ (۱۱۷) لَّعَنَهُ اللّٰهُ ‌ۘ وَقَالَ لَاَ تَّخِذَنَّ

اور یہ لوگ پکارتے بھی ہیں تو بس شیطان سرکش کو ۳۱۵ اس پر لعنت کی ہے اللہ نے ۳۱۶ اور وہ کہہ چکا ہے کہ

مِنۡ عِبَادِكَ نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا ۙ‏ (۱۱۸) وَّلَاُضِلَّنَّهُمۡ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمۡ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ

میں تیرے بندوں میں اپنا مقرر حصہ لے کر رہوں گا ۳۱۷ اور میں انہیں گمراہ کر کے رہوں گا اور ان میں ہوس پیدا کر کے رہوں گا اور انہیں

فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الۡاَنۡعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمۡ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلۡقَ اللّٰهِ‌ ؕ

حکم دوں گا ۳۱۸ چنانچہ وہ چوپایوں کے کانوں کو تراشیں گے ۳۱۹ اور انہیں حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے ۳۲۰

ہندوؤں میں درگا دیوی، کالی مائی، لکشمی جی، سرسوتی دیوی کے نام ایک ایک کی زبان پر ہیں عرب جاہلی میں یہ دیوی پرستی اور زیادہ زوروں کے ساتھ جاری تھی، چنانچہ قرآن مجید میں بھی جاہلی معبودوں کے سلسلہ میں صراحت جن ناموں کی آئی ہے وہ دیویوں ہی کے ہیں یعنی لات، منات اور عُزّیٰ، ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

اِنَاث۔ لغت میں اس کے ایک معنی دیوی، کمزور اور ضعیف العمل چیزوں کے بھی آتے ہیں۔

قیل لما یضعف عملہ انثی۔ (راغب)

پھر چونکہ جمادات تمام تر انفعالیت کے مظہر ہوتے ہیں اور پتھر کے بت یا مورتیاں انہی کی بنی ہوئی ہوتی ہیں جن میں نہ جان ہوتی ہے اور نہ کوئی قوتِ فاعلی، اس لئے لغت نے لفظ اناث کا مجازی استعمال ان کے لئے بھی جائز رکھا ہے۔

لما کان معبوداتھم من جملۃ الجمادات التی ھی منفعلۃ غیر فاعلۃ سماھا اللہ تعالیٰ انثیٰ (راغب) من کل شئ اخسہ (ابن جریر)

چنانچہ اکابر مفسرین میں سے بھی بہت سے اسی طرف گئے ہیں۔

ای اصناما بلا روح (ابن عباسؓ) میت لا روح فیہ (ابن جریر عن قتادۃ)

**۳۱۵** یہ مشرکوں کی حماقت کو واضح کیا ہے کہ ان بتوں اور دیویوں کو پکارنا عین شیطان کو پکارنا ہے۔

**۳۱۶** (اور لعنت کی باعث اس کی یہی سرکشی اور بے حکمی ہوئی ہے)

**۳۱۷** یہ بنی آدم کو وضاحت سے بتا دیا ہے کہ شیطان تو ان کا پرانا دشمن اور بدخواہ ہے۔

لَاَتَّخِذَنَّ..... نَصِيۡبًا مَّفۡرُوۡضًا۔ یعنی اپنی راہ پر لگا کر رہوں گا۔

**۳۱۸** یعنی ان کے عقائد اور بنیادی خیالات کو بھی ڈگمگا دوں گا، اور ان کے نفسانی جذبات اور خواہشات کو بھی ابھار دوں گا، گمراہیاں دو ہی طریقوں سے آسکتی ہیں اور انسان شیطانی اثر دو ہی شکلوں سے قبول کر سکتا ہے ایک عقل و فکر کی راہ ہے دوسرے جذبات اور احساسات کا راستہ ہے، قرآن مجید کے دو جامع لفظوں نے ان سب کا احاطہ کر لیا۔

ضلال کے تحت میں ہر قسم کی عقلی، فکری، نظری گمراہیاں آگئیں، اور تمنی کے تحت میں معاصی و فواحش کی جانب میلان اور نظر سے ان کی مضرتوں کا غائب ہو جانا آگیا۔

وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا

اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنائے گا وہ یقیناً کھلے ہوئے نقصان میں رہے گا ۳۲۱ ؎

مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾

(شیطان) ان سے وعدے ہی کرتا اور ہوسیں ہی دلاتا رہتا ہے اور شیطان ان سے وعدہ صرف فریب کی راہ سے کرتا ہے ۳۲۲ ؎

**۳۱۹ ؎** (بتوں کے نام پر)

عرب جاہلیت کے ایک خاص دستور کی طرف اشارہ ہے، کان کے پیچھے جو غدود ہوتے ہیں، وہ غدود بندروں کے کاٹ کاٹ کر انسان کے جسم میں ان کی تقلیم کی ہوا جو اس زمانہ میں چلنی شروع ہوئی ہے اور عجب نہیں کہ کل بندروں سے گزر کر دوسرے جانوروں اور چوپایوں تک پہنچ جائے، ادھر اگر فاطرِ کائنات کے کلام میں اشارہ ہے تو کچھ عجب نہیں۔

**۳۲۰ ؎** تغییرِ خلق اللہ کی دو بڑی تقسیمیں ہو سکتی ہیں، ایک خلقِ تکوینی میں تغییر، دوسرے خلقِ تشریعی میں تغییر، قدیم مفسرین نے تغییرِ خلقِ تکوینی کی مثال میں داڑھی منڈاتے اور جسم گدانے کو پیش کیا ہے لیکن جاہلیتِ جدید کی ترقیوں نے اُن سے کہیں بڑھ بڑھ کر مثالیں نہ صرف ایجاد کر لی ہیں بلکہ انھیں پھیلا کر فیشن میں داخل کر دیا ہے، مثلاً مردوں کا چہرہ کے بال بالکل صاف کر کے اور طرح طرح کی زناکتیں اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک عورت بن جانا، عورتوں کے سر کے بال کٹا کر اور مردانہ وضع و لباس اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ حد تک مرد بن جانا، ایسے آپریشن کرانا جن سے جنس تبدیل ہو جائے یعنی عورت مرد بن جائے اور مرد عورت ہو جائے۔ وقس علیٰ ھذا۔

خلقِ تشریعی میں تغییر کے معنیٰ دین اور احکامِ دین تحریف کر دینا ہے۔

قیل معناہ یغیرون حکمہ (راغب)

ابن جریر نے خلق اللہ کے معنی دین اللہ کے ابن عباسؓ صحابی اور مجاہدؒ تابعی اور عکرمہؒ تابعی سے نقل کئے ہیں اور دوسروں نے بھی یہی معنی لئے ہیں۔

ای دینہ بالکفر واحلال ما حرم وتحریم ما احل (جلالین) قال معناہ ابن عباس وعن عکرمۃ وابو صالح وذلک کلہ تـ ـب للحیوان وتحریم وتحلیل بالطغیان وقولہ بغیر حجۃ ولا برھان. (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، آتش پرستی، شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اسی تغییرِ خلق اللہ کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لئے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔ (قرطبی)

**۳۲۱ ؎** شیطان کا دوست بنانا یہی ہے کہ احکامِ شریعت کو چھوڑ کر خود ساختہ طور طریقوں کو اختیار کیا جائے اور مخلوق کے چلائے ہوئے رسم و رواج کو دلیلِ راہ بنا لیا جائے۔

**۳۲۲ ؎** چنانچہ ان وعدوں کی بے حقیقتی اکثر تو اسی دنیا میں روشن ہو کر رہتی ہے ورنہ موت کے وقت تو بہر صورت کھلتی ہی ہے۔ یَعِدُھُمْ۔ شیطانی وعدے مثلاً یہ کہ حشر نشر، حساب کتاب کوئی چیز نہیں، جو کچھ ہے یہی مادی دنیا ہے، عقلِ جزوی ہی سب سے بڑا معیار اور آخری معیار ہے، وحیِ الٰہی محض وہم ہے، مادہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں،

أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا ﴿١٢١﴾ وَالَّذِينَ

یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ لوگ اس سے بچنے کی کوئی جگہ نہ پائیں گے اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

نے عمل نیک کئے ہم انھیں عنقریب (بہشت کے) باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی

خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ قِيلًا ﴿١٢٢﴾

ان میں ہمیشہ ہمیش کو رہیں گے اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون بات کا سچا ہے؟ ۳۲۳

لَّيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَن يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ وَلَا

نہ تمھاری تمناؤں پر ہے نہ اہل کتاب کی تمناؤں پر (بلکہ) جو کوئی بھی برائی کرے گا اسے اس کا بدلا دیا جائے گا ۳۲۴

يَجِدْ لَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ﴿١٢٣﴾ وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِن

اور وہ اللہ کو چھوڑ کر اپنے لئے نہ کوئی دوست پائے گا نہ مددگار، اور جو کوئی نیکیوں پر عمل کرے گا (خواہ) مرد ہو

ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا ﴿١٢٤﴾

یا عورت اور وہ صاحبِ ایمان ہو تو ایسے (سب) لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا ۳۲۵

اُن کے اوپر کوئی مشیّتِ اعلیٰ حاکم نہیں، وَقِس علیٰ ہٰذا۔

یُمَنِّیْھِمْ۔ شیطانی جذبات مثلاً یہ کہ فحش کاری میں کوئی عیب و حرج نہیں، شراب صحت کے لئے ضروری ہے، قانونِ حجاب ترقی کی راہ میں حائل ہے۔

۳۲۳ دائمی راحت کی زندگی صرف قرآن اور شریعت کے اتباع سے ممکن ہے۔

۳۲۴ (اس برائی کے مناسب اور اس شخص کے مناسبِ حال)

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ مدارِ کار طاعت ہے محض آرزوئیں اور خوش خیالیاں لاشیٔ محض ہیں خواہ وہ کسی کی بھی ہوں۔ سُوْٓءً کے معنی یہاں شرک کے بھی کئے گئے ہیں لیکن جمہور مفسرین نے اسے عام ہی رکھا ہے۔

قال الجمھور لفظ الآیۃ عام والکافر والمؤمن مجاز بعملہ السوء۔ (قرطبی)

۳۲۵ (کہ اُن کی کوئی نیکی لکھنے سے جزءًا یا کُلًّا رہ جائے)

وَھُوَ مُؤْمِنٌ۔ ایمان کی قید بہت ضروری ہے ہر عمل کے واقعۃً صالح ہونے کے لئے لازم ہے کہ محرکِ عمل بھی صحیح ہو، ریاء، نمائش یا وہم پرستی مقصود نہ ہو، اسی اخلاصِ نیت کا نام اصطلاحِ شریعت میں ایمان ہے اور بغیر اخلاصِ نیت

وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ

اور دین میں اس سے بہتر کون ہے جو اپنا رُخ اللہ کی طرف جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو ۳۲۶ اور ابراہیمؑ

وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا‌ ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا ﴿۱۲۵﴾

راست رُو کے مذہب کی پیروی کرے ۳۲۷ اور اللہ نے تو ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنا لیا ۳۲۸

کے کوئی عمل مقبول نہیں، اس کے بغیر عمل صالح صرف صورۃً ہی صالح ہوگا، حقیقت صالحیت سے خالی، یہیں سے اس بحث کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے جو بعض سطحی دماغ والوں نے آج کل پیدا کر رکھی ہے یعنی آیا کافروں کے اعمال صالحہ قبول ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ بغیر اخلاص نیت یا ایمان کے کسی عمل پر عمل صالح کا اطلاق ہی درست نہیں تو اس کے اجر کا کیا سوال ہے۔ يَعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ کے بعد هُوَ مُؤۡمِنٌ کے اضافہ نے اس مسئلہ کو صاف کر دیا کہ ایمان اور عمل صالح دو الگ الگ چیزیں ہیں، باہم مرادف نہیں۔

فيه اشارة الى ان الاعمال ليست من الايمان۔ (مدارک)

مِنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى۔ اس میں تردید آگئی ان تمام جاہلی مذہبوں کی جو حسن عمل کے باوجود عورت کو محض اس کے عورت ہونے کی بنا پر ثمرۂ حسن عمل سے محروم ٹھہرائے ہوئے ہیں۔ اسلام میں عورت کو اس کی جنس کی بنا پر ہرگز کسی اجر سے محروم نہیں کیا ہے۔

نقیر۔ پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے۔

**۳۲۶** یعنی فرمانبرداری دل سے ہو، منافقانہ نہ ہو۔

موحّد محسن بالقول والفعل (ابن عباس)

متابعا للشريعة فيصح ظاهره بالمتابعة وباطنه بالاخلاص (ابن كثير)

اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ۔ یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی، اعمال میں بھی۔

اى اخلص دينه وعمله لله (ابن عباسؓ)

**۳۲۷** (کر اسہ۔ ملّتِ ابراہیمی کا دوسرا نام دینِ اسلام ہے)

**۳۲۸** توریت۔ یا بھی ابراہیم علیہ السلام کا لقب خدا کا "دوست" آیا ہے:۔

"کیا تو ہمارا خدا نہیں، جس نے اس سرزمین کے باشندوں کو اپنے گروہ اسرائیل کے آگے سے خارج کیا اور اسے اپنے دوست ابرہام کی نسل کو ہمیشہ کے لئے دیا"(۲۔ تواریخ ۲۰ : ۷)

"اے اسرائیل میرے بندے اے یعقوب جسے میں نے پسند کیا، جو میرے دوست ابرہام کی نسل سے ہے"۔ (یسعیاہ ۴۱-۸)

خَلِيۡلًا۔ خلة کہتے ہیں محبتِ خالص کو اور خلیل دوست خالص کو۔

الخلة هى المودة التى ليس فيها خلل (بحر) محبة تامة لاخلل فيها (تاج) قال الزجاج الخليل هو المحبّ الذى لاخلل فى محبته (تاج) سمّى خليلا لانّ الله احبّه واصطفاه (معالم) قال ثعلب انما سمى الخليل خليلا لان محبته تتخلل القلب فلا تدع فيه خللا الا ملأته (قرطبى)

ع ۱۱ ۸ ۱۵ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع

اور اللہ ہی کی مِلک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۳۲۹ ؎ لوگ

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَاۗءِ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ

آپ سے عورتوں کے باب میں فتویٰ طلب کرتے ہیں ۳۳۰ ؎ آپ کہہ دیجئے اللہ تمہیں ان کے بارہ میں (وہی) فتویٰ دیتا ہے ۳۳۱ ؎

فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَي النِّسَاۗءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ

وہ (آیات بھی) جو تمہیں کتاب کے اندر ان یتیم عورتوں کے باب میں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں جنہیں وہ نہیں دیتے ہو جو ان

اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰي

کے لئے مقرر ہو چکا ہے ۳۳۲ ؎ اور اس سے بیزار ہو کر ان سے نکاح کرو ۳۳۳ ؎ اور جو (آیات) کمزور بچوں کے (باب میں ہیں) اور جو

بِالْقِسْطِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِــيْمًا ﴿۱۲۷﴾

(آیات اس باب میں ہیں) کہ یتیموں کے معاملات میں انصاف پر قائم رہو ۳۳۴ ؎ اور تم جو کچھ بھی نیکی کرو گے سو اللہ اس کا خوب علم رکھتا ہے ۳۳۵ ؎

خلّتِ الٰہی سے مراد ہے تقرب و مقبولیت کا اعلیٰ مقام۔ قرآن مجید نے ایک طرف تو ملّتِ ابراہیمی کی پیروی ضروری قرار دی اور دوسری طرف ابراہیمؑ کو اپنا خلیل بنایا، اس میں صاف اشارہ یہ نکل آیا کہ اسی ملّت کی پیروی سے آج بھی کوئی نہ کوئی درجہ خلّت کا حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۲۹ ؎ (اپنے علم و قدرت سے)

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ میں بیان کیا گیا اللہ کے کمالِ قدرت و وسعتِ سلطنت کا اور كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا میں بیان آگیا اس کے کمالِ علم کا، یعنی چھوٹی بڑی کوئی سی شے کائنات میں نہ اس کی مِلک و سلطنت سے باہر ہے اور نہ اس کے احاطۂ علم سے۔ مشرکین کو علی العموم انہی دو صفاتِ باری (صفتِ علم و صفتِ مِلک و قدرت) میں ٹھوکر لگی ہے، اس لئے انہی صفات کا اثبات قرآن مجید بار بار کرتا ہے۔

۳۳۰ ؎ یعنی ان کے مہر، میراث وغیرہ کے باب میں، ان کے حقوق و فرائض کے بارہ میں۔

ای یطلبون منک تبیین المشکل من الاحکام فی النساء ومما یجب لھن وعلیھن (روح)

یہ سوال کرنے والے صحابی حضرات تھے۔

نزلت بسبب سؤال قوم من الصحابة امر النساء واحکامھن فی المیراث وغیر ذلک (قرطبی)

آیت کے مضمون کا ربط سورت کی ابتدائی آیتوں کے مضمون سے ہے۔

ھذہ الآیة مرجوع الی ما افتتحت بہ السورة من امر النساء (قرطبی)

**۴۳۱** (جو پہلے گزر چکا ہے)
خلاصہ یہ کہ عورتوں کو ترکہ سے محروم رکھو ایک بندھا ہوا حصہ انہیں دو، جو یتیم عورتیں تمہاری پرورش میں ہیں
ان کا حق کسی حیلہ سے بھی مت دباؤ، اگر اپنے نکاح میں لاتے ہو تو ان کا مہر پورا ادا کرو۔ وترغبون کی بنا۔

**۴۳۲** یعنی ان کا مہر پورا ادا کرنے میں ان کا حصہ۔ وترغبون کی بنا۔
مَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ یعنی وہ آیتیں جو اس کے قبل نازل ہو چکی ہیں، اشارہ جاہلیت کے عام دستور کی جانب ہے کہ یتیم عورتوں کے ساتھ جو ولی ہوتے تھے، اگر وہ صاحب مال ہوئیں یا صاحب جمال، تو ان سے عقد تو کر لیتے، لیکن ان کے جو حقوق ہوتے، وہ انہیں ادا نہیں کرتے، اور یتیموں کے حقوق اور عورتوں کے حقوق تلف کرنا تو عرب کا عام دستور تھا جیسا کہ معلوم ہوتا ہے اور یہ بات اسلام کے سامنے چودہ سو سال بعد بھی آج ہی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ دستور، کہ اندازہ کر لیجئے کہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی پامالی میں عرب کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ ہندوستان، ایران، چین، یورپ کل دنیا کا یہی حال تھا، عورتوں کے حقوق کے باب میں۔

**۴۳۳** یعنی جو کہ وہ صاحب جمال نہیں اس لئے ان سے عقد کرنا نہیں چاہتے، گریز کرتے ہو، اور جو
چونکہ صاحب مال ہیں، اس لئے دوسری جگہ بھی نکاح نہیں کرنے دیتے، ہوس کہ ان کا مال اپنے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔
ترغبون کے ساتھ حرف جار کا حذف یہاں مفسرین نے مقدر مانا ہے، اکثر اہل تفسیر نے مقدر "عن" مانا ہے اور تقدیر
"عن" ہی ٹھیک ہے اور خود حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔

یعنی ترغبون عن نکاحھن (ابن عباس) ای ترغبون عنھن (ابن جریر عن الحسن) ای وترغبون
عن ان تنکحوھن ثم حذفت عن (قرطبی) وحدیث عائشۃؓ یقوی حذف عن (قرطبی)

دوسری تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مقدر لفظ "فی" ہو، یعنی تم ان کے مال کی لالچ میں نکاح کی رغبت تو ان سے عقد کی
رکھتے ہو، یعنی صاحب مال یا صاحب جمال ہونے کی بنا پر لیکن ان کا مہر ویسے ہی نہیں دیتے جیسا کہ ایک خاص حق ہوتا ہے۔

قال سعید بن جبیر ومجاھد وترغبون فی نکاحھن اذا کانت کثیرۃ المال۔ (قرطبی)

کشاف نے "فی" اور "عن" دونوں کے احتمالات نقل کر دیئے ہیں اور کبیر میں ابو عبیدہ نحوی کا قول نقل
ہوا ہے کہ معنی رغبت اور بیزاری کے دونوں کے نکلتے ہیں۔

قال ابو عبیدۃ ھذا یحتمل الرغبۃ والنفرۃ۔

لُبّ لباب دونوں کا ایک ہی ہے یعنی عورتوں کے باب میں عدم ادائے حقوق۔

**۴۳۴** تقدیر کلام یوں ہے:۔
یفتیکم فی یتامی النساء وفی المستضعفین وفی ان تقوموا۔ (مدارک)

یہاں یہ مطلب ہے کہ یہ ساری آیات احکام جو پہلے گزر چکی ہیں، بدستور واجب العمل ہیں، ان احکام میں کوئی
ترمیم یا تنسیخ نہیں ہوئی ہے۔ یتیموں کی حق تلفی، یتیم لڑکوں کے ساتھ حسن سلوک، عورتوں کی ضرورتوں کے ساتھ میں
دیو سماوات وغیرہ کے باب میں اسی سورۃ النساء کی آیات ذیل پہلے گزر چکی ہیں۔
وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ (۲:۴) وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ (۳:۴) وَلَا تُؤْتُوا
السُّفَهَاءَ (۵:۴) يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ (۱۱:۴) لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا اكْتَسَبُوا (۳۲:۴)

وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے زیادتی یا بے التفاتی کا اندیشہ ہو تو اس میں ان کے لئے کوئی مضائقہ نہیں کہ

عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ

دونوں آپس میں ایک خاص طریق پر صلح کرلیں ۳۳۶ اور صلح (بہرحال) بہتر ہے ۳۳۷

۳۳۵ (اور اسی علم کامل کے مطابق جزائے خیر بھی دے گا)

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ۔ اسی عمل خیر میں یتیموں اور عورتوں کے ساتھ حسن سلوک وحسن معاشرت بھی آ گیا۔

۳۳۶ (بہ شرطیکہ شرائطِ صلح اصلاً جائز ہوں، حرام وممنوع نہ ہوں)

فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ صلح اگر کسی حرام شرط کے ساتھ مشروط ہوگی تو باطل ہوگی، مثلاً شوہر نے صلح کی یہ شرط لگا دی کہ وہ بیوی کے ساتھ اس کی بہن کو بھی زوجیت میں رکھے گا، اور بیوی نے اسے منظور کرلیا جب بھی چونکہ یہ ایک امر حرام ہے، اس لئے یہ مصالحت باطل رہے گی۔

صُلْحًا۔ کی تنوین تنویع کے لئے ہے یعنی ایک خاص قسم کی صلح، پوری صلح اگر طیبِ خاطر کے ساتھ ہوجائے تو پھر تو کسی شرط وغیرہ کا سوال ہی نہیں رہ جاتا۔

اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا۔ مثلاً اس طور پر کہ بیوی اپنے شوہر کو رضامند رکھنے کے لئے اپنے حقوق میں سے کچھ چھوڑ دے، اپنا مہر معاف کردے یا اس میں کمی کردے، اپنی باری کا دن دوسری بیوی کو دیدے، اپنے مصارف کا بار ہلکا کردے۔ وقس علیٰ ہذا۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ بیوی کے حق شوہر پر دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک ثابت ومستقل مثلاً رقم مہر، دوسرے وہ جو وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں، مثلاً نفقہ یا ہمبستری، صلح کے لئے عورت دست برداری دونوں قسم کے حقوق سے کرسکتی ہے، البتہ یہ فرق ہے کہ قسم اول کے حقوق میں نقض صلح کا اختیار نہ رہے گا، یعنی جو چھوڑا بس وہ ساقط ہوگیا اور الساقط لایعود لیکن دوسرے قسم کے حقوق میں بیوی کو یہ اختیار باقی رہے گا کہ وہ جب چاہے کسی چھوٹے ہوئے حق کا مطالبہ ازسرنو کردے۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا۔ بیوی کی طرف سے یہ دست برداری بظاہر ایک صورت رشوت کی معلوم ہوتی ہے، یہاں اس وہم کو دفع فرمایا ہے اور بتا دیا ہے کہ نہیں اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بالکل جائز ودرست ہے۔

نُشُوْزًا۔ کے معنی پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے۔

اِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ۔ بیوی کی طرف سے جو نشوز ہو اس کا علاج اوپر بتایا جاچکا ہے، اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ نشوز اگر شوہر کی طرف سے ہو تو وہ بھی لاعلاج نہیں، اس کی بھی تدبیریں ہیں۔

خَافَتْ۔ خوف یہاں توقع کے معنی میں ہے خَافَتْ یعنی توقعت (قرطبی)

۳۳۷ (ہر نزاع وافتراق سے، ہر فساد وعناد سے)

من الفرقة او سوء العشرة او من الخصومة (بیضاوی)

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا

اور طبیعتوں میں تو بخل ہوتا ہی ہے ۳۲۸ اور اگر تم حسن سلوک رکھو اور تقوے اختیار کئے رہو تو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ

تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٢٨﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ

اس کی پوری خبر رکھتا ہے ۳۲۹ اور تم سے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ بیویوں کے درمیان (پورا) عدل رکھو گو تمہارا کتنا ہی جی چاہے ۳۳۰

نزاع و افتراق ہو، یہی عقل و شریعت کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، چہ جائیکہ خانگی زندگی میں اور میاں بیوی جیسے قریب ترین رشتوں کے درمیان۔

۳۲۸ بیوی کے لئے ان الفاظ میں صاف ترغیب ہے کہ وہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ ہی دے جب صلح اس طرح پر قائم ہوتی ہے تو شوہر جب دیکھے گا کہ اس کے اپنے حقوق و حظوظ میں کچھ فرق نہیں آیا اور بیوی ہی اپنے بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑے دے رہی ہے تو عجب نہیں کہ مصالحت پر جلد تر آمادہ ہو جائے۔

الشُّحَّ۔ شح ایسے بخل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ حرص بھی ہوتی ہو۔

(الشح بخل مع حرص۔ راغب)

مراد یہ ہے کہ خود غرضی اور نفس پرستی کا مادہ طبعی ہے کوئی بھی فریق خالی نہیں اپنی راحت کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

ای کل واحد منھما یطلب ما فیہ راحتہ۔ (مدارک)

۳۲۹ (اور اس کی طرف سے وعدہ ہر تقوی اور حسن سلوک پر اجر کا ہے)

اس میں روئے سخن شوہروں کی طرف ہے کہ نفاق و افتراق تو بہت دور کی چیز ہے انہیں تو تقوی اور حسن سلوک کی روش پر قائم رہ کر بیویوں سے کسی حق کی دستبرداری کی بھی توقع نہ رکھنی چاہئے۔

وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا۔ ذکر یہاں شوہروں کے خود غرضی و اعراض کا چل رہا ہے اس لئے خطاب بھی شوہروں سے ہے۔ تُحْسِنُوا۔ تو شوہر جب بیوی سے حسن سلوک کا خوگر ہو جائے گا تو اس سے اس کی بھی توقع نہیں رکھے گا کہ وہ اپنے کسی حق سے دست بردار ہو جائے۔

وَتَتَّقُوا۔ اور جب تقوی اختیار کرے گا تو خود غرضی و اعراض خود ہی کافور ہو جائیں گے۔ خوب خیال کرکے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں حسن معاشرت کی تعلیم ہے اور بار بار بیویوں کے حقوق پر توجہ دلائی ہے ایک جامع لفظ تقوی کا لایا گیا ہے اور اس خانگی حسن معاشرت کو تقوی ہی کا ایک جز قرار دیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر اور مؤثر ترغیب پر کوئی اور ہے ہی نہیں۔

۳۳۰ سو یہ چیز تمہارے اختیار سے باہر ہے اس لئے تم اس حد کے مکلف بھی نہیں۔

أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ۔ برابری ہر چیز میں یہاں تک کہ رغبت قلب اور امور غیر اختیاری میں بھی۔ شروع سورت میں جہاں چار تک کی تعداد ازدواج کی اجازت صراحت کے ساتھ دی گئی تھی فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ۔ وہاں صاف یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ ان کے درمیان عدل رکھنا اور اگر عدل نہ رکھ سکو

فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا

تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھلک جاؤ ۳۴۱ اور اُسے اُدھر میں لٹکی ہوئی کی طرح چھوڑ دو۔ ۳۴۲ اور اگر تم (اپنی) اصلاح کرلو اور تقویٰ

فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ

اختیار کرو تو اللہ بیشک بڑا بخشنے والا ہے بڑا مہربان ہے ۳۴۳۔ اور اگر دونوں جدا ہی ہوجائیں تو اللہ ہر ایک کو اپنے (فضل کی) وسعت سے بے نیاز کردے گا ۳۴۴

ایک ہی پر قناعت رکھنا۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔ اس موقع پر عدل سے مراد تھی عدل معاملات میں، عدل اُمور اختیاری میں یعنی ہر بیوی کی ضروریات کا، مزاج ومذاق کا لحاظ رکھنا، برخلاف اس کے یہاں جس عدل کی نفی کی جارہی ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ ایسے عدل پر تم قادر ہی نہیں ہوسکتے، چاہے لاکھ اس کی تمنا کرو۔ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ۔ اس عدل سے مراد ہے مساوات امور غیر اختیاری میں، کیفیات قلب میں مثلاً محبت ورغبت میں اور ایسی مساوات کامل تو والدین عادۃً اپنی ساری اولاد کے درمیان نہیں رکھ سکتے۔

لفظ عدل دونوں جگہ مشترک ہے، لیکن مفہوم الگ الگ ہے اور اس اسلوب بیان کی مثالیں قرآن مجید میں کثرت سے ملتی ہیں۔

اخبر تعالی بنفی الاستطاعة فی العدل بین النساء وذلك فی میل الطبع فی المحبة والجماع والحظ فی القلب (قرطبی) المیل القلبی وهو مما لا یملكه المرء ولا یحیط به اختیاره (المنار) المراد بغیر المستطاع من العدل هو العدل الكامل الذی یحرص علیه اهل الدین والورع (المنار) روی عن ابی عبیدة قال یعنی المودة ومیل الطباع وكذلك روی عن ابن عباس والحسن وقتادة۔ (جصاص)

پس بعض جدید محرّفین نے اس آیت سے یہ جو نکالنا چاہا ہے کہ قرآن مجید نے عدل بین الازواج کو ناممکن بتایا ہے اور تعدد ازواج کی اجازت عدل کے ساتھ دی ہے تو اس طرح اس اجازت کو ایک بار دے کر پھر واپس لے لیا ہے تو ایسے لوگوں نے نادانستہ سہی لیکن بہرحال قرآن پر بڑا ظلم کیا ہے اور اس کی جانب بے تکلف اس عیب کو منسوب کردیا ہے کہ وہ جس چیز کو روکنا چاہتا ہے اُسے براہ راست منع نہیں کردیتا بلکہ اس کے لئے خواہ مخواہ ایک پُرپیچ راستہ اختیار کرتا ہے۔

۳۴۱ (کہ مساوات کامل اور رغبت قلب کی بے اختیاری کو بہانہ کرکے بیوی کے ظاہری اور اپنے اختیار کے اندر والے حقوق بھی پامال کرنے لگو)

قال مجاهد لا تتعمدوا الاساءة بل الزموا التسوية فی القسم والنفقة لان هذا مما یستطاع (قرطبی)

۳۴۲ (کہ وہ بیچاری نہ تو عام شوہر والیوں کی طرح اپنے حقوق سے مستفید ہوتی رہے، اور نہ طلاقنوں کی طرح اپنے کو آزاد وخود مختار پائے)

فَتَذَرُوْهَا۔ میں ضمیر مونث مظلوم بیوی کی جانب ہے۔

ای لا هی مطلقة ولا ذات زوج قاله الحسن (قرطبی) التی لیست ذات بعل ولا مطلقة (بیضاوی)

شریعت نے اس اُدھر میں پڑی رہنے والی کی حالت کو بدترین قرار دیا ہے، شوہر کو چاہئے کہ اپنے امکان بھر پوری کوشش حسن معاشرت کی اور تعلق زوجیت کے حق کی کرے لیکن جب دیکھے کہ کوئی صورت اس میں کامیابی

وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ

اور اللہ ہے بھی بڑا وسعت والا بڑا حکمت والا ۳۴۵ اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کی ملک ہے ۳۴۶

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

اور ہم نے ان لوگوں کو جنھیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے اور خود تمھیں بھی حکم دیا ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو ۳۴۷

وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا

اور اگر ناشکری کرو گے تو (یاد رہے کہ) جو کچھ بھی آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ ہی کی ملک ہے ۳۴۸ اور اللہ بڑا بے نیاز ہے

حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

ستودہ صفات ہے ۳۴۹ اور جو کچھ بھی آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے (سب) اللہ ہی کی ملک ہے اور اللہ ہی کافی کارساز ہے ۳۵۰

کی نہیں تو پھر صاف طور پر قاعدۂ شرعی کے مطابق طلاق دے دے، یہ ظالمانہ صورت بہرحال نہ اختیار کرے کہ عورت بظاہر سہاگن اور شوہر دار ہو لیکن حقیقۃً اپنے کسی حق سے بھی متمتع نہیں ہو رہی ہے۔

۳۴۳ (سو اس کے ہاں ماضی کی اصلاحِ حال کی احتیاط، اور مستقبل کے عزم احتیاط کے بعد تمام تر مغفرت و رحمت ہی ہے)

اَنْ تُصْلِحُوْا۔ یعنی اپنی پچھلی بدعنوانیوں کی اصلاح حسب قاعدۂ شرعی کر لو۔

وَتَتَّقُوْا۔ اس تقوے کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے۔

۳۴۴ (ایک کو دوسرے سے)

یعنی اگر صلح و موافقت کی ہر تدبیر ناکام رہے اور نوبت بالآخر علیحدگی ہی کی آجائے تو زیادتی (نشوز) اور بے التفاتی (اعراض) کرنے والا فریق یہ نہ سمجھے رہے کہ اللہ کسی کے کام کو کسی سے اٹکائے نہیں رکھتا، وہ بغیر کسی بندہ کی شرکت اور مدد کے ہر ایک کا کام چلا دینے کے لئے کافی ہے۔

۳۴۵ (اُسے ہر ایک کے لئے مناسب سبیل نکال لینا کیا مشکل ہے)

۳۴۶ سو اس مالکُ الملک اور ملکُ الملوک کی رضا جوئی کے بجائے کسی اور کی رضا طلبی کیسی شدید حماقت ہے، وہ زمین و آسمان کے سارے خزائن کا مالک ہے، اُسے دوسروں کو غنی بنا دینے میں کیا دیر لگ سکتی ہے۔

۳۴۷ (کہ یہی خوفِ خدا و تقویٰ الٰہی بنیاد ہی تمام احکام الٰہی کی تعمیل کی ہے اور اُسے آسان اور خوشگوار بنا دینے والی بھی) انسان کی ساری زندگی کا سنگِ بنیاد یہی تقویٰ ہے اور اس لئے یہ عین مقتضائے حکمت ہے کہ قرآن مجید اس کی تاکید سے لبریز ہے، مسیحیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کی بنا خوفِ خدا پر نہیں، بلکہ محبتِ الٰہی پر ہے اور ان کے پادری اُسے بہت فخر سے پیش کرتے رہتے ہیں حالانکہ ان کی انجیل ان تاکیدوں سے خالی نہیں، مثلاً:۔

"اسی سے ڈرو جو روح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔" (متی ۱: ۲۸) "اس سے ڈرو جس کو

اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاۡتِ بِاٰخَرِيۡنَ ؕ وَكَانَ

وہ اگر چاہے تو اے لوگو! تم (سب) کو لے جائے اور دوسروں کو لے آئے ۳۵۱ اور اللہ

اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيۡرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ

اس پر قادر ہی ہے ۳۵۲ جو کوئی دنیا کا انعام چاہتا ہے تو اللہ کے پاس تو دنیا اور

ع ۸ ۱۹/۱۶ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيۡعًا ۢ بَصِيۡرًا ﴿۱۳۴﴾ ع

آخرت (دونوں) کا انعام موجود ہے ۳۵۳ اور اللہ بڑا سننے والا ہے بڑا دیکھنے والا ہے ۳۵۴

قتل کرنے کے بعد اختیار ہے کہ جہنم میں ڈالے، ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ اُسی سے ڈرو۔" (لوقا ۱۲: ۵)

رہی توریت تو اس کے حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ تفسیر انگریزی۔

۳۴۸ (سو ایسے کی ناشکری اور نافرمانی سے اُس کا کیا ضرر، ضرر تو خود تمہارا ہی ہے۔

اِنۡ تَكۡفُرُوۡا۔ احکامِ الٰہی کی مخالفت ہی کا نام ناشکری ہے۔

۳۴۹ مشرک جاہلی قوموں کے دیوی دیوتا اپنی صفات میں ناقص اور اپنی ذات کے لحاظ سے محدود ہوتے ہیں ان کے پرستار اور پجاری جو منتر وغیرہ جاپ کرتے رہتے ہیں اس سے اُن کے نقائص کی تکمیل ہوتی رہتی ہے اور وہ اپنی اُلوہیت و معبودیت کے لئے غذا حاصل کرتے رہتے ہیں، قرآن مجید نے یہاں ان دو صفات کا ذکر کرکے ان خرافات کی تردید کردی۔ اللہ تو خود ہر طرح کامل و مکمل ہے، کسی کی عبادت سے اس کی تکمیل کا خیال ہی مہمل ہے اور اس کی صفات سب عالی و منزہ ہیں، نقص کا گزر نہیں۔

۳۵۰ (اس کی کارسازیِ عالم کو ناکافی سمجھ کر کسی مخلوق کی طرف التفات کرنا اور اس سے کارسازی کی توقع رکھنا کیسی خرافات ہے۔

خلقتِ کائنات و تدبیرِ کائنات سب اس کے لئے آسان ہیں۔

۳۵۱ (اور جو کام اُسے لینے ہیں، وہ اسی نئی مخلوق سے لے)

یہ بیان اُس کے کمالِ قدرت کا ہے۔

اٰخَرِيۡنَ یعنی نوعِ انسان کے علاوہ کوئی اور ہی نئی مخلوق۔

ای خلقا آخرین مکان الانس (بیضاوی) جوز الزمخشری وابن عطیة ومقلد وهما ان یکون المراد جنسا غیر جنس الناس۔ (روح)

۳۵۲ (سو اس قدرت کے باوجود وہ اگر ایسا نہیں کرتا اور تمہارے بجائے کسی جدید مخلوق کو وجود میں نہیں لا رہا ہے تو اس کا تمہارے ہی اوپر کمال احسان ہے کہ وہ اس طرح حصولِ اجر کا موقع دیے جا رہا ہے۔)

كَانَ۔ لانے سے مفہوم ماضی مقصود نہیں، بلکہ صفتِ قدرت کی ازلیت اور غیر ازلیت کا اثبات مقصود ہے۔

القدرة صفة ازلية لا تتناهى مقدوراته كما لا تتناهى معلوماته والماضي والمستقبل في صفاته بمعنى واحد (قرطبی)

صیغۂ ماضی لانے میں نکتہ یہ ہے کہ صفت کے قدیم ہونے کی طرف اشارہ ہو جائے ذات و صفات کو کوئی حادث نہ سمجھ لے

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ بِٱلْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلَّهِ وَلَوْ

اے ایمان والو انصاف پر خوب قائم رہنے والے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو ۳۵۵

عَلَىٰٓ أَنفُسِكُمْ أَوِ ٱلْوَٰلِدَيْنِ وَٱلْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا

چاہے وہ تمہارے یا (تمہارے) والدین اور عزیزوں کے خلاف ہی ہو ۳۵۶ وہ امیر ہو یا مفلس (اللہ ہر حال)

فَٱللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا۟ ٱلْهَوَىٰٓ أَن تَعْدِلُوا۟ ۚ

دونوں سے زیادہ حق دار ہے ۳۵۷ تو خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا ۳۵۸ کہ (حق سے) ہٹ جاؤ ۳۵۹

انما خص الماضی بالذکر لئلا یتوھم انه محدث فی ذاته وصفاته۔ (قرطبی)

۳۵۳ (سو اس لازوال انعام ولذت کو چھوڑ کر صرف عارضی اور فانی لذتوں پر قناعت کر لینا کس درجہ بے دانشی اور عاقبت نااندیشی ہے۔)

۳۵۴ سو وہ سب کی دعاؤں کو، التجاؤں کو خوب سنتا رہتا ہے، خواہ وہ معاوضۂ دنیوی کے باب میں ہوں یا اجرِ اخروی سے متعلق اور سب کی نیتوں کے اخلاص وعدمِ اخلاص کو دیکھتا رہتا ہے۔

۳۵۵ (اپنے تمام معاملات میں)

احکام کی تعمیل میں اور زندگی کے مختلف معاملات میں بار بار ترغیب راہِ حق ودیانت سے ہٹنے کی ہوتی رہتی ہے، اور کہیں اپنے ذاتی نقصان کے خیال سے کہیں بزرگوں عزیزوں کی مروت اور خاطر سے قدم کو بار بار لغزش ہونے لگتی ہے یہاں تاکید ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر حق ودیانت پر قائم رہو۔

شُهَدَآءَ لِلَّهِ۔ اُس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ گواہی سے مقصود اللہ کی رضا جوئی ہے۔

ای تقیمون الشھادات لوجه اللّٰه (بیضاوی) ای لا یراعی فی الشھادة الا جھة اللّٰه (بحر) لذات اللّٰه ولوجھه ولمرضاته وثوابه۔ (قرطبی)

اور دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "اللہ کے گواہ بن جاؤ" یعنی تمہاری شہادت شہادتِ الٰہی کے قائم مقام ہو جائے فقہاء نے یہی معنی لے کر استنباط یہ کیا ہے کہ جو امر گواہیوں سے ثابت ہو جائے وہی قطعی ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں، چنانچہ قاضی اگر معتبر آدمیوں کی شہادت پر مدعی کو ڈگری دے دے اور مدعا علیہ خوب علم رکھتا ہو کہ حق مدعی کا نہیں اور فیصلہ غلط اور نامنصفانہ ہوا ہے تاہم اگر وہ تعمیل نہ کرے گا تو قاضیٔ اسلام کی مخالفت اور گواہوں کی تکذیب کا مجرم ہوگا۔

۳۵۶ یعنی مروت اور رعایت نہ خود اپنی کرو نہ اپنے کسی بزرگ کی نہ کسی عزیز کی، بلکہ صرف اللہ کی اور حق وصداقت کی قرآن مجید پر حامل مسلمان حلفیہ شہادت کا ذکر نہیں، بلا حلف بھی کبھی جھوٹی گواہی کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ حکم عام ہے ہر قسم کی گواہی کے لئے، صرف مالی اور عدالتی معاملات کی حد تک محدود نہیں، محققین لکھتے ہیں کہ اس کے پورے مصداق تو حضرات محدثین ہوئے ہیں کہ انھوں نے روایات حدیث کے باب میں کسی کی ذرا رعایت نہ کی اسی لئے وہ اللہ کے گواہ بن گئے۔

وَاِنْ تَلْوٗۤا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾

اور اگر تم کجی کروگے یا پہلو تہی کروگے تو جو کچھ تم کررہے ہو اللہ اُس سے خوب خبردار ہے ۳۶۰ ف

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ اور (اُس) کتاب پر ایمان لاؤ جو اُس نے اپنے رسولؐ پر

نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ

نازل کی ہے اور اس (جنس) کتاب پر بھی جو وہ اُس سے قبل نازل کرچکا ہے ۳۶۱ ف

اور ان کی روایتوں پر دین کے ایک حصہ کا مدار ٹھہر گیا۔

**۳۵۷ ف** یعنی جس کے خلاف اگر تمہاری سچی گواہی پڑ رہی ہے اور اس کی خاطر تم سچے اظہار سے بچنا چاہتے ہو، اس پر جتنا حق تمہارا ہے اس سے کہیں بڑھ کر حق اللہ کا ہے۔ جھوٹی گواہی کے محرک عموماً دو ہی ہوتے ہیں فریق اگر امیر ہے تو اُس کا دباؤ، لحاظ، مروت اور اگر غریب ہے تو اس کے ساتھ جذبۂ ہمدردی۔ یہاں دونوں کی جڑ کاٹ دی ہے اور بتایا ہے کہ دونوں صورتوں میں جتنا تمہارا تعلق اس کے ساتھ ہے اُس سے کہیں بڑھ چڑھ کر اللہ کا تعلق اس کے ساتھ ہے۔

**۳۵۸ ف** (اداۓ شہادت میں)

تاکید ہے کہ شہادت بالکل واقعہ کے مطابق ہونا چاہیئے، شاہد کے ذاتی رجحانات کا دخل کبھی نہ آنے پائے۔

**۳۵۹ ف** یعنی ذاتی رجحانات کو دخل دینے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ قدم راہِ حق سے ادھر یا اُدھر ہو جائے گا۔

اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تقدیر کلام یوں ہے۔

اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا۔ (جلالین) ای مخافة ان تعدلوا۔ (ابوسعود)

**۳۶۰ ف** ہر معصیت، ہر بداخلاقی کی طرح اداۓ شہادت کی بھی ہر بے عنوانی سے روکنے کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ بھی اللہ کی ہمہ بینی، ہمہ دانی کا استحضار ہے۔ جتنا یہ عقیدہ قوی، زندہ اور تازہ ہوگا، اُسی قدر سخت پہرہ انسان کے نفس پر قائم رہے گا۔

اِنْ تَلْوٗ۔ یعنی شہادت تو دی جائے لیکن بددیانتی، خیانت اور ایچ پیچ کے ساتھ۔

تُعْرِضُوْا۔ یعنی سرے سے شہادت ہی نہ دی جائے۔

**۳۶۱ ف** یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ آیت میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو کلمۂ اسلام پڑھ کر اجمالاً تو ایمان لاچکے ہیں اور اسی لئے لقب مومنین سے مشرف ہیں اور ان ہی کو تاکید ہو رہی ہے کہ تفصیل کے ساتھ ایمانیات کے ایک ایک جزء پر اپنا عقیدہ مضبوط کریں۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ۔ یعنی اللہ کی ذات و صفات پر اس کی اور توحید کے تضمنات پر بہ تفصیل ایمان لاؤ۔

وَرَسُوْلِهٖ۔ رسول پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی شریعت کے ہر ہر جزء کو بے چون و چرا مان لیا جائے۔

الْكِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ۔ مراد یہاں جنس کتاب ہے یعنی ان کتابوں پر ایمان لایا جائے جو قرآن سے قبل نازل ہوچکی ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ

اور جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیمبروں اور قیامت کے دن سے کفر کرتا ہے وہ

ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ

گمراہی میں بہت دور جا پڑا ہے ۳۶۲ بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے پھر کفر میں ترقی

ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾

کرتے گئے اللہ ہرگز نہ ان کی مغفرت کرے گا اور نہ انھیں سیدھی راہ دکھائے گا ۳۶۳

المراد به جنس ما انزل علی الانبیاء قبله من الکتب (کشاف) نزلت فی جمیع المؤمنین والمعنی یاایہا الذین صدقوا اقیموا علی تصدیقکم واثبتوا علیه (قرطبی) یاایہا الذین اٰمنوا بحسب الاستدلالات الجملیة اٰمنوا بحسب الدلائل التفصیلیة (کبیر)

۳۶۲ ان میں سے ہر ہر عقیدہ پر فرداً فرداً ایمان لانا ضروری ہے اور اُن میں سے کسی ایک عقیدہ سے بھی انکار دائرۂ اسلام سے خارج کر دینے کے لئے کافی ہے ۔ وَ یہاں چاروں جگہ اَوْ کے معنی میں ہے۔

یَکْفُرْ بِاللّٰهِ ۔ اللہ کی ذات سے انکار کی طرح اس کی صفات سے بھی انکار داخل کفر ہے۔

وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ۔ بجائے فرشتوں کے جاہلی قوموں کی طرح دیوتاؤں کو ماننا فرشتوں ہی سے کفر کی ایک شکل ہے۔

وَكُتُبِهٖ ۔ جاہلی مشرک قومیں چونکہ عقیدۂ وحی سے محروم ہیں اس لئے کتب آسمانی کی بھی قائل نہیں۔

وَرُسُلِهٖ ۔ بجائے پیمبروں کے اوتاروں یا خدا کے مظہروں کو ماننا رسولوں سے کفر کرنا ہے۔

ای من یکفر بشیء من ذلك (بیضاوی۔ بحر۔ مدارك) لان الکفر ببعضه کفر بکله (مدارك)

۳۶۳ (جنت و ہدایت کی)

ذکر ان لوگوں کا ہے جو اسلام پر قائم نہ رہے بلکہ مرتد ہو گئے، اور دوبارہ ایمان لا کر پھر بھی ایمان پر قائم نہ رہے، اور توبہ نہ کی بلکہ اسی حالت کفر و ارتداد پر ختم ہو گئے، مگر متعین طور پر کون گروہ مراد ہے؟ ایک قول ہے کہ یہود مراد ہیں پہلے حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے، پھر اُن ہی کی زندگی میں گوسالہ پرستی کی اور کافر ہو گئے، تائب ہوئے اور اُن کی ذریت حضرت عیسیٰؑ سے انکار کر کے پھر کافر ہو گئی اور آخر میں رسول اللہ صلعم سے انکار کر کے اپنا کفر بڑھاتے ہی رہے، دوسرا قول یہ ہے کہ مرتدین کا کوئی خاص گروہ مراد ہے، جو مکرر مرتد ہوا اور آخر تک مرتد رہا، تیسرا قول اور سب سے زیادہ لگتا ہوا یہ ہے کہ مراد منافقین و مترددین و مذبذبین ہیں اور مقصود اُن کے تردد و تذبذب کا اظہار ہے نہ کہ اُن کے ارتداد کا تعدد، سیاقِ قرآنی بھی منافقین ہی کو چاہتا ہے

کنا نحسبهم المنافقین ویدخل فی ذلك من کان مثلهم (ابن جریر عن مجاهد) هؤلاء المنافقون (ابن جریر عن ابن زید) روی عن ابن عباس ان الاٰیة فی المترددین (بحر) لیس المراد بیان هذا العدد بل المراد ترددهم کما قال مذبذبین بین ذلك (کبیر عن القفال)

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ۙ ۱۳۸ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ

آپ منافقین کو سنا دیجئے کہ ان کے لئے عذاب دردناک ہے ۳۶۴ (یعنی وہ لوگ) جو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست

مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ

بنائے ہوئے ہیں کیا ان کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہو سو عزت تو ساری اللہ ہی کی

جَمِيْعًا ۱۳۹ ۭ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ

ہے ۳۶۵ اور وہ تمہارے اوپر یہ (فرمان) کتاب میں نازل ہی کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر

يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ

اور تمسخر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں کہ اس حالت میں یقیناً تم بھی انہی جیسے ہو جاؤ گے ۳۶۶

۳۶۴ بَشِّرِ۔ تبشیر کے معنی ہمیشہ خوشخبری ہی کے نہیں ہوتے لغت میں عام ہے ہر ایسی خبر کے لئے جس کا اثر چہرہ سے ظاہر ہونے لگے۔

التبشیر الاخبا ربما یظهرا ثره علی البشرة (قرطبی)

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بشارت یہاں طنز و زجر کے معنی میں ہو، اور عرب ایسے موقع پر ایسا ہی استعمال کرتے ہیں۔

قوله بشر تهکم بهم والعرب تقول تحیتك الضرب وعتابك السیف (کبیر) ذلك قول الشاعر

تحیة بینهم ضرب وجیع اردو میں تو طنز یہ موقع پر کہتے ہیں لو اب اپنا انعام لو، اب تو مزہ پایا، اب دیکھو اپنا تماشہ۔

۳۶۵ یعنی اعزاز تو تمام تر اللہ کی ملک اور قبضہ میں ہے وہ جسے چاہے معزز بنا دے منکرین کے بڑے بڑے امراء و رؤسا تک حقیقی عزت سے خالی ہیں۔

يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ یعنی یہ منافقین اہل ایمان کے سے دینی عقائد تو کیا رکھتے ظاہری تعلقات بھی ان سے قائم نہ رکھ سکے اور بجائے ان کے الٹے کافروں سے لگے لپٹے ہوئے ہیں، فقہاء نے آیت سے نکالا ہے کہ منکروں اور کافروں سے بلاضرورت میل جول، خلا ملا، ان کی وضع قطع بلاضرورت بنانا، ان کا فیشن اختیار کرنا، ان کے لباس تمدن و معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا سب اہل نفاق سے ہے۔

۳۶۶ (نفس معصیت میں)

مثلیت اور یکسانی نفس معصیت میں ہو گی، ورنہ منکرین کا استہزاء ظاہر ہے کہ کفر اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کے جلسوں محفلوں میں مسلمانوں کی شرکت محض فسق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ای فی العذر اذا مکثتم معهم ولم یرد به التمثیل من کل وجه فان خوض المنافقین فیه کفر و مکث هؤلاء معهم معصیة (مدارك) ای فی العصیان وان لم تبلغ معصیتهم منزلة الکفر (جصاص)

فِي الْكِتٰبِ۔ حوالہ اسی کتاب قرآن کا ہے۔

واذا رأیت الذین یخوضون فی اٰیٰتنا فاعرض عنهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره۔ (سورۃ انعام آیت ۶۷)

إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ جَامِعُ الْمُنَافِقِينَ وَالْكَافِرِينَ فِي جَهَنَّمَ جَمِيعًا ﴿١٤٠﴾

بے شک اللہ دوزخ میں منافقوں اور کافروں سب کو اکٹھا کرے گا ۳۶۷

الَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِن كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُن مَّعَكُمْ

(یہ وہ لوگ ہیں) جو تمہارے لئے مصیبت کے منتظر رہتے ہیں تو اگر تمہیں اللہ کی جانب سے فتح حاصل ہو گئی تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم

وَإِن كَانَ لِلْكَافِرِينَ نَصِيبٌ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُم مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ

تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کو حصہ مل گیا تو (ان سے) کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہیں آنے لگے تھے اور ہم نے تمہیں مسلمانوں سے بچا نہیں لیا ۳۶۸

یہ سورہ نساء مدنی ہے اور سورہ انعام اس سے بہت قبل کی مکی ہے۔

اٰیٰتِ اللّٰہِ۔ اللہ کی نشانیوں کا لفظ عام ہے، قرآن مجید کی آیتیں بھی انہی میں شامل ہیں، یہ حکم کی تکرار کر دی ہے یعنی ایک بار مکہ میں نزول اور دوبارہ مدینہ میں، مسیحی یا ہندوانہ تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی و سیاسی ماحول کے جو گہرے اثرات طبعی طور پر مسلمان پر پڑ رہے ہیں، وہ سب اس وعید کے ماتحت آجاتے ہیں، اپنے شعائر و اصول دین پر مضحکہ سنتے رہنا خواہ وہ اسکولوں و کالجوں میں ہو یا بازاروں و ریلوں میں، یا تھیٹروں و سینماؤں میں، یہ بھی بہرصورت بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ فاسقوں کی مجلس میں شرکت جس وقت وہ فسق میں مشغول ہوں جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ، لیکن اس قسم کے فقہی احکام کا وجوب مشروط ہے حکومتِ اسلامی کے ساتھ۔

**۳۶۷** (کہ آخرت میں ایک کا چھپا ہوا اور ڈھکا ہوا کفر اور دوسرے کا کھلا ہوا کفر دونوں یکساں روشن ظاہر ہو جائیں گے) اسی سے یہ تعلیم بھی نکلتی ہے کہ اصلی جوڑ اور ساتھ تو کافروں اور منافقوں کا ہے، حقیقتاً مناسبت اُن ہی دونوں کے درمیان باہم ہے، پاک و صالح انسانوں یعنی مسلمانوں کا ان لوگوں کے ساتھ مجلسی اختلاط ہی کیسا؟

جَامِعُ۔ یہاں مضارع یَجْمَعُ کے معنی میں ہے۔

(الاصل جامعٌ بالتنوین محذوف استخفافاً فانہ بمعنی یجمع۔ (قرطبی)

**۳۶۸** منافقین کی پوری ذہنیت آشکار و بے نقاب کی جا رہی ہے۔

ان لوگوں کا بھی عجب حال تھا، جب جنگ چھڑتی تو منافقین کا گروہ لشکر اسلامی کے ساتھ ہوتا اگرچہ کافروں سے قتال نہ کرتا یا برائے نام ہی کرتا، تو اگر مسلمانوں کو فتح ہو جاتی تو یہ مسلمانوں کے پاس آکر اپنی شرکت معیت و رفاقت کا حق جتلاتے اور مال غنیمت وغیرہ میں سے اپنا حصہ طلب کرتے، لیکن اگر اس کے برعکس کبھی اتفاق سے کافروں ہی کے ہاتھ میدان رہتا تو جھٹ ان کے پاس جا کر ان پر اپنا احسان رکھتے کہ دیکھو فلاں موقع پر لشکر اسلامی کا پلہ بھاری ہو رہا تھا، اور تم شکست کھانے ہی کو تھے کہ ہم آڑے آگئے، ہم نے اپنی کوشش و تدبیر سے تمہارا پلہ وزن دار کرا دیا اور ہاری ہوئی لڑائی جتا دی، تو اب ہمارا حصہ دلواؤ۔ حربی کافروں سے مسلمانوں کی مخبری کرنا، جاسوسی کرنا، سب اسی کے تحت میں آجاتا ہے۔

یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ۔ یعنی تمہارے لئے آفت و مصیبت کے انتظار میں رہتے ہیں۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَي

تو اللہ ہی تم (سب) لوگوں کے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ۳۶۹ اور اللہ کافروں کا ہرگز

الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۱۴۱ ع اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ ۚ

ع ۲۰ ۱۷

مومنوں پر غلبہ نہ ہونے دے گا ۳۷۰ بیشک منافقین تو اللہ سے چال چل رہے ہیں حالانکہ اللہ ان ہی کی چالوں کو ان پر الٹ رہا ہے ۳۷۱

ای یستظرون بکم الدوائر والشتۃ۔ (ابن عباس)

اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ۔ معیت کا تعلق سفرِ جہاد سے ہے۔

اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ۔ یہاں صیغۂ جمع متکلم ہیں منافقین اپنے کو مجموعۂ لشکرِ اسلام میں شامل کر رہے ہیں آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافقین کو مالِ غنیمت میں حصہ نہیں ملتا تھا جب ہی وہ اسے مانگتے اور اس کے لئے مطالبہ کرتے۔

والآیۃ تدل علی ان المنافقین کانوا لایعطونہم الغنیمۃ ولھذا طلبوھا (قرطبی)

فتح کے لفظ میں شان وعظمت ہے اس لئے مسلمانوں کی کامیابی کو اس سے تعبیر کیا گیا اور نصیب میں حقارت اور پستی ہے، اس لئے کافروں کی کامیابی کے لئے یہ لفظ دیا گیا۔

سمّی ظفر المسلمین فتحا تعظیما لشان المسلمین وسمّی ظفر الکافرین نصیبا تخسیسا لحظّ الکافرین (کشاف)

۳۶۹ یعنی آج تو اظہارِ اسلام کرکے ہر قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں اور مسلمانوں میں ملے جلے رہتے ہیں، لیکن قیامت میں کیا کریں گے، وہاں تو ان کا کفر علانیہ ظاہر ہوگا اور یہ مسلمانوں سے علیحدہ ہوکر رہیں گے۔

۳۷۰ (اپنے اسی آخری اور اُخروی فیصلہ میں)

آخرت دار الجزاء ہے وہاں اس دار العمل کی طرح کسی تکوینی امتحان التباس واشتباہ کی گنجائش نہیں، وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی بہرحال وبہرصورت الگ ہوکر رہے گا، دوسرے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اسی دنیا میں کافروں کو مومنوں پر غالب نہ آنے دے گا، حجت عقلی وشرعی کے لحاظ سے۔

قال علیؓ معنی ذلک یوم القیٰمۃ یوم الحکم وکذا قال ابن عباس ذالک یوم القیٰمۃ قال ابن عطیۃ وبھذا قال جمیع اھل التاویل (قرطبی) المراد بالسبیل الحجۃ (بیضاوی) ای حجۃ شرعیۃ لا عقلیۃ (بحر) ای حجۃ عقلیۃ ولا شرعیۃ یستظھرون بھا الا ابطلھا ودحضت۔ (قرطبی)

اس نفی غلبہ وولایت کفار کا تعلق اسی عالمِ تکوینی سے مان کر بعض فقہاء نے اس سے ذیل کے استنباطات کئے ہیں:

(۱) کافر کی گواہی اگر مسلمان کے مضر پڑرہی ہو تو قبول نہ کی جائے گی۔

(۲) کافر کی ولایت کسی مسلم نابالغ کے نکاح میں جائز نہ ہوگی۔

(۳) کافر کو کسی مسلمان کی وراثت نہ پہنچے گی۔

۳۷۱ (ان کی چالوں کو ناکام دیکھ کر ان کی چالوں کی سزا ان کو دے دے کر)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ یعنی اپنے اسلام کا جھوٹا اقرار کرکے اللہ تک کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اپنے حمق سے

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ

اور یہ لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں (صرف) لوگوں کو دکھلاتے ہیں

اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى

اور اللہ کی یاد کچھ یوں ہی سی کرتے ہیں ۳۷۲ درمیان ہی میں معلّق، نہ (پورے) ادھر ہی کے ہیں نہ (پورے) اُدھر ہی کے،

هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور جسے اللہ گمراہ رکھے تو اُس کے لئے تو کوئی راہ نہ پائے گا ۳۷۳ اے ایمان والو!

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ

مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست مت بناؤ۔

یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جس طرح دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ ہو رہا ہے، اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ۔ خداع کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اُس سے مراد مجازاتِ خداع ہوتی ہے۔

الخداع من الله مجازاتهم على خداعهم اولياءه ورسله (قرطبی) سمّی الجزاء علی العمل باسمه علی مجاوزة الکلام (جصاص) ای یجازیهم بالعقاب علی خداعهم (کبیر) ای هو الذی یستدرجهم فی طغیانهم وضلالهم ویخذلهم عن الحق والوصول الیه فی الدنیا وکذٰلک یوم القیمة۔ (ابن کثیر)

۳۷۲ یعنی یہ منافقین اول تو نماز پڑھتے ہی کہاں ہیں! جب مسلمانوں کے مجمع میں شرماشرمی پڑھنا ہی پڑی، تو صرف ہیئتِ ظاہری کے لحاظ سے کچھ دیر اٹھک بیٹھک سی کرلی۔

قَامُوْا كُسَالٰى۔ عبادت میں نشاط، مستعدی اور چستی تو صرف ایمان و اعتقاد کی قوت سے پیدا ہوتی ہے جب سرے سے یہی مفقود ہے تو ظاہر ہے کہ کاہلی اور بد نظمی جیسے نہ پیدا ہوتی یہاں تو مقصود تمام تر ظاہر داری تھی خلقت کی نظر میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرنا۔

اِلَّا قَلِيْلًا۔ عارفین نے کہا ہے کہ یہ عمل قلیل ہی اگر اللہ کے لئے ہوتا تو اللہ اسے کثیر ہی قرار دیتا۔

قال الحسن لو کان ذٰلک القلیل للہ تعالیٰ لکان کثیرا (مدارک) انما سمّاه قلیلا لانه لغیر وجهه فهو قلیل فی المعنی وان کثر الفعل منهم (جصاص)

يُرَآءُوْنَ النَّاسَ محض لوگوں کے دکھاوے کو تاکہ یہ بھی مسلمان ہی سمجھے جائیں اور ان کے ساتھ بھی مسلمانوں ہی کی سی مراعات ہوتی رہے۔

ریاء۔ کے معنی ہیں کسی اچھی چیز کو دکھاوے کے لئے اختیار کرنا نہ کہ حکم الٰہی کی تعمیل ہیں۔

الریاء اظهار الجمیل لیراه الناس لا لاتباع امر اللہ۔ (قرطبی)

اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ۔ جب نماز جیسے اہم ترین رکنِ اسلام کے ساتھ یہ معاملہ ہے تو دوسری عبادتوں کا

أَتُرِيدُونَ أَن تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُّبِينًا ﴿١٤٤﴾ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی حجت صریح قائم کر لو؟ ۳۷۴ یقیناً منافق دوزخ کے

فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَن تَجِدَ لَهُمْ نَصِيرًا ﴿١٤٥﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا

سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اور تو ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا ۳۷۵ البتہ جو لوگ توبہ کرلیں

وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِينَ

اور (اپنی) اصلاح کرلیں اور اللہ کا سہارا پکڑے رہیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرلیں تو یہ لوگ مومنوں کے ساتھ ہوں گے ۳۷۶

کے ساتھ جو معاملہ ہوگا، ظاہر ہی ہے۔ نماز کی تصریح خصوصیت کے ساتھ اس لئے کی گئی ہے کہ اعمال میں نماز ہی ایمان و اسلام کا ظاہری معیار ہے۔ فقہاء نے کہا ہے کہ جس نماز ریائی کا یہاں ذکر ہے اور جو معصیت کے درجہ میں ہے اور جس نماز کا دہرانا لازم ہے وہ وہ ہے جو عقیدہ کے بغیر لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے پڑھی جائے کہ اس سے ایسے لوگ مسلمان کہے جانے لگیں، باقی جو نماز اس ارادہ سے پڑھی جائے کہ لوگ اسے دیکھ کر اس کے مومن اور مقبول الشہادۃ ہونے کی اور اس کے جواز امامت کی شہادت دیں تو ایسی نماز اس وعید کے تحت میں نہیں آتی۔

یعنی انہم یفعلونہا لیراہا الناس وہم یشہدون لہم بالایمان فہذا ہو الریاء والشرک، فاما ان صلاہا لیراہا الناس یعنی ویرونہ فیہا فیشہدون لہ بالایمان فلیس ذلک الریاء المنہی عنہ ولکن للطوار لدیہا طلب المنزلۃ والظہور لقبول الشہادۃ وجواز الامامۃ لم یکن علیہ حرج وانما الریاء المعصیۃ ان یظہرہا صیدا للدنیا وطریقا الی الاکل بہا فہذہ نیۃ لا تجزی وعلیہ الاعادۃ (ابن عربی)

۳۷۳ (ایمان اور ہدایت کی)

مُّذَبْذَبِينَ بَيْنَ ذَٰلِكَ۔ یعنی کافروں اور مومنوں کے درمیان۔

لَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ وَلَا إِلَىٰ هَٰؤُلَاءِ۔ یعنی ظاہر اور صورت کے اعتبار سے مومن اور معنی اور حقیقت کے لحاظ سے کافر۔

وَمَن يُضْلِلِ اللَّهُ۔ اللہ کا یہ فعلِ اضلال اس کی سنتِ تکوینی کے مطابق ہے جس کے ماتحت وہ ہر عزم عمل پر عمل کا ترتب کردیتا ہے۔

۳۷۴ (اپنے مجرم اور مستحقِ سزا ہونے کی)

اتنی صریح وعیدوں کے باوجود ہم لوگ جو بلا ضرورت ہر قسم کے غیر مسلموں، بے دینوں، بد دینوں سے دوستی اور صحبت کے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہیں تو ہم لوگوں کا کیا انجام ہونا ہے۔ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا۔

لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ۔ کافروں کے تحت میں پوری طرح وہ چھپے ہوئے کافر بھی داخل ہیں جنہیں منافقین کہا گیا ہے۔

اقتضت الآیۃ النہی عن الاستنصار بالکفار والاستعانۃ بہم والرکون الیہم والثقۃ بہم (جصاص)

فقہاء حنفیہ نے ذمیوں کو وکیلِ مال بنانا اور ان سے شرکتِ تجارت (مضاربت) میں بھی کراہت کی ہے۔

وقد کرہ اصحابنا توکیل الذمی فی الشری والبیع ودفع المال الیہ مضاربۃ وہذہ الآیۃ دالۃ علی صحۃ ہذا القول (جصاص)

وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ

اور اللہ مومنوں کو عنقریب اجر عظیم دے گا ۳۷۷ — اللہ کو تمہارے عذاب سے کیا کرنا

بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

ہے، اگر تم شکر گزاری کرو اور ایمان لے آؤ تو اللہ بڑا قدر دان ہے، بڑا علم والا ہے ۳۷۸

**۳۷۵** (کہ انھیں بچا سکے یا ان کی سزا کچھ ہلکی ہی کرا سکے)

فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ۔ ہر منافق اصلاً کافر ہی ہوتا ہے، منافق کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے جرم کفر پر ایک مزید جرم مکر و فریب کا اضافہ کئے ہوئے ہے اس لئے اگر اُسے کھلے ہوئے کافر سے سخت تر سزا ملے تو یہ عین مقتضائے عقل ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا اسے فقہائے مفسرین نے محض گنہگاروں کی شفاعت پر استدلال کیا ہے، اور تقریر استدلال یہ ہے کہ یہ عدم نصرت کی تہدید چونکہ اہلِ نفاق کے لئے مخصوص ہے اس لئے معلوم ہوا کہ جو منافق نہ ہوں گے ان کی نصرت و شفاعت ہو سکے گی۔

واحتج اصحابنا بهذا على اثبات الشفاعة فى حق الفساق من اهل الصلوٰة (كبير)

**۳۷۶** (جنت اور درجات جنت میں)

مومنین کے ساتھ ان نئے تائبین کا ذکر لانے سے مومنین ہی کی تکریم اور شرف مرتبت نکلتی ہے۔

او قع اجر المومنين فى التشريف لانضمام المنافقين اليهم (كبير)

مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ کے معنی من المومنین کے بھی کئے گئے ہیں۔

قال الفراء اى من المؤمنين۔ (قرطبی)

تَابُوْا۔ یعنی اپنے عقائدِ شرک و کفر سے توبہ کر لیں۔

اَصْلَحُوْا۔ یعنی اپنے افعال و احوال کو شریعت کے مطابق و ماتحت کر لیں۔

وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ۔ اور اس اعتصام باللہ کے تحقق کے لئے کافروں کی رفاقت کا ترک لازمی ہے۔

اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ۔ اللہ کے ساتھ اخلاص کی شرط منافقت کی جڑ کاٹ رہی ہے، فقہاء نے آیت کے اس جزء سے یہ نکالا ہے کہ اعمالِ تقرب عبادت ہر قسم کے شائبۂ ریا اور ہر قسم کے دنیوی معاوضہ و نفع سے خالی ہونا چاہیے۔

يدل على ان كل ما كان من امر الدين على منهاج الحق فسبيله ان يكون خالصا لله سالما من شوب الرياء وطلب عرض من الدنيا (جصاص)

اور یہ بھی نکلا ہے کہ نماز، اذان و حج وغیرہ اعمالِ عبادات پر معاوضہ قبول کرنا جائز نہیں۔

هذا يدل على امتناع جواز اخذ شئ من اعراض الدنيا على ما سبيله ان لا يفعل الا على وجه القربة من نحو الصلوٰة والاذان والحج (جصاص)

پوری آیت کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین جو اس قدر وعید کے مستحق ہیں وہ بھی اللہ کی رحمت و مغفرت سے ہمیشہ کے لئے مایوس نہ ہو جائیں، توبہ اور اصلاح حال تو ان کی اپنی اختیاری چیز ہے جب اور جس وقت چاہیں ایسی راہ اختیار کر کے مومنین کی معیت حاصل کر سکتے ہیں کوئی بڑے سے بڑا گناہ بھی ایسا نہیں جو موروثی یا پیدائشی ہو یا ناقابلِ اصلاح و تلافی ہو۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ

اللہ منہ پھوڑ کر برائی کرنے کو (کسی کے لئے بھی) پسند نہیں کرتا سوا مظلوم

ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ

کے اور اللہ تو ہے ہی خوب سننے والا، خوب جاننے والا ۳۷۹ ؁ تم کسی بھلائی کو ظاہر کرو یا چھپاؤ یا کسی برائی

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾

سے درگزر کر جاؤ ۳۸۰ ؁ تو اللہ تو (بہر صورت) بڑا معاف کرنے والا ہے، بڑا قدرت والا ہے ۳۸۱ ؁

۳۷۷ ؁ (اور جب یہ تائبین اور نو مسلمین مومنین کے ساتھ ہوئے تو ظاہر ہے کہ اجر عظیم ان کے حصہ میں بھی آکر رہے گا) اس میں سبق ہے ان خاندانی اور نسلی مسلمانوں کے لئے جو آج کفر و فسق سے تائب و نو مسلم یا نو صالح کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں، یہ اسلامی اور ایمانی برادری میں نئے شامل ہونے والے بھائی ہیں جو اور زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہوتے ہیں۔

۳۷۸ ؁ خطاب منافقوں سے ہے انھیں بتایا ہے کہ تمھاری سزا دینے پر اللہ تعالیٰ کا کوئی کام تو معلق ہے نہیں، یہ تو محض تمھارا کفر اور کفرانِ نعمت ہے جو تمھیں جنت کی نعمتوں سے استفادہ کے ناقابل بنائے ہوئے ہیں اگر اپنے ان عقائد کو چھوڑ دو تو رحمتِ حق تو خود بخود تمھیں آ لے گی، اس میں یہ تعلیم بھی آگئی کہ اسلام کا خدا مشرک اور جاہلی قوموں کے خونخوار و سفاک دیوی دیوتاؤں کی طرح نہیں جسے بندوں کی آزار دہی ہی میں لطف آرہا ہے۔

شَاكِرًا۔ یعنی خدمت اور عبودیت اور اخلاص کا قدردان۔

عَلِيْمًا۔ یعنی ہر ایک کے درجۂ اخلاص سے واقف آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مومن شاکر عذابِ الٰہی سے دور رہے گا، فقہاء مفسرین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ صاحبِ کبیرہ پر عذاب نہیں ہے۔

قال اصحابنا دلت هذه الاية على انه لا يعذب صاحب الكبيرة. (كبير)

۳۷۹ ؁ آیت نے مذہب و اخلاق کی اصطلاح میں غیبت و بدگوئی کو اور قانون کی زبان میں ہتکِ عزت کو بالکل ناجائز قرار دیا ہے اور فرد و جماعت شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دے دی ہے الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ کے تحت میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے روبرو تلخ کلامی بھی، بلا ضرورت اور بلا مصلحتِ شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں بھی جائز نہیں نہ سامنے نہ پیچھے۔

اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔ مظلوم البتہ اپنے دل کا بخار ایک حد تک بھی نکال سکتا ہے اور حاکم کے سامنے فریاد بھی لے جاسکتا ہے انسان کے طبعی تقاضوں اور اضطراری یا نیم اضطراری ضرورتوں کا اس حد تک لحاظ بجز شریعتِ اسلامی کے اور کس نے کیا ہے؟ فقہاء نے تصریح کردی ہے کہ جھوٹی بات کی شہرت مظلوم کو بھی جائز نہیں ـــــ لیجئے مظلوموں کے ساتھ ساتھ ظالموں کے بھی حق اسی سچی، فطری، الٰہی شریعت نے تسلیم کرلئے۔

سَمِيْعًا۔ اس میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد لے کر جائے نہ جائے اللہ تو بہر صورت اس کی سن ہی

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ

بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے پیمبروں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے پیمبروں کے درمیان

وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ

فرق رکھیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم کسی پر تو ایمان لائے ہیں اور کسی کے ہم منکر ہیں ۳۸۲

رہا ہے اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب دی ہے کہ خلق کے آگے خواہ مخواہ زیادہ رونا گاتا نہ پھرے یقین رکھے کہ اللہ تو سننے والا ہے ہی۔ عَلِيمًا۔ یہ صفت لاکر بھی ظالم و مظلوم دونوں کو یاد دلا دیا ہے کہ کوئی زبان سے نکالے یا نہ نکالے اللہ پر تو ہر ظلم کی نوعیت و حقیقت عیاں ہی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے انتقام کی اجازت نکل رہی ہے جس کی ایک فرد شکایت بھی ہے اور ضعفاء کی اس میں بڑی رعایت ہے کہ اس سے دل کا کینہ دور ہو جاتا ہے۔

**ف ۳۸۰** (جو بہر صورت افضل اور اولیٰ ہے) انسان اپنے نفس کو ٹٹولے تو نظر آئے کہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرنے یا اس پر مال خرچ کرنے سے کہیں زیادہ شاق نفس پر یہ گزرتا ہے کہ کوئی ہمیں دکھ پہنچائے اور ہم اس سے درگزر کر جائیں اور انتقام نہ لیں اس لئے فعلِ خیر سے الگ اور ممتاز کر کے اس وصف چشم پوشی اور عدم انتقام کو بیان کیا ہے۔

فندب الى العفو ورغّب فيه۔ (قرطبی)

**ف ۳۸۱** اخلاقی حیثیت سے یہ تین مرتبے الگ الگ ہیں اور انھیں یہاں کیسی صحیح ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ إِن تُبْدُوا خَيْرًا۔ پہلا درجہ تو یہ ہے کہ انسان نے نیکی کی ساتھ ہی وہ اس کا اظہار و اعلان بھی کر دیا، خلق سے داد لینے کی خواہش ایک حد تک طبعی ہے، نیکی یہ بھی ہوئی مگر ہلکی قسم کی، بندی کی سطح کی۔ أَوْ تُخْفُوهُ۔ اس سے اونچا مرتبہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور خلق سے داد و صلہ کی پرواہی نہ رکھے، بلکہ اسے خلق کے علم میں آنے ہی نہ دے اور مقصود اس سے تمام تر رضاء الٰہی ہی رکھے۔ تَعْفُوا عَن سُوءٍ۔ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ انھیں نظر انداز کر جائے اور برائی کرنے والے سے بدلہ نہ لے، یہ نفس کے لئے بہت ہی شاق ہے اور یہ مرتبہ سلوک و اخلاق کے منتہی ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ عَفُوًّا۔ اس صفت کو لاکر یہ یاد دلا دیا کہ درگزر کی صفت تو صفاتِ کمالیہ الٰہیہ میں سے ہے کیا خوب ہو جو بندہ بھی اپنے کو اسی رنگ میں رنگ لے۔ قَدِيرًا۔ یہ لفظ لاکر ادھر اشارہ کر دیا کہ بندہ بیچارہ انتقام لے ہی کیا سکتا ہے، انتقام پر قدرتِ کامل تو اللہ ہی کو حاصل ہے اور وہ اس کمالِ قدرت کے باوجود عفو و درگزر سے کام لیتا رہتا ہے ——— بندوں کو عفو و درگزر کی راہ پر لانے کا کتنا مؤثر و حکیمانہ طریقہ یہ ہے! امام رازیؒ نے جن کی نکتہ رسی قرآن فہمی میں قابل صد رشک ہے، یہاں خوب بات فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر سے فقروں میں سارا خلاصۂ اخلاق و سلوک آ گیا۔

وَيُرِيدُونَ اَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ

اور یہ چاہتے ہیں کہ ایک راہ درمیانی نکالیں ۳۸۳ تو یہی لوگ حقیقی کافر

حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ

ہیں ۳۸۴ اور ہم نے کافروں کے لئے ایک عذاب رُسوا کرنے والا تیار کر رکھا ہے ۳۸۵ اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیمبروں

وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ

پر ایمان لائے، اور وہ لوگ ان کے درمیان فرق بھی نہیں کرتے ۳۸۶ تو ایسے لوگوں کو (اللہ) ضرور ان کا اجر دے گا

دخل فی هاتین الکلمتین جمیع انواع الخیر واعمال البر۔ (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح پہلی آیت میں ضعفاء کی رعایت تھی، یہ آیت اہلِ ہمت کے مناسبِ حال ہے، اس میں مصلحت عروج اِلَی الْقُرب ہے۔

۳۸۲ یہ اشارہ کن لوگوں کی طرف ہے اس باب میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے بہر حال اتنا تو صاف ہے کہ اصل اشارہ یہود کی جانب ہے جو انبیاءِ سابقین میں سے بہتوں کے تو قائل تھے لیکن اپنے ہی سلسلہ کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے منکر تھے، اور پھر نبوتِ مصطفوی کے بھی لیکن قرآن کے الفاظ عام ہیں اور اُن کے تحت میں نصرف مسیحی آجاتے ہیں، جو نبوتِ مصطفوی کے تو صاف منکر ہی ہیں اور رسالتِ مسیح کے بھی منکر ہو کر اُلوہیتِ مسیحؑ کے قائل ہو گئے ہیں بلکہ آج کل کے بہت سے "آزاد خیال" اور "روشن خیال" بھی اس ذیل میں آجاتے ہیں یورپ میں ایک فرقہ DEISTS (خدا پرستوں) کا کہلاتا ہے، اور ہندوستان میں بھی برہمو سماج ہے، یہ لوگ توحید کے تو قائل ہیں لیکن عقیدۂ وحی و نبوت کے منکر — یہ سب مثالیں اسی ناقص اور غلط ذہنیت کی ہیں، جیسے اسلام بڑھانا اور پیدا کرنا نہیں بلکہ مٹانا اور فنا کرنا چاہتا ہے، اسلام وحدتِ تعلیمِ انبیاء کا قائل ہے، اس کے اندر گنجائش اس کی نہیں کہ فلاں فلاں پیمبروں پر ایمان لایا جائے اور فلاں فلاں کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے آیت میں بڑی تنبیہ ان روشن خیال مسلمانوں کے لئے بھی ہے جو شریعت میں سے صرف اپنے پسند و مذاق کی چیزیں چن کر لے لینا چاہتے ہیں۔

۳۸۳ جیسے دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا جُلا کر ایک "دینِ الٰہی" ایجاد کیا تھا، اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی، اور بعض مُلحد طبع آج بھی شرک و توحید، کفر و اسلام کو مخلوط و ممزوج کر کے طرح طرح کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی ترکیب و اختراع کی فکر میں لگے رہتے ہیں — ان لوگوں کی نظر دینِ اسلامی کی وحدت، اور اس کے عقائد و ارکان کے اندرونی نظم و ارتباط پر سرے سے ہی نہیں!

۳۸۴ کہیں کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ ایسے لوگوں کا مرتبہ کافروں سے تو بہر حال بہتر ہوگا نہیں بلکہ یہ لوگ پکے کافر ہیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. جملہ کی ترکیب خود ہی زور پیدا کرنے کے لئے ہے۔

حَقًّا. کا اضافہ تاکیدِ مزید کے لئے ہے۔

ای وهم الکاملون فی الکفر (کشاف) ای لاعبرة بایمانهم هذا (بیضاوی) وهو تاکید لمضمون

ع ۱۱

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ

اور اللہ تو ہے ہی بڑا مغفرت والا بڑا رحمت والا ۳۸۷ آپ سے اہل کتاب فرمائش کرتے ہیں کہ آپ

عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ

ان کے اوپر ایک نوشتہ آسمان سے اُتروا دیں ۳۸۸ سو یہ تو موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑی فرمائش کر چکے

فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ

ہیں ۳۸۹ (اُن سے) یہ بولے تھے کہ ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو، سو ان کی (اس) زیادتی پر انھیں کڑک بجلی نے آپکڑا

الجملة الخبرية (یعنی) اولئك هم الكافرون كفراً كاملاً ثابتاً حقاً يقيناً (کبیر)

۳۸۵ ایسے لوگوں کے خیالات ونظریات کی تہہ میں اصلی روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے، شعوری یا لاشعوری طور پر بہرحال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کی عقل وحیِ الٰہی کے مقابلہ میں زیادہ وزن دار ہے، اور پیمبر بیچارے (نعوذ باللہ) جو کوتاہیاں رہ گئیں، ان کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کردیں گے — اس کبر وخود بینی کی سزا انھیں آخرت میں ملے گی کہ علاوہ جسمانی تعذیب کے، یہ خلق کی نظر میں ذلیل ورسوا ہو کر بھی رہیں گے۔

۳۸۶ (ایمان میں)

یعنی یہ نہیں کرتے کہ کسی پیمبر کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں، قرآن مجید نے وحدتِ وحی پر بڑا زور دیا ہے اور سارے انبیاء کو ایک مستقل نظام وسلسلہ کے اندر منسلک قرار دیا ہے، مومن وہی ہے جو ایمان سارے ہی پیغمبروں پر رکھتا ہو گو عمل صرف آخری پیمبر کی شریعت پر کرتا ہو۔

فی الایمان وان كانوا لا يلتزمون العمل الا بشريعة الاخير منهم. (المنار)

۳۸۷ (تو ایسے ایمان والوں کے لئے کیوں نہ عفو ورحمت سے کام لے گا۔)

سَوْفَ۔ یہاں قُربِ زمانی کے لئے نہیں، بجزم وتیقن کے لئے ہے۔

معناه ان ایتاءها كائن لا محالة وان تاخر (کشاف) فالغرض به توكيد الوعد وتحقيقه لا كونه متاخرا (کبیر)

متکلمین نے آیت سے معتزلہ کا رد بھی نکالا ہے جو مرتکبِ گناہ کبیرہ کے دوامِ عذاب کے قائل ہیں، حالانکہ آیت میں صاف مضمون موجود ہے کہ ایمان محض پر بھی اجر ملے گا۔

والآية تدل على بطلان قول المعتزلة فى تخليد المرتكب الكبيرة لانه اخبران من اٰمن بالله ورسله ولم يفرق بين احد منهم يؤتيه اجره ومرتكب الكبيرة فيمن من اٰمن بالله ورسله ولم يفرق بين احد فيدخل تحت الوعد (مدارك) تمسك اصحابنا بهذه الآية فى اثبات العفو وعدم الاحباط فقالوا انه تعالٰى وعد من اٰمن بالله ورسله بانه يؤتيهم اجورهم، والمفهوم منه يؤتيهم اجورهم على ذلك الايمان (کبیر)

۳۸۸ یہ فرمائش کرنے والے یہودِ مدینہ تھے خصوصاً کعب بن اشرف اور اس کی پارٹی۔

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ

پھر بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں آچکی تھیں، انھوں نے گوسالہ کو (معبود) تجویز کرلیا لیکن

ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

ہم نے اس سے (بھی) درگزر کیا اور ہم نے موسیٰؑ کو ایک صریح اقتدار عطا کیا۔ ۳۹۰ف

ای کعب واصحابہ (ابن عباسؓ)

یہود کہتے تھے کہ ہم ایسی وحی کے قائل نہیں جو فرشتہ کے ذریعہ سے قلب نبی پر نازل ہو، ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ ہمارے پیمبر موسیٰؑ پر لکھے لکھائے ہوئے احکام عشرہ نازل ہوئے تھے تو اگر اپنے دعوائے نبوت میں سچے ہو تو اسی طرح کا کوئی لکھا لکھایا صحیفہ پیش کرو۔

قالت الیھود ان کنت صادقا فجئ بکتاب من السماء جملۃ کما جاء موسیٰ بالکتاب (بحر۔ عن السدی)

سأل الیھود رسول اللہ صلعم ان ینزل علیھم کتابا من السماء کما نزلت التورٰیۃ علی موسیٰ مکتوبۃ (ابن کثیر عن محمد بن کعب القرظی والسدی وقتادۃ) فاتنا بکتاب من السماء جملۃ کما جاء موسیٰ بالالواح (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اُس شخص کی مذمت نکل رہی ہے جو برکاتِ سماوی کو شیخ کے اختیار میں سمجھ کر اس سے افاضہ کی درخواست کر رہا ہے۔

ف۳۸۹ (سو ایسی قوم سے ایسی فرمائشیں کچھ انوکھی اور نادر نہیں)

ضمناً جواب بھی نکل آیا کہ حضرت موسیٰؑ تو خود ہی ایسی چیز لائے تھے پھر اس پر ان ظالموں نے کب بس کیا؟ اُن سے تو یہ فرمائش کردی کہ براہ راست اللہ میاں کا دیدار ہی ہمیں کرا دیجئے، یہ سارے واقعات اس غرض کے لئے یاد دلا دیئے گئے کہ ان لوگوں کی تو قومی تاریخ ہی ضد و عناد سے بھری پڑی ہے ایسی فرمائشوں سے ان کا مقصود تحقیقِ حق نہیں بلکہ محض مجادلہ و مکابرہ تھا۔

ھذا یدل علی ان طلب ھؤلاء لنزول الکتب علیھم من السماء لیس لاجل الاسترشاد بل لمحض العناد۔ (کبیر)

ف۳۹۰ (چنانچہ وہ محض نبی و رسول ہی نہ تھے بلکہ اپنی قوم کے حاکم اعلیٰ اور صاحب اقتدار لیڈر بھی تھے)

اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً. فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ. ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ. ان سب افعالِ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔

محققین نے کہا ہے کہ آیت میں اس گروہ کا رد نکل رہا ہے جو وقوعِ رویت باری کا اسی دنیوی زندگی میں قائل ہے۔

یدل علی الانکار علی من یعتقد وقوع الرؤیۃ فی النشأۃ الدنیویۃ۔ (روح)

بِظُلْمِهِمْ میں ب سببیہ ہے۔

بسبب ظلمھم (بیضاوی)

ثُمَّ یہاں تأخر زمانی کے لئے نہیں استبعاد کے لئے ہے یعنی ایسی بیہودہ فرمائشیں ہی کیا کم تھیں کہ اس سے بڑھ کر حرکت یہ کہ گوسالہ پرستی شروع کردی۔

الْبَيِّنٰتُ۔ اپنے وسیع مفہوم میں ہے، دلائل و معجزات سب کو جامع۔

ای البراھین والدلالات والمعجزات الظاھرات (قرطبی)

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

اور ہم نے ان کے اوپر طور کو معلق کر دیا تھا ان سے قول و قرار کے لئے، اور ہم نے ان سے کہا کہ دروازہ (شہر) میں داخل ہو

وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

عاجزی کے ساتھ اور ہم نے ان سے کہا کہ سبت کے بارہ میں زیادتی نہ کرنا، اور ہم نے اُن سے سخت قول و قرار لیا ۳۹۱؎ سو ہم نے

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ

بسبب ان کی عہد شکنی کے اور بسبب نشانات الٰہی سے ان کے کفر کے اور بسبب ان کے قتل ناحق انبیاء کے اور بسبب ان کے اس قول کے ﴿۱۵۵﴾

وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۶﴾

ہمارے قلوب محفوظ ہیں (ہم نے انہیں سزا میں مبتلا کیا) ۳۹۲؎ نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے بسبب ان کے کفر کے ۳۹۳؎ سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر (بہت) تھوڑا سا ۳۹۴؎

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ یعنی حضرت موسیٰؑ کے پیش کئے ہوئے دلائل و معجزات جاننے سمجھنے، دیکھنے کے بعد۔ شرک اور وہ بھی اپنی قبیح ترین صورت یعنی گوسالہ پرستی، یوں بھی تمام تر بُرا تھا، فطرت سلیم خود اس سے ابا کرتی ہے لیکن ایک پیمبر برحق کے لائے ہوئے دلائل قوی اور شواہد بیّن کے بعد تو اس پستی میں گرنا بدبختی کی انتہا تھی۔

**۳۹۱؎** (ان احکام نیز دوسرے احکام کی تعمیل کے لئے)

رفع طور، داخلۂ باب، احترام سبت، سب پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے۔

بِمِيْثَاقِهِمْ میں بؔ اظہارِ غرض و غایت کے لئے ہے۔

ای بسبب میثاقهم لیقبلوه (بیضاوی) والباء للسبب (بحر)

سُجَّدًا یہاں سجدۂ اصطلاحی شرعی مراد نہیں، بلکہ سجدہ اپنے لفظی معنی میں ہے یعنی تواضع کے ساتھ۔

ای متطامنین خاضعین۔ (روح)

**۳۹۲؎** یہود کے نقضِ میثاق پر اور کفر بآیاتِ الٰہی پر اور انبیاء کے قتلِ ناحق پر اور ان کے قول قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ان سب پر حاشیے پارۂ اوّل میں گزر چکے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ کی اصل تقدیر کلام یوں ہے۔

فبنقضهم میثاقهم لعنّاهم عن قتادة وغیره۔ (قرطبی)

عربی اُسلوبِ بیان میں ایسے محذوفات عام ہیں، مخاطبین کے علم کی بنا پر محذوف کر دیے جاتے ہیں۔

حذف هذا العلم السامع (قرطبی) قال ابن عطیة وحذف جواب هذا الکلام بلیغ متروك علی ذهن السامع (بحر)

بِمَا میں مَا زائدہ تاکید کلام کے لئے ہے۔

ما زائدة موكدة (قرطبی)

وَّ بِكُفْرِهِمْ وَ قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿۱۵۶﴾ وَّ قَوْلِهِمْ

نیز بہ سبب اُن کے کفر کے اور بہ سبب اُن کے مریمؑ پر بہتانِ عظیم رکھنے کے ۳۹۵ اور (نیز)

اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ

بہ سبب اُن کے (اس) قول کے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو مار ڈالا جو مسیح اور اللہ کے پیمبر تھے ۳۹۶

**۳۹۳** یہ پھر ابتداءً خواہ مخواہ کبھی نہیں لگتی، جزاءً ہی لگتی ہے، اور یہاں تو اس کی تصریح ہی موجود ہے۔

بکفرھم ای جزاءً لھم علی کفرھم۔ (قرطبی)

**۳۹۴** (اور وہ بہت تھوڑا سا ایمان نجات کے لئے کافی نہیں)

یہ ایمان قلیل غیر نافع اسی لئے ہوگا کہ یہ کُل انبیاء کے ایمان پر شامل نہیں۔

ای الا ایمانًا قلیلًا ای ببعض الانبیاء وذلک غیر نافع لھم (قرطبی) وھو غیر مفید لان الکفر بالبعض کفر بالکل۔ (روح)

اہل کتاب کا "ایمان" بس ایسا ہی تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو ماننے کا اقرار کیا، اور عیسیٰ علیہ السلام سے انکار کرتے رہے حضرت اسحٰقؑ کی تصدیق کی لیکن حضرت اسمٰعیلؑ کی تکذیب یا مثلاً حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ کو تو مان لیا، لیکن خود خاتم النبیینؐ سے انکار کر گئے، ایسی حالت میں لفظ ایمان پر ایمانِ شرعی کا اطلاق ہو ہی کہاں سکتا ہے۔ ایمان اصطلاح شریعت میں تو وہ ہے جو سارے سلسلۂ نبوت پر ہو، ورنہ ایک نبی پر ایمان لاکر دوسرے انبیاء سے انکار کرنے کے کوئی معنی ہی نہیں۔

لانہ ایمان لغوی لا شرعی (تھانوی) فقد بیّنا ان من یکفر برسول واحد فانہ لا یمکنہ الایمان باحد من الرسل البتۃ (کبیر)۔

**۳۹۵** (کہ نعوذ باللہ وہ بدوضع تھیں)

بُهْتَانًا عَظِيْمًا۔ یہود کی کتابوں میں ایسی ایسی گندہ روایتیں اس پاک سرشت خاتون کی بابت لکھی ہوئی ہیں کہ ان صفحات پر بغرض رد بھی نقل ہونے کے قابل نہیں، قرآن مجید نے اس سارے طومارِ خرافات کی طرف بہ کمالِ عفت بہتان اور بہتانِ عظیم لاکر اشارہ کر دیا، یعنی یہ نہیں کہ الزام میں بڑے مبالغہ سے کام لیا، بلکہ ایسا الزام لگایا جس کی کوئی بنیاد ہی سرے سے نہ تھی مَرْيَمَ۔ پر حاشیہ پ۳ میں گزر چکے کہ یہ عمران کی صاحبزادی اور حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ ماجدہ تھیں، نکاح حسب روایاتِ انجیل یوسف سے ہوا تھا اور ولادتِ عیسیٰؑ تک صرف منگنی ہوئی تھی (متی ۱: ۱۹۔ لوقا ۱: ۲۷۔ ۲: ۴) یہ یوسف نجاری کا پیشہ اختیار کئے ہوئے تھے، اور میاں بیوی دونوں بڑے عابد و خدا رسیدہ تھے، معاشرتِ یہود میں منگنی ہمارے ہاں عقد کی جگہ پر تھی اور اُن کے ہاں کا نکاح ہمارے ہاں کی رخصتی کا مرادف تھا۔

بِكُفْرِهِمْ۔ ذکر یہود کی سزا کا چل رہا ہے کہ اُن پر جو یہ عذاب مسلّط ہے، فلاں فلاں اسباب سے ہے، یہاں کفرِ یہود سے مراد اُن کا کفر حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ ہے۔

ای بعیسیٰ علیہ السلام۔ (بیضاوی)

**٣٩٦** یہ قول کس کا تھا؟ ظاہر ہے کہ یہودی کا تھا، جو اس پر خوش بھی ہوئے تھے اور اس کا دعویٰ بھی فخر کے ساتھ کر رہے تھے چاروں انجیلوں میں یہ داستان بڑی تفصیل اور تکرار کے ساتھ درج ملے گی مثلاً متی۔ باب ۲۶ و ۲۷ میں، مرقس باب ۱۴ و ۱۵ میں اور لوقا باب ۲۲ و ۲۳ میں اور یوحنا باب ۱۸ و ۱۹ میں۔

الْمَسِيحَ ۔ رَسُولَ اللّٰهِ ۔ یہ دونوں الفاظ یہود کے نہیں، وہ انہیں دونوں منصبوں یعنی مسیحیت اور رسالت ہی کے تو منکر تھے، قرآن مجید نے نفس واقعہ کے لحاظ سے ان کا صحیح منصب بیان کر دیا، قرآن مجید کا یہ اُسلوبِ بیان عام ہے
هو اخبار من الله تعالى بصفة عيسى (بحر عن ابن عطيه) يجوزان يضع الله الذكر الحسن مكان ذكرهم القبيح فى الحكاية عنهم (كبير. كشاف) يحتمل ان يكون استينافا من الله تعالى بمدحه. (بيضاوى) يحتمل ان الله وصفه بالرسول وان لم يقولوا ذلك (مدارك)

البتہ خود انجیل میں ایک جگہ رومی حاکم کی زبان سے یہ فقرہ درج ملتا ہے "پیلاطس نے ان سے کہا کہ یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں" (متی ۔ ۲۷: ۲۲) اس سے اتنا اندازہ تو بہرحال ہو جاتا ہے کہ یسوع کے لئے لقب "مسیح" اس وقت بھی چل نکلا تھا

إِنَّا قَتَلْنَا ۔ قتل کے معنی روح کو جسم سے جدا کر دینے کے ہیں، خواہ کسی طریقے پر ہو، تلوار سے، تیر سے، زہر سے، بیماری سے وغیرہ اسی کو اردو محاورہ میں "ختم کر دینا" یا "کام تمام کر دینا" کہتے ہیں۔
اصل القتل ازالة الروح عن الجسد (راغب ـ ابو البقاء) قتله اى اماته بضرب او حجر او سم او علة (تاج)
اور امام قرطبی نے ایک دوسری آیت يا ايها الذين امنوا لاتقتلوا الصيد کے تحت میں لکھا ہے، القتل هو كل فعل يفيت الروح وهو انواع: منها النحر والذبح والخنق والرضخ وشبهه. یہاں اصطلاح فقہ یا زبان اُردو کا "قتل" مراد نہیں جس کے معنی محض کسی دھاردار آلہ سے ہلاک کرنے کے ہوتے ہیں۔

تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سزائے موت اگرچہ رومی عدالت سے ملی اور وہی ملکی عدالت نفاذِ سزا پر قادر بھی تھی لیکن آپ کو سزا دلوانے میں اور آپ کے لئے سزائے موت کا حکم سنوانے میں ہاتھ تمام تر یہود ہی کا کام کر رہا تھا، اسی لئے قرآن مجید نے بھی جو تاریخ کی دقیق حقیقتوں کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتا، بالکل صحیح طور پر آپ کے قتل یا اقدام قتل کی ذمہ داری یہود ہی پر رکھی، انجیلیں اتنے جزو پر متفق المعنی (بلکہ ایک حد تک متفق اللفظ بھی) ہیں کہ رومی عدالت کا حاکم پیلاطیس (PILUTS) آپ کو سزا دینا ہرگز نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس سے برابر بچ رہا تھا، یہ یہود ہی تھے کہ جنہوں نے استغاثہ جھوٹا گڑھا، گواہیاں جھوٹی فراہم کیں اور بلوہ و فساد کی دھمکی دے دے کر عدالت کو سزائے موت سنانے پر مجبور کر دیا، انجیل متی کا ایک مختصر سا بیان ملاحظہ ہو:۔

"...... جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ نہیں بن پڑتا، بلکہ اُلٹا بلوہ ہوا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے رُو برو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا کہ میں راست باز کے خون سے بری ہوں، تم جانو، سب لوگوں نے کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو اُن کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالہ کیا تاکہ صلیب دی جائے" (۲۷: ۲۴ : ۲۶)

اسی کی تائید دوسری انجیلیں بھی کرتی ہیں، بلکہ لوقا میں تو اتنی تصریح اور زائد ہے کہ حاکم نے ملزم کو سزائے موت سے بچانے کی تین تین بار کوشش کی، لیکن یہود نے ہر دفعہ اس کی بات کو رد کر دیا۔ (۲۳: ۲۲)
یہ بیانات تو مسیحیوں کے تھے خود یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین تاریخ عہد مسیح و ماقبل و مابعد کی دنیائے معلوم میں موجود ہے

# وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ

حالانکہ نہ وہ آپ کا کام تمام کرسکے اور نہ آپ کو سولی ہی پر چڑھا پائے ۳۹۷ بلکہ اُن پر شبہ ڈال دیا گیا ۳۹۸

یعنی جوزیفس کی، اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ANTIQUITIES : OF JEWISH کے نام سے شائع ہوچکا ہے اس نے بھی اس واقعہ کو فخر کے ساتھ اپنی ہی جانب منسوب کیا ہے۔ انجیلوں میں بھی جو پیش گوئیاں حضرت مسیح کی زبان سے اپنے ہلاک ہونے کی بابت منقول ہیں، ان میں بھی ساری ذمہ داری سرداران یہود ہی کے سر ملتی ہے اور رومیوں یا حاکموں کا ذکر نہیں آتا:۔

"اُس وقت سے یسوع اپنے شاگردوں پر ظاہر کرنے لگا کہ مجھے ضرور ہے کہ یروشلم کو جاؤں اور بزرگوں اور سردار کاہنوں اور فقیہوں کی طرف سے بہت دکھ اٹھاؤں اور قتل کیا جاؤں۔" (متی۔ ۱۶: ۲۱) "پھر وہ انھیں تعلیم دینے لگا کہ ضرور ہے کہ ابن آدم بہت دکھ اٹھائے اور بزرگ اور سردار کاہن اور فقیہ اُسے رد کردیں اور وہ قتل کیا جائے" (لوقا ۹-۲۲)

**۳۹۷** یعنی حضرت عیسیٰؑ کا کام تمام کردینا تو الگ رہا، یہود تو واقعۃً اتنا بھی نہ کرسکے کہ آپ کو سولی پر چڑھوا ہی دیتے، رومی حکومت میں جس کے ماتحت شام و فلسطین تھے سزائے موت کا طریقہ سولی ہی کے ذریعہ سے تھا۔

وَمَا صَلَبُوْهُ۔ صلبوا کے اصل معنی محض سولی پر لٹکانے یا چڑھانے کے ہیں، چڑھا کر جان لینے کے نہیں۔

ھو تعلیق الانسان للقتل۔ (راغب)

اردو میں یہ مفہوم تعلیق "سولی دینے" سے نہیں "سولی چڑھانے" ہی سے ادا ہوتا ہے چنانچہ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ اور شاہ عبدالقادرؒ اور علامہ تھانویؒ نے اپنے اپنے اردو ترجموں میں اسی مفہوم کو ادا کیا ہے۔

**۳۹۸** یا "وہ دھوکے میں ڈال دیے گئے" یا حقیقت اُن پر مشتبہ ہوگئی۔

یہ شبہ میں کون پڑ گئے یا حقیقت کن پر مشتبہ و ملتبس ہوگئی؟ ظاہر ہے کہ مراد وہی یہود یا اعدائے مسیح ہیں جن کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے

کانہ قیل وقع علیھم الشبہ (مدارک) التبس علیھم الامر (بیضاوی)

یا یوں کہا جائے کہ شبہ انھیں مقتول سے متعلق ہوا، اور وہ دھوکے میں اس کی شخصیت کے بارہ میں پڑ گئے۔

شبہ لھم المقتول والمصلوب۔ (جلالین)

بہرحال اس پر ہمارے سارے مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکا ہوا، اور وہ حضرت مسیحؑ کے دھوکے میں کسی اور کو سولی پر چڑھا گئے، لیکن یہ شخص کون تھا، اور دھوکے کی صورت کیا ہوئی، اس کا تصریحی جواب نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث صحیح میں، اب سوا اس کے چارہ نہیں رہتا کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کے جزئیات کو ایک ایک کرکے لایا جائے، اُس وقت کے پس منظر کو سامنے لایا جائے اور جو صورت واقعہ نسبۃً زیادہ قرین قیاس اور مطابق مقتضائے حال معلوم ہو اُسی کو ترجیحی طور پر اختیار کیا ہے۔

پہلی بات اس سلسلہ میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم کے لوگوں سے ملتے جلتے کم تھے، نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام، خواص بھی آپ کو پوری طرح پہچانتے نہ تھے، چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لئے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ مل کر بھی اس ضرورت کے لئے کافی نہ ہوا، بلکہ آپ کی شناخت کے لئے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا، یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے، لیکن امام رازیؒ اس راز سے بھی واقف ہیں، فرماتے ہیں:۔

والناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم بانہ کان قلیل المخالطۃ للناس۔ (کبیر)

متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتار کرنے والی پارٹی میں سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک بڑی بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لئے ہوئے" سپاہیوں کی شامل تھی، اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لئے انھیں یہوداہ منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا، اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو یسوع نے اُن سے پھر پوچھا تم کسے ڈھونڈتے ہو؟ وہ بولے یسوع ناصری کو، یسوع نے جواب دیا میں تم سے کہہ تو چکا ہوں کہ میں ہی ہوں" (۱۸: ۳ - ۸)

حضرت مسیحؑ کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے، معاصرین مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامے ایک بدنام و غیر معروف مجرم کی تھی، وہ سامنے موجود تھا، اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا حالانکہ سب آئے تھے اسی کی تلاش میں۔

دوسری بات اس سلسلے میں یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرتؑ کو نا بہ الفاظ یہود یسوع ناصری کو تبدیل ہیئت پر خاص قدرت تھی، انجیلوں میں حضرتؑ کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے "چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انھیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور ان کے سامنے اس کی صورت بدل گئی اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا" (متی ۱۷: ۱ - ۲) "جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی" (لوقا ۹: ۲۹، نیز مرقس ۹: ۲) یہ معجزہ تھا یا نہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے، بہرحال تبدیل ہیئت پر آپ کو نفس قدرت حاصل تھی۔

تیسرے اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے کہ ملک (شام و فلسطین) کی عام آبادی اُس وقت اسرائیلیوں (یہود) ہی کی تھی، اور اسی برادری کے ایک فرد آپؑ بھی تھے، لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی، اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی، اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے مختلف تھے بلکہ صورت شکل، وضع و لباس، نسل و زبان، معیشت و معاشرت وغیرہ میں بھی ان سے ایسے ہی الگ تھے جیسے کل تک ہندستان کے حاکم انگریز ہندوستانیوں سے نمایاں طور پر مختلف و ممتاز تھے، اور جس طرح ہندوستانیوں کو سب گورے یکساں اور گوروں کو سارے "کالے" ایک سے معلوم ہوتے تھے، اسی طرح بدیسی حکمران رومیوں کی نظر میں سارے یہود یا اسرائیلی بھی ایک ہی سے تھے۔

چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی، وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف (ٹی) **T** کے مشابہ یا ریلوے سگنل سے ملتی جلتی ہوتی تھی، وہ سولی گھر میں پوری گڑی ہوئی نہیں ہوئی تھی، صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑا ہوا رہتا تھا، باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی پڑتی تھی، اس کے لئے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سولی گھر تک لانی پڑتی تھی۔

یہاں تک جو کچھ عرض ہوا، اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے:۔

(۱) حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا، اور دن آخر ہو رہا تھا، اور یہود کو جلدی تھی کہ کس طرح فراغت پا کر شام ہوں تو شام گھر واپس آ جائیں، جمعہ کی شام ہی سے ان کا یَوْمُ السَّبْت شروع ہو جاتا تھا، اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ بھی ممنوع تھی، اور پھر یہود کا اہم تہوار یعنی عید فسح (PASSOVER) بھی شروع ہو رہی تھی، غرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح ان کا یہ مجرم جلد سے جلد سولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔

(۲) لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیحؑ) کے لئے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انھیں چھیڑتے جاتے اور ان کا راستہ کھوٹا کرتے جاتے

اب اس ساری صورت حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر فرمایئے کہ رومی سپاہی جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سولی کے لئے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لئے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے ایسے موقع پر کیا کرتے — خود تو اپنے اوپر وہ سولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے، انھوں نے وہی کیا جو اُن کی جگہ پر کوئی بھی اُن کا سا حکمران قوم کا فرد کرتا، انھوں نے مجمع ہی میں سے کسی بدتمیز یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اُس پر لاد دی! — انگریز گارد ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لئے جاتا ہوتا تو کیا کرتا؟ خصوصاً جب کہ ہندوستانی تماشائیوں کی طرف سے چھیڑ چھاڑ بھی اس مجرم کے ساتھ جاری تھی یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا اور چوب صلیب اس پر لاد دیتا، یہ محض قیاس و قرینہ نہیں، انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے:

"انھیں شمعون نامے ایک کرینی آدمی ملا، اُسے بیگار پکڑا کہ اُس کی صلیب اُٹھائے" (متی ۲۷: ۳۲) "اور شمعون نامے ایک کرینی آدمی اسکندر اور روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا، انھوں نے اُسے بیگار میں پکڑا کہ اس کی صلیب اٹھائے"۔ (مرقس۔ ۱۵: ۲۱) "اور جب اس کو لئے جاتے تھے، تو انھوں نے شمعون نام ایک کرینی کو جو دیہات سے آتا تھا، پکڑ کے صلیب اُسی پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے"۔ (لوقا۔ ۲۳: ۲۶)

جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا) اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اس سے تمسخر کرتا ہوا، سولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل و دخل شروع ہوتا ہے، وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس شخصیت کا نام ہے، وہ اپنے حسب دستور مجرم اُسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لدی ہوئی تھی — ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجئے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کی نظر میں سب یہودی اجنبی ہی تھے، اور اس لئے باہمدگر ہم شکل اور یکساں انھیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا، انھیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نہیں نظر آسکتا تھا، شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا، لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ اُدھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت اور پھر سولی پر لٹکا دینے کی جلدی اسی افراتفری کے عالم میں اُسی شمعون کو پکڑ کر سولی پر چڑھا دیا گیا، اور وہ چیختا چلاتا رہا، حضرت مسیحؑ قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہوگئے، اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ٹامک ٹوئیے مارتے رہے۔!

ہمارے اکابر نے اس شخص کا نام جس کو حضرت عیسیٰؑ کے دھوکے میں سولی پر چڑھا دیا گیا، حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے یودس (GU DOS) لکھا ہے، اور یہی عقیدہ بعض مسیحیوں کی جانب بھی منسوب کیا ہے (البدایۃ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۹۳ مطبوعہ مصر) وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ۔ یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں، خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ۔ BASILIDES کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات ۱۴۰ء) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا، اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے، بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے، قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے، لیکن پولوس (متوفی ۶۵ء) کے اثر سے جو مسیحیت چلی اور پھیلی اُس کی تو بنیاد ہی عقیدۂ کفارہ پر ہے یعنی اس عقیدہ پر کہ ابن اللہ نے یا خود خدا نے مجسم ہو کر اور صلیب پر جانکنی کی تکلیف اٹھا کر اور اپنی جان دے کر سب کی طرف سے مخلوق کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا، اس لئے یہ رواجی مسیحیت تو بغیر مصلوبیت مسیح کو مانے اور فرض کئے ہوئے ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتی، اس لئے لامحالہ اسی پولوسی اور کلیسائی مسیحیت نے

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ

اور یہ لوگ آپؑ کے بارہ میں اختلاف کر رہے ہیں ۳۹۹ وہ آپؑ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ۴۰۰ اُن کے پاس کوئی علم

عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ﴿١٥٧﴾ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ

(صحیح) تو ہے نہیں ہاں بس گمان کی پیروی ہے ۴۰۱ اور یقینی بات ہے کہ انھوں نے آپ کا کام تمام نہیں کیا ۴۰۲۔ البتہ آپؑ کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ۴۰۳

کل قدیم اور صحیح العقیدہ مسیحی فرقوں کو "بدعتی" اور "مبتدع" قرار دے کر کلیسا سے خارج کر دیا اور خود وہی کہنے لگے جو دشمنانِ عیسیٰؑ یعنی یہود پہلے ہی سے کہہ رہے تھے، یعنی یہی کہ عیسیٰؑ صلیب پر وفات پا گئے! گو ظاہر ہے کہ اس اشتراکِ عقیدہ میں نیتیں دونوں کی بالکل الگ الگ ہیں، یہود وفاتِ عیسیٰؑ کو موقع تحقیر واہانت میں بیان کرتے ہیں، اور مسیحی بعینہٖ اسی واقعہ سے آپ کی عظمت پر دلیل لاتے ہیں، لیکن نفس عقیدہ بہرحال دونوں میں مشترک ہے اور بڑے تأسف اور قلق کا مقام ہے کہ آج بیسویں صدی عیسوی میں بعض کلمہ گو فرقے بھی اسی گمراہی کی طرف واپس جا رہے ہیں، اور طرفہ یہ ہے کہ وفاتِ مسیحؑ کے اس باطل اور خلافِ تحقیق عقیدہ کو "روشن خیالی" کا تمغہ اور تحقیق کا پروانہ سمجھ رہے ہیں۔!

۳۹۹ (آپس میں اس طرح کہ کوئی آپ کو مرتبۂ الوہیت پر پہنچائے دیتا ہے اور کوئی مرتبۂ عبدیت کاملہ سے بھی نیچے گرائے لا رہا ہے)

فیہ میں ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔

ای فی شان عیسیٰ علیہ السلام (روح) ای فی عیسیٰ (مدارک) ای فی عیسیٰ (جلالین)

الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ۔ سے مراد یہود و نصاریٰ اور ان کے مختلف فرقے ہیں کہ کوئی آپؑ کو (نعوذ باللہ) شعبدہ باز قرار دے رہا ہے، اور کوئی (نعوذ باللہ) آپؑ کی خدائی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔

المراد من الموصول ما یعم الیہود والنصاریٰ جمیعا (روح) قیل الضمیر عائد علی الیہود والنصاریٰ۔ (بحر)

۴۰۰ یعنی نظریہ پر نظریہ قائم کرتے چلے جاتے ہیں اور کوئی بات بنائے نہیں بنتی، مسیحی مسیحیوں سے دست و گریبان ہیں اور یہودی یہودیوں سے، اندر ہی اندر خدا معلوم کتنے فرقے دونوں قوموں میں ہو گئے ہیں اور ایک دوسرے کو جھٹلاتے ہیں۔

شَكٍّ۔ یہاں اصطلاحِ منطق میں نہیں یعنی قول مساوی الطرفین نہیں جس میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جا سکے بلکہ اپنے لغوی مفہوم میں یعنی قول بلا دلیل، غیر مستند، غیر محقق۔

الشك ضد الیقین، واما معناہ فی اصل اللغۃ فھو قریب من معنی الجھل، وعدم استبانۃ ما یحصل فی الذھن من الامر (المنار) المعرفۃ فی مقابلۃ الشك (المنار)

۴۰۱ (اور گمان یا اٹکل حقیقت رسی میں کہاں تک کافی ہو سکتی ہے!)

مسیحیوں نے تو غضب ہی کر رکھا ہے اپنے سارے مذہب یعنی الوہیتِ مسیحؑ، وفاتِ مسیحؑ اور احیاءِ مسیحؑ کی بنیاد ہی ظن و تخمین پر رکھی ہے۔

لَهُم۔ میں ضمیر اِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا کی طرف ہے یعنی وہ لوگ جو حضرت مسیحؑ کے باب میں جھگڑ رہے ہیں یہود و نصاریٰ اور ان کے اندرونی فرقے۔

مِنْ عِلْمٍ۔ علم سے مراد علم صحیح، علم ثابت بالدلائل ہے اور مِن نحویوں کی اصطلاح میں زائد ہے۔

من زائدۃ۔ (قرطبی)

مراد یہ ہے کہ علم صحیح کا کوئی حصہ بھی ان لوگوں کے پاس نہیں۔ چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔ یہود اور مسیحی دونوں قوموں کی روایتوں اور حکایتوں کی بالکل صحیح تصویر قرآن مجید نے ان مختصر و جامع الفاظ میں کھینچ دی ہے۔

لکن یتبعون فیہ الظن الذی تخیلوہ (جلالین)

ظنّ یہاں مقابل علم کے ہے یعنی ایسا قول جو بلادلیل ہو اور جس کا مبنی نہ کوئی نص ہو نہ اس سے کوئی استنباط بعض لوگوں نے آیت کے الفاظ سے نفی قیاس فقہی پر جو دلیل قائم کرنا چاہی ہے وہ بے اصل ہے، قیاسِ فقہی تو خود ایک دلیل شرعی ہے استنباط و استخراج کے مرادف۔

**۴۰۲** وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا۔ میں یقیناً نفی قتل کی تاکید کے لئے ہے۔

کذلک ما قتلوہ حقا (کشاف) ما قتلوہ حقا فیجعل یقینا تاکید القولہ وما قتلوہ (مدارک) حال مؤکدۃ لنفی القتل (جلالین)

جملہ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یقین خود یہود کو بھی آپ کے قتل کا نہیں بلکہ یہ یا محض وہم و ظن کی بنا پر وہ کہہ رہے ہیں۔

ای ما قتلوہ قتلا تیقنوہ بل انما حکموا تخمینا و وھما (راغب)

عقیدۂ قتلِ مسیح چونکہ بہت بڑی غلط فہمی یا گمراہی کا باعث ہے اور دنیا کی دو بڑی قومیں یہود اور مسیحی اسی غلطی میں مبتلا ہیں، اس لئے قرآن مجید نے بھی اس کی تردید میں اتنا اہتمام کیا۔

**۴۰۳** (اور اس امتیاز خاص سے آپ کو سرفرازی بخشی)

اِلَيْهِ۔ لفظی معنی ہیں اپنی طرف لیکن مفسرین نے مراد اپنے آسمان کی طرف لی ہے، قرآن مجید میں اس طرح کے حذفِ مضاف کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں اور جس طرح "اللہ نے اپنی طرف بلالیا" سے مراد لی جاتی ہے کہ آخرت کی طرف بلالیا، اسی طرح عربی اور اردو دونوں محاوروں میں اللہ کی طرف اٹھالینے سے مراد آسمان کی طرف اٹھالینا ہوتی ہے۔

ای الی السماء واللہ تعالی متعال عن مکان (قرطبی) الی السماء (مدارک) الی سمائہ۔ (بحر)

اہلِ لغت نے بھی یہ معنی جائز رکھے ہیں۔

یحتمل رفعہ الی السماء (راغب)

رَفَعَهُ۔ رفع کے اصلی معنی رفعِ جسمانی یا رفعِ مادّی ہی کے ہیں۔

الرفع یقال فی الاجسام الموضوعۃ اذا اعلیتھا عن مقرھا (راغب)

مجازی معنی یعنی رفعِ مراتب کے بھی جائز ہیں۔

ای رفعہ من حیث التشریف (راغب)

لیکن حقیقت کو چھوڑ کر مجاز اختیار کرنے کی کوئی وجہ قوی موجود ہونا چاہئے، اور وہ یہاں موجود نہیں۔ بعض فرقوں کا یہ استدلال کہ چونکہ رفع کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہے اس لئے رفع جسمانی تو مراد ہو ہی نہیں سکتا، اور اس لئے لامحالہ رفع مجازی یعنی قربِ منزلت ہی مراد ہوگی، قرآن فہمی سے بُعد پر مبنی ہے، آخر قرآن مجید ہی میں اس طرح کی آیات دوسری بھی تو موجود ہیں:۔

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۵۸﴾ وَإِنْ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ

اور اللہ بڑا قوت والا ہے، بڑا حکمت والا ہے ۴۰۴ اور اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ پر اپنے مرتے وقت

بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

ایمان نہ لے آئے ۴۰۵ اور آپ قیامت کے دن اُن پر گواہ (کی حیثیت سے پیش) ہوں گے ۴۰۶

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا إِلَى اللّٰهِ۔ یہاں مہاجرت الی اللہ سے کھلی ہوئی مراد مہاجرت الی دار الاسلام یا مہاجرت الی المدینہ ہے، اسی طرح قال ابراهيم انى ذاهب الى ربى۔ یہاں بھی سب کے نزدیک ذهاب الى رب سے مراد ذهاب الى الشام ہی ہے وقس على هذا۔

امام رازیؒ نے خوب لکھا ہے کہ تعظیم و تشریف کے جس سیاق میں یہاں ذکر رفع الی اللہ کا ہے، وہ خود اس امر کی دلیل ہے کہ یہ رفع کوئی امتیازی اور مخصوص چیز ہے متقین و صالحین کے عام دخولِ جنت اور وہاں کی لذاتِ جسمانی و حسّی سے الگ۔

مسیحؑ کے رفعِ جسمانی کا عقیدہ لازمۂ ایمان اور شرطِ اسلام ہو یا نہ ہو بہرحال ظاہر قرآن سے قریب تر تو ہے اور جمہور علماء سلف کے مطابق۔ رفعه اليه اعظم فى باب الثواب من الجنة ومن كل ما فيها من اللذات الجسمانية (کبیر)

۴۰۴ صفت عَزِیْزًا لا کر یہ یاد دلا دیا کہ وہ اپنے نبی کو بچا لینے پر بھی قادر، اور اُسے اٹھا لینے پر بھی قادر، رفعِ جسمانی و رفعِ روحانی دونوں پر قادر۔ صفتِ حَكِیْمًا لا کر ادھر اشارہ کر دیا کہ اس نے حضرت عیسیٰؑ اور اُن کے دشمنوں کے ساتھ جو معاملہ کیا وہی عین مقتضائے حکمت تھا۔

۴۰۵ (جب عالم برزخ کا مشاہدہ شروع ہو جاتا ہے اور اس لئے وہ ایمان نافع نہیں ہوتا۔)

قَبْلَ مَوْتِهٖ میں ضمیر کتابی کی طرف ہے اور مراد ہے موت کے وقت۔

يؤمن بعيسىٰ اذا عاين الملكؑ ولكنه ايمان لا ينفع لانه ايمان عند الياس وحين التلبس بحالة الموت (قرطبی) لا يموت يهودى حتى يؤمن بعيسىٰ (ابن جریر۔ عن ابن عباسؓ) كل صاحب كتاب يؤمن بعيسىٰ قبل موته (ابن جریر۔ عن مجاهد) هذا قول اكثر المفسرين واهل العلم (معالم) يعنى اذا عاين قبل ان تزهق روحه حين لا ينفعه ايمانه لانقطاع وقت التكليف۔ (کشاف)

اور اس معنی کو بڑی تقویت دوسری قرأت سے ہو جاتی ہے جو موته کے بجائے موتهم کی ہے۔

يؤمن كل يهودى بعيسى عند موته وتحقيق ذلك فى قرأة ابىّ الا ليؤمنن به قبل موتهم۔ (معالم)

قبل کا اطلاق عربی میں جس طرح تقدمِ منفصل پر ہوتا ہے، تقدمِ متصل پر بھی ہوتا ہے۔

يستعمل فى تقدم المتصل والمنفصل۔ (راغب)

اور یہاں تقدمِ متصل ہی مراد ہے، یعنی مرتے وقت۔

بِهٖ میں ضمیر بالاتفاق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب ہے۔

لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ۔ یعنی آپ کا جو صحیح مرتبہ عند اللہ ہے اُسے وہ جان کر اور اس کا اعتراف و اقرار

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ

سو یہود کی (ایسی ہی) زیادتیوں کے باعث ہم نے ان پر بہت سی چیزیں جو ان پر حلال تھیں حرام کردیں ۴۰۷

وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾

اور اس سبب سے بھی کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے تھے ۴۰۸

کرکے رہیں گے۔

اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ لفظ عام ہے لیکن محاورۂ قرآنی میں اکثر اس سے مراد یہود ہی ہوتے ہیں اور یہاں بھی عبارت کا سیاق و سباق انہی کی جانب مشیر ہے۔

ای من الیهود (یعنی) لایموت یهودی حتی یؤمن بعیسیٰ (ابن جریر عن ابن عباسؓ) ای الیهود خاصة کما اخرج ابن جریر عن ابن عباسؓ (روح)

اور اگر وہی عام مفہوم لیا جائے اور یہود و نصاریٰ دونوں مراد سمجھے جائیں، تب بھی معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یعنی الیهود والنصاریٰ کما ذهب الیه کثیر من المفسرین۔ (روح)

مراد یہ ہوگی کہ مسیحیوں یعنی منزلت عیسیٰؑ میں افراط کرنے والوں اور یہود یعنی منصب عیسیٰؑ میں تفریط کرنے والوں، دونوں پر موت کے وقت صحیح مقام عیسیٰؑ کا انکشاف کردیا جائے گا۔

۴۰۶ یعنی یہ بتلائیں گے کہ فلاں فلاں نے میری تصدیق کی تھی اور فلاں فلاں نے تکذیب۔

یعنی شاهدا علیهم بتکذیب من کذبه منهم وتصدیق من صدقه منهم (ابن جریر)

شہید کے معنی حکم لگانے والے کے بھی ہوتے ہیں۔

وقد یعتبر بالشهادة عن الحکم۔ (راغب)

۴۰۷ جس طرح افراد کے نفس سرکش کی اصلاح کی ایک صورت یہ ہے کہ بعض مباحات سے بھی اُسے روک دیا جائے اُسی طرح جب قوم کا مزاج اعتدال سے منحرف ہوجاتا ہے تو اُس کے لئے بھی مناسب صورت یہی ہوتی ہے کہ جن جائز چیزوں کی وہ عادی تھی، اُن سے اُسے محروم کردیا جائے۔

بِظُلْمٍ میں بَا سببیہ ہے، اس سے یہ صاف نکل آیا کہ اُمت اسرائیلی پر بعد کو جو کچھ بھی سختیاں ہوئیں خود انہی کی زیادتیوں کی بدولت ہوئیں، بلاوجہ نہیں ہوئیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی کے سبب سالک سے واردات کا قبض اسی کے مشابہ ہے۔

۴۰۸ یہود کی قومی فرد جرم کی یہ دوسری دفعہ ہے یعنی خود اپنی جانوں پر تو وہ ظلم کرہی رہے تھے ان کی گمراہی متعدی بھی تھی، دوسروں کو بھی بھٹکا رہے تھے۔

كَثِيْرًا۔ کثیر کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راہ حق سے روک دیتے تھے، دوسرے معنی یہ بھی

وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ

اور (اس سبب سے بھی کہ) وہ سود لیتے تھے، حالانکہ وہ اس سے منع کر دیئے گئے تھے ۴۰۹ اور (اس سبب سے بھی کہ) وہ

بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿۱۶۱﴾

دوسروں کا مال ناحق کھا لیتے تھے ۴۱۰ اور اُن میں سے جو کافر ہیں ان کے لئے ہم نے عذاب دردناک تیار کر رکھا ہے ۴۱۱

ہو سکتے ہیں کہ ان کی روک یا گمراہ کرنے کی خصلت بہت زائد تھی، تیسرے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ مدتِ طویل تک روک تھام کرتے رہے، غرض کثرت کا تعلق کمیت و کیفیت اور زمانہ تینوں سے ہو سکتا ہے۔

ای جمعا عظیما من الناس اوصدّ اکثیرا و قد رہ بعضھم زمانا کثیرا۔ (بحر)

**۴۰۹** (ان کے پیمبروں کے ذریعہ سے ان ہی کی کتابوں میں)

توریت میں ممانعت سود کے اس طرح کے احکام آج تک لکھے چلے آرہے ہیں۔

"اگر تو میرے لوگوں میں سے جس کسی کو جو تیرے آگے محتاج ہے کچھ قرض دیوے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک مت کر، اور سود مت لے" (خروج۔ ۲۲ : ۲۵)

"تو اس سے سود اور نفع مت لے، اپنے خدا سے ڈر تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ اُسے نفع کے لئے کھانا کھلا" (احبار۔ ۳۵ : ۳۶۔ ۳۷)

یہ اور بات ہے کہ آج دنیا میں سب سے زیادہ سود خور قوم یہی یہود ہو، اور ان کے "شایلاک" دنیا کے ادبیات میں ضرب المثل بن گئے ہوں۔

**۴۱۰** یعنی ان کی شریعت میں سود، رشوت، خیانت وغیرہ آمدنی کے جن ذریعوں کو حرام کر دیا گیا تھا انہی کو اختیار کر کے جن نعمتوں سے یہود محروم کر دیئے گئے تھے، وہ جتنی اور جو کچھ بھی ہوں، بہرحال اُن سے محرومی کے اسباب یہاں کھول کر بیان کر دیئے گئے ہیں:۔

(۱) اُن کی ذاتی زبردستیاں، زیادتیاں، گنہگاریاں۔ (فبظلم من الّذین ھادوا)

(۲) ان کی متعدی گمراہیاں۔ (یصدّ ھم عن سبیل اللہ کثیرا)

(۳) ان کی سود خواری، وہ بھی ممانعت کے بعد۔ (اخذ ھم الربٰوا و قد نھوا عنہ)

(۴) ناجائز آمدنیوں سے ان کا تأمل نہ کرنا۔ (اکلھم اموال الناس بالباطل)

**۴۱۱** (آخرت میں)

اور دُنیوی سزاؤں میں تو دیہ نعمتوں سے محروم ہو جانا کیا کچھ کم ہے؟ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیوی سزائیں تو عمومی و اجتماعی رنگ میں ملتی ہیں، چنانچہ فلاں فلاں نعمتوں سے ساری قوم محروم کر دی گئی، لیکن آخرت میں سزائیں تمام تر انفرادی اور شخصی حیثیت سے ملتی ہیں، ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کو بھگتے گا، جہنم کا عذاب الیم صرف انہی افراد کو ہوگا جو کافر ہوں گے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ

البتہ ان میں جو لوگ علم میں پختہ اور ایمان والے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اس (کتاب) پر جو آپ پر اتری ہے اور

اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

اس پر بھی) جو آپ سے قبل اتر چکی ہے اور نماز کے پابند اور زکوٰۃ کے ادا کرنے والے ہیں اور اللہ اور

۲۲ ع ۱۰ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع

روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں ایسوں کو ہم اجر عظیم ضرور دیں گے ۴۱۲

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

یقیناً ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے جیسی کہ ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد کے نبیوں پر وحی بھیجی تھی اور ہم نے ابراہیمؑ

وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى

اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور

وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾

ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ پر وحی بھیجی تھی ۴۱۳ اور ہم نے داؤدؑ کو ایک صحیفہ دیا تھا ۴۱۴

**۴۱۲** (آخرت میں)

آیت میں ایمان کے بھی اہم ترین اجزاء (اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، آسمانی کتابوں پر ایمان) آگئے اور عبادات کے بھی اہم ترین عنوانات، یعنی اقامتِ صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ۔

الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ۔ علم سے مراد علم دین ہے۔

الْمُؤْمِنُوْنَ۔ یعنی جو ایمان لے آنے والے ہیں۔

سَنُؤْتِيْهِمْ۔ سَ یہاں تیقن کے لئے ہے۔

والسین لتوکید الوعد (روح)

**۴۱۳** یہ جتنے نام یہاں آئے ہیں ان سب پر حاشیے پہلے گزر چکے۔

خطاب کا رُخ زیادہ تر یہود ہی کی جانب ہے، انہی کو بتایا اور سمجھایا ہے کہ سلسلۂ وحی کو تو آخر تم مانتے ہو اور حضرت نوحؑ اور ان کے بعد کے انبیاءؑ کی نبوت کو بھی تسلیم کرتے ہو پھر ایک نئے نبی کی شناخت و معرفت میں تمہیں اتنی دشواری کیوں پیش آرہی ہے؟ حضرت ابراہیمؑ وغیرہ ایسے انبیاءؑ کے ساتھ جن کی نبوت یہود کو مسلم تھی،

وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

اور (دوسرے) پیمبروں پر کہ اُن کا حال ہم پیشتر ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں (ہم نے وحی بھیجی تھی) اور ایسے پیمبروں پر بھی

عَلَيْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾

کہ ان کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا ۴۱۵ اور اللہ نے موسیٰؑ سے (خاص طور پر) کلام فرمایا ۴۱۶

چند ایسے پیغمبروں کے نام بھی لے دیے گئے ہیں جن کی نبوت کے یہود منکر تھے (مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام) یا تقریباً منکر تھے (مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام)۔

**۴۱۴** (جیسا کہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو عنایت ہو چکا ہے)

زَبُوْرًا۔ مادہ زبر کے لفظی معنی کتابت یا لکھنے کے ہیں۔

الزبر الکتابة، زبر الکتاب کتبه (لسان) زبرت الکتاب کتبته کتابة عظیمة۔ (راغب)

اور زبور کے معنی بھی لکھی ہوئی کتاب کے ہیں۔

الکتاب الزبور (لسان) الکتاب المسطور (تاج) وکل کتاب غلیظ الکتابة یقال له زبور (راغب)

الزبور بمعنی المزبور کالرکوب بمعنی المرکوب۔ (المنار)

زبور کے نام سے اس وقت جو کتاب حضرت داؤدؑ کی جانب منسوب موجود ہے، وہ عہدِ عتیق کے مجموعۂ صحائف میں سے ایک صحیفہ ہے، اور اُس مجموعہ کے نمبر ۹ پر ہے، اس زبور میں احکام و مسائلِ شریعت درج نہیں بلکہ صرف حمد، مناجات دعائیں وغیرہ ہیں، اور جابجا آخری نبی کی بابت پیش گوئیاں بھی پیش گوئیوں کے ڈھکے چھپے ہوئے انداز میں موجود ہیں۔

**۴۱۵** (اب تک)

پھر بعض پیمبر ایسے ہیں جن کا ذکر اس آیت کے نزول کے بعد قرآن مجید میں آ گیا، اور بہت سے ایسے ہیں، جن کا ذکر قرآن مجید میں سرے سے آیا ہی نہیں۔

والاکثرون غیر مذکورین علی سبیل التفصیل۔ (کبیر)

متکلمین نے یہیں سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ ہر ہر نبی پر تفصیل کے ساتھ ایمان لانا ضروری نہیں، البتہ سب نبیوں کی اجمالاً تصدیق ضروری ہے۔

والآیة تدل علی ان معرفة الرسل باعیانهم لیست بشرط لصحة الایمان بل من شرطه ان یؤمن بهم جمیعا اذ لو کان معرفة کل واحد منهم شرطا لقص علینا کل ذلك (مدارك)

مِنْ قَبْلُ یعنی اس آیت کے نزول کے پیشتر۔

باقی ہر اُمت میں تعلیمِ توحید کا پہنچ جانا خواہ رسولِ اصطلاحی کے ذریعہ سے ہو یا اس کے کسی نائب سے، قرآن مجید سے ثابت ہی ہے۔ ولقد بعثنا فی کل اُمة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (النحل پ ۱۴۔ آیت ۳۶)

رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ جن پیمبروں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے، وہ مشرق میں چین، جاپان، ہندو وغیرہ اور

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ

اور پیمبروں کو (ہم نے بھیجا) خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے (بنا کر) تاکہ لوگوں کو پیمبروں کے (آجانے کے) بعد اللہ کے

حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ

سامنے عذر نہ باقی رہ جائے ۴۱۷ اور اللہ تو ہے ہی بڑا زبردست بڑا حکمت والا ۴۱۸ لیکن (اس کے ساتھ) اللہ

يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ

گواہی دے رہا ہے ۴۱۹ اس (کتاب) کے ذریعہ سے جو اس نے آپ پر نازل کی (اور) اسے اس نے اپنے (کمال) علم سے نازل کیا ہے ۴۲۰

مغرب میں یورپ و امریکہ وغیرہ کی طرف بھیجے ہوئے پیمبر ہیں۔ اس لئے کہ ان کی تاریخیں مجہول ہیں اور ان کے ذکر سے اہل عرب کو عبرت وغیرہ کا کوئی فائدہ نہ تھا، باقی اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عامہ کا تقاضا تو یہی ہے کہ اس نے رحمتِ رسالت سے کسی قوم و ملک کو محروم نہیں رکھا ہے۔

وحسبنا المعلم ان الله تعالى ارسل الرسل فى كل الامم فكانت رحمته بهم عامة لا محصورة فى شعب معين احتكرها لنفسه كما كان بزعم اهل الكتب۔ (المنار)

۴۱۶ (اور اسی خصوصی نعمت سے انھیں سرفراز کیا)

تَكْلِيْمًا۔ فعل کلام کے بعد اسی مصدر کو اور اسے بھی تنوین کے ساتھ لانے سے معنی یہ نکلے کہ کلام کی کوئی بہت ہی مخصوص نوعیت مراد ہے، ورنہ کلام و مخاطبہ اپنے عام معنی میں تو ہر نبی کے ساتھ ہوتا ہے۔۔۔ ایسا کلام جو ہم کلامی و مخاطبۂ انبیاء میں بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ عام عقول کے لئے تو ناقابلِ فہم ہی ہوگا۔

مصدر معناه التاكيد (قرطبى) هو الكلام الحقيقى الذى يكون به المتكلم متكلما (قرطبى) والمعنى ان التكليم بغير واسطة منتهى مراتب الوحى واعلاها۔ (روح)

۴۱۷ یعنی پیمبروں کے آجانے کے بعد اب کسی کو قیامت میں یہ عذر پیش کرنے کا موقع باقی نہیں رہا کہ ہماری عقل مسائل و حقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی۔ متکلمین نے یہیں سے یہ اخذ کیا ہے کہ بندوں پر حجتِ الٰہی ارسالِ رسل کے بعد ہی قائم ہوئی ہے، نہ کہ مجرد عقل کی بنا پر۔

يدل على ان قبل البعثة يكون للناس حجة فى ترك الطاعات والعبادات (كبير) احتج اصحابنا بهذه الآية على وجوب معرفة الله تعالى لا يثبت الا بالسمع (كبير) فى هذا كله دليل واضح انه لا يجب شئ من ناحية العقل (قرطبى) فيه تنبيه على ان بعثة الانبياء الى الناس ضرورة بقصور الكل عن ادراك جزئيات المصالح والاكثر عن ادراك كليا تها۔ (بيضاوى)

۴۱۸ صفتِ عَزِيْز لا کر یاد دلا دیا کہ وہ مالکِ حقیقی ہے، فاعلِ مختار، پیمبروں کے بھیجے ہوئے بغیر بھی ہر عذر کو قطع کر سکتا ہے، لیکن ساتھ ہی وہ حکیم بھی تو ہے، اس صفت کو لا کر یہ بتا دیا کہ اس کی حکمتِ کاملہ مقتضی

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اور فرشتے (بھی) گواہی دے رہے ہیں، اور اللہ کی گواہی کافی ہے ۴۲۱ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور

وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۶۷ اِنَّ الَّذِيْنَ

اللہ کی راہ سے (دوسروں کو) روکا، وہ بڑی ہی دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا

كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝۱۶۸ اِلَّا

اور ظلم کیا ۴۲۲ اللہ ایسا نہیں کہ انھیں بخش دے اور نہ یہ ہے کہ انھیں کوئی راستہ

طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۶۹

دکھائے بجز راہِ جہنم کے ۴۲۳ اس میں وہ پڑے رہیں گے ہمیشہ ہمیش کو اور اللہ کے نزدیک یہ آسان ہے ۴۲۴

اس کی ہوئی کہ وہ ظاہری عذر بھی باقی نہ رہنے دے۔

۴۱۹ لکن۔ کلمۂ استدراک ہے اور استدراک قول ماسبق پر ہوتا ہے یہاں مراد ہے کہ اگر یہ لوگ خصوصاً یہود اب بھی اور اس کے باوجود بھی نبوت محمدیؐ کو نہ مانیں تو ـــــ روایتوں میں آتا بھی ہے کہ یہود نے پچھلی آیات انا اوحینا الیک الخ کو سن کر کہا تھا کہ ہم تو ان کی رسالت کی گواہی نہیں دیتے۔

لما قال انا اوحینا الیک قال القوم لانشھد لک بذلک فنزل لکن اللہ یشھد (کبیر) فی الکلام حذف دل علیہ الکلام کان الکفار قالوا ما نشھد لک یا محمد فی ما تقول فمن یشھد لک (قرطبی)

۴۲۰ (اور اسی کمال علمی ہی نے تو قرآن کو معجزہ بنا دیا ہے)

اَللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ۔ یعنی اللہ کی شہادت اسی قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ۔ اس میں قرآن کے لئے صفتِ کمال کا اثبات ہے۔

والمراد من قولہ وصف القرآن بغایۃ الحسن ونہایۃ الکمال۔ (کبیر)

معتزلہ نے جو صفاتِ باری سے انکار کیا ہے اس کا رد بھی متکلمین اہلِ سنت نے یہیں سے نکالا ہے۔

فیہ نفی قول المعتزلۃ فی انکار الصفات فانہ اثبت لنفسہ العلم (مدارک) دلت الآیۃ علی انہ تعالیٰ عالم بعلم (قرطبی)

۴۲۱ یعنی حقیقت نفس الامر کے اعتبار سے اللہ کی شہادت ہر دوسری شہادت سے بے نیاز ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ۔ اللہ کی گواہی تو قرآن کے ذریعہ سے ظاہر ہی ہے لیکن فرشتوں کی گواہی سے کیا مراد ہے؟ عام مفسرین نے یہ پہلو اختیار کیا ہے کہ فرشتے جو ان منکرین سے کہیں افضل واشرف ہیں جب وہ رسول کی صداقت پر گواہ ہیں تو ان منکرین کی ہستی اور حقیقت کیا ہے لیکن ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سارا تکوینی کاروبار فرشتوں ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے تو گویا کائنات کی فعلی شہادت جو درحقیقت

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا

اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس (یہ) رسولؐ تمہارے پروردگار کے پاس سے آئے ہیں، سچی بات لے کر ۴۲۵ پس

لَّكُمْ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ

ایمان لاؤ یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا ۴۲۶ اور اگر تم کفر کرتے رہے ۴۲۷ تو بیشک اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۷۰

اور اللہ بڑا علم والا ہے، بڑا حکمت والا ہے ۴۲۸

فرشتوں ہی کی شہادت ہے، خود تمام تر رسولِ اسلام اور دینِ رسول کی تصدیق و تائید میں ہے۔

بِاللّٰهِ میں بِ نحویوں کی اصطلاح میں زائد ہے۔

والباء زائدۃ (قرطبی)

۴۲۲ اس ظلم سے مراد دونوں قسم کے ظلم ہو سکتے ہیں، ایک ظلم تو خود اپنے نفس پر ایمان پر کفر و انکار کر کے، دوسرا ظلم یہ ہے کہ دوسروں کو اسلام و ایمان کے راستہ سے ظلم یا مکر سے روکا جائے۔

۴۲۳ یہ بیان ہو رہا ہے قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل کا، کفر اور ظلم کے نتیجے قدرۃً اسلام اور عدل کے نتیجوں سے بالکل مختلف نکلیں گے۔

۴۲۴ اسلام کا خدا مشرک قوموں کے خداؤں کی طرح محدود اور ناقص قوتیں رکھنے والا خدا نہیں جو اُسے اس سزا دہی کے لئے کسی خاص اہتمام یا تکلّف کی ضرورت پڑے، وہ مطلق الاختیار ہے وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ہے، جو کچھ چاہے بات کی بات میں کر سکتا ہے۔ ایسی تمام آیتوں سے اُن قوموں کا رد بھی نکل آتا ہے جو خدا کے اختیارات پر بھی کچھ پابندیاں عائد کئے ہوئے ہیں۔

۴۲۵ (مع قوی دلائل کے)

يَاَيُّهَا النَّاسُ خطاب صرف اہلِ عرب یا اہلِ مکہ کو نہیں سارے جہان کو ہے اور یہ دعوتِ قرآنی کی عالمگیری کا ایک اور ثبوت ہے۔

هذا خطاب للكل (قرطبی) خطاب لجميع المكلفين (روح) ذكر خطابا عاما يعمهم ويعم غيرهم (كبير)

اَلْحَقُّ۔ اس میں سچے دعوے اور سچے دلائل دونوں آگئے۔

۴۲۶ ایمان لانے اور زندگی کو شریعت کے مطابق ڈھالنے میں نفع تمام تر بندہ کا اپنا ہی ہے حق تعالیٰ کی کوئی غرض اس سے اٹکی ہوئی نہیں ہے جیسا کہ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کے بارہ میں تصور کر رکھا ہے۔

فَاٰمِنُوْا میں فَ سے اشارہ اس جانب ہے کہ صحیح دعوی اور صحیح دلیل کا مقتضا ہی یہ ہے کہ ایمان لے آیا جائے۔

۴۲۷ (سو اس کا ضرر کسی طرح بھی نہیں، ضرر تمام تر تمہارا ہی ہے)

مشرکوں کو یہ حقیقت بار بار یاد دلانے کے قابل تھی، وہ اپنے دیوی دیوتاؤں کو بھی اپنا ہی جیسا محتاج اور غرض مند تصور کرتے تھے۔

۴۲۸ صفت عَلِيْمٌ لا کر یاد دلا دیا کہ ہر ایک کا کفر و ایمان اللہ پر روشن ہے اس کے حدودِ علم سے باہر کوئی چیز نہیں۔

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لَا تَغْلُوا۟ فِى دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا۟ عَلَى ٱللَّهِ إِلَّا ٱلْحَقَّ ۚ

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو ۴۲۹ اور اللہ کے بارے میں کوئی بات حق کے سوا نہ کہو ۴۳۰

إِنَّمَا ٱلْمَسِيحُ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ ٱللَّهِ وَكَلِمَتُهُۥٓ

مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ تو بس اللہ کے ایک پیمبر ہی ہیں ۴۳۱ اور اس کا کلمہ ۴۳۲

اور صفتِ حَکِیْمٌ لا کر یہ اشارہ کر دیا کہ وہ سزا بھی موقع مناسب ہی پر دے گا۔

۴۲۹ دین میں غلو کرنا یہ ہے کہ عقائد و مسائل میں اضافہ و افراط کو اپنی طرف سے دخل دے دیا جائے خواہ کسی نیت سے ہو۔

الغلو فی الدین ھو مجاوزۃ حد الحق فیہ (جصاص)

اَہلَ الْکِتٰبِ سے یہاں مُراد اہلِ انجیل یا نصاریٰ ہیں۔

ای اھل الانجیل من النصاریٰ (ابن جریر) والمقصود بیا اھل الکتٰب من النصاریٰ (کبیر) ینھی تعالیٰ اھل الکتٰب عن الغلو والاطراء وھذا کثیر فی النصاریٰ (ابن کثیر) نزلت فی النصاریٰ۔ (معالم)

یہود کے مطاعن کا ذکر کرکے اور ان کا جواب دے کر اب ذکر عیسائیوں کا شروع ہو رہا ہے جو یہود کی تفریط کے مقابلہ پر افراط کی حد پر پہنچ گئے تھے اور عیسیٰ مسیحؑ کو بجائے ایک برگزیدہ نبی کے خدا یا خدا کا بیٹا ماننے لگے تھے۔ اور اللہ کے بتائے ہوئے دین میں کچھ زیادتی یا اضافہ کرنا، ویسا ہی حدودِ ایمان سے خارج ہو جانا ہے جیسا اُس دین کے کسی جزو کو گھٹا دینا۔

فتجاوزوا الحدود التی حدھا اللہ لکم فان الزیادۃ فی الدین کالنقص منہ کلاھما مخرج لہ عن وضعہ۔ (المنار)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہود کا غلو احکام ظاہری میں تعمق تھا اور مسائلِ باطن کی طرف سے اعراض تھا، اور مسیحیوں کا غلو مسائلِ باطن میں تعمق اور ظاہری کی طرف سے اعراض تھا، طریقِ حق ظاہر و باطن کو جمع کرنا ہے۔

۴۳۰ یعنی اُلوہیت کے باب میں کوئی عقیدہ اپنی رائے سے گڑھ کر پیش نہ کرو اور توحید میں کوئی شائبہ بھی شرک کا نہ آنے دو۔

۴۳۱ (نہ کہ خود معبود یا خدا یا مظہرِ خدا)

اللہ کے بھیجے ہوؤں کو، اُس کے نائبوں اور رسولوں کو خود معبود سمجھ بیٹھنے کا مرض مُشرک قوموں میں عام رہا ہے، مسیحیوں نے بھی مصری، یونانی، رومی مشرکوں اور مشرک فلاسفہ سے متاثر ہو کر اپنے پیمبر برحق کو بھی مظہر خدا، یا فرزند خدا کا درجہ دے دیا تھا، یہاں اُس کی تردید ہو رہی ہے۔

۴۳۲ یعنی ان کی پیدائش اللہ کے ایک کلمہ ہی کا نتیجہ ہے۔

ای صار بکلمۃ من اللہ مخلوقا (ابن عباس) والمعنی انہ وجد بکلمۃ اللہ وامرہ من غیر واسطۃ ولا نطفۃ (کبیر) ای ھو مکون بکلمۃ کُن (قرطبی) الکلمۃ الدالۃ علی التکوین بمحض قدرۃ اللہ تعالیٰ عند ارادتہ خلق الشئ وایجادہ وقد خلق المسیح بھذہ الکلمۃ (المنار) وھو تحقیق الکلمۃ التی القاھا الی اُمّہٖ مریم ومصداقھا والمراد کلمۃ التکوین او البشارۃ۔ (المنار)

أَلْقٰهَآ إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلٰثَةٌ ۚ

جسے اللہ نے پہنچا دیا تھا مریم تک ۴۳۲ اور ایک جان ہے اس کی طرف سے ۴۳۳ سو اللہ اور اس کے پیمبروں پر ایمان لاؤ ۴۳۵ اور یہ نہ کہو کہ (خدا) تین ہیں ۴۳۶

کلمہ سے مراد یا تو کلمہ کُنْ ہے یا وہ کلمہ جو بواسطۂ جبریل حضرت مریمؑ پر القاء کیا گیا تھا۔

ومعنی کونہ کلمۃ انہ حصل بکلمۃ کن من غیر مادۃ معتادۃ والی ذلک ذھب حسن وقتادۃ (رح) ای قولہ کن (معالم) لیست الکلمۃ صارت عیسیٰ ولکن بالکلمۃ صار عیسیٰ (ابن کثیر۔ عن شاذان بن یحیی) وتسمیۃ عیسیٰ بکلمۃ لکونہ موجدًا بکُن۔ (راغب)

**۴۳۳** (بہ واسطۂ فرشتۂ جبریل کے)

ای القاء الکلمۃ کان من اللہ ثم من جبرئیل۔ (ابن العربی)

**أَلْقٰهَا**۔ القاء کا استعمال مادّی چیزوں کے علاوہ کلام وغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔

والالقاء یستعمل فی المعانی والکلام کما یستعمل فی المتاع (المنار) ای اوصلھا الیھا وبلغھا ایاھا (المنار)

**۴۳۴** یعنی اللہ کے زندہ کئے ہوئے اور اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، جو بلا اسبابِ عادی ظاہری مریمؑ کے بطن میں مجسّم ہو گئے

ای تخلیقہ وتکوینہ (مدارک) ای یامرمنہ صار ولدا بلا اب (ابن عباسؓ) ای احیاہ اللہ ایاہ بتکوینہ (ابن جریر)

نسب الی انہ روح من اللہ لانہ بامرہٖ (ابن جریر) ای من خلقہ ومن عندہٖ (ابن کثیر) ای مخلوق من روح مخلوقہ (ابن کثیر)

**رُوحٌ مِّنْهُ**۔ روح کا انتساب اللہ کی جانب محض اس کے شرف وعظمت کے لئے ہے، جیسے بیت اللہ یا نعمۃ من اللہ میں نسبت تشریفی و تعظیمی ہوتی ہے۔

والمراد من قولہ منہ التشریف والتفضیل کما یقال ھذہ نعمۃ من اللہ (کبیر) اضیفت الروح الی اللہ علی وجہ التشریف کما اضیفت الناقۃ والبیت الی اللہ (ابن کثیر) ھو روح کسائر الارواح الا انہ تعالٰی اضافۃ الی نفسہ تشریفا (معالم) اضافہ اللہ تعالٰی الیہ تشریفا لہ کما یقال بیت اللہ وسماء اللہ۔ (جصاص)

یہ مراد نہیں کہ صرف اُنہی میں اللہ کی روح تھی، کسی اور میں اللہ کی رُوح نہیں ہوتی، اللہ کی روح تو ہر فرد بشر میں ہے، ونفخت فیہ من روحی۔ قرآن مجید میں موقع تخصیص و امتیاز پر کبھی کسی کو عَبْدُہٗ سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی کسی کو عبدنا سے، حالانکہ ظاہر ہے کہ اللہ کے عبد سب ہی ہیں۔

اور اللہ کی روح سے تائید عامۂ مومنین کے حق میں بھی آئی ہے، اولٰئک کتب فی قلوبھم الایمان وایدھم بروح منہ (المجادلہ، آیت ۲۲)

**۴۳۵** (اُن ہی پیمبروں کی تعلیمات کے مطابق)

**فَآمِنُوا**۔ کی فَ میں اشارہ اس طرف ہے کہ ان صحیح حقائق کو سمجھ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد و خیالات کو چھوڑ کر ایمان اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر لاؤ۔

**۴۳۶** خواہ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں، مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

انْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ

(اس سے) باز آجاؤ ۴۳۷ تمہارے حق میں یہی بہتر ہے، اللہ تو بس ایک ہی معبود ہے ۴۳۸ وہ پاک ہے اس سے کہ اس کے بیٹا ہو ۴۳۹

لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ ع ۲۳ لَنْ

اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ۴۴۰ اور اللہ کا کارساز ہونا کافی ہے ۴۴۱ نہ مسیح

يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ

ہرگز اس سے عار کریں گے کہ وہ اللہ کے بندہ ہیں اور نہ مقرب فرشتے ہی ۴۴۲

"باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر عظمتِ ازلی یکساں، جیسا باپ ہے، ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے، باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود، اور روح قدس غیر محدود، باپ ازلی، بیٹا ازلی، اور روح قدس ازلی، تاہم تینوں ازلی نہیں، بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تینوں غیر محدود نہیں، اور نہ تینوں غیر مخلوق، بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود ——— یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور روح قدس قادر مطلق، تو بھی تین قادر مطلق نہیں، بلکہ ایک قادر مطلق ہے، ویسا باپ خدا، بیٹا خدا، اور روح قدس خدا، پس بھی تینوں خدا نہیں بلکہ ایک خدا!"

ایک طرف یہ گورکھ دھندا، اور دوسری طرف اسلام کا صاف و سادہ کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ـ کوئی مناسبت بھی دونوں میں ہے؟

۴۳۷ کہ یہ غالیانہ عقائد کفر بلکہ شرک تک پہنچا دینے والے ہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہ آیت حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے جس کے قائل بعض جہلاء صوفیہ ہوئے ہیں۔

۴۳۸ واحد ہر اعتبار سے اور اپنے ہر معنی میں، نہ وہ ایک تینوں میں تقسیم ہے نہ وہ ایک اپنے کو تینوں شکلوں میں ظاہر کرنے والا ہے، نہ ترمورتی کی کوئی قسم بھی صحیح ہے ـــ نہ کوئی اس کا اوتار، نہ کوئی اُس کا اقنوم، نہ کوئی اس کا بروز، نہ وہ کسی میں حلول، وہ واحد عدد کے اعتبار سے بھی، اور ہر دوسرے اعتبار سے بھی کیا ظاہراً، کیا باطناً۔

ثنویت تثلیث اور شرک مطلق کے عقیدے بہت قدیم ہی نہیں، بلکہ یونان، ایران، مصر، ہند، عراق، چین وغیرہ دنیا کے اکثر ملکوں میں شائع رہ چکے ہیں، آیت کا یہ جزو ان سارے ہی عقائد پر ضرب لگاتا ہے۔

۴۳۹ یہ ولدیت کا عقیدہ غلط ہی نہیں بلکہ اصلاً مہمل اور تنزیہ اُلوہیت کے لئے باعثِ توہین شانِ اُلوہیت کے بالکل منافی ہے۔

۴۴۰ خالق کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے، مالک و مملوک میں مباینت لازمی ہے، برخلاف اس کے والد و مولود کے درمیان مجانست ہم جنسی و ہم نوعی شرط ہے، تو جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی بھی مخلوق اس کی اولاد ہو ہی نہیں سکتی۔

۴۴۱ کیا اُسے بندوں کی حاجت روائی اور اپنی کارسازی میں کسی کی اعانت کی محتاجی ہے جو وہ کسی کو شریک کرے؟

۴۴۲ (عار نہ کریں گے، کیا عالمِ ناسوت میں، اور کیا برزخ میں، اور کیا آخرت میں)

وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ

اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبّر کرے گا تو اللہ ضرور اپنے پاس سب کو جمع کرے گا

جَمِيْعًا ﴿۱۷۳﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ

۴۴۳ پھر جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انھوں نے نیک کام بھی کئے ہوں گے تو وہ ان کو ان کا

اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ

پورا پورا اجر دے گا اور انھیں اپنے فضل سے اور زائد دے گا ۴۴۴

۴۴۳ اَلْمَسِيْحُ ۔ اَلْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۔ ایک طرف حضرت مسیحؑ اور دوسری طرف ملائکۂ مقربین یہی دونوں دنیا میں کثرت سے پوجے گئے ہیں ۔ مشرکوں نے فرشتوں کو دیوی دیوتا کے نام دے کر شریکِ الوہیت ٹھہرایا اور مسیحیوں نے مسیحؑ کو خدائی کے مرتبہ پر پہنچایا ، اسی لئے خصوصیت کے ساتھ تصریح سے ان دونوں کی نفیِ الوہیت کی گئی اور بتادیا گیا کہ اللہ کی عبدیت کوئی چیز توہین کی نہیں ، مسیحؑ اور ملائکہ مقربین تو اس پر فخر کرتے ہیں ، نہ یہ کہ اس میں کسی قسم کا بھی عار محسوس کرتے ہوں ۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ مراتبِ شرف میں عبدیت مرتبۂ اعلیٰ ہے ۔

بعض مفسرینؒ اس آیت کے تحت میں انبیاء و ملائکہ کے درمیان تفاضل کی بحث چھیڑ دی ہے اور ایک گروہ افضلیتِ ملائکہ کا قائل ہوگیا ہے ۔

فدلّ بھذا علی ان الملائکۃ افضل من الانبیاء (قرطبی) واحتج بہ من زعم فضل الملائکۃ علی الانبیاء (بیضاوی) استدل المعتزلۃ بھذہ الآیۃ علی ان الملک افضل من البشر (کبیر) واحتج بالآیۃ قاضی ابوبکر والحلیمی والمعتزلۃ علی ان الملائکۃ افضل من الانبیاء (روح)

دوسرے گروہ نے فیصلہ افضلیتِ انبیاء کے حق میں دیا ہے ۔

والحاصل ان خواص البشر وھم الانبیاء افضل من خواص الملٰئکۃ ودلیلنا علی تفضیل البشر علی الملک ابتداء (مدارک) وقد استدل بعض من ذھب الی تفضیل الملائکۃ علی البشر بھذہ الآیۃ ولیس لہ فی ذلک دلالۃ (ابن کثیر)

بہ حیثیت مجموعی معتزلہ اور بعض اشاعرہ فریقِ اول کے ساتھ ہیں اور جمہور اشاعرہ فریقِ دوم کے ساتھ ۔

وقد استدل بھذہ الآیۃ علی ان الملٰئکۃ المقربین افضل من الانبیاء المرسلین ھو قول القاضی ابی بکر الباقلانی والحلیمی من ائمۃ الاشعریۃ وجمھور المعتزلۃ واما جمھور الاشعریۃ فیفضلون الانبیاء علی الملٰئکۃ (المنار)

لیکن انصاف کی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ آیت زیرِ بحث کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں اور نہ اس مسئلہ میں مناظرہ سے کچھ حاصل ہی ہے جب کہ قرآن و سنّت دونوں خاموش ہیں ۔

والمنصف یری ان التفاضل فی ھذا من الرجم بالغیب اذ لا یعلم الا بنص من الشارع ولا نص لدینا للخلاف فی ھذہ المسئلۃ فائدۃ فی ایمان ولا عمل ولکنہ من توسیع مسافۃ التفرق بالمراء والجدل ۔ (المنار)

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا

اور جن لوگوں نے عار و تکبر کیا ہوگا سو انھیں وہ دردناک عذاب دے گا اور نہ وہ لوگ اپنے حق میں

يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ

کسی غیر اللہ کو دوست نہ پائیں گے نہ مددگار ۴۴۵ اے لوگو! تمھارے

قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾

پاس یقیناً ایک دلیل تمھارے پروردگار کے پاس سے آچکی ۴۴۶ اور ہم تمھارے اوپر ایک کھلا ہوا نور اتار چکے ۴۴۷

۴۴۳ یہاں بیان اس عام قانون کا ہو رہا ہے کہ کوئی اللہ کی بندگی میں عار اور تکبر کر ہی کیوں کر سکتا ہے؟ اللہ تو ایسا حاکم مطلق ہے کہ وقت موعود پر سب ہی کو اس کی خدمت میں حاضری دینا ہے۔

۴۴۴ (جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے)

يُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ۔ یعنی جتنا اجر مقرر و موعود ہے، وہ تو انھیں پورا ملے ہی گا۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ یعنی جو لوگ عقیدہ اور عمل دونوں کے اعتبار سے عبد بنے رہے۔

۴۴۵ خلاصہ یہ کہ بزرگ ترین اور مقبول ترین بندے بھی بہر حال بندے ہی ہوتے ہیں، غالی مریدوں، معتقدوں کا اپنے شیخ یا کسی پیمبر کو اس کی حد عبدیت سے باہر نکال دینا اپنے کو مستحقِ عذاب بنانا ہے۔

الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا۔ یعنی جنھوں نے عبد بننے سے عار رکھا۔

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔ ولی اور نصیر میں فرق یہ ہے کہ ولی ایجابی طور پر ایصالِ نفع پر قادر ہوتا ہے، اور نصیر سلبی طور پر دفع مضرت پر۔

ولیًّا ای قریبا ینفعھم (ابن عباسؓ) نصیرًا ای مانعا یمنعھم من عذاب اللہ (ابن عباسؓ)

۴۴۶ (کافی اور محکم)

بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اس برہان سے مراد رسول اللہ صلعم کی ذات اقدس ہے، جن کی سیرت پاک اور تعلیم کی جامعیت نے ہر مشکل کو آسان اور ہر پتھر کو پانی بنا دیا ہے۔

ای رسول من ربکم (ابن عباسؓ) یعنی محمدا صلعم عن الثوری (قرطبی) الجمھور علی ان البرھان ھو محمد صلعم۔ (بحر)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ۔ خطاب ساری نسلِ انسانی جملہ اہلِ مذاہب کو عام ہے۔

یایھا الناس من جمیع اصناف الملل (ابن جریر) یقول تعالٰی مخاطبا جمیع الناس (ابن کثیر) خطاب لکافۃ المکلفین (روح)

۴۴۷ یعنی قرآن مجید جس کے اندر بڑے اور چھوٹے، انفرادی اور اجتماعی، سارے مسائل کا حل موجود ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ اعۡتَصَمُوۡا بِہٖ فَسَیُدۡخِلُہُمۡ فِیۡ رَحۡمَۃٍ مِّنۡہُ

تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اُسے انھوں نے مضبوط پکڑا انھیں وہ ضرور اپنی رحمت و فضل میں داخل

وَ فَضۡلٍ ۙ وَّ یَہۡدِیۡہِمۡ اِلَیۡہِ صِرَاطًا مُّسۡتَقِیۡمًا ﴿۱۷۵﴾ؕ یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ ؕ

کرے گا ۴۴۸ اور انھیں اپنے تک سیدھی راہ دکھا دے گا ۴۴۹ لوگ آپ سے حکم دریافت

قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ ؕ اِنِ امۡرُؤٌا ہَلَکَ لَیۡسَ لَہٗ

کرتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تمھیں (میراث) کلالہ کے باب میں ۴۵۰ حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے

وَلَدٌ وَّ لَہٗۤ اُخۡتٌ فَلَہَا نِصۡفُ مَا تَرَکَ ۚ وَ ہُوَ یَرِثُہَاۤ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ

کوئی اولاد نہ ہو اور اُس کے ایک بہن ہو ۴۵۱ تو اُسے اس کا ترکہ نصف ملے گا ۴۵۲ اور وہ مرد وارث ہوگا اس (بہن

لَّہَا وَلَدٌ ؕ فَاِنۡ کَانَتَا اثۡنَتَیۡنِ فَلَہُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَکَ ؕ

کے کل ترکہ) کا اگر اُس (بہن) کے اولاد نہ ہو ۴۵۳ اگر دو بہنیں ہوں تو ان دونوں کو ترکہ میں سے ۲/۳ دو تہائی ملے گا ۴۵۴

ای کتابا مبینا (ابن عباسؓ) النور المنزل ھو القرآن. عن الحسن (قرطبی) وھو القرآن کما قالہ قتادۃ ومجاھد والسدی (روح)

۴۴۸ یعنی جنت میں داخل کرکے اور بھی نعمتوں سے سرفراز کرے گا۔

اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ۔ یعنی اللہ کی توحید اور نفی شرک پر ایمان لائے۔

وَ اعۡتَصَمُوۡا بِہٖ۔ یعنی اللہ کے دین کو مضبوط پکڑے رہے۔

بِہٖ۔ میں ضمیر قرآن کی جانب بھی سمجھی گئی ہے، اگرچہ اس پر اعتراض بھی کیا گیا ہے۔

ای بالقرآن (قرطبی) واخرج ابن جریر وغیرہ عن ابن جریج ان الضمیر راجع الی القرآن أعنی النور المبین وھو خلاف الظاھر (روح)

اور اللہ کی طرف ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔

قیل ای باللہ (قرطبی) ای عصموا بہ سبحانہ انفسھم۔ (روح)

۴۴۹ یعنی دنیا میں انھیں طریق رضا پر ثابت و قائم رکھا جائے گا، اور اطاعت کی برکت سے انھیں ثبات علی الطاعات کی توفیق ہوگی۔

ای یثبتھم علی طریق مستقیم فی الدنیا مقدم ومؤخر۔ (ابن عباسؓ)

اسی سے تارکین ایمان و اعمالِ صالحہ کی حالت معلوم ہوگئی کہ اُن کو یہ ثمرات نہ ملیں گے (تھانویؒ)

وَإِن كَانُوٓاْ إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ ٱلْأُنثَيَيْنِ ۗ

اور اگر (وارث) چند بھائی بہن مرد و عورت ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر ملے گا ۴۵۵

يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّواْ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمٌۢ ﴿١٧٦﴾ ۲۴ ع ۶ ۵

اللہ تمہارے لئے (یہ احکام) کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہی میں نہ پڑو ۴۵۶ اور اللہ ہر شے کا پورا علم رکھتا ہے ۴۵۷

۴۵۰ کلالہ وہ ہے جس کے نہ اولاد ہو اور نہ والدین زندہ ہوں۔

۴۵۱ اور یہ بہن حقیقی یا عینی ہو، یا علاتی یعنی باپ کی طرف سے ہو۔ اخیافی یعنی صرف ماں کی طرف سے بہن کا حکم سورہ کے شروع (آیت ۱۲) میں آچکا ہے۔

۴۵۲ (اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہو تو اُسے ملے گا، ورنہ خود اُسی بہن پر لوٹ آئے گا۔) چچا، چچازاد بھائی وغیرہ عصبات میں داخل ہیں، ادائے قرض، اجرائے وصیّت بہرحال مقدّم ہے۔

۴۵۳ (اور والدین بھی نہ ہوں)

۴۵۴ اور بقیہ ایک تہائی عصبہ کو ملے گا، ورنہ بطور رد پھر انہی بہنوں کو مل جائے گا، بہنیں اگر دو سے زائد ہوں تو اُن کا بھی یہی حکم ہے۔

۴۵۵ یعنی بھائی کو دہرا اور بہن کو اکہرا حصّہ ملے گا، یہ بیان عام قاعدہ یا اصول کا ہے، باقی تفصیلات کہ عینی بھائی اور عینی بہن کا اثر علاتی بھائی بہنوں پر کیا پڑے گا، کتبِ فقہ و فرائض میں ملیں گی۔

وَإِن كَانُوٓاْ إِخْوَةً یعنی ایسی میّت کے بھائی بہن ہوں جس پر اطلاق کلالہ کا ہو۔

۴۵۶ (اور معاشرتِ دُنیوی اور جزائے آخرت دونوں میں نقصان سے محفوظ رہو) میراث و ترکہ کے احکام کو سرسری و ناقابلِ التفات سمجھنا خود ضلالت ہی کی ایک قسم ہے۔

۴۵۷ اپنی صفتِ علم لاکر یاد دلا دیا کہ ان احکام میں بندوں کی ساری رعایتیں اور مصلحتیں جمع کر دی گئی ہیں، اور اس سے احکامِ تقسیمِ ترکہ اور زیادہ مؤکّد ہو گئے۔

(۵)

رکوعہا ۱۶

# سُورَةُ الْمَائِدَةِ مَدَنِيَّةٌ

آیاتہا ۱۲۰

سورۂ مائدہ مدنی ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ نہایت مہربان بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۥ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ

اے ایمان والو! (اپنے) معاہدوں کو پورا کرو ۲ تمہارے لئے چوپائے مویشی جائز کئے گئے ہیں بجز

اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ

(اُن چیزوں کے) جن کا ذکر (آگے) تم سے کیا جاتا ہے ۳ ہاں شکار اس حال میں کہ تم احرام میں ہو جائز نہیں ۴

۱ سورہ مدنی اس معنی میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسول اللہ صلعم کے قیام مدینہ (بلکہ آخر عمر شریف) کا زمانہ ہے، ورنہ واقعۃً اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ معظمہ میں حجۃ الوداع (ذی الحجہ ۹ ۱۰ھ) کے موقع پر ہوا ہے، اور کچھ صلح حدیبیہ (۶ھ) سے واپسی کے وقت اور کچھ سال فتح مکہ ۸ھ میں، روایتوں میں آتا ہے کہ جس وقت اس کا نزول ہوا ہے آپ اونٹنی پر سوار تھے، نزول وحی کے ثقل کو جانور تک نے محسوس کیا، اور وہ بیٹھ گئی۔

۲ (اور اس کو ایک امر دینی سمجھو)

اَلْعُقُوْدُ۔ عقد کا لفظ عام ہے، اور ہر عہد شرعی کو شامل، خواہ اس کا تعلق خالق سے ہو خواہ مخلوق سے — بامحاورہ شستہ اردو میں اسی کو قول و قرار بھی کہا جاتا ہے۔

العھود التی بینکم وبین اللہ او بین الناس (ابن عباس) والظاھر عموم العقود فی کل ربط یوافق الشرع سواء کان اسلامیًا او جاھلیًا۔ (بحر)

عبادات کے علاوہ بھی جتنے عہد سیاسیات، تجارت، معاشرت وغیرہ معاملات و اخلاقیات سے متعلق ہو سکتے ہیں، سب اس میں آگئے

قال الحسن یعنی بذلک عقود الدین وھو ما عقدہ المرء علی نفسہ من بیع وشراء واجارۃ وکراء ومناکحۃ وطلاق ومزارعۃ ومصالحۃ وتملیک وتخییر وعتق وتدبیر وغیر ذلک من الامور ما کان ذلک غیر خارج عن الشریعۃ وکذلک ما عقدہ علی نفسہ للہ من الطاعات (قرطبی)

۳ (اور وہ ذکر کہیں دور نہیں، قریب ہی آ رہا ہے۔ حرمت علیکم المیتۃ الخ کے تحت میں)

بھیمۃ الانعام۔ اضافت تشبیہ کے لئے ہے یعنی مویشیوں سے ملتے جلتے ہوئے چوپائے جو نہ درندے ہوں نہ شکاری

إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ ① يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللّٰهِ

بے شک اللہ جو چاہے حکم دے ۵ اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو اللہ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت

وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَائِدَ وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ

والے مہینوں کی اور نہ (حرم میں) قربانی والے جانوروں کی اور نہ گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کی اور نہ بیت الحرام

الْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ۚ وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا

کے قصد کرنے والوں کی جو اپنے پروردگار کے فضل اور رضامندی کے طالب بنتے ہیں ۶ اور جب تم احرام کھول چکو تو اب تم شکار کر سکتے ہو ۷

(اضافتها الی الانعام لملابسة الشبه (بیضاوی) ای مما یماثل الانعام فی الاجتراء وعدم الانیاب.
(بیضاوی)

مراد ہیں ہرن، نیل گائے وغیرہ ایسے چوپائے جو شکاری اور درندے نہ ہونے میں مویشیوں (گائے، بیل، اونٹ، بھیڑ، بکری) سے مشابہ ہوں، البتہ خچر، گدھے، وغیرہ جن کی حرمت حدیث صحیح سے ثابت ہے اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

۴ یعنی شکار حلال چوپایوں کا بھی۔

الصَّيْدُ شکار سے یہاں مراد صرف ان جانوروں کا شکار ہے، جن کا کھانا جائز ہے۔

الصید فی هذا الموضع مختص بما یوکل لحمه. (راغب)

باقی سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا اس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ان کے ہلاک کرنے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ صَيْد ہی کے لفظ نے اسے بھی واضح کر دیا کہ شکار ان جانوروں کا مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں، اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر یا حیلہ کی ضرورت پڑتی ہے، عام گھریلو جانور بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ جو عادۃً شکار کر کے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کر کے کھانے کے کام میں لائے جاتے ہیں، ان کے ذبح کی کوئی ممانعت نہیں۔

ای ما کان صیدًا فهو حلال فی الاحلال دون الاحرام وما لم یکن صیدا فهو حلال فی الحالین
(قرطبی)

وَأَنْتُمْ حُرُمٌ۔ حالتِ احرام میں ہو یا حدودِ حرم کے اندر داخل ہو، خواہ بلا احرام ہی ہو، ممانعت کا اصل مدار صید کا حدودِ حرم کے اندر موجود ہونا ہے۔

۵ (کہ وہی حکم ہمیشہ عین مطابق مصلحت ہوگا۔)

ارادۂ الٰہی سے بالاتر کوئی قانون نہیں جس کے وہ ماتحت ہو، وہ خود سب سے بالاتر ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اسرارِ احکام کی تفتیش کی ممانعت کا اشارہ ہے۔

۶ (اپنے زعم و پندار میں)

فَضْلًا مِنْ رَبِّهِمْ وَرِضْوَانًا۔ مشرکین عرب بھی اس وقت حج و عمرہ کی نیت سے بیت اللہ کا قصد کرتے رہتے تھے فضل سے مراد ان کی منفعتِ دنیوی ہو سکتی ہے، حج کے موقع پر تجارت بھی خوب زوروں پر ہوتی تھی۔

رضوان۔ سے مراد ان کے حسب پندار رضا الٰہی ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ

اور ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ کسی قوم سے جو تمہیں بیزاری اس بنا پر ہے کہ انھوں نے تمہیں مسجد حرام سے روک دیا تھا تو تم

تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠

(اس بیزاری کے باعث) زیادتی کرنے لگو۔ اور ایک دوسرے کی مدد نیکی اور تقوے میں کرتے رہو۔

قال فیہ جمہور المفسرین معناہ یبتغون الفضل والارباح فی التجارۃ ویبتغون مع ذٰلک رضوانہ فی ظنہم وطمعہم

شعائر اللہ۔ شعائر جمع شعیرۃ کی ہے، مراد اعلام الٰہی ہیں یعنی وہ چیزیں جن کے ادب و احترام (قرطبی)

کے تحفظ کے لئے اللہ نے کچھ احکام مقرر کر دیے ہیں۔

جمیع معالم دین اللہ (جصاص)

ان احکام و آداب کی خلاف ورزی کرنا ان شعائر کی بے حرمتی کرنا ہے مثلاً حدودِ حرم اور حالتِ احرام کا ایک ادب یہ ہے کہ ان حدود میں یا اس حال میں شکار بند کیا جائے، اب اس کی خلاف ورزی کرنا شعائرِ حرم و احرام سے بے ادبی کرنا ہے۔

والشہر الحرام۔ بہ طور اسم جنس آیا ہے، لفظاً واحد معنًی جمع، یعنی سارے حرمت والے مہینے۔

الشہر مفرد محلّی باللام الجنسیۃ فالمراد بہ عموم الاشہر الحرم۔ (بحر)

مطلب یہ ہوا کہ ان چاروں متبرک مہینوں میں قتال کی ابتدا نہ کرو۔

الھدی۔ لفظ اُن قربانیوں کے لئے مخصوص ہے کہ جو کعبۂ مقدس کو لے جائی جاتی ہیں۔

الھدی مختص بما یھدی الی البیت (راغب) ھی اسم ما اشعر ای جعل شعارًا و علمًا (مدارک)

ان کی بے حرمتی یہ ہوگی کہ ان قربانیوں سے تعرض کیا جائے۔

القلآئد۔ یہ پٹے اسی نشانی کے لئے گلے میں پڑے رہتے تھے کہ یہ اللہ کی نذر ہیں، حرم ہی میں ذبح ہوں گی،

القلائد سے مراد ذوات القلائد ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے تبرکات کی تعظیم بوجہ تعلق ذات واجب التعظیم کے مفہوم ہوتی ہے پھر چونکہ فضل و رضوان کا تعلق مشرکین سے ہے اس لئے یہ مفہوم بھی ہوا کہ طالب رضائے حق قابلِ رعایت ہے اگرچہ اخذ طریق میں اس نے غلطی کی ہو، اسی طرح رَبِّهِمْ سے اشارہ رحمتِ الٰہی کے عموم و وسعت کی جانب نکلتا ہے

کہ (جب کہ خود وہ شکار حدودِ حرم میں نہ ہو)

فَاصْطَادُوْا۔ صیغۂ امر ہے لیکن وجوب کے معنی میں نہیں، بلکہ صرف اجازت کے مفہوم میں۔

ای فلا جناح علیکم بالاصطیاد لزوال المانع (روح) فالامر للاباحۃ بعد الحظر (روح) اباحۃ للاصطیاد بعد حظرہ علیھم (مدارک) ای فقد ابحنا لکم ما کان محرما علیکم فی حال الاحرام من الصید۔ (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ محض ایک امرِ مباح کے لئے صیغۂ امر کا وارد ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس مباح کے ترک سے اس کے ممنوع ہونے کا شبہ ہونے لگے، اس مباح کا کرنا ہی مطلوب ہوتا ہے اور یہیں سے ان متشددین کی

وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝ (۲)

اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو ۹؎ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۱؎

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ

تم پر حرام کئے گئے ہیں مُردار اور خون اور سُور کا گوشت ۱۱؎ اور جو جانور غیر اللہ کے لئے نامزد کردیا گیا ہو ۱۲؎

وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَاۤ اَكَلَ السَّبُعُ

اور جو گلا گھٹنے سے مرجائے اور جو کسی ضرب سے مرجائے اور جو اونچے سے گر کر مرجائے اور جو کسی کے سینگ سے مرجائے اور جس کو درندے

اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ

کھانے لگیں سوا اس صورت کے کہ تم اُسے ذبح کر ڈالو، اور جو جانور استھانوں پر بھینٹ چڑھایا جائے ۱۳؎ اور یہ کہ قرعہ کے تیروں سے ۱۴؎

غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے، جو مباحات کے ترک کر دینے میں حرام ہی کی طرح تشدّد و غلو رکھتے ہیں۔

۸؎ (بلکہ اس عقلی ناگواری اور طبعی انقباض کے باوجود معاملہ ان سے بھی حق و انصاف ہی کا رکھو۔) مراد کفار قریش ہیں جنھوں نے ۶ھ میں مسلمانوں کو بیت اللہ تک پہنچنے اور عمرہ کرنے سے حدیبیہ میں روک دیا تھا۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ ایسے موذی اور خدا ناترس دشمنوں سے بھی ہر غصہ و اشتعال کے باوجود برتاؤ عدل ہی کا رکھو۔ اللہ اللہ! کیا ٹھکانا ہے اس فراخ دلی کا!

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس سے بغض فی اللہ ہو اس کے معاملات میں بھی حدود شرعی سے تجاوز جائز نہیں۔

۹؎ کیسے زرّیں اصول کی تعلیم مل رہی ہے! نیکی میں سب کے شریک رہو، بدی اور فسق میں کسی کا ساتھ نہ دو! "مہذب" قوموں کا سا شیوہ نہ رکھو کہ اپنی قوم سب پر مقدم، اور اپنی پارٹی بہرحال اپنی پارٹی! ادھر قاعدے اور اصول غیروں سے معاملت کے بتائے تھے، اب یہاں ارشاد آپس کی معاملت سے متعلق ہو گیا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہیں سے معلوم ہوا کہ حُسن و قبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور مشائخ اہلِ تربیت کے ہاں اسی قاعدے پر عمل ہے، یہیں سے وجوب ان مجلسوں میں شرکت کا نکل آیا جن کا مقصد اشاعتِ دین و نصرتِ دین ہے، اور حُرمت ان اجتماعی اداروں میں شرکت کی نکل آئی جن سے بے دینی یا بدعملی کی تائید ہوتی ہو۔

الْبِرِّ۔ برّ بہت جامع مفہوم رکھتا ہے، نیکی کی چھوٹی بڑی ہر قسم اس کے اندر آ جاتی ہے۔

البرّ اسم لمجموع ما یتقرب به الی الله تعالیٰ من الایمان والاخلاق والآداب والاعمال وکل واحد منها یعدّ خصلة او شعبة من البرّ۔ (المنار)

اور لغت میں اس کا مفہوم ہی توسّعِ خیر کا لیا گیا ہے اور سچائی کو بھی اس لیے لیا گیا ہے کہ وہ بھی خیر ہی کی ایک قسم ہے۔

التوسع فی فعل الخیر ویستعمل البرّ فی الصدق لکونه بعض الخیر المتوسع فیه۔ (راغب)

ف۱۰ (نافرمانوں اور سرکشوں کے حق میں)

اتَّقُوا اللّٰہَ۔ خشیتِ الٰہی ہی ایسی چیز ہے' جو ہر مجاہدہ کو آسان اور ہر پابندی کو سہل بنا سکتی ہے۔

ف۱۱ آیت نمبر ایک میں اِلَّا مَا یُتْلٰی گزر چکا ہے' اب اسی کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔

الْمَیْتَۃُ۔ یعنی وہ جانور جو بلا ذبح شرعی مر جائے۔

الدَّمُ۔ دمِ مسفوح یعنی بہتا ہوا خون مراد ہے۔

لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ۔ اسی میں سور کی چربی وغیرہ اس کے جسم کے دوسرے اجزاء بھی شامل ہیں۔

اکلہ نجس وانما خص اللحم لانہ معظم المقصود (مدارک) فانہ قد تناول شحمہ وعظمہ وسائر اجزائہ ولاخلاف بین الفقہاء فی ذلک (جصاص)

سور کے گوشت کی جسمانی مضرتوں سے طبی لٹریچر بھرا پڑا ہے' اخلاقی و روحانی نقصانات کا ذکر ہی کیا۔

ف۱۲ (بہ خیال تقرب اور بہ نیت عبادت)

حرمت کا اصل مدار ذابح کی نیت پر ہے اور غیر اللہ کی طرف نامزدگی عین ذبح کے وقت ہو یا اس سے قبل' یکساں ہیں' قبروں' درگاہوں پر چڑھاوے چڑھانے والے ذرا اپنے لئے بھی سوچ لیں۔

ف۱۳ (عام اس سے کہ نامزدگی غیر اللہ کی جانب زبان سے بھی کی جائے' یا محض دل میں نیت رکھی جائے)

حرمت کی اصل بنا اعتقادِ خبیث ہے' خواہ زبان سے اس کا اظہار کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو' تھانوں پر ذبح فی نفسہٖ حرام نہیں' حرام بہ نیت خبیث ہے۔

ما ذبح علی اعتقاد تعظیم النصب (کبیر) والنیۃ فیہا تعظیم النصب لان الذبح علیہا غیر جائز۔ (قرطبی)

علی۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں لِ کے مرادف ہو' یعنی تھانوں پر چڑھائے جانے کی غرض سے۔

قال قطرب علی بمعنی اللام ای وما ذبح لاجل النصب (معالم) قیل علی بمعنی اللام ای لاجلہا (قرطبی)

الْمَوْقُوْذَۃُ۔ یہ وہ جانور ہے جو کسی ضرب سے مر جائے۔

المقتولۃ بالضرب (راغب)

فقہاء نے ایسے جانور کو بھی جو محض غُلّہ یا گولی سے بلا ذبح مر جائے' اسی حکم میں داخل کیا ہے۔

ویدخل فی الموقوذۃ ما رمی بالبندق فمات۔ (کبیر)

الْمُتَرَدِّیَۃُ۔ پہاڑی سے گر کر مر جانا' یا کنواں میں گر کر مر جانا بھی اسی کے تحت میں آجاتا ہے۔

وَمَا اَکَلَ السَّبُعُ۔ یعنی وہ جانور جسے درندے کھانے لگیں اور وہ اسی صدمہ سے مر جائے۔

اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ۔ یعنی تم اُسے ذبح کر ڈالو قبل اس کے کہ اس کا دم نکلے۔

اس استثناء کا تعلق اوپر کی لکھی ہوئی سب صورتوں سے ہے یعنی گردن مروڑے ہوئے' چوٹ کھائے ہوئے وغیرہ سب حلال جانور بھی حرام ہیں' بشرطیکہ کسی جانور کا دم نہ نکلا ہو اور وہ مطابق شرع ذبح کر لیا جائے' ایسا جانور حکم حرمت سے مستثنیٰ اور حلال ہے۔

نصب علی الاستثناء المتصل عند الجمہور من العلماء والفقہاء وھو راجع علی کل ما ادرک ذکاتہ من المذکورات وفیہ حیاۃ۔ (قرطبی)

ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ

تقسیم کیا جائے یہ سب گناہ (کے کام) ہیں ۵۱ آج کافر تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے ۱۶ سو تم ان سے

وَاخْشَوْنِ ۗ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

نہ ڈرو۔ اور مجھی سے ڈرو ۱۷ آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور

نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۗ

تمہارے لئے اسلام کو بہ طور دین کے پسند کر لیا ۱۸

ذَكَّيْتُمْ. ذکاۃ ذبح کے معنی میں ہے۔

الذکاۃ فی کلام العرب الذبح قاله قطرب (قرطبی) التذکیة الذبح (فہر) وذکاته ان تقطع اوداجه اودمه وتذکر اسم اللہ علیه اذا ذبحته (مجاز) وذکیت الشاۃ ای ذبحتها وحقیقة التذکیة اخراج الحرارۃ الغریزیة (راغب)

۱۴ ایک دستور اہلِ جاہلیت کا یہ تھا کہ تیروں پر اجازت و ممانعت کے الفاظ لکھ رکھتے تھے اور بعض خالی چھوڑ دیتے تھے اور سفر تجارت، جنگ وغیرہ کے اہم موقعوں پر یہ کرتے کہ انہی تیروں سے جا کر فال لیتے، اور جو حکم نکل آتا اسی پر عمل کرتے، صحیح بخاری، کتاب التفسیر میں ایک روایت اسی مضمون کی ہے:۔

والاستقسام ان یجیل القداح فان نهته انتهی وان امرته فعل ما امرہ وقد اعلموا القداح اعلاما بضروب یستقسمون بها۔

صحابہ، تابعین اور اکثر مفسرین سے یہی معنی منقول ہیں۔

یعنی القداح کانوا یستقسمون بها فی الامور (ابن جریر عن ابن عباسؓ) وکذا روی عن مجاهد وابراهیم النخعی والحسن البصری ومقاتل بن حیان (ابن کثیر) فمعنی الاستقسام بالازلام طلب معرفة الخیر والشر بواسطة ضرب القداح وهو اختیار الجمهور (کبیر)

مجاہد تابعی کے ایک قول سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی، فال گیری اور وہم پرستی کی یہ شکل اہلِ عرب کے ساتھ مخصوص نہ تھی، ایران اور روم کی بڑی بڑی مہذب و متمدن قومیں اس میں مبتلا تھیں۔

قال سهام العرب وکعاب الفارس والروم کانوا یتقامرون بها (ابن جریر ابن کثیر قرطبی عن مجاهد)

مفسر تھانویؒ نے کہا ہے کہ آج کل چٹھی ڈالنے کا جو دستور نکلا ہے، وہ اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک شکل قمار کی ہے۔

۱۵ (اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے دین و آئین کی خلاف ورزی میں داخل ہیں)

ذٰلِكُمْ کا اشارہ ممکن ہے کہ استقسام بالازلام تک محدود ہو لیکن زیادہ قابلِ قبول یہ قول ہے کہ ان سب چیزوں کی طرف ہو جن کی ممانعت اوپر آچکی ہے۔

یرجع الی جمیع ماذکر من الاستحلال لجمیع ھذہ المحرمات وکل شیٔ منھا فسق وخروج من الحلال الی الحرام (قرطبی) راجعا الی جمیع ما تقدم ذکرہ من التحلیل والتحریم (کبیر)

ذٰلک ۔ اشارہ بعید ہے، یہاں کنایہ ان افعال کی بُعدِ منزلت سے ہے۔

ومعنی البعد فیہ الاشارۃ الی بعد منزلتہ فی الشر (روح ۔ ابو سعود)

فسق ۔ یہاں کفر کے مفہوم میں ہی لیا گیا ہے۔

فسق ای کفر (بحر)

ورنہ یوں عام معنی فسق کے خروج کے ہیں یعنی ان چیزوں میں سے کسی پر عمل کرنا حلال سے نکل کر حرام کی طرف آنا ہے۔

**۱۶۶** (کہ یہ دین کبھی بھی مغلوب یا گمنام ہو سکے گا)

آیت کے نزول کا وقت یوم جمعہ (ذی الحجہ ۹ سنہ ۱۰ھ ۔ ۸ یا ۹ مارچ ۶۳۲ء) بعد عصر، مقام عرفات ہے۔

نزلت فی یوم عیدین فی یوم الجمعۃ ویوم عرفۃ (ترمذی ابواب تفسیر القرآن عن ابن عباسؓ)

رسول اللہ صلعم نے اس کے نزول کے کل دو مہینے اکیس دن بعد انتقال فرمایا، نکتہ رس و دقیقہ سنج اصحابی آیت کے مضمون ہی سے سمجھ گئے تھے کہ اب دین ہر طرح مکمل و مستحکم ہو چکا، نبی کے مشن کی تکمیل ہو چکی، نبی کو اب دنیا میں مزید قیام کی ضرورت کیا رہی اور زمانۂ مفارقتِ نبوی کا قریب آ گیا چنانچہ حدیث و سیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ آیت کو سن کر رو پڑے تھے

**۱۶۷** یعنی میرے احکام کی مخالفت نہ کرو، یہ گویا وعدۂ الٰہی ہے کہ اب تشویش و تردد کی چیز غلبۂ کفر و استیلاءِ کفار نہیں بلکہ احکامِ شریعت سے تجاوز و تزلزل ہے، یہی چیز ایسی ہے جو مسلمانوں کو ضرر پہنچا سکتی ہے اور ان کے ملی وجود کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے خشیتِ الٰہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی مسلمانوں میں ضعف پیدا کر سکتی ہے نہ کہ اہلِ کفر وغیرہ کی کوئی خارجی قوت، اور تاریخ و تجربہ نے اسے لفظ بہ لفظ ثابت کر دکھایا ہے، اس پوری چودہ سو سال کے عرصہ میں جب کبھی اور جہاں بھی ملت کو نقصان پہنچا ہے، اپنے ہی ضعفِ ایمان سے، بے عملی سے بد عملی سے خوفِ خدا کی کمی سے

**۱۶۸** (قیامت تک کے لئے)

اکملت لکم دینکم ۔ یہ اکمالِ دین بہ لحاظ قوت بھی ہے، اور بہ لحاظ احکام و قواعد بھی۔

اتممت علیکم نعمتی ۔ یہ اتمامِ نعمت اسی دین کی تکمیل سے ہوا، اس اکمالِ دین و اتمامِ نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم، اضافہ، تصرف کی گنجائش نہ رہی، نہ کسی اور نبی کی بعثت کی حاجت، ختمِ نبوت پر اگر کوئی دلیلِ صریح و مستقل نہ موجود ہوتی تو خود یہی آیت بھی کافی ہو سکتی تھی، عقیدۂ امامت کا، جو در حقیقت اجرائے نبوت ہی کی ایک شکل ہے، رد بھی یہیں سے نکل آتا ہے۔

البتہ ہر دور میں نو پیدا حالات و مسائل کے مطابق نئے نئے احکام کا انکشاف اہلِ علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق و ماتحت قیامت تک کرتے رہیں گے۔

اشیاء کی حلت و حرمت کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا تھا، تو یہ مسئلہ بھی اسی کتابِ اضح کے اندر آ گیا اور اس میں بھی اب کسی تغیر و تصرف کی گنجائش نہ رہی۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ فقہائے ظاہر اور حکمائے باطن نصوص سے جو مستنبط کرتے ہیں وہ بھی سب دین ہی میں

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

ہاں جو کوئی بھوک کی شدت سے بے قرار ہو جائے، گناہ کی طرف رغبت کئے بغیر ۱۹ سو اللہ بڑا مغفرت

رَّحِيْمٌ ③ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ

والا ہے بڑا رحمت والا ہے ۲۰ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیز (کھانے کی) ان پر حلال کی گئی ہے ۲۱

داخل ہے، ورنہ اکمالِ دین کے بعد اس کی اجازت نہ ہوتی۔

اَلْيَوْمَ۔ دین الٰہی چلا تو شروع ہی سے آرہا تھا، لیکن ہر نبی کے عہد میں زمان و مکان کے مصالح و مقتضیات کے لحاظ سے احکام شریعت وقت و مقام کے ساتھ محدود و مخصوص رہتے تھے، دین اب پہلی بار عالمگیر اپنی جزئیات و تفصیلات کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اَلْيَوْمَ میں اشارہ اسی جانب ہے کہ اب خدائی پروگرام میں وحدتِ نسل انسانی کا زمانہ شروع ہونے کو ہے، دنیا اب تک مختلف جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا، اور آپس میں نامہ و پیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی، ہر علاقہ گویا چاہے اپنی جغرافی و طبعی سرحدوں کے اندر محصور و محفوظ تھا، دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل رہتے، ان کا عبور کرنا تقریباً محال تھا، ریل، سائیکل، موٹر، لاری، تار، ٹیلیفون وغیرہ خواب و خیال میں بھی نہ تھے، اب کائناتِ ارضی کی تاریخ میں پہلی بار اس کا وقت آرہا تھا کہ انسانیت کے بٹے اور کٹے ہوئے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں، رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں، اور جس طرح نظامِ تکوینی میں ہر فرد کے لئے اس کے وجود میں آنے سے قبل ہی اس کے لئے ہوا کا، اور روشنی کا اور پانی کا سامان حکمتِ الٰہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظامِ تشریعی میں رحمتِ حق نے چاہا کہ نوعِ انسان کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود رہے، چنانچہ قرآن کے سے جامع ہدایت نامہ و دستور العمل کو موجود کر دیا گیا۔

۱۹ (اور حرام ماکولات میں کسی شے کو کھا پی لے)

فاباح اللّٰه عند الضرورة اکل جميع ما نص علی تحريمه فی الأية (جصاص)

مَخْمَصَةٍ۔ کے معنی شدید بھوک کے ہیں۔

المخمصة جوع وخلاء البطن من الطعام (قرطبی) ای مجاعة (مجاز) قال ابن عباس والسدی قتادة المخمصة المجاعة (جصاص) قال اهل اللغة الخمص والمخمصة خلو البطن من الطعام عند الجوع (کبیر)

غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ یعنی حرام شے محض بھوک کی شدت سے مجبور ہو کر کھالی جائے، حصولِ لذت کی نیت نہ ہو اور نافرمانی یا قانون شکنی مقصود نہ ہو۔

ای غیر متعمد لمعصیة فی قصده قاله قتادة والشافعی رحمهما اللّٰه (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس کی اجازت بضرورت دی، اس سے حظِ نفس کا قصد جائز نہیں جیسے طبیب یا گواہ عورت یا اُس کے جسم کو بضرورت دیکھے، بہ قصدِ شہوت نظر کرنا حرام ہے۔

۲۰ صفتِ غفر لا کر یہ یاد دلا دیا کہ اگر قدرِ ضرورت سے کوئی ایک آدھ لقمہ زیادہ کھا گیا، جب بھی

## قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ

آپ یہ کہہ دیجئے کہ تم پر (سب) پاکیزہ جانور حلال ہیں ۲۲ اور تمہارے سدھے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں ۲۳

معاف کردیا جائے گا اور صفتِ رحمت سے یہ اشارہ ہے کہ قانون ایسے موقع کے لئے دیکھو کیسا نرم و آسان رکھ دیا۔

۲۱ (کتّے اور باز کے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے)

یہ سوال کرنے والے منکرین نہ تھے، مومنین و صحابہ ہی تھے، اور حلّت و حرمتِ اشیاء کے سلسلہ میں اس مسئلہ کا حل بھی ضروری تھا۔

یسئلك یا محمّد اصحابك ما الذی احلّ لهم (ابن جریر)

لَهُمْ یعنی مسلمانوں پر۔ صحابہ کا اصل سوال یہ تھا کہ شکاری جانوروں (مثلاً کتّے اور باز) کے ذریعہ سے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے کون کون حلال ہیں؟ آیا سب ہی حلال جانور اس طریق شکار کے بعد بھی حلال رہتے ہیں، یا کچھ مخصوص جانور حلال رہ جاتے ہیں، اور وہ بھی مخصوص شرائط ما تحت؟

اللہ حضرات صحابہ پر بے شمار رحمتیں نازل کرے، امت کے کام کی کیسی کیسی چیزیں خدا اور رسول سے دریافت کرڈالیں، یہ معلومات اگر پیشتر سے نہ موجود ہوتے تو آج کتنی دشواریاں بڑھ جاتیں!

۲۲ جواب یہ ملا کہ جو حلال جانور ہیں، وہ اس طریق شکار کے بعد بھی حلال رہتے ہیں، البتہ کچھ شکار کے شرائط آگے آتے ہیں۔

طیّب کے اصل معنی لذیذ و دل پسند کے ہیں، طیب کی تعریف میں ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ وہ وہ پاک و لذیذ غذا ہے جسے طبع سلیم قبول کرلے

یقال طاب الشئ یطیب طیبًا فهو طیّب (راغب) واصل الطیب ما تستلذه الحواس وما تستلذه النفس

۲۳ دو شرطیں اتنے ہی جواب سے نکل آئیں، پہلی شرط تو یہ نکلی کہ وہ شکاری جانور سکھائے ہوئے سدھائے ہوئے ہوں، اور فقہائے بات سے بات یہ پیدا کی ہے کہ یہ قید صرف وحشی جانوروں کے لئے نہیں بلکہ گھریلو جانوروں کے لئے بھی ہے، چنانچہ گھریلو جانور اگر تربیت پایا ہوا نہ ہو تو اس کا کیا ہوا شکار حلال نہ ہوگا، البتہ جو جانور (وحشی ہو یا گھریلو) سکھایا ہوا ہوگا اس کا فعل خود شکاری کا فعل سمجھا جائے گا، دوسری شرط یہ ظاہر ہوئی کہ وہ جانور تمہارے چھوڑے ہوئے جھپٹیں، یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔

الجوارح۔ جارحہ کی جمع ہے، معنی ہیں، ہر شکاری جانور کے خواہ وہ پرندہ ہو یا درندہ۔

تسمّی الصائدة من الکلاب والفهود والطیور جارحة (راغب)

جارحہ کا نام ہی اس لئے جارحہ پڑا کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔

قیل فی الجوارح انها ما تجرح بناب او مخلب (جصاص) سمیت جوارح من الجرح لانها تجرح الصید عند امساکه۔ (خازن)

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ۔ ترکیب میں اس کا عطف الطیبات پر ہے اور صید مضاف محذوف ہے۔

عطف علی الطیبٰت ای احلّ لکم الطیبٰت وصید ما علّمتم فحذف المضاف (کشاف) ای وصید ما علّمتم۔ (قرطبی)

مُكَلِّبِیْنَ۔ مُكَلِّب کے ایک معنی تو ہیں کتّے کو تعلیم دینے والا، اور دوسرے معنی ہیں شکار پر جھپٹنے والا، دونوں میں کوئی منافات نہیں، اور اہلِ لغت نے دونوں کی گنجائش رکھی ہے۔

المکلّب معلم الکلاب الصید مضرّیها علیه وقد یکون التکلیب واقعًا علی الفهد وسباع الطیر۔ (تاج)

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا

تم انھیں اس طریقہ پر سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھایا ہے ۲۴ سو کھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور) تمہارے لئے پکڑ رکھیں ۲۵

اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ④

اور اللہ کا نام اس (جانور) پر لے لیا کرو ۲۶ اور اللہ سے ڈرتے رہو ۲۷ بیشک اللہ حساب (بہت) جلد کر دینا ہے ۲۸

مكلّب مضر للكلاب على الصيد معلم لها وقد يكون التكليب واقعاً على الفهد وسباع الطير (لسان)

المكلّب الذى يعلّم الكلب (راغب) التكليب هو التضرية بالشئ والتسليط عليه لغة۔ (ابن العربی)

مُكَلِّبِيْنَ کے لفظ سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ تعلیم و تربیت صرف کتوں کے ساتھ مخصوص ہے شکاری پرندے بھی بلا اختلاف فقہاء سب اسی حکم میں داخل ہیں۔

لا يختص ذلك بالكلاب دون غيرها فوجب حمله على العموم ولا نعلم خلافاً بين فقهاء الامصار فى اباحة صيد الطير (جصاص)

گویا یہ پہلی شرط حلت کی تفصیل ہوگئی۔

۲۴ فقہاء نے تعلیم و تربیت کا معیار کتے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سکھایا ہوا کتا شکار کو پکڑ کر خود نہ کھا جائے اور باز کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سدھے ہوئے باز کو جب آواز دی جائے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔

۲۵ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ۔ یعنی وہ شکار مسلمان شکاری ہی کے لئے ہونا چاہئے نہ کہ جانور کے اپنے لئے، اس نص نے اُسے صاف کر دیا جو فقہاء قبل کے الفاظ سے استنباطاً سمجھے تھے اور اس کا معیار وہی ہے جو اوپر کے حاشیہ میں ابھی بیان ہو چکا، تو اگر کتا اس شکار کو خود کھانے لگے، یا باز شکاری کے بلانے سے واپس نہ آئے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جانور نے شکار مالک کے لئے نہیں اپنے لئے پکڑا ہے عَلَيْكُمْ میں عَلٰی کے معنی لِ کے ہیں اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ سے مراد یہ ہے کہ وہ جانور خود اس شکار کو نہ کھائے اور اسے شکاری کے لئے روکے رکھے۔

اى حبس لكم ولم يأكل (قرطبى) الامساك على صاحبه ان لا يأكل منه۔ (مدارك)

اور قرطبی نے اس معنی پر صحابیوں میں سے ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ اور تابعین میں سے عکرمہؒ، قتادہؒ، ابن جبیرؒ اور عطاءؒ کا اور ائمہ فقہ میں سے نخعیؒ، شافعیؒ، احمدؒ، اسحٰقؒ، ابو ثورؒ اور ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا اتفاق نقل کیا ہے۔

واليه ذهب اكثر الفقهاء (بيضاوى)

البتہ باز، شکرہ وغیرہ شکاری پرندوں کی تادیب اس حد تک ذرا دشوار ہی ہے، اس لئے فقہاء کے ذیقہ سنج گروہ نے انھیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ رکھا۔

وقال بعضهم لا يشترط ذلك فى سباع الطير لأن تاديبها الى هذا الحد متعذر (بيضاوى) قال ابو حنيفة وابو يوسف ومحمد وزفر يوكل صيد البازى وان اكل (جصاص) واما البازى فانه معلوم انه لا يمكن تعليمه بترك الاكل وانه لا يقبل التعليم من هذه الجهة (جصاص) فان اكل منه لم يوكل اذا كان صيد كلب ونحوه فاما صيد البازى ونحوه فاكله لا يحرمه (مدارك)

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۪

آج جائز کر دی گئیں تم پر (لذیذ) پاکیزہ چیزیں ۲۹ اور جو لوگ اہل کتاب ہیں ان کا کھانا تمہارے لئے جائز ہے ۳۰

۲۶ یعنی شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرو۔

یعنی اذا ارسلت جارحک فقل بسم اللہ (ابن عباس) ای سموا علیه عند ارساله (مدارک) ومن شرائط ذکاۃ الصید التسمیۃ علی الارسال (جصاص)

حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے:۔

عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلعم اذا ارسلت کلابک المعلمۃ وذکرت اسم اللہ فکل مما امسکن علیک (صحیح بخاری)

عدی بن حاتم صحابی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم سکھایا ہوا کتا اللہ کا نام لے کر چھوڑو تو پھر وہ جو تمہارے لئے پکڑے رکھے اُسے کھا سکتے ہو، فقہاء نے حدیث بالا ہی سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ ذبح حیوانات کے وقت جو بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اسی کے قائم مقام وہ بسم اللہ ہے جو شکار پر شکاری جانور کے چھوڑتے وقت پڑھی جائے۔

ھذا یدل علی ان حال الارسال بمنزلۃ حال الذبح فی وجوب التسمیۃ علیه (جصاص) وتشترط التسمیۃ من الذابح حالۃ الذبح او الرمی بصید او الارسال (درمختار)

۲۷ (ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے)

ذرا موقع کی تصویر چشم تصوّر میں لایئے، خوب بھوک لگی ہوئی ہے، شکر ایک بڑے لذیذ گوشت کا جانور پکڑ کر لایا ہے شوق بے قرار ہے کہ جلد سے جلد اس کے کباب بنیں اور بھنے ہوئے شکار سے جی بھر کر لذت حاصل کی جائے اب کون اس موقع پر یاد دلائے کہ شرائط حلّت ذرا مستحضر کر لیجئے، جانور سدھا ہوا ہے یا نہیں؟ اُسے چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ دی گئی تھی یا نہیں؟ وغیرہا، بجز تقویٰ الٰہی کے کس میں اس وقت یہ یاد دلانے کی قوت ہے؟

۲۸ (اور یہی مراقبہ ہر دشوار حکم کی تکمیل کو آسان بنا دے گا)

خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن حکیم میں احکام جہاں جہاں بھی آئے ہیں ان کے متصل ہی کوئی اس قسم کا فقرہ بھی ضرور مل جاتا ہے جس سے یاد آخرت یا اللہ کے علم کل کا استحضار ہو جائے، ہر دشواری کو آسان بنا دینے کا، ہر سنگ کو پانی کر دینے کا نسخہ اس سے بڑھ کر آج تک نہیں دریافت ہو سکا ہے۔

۲۹ (اور یہ جواز قیامت تک رہے گا، کوئی نئی شریعت اُسے منسوخ کرنے والی اب نہیں آنے کی۔)

طیّب پر حاشیہ ابھی گزر چکا ہے۔

۳۰ (بہ شرطیکہ ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے دیا گیا ہو۔)

"تثلیث مقدّس" کے نام پر اگر کوئی جانور ذبح ہوا ہو گا تو وہ محققین حنفیہ کے یہاں حلال نہیں، حرام ہو گا۔

قال ابوحنیفۃ وابویوسف ومحمد وزفر من کان یھودیا او نصرانیا من العرب والعجم فذبیحته مذکاۃ اذا سمی اللہ علیھا وان سمی النصرانی علیھا اسم المسیح لم توکل (جصاص)

طعام سے مراد حلال جانور ہیں، جو اہل کتاب کے ہاتھ کے ذبح کئے ہوں، جیسا کہ صحابیوں تابعین

وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ز وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ

اور تمہارا کھانا ان کے لئے جائز ۱۳۱ھ اور (اسی طرح تمہارے لئے جائز ہیں) مسلمان پارسائیں اور ان کی پارسائیاں

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ

جن کو تم سے قبل کتاب مل چکی ہے جب تم انھیں ان کے مہر دے دو ۱۳۲ھ

اور ائمۂ تفسیر نے سمجھا ہے، ورنہ مطلق کھانا تو دوسرے غیر مسلموں کے ہاں کا بھی جائز ہے کچھ اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں۔

وفی المراد بالطعام ھٰھنا وجوہ ثلاثۃ الاول انہ الذبائح والاکثرون علی القول الاول (کبیر) ھو ھھنا خاص بالذبائح عند کثیر من اھل العلم بالتاویل (قرطبی) وعلیہ اکثر المفسرین (روح) روی عن ابن عباسؓ وابی الدرداء والحسن ومجاھد وابراھیم وقتادۃ والسدی انہ ذبائحھم وظاھرہ یقتضی ذلک (جصاص)

بعض فقہاءِ اُمت نے تصریح اور تاکید کی ہے کہ جن اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال ہے انھیں واقعتہً اور عملاً یہودی اور نصرانی ہونا چاہئے محض اسمًا یا نسلاً ان کا "قوم" اہلِ کتاب کے ہاں ہونا کافی نہیں ورنہ جو علّت مشرکین کے ذبیحہ کی حرمت کی ہے وہی یہاں بھی مشترک ہے حضرت علیؓ اور دوسرے صحابیوں کے فتوے اس باب میں موجود ہیں، اس وقت جو نصرانی محض نام کے تھے، ان کے ذبیحہ کے کھانے سے آپ نے روک دیا ہے، حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور بعض تابعین سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

عن علیؓ قال لاتاکلوا ذبائح نصاری بنی تغلب فانھم لم یتمسکوا بشیٔ من النصرانیۃ الا بشرب الخمر (ابن جریر) عن ابن عباسؓ قال لاتاکلوا ذبائح نصاری العرب ذبائح نصاری ارمینیہ (ابن جریر) وقال بھٰذا من الصحابۃ علیؓ وعائشۃؓ وابن عمرؓ وھو قول طاؤس والحسن (قرطبی)

کثرت سے اکابر تابعین وائمۂ فقہ کا یہ قول موجود ہے کہ کتابیوں کا ذبیحہ بہر صورت جائز ہے۔

وذھب اکثر اھل العلم الی انہ یحل وھو قول الشعبی وعطاء والزھری ومکحول (معالم)

حسن بصری تابعی کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ اگر کوئی یہودی یا نصرانی کے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام خود سُن لو، جب تو نہ کھاؤ، ورنہ کھا لینے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

وقال الحسن اذا ذبح الیھود والنصرانی فذکر اسم غیر اللہ وانت تسمع فلا تاکلہ واذا غاب عنک فکل فقد احل اللہ لک۔ (معالم۔ روح)

لیکن واضح رہے کہ یہ سارے اختلافات اس صورتِ حال کے موقع پر ہیں جب جانور بہر حال ذبح ہوا ہو، لیکن جب ذبح ہی کی نوبت سرے سے نہ آئے مثلاً مرغ کو گردن مروڑ کر ہلاک کر دیا گیا تو ایسے غیر مذبوح جانور کے جواز کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، اور آج کل برائے نام مسیحی قوموں میں جو عام دستور ہے، سب پر ظاہر ہے۔

۱۳۱ھ (سو تم اپنے کھانے سے انھیں بلا تکلف کھلا سکتے ہو)

مسلمان رُک رہے تھے کہ معلوم نہیں ہمارے لئے جائز بھی ہے یا نہیں کہ ہم کتابیوں کو اپنے کھانے میں سے

کھا سکیں، یہاں تصریح کردی گئی کہ بے تکلف جائز ہے۔

فلا جناح علیکم ان تطعموھم (مدارک) ای وحل لکم ان تطعموھم من طعامکم (کبیر)

یہ صراحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ نکاح کا بیان معا بعد آرہا ہے، ذبیحہ تو طرفین سے حلال ہے لیکن مناکحت کا قیاس اس پر درست نہ ہوگا، نکاح کتابیوں کی صرف عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے، مسلمان عورت کا نکاح کتابی مرد سے جائز نہیں۔

لاجرم ذکر اللہ تعالیٰ ذلک تنبیھا علی التمییز بین النوعین۔ (کبیر)

**۳۲** ابھی ذکر کھانے پینے کی حلال چیزوں کا تھا، اب عورتوں کا ہے کہ زن مسلم اور زن کتابی تمہارے لئے حلال ہے، مواکلت کی طرح مناکحت بھی انسان کی ایک طبعی خواہش ہے اس لئے دونوں کے احکام اگر اکٹھے لائے گئے تو یہ عین باہمی مناسبت کا تقاضہ ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ۔ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ مسلمات اور کتابیات دونوں کے درمیان اصلاً قدر مشترک سلسلۂ وحی و نبوت پر ایمان ہے، یہود و نصاریٰ کے اعمال فاسقانہ ہوں اور بعض عقائد کیسے ہی غالیانہ نہ ہوں، بہرحال اصلاً وہ لوگ توحید ہی کے قائل ہیں، اور سلسلۂ وحی و نبوت کے ماننے والے، اور عقائد کے باب میں بھی ذو عنوانات اہم ترین ہیں، البتہ یہ خیال رہے کہ "نصرانیت" موجودہ یوروپی قوموں کی مسیحیت کے مرادف نہیں۔

نکاح کتابیوں کے ساتھ بالکل جائز ہے نفس جواز میں کوئی گفتگو اس نص کے بعد چل ہی نہیں سکتی، البتہ فقہاء نے مفسدوں پر نظر کرکے اور مصلحت شرعی کا لحاظ کرکے فتویٰ یہ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاحوں سے بچنا چاہئے۔

یجوز تزوج الکتابیات والاولیٰ ان لا یفعل (فتح القدیر) وصح نکاح کتابیۃ وان کرہ تنزیھا (در مختار)

اور کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کی کراہت میں تو شبہ نہیں۔

وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعا لافتتاح باب الفتنۃ (فتح القدیر) واصحابنا یکرھون مناکحات اھل الحرب من اھل الکتاب (جصاص) یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیۃ فی دار الحرب ولکنہ یکرہ (مبسوط)

حنفیہ کے اس قول کا ماخذ حضرت علیؓ کا ایک اثر ہے جس میں آپ نے کتابیہ مقیم دار الحرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔

بلغنا عن علی بن ابی طالب انہ سئل عن مناکحۃ اھل الحرب من اھل الکتاب فکرہ ذلک وبہ ناخذ (مبسوط)

علامہ شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر حربیہ کے ساتھ تو محض مکروہ تنزیہی ہے، لیکن حربیہ کے ساتھ مکروہ تحریمی۔

قولہ والاولیٰ ان لا یفعل یفید کراھیۃ التنزیہ فی غیر الحربیۃ وما بعدہ یفید کراھیۃ التحریم فی الحربیۃ۔ (رد المحتار)

وَالْمُحْصَنٰتُ۔ ترکیب میں عطف ہے الطیبات پر اوپر کی آیت میں۔

الْمُحْصَنٰتُ۔ پر حاشیہ پارہ پنجم کی ابتداء میں گزر چکا، یہاں مراد ہے کہ قید عصمت کی پابند اور پارسا ہوں، یہ نہ ہو کہ ادھر کسی کے عقد میں بھی ہوں اور ادھر بدچلنی اور عصمت فروشی بھی جاری رکھیں۔

الحصان فی النساء ھی العفۃ عن الزنا (ابن کثیر)

لفظ کے لانے سے مقصود عصمت کی عظمت کو بڑھانا اور اس کی ترغیب دینا ہے، ورنہ قانونی حیثیت سے نکاح منعقد تو ہر نیک چلن، بدچلن اور بیوی باندی سب کا ہو سکتا ہے۔

ھی الحرائر والعفائف ولیس ھذا بشرط لصحۃ النکاح بل ھو للاستحباب لانہ یصح نکاح الاماء

أُجُورَهُنَّ مُحۡصِنِينَ غَيۡرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِيٓ أَخۡدَانٖۗ

اور قید نکاح میں لانے والے ہو، نہ کر (محض) مستی نکالنے والے، اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے ۳۳ ؎

ع ۱ ۵

من المسلمات ونکاح غیر العفائف (مدارک) روی عن الحسن والشعبی وابراهیم والسدی انهم العفائف (جصاص) قال ابو عبید یعنی العواهر فهذا یدل علی أن معنی الاحصان عنده هٰهنا کان علی العفة (جصاص)

اِذَآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ. مہر شرط نکاح نہیں لیکن مہر کی عظمت اور اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید بار بار اس کا ذکر تصریحاً کرتا ہے۔

وتقیید التحلیل بایتاء الاجور یدل علی تاکد وجوبها (کبیر) وتقیید الحل بایتائها لتاکید وجوبها. (روح)

شیخ رشید رضا مصری نے آیت کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث اس پر کی ہے کہ جن مشرک عورتوں سے نکاح ممنوع ہے اُن سے مراد صرف مُشرکاتِ عرب ہیں، یا عام مشرکات، اور ابن جریر طبری کے حوالہ سے ترجیح پہلی شق کو دی ہے، ملخص هذا الفتوی ان المشرکات اللاتی حرم الله نکاحهن فی اٰیة البقرة من مشرکات العرب وهو المختار الذی رجحه شیخ المفسرین ابن جریر الطبری (المنار)

۳۳ ؎ نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں، ایک اہم اور زبردست اخلاقی، اجتماعی، روحانی ادارہ ہے اس کے منافع و مصالح فرد کے لئے، خاندان کے لئے، معاشرہ کے لئے سب کے لئے بے شمار ہیں، اور اسی رعایت سے نکاح یا شادی کے لئے اردو میں بھی دوسرا لفظ "خانہ آبادی" کا ہے، اُجڑے ہوئے سنسان، اور ویران گھر گھرانے اسی ذریعہ سے آباد ہوتے ہیں، مرد و زن کے باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا، ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو، اپنے کو مہذب و متمدن کہلانے والی لیکن حقیقۃً جاہلی قوموں میں اس صورتِ مناکحت کے علاوہ دو اور صورتیں مرد و زن کے تعلق کی پہلے بھی جاری رہی ہیں، اور اب بھی جاری ہیں۔

ایک شکل تو کھلم کھلا بدکاری کی ہے، عورت زنا کے لئے آزاد ہے، اس کو باقاعدہ اپنا پیشہ بنا لے، نہ سوسائٹی اُسے اس سے روک سکے، نہ حکومت، جو مرد جب چاہے اس کے ہاں جا کر ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہا آئے، اور منہ کالا کر کے چلا آئے دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنی ہی مٹ جائیں اور شریف و بیسوا میں کوئی فرق نہ رہ جائے البتہ اس سے پبلک فضیحتا (SCANDAL) نہ پھیلتا ہو یعنی جاننے اپنی جگہ سب ہوں لیکن عام زبانوں پر چرچے نہ پھیلیں۔

اسلام نے ان دونوں مہذب جُرموں کو ایک لعنت قرار دیا اور جائز صورت مرد و عورت کے جنسی شہوانی تعلق کی صرف نکاح بتائی، نکاح چوری چھپے نہیں، اعلان کے ساتھ ہوتا ہے اس میں خدا کا نام درمیان میں لا کر خالقِ کائنات کا واسطہ ڈال کر مرد عورت کی راحت آسائش کا ذمہ لیتا ہے اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کر لیتی ہے دو اجنبی خاندان ملتے ہیں، دُہری سسرالیں قائم ہوتی ہیں، سسرالی عزیزوں کا ایک طویل سلسلہ وجود میں آتا ہے میاں بیوی پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقبل نباہ کے لئے عمر کے ہر دور، زوال و اقبال کے ہر اتار چڑھاؤ، صحت و علالت کے ہر امکان کے لئے تیار کرتے ہیں اور یہ معاہدہ گواہوں کی موجودگی میں بزرگوں اور خوردوں کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے محصنین غیر مسافحین ولا متخذی اخدان لا کر قرآن مجید نے ازدواجی و خانگی زندگی کا وہ بنیادی

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ

اور جو کوئی ایمان سے انکار کرے گا تو اس کا عمل اکارت جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے

الْخٰسِرِيْنَ ۵ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

والوں میں سے ہوگا ۳۴ اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو ۳۵

معیار پیش کر دیا، جہاں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے اسلام نے نکاحی تعلق میں ایک تقدیس پیدا کر دی ہے۔

۳۴ (گو اس کا حال اور مستقبل قریب بظاہر کیسا ہی خوشنما ہو)

بِالْاِيْمَانِ یعنی مقتضیات ایمان سے، ان چیزوں سے جو ایمان لانے سے واجب ہو جاتی ہیں اور انہی میں حلت وحرمت کے مسائل بھی آجاتے ہیں۔

ای بشرائع الاسلام وما احل اللہ وما حرم (کشاف) قال الزجاج معناہ من احل ما حرم اللہ او حرم ما احل اللہ فھو کافر۔

حَبِطَ عَمَلُهٗ۔ کوئی عمل کیسا ہی خوشنما ہو اگر روح سے خالی ہے تو اس کا شمار نیکی میں نہیں ہو سکتا، ایمان نام اسی روحِ عمل کا ہے تو جس کی نیت ہی سرے سے درست نہیں اور جو ایمان کی دولت سے یکسر محروم ہے ظاہر ہے کہ اس کے اعمال صرف صورۃً نیک ہو سکتے ہیں نہ کہ معنی وحقیقت کے لحاظ سے، نیکی کی نقل اور چیز ہے اور خود نیکی اور۔

۳۵ یعنی نماز کا ارادہ کرو اور حالتِ وضو میں نہ ہو جسماً اٹھ کھڑے ہو جانا مراد نہیں۔

ای اذا اردتم (قرطبی) فالتقدیر فاذا اردت فاکتفی بالسبب عن المسبب (برھان) ای اذا اردتم القیام عبر عن ارادۃ الفعل بالفعل المسبب عنھا للایجاز (بیضاوی)

اتنا فقرہ کہ حالت وضو میں نہ ہو یا محدث ہو محذوف مانا گیا ہے اجماعاً، اسی لئے وضو پر وضو نماز کے لئے ضروری نہیں۔

وظاھر الآیۃ یوجب الوضوء علی کل قائم الی الصلوۃ وان لم یکن محدثا والاجماع علی خلافہ (بیضاوی) مطلق ارید بہ التقیید والمعنی اذا قمتم الی الصلوۃ محدثین (بیضاوی) وقد روی نفی ایجاب الوضوء بکل صلاۃ من غیر حدث عن ابن عمر وابی موسی وجابر بن عبد اللہ وعبیدۃ السلمانی وابی العالیۃ وسعید بن المسیب وابراھیم والحسن ولا خلاف بین الفقھاء فی ذلک (جصاص)

تازہ وضو گو فرض نہیں لیکن اس کی فضیلت بہت زائد وارد ہوئی ہے اور رسول اللہ صلعم اور خلفاء راشدینؓ کا تعامل بھی یہی تھا چنانچہ وضو پر وضو کرنے کے استحباب کے سب قائل ہیں۔

وقد روی عن النبی صلعم اخبار فی تجدید الوضوء (جصاص) وقد روی عن ابی بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ انھم کانوا یتوضؤن لکل صلوۃ وھذا محمول علی انہ فعلوہ استحبابا (جصاص) وقال صلی اللہ علیہ وسلم لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالوضوء عند کل صلوۃ۔ فھذا کلہ یدل علی استحباب الوضوء عند کل صلوۃ وان لم یکن محدثا (جصاص) قال ابن سیرین کان الخلفاء یتوضؤن لکل صلوۃ (قرطبی) حملوا الامر علی الندب وکان کثیر من الصحابۃ منھم ابن عمر یتوضؤن لکل صلوۃ طلباً للفضل وکان علیہ السلام یفعل ذلک۔ (قرطبی)

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ

تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں پر مسح کر لیا کرو اور

وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ

اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھو لیا کرو)٣٦

٣٦ اب تعلیم ارکانِ وضو کی ہو رہی ہے، اسلام بخلاف دوسرے مذہبوں کے باطنی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ ظاہری و جسمانی صفائی کا بھی بہت قائل ہے اور اس نے اپنی مرکزی عبادت نماز سے قبل وضو کو لازمی ٹھہرا لیا ہے کہ بغیر اس کے نماز درست ہی نہیں، آیت احکامِ قرآنی کی اہم ترین آیتوں میں سے ہے۔

ذکر العلماء ان هذه الآية من اعظم آيات القرآن مسائل واكثرها احكاما في العبادات وبحق ذالك۔ (ابن العربی)

یہاں تک کہ اس آیت کے اندر سے بعض بعض علماء اور فقہاء نے آٹھ آٹھ سو اور ہزار ہزار مسئلے مستخرج اور مستنبط کئے ہیں۔

ولقد قال بعض العلماء ان فيها الف مسئلة واجتمع اصحابنا بمدينة السلام فتتبعوها فبلغوها ثمان مائة مسئلة ولم يقدروا ان يبلغوها الالف۔ (ابن العربی)

وضو میں فرض صرف چار چیزیں ہیں اور انہی کا آیت میں بیان ہے:۔

(۱) فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ چہرہ کا دھونا۔ (۲) وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ۔ ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا۔ (۳) وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ سر کا مسح کرنا یا پانی میں تر کیا ہوا ہاتھ اس پر پھیرنا (۴) (اغْسِلُوْا) اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ پیروں کا ٹخنوں سمیت دھونا۔ ان کے علاوہ اور جو چیزیں ہیں مثلاً کلی کرنا، مسواک کرنا، ناک میں پانی لینا، غرغرہ کرنا، وَقِسْ عَلٰى هٰذَا۔ ان میں سے بعض امور مسنون ہیں اور بعض مستحب، تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملے گی، تفسیر سے اس کا تعلق نہیں، اعضائے وضو پر پانی بہانا، انھیں دھونا، ملنا، صاف کرنا اپنے اندر جتنی بھی حکمتیں اور جسمانی مصلحتیں رکھتا ہے اور حضورِ قلب میں جس حد تک معین ہو سکتا ہے، ان پہلوؤں پر تفصیل سے لکھنے کے لئے ایک مستقل مقالہ کی ضرورت ہوگی۔

فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ۔ مالکیہ کے ہاں چہرہ دھونے کے معنی یہ ہیں کہ پانی اس پر بہایا جائے اور ہاتھ اس پر پھیرا جائے، لیکن حنفیہ کے ہاں محض پانی کا اس پر بہہ جانا کافی ہے، ہاتھ سے ملنا اور رگڑنا لازمی نہیں۔

ولابد في غسل الوجه من نقل الماء اليه وامرار اليد عليه وهذه حقيقة الغسل عندنا (قرطبی)

قال آخرون وهو قول اصحابنا وعامة الفقهاء عليه اجراء الماء عليه وليس عليه دلكه بيده (جصاص)

وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ۔ اِلٰى اظہارِ غایت و انتہا کے لئے آتا ہے اور اس فیصلہ کا تعلق سیاق سے ہے کہ اِلٰى کا مابعد بھی اِلٰى کے ماقبل کے ساتھ شامل رکھا جائے یا اس سے الگ سمجھا جائے، بعض ماہرینِ نحو نے یہ بھی کہا ہے کہ مابعد اگر ہم جنس ہے تو ماقبل کے ساتھ شامل سمجھا جائے گا اور اگر غیر جنس ہے تو اس سے خارج رہے گا۔

لان ما بعد الى اذا كان من نوع ما قبلها دخل فيه قاله سيبويه وغيره (قرطبی) قال الخليل في قوله تعالى الى المرافق ان المرافق فيما يغسل (تاج) القول الثاني ان الى حد والحد اذا كان من جنس المحدود دخل فيه۔ (ابن العربی)

الیٰ۔ کبھی معیت کے معنی بھی دیتا ہے، اور مع کا مرادف ہوتا ہے۔

وتاتی للمعیۃ۔ (تاج)

چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں اسی معنی میں آیا ہے: واذا خلوا الیٰ شیاطینهم۔ من انصاری الی اللہ۔ ولا تاکلوا اموالهم الیٰ اموالکم وغیرها۔ اور بہت سے نحویین نے یہاں بھی الیٰ اسی معنی میں لیا ہے۔

فان جماعۃ النحویین جعلوا الیٰ بمعنی مع ههنا واوجبوا غسل المرافق والکعبین۔ (تاج)

رسول اللہ صلعم کا تعامل بھی کہنیاں دھونے کا تھا، بہرحال لفظ الیٰ سے اگر کچھ اشتباہ رہ بھی گیا ہو تو سنّتِ رسولؐ نے اُسے رفع کر دیا ہے۔

روی جابرؓ بن عبد اللہ ان النبی صلعم کان اذا بلغ المرفقین فی الوضوء ادار الماء علیهما وفعلہ ذالک عندنا علی الوجوب لورودہ مورد البیان (جصاص) عن النبی صلعم انہ کان یدیر الماء علیٰ مرفقیہ (مدارک)

حنفیہ کے ہاں تو کہنی کا اعضاء وضو میں داخل ہونا ایک متفقہ مسئلہ ہے ہی (اختلاف صرف امام زفرؒ سے منقول ہے)

والذی ذکرنا من دخول المرافق فی الوضوء هو قول اصحابنا جمیعا الا زفر (جصاص)

باقی دوسرے مذاہبِ فقہ نے بھی کہنی کا دھونا لازم قرار دیا ہے۔

وجمهور الفقهاء علی دخولها وحکی عن الشافعیؒ انہ قال لا اعلم خلافا فی ان المرافق یجب غسلها (روح) فقد نقل ابن هبیرۃ اجماع الائمۃ الاربعۃ علی فرضیۃ غسل الیدین مع المرفقین (روح) قال الجمهور غسل الیدین الی المرفقین واجب معهما۔ (کبیر)

وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ۔ مسح سے مراد بھیگے ہوئے ہاتھ کے پھیر لینے سے ہے۔ جملہ کی ترکیب (بِرُءُوْسِكُمْ) اس کی مقتضی ہے کہ مراد پورے سر کا مسح نہیں بلکہ اس کے کسی حصہ کا ہے، چنانچہ حنفیہ کے ہاں سر کے چوتھائی حصہ کا مسح کافی ہے، اور بِ تبعیض کے لئے ہے

یقتضی مسح بعضہ (جصاص) لخبر ابراهیم ان الباء للتبعیض وقد کان من اهل اللغۃ مقبول القول فیها (جصاص)

الباء مزیدۃ وقیل للتبعیض (ابو سعود) روی عن اصحابنا فیہ روایتان احداهما ربع الرأس والاخری مقدار ثلاثۃ اصابع (جصاص)

نحویین کے ایک گروہ نے بِ کے تبعیضیہ ہونے سے انکار بھی کیا ہے۔

وکونها للتبعیض ینکرہ اکثر النحاۃ حتی قال بعضهم وقال من لا خبرۃ لہ بالعربیۃ الباء فی مثل هذا للتبعیض ولیس بشیء یعرفہ اهل العلم (بحر)

تاہم رُبعِ سر کے لئے حنفیہ کے ہاں دلیل سنّتِ رسولؐ سے ہے، آپ کا تعامل پیشانی پر مسح کا تھا اور پیشانی کی مقدار رُبعِ سر کے برابر ہو جاتی ہے۔

والمفتقر الی البیان بیان النبی صلعم وهو ما روی انہ مسح علی ناصیتہ وقدرت الناصیۃ بربع الرأس۔ (مدارک)

وارجلکم۔ شامی ونافع وعلی وحفص سب سے اس کی قراءت نصب کے ساتھ اَرْجُلَ مروی ہے جب سے اَرْجُلَكُمْ، فَاغْسِلُوْا کا مفعول ٹھہرتا ہے اور وُجُوْهَكُمْ اور اَيْدِيَكُمْ پر عطف ہوتا ہے اور معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں اور پیروں کو دھوؤ

بالنصب شامی ونافع وعلی وحفص والمعنی فاغسلوا وجوهکم وایدیکم وارجلکم (مدارک)

قرأ نافع ابن عامر والکسائی ارجلکم بالنصب (قرطبی) عن ابی عبد الرحمٰن قال قرأ علیؓ الحسنؓ والحسینؓ

فقرأ وارجلکم الی الکعبین فمسح علیؓ ذلک وکان یقضی بین الناس فقال وارجلکم وھذا من المقدم والمؤخر من الکلام (ابن جریر) قرأ علی وعبد اللہ بن مسعود وابن عباس فی روایۃ وابراھیم والضحاک ونافع وابن عامر والکسائی وحفص عن عاصم بالنصب وکانوا یرون غسلھا واجبا (جصاص)

دونوں پیروں کا دھونا ہی (نہ کہ ان پر صرف مسح کرنا) سنّتِ رسولؐ سے بھی ثابت ہے اور تعاملِ صحابہؓ سے بھی، اور عطاءؒ تابعی کا قول ہے کہ صحابہ کا اس بارہ میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

ھذا مذھب الجمھور والکافۃ من العلماء وھو الثابت من فعل النبی صلعم (قرطبی) عن علیؓ قال اغسلوا الاقدام الی الکعبین (ابن جریر) وعن عطاء قال واللہ ما علمت ان احدا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی القدمین (انما امر بغسل ھذہ الاعضاء (مدارک) یؤیدہ السنۃ الشائعۃ وعمل الصحابۃ وقول اکثر الائمۃ (بیضاوی) ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم غسل وما مسح قط (ابن العربی) قال جمھور الفقھاء والمفسرین فرضھما الغسل (کبیر)

اور فقہاء کی عبارتیں بھی انھیں مفسرین کے قریب قریب ہیں۔

ولنا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم واظب علی غسل الرجلین وبہ امر من علمہ الوضوء ورأی رجلا یلوح عقبہ فقال ویل للاعقاب من النار (المبسوط) والجواب بان وجوب ولمۃ بالعبارۃ والاخری بالدلالۃ لاطائل تحتہ بعد انعقاد الاجماع القطعی علی افتراضھما فان الاجماع انعقد علی غسلھما (بحر الرائق)

لیکن دوسری قرأت جرِّ لام کے ساتھ اَرْجُلِکُمْ کی بھی ہے یعنی بجائے نصب کے خفض کی۔

وقرأ ذلک آخرون من قراء الحجاز والعراق بخفض الارجل (ابن جریر) قرأ ابن کثیر وحمزۃ وابو عمرو وعاصم فی روایۃ ابی بکر عنہ بالجرّ (کبیر) قرأ ابن عباس والحسن وعکرمۃ وحمزۃ وابن کثیر بالخفض (جصاص)

اس ترکیب میں اَرْجُلِکُمْ کا عطف بجائے وُجُوْھَکُمْ و اَیْدِیَکُمْ کے رُءُوْسِکُمْ پر ہوتا ہے اور اَرْجُلِکُمْ بجائے فَاغْسِلُوْا کے مفعول ہونے کے بِرُءُوْسِکُمْ کے حرف جارّہ بِ کا مجرور ٹھہرتا ہے اور ترجمہ اس صورت میں یہ ہوگا۔

”مسح کرلیا کرو اپنے سروں اور اپنے پیروں پر“۔

چنانچہ شیعہ امامیہ کا مذہب مسحِ قدمین یہیں سے ماخوذ ہے۔

وھو مذھب الامامیۃ من الشیعۃ۔ (کبیر)

لیکن یہ مذہب محض امامیہ کا نہیں، بلکہ بعض اکابر اہلِ سنّت بھی اس طرف گئے ہیں اور بعض تابعین بلکہ بعض صحابہؓ سے بھی یہ مسلک نقل ہوا ہے۔

قال انس نزل القرآن بالمسح والسنۃ الغسل (ابن جریر) وکان عکرمۃ یمسح رجلیہ وقال لیس فی الرجلین غسل انما نزل فیھما المسح (قرطبی) وعن ابن عباس وقتادۃ افترض اللہ مسحین وغسلین وبہ قال عکرمۃ والشعبی (ابن العربی) نقل القفال فی تفسیرہ عن ابن عباس وانس بن مالک وعکرمۃ والشعبی وابی جعفر محمد بن علی الباقر ان الواجب فیھما المسح (کبیر)

امام المفسرین ابن جریر طبری نے تحسین دونوں قرأتوں کی کی ہے، نصب کی اور خفض کی بھی۔

وکانت القرأتان کلتاھما حسنًا صوابًا۔

بلکہ موصوف کا رجحان مسلک خفض و جرّ کی جانب غیر مخفی ہے۔

والصواب من القول عندنا فی ذلک ان اللہ امر بعموم مسح الرجلین بالماء فی الوضوء (ابن جریر)

لیکن خود "مسح" سے ابن جریر کی مراد (جیسا کہ ابھی اُن کی عبارت میں گزر چکا) مسح جزوی نہیں بلکہ مسح پورے پیروں کا، اور یہی حسن بصری تابعی سے بھی منقول ہے۔

والمحفوظ عن حسن البصری استیعاب الرجل کلھا بالمسح (جصاص)

اور اس توضیح کے بعد قدمین سے مراد پیر کے اوپر کے کسی حصہ کا مسح نہیں بلکہ پورے پیر کا مسح ہے مسح اور غسل کے درمیان فرق عملاً کچھ زیادہ نہیں رہ جاتا ہے سوا اس کے کہ غسل میں عضو پر پانی بہایا جاتا ہے اور مسح میں بھیگا ہوا ہاتھ اس پر پھیر لیا جاتا ہے۔

اور متأخرین میں اسی طرف رشید رضا مصری بھی گئے ہیں۔

والصواب من القول عندنا فی ذلک ان اللہ امر بعموم مسح الرجلین بالماء فی الوضوء کما امر بعموم مسح الوجہ بالتراب فی التیمّم واذا فعل ذلک بھما المتوضیٔ کان مستحقا اسم ماسح غاسل لان غسلھما امرار الماء علیھما او اصابتھما بالماء ومسحھما امرار الید وما قام مقام الید علیھما (المنار)

امام ابن جریر نے خود ہی یہ سوال قائم کیا ہے کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ مسح سے مراد سر کا تو مسح جزئی ہے اور پیر کا مسح کلّی، اور پھر خود ہی جواب دیا ہے:۔

| | |
|---|---|
| الدلیل علی ذلک تظاھر الاخبار عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ویل للأعقاب وبطون الاقدام من النار۔ | اس کی دلیل وہ وعیدیں ہیں جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایڑی اور پیر کے تلوے خشک رہ جانے پر بیان فرمائی ہیں۔ |

اور مذہب جمہور اہل سنّت کی تائید میں دو دلیلیں اور بھی قابل ذکر ہیں:۔
ایک یہ کہ ارجلکم کا اعراب اگر جرّ سے بھی ہو تو محض لسانی قاعدۂ مجاورت کے لحاظ سے حکم فقہی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا دوسرے یہ کہ ایسے شخص سے جس نے وضو میں پیر پوری طرح نہیں دھوئے تھے حضرت عمرؓ نے وضو دوبارہ کرا کے نماز پڑھوائی، جس کے معنی یہ ہیں کہ بغیر پیر دھوئے وضو ناقص تھا۔

اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ یعنی ٹخنوں کو شامل کر کے۔

وحکم الکعبین کالمرفقین۔ (البحر الرائق)

اِلی کے مفہوم سے متعلق یہاں بھی وہی بحثیں ہوئی ہیں جو اِلَى الْمَرَافِقِ کے تحت میں اوپر گزر چکیں۔
وضو ہی کے سلسلہ میں فقہاء کے درمیان ایک طویل بحث نیت کی بھی آ گئی ہے حنفیہ کے ہاں نیت واجب نہیں، دوسرے ائمہ کے بابت روایتیں مختلف ملتی ہیں۔

وقال کثیر من الشافعیۃ لاحاجۃ الی نیۃ وھو قول الحنفیۃ (قرطبی) النیۃ فی الطھارۃ واجبۃ فیہ وبہ قال مالک والشافعی واکثر العلماء وروی الولید بن مسلم عن مالک انھا غیر واجبۃ فیہ وبھا قال ابوحنیفۃ والاوزاعی سواء قارنتہ النیّۃ اولم تقارنہ (جصاص) قال ابوحنیفۃ وابو یوسف

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰۤى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ

اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو (سارا جسم) پاک صاف کرو ۳۷ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے

اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً

کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورت سے صحبت کی ہو ۳۸ پھر تم کو پانی نہ ملے ۳۹

وعندنا كل طهارة بماء تجوز بغير نية ولا يجزي التيمم الا بنية وهو قول الثوري وقال الاوزاعي يجزي الوضوء بغير نية (جصاص) قال الشافعي النية شرط لصحة الوضوء والغسل وقال ابو حنيفة ليس كذلك (كبير) اختلف علماء الامصار هل النية شرط صحة الوضوء ام لا فذهب فريق منهم الى انها شرط وهو مذهب الشافعي ومالك واحمد وذهب فريق آخر الى انها ليست بشرط وهو مذهب ابي حنيفة والثوري (بداية المجتهد)

۳۷ یعنی غسل کرلو، یا سارے جسم کو پانی سے دھو ڈالو۔

اي فاغتسلوا (معالم۔ بیضاوی) امر بالاغتسال بالماء (قرطبی)

جُنُبًا۔ جنابت پر حاشیہ سورۃ النساء میں گزر چکا۔

فَاطَّهَّرُوۡا۔ یہیں سے نکتہ سنج فقہاء نے سارے جسم کے دھونے کا حکم نکالا ہے، اور محض بعض اعضاء کے دھو ڈالنے کو کافی نہیں سمجھا ہے، اور غسل واجب میں کلی، غرغرہ اور ناک میں پانی ڈالنے کا حکم بھی یہیں سے پیدا ہوا ہے۔

عموم سائر البدن فلا يجوز الاختصار على بعضه (جصاص) يقتضي تطهير داخل الفم والانف۔ (جصاص)

۳۸ (یا کسی اور طریقہ سے غسل ٹوٹ چکا ہو اور اب غسل کی ضرورت ہو)

لٰمَسۡتُمُ۔ ملامست سے کنایہ صحبت سے ہے صحابہ، تابعین، لغت سب سے یہی ثابت ہے۔

يكني بالملامسة عن الجماع (راغب) الملامسة هنا الجماع (قرطبی) قال علیؓ وابن عباسؓ وابو موسیٰؓ والحسنؒ وعبیدۃؒ والشعبیؒ هي كناية عن الجماع (جصاص) فمن قرأ ولٰمستم فظاهره الجماع لاغير لان المفاعلة لا تكون الا من اثنين الا في اشياء نادرة (جصاص)

۳۹ اس کا تعلق ضرورتِ وضو و غسل کی سب شکلوں سے ہے یعنی پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، خواہ بہ سبب مرض کے خواہ بہ سبب فاصلہ کے، یا کسی اور سبب سے۔

معناه فلم تقدروا على الماء (راغب)

سردی لگ جانے کا خوف، بیماری بڑھ جانے کا اندیشہ، پانی لانے میں بہت دشواریاں، یہ ساری چیزیں پانی نہ ملنے ہی کے حکم میں داخل ہیں، حدیث میں تصریح موجود ہے کہ عمرو بن العاصؓ نے پانی ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیا، اس لئے کہ پانی سے انھیں سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا، اور رسول اللہ صلعم نے اسے جائز رکھا۔

قد روي في حديث عمرو بن العاص انه تيمم مع وجود الماء لخوف البرد فاجازه النبي صلعم ولم ينكره۔ (جصاص)

حنفیہ کے ہاں سردی کے عذر پر بجائے غسل کے تیمم کر لینا بالکل جائز ہے۔

فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُم مِّنْهُ ۚ

تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس سے مسح کر لیا کرو ۱۴۰

مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُم مِّنْ حَرَجٍ

اللہ نہیں چاہتا کہ تمھارے اوپر کوئی تنگی ڈالے ۱۴۱

قال ابوحنیفة ومحمد من خاف برد الماء ان اغتسل جاز له التیمم لما یخاف من الضرر۔ (جصاص)

تیمم کے ساتھ نماز جماعت میں بھی شرکت کی پوری اجازت حدیث میں موجود ہے۔

وحدیث عمران بن حصین نص فی ذلک وھو ان رسول اللہ صلعم رای رجلا معتزلا لم یصل فی القوم فقال یا فلان ما منعك ان تصلی فی القوم فقال یا رسول اللہ اصابتنی جنابة ولا ماء قال علیك بالصعید فانه یکفیك ۔ اخرجه البخاری۔ (قرطبی)

فقہاء امت نے جنھیں حقیقۃً حکماء امت کہنا چاہئے، اسے خوب صاف کر دیا ہے کہ پانی مل سکتا تو ہو لیکن بہت گراں قیمت پر، یا موجود تو ہو لیکن اتنی کم مقدار میں کہ پینے کے لئے نہ بچ سکے گا تو ایسے ہر موقع پر پانی کا وجود اس کے عدم ہی کے برابر ہے، اور تیمم بالکل درست ہوگا۔

والجملة التی اتفق اصحابنا علیھا ان الوجود امکان استعمال الماء الذی یکفیه لطھارته من غیر ضرر فلو کان معه ماء وھو یخاف العطش او لم یجد الا بثمن کثیر تیمم ولیس علیه ان یغالی فیه۔ (جصاص)

۱۴۰ تیمم کا بیان اور اس کا طریقہ سب سورۃ النساء کی آیت متعلقہ کے ماتحت گزر چکا ہے۔

صَعِيدًا طَيِّبًا۔ صعید سے مراد مٹی کی جنس ہے جس چیز میں بھی اجزاء ارضی شامل ہوں اس حکم میں آجائے گی۔

وکان الصعید اسما للارض اقتضی ذلك جواز التیمم بکل ما کان من الارض (جصاص) قال ابوحنیفة یجزی التیمم بکل ما کان من الارض التراب والرمل والحجارة والزرنیخ والنورة والطین الاحمر والمرداسنج وما اشبھه وھو قول محمد وزفر (جصاص)

۱۴۱ (احکام شریعت کے ذریعہ سے بلکہ وہ تو تنگی رفع کرتا رہتا ہے جیسا کہ احکام تیمم سے ابھی ابھی ظاہر ہوگا) آیت میں ایک بہت بڑی اصل کا بیان آگیا یعنی یہ کہ اللہ نے شریعت میں مشقت و تعب نہیں رکھی ہے، اور اس ایک اصل سے بیسیوں مسائل نکل سکتے ہیں، اور محقق رازی کی نظر اس نکتہ تک خوب پہنچی ہے۔

اعلم ان ھذہ الآیة اصل کبیر معتبر فی الشرع وھو ان الاصل فی المضار ان لاتکون مشروعة۔ (کبیر)

احکام کا وہ مجموعہ جس پر شریعت کا اطلاق ہوتا ہے وہ تو نام ہی بہترین نقشۂ زندگی کا ہے، اور اس کا مقصود بھی یہ ہے کہ جو کوئی اس ہدایت نامہ پر عمل کرے، وہ زندگی کی دشواریوں کو بہترین اور سہل ترین طریق پر عبور کر سکے۔ احکام شریعت کو سخت سمجھ لینا ایسا ہی احمقانہ ہے جیسے کوئی بچہ اپنے شفیق اور تجربہ کار باپ کی ہدایتوں کو یا کوئی مریض اپنے دل سوز اور حاذق طبیب کے احکام کو ظلم و جبر سے تعبیر کرنے لگے بلکہ ان دونوں مثالوں سے بھی کہیں بڑھ کر احمقانہ

وَلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝٦ وَاذْكُرُوْا

بلکہ وہ (تو یہ) چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک صاف رکھے ۴۲ اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے تاکہ تم شکر گزاری کرو ۴۳ اور اپنے اوپر اللہ کی

نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا

نعمتوں کو یاد کر لیا کرو ۴۴ اور اس کے اس عہد کو بھی جس کا اس نے تم سے معاہدہ کیا ہے، (اس وقت) جب تم نے کہا کہ ہم نے سن لیا، اور مان لیا ۴۵

اور شیخ رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ احکام میں تنگی کی نفی جو اس آیت میں کی گئی ہے، وہ مطلق صورت میں ہے، اور اس کا تعلق اولاً اور براہ راست تو ان احکام سے ہے جو اس صورت میں مذکور ہیں اور ثانیاً اور بالواسطہ جمیع احکام شریعت سے۔

وقد اطلق هنا نفي الحرج والمراد به اولاً وبالذات ما يتعلق باحكام الآية او بما تقدم من الاحكام من اول السورة وثانياً وبالتبع جميع احكام الاسلام۔ (المنار)

۴۲ (معنوی و ظاہری ہر اعتبار سے)

طہارت کا لفظ صفائی قلب اور جسمانی پاکیزگی دونوں کے لئے عام و وسیع ہے، چنانچہ شریعت کے احکام دونوں اقسام کے جامع ہیں۔ مَا يُرِيْدُ. يُرِيْدُ. متکلمین نے آیت کے ان الفاظ سے استدلال کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ ارادہ ہے۔

دلت الآية على انه تعالى مريد وهذا متفق عليه بين الائمة (کبیر)

یہی الفاظ ان نیم مشرک، نیم ملحد قوموں کی تردید کے لئے بھی کافی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو صفتِ ارادہ سے محروم محض مشین کی طرح چند قاعدوں کا پابند و محکوم سمجھے ہوئے ہیں۔

تطہیر. باب تفعیل سے ہے یعنی خوب اچھی طرح تمہیں پاک و صاف کر دے، یہاں یہ نکتہ بھی خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ایک طرف صوفیۂ محققین اور دوسری طرف فقہائے امت نے کتاب و سنت ہی سے جو جزئیاتِ اعمال نکال نکال کر پیش کئے ہیں ان سے مقصود بھی تمام تر اسی تطہیرِ ظاہری و باطنی کی راہ میں سہولتیں پیدا کرنا ہے نہ کہ اور مشقتیں بڑھانا۔

۴۳ (اور ادائے شکر کی اعلیٰ ترین فرد ان احکام کی تعمیل ہے)

لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ. اور وہ اتمامِ نعمت یہی ہے کہ وہ اپنے قرب اور رضا کے راستے سہل ترین اور کامل ترین صورت میں تمہیں بتا دے

نعمته بالاسلام وببيان شرائع الدين (جلالین)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ شرعی رخصتوں سے تنگ دل ہونا اور ان پر ہوائے نفس کا شبہ کرنا جیسا کہ عمل میں غلو رکھنے والے کرتے رہتے ہیں، مزاحمتِ حق ہے۔

۴۴ (اور اس کی بڑی نعمت یہی ہے کہ اس نے فلاح دنیوی و اخروی کے طریقے اس تفصیل و اس تکمیل کے ساتھ تمہیں بتا دیئے ہیں)

النعمة هنا الاسلام۔ (بحر)

امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ نعمة الله سے یہاں مراد ان نعمتوں کی تعداد نہیں، بلکہ جنس نعمت ہے، نعمۃ بطور اسم جنس مستعمل ہوا ہے، اس لئے ضرورت صیغۂ جمع کی نہیں پڑی۔

وهي نعمة الاسلام او الاعم على ارادة الجنس۔ (روح)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سینوں کے اندر تک کا علم رکھتا ہے ۴۶ اے ایمان والو اللہ

اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ

کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ شہادت دینے والے رہو ۴۷

۴۵ میثاقکم۔ اس سے کون سا عہد مُراد ہے؟ ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد عالمِ ارواح کا وہ عہد ہے جو سارے بنی آدم سے اقرارِ ربوبیت کی بابت لیا گیا تھا۔

قال مجاھد وکلبی ومقاتل ھو المیثاق الذی اخذہ اللہ تعالٰی منھم حین اخرجھم من ظھر ادم۔ (کبیر)

روحِ انسانی کے اندر جو فطری طلبِ خدارسی کی اور طبعی خواہش خداطلبی کی ہے یہ اسی عہد کا عملی ظہور ہے۔ لیکن خطاب یہاں عام نوعِ بشر سے نہیں، بلکہ اہلِ ایمان سے ہے اس لئے آسان اور بےتکلف صورت یہ ہے کہ وہ عہد مراد لیا جائے جو ہر کلمہ گو انسان اسلام قبول کرتے وقت کرتا ہے یعنی تعمیلِ احکام کا اجمالی عہد۔

قیل المیثاق اقرار کل مومن بما التزمہ (بحر)

اس سے بھی زیادہ دل نشین تفسیر یہ ہے کہ میثاقکم سے مراد بیعت واطاعت کے وہ عہد ہیں جو رسول اللہ صلعم نے مسلمانوں سے لئے تھے ابن عباسؓ صحابی اور سدی تابعی وغیرہم سے یہی معنی مروی ہیں۔

والذی علیہ الجمھور من المفسرین کابن عباسؓ والسدی ھو العھد والمیثاق الذی جری لھم مع النبی صلعم علی السمع والطاعۃ فی المنشط والمکرہ کما جری لیلۃ العقبۃ وتحت الشجرۃ (قرطبی) المراد ھو المواثیق التی جرت بین رسول اللہ صلعم وبینھم فی ان یکونوا علی السمع والطاعۃ فی المحبوب والمکروہ (کبیر) وھذہ ھی البیعۃ التی کانوا یبایعون علیھا رسول اللہ صلعم عند اسلامھم (ابن کثیر) وذلک حین بایعوا رسول اللہ صلعم علی السمع والطاعۃ فی ما احبوا وکرھوا وھو قول اکثر المفسرین (معالم)

ایسے عہد لئے تو تھے رسول اللہ صلعم نے لیکن حق تعالٰی نے ان کے اہتمامِ شان کے اظہار کے لئے انہیں منسوب اپنی ہی جانب فرمایا۔

واضافہ تعالٰی الی نفسہ کما قال انما یبایعون اللہ فبایعوا رسول اللہ صلعم (قرطبی)

سدی تابعی سے یہ تفسیر بھی منقول ہے کہ اس میثاق سے مراد حقانیتِ اسلام کے دلائل عقلی ونقلی ہیں اور متکلمین نے عموماً یہی معنی اختیار کئے ہیں۔

قال السدی المراد بالمیثاق الدلائل العقلیۃ والشرعیۃ نصبھا اللہ تعالٰی علی التوحید والشرائع وھو اختیار اکثر المتکلمین (کبیر)

۴۶ اس حقیقت کے استحضار سے تعمیلِ احکام میں اخلاص کا پیدا ہو جانا لازمی ہے، ورنہ عمل بلا اخلاص سے تو محض مشقت ہی مشقت ہاتھ رہے گی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ اللہ سے ڈرنا یہی ہے کہ اس کے احکام کی مخالفت سے بچو، پہلے یہ بتایا کہ تعمیلِ احکام میں نفع

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؗ

اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر نہ آمادہ کر دے کہ تم (اس کے ساتھ) انصاف ہی نہ کرو، انصاف کرتے رہو (کہ) وہ تقوی سے بہت قریب ہے ۴۲۸

تمہارا ہی ہے اپنی ہی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان احکام پر عمل کیا جائے، پھر یہ یاد دلا دیا کہ تم عہد و معاہدہ بھی تو کر چکے ہو اب اخلاقی فرض ان معاہدوں کو پورا کرنا ہے اب وَاتَّقُوا اللّٰهَ میں اشارۃً یہ بتایا جا رہا ہے کہ مخالفت و عدم تعمیل میں ضرر بھی تمہارا ہی ہے۔

۴۲۷ (کہ یہی مومن کے مقتضائے شان ہے۔)

قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ۔ یعنی اللہ کے احکام کی پوری پابندی کرتے رہو۔

معناہ کونوا قوامین للہ بالحق فی کل ما یلزمکم القیام بہ من الامر بالمعروف والعمل بہ والنھی عن المنکر واجتنابہ (جصاص) والمراد حثھم علی الانقیاد لتکالیف اللہ تعالٰی۔ (کبیر)

لِلّٰهِ۔ یعنی اللہ کی رضا جوئی کے لئے۔

ای لاجل ثواب اللہ۔ (قرطبی)

مطلب یہ ہوا کہ حقوق اللہ کی ادائی میں ہمہ وقت مستعد رہو۔

اشارۃ الی التعظیم لامر اللہ (کبیر)

شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ یعنی ہر معاملہ میں مرتبۂ انصاف کا لحاظ رکھو، یہ تاکید ہوئی حقوق العباد کی ادائی کی۔

اشارۃ الی الشفقۃ علی خلق اللہ۔ (کبیر)

۴۲۸ گویا ادائے حقوق ہی کا دوسرا نام تقوی ہے۔

اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ یہ بالکل حکیمانہ ترتیب کے مطابق ہے پہلے ممانعت ناانصافی اور زیادتی سے ہوئی، پھر اس سلب کے بعد ایجابی حکم عدل کا ملا۔

شَنَاٰنُ قَوْمٍ جس قوم یا جماعت سے مسلمانوں کو بہ حیثیت مسلمان کے دشمنی ہوگی، ظاہر ہے کہ وہ دشمن اسلام قوم کافروں ہی کی ہوگی، تو گویا تاکید اس کی ہوئی کہ دشمنوں تک کے ادائے حقوق میں کمی نہ کرو۔۔۔ اللہ اللہ! دنیا کا کون قانون ایسا ہے گا جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں کے حقوق کی یہاں تک رعایت رکھی ہو، فقہاء نے آیت سے یہ حکم نکالا ہے کہ کافر کا کفر اُسے اس حق سے محروم نہیں کر دیتا کہ عدل اس کے معاملہ میں کیا جائے یا حقوق اس کے ادا کئے جائیں۔

دلت الآیۃ علی ان کفر الکافر لا یمنع من العدل علیہ۔ (قرطبی)

اور عدل کا وجوب جب کفر کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے تو کفر سے کمتر درجہ کی چیزوں فسق، بدعت وغیرہ کے ساتھ اس کا وجوب کیوں کر نہ جمع ہوگا، جب منکروں، باغیوں، سرکشوں کے ساتھ عدل واجب ہے، تو توحید و رسالت کے قائلوں کے ساتھ یہ وجوب کتنا اور موکد ہوگا! اکابر شارحین نے اس طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔

فیہ تنبیہ عظیم علی ان وجوب العدل مع الکفار الذین ھم اعداء اللہ اذا کان بھذہ الصفۃ من القوۃ فما الظن بوجوبہ مع المومنین (کشاف۔ کبیر۔ مدارک) وفی الآیۃ تنبیہ علی مراعاۃ حق المومنین بالعدل اذ کان تعالٰی قد امر بالعدل مع الکافرین۔ (بحر)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ کو اس کی (پوری) خبر ہے کہ تم کیا کرتے رہتے ہو ۴۹؎ جو لوگ کہ ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۹﴾ وَالَّذِیْنَ

اور اچھے کام کرتے رہے اللہ نے اُن سے وعدہ کر لیا ہے کہ اُن کے لئے مغفرت اور بڑا اجر ہے ۵۰؎ اور جن لوگوں نے

كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ ﴿۱۰﴾

کفر کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا (سو) ایسے لوگ دوزخ والے ہیں ۵۱؎

شدّتِ غضب میں کون اپنے آپ پر قابو رکھ سکا ہے، یہاں تاکید اسی کی ہو رہی ہے کہ جو غصہ تمہارے دلوں میں کافروں کے خلاف ہے وہ کہیں تمہیں ان کے مقابلہ میں زیادتی پر نہ آمادہ کر دے تو زیادتی نہ ہونے پائے، عدل و اعتدال کا لحاظ ہر معاملہ میں رہے۔

والمعنى لايحملنكم شدة بغضكم للمشركين على ترك العدل فيهم فتعتدوا عليهم بارتكاب مالايحل كمثلة وقذف وقتل نساء وصبية ونقض عهد تشفيا مما في قلوبكم (بيضاوی) نهاهم اولاعن ان يحملهم البغضاء على ترك العدل ثم استانف فصرح لهم بالامر بالعدل تاكيدا وتشديدا۔ (کبیر)

مرشد تھانوی نے فرمایا کہ معاملات میں طبیعیات پر عمل نہ کرنا ایک مجاہدہ ہے اور یہاں اسی کی تعلیم ہے۔

۴۹؎ اللہ کی اس ہمہ بینی و ہمہ دانی کا استحضار ہی تقویٰ کی ہر منزل اور ہر مرحلہ کو آسان بنا سکتا ہے اسی لئے یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں تقویٰ کا حکم ہے اکثر اسی کے متصل ہی اس مضمون کا بیان بھی مل جاتا ہے چنانچہ اسی سے ملتی جلتی ایک آیت پارہ پنجم سورۃ النساء میں بھی آئی ہے یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ الخ۔ مفسر تھانویؒ نے خوب فرمایا کہ معاملات میں بے انصافی کے سبب عموماً دو ہی ہوتے ہیں، یا تو کسی فریق کی رعایت و مروت اور یا کسی فریق کی عداوت و مخالفت، سورۃ النساء میں اقامتِ عدل کا حکم سببِ اوّل کی مناسبت سے ہے اور یہاں سببِ دوم کی مناسبت سے۔

۵۰؎ (اور اللہ جس اجر کو بڑا کہے اس کی بڑائی کا کیا ٹھکانا ہے!)

وَعَدَ اللّٰهُ خوشخبری میں جان ڈال دینے والا لفظ یہی وعدۂ الٰہی ہے اہلِ ایمان کے لئے کس قدر شوق افزا اور کس درجہ محرکِ عمل!

۵۱؎ (اور اُسی میں ہمیشہ پڑے رہنے والے)

اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۔ صاحب میں مفہوم عارضی و ہنگامی اجتماع کا نہیں، بلکہ مستقل اور طویل تعلق کا پایا جاتا ہے اس لئے کافروں کو اصحابِ دوزخ کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ وہ گویا دوزخ ہی کے لئے بنے ہیں، یا دوزخ انہی کے لئے بنی ہے، اگر صرف وعید کی صورت ہوتی تو کچھ اُمید نجات کی باقی بھی رہ جاتی۔

الصاحب الملازم ولايقال في العرف الالمن كثرت ملازمته (راغب) المصاحبة والاصطحاب ابلغ من الاجتماع لاجل ان المصاحبة تقتضى طول لبثه (راغب) اى ملابسوا النار الشديدة التاجج ملابسة مؤبدة (روح)

فخر المفسرین فخر رازیؒ نے حسب معمول اس موقع پر بھی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے، اور دوسرے بھی ان کی راہ چلے ہیں:

يفيد الحصر والمصاحبة تقتضى الملازمة كما يقال اصحاب الصحراء اى الملازمون لها (کبیر)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ

اے ایمان والو اللہ کی نعمت کو (جو) تم پر ہے یاد کرو جب ایک قوم نے ٹھان لی تھی کہ تم پر اپنے ہاتھ

قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا

دراز کرے ۵۲ لیکن اللہ نے ان کے ہاتھ تم سے روک دیے ۵۳ اور اللہ سے

اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ ع ۲

ڈرتے رہو ۵۴ اور ایمان والوں کو چاہیئے کہ بھروسہ اللہ ہی پر رکھیں ۵۵

فهم دائمون فى عذاب اذ ختم لهم انهم اصحٰب الجحيم ولم يأت بصورة الوعيد فكان يكون الرجاء لهم فى ذلك (بحر) لم يؤت بالجملة فى سياق الوعيد قطعا لرجائهم۔ (روح)

اور آیت ہی سے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ خلود جہنم کفار ہی کے لئے ہے۔

فهذه الآية نصٌّ قاطع فى ان الخلود ليس الا للكفار۔ (کبیر)

۵۲ (اور اس تہیہ کے ساتھ کہ تمہارا خاتمہ ہی کر دیں، اور ظاہر میں قرائن بھی ان کے اسی ارادہ کی تائید میں تھے) يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ۔ بسط ید کے ایک معنی عربی میں حملہ کرنے، پکڑنے مارنے کے ہیں، اور وہی یہاں مراد لیا

يستعمل تارة للصولة والضرب (راغب) يقال بسط اليه يده اذا بطش به (کبیر)

اُردو میں بھی "دراز دستی" ایسے ہی موقعوں کے لئے ہے۔

اِذْ هَمَّ قَوْمٌ۔ یہ کون لوگ تھے؟ مخالفین و معاندین کا مراد ہونا تو ظاہر ہی ہے، سوال یہ رہ جاتا ہے کہ یہاں تعیین طور پر کن معاندین کی جانب اشارہ ہے؟ اشارہ اگر اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف سمجھا جائے تو اس وقت سب سے بڑے دشمن مشرکین قریش تھے، اور ارباب تفسیر کا ایک گروہ اسی جانب گیا ہے۔

وهم المشركون (کبیر) روى ابو صالح عن ابن عباس انها نزلت من اجل كفار قريش (بحر)

اور اگر مراد مابعد کے زمانہ سے لی جائے تو اس وقت سب سے پُرقوت مخالفین یہود عرب تھے، چنانچہ ایک گروہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔

موقع نزول کی روایتیں متعدد ہیں لیکن ان میں تعارض و تناقض کچھ بھی نہیں، اور قوم کے لفظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی جماعت ہی مراد ہو، کوئی مخصوص لیڈر یا سرغنہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

لا يخفى ان سبب النزول يجوز تعدده وان القوم قد يطلق على الواحد۔ (روح)

۵۳ (بلکہ آخر میں تمام قرائن ظاہری کے خلاف تم ہی کو کامیاب اور غالب کر دیا)

كفّ يد۔ بسط ید کی ضد ہے، مطلب یہ ہوا کہ دشمنوں نے تم پر حملہ کر کے تمہارا قلع قمع کر دینا چاہا تھا، لیکن اللہ نے ان کے حملوں کو ناکام رکھا، اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ

اور بے شک اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا ۵۶ اور ہم نے ان میں بارہ ۱۲ سردار مقرر کئے تھے ۵۷

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں رد ہے ان افراط پسند جاہلوں کا جو اللہ کی دنیوی نعمتوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔

۵۴ (جیسا کہ اب تک ڈرتے رہے ہو)

غلبہ و کامیابی کی مسرت کو یاد دلا کر معاً بعد تقوائے الٰہی کے استحضار سے صاف اشارہ اس امر کی طرف پایا جاتا ہے کہ غلبہ و کامیابی میں بڑا دخل تقویٰ الٰہی کو ہے، قناعت، بے طمعی، بے نفسی، ہمدردی، صداقت شعاری، ایثار، حفظ حدود، غرض سیرت و کردار کی ساری انفرادی و اجتماعی خوبیاں اس ایک جامع لفظ "تقوائے" کے اندر آگئیں۔

۵۵ (نہ کہ اپنے دست و بازو، اپنی ہمت و تدبیر پر)

کامیابی و کامرانی کے بعد بڑا خطرہ یہی رہتا ہے کہ گھمنڈ اپنی قوتِ بازو اور اپنی عقل و فرزانگی پر ہو جاتا ہے۔ قرآن انسان کو پست ہمتی اور تعطل کی تعلیم ہرگز نہیں دیتا، اُسے سرگرم عمل برابر رکھنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا بھی روادار نہیں کہ انسان خود پرستی اور اسباب پرستی کی لعنت میں مبتلا ہو جائے، وہ تعلیم بار بار اسی کی دیتا ہے کہ نظر اسباب سے بڑھ کر مسبب الاسباب پر رکھنا چاہیے، اسی نے پہلے بھی بگڑے کام بنائے ہیں اور اسی کی ذات کا سہارا آخرت تک قائم ہے۔

۵۶ (ان کی اطاعت و وفاداری کا، ان کے پیمبروں کے واسطے سے)

ابھی تاکید اللہ پر اعتماد اور اس کے احکام کی تعمیل کی آچکی ہے، اب شہادت بنی اسرائیل کی تاریخ سے لائی جارہی ہے کہ دیکھو اس موحد قوم نے بھی جب نافرمانی اختیار کی تو کیسے کیسے وبال میں پڑنے لگی۔

۵۷ (اُن کے قبیلوں کی تعداد کے مطابق)

قوم اسرائیل بارہ ۱۲ قبیلوں میں تقسیم تھی، اور ہر قبیلہ کا ایک ایک سردار تھا، بارہ سرداروں کا قرآنی علاوہ توریت کے بیان کے عین مطابق ہے، توریت میں ہے کہ مصر سے نکلنے کے دوسرے برس خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کرکے فرمایا:۔

"تو بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا، مطابق ان کے فرقوں کے اور اُن کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سر سے سر گن کر حساب کر، اور ہر فرقہ سے ایک ایک آدمی ہر ایک جو اپنے اپنے آبائی خاندان کا سردار ہے تمہارے ساتھ ہو۔" (گنتی۔ ۱: ۲-۴)

آگے ان سرداروں کے نام درج ہیں، اور وہ تعداد میں بارہ ۱۲ ہیں۔

اسی طرح توریت میں ایک دوسری جگہ کنعان (فلسطین) پر فوج کشی سے ذرا قبل کے موقع پر ہے:۔

"خداوند نے موسیٰؑ کو خطاب کرکے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں، ایک ایک مرد اُن کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دے، چنانچہ موسیٰؑ نے خداوند کے ارشاد کے موافق دشتِ فاران میں اُن کو بھیجا، وہ سب لوگ بنی اسرائیل کے سردار تھے۔"

یہاں بھی سرداروں کی تعداد بارہ ۱۲ درج ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اصل ہے مشائخ اہل تربیت کی اس عادت کی کہ وہ مریدوں پر ان کی

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ

اور اللہ نے (اُن سے یہ بھی) کہہ دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۵۸ تو اگر تم نماز کے پابند رہو گے اور زکوٰۃ دیتے

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ

رہو گے اور میرے پیمبروں پر ایمان لاتے رہو گے اور اُن کی مدد کرتے رہو گے اور اللہ کو اچھے طور پر قرض دیتے رہو گے تو میں تم

عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

تمہارے گناہ ضرور دور کر دوں گا اور ضرور تم کو بہشت کے باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے ندیاں پڑی بہہ رہی ہوں گی ۵۹

اصلاح، نگرانی کی غرض سے اپنے نائبوں کو مقرر کر دیتے ہیں اور اس میں اُن کی باہمی مناسبت کا لحاظ رکھ لیتے ہیں۔

**۵۸** معیتِ الٰہی کا تصور ایک خدا پرست قوم کے لئے کس درجہ ہمت آفریں و شوق افزا ہے! اداس کے بعد کس قدر قوی اور مطمئن ہو جاتا ہے اور شکست کا کوئی سوال بھی اس کے بعد ذہن کے سامنے نہیں آ سکتا، آج ایک بڑا حاکم اگر رعایا کے ایک معمولی فرد سے کہہ دے کہ "گھبراؤ نہیں مت ہم تمہارے ساتھ رہیں گے" تو اسے کس قدر قوت و اطمینان حاصل ہو جائے، چہ جائیکہ یہاں خالقِ کائنات، مالک الملک، حاکم علی الاطلاق اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے! تسکین و اطمینان کا کوئی درجہ اس کے بعد اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایک پہلو تھا، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے، کوئی معصیت اس استحضارِ معیتِ الٰہی کے بعد بندہ سے ممکن ہے؟ جہاں کوئی اپنے سے ذرا بڑا نگرانی کے لئے پاس موجود رہتا ہے جب تو اس کی مروت لحاظ یا دباؤ سے ہم اپنے اوپر قابو حاصل کر لیتے ہیں، اور کوئی کوتاہی یا لغزش اپنے سے سرزد نہیں ہونے دیتے، چہ جائیکہ ہمہ بیں و ہمہ تواں، مالک و مولیٰ کی معیت کا استحضار! کوئی معصیت بھی اس کے بعد ممکن رہ جاتی ہے۔

غرض ترغیب و ترہیب کے ہر اعتبار سے بھی دیکھا جائے معیتِ الٰہی کا مراقبہ بہترین و مؤثر ترین ہے، محققین نے یہ بھی صاف کر دیا ہے کہ معیت سے یہاں مراد معیتِ جسمانی نہیں جیسے مخلوق کے درمیان ہوتی ہے بلکہ احاطۂ علم و قدرت و نصرت کے لحاظ سے ہے۔

انی معکم بالعلم والقدرۃ فاسمع کلامکم واری افعالکم واعلم ضمائرکم واقدر علی ایصال الجزاء الیکم (کبیر) ای بالعلم والحیاطۃ وفی ھذہ المعیۃ دلالۃ علی عظم الاعتناء والنصرۃ (بحر) ای ناصرکم و معینکم (مدارک)

**۵۹** خوب خیال رہے کہ ایمان و حسنِ عمل کی اصل جزا قرآن مجید نے آخرت ہی میں رکھی ہے اور سارا زور جنت اور اس کی نعمتوں ہی پر دیا ہے یہاں تک کہ یہود وغیرہ قدیم قوموں کے تذکرہ کے سلسلہ میں بھی اسی کو بار بار دہرایا ہے — دنیوی کامیابی اور غلبہ کو بھی بیان کیا ہے لیکن صرف کہیں کہیں اور وہ بھی گویا ضمنی اور ثانوی طور پر بہ طور انعام اصلی کے تتمہ کے — اور یہی بڑا فرق قرآن اور توریت کے درمیان ہے۔

اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ۔ یعنی جو پیمبر میری طرف سے آئندہ آتے رہیں گے، ان کی تصدیق کرو گے۔

وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ۔ یعنی اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کی مدد کرو گے۔

ای رددتم عنھم اعداءھم (قرطبی) نصرتموھم بان تردوا عنھم اعداءھم (مدارک)

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ⑫ فَبِمَا

اور جو کوئی تم میں سے اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو بے شک اس نے ضائع کر دی راہ راست ۶۰ غرض ان کی

نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ

پیمان شکنی ہی کی بنا پر ہم نے انھیں رحمت سے دُور کر دیا ۶۱ اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا ۶۲

اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ یعنی اللہ کی راہ میں نیک کاموں میں اخلاص و خوش دلی کے ساتھ خرچ کرتے رہو گے۔ ہر زبان کے کچھ خاص محاورے ہوتے ہیں جو دوسری زبان والوں کو نامانوس معلوم ہوتے ہیں، انھی میں سے عربی کا یہ محاورہ ہے، جو اردو خوانوں کو اجنبی سا محسوس ہوتا ہے۔ قرض کی حقیقت عربی زبان میں صرف اس قدر ہے کہ یہ وہ مال ہے جس کی واپسی کچھ مدت بعد لینے والے پر لازم اور واجب ہو جاتی ہے۔

سمّی ما یدفع الی الانسان من المال بشرط ردّ بدله قرضًا۔ (راغب)

تو اسی واپسی کے لزوم و وجوب کی بنا پر اللہ کی خدمت میں مال پیش کرنے کو قرض سے تعبیر کر دیا گیا ہے اور حَسَنًا کے اضافہ نے یہ قید لگا دی کہ وہ صرفِ مال اخلاص اور خوش دلی کے ساتھ ہو۔

۶۰ (اور بھٹک گیا)

بَعْدَ ذٰلِكَ۔ یعنی اس عہد و پیمان کے بعد۔

۶۱ چنانچہ خود توریت بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانی، عہد شکنی اور ملعونیت کی داستان سے لبریز ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ۔ ب سببیہ ہے اور قرآن نے یہ صاف کر دیا کہ یہ ساری فہمائشیں بیکار گئیں، اور بنی اسرائیل خود اپنے عہد و قرار کے توڑنے پر تُل گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ روز بروز لعنت الٰہی میں گرفتار ہوتے گئے، لعنت کے مفہوم یعنی رحمتِ الٰہی سے محرومی پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں۔

لعناهم ای طردناهم وابعدناهم من الرحمة قاله عطاء والزجاج۔ (بحر)

بِمَا میں مَا نے معنیٔ تاکید کے پیدا کر دیئے۔

ما زائدة للتوكيد عن قتادة وسائر اهل العلم وذلك انها موكّد الكلام بمعنى تمكنه فى النفس من جهة حسن النظم ومن جهة تكثيره للتوكيد. فالتاكيد بعلامة موضوعة كالتاكيد بالتكرير (قرطبی)

الباء سببية وما مزيدة لتوكيد الكلام وتمكينه فى النفس (روح) ما مزيدة لافادة تفخيم الامر (مدارك)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے یہ نکلا کہ بعض معاصی سے قبض طاری ہو جاتا ہے۔

۶۲ (کہ حق بات قبول نہیں کرتے)

یہ قلب کی قساوت یعنی کلمۂ حق کے قبول کرنے سے گریز اسی ملعونیت کے اثر سے ہے اور لعنت کی حقیقت ہے لطفِ حق سے دُوری اور رحمتِ حق سے مہجوری۔

اللعن الابعاد والطرد من الرحمة (قرطبی) يحتمل التاويل الباطل ويحتمل تغييرا اللفظ (كبير)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ

وہ کلام کو اس کے موقع و محل سے بدل دیتے ہیں، اور جو کچھ انھیں نصیحت کی گئی تھی اس کا ایک (بڑا) حصہ

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا

بھلا بیٹھے ہیں ۶۳ اور ان میں سے بجز معدودے چند کے آپ کو اُن کی خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے ۶۴

یہود کی قساوتِ قلب کا ذکر انجیل میں بھی بار بار آیا ہے:۔

"اُس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف اُن پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا" (مرقس۔ ۳ : ۵) "ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی" (مرقس۔ ۱۶ : ۱۴) "تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لئے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے" (رومیوں۔ ۳ : ۵)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جس طرح معاصی سے قبض طاری ہو جاتا ہے اسی طرح قبض سے معاصی پیدا بھی ہو جاتے ہیں

۶۳ (اور اسی بڑے حصہ میں تصدیق رسالتِ محمدیؐ بھی شامل ہے)

قال ابن عباسؓ ترکوا نصیبا مما امروا به فی کتابهم وهو الایمان بمحمد صلعم (کبیر)

حَظًّا۔ تنکیر معنی کی بڑائی کے لئے ہے، یعنی بڑا حصہ۔

ای نصیبا جزیلا وقسطا وافیا (مدارک) نصیبا وافیا۔ (بیضاوی)

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ اس میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفیں آگئیں۔

ای یتاولونه علی غیر تاویله (قرطبی) قیل معناه یبدلون حروفه (قرطبی)

یہود مسیحیوں کی طرح خود بھی وحی لفظی کے قائل نہیں اور نہ اپنے صحیفوں بلکہ خود توریت تک کی محفوظیت کے مدعی ان کا تو سارا کام مسیحیوں کی طرح بجائے اصل متن کے، ترجمہ کے زور پر چل رہا ہے اور ترجمہ بہتر سے بہتر بھی اصل سے جتنا دور ہوتا ہے ہر صاحبِ علم پر روشن ہے پھر ترجمہ در ترجمہ میں یہ لوگ آزادی ترمیم و تصرف سے شرماتے نہیں فخریہ اس کا اظہار کرتے رہتے ہیں

۶۴ یہود کی دینی و دنیوی خیانتوں کی مثالیں خود قرآن ہی میں جا بجا مذکور ہیں، مثلاً ان کا اخفاءِ احکامِ توریت، ان کی جھوٹی اور جعلی شہادتیں پیش کرنا۔ وقس علیٰ ہذا۔

خَآئِنَةٍ سے مُراد خیانت ہے اور ایسا استعمال عربی میں عام ہے۔

الخائنة الخیانة قال قتادة وهذا جائز فی اللغة (قرطبی) الخائنة فی هذا الموضع الخیانة وضع وهو اسم موضع المصدر (ابن جریر) بمعنی المصدر ونظیره کثیر کالکافیة والعافیة وقال تعالیٰ فاهلکوا بالطاغیة ای الطغیان (کبیر)

خَآئِنَة کا اطلاق کبھی علامہ و نسابہ کی طرح مبالغہ کے لئے بھی ہوتا ہے۔

ان تقع خائنة للواحد کما یقال رجل نسابة علامة فخائنة علی هذا للمبالغة یقال رجل خائنة اذا بالغت فی وصفه بالخیانة (قرطبی)

اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ۔ اور یہ معدودے چند وہ تھے، جو بعد کو ایمان لے آئے۔

مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَمِنَ الَّذِيْنَ

سو آپ اُن کو معاف کر دیجئے اور (ان سے) درگزر کیجئے ۶۵ بے شک اللہ نیک کاروں کو پسند کرتا ہے ۶۶ اور جو لوگ

قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠

کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں ہم نے اُن سے بھی عہد لیا تھا ۶۷ سو جو کچھ انھیں نصیحت کی گئی (اس کا) بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے ۶۸

۶۵ یعنی اُن کے ان جرائم کے باوجود بھی اُن سے انتقام نہ لیجئے اور بلاضرورت شرعی ان کی تفضیح و رسوائی کا سامان نہ کیجئے
۶۶ (اور اسی نیک کاری کی ایک فرد یہ ہے کہ بلاضرورت شرعی کسی کی تفضیح و رسوائی نہ کی جائے)
مُحْسِنِيْنَ۔ احسان کے معنی عربی میں صرف حسن عمل اور نیک کاری کے ہیں اُردو کے "احسان" کا اُسے مرادف نہ سمجھا جائے انکتہ سنجوں نے یہیں سے یہ حقیقت اخذ کی ہے کہ جب کافروں اور کافر بھی کیسے غدر پیشہ و خائن کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ حسن عمل اور نیک کاری قرار پایا تو پھر مسلمان کے ساتھ عفو و درگزر کے معاملہ کی فضیلت کا کہنا ہی کیا!

تنبیه على ان العفو عن الكافر الخائن احسان فضلا عن العفو عن غيره (بیضاوی)

۶۷ (ویسا ہی عہد جس کا ذکر ابھی بنی اسرائیل کے سلسلہ میں اوپر آچکا ہے)
قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى۔ انداز بیان کی احتیاط ملاحظہ ہو یہ ارشاد نہیں ہوا کہ ہم نے نصاریٰ سے عہد لیا بلکہ یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، ان سے ہم نے عہد لیا۔
نصاریٰ نصرانی کی جمع ہے اور اس لفظ پر حاشیے پ۱ میں گزر چکے زیر آیت وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى الخ
۶۸ (اور اسی بھلائے ہوئے بڑے حصہ میں توحید الٰہی بھی شامل ہے اور تصدیق رسالت محمدی بھی)
یہ قرآن کا ایک عجیب معجزہ ہے کہ آج جو صحیفے انجیلوں کے نام سے مسیحی ہاتھوں میں موجود ہیں، صدگونہ تحریفات کے بعد بشارات محمدی ان میں اب تک باقی ہیں، حضرت یحییٰؑ کے سلسلہ میں ہے :۔
"جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا، پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں، پس انھوں نے اُس سے کہا پھر تو ہے کون؟" (یوحنا۔ ۱: ۱۹۔ ۲۲)
"انھوں نے اُس سے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ۔ نہ وہ نبی۔ تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے؟" (یوحنا۔ ۱: ۲۵)
یہ بار بار "وہ نبی" کے سوال کے کیا معنی؟ ضروری ہے کہ کسی معروف نبی کی پیش گوئی یہود میں مدت سے چلی آرہی ہو، اور یہ النبی یقیناً مسیح سے الگ کوئی تھے، جیسا کہ اوپر کے سوالات سے ظاہر ہے۔
اور آگے چلئے، خود مسیحؑ نے ایک بار عید کے آخر دن کھڑے ہو کر پکار اکہ اگر کوئی پیاسا ہو تو میرے پاس آکر زندگی کا پانی پیئے" پس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا، بے شک یہی وہ نبی ہے، اوروں نے کہا، یہ مسیح ہے" (یوحنا۔ ۷: ۴۰)
ایک حوالہ اور ملاحظہ ہو حضرت مسیح دنیا سے رخصت ہونے سے قبل اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہیں "اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کروگے، اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے" (یوحنا۔ ۱۴: ۱۶)

فَاَغۡرَيۡنَا بَيۡنَهُمُ الۡعَدَاوَةَ وَالۡبَغۡضَآءَ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ؕ وَسَوۡفَ يُنَبِّئُهُمُ

تو ہم نے ان میں باہم بغض اور عداوت قیامت تک کے لئے ڈال دیا ۶۹ اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اللہ

اللّٰهُ بِمَا كَانُوۡا يَصۡنَعُوۡنَ ﴿۱۴﴾ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ قَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلُنَا يُبَيِّنُ

انھیں عنقریب وہ جتلا دے گا ۷۰ اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے (یہ جو) رسول آئے ہیں یہ تمہارے سامنے کتاب

لَـكُمۡ كَثِيۡرًا مِّمَّا كُنۡتُمۡ تُخۡفُوۡنَ مِنَ الۡكِتٰبِ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ؕ

(الٰہی) کے (وہ مضامین) کثرت سے کھول دیتے ہیں جنھیں تم چھپاتے رہے ہو ۷۱ اور بہت سے اُمور کو نظر انداز بھی کر جاتے ہیں ۷۲

(مددگار کے لفظ پر انجیل کے اُردو نسخہ میں "یا وکیل یا شفیع" بھی درج ہے)

اب یہ ابد تک ساتھ رہنے والا مددگار "یا شفیع یا وکیل" بجز نبی "خاتم النبیین" کے اور کون ہے؟ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیحؑ کی زبان سے ملاحظہ ہو:۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار (وکیل یا شفیع) تمہارے پاس نہ آئے لیکن اگر میں جاؤں گا تو وہ اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا، اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔" (یوحنا ۱۶: ۷، ۸)

اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہوئے کہ وہ نبی آکر پرانی شریعتیں منسوخ کرے گا اور نئی شریعت چلائے گا۔

حَظًّا پر حاشیہ ابھی نمبر ۶۳ میں گزر چکا۔

صیغۂ نکرہ یہاں بھی "بڑائی" کے اظہار کے لئے ہے، یعنی بڑا حصہ۔

والظاھر ان التنکیر للتعظیم ای ان مانسوہ واضاعوہ منہ کثیر۔ (المنار)

**۶۹** (جس سے وہ کبھی ایک کلمہ پر متحد نہ ہو سکیں گے)

بَيۡنَهُمُ۔ یعنی مسیحی قوموں کے درمیان۔ اشارہ نصرانیوں کے اندرونی مذہبی اختلافات کی جانب ہے، مسیحیوں کے اندر جس کثرت سے فرقے ہیں اور پھر ان میں باہم جس درجہ شدید اختلافات ہیں، باہر والوں کو اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، اور اگر اس مفہوم میں یورپ کی موجودہ سیاسی قومیں شامل سمجھی جائیں تو ان کی باہمی رقابتیں اور عداوتیں تو اور زیادہ ظاہر و روشن ہیں، جرمنی کی آویزش فرانس سے، امریکا کا غصہ روس پر، فرانس کی عداوت اسپین سے، برطانیہ کی بدگمانی اٹلی سے وغیرہا، اور یہ جوڑ ہمیشہ بدلتے ہی رہتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ خاص سنہ کی یہ مثالیں اس کے دس سال بعد بھی قائم رہیں، اندرونی نفسانیت اور کشمکش کی حد و حساب ہی نہیں۔

اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ۔ یعنی ہمیشہ یا مستقل طور پر۔ قرآن مجید ظاہر ہے کہ محاورۂ انسانی کے مطابق ہے، اور محاورہ میں قیامت تک سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جب تک اس شے کا وجود باقی ہے، قرآن مجید ہی میں ابلیس کے ذکر میں ہے کہ اس پر لعنت قیامت تک رہے گی، معنی بالکل ظاہر ہیں کہ وہ لعنت اس پر ہمیشہ رہے گی، نہ یہ کہ وہ یوم حشر کے بعد لعنت سے نجات پا جائے گا۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ

بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے ۷۳ اس کے ذریعہ سے اللہ

مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ

انھیں سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی رضا کی پیروی کرتے رہتے ہیں ۷۴ اور انھیں اپنی توفیق سے

اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

نور کی طرف تاریکیوں سے نکال کر لاتا ہے اور انھیں سیدھی راہ دکھائے رہتا ہے ۷۵

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی جس طرح عقابِ اُخروی کا سبب بنتے ہیں، عقابِ دُنیوی کا بھی باعث بن سکتے ہیں۔

۷۰ یعنی قیامت میں قرآن مجید قربِ آخرت کے استحضار کے لئے بار بار اس کی آمد و وقوع کے لئے سوف کا لفظ اختیار کیا ہے۔ القاء عداوت و تبغض باہمی میں ذکر وبالِ دُنیوی کا تھا، اب ذکر سزائے آخرت کا آگیا۔

۷۱ (اور یہ بجائے خود ایک شہادت ہے اُن کے پیمبرانہ علم کی)

مطلب یہ ہوا کہ یہ پیمبر باوجود خود اُمّی ہونے اور باوجود تمھاری طرف سے ہر سعیِ اخفاء کے توریت وانجیل کے اصل مضامین وحی الٰہی سے معلوم کر کے ظاہر کر دیتے ہیں۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ۔ اب خطاب یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔

۷۲ (اور یہ حلم و عفو بجائے خود ایک شہادت ہے ان کے پیمبرانہ اخلاق کی)

يَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ یہ مضامین جنھیں آپ نظر انداز کر جاتے ہیں وہ ہیں، جن کے اظہار سے بجز مجرموں کی تفضیح کے اور کوئی شرعی غرض وابستہ نہیں۔

انما لم يظهره لانه لاحاجة الى اظهاره فى الدين (كبير) لا يبينه اذا لم تضطر اليه مصلحة دينية وما فيه احياء الشريعة واماتة بدعة (كشاف)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہیں سے اہل اللہ کی یہ عادت ہے کہ جب تک کوئی مصلحت دینی نہ ہو مقتضائے غیظ پر عمل نہیں کرتے، اور عداوت میں بھی شفاءِ غیظ نفسانی کا قصد نہیں کرتے۔

۷۳ نُوْرٌ سے اشارہ ہے رسالتِ محمدی کی جانب اور كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ سے قرآن مجید کی جانب۔

يعنى بالنور محمدا صلعم وكتاب مبين هو القرآن الذى انزله على نبينا (ابن جرير) نور قيل محمد صلعم عن الزجاج وكتاب مبين اى القرآن فانه يبين الاحكام (قرطبى)

۷۴ یعنی رضائے حق کا ارادہ کرتے ہیں، اور اس کی تلاش و فکر میں رہا کرتے ہیں۔

اى من يعلم الله تعالىٰ انه يريد اتباع رضاء الله تعالىٰ بالايمان به (روح)

یہیں سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ راہِ ہدایت انہی کے نصیب میں آتی ہے، جو از خود اس کی تلاش طلب میں رہتے ہیں

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ مَرۡيَمَ‌ؕ قُلۡ فَمَنۡ

وہ لوگ یقیناً کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو عیسیٰ مسیح ابن مریمؑ ہے ۷۶ آپ کہئے کہ ۷۷

يَّمۡلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـئًا اِنۡ اَرَادَ اَنۡ يُّهۡلِكَ الۡمَسِيۡحَ ابۡنَ مَرۡيَمَ وَاُمَّهٗ

اچھا تو اللہ سے کون کچھ بھی بچا سکے اگر وہ ہلاک کر دینا چاہے مسیح ابن مریمؑ اور ان کی والدہ کو ۷۸

سُبُلَ السَّلٰمِ۔ پوری سلامتی، مادّی و روحانی، ہر حیثیت سے مکمل جنّت ہی میں جا کر نصیب ہو سکتی ہے، اس کے راستے یعنی جنت میں جانے کے طریقے صحیح عقائد اور صحیح اعمال ہیں۔

طرق السلامۃ الموصلۃ الی دار السلام وھی الجنۃ (قرطبی) قیل طرق الجنۃ (بحر)

بِہٖ میں ضمیر کتاب کی طرف ہے۔

ای بالکتاب المبین (کبیر) ظاھرہ انہ یعود علی کتاب اللہ (بحر) ای بالقرآن (مدارک)

۷۵ یعنی عمر بھر انھیں سیدھی راہ پر قائم رکھتا ہے۔

الظُّلُمٰتِ سے مراد کفر کی تہ بہ تہ تاریکیاں ہیں۔

ای من ظلمات الکفر والجہالات (قرطبی)

النُّوۡرِ سے مراد ایمان و طاعت کی روشنی ہے۔

ای الی نور الاسلام والھدایات۔ (قرطبی)

بِاِذۡنِهٖ سے مراد ارادۂ الٰہی، توفیق الٰہی، یا مشیّت تکوینی ہے۔

ای بتوفیقہ (کبیر) ای بارادتہ وتوفیقہ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اصل مقصود طلب رضا ہے، دخول جنّت اس کے تابع ہے۔

۷۶ اس عقیدہ کو جو کھلا ہوا شرک ہے خوب خیال کر کے دیکھ لیا جائے کہ قرآن مجید "نصرانیت" سے تعبیر نہیں کرتا، نہ ایسے لوگوں کو نصاریٰ یا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ سے موسوم کرتا ہے، اُن کا ذکر تو الذین قالوا انا نصٰری کے تحت میں ابھی اوپر آچکا ہے، اب جن لوگوں کا ذکر ہے اُن کے لئے تو کھلا ہوا حکم تکفیر ہی کا ہے۔

لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِيۡنَ الخ مسیحیتِ موجودہ کی متعدد شاخوں کے عقیدے تو کھلے ہوئے مشرکانہ ہیں، مثلاً SABELLIANSIM و MONAR CHIANISM DOCETISM وغیرہا، ان کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تفسیر انگریزی، اردو میں ان کی اصطلاحوں کے ترجمے بھی دشوار ہیں، اب یہی وہ مسیحیت جو مسلکِ جمہور کے مطابق ہے اور صدیوں سے دنیا میں خوب پھیلی ہوئی ہے وہ بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، عقیدۂ اتھانیاسیس (ATHANASIAN CREED) جو کیتھولک، پروٹسٹنٹ وغیرہ سب مشہور و مقبول فرقوں میں مشترک ہے اس میں یہ الفاظ صراحۃً موجود ہیں:۔

"باپ بیٹے اور روح القدس کی اُلوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر عظمتِ ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے، باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق، باپ غیر محدود، بیٹا

وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اور جو کوئی بھی زمین پر ہے سب کو ۴۷۹ — اور آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے

وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۷﴾

اس (سب) پر اللہ ہی کی حکومت ہے ۴۸۰ وہ جو کچھ چاہے پیدا کر دیتا ہے اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے ۴۸۱

غیر محدود اور رُوح قدس غیر محدُود۔ باپ ازلی، بیٹا ازلی اور رُوح قدس ازلی۔ یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق، اور رُوح قدس قادر مطلق، ویسا ہی باپ خدا، بیٹا خدا اور رُوح قدس خدا"۔۔۔ کھلا شرک اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

اَلْمَسِیْحُ اور مَرْیَمَ دونوں پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں۔

اَلْمَسِیْحُ کے ساتھ ابن مریم کا اضافہ بجائے خود ایک ضرب کاری ہے، عقیدۂ اُلوہیت مسیح پر کہ جسے تم عین خدا قرار دے رہے ہو، وہ تو خود ایک خاتون کا فرزند تھا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں صریح رد ہے اُن لوگوں پر جو خالق و مخلوق میں اتحاد کے قائل ہیں۔

۴۷۷ (اس مسیح پرستی کی تردید میں، اے ہمارے پیغمبر!)

۴۷۸ (طبعی موت سے)

اَنْ یُّهْلِكَ۔ اہلاک تو ایک ہوتا ہے بصورت عذاب، وہ یہاں مراد نہیں، یہاں اہلاک بصورت موت طبعی مُراد ہے۔

المراد بالاھلاك الاماتة والاعدام مطلقا لاعن سخط وغضب (روح)

مَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا۔ مِلْك یہاں قدرت کے معنی میں ہے۔

الملك هو القدرة (کبیر) یملك بمعنی یقدر من قولهم ملكت علی خلاف امرہ ای اقتدرت علیه (قرطبی)

پورے فقرے کا مفہوم یہ ہوا کہ کون اللہ کے ارادہ کی راہ میں حائل و مانع ہو سکتا ہے؟

یعنی فمن الذی یقدر علی دفع شیء من افعال اللّٰه تعالٰی ومنع شیء من مرادہ (کبیر) ای فمن یقدر ان یمنع من ذلك شیئا (قرطبی) فمن یمنع من قدرته وارادته شیئا (بیضاوی)

فَمَنْ میں من لانے سے مُراد یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے تو بتاؤ، اسی مفہوم کو ترجمہ میں "اچھا تو" ظاہر کیا گیا ہے۔

وَاُمَّهٗ۔ مسیحؑ کے ساتھ حضرت مریمؑ کا ذکر لانے کی مناسبت یہ ہے کہ دنیائے مسیحیت کی ایک بڑی آبادی کے نزدیک وہ بھی شریکِ اُلوہیت ہیں اور لاکھوں بلکہ کروڑوں مسیحیوں کے اعتقاد میں مرتبۂ خدائی پر فائز ہیں۔ اصل حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی تفسیرِ انگریزی۔

حاصل استدلال یہ ہوا کہ قوت، قدرت، ارادہ و اختیار میں کوئی مخلوق، حتیٰ کہ مسیحؑ و مریمؑ بھی خدا تعالیٰ خالقِ کائنات کے مقابلہ میں کچھ بھی لائے جا سکتے ہیں؟ اور اللہ کی مشیت کی راہ میں ذرا بھی حائل ہو سکتے ہیں؟ کھلا ہوا جواب یہ ہے کہ نہیں، پھر جب یہ ہے کہ تمہاری عقل کیسی ماری گئی ہے کہ تم مسیحؑ (یا مسیحؑ و مریمؑ دونوں) کو شریکِ اُلوہیت ٹھہرا رہے ہو!

# وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ط

اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے لڑکے اور اس کے چہیتے ہیں ۵۸۲

۵۷۹ (کہ بے اختیاری، بےبسی، اور مخلوقیت میں حضرت مسیحؑ اور حضرت مریمؑ بھی ساری ہی مخلوق جیسے ہیں، اور اس اعتبار سے اِن میں اور اُن میں کوئی فرق نہیں)

اراد بعطف من فی الارض علی المسیح وامّه انهما من جنسهم لا تفاوت بینهما وبینهم فی البشریة (کشاف)

یعنی ان عیسٰی مشاکل بمن فی الارض فی الصورة والخلقة والجسمیة والترکیب وتغییر الصفات والاحوال۔ (کبیر)

۵۸۰ (بلا کسی کی شرکت و اعانت کے)

آسمانوں پر اور زمین پر اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اس پر یعنی ساری موجودات و کائنات پر۔

۵۸۱ مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اور اس سے ان کا استدلال یہ تھا کہ ایسے محیر العقول وجود کو انسان یا بشر کیسے تسلیم کر لیا جائے؟ وہ یقیناً فوق البشر ہے اور اُلوہیت کا حصّہ دار، یہاں جواب اسی کا دیا گیا ہے کہ اللہ تو پیدا کرنے کی ہر صورت پر اور ہر صورت سے پیدا کرنے پر قادر ہے اس نے اگر کسی مخلوق کو عام اور عمومی عادت کے خلاف کسی اور طریقہ سے پیدا کر دیا تو اس سے اس مخلوق کی اُلوہیت یا غیر مخلوقیت کیسے ثابت ہو گئی؟ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ۔ جو کچھ چاہے اور جس طرح چاہے، خواہ سُنّتِ عادی کے موافق ہو یا مخالف پیدا کر سکتا اور پیدا کرتا رہتا ہے، اُس کی قوتِ خلّاقی کسی صورت اور کسی طریق کے ساتھ مخصوص و معیّن نہیں تخلیق کی ہر نوع اور ہر صنف، بلا واسطہ اور بواسطہ سب پر یکساں قادر ہے۔

ای یخلق ای خلق یشاءه فتارة یخلق من غیر اصل واخری من اصل وتارة من اصل یجانسه ویخلق بلا توسط شئ من المخلوقات وقد یخلق بتوسط مخلوق اٰخر (روح) ای ان خلقه لیس مقصورًا علی نوع واحد بل ما تعلقت مشیئته، بایجاده اوجده واخترعه (بحر)

۵۸۲ (اور اس لئے عام نوع انسان سے کہیں افضل و اشرف)

نَحْنُ صیغۂ جمع متکلم سے مراد یہاں افراد نہیں بلکہ قوم یا ملّت مجموعۂ افراد مراد ہے یعنی یہود من حیث القوم اور نصاریٰ بحیثیت ملّت، بائبل میں آج تک اس قسم کے حوالے موجود ہیں:۔

"خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پلوٹھا ہے"۔ (خروج۔ ۴: ۲۲)

"تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو"۔ (استثناء ۱۴: ۲۲)

"جب اسرائیل لڑکا تھا میں نے اس کو عزیز رکھا اور اپنے بیٹے کو مصر سے بُلایا"۔ (ہوسیع ۱۱: ۱)

"جتنوں نے اُسے قبول کیا، اس نے انھیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا"۔ (یوحنا۔ ۱: ۱۲)

"جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے چلتے ہیں، وہی خدا کے بیٹے ہیں"۔ (رومیوں۔ ۸: ۱۴)

مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم سطور کی انگریزی تفسیر۔

اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ میں ابناء سے مراد حقیقی صُلبی بیٹے نہیں اور نہ اہلِ کتاب کے یہ معنی ہی لازمی طور پر ہیں،

صلبی بیٹے کے لئے عربی میں دوسرا لفظ ہے ولد۔ ابن کا اطلاق مجازی منھ بولے لڑکوں پر پوری طرح ہوتا ہے اور عربی میں اس کا یہ مجازی استعمال بہت عام ہے۔

یقال لکل ما یحصل من جهة شئ او من تربیته او بتفقده او کثرة خدمته له او قیامه بامره هو ابنه نحو فلان ابن حرب وابن السبیل للمسافر وابن اللیل وابن العلم وفلان ابن بطنه وابن فرجه اذا کان همته مصروفا الیهما وابن یومه اذا لم یتفکر فی غده۔ (راغب)

اور اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب، ابن، بنت یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے چیزیں ان کی جانب منسوب و مضاف ہوتی ہیں

وللأب والابن والبنت اسماء کثیرة تضاف الیها (تاج۔ لسان)

اور آگے ازہری لغوی اور ابن العربی لغوی کے حوالہ سے ایک بڑی طویل فہرست ایسے ناموں کی دے دی ہے جو عربی میں کسی کے "ابن" کی حیثیت سے مشہور و متعارف ہیں، مثلاً ابن الطین حضرت آدمؑ کے لئے، ابن اللیل چور کے لئے، ابن الاقوال باتونی شخص کے لئے، وغیرہا۔

ہمارے مفسرین رحمہم اللہ نے بھی بغیر اس کے کہ بائبل کے محاوروں کا مطالعہ کیا ہو محض اپنے اشراقِ ایمانی سے یہاں یہی معنی قرار دیے ہیں، یعنی ہم خاصانِ خدا میں سے ہیں، ہمارا اور عام خلقت کا مقابلہ ہی کیا۔

کما کان یقول رهط مسیلمة نحن ابناء الله ویقول اقرباء الملك وذووه وحشمه نحن الملوك (کشاف) ای اعزة علیه کالابن علی الاب (مدارك) لفظ الابن کما یطلق علی ابن الصلب فقد یطلق ایضا علی من یتخذ ابنا واتخاذه ابنا بمعنی تخصیصه بمزید الشفقة والمحبة (کبیر) ارادوا ان الله تعالیٰ لنا کالاب فی الحنو والعطف ونحن کالابناء له فی القرب والمنزلة (معالم۔ ابوسعود) قالوا هذا یطلق عندهم علی التشریف والاکرام (ابن کثیر) ومرادهم بالابناء المقربون ای نحن مقربون عند الله تعالیٰ قرب الاولاد من والدهم (روح) البنوة هنا بنوة الحنان والرأفة (بحر)

اور شیخ رشید رضا مصری جن کی نظر سے توریت و انجیل پوری طرح گزر چکی ہیں، انھوں نے ان کتابوں سے بہت سی نظیریں ان الفاظ کے استعمال کی اکٹھی کر کے آخر میں صاف لکھ دیا ہے:۔

فعلم من هذه النصوص واشباهها ان لفظ ابن الله یستعمل فی کتب القوم بمعنی حبیب الله الذی یعامله الله معاملة الاب لابنه من الرحمة والاحسان والتکریم فعطف احباء الله علی ابناء الله للتفسیر والایضاح (المنار)

ان سب حوالوں سے ثابت ہو گیا کہ لفظ ابن اللہ ان لوگوں کی کتابوں میں مرادف ہے حبیب اللہ کے یعنی اللہ ان کے ساتھ وہ تعلق رکھتا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتا ہے شفقت و لطف و کرم کا، اور اس لئے "احباءہ" کی اس پر عطف بطور تفسیر و توضیح کے ہے۔

گویا حاصل تقریر یہود و نصاریٰ کا یہ تھا کہ ہم سب اونچی ذات والے اور خاص مقربین حق میں ہیں، ٹھیک ویسے ہی دعوے جیسے ہندوستان میں برہمنوں کی اور اپنے کو چندر بنسی اور سورج بنسی کہلانے والے راجپوتوں کی زبان سے سنے جاتے ہیں۔

ومقصود الفریقین هو المعنی المتضمن مدحا وحاصل دعواهم ان لهم فضلا ومزیة عند الله تعالیٰ علی سائر الخلق (روح) وجملة الکلام ان الیهود والنصاریٰ کانوا یرون لانفسهم فضلا علی سائر الخلق

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ

آپ کہہ دیجئے تو پھر خدا انھیں گناہوں پر سزا کیوں دیتا ہے ۵۸۳ نہیں بلکہ تم (محض) بشر ہو مخلوقات میں سے ۵۸۴

يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ

وہ جسے چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا ۵۸۵ اور اللہ ہی کی حکومت آسمانوں اور

وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ﴿١٨﴾ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ

زمین پر اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس (سب) پر بھی ہے اور اسی کی طرف واپسی ہے ۵۸۶ اے اہل کتاب!

قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ

تمہارے پاس ہمارے (یہ) رسول جو تمہیں صاف صاف بتاتے ہیں آپہنچے ایسے وقت میں کہ رسولوں کا آنا بند تھا ۵۸۷

بسبب اسلافهم الافاضل من الانبياء حتى انتهوا فی تعظیم انفسهم (کبیر)

اور اسی سے ملتی جلتی ذہنیت خود مسلمانوں کے اندر بھی پیرزادگی، مشائخ زادگی، مخدوم زادگی کے گھمنڈ سے پیدا ہوگئی ہے۔

۵۸۳ (جس کے تم خود قائل ہو)

بداعمالی پر دنیوی سزاؤں کا ترتب تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی جس سے یہود و نصاریٰ کسی کے لئے انکار ممکن نہ تھا، اور ان دنیوی سزاؤں کے تذکرہ سے عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں صریح رد ہے اس شخص پر جو اللہ کے ساتھ ایسے قرب کا قائل ہو جس میں معصیت پر بھی مواخذہ نہ ہو۔

۵۸۴ (اور بلا امتیاز و استثناء انھیں کی طرح عام قاعدوں کے تحت میں داخل ہو)

یعنی جزاء و سزا کا جو قانون ساری دنیا کے لئے ہے، وہی تمہارے لئے بھی ہے۔

۵۸۵ (اور وہی قادر مطلق، حاکم برحق یہ وعدہ کرچکا ہے کہ اہل ایمان کے لئے مغفرت ہے اور اہل کفر کے لئے دائمی عذاب)

یعنی اس کی مشیت سب پر غالب ہے، وہ کسی کی محکوم نہیں، نہ کسی کی مروت نہ کسی کا دباؤ اس کے اوپر غالب۔

۵۸۶ (نہ کہ کسی نبی یا ولی کی طرف، نہ کسی فرشتہ یا دیوتا کی طرف)

مسیحیوں کا عقیدہ تھا کہ آخرت میں بیٹی ابن اللہ مسیح کے دربار میں ہوگی، اور یہود اس خیال میں تھے کہ اُن کے آباء و اجداد، یعقوبؑ اور اسحقؑ اور ابراہیمؑ انھیں عذاب الٰہی کی گرفت سے بچالیں گے۔

حکیم الامت تھانویؒ نے اس موقع پر جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ لفظ بہ لفظ نقل ہونے کے قابل ہے:۔

"یہ دعویٰ مذکورہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ہمارے زمانہ کے جاہل پیرزادوں کا انتساب تو لدیا اتصالِ سلسلہ کی بنا پر گھمنڈ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایک گونہ ذاتی خصوصیت اور نسبت ہے جو معاصی وغیرہ سے قطع نہیں ہوتی اور ہم کیسے ہی ہوں مگر اس انتساب یا اتصال کے زور سے کھڑے جنت میں جائیں گے۔"

اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ ۡ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ

کہ کہیں تم یہ نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی بھی تو بشارت دینے والا آیا نہ تنبیہ کرنے والا۵۸۹ (اب تو) آگیا تمہارے

وَّنَذِیْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۹﴾ ع

پاس بشارت دینے والا اور تنبیہ کرنے والا۵۹۰ اور اللہ ہر چیز پر (پوری) قدرت رکھنے والا ہے

۳۸۷

السَّمٰوٰتِ.... بَیْنَهُمَا۔ اصطلاح قرآنی میں اس سے مراد ساری کائنات، ساری موجودات سے ہوتی ہے۔

۵۸۷ (اور دنیا صدہا سال سے وحیٔ تازہ کی نعمت سے محروم تھی)

رَسُوْلُنَا۔ ہمارے یہ رسول جن کی آمد آمد تم اہل کتاب سے مدت سے سن رہے تھے، انجیل میں بار بار ذکر "وہ نبی" THF PROPHET کا یہود کی زبان سے آتا ہے اس کے کھلے ہوئے معنی یہ ہیں کہ ایک متعارف نبی کا آنا مدتوں سے تم میں چلا آرہا تھا۔

یُبَیِّنُ لَكُمْ۔ تمہیں صاف صاف احکام شریعت بتاتے رہتے ہیں علی فترۃ من الرسل کی تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

علی حین فترۃ من الرسل۔ ای جاءکم علی حین فترۃ من ارسال الرسل (کشاف) ای علی فتور من الارسال (کبیر)

فترۃ کے لفظی معنی انقطاعِ عمل یا سکون کے ہیں۔

ای سکون والاصل فیہا انقطاع العمل عما کان علیہ من الجد فیہ (قرطبی)

اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی زمانہ کو کہتے ہیں۔

الفترۃ ما بین کل نبیین (تاج) ای علی انقطاع ما بین النبیین عن ابی علی وجماعۃ

اہل العلم (قرطبی) سمیت المدۃ التی بین الانبیاء فترۃ (کبیر)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی کریم صلعم کے درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا رہا ہے حضورؐ کا سالِ ولادت ۵۷۰ء (یا ۵۷۱ء) ہے اور سالِ بعثت ۶۱۰ء ہمارے ہاں بھی متعدد تابعین سے یہی مدت منقول ہے۔

وقال قتادۃ کان بین عیسیٰ ومحمد علیہما السلام ست مائۃ سنۃ وقال مقاتل والضحاک

ووھب بن منبہ الا ان وھبا زاد عشرین سنۃ (قرطبی)

۵۸۸ (اس لئے ہم کو دین کے باب میں صحیح اور تفصیلی کافی علم ہوتے ہی نہیں پایا۔)

اَنْ تَقُوْلُوْا۔ یعنی کہیں قیامت کے دن یہ عذر پیش کرنے لگو، اَنْ یہاں لئلا کے معنی میں ہے۔

ای لئلا او کراھۃ ان تقولوا (قرطبی) فقدرہ القراء لأن لا تقولوا (ابو سعود)

مِنْۢ بَشِیْرٍ۔ میں مِنْ نفی و انکار میں زیادتی کے لئے ہے، کہ کوئی بھی تو نہیں آیا۔

وزیادۃ من فی الفاعل للمبالغۃ فی نفی المجیٔ (روح)

۵۸۹ (سو سن لو کہ اب عذر کی کوئی گنجائش تمہارے پاس باقی نہیں رہی، آگے ماننا نہ ماننا تمہارا فعل ہے)

والنقدیر ھنا لا تعتذروا فقد جاءکم (روح) والفاء متعلق بمحذوف ای لا تعتذروا فقد جاءکم (مدارک)

۵۹۰ (اور یہ اسی کی قدرت کا ایک ظہور ہے کہ اتنی صدیوں کے بعد ایک پیغمبر اور وہ بھی سب پیغمبروں سے بڑا مبعوث کردیا)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا ۹۱ کہ اے میری قوم! اللہ کا وہ احسان تم اپنے

اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ

اوپر یاد کرو جب اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے اور تمہیں خود مختار کیا ۹۲

آیت کے اس ٹکڑے سے یہ پہلو بھی صاف ہوا جاتا ہے کہ گو اس نے تمہاری حُجّت قطع کرنے کو یہ پیغمبر مبعوث کر دیا، تاہم اگر وہ چاہتا تو بغیر اس کے بھی تم پر حجّت قائم کر دیتا، اور تمہیں دم مارنے کی مجال نہ ہوتی۔

۹۱ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا وہ زمانہ ہے کہ جب بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی و محکومی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جو ایک ہی وقت میں ان کے دینی پیغمبر بھی تھے اور دنیوی لیڈر بھی انھیں آمادہ کر رہے ہیں کہ اپنے وطن فلسطین چلو، ظالم و غاصب قوم عمالقہ کو وہاں سے نکال دو اور خود اس پر حکمرانی کرو، تازہ ترین تاریخی اور اثریاتی تحقیق کے مطابق مصر سے خروج بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۰ء ق م کا ہے اور فلسطین پر اسرائیل کی فوج کشی کا زمانہ ۱۴۰۰ء ق م کا، اس لحاظ سے حضرت موسیٰؑ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے، عجب نہیں کہ یہ آپ کے بالکل آخری زمانہ کی ہو، جیسا کہ توریت کے صحیفۂ استثناء باب اول سے اندازہ ہوتا ہے، یہ اگر صحیح ہے تو اسی صحیفۂ استثناء میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ آپ نے یہ تقریر دریائے یردن کے اسی پار موآب کے میدان میں، واقعۂ خروج مصر کے چالیسویں سال کے گیارھویں مہینہ کی پہلی تاریخ کو ارشاد کی تھی۔

۹۲ (اے اسرائیلیو!)

يٰقَوْمِ۔ خطاب یہاں قوم سے بہ حیثیت مجموعی ہے، افراد سے نہیں۔

فِيْكُمْ۔ میں فِیْ۔ مِنْ کے مرادف ہے۔

فِيْكُمْ اى منكم (ابن عباسؓ)

نبوت ایک انفرادی اور شخصی منصب ہوتا ہے اسی لئے فیکم وارد ہوا ہے، یعنی تمہاری قوم کے اندر افرادِ انبیاءؑ ہوتے رہے۔

جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا۔ مَلِكْ کے معنی عربی میں لازمی طور پر بادشاہ اور تاجدار کے نہیں، ہر آزاد، خود مختار اور صاحبِ حیثیت شخص پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

يقال من استغنى عن غيره فهو ملك (قرطبی) الملك اسم لكل من يملك السياسة إمّا فى نفسه وامّا فى غيره سواء تولّى ذلك اولم يتولّ (راغب) كل من كان مستقلا بامر نفسه ومعيشته ولم يكن محتاجا فى مصالحه الى احد فهو ملك (كبير) كل من ملك بيتا وخادما وامرأة فهو ملك۔ (ابن جریر)

حدیث میں ہر ایسے شخص پر مَلِك کا اطلاق آیا ہے، جو اپنا ذاتی مکان اور زوجہ اور خادم رکھتا ہو۔

عن النبى صلعم من كان له بيت اوقال منزل ياوى اليه وزوجة وخادم يخدمه فهو ملك۔ (قرطبی)

وَاٰتٰكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ

اور تمھیں وہ دیا جو دنیا میں کسی (قوم) کو بھی نہیں دیا گیا تھا ۹۳؎ اے میری قوم! اس زمین مقدس میں

الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ

داخل ہو جاؤ جسے اللہ نے تمھارے لئے لکھ دیا ہے ۹۴؎ اور پچھلے پیروں واپس نہ ہو ورنہ بالکل خسارہ

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ

میں پڑ جاؤ گے ۹۵؎ وہ بولے کہ اے موسٰی! اس سرزمین پر تو بڑی زبردست قوم (آباد) ہے ۹۶؎

عن زید بن اسلم قال قال رسول اللہ صلعم من کان له بیت وخادم فهو ملک (ابن جریر)

اور قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ ملک سردار، افسر یا فوجی قائد کے معنی میں آچکا ہے ابعث لنا ملکًا۔ (بقرہ۔ ۲۴۶) خود اہل فلسطین کے محاورہ میں بھی تقریبًا ہر سردار بادشاہ ہی کہلاتا تھا (جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد ۵، صفحہ ۵) اسی لئے یہاں متعدد ائمہ و اکابر نے مَلِک کا ترجمہ مخدوم یا اور ایسے ہی مترادفات سے کیا ہے۔

ای هم مخدومون کالملوک وعن ابن عباس ایضًا یعنی الخادم والمنزل وقاله مجاهد وعکرمة والحکم بن عیینة (قرطبی) اصحاب خدم وحشم (جلالین) قال ابن اسحٰق یعنی اصحٰب خدم وحشم (کمالین)

اسرائیلی ابھی چند سال قبل تک محکوم، مغلوب و مقہور تھے، اور اب ہر طرح آزاد و خود مختار تھے بالکل بجا تھا کہ تقابلِ حالات کے اظہار کے لئے اب انھیں ملوک سے تعبیر کیا جاتا۔

بعد ما کنتم مملیک فرعون (ابن عباسؓ) قال السدی یعنی وجعلکم احرارًا تملکون انفسکم بعد ما کنتم فی ایدی القبط بمنزلة اهل الجزیة فینا (کبیر)

۹۳؎ یہ نعمتِ عظمٰی نعمتِ توحید ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اقوامِ عالم میں نسلی و قومی حیثیت سے توحید اسرائیلیوں کے ساتھ مخصوص رہی ہے ورنہ اور قومیں من حیث القوم شرک ہی میں مبتلا رہی ہیں۔ ہمارے مفسرین کو اس مضمون کی آیتوں کی تفسیر میں بڑی دشواری یہ پیش آتی رہی ہے کہ اگر بنی اسرائیل کو سب سے افضل مان لیا جائے تو پھر امتِ محمدیؐ کے لئے کون سا مقام باقی رہ جائے گا؟

اشکال اور دشواری کی بنیاد ہی سرے سے غلط ہے۔ یہاں مقابلہ تو دنیا کی ساری قوموں اور نسلوں کا ہو رہا ہے ان میں بیشک سب سے افضل و اشرف نسل اسرائیلی ہی ہے کہ یہ خلاف دوسری قوموں کے شرک اور وہم پرستیوں کے توحید اور اس کے لوازم یعنی رسالت و وحی، حشر و غیرہ عقائدِ صحیحہ کی حامل دنیا کی تاریخ میں یہی ایک قوم رہی ہے، بخلاف اس کے امتِ محمدیؐ تو کسی قوم یا نسل کا نام ہی سرے سے نہیں، یہاں تو اسرائیلی، اسمٰعیلی، حبشی، چینی، روسی، جاپانی جو کوئی بھی عقائدِ اسلامی پر ایمان لے آئے وہی امتِ محمدیؐ میں داخل ہے اس پر مفصل حاشیے انی فضلتکم علی العٰلمین کے تحت میں سورۂ بقرہ کے رکوع ۵ و ۶ میں گزر چکے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کے خاندان میں سے ہونا ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے کیونکہ اس تعلق سے دین اس پر سہل ہوجاتا ہے، البتہ اس پر فخر اور گھمنڈ روا نہیں۔

**۹۴** (لوح محفوظ میں یا اپنے علم میں)

حضرت موسیٰؑ موقع ترغیب پر فرمارہے ہیں کہ وہ زمین تو تمہارے لئے مقدر ہوہی چکی ہے، ذرا سی ہمت و کوشش کرو تو ابھی مل جاتی ہے۔

الارض المقدّسة التی مقدس سرزمین سے مُراد شام ہے فلسطین (کنعان) اسی کے ایک علاقہ کا نام ہے۔

ھی الشام (ابن جریر عن قتادۃ) الارض المقدسة دمشق وفلسطین وبعض الاردن (ابن جریر عن ابن عباسؓ)

توریت میں ان وعدوں کی صراحتیں موجود ہیں:۔

"دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس زمین کو جس کی بابت خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا، میراث میں لو" (استثناء۔ ۱: ۸) "تو اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے قسم کھاکے کہ اسے میں تمہیں دوں گا، سکونت کرے" (استثناء۔ ۳۰: ۲۰) "مضبوط ہوجاؤ اور دلاور ہو خوف نہ کھاؤ اور ان سے مت ڈرو، کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے، وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا" (استثناء۔ ۳۱: ۶)

**۹۵** دنیوی خسارہ تو ظاہر ہی ہے کہ حکومت اور اتنی بڑی حکومت سے محروم ہوجاؤ گے اور اُخروی خسارہ یہ کہ حکم جہاد کی نافرمانی کا خمیازہ آخرت میں اٹھانا پڑے گا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی سے کبھی کبھی دُنیوی مضرتیں بھی پیدا ہوجاتی ہیں۔

**۹۶** یہ قوم عمالقہ کی تھی، جو ایک بڑی زور آور اور جنگ آزما قوم تھی، بنی اسرائیل کی پُرانی حریف توریت اور تاریخ اسرائیل اس کی جنگوں ریزیوں کی داستان سے رنگین ہے، توریت میں اس مقام پر بنی اسرائیل کی زبان سے یہ الفاظ ادا کئے گئے ہیں:

"ہمیں زور نہیں کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں" (گنتی۔ ۱۳: ۳۲)

"یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگلتی ہے اور سب لوگ جنھیں ہم نے وہاں دیکھا۔ بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو ہاں بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا، اور ہم اپنی نظروں میں اُن کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم اُن کی نظروں میں تھے" (گنتی۔ ۱۳: ۳۳)

جَبَّارِیْنَ جبار کا اطلاق بڑے ڈیل ڈول والوں، کلّے ٹھلّے والوں پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ یہاں یہی مُراد ہے۔

ای عظام الاجسام طوال (قرطبی) یقال رجلا جبارا اذا کان طویلا عظیما قویا والقوم کانوا فی غایة القوۃ وعظم الاجسام۔ (کبیر)

روایات یہود میں ذکر بہت مبالغہ کے ساتھ ان کے قدو قامت کی درازی کا آیا ہے، اور ان کی دراز دستیاں بھی بہت کچھ مذکور ہیں — لفظ جبار جو قرآن مجید نے ان کے لئے استعمال کیا ہے، بعینہٖ ہی ہے جو خود توریت میں ان کے لئے آیا ہے، جیسا کہ اوپر کے اقتباسات میں نقل ہوچکا۔

وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم تو وہاں ہرگز نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں البتہ وہ اگر وہاں سے نکل جائیں تو ہم بیشک داخل ہونے کو تیار ہیں ۹۷

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ

(اس پر) وہ دو آدمی جو (اللہ سے) ڈرنے والوں میں تھے (اور) ان دونوں پر اللہ کا فضل تھا بولے ۹۸ تم ان پر چڑھائی کرکے شہر کے دروازہ تک تو چلو

۹۷ بنی اسرائیل ایک طرف تو اپنے ان مخالفین یعنی عمالقہ کی ہیبت و شوکت سے اس قدر مرعوب تھے اور دوسری طرف تن آسانیوں کے طالب اور فرائض جہاد سے جی چُرانے والے بھی، اپنے وطن تک کے لئے، اپنے پیمبر اور دُنیوی لیڈروں کی ترغیب کے باوجود آمادہ نہ ہوئے۔

توریت میں اُن کی زبان سے ادا کیا گیا ہے:۔

"وہ لوگ جو وہاں بستے ہیں زور آور ہیں، اور اُن کے شہر بہت مضبوط قلعوں میں ہیں اور ہم نے بنی عناق کو بھی وہاں دیکھا، اور اس زمین میں دکھن کی طرف عمالیقی بستے ہیں ۔۔۔۔ ہمیں زور نہیں کہ ہم اُن لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زور آور ہیں" (گنتی۔ ۱۳: ۲۸، ۳۲)

نیز ملاحظہ ہو حاشیہ ماقبل، اسرائیلیوں کا یہ قول بھی بہ طریق استبعاد تھا، خوب سمجھے ہوئے تھے کہ نہ عمالقہ وہاں سے از خود نکلیں گے اور نہ ہمیں چڑھائی کی نوبت آئے گی۔

انما قالوا هذا على سبيل الاستبعاد (كبير) قيل قالوا ذلك على سبيل الاستبعاد ان يقع خروج الجبارين منها۔ (بحر)

۹۸ (ان کم ہمتوں کو حوصلہ دلانے کے لئے)

رَجُلٰنِ۔ ان دو میں سے ایک کا نام یوشع بن نون تھا، اور دوسرے کا کالب بن یوفنا، یوشع سردار تھے قبیلۂ بنی افرائیم کے، اور کالب قبیلۂ بنی یہودا کے۔

مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جن میں خوفِ خدا تھا جن کے دلوں میں تقویٰ الٰہی اور خشیت تھی۔

اى يخافون الله سبحانه و يتقونه (بيضاوى) كانه قيل رجلان من المتقين (كشاف)

اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا۔ اللہ کا فضل و ایمان اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ انھیں حق گوئی و حق پرستی کی توفیق دی اور وہ شوکتِ کفار سے مرعوب نہ ہوئے۔

اى باليقين و الصلاح۔ (قرطبى)

موسیٰ علیہ السلام نے جیسا کہ ہر دانشمند قومی لیڈر کو ایسے موقع پر کرنا چاہئے، کیا یہ کہ فلسطین پر فوج کشی سے قبل اپنی قوم کے ہر قبیلہ سے اُس کے کل بارہ معززین و شرفاء کو چُن کر ملک کے متعلق تحقیق حال کے لئے یا بہ اصطلاح توریت "جاسوسی" کے لئے آگے روانہ کردیا، اس میں سے دس نے آکر یہ مبالغہ آمیز رپورٹ دی کہ غنیم بہت ہی طاقتور ہے اس سے مقابلہ کرنا اپنی جان کھونا ہے، باقی دو نے اس کے برعکس ہمت افزا باتیں بیان کیں۔

توریت کے بیانات اس موقع پر بھی حسبِ معمول بڑے طویل ہیں، تاہم کچھ اقتباسات تو بہر حال قابلِ نقل ہیں:۔

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۬ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ

سو جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اسی وقت غالب آ جاؤ گے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو اگر تم ایمان رکھتے

مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا

ہو ۹۹ وہ لوگ بولے اے موسیٰؑ! ہم ہرگز وہاں کبھی بھی نہ داخل ہوں گے جب تک کہ وہ لوگ وہاں موجود

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

ہیں، سو آپ خود اور آپ کے خداوند چلے جائیں اور آپ دونوں لڑ بھڑ لیں ہم تو یہاں سے ٹلتے نہیں ۱۰۰

"پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کرکے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تا کہ کنعان کی زمین کی جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں، ایک ایک مرد اُس کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دے چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران سے اُن کو بھیجا، وہ سب لوگ بنی اسرائیل کے سردار تھے اور ان کے نام یہ ہیں — اور موسیٰؑ نے انھیں بھیجا کہ زمین کنعان کی جاسوسی کریں — اور اس زمین کو دیکھو کہ کیسی ہے وہ لوگ جو وہاں کے بسنے والے ہیں کیسے ہیں زور آور ہیں یا کمزور اور تھوڑے ہیں یا بہت، اور وہ زمین جس میں وہ رہتے ہیں کیسی ہے اچھی ہے کہ بری اور وہ شہر جن میں وہ بستے ہیں کیسے ہیں خیموں میں ہیں یا قلعوں میں، اور زمین کیسی ہے جید یا بنجر، اس میں درخت ہیں یا نہیں" (گنتی ۱۳: ۲۱-۲۵)

"وہ لوگ چڑھے اور زمین کی جاسوسی دشت صین سے حوب تک جو حمات کے راستہ میں ہے کی، وہ چالیس دن کے بعد اس زمین کی جاسوسی کرکے پھرے"۔ (گنتی ۱۳-۲۱-۲۵)

انھوں نے آکر جو کچھ کہا وہ حاشیہ نمبر ۹۶ میں نقل ہو چکا۔

۹۹ ان لوگوں نے ایک بڑی گہری اور عارفانہ حقیقت بیان کر دی کہ اصل امتحان تو حضرت حق کے ہاں بس عزم و ہمت ہی کا ہوتا ہے، باقی نتائج میں برکت تو از خود پیدا ہو جاتی ہے توریت میں اس مقام کی منظر کشی یوں کی ہے:-

"تب کالب نے موسیٰؑ کے حضور لوگوں کو چپ کروایا اور کہا کہ البتہ ہم لوگ چڑھیں گے اور ملک پالیں گے، کیونکہ ہمیں بلاشبہ اس کے لینے کا زور ہے"۔ (گنتی۔ ۱۳: ۳۰) "اور نون کے بیٹے یشوع یفنہ کے بیٹے کالب نے جو اس زمین کی جاسوسی کرنے والوں میں سے تھے اپنے کپڑے پھاڑے اور انھوں نے بنی اسرائیل کی ساری جماعت کو کہا، وہ زمین جس پر ہم اس کی جاسوسی کے لئے ہو گزرے نہایت خوب زمین ہے، اگر خدا ہم سے راضی ہے تو ہم کو اس زمین پر لے جائے گا، اور یہ زمین جس پر دودھ اور شہد بہہ رہا ہے ہم کو عنایت کرے گا، مگر تم خداوند سے بغاوت نہ کرو، اور نہ تم اس زمین کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں، اُن کا سایہ اُن سے جا چکا ہے، پر خداوند ہمارے ساتھ ہے ان کا خوف نہ کرو، تب ساری جماعت نے چاہا کہ ان پر پتھراؤ کرے"۔ (گنتی۔ ۱۴: ۶-۹)

(توریت کی اس عبارت میں یوشع کے بجائے یشوع اور یوحنا کے بجائے یفنہ کے نام عبرانی تلفظ و املاء کے مطابق درج ہیں)

۱۰۰ یہ کہنے والی بنی اسرائیل کی عام جماعت تھی جو ان فہمائشوں سے غیر متأثر رہی تھی توریت میں اس موقع کی

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ

(موسیٰ نے) عرض کی کہ اے میرے پروردگار میں تو سوا اپنے اور اپنے بھائی کے اور کسی پر اختیار رکھتا نہیں، سو تو ہی ہمارے اور

الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ

(اس) بے حکم قوم کے درمیان فیصلہ کر دے ۱۰۱۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تو وہ ملک ان پر چالیس سال کے لئے حرام

یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ

کر دیا گیا یہ لوگ زمین پر بھٹکتے پھریں گے ۱۰۲۔

منظر کشی یوں کی گئی ہے:۔

”تب ساری جماعت چلّا کر روئی اور لوگ اس رات بھر رویا کئے، پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰؑ اور ہارونؑ پر کڑکڑائے اور ساری جماعت نے انھیں کہا کہ اے کاش ہم مصر میں مر جاتے اور کاش کہ ہم اسی بیابان میں فنا ہوتے! خداوند کس لئے ہم کو اس زمین میں لایا کہ تلوار سے گر جائیں اور ہماری جوروان اور بچے پکڑے جائیں۔“ (گنتی ۱۴: ۱-۳)

”تب ساری جماعت نے چاہا کہ اُن پر (یوشع اور کالب پر) پتھراؤ کرے۔“ (گنتی ۔ ۱۴: ۱۰)

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ ۔ اسرائیلیوں کی اس تقریر کا گستاخانہ طرز تو ظاہر ہی ہے، لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شرک قوموں سے متاثر ہو کر یہ موحد قوم بھی اپنے عقیدے میں شرک اس حد تک داخل کر چکی ہو، مشرک قوموں کا یہ ایک عام دستور تھا کہ میدانِ جنگ میں جاتے تو اپنی مورتیوں، ٹھاکروں کو اپنے ساتھ لے جاتے اور یہ عقیدہ رکھتے کہ اُن کے دیوتا بھی اُن کے ساتھ ساتھ ہیں۔

اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ یہ واضح رہے کہ اسرائیلیوں کی اس وقت تک کوئی الگ باقاعدہ فوج نہ تھی بلکہ ساری قوم کا ہر بالغ و تندرست مرد مسلح اور فوجی سپاہی تھا — اُردو روزمرہ میں اس فقرہ کو یوں ہی ادا کیا جائے گا۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ ۔ یہ فقرہ ایک خدا پرست قوم کی زبان سے کس درجہ گستاخانہ تھا!

۱۰۱ یعنی فیصلہ ان دو فریقوں کے درمیان، جن میں ایک طرف ہم دو بھائی ہیں بے بس و بے اختیار اور دوسری طرف یہ جمّ غفیر ہے، ہر طرح گستاخ و نافرمان۔

اَخِیْ بھائی سے مراد حضرت ہارونؑ تھے، جو خود بھی پیغمبر برحق تھے، یہ دعا ظاہر ہے کہ ان پیمبرانِ برحق نے اپنی ناکارہ قوم کی سرکشی اور بغاوت اور اپنی بے بسی پوری طرح محسوس کرتے کے بعد ہی کی۔ توریت کے صفحات اسرائیلیوں کی گستاخانہ روش کے تذکرہ سے لبریز ہیں۔ آیت میں بڑی تسکین کا سامان اکابر اُمت کے لئے ہے، قوم جب سرکشی اور نافرمانی کے لئے تل جائے تو پیمبرانِ برحق تک کی کوششیں ناکام رہتی ہیں، پھر کسی ولی یا بزرگ کی سعی اصلاح اگر ناکام رہے تو وہ دل شکستہ کیوں ہو۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ دعائے موسوی میں لفظ اَخِیْ کے بڑھانے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ شیخ اپنے مخلص تابع میں بھی وہی حاکمانہ تصرف رکھتا ہے جو خود اپنے نفس میں۔

۱۰۲ (اور اسی جزیرہ نمائے سینا میں ٹھوکریں کھاتے رہیں گے۔)

ع ۷ ۔ ۸ رکوع

# فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ

سو آپ (اس) بے حکم قوم پر (ذرا) غم نہ کیجئے ۱۰۳ ۔ اور آپ انھیں آدمؑ کے دونوں بیٹوں کا قصہ ٹھیک ٹھیک پڑھ سنائیے

مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ۔ یعنی ان کے لئے تکوینی طور پر اب یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ چالیس سال سے قبل اس ارضِ مقدس میں داخل ہو سکیں اور جو نعمت انھیں تھوڑی جد و جہد کے بعد فی الفور مل جا رہی تھی اب اس کے لئے انھیں چالیس سال کا انتظار کرنا ہوگا اور ان کی موجودہ نسل کا بڑا حصہ اسی انتظار میں ختم ہو جائے گا۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ میں اُن سے جو وعدہ ہو چکا تھا، وہ بالکل مطلق اور غیر مشروط صورت میں نہ تھا، وہ مشروط تھا، ان کی جد و جہد کے ساتھ۔

والمراد بقوله كتب الله لكم اى بشرط ان تجاهدوا اهلها فلما ابوا الجهاد قيل فانها محرمة عليهم (مدارک) ينبغى ان يكون الله قد جعلها على شريطة القيام بطاعته واتباع امره فلما عصوا حرمهم اياها (جصاص)

توریت میں اس مقام پر ہے:۔

"مجھے اپنی حیات کی قسم کہ ساری زمین خداوند کے جلال سے معمور ہوگی کہ وہ سب لوگ جنھوں نے میری شوکت اور میرے معجزے جو میں نے مصر میں اور اس بیابان میں ظاہر کئے دیکھے اب تک مجھے اس مرتبہ آزماتے اور میری آواز پر کان نہ دھرتے وہ اس زمین کو جس کی بابت میں نے اُن کے باپ دادوں سے قسم کھائی تھی نہ دیکھیں گے بلکہ کوئی ان میں سے جنھوں نے مجھے غصہ دلایا اُسے نہ دیکھے گا" (گنتی ۱۴: ۲۱: ۲۳) "مجھے اپنی حیات کی قسم جیسا تم نے مجھے سنا کے کہا ہے میں تم سے ویسا ہی کروں گا، تمہاری لاشیں اور ان سب کی جو تم میں شمار کئے گئے ان کے کل جمع کے مطابق بیس برس والے سے لے کے اوپر والے تک جنھوں نے میری شکایتیں کیں اس بیابان ہی میں گریں گی اور تمہارے لڑکے اس دشت میں چالیس سال تک بھٹکتے پھریں گے اور تمہاری برگشتگی کے اُٹھانے والے ہوں گے" (گنتی ۱۴: ۲۳) "ان دنوں کے شمار کے موافق جس میں تم اس زمین کی جاسوسی کرتے تھے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہوگا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے، میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے کہ میں اس سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہیں ایسا ہی کروں گا، اس دشت میں وہ برباد ہو جائیں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے" (گنتی ۱۴: ۳۴، ۳۵)

عصر حاضر کے ایک فرنگی ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کے تخمینہ کے مطابق یہ زمانہ ۱۴۴۰ ق م اور ۱۴۰۰ ق م کے درمیان کا ہے۔

اَرْبَعِيْنَ۔ فعل حرّم کا ظرف زمانی ہے۔

اربعين ظرف التحريم (مدارک)

۱۰۳ ۔ پیمبر آخر پیمبر ہوتے ہیں، رحمت و شفقت کے پتلے، عفو و کرم کے مجسمے، کہاں تو دہی تو دعا کی تھی کہ نافرمان قوم کو سزا ملے اور کہاں اب جو سزا، وہ بھی صرف دنیوی، ملنے لگی تو لگا خود آپ ہی کا دل پسیجنے، اور ان لوگوں پر غم کرنے، عین اُسی وقت حکم ہوا کہ حکمتِ کاملہ میں ایسے نافرمانوں کے لئے سزا یہی مناسب ہے، اور آپ ان پر غم نہ کیجئے۔

خطاب موسیٰ علیہ السلام سے ہے جیسا کہ جمہور مفسرین کا قول ہے اور سیاق خود اسی کا مقتضی ہے۔

فالخطاب لموسى عليه السلام كما هو الظاهر واليه ذهب اجلة المفسرين (روح)

## إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ

(یہ اس وقت ہوا) جب دونوں نے ایک نیاز پیش کی ۱۰۵ ان میں سے ایک کی تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی ۱۰۶

۱۰۴ (اے ہمارے پیغمبر!)

عَلَيْهِمْ۔ میں ضمیر کس طرف ہے؟ اہلِ کتاب، خصوصاً معاندین اہلِ کتاب کی طرف ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔

واتل على اهل الكتاب (كبير) اى اقصص على هؤلاء البغاة الحسدة (ابن كثير) واتل على هؤلاء اليهود الذين هموا ان يبسطوا ايديهم اليكم۔ (ابن جرير)

لیکن عام نوعِ انسانی بھی مراد ہو سکتی ہے۔

واتل على الناس (كبير)

قصہ کا مقصد دو امور کی تعلیم دینا ہے (۱) ایک یہ کہ نسب کی بزرگی مطلق صورت میں کام نہیں آتی، مقبول صرف وہی ہوتا ہے جو حکم کا مطیع ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ انسان حسد سے متأثر ہو کر کیسی کیسی شیطانی حرکتیں کر گزرتا ہے۔

ابْنَيْ آدَمَ۔ مراد قابیل وہابیل ہیں، یا بہ اصطلاح توریت قائن وہابل، قابیل بڑے تھے اور ہابیل چھوٹے، حسبِ تصریح توریت قابیل کاشت کار تھے، اور ہابیل بھیڑ، بکری کے چرواہے یا گلہ بان۔

بِالْحَقِّ۔ تقدیر کلام یوں ہے۔

متلبسا بالحق۔ تلاوة متلبسة بالحق والصحة (كشاف)

عجب نہیں مقصود یہ ظاہر کرنا ہو کہ قرآن کی یہ بیان کی ہوئی روداد بالکل سچ ہی سچ ہے توریت وغیرہ کی روایتوں کی طرح یہ قصہ بھی حق و باطل کی ملاوٹ نہیں رکھتا۔ محقق رازیؒ نے ایک پہلو اور بھی رکھا ہے یعنی یہ قرآنی حکایت، دوسری قرآنی حکایتوں کی طرح، ہدایت کا سبق لینے کے لئے ہے جاہلیتِ قدیم و جاہلیتِ جدید کی طرح قصہ محض قصہ کی غرض سے آرٹ محض آرٹ کی غرض سے، قرآن مجید کا مقصود نہیں ہو سکتا۔

اى ليعتبروا به لا ليحملوه على اللعب والباطل مثل كثير من الأقاصيص التى لا فائدة فيها وانما هى لهو الحديث

اور یہ بات اسی ایک حکایت کے ساتھ خاص نہیں قرآن مجید کی ساری حکایتوں اور قصوں سے مقصود یہی عبرت و موعظت و ہدایت ہے

وهذا يدل على ان المقصود بالذكر من الاقاصيص والقصص فى القرآن العبرة لا مجرد الحكاية (كبير)

۱۰۵ (اللہ کے حضور میں)

قُرْبَانًا۔ قربانی یہاں اصطلاحی معنی میں یعنی ذبیحہ کے مرادف نہیں بلکہ لفظی معنی اور وسیع مفہوم میں نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔

القربان ما يتقرب به الى الله (راغب) القربان: اسم لما يتقرب به إلى الله تعالى من ذبيحة او صدقة (كبير) القربان ما يقصد به القرب من رحمة الله تعالى من اعمال البر (جصاص)

قُرْبَان۔ اسم جنس ہے، واحد و جمع دونوں موقعوں پر اسی صورت سے آتا ہے۔

اسم جنس فهو يصلح للواحد والعدد (كبير)

قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۷﴾

(اس پر وہ دوسرا) بولا کہ میں تجھ کو قتل کر کے رہوں گا ف۱۰۶ (پہلے نے) کہا اللہ تو متقیوں کا (عمل) قبول کرتا ہے ف۱۰۷

**ف۱۰۶** (اس لئے کہ وہ مخلصانہ نہ تھی)

روایتوں میں آتا ہے کہ چھوٹے بھائی ہابیل کی نذر مخلصانہ تھی، اس نے اپنے گلّے کی بہترین بھیڑ پیش کر دی تھی، وہ قبول ہو گئی، بڑے بھائی قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار کا ناقص حصّہ پیش کیا، وہ قبول نہ ہوا، قبولِ نیاز کی علامت اُس زمانہ میں یہ تھی کہ ایک آگ آسمان سے آ کر نذر قبول کر لے جاتی تھی توریت میں اس کے اشارے بار بار آئے ہیں۔

**ف۱۰۷** قابیل ہابیل سے خفا پہلے ہی کسی معاملہ میں تھا، اور یوں بھی سِن میں بڑا تھا، اپنے کو بزرگی اور مقبولیت کا زیادہ حقدار سمجھتا تھا، اب شدّتِ حسد سے بہت ہی برافروختہ ہو کر بے گناہ بھائی کی جان تک لینے پر آمادہ ہو گیا۔

توریت میں یہ پورا قصّہ یوں درج ہے:۔

"چند روز کے بعد یوں ہوا کہ قائن اپنے کھیت میں سے خداوند کے واسطے ہدیہ لایا اور ہابل بھی اپنی پلوٹھی اور موٹی بھیڑ بکریوں میں سے لایا، اور خداوند نے ہابل کو اور اس کے ہدیہ کو قبول کیا، پر قائن کو اور اس کے ہدیہ کو قبول نہ کیا، اس لیے قائن نہایت غصّہ اور ترش رو ہوا، اور خداوند نے قائن سے کہا تجھے کیوں غصّہ آیا اور اپنا منہ کیوں بگاڑا، اگر تو اچھا کرتا تو کیا مقبول نہ ہوتا؟ اور اگر تو اچھا نہ کرے تو گناہ دروازہ پر موجود ہے، اور تیرا ارادہ رکھتا ہے، پر تو اس پر غالب آ، اور قائن نے اپنے بھائی ہابل سے باتیں کیں، اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن نے اپنے بھائی ہابل پر اُٹھا، اور اُسے مار ڈالا" (پیدائش۔ ۴: ۳، ۸)

**ف۱۰۸** (اور تم چونکہ مقامِ تقوٰے اور اخلاص پر قائم نہ رہے اس لئے قبولِ نذر کے معاملہ میں ناکام رہے اس میں میری کیا خطا ہے؟)

لان حصول التقوی شرط فی قبول الاعمال (کبیر)

محقق رازیؒ نے لکھا ہے کہ تقوٰے میں ان تین امور کی رعایت لازمی ہے، ایک یہ کہ قبولِ طاعت میں غایتِ خشیت کا استحضار ہو اور اپنی طرف سے کوئی بات تکمیلِ طاعت میں اٹھا نہ رکھی جائے، دوسرے یہ کہ امکانی کوشش اس امر کی رہے کہ طاعت سے رضاءِ الٰہی کے سوا اور کچھ مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ غیر اللہ کی شرکت و آمیزش ذرا بھی اس طاعت میں نہ ہو

حقیقۃ التقوی امور احدھا ان یکون علی خوف و وجل من تقصیر نفسہ فی تلک الطاعۃ فیتقی باقصی ما یقدر علیہ عن جھات التقصیر۔ وثانیھا ان یکون فی غایۃ الاتقاء من ان یاتی بتلک الطاعۃ لغرض سوی طلب مرضاۃ اللہ تعالٰی۔ وثالثھا ان یتقی ان یکون لغیر اللہ تعالٰی فیہ شرکۃ (کبیر)

محققین اہلِ سنّت کا اس پر اتفاق ہے کہ تقوٰی سے اس سیاق میں مراد تقوٰی شرک ہے، تو جو شرک سے محفوظ اور توحید پر قائم رہا، تو جن اعمال میں اس نے صدقِ نیت سے کام لیا، وہ مقبول ٹھہریں گے اور جو شرک و معصیت دونوں سے بچا، وہ قبول و رحمت دونوں کا حقدار ٹھہرا

قال ابن عطیۃ المراد بالتقوی ھنا اتقاء الشرک باجماع اھل السنۃ فمن اتقاہ وھو موحد فاعمالہ التی تصدق فیھا نیتہ مقبولۃ (قرطبی بحر) واما المتقی الشرک والمعاصی فلہ الدرجۃ من القبول والختم بالرحمۃ (قرطبی)

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَکَ لِتَقْتُلَنِیْ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْکَ لِاَقْتُلَکَ ۚ

تو اگر تو اپنا ہاتھ مجھ پر اٹھائیگا کہ مجھے قتل کر ڈالے ف۹ تو میں (جب بھی) اپنا ہاتھ تجھ پر اٹھانے کا نہیں کہ تجھے قتل کر ڈالوں ف۱۰

اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ

(کیونکہ) میں تو اللہ پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں ف۱۱ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ تو میرے (قتل کا) گناہ اور

وَاِثْمِکَ فَتَکُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِکَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۹﴾ ۚ

اپنا (پچھلا) گناہ (دونوں) اپنے سر رکھ لے پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جائے ف۱۲ یہی سزا ہے ظلم کرنے والوں کی ف۱۳

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اپنے کسی کمال کا اظہار موقع شکر پر جائز ہے بہ طور فخر نہیں۔

ف۹ (باوجود اس کے کہ میں بے قصور ہوں)

ف۱۰ (حالانکہ تیرے ارادۂ قتل پر مطلع ہو کر اور آمادگیٔ قتل دیکھ کر میرے پاس جواز قتل کا عذر بھی موجود ہے) فقرہ کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ تم جس طرح آغازِ قتل میں دلیر ہو میں ابتداء بالقتل کی جرأت نہیں رکھتا۔ یہ مطلب نہیں کہ مدافعت میں تلوار اٹھانا جائز نہ ہو۔ شریعت اسلامی میں جب قرائن قوی سے یہ معلوم ہو جائے کہ قاتل حملہ کیا ہی چاہتا ہے تو جوابی مدافعت میں تلوار اٹھانا بالکل جائز ہے بلکہ اگر مصلحتِ اسلامی اس کی مقتضی ہو تو ایسے موقع پر واجب ہو جاتا ہے۔

قال ابن عباسؓ لئن بدأتنی بقتل لم ابدأک به ولم یرد انی لا ادفعک عن نفسی اذا قصدت قتلی (جصاص) یجب علی من قصدہ انسان بالقتل قتله اذا امکنه (جصاص) انه فی شرعنا یجوز دفعه اجماعاً وفی وجوب ذلک علیه خلاف والاصح وجوب ذلک (قرطبی) واختلف فی هذا الآن فالصحیح من المذهب انه یلزم الرجل دفع الفساد عن نفسه وغیرہ وان ادّٰی للقتل۔ (روح)

محققین اہلِ سنت نے اس فتویٰ پر علاوہ احادیث نبوی کے متعدد آیاتِ قرآنی سے بھی استدلال کیا ہے مثلاً (۱) وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة، کہ قصدِ قتل یقیناً فتنہ میں شامل ہے (۲) ولکم فی القصاص حیٰوۃ کہ اسی سزائے قتل کے خوف سے قاتل قتل سے باز رہے گا (۳) فان بغت احدٰهما علی الاخرٰی فقاتلوا التی تبغی الخ کہ فئہ باغیہ قصدِ قتال ہی رکھتی ہے۔ اور انہی آیاتِ قرآنی و احادیثِ نبوی سے استدلال کر کے حضرت علیؓ نے خوارج سے قتال ان کے قصدِ قتال کی بنا پر جائز رکھا تھا اور سب صحابیوں نے آپؓ کی رائے سے اتفاق کیا۔

وقد قتل علیؓ بن ابی طالب الخوارج حین قصدوا قتل الناس واصحاب النبی صلعم معه موافقون له علیه وقد روی عن النبی صلعم آثار فی وجوب قتلهم (جصاص)

مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ کے فقرۂ نفی میں ایک تو بجائے فعل کے اسم فاعل اور پھر حرف ب نفی بسط کی تاکید و استمرار کے لئے ہے۔

لتاکید النفی بما فی حیزها من الباء للمبالغة فی اظهار براءته عن بسط الید ببیان استمرارہ علی نفی البسط (ابوسعود) واکد النفی بالباء (بیضاوی) ذکر الشرط بلفظ الفعل والجزاء بلفظ اسم الفاعل مقروناً بالباء المزیدة لتاکید النفی (نیشاپوری)

۱۱۱ (اور مدافعت تک میں ہاتھ نہیں اٹھاتا، تیری سی جسارت کہاں سے لاسکتا ہوں کہ خدا سے ذرا نہیں ڈرتا، اور بالکل بلاوجہ میرے قتل پر آمادہ ہوگیا ہے)

اصل مسئلہ شرعی تو وہی ہے جو اوپر کے حاشیہ میں مذکور ہوچکا، البتہ الفاظِ قرآنی کے ظاہر سے سند پکڑ کے بعض بزرگوں نے ایسے موقع پر بھی عفو و درگزر ہی کو اختیار کیا ہے اور بعض اکابر سے منقول ہے کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا آخری وقت کا طرزِ عمل اسی آیت کے مطابق تھا یعنی اپنی جان دینا گوارا کرلی اور جان کے دشمنوں سے مقابلہ وقتال قبول نہ فرمایا۔

قال ایوب السختیانی ان اول من اخذ بھذہ الآیۃ من ھذہ الامۃ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ رواہ ابن ابی حاتم (ابن کثیر) وھذا فی الشرع جائز لمن ارید قتلہ ان ینقاد ویستسلم طلبا للاجر کما فعل عثمان رضی اللہ عنہ (معالم) قال بعضھم المقصود بالقتل ان اراد ان یستسلم جاز لہ ذلک وھکذا فعل عثمان رضی اللہ عنہ (کبیر) انما استسلم کما استسلم عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ (بحر)

اِنِّیٓ اَخَافُ۔ جملہ تعلیلیہ ہے اور اسی لئے ترجمہ میں "کیونکہ" بڑھا دیا گیا۔

اشارۃ الی کون الجملۃ تعلیلیۃ لما قبلہ وھذا التقریر احسن من کل ما یوجد فی التفاسیر (تھانوی) علل ذلک بقولہ انی اخاف اللہ (ابوسعود) تعلیل للامتناع عن بسط یدہ لیقتلہ (روح)

۱۱۲ (جو کھلا ہوا نتیجہ تیری بدکرداریوں کا ہوتا ہے)

اِثْمِیْ کے معنی "میرے گناہ" کے نہیں بلکہ اہل تحقیق کے نزدیک "میرے قتل کے گناہ" کے ہیں، اور تقدیر کلام یوں ہے:

یاثم قتلی من قتلک ایای (ابن جریر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وابن مسعود رضی اللہ عنہ وناس من اصحاب الرسول) ای باثم قتلی (ابن کثیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ومجاھد والضحاک وقتادہ والسدی) ای باثم قتلی وھذا قول اکثر المفسرین (معالم)

اِثْمِکَ۔ سے مراد وہ گناہ ہیں جو قابیل اس تازہ اقدامِ گناہ سے قبل کرچکا تھا، یا وہ پہلا گناہ جس کے پاداش میں اس کی نذر قبولیت سے محروم رہ گئی تھی۔

واثمک فی معصیۃ اللہ بغیر ذلک من معاصیک (ابن جریر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وابن مسعود رضی اللہ عنہ وناس من اصحاب الرسول) اثم الذی علیک قبل ذلک (ابن کثیر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ومجاھد والضحاک وقتادۃ والسدی) اثمک الذی لاجلہ لم یتقبل قربانک (مدارک) قال اکثر العلماء ان المعنی ترجع باثم قتلی واثمک الذی عملتہ قبل قتلی قال الثعلبی ھذا قول عامۃ اکثر المفسرین (قرطبی)

فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ۔ اس جزو سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ قابیل کافر تھا، اس لئے کہ اَصْحٰبُ النَّار کا اطلاق قرآنی اصطلاح میں کافروں ہی پر ہوتا ہے۔

وقد استدل بقول ھابیل لاخیہ قابیل انہ کان کافرا لان لفظ اصحب النار انما ورد فی الکفار حیث وقع فی القرآن (قرطبی)

لیکن اہل تحقیق کے نزدیک یہ استدلال صحیح نہیں، اصحاب النار وہ سارے ہی لوگ ہیں جو کچھ دیر کے لئے بھی دوزخ میں چلے جائیں، اور یہ سزا مومن عاصی تک کے لئے ممکن ہے۔

وھذا مردود بما ذکرناہ عن اھل العلم فی تاویل الآیۃ ومعنی من اصحب النار مدۃ کونک فیھا (قرطبی) ولا یقوی ھذا الاستدلال لانہ یکفی عن المقام فی النار مدۃ بالصحبۃ (بحر)

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

غرض اس کے نفس نے اُسے اپنے بھائی کے مار ڈالنے پر آمادہ کر دیا تو اس نے اُسے مار ہی ڈالا [۱۱۴] جس سے وہ بڑا نقصان اٹھانے والوں میں ہو گیا [۱۱۵]

اِنِّیْٓ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ۔ یعنی میں چاہتا ہوں کہ سارا وبال تم ہی پر پڑے مجھ پر نہ پڑے، یہ مراد نہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی گناہ کرو، کسی کے لئے یہ چاہنا کہ وہ گناہ کرے جائز نہیں۔ البتہ اس چاہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ گناہ کا وبال گناہ گار ہی پر پڑے۔

والمراد انی ارید ان تبوا بعقاب اثمی واثمك لانه لایجوز ان یکون مرادہ حقیقۃ الاثم اذ غیر جائز لاحد ارادۃ معصیۃ اللّٰہ من نفسه ولا من غیرہ (جصاص) معناہ انی ارید ان تبوا بعقاب قتلی فیکون ارادۃ صحیحۃ لانها موافقۃ لحکم اللّٰہ عزّوجلّ (معالم)

تَبُوْٓاَ۔ باء کے معنی اُلٹ کر پڑنے کے ہیں۔

ومعنی تبوٓا ترجع والبواء الرجوع بالقود (جصاص) وقیل تحتمل (معالم)

[۱۱۳] اپنے عام حکیمانہ اُسلوب کے مطابق قرآن مجید نے یہاں بھی ایک مخصوص واقعہ کے بیان کے مابعد ہی قانونِ عام بھی سنا دیا۔

[۱۱۴] ہابیل کی اس مؤثر تقریر سے قابیل ذرا بھی متاثر نہ ہوا، بلکہ مقابلہ و مزاحمت کی طرف سے بے فکر ہو کر عجب نہیں جو قتل پر اور زیادہ آمادہ ہو گیا ہو۔

فَقَتَلَهٗ۔ توریت میں ہے:۔

"اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے تو یوں ہوا کہ قائن اپنے بھائی ہابل پر اٹھا اور اُسے مار ڈالا" (پیدائش ۴:۸)

یہ تصریح کہیں نظر سے نہیں گزری کہ قابیل نے کس طریقہ سے جان لی، گلا گھونٹ کر، یا پتھر مار کر یا کسی دھاردار چیز سے گلا کاٹ کر۔ عربی کا لفظ قتل، جان لینے کی ہر صورت کے لئے عام ہے۔

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ۔ یعنی اُسے نفس نے اس کام پر رفتہ رفتہ دلیر و مستعد بنا دیا، اور اُسے اس کی نظر میں خوشگوار کر دکھایا۔

ای فحسنت وسولت نفسه وشجعته علی قتل اخیه (ابن کثیر)

بہ حال ہر بدی و معصیت کا ہے، ابتداءً ہر فطرت سلیم اُس سے رُکتی ہے، ہچکچاتی ہے لیکن رفتہ رفتہ نفس اس کی جانب مائل اور اُس پر گردیدہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی طرف سے جھجک مٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ انسان اُسے بے دھڑک کر گزرتا ہے۔

[۱۱۵] خسران اور نقصان اس سے بڑھ کر کیا ہو گا کہ دنیا میں سب سے پہلا قتل کیا قتلِ انسانی اور برادر کُشی کا مرتکب ہوا، اور آخرت میں عذاب شدید کا مستحق ٹھہرا۔

فَاَصْبَحَ۔ سے یہ مراد نہیں کہ قتل رات ہی کے وقت ہوا تھا، اَصْبَحَ کا اطلاق وقت مبہم کے لئے عام ہے، وقوعِ قتل و حصولِ خسران دن یا رات کے جس حصہ میں بھی ہوا ہو، اس لفظ کے اعتبار سے بے تکلف جائز ہے۔

اَصْبَحَ "ہو گیا" کے معنی میں اور صار کے مرادف عرب کا عام محاورہ ہے بعضوں کو اس محاورہ کے سمجھنے میں عجب غلطی ہوئی ہے۔

ولا دلالۃ فی قوله فاصبح علی ان القتل کان لیلا وانما المراد به وقت مبهم جائز ان یکون لیلا

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِى الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِىْ

اس پر اللہ نے ایک کوّے کو بھیجا جو زمین کو کھودتا تھا تاکہ اسے دکھا دے کہ وہ اپنے بھائی کی لاش کو کس طرح

سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا

چھپائے ۱۱۶ (یہ دیکھ کر) وہ بولا ہائے میری کمبختی کہ میں اس سے بھی گیا گزرا ہوا کہ اس کوّے ہی کے

الْغُرَابِ فَاُوَارِىَ سَوْءَةَ اَخِىْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا ۱۱۷ غرض وہ (بہت ہی) شرمندہ ہوا ۱۱۸

وجائز ان یکون نهارا وهذا عادة العرب فی اطلاق مثله والمراد به الوقت المبهم (جصاص) اصبح بمعنی صار (بحر) الاتری انهم جعلوا اضحی وظل وامسی وبات بمعنی صار (بحر)

۱۱۶ یہ روئے زمین پر پہلا قتل تھا، اور قابیل غریب کو یہ بھی خبر نہ تھی کہ اپنے مردہ بھائی کی لاش کو آخر کرے کیا۔ آخر ایک معمولی اور حقیر سا پرندہ انتظاماتِ تکوینی کے ماتحت اس قاتل کو دفن کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا گیا۔

سَوْءَةَ۔ کے لفظی معنی جسم کے پوشیدہ رکھے جانے والے حصّہ کے ہیں، یہاں مراد نعش سے ہے۔

ای جیفة اخیه (کبیر) قیل جمیع جیفته فان المیت کله عورة (بحر)

۱۱۷ قاتل اب بہ کمال حسرت وندامت کہہ رہا ہے کہ مجھے تو اس مُردار خوار جانور کے برابر بھی فہم وشعور نہیں! توریت میں تو ہابیل کی تدفین کا کچھ ذکر نہیں، البتہ شارحینِ توریت نے ایک پرندہ کا ذکر کیا ہے کہ اس کے عملِ تدفین کو دیکھ کر آدمؑ وحواؑ نے بھی ہابیل کا لاشہ زمین میں دفن کیا، لیکن پرندہ کا نام بجائے کوّے کے جنگلی فاختہ آیا ہے، ملاحظہ ہو جیوش انسائیکلو پیڈیا جلد اول ص ۴۹

اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ بعض فقہاء نے اس بیان سے جوازِ قیاسِ تمثیلی کا استنباط کیا ہے۔

فیه دلیل علی قیاس الشبه (ابن العربی)

يٰوَيْلَتٰۤى۔ ویل کلمۂ تقبیح ہے حسرت ودرد کے موقع پر آتا ہے جیسے اُردو میں کوئی کہے اے میری شامت! یا ہائے میری خرابی!

قال الاصمعی ویل تقبیح ... وقد توقع موضع التحسس والتفجع منه (برہان)

۱۱۸ (اپنی اس تباہ حالی پر)

یہ ندامت قتلِ نفس پر نہ تھی جو توبہ کی قائم مقام کسی درجہ میں بھی ہو سکتی، بلکہ قتل کے بعد جو دشواریاں نظر آئیں صرف ان پر تھی جسے ندامتِ طبعی کہا جا سکتا ہے جو کسی حد تک بھی توبہ کا کام نہیں دے سکتی، گویا قاتل صرف پریشان ہوا پشیمان اب بھی نہ ہوا۔

ولم یکن ذلك ندم توبة (قرطبی) قیل انه ندم علی القتل علی غیر جهة القربة الی الله تعالی منه وخوف عقابه (جصاص) فكان ندمه لاجل هذه الاسباب لا لكونه معصية (كبير)

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ

اسی باعث ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے

نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ

عوض) کے بغیر مار ڈالے ۱۱۹ے تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا ۱۲۰ے

جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ

اور جس نے ایک کو بچا لیا، تو گویا اس نے سارے آدمیوں کو بچا لیا ۱۲۱ے

حکیم الامت تھانویؒ نے فرمایا کہ اگر یہ ندامت عواقبِ قتل پر نہیں، بلکہ قتل ہی مانی جائے، جب بھی ہر ندامت توبہ نہیں، جب تک معذرت اور انکسار اور فکر تدارک بھی اس کے ساتھ شامل نہ ہو، یہ ندامت اگر کہیں معصیت کو معصیت سمجھ کر، اور خوفِ خدا سے ہوتی تو توبہ قبول ہی نہ ہو گئی ہوتی۔

ولو ندم علی الوجه المامور به لقبل الله توبته وغفر ذنوبه (جصاص) الندم له شروط فكل من جاء بشروطه قبل منه ومن اخل بها او بشیٔ منها لم يقبل (ابن العربی) الندم علی المعاصی انما يقع بشرط العزم علی ان لا يفعل فی المستقبل۔ (ابن العربی)

۱۱۹ے (اور اس طرح قتلِ ناحق کا مرتکب ہو)

آیت سے ظاہر ہو گیا کہ جو بھی قتلِ ارادی بجز ان دو صورتوں کے کیا جائے، وہ قتلِ ناحق ہو گا۔

نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ۔ یعنی وہ قتل بہ طور قصاص یا کسی قتل کے عوض میں ہو۔

فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ۔ یعنی وہ قتل کسی ایسے جرم کے پاداش میں ہو جس سے ملک میں بدامنی اور فساد کی بنیاد پڑ رہی ہو، اور نظامِ عالم پر اس سے ضرب لگ رہی ہو، مثلاً رہزنی، بغاوت، حرام کاری وغیرہ۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ۔ یعنی ان مفاسد کے باعث جو قتلِ ناحق سے پیدا ہوتے ہیں۔

ذٰلك سے اشارہ قصۂ قتل ہابیل کی جانب نہیں، بلکہ ان مفاسد کی جانب ہے جو قتلِ ناحق سے لازم آتے ہیں۔

هو اشارة الی ما مر ذكره فی هذه القصة من انواع المفاسد الحاصلة بسبب القتل الحرام (كبير)

آیت کے اس ٹکڑے سے فقہاء نے قیاسِ شرعی کا بھی اثبات و استناد کیا ہے۔

فيه ابانة عن المعنی الذی من اجله كتب علی بنی اسرائيل ما ذكر فی الآية (جصاص) وفيه دليل علی اثبات القياس ووجوب اعتبار المعنی التی علق بها الاحكام وجعلت عللا و اعلاما لها (جصاص)

۱۲۰ے آیت پر یہ جو اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرد کا قاتل اور ساری نوع کا قاتل برابر کیسے ہو سکتے ہیں تو یہ لفظ فكانما پر غور کرنے پر جاتا رہتا ہے، یہ ارشاد ہرگز نہیں ہو رہا ہے کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں یکساں ہو گا، قانونِ عدالت اور ضابطہ کی نظر میں دونوں جرموں کی مساوات کا یہاں مطلق ذکر نہیں، مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے، جو ظالم و فاجر ایک شخص کی بھی جان بلا وجہ اور بے قصور لے ڈالنے میں نہیں ہچکچاتا، اس کی جسارت اور خبث نفس سے

ـــ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۔ معانقہ ۵

# وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ

اور یقیناً اُن لوگوں کے پاس ہمارے پیمبر کُھلے ہوئے احکام لے کر آئے ۱۲۲

بعید کیا ہے، جو وہ پائے تو سارے انسانوں کو تہہ تیغ کرکے رکھ دے۔ اصل شے تو اس شخص کی نظر میں قانونِ شریعت کی بے وقری اور اس کے خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے۔

من حیث انه هتك حرمة الدماء وسنّ القتل وجرّأ الناس علیه (بیضاوی) المقصود من تشبیه قتل النفس الواحدة بقتل النفوس المبالغة فی تعظیم امر القتل العمد العدوان وتفخیم شانه (کبیر) قیل المعنی من استحل واحدا فقد استحل جمیعا لانه انکر الشرع (قرطبی)

حدیث نبوی میں بھی یہ مضمون ایک جگہ آیا ہے کہ روئے زمین پر جو بھی قتل ناحق ہوتا ہے، اس کے وبال کا ایک حصہ قابیل کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ بانیٔ اوّل اس جور و ستم کا تو وہی ہوا ہے۔

عن عبد الله قال قال رسول الله صلعم لا تقتل نفس ظلما الا کان علی ابن آدم الاول کفل من دمها لانه اول من سنّ القتل۔ (بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب خلق آدم وذرّیته)

موجودہ توریت میں تو جرم قتلِ انسانی سے متعلق صرف اس قدر ہے:۔

”جو کوئی آدمی کا لہو بہاوے آدمی ہی سے اس کا لہو بہایا جائے گا کیونکہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے“ (پیدائش ۹:۶)

لیکن تالمود میں (حسب روایت راڈول، انگریزی مترجم قرآن) حسب ذیل مضمون بھی موجود ہے:۔

”جو کوئی کسی ایک اسرائیلی کو بھی مار ڈالے گا، اس کے لئے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ساری نسل اسرائیل کو قتل کر دیا“۔

۱۲۱ ایک حدیث صحیح میں بھی یہ مضمون، ایک عام قاعدہ وضابطہ کی صورت میں آیا ہے:۔

من سنّ سنّة حسنة فعمل بها کان له اجرها ومثل اجر من عمل بها لا ینقص من اجورهم شیئا ومن سنّ سنّة سیئة فعمل بها کان علیه وزرها ووزر من عمل بها لا ینقص من اوزارهم شیئا۔

(جو کوئی کسی نیک رسم کی بنیاد ڈال دے اور اس پر عمل بھی کرے اُسے اجر اپنا بھی ملتا ہے اور اس کے بعد اس پر تمام عمل کرنے والوں کا بھی، بغیر اس کے کہ ان لوگوں کے اجر سے کچھ کم کیا جائے، اور جو کوئی کسی رسمِ بد کی بنیاد ڈال دے اور اس پر عمل بھی کرے اس پر گناہ اپنے کئے کا بھی پڑتا ہے، اور اس کے بعد اس پر دوسرے عمل کرنے والوں کا بھی بغیر اس کے کہ ان لوگوں کا گناہ کچھ گھٹا ہو۔)

اگر نص کی اتنی تصریحات نہ موجود ہوتیں، جب بھی یہ مسئلہ اپنی جگہ پر عقلی تھا۔

اَحْیَاهَا۔ احیا کے معنی یہاں زندہ کرنے کے نہیں، موت سے بچا لینے اور اسبابِ ہلاکت سے دور رکھنے کے ہیں۔

قال مجاهد نجاها من الهلاك (جصاص) من سلم من قتلها (معالم) المراد من احیاء النفس تخلیصها عن المهلکات مثل الحرق والغرق والجوع المفرط والبرد والحر المفرطین (کبیر) الاحیاء هٰهنا العفو (معانی)

یہ بچا لینا مستحقِ مدح واجر جب ہے جب خونِ ناحق سے بچایا جائے، ورنہ بچا لینے کو اگر اپنے مطلق اور عمومی معنی میں رکھا جائے تو موقع قصاص وغیرہ پر قتل واجب سے کسی کو بچانا بجائے خود ایک معصیت اور اعانت علی الحرام ہے۔

۱۲۲ (اور اُن ہی احکام میں قتلِ ناحق اور خوں ریزی کی ممانعت بھی داخل تھی۔)

ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا

اس پر بھی ان میں کے بہت سے لوگ ملک میں زیادتی کرنے والے ہی رہے ۱۲۳ جو لوگ

جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا

اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے میں لگے رہتے ہیں ۱۲۴

البیّنات۔ سے مُراد دلائل و معجزات بھی ہو سکتے ہیں، لیکن یہاں زیادہ چسپاں معنی احکام و ہدایات کے ہیں۔

ای بالامر والنھی والعلامات (ابن عباسؓ) "صاف حکم" (شاہ عبد القادر دھلویؒ)

جَآءَتْهُمْ۔ هُمْ کی ضمیر انھی بنی اسرائیل کی جانب ہے۔

۱۲۳ (یہاں تک کہ بعض اوقات تو خود اُن ہی پیغمبروں کو مار ڈالا۔)

ثُمَّ۔ کبھی استبعاد کے لئے بھی آتا ہے۔

ثم للتراخی فی الرتبة والاستبعاد (روح) جیٔ ثم ایذانا بترتبه وتراخیه فی الاعجاب (مغنی)

چنانچہ یہاں اس معنی میں ہے کہ جو نتیجہ ان پیمبروں کے آنے کا نکلنا تھا وہ تو کچھ بھی نہ نکلا، البتہ اس کے برعکس نکلا۔

لَمُسْرِفُوْنَ۔ اسراف میں ہر قسم کی زیادتی اور ہر قسم کے گناہ آگئے، اور مطلب یہ ہوا کہ پیغمبروں کی آمد کے باوجود اسرائیلیوں کی اکثریت احکامِ شریعت کی مسلسل خلاف ورزی کرتی رہی۔

الاسراف فی کل امر التباعد عن حد الاعتدال مع عدم مبالاة به (روح) ای ان اکثرھم مجاوزون الحد تارکو امر اللّٰه (قرطبی) ای مجادّ واللّٰه ورسله باتباعھم اھواء ھم وخلافھم علی انبیاءھم وذلک کان اسرافھم فی الارض (ابن جریر)

۱۲۴ یہ کون لوگ ہیں؟ اور آیت کے ان دو جملوں میں باہمی تعلق کیا ہے؟ اہل تحقیق کے نزدیک دونوں فقروں کے درمیان کا "و" واو تفسیری ہے، اور اس لئے دوسرا فقرہ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ پہلے فقرہ الذین یحاربون اللّٰه ورسوله کی تشریح و تفسیر اور اس کی مُراد متعین کر رہا ہے۔

ویسعون فی الارض فسادا ھذا ھو معنی محاربة المسلمین (جمل)

مُراد یہاں رہزنوں اور ڈاکوؤں کے گروہ سے ہے، عام اس سے کہ وہ کافر ہوں یا مسلم، یہی گروہ جب نکلتا ہے تو ہتھیار باندھ کر پوری شان و شوکت کے ساتھ کہ جن پر حملہ کیا جائے وہ بیچارے مقابلہ بھی نہ کر سکیں، عاصیوں اور نافرمانوں کے طبقہ میں یہ گروہ خصوصیت کے ساتھ محاربین کا مصداق ہوتا ہے۔

ذھب اکثر المفسرین وعلیه جملة الفقھاء الی انھا نزلت فی قطاع الطریق (روح) والصحیح ان ھذه الاٰیة عامة فی المشرکین وغیرھم فی من ارتکب ھذه الصفات (ابن کثیر) یتناول کل من کان موصوفا بھذه الصفة سواء کان کافرا ومسلما (کبیر) نزلت فی قطاع الطریق من المسلمین وھذا قول اکثر الفقھاء (کبیر) المراد قطاع الطریق من اھل الملة (جصاص) ولم یسم بذالک کل عاص للّٰه تعالٰی اذ لیس بھذه المنزلة فی الامتناع واظھار المغالبة فی اخذ الاموال وقطع الطریق (جصاص)

اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا اَوۡ یُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ اَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ

ان کی سزا بس یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا سولی دیے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف جانب سے

خِلَافٍ اَوۡ یُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ

کاٹے جائیں، یا وہ ملک سے نکال دیے جائیں ۱۲۵ لے

ایک قول بعض غیر مستند متأخرین (عن بعض المتأخرین ممن لایعتد بہ) کا یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آیت کے مصداق مرتدین ہیں لیکن محققین نے تصریح کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ یہ قول سرتا سر لغو و باطل ہے۔

هو قول ساقط مردود مخالف للآية ولجماع السلف والخلف (جصاص) لاخلاف بين السلف والخلف من
فقهاء الامصار ان هذا الحكم غير مخصوص باهل الردة وانه فى من قطع الطريق وان كان من اهل الملّة (جصاص)

یُحَارِبُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ۔ محاربہ اپنے لفظی معنی میں اللہ سے تو کسی کا ممکن ہی نہیں، رسول اللہ صلعم سے ممکن تھا، لیکن کبھی کسی مسلم سے واقع نہیں ہوا، اور بعد وفات شریف تو اس کا امکان ہی نہ رہا، یہاں محاربہ سے مراد معصیت اور مخالفت یا اللہ اور اس کے رسول کے قانون کو توڑنا اور اس سے مقابلہ کرنا ہے، اہلِ لغت نے یہی معنی لئے۔

يعنى المعصية اى يعصونه (لسان) اى يعصونه (تاج)

اور اہل تفسیر تو سب اسی طرف گئے ہیں:۔

اى الذين يخالفون لحكام الله واحكام رسوله (كبير) المحاربة هى المضادة والمخالفة وهى صادقة
على الكفر وعلى قطع الطريق واخافة السبيل. (ابن كثير)

یَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا۔ مسلمان تو خیر مسلمان ہی ہیں، اُن کے ساتھ ذمیوں کے بھی مال اور جان دونوں اللہ اور اس کے رسول کے بخشے ہوئے حفظ و امن میں ہوتے ہیں، اب جو کوئی ان پر بلا عذر حملہ کرتا ہے وہ پوری طرح سعی فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ اور رسول سے محاربہ بھی ہے۔

سمّى قاطع الطريق محاربا لله لكون المسافر معتمدا على الله تعالىٰ فالذى يزيل امنه محارب لمن
اعتمد عليه فى تحصيل الامن (فتح القدير) سموا محاربين تشبيها لهم بالمحاربين من الناس (جصاص)

فقہاءِ حنفیہ نے یہاں یہ قید لگائی ہے کہ جس رہزنی کا یہاں ذکر ہے اور جس کی سزا یہاں درج ہے، یہ شہر اور یا قربِ شہر میں معتبر نہیں، شہر اور قربِ شہر صرف تعزیر و قصاص کا محل ہے یہاں حد جاری نہ ہوگی۔

ومذهب ابى حنيفة وجماعة ان المحاربين هم قطاع الطريق خارج المصر واما فى المصر فيلزمه
حد ما اجترح من قتل او سرقة او غصب ونحو ذلك (بحر) وقال قوم المكابرون فى الامصار ليس لهم حكم
المحاربين فى استحقاق هذا الحد وهو قول ابى حنيفة (معالم) قالت طائفة لاتكون المحاربة فى المصر انما تكون
خارجا عن المصر هذا قول سفيان الثورى واسحٰق والنعمان (قرطبى)

**۱۲۵ لے** چار سزائیں یہاں مذکور ہوئیں اور چاروں الگ الگ موقعوں کے لئے ہیں، قولِ صحیح و معتبر یہی ہے نہ یہ کہ

امام کو ان چاروں سزاؤں میں سے ہر ایک موقع کے لئے اختیار دے دیا گیا ہے اگرچہ بعض اکابر اس طرف بھی گئے ہیں۔

ذھب الاکثرون الی ان ھذہ العقوبات علی ترتیب الجرائم لاعلی التخییر (معالم) وقال ابن عباس وابو مجلز وقتادۃ والحسن جماعۃ لکل رتبۃ من الحرابۃ رتبۃ من العقاب (بحر) والمراد منہ واللہ اعلم التوزیع علی الاحوال (ھدایۃ)

اَوْ۔ حرف اَوْ جو یہاں سزاؤں کے درمیان بار بار آیا ہے، تخییر کے لئے نہیں تفصیل کے لئے ہے۔

واَو فی الآیۃ علی ھذا للتفصیل (بیضاوی) قال ابن عباس فی روایۃ عطاء کلمۃ او ھھنا لیست للتخییر بل ھی لبیان ان الاحکام تختلف باختلاف الجنایات وھذا قول الاکثرین من العلماء (کبیر)

یُقَتَّلُوْا۔ یہ سزا اس موقع کے لئے ہے جب رہزنوں نے کسی کو صرف قتل کیا ہو اور نوبت مال لینے کی نہ آئی ہو۔

تقتیل۔ باب تفعیل سے ہے اور اس کے معنی میں باب قتل یا قصاص پر زیادتی ہے یہیں سے اشارہ اس نکتہ کی طرف ہو رہا ہے کہ یہ حقِ شریعت ہے محض ولی کے معاف کر دینے سے معاف نہیں ہوگا۔

ویقتلون حدا حتی لو عفا الاولیاء عنھم لایلتفت الی عفوھم لانہ حق الشرع (ھدایۃ)

رہزنی کا جرم تنہا فرد یا افراد کے خلاف نہیں، معاشرہ کے خلاف بھی ہے جیسا کہ دنیا کے فاضل ترین مقننوں اور قانون سازوں نے تسلیم کر لیا ہے، اس لئے مستغیث افراد کی دست برداری ایسے مقدمہ کو ختم کرنے کو کافی نہیں۔

یُصَلَّبُوْا۔ یہ سولی کی سزا اس صورت کے لئے ہے جب رہزنی میں قتل و غارت دونوں کا ارتکاب ہوا ہو۔ حنفیہ کے ہاں سولی کی سزا کے لازمی ہونے نہ ہونے میں اختلاف ہے امام ابوالحسن قدوری کا قول ہے اور یہی ظاہر الروایۃ ہے کہ سولی دینے نہ دینے کا امام کو اختیار ہے۔

ثم ذکر فی الکتاب التخییر بین الصلب وترکہ وھو ظاھر الروایۃ (ھدایۃ) فی ظاھر الروایۃ ھو مخیّر فی الصلب ان شاء فعلہ وان شاء لم یفعلہ والنفی بالقتل (مبسوط)

لیکن امام یوسفؒ کا قول ہے کہ سولی ضرور دی جائے، اس لئے کہ اولاً تو یہ نصِ قرآنی کے مطابق ہے اور دوسرے سزا سے جو مقصود تشہیر اور دوسروں کے لئے عبرت ہے وہ بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

وعن ابی یوسفؒ انہ لایترکہ لانہ منصوص علیہ والمقصود التشھیر لیعتبر بہ غیرہ (ھدایہ)

وعن ابی یوسفؒ قال لیس للامام ان یدع الصلب لان المقصود بہ الاشتھار لیعتبر غیرہ (مبسوط)

خود صاحبِ ہدایہ کا کہنا یہ ہے کہ تشہیر تو نفس قتل ہی سے ہو جاتی ہے البتہ سولی سے اس تشہیر میں اور زیادتی ہو جاتی ہے، اس لئے یہ امام ہی کی رائے پر چھوڑنا چاہیے۔

ونحن نقول اصل التشھیر بالقتل والمبالغۃ فی الصلب فیخیّر فیہ (ھدایۃ)

تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔ یہ سزا اس صورت میں ہے کہ صرف مال لوٹا ہو اور جان نہ لی ہو، اس سزا کے باب میں بھی فقہاء حنفیہ میں کسی قدر اختلاف ہے امام محمدؒ سے منقول ہے کہ جب قتل یا سولی کی سزا اپنے اپنے دفعاتِ جرم کی بنا پر نافذ ہو رہی ہو تو یہ قطع اعضاء کی سزا نافذ نہ کی جائے گی، اس لئے کہ کسی بڑی حد کے اجراء کے بعد چھوٹی حد کے اجراء کا سوال باقی نہیں رہتا، مثلاً اگر کسی پر چوری اور زنا دونوں ثابت ہوں تو سزا صرف زنا کی ملے گی، اور سنگساری کے ہوتے ہوئے ہاتھ کاٹے جانے کی الگ سزا کی ضرورت نہ رہے گی، لیکن امام ابو حنیفہ کا فرمانا ہے کہ قطع اعضاء اور سولی، یہ تعداد میں دو سزائیں ہی نہیں بلکہ مجرم کے ہاتھ پیر کاٹ کر

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾

یہ تو ان کی رُسوائی دنیا میں ہوئی ۱۲۶؎ اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے ۱۲۷؎

قتل یا سولی ایک ہی سزا ہوئی یہ سزا سخت ترین بیشک ہے لیکن یہ اس لئے کہ جرم بھی تو سخت تر ہے اور جرم کی اشدیت یہ ہے کہ مجرم نے قتل و غارت (مار اور لوٹ) دونوں کر کے امن عامّہ کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچا دیا۔ یہ ساری تفصیلات ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ یُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ۔ یہ اس صورت میں کہ ابھی نوبت نہ جان لینے کی آئی نہ مال لوٹنے کی محض قصد و اقدام ہی کے بعد گرفتاری ہو گئی۔ ملک سے نکال دیئے جانے سے ایک مُراد تو جلاوطنی ہے، دوسرے یہ کہ مجرم ملک میں آزادانہ چلنے پھرنے نہ پائیں ان کی آزادی سلب کر لی جائے اور وہ قید خانہ میں بند کر دیئے جائیں۔ فقہاءِ حنفیہ نے بھی آخری معنی اختیار کئے ہیں اور لغت بھی اس کی تائید میں ہے وقال ابو حنیفة النفی من الارض هو الحبس وهو اختیار اکثر اهل اللغة (کبیر) والمراد بالنفی عند نا هو الحبس والسجن والعرب تستعمل النفی بذلك المعنی لان الشخص یفارق بیته واهله (روح) قیل نفیهم ان یخلّد وا فی السجن۔ (تاج، لسان) فقہاءِ حنفیہ کہتے ہیں کہ جلاوطنی کی صورت میں مجرم یا تو کسی دوسرے اسلامی شہر میں چلا جائے گا تو وہاں جا کر فتنہ و فساد کا باعث بنے گا یا اگر دار الحرب چلا گیا تو وہاں دشمنانِ اسلام کی تقویت کا سبب بن جائے گا، اس لئے یہاں مراد حبس اور قید ہی ہے ——— مبسوط۔ ہدایہ، فتح القدیر وغیرہ میں یہ بحثیں تفصیل سے ملیں گی۔

ان چار صورتوں کے علاوہ پانچویں صورت یہ بھی ممکن ہے کہ رہزنوں نے کسی کو محض زخمی کر کے چھوڑ دیا ہو تو اس کا حکم مثل عام زخمیوں کے ہو گا، یہاں قانون قصاص و ضمان کی دفعات چلیں گی، اور یہ حق العبد ہونے کے باعث معاف بھی ہو سکے گا۔ "روشن خیالی" اور "تجدد نوازی" جو دوسرا نام ہے جاہلیتِ فرنگ سے مرعوبیت کا، ممکن ہے اسلامی سزاؤں کی ان سختیوں پر چیں بہ جبیں ہو لیکن ساری قیاسی اور عقلی بحثوں سے قطع نظر، صرف عملی اور تجربی حیثیت سے نہ دیکھ لیا جائے کہ جن ملکوں نے اپنے ہاں قانون کو نرم کر کے سزائیں ہلکی سے ہلکی کر دی ہیں، اُن کے ہاں جرائم اور بدامنی کا کیا حال ہے، اور ان قوموں کے ہاں کیا، جن کے ہاں اب تک اسلامی تعزیرات و حدود کا نفاذ جاری ہے؟ ——— امریکہ اور برطانیہ، اور فرانس کا ریکارڈ جرائم کے لحاظ سے، بلووں اور ڈاکوں، قتل و غارت کے لحاظ سے کیا ہے، اور نجد و حجاز و یمن کا کیا؟ GUNMEN اور GANGSTER قسم کی نئی نئی اصطلاحیں روز کہاں پیدا ہو رہی ہیں؟ بدنام تو لوٹ مار، لوٹ کھسوٹ، کشت و خون کے لئے کسی زمانے میں عرب کے بدوی تھے، لیکن اب کیا نسبت انھیں تہذیبِ دنیا کے روشن دور میں ڈاکوؤں سے رہ گئی ہے؟ ——— یہ تو واقعات ہیں واقعات، خوش اعتقادی کا کوئی سوال نہیں، عقلاً اور اصلاً بھی یہی بات کہ اسلام نے معاش اور معیشت اور معاشرت کا جو بہترین نظام دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور فرد و جماعت دونوں کے لئے فراغ خاطری اور آسائش و سہولت کے جتنے موقعے بہم پہنچا دیئے، اُن کے بعد بھی جو ظالم اللہ کی ان نعمتوں کی شدید ناشکری کر کے امن عامّہ پر ڈاکہ ڈالتا، اور اللہ کے بندوں کی جان اور مال بہ جبر لے لینا چاہتا ہے اور ثبوت جو اپنے انتہائی خُبثِ نفس کا دے رہا ہے ایسا خبیث الفطرت مستحق بھی سخت ترین سزا کا ہے۔

۱۲۶؎ عبرت و موعظت کے لئے سزاؤں کا محض سخت یا جسمانی حیثیت سے تکلیف دِہ ہونا ہی کافی نہیں، تفضیح و رُسوائی، دماغی و قلبی تکلیف کا پہلو بھی ان میں نمایاں ہونا چاہیئے، فقہاء نے یہ بھی طے کر دیا ہے کہ رہزنی اور ڈکیتی کا ارتکاب

اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ ۚ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ

مگر جو لوگ توبہ کر لیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ تو جانے رہو کہ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا ہے بڑا رحمت

رَّحِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡہِ الۡوَسِیۡلَۃَ

والا ہے ۱۲۸ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو ۱۲۹ اور اس کا قرب تلاش کرو ۱۳۰

اگر ایک غول یا جتھے نے کیا ہے تو فرداً فرداً ہر ایک کے تعیّن جرم کے ثبوت کی حاجت نہیں محض اس گروہ سے وقوع جرم کا ثبوت کافی ہے، اس لئے کہ جتھے کے کسی فرد نے بھی جو کچھ کیا ہے، جتھے ہی کی قوت کے بھروسہ پر کیا ہے، چنانچہ قتل بالفرض رہزنوں کی جماعت میں سے کسی ایک نے بھی کیا ہے تو محاربہ میں بہر حال پورا جتھا شریک ہوا اور قصاص میں قتل سب ہوں گے۔

فان باشر القتل احدھم اجری الحد علیھم باجمعھم لانہ جزاء المحاربۃ (ھدایہ) ان باشر القتل احد ھم یجب الحد علی الجمیع۔ (شرح وقایۃ)

۱۲۷ (اور یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیا کی سزا ایسے مجرموں کے لئے کافی ہو جائے گی)

یہیں سے فقہاء حنفیہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ اجرائے حد کفارۂ معصیت کے لئے کافی نہیں۔

یدل علی ان اقامۃ الحد علیہ لاتکون کفارۃ لذنوبہ (جصاص) والآیۃ اقوی دلیل لمن یقول ان الحدود لاتسقط العقوبۃ فی الآخرۃ۔ (روح)

اور یہی مذہب مالکیہ کا بھی نقل ہوا ہے۔

۱۲۸ (اس لئے وہ توبہ کرنے والوں سے حد بھی ساقط کئے دیتا ہے)

اب نہ ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے، نہ سولی اور نفی فی الارض (حبس) کا اختیار باقی رہے گا، یہ متعیّن حدود جو اللہ کی مقرر کی ہوئی تھیں، توبہ کے بعد ساقط ہو جائیں گی، اور کوئی دعوے اور مطالبہ اب حکومت اسلامی کی طرف سے باقی نہیں رہے گا، البتہ وارثوں اور مدعیوں کو اب بھی اختیار ہے کہ خواہ معاف کر دیں، خواہ مال پر صلح کر لیں، خواہ خون کے بدلے میں خون کا مطالبہ کریں، اب معاملہ صرف بندوں کے درمیان رہ گیا۔

وان اخذ بعد ماتاب وقد قتل عمداً فان شاء الاولیاء قتلوہ وان شاؤا عفوا عنہ لان الحد فی ھذہ الجنایۃ لایقام بعد التوبۃ (ھدایۃ) ومتی سقط الحد المذکور فی الآیۃ وجبت حقوق الآدمیین فی المال والنفس والجراحات (جصاص) فان کان قد قتل فان شاء الاولیاء قتلوہ وان شاؤا عفوا عنہ لان ھذا القتل قصاص فصح العفو عنہ والصلح بہ (فتح القدیر)

تَابُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَقۡدِرُوۡا عَلَیۡہِمۡ۔ توبہ کے تحقّق کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ اس کا وجود مجرموں پر قابو پائے جانے سے پہلے پایا جائے، بغیر اس کے صدق توبہ اور اخلاص ثابت نہ ہوگا، فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ توبہ محض زبانی و لفظی کافی نہیں، عملی علامتیں بھی اصلاحِ حال اور صدق توبہ کی ظاہر ہونی چاہئیں۔

حتی یتوب لا بالقول بل بظھور سیماء الصلحاء (در مختار)

**۱۲۹ؔ** یعنی اس کے احکام کی نافرمانی سے ڈرو اور بچو)
تقویٰ ہی ایسی چیز ہے جو جاہ ومال کی ہر حرص بیجا سے بچا سکتا ہے۔

**۱۳۰ؔ** (طاعتوں کے ذریعہ سے)
وَسِيلَةٌ۔ کے معنی قرب کے ہیں، اہلِ لغت اور تابعین سب سے یہی معنی مروی ہیں۔

یعنی بالوسیلۃ القربۃ (ابن جریر) توسلت الی فلان بکذا بمعنی تقربت الیہ (ابن جریر) الوسیلۃ القربۃ التی ینبغی ان یطلب بھا (قرطبی) الوسیلۃ ھی القربۃ عن ابی وائل والحسن ومجاھد وقتادۃ وعطاءٗ والسدیؒ وابن زید وعبداللہ بن کثیر (قرطبی) الوسیلۃ القربۃ الزلفۃ یقال توسل الی ھکذا ای تقرب۔ (ابن قتیبہ)

اور قرب کا بہترین ذریعہ احکام الٰہی کی تعمیل ہے۔

اطلبوا الیہ القرب فی الدرجات بالاعمال الصالحۃ (ابن عباسؓ) استعیرت لمایتوسل بہ الی اللہ تعالیٰ من فعل الطاعات وترک السیئات (مدارک) فالمراد طلب الوسیلۃ الیہ فی تحصیل مرضاتہ وذلک بالعبادات والطاعات (کبیر) وحقیقۃ الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ مراعاۃ سبیلہ بالعلم والعبادۃ وتحری مکارم الشریعۃ وھی کالقربۃ۔ (راغب)

جن لوگوں نے وسیلہ کے تحت میں مرحوم بزرگانِ دین کی استعانت اور فوت شدہ انبیاء واولیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے، انھوں نے عربی کے وسیلہ (بہ معنی قرب کو) اُردو کے وسیلہ (بہ معنی ذریعہ) کا مرادف سمجھ لیا ہے، اور ایسی شدید وفاحش غلطیاں نادر نہیں، کثیر الوقوع ہیں، علامہ آلوسی نے بڑے بسط وتفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور لکھا ہے کہ

واما اذا کان المطلوب منہ میتًا اوغائبًا فلا یستریب عالم انہ غیر جائز وانہ من البدع التی لم یفعلھا احد من السلف (روح)

(میت یا غائب شخص سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی عالم کو شک نہیں، اور یہ ایک ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں کسی نے کبھی نہیں کیا ہے) اور لکھا ہے کہ:۔

ولم یروی عن احد من الصحابۃ رضی اللہ تعالیٰ عنھم وھم احرص الخلق علیٰ کل خیر انہ طلب من میت شیئًا۔

(حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہوا ہے لیکن کسی ایک صحابی سے بھی منقول نہیں کہ انھوں نے صاحبِ قبر سے کچھ طلب کیا ہو)

صحابیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اتباعِ سنّت ضرب المثل کی حد تک شہرت رکھتا ہے، ان کی حالت یہ تھی:۔

قد صح عن ابن عمرؓ انہ کان یقول اذا دخل الحجرۃ النبویۃ زائرًا السلام علیک یارسول اللہ صلعم السلام علیک یا ابا بکرؓ السلام علیک یا ابت ثم ینصرف ولا یزید علیٰ ذلک ولا یطلب من سید العٰلمین اومن ضجیعیہ المکرمینؓ شیئًا وھم اکرم من ضمنتہ البسطۃ وارفع قدرا من سائر من احاطت بہ الافلاک المحیطۃ۔

(جب روضۂ نبوی میں زیارت کے لئے داخل ہوتے تو صرف اس قدر کہتے کہ السلام علیک یارسول اللہ السلام علیک یا ابابکر، السلام علیک ابا جان، اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے نہ کچھ مانگتے حضورِ عالمؐ سے نہ ان کے ان مقربین سے حالانکہ سارے زمین وآسمان کی مخلوقات میں ان سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے)

وَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۳۵﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا

اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو ۱۳۱ تاکہ (ہر طرح) فلاح پاؤ ۱۳۲ بے شک جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے

لَوْ أَنَّ لَهُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ

پاس ساری دنیا کی چیزیں ہوں اور اتنی ہی اُن کے پاس اور بھی ہوں تاکہ وہ انھیں معاوضہ میں دے کر قیامت کے

مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۳۶﴾

دن عذاب سے چھوٹ جائیں تو وہ ان سے (ہرگز) قبول نہ کی جائیگی اور ان کے لئے عذاب دردناک (ہی) ہے ۱۳۳

روضۂ مبارک کے سامنے دعا کرنے سے بڑھ کر کون سی شے مقبول ہوسکتی ہے لیکن:۔

فقد کانت الصحابة رضی اللہ تعالی عنہم ہنالک مستقبلین القبلة ولم یروعنہم استقبال القبر الشریف عند الدعاء مع انه افضل من العرش۔

(یہاں بھی صحابۂ کرامؓ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے تھے قبلہ رُخ ہو کر اور یہ نہیں کرتے تھے کہ دعا کرتے وقت قبر شریف کی طرف منہ کرلیں باوجود اس کے کہ وہ مقام عرش سے بھی افضل ہے[له])

اور تو اور سلام پڑھتے وقت تک کے لئے:۔

واختلف الائمة فی استقباله عند السلام فعن ابی حنیفةؒ انه لایستقبل بل یدبر ویستقبل القبلة (ائمہ میں اختلاف ہے کہ منہ کس طرف رکھنا چاہئے لیکن امام ابوحنیفہؒ کا فیصلہ اس موقع کے لئے بھی یہی ہے کہ منہ قبر شریف کی طرف نہ کرے بلکہ ادھر پشت رکھے اور چہرہ قبلہ شریف کی طرف رہے)

غرض یہ کہ بعض اہل بدعت نے لفظ وسیلہ سے جو اپنے لئے پناہ ڈھونڈی ہے وہ سرتاسر لغو اور بے بنیاد ہے۔

۱۳۱ وسیلہ ہی کی طرح عربی کے جہاد کو بھی لوگوں نے اُردو کے جہاد کے مفہوم میں لے رکھا ہے اردو میں جہاد ایک دینی اصطلاح کی حیثیت سے صرف قتال فی سبیل اللہ کے معنی میں مخصوص ہو چکا ہے عربی میں یہ حصر و تحدید صحیح نہیں عربی میں جہاد کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے ہر سخت کوشش جو کسی بھی دینی غرض سے کی جائے اخاص کر دشمنانِ دین کے مقابلہ میں اصطلاحِ قرآنی میں جہاد کا درجہ رکھتی ہے۔

الجهاد والمجاهدة استفراغ الوسع فی مدافعة العدو (راغب) وهو المبالغة والاستفراغ ما فی الوسع والطاقة من قول او فعل (تاج)

اور جہاد جس طرح رزم میں تیغ و تفنگ سے ہو سکتا ہے اسی طرح بزم میں مال و دولت سے اور قلم و زبان سے بھی ہوسکتا ہے

۱۳۲ (اور سب سے بڑی فلاح رضائے الٰہی کا حصول ہے)

فلاح کا لفظ دنیوی، اُخروی، مادی و روحانی ہر طرح کی کامیابیوں اور کامرانیوں پر شامل ہے۔

---

[له] علامہ آلوسی کے اس آخری قول پر کوئی دلیل نظر سے نہیں گزری۔

يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ

چاہیں گے کہ نکل آئیں آگ سے، حالانکہ اس سے (کبھی) نہ نکل پائیں گے، اور ان کے لئے

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٧﴾

مستقل عذاب ہے ۱۳۴

لیس فی کلام العرب کلمۃ اجمع من لفظۃ الفلاح لخیری الدنیا والآخرۃ کما قالہ ائمۃ اللسان (تاج)
ملاحظہ ہو اَلْمُفْلِحُوْنَ پر حاشیہ سورۃ البقرہ کے رکوع اول میں۔
لَعَلَّ پر حاشیے پہلے گزر چکے ہیں، کہ جب اس کا استعمال حق تعالٰی کی زبان سے ہوتا ہے تو معنی میں مفہوم شک و احتمال کا باقی نہیں رہتا بلکہ تیقن پیدا ہو جاتا ہے۔

۱۳۳ توحید و رسالت کی طرح معاد و آخرت کے مسئلہ میں اہلِ جاہلیت سیکڑوں غلطیوں میں مبتلا رہتے ہیں، ان ہی میں سے ایک چلی ہوئی اور بڑی غلطی یہ ہے کہ وہاں کے معاملات کو بھی دنیا پر قیاس کر کے یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح یہاں کی عدالتوں، دفتروں، محکموں میں لین دین سے کام چلا لیا جاتا ہے ایسے ہی نذرانوں، رشوتوں کی گرم بازاری وہاں بھی ہوگی، اور ہر خطا و لغزش پر کسی نہ کسی مالی معاوضہ سے قلم پھیر دیا جا سکے گا، قرآن مجید کو اس عالمگیر غلطی کی بار بار تردید کرنی پڑی، اور بتانا پڑا ہے کہ کفر کا فدیہ یا کفارہ آخرت میں کسی مال و دولت سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔
اَنَّ لَهُمْ۔ ان لکل واحد منھم کے معنی میں ہے یعنی ان میں سے ایک ایک کے پاس بھی اگر اتنا مال ہوتا۔
مَعَهٗ۔ میں ضمیر واحد غائب اسی مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا کی طرف ہے۔
لَوْ۔ یہ حرف جس عبارت پر آتا ہے، اکثر اس سے مُراد ایک اَن ہونی بات بہ طور فرضِ محال کے ہوتی ہے، چنانچہ یہاں بھی یہی مُراد ہے کہ اس فرضِ محال پر بھی کوئی صورت عذاب سے نجات کی نہ ہو سکے گی۔
مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ اس کے تحت میں وہ سب کچھ آگیا، جو ذہنِ انسانی میں سما سکتا ہے۔

۱۳۴ (جو کبھی ہٹنے والا اور مٹنے والا نہیں)
عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ وہ عذاب پائدار و مستقل ہے، جو نہ کبھی ہٹ سکے اور نہ کبھی مٹ سکے۔
معناہ دائم ثابت لایزول ولا یحول (قرطبی) عذاب دائم ثابت لایزول عنھم ولا ینتقل ابدًا۔ (ابن جریر)
يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ۔ عذاب او ر وہ بھی عذاب الیم! ——
ظاہر ہے کہ دوزخیوں کو کیسی کچھ تڑپ، کیسی کچھ حسرت، کیسی کچھ تمنّا اس عذاب سے نکل بھاگنے کی ہوگی۔
مَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنْهَا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ۔ اس ارشاد سے اُن حسرت نصیبوں کی حسرت نصیبی پر گویا مُہر لگ گئی، عذاب سے نکلنے کا نہ کوئی امکان ہے، نہ کوئی تدبیر کام دے سکتی ہے بلکہ اب یہ بھی سنا دیا گیا کہ یہ عذاب جس درجہ کا شدید و ہولناک ہوگا، اسی طرح لازوال بھی ہوگا۔
اشتدادِ عذاب قبل کی آیت میں بیان ہو چکا، امتدادِ عذاب اب بتا دیا گیا، اس عذابِ دائمی کی خصوصیت چونکہ

وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا

اور چور مرد اور چور عورت ۱ دونوں کے ہاتھ کاٹ ڈالو ۱۳۵ ؎

کافروں کے ساتھ بیان ہوئی اس سے متکلمین نے یہ نتیجہ اور صحیح نتیجہ نکالا ہے کہ مخلص کلمہ گو بہر صورت عذاب سے مخلصی پا جائے گا۔

احتج اصحابنا بھذہ الآیۃ علی انہ تعالٰی یخرج من النار من قال لا الٰہ الا اللّٰہ علی سبیل الاخلاص۔ (کبیر)

اور امام رازیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ کی ترکیب خود حصر پر دلالت کر رہی ہے یعنی یہ عذابِ دائمی صرف کافروں پر ہوگا نہ کہ غیر کافروں کے لئے۔

وھذا یفید الحصر فکان المعنی ولھم عذاب مقیم لا لغیرھم۔ (کبیر)

۱۳۵ ؎ (اے حکام)

اجرائے حدودِ شرعی و قصاص کا حق صرف اہلِ حل و عقد یا حکومتِ اسلامی کے حکام ہی کو حاصل رہتا ہے اس لئے خطاب بھی قدرۃً ان ہی سے ہے۔

خطاب مع قوم فیحتمل ان یکون اقعا علی شخص متعین منھم وھو امام الزمان کما یذھب الیہ الاکثرون (کبیر)

السَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ لاکر یہ بتا دیا گیا ہے کہ بجرم قابلِ تعزیر کی حیثیت سے مرد و عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں یہ نہ ہوگا کہ مجرم اگر عورت ہے تو اس کی سزا کچھ بڑھا دی جائے یا عورت ہونے کی بنا پر اس کی سزا کچھ گھٹا دی جائے دوسری قوموں کے قانون میں مرد و عورت کے درمیان سزا کی عدم مساوات کی مثالیں کثرت سے ملیں گی۔

سرقہ۔ اپنے لغوی معنی میں تو مطلقاً ہر چوری کو کہیں گے لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد ہوتی ہے غیر کے مال کو کسی خاص جگہ سے اور کسی خاص مقدار میں چرا لینا۔

السرقۃ اخذ ما لیس لہ اخذہ فی خفاء وصار ذلک فی الشرع لتناول الشیء من موضع مخصوص وقدر مخصوص (راغب) قد ثبت عندنا ان الحکم متعلق بمعنی غیر الاسم یجب اعتبارہ فی ایجابہ وھو الحرز والمقدار (جصاص)

ان دو قیدوں کے الگ جانے سے ایسی بیسیوں چیزیں جو ہر جگہ اور ہر مقدار میں مل جاتی ہیں ان کی چوری، چوری کی فقہی تعریف سے خارج ہو گئی پھر چوری کے ثبوت کے دو ہی طریقے ہیں ایک جرم کا اقرار، دوسرے عادل گواہوں کی شہادت۔

السرقۃ انما تظھر باحد الامرین اما بالبینۃ او بالاقرار (المحیط)

جس چوری پر حد جاری ہوگی اس کی مالیت حنفیہ کے ہاں کم از کم ایک دینار یا دس درہم کی ہونا چاہئے اور اس چیز کو کسی محفوظ مقام میں ہونا چاہئے، اور خود وہ چور جس پر حد واجب ہوگی اسے عاقل و بالغ ہونا چاہئے۔

اذا سرق العاقل البالغ عشرۃ دراھم او ما یبلغ قیمتہ عشرۃ دراھم مضروبۃ من حرز لا شبھۃ فیہ وجب القطع (ھدایۃ)

حفاظت عرفِ عام کے تابع ہے، کوئی جامع و مانع معیار اس کا خارج میں موجود نہیں۔

الحرز ھو ما نصب عادۃ لحفظ اموال الناس وھو مختلف فی کل شیء بحسب حالہ (قرطبی)

۱ سارقۃ کا ترجمہ ایک لفظ سے چورٹی ہی ہو سکتا ہے اور اسی کے خیال سے سارق کا ترجمہ بجائے "چور" کے چورٹے کیا گیا کاش اردو میں لفظ "چور" کے مقابل مؤنث کے لئے "چورنی" موجود ہوتا۔

فقہاء نے اور بھی متعدد شرطیں کتاب و سنت کے مزاج کو سمجھ کر اور انہی سے اخذ کر کے لگائی ہیں، حنفی نقطۂ نظر سے ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) چور عاقل و بالغ ہو، بچہ اور مجنون پر حد نہیں ہے۔

(۲) مال نظر بچا کے لے گیا ہو، کھلے خزانے چھین جھپٹ کر نہ لے گیا ہو، غاصب اور اُچکے کی سزائیں دوسری ہیں، حد سرقہ نہیں۔

(۳) مال کسی کی ملک ہونا چاہئے، غیر مملوک مال (مثلاً کفن جو کسی کی ملک نہیں ہوتا) کی چوری سرقہ مستوجب الحد کی تعریف میں نہ آئے گی۔

(۴) مال کسی غیر کی غیر مشترک ملک ہو، چور کے اپنے مال کے ساتھ مخلوط و مشترک نہ ہو، شوہر، بیوی، اولاد وغیرہ پر حد اسی لئے جاری نہ ہو گی کہ انکے مال کے ساتھ خلط و اشتراک رہا کرتا ہے۔

(۵) مال کسی حد اور درجہ تک حفاظت میں ہو، خواہ حقیقۃً (مثلاً کسی سپاہی، چوکیدار وغیرہ کے پہرہ میں) خواہ حکماً (مثلاً مکان کے اندر، صندوق کے اندر وغیرہ) سر راہ کھلے اور پڑے ہوئے مال کے اُٹھا لینے پر حدِ سرقہ جاری نہ ہو گی، چوکیدار، پہرہ دار وغیرہ اگر چوری کریں تو وہ خیانت کی دفعہ میں ملزم ہوں گے، حدِ سرقہ کے مستوجب نہ ہوں گے۔

علماء متکلمین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ اُمت کے لئے نصبِ امام ضروری ہے، اس لئے کہ اجرائے حدود کا حکم درجۂ فرض میں ہے اور اجراء کی صورت اجماعِ اُمت سے طے ہو چکا ہے کہ افراد سے ممکن نہیں اس لئے امام معین کا ہونا لازمی ہے۔

احتج المتكلمون بهذه الآية فى انه يجب على الامة ان ينصبوا لانفسهم اماما معينا والدليل عليه انه تعالى اوجب بهذه الآية اقامة الحد على السراق والزناة فلابد من شخص يكون مخاطبا بهذا الخطاب واجمعت الامة على انه ليس لآحاد الرعية اقامة الحدود على الجناة بل اجمعوا على انه لا يجوز اقامة الحدود على الاحرار الجناة الا للامام (كبير)

فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا۔ چوری کی سزا میں پہلی بار داہنا ہاتھ پہونچے سے کاٹا جائے گا، دوسری بار کی چوری میں بایاں پیر ٹخنہ سے قطع کر دیا جائے گا، اس کے بعد کی چوریوں میں فقہاء نے سنّت ہی سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ اب مزید سزا قطع اعضاء کی نہیں، بلکہ قید کی دی جائے گی، چوری کی یہ سزا، قطعِ ید، عرب میں پہلے سے جاری تھی، اسلام نے اُسے قائم رکھا، اور اس میں چند قیود و شرائط کا اضافہ کر دیا۔

وقد كان القطع معمولا به فى الجاهلية فقرر فى الاسلام وزيدت شروطا آخر (ابن كثير)

دنیا کے اور قانونوں اور دوسری تہذیبوں میں بھی چوری کی سزا کہیں تو ایک طویل مدت کی اسیری رہی ہے اور کہیں جلا وطنی اور کہیں قطع اعضاء اور کہیں پھانسی یا اور کسی طریقہ سے ہلاکت۔

دوسری حدودِ شرعی کی طرح، خوب واضح رہے کہ سرقہ کی حد صرف دارالاسلام ہی میں جاری ہو گی، اور دشمنوں کے ملک میں اور دورانِ جہاد و قتال میں جاری نہ ہو گی، ابن قیمؒ نے "اعلام الموقعین" میں یہ مضمون، محدثین و فقہاء کے حوالہ سے بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے۔

وقد نص احمد واسحٰق بن راهويه والاوزاعى وغيرهم من علماء الاسلام على ان الحدود لا تقام فى ارض العدو۔ وذكرها ابو القاسم الخرقى فى مختصره فقال لا يقام الحد على مسلم فى ارض العدو۔

(فضلاء اسلام میں سے احمدؒ اور اسحٰق بن راہویہ اور اوزاعی وغیرہم نے صاف حکم لکھا ہے کہ مسلمانوں پر حد دشمنوں کی سرزمین پر جاری نہ کی جائے اور یہی قول ابو القاسم خرقی نے اپنی مختصر میں نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ مسلمانوں پر حد

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

اُن کے کرتوتوں کے عوض میں، اللہ کی طرف سے بطورِ عبرتناک سزا کے ۱۳۶؎ اور اللہ بڑا قوت والا ہے بڑا حکمت والا ہے ۱۳۷؎

دشمن کے ملک میں جاری نہ کی جائے گی۔)

رواہ ابوداؤد وقال ابومحمد المقدسی وھواجماع الصحابۃ۔

یہ روایت ابوداؤد کی ہے، اور ابومحمد مقدسی نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔

اور تفسیر المنار میں اسی طرح کے اقوال چند آیات کے بعد آیۂ کریمہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ کے تحت میں نقل ہوئے ہیں

۱۳۶؎ سزائے سرقہ کی اہمیت آیت سے بالکل ظاہر ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا۔ چوری شریعت اسلامی میں ایک بدترین جرم ہے، اسلام نے فرد وجماعت دونوں کے لئے امن وامان اور سکون خاطر کا جو بہترین کامل ترین نظام قائم کیا ہے، چور اس میں رخنہ ڈالنا، اور اس ساری فضا کو درہم برہم کرڈالنا چاہتا ہے آیت کے اس ٹکڑے نے واضح کردیا کہ چوری کا بدبخت مجرم ہے ہی ایسی سخت سزا کا مستحق۔ شریعت موسوی کا قدم بھی اس باب میں کچھ پیچھے نہیں، کچھ آگے ہی ہے، نقب زن کی جان سے امان اٹھ جاتی ہے کوئی اگر اُسے قتل کرڈالے تو اس کے خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا۔ "اگر چور سیند مارتے ہوئے دیکھا جائے اور کوئی اسے مار بیٹھے اور وہ مرجائے تو اس کے لئے خون نہ کیا جائے گا۔" (خروج۔ ۲۲: ۲)

اجازت ہی نہیں، ایک جگہ تو حکم تک توریت میں نقب زن کے قتل کا ملتا ہے:۔

"اگر کوئی شخص اپنے بھائیوں بنی اسرائیل میں سے کسی کو چُرانے میں پکڑا جائے اور اس کا بیوپار کرے یا اُسے بیچ ڈالے تو چور مارڈالا جائے اور تو شر کو اپنے درمیان سے دفع کر۔" (استثناء۔ ۲۴: ۷)

نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ نکال کہتے ہیں ایسے عذاب وسزا کو جس سے دوسرے عبرت حاصل کریں۔

(ای مایجب ان ینکل بہ عن ذلک الفعل (قرطبی) ای عظۃ من اللہ بما عوقبا بہ لمن راھما (ابن قتیبۃ)

فلسفۂ تعزیر کے واقفین جانتے ہیں کہ مجرم کے لئے سزا کی تجویز کرنے میں دو بڑے پہلو پیش نظر ہوتے ہیں:۔ ایک انتقامی یعنی مظلوم یا مستغیث کے جذبات کی تسکین، دوسرے انتظامی یعنی آئندہ کے ممکن مجرموں کی حوصلہ فرسائی وہمت شکنی نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ اسی دوسرے پہلو کی تاکید وتقویت کے لئے ہے، اور پھر من اللہ سے اشارہ یہ بھی ہوگیا کہ یہ خدائی فیصلہ ہے، بندوں کو اس میں ترمیم وتنسیخ کا حق حاصل نہیں۔

جَزَآءً نَكَالًا۔ دو لفظ الگ الگ آئے اور دونوں مفعول لہ بلاعطف ہیں، علماء بلاغت نے کہا ہے کہ جزاء میں اشارہ حق العبد کے اِتلاف کا ہے اور نکال میں حق اللہ کے اِتلاف کا۔

والجزاء اشارۃ الی ان فیہ حق العبد والنکال اشارۃ الی ان فیہ حق اللہ تعالیٰ۔ (روح)

۱۳۷؎ (وہ سزا وہی مقرر کرتا ہے جو عین اُس کے تقاضائے قدرت وحکمت کے شایان شان ہے)

صفتِ عزیز لاکر یہ یاد دلا دیا کہ اللہ حاکم مطلق ہے وہ جس جُرم کی جو سزا چاہے، مقرر کردے، کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں پہنچتا، اور صفتِ حکیم سے اشارہ اس طرف کردیا کہ اس کا کوئی سا بھی حکم حکمتوں اور مصلحتوں

فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ

پھر جو شخص اپنی حرکت ناشائستہ کے بعد توبہ کرلے، اور اپنی اصلاح کرلے تو بیشک اللہ اس پر توجہ کرے گا ۱۳۸

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾

بے شک اللہ بڑا مغفرت والا ہے، بڑا رحمت والا ہے ۱۳۹

سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے اس نے چوری کی بھی سزا وہی مقرر کی، جو فرد اور جماعت دونوں کی مصلحتوں کے عین مطابق ہے۔
امام رازیؒ نے اس مقام پر اصمعی کے حوالہ سے یہ حکایت نقل کی ہے کہ میں ایک روز ایک بدوی عرب کے سامنے سورۂ مائدہ زبانی پڑھ رہا تھا، یہ آیت آئی، اور یہاں سہواً میری زبان سے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ نکلا، بدوی نے کہا کہ یہ کس کا کلام ہے؟ میں نے کہا کلام الٰہی ہے اس پر وہ بولا کہ اسے دوبارہ پڑھو، میں نے پھر پڑھا، اور اب مجھے تنبیہ ہوگئی کہ بجائے عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ کے میری زبان سے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ نکل گیا تھا، بدوی نے کہا کہ بیشک اب ٹھیک پڑھا، میں نے کہا تمہیں کیسے پتہ چلا، اس نے جواب دیا کہ سیاق کلام سے، یہاں جب کہ سزا و عقاب کا ہے تو عین مقتضائے بلاغت یہی ہے کہ صفات بجائے غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ کے عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ہی لائی جائیں۔

۱۳۸ (رحمت کے ساتھ یوں کہ پچھلا گناہ معاف کردے گا اور توبہ پر استقامت کی بھی توفیق دے گا)

فَمَنْ تَابَ۔ یہ توبہ قاعدۂ شریعت کے مطابق ہونا چاہیے۔ فقہاء نے کہا ہے کہ چرائی ہوئی چیز مالک کو واپس کردینا چاہیے اور اگر تلف ہوچکی ہو تو اس کا تاوان مالک کو دے، اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو مالک سے معاف کرانے کی کوشش کرے کہ یہ سب شرائط تکمیل توبہ ہی سے ہیں، سزائے قطع ید جو حق العباد کی اتلاف کی سزا ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوجاتی۔

فاما القطع فلا يسقط عنه بالتوبة عند الاكثرين (معالم) والقطع لا يسقط بالتوبة (قرطبي) لم يسقط شئ ولا توبة السارق (ابن العربي) وقال الجمهور لا يسقط عنه هذا الحد (كبير)

حنفیہ اور مالکیہ کا اس پر اتفاق ہے۔
لیکن امام شافعیؒ کے ایک قول میں اس سے اختلاف بھی نقل ہوا ہے، اور ایک گروہ نے اس پر استدلال اس سے کیا ہے کہ آیت کے آخر میں غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ جو آگیا ہے۔

قال بعض العلماء التابعين يسقط عنه الحد لان ذكر الغفور الرحيم في آخر هذه الآية (كبير)

فقیہ مفسر ابن العربی مالکی نے اس کے رد میں تفصیل سے کلام کیا ہے (احکام القرآن جلد اول ص ۲۵۴)

وَاَصْلَحَ۔ یعنی آئندہ کے لئے ایسی عادتیں اور حرکتیں چھوڑ دے، توبہ کا تعلق ماضی سے تھا، اور اصلاح حال کا تعلق مستقبل سے ہے، باریک بیں فقہاء نے لفظ وَاَصْلَحَ سے یہ بھی استنباط کرلیا ہے کہ مجرم نے جب توبہ کرکے اپنی اصلاح کرلی تو اب اس پر طعن جائز نہیں۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ توبہ کا معتبر ہونا اصلاح پر موقوف ہے مثلاً سرقہ وغیرہ کا مال بہ شرط امکان واپس کردینا، ورنہ مالک سے معاف کرالینا، اور جب مالک نہ معلوم ہو تو اللہ کی راہ میں تصدق کردینا۔

۱۳۹ (چنانچہ صفت غفر کے تقاضہ سے اس نے پچھلا گناہ معاف کردیا اور صفت رحمت کے تقاضہ سے آئندہ کے لئے توفیق تقوے دیدی)

امام رازیؒ نے آیت میں ان صفات کے آنے سے جو موقع مدح پر لائی گئی ہیں، معتزلہ کے رد میں یہ استدلال کیا ہے کہ

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ

کیا تو نہیں جانتا کہ بس اللہ ہی کی حکومت آسمانوں اور زمین میں ہے ۱۴۰لہ وہ جسے چاہے سزا دے

وَ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۰ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ

اور جسے چاہے معاف کردے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۱۴۱لہ اے پیغمبر! آپ کو وہ لوگ رنج

لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِی الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا

میں نہ ڈالیں جو دوڑ دوڑ کر کفر میں پڑتے ہیں ۱۴۲لہ (خواہ) اُن میں سے ہوں جو اپنے منہ سے

بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛۚ

تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے ۱۴۳لہ (خواہ) اُن میں سے

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ

ہوں جو یہودی ہیں جھوٹ کے بڑے سننے والے ۱۴۴لہ سننے والے دوسرے لوگوں کی خاطر جو آپ کے پاس نہیں آتے ۱۴۵لہ

توبہ کی قبولیت اللہ کے ذمہ کچھ واجب نہیں ہے، واجب ہوتی تو یہ فضل واحسان کو یاد دلانے والی صفات نہ لائی جاتیں۔

دلت الآیة علی ان قبول التوبة غیر واجب علی اللہ تعالٰی لأنہ تعالٰی تمدح بقبول التوبة والتمدح انما یکون بفعل التفضل والاحسان لا بأداء الواجبات (کبیر)

۱۴۰لہ (اے مخاطب!)

یہ یاد دلا دیا ہے کہ جس نے یہ سزائیں تجویز کی ہیں بس وہی ایک مالکِ حقیقی اور قادرِ تحقیقی ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ میں خطاب عام ہر انسان سے ہے۔

قیل معناہ الم تعلم ایہا الانسان فیکون خطابا لکل واحد من الناس (معالم)

۱۴۱لہ (اور کوئی چیز اُس پر قدرت نہیں رکھتی)

وہ حاکمِ مطلق ہے، آمرِ علی الاطلاق ہے، وہ کسی قانون سے مجبور نہیں کہ مجرم کو ہمیشہ سزا ہی دے، اس میں تردید آ گئی، ہندی مشرکوں کے قانون "کرم" (ناگزیر مکافاتِ عمل) کی۔

يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ۔ لیکن وہ سزا اُسی کو دیتا ہے جو سزا ہی کے لائق ہوتا ہے، اس کی حکمتِ کاملہ خود ہی جانچ کر لیتی ہے کہ کون کس لائق ہے۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ یہ معافی چاہے صرف آخرت میں ہو چاہے دونوں جگہ۔

۱۴۲لہ یعنی آپ ایسے لوگوں کی باتوں سے رنج نہ قبول کریں۔

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۚ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ

کلام کو اس کے صحیح موقعوں سے بدلتے رہتے ہیں ۱۴۶ے کہتے رہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ ملے تو قبول

هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ

کر لینا اور اگر یہ نہ ملے تو اس سے احتیاط رکھنا ۱۴۷ے

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ ۔ قرآن مجید کی سی قیامت تک باقی رہنے والی کتاب میں رسول اللہ صلعم کا ذکر صیغہ غائب میں صرف الرسول والنبی سے اور صیغۂ حاضر میں ایہا الرسول ایہا النبی سے بغیر صفات کے لانا بجائے خود اس امر کی طرف مشیر ہے کہ اب کوئی دوسرا شخص وصف نبوت و رسالت میں شریک ہو کر آنے والا نہیں جس سے تعیین وصف میں اشتباہ پیدا ہو سکے۔ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ یعنی کفریات کی طرف بے تکلف اور بہ شوق و رغبت لپکتے ہیں۔ يُسَارِعُونَ مضارع ہے، مسارعة باب مفاعلة سے۔ مراد یہ ہے کہ یہ لوگ کفر کی جانب ایسے ساعی ہیں کہ گویا ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ امام رازیؒ نے کہا ہے کہ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ تو قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے لیکن يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ سے مخاطبت صرف دو ہی جگہ وارد ہوئی ہے ایک یہاں، اور دوسری جگہ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ میں اور یہ طرز خطاب شرف و تعظیم کے لئے ہے۔

وهذا الخطاب لاشك انه خطاب تشريف وتعظيم (كبير)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اہل طریق کی اس عادت کی اصل نکلتی ہے کہ اہل اغراض کی بدحالی پر کچھ زیادہ فکر نہیں کرتے۔

۱۴۳ے ظاہر ہے کہ مراد منافقین ہیں، زبان پر دعویٰ ایمان، دل میں ایمان کا گزر نہیں۔ مِنَ الَّذِينَ میں مِنْ بیانیہ ہے، مراد ہے من المنافقین۔ اور اسی پر عطف ہے مِنَ الَّذِينَ هَادُوا کا جو ابھی آ رہا ہے۔

۱۴۴ے منافقین اور یہود دونوں قسم کے لوگوں میں وصف مشترک یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹ اور باطل کے بڑے سننے والے اور قبول کرنے والے ہیں، سَمَّاعُونَ میں سمع قبول کرنے کے معنی ہیں اور عربی میں یہ استعمال عام ہے۔

والسمع يستعمل ويراد منه القبول (كبير) اى قابلون لما تفتريه الاحبار (بيضاوى)

لِلْكَذِبِ کے معنی لاجل الكذب کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی یہ لوگ خبریں اس لئے سنتے ہیں کہ جھوٹ بول لیں اور غلط شہرت دیں۔

اى يسمعون منك لكى يكذبوا عليك (كبير) اى يسمعون منك لاجل ان يكذبوا (راغب)

۱۴۵ے (بربنائے کبر و بغض)

تجافوا عنك تكبرا وافراطا فى البغضاء (بيضاوى)

یعنی کچھ تو ایسے ہیں جو بربنائے کبر و بغض آپ کی خدمت میں آتے ہی نہیں مثلاً یہود خیبر اور کچھ ایسے ہیں جو آپ کی مجلس میں حاضر تو ہوتے ہیں لیکن طلب حق کی غرض سے نہیں، بلکہ شکل مخبروں اور جاسوسوں کے کہ دوسروں سے لگائی بجھائی کریں۔

۱۴۶ے یہ وصف ان ہی اکابر یہود کا بیان ہوا، جو فرط عداوت و کبر سے خود تو بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے نہ تھے اور جب موقع دیکھتے تو اپنے ہاں کے کلام الٰہی میں تحریف سے بھی نہ چوکتے، روایتوں میں بھی آتا ہے کہ یہود اپنے ہاں کی زناکاری کا ایک مقدمہ رسول اللہ صلعم کی خدمت میں لائے آپ نے فرمایا کہ توریت میں حکم سنگساری کا موجود ہے

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اور جس کے لئے اللہ ہی کو گمراہی منظور ہو تو اس پر تیرا زور اللہ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں چل سکتا ۱۴۸ؕ یہی لوگ

لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚۖ وَّلَهُمْ فِي

وہ ہیں جن کے لئے اللہ کو منظور نہ ہوا کہ ان کے دلوں کو پاک (صاف) کرے ۱۴۹ؕ ان کے لئے دنیا میں بھی رسوائی ہے

الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ

اور ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے ۱۵۰ؕ جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں، حرام کے بڑے کھانے والے ہیں ۱۵۱ؕ

اسی کے مطابق سزا جاری کرو، وہ ظالم اس سزا ہی کو چھپا گئے۔

۱۴۷ؕ یعنی اس کے مان لینے کا اقرار نہ کرنا۔

يَقُوْلُوْنَ ۔ یعنی یہ لوگ اپنے والوں سے اپنے جتھے کے لوگوں سے جنھیں یہ مجلس نبوی میں بھیجتے رہتے تھے کہتے ہیں۔

هٰذَا ۔ یعنی یہ حکم محرّف، اصلی اور آسمانی حکم کے بجائے اُن کا اختراعی حکم۔

فَخُذُوْهُ ۔ یعنی اس کے ماننے کا اقرار کر لینا۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے اس شخص کی مذمت نکل رہی ہے جو اہل علم کی طرف رجوع اس غرض سے نہیں کرتا کہ مسئلہ پر عمل کرے گا، بلکہ اس امید پر کرتا ہے کہ اگر اس کی مرضی کے موافق قول مل گیا تو اسے اپنی بڑائی کی سپر بنالے گا۔

۱۴۸ؕ (کہ تو اس گمرہی کو پیدا ہونے سے روک دے، اے مخاطب!)

وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ ۔ اس ارادۂ اللہ کا ترتّب خود اس شخص کے عزم گمرہی پر ہوگا۔

فِتْنَتَهٗ ۔ فتنہ کے یہاں کھلے ہوئے معنی ضلالت اور مغضوبی کے ہیں۔

ای ضلالة فی الدنیا وعقوبة فی الاخرة (قرطبی) ای عذابه کما روی عن الحسن وقتادة واختاره الجبائی وابو مسلم (روح) بعض نے کفر مراد لی ہے ای کفر (مجاز)

مِنَ اللّٰهِ ۔ یعنی اللہ کے قانون تکوینی کے مقابلہ میں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ شیخ کی شفقت و توجہ بدون فضل و توفیق الٰہی کچھ نفع نہیں دیتی۔

۱۴۹ؕ (اُن کے کفریات سے اور یہ اس لئے کہ یہ لوگ خود ہی اس کا عزم نہیں کرتے)

مطلب یہ ہوا کہ جب یہ لوگ خود اپنی اصلاح کا قصد نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس اپنی ضد پر قائم ہیں تو یہ ایک قانون الٰہی تکوینی ہے کہ بندہ کے عزم و فعل پر اُس فعل کی تخلیق بھی ہو جاتی ہے اور اس قانون تکوینی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس سے ایک طرف تو رسول اللہ صلعم کو تسکین دی گئی اور دوسری طرف معتزلہ کا رد بھی نکل آیا جو خالقِ افعال اللہ کو نہیں، بندہ کو سمجھتے ہیں۔

۱۵۰ؕ عذابِ آخرت کا ظہور تو آخرت میں ہوگا، لیکن دنیا کے عذاب یعنی تفضیح کا ظہور اس شدومد سے چند ہی روز کے اندر

فَإِنْ جَآءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ

اور اگر یہ آپ کے پاس آئیں تو (خواہ) اُن کے درمیان فیصلہ کر دیجیئے (خواہ) انھیں ٹال دیجیئے ۱۵۲

ہو کر رہا کہ دوست دشمن سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، منافقین میں سے نفاق ایک ایک کا کھل گیا اور یہ سب خیبر و ذلیل ہوئے، رہے یہود تو ان کے بڑے سے بڑے پُرقوت قبیلے بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع، سب کے سب شکست کھا کر قید ہوئے یا جلاوطن ہوئے یا تہِ تیغ ہو گئے۔

۱۵۱ سَمّٰعٌ۔ اَکّٰلٌ۔ دونوں صیغے مبالغہ کے ہیں یعنی یہ نہیں کہ یہ لوگ کبھی کبھی جھوٹ میں بھی پڑ جاتے اور کبھی کبھی رشوت بھی لے لیتے ہیں، بلکہ یہ دونوں وصف گویا ان کے خمیر و سرشت میں داخل ہو گئے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ۔ یہ وصف یہود کے خواص و عوام دونوں کا بیان ہوا، سمع میں یہاں سُننے کے ساتھ کذب و باطل کا قبول کرنا بھی ہے، ابھی یہ لفظ آیت ماقبل میں گزر چکا ہے دوبارہ زور و تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔

کرّرہ تاکیدا و تعظیما (قرطبی) کرر للتاکید (مدارک)

اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔ سُحت۔ ہر حرام خوری کے لئے عام ہے۔

السحت الحرام او ماخبث من المکاسب (قاموس) وھو کل مالا یحل کسبہ (مدارک)

یہاں مراد رشوت ہے اور یہی معنی اب اس کے خاص ہو گئے ہیں۔

سمی الرشوۃ فی الحکم سحتا (تاج) سمی الرشوۃ سحتا (راغب) قال الزجاج سمیت الرشوۃ التی کانوا یاخذونہا بالسحت (کبیر) وفی الحدیث ھو الرشوۃ فی الحکم (مدارک) ھو الرشوۃ (ابن کثیر)

یہ وصف یہود کے خواص و اکابر کا بیان ہو رہا ہے جو رشوت اور نذرانے لے لے کر غلط سلط احکام بتانے اور مسائل کے مسخ کر ڈالنے کے عادی ہو گئے تھے، خود ان کی کتاب آسمانی میں ان کو عدل پر قائم رہنے اور رشوت نہ لینے کے باب میں یہ حکم ملا تھا کہ "اپنے سارے فرقوں میں قاضی اور حاکم مقرر کیجیو، وہ انصاف سے لوگوں کی عدالت کریں تو عدالت میں مقدمہ نہ بگاڑیو تو طرفداری نہ کیجیو اور نہ رشوت لیجیو کہ رشوت دانش مند کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور صادق کی باتوں کو پھیر دیتی ہے" (استثناء ۱۶: ۱۸ و ۱۹) لیکن انہی کے بزرگوں نے تالمود میں احکام یہ جاری کر دیے تھے کہ جب کسی مقدمہ میں ایک فریق اسرائیلی ہو اور دوسرا غیر اسرائیلی تو اگر اسرائیلی کے موافق فیصلہ یہودی شریعت کے مطابق ہو سکتا ہے تو وہی کر دو، اور کہہ دو کہ یہی ہمارا قانون ہے، اور اس کے موافق فیصلہ غیر اسرائیلی قانون کے مطابق ہو سکتا ہو تو یہی کر دو، اور غیر اسرائیلی سے کہہ دو کہ تمھارے ہاں کا ضابطہ یہی ہے، اور اگر ایسا فیصلہ دونوں ضابطوں میں سے کسی ضابطہ سے بھی نہ ہو رہا ہو تو کسی حیلہ سے کام لو۔"

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت اللہ کی رحمت پر بڑی دلیل ہے کہ اس میں مذمت کو کثرتِ عادتِ معصیت پر مرتب فرمایا، سرسری خطا پر مذمت نہیں فرمائی جس سے عادۃً کوئی خالی نہیں ہوتا، یہی شان ہوتی ہے مشائخ اہلِ تربیت کی کہ خفیف اُمور سے تسامح کرتے ہیں۔

۱۵۲ (آپ کو دونوں چیزوں کا اختیار ہے جیسی بھی آپ کو مصلحت معلوم ہو)

فَاِنْ جَآءُوْکَ۔ یعنی جب یہ کوئی مقدمہ معاملے کر آپ کے پاس آئیں، مدینہ میں رسول اللہ صلعم اب حاکم اور دُنیوی حیثیت سے بھی آمر و مقتدر تھے، کچھ تو اس لئے بھی کہ یہود کو اپنے معاملات آپ کے سامنے لامحالہ لانے پڑتے تھے، پھر یہ بھی تھا کہ بہت سے مسائل میں شریعتِ محمدیؐ شریعت یہود سے کہیں زیادہ نرم تھی اس لالچ میں بہت سے

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ

اور اگر آپ انھیں ٹال دیں جب بھی یہ آپ کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور اگر آپ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان

بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ

(قانون) عدل کے مطابق فیصلہ کریں ۱۵۳ بے شک اللہ عدل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے ۱۵۴ اور آپ کو یہ کیسے فیصلہ کرتے ہیں

وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ

دراں حالیکہ اُن کے پاس توریت موجود ہے ۱۵۵ اور اس میں اللہ کا حکم (درج) ہے ۱۵۶ پھر اس کے بعد ہٹ جاتے ہیں ۱۵۷

یہود مدینہ اپنے نقصے قضیے فیصلہ کے لئے رسول اللہ صلعم ہی کی خدمت میں لایا کرتے تھے، فیصلہ واجب امیر اسلام پر تو ذمیوں ہی کے درمیان ہے، دوسرے کافروں کے لئے واجب نہیں، صرف جائز ہے حسب ضرورت و مصلحت۔

ھذا التخییر من اللہ تعالی ولا یجب علینا الحکم بین الکفار اذا لم یکونوا اھل ذمۃ بل یجوز الحکم ان اردنا (قرطبی) ھذا التخییر مختص بالمعاھدین الذین لا ذمۃ لھم (کبیر)

۱۵۳ (اور وہ قانونِ عدل اب منحصر ہے قانونِ اسلام میں)

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ۔ آپ کا یہ ٹالنا بھی کسی مصلحت دینی ہی کے ماتحت ہوتا۔

فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْئًا۔ اس لئے آپ اندیشہ نہ کریں کہ ناخوش ہو کر یہ لوگ آپ سے دشمنی نکالیں گے۔

بالقسط ای بالعدل الذی امرت بہ وھو ما تضمنہ القرآن واشتملت علیہ شریعۃ الاسلام (روح)

اختیار آپ کو اس بارے میں تو دیا گیا تھا کہ کافروں کے درمیان فیصلہ فرمائیں یا نہ فرمائیں لیکن فیصلہ اگر کیا جائے تو یہ قطعی ہے کہ قانونِ شریعت ہی کے ماتحت کیا جائے، اس کا اختیار نہیں کہ فیصلہ کسی اور قانون کے مطابق کر دیا جائے۔

۱۵۴ (اور اللہ جن کے ساتھ محبت کرتا ہے، ظاہر ہے کہ انھیں توفیق بھی حق پر قیام کی دیتا ہے گا)

یہاں یہ یاد دلا دیا گیا ہے کہ وہ لوگ کیسے ہی اہلِ جور ہوں، آپ بہر حال اُن کے معاملہ میں بھی طریق حق و عدل سے ذرا تجاوز نہ کیجئے

بالقسط ای بالحق والعدل وان کانوا ظلمۃ خارجین عن طریق العدل (ابن کثیر)

۱۵۵ (جس کا کتابِ الٰہی ہونا انھیں مسلّم ہے)

كَيْفَ۔ کلمۂ تعجب ہے یعنی اظہارِ حیرت اس پر ہے کہ یہ لوگ اپنی کتاب آسمانی رکھنے کے باوجود دین کے کسی معاملہ میں فیصلہ کے لئے آپ کے پاس آتے ہیں!

تعجیب من تحکیمھم من لا یؤمنون بہ والحال ان الحکم منصوص علیہ فی الکتاب الذی ھو عندھم (بیضاوی) تعجیب من تحکیمھم (کشاف)

اوپر کسی حاشیہ میں گزر چکا ہے کہ یہود کا رسول اللہ صلعم کی خدمت میں حاضر ہونا معرفتِ حق کے لئے تو ہوتا نہ تھا، بلکہ کہیں اپنے مطلب اور اپنی غرض کے لئے ہوتا کہ شاید کوئی آسان تر حکم مل جائے۔

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ ع ۶ ۹/۱۰

اور یہ لوگ ہرگز ایمان والے نہیں ۱۵۸ بے شک ہم ہی نے توریت نازل کی ہے جس میں ہدایت اور روشنی ہے ۱۵۹

تنبیه على انهم ما قصدوا بالتحكيم معرفة الحق واقامة الشرع وانما طلبوا به ما يكون اهون عليهم وان لم يكن حكم الله تعالىٰ فى زعمهم (بیضاوی)

۱۵۶ جس خاص حکم کا یہ ذکر برابر چل رہا ہے، اور یہود نے اسے رسول اللہ صلعم سے چھپا ڈالنا چاہا تھا، وہ حکم رجم یا سنگ ساری ہے، اور قرآن کے اعجاز کے لئے یہ دلیل بھی بجائے خود کافی اور قوی ہے کہ یہود کی ہزار کوشش اخفاء کے باوجود، شادی شدہ زناکار کے لئے حکم قتل و رجم کسی نہ کسی صورت میں آج تک توریت میں باقی ہے، اور موجودہ توریت سے یہود تحریفات بھی اسے یکسر اور تمام تر دور نہ کر سکیں، چند حوالے ملاحظہ ہوں :۔

"اور وہ شخص جو دوسرے کی جورو کے ساتھ یا اپنے پڑوسی کی جورو کے ساتھ زنا کرے، وہ زنا کرنے والا اور زنا کرنے والی دونوں قتل کئے جائیں"۔ (احبار۔ ۲۰:۱۰) "اور وہ مرد یا عورت جس کا یار دیو ہے یا جادوگر ہو تو دونوں قتل کئے جائیں اور چاہیے کہ تم ان پر پتھراؤ کرو، ان کا خون بھی ان ہی پر ہووے"۔ (احبار۔ ۲۰:۲۷) "اگر کوئی جورو کرے اور اس سے خلوت کرے اور کہے کہ میں نے اس عورت سے بیاہ کیا، جب میں اس کے پاس گیا تو میں نے اسے کنواری نہ پایا، اگر یہ بات سچ نکلے اور لڑکی کے کنوارے پن کی نشانیاں پائی نہ جائیں، تو وہ اس لڑکی کو اس کے ماں باپ کے گھر کے دروازہ پر نکال لائیں اور اس کی بستی کے لوگ اس پر پتھراؤ کریں کہ وہ مر جائے"۔ (استثناء۔ ۲۰۔ ۱۳:۲۱۰۲۰) "اگر کوئی مرد شوہر والی عورت سے زنا کرتے پایا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں، مرد جس نے اس عورت سے صحبت کی اور عورت بھی"۔ (استثناء ۲۲:۲۳)

اور انجیل کے واسطہ سے جو گواہی پہنچی ہے وہ تو اس سے بھی زیادہ کھلی ہوئی ہے :۔

"فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی، اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا کہ اے استاد یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے، توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں، پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے"؟ (یوحنا ۸: ۴۔۶)

۱۵۷ پہلے تو خود ہی فیصلہ کرانے کے لئے رسول کی خدمت میں آئے، اور جب فیصلہ سن لیا تو اس سے ہٹ بھی گئے۔

ثُمَّ۔ تعجب میں ترقی کے لئے ہے، یعنی حیرت بالائے حیرت کے اظہار کے لئے۔

ثم للتراخى فى الرتبة (روح) تصريح بما علم لنا كيد الاستبعاد والتعجب۔ (روح)

۱۵۸ ان کے اس طرزِ عمل نے ظاہر کر دیا کہ ان کا ایمان قرآن و صاحبِ قرآن پر تو کیا ہوتا، توریت و صاحبِ توریت پر بھی کامل و محکم نہیں

مومنين بك او بكتابهم كما يدعون (مدارك) مؤمنين بكتابهم كما يدعون۔ (کشاف)

۱۵۹ یعنی جلی احکامِ الٰہی درج ہیں۔

هُدًى۔ یعنی عقائد اور مسائل سے متعلق ہدایات و احکام تھے۔

نُوْرٌ۔ یعنی وضوح تھا احکامِ عملی سے متعلق۔

التَّوْرٰىةَ پر حاشیہ سورۂ آلِ عمران کے شروع میں گزر چکا۔

يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ

اسی کے مطابق وہ نبی جو اللہ کے مطیع تھے یہودی لوگوں کا فیصلہ کرتے تھے اور (اسی طرح) ان کے مشائخ و

وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ

علماء (بھی) ۱۶۰ اس لئے کہ انھیں کتاب اللہ کی نگہداشت کا حکم دیا گیا تھا ۱۶۱ اور وہ اس کے گواہ تھے ۱۶۲

إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ۔ اس میں رد آگیا یہود کے موجودہ عقیدہ کا کہ توریت صاحبِ الہام انبیاء کی مرتب کی ہوئی ایک انسانی کتاب ہے۔ توریت اسلامی عقیدہ کے مطابق، خدا کے ہاں سے نازل شدہ کتاب ہے، سوا اس صورت کے کہ خود لفظ "انزال" میں اتنی وسعت اور لچک پیدا کر دی جائے کہ خالص وحی الٰہی کا درجہ پیغمبروں کے کشف والہام کو بھی دے دیا جائے۔

۱۶۰ مقصود توریت کی اہمیت و شرف کا اظہار ہے، یہ وہ کتابِ الٰہی ہے جو پچھلی صدیوں میں معیارِ حق و عدل رہی ہے، علماء و مشائخ و انبیاء بنی اسرائیل کے لئے۔

النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا۔ یہود کی اصطلاح میں "نبوت" اسلامی نبوت سے بالکل الگ ایک مفہوم رکھتی ہے، ان کے ہاں یہ ہرگز ضروری نہیں کہ نبی کا تعلق اللہ کے ساتھ جڑا ہوا اور مستحکم ہو یا نبی کی نسبت مع اللہ قوی ہو، وہ "نبی" یا "نبوت" کے قائل صرف ان الفاظ کے لفظی معنی میں تھے، نبی ان کے ہاں پیش گوئی کرنے والا تھا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ صاحبِ کشف بھی تھا جیسے مشرک قوموں میں کاہن ہوتے تھے، خود یہود کے ہاں نبی اور کاہن کی اصطلاحیں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ عہد عتیق میں ذکر ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر جعلی اور جھوٹے نبیوں کا آیا ہے، جو کفر و شرک کی دعوت دینے والے تھے، صرف چند بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں:-

"اگر تمھارے درمیان کوئی نبی یا خواب دیکھنے والا ظاہر ہو اور تمھیں کہے آؤ ہم غیر معبودوں کی جنھیں تم نے نہیں جانا، پیروی کریں، تو ہرگز اس نبی یا خواب دیکھنے والے کی بات پر کان مت دھرو، وہ نبی یا خواب دیکھنے والا قتل کیا جائے گا۔" (استثناء۔ ۱۳: ۱۔ ۳ و ۵) "وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" (استثناء ۱۸: ۲۰۔۲۲)

"انبیاء میرا نام لے کر جھوٹی نبوت کرتے ہیں، میں نے انھیں نہیں بھیجا اور حکم نہیں دیا، نہ انھیں کہا، یہ نبی تلوار اور کال سے ہلاک کئے جائیں گے۔" (یرمیاہ ۱۴: ۱۳: ۱۶)

قرآن مجید نے ان ہی عقائد کے مدنظر الَّذِينَ أَسْلَمُوا کی قید لگا کر بتا دیا کہ النَّبِيُّونَ سے مراد جھوٹی اور شیطانی نبوت کرنے والے نہیں، بلکہ سچّے اور وحی الٰہی سے مشرف نبی ہیں۔

الرَّبَّانِيُّونَ۔ مراد اہل اللہ و مشائخ و علماء باطن ہیں۔

العلماء الحکماء (قرطبی) الربانیون فوق العلماء (قرطبی)

الْأَحْبَارُ۔ مراد علماء ظاہر و فقہاء ہیں۔

قال ابن عباس ھم الفقھاء (قرطبی) الحبر الرجل العالم وھو ماخوذ من التحبیر وھو التحسین فھم یحبرون العلم ای یبینونه ویزینونه (قرطبی)

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ

سو تم انسانوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو ۱۶۳ اور میرے احکام کو دنیا کی متاعِ قلیل کے عوض نہ بیچ ڈالو ۱۶۴

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو یہی لوگ تو کافر ہیں ۱۶۵

لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔ میں لَ عَلٰی کے معنی میں ہے۔

اللام بمعنی علی ای علی الذین ھادوا۔ (بحر)

لَ بیانیہ بھی سمجھا گیا ہے، اور تقدیر کلام یوں سمجھی گئی۔ لاجل الّذین ھَادُوْا۔

واللام لبیان اختصاص الحکم بھم کانّہ قیل لاجل الذین ھادوا۔ (روح)

۱۶۱ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ توریت حفاظت اور عملدرآمد کے لئے اکابر یہود کی سپردگی میں دیدی گئی تھی۔

اُسْتُحْفِظُوْا۔ اِستحفاظ کے معنی ہیں کسی سے سوال کرنا کہ وہ حفاظت و نگہداشت رکھے۔

ای بسبب ما طلب اللہ منھم حفظھم لکتاب اللہ وکلفھم حفظھا واخذ عھدہ علیھم فی العمل بھا والقول بھا (بحر)

مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ۔ میں مِنْ بیانیہ ہے۔

من للتبیین۔ (بیضاوی)

بِمَا میں بَ سببیہ ہے۔

الباء فی بما للسبب۔ (بحر)

۱۶۲ گواہ اس امر کے، کہ یہ کتاب، کتاب الٰہی ہے، اور محافظ اس کے متن و عبارت کے۔

ای علی الکتٰب بأنہ من عند اللہ (قرطبی) کانوا علیہ رقباء لئلا یتبدل (بحر) رقباء لا یترکون ان یغیر (بیضاوی) شھداء علی ان کل ما فی التورٰۃ حق وصدق ومن عند اللہ۔ (کبیر)

۱۶۳ (کہ میں انکار حق پر ہر سزا پر قادر ہوں)

خطاب قرآن اپنے معاصر مقتدایانِ یہود سے کر رہا ہے۔

فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ۔ خلقت سے ڈرتے ہو کہ اگر ہم نے حسب بشارات توریت نبوت محمدیؐ کی تصدیق کر دی تو ہمارے عوام ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے، رؤساء و اکابر یہود کے لئے قبول حق یا تصدیق محمدیؐ سے پہلا مانع یہی حبِ جاہ تھا یہ ضرب اسی پر لگائی گئی۔

۱۶۴ (اور یہ نذرانے وغیرہ جو عوام سے حاصل ہوتے ہیں، ان کے بند ہو جانے کا ڈر دل سے نکال ڈالو۔)

مقتدایانِ یہود کو قبول حق و تصدیق اسلام سے پہلا مانع تو حبِ جاہ تھا جس کا ذکر ابھی اوپر آچکا ہے، اور دوسرا مانع یہ حبِ مال تھا۔

۱۶۵ (کہ غیر شرعی احکام کو شرعی احکام قرار دے رہے اور انسانی قانون کو خدائی قانون کہہ کر چلا رہے ہیں)

مقتدایانِ یہود کا اصلی اور سب سے بڑا جرم یہی تھا کہ وہ اپنے گڑھے ہوئے قانون اور مسائل کو خدائی قوانین و مسائل کہہ کر چلاتے تھے فتوے خود اور اپنی طرف سے دیتے اور کہتے کہ یہی دین و مذہب کا حکم ہے، اور یہی تفسیر بعض اکابر تابعین سے منقول ہے

عن ابی زید قال من حکم بکتابہ الذی کتب بیدہ وترک کتاب اللہ وزعم ان کتابہ ھذا من عند اللہ فقد کفر (ابن جریر)

ایسی جسارت رکھنے والوں کے کفر میں شک کیا ہو سکتا ہے، اور اہل سنت کا یہی مذہب ہے۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ میں مَنْ اَلَّذِیْ کا مترادف ہے اور آیت یہود کے حق میں ہے۔

من ھنا بمعنی الذی (قرطبی)

معنی یہ ہوئے کہ وہ یہود جو احکام الٰہی رجم و قصاص وغیرہ کو مٹا کر اپنی تجویزوں کو حق تعالیٰ کی جانب منسوب کر دیتے وہ کافر ہو گئے

والمعنی یرید الیہود الذین لم یحکموا بما انزل اللہ فاولئک ھم الکٰفرون فھذا من احسن ما قیل فی ھذا (قرطبی)

آیت سے خوارج نے بڑے زور و دعوے کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ مسلمان فاسق بھی کافر کے حکم میں داخل ہے، جب اس نے غیر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ شروع کر دیا تو وہ کفر میں داخل ہو گیا، لیکن یہ استدلال (خوارج کے دوسرے استدلالات کی طرح) تمام تر غلطی ہے، اس لئے کہ جس فیصلہ کا یہاں ذکر ہے، اُس کا تعلق عمل سے نہیں، بلکہ عقیدہ سے ہے اور وہ شخص کافر یقیناً ہو جاتا ہے، جو عقیدۃً بھی اللہ کے قانون کو غلط اور اپنے قانون کو صحیح سمجھتا ہے۔

المراد بہ ھنا عمل القلب وھو التصدیق ولا نزاع فی کفر من لم یصدق بما انزل اللہ تعالیٰ۔ (روح)

آیت کے عام نہ ہونے بلکہ کفار اور ان میں بھی یہود کے ساتھ مخصوص ہونے پر ابو صالح، عکرمہ، ضحاک، قتادہ وغیرہ تابعین کے علاوہ حذیفہؓ، ابن عباسؓ صحابیؓ بلکہ خود نبی کریم صلعم تک کی سند موجود ہے۔

عن البراء بن عازب عن النبی صلعم فی قولہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون فی الکافرین کلھا (ابن جریر) عن ابی صالح قال الثلاث الآیات التی فی المائدۃ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون والظالمون والفاسقون لیس فی اھل الاسلام منھا شیء ھی فی الکفار (ابن جریر) عن الضحاک قال نزلت ھؤلاء الآیات فی اھل الکتاب (ابن جریر) عن ابی جعفر قال انزلت فی الیہود والنصاریٰ واھل الشرک او نحو من ھذا (ابن جریر) عن عکرمۃ قال ھؤلاء الآیات فی اھل الکتاب (ابن جریر) عن عبید اللہ بن عبد اللہ قال انما عنی بذلک الیہود وفیھم نزلت ھذہ الصفۃ (ابن جریر) عن ابن عباسؓ قال انما انزل اللہ تعالیٰ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون والظالمون والفاسقون فی الیہود خاصۃً (روح)

قال البراء بن عازب وحذیفۃ بن الیمان وابن عباس وابو مجلز وابو رجاء العطاردی وعکرمۃ وعبید اللہ بن عبد اللہ والحسن البصری وغیرھم نزلت فی اھل الکتٰب (ابن کثیر) قال قتادۃ والضحاک نزلت ھذہ الآیات الثلث فی الیہود دون من اساء من ھذہ الامۃ (معالم)

امام ابن جریر طبری حسب دستور موافق و مخالف سارے اقوال کو نقل کرتے ہیں، لیکن ترجیح اُسی کو دیتے ہیں کہ آیتوں کا تعلق صرف کفار اہل کتاب سے ہے کہ انہی کا ذکر سیاق میں بھی ہے اور انہی کا ذکر سباق میں بھی، اور دوسرے محققین مفسرین بھی اسی طرف گئے ہیں

واولیٰ ھذہ الاقوال عندی بالصواب قول من قال نزلت ھذہ الآیات فی کفار اھل الکتاب لان ما قبلھا وما بعدھا من الآیات ففیھم نزلت وھم المعنیون بھا (ابن جریر) قال الشعبی ھی فی الیہود خاصۃ واختارہ النحاس (قرطبی)

یعنون ان من جحد حکم اللہ او حکم بغیر حکم اللہ تعالیٰ ثم قال ان ھذا حکم اللہ فھو کافر کما کفرت بنو اسرائیل حین فعلوا ذلک (جصاص)

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ

اور ہم نے اُن پر اس میں یہ فرض کر دیا تھا ۱۶۶ کہ جان کا بدلہ جان ہے، اور آنکھ کا آنکھ اور ناک کا

وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ

ناک اور کان کا کان اور دانت کا دانت ۱۶۷

کفر کی دفعہ اگر کسی غیر خدائی قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والے مسلمان پر عائد ہوگی بھی تو صرف اس صورت میں جب وہ بیّن وصریح حکم کی خلاف ورزی دیدۂ و دانستہ کرے، نہ اس وقت جب کہ حکم کی دلالت ہی خفی ہو اور غلط تعبیر وہ نادانستہ یا غیر شعوری طور پر کر رہا ہو۔

قال العلماء هذا اذا رد نص حكم الله عيانا فاما من خفي عليه او اخطأ في تاويل فلا (معالم)

عکرمہ تابعی نے کہا ہے اور امام رازیؒ نے بھی اس قول کی تصویب کی ہے کہ جب تک کوئی کسی حکم الٰہی کو دل سے مان رہا ہے اور زبان سے اس کا اقرار کر رہا ہے، اس وعید کے تحت میں آ کیوں کر سکتا ہے؟ عمل اس کا اس کے مخالف ہی ہو جب بھی وہ محض عاصی یا تارک کہا جائے گا نہ کہ منکر یا باغی۔

قال عكرمة قوله ومن لم يحكم بما انزل الله انما يتناول من انكر بقلبه وجحد بلسانه امامن عرف بقلبه كونه حكم الله واقر بلسانه كونه حكم الله الا انه اتى بما يضاده فهو حاكم بما انزل الله تعالى ولكنه تارك له فلا يلزم دخوله تحت هذه الآية وهذا هو الجواب الصحيح (كبير)

اس خاص مسلک میں خارجیوں کے مذہب کی ہمارے زمانہ میں پھر زبردست تجدید شروع ہوئی ہے بڑے بڑے خوشنما القاب وخطابات کے ساتھ، اور اس دعایۃ میں خاص کام اسی آیت سے لیا جاتا ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آیت کی تفسیر مذہب اہل سنّت کے مطابق ذرا تفصیل سے کر دی جائے۔

۱۶۶ (قتل عمد یا دانستہ ضرب رسانی کی صورت میں)

عَلَيْهِمْ۔ ضمیر یہود کی طرف ہے، ذکر اُن ہی کا برابر چل رہا ہے، اور یہ بجائے خود ایک دلیل اس امر کی ہے کہ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ کا تعلق بھی یہود ہی سے ہے۔

فِيهَا۔ میں ضمیر متفقہ طور پر توریت کی جانب ہے۔

وَكَتَبْنَا۔ سے اس کی صراحت ہوگئی کہ توریت کی تعزیرات اللہ ہی کی مقرر کی ہوئی ہیں۔

۱۶۷ موجودہ توریت میں اتنے تحریفی انقلابات کے بعد بھی یہ حکم ان الفاظ میں موجود رہ گیا ہے:۔

"اگر وہ اس صدمہ سے ہلاک ہو جائے تو تو جان کے بدلے میں جان لے اور آنکھ کے بدلے میں آنکھ، دانت کے بدلے دانت اور ہاتھ کے بدلے ہاتھ پاؤں کے بدلے پاؤں، جلانے کے بدلے جلانا، زخم کے بدلے زخم، اور چوٹ کے بدلے چوٹ۔" (خروج ۲۱: ۲۳-۲۵)

"اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگا دے سو جیسا کرے گا ویسا ہی پائے گا، توڑنے کے بعد توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت جیسا کوئی کسی کا نقصان کرے اُس سے ایسا ہی کیا جاوے۔" (احبار ۲۴-۲۰) "اور تیری آنکھ مروت نہ کرے

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۚ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۚ وَمَنْ لَّمْ

اور زخموں میں قصاص ہے سو جو کوئی اسے معاف کردے ۱۶۸؎ تو وہ اس کی طرف سے کفارہ ہوجائے گا ۱۶۹؎ اور جو

يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ

کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے موافق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ تو ظالم ہیں ۱۷۰؎ اور ہم نے ان کے

بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ص

پیچھے عیسیٰؑ ابن مریم کو بھیجا تصدیق کرنے والے اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کے ۱۷۱؎

جان کا بدلہ جان، آنکھ کا بدلہ آنکھ، دانت کا بدلہ دانت، ہاتھ کا بدلہ ہاتھ اور پاؤں کا بدلہ پاؤں ہوگا۔" (استثناء۔۱۹:۲۱)

**۱۶۸؎** (رضائے الٰہی کے لئے، یا اپنی مالی غرض سے)

بِهٖ۔ اس کو یعنی اس قصاص کو، اس بدلہ لینے کے حق کو۔

ای تصدق بالقصاص (قرطبی)

وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ سے مراد ہے کہ زخم محلِ قصاص ہیں۔

ای ذات قصاص (بیضاوی) ای متقاصۃ (قرطبی) ای یقتص فیہا (جلالین)

**۱۶۹؎** یعنی موجبِ اجر و ثواب اور اُس معاف کردینے والے کے گناہوں کے دُور ہونے کا باعث بن جائے گا۔

هُوَ۔ یعنی یہ معاف کردینا، یہ اپنے جائز حق سے دست برداری۔

لَهٗ۔ یعنی اُس معاف کردینے والے کے حق میں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ترغیب ہے عفو کی، اور یہ اہل اللہ کی عادات میں داخل ہے۔

**۱۷۰؎** (اپنے حق میں)

یعنی بہت بُرا کام کرنے والے ہیں۔ یہود کا ذکر اب بھی چلا جارہا ہے، پہلے ذکر یہ تھا کہ اُن کے اکابر و مشائخ اپنی طرف سے ایک فتوے گڑھ کردے دیتے ہیں اور اُسے شریعت الٰہی کی جانب منسوب کردیتے ہیں، ایسے لوگ اپنی اس حرکت سے یقیناً کافر ہوجاتے ہیں فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اب ذکر انہی یہود کا ہے کہ یہ اجرائے حد و قصاص میں احکامِ شریعت کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں، تو یہ اپنے ہی اوپر ظلم کررہے ہیں، فاولٰئک ھم الظٰلمون۔ ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۶۵

**۱۷۱؎** یہ تصدیق خود موجودہ محرّف اور مسخ شدہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے موجود ہے:۔

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں" (متی ۵۔۱۷)

اٰثَارِهِمْ۔ میں ضمیر انبیاءِ اسرائیل کی جانب ہے۔

ای النبیین الذین اسلموا من قبلک یا محمدؐ۔ (ابن جریر)

وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ۔ یعنی ہم نے ان کے نقشِ قدم پر پیچھے پیچھے بھیجا، ان الفاظ میں اشارہ اس جانب بھی ہوگیا کہ

وَ اٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ فِیْهِ هُدًی وَّ نُوْرٌ ۙ وَّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ

اور ہم نے انھیں انجیل دی جس میں ہدایت اور نور ہے ۱۷۲ تصدیق کرنے والی اپنے قبل کی کتاب یعنی توریت

التَّوْرٰىةِ وَ هُدًی وَّ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۴۶﴾ وَلْیَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِیْلِ

کی ۱۷۳ اور پرہیزگاروں کے لئے ایک ہدایت اور نصیحت ۱۷۴ اور اہل انجیل پر بھی لازم ہے کہ اللہ نے جو کچھ

بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِیْهِ ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓىِٕكَ

اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں ۱۷۵ اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا

نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں ۱۷۶ اور ہم نے آپ پر (یہ) کتاب اُتاری ہے سچائی کے ساتھ، تصدیق

بَیْنَ یَدَیْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مُهَیْمِنًا عَلَیْهِ

کرنے والی ان کتابوں کی جو اس سے پیشتر اُتر چکی ہیں اور ان پر محافظ ۱۷۷

حضرت مسیح اُسی طرح کے نبی تھے، جیسے کہ ان کے قبل بنی اسرائیل میں اور نبی ہو چکے تھے، ان کی شخصیت اور اُن کی وحی دوسرے انبیاء کی شخصیت اور وحی سے کچھ مختلف نہ تھی۔

**۱۷۲** قرآن مجید بار بار یہ کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نامی کوئی کتاب وحی یا الہام کی گئی تھی اب یہ کتاب دنیا کی نظروں سے معدوم ہے، اور آئندہ کے کسی اسلامی محقق کا کام یہ پتہ لگانا ہے کہ آخر یہ کتاب آسمانی ہوئی کیا؟ اور کب اور کیسے غائب ہو گئی؟ "عہد نامہ جدید" جسے عوام انجیل کا مرادف سمجھتے ہیں اس کے کتاب الٰہی ہونے کا دعویدار تو کوئی بھی نہیں، نہ عیسائی نہ غیر عیسائی، وہ تو حضرت عیسیٰؑ کے کچھ ملفوظات اور کچھ حالات ہیں آپ کے بہت بعد کچھ مجہول الحال لوگوں کے لکھے ہوئے۔

هُدًی یعنی عقائد و مسائلِ صحیحہ۔

نُوْرٌ۔ یعنی واضح احکامِ عملی۔

**۱۷۳** انجیل کی اصطلاح میں "شریعت" (LAW) سے مراد شریعتِ موسوی یا توریت ہوتی ہے اور اس کی بابت موجودہ انجیل میں تصریح موجود ہے کہ "آسمان اور زمین کا ٹل جانا شریعت کے ایک نقطہ کے ہٹ جانے سے آسان ہے" (لوقا ۱۶: ۱۷)

**۱۷۴** یعنی نفع اُس سے صرف پرہیزگار ہی اُٹھائیں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب اُس ملک و زمانہ کے عام و خاص سب ہی تھے۔

**۱۷۵** خود انجیل مروجہ کی تعلیم اس سلسلہ میں یہ ہے:-

"جو کوئی ان چھوٹے سے چھوٹے حکموں میں سے بھی کسی کو توڑے گا، اور یہی آدمیوں کو سکھائے گا وہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے چھوٹا کہلائے گا، لیکن جو ان پر عمل کرے گا اور اُن کی تعلیم دے گا، وہ آسمان کی بادشاہت میں بڑا کہلائے گا۔" (متی ۵: ۱۹)

مگر ایک لطیفہ یہ ہے کہ موجودہ "انجیل" میں احکام قانونی کا حصہ بس برائے نام ہی ہے، فوجداری اور دیوانی کے قانون کے بیسیوں باب سرے سے خالی ہیں، ان کے بجائے اخلاقی وعظ البتہ ملتے ہیں۔

فقہاء نے یہاں سے یہ نکتہ بھی اخذ کیا ہے کہ پچھلی شریعتوں سے جو حصہ منسوخ نہیں ہوا ہے، وہ اس معنی میں اب بھی واجب العمل ہے کہ وہ ایک جزو ہماری شریعت کا جزو بن گیا، اور اسی میں شامل ہوگیا ہے۔

فیه دلالة علی ما لم ینسخ من شرائع الانبیاء المتقدمین فهو ثابت علی معنی انه صار شریعة النبی صلعم (جصاص) انهم مامورون باستعمال احکام تلك الشریعة علی معنی انها قد صارت شریعة للنبی علیه السلام (جصاص)

۱۷۱ ظاہر ہے کہ آیت کا خاص تعلق اہل انجیل ہی سے ہے، مسیحیوں ہی کو حکم مل رہا ہے کہ جب دعوی انجیل کے ماننے کا ہے تو عمل بھی، اسی کتاب الہی کے مطابق و ماتحت ہونا چاہیئے۔

وقد تقدم ان هذه الآیة نزلت فی النصاری وهو ظاهر من السیاق (ابن کثیر) امر القسیسین والرهبان ان یحکموا بما فی الانجیل (معالم) قال الاصم فی النصاری (کبیر)

آیت کو آج مسلمانوں پر چسپاں کرنا، خوارج کی رعایت کا نادانستہ یا دانستہ شکار ہوجانا ہے۔

۱۷۲ (اے پیغمبر!)

توریت و انجیل کے بعد اب ذکر قرآن مجید کا شروع ہو رہا ہے۔

بِالْحَقِّ۔ یعنی ایسی کتاب جو بجائے خود سچی ہے، ہر شک و کذب سے برتر۔

ای بالامر الحق (قرطبی) یعنی بقوله بالحق بالصدق ولا کذب فیه ولا شك انه من عند الله (ابن جریر)

مِنَ الْكِتٰبِ۔ کتاب بطور اسم جنس آیا ہے۔

من جنس الکتاب (قرطبی)

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ۔ تصدیق کرنے والی ان پچھلی کتابوں کی کہ وہ بھی منزل من اللہ ہی ہیں، اس تصدیق سے ان کتابوں کی تحریفات و تصحیفات کی تصدیق ہرگز لازم نہیں آتی۔

مُهَيْمِنًا۔ مہیمن کے لفظی معنی ہیں حفظ و نگہبانی کرنے والا۔

اصل الهیمنة الحفظ والارتقاب (ابن جریر)

مراد یہ کہ قرآن ہی سب اگلی کتابوں کے لئے معیار صحت و صداقت ہے۔

شهیدا علی الکتب کلها ویقال امینا علی الکتب (ابن عباس) مؤتمنا علیه (ابن جریر عن ابن عباس) قال قتادة معناه الشاهد وقیل الحافظ (قرطبی) قال بعضهم معناه شهیدا ——— وقال بعضهم معناه امینا علیه (ابن جریر عن ابن عباس) ای شاهدا علیه وهو قول مجاهد وقتادة والسدی والکسائی (معالم) قال سعید بن جبیر وابو عبید مؤتمنا علیه (معالم)

محقق ابن کثیر نے "حاکم" اور "امین" اور "شہید" اور "مؤتمن" وغیرہ متعدد معنی نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ سب قریب المعنی ہیں اور مُهَيْمِن کا مفہوم ان سب پر شامل ہے اور قرآن سب کتابوں کی خاتم اور سب سے اکمل و اعظم و اشمل ہے۔

هذه الاقوال کلها متقاربة المعنی فان اسم المهیمن یتضمن هذا کله فهو امین وشاهد وحاکم علی کل

فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ

تو آپ ان لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے (احکام) کے مطابق فیصلہ کیا کیجیے اور ان لوگوں کی خواہشوں پر عمل

مِنَ الۡحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ

نہ کیجیے ۱۷۸؎ اس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آچکی ہے ۱۷۹؎ تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھی تھی ۱۸۰؎

کتاب قبلہ جعل اللہ ھذا الکتاب العظیم الذی انزلہ اٰخر الکتب وخاتمھا اشملھا واعظمھا واکملھا۔ (ابن کثیر)

مجاہد تابعی کی جانب منسوب ایک قول یہ بھی نقل ہوا ہے کہ مہیمن سے مراد ذات محمدیؐ ہے اور علیہ میں ضمیر قرآن (الکتاب) کی طرف ہے گویا محمد صلعم قرآن پر بہ طور مہیمن کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس روایت کی نقل میں کہیں غلطی ہوگئی ہے، امام ابن جریر لکھتے ہیں کہ یہ معنی تو قواعد عربیت کے لحاظ سے غلط ہیں، اگر یہی مراد ہوتی تو مصدقا اور مہیمنا کے درمیان واو عطف نہ ہوتا، عطف کے بعد دونوں صفتیں ایک ہی موصوف، قرآن کی ہو سکتی ہیں۔

وھذا التاویل بعید من المفھوم فی کلام العرب بل ھو خطأ وذلک ان المھیمن عطف علی المصدق فلا یکون الا من صفۃ ما کان المصدق صفۃ لہ۔ (ابن جریر)

قرآن مجید کی دو صفتیں پہلے بیان ہو چکی تھیں، ایک یہ کہ وہ بذاتِ خود صحیح اور سچا ہے، دوسرے یہ کہ وہ قبل کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، تیسری صفت مُھَیۡمِن کی اب بیان ہوئی، مصدق و مھیمن ان دو صفات کے لانے سے قرآن مجید کی دو حیثیتوں کو بیان کرنا ہے، ایک یہ کہ سابق کتابوں کے کل مضمون اس کے اندر آگئے، اور اس میں جمع و محفوظ ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن ان کتابوں پر بطور نگراں کے کام دے گا، یعنی ان کی تحریفات و تصحیفات کے لئے معیار کا کام بھی دے گا۔

۱۷۸؎ (جیسا کہ اب تک بھی نہیں کیا ہے)

مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ۔ اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق جو اب سب کے سب قرآن میں محفوظ ہیں۔

ای بما فی القرآن (مدارک)

بَيۡنَهُمۡ۔ یعنی اہل کتاب کے درمیان، جب کہ ان کے معاملات آپ کے سامنے پیش ہوں۔

ای بین الیھود (کبیر) ای بین اھل الکتاب کما قال ابن عباسؓ۔ (روح)

۱۷۹؎ (اور وہ سچائی وحی الٰہی کی روشنی ہے قرآن کے اندر ہو یا اس کے باہر)

ای بالقرآن والوحی الذی نزّلہ اللہ تعالٰی علیک (کبیر) المراد سائر الاحکام (روح)

۱۸۰؎ خطاب عام ہے، نوع انسان بھی مراد ہو سکتی ہے، اور اہلِ کتاب بھی۔

ایھا الناس (مدارک۔ بیضاوی) ایھا الامم الباقیۃ (روح)

شِرۡعَةً سے مراد ہر نبی کی لائی ہوئی تعلیم یا کتاب ہے، اور منہاج اس پیمبر کا تعامل یا سنّت ہے، گویا یہ بتا دیا کہ کتاب و سنت کی دوگونہ نعمت قدیم موحّد قوموں کے حصّہ میں بھی ودیعت رہی ہے۔

عن ابن عباسؓ سبیلا وسنۃ وکذا روی عن مجاھد وعکرمۃ وحسن البصریؒ وقتادۃ والضحاک والسدیؒ۔ (ابن کثیر)

وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ

اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب) کو ایک ہی امت بنا دیتا ۱۸۱ لیکن (اس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ تمہیں

مَاۤ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ

آزماتا رہے اُس میں جو وہ تمہیں دیتا رہا ہے تو تم نیکیوں کی طرف لپکو ۱۸۲

ایک قول یہ بھی ہے کہ شرعۃ سے مراد مطلق شریعت ہے اور منہاج سے مراد کمالاتِ شریعت۔

قال اٰخرون بینہما فرق فالشرعۃ عبارۃ عن مطلق الشریعۃ والطریقۃ عبارۃ من مکارم الشریعۃ وھی مراد بالمنہاج فالشریعۃ اول والطریقۃ اٰخر وقال المبرد الشریعۃ ابتداء الطریقۃ، والطریقۃ المنہاج المستمر (کبیر)

۱۸۱ (اور آپس میں کوئی دینی اختلاف باقی ہی نہ رکھتا سب کے سب دین حق پر متحد و متفق ہوتے)

ای فجعل شریعتکم واحدۃ فکنتم علی الحق (قرطبی) فجمع الناس کلھم علی دین واحد وشریعۃ واحدۃ۔ (ابن کثیر)

وَلَوْ شَاۤءَ اللّٰهُ یعنی اگر مشیتِ تکوینی یہی ہوتی، اگر اللہ تعالیٰ کو مصالحِ تکوینی کے اعتبار سے یہی منظور ہوتا مخاطبت یہاں ساری نوعِ انسانی یا مختلف اقوام سے ہے۔

ھذا خطاب لجمیع الامم واخبار عن قدرتہ (ابن کثیر)

۱۸۲ یعنی قانونِ اسلام کی طرف، جو نام ہی نیکیوں اور بھلائیوں کے تسلسل کا ہے۔

الْخَيْرٰت۔ خیرات کا لفظ جامع ہے، اس کا اطلاق نیکیوں کے جملہ اقسام پر ہوگا۔

المراد کل ما امر اللہ تعالیٰ بہ (مدارک)

یہاں جبر و اختیار، خیر و شر کے پورے فلسفہ کی طرف اشارہ کردیا ہے، ارشاد یہ ہے کہ اگر حکمتِ مطلقہ کا تقاضہ یہ ہوتا کہ سب کو یکساں اِحق ہی پر رکھا جاتا تو تکوینیات کے قانون ہی دوسرے ہوتے نہ یہ اختلافِ عقول باہم باقی رکھا جاتا، نہ یہ اختلافِ طبائع، نہ یہ اختلافِ استعدادات، سب انسان اختلافِ ماحول کے باوجود یکساں یک رنگ ہوتے، بہ ظاہر سب حق پر ہوتے لیکن حقیقۃً سب بے ارادہ بے اختیار مجبور مشین کی طرح حرکت کرتے رہتے، لیکن مشیتِ تکوینی کو یہ منظور ہی نہ ہوا، اس لئے انسان کی خلقت و ترکیب ہی دوسرے طریق پر ہوئی، وہ فاعل مختار و با ارادہ بنا کر بھیجا گیا کہ اپنے قصد و ارادہ سے کام لے کر ایک راستہ کو چھوڑ، دوسرے کو انتخاب کرسکے۔

لِيَبْلُوَكُمْ۔ اس میں انسان کے صاحبِ ارادہ و اختیار ہونے کی غایت و مقصود کی جانب اشارہ ہوگیا، حق کا باطل سے صالح کا فاسد سے خیر کا شر سے انتخاب ہی ارادہ و اختیار کا صحیح استعمال ہے اور یہی ہے انسان کی آزمائش۔

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰت۔ یعنی طاعتوں کی طرف قدم بڑھاؤ، لپکو۔

ای سارعوا الی الطاعات (قرطبی)

فقہاء نے لفظ استباق سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ عباداتِ واجبہ میں عجلت کرنا تاخیر سے افضل ہے۔

وھذا یدل علی ان تقدیم الواجبات افضل من تاخیرھا (قرطبی۔ جصاص)

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ﴿۴۸﴾

اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے، تو وہ تمہیں وہ بتادے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو ۱۸۳ لہ

وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ

اور آپ ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے رہئے اسی (قانون) کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشوں پر

وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ فَإِن

عمل نہ کیجئے ۱۸۴ لہ اور ان لوگوں سے احتیاط رکھئے کہ کہیں یہ آپ کو بچلا نہ دیں آپ پر اللہ کے اتارے ہوئے کسی حکم سے ۱۸۵ لہ

تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَن يُصِيبَهُم بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ ۗ

پھر اگر یہ روگردانی کریں تو جان لیجئے کہ اللہ کو بس یہی منظور ہے کہ ان کے بعض جرموں پر انھیں پاداش کو پہنچادے ۱۸۶ لہ

۱۸۳ لہ (باوجود وضوحِ حق کے، اور جزا بھی اسی کے مطابق دے گا)

مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا۔ سب کی واپسی اُسی کے حضور میں ہونا اور اُسی سے سابقہ پڑنا ہے اس میں رد آگیا ان تمام مشرکانہ خیالات کا، جن کا ماحصل یہ ہے کہ حشر کی داوری بجائے حق تعالٰی کے کسی اور کے سپرد ہوگی۔

يُنَبِّئُكُمْ۔ خبر دینا یہاں محض اطلاع دینے کے معنی میں نہیں بلکہ جزا دینے پر بھی شامل ہے۔

اى يفعل بكم من الجزاء الفاصل بين الحق والباطل (روح) فالانباء هنا مجاز عن المجازاة بما فيها من تحقق الامر (روح)

۱۸۴ لہ (اے پیغمبر!)

فَاحْكُم بَيْنَهُمْ۔ یعنی اُن اہلِ کتاب خصوصاً یہود کے درمیان فیصلہ کیجئے، جب وہ اپنا مقدمہ آپ کے سامنے لائیں، آیت کا یہ ٹکڑا ابھی اوپر آچکا تھا، دوبارہ اس کا ورود تاکید کے لئے ہے۔

وتكرير واد احكم بينهم بما انزل الله" للتاكيد (قرطبی)

بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ۔ سے مراد قرآن مجید کا ہونا تو ظاہر ہی ہے لیکن اگر توریت وانجیل ہی مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان کتابوں کے بھی ٹھیک الہامی اور وحی شدہ احکام کے مطابق ہی فیصلہ کیجئے، نہ کہ اُن کے اضافوں اور تحریفوں کے مطابق جو انھوں نے اپنے دل سے ان کتابوں میں کر لئے ہیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ۔ اس جزوِ آیت کی تکرار صرف ظاہری ہے، حقیقی نہیں کہ حکم دو مختلف مسئلوں کے بارہ میں ہے۔

ليس بتكرار لما تقدم من مثله لانهما نزلا فى شيئين مختلفين احدهما فى شان الرجم والآخر فى التسوية بين الآيات (جصاص)

۱۸۵ لہ اس حذر کا التزام اور اتنی احتیاط کا اہتمام برابر کرتے رہنا بقول مفسر تھانوی خود باعثِ اجر ہے۔

أَن يَفْتِنُوكَ۔ رسولِ معصوم کا کسی حکمِ الٰہی سے بچلنا قصد وعمد سے تو ہو ہی نہیں سکتا، لامحالہ سہو ونسیان ہی کی بنا پر ہوگا، اور یہیں سے ہے کہ آیت سے بعض محققین نے پیغمبر کے لئے جوازِ نسیان پر استدلال کیا ہے۔

وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ﴿٤٩﴾ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ

اور یقیناً زیادہ آدمی تو بے حکم ہی ہوتے آئے ہیں ۱۸۸ تو کیا یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں ۱۸۹

وفی الآیة دلیل علی جواز النسیان علی النبی صلعم (قرطبی) قال اھل العلم ھذہ الآیة تدل علی ان الخطاء والنسیان جائزان علی الرسول (کبیر)

**۱۸۶** (اسی دنیا میں)

بَعْضِ ذُنُوبِهِمْ۔ جرموں سے یہاں مراد یہود کا فیصلۂ قرآنی اور تحکیم رسول سے انکار ہے۔

یعنی ذنب التولی عن حکم اللہ سبحانہ وتعالیٰ (بیضاوی)

یہ حقیقت مدنظر رہے کہ کفر یا محض بدعقیدگی کی سزا آخرت پر اٹھا رکھی گئی ہے لیکن حربیت یا دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے کی سزا اسی دنیا میں ملتی ہے، چنانچہ یہود کو قید کی، جلاوطنی کی اور قتل کی سزائیں پاتے سب نے اسی دنیا میں دیکھ لیا۔

بَعْضِ۔ کا لفظ لانے سے اظہار عظمت واہمیت مقصود ہے، جیسا کہ لفظ کے نکرہ لانے سے ہوتی ہے۔

فیه دلالة علی التعظیم کما فی التنکیر (بیضاوی) ھذا الابھام فیه تعظیم التولی وفرط اسرافھم فی ارتکابھم (بحر)

فَإِن تَوَلَّوْا۔ اور یہ روگردانی آپ کے فیصلہ سے ہوگی، جو عین حکم قرآنی کے مطابق ہوگا۔

عن الحکم المنزل واراد واغیرہ (بیضاوی)

**۱۸۷** (اس لئے آپ زیادہ رنج وتردد میں نہ پڑیں۔)

النَّاس۔ سے مراد عام نوع انسانی بھی لی گئی ہے، اور قوم یہود بھی جن کا ذکر برابر چلا آرہا ہے۔

والمراد من الناس العموم وقیل الیھود (روح) ظاھر الناس العموم ویحتمل ان یکون الناس للعھد وھم الیھود الذین تقدم ذکرھم۔ (بحر)

**۱۸۸** (حالانکہ اُس دور سے خود ہی پناہ مانگتے ہیں)

یہود ونصاریٰ کو قائل کیا جا رہا ہے کہ تم جو اسلام کے قانون سے گریز کر رہے ہو تو یہ تو گویا دورِ جاہلیت ہی کی طرف واپس جانا ہوا، جس قانون کی بنیاد تمام تر عدل اور سرتاسر انصاف پر ہے، وہ تو اسلام ہی کا خدائی قانون ہے، ورنہ جاہلی تو سوکے قانون کا عملدرآمد تو اسی اصل اصول پر رہا ہے (اور دورِ جاہلیت عرب اس سے مستثنیٰ نہ تھا) کہ زبردست کا ساتھ دو، جو قوی ہے اُسے قوی تر کردو، اور زیردستوں کی کوئی پروا نہ کرو، خود یہود اہل کتاب وصاحب شریعت ہونے کے باوجود اس فضا سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ ان کے دو بڑے قبیلے بنونضیر اور بنوقریظہ جو حوالی مدینہ میں آباد تھے ان میں بنونضیر چونکہ زبردست تھے اس لئے انھوں نے قاعدہ یہ مقرر کر لیا تھا کہ قتل وغیرہ کے معاملات میں دیت کی جتنی رقم خود دیتے، اس کی دوگنی شرح سے بنوقریظہ سے وصول کرتے۔

الْجَاهِلِيَّةِ۔ جاہلیت پر حاشیہ پ۴ آل عمران آیت ۱۵۴ میں گزر چکا ہے، قانون جاہلیت کا اطلاق ہر ایسے قانون پر ہوگا، جو خدائی اور آسمانی قانون کے مقابلہ میں بشری دماغ نے تراشا ہو، حافظ ابن کثیر نے اسی آیت کے تحت میں بڑے سخت الفاظ میں اور بہت تفصیل کے ساتھ ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو خدائی قانون کے مقابلہ میں اور اُسے کلاً وجزاً بے دخل کر کے غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں، یا بشری اختراعات کو دخل دیتے ہیں اور ایسے لوگوں کو قطعی کافر ٹھہرایا ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۞ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

اور جو قوم یقین (وایمان) رکھتی ہے اس کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کس کا ہو سکتا ہے؟ ۱۸۹ اے ایمان والو

اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ

یہود ونصاریٰ کو دوست مت بنانا ۱۹۰

جن سے جہاد واجب ہے واضح رہے کہ ابن کثیر کے زمانہ تک تاتاری قانون مسلمان حکومتوں میں چل نکلا تھا۔

ینکر تعالٰی علی من خرج عن حکم اللہ المحکم المشتمل علی کل خیر الناھی عن کل شر وعدل الی ما سواہ من الاراء والاھواء والاصطلاحات التی وضعھا الرجال بلا مستند من شریعۃ اللہ کما کان اھل الجاھلیۃ یحکمون بہ من الضلالات والجھالات بما یضعونھا باراءھم واھواءھم وکما یحکم بہ التتار من السیاسات الملکیۃ الماخوذۃ عن ملکھم۔

رومی قانون، انگریزی قانون، ہندو قانون کسی بھی غیر اسلامی قانون کی گنجائش اسلامی حکومت میں نہیں۔

۱۸۹ شریعتِ الٰہی سے بڑھ کر عادلانہ وحکیمانہ صحیح ومناسب قانون اور کون ہو سکتا ہے لیکن اتنی موٹی سی بات بھی محسوس وہی کرتے ہیں جن کی عقلیں شرک والحاد کے زنگ سے صاف اور ایمان وایقان کی روشنی سے منور ہوتی ہیں۔

بڑی حیرت اور بڑی عبرت کے قابل آج کی اُن "آزاد مسلم" قوموں کی حالت ہے جو فرنگی قوموں کے اثر سے طلاق، خلع، تعدد ازواج، ترکہ وغیرہ معاملات وفقہیات کے متعدد شعبوں میں فرنگی قانون کو دھڑا دھڑ اپناتے چلے جاتے ہیں، اور جوشِ تقلیدِ فرنگ میں ان شدید مفاسد کو بھی نظر کے سامنے نہیں لاتے جو ان بشری اور محدود دماغوں کے نکلے ہوئے قوانین کے نفاذ سے معاشرے میں پیدا ہو جانے لازمی ہیں، یورپ اور امریکہ کی صنفی انارکی اور خانگی ابتری کو دیکھ کر مسلمان بجائے اس کے کہ فرنگیت سے بچتے اور جھجکتے، اُلٹے خود اس کے خیر مقدم کے لئے بیتاب ہونے لگے ہیں، عدم توازن اور معاشرے میں اختلال وانتشار انسان کی خود ساختہ شریعت پر چلنے کا وہ لازمی نتیجہ ہے، جس سے مفر کی کوئی صورت ہی نہیں۔

۱۹۰ (جو صاحب کتاب ہونے کے باوجود قانون الٰہی کے منکر بلکہ اس کے باغی ہیں)

اَوْلِيَآءَ. ولی کی جمع ہے اور ولی کا اطلاق دوست، قریبی اور ناصر ومددگار سب پر ہوتا ہے، یہاں جس چیز کی ممانعت فرمائی گئی ہے وہ، دوستی، محبت، قربِ اختصاصی کا ہے، رہا عدل وحُسنِ سلوک تو اس کا تعلق کفر واسلام سے نہیں وہ تو ہر فرد بشر بلکہ ہر مخلوق کے حق میں لازمی ہے ایک تیسری اور درمیانی صورت مصالحت ومعاملت کی رہ جاتی ہے تو وہ اہلِ اسلام کی اپنی مصلحت کے تابع ہے، صلح اور عہد وپیمان ہر کافر جماعت سے مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں، ممانعت قطعی صرف موالات یا دوستانہ اتحاد اور برادرانہ مناصرۃ کی ہے۔

ھذا یدل علی قطع الموالات شرعًا (قرطبی) ای لاتعتمدوا علی الاستنصار بھم ولا تتوددوا الیھم۔ (کبیر)

اور پھر یہ ممانعت جب اہل کتاب سے دوستی اور یگانگت کی ہے جو توحید سلسلۂ نبوت اور جزائے آخرت کے عقائد میں کم از کم اصولی طور پر تو مسلمانوں سے متحد ہیں تو ظاہر ہے کہ مشرکین ودہریئین کے مقابلہ میں یہ ممانعت کتنی مؤکد اور اشد ہو گی جو مسلمانوں کے ساتھ بنیادی قیدوں کی کچھ بھی قدر مشترک نہیں رکھتے، یہ نہ بھی ہو جب بھی کافر کتابی درجہ میں تو وہ بہرحال رہیں گے۔

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ

وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں ۱۹۱ اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ ان ہی میں (شمار) ہوگا ۱۹۲

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ

بے شک اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا ۱۹۳ اس لئے تو ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے اُن کی

يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ

طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے (وہ) کہتے ہیں کہ ہمیں تو یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ہم پر کہیں کوئی دقت نہ پڑ جائے ۱۹۴

فاذا امرنا بمعاداۃ الیہود والنصاریٰ لکفرھم فغیرھم من الکفار بمنزلتھم (جصاص)

۱۹۱ (اپنی مناسبتِ باہمی اور اسلام سے عداوتِ مشترک کی بنا پر)

مطلب یہ ہوا کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہونے ہی ہیں باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے کم سے کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں ان کے آپس میں اگر تمہارے خلاف سازباز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں، لیکن تم جو اہل ایمان ہو تم میں اور منکرین قرآن میں مناسبت ہی کیا اور اشتراک کیا؟ آج جب کہ یہ سطریں پہلی بار لکھی جا رہی ہیں (جمادی الثانی ۱۳۶۵ھ مئی ۱۹۴۶ء میں) فلسطین کی سرزمین پر ایک اسرائیلی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف یہود اور نصرانی قوموں کا سازباز قرآن مجید کی اس پیش خبری کی معجزانہ تصدیق پیش کر رہا ہے، اور پھر اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز اور دنیا کو دنگ کر دینے والی مثال یہودی نصرانی اتحاد کی اواخر ۱۹۶۴ء میں پیش آئی، جب یہود نے اپنا تبرّی نامہ قتل مسیح کی ذمہ داری سے متعلق پیش کیا اور دنیائے مسیحیت کے پیشوائے اعظم نے اسے انجیلوں کی واضح ترین اور بار بار کی دہرائی ہوئی شہادتوں کے باوجود قبول کر لیا!

۱۹۲ یعنی وہ بھی اُن ہی میں داخل و شامل اور اُن ہی کا ایک جزو یا ضمیمہ سمجھا جائے گا۔

ای من جملتھم وحکمہ حکمھم وھذا تغلیظ من اللہ وتشدید فی وجوب مجانبۃ المخالف فی الدین (مدارک)

غیروں، بیگانوں، اللہ کے دشمنوں سے دوستی ہو نہیں سکتی جب تک پہلے ان کی عظمت یا محبت کا نقش دل پر نہ بیٹھ لے، اور مسلمانوں کی پختگی سے کچھ نہ کچھ ہٹ نہ لے، قومی تشخص اور ملت کی خودی کے لئے لازمی ہے کہ ملتِ اسلامی کے دوستانہ، رازدارانہ، برادرانہ تعلقات غیر مسلموں سے ممنوع قرار دے دیئے جائیں، یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دشمنانِ دین کے ساتھ خلا ملا میل جول زیادہ رکھتے ہیں، اُن کے اندر سے فہم دین اور دینی تصلب اور ملی خودداری رخصت ہو جاتی ہے حدیث نبوی میں دوسری قوموں کے وضع و لباس اختیار کرنے اُن سے تشبہ پیدا کرنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ عجب نہیں کہ ان ہی مصلحتوں اور مضرتوں پر مبنی ہو۔

۱۹۳ یعنی دین کی سمجھ اور غیرتِ ملی ایسے لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے۔

ظٰلِمِيْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دینِ خدا کے باغیوں کو دوست و رازدار بنا کر خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔

الذین ظلموا انفسھم بموالاۃ الکفرۃ (کشاف۔ مدارک)

فَعَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَيُصۡبِحُوۡا

لیکن کیا عجب کہ اللہ (کامل) فتح ہی دے دے یا (اور کوئی) خاص بات اپنی طرف سے (کر دے) تو

عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾

اس وقت یہ اپنے پوشیدہ دلی خیالات پر شرمندہ ہو کر رہیں ۱۹۵ھ

۱۹۴ھ (اور نہ اس وقت یہودی ساہوکاروں سے دوستانہ تعلقات کام آئیں گے)

دَآئِرَۃٌ۔ مراد ہے گردشِ زمانہ سے کوئی اتفاقی مصیبت مثلاً قحط، گرانی، شکست جنگ وغیرہ۔

قال الواحدی الدائرۃ من دوائر الدھر کالدولۃ وھی التی تدور من قوم الی قوم (کبیر) والدائرۃ ھی التی تخشی کالھزیمۃ والحوادث المخوفۃ (کبیر) ھی دوائر الزمان ای صرف من صروفہ ودولۃ من دولہ فیحتاجوا الیھم (کشاف)

مدینہ اور نواحِ مدینہ میں یہود کی حیثیت مہاجنوں، صرافوں اور بینکرز کی سی تھی، اور عرب آبادی اپنی ہر مالی اُفتاد و مصیبت کے وقت سہارا انھیں کا ڈھونڈتی تھی۔

الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ۔ سے مراد منافقین مدینہ ہیں، یہی ان احکامِ امتناعی کے باوجود یہودی مہاجنوں، ساہوکاروں سے برابر رشتۂ موالات قائم کئے ہوئے تھے۔

مَّرَضٌ۔ سے مراد شک و نفاق کا مرض ہے۔

مرض شك ونفاق والمراد ابن ابی واصحابه (قرطبی) المنافقون مثل عبد الله ابن ابی واصحابه (کبیر)

فَتَرَى۔ میں خطاب عام ہے، یعنی اے دیکھنے والے۔

فِيۡهِمۡ۔ یعنی ان کی دوستی کی طرف جن سے ان کا لین دین جاری تھا۔

ای فی موالاتھم ومعاونتھم (بیضاوی۔ قرطبی) فی مودۃ الیھود ونصاری نجران لانھم کانوا اھل ثروۃ وکانوا یعینونھم علی مھماتھم ویقرضونھم۔ (کبیر)

يَقُوۡلُوۡنَ یعنی مسلمانوں سے بطور حیلہ بازی اور سخن سازی کے کہتے ہیں، روایتوں میں آتا ہے کہ مدینہ میں جو پُرقوت جتھا عبد اللہ بن ابی کی سرداری میں منافقوں کا تھا، وہ برابر متموّل یہود و نصاریٰ سے لین دین جاری رکھے ہوئے تھا، اور مسلمانوں سے کہتا رہتا کہ کل کی کیا خبر، اگر کہیں یہی لوگ تم پر غالب آگئے، یا کوئی اور مصیبت ہم تم پر پھٹ پڑی تو بغیر ان لوگوں سے مدد لئے کچھ بنائے نہ بنے گی، اس لئے انھیں ساتھ لئے رہنا ضروری ہے۔

۱۹۵ھ اور شرمندگی بھی کیسی، دُہری بلکہ تہری تہری شرمندگی اُٹھانا پڑے، پہلی کھسیاہٹ تو اسی کی کہ سمجھے کیا تھے اور ہو گیا، دوسری جھنجلاہٹ اپنی رسوائی پر جو نفاق کمبخت کی بدولت ظہور میں آئی، تیسرا غصہ اپنی اس ناکامی پر کہ ادھر کافروں سے دوستی کچھ آڑے نہ آئی اور ادھر مسلمانوں سے بھی بُرے بنے!

عَسَى اللّٰهُ۔ عسیٰ کا حال بھی لعل ہی کا سا ہے، جب اس کا تعلق حق تعالیٰ کے کسی فعل سے ہوتا ہے تو معنی میں شک و احتمال نہیں رہتا، بلکہ مفہوم یقین کا پیدا ہو جاتا ہے۔

الثلثة

وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ

اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (حیرت سے) کہیں گے ارے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی قسمیں بڑے زور وشور

أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ﴿۵۳﴾

سے کھایا کرتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں! ۱۹۶؎ ان کے عمل (سب) غارت گئے اور یہ لوگ گھاٹے میں آگئے ۱۹۷؎

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ

اے ایمان والو! تم میں جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، سو اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو (وجود میں)

بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى

لے آئے گا ۱۹۸؎ جنھیں وہ چاہتا ہوگا اور جسے وہ چاہتے ہوں گے، ایمان والوں پر وہ مہربان ہوں گے اور کافروں کے

الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ

مقابلہ میں وہ سخت ہوں گے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے ۱۹۹؎

يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ۔ یہ فتح مسلمانوں کو ان ہی کافروں کے مقابلہ میں حاصل ہوگی جو آج ان منافقوں کی امیدوں کا سہارا اور جائے پناہ بنے ہوئے ہیں۔

أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ۔ اللہ کی طرف سے کوئی خاص بات مثلاً ان ہی منافقین کی پردہ دری ان کے ناموں کے تعیین کے ساتھ۔

۱۹۶؎ (لیکن اب تو حقیقتِ حال کچھ اور ہی ظاہر ہو رہی ہے)

یہ کہنے والے مؤمنین ہوں گے اور اس وقت آپس میں کہیں گے جب منافقین کا نفاق کھل کر رہے گا۔

۱۹۷؎ (آخرت اور دنیا دونوں میں)

(استحقوا اللعن فی الدنیا والعقاب فی الآخرۃ (کبیر)

دنیا میں یوں کہ کافروں کی معاونت لاحاصل نکلی، اور مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل کر رہی، اور آخرت میں یوں کہ اُن کی ظاہری نیکیاں بالکل بے وزن نکلیں۔

أَعْمَالُهُمْ۔ میں اعمال سے ان کے وہ اعمال تو مراد ہیں ہی جن پر انھیں طاعات ہونے کا گمان تھا، لیکن مراد ان کی منافقانہ کارروائیاں اور دورُخی چالیں بھی ہو سکتی ہیں۔

۱۹۸؎ (ان مرتدوں کے بجائے، دین کی خدمت کے لئے)

سو کسی فرد یا جماعت کے ارتداد سے دینِ اسلام یا خدائے اسلام کو مطلق ضرر نہیں۔

۱۹۹؎ (دین وجہاد کے باب میں)

ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۵۴﴾ ع ۸

یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہے عطا کرے، اور اللہ بڑا وسعت والا ہے، بڑا علم والا ہے ۲۰۰ ۱۲

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ

تمہارے دوست تو بس اللہ اور اُس کا رسولؐ اور ایمان والے ہیں جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور

الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ رٰكِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾

زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں، اس حال میں کہ وہ خشوع بھی رکھتے ہیں ۲۰۱

یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ ۔ قرآن مجید نے اُسے بار بار صاف کیا ہے کہ خدائے اسلام بعض مشرک قوموں کے خداؤں کی طرح ایک بے جان و بے حس مشین اور محض علت العلل نہیں، وہ خوش بھی ہوتا ہے اور ناخوش بھی، وہ پسند بھی کرتا ہے اور ناپسند بھی، وہ حکم بھی دیتا ہے اور منع بھی کرتا ہے یہاں یہ بتایا کہ وہ فلاں فلاں اوصاف والوں کو پسند کرتا ہے اور وہ لوگ بھی اس کو محبوب رکھتے ہیں

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ۔ یہی مضمون سورۃ الفتح، رکوع چار میں بھی بیان ہوا ہے، اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ۔

اَذِلَّةٍ ۔ کے معنی ہیں نرمی و شفقت سے لبریز۔

ای یرأفون بالمومنین ویرحمونهم ویلینون لهم (قرطبی) لیس المراد بکونهم اذلّة هو انّهم مهانون بل المراد المبالغة فی وصفهم بالرفق ولین الجانب (کبیر)

اَعِزَّةٍ کے معنی ہیں غالب، سخت، مستقل۔

ای اشدّاء غلاظ علی الکفار یعادونهم ویغالبونهم (معالم) هم فی الغلظة علی الکفار کالسبع علی فریسته (ابن عباس)

یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۔ یجاهدون کے ساتھ ہر جگہ فی سبیل اللہ کی قید لگی رہنا بے معنی نہیں، نفس مجاہدے اور سخت قسم کی مشقتیں مشرک، ملحد، منافق سب ہی اپنے اپنے دنیوی، ملکی، وطنی، شخصی، قومی اغراض و مقاصد کے لئے کیا کرتے ہیں جیل جاتے ہیں، تازیانے کھاتے ہیں، گولیاں سینے پر لیتے ہیں، پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں، مومن مسلم کی شان امتیازی یہ ہے کہ اس کے مجاہدے بڑے ہوں یا چھوٹے جو بھی ہوں اللہ کی راہ میں رضاء الٰہی کی غرض سے دین خدا کی سربلندی کی خاطر ہو

لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ۔ یہ شان مومنین مخلصین کی ہے، برخلاف منافقین کے کہ وہ اگر جہاد میں شریک ہوتے بھی ہیں تو دبے دبائے، شرمائے ہوئے، کافروں کی طعنہ زنی سے ڈرے سہمے ہوئے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اہل طریق کے طرز عمل کی تصریح آگئی۔

۲۰۰ (جس کو چاہے اس مرتبے سے نواز دے)

ذٰلِكَ ۔ اشارہ ایمان اور اُن اوصاف عمل کی جانب ہے جو ابھی اوپر بیان ہو چکے۔

اشارة الی ما تقدم من الاوصاف (بیضاوی)

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی رکھے گا، سو بیشک اللہ ہی کا گروہ غالب ہے ۳۲۳

وَاسِعٌ۔ اس کے ہاں کی وسعتوں اور گنجائشوں کا کیا پوچھنا، وہ چاہے تو سب ہی کو ان اوصاف سے متصف کر دے۔

عَلِيْمٌ۔ لیکن اس کا علم بھی تو ہمہ گیر و دقیق ترین ہے، وہ اُن ہی کو ان اوصاف سے متصف کرتا ہے جو اس کے علم کامل میں اس کے اہل ہوتے ہیں۔

**۲۰۱ھ** (حالتِ نماز میں خصوصاً)

وَلِيُّكُمُ۔ یہاں ولی اس معنی میں ہے کہ وہ جس سے تمہیں دوستی رکھنا چاہئے یعنی تمہارے حقیقی دوست اور خطاب اُمت اسلامی سے ہے اوپر ذکر اس کا تھا کہ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست مت بناؤ، اب گویا ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ دوست اللہ اور رسول اور اہلِ ایمان کو بناؤ۔

فکأنه قيل لا تتخذوا أولئك أولياء انما أولياءكم الله تعالى ورسوله والمؤمنون فاختصوهم بالموالاة (روح)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں ایسے شخص سے علیحدہ رہنے پر دلالت ہے جو اہل اللہ اور ان کے طریق کے ساتھ تمسخر کرے۔

وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔ میں وَ حالیہ ہے۔

والواو للحال (کشاف) ای یعملون ذلك فی حال الرکوع۔ (کشاف)

لیکن خود رکوع کے اس سیاق میں کیا معنی ہیں؟ رکوع یہاں معنی خشوع ہے نماز کی اصطلاحی ہیئتِ متعارف مراد نہیں۔

تارة يستعمل فی التواضع والتذلل (راغب) الركوع بمعنى التخشع والتذلل لا بالمعنى المعروف فی عرف اهل الشرع (روح) وهو الخشوع والاخبات والتواضع لله اذا صلوا واذا زكوا (کشاف) والركوع هنا ظاهره الخضوع لا الهيئة التی فی الصلوة (بحر)

مطلب یہ ہوا کہ ان کی اقامتِ صلوٰۃ و ادائے زکوٰۃ محض صورتِ ظاہری کے لحاظ سے نہیں ہوتی، بلکہ وہ صحیح کیفیت باطنی کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ۔ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔ غرض یہ کہ وہ لوگ عقائد اور اعمالِ بدنی و مالی اور اخلاص و اخلاق سب کے جامع ہوں گے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ عین ذکر میں اگر کسی ایسے شغل کا ہجوم و تقاضا ہو کہ اگر اس سے فارغ نہ ہو تو اس کا قلب مشغول رہے تو اس سے جلد فارغ ہو جانا ہی مستحسن ہے۔

**۲۰۲ھ** (بہ اعتبار اصل حقیقت کے، گو بعض اوقات اس غلبہ کے آثار کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر ظاہر نہ ہوں)

بقول مفسر تھانویؒ حقیقۃً ارفع تو مومنین ہی ہیں، گو حکمتِ ابتلاء وغیرہ کی بنا پر کسی خاص محل مثلاً اس دنیا میں اور کسی خاص وقت تک اس ارفعیت کے آثار نمایاں نہ ہوں، ارفعیت بجائے خود قائم ہے خواہ اس کے آثار بعد ایک مدت کے اسی دنیا میں ظاہر ہو جائیں خواہ کسی دوسرے محل کے لئے، مثلاً آخرت میں اپنے ظہور کے اصلی اور مقدر وقت پر اٹھا رہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ غلبہ کی تفسیر اگر قوتِ قلب سے کی جائے تو فہم سہل تر ہو جائے اہل اللہ پر اسباب مغلوبیت کا ظاہر اً کتنا ہی ہجوم ہو، لیکن ان کو ضعف و استکانت بوجہ توکل و تعلق مع اللہ کے نہیں ہوتا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا

اے ایمان والو جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) مل چکی ہے اور وہ ایسے ہیں کہ انھوں نے

وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ ۚ

تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے ان کو اور کافروں کو دوست نہ بناؤ ۲۰۳

وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٥٧﴾ وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ

اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم ایمان والے ہو ۲۰۴ اور جب تم نماز کے لئے پکارتے ہو ۲۰۵

اتَّخَذُوهَا هُزُوًا وَلَعِبًا ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٥٨﴾

تو یہ لوگ اس کو ہنسی اور کھیل بنا لیتے ہیں یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ (بالکل) عقل سے کام نہیں لیتے ۲۰۶

۲۰۳ جو لوگ دین حق سے تمسخر و استہزاء کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، خواہ وہ کتابی کافر ہوں یا غیر کتابی ان سے انقطاعِ تعلقات و دوستی کے باب میں یہ آیت ایک اور نصِ قطعی ہے۔

ذکر ھھنا النھی العام عن موالاۃ جمیع الکفار۔ (کبیر)

الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ سے مراد ظاہر ہے کہ یہود و نصاریٰ ہیں، اسی آیت سے فقہاء نے یہ بھی نکالا ہے کہ مشرکین سے مدد لینا ناجائز ہے۔

فیہ نھی عن الاستنصار بالمشرکین لان الاولیاء ھم الانصار (جصاص)

مِنَ الَّذِينَ ۔ میں مِنْ تبیین و تشریح کے لئے ہے، انتخاب و تبعیض کے لئے نہیں۔ من للبیان (جلالین) اس لئے یہ معنی نہیں کہ اہلِ کتاب میں سے ایک طبقہ اس قسم کا ہے، بلکہ مراد ہے اہلِ کتاب جو سب کے سب اسی قماش کے ہیں ـــــ شاہ عبد القادر دہلوی اور حضرت تھانوی دونوں نے اپنے اپنے ترجمہ میں یہی پہلو اختیار کیا ہے۔

وَالْكُفَّارَ ۔ کفار سے مراد کافر غیر کتابی ہیں۔

ای المشرکین وقد ورد بھذا المعنی فی مواضع من القرآن۔ (روح)

۲۰۴ حکم، اور بعض صورتوں میں ناخوشگوار حکم کی تعمیل اور ادائے فرض پر تقوائے الٰہی ہی آمادہ کر سکتا ہے اور خود تقوائے ایمان کی پختگی کے لوازم میں سے ہے۔

امرھم بتقوی اللہ فانھا ھی الحاملۃ علی امتثال الاوامر واجتناب النواھی (بحر) ثم نبّہ علی الوصف الحامل علی التقوی وھو الایمان۔ (بحر)

۲۰۵ اسی پکار کا نام اصطلاحِ شریعت میں اذان ہے اور یہ اسلام کے امتیازاتِ خصوصی میں سے ہے، دوسرے مذہبوں میں ... اول تو روزانہ عبادتِ اجتماعی کا دستور ہی نہیں (چہ جائیکہ دن میں پانچ پانچ مرتبہ!) اور پھر روزانہ یا ہفتہ وار جب کبھی بھی وقتِ عبادت کے اعلان کی ضرورت پڑتی ہے تو اس موقع پر کام گھنٹہ کی ٹھنا ٹھن یا گھنٹی کی

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب! تم ہم سے بس یہی ضد رکھتے ہو نہ کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور جو کچھ ہمارے

اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

اوپر اترا ہے اس پر جو کچھ ہم سے پیشتر اُتر چکا ہے اُس پر ۲۰۷ اور یہی کہ تم میں سے اکثر نافرمان ہیں ۲۰۸

ٹن ٹن سے لیا جاتا ہے، یہ شرف صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہے کہ اس نے عبادت کے اعلانِ دعوت کا طریقہ ایسا نکالا جو عبادت کا ذریعہ ہی نہیں، بلکہ بجائے خود بھی ایک عبادت ہی ہے! اذان میں ہوتا کیا ہے؟ نہ باجہ نہ گانا، نہ جرس نہ ناقوس، نہ قومی نغمہ نہ ملّی ترانہ بس اللہ کی حکومت وکبریائی، اللہ کی توحید اور محمدؐ کی رسالت کے اقرار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو نماز کی طرف بلاوا! الفاظ کل یہی ہوتے ہیں کہ اَللّٰہُ اَکْبَرُ (چار بار) اللہ ہی بڑا ہے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ (دو بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ (دو بار) لپکو نماز کی طرف حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ (دو بار) لپکو فلاح وبہبود کی طرف، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ (دو بار) نماز نیند سے کہیں بہتر ہے (صرف نمازِ فجر کے وقت) اَللّٰہُ اَکْبَرُ (دو بار) اللہ ہی بڑا ہے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (ایک بار) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

فرمائیے اس سے پاکیزہ تر پکار اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس وسیع کرۂ ارض کے جس قطعہ میں جہاں بھی کوئی مسجد ہے مؤذن اس پاک گھر میں خود بھی پاک وصاف ہو کر باوضو کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر اللہ کی کبریائی اللہ کی یکتائی محمدؐ کی رسالت کی منادی بلند آواز سے کرتا رہتا ہے اور لوگوں کے لئے عبادت وفلاح کی دعوت بغیر کسی مادی آلہ کی مدد کے فضا میں پانچ بار ہر روز بلند ہوتی رہتی ہے! ظالم اسی صدائے خیر وفلاح کو روکنا اور بند کرنا چاہتے تھے، غیر قوم والے اس قدرتی لحن سے جس طرح متاثر ہوتے رہتے ہیں، اُس کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

۲۰۶ اس پاکیزہ صدا کا کون سا جزو آخر قابلِ مضحکہ ہے؟ کون سا پہلو اس کا قابلِ تمسخر ہے؟ اتنا صحیح، سچا، سنجیدہ پیام آخر کس اعتبار سے ناقابلِ التفات ہے، اور جو اسے قابلِ تحقیر سمجھیں کیا اُن کی انتہائی بے عقلی، کج فہمی پر کسی مزید دلیل قائم کرنے کی ضرورت ہے؟

اِتَّخَذُوْھَا۔ میں ضمیر صلوٰۃ کی طرف بھی ہو سکتی ہے، اور ندا (اذان) کی طرف بھی۔

الضمیر للصلوۃ او للمناداۃ (کشاف)

سیاق کے لحاظ سے اذان ہی مراد لینا بہتر ہوگا۔

۲۰۷ یعنی ہمارے اصولِ دین میں سے تمھیں عداوت اور ضد اس کے کسی جزو سے ہے؟ ہمارا جرم بس یہی ہے نہ کہ ہم توحید کے پرستار ہیں، اور اپنے نبی کے ساتھ ساتھ تمھارے انبیاء پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

قُلْ۔ خطاب پیغمبرؐ کو ہے کہ آپ سب مسلمانوں کی طرف سے یہ جواب دیں۔

قال علی سبیل التعجب هل تجدون فی هذا الدین الا الایمان باللّٰه والایمان بما انزل علی محمد صلعم والایمان

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۚ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ

آپ کہہ دیجئے کیا میں تمہیں جتلا دوں وہ جو اللہ کے ہاں پاداش کے لحاظ سے اس سے (بھی کہیں) بُرا ہے ۲۰۹ وہ، وہ لوگ ہیں جن پر

وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ۚ

اللہ نے لعنت کی ہے اور ان پر غضب کیا ہے ۲۱۰ اور ان میں سے بندر اور سور بنا دیئے ۲۱۱ اور انھوں نے شیطان کی پوجا کی ۲۱۲

بجمیع الانبیاء۔ (کبیر)

تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ۔ نقم کے معنی ہیں برا سمجھنا یا مبغوض رکھنا، اور عیب لگانا، یہاں دونوں معنی چسپاں ہو سکتے ہیں۔

معناہ تسخطون وقیل تکرھون وقیل تنکرون والمعنی متقارب (قرطبی) ھل تنکرون منّا وتعیبون (بیضاوی)

۲۰۸ (خود اپنے دین کے معیار سے بھی)

اہل کتاب اس وقت دینی اور اخلاقی اعتبار سے اتنے گرے ہوئے تھے کہ قرآن مجید نے بےتکلف انھیں اس لحاظ سے بھی ملزم قرار دے دیا ہے

ای فسقکم ثابت معلوم عندکم (بیضاوی) انتم فی دینکم فساق لاعدول۔ (کبیر)

وَاَنَّ میں وَ مع کے معنی بھی دے سکتا ہے۔

یجوز ان یکون الواو بمعنی مع۔ (کشاف۔ کبیر)

اس ترکیب کے بعد آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ تم ہم سے ہمارے ایمان ہی کی بنا پر تو خفا ہو باوجود اس کے کہ اکثر تم خود ہی نافرمان ہو

ما تنقمون منّا الا الایمان مع ان اکثرکم فاسقون (کشاف) ای لان اکثرکم فاسقون تنقمون منا ذلک (قرطبی)

۲۰۹ (جسے تم اپنے لئے برا سمجھ رہے ہو)

یعنی تم تو ہمارے طریقہ کو برا سمجھ رہے ہو، لیکن میں تمہیں اس طریقہ کا پتہ بتائے دیتا ہوں جو واقعی عند اللہ سزا و پاداش کے لحاظ سے بدترین ہے۔

من ذٰلِکَ۔ یعنی ہمارے اس طریقہ سے جو تمہارے نزدیک موجبِ صد عیب ہے۔

ای من ذالک المنقوم (بیضاوی) ای بشرّ من نقمکم علینا (قرطبی) اشارۃ الی المنقم۔ (کبیر)

۲۱۰ (ان کے اسی طریق مبغوض کے باعث)

لَعَنَهُ۔ لعنت پر حاشیہ اوپر گزر چکا ہے کہ اس کے معنی رحمتِ الٰہی سے دوری اور مہجوری کے ہوتے ہیں۔

مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کا مضاف محذوف ہے اور تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

بشرّ من اھل ذالک من لعنہ اللہ او بشرّ من ذلک دین من لعنہ اللہ (بیضاوی) لابد من حذف المضاف

وتقدیرہ بشرّ من اھل ذلک (کبیر)

ذکر ہو چکا ہے۔

۲۱۱ یہ لوگ جو بندر اور سور بنا دیئے گئے کون تھے، کہاں کے تھے، کس زمانہ کے تھے قرآن مجید اس باب میں خاموش ہے اور احادیث صحیح میں بھی کوئی تفصیل وارد نہیں ہوئی ہے، اس لئے اس پر محض اجمالی ایمان بالکل

کا فی ہے البتہ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ قردۃ بننے والوں سے مراد یہود بلکہ ان میں سے بھی اَصْحَابَ السَّبْتِ ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ پارہ اول میں آچکا ہے، اور خنازیر سے مراد مسیحی اصحاب المائدہ ہیں، جن کا ذکر اسی سورت میں آگے آرہا ہے۔

قال اهل التفسیر عنی بالقردۃ اصحاب السبت وبالخنازیر کفار مائدۃ عیسی (کبیر) ای مسخ بعضهم قردۃ وهم اصحاب السبت وبعضهم خنازیر وهم کفار مائدۃ عیسیؑ۔ (روح)

لیکن یہ قول بھی سلف ہی سے مروی چلا آرہا ہے کہ مسخ محض معنوی ہوا تھا صوری نہ تھا یعنی صورتیں وہی رہی تھیں، صرف سیرتیں بندروں اور سؤروں کی ہوگئی تھیں، مفردات میں لغت خنزیر کے تحت میں ہے:۔

قیل عنی من اخلاقه وافعاله مشابهة لاخلاقها لامن خلقته خلقتها وروی ان قوما مسخوا خلقة وکذا ایضا فی الناس قوم اذا اعتبرت اخلاقهم وجدوا کالقردۃ والخنازیر وان کانت صورهم صور الناس (راغب)

اس نامۂ سیاہ کو اس آیت کی تفسیر کے باب میں خاص طور پر تردّد تھا، سورۂ اول کی تحریر کے وقت (اپریل ۱۹۴۲ء میں) حکیم الامت مفسر تھانویؒ زندہ وسلامت تھے، حل مشکل کے لئے عریضہ ان کی خدمت میں بھیجا، اور اس میں امام راغب کی عبارت مذکورۂ بالا نقل کردی، جواب جو موصول ہوا اس کو خلاصۃً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اولاً تو ایسی تاویلیں ان صحیح و مسلّم اور عقلی قواعد کے اگر مخالف پڑتی ہیں۔

النصوص تحمل علی ظواهرها۔ لا تعدل الی المجاز الا اذا تعذرت الحقیقة الناطق یقضی علی الساکت۔

ثانیاً خود الفاظ قرآنی اس تاویل کو مستبعد بتارہے ہیں مثلاً لفظ جعل تصییر پر دال ہے تو اس کا مفعول ثانی ایسی ہی چیز ہوسکتی ہے جو پہلی کے خلاف ہو، اور قردۃ وخنازیر بالتاویل تو وہ خود ہی ہوچکے تھے، اس میں جعل کے کیا معنی اس جعل کا تو یہ حاصل ہوا کہ جعل القردۃ قردۃ وجعل الخنازیر خنازیر۔ بایں عبارت دیگر جعل الخبیثین خبیثین، کیا اس سے کلام کے بے معنی ہونے کا شبہ قوی نہیں ہوسکتا، جو کلام اللہ سے نہایت مستبعد ہے، ثالثاً جب وہ خود خبیث ہوچکے تھے تو اب اُن کو خبیث بنانے کے کیا معنی، رابعاً سورۂ بقرہ میں ہے فجعلناها نکالا لما بین یدیها وما خلفها وموعظة للمتقین تو سزا پر تو نکال اور موعظہ صادق آتا ہے مگر عقائد واخلاق فاسدہ تو خود موجب سزا ہیں نہ کہ سزا، غایۃ ما فی الباب ایسی تاویل کو نص کی تکذیب نہ کہیں گے لیکن کیا بدعت بھی نہ کہیں گے؟ اگر شبہ کیا جائے کہ بعض سلف کو بدعتی کہنا لازم آتا ہے تو یہ بدعت اجتہادی محل وعید نہیں، ورنہ اگر اس تاویل کو سنت میں داخل کیا جائے تو جمہور کو بدعتی کہنا لازم آئے گا۔

گنجائش بہرحال کسی درجہ میں اس تاویل کی موجود ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

شیخ رشید رضا مصری نے کہا ہے کہ اگرچہ عامۂ مفسرین مسخ جسمانی کے قائل ہیں، لیکن سیوطی کی درمنثور میں محدث ابن المنذر و محدث ابن ابی حاتم کے حوالہ سے ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا نہ کہ صوری، اور سورۂ البقرہ میں اس مضمون کی آیت کی تفسیر کے ذیل میں ظاہر ہوچکا ہے کہ ترجیح اسی معنی کو ہے اور مجاہد تابعی کا قول لغت وزبان کے اعتبار سے بھی بعید نہیں۔

وجمهور المفسرین علی ان معنی ذلک انهم مسخوا فکانوا قردۃ وخنازیر حقیقة وانقرضوا، وفی الدر المنثور اخرج ابن المنذر وابن ابی حاتم فی قوله کونوا قردۃ خاسئین قال مسخت قلوبهم ولم یمسخوا قردۃ۔ فالمراد علی هذا انهم صاروا کالقردۃ فی نزواتها والخنازیر فی اتباع شهواتها وقدم فی تفسیر آیة البقرۃ ترجیح هذا القول من جهة المعنی بعد نقله عن مجاهد۔ ولیس قول مجاهد بالبعید من استعمال اللغة (المنار)

أُولَٰئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَأَضَلُّ عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾ وَإِذَا

ایسے لوگ مقام کے اعتبار سے بدتر اور راہِ راست سے بہت دور ہیں ۲۱۳ف اور جب یہ لوگ

جَاءُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَقَد دَّخَلُوا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوا بِهِ ۚ

تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے حالانکہ وہ کفر کو لے کر آئے تھے اور اسی کو لے کر چلے گئے ۲۱۴ف اور اللہ

وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا كَانُوا يَكْتُمُونَ ﴿٦١﴾ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي

خوب جانتا ہے اُس چیز کو جسے یہ لوگ چھپاتے ہیں ۲۱۴ف اور آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھتے ہیں گناہ اور ظلم

الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٦٢﴾

اور حرام کھانے پر لپکتے ہوئے، کیسے بُرے ان لوگوں کے کرتوت ہیں ۲۱۵ف

۲۱۲ف یہ ترجمہ اس صورت میں ہے جب عَبَدَ بہ طور فعل پڑھا جائے اور تقدیر کلام یوں ہوگی وَمَن عَبَدَ الطّاغوت عطف اس صورت میں من لعنہ اللہ پر ہوگا۔

جعلوہ فعلا ماضیا وعطفہ علی فعل ماض وھو غضب ولعن (قرطبی) عطف علی صلۃ من کأنہ قیل ومن عبد الطاغوت (کشاف)

دوسری ترکیب یہ بھی جائز ہے کہ عبد کو اسم اور عبد کی جمع سمجھا جائے، اس صورت میں عبد کا عطف القردۃ والخنازیر پر ہوگا اور پورے فقرہ کے معنی ہوں گے کہ "انھیں بندر اور سور اور پرستارِ شیطان بنا دیا"۔

طاغوت۔ پر حاشیے سورۂ بقرہ پ۳ میں گزر چکا۔

طاغوت۔ طغیان سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا اطلاق باطل و منکر کی ہر شکل پر ہو سکتا ہے۔

الطاغوت اسم فیہ معنی المبالغۃ من الطغیان الذی ھو مجاوزۃ الحد المشروع والمعروف الی الباطل والمنکر فھو یشمل کل مصادر طغیانھم (المنار)

یہود رفتہ رفتہ کاہنوں کے بہت معتقد اور گرویدہ ہو گئے تھے اور کہانت وغیرہ تمام شیطانی فنون ان پر غالب آگئے تھے، اسی پیروی باطل کو شیطان کی پرستاری یا عبادت سے تعبیر کیا گیا۔

عن ابن عباس الطاغوت الکھنۃ وکل من اطاع احدا فی معصیۃ اللہ فقد عبدہ (کشاف)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ جب مصلحت دینی ہو تو مخالف کے ذم کو خوب ظاہر کر دیا جائے اور یہ صبر و حلم کے منافی نہیں۔

۲۱۳ف (اسی دنیا میں)

شَرٌّ مَّكَانًا۔ آخرت میں کہ وہ مکان دوزخ ہے، "شر" کو یہاں مضاف مکان کی طرف کیا گیا ہے اور مُراد اُس سے اہلِ مکان ہیں۔

لان مکانھم النار واما المؤمنون فلا شر فی مکانھم (قرطبی) جعلت الشرارۃ للمکان وھی لاھلہ للمبالغۃ (مدارک)

۲۱۴ف (یعنی ان کے عقائد کفر و نفاق کو)

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ

کیوں اُن کے مشائخ اور علماء انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کے کھانے سے نہیں روکتے ہیں کیسی بُری

السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ

ان کی کارستانیاں ہیں! ۲۱۶ھ اور یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ بند ہو گیا ۲۱۷ھ

ذکر اب منافقین کا ہے خصوصاً منافقین یہود کا، جو اپنے عقائد کفر کے باوجود اپنے کو مسلمان آبادی کے درمیان چالاکی سے ملے جُلے رکھتے تھے۔

هذه صفة المنافقين (قرطبی) ای منافقوا الیهود (جلالین)

اِذَا جَآءُوْكُمْ۔ یعنی یہ منافقین جب مسلمانوں کی مجلسوں میں آتے جاتے اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔

دَخَلُوْا بِالْكُفْرِ۔ یعنی تمہاری مجلس کے اندر عقائد کفر لئے ہوئے آئے۔

خَرَجُوْا بِالْكُفْرِ۔ یعنی تمہاری مجلس سے باہر وہی عقائد کفر لئے ہوئے واپس ہوئے۔ مطلب یہ ہوا کہ انھیں مسلمانوں کی مجلس سے نفع مطلق نہ ہوا، جو کفر یہ عقائد لے کر آئے تھے، وہی لے کر چلے بھی گئے۔

والمعنی انهم لم ینتفعوا بشیء مما سمعوه بل دخلوا کافرین وخرجوا کافرین (قرطبی)

۲۱۵ھ ذکر یہود کا ہے۔

الْاِثْمَ۔ جھوٹ کی قسم کے سارے گناہ اس میں شامل ہیں، یا وہ گناہ جو گنہگار کی ذات تک محدود رہیں۔

الاثم الکذب وقیل الاثم ما یختص بهم (کشاف) یعنی عن قول الکذب والزور (ابن جریر)

الْعُدْوَانِ۔ یہ لفظ ہر قسم کے ظلم، زیادتی اور سرکشی پر حاوی ہے، یا وہ گناہ جو دوسروں تک متعدی ہو۔

العدوان الظلم وقیل العدوان ما یتعدا هم الیٰ غیرهم (کشاف)

اَكْلِهِمُ السُّحْتَ۔ اس میں سود، رشوت اور جبر یا مکر سے حاصل کی ہوئی ہر آمدنی آگئی۔ پُرانے حکماء کی تحلیلِ نفس کے مطابق اثم قوت نطقیہ سے صادر ہوتا ہے اور عُدوان قوت غضبیہ سے اور اکل سُحت قوت شہویہ سے۔

۲۱۶ھ آیت ماقبل میں ذکر عوام یہود کا تھا، اس آیت میں ذکر خواص و اکابر یہود کا ہے۔ لَوْلَا، افلا کے معنی میں ہے۔

لولا بمعنی افلا (قرطبی)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب اس کا داخلہ مستقبل پر ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ہے تو اس کے معنی صیغۂ امر کے اور ممانعت کے پیدا ہو جاتے ہیں۔

فاذا کانت للمستقبل فهی فی معنی الامر کقوله لاتفعل وهی هٰهنا للمستقبل یقول هلا ینهاهم ولم لاینهاهم۔ (جصاص)

لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ۔ صحابہ، تابعین اور علماء سلف سے مروی ہے کہ یہ آیت قرآن مجید کی سخت ترین آیتوں میں سے ہے۔

عن ابن عباسؓ هی اشد آیة فی القراٰن (کشاف) عن الضحاک ما فی القراٰن اٰیة اخوف عندی منها (کشاف)

کان العلماء یقولون ما فی القراٰن اٰیة اشد توبیخا للعلماء من هذه الاٰیة ولا اخوف علیهم منها (ابن جریر)

۲۱۷ھ یہ مسلمانوں کے افلاس پر طنز و استہزاء کی راہ سے ایک فقرہ تھا۔ محاورہ میں اس سے مراد بُخل و تنگدستی ہوتی ہے۔

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ

جو کوئی اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک کرے گا، سو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانا (دوزخ

النَّارُ ۖ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا

کی) آگ ہے اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۴۷ یقیناً وہ (بھی) کافر ہوگئے جنھوں نے کہا کہ

إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ

وقف لازم

خدا تین میں سے تیسرا ہے، ۲۴۸ حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے ۲۴۹

**۲۴۵** ملاحظہ ہو اسی سورہ کا حاشیہ ۲۶، خوب خیال کر لیا جائے کہ قرآن مجید انصاری اور ان صریح کافروں بلکہ مشرکوں کے درمیان فرق کرتا ہے، ان لوگوں کا ذکر نام کے ساتھ نہیں، صرف صفات کے ساتھ کرتا ہے، اور انھیں ایک الگ مستقل امت قرار دیتا ہے۔ ہبرٹ جرنل (لندن) دنیائے مسیحیت کا ایک بلند پایہ علمی سہ ماہی رسالہ ہے، اس کے اکتوبر ۱۹۳۴ء کے نمبر میں ہے:
"ٹھیٹھ مسیحی کے عقیدہ میں مسیح تمام تر خدا نہیں عقلاً جو عقیدہ جتنا زیادہ مستبعد ہو، اسی قدر خوش عقیدگی سے قریب ہوتا ہے"۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں صاف رد ہے حلول و اتحاد کا جس کے قائل جاہل صوفیاء ہوئے ہیں۔

**۲۴۶** ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران آیت ۵۱۔
قرآن مجید کے بیان کی تائید اس حد تک تو موجودہ محرّف انجیلیں بھی کر رہی ہیں:-
"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت کر"۔ (متی ۴: ۱۰) "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت"۔ (لوقا ۴: ۸) "یسوع نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ (لوقا ۱۸: ۱۹)

**۲۴۷** (جو شفاعت کی حد تک بھی اُن کی مدد کر سکے)
یہ سب وعیدیں مسیحیوں یا عیسائیوں کے لئے آرہی ہیں، جو مسیح پرستی کے شرک کو اپنے لئے باعث ننگ نہیں، باعث فخر سمجھ رہے ہیں۔
مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ۔ ہر قسم کے شرک پر حاوی ہے خواہ ذاتی ہو یا صفاتی۔
مِنْ أَنْصَارٍ۔ صیغۂ جمع لانے میں نکتہ یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اپنے بہت سے ناصروں اور شافعوں کا زعم تھا۔

**۲۴۸** موجودہ مسیحیوں کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں، مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں، اور مجتمعاً بھی، تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں، اور تینوں مل کر بھی۔

**۲۴۹** (جو نہ اُقنوموں میں تقسیم ہے نہ اور کسی طرح)
مِنْ إِلٰهٍ۔ میں مِنْ زائد کلیت یا استغراق کے لئے ہے، اور آیت کے معنی ہیں کہ سرے سے ایسے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں، جو صفتِ وحدانیت سے متصف نہ ہو۔
من مزیدۃ للاستغراق (بیضاوی) والمعنی وما الٰہ قط فی الوجود الا الٰہ موصوف بالوحدانیۃ لاثانی لہ (کشاف) اکد ذلک بزیادۃ من الاستغراقیۃ (بحر)

غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ ۭ

ہاتھ ان ہی کے بند ہوں! اپنے اس کہنے سے یہ ملعون ہوگئے (۲۱۸) بلکہ اللہ کے تو دونوں ہاتھ خوب کھلے ہوئے ہیں (۲۱۹) وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے (۲۲۰)

غل الید وبسطها مجاز عن البخل والجود (کشاف) غل الید وبسطها مجاز مشهور عن البخل والجود (کبیر)

ید کے یہاں لفظی معنی لینا مضحکہ خیز ہے۔ یہ تو محض محاورۂ زبان اور ایک اسلوبِ بیان ہے۔ کسی کے ہاتھ سرے سے نہ رہے ہوں جب بھی اس کے بخل کے لئے غل ید اور وجود و سخا کے لئے بسط ید کا محاورہ بلا تکلف استعمال ہوگا، اس لئے یداللہ کے لفظ کے آجانے سے حق تعالیٰ کے اثبات ید کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

ولا یقصد المتکلم به اثبات ید ولا غل ولا بسط (مدارک)

روایتوں میں یہ قول صرف دو ہی یہودیوں سے نقل ہوا ہے لیکن اس سے دلچسپی لینے والے اور اس کو منع نہ کرنے والے دوسرے لوگ بھی تھے اسی لئے یہ قول منسوب افراد ہی کی جانب نہیں بلکہ فرقہ کی جانب کر دیا گیا۔

ما قال قوم هذا ولم ینکر الباقون صار کانهم باجمعهم قالوا هذا (قرطبی)

مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ یہود کا یہ قول گو ان کے اعتقاد پر مبنی نہ ہو، لیکن کلمۂ کفر کا تلفظ بھی بلا عذر قرار واقعی موجب کفر ہی ہوتا ہے اور یہیں سے یہ ہے کہ آگے فقرہ میں لعنوا کی علت بما قالوا ارشاد ہوئی ہے بما اعتقدوا نہیں۔

۲۱۸ چنانچہ دنیا میں اس ملعونیت کا اثر قید و قتل، ذلت وغیرہ سے ظاہر ہوا اور آخرت میں عذابِ جہنم سے ظاہر ہوگا۔
غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ۔ یہ بددعا کا کلمہ ہے یعنی افلاس و تنگدستی، بدحالی ان ہی پر چپک کر اور ان ہی پر پلٹ کر رہے گی۔

یجوز ان یکون دعاء علیهم (قرطبی) یجوز ان یکون معناه الدعاء علیهم بالبخل (کشاف)

اس پیش خبری کا ظہور عین اس وقت بھی ہوا یعنی چند ہی سال کے اندر یہود مدینہ مفلس و بے زر ہو کر رہ گئے اور خود آج بھی باوجود اپنے شہرۂ آفاق تمول کے، خوشحالی اور دولت ان کے کچھ افراد ہی تک محدود ہے ورنہ بحیثیت قوم یہود ایک مفلس و نادار قوم ہے۔ مفصل حاشیہ سورۂ بقرہ آیت ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ کے تحت میں پارۂ اول میں گزر چکا۔

۲۱۹ یعنی اللہ کے ہاں کریمی اور رزاقی بدستور جاری ہیں۔
یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ۔ اردو میں بھی غایت فیاضی کے اظہار کے موقع پر بولتے ہیں کہ کوئی ایک ہاتھ سے خرچ کرتا ہے فلاں دونوں ہاتھوں سے لٹاتا ہے۔ عربی میں بھی دونوں ہاتھوں کا لانا زور و تاکید کے لئے ہے۔

لیکون رد قولهم وانکاره ابلغ وادل علی اثبات غایة السخاء ونفی البخل عنه (کشاف)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ تثنیہ کا صیغہ دوہری نعمت کے اظہار کے لئے ہے، ایک نعمت دنیا کی اور دوسری آخرت کی۔

۲۲۰ (حسب حکمت و مصلحت)
اور وہ جس کو چاہتا ہے اپنی مصلحت تکوینی سے غنی و تونگر کر دیتا ہے۔ اہل سنت اللہ تعالیٰ کے صفات ید وغیرہ کو غیر مقید و غیر محدود کے قائل ہیں اسی لئے اس آیت سے انھوں نے اپنے مذہب کی تقویت اور معتزلہ کے رد کا کام لیا ہے جو اس کے قائل ہیں کہ حق تعالیٰ پر اجر طاعت و جزاء اعمال واجب ہے۔

اعلم ان هذه الآیة رد علی المعتزلة وذلك لانهم قالوا یجب علی الله تعالیٰ اعطاء الثواب للمطیع ... (کبیر)

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ

اور جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اُترا ہے، وہ اُن میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر بڑھا دیتا ہے ۲۲۱

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ كُلَّمَا

اور ہم نے اُن کے درمیان دشمنی اور کینہ قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے ۲۲۲ جب جب وہ لڑائی کی

أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللَّهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ

آگ بھڑکاتے ہیں، اللہ اُسے بُجھا دیتا ہے ۲۲۳ اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ۲۲۴

**۲۲۱** اپنے ضد و عناد کی بنا پر اسی نسخۂ شفا کو یہ لوگ اپنے حق میں ازدیادِ مرض کا سبب بنا لیتے ہیں۔
مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ۔ یعنی یہی قرآن۔

**۲۲۲** یعنی اُن کا ہر قبیلہ اور فرقہ دوسرے کا دشمن ہے۔
بَيْنَهُمُ۔ مُراد یہود کے اندر کے فرقے اور قبیلے ہیں کہ یہود ہی کا ذکر قریب میں ہے۔
ای القینا بین طوائف الیہود (قرطبی) المراد وقوع العداوۃ بین فرق الیہود (کبیر)
جائز یہ بھی ہے کہ ضمیر کُل اہلِ کتاب کی طرف ہو جس کا ذکر اس کے قبل آچکا ہے۔
قال مجاھد ای بین الیہود والنصارٰی (قرطبی) المراد منہ ما بین الیہود والنصارٰی من العداوۃ وھو قول الحسن ومجاھد (کبیر)

**۲۲۳** آگ کا بُجھانا یہ کہ اللہ ان کی یہ شرارتیں چلنے نہیں دیتا، ان کی تدبیریں باطل کر دیتا ہے خصوصًا اس طرح کہ ان ہی میں کے ایک دوسرے کے مخالف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔
اطفاؤھا صرف اللہ عنہم ذلک وتفرق آراءھم وحل عزائمھم وتفرق کلمتھم والقاء الرعب فی قلوبھم (بحر)
أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ۔ یعنی مومنین کے خلاف جنگ کی تدبیریں سوچتے ہیں، جنگ کے نقشے تیار کرتے ہیں، جنگ کی آگ روشن کرنا، عربی محاورہ میں کنایہ ہے جنگ کی تیاری سے۔
قال الجمھور ھو استعارۃ وایقاد النار عبارۃ عن اظھار الحقد والکید والمکر بالمؤمنین والقتال (بحر) ایقاد النار کنایۃ من ارادۃ الحرب (روح)
قدیم اہلِ عرب جنگ کے وقت واقعۃً بھی آگ روشن کیا کرتے تھے، اور اس اعتبار سے یہ فقرہ محض مجازًا واستعارۃً نہیں بلکہ لفظاً بھی صحیح ہو جاتا ہے۔

**۲۲۴** (دوسرے دوسرے ذرائع سے)
دنیا میں قانونِ الٰہی کے نفاذ کی مخالفت کرنا خواہ وہ کسی عنوان سے بھی ہو، بہرحال اور بہرصورت فساد فی الارض ہی ہے انفرادی بربادی و اجتماعی ہلاکت دونوں کا پیش خیمہ۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا

دراں حالیکہ اللہ فساد پیدا کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ۲۲۵ اور اگر اہل کتاب ایمان لے آتے اور تقوے اختیار

لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ

کرتے تو ہم ضرور ان کی برائیاں اُن سے دُور کر دیتے اور ہم ضرور انھیں نعمت کے باغوں میں داخل کر دیتے ۲۲۶ اور

اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا

اگر وہ توریت اور انجیل کی پابندی کرتے اور اُس کی جو اُن پر ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) نازل ہوا ہے ۲۲۷

مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ

تاکہ یہ لوگ (خوب) کھاتے (پیتے) رہتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پیروں کے نیچے سے (بھی) ۲۲۸ انھی میں ایک جماعت میانہ رو بھی ہے ۲۲۹

**۲۲۵** (بلکہ سخت مبغوض رکھتا ہے)

اللہ کی رضامندی کو فسادِ فی الارض سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں۔

فساد تو نام ہی غیر طبعی مرضیاتِ الٰہی کے خلاف صورت حال کا ہے۔

**۲۲۶** اٰمَنُوْا یعنی قرآن اور حامل قرآن پر ایمان لاتے۔

اٰمَنُوْا کے مطلق رکھنے میں بعض اہل علم نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ اہل کتاب اگر محمد رسول اللہ پر ایمان لے آئیں تو یہ تو خیر عین مقصود ہی ہے لیکن اگر اپنے پیمبر اور اپنی ہی کتاب پر سچا اور پورا ایمان رکھیں تو پیمبر کی ہدایت اور کتاب کی عبارت بھی تو بالآخر انھیں اسی ایمان مصطفوی م پر لائے گی ؎

عاشقی گرزیں سر و گرزاں سرست عاقبت ما را بداں شہ رہبرست

**۲۲۷** (بہ واسطۂ نبی آخر الزماں ؐ)

مُراد قرآن و شریعتِ اسلامی ہے۔

اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مُراد ہے ان کتابوں کی عدم تحریف اور ان کے احکام پر عمل۔

واقامة التورٰىة والانجيل العمل بمقتضاهما وعدم تحريفهما۔ (قرطبی)

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ۔ اس کے معنی علاوہ قرآن مجید کے خود ان کے انبیاء کی دوسری کتابوں کے بھی کئے گئے ہیں

قيل كتب انبياءهم (قرطبی) من سائر كتب الله لانهم مكلفون الايمان بجميعها۔ (مدارک)

**۲۲۸** یعنی اس دنیا میں آسمانی اور زمینی برکتوں سے خوب تمتّع حاصل کرتے۔

فَوْقِ و تَحْتِ کے الفاظ عموم تمتّع دنیوی اور زور و تاکید کے لئے ہیں۔

ذكر فوق وتحت للمبالغة فی ما يفتح عليهم من الدنيا (قرطبی) المراد منه المبالغة فی شرح السعة (کبیر)

ع ۹ / ۱۰ / ۱۳

وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾ يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ

لیکن اکثر ان میں کے ایسے ہیں جو بہت ہی برا کر رہے ہیں ۲۳۰ اے (ہمارے) پیغمبر جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار

إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ

کی طرف سے اُترا ہے یہ (سب) آپ (لوگوں تک) پہنچا دیجئے ۲۳۱ اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچایا ہی نہیں ۲۳۲

آیت سے یہ استنباط بھی کیا گیا ہے کہ طاعت و عمل صالح خوشحالی اور وسعت رزق کے موجبات میں سے ہیں۔

دلت الآية على ان العمل بطاعة الله تعالى سبب لسعة الرزق (مدارک)

۲۲۹ (اور یہی میانہ رو جماعت آگے چل کر ایمان لے آئے گی)

مُّقْتَصِدَةٌ۔ اقتصاد۔ کے معنی عمل میں راہِ اعتدال اختیار کرنے کے ہیں۔

والاقتصاد الاعتدال فی العمل (قرطبی)

یہاں مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت عیسیٰ مسیحؑ کے باب میں نہ افراط کے غلو تک پہنچ جاتے ہیں، نہ تفریط کے قعر میں گر پڑتے ہیں۔

مقتصدة فی القول فی عیسیٰ ابن مریم (ابن جریر)

مسیحیوں میں نجاشی شاہ حبش اور ان کے رفقاء اور یہود میں عبد اللہ بن سلام اور ان کی جماعت یہ سب اسی امت مقتصدہ کے افراد ہوئے ہیں۔

۲۳۰ اشارہ اہل کتاب کی تحریف کتب و تکذیب انبیاء کی جانب ہے۔

۲۳۱ (اور اسی کا نام حق رسالت ادا کر دینا ہے)

مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ۔ اس میں قرآن مجید کے سارے کا سارا آجانا تو ظاہر ہی ہے باقی جو چیزیں وحی خفی کے ذریعہ سے رسول اللہ صلعم کو تعلیم ہوتی تھیں، وہ بھی اس عموم میں شامل ہیں۔

قال ابن عباسؓ المعنى بلغ جميع ما انزل اليك (قرطبی) فيه امر للنبی صلعم بتبليغ الناس جميعا ما ارسله به اليهم من كتابه واحكامه وان لا يكتم منه شيئا خوفا من احد ولا مداراة له (جصاص) جميع ما انزل اليك (مدارک)

يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ۔ تبلیغ کے موقع پر یہ انداز خطاب بجائے خود نہایت بلیغ و حکیمانہ ہے کہ اے مخاطب تمہاری تو حیثیت ہی تمام تر رسول کی، پیغام پہنچانے والے کی ہے۔

۲۳۲ یعنی اگر آپ نے کوئی بات احکام خداوندی میں سے چھپالی تو گویا آپ نے فریضۂ رسالت ادا ہی نہیں کیا۔

فان كتمت شيئا منه فما بلغت رسالته (قرطبی عن ابن عباسؓ) اخبرانه ان ترك تبليغ شئ منه فهو كمن لم يبلغ شيئا (جصاص) فكانك لم تبلغ الرسالة اصلا (مدارک) لان كتمان بعضها ككتمان كلها (جلالین)

اور ایسے مفروضات اور محالات عادی ہی نہیں بلکہ محالات عقلی، مثلاً ایک کے بجائے دو خداؤں کا ہونا، تو قرآن مجید نے بیان توحید تک نو وار رکھے ہیں ان میں رد آگیا اُن غالی اہل ضلال کا جن کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نے نعوذ باللہ کسی خوف یا مصلحت سے قرآن مجید ہم تک پورے کا پورا نہیں، بلکہ کسی قدر ناقص صورت میں پہنچایا ہے۔

دلت على انه صلى الله عليه وسلم لم يسر الى احد شيئا من امر الدين (قرطبی)

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٧﴾

اور اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے رکھے گا ۲۳۳ یقیناً اللہ کافر لوگوں کو راہ نہ دکھائے گا ۲۳۴

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ

آپ کہہ دیجئے کہ اہل کتاب تم کسی بھی راہ (حق) پر نہیں جب تک تم توریت وانجیل کی پابندی نہ کرو اور اس

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ

(کتاب) کی جو تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے اوپر اتری ہے ۲۳۵ اور جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا

مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٦٨﴾

گیا ہے وہ یقیناً ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کو بڑھا کر رہے گا ۲۳۶ تو آپ کافروں پر افسوس نہ کیجئے ۲۳۷

اور حقیقۃً یہ ہے بھی مرتبۂ رسالت سے بہت ہی گری ہوئی چیز کہ پیمبر یا عبد کامل بھی کوئی حکم شریعت کسی مروّت یا کسی خوف سے چھپا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کیسی لطیف اور سچی بات اس موقع پر کہی ہے کہ اگر آپؐ نے کوئی سا بھی جزو قرآن کریم کا چھپایا ہوتا تو وہ یہی جزو ہوتا۔

قالت لوکان محمّد کاتما شیئًا من القراٰن لکتم ھٰذہ الاٰیة (ابن کثیر)

فقہاء نے آیت سے استنباط کیا ہے کہ رسولؐ کی طرح علماء امت کے لئے بھی کسی مسئلۂ شریعت کا اخفاء وکتمان جائز نہیں۔

ھٰذا تادیب للنبی صلعم وتادیب لحملة العلم من امته الا یکتموا شیئًا من امر شریعته (قرطبی)

۲۳۳ (کہ آپ کے قتل وہلاک پر قدرت حاصل کرسکیں)

اس لئے آپ تبلیغ کے باب میں تو اپنی جان کی ذرا فکر نہ کیجئے، مخالفین ومعاندین جو کچھ بھی چاہیں کرتے رہیں۔

یعصمك من القتل فلا یصلون الی قتلك (معالم)

ایک سوال یہاں یہ پیدا کیا گیا ہے کہ جب محفوظیت کا وعدہ ہوچکا تھا، تو پھر جنگ احد میں جسم مبارک کو جراحتیں کیسے پہنچیں؟ مفسرین نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں لیکن سب سے زیادہ صاف اور بے تکلّف جواب مفسّر تھانویؒ کے قلم سے یہ ہے کہ وعدۂ محفوظیت سیاق تبلیغ میں کیا گیا ہے اس لئے اس کا تعلق بھی قدرۃً اتنی ہی محفوظیت سے ہے جو آپ کے فرائض تبلیغ میں مانع نہ ہو، بالکلیہ محفوظیت نہ مقصود تھی نہ ہوسکتی تھی، مرض، صدمہ، زخم وغیرہ تو حکمت تکوینی کے ماتحت رفع درجات وترقی اجر کے لئے ضروری ہیں۔ آیت سے علماء نے یہ استنباط بھی کیا ہے کہ علماء حق پرست خدا کے کام کو اپنے ذمہ سمجھیں، اور اپنی ضرورتوں کا کفیل اسی کے فضل کو سمجھے رہیں۔

۲۳۴ (کہ آپ تک پہنچ کر اپنے ملعون منصوبوں کو پورا کرسکیں)

لا یمکنھم مما یریدون انزالہ بك من الھلاك۔ (کشاف)

۲۳۵ یہاں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ مدار فضیلت کا، مقبولیت کا، احکام الٰہی کا اتباع ہی ہے تو پھر جب سرے سے اس سے گریز ہے، تو کیسی افضلیت اور کہاں کی مقبولیت؟

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ

بے شک جو لوگ ایمان لاچکے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور صابی اور نصرانی (غرض) جو بھی اللہ اور روزِ

بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک عمل بھی کرے سو ایسوں کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۲۳۸

علیٰ شیءٍ۔ یعنی راہ راست و دین حق۔

ای علی دین یعتد بہ (کشاف۔ بیضاوی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بغیر اتباعِ شریعت کے کوئی کمال معتبر نہیں۔

**۲۳۶** ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۲۱

**۲۳۷** حضور انورؐ فرطِ شفقت و ترحم سے کافروں کے حال پر بے چین و مضطرب رہا کرتے تھے ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ اتنا غم و تاسف نہ کیجئے، یہ لوگ اپنی ضد و عناد کی بنا پر مستحق کسی ہمدردی و رعایت کے نہیں۔ آیت رسول اللہ کی تسلی کے لئے ہے آپ کو ممانعت نفس حزن سے نہیں کی گئی ہے کہ وہ آپ کے لئے ایک امر طبعی تھا، بلکہ افراطِ حزن سے کی گئی ہے۔

وھذہ تسلیۃ للنبی صلعم ولیس بنھی عن الحزن لانہ لایقدر علیہ ولکنہ تسلیۃ ونھی عن التعرض للحزن (قرطبی) لاتتأسف بسبب نزول اللعن والعذاب علیھم فانھم من الکٰفرین المستحقین لذٰلک (کبیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اعراض کرنے والوں پر زیادہ قلق نہ کرے جیسا کہ بعض مبالغین فی الشفقۃ کرتے ہیں۔

**۲۳۸** آیت کے الفاظ و مطالب کی تشریح پارۂ اول رکوع ۸ آیت ۶۲ کے تحت گزر چکی۔

سورہ توبہ کی آیت ولایدینون دین الحق الخ کے تحت میں الصابئون پر بھی حاشیہ وہیں گزر چکا ہے، بانی محقق جصاص رازی حنفی نے ایک بات صابیوں کے بارے میں یہ لکھی ہے کہ ان کے اندر دو فرقے ہیں، وھم فریقان ان میں سے ایک فرقہ جو نواحی کسکر و بطائح میں رہتا ہے اس کا دین، نصاریٰ سے مشابہ ہے، اور یہ لوگ حضرت یحییٰ اور حضرت شیث پیمبروں کو مانتے ہیں، اور ان پر کتب آسمانی کا نزول تسلیم کرتے ہیں۔

والنصریٰ تسمیھم یوحنایۃ فھذہ الفرقۃ یجعلھا ابوحنیفۃ من اھل الکتٰب ابیح اکل ذبائحھم ومناکحۃ نسائھم (جلد ۳ ص ۱۱۲-۱۱۳)

نصاریٰ انھیں کو یوحنایہ (جان دی بپٹسٹ کا ماننے والا) کہتے ہیں، اور اسی فرقہ کے لئے امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ یہ اہل کتاب ہیں ان کا ذبیحہ جائز اور ان کی عورتوں سے نکاح درست۔

اور انھیں صابیوں کا ایک دوسرا فرقہ ہے، جو نواح حران میں آباد ہے، وہ بت پرست ہیں اور نہ کسی نبی کو مانتے ہیں، اور نہ کسی کتاب آسمانی کے قائل ہیں۔

فھؤلاء لیسوا اھل الکتاب ولاخلاف ان

تو یہ لوگ نہ اہل کتاب میں داخل ہیں اور نہ اس میں

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا

بیشک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد کرلیا اور ان کے پاس (بہت سے) پیمبر بھیجے ۲۳۹ جب جب کوئی

جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ۞۷۰

پیمبران کے پاس (ایسا) حکم لائے جس کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا تو بعض کو جھٹلاتے تھے اور بعض کو تو مار ہی ڈالتے تھے ۲۴۰

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

اور گمان یہی کرتے رہے کہ وبال کچھ نہ پڑے گا ۲۴۱ سو اندھے اور بہرے ہوگئے ۲۴۲ پھر اللہ نے اُن پر رحمت سے توجہ فرمائی ۲۴۳

هذه النحلة لا تؤكل ذبائحهم ولا تنكح نساءهم فمذهب ابي حنيفة في جعله الصابئين من اهل الكتاب محمول على مراده الفرقة الاولى وهما ابو يوسف ومحمد فقالا ان الصابئين ليسوا اهل الكتاب ولم يفصلوا بين الفريقين۔

کوئی اختلاف ہے کہ نہ ان کا ذبیحہ درست ہے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے تو امام ابوحنیفہؒ نے جن صابئین کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے اس سے اُن کی مراد صابئین فرقۂ اول ہی سے ہے، اور امام ابویوسفؒ و امام ابومحمدؒ کے ہاں صابئین بلا کسی تفریق و تفصیل کے دائرۂ اہل کتاب سے خارج ہیں۔

۲۳۹ چنانچہ قوم بنی اسرائیل کی تاریخ گویا انبیاء مرسلین ہی کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔
مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے، یہ عہد توحید ہی سے متعلق تھا۔

۲۴۰ یعنی کم و بیش مخالفت تو اپنے سب ہی انبیاء کی کی، جو ذرا سا بھی کوئی حکم ان کی مرضی کے خلاف لے کر آئے لیکن بعض کو تو تکذیب سے گزر کر ہلاک تک کر ڈالا، یہود کے قتل انبیاء وغیرہ پر حاشیے پارۂ اول میں گزر چکے ہیں، انجیل میں یہ الزام اس سے کہیں زیادہ زوردار الفاظ میں دُہرایا گیا ہے:۔

"اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچوگے، اس لئے دیکھو میں نبیوں اور داناؤں اور نقیبوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، اُن میں سے بعض کو قتل کروگے، اور صلیب پر چڑھاؤگے، اور بعض کو اپنے عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے، اور شہر بہ شہر ستاتے پھروگے" (متی۔ ۳۲ : ۳۴)

ملاحظہ ہوں پارۂ اول کے حاشیے آیت ۶۱ پر۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ سارے کبائر کی اصل اتباع ہوئی ہے اس لئے صوفیاء اس کے استیصال کی سخت کوشش کرتے رہتے ہیں۔

۲۴۱ (اُن پر تکذیب انبیاء اور قتل انبیاء کا)
فِتْنَةٌ کے ایک معنی سزا کے بھی ہیں۔

الفتنة العذاب (قاموس)

قرآن مجید میں بھی فِتْنَة ایک دوسرے موقع پر اسی معنی میں آیا ہے۔

ذوقوا فتنتكم اى عذابكم (راغب)

ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

پھر بھی ان میں کے بہت سے اندھے اور بہرے ہی رہے اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے ان کے کرتوت ۲۴۴

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ

یقیناً وہ کافر ہو گئے جنھوں نے کہا کہ خدا ہی تو مسیح ابن مریمؑ ہے ۲۴۵ حالانکہ (خود)

الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ

مسیحؑ نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل! میرے پروردگار اور اپنے پروردگار (یعنی) اللہ کی عبادت کرو ۲۴۶

اہلِ تحقیق نے یہی معنی یہاں بھی لئے ہیں۔

ای عذاب وقتل (معالم)

صحیفۂ زبور میں حضرت داؤدؑ کی ایک مناجات بھی اسی معنی و مفہوم کی تائید میں ہے:۔

"اے خداوند، شریر کب تک، ہاں شریر کب تک شادیانے بجائیں گے، وہ ڈکارتے اور گستاخی کی باتیں بولتے، سارے بدکاری کرنے والے لاف زنی کرتے، وہ اے خداوند تیرے لوگوں کو پیس ڈالتے ہیں اور تیری میراث کو دکھ دیتے ہیں اور بیوہ اور پردیسی کو جان سے مارتے ہیں اور یتیم کو قتل کرتے ہیں اور کہتے ہیں خداوند نہ دیکھے گا، یعقوبؑ کا خدا ہرگز نہ سمجھے گا۔" (زبور ۹۴: ۳۔۷)

فتنة کے مشہور و متعارف معنی آزمائش کے ہیں، وہ بھی یہاں بیجا نہیں اور بعض مفسرین نے یہی اختیار کئے ہیں۔

انه لایقع من الله عزوجل ابتلاء واختیار بالشدائد (قرطبی)

۲۴۲ یعنی ان کے اس گمان و پندار نے اور حق تعالیٰ کی طرف سے مہلت نے انھیں قبول حق و کلمۂ حق کی طرف سے اور زیادہ غافل و بے نیاز کر دیا۔

عموا عن الهدیٰ وصموا عن سماع الحق (قرطبی) عموا عن الرشد وصموا عن الوعظ (مدارک)

۲۴۳ (اور مزید ہدایت کے لئے کوئی اور پیمبر اُن میں بھیجا)۔

یا عام قانونِ رحمت کے مطابق، انھیں کسی اور طرح ہدایت کے مواقع آئے۔

۲۴۴ (اور وقت مناسب پر انھیں سزا دے کر رہے گا)۔

فیجازیهم بحسب اعمالهم (مدارک)

صحیفۂ زبور میں حضرت داؤدؑ کی زبان سے ہے:۔

"اے قوم کے بے وقوفو سمجھو، اے جاہلو تم کب ہوشیار ہو گے، وہ جس نے کان لگایا، کیا نہیں سنتا؟ وہ جس نے آنکھ بنائی کیا نہیں دیکھتا؟ وہ جو قوموں کو تنبیہ دیتا ہے کیا وہ سزا نہ دیگا؟ وہ جو انسان کو دانش سکھلاتا ہے کیا وہ واقفیت نہ رکھتا ہوگا؟" (زبور ۹۴: ۹)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ معاصی پر اصرار سے استعداد بالکل مضمحل ہو جاتی ہے اور اسی کو بطلانِ استعداد کہا جاتا ہے۔

إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ

جو کوئی اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک کرے گا، سو اللہ اس پر جنت حرام کردے گا، اور اس کا ٹھکانا (دوزخ

النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٧٢﴾ لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا

کی) آگ ہے اور (ایسے) ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۲۴۷ یقیناً وہ (بھی) کافر ہوگئے جنھوں نے کہا کہ

إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۚ

خدا تین میں سے تیسرا ہے، ۲۴۸ حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے ۲۴۹

**۲۴۵** ملاحظہ ہو اسی سورہ کا حاشیہ ۲۷۶، خوب خیال کرلیا جائے کہ قرآن مجید النصاریٰ اور ان صریح کافروں بلکہ مشرکوں کے درمیان فرق کرتا ہے۔ ان لوگوں کا ذکر نام کے ساتھ نہیں، صرف صفات کے ساتھ کرتا ہے، اور انھیں ایک الگ مستقل امت قرار دیتا ہے۔
ہبرٹ جرنل (لندن) دنیائے مسیحیت کا ایک بلند پایہ علمی سہ ماہی رسالہ ہے، اس کے اکتوبر ۱۹۳۴ء کے نمبر میں ہے:
"تثلیث مسیحی کے عقیدہ میں مسیح تمام تر خدا نہیں عقلاً جو عقیدہ جتنا زیادہ مستبعد ہو اسی قدر خوش عقیدگی سے قریب ہوتا ہے"۔
مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں صاف رد ہے حلول واتحاد کا جس کے قائل جاہل صوفیاء ہوئے ہیں۔

**۲۴۶** ملاحظہ ہو سورۃ آل عمران آیت ۵۱
قرآن مجید کے بیان کی تائید اس حد تک تو موجودہ محرّف انجیلیں بھی کررہی ہیں:۔
"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت کر"۔ (متی ۴: ۱۰) "تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت"۔ (لوقا ۴: ۸) "یسوع نے اس سے کہا تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔ (لوقا ۱۸: ۱۹)

**۲۴۷** (جو شفاعت کی حد تک بھی اُن کی مدد کرسکے)
یہ سب وعیدیں مسیحیوں یا عیسائیوں کے لئے آرہی ہیں، جو مسیح پرستی کے شرک کو اپنے لئے باعث ننگ نہیں، باعثِ فخر سمجھ رہے ہیں۔
مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ۔ ہر قسم کے شرک پر حاوی ہے خواہ ذاتی ہو یا صفاتی۔
مِنْ أَنصَارٍ۔ صیغۂ جمع لانے میں نکتہ یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اپنے بہت سے ناصروں اور شافعوں کا زعم تھا۔

**۲۴۸** موجودہ مسیحیوں کے کافر بلکہ مشرک ہونے پر یہ صاف نصوص موجود ہیں، مسیحیوں کا عقیدہ ہے کہ باپ، بیٹا، روح القدس، یہ تینوں اقنوم (اصل) منفرداً بھی خدا ہیں، اور مجتمعاً بھی، تینوں الگ الگ بھی خدا ہیں، اور تینوں مل کر بھی۔

**۲۴۹** (جو نہ اُقنوموں میں تقسیم ہے نہ اور کسی طرح)
مِنْ إِلَٰهٍ۔ میں مِنْ زائد کلّیت یا استغراق کے لئے ہے، اور آیت کے معنی ہیں کہ سرے سے ایسے معبود کا کوئی وجود ہی نہیں، جو صفتِ وحدانیت سے متصف نہ ہو۔
من مزيدة للاستغراق (بيضاوى) والمعنى وما اِلٰهٌ قط فى الوجود الا اِلٰه موصوف بالوحدانية لاثانى له (كشاف) اكّد ذلك بزيادة من الاستغراقية (بحر)

وَ إِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ

اور اگر یہ لوگ اپنے (ان) اقوال سے باز نہ آئے تو ان میں سے جو لوگ کافر رہیں گے ان پر عذاب

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ

دردناک واقع ہو کر رہے گا ۲۵۰؎ سو یہ لوگ اللہ کے سامنے کیوں توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے؟

وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ

درانحالیکہ اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا رحمت والا ہے ۲۵۱؎ مسیحؑ ابن مریمؑ اور کچھ نہیں ہیں بجز ایک رسول کے ۲۵۲؎

وَاحِدٌ۔ صفات کی یکتائی وغیرہ کے علاوہ عدد کے لحاظ سے بھی ایک، اس لفظ کا استعمال جب ذات باری تعالیٰ کے لئے ہوتا ہے تو اس سے مراد ایسی ذات ہوتی ہے جس میں تجزّی بھی ناممکن ہو اور تکثّر بھی ایسی ذات فرد جس کے لئے وحدت ہمیشہ اور لازمی ہو اور جو کسی کی شرکت کو قبول ہی نہ کرے۔

واذا وصف الله تعالیٰ بالواحد معناه هو الذی لایصح علیه التجزّی ولا التکثّر (راغب)

الواحد هو الفرد الذی لم یزل وحده ولم یکن معه اٰخر (نهایة) یہ وہ ذات ہے جو بے مثل و بے نظیر ہونے میں منفرد اور ناقابلِ تقسیم و تجزّی ہونے اور بے مثل و نظیر ہونے کے اوصاف بس ذات باری ہی میں جمع ہو سکتے ہیں۔

وقال ابو منصور الواحد منفرد بالذات فی عدم المثل والنظیر (تاج) وقیل الواحد الذی هو لا یتجزأ ولا یثنی ولا یقبل الانقسام ولا نظیر له ولا مثل ولا یجمع هذین الوصفین الا الله تعالیٰ (تاج۔ نهایة)

۲۵۰؎ (آخرت میں ان کے کفر صریح کے پاداش میں)

عَمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یعنی تثلیث کے اس مشرکانہ قول و عقیدہ سے۔

ای یکفوا عن القول بالتثلیث (قرطبی)

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ۔ یعنی ان میں سے جو لوگ کافر رہ جائیں گے اس کے بعد بھی کہ ان کے عقائد کی گمراہی ان پر پوری طرح واضح ہو چکی۔

ای الذین اقاموا علی هذا الدین (کبیر۔ عن الزجاج) الذین بقوا منهم علی الکفر (بیضاوی)

مِنْهُمْ۔ میں مِنْ تبعیضیہ ہے، علم الٰہی میں یہ بات تھی کہ ان میں سے بہت سے لوگ اپنے اس مشرکانہ عقیدہ سے باز آجائیں گے اور ایمان لے آئیں گے، ایسے لوگ اس وعید سے خارج ہیں۔

خصّ الذین کفروا بعلمه ان بعضه یؤمنون (معالم)

۲۵۱؎ ان لوگوں کی حماقت دکھائی ہے کہ ابھی مہلت باقی ہے، اور پھر ایسے غفور و رحیم خدا کے سامنے توبہ و استغفار کر کے اس کے عفو و رحمت سے فائدہ نہیں اٹھاتے!

غَفُوْرٌ۔ غفور۔ اس کے حق میں جو طالبِ مغفرت ہو۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ

ان سے قبل بھی (اور) رسول گزر چکے ہیں ۲۵۳ اور ان کی ماں ایک ولیہ تھیں ۲۵۴ دونوں کھانا کھاتے تھے ۲۵۵

الطَّعَامَ ۗ انْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انْظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٧٥﴾

دیکھو کہ ہم کس کس طرح صاف صاف دلائل ان کے سامنے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھو کہ وہ کدھر الٹے چلے جا رہے ہیں ۲۵۶

رَحِیْمٌ۔ رَحِیْمٌ اس کے حق میں جو طالبِ رحمت ہو۔

مسیحیوں کے رد کے موقع پر ان صفات کے لانے میں شاید ایک پہلو یہ بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ تو خود غفور و رحیم ہے، اس کے ان ذاتی صفات کو بروئے کار لانے کے لئے اس کی کوئی ضرورت تھوڑے ہی ہے کہ کوئی "ابن اللہ" اپنے کو سب کی طرف سے بطور فدیہ و کفارہ پیش کرے! ع ۱۰/۱۴

۲۵۲ (نہ کہ خدا یا فرزند خدا۔ یا معاذ اللہ دشمنِ خدا)

یہ عیسیٰ مسیحؑ کا صحیح مرتبہ بیان کر دیا، اس میں رد آگیا، ایک طرف مسیحی افراط کا جو آپ کو مظہرِ خدا یا اوتار سمجھتے تھے، اور دوسری طرف یہودی تفریط کا، جو معاذ اللہ آپ کو ایک شعبدہ باز ساحر قرار دیتے تھے، پ۶ سورۃ النساء کے حواشی ۸۴۶ و ۵۱۸ (یعنی حواشی آیت نمبر ۱۷۱) وغیرہ بھی ایک بار پھر ملاحظہ کر لئے جائیں۔

اِبْنُ مَرْیَمَ۔ ابن مریم لا کر مسیح پرستوں کو یہ یاد دلا دیا کہ مسیح تو ایک عورت، فانی عورت کے بطن سے تھے، بشر کے سوا اور ہو کیا سکتے تھے۔

۲۵۳ (اور ان ہی کے سے ایک رسول یہ بھی ہیں، نہ وہ اوتار یا دیوتا تھے، نہ یہ اوتار یا دیوتا ہیں)

۲۵۴ (نہ کہ مادرِ خدا جیسا کہ مسیحیوں نے قرار دے لیا ہے اور نہ کہ معاذ اللہ بے عصمت جیسا کہ یہودیوں نے انھیں متہم کر رکھا ہے)

صِدِّیْقَةٌ۔ وہ ہے جو نافرمانی سے غایت بُعد اور فرمانبرداری میں کمال رکھتی ہو۔

المراد بکونها صدیقة غایة بعدها عن المعاصی وشدة جدها واجتهادها فی اقامة مراسم العبودیة (کبیر)

اردو محاورہ میں پورا مفہوم لفظ "ولیہ" یا ولی بیوی ہی سے ادا ہوتا ہے اور شاہ ولی اللہؒ نے اپنے فارسی ترجمہ میں ولیہ ہی استعمال کیا ہے، اس ایک لفظ میں پورا رد آگیا، مسیحیوں کی افراط اور یہودیوں کی تفریط دونوں کا۔

۲۵۵ (اور اپنے سارے کمالاتِ بشری کے باوجود احتیاجاتِ بشری سے منزہ و بالاتر نہ تھے۔)

اس میں بتا دیا کہ یہ مقدس ماں اور مقدس تر فرزند، دونوں بہرحال قوائے بشری ہی سے مرکب تھے اور کھانے پینے ساری بشری ضرورتوں کے محتاج، تو جو ایسے صاحبِ احتیاج ہوں انھیں خدائی کا مرتبہ دیتے ہوئے تثلیثیوں کو شرم نہیں آتی؟

۲۵۶ اور اسی طرح کے خرافات میں برابر پڑے ہوئے ہیں کہ "باپ، بیٹا، اور روح القدس تین جدا جدا مستقل اقنوم ہیں" "عالمِ لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک ہی خدا ہے، تین خدا نہیں" "بیٹا ازل ہی میں باپ سے پیدا ہوا"

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ

آپ کہئے کہ کیا تم اللہ کے سوا ایسے کی عبادت کرتے ہو جو تمھیں نہ نقصان پہنچا سکے نہ نفع، اور اللہ ہی تو

وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا

(سب کی) سننے والا (سب کچھ) جاننے والا ہے ۲۵۷ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اپنے دین

فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا

میں ناحق غلو نہ کرو ۲۵۸ اور ان لوگوں کی من مانی باتوں پر نہ چلو ۲۵۹ جو پہلے (خود بھی)

مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾ ع

گمراہ ہو چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور راہ راست سے (بہت) بھٹک چکے ہیں ۲۶۰

اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں باپ سے ہوا ہے" "روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا ہے" "خدا ہونے میں تینوں اُقنوم برابر کے شریک ہیں، ایک ایک پورا، اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ دار ہیں" "یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی ترکیب ہے" "اُقنوم وجود باپ ہے اقنوم حیات بیٹا اور اقنوم علم روح القدس ہے"

یہ صرف چند عقیدے بطور نمونہ مسیحیوں کے "اسرار الٰہیات" سے پیش کئے گئے ورنہ اسی طرح اور بھی بہت سے ہیں، قرآن مجید کہتا ہے کہ ایک طرف میرے صاف، سادہ اور ہر شخص کی سمجھ میں آجانے والے بیانِ توحید کو دیکھو اور دوسری طرف الفاظ واصطلاحات کے اس گورکھ دھندے پر نظر کرو! امام رازیؒ نے سچ کہا جب یہ کہا کہ اس سے بڑھ کر مہمل ونامعقول عقیدے دنیا کے پردہ پر کسی کے نہ ہوں گے۔

ولا یری فی الدنیا مقالۃ اشدّ فسادا واظہر بطلانا (کبیر)

۲۵۷ اس ایک عالمِ کل، ہمہ دان، ہمہ بین، ہمہ تواں کے سوا عبادت کے قابل اور ہے کون؟

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ الخ یہ سارا خطاب مسیحیوں ہی سے ہے، اور ان کے مشرک ہونے پر نصّ قرآنی کی مہر لگا رہا ہے، مسیحیوں کی مشہور وضخیم ومستند انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس میں ایک جگہ فخر کے ساتھ درج ہے کہ کلیسا نے اپنی طویل تاریخ میں "کبھی ایسا نہیں کیا کہ خدا کے ساتھ ساتھ مسیحؑ سے بھی دعا نہ کی ہو"۔ (جلد اول ص ۱۰۴)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں رد ہے مشائخ کو مستقل متصرّف سمجھنے والے جاہلوں کا۔

۲۵۸ (بلکہ اپنے اصل دین اور عقائدِ حق پر قائم رہو)

اَهْلَ الْكِتٰبِ سے یہاں مراد مسیحی ہیں اور الکتاب سے انجیل۔

یعنی یا الکتٰب الانجیل (ابن جریر) قل یا محمد لھؤلاء الغالیۃ من النصاری فی المسیح (ابن جریر) قیل الخطاب للنصاری خاصۃ (بیضاوی)

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى

بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر اختیار کیا، اُن پر لعنت ہوئی داؤدؑ اور عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی

ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾

کی زبان سے ۲۶۱ یہ اس لئے کہ انھوں نے (برابر) نافرمانی کی اور حد سے آگے نکل نکل جاتے تھے ۲۶۲

لا تغلوا فی دینکم۔ ملاحظہ ہو حاشیے نمبر ۸۴۶ ـ ۸۵۳ پارۂ ششم کے (یعنی حواشی سورۃ النساء آیۃ ۱۷۱)

۲۵۹ اس میں صاف اشارہ اس حقیقت کی طرف آگیا کہ مسیحیوں کی گمراہیاں اور بدعقیدگیاں کسی اور کج رو اور گمراہ قوم کی ریس اور تقلید سے پیدا ہوئی ہیں۔

اَھْوَآءَ۔ لغو و بے بنیاد خیالات، من گھڑت عقائد، خیالی ڈھکوسلے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں اُن رسوم کا ابطال ہے جو شریعت کے خلاف ہیں اگرچہ وہ منسوب مشائخ کی جانب ہوں، مشائخ اگر محقق ہیں تو اُن کی طرف یا تو یہ نسبت ہی صحیح نہ ہوگی اور یا پھر کسی عذر صحیح پر انھیں محمول کیا جائے گا۔

۲۶۰ جو لوگ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ پر نظر رکھتے ہیں، اور خود فرنگیوں کی موجودہ BIBLICAL CRITICISM (نقدیات اناجیل) سے واقف ہیں، وہ قرآن مجید کے اس بیان پر عش عش کر جائیں گے چھٹی صدی عیسوی کا ایک عرب اُمّی آلاکہ ذہین و باخبر ہو، ان اہم تاریخی حقائق پر نظر رکھ ہی کیسے سکتا تھا، تاوقتیکہ عالم الغیب والشہادۃ براہ راست اُسے تعلیم نہیں دے رہا تھا، مصری شرک یونانیوں میں پوری طرح حلول کر آیا تھا، یونان کے بڑے بڑے فلسفی اسکندریہ کے مرکز "عقلیت" و "روشن خیالی" سے مرعوب و متاثر تھے، حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم جب شروع شروع پھیلی تو انہی یونانیوں میں اکابر یہود (مثلاً فائلو) پہلے ہی سے یونانیوں کے آگے گھٹنے جھکا چکے اور اُن سے LOGOS وغیرہ کے عقائد اخذ کر چکے تھے، مسیحیوں نے ان تعلیمات کو بلا تامل قبول کر لیا، اور پھر پولوس (سینٹ پال) نے تو حضرت مسیح کے مذہب و تعلیم کو تمام تر مسخ کر کے اُسے یونانی شرک کی ایک شاخ بنا دیا، آخر میں رہی سہی کسر رومیوں کے مشرکانہ عقائد و خرافات نے پوری کر دی، موجودہ مسیحی قوموں کے عقائد و رسوم کثرت سے مصری، یونانی اور رومی شرک ہی کا ایک مخلوطہ ہیں۔

۲۶۱ ان دونوں لعنتوں کا ذکر عہد عتیق کے صحیفۂ زبور اور عہد جدید کے صحیفۂ متی میں علی الترتیب موجود ہے، چنانچہ حضرت داؤد کی زبان سے :-

"خداوند نے سُنا اور نہایت غصہ ہوا، اس لئے یعقوب میں ایک آگ بھڑکائی گئی، اور اسرائیل پر قہر بھی اٹھا کیونکہ انھوں نے خدا پر اعتماد نہ کیا، اور اس کی قیامت پر اعتماد نہ رکھا" (زبور۔ ۷۸ : ۲۱، ۲۲، ۲۳)

اور حضرت عیسیٰ مسیحؑ کی زبان سے :-

"غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو، اے سانپو، اے افعی کے بچو، تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچوگے" (متی ۲۳ : ۳۲، ۳۳)

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ اسرائیلیوں کا یہ کفر اپنے اپنے پیغمبروں کے مقابلہ میں تھا، چنانچہ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں قانون سبت کو توڑا، اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں تو خود ان کی نبوت ہی کا شدت سے انکار کر دیا۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾

جو برائی انھوں نے اختیار کر رکھی تھی، اُس سے باز نہ آتے تھے، کیسا بے جا تھا جو کچھ وہ کر رہے تھے ۲۶۳

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ کفر کرنے والوں سے دوستی رکھتے ہیں ۲۶۴ کیسا بیجا ہے وہ جسے وہ

لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾

اپنے آگے بھیج چکے ہیں، جس سے اللہ ان سے ناخوش ہوا اور وہ لوگ عذاب میں ہمیشہ پڑے رہیں گے! ۲۶۵

**۲۶۲** اِن مسلسل نافرمانیوں کی داستان سے اسرائیلیوں کے مذہبی نوشتے اور صحیفے خود بھرے ہوئے ہیں، نمونے کے طور پر صرف ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"انھوں نے ایسی شرارتیں کیں کہ جن سے خداوند کو غصہ ور کیا، کیونکہ انھوں نے بُت پوجے باوجودیکہ خداوند نے انھیں کہا تھا کہ تم یہ کام نہ کیجیو، اور باوجود اس کے کہ خداوند نے سارے نبیوں اور غیب بینوں کی معرفت بنی اسرائیل اور یہوداہ پر باتیں جتائی تھیں، پر انھوں نے نہ سُنا، بلکہ اپنے باپ دادوں کی گردن کشی کی مانند جو خداوند اپنے خدا پر ایمان نہ لائے تھے، گردن کشی کی، اور اس کے قانونوں کو، اور اس کے عہد کو جو اس نے اپنے باپ دادوں سے باندھا تھا اور اس کی گواہیوں کو جو اُس نے اُن پر دی تھیں رد کیا اور بطالتوں کو اختیار کیا، اور بیہودہ ہوئے اور اُن اُمتوں کے پیرو ہو گئے جو اُن کے گرد و پیش تھیں جنھیں دکھا کے خداوند نے انھیں حکم کیا تھا کہ تم ان کے سے کام مت کیجیو، اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب حکم ترک کئے، اور اپنے لئے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنائے اور یسیرت تیار کی، اور آسمانی تاروں کی ساری فوج کی پرستش کی اور بعل کی عبادت کی، اور انھوں نے اپنے بیٹے بیٹی کو آگ کے درمیان گزارا اور فال گیری اور جادوگری کی اور اپنے تئیں بیچ ڈالا کہ خداوند کے حضور بدکاریاں کریں کہ اُسے غصہ دلا دیں، ان باعثوں سے خداوند بنی اسرائیل پر نپٹ غصہ ہوا۔" (۲ سلاطین۔ ۱۷: ۱۲۔ ۱۸)

پارۂ اول آیت ۸۷ کے حاشیے بھی ملاحظہ ہوں۔

**۲۶۳** (باوجود بار بار کی تبلیغ و ہدایت کے)

یعنی بجائے ندامت و استغفار کے انھیں اپنی کفریات پر اصرار تھا۔

ای کانوا لاینتھون عن منکر اتوہ (ابن جریر) التناھی بمعنی الانتھاء۔ (روح)

دوسرے معنی لایتناھون کے یہ ہو سکتے ہیں کہ "وہ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے اور یہی معنی اکثر نے لئے ہیں وھو الذی علیہ الجمھور انہ تفاعل من النھی ای کان لاینھی بعضھم بعضا (کبیر) ای لاینھی بعضھم بعضا (کشاف۔ قرطبی) یک دیگر را منع نمی کردند (شاہ ولی اللہؒ)

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ

اور اگر یہ لوگ ایمان لے آتے، اللہ اور (اس) نبی پر اور جو کچھ اس (نبی) پر نازل ہوا ہے اُس پر

أَوْلِيَاءَ وَلَٰكِنَّ كَثِيرًا مِنْهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٨١﴾

تو وہ لوگوں کو دوست نہ بناتے ۲۶۶ لیکن اُن میں سے اکثر تو نافرمان ہی ہیں ۲۶۷

اور یہ معنی لے کر فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ منکرات سے ایک دوسرے کو نہ روکنا ایک سنگین گناہ اور اُمت کے لئے بڑی حسرت کی چیز ہے۔

فیه دلیل علی ان ترك النهی عن المنکر من العزائم فیا حسرة علی المسلمین فی اعراضهم عنه. (مدارك)

۲۶۴ یعنی مشرکین عرب سے سازو باز رکھتے ہیں۔

ابتدائی تاریخ اسلام کا یہ ایک مشہور ومسلّم واقعہ ہے کہ رسولِ اسلام کی مخالفت وعناد میں اور اسلام کو مٹانے کی خاطر یہود نے مشرکین عرب سے ہر طرح کی سازشیں کی تھیں۔

۲۶۵ یہی ان کا عذاب دوزخ میں پڑے رہنا اللہ کی ناخوشی کا ظہور ہے۔

اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ میں اَنْ موصولہ کا کام دیتا ہے۔

ای الذی اوجب لهم سخط الله علیهم (جمل)

مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ۔ یعنی اپنے اعمال وعقائد کفریہ جنھیں آخرت میں وہ بھگتیں گے۔

۲۶۶ (بلکہ ایسی صورت میں تو وہ اسلام کے جاں نثاروں میں ہوتے۔)

النبی سے مراد رسول اللہ صلعم کی ذات مبارک ہے۔

یُصَدِّقُوْنَ نبیه محمدًا صلعم (ابن جریر)

وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ۔ یعنی قرآن۔

ویقرّون بما انزل الی محمد صلعم (ابن جریر)

النبیّ سے اشارہ حضرت موسیٰؑ اور وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ سے توریت کی جانب بھی سمجھا گیا ہے۔

۲۶۷ اور اسی نافرمانی کے آثار میں سے ان کی عداوت اسلام ومسلمین کے ساتھ اور ان کی موالات مشرکین عرب کے ساتھ ہے۔

فَاسِقُوْنَ۔ فاسق یہاں محض بدعمل وبدکردار کے معنی میں نہیں بلکہ فاسق العقائد یا خارج از ایمان کے معنی میں ہے، اور فسق یہاں ایمان کے مقابلے میں آیا ہے۔

ای خارجون عن الایمان (قرطبی۔ جلالین) متمردون فی کفرهم ونفاقهم (کشاف)

کافر پر فاسق کا اطلاق اسی معنی میں ہوتا ہے کہ وہ مقتضیاتِ عقل وفطرت کے حدود سے نکل گیا۔

واذا قیل الکافر الاصلی فاسق فلانه اخل بحکم ما الزمه العقل واقتضته الفطرة (راغب)

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

ایمان والوں کے ساتھ سب سے بڑھ کر دشمنی رکھنے والے آپؐ یہود اور مشرکین ہی کو پائیں گے ۲۶۸ اور آپؐ

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ

ایمان والوں کے ساتھ دوستی میں سب سے زیادہ قریب انھیں پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ۲۶۹

۲۶۸ یعنی اسلام سے مخالفت وعداوت تو ہر غیر مسلم کو ہے، لیکن اس عموم میں مرتبہ خصوصی مشرکین و یہود کو حاصل ہے کہ وہ شدید ترین دشمنانِ اسلام ہیں۔

۲۶۹ آیت پر اشکال متعدد وارد ہوئے ہیں، اور جوابات بھی متعدد دیے جا چکے ہیں، مثلاً ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مُراد صرف رسول اللہ صلعم کے معاصر مسیحی ہیں، یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن بنیادی اشکال صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ آیت کے لفظ نصاریٰ پر پورا غور نہ کیا گیا اور اسے "مسیحیوں" کا مرادف سمجھ لیا گیا، آیت میں مسیحی یا عیسائی سرے سے مُراد ہی نہیں، بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں، جو کہ حضرت عیسیٰؑ کو نبی ماننے والا، نہ کہ انھیں ابن اللہ قرار دینے والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے، اور اس کا شمار ہزار ڈیڑھ ہزار سال سے ارباب کلیسا "ملحدوں" میں کر رہے ہیں، اور قدیم مفسروں میں بھی کوئی کوئی اس نکتہ تک پہنچ گیا تھا۔

قال قتادة نزلت فی ناس من اهل الكتب كانوا علی شريعة مما جاء به عيسیٰ امنوا بالرسول فاثنی الله عليهم (بحر) قال الضرون هذه صفة قوم كانوا علی شريعة عيسیٰ من اهل الايمان (ابن جرير)

نصاریٰ۔ پر مفصل حاشیہ پارۂ اول میں گزر چکا ہے، وہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

قَالُوْٓا۔ کا لفظ بھی حشو نہیں، ذکر اُن کا ہو رہا ہے، جو اپنے نصاریٰ ہونے کا اقرار کر رہے ہیں، موجودہ فرنگی قومیں اور حکومتیں تو اپنے مسیحی ہونے کے بھی کھلے اقرار میں پس و پیش کرتی ہیں، اور حکومت کو مذہب سے الگ رکھنے ہی کے اظہار کو باعثِ فخر سمجھتی ہیں، چہ جائیکہ اپنے کو "نصرانی" کہیں، اِن ٹھیٹھ دنیا دار ملحد نیم مشرک قوموں کو قدیم "نصرانیت" سے کوئی علاقہ ہی نہیں، اس لئے ان کی مودت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اَقْرَبَهُمْ۔ ذکر یہاں قُرب مطلق کا نہیں، صرف قُرب اضافی کا ہو رہا ہے۔

لَتَجِدَنَّ۔ میں اگر خطاب رسول اللہ صلعم سے سمجھا جائے تو مُراد بظاہر صرف آپؐ کے معاصرین ہی سے ہو گی، اور مشرکین، یہود، نصاریٰ، ہر دور، ہر ملک کے قیامت تک مُراد نہ ہوں گے۔

واما صدقه علی اهل العصر الاول فظاهر اتم الظهور (المنار)

الْعَدَاوَةَ۔ یعنی وہ بُغض جس کا ظہور قول وعمل سے ہوتا رہے۔

بغضا و يظهر اثرها فی القول والعمل (المنار)

مَوَدَّةً۔ یعنی وہ محبت جس کا ظہور قول وعمل سے ہوتا رہا ہے۔

محبة يظهر اثرها فی القول والعمل (المنار)

ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

یہ اس لئے کہ ان میں عالم اور درویش ہیں، اور اس لئے کہ یہ تکبر نہیں کرتے ۲۷۰

**۲۷۰** یہاں نصاریٰ کے اسلام سے نسبۃً قریب تر ہونے کے دو وجوہ بھی بیان کر دیئے۔ ایک یہ کہ ان کی جماعت میں علم دوست، شب بیدار علماء اور تارک الدنیا درویش ہوتے ہیں، دوسرے یہ کہ ان کے قلوب میں تواضع کی نرمی ہوتی ہے۔ ان دو خصوصیات نے اس حقیقت کو اور زیادہ روشن و مؤکد کر دیا کہ مراد عام مسیحی خصوصاً فرنگی قومیں ہو ہی نہیں سکتیں کہ یہاں ان دونوں اوصاف کا قحط ہے۔ بلکہ مراد اسی قدیم فرقہ نصاریٰ (NAZARENS) سے ہے۔ ظہورِ اسلام کے وقت تک اس فرقہ کا زور ٹوٹ چکا تھا، تاہم اس کے کچھ آثار تو باقی ہی رہ گئے تھے۔

ذٰلِكَ۔ یعنی یہی نصاریٰ کا اسلام سے قربِ اضافی۔

قِسِّيْسِيْنَ۔ قس کے لفظی معنی عربی میں رات کو کسی شے کے طلب کرتے رہنے کے ہیں۔

اصل القس تتبع الشیٔ وطلبہ باللیل (راغب)

اور علماء نصاریٰ چونکہ عابدِ شب بیدار ہوتے تھے، اس لئے انہیں بھی قسیس کہنے لگے۔

والقسیس العالم العابد من رؤس النصاریٰ (راغب)

لیکن یہ بھی اہلِ لغت سے مروی ہے کہ قسیس کسی بیرونی زبان سریانی یا لاطینی سے منتقل ہو کر عربی بن گیا ہے اور لغتِ عرب میں داخل ہو گیا ہے۔

قال قطرب القس والقسیس العالم بلغۃ الروم (کبیر) ولفظ القسیس اما ان یکون عربیا او یکون بلغۃ الروم ولکن خلطتہ العرب بکلامہم فصار من لغتہم اذ لیس فی الکتاب ما لیس من لغۃ العرب (قرطبی)

محققین نے آیت سے یہ بھی نکالا ہے کہ تواضع وغیرہ صفاتِ محمودہ بہرحال قابلِ قدر ہیں، خواہ وہ کہیں مل جائیں یہاں تک کہ نصاریٰ میں بھی۔

وفی الآیۃ دلیل علی ان التواضع والاقبال علی العلم والعمل والاعراض عن الشہوات محمودۃ اینما کانت (روح) وفی ہذا التعلیل دلیل علی ان العلم انفع شیٔ واہداہ الی الہدایۃ وعلی حسن عاقبۃ الانقطاع (بحر) وفیہ دلیل علی ان العلم انفع شیٔ واہداہ الی الخیر وان کان علم القسیسین وکذا علم الآخرۃ وان کان فی راہب والبراءۃ من الکبر وان کانت فی نصرانی (مدارک)

امام رازیؒ نے آیت کے تحت میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔ وفیہا دقیقۃ نافعۃ فی طلب الدین اور اس کے تحت میں نکتہ یہ لکھا ہے کہ نصرانیوں کا کفر تو یہود کے کفر سے سخت تر ہے، اس لئے یہود تو صرف منکرِ نبوت ہیں، اور یہ تو خود نبوت کا ثبوت مانتے ہیں با وجود اس کے یہاں یہود سخت مرتکب تحقیق قرار پائے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کو دنیا کی حرص بہت زیادہ تھی اور یہی اس صورت میں جو گویا ہے کہ سارے گناہوں کی جڑ دنیا کی محبت ہی ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے معلوم ہوا کہ علوم و اخلاق کو اعمال میں دخلِ عظیم ہے اور اسی سے ثابت ہے طریقت کو علوم و اخلاق کا اہتمام اعمال سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ

اور وہ جب اس (کلام) کو سنتے ہیں جو پیمبر پر اتارا گیا ہے تو آپ ان کی آنکھیں دیکھیں گے کہ ان سے

تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا

آنسو بہے ہیں اس لئے کہ انھوں نے حق کو پہچان لیا وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾

سو تو ہم کو بھی تصدیق کرنے والوں میں لکھ لے ۲۷۱

**۲۷۱** یہ تصدیق کرنے والے کون لوگ تھے؟ حدیث و سیر کی کتابیں اس پر متفق ہیں کہ اس سے مراد نجاشی (شاہ حبش متوفی ۹ھ ہجری) اور اس کے درباری ہیں، یہ لوگ سچے مسیحی تھے اور قبل ہجرت نبوی جب آپؐ نے ہجرتِ مدینہ سے قبل صحابیوں کی ایک جماعت کی ہجرت ملک حبشہ کو کرائی تھی، تو ایک موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کی فرمائش پر بسر دربار سورۂ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، اس پر نجاشی اور اہل دربار متاثر ہو کر رو پڑے۔

قال ابن عباس یرید النجاشی واصحابہ (کبیر) عن عبد اللہ بن زبیر قال نزلت ھذہ الآیۃ فی النجاشی واصحابہ (ابن کثیر) فبکی واللہ النجاشی حتی اخضلت لحیتہ وبکت اساقفتہ حتی اخضلوا مصاحفھم حین سمعوا ما تلا علیھم ثم قال النجاشی ان ھذا والذی جاء بہ عیسیٰ لیخرج من مشکوۃ واحدۃ (ابن ھشام)

واذا ۔ و یہاں عطف ہے خبر سابق لا یستکبرون پر (عکبری)

ما انزل الی الرسول ۔ یہ سورۂ مریم کی آیتیں تھیں۔

فقرا علیہ صدرا من کٓھٰیٰعٓصٓ (ابن ھشام) ثم امر جعفر ان یقرا علیھم القرآن فقرا سورۃ مریم (قرطبی)

اعینھم تفیض من الدمع ۔ افاض یعنی آنسو کثرت سے رواں ہو گئے۔

فاض الماء اذا سال منصبا (راغب)

اہل علم کا تاثر عموماً اس قسم کا ہوتا ہے، وہ ہائے وائے نہیں کرتے البتہ ان کے آنسو چلنے لگتے ہیں۔

وھذہ احوال العلماء یبکون ولا یصعقون ویسالون ولا یصیحون (قرطبی)

مما عرفوا من الحق ۔ کلامِ حق سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہونا اور گریہ طاری ہو جانا گویا سنّتِ صالحین ہے توریت میں ہے:۔

"سب لوگ شریعت کی باتیں سن کر روتے تھے۔" (نحمیاہ ۔ ۸ : ۹)

زیادہ ہنسنا جس طرح غفلت کی دلیل ہے، اسی طرح رقتِ قلب علامت عبرت پذیری اور بیداری روح کی ہے اور گریہ اور رقتِ قلب کے فضائل کلام مسیحؑ میں طرح طرح سے وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً:۔

"مبارک ہو تم جو اب روتے ہو کیونکہ ہنسو گے۔" (لوقا ۔ ۶ : ۲۱)

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا

اور یہ کہ ہم ایمان تو نہ لائیں اللہ اور (اس) حق پر جو ہمیں (اب) پہنچا ہے اور (پھر) امید اس کی رکھیں کہ ہمارا

رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ

پروردگار ہم کو صالح لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا ۲۷۲؎ تو اللہ ان کو اس قول کے عوض میں ایسے باغ دے گا جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

نیچے ندیاں پڑی بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور نیک کاروں کا ایسا ہی معاوضہ ہے ۲۷۳؎

الحق کا لفظ لانے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے جس آخری نبی کی پیش گوئی درج ہے اسے تعبیر بھی "روح حق" ہی سے کیا گیا ہے (یوحنا۔ ۱۲: ۱۷۔ و یوحنا۔ ۱۶: ۱۳)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت سے وجدِ صوفیہ کا اثبات ہوتا ہے، اور وجد نام ہے بے اختیاری کی کیفیتِ محمودہ کا، حالۃ محمودۃ غریبیۃ غیر اختیاریتہ۔

فاکتبنا۔ اکتاب۔ یہاں بنا دینے یا کر دینے یا رکھ دینے کے معنی میں ہے۔

ومعنی فاکتبنا اجعلنا فیکون بمنزلۃ ما قد کتب ودوّن (قرطبی) ای اجعلنا فی زمرتھم (راغب)

الشاھدین۔ یعنی قرآن کے کلام الٰہی اور محمدؐ کے رسول برحق ہونے کی گواہی دینے والے۔

قال ابو علی الذین یشھدون بتصدیق نبیک وکتابک (قرطبی)

مما عرفوا من الحق۔ میں پہلا من سببیہ ہے، اس لئے کے معنی میں، اور دوسرا من تبعیضیہ ہے بعض الحق کے معنی میں۔

الاول لابتداء الغایۃ والثانیۃ للتبعیض (کبیر) معناہ من اجل الذی عرفوہ (عکبری)

۲۷۲؎ یعنی ہماری اس آرزو کا پورا ہونا موقوف ہی ہے اسلام لانے پر۔

استفھام انکار و استبعاد لانتفاء الایمان مع قیام الداعی وھو الطمع فی الانخراط مع الصالحین (بیضاوی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ بغیر عمل کے محض آرزو یا طمع مفید یا معتد بہ نہیں۔

۲۷۳؎ خاص سے عام کی طرف آنا، اور جزئیات سے کلیات پیدا کرنا قرآن مجید کا ایک عام اُسلوب بیان ہے۔ اوپر ایک خاص گروہ کے انعامات کا ذکر تھا، اب عام قاعدہ بیان کر دیا کہ ہمارے قانون میں ایسی جزائے خیر تو ہر نیک کار کو ملتی ہی رہتی ہے، اور اخلاص طلب رائگاں نہیں جاتا۔

وھکذا من خلص ایمانہ وصدق یقینہ یکون ثوابہ الجنۃ (قرطبی)

فاثابھم اللہ بما قالوا سے معلوم ہوا کہ جنت اس اقرار اور اس معرفت سے معاً واجب ہو جاتی ہے اگرچہ صاحبِ اقرار و صاحبِ معرفت صاحبِ کبیرہ ہی ہو اسی لئے متکلمین نے کہا ہے کہ آیت میں قوی دلیل اس کی موجود ہے کہ مومن فاسق کی سزا خلود فی النار نہیں

ع ۱۱ | ۹ | ۱

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٨٦﴾

اور جو لوگ کفر کرتے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے تو وہی دوزخ والے ہیں ؁۲۷۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ

اے ایمان والو! اپنے اوپر ان لذائذ کو جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہیں حرام نہ کرلو، اور

لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿٨٧﴾

حدود سے باہر نہ نکلو۔ بے شک اللہ حدود سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ؁۲۷۵

الآية دالة على ان المومن الفاسق لايبقى مخلدا فى النار (کبیر)

فاثابهم الله بما قالوا۔ سے اہل سنت نے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ اقرار داخلِ ایمان ہے۔

وفيه دليل على ان الاقرار داخل فى الايمان كما هو مذهب الفقهاء (مدارک)

ونطمع میں و حالیہ لیا گیا ہے۔

والواو فى ونطمع واو الحال (کشاف)

مع القوم الصالحين میں مع فی کے معنی میں بھی سمجھا گیا ہے۔

قيل مع بمعنى فى (قرطبی)

؁۲۷۴ اولٰئك کے حصر سے یہ ظاہر ہوگیا کہ اصحاب جحیم یعنی دوزخ میں مستقل رہنے والے کافر ہی ہوں گے نہ کہ غیر کافر یا فاسق مسلم۔

يفيد الحصر اى اولٰئك اصحاب الجحيم لاغيرهم فهذا يقتضى تخصيص هذا الدوام بالكفار (کبیر)

؁۲۷۵ تحریم حلال کی ایک عام اور چلی ہوئی صورت یہ ہے کہ کسی جائز لذت سے بہ قصد قربت حق اپنے کو ہمیشہ کے لئے محروم کردیا جائے، غیر مذہب والے اس عادت کا شکار بکثرت ہوچکے ہیں، کسی مسلمان کا ایسی جسارت کرنا گویا اس کا اقرار کرنا ہے کہ شریعت نے فلاں فلاں پرہیز کے مقرر نہ کرنے میں کمی رہ گئی ہے اور اب میں اپنی عقل و تجربہ سے اس فروگذاشت کی تلافی کررہا ہوں، ہاں کسی طبی یا انتظامی مصلحت کی بنا پر کسی جائز لذت سے دست بردار ہوجانا اور چیز ہے، اور بعض بزرگوں سے ترک لذات کے سلسلہ میں جو مجاہدے منقول ہیں، سمجھنا چاہئے کہ وہ اسی قبیل سے ہوں گے، کم سے کم حسن ظن کا تقاضا تو یہی ہے۔

لاتحرموا۔ تحریم اعتقادی، تحریم قولی، تحریم عملی کی تینوں صورتوں پر شامل ہے۔

اى لاتعتقدوا تحريم ما احل الله تعالى لكم ولاتظهروا باللسان تحريم ما احل الله لكم ولا تجتنبوا عنها اجتنابا يشبه الاجتناب من المحرمات (کبیر)

طیبات ما احل الله لكم۔ ان پاکیزہ اور جائز چیزوں میں صرف غذا ہی نہیں، بلکہ لباس، ازدواج وغیرہ ہر قسم کی لذتیں آگئیں، اور طیبات کے تحت میں ہر وہ جائز لذت شامل ہے جس کی طرف قلب اور طبیعت کو میلان

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور اللہ نے جو کچھ تمھیں حلال لذیذ چیزیں دے رکھی ہیں، ان میں سے کھاؤ (پیو) اور اسی اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو ۲۷۶

ہوتا ہے، طیب کے لغوی معنی بھی یہی ہیں۔

واصل الطیب ماتستلذہ الحواس وماتستلذہ النفس (راغب)

اور اہل تفسیر نے بھی یہی معنی برقرار رکھے ہیں۔

الطیبات اللذیذات التی تشتھیھا النفوس وتمیل الیھا القلوب (کبیر) الطیبات اسم یقع علی مایستلذ ویشتھی ویمیل الیہ القلب (جصاص) ای ماطاب ولذ منہ (بیضاوی) الطیبات ھنا المستلذات من الحلال (بحر)

آیت سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شدت زہد و ترک لذات کی اسلام میں گنجائش نہیں، عربی خواں ناظرین اگر یہاں صاحب روح المعانی کی تصریحات کو پیش نظر رکھیں تو بہتر ہوگا۔

ولا تعتدوا۔ اعتدا یا حدود سے نکل جانا یہی ہے کہ شریعت کی احتیاطوں اور قیدوں کو ناکافی سمجھ کر ان پر اپنی رائے و تجویز سے اضافہ کر لیا جائے یا اس کے برعکس انھیں زیادہ سمجھ کر ان میں سے کچھ چیزوں کو گھٹا دیا جائے جو حکمت یا صنعت ہر لحاظ سے اکمل اور ہر اعتبار سے اجمل ہو، اس میں ایک ذرہ کا اضافہ کر دینا بھی اس کے کمال حسن کے غارت کر دینے کے لئے اسی طرح کافی ہے، جس طرح اس میں سے کچھ گھٹا دینا یا نکال لینا۔

فالنھیان علی ھذا تضمنا الطرفین ای لاتشددوا فتحرموا حلالا ولا ترخصوا فتحللوا حراما (قرطبی) ای لاتبالغوا فی التضییق علی انفسکم بتحریم المباحات علیکم کما قال من قالہ من السلف (ابن کثیر)

محققین نے کہا ہے کہ آیت میں دو طرفہ رد ہے ایک طرف زہاد متشددین کا، اور دوسری طرف رخصت میں بہت ڈھیل ڈال دینے والے صوفیہ اہل باطل کا۔

قال علماءنا فی ھذہ الآیۃ وماشابھھا رد علی غلاۃ المتزھدین وعلی اھل البطالۃ من المتصوفین (قرطبی)

۲۷۶ (کہ یہ تقوی اور خوف خدا ہی راہ اعتدال و احتیاط و فرمانبرداری پر قائم رکھے گا)

اسلامی شریعت کے احکام "عقلاء" و "حکماء" کے گڑھے ہوئے نہیں کہ ان میں کسی قسم کی ترمیم تنقید اضافہ و اصلاح کی گنجائش ہو، وہ تو تمام تر حکیم مطلق اور حاکم برحق کے مقرر کئے ہوئے ہیں، اس میں اپنی رائے و تجویز کو دخل دینا، مقتضیات ایمان کے سرتاسر خلاف اور حاکمیت الٰہی سے بغاوت ہے۔

فقہاء محققین نے تصریح سے لکھ دیا ہے کہ جو غذائیں شریعت الٰہی نے حلال و طیب قرار دی ہیں، انھیں چھوڑ دینے میں کوئی دینی فضیلت ہرگز نہیں جیسا کہ خود ساختہ مذہبوں نے ترک لذائذ کو ایک معیار تقوی و مقبولیت سمجھ رکھا ہے۔

یدل علی انہ لافضیلۃ فی الامتناع من اکلھا (جصاص) وفی ھذہ الآیۃ دلالۃ علی بطلان قول الممتنعین من اکل اللحوم والاطعمۃ اللذیذۃ تزھدا لان اللہ تعالی قد نھی عن تحریمھا واخبر باباحتھا (جصاص)

خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے گوشتوں میں علاوہ بکری، بھیڑ، اونٹ وغیرہ کے مرغ کا گوشت بھی تناول فرمایا ہے

قد روی ابوموسی الاشعری انہ رای النبیؐ یاکل لحم الدجاج (جصاص)

فواکہ اور شیرینی اور حلوے کی دوسری لذیذ قسمیں بھی آپ سے نوش فرمانا ثابت ہیں۔

روی انہ کان یاکل الرطب والبطیخ (جصاص) روی ان رسول اللہ صلعم کان یاکل الدجاج والفالوذج وکان یعجبہ الحلواء والعسل (مدارک۔ بحر)

کلوا۔ کے امر و اجازت کا دائرہ صرف کھانے کی چیزوں تک محدود نہیں، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، سواری، مکان غرض برتنے کی ساری ہی چیزیں اس کے اطلاق میں داخل ہیں۔

الاکل فی ھذہ الآیۃ عبارۃ عن التمتع بالاکل والشرب واللباس والرکوب ونحو ذلک (قرطبی)

والمراد بالاکل التمتع فیدخل فیہ الشرب مثل قولہ لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وھو یعم کل ماینتفع بہ من طعام وشراب ولباس ومتاع وماوی (المنار)

ابن عباسؓ صحابی نے فرمایا کہ جو چاہو کھاؤ، جو چاہو پہنو، بس لحاظ صرف اس کا رکھو کہ اسراف اور فخر و نمائش کے حدود تک نہ پہنچ جاؤ۔

عن طاؤس قال سمعت ابن عباسؓ یقول کل ماشئت والبس ما اخطأتک اثنتین سرفا ومخیلۃ (جصاص)

اور رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ سارے لذائذ جائز ہیں، جو فطرت سلیم کے مطابق ہوں اور جن کے استعمال میں اعتدال ملحوظ رہے اور حرام سے احتیاط۔

ھدی القرآن فی الطیبات ای المستلذات ھو ما تقتضیہ الفطرۃ السلیمۃ المعتدلۃ من التمتع بھا مع الاعتدال والتزام الحلال کھدیہ فی سائر الاشیاء التی یسرف فیھا بعض الناس ویقصر بعض (المنار)

فقیہ جصاص رازیؒ نے لکھا ہے کہ صحابیوں میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت حسنؓ، حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ، حضرت عمران بن حصینؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت ابوہریرہؓ سے اور مشہور تابعی قاضی شریح سے لباس میں پشمینہ کا استعمال ثابت ہے۔ (احکام القرآن)

کلوا صیغۂ امر ہے لیکن مراد یہاں وجوب نہیں صرف اباحت ہے۔

کلوا صیغۃ امر وظاھرہا للوجوب الا ان المراد ھھنا للاباحۃ والتحلیل (کبیر)

کھانے پینے کے باب میں اسوۂ رسول، ہر مومن کے لئے قابل تقلید ہے کہ آپؐ نے کبھی کبھی لذیذ غذاؤں کو بھی تناول فرمایا ہے مثلاً چوپایوں کا، یا پرندوں کا، یا مرغ کا گوشت اور کبھی کبھی سوکھی روکھی پر بھی قناعت کی ہے مثلاً جو کی روٹی نمک کے ساتھ، اور کبھی آپؐ نے بھوک میں بھی بسر کی ہے اور کبھی آسودہ ہو کر بھی تناول فرمایا ہے البتہ کھانے کا اہتمام آپؐ نے کبھی نہیں فرمایا ہے گو آپؐ میٹھا اور سرد بھی پسند فرماتے تھے اور یہ سب رشید رضا مصری نے اپنی تفسیر المنار میں تفصیل سے لکھا ہے۔

مما رزقکم اللہ۔ میں من تبعیض کے لئے ہے اس میں ادھر اشارہ ہے کہ جائز چیزوں میں سے کچھ کھاؤ پیو، اور کچھ دوسروں کی نذر کردو تاکہ اسراف سے بھی بچے رہو۔

کلمۃ من للتبعیض فکانہ قال اقتصروا فی الاکل علی البعض واصرفوا البقیۃ الی الصدقات والخیرات لانہ ارشاد الی ترک الاسراف کما قال ولا تسرفوا۔ (کبیر)

رزقکم اللہ۔ لاکر یہ جتا دیا کہ دنیوی نعمتوں سے تمتع کرنے وقت یہ بہر صورت یاد رہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ

اللہ تم سے تمہاری بے معنی قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا ۲۷۷ لیکن جن قسموں کو تم مضبوط کرچکے ہو ان پر تم سے مواخذہ کرتا ہے ۲۷۸

الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ

سو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو یا انہیں کپڑا

اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ

دینا یا غلام آزاد کرنا ۲۷۹ لیکن جس کو (اتنا) مقدور نہ ہو تو اس کے لئے تین دن کے روزے ہیں ۲۸۰

سب اللہ ہی کا دیا ہوا عطیہ ہے نہ یہ کہ سر تا سر تمہاری سعی و محنت کا نتیجہ ہے اور نہ یہ کہ کسی غیر اللہ کا عطیہ ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں رسم ترک حیوانات کا ابطال ہے جو بعض مدعیان طریقت کا طریق ہے۔

۲۷۷ (قانون دنیوی میں)

یعنی ایسی قسم کا کوئی کفارہ واجب نہیں کرتا۔

اللغو فی ایمانکم۔ بے معنی قسموں پر حاشیہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا۔ پ ۲ حاشیہ آیت ۲۲۵

۲۷۸ (اور اس کے توڑنے کی سزائے دنیوی یا کفارہ مقرر کرتا ہے۔)

بما عقدتم الایمان۔ جھوٹی قسم ایک تو کسی گذشتہ واقعہ سے متعلق ہو سکتی ہے جیسے کسی واقعہ کا وقوع قسم کھا کر بیان کیا، حالانکہ وہ خلاف واقعہ تھا، یہاں ایسی قسموں کا ذکر نہیں قسموں کی ایک دوسری قسم یہ ہے کہ مستقبل میں کسی امر کے وقوع یا عدم وقوع کو بہ طور عہد یا قسم سے مؤکد کر کے بیان کیا جائے، یہاں یہی قسم مراد ہے۔

عقدتم۔ عقد کے لفظی معنی گرہ دینے کے ہیں، مجازاً عہد، قسم، بیع وغیرہ کے مؤکد کرنے پر بولا جاتا ہے۔

لفظ کی قرأت عقدتم (بلا تشدید) اور عاقدتم سے بھی آئی ہے، عقّدتم میں تشدید قسم کے زوردار اور مؤکد بنانے کے لئے ہے۔

ویقرأ بتشدیدها وذلك لتوكيد اليمين (عكبری)

۲۷۹ یہ کفارہ قسم توڑنے کے بعد ہی واجب ہوگا، اس کے قبل نہیں ادا ہو سکتا ہے۔

یہ قسم خواہ ارادۃً توڑی ہو، یا بھول چوک سے ٹوٹ گئی ہو، فقہاء نے لکھا ہے کہ کفارہ دونوں صورتوں میں واجب ہوگا۔

اطعام۔ یہ کھانا دونوں وقتوں کا ہوگا، یہ کھانا چاہے دس شخصوں کو ایک دن میں کھلا دیا جائے، یا ایک ہی شخص کو دس دن تک کھلایا جاتا رہے۔

کسوتہم۔ کپڑا ایسا ہو کہ جسم کے اکثر حصہ کے لئے کافی ہو۔

تحریر رقبۃ۔ لفظی معنی گردن آزاد کر دینے کے ہیں، مراد غلام یا باندی کا آزاد کرنا ہے۔

رقبۃ۔ کا لفظ سورۃ النساء ع ۱۳، آیت ۹۲ میں آچکا ہے اور اس کی جمع رقاب سورۃ البقرۃ ع ۲۲ آیت ۷، ایں

ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ

یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم حلف اٹھا چکے اور اپنی قسموں کو یاد رکھا کرو ۲۸۱ے اللہ اسی لئے

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾ يٰٓاَيُّهَا

تمہارے لئے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر گزار رہو ۲۸۲ے اے ایمان والو

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ

شراب اور جوا اور بت اور پانسے تو بس بڑی گندی باتیں ہیں شیطان کے کام ۲۸۳ے

مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾

سو اس سے بچے رہو تاکہ فلاح پاؤ ۲۸۴ے

او۔ کفارہ کی یہ تینوں صورتیں جو یہاں ارشاد ہوئیں، ان کی ترتیبِ ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان پر عمل بھی نمبروار اسی ترتیب سے ہو، بلکہ اختیار ہے کہ ماحول کا لحاظ کر کے جو کفارہ بہتر معلوم ہو وہی دیا جائے۔

لاخلاف فی ان کفارۃ الیمین علی التخییر (قرطبی) ومعنی او التخییر وایجاب احدی الکفارات الثلاث (مدارک)

بلکہ فقہائے مالکیہ نے تو تصریح کر دی ہے کہ ضرورت کا اعتبار کیا جائے: وعندی انہا تکون بحسب الحال فان علمت محتاجا فالاطعام أفضل لانک اذا اعتقت لم ترتفع حاجتہم وزدت محتاجا (ابن العربی)

۲۸۰ے (اور یہ تینوں روزے متواتر ہونے چاہیئے)

یہ رعایتی کفارہ صرف معذوری کی صورت میں ہے، اور جوں ہی مقدرت کا عذر ساقط ہوگا، یہ رعایت بھی ازخود ختم ہو جائے گی، چنانچہ فقہاء نے لکھا ہے کہ کسی نے یہ کفارہ کے روزے شروع کئے، اور دو روزے ہو بھی چکے تھے کہ اسے طعام یا لباس کی مقدرت حاصل ہو گئی تو اب تیسرا روزہ رکھنے کے بجائے اسے اصل کفارہ ہی دینا چاہیئے۔

فمن لم یجد۔ فقہاء نے کہا ہے کہ یہاں مقدرت کا معیار صاحبِ نصاب ہونا ہے۔

۲۸۱ے (تاکہ اس کے توڑنے اور پھر کفارہ دینے کی نوبت ہی نہ آئے)

اذا حلفتم۔ یعنی جب تم حلف لے چکے اور اسے توڑ بھی چکے۔

۲۸۲ے شکر یہ اس کا کہ حاکم علی الاطلاق و حکیم مطلق نے تمہاری چھوٹی بڑی دینی و دنیوی، انفرادی و اجتماعی ساری مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ اور سب کی رعایت رکھ لی، اور اس طرح تم کو ایک بہترین نظامِ زندگی کا سرمایہ دار بنا دیا۔

کذٰلک۔ یعنی ایسی مثالیں کمالِ تبئین کے لئے بیان ہوتی ہیں۔

اے تبین لکم آیاتہ تبیینا مثل ذلک (عکبری)

۲۸۳ے بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں فطرتِ انسانی اور طبیعتِ بشری سے پھر کچھ نہ کچھ لگاؤ ہوتا ہے لیکن

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي

شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں دشمنی اور کینہ شراب اور جوے کے ذریعہ

الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ

سے ڈال دے ۲۸۵ اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے ۲۸۶

یہ چاروں چیزیں تو ایسی ہیں کہ انسان ان کی جانب تمام تر خارجی مؤثرات ہی کے اثر سے آتا ہے اور یہ بالکل ہی شیطان کی تحریک کا نتیجہ ہوتا ہے، رجس من عمل الشیطان ان کی بالکل صحیح تصویر کشی ہے، فطرت بشری ان سے خود اِبا کرتی ہے۔

خمر اور میسر پر حاشیہ سورۃ البقرۃ رکوع ۲۷ آیت ۲۱۹ کے تحت میں اور انصاب اور ازلام پر اسی سورہ مائدہ کے شروع میں درج ہو چکے، شراب اور جوئے کی مادی مضرتوں کے لئے ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔

من عمل الشیطان یعنی براہ راست تحریک شیطانی کا نتیجہ، نہ کہ محض نفس بشری کا تقاضہ۔

لانه مسبّب من تسویله وتزیینه (بیضاوی) لانه یحمل علیه فکانه عمله (مدارک)

محض رجس ہی نہیں بلکہ من عمل الشیطن کی صراحت کے بعد عجیب طفلانہ سوال حال میں بعض حلقوں کی طرف سے پیش ہوا ہے کہ قرآن میں شراب کی "حرمت" مذکور نہیں۔

۲۸۴ اور فلاح دینی و دنیوی، مادی و روحانی جسمانی و دماغی، انفرادی و اجتماعی ہر قسم کے سود و بہبود پر شامل ہے، مفسر زمخشری نے لکھا ہے کہ حرمت خمر و میسر کے متعدد طریقے قرآن نے اس آیت میں جمع کر دیئے۔

(۱) آیت کی ابتداء کلمہ حصر انما سے کی یعنی ان چیزوں کی بس یہی کل حقیقت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) ان دونوں چیزوں کا ذکر انصاب و ازلام جیسی مسلم گندی چیزوں کے ساتھ کیا۔

(۳) انھیں رجس قرار دیا۔ (۴) انھیں عمل شیطان ٹھہرایا۔

(۵) صاف صاف ان سے اجتناب کا حکم دیا۔ (۶) ان سے احتراز کو موجب فلاح بتلایا۔

(۷) ان کی مضرتوں کا ذکر کیا۔

فاجتنبوہ میں ضمیر رجس یا عمل الشیطان کی جانب ہے۔

الضمیر للرجس (بیضاوی) والضمیر یرجع الی الرجس او الی عمل الشیطان (مدارک)

حرمت خمر پر اگر دوسرے نصوص نہ موجود ہوں، جب بھی یہی ایک آیت کافی ہے، اس لئے کہ اول تو لفظ رجس موجود ہے، جو خود تحریم کا مقتضی ہے اور پھر فاجتنبوہ صیغۂ امر۔

اقتضت هذه الاٰیة تحریم الخمر من وجهین احدهما قوله رجس لان الرجس اسم فی الشرع لما یلزمه اجتنابه والوجه الاٰخر قوله تعالیٰ فاجتنبوہ وذلك امر والامر یقتضی الایجاب (جصاص)

۲۸۵ شراب نوشی اور قمار بازی کی دنیوی مضرتوں اور اخلاقی قباحتوں کی تفصیل لکھنے پر کوئی آئے تو کتاب کی کتاب تیار ہو سکتی ہے، قرآن مجید نے یہاں ان کی صرف سب سے بڑی اور کلیدی مضرت، تنازع جنگی کی طرف اشارہ کر دیا

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ

سو اب بھی تم باز آجاؤ گے ؟ ۲۸۷ اور اطاعت کرتے رہو اللہ کی اور رسول کی، اور احتیاط رکھو، اور

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

اگر اعراض کرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے ۲۸۸ اور بس

شراب و قمار دونوں کے مضر اثرات شر و فساد کی شکل میں روزمرہ کے مشاہدے ہیں، مے نوشی اور جرائم کا قریبی تعلق آج ماہرین فن کے فراہم کئے ہوئے اعداد سے ایک ثابت شدہ حقیقت ہے، اور جوئے کی لت میں پڑ کر بڑے بڑے مشاہیر و اکابر کا اپنی دولت، سلطنت، عزت و ناموس تک گنوا بیٹھنا ہندوستان کے قدیم ترین تاریخی قصہ مہابھارت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

جاہلیتِ عرب کے مہذب باشندے ان دونوں بلاؤں میں بُری طرح مبتلا تھے، ٹھیک اسی طرح جیسے آج جاہلیتِ فرنگ کی مہذب آبادی پر بھی دونوں بلائیں بری طرح مسلط ہیں، ملاحظہ ہو انگریزی تفسیر القرآن۔

فی الخمر والمیسر۔ میں فی سببیہ ہے یعنی ان کے ذریعہ یا واسطہ سے۔

ای بسببھما (جمل) ای بسبب تعاطیھما (روح) فی متعلقة بیوقع وھی بمعنی السبب (عکبری)

الخمر۔ خمر کے اصل معنی اگرچہ صرف شرابِ انگوری کے تھے، لیکن بعد کو یہ لفظ ہر قسم کی نشہ آور شراب کے لئے استعمال ہونے لگا۔

کل شیٔ اسکر فھو خمر (جصاص) الخمر سمیت لکونھا خامرۃ لمقر العقل وھو عند بعض الناس اسم لکل مسکر وعند بعضھم اسم للمتخذ من العنب والتمر (راغب)

شراب کے سلسلہ میں یہ یاد رہے کہ جس طرح اس کا پینا ناجائز ہے، اسی طرح اس کا بنانا، اس کا بیچنا، اس کے کاروبار میں حصہ لینا، اس سے کسی طرح نفع اٹھانا، سب ناجائز ہے، حدیث ابوداؤد میں ان اللہ حرم الخمر وثمنھا صاف آچکا ہے، اور فقہاء نے تمام متعلقاتِ شراب کی حرمت پر دلائل نقل کئے ہیں۔ "آبکاری" کا عظیم الشان محکمہ اور پُر منفعت کاروبار اسلامی حکومت کے تحت میں ایک منٹ کے لئے بھی زندہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔

مرشد تھانویؒ نے اس آیت کے ذیل میں خوب فرمایا کہ معاصی میں جیسے اُخروی مضرتیں ہیں، دُنیوی قباحتیں بھی بہت ہیں۔

۲۸۶ ذکر اللہ اور الصلوٰۃ میں مناسبت باہمی یہ ہے کہ نماز ذکر الٰہی ہی کی فردِ اعلیٰ و افضل ہے، اور عام کے ساتھ اس کی صورت خاص کی تصریح کر دینا قرآن مجید کا عام اسلوبِ بیان ہے، ضمناً اس سے نماز کی عظمت اور اہمیت و اشرفیت پر پوری روشنی پڑ گئی۔

خص الصلوٰۃ من الذکر بالافراد للتعظیم والاشعار بان الصاد عنھا کالصاد عن الایمان (بیضاوی)

وخص الصلوٰۃ من بین الذکر لزیادۃ درجتھا کانہ قال وعن الصلوٰۃ خصوصًا۔ (مدارک)

شراب اور جوئے کے دُنیوی نقصانات کی طرف اشارہ ابھی اوپر ہو چکا اب بیان ان کی دینی مضرتوں کا ہو رہا ہے۔

میسر کی حرمت کی جو حکمتیں یہاں بیان ہوئیں، وہی ذرا ہلکی صورت میں، شطرنج وغیرہ نیم قماری کھیلوں میں بھی مشاہد ہیں، اسی لئے فقہاء نے ان کے بھی عدم جواز کا فتوی دیا ہے، اور صحابہ اور تابعین سے بھی منقول ہے۔

روی عن علیؓ انہ قال الشطرنج من المیسر وقال عثمان وجماعۃ من الصحابۃ والتابعین النرد وقال قوم من اہل العلم القمار کلہ من المیسر (جصاص) ھذہ الآیۃ تدل علی تحریم اللعب بالنرد والشطرنج قمارا او غیر قمار (قرطبی)

**۲۸۷** (شراب اور قمار سے)

اصحاب نبیؐ جو آیت کے مخاطب اولین تھے، اسے سنتے ہی پکار اٹھے، ہم باز آگئے! ہم باز آگئے!

قال عمر انتہینا انتہینا (ابن جریر) فقالوا انتہینا یارب (ابن جریر) فقالوا انتہینا ربنا انتہینا ربنا (ابن جریر)

کیا ڈسپلن تھا بارگاہِ نبوت کا، اور کیسی زبردست اصلاحی قوت تھی عرب کے اس امی حکیم کی، کہ دم کے دم میں بڑے بڑے پرانے اور عمر بھر کے شرابیوں اور جواریوں کو پاکباز و متقی بلکہ پاکبازوں اور صالحین کا سردار بنا دیا! سچ کہا ہے اکبر الٰہ آبادی نے

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے

کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا!

فھل انتم منتھون۔ حرمت شراب و قمار کی تاکید در تاکید تو اوپر سے چلی آرہی تھی اب اس فقرہ نے اسے اور مؤکد کر کے گویا شدتِ ممانعت پر مہر لگا دی۔

اعاد الحث علی الانتہاء بصیغۃ الاستفہام مرتبا علی ما تقدم من انواع الصوارف (بیضاوی)

ایذانا بان الامر فی المنع والتحذیر بلغ الغایۃ وان الاعذار قد انقطعت (بیضاوی)

صیغۂ استفہام ایسے موقع پر صیغۂ امر سے بھی بلیغ تر ہوتا ہے۔

لفظہ استفہام ومعناہ الامر، ای انتہوا۔ لکن الاستفہام عقیب ذکر ھذہ المعایب ابلغ من الامر (عکبری)

علامہ زمخشری نے ایک سوال یہاں یہ پیدا کیا ہے کہ پہلی آیت میں خمر و میسر کا ذکر انصاب و ازلام کے ساتھ کیا ہے، اور اگلی میں تنہا انھیں دو کا ذکر کیوں کیا ہے؟ اور خود اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے، اور انھیں کو شراب و قمار سے روکنا مقصود ہے، پہلی آیت میں چاروں منکرات کا ذکر ایک ساتھ اس امر کے اظہار کے لئے اور مسلمانوں کو شراب و قمار سے مزید نفرت دلانے کے لئے تھا کہ یہ ایسے اعمال ہیں جن کا ارتکاب اہل جاہلیت و مشرکین ہی کر سکتے ہیں۔

ذکر الانصاب والازلام لتاکید تحریم الخمر والمیسر واظہار ان ذلک جمیعا من اعمال الجاھلیۃ واھل الشرک ثم افردھما بالذکر لیری ان المقصود بالذکر الخمر والمیسر۔ (کشاف)

**۲۸۸** (احکام اور پیام کا، سو آپ تبلیغ پوری پوری کر چکے، اور عذر کی گنجائش کسی کو نہ رہی، اب ایمان لانا نہ لانا تمہارا ہی کام ہے)

رسول کی ذمہ داری کے ان حدود کو قرآن مجید نے بار بار بیان کیا ہے، اور افراد امت کو قبول ورد ایمان میں بالکل آزاد رکھا ہے۔

اطیعوا الرسول۔ یہ اطاعت اللہ اور رسول کی سارے احکام شریعت میں ہوگی۔

قرآن مجید نے اطاعتِ رسول کی صراحت بار بار کی ہے، رسول بہ حیثیت رسولؐ جو بھی حکم دیں اس کی تعمیل

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا

جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں ان پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے ہوں جبکہ وہ لوگ تقوی

مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا

رکھتے ہوں ۲۸۹ اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر تقوی کریں ۲۹۰ اور ایمان رکھتے ہوں اور پھر تقوی کریں اور خوب نیک کام بھی کریں ۲۹۱

حکم الٰہی ہی کی طرح ضروری ہے۔

واحذروا۔ یہ احتیاط کا حکم احکام کی نافرمانی سے متعلق چل رہا ہے، یعنی نافرمانی سے بچو۔

۲۸۹ (اور اس لئے اس وقت کی حرام چیزوں سے محترز ہوں)

فی ما طعموا۔ جبکہ وہ وہ چیزیں کھا رہے ہوں جو اس وقت میں حلال ہوں۔

طعموا ما لم يحرم عليهم (بیضاوی)

روایتوں میں آتا ہے کہ جب شراب و قمار کی حرمت کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے سوال کیا کہ پھر ان کا کیا حشر ہوگا، جو اب تک شراب پیتے اور قمار کا مال کھاتے رہے؟ اور پھر اب زندہ بھی نہیں جو توبہ اور استغفار سے کام لیں، بلکہ وفات پا چکے ہیں، یہ آیت اس پر نازل ہوئی ۔۔۔ سوال اسی قسم کا تھا جیسے حکم تحویل قبلہ کے بعد بعض صحابیوں نے سوال کیا تھا کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی جا چکی ہیں، ان کا کیا حشر ہوگا؟ اور اس کا جواب بھی قرآن ہی میں موجود ہے، ما كان الله ليضيع ايمانكم ۔۔۔ سوال دونوں موقعوں پر بالکل قدرتی تھا، اور آج جن لوگوں نے سوال پر استعجاب ظاہر کیا ہے، انھوں نے خود اپنی سطحیت و کم فہمی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

چار چار صحابیوں ابن عباسؓ و جابرؓ۔ براء بن عازبؓ و انس بن مالکؓ اور چار چار تابعیوں حسنؒ، مجاہدؒ، قتادہؒ و ضحاکؒ کی سند سے جصاص نے کہا ہے کہ:۔

لما حرم الخمر كان قد مات رجال من اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم وهم يشربون الخمر قبل ان تحرم فقالت الصحابة كيف بمن مات منا وهم يشربونها فانزل الله تعالى هذه الآية۔

۲۹۰ یعنی ان چیزوں کو ترک کر دیں جو پہلے حلال تھیں، اور اب حرام ہو گئی ہیں۔

وعملوا الصّٰلحٰت۔ یہ عمل صالح خود دلیل ہے ان کے ایمان و تقوی کی۔

۲۹۱ مطلب یہ ہوا کہ نزول شریعت کے ہر دور میں اور ہر منزل میں وہ اتباع احکام اور احترام قیود پر حریص ہوں۔

احسان۔ سلوک شرعی میں آخری مرتبہ کا نام ہے، ایک تو ہوا کسی کام کو کسی نہ کسی طرح محض کر ڈالنا اور ایک ہے اس کام کو بوجہ احسن کرنا، دل و جان سے کرنا، اس میں حسن و زیبائی کے کمالات پیدا کر کے کرنا، اسی کا نام احسان ہے، اسے اردو کے چلے ہوئے لفظ احسان، و منت سے کوئی تعلق نہیں، اس قرآنی "احسان" کا ترجمہ حسن کاری سے بھی ہو سکتا ہے۔

ثم اتقوا۔ اس تقوی سے بھی یہی مراد ہے کہ جو چیز اب حرام ہوئی ہے اسے ترک کر دیں۔

فامنوا۔ ایمان کی تصریح سے اشارہ اوپر ہو گیا کہ ایمان ہی تو مبنی و منشا سارے اعمال صالح کا ہے۔

وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ ع ۱۲/۲

اور اللہ تو محبت رکھتا ہے خوب نیککاری کرنے والوں سے ۲۹۲ اے ایمان والو! اللہ تمہیں آزمائے گا قدرے شکار سے جس تک

الصَّيْدِ تَنَالُهٗۤ اَيْدِيْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ج

تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں ۲۹۳ تاکہ اللہ معلوم کرلے کہ کون شخص اس سے بے دیکھے ڈرتا ہے ۲۹۴

بغیر جڑ کے شاخوں کے معنی کیا؟ اور بغیر ایمان کے کوئی عمل صالح ہو کیوں کر سکتا ہے۔

جصاص رازی نے کہا ہے کہ تقویٰ کا ذکر آیت میں تین مرتبہ آیا ہے اور ہر مرتبہ ایک نئی مراد ہے پہلے تقویٰ سے اشارہ ماضی کی طرف ہے اور دوسرے سے مستقبل کی طرف، اور تیسرے سے مراد بندوں پر ظلم و زیادتی سے بچنا ہے۔

واعاد ذکر الاتقاء فی الآیة ثلاث مرات فاما الاول فمن اتقی فی ما سلف والثانی الاتقاء منهم فی مستقبل الاوقات والثالث اتقاء ظلم العباد والاحسان الیهم۔

۲۹۲ (سو ایسے ایمان تقویٰ و حسنِ عمل والوں کے مبغوض و مردود ہونے کا تو احتمال ہی نہیں ان کا شمار تو محبوبوں اور مقبولوں میں ہے)

علماء نے اس پوری آیت سے ہر مباح لذت سے پورے استلذاذ و انتفاع کا جواز نکالا ہے۔

قال ابن خویز منداد تضمنت هذه الآیة تناول المباح والشهوات والانتفاع بکل لذیذ من مطعم ومشرب ومنکح وان بولغ فیه وتنوهی فی ثمنه۔ (قرطبی)

۲۹۳ یعنی وہ شکار کے جانور تم سے بہت دور بھی نہ ہوں گے، قریب ہی پھرتے رہیں گے کہ تمہارے لئے ان کا شکار بآسانی ممکن ہوگا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ یہ ذکر مقامِ حدیبیہ کا ہے شکار کے جانور بالکل آس پاس لگے پھرتے تھے لیکن مسلمان حالتِ احرام میں تھے، اس لئے شکار سے محتاط و محترز رہے۔

(انزلت هذه الآیة فی عمرة الحدیبیة فکانت الوحش والطیر والصید تغشاهم فی رحالهم (ابن کثیر)

لیبلونکم اللہ۔ سورۃ کے شروع میں آچکا ہے کہ حالتِ احرام میں شکار ممنوع ہے اب یہاں اس کی کچھ تفصیل بیان ہوگی، ملاحظہ ہوں اسی سورۃ المائدہ کے حواشی ۱۲ ومابعدہ۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ لیبلونکم سند ہے ان مشائخ کے لئے جو اپنے طالبین کے صدق و اخلاص کا امتحان کرتے رہتے ہیں۔

من الصید میں من یا تو تبعیض کے لئے ہے یا تمیز کے لئے یا جنس کے لئے۔

قیل فی موضع من ههنا انها للتبعیض وقیل انها للتمیز (جصاص) ومن للتبعیض او لبیان الجنس (مدارک) یرید ببعض الصید فمن للتبعیض (قرطبی)

۲۹۴ یعنی اس ان دیکھے معبود کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہے۔

لیعلم اللہ۔ یعنی تاکہ اللہ دنیا کی نظر میں بھی اس شخص کے عمل سے معلوم کرلے اللہ کا علم تو ہمیشہ ہی سے

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

سو جو کوئی اس کے بعد حد سے نکلے گا تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے ۲۹۵ اے ایمان والو شکار کو

لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ

مت مارو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو ۲۹۶ اور تم میں سے جو کوئی دانستہ اسے مار دے گا تو اس کا جرمانہ

مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًاۢ بٰلِغَ

اسی طرح کا ایک جانور ہے جس کو اس نے مار ڈالا ہے ۲۹۷ (اور) اس کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں گے

الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ

خواہ وہ جرمانہ چوپایوں میں سے ہو جو نیاز کے طور پر کعبہ تک پہنچائے جاتے ہیں ۲۹۸ اور خواہ مسکینوں کو کھانا (کھلا دیا جائے)

ہے ایسے موقعوں پر مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شخص کے عمل سے بھی یہ کیفیت ظاہر ہو جائے۔

۲۹۵ بعد ذلک۔ یعنی اس حکم حرمت کے بعد، یا اس شکار کی آزمائش میں پڑنے کے بعد۔

بعد ذلک الابتلاء بالصید۔ (بیضاوی)

اعتدٰی۔ یعنی احکامِ شرعی کی حد سے نکلے گا اور شکارِ ممنوع کا مرتکب ہوگا۔

شکار اہل عرب کی عام عادت میں داخل تھا، اور صحابہ رضی اللہ عنہم شکار کے ہمیشہ سے عادی تھے، اس لئے ان کی اطاعت اور قوتِ ضبط کا پورا امتحان ہو رہا تھا۔

بشیءٍ یہ دل بڑھانے کے لئے ہے کہ امتحان کوئی ایسا بڑا نہیں، ایک حقیر ہی شے کا ہے۔

التقلیل والتحقیر فی بشیءٍ للتنبیہ علی انہ لیس من العظائم (بیضاوی) لیعلم انہ لیس بفتنۃ من الفتن العظام التی تدحض عندھا اقدام الثابتین۔ (کشاف)

۲۹۶ (یا تم خود تو حالتِ احرام سے باہر ہو لیکن وہ شکار حدودِ حرم کے اندر ہو)

یہ عام ممانعت خشکی اور تری کے ان جانوروں کے حق میں بھی جن کے قتل یا شکار کا جواز قرآن مجید ہی کی کسی دوسری آیت یا حدیث صحیح سے ثابت ہو گیا ہے، مثلاً دریائی جانور، یا سانپ، بچھو، بھیڑیا، کاٹنے والا کتا وغیرہا۔

قد روی ابن عباسؓ وابن عمر وابو سعید وعائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال خمس یقتلھن المحرم فی الحل والحرم الحیۃ والعقرب والغراب والفارۃ والکلب العقور (جصاص) واما ما کان من السباع لا یبتدء (جصاص)

لا تقتلوا۔ قتل کے معنی اردو میں فقہی اصطلاح کے مطابق ہلاک کی ایک بالکل خاص صورت کے ساتھ مخدوم ہو کر رہ گئے ہیں، عربی کے قتل کے مفہوم میں یہ تنگی نہیں، وہ جان لے لینے کی ہر صورت کے لئے عام ہے اور یہی یہاں مراد ہے۔

القتل ھو کل فعل یفیت الروح وھو انواع (قرطبی)

ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَمَنْ

یا اس کے مساوی روزہ رکھ لئے جائیں تاکہ وہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے ۲۹۹ جو کچھ ہو چکا اللہ نے

عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

اسے معاف کر دیا ۳۰۰ لیکن جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا اللہ اسے سزا دے گا، ۳۰۱ اور اللہ زبردست ہے سزا پر قادر ہے ۳۰۲

۲۹۷ یعنی اس شخص کو جرمانہ میں اسی قیمت کا جانور پیش کرنا چاہیے۔

مثل ما قتل۔ مثلیت کا معیار حنفیہ کے ہاں ہم قیمتی ہے۔

قال ابوحنیفة وابویوسف المثل هو القیمة (جصاص) وهو قیمة الصید (مدارک)

یہ جزاء یا جرمانہ جس طرح قصد و تعمد میں واجب ہے اسی طرح حالتِ خطا و نسیان میں بھی ہے، حدیث سے یہی ثابت ہے اور فقہاء نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

عن الزهری قال نزل القرآن بالعمد وجرت السنة فی الخطأ (ابن جریر) ان قتله متعمدا او ناسیا حکم علیه (ابن جریر عن ابن عباس) قال قائلون وهم الجمهور سواء قتله عمدا او خطاء فعلیه الجزاء (جصاص) الاصل فعل المتعمد والخطأ ملحق به للتغلیظ (مدارک) یحکم علیه فی العمد والخطاء والنسیان قال ابن عباس وروی عن عمر وطاؤس والحسن وابراهیم والزهری وبه قال مالک والشافعی وابوحنیفة واصحابهم (قرطبی) والذی علیه الجمهور ان العامد والناسی سواء فی وجوب الجزاء علیه (ابن کثیر)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس پوری آیت سے اہلِ ریاضت کے اس طریق کا ثبوت مل جاتا ہے کہ پہلی خطا پر اپنے نفس کو ایسی سزا دیتے ہیں جس کا تحمل ان کو آسان ہوتا ہے اور اگر وہ خطا پھر عود کرے تو اسے ایسی سزا دیتے ہیں جو اس پر قدرے دشوار ہو۔

۲۹۸ یعنی یہ کھانا اسی جانور کی تخمینی قیمت کے مساوی ہو۔

من النعم۔ چوپایوں سے مراد ہیں، اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری۔

یحکم به ذوا عدل منکم۔ یعنی اس جانور کی قیمت کا تخمینہ تم میں سے دو متدین اہل و صاحبِ بصیرت اشخاص کریں۔

بلغ الکعبة۔ "کعبہ تک" سے مراد ہے کہ حدودِ حرم کے اندر پہنچا دیئے جائیں، حرمت فقہی کے اعتبار سے کعبہ اور کل حرم دونوں یکساں ہیں، اور قربانی خاص کعبہ تک تو پہنچتی بھی نہیں۔

بلوغه الکعبة ذبحه فی الحرم لاخلاف فی ذلک وهذا یدل علی ان الحرم کله بمنزلة الکعبة فی الحرمة (جصاص) ویرسل من الحل الی مکة ولم یرد الکعبة بعینها فان الهدی لایبلغها اذهی المسجد وانما اراد الحرم ولاخلاف فی هذا (قرطبی) والکعبة انما ارید بها کل الحرم لان الذبح والنحر لایقعان فی الکعبة ولاعندها ملازقا لها (کبیر)

الکعبة۔ کعبہ پر حاشیہ ابھی آگے آ رہا ہے۔

۲۹۹ مساوی مقدار میں روزہ کے معنی یہ ہیں کہ ہر مسکین کے حصہ کا ایک ایک روزہ رکھا جائے۔

گویا کفارہ کی تین صورتیں ارشاد ہوئیں ہدی، اطعام، صیام اور تینوں مساوی ہیں جیسا کہ او کلمۂ تخییر کا اقتضاء ہے

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ

تمہارے لئے دریائی شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا، تمہارے نفع کے لئے اور قافلوں کے لئے ۳۰۳

وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ

اور تمہارے اوپر جب تک تم حالتِ احرام میں ہو خشکی کا شکار حرام کیا گیا

وما ذکرہ اللہ تعالیٰ فی ھذہ الآیۃ من الھدی والاطعام والصیام فھو علی التخییر لان او یقتضی ذلک وروی نحو ذلک عن ابن عباس وعطاء والحسن وابراھیم روایۃ وھو قول اصحابنا (جصاص)

۳۰۰ یعنی جو لوگ یہ جرمانہ ادا کر چکے، وہ معاف ہو جائیں گے۔

دوسرے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ قبل اسلام یا قبل نزول حکم جو کچھ گزر چکا، اس سے درگزر کردی جائے گی۔

عما کان فی الجاھلیۃ (ابن جریر عن عطاء) عما سلف منکم فی جاھلیتکم (ابن جریر) عما مضی فی الجاھلیۃ وعما سلف قبل التحریم فی الاسلام (کبیر)

۳۰۱ (اس جسارت اور ڈھٹائی کا)

گناہ کا اعادہ خود ایک دلیل ہے بے باکی اور ڈھٹائی کی۔

فینتقم اللہ۔ قرآن کا انتقام، اردو کے چلے ہوئے انتقام سے مختلف ہے، عربی میں نقمۃ کے معنی مطلق سزا کے ہیں

النقمۃ العقوبۃ (راغب)

مفسر تھانویؒ نے لکھا ہے کہ توبہ سے یہ علتِ انتقام خود ہی مرتفع ہو جائے گی۔

۳۰۲ اس میں رد آ گیا، بہت سی مشرک قوموں کے عقیدہ کا، جن کا معبود ہر طرح کی فعالیت سے محروم ہے، قرآن نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کو بار بار جتایا ہے کہ اللہ جب چاہے سخت سزا دینے پر بھی قادر ہے۔

۳۰۳ بحری مسافروں کے لئے دریائی جانوروں کے شکار کی اجازت ان کے حق میں رحمتِ خاص ہے۔

یہ ہدایتیں حالتِ احرام کے بارہ میں مل رہی ہیں، وَاَنْتُمْ حُرُمٌ کے تحت میں۔

صید البحر۔ بحر سے صرف سمندر مراد نہیں، ہر قسم کے دریا، ندی، جھیل، تالاب وغیرہ غرض پانی کا ہر ذخیرہ اس کے تحت میں آ جاتا ہے۔

وعنی بالبحر فی ھذا الموضع الانھار کلھا والعرب تسمی الانھار بحارا (ابن جریر) اصل البحر کل مکان واسع جامع للماء الکثیر (راغب) المفصل فیہ صید الماء فسائر حیوان الماء یجوز للمحرم اصطیادہ ولا نعلم خلافا فی ذلک بین الفقہاء (جصاص) والمراد بالبحر جمیع المیاہ والانھار (کبیر) والمراد بالبحر جمیع المیاہ (معالم)

اور دریائی جانور کی تعریف فقہاء نے یہ کی ہے کہ وہ وہ جانور ہے جس کا مولد بھی پانی ہے اور مسکن بھی پانی اس لئے مرغابی، بط وغیرہ اس تعریف کے بعد دریائی جانور کے حکم سے نکل گئے۔

طعامہ میں ضمیر صید کی طرف ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٩٦﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ

اور اللہ سے ڈرتے رہو جس کے پاس جمع کئے جاؤ گے ٣٠۴ اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی

الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْیَ وَالْقَلَآىِٕدَ ؕ

رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے ٣٠۵ (نیز) حرمت والے مہینہ کو اور حرم میں قربانی کو اور گلے میں پٹے پڑے ہوئے جانوروں کو ٣٠٦

قیل الضمیر للصید وطعامہ اکلہ (بیضاوی)

اور اس پر کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، لیکن بہت سے ارباب تفسیر ادھر بھی گئے ہیں کہ ضمیر بحر کی جانب ہے۔

ما قذفہ اونضب عنہ (بیضاوی)

تو گویا اب دو چیزیں ہوگئیں، ایک صید البحر دوسرے طعام البحر یہ ترکیب مان کر دونوں میں فرق یہ کیا گیا ہے کہ صید البحر وہ جانور ہے جس کا شکار کر کے اسے مارا جائے، اور طعام البحر وہ جانور ہے جسے دریا خود پھینک دے یا جو پانی کے پیچھے ہٹ آنے سے رہ جائے اور یہ تفریق حضرات صحابہ بلکہ حضرت صدیقؓ سے مروی ہے۔

طعامہ ما قذفت بہ (ابن جریر عن ابن عباسؓ) طعامہ ما قذف منہ (ابن جریر عن قتادہؒ) وھو الاحسن ما ذکرہ ابو بکر الصدیقؓ ان الصید ما صید بالحیلۃ حال حیاتہ والطعام ما یوجد مما لفظہ البحر او نضب عنہ الماء من غیر معالجۃ فی اخذہ وھذا ھو الاصح (کبیر)

اس اصل حکم سے مرشد تھانویؒ نے یہ استنباط کیا ہے کہ اس میں زہد کی تعدیل اور اس میں غلو کرنے سے منع ہے۔

٣٠۴ حاکم مطلق کی حکومتِ مطلقہ کا یہی اقتضا ہر حکم، ہر قید کو نفس کے لئے آسان بنا دینے کو کافی ہے۔ حرم علیکم۔ یہ حکم حرمت عام ہے شکار پکڑنے والے اور اس میں معین ہونے والے دونوں کے لئے۔

٣٠۵ (اور اس کے حفظِ ادب اور تعظیمِ شان کے لئے تو یہ سب حرم و احرام کے احکام و قواعد ہیں)

جعل یہاں صیّر کے معنی میں ہے، اور قیامًا اس کا مفعول ثانی ہے۔

بمعنی صیّر فیکون قیامًا مفعولًا ثانیًا (عکبری)

الکعبۃ۔ جس طرح لفظ اللہ خود دلالت کرتا ہے اپنے مسمّٰی کے سارے مخلوق سے بلند ہونے اور اس کے معبود ہونے پر، اور لفظ محمد خود جامعیت رکھتا ہے ہر طرح کی بزرگی اور ستودہ صفاتی کی، اسی طرح لفظ کعبہ کے اندر بھی دلالت اس کی عظمت و بزرگی کی موجود ہے۔

کعبہ۔ کے معنی ہی بلند مقام کے ہیں، اور یہ بلندی ظاہری و معنوی دونوں کی جامع ہے۔

سمیت الکعبۃ کعبۃ لارتفاعھا (کبیر) فالکعبۃ لما ارتفع ذکرھا فی الدنیا واشتھر امرھا فی العالم سمیت بھذا الاسم (کبیر)

کعبہ۔ سیاہ پتھر کی اس بلند اور مستطیل عمارت کا نام ہے، جو صحن مسجد الحرام (مکہ معظمہ) میں بنی ہوئی ہے، اور جس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا دنیا کے ہر مسلمان پر فرض ہے، اور حج و عمرہ میں طواف اسی کا کیا جاتا ہے۔

عمارت کی پیمائش میں اختلاف ہے، بلندی ۴۷ فیٹ یا ۵۰ فیٹ ہے، طول ۳۶ یا ۴۰ فٹ اور عرض ۳۰ یا ۳۵ فٹ کرسی سنگ مرمر کی ہے، اور زمین سے ۱۰ انچ بلند، شمالی کونے کو رکنِ عراقی کہتے ہیں، مغربی زاویہ رکن شامی کہلاتا ہے جنوبی گوشہ رکن یمانی، اور مشرقی زاویہ رکن اسود، حجرِ اسود جس کا بوسہ طوافِ حج میں کیا جاتا ہے، اسی رخ پر دیوار میں نصب ہے، زمین سے ۵ فٹ بلند، دروازہ ایک ہے، جو شمالی مشرقی دیوار میں ہے، زمین سے ۷ فٹ بلندی پر، جس زمانہ میں وہ کھلتا ہے، تو اُترنے چڑھنے کو ایک پہیہ دار زینہ لگا دیا جاتا ہے۔

یہ بھی شریعت کا متفقہ مسئلہ ہے کہ خانہ کعبہ سے نیچے تحت الثریٰ تک، اور اوپر آسمان تک، اس سیدھ میں جو کچھ بھی ہے، سب استقبال نماز کے لئے کعبہ ہی کے حکم میں ہے۔

کعبہ کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی نوعِ انسانی کی، روایتوں میں ہے کہ اوّلین کعبہ حضرت آدمؑ کے خیمہ کی شکل میں جنّت سے اترا تھا، موجودہ پختہ عمارت کے معمار اول حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ تھے۔

البیت الحرام کو بیت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں چھت اور دیواریں ہیں، اور یہ حقیقتِ بیت ہے، نہ اس لئے کہ اس میں کسی کی سکونت ہے۔

والبیت سمی بذلک لانہا ذات سقف وجدار وھی حقیقۃ البیتیۃ وان لم یکن بہا ساکن (قرطبی)

قیاماً۔ یعنی لوگوں کی حفاظت ونگہداشت کا ذریعہ و واسطہ، اور پھر قیاما للعرب نہیں، قیاما للناس، یعنی ساری کائناتِ انسانی اسی کے دم سے قائم، انسانیت کی سانس اسی کے وجود سے وابستہ، گویا اس میں اس کا وعدہ بھی آگیا کہ جب تک انسانی آبادی قائم ہے، خانۂ کعبہ کا بھی وجود باقی رہے گا۔

اراد انہ جعل ذلک قواما لمعایشھم وعمادًا لھم فھو قوام دینھم ودنیاھم (جصاص) اصلہ قوام وھو ما یستقیم بہ الامر ویصلح (کبیر) یعنی یقومون بہا (قرطبی) ای سببا لقوام مصالح الناس (کبیر) ھو سبب لامن الناس عن الآفات والمخافات وسبب لحصول الخیرات والسعادات فی الدنیا والآخرۃ (کبیر) ای سبب اصلاح امورھم (روح)

امام رازیؒ لکھتے ہیں کہ کعبہ کے سبب قوام ہونے کی متعدد توجیہیں کی گئی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ وہ سب درست ہوں اور کعبہ قیاما للناس کسی ایک ہی جہت سے نہیں، متعدد جہات سے ہو۔

لایبعد حمل الآیۃ علی جمیع ھذہ الوجوہ وذلک لان قوام المعیشۃ اِمّا بکثرۃ المنافع واما بدفع المضار واما بحصول الجاہ والریاسۃ واما بحصول الدین فلما کانت الکعبۃ سببا لحصول ھذہ الاقسام الاربعۃ وثبت ان قوام المعیشۃ لیس الا بھذہ الاربعۃ ثبت ان الکعبۃ سبب لقوام الناس (کبیر)

احادیث میں آتا ہے کہ جب خانۂ کعبہ کا ہدم کافروں کے ہاتھ سے ہو جائے گا، تو اس کے بعد قیامت بھی آجائے گی۔

**۳۰۶** ھدی اور قلائد پر حاشیے پارۂ ششم میں سورۂ مائدہ کے شروع میں گزر چکے۔

الشھر الحرام۔ یعنی حرمت والے چاروں مہینہ۔

وھو اسم جنس والمراد الاشھر الثلاثۃ باجماع من العرب (قرطبی) اراد بالشھر الحرام الاشھر الحرم الاربعۃ الا انہ عبر عنھا بلفظ الواحد (کبیر) عن الحسن انہ قال ھو الاشھر الحرم فاخرجہ مخرج الواحد لانہ اراد الجنس۔ (جصاص)

ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ

یہ اس لئے کہ تم یقین کر لو کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اللہ اس سب کا علم رکھتا ہے اور یہ کہ اللہ

بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

ہر چیز کا پورا علم رکھتا ہے ۳۰۵ جان رکھو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا بھی ہے ۳۰۶ اور اللہ بڑا مغفرت والا بڑا رحمت والا

رَّحِيْمٌ ۝ مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝

بھی ہے ۳۰۷ اور رسول کے ذمہ تو بجز تبلیغ کے اور کچھ نہیں اور اللہ اس کو بھی جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور اس کو بھی جو چھپاتے ہو

بعض نے صرف ماہ ذی الحجہ ہی مراد لیا ہے۔

وهو ذو الحجة لانه المناسب لقرنائه ثم بينا ... الذي يؤدى فيه الحج وهو ذو الحجة (روح)

ف ۳۰۵ (کہ اس کا علم ذاتی بھی ہے اور محیط و کامل بھی) اور اسی لئے صرف اسی سے ایسی پیشگوئیوں کا صدور ممکن ہے

كان تعالى في الازل عالما بجميع المعلومات من الكليات والجزئيات (كبير)

ذٰلِكَ یعنی خانۂ کعبہ کا قیاماً للناس ہونا اور اس کی مصلحتیں خصوصاً یہ پیشگوئی کہ ثباتِ نسلِ انسانی

حرم کعبہ کے وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔

اشارة الى جعل الله هذه الامور قياما (قرطبي) ... ذلك التدبير اللطيف لاجل ان تتفكروا فيه (كبير)

لتعلموا۔ علم یہاں یقین کے معنی میں ہے (تھانوی) یا علم سابق کو مستحضر کر لینے کے معنی میں۔

لتعلموا۔ علیم۔ گمراہ مشرک قوموں کو بہت زیادہ ٹھوکریں اللہ کی صفت علم ہی کے بارے میں لگی ہیں

اس لئے قرآن اس صفت باری کا ذکر بار بار کرتا ہے۔

ف ۳۰۶ (نا قابل اصلاح نافرمانوں کے لئے)

کثرت سے انسانی طبیعتیں ایسی بھی ہیں جو صرف تخویف و ترہیب ہی سے متاثر ہوتی ہیں (اور جو کچھ ایسے لوگ اصلاح صرف کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے رفتہ رفتہ ان میں اتنی قساوتِ قلب پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اصلاح کی حد سے گزر جاتے ہیں) ان کے لئے آخری صورت عذاب الٰہی ہی کی رہ جاتی ہے۔

ان مشرک قوموں کے عقیدے کی تردید بھی اسی آیت سے نکل آتی ہے جو خدا کو کسی سختی یا سخت گیری کا سرے سے اہل ہی نہیں سمجھتی ہیں۔

ف ۳۰۷ (اس لئے اگر خلاف ورزی ہو جائے تو بے تاخیر توبہ و تدارک بھی کر لو۔)

اللہ کا معمول و عادت مسلسل قرآن مجید کے ساتھ اپنی صفات جمال، مغفرت و رحمت کے ساتھ دیتا ہے۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ آیت سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت و ربوبیت کا بیان تھا اور درمیان میں عقاب کا ذکر آگیا آیت کا خاتمہ بھی صفات مغفرت و رحمت کے ذکر پر ہوا ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ تخفیف ...

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ ۚ

آپ کہہ دیجئے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، گو تجھے ناپاک کی کثرت حیرت میں ڈالتی ہو ۳۱۱ھ

ابتدا بھی رحمت ہی سے ہوئی ہے اور خاتمہ بھی رحمت ہی پر ہوگا۔

ھذا تنبیہ علی دقیقۃ وھی ان ابتداء الخلق والایجاد کان لاجل الرحمۃ والظاھر ان المختتم لایکون الا علی الرحمۃ (کبیر)

غفور رحیم۔ غفور ہے گناہ گاروں کے حق میں اور رحیم ہے کل بندوں کے حق میں۔

۳۱۰ھ اللہ اور اس کے رسول کی جداگانہ حیثیتوں کی یہ تصریح مشرک منش مخاطبین کے لئے بار بار ضروری ہوئی، اور بار بار بتانا پڑا کہ رسول کے ہاتھ میں ہدایت، تقسیم عذاب و ثواب کچھ بھی نہیں، صرف تبلیغ ہے۔

ای لیس لہ الھدایۃ والتوفیق ولا الثواب وانما علیہ البلاغ (قرطبی)

البلاغ۔ یعنی تبلیغ احکام کی اور پیام کی۔

ما تبدون۔ یعنی تمہارے اقوال اور تمہارے افعال ـــــ تمہارا سارا ظاہر۔

ما تکتمون۔ یعنی تمہارے اسرار اور محرکاتِ عمل ـــــ تمہارا سارا باطن۔

اللہ کی ان دونوں صفات کو یاد دلا کر گویا یہ بتا دیا کہ اطاعت ظاہری بھی ہونا چاہئے اور اطاعت باطنی بھی۔

۳۱۱ھ (اے مخاطب)

الخبیث۔ نافرمان یا نافرمانی، ذات و صفات سب کے لئے جامع۔

والصحیح ان اللفظ عام فی جمیع الامور یتصور فی المکاسب والاعمال والناس والمعارف من العلوم وغیرھا (قرطبی)

الطیب۔ فرماں بردار یا فرماں برداری ـــــ طیب جب خبیث (گندہ و ناپاک) کے مقابلہ میں ہے، تو اس کے معنی پاک، پاکیزہ و لطیف کے ہوں گے۔

لا یستوی۔ اس لئے کہ ایک اللہ کے ہاں محبوب و محمود ہے، اور دوسری مبغوض و مردود۔

امام رازیؒ نے فرمایا ہے کہ عالمِ روحانیات میں جو چیزیں گندی یا خبیث ہیں، وہ عالمِ جسمانیات میں بڑی مقدار والی اور بڑی لذت والی دکھائی دیتی ہیں لیکن ان کی یہ ظاہری مقدار و لذتِ دائمی اور سرمدی لذتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دینے والی ہے، اس لئے ان کا اور ان کا کوئی مقابلہ ہی کیا؟

یعنی ان الذی یکون خبیثا فی عالم الروحانیات قد یکون طیبا فی عالم الجسمانیات ویکون کثیر المقدار وعظیم اللذۃ الا انہ مع کثرۃ مقدارہ ولذاذۃ متناولہ وقرب وجدانہ سبب للحرمان من السعادات الباقیۃ الابدیۃ السرمدیۃ (کبیر)

ولو اعجبک۔ یعنی اس پر حیرت نہ کرو کہ جب نافرمان اور نافرمانی اس قدر مبغوض ہیں تو پھر ان کی کثرت و فراوانی کیوں ہے؟ یہ ترقی یقیناً دلیل مقبولیت نہیں، اس کی بنا دوسری ہی تکوینی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔

الخطاب لہ انہ صار عندہ عجبا مما یشاھد من کثرۃ الکفار والمال الحرام وقلۃ المؤمنین والمال الحلال (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہلِ حقائق کے مقابلہ میں اہلِ رسوم کی کثرت سے دھوکا نہ کھانا چاہئے۔

۱۳۷ ع

فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿١٠٠﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ

سو اے عقل والو اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ (پوری) فلاح پا جاؤ ۳۱۲ ے اے ایمان والو ایسی

اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ

باتیں مت پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں ۳۱۳ ے

ولو اعجبک کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ "گو تجھے بھلی لگے۔"

سرّک (معالم) ای وان سرّک ایها الناظر۔ (روح)

آج دنیا میں فسق و خبث کی کثرت بھی ہے، اور ہر طرح کی ظاہری خوشنمائی و زینت بھی، اور ایسا ہی کم و بیش ہر زمانہ میں رہا ہے، اور عام بشری طبیعتوں کا اس سے متاثر و مرعوب ہونا بھی قدرتی ہے ۔۔۔ خبث و خباثت کی "کثرت" جب آج سے ۱۴ سو سال قبل بھی تھیں تو آج اس کی کثرت کا کہنا ہی کیا!

۳۱۲ ے (دنیا اور آخرت دونوں میں)

فاتقوا اللہ۔ یعنی راہ ہدایت اور پاکیزگی ہی کی اختیار رکھو، اور بدی اور گندگی کی کثرت یا ظاہری خوشنمائی سے متاثر ہو کر ادھر نہ جھک جاؤ۔

ای اثروا الطیب وان قل علی الخبیث وان کثر۔ (کشاف)

تفلحون کو فاتقوا پر مرتب کر کے گویا یہ بتا دیا کہ فلاح کی بنیاد تقوی الٰہی ہی پر ہے۔

خطاب اولی الالباب سے کر کے ادھر اشارہ کر دیا کہ عین عقل و بصیرت ہی کا تقاضہ یہ ہے کہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی سے بچا جائے، اور راہ تقوی اختیار کی جائے۔

اولی الالباب۔ لُب کے معنی عقل خالص کے ہیں، جو ہر طرح کی آمیزش و کدورت سے پاک ہو۔

اللبّ العقل الخالص من الشوائب۔ (راغب)

عقل انسان کے پاس اللہ ہی کی بخشی ہوئی ایک بہت بڑی نعمت ہے، قرآن مجید عقل کو دباتا نہیں، بلکہ صحیح حدود کے اندر عقل سلیم سے کام لینے پر تاکید کی ہے۔

فاتقوا ..... تفلحون۔ انسان اگر عقل سلیم سے ذرا کام لیتا ہے تو اس پر خود واضح ہو جائے گا کہ دین و دنیا کی ساری برکتیں اور راحتیں اسلام ہی کے پیش کردہ نظام زندگی سے وابستہ ہیں۔

۳۱۳ ے ممانعت ایسے سوالات سے ہو رہی ہے جو سرتاسر فضول و لایعنی ہوں مثلاً لوگوں کے جزئیات زندگی کے بابت سوالات کرتے رہنا۔ سوال دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ کوئی معاشی یا معادی ضرورت واقعی پیش آ جائے یا اس کے پیش آ جانے کا احتمال قوی ہو اور صاحب شریعت سے ادب و احترام کے ساتھ اس کی بابت پوچھ لیا جائے، دوسرے یہ کہ غرض و مقصد صحیح کچھ بھی نہ ہو، اور دور دور کے احتمالات پیدا کر کے سوال محض سوال کرنے ہی کی نیت سے کیا جائے، تحقیقات اپنے دل سے گڑھے جائیں، اور گویا رسول کا امتحان لینے کو سوالات اس کے

وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ

اور اگر تم انھیں دریافت کرتے رہوگے اس زمانہ میں جبکہ قرآن اتر رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی ۳۱۴ اللہ نے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا

ان کی بابت درگزر کی، اور اللہ بڑا مغفرت والا ہے بڑا حلم والا ہے ۳۱۵ لوگ تم سے قبل بھی ایسی ہی پوچھ پاچھ کر چکے ہیں،

بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ

پھر ان سے منکر ہو ہو گئے ہیں ۳۱۶ اللہ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے نہ سائبہ کو نہ وصیلہ کو نہ حامی کو ۳۱۷ البتہ

سامنے پیش کئے جائیں، یہاں ذکر اسی آخری قسم کا ہے، اور اسی سوال بازی کو ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔

ان تبد لکم تسوءکم۔ ناگوار ہونے کی صورتیں مثلاً یہ کہ تمھارے کسی چھپانے والے واقعہ کی پردہ دری ہو جائے اور تمھیں تفضیح و رسوائی کا سامنا کرنا پڑے یا ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کی تعمیل تم پر شاق گزرے۔

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انس رضی صحابی سے روایت آئی ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلعم سے عرض کی کہ اچھا یہ بتائیے کہ میرا باپ کون تھا؟ آپ نے فرمایا کہ فلاں شخص، اسی طرح ترمذی وغیرہ میں حضرت علی رضی سے روایت ہے کہ جب فرضیتِ حج کی آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کرنا شروع کیا کہ کیا ہر سال فرض ہے؟ —— یہ دو نمونے ہیں اس قسم کے بیجا سوالات کے جن کے خلاف یہاں تنبیہ کی جا رہی ہے۔

"احکام میں جیسا یہ سوال بوجہ افراط کے ممنوع ہے، واقعات میں یہ سوال موجب تفریط فی الاطاعت و الادب بھی ہے چنانچہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ استہزاءً پوچھتے تھے —— پس آیت سب اقسام سوال کو اور سب اقسام جواب کو شامل ہے اور علت نہی کی کہیں افراط ہوگی کہیں تفریط، اور ناگواری جواب کا احتمال کہیں تحریم سے ہوگا کہیں رسوائی سے کہیں زجر سے اور بعد ختم نزول وحی کے ایسے سوالات سے نہی کی علت اضاعتِ وقت اور مجیب کو ضیق میں ڈالنا ہے" (تھانوی)

روی مسلم عن المغیرۃ بن شعبۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان اللہ حرم علیکم عقوق الامھات الخ وکرہ لکم قیل وقال وکثرۃ السؤال الخ وقال کثیر من العلماء التکثیر من السؤال فی المسائل الفقھیۃ تنطعا وتکلفا فی مالم ینزل والأغلوطات وتشقیق وقد کان السلف یکرھون ذلک ویرونہ من التکلیف (قرطبی)

۳۱۴ تو ایسے ہی سوالات جن میں یہ احتمالات ہوں ممنوع قرار دیئے جاتے ہیں۔

ھذا تادیب من اللہ لعبادہ المومنین ونھی لھم عن ان یسألوا عن اشیاء مما لا فائدۃ لھم فی السوال والتنقیب عنھا لانھا ان اظھرت لھم تلک الامور ربما ساءتھم وشق علیھم سماعھا۔ (ابن کثیر)

۳۱۵ (اس لئے حکم کی خلاف ورزی پر گرفت اگر فوری نہیں ہوئی تو اس سے مطمئن اور بے خوف نہ ہو جاؤ) عنھا۔ یعنی ان سوالات کے بارہ میں جو تم اب تک کر چکے۔

ای عن المسئلۃ او عن السؤالات (قرطبی) ای عما سلفکم من مسالکم واغضابکم للرسول بسببھا (کبیر)

وَلَا وَصِيلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ

جو لوگ کافر ہیں وہی اللہ پر جھوٹ جوڑتے رہتے ہیں اور ان میں سے اکثر عقل سے

الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى

کام ہی نہیں لیتے ۳۱۸ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ نازل کیا ہے اس کی طرف

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا

اور رسول کی طرف آؤ ۳۱۹ تو کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو پایا ہے ۳۲۰

غفور۔ اس صفت عفو کا اقتضاء ہے کہ اس نے ماضی کو معاف کر دیا۔

۳۱۶ اس کفر وانکار کی دو صورتیں ممکن تھیں، اور دونوں واقع ہو چکی تھیں، ایک یہ کہ جو احکام دیئے گئے ان کا حق ادا نہ کیا، دوسرے یہ کہ جو واقعات بیان کئے گئے، ان سے متاثر نہ ہوئے۔

قوم من قبلکم۔ یہ کن لوگوں کی طرف اشارہ ہے؟ عام طور سے مراد بنی اسرائیل سے لی گئی ہے کہ سابق انبیاء کی امتوں میں وہی کھود کھود کر اور کرید کرید کر سب سے زیادہ سوال کرنے کے عادی رہے ہیں، گنجائش دوسری امتوں سے بھی مراد ہونے کی ہے۔

۳۱۷ ماجعل اللہ۔ یعنی اللہ نے ان چیزوں کو مشروع نہیں کیا۔

والمعنی ما سمی اللہ ولا سن ذلک حکما ولا تعبد به شرعا (قرطبی) لے ما انزل اللہ ولا امر به (معالم)

یہ سب اصطلاحیں عرب جاہلیت کی ہیں۔

بحیرہ۔ وہ اونٹنی تھی جو دس بچہ جنتی، اور ان میں کا آخری نر ہوتا، اس کا کان چیر کر اسے سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دیا جاتا، اور کوئی کام اس سے نہ لیا جاتا۔

سائبہ۔ بھی وہ اونٹنی ہے جو کسی دیوتا کے نام پر سانڈ کی طرح آزاد چھوڑ دی جاتی اور اسے چارہ پانی سے نہ روکا جاتا۔

وصیلہ۔ بھی اونٹنی ہی کی ایک قسم ہے، مادہ جننے والی، اسے بھی کسی دیوی کے نام پر آزاد چھوڑ دیا جاتا۔

حامی۔ نر اونٹ کی ایک قسم ہے، جس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا۔

اہل شرک کی رسمیں ہر ملک میں ملتی جلتی سی ہیں، یہاں یہ بتایا ہے کہ اس قسم کی گڑھی ہوئی رسمیں اور ایسے جانوروں کا ادب واحترام ہرگز مشروع نہیں۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ابطال ہے اہل جاہلیت کی اس بدعت کا کہ بعض چیزوں کو غیر اللہ سے نامزد کر دیتے تھے، جیسا کہ اب بھی بعض جہلاء ارواح طیبہ سے تقرب حاصل کر لینے کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

۳۱۸ (اور سمجھتے رہتے ہیں کہ خدا ان لغویات وخرافات سے خوش ہوگا۔)

لے ماشرع اللہ هذه الاشياء ولا هي عنده لا قربة ولكن المشركون اقروا ذلك وجعلوه شرعا لهم وقربة يتقربون بها اليه (ابن کثیر)

أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٠٤﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

تو کیا جاہے ان کے بڑے نہ کسی شے کا علم رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یاب بھی ہوں ۳۲۱ اے ایمان والو تم اپنی ہی

آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ

فکر میں لگے رہو، کوئی بھی گمراہ ہو جائے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں جبکہ تم راہ پر چل رہے ہو ۳۲۲

یفترون علی اللہ الکذب ۔ اہل شرک اپنے عقائد وغیرہ کی طرح رسوم کے باب میں بھی افتراء علی اللہ پر بڑے جری وبے باک ہوتے ہیں، اور یہ گڑھنے والے عموماً مشرکین کے خواص و اکابر ہوتے ہیں۔

اکثرھم لا یعقلون ۔ یہ کورانہ تقلید کرنے والے مشرکین کے عوام ہوتے ہیں، اور انھیں کی تعداد بڑی ہوتی ہے۔

والمعنی ان الرؤساء یفترون علی اللہ الکذب فاما الاتباع والعوام فاکثرھم لا یعقلون (کبیر)

۳۱۹ یعنی حق و باطل کا معیار محض احکام خدا و رسول کو قرار دو، اپنے مزعومات و مظنونات کو شریعت کی کسوٹی پر کسو، پرکھو، جانچو۔

۳۲۰ (اور ہمیں کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہیں)

تقلید جامد جاہلوں کا سہارا ہر ملک اور ہر دور میں رہا ہے، کسی صاحب علم کی تقلید اگر اس اعتماد پر کی جائے کہ وہ احکام شریعت کا ماہر ہے تو یہ ممنوع نہیں بلکہ عین مطلوب ہے، لیکن آنکھ بند کر کے اپنے اسلاف کی راہ پر اس لئے چلتے رہنا کہ وہ اسلاف تھے یہ اندھی تقلید محض معصیت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتی ہے اور اسی کا نام رسم پرستی ہے ——— آج ہندوستان کی بڑی آبادی کے پاس نہ کوئی "کتاب" ہے نہ کسی رسول کی تعلیم محفوظ، بس صرف رسوم کا ایک مجموعہ ہے، جو سیکڑوں ہزاروں برس ہوئے ہاتھ آ گیا تھا، اور اسی طرح اندھا دھند اس کی پوجا ہوتی چلی آرہی ہے۔ مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ آیت میں ابطال ہے جاہل صوفیہ کے اس طریقہ کا کہ جب ان کے سامنے شریعت پیش کی جاتی ہے تو اس کے بجائے وہ اپنے مشائخ کے معمولات سے تمسک کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

۳۲۱ یعنی کیا ان کا یہ خیال جب بھی ہے جب ان کے بزرگ علم نہ رکھتے ہوں حقائق دین سے کسی شے کا، اور ہدایت نہ رکھتے ہوں کسی کتاب الٰہی کے ذریعہ سے؟

وتقدیرہ أحسبھم ذلک ولو کان اٰباءھم (کشاف)

أوَ میں و حالیہ ہے، اور اس پر ہمزہ (أ) انکار کا داخل ہوا ہے۔

واو الحال قد دخلت علیھا ھمزۃ الانکار۔ (کشاف)

اندھی تقلید آباء اور سلف پرستی پر جو ملامت آیت سے ٹپک رہی ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔

۳۲۲ حکم افراد کو ہے کہ تم دوسروں کی فکر میں اتنا زیادہ کیوں گھلے جاتے ہو، مقدم فکر اپنی ہے، اپنے مطالبات دین ادا کئے جاؤ، تم پر دوسرے کی ذمہ داری نہیں ہے، تم سے پرسش تمہارے ہی احوال کی ہوگی۔ آیت میں ایک زبردست اصول یعنی شخصی ذمہ داری کا اثبات ہے، اور ان لوگوں کا ابطال ہے جو انفرادیت کو اجتماعیت میں گم رکھنا چاہتے ہیں۔

إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ

اللہ ہی کی طرف تم سب کی واپسی ہے سو وہ تمھیں جتلادے گا جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے ۳۲۳؎ اے ایمان والو جبکہ

آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ

تم میں سے کسی کو موت آجائے وصیت کے وقت تمھارے آپس میں گواہ دو شخص تم میں سے معتبر ہوں ۳۲۴؎

علیکم انفسکم۔ یعنی اپنے نفس کی نگرانی اپنے اوپر لازم کرلو۔

معناہ احفظوا انفسکم من المعاصی (قرطبی)

علیکم، محاورہ میں جب صیغۂ مخاطب میں آتا ہے تو اس کے معنی لازم پکڑ لینے کے ہوتے ہیں، صیغۂ غائب وغیرہ میں نہیں آتا۔

تقول علیک زیداً بمعنی الزم زیداً ولا یجوز علیہ زیداً بل انما یجری ھذا فی المخاطبۃ (قرطبی)

دوسروں کی بھی بقدر وسعت و استطاعت اصلاح شخصی مطالبات دین ہی میں شامل ہے ان کے منافی نہیں مقصود دوسروں کی اصلاح کے کام سے روکنا نہیں صرف اس کے مبالغہ آمیز تخیل میں اعتدال پیدا کرنا ہے، مطلب یہ نہیں کہ دوسروں کو اچھی بری بات بتاؤ نہیں بلکہ یہ ہے کہ دوسروں کی عیب چینی اور کھوج میں نہ پڑے رہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو بجائے خود ایک انفرادی فریضہ ہے اس کا سقوط مقصود نہیں اور آیت سے اس کی کوئی سند نہیں مل جاتی کہ جب ممکن بھی ہو، جب بھی انسان دوسروں کی ہدایت و اصلاح کا فریضہ ترک کئے رہے اسلام تو ایک اجتماعی دین ہے، جس میں فرد کے ساتھ ساتھ جماعت، ملت کی بھی صلاح و فلاح مطلوب ہے۔

قال ابن خویز منداد تضمنت الآیۃ اشتغال الانسان بخاصۃ نفسہ وترکہ التعرض لمعایب الناس والبحث عن احوالھم فانھم لا یسألون عن حالہ فلا یسأل عن حالھم (قرطبی) ومن الاھتداء اتباع امر اللہ فی انفسنا وفی غیرنا فلا دلالۃ فیھا اذاً علی سقوط فرض الامر بالمعروف والنھی عن المنکر (جصاص) اخبر ابوبکرؓ ان ھذہ الآیۃ لا رخصۃ فیھا فی ترک الامر بالمعروف والنھی عن المنکر (جصاص) لیس فیھا دلیل علی ترک الامر بالمعروف والنھی عن المنکر اذا کان فعل ذلک ممکنا (ابن کثیر)

آیت کا ایک محمل یہ بھی ہے کہ انسان جب یہ دیکھ لے کہ وعظ و پند مطلق کارگر نہیں ہوتا، بلکہ الٹا اس پر اور مضحکہ ہوتا ہے تو ایسے موقع پر چاہیئے کہ سکوت سے کام لے، اور بس اپنے ہی ذاتی اعمال کی فکر میں لگا رہے۔

قیل الآیۃ فی اھل الاھواء الذین لا ینفعھم الوعظ فاذا علمت من قوم انھم لا یقبلون بل یستخفون ویظھرون فاسکت عنھم۔ (قرطبی)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ یہی طریقہ ہے عارفین سالکین کا کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کردینے کے بعد پھر کسی کے زیادہ درپے نہیں ہوتے۔

۳۲۳؎ (کہ حشر میں اصلی وقت و مقام نتائج کے ظہور تام کا ہوگا)

الی ... جمیعا۔ یہ تصریح ضروری تھی، اس لیے کہ بعض مذہبوں نے داور محشر بجائے اللہ کو قرار دینے کے "ابن اللہ" وغیرہ کو قرار دیا ہے

۳۲۴؎ قرآن محض ایک پندنامۂ اخلاق نہیں، قانون کی بھی کتاب ہے، زندگی میں قانون، اخلاق، خطابت

سب ہی کی اپنی اپنی جگہ ضرورت ہوتی ہے، اور قرآن نے جو مکمل ہدایت نامہ اور زندگی کا مکمل دستور العمل ہے سب ہی سے اپنی اپنی جگہ کام لیا ہے۔ اس جگہ قانون وصیت و وراثت کا بیان مختلف پہلوؤں سے آرہا ہے۔

بینکم۔ یعنی تمہارے آپس کے معاملات میں، مثلاً موت کے وقت ورثہ کو مال سپرد کرنے کے وقت اصطلاح فقہ میں ایسے اشخاص کو وصی کہتے ہیں، اور انھیں کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر کیا گیا ہے، یہاں کوئی حکم نہیں مل رہا ہے، صرف بہ طور مشورۂ مناسب کے ارشاد ہو رہا ہے۔

منکم۔ یعنی مسلمان ہوں، تم میں سے ہوں تمہارے غیر نہ ہوں۔

ای من المسلمین قاله الجمهور (ابن کثیر)

ہاں اوصیاء کو مسلمان ہونا چاہیئے، عادل یا ثقہ ہونا چاہیئے، اور تعداد میں دو ہونا چاہیئے، لیکن فقہاء نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ ان کا مسلمان اور عادل ہونا صرف افضل ہے، شرط لازمی نہیں، جیسا کہ خود قرآن مجید میں بھی ابھی آرہا ہے، اور یہ قبول شہادت میں ذمیین تک کے لئے یہ وسعت صرف مسئلہ وصیت میں ہے۔

ھذان شرطان لجواز استشهاد الذمیین عند فقد المومنین ان یکون ذلك فی سفر، وان یکون فی وصیة کما صرح بذلك شریح القاضی (ابن کثیر) قال شریح من کان بارض غربة ولم یجد مسلما یشهده علی وصیته فاشهد کافرین علی ای دین کانا من دین اهل الکتاب او عبدة الاوثان فشهادتهم جائزة ولا یجوز شهادة کافر علی مسلم الا علی وصیة فی سفر (معالم)

صاحب تفسیر المنار نے یہاں ایک مستقل عنوان مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلموں کی شہادت کا قائم کرکے یہ بتایا ہے کہ جہاں کہیں زن مسلمہ کی حرمت و ناموس کا معاملہ ہے، وہاں تو شہادت میں مومنین کی قید لگی ہوئی ہے لیکن جہاں یتیموں کو محض مال دلانے یا خرید و فروخت کا ذکر ہے، وہاں کوئی ایسی قید نہیں حکم مطلق ہے۔

نری انه جل وعز اشترط فی الاستشهاد والاشهاد فی الوقائع المتعلقة بامور المومنات الشخصیة ان یکون الاشهاد من المومنین ولم یذکر هذا القید فی الاشهاد علی دفع اموال الیتامی الیهم ولا فی الاشهاد علی البیع (المنار)

امام ابو حنیفہؒ نے اسی آیت سے ذمیوں کے آپس کے معاملات میں قبول شہادت کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

استدل ابو حنیفة بهذه الآیة علی جواز شهادة الکفار من اهل الذمة فی ما بینهم قال ومعنی اوآخران من غیرکم ای من غیر اهل دینکم فدل علی جواز شهادة بعضهم علی بعض (قرطبی)

ضربتم فی الارض۔ ضرب فی الارض۔ کے معنی محاورہ میں سفر کرنے کے آتے ہیں (مطلق ضرب کے معنی سفر کرنے اور چلنے کے نہیں جیسا کہ ایک جدید فرقہ نے اپنی تفسیروں میں لکھ دیا ہے، بلکہ جب فعل ضرب کا صلہ فی کے ساتھ آئے اس وقت یہ معنی ہو جاتے ہیں)

ای سافرتم (قرطبی)

پوری تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے۔

ان انتم ضربتم فی الارض فاصابتکم مصیبة الموت فاوصیتم الی اثنین عدلین فی ظنکم ودفعتم الیهما ما معکم من المال ثم متم وذهبا الی ورثتکم

اگر تم سفر کر رہے ہو اور اس حال میں تمہیں موت آگئی، اور تم نے اپنے خیال میں دو متدین شخصوں کو اپنا وصی مقرر کرکے مال ان کے سپرد کر دیا پھر تمہاری وفات ہوگئی اور دونوں وصی تمہارا ترکہ لے کر تمہارے وارثوں

اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ

یا دو گواہ تم میں سے کے علاوہ ہوں ۳۲۵ جب تم زمین پر سفر کر رہے ہو اور تم پر موت

فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ

کا واقعہ آ پہنچے۔ تو اگر تم کو شبہ ہو جائے ۳۲۶ تو دونوں (گواہوں) کو بعد نماز روک رکھو اور

فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ

وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہم اس کے عوض کوئی نفع نہیں لینا چاہتے خواہ کسی قرابتدار (ہی کے لئے)

وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿١٠٦﴾

ہو اور نہ ہم اللہ کی گواہی چھپائیں گے، ورنہ ہم بے شک گنہگار ہوں گے ۳۲۷

بالترکة فارتابوا فی امرھما وادعوا علیھما خیانة فالحکم ان تحبسوھما من بعد الصلاة ای تستوثقوا منھما. (قرطبی)

کے پاس گئے اور ان لوگوں کو ان گواہوں کے بیان میں شک پیدا ہوا اور ان دونوں پر انھوں نے دعویٰ دائر کر دیا تو اب چاہیے کہ نماز کے بعد ان دونوں گواہوں کو روک لو اور ان سے پوچھ پاچھ کرو۔

فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ وصی اگر دو نہ ہوں یا ایک بھی نہ ہو، جب بھی وصیت جائز رہے گی۔

یہ آیتیں اپنی ترکیب نحوی وغیرہ کے لحاظ سے قرآن کے مشکل ترین مقامات میں سے ہیں، اور یہ دشواری اس بے علم وکم سوادہی کو نہیں محسوس ہوئی ہے، اکابر قدیم بھی کچھ ایسا ہی فرما گئے ہیں۔

هذه الآيات الثلاث عند اهل المعاني من اشكل ما في القرآن اعرابا ومعنى وحكما ـــــ وقال ابن عطية هذا كلام من لم يقع له الثلج في تفسيرها (قرطبی) اتفق المفسرون على انها في غاية الصعوبة اعرابا ونظما وحكما (کبیر)

۳۲۵ یعنی اگر حالت سفر وغیرہ میں مسلمان اور عادل اوصیاء نہ مل سکیں تو غیر مسلم گواہ بھی جائز ہیں۔ صحابہ اور تابعین اور فقہاء میں سے ایک بڑے گروہ کا مذہب یہی ہے۔

من غيركم ضمير للكافرين وهو الاشبه بسياق الآية مع ما تقرر من الاحاديث وهو قول ثلاثة من الصحابة الذين شاهدوا التنزيل ابوموسى الاشعري وعبد الله بن قيس وعبد الله بن عباس (قرطبی) هذا معنى الآية على مذهب ابي موسى الاشعري وسعيد بن المسيب ويحيى بن يعمر وسعيد بن جبير وابي مجلز و ابراهيم وشريح وعبيدة السلماني وابن سيرين ومجاهد وقتادة والسدي وابن عباس وغيرهم وقال به من الفقهاء سفيان الثوري واختاره احمد بن حنبل كلهم يقولون منكم من المومنين ومعنى من غيركم يعني الكفار (قرطبی) اى من غير دينكم وملتكم في قول اكثر المفسرين قال ابن عباس وابوموسى الاشعري (معالم)

۳۲۶ (ان اوصیاء کی دیانت وشہادت کے باب میں۔)

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ

پھر اگر خبر ہو جائے کہ وہ دونوں (وصی) حق بات دبا گئے ۳۲۸ تو دو گواہ دوسرے ان کی جگہ اور مقرر ہوں ان لوگوں میں سے

خطاب یہاں وارثوں سے ہے۔

۳۲۷ شریعتِ اسلامی جو انفرادی و اجتماعی ہر بشری ضرورت کی کفیل ہے یہاں ایک کثیر پیش آجانے والی ضرورت کا صحیح طریقۂ تعلیم کر رہی ہے، ارشاد یہ ہے کہ مسلمان اگر اپنی موت کے وقت اپنا مال کسی کو حوالہ کرنا چاہے تو بہتر ہے کہ دو معتبر مسلمانوں کو گواہ کر جائے لیکن گواہ اگر مسلمان نہ مل سکیں جیسا کہ حالتِ سفر وغیرہ میں اکثر اتفاق ہو جاتا ہے تو پھر دو غیر مسلموں ہی کو گواہ بنالے پھر اگر ان گواہوں کی دیانت ہی سے متعلق شبہ ہو جائے اور وارث اپنا دعوی ان کے بیان کے خلاف پیش کر دیں لیکن گواہ نہ رکھتے ہوں تو اس وقت خود ان اوصیاء سے مؤکد بہ حلف بیان لیا جائے۔ کہ اور کہاں؟ بعد نماز کہ وہ وقت عموماً عظمت الٰہی کے استحضار کا ہوتا ہے اور مسجد میں کہ خلق کے سامنے انسان عادۃً کذب بیانی سے شرماتا ہے۔

بعد الصلوٰۃ۔ نماز سے یہاں مراد عموماً نماز عصر لی گئی ہے، گو جائز ہر نماز کا وقت سمجھا گیا ہے۔

یعنی صلاۃ العصر قالہ الاکثر من العلماء وقیل ای صلوٰۃ کانت (قرطبی) ای صلاۃ العصر کما روی عن ابی جعفر وقتادۃ وابن جبیر وغیرہم ویجوز ان تکون اللام للجنس ای بعد ای صلاۃ (روح)

تحبسونهما من بعد الصلوٰۃ۔ مفسر تھانویؒ نے کہا کہ اس سے مقصود قسم کی قوت اور اہمیت کو اور بڑھا دینا ہے، زمان متبرک اور مکان اجتماع خلق کی قید کے ساتھ۔

ولو كان ذا قربىٰ۔ انسان عموماً اور عادۃً عزیزوں قریبوں ہی کے نفع کا لحاظ کر کے جھوٹ بولنے اور جھوٹا حلف اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے ــــ خالقِ فطرت کا کلام ہے فطرت بشری کے کیسے کیسے چھپے ہوئے چوروں کا لحاظ رکھا ہے۔

شهادة الله۔ یعنی جس بات کے بیان کرنے پر ہم اللہ کی طرف سے مامور ہیں ــ عظمت الٰہی کے استحضار اور خشیتِ قلب کے بیدار کرنے کیلئے قرآن مجید اسلوب بھی کیسے کیسے مؤثر اختیار کرتا ہے، یہاں محض شہادت کو شہادۃ اللہ سے تعبیر کر کے اس کی کتنی اہمیت بڑھا دی۔

۳۲۸ یعنی ظاہراً ان گواہوں کا کاذب وخائن ہونا معلوم ہو جائے۔

عثر علی۔ یعنی اگر اس کی خبر ہو گئی، اگر یہ کھل گیا۔

عثر علی کذا ای اطلع علیه (قرطبی)

آیت کی ترکیب حضرت عمرؓ جیسے اہل زبان صحابی اور زجاج جیسے نحوی کو دشوار معلوم ہوئی ہے اور دوسرے مفسرین کرام کا ذکر ہی نہیں۔

قال عمر هذه الآية اعضل ما فی هذه السورۃ من الاحکام وقال الزجاج اصعب ما فی القرآن من الاعراب۔ (قرطبی)

البتہ رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے قول کا یہ مطلب نہیں کہ آیت کا مفہوم از روئے اعراب متعین کرنا دشوار ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جو حکم اس آیت میں بیان ہوا ہے وہ سورۃ کے دوسرے احکام سے مشکل تر ہے۔

وما نقله الواحدی عن عمر فلیس مما یؤید ما نقل عن المفسرین من استصعابها بل معناه ان احکامها اشد من سائر احکام السورۃ (المنار)

اور اسی ضمن میں شیخ نے بڑی دلچسپ بات یہ بھی فرمائی ہے کہ مفسرین کو دشواری اس لئے پیش آئی ہے کہ

الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْهِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَآ اَحَقُّ

جن کا حق دبا ہے (میت کے) قریب تر لوگوں میں سے ۳۲۹ اور یہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی ان دونوں

مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَآ ۖ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ

کی گواہی سے زیادہ درست ہے اور ہم نے زیادتی نہیں کی ہے، ورنہ بے شک ہم ہی ظالم ٹھہریں گے ۳۳۰ یہ اس کا

اَدْنٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰی وَجْهِهَآ اَوْ یَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌۢ ۳۳۱

قریب ترین (طریقہ) ہے کہ لوگ گواہی ٹھیک دیں۔ یا اس سے ڈرتے رہیں کہ ہماری قسمیں ان کی قسموں کے بعد الٹی پڑیں گی

ان کے پاس اپنے اپنے پیمانے نحو و فقہ کے ہوتے ہیں، اور وہ قرآن کو انھیں سے ناپنا چاہتے ہیں، حالانکہ قرآن ہر اصول نحو اور ہر قاعدۂ فقہی سے بالاتر ہے، لانا ان سارے علوم و قواعد کو قرآن کے ماتحت چاہیئے نہ کہ قرآن کو ان کے ماتحت بنانا۔

اقول یعنی لا یزعجنا ما یراہ المفسرون من الصعوبۃ فی اعراب بعض الآیات او فی حکمها لان لهم مذاهب فی النحو والفقه یزنون بها القرآن فلا یفهمونه الا منها والقرآن فوق النحو والفقه والمذاهب کلها فهو اصل الاصول، ما وافقه فهو مقبول وما خالفه فهو مردود مرذول (المنار)

۳۲۹ اب مقدمہ کا رخ بدل گیا، اوصیاء جو پہلے مدعیٰ علیہ تھے، ورثہ کے مقابل، اب خود مدعی ہو گئے، اور ورثہ جو اوصیاء کی خیانت کا دعویٰ لے کر آئے تھے اب مدعیٰ علیہ بن گئے۔

یعنی فی الایمان او فی الشهادۃ (قرطبی)

یقومٰن مقامهما۔ اگر دو کے بجائے ایک ہی گواہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

من الذین استحق علیهم الاولیان یعنی ان لوگوں میں سے جنھیں مال وصیت پہنچا تھا یعنی میت کے قریب تر اور مال کے وارث

روی عن سعید بن جبیر قال معنی الاولیان بالمیت یعنی الورثۃ (جصاص) الاقربان الی المیت (کبیر)

اولیان آیت میں بدل ہے فاٰخران سے۔

لان المعنی عند اهل التفسیر من الذین استحقت علیهم الوصیۃ والاولیان بدل من قوله فاٰخران قاله ابن السری واختارہ النحاس (قرطبی)

۳۳۰ یہ سب تعلیم اس غرض سے مل رہی ہے کہ یہ گواہ بھی اپنی ذمہ داری کا خوب اچھی طرح احساس و استحضار کر لیں سوا اس کے کہ جس کا ایمان یا خوفِ خدا دل سے بالکل ہی زائل ہو چکا ہو کوئی برائے نام مسلم بھی ایسے جھوٹے حلف کی جرأت کیسے کر سکتا ہے وما اعتدینا یعنی ہم نے حق و صداقت سے ذرا تجاوز نہیں کیا ہے نہ اس مال کے مطالبہ میں، ورنہ اوصیاء پر الزام خیانت لگانے میں

ای ما اعتدینا فی طلب هذا المال وفی نسبتهم الی الخیانۃ (کبیر)

۳۳۱ شاہ عبدالقادر دہلویؒ اپنے تفسیری حاشیہ میں لکھتے ہیں:۔

"یعنی وارثوں کو شبہ پڑے تو قسم دینے کا حکم رکھا، اس لئے کہ قسم سے ڈر کر اول ہی جھوٹ نہ ظاہر کریں پھر اگر ان کی

بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

اللہ سے ڈرتے رہو اور سنتے رہو اور اللہ فاسق لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا

الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۰۸ يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا

۳۳۲ (اس دن سے ڈرو) جس دن اللہ پیمبروں کو جمع کرے گا ۳۳۳ پھر ان سے پوچھے گا کہ تمہیں

لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۱۰۹

کیا جواب ملا تھا ۳۳۴ وہ عرض کریں گے کہ ہم کو علم نہیں چھپی ہوئی باتوں کے خوب جاننے والے تو بس آپ ہی ہیں ۳۳۵

بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں جانیں کہ ہماری قسم الٹی پڑے گی (موضح القرآن)

ذلك۔ یعنی یہی قانون جو دو آیتوں میں بیان ہوا ہے۔

اے الحکم الذی ذکرنا، والطریق الذی شرعنا (کبیر)

علی وجهها۔ یعنی مطابق حقیقت۔ بلا آمیزش۔

اے علی حقیقتها من غیر تغییر لها۔ (روح)

او یخافوا.... ایمانهم۔ اور اس ڈر سے جھوٹی قسم کھانے سے رک جائیں۔

"اگر سپردگی مال زائد کی نہیں ہوئی قسم کھالیں اور اگر ہوئی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کردیں یہ حکمت تو تحلیف اوصیاء میں ہے۔" (تھانوی) "اور ہم کو تخفیف ہونا پڑے گا، یہ حکمت تحلیف ورثہ میں ہے۔" (تھانوی)

۳۳۲ یہ راہ ہدایت سے محرومی دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے حصہ میں آتی ہے جو گویا نافرمانی کو اپنا پیشہ بنائے ہوئے ہیں اس ساری نافرمانی کا وبال یہ پڑتا ہے کہ نہ دنیا میں انھیں راہ راست پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے اور نہ آخرت میں انھیں اس کا ثمرہ یا جنت نصیب ہوگی۔

اے لا یهدیهم الی حجة او الی طریق الجنة (بیضاوی)

واتقوا الله یعنی تقوی الٰہی پر نظر اپنے تمام معاملات میں رکھو، اور ادائے شہادت میں بھی تقوے کا تعلق محض قول سے نہیں، عمل و قلب سے بھی ہے، یہ گویا اس امر کی تاکید ہے کہ قانونی احکام میں بھی نظر محض ضابطہ پر نہ رہے بلکہ ان پر عمل پوری دیانت، صداقت و اخلاص کے ساتھ کیا جائے۔

واسمعوا۔ یعنی احکام الٰہی کو سنتے اور مانتے رہو۔

معاملاتی احکام کی آیات پر واتقوا الله لانے سے ان احکام کی اہمیت و تاکید بھی مقصود ہے۔

۳۳۳ (مع ان کی امتوں کے)

ذکر قیامت کے موقع کا ہے۔

تقدیر کلام یوں ہے واتقوا یوم یجمع الله الرسل۔ بعض نے احذروا اور بعض نے اذکروا فرض کیا ہے۔

مقصود ہر صورت میں تخویف و تہدید ہے۔

قیل التقدیر واتقوا یوم یجمع اللہ الرسل عن الزجاج وقیل التقدیر اذکروا او احذروا یوم القیامۃ حین یجمع اللہ الرسل والمعنی متقارب والمراد التخویف والتھدید (قرطبی)

**۳۳۴** (ان امتیوں کی طرف سے)

یعنی تمہاری دعوت آیا قبول کی یا رد کی؟ ماذا یہاں بماذا کے مرادف ہے۔

بای شیء اجبتم (بیضاوی) قیل التقدیر بماذا اجبتم (روح)

امت کے نافرمانوں کے مواجہہ میں یہ مکالمہ بجائے خود ایک عذاب ان نافرمانوں اور سرکشوں کے حق میں ہوگا۔

اراد ان یفضحھم بذلک علی روس الاشھاد لیکون ذلک نوعا من العقوبۃ لھم۔ (قرطبی)

امام رازیؒ نے یہ کہا ہے کہ قرآن مجید کا ایک عام اسلوب بیان یہ ہے کہ احکام و شرائع کے مفصل بیان کے معاً بعد یا تو ذکر صفات الٰہی کا شروع کر دیا جاتا ہے یا حالات انبیاء کا، یا احوال قیامت کا، اور مقصود ان سب صورتوں میں ان احکام کی تعمیل کے لئے قلب کو زیادہ آمادہ کر دینا ہوتا ہے چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔

اعلم ان عادۃ اللہ تعالیٰ جاریۃ فی ھذا الکتاب الکریم انہ اذا ذکر انواعا کثیرۃ من الشرائع والتکالیف والاحکام اتبعھا اما بالالھیات واما بشرح احوال الانبیاء او بشرح احوال القیامۃ لیصیر ذلک موکدا لما تقدم ذکرہ من التکالیف والشرائع (کبیر)

**۳۳۵** یعنی ہمیں علم نہیں کہ ہمارے پیچھے انہوں نے کیا کیا، یا یہ کہ ان کے واقعی کیا عقائد تھے ہم تو اپنے سامنے ان کے صرف ظاہری اقوال و اعمال کو جانتے تھے، باطن کا علم تو صرف آپ ہی کو ہو سکتا ہے اور جزاء صرف انہیں اصل عقائد پر ملے گی۔

معناہ لا علم لنا بباطن ما اجاب بہ امم لان ذلک ھو الذی یقع علیہ الجزاء (قرطبی)

دوسری تفسیر اسی سے ملتی یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ جواب محض غلبۂ خشیت سے ادباً ہوگا یعنی آپ کے علم کامل و محیط کے آگے ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ علم ہمیں ہے بھی خود اس کا بھی تو ہم سے عالم تر ہے بعض صحابیوں اور تابعین سے یہی معنی مروی ہیں۔

لا علم لنا الا انک تعلم ما اظھروا وما اضمروا ونحن لا نعلم الا ما اظھروا فعلمک فیھم انفذ من علمنا۔ (ابن عباسؓ)

امام المفسرین ابن جریر طبری اور فخر المفسرین امام رازیؒ دونوں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

واولی الاقوال بالصواب قول من قال معناہ لا علم لنا الا علم انت اعلم بہ منا (ابن جریر) وھو الاصح۔ (کبیر)

دونوں تفسیروں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں۔

امام رازیؒ نے ایک تیسرے معنی یہ بھی بیان کئے ہیں کہ ہمیں جو کچھ حاصل ہے وہ محض درجۂ ظن کی چیز ہے اور آج جو کشف حقائق کا دن ہے محض ظن کام نہیں دے سکتا، آج تو علم ہی کام دے گا، اور وہ بس آپ ہی کو حاصل ہے۔

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس ذہول کی وجہ بعض نے تجلی جلال کے آثار ظہور کو بتایا ہے۔

اذ قال۔ بہ صیغۂ ماضی معنی مستقبل ہے، قرآن مجید کے اس عام اسلوب بیان کے مطابق، کہ مستقبل کے کسی بالکل قطعی و یقینی واقعہ کے وقوع کو ادا صیغۂ ماضی ہی سے کیا جاتا ہے۔

ای فی التعبیر عن المستقبل بالماضی۔ (بیضاوی۔ المنار)

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى

(وہ وقت یاد میں رکھو) جب اللہ عیسیٰ ابن مریمؑ سے کہے گا کہ میرا انعام اپنے اوپر اور اپنی والدہ کے اوپر یاد

وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ

کرو ۳۳۶ جب کہ میں نے تمہاری تائید روح القدس کے واسطہ سے کی تھی ۳۳۷ تم آدمیوں سے کلام (ماں کی

وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ

گود میں بھی کرتے تھے اور بڑی عمر میں بھی ۳۳۸ اور جبکہ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم دی ۳۳۹

**۳۳۶** انعامات کا سرچشمہ صرف وہی ذات تبارک و تعالیٰ ہے، مسیحؑ اس کے صرف ایک انعام پائے ہوئے معزز و مقرب بندے ہیں اور والدۂ مسیح اس کی صرف ایک انعام پائی ہوئی معزز و مقرب بندی۔

عیسیٰ بن مریمؑ سے یاد دلا دیا گیا کہ وہی نبی جو ایک عورت کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں، نہ کہ ابن اللہ۔ عیسیٰ اور مریمؑ پر تاریخی حاشیے پہلے بھی گزر چکے اور آئندہ بھی آئیں گے۔

وعلی والدتك۔ اس طریق تخاطب سے مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اہل اللہ کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت و شرف ثابت ہوتا ہے۔

**۳۳۷** مختلف انبیاءؑ کی امتیازی شانیں بھی مختلف رہی ہیں، حضرت عیسیٰؑ کی شانِ امتیازی یہ تھی کہ آپ کو حضرت جبرئیلؑ کی تائید ایک درجۂ خاص میں حاصل تھی۔

سورۃ البقرۃ آیت ۸۷ و ۲۵۳ میں اس فقرہ اور لفظ روح القدس پر حاشیے گزر چکے۔

**۳۳۸** اس پورے فقرے پر حاشیے سورۂ آل عمران میں آیت نمبر ۴۶ کے ذیل میں گزر چکے ہیں۔

کہلاً کے لفظ سے ایک نو پیدا فرقہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بوڑھی عمر تک پہنچ کر بھی اس دنیا میں زندہ تھے، حالانکہ لفظ سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ فی المھد (بچپن) کے مقابلہ کی بڑی عمر، پوری عمر یا پختہ عمر ہے جو نوجوانی کے ختم پر ۳۰، ۳۵ سال کے سن میں حاصل ہو جاتی ہے، لغت کے کچھ حوالے اس نوٹ میں درج ہو چکے ہیں، کچھ اب ملاحظہ ہوں، ایک میں صراحت ہے، ۳۰ اور ۴۰ کے درمیان والے کو کہلاً کہتے ہیں۔

الكهل من الرجال الذی جاوز الثلاثين ووخطه الشيب (جوهری) الكهل من الرجال من زاد علی ثلاثين سنة الی الاربعين۔ (نهايه)

اور حدیث میں جو لفظ "کہلاً" آیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جنت میں عاقل و بالغ داخل ہوں گے۔

وقيل اراد بالكهل ههنا الحليم العاقل ای ان الله يدخل اهل الجنة الجنة حلماء عقلاء (نهايه لسان)

اور اردو میں اس کو پختہ عمر والا کہتے ہیں، مستند اردو مترجمینِ قرآن بھی اسی طرف گئے ہیں، بڑھاپے سے ترجمہ کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔

"بڑی عمر میں" (شاہ عبدالقادر۔ تھانویؒ) "بڑے ہو کر" (نذیر احمد) "ادھیڑ" (شاہ رفیع الدین)۔

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِىْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا

اور جب تم مٹی سے پرندہ جیسی ایک شکل میرے حکم سے وجود میں لاتے تھے پھر تم اس کے اندر پھونک مارتے تھے تو وہ

بِاِذْنِىْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِىْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِىْ

میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا ۳۴۰ اور تم مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کر دیتے تھے اور جب تم مردوں کو میرے حکم سے نکال کھڑا کرتے تھے ۳۴۱

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ۳۰ سال کے اندر کسی روایت میں نہیں آئی ہے۔ مسیحی اور اسلامی دونوں روایتوں میں ۳۰ سے اوپر کی آئی ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ مفردات راغب میں گنتی کے جن چند لغات کا بیان رہ گیا ہے ان میں یہ لغت "کہل" بھی ہے[1] اور عجیب مزید یہ کہ صحاح جوہری کے فارسی ترجمہ صراح میں بھی یہ لفظ چھوٹ گیا ہے۔

۳۳۹ حضرت عیسیٰؑ براہ راست حق تعالیٰ کے شاگرد تھے، جیسا کہ اور سب انبیاء بھی ہوئے ہیں، اور سب سے بڑھ کر ہمارے حضرت خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم۔

الکتاب۔ یہاں بطور اسم جنس کے ہے یعنی آسمانی کتابوں کی جنس۔

المراد منہ جنس الکتاب (کبیر) الکتاب والحکمۃ المراد بہما جنس الکتاب والحکمۃ (کشاف)

الحکمۃ۔ التورٰیۃ۔ الانجیل۔ ان سب پر حاشیے گزر چکے، سورۂ آل عمران آیت ۴۸ کے تحت۔

۳۴۰ ان سب معجزات پر حاشیے سورۂ آل عمران میں گزر چکے، آیت ۴۹ کے تحت۔

معجزہ اصطلاح میں ہر اس خارق عادت کو کہتے ہیں جس کا ظہور پیمبر کے ہاتھ سے کافروں اور منکروں پر پیمبر کی تائید غیبی و نصرت الٰہی کے اظہار کے لئے، کرا دیا جاتا ہے۔

اور خارق عادت وہ واقعہ بھی ہے جو تکوینیات میں بندوں کے سمجھے اور قرار دیئے ہوئے کسی قاعدہ سے الگ ہو، مثلاً عام قاعدہ بندوں کے مشاہدہ میں یہ آیا ہے کہ ہندوستان میں جون کے مہینہ میں تیز گرمی اور دسمبر میں تیز سردی پڑتی ہے اب اگر کسی پیمبر کی دعا سے جون میں برف جمنے اور دسمبر میں لو چلنے لگے تو یہ اس پیمبر کا معجزہ کہا جائے گا۔ "نیچریوں" یا منکرین معجزات کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ بندوں کے مشاہدہ و تجربہ کو خود قدرت کی طرف سے کسی مستقل قاعدہ یا قانون کا اعلان سمجھے، اور دوسری غلطی یہ کہ قاعدوں اور قانونوں کو قانون ساز اور قاعدہ گر کی مرضی و ارادہ سے بے نیاز خود مستقل، مستمر، لا یزال حقیقتیں سمجھ بیٹھیے۔

باذنی۔ کی تکرار اس سارے سلسلۂ معجزات میں قابل غور ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا بادی النظر میں کیسا ہی عجیب و غریب ہو بہر حال تھا وہ اذن الٰہی، قانون تکوینی ہی کے کسی نہ کسی دفعہ کے ماتحت!

انما اعاد قولہ باذنی تاکید الکون ذلک واقعا بقدرۃ اللہ وتخلیقہ لا بقدرۃ عیسٰی وایجادہ۔ (کبیر)

تخلق۔ خلق کے معنی یہاں صورت بنانے کے ہیں۔

تخلق ای تصور (روح) ای تصورہ تشکلہ علی ہیئۃ الطائر (معالم)

تنفخ فیہا میں ضمیر مونث ھیئۃ کی طرف نہیں، بلکہ کھیئۃ کے ک کی جانب ہے۔

[1] "مفردات راغب" مطبوعہ ۱۳۸۱ھ میں "الکھل من وخطۃ الشیب" موجود ہے۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ فَقَالَ ٱلَّذِينَ

اور جبکہ میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک رکھا جب تم ان کے پاس روشن (نشانیاں) لے کر آئے تھے ۳۴۲

كَفَرُوا۟ مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ﴿١١٠﴾ وَإِذْ أَوْحَيْتُ إِلَى ٱلْحَوَارِيِّـۧنَ

پھر ان میں سے جو کفر اختیار کئے رہے وہ بول اٹھے کہ یہ تو بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایک کھلا ہوا جادو ہے ۳۴۳ اور وہ وقت قابل ذکر ہے

أَنْ ءَامِنُوا۟ بِى وَبِرَسُولِى قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا وَٱشْهَدْ بِأَنَّنَا مُسْلِمُونَ ﴿١١١﴾

جب میں نے حواریوں کو حکم دیا کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے پیمبر پر تو وہ بولے کہ ہم ایمان لائے اور آپ شاہد رہئے کہ ہم پورے فرمانبردار ہیں

الضمیر کان لانہا صفۃ الہیئۃ التی کان یخلق عیسیٰ ولا یرجع الی الہیئۃ المضاف الیہا لانہا لیست من خلقہ (کشاف)

۳۴۱ ان سارے معجزوں پر بھی حاشیے سورۂ آل عمران میں گزر چکے۔

باذنی۔ کی تکرار ہر فقرہ میں بہت ہی قابل لحاظ ہے۔ پیمبر کے سارے معجزات کی تہ میں کارفرما حق تعالیٰ کا مشیت ہی کا کوئی نہ کوئی قانون ہوتا ہے۔

باذنی اے بفعلی ذٰلک عند دعائک (کبیر) ذکر الاذن فی ہذہ الافاعیل انما ہو علی معنی اضافۃ حقیقۃ الفعل الی اللہ تعالیٰ (کبیر)

۳۴۲ یہ اشارہ ہے اس حقیقتِ تاریخی کی جانب کہ بنی اسرائیل نے حضرت مسیحؑ کی گرفتاری کی کوشش بار بار کی تھی اور ہر دفعہ اس میں ناکام رہے تھے۔

انجیل بھی اس تذکرہ سے خالی نہیں، مثلاً:۔

"انھوں نے اس کے مارنے کو پتھر اٹھائے، مگر یسوع چھپ کر ہیکل سے نکل گیا۔" (یوحنا ۸: ۵۹)

"انھوں نے پھر اس کے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔" (یوحنا ۱۰: ۳۹)

بالبینات۔ بینات میں دلائل عقلی اور معجزات دونوں آگئے۔

اے الدلالات والمعجزات۔ (قرطبی)

اذ جئتھم۔ ضمناً یہی اہم ایک بار پھر یہ حقیقت معرض بیان میں آگئی کہ حضرتؑ کا خطاب صرف بنی اسرائیل سے تھا۔ ملاحظہ ہو سورۂ آل عمران کے حاشیے۔

۳۴۳ یہود کی لکھی ہوئی جو قدیم ترین کتابیں ملتی ہیں یعنی حضرت مسیحؑ کے زمانہ کے متصل بعد کی ان میں بھی آپ کے اعجاز کو گویا سحر پیشہ ہونے کی صراحت موجود ہے اور اسی طرح ان کی کتابوں میں بھی جو اس بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول بلکہ ثلث اول میں یہودی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔

الذین کفروا منھم سے مراد وہی یہود ہیں، جو حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے منکر تھے، عام اس سے کہ وہ اسرائیلی انبیاء سابقین کو مانتے ہوں یا نہ مانتے ہوں۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ أَنْ يُنَزِّلَ

اور (وہ وقت قابل ذکر ہے) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسٰی ابن مریم! کیا آپ کا پروردگار قدرت رکھتا ہے کہ ہم پر

عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ ۖ قَالَ اتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٢﴾

کھانے کا خوان آسمان سے اتار دے ۳۴۵ (اس پر عیسٰیؑ نے) کہا کہ اللہ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو ۳۴۶

یعنی الذین لم یومنوا بک وجھد وا بنبوتک (قرطبی)

**۳۴۴** یا یہ کہ "ہم پورے مسلم ہیں"۔

مسلم کا لفظ کوئی نو پیدا اصطلاح نہیں، انبیاءؑ کے ماننے والے تو ہمیشہ اور ہر نبیؑ کے دور میں مسلم ہی کہلائے ہیں۔

واذا وحیت الی الحواریین۔ حواری پر حاشیہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا۔

وحی۔ کا اطلاق عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔

الوحی کل شئی دللت بہ من کلام او کتاب او اشارۃ او رسالۃ (ابن قتیبہ)

وحی۔ کے معنی قلب میں القاء یا الہام کے بھی ہوتے ہیں۔

والوحی فی کلام العرب معناہ الالہام ...... ای الھمتھم وقذفت فی قلوبھم (قرطبی) المراد بذلک الوحی الالہام والالقاء فی القلب (کبیر) قیل المراد بالوحی الیھم الھامہ تعالی ایاھم (روح) عن السدی یقول قذفت فی قلوبھم (ابن جریر) قیل المراد بھذا الوحی وحی الھام (ابن کثیر)

وحی کے یہ معنی لے کر تو آگے کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن وحی کو امر کے مرادف بھی قرار دیا گیا ہے۔

قال ابوعبیدۃ اوحیت بمعنی امرت وقیل اوحیت ھھنا بمعنی امرتھم (قرطبی) وجاء استعمال الوحی بمعنی الامر فی کلام العرب کما قال الزجاج (روح)

اس صورت میں صرف اتنا محذوف ماننا پڑے گا کہ "اے عیسٰی، تمہارے ذریعہ سے"۔

ای امرتھم فی الانجیل علی لسانک (روح) یحتمل ان یکون المراد اذا وحیت الیھم بواسطتک (ابن کثیر)

**۳۴۵** یٰعیسی بن مریم۔ اس طرز خطاب سے صاف ظاہر ہے کہ حواری بھی آپؑ کو ابن مریم ہی سمجھتے تھے ابن اللہ کا کوئی شائبہ بھی ان کے خیال میں نہ تھا۔

ھل یستطیع ربک۔ حواری بہرحال صاحب ایمان تھے، سوال سے ان کی مراد، بہ قول مفسر تھانویؒ یہی ہو سکتی ہے کہ کوئی امر مثلاً اس کا خلاف حکمت ہونا اس سے مانع تو نہیں؟

المراد من ھذا الکلام استفہام ان ذلک ھل ھو جائز فی الحکمۃ ام لا (کبیر) قیل ھذہ الاستطاعۃ علی ما تقتضیہ الحکمۃ والارادۃ فکانھم قالوا ھل ارادۃ اللہ تعالی وحکمتہ تعلقت بذلک اولا (روح)

مائدۃ من السماء۔ مائدہ کے اصل معنی خوان طعام کے ہیں اور پھر مطلق طعام کو بھی کہنے لگے۔

المائدۃ الطبق الذی علیہ الطعام ویقال لکل واحد منھما مائدۃ (راغب) مائدۃ وھی الخوان

قَالُوۡا نُرِيۡدُ اَنۡ نَّاۡكُلَ مِنۡهَا وَتَطۡمَٮِٕنَّ قُلُوۡبُنَا وَنَعۡلَمَ اَنۡ قَدۡ

وہ لوگ بولے کہ ہم تو (بس) یہ چاہتے ہیں کہ اس میں سے کھائیں، اور اپنے دلوں کو مطمئن کرلیں اور یقین

صَدَقۡتَنَا وَنَكُوۡنَ عَلَيۡهَا مِنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيۡسَى ابۡنُ مَرۡيَمَ

کرلیں کہ آپ ہم سے سچ بولے ہیں، اور ہم اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں ۳۴۷ عیسیٰ ابن مریمؑ نے دعا کی ۳۴۸

ربع

علیه الطعام (جوهری) المائدة فی المشهور الخوان الذی علیه الطعام وتطلق المائدة علی نفس الطعام ایضاً (روح) المائدة الخوان الذی علیه الطعام قال قطرب ویسمی الطعام ایضاً (قرطبی)

یہاں مراد کھانے ہی سے لی گئی ہے۔

قیل اتدعوا طعاما (راغب)

۳۴۶ یعنی بلا ضرورت خرق عادت کی طلب وفرمائش آداب ایمان کے بالکل خلاف ہے۔

اتقوا الله فی تعیین المعجزة فانه جار مجری التعنت والتحکم (کبیر) اتقوا الله من امثال هذا السؤال واقتراح الآیات (روح)

مرشد تھانویؒ نے فرمایا کہ اس میں زجر ہے کہ اہل اللہ میں خوارق کو تلاش کیا جائے۔

۳۴۷ حواری اپنی صفائی میں یہ تقریر کر رہے ہیں کہ سوال سے ہماری غرض کوئی بے ادبی نہیں تھی مقصود صرف اس قدر تھا کہ ناکل منها۔ ہم اس آسمانی غذا سے کچھ کھائیں اور اس سے لذت وبرکت حاصل کریں۔

اکل تبرك (روح۔ معالم)

وتطمئن قلوبنا۔ اور اس خرق عادت کے مشاہدہ سے ہمارا ایمان اور ترقی حاصل کرے۔

بازدیاد الیقین کما قال عطاء (روح)

ونعلم۔ اور ہم مشاہدہ کی مزید قوت کے ساتھ یقین حاصل کرلیں۔

علم مشاهدة وعیان علی ما قدمناه (روح)

اَنۡ قَدۡ صَدَقۡتَنَا۔ کہ آپ اپنے دعویٰ نبوت میں بالکل سچے ہیں۔

ای ان قد صدقتنا فی ادعاء النبوة (روح) ای نزداد ایمانا ویقینا (معالم)

ونکون علیها من الشاهدین } اور اس کے بعد ہم دوسروں کے سامنے بھی یہ گواہی دے سکیں کہ ہاں ہم نے اپنی آنکھوں سے ایسا معجزہ دیکھا ہے، اور اس طرح ان کی ہدایت کا ذریعہ بھی بن جائیں۔

عند من لم یحضرها من بنی اسرائیل (روح) ونکون من الشاهدین لك عند بنی اسرائیل (معالم)

نرید۔ ارادہ یا تو اپنے عام معنی میں ہے اور یا شوق وتمنا کے معنی میں۔

والارادة اما معناها الظاهر او بمعنی المحبة (روح)

۳۴۸ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب دیکھ لیا کہ حواریوں کی غرض فاسد نہیں تو اب ان کے فرمائشی معجزہ

اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا

کہ اے اللہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لئے ایک خوان (طعام) آسمان سے ایسا اُتار دیجئے کہ وہ ہمارے لئے (یعنی) ہم میں سے اگلوں

وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ

اور پچھلوں کے لئے ایک جشن بن جائے اور آپ کی طرف سے ایک نشان ہو جائے، تو ہمیں عطا کر دیجئے اور آپ ہی بہترین عطا کرنے والے ہیں ۳۴۹

مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ

اللہ نے فرمایا کہ وہ کھانا ضرور تم پر اُتاروں گا، لیکن پھر جو کوئی تم میں سے کفر اختیار کرے گا اسے سزا بھی وہ دوں گا کہ وہ سزا دنیا

اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ع ۱۵

والوں میں سے کسی کو بھی نہ دوں گا ۳۵۰ اور (وہ وقت بھی قابل یاد رکھنے کے ہے) جب اللہ فرمائے گا ۳۵۱ کہ اے عیسیٰ ابن مریم

کے لئے حضرت حق سے دعا و مناجات کی۔

۳۴۹ دعا کے الفاظ اللھم، ربنا، وارزقنا وانت خیر الرازقین کس کس طرح عقیدۂ اُلوہیت مسیحؑ پر ضرب لگانے والے ہیں؟ اللھم اور ربنا دونوں میں اُلوہیت و ربوبیت کا مکرر انتساب حق تعالیٰ کی جانب حضرت مسیحؑ کی زبان سے ہے۔

عیدًا۔ عید کہتے ہیں اس خوشی کو جو بار بار لوٹ کر آتی رہے، یعنی اسے تہوار کا دن بنالیں۔

العید السرور العائد (کشاف) یستعمل العید فی کل یوم فیہ مسرۃ (راغب) ای یکون یوم نزولھا عیدا۔ (مدارک)

لاولنا واخرنا۔ یعنی ہم لوگ جو موجود ہیں ان کے لئے بھی اور جو لوگ ہمارے بعد آئیں ان کے لئے بھی۔

ای لاھل زماننا ولمن یجیء بعدنا (روح) قال ابن عباسؓ لاولنا اھل زماننا ولاخرنا من یجیء بعدنا (بحر)

اٰیۃ منک۔ ایک الٰہی نشان بن جائے میری پیمبری کا کہ اس سے مومنین کا ایمان بڑھ جائے اور منکرین پر حجت قائم ہو جائے۔

اٰیۃ کائنۃ منک دالۃ علی کمال قدرتک وصحۃ نبوتی (روح) علی صحۃ نبوتی (مدارک)

من السماء۔ یہ لازمی نہیں کہ نزول "آسمان" ہی سے ہو، بلکہ صرف جہت آسمان یا بلندی سے نزول بھی مراد ہو سکتا ہے۔

والمراد بھا اما المحل المعھود وھو المتبادر من اللفظ واما جھۃ العلو (روح)

سماء پر حاشیے بار بار اس تفسیر میں آئے ہیں کہ اس لفظ سے کلام عرب میں مراد ہمیشہ آسمان ہی نہیں ہوتی بلکہ مطلق بلندی بھی مراد ہوتی ہے۔

وانت خیر الرازقین۔ رزق سے معاً رازق تک پہنچ جانا اور فوراً خیر الرازقین کی حمد و ثنا میں لگ جانا پیمبروں کی زبان کی امتیازی خصوصیت ہے۔

۳۵۰ ایسی کھلی ہوئی حس و مشاہدہ میں آئی ہوئی نعمت کا انکار جس شدید درجہ کی ناشکر گزاری ہے، سزا بھی اسی درجہ میں شدید ملے گی۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

کیا تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ "خدا کے علاوہ مجھے اور میری والدہ کو بھی معبود بنا لو؟" ۳۵۲ (عیسیٰ) عرض

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ

کریں گے پاک ہے تو، میرے لئے یہ کسی طرح بھی ممکن نہ تھا کہ میں ایسی بات کہہ دیتا جس کا مجھے کوئی حق ہی نہ تھا ۳۵۳

قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ

اگر میں نے کہا ہوتا تو یقیناً تجھ کو اس کا علم ہوتا، تو تو جانتا ہی ہے جو کچھ میرے دل میں ہے البتہ میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے دل میں ہے

اجر ایمان کا دار ومدار غیبیت پر بھی ہے۔ اب جو واقعہ سلسلۂ اسباب عادیہ سے اس قدر الگ ہو جیسا کہ بلا اسباب ظاہری بلکہ خلاف اسباب ظاہری، آسمان یا جہت آسمان سے تیار شدہ کھانے کا اتر آنا نہایت بیّن اور معمول سے زیادہ نمایاں معجزہ ہے، اتنے کھلے ہوئے خارق عادت سے ایمان پر انکار کرنا غیب ہی سے نہیں کہنا چاہیئے کہ شہود کے بعد بھی انکار پر قائم رہنا ہے، جو جحود کی قبیح ترین شکل ہے اور ایسے جرم کی سزا بھی شدت جرم ہی کی مناسبت سے شدید ترین ہوگی۔

انی منزّلھا علیکم۔ مفسرین کے ایک گروہ نے ان الفاظ سے یہ استنباط کیا ہے کہ نزول مائدہ ضرور واقع ہو کر رہا، لیکن مفسرین ہی کے دوسرے گروہ نے ان الفاظ کے ساتھ اس کی بھی قید لگا دی ہے یعنی ان سألتم اور واقعۂ نزول سے انکار بعض تابعین تک سے منقول ہے۔

فقال مجاھد والحسن لم تنزل (معالم) قال الحسن ومجاھد لما سمعوا الشرط فاشفقوا فلم تنزل (بحر) قال الحسن ان المائدۃ لم تنزل (مدارک)

منزلھا۔ اس صیغۂ تفعیل نے ایک معنی یہ بھی پیدا کر دیئے ہیں کہ یہ نزول خوان بار بار ہوتا رہے گا۔

مرات عدیدۃ کما ینبئ عن ذلک صیغۃ التفعیل (روح) ای منزلھا مرۃ بعد اخری (کبیر)

۳۵۱ (قیامت کے دن)

یہ سوال وجواب مسیحیوں یعنی مسیح پرستوں کو اور زیادہ قائل اور شرمندہ کرنے کے لئے میدان حشر میں ہوگا۔

قال قتادۃ وابن جریج واکثر المفسرین انما یقول لہ ھذا یوم القیامۃ (قرطبی) الجمھور علی ان ھذا السوال یکون فی یوم القیامۃ (مدارک) قال سائر المفسرین انما یقول اللہ لہ ھذا القول یوم القیامۃ (معالم)

۳۵۲ مسیح پرستی تو خیر موجودہ مسیحیت کے مرادف ہی ہے لیکن مریم پرستی بھی مسیحی دنیا کا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، دعائیں اس "خدا کی کنواری" کو مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، نذریں اور نیازیں ان کے نام پر کی جاتی ہیں، کیتھولک گرجاؤں میں قد آدم تصویریں ان کی لگی رہتی ہیں، جن کے آگے مراسم پرستش بجا لائے جاتے ہیں۔

مریم پرستی پر مزید معلومات کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر انگریزی۔

سوال سے مقصود ظاہر ہے کہ استفہام واستفسار نہیں، بلکہ مسیح پرستوں اور مریم پرستوں پر مزید حجت قائم کرنا،

إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ

بے شک تو ہی تو ہے پوشیدہ چیزوں کا خوب جاننے والا ۳۵۴ میں نے تو ان سے کچھ بھی نہیں کہا تھا بجز اس کے جس کا تو نے

اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ

مجھ کو حکم دیا تھا یعنی یہ کہ میرے اور اپنے پروردگار اللہ کی پرستش کرو ۳۵۵ میں ان پر گواہ رہا جب تک میں ان کے درمیان رہا

اور انھیں اور زیادہ خجل ولاجواب کرنا اور انھیں خود انھیں کی نظر میں ذلیل کرنا ہے۔

ولیس ھو باستفھام انہ سالہ عن ذلک توبیخا لمن ادعی ذلک علیہ لیکون انکارہ بعد السوال ابلغ فی التکذیب واشد فی التوبیخ والتقریع۔ (قرطبی)

۳۵۳ میری مجال نہیں کہ میں ایسا صریح کلمۂ باطل زبان سے نکال سکتا!

فخر المفسرین امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ حق تعالیٰ کے براہ راست سوال (اقلت للناس) کا جواب براہ راست ماقلت دینے اور یوں اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اسے تمام تر علم الٰہی کے حوالے کر دیئے اور یہی مقام ادب و تواضع کے زیادہ مناسب بھی تھا۔

فلم یقل بانی ما قلت ھذا الکلام لان ھذا یجری مجری دعوی الطھارۃ والنزاھۃ والمقام مقام الخضوع والتواضع (کبیر)

سبحانک یعنی پاک ہے تو ہر قسم کی شرکت سے اور ہر ایسے انتساب سے جو تیری شان کے لائق نہ ہو۔

۳۵۴ حضرت عیسیٰؑ عرض کریں گے کہ بالفرض میں نے کوئی ایسی بات کہی ہوتی تو وہ ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی اور جب تیرے علم میں نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی، میرے ناقص و محدود علم اور تیرے کامل و غیر محدود علم کا مقابلہ ہی کیا، میری ہر چھپی ہوئی چیز خوب تجھ پر روشن، لیکن تیری کوئی سی بھی چھپی ہوئی چیز مجھ پر روشن نہیں، اور ایک میرے ہی مغیبات پر کیا موقوف ہے، تجھ پر تو ہر غیب روشن ہے۔

انک انت علام الغیوب سے مقصود حق تعالیٰ کے علم محیط و کامل کا اثبات ہے، اور اس میں رد آ گیا بہت سی مشرک قوموں کے عقائد واہیہ کا۔

یہ حضرت عیسیٰؑ کا دوسرا جواب ہے، پہلا جواب لفظ سبحانک میں آ گیا، یعنی تیری شانِ تنزیہی کے بالکل خلاف ایسی بات میں زبان سے نکال کیونکر سکتا تھا۔

مافی نفسک۔ سے بعض اہل باطل نے حق تعالیٰ کی تجسیم نکالنی چاہی ہے اور کہا ہے کہ نفس سے مراد شخص ہوتی ہے لیکن جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا، اول تو نفس و ذات مرادف ہیں، جسمیت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

النفس عبارۃ عن الذات یقال نفس الشیء وذاتہ بمعنی واحد (کبیر) قال الزجاج النفس عبارۃ عن جملۃ الشیء وحقیقتہ یقول تعلم جمیع ما اعلم من حقیقۃ امری ولا اعلم حقیقۃ امرک (معالم) ای ذاتک فنفس الشیء ذاتہ وھویتہ والمعنی تعلم معلومی ولا اعلم معلومک (مدارک)

اور پھر نفسی کے مقابلہ میں نفسک لانا ہی بہ قاعدۂ مشاکلت عربی اسلوبِ بیان میں فصیح تر ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾

پھر جب تو نے مجھے (دنیا سے) اٹھالیا (جب سے) تو ہی ان پر نگراں ہے، اور آپ ہر چیز پر گواہ ہیں ۳۵۶

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾

تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں ۳۵۷ اور اگر تو انھیں بخش دے تو تو ہی زبردست حکمت والا ہے ۳۵۸

ذکر هذا الکلام علی طریق المطابقة والمشاکلة وهو من فصیح الکلام (کبیر)

**۳۵۵** موجودہ انجیلیں بھی باوجود اپنے تثلیثی شرک کے اس توحیدی تعلیم کو مٹا نہ سکیں:۔

"یسوع نے اس سے کہا، اے شیطان دور ہو، کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت کر تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا، اور دیکھو فرشتے آکر اس کی خدمت کرنے لگے"۔ (متی ۴: ۱۰ و ۱۱)

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا، لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر، اور صرف اسی کی عبادت کر"۔ (لوقا ۴: ۸)

ان اعبدوا میں ان مفسرہ اے کے مرادف ہے۔

ان مفسرة بمعنی ای (مدارک) ان مفسرة (کبیر)

حضرت کا یہ کلام آپ کی کمال عبدیت اور انتہائی عبودیت پر دلالت کر رہا ہے آپ نے اس پیام توحید کو بھی براہ راست اپنی جانب منسوب نہیں کر دیا کہ میں انھیں یہ پیام دے آیا تھا، بلکہ یوں عرض کیا کہ میں تو وہی کہہ آیا تھا جس کا حکم تو نے ہی دیا تھا، پیام توحید بھی میری اپنی جانب سے نہ تھا، تیرے ہی ارشاد کی تعمیل یہ بھی تھی۔

**۳۵۶** آیت میں ایک بار پھر حضرت حق کے علم محیط و کامل کا اثبات ہے۔

کنت علیهم شهیدا مادمت فیهم۔ یعنی میں جب تک دنیا میں زندہ رہا، میری امت کا حال میرے علم و مشاہدہ میں آتا رہا۔ فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیهم۔ یعنی جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھالیا، اس کے بعد سے مجھے کچھ خبر نہیں۔

توفیتنی۔ یہ لفظ دونوں مفہوموں کو شامل ہے زندہ آسمان پر اٹھالئے جانے کو بھی جیسا کہ جمہور امت کا قول ہے

المراد منه وفاة الرفع الی السماء (کبیر) ای قبضتنی بالرفع الی السماء کما یقال توفیت المال اذا قبضته وروی هذا عن الحسن وعلیه الجمهور۔ (روح)

اور طبعی موت کو بھی جیسا کہ جبائی معتزلی کا قول ہے، اور مفسرین نے بھی اسے قبول کئے بغیر نقل کیا ہے۔

وعن الجبائی ان المعنی امتنی والجمهور ان رفعه علیه السلام الی السماء کان بعد موته والیه ذهب النصاری (روح) قیل هذا یدل علی انه توفاه وفاة الموت قبل ان رفعه ولیس بشیء (بحر)

قال الحسن الوفاة وفاة الموت ووفاة النوم ووفاة الرفع (بحر)

"جب تو نے مجھے قبض کر لیا" (ترجمہ شاہ رفیع الدین دہلویؒ) "جب تو نے مجھے بھر لیا" (ترجمہ شاہ عبد القادر دہلویؒ)

**۳۵۷** (اور تو ان کا مالک و مختار اور پیدا کرنے والا ہے تو جو چاہے ان کے ساتھ معاملہ کرے میں دخل دینے کی مجال نہیں رکھتا، میں ان کا لاکھ خیرخواہ سہی پھر بھی وہ حق تو نہیں رکھ سکتا جو خالق کو اپنی مخلوق پر اور معبود کو اپنے عبد پر ہوتا ہے

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ

اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے جب سچوں کے کام ان کا سچ آئے گا ۳۵۹ان کے لئے باغ ہوں گے جن کے

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِىَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا

نیچے ندیاں بہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ ہمیش کو رہیں گے۔ اللہ ان سے خوش رہا اور وہ اللہ سے

عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

خوش رہے یہی بڑی کامیابی ہے ۳۶۰

عبد و معبود کا رشتہ دنیا کے ہر ممکن رشتہ پر فائق و مقدّم ہے۔

۳۵۸ تو ان کی مغفرت ہی کر دینا چاہے تو کون تجھ کو روک سکتا ہے تو سب پر غالب؛ العزیز ہے تیرا ارادہ سب پر حاکم و مقتدر لیکن تو اسی کے ساتھ الحکیم بھی تو ہے تیرا کوئی فیصلہ خلافِ حکمت ہو نہیں سکتا، تو کرے گا وہی جو تیرے آئین و حکمت و مصلحت کے مطابق ہوگا، میں ایک بندہ ہو کر اس میں دخل دینے والا کون؟

یعنی انت قادر علی ما ترید، حکیم فی کل ماتفعل لا اعتراض لاحد علیک فمن انا والخوض فی احوال الربوبیة (کبیر)

واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو قیامت میں ہوگی، جہاں کافروں اور منکرانِ دینِ حق کے لئے کوئی محل ہی شفاعت کا نہیں، یہیں سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ کے اس کلام میں، ان کے پیمبر جلیل القدر ہونے کے باوجود کوئی شائبہ شفاعت کا نہیں، بلکہ مقصود تمام تر اللہ کی طرف تفویض ہے۔

ومقصودہ منہ تفویض الامور بالکلیة الی اللہ تعالی وترک التعرض والاعتراض بالکلیة (کبیر)

دل ذلک علی ان غرضہ تفویض الامر بالکلیة الی اللہ تعالی وترک التعرض لھذا الباب من جمیع الوجوہ (کبیر)

ضمناً حضرت مسیحؑ کے اس کلام سے تردید بھی مسیحیوں کے اس عقیدہ کی نکل آئی کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں، خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا، جیسا کہ موجودہ انجیل میں ہے:-

"باپ کسی کی بھی عدالت نہیں کرتا، بلکہ اس نے عدالت کا سارا کام بیٹے کے سپرد کیا ہے۔" (یوحنا ۵: ۲۳)

۳۵۹ حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اوپر کے سب مکالمات و مخاطبات کے بعد ہوگا۔

الصادقین۔ وہ ہیں جو دنیا میں عقائدِ صحیحہ و اعمالِ صالحہ پر قائم رہے ہوں۔

المعنی ان صدقھم فی الدنیا ینفعھم فی القیامة (کبیر)

اس کے ماتحت میں انبیاءؑ کے علاوہ عام مومنین بھی داخل ہیں۔

صدقھم۔ یعنی وہ سچائی جس کا اقرار انھوں نے دنیا میں کیا تھا، اقرارِ توحید و رسالت۔

۳۶۰ بڑی کامیابی کس چیز کو کہا گیا ہے؟ جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اشارہ پوری آیت کی جانب یعنی نعمتِ جنت اور نعمتِ رضوانِ الٰہی سب کی جانب ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ؕ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾

اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے اس (سب) کی، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے ۳۶۱

الجمهور على ان قوله ذلك عائد الى جملة ما تقدم من قوله لهم جنات الى قوله ورضوا عنه (كبير)
لیکن امام رازیؒ نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ الفوز العظیم کا تعلق صرف رضوان الٰہی سے ہے جس کے مقابلہ میں جنت کی عام نعمتوں کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

وعندی انه يحتمل ان يكون ذلك مختصا بقوله رضى الله عنهم ورضوا عنه فانه ثبت عند ارباب الالباب ان جملة الجنة بما فيها بالنسبة الى رضوان الله كالعدم بالنسبة الى الوجود وكيف والجنة مرغوب الشهوة والرضوان صفة الحق واى مناسبة بينهما (كبير)

امام موصوف تصوف کے بھی ذوق شناس تھے خدا جانے خشک متکلم کیسے مشہور ہو گئے خود بھی خشک متکلموں سے عاجز تھے چنانچہ یہیں اپنا خیال لکھ کر فرماتے ہیں:-

وهذا الكلام يشمئز منه طبع المتكلم الظاهرى ولكن كل ميسر لما خلق (كبير)

ابدًا۔ صراحت کے ساتھ یہ دوام اور ابدیت کی خوش خبری اہل جنت ہی کے حق میں آئی ہے، ورنہ اہل دوزخ کے لئے وعید صرف لفظ خلود کی حد تک ہے۔

(اشارة الى الدوام (كبير)

۳۶۱ ایجاد و اعدام، نیستی سے ہستی اور ہستی سے نیستی، ہر چیز پر قادر اس کی قدرت علی الاطلاق کو کسی شرط و قید سے محدود و مقید کرنا سرتا سر جہل ہے۔

مخلوقات پر حکومت و سلطنت جو کچھ ہے وہ خدائے واحد و یکتا کی ہے، نہ کسی فرزند خدا یا مظہر خدا وغیرہ کی۔

ما فیھن۔ ما غیر ذوی العقول یا بے جانوں کے واسطے آتا ہے، اور من ذوی العقول کے لئے، امام رازیؒ نے یہ سوال قائم کر کے کہ یہاں من کے بجائے ما کا استعمال کیوں ہوا ہے، جواب یہ دیا ہے کہ ساری مخلوقات اپنے مسخر ہونے کے اعتبار سے خالق کی قضا و قدرت کے آگے ایسی ہیں کہ جیسے ان میں جمادات کی طرح نہ کوئی توت ہے اور نہ بہائم کی طرح عقل ہے اللہ کی قدرت کے سامنے وہ گویا بالکل بے قدرت اور اللہ کے علم کے سامنے وہ گویا بالکل بے علم ہیں۔

ولم يقل ومن فيهن فغلب غير العقلاء على العقلاء والسبب فيه التنبيه على ان كل المخلوقات مسخرون فى قبضة قهره وقدرته وقضائه وقدره وهم فى ذلك التسخير كالجمادات التى لا قدرة لها وكالبهائم التى لا عقل لها فعلم الكل بالنسبة الى علمه كلا علم وقدرة الكل بالنسبة الى قدرته كلا قدرة (كبير)